فی ظلالِ القرآن

پارہ ۱ تا ۴

جلد اوّل

سید قطب شہید

ترجمہ

سید معروف شاہ شیرازی

ادارہ منشوراتِ اسلامی

بالمقابل منصورہ ملتان روڈ لاہور

شہید اسلام سید قطب رح اور تفسیر فی ظلال القرآن

شہید اسلام سید قطب کا شمار امت مسلمہ کی ان چند برگزیدہ ہستیوں میں ہوتا ہے جنہوں نے تاریک ادوار میں روشنی کے چراغ جلائے اور اسلامی نظام زندگی کی کھیتی کو اپنے خون سے سینچا۔

سید قطب ؒ ۱۹۰۶ء میں مصر کے ایک صوبہ "اسیوط" کے ایک گاؤں "موشاء" میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام حاجی قطب ابراہیم اور والدہ کا نام فاطمہ حسین عثمان تھا۔ دونوں عربی النسل تھے۔ سید قطب ؒ اپنے والدین کے سب سے بڑے لڑکے تھے۔

آپ نے ثانوی تعلیم "تجہیزیہ دار العلوم" نامی ایک اسکول میں حاصل کی۔ اس اسکول میں طلباء کو دار العلوم میں داخلہ کے لئے تیار کیا جاتا تھا۔ وہاں سے فارغ ہو کر آپ ۱۹۲۹ء میں قاہرہ کے دار العلوم میں داخل ہوئے۔ ۱۹۳۳ء میں آپ نے بی۔ اے کی ڈگری اور ڈپلومہ ان ایجوکیشن حاصل کیا۔ تعلیم سے فراغت کے بعد آپ نے محکمہ تعلیم میں بحیثیت انسپکٹر تعلیم ملازمت اختیار کر لی اور ۱۹۵۲ء تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ اسی دوران ۱۹۵۳ء میں آپ اخوان المسلمون سے متعارف ہوئے۔ اور ۲ جولائی ۱۹۵۴ء میں آپ کو اخوان کے شعبہ نشر و اشاعت نے اخبار "الاخوان المسلمون" کا ایڈیٹر مقرر کیا۔

شہید اسلام سید قطب ؒ ۱۹۵۴ء سے لے کر ۱۹۶۴ء تک جیل میں رہے اور اگست ۱۹۶۴ء میں مرحوم عبد السلام عارف صدر عراق کی کوشش سے رہا ہوئے۔ رہا ہوتے ہی پوری دنیا کے نوجوانوں نے آپ کی طرف رجوع کیا، اور آپ کا لٹریچر جنگل کی آگ کی طرح پوری دنیا میں پھیلنے لگا۔ چنانچہ لادین مغرب پرست کیمونسٹ اور سوشلسٹ عناصر چیخ اٹھے اور بیک وقت ماسکو اور واشنگٹن سے ان کے خلاف سازشیں ہونے لگیں۔ چنانچہ آپ کو ایک سال بعد اگست ۱۹۶۵ء میں دوبارہ گرفتار کر لیا گیا اور ایک سال بعد ۲۹ اگست ۱۹۶۶ء میں آپ کو شہید کر دیا گیا۔

سید قطب اخوان المسلمون میں آنے سے پہلے خالص ادبی کام کرتے رہے۔ لیکن تحریک اخوان المسلمون میں شامل ہونے کے بعد اسلامی انقلاب، اور تحریک اسلامی، ان کا خاص موضوع رہا۔

مصنف نے فی ظلال القرآن میں قرآن پاک کی اثر انگیزی، جس نے عرب کی کایا پلٹ دی تھی، کی راہ میں حائل پردوں کو چاک کر دیا ہے۔ اس کے ذریعے قرآن پاک کا مطالعہ کرنے والا اس تحریک کے ساتھ جا کھڑا ہوتا ہے جو ہبوط آدم علیہ السلام کے وقت سے روئے زمین پر برپا ہوئی اور انبیا علیہم السلام کی قیادت میں چلتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور تک آپہنچی۔ آپ ؐ کے بعد بھی یہ تحریک زندہ ہے اور قیامت تک جاری رہے گی۔ قاری توحید و رسالت اور آخرت کے عقیدے کو قافلے کے ایک رفیق اور تحریک کے ایک کارکن کی حیثیت سے سنتا اور سمجھتا ہے اور قوموں کے عروج و زوال کی داستان کو امت کے ایک فرد کی حیثیت سے پڑھ کر اس سے سبق لیتا ہے۔

فی ظلال القرآن میں علمی موشگافیوں اور فقہی باریکیوں سے ہٹ کر قرآن پاک کے اصل مقصد اور دعوتی رنگ کو اختیار کیا گیا ہے۔ اس کے لئے جو زبان استعمال کی گئی ہے۔ وہ سید کا ہی حصہ ہے اور اسے بلاشبہ الہامی زبان کہا جا سکتا ہے۔ اپنے اس رنگ میں یقیناً یہ ممتاز ترین تفسیر ہے۔ تفسیر کیا ہے ایک دعوت عمل اور دعوت انقلاب ہے، الفاظ اور معنی کا دریا ہے۔ جس میں تحقیقی، علمی، وجدانی، اور ادبی نکات جابجا موجود ہیں۔ پورے ذخیرہ تفاسیر میں یہ پہلی تفسیر ہے۔ جو خود قرآن کے اسلوب بیان میں لکھی گئی ہے۔ دوسری تفاسیر بالعموم منطقی انداز بیان میں لکھی گئی ہیں اور فی ظلال القرآن قرآنی اور انقلابی انداز بیان میں ہے۔ اس کی اہم خصوصیات یہ ہیں کہ یہ اختلافی مسائل اور اسرائیلیات سے خالی ہے۔ اسلام کا جامع تصور لئے ہوئے، اس کے احیاء کا طریقہ کار نمایاں کرتی ہے۔ غرض اخلاص، روح ایمان، عمل صالح اور دعوت انقلاب اس کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ پندرہ پارے جیل سے باہر اور بقیہ جیل میں لکھے گئے ہیں۔ عربی میں اب تک کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

اردو ترجمہ کی تکمیل کے بعد اب فی ظلال القرآن کی پہلی جلد آپ کے ہاتھوں میں ہے اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں اس سلسلہ کی مزید ۵ جلدیں، جلد شائع کرنے کی توفیق نصیب فرمائے آمین ثم آمین (سید عارف شیرازی)

جلد اول

سورۃ الفاتحہ ۔ ۱	آیات	۱ -- تا -- ۷
سورۃ البقرہ ۔ ۲	آیات	۱ -- تا -- ۲۸۶
سورۃ آل عمران ۔ ۳	آیات	۱ -- تا -- ۲۰۰
سورۃ النساء ۔ ۴	آیات	۱ -- تا -- ۲۳

---ООО---

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فہرست جلد اول

پارہ نمبر- ا-------- سورۃ الفاتحہ -ا

.....پارہ - ۲.....

.....پارہ - ۳.....

.....سورۃ آل عمران - ۳.....

.....پارہ ـ ۴.....

.....سورۃ النساء ـ ۴.....

---OOO---

نوٹ

فی ظلال القرآن کے تفسیری ادب ' میں اپنے اسلوب تفسیر ' انداز بیان اور اپنی صورت فکر کے لحاظ سے ایک منفرد مقام رکھتی ہے ۔ اس کا اسلوب بھی نیا ہے ۔ عربی زبان میں سید قطب صاحب طرز ادیب ہیں ۔ انہوں نے جدید عربی کو بالکل ایک نیا اسلوب دیا ہے ۔ میں اسے ''ایمانی اسلوب بیان'' سے تعبیر کرتا ہوں ۔ نئی نئی تعبیرات کو استعمال میں لاکر اپنے مافی الضمیر کا اظہار کیا ہے ۔ اس کا ترجمہ اس معیار کا تو ممکن ہی نہیں ' میں نے اپنے اس ترجمہ میں نہایت ہی سہل اور سادہ پیرایہ اظہار میں ان کے مفہوم اور مراد کو منتقل کرنے کی سعی کی ہے ۔

کتاب کے معنوی حسن کے ساتھ ساتھ ہم نے یہ کوشش کی ہے کہ اس کی کتابت اور طباعت کا معیار بھی بہتر ہو ' جس کی وجہ سے بہت ہی زیادہ اخراجات اٹھے ۔ ہم نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ زیادہ اخراجات کے باوجود قیمت کم سے کم رکھی جائے تاکہ زیادہ سے زیادہ قارئین اسے خرید سکیں ۔ اس لیے عام کتابوں کی طرح اس میں زیادہ تاجرانہ کمیشن ملنا بھی مشکل ہو گا ۔

اس کتاب کی طباعت اور ترتیب میں برخوردار سید عارف شیرازی نے ' اپنی تعلیمی و تنظیمی مصروفیات کے باوجود میری امداد کی ۔ میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ انہیں توفیق دے کہ وہ اس سلسلے کے اختتام تک یہ خدمت کرتے رہیں ۔ اس سلسلے کی مزید دو جلدیں تیار ہیں ۔ باقی تین جلدیں انشاء اللہ جلد ہی منظر عام پر آ جائیں گی ۔ اللہ تعالیٰ اس پیشکش کو قبول فرمائے ' آمین !

تو لیجئے قارئین ! میں ' آپ اور سید قطب شہید کے درمیان زیادہ دیر تک حائل نہیں رہنا چاہتا ۔

سید معروف شاہ شیرازی

منصورہ ۲۹ دسمبر ۱۹۸۷ء

☆☆☆☆☆

قرآن کے سائے میں

قرآن کے سائے میں زندگی بسر کرنا نعمت عظمیٰ ہے اور اس کی قدر وہی جانتا ہے جو اس سے لطف اندوز ہوا ہو۔ یہ نعمت زندگی کی شان بلند کر دیتی ہے' اسے بابرکت بنا دیتی اور اسے پاک کر دیتی ہے۔ مجھ پر اللہ تعالیٰ کا یہ کرم عظیم ہے کہ اس نے مجھے ایک عرصہ تک قرآن کے سائے میں جینے کا موقع عنایت فرمایا۔ اس عرصہ میں میری کیفیت یہ تھی کہ گویا میں براہ راست اللہ تعالیٰ سے ہمکلام ہوں۔ میں ...... اللہ کا ایک حقیر اور بے بضاعت بندہ۔ اور ذات باری۔

چہ نسبت خاک را با عالم پاک

انسان کے لئے' عالم بالا کے اس جلیل القدر اعزاز سے اور بڑا کوئی اعزاز نہیں ہو سکتا۔ کیا ہیں وہ بلندیاں جہاں تک اللہ کا یہ کلام انسانی زندگی کو پہنچاتا ہے اور کیا ہے وہ مقام بلند' جو بندہ ناچیز کا خالق اسے مرحمت فرماتا ہے' ہاں تو ..... قرآن کے سائے میں جیتے ہوئے۔
میں نہایت بلندی سے دیکھتا رہا کہ اس زمین پر جاہلیت کا سیلاب امنڈ رہا ہے۔ میں اس جاہلیت کے پیرو کاروں کے حقیر و صغیر تکلفات کو بھی دیکھتا رہا۔ اہل جاہلیت کے خاکسارانہ معارف و تصورات اور طفلانہ اہتمامات کو میں ایک فرزانہ اور جہاندیدہ شخص کی نظر سے دیکھتا رہا کہ وہ کھیلتے ہیں گھروندے بناتے ہیں اور بچوں کی سی باتیں کرتے ہیں۔ مجھے تعجب ہوتا کہ یہ لوگ اس گندے اور وبائی ماحول میں خطرناک حد تک گھرے ہوئے ہیں اور اس جلیل القدر آسمانی آواز کو نہیں سن رہے جو انہیں مسلسل پکار رہی ہے اور جو ان کی زندگی کو بلند' بابرکت اور پاکیزہ بنانا چاہتی ہے۔

اور قرآن کے سائے میں جیتے ہوئے ......

میں اس کائنات کی غرض و غایت' موجودات کے مقصد وجود اور وجود انسانی کے بارے میں ایک مکمل و جامع اور ایک بلند و پاکیزہ تصور سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ میں اس پاکیزہ تصور حیات اور ان جاہلی تصورات زندگی کے درمیان موازنہ کرتا جن کے مطابق مشرق و مغرب میں آج پوری انسانیت زندگی بسر کر رہی ہے اور قدرتی طور پر میرے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا کہ انسانیت اس سڑانڈ' ان پستیوں اور اس گھٹاٹوپ اندھیرے میں کیونکر زندگی بسر کر رہی ہے جبکہ اس کے پاس ایک سرسبز و شاداب سیر گاہ' ایک بلند مقام اور ضوپاش چراغ ہے۔

اور قرآن کے سائے میں جیتے ہوئے ......

میں نے محسوس کیا کہ انسان کی حرکت اور اس پوری کائنات کی حرکت کے درمیان مشیت ایزدی ایک حسین ربط ہے۔ دونوں کو اللہ نے پیدا کیا اور دونوں اسی کے ارادے کے مطابق متحرک ہیں۔ پھر پوری انسانیت قوانین فطرت کی خلاف ورزی کر رہی ہے اور اس وجہ سے گم کردہ راہ ہو کر بے حد و حساب مصائب کا شکار ہے۔ اس کی فطرت سلیمہ اور ماحول کی ان فاسد اور فتنہ پرور تعلیمات کے درمیان کشمکش برپا ہے۔ جو اس ماحول میں رائج ہیں اور ہر طرف سے اسے یہ خلاف فطرت تعلیمات دی جا رہی ہیں۔ میں بڑی بے بسی سے اپنے دل میں کہتا کہ کوئی شیطان ہے جو پوری انسانیت کو اس جہنم کی طرف لے جا رہا ہے اور حیرت ہے ان لوگوں پر کہ وہ بے خبر ہیں اور نہیں سمجھتے۔

اور قرآن کے سائے میں جیتے ہوئے ......

میں نے اس کائنات کو اس کی ظاہری شکل و صورت سے کہیں بڑا پایا۔ میں نے دیکھا کہ یہ ایک عظیم حقیقت ہے' اس کے متعدد پہلو ہیں' اس میں صرف عالم عیاں ہی نہیں عالم غیاب بھی ہے۔ وہ صرف دنیا ہی نہیں بلکہ دنیا بھی ہے اور آخرت بھی۔ ایک طویل راہ حیات ہے۔ انسانی زندگی اس کی گھاٹیوں میں پھیلی ہوئی ہے لیکن موت اس سفر حیات کی آخری منزل نہیں ہے بلکہ اس طویل سفر کا ایک اہم مرحلہ ہے۔ انسان اس زمین پر جو کچھ سمیٹ سکتا ہے صرف وہی اس کا پورا حصہ نہیں ہے' بلکہ اس کے لئے مقرر حظ وافر کی قسط اول ہے۔ اگر اس دنیا میں وہ جزائے وفاق نہیں پا سکا تو کیا بات ہے۔ آخرت میں اسے پورا بدلہ دیا جائے گا وہاں نہ ظلم ہو گا' نہ کمی ہو گی اور نہ ہی ضیاع اجر کا امکان ہو گا..... نیز وہ مرحلہ حیات جسے وہ ستارہ زمین کی پشت پر طے کر رہا ہے محض سفر ہی نہیں بلکہ وہ اسے ایک زندہ و مانوس اور محب و انیس کائنات کی معیت میں طے کر رہا ہے۔ ایک زندہ' سامع اور مجیب کائنات کے درمیان' جو اسی خالق کائنات کی طرف متوجہ ہے۔ جس کی طرف ایک مومن عالم خضوع اور خشوع میں متوجہ ہوتا ہے وَ لِلّٰهِ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّ كَرْهًا وَّظِلٰلُهُمْ بِالْغُدُوِّ وَ الْاٰصَالِ ۝ (السجدہ) وہ تو اللہ ہی ہے جس کو زمین و آسمان کی ہر چیز طوعاً و کرہاً سجدہ کر رہی ہے۔ (۱۳-۱۵) تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَ الْاَرْضُ وَ مَنْ فِيْهِنَّ ؕ وَ اِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ "اس کی پاکی تو ساتوں آسمان اور زمین اور وہ ساری چیزیں بیان کر رہی ہیں جو آسمان و زمین میں ہیں۔ کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو اس کی تسبیح نہ کر رہی ہو۔" (۱۷-۴۴) کیا راحت ہے اور کیا ہی وسعت؟ اس انس اور وثوق کا کیا کہنا جو ایک چشمے کی طرح زندگی کے اس کامل' ہمہ گیر اور وسیع تصور سے قلب انسانی پر پھوٹا پڑتا ہے۔

اور قرآن کے سائے میں جیتے ہوئے......

میں نے پایا کہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے ایک بلند رتبہ دیا ہے اور یہ عزت اور مرتبہ اسے نہ پہلے کسی تصور حیات سے ملا اور نہ آئندہ ملے گا۔ قرآنی تصور کی رو سے انسان وہ ذات ہے جس میں خود اللہ ذوالجلال نے اپنی روح پھونکی۔ وَ نَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ "اور اس میں اپنی روح پھونک دوں تو تم سب اس کے آگے سجدے میں گر جانا۔" (۱۵-۲۹) بلکہ وہ اس کے ساتھ رب ذوالجلال کا خلیفہ بھی ہے وَ اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً "اور جس وقت کہا آپ کے رب نے فرشتوں کو کہ میں زمین میں ایک نائب بنانے والا ہوں۔" (۲-۳۰) اور لیجئے وہ اس پوری کائنات کا امین بھی ہے اور یہ اسی کے لئے ہے۔ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ "مسخر کر لیا ہے تمہارے لئے زمین کی چیزوں کو۔" (۲۲-۶۵) انسان کی برگزیدگی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس نے اپنی اس قدر و منزلت سے آگے بڑھ کر اللہ کی ہدایت اور مشفقانہ نفخ روح ہی کو پوری انسانیت کے باہمی اجتماعی روابط کی اساس اور وسیلہ بنایا۔ ربط انسانیت کی عمارت کی اساس ایمان باللہ کے عقیدے پر رکھی گئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک مومن کا نظریہ اور عقیدہ ہی اس کی قومیت قرار پایا۔ اور عقیدہ ہی اس کا وطن بنا۔

ہر ملک ملک ماست کہ ملک خدائے ما است

عقیدہ ہی اس کا خاندان قرار پایا' ایک مومن بھائی کا درجہ سگے بھائی سے بلند اور مضبوط ہو گیا۔ چنانچہ انسانیت کا مستحکم اجتماع اور اکٹھ ہمیشہ عقیدے ہی کی بنیاد پر ہوا اور کبھی وہ حیوانات اور بہائم کی طرح باڑے' چراگاہ' چارے اور ریوڑ کی بنیاد پر جمع نہ ہوئی۔

ذرا دیکھئے تو سہی مومن کا نسب کس قدر بلند ہے۔ اس کا شجرہ نسب تاریخ انسانیت میں دور دور تک جا پہنچا ہے۔ وہ ایک ایسے معزز خاندان کا فرد ہے جس کی قیادت اونچے درجے کے معزز حضرات کے ہاتھ میں ہے۔ یعنی حضرت نوح علیہ السلام' حضرت ابراہیم علیہ السلام' حضرت اسماعیل علیہ السلام' حضرت اسحاق علیہ السلام' حضرت یعقوب علیہ السلام' حضرت یوسف علیہ السلام' حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بالآخر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔

إِنَّ هَٰذِهِ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَأَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُونِ یہ ہے امت ایک اور میں تمہارا رب ہوں پس میری ہی بندگی کرو۔" (۲۱-۹۲)

یہ معزز اور مکرم جماعت 'انسانیت کی تاریخ قدیم کے نشیب و فراز میں دور دور تک پھیلی ہوئی ہے۔ قرآن کریم کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے ہر فرد کو ایک ہی جیسی صورت حال کا مقابلہ کرنا پڑا۔ ہر جگہ وہی موقف' وہی بحران' اور ویسے ہی تجربات و پیش آنے والے واقعات ہیں۔ زبان و مکان بدل رہے ہیں۔ نئی نئی اقوام تاریخ کے اسٹیج پر آتی ہیں لیکن ایک ہی پارٹ ادا کر رہی ہیں۔ ہر جگہ ان حضرات کا استقبال ضلالت و گمراہی' ہوا و ہوس' تمرد و سرکشی' ظلم و تعدی اور تہدید و جلاوطنی سے کیا جاتا ہے۔ لیکن یہ جماعت متاثر ہوئے بغیر برابر اپنی راہ پر گامزن نظر آتی ہے۔ اس کا ضمیر مطمئن ہے' پاؤں جمے ہوئے ہیں اور اسے اللہ کی حمایت و نصرت کا بھرپور یقین ہے۔ ناامیدی کا کہیں نام و نشاں نہیں اور اسے ہر لحہ اللہ کی حمایت و نصرت کا بھرپور یقین ہے۔ ناامیدی کا کہیں نام و نشان نہیں اور اسے ہر لحہ اللہ کے اس سچے وعدے پر بھروسہ ہے۔ اس قافلہ حق کو ہر دور میں یہ چیلنج دیا گیا۔

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِرُسُلِهِمْ لَنُخْرِجَنَّكُم مِّنْ أَرْضِنَا أَوْ لَتَعُودُنَّ فِي مِلَّتِنَا فَأَوْحَىٰ إِلَيْهِمْ رَبُّهُمْ لَنُهْلِكَنَّ الظَّالِمِينَ ○ وَلَنُسْكِنَنَّكُمُ الْأَرْضَ مِن بَعْدِهِمْ ذَٰلِكَ لِمَنْ خَافَ مَقَامِي وَخَافَ وَعِيدِ ○

"آخر کار منکرین نے اپنے رسولوں سے کہہ دیا کہ "یا تو تمہیں ہماری ملت میں واپس آنا ہو گا ورنہ ہم تمہیں اپنے ملک سے نکال دیں گے۔" تب ان کے رب نے ان پر وحی بھیجی کہ ہم ان ظالموں کو ہلاک کر دیں گے اور ان کے بعد تمہیں زمین میں آباد کریں گے۔ یہ انعام ہے اس کا جو میرے حضور جواب دہی کا خوف رکھتا ہو اور میری وعید سے ڈرتا ہو۔"

ہر جگہ وہی موقف' وہی تجربہ اور وہی تہدید ہے.... لیکن اس کے مقابلے میں ہر جگہ ایک ہی یقین محکم ہے اور ایک ہی وعدہ ہے جو اس برگزیدہ جماعت کے ساتھ ہو رہا ہے اور مومنین کی جماعت۔" یہ سب مظالم سہتے ہوئے اور ہر قسم کی وعید و تخویف سنتے ہوئے' پایان کار ایک ہی جیسے انجام کی منتظر ہے۔

اور قرآن کے سائے میں جیتے ہوئے......

میں نے جانا کہ اس کائنات میں اندھے اتفاق کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ نہ یہ دنیا بغیر کسی سوچی سمجھی سکیم کے اچانک ہی نمودار ہو گئی ہے إِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنَاهُ بِقَدَرٍ "ہم نے ہر چیز کو اندازے سے پیدا کیا۔" (۵۴-۴۹) وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهُ تَقْدِيرًا ○ "اس نے ہر چیز کو پیدا کیا' پھر اس کی ایک تقدیر مقرر کی۔" (۲۵-۲).... بے شک یہاں ہر کام کسی نہ کسی حکمت کے مطابق ہی ہو رہا ہے لیکن یہ حکمت نہایت ہی گہری اور پردہ غیب میں مستور ہے اور کبھی وہ ہماری نگہ ظاہر بین سے اوجھل بھی رہتی ہے۔ فَعَسَىٰ أَن تَكْرَهُوا شَيْئًا وَيَجْعَلَ اللَّهُ فِيهِ خَيْرًا كَثِيرًا ○ "ہو سکتا ہے کہ ایک چیز تمہیں پسند نہ ہو مگر اللہ نے اسی میں بہت کچھ بھلائی رکھ دی ہو۔" (۴-۱۹) وَعَسَىٰ أَن تَكْرَهُوا شَيْئًا وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۖ وَعَسَىٰ أَن تُحِبُّوا شَيْئًا وَهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ۗ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ○ "ہو سکتا ہے کہ ایک چیز تمہیں ناگوار ہو اور وہی تمہارے لئے بہتر ہو اور ہو سکتا ہے کہ ایک چیز تمہیں پسند ہو اور وہی تمہارے لئے بری ہو۔ اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔" (۲-۲۱۶)

رہی متعارف اسباب کی دنیا' جس کے مطابق لوگ کاروبار زندگی چلاتے ہیں تو اس کی حالت بھی یکساں نہیں ہے۔ کبھی تو ان اسباب سے متوقع نتائج نکل آتے ہیں اور کبھی نہیں بھی نکلتے۔ حتیٰ کہ جن مقدمات کو عوام حتمی اور یقینی سمجھتے ہیں ان سے بھی متوقع نتائج کبھی برآمد

ہوتے ہیں اور کبھی نہیں ہوتے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ان مقدمات و اسباب کو ظہور نتائج میں مطلق دخل نہیں ہے۔ یہ تو صرف اللہ کا ارادہ مطلقہ ہے جو خود ان نتائج کا بھی خالق ہے اور اس طرح ان کے اسباب و مقدمات کو بھی پیدا کرتا ہے لَا تَدْرِيْ لَعَلَّ اللّٰهَ يُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ اَمْرًاO "تجھ کو خبر نہیں' شاید اللہ تعالیٰ اس کے بعد کوئی نئی بات پیدا کر دے۔" (۶۵-۱) وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ "اور اللہ کے چاہے بغیر تم کوئی بات چاہ نہیں سکتے۔" (۷۶-۳۰) اس میں شک نہیں کہ ترک اسباب ازروئے شریعت روا نہیں ہے۔ مومن انہیں اختیار کرتا ہے اور وہ مراعات اسباب پر مامور ہے۔ لیکن اس کے باوجود ان کے آثار و نتائج کا صحیح اندازہ صرف اللہ۔ کے علم و قدرت میں ہے اور انسان کے لئے پرامن راستہ صرف یہی ہے کہ وہ اللہ کی رحمت' اس کے عدل و انصاف اور اس کے علم و حکمت پر مطمئن ہو اور صرف اسی صورت میں وہ قلق اور وسوسوں سے نجات پا سکتا ہے۔ اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَاْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَآءِ ۚ وَاللّٰهُ يَعِدُكُمْ مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَفَضْلًا ۗ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ

"شیطان تمہیں مفلسی سے ڈراتا ہے اور شرمناک طرز عمل اختیار کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔ مگر اللہ تمہیں اپنی بخشش اور فضل کی امید دلاتا ہے۔ اللہ بڑا فراخ دست اور دانا ہے۔" (۲-۲۶۸)

ان وجوہات سے جب قرآن کریم کی چھاؤں میں......

میں زندگی بسر کر رہا تھا تو میرا دل مطمئن تھا' میرا نفس پرسکون تھا اور میرا ضمیر برقرار تھا۔ مجھے ہر حادثہ اور ہر امر اللہ کی قدرت کا کرشمہ نظر آنے لگا۔ میں خاص اللہ کی پناہ اور نگرانی میں جی رہا تھا۔ اور مجھے صفات الٰہی کی ایجابیت (Possitivness) اور فاعلیت (Activeness) کا مکمل شعور تھا۔

اَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَيَكْشِفُ السُّوْٓءَ "کون ہے جو بے قرار کی دعا سنتا ہے جبکہ وہ اسے پکارے اور کون اس کی تکلیف رفع کرتا ہے۔" (۲۷-۶۲) وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ ۭ وَهُوَ الْحَكِيْمُ الْخَبِيْرُO "وہ اپنے بندوں پر کامل اختیار رکھتا ہے اور وہ دانا اور باخبر ہے۔" (۶-۱۸) وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰٓي اَمْرِهٖ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَO "اللہ اپنا کام کر کے رہتا ہے مگر اکثر لوگ جانتے نہیں۔" (۱۲-۲۱) وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَحُوْلُ بَيْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهٖ "اور جان رکھو کہ اللہ' آدمی اور اس کے دل کے درمیان حائل ہے۔" (۸-۲۴) فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُO "جو چاہے کرے" (۱۱-۱۰۷) وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا ۙ وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ۭ وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَي اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بَالِغُ اَمْرِهٖ O "اور جو شخص اللہ سے ڈرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے لئے نجات کی شکل نکال دیتا ہے اور اس کو ایسی جگہ سے رزق دیتا ہے جہاں سے اس کا گمان بھی نہیں ہوتا اور جو شخص اللہ پر توکل کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے کافی ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنا کام پورا کر کے رہتا ہے۔" (۶۵-۳) مَا مِنْ دَاۗبَّةٍ اِلَّا هُوَ اٰخِذٌۢ بِنَاصِيَتِهَا "کوئی جاندار ایسا نہیں ہے جس کی چوٹی اس کے ہاتھ میں نہ ہو۔" اَلَيْسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبْدَهٗ ۭ وَيُخَوِّفُوْنَكَ بِالَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖ "یہ لوگ اس کے سوا دوسروں سے تم کو ڈراتے ہیں۔" (۳۹-۳۶) وَمَنْ يُّهِنِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ مُّكْرِمٍ "اور جسے اللہ ذلیل و خوار کرے اسے پھر کوئی عزت دینے والا نہیں ہے۔" (۲۲-۱۸) وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ "جسے اللہ بھٹکا دے اسے پھر کوئی راستہ دکھانے والا نہیں ہوتا۔" (۴۰-۳۳)

اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کو اندھے اور بہرے مشینی قوانین کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑ دیا بلکہ ان قوانین فطرت کے پیچھے ایک مدبر ارادہ ہے اور ایک مطلق مشیت ہے۔ اللہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے چن لیتا ہے۔ میں نے یہ بات اچھی طرح جان لی کہ اللہ کی قدرت برابر کام کر رہی ہے۔ لیکن اس کے کام کا ایک خاص طریقہ ہے اور ہمارے لئے یہ مناسب نہیں ہے کہ ہم کسی کام میں جلد بازی

کریں یا اللہ کی بارگاہ میں تجاویز بھیجتے پھریں کیونکہ اسلامی نظام زندگی ..... جیسا کہ قرآن کے گہرے مطالعے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے ..... بنایا ہی اس لئے گیا ہے کہ وہ ہر معاشرے میں چلے۔ انسانی ترقی کے ہر مرحلے میں اور بنی نوع انسان کے ذہنی ارتقاء کے مختلف حالات میں سے ہر حال میں رائج و نافذ ہو۔ یہ نظام زندگی اس آدمی کے لئے بنایا گیا ہے جو اس کرہ ارض پر زندگی بسر کر رہا ہے۔ اس نظام میں اس آدمی کی فطرت' اس کی قوتوں' اس کی قابلیتوں' اس کے حالات' اس کی کمزوریوں اور ہر لحہ بدلنے والے حالات کو مد نظر رکھا گیا ہے۔ یہ نظام انسانوں کے بارے میں کوئی بری رائے نہیں رکھتا کہ اس کرہ ارض پر اس کی کوئی حیثیت اور وقعت ہی نہ ہو۔ آدمی مختلف شکلوں اور صورتوں کے مطابق زندگی بسر کر رہے ہیں۔ بحیثیت ایک فرد بھی بحیثیت ایک جماعت بھی اور یہ نظام زندگی کی کسی ظاہری شکل کو حقیر نہیں سمجھتا۔ اسی طرح یہ نظام محض خیالی باتوں کے درپے نہیں ہوتا اور انسان کو اس کی حقیقی قدر و منزلت' اس کی طاقت اور قابلیت اور اس کے مقصد وجود سے زیادہ بلند بھی نہیں کرتا' جس کے لئے اسے روز اول سے پیدا کیا گیا ہے۔ یہ نظام دونوں حالتوں میں یہ فرض نہیں کرتا کہ فطرت انسانی کے بنیادی عناصر کوئی سطحی چیز ہے اور انہیں کسی قانون کے ذریعے تخلیق کیا جا سکتا ہے۔ یا محض قلم کاری کے بل بوتے پر انسان کو اپنی فطرت سلیمہ سے معراء کیا جا سکتا ہے بلکہ وہ سمجھتا ہے کہ انسان اپنی فطرت' اپنے میلانات اور اپنی قابلیت کے نقطہ نظر سے اپنی اسی مخصوص شکل میں ایک مستقل "حقیقت ہے اور اسلامی نظام زندگی صرف اس کی رہنمائی کر کے اسے ان بلند درجات تک پہنچانا چاہتا ہے جو اس کے لئے' اس کے مقصد تخلیق اور اس کی ذمہ داریوں کے نقطہ نظر سے مقرر ہیں۔ یہ نظام آدمی کی ذات' اس کی فطرت اور اس کے بنیادی عناصر ترکیبی کا احترام کرتے ہوئے اسے اس راہ پر چلاتا ہے جو سیدھی ذات باری تک جا پہنچتی ہے..... غرض اسلامی نظام زندگی ایک طویل زمانے کے لئے بنایا گیا ہے جس کی طوالت کا صحیح اندازہ اس انسان کے خالق اور اس قرآن کے نازل کرنے والے ہی کے پاس ہے۔ اس لئے' اپنے بلند مقاصد کے حصول کے لئے" یہ نظام نہ تو بے راہ روی اختیار کرتا ہے نہ جلد بازی سے کام لیتا ہے۔ اس کے سامنے ایک طویل عرصہ حیات اور ایک وسیع میدان کار ہے۔ ایک فرد کی عمر اسے محدود نہیں کر سکتی' نہ ہی کسی فنا ہونے والے کی یہ خواہش اور ڈر کہ اپنے انتہائی مقصد تک پہنچنے سے قبل ہی کہیں اس کا سررشتہ حیات ٹوٹ نہ جائے' اسے اپنی فطری رفتار سے تیز کر سکتا ہے۔

عام طور پر دنیاوی نظریات و مذاہب کے حاملین کا حال ایسا ہی ہوتا ہے کہ وہ تمام کام کو ایک ہی نسل میں کر گزرنا چاہتے ہیں۔ اس طرح وہ فطرت کے متوازن طریق کار سے آگے بڑھ جاتے ہیں۔ کیونکہ وہ ایک متوازن اور صبر آزما طریق کار کے مطابق کام کرنے کا حوصلہ اپنے اندر نہیں رکھتے۔ اور وہ جو راہ اختیار کرتے ہیں' اس میں قتل و غارت ہوتی ہے' خون ناحق ہوتا ہے' اعلیٰ اقدار پامال ہوتی ہیں اور زندگی کے پرسکون معاملات میں ایک شدید اضطرابی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ فطرت سے ٹکرا کر ایسے لوگ خود بھی پاش پاش ہو جاتے ہیں اور جب انکے مصنوعی نظریات فطرت سلیمہ کی زد میں آتے ہیں تو ان کا نام و نشان ہی صفحہ ہستی سے مٹ جاتا ہے' کیونکہ فطرت کے مقابلے میں ناپختہ نظریات کبھی نہیں ٹھہر سکتے۔

اس کے مقابلے میں اسلامی نظام زندگی نہایت دھیمی رفتار سے' فطرت کے ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ بعض مواقع پر وہ فطرت کو آگے بڑھاتا ہے' بعض جگہ وہ اسے پیچھے ہٹاتا ہے۔ اگر اس میں کجی آ جائے تو اسے سیدھا کر دیتا ہے' وہ اس میں توڑ پھوڑ کو پسند نہیں کرتا۔ وہ ایک صاحب بصیرت اور صاحب حکمت انسان کی طرح صبر کرتا ہے' جسے منزل مقصود تک پہنچ جانے کا وثوق ہوتا ہے اور جسے یقین ہوتا ہے کہ جو کام اس کوشش میں نہیں ہو پا سکا وہ دوسری میں ہو جائے گا ورنہ تیسری میں' ورنہ دسویں میں' ورنہ سوویں میں' ورنہ ایک ہزارویں میں تو ہو کے رہے گا۔ کیونکہ زمانہ طویل ہے' مقصد واضح ہے اور اعلیٰ مقصد تک پہنچنے کے لئے راہ دور ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ ایک پودا اگتا ہے' اس کی جڑیں زمین میں گہری ہوتی چلی جاتی ہیں اور پھر اس کی شاخیں فضا میں دور دور تک پھیل جاتی ہیں اور وہ ایک دوسرے سے

پیوستہ ہوتی ہیں اور اسی میں ان کے لئے امید بہار ہوتی ہے۔ بعینہ اسی طرح اسلامی نظام حیات کا پودا دلوں میں اگتا ہے۔ دھیرے دھیرے وہ بلند ہوتا ہے اور اس کے بعد زمین پر ہوتا وہی کچھ ہے جس کے بارے میں اللہ کے ہاں فیصلہ ہو چکا ہوتا ہے کہ ہو جائے۔ دیکھئے کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ فصل ریت میں دب جاتی ہے۔ کبھی اسے ٹڈی دل چاٹ جاتا ہے۔ کبھی خشک سالی اسے تباہ کر دیتی ہے۔ کبھی سیلاب اسے بہاکر لے جاتا ہے لیکن ایک صاحب بصیرت کسان اچھی طرح جانتا ہے کہ یہ فصل اپنی جڑ کے لحاظ سے باقی ہے' اسے کامل ہونا ہے اور بالآخر ایک عرصہ بعد وہ ان سب آفات پر غالب آجاتی ہے لیکن ان سب حالات کے باوجود کسان جلد بازی نہیں کرتا' پریشان نہیں ہوتا اور فطرت کے متوازن اور تدریجی خوشگوار اور پیارے طریق کار کے علاوہ کسی اور مصنوعی طریق سے وہ اس فصل کو پکانے کی کوشش بھی نہیں کرتا۔ یہی ہے اسلامی انقلاب کا ربانی طریق کار جو اس پوری کائنات میں جاری و ساری ہے۔ یہی سنت اللہ ہے اور ظاہر ہے کہ سنت اللہ میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی۔" وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيلًا

اسلامی نظام حیات کی رو سے اس کائنات کی تعمیر میں سچائی ایک ٹھوس (Solid) حقیقت ہے۔ یہ کوئی سرسری حادثہ نہیں ہے اور نہ ہی کوئی غیر مطلوب و مقصود اتفاق ہے۔ اللہ ہی حق ہے اور ہر موجود اپنا وجود اسی سے اخذ کرتا ہے۔ ذٰلِكَ بِأَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَأَنَّ مَا يَدْعُونَ مِنْ دُونِهِ الْبَاطِلُ وَأَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيرُ

"یہ سب کچھ اس وجہ سے ہے کہ اللہ ہی حق ہے اور اسے چھوڑ کر جن دوسری چیزوں کو یہ لوگ پکارتے ہیں وہ سب باطل ہیں اور اللہ ہی بزرگ و برتر ہے۔" (۳۱-۳۰) نیز اللہ نے اس کائنات کو حق پر پیدا کیا ہے اور اس کی مخلوق میں باطل کی آمیزش نہیں ہو سکتی۔ مَا خَلَقَ اللّٰهُ ذٰلِكَ إِلَّا بِالْحَقِّ "اللہ نے یہ سب کچھ بطور حق بنایا ہے۔" رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا سُبْحٰنَكَ "پروردگار! یہ سب کچھ تو نے فضول اور بے مقصد نہیں بنایا' تو پاک ہے۔" (۳-۱۹۱) حق و صداقت ہی اس کائنات کا قوام ہیں۔ اگر یہ کائنات صداقت کی ڈگر سے ہٹ جائے تو پھر تباہی یقینی ہے۔ وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ أَهْوَاءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْأَرْضُ وَمَنْ فِيهِنَّ "اگر حق ان کی خواہشات کے پیچھے چلتا تو زمین و آسمان اور ان کے درمیان ساری آبادی کا نظام درہم برہم ہو جاتا۔" (بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهُ فَإِذَا هُوَ زَاهِقٌ "مگر ہم باطل پر حق کی چوٹ لگاتے ہیں جو اس کا سر توڑ دیتی ہے اور وہ دیکھتے دیکھتے مٹ جاتا ہے۔" (۲۱-۱۸) اس لئے یہ لابدی ہے کہ سچائی ظاہر ہو اور باطل روپوش ہو جائے۔ اگرچہ بظاہر اس کے خلاف نظر آئے۔

نیز نیکی' بھلائی اور احسان بھی' صداقت کی طرح ٹھوس حقائق ہیں اور جب تک یہ دنیا باقی ہے باقی رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَسَالَتْ أَوْدِيَةٌ بِقَدَرِهَا فَاحْتَمَلَ السَّيْلُ زَبَدًا رَابِيًا ۚ وَمِمَّا يُوقِدُونَ عَلَيْهِ فِي النَّارِ ابْتِغَاءَ حِلْيَةٍ أَوْ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِثْلُهُ ۚ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ ۚ فَأَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَاءً ۖ وَأَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ ۚ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْأَمْثَالَ:

"اللہ نے آسمان سے پانی برسایا اور ہر ندی نالہ اپنے ظرف کے مطابق اسے لے کر چل نکلا۔ پھر جب سیلاب اٹھا تو سطح پر جھاگ بھی آ گئے اور ایسے ہی جھاگ ان دھاتوں پر بھی اٹھتے ہیں جنہیں زیور اور برتن وغیرہ بنانے کے لئے لوگ پگلایا کرتے ہیں۔ اسی مثال سے اللہ حق و باطل کے معاملے کو واضح کرتا ہے جو جھاگ ہے وہ اڑ جایا کرتا ہے اور جو چیز انسانوں کے لئے نافع ہے وہ زمین میں ٹھہر جاتی ہے۔ اسی طرح مثالوں سے اللہ اپنی بات سمجھاتا ہے۔" (۱۳-۱۷) اور دوسری جگہ ہے أَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ أَصْلُهَا ثَابِتٌ وَفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ ۝ تُؤْتِي أُكُلَهَا كُلَّ حِينٍ بِإِذْنِ رَبِّهَا

وَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ وَ مَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيْثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَبِيْثَةِ ﹰاجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْاَرْضِ مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ۝ يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ فِي الْاٰخِرَةِ ۚ وَ يُضِلُّ اللّٰهُ الظّٰلِمِيْنَ ۙ وَ يَفْعَلُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ

"کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ نے کلمہ طیبہ کو کس چیز سے مثال دی ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک اچھی ذات کا درخت' جس کی جڑ زمین میں گہری جمی ہوئی ہے اور شاخیں آسمان تک پہنچی ہوئی ہیں۔ ہر آن وہ اپنے رب کے حکم سے اپنے پھل دے رہا ہے۔ یہ مثالیں اللہ اس لئے دیتا ہے کہ لوگ ان سے سبق لیں اور کلمہ خبیثہ کی مثال ایک بدذات درخت کی سی ہے جو زمین کی سطح سے اکھاڑ پھینکا جاتا ہے' اس کے لئے کوئی استحکام نہیں ہے۔ ایمان لانے والوں کو اللہ ایک قول ثابت کی بنیاد پر دنیا و آخرت دونوں میں ثابت عطا کرتا ہے اور ظالموں کو اللہ بھٹکا دیتا ہے۔ اللہ کو اختیار ہے جو چاہے کرے۔

ذرا غور تو کیجئے! کس قدر عظیم اطمینان ہے جسے یہ تصور حیات جنم دے رہا ہے۔ سکون و طمانیت کا ایک سرچشمہ ہے جس کے سوتے قلب مومن میں پھوٹ رہے ہیں۔ کس قدر بھرپور یقین ہے حق و صداقت اور صلاح و تقویٰ پر اور قوت اور سربلندی کا مدہوش کن جام ہے جو ایک چھوٹی سی مثال کے ذریعہ 'قلب مومن میں انڈیلا جا رہا ہے۔

قرآن کے سائے میں جی کر.........

میں اس یقین محکم اور قطعی فیصلے پر پہنچا کہ اس زمین کی اصلاح' اس میں بسنے والی انسانیت کی مسرت' انسان کے لئے اطمینان قلب' اس زمین میں اس کے لئے سربلندی اور برتری' اس کے کاموں میں برکت اور پاکیزگی اور سب سے زیادہ یہ کہ اس کائنات کے قوانین قدرت اور انسانی زندگی کے فطری امور کے درمیان ہم آہنگی صرف اس صورت میں ممکن ہے کہ انسان از سرنو خدا کی طرف رجوع کرے۔

قرآن کریم کے گہرے مطالعے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ خدا کی طرف "رجوع" صرف ایک ہی صورت میں ممکن ہے۔ اللہ تک پہنچنے کا راستہ صرف ایک ہے جس کے سوا کوئی اور راستہ نہیں ہے اور وہ راستہ یہ ہے کہ ہم اپنی پوری زندگی کو اس نظام حیات کے مطابق تبدیل کر دیں جسے اللہ تعالیٰ نے اپنی ہی کتاب میں' پوری انسانیت کے لئے نازل فرمایا ہے۔ اس طرح کہ تمام انسان اپنی پوری زندگی میں اس کتاب کو حکم بنائیں اور اپنی زندگی کے تمام حالات و قضیات میں صرف اس کے مطابق فیصلے کریں۔ اگر یہ صورت نہیں ہوتی تو پھر روئے زمین پر فساد ہی فساد ہو گا' لوگوں کے لئے بدنصیبی مقدر ہو چکی ہو گی' گندگیوں کے سیلاب میں گرنا ہو گا اور اس زمین پر جاہلیت کا دور دورہ ہو گا' جو اللہ کے بجائے ہوائے نفس کی بندگی کرے گی۔ فَاِنْ لَّمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَكَ فَاعْلَمْ اَنَّمَا يَتَّبِعُوْنَ اَهْوَآءَهُمْ ۚ وَ مَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰىهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ ۚ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ اگر وہ تمہارا یہ مطالبہ پورا نہیں کرتے تو سمجھ لو کہ دراصل یہ اپنی خواہشات کے پیرو ہیں' اور اس شخص سے بڑھ کر کون گمراہ ہو گا جو خدائی ہدایت کے بغیر بس اپنی خواہشات کی پیروی کرے۔ اللہ ایسے ظالموں کو ہرگز نہیں بخشتا۔" (۲۸-۵۰)

اللہ کی کتاب ہی کے مطابق فیصلے کرنے کا یہ حکم کوئی مستحب یا اختیاری امر ہی نہیں ہے بلکہ اس پر ہمارے ایمان کا دارومدار ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو ایمان نہیں ہے وَ مَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّ لَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗۤ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ "کسی مومن مرد اور کسی مومنہ عورت کو یہ حق نہیں ہے کہ جب اللہ اور اس کا رسول ﷺ کسی معاملے کا فیصلہ کر دے تو پھر اسے اپنے اس معاملے میں خود فیصلہ کرنے کا اختیار حاصل رہے۔ (۳۳-۳۶) ثُمَّ جَعَلْنٰكَ عَلٰى شَرِيْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْهَا وَ لَا

تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ۝ اِنَّهُمْ لَنْ يُّغْنُوْا عَنْكَ مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا ؕ وَ اِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۚ وَ اللّٰهُ وَلِيُّ الْمُتَّقِيْنَ

"اس کے بعد اے نبی ﷺ، ہم نے تم کو دین کے معاملے میں ایک شاہراہ (شریعت) پر قائم کیا ہے۔ لہٰذا تم اسی پر چلو اور ان لوگوں کی خواہشات کا اتباع نہ کرو جو علم نہیں رکھتے۔ اللہ کے مقابلے میں وہ تمہارے کچھ بھی کام نہیں آسکتے۔ ظالم لوگ ایک دوسرے کے ساتھی ہیں اور متقیوں کا ساتھی اللہ ہے۔" (۴۵-۱۸'۱۹)

لہٰذا یہ معاملہ نہایت ہی اہم ہے اور اس کا تعلق اساسی عقائد سے ہے بلکہ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے کہ اس پر پوری انسانیت کی سعادت و شقاوت کا دارومدار ہے۔ یہ انسانیت جسے اللہ نے تخلیق کیا ہے' اپنی فطرت کا راز اس وقت تک نہیں پاسکتی جب تک وہ خود صانع کائنات کی بنائی ہوئی چابیوں کو استعمال نہ کرے۔ اس کے دکھ درد اور اس کی بیماریوں کا علاج صرف اسی دوا سے ہو سکتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی جانب سے تجویز ہو اور ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر عقدے کا حل اور ہر بیماری کا علاج صرف اسلامی نظام زندگی میں ودیعت کیا ہوا ہے۔ وَ نُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّ رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۙ وَلَا يَزِيْدُ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا خَسَارًا ۝ اور ہم اس قرآن کے سلسلہ تنزیل میں وہ کچھ نازل کر رہے ہیں جو ماننے والوں کے لئے تو شفاء اور رحمت ہے مگر ظالموں کے لئے خسارے کے سوا اور کچھ چیز میں اضافہ نہیں کرتا۔" اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ "حقیقت یہ ہے کہ یہ قرآن وہ راہ دکھاتا ہے جو بالکل سیدھی ہے۔" (۱۷-۹)

انسانوں کا بھی عجیب حال ہے کہ وہ اس قفل کو اس کاریگر کے پاس نہیں لے جاتے جس نے اسے بنایا۔ بیمار کے علاج کے لئے مشورہ اس ذات سے نہیں کرتے جس نے بیمار کو پیدا کیا۔ وہ اپنی شخصیت' اپنی انسانیت اور اپنی شقاوت و سعادت جیسے اہم معاملات میں بھی سادہ اور فطری طریق کار اختیار نہیں کرتے جو اپنے روز مرہ کے چھوٹے موٹے کاموں میں استعمال ہونے والے معمولی آلات اور مشینوں کے سلسلے میں اپنی عام زندگی کے دوران استعمال کرتے ہیں۔ عام طور پر لوگ کسی مشین کو درست کرنے کے لئے اس کارخانے کے انجینئر یا ماہر کو بلاتے ہیں جس نے اس مشین کو تیار کیا ہوتا ہے۔ لیکن تعجب ہے کہ انسانیت اس سادہ اصول کو خود اپنے نفس کے بارے میں استعمال نہیں کرتی تاکہ اسے بھی وہ اس کارگاہ کی طرف لوٹا دے جہاں سے نفس تیار ہو کر آیا ہے۔ وہ اس کے معاملات میں اس ذات سے کوئی استفسار نہیں کرتی جس نے اس عجیب و غریب کل کی تخلیق کی۔ یہ عظیم انسانی مشین' نہایت قیمتی' باریک اور نازک' جس کی باریکیوں اور اندرونی پیچیدگیوں کو صرف وہی جانتا ہے جس نے اسے پیدا کیا اور اس کی تخلیق کی اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ۝ اَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ ؕ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ

"وہ دلوں تک کی باتوں سے خوب واقف ہے۔ کیا وہ نہ جانے گا جس نے پیدا کیا ہے اور وہ باریک بین اور پورا باخبر ہے۔" (۶۷-۱۴) یہیں سے اس گم کردہ راہ بیچاری حیران و پریشان انسانیت کی بدبختی کا آغاز ہوتا ہے' جو رشد و ہدایت اور آرام و سعادت صرف اسی صورت میں پاسکتی ہے کہ وہ انسانی فطرت کو' اس کے صانع اور خالق کی طرف لوٹا دے۔ جس طرح کہ وہ ایک معمولی مشین کو اس کے ادنیٰ صانع اور بنانے والے کے پاس بغرض اصلاح لے جاتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام کا مقام قیادت سے برطرف کر دیا جانا' انسانیت کی تاریخ میں' پوری انسانی تاریخ کا ایک اندوہناک حادثہ تھا۔ انسانوں کی تاریخ میں یہ ایک عظیم الشان اور تباہ کن شکست تھی۔ اور اس سے قبل انسانیت پر جس قدر مصائب بھی نازل ہوئے' ان سب میں سے یہ عظیم تر مصیبت تھی۔

اسلام نے انسانیت کی قیادت کا منصب اس وقت سنبھالا تھا جبکہ پوری دنیا کا نظام فاسد ہو گیا تھا۔ انسان کے لئے زندگی وبال جان بن گئی تھی، قیادت متعفن ہوگئی اور فاسد قیادت اس کے لئے بے پناہ مصائب و آلام کا باعث بن رہی تھی اور دنیا کی حالت یہ تھی کہ

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ "خشکی اور تری میں فساد برپا ہو گیا ہے، لوگوں کے اپنے ہاتھوں کی کمائی سے۔" (۳۰-۴۱)

اسلام نے اس قرآن مجید کو دستور حیات بنا کر دنیا کی قیادت کی ذمہ داری سنبھالی، دنیا کو وہ نیا تصور دیا گیا جو قرآن اور اس کی تعلیمات پر مبنی شریعت نے پیش کیا تھا۔ اس کے نتیجے میں انسانیت کو بالکل ایک نیا جنم ملا جو اس کے طبیعی جنم سے زیادہ عظیم تھا۔ قرآن کریم نے انسانیت کو اس کائنات، حیات انسانی، اعلیٰ اقدار اور زندگی کے معاملات کی تنظیم کے لئے ایک جدا تصور دیا۔ پھر اس نے اس تصور حیات کے مطابق ایک معاشرہ عملاً قائم بھی کر دیا۔ قرآن مجید کے پیدا کردہ اس معاشرے سے قبل، انسانیت کے لئے محض خیالی اور ایسے مجرد معاشرت کا تصور تک ممکن نہ تھا۔ اگر اللہ تعالیٰ کی مشیت متقاضی نہ ہوتی اور وہ عملاً اس معاشرے کو قائم نہ کر دیتا تو انسانیت کے لئے ایسے بلند و برتر، حسین و جمیل، سہل و سادہ، مثبت و حقیقت پسندانہ اور متوازن و متناسب معاشرے کا تصور تک کرنا بھی ممکن نہ تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے ....

قرآن کے سائے میں.......

قرآنی شریعت کے ذریعہ ....

اور اسلامی نظام زندگی کے مطابق ....

اس زندہ و تابندہ معاشرے کو عالم وجود میں لا کر کھڑا کر دیا۔

وائے ناکامی! پھر اس کے بعد کیا ہوا۔ اس کے بعد یہ تباہ کن شکست اور تاریخی واقعہ عالم ظہور میں آیا۔ اسلام کو مقام قیادت سے ہٹا دیا گیا تاکہ جاہلیت ایک بار پھر، اپنی مختلف شکلوں میں دندناتی پھرے۔ جیسا کہ آج وہ مادیت کے روپ میں ہمارے سامنے ہے۔ اور انسانیت ہے کہ اس پر فریفتہ ہوئی جا رہی ہے۔ اس کی مثال بعینہٖ اسی طرح ہے جیسے بچے زرق و برق لباس اور قیمتی رنگارنگ کھلونوں کو دیکھ کر بے تاب ہو جاتے ہیں۔

بد قسمتی سے اس وقت ہمارے درمیان ایک ایسا طبقہ موجود ہے جو انسانیت کا دشمن ہے۔ اور اسے صریح دھوکہ دے رہا ہے۔ یہ طبقہ اسلامی نظام زندگی کو ایک ہاتھ میں اور انسان کی مادی ترقیوں کو دوسرے ہاتھ میں رکھ کر دنیا کو کچھ اس رنگ میں دعوت دیتا ہے کہ "ان دو چیزوں میں سے تم کسی ایک کو اختیار کر لو! یا تو اسلامی نظام زندگی اختیار کر لو اور مادی میدان میں انسان نے جو ترقیاں کی ہیں ان سے دست بردار ہو جاؤ اور یا انسان کی علمی ترقیوں کے پھل چن لو اور اسلامی نظام زندگی کو ترک کر دو۔" یہ نہایت ہی مذموم دھوکہ ہے اور خباثت سے پر سازش ہے، جو اسلام اور پوری انسانیت کے خلاف کی جا رہی ہے۔ کیونکہ مسئلہ کی حقیقی صورت یہ ہرگز نہیں ہے۔ اسلامی نظام زندگی، انسانی ترقیوں کا مخالف نہیں ہے، وہ تو ان ترقیوں کا موجد ہے اور ان کے لئے ترقی و افادیت کی ایک صحیح سمت مقرر کرتا ہے اور مادی ترقیوں کو صحیح رخ پر ڈال دیتا ہے تاکہ انسان خلافت فی الارض کے منصب کو خوش اسلوبی سے سنبھال سکے۔ خلافت خداوندی کا یہ منصب عظیم انسان کو خود اللہ تعالیٰ نے عنایت فرمایا ہے اور اسی منصب کی وجہ سے انسان کی قدر و منزلت میں دوسری مخلوق کے مقابلے میں اضافہ ہوا ہے۔ اس منصب کی ذمہ داریاں ادا کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے انسان کو کچھ خاص قوتیں بھی عطاء کیں، جو اس کے فرائض اور ذمہ داریوں کی ادائیگی کے لئے ضروری تھیں۔ اور انسان کے لئے تکوینی قوانین کو سہل کر دیا گیا تاکہ وہ ان فرائض کی ادائیگی میں انسان

کے ممد اور معاون ہوں۔ اس کائنات کی تخلیق اور انسان کی تخلیق کے درمیان خدا تعالیٰ نے ایک خاص توازن برقرار رکھا ہے تاکہ وہ اس کائنات میں زندہ رہے' کام کرے اور نئی نئی چیزیں دریافت کرے۔ لیکن اس کی ہر ایجاد اللہ کی عبادت اور بندگی ہو اور اللہ تعالیٰ کے عظیم انعامات و اکرامات پر شکر گذاری کے وسائل میں سے ایک وسیلہ ہو۔ اور یہ تمام کام اللہ تعالیٰ کی شرط خلافت کے دائرے کے اندر رہ کر کیا جائے اور انسان کی ہر حرکت اور اس کا ہر عمل رضائے الٰہی کے دائرے کے اندر محدود ہو۔

جو لوگ اسلامی نظام حیات کو ترازو کے ایک پلڑے میں رکھتے ہیں اور انسانی ترقیوں کو دوسرے میں وہ دراصل بدنیت اور شریر ہیں۔ وہ اس حیران اور درماندہ انسانیت کے لئے گھات میں بیٹھے ہیں۔ اور جب بھی وہ اس حیرانی و پریشانی اور گمراہی و ضلالت سے نکلنے کا ارادہ کرتی ہے اور ناصح مشفق کی میٹھی آواز پر کان دھرتی ہے اور اس پر آمادہ ہوتی ہے کہ اس حیرانی اور ہلاکت سے نکل آئے اور اللہ تعالیٰ کے جوار رحمت میں پرامن زندگی بسر کرے تو گھات میں چھپے ہوئے یہ دشمن اسے روکنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ایک گروہ ایسا بھی ہے کہ اس میں خلوص دل کی کمی تو نہیں لیکن وہ معاملے کو صحیح طریقے سے سمجھ نہیں سکا۔ اس کی نظر گہری نہیں ہے ۔ طبعی اکتشافات اور مادی ترقیوں کی چمک دمک نے اس کی نظروں کو چندھیا دیا ہے اور مادی دنیا میں انسان کی عظیم اور بے مثال کامیابیوں سے وہ مرعوب ہے۔ یہ تحیر اور مرعوبیت ان کے شعور کا جزو بن جاتے ہیں۔ اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ طبعی قوانین اور ایمانی اقدار کے درمیان فرق کرتا ہے۔ اس کے نزدیک انسان کی عملی زندگی میں اور اس کائنات میں' ان اقدار کا جو اثر ہوتا ہے وہ ایک دوسرے سے بہت مختلف ہے۔ اس گروہ نے طبعی قوانین کے لئے ایک علیحدہ میدان کار تجویز کر رکھا اور ایمانی اقدار کے لئے علیحدہ۔ اس کا خیال ہے کہ طبعی قوانین ایمانی اقدار سے متاثر ہوئے بغیر بھی اپنا کام برابر کرتے رہتے ہیں اور اپنے مخصوص نتائج پیدا کرتے چلے جاتے ہیں اور اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ لوگ مومن ہیں یا کافر۔ اسلامی نظام زندگی کے متبع ہیں یا مخالف۔ اپنی زندگی کے تنازعات میں اللہ کی شریعت کے مطابق فیصلے کرتے ہیں یا لوگوں کی خواہشات کے مطابق۔

یہ نہایت ہی غلط نقطہ نظر ہے جو اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ قوانین کی دو قسموں کے درمیان تفریق کرتا ہے اور ان کو ایک دوسرے سے علیحدہ کر دیتا ہے حالانکہ دراصل یہ دونوں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ایمانی اقدار اللہ کے تکوینی قوانین ہی کا ایک حصہ ہوتی ہیں۔ اور بالکل طبعی قوانین کی طرح ان کے نتائج بھی ایک دوسرے سے مربوط اور باہم پیوستہ ہوتے ہیں۔ ایک مومن کے تصور زندگی اور احساسات میں' ان دونوں کے درمیان جدائی کرنے کی کوئی وجہ جواز نہیں ہے۔

یہ ہے وہ صحیح تصور حیات جسے یہ قرآن کریم' انسان کے دل و دماغ میں پیوست کرتا ہے جبکہ وہ قرآن کے سائے میں زندگی بسر کر رہا ہو۔ یہ تصور پیدا کرنے کے لئے قرآن مجید سابقہ کتب سماوی کے حاملین' ان کی بے راہ روی اور آخر کار اس ضلالت کے نتائج کا بھی ذکر کرتا ہے

وَلَوْ أَنَّ أَهْلَ الْكِتٰبِ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَكَفَّرْنَا عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَاَدْخَلْنٰهُمْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ وَلَوْ أَنَّهُمْ أَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ ؕ

"اگر (اس سرکشی کے بجائے) یہ اہل کتاب ایمان لاتے اور خدا ترسی کی روش اختیار کرتے تو ہم ان کی برائیاں ان سے دور کر دیتے اور ان کو نعمت بھری جنتوں میں پہنچاتے۔ کاش انہوں نے تورات اور انجیل اور ان دوسری کتابوں کو قائم کیا ہوتا جو ان کے رب کی طرف سے ان کے پاس بھیجی گئی تھیں۔ ایسا کرتے تو ان کے لئے اوپر سے رزق برستا اور نیچے سے ابلتا۔" (۵-۶۶)

اس تصور کو ذہن نشین کرنے کے لئے قرآن مجید حضرت نوح ؑ کے اس وعدے کا ذکر بھی کرتا ہے جو انہوں نے اپنی قوم سے کیا تھا
فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ إِنَّهُ كَانَ غَفَّارًا ۝ يُرْسِلِ السَّمَاءَ عَلَيْكُمْ مِدْرَارًا ۝ وَيُمْدِدْكُمْ بِأَمْوَالٍ وَبَنِينَ وَيَجْعَلْ لَكُمْ جَنَّاتٍ وَيَجْعَلْ لَكُمْ أَنْهَارًا
اور میں نے کہا کہ تم اپنے پروردگار سے گناہ بخشواؤ۔ بے شک وہ بڑا بخشنے والا ہے' وہ کثرت سے تم پر بارش بھیجے گا اور تمہارے مال اور اولاد میں ترقی دے گا اور تمہارے لئے باغ لگادے گا۔ اور تمہارے لئے نہریں بہادے گا۔ (۷۱-۱۲)

پھر اس تصور کو پیدا کرنے کے لئے قرآن مجید لوگوں کی نفسیاتی صورت حال اور خارجی اور واقعاتی دنیا کے درمیان' جسے اللہ تعالیٰ لوگوں کے ذریعے عالم وجود میں لانا چاہتے ہیں' ایک حسین ربط پیدا کر دیتا ہے۔ إِنَّ اللَّهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّى يُغَيِّرُوا مَا بِأَنْفُسِهِمْ "بے شک اللہ تعالیٰ کسی قوم کے حال کو نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنے اوصاف کو نہیں بدل دیتی۔" (۱۳-۱۱)

اللہ کی ذات پر ایمان' اس کی ٹھیک بندگی اور زمین میں اس کی شریعت کا نفاذ' سب کے سب دراصل اللہ کے قانون قدرت ہی کے نفاذ ہیں۔ یہ قوانین بھی مثبت اثرات کے حامل ہیں اور اسی سرچشمے سے نکلے جس سے دوسرے تکوینی اور طبعی قوانین نکلے ہیں اور جن کے اثرات ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں اور جو رات دن ہمارے مشاہدات و تجربات میں آتے رہتے ہیں۔

بعض اوقات ہمیں ایسے مظاہرے سے دوچار ہونا پڑتا ہے' جو قوانین قدرت کے درمیان اس تفریق کے بارے میں ہمارے لئے باعث فریب ہوتے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ایمانی قدروں کی مخالفت کرتے ہوئے بھی طبعی قوانین کی پیروی کامیابی کی ضمانت دے رہی ہے۔ اس میں شک نہیں...... کہ شروع شروع میں اس تفریق کے نتائج سامنے نہیں آتے' لیکن آخر کار وہ لازماً ظاہر ہو کے رہتے ہیں۔ یہ صورت حال خود اسلامی معاشرے کو بھی پیش آئی۔ ایمانی قدروں اور طبعی قوانین کے نقطہ ارتقاء سے اسلامی معاشرے کی ترقی شروع ہوئی اور جس نقطے سے ان دونوں کے درمیان افتراق ہوا' اسی سے اسلامی معاشرے کا زوال شروع ہو گیا۔ آج تک جوں جوں ان کے درمیان خلیج وسیع تر ہوتی جاتی ہے' اسلامی معاشرہ اسی نسبت سے زیادہ زوال پذیر ہو رہا ہے اور اس کا یہ زوال اب اس درجے تک آپہنچا ہے کہ مسلمانوں نے بیک وقت اسلامی قدروں اور طبعی قوانین و مادی ترقیات سب کو کھو دیا ہے۔

اس کے بالمقابل آج مغربی تہذیب قائم ہے اور اس کی مثال یوں ہے جیسا کہ ایک پرندہ صرف ایک مضبوط پر کے بل بوتے پر اڑنا چاہتا ہے اور فضا میں معلق ہو کر پھڑپھڑا رہا ہے اور اس کا دوسرا پر شل ہو کر لٹک رہا ہے۔ یہ تہذیب مادی ایجادات کے میدان میں جس قدر بلند مقام تک جا پہنچی ہے' انسانی قدروں کے لحاظ سے اسی قدر پستیوں میں جاگری ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ تہذیب مغرب کے فرزند اس قدر جاں گسل قلق و بے چینی اور اس قدر اعصابی و نفسیاتی بیماریوں کا شکار ہو گئے ہیں جس سے مغربی دنیا کے اہل دانش چیخ اٹھے ہیں۔ لیکن اے کاش کہ یہ بدنصیب اسلامی نظام زندگی کی طرف نہیں لوٹتے۔ حالانکہ صورت حال کا صحیح علاج و مداوا صرف وہی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے لئے جو شریعت بھیجی ہے' وہ اس کائنات کے لئے اللہ کے کلی قانون کا ایک حصہ اور جز ہے لہٰذا اس دنیا میں اس شریعت کو نافذ کرنے کا لازمی اور مثبت اثر یہ ہوگا کہ اس پوری کائنات کی روش اور لوگوں کے طرز عمل کے درمیان ایک حسین ہم آہنگی پیدا ہو جائے گی۔

شریعت الٰہی ایمان کا ثمرہ اور نتیجہ ہے اور ایمان اس کی بنیاد ہے۔ یہ اپنی اس بنیاد کے بغیر قائم نہیں ہو سکتی۔ اسے وضع ہی اس لئے کیا گیا ہے کہ وہ ایک مسلم معاشرے کی تعمیر و تشکیل میں مدد دے۔ اس عظیم کائنات کے بارے میں اور اس کائنات میں انسانی وجود کے متعلق اسلام جو تصور رکھتا ہے' اور اس تصور کے نتیجے میں انسان کے ضمیر میں جو تقویٰ' اس کے شعور میں جو پاکیزگی اس کی اعلیٰ اقدار کے

اندر جو عظمت' اس کے اخلاق کے اندر جو بلندی اور اس کے طرز عمل میں جو استقامت پیدا ہو جاتی ہے' یہ سب چیزیں اس شریعت مطہرہ سے مل کر ایک متماثل الاجزا اکائی بن جاتی ہیں۔ اس طرح اس کائنات کے بارے میں سنت الٰہی کی مختلف قسموں کے درمیان مکمل توافق اور ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے خواہ وہ سنت الٰہی ان امور پر مشتمل ہو جنہیں ہم قوانین قدرت کہتے ہیں یا ان امور پر مشتمل ہو جنہیں ایمانی اقدار سے تعبیر کیا جاتا ہے کیونکہ یہ سب چیزیں اس کائنات کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے کلی قوانین و سنن کا ایک جزو اور حصہ ہیں۔

انسان بحیثیت ایک کائناتی قوت' اس کا عمل و ارادہ' اس کا ایمان اور نیکی اور اس کی عبادات اور سرگرمیاں سب کی سب ایسی قوتیں ہیں جو اس کائنات میں مثبت اثرات کی حامل ہیں۔ یہ قوتیں اس سنت الٰہی سے مربوط ہیں جس کے مطابق یہ کائنات چل رہی ہے۔ یہ سب قوتیں باہم مل کر کام کرتی ہیں اور جب یہ صحیح طریقہ سے جمع ہو جاتی ہیں اور ان کے درمیان ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے تو اپنے کامل برگ و بار سامنے لے آتی ہیں لیکن جب ان قوتوں کے درمیان افتراق واقع ہو جائے تو ان کے فاسد نتائج ظاہر ہوتے ہیں' ان میں اضطراب رونما ہو جاتا ہے اور زندگی کا پورا نظام بگڑ جاتا ہے اور انسانیت بدبختی اور ہلاکت سے دوچار ہوتی ہے۔ **ذٰلِكَ بِأَنَّ اللَّهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِعْمَةً أَنْعَمَهَا عَلَىٰ قَوْمٍ حَتَّىٰ يُغَيِّرُوا مَا بِأَنفُسِهِمْ** "اللہ کسی نعمت کو جو اس نے کسی قوم کو عطا کی ہو اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک کہ وہ قوم خود اپنے طرز عمل کو نہیں بدل دیتی۔" (۸-۵۳)

غرض انسان کے عمل و شعور اور عالمگیر سنت الٰہی کے مطابق وقوع پذیر ہونے والے تمام واقعات و حوادث کے درمیان ایک گہرا ربط ہے جو شخص بھی اس ربط کو ختم کرنا چاہتا ہے' اس ہم آہنگی کو درہم برہم کرتا ہے' اور انسانیت اور عالمگیر سنت الٰہی کے درمیان حائل ہو جاتا ہے' وہ اس انسانیت کا بدترین دشمن ہے اور وہ دراصل اسے نور ہدایت کی طرف آنے سے روکتا ہے۔ انسانیت کا یہ فرض ہے کہ وہ اس کا پیچھا کرے اور اسے اس راہ سے ہٹا کر پرے پھینک دے جس میں وہ حاصل ہے اور یہ وہ راہ ہے جو رب کریم تک پہنچاتی ہے۔

تو ایک عرصہ تک قرآن کے سائے میں جی کر......!

یہ چند نقوش تھے جو میرے دل میں نقش ہوئے' چند خطوط تھے جو لوح دماغ پر ابھرے۔ میں نے انہیں صفحہ قرطاس پر محض اس لئے منتقل کر دیا ہے کہ شاید ان سے کسی کا بھلا ہو' کسی کو ہدایت ملے اور حقیقت یہ ہے کہ ہم کر بھی کیا سکتے ہیں۔ اگر اللہ نہ چاہے۔

فی ظلال القرآن

سورۃ الفاتحہ

پارہ ——— 1

سورۂ فاتحہ ایک نظر میں

اس مختصر اور سات آیتوں پر مشتمل چھوٹی سی سورت کو ایک مسلمان 'رات دن میں کم از کم سترہ مرتبہ دہراتا ہے اور جب وہ سنتیں پڑھتا ہے تو یہ تعداد اس سے بھی دوچند ہو جاتی ہے اور اگر کوئی فرائض و سنن کے علاوہ نوافل بھی پڑھتا ہے تو وہ اسے بے شمار مرتبہ دہراتا ہے۔ اس سورت کی تلاوت کے بغیر نماز نہیں ہوتی۔ صحیح حدیث میں حضرت عبادہ ابن صامت نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں "اس کی نماز نہیں ہوتی جس نے فاتحہ نہ پڑھی"

اس سورت میں اسلامی عقائد کے بلند اصول' اسلامی تصور حیات کے کلیات و مبادی اور انسانی شعور اور انسانی دلچسپیوں کے لئے نہایت ہی اہم اصولی ہدایات بیان کی گئی ہیں' اور یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نماز کی ہر رکعت میں اس سورت کا پڑھنا ضروری قرار دیا ہے' اور جس نماز میں اس سورت کی تلاوت نہ ہو اسے فاسد قرار دیا گیا ہے۔

☆ ☆ ☆ ☆

سُوْرَۃُ الْفَاتِحَۃ (۱) مَکِّیَّۃٌ (۵) اٰیَاتُھَا (۷) رُکُوْعُھَا (۱)

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ «۱» اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ «۲» مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ «۳» اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ «۴» اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ «۵» صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ «۶» غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ «۷» ع

ع ۱ ۷

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔ تعریف اللہ ہی کے لئے ہے جو تمام کائنات کا رب ہے' نہایت مہربان اور رحم فرمانے والا ہے' روز جزا کا مالک ہے۔ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد مانگتے ہیں۔ ہمیں سیدھا راستہ دکھا' ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے انعام فرمایا' جو معتوب نہیں ہوئے' جو بھٹکے ہوئے نہیں ہیں۔" ع

اس سورت کا آغاز "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" سے ہوا ہے۔ اس کے بارے میں فقہاء کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے کہ یہ ہر سورت کی ایک آیت ہے یا پورے قرآن مجید کی ایک آیت ہے' اور صرف پڑھتے وقت ہر سورت کا آغاز اس سے کیا جاتا ہے' لیکن راجح بات یہی ہے کہ بسم اللہ سورۃ فاتحہ کی ایک آیت ہے اور اس کو ملا کر ہی سورۃ فاتحہ کی آیتوں کی تعداد سات ہوتی ہے۔ قرآن کریم میں آتا ہے وَلَقَدْ اٰتَیْنٰکَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِیْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِیْمَ O "ہم نے تم کو سات ایسی آیتیں دے رکھی ہیں جو بار بار دہرائی جانے کے لائق ہیں' اور تمہیں قرآن کریم عطا کیا۔" (۱۵-۸۷) اس آیت کے مفہوم کے بارے میں ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد سورۂ فاتحہ ہے' کیونکہ اس کی سات آیتیں ہیں اور اسے مثانی اس لئے کہا گیا ہے کہ اسے نماز میں بار بار دہرایا جاتا ہے۔

بسم اللہ سے آغاز کرنا ان آداب میں سے ایک ہے جو اللہ نے اپنے نبی ﷺ کو آغاز وحی کے وقت بتا دیئے تھے۔ **اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ** (پڑھئے اپنے رب کے نام سے) اور یہ ان آداب میں سے ہے' جو اسلامی تصور حیات کے اساسی عقیدے سے مطابقت رکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ھُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاھِرُ وَالْبَاطِنُ "وہی پہلے ہے' وہی پیچھے ہے' وہی ظاہر ہے' وہی مخفی ہے۔" (۵۷-۳) صرف اللہ موجود برحق اور حقیقی وجود رکھتا ہے اور تمام دوسرے موجودات اپنا وجود اس سے لیتے ہیں۔ ہر چیز کا آغاز اس سے ہوتا ہے لہٰذا ایک مسلمان ہر آغاز اور ہر حرکت اسی کے نام سے کرتا ہے۔

اللہ کی صفات رحمان و رحیم' جنہیں شروع ہی میں لایا گیا ہے۔ رحمت کے تمام حالات اپنے اندر لئے ہوئے ہیں۔ ان دونوں کو یکجا طور پر صرف اللہ ہی کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے جبکہ الرحمٰن اکیلا بھی صرف اللہ ہی کے لئے استعمال ہو سکتا ہے۔ یہ تو جائز ہے کہ ہم اللہ کے سوا کسی انسان کو بھی رحیم کہہ دیں لیکن اسلامی عقائد کی رو سے یہ جائز نہیں ہے کہ ہم بندے کو رحمان کہیں۔ افضل یہ ہے کہ اللہ کے لئے ان دونوں صفات کو بیک وقت استعمال کیا جائے یعنی "رحمان و رحیم" اگرچہ اس بارے میں اختلاف ہے کہ ان دونوں میں سے

یہ رائے شوافع کی ہے۔ حنفی کہتے ہیں کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پورے قرآن مجید کی ایک آیت ہے اور فاتحہ کی آیتوں کی تعداد بسم اللہ کو چھوڑ کر سات ہے۔ البتہ سلف کی اکثریت اس پر متفق ہے کہ سبع مثانی سے مراد فاتحہ ہی ہے' امام بخاری نے اس سلسلے میں دو مرفوع روایتیں بھی پیش کی ہیں۔

کس لفظ کے معنی وسیع تر ہیں لیکن قرآن کے اس سائے میں ہمیں ایسی بحثوں سے زیادہ دلچسپی نہیں ہے' ہاں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ دونوں صفات ملکہ رحمت کے تمام معانی' تمام وسعتوں کو اپنے اندر لئے ہوئے ہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے آغاز کلام' اللہ کی عظمت اور وحدانیت کے معانی پر مشتمل ہوتے ہوئے اگر اسلامی تصور حیات کا پہلا اصول ہے تو رحمان رحیم کی دو صفتوں میں رحمت کے تمام مفاہیم تمام حالات اور تمام وسعتوں کا سمو دینا' اسلامی تصور حیات کا دوسرا زریں اصول ہے۔ جس سے ایک بندے اور اس کے خدا کے درمیان تعلق کی صحیح نوعیت کا اظہار ہوتا ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے ساتھ آغاز کرنے کے بعد' اب انسان اپنے خدا کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ اس کی تعریف کرتا ہے اور پوری کائنات کے لئے اس کی عالمگیر ربوبیت کا اعلان کرتا ہے۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ تعریف اللہ ہی کے لئے ہے جو تمام کائنات کا رب ہے۔"

اللہ کی تعریف وہ شعور ہے جو اللہ تعالیٰ کا ذکر ہوتے ہی قلب مومن میں موجزن ہوتا ہے اور مومن کا دل اس سے سرشار ہو جاتا ہے کیونکہ وجود انسانی اپنے آغاز ہی میں اللہ کی بے پایاں نعمتوں اور فیوض میں سے ایک فیض ہے' جو قلب مومن میں اللہ کی حمد و ثنا کے جذبات کے مہمیز کا کام کرتا ہے۔

اللہ کی نعمتیں قدم قدم پر' لحہ لحہ مسلسل اور جوق در جوق آتی ہیں اور اللہ کی تمام مخلوقات اور بالخصوص اس "انسان" کو فیض یاب کر رہی ہے۔ لہٰذا اللہ کی حمد سے ہر کام کا آغاز اور اسی کی تعریف و ثنا پر ہر کام کا انجام اسلامی تصور حیات کے اصولوں میں سے ایک اہم اصول ہے وَهُوَ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ لَهُ الْحَمْدُ فِي الْاُوْلٰى وَالْاٰخِرَةِ "وہی اللہ جس کے سوا کوئی عبادت کے مستحق نہیں اس کے لئے حمد ہے۔ اول میں بھی اور آخر میں بھی۔" (۲۸۔۷۰) ایسے بندے پر ذرا اللہ کے فضل و کرم کو تو دیکھئے! جب وہ اپنی زبان سے "الحمد للہ" ادا کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے نامہ اعمال میں وہ بھلائی لکھ دیتا ہے جو سب نیکیوں پر بھاری ہوتی ہے۔ ابن ماجہ میں حضرت ابن عمرؓ کی روایت کردہ ایک حدیث میں آتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "کسی بندے نے اللہ کی تعریف کرتے ہوئے کہا یَا رَبِّ لَکَ الْحَمْدُ کَمَا یَنْبَغِیْ لِجَلَالِ وَجْهِکَ وَعَظِیْمِ سُلْطَانِکَ "اے اللہ تیرے لئے ایسی حمد ہے جو تیرے چہرے کی بزرگی اور تیری سلطنت کی عظمت کے لائق ہو۔"

"فرشتے اس معاملے میں متحیر ہوئے اور فیصلہ نہ کر سکے کہ اسے کس طرح لکھیں چنانچہ وہ اللہ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور عرض کی "یا خدایا! تیرے بندے نے ایک ایسی بات کہی ہے کہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ اسے کس طرح لکھیں۔" یہ جانتے ہوئے بھی کہ بندے نے کیا کہا تھا' اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے سوال کیا "تو میرے بندے نے کیا کہا؟" فرشتوں نے عرض کی' اس نے کہا! "اے اللہ تیرے لئے ایسی تعریف ہے جو تیرے چہرے کی عظمت و جلال اور تیری سلطنت کی عظمت کے لائق ہے۔" تو اللہ تعالیٰ نے انہیں حکم دیا کہ اسی طرح لکھو کہ جس طرح میرے بندے نے کہا۔ قیامت کے دن وہ مجھ سے ملے گا اور میں خود اسے اس کی جزا دوں گا۔"

غرض اللہ کی تعریف کے ساتھ اس کی طرف متوجہ ہونا ایک مومن کا وہ شعور ہے جو اللہ کا نام زبان پر آتے ہی' قلب مومن میں موجزن ہوتا ہے۔ اس آیت کا دوسرا حصہ رب العالمین بھی لفظ اسلامی تصور حیات کا ایک بنیادی اصول ہے۔ اللہ کی عالمگیر اور مطلق ربوبیت اسلامی عقائد کا اصل الاصول ہے۔ رب اس ذات کو کہتے ہیں جو مالک اور متصرف ہو اور عربی لغت میں یہ لفظ اس سربراہ کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے جو اصلاح و تربیت کی خاطر کسی چیز میں تصرف کرتا ہے۔ اصلاح و تربیت کے لئے تصرف اور ربوبیت تمام جہانوں اور تمام مخلوقات کو شامل ہے' اللہ نے مخلوقات کو اس لئے پیدا نہیں کیا کہ اسے یونہی مہمل چھوڑ دیا جائے' بلکہ اللہ ہی اس کائنات میں متصرف اور اس کا مصلح ہے' وہ اس کی نگرانی کرتا ہے اور اسے مسلسل پال رہا ہے' تمام جہانوں اور تمام مخلوقات کی دیکھ بھال رب العالمین کی

نگرانی میں کی جارہی ہے' خالق اور مخلوق کے درمیان ربط و صلہ ہر لمحہ اور ہر حال میں قائم ہے اور ہر وقت رواں دواں ہے۔

اس مکمل اور ہمہ گیر عقیدہ توحید کی تشریح و توضیح اور اس ژولیدہ فکری کے درمیان جو اس عقیدے کی عدم وضاحت کے نتیجے میں پیدا ہو جایا کرتی ہے' نقطہ امتیاز صرف ربوبیت مطلقہ ہے۔ یہ ربوبیت ہی ہے جو ان دونوں کے درمیان قطعی امتیاز کر کے رکھ دیتی ہے۔ بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے اور اب بھی ہو رہا ہے کہ لوگ خدائے واحد اور صانع کائنات کا اعتراف بھی کرتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود وہ متعدد الہوں اور ارباب کے بھی قائل ہیں اور وہ ان الہوں اور ارباب کو اپنی زندگی میں حاکم تسلیم کرتے ہیں۔ اگرچہ بادی النظر ہی میں یہ عقیدہ نہایت ہی مضحکہ خیز معلوم ہوتا ہے لیکن حقیقت واقعہ یہی ہے کہ بعض لوگوں کا یہ عقیدہ تھا اور اب بھی ہے۔ قرآن کریم نے' بعض مشرکین کا یہ عقیدہ بیان کیا ہے۔ جو وہ اپنے الہوں اور ارباب کے بارے میں رکھتے تھے۔

مَا نَعۡبُدُهُمۡ اِلَّا لِيُقَرِّبُوۡنَاۤ اِلَى اللّٰهِ زُلۡفٰىؕ "ہم تو ان کی عبادت اس لئے کرتے ہیں کہ وہ اللہ تک ہماری رسائی کرا دیں۔" (۳۹-۳) جیسا کہ اہل کتاب کے بارے میں کہا گیا۔ اِتَّخَذُوۡۤا اَحۡبَارَهُمۡ وَرُهۡبَانَهُمۡ اَرۡبَابًا مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ انہوں نے اپنے علماء اور درویشوں کو اللہ کے سوا اپنا رب بنا لیا ہے۔ (۹-۳۱) نزول قرآن کے وقت مشرکین عرب کی حالت یہ تھی کہ وہ بڑے الہوں کے ساتھ چھوٹے چھوٹے ارباب کے بھی قائل تھے' اور یہ چھوٹے ارباب ان کے خیالات کے مطابق وہ تھے جو بڑے خداؤں کے ساتھ ساتھ خدائی کا کام کر رہے تھے۔

غرض اس صورت میں عالمگیر ربوبیت کا بیان کرنا اور اسے تمام جہانوں کے لئے عام و شامل کرنے سے غرض یہ ہے کہ جاہلیت کے فکری انتشار اور اسلام کی نظریاتی ہم آہنگی کے درمیان واضح طور پر خط فاصل کھینچ دیا جائے تاکہ یہ پوری کائنات اور تمام لوگ صرف ایک خدا کی طرف متوجہ ہوں اور اس کی حاکمیت مطلقہ (Boundless Sovereignty) کا اقرار کریں اور اپنی گردنوں سے ارباب متفرقوں کی غلامی کا جوا اتار پھینکیں اور بے شمار خداؤں کو ماننے سے وہ جس فکری انتشار و پریشانی میں مبتلا ہوتے رہتے ہیں اس سے نجات پائیں۔ اور اس طرح اللہ کی مخلوق کا ضمیر اللہ تعالیٰ کی دائمی نگرانی اور قائم ربوبیت کے سائے میں مطمئن ہو جائے' وہ ربوبیت جو کسی وقت بھی منقطع نہیں ہوتی' جس کا سلسلہ ابد الآباد تک قائم دائم اور جاری و ساری ہے۔ یاد رہے یہ کوئی ایسی ربوبیت نہیں جس کا تصور ارسطو نے پیش کیا کہ اللہ نے اس کائنات کی تخلیق کی اور پھر اسے یونہی چھوڑ دیا۔ وہ کہتا ہے کہ اللہ کو کیا پڑی ہے کہ وہ اپنے سے فروتر چیزوں کے بارے میں فکر کرے' وہ صرف اپنی ذات ہی کے بارے میں فکر کرتا ہے۔" یہ خیال اس شخص کا ہے جو ایک عظیم فلسفی سمجھا جاتا ہے' اس کا فلسفہ ایک ٹھوس حقیقت مانا جاتا ہے اور اس کی عقل کو عقل رسا اور اسے عبقری تسلیم کیا جاتا ہے۔

جب اسلامی تعلیمات کا آغاز ہوا تو اس دنیا میں عقائد و تصورات' افکار و توہمات اور فلسفوں اور روایات کا ایک عظیم ذخیرہ موجود تھا جس میں حق و باطل کا کوئی امتیاز نہ تھا۔ کھرے اور کھوٹے میں کوئی جدائی نہ تھی۔ خرافات دین کا جزو تھے۔ فلسفے اور عقائد اوہام و خرافات کا پلندہ تھے' اور انسانی ضمیر ان اوہام و روایات کے تہ بہ تہ ذخیرے کے نیچے دب گیا تھا اور یقین سے محروم وہم و گمان کے ان گھٹاٹوپ اندھیروں میں ٹاک ٹوئیاں مار رہا تھا۔

یہ حیرانی و پریشانی کیا تھی' جس میں اسے نہ سکون ملتا اور نہ نور ہدایت کی کرن نظر آتی؟ یہ فقط اس وقت کا تصور الٰہ تھا۔ الٰہ العالمین اس کی صفات' مخلوق سے اس کا تعلق ایسے مسائل' بالخصوص اللہ تعالیٰ اور انسان کے باہم تعلق کی صحیح نوعیت' اس وقت کے تمام عقائد اس ضلالت اور گمراہی کا شکار تھے۔

اور اس سے قبل کہ انسان اپنے خدا اور اس کی صفات کے بارے میں کوئی تصور قائم کرتا اور اس وقت کی موجود گمراہی' سرگردانی

اور اوہام و تخیلات کے بھاری بھرکم ذخیرے سے نجات پاتا' انسان کے لئے یہ ممکن ہی نہ تھا کہ اس کا ضمیر اس کائنات کے بارے میں یا خود اپنے نفس کے بارے میں اور اپنے لئے کسی نظام زندگی کے بارے میں مطمئن ہو جائے اور اسے قرار و سکون حاصل ہو سکے ۔ (لہٰذا سب سے پہلے تصور اللہ کی درستگی اور ان باطل نظریات سے نجات ضروری تھی)

اس سکون اور تطہیر عقائد کی ضرورت اور اہمیت کا احساس' انسان کو اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک وہ اس فکری ضلالت کے طول و عرض سے خوب واقفیت نہ رکھتا ہو' اور اسے اس بارے میں پورا پورا علم نہ ہو کہ جب اسلام آیا تو انسان کے دل و دماغ پر غلط عقائد و تصورات' باطل فلسفوں اور غلط روایات کی کس قدر تہیں جمی ہوئی تھیں ۔ ہم نے یہاں تو ان کی طرف اجمالی اشارہ کیا ہے ۔ تفصیلی بحث ان مقامات میں ہو گی جہاں قرآن کریم نے تفصیلاً ان تصورات سے بحث کی ہے۔

ان وجوہات کی بنا پر اسلام نے سب سے پہلے اسلامی عقائد اور اسلام کے اساسی تصورات سے تفصیلی بحث کی اور اللہ کی ذات و صفات' مخلوقات سے اس کے تعلق اور مخلوق کے اپنے خالق کے ساتھ ربط کی نوعیت کے بارے میں اسلامی تصور کو قطعی اور یقینی طور پر واضح اور متعین کر دیا ۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی تصور حیات کی بنیاد' وہ کامل' خالص اور ہمہ گیر توحید ہی جس میں شرک کا شائبہ تک نہ تھا۔ اسلامی تعلیمات میں مسلسل اس کی وضاحت کی گئی ہے ۔ اس کے بارے میں اٹھنے والے تمام شکوک و شبہات کا قلع قمع کیا گیا۔ اس کے متعلق ہر قسم کے خلجان اور اجمال کو دور کیا گیا اور اسے پاک و صاف کر کے خالص اور واضح شکل میں دل مومن میں جاگزیں کیا گیا تاکہ وہ اس معاملے میں کسی طرح وہم و گمان کا شکار نہ ہو' اسلام نے اللہ کی صفات اور صفت ربوبیت مطلقہ کے بارے میں بھی دو ٹوک اور واضح تعلیمات دیں۔ کیونکہ غلط فلسفوں اور بے اصل نظریات کا ایک بڑا حصہ انہی شرکیہ اوہام و اساطیر پر مشتمل تھا جو اللہ کی صفات کے بارے میں' ان غلط فلسفوں نے لوگوں کے دل و دماغ میں جاگزیں کر دی تھیں اور انسانی ضمیر پر ان کا بڑا اثر تھا اور پھر انسانی طرز عمل پر بھی یہ تصورات اثر انداز ہو رہے تھے۔

جن لوگوں نے ان کوششوں کا سرسری مطالعہ کیا ہے جو اسلام نے اللہ کی ذات و صفات اور مخلوق کے ساتھ اس کے تعلق کی نوعیت کو لوگوں کے ذہن نشین کرنے کے لئے اور جن کے بیان میں قرآن کی لاتعداد آیات نازل ہوئیں اور اس نے ان باطل فلسفوں اور شرکیہ نظریات کا مطالعہ نہیں کیا جن کے بھاری بھرکم بوجھ تلے انسانی ضمیر دبا ہوا تھا۔ اور پوری انسانیت ان نظریات میں گم گشتہ تھی' تو وہ قرآن مجید کی ان کوششوں' عقائد کے بارے میں بے حد تاکید و تکرار اور تفصیل و توضیح کی حقیقی وجہ کو ہرگز نہ پا سکے گا۔ لیکن اس کے برعکس جو شخص ان باطل نظریات و عقائد کا گہرا مطالعہ کرے گا جو نزول قرآن کے وقت رائج تھے' اس پر ان کوششوں کی حقیقت و اہمیت اور ضرورت اچھی طرح واضح ہو جائے گی۔ وہ سمجھ سکے گا کہ عقیدۂ توحید نے انسانی ضمیر کی آزادی میں کیا پارٹ ادا کیا۔ کیونکہ اس سے انسان کو اوہام و اساطیر اور متعدد خداؤں کی دیومالائی تصورات سے نجات دی۔

غرض عقیدۂ توحید کا حسن' اس کا کمال' اس کی ہم آہنگی اور جس حقیقت کا اس میں اظہار کیا گیا ہے' اس کی سادگی اور واقعیت پسندی' اس وقت تک سمجھ میں نہیں آ سکتی جب تک انسان ان باطل تصورات و عقائد اور اساطیر و روایات کا اچھی طرح جائزہ نہ لے جو اس وقت دنیا میں رائج تھے ۔ بالخصوص ذات باری کی حقیقت' اس دنیا کے ساتھ اس کے تعلق کی نوعیت وغیرہ' غرض ان باطل افکار کے گہرے مطالعے کے بعد ہی یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ اسلامی نظریۂ حیات دراصل ایک نعمت ہے۔ یہ قلب و نظر دونوں کے لئے رحمت ہے' اس کا حسن اور سادگی انعام الٰہی ہے' انسانی فطرت سے اس کی ہم آہنگی اور معقولیت' ذہن انسانی سے قرب اور مانوسیت اور اس کا توازن اور اعتدال یہ سب کچھ اللہ کی رحمت خاص ہے جو اس نے اپنی مخلوق پر کی۔

الرحمن الرحیم کی صفت کو یہاں وسط سورت میں بطور ایک مستقل آیت پھر دھرایا جارہا ہے۔ یہ رحمت و شفقت کے تمام معانی' تمام حالات اور تمام وسعتوں کو اپنے اندر لئے ہوئے ہے۔ اور یہاں دوبارہ لانے کی غرض و غایت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عالمگیر ربوبیت کی ان صفات کے ایک نہایت ہی ممتاز پہلو کو نمایاں کیا جائے اور خالق و مخلوق اور اللہ اور اس کے پروردہ بندوں کے درمیان ربط و تعلق کو مزید مضبوط اور استوار کر دیا جائے۔ یہ ربط و تعلق اپنی نوعیت کے اعتبار سے رحمت و شفقت کا تعلق ہے۔ جو ایک مومن کو باری تعالیٰ کی حمد و ثنا پر ابھارتا ہے اور یہ وہ تعلق ہے جو اطمینان قلب کی اساس پر قائم ہے اور اس کی تہ میں محبت کے ساتھ بھرے ہوئے دل میں جڑی ہوئی ہیں۔ لہٰذا الحمدللہ درحقیقت انسانی فطرت کی وہ آواز ہے جو وہ اللہ تعالیٰ کی بے پایاں رحمت کے جواب میں بلند کرتی ہے۔

اسلام نے اللہ اور رب کا جو تصور پیش کیا ہے وہ اس تصور سے سراسر مختلف ہے جو اولمپک (Olympic) خداؤں کے متعلق یونانی افکار نے پیش کیا۔ اس تصور کے مطابق یہ قسی القلب خدا زمانہ امن اور حالت جنگ دونوں میں یکساں طور پر اپنے بندوں کے پیچھے پڑے رہتے تھے۔ اور ایک دشمن کی طرح اپنے بندوں کے تعاقب میں لگے رہتے تھے۔ لیکن اسلام کا الٰہ العلمین اپنے بندوں کے لئے وہ انتقامی تدابیر اختیار نہیں کرتا جن کا ذکر عہد نامہ قدیم کی محرف روایات میں ہوا ہے۔ مثلاً سفر تکوین کے باب ۱۱ میں بابل کے متعلق جو داستان بیان کی گئی ہے وہ اس کی واضح ترین مثال ہے۔۱

مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ "روز جزاء کا مالک ہے۔" اس آیت میں اسلام کا وہ اصولی اور بنیادی عقیدہ بیان کیا گیا ہے' جس کے اثرات پوری انسانی زندگی پر نہایت ہی گہرے ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے روز جزاء کے بارے میں ملکیت کا لفظ استعمال کیا ہے۔ جو قبضہ و استیلاء اور تصرف و اختیار کے نہایت اعلیٰ درجے کو ظاہر کر رہا ہے۔ یوم الدین سے مراد قیامت کا روز جزاء ہے۔ یاد رہے کہ نزول قرآن کے وقت بعض ایسے لوگ بھی تھے جو اللہ تعالیٰ کو الٰہ مانتے تھے۔ اور اللہ کی صفت تخلیق پہ بھی یقین رکھتے تھے۔ اور کہتے تھے کہ اللہ ہی اس دنیا کو عدم سے وجود میں لایا' اس کے باوجود وہ یوم جزاء اور حساب کتاب کے قائل نہ تھے۔ ایسے ہی لوگوں کے بارے میں قرآن مجید کہتا ہے وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ "اگر آپ ان سے پوچھیں کہ آسمان و زمین کو کس نے پیدا کیا تو کہیں گے اللہ نے۔" اور دوسری جگہ میں ہے بَلْ عَجِبُوْٓا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ فَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا شَيْءٌ عَجِيْبٌ ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا ذٰلِكَ رَجْعٌۢ بَعِيْدٌ O "انہیں یہ بات عجیب لگی کہ ان کے پاس خود ان میں سے ڈرانے والا آیا۔ کافروں نے کہا کہ یہ انچنبھے کی بات ہے۔ کیا جب ہم مر جائیں گے اور مٹی ہو جائیں گے تو پھر آنا عقل سے بعید کی بات ہے۔" (۵۰-۲)

یوم آخرت پر ایمان اسلام کے اساسی عقائد میں سے ایک اہم عقیدہ ہے۔ اور لوگوں کے دل و دماغ میں' اس جہاں سے آگے' دار آخرت میں اللہ کے سامنے جوابدہی کا احساس پیدا کرنے میں اس کی اہمیت حد درجہ مسلمہ ہے۔ اس عقیدے پہ ایمان لانے والے اس دنیائے

۱۔ "اور تمام زمین پر ایک ہی زبان اور ایک ہی بولی تھی اور ایسا ہوا کہ مشرق کی طرف سفر کرتے کرتے ان کو ملک سنعار میں ایک میدان ملا اور وہاں بس گئے اور انہوں نے آپس میں کہا آؤ ہم اینٹیں بنائیں اور ان کو آگ میں خوب پکائیں۔ سو انہوں نے پتھر کی جگہ اینٹ سے اور چونے کی جگہ گارے سے کام لیا۔ پھر وہ کہنے لگے آؤ ہم اپنے واسطے ایک شہر اور ایک برج جس کی چوٹی آسمان تک پہنچے' بنائیں اور یہاں اپنا نام کریں۔ ایسا نہ ہو کہ ہم تمام روئے زمین پر پراگندہ ہو جائیں اور خداوند اس شہر اور برج کو جس کو بنی آدم بنانے لگے دیکھنے کو اترا اور خداوند نے کہا دیکھو! یہ لوگ سب ایک ہیں اور ان سبھوں کی ایک ہی زبان ہے۔ وہ جو یہ کرنے لگے ہیں تو اب کچھ بھی جس کا وہ ارادہ کریں ان سے باقی نہ چھوٹے گا۔ سو آؤ ہم وہاں جاکر ان کی زبان میں اختلاف ڈالیں تاکہ وہ ایک دوسرے کی زبان نہ سمجھ سکیں۔ پس خداوند نے ان کو وہاں سے تمام روئے زمین میں پراگندہ کیا۔ سو وہ اس شہر کے بنانے سے باز آئے۔ اس لئے اس کا نام بابل ہوا کیونکہ خدا نے وہاں ساری زمین کی زبان میں اختلاف ڈالا اور وہاں سے خداوند نے ان کو تمام روئے زمین پر پراگندہ کیا۔"

دی کی ضروریات کے حصول ہی میں منہمک نہیں ہو جاتے بلکہ اس عقیدے پر ایمان لانے کے بعد وہ دنیاوی حوائج و ضروریات سے بلند ہو کر سوچتے ہیں۔ انہیں اس بات کی کوئی فکر نہیں ہوتی کہ اس محدود مختصر عمر اور دنیا کے اس تنگ دائرہ مکافات میں انہیں اپنے اعمال حسنہ کی پوری جزاء ملتی ہے یا نہیں۔ بلکہ ان کی تمام نیکی اور اللہ کی راہ میں تمام جدوجہد سے مقصود صرف اللہ کی رضا جوئی ہوتی ہے۔ وہ اعمال کا بدلہ صرف اللہ تعالیٰ ہی سے مانگتے ہیں۔ خواہ وہ اس دنیا میں ملے یا آخرت میں ملے۔ وہ مطمئن رہتے ہیں۔ انہیں حق و صداقت پر بھروسہ ہوتا ہے۔ وہ حق پر جم جاتے ہیں اور وہ دولت یقین' وسعت قلب و نظر اور حسن خلق کے مالک ہو جاتے ہیں..... غرض یہ اصولی عقیدہ اس بات کے لئے معیار و کسوٹی ہے کہ کوئی انسان محض اپنی خواہشات و مرغوبات کا بندہ و غلام ہے یا اسے انسان کی انسانیت کے لائق آزادی و حریت بھی حاصل ہے۔ اس سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ اس جہاں میں دنیاوی اقدار' مادی تصورات اور جاہلیت کو برتری حاصل ہے یا ربانی اقدار' روحانی تصورات اور اسلامی نظریۂ حیات کو جاہلیت کی منطق پہ غلبہ حاصل ہے۔ نیز اس اصولی عقیدے کے ذریعے وہ بلند مقام نکھر کر سامنے آتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لئے پسند فرمایا ہے اور ناقص' ناخالص اور منحرف تصورات حیات اور انسانیت کے اس بلند مقام کے درمیان فرق و امتیاز بھی واضح ہو جاتا ہے۔

جب تک انسانوں کے دل و دماغ میں یہ اصولی عقیدہ جاگزیں نہیں ہو جاتا' اور لوگوں کے دلوں میں یہ اطمینان پیدا نہیں ہو جاتا کہ دنیاوی فوائد اور مادی مرغوبات میں انسان کا پورا مقدر نہیں ہے اور جب تک محدود عمر رکھنے والا یہ انسان' یہ یقین نہیں کر لیتا کہ ایک آنے والی زندگی بھی ہے اور اس کا یہ فرض ہے کہ وہ اگلے جہاں اور اس زندگی کے لئے بھی محنت کرے' اس کے لئے قربانی دے' حق کی نصرت کرے' بھلائی میں تعاون کرے اور یہ کہ ان سب باتوں کا اجر اسے آخرت میں ملے گا' اس وقت تک انسانی زندگی اسلامی نظام حیات کے مطابق استوار نہیں ہو سکتی۔

عقیدۂ آخرت پر یقین رکھنے والا اور اس کا انکار کرنے والا اخلاق و شعور اور فکر و عمل میں ہرگز برابر نہیں ہو سکتے۔ لہٰذا یہ دونوں گروہ اللہ کی مخلوقات کے علیحدہ علیحدہ انواع ہیں۔ یہ دونوں مختلف طبائع رکھتے ہیں اور اس دنیا میں ان دونوں کا طرز عمل ہرگز ایک نہیں ہو سکتا اور نہ آخرت میں یہ دونوں ایک ہی طرح کے جزاء کے مستحق ٹھہر سکتے ہیں۔ لہٰذا یہ عقیدہ ان دونوں کے درمیان ایک واضح فرق و امتیاز کا باعث بن جاتا ہے۔

إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ "ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد مانگتے ہیں۔" یہ بھی ایک اصولی عقیدہ ہے اور اس سے پہلے جن عقائد کا ذکر ہوا ہے انہی کا منطقی نتیجہ ہے۔ اللہ کے سوا کوئی بندگی اور عبادت کے قابل نہیں ہے' اور نہ کوئی اس قابل ہے کہ اس سے مدد مانگی جائے۔ یہ عقیدہ بھی اس میدان میں حق و باطل کے درمیان فرق کر کے رکھ دیتا ہے۔ اس سے یہ بات معلوم ہو جاتی ہے کہ ہر قسم کی غلامیوں سے مکمل آزادی کیا ہوتی ہے' اور انسان کی جانب سے دوسرے انسانوں کی غلامی کی حقیقت کیا ہے؟ یہ اصول دراصل اس بات کا اعلان عام ہے کہ انسان کو مکمل اور بھرپور آزادی ملنی چاہئے۔ اوہام و خرافات کی پیروی سے آزادی' غلط اوضاع و اطوار کی پابندی سے آزادی اور باطل نظام زندگی کی اطاعت سے آزادی جب صرف ایک اللہ کی بندگی رہے اور صرف ایک خدا سے نصرت طلب ہو تو انسانی ضمیر کو دوسرے انسانوں' جاہلی نظام ہائے حیات اور رسم و رواج کی جکڑ بندیوں سے آزادی نصیب ہوتی ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ وہ اوہام و خرافات اور مذہبی دیومالائی تصورات (Mythology) کے بندھنوں سے آزاد ہو جاتا ہے۔

یہاں اس بات کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ انسانی قوتوں (Human Powers) اور کائناتی قوتوں (Physical Powers) کے بارے میں ایک مسلمان کے نقطہ نظر کو واضح کر دیا جائے۔

ایک مسلمان کے نقطہ نظر سے انسانی قوت و اقتدار کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ قوت ہے جو ہدایت اور صراط مستقیم پہ قائم ہوتی ہے اور اسلامی نظام زندگی کی مطیع ہوتی ہے۔ اس کے بارے میں ایک مسلم کی پالیسی یہ ہوتی ہے کہ وہ بھلائی' سچائی اور اصلاحی کاموں میں اس کا معاون و مددگار ہوتا ہے اور اسے اپنا فرض منصبی سمجھتا ہے۔ دوسری جاہلی قوت ہوتی ہے جو صراط مستقیم سے بھٹکی ہوئی ہوتی ہے۔ اسلامی نظام زندگی کی مطیع نہیں ہوتی۔ اس کے بارے میں ایک مسلمان کی پالیسی یہ ہوتی ہے کہ وہ اس کا مقابلہ کرتا ہے' اس سے لڑتا ہے اور اسے ختم کر کے اس کی جگہ صحیح قوت و اقتدار قائم کرنے میں مدد دیتا ہے۔

یاد رکھیے! کسی مسلم کو جاہلی قوت کی ظاہری جسامت اور شان و شوکت کو دیکھ کر مضطرب نہ ہونا چاہئے۔ کیونکہ ایک مسلمان کے لئے قوت کا اصل سرچشمہ ذات باری ہے۔ اور جاہلیت اپنی طاقت کے اس اصل سرچشمے کو کھو چکی ہوتی ہے' جو مسلسل اور دائمی طور پر انسان کو قوت فراہم کر رہا ہوتا ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ اجرام فلکی میں سے کوئی عظیم جسم جب کسی جلتے ہوئے ستارے سے جدا ہوتا ہے تو بہت دیر نہیں گزرتی کہ وہ بجھ کر رہ جاتا ہے۔ اس کی روشنی مدہم اور تپش ختم ہو جاتی ہے' اگرچہ اس کا ظاہری جسم عظیم الشان ہو۔ لیکن اس کے برعکس اگر ایک حقیر ذرہ بھی اپنی قوت اور روشنی کے اصل منبع سے جڑا ہوا ہوتا ہے تو وہ اس سے مسلسل حرارت اور روشنی حاصل کرتا رہتا ہے اور حالت یہ ہوتی ہے کَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةً بِاِذْنِ اللّٰهِ "بارہا ایسا ہوا ہے کہ ایک قلیل جماعت نے اللہ کے حکم سے ایک کثیر جماعت پر غلبہ پایا۔" (۲-۲۴۹)

رہی طبیعاتی قوت تو اس کے ساتھ ایک مومن کا تعلق علم و معرفت اور دوستی و ہم آہنگی کا تعلق ہوتا ہے۔ خوف اور دشمنی کا تعلق نہیں ہوتا۔ کیونکہ انسانی اور طبعی دونوں قوتیں ایک مصدر اور مشیت کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ یعنی دونوں ارادہ ربی کے تابع ہوتی ہیں اور دونوں خالق کائنات کے ارادوں کے سامنے محکوم و مقہور ہیں۔ ان کے درمیان مکمل ہم آہنگی اور پورا پورا تعاون ہے۔ وہ یکساں طور پر متحرک ہوتی ہیں اور ان کی حرکت کی سمت بھی ایک ہوتی ہے۔

ایک مسلمان کا عقیدہ اور نظریۂ حیات ہی اسے یہ سکھلاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کو بنایا ہی اس لئے ہے کہ مومن اس کا دوست' معاون اور پشتیبان ہو اور اس دوستی کا تحقق اس طرح ہو سکتا ہے کہ ایک مومن اس کائنات میں غور و فکر کرے' اس سے متعارف ہو' اس کے ساتھ تعاون کرے اور اس کائنات کے ساتھ مل کر اپنے رب کی طرف منہ موڑے۔ اگرچہ بظاہر بعض اوقات طبعی قوتیں انسان کے لئے باعث مضرت ہوتی ہیں لیکن اس کی وجہ یہ ہوتی ہے انسان ان کے سمجھنے میں غلطی کرتا ہے۔ وہ ان کے بارے میں گہری سوچ بچار نہیں کرتا اور وہ اس اصلی طاقت کو بھول جاتا ہے جو اس پوری کائنات کو چلا رہی ہے۔

رومی جاہلیت کے وارث مغرب کے ہاں یہ فیشن سا ہو گیا ہے کہ وہ طبعی طاقتوں کے استعمال کو "تسخیر طبیعت" کے الفاظ سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہ تعبیر صاف صاف بتا رہی ہے کہ اس جاہلیت کا رشتہ رب کائنات سے ٹوٹ چکا ہے اور اسے کائنات کی اس روح سے کوئی تعلق نہیں ہے جو اللہ کو لبیک کہہ رہی ہے۔ رہا وہ مسلمان جس کا دل رحمان و رحیم سے متعلق ہے اور وہ اس کائنات سے بھی پیوستہ ہے جو اللہ رب العالمین کی تسبیح و تہلیل میں ہر وقت محو ہوتی ہے' تو وہ اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ قہر و جفاء کے علاوہ کائنات کے ساتھ تعلق کی ایک دوسری نوعیت بھی ہے۔ اس کا یہ ایمان ہوتا ہے کہ اللہ ہی اس کائنات کا پیدا کرنے والا ہے۔ اسی نے اس پوری کائنات اور اس کی تمام قوتوں کو پیدا کیا۔ اور اس کے لئے قانون قدرت کا ایک ضابطہ کار مقرر کیا تاکہ یہ تمام قوتیں' اس کے دائرے کے اندر اندر' وہ مقاصد پورے کریں جو اللہ کو ان سے مطلوب ہیں۔ اللہ نے اس کائنات کو صرف انسان کے لئے پیدا کیا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے انسان کو یہ سہولت دی کہ وہ اس کے قوانین و ضوابط کو سمجھ سکے اور اس کے بھیدوں کو پا سکے۔ جب بھی وہ ان رازوں میں سے کسی نئے راز کو پا لے تو اس کا یہ فرض ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے کیونکہ اللہ ہی ہے جس نے اس کیلئے کائنات کو مسخر کیا ہے۔ از خود انسان کے

یہ فرض ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے کیونکہ اللہ ہی ہے جس نے اس کے لئے اس کائنات کو مسخر کیا ہے۔ از خود انسان کے بس میں یہ بات نہ تھی کہ وہ اس کائنات کو مسخر و مغلوب کر سکتا سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي الْأَرْضِ "مسخر کیا اس نے تمہارے لئے ان سب چیزوں کو جو زمین میں ہیں۔"

اس تصور کے نتیجے میں، ان کائناتی قوتوں کے بارے میں ایک مومن کا احساس و شعور، ہر قسم کے اوہام و خرافات سے پاک ہوتا ہے۔ اس کے اور ان کائناتی قوتوں کے درمیان خوف و ہراس کے پردے حائل نہیں ہوتے۔ وہ صرف خدائے واحد پر ایمان لاتا ہے، صرف خدائے و' ، کی بندگی کرتا ہے اور صرف رب یکتا سے نصرت کا طلبگار ہوتا ہے۔ رہیں یہ طبعی قوتیں تو اس کے تصور کائنات کی رو سے، یہ بھی اللہ کی مخلوقات کا ایک حصہ ہوتی ہیں۔ وہ ان میں غور و فکر کرتا ہے، ان میں دلچسپی لیتا ہے، اور ان کے بھیدوں کو پانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کے جواب میں یہ تکوینی قوتیں اس کی مددگار ہوتی ہیں اور اس کے سامنے اپنے راز کھول کر رکھ دیتی ہیں اور وہ ان قوتوں کے ساتھ پرامن "مشفقانہ" ایک صدیق صمیم اور یار مانوس کی سی زندگی بسر کرتا ہے۔ جبل احد کی طرف نظر اٹھاتے ہوئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا خوب کہا "یہ پہاڑ ہے اسے ہم سے محبت ہے اور ہمیں اس سے محبت ہے۔" یہ کلمات اس حقیقت کا اظہار کر رہے ہیں کہ مسلم اول حضرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں اس کائنات کی ٹھوس ترین شکل ایک پہاڑ کی بھی کس قدر وقعت اور محبت تھی اور ان کو اس کے ساتھ کس قدر لگاؤ تھا۔

اسلامی تصور حیات کی ان اصولی باتوں کے بعد اور اس بات کی وضاحت کے بعد کہ عبادت و استعانت میں ایک مسلم کو صرف اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونا ہوتا ہے۔ اب ان باتوں کی عملی تطبیق شروع ہوتی ہے۔ دعا اور تضرع کے ذریعے اب بندۂ مومن اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور یہ دعا بھی ایک اصولی دعا ہے جو اس سورت کی اصولی فضاء اور اس کے مجموعی مزاج سے مکمل ہم آہنگی اور مطابقت رکھتی ہے۔

اهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۝ غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ ۝

"ہمیں سیدھا راستہ دکھا۔ ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے انعام فرمایا، جو معتوب نہیں ہوئے اور جو بھٹکے ہوئے نہیں ہیں۔"

"ہمیں سیدھا راستہ دکھا۔ یعنی ہمیں سیدھے اور منزل مقصود تک پہنچانے والے راستے کو سمجھنے کی توفیق دے۔ اور اس کو سمجھنے کے بعد اس پر چلنے کی استقامت دے۔ کیونکہ معرفت حق اور پھر اس پر استقامت دراصل اللہ کی رحمت شفقت اور رہنمائی کا ثمرہ ہوتی ہے۔ اور اسی بارے میں اللہ کی طرف رجوع کرنا دراصل عقیدۂ توحید کا ثمرہ ہے۔ لہٰذا ایک مومن جن معاملات میں اپنے رب سے مدد اور نصرت طلب کرتا ہے ان میں سے صراط مستقیم پر چلنے کی توفیق کی دعا ایک نہایت ہی اہم اور عظیم مطلوب ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دنیا و عقبیٰ کی سعادت اس پر موقوف ہے کہ انسان جادہ مستقیم کی طرف راہنمائی پائے۔ اور جادۂ مستقیم تک رسائی دراصل اس الٰہی ناموس تک رسائی ہوتی ہے جو اس پوری کائنات کی حرکت اور اس کے اندر اس چھوٹے سے انسان کی حرکت کے درمیان توازن و تناسق پیدا کر رہا ہے اور ان دونوں کو اللہ رب العالمین کی طرف متوجہ کر رہا ہے۔

اس کے بعد باری تعالیٰ اس راستے کی حقیقت کو بیان فرماتے ہیں "وہ ان لوگوں کا راستہ ہے جن پر تو نے انعام فرمایا، جو معتوب نہیں ہوئے اور جو بھٹکے ہوئے نہیں۔" یعنی ان لوگوں کا راستہ جن کی قسمت میں اللہ کا انعام لکھا ہوا ہے اور ان لوگوں کا راستہ نہیں جنہوں نے حق کو جانا اور پھر اس سے روگردانی اختیار کی۔ یا جو سرے سے راہ حق کی معرفت ہی سے محروم رکھے گئے۔ اور ہدایت ہی نہ پا سکے۔ بلکہ ان لوگوں کی راہ جو سعادت مند اور واصلین حق ہیں۔

غرض یہ ایک مختصر اور بکثرت نماز میں دہرائے جانے والی سورت ہے' جس کے بغیر نماز نہیں ہوتی اور مختصر ہونے کے باوجود اسلامی نظریہ حیات کے نہایت ہی اہم اور اصولی عقائد پر مشتمل ہے۔ نیز اس میں وہ شعوری ہدایات دی گئی ہیں جن کے سرچشمے اسلامی تصور حیات سے پھوٹتے ہیں۔

صحیح مسلم میں حضرت علاء حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے "اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں نے نماز کو اپنے اور اپنے بندے کے درمیان پورا پورا تقسیم کر دیا ہے۔ نصف اپنے لئے اور نصف بندے کے لئے اور میرے بندے کے لئے وہ سب کچھ ہے جو وہ طلب کرے۔ جب بندہ کہتا ہے الحمد للہ رب العالمین تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "میرے بندے نے میری حمد اور تعریف کی" اور جب وہ الرحمٰن الرحیم ادا کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "میرے بندے نے میری ثناء کی" جب وہ مالک یوم الدین پڑھتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ "میرے بندے نے میری بڑائی بیان کی۔" اور جب وہ کہتا ہے اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ میرے اور میرے بندے کے درمیان مشترک ہے اور میرے بندے کے لئے وہ کچھ ہے جو اس نے طلب کیا۔ اور جب وہ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ .... وَلَا الضَّالِّيْنَ تک پڑھتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ میرے بندے کے لئے ہے اور اس کے لئے وہ کچھ ہے جو اس نے مانگا۔"

اس بیان اور تفسیر کی روشنی میں وہ حکمت کھل کر سامنے آجاتی ہے جس کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے اس سورت کو کم از کم سترہ مرتبہ نماز کے دوران پڑھنا فرض قرار دیا۔ اور اگر کوئی اس سے زیادہ پڑھتا ہے تو یہ اس سے بھی زیادہ مرتبہ دہرائی جاتی ہے۔

☆ ☆ ☆ ☆

فی ظلال القرآن

سورۃ البقرہ

آیات نمبر1تا141

سورۂ بقرہ ایک نظر میں

سورۂ بقرہ کا شمار ان ابتدائی سورتوں میں ہوتا ہے جن کا نزول ہجرت کے متصلاً بعد شروع ہوا۔ قرآن مجید کی تمام سورتوں میں یہ طویل ترین سورت ہے۔ راجح قول یہی ہے کہ اس کی آیات کا نزول اس طرح تسلسل کے ساتھ نہیں ہوا کہ اس کی تکمیل سے قبل کسی دوسری سورت کی کوئی آیت نازل نہ ہوئی ہو۔ کیونکہ جب ہم سورۂ بقرہ کی بعض آیات اور مدینہ میں نازل ہونے والی دوسری طویل سورتوں کی بعض آیات کے اسباب نزول پر غور کرتے ہیں (اگرچہ اسباب نزول کے واقعات قطعی الثبوت نہیں ہوتے) تو معلوم ہوتا ہے کہ ان تمام سورتوں کی آیات کا نزول تسلسل سے نہیں ہوا۔ بارہا ایسا ہوا ہے کہ ایک سورت کا نزول شروع ہو جاتا ہے لیکن ابھی اس کی ابتدائی آیات ہی نازل ہوتی ہیں کہ دوسری سورت کا نزول شروع ہو جاتا ہے۔ چنانچہ سورتوں کے زمانہ نزول کے تعین کا دارومدار ان کی ابتدائی آیات پر ہوتا ہے نہ کہ پوری سورت پر مثلاً سورۂ بقرہ کی آیت ربا کا شمار ان آیات میں ہوتا ہے جو نزول قرآن کے آخری دور سے تعلق رکھتی ہیں۔ حالانکہ راجح قول کے مطابق بقرہ کا ابتدائی حصہ مدنی دور میں سب سے پہلے نازل ہوا۔

آیات قرآنی کی ترتیب اور انہیں ایک سورت کی شکل میں جمع کرنے کا کام براہ راست اللہ تعالیٰ کی ہدایات کی روشنی میں ہوا۔ امام ترمذی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی ایک روایت نقل کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے سوال کیا "آپ لوگوں نے سورۂ انفال اور سورۂ توبہ کو باہم دگر ملادیا ہے حالانکہ انفال مثانی میں سے ہے اور توبہ "مئین" میں سے ہے۔ نیز آپ حضرات نے دونوں کے درمیان بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کی سطر بھی نہیں لکھی اور ان کو سبع طوال میں رکھ دیا ہے۔ معلوم نہیں اس کی کیا وجہ ہے؟ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا "دراصل بات یہ تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر بیک وقت متعدد سورتیں نازل ہوتی رہتی تھیں، جب کبھی آپ پر نئی آیات کا نزول ہوتا" آپ کاتبین وحی میں سے کسی کو بلالیتے اور حکم دیتے کہ اس آیت کو فلاں فلاں سورت میں شامل کر دو۔" سورۂ انفال ان سورتوں میں سے تھی جو مدینہ کے ابتدائی دور میں نازل ہوئی اور سورۂ توبہ ایسی آیات پر مشتمل تھی جن کا نزول سلسلہ نزول قرآن کے آخری دور میں ہوا۔ ان دونوں کے مضامین چونکہ باہم مشابہ تھے، اس لئے میں نے یہ گمان کیا کہ شائد یہ انفال ہی کا حصہ ہے۔ اس اثناء میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہو گیا اور آپ کو اس بات کی وضاحت کرنے کا موقع نہ ملا کر وہ انفال کا حصہ ہے یا نہیں؟ ان وجوہات کی بناپر میں نے ان دونوں سورتوں کو باہم ملادیا اور اسی لئے دونوں کے درمیان بسم اللہ الرحمٰن الرحیم نہ لکھا اور ان کو "سبع طوال" میں رکھ دیا۔"

یہ روایت صاف صاف بتارہی ہے کہ سورتوں کی شکل میں آیات کی ترتیب خاص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات کے تحت تکمیل پذیر ہوئی۔ امام مسلم اور بخاری نے حضرت ابن عباس سے ایک روایت نقل کی ہے جس میں آپ فرماتے ہیں "رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم

قرآن مجید کی سورتوں کی تقسیم یوں ہے کہ بقرہ سے توبہ تک "طوال" ہیں یعنی لمبی سورتیں یونس سے فرقان تک مئین کہلاتی ہیں۔ یعنی ایسی سورتیں جن کی آیات سو کے لگ بھگ ہیں۔ الشعراء سے الفتح تک مثانی کہلاتی ہیں۔ ان کی آیات سو سے کم ہیں۔ اور ان میں سے قصوں کو بار بار دہرایا گیا ہے۔ سورہ الحجرات سے لے کر اختتام تک تمام سورتوں کو مفصل کہلاتی ہیں (ایسی سورتیں جن کی آیات کے آخر میں آنے والے الفاظ صوتی ہم آہنگی رکھتے ہیں) اس آخری قسم کو پھر مزید تین قسموں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ طوال مفصل (لمبی) اوساط مفصل (متوسط) قصار مفصل (مختصر) یعنی سورہ الحجرات سے الانشقاق تک طوال، "والسماء ذات البروج" سے لم یکن تک اوساط اور یہاں سے آخری تک قصار (مترجم)

کے ساتھ بھلائی کرنے میں بے حد کشادہ دل تھے۔ بالخصوص رمضان المبارک میں تو آپ کی فراخ دلی کی کوئی انتہا نہ رہتی تھی۔ پورے رمضان مبارک میں ہر رات جبرئیل امین آپ سے ملتے تھے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم آپ کو قرآن کریم سناتے تھے۔ بعض روایات میں فیدارسہ القرآن کے لفظ آتے ہیں۔ یعنی باہم پڑھتے پڑھاتے تھے۔ تو جب رمضان میں جبرئیل امین آپ سے ملتے تو آپ کار خیر کے لئے فراخدلی میں' ان ہواؤں سے بھی بڑھ جاتے تھے جو بارش لاتی ہیں۔" اس حدیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پورا قرآن مجید جبرئیل امین کو سناتے تھے اور اسی طرح جبرئیل امین آپ کو سناتے۔ تو معلوم ہوا کہ پورا قرآن سورتوں کی شکل میں بہرحال مرتب تھا۔

جو شخص قرآن کے سائے میں جیتا ہے اور اس میں غور و فکر کرتا ہے اس پر یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ قرآن کی ہر سورت ایک مستقل اور ذی روح شخصیت رکھتی ہے۔ دل مومن تو اس کے ساتھ اسی طرح مانوس ہو جاتا ہے کہ گویا وہ کسی زندہ انسان سے ہم کلام ہے جو واضح خدو خال اور روح و حیات رکھتا ہے..... ہر سورت کا ایک مرکزی مضمون ہے یا کئی مضامین ہیں جو ایک ہی محور کے گرد گھوم رہے ہیں۔ نیز ہر سورت کی ایک مخصوص فضا ہے جو اس کے تمام موضوعات سخن پر چھائی ہوئی ہے۔ اس میں ان موضوعات پر متعین پہلوؤں سے بحث ہوتی ہے تاکہ ان موضوعات اور سورت کی اس عمومی فضا کے درمیان کامل درجہ کی ہم آہنگی پائی جائے۔ پھر ہر سورت کا ایک مخصوص صوتیاتی اثر ہوتا ہے۔ اور وہ پوری سورت میں ایک ہی رہتا ہے۔ اگر کہیں اس میں کوئی تبدیلی ہو بھی تو وہ اس مخصوص موضوع سخن کی وجہ سے ہوتی ہے۔ قرآن کی تمام سورتوں کی یہی خصوصیت ہے اور اس سے سورۂ بقرہ جیسی طویل ترین سورتیں بھی مستثنیٰ نہیں ہیں۔

سورہ بقرہ متعدد موضوعات پر مشتمل ہے لیکن وہ تمام موضوعات ایک ہی محور کے ارد گرد گھوم رہے ہیں۔ یہ محور دو متوازی اور باہم مربوط خطوط سے مرکب ہے۔ ایک طرف تو یہ پوری سورت یہ بتاتی ہے کہ بنی اسرائیل نے دعوت اسلامی کے مقابلے میں کیا موقف اختیار کیا؟ انہوں نے اس دعوت کا استقبال کس طرح کیا؟ اس کے پیغامبر کو کیا کیا اذیتیں دیں۔ اس دعوت کی بنیاد پر اٹھنے والی جماعت اور امت مسلمہ کے خلاف کیا کیا سازشیں کیں۔ نیز اس موقف کی دوسری تفصیلات اور کڑیاں مثلاً یہود و منافقین کا باہم گٹھ جوڑ' یہود و مشرکین کا باہم تعلق وغیرہ...... دوسری طرف اس سورت میں یہ اعلان کیا گیا ہے کہ اب بنی اسرائیل کو فریضہ ادائیگی خلافت کے لئے نااہل قرار دیا جاتا ہے کیونکہ انہوں نے اس بارے میں خداوند کریم سے جو عہد و پیمان باندھے تھے وہ ایک ایک کر کے توڑ چکے ہیں اور یہ کہ اب انہیں اس تحریک کے داعی اول حضرت ابراہیم علیہ الصلوۃ والسلام سے کوئی نسبت نہیں رہی ہے اور یہ کہ مسلمانوں کو بھی اس بات کی تنبیہہ کی جاتی ہے کہ وہ ان غلطیوں سے بچیں جن کی وجہ سے بنی اسرائیل کو نااہل قرار دیا جا رہا ہے۔ پھر اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ اپنے ابتدائی حالات میں (منصب امانت کو سنبھالتے ہوئے) اسلامی جماعت نے کیا موقف اختیار کیا اور کس پالیسی پر گامزن رہی۔ اس نے فریضہ اقامت دین' دعوت دین اور خلافت فی الارض کی اس عظیم الشان اور بھاری ذمہ داری کو پورا کرنے کے لئے اپنے آپ کو کیونکر تیار کیا؟

غرض سورۂ بقرہ کے تمام مضامین ان دو متوازی خطوط پر چل رہے ہیں۔ اس کی تفصیل انشاء اللہ آئندہ تفصیلی بحثوں کے دوران آئے گی۔

/

یہاں اس بات کی ضرورت ہے کہ اس صورت حالات پر اجمالاً بحث کی جائے جس کے مقابلے کے لئے سب سے پہلے یہ سورت نازل ہوئی تاکہ ایک طرف تو اس سورت اور اس کے مضامین کے درمیان ربط کا صحیح اندازہ ہو سکے۔ اور دوسرے یہ معلوم ہو سکے کہ مدنی دور کے ابتدائی ایام میں دعوت اسلامی کی رفتار کیا تھی؟ اور اسلامی جماعت کی سرگرمیاں اور پیش آنے والے حالات کیا تھے؟ یہاں یہ بات پیش نظر رہنی چاہئے کہ یہ صورت حال اپنے عمومی پہلو سے بعینہ وہی ہے جو ہر دور اور ہر زمانے میں ایک معمولی فرق کے ساتھ دعوت اسلامی کے حاملین کو پیش آتی رہی ہے۔ تاریخ میں دعوت اسلامی کے دشمنوں نے ہمیشہ وہی کردار ادا کیا ہے جو کبھی مدینہ کے اسلام دشمنوں نے ادا

کیا تھا۔ اور اس کے دوستوں کا تعلق اخلاص بھی ایسا رہا جو قرن اول کے فدا کار اسلام کا رہا۔ اس طرح یہ قرآنی ہدایات دعوت اسلامی کے لئے ایک طرح کا دائمی دستور بن جاتی ہیں۔ اور ان آیات میں ہر حال اور ہر زمانے کے لئے زندہ جاوید ہدایت پائی جاتی ہے اور یہ آیات امت مسلمہ کے لئے اس طویل اور کٹھن سفر میں مشعل راہ کی حیثیت رکھتی ہیں جس میں اسے کئی مختلف الشکل لیکن متحد المزاج مخالف عناصر کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ پورے قرآن مجید کی ایک ایک آیت میں یہ خصوصیت موجود ہے اور یہ قرآن کریم کے اعجاز کے ایک خاص پہلو کو ظاہر کر رہی ہے۔

مدینہ کی طرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کا عمل ایک محکم منصوبے اور سوچی سمجھی تعلیم کے مطابق ظہور پذیر ہوا۔ اور جن حالات میں ہجرت کا فیصلہ ہوا وہ ایسے تھے کہ انہوں نے ہجرت کے عمل کو لابدی اور حتمی بنا دیا تھا کیونکہ جس منصوبہ کے مطابق باری تعالیٰ کو تحریک اسلامی کو چلانا مقصود تھا' اس کے لئے ہجرت ضروری ہوگئی تھی۔ قریش نے دعوت اسلامی کے بارے میں جو سخت موقف اختیار کیا تھا' حضرت خدیجہ الکبریٰ رضی اللہ عنہا اور ابو طالب کی وفات کے بعد' اس کی وجہ سے مکہ اور اس کے ماحول میں دعوت اسلامی پر ایک جمود اور ٹھہراؤ کی کیفیت طاری ہوگئی تھی۔ اگرچہ قریش کی گہری سازشوں اور ان کی بے حد ایذا رسانیوں کے باوجود بعض لوگ دین اسلام میں داخل ہو رہے تھے۔ تاہم قریش کے سخت رویئے اور اسلام کے خلاف ان کی چومکھی لڑائی کی وجہ سے مکہ اور اس کے اردگرد کے علاقوں میں عملاً دعوت اسلامی کا پھیلاؤ روک دیا گیا تھا اور مکہ کے علاوہ دوسرے عرب قبائل نے بھی محتاط اور "انتظار کرو اور دیکھو" کا رویہ اختیار کر لیا تھا۔ وہ اس بات کے منتظر تھے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے قریبی رشتہ داروں' ابولہب' عمرو' ابن ہشام' ابو سفیان بن حرب وغیرہ کے درمیان جو کشمکش برپا ہے اس کا کیا فیصلہ ہوتا ہے کیونکہ یہ لوگ دعوت اسلامی کے داعی کے قریبی رشتہ دار تھے اور عرب کے قبائلی معاشرے میں کنبہ پروری کو بڑی اہمیت حاصل تھی اور عام لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان سے یہ توقع رکھتے تھے کہ وہ سب سے پہلے اسلام کو قبول کرے۔ لہٰذا ان کے اس معاندانہ موقف میں کوئی وجہ نہ تھی کہ ایک عام عرب دعوت اسلامی کو قبول کرے بالخصوص جبکہ حضور کا خاندان خانہ کعبہ کا متولی بھی تھا۔ اور جزیرۃ العرب میں وہی دینداری اور مذہبیت کی نمائندگی کا مستحق سمجھا جاتا تھا۔

یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسلسل اس بات کی تلاش میں رہے کہ مکہ کے باہر دعوت اسلامی کے لئے کوئی ایسا مرکزی مقام تلاش کیا جائے جو اس نظریۂ حیات کا گہوارہ ہو اور تحریک کو امن و آزادی کی ضمانت دے۔ جہاں تحریک اسلامی اس جمود کی حالت سے نکل سکے جو مکہ میں اس پر طاری ہوگئی تھی اور جہاں آزادی کے ساتھ لوگوں کے سامنے دعوت اسلامی پیش کی جا سکے اور اسے قبول کرنے والے آلام و فتن اور دشمن کی ایذا رسانیوں سے محفوظ ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہجرت کے اقدام کے جو اسباب بھی ہوں ان میں سے یہ پہلا اور سب سے اہم سبب ہے۔

یثرب کو تحریک اسلامی کا مرکز بنانے سے قبل بھی کئی دوسرے مقامات زیر غور رہے تھے۔ سب سے پہلے حبشہ کی طرف ہجرت ہوئی تھی۔ جن لوگوں نے ابتدائی ایام میں دین اسلام کو قبول کیا تھا' ان کی ایک بڑی تعداد نے حبشہ کی طرف ہجرت کی تھی۔ یہ بات درست نہیں ہے کہ یہ لوگ محض جسمانی نجات حاصل کرنے کے لئے حبشہ کی طرف نکل گئے تھے۔ کیونکہ قرائن اس کی تردید کرتے ہیں۔ اگر یہ ہجرت صرف جسمانی اذیت سے نجات پانے کے لئے ہوتی تو مسلمانوں میں سے صرف وہ لوگ ہجرت کرتے جن کی جان و مال اور آبرو کی حفاظت کا مکہ مکرمہ میں کوئی بندوبست نہ تھا۔ حالانکہ جو لوگ نکلے ان کی حالت اس سے برعکس تھی۔ ان مہاجرین میں وہ لوگ شامل نہ تھے جن پر جسمانی اذیت کے پہاڑ توڑے جا رہے تھے مثلاً ضعفاء اور غلام وغیرہ۔ جو لوگ اس ہجرت میں شریک ہوئے وہ سب خاندانی اور ذی وجاہت لوگ تھے۔ اور ان کے خاندان کے ہوتے ہوئے کوئی شخص یہ جرات نہ کر سکتا تھا کہ انہیں کسی قسم کی اذیت پہنچائے۔ کیونکہ قبائلی عصبیت

کے اس معاشرے میں لوگ اپنے مسلمان رشتہ داروں کی حمایت بھی کرتے تھے۔ ان مہاجرین کی اکثریت قریش سے نسبی تعلق رکھتی تھی۔ مثلاً جعفر بن ابی طالب (حالانکہ ابو طالب اور دوسرے ہاشمی نوجوان ہی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حمایت کر رہے تھے) زبیر بن عوام' عبدالرحمٰن بن عوف' ابو مسلمہ مخزومی اور عثمان بن عفان وغیرہ۔ اسی طرح ان مہاجرین میں مکہ کے اونچے خاندانوں کی خواتین بھی شامل تھیں اور اس بات کا کوئی امکان ہی نہ تھا کہ انہیں کسی قسم کی اذیت پہنچائے۔

البتہ اس بات کا امکان ہے کہ ہجرت کے پس منظر میں کچھ اور اسباب بھی پوشیدہ ہوں مثلاً یہ کہ قریشی اونچے درجے کے گھرانوں میں یہ احساس اور بے چینی برپا کرنا کہ ان میں سے ایسے معزز اور سرکردہ شرفا ان کی ایذاؤں سے تنگ آکر' اپنے نظریۂ حیات کو لے کر' اور اپنے وطن عزیز اور اعزہ کو الوداع کہہ کر' جاہلیت سے بھاگ رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ عرب جیسے باحمیت اور کنبہ پرست معاشرے میں مسلمانوں کا یہ اقدام غم و غصہ کی لہر دوڑا سکتا تھا۔ جبکہ مہاجرین میں ام حبیبہ بنت ابی سفیان بھی شامل تھیں جو جاہلیت کا سب سے بڑا علمبردار تھا۔ اور اسلامی نظریۂ حیات اور اس کے داعی کے خلاف برپا کی ہوئی اس فتنہ انگیزی میں ایک بڑا پارٹ ادا کر رہا تھا لیکن ان اسباب کو صحیح تسلیم کرنے کے بعد بھی اس بات کا انکار نہیں کیا جاسکتا کہ حبشہ کی طرف ہجرت بھی انہی کوششوں کی ایک کڑی تھی۔ جو تحریک اسلامی کے لئے ایک آزاد مرکز کی تلاش کے سلسلے میں ہو رہی تھیں۔ جہاں یہ نئی تحریک آزاد اور پرامن طریقے سے کام کر سکے۔ اس کی تائید ان روایات سے بھی ہوتی ہے جو حبشہ کے نجاشی کے اسلام کے بارے میں کتب احادیث میں نقل ہوئی ہیں۔ جن میں کہا گیا ہے کہ نجاشی نے اپنے اسلام کا اعلان محض اس لئے نہ کیا کہ وہ اپنے مذہبی لیڈروں سے خائف تھا۔

سیرت کی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ہجرت سے قبل نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے طائف کا سفر فرمایا۔ اس کا مقصد بھی دعوت اسلامی کے لئے ایک آزاد اور مامون مرکز کی تلاش تھا۔ لیکن آپ کی یہ کوشش کامیاب نہ ہوئی۔ اور ثقیف کے کبراء نے آپ کا استقبال پتھروں سے کیا۔ انہوں نے اپنے نادانوں اور بچوں کو آپ کے پیچھے لگادیا۔ یہ لوگ آپ کو پتھر مارنے لگے۔ آپ کے پاؤں مبارک زخمی ہو گئے اور آپ کو مجبوراً عتبہ اور شیبہ پسران ربیعہ' کے باغ میں پناہ لینا پڑی۔ اس باغ میں آپ کی زبان مبارک سے جو پرخلوص اور گہری دعا نکلی وہ داعیان حق کے لئے نمونہ عبرت ہے۔ آپ نے فرمایا!

"اللہ! میں اپنی ناتوانی' قلت تدبیر اور لوگوں کے مقابلے میں اپنی کمزوری کی فریاد آپ ہی سے کرتا ہوں۔ اے ارحم الراحمین! تو ہی میرا اور سب ضعیفوں کا رب ہے۔ تو مجھے کس کے حوالے کر رہا ہے۔ کیا تو نے میرا معاملہ دشمن کے سپرد کر دیا ہے؟ یا کسی غیر کے جو مجھ سے ترشروئی سے پیش آئے۔ اگر تو مجھ پر غضبناک نہیں ہے تو پھر مجھے کسی چیز کی کوئی پروا نہیں لیکن تیری عافیت میرے لئے کشادہ ہے۔ میں تیرے غضب اور تیری پھٹکار سے تیرے چہرہ کے نور میں پناہ مانگتا ہوں۔ جس نے اندھیروں کو اجالا کر دیا جن سے دینی اور دنیوی امور درست ہوتے ہیں۔ میں تیرے ہی در کا سوالی ہوں۔ یہاں تک کہ تو مجھ سے راضی ہو جائے اور تیرے سوا قوت و استطاعت کا کوئی اور مصدر نہیں ہے۔

چنانچہ اس کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور دعوت اسلامی کے لئے غیبی اسباب فراہم ہو گئے۔ عقبہ گھاٹی کے دامن میں پہلی بیعت ہوئی۔ پھر اگلے سال دوسری ہوئی۔ چونکہ ان بیعتوں کا ہمارے موضوع اور مدینہ میں دعوت اسلامی کی تاریخ سے گہرا تعلق ہے اس لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ان کا مختصر تذکرہ کیا جائے۔

ہجرت سے ۲ سال قبل کا واقعہ ہے کہ حجاج کے سامنے دعوت اسلامی پیش کرنے کے دوران نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات خزرج کے کچھ لوگوں سے ہوئی۔ آپ کا معمول تھا کہ حج کے موقع پر آپ لوگوں کو دعوت دیتے اور ایک ایک قبیلے سے درخواست کرتے کہ وہ

دعوت اسلامی و قبول کریں اور آپ کی حمایت کریں تاکہ آپ اپنے رب کا پیغام پوری دنیا تک پہنچا سکیں۔ یثرب کے باشندوں کے پڑوس میں چونکہ یہود آباد تھے اور یہ لوگ اکثر اوقات یہودیوں سے یہ بات سنا کرتے تھے کہ ایک نبی آخرالزمان آنے والا ہے اور یہ کہ اس کی حمایت و قیادت میں وہ عربوں پر فتح یاب ہوں گے۔ وہ اللہ سے یہ دعائیں بھی مانگتے تھے کہ وہ انہیں اس کی طفیل فاتح و کامران کرے اور وہ نبی ان کے دشمنوں کے مقابلے میں ان کا حامی و مددگار ہو۔ جب خزرج کے وفد نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کو سنا تو آپس میں کہنے لگے "خدا کی قسم یہ وہی نبی ہے جس سے تمہیں یہود ڈراتے ہیں اور ایسا نہ ہو کہ یہودی تم سے پہلے اس پر ایمان لے آئیں۔ لہٰذا انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت قبول کر لی۔ اور آپ سے کہا کہ "ہماری پوری قوم مدینہ طیبہ میں ہے اور ان میں آج کل ایسی دشمنی اور خانہ جنگی برپا ہے جو کسی دوسری قوم میں نہیں ہے۔ ہم توقع رکھتے ہیں کہ آپ کے ذریعہ اللہ اس دشمنی کو ختم کر دے۔" جب یثرب لوٹے تو یہ واقعہ انہوں نے اہل مدینہ کو سنایا۔ اہل مدینہ بے حد خوش ہوئے اور دعوت اسلامی کو قبول کر لینے پر متفق ہو گئے۔

اگلے سال اوس اور خزرج کی ایک جماعت موسم حج میں مکہ آئی۔ اس نے حضور سے ملاقات کی اور حلقہ بگوش اسلام ہو کر لوٹی۔ آپ نے کچھ معلمین اور مبلغین ان کے ساتھ کر دیئے تاکہ وہ ان کی مزید تربیت کریں۔

تیسرے سال اوس و خزرج کی ایک بہت بڑی جمعیت حاضر ہوئی۔ اور آپ کے ساتھ معاہدہ کیا۔ یہ معاہدہ حضرت عباس کی موجودگی میں ہوا۔ معاہدہ کی اہم شق یہ تھی کہ اہل یثرب آپ کی حفاظت اسی طرح کریں گے جس طرح وہ اپنی جان اور مال کی حفاظت کرتے ہیں۔ اس معاہدے کو بیعت عقبہ کبریٰ کہتے ہیں۔ اس کے بارے میں محمد بن کعب قرظی نقل کرتے ہیں کہ اس میں حضرت عبداللہ بن رواحہ نے حضرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا "آپ اپنے رب اور اپنی ذات کے لئے جو شرائط چاہیں ہم سے منوا لیں۔" آپ نے فرمایا اللہ کے لئے صرف یہ شرط ہے کہ آپ لوگ اس کی بندگی کریں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں اور اپنے لئے میں تم پر صرف یہ شرط عائد کرتا ہوں کہ آپ لوگ میری حفاظت ایسے ہی کریں جیسے اپنی جان و مال کی کرتے ہیں۔" اس پر عبداللہ بن رواحہ نے کہا تو پھر اس پر ہمیں کیا اجر ملے گا؟" آپ نے فرمایا "جنت!" اس پر سب نے کہا "بہت نفع بخش سودا ہے۔" "نہ ہم اسے واپس کرتے ہیں اور نہ فریق ثانی سے اس کا مطالبہ کرتے ہیں۔

یوں مسلمانوں نے بزور طاقت نظام حکومت اپنے ہاتھ میں لیا اور اسلام مدینہ طیبہ میں تیزی سے پھیل گیا۔ کوئی گھر ایسا نہ رہا جس میں کوئی نہ کوئی مسلمان نہ ہو۔ مسلمان مکہ مکرمہ سے ہجرت کر کے مدینہ طیبہ آنا شروع ہو گئے۔ اور صرف دولت ایمان لے کر اپنے گھروں سے نکلے اور اپنا سب کچھ اس راہ حق میں لٹا دیا۔ مدینہ میں ان کے بھائیوں نے جو ان سے قبل دارالاسلام اور ایمان میں جم کر بس گئے تھے' ان کے ساتھ جس ایثار اور بھائی چارے کا مظاہرہ کیا' وہ ایسا ہے کہ پوری انسانی تاریخ اس کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے۔ اس کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صدیق اکبر نے ہجرت فرمائی۔ اور آپ اس مامون اور آزاد مرکز میں جا پہنچے جس کے آپ ﷺ ایک عرصہ سے متلاشی تھے۔ جس دن آپ مدینہ پہنچے اسی دن اس نئے مرکز میں اسلامی حکومت قائم ہو گئی تھی۔

جن لوگوں نے تحریک اسلامی کے اس مرحلے میں مدینہ کی طرف ہجرت کی تھی اور ان کے معاون و مددگار پہلے سے مدینہ میں ان کے لئے منتظر بیٹھے تھے' یہ دونوں مل کر وہ جماعت بن گئے جس کی طرف قرآن کریم متعدد مقامات پر اشارہ کرتا ہے۔ سورۂ بقرہ کے آغاز ہی میں جن ایمانی مبادیات کا ذکر شروع ہو جاتا ہے' یہ صفات اگرچہ بظاہر علی الاطلاق تمام سچے مومنین کی ہیں لیکن ان صفات کا سب سے پہلا مصداق مومنین کی وہ جماعت ہے جو اس وقت مدینہ طیبہ میں جمع تھی۔

الٓمّٓ ۚ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۙ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ

يُنْفِقُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ

"الف' لام' میم۔ یہ اللہ کی کتاب ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں۔ ہدایت ہے ان پرہیزگاروں کے لئے جو غیب پر ایمان لاتے ہیں' نماز قائم کرتے ہیں' جو رزق ہم نے ان کو دیا ہے' اس میں سے خرچ کرتے ہیں' جو کتاب تم پر نازل کی گئی ہے اور جو کتابیں تم سے پہلے نازل کی گئی تھیں' ان سب پر ایمان لاتے ہیں اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔ ایسے لوگ اپنے رب کی طرف سے راہ راست پر ہیں اور وہی فلاح پانے والے ہیں۔

مومنین کی یہ صفات بیان کرنے کے بعد سیاق کلام میں متصلاً کفار کی صفات کا بیان آجاتا ہے۔ اگرچہ علی العموم ان صفات کا تعلق بھی تمام کفار سے ہے لیکن ان کا سب سے پہلا مصداق وہ کفار بنے جو اس وقت دعوت اسلامی کی راہ روکے کھڑے تھے۔ خواہ وہ مکی کفار ہوں یا ان کا تعلق مدینہ اور اس کے ماحول سے ہو۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ ۚ وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ۚ وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝

"جن لوگوں نے ان باتوں کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا' ان کے لئے یکساں ہے' خواہ تم انہیں خبردار کرو یا نہ کرو' بہرحال وہ ماننے والے نہیں ہیں۔ اللہ نے ان کے دلوں اور ان کے کانوں پر مہر لگا دی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردہ پڑ گیا ہے۔ وہ سخت سزا کے مستحق ہیں۔

ان دو گروہوں کے علاوہ وہاں منافقین کا ایک تیسرا گروہ بھی موجود تھا جیسا کہ ہم نے بالتفصیل بتایا' جن حالات میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت فرمائی تھی' ان کا قدرتی نتیجہ یہ تھا کہ ہجرت کی تکمیل کے فوراً بعد ہی وہ گروہ پیدا ہو گیا۔ مکہ میں اس گروہ کا وجود نہ تھا۔ کیونکہ وہاں اسلام کی پشت پر کوئی قوت اور حکومت نہ تھی اور نہ کوئی ایسی قومی جماعت تھی جس سے ڈر کر قریش اسلام کے بارے میں کوئی منافقانہ رویہ اختیار کرتے بلکہ اس کے برعکس مکہ میں اسلام کمزور تھا۔ دعوت ہر قسم کے خطرات میں گھری ہوئی تھی۔ صرف مخلصین ہی تھے جو اس دور میں دعوت اسلامی کی صفوں میں شامل ہونے کی جرأت کر سکتے تھے' جو اس کی راہ میں ہر قسم کے مصائب جھیلنے کے لئے تیار تھے اور اس کے لئے سب کچھ لٹانے پر تلے ہوئے تھے لیکن یثرب..... (جو پہلے دن ہی سے مدینہ الرسول کے نام سے مشہور ہو گیا) میں حالات کا رخ یکلخت بدل گیا تھا۔ اسلام ایک ایسی قوت بن گیا تھا جسے ہر شخص محسوس کرنے لگا تھا اور ہر کوئی مجبور تھا کہ وہ اس قوت سے تھوڑا بہت بنائے رکھے۔ بالخصوص جنگ بدر کی عظیم کامیابی کے بعد تو بڑوں بڑوں کی گردنیں جھک گئی تھیں۔ جو لوگ روش نفاق پر مجبور تھے ان میں بعض کبرائے یثرب بھی تھے۔ ان کے خاندان اور قبیلے کے لوگ اسلام میں داخل ہو گئے تھے۔ اس لئے یہ کبراء بھی اپنی سابقہ پوزیشن کو بحال رکھنے کے لئے اور اپنے مخصوص مصالح کی خاطر بظاہر دائرہ اسلام میں داخل ہو گئے تھے۔ ایسے لوگوں میں عبداللہ بن ابی ابن سلول کا نام سرفہرست تھا۔ کیونکہ مسلمانوں کی ہجرت سے کچھ قبل ہی اس کی قوم نے یہ پروگرام بنایا تھا کہ اسے بادشاہ بنا دیں۔ اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لئے اس کی قوم اس کے لئے ہار اور تاج تیار کر رہی تھی۔

سورۂ بقرہ کی ابتدا میں بالتفصیل ان منافقین کے اوصاف بیان کئے گئے ہیں۔ بعض فقروں سے یہ معلوم ہوتا ہے اکثر و بیشتر فقروں کا مصداق یہی بڑے لوگ ہیں جنہوں نے حالات سے مجبور ہو کر اپنے آپ کو دائرہ اسلام میں داخل کر دیا تھا۔ لیکن وہ اب بھی عوام الناس پر اپنی لیڈر شپ قائم رکھنے کے خواب دیکھ رہے تھے۔ اور عام طور پر ایسے متکبر اکابرین جس طرح عوام کے بارے میں رائے رکھتے ہیں اسی

طرح یہ لوگ اسلام قبول کرنے والوں کو "بے وقوف" لوگ کہہ کر پکارتے تھے چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

"بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان لائے ہیں' حالانکہ درحقیقت وہ مومن نہیں ہیں۔ وہ اللہ اور ایمان لانے والوں کے ساتھ دھوکہ بازی کر رہے ہیں۔ مگر دراصل وہ اپنے آپ ہی کو دھوکے میں ڈال رہے ہیں اور انہیں اس کا شعور نہیں ہے۔ ان کے دلوں میں ایک بیماری ہے جسے اللہ نے اور زیادہ بڑھا دیا اور جو جھوٹ وہ بولتے ہیں اس کی پاداش میں ان کے لئے دردناک سزا ہے۔ جب کبھی ان سے کہا گیا کہ زمین میں فساد برپا نہ کرو' تو انہوں نے یہی کہا کہ ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں۔ خبردار! حقیقت میں یہی لوگ مفسد ہیں مگر انہیں شعور نہیں ہے اور جب ان سے کہا گیا کہ جس طرح دوسرے لوگ ایمان لائے ہیں' اسی طرح تم بھی ایمان لے آؤ تو انہوں نے یہی جواب دیا کہ ہم بیوقوفوں کی طرح ایمان لائیں؟..... خبردار! حقیقت میں تو یہ خود بیوقوف ہیں' مگر یہ جانتے نہیں ہیں۔ جب یہ اہل ایمان سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ہیں' اور جب علیحدگی میں اپنے شیطانوں سے ملتے ہیں' تو کہتے ہیں کہ اصل میں تو ہم تمہارے ساتھ ہیں اور ان لوگوں سے محض مذاق کر رہے ہیں...... اللہ ان سے مذاق کر رہا ہے' وہ ان کی رسی دراز کئے جاتا ہے' اور یہ اپنی سرکشی میں اندھوں کی طرح بھٹکے چلے جاتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی خرید لی ہے' مگر یہ سودا ان کے لئے نفع بخش نہیں ہے اور یہ ہرگز صحیح راستے پر نہیں ہیں۔ ان کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص نے آگ روشن کی اور جب سارا ماحول چمک اٹھا تو اللہ نے ان کا نور بصارت سلب کر لیا اور انہیں اس حال پر چھوڑ دیا کہ تاریکیوں میں انہیں کچھ نظر نہیں آتا۔ یہ بہرے ہیں' گونگے ہیں' اندھے ہیں۔ یہ اب نہ پلٹیں گے یا پھر ان کی مثال یوں سمجھو کہ آسمان سے زور کی بارش ہو رہی ہے۔ اور اس کے ساتھ اندھیری گھٹا اور کڑک اور چمک بھی ہے۔ یہ بجلی کے کڑاکے سن کر اپنی جانوں کے خوف سے کانوں میں انگلیاں ٹھونسے لیتے ہیں اور اللہ ان منکرین حق کو ہر طرف سے گھیرے میں لئے ہوئے ہے۔ چمک سے ان کی حالت یہ ہو رہی ہے کہ گویا عنقریب بجلی ان کی بصارت اچک لے جائے گی۔ جب ذرا کچھ روشنی انہیں محسوس ہوتی ہے تو اس میں کچھ دور چل لیتے ہیں اور جب ان پر اندھیرا چھا جاتا ہے تو کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اللہ چاہتا تو ان کی سماعت اور بصارت بالکل ہی سلب کر لیتا یقیناً وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

مریض دل منافقین پر اس بھرپور وار کے دوران' ان کے شیاطین کی طرف اشارے ملتے ہیں۔ اس سورت کے سیاق و سباق اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کے واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مراد یہود ہیں۔ کیونکہ اس سورت میں ان کے کردار پر بھرپور تنقید کی گئی ہے۔ دعوت اسلامی کے بارے میں یہودیوں نے جو طرز عمل اختیار کیا اس کا خلاصہ یہ ہے کہ مدینہ طیبہ میں یہود وہ پہلا طبقہ تھا جس نے تحریک اسلامی سے ٹکر لی اور اس ٹکراؤ اور تصادم کے متعدد اسباب تھے۔ وہ اوس خزرج جیسی امی اقوام کے مقابلے میں' اہل کتاب ہونے کی وجہ سے ایک ممتاز مقام رکھتے تھے۔ مشرکین عرب میں اگرچہ مذہب یہود کی طرف کم میلان پایا جاتا تھا لیکن وہ آسمانی کتاب و ہدایت رکھنے کی وجہ سے یہودیوں کے لئے مفید مطلب تھیں۔ فتنہ و فساد اور تشتت و افتراق وہ میدان ہے جس میں یہودی زیادہ چابکدستی سے کام کرتے ہیں' لیکن جب اسلام آیا تو یہودیوں کے ان تمام مفادات پر زد پڑی۔ وہ ایک ایسی کتاب لے کر آیا جو سابقہ کتب کی تصدیق کرتی تھی اور ان کی تعلیمات کی محافظ تھی۔ پھر اسلام نے اوس اور خزرج کے اختلافات کو بھی ختم کر دیا' جن کے ذریعے یہودی اپنے مکر و فریب کا جال بچھاتے تھے اور مالی مفادات حاصل کرتے تھے۔ اوس اور خزرج کے باہم دست و گریبان لوگ اسلامی صفوں میں آکر ایک دوسرے سے گلے مل گئے اور اوس و خزرج کے بجائے وہ دونوں مہاجرین کی نصرت کی وجہ سے انصار کہلانے لگے۔ اور ان سب عناصر کو ملا کر اسلام نے وہ بے نظیر اور نیا اسلامی معاشرہ تیار کیا جس کے تمام افراد متحد اور متفق تھے' یوں کہ گویا وہ تمام ایک ہی جسم کے مختلف اعضاء ہیں اور جس کی مثال نہ اس سے پہلے کبھی تاریخ میں پائی گئی اور نہ اس کے بعد آج تک کہیں وجود میں آسکی۔

یہودی اپنے آپ کو اللہ کی مختار اور برگزیدہ قوم سمجھتے تھے۔ ان میں بے شمار رسول اور نبی مبعوث ہوئے تھے اور وہ متعدد کتابوں کے حامل تھے۔ وہ ہمیشہ اس کی توقع رکھتے تھے اور شدت سے منتظر بھی تھے کہ نبی آخر الزماں خود ان کے ہاں سے مبعوث ہو گا لیکن جب وہ عربوں سے مبعوث ہوا تو پھر انہوں نے یہ توقعات باندھ لیں کہ شاید نیا نبی ان کو اپنے دائرہ دعوت سے باہر رکھے گا اور اپنی دعوت کو ان پڑھ عربوں تک ہی محدود رکھے گا۔ لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ وہ سب سے پہلے اہل کتاب کو اللہ کی اس آخری کتاب کی طرف دعوت دے رہا ہے اور اس بات پر وہ دلیل یہ پیش کرتا ہے کہ وہ عربوں کی نسبت زیادہ ذی علم ہیں اور ان کا یہ فرض ہے کہ وہ مشرکین سے بھی پہلے اس دعوت حق پر لبیک کہیں تو ان کے غرور نفس نے انہیں نافرمانی پر آمادہ کر لیا اور انہوں نے اسے اپنے لئے اہانت سمجھا اور اپنے مذہب کے خلاف اس نئی دعوت کو دست درازی تصور کرنے لگے۔

اب یہودی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف شدید حسد و بغض میں مبتلا ہو گئے۔ ایک تو اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی آخر الزماں کے منصب کے لئے آپ کو منتخب فرمایا اور آپ کو کتاب دی جس کی صداقت میں یہودیوں کو ذرہ بھر شبہ نہ تھا۔ دوسرے اس لئے کہ ظہور نبوت کے ساتھ ساتھ آپ کو اس نئے ماحول میں برق رفتار کامیابی حاصل ہو گئی' ان اسباب کے علاوہ اس حسد و بغض 'تحریک اسلامی سے عداوت اور اس کے خلاف ہر قسم کے اوچھے ہتھیار استعمال کرنے کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ یہودی اس بات کا پختہ شعور رکھتے تھے کہ نئے حالات میں یا تو انہیں اس نئے معاشرے سے پوری طرح کٹ جانا ہو گا اور اس صورت میں ان کی فکری قیادت' تجارت اور سودی کاروبار کے تمام مفادات ختم ہو جائیں گے اور یا پھر انہیں پوری طرح اس نئے معاشرے میں ضم ہو کر گم ہو جانا ہو گا اور یہ دونوں گولیاں ایسی ہیں کہ جو کسی قیمت پر بھی' ایک یہودی کے حلق سے نہیں اتر سکتیں۔

یہ تھے وہ وجوہات جن کی بنا پر یہودان مدینہ نے تحریک اسلامی کے مقابلے میں وہ سخت رویہ اختیار کیا' جس کی تفصیل سورۂ بقرہ اور دوسری سورتوں میں بیان کی گئی ہے۔ ہم یہاں ایسی چند آیات نقل کر رہے ہیں جن میں اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

بنی اسرائیل کے بارے میں کچھ کہنے سے پہلے' قرآن انہیں ان الفاظ سے پکارتا ہے اور ایمان کی دعوت دیتا ہے۔

"اے بنی اسرائیل! ذرا خیال کرو اس نعمت کا' جو میں نے تم کو عطا کی تھی' میرے ساتھ تمہارا جو عہد تھا اسے پورا کرو' تو میرا جو عہد تمہارے ساتھ ہے اسے میں پورا کروں' اور مجھ ہی سے ڈرو' اور میں نے جو کتاب بھیجی ہے' اس پر ایمان لاؤ۔ یہ اس کتاب کی تائید میں ہے' جو تمہارے پاس پہلے سے موجود تھی' لہٰذا سب سے پہلے تم ہی اس کے منکر نہ بن جاؤ۔ تھوڑی قیمت پر میری آیات کو نہ بیچ ڈالو۔ اور میرے غضب سے بچو! باطل کا رنگ چڑھا کر حق کو مشتبہ نہ بناؤ اور نہ جانتے بوجھتے حق کو چھپانے کی کوشش کرو' نماز قائم کرو زکوٰۃ دو' اور جو لوگ میرے آگے جھک رہے ہیں' ان کے ساتھ تم بھی جھک جاؤ' تم دوسروں کو تو نیکی کا راستہ اختیار کرنے کے لئے کہتے ہو مگر اپنے آپ کو بھول جاتے ہو' حالانکہ تم کتاب کی تلاوت کرتے ہو؟ کیا تم عقل سے بالکل ہی کام نہیں لیتے؟"

ایک دوسری جگہ تفصیل سے وہ رویہ اور طرز عمل بیان کیا گیا ہے جو بنی اسرائیل نے اپنے رسول حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ اختیار کیا تھا کہ کس طرح انہوں نے اللہ تعالیٰ کے انعامات کا کفران کیا۔ کس طرح انہوں نے کتاب اللہ اور شریعت کے بارے میں بے عملی کا مظاہرہ کیا اور بار بار اللہ تعالیٰ کے ساتھ کئے ہوئے وعدوں کو توڑا۔ یہ کچھ بالتفصیل بیان کر کے قرآن مجید مسلمانوں کو متنبہ کرتا ہے۔

اے مسلمانو! اب کیا ان لوگوں سے تم یہ توقع رکھتے ہو کہ یہ تمہاری دعوت پر ایمان لے آئیں گے؟ حالانکہ ان میں سے ایک گروہ کا شیوہ یہ رہا ہے کہ اللہ کا کلام سنا اور پھر خوب سمجھ بوجھ کر دانستہ اس میں تحریف کی۔ محمد رسول اللہ کو ماننے والوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم بھی انہیں مانتے ہیں اور جب آپس میں ایک دوسرے سے تخلیے کی بات چیت ہوتی ہے تو کہتے ہیں کہ بیوقوف ہو گئے ہو؟ ان لوگوں کو وہ

باتیں بتاتے ہو' جو اللہ نے تم پر کھولی ہیں تاکہ تمہارے رب کے پاس تمہارے مقابلے میں انہیں حجت میں پیش کریں۔" (۲-۷۶)

"وہ کہتے ہیں کہ دوزخ کی آگ ہمیں ہرگز چھونے والی نہیں ہے۔ الا یہ کہ چند روز کی سزا مل جائے' تو مل جائے ان سے پوچھو' کیا تم نے اللہ سے کوئی عہد لے لیا ہے' جس کی خلاف ورزی وہ نہیں کر سکتا؟ یا یہ بات ہے کہ تم اللہ کے ذمے ڈال کر ایسی بات کہہ دیتے ہو' جن کے متعلق تمہیں علم نہیں ہے کہ اس نے ان کا ذمہ لیا ہے۔" (۲-۸۰)

"اور اب جو ایک کتاب اللہ کی طرف سے ان کے پاس آئی ہے' اس کے ساتھ ان کا کیا برتاؤ ہے؟ باوجودیکہ وہ اس کتاب کی تصدیق کرتی ہے جو ان کے پاس پہلے سے موجود تھی' باوجودیکہ اس کی آمد سے قبل وہ خود کفار کے مقابلے میں فتح و نصرت کی دعائیں مانگا کرتے تھے' مگر جب وہ چیز آگئی' جسے وہ پہچان بھی گئے' تو انہوں نے اسے ماننے سے انکار کر دیا۔ خدا کی لعنت ان منکرین پر۔" (۲-۸۹)

"جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جو کچھ اللہ نے نازل کیا ہے' اس پر ایمان لاؤ تو کہتے ہیں "ہم تو صرف اس چیز پر ایمان لاتے ہیں جو ہمارے ہاں یعنی نسل بنی اسرائیل میں اتری ہے۔ اس دائرے کے باہر جو کچھ آیا ہے اسے ماننے سے وہ انکار کرتے ہیں' حالانکہ وہ حق ہے اور اس تعلیم کی تصدیق و تائید کر رہا ہے' جو ان کے پاس پہلے سے موجود ہے۔" (۲-۹۱)

"اور جب ان کے پاس اللہ کی طرف سے کوئی رسول اس کتاب کی تصدیق و تائید کرتا ہوا آیا' جو ان کے ہاں پہلے سے موجود تھی' تو ان اہل کتاب میں سے ایک گروہ نے کتاب اللہ کو' اس طرح پس پشت ڈالا گویا کہ وہ کچھ جانتے ہی نہیں۔" (۲-۱۰۱)

"یہ لوگ جنہوں نے دعوت حق کو قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے خواہ اہل کتاب میں سے ہوں یا مشرک ہوں' ہرگز یہ پسند نہیں کرتے کہ تمہارے رب کی طرف سے تم پر کوئی بھلائی نازل ہو۔" (۲-۱۰۵)

"اہل کتاب میں سے اکثر لوگ یہ چاہتے ہیں کہ کسی طرح تمہیں ایمان سے پھیر کر پھر کفر کی طرف پلٹا لے جائیں۔ اگرچہ حق ان پر ظاہر ہو چکا مگر اپنے نفس کی حسد کی بنا پر تمہارے لئے ان کی یہ خواہش ہے۔" (۲-۱۰۹)

"ان کا کہنا ہے کہ کوئی شخص جنت میں نہ جائے گا جب تک وہ یہودی نہ ہو یا (عیسائیوں کے خیال کے مطابق) عیسائی نہ ہو یہ ان کی تمنائیں ہیں۔" (۲-۱۱۱)

"یہودی اور عیسائی تم سے ہرگز راضی نہ ہوں گے' جب تک تم ان کے طریقے پر نہ چلنے لگو۔" (۲-۱۲۰)

یہ قرآن مجید کا زندہ جاوید معجزہ ہے کہ قرآن نے ان یہودیوں کو جس صفت سے موصوف کیا وہ صفت آج تک ان کے ساتھ چپکی ہوئی ہے اور یہ صفت ہے جو ان کی ہر نسل میں ان کے ساتھ لازم رہی ہے۔ خواہ وہ نسل قبل اسلام گزری ہو یا اسلام کے بعد آج تک کسی دور میں رہی ہو۔ قرآن کریم ان کو یوں خطاب کرتا ہے کہ گویا یہودان یثرب بذات خود حضرت موسیٰ اور آپ کے بعد آنے والے انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے ادوار میں موجود تھے۔ کیونکہ اول روز سے بنی اسرائیل کی یہی فطرت رہی ہے۔ ان کے اوصاف وہی ہیں۔ ان کا طرز عمل وہی ہے اور حق و صداقت کے ساتھ وہ ہر دور اور ہر زمانے میں ایک ہی برتاؤ کرتے چلے آئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دوران کلام قوم موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بعد آنے والی اسرائیلی نسلوں کی طرف بھی اشارے ملتے ہیں۔ اور قرآن مجید کے یہ زندہ کلمات آج بھی امت مسلمہ اور یہودیوں کے باہم تعلق اور موقف کو ظاہر کر رہے ہیں اور بتا رہے ہیں کہ یہودی دعوت اسلامی اور امت مسلمہ کے مقابلے میں آج بھی وہی طرز عمل اختیار کر رہے ہیں جو انہوں نے آج سے صدیوں قبل اختیار کیا اور یہی ان کا طرز عمل مستقبل میں بھی ہو گا۔ یہ قرآنی آیات اس وقت امت مسلمہ کے لئے ایک دائمی ہدایت اور تنبیہ کی حیثیت رکھتی تھیں اور آج بھی وہ یہی بتا رہی ہیں کہ اعداء اسلام نے ہمارے اسلاف کے ساتھ جو رویہ روا رکھا تھا وہی پالیسی وہ آج بھی اختیار کریں گے۔ آج بھی ان کی ریشہ دوانیاں اور

مکروفریب ویسے ہی ہیں جیسے یثرب میں تھے۔ وہ ہر دور میں اسلام کے خلاف مختلف اور متنوع طریقوں سے برسرپیکار رہے۔ لیکن اس جنگ کی حقیقت صرف ایک رہی یعنی اسلام دشمنی۔

غرض اس صورت میں جہاں یہودیوں کے یہ اوصاف بیان ہوئے ہیں اور مسلمانوں کو ان کی سازشوں سے متنبہ کیا گیا' وہاں اسلامی جماعت کی تشکیل اور اس دنیا میں اسلامی نظریۂ حیات کی امانت کی ذمہ داریاں اٹھانے کے لئے' اسے تیار کرنے اور اس کی تربیت کرنے کے طریقے بھی بتائے گئے ہیں' جبکہ بنی اسرائیل ایک زمانے سے اس امانت کی ذمہ داریاں پوری کرنے میں ناکام ہو چکے تھے اور آخر میں انہوں نے اس نظریۂ حیات کے بارے میں یہ معاندانہ رویہ تک اختیار کر لیا تھا۔

جیسا کہ ہم پہلے کہہ آئے ہیں سورت کا آغاز ان طبقات کے ذکر سے ہوتا ہے جنہوں نے ہجرت کے متصلا بعد تحریک اسلامی کے بارے میں مختلف طرزہائے عمل اختیار کر رکھے تھے۔ ان طبقات میں شیاطین بنی اسرائیل کی طرف مخصوص اشارے بھی تھے۔ جن کا ذکر بعد میں مفصل ہوا۔ اس سورت کے آغاز میں جن طبقات کا ذکر ہوا ہے ان کی نوعیت ایسی ہے کہ ہر دور اور ہر زمانے میں دعوت اسلامی کے مقابلے میں لوگوں نے ایسے ہی طرز عمل اختیار کئے۔ اس کے بعد پوری سورت کے مباحث اپنے انہی متوازی خطوط پر چل رہے ہیں جن میں اس وحدت و یگانگت کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ جس سے اس سورت کی خاص شخصیت کا ظہور ہو رہا ہے' حالانکہ اس کے موضوعات سخن میں کافی تنوع پایا جاتا ہے۔

کافرین اور منافقین کے تین طبقات کے ذکر اور شیاطین یہود کی طرف اشارات کے بعد اب تمام انسانوں کو دعوت دی جاتی ہے کہ وہ صرف ایک اللہ کی بندگی کریں اور اللہ نے اپنے بندے پر جو کتاب نازل کی ہے' اس پر ایمان لے آئیں۔ کافروں کو چیلنج دیا جاتا ہے کہ اگر وہ کتاب کی صداقت میں شک کرتے ہیں تو پھر اس جیسی کوئی ایک سورت لے آئیں' کافروں کو آگ سے ڈرایا جاتا ہے اور مومنین کو جنتوں کی خوشخبری دی جاتی ہے۔ اس کے بعد کافروں کو غور و فکر کی دعوت دی جاتی ہے اور متعجبانہ انداز میں ان کے کفر کی تردید کی جاتی ہے۔

"تم اللہ کے ساتھ کفر کا رویہ کیسے اختیار کرتے ہو؟ حالانکہ تم بے جان تھے' اس نے تمہیں زندگی عطا کی' پھر اسی کی طرف تمہیں پلٹ کر جانا ہے۔ وہی تو ہے جس نے تمہارے لئے زمین کی ساری چیزیں پیدا کیں۔ پھر اوپر کی طرف توجہ فرمائی اور سات آسمان استوار کئے اور وہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔" (۲-۲۹)

اس حقیقت کی طرف اشارے کے بعد' کہ زمین کی تمام مخلوقات کو انسانوں کے لئے پیدا کیا گیا ہے' حضرت آدم علیہ السلام کی خلافت فی الارض کا بیان شروع ہو جاتا ہے۔

"پھر ذرا اس وقت کا تصور کرو' جب اس کے رب نے فرشتوں سے کہا تھا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔" اس کے بعد قصے کی تفصیلات بیان ہوتی ہیں۔ آدم و ابلیس کا معرکہ پیش آتا ہے اور آخر کار حضرت آدم علیہ السلام کا نزول ہوتا ہے اور زمین کے اندر "عہد خلافت آدم" کا آغاز ہوتا ہے۔ جو دراصل دور ایمان ہے۔

ہم نے کہا "تم سب یہاں سے اتر جاؤ۔ پھر جو میری طرف سے کوئی ہدایت تمہارے پاس پہنچے تو یہ لوگ میری اس ہدایت کی پیروی کریں گے' ان کے لئے کسی خوف اور رنج کا موقع نہ ہو گا اور جو اس کو قبول کرنے سے انکار کریں گے اور ہماری آیات کو جھٹلائیں گے' وہ آگ میں جانے والے لوگ ہیں' جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔" (۲-۳۹)

اس کے بعد بنی اسرائیل کی تاریخ پر طویل ترین تبصرہ شروع ہوتا ہے جس کے چند فقرے ہم اس سے پہلے نقل کر آئے ہیں۔ اس تبصرے اور تنقید کے درمیان جگہ جگہ انہیں دعوت دی جاتی ہے کہ وہ اسلامی نظام حیات کو اپنا لیں اور اس کتاب پر ایمان لے آئیں جو ان

کتابوں کی تصدیق کر رہی ہے جن کے حامل خود وہ ہیں۔ ساتھ ساتھ انہیں یہ تنبیہہ کی جارہی ہے کہ انہوں نے کیا کیا کوتاہیاں کیں۔ کس طرح وہ راہ راست سے بھٹکتے رہے اور حق و باطل کی آمیزش کرتے رہے۔ بنی اسرائیل کے ساتھ بحث و تمحیص قرآن مجید کے پہلے پارے کے آخر تک پھیلی ہوئی ہے۔

اس پوری بحث سے اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ بنی اسرائیل نے دین اسلام' نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن مجید کا استقبال کس طرح کیا۔ سب سے پہلے انہوں نے کفر کا رویہ اختیار کیا۔ انہوں نے حق و باطل کی تلبیس کی' وہ دوسرے لوگوں کو تو یہ مشورہ دیتے کہ وہ ایمان لے آئیں لیکن خود اپنے آپ کو بھول جاتے۔ وہ کلام اللہ سنتے' اچھی طرح سمجھتے لیکن اس کے بعد اس کو غلط معانی پہنا کر جھوٹا پروپیگنڈا کرتے۔ وہ پہلے ایمان کا اظہار کرتے اور پھر کفر کا اعلان کر کے مومنین صادقین کو دھوکہ دینے کی کوشش کرتے اور جب آپس میں اکٹھے ہوتے تو ایک دوسرے کو بتاکید یہ کہتے کہ 'خبردار! وہ راز کی باتیں مسلمانوں کو نہ بتانا' جو حضرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں کتب سابقہ میں وارد ہیں اور جنہیں انہوں نے چھپا رکھا تھا۔ انہوں نے کوششیں کیں کہ کسی طرح مومنین کو دوبارہ کفر کی روش پر مجبور کر دیں۔ وہ یہ دعویٰ کرتے تھے کہ صحیح اہل ہدایت ہیں ہی یہود۔ جیسا کہ نصرانیوں کا یہ خیال تھا کہ روئے زمین پر اہل ہدایت صرف وہ ہیں۔ وہ حضرت جبرائیل علیہ السلام کے محض اس لئے دشمن ہو گئے تھے کہ بقول ان کے انہوں نے ان کو چھوڑ کر پیغام خداوندی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچا دیا۔ وہ مسلمانوں کی ہر کامیابی پر متغیض ہو جاتے اور ان کی بربادی کے منتظر رہتے' وہ ہر لحظہ یہ کوشش کرتے کہ وحی الٰہی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام و اوامر میں شک پیدا کیا جائے' اور تحویل قبلے کے موقع پر تو ان کے پروپیگنڈے کی تو کوئی انتہا نہ رہی۔ منافقین کے ساتھ مسلسل ربط ضبط رکھتے تھے اور ہر وقت ان کی راہنمائی کرتے تھے اور مشرکین کی حوصلہ افزائی کھل کر کرتے تھے۔

یہی وجہ ہے کہ اس سورت میں ان کے کردار پر سخت ترین تنقید پائی جاتی ہے اور سورت انہیں یاد دلاتی ہے کہ انہوں نے یہی طرز عمل خود اپنے نبی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابلے میں اختیار کیا تھا اور آپ کے بعد بھی انبیاء و رسل کے ساتھ یہ لوگ ایسا سلوک کرتے رہے۔ نسلوں تک ان کا رویہ یہی رہا۔ قرآن کریم انہیں اس طرح مخاطب کرتا ہے کہ بنی اسرائیل جہاں اور جس دور میں بھی ہوں گویا وہ ایک ہی گروہ ہے کیونکہ وہ ایک ہی فطرت اور جبلت رکھتے ہیں جس میں کبھی بھی تبدیلی نہیں ہوتی۔

اس طویل ترین تنقید کے آخر میں مسلمانوں کو بنی اسرائیل کے ایمان سے مایوس کر دیا جاتا ہے کیونکہ ان کی یہ خود غرضانہ ذہنیت اور مطلب پرستی اور سڑی ہوئی اور خبیث طبیعت ان کے ایمان کی راہ میں رکاوٹ ہے اور بالآخر یہ تقریر ان کے اس دعوے کی تردید پر ختم ہوتی ہے کہ "صرف وہی ہدایت پر ہیں کیونکہ وہی حضرت ابراہیم ؑ کے وارث ہیں" اور بتایا جاتا ہے حضرت ابراہیم ؑ کے صحیح وارث وہی لوگ ہیں جو سنت ابراہیمی پر چلتے ہیں اور اس عہد کی پابندی کرتے ہیں جو حضرت ابراہیم ؑ نے اپنے رب کے ساتھ باندھا تھا للذا حضرت ابراہیم ؑ کی وراثت اور جانشینی گویا اب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور مومنین کو حاصل ہو گئی ہے کیونکہ یہودی راہ راست سے بھٹک گئے' اپنے دین کو تبدیل کر دیا اور اب وہ اسلامی نظریۂ حیات کی امانت کی حفاظت کے اہل اور اس زمین پر منصب خلافت الٰہی کے قابل نہیں رہے للذا یہ ذمہ داری اب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ پر ایمان لانے والوں نے اپنے کاندھوں پر لے لی۔ خانہ کعبہ کی بنیادیں اٹھاتے وقت حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام نے جو دعا کی تھی امت مسلمہ کا برپا ہونا گویا اس دعا کی قبولیت کا مجسم ظہور تھا' انہوں نے کہا تھا:

"اے رب ہم دونوں کو اپنا مطیع بنا' ہماری نسل سے ایک ایسی امت اٹھا' جو تیری مسلم ہو' ہمیں اپنی عبادت کے طریقے بتا اور ہماری

کوتاہیوں سے درگزر فرما تو بڑا معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے اور اے رب ان لوگوں میں خود انہی کی قوم سے ایک ایسا رسول اٹھائیو جو انہیں تیری آیات سنائے اور ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دے اور ان کی زندگیاں سنوار دے۔ تو بڑا مقتدر اور حکیم ہے۔" (۲۔۱۲۹)

اب یہاں سے قرآن مجید کا خطاب اور روئے سخن نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے گرد جمع ہونے والی جماعت مسلمہ کی طرف پھر جاتا ہے اور وہ اصول و قواعد بیان کئے جاتے ہیں جن پر اس نئی جماعت کی تشکیل ہوئی ہے جو دعوت دین کا کام لے کر اٹھی ہے اور یہ بیان کیا جاتا ہے کہ اس جماعت کا ایک خاص مزاج ہے اور نظریہ و عمل میں وہ ایک مخصوص زاویہ نگاہ رکھتی ہے۔

امت مسلمہ کی خصوصیات کا بیان تحویل قبلہ سے شروع ہوتا ہے۔ وہ سمت متعین ہو جاتی ہے جس کی طرف امت مسلمہ کو متوجہ ہونا ہے۔ یہ نیا قبلہ بیت الحرام ہے جو حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام نے اللہ کے خاص احکامات کے تحت تعمیر کیا تھا۔ اللہ نے انہیں حکم دیا تھا کہ وہ اسے تعمیر کریں اور پاک و صاف کریں تاکہ وہاں صرف ایک اللہ تعالیٰ کی پرستش کی جائے۔ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خواہش بھی یہی تھی کہ قبلہ بدل دیا جائے لیکن آپ نے کبھی اس کا اظہار نہ کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"یہ تمہارے منہ کا بار بار آسمان کی طرف اٹھنا ہم دیکھ رہے ہیں۔ لو ہم اس قبلے کی طرف تمہیں پھیرے دیتے ہیں جسے تم پسند کرتے ہو۔ مسجد حرام کی طرف رخ پھیر دو اب جہاں کہیں تم ہو اس طرف منہ کر کے نماز پڑھا کرو۔" (۲۔۱۴۴)

اس کے بعد اسلامی نظام حیات کی تفصیلات بیان کی جاتی ہیں جس پر اس جماعت نے عمل پیرا ہونا ہے۔ نظریۂ حیات اور طریق عبادت اور سلوک و معاملات کا بیان شروع ہو جاتا ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ راہ حق میں جو لوگ جانیں دیتے ہیں انہیں مردہ نہ سمجھو وہ تو زندہ جاوید ہیں۔ بتایا جاتا ہے کہ اللہ کی راہ میں خوف، بھوک، مالی نقصانات، جانی نقصانات، فصلوں اور پھلوں کی تباہی جیسی ابتلائیں محض اذیتیں نہیں ہوتیں بلکہ وہ آزمائشیں ہوتی ہیں۔ اور یہ ہمیشہ ان لوگوں کی راہ میں آتی ہیں جو دعوت حق کو لے کر اٹھتے ہیں۔ تنبیہ کی جاتی ہے کہ حق و باطل کی کشمکش میں شیطان تمہیں فقر و مسکنت سے ڈراتا ہے اور فحاشی اور بے حیائی پر آمادہ کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کا وعدہ تم سے یہ ہوتا ہے کہ وہ تمہیں بخش دے گا۔ اور تمہیں اپنے فضل سے نوازے گا۔ یہ کہ اللہ تعالیٰ مومنین کا والی اور مددگار ہے اور وہ انہیں اندھیروں سے روشنی کی طرف نکالتا ہے اور کافروں کے والی طاغوت ہیں جو انہیں روشنی سے نکال کر اندھیروں میں پھینک دیتے ہیں۔ اس کے بعد کھانے پینے کی چیزوں میں حلال و حرام احکامات بیان کئے جاتے ہیں۔ بتایا جاتا ہے کہ نیکی کی حقیقت کیا ہے۔ صرف ظاہری شکل و صورت ہی کو دیکھ کر نیک و بد کا فیصلہ نہ کرنا چاہئے۔ پھر قتل میں قصاص کے احکام، وصیت کے احکام، روزے کے احکام، جہاد کے احکام، حج کے احکام اور نکاح و طلاق کے احکام بیان کئے جاتے ہیں۔ اسلام کے عائلی نظام کی دقیق شیرازہ بندی کی جاتی ہے۔ اور نظام معیشت میں زکوٰۃ، ربا کی حرمت، لین دین اور تجارت کے احکامات بیان ہوتے ہیں۔

۵۔ ان تمام موضوعات پر بحث کرتے ہوئے دوران گفتگو، موقع و محل کی مناسبت سے، موسیٰ علیہ السلام کے بعد بنی اسرائیل کے حالات کی طرف اشارہ بھی کیا جاتا ہے۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زندگی کے کچھ پہلو بھی بیان ہوتے ہیں۔ لیکن پہلے پارے کے بعد پوری سورت میں روئے سخن مستقلاً اسلامی جماعت کی طرف پھر جاتا ہے۔ اسے اسلامی نظام حیات کی ذمہ داریوں کو اٹھانے اور اللہ کی شریعت کے مطابق، زمین میں نظام خلافت کے قیام کی ذمہ داریوں کے لئے تیار کیا جاتا ہے اور اس طرح امت مسلمہ کو تمام دوسری امتوں سے ممتاز کر دیا جاتا ہے۔ کیونکہ یہ امت خود اس کائنات اور رب کائنات (جس نے اس امت کو اس عظیم منصب کے لئے چنا) کے درمیان ربط و تعلق کی نوعیت کے بارے میں ایک مخصوص نقطۂ نظر رکھتی ہے۔

سورت کے آخر میں پہنچ کر ہم دیکھتے ہیں کہ کلام کے خاتمے میں سورت کے ابتدائیہ کو دہرایا جاتا ہے۔ ایمانی نظریۂ حیات کی حقیقت کی وضاحت ہوتی ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ امت مسلمہ تمام انبیاء پر ایمان رکھتی ہے۔ نیز تمام کتب سماوی پر اس کا ایمان ہے اور وہ انبیاء کے بیان کردہ امور غیبیہ پر بھی یقین رکھتی ہے اور انبیاء کی تعلیمات کو مانتی ہے اور دل و جان سے مطیع فرمان ہے۔ فرمایا جاتا ہے:

"رسول اس ہدایت پر ایمان لایا ہے جو اس کے رب سے اس پر نازل ہوئی ہے اور جو لوگ اس رسول اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں کو مانتے ہیں۔ اور ان کا قول یہ ہے کہ "ہم اللہ کے رسولوں کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کرتے' ہم نے سنا اور اطاعت قبول کی۔ مالک! تجھ سے خطابخشی کے طالب ہیں اور ہمیں تیری ہی طرف پلٹنا ہے۔ اللہ کسی متنفس پر' اس کی مقدرت سے بڑھ کر ذمہ داری کا بوجھ نہیں ڈالتا۔ ہر شخص نے جو نیکی کمائی ہے' اس کا پھل اس کے لئے ہے اور جو بدی سمیٹی ہے اس کا وبال اسی پر ہے۔ (ایمان لانے والو! تم یوں دعا کیا کرو) اے ہمارے رب! ہم سے بھول چوک میں جو قصور ہو جائیں' ان پر گرفت نہ کر۔ مالک! ہم پر وہ بوجھ نہ ڈال جو ہم سے پہلے لوگوں پہ ڈالے تھے۔ پروردگار! جس بار کو اٹھانے کی طاقت ہم میں نہیں ہے' وہ ہم پر نہ رکھ۔ ہمارے ساتھ نرمی کر' ہم سے درگذر فرما' ہم پر رحم کر' تو ہمارا مولیٰ ہے' کافروں کے مقابلے میں ہماری مدد کر۔"

اسی طرح آغاز و انجام کے درمیان پوری یک رنگی پائی جاتی ہے اور سورت کے تمام موضوعات سخن مومنین صادقین کی صفات اور خصوصیات کے ان دو بیانوں کے درمیان سمٹ جاتے ہیں۔

☆ ☆ ☆

درس ۲ ایک نظر میں

(۱) آیات کا یہ حصہ 'اس عظیم سورت کا افتتاحیہ ہے 'اس میں یہودیوں کے سوا 'ان تمام عناصر (Pressure Groups) سے ہم متعارف ہو جاتے ہیں 'جن کا مقابلہ مدینہ طیبہ میں تحریک اسلامی کو کرنا پڑا۔ اس میں یہودیوں کی طرف ایک مختصر سا اشارہ پایا جاتا ہے۔ قرآن انہیں منافقین کو "شیاطین" کا لقب دیتا ہے' یہ لفظ ہی ان کی بیشتر صفات کو ظاہر کر دیتا ہے۔ اور بتا دیتا ہے کہ تحریک اسلامی کی مخالفت میں ان کا کیا کردار رہا۔ اگرچہ یہ اشارہ مختصر ہے لیکن ابتدا میں ان کی حقیقت کے اظہار کے لئے کافی ہے۔ بعد میں ان کے کردار پر تفصیلی تبصرہ ہوتا ہے۔

(۲) ان خصوصیات کی نقشہ کشی کے دوران ہم قرآن مجید کی تعبیری خصوصیات (Style of expression) سے بھی متعارف ہوتے ہیں۔ منظر کشی کے لئے خطوط والوان کی جگہ یہاں حسین الفاظ کا انتخاب پایا جاتا ہے۔ ان الفاظ کو پڑھتے ہی اصل مناظر آنکھوں کے سامنے جلوہ گر ہو جاتے ہیں۔ یہ مناظر اور یہ تصورات بڑی تیزی سے حرکت پذیر ہوتے ہیں اور زندگی کی تگ و تاز سے بھرپور نظر آتے ہیں۔

(۳) سورت کے آغاز ہی میں ہلکے پھلکے 'عام فہم اور مختصر الفاظ میں تین قسم کے انسانوں کی عجیب تصویر کشی کی گئی ہے۔ ان میں سے ہر نوع ایسی ہے کہ انسانی افراد اور مجموعوں کی ایک عظیم الشان تعداد کا زندۂ جاوید نمونہ ہے۔ یہ مجموعے حد درجہ حقیقی اور گہرے ہیں اور ہر زمان و مکان میں بار بار وجود میں آتے ہیں اور قرآن کریم کے اعجاز کا یہ ایک خاص پہلو ہے کہ انسانیت کی طویل ترین تاریخ میں روز اول سے لے کر آج تک پوری انسانیت انہی تین گروہوں میں منقسم نظر آتی ہے۔

(۴) ان مختصر کلمات اور معدودے چند جملوں کے ذریعہ' ان طبقوں کے حقیقی خدوخال اس طرح واضح اور مکمل صورت میں لوح دماغ پر منقش ہو جاتے ہیں کہ یہ طبقے زندہ و متحرک 'ممتاز و مشخص اور اپنے حقیقی خدوخال کے ساتھ ساتھ صاف صاف آنکھوں کے سامنے چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ یہ بے ساختہ جملے اس قدر موزوں اور متناسب اور اپنے اندر اس قدر مترنم صوتی ہم آہنگی رکھتے ہیں کہ کوئی طویل ترین کلام اور کوئی مفصل ترین بیان بھی اس کی گرد تک نہیں پہنچ سکتا۔

(۵) جب ان طبقوں کی یہ منظر کشی ختم ہو جاتی ہے تو پھر قرآن کریم تمام بنی نوع انسان کو یہ دعوت دیتا ہے کہ وہ پہلے طبقے میں شامل ہوں۔ وہ انہیں پکارتا ہے کہ ایک خدا ایک خالق اور ایک رازق کی بندگی اور غلامی کی طرف لوٹ آئیں' جس کے ساتھ کوئی شریک نہیں اور اس کا کوئی ہمسر نہیں۔ اس کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت اور رسالت اور آپ پر نزول قرآن کے بارے میں جو لوگ متشکک ہیں انہیں چیلنج دیا جاتا ہے کہ وہ ایسی ایک سورت تو بنا لائیں۔ اگر وہ اس چیلنج کو قبول نہیں کر سکتے تو پھر دردناک اور خوفناک عذاب کے لئے تیار ہو جائیں۔ اس کے برعکس مومنین اور متقین کو خوشخبری دی جاتی ہے کہ ان کے لئے نہ ختم ہونے والا انعام و اکرام ہے۔ اور الفاظ کے آئینے میں اس کی جھلک بھی دکھا دی جاتی ہے۔

(۶) اس کے بعد پھر یہود و منافقین کی فتنہ پردازی کا جائزہ لیا جاتا ہے جو یہ کہتے تھے کہ قرآن کریم میں چھوٹی چھوٹی چیزوں کو تمثیلات دی گئی ہیں۔ لہٰذا یہ منزل کتاب نہیں ہے۔ انہوں نے اس مسئلے کو آڑ بنا کر شکوک و شبہات پھیلانے کا ایک وسیع کاروبار شروع کر دیا تھا۔ ان کو بتایا گیا کہ یہ مثالیں گہری حکمت پر مبنی ہیں اور یہ کہ انہیں پڑھ کر ایک شخص گمراہ بھی ہو سکتا ہے جیسا کہ وہ ہوئے اور دوسری طرف ان سے مومنین کا گروہ ایمان میں اور پختہ ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد ان پر نکیر کی جاتی ہے کہ وہ اس

خالق و مدبر' علیم و بصیر اور جلانے والے اور مارنے والے کا انکار کیوں کر کرتے ہیں؟ حالانکہ وہی تو ہے جس نے انسانوں کے لئے اس پوری کائنات کو پیدا کیا' انہیں یہاں یہ طویل و عریض مملکت دے کر اپنا خلیفہ و مختار بنایا اور انہیں بے شمار انعامات و اکرامات سے نوازا۔

(۷) بقرہ کا یہ پہلا درس جن اساسی خطوط پر آگے بڑھتا ہے یہ ان کا اجمالی بیان ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس اجمالی نظر کے بعد آیات و کلمات کی قدرے مفصل تشریح کر دی جائے۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

سُوْرَةُ الْبَقَرَة (٢) مَدَنِيَّةٌ (٨٧) اٰيَاتُهَا (٢٨٦) رُكُوْعَاتُهَا (٤٠)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الٓمّٓ (١) ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ (٢) الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ (٣) وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ (٤) اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ ۗ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿٥﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿٦﴾ خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ ؕ وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ۫ وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿٧﴾ ع ١

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿٨﴾ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ﴿٩﴾ فِىْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ ۙ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۢ ۙ بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ ﴿١٠﴾ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِى الْاَرْضِ ۙ قَالُوْٓا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ ﴿١١﴾ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ﴿١٢﴾ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ كَمَآ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ ؕ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَآءُ وَلٰكِنْ لَّا يَعْلَمُوْنَ ﴿١٣﴾ وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚ وَاِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ ۙ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ ﴿١٤﴾ اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَيَمُدُّهُمْ فِىْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴿١٥﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى ۪ فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ﴿١٦﴾ مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِى اسْتَوْقَدَ نَارًا ۚ فَلَمَّآ اَضَآءَتْ مَا حَوْلَهٗ ذَهَبَ اللّٰهُ

بِنُوْرِهِمْ وَ تَرَكَهُمْ فِيْ ظُلُمٰتٍ لَّا يُبْصِرُوْنَ ﴿۱۷﴾ صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا
يَرْجِعُوْنَ ﴿۱۸﴾ اَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ فِيْهِ ظُلُمٰتٌ وَّ رَعْدٌ وَّ بَرْقٌ ۚ يَجْعَلُوْنَ
اَصَابِعَهُمْ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ مِّنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ ؕ وَ اللّٰهُ مُحِيْطٌۢ
بِالْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۹﴾ يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ اَبْصَارَهُمْ ؕ كُلَّمَآ اَضَآءَ لَهُمْ مَّشَوْا
فِيْهِ ۙۗ وَ اِذَآ اَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوْا ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ
وَ اَبْصَارِهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲۰﴾ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ
الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۲۱﴾ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ
الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّ السَّمَآءَ بِنَآءً ۪ وَّ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ
الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۲﴾ وَ اِنْ
كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ ۪ وَ ادْعُوْا
شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۲۳﴾ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَ لَنْ
تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَ الْحِجَارَةُ ۚۖ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۴﴾
وَ بَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا
الْاَنْهٰرُ ؕ كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا ۙ قَالُوْا هٰذَا الَّذِيْ رُزِقْنَا
مِنْ قَبْلُ ۙ وَ اُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا ؕ وَ لَهُمْ فِيْهَآ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۙۗ وَّ هُمْ
فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۵﴾

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

الف 'لام' میم ا۔ یہ اللہ کی کتاب ہے' اس میں کوئی شک نہیں۔ ہدایت ہے ان پرہیزگار لوگوں کے لئے جو غیب ۲۔ پر ایمان لاتے ہیں' نماز قائم کرتے ہیں ۳۔ جو رزق ہم نے ان کو دیا ہے' اس میں سے خرچ کرتے ہیں' جو کتاب تم پر نازل کی گئی ہے (یعنی قرآن) اور جو کتابیں تم سے پہلے نازل کی گئی تھیں ان سب پر ایمان لاتے ہیں' اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔ ایسے لوگ اپنے رب کی طرف سے راہ راست پر ہیں اور وہی فلاح پانے والے ہیں۔

جن لوگوں نے ان (باتوں کو تسلیم کرنے سے) انکار کر دیا' ان کے لئے یکساں ہے' خواہ تم انہیں خبردار کرو یا نہ کرو' بہرحال وہ ماننے والے نہیں ہیں۔ اللہ نے ان کے دلوں اور ان کے کانوں پر مہر لگادی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردہ پڑ گیا ہے۔ وہ سخت سزا کے مستحق ہیں۔

بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان لائے ہیں' حالانکہ در حقیقت وہ مومن نہیں ہیں۔ وہ اللہ اور ایمان لانے والوں کے ساتھ دھوکہ بازی کر رہے ہیں مگر دراصل وہ خود اپنے آپ ہی کو دھوکے میں ڈال رہے ہیں اور انہیں اس کا شعور نہیں ہے۔ ان کے دلوں میں ایک بیماری ہے جسے اللہ نے اور زیادہ بڑھا دیا ہے اور جو جھوٹ بولتے ہیں' اس کی پاداش میں ان کے لئے دردناک سزا ہے۔ جب کبھی ان سے کہا گیا کہ زمین میں فساد برپا نہ کرو' تو انہوں نے یہی کہا کہ "ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں۔" خبردار' حقیقت میں یہی لوگ مفسد ہیں مگر انہیں شعور نہیں ہے۔ اور جب ان سے کہا گیا کہ جس طرح دوسرے لوگ ایمان لائے ہیں اسی طرح تم بھی ایمان لاؤ تو انہوں نے یہی جواب دیا کہ "ہم بیوقوفوں کی طرح ایمان لائیں؟" --- خبردار' حقیقت میں تو یہ خود بیوقوف ہیں' مگر یہ جانتے نہیں ہیں۔ جب یہ اہل ایمان سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ہیں' اور جب علیحدگی میں اپنے شیطانوں سے ملتے ہیں' تو کہتے ہیں کہ اصل میں تو ہم تمہارے ساتھ ہیں اور ان لوگوں سے محض مذاق کر رہے ہیں۔ اللہ ان سے مذاق کر رہا ہے۔ وہ ان کی رسی دراز کئے جاتا ہے اور یہ اپنی سرکشی میں اندھوں کی طرح بھٹکتے چلے جاتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی خرید لی ہے' مگر یہ سودا ان کے لئے نفع بخش نہیں ہے اور یہ ہرگز صحیح راستے پر نہیں ہیں۔ ان کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص نے آگ روشن کی اور جب اس نے سارے ماحول کو روشن کر دیا تو اللہ نے ان کا نور بصارت سلب کر لیا اور انہیں اس حال میں چھوڑ دیا کہ تاریکیوں میں انہیں کچھ نظر نہیں آتا۔ یہ بہرے ہیں' گونگے ہیں' اندھے ہیں' یہ اب نہ پلٹیں گے یا پھر ان کی مثال یوں سمجھو کہ آسمان سے زور کی بارش ہو رہی ہے اور اس کے ساتھ اندھیری گھٹا اور کڑک اور چمک بھی ہے' یہ بجلی کے کڑاکے سن کر اپنی جانوں کو ہر طرف سے گھیرے میں لئے ہوئے ہے۔ چمک سے ان کی حالت یہ ہو رہی ہے کہ گویا عنقریب بجلی ان کی بصارت اچک لے جائے گی۔ جب ذرا کچھ روشنی انہیں محسوس ہوتی ہے تو اس میں کچھ دور چل لیتے ہیں اور جب ان پر اندھیرا چھا جاتا ہے تو کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اللہ چاہتا تو ان کی سماعت اور بصارت بالکل ہی سلب کر لیتا' یقیناً وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ع

لوگو' بندگی اختیار کرو' اپنے اس رب کی جو تمہارا اور تم سے پہلے جو لوگ ہو گزرے ہیں ان سب کا خالق ہے' تمہارے بچنے کی توقع اسی صورت سے ہو سکتی ہے۔ وہی تو ہے جس نے تمہارے لئے زمین کا فرش بچھایا' آسمان کی چھت بنائی' اوپر سے پانی برسایا اور اس کے ذریعے سے ہر طرح کی پیداوار نکال کر تمہارے لئے رزق بہم پہنچایا۔ پس جب تم یہ جانتے ہو تو دوسروں کو اللہ کا مدمقابل نہ ٹھیراؤ۔

اور اگر تمہیں اس امر میں شک ہے کہ یہ کتاب جو ہم نے اپنے بندے پر اتاری ہے' یہ ہماری ہے یا نہیں' تو اس کے مانند ایک ہی سورت بنا لاؤ' اپنے سارے ہمنواؤں کو بلا لو' ایک اللہ کو چھوڑ کر باقی جس جس کی چاہو' مدد لے لو' اگر تم سچے ہو تو یہ کام کر کے دکھاؤ۔ لیکن اگر تم نے ایسا نہ کیا اور یقیناً کبھی نہیں کر سکتے تو ڈرو اس آگ سے جس کا ایندھن بنیں گے انسان اور پتھر' جو مہیا کی گئی ہے منکرین خدا کے لئے۔

اور اے پیغمبر' جو لوگ اس کتاب پر ایمان لے آئیں اور (اس کے مطابق) اپنے عمل درست کر لیں' انہیں خوشخبری دے دو کہ ان کے لئے ایسے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ ان باغوں کے پھل صورت میں دنیا کے پھلوں سے ملتے جلتے ہوں گے۔ جب کوئی

پھل انہیں کھانے کو دیا جائے تو وہ کہیں گے کہ ایسے ہی پھل اس سے پہلے دنیا میں ہم کو دیئے جاتے تھے۔ ان کے لئے وہاں پاکیزہ بیویاں ہوں گی' اور وہ وہاں ہمیشہ رہیں گے۔

سورت کا آغاز تین حروف مقطعات الف' لام اور میم سے ہوتا ہے۔ اور ان کے متصلا بعد کتاب اللہ کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے

"یہ اللہ کی کتاب ہے' اس میں کوئی شک نہیں' پرہیز گاروں کے لئے ہدایت ہے۔"

قرآن کی بعض دوسری سورتوں کے شروع میں بھی ایسے ہی حروف آئے ہیں۔ لوگوں نے ان کی مختلف تفسیریں کی ہیں۔ ہم ان میں سے اس تشریح کو اختیار کرتے ہیں جس میں کہا گیا ہے کہ یہ دراصل اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ کتاب بھی انہی حروف تہجی سے مرکب ہے۔ جو معلوم و معروف ہیں اور یہ حروف و کلمات ایسے ہیں جنہیں عرب بسہولت استعمال کر رہے ہیں لیکن اس حقیقت کے باوجود قرآن کریم صفت اعجاز رکھنے والی کتاب ہے۔ عربوں کی استطاعت سے یہ باہر ہے کہ وہ انہی حروف و کلمات سے اس جیسی کتاب تیار کر سکیں۔ یہ کتاب انہیں بار بار چیلنج دیتی ہے کہ اگر ان کے بس میں ہے تو وہ اس جیسی کوئی کتاب پیش کریں' یا اس کی سورتوں جیسی دس سورتیں ہی بنا لائیں۔ ورنہ ایک سورت ہی لے آئیں لیکن اس تحدی کا ان کے پاس کوئی جواب نہیں ہے۔

قرآن کریم کی شان اعجاز ایسی ہی ہے جیسے اس پوری کائنات کی ہے۔ جیسے اللہ کی تخلیق اور انسانی مصنوعات میں نمایاں فرق ہے۔ ایسے ہی قرآن اور انسانی کلام میں امتیاز ہے۔ ذرا اس مٹی کو دیکھئے کہ یہ چند معلوم و معروف عناصر سے مرکب ہے۔ ہم ان سے اینٹ اور برتن یا زیادہ سے زیادہ کوئی پیچیدہ مشین بناتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ کی شان تخلیق کو دیکھئے کہ وہ ان ذرات کو حیات بخشتا ہے۔ اور یکایک وہ ذرات ذی روح اور متحرک مخلوق بن جاتے ہیں اور ذات باری کے اس معجزانہ راز یعنی "حیات" کو اپنے اندر لئے ہوئے ہمارے سامنے آتے ہیں۔ یہ "حیات" ایسا راز ہے جو انسان کے حیطۂ قدرت سے باہر اور اس کے ادراک سے وراء ہے۔ بس بعینہ یہی مثال ہے قرآن کریم کی۔ یہ حروف تہجی اور ان سے مرکب معروف و متداول کچھ کلمات ہیں جن سے تمام انسان نظم و نثر بناتے ہیں لیکن جب اللہ تعالیٰ اسی مواد کو استعمال کرتا ہے تو وہ قرآن و فرقان کی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں۔ غرض اللہ کے کلام اور انسانی کلام کے درمیان فرق ایسا ہے جیسے ایک بے جان مادہ اور ایک زندہ متحرک مخلوق کے درمیان ہوتا ہے۔ یہی ہے فرق ظاہری زندگی اور حقیقی زندگی کے درمیان۔

"اس کتاب میں شک نہیں۔"

اس میں شک و شبہ کیونکر ہو؟ جبکہ اس کے آغاز ہی میں صداقت و یقین کے دلائل پوشیدہ ہیں۔ حروف تہجی سے عرب ادباء ایسی کتاب بنانے میں ناکام رہے ہیں حالانکہ یہ حروف و کلمات ان کے درمیان متداول و معروف ہیں لہٰذا اب شک کی کیا گنجائش ہے؟

"اس میں کوئی شک نہیں اور پرہیز گاروں کے لئے ہدایت ہے۔"

بلکہ ہدایت اس کی حقیقت و مزاج میں داخل ہے۔ اس کی ماہیت اور اس کا وجود ہی عین ہدایت ہے لیکن سوال یہ ہے کہ وہ کن لوگوں کے لئے ہدایت ہے؟ اور کن لوگوں کے لئے نور مبین اور مشفق رہنما ہے؟ صرف متقین کے لئے۔ اس سے صرف وہی شخص مستفید ہو سکتا ہے جس کا دل خوف خدا سے اور تقویٰ سے معمور ہے۔ تقویٰ ہی اس کتاب کے لئے دل کے دریچے کھولتا ہے۔ اور جب یہ کتاب کسی دل میں اتر جاتی ہے تو پھر وہاں جا کر ہی یہ اپنا اہم پارٹ ادا کرتی ہے۔ کیونکہ صرف تقویٰ ہی کسی دل کو اس طرف آمادہ کرتا ہے کہ وہ سچائی کو آگے بڑھ کر اٹھا لے اور آواز حق پر لبیک کہے۔

جو شخص قرآن سے ہدایت لینا چاہتا ہے اس کے لئے یہ از حد ضروری ہے کہ وہ قرآن کے پاس قلب سلیم لے کر آئے اور اس کا دل خلوص سے پر ہو۔ پھر وہ دل تقویٰ اور خوف خداوندی سے بھی معمور ہو۔ اس کو اس بات کا خوف ہو کہ وہ کہیں گمراہی میں مبتلا نہ ہو یا

ضلالت اسے اپنی طرف کھینچ نہ لے۔ جب ایک شخص اس طرح قرآن کا مطالعہ کرتا ہے تو پھر قرآن بھی اس پر اپنے اسرار و رموز کھول دیتا ہے اور اس پر اپنے انوار و برکات کی بارش کر دیتا ہے۔ اور یوں وہ اس خائف' متقی' حساس اور غیب دل میں شراب معرفت انڈیل دیتا ہے۔ روایات میں آتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابی ابن کعب رضی اللہ عنہ سے دریافت فرمایا کہ تقویٰ کا مفہوم کیا ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا "کیا آپ کا گزر کبھی کسی پر خار راستے سے نہیں ہوا؟" آپ نے کہا "ہاں۔" تو انہوں نے کہا "تو پھر آپ اس راہ سے کیونکر گزرے؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا "میں نے اپنے کپڑوں کو سمیٹ لیا اور احتیاط سے چلا! انہوں نے کہا "بس یہی ہے تقویٰ!"

یہ ہے تقویٰ کا مفہوم۔ ضمیر کا احساس 'شعور کی صفائی' دائمی خوف خدا 'مسلسل احتیاط اور زندگی کی شاہراہ میں آنے والے کانٹوں سے بچنا۔ بالخصوص ایسی راہ جہاں ہر طرف خواہشات نفس اور مرغوبات کے کانٹے بچھے ہوئے ہیں۔ جہاں خوف و ہراس کے کانٹے ہیں' طمع ولالچ کے کانٹے ہیں اور جھوٹی تمناؤں اور آرزوؤں کے کانٹے ہیں۔ اور یہ تمنائیں ان لوگوں سے وابستہ ہیں جو انہیں پوری نہیں کر سکتے۔ اور یہ خوف ان لوگوں سے ہے جو کسی کو نفع و نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ غرض یہ اور دوسرے ہزاروں قسم کے کانٹے اور رکاوٹیں جو ہر وقت ' ہر طرف سے دامنگیر ہوتی ہیں۔

اس کے بعد متقین کی صفات بیان کی جاتی ہیں۔ ان صفات کا ذکر ہوتا ہے جو مدینہ طیبہ کے سابقین مومنین میں پائی جاتی تھیں۔ اور اب اس امت کے مخلصین کے لئے ہر دور میں وہی معیار بن گئی ہیں۔

"جو غیب پر ایمان لاتے ہیں' نماز قائم کرتے ہیں' جو رزق ہم نے ان کو دیا ہے' اس میں سے خرچ کرتے ہیں' جو کتاب تم پر نازل کی گئی ہے (یعنی قرآن) اور جو کتابیں تم سے پہلے نازل کی گئی تھیں۔ ان سب پر ایمان لاتے ہیں اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔"

متقین کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں فعال اور مثبت شعوری اتحاد پایا جاتا ہے۔ ان سب کے دل ایمان بالغیب سے معمور ہیں۔ وہ سب ایک جیسے فرائض بجالاتے ہیں' سب کے سب تمام انبیاء پر ایمان لاتے ہیں اور سب کو قیامت کی جواب دہی کا خوف ہے۔ یہ فکری اتحاد اسلامی نظریۂ حیات کی ممتاز خصوصیت ہے اور جو لوگ اس نظریۂ حیات کو قبول کرتے ہیں ان میں دوسرے لوگوں کے مقابلے میں کامل اتحاد پایا جاتا ہے۔ اس لئے مناسب یہ ہے کہ یہ نظریۂ حیات پوری انسانیت کا نظریہ بن جائے۔ پوری انسانیت اسے قبول کرے اور اس نظریۂ حیات کے سائے میں تمام دنیا اپنے احساسات اور طریقہ ہائے حیات کے ساتھ 'مکمل اتحاد کی شکل میں زندگی بسر کرے اس کے باشندوں کے شعور و نظریات اور ان کی عملی زندگی اور اجتماعی نظم پر یہ نظریۂ حیات حاوی ہو۔

جب ہم متقین کی اس اہم اور ممتاز خصوصیت کا تفصیلی جائزہ لیتے ہیں اور اس کے ایک ایک جز کا مطالعہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ اجزاء وہی ہیں جو ہمیشہ تمام انسانوں کی زندگی میں بحیثیت اعلیٰ اقدار مسلم رہے ہیں مثلاً الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ "جو غیب پر ایمان لاتے ہیں۔" اس لئے 'ان کی ارواح اور اس قوت کے درمیان جس نے انہیں اور اس پوری کائنات کو پیدا کیا' مادیات اور حسیات کے پردے حائل نہیں ہوتے۔ اس مادی دنیا سے وراء الوراء جو عالم اور جو موجودات اور جو "قوت" اور "حقیقت" موجود ہے' ان کی روح اور اس کے درمیان حسیات و مادیت کے یہ پردے حائل نہیں ہو سکتے۔

ایمان بالغیب وہ پہلی سیڑھی ہے' جسے انسان عبور کر کے حیوانیت کے مقام ارزل سے آگے بڑھ جاتا ہے۔ جہاں صرف اسی چیز کا ادراک ہوتا ہے جسے یہ ظاہری حواس پا سکتے ہیں۔ لیکن ایمان بالغیب کے مقام پر آکے' انسان اب انسانیت کے اس مقام تک بلند ہو جاتا ہے' جہاں اسے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کائنات جو اس کی اس محدود دنیا سے کہیں بہت بڑی ہے۔ حواس (یا آلات جدیدہ کے ذریعہ ترقی یافتہ حواس) کا دائرہ ادراک بہت محدود ہے اور یہ کہ ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں۔ اس طرح ایک "مومن بالغیب" انسان کے تصور

کی دنیا میں' اس پوری کائنات کی حقیقت کے بارے میں' بلکہ خود انسان کے وجود کے بارے میں اور وجود انسانی میں جو قوتیں کارفرما ہیں ان کے بارے میں اور اس کائنات اور اس کی پشت پر کام کرنے والی مدبرانہ قوت کے متعلق' ایک دور رس تبدیلی اور ایک ہمہ گیر انقلاب برپا ہو جاتا ہے۔ صرف تصور ہی میں نہیں بلکہ اس کرہ ارض پر اس کے طور طریقوں میں بھی ایک وسیع تبدیلی واقع ہو جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ جو شخص اپنے ظاہری حواس کی محدود دنیا میں گم رہتا ہے' اس کی زندگی اس شخص کی طرح نہیں ہو سکتی جو اس عظیم تر کائنات میں رہتا ہو جسے اس کی بصارت یا بصیرت دیکھ رہی ہو اور وہ اپنی دلی گہرائیوں اور اپنے تصور میں' اس وسیع تر اور عظیم تر کائنات کی صدائے بازگشت ہر وقت پا رہا ہو۔ اسے اس بات کا پختہ شعور ہو کہ اس کا انجام زمان و مکان کے حدود' اور اس مختصر عمر میں خود اس کے اپنے حقیر مدرکات سے وراء ہے۔ اور یہ کہ اس ظاہری اور باطنی کائنات کی پشت پر ایک "عظیم حقیقت" کام کر رہی ہے جو اس انسان کے وجود کا مصدر و منبع ہے اور وہ حقیقت صرف "ذات باری تعالیٰ" ہے۔ جو ہماری نظر کی گرفت سے باہر ہے اور عقل کے حیطہ ادراک سے وراء ہے۔ لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ

صرف یہی ایک صورت ہے جس کے ذریعے انسان کی اس محدود فکری قوت کو پریشانی' انتشار اور ایسی لایعنی چیزوں میں مشغول ہونے سے بچایا جا سکتا ہے جن کے لئے اسے پیدا ہی نہیں کیا گیا اور نہ ہماری یہ محدود فکری قوت ان امور کا احاطہ کر سکتی ہے۔ اور اگر ہم اپنی پوری فکر کو ان امور میں صرف بھی کر دیں تو ان سے ہمیں نہ کوئی دینی فائدہ حاصل ہوتا ہے نہ دنیوی۔ اللہ نے انسان کو جو محدود فکری قوت دی ہے' وہ اسے صرف اس لئے دی گئی ہے کہ وہ زمین پر اللہ کے نائب ہونے کی حیثیت سے اپنے فرائض سرانجام دے۔ انسانی فکر کے ذمہ صرف اس واقعی اور قریب زندگی کے امور کو سلجھانا ہے۔ انسان کا فرض ہے کہ وہ انسانی زندگی پر غور کرے' اسے گہری اور عمیق نظر سے دیکھے' اس سے نتائج اخذ کرے۔ اس زندگی کو ترقی دے' حسین تر بنائے' لیکن وہ یہ سب کام اس روحانی قوت کے مستند طریقے کے مطابق کرے جسے اس کائنات اور اس کائنات کے خالق کے ساتھ براہ راست ربط ہے۔ رہے وہ غائبانہ امور اور عالم مغیبات' تو اسے اپنے حال پر چھوڑ دے کیونکہ انسان کی محدود عقل عالم مغیبات کا احاطہ نہیں کر سکتی۔ اسی واقعاتی دنیا سے آئے' جو عالم اور جو جہاں ہیں' ان کی تلاش میں جو لوگ اس کوتاہ عقل کو لے کر نکلتے ہیں' جس کی نظر اس زندگی اور اس کرہ ارض تک ہی محدود ہے' اور اس تلاش میں وہ روحانیت اور الہام اور کھلی بصیرت سے بھی کوئی مدد نہیں لیتے اور غائبانہ امور کو ناقابل ادراک سمجھ کر اپنی جگہ نہیں چھوڑتے' ایسے لوگوں کی تمام کوششیں بالآخر ناکامی کا منہ دیکھیں گی۔ ان کی یہ کوشش اس لئے ناکام ہو گی کہ وہ اس کام کے لئے اس طاقت کو استعمال کر رہے ہیں جو اس میدان میں کام ہی نہیں آ سکتی نہ اس کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ اور ان کی یہ کوشش عبث اس لئے ہو گی کہ فکری طاقت کو غلط جگہ استعمال کر کے وہ اسے منتشر کر دیں گے۔ جب انسانی ذہن اس بات کو تسلیم کر چکا ہے کہ ایک محدود ذہن مطلق اور لامحدود اشیاء کا ادراک بھی نہیں کر سکتا تو ذہن انسانی کی اس منطق کا احترام کرنا چاہئے اور اس امر کو تسلیم کر لینا چاہئے کہ مطلق اور لامحدود امور کا ادراک محال ہے۔ نیز یہ بھی پیش نظر رہے کہ کسی مجہول امر کا عدم ادراک اس بات کو مستلزم نہیں ہے کہ وہ امر سرے سے عالم غیب میں موجود ہی نہیں ہے۔ لہٰذا انسان کا فرض ہے کہ وہ غیبی امور کو قوت عقلی کے علاوہ کسی اور قوت کے سپرد کر دے اور اس بارے میں اسے جو معلومات درکار ہیں وہ اس ذات سے حاصل کرے جو علیم و خبیر ہے' ظاہر و باطن پر محیط ہے۔ عالم غیب اور عالم شہادت اس کے سامنے یکساں ہیں۔

یہ صرف مومن ہی ہے جو اس نقطہ نظر سے عقل کی اس منطق کا احترام کرتا ہے اور یہاں قرآن مجید اہل تقویٰ کی یہ صفت بیان کرتا ہے کہ ان کی پہلی صفت یہ ہے کہ وہ غائب امور پر ایمان لاتے ہیں۔

ایمان بالغیب کا عقیدہ' درجہ حیوانیت سے انسان کی ترقی کے سلسلے میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن ہمارے زمانے کی طرح ہر دور میں مادہ پرست انسانوں نے یہ کوشش کی ہے کہ وہ انسان کو پیچھے لوٹا کر دوبارہ درجہ حیوانیت میں گرا دیں۔ اسے حیوانی دنیا میں لے جائیں۔ جہاں محسوسات کے سوا کسی اور چیز کی گنجائش نہیں ہے۔ وہ اس عمل کو "ترقی پسندی" کا نام دیتے ہیں حالانکہ وہ ترقی پسندی نہیں بلکہ رجعت قہقری ہے اور اس سے اللہ نے ایک مومن کو یوں بچایا کہ ان کی ممتاز صفت ہی یہ قرار دی کہ وہ عالم مغیبات پر ایمان رکھتے ہیں۔ ہمارے لئے یہ اللہ کی ایک عظیم نعمت ہے ہم اس پر اس کا شکر ادا کرتے ہیں۔ رہی وہ حیوانیت جس پر یہ مادہ پرست فریفتہ ہو چکے ہیں تو یہ انہیں ہی مبارک ہو۔

وَ يُقِيمُونَ الصَّلٰوةَ "نماز قائم کرتے ہیں۔" وہ صرف ایک خدا تعالیٰ کی عبادت اور بندگی کرتے ہیں اور اس طرح وہ انسانوں یا دوسری کسی چیزوں کی غلامی سے بلند اور آزاد ہو جاتے ہیں۔ وہ ایسی ذات کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جو لامحدود قوت و قدرت کی مالک ہے۔ ان کے سر کسی انسان کے آگے نہیں' بلکہ ذات باری تعالیٰ کے سامنے خم ہو جاتے ہیں۔ وہ "دل" جو صحیح معنوں میں ذات باری کے سامنے سربسجود ہوتا ہے اور شب و روز کی ہر گھڑی میں وہ اللہ سے جڑا ہوا ہوتا ہے۔ وہ اپنے اندر یہ شعور پاتا ہے کہ اس کا تعلق خالق کائنات سے قائم ہے۔ اب وہ اس دنیائے دنی اور اس کی ضروریات میں غرق نہیں ہو جاتا بلکہ وہ زندگی کا ایک بلند نصب العین پالیتا ہے۔ وہ محسوس کرتا ہے کہ وہ تمام مخلوق سے قوی تر اور برتر ہے کیونکہ اس کا جوڑ اس ذات سے ہے جس نے تمام دنیاوی مخلوقات کو پیدا کیا ہے۔ یہی شعور دراصل انسانی ضمیر کی قوت کا مصدر ہے اور تقویٰ اور نیک و بد کے احساس کی یہی اساس ہے۔ انسانی شخصیت کی تربیت کے لئے یہ ہمیشہ ایک اہم عنصر رہا ہے۔ اس کے نتیجے میں جو شخصیت تیار ہوتی ہے وہ ربانی فکر' ربانی شعور اور ربانی طرز عمل کی حامل ہوتی ہے۔

وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُونَ "جو رزق ہم نے ان کو دیا ہے' اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔" یعنی وہ اس کے معترف ہوتے ہیں کہ ان کے قبضے میں جو دولت ہے' وہ اللہ کی دی ہوئی ہے' وہ خود ان کی پیدا کردہ نہیں ہے۔ بخشش رزق کے اس اعتراف ہی کے نتیجے میں' انسان کے دل میں' ناتوانوں کے ساتھ احسان' خالق کائنات کی عیال کے درمیان باہم تعاون اور انسانی اخوت اور روابط کا شعور و احساس پیدا ہوتا ہے۔ اس اعتراف کی قدر و قیمت اس وقت ظاہر ہوتی ہے جب دوسروں کے ساتھ احسان کر کے نفس انسانی حرص و آز کی امراض سے پاک ہو جائے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ زندگی میں طبقاتی کشمکش اور ظلم و ستم کی جگہ طبقاتی تعاون (Co-operation) پیدا ہوتا ہے۔ دولت کے اس تصور میں ضعیف و ناتواں اور فقیر و مسکین یہ محسوس کرتے ہیں کہ وہ دل اور روح کی دنیا میں رہتے ہیں' انہیں خوبصورت چہروں سے واسطہ پڑتا ہے اور ظلم و ستم کے چنگل میں گرفتار نہیں۔ نہ ہی وہ شعور رکھتے ہیں کہ انہیں درندوں اور بھیڑوں سے واسطہ ہے۔

انفاق فی سبیل اللہ میں زکوٰۃ' صدقات واجبہ اور بھلائی کی راہ میں خرچ ہونے والے سب سرمائے داخل ہیں۔ انفاق فی سبیل اللہ کو فرضیت زکوٰۃ سے بھی پہلے لازم کیا گیا۔ یہ دراصل ایک عمومی پالیسی ہے۔ فرضیت زکوٰۃ کی آیات اس کی ایک مخصوص اور جزوی شکلوں کو متعین کرتی ہیں۔ فاطمہ بنت قیس نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے (بروایت ترمذی) نقل کرتی ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا "زکوٰۃ کے علاوہ بھی مال میں مساکین کا حق ہے۔" وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ "جو کتاب تم پر نازل کی گئی (یعنی قرآن) اور جو کتابیں تم سے پہلے نازل کی گئی تھیں' ان سب پر ایمان لاتے ہیں۔" یہی صفت امت مسلمہ کے شایان شان ہے۔ وہ آسمانی عقائد کی وارث ہے؟ آغاز انسانیت سے لے کر آخر تک تمام نبیوں کی وہ وارث ہے؟ وہ عقائد کی وارث اور نبوت کے ورثے کی امین ہے اور تاقیامت' اس زمین پر قافلہ ایمان کی حدی خواں ہے۔

اس صفت کی وجہ سے امت مسلمہ میں انسانی اتحاد کا شعور پیدا ہوتا ہے۔اس طرح پوری انسانیت کا دین ایک ہو جاتا ہے۔اس کا ایک معبود قرار پاتا ہے اور اس کی طرف سے جو رسول بھیجے گئے سب کے نزدیک وہ رسولان برحق ہو جاتے ہیں۔اس صفت کی وجہ سے دوسرے ادیان اور ان کے ماننے والوں کے خلاف مذموم تعصب ختم ہو جاتا ہے' جب تک وہ صحیح راہ پر ہوں' اور انسان اس پر مطمئن ہو جاتا ہے کہ مختلف ادوار اور زمانوں میں اللہ تعالیٰ پوری انسانیت کی ہدایت اور اصلاح کا بندوبست فرماتے رہے ہیں۔چنانچہ اس نے مسلسل ایک ہی پیغام اور ایک ہی ہدایت مختلف رسولوں کے ذریعے انسانوں تک پہنچانے کا اہتمام فرمایا۔نیز اس صفت کے نتیجے میں یہ احساس بھی ابھرتا ہے کہ مختلف ادوار اور زمانوں میں حالات کی تبدیلی کے باوجود حق اور ہدایت ایک ہی رہی ہے۔یہ ہدایت اور روشنی اسی ستارے کی طرح مسلسل قائم ہے جو اندھیروں میں ہر فرد کے لئے رہنما ہوتا ہے۔

وَبِالْآخِرَةِ هُمْ يُوقِنُونَ "اور آخرت پر وہ یقین رکھتے ہیں۔" یہ مومنین کی صفات میں سے آخری صفت ہے۔یہاں آکر اب دنیا کے ڈانڈے آخرت سے مل جاتے ہیں۔ابتدا کا ربط انجام سے ہوتا ہے۔اعمال پر سزا جزاء مرتب ہوتی ہے اور انسان کے اندر یہ احساس پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ کوئی مہمل اور عبث مخلوق نہیں ہے۔نہ ہی وہ اس دنیا میں خود مختار چھوڑ دیا گیا ہے۔بلکہ اسے ایک عظیم عدالت میں جانا ہے تاکہ اس کا دل مطمئن ہو جائے۔اس کی پریشانیاں دور ہو جائیں۔وہ اعمال صالحہ کی طرف مائل ہو جائے۔اور اسے یقین ہو جائے کہ انجام کار اسے اللہ' رحمان و رحیم کی عدالت میں حاضر ہونا ہے۔جہاں ہر کسی کے ساتھ انصاف کیا جائے گا۔

محسوسات کے محدود دائرے میں قید رہنے والوں اور اس وسیع کائنات میں آزاد پھرنے والوں کے درمیان' یوم آخرت پر یقین کی وجہ سے واضح طور پر فرق و امتیاز ہو جاتا ہے۔پہلی قسم کے لوگوں کا احساس اور شعور یہ ہوتا ہے کہ حیات انسانی بس وہی ہے جو اس کرہ ارض پر گزرتی ہے۔لیکن دوسرے قسم کے لوگوں کا یہ عقیدہ ہوتا ہے کہ یہ دنیا تو دارالامتحان ہے۔جو جزائے اعمال کی تمہید ہے۔حقیقی زندگی تو اس جہاں کی ہے' جو اس محدود اور مختصر دنیا سے آگے آنے والی ہے۔

جیسا کہ اوپر جائزہ لیا گیا کہ جن صفات کا ذکر یہاں ہوا ہے وہ حیات انسان کی وقیع ترین صفات ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ان صفات کو متقین کی خصوصی صفات قرار دیا گیا۔ان سب صفات کے درمیان ایک منطقی ربط پایا جاتا ہے۔جس کی وجہ سے یہ باہم مل کر ایک مربوط اور متناسب اکائی بن جاتی ہیں۔مثلاً انسانی ضمیر میں تقویٰ اس وجدانی حالت کا نام ہے جو کچھ خاص میلانات اور اعمال صالحہ کو جنم دیتی ہے۔اس صفت کی وجہ سے باطنی احساسات اور انسان کی عملی سرگرمیوں اور تصرفات کے درمیان وحدت اور ربط پیدا ہو جاتا ہے اور انسان اپنی باطنی اور فکری اور ظاہری اور عملی دونوں پہلوؤں میں اپنے رب کے ساتھ جڑ جاتا ہے۔اس کی روح شفافیت پاتی ہے۔روح اور عالم غیب و شہادت کی حاوی اور اپنے گھیرے میں لینے والی ذات مطلق کے درمیان تمام حجابات اٹھ جاتے ہیں۔معلوم اور مجہول کی سرحدیں آپس میں مل جاتی ہیں۔جب روح شفاف ہو جائے اور ظاہر و باطن کے درمیان سے حجابات اٹھ جائیں تو اس وقت ایمان بالغیب سچائی کو چھپانے والے پردوں کے اٹھنے کا قدرتی ثمرہ ہوتا ہے۔اس طرح انسانی روح عالم مغیبات سے جڑ جاتی ہے اور اسے اطمینان نصیب ہوتا ہے۔تقویٰ اور ایمان بالغیب کے ساتھ اللہ کی عبادت کی وہ صورت بیان ہوئی ہے' جو اللہ نے تجویز کی ہے یعنی نماز۔اللہ اور بندے کے درمیان یہ ایک خاص تعلق ہے۔اس کے بعد یہ بیان کیا گیا ہے کہ اللہ نے تم پر جو احسانات و اکرامات کئے ان کا شکر ادا کرتے ہوئے انسانی اخوت کے قیام کے لئے تم ان انعامات کا ایک حصہ خرچ کرو۔پھر قافلہ ایمان کی لمبی تاریخ کے بارے میں وسعت فکر و نظر کا ذکر ہوتا ہے۔یہ شعور بیدار کیا جاتا ہے کہ ہر مومن ہمارا بھائی ہے۔ہر رسول ہمارا رسول ہے۔اور ہمیں اس سے فکری قرب ہے۔اگرچہ وہ بعد زمانی رکھتا ہو۔اس کے بعد آخرت کی جوابدہی کے متعلق پختہ یقین یہ سب صفات ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہیں۔

مدینہ طیبہ میں ابتدا جو جماعت قائم ہوئی وہ ایسی ہی تھی جو مہاجرین و انصار کے سابقین اولین پر مشتمل تھی۔ یہ جماعت اپنی ان اوصاف کے ساتھ ایک عظیم حقیقت تھی۔ وہ عظیم حقیقت کہ یہ ایمانی حقائق اس کی زندگی میں مجسم و متشکل تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس زمین پر انسانی تاریخ میں اس جماعت کے ہاتھوں وہ کارہائے نمایاں سرانجام دیئے جس کی نظیر تاریخ میں نہیں ملتی۔ یہی وجہ ہے کہ یہ فیصلہ دیا جاتا ہے أُولَٰئِكَ عَلَىٰ هُدًى مِّن رَّبِّهِمْ ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ "ایسے لوگ اپنے رب کی طرف سے راہ راست پر ہیں۔ اور وہی فلاح پانے والے ہیں۔" ..... یوں انہوں نے ہدایت پائی لہٰذا وہ کامیاب رہے اور ہمیشہ کے لئے ہدایت و فلاح کی واحد راہ یہی ہے۔ جو چاہے اس پر گامزن ہو جائے۔

اب ہمارے سامنے منکرین دعوت اسلامی کی تصویر آتی ہے۔ اس تصویر کشی میں وہ تمام اہم عناصر (Groups) بیان کر دیئے گئے ہیں جو کفر کی حقیقت کے اندر پائے جاتے ہیں' یہ کفر جس دور میں ہو اور زمین کے جس حصے میں بھی وہ پایا جائے یہ عناصر اس میں ضرور پائے جاتے ہیں۔

"جن لوگوں نے (ان باتوں کو تسلیم کرنے سے) انکار کر دیا' ان کے لئے یکساں ہے' خواہ تم انہیں خبردار کرو یا نہ کرو بہرحال وہ ماننے والے نہیں ہیں۔ اللہ نے ان کے دلوں اور ان کے کانوں پر مہر لگا دی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردہ پڑ گیا ہے۔ وہ سخت سزا کے مستحق ہیں۔"

یہاں متقین اور کافرین بالکل ایک دوسرے کے بالمقابل کھڑے نظر آتے ہیں۔ یہ کتاب متقین کے لئے تو ہدایت اور نور بصیرت ہے لیکن کفار کا حال یہ ہے کہ خواہ انہیں خبردار کیا جائے یا نہ کیا جائے' وہ ہر حال میں روش کفر پر جمے ہوئے ہیں۔ مومنین کے دلوں میں ہدایت ربانی کے جو دریچے سدا وا ہوتے ہیں اور وہ روابط جن کی وجہ سے وہ ہروقت اس پوری کائنات' اس کے خالق' اس کے ظاہر و باطن اور اس کے عالم غیب و شہادت سے جڑے ہوئے ہوتے ہیں' رشد و ہدایت کے یہ سب دریچے کفار کے لئے بند نظر آتے ہیں' اسی منظر میں انسان اور خالق کائنات کے درمیان وہ تمام رابطے بالکل کٹے ہوئے ہیں' جو مومنین اور خالق کائنات کے درمیان قائم و دائم ہوتے ہیں۔

خَتَمَ اللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ وَعَلَىٰ سَمْعِهِمْ "اللہ نے ان کے دلوں اور ان کے کانوں پر مہر لگا دی ہے۔" جس کی وجہ سے وہ حقیقت رشد و ہدایت پانے اور حق کی آواز سننے کے قابل ہی نہیں رہے۔ وَعَلَىٰ أَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ "اور ان کی آنکھوں پر پردہ پڑ گیا ہے۔ لہٰذا وہ نور ہدایت کے دیکھنے سے محروم ہیں۔ چونکہ انہوں نے اپنی غلط روش سے مسلسل انذار و تبشیر کو ٹھکرا دیا تھا اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان کی اس روش پر انہیں دنیا ہی میں یہ سخت سزا دی کہ ان کے دلوں پر مہر لگا دی' آنکھوں پر پردے پڑ گئے اور ان کے کان صدائے صداقت کے لئے بہرے ہو گئے ہیں۔ یوں ان کے لئے وعظ و تبلیغ اور انہیں خبردار کرنا نہ کرنا برابر ہو گیا۔

یہ نہایت کرخت' جامد اور تاریک تصویر ہے' جو ان لوگوں کے دل و دماغ کی گہری تاریکی و سیاہی اور مسلسل اندھے پن اور بہرے پن کی روش اختیار کرنے کی وجہ سے منقش ہو کر ہمارے سامنے جلوہ گر ہوتی ہے۔ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ۝ "اور وہ سخت عذاب کے مستحق ہیں۔" کیونکہ یہی ان کی معاندانہ اور کافرانہ روش کا قدرتی انجام ہے' جو لوگ ڈرانے والے کی بات کو مان کر نہیں دیتے اور جن کو ڈرانا یا نہ ڈرانا یکساں ہو جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے علم میں بھی یہ بات ہوتی ہے کہ یہ لوگ آخر تک اپنی اس روش پر قائم رہیں گے۔ وہ اسی انجام کے مستحق ہیں۔

اب سیاق کلام تیسری تصویر اور تیسرے منظر کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ اس تیسرے نمونے کی تصویر کشی ان الفاظ میں کی جاتی ہے۔

"بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم اللہ پر اور آخرت پر ایمان لائے ہیں' حالانکہ درحقیقت وہ مومن نہیں ہیں۔ وہ اللہ

اور ایمان لانے والوں کے ساتھ دھوکہ بازی کر رہے ہیں۔ مگر دراصل وہ اپنے آپ ہی کو دھوکے میں ڈال رہے ہیں اور انہیں اس کا شعور نہیں۔ ان کے دلوں میں ایک بیماری ہے جسے اللہ نے اور زیادہ بڑھادیا۔ اور جو جھوٹ وہ بولتے ہیں' اس کی پاداش میں ان کے لئے دردناک سزا ہے۔ جب کبھی ان سے کہا گیا کہ زمین میں فساد برپا نہ کرو' تو انہوں نے یہی کہا کہ ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں۔ خبردار حقیقت میں یہی لوگ مفسد ہیں مگر انہیں شعور نہیں۔ اور جب ان سے کہا گیا کہ جس طرح دوسرے لوگ ایمان لائے ہیں اسی طرح تم بھی ایمان لاؤ تو انہوں نے جواب دیا کہ ہم بیوقوفوں کی طرح ایمان لائیں؟

خبردار! حقیقت میں تو یہ خود بے وقوف ہیں' مگر یہ جانتے نہیں۔ جب یہ اہل ایمان سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ہیں اور جب علیحدگی میں' اپنے شیطانوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ اصل میں تو ہم تمہارے ساتھ ہیں اور ان لوگوں سے محض مذاق کر رہے ہیں۔ اللہ ان سے مذاق کر رہا ہے' وہ ان کی رسی دراز کئے جارہا ہے اور یہ اپنی سرکشی میں اندھوں کی طرح بھٹکتے چلے جاتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں' جنہوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی خرید لی ہے' مگر یہ سودا ان کے لئے نفع بخش نہیں ہے' اور یہ ہرگز صحیح راستے پر نہیں ہیں۔ ان الفاظ میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ مدینہ طیبہ کی واقعی صورت حال کی صحیح تصویر کشی ہے لیکن زمان و مکان کی حد بندیوں سے قطع نظر کر کے بھی جب ہم دیکھتے ہیں تو اس قسم کے لوگ ہمیں انسانوں کی ہر نسل میں موجود نظر آتے ہیں۔ ہر نسل میں ایسے ذی حیثیت منافق لوگ پائے جاتے ہیں جو نہ تو اپنے اندر یہ جرأت پاتے ہیں کہ حق و صداقت کو پوری طرح تسلیم کرلیں اور ایمان لے آئیں اور نہ ان میں یہ سکت ہوتی ہے کہ حق و صداقت کا صاف صاف انکار کر دیں۔ اس صورت حال کے ساتھ ساتھ ایسے لوگ عوام کے مقابلے میں اپنے لئے ایک اونچی حیثیت اور رتبہ بلند بھی پسند کرتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو جمہور عوام سے زیادہ علیم و فہیم سمجھتے ہیں۔ لہٰذا ہم ان آیات کو ہر قسم کی تاریخی مثالوں سے آزاد اور اصولی آیات سمجھتے ہیں جو ہر دور کے ان تمام لوگوں پر صادق ہیں جو منافقانہ روش اختیار کرتے ہیں۔ غرض ان آیات میں جس نفسیاتی صورت حال کی تصویر کھینچی گئی ہے وہ ایسی صورت حال ہے کہ ہر دور میں نفس انسانی کی گہرائیوں میں موجود رہی ہے اور اب بھی ہے اور آئندہ بھی رہے گی۔

اس قسم کے لوگ ہمیشہ اللہ اور یوم آخرت پر ایمان (اور خادم اسلام ہونے) کا دعویٰ کرتے ہیں۔ لیکن درحقیقت ان کے دل دولت ایمان سے خالی ہوتے ہیں' یہ صریح طور پر منافقت میں مبتلا ہوتے ہیں' یہ بزدل ہوتے ہیں اور مومنین کے بارے میں ان کی جو حقیقی رائے ہوتی اس کا اظہار کرنے کی جرأت ان کے اندر نہیں ہوتی۔

ایسے لوگ ہمیشہ اس زعم میں مبتلا رہتے ہیں کہ وہ غایت درجے کے ذہین' معاملہ فہم اور پالیسی باز ہیں اور وہ ہر حال میں ان سادہ لوح مومنین کو طرح دے سکتے ہیں۔ قرآن مجید کہتا ہے کہ ایسے لوگ صرف مومنین ہی کو نہیں بلکہ اللہ کو بھی دھوکہ دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ "وہ اللہ اور ان لوگوں کے ساتھ جو ایمان لائے ہیں' دھوکہ بازی کر رہے ہیں۔" اس آیت اور اس جیسی دوسری آیات میں ایک عظیم حقیقت کھل کر ہمارے سامنے آتی ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا ایک عظیم الشان فضل و کرم ہے کہ قرآن کریم میں بار بار اور بتاکید و تکرار اس کا اظہار ہوا ہے اور اسی میں دراصل بندہ مومن اور اللہ تعالیٰ کے درمیان قائم ربط و تعلق کا راز پنہاں ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ مومنین کے محاذ کو خود اپنا محاذ قرار دیتا ہے۔ ان کے معاملات اور حالات کو خود اپنے معاملات اور حالات قرار دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں اپنے ساتھ ملاتا ہے اور انہیں اپنے دامن شفقت و رافت میں لیتا ہے۔ ان کے دشمن کو خود اپنا دشمن قرار دیتا ہے' ان کے خلاف کی جانے والی سازشوں کو اپنے خلاف سازشیں قرار دیتا ہے۔ یہ اس کی انتہائی شاہانہ کرم نوازی اور عزت افزائی ہے جس سے مومنین کی قدر و منزلت اپنے انتہائی عروج تک جا پہنچتی ہے اور جس سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ اس کائنات میں ایمان باللہ ایک

عظیم ترین حقیقت ہے' جس سے دل مومن میں ثبات و طمانیت کے سرچشمے پھوٹ نکلتے ہیں۔ وہ دیکھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک مومن کے مسائل اور مشکلات کو اپنے دست قدرت میں لے لیتا ہے' اس کا معرکہ اللہ کا معرکہ قرار پاتا ہے' اس کا دشمن اللہ کا دشمن بن جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے اپنے محاذ میں لے لیتا ہے اور اپنے عمل عاطفت میں داخل کر لیتا ہے۔ اس کے مقابلے میں پھر انسانوں اور حقیر بندوں کی سازشوں' دھوکہ بازیوں اور ایذا رسانیوں کی حقیقت کیا رہ جاتی ہے؟

اس حقیقت کا دوسرا رخ یہ ہے کہ اس میں ان لوگوں کے لئے ایک خوفناک تہدید ہے جو مومنین کو دھوکہ دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کے خلاف سازشیں کرتے ہیں اور ان کی ایذا رسانی کے درپے ہوتے ہیں۔ انہیں کہا جا رہا ہے کہ ان کی یہ جنگ صرف مومنین کے خلاف ہی نہیں بلکہ وہ درحقیقت اس ذات اقدس کے خلاف صف آرا ہیں جو قوی و متین ہے اور قہار و جبار ہے۔ اللہ کے دوستوں سے بر سرپیکار ہو کر وہ دراصل اللہ کے خلاف لڑ رہے ہیں اور اپنی ان ذلیلانہ سرگرمیوں کی وجہ سے اللہ کے قہر و غضب کے مستحق بن رہے ہیں۔

مومنین کا یہ فرض ہے کہ وہ اس حقیقت عظمیٰ کے ان دونوں پہلوؤں پر اچھی طرح غور و فکر کریں تاکہ انہیں اطمینان و ثبات حاصل ہو اور وہ ٹھیک ٹھیک اپنی منزل کی طرف بڑھتے رہیں اور دھوکہ بازوں کے دھوکوں' سازشیوں کی سازشوں اور اشرار کی ایذا رسانیوں کی کوئی پروا نہ کریں۔ مومنین کے دشمنوں کو بھی ایک لمحہ کے لئے اس حقیقت پر غور کر لینا چاہئے۔ انہیں چاہئے کہ وہ سوچ لیں کہ وہ کس کے ساتھ بر سرپیکار ہیں اور کس ذات کے قہر و غضب کا مستحق بن رہے ہیں۔ انہیں اس بات سے ڈرنا چاہئے کہ مومنین کے درپے آزار ہو کر وہ کیا خطرہ مول لے رہے ہیں؟

اب ہم دوبارہ ان لوگوں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جو بزعم خود مومنین کو دھوکہ دینا چاہتے ہیں اور اپنے کو غایت درجے کا ذہین اور معاملہ فہم تصور کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم اللہ اور یوم آخرت پر ایمان لائے ہیں۔ لیکن ملاحظہ کیجئے کہ آیت کے اختتام سے پہلے ہی وہ کس عظیم مذاق کا شکار ہو جاتے ہیں۔

وَمَا يَخْدَعُونَ إِلَّآ أَنفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُونَ ۝ "مگر دراصل وہ اپنے آپ ہی کو دھوکہ دے رہے ہیں اور انہیں اس کا شعور نہیں یعنی وہ اس قدر غافل ہیں کہ خود اپنے آپ کو دھوکہ دے رہے ہیں اور انہیں اس کا شعور تک نہیں اور اللہ ان کی سب حرکات سے باخبر ہے۔ رہے مومنین تو وہ براہ راست اللہ تعالیٰ کی حفاظت میں ہیں اور ان کے اس ذلیلانہ مکر و فریب سے وہ خود انہیں بچا رہا ہے۔ لیکن یہ نادان خواہ مخواہ دھوکہ کھا رہے ہیں۔ اور اپنے آپ کو برائی اور گناہوں سے ملوث کر رہے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ روش نفاق اختیار کر کے انہوں نے بہت نفع بخش سودا کیا ہے۔ اور اس سے انہیں کافی فائدہ پہنچا لیکن اس طرح وہ مومنین کی سوسائٹی میں اعلان کفر جیسے مشکل کام سے بھی بچ گئے اور مومنین کے ساتھ نئے معاشرے کے مفادات بھی انہوں نے سمیٹ لئے۔ حالانکہ جس کفر کو وہ اپنے دل میں چھپا رہے ہیں وہ انہیں ہلاکت کے گڑھے کی طرف لے جا رہا ہے۔ ان کا نفاق ان کے لئے تباہی کا سامان ہے اور اس کی وجہ سے وہ ایک نہایت نامسعود انجام تک پہنچنے والے ہیں۔

لیکن سوال یہ ہے کہ منافقین یہ حرکت کیوں کرتے ہیں۔ روش نفاق اختیار کر کے وہ مومنین کو یہ دھوکہ کیوں دینا چاہتے ہیں؟ اس لئے کہ فِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ "ان کے دلوں میں بیماری ہے۔" ان کے دلوں کو یہ روگ لگ گیا ہے۔ دماغوں پر یہ آفت آن پڑی ہے اور یہ انہیں حق کی راہ مستقیم پر چلنے نہیں دیتی۔ اس کی وجہ سے وہ پھر اس بات کے مستحق ہو جاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا قانون قدرت ان کے اس روگ کو اور زیادہ کر دے فَزَادَهُمُ اللَّهُ مَرَضًا "ان کی اس بیماری کو اللہ نے اور بڑھا دیا۔" ظاہر ہے کہ ایک بیماری دوسری کو

جنم دیتی ہے۔ گمراہی ابتدا میں نہایت معمولی ہوتی ہے اور جونہی اس کے خطوط و حدود آگے بڑھتے ہیں اس کا زاویہ وسیع تر ہوتا جاتا ہے۔ یہ اللہ کا قانون قدرت ہے' جو ہر جگہ جاری و ساری ہے۔ یہ قانون فطرت انسانی سوچ اور طرز عمل' تمام چیزوں اور تمام حالات میں جاری ہے۔ وہ خود ایک معلوم و معروف انجام کی طرف چلے جا رہے ہیں۔ وہ انجام جو ان سب لوگوں کے لئے مقدر ہے جو اللہ اور مومنین کو دھوکہ دینا چاہتے ہیں۔ وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌۢ ۙ بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ ۝

"یہ جھوٹ بولتے ہیں اور اس کی پاداش میں ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔" ان کی اہم صفات میں سے یہ دوسری صفت ہے' بالخصوص ان لوگوں کی جو ان میں سرکردہ تھے اور ہجرت رسول ﷺ سے قبل اپنی قوم اور قبیلے میں سرداری کے مناصب پر فائز تھے مثلاً عبداللہ ابن ابی ابن سلول۔ ان کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ مومنین کے خلاف دل میں گہرا کینہ رکھتے تھے اور جو فتنہ و فساد برپا کرتے تھے اس کے لئے تاویلیں پیش کرتے اور اپنے ان کارناموں پر ہر قسم کی سزا و مواخذہ سے بچ کر پھولے نہ سماتے۔

وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ ۙ قَالُوْٓا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ ۝ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَ لٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ۝

"جب کبھی ان سے یہ کہا گیا کہ زمین میں فساد برپا نہ کرو تو انہوں نے یہی کہا کہ ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں۔ خبردار! حقیقت میں یہی لوگ مفسد ہیں مگر انہیں شعور نہیں۔"

گویا یہ لوگ جھوٹ اور فریب پر ہی اکتفا نہیں کرتے بلکہ وہ مومنین کو بیوقوف سمجھتے ہوئے الٹا یہ دعویٰ بھی کرتے ہیں کہ ہم تو مصلح ہیں وہ اس نصیحت کا کہ "زمین میں فساد نہ کرو۔" یہ سادہ جواب نہیں دیتے کہ "بھائی ہم کب فساد برپا کر رہے ہیں؟ بلکہ وہ اکڑ کر یہ ادعا کرتے ہیں کہ "مصلح تو ہیں ہی ہم۔"

ہر دور اور ہر زمانے میں لوگوں کی یہ قسم دیکھنے میں آتی ہے کہ وہ عملاً فساد کی بدترین شکلیں برپا کر رہی ہوتی ہے اور اس کا دعویٰ یہ ہوتا ہے کہ ہم تو بس اصلاح معاشرہ چاہتے ہیں جب معاشرہ میں بلند اقدار تباہ ہوتی ہیں تو ایسے لوگ پیدا ہوتے ہیں۔ وہ اخلاص اور پاکیزگی نفس سے محروم ہوتے ہیں اور جب اخلاص جاتا رہے اور نفس انسانی میں فساد پیدا ہو جائے تو تمام اعلیٰ قدریں اور حسن و قبح کے پیمانے از خود ختم ہو جاتے ہیں اور جن لوگوں کے دلوں میں خلوص اور ایمان نہ رہے۔ وہ کبھی بھی فساد فکر و عمل کا شعور نہیں پا سکتے اور ان کے دل و دماغ میں خیر و شر اور اصلاح و فساد کا جو پیمانہ ہوتا ہے' وہ ان کی خواہشات نفسانی کی طرف جھکتا رہتا ہے اور ربانی نظام حیات کی طرف مائل نہیں ہوتا۔ اسی لئے ان کے اس دعوے کا یہ سخت لیکن حقیقت پسندانہ جواب دیا جاتا ہے۔

اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَ لٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ۝ "خبردار! حقیقت میں یہی لوگ مفسد ہیں مگر انہیں شعور نہیں ہے۔"

ان لوگوں کی خصوصیات میں سے ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ کبر و غرور میں مبتلا ہوتے ہیں اور اپنے آپ کو عوام الناس سے اونچے درجے (Upper Class) کے لوگ سمجھتے ہیں اور لوگوں کے دلوں میں اپنا جھوٹا وقار قائم رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ كَمَآ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ ۭ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَآءُ وَ لٰكِنْ لَّا يَعْلَمُوْنَ

"اور جب ان سے کہا گیا کہ جس طرح دوسرے لوگ ایمان لائے ہیں اسی طرح تم بھی ایمان لاؤ تو انہوں نے جواب دیا کہ ہم بے وقوفوں کی طرح ایمان لائیں؟ خبردار حقیقت میں تو یہ خود بے وقوف ہیں مگر یہ جانتے نہیں۔"

حقیقت یہ ہے کہ مدینہ طیبہ میں منافقین کو جس چیز کی طرف بلایا جا رہا تھا وہ یہ تھی کہ وہ مخلصانہ طور پر ایمان لے آئیں اور اپنے ایمان کو ذاتی خواہشات سے پاک کر دیں۔ جس طرح دوسرے مخلصین اپنی انفرادیت ختم کر کے پوری طرح اسلام کے اندر جذب ہو گئے

تھے۔ اور انہوں نے اللہ کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا تھا اور انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے اپنے دلوں کے تمام دریچے کھول دیئے تھے۔ آپ ﷺ انہیں جو ہدایت بھی دیتے وہ اخلاص اور بے نفسی سے لبیک کہتے تھے۔ چنانچہ منافقین کو دعوت دی جارہی تھی کہ وہ بھی ان لوگوں کی طرح اخلاص ' استقامت اور واضح اور صاف دل و دماغ کے ساتھ ایمان لائیں۔

لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ یہ منافقین ان معنوں میں نبی کریم ﷺ کے سامنے پوری طرح جھکنے کے لئے تیار نہ تھے۔ وہ اپنے آپ کو اعلیٰ طبقے (Upper Class) کے لوگ سمجھتے تھے۔ اور کہتے تھے کہ ان کے لئے تسلیم و رضا کی یہ کیفیت ضروری نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مومنین کے بارے میں کہتے تھے کہ کیا ہم ان بیوقوفوں کی طرح اندھی اطاعت کرتے پھریں اور قرآن نے بھی اس سختی ' تاکید اور جزم کے ساتھ ان کے اس زعم باطل کی تردید کی۔ "خبردار! حقیقت میں تو یہ خود بے وقوف ہیں مگر جانتے نہیں۔"

سوال یہ ہے کہ کوئی بے وقوف کبھی یہ سمجھا ہے کہ وہ بے وقوف ہے ' یا کوئی گمراہ کبھی یہ شعور رکھتا ہے کہ وہ جادہ مستقیم سے ہٹ چکا ہے۔

اس کے بعد اب منافقین کی آخری صفت کو بیان کیا جاتا ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ یہ لوگ صرف جھوٹ ' فریب کاری ' تحقیر مسلمین اور ادعاء و تعلی ہی میں مبتلا نہیں بلکہ ان مذموم صفات کے ساتھ ساتھ وہ پست ہمت ' لئیم ' سازشی اور مکار بھی ہیں۔ ان کی حالت یہ ہے کہ وَ اِذَا لَقُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚۖ وَ اِذَا خَلَوْا اِلٰی شَیٰطِیْنِهِمْ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ ۙ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ۝

"جب یہ اہل ایمان سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ اصل میں تو ہم تمہارے ساتھ ہیں اور ان لوگوں سے محض مذاق کر رہے ہیں۔"

بعض لوگ اس ذلت اور کمینگی کو قوت اور حکمت سمجھتے ہیں ' مکر و فریب ان کے خیال میں غایت درجے کی فراست و سیاست ہوتی ہے۔ حالانکہ یہ چیز درحقیقت بے چارگی اور خسیس پنے کی آخری حد ہوتی ہے۔ ایک پر شوکت اور قوی انسان کبھی کمینہ اور خبیث النفس نہیں ہو سکتا۔ نہ اسے مکر اور فریب کی ضرورت پڑتی ہے۔ نہ اسے اس بات کی ضرورت پڑتی ہے کہ وہ تنہائی میں چغل خوریاں کرے اور طعنے اور طنز سے دل کا غبار نکالے۔ ان منافقین کا حال یہ تھا کہ وہ کھلم کھلا مسلمانوں کا سامنا کرنے سے کترا رہے تھے اور مومنین سے مل کر اپنی طرف سے بھی اس بات کا اظہار کر رہے تھے کہ ہم مومن ہیں تاکہ اس طرح وہ مومنین کی جانب سے ہر قسم کی اذیت سے محفوظ رہیں اور اس طرح محفوظ و مامون ہو کر مومنین کے خلاف نیش زنی کرتے رہیں۔ یہ لوگ جب اپنے شیاطین کے پاس جاتے ' (جو غالباً یہود ہوا کرتے تھے ' اور جنہیں ایسے لوگوں میں سے ایسے کئی افراد مل جاتے تھے جو اسلامی صفوں میں انتشار و اختلاف پھیلانے کے لئے استعمال ہوں۔ دوسری طرف سے یہودی بھی ایسے لوگوں کے لئے ایک سہارے اور ملجاو ماویٰ کا کام کرتے تھے۔ چنانچہ یہ منافقین "جب علیحدگی میں اپنے شیطانوں سے ملتے تو کہتے کہ اصل میں ہم تو تمہارے ساتھ ہیں اور ان لوگوں سے محض مذاق کر رہے ہیں۔" مومنین سے ان کا مذاق یہ تھا کہ وہ ایمان اور تصدیق قلبی کا اقرار کرتے تھے اور سمجھتے تھے کہ بس مومنین کیا جانتے ہیں کہ ہم کیا ہیں۔

ان کی اس عیارانہ گفتگو اور مکارانہ طرز عمل کی وضاحت کے فوراً بعد قرآن کریم انہیں ایسی سخت ڈانٹ پلاتا ہے کہ اگر احساس ہو تو پہاڑ بھی مارے خوف کے کانپ اٹھیں۔

اَللّٰهُ یَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَ یَمُدُّهُمْ فِیْ طُغْیَانِهِمْ یَعْمَهُوْنَ O "اللہ ان سے مذاق کر رہا ہے ' وہ ان کی رسی دراز کئے جاتا ہے اور یہ اپنی رو میں اندھوں کی طرح بھٹکتے چلے جاتے ہیں۔" کس قدر بدبخت ہے وہ شخص کہ آسمان و زمین کا قہار و جبار جس کے ساتھ مذاق کر رہا ہے؟ اس سے بڑی شقاوت کوئی اور نہیں "اللہ ان کی رسی دراز کئے جارہا ہے اور یہ اپنی سرکشی میں اندھوں کی طرح بھٹکتے ہیں۔" جب ایک حساس انسان ان الفاظ پر غور کرتا ہے اور مرکب خیال جولانی دکھاتا ہے تو یہاں آکر وہ نہایت ہی خوفناک اور کپکپادینے والے منظر کے سامنے بے حس و حرکت کھڑا ہو جاتا ہے۔ یہ اس قدر خوفناک انجام ہے جس سے دل دہل جاتے ہیں اور بدن پر رونگٹے

کھڑے ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ ان مکاریوں کو یوں اپنے حال پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ نہ ان کا کوئی مرشد ہے' نہ کوئی راہ بھائی دیتی ہے' نہ ان کے سامنے کوئی مقصد ہے۔ یہ لوگ اسی سرگردانی کی حالت ہی میں ہوتے ہیں کہ اللہ کا دست قدرت انہیں اپنی شدید گرفت میں لے لیتا ہے اور یہ چوہوں کی طرح غفلت ولاپرواہی کے عالم میں جال میں کود جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی جانب سے یہ ایک خوفناک انجام ہے اور اس کے مقابلے میں اس مذاق کی کوئی حیثیت نہیں ہے جو یہ اپنے خیال کے مطابق کر رہے ہیں۔

یہاں اس حقیقت کا اظہار ہو رہا ہے جس کی طرف ہم پہلے بھی اشارہ کر آئے ہیں کہ کفر و اسلام کے معرکے میں خود اللہ تعالیٰ مومنین کا والی اور مددگار ہوتا ہے۔ اللہ کے دوستوں اور بندوں کے لئے اس کی اس سرپرستی میں اگر طمانیت قلب کا ایک عظیم سرمایہ ہے تو خدا تعالیٰ کے مخبوط الحواس' غافل اور راندہ درگاہ دشمنوں کے لئے انجام بد اور ایک خوفناک پایان کار کی نشاندہی ہے' جو اس لئے دھوکہ کھائے ہوئے ہیں کہ اللہ ان کے لئے رسی دراز کئے جا رہا ہے اور وہ اپنی سرکشی اور گمراہی میں سرگرداں ہیں۔ یہ اندھے ہو رہے ہیں' غفلت میں ڈوبے جا رہے ہیں' حالانکہ ایک خوفناک انجام ان کا منتظر ہے۔

اب قرآن کریم چند آخری کلمات میں ان کی حقیقت حال اور ان کے اس خسارے کو بیان کرتا ہے جو ان کی اس روش کی وجہ سے انہیں پہنچ رہا ہے۔ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الضَّلَالَةَ بِالْهُدَىٰ فَمَا رَبِحَت تِّجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوا مُهْتَدِينَ ﴿١٦﴾

"یہ لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی خرید لی ہے مگر یہ سودا ان کے لئے نفع بخش نہیں ہے اور یہ ہرگز صحیح راستے پر نہیں ہیں۔" اگر وہ چاہتے تو ہدایت کی راہ ان کے پاس تھی۔ ان پر ہدایت کے دریا بہا دیئے گئے تھے۔ یہ ان کے ہاتھ میں تھی لیکن انہوں نے اپنی مرضی سے ہدایت دے کر اس کے بدلے ضلالت خرید لی۔ جیسا کہ ایک غافل تاجر کا انجام ہوتا ہے۔ ویسا ہی انجام ان کا بھی ہوا۔ اس سودے میں انہیں کوئی نفع نہ ہوا اور ہدایت بھی ہاتھ سے جاتی رہی۔

آپ نے دیکھا کہ قرآن نے ان آیات میں تین قسم کے لوگوں کی تصویر کشی کی ہے۔ ان میں سے اس تیسرے فریق نے لوح قرطاس میں نسبتاً زیادہ وسیع جگہ لی۔ اس کے اس وسیع خاکے میں ہمیں مختلف رنگ بھرے ہوئے نظر آتے ہیں' جو پہلی اور دوسری تصویر میں نہیں ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پہلی اور دوسری تصویر میں جو لوگ دکھائے گئے ہیں ان کی راہ و رسم کسی نہ کسی شکل میں متعین ہے۔ وہ سیدھی طرح ایک مخصوص روش پر قائم ہیں۔ پہلی تصویر میں ایک ایسا کردار نظر آتا ہے جو فکر مستقیم کا مالک ہے۔ ایک سیدھی راہ ہے جس پر وہ بالکل سیدھا جا رہا ہے۔ دوسری تصویر میں ایک نابینا شخص دکھایا گیا ہے جو حیران و سرگردان ہے اور اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مار رہا ہے۔ لیکن تیسرے شخص کی نفسیاتی حالت اس قدر پیچیدہ اس کا دل اس قدر بیمار ہے اور فکر اس قدر پریشان ہے کہ اس پر مزید آخری' ایک آخری تبصرے کی ضرورت ہے۔ اس تصویر میں کچھ مزید خاکے ہیں اور ان میں رنگ بھرے گئے ہیں تاکہ اس گروہ کی مکروہ اور متلون شخصیت کے خدوخال اچھی طرح واضح ہو سکیں۔

اس تفصیلی بحث سے ایک طرف تو وہ کردار بھی اچھی طرح ہمارے سامنے آ جاتا ہے جو منافقین مدینہ' فدائیان اسلام کی ایذا رسانی' ان کے اندر انتشار اور بے چینی پھیلانے کے سلسلے میں ادا کر رہے تھے۔ دوسری طرف اسلامی جماعت کو متنبہ کر دیا جاتا ہے کہ ہر دور میں ایک منافق' نظم جماعت کے لئے کس قدر خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ اور اسلامی جماعت میں ان منافقین کی پردہ دری اور ان کی سازشوں کو بے نقاب کرنے کی کتنی اہمیت و ضرورت ہے۔

چنانچہ مزید وضاحت کی خاطر قرآن کریم مثالیں دے کر اس گروہ کی نفسیات' اس کے مزاج کے تلون' اس کی بے ثباتی اور قلابازیوں کی مزید نشاندہی کرتا ہے کہ ایسے افراد کے خدوخال نکھر کر ہمارے سامنے آ جائیں۔

مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا ۚ فَلَمَّآ أَضَآءَتْ مَا حَوْلَهُ ذَهَبَ اللَّهُ بِنُورِهِمْ وَتَرَكَهُمْ فِي ظُلُمَٰتٍ لَّا يُبْصِرُونَ ۝ صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُونَ ۝ "ان کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص نے آگ روشن کی اور جب سارا ماحول چمک اٹھاتو اللہ نے ان کا نور بصارت سلب کر لیااور انہیں اس حال میں چھوڑ دیا کہ تاریکیوں میں انہیں کچھ نظر نہیں آتا۔ یہ بہرے ہیں گونگے ہیں' اندھے ہیں' اسی لئے یہ اب نہ پلٹیں گے۔" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتداء میں ان کا رویہ ایسانہ تھا کہ انہوں نے ہدایت سے اعراض کیا ہو' یا اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لی ہوں' آنکھیں بند کر لی ہوں اور نہ یہ صورت تھی کہ انہوں نے اس تحریک کے مطالعے سے انکار کیا ہو جیسا کہ کفار نے کیا لیکن بعد میں انہوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی کو پسند کر لیا اور یہ فیصلہ انہوں نے سوچ سمجھ کر غور و خوض کے بعد کیا۔ انہوں نے آگ جلائی۔ اس نے ان کے ماحول کو روشن بھی کیا لیکن انہوں نے اس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا حالانکہ وہ روشنی کے متلاشی تھے۔ جب ان لوگوں نے اپنی مطلوب روشنی کو پاکر بھی اس سے منہ موڑا تو اللہ نے ان کے اس رویئے کی وجہ سے ان کا نور بصارت ہی سلب کر لیا اور انہیں اس حال میں چھوڑ دیا کہ تاریکی میں بھٹکتے پھریں کیونکہ انہوں نے عین اس چیز سے منہ موڑا جس کے وہ طالب تھے۔

اللہ نے انسان کو آنکھ' کان اور زبان دی ہی اس لئے ہے کہ انسان بات سن سکے' روشنی کو دیکھ سکے اور نور ہدایت سے فائدہ اٹھائے۔ لیکن انہوں نے اپنے کانوں سے کام نہ لیا۔ پس بہرے قرار پائے۔ انہوں نے اپنی زبان سے کام نہ لیا۔ پس گونگے قرار دیئے گئے' انہوں نے آنکھوں سے دیکھنا ہی بند کر دیا لہذا اندھے بن گئے۔ ظاہر ہے کہ ایسے حالات میں ان کے لئے ممکن نہیں ہے کہ وہ حق کی طرف لوٹ سکیں' راہ ہدایت کی طرف مڑ سکیں اور صداقت کی اس روشنی کو دیکھ سکیں۔

اب ایک دوسری تمثیل کے ذریعے ان کی نفسیاتی صور تحال کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔ جس سے ان کے اندرونی اضطراب' حیرت اور خوف و بے چینی کا اظہار ہوتا ہے۔ أَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ .... إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝

"یا پھر ان کی مثال یوں سمجھو کہ آسمان سے زور کی بارش ہو رہی ہے' اور اس کے ساتھ اندھیری گھٹا اور کڑک اور چمک بھی ہے۔ یہ بجلی کے کڑاکے سن کر اپنی جانوں کے خوف سے کانوں میں انگلیاں ٹھونسے لیتے ہیں اور اللہ ان منکرین حق کو ہر طرف سے گھیرے میں لئے ہوئے ہے۔ چمک سے ان کی حالت یہ ہو رہی ہے کہ گویا عنقریب بجلی ان کی بصارت لے جائے۔ جب ذرا کچھ روشنی انہیں محسوس ہوتی ہے تو اس میں کچھ دور چل لیتے ہیں۔ جب ان پر اندھیرا چھا جاتا ہے تو کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اللہ چاہتا تو ان کی سماعت اور بصارت بالکل ہی سلب کر لیتا' یقیناوہ ہر چیز پر قادر ہے۔

عجیب منظر ہے یہ بھی' جس دوڑ بھاگ' قلق و اضطراب' گمراہی و ضلالت' خوف و رعب' جزع و فزع' حیرانی و پریشانی' چمک دمک اور چیخ و پکار کی مختلف تصویریں رواں اور دواں نظر آتی ہیں۔ آسمان سے موسلادھار بارش ہو رہی ہے اور اس کے ساتھ اندھیری گھٹائیں اور تیز چمک اور بجلی کے کڑاکے کی سخت آوازیں ہیں۔ کچھ لوگ ہیں جو اس تیز چمک کی روشنی میں آگے بڑھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اچانک اندھیرا ہو جاتا ہے۔ بے چارے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ حیران و پریشان ہیں' نہیں جانتے کہ کدھر جائیں۔ مارے خوف کے کانپ رہے ہیں اور بجلی کے کڑاکے سن کر جان نکلی جا رہی ہے اور اس کی وجہ سے کانوں میں انگلیاں ٹھونسے لیتے ہیں۔

پورا منظر اس تگ و تاز سے بھرا ہوا ہے' موسلادھار بارش' تاریکیاں' کڑک اور چمک' خوفزدہ اور پریشان مسافر جو ڈرتے ڈرتے کچھ قدم آگے بڑھاتے ہیں اور اندھیرا آتے ہی رک جاتے ہیں۔ اس پورے منظر سے قرآن کریم یہ مثبت تاثر دینا چاہتا ہے کہ منافقین کس طرح قلق و اضطراب' حیرانی و پریشانی' گمراہی و سرگردانی کا شکار ہیں۔ ادھر مومنین سے ملتے ہیں۔ ادھر اپنے شیاطین سے بھی ان کی ملاقات ہے۔

ادھر اقرار حق ہے تو ایک لحظہ بعد انکار اور سرکشی ہے۔ وہ نور اور ہدایت کے متلاشی ہیں۔ لیکن عملاً وہ اندھیروں اور گمراہیوں میں پھنسے ہوئے ہیں۔ یہ ایک انتہائی محسوس تمثیل اور منظر ہے لیکن منافقین کی خفیہ ترین نفسیاتی صورت حال کو آئینہ دکھا رہا ہے۔ شعوری صور تحال کو مجسم شکل میں ظاہر کر رہا ہے۔ یہ قرآن مجید کا ایک مخصوص اور عجیب اسلوب بیان ہے۔ قرآن کریم نفسیاتی اور الجھی ہوئی ذہنی کیفیات کو اس طرح مخصوص انداز میں بیان کرتا ہے کہ وہ مجسم شکل میں آنکھوں کے سامنے کھڑی ہوئی نظر آتی ہیں۔ا۔

مذکورہ بالا تین قسم کے لوگوں کی تصویر کشی کے بعد سیاق کلام اب پوری انسانیت کو دعوت دینے کی طرف مڑ جاتا ہے۔ پوری انسانیت سے کہا جاتا ہے کہ وہ ان تین تصاویر میں سے سیدھی اور شریفانہ 'پاک و خالص' سرگرم عمل اور نفع بخش اور ہدایت یافتہ اور کامیاب تصویر یعنی متقین کی تصویر کو اختیار کرے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ﴿٢١﴾ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ فِرَاشًا وَالسَّمَاءَ بِنَاءً وَأَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجَ بِهِ مِنَ الثَّمَرَاتِ رِزْقًا لَكُمْ ۖ فَلَا تَجْعَلُوا لِلَّهِ أَنْدَادًا ۔

"اے لوگو! بندگی اختیار کرو اپنے اس رب کی جو تمہارا اور تم سے پہلے جو لوگ ہو گذرے ہیں 'ان سب کا خالق ہے' تمہارے بچنے کی توقع اسی صورت سے ہو سکتی ہے۔ وہی تو ہے 'جس نے تمہارے لئے زمین کا فرش بچھایا' آسمان کی چھت بنائی 'اوپر سے پانی برسایا اور اس کے ذریعے سے ہر طرح کی پیداوار نکال کر تمہارے لئے رزق بہم پہنچایا۔ پس جب تم یہ جانتے ہو تو دوسروں کو اللہ کا مد مقابل نہ ٹھہراؤ۔"

اب گویا یہ تمام لوگوں کو دعوت ہے کہ وہ اس رب واحد کی بندگی میں داخل ہو جائیں جس نے انہیں پیدا کیا ہے۔ اور اسی نے ان کے آباؤ و اجداد کو بھی پیدا کیا ہے۔ وہ ایسا رب ہے جو اکیلا اس کائنات کا خالق ہے لہٰذا صرف وہی اس بات کا مستحق ہے کہ اس کی بندگی کی جائے۔ اور اس کی بندگی کا ایک خاص مقصد ہے اور توقع ہے کہ اللہ کی بندگی کر کے لوگ اس مقصد تک جا پہنچیں اور اسے حاصل کر لیں۔ اور وہ مقصد ہے لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ﴿٢١﴾ "تاکہ تم پرہیز گار بن جاؤ۔" تم انسانی زندگی کا وہ نقشہ اختیار کر لو جو پسندیدہ ہے اور جو خدا کو پسند ہے۔ یعنی اللہ کی بندگی کرنے والوں اور اس سے ڈرنے والوں کا نقش حیات 'جنہوں نے اللہ کی خلاقیت اور ربوبیت کا حق صحیح طرح ادا کر دیا' صرف ایک خالق کی بندگی کی' جو تم حاضر اور گذشتہ لوگوں کا خالق ہے۔ اور جس نے آسمان و زمین کے وسائل کے ذریعہ ان کے رزق کا بندوبست کیا اور اس کام میں اس کا نہ کوئی مساوی ہے اور نہ شریک۔ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ فِرَاشًا "جس نے تمہارے لئے زمین کا فرش بچھایا۔"

اس تعبیر سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زمین پر انسانی حیات کو بے حد سہل بنایا ہے۔ زمین کو اس طرح بنایا کہ وہ انسانوں کے لئے خوشگوار رہائش گاہ ہو اور فرش کی طرح محفوظ جائے قیام ہو۔ لیکن انسان چونکہ ایک طویل عرصے تک یہاں رہتے ہیں۔ اس لئے ان کے شعور سے زمین و آسمان کی یہ خوشگواری محو ہو جاتی ہے۔ وہ اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے وسائل حیات فراہم کرنے کے واسطے اس زمین کے موسم کو ان کے لئے کیسا موافق اور خوشگوار بنایا ہے' اور ان کے لئے اس جہاں میں آرام اور آسائش کے کیا کیا ذرائع بہم پہنچائے ہیں۔ اگر یہ وسائل نہ ہوتے تو اس کرہ ارض پر ان کی زندگی اس قدر خوشگوار' سہل اور پر سکون نہ ہوتی۔ اس کائنات کے عناصر ترکیبی میں سے اگر کوئی ایک عنصر بھی غائب ہو جائے تو یہاں کا ماحول اس قدر تبدیل ہو جائے کہ اس میں اس پوری انسانیت کی نشوونما محال ہو جائے۔ صرف ہوا ہی کی مثال لیجئے کہ جن مقررہ عناصر پر یہ مشتمل ہے' اگر ان میں ذرہ بھر کمی ہو جائے تو لوگوں کے لئے زمین پر سانس لینا دشوار ہو جائے۔ اگرچہ انہوں نے ابھی زندہ رہنا ہے۔

ا۔ دیکھئے میری کتاب التصویر الفنی۔ فی القرآن کی فصل حسی تمثیل و تخییل

وَّ السَّمَآءَ بِنَآءً "اور آسمان کو چھت بنایا" یعنی آسمان ایک چھت کی طرح موزوں اور پختہ ہے۔ اسی زمین میں انسان کی زندگی اور اس زندگی کی آسائشوں کے ساتھ آسمان کو گہرا ربطہ ہے۔ آسمان کی حرارت اجرام فلکی کی جاذبیت اور توازن وغیرہ غرض زمین و آسمان کے تمام طبعی روابط ممد حیات ہیں اور اس زمین میں قیام حیات کے لئے تمہید اور خشت اول ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن میں جب بھی اس جہان کے خالق کی قدرت کا بیان ہوتا ہے' انسان کے رازق کی کبریائی بیان ہوتی ہے اور یہ کہا جاتا ہے کہ تمام مخلوق اور تمام انسانوں کا یہ فرض ہے کہ وہ صرف اسی کی عبادت کریں۔ چنانچہ تمام ایسے مواقع پر اللہ کے ایسے احسانات کا ذکر ہوتا ہے۔ وَّ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ "اوپر سے پانی برسایا اور اس کے ذریعے سے ہر طرح کی پیداوار نکال کر تمہارے لیے رزق بہم پہنچایا۔"

اللہ جل شانہ کی قدرت اور اس کے انعامات کے تذکرے کے ضمن میں' آسمان سے پانی برسانے اور اس کے ذریعے مختلف قسم کی پیداوار نکالنے کا ذکر قرآن مجید کے متعدد مقامات میں کیا گیا ہے۔ چنانچہ آسمان سے اترنے والا پانی' طبعی نقطہ نظر سے بھی اس زمین پر قیام حیات کا بنیادی عنصر ہے۔ زمین پر زندگی اپنی مختلف شکلوں اور درجوں میں' اسی پانی کی رہین منت ہے۔ قرآن مجید میں ہے **وَ جَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ** "اور ہم نے ہر چیز کو پانی سے زندہ بنایا۔" کبھی تو یہ پانی بارش کی صورت میں کھیتوں کو سیراب کرتا ہے' کبھی وہ میٹھی ندیوں اور نہروں کی صورت میں بہتا ہے۔ اور کبھی وہ زمین کی رگوں میں سرایت کر جاتا ہے اور چشموں اور کنوؤں کی صورت میں نمودار ہوتا ہے اور آلات کے ذریعے زراعت اور کھیتی باڑی کے کام میں استعمال ہوتا ہے۔

زمین میں پانی کی اہمیت' یہاں بقائے حیات میں اس کا کردار اور مختلف چیزوں کی زندگی کا اس پر موقوف ہونا' ایک ایسی بدیہی اور مسلم بات ہے جس کی طرف اشارہ اور یاد دہانی ہی کافی ہے۔ مقصد یہ ہے کہ اللہ جو ہمارا خالق اور رازق ہے اور جس نے یہ تمام نعمتیں ہمیں بخشی ہیں وہ اس بات کا مستحق ہے کہ ہم صرف اسی کی بندگی کریں۔

اس طریقہ دعوت سے' اسلامی تصور حیات کے دو اہم اصول خود بخود واضح ہو جاتے ہیں' ایک یہ کہ اس پوری کائنات کا خالق ایک ہے۔ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ "جس نے تمہیں اور تم سے پہلے جو لوگ ہو گذرے ہیں' ان سب کو پیدا کیا۔" یعنی یہ کائنات ایک ہے' اس کی اکائیوں اور اجزا کے درمیان مکمل ہم آہنگی ہے اور وہ انسان اور زندگی کے لئے معین و مددگار ہے۔

الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّ السَّمَآءَ بِنَآءً وَّ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ "وہی تو ہے جس نے تمہارے لئے زمین کا فرش بچھایا' آسمان کی چھت بنائی' اوپر سے پانی برسایا اور اس کے ذریعے سے ہر طرح کی پیداوار نکال کر تمہارے لئے رزق بہم پہنچایا۔" زمین ایک تخت کی طرح بچھی ہوئی ہے۔ اس کی فضاؤں کا نظام قانون قدرت میں بندھا ہوا ہے۔ اس کے ذریعہ آبپاشی کا ایسا انتظام کیا گیا ہے کہ روئے زمین پر لوگوں کی ضروریات کی فراہمی کے لئے ہر قسم کی پیداواروں کا بندوبست کر دیا گیا ہے۔ یہ سب کچھ کس کے لئے؟ حضرت انسان کے لئے۔ اور یہ سب کچھ اس کائنات کے خالق وحدہ لاشریک کا کمال ہے۔

فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ O "پس جب تم یہ جانتے ہو تو دوسروں کو اللہ کا مد مقابل نہ ٹھہراؤ۔" تم اچھی طرح جانتے ہو کہ اس نے تمہیں پیدا کیا۔ تم سے قبل جو لوگ ہو گذرے ہیں ان سب کو پیدا کیا۔ تم جانتے ہو کہ اسی نے تمہارے لئے زمین کو فرش بنایا اور آسمان کو چھت بنایا۔ آسمان سے پانی اتارا اور اس پورے کام میں اس کا کوئی مددگار نہ تھا جو اس کام میں اس کا ہاتھ بٹاتا۔ نہ کوئی مد مقابل تھا جو اس کی کسی بات کی مخالفت کرتا۔ لہٰذا اس علم کے بعد بھی اس کے ساتھ کسی کو شریک کرنا نہایت ہی نامناسب طرز عمل ہے۔

عقیدہ توحید کو صاف و شفاف طریقے سے ذہنوں میں بٹھانے کے لئے قرآن کریم' اللہ تعالیٰ کے جن شریکوں کی بار بار نفی اور تردید کرتا ہے' وہ ہمیشہ صرف اسی معروف صورت میں نہیں ہوتے کہ کچھ بت یا اشخاص ہوں جنہیں اللہ کا شریک بنا کر ان کی پوجا کی جائے بلکہ کبھی وہ

اس کے علاوہ دوسری خفی صورتوں میں بھی ہوتے ہیں۔ مثلاً اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی سے کسی قسم کی امید رکھنا یا اللہ کے سوا کسی سے کسی قسم کا خوف اپنے دل میں رکھنا بھی شرک ہوتا ہے۔ نیز یہ اعتقاد رکھنا بھی شرک ہے کہ اللہ کے سوا کوئی اور بھی نفع و نقصان پہنچا سکتا ہے۔ حضرت ابن عباس ﷺ فرماتے ہیں انداد شرک ہے اور یہ اس قدر خفی ہوتی ہے جس طرح اندھیری رات میں سیاہ پتھر پر چیونٹی کا آہستہ آہستہ چلنا پوشیدہ ہوتا ہے اور اس کی کئی صورتیں ہیں مثلاً کوئی کہے کہ "اے فلاں خدا کی قسم' میری جان کی قسم' تیری جان کی قسم۔" یا کوئی کہے "اگر گئی رات کتیانہ ہوتی تو چور ہمیں لوٹ لیتے۔" یا کوئی کہے "اگر گھر میں بطخ نہ ہوتی تو چور آجاتے۔" یا کوئی اپنے دوست سے کہے جو اللہ چاہے اور جو آپ چاہیں۔ یا کسی کا یہ کہنا کہ "اگر اللہ اور فلاں نہ ہوتے تو" غرض یہ سب اقوال شرک ہیں۔ نیز حدیث شریف میں آتا ہے کہ کسی شخص نے حضور ﷺ سے کہا "جو اللہ چاہے اور جو آپ ﷺ چاہیں۔" تو آپ ﷺ نے فرمایا "کیا تم مجھے اللہ کا شریک بنانا چاہتے ہو۔"

یہ تھا سلف صالحین کا نقطہ نظر شرک خفی اور اللہ کے شریکوں کے بارے میں ہمیں چاہئے کہ ہم ذرا گریبان میں سر ڈال کر اپنے حال پر غور کریں۔ کہاں سلف کا شرک کے بارے میں یہ شدید احساس اور کہاں ہم؟ کس قدر دور ہو گئے ہیں ہم عقیدہ توحید کی اس عظیم الشان سچائی سے؟

یہودیوں کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت میں شک تھا۔ منافقین بھی اس میں شک کرتے تھے اور مشرکین کی بھی یہی حالت تھی۔ قرآن کریم یہاں سب کو چیلنج دیتا ہے۔ اور ان کے سامنے ایک فیصلہ کن عملی تجربہ رکھ کر ان کو دعوت دیتا ہے کہ وہ اس قرآن جیسی کتاب بنا لائیں۔

وَ اِنۡ کُنۡتُمۡ فِیۡ رَیۡبٍ مِّمَّا نَزَّلۡنَا عَلٰی عَبۡدِنَا فَاۡتُوۡا بِسُوۡرَۃٍ مِّنۡ مِّثۡلِہٖ ۪ وَ ادۡعُوۡا شُہَدَآءَکُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ ﴿۲۳﴾ "اگر تمہیں اس امر میں شک ہے کہ یہ کتاب جو ہم نے اپنے بندے پر اتاری ہے' یہ ہماری ہے یا نہیں' تو اس کے مانند ایک ہی سورت بنا لاؤ' اپنے سارے ہم نواؤں کو بلا لو' ایک اللہ کو چھوڑ کر باقی جس جس کی چاہو مدد لے لو' اگر تم سچے ہو۔"

یہ چیلنج ایک خاص انداز سے شروع ہوتا ہے' جو اس مقام میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت عبودیت کا ذکر فرمایا ہے کہ ہم نے اپنے بندے پر جو کتاب اتاری ہے اگر تمہیں اس کے بارے میں شک ہے کہ وہ' ہماری جانب سے ہے یا نہیں تو تم اس جیسی کوئی کتاب بنا لاؤ۔

یہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو "اپنا بندہ" کہا گیا ہے' اس سے متعدد اور باہم مربوط باتوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ مثلاً یہ کہ آپؐ کو "ہمارا بندہ" کہہ کر آپ کی عظمت شان کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ اللہ کی بندگی اور غلامی' وہ بلند ترین اعزاز ہے جو کسی انسان کو یہاں دیا جا سکتا ہے اور جس پر کوئی فخر کر سکتا ہے۔ دوسرے یہ کہ نبی ﷺ کو اپنا بندہ اور غلام کہہ کر اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ ذات باری کے ساتھ کوئی شریک نہیں ہے اور نہ کوئی اس کا ہمسر ہے۔ بلکہ سب لوگ اسی کے بندے اور غلام ہیں اور تو اور حضرت نبی ﷺ پیغمبر اور مورد وحی ہونے کے باوجود اللہ کے غلام اور بندے ہیں اور انہیں اپنے اس اعزاز پر فخر ہے۔

اس چیلنج میں اس بات کو پیش نظر رکھا گیا ہے کہ سورہ کے آغاز میں حروف تہجی کا ذکر تھا۔ اور یہ کتاب انہی حروف کلمات سے مرکب ہے جو ان کی دسترس میں ہیں۔ اگر انہیں اس کتاب کے منزل من اللہ ہونے میں کوئی شبہ ہے تو یہ حروف ان کے پاس موجود ہیں۔ انہیں چاہئے کہ وہ اس جیسی کوئی ایک سورت مرتب کر کے لے آئیں۔ اور اس کام میں اپنے تمام ہمنواؤں اور مددگاروں سے بھی کام لیں تاکہ وہ اس سلسلے میں ان کے حق میں کوئی بات کریں۔ جہاں تک باری تعالیٰ کا تعلق ہے اس نے تو اپنے بندے کے حق میں گواہی دے دی ہے کہ وہ سچا ہے۔

یہ چیلنج جو مستشکمین قرآن کو دیا گیا حضور ﷺ کی پوری زندگی میں اور آپ ﷺ کے بعد قائم رہا۔ اور آج بھی ہمارے دور تک اسی طرح قائم ہے۔ یہ ایک ایسی دلیل ہے جس کا کسی کے پاس کوئی جواب نہیں ہے۔ آج تک قرآن کریم اور تمام انسانی تحریروں اور ادبی شہ پاروں کے درمیان واضح فرق قائم ہے اور قیامت تک یونہی رہے گا اور یہ فرق قیامت تک اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی تصدیق کرتا رہے گا۔

فَإِنْ لَّمْ تَفْعَلُوا وَلَنْ تَفْعَلُوا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِي وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ۖ أُعِدَّتْ لِلْكَافِرِينَ "لیکن اگر تم نے ایسا نہ کیا' اور یقیناً کبھی نہیں کر سکتے' تو ڈرو اس آگ سے' جس کا ایندھن بنیں گے انسان اور پتھر جو مہیا کی گئی ہے منکرین حق کے لئے۔

یہ چیلنج اگر عجیب ہے تو یہ جزم کہ اسے قیامت تک کوئی قبول ہی نہیں کر سکتا' اس سے عجیب تر ہے۔ اگر کفار کے بس میں یہ بات ہوتی کہ وہ اس جیسی کوئی کتاب بنا لائیں تو وہ ایک لحظہ کے لئے بھی توقف نہ کرتے۔ قرآن کا یہ کہہ دینا کہ "وہ یقیناً اس جیسی کتاب نہیں لا سکتے۔" اور اس کے بعد صدیوں تک فی الواقعہ مخالفین کا عاجز رہ جانا ہی اپنی جگہ ایک ایسا کھلا معجزہ ہے' جس میں کسی قسم کے شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں۔ یہ مخالفین کے لئے ایک عام چیلنج تھا۔ ان کے لئے میدان کھلا تھا۔ اگر وہ اس جیسی کوئی کتاب لے ہی آتے تو قرآن کا اعجاز ہمیشہ کے لئے ختم ہو سکتا تھا مگر وہ ایسا نہ کر سکے اور نہ ایسا کر ہی سکیں گے۔ اگرچہ ابتداً خطاب ایک نسل کو تھا لیکن دراصل یہ پوری انسانیت کو چیلنج دیا گیا تھا اور اعجاز قرآن اور حجیت قرآن کا تاریخی فیصلہ تھا۔

جو لوگ انسانی اسالیب کلام کا کسی قدر ذوق رکھتے ہیں۔ جنہیں' اس کائنات اور موجودات کے بارے میں انسانی تصورات سے کچھ بھی واقفیت ہے اور جو لوگ انسان کے بنائے ہوئے طریقوں اور نظاموں کے بارے میں کچھ بھی جانتے ہیں اور اس کے قائم کئے ہوئے نفسیاتی اور اجتماعی تصورات میں کسی قدر بھی درک رکھتے ہیں' وہ یقیناً اس بات کو اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ اس سلسلے میں قرآن جو کچھ کہتا ہے وہ بالکل ایک دوسری ہی چیز ہے اور اسے ان گھروندوں سے کوئی نسبت ہی نہیں ہے۔ جو یہ بے چارہ انسان بناتا رہتا ہے۔ اس بارے میں اگر کوئی شک و شبہ میں مبتلا ہے تو وہ جاہل ہے' اسے کھرے کھوٹے کی کوئی تمیز نہیں ہے یا وہ اپنے کسی مفاد کی خاطر حق و باطل کو گڈمڈ کر رہا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جو لوگ اس چیلنج کے مقابلے میں عاجز آگئے اور پھر بھی انہوں نے اس کھلی سچائی کو تسلیم نہ کیا ان کے بارے میں یہ وعید شدید آئی ہے۔

فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِي وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ۖ أُعِدَّتْ لِلْكَافِرِينَ "تو ڈرو اس آگ سے' جس کا ایندھن بنیں گے انسان اور پتھر جو مہیا کی گئی ہے منکرین حق کے لئے۔"

اس میں انسان پتھروں کے ساتھ کیوں جمع کئے گئے۔ اور پھر اس خوفناک اور ڈراؤنی صورت میں؟ اس لئے کہ وہ آگ منکرین حق کے لئے تیار کی گئی ہے۔ وہ منکرین جن کا ذکر اس صورت کے آغاز میں ان الفاظ میں کیا گیا تھا کہ "اللہ نے ان کے دلوں اور کانوں پر مہر لگا دی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردہ پڑا ہوا ہے۔" یہ وہی لوگ ہیں جنہیں قرآن کریم یہ چیلنج دیتا ہے کہ وہ اس کے قبول کرنے سے (صدیوں تک) عاجز آ جاتے ہیں لیکن پھر بھی دعوت حق کو قبول نہیں کرتے۔ اس لئے یہ لوگ بھی گویا اور پتھروں کی طرح پتھر ہیں' اگرچہ ظاہری صورت کے لحاظ سے یہ آدمی نظر آتے ہیں۔ بس اب انتظار اس بات کا ہے کہ قیامت میں یہ پتھر کی قسم کے پتھر اور انسانوں کے پتھر جہنم میں باہم جمع ہو جائیں۔

یہاں پتھروں کے ذکر سے ایک خاص مفہوم کو ذہن نشین کرنا مطلوب ہے۔ یعنی آگ کی خوفناکی۔ ملاحظہ ہو پتھروں کو کھائے جا رہی ہے

اور اس آگ کے اندر ان بدبخت آدمیوں کی حالت ملاحظہ ہو جو پتھروں کے اندر دبے پڑے ہوں گے۔

اس خوفناک اور وحشتناک منظر کے بالمقابل ذرا دوسرا رخ بھی دیکھئے کہ انعامات و اکرامات کی کیا فراوانی ہے جو مومنین کا انتظار کر رہی ہے؟ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۭ كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا ۙ قَالُوْا ھٰذَا الَّذِيْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ ۙ وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا ۭ وَلَهُمْ فِيْهَآ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ڎ وَّهُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝

"اور اے پیغمبر جو لوگ اس کتاب پر ایمان لے آئیں' اور اس کے مطابق اپنے عمل درست کر لیں' انہیں خوشخبری دے دو کہ ان کے لئے ایسے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ ان باغوں کے پھل صورت میں دنیا کے پھلوں سے ملتے جلتے ہوں گے۔ جب کوئی پھل انہیں کھانے کو دیا جائے گا تو وہ کہیں گے کہ ایسے ہی پھل اس سے پہلے ہم کو دیئے جا چکے ہیں۔ ان کے لئے وہاں پاکیزہ بیویاں ہوں گی اور وہ وہاں ہمیشہ رہیں گے۔"

یہ رنگارنگ انعامات و اکرامات' نگاہ جا کر ان میں سے پاکیزہ بیویوں پر جا ٹکتی ہے۔ یہ پھل جو اس سے پہلے کے پھلوں سے ملتے جلتے ہوں گے اور جن کے بارے میں اہل جنت یہ خیال کریں گے کہ اس سے پہلے بھی جنت میں ان کی تواضع ایسے ہی پھلوں سے کی گئی ہے۔ یا وہ ان پھلوں کے ہم شکل ہیں جو انہیں دنیاوی زندگی میں دیئے گئے تھے۔ یہ دراصل مومنین کے ساتھ ایک لطیف مذاق ہو گا کہ انہیں بظاہر ہم شکل پھل دیئے جائیں گے لیکن جب بھی وہ انہیں چکھیں گے تو ان کی حیرانی کی انتہا نہ رہے گی کہ مزا ہر دفعہ علیحدہ اور پرکیف ہو گا۔ قدم قدم پر انہیں ایسے نئے تجربے ہوں گے' جن سے ظاہر ہو گا کہ وہ رضائے الٰہی کے اطمینان بخش ماحول میں رہ رہے ہیں۔ کیا خوب تفکہہ ہے کہ ہر دفعہ بظاہر ہم شکل پھلوں کی صورت میں انہیں ایک نئی نعمت دی جاتی ہے۔

شکل و صورت کی یہ ہم رنگی اور ذائقہ و حقیقت کا یہ تنوع' تخلیق کائنات میں اللہ تعالیٰ کی ایک ممتاز کاریگری ہے' جس سے یہ کائنات بظاہر ایک عظیم حقیقت نظر آتی ہے۔ اس عظیم نکتے کی وضاحت کے لئے مناسب ہے کہ ہم خود اس انسان کا مطالعہ کریں۔ دیکھئے تمام انسان تخلیقی اعتبار سے ایک ہیں۔ سر' جسم اور دوسرے اعضاء سب کے ایک جیسے ہیں۔ سب گوشت پوست اور ہڈیوں اور اعصاب سے بنے ہوئے ہیں۔ سب کو دو آنکھیں' دو کان' ایک ناک اور ایک زبان دی گئی ہے۔ اور سب اسی ایک زندہ (Cell) خلیے سے پیدا کئے گئے ہیں۔ مادہ اور صورت کے لحاظ سے سب ایک جیسے ہیں لیکن اخلاق و قابلیت میں ایک دوسرے کے درمیان کس قدر عظیم فرق پایا جاتا ہے۔ ذہانت و قابلیت میں وہ ایک دوسرے سے کس قدر مختلف ہیں بعض اوقات ایک انسان اور دوسرے کے درمیان زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے اور اس ظاہری مشابہت کے باوجود یہ فرق کبھی آسمان و زمین سے بھی زیادہ ہوتا ہے۔

جب انسان صنعت باری کی ان باریکیوں پر غور کرتا ہے تو سر چکرا جاتا ہے۔ ذرا غور کیجئے! مخلوقات کی مختلف اقسام اور اجناس میں کیا تنوع ہے۔ مختلف شکلیں اور رنگارنگ خصوصیات' قابلیتوں اور خصوصیتوں میں امتیاز' لیکن ان تمام چیزوں کا آغاز صرف ایک جیسے خلیے سے ہوا ہے جو اپنی ترکیب اور ساخت کے لحاظ سے بالکل یک گونہ ہوتا ہے۔

پس کون سیاہ دل ہے جو اللہ کی قدرت کے ان کھلے آثار اور شواہد کو دیکھ کر بھی صرف اسی کی بندگی اور غلامی اختیار نہیں کرتا؟ اور کون ہے جو ان معجز دلائل اور واضح براہین کے ہوتے ہوئے بھی اللہ کی ذات و صفات میں کسی کو اس کا ہمسر بناتا ہے! حالانکہ یہ بے شمار آثار اور یہ بکثرت دلائل اس کی آنکھوں کے سامنے ہیں اور وہ برابر ان کا مشاہدہ کر رہا ہے۔ کئی ایسے دلائل بھی ہیں جو اس کی نظروں اور

مشاہدے سے اوجھل ہیں۔

إِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيِۦٓ أَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا ۚ فَأَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَيَعْلَمُوْنَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ وَأَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَيَقُوْلُوْنَ مَاذَآ أَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا ۘ يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا ۙ وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا ۚ وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ إِلَّا الْفٰسِقِيْنَ ﴿۲۶﴾ الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ ۖ وَيَقْطَعُوْنَ مَآ أَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ أَنْ يُّوْصَلَ وَيُفْسِدُوْنَ فِي الْأَرْضِ ۚ أُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۲۷﴾

"ہاں' اللہ اس سے ہرگز نہیں شرماتا کہ مچھر یا اس سے بھی حقیر تر کسی چیز کی تمثیلیں دے۔ جو لوگ حق بات کو قبول کرنے والے ہیں' وہ انہی تمثیلوں کو دیکھ کر جان لیتے ہیں کہ یہ حق ہے' جو ان کے رب کی طرف سے آیا ہے اور جو ماننے والے نہیں ہیں' وہ انہیں سن کر کہنے لگتے ہیں کہ ایسی تمثیلوں سے اللہ کو کیا سروکار؟ اسی طرح اللہ ایک ہی بات سے بہتوں کو گمراہی میں مبتلا کر دیتا ہے' اور بہتوں کو راہ راست دکھا دیتا ہے اور گمراہی میں انہی کو مبتلا کرتا ہے جو فاسق ہیں۔ اللہ کے عہد کو مضبوط باندھ لینے کے بعد توڑ دیتے ہیں' اللہ نے جسے جوڑنے کا حکم دیا ہے' اسے کاٹتے ہیں اور زمین میں فساد برپا کرتے ہیں' حقیقت میں یہی لوگ نقصان اٹھانے والے ہیں۔"

اس سے قبل سورت کی ابتدا میں قرآن مجید نے یہود و مشرکین سے تعلق رکھنے والے منافقین کو اس شخص سے تشبیہہ دی تھی جو آگ جلاتا ہے یا اس شخص کے ساتھ جو آسمانی بادلوں کی تاریکی اور گرج و چمک میں گھر ہوا ہے' نیز اس سے پہلے مکی دور کے نازل شدہ قرآن کریم میں بھی کئی تمثیلیں بیان کی گئی ہیں اور جو مدینہ میں عام طور پر پڑھی جاتی تھیں۔ مثلاً جو لوگ رب العالمین کا انکار کرتے ہیں انہیں مکڑی سے تشبیہہ دیتے ہوئے کہا گیا تھا "ان کی مثال اس مکڑی کی طرح ہے جو اپنا گھر بناتی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ سب گھروں میں کمزور گھر مکڑی کا جالا ہوتا ہے۔ کاش کہ یہ لوگ جانتے۔" ایک جگہ یہ کہا گیا تھا کہ جن کو یہ پکارتے ہیں' ان کے عجز و ماندگی کا حال یہ ہے "وہ لوگ جو اللہ کے سوا پکارے جاتے ہیں ان کا حال یہ ہے کہ اگر وہ سب کے سب بھی جمع ہو جائیں تو ایک مکھی بھی پیدا نہیں کر سکیں گے۔ بلکہ اگر ان سے مکھی کوئی چیز لے بھاگے تو وہ اس سے چھڑا نہیں سکتے۔ کیا برا حال ہے طالب اور مطلوب دونوں کا؟"

یہ آیات بتا رہی ہیں کہ منافقین جن میں یہود و مشرکین دونوں شریک تھے' ایسی تشبیہات پر یہ اعتراض کرتے تھے کہ ان تشبیہات میں منافقین کا مذاق اڑایا گیا ہے۔ ان میں مکھیوں اور مکڑیوں جیسی حقیر چیزوں کا ذکر ہے اور ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ جل شانہ کی مقدس ذات اس سے برتر و بالا ہے۔ یہ اعتراض مشرکین مکہ اور منافقین مدینہ کے پھیلائے ہوئے شبہات اور انتشار کے مختلف پہلوؤں اور تدبیروں میں سے ایک ہے۔

چنانچہ ان آیات میں ان شبہات کی تردید کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ تمثیلوں کے بیان سے اللہ کا مقصد کیا ہے کفار کو اس بات سے ڈرایا جاتا ہے کہ وہ اس فریب کاری سے باز آ جائیں اور مومنین کو اطمینان دلایا جاتا ہے کہ ان مثالوں سے ان کے ایمان میں مزید اضافہ ہو گا۔

إِنَّ اللَّهَ لَا يَسْتَحْيِي أَنْ يَضْرِبَ مَثَلًا مَا بَعُوضَةً فَمَا فَوْقَهَا " اللہ اس بات سے ہرگز نہیں شرماتا کہ مچھر یا اس سے بھی کسی حقیر تر چیز کی تمثیلیں دے۔" کیونکہ اللہ جس طرح چھوٹی چیزوں کا رب ہے اسی طرح بڑی چیزوں کا بھی رب ہے۔ مچھر کا بھی خالق اور ہاتھی کا بھی خالق۔ جس طرح ہاتھی کی تخلیق ایک اعجاز ہے اسی طرح مچھر کی تخلیق بھی ایک اعجاز ہے اور ان دونوں کی زندگی ایک ایسا راز سربستہ ہے' جس کا علم اللہ کے سوا آج تک کسی کو نہیں ہے۔ پھر تمثیل تو ایک پیرایہ اظہار ہوتا ہے اور اس کی غرض و غایت صرف یہ ہوتی ہے کہ اس کی مدد سے مدعا کو اچھی طرح کھول کر ذہن نشین کرایا جائے' نہ یہ کہ جس چیز سے تشبیہ دی جارہی ہے وہ کوئی عظیم الشان چیز ہی ہو۔ ضرب الامثال میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے' جس کا تذکرہ معیوب ہو۔ بلکہ ان تمثیلات کے بیان کے ذریعہ تو اللہ تعالیٰ دلوں کو آزمانا اور نفوس کو پرکھنا چاہتا ہے۔

فَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا فَيَعْلَمُونَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَبِّهِمْ " جو لوگ حق بات کو قبول کرنے والے ہیں وہ انہی تمثیلوں کو دیکھ کر جان لیتے ہیں کہ یہ حق ہے جو ان کے رب کی طرف سے آیا ہے۔" اپنے ایمان کی بدولت وہ اللہ جل شانہ سے اس طرح ہدایت لیتے ہیں جس طرح اس کی شان ہے۔ نیز وہ جانتے ہیں کہ ان تمثیلوں میں کیا حکمت پوشیدہ ہے۔ ان کا دل نور سے لبریز ہے۔ ان کی روح حساس ہے' ان کا دل و دماغ اس ہدایت کے لئے کھلا ہے۔ ان کے پاس اللہ کا جو حکم آتا ہے' اللہ کی جو بات ان تک پہنچتی ہے' وہ اس کی حکمت اور اس کے پس منظر کو اچھی طرح جانتے ہیں۔

وَأَمَّا الَّذِينَ كَفَرُوا فَيَقُولُونَ مَاذَا أَرَادَ اللَّهُ بِهَذَا مَثَلًا اور جو ماننے والے نہیں ہیں' وہ انہیں سن کر کہنے لگتے ہیں کہ ایسی تمثیلوں سے اللہ کو کیا سروکار؟" یہ اس شخص کا سوال ہے جس کی نظروں سے اللہ کا نور اور اس کی حکمت اوجھل ہے۔ وہ سنت الٰہی اور تدبیر الٰہی کو نہیں جانتا۔ ایسا سوال وہ لوگ کرتے ہیں جن کے دلوں میں اللہ تعالیٰ کا کوئی احترام نہیں ہوتا اور وہ اللہ تعالیٰ کے تصرفات کو ان نظروں سے نہیں دیکھتے جن سے انہیں اللہ کا ایک بندہ اور فرمانبردار غلام دیکھتا ہے۔ ایسے لوگ کبھی تو بطور اعتراض اور ناپسندیدگی ایسی باتیں کرتے ہیں' یا وہ ایسی باتیں اس لئے کرتے ہیں کہ انہیں اس بات کا یقین نہیں آتا کہ اللہ تعالیٰ بھی ایسی باتیں کر سکتا ہے۔

ان کی اس روش پر تہدید اور تنبیہ کی صورت میں انہیں جواب دیا جاتا ہے کہ ان تمثیلوں کے پیچھے اللہ کی ایک خاص تدبیر کام کر رہی ہے۔ یہ تمثیلیں لوگوں کی تقدیر کا فیصلہ کر رہی ہیں۔

يُضِلُّ بِهِ كَثِيرًا وَيَهْدِي بِهِ كَثِيرًا " وَمَا يُضِلُّ بِهِ إِلَّا الْفَاسِقِينَ' اس طرح اللہ ایک ہی بات سے بہتوں کو گمراہی میں مبتلا کر دیتا ہے اور بہتوں کو راہ راست دکھا دیتا ہے اور گمراہی میں ان ہی کو مبتلا کر دیتا ہے جو فاسق ہیں۔" یہ اللہ تعالیٰ کا قانون قدرت ہے کہ وہ انسانوں کو امتحان اور ابتلا میں ڈالتا ہے۔ ان آزمائشوں اور ابتلاؤں میں ہر انسان مقتضائے طبیعت و استعداد کے مطابق طرز عمل اختیار کرتا ہے۔ ہر شخص کی روش اس طریق حیات کے مطابق ہوتی ہے جو اس نے اپنے لئے پسند کیا ہوتا ہے۔ آزمائش ایک ہی ہوتی ہے لیکن مختلف نظام ہائے زندگی اختیار کرنے والے لوگوں پر اس کے اثرات مختلف ہوتے ہیں۔ مثلاً مصیبت اور تکلیف ہی کو لے لیجئے۔ سب لوگ مصائب میں مبتلا ہوتے ہیں۔ مومن بھی اور فاسق بھی۔ ایک صالح جو اللہ کی رحمتوں اور حکمتوں پر پختہ یقین رکھتا ہے وہ جب مصیبت میں مبتلا ہوتا ہے تو وہ زیادہ خشیت زیادہ عاجزی اور تضرع سے اللہ کے سامنے ملتجی ہوتا ہے۔ لیکن اگر ایک فاسق تکلیف میں مبتلا ہو تو اس کے قدم اکھڑ جاتے ہیں' وہ اللہ سے اور بعید ہو جاتا ہے۔ وہ مومنین کی صفوں سے نکل جاتا ہے۔ اسی طرح خوشحالی اور تکاثر کو لیجئے کہ...... بعض لوگ اس آزمائش میں مبتلا ہوتے ہیں۔ لیکن ایک مومن جب زیادہ انعامات اور اکرامات پاتا ہے تو وہ زیادہ بیدار ہو جاتا ہے۔ وہ شکر الٰہی میں پہلے سے بھی زیادہ حساس ہو جاتا ہے۔ لیکن جب ایک فاسق کو سہولتیں ملتی ہیں تو وہ اسے تباہ و برباد کر دیتی ہیں۔ وہ غرور میں مبتلا ہو جاتا

ہو جاتا ہے اور گمراہی کی روش اختیار کرتا ہے۔ اسی طرح اللہ نے لوگوں کے لئے جو تمثیلیں بیان کیں ان کا نتیجہ یہ نکلا کہ یُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا ”ان سے بھی وہ بہتوں کو گمراہ کرتا ہے“ اور یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو اللہ کی طرف سے آنے والی ہدایت کو اچھی طرح قبول نہیں کرتے۔ وَّ يَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا ”اور بہتوں کو راہ ہدایت دکھا دیتا ہے۔“ اور یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو حکمت باری کو جانتے ہوتے ہیں۔ وَ مَا يُضِلُّ بِهٖۤ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ ”اور گمراہی میں انہی کو مبتلا کرتا ہے جو فاسق ہیں۔“ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جن کے دل پہلے سے فاسق ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ یہ لوگ ہدایت اور اصلاح کی روش سے نکل جاتے ہیں لہذا ان کا صلہ یہی ہے کہ ان کی اس ضلالت میں اور اضافہ کر دیا جائے۔

جس طرح اس سورت کے آغاز میں متقین کی صفات کو تفصیل سے بیان کیا گیا تھا اسی طرح یہاں فاسقین کی خصوصیات کو بھی قدرے تفصیل سے لیا جاتا ہے۔ کیونکہ اس پوری سورت میں روئے سخن ایسے ہی لوگوں کی طرف رہے گا۔ نیز انسان ہر زمانے میں انہی ہر طبقات میں منقسم رہتے ہیں اور وہ یہ ہیں۔

الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ ۖ وَ يَقْطَعُوْنَ مَاۤ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖۤ اَنْ يُّوْصَلَ وَ يُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ جو اللہ کے عہد کو مضبوط باندھنے کے بعد توڑ دیتے ہیں' اللہ نے جسے جوڑنے کا حکم دیا ہے اسے کاٹتے ہیں اور زمین میں فساد برپا کرتے ہیں' حقیقت میں یہی لوگ نقصان اٹھانے والے ہیں۔“

وہ کون سا عہد ہے جسے یہ توڑتے ہیں؟ وہ کون سا تعلق ہے کہ اللہ نے اس کے جوڑنے کا حکم دیا ہے اور یہ اسے کاٹتے ہیں؟ اور جو فساد یہ کرتے ہیں اس کی نوعیت کیا ہے؟ ان سب امور کو سیاق کلام میں مجمل چھوڑ دیا گیا ہے۔ کیونکہ یہاں اصولی طور پر ایسے لوگوں کا مزاج بتایا جا رہا ہے۔ ان کی نوعیت کو متعین و مشخص کیا جا رہا ہے۔ کسی حادثے یا کسی مخصوص واقعہ کا بیان مقصود نہیں ہے بلکہ ایک عمومی صورتحال کی وضاحت مطلوب ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ اور ایسے لوگوں کے درمیان جو عہد بھی ہے وہ توڑ دیا گیا ہے اور اللہ نے جن جن انسانی رابطوں کے قیام کا حکم دیا ہے' وہ سب کے سب ان لوگوں نے توڑ دیئے ہیں اور جو فساد بھی ممکن ہے اس کا ارتکاب یہ کرتے رہتے ہیں۔ ان کی فطرت میں بگاڑ پیدا ہو گیا ہے۔ لہذا یہ لوگ کسی عہد اور کسی رابطے کے پابند نہیں ہیں۔ اور کسی فساد سے بھی باز نہیں رہتے۔ ان کی مثال کچے پھل کی سی ہے' جو شجر حیات سے جدا ہو گیا ہو' گل اور سڑ گیا ہو اور زندگی نے اسے پرے پھینک دیا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ جن تمثیلوں سے مومنین ہدایت پاتے ہیں' ان سے ایسے لوگ گمراہ ہو جاتے ہیں' جو چیزیں متقین کے لئے سبب ہدایت ہوتی ہیں وہ ان فاسقین کے لئے باعث ضلالت ہو رہی ہیں۔

ایسے لوگ جو کبھی یہود و مشرکین کے منافقین کی صورت میں مدینہ میں پائے جاتے تھے اور جو دعوت اسلامی کے مقابلے میں ایک بڑی رکاوٹ تھے اور جو آج بھی نام اور عنوان کی مختصر تبدیلی اور بالکل معمولی اختلاف کے ساتھ تحریک کی راہ میں سنگ گراں بنے ہوئے ہیں' ان کی فتنہ انگیزیوں کے نشانات تو دیکھئے۔ الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ ”جو اللہ کے عہد کو مضبوط باندھ لینے کے بعد توڑ دیتے ہیں۔“ انسانوں اور اللہ تعالیٰ کے درمیان جو پیمان بندھا ہوا ہے اس کی کئی شکلیں اور صورتیں ہیں۔ ایک تو وہ جبلی عہد ہے جو ہر ذی حیات کی جبلت میں ودیعت کیا گیا ہے۔ اس کی رو سے ہر ذی حیات کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنے خالق کی معرفت حاصل کرے اور اس کی بندگی کرے۔ انسانی فطرت میں ہمیشہ عقیدہ خداوندی کے لئے پیاس رہتی ہے۔ لیکن کبھی اس فطرت سلیمہ میں فساد رونما ہو جاتا ہے اور اس کے نتیجے میں انسان راہ راست سے بھٹک جاتا ہے' اور دوسروں کو اللہ کا ہمسر اور شریک بنانے لگتا ہے۔ نیز اس کی ایک صورت عہد خلافت کی ہے' جو اللہ تعالیٰ اور آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے درمیان طے پایا۔ جس کا تذکرہ عنقریب ہو گا۔

فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ "پھر میری طرف سے جو ہدایت تمہارے پاس پہنچے' تو جو لوگ میری ہدایت کی پیروی کریں گے ان کے لئے کسی خوف اور رنج کا موقعہ نہ ہو گا اور جو لوگ اس کو قبول کرنے سے انکار کریں گے اور ہماری آیات کو جھٹلائیں گے' وہ آگ میں جانے والے لوگ ہیں' جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔" نیز اس عہد کی ایک شکل وہ ہے جو مختلف پیغمبروں کے ذریعہ مختلف اقوام سے باندھی گئی کہ وہ صرف ایک اللہ جل شانہ کی بندگی کریں اور اپنی زندگی میں صرف اسی کے تجویز کردہ نظام حیات اور نظام قانون کو اپنائیں گے۔ یہ سب عہد ایسے ہیں جنہیں یہ فاسق لوگ توڑتے ہیں۔ اور جب کوئی اللہ تعالیٰ سے پختہ پیمان باندھنے کے بعد توڑتا ہے تو پھر وہ کسی دوسرے عہد کی کوئی پرواہ نہیں کرتا۔ جس کے اندر اللہ تعالیٰ کے ساتھ عہد شکنی کا حوصلہ ہوتا ہے' وہ اس کے بعد کسی عہد و پیمان کا کوئی احترام نہیں کرتا۔

وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ "اللہ نے جسے جوڑنے کا حکم دیا ہے اسے کاٹتے ہیں۔" اللہ تعالیٰ نے کئی قسم کے روابط و تعلقات کو قائم رکھنے کا حکم دیا ہے۔ اس نے یہ حکم دیا ہے کہ عزیزوں اور رشتہ داروں کے ساتھ صلہ رحمی کی جائے' اس نے یہ حکم دیا ہے کہ پوری انسانیت کی عظیم برادری قائم کی جائے اور ہر انسان دوسرے کا بھائی ہو۔ اور ان سب سے مقدم درجے میں اس نے حکم دیا ہے کہ ایک نظریاتی اخوت اور ایمانی برادری قائم کی جائے کیونکہ کوئی ربط اور تعلق ایمان و نظریہ کے سوا مضبوط نہیں ہو سکتا۔ جب وہ تعلقات و روابط ٹوٹ جائیں جن کا حکم اللہ تعالیٰ نے دیا ہے تو پھر تمام رشتے ٹوٹ جاتے ہیں اور تمام روابط ختم ہو جاتے ہیں۔ زمین پر افراتفری عام ہو جاتی ہے اور شر و فساد پھیل جاتا ہے۔

وَيُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ "اور زمین میں فساد برپا کرتے ہیں۔" زمین پر فساد پھیلانے کی بھی کئی شکلیں ہیں۔ سب کی سب اللہ تعالیٰ کے عہد کو توڑنے' اللہ تعالیٰ نے جن تعلقات کو جوڑنے کا حکم دیا ہے' ان کے کاٹنے اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کا نتیجہ ہوتی ہیں اور ان تمام فسادات کا سرچشمہ یہ ہے کہ انسان اس نظام حیات کو ترک کر دے جو اللہ تعالیٰ نے انسانی زندگی اور اس کے تصرفات کے لئے تجویز کیا ہے۔ اسلامی نظام حیات ہی وہ راہ ہے جو ان تمام راہوں سے علیحدہ ہو کر جاتی ہے اور جو شر و فساد پر منتج ہوتی ہیں۔ اگر صورت یہ ہو کہ اسلامی نظام زندگی کے تصرف و اقتدار سے اس دنیا کے امور آزاد کر دیئے گئے ہوں' اس زندگی کو اللہ کی شریعت کے دائرے سے نکال دیا گیا ہو تو ممکن نہیں ہے کہ اس دنیا کی اصلاح ہو سکے۔ جب بھی ایسا ہوا ہے کہ انسانوں اور ان کے رب کے درمیان یہ مضبوط تعلق نہیں رہا' تو اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ دنیا شر و فساد کے عظیم سیلاب کی لپیٹ میں آگئی ہے' انسانی اخلاق خراب ہو گئے ہیں' لوگوں کی زندگی اور احوال تباہ ہو گئے۔ ان کی معیشت برباد ہو گئی۔ غرض ایسے حالات میں یہ زمین اور اس کے اوپر رہنے والی تمام جاندار مخلوق اور تمام چیزوں میں فساد رونما ہو جاتا ہے اور یہی وہ تباہ کاری اور شر و فساد ہے جو اللہ کی نافرمانی کے نتیجہ میں پیدا ہوتا ہے۔ اس لئے ایسے فساد میں مبتلا لوگ اسی کے مستحق ہوتے ہیں کہ جن امور سے مومنین کو راہ ہدایت نصیب ہوتی ہے وہ ان کے لئے باعث گمراہی ہوتے ہیں۔

کفر و فسق کے آثار و نتائج کی وضاحت کے بعد اب روئے سخن تمام انسانیت کی طرف پھر جاتا ہے۔ ان کی تنبیہہ کی جاتی ہے کہ وہ اس خالق و رازق' علیم و مدبر اور حیات و ممات کے مالک ذات باری کا انکار کیونکر کر رہے ہیں؟

كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ۚ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۲۸﴾ هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي

الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۚ ثُمَّ اسْتَوٰٓى اِلَى السَّمَآءِ فَسَوّٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ ؕ وَهُوَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۲۹﴾

۳ ع ۹ ۳

"تم اللہ کے ساتھ کفر کا رویہ کیسے اختیار کرتے ہو' حالانکہ تم بے جان تھے' اس نے تم کو زندگی عطا کی' پھر وہی تمہاری جان سلب کرے گا' پھر وہی تمہیں دوبارہ زندگی عطا کرے گا' پھر اسی کی طرف تمہیں پلٹ کر جانا ہے۔ وہی تو ہے جس نے تمہارے لئے زمین کی ساری چیزیں پیدا کیں۔ پھر اوپر کی طرف متوجہ فرمائی اور سات آسمان استوار کئے اور وہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔"

ان قوی دلائل کے ہوتے ہوئے اللہ کا انکار کرنا' کفر و انکار کی وہ قبیح اور ناپسندیدہ روش ہے جس کی پشت پر کوئی سند و دلیل نہیں ہے۔ قران کریم یہاں ایک ایسی حقیقت پیش کرتا ہے جس سے ان کے لئے کوئی راہ فرار نہیں ہے۔ وہ اس بات پر مجبور ہیں کہ اس حقیقت اور اس کے لازمی نتائج کو تسلیم کریں۔ قرآن ان کے سامنے قافلۂ حیات اور اس کے مختلف حالات و کیفیات لاکر رکھ دیتا ہے تاکہ وہ اس پر غور کریں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ انسان مردہ حالت میں تھے' اللہ نے انہیں زندگی سے نوازا' اللہ ہی انہیں حالت موت سے حالت حیات کی طرف لایا' یہ ایک ایسی روشن حقیقت ہے کہ سوائے قدرت الٰہی اور تخلیق الٰہی کے اس کی کوئی اور توجیہ وہ نہیں کر سکتے۔ وہ زندہ ہیں ان کے قلب جسدی میں حیات موجود ہے؟ اس حیات کا خالق کون ہے؟ وہ کون ہے جس نے جمادات میں یہ زائد صفت' صفت حیات پیدا کی؟ کیونکہ جمادات جن پر موت و جمود کی حالت طاری ہے' وہ حیات کی حقیقت و مزاج سے بالکل مختلف ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اس حیات کا مصدر کیا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ یہ سوال ایسا ہے کہ عقل و نفس ہروقت کوئی حقیقی اور تشفی بخش جواب چاہتا ہے اور کسی کے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ اس سوال کو نظرانداز کر سکے۔ پھر اس سوال کے جواب میں کوئی ایسی بات انسان کو مطمئن نہیں کر سکتی جس میں اس مادی دنیا سے آگے کسی خالق ذات کو تسلیم نہ کیا گیا ہو۔

غرض یہ زندگی جو اس زمین پر رواں دواں ہے اور جس کی روش جمادات سے بالکل مختلف ہے کہاں سے آئی؟ اس کا واحد تشفی بخش جواب یہ ہے کہ یہ اللہ کی طرف سے آئی اور اسی کی قدرت کا کرشمہ ہے۔ یہی جواب ایسا ہے جو سمجھ میں آسکتا ہے۔ اگر کسی کو یہ جواب تسلیم نہیں ہے تو ہم اس سے پوچھتے ہیں کہ لائے وہ کوئی تشفی بخش جواب؟

یہ ہے وہ حقیقت جسے قرآن کریم اس موقع پر لوگوں کے سامنے رکھتا ہے۔ كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ "تم اللہ کے ساتھ کفر کا رویہ اختیار کرتے ہو حالانکہ تم بے جان تھے' اس نے تم کو زندگی عطا کی۔" یعنی تم اس طرح بے جان تھے جس طرح تمہارے ارد گرد پھیلی ہوئی یہ کائنات بے جان ہے۔ اس نے تمہارے اندر جان پیدا کی اور تمہیں زندہ کیا۔ کوئی اپنے خالق سے انکار کیونکر کر سکتا ہے۔ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ "پھر تمہاری جان سلب کرے گا۔" یہ بھی ایک ایسی حقیقت ہے جس کا کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ کیونکہ زندہ و ذی روح مخلوقات کا مرنا روز مرہ کا معمول و مشاہدہ ہے۔ لہٰذا زندگی کے بعد مرنا ایک ایسی حقیقت ہے جو از خود ہی ذہنوں پر حاوی ہوتی ہے اور اس میں کسی قسم کی بحث و جدال کی کوئی گنجائش نہیں ہے ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ پھر وہ تمہیں دوبارہ زندگی عطا کرے گا۔" یہ تھی وہ حقیقت جس میں ان کو شک تھا' لہٰذا وہ اس کے بارے میں بحث و جدال کرتے تھے اور آج بھی اس میں بعض کج فطرت لوگ شک کرتے ہیں' جو آج پھر صدیوں قبل کی جاہلیت کی طرف لوٹ چکے ہیں۔ لیکن انسان اگر اس بات پر غور کرے کہ وہ پہلے بھی کچھ نہ تھا۔ اسے

پیدا کیا گیا' لہٰذا یہ بات عقل سے بعید نہیں ہے کہ موت کے بعد دوبارہ اسے زندہ کیا جاسکتا ہے۔ پس یہ عقیدہ کوئی ایسا عجوبہ نہیں ہے کہ لازماً اس کی تکذیب ہی کی جائے۔

ثُمَّ إِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ۞ "پھر اسی کی طرف تمہیں پلٹ کر جانا ہے۔" جیسا کہ اس نے تمہیں پہلی مرتبہ پیدا کیا اسی طرح تم اس کی طرف لوٹو گے' جس طرح اس نے تمہیں زمین میں پھیلایا۔ اسی طرح تم اٹھائے جاؤ گے۔ جس طرح تم مردہ حالت سے نکل کر اس زندہ حالت کی طرف لائے گئے۔ اسی طرح تم اس کی طرف پلٹ کر جاؤ گے تاکہ وہ تمہارے درمیان اپنا حکم نافذ کرے اور تمہارے قضیوں کا فیصلہ کرے۔

یہ ایک مختصر سی آیت ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کے اندر پل بھر میں زندگی کا پورا دفتر پھیلا بھی دیا۔ اور لپیٹ بھی لیا۔ ایک چمک اٹھی اور دیکھا گیا کہ پوری انسانیت اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہے۔ اللہ نے پہلے اسے زندہ کر کے زمین پر پھیلایا' پھر اسے اچانک موت نے آلیا' پھر روز محشر کا منظر ہے جس میں پوری انسانیت اٹھ رہی ہے اور اللہ کی طرف لوٹ رہی ہے بعینہٖ اسی طرح جس طرح پہلے اللہ نے اسے زندہ کیا تھا۔ اس برق رفتار پیرایہ بیان میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ صاف صاف نظر آتی ہے اور انسانی احساس و شعور پر اس کے گہرے اثرات پڑتے ہیں۔

اس پہلی چمک کے متصلاً بعد روشنی کی ایک دوسری کرن آتی ہے جو پہلی کے لئے تکمیل کا درجہ رکھتی ہے۔ هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُم مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا ثُمَّ اسْتَوَىٰ إِلَى السَّمَاءِ فَسَوَّاهُنَّ سَبْعَ سَمَاوَاتٍ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ "وہی تو ہے' جس نے تمہارے لئے زمین کی ساری چیزیں پیدا کیں' پھر اوپر کی طرف توجہ فرمائی اور سات آسمان استوار کئے اور وہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔" اللہ تعالیٰ کی تخلیق کے بارے میں مفسرین اور متکلمین نے طویل بحثیں کی ہیں' قبلیت و بعدیت اور استوا اور تسویہ اور دوسری کلامی بحثیں یہاں کی جاتی ہیں۔ لیکن یہ حضرات اس حقیقت کو بھول جاتے ہیں کہ قبل و بعد' محض انسانی اصطلاحات ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے لئے ان کا کوئی مفہوم نہیں ہے۔ یہ حضرات اس بات کو بھی سامنے نہیں رکھتے کہ استوا اور تسویہ انسانی لغوی اصطلاحات ہیں جو لامحدود ذات کو انسان کے محدود تصور کے قریب لے آتی ہیں۔ اس کے سوا اور کچھ نہیں۔ قرآن کی ایسی تعبیروں پر علمائے اسلام نے جو طویل بحثیں کیں' وہ اس مصیبت اور آفت کا نتیجہ تھیں جو یونانی فلسفہ اور یہود و نصاریٰ کی لاہوتی بحثوں کی صورت میں امت مسلمہ پر نازل ہوئی۔ یہ بحثیں تب پیدا ہوئیں جب اس فلسفہ اور ان لاہوتی بحثوں نے عربوں کی سادہ ذہنیت اور مسلمانوں کے پاکیزہ خیالات کو گدلا کر دیا تھا۔ اب ہمارے لئے یہ ہرگز مناسب نہیں ہے کہ ہم بھی اس مصیبت میں خواہ مخواہ گرفتار ہو جائیں اور منطقی اور کلامی جدلیات میں قرآن کریم کے حسن و جمال کو گم کر دیں۔

اس لئے ہمیں چاہئے کہ ان مصنوعی تعبیرات و اصطلاحات سے آزاد ہو کر یہ دیکھیں کہ پوری کائنات کو انسان کے لئے پیدا کرنے کی حقیقت کیا ہے؟ اس حقیقت سے کس چیز کا اظہار ہو رہا ہے۔ اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے وجود انسانی کا کیا مقصد قرار پاتا ہے۔ اس زمین پر انسان کے کیا فرائض ہیں۔ اللہ کے ہاں انسان کی قدر و قیمت کیا ہے۔ نیز اسلامی تصور حیات اور تصور کائنات میں انسان کی کیا قدر و قیمت ہے اور اسلامی نظام زندگی میں انسان کا مقام کیا ہے؟

هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُم مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا ۝ "اللہ وہی تو ہے جس نے تمہاری زمین کی ساری چیزیں پیدا کیں۔" یہاں لفظ لکم یعنی "تمہارے لئے" اپنے گہری معنویت لئے ہوئے ہے۔ یہ اس گہری حقیقت کا اظہار کر رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس انسان کو ایک عظیم مقصد کے لئے پیدا کیا ہے۔ اس کی پیدائش کا مقصد یہ ہے کہ وہ زمین پر اللہ کا نائب اور خلیفہ ہو۔ زمین کے اندر جو کچھ ہو وہ

اس کی ملکیت میں ہو اور وہ اس میں مؤثر اور متصرف ہو۔ کیونکہ اللہ کی اس طویل و عریض کائنات میں وہی اعلیٰ مخلوق ہے۔ وہ اس وسیع میراث کا پہلا وارث ہے۔ لہٰذا اس زمین کے حالات اور اس کے انقلاب کے اندر اس کا کردار بھی اول درجے کا ہے۔ وہ جس طرح اس زمین کا سردار ہے اسی طرح اس کے آلات کا بھی سردار ہے۔ وہ آلات پیداوار کے ہاتھ میں مقید اور بے بس نہیں ہے' جس طرح آج کی مادی دنیا میں انسان ان آلات کے ہاتھوں میں بے بس ہو چکا ہے۔ نیز وہ ان تبدیلیوں اور تغیرات کا بھی تابع نہیں ہے جو انسان اور انسان کے باہم روابط میں ان آلات کی پیدا کردہ ہیں جیسا کہ آج کل کے مادہ پرستانہ تصور حیات میں انسان اور اس کے کردار کو حقیر تر سمجھا جاتا ہے اور اسے بے جان اور بے شعور آلات کا غلام بنادیا جاتا ہے۔ حالانکہ وہ ان سے برتر اور ان کا سردار ہے۔ قرآن کی رو سے ساری اقدار میں سے کوئی بھی ایسی نہیں ہے کہ اسے انسانیت کی قدر و قیمت سے برتری حاصل ہو۔ انسان تو اس کے سامنے ذلیل و خوار ہو اور وہ اس کے مقابلے میں بلند و بالا ہو۔ وہ تمام مقاصد جن کے نتیجے میں انسان کی انسانیت کی تذلیل ہو۔ وہ انسان کے مقصد وجود ہی کے خلاف ہیں اور اس لئے معیوب ہیں' چاہے ان کے نتیجے میں بے شمار مادی فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ چنانچہ اسلامی تصور حیات کے مطابق انسان کی شرافت اور انسان کی برتری وہ پہلی قدر ہے جو سب اقدار سے اولیت رکھتی ہے۔ تمام مادی قدریں اس کے تابع ہیں اور ان کا درجہ بعد میں آتا ہے۔

یہاں اللہ تعالیٰ اپنی جس نعمت کا ذکر فرمارہے ہیں اور اس کے کفران پر نکیر ہو رہی ہے۔ وہ صرف یہ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو زمین کی تمام نعمتوں سے نوازا بلکہ یہ بھی ہے کہ انسان ان تمام چیزوں کا مالک اور متصرف بھی ہے اور یہ کہ انسان کی قدر و قیمت ان تمام مادی اقدار سے برتر ہے جن پر یہ زمین حاوی ہے۔ جس انعام کا یہاں ذکر ہے ملکیت کائنات اور زمین کے ذخائر سے انتفاع سے بھی آگے' وہ انسانی شرافت اور انسان کی برتری کی نعمت ہے۔

ثُمَّ اسْتَوٰىٓ اِلَى السَّمَآءِ فَسَوّٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ "پھر اوپر کی طرف توجہ فرمائی اور سات آسمان استوار کئے۔" یہاں اس بات کی ضرورت نہیں ہے کہ استوا الی السماء کی حقیقت و ماہیت کیا ہے؟ ہمارے لئے صرف یہ جاننا کافی ہے کہ آسمان کی طرف متوجہ ہونے سے مراد کیا ہے؟ استوا الی السماء قدرت الٰہی کے اظہار کا ایک پیرایہ ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے تخلیق و تکوین کا ارادہ فرمایا۔ اسی طرح سات آسمانوں کی حقیقت اور ان کی شکل اور حدود اربعہ کے تعین کی بھی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ آیت کے اس اصولی اور عام مفہوم کا سمجھ لینا ہی کافی ہے۔ کفار چونکہ کائنات کے خالق و نگہبان کے منکر تھے' اس لئے یہاں یہ بیان کیا گیا کہ اللہ ہی زمین و آسمان کا خالق ہے۔ اس نے انسانوں کے لئے زمین کی تمام مخلوق کو مسخر کر لیا ہے اور آسمانوں کے اندر اس طرح نظم اور ربط پیدا کیا ہے جس کی وجہ سے اس کرہ ارض پر زندگی کا باقی رہنا آسان اور سہل ہو گیا ہے۔

وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ "اور وہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔" وہی سب کا خالق اور سب کا مدبر ہے' لہٰذا ظاہر ہے کہ وہ ہر چیز کا علم بھی رکھتا ہے۔ پوری کائنات کی تدبیر کے ساتھ ساتھ پوری کائنات کا علم بھی رکھنا ایک ایسی حقیقت ہے جو اس کائنات کے خالق وحدہ لاشریک پر ایمان لانے کے لئے مہمیز کا کام دیتی ہے۔ اس سے انسان اس وحدہ لاشریک مدبر کی بندگی کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ اور بطور شکر نعمت اپنے رازق اور منعم کی بندگی بجالاتا ہے۔

یہاں آکر سورت کی ابتدائی بحثیں ختم ہو جاتی ہیں۔ اس پوری بحث میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ لوگ ایمان لے آئیں اور مومنین و متقین کے اختیار کردہ راستے کو اپنالیں۔

درس ۳ ایک نظر میں

قرآن کریم میں مختلف مواقع پر قصص کا بیان ہوتا ہے۔ موقع و محل خود بتادیتا ہے کہ یہاں اس قصے کے بیان سے غرض وغایت کیا ہے' سلسلہ کلام کی کون سی کڑی سے تعرض کیا جارہا ہے؟ کس شکل و صورت میں قصہ پیش ہو رہا ہے اور وہ طرز ادا کیا ہے جس میں وہ قصہ بیان ہو رہا ہے...... اس اسلوب کلام سے روحانی' فکری اور فنی فضا میں ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے۔ ایک تو موضوع کلام کا حق ادا ہو جاتا ہے دوسری طرف بیان قصہ کی نفسیاتی اغراض بھی پوری ہو جاتی ہیں اور قصہ کو لانے سے جو اثرات پیدا کرنے مطلوب ہوتے ہیں وہ ہو جاتے ہیں۔

بعض لوگوں کو یہ وہم ہوا ہے کہ قرآنی قصص میں تکرار ہے کیونکہ ایک ہی قصہ مختلف شکلوں میں کئی جگہ دہرایا گیا ہے۔ لیکن گہری نظر سے مطالعہ کرنے کے بعد معلوم ہو جاتا ہے کہ جن قصوں کا کوئی ایک حصہ یا پورے قصے کو کسی جگہ دہرایا گیا ہے تو وہاں وہ اپنی سابقہ شکل و صورت میں ہی نہیں بیان ہوا بلکہ دونوں مقامات پر قصے کی مقدار اور سیاق کلام اور طرز ادا بالکل مختلف ہوتی ہے۔ جہاں بھی قصے کا کوئی حصہ دہرایا جاتا ہے وہاں ایک نئی بات کہنی مطلوب ہوتی ہے۔ لہٰذا فی الحقیقت قرآن کریم میں بیان قصص میں کوئی تکرار نہیں ہے۔

بعض کج فہم لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ قرآن کریم کے بیان کردہ بعض واقعات تخلیقی ہیں یا ان کے بیان میں تصرف کیا گیا ہے یعنی محض مقاصد اور تحسین کلام کے لئے یہ قصے لائے گئے ہیں لیکن جو شخص بھی فطرت سلیم رکھتا ہو اور کھلی آنکھوں سے قرآن کا مطالعہ کرتا ہو وہ اس حقیقت کو بسہولت پالیتا ہے کہ ہر جگہ موضوع بحث کی مناسبت سے کوئی قصہ یا اس کا کوئی حصہ لایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ انداز بیان اور طرز ادا بھی موقع و محل کی مناسبت سے بالکل جدا ہوتی ہے۔ قرآن کریم ایک دعوتی کتاب ہے۔ ایک نظام زندگی ہے اور ایک نظام زندگی کا دستور بھی ہے۔ وہ تسکین ذوق کی حکایت یا تاریخ کی کتاب نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دعوت دین کے دوران منتخب قصے بھی بیان کئے جاتے ہیں۔ قصوں کے اسلوب بیان اور ان کے مقدار کا فیصلہ سیاق کلام اور مناسبت حال کے لحاظ سے کیا جاتا ہے۔ بیان قصص میں صرف حسن ادا کی بہترین خوبیوں ہی کا لحاظ رکھا جاتا ہے۔ زور کلام کی خاطر کہیں بھی واقعات میں اضافہ نہیں کیا گیا ہاں ہر جگہ واقعات کو بالکل ایک انوکھے انداز میں پیش کیا گیا ہے اور اثر انگیزی کے لئے صرف سچائی کی قوت اور حسن ادا پر ہی اعتماد کیا گیا ہے۔

قرآنی قصے در حقیقت قافلہ ایمان کے طویل اور مسلسل سفر کی داستان اور روئیداد ہوتے ہیں اور قرآن میں دعوت دین کی طویل کہانی کو سمو دیا گیا ہے: جو نسلاً بعد نسل لوگوں کے سامنے پیش کی جاتی رہی اور لوگ اسے قبول کرتے رہے۔ یہ قصے ایک طرف تو انسانوں کی ان برگزیدہ ہستیوں کی کیفیت ایمان کو پیش کرتے ہیں جنہیں اس کام کے لئے منتخب کیا گیا اور دوسری طرف یہ بتاتے ہیں کہ ان برگزیدہ ہستیوں اور رب العالمین کے درمیان تعلق کی نوعیت کیا تھی؟ ان قصوں کے ذریعہ ہم دیکھتے ہیں کہ یوں یہ قافلہ اہل کرم اس طویل شاہراہ پر چلا آتا ہے۔ دل کو روشنی نور اور طہارت سے بھرتے ہوئے وہ دل کے اندر اس قیمتی متاع' متاع ایمان اور اس کائنات میں اس کی اہمیت کا شعور بیدار کرتے ہوئے آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ وہ ایمانی تصور حیات کو تمام دوسرے عارضی تصورات زندگی سے ممیز کرتے ہوئے اسے انسان کے حس وشعور میں بٹھاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید جو کتاب دعوت ہے اس کا ایک بڑا حصہ ایسے ہی قصص پر مشتمل ہے۔

اب ہمیں چاہئے کہ ان تصریحات کی روشنی میں قصہ آدم کا مطالعہ کریں جیسا کہ سیاق کلام سے معلوم ہوتا ہے۔ اس سے پہلے قافلہ حیات انسانی کی زندگی سے بحث کی گئی ہے بلکہ اس پوری کائنات کے وجود سے بحث کی گئی۔ اس کے بعد انسان پر اپنی نعمتوں کا ذکر کرتے

ہوئے اس کرہ ارض کا ذکر ہوا اور بتایا گیا کہ اس زمین میں جو کچھ بھی ہے وہ اللہ نے انسانوں کے لئے پیدا کیا ہے۔ اس ضمن میں اس زمین پر حضرت آدم علیہ السلام کو منصب خلافت عطا کئے جانے کا قصہ شروع ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ زمین کے اختیارات حضرت آدم علیہ السلام کے سپرد کر دیتے ہیں لیکن اختیارات کی یہ سپردگی مشروط ہے اور حضرت آدم کے ساتھ ایک معاہدہ ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ حضرت آدم علیہ السلام کو علم و معرفت کی وہ ضروری مقدار بھی عطا کرتے ہیں جو بار خلافت اٹھانے کے لئے ضروری تھی نیز بعد میں چونکہ اللہ تعالیٰ نے منصب خلافت کا معاہدہ بنی اسرائیل سے کیا۔ اس لئے قصہ آدم اس کے لئے تمہید کا درجہ رکھتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کے بعد بنی اسرائیل کو اس خلافت سے معزول کر دیا اور قلمدان خلافت اس امت مسلمہ کے حوالے کر دی جاتی ہے جو اللہ کے عہد کو اچھی طرح پورا کرنے والی ہے۔ اس طرح یہ قصہ سیاق سباق سے پوری طرح ہم آہنگ ہو جاتا ہے۔ اب ہمیں چاہئے کہ لحہ بھر آغاز انسانیت کے احوال پڑھیں اور دیکھیں کہ ان کے پس منظر میں کس قدر قیمتی ہدایات پوشیدہ ہیں۔

پردہ اٹھتا ہے اور سب سے پہلے ہم عالم بالا کے اسٹیج پر پہنچ جاتے ہیں۔ بلندیوں کی چمک اور روشنیوں میں نور بصیرت کے ذریعہ ہم انسانیت کے آغاز کی کہانی کو یوں اسٹیج ہوتے دیکھ رہے ہیں۔

☆ ☆ ☆

درس نمبر ۳ تشریح آیات (۳۰ تا ۳۹)

وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَٰٓئِكَةِ إِنِّى جَاعِلٌ فِى ٱلْأَرْضِ خَلِيفَةً ۖ قَالُوٓا۟ أَتَجْعَلُ فِيهَا مَن يُفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ ٱلدِّمَآءَ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ۖ قَالَ إِنِّىٓ أَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴿٣٠﴾

پھر ذرا اس وقت کا تصور کرو جب تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا تھا کہ "میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔" انہوں نے عرض کیا: "کیا آپ زمین میں کسی ایسے کو مقرر کرنے والے ہیں جو اس کے نظام کو بگاڑ دے اور خونریزیاں کرے گا؟ آپ کی حمد وثنا کے ساتھ تسبیح اور آپ کی تقدیس تو ہم کر ہی رہے ہیں۔" فرمایا: "میں جانتا ہوں' جو کچھ تم نہیں جانتے۔"

وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَٰٓئِكَةِ إِنِّى جَاعِلٌ فِى ٱلْأَرْضِ خَلِيفَةً "پھر ذرا اس وقت کا تصور کرو' جب تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا تھا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔" تو معلوم ہوا کہ یہ عالم بالا کی خاص مشیئت ہے کہ اس کائنات میں پیدا کئے جانے والے اس نئے موجود (انسان) کو اس زمین کے تمام اختیارات دے دیئے جائیں۔ اسے اس دنیا میں آزاد چھوڑ دیا جائے اور اس کائنات کے مقصد تخلیق اور اسے عدم سے وجود میں لانے کی غرض وغایت کا اظہار اور اس کے بروئے کار لانے کا کام اس انسان کے سپرد کر دیا جائے اور اس انسان کو اس زمین کی تحلیل و ترکیب' اس کی تبدیلی اور ترقی' اس کے اندر پوشیدہ خزانوں کا کھوج لگانے اور اس خام ذخائر کے پتہ لگانے اور انہیں مسخر کرنے کے کام میں لگا دیا جائے۔ یہ سب کام اللہ کے حکم سے ہو اور انسان کی اس عظیم مہم کا ایک حصہ ہو جو اللہ تعالیٰ نے اس انسان کے سپرد کی۔

O..... نیز استخلاف آدم سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اللہ نے اس جدید مخلوق (انسان) کے اندر ایسی پوشیدہ قوتیں ودیعت کی ہیں اور اسے ایسی استعداد دی ہے جس کے ذریعے وہ اس زمین کے اندر پوشیدہ تمام قوتوں' تمام مفید ذخیروں اور خام مواد کو کام میں لا سکتا ہے۔ اسے اللہ تعالیٰ نے ایسی اندرونی اور خفیہ طاقتیں دی ہیں جن کے ذریعے وہ اس منشاء خداوندی کو بروئے کار لا سکتا ہے۔

O..... نیز اس سے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کائنات پر حاوی ہونے والے قوانین قدرت اور نوامیس فطرت اور اس انسان اور اس کی قوتوں پر نافذ ہونے والے قوانین شریعت کے درمیان مکمل توافق اور ہم آہنگی پائی جاتی ہے تاکہ ان دونوں قوانین کے درمیان تصادم اور تضاد نہ ہو اور انسانی طاقت اور قوتیں اس عظیم کائنات کے قوانین قدرت اور نوامیس فطرت سے ٹکرا کر پاش پاش نہ ہو جائیں۔

O..... نیز اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک عظیم اعزاز ہے جو اس کائنات کے اندر اور اس پورے کرہ ارض پر حضرت انسان کو دیا گیا۔ یہ وہ شرف ہے جو انسان کے خالق رحیم اور خداوند کریم نے اس کے لئے پسند فرمایا اور کیا ہی بلند ہے یہ مقام! اور یہ تمام باتیں عالم بالا کے اس جلیل القدر اشارے سے معلوم ہوتی ہیں کہ "میں زمین پر اپنا خلیفہ بنانے والا ہوں۔"

بالخصوص جبکہ آج ہم چشم سر اور چشم بصیرت دونوں سے عیاں دیکھ رہے ہیں کہ انسان نے اس کائنات میں یہ کام کیا اور اس نے اللہ تعالیٰ کی اس زمین میں وہ تکوینی مقصد پورا کیا جس کے لئے اسے پیدا کیا گیا تھا اور اس وسیع مملکت میں اسے اپنا خلیفہ بنایا گیا تھا۔

قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَاۗءَ ۚ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ۭ

"انہوں نے عرض کیا "کیا آپ زمین میں کسی ایسے کو مقرر کرنے والے ہیں جو اس کے نظام کو بگاڑ دے گا اور خونریزیاں کرے گا؟ آپ کی حمد و ثنا کے ساتھ ساتھ تسبیح اور آپ کے لئے تقدیس تو ہم کر ہی رہے ہیں۔" ملائکہ کی اس بات سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے یا تو اس وقت موجودہ صورت حال سے آنے والی مخلوق کے بارے میں اندازہ کر لیا تھا یا اس سے پہلے زمین میں جو مخلوق بسائی گئی تھی اس کے تجربات کی روشنی میں انہوں نے یہ بات کہی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ انہوں نے اپنی خداداد بصیرت کے ذریعے یہ معلوم کر لیا ہو کہ آنے والی مخلوق کیسی ہوگی؟ نیز یہ بھی ہو سکتا ہے کہ زمین میں انسانی زندگی کے لئے جو ضروری تقاضے تھے اس سے انہوں نے اس مخلوق کی فطرت کا اندازہ لگا لیا ہو۔ اس لئے وہ جانتے تھے یا کم از کم انہیں یہ توقع تھی کہ آنے والی یہ نئی مخلوق زمین میں فساد برپا کرے گی اور یہاں خونریزیاں ہوں گی۔ انہوں نے یہ سوال اس لئے بھی اٹھایا کہ اپنی پاک فطرت اور معصومیت کی وجہ سے وہ خیر مطلق اور ہمہ جہت امن و امان ہی کا تصور کر سکتے تھے۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ اس کائنات کا مقصد وجود اور سبب تخلیق ہی صرف یہ ہے کہ اللہ کی حمد و ثنا کے ساتھ اس کی تقدیس کی جائے اور یہ بات ان کی موجودگی سے پوری طرح سرانجام دی جا رہی تھی۔ کیونکہ یہ فرشتے ہر وقت اللہ کی حمد و ثنا کے ساتھ اس کی پاکی بیان کرتے رہتے تھے اور کسی وقت بھی اس کی بندگی اور اطاعت سے منہ نہ موڑتے تھے۔

لیکن اس زمین کی ساخت و پرداخت اور اس کے اندر زندگی کی بوقلمونیوں کے بروئے کار لانے میں جو گہری اور دوررس مصلحت کارفرما تھی وہ ان کی نظر سے اوجھل تھی۔ مشیت الٰہی یہ تھی کہ اللہ کا یہ خلیفہ جو اگرچہ کبھی کبھار فساد بھی پھیلائے گا، خونریزیاں بھی کرے گا، اس زمین کو مسخر کرے، اسے ترقی دے، اس کی ساخت کو بدلے تاکہ اللہ کا منشا پورا ہو اور اس معمولی اور جزوی شر و فساد کے ہوتے ہوئے وہ عظیم بھلائیاں پروان چڑھیں جو عمومی اور سب کائنات کو شامل ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی اس وسیع کائنات میں دائمی نشوونما، مسلسل تہذیب کی ترقی، تخریب و تعمیر کا دائمی عمل، پیہم جدوجہد، نہ رکنے والی جستجو، مسلسل تغیر و تبدیلی کے ذریعہ یہ عظیم تر بھلائی اور بہبود بروئے کار لائی جائے۔

چنانچہ ان کے اس سوال کے جواب میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو عالم الغیب اور علیم و خبیر ہے یہ فیصلہ صادر ہوتا ہے۔ قَالَ اِنِّىْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ "میں وہ کچھ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔"

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَاۗءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَي الْمَلٰۗىِٕكَةِ ۙ فَقَالَ اَنْۢبِــُٔـوْنِىْ بِاَسْمَاۗءِ ھٰٓؤُلَاۗءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝۳۱ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ۭ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ۝۳۲ قَالَ يٰٓاٰدَمُ اَنْۢبِئْھُمْ بِاَسْمَاۗىِٕهِمْ ۚ فَلَمَّآ اَنْۢبَاَھُمْ بِاَسْمَاۗىِٕهِمْ ۙ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّىْٓ اَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ

وَ الْاَرْضِ ۙ وَ اَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ﴿۳۳﴾

"اس کے بعد اللہ نے آدم کو ساری چیزوں کے نام سکھائے، پھر انہیں فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور فرمایا اگر تمہارا خیال صحیح ہے (کہ کسی خلیفہ کے تقرر سے نظام بگڑ جائے گا) تو ذرا ان چیزوں کے نام بتاؤ۔" انہوں نے عرض کیا "نقص سے پاک تو آپ ہی کی ذات ہے ہم تو بس اتنا ہی جانتے ہیں جتنا آپ نے ہم کو دیا ہے۔ حقیقت میں سب کچھ جاننے اور سمجھنے والا آپ کے سوا کوئی نہیں۔" پھر اللہ نے آدم سے کہا "تم انہیں ان چیزوں کے نام بتاؤ؟" جب اس نے ان کو سارے نام بتا دیئے تو اللہ نے فرمایا "میں نے تم سے کہا نہ تھا کہ میں آسمانوں اور زمین کی وہ ساری حقیقتیں جانتا ہوں جو تم سے مخفی ہیں اور جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو وہ بھی مجھے معلوم ہے اور جو کچھ تم چھپاتے ہو اسے بھی میں جانتا ہوں۔"

دیکھئے! اب ہم چشم بصیرت سے نہایت بلند روشنیوں میں عالم بالا کے کسی مقام پر فرشتوں کی ایک جمعیت کا مشاہدہ کر رہے ہیں۔ اس تقریب میں جب ہم دیکھتے ہیں کہ انسانیت کو منصب خلافت سپرد کیا جا رہا ہے اور یوں ہمیں اس عظیم راز سے آگاہ کر دیا جاتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنی اس انسانی مخلوق کی ذات میں ودیعت فرمایا ہے۔ وہ راز یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو مفاہیم کے اظہار کے لئے ان کے نام رکھنے کی صلاحیت دی ہے اور اس طرح انسان ان ناموں کے ذریعہ اظہار مافی الضمیر کرتے ہیں۔ ناموں کی حقیقت کیا ہے؟ صرف یہ کہ وہ مختلف قسم کی آوازیں ہیں جو انسان اپنے منہ سے نکالتا ہے اور جو ان محسوسات اور اشخاص پر دلالت کرتی ہیں جنہیں انسان دیکھتا ہے۔ اس زمین پر حیات انسانی کو آسان بنانے کے لئے یہ ایک اہم صلاحیت ہے جو اللہ نے انسان کو دی ہے۔ اس کی افادیت کا صحیح تصور اس وقت ہی ہو سکتا ہے جب ہم تھوڑی دیر کے لئے یہ فرض کر لیں کہ انسان...... کے اندر اشیاء کے نام رکھنے اور استعمال کرنے کی قدرت نہیں ہے۔ اب دیکھئے ایک دوسرے کو سمجھنے میں اور باہم معاملات طے کرنے میں کیا مشکلات ہیں؟ جم سے اچانک یہ دوچار ہو گئے۔ اگر کوئی کسی کے ساتھ کسی چیز کے بارے میں کوئی معاملہ کرنا چاہتا ہے تو خود اس چیز کا حاضر کرنا ضروری ہو جاتا ہے تاکہ وہ اس کے بارے میں کوئی مفاہمت کر سکیں۔ اگر کسی درخت کا معاملہ درپیش ہے تو ضروری ہے کہ درخت سامنے ہو۔ اگر کسی پہاڑ اور قطعہ زمین کے بارے میں کچھ طے کرنا ہے تو ضروری ہے کہ سب لوگ وہاں جائیں۔ اگر کسی فرد بشر کا معاملہ ہے تو ضروری ہے کہ اسے سامنے لایا جائے۔ ذرا سوچئے مشکلات کا ایک طوفان برپا ہو گیا ہے اور جینا دوبھر ہو گیا ہے۔ غرض اگر اللہ تعالیٰ حضرت انسان کو یہ راز نہ بتاتے کہ ہر معنی و مفہوم کا اظہار ان ناموں کے ذریعے ہو سکتا ہے تو ہماری زندگی دو قدم بھی آگے نہ بڑھ سکتی۔

رہے فرشتے تو انہیں اس قابلیت کی ضرورت ہی کیا تھی؟ ان کے کام اور ان کی ڈیوٹی کی جو نوعیت تھی اس کے لئے اس کی ضرورت ہی نہ تھی کہ وہ ہر چیز کے نام کو جانیں۔ اس لئے اللہ نے اس وقت فرشتوں کو یہ راز نہ بتایا تھا۔ جب اللہ نے آدم کو یہ راز بتایا اور فرشتوں کے سامنے جب چیزیں پیش کی گئیں تو وہ ان کے نام نہ بتا سکے۔ وہ یہ نہ جانتے تھے کہ مختلف چیزوں اور اشخاص کا نام رکھ کر الفاظ کے ذریعے انہیں بہ سہولت سمجھایا جا سکتا ہے۔ چنانچہ انہوں نے اپنی اس ناکامی کو دیکھ کر اللہ کی حمد و ثنا بیان کی اور اپنے عجز و درماندگی کا اقرار کیا اور کہہ دیا ان کا علم تو صرف انہی چیزوں تک محدود ہے جو اللہ تعالیٰ نے انہیں دی ہیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کا تعارف کرایا اور آخر میں نتیجہ بحث کے طور پر یوں انہیں اللہ تعالیٰ کی حکمت اور وسعت علم کی طرف راہنمائی کی۔ "میں نے تم سے کہا نہ تھا کہ آسمانوں اور زمین کی وہ ساری حقیقتیں جانتا ہوں جو تم سے مخفی ہیں۔ جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو وہ بھی مجھے معلوم ہے اور جو کچھ تم چھپاتے ہو اسے بھی میں جانتا ہوں۔"

وَ اِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ اَبٰى وَ اسْتَكْبَرَ ٘ وَ كَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۳۴﴾ وَ قُلْنَا يٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَ زَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَ كُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا ۪ وَ لَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۳۵﴾ فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ ۪ وَ قُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَ لَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّ مَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ﴿۳۶﴾ فَتَلَقّٰٓى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۳۷﴾

"پھر جب ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کے آگے جھک جاؤ' تو سب جھک گئے مگر ابلیس نے انکار کیا۔ وہ اپنی بڑائی کے گھمنڈ میں پڑ گیا اور نافرمانوں میں شامل ہو گیا۔

پھر ہم نے آدم سے کہا کہ "تم اور تمہاری بیوی' دونوں جنت میں رہو اور یہاں بفراغت جو چاہو کھاؤ' مگر اس درخت کا رخ نہ کرنا' ورنہ ظالموں میں شمار ہو گے۔"

آخر کار شیطان نے ان دونوں کو اس درخت کی ترغیب دے کر ہمارے حکم کی پیروی سے ہٹا دیا اور انہیں اس حالت سے نکلوا کر چھوڑا جس میں وہ تھے۔ ہم نے حکم دیا کہ "اب تم سب یہاں سے اتر جاؤ' تم ایک دوسرے کے دشمن ہو اور تمہیں ایک خاص وقت تک زمین میں ٹھیرنا اور وہیں گزر بسر کرنا ہے۔" اس وقت آدم نے اپنے رب سے چند کلمات سیکھ کر توبہ کی جس کو اس کے رب نے قبول کر لیا کیونکہ وہ بڑا معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔"

وَ اِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا "پھر جب ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کے آگے جھک جاؤ تو سب جھک گئے۔ اب ذرا اس مفسد اور خون آشام مخلوق کی عزت افزائی دیکھئے کہ وہ کروبیوں کی مسجود ہو رہی ہے۔ فرشتوں سے بھی بلند ہو جاتی ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ ایک تو اسے معرفت الٰہی کا راز بخشا گیا دوسرے یہ کہ اسے ایک صاحب ارادہ مخلوق بنایا گیا ہے۔ انسان جس راہ کو اختیار کرنا چاہئے آزادانہ اختیار کر سکتا ہے۔ غرض فطرت انسانی کی یہ دو رنگی اپنے ارادے پر اس کا اختیار اور اس کے ذریعے اپنے لئے راہ حیات کے تعین میں آزادی اپنی خاص کوششوں اور جدوجہد سے ہدایت انسانیت کی ذمہ داری اور اس فریضے کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کی قدرت وغیرہ ہی وہ چیزیں ہیں جن میں اس کے اس عظیم اعزاز کا راز پوشیدہ ہے۔

چنانچہ اس تقریب میں باری تعالیٰ کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے سب فرشتے آدم خاکی کے سامنے سربسجود ہو جاتے ہیں۔ اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ اَبٰى وَ اسْتَكْبَرَ ٘ وَ كَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ مگر ابلیس نے انکار کیا وہ اپنی بڑائی کے گھمنڈ میں پڑ گیا اور نافرمانوں میں شامل ہو گیا۔"

اس تقریب میں شریر مخلوق مجسم ہو کر سامنے آجاتی ہے۔ خود ذات قدس کی بارگاہ میں باری تعالیٰ کی نافرمانی ہوتی ہے اور صاحب فضیلت کے فضل اور اعزاز کا انکار کیا جاتا ہے۔ یہ شریر مخلوق گناہ پر مصر ہے اور فہم و فراست کے تمام دروازے اس کے لئے بند ہو جاتے ہیں۔

سیاق کلام سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ ابلیس اگرچہ فرشتوں کے ساتھ رہتا تھا لیکن وہ ملائکہ میں سے نہ تھا کیونکہ اگر وہ فرشتوں میں سے ہوتا تو اسے سرتابی کی مجال نہ ہوتی کیونکہ فرشتوں کی توصفت اور خاصیت ہی یہ ہے کہ لَا يَعْصُوْنَ مَا اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ "اللہ انہیں جو حکم دیتا ہے وہ اس کی نافرمانی نہیں کرتے بلکہ انہیں جو حکم دیا جاتا ہے وہ اسے کر گزرتے ہیں۔" اگرچہ یہ استثنائی جملہ کہ "سب فرشتوں نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے" بظاہر یہ بتاتا ہے کہ ابلیس فرشتوں میں سے تھا لیکن وہ چونکہ فرشتوں کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا تھا اسی لئے سلسلہ کلام میں ایسی استثنا لائی گئی۔ عرب کہتے ہیں جَاءَ بَنُوْ فُلَانٍ اِلَّا اَحْمَدُ فلاں قوم کے لوگ سب آگئے مگر احمد حالانکہ احمد ان میں سے نہیں ہوتا بلکہ وہ ان کے جوار میں رہتا ہے۔ دوسری جگہ قرآن مجید اس کی تصریح بھی کرتا ہے کہ ابلیس جنوں میں سے تھا اور جنوں کو اللہ تعالیٰ نے آگ کے شعلے سے پیدا کیا ہے۔ اس سے یہ بات قطعیت کے ساتھ معلوم ہو جاتی ہے کہ وہ فرشتوں میں سے نہ تھا۔

اس تقریب کے بعد اب ہمارے سامنے میدان کارزار ہے جس میں خلیفہ شر 'ابلیس' اور خلیفہ خدا انسان ہے اور دونوں کے درمیان مسلسل جنگ ہو رہی ہے۔ یہ جنگ درحقیقت انسانی ضمیر اور اس کے دل و دماغ کے میدانوں میں لڑی جا رہی ہے۔ اور اس میں وہی انسان کامیاب ہوتے ہیں جو پختہ ارادے کے مالک ہوتے ہیں۔ وہی سرخرو ہوتے ہیں جو اللہ کے ساتھ کئے ہوئے عہد کو مضبوطی سے تھام لیتے ہیں۔ جوں جوں انسان اپنی خواہشات نفس کا بندہ بنتا چلا جاتا ہے اللہ تعالیٰ سے دور ہوتا جاتا ہے۔ شر کی قوتوں کو پیش قدمی حاصل ہوتی جاتی ہے۔

وَ قُلْنَا يٰۤاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَ زَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَ كُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا ۪ وَ لَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ "پھر ہم نے آدم سے کہا تم اور تمہاری بیوی دونوں جنت میں رہو اور یہاں بفراغت جو چاہو کھاؤ مگر اس درخت کا رخ نہ کرنا ورنہ ظالموں میں شمار ہو گے۔" ...... آدم و حوا کے لئے جنت کے تمام پھل جائز قرار دیئے گئے' صرف ایک درخت کو مستثنیٰ رکھا گیا تھا۔

صرف ایک درخت ..... شاید اس میں یہ اشارہ تھا کہ زمین میں نسل انسانی حلال و حرام کے قیود کی پابند ہوگی' کیونکہ حدود و قیود کے بغیر آزاد اور خود مختار ارادہ پیدا کیونکر ہو سکتا ہے اور ایک متحرک بالارادہ انسان اور ایک مجبور حیوان کے درمیان فرق کیونکر ہو سکتا ہے۔ اس کے سوا تو اس بات کا امکان ہی نہیں رہتا کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے عائد شدہ حدود و قیود کی پابندی کے سلسلے میں انسان کو آزمایا جائے۔ یہ قوت ارادہ ہی ہے جو ایک حقیقی انسان اور ایک انسان نما حیوان کے درمیان فرق کر دیتی ہے جو مویشیوں کی طرح دنیا میں چرتا پھرتا ہے اور بس۔

فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ ۪ "آخر کار شیطان نے ان دونوں کو اس درخت کی ترغیب دے کر ہمارے حکم کی پیروی سے ہٹا دیا اور انہیں اس حالت سے نکلوا کر چھوڑا جس میں وہ تھے۔" ...... ذرا تعبیر کا شاہکار دیکھئے۔ شیطان نے انہیں پھسلایا۔ "پھسلانے کا لفظ ہی پوری صورت حال کی تصویر کھینچ دیتا ہے۔ گویا ہم چشم سر دیکھ رہے ہیں کہ شیطان انہیں دھکیل دھکیل کر جنت سے نکالنے کی کوشش کر رہا ہے۔ گویا وہ اچانک ان کی ثابت قدمی کو دھکا دیتا ہے اور وہ گر جاتے ہیں اور نیچے آ رہتے ہیں۔

یہاں آدم و ابلیس کی کشمکش کا پہلا تجربہ مکمل ہو جاتا ہے۔ آدم علیہ السلام اپنے عہد کو بھول جاتے ہیں' وہ اس کے بہکانے کے سامنے کمزور پڑ جاتے ہیں۔ اللہ کا حکم سچائی بن کر سامنے آتا ہے اور قضائے الٰہی کا اعلان یوں ہوتا ہے۔

وَ قُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَ لَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّ مَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ "ہم نے حکم دیا کہ

اب تم یہاں سے اتر جاؤ' تم ایک دوسرے کے دشمن ہو اور تمہیں ایک خاص وقت تک زمین میں ٹھہرنا اور وہیں گزر بسر کرنا ہے۔" یہ اعلان تھا کہ اب آدم و ابلیس کا معرکہ اپنی مقرر جگہ یعنی اس زمین پر شروع ہو جاتا ہے۔ اور اب یہ معرکہ تاقیامت یوں ہی برپا رہے گا۔

آدم علیہ السلام گرنے کے بعد اب سنبھلتے ہیں اور اٹھتے ہیں کیونکہ گرنا اور اٹھنا تقاضائے فطرت انسانی ہے۔ اب اللہ کی رحمت انہیں اپنے سایہ رحمت و عاطفت میں لے لیتی ہے اور جو بھی اللہ کی رحمت کے دامن میں پناہ لے اور اس کی چوکھٹ پر آگرے یہ رحمت بے پایاں ہمیشہ اسے ڈھانپ لیا کرتی ہے۔

فَتَلَقّٰٓى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ۭ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ "اس وقت آدم نے اپنے رب سے چند کلمات سیکھ کر توبہ کی' جس کو اس کے رب نے قبول کر لیا۔ کیونکہ وہ بڑا معاف کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔" آدم اور نسل آدم کے ساتھ یہ اللہ تعالیٰ کا ایک دائمی معاہدہ ہے۔ بات مکمل ہو گئی۔ آدم اس زمین پر اللہ کا ایک بااختیار اور ذی ارادہ خلیفہ قرار پایا۔ اس کا کام ہے کہ وہ فلاح کی راہ اختیار کرتا ہے یا ہلاکت و بربادی کی۔

(قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّىْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَاىَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۳۸﴾ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۳۹﴾)

۴
ع ۱۰
۴

"ہم نے کہا تم سب یہاں اتر جاؤ۔ پھر جو میری طرف سے کوئی ہدایت تمہارے پاس پہنچے تو جو لوگ میری اس ہدایت کی پیروی کریں گے' ان کے لئے کسی خوف اور رنج کا موقع نہ ہو گا۔ اور جو اس کو قبول کرنے سے انکار کریں گے اور ہماری آیات کو جھٹلائیں گے' وہ آگ میں جانے والے ہیں جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔" یہاں آکر یہ معرکہ اپنے اصلی میدان' زمین کی طرف منتقل ہو جاتا ہے اور اس وقت سے شروع ہے۔ لمحہ بھر کے لئے بھی ٹھنڈا نہیں ہوتا۔ اور یوں انسان' آغاز انسانیت سے یہ راز پالیتا ہے کہ اگر وہ اس دنیا میں سرخروئی اور کامرانی چاہتا ہے تو اس کے حصول کا طریقہ کیا ہے؟ اور اگر وہ ذلت و خواری چاہت ہے تو اس کی راہ کون سی ہے؟

O......☆......O

لمحہ بھر کے لئے ذرا پیچھے کی طرف لوٹئے اور ابتدائی انسانیت کی اس دلچسپ کہانی کے بعض پہلوؤں کا جائزہ لیجئے! اللہ تعالیٰ فرشتوں سے خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ "میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔ معلوم ہوا کہ آدم علیہ السلام پہلے ہی اس زمین کے لئے پیدا کئے گئے تھے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پہلے کیوں اسے جنت دکھائی گئی ہے؟ کیوں ایک درخت کو حرام قرار دیا گیا' اسے ابتلا میں ڈالا گیا' یوں اسے زمین کی طرف اتار دیا گیا حالانکہ وہ طے شدہ پروگرام کے مطابق پیدا ہی اس لئے کیا گیا تھا کہ زمین پر فریضہ خلافت سرانجام دے؟

میں سمجھتا ہوں کہ کشمکش آدم و ابلیس کا یہ پہلا تجربہ کرایا ہی اس لئے گیا تھا کہ اس کے ذریعے آدم علیہ السلام کو کاروبار خلافت کے چلانے کے لئے تیار کیا جائے۔ اس طرح آدم علیہ السلام کی پوشیدہ قوتوں کو جگا دیا گیا۔ اسے لغزش کا تجربہ کرایا گیا اور اس کے نتائج سے دوچار کیا گیا۔ اس کے بعد ندامت و شرمندگی' توبہ' دشمن کی پہچان اور اللہ کی مامون پناہ گاہ میں آنے کا طریقہ سکھلایا گیا۔

شجر ممنوعہ کی کہانی' اس کے چکھنے کے لئے شیطان کی وسوسہ اندازی' انسان اول کا نسیان عہد عصیان کے بعد ہوش میں آنا' پشیمانی اور

استغفار۔ یہ سب کیفیات و واردات ایسی ہیں جن کا تجربہ ہر انسان کو ہر لحظہ ہوتا رہتا ہے۔

اس انسان پر اللہ کی رحمت اور شفقت کا یہ تقاضا تھا کہ وہ اپنے دار الخلافہ میں تمام ایسے تجربات سے آراستہ ہو کر اترے جن کا پیش آنا اس کی زندگی کا ایک اہم حصہ تھا۔ تاکہ وہ اس طویل اور نہ ختم ہونے والی کشمکش (کشمکش آدم و ابلیس) کے لئے تیار ہو اور یہ تجربہ اس کے لئے نصیحت آموز اور سامان عبرت ہو۔

آپ دوبارہ یہ سوال کر سکتے ہیں کہ پھر یہ تجربہ کہاں ہوا؟ وہ جنت کون سی ہے جس میں آدم و حوا کچھ عرصے کے لئے قیام پذیر ہوئے؟ فرشتے کیا ہیں؟ ابلیس کی حقیقت کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے انہیں کیونکر خطاب کیا' اور انہوں نے کیونکر جواب دیا؟

بھائی! یہ اور ایسی تمام دوسری باتیں جو قرآن کریم میں مذکورہ ہیں دراصل یہ اللہ کے ان بھیدوں اور اسرار میں سے ہیں۔ جن کی حقیقت کا علم صرف اللہ ہی کو ہے' اللہ تعالیٰ جو علیم و حکیم ہے' وہ جانتا تھا کہ ان چیزوں کی حقیقی معرفت اور ان کی ماہیت معلوم کرنے سے انسان کو کوئی فائدہ نہیں ہے۔" لہٰذا اللہ تعالیٰ نے انسان کو ان چیزوں کی حقیقت معلوم کرنے اور ان کی اصلیت کا ادراک کرنے کی صلاحیت ہی نہیں دی۔ وہ ان کی ماہیت کا احاطہ کر ہی نہیں سکتا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو مدرکات دیئے ہیں وہ صرف اس لئے دیئے ہیں کہ ان کے ذریعے انسان اس زمین میں کاروبار خلافت سرانجام دے۔ یہ مدرکات حقیقت مغیبات کا علم حاصل کرنے کے لئے استعمال ہی نہیں ہو سکتے۔ نیز فریضۂ خلافت کے لئے یہ ضروری بھی نہیں ہے کہ ہم ان مغیبات کی حقیقت کو بھی جانتے ہوں۔ اللہ کے قوانین قدرت کو کس قدر انسان کے لئے مسخر کیا ہے۔ انسان کو کائنات کے اسرار و رموز کا کتنا علم دیا ہے؟ کتنے اسرار مغیبہ ہیں' جو اس کی نظروں سے اوجھل ہیں؟ یہ ایسی باتیں ہیں جن کے علم و ادراک کی حضرت انسان کو قطعاً کوئی ضرورت نہیں ہے۔ انسان کی حالت یہ ہے کہ اس کائنات کے بے شمار اسرار کا پردہ فاش کرنے کے باوجود' وہ اب بھی ان تمام واقعات و حوادث سے مطلقاً بے خبر ہے جو اگلے لمحہ نمودار ہونے والے ہیں۔ تمام مہیا اور میسرہ آلات...... اور ذرائع علم کے باوجود جو اسے میسر ہیں' وہ کچھ نہیں جانتا کہ اگلے لمحے میں کیا ہونے والا ہے۔ اسے معلوم نہیں کہ وہ جو سانس لے رہا ہے وہ آخری سانس لے رہا ہے یا اس کے بعد وہ دوسرا سانس بھی لے سکے گا۔ پردۂ غیب میں جو حقائق پوشیدہ ہیں یہ ان میں سے ایک ادنیٰ مثال ہے۔ غرض فریضۂ خلافت کی ادائیگی کے لئے اسے ان مغیبات میں سے کسی چیز کا جاننا بھی ضروری نہیں ہے' بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ اگر انسان پر بعض اسرار کھول دیئے جائیں تو وہ اس کی کارکردگی پر الٹا اثر ڈالیں گے۔ چنانچہ ایسے پوشیدہ اسرار و رموز کی کئی قسمیں جو پردۂ غیب میں مستور ہیں اور اللہ کے سوا ان کا علم کسی کو بھی نہیں ہے۔

اس لئے عقل انسان کا یہ کام ہی نہیں ہے کہ وہ اس میدان میں سعی لاحاصل کرے۔ کیونکہ اس کے پاس وہ ذرائع اور آلات ہی نہیں جو اس میدان میں کام آتے ہیں۔ جو شخص بھی اس میدان میں جدوجہد کرے گا' اور اپنی قوتیں کھپائے گا' اس کی جدوجہد اکارت جائے گی۔ بالکل ضائع اور لاحاصل۔

جب عقل انسانی کو وہ ذرائع ہی حاصل نہیں جن کے ذریعے وہ عالم مغیبات کے بارے میں کسی چیز کا ادراک کر سکے تو پھر اسے کوئی حق نہیں ہے کہ وہ محض ہٹ دھرمی کر کے غیبی حقائق کا انکار کرے۔ کیونکہ کسی چیز کا انکار کرنے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ اس کے وجود کا علم حاصل ہو۔ اور مغیبات کا علم و ادراک عقل کا کام ہی نہیں ہے۔ نہ اس کے حیطۂ قدرت اور دائرہ کار میں یہ چیزیں آتی ہیں۔ اس کے پاس ان کے ادراک کے نہ وسائل ہیں اور نہ ہی عقل کو ان کے ادراک کی ضرورت ہے۔ اور نہ ہی عقل انسانی کا یہ دینی فریضہ ہے کہ وہ ان کا ادراک کرے۔

ہمیں یہ تسلیم ہے کہ وہمیات و خرافات کو تسلیم کرنا نہایت ہی خطرناک اور مضرات ہے' لیکن یہ بات اس سے بھی بدرجہا زیادہ مضر

اور خطرناک ہے کہ انسان ایک ایسی چیز کا انکار کرے جو اس کے علم کے دائرہ رسائی ہی سے باہر ہے۔ یا کسی حقیقت کو محض اس لئے مستبعد سمجھا جائے کہ وہ انسان کے حد ادراک اور حدود قدرت سے باہر ہے۔ اگر ہم علم ویقین کا یہ معیار مقرر کر لیں تو یہ ایک حیوانی معیار ہو گا۔ گویا انسانیت پیچھے لوٹ کر دوبارہ حیوانیت کے مقام تک پہنچے گی۔ جہاں عالم محسوسات سے آگے کوئی چیز نہیں ہوتی اور جس کے لئے محسوسات کی چار دیواری سے نکل کر وجود مطلق تک پہنچنے کا امکان ہی نہیں ہے۔

لہٰذا ہمارے لئے بہتر یہی ہے کہ ہم اس عالم غیب کو اس ذات ہی کے حوالے کر دیں جو اس دنیا کا مالک ہے' اور ہمارے لئے وہی کافی ہے جس کی اطلاع وہ ہمیں دے دے۔ صرف اسی قدر جس کی ہمیں اس دنیا میں ضرورت ہے جس سے ہماری روحانی اور مادی اصلاح ہو جائے اور بس!

اب ہم اس قصے کے ان پہلوؤں کو لیتے ہیں جو بعض انسانی اور تکوینی حقائق کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ عالم موجودات کا تصور' اس کا باہم ربط' انسانی مزاج اور اس کا معیار حسن وقبح وغیرہ۔ کیونکہ انہی پہلوؤں میں بشریت کی ہدایت اور منفعت کا سامان ہے۔

یہاں ظلال القرآن کی مناسبت سے' اختصار کے ساتھ ہم ان اشارات' تصورات اور حقائق پر ایک اچٹتی نظر ڈالنا چاہتے ہیں۔

۱۔ اس قصے سے یہاں جو بات واضح ہوتی ہے وہ مقام اور حیثیت ہے جو اسلامی تصور حیات' خود اس انسان کو عطا کرتا ہے یعنی اس کائنات میں اس کی اہمیت' ان اقدار کی اہمیت جن سے اسے پرکھا جاتا ہے اور زمین پر اس کے کردار کی اہمیت وغیرہ۔ پھر یہ کہ اسلامی تصور حیات انسان اور عہد ربانی کے درمیان تعلق کی کیفیت کیا ہے؟ اور اس عہد کی حقیقت کیا ہے جس کی بنیاد پر انسان خلیفۃ اللہ فی الارض ہے۔

چنانچہ ملاء اعلیٰ میں تکریم انسانیت کی جو تقریب منعقد ہوتی ہے اور اس کے بعد جو عظیم الشان اعلان ہوتا ہے اس سے صاف صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ اسلامی تصور حیات کے مطابق حضرت انسان کی قدر وقیمت کیا ہے؟ یعنی وہ ایک ایسی مخلوق ہے جسے زمین میں خلیفۃ اللہ ہونے کا شرف حاصل ہے۔ اس کا نہایت ہی واضح اظہار اس منظر سے ہوتا ہے جس میں ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ کا حکم ہوتے ہی سب کروبی اس پتلۂ خاکی کے آگے سربسجود ہو جاتے ہیں۔ اس تقریب میں ابلیس استکبار کرتا ہے اور راندہ درگاہ ہو جاتا ہے۔ اور یہ سب کچھ آغاز سے انجام تک خاص ذات کبریائی کی نگرانی میں ہوتا ہے۔

انسان کے بارے میں جب یہ نقطۂ نظر اختیار کیا جاتا ہے تو نظریاتی دنیا اور عملی دنیا میں انسان کے اس تصور کے عظیم الشان اور گہرے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

سب سے پہلا تصور یہ پیدا ہوتا ہے کہ انسان اس زمین کا مالک ہے۔ یہ اسی کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ اس کائنات کی تمام چیزیں بھی اس انسان کے لئے پیدا کی گئی ہیں۔ اس لئے وہ ہر مادی چیز سے زیادہ معزز' زیادہ قیمتی اور زیادہ عزیز ہے۔ وہ دنیا کی تمام مادی اقدار سے بلند تر ہے۔ لہٰذا یہاں اس بات کی اجازت نہیں دی جاسکتی کہ کسی بڑے سے بڑے مادی مفاد' یا عظیم سے عظیم مادی ترقیات کے لئے انسان کو ذلیل و خوار ہونے دیا جائے۔ لہٰذا کسی قسم کی مادی تحقیقات وفتوحات' کسی قسم کی مادی پیداوار یا مادی عناصر میں سے کسی عنصر کی کثرت اور اس کے حصول کے لئے انسان کے انسانی اور اخلاقی عناصر ترکیبی میں سے کسی عنصر کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ تمام مادیات اور تمام مصنوعات' صرف انسان کی خاطر پیدا کی گئی ہیں۔ اس لئے کہ اس کی انسانیت پروان چڑھے اور بحیثیت انسان یہاں اس کی زندگی قائم رہ سکے۔ لہٰذا اس بات کی اجازت نہیں دی جاسکتی کہ محض انسانی زندگی کو قائم رکھنے کے لئے اس کی اعلیٰ اقدار اور اس کی کرامت اور شرافت کے عناصر ترکیبی ہی کو خیرباد کہہ دیں اور انہیں ضائع کر دیں۔

۲۔ اس کہانی کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اس زمین پر انسان ہی اول درجے کی موثر طاقت ہے۔ وہی ہے جو اس زمین کے رنگ ڈھنگ بدلتا ہے اور انسان کی معاشرتی زندگی میں وہی باہمی ربط و تعلق کی نوعیت معین کرتا ہے۔ وہی ہے جو قافلۂ حیات کا قائد و سالار ہے اور سمت سفر کا تعین کرتا ہے۔ ذرائع پیداوار یا پیداوار کی تقسیم کے کسی نظام کو اس انسان کی قیادت کا مقام حاصل نہیں ہے۔ یوں کہ انسان کی نکیل ان کے ہاتھ میں ہو اور وہ ذلیل و خوار ایک حیوان کی طرح اس کے پیچھے پیچھے عالم بے بسی میں چلتا ہو جیسا کہ آج کل کے بعض مادی فلسفے اس کی ایسی ہی تصویر کھینچتے ہیں۔ اور جن کا نظریہ انسانیت یہ ہے کہ اس زندگی میں ـــــ اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ ان نظاموں میں جوں جوں مشین کی قدر و قیمت میں اضافہ ہوتا ہے' انسان کی انسانیت پامال ہوتی جاتی ہے۔

قرآن انسان کو بطور خلیفۃ اللہ فی الارض پیش کرتا ہے۔ نظام کائنات میں اسے ایک بنیادی اور مؤثر عامل سمجھتا ہے اور اسلامی نظام میں اس کی ایک اہمیت ہے۔ یہ اہمیت بحیثیت خلیفہ ہے ہے۔ خلافت فی الارض کی حقیقت کیا ہے؟ اسے اس ربط و تعلق کے ذریعے سمجھا جا سکتا ہے جو انسان کو بطور خلیفہ مختلف چیزوں سے ہے۔ آسمانوں سے' زمین سے' ہواؤں سے' بارشوں سے' سورج و سیاروں اور چاند ستاروں سے۔ غرض ان سب چیزوں کی تخلیق میں اس بات کو ملحوظ رکھا گیا ہے کہ یہ حیات انسانی کے لئے ممد اور ساز گار ہوں اور ان کے لئے تعاون سے انسان زمین پر خلافت کی ذمہ داریوں سے عہدہ بر آ ہو سکے۔ ذرا اس مقام بلند کو دیکھئے اور اس ذلیل و حقیر حیثیت کو دیکھئے جو اس کے لئے دنیا کے تمام مادی نظام ہائے زندگی مخصوص کرتے ہیں۔ اور اسے اجازت نہیں دیتے کہ وہ اس پست مقام سے دو قدم آگے بڑھ سکے۔

یہ بات شک و شبہ سے بالا ہے کہ انسان کے لئے جو نظام زندگی تجویز کرتا ہے وہ یا تو اس اسلامی نقطۂ نظر کے مطابق تجویز ہوتا ہے یا پھر اس مادی نقطۂ نظر کے مطابق تشکیل پاتا ہے۔ اس کے نتیجے میں بلند انسانی اقدار کو یا تو عروج نصیب ہوتا ہے یا وہ پامال ہوتی ہیں۔ انسان اشرف المخلوقات بن جاتا ہے یا ایک حقیر مشین اور آلہ۔ آج کی اس مادی دنیا میں محض مادی ترقی اور کثرت پیداوار کی خاطر ہر قسم کی انسانی آزادیوں' انسانی شرافتوں اور انسان کی انسانیت کو جو پامال اور برباد کیا جارہا ہے' وہ صرف اس نقطہ نظر کا فطری نتیجہ ہے جو مادی نظامہائے حیات اس انسان کی حقیقت اور دنیا میں اس کی اہمیت کے بارے میں رکھتے ہیں۔

لیکن اس مادی دنیا کے برعکس انسان کی حقیقت اور اس کے مقصد تخلیق کے بارے میں اسلام جو تصور دیتا ہے' اس کے ترازو اور معیار میں آداب انسانیت کی قدریں بلند ہو جاتی ہیں' اخلاقی فضائل و محاسن اہمیت اختیار کر لیتے ہیں' انسان کی زندگی میں ایمان' نیکی اور اخلاص جیسی صفات اہمیت اختیار کر لیتی ہیں کیونکہ اسلامی تصور حیات کے مطابق یہی وہ اعلیٰ اقدار ہیں جن پر خلافت فی الارض کی ذمہ داری موقوف ہے۔

فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ مِنِّي هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ "پھر جو میری طرف سے کوئی ہدایت تمہارے پاس پہنچے' تو جو لوگ میری اس ہدایت کی پیروی کریں گے' ان کے لئے کسی خوف اور رنج کا موقع نہ ہو گا۔" غرض یہ اقدار تمام مادی اقدار سے زیادہ قیمتی اور برتر ہیں۔ لیکن یہ بات بھی ہمارے ذہن میں رہنی چاہئے کہ ان مادی اقدار کا حصول بھی مقاصد خلافت فی الارض میں داخل ہے۔ اس حد تک کہ یہ مادی اقدار اعلیٰ اخلاقی اور روحانی اقدار کے تابع ہوں اور بذات خود اصل مقاصد نہ بننے پائیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام انسانی ضمیر کو پاک و صاف اور ایک اعلیٰ زندگی بسر کرنے پر آمادہ کرتا ہے' جبکہ تمام دوسرے مادی نظریات تمام روحانی اقدار کو حقارت کی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ اور مادیت کے لئے آداب انسانیت تک کو قربان کر دیتے ہیں۔ اور یہ سب قربانی کس لئے دی جاتی ہے؟ محض ضروریات زندگی سامان تعیش کی فراوانی اور حیوانوں کی طرح شکم پروری کی خاطر!

(حاشیہ اگلے صفحہ پر)

اسلام کا تصور انسان کس قدر بلند ہے؟ ذرا اس کے اس پہلو پر غور کیجئے کہ اس کی رو سے انسان ایک بااختیار اور صاحب عزم و ارادہ مخلوق ہے۔ کیونکہ اگر وہ بااختیار اور ذی عزم نہیں تو اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس کے معاہدے کی کیا حیثیت رہ جاتی ہے۔ کیونکہ اختیار ہی کی اساس پر انسان مکلف ہے اور جزاء و سزا کا مستحق ہے۔ اگر وہ اپنے ارادے کا پکا اور خواہشات نفسانیہ پر قابو پا لیتا ہے تو اس طرح وہ فرشتوں سے بھی ارفع مقام حاصل کر سکتا ہے۔ وہ ہر اس کجروی سے بچ سکتا ہے جس سے اسے سابقہ درپیش ہو۔ لیکن اگر اس عزم پر خواہشات نفسانیہ غلبہ پالیں' اس کی زندگی میں ہدایت پر ظلمت غالب آجائے اور وہ اپنے اس عہد الست کو بھول جائے جو اس نے اپنے خالق سے باندھا تھا تو وہ اس بلند مقام سے گر بھی سکتا ہے اور اپنے لئے شقاوت و نکبت کے تمام سامان بھی فراہم کر سکتا ہے۔

اسلامی نظام زندگی نے 'اس کائنات میں انسان کو برتری اور شرافت کے جو اصول دیئے ہیں اس قصے میں ان کی صرف ایک جھلک دکھائی گئی ہے۔ انسان کو یاد دلایا گیا ہے کہ سعادت و شقاوت' بلندی و پستی' ایک بااختیار بلند مرتبت انسان اور ایک مقید و مجبور حیوان جو قعر ذلت میں گرا پڑا ہو' ان دونوں کی راہیں کہاں سے جدا ہوتی ہیں۔

اس قصے میں بیان کردہ' واقعات کی تصویر کشی کے دوران یہ یاد دلانے کی کوشش کی گئی ہے کہ معرکہ آدم و ابلیس کی نوعیت کیا ہے؟ ایک طرف بندے اور خدا کا پیمان ہے اور دوسری جانب شیطان کی فتنہ انگیزی ہے۔ ایک طرف ایمان ہے اور دوسری جانب کفر ہے' ایک محاذ پر حق ہے اور دوسرے پر باطل ہے۔" ایک صف اہل ہدایت کی ہے اور دوسری اہل ضلال کی۔ لیکن میدان جنگ کہاں ہے؟ انسان اور اس کی زندگی۔ فاتح بھی انسان اور مفتوح بھی انسان۔ سود و زیاں کا یہ بازار خود اس کے ضمیر میں ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ اسے متنبہ کرتے ہیں کہ وہ ہروقت چوکنا رہے کیونکہ وہ ہروقت میدان کارزار میں ہے۔ صورتیں دو ہی ہیں یا تو وہ لٹ جائے گا اور یا مال غنیمت لے کر ظفریاب ہو گا۔

اس قصے میں اسلام کے تصور خطا اور توبہ کی وضاحت بھی کر دی جاتی ہے۔ گناہ چونکہ ایک فرد سے سرزد ہوتا ہے۔ لہٰذا توبہ بھی ایک انفرادی عمل ہے۔ یہ ایک ایسا واضح اور صاف نظریہ ہے جس میں کوئی پیچیدگی نہیں ہے۔ اہل کنیسہ کی طرح یہاں کسی ایسے تصور کی گنجائش نہیں ہے کہ انسان پیدا ہونے سے پہلے خطا کا مرتکب بن جاتا ہو۔ اسلام میں کسی لاہوتی کفارہ معاصی کا کوئی تصور نہیں ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام انسان کو آدم علیہ السلام کے گناہ سے پاک کرنے کے لئے مصلوب ہوئے۔ یہ ایک غلط تصور ہے۔ حضرت آدم ؑ کی ایک لغزش ایک انفرادی عمل تھا۔ اور اس سے چھٹکارا پانے کا طریقہ بھی ایک انفرادی عمل ندامت اور توبہ تھا جو بالکل واضح اور صاف اور قابل فہم ہے۔ حضرت آدم ؑ کی اولاد میں سے ہر ایک خود اپنے کئے کا ذمہ دار ہے۔ اور سب کے لئے توبہ کا دروازہ کھلا ہے۔ صاف اور سادہ اور آسان

صد بار اگر توبہ شکستی باز آ

ذرا غور کیجئے کہ کس قدر واضح اور دل لگتا تصور ہے یہ۔ ہر شخص کو چاہئے کہ وہ اپنا بوجھ اٹھائے۔ یہ تصور ہر انسان کو بھلائی کے حصول کی جدوجہد پر آمادہ کرتا ہے اور وہ یاس و قنوط کا شکار نہیں ہوتا کیونکہ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ "وہ بڑا معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔"

اشارات قصۂ آدم کا یہ صرف ایک پہلو ہے فی ظلال القرآن کے اس مقام پر ہم اسی پر اکتفاء کرتے ہیں۔ صرف اس ایک پہلو ہی میں بے بہا حقائق اور صحت مند تصورات کا ایک عظیم خزانہ موجود ہے۔ اس قصے میں قیمتی اشارات و ہدایات کا ایک وافر ذخیرہ ہے۔

۱۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو سید محمد قطب کی کتاب انسان اسلام اور مادیت

اس میں اسلام کے تصور اجتماع اور طرز معاشرت کی بنیادیں متعین کردی گئی ہیں۔ اور جنہیں بھلائی' اخلاق اور دوسرے فضائل کے ذریعے استحکام بخشا گیا ہے۔ جب ہم اس پہلو پر غور و فکر کرتے ہیں تو ہمیں قرآنی قصوں کی اہمیت اور مقصدیت کا احساس ہوتا ہے کہ یہ قصے کس طرح اسلامی تصور حیات کی بنیادوں کو مضبوط کرتے ہیں۔ اور ان اعلیٰ اقدار کی وضاحت کرتے ہیں جو ان بنیادوں پر قائم ہوتیں ہیں جس کائنات کو اللہ نے پیدا کیا ہے اور جو اللہ ہی کی طرف متوجہ ہے' اور جسے آخر کار اللہ ہی کی طرف جانا ہے' وہ اس بات کی مستحق ہے کہ اس میں وہی اقدار بلند ہوں جو اللہ کے ہاں بلند ہیں۔

معاہدہ خلافت انسانی دراصل ربانی ہدایت پہ قائم ہے۔ اس کی اہم شرط یہ ہے کہ انسان اسلامی نظام حیات کے مطابق زندگی بسر کرے گا۔ اس معاہدے کے بعد پوزیشن یہ ہو جاتی ہے کہ انسان ایک ذی ارادہ مخلوق کی حیثیت سے ایک دوراہے پر کھڑا ہے۔ ایک طرف اسے خدا پکار رہا ہے' اور وہ سن رہا ہے۔ اگر وہ فیصلہ کرتا ہے تو صراط مستقیم پر چل پڑتا ہے۔ دوسری جانب اسے شیطان پکار رہا ہے۔ وہ چاہے تو شیطانی راہ پر چل پڑے۔ بس یہی دوراہے ہیں۔ ان کے درمیان تیسری راہ نہیں ہے یا تو اللہ ہے　اور یا شیطان' یا ہدایت ہے یا ضلالت..... یا حق ہے اور یا باطل..... اور یا فلاح ہے اور یا خسران..... یہ ہے حقیقت اور اسے قرآن کریم ہمیشہ بطور حقیقت اولیہ پیش کرتا ہے۔ عالم انسان کے سارے نظریات و تصورات اور طرزہائے زندگی بس صرف اس ایک حقیقت پر قائم ہیں۔

☆ ☆ ☆

درس ۴ ایک نظر میں

یہاں آکر گفتگو کا رخ بنی اسرائیل کی طرف مڑ جاتا ہے۔ مدینہ طیبہ میں صرف انہوں نے دعوت اسلامی کا سختی سے مقابلہ کیا تھا۔ انہوں نے ظاہری اور خفیہ دونوں قسم کی تدبیروں کے ذریعے دعوت اسلامی کو ختم کرنے کی کوشش کی اور اس کا مقابلہ کیا۔ وہ تحریک اسلامی کے خلاف پے درپے سازشیں کرتے رہے اور ظہور اسلام سے لے کر دعوت کے اس مرحلے تک ایک لمحہ بھران کی ریشہ دوانیوں میں کوئی کمی نہ آئی۔ انہیں اس بات کا یقین ہو چلا تھا کہ اقتدار کی کنجیاں ایک ایک کر کے مسلمانوں کے ہاتھوں میں منتقل ہو رہی ہیں۔ جب سے اوس و خزرج کی لڑائیاں بند ہوئیں اور وہ راستے بند ہوئے جن کے ذریعے یہود مشرکین مدینہ کے اندر اثر و رسوخ پیدا کرتے اور ان پر اثر انداز ہوتے تھے، پھر جب مسلمانوں کے لئے، اس نئی کتاب کی بنیاد پر ایک نئے نظام زندگی کی تشکیل شروع ہوئی تو یہودیوں کو یہ احساس شدت سے ہو رہا تھا کہ اس نئی تحریک نے انہیں ادب و ثقافت اور معیشت و اقتصاد دونوں اہم شعبوں سے باہر نکال پھینکا ہے۔

غرض یہ ہے وہ معرکہ جو یہودیوں نے اسلام اور مسلمانون کے خلاف اول روز سے شروع کیا اور آج تک وہ جوں کا توں قائم ہے۔ آج بھی وہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف وہی اوچھے ہتھیار استعمال کر رہے ہیں جو اس وقت کر رہے تھے۔ ہتھیاروں کی شکل اگرچہ مختلف ہے، رنگ ڈھنگ نیا ہے۔ لیکن ان کی حقیقت اور مزاج بالکل وہی ہے..... یاد رہے کہ یہودی اسلام و مسلمانوں کے خلاف اس حقیقت کے باوجود یہ معاندانہ روش اختیار کئے ہوئے ہیں کہ انسانی تاریخ میں پوری دنیا اس قوم کو ہمیشہ دھتکارتی رہی۔ کبھی ادھر سے ادھر اور کبھی ادھر سے ادھر بھگایا جاتا رہا۔ اور یہ لوگ خاک چھانتے پھرے۔ صدیاں یونہی گزر گئیں لیکن بالآخر انہیں آرام اور چین کی زندگی عالم اسلام ہی میں نصیب ہوئی، جو سب کے لئے کھلا ہے اور جس میں عقیدہ و مذہب کی اساس پر کسی کے خلاف کوئی نفرت نہیں ہوا کرتی ہے۔ جہاں فرقہ وارانہ اور مذہبی فسادات کو ہمیشہ بری نظروں سے دیکھا جاتا ہے اور جہاں ہر اس شخص کو آنے کی کھلی اجازت رہی ہے جو اسلام کو اذیت نہ دے اور مسلمانوں کے خلاف سازشیں نہ کرتا ہو اور مسالم ہو کر رہے۔

توقع تو یہ تھی کہ یہود مدینہ، اس نئے رسول اور اس نئی دعوت کو سب سے پہلے قبول کرتے اور ایمان لاتے۔ جبکہ قرآن کریم اپنی عمومی حیثیت میں ان تمام تعلیمات کی تصدیق کر رہا تھا جو تورات میں بیان کی گئی تھیں۔ پھر ان کو ایک نئے رسول کی آمد کا انتظار بھی تھا۔ ان کو اس کے اوصاف معلوم تھے اور ان کے پاس کتب سماوی میں اس کے بارے میں بشارتیں موجود تھیں۔ اور وہ ہمیشہ اللہ سے دست بدعا ہوا کرتے تھے کہ وہ نبی منتظر کے طفیل انہیں مشرکین عرب پر ظفریاب کرے۔

یہ سبق، بنی اسرائیل کے ساتھ قرآن کی وسیع گفتگو کا پہلا حصہ ہے۔ بنی اسرائیل کے ساتھ یہ گفتگو درحقیقت ان کے موقف کی تردید اور ان کی سازشوں کو طشت ازبام کرنے کے لئے ان پر ایک ہمہ گیر تنقیدی حملہ ہے اور یہ بطور مجبوری اور ضرورت اس وقت شروع کیا گیا ہے۔ جب دعوت اسلامی نے، مدینہ میں آکر، انہیں اسلام کی طرف بلانے میں اپنی پوری قوت صرف کر دی، ان پر حجت تمام کر دی اور انہیں اس جدید تحریک کی طرف راغب کرنے کے لئے تمام ذرائع استعمال کر لئے گئے۔

اس سبق کا آغاز باری تعالیٰ کی اس جلیل القدر پکار سے ہوتا ہے جس میں باری تعالیٰ انہیں اپنی نعمتیں یاد دلاتا ہے، انہیں پکارا جاتا ہے کہ وہ اپنے عہد کو پورا کریں تاکہ اللہ تعالیٰ اپنے اس عہد کو پورا کرے، جو اس نے ان کے ساتھ کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں بطور تمہید، پہلے خوف خدا اور تقویٰ و طہارت کی طرف بلاتا ہے اور اس کے بعد انہیں دعوت دیجاتی ہے کہ وہ اس کتاب اور ہدایت کو قبول کر لیں جو ان

تمام کتابوں اور ہدایات کی تصدیق کرتی ہے جو اللہ تعالیٰ نے خود ان کی طرف اتاریں۔ انہوں نے قرآن کریم کے بارے میں جو رویہ اختیار کیا اللہ تعالیٰ اس کی مذمت کرتا ہے' اور انہیں اس بات کی نصیحت کرتا ہے کہ وہ ان لوگوں میں سے نہ ہوں جو سب سے پہلے اس کتاب کے منکر بنے۔ ان کی اس روش کی بھی مذمت کی جاتی ہے کہ وہ حق کو چھپاتے ہیں اور حق و باطل کو باہم مشتبہ بناتے ہیں تاکہ لوگوں کو راہ راست سے بھٹکائیں۔ بالخصوص مسلمانوں کو۔ اور اسلامی جماعت کی صفوں میں فتنہ کھڑا کریں اور انتشار پھیلائیں۔ نیز جو لوگ نئے حلقہ بگوش اسلام ہو رہے تھے ان کے دلوں میں شکوک و شبہات پھیلائیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں مشورہ دیتا ہے کہ وہ ان فتنہ انگیزیوں کو چھوڑ کر اسلامی جماعت میں شریک ہو جائیں۔ مسلمانوں کے ساتھ نماز پڑھیں' زکوٰۃ ادا کریں اور نظام جماعت قائم کریں اور اپنے آپ کو اس نئے دین میں ضم کر دینے کے مشکل کام میں صبر اور نماز سے مدد لیں۔ اللہ ان کی اس روش پر سخت تنقید کرتا ہے کہ وہ مشرکین کو تو یہ کہتے ہیں کہ وہ ایمان لے آئیں لیکن خود ایمان نہیں لاتے اور نہ اس دین کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہیں۔

اس کے بعد بنی اسرائیل کو وہ نعمتیں یاد دلائی جاتی ہیں جن سے انہیں' ان کی پوری تاریخ میں نوازا جاتا رہا تھا۔ دوران گفتگو حاضرین بنی اسرائیل کو یوں مخاطب کیا جاتا ہے کہ گویا حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عہد میں خود یہ لوگ وہاں موجود تھے' جو آج مدینہ میں موجود ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ بنی اسرائیل ایک ہی امت ہیں اور صدیوں تک وہ ایک ہی قومیت اور اسی جبلت پر جمے ہوئے ہیں۔ جیسا کہ اس کے بعد بھی وہ ہر دور میں ویسے ہی رہے اور انہیں خصوصیات کے حامل رہے۔

اس کے بعد انہیں اس دن یعنی یوم قیامت سے ڈرایا جاتا ہے جہاں کوئی نفس کسی دوسرے کا بدلہ نہ دے سکے گا۔ کسی کی کوئی سفارش نہ چلے گی نہ کسی سے کسی قسم کا فدیہ اور معاوضہ قبول ہو گا اور اس دن تمام لوگ بے یار و مددگار ہوں گے' اور کوئی انہیں قیامت کے عذاب سے بچانے والا نہ ہو گا۔

اب ان کے سامنے وہ منظر پیش کیا جاتا ہے کہ جب اللہ نے انہیں فرعون سے نجات دی۔ یہ منظر کشی ایسی ہی کہ گویا نظارہ آنکھوں کے سامنے ہے۔ پھر ان انعامات کا ذکر ہوتا ہے جو پے در پے ان پر ہوتے رہے۔ ان کے سروں پر بادلوں کے سائے کئے جاتے ہیں۔ من و سلویٰ سے ان کی تواضع کی جاتی ہے اور پتھروں کا دل چیر کر ان کے لئے پانی فراہم کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد انہیں شرم دلائی جاتی ہے کہ ان انعامات کے بدلے میں وہ پے در پے کیا کیا سرکشیاں اور کیا کیا خرمستیاں کرتے رہے۔ جب اللہ تعالیٰ ان کی ایک غلطی معاف کرتے تو وہ دوسری میں جا پڑتے' ایک مصیبت سے نجات دیتے تو وہ اپنے لئے دوسری کا سامان کر دیتے۔

لیکن بنی اسرائیل بھی تو بنی اسرائیل تھے۔ وہی فساد اور کینہ پروری' وہی کجروی اور گمراہی اور اس پر اصرار۔ ہمیشہ انہوں نے اللہ کے احکامات کی خلاف ورزی کی۔ امانت میں خیانت کی۔ عہد کو پختہ باندھنے کے بعد توڑا۔ اللہ تعالیٰ اور پیغمبروں کے ساتھ کئے ہوئے ہر میثاق کو انہوں نے بالائے طاق رکھا۔ وہ یہاں تک آگے بڑھے کہ بغیر کسی جواز کے پیغمبروں کو قتل کرنے لگے۔ رب کی آیات کو جھٹلانے لگے۔ بچھڑے کو پوجنے لگے اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ ان کی گستاخی اس حد تک پہنچ گئی کہ انہوں نے اس وقت تک ایمان لانے سے انکار کر دیا جب تک وہ اپنی آنکھوں سے اللہ کو نہ دیکھ لیں۔ ذرا غور کیجئے! کہ اس کے بعد یہ لوگ اللہ کے حکم کی صریح خلاف ورزی کرتے ہیں اور گاؤں میں داخل ہوتے وقت وہ الفاظ ادا نہیں کرتے' جو اللہ تعالیٰ نے انہیں بتائے تھے' اور جس کے ادا کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ احکام سبت کی خلاف ورزی کرتے رہے۔ عہد طور کو تو صاف بھول گئے۔ جس گائے کو ذبح کرنے کا اللہ نے حکم دیا تھا' اس میں ٹال مٹول کرنے لگے اور مجادلہ اور مباحثہ شروع کر دیا۔

غرض یہ سب کام یہ لوگ اس ادعاء کے ساتھ کرتے رہے کہ بس ہدایت یافتہ امت اگر کوئی ہے تو بس وہ صرف یہودی اور بنی

اسرائیل ہی ہیں۔ قیامت میں اللہ میاں تو صرف بنی اسرائیل ہی سے راضی ہوں گے۔ تمام دین باطل ہیں۔ تمام دوسری امتیں گمراہ ہیں۔ چنانچہ قرآن کریم اس پہلی تنقیدی گفتگو ہی میں اس کی تردید کر دیتا ہے اور کہتا ہے کہ دوسری امتوں میں سے جو لوگ بھی اللہ تعالیٰ' یوم آخرت پر ایمان لائے اور انہوں نے نیک کام کیے تو ان کے رب کے نزدیک ان کے لئے اجر ہے۔ ان پر نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ انہیں کسی چیز کا حزن و ملال ہوگا۔

بنی اسرائیل پر یہ بھرپور وار یا بعد میں سورت کے مباحثے کے ضمن میں آنے والی تنقیدیں' وقت کی اہم ضرورت تھی۔ اس بات کی اشد ضرورت تھی کہ بنی اسرائیل کے تمام کھوکھلے دعوؤں کی قلعی کھول دی جائے اور ان کی تمام سازشوں سے پردہ اٹھایا جائے اور مسلمانوں کو ان تمام سازشوں اور مکاریوں سے آگاہ کر دیا جائے' جو ان کی جدید سوسائٹی کے خلاف کی جارہی تھیں۔ ان کے دل و دماغ میں وہ اصول بٹھا دیئے گئے جن کی بنا پر بنی اسرائیل یہ سازشیں کرتے پھرتے۔ نیز مسلمانوں کو اس خلفشار اور فتنہ انگیزی کا مقابلہ کرنے کے لئے متحد ہو جانے کی ترغیب دی گئی۔

تاریخ بنی اسرائیل پر یہ تنقید اس لئے بھی ضروری تھی کہ خود مسلمان متنبہ ہو جائیں۔ انہیں معلوم ہو جائے کہ خلافت ارضی کے اس نئے منصب میں ان کے سامنے کیا کیا دشواریاں ہیں؟ کہاں کہاں پھسلنے کا خطرہ ہے؟ اس سلسلے میں سابقہ مقتدر امتوں سے کیا کیا لغزشیں ہوئیں اور جس کی وجہ سے وہ منصب خلافت سے محروم ہوئیں اور اس زمین میں اللہ کی امانت کے قیام و نگہبانی کا جو شرف انہیں حاصل تھا وہ کس طرح انہوں نے گنوایا۔ اور انسانی قیادت کا نظام کس طرح اور کن اسباب کی بناء پر ان کے ہاتھوں سے نکل گیا۔ غرض اس پوری تنقیدی بحث میں کہیں تو کھل کر اور کہیں اشاروں اشاروں میں مسلمانوں کو متنبہ کیا گیا ہے کہ اس راہ اور اس منصب میں ان کے سامنے کیسے کیسے مشکل مقامات آئیں گے؟ جہاں لغزشوں اور پھسلنے کا سخت اندیشہ ہوگا۔ جیسا کہ اس بحث کے دوسرے حصے میں بھی ایسی ہی تنبیہیں ہوں گی۔

مدینہ طیبہ میں امت مسلمہ کو ان تنبیہات اور ہدایات کی اشد ضرورت تھی' جیسا کہ ہمیشہ اور ہر وقت اور ہر زمانے میں امت مسلمہ کو ان ہدایات کی ضرورت ہے۔ مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ آنکھیں کھول کر گہرے اور بصیرت افروز احساس کے ساتھ قرآن کریم کا مطالعہ کریں اور بزرگ و برتر قیادت کی ان ہدایات اور تعلیمات کو اپنائیں۔ جو اس نے اپنے پرانے دشمنوں کے خلاف جنگ کرتے ہوئے مسلمانوں کو دیں۔ مسلمانوں کو ہمیشہ اچھی طرح یہ معلوم ہونا چاہئے کہ انہوں نے ان جدی دشمنوں کی ان سازشوں اور مکاریوں کا مقابلہ کس طرح کرنا ہے' جو یہ دشمن نہایت ہی خفیہ ذرائع اور گہرے فریب کارانہ طریقوں سے اسلامی معاشرہ کے خلاف کرتے ہیں۔ جس شخص کا دل نور ایمان سے منور نہ ہو اور جو ظاہر و باطن اور خفیہ و اعلانیہ غرض اپنی پوری زندگی میں اس بزرگ و برتر قیادت خداوندی سے ہدایات نہیں لیتا' وہ کبھی بھی ان خفیہ راستوں اور ناپاک راستوں اور زیر زمین ذرائع کا پتہ نہیں لگا سکتا جن کے ذریعے یہ خطرناک اور ناپاک سازشیں اسلامی معاشرے میں گھس آتی ہیں۔

اس بحث میں قرآن کریم کی طرز ادا کی فنی اور نفسیاتی ہم آہنگی کا ایک خاص پہلو قابل لحاظ ہے۔ تاریخ بنی اسرائیل کی یہ بحث قصہ خلافت آدم کے اختتام کے متصلاً بعد شروع ہو جاتی ہے۔ یہ بحث اس ذہنی پس منظر میں شروع ہوتی ہے جس کی طرف ہم نے قصہ آدم و ابلیس میں اشارے کیے ہیں۔ چنانچہ قرآن مجید کے اسلوب ادا میں اس بات کا لحاظ رکھا گیا ہے کہ پیش کیے جانے والے قصے اور اس ماحول

دیکھئے میری کتاب التصویر الفنی فی القرآن "قرآن مجید کے قصے"

کے درمیان مکمل مطابقت اور ہم آہنگی ا۔ ہو جس میں قصہ پیش ہو رہا ہوتا ہے۔

ذرا پیچھے لوٹئے' دوران بحث یہ کہا گیا تھا کہ "اللہ تعالیٰ نے اس زمین کی تمام مخلوقات کو تم انسانوں کے لئے پیدا کیا ہے۔" اس کے بعد زمین میں خلافت آدم کا قصہ شروع ہوتا ہے اور آدم اور اللہ تعالیٰ کے درمیان ایک اعلانیہ معاہدہ ہوتا ہے۔ آدم کو فرشتوں پر فضیلت دی جاتی ہے۔ اس کے بعد' آدم کو وصیت کرنا' بھول چوک' توبہ و ندامت' ہدایت الٰہی اور مغفرت الٰہی کے مضامین آتے ہیں اور آدم ؑ کو جنت ہی میں شر کی قوتوں اور خیر کی قوتوں کی اس طویل اور نہ ختم ہونے والی کشمکش کی ایک جھلک دکھائی جاتی ہے' جو اس دنیا میں تاقیامت جاری رہنی تھی۔ خیر' اصلاح اور تعمیر کی قوتیں ایک ایسے انسان کی شکل میں پیش ہوتی ہیں جو مومن ہے اور اللہ کی رسی کو تھامے ہوئے ہے اور شر' فساد اور تخریب کی قوتیں ابلیس کی صورت میں مجسم کھڑی ہیں۔

یہ تمام باتیں کرنے کے بعد' اب بنی اسرائیل پر تنقید شروع ہو جاتی ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ انہوں نے کس طرح اللہ سے پختہ عہد باندھا اور پھر اسے توڑا۔ ان پر کن کن نعمتوں کی بارشیں ہوئیں اور انہوں نے ان کی ناشکری کی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے انہیں زمین میں منصب خلافت سے محروم کر دیا اور ذلت و مسکنت کو ان پر مسلط کر دیا۔ مومنین کو ان کی مکاریوں سے آگاہ کیا گیا اور بتایا گیا کہ اپنی تاریخ میں ان سے کیا کیا لغزشیں سرزد ہوئیں؟ یہاں آکر زمین پر خلیفہ بنانے اور اس کے بعد بنی اسرائیل کو خلیفہ بنانے کے درمیان ایک واضح معنوی ربط پیدا ہو جاتا ہے اور سیاق کلام واضح طور پر باہم مربوط ہو جاتا ہے۔

قرآن کریم کے پیش نظر یہاں یہ مقصد نہیں ہے کہ بنی اسرائیل کی قومی تاریخ پیش کرے بلکہ وہ اس تاریخ کے بعض واقعات کی طرف اشارہ کرتا ہے اور مناسب اختصار یا مناسب بسط سے۔ اس طویل تاریخ کے بعض مناظر پیش کرتا ہے۔ سورۂ بقرہ سے پہلے قرآن مجید کی تمام مکی سورتوں میں بھی یہ قصہ بار بار آتا ہے۔

لیکن وہاں اس قصے کے بیان سے مطلوب یہ تھا کہ مکی زندگی کے پر آشوب دور میں مسلمانوں کی قلیل جماعت کی ڈھارس بندھائی جائے۔ اس وقت مطلوب یہ تھا کہ آغاز کائنات سے آج تک قافلۂ اہل ایمان کے دعوتی تجربات' مسلمانوں کی اس قلیل جماعت کے سامنے پیش کئے جائیں اور مکہ مکرمہ میں اسے جو مرحلہ درپیش تھا' اس کے تقاضوں کے مطابق اسے ہدایات دی جائیں لیکن یہاں (مدینہ میں) مقصد یہ تھا کہ یہودیوں کی ریشہ دوانیوں اور برے ارادوں سے مسلمانوں کو آگاہ کیا جائے اور اسلامی جماعت کو متنبہ کیا جائے کہ یہودیوں کے ارادے کیا ہیں اور انہیں بروئے کار لانے کے لئے ان کے پاس وسائل کیا ہیں؟ نیز امت مسلمہ کو متوجہ کیا جا رہا ہے کہ خود وہ بھی انہی کوتاہیوں اور کمزوریوں میں مبتلا نہ ہو جائیں جن میں اس سے قبل یہودی مبتلا ہو چکے تھے۔ چونکہ مکہ مکرمہ میں اور مدینہ طیبہ میں مقاصد بالکل مختلف تھے' اس لئے قرآن کریم نے یہاں قصہ بنی اسرائیل کو مختلف اسلوب میں اور مختلف پہلوؤں سے پیش کیا۔ اگرچہ جو حقائق پیش کئے گئے وہ یہاں اور وہاں بالکل ایک ہی تھے۔ یعنی بنی اسرائیل کی گمراہی اور جادۂ مستقیم سے انحراف۔ (جب مکی سورتوں پر بحث ہوگی جو ترتیب نزول کے اعتبار سے بقرہ سے پہلے نازل ہوئیں تو وہاں ہم اس نکتے کی مزید وضاحت کریں گے۔)

بنی اسرائیل کا قصہ قرآن کریم میں جہاں بھی آیا ہے' اس کا بغور مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جس سیاق و سباق میں اسے پیش کیا

ا۔ مشہور مستشرق گولڈ زیہر نے قرآن کریم پر یہ اعتراض کیا ہے کہ مکہ مکرمہ میں یہودیوں کے بارے میں قرآن کریم کا رویہ نرم تھا لیکن مدینہ طیبہ میں قرآن کریم نے یہودیوں پر سخت تنقید شروع کر دی لیکن جیسا کہ سید قطب نے وضاحت کر دی' دونوں مقامات پر مقاصد مختلف تھے۔ مکہ مکرمہ میں بنی اسرائیل پر تنقید کرنے کی ضرورت کیا تھی۔ مستشرقین جب اسلامی لٹریچر کا مطالعہ' اپنے کجرو ذہن کے ساتھ شروع کرتے ہیں تو ان کو اسلام میں تضاد ہی تضاد نظر آتا ہے۔

گیا ہے وہ اس سے ہم آہنگ ہے۔ اور اس مقام کے مقاصد و مطالب اور فکری ہدایات و توجہات کا تکملہ ہے۔ یہاں بھی یہ قصہ سیاق و سباق سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔ یہاں پہلے انسان کے شرف اور اس کی کرامت کا مضمون بیان ہوا۔ اس کے بعد انسان اور اللہ کے درمیان عہد اور انسان کی جانب سے بھول چوک کے مضامین آئے' جن میں بطور اشارہ یہ بتایا گیا کہ انسانیت ایک اکائی ہے۔ اس کی جانب آنے والے رسول اور ان کا پیش کردہ دین بھی ایک ہی سرچشمے سے نکلے ہیں۔ دوران کلام نفس انسانی اور اس کے عناصر ترکیبی کی طرف بھی جابجا اشارہ کیا گیا اور یہ بتایا گیا ہے کہ ان عناصر ترکیبی کو نظرانداز کرنے اور ان سے انحراف کے عواقب و نتائج کیا ہوں گے؟ جن پر انسان کے خلیفۃ اللہ فی الارض ہونے کا دارومدار ہے اور جن کی اہمیت یہ ہے کہ جو شخص ان کا انکار کرے گا' وہ اپنی انسانیت کا منکر بن جائے گا' وہ ان اسباب کو گم کردے گا جن کی بنا پر اسے خلافت فی الارض کا منصب ملا' نتیجتاً" انسان دوبارہ حیوانیت کے ارذل مقام میں جا گرے گا۔

قرآن کریم میں بنی اسرائیل کا قصہ سب سے زیادہ آیا ہے۔ اس قصے کے مختلف مقامات اور نصیحت آموز پہلو بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ ان سے اللہ تعالیٰ کا وہ حکیمانہ اسلوب تربیت معلوم ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے امت مسلمہ کو خلافت کبریٰ کے منصب کے لئے تیار کرنے اور اس کی تعلیم و تربیت کے مقصد کے لئے اختیار فرمایا۔

اس اجمالی بحث کے بعد اب ہم چاہتے ہیں کہ قرآنی آیات پر تفصیلی نظر ڈالیں۔

☆ ☆ ☆

درس ۴ تشریح آیات

(۴۰ تا ۴۶)

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَ اَوْفُوْا بِعَهْدِيْٓ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ ۚ وَ اِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ ﴿۴۰﴾ وَ اٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۢ بِهٖ ۠ وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۡ وَّ اِيَّايَ فَاتَّقُوْنِ ﴿۴۱﴾ وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَ تَكْتُمُوا الْحَقَّ وَ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۴۲﴾ وَ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ وَ ارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ﴿۴۳﴾ اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَ تَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَ اَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۴۴﴾ وَ اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَ الصَّلٰوةِ ؕ وَ اِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ ﴿۴۵﴾ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَ اَنَّهُمْ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ﴿۴۶﴾

الربع　۵ ع ۷ ۵

اے بنی اسرائیل ےا ذرا خیال کرو میری اس نعمت کا جو میں نے تم کو عطا کی تھی۔ میرے ساتھ تمہارا جو عہد تھا اسے تم پورا کرو تو میرا جو عہد تمہارے ساتھ تھا' اسے میں پورا کروں' اور مجھ ہی سے تم ڈرو۔ اور میں نے جو کتاب بھیجی ہے اس پر ایمان لاؤ۔ یہ اس کتاب کی تائید میں ہے جو تمہارے پاس پہلے سے موجود تھی' لہٰذا سب سے پہلے تم ہی اس کے منکر نہ بن جاؤ۔ تھوڑی قیمت پر میری آیات کو نہ بیچ ڈالو ۱۸ا۔ اور میرے غضب سے بچو۔ باطل کا رنگ چڑھا کر حق کو مشتبہ نہ بناؤ اور نہ جانتے بوجھتے حق کو چھپانے کی کوشش کرو۔ نماز قائم کرو' زکوٰۃ دو اور جو لوگ میرے آگے جھک رہے ہیں ان کے ساتھ تم بھی جھک جاؤ۔ تم دوسروں کو تو نیکی کا راستہ اختیار کرنے کے لئے کہتے ہو' مگر اپنے آپ کو بھول جاتے ہو؟ حالانکہ تم کتاب کی تلاوت کرتے ہو۔ کیا تم عقل سے بالکل ہی کام نہیں لیتے؟ صبر اور نماز سے مدد لو' بے شک نماز ایک سخت مشکل کام ہے۔ مگر ان فرماں بردار بندوں کے لئے مشکل نہیں ہے جو سمجھتے ہیں کہ آخر کار انہیں اپنے رب سے ملنا اور اسی کی طرف پلٹ کر جانا ہے۔

جو لوگ بھی بنی اسرائیل کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں' وہ حیران رہ جاتے ہیں کہ باری تعالیٰ نے اس قوم کو کن کن نعمتوں سے نوازا۔ اور یہ کہ نعمتوں کی اس مسلسل بارش کے مقابلے میں وہ کس مکروہ انداز میں بار بار حق کا انکار کرتے رہے۔ یہاں ابتداء میں اللہ تعالیٰ اجمالاً ان نعمتوں کا تذکرہ کرتے ہیں جو اس نے ان پر کیں۔ اس کے بعد آنے والے پیراگرافوں میں بالتفصیل ان کا ذکر آتا ہے۔ یہ انعامات انہیں اس لئے یاد دلائے جاتے ہیں تاکہ انہیں اس بات کی دعوت دی جائے کہ جو عہد تم نے اللہ سے باندھا تھا اسے پورا کرو تاکہ اللہ تعالیٰ

اپنے انعامات کا سلسلہ جاری رکھے اور اپنی پوری نعمتوں سے انہیں نوازدے۔

يٰبَنِىٓ اِسۡرَآءِيۡلَ اذۡكُرُوۡا نِعۡمَتِىَ الَّتِىۡٓ اَنۡعَمۡتُ عَلَيۡكُمۡ وَاَوۡفُوۡا بِعَهۡدِىۡٓ اُوۡفِ بِعَهۡدِكُمۡ "اے بنی اسرائیل! ذرا خیال کرو میری اس نعمت کا جو میں نے تم کو عطا کی تھی' میرے ساتھ تمہارا جو عہد تھا' اسے پورا کرو' تو میرا جو عہد تمہارے ساتھ تھا اسے میں پورا کروں۔"

یہاں جس عہد کا ذکر ہو رہا ہے' وہ کون سا عہد ہے؟ کیا اس سے "عہد اول" مراد ہے یعنی جو اللہ تعالیٰ اور حضرت آدم ؑ کے درمیان طے پایا تھا جس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا فَاِمَّا يَاۡتِيَنَّكُمۡ مِّنِّىۡ هُدًى فَمَنۡ تَبِعَ هُدَاىَ فَلَا خَوۡفٌ عَلَيۡهِمۡ وَلَا هُمۡ يَحۡزَنُوۡنَ وَالَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا وَكَذَّبُوۡا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصۡحٰبُ النَّارِ‌ۚ هُمۡ فِيۡهَا خٰلِدُوۡنَ "پھر جو میری طرف سے کوئی ہدایت تمہارے پاس پہنچے' تو جو لوگ میری اس ہدایت کی پیروی کریں گے' ان کے لئے کسی خوف اور رنج کا موقع نہ ہو گا اور جو اس کو قبول کرنے سے انکار کریں گے اور ہماری آیات کو جھٹلائیں گے' وہ آگ میں جانے والے لوگ ہیں' جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔" یا یہ حضرت آدم علیہ السلام کے ساتھ کئے ہوئے' اس عہد الٰہی سے بھی پہلے کا وہ تکوینی عہد ہے' جو اللہ تعالیٰ اور فطرت انسانی کے درمیان تکمیل پایا' جس میں فطرت کے لئے یہ ضروری قرار دیا گیا کہ وہ اللہ کی معرفت حاصل کرے۔ اور صرف اللہ وحدہ لاشریک کی پیروی کرے۔ یہ فطری معاہدہ تو ایسا ہے جو بیان اور برہان کا محتاج نہیں ہے کیونکہ انسانی فطرت اپنی حقیقت اور لدنی میلانات کی بنا پر ہی خود بخود معرفت کردگار کی طرف متوجہ ہوا کرتی ہے۔ صرف گمراہی اور فساد فطرت ہی کی وجہ سے انسان معرفت الٰہی سے غافل ہو جاتا ہے۔ یا یہ عہد وہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم' بنی اسرائیل کے جد اعلیٰ کے ساتھ کیا اور جس کا ذکر اسی سورت میں عنقریب ہو گا۔ وَاِذِ ابۡتَلٰٓى اِبۡرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ‌ؕ قَالَ اِنِّىۡ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا‌ؕ قَالَ وَمِنۡ ذُرِّيَّتِىۡ‌ؕ قَالَ لَا يَنَالُ عَهۡدِى الظّٰلِمِيۡنَ ○ "یاد کرو جب ابراہیم ؑ کو اس کے رب نے چند باتوں میں آزمایا اور وہ ان سب میں پورا اتر گیا۔ تو اس نے کہا "میں تجھے سب لوگوں کا پیشوا بنانے والا ہوں۔" ابراہیم ؑ نے عرض کیا "اور کیا میری اولاد سے بھی یہی وعدہ ہے۔" اس نے جواب دیا "میرا وعدہ ظالموں سے متعلق نہیں ہے۔" (۲-۱۲۴) یا یہ بنی اسرائیل کا وہ مخصوص عہد ہے جو اللہ نے ان کے ساتھ اس وقت طے کیا' جبکہ کوہ طور ان کے سروں پر لٹک رہا تھا اور اللہ نے انہیں حکم دیا کہ جو ہدایات انہیں دی جا رہی ہیں' وہ سختی سے ان پر عمل کریں اور جس کا ذکر بنی اسرائیل پر اس طویل تنقید کے ضمن ہی میں (۲-۹۳) آ رہا ہے۔

یہ تمام عہد' اپنی اصلیت کے لحاظ سے ایک ہی ہیں۔ ان سے مدعا یہ ہے کہ اللہ کے بندے دل و جان سے اس کی طرف متوجہ ہوں' اپنی پوری زندگی کو اس کے حوالے کر دیں' اللہ کا دین ایک ہی ہے اور تمام انبیاء جو پیغام لے کر آئے' وہ ایک ہی ہے یعنی دین اسلام اور آغاز کائنات سے لے کر آج تک قافلۂ ایمان' اسی دین کو شعار بنا کر چلتا رہا ہے۔

غرض اللہ تعالیٰ اسرائیل کو دعوت دیتے ہیں کہ ان معاہدوں کی پابندی کرتے ہوئے وہ اس سے ڈریں اور اپنے اندر صرف اسی کی خشیت پیدا کریں۔ وَاِيَّاىَ فَارۡهَبُوۡنِ ○ "اور مجھ ہی سے تم ڈرو۔"

بنی اسرائیل کو دعوت دی جاتی ہے کہ ان معاہدوں کا تقاضا پورا کرتے ہوئے وہ اللہ کے نازل کردہ کلام پر ایمان لائیں' جو ان کی کتابوں کی تصدیق کرتا ہے جو ان کے پاس ہیں' وہ اس کلام کا انکار کرنے اور کفر کرنے میں جلد بازی سے کام نہ لیں' کیونکہ ان کے لئے مناسب تو یہ تھا کہ وہ سب سے پہلے اس پر ایمان لاتے۔

وَاٰمِنُوۡا بِمَآ اَنۡزَلۡتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمۡ وَلَا تَكُوۡنُوۡٓا اَوَّلَ كَافِرٍۢ بِهٖ‌ "اور میں نے جو کتاب بھیجی ہے' اس پر ایمان

لاؤ۔ یہ اسی کتاب کی تائید میں ہے' جو تمہارے پاس پہلے سے موجود تھی۔ للذا سب سے پہلے تم ہی اس کے منکر نہ بن جاؤ۔"

اسلام' جسے اب حضرت محمد ﷺ اپنی آخری صورت میں لے کر آئے ہیں' وہ وہی لازوال دین ہے جو ہمیشہ اللہ کی جانب سے آتا رہا۔ یہ اللہ تعالیٰ کا وہ مسلسل پیغام ہے اور آغاز انسانیت سے یہ اللہ اور انسان کے درمیان ایک معاہدہ ہے۔ اس سے پہلے بھی اس نے پوری انسانیت کو اپنے سایہ عاطفت میں لیا اور آئندہ بھی وہ انسانیت کا ہادی و رہبر ہو گا۔ یہ دین عہد نامہ قدیم اور عہد نامہ جدید کو باہم ملاتا ہے۔ اور مستقبل کی انسانیت کے لئے اللہ تعالیٰ کو جو خیر اور بھلائی مطلوب تھی' اس کا اضافہ کرتا ہے۔ یہ دین اب پوری انسانیت کو ایک لڑی میں پروتا ہے اور انہیں باہم متعارف بھائی بھائی قرار دیتا ہے۔ وہ انسانیت کو مختلف گروہوں' جماعتوں' نسلوں اور اقوام کی صورت میں تقسیم نہیں کرتا' بلکہ وہ ان سب کو اللہ کے ایسے بندوں کی صورت میں منظم کرتا ہے جو اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے ہوئے ہیں جو فجر انسانیت سے آج تک ناقابل تغیر ہے۔

اللہ تعالیٰ بنی اسرائیل کو اس بات سے روکتے ہیں کہ وہ اس کتاب کا انکار محض دنیاوی مفادات کی خاطر نہ کریں جبکہ وہ ان تمام کتابوں کی تصدیق بھی کرتی ہے' جو تمہارے پاس ہیں۔ وہ زندگی کی مصلحتوں اور ذاتی اغراض کی خاطر' اس سچائی کو رد نہ کریں' بالخصوص احبار اور مذہبی راہنما جو محض اس لئے اسلام قبول کرنے سے ہچکچاتے تھے کہ انہیں معاشرے میں سیادت و قیادت کا جو مقام حاصل تھا' وہ چلا نہ جائے اور جو مالی مفادات وہ حاصل کر رہے تھے' وہ بند نہ ہو جائیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں نصیحت کرتا ہے کہ وہ اللہ کا خوف کریں۔ ایسے برے اور گھٹیا خیالات دل میں نہ لائیں وَ لَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۡ وَ اِيَّايَ فَاتَّقُوْنِ "تھوڑی قیمت پر میری آیات کو نہ بیچ ڈالو اور میرے غضب سے بچو۔"

دام و درم' مال و دولت اور دنیاوی مفادات کی بندگی یہود کا قدیم وصف ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہاں مالی مفادات سے یہودیوں کے مذہبی رہنماؤں کے وہ مفادات مراد ہوں' جو وہ دینی خدمات' جھوٹے فتوؤں اور روسائے یہود کو شرعی سزاؤں سے بچانے کی خاطر' آیات الٰہی میں تحریف کرنے کے عوض حاصل کرتے تھے۔ جیسا کہ قرآن کریم کے دوسرے مقامات پر اس کی تفصیلات آئی ہیں۔ ان تمام مفادات کی حفاظت کرنے کے لئے یہ لوگ اپنی قوم کو اسلام میں داخل ہونے سے روکتے تھے' کیونکہ اس صورت میں اس بات کا خطرہ تھا کہ ان کے ہاتھ سے قیادت اور سرداری چلی جائے۔ نیز جیسا کہ بعض صحابہ اور تابعین نے اس آیت کی تفسیر کے ضمن میں تصریح کی ہے' کہ یہ دنیا پوری کی پوری ثمن قلیل ہے۔ کیونکہ آیات الٰہی پر ایمان لے آنے اور اللہ تعالیٰ کے ہاں قیامت کے دن اہل ایمان کا جو بہتر انجام ہونے والا ہے' اس کے مقابلے میں اس پوری دنیا کی بلکہ اس پوری کائنات کی حقیقت ہی کیا ہے۔

اگلے فقرے میں انہیں ان کی دوسری بری خصلت سے روکا جاتا ہے' ان کی عادت تھی کہ وہ باطل کو حق کا رنگ دے کر پیش کرتے تھے اور سچائی کو چھپاتے تھے' حالانکہ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔ ان کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ اسلامی معاشرے کے اندر فکری انتشار پیدا ہو اور مسلمانوں کے دلوں میں شکوک و شبہات کا ایک طوفان کھڑا ہو جائے۔ وَ لَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَ تَكْتُمُوا الْحَقَّ وَ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ○

"باطل کا رنگ چڑھا کر حق کو مشتبہ نہ بناؤ اور نہ جانتے بوجھتے حق کو چھپانے کی کوشش کرو۔" یہودیوں نے ہر موقع اور ہر مناسبت میں سے حق کو چھپایا' اس میں باطل کی رنگ آمیزی کی اور جب بھی انہیں موقع ملا انہوں نے انسانیت کو دھوکہ دینے کی پوری کوشش کی۔ اس لئے قرآن کریم نے بار بار ان کی اس صفت اور عادت کی تفاصیل کو بیان کیا۔ وہ اسلامی معاشرہ اور اسلامی جماعت میں ہمیشہ فتنے اور اضطرابات پیدا کرتے رہتے تھے۔ خلفشار اور انتشار پیدا کرنے کے لئے کوشاں رہتے تھے۔ چنانچہ ان کے اس کردار کی کئی مثالیں اسی

سورت میں آگے بیان کی گئی ہیں۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ انہیں دعوت دیتے ہیں کہ بد بخت قافلۂ ایمان جا رہا ہے' اس میں شامل ہو جاؤ' جماعت کا ساتھ دو' ورنہ مٹ جاؤ گے' مذموم تعصبات کو چھوڑ دو اور اس انفرادیت کو ترک کر کے مسلمانوں کے ساتھ اجتماعی عبادات اور فرائض ادا کرو۔ اس لئے کہ علیحدگی پسندی زمانہ قدیم سے یہودیوں کی عادت مستمرہ چلی آ رہی ہے۔ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ O

"نماز قائم کرو' زکوٰۃ دو اور جو لوگ میرے آگے جھک رہے ہیں' ان کے ساتھ تم بھی جھک جاؤ۔" اس کے بعد یہودیوں کو عموماً اور ان کے مذہبی پیشواؤں کو خصوصاً اس بات کی تنبیہہ کی جاتی ہے کہ وہ مشرکین اہل عرب میں اپنے آپ کو ایمان کا داعی کہتے ہیں اور اہل کتاب ہونے کی حیثیت سے وہ ایسے ہیں بھی' اس لئے کہ وہ مشرکین کے مقابلے میں اہل توحید ہیں' لیکن اس کے باوجود' خود اپنی قوم کو' اللہ کے اس دین پر ایمان لانے سے روکتے ہیں' جو تمام سابق ادیان کی تصدیق کرتا ہے۔ اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ۚ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ O "تم دوسروں کو تو نیکی کا راستہ اختیار کرنے کے لئے کہتے ہو' مگر اپنے آپ کو بھول جاتے ہو' حالانکہ تم کتاب کی تلاوت کرتے ہو۔" اگرچہ ابتدا میں یہ آیت اس وقت کے بنی اسرائیل کے اندر موجود کمزوریوں کی عکاسی کر رہی ہے' تاہم یہ نفس انسانی اور بالخصوص ہر مذہب و ملت کے دینی پیشواؤں کے لئے سرمہ بصیرت ہے۔ کسی قوم اور ملک کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ نہ کسی خاص نسل اور زمانے تک محدود ہے۔

جب کوئی دین ایک زندہ اور موجزن نظریۂ حیات کے بجائے محض ایک پیشہ اور کاروبار بن جاتا ہے تو دین کے پیشواؤں کی حالت یہ ہو جاتی ہے کہ وہ اپنی زبان سے جو کچھ کہتے ہیں' وہ ان کے دل میں نہیں ہوتا' وہ بھلائی کا وعظ کرتے ہیں اور خود کار دیگر میں مبتلا ہوتے ہیں۔ لوگوں کو بر اور تقویٰ کی دعوت دیتے ہیں' لیکن بر و تقویٰ جس چیز کا نام ہے' وہ خود انہیں چھو کر بھی نہیں گزری ہوتی۔ وہ سیدھی بات کو غلط معنی پہنا کر بتنگڑ بناتے ہیں' نفسانی خواہشات کو پورا کرنے کے لئے قطعی نصوص میں تاویلات کرتے ہیں۔ وہ ایسی ایسی حسین تاویلات اور ایسے ایسے مدلل فتوے میدان میں لا ڈالتے ہیں جو بظاہر آیات و نصوص کے ظاہر مفہوم سے بالکل موافق ہوتے ہیں لیکن اپنی حقیقت کے اعتبار سے دین کی حقیقت اور اصلیت ہی سے کوسوں دور ہوتے ہیں اور یہ سب کچھ یہ لوگ اپنے مفادات اور دلی خواہشات کے لئے کرتے ہیں اور ان لوگوں کی خاطر جو یا تو مالدار ہوتے ہیں یا اہل اقتدار۔ یہودیوں کے مذہبی پیشوا یہی کام کرتے تھے۔

لوگوں کو بھلائی کی طرف دعوت دینا' اور پھر اپنی عملی زندگی میں خود' اس کے خلاف چلنا' ایک ایسا مرض ہے اور ایک ایسی وبا ہے جو نہ صرف یہ کہ خود داعیوں کے دلوں میں شبہات و شکوک پیدا کر دیتی ہے' بلکہ دعوت بھی اس سے مشکوک ہو جاتی ہے۔ قول و فعل کے اس تضاد کی وجہ سے لوگوں کے دلوں اور ان کے افکار میں انتشار پیدا ہو جاتا ہے' کیونکہ لوگ کانوں سے تو بہترین بات سنتے ہیں لیکن آنکھوں سے قبیح ترین افعال دیکھتے ہیں۔ قول و فعل کا یہ تضاد دیکھ کر وہ بے چارے حیران رہ جاتے ہیں۔ ان کے ایمان نے یہ دعوت و وعظ سن کر جو دیا ان کی روحانی دنیا میں روشن کیا تھا' وہ بجھ جاتا ہے۔ دلوں سے ایمان کی روشنی ختم ہو جاتی اور جب انہیں مذہبی پیشواؤں میں سے کوئی عقیدت نہیں رہتی' تو اس کے نتیجہ میں پھر خود دین سے ان کا اعتماد جاتا رہتا ہے۔

داعی بے عمل کی بات بے جان ہوتی ہے۔ یہ ایک ایسی چنگاری ہوتی ہے جو دوسروں تک پہنچتے پہنچتے بجھ جاتی ہے۔ ایسے داعیوں کی بات بے اثر ہوتی ہے۔ اگرچہ وہ بات مقفع و مسجع' چکنی چپڑی اور جوش و خروش سے پر ہو کیونکہ یہ بات ایسے دل سے نکلی ہی نہیں جو اس پر یقین رکھتا ہو۔ اثر تو اسی بات میں ہوتا ہے جو دل سے نکلتی ہے۔ دل سے جو بات نکلتی اثر رکھتی ہے۔ ایک داعی اپنی بات کا صحیح مومن اسی

وقت ہی ہو سکتا ہے' جب وہ اپنے کردار کے اعتبار سے اس بات کی تفسیر اور ترجمہ ہو' جو دعوت وہ دے رہا ہے' وہ خود اس کی زندگی کی صورت میں عملاً مجسم ہو۔ جب کوئی انسان اس معیار تک پہنچ جاتا ہے' تو پھر لوگ اس پر بھروسہ کرتے ہیں اور اس پر یقین کرتے ہیں۔ اگرچہ اس کی باتیں چکنی چپڑی نہ ہوں اور اس کی تقریر دھواں دھار نہ ہو کیونکہ اس صورت میں اس بات کے اندر زور اس کی چرب لسانی سے نہیں بلکہ اس کی واقعیت اور حقیقت پسندی کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ اس وقت کلام کی صداقت ہی اس کا حسن ہوتا ہے۔ چرب لسانی سے زور کلام پیدا کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان سب باتوں کے باوجود قول و فعل کے درمیان تطابق' ایمان و عمل کے درمیان ہم آہنگی کوئی آسان کام نہیں ہے۔ یہ کوئی آسان طریقہ نہیں ہے جسے بسہولت اختیار کر لیا جائے۔ اسے حاصل کرنے کے لئے سخت ریاضت اور جدوجہد کی ضرورت ہے۔ اس کے لئے تعلق باللہ' اللہ کی اعانت و توفیق اور اس کی ہدایات سے مدد لینے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ عملی زندگی کے مختلف احوال' اس کی ضروریات اور اس کی مجبوریاں' انسان کو اپنے دلی معتقدات سے یا ان باتوں سے جن کی طرف اسے دوسرے لوگ بلا رہے ہوتے ہیں' دور پھینک دیتی ہیں۔ یہ انسان' خواہ کسی عظیم قوت کا مالک کیوں نہ ہو' جب تک مالک الملک اور قادر مطلق ہستی کا دامن نہیں تھامے گا' کمزور اور ناتواں ہی رہے گا۔ کیونکہ شر' فساد اور انسان کے لئے گمراہ کن شیطانی قوتیں ہر طرف جال پھیلائے ہوئے ہیں۔ اگرچہ انسان بسا اوقات اور بار بار ان پر غالب آسکتا ہے لیکن جونہی کسی لمحہ وہ کمزوری دکھاتا ہے' تو گر جاتا ہے' ذلیل ہو جاتا ہے۔ اپنے ماضی' حال اور مستقبل سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ لیکن جب انسان کا اعتماد اس ازلی اور ابدی طاقت پر ہوتا ہے' تو پھر اس کی قوت کے کیا کہنے' وہ ہر چیز پر غالب آ جاتا ہے۔ وہ اپنی کمزوریوں اور اپنی خواہشات نفس تک کو مغلوب کر لیتا ہے۔ وہ اپنی ضروریات اور اپنی مجبوریوں پر بھی غالب آ جاتا ہے۔ وہ ان تمام قوتوں پر غالب آجاتا ہے جو اس کا سامنا کرتی ہیں۔

اس لئے قرآن کریم یہاں پہلے تو یہود کو اس طرف متوجہ کرتا ہے' کیونکہ روئے سخن ان کی طرف ہے اور پھر ان کے بعد پوری دنیا کو اس طرح متوجہ کرتا ہے کہ وہ اس مشکل کام اور کٹھن معرکے کو سر کرنے کے لئے صبر و ثبات اور نماز و نیاز سے مدد حاصل کریں۔ یہودیوں سے مطلوب یہ تھا کہ مذہبی خدمات' یا پوری دنیا کا مال و منال جو انہیں حاصل تھا' اسے متاع قلیل سمجھیں اور اس کے مقابلے میں حق کو ترجیح دیں۔ کیونکہ مدینہ میں اپنی مذہبی حیثیت اور مذہبی معلومات کی وجہ سے وہ اس سچائی و صداقت کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ اس لئے ان کا فرض ہے کہ جلد قافلۂ ایمان کے ہمرکاب ہو جائیں کیونکہ وہ پہلے سے لوگوں کو ایمان کی طرف بلا رہے ہیں۔ چونکہ یہودیوں کی طرف سے کوئی ایسا فیصلہ کرنے کے لئے قوت و شجاعت کی ایک بڑی مقدار کی ضرورت تھی' اس لئے انہیں حکم دیا گیا کہ وہ صبر و ثبات اور نیاز نماز سے مدد لیں۔

وَ اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَ الصَّلٰوةِ ؕ وَ اِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَۙ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَ اَنَّهُمْ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ O "نماز اور صبر سے مدد لو' بے شک نماز ایک سخت مشکل کام ہے' مگر ان فرمانبردار بندوں کے لئے مشکل نہیں ہے' جو سمجھتے ہیں کہ آخر کار انہیں اپنے رب سے ملنا ہے اور اسی کی طرف پلٹ کر جانا ہے۔"

میں سمجھا ہوں کہ انہا کی ضمیر شان ہے (یعنی کسی فرد کی طرف اشارہ نہیں بلکہ صورت حال کی طرف اشارہ ہے) یعنی صورت حال یہ ہے کہ بنی اسرائیل کو اعتراف حق کی دعوت دینا' جبکہ اس کی راہ میں ایسی رکاوٹیں کھڑی ہوں' بڑا مشکل اور جاں گسل کام ہے۔ یہ صرف ان بزرگوں کے لئے آسان ہے جو اپنے دلوں میں اللہ کی خشیت رکھتے ہوں اور اس کے مطیع فرمان ہوں۔ جنہیں اللہ کی خشیت اور اس کے تقویٰ کا اچھی طرح شعور ہو' اور جنہیں پورا یقین ہو کہ انہیں اسی کی طرف پلٹ کر جانا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ صبر و ثبات سے مدد لینے کی اشد ضرورت انسان کو بار بار پیش آتی ہے۔ یہ ہر مصیبت اور ہر مشقت کا درماں ہے۔ یہ ہر مشکل کا حل ہے اور انسان کے لئے مشکل ترین کام یہ ہے کہ وہ قیادت اور ریاست کے منصب سے نیچے اتر آئے' حق و سچائی کی خاطر اپنے مفادات اور کسب و کمائی پر لات مار دے اور سب چیزوں سے بے نیاز ہو کر حق کا اعتراف کرے اور اس کے تابع ہو جائے۔

سوال یہ ہے کہ انسان اس کام میں نماز سے کس طرح مدد لے؟

نماز در حقیقت بندے اور اس کے رب کے درمیان ایک خاص ملاقات ہے۔ اس سے دل غذا لیتا ہے اور روح ایک خاص تعلق کا احساس کرتی ہے۔ اس کے اندر نفس انسانی کے لئے وہ سروسامان ہے' جو دنیا کے تمام مال و متاع سے زیادہ قیمتی ہے۔ نبی ﷺ کی حالت یہ تھی کہ جب کوئی معاملہ انہیں پریشان کرتا تو آپ نماز کی طرف لپکتے تھے' حالانکہ آپ ﷺ کا حال یہ تھا اپنے رب سے' آپ ﷺ ہر وقت جڑے رہتے تھے' آپ کی روح ہر وقت وحی اور الہام سے مربوط تھی۔ یہ سرچشمہ خیر و برکت اب بھی ہر مومن کی دسترس میں ہے' جسے زاد راہ کی طلب ہو' جو سخت گرمی میں شراب بارد کا خواہاں ہو' جو ایسے حال میں مدد کا طلب گار ہو' جب ہر قسم کی مدد منقطع ہو گئی ہو اسے زاد راہ کی ضرورت ایسے حال میں پیش آئے جبکہ اس کا توشہ دان خالی ہو۔

اللہ کی طرف پلٹ کر جانے کا یقین (قرآن کریم میں بارہا ظن اور اس کے مشتقات یقین کے معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔ نیز عربی زبان میں بھی علم العموم ظن کا استعمال یقین میں ہوتا ہے) اور ہر معاملے میں پلٹ کر اس کی طرف جانے کا یقین ہی انسان کے اندر صبر و استقلال پیدا کرتا ہے۔ تقویٰ اور بھلائی کی حس اسی پر موقوف ہے۔ دنیاوی اقدار اور اخروی اقدار کے درمیان صحیح توازن اسی یقین کا مرہون منت ہے۔ ان اقدار کا توازن جب درست ہو جاتا ہے۔ ترازو کی ڈنڈی جب سیدھی ہو جاتی ہے تو پھر انسان کو یہ تمام دنیا' متاع قلیل اور ایک حقیر چیز نظر آتی ہے۔ تب جا کر آخرت صحیح نظر آتی ہے اور پھر کوئی عقلمند آدمی اسے ترجیح دینے اور اختیار کرنے میں ایک لمحہ بھر تردد نہیں کرتا۔

جب انسان اس نہج پر قرآن کریم میں غور و فکر کرتا ہے تو یہ ہدایات جو ابتداءً بنی اسرائیل کو دی گئی تھیں' سب کے لئے دائمی ہدایات بن جاتی ہیں۔

چنانچہ بنی اسرائیل کو دوبارہ پکارتے ہوئے' دوبارہ انہیں اپنی نعمتیں یاد دلاتے ہوئے اور آنے والی تفصیلات سے پہلے' اجمالاً انہیں آنے والی گھڑی سے ڈراتے ہوئے' اللہ تعالیٰ انہیں اس طرح خطاب کرتے ہیں۔

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۝۴۷ وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔـا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ۝۴۸

"اے بنی اسرائیل یاد کرو میری اس نعمت کو' جس سے میں نے تمہیں نوازا تھا اور اس بات کو کہ میں نے تمہیں دنیا کی ساری قوموں پر فضیلت عطا کی تھی۔ اور ڈرو اس دن سے جب کوئی کسی کے ذرا کام نہ آئے گا' نہ کسی کی طرف سے سفارش قبول ہو گی' نہ کسی کو فدیہ لے کر چھوڑا جائے گا اور نہ مجرموں کو کہیں سے مدد مل سکے گی۔"

بنی اسرائیل کو تمام مخلوق پر فضیلت دینا' اس وقت کی بات ہے جب وہ صحیح معنوں میں' اس زمین پر اللہ کے نائب اور خلیفہ تھے' لیکن جب انہوں نے اپنے رب اور مالک کے احکامات سے منہ پھیر لیا' اپنے انبیاء کی نافرمانی کرنے لگے' اللہ نے ان پر جو انعامات کئے تھے ان کی ناشکری کی اور پھر یہ کہ انہوں نے اللہ سے جو عہد کر رکھے تھے' اور جو ذمہ داریاں لے رکھی تھیں ان کا پورا کرنا ترک کر دیا' تو اللہ تعالیٰ نے بھی فیصلہ کیا کہ اب وہ ہمیشہ کے لئے ملعون مغضوب اور ذلیل و خوار رہیں گے۔ ان کی جلاوطنی اور دربدر ہونے کا فیصلہ ہوا اور وہ اللہ کے عتاب کے مستحق ہو گئے۔

انہیں یہاں یاد دلایا جاتا ہے کہ ایک وقت وہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کے ان پر یہ فضل و کرم تھے اور وہ دنیا کی افضل تر قوم تھے۔ یہ بات انہیں بطور ترغیب سنائی جا رہی ہے کہ اب پھر ان کے لئے اپنا کھویا ہوا مقام حاصل کرنے کے مواقع ہیں۔ یوں کہ وہ اس نئے قافلۂ ایمان میں شامل ہو جائیں۔ دعوت اسلامی کا ساتھ دیں۔ اللہ کے عہد میں دوبارہ داخل ہو جائیں اور اللہ نے ان کے آباؤ اجداد کو جو فضیلت دی تھی اس کا شکر وہ بھی ادا کریں اور اب مومنین کو جو مقام عنایت ہو رہا ہے' اس میں وہ بھی شریک ہو جائیں۔

لیکن اس ترغیب کے ساتھ ساتھ اور فضل و کرم اور نعمت ہمیشہ کی یاد دہانی کے ساتھ ساتھ آنے والے دن کی ترہیب و تخویف بھی آتی ہے جس میں لَا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا کوئی کسی کے ذرا کام نہ آئے گا۔"

کیونکہ قیامت کے دن ہر شخص فرداً اپنے اعمال کا صلہ پائے گا۔ وہاں حساب انفرادی طور پر ہو گا' ہر کوئی صرف اپنے کئے کا جوابدہ ہو گا کوئی شخص کسی کے کام نہ آسکے گا۔ یاد رہے کہ شخصی مسئولیت' دنیا و آخرت میں اسلام کا ایک زریں اور عظیم اصول ہے۔ شخصی مسئولیت کا یہ اصول' انسان کے آزاد ارادہ اور اختیار تمیزی پر قائم ہے۔ اور اس کے مطابق ہی اللہ تعالیٰ کی جانب سے عالمگیر عدل و انصاف ہو گا۔ یہی وہ اصول ہے' جو انسان کے اندر' اس کے ذی شرف ہونے کا احساس پیدا کرتا ہے۔ اور اس سے اس کے دل میں دائمی بیداری کا جذبہ موجزن رہتا ہے۔ یہ دونوں چیزیں انسان کی تہذیب اور تربیت کے لئے بے حد مفید ہے۔ نیز ان سے ان انسانی قدروں میں اضافہ ہوتا ہے' جن کی بنا پر اسلام نے انسان کو اشرف المخلوقات کا مقام دیا ہے۔

وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ "نہ کسی کی طرف سے سفارش قبول ہو گی' نہ کسی کو فدیہ لے کر چھوڑا جائے گا۔" اس دن جو شخص ایمان اور عمل صالح کا توشہ لے کر نہ آئے اس کے حق میں کوئی سفارش نہ ہو گی۔ کفر اور معصیت کی معافی کے لئے کوئی فدیہ نہ لیا جائے گا۔ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ "اور نہ مجرموں کو کہیں سے مدد مل سکے گی۔" اس دن عذاب الٰہی سے انہیں نجات دینے کے لئے کوئی ناصر و یاور نہ ہو گا۔ کوئی نہ ہو گا جو انہیں اس کے عذاب سے نجات دلا سکے۔ اس آخری فقرے میں لفظ جمع سے سب کو یکجا بیان کیا گیا۔ یعنی وہ تمام لوگ جو ایک دوسرے کے کام نہ آسکیں گے' اور جن کی سفارش ایک دوسرے کے بارے میں قبول نہ ہو گی' اور ایک دوسرے کے بارے میں ان سے فدیہ نہ لیا جائے گا' ابتدائے آیت میں بنی اسرائیل کو خطاب کیا گیا' لیکن آخر میں کلام کا اسلوب خطاب سے غائبین کی طرف چلا گیا' تاکہ یہ اصول عام ہو جائے اور وہ لوگ جن سے خطاب کیا جا رہا ہے وہ اور دوسرے سب لوگ اس میں شامل ہو جائیں۔

اس کے بعد قرآن کریم ایک ایک کر کے اللہ کے ان انعامات کا تذکرہ کرتا ہے جو ان پر ہوتے رہے ہیں اور یہ بتاتا ہے کہ انہوں نے ان انعامات کے مقابلے میں کیا طرز عمل اختیار کیا؟ کس طرح انہوں نے انکار کیا' کفر کیا اور راہ راست سے ہٹ گئے؟ فرعون کی غلامی اور اس کے دردناک مظالم سے انہیں نجات دینا ان احسانات میں سے چونکہ عظیم ترین احسان تھا' اس لئے یہاں سب سے پہلے اس کا ذکر کیا جاتا ہے۔

وَ اِذْ نَجَّیْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ یَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ یُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَ یَسْتَحْیُوْنَ نِسَآءَكُمْؕ وَ فِیْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِیْمٌ ﴿۴۹﴾ وَ اِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ فَاَنْجَیْنٰكُمْ وَ اَغْرَقْنَاۤ اٰلَ فِرْعَوْنَ وَ اَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ﴿۵۰﴾

"یاد کرو وہ وقت جب ہم نے تم کو فرعونیوں کی غلامی سے نجات بخشی۔ انہوں نے تمہیں سخت عذاب میں مبتلا کر رکھا تھا' تمہارے لڑکوں کو ذبح کرتے تھے اور تمہاری لڑکیوں کو زندہ رہنے دیتے تھے اور اس حالت میں تمہارے رب کی طرف سے تمہاری بڑی آزمائش تھی۔" یہاں اس کربناک صورتحال کو ان کے پردہ ذہن پر دوبارہ اجاگر کیا جارہا ہے' جس میں ان کے آباؤ اجداد فرعون کے زمانے میں مبتلا تھے۔ کیونکہ یہ لوگ ان بنی اسرائیل کی اولاد تھے جو اس عذاب میں مبتلا ہوئے۔ تعذیب اور مظالم کی تصویر کشی کے بعد' اللہ تعالیٰ ان کے سامنے وہ منظر بھی پیش فرماتے ہیں' جس سے انہیں نجات دی گئی۔ انہیں کہا جاتا ہے ذرا اس وقت کو یاد کرو جب ہم نے تمہیں فرعونیوں سے نجات دی' جو تمہیں مسلسل عذاب میں مبتلا کئے ہوئے تھے۔ یَسُوْمُوْنَ کے معنی ہیں "ہمیشہ تمہیں عذاب میں رکھتے تھے۔" یہ لفظ سام الماشیتہ "اس نے مویشیوں کو ہمیشہ چرنے والے (سائمہ) بنایا۔" گویا فرعونیوں نے ان مظالم کو بنی اسرائیل کے لئے ایک قسم کی غذا بنا دیا تھا' جو انہیں مسلسل کھلائی جاتی تھی۔ اس کے بعد اس عذاب کی ایک خاص قسم کا ذکر کیا جارہا ہے یعنی وہ مردوں کو ذبح کرتے تھے۔ اور عورتوں کو زندہ رکھتے تھے تاکہ بنی اسرائیل کی قوت کم ہو۔

اس سے پہلے کہ بنی اسرائیل کی نجات کے واقعے کی تفصیلات پیش ہوں انہیں یہ بتایا جاتا ہے کہ مصیبت بنی اسرائیل کے لئے ابتلائے عظیم تھی۔ تاکہ ان کے احساس و شعور' بلکہ ہر اس مسلمان کے احساس و شعور میں جو کسی مصیبت میں مبتلا ہو' یہ بات بیٹھ جائے کہ اللہ کے بندوں پر مصائب کا آنا دراصل ان کے لئے ابتلا و امتحان ہوتا ہے۔ انہیں آزمائشوں اور فتنوں میں مبتلا کیا جاتا ہے۔ جو شخص ابتلا کی اس حقیقت کو سمجھتا ہے وہ سختی اور مصیبت سے فائدہ حاصل کرتا ہے' وہ اپنے اس شعور کی وجہ سے مصائب و شدائد سے کچھ حاصل ہی کر لیتا ہے۔ رنج و الم میں مبتلا شخص اگر یہ جانتا ہے کہ اس کا امتحان لیا جارہا ہے اور اس کے بعد اس سختی سے' اسے فائدہ ہی پہنچنے والا ہے تو یہ رنج و الم اس کے لئے بے فائدہ نہیں ہوتے۔ جب آدمی اس تصور کے ساتھ مصیبت کی زندگی گزار رہا ہو تو اس کی مشکلیں آسان ہو جاتی ہیں۔ بالخصوص جبکہ ان دردناک تجربات کے دوران حاصل ہونے والے ثبات اور علم و معرفت کو پیش نظر رکھا جارہا ہو۔

نیز جبکہ یہ احساس بھی ہو کہ اللہ کے ہاں اس مصیبت کا اجر محفوظ ہے اور اللہ کے سامنے سلسلہ عجز و نیاز بھی جاری ہو اور اس کی جانب سے نجات کی پوری امید بھی ہو اور اس کی رحمت و شفقت سے کسی قسم کی مایوسی نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ مصیبت بنی اسرائیل کے ذکر کے ساتھ ہی یہ فرمادیا

وَ فِیْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِیْمٌ O "اور اس حالت میں تمہارے رب کی طرف سے تمہاری بڑی آزمائش تھی۔"

اس کے بعد بنی اسرائیل کے قصۂ نجات کی تمہید شروع ہوتی ہے۔

وَ اِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ فَاَنْجَیْنٰكُمْ وَ اَغْرَقْنَاۤ اٰلَ فِرْعَوْنَ وَ اَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ

"یاد کرو وہ وقت' جب ہم نے سمندر پھاڑ کر تمہارے لئے راستہ بنایا' پھر اس میں سے بخیر تمہیں گزار دیا' پھر وہیں تمہاری آنکھوں کے

سامنے فرعونیوں کو غرقاب کیا۔" اس نجات کی تفصیلات سورۂ بقرہ سے پہلے نازل ہونے والی مکی سورتوں میں بالتفصیل آچکی تھی۔ یہاں ان لوگوں کو جو تفصیلات سے واقف تھے، محض یاد دہانی کے طور پر بتایا جارہا ہے۔ مخاطب اس قصے کی تفصیلات کو جانتے تھے، قرآن کریم سے یا اپنے محفوظ قصوں یا مذہبی کتابوں کی وساطت سے۔ یہاں ان کے سامنے دوبارہ اس نجات کی تصویر کشی کی جارہی ہے تاکہ وہ اسے پردہ خیال پر لاکر اس سے متاثر ہوں۔ انداز بیان تو دیکھئے کہ گویا مخاطب خود دیکھ رہے ہیں کہ دریا پھٹ رہا ہے اور ان کی آنکھوں کے سامنے بنی اسرائیل حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قیادت میں دریا کو پار کر رہے ہیں۔ قرآن کریم کا یہ اسلوب بیان، یعنی منظر کشی کے ذریعے مخاطب کو تاثر دے دینا، وہ خاص معجزانہ اسلوب بیان ہے جو قرآن کے لئے مخصوص ہے۔[۱] اب گفتگو کا سلسلہ خروج بنی اسرائیل کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتا ہے۔ بنی اسرائیل مصر کی غلامی سے نجات پاچکے ہیں۔

وَاِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰٓى اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۵۱﴾ ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۵۲﴾ وَاِذْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَالْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۵۳﴾ وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ فَتُوْبُوْٓا اِلٰى بَارِىِٕكُمْ فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِىِٕكُمْ ۭ فَتَابَ عَلَيْكُمْ ۭ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۵۴﴾

"یاد کرو، جب موسیٰ کو ہم نے چالیس شبانہ روز کی قرارداد پر بلایا، تو اس کے پیچھے تم بچھڑے کو اپنا معبود بنا بیٹھے۔ اس وقت تم نے بڑی زیادتی کی تھی، مگر اس پر بھی ہم نے تمہیں معاف کیا کہ شاید اب تم شکر گزار بنو۔

یاد کرو کہ (ٹھیک اس وقت جب تم یہ ظلم کر رہے تھے) ہم نے موسیٰ کو کتاب اور فرقان عطا کی تاکہ تم اس کے ذریعے سیدھا راستہ پا سکو۔

یاد کرو، جب موسیٰ (یہ نعمت لئے ہوئے پلٹا تو اس) نے اپنی قوم سے کہا کہ "لوگو! تم نے بچھڑے کو معبود بنا کر اپنے اوپر سخت ظلم کیا ہے، لہٰذا تم لوگ اپنے خالق کے حضور توبہ کرو اور اپنی جانوں کو ہلاک کرو، اسی میں تمہارے خالق کے نزدیک تمہاری بہتری ہے۔ اس وقت تمہارے خالق نے تمہاری توبہ قبول کرلی کہ وہ بڑا معاف کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔"

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی عدم موجودگی میں بنی اسرائیل کا بچھڑے کو خدا بنالینا اور اس کی پوجا کرنا، جبکہ موسیٰ علیہ السلام چالیس دن کے لئے کوہ طور پر گئے تھے، سورۂ بقرہ سے پہلے نازل ہونے والی سورت، سورت طٰہٰ میں بالتفصیل بیان ہوا ہے۔ یہاں صرف انہیں اس کی یاد دہانی کرائی جارہی ہے کیونکہ وہ اس کی تفصیلات سے خوب واقف ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں یاد دلا رہے ہیں کہ ان کی حالت یہ تھی کہ نبی کے اوجھل ہوتے ہی بچھڑے پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ حالانکہ نبی نے انہیں فرعونیوں کے دردناک عذاب سے محض اللہ تعالیٰ کے نام پر رہائی دلائی تھی۔ اللہ تعالیٰ یہاں ان کے موقف پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ O "اور تم ظالم تھے۔" اس سے بڑا ظلم اور

---

[۱] دیکھئے التصویر الفنی فی القرآن۔ فصل "قرآن کا انداز بیان"

کون ہو گا' جو اللہ کی بندگی ترک کر کے اپنے پیغمبر کی وصیت کو بھلا کر' ایک بچھڑے جیسے جسم کی پوجا شروع کر دے' حالانکہ اللہ ہی تھا' جس نے اسے ان لوگوں کی غلامی سے نجات دی جو گائے کے بچھڑے کو مقدس سمجھتے تھے۔

لیکن اس کے باوجود اللہ انہیں معاف کر دیتے ہیں۔ ان کے نبی کو کتاب ہدایت' تورات دیتے ہیں جس میں جو کچھ لکھا تھا وہ حق و باطل کے درمیان فرقان تھا۔ اس امید پر کہ شاید یہ لوگ گمراہی کو چھوڑ کر واضح حق کو قبول کر لیں۔

لیکن پھر بھی اس بات کی ضرورت تھی کہ سنگدلی سے ان کی تطہیر کی جائے۔ کیونکہ ان کی بگڑی ہوئی فطرت کو صرف ننگی تلوار اور سخت ترین عذاب کے ذریعے ہی سیدھا کیا جاسکتا تھا۔ ان کی فطرت کا تقاضا تھا کہ ان کے لئے سزا بھی سخت ہو اور انوکھی بھی۔ چنانچہ حکم ہوا: وَ اِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ فَتُوْبُوْٓا اِلٰى بَارِىِٕكُمْ فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِىِٕكُمْ "یاد کرو' جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ لوگو! تم نے بچھڑے کو معبود بنا کر اپنے اوپر سخت ظلم کیا ہے' لہٰذا تم لوگ اپنے خالق کے حضور توبہ کرو اور اپنی جانوں کو ہلاک کرو' اسی میں تمہارے خالق کے نزدیک تمہاری بہتری ہے۔" اپنے آپ کو قتل کرو تاکہ اسے بھی پاک کر دے اور خود اپنے آپ کو بھی پاک کر دے۔ تم میں سے فرمانبردار مجرم قتل کرے۔ اس سخت عذاب اور شدید کفارہ کے بارے میں روایات سے یہی معلوم ہوتا ہے۔ بے شک یہ ایک جانگسل اور روح فرسا ذمہ داری تھی کہ بھائی بھائی کو قتل کرے۔ گویا وہ خود اپنے آپ کو قتل کرے۔ لیکن ان کے اس بگڑے ہوئے مزاج اور بزدلانہ طبیعت کی تربیت کے لئے یہ ضروری تھا کیونکہ ان کا مزاج ہر شر پر مائل تھا۔ اور کسی ناپسندیدہ فعل کے کر گزرنے سے وہ نہ چوکتے تھے۔ اگر وہ ناپسندیدہ امور سے رکنے کی صلاحیت رکھتے تو نبی کے غیر حاضر ہوتے ہی وہ بچھڑے کی پوجا پر نہ پل پڑتے۔ ان کا علاج یہ تھا۔ کیونکہ لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانا کرتے۔ ان کے لئے مناسب یہی تھا کہ وہ اس قسم کا بھاری بھرکم تاوان ادا کریں تاکہ انہیں کچھ نفع ہو' اور بگڑے ہوئے مزاج کی تربیت ہو۔

لیکن اس سزا کے بعد پھر اللہ کی رحمت انہیں ڈھانپ لیتی ہے۔ فَتَابَ عَلَيْكُمْ ۭ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۝ "اس وقت تمہارے خالق نے تمہاری توبہ قبول کر لی۔ کیونکہ وہ بڑا معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔"

لیکن بنی اسرائیل بھی تو بنی اسرائیل تھے وہ موٹا دماغ رکھنے والے دنیا پرست تھے اور عالم غیب اور آخرت ان کی نظروں سے اوجھل اور مستور تھا۔ اس لئے انہیں صرف یہی سوجھتا ہے کہ رویت الٰہی کا مطالبہ کر دیں اور جنہوں نے یہ مطالبہ کیا وہ کوئی عام لوگ بھی نہ تھے' بلکہ ان میں سے ستر مختار اور برگزیدہ لوگ تھے جنہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے رب سے ملاقات کے موقع پر پوری قوم سے چنا تھا اور ساتھ لے گئے تھے۔ جس کی پوری تفصیل' اس سے پہلے کی مکی آیات میں بیان ہو چکی ہے۔ غرض بنی اسرائیل نے علانیہ اللہ کو دیکھنے سے پہلے' ایمان لانے سے صاف صاف انکار کر دیا۔ قرآن کریم یہاں بنی اسرائیل کے آباؤ اجداد کی گستاخی کو نقل کر کے یہ بتانا چاہتا ہے کہ زمانہ قدیم سے یہ قوم ضد اور ہٹ دھرمی میں مبتلا چلی آ رہی ہے اور ان کی یہ قدیم ہٹ دھرمی اس ہٹ دھرمی کے بالکل مشابہ ہے جو اس وقت یہ لوگ نبی آخر الزمان ﷺ کے مقابلے میں اختیار کئے ہوئے ہیں۔ یہ لوگ خود بھی' اپنے آباؤ اجداد کی طرح معجزات کا مطالبہ کر رہے ہیں اور سادہ دل مومنین کو بھی اس پر آمادہ کرنے کی سعی کر رہے ہیں کہ وہ حضور ﷺ کی سچائی کو آزمانے کے لئے معجزات کا مطالبہ کریں۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆

وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ۝ ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝ وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ وَاَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى ۭ كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ۭ وَمَا ظَلَمُوْنَا وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ۝

"یاد کرو' جب تم نے موسیٰ سے کہا تھا کہ ہم تمہارے کہنے کا ہرگز یقین نہ کریں گے' جب تک کہ اپنی آنکھوں سے علانیہ خدا کو (تم سے کلام کرتا) نہ دیکھ لیں۔ اس وقت تمہارے دیکھتے دیکھتے ایک زبردست صاعقے نے تم کو آلیا۔ تم بے جان ہو کر گر چکے تھے۔ مگر پھر ہم نے تم کو جلا اٹھایا' شاید کہ اس احسان کے بعد تم شکر گذار بن جاؤ۔ ہم نے تم پر ابر کا سایہ کیا۔ من سلویٰ کی غذا تمہارے لئے فراہم کی اور تم سے کہا کہ جو پاک چیزیں ہم نے تمہیں بخشی ہیں' انہیں کھاؤ مگر تمہارے اسلاف نے جو کچھ کیا' وہ ہم پر ظلم نہ تھا بلکہ انہوں نے آپ اپنے ہی اوپر ظلم کیا"

اندازہ ہوتا ہے کہ یا تو یہ ٹھوس اور مادی احساس ہی ان کا واحد ذریعہ علم ہے اور محسوسات سے آگے وہ کسی چیز کے ادراک کے اہل ہی نہ تھے اور یا پھر یہ لوگ چاہتے تھے کہ اپنی ہٹ دھرمی پر قائم رہیں اور مخاطب کو عاجز کر دیں۔

اللہ کے بے شمار نشانیاں' اس کی نعمتیں بار بار کی عفو اور درگزر' ان سب چیزوں کا ان کی اس مادی فطرت اور مادہ پرست طبیعت کے سامنے بالکل بے اثر تھیں۔ ان سب نعمتوں کے باوجود یہ لوگ سخت جھگڑالو اور فریب کار تھے۔ اور کسی سخت عذاب اور انتقام کے بغیر' قبول حق کے لئے ہرگز تیار نہ تھے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ فرعون کی غلامی اور اس کے ظالمانہ نظام نے ان بیچاروں کی فطرت ہی کو بری طرح مسخ کر ڈالا تھا۔ یاد رہے کہ جب کوئی ظالمانہ اور جابرانہ نظام ایک طویل عرصے تک کسی قوم پر مسلط رہے تو وہ قوم اس کی فطرت سلیمہ کو بالکل مسخ کر دیتا ہے اور اس سے تمام انسانی فضائل اور اچھی عادات ایک ایک کر کے ختم ہو جاتی ہیں۔ غلامی سے انسانیت کے بنیادی فضائل اور اساسی عناصر ضائع ہو جاتے ہیں اور اقوام کے اندر غلاموں کی معروف اور گھٹیا صفات و عادات پیدا ہو جاتی ہیں۔ ایسے لوگوں کی عادت یہ ہوتی ہے کہ جب ان کے سروں پر ڈنڈا مسلط ہو' تو وہ رام ہو جاتے ہیں اور جونہی وہ آزاد ہوتے اور آزادی کے سائے میں قوت اور آسائش پاتے ہیں تو آپے سے باہر ہو جاتے ہیں۔ جنوں کی سی سرکشی کرنے لگتے ہیں۔ یہی حالت تھی بنی اسرائیل کی جو آج تک اس پر قائم ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ وہ ایسے کفریہ کلمات کہتے ہیں اور ذلت و گمراہی کے گہرے گڑھے میں جا پڑتے ہیں۔

وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً "یاد کرو' جب تم نے موسیٰ سے کہا تھا کہ ہم تمہارے کہنے کا ہرگز یقین نہ کریں گے' جب تک کہ اپنی آنکھوں سے علانیہ' خدا کو (تم سے کلام کرتے) نہ دیکھ لیں۔"

یہی وجہ ہے کہ ابھی وہ پہاڑ پر ہی تھے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں' ان کے اس کافرانہ رویہ کے بدلے یہ سزا دی۔ فَاَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ "اس وقت تمہارے دیکھتے دیکھتے' ایک زبردست صاعقہ نے تم کو آلیا۔"

چنانچہ اس کے بعد دوبارہ طین کو اللہ کی رحمت ڈھانپ لیتی ہے۔ انہیں دوبارہ زندگی کا موقع دیا جاتا ہے تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں اور رب العزت کا شکر ادا کریں۔

یہاں اللہ تعالیٰ انہیں اپنی وہ نعمت یاد دلاتے ہیں۔ ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ○ "مگر پھر ہم نے تم کو جلا اٹھایا' شاید کہ اس احسان کے بعد تم شکر گذار بن جاؤ۔"

اس کے بعد اللہ تعالیٰ انہیں وہ مراعات اور احسانات یاد دلاتے ہیں' جو اس نے ان پر سینائی کے چٹیل میدان میں کئے۔ ان کو کھانے کے لئے مطلوبہ خوراک دی گئی۔ جس کے لئے انہیں کوئی خاص محنت نہ کرنی پڑتی تھی۔ بے کدو کاش انہیں مل جاتی تھی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت اور تدبیر خاص سے انہیں صحرا کی تپش اور سورج کی جھلسا دینے والی گرمی سے بچایا۔

وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ وَاَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى ؕ كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ؕ وَمَا ظَلَمُوْنَا وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ "ہم نے تم پر ابر کا سایہ کیا' من و سلویٰ کی غذا تمہارے لئے فراہم کی اور تم سے کہا کہ جو پاک چیزیں ہم نے تمہیں بخشی ہیں' انہیں کھاؤ' مگر تمہارے اسلاف نے جو کچھ کیا' وہ ہم پر ظلم نہ تھا' انہوں نے آپ اپنے ہی اوپر ظلم کیا۔"

روایات میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بادل کا ایک ٹکڑا ان کے سروں پر قائم رکھا تاکہ وہ گرمی سے محفوظ رہیں۔ صحرا کا موسم ایسا ہوتا ہے کہ اگر بادل اور بارش نہ ہو تو وہ ایک کھولتی ہوئی جہنم کی مانند ہوتا ہے۔ اس سے آگ کے شعلے بلند ہو رہے ہوتے ہیں۔ لیکن اگر صحرا میں بارش ہو جائے اور مطلع ابر آلود ہو تو اس کا موسم تروتازہ اور نہایت خوشگوار ہوتا ہے۔ جس میں جسم و روح دونوں فرحت محسوس کرتے ہیں۔ روایات میں یہ بھی آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے من کا انتظام فرمایا' جو درختوں پر ہوتا تھا اور شہد کی طرح میٹھا ہوتا تھا۔ نیز اللہ تعالیٰ نے ان کی خوراک کے لئے سلویٰ پرندے کی وافر مقدار پیدا کر دی جو ان کے گھروں کے قریب بڑی مقدار میں پائے جاتے تھے۔ ان دو چیزوں کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے لئے ایسے لذیذ کھانے کا بندوبست کیا جس کی نظیر دنیا میں نہ تھی۔ رہائش کے لئے مقام کو خوشگوار بنایا اور ان پاکیزہ چیزوں کو ان کے لئے حلال کیا۔ لیکن اب ذرا اس قوم کی روش تو دیکھئے! کیا اب بھی وہ شکر گذار بنتی ہے یا نہیں؟ ہدایت پاتی ہے یا نہیں؟ آیت کا آخری حصہ صاف صاف نشاندہی کر رہا ہے کہ انہوں نے ان تمام نعمتوں کا انکار کیا اور ظلم کا ارتکاب کیا لیکن یہ ظلم خود اپنے اوپر تھا۔

وَمَا ظَلَمُوْنَا وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ "تمہارے اسلاف نے جو کچھ کیا وہ ہم پر ظلم نہ تھا' انہوں نے اپنے ہی اوپر ظلم کیا۔"

اس کے بعد بنی اسرائیل کے انحراف' انکار حق اور معصیت پر مسلسل اصرار کی یہ طویل داستان ذرا اور آگے بڑھتی ہے۔

وَاِذْ قُلْنَا ادْخُلُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ فَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا وَّادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّقُوْلُوْا حِطَّةٌ نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطٰيٰكُمْ ؕ وَسَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ ۝ فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ فَاَنْزَلْنَا عَلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ۝ ۶ ع ۱۳ ۶

"اور پھر یاد کرو' جب ہم نے کہا تھا کہ یہ بستی جو تمہارے سامنے ہے' اس میں داخل ہو جاؤ' اس کی پیداوار جس طرح چاہو' مزے سے کھاؤ' مگر بستی کے دروازے میں سجدہ ریز ہوتے داخل ہونا اور کہتے جانا حطۃ' حطۃ' ہم تمہاری خطاؤں سے درگذر کریں گے اور نیکو کاروں کو مزید فضل و کریم سے نوازیں گے۔ مگر جو بات کہی گئی تھی' ظالموں نے اسے بدل کر کچھ کر دیا۔ آخر کار ہم نے ظلم کرنے والوں

پر آسمان سے عذاب نازل کیا۔ یہ سزا تھی ان نافرمانیوں کی جو وہ کر رہے تھے۔"

بعض روایات میں اس کی تصریح آتی ہے کہ اس گاؤں سے مراد بیت المقدس ہے۔ مصر سے خروج کے بعد اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو حکم دیا تھا کہ وہ اس شہر میں داخل ہو جائیں۔ اس وقت اس میں عمالقہ آباد تھے۔ بنی اسرائیل کو حکم تھا کہ وہ ان لوگوں کو نکال دیں۔ لیکن بنی اسرائیل نے اس سے انکار کر دیا تھا اور کہا تھا "اے موسیٰ! اس شہر میں تو ایک جبار قوم آباد ہے۔ ہم تو اس میں اس وقت تک داخل نہیں ہو سکتے جب تک وہ وہاں سے نکل نہیں جاتے۔ اگر وہ نکل جاتے ہیں تو ہم داخل ہوں گے۔" نیز اسی شہر کے بارے میں انہوں نے اپنے پیغمبر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا تھا "اے موسیٰ ﷺ ہم ہرگز اس شہر میں داخل نہ ہوں گے' جب تک کہ یہ لوگ اس شہر میں موجود ہیں' جائیں! آپ اور آپ کا رب لڑیں ان سے' ہم تو یہیں بیٹھے ہیں۔" چنانچہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اس کی یہ سزا دی کہ وہ چالیس سال تک بھٹکتے پھرے۔ ان کی موجودہ نسل سب مر گئی' ایک جدید نسل تیار ہو گئی اور اس نے حضرت یوشع بن نون کی قیادت میں اس شہر کو فتح کیا اور یہ لوگ شہر میں داخل ہوئے۔ لیکن اس طویل سزا کے بعد بھی جیسا کہ اللہ نے انہیں حکم دیا تھا کہ خشوع و خضوع اور تواضع سے جھک کر شہر میں داخل ہوں اور حطۃ حطۃ پکاریں' انہوں نے ویسا نہ کیا۔ شہر میں داخلے کی جو صورت اللہ تعالیٰ نے تجویز کی تھی اس کے مطابق داخل نہ ہوئے' نیز وہ لفظ بھی ادا نہ کئے جن کا حکم اللہ تعالیٰ نے دیا۔

یہاں اللہ تعالیٰ' ان کی اس تاریخی نافرمانی کو نقل کر کے ان کے سامنے رکھتے ہیں۔ نیز تاریخی لحاظ سے یہ واقعہ پیش بھی' موضوع زیر بحث یعنی خروج بنی اسرائیل کے متصلاً بعد آیا تھا۔ اس لئے یہاں اس کا بھی ذکر ہوا۔ قرآن کریم کا یہ انداز بتا رہا ہے کہ وہ بنی اسرائیل کی پوری تاریخ کو ایک اکائی تصور کرتا ہے جس کا آغاز' وسط اور انتہا بالکل یکساں ہے۔ کیونکہ یہ لوگ ہمیشہ اپنی پوری تاریخ میں' مخالف حق' سرکش' نافرمان اور راہ راست سے بھٹکے ہوئے نظر آتے ہیں۔

تاریخی طور پر یہ واقعہ جو بھی ہو اس کا کوئی یقینی علم ہمیں نہیں ہے۔ البتہ قرآن کریم ان کے سامنے جو واقعہ پیش کر رہا ہے۔ اس کا انہیں علم ہے۔ وہ اس بات کو جانتے ہیں جس کی طرف یہاں اشارہ کیا جا رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی مدد کی تھی اور وہ اس خاص شہر میں داخل ہوئے تھے۔ نیز یہ کہ اللہ تعالیٰ کا حکم یہ تھا کہ وہ خضوع اور خشوع کی حالت میں' اس شہر میں داخل ہوں اور اللہ سے دعا کریں کہ وہ ان کی ان غلطیوں کو معاف کرے۔ نیز اللہ تعالیٰ نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ وہ ان کی غلطیوں کو معاف کر دے گا۔ اور نیکی کرنے والوں پر اپنا مزید فضل و کرم کرے گا۔ لیکن ان لوگوں نے اپنی عادت مستمرہ کے مطابق اس حکم کی بھی خلاف ورزی ہی کی فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ مگر جو بات کہی گئی تھی ظالموں نے اسے بدل کر کچھ اور کر دیا۔

یہاں اللہ تعالیٰ بالخصوص ان لوگوں کا ذکر کرتے ہیں جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے اس حکم و نصیحت کو بدل دیا تھا۔ یعنی **اَلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا** یا تو اس لئے کہ بنی اسرائیل میں سے ایک خاص گروہ نے یہ کام کیا تھا اور یا اس لئے کہ یہ ثابت کر دیا جائے کہ بنی اسرائیل سب کے سب ظالم ہیں اور ان سب نے اس کریہہ فعل کا ارتکاب کیا۔

فَاَنْزَلْنَا عَلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ آخر کار ہم نے ظلم کرنے والوں پر آسمان سے عذاب نازل کیا۔ یہ سزا تھی ان نافرمانیوں کی' جو وہ کر رہے تھے۔"

الرجز کے معنی ہیں عذاب اور فسق کے معنی ہیں حکم کی مخالفت اور دائرہ حق سے خروج۔ اور یہ دونوں صفات بنی اسرائیل کی منجملہ اور صفات کے ان میں بدرجہ اتم موجود تھیں۔

اللہ تعالیٰ نے' جس طرح صحرا کی تپش میں بنی اسرائیل کے لئے سائے کا انتظام کیا اور بے آب و گیاہ چٹیل میدان میں ان کے طعام کا

بندوبست کیا' اسی طرح ان کے پینے کے لئے پانی کا بھی خاص بندوبست کیا اور یہ بندوبست بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے تمام دوسرے معجزات کی طرح معجزانہ انداز میں کیا۔ اس واقعہ کو بھی قرآن کریم یہاں بطور احسان بیان کرتا ہے اور اس کے بعد بتاتا ہے کہ اس احسان اور انعام کا جواب ان لوگوں نے کس شکل میں دیا۔

وَاِذِ اسْتَسْقٰى مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ؕ فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ؕ قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ؕ كُلُوْا وَ اشْرَبُوْا مِنْ رِّزْقِ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِى الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ﴿۶۰﴾

"اور یاد کرو جب موسیٰ نے اپنی تمام قوم کے لئے پانی کی دعا کی' تو ہم نے کہا کہ فلاں چٹان پر اپنا عصا مارو۔ چنانچہ اس سے بارہ چشمے پھوٹ نکلے اور ہر قبیلے نے جان لیا کہ کون سی جگہ اس کے پانی لینے کی ہے۔ اس وقت یہ ہدایت کر دی گئی تھی کہ اللہ کا دیا ہوا رزق کھاؤ پیو اور زمین میں فساد نہ پھیلاتے پھرو۔"

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کے لئے پانی طلب فرمایا۔ اور انہوں نے یہ درخواست اپنے رب سے کی اور اس نے قبول فرمائی۔۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ سے کہا کہ وہ ایک متعین پتھر کو اپنے عصا سے ماریں۔ آپ نے حکم کی تعمیل کی اور پتھر سے بارہ چشمے پھوٹ نکلے۔ یہ بارہ چشمے بنی اسرائیل کے بارہ قبائل کی تعداد کے مطابق تھے۔ کیونکہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے پوتوں کے بعد یہ لوگ بارہ قبائل میں تقسیم ہو گئے تھے۔ حضرت یعقوب کا نام اسرائیل تھا جس کی طرف یہ لوگ نسبت کرتے ہیں۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کے پوتے اسباط کے نام سے مشہور ہیں' جن کا ذکر بار بار قرآن کریم میں آیا ہے۔ یہ لوگ بنی اسرائیل کے سربراہ تھے۔ اور قبائلی نظام کے مطابق زندگی بسر کر رہے تھے۔ اور قبائلی نظام میں قبیلے کی نسبت اکثر اوقات مورث اعلیٰ کی طرف کر دی جاتی ہے۔ چنانچہ قرآن کریم کہتا ہے قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ؕ ہر قبیلے نے جان لیا کہ کون سی جگہ ہے اس کے پانی لینے کی۔" یعنی وہ چشمہ جو بارہ چشموں سے ان کے لئے مخصوص کر دیا گیا ہے۔ كُلُوْا وَ اشْرَبُوْا مِنْ رِّزْقِ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِى الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ "اس وقت انہیں ہدایت کر دی گئی تھی کہ اللہ کا دیا ہوا رزق کھاؤ پیو اور زمین میں فساد نہ پھیلاتے پھرو۔"

بنی اسرائیل کی حالت یہ تھی کہ وہ خشک صحرا کی پتھریلی زمین میں تھے۔ آسمان اوپر سے آگ کے شعلے برسا رہا تھا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے پتھروں سے پانی نکالا۔ آسمان سے من و سلویٰ' شہد و پرندوں کا انتظام فرمایا' لیکن ان کی فاسد اور گری ہوئی ذہنیت اور گری ہوئی فطرت اور عادات نے' انہیں اس بلند مقام تک پہنچنے نہ دیا جس کے لئے انہیں مصر سے نکالا گیا تھا۔ اور اس بے آب و گیاہ صحرا میں ڈال دیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں ان کے نبی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذریعے ذلت و خواری سے اس لئے نکالا تھا کہ ارض مقدس دوبارہ ان کے اقتدار میں آجائے اور وہ اس ذلت اور خواری کی زندگی سے باہر نکل آئیں۔ ظاہر ہے کہ حریت و آزادی اور عزت و آبرو کے حصول کے لئے کچھ قربانیاں دینی پڑتی ہیں۔ جو امانت کبریٰ ان کے حوالے کی جارہی تھی اس کا کسی قدر ان سے شکرانہ بھی لینا مقصود تھا۔ لیکن بنی اسرائیل تو ایسے لوگ تھے جو اس کی کوئی قیمت ادا نہ کرنا چاہتے تھے۔ نہ وہ تکالیف اور آزمائشوں کو انگیز کر سکتے تھے۔ اس لئے وہ اس مقام رفیع کا کوئی شکرانہ دینے کے لئے بھی تیار نہ تھے۔ نہ وہ یہ چاہتے تھے کہ مصر میں وہ جس طرح کی پر کیف اور پر آسائش زندگی بسر کر رہے تھے

اسے چھوڑ دیں۔ یہاں تک کہ وہ اس بلند مرتبے کے لئے اپنے مالوف کھانوں اور پینے کی چیزوں کو بھی ترک نہ کر سکتے تھے اور کسی طرح بھی آمادہ نہ تھے کہ عزت و شرف اور حریت و آزادی کے حصول کے لئے' وہ اپنی زندگی کو کسی قدر نئے سانچے میں ڈھالیں۔ وہ تو وہی کھانے چاہتے ہیں کہ جن کے وہ مصر میں عادی تھے۔ اور ساگ' ترکاری' گیہوں اور لہسن وغیرہ کے دلدادہ تھے۔ یہاں مدینہ میں قرآن کریم انہیں ان کے پارسائی کے ان طویل و عریض دعووں کے جواب میں یہ کہتا ہے کہ وہ ذرا اپنی تاریخ کے اوراق تو الٹیں اور دیکھیں کہ انہوں نے کیا کیا کارنامے سرانجام دیے ہیں۔

وَإِذْ قُلْتُمْ يَٰمُوسَىٰ لَن نَّصْبِرَ عَلَىٰ طَعَامٍ وَٰحِدٍ فَٱدْعُ لَنَا رَبَّكَ يُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنۢبِتُ ٱلْأَرْضُ مِنۢ بَقْلِهَا وَقِثَّآئِهَا وَفُومِهَا وَعَدَسِهَا وَبَصَلِهَا ۖ قَالَ أَتَسْتَبْدِلُونَ ٱلَّذِى هُوَ أَدْنَىٰ بِٱلَّذِى هُوَ خَيْرٌ ۚ ٱهْبِطُوا۟ مِصْرًا فَإِنَّ لَكُم مَّا سَأَلْتُمْ ۗ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ ٱلذِّلَّةُ وَٱلْمَسْكَنَةُ وَبَآءُو بِغَضَبٍ مِّنَ ٱللَّهِ ۗ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ كَانُوا۟ يَكْفُرُونَ بِـَٔايَٰتِ ٱللَّهِ وَيَقْتُلُونَ ٱلنَّبِيِّۦنَ بِغَيْرِ ٱلْحَقِّ ۗ ذَٰلِكَ بِمَا عَصَوا۟ وَّكَانُوا۟ يَعْتَدُونَ ﴿٦١﴾

"یاد کرو' جب تم نے کہا تھا "اے موسیٰ! ہم ایک ہی طرح کے کھانے پر صبر نہیں کر سکتے۔ اپنے رب سے دعا کرو کہ ہمارے لئے زمین کی پیداوار ساگ' ترکاری' گیہوں' لہسن' پیاز' دال وغیرہ پیدا کرے۔" تو موسیٰ نے کہا "کیا ایک بہتر چیز کی بجائے تم ادنیٰ درجے کی چیز لینا چاہتے ہو؟ اچھا کسی شہری آبادی میں جا رہو۔ جو کچھ تم مانگتے ہو' وہاں مل جائے گا۔" آخر کار نوبت یہاں تک پہنچی کہ ذلت و خواری اور پستی و بدحالی ان پر مسلط ہو گئی اور وہ اللہ کے غضب میں گھر گئے۔ یہ نتیجہ تھا اس کا کہ وہ اللہ کی آیات سے کفر کرنے لگے اور پیغبروں کا ناحق قتل کرنے لگے۔ یہ نتیجہ تھا ان کی نافرمانیوں کا اور اس بات کا کہ حدود شرع سے نکل نکل جاتے تھے۔"

حضرت موسیٰ' ان کی یہ طفلانہ درخواست سن کر سخت رنجیدہ ہوئے۔

"کیا ایک بہتر چیز کے بجائے' تم ادنیٰ درجے کی چیز لینا چاہتے ہو؟" اللہ تعالیٰ تو تمہارے لئے بلندیاں پسند کرتا ہے اور تم ہو کہ گرے جا رہے ہو۔

"اچھا کسی شہری آبادی (یا مصر) میں جا رہو' جو کچھ مانگتے ہو' وہاں مل جائے گا۔"

اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ جو کچھ وہ طلب کر رہے ہیں وہ تو بالکل ایک معمولی چیز ہے۔ اس لئے کوئی لمبی چوڑی درخواست دینے اور دعا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے' کسی شہری آبادی میں چلے جائیں وہاں یہ چیزیں بڑی مقدار میں انہیں مل سکتی ہیں۔

دوسرے یہ کہ تم دوبارہ لوٹ کر مصر چلے جاؤ' جہاں سے تمہیں نکالا گیا تھا۔ اپنی اس مالوف ذلت آمیز اور گھٹیا درجے کی غلامانہ زندگی کو دوبارہ اختیار کر لو۔ وہاں تمہیں کافی مقدار میں ساگ' ترکاریاں' گیہوں' اور لہسن پیاز وغیرہ سب دستیاب ہوں گے۔ اور اس بلند نصب العین کو چھوڑ ہی دو جس کے لئے تمہیں چن لیا گیا تھا۔ اگر یہ دوسرا مفہوم لیا جائے تو یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے ایک قسم کی تادیب اور توبیخ ہو گی اور انہیں شرم دلانا مقصود ہو گا۔

اگرچہ بعض مفسرین نے اس دوسرے معنی کو مستبعد سمجھا ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اگر اس کے بعد آنے والے نتیجے پر غور کیا جائے تو یہی مفہوم زیادہ مناسب ہے۔ فرمایا جاتا ہے۔

"آخر کار نوبت یہاں تک پہنچی کہ ذلت و خواری اور پستی و بدحالی ان پر مسلط کر دی گئی اور وہ اللہ کے غضب میں گھر گئے۔"

ان پر ذلت و خواری کا ہمیشہ کے لئے مسلط ہونا' اور ان کا اللہ کے غضب میں گھر جانا تاریخی لحاظ سے اس مرحلے میں واقع نہیں ہوا۔ یہ لوگ ذلیل خوار زمانہ مابعد میں' اس وقت ہوئے جب کہ وہ بہت سی برائیوں میں مبتلا ہو گئے اور جس کا ذکر اس آیت کے آخری حصے میں ہوا۔

"یہ نتیجہ تھا' اس کا کہ وہ اللہ کی آیات سے کفر کرنے لگے اور پیغمبروں کو ناحق قتل کرنے لگے۔ یہ نتیجہ تھا ان کی نافرمانیوں کا اور اس بات کا کہ حدود شرع سے نکل نکل جاتے تھے۔"

اور ان برائیوں کا صدور' ان سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ کے کئی نسلیں بعد ہوا۔ لیکن یہاں چونکہ انہوں نے ساگ ترکاریوں' گیہوں اور لہسن پیاز وغیرہ کا مطالبہ کر دیا تھا' اس لئے' ان کے اس مکروہ موقف کی مناسبت سے یہاں ہی بتا دیا کہ منجملہ اور اسباب کے ان کی ذلت کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ وہ ان چیزوں کا مطالبہ کر رہے تھے۔

اس لئے مناسب یہی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یہ قول کہ "کسی شہر میں جا کر آباد ہو جاؤ۔" اس پر محمول کیا جائے کہ آپ انہیں مصر کی غلامانہ زندگی یاد دلا رہے ہیں اور انہیں جتلاتے ہیں کہ وہ اس زندگی سے چھٹکارا پانے پر شکر ادا کریں۔ اور ان نفسانی ذلیل خواہشات کے پیچھے نہ بھاگیں' جن کے وہ مصر کی ذلیل و خوار زندگی میں خوگر ہو گئے تھے۔

راہ ہدایت کی طرف بلانے والے مصلحین اور پیغمبروں پر' بنی اسرائیل نے جو مظالم ڈھائے اور ان کے ساتھ وہ مسلسل جو وحشیانہ اور سنگدلانہ برتاؤ کرتے رہے' اس کی مثال کسی دوسری قوم کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ انہوں نے کئی انبیاء و مصلحین کو ذبح کیا' قتل کیا بلکہ آرے سے چیر ڈالا کیا ہی بدترین اور وحشیانہ فعل ہے جو ان سے صادر ہوا..... انہوں نے کفر اور حد سے گزر جانے کی بدترین مثالیں پیش کیں۔ ظلم و زیادتی کی وحشیانہ مثالوں میں وہ سب سے بازی لے گئے۔ اور سرکشی اور نافرمانی کا ایک ریکارڈ قائم کر دیا۔ غرض فسق و فجور کے ان سب میدانوں میں انہوں نے وہ وہ کارہائے نمایاں سرانجام دیئے جو انہی کا حصہ تھے اور ہیں۔

لیکن اس کے باوجود' پھر بھی وہ طویل و عریض اور بڑے بڑے دعوے کرتے رہے۔ ان کا ہمیشہ سے یہ دعویٰ تھا کہ صرف وہی ہیں جو ہدایت یافتہ کہلا سکتے ہیں۔ صرف وہی اللہ کی پسندیدہ قوم ہیں' وہی اللہ کی جانب سے اجر و ثواب کے مستحق ہیں۔ اللہ کا فضل و کرم ان کے لئے مخصوص ہے اور اس میں ان کا کوئی شریک نہیں ہے۔ قرآن کریم یہاں ان کے دعاوی کی تردید کرتے ہوئے ایک قاعدہ بیان کر دیتا ہے اور یہ قاعدہ قرآن کریم کے تمام قصص کے درمیان بار بار دہرایا جاتا ہے۔ کبھی پہلے اور کبھی ان کے آخر میں۔ یعنی یہ کہ ایمان کی حقیقت ایک ہے۔ صحیح عقیدہ ایک ہی ہے' بشرطیکہ اس عقیدے کے نتیجے میں نفس انسانی اللہ کے سامنے جھک جائے اور ایمان ایسا ہو کہ اس سے عمل صالح کے چشمے پھوٹ رہے ہوں اور یہ کہ اللہ کا فضل و کرم کوئی محدود چیز نہیں ہے نہ کسی نسل سے مخصوص ہے۔ وہ تمام مؤمنین کے لئے ہے۔ تمام لوگ' چاہے جس زمان و مکان سے بھی تعلق رکھتے ہوں' اللہ کے اس ازلی ابدی دین کے مطابق اس کے فضل و کرم کے مستحق رہے ہیں اور رہیں گے اور آخر میں آخری دین (محمدی) اور آخری نبوت کے مطابق مومنین کا انجام یہ ہو گا۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالنَّصَارَىٰ وَالصَّابِئِينَ مَنْ آمَنَ

بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۶۲﴾

"یقین جانو! کہ نبی عرب کے ماننے والے ہوں یا یہودی' عیسائی ہوں یا صابی جو بھی اللہ اور روز آخرت پر ایمان لائے گا اور نیک عمل کرے گا اس کا اجر اس کے رب کے پاس ہے اور اس کے لئے کسی خوف اور رنج کا موقع نہیں ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ...... یعنی مسلمان

وَالَّذِيْنَ هَادُوْا ...... یعنی وہ جو اللہ کی طرف راہ پا گئے وہ جو "یہودا" کی اولاد ہیں۔

وَالنَّصٰرٰى ...... یعنی عیسائی

وَالصّٰبِـِٕيْنَ ...... میرے نزدیک راجح یہ ہے کہ صابئین سے مراد مشرکین کے وہ لوگ ہیں' جو بعثت سے قبل مشرکین کے موروثی شرکیہ دین سے برگشتہ ہو گئے تھے۔ انہیں بتوں کی پوجا کی معقولیت میں شک لاحق ہو گیا تھا۔ اس لئے انہوں نے خود اپنے غور و فکر سے اپنے لئے خود کوئی عقیدہ تجویز کرنے کی کوشش کی اور اس آزادانہ غور و فکر کے نتیجے میں وہ عقیدۂ توحید پر پہنچ گئے تھے۔ ان لوگوں کا دعویٰ یہ تھا کہ وہ ابتدائی دین حنیف پر ہیں جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے پیش کیا تھا۔ چنانچہ ان لوگوں نے بتوں کی پوجا ترک کر دی تھی' اگرچہ وہ اپنی قوم کو عقیدۂ توحید کی طرف دعوت نہ دیتے تھے۔ ان لوگوں کے بارے میں مشرکین کہتے تھے کہ یہ لوگ صابی ہو گئے ہیں۔ یعنی اپنے باپ دادا کا دین انہوں نے ترک کر دیا ہے جیسا کہ بعد میں یہی طعنہ مشرکین ان مسلمانوں کو بھی دیا کرتے تھے۔ یہ جو بعض تفاسیر میں آیا ہے کہ یہ لوگ ستارہ پرست تھے۔ اس کے مقابلے میں یہ قول راجح معلوم ہوتا ہے۔

آیت کا مقصد یہ ہے کہ ان گروہوں میں سے جو بھی ایمان لائے' اللہ پر اور یوم آخرت پر اور اس کے ساتھ ساتھ عمل صالح بھی کرے تو وہ اپنے رب کے نزدیک اجر کا مستحق ہو گا۔ اسے کسی قسم کا خوف اور حزن و ملال نہ ہو گا کیونکہ اسلام میں دارومدار نظریہ اور عقیدے پر ہے' کسی قوم اور نسل پر نہیں۔ لیکن عمل و جزاء کا یہ اصول بعثت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے کے ادوار سے متعلق ہے۔ آپ کی بعثت کے بعد ظاہر ہے کہ ایمان باللہ کی آخری شکل (اسلام کی صورت میں) متعین ہو گئی ہے۔

اس کے بعد مسلمانوں کو سناتے ہوئے اور یہود مدینہ کو سامنے رکھتے ہوئے بنی اسرائیل کے کچھ کارنامے بیان کئے جاتے ہیں۔

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ۭ خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاذْكُرُوْا مَا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۶۳﴾ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ۚ فَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَكُنْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۶۴﴾

"یاد کرو وہ وقت' جب ہم نے طور کو تم پر اٹھا کر تم سے پختہ عہد لیا اور کہا تھا کہ "جو کتاب ہم تمہیں دے رہے ہیں' اسے مضبوطی سے تھامنا اور جو احکام و ہدایات اس میں درج ہیں انہیں یاد رکھنا۔ اسی ذریعے سے توقع کی جا سکتی ہے کہ تم تقویٰ کی روش پر چلو۔" مگر اس کے بعد تم اپنے عہد سے پھر گئے۔ اس پر بھی اللہ کے فضل اور اس کی رحمت نے تمہارا ساتھ نہ چھوڑا' ورنہ تم کبھی کے تباہ ہو چکے ہوتے۔

اس عہد کی تفصیل دوسری سورتوں اور خود اس سورۂ بقرہ میں بھی بعد میں مذکور ہے۔ یہاں مقصد صرف یہ ہے کہ اس منظر کو دوبارہ

ان کی نظروں کے سامنے اجاگر کر دیا جائے' اور یہ بتایا جائے کہ ان کے سروں پر کوہ طور کو معلق کرنا اور طاقت سے عہد لینا اور ان کو حکم دینا کہ وہ احکام تورات کو پوری قوت کے ساتھ تھام لیں' ان امور کے درمیان ایک نفسیاتی اور تعبیری ہم آہنگی موجود ہے۔ انہیں حکم دیا جاتا ہے کہ وہ عقاید کے سلسلے میں عزیمت کی روش اختیار کریں۔ کیونکہ عقاید و نظریات میں کسی قسم کی نرمی اور مداہنت نہیں برداشت کی جا سکتی۔ نظریات کے باب میں کچھ لو اور کچھ دو کی پالیسی اختیار نہیں کی جاسکتی۔ نہ ہی اس بارے میں غیر سنجیدگی اور نرمی برداشت کی جاسکتی ہے۔ نظریہ و عقیدہ اللہ اور مؤمنین کے درمیان ایک عہد ہے۔ ایک سنجیدہ اور برحق معاہدہ۔ لہٰذا اس میں باطل اور غیر سنجیدگی کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اس راہ میں بے حد قربانیاں دینی پڑتی ہیں۔ کیونکہ عقاید و نظریات کا مزاج ہی یہ ہے۔ عقیدہ ایک عظیم چیز ہے۔ اس کائنات میں اس کی عظمت ہر چیز سے بڑھی ہوئی ہے۔ لہٰذا انسان کو چاہئے کہ وہ بڑی سنجیدگی سے' اچھی طرح سمجھتے ہوئے اور اس کے تقاضوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس کی طرف متوجہ ہو۔ اور پوری دلجمعی اور عزم صمیم سے نظریہ کی راہ میں آنے والی مشکلات کو انگیز کرے۔ جو شخص بھی کسی عقیدے کو ان معنوں میں اپنائے' اسے معلوم ہونا چاہئے کہ اب اس نے آرام و آسائش اور عیش و عشرت کو الوداع کہہ دیا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو فریضۂ رسالت کی ادائیگی کے لئے پکارا تو آپ نے فرمایا "خدیجہ! اب آرام اور سونے کا زمانہ ختم ہو گیا۔" نیز اللہ تعالیٰ نے بھی آپ کو متنبہ فرمایا کہ سَنُلْقِىْ عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيْلًا "ہم عنقریب آپ پر ایک بھاری بات نازل کریں گے۔" اور جیسا کہ بنی اسرائیل سے کہا گیا "جو کتاب ہم تمہیں دینے والے ہیں اسے مضبوطی کے ساتھ تھامنا اور جو احکام و ہدایات درج ہیں انہیں یاد رکھنا۔ اسی ذریعے سے توقع کی جاسکتی ہے کہ تم تقویٰ کی روش اختیار کرو۔

لیکن قوت' سنجیدگی' دلجمعی اور عزم صمیم کے ساتھ عہد لینے کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ عہد کرنے والے مسلمان اس عہد کی حقیقت کو بھی سمجھیں۔ انہیں اس عہد و پیمان کی نوعیت کا شعور اچھی طرح ہو' وہ اپنی زندگیوں کو اس عہد و پیمان کے رنگ میں رنگ دیں۔ تاکہ معاملہ محض جذبات' حمیت' طاقت اور جوش و خروش تک ہی محدود نہ رہے کیونکہ اللہ کے ساتھ ہمارا عہد درحقیقت یہ ہے کہ ہم پوری زندگی' اس کے پسندیدہ نظام حیات کے مطابق گزاریں گے۔ یہ نظام زندگی قلب و دماغ میں بطور حیات اور زندہ شعور کے راسخ ہوتا ہے اور عملی زندگی میں نظام حیات اور طریقۂ زندگی کی شکل میں نمودار ہوتا ہے۔ معاشرت میں حسن خلق اور حسن سلوک کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے اور اخروی' زندگی میں تقویٰ اور اللہ کے سامنے جوابدہی کے شعور احساس پر منتج ہوتا ہے۔

لیکن وائے ناکامی! بنی اسرائیل پھر بھی جوں کے توں رہتے ہیں۔ ان کی بری فطرت ان پر غالب آہی جاتی ہے۔ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ مِّنْ بَعْدِ ذٰلِكَ "مگر اس کے بعد تم پھر اپنے عہد سے پھر گئے۔"

اس کے بعد پھر اللہ کی رحمت و شفقت ان کا ساتھ دیتی ہے۔ اللہ کا فضل و کرم ان کے شامل حال ہو جاتا ہے اور انہیں خسران اور تباہی میں سے نکال لیا جاتا ہے۔

فَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَكُنْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ O "اس پر بھی اللہ کے فضل و کرم اور اس کی رحمت نے تمہارا ساتھ نہ چھوڑا ورنہ تم کبھی کے تباہ ہو چکے ہوتے۔"

☆☆---O---☆☆

اب دیکھئے ان کی غداری' عہد شکنی اور حیلہ سازی کا ایک نیا منظر' جس میں وہ یہ ثابت کرتے ہیں کہ وہ کسی عہد کی پابندی کرنے کے سرے سے اہل ہی نہیں۔ وہ اس عہد و پیمان کی ذمہ داریاں ادا ہی نہیں کرسکتے۔ خواہشات نفس اور وقتی مفادات کو دیکھ کر وہ بے بس ہو جاتے ہیں۔

وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِينَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ كُونُوا قِرَدَةً خَاسِئِينَ ﴿٦٥﴾ فَجَعَلْنَاهَا نَكَالًا لِمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا وَمَوْعِظَةً لِلْمُتَّقِينَ ﴿٦٦﴾

"پھر تمہیں اپنی قوم کے ان لوگوں کا قصہ تو معلوم ہی ہے جنہوں نے سبت کا قانون توڑا تھا۔ ہم نے انہیں کہہ دیا کہ بندر بن جاؤ اور اس حال میں رہو کہ ہر طرف سے تم پر دھتکار پھٹکار پڑے۔ اس طرح ہم نے ان کے انجام' اس زمانے کے لوگوں اور بعد میں آنے والی نسلوں کے لئے عبرت اور ڈرانے والوں کے لئے نصیحت بنا کر چھوڑا۔"

دوسری جگہ قرآن کریم نے سبت کے احکام کی خلاف ورزی کی تفصیلات بیان کی ہیں۔ "اور ذرا ان سے اس بستی کا حال بھی پوچھئے' جو سمندر کے کنارے واقع تھی۔ انہیں یاد دلاؤ وہ واقعہ کہ وہاں کے لوگ سبت (ہفتہ) کے دن احکام الٰہی کی خلاف ورزی کرتے تھے اور یہ کہ مچھلیاں سبت ہی کے دن ابھرابھر کر سطح پر ان کے سامنے آتی تھیں اور سبت کے سوا باقی دنوں میں نہیں آتی تھیں۔" (۷۔۱۶۳)

بنی اسرائیل نے اللہ تعالیٰ سے درخواست کی تھی کہ ان کے آرام کے لئے ایک دن کو مقدس قرار دیا جائے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے سبت کے دن کو مقدس دن قرار دیا اور اس دن دنیاوی معاش کے لئے کوئی کام کرنا حرام قرار دیا۔ اس کے بعد انہیں اس آزمائش میں ڈالا کہ ہفتے کے دن تمام مچھلیاں بڑی کثرت سے دریا کی سطح پر نکل آتیں اور دوسرے دنوں میں غائب ہوتیں۔ یہ ایسی آزمائش تھی' جس کے مقابلے میں یہود نہ ٹھہر سکے۔ ان کے لئے ثابت قدمی کیسے ممکن تھی۔ ایسا بہترین شکار بالکل قریب مل رہا تھا۔ انہیں اس کے سوا اور کیا چاہئے تھا۔ کیا محض عہد و پیمان کی خاطر وہ اس شکار کو جانے دیتے۔ یہودیوں سے بہرحال یہ کام نہیں ہونے کا۔ یہ تو ان کے مزاج کے خلاف ہے۔

فَقُلْنَا لَهُمْ كُونُوا قِرَدَةً خَاسِئِينَ "ہم نے انہیں کہہ دیا کہ بندر بن جاؤ اور اس حال میں رہو کہ ہر طرف سے دھتکار پھٹکار تم پر پڑے۔"

اللہ کا عہد توڑ کر بہرحال وہ اس سزا کے مستحق بن چکے تھے۔ وہ اس بات کے مستحق تھے کہ حیوان بن جائیں کیونکہ انسان تو ایک صاحب ارادہ مخلوق ہے اور وہ اس مقام سے نیچے گر گئے تھے۔

ظاہر ہے کہ کوئی حیوان اپنے پیٹ سے بلند ہو کر نہیں سوچ سکتا۔ چنانچہ جونہی انہوں نے انسان کی خصوصیت اولیٰ یعنی ٹھوس اور بلند ارادہ اور خداوند کریم کے ساتھ کئے ہوئے عہد پر قائم رہنے کا عزم صمیم ...... کو ترک کیا تو وہ مقام انسانیت سے گر کر بہیمیت کے درجے میں آگئے۔

یہ ضروری نہیں ہے کہ ان کے جسم بھی بندر کے جسموں میں تبدیل ہو گئے ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ روح' فکر' شعور اور مزاج کے اعتبار سے وہ بندر بن گئے ہوں اور بندروں جیسی حرکتیں کرتے ہوں کیونکہ فکر کا پرتو ہمیشہ چہرے' شکل و ہیئت اور حرکات و سکنات پر پڑتا ہے۔ انسان کی ظاہری حالت پر اس کی فکر کے گہرے اثرات پڑتے ہیں۔

یہ واقعہ اس دور میں اور اس کے متصلاً مابعد کے ادوار میں مخالفین حق کے لئے ایک نہایت ہی عبرت آموز واقعہ تھا اور مومنین کے لئے ہر دور میں یہ ایک بہترین نصیحت ہے فَجَعَلْنَاهَا نَكَالًا لِمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا وَمَوْعِظَةً لِلْمُتَّقِينَ "اس طرح ہم نے ان کے انجام کو' اس زمانے کے لوگوں اور بعد کی آنے والی نسلوں کے لئے عبرت اور ڈرنے والوں کے لئے

نصیحت بنا کر چھوڑا۔"

اس سبق کے آخر میں اب گائے ذبح کرنے کا مشہور قصہ بیان کیا جاتا ہے۔ یہ قصہ ایک کہانی کی شکل میں بڑی تفصیل سے بیان کیا جاتا ہے۔ اور اس سے قبل اس سورت میں بنی اسرائیل کے جو تاریخی واقعات بیان ہوئے ہیں' ان میں اجمال و اختصار سے کام لیا گیا ہے۔ کیونکہ وہ تمام واقعات سورہ بقرہ سے پہلے نازل ہونے والی مکی سورتوں میں بیان ہو چکے تھے لیکن یہ واقعہ کسی دوسری جگہ بیان نہیں ہوا تھا۔ یہ قصہ بنی اسرائیل کی لجاجت' نافرمانی اور تعمیل حکم میں لیت و لعل اور عذر سازی کی ایک واضح تصویر کھینچ کر رکھ دیتا ہے' جس میں مدینہ کے یہودی بھی ممتاز تھے۔ وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تَذْبَحُوا بَقَرَةً ۖ قَالُوا أَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا ۖ قَالَ أَعُوذُ بِاللَّهِ أَنْ أَكُونَ مِنَ الْجَاهِلِينَ ﴿٦٧﴾ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَنَا مَا هِيَ ۚ قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ لَا فَارِضٌ وَلَا بِكْرٌ عَوَانٌ بَيْنَ ذَٰلِكَ ۖ فَافْعَلُوا مَا تُؤْمَرُونَ ﴿٦٨﴾ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَنَا مَا لَوْنُهَا ۚ قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَاءُ فَاقِعٌ لَوْنُهَا تَسُرُّ النَّاظِرِينَ ﴿٦٩﴾ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَنَا مَا هِيَ إِنَّ الْبَقَرَ تَشَابَهَ عَلَيْنَا وَإِنَّا إِنْ شَاءَ اللَّهُ لَمُهْتَدُونَ ﴿٧٠﴾ قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ لَا ذَلُولٌ تُثِيرُ الْأَرْضَ وَلَا تَسْقِي الْحَرْثَ مُسَلَّمَةٌ لَا شِيَةَ فِيهَا ۚ قَالُوا الْآنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ ۚ فَذَبَحُوهَا وَمَا كَادُوا يَفْعَلُونَ ﴿٧١﴾ وَإِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادَّارَأْتُمْ فِيهَا ۖ وَاللَّهُ مُخْرِجٌ مَا كُنْتُمْ تَكْتُمُونَ ﴿٧٢﴾ فَقُلْنَا اضْرِبُوهُ بِبَعْضِهَا ۚ كَذَٰلِكَ يُحْيِي اللَّهُ الْمَوْتَىٰ وَيُرِيكُمْ آيَاتِهِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ﴿٧٣﴾

٨ ع١٠ ٨

"پھر وہ واقعہ یاد کرو' جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا اللہ تمہیں ایک گائے ذبح کرنے کا حکم دیتا ہے۔ کہنے لگے تم ہم سے مذاق کرتے ہو؟ موسیٰ علیہ السلام نے کہا میں اس سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں کہ جاہلوں کی سی باتیں کروں۔ بولے اچھا اپنے رب سے درخواست کرو کہ وہ ہمیں اس گائے کی کچھ تفصیل بتائے۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا' اللہ کا ارشاد ہے کہ وہ ایسی گائے ہونی چاہئے جو نہ بوڑھی ہو نہ بچھیا' بلکہ اوسط عمر کی ہو۔ جو حکم دیا جاتا ہے اس کی تعمیل کرو۔ پھر کہنے لگے اپنے رب سے یہ اور پوچھ دو کہ اس کا رنگ کیسا ہو؟ موسیٰ علیہ السلام نے کہا' وہ فرماتا ہے' زرد رنگ کی گائے ہونی چاہئے' جس کا رنگ ایسا شوخ ہو کہ دیکھنے والوں کا جی خوش ہو جائے۔ پھر بولے اپنے رب سے صاف صاف پوچھ کر بتاؤ کیسی گائے مطلوب ہے' ہمیں اس کے تعین میں اشتباہ ہو گیا ہے۔ اللہ نے چاہا تو ہم اس کا پتہ پالیں گے۔ موسیٰ علیہ السلام نے جواب دیا!

جواب دیا! اللہ کہتا ہے کہ وہ ایسی گائے ہے جس سے خدمت نہیں لی جاتی' نہ زمین جوتتی ہے' نہ پانی کھینچتی ہے' صحیح سالم اور بے داغ ہے' اس پر وہ پکار اٹھے کہ ہاں' اب تم نے ٹھیک پتہ بتایا ہے۔ پھر انہوں نے اسے ذبح کیا' ورنہ وہ ایسا کرتے معلوم نہ ہوتے تھے۔

اور تمہیں یاد ہے وہ واقعہ جب تم نے ایک شخص کی جان لی تھی۔ پھر اس کے بارے میں جھگڑنے اور ایک دوسرے پر قتل کا الزام تھوپنے لگے تھے اور اللہ نے فیصلہ کر لیا تھا کہ جو کچھ تم چھپاتے ہو' اسے کھول کر رکھ دے گا۔ اس وقت ہم نے حکم دیا کہ مقتول کی لاش کو اس کے ایک حصے سے ضرب لگاؤ۔ دیکھو اس طرح اللہ مردوں کو زندگی بخشتا ہے اور تمہیں اپنی نشانیاں دکھاتا ہے' تاکہ تم سمجھو۔"

قرآن کریم نے یہ قصہ جس انداز میں بیان کیا ہے' اس کے کئی پہلو غور و فکر ہیں۔ اس کا ایک پہلو تو یہ ہے کہ یہ بنی اسرائیل کے قومی مزاج اور ان کی موروثی جبلت کو اچھی طرح اجاگر کر دیتا ہے۔ نیز اس سے موت و حیات کی حقیقت' موت کے بعد اٹھائے جانے کی کیفیت اور اللہ تعالیٰ کی قدرت بے پایاں کا اظہار بھی ہوتا ہے' پھر اس قصے میں بیان اور طرز ادا کی فنی خوبیاں بھی قابل لحاظ ہیں۔ قصے کا آغاز' اس کی انتہا اور سیاق و سباق سے اس کی ہم آہنگی قابل غور ہیں۔

مختصر یہ کہ بقرۃ کے اس قصے میں بنی اسرائیل کے قومی خد و خال بڑی خوبی سے ظاہر کئے گئے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہدایت کے اس صاف و شفاف سرچشمے وحی الٰہی اور ان کے دلوں کے رابطے ٹوٹ چکے ہیں۔ ایمان بالغیب' اللہ پر توکل' اور اصولوں پر نازل شدہ ہدایت الٰہی کی تصدیق سے محروم ہو چکے ہیں۔ اللہ کے احکام و ہدایات کے قبول کرنے میں وہ ہر وقت متامل ہیں اور پس و پیش کرتے ہیں۔ ہر وقت جھوٹے بہانے تلاش کرتے رہتے ہیں اور بار ہا اپنی چرب زبانی اور دل کی بے باکی کی وجہ سے وہ شعائر دین کے ساتھ مذاق کرنے پر اتر آتے ہیں۔

ان کے پیغمبر انہیں اللہ کا صاف صاف حکم سناتے ہیں۔ "اللہ تمہیں حکم دیتے ہیں کہ تم گائے ذبح کرو۔" ظاہر ہے کہ یہ حکم اپنے الفاظ میں بالکل صاف اور واضح تھا اور اس پر عمل کیا جا سکتا تھا۔ حکم سنانے والے نبی ان کے وہ محبوب رہنما تھے' جن کی قیادت میں اللہ نے انہیں فرعونیوں کے دردناک عذاب سے نجات دی تھی اور نجات کا یہ کام اللہ کی خاص رحمت' نگرانی اور ہدایات کے مطابق ایک حیرت انگیز معجزانہ انداز میں اپنے انجام کو پہنچا تھا۔ ان کے نبی نے انہیں واضح طور پر بتا دیا کہ یہ کوئی ان کی ذاتی رائے یا ذاتی حکم نہیں ہے بلکہ یہ اس رب ذوالجلال کا حکم ہے' جس کی ہدایات کے مطابق وہ بنی اسرائیل کو لے کر چل رہے ہیں۔ اب ذرا غور تو کیجئے' یہ لوگ اس جلیل القدر نبی کو کیا جواب دیتے ہیں؟ نہایت گستاخی' حماقت اور بے حیائی سے وہ اپنے نبی سے کہتے ہیں کہ کیا وہ ان کے ساتھ مذاق کر رہا ہے۔ ان کی بے حیائی تو دیکھئے کہ ان کے نزدیک گویا اللہ کی معرفت رکھنے والا ایک عام آدمی بھی نہیں' بلکہ اللہ کے جلیل القدر نبی اور کسی عام معاملے میں بھی نہیں' بلکہ اللہ کے نام پر اور اللہ تعالیٰ کے احکام کے معاملے میں بر سر عام اور لوگوں کے سامنے مذاق کر سکتا ہے۔ وہ کہتے ہیں أَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا "کیا تم ہم سے مذاق کر رہے ہو۔"

اس احمقانہ اور سفیہانہ بہتان کے جواب میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نعوذ باللہ پڑھنے کے سوا اور کر ہی کیا سکتے تھے' چنانچہ آپ بڑی نرمی کے ساتھ اشاروں کنایوں میں انہیں سمجھاتے ہیں کہ اللہ جل شانہ کی بارگاہ میں کس قدر ادب و احترام لازم ہے۔ آپ انہیں سمجھاتے ہیں کہ انہوں نے جو بہتان باندھا ہے اس کا ارتکاب وہی کر سکتا ہے جو بارگاہ قدس کے آداب و احترام سے ناواقف ہو۔ اور اس کے دل میں اللہ کی عظمت اور قدر و منزلت نہ ہو۔ چنانچہ آپ نے کہا قَالَ أَعُوذُ بِاللَّهِ أَنْ أَكُونَ مِنَ الْجَاهِلِينَ "موسیٰ نے کہا میں اس سے پناہ مانگتا ہوں کہ جاہلوں کی سی باتیں کروں۔"

یہ ہدایت و رہنمائی ان کے لئے کافی تھی کہ اب وہ ہوش میں آ جائیں' اپنے رب کی طرف لوٹیں اور اپنے نبی کے حکم کی تعمیل کریں

لیکن بہرحال وہ بنی اسرائیل تھے۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ حکم آئے اور وہ عمل پیرا ہو جائیں۔

ان کے لئے یہ ممکن تھا' جب حکم بالکل آسان تھا کہ وہ کسی گائے کو پکڑتے اور ذبح کر ڈالتے' اور اس طرح بسہولت وہ اللہ کے حکم پر عمل پیرا ہو جاتے اور اپنے لیڈر اور اپنے نبی کا اشارہ ملتے ہی اسے نافذ کر دیتے۔ لیکن اس وقت ان کی فطرت حیلہ ساز جاگ اٹھتی ہے' اور اپنے اس موروثی مزاج سے مغلوب ہو کر وہ پوچھنے لگتے ہیں قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ "بولے! اچھا' اپنے رب سے درخواست کرو کہ وہ ہمیں اس گائے کی کچھ تفصیل بتائے۔" انہوں نے اپنا سوال جن الفاظ میں بیان کیا' وہ الفاظ ہی یہ ظاہر کر رہے ہیں کہ انہیں اب بھی اس بارے میں شک ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام مذاق کر رہے ہیں۔ یہ سنجیدہ ہیں وہ پہلے تو کہتے ہیں کہ اپنے رب سے درخواست کرو گویا موسیٰ ﷺ کا رب صرف اسی کا ہے اور وہ ان کا رب نہیں ہے۔ یا گویا' اس سوال کا تعلق صرف موسیٰ ہی سے ہے' انہیں اس سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے۔ یہ صرف حضرت موسیٰ ﷺ اور آپ کے رب کا معاملہ ہے۔ پھر وہ حضرت موسیٰ ﷺ سے کہتے ہیں کہ وہ اپنے رب سے معلوم کر کے بتائے کہ وہ گائے "کیا ہے" یہاں مقصد تو یہ تھا کہ گائے کیسی ہو' لیکن بطور استہزا اور انکار پوچھتے ہیں کہ "گائے! گائے کیا چیز ہوتی ہے؟" گویا وہ گائے کی ماہیت سے واقف نہیں۔ گائے کیسی ہو' حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں صاف صاف بتا دیا تھا کہ وہ کوئی گائے ذبح کریں تعمیل حکم کے لئے وہ کافی ہوگی۔ اب حضرت موسیٰ ﷺ ان کے سوال کو نظر انداز کر کے انہیں صحیح جواب دیتے ہیں اور انہیں راہ راست پر لانے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ ان کے اصلی سوال کا جواب دے کر ان کے ساتھ گائے کی ماہیت پر فلسفیانہ بحث و مباحثہ نہیں شروع کرتے' بلکہ انہیں اس طرح جواب دیتے ہیں جس طرح ایک مصلح اور مربی' ایسے لوگوں کو دیا کرتا جبکہ اللہ تعالیٰ اسے ایسے احمقوں اور فاسقوں کو راہ ہدایت پر لانے کے مشکل کام میں لگا کر آزماتا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام انہیں گائے کے بارے میں کہتے ہیں۔ قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا فَارِضٌ وَلَا بِكْرٌ عَوَانٌ بَيْنَ ذَٰلِكَ کہا اللہ کا ارشاد ہے کہ وہ ایسی گائے ہونی چاہئے جو نہ بوڑھی ہو نہ بچھیا' بلکہ اوسط عمر کی ہو۔" یعنی نہ بہت بوڑھی ہو اور نہ ہی بالکل جوان ہو بلکہ اوسط درجے کی ہو' لیکن اس مجمل بیان کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام پھر انہیں نصیحت کرتے ہیں اور بتاکید انہیں کہتے ہیں۔ فَافْعَلُوا مَا تُؤْمَرُونَ "بس جو حکم دیا جا رہا ہے اس کی تعمیل کرو۔"

یہاں تک جو گفتگو ہوئی' اگر بنی اسرائیل حکم کی تعمیل چاہتے تو یہ کافی شافی تھی۔ اس گفتگو سے انہیں تسلی ہو جانی چاہئے تھی' دو مرتبہ یہ جلیل القدر پیغمبر انہیں جادۂ مستقیم پر لا چکے اور بارگاہ اقدس میں سوال و جواب اور وہاں سے استفادہ کرنے کے آداب بھی انہیں سمجھا چکے' دوبار انہیں بتا چکے کہ بس آگے بڑھیں اور اپنی گائیوں میں سے کسی اوسط درجے کی گائے کو ذبح کر ڈالیں۔ نہ بوڑھی ہو اور نہ ہی بہت چھوٹی' ادھیڑ عمر کی ہو' اس طرح وہ اس فرض کی ادائیگی سے جلد ہی بری الذمہ ہو جائیں اور اسے ذبح کر کے اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل کر ڈالیں اور اپنے آپ کو مزید قیود و حدود اور تنگی و مشقت میں نہ ڈالیں...... لیکن وائے ناکام! بنی اسرائیل بہرحال بنی اسرائیل تھے! پھر پوچھتے ہیں۔

قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا لَوْنُهَا "پھر کہنے لگے' اپنے رب سے یہ اور پوچھ دو کہ اس کا رنگ کیسا ہو؟" یوں سہ بارہ وہ کہتے ہیں۔ "اپنے رب سے یہ اور پوچھ دو۔" اس لئے ان کے اصرار و تکرار کے نتیجے میں یہ ضروری ہو گیا کہ بالتفصیل انہیں جواب دیا جائے۔ چنانچہ جواب آیا قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَاءُ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا تَسُرُّ النَّاظِرِينَ

"موسیٰ نے کہا" وہ فرماتے ہیں زرد رنگ کی گائے ہونی چاہئے جس کا رنگ ایسا شوخ ہو کہ دیکھنے والوں کا جی خوش ہو جائے۔"

یوں ان بدبختوں نے اپنا وسیع دائرہ اختیار کم کر دیا۔ اس سے پہلے اس حکم میں بڑی وسعت اور گنجائش تھی لیکن اب وہ صرف کوئی

ایک گائے ذبح کرنے کے مکلف نہیں بلکہ ایک ایسی گائے انہیں ذبح کرنی ہے جو ادھیڑ عمر کی ہو 'نہ بوڑھی اور نہ بچھیا ہو' پھر اس کا رنگ بھی زرد ہو اور اس میں بھی پھر شوخ رنگ کی گئے ہو۔ پھر وہ دبلی پتلی اور بدصورت بھی نہ ہو بلکہ ایسی ہو کہ اسے دیکھ کر جی خوش ہو جائے۔ اور ظاہر ہے کہ دیکھنے والے کا سرور تب ہی مکمل ہو سکتا ہے کہ جب مطلوبہ گائے خوب موٹی تازی' حیات و نشاط سے بھرپور' اچھلتی کودتی چمکدار ہو۔ کیونکہ مویشیوں میں یہ صفات لوگوں کے نزدیک پسندیدہ صفات ہیں اور لوگ بالعموم زندگی سے بھرپور اور متوسط عمر کے اور خوبصورت جانوروں کو دیکھ کر خوش ہوتے ہیں اور دبلے پتلے' بدصورت جانوروں سے نفرت کرتے ہیں۔

غرض اب تک بنی اسرائیل نے لیت و لعل سے کام لیا۔ فائباً وہ کافی بلکہ ضرورت سے بھی زیادہ تھا۔ لیکن وہ اب بھی بس نہیں کرتے۔ اپنی غلط روش میں آگے ہی بڑھتے جاتے ہیں' معاملے کو اور پیچیدہ بناتے چلے جاتے ہیں۔ اپنے اوپر اور تنگی کر رہے ہیں۔ اس لئے اللہ تعالیٰ بھی ان کی روش کے مطابق اپنے حکم اور سخت کرتے جاتے ہیں۔ اس قدر تفصیلات آچکنے کے بعد وہ اچانک دوبارہ گائے کی ماہیت اور حقیقت کے بارے میں پوچھنے لگتے ہیں۔

قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّن لَّنَا مَا هِيَ "پھر بولے' اپنے رب سے صاف صاف پوچھ کر بتاؤ کیسی گائے مطلوب ہے؟......

اس سوال اور لیت و لعل کا عذر وہ یہ بیان کرتے ہیں کہ یہ معاملہ ان کے لئے موجب اشتباہ بن گیا اور گائے کے تعین میں بڑی مشکل درپیش آرہی ہے۔ إِنَّ الْبَقَرَ تَشَابَهَ عَلَيْنَا "ہمیں اس گائے کے تعین میں اشتباہ ہو گیا ہے۔" اب آکر انہیں اپنی لجاجت اور جھگڑالو پنے کا قدرے احساس ہو جاتا ہے۔ اور بادل نخواستہ ان کی زبان سے یہ الفاظ نکلتے ہیں۔ وَإِنَّا إِن شَاءَ اللَّهُ لَمُهْتَدُونَ "اللہ نے چاہا تو ہم اس کا پتہ پالیں گے۔"

غرض اس نہ ختم ہونے والی لجاجت اور مباحثے کے نتیجے میں اس کے سوا کوئی اور چارہ کار ہی نہ تھا کہ اس حکم کو مزید پیچیدہ اور سخت کر دیا جائے اور انتخاب و اختیار کا جو وسیع دائرہ انہیں فراہم کیا گیا تھا' اسے مزید تنگ اور محصور کر دیا جائے اور مطلوبہ گائے کے اندر چند مزید اوصاف کا اضافہ کر دیا جائے' جبکہ پہلے ان اوصاف کی ضرورت نہ تھی اور حکم کی تعمیل کا دائرہ وسیع تر رکھا گیا تھا۔ قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا ذَلُولٌ تُثِيرُ الْأَرْضَ وَلَا تَسْقِي الْحَرْثَ مُسَلَّمَةٌ لَّا شِيَةَ فِيهَا "موسیٰ نے کہا! اللہ کہتا ہے وہ ایسی گائے ہو جس سے خدمت نہیں لی جاتی' نہ زمین جوتتی ہے' نہ پانی کھینچتی ہے' صحیح سالم اور بے داغ ہے۔"

اب وہ گائے صرف شوخ اور دل کو لبھانے والے زرد رنگ کی متوسط عمر کی گائے ہی نہ رہی بلکہ اس کے ساتھ ساتھ وہ ایسی گائے بن گئی جو کوئی محنت نہیں کرتی' ہل نہیں جوتتی' پانی نہیں کھینچتی اور ہے بھی خالص رنگ کی' اس میں کوئی داغ نہیں ہے۔

یہاں آکر اب ان کا دماغ درست ہوتا ہے۔ معاملے کو مشکل سے مشکل تر بنانے' زیادہ سے زیادہ شرائط عائد کرانے اور اپنے دائرہ عمل کو آخری حد تک تنگ کرانے کے بعد اب وہ پکار اٹھتے ہیں۔ قَالُوا الْآنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ "اس پر وہ پکار اٹھے ہاں اب تم نے ٹھیک پتہ بتایا۔"

"اب" گویا اس سے پہلے جو کچھ آپ فرما رہے تھے وہ حق نہ تھا گویا اس لمحہ ہی میں انہیں یہ یقین ہو رہا ہے کہ حضرت موسیٰ جو کچھ پیش فرما رہے ہیں وہ حق ہے۔

فَذَبَحُوهَا وَمَا كَادُوا يَفْعَلُونَ "پھر انہوں نے اسے ذبح کیا ورنہ وہ ایسا کرتے معلوم نہ ہوتے تھے۔"

جب وہ حکم الٰہی پر عمل پیرا ہو جاتے ہیں اور فریضہ الٰہی کو ادا کر دیتے ہیں' تو اب یہاں پوری کہانی کے آخر میں' اللہ تعالیٰ انہیں بتاتے ہیں کہ اس نے گائے کو ذبح کرنے کا حکم کیوں دیا تھا۔

وَ اِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ فِيْهَا ؕ وَ اللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ۚ فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا ؕ كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى ۙ وَ يُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ O

"اور تمہیں یاد ہے' وہ واقعہ جب تم نے ایک شخص کی جان لی تھی' پھر اس کے بارے میں جھگڑنے اور ایک دوسرے پر قتل کاالزام تھوپنے لگے تھے اور اللہ نے فیصلہ کر لیا تھا کہ جو کچھ تم چھپاتے ہو' وہ اسے کھول کر رکھ دے گا۔ اس وقت ہم نے حکم دیا کہ مقتول کی لاش کو اس کے حصے سے ضرب لگاؤ۔ دیکھو اس طرح اللہ مردوں کو زندگی بخشتا ہے اور تمہیں اپنی نشانیاں دکھاتا ہے تاکہ تم سمجھو۔"

یہاں آکر ہم قصہ بقرۃ کے ایک دوسرے پہلو تک آپہنچے ہیں۔ یہ پہلو اللہ تعالیٰ کی قدرت بے پایاں کا اظہار کر رہا ہے۔ اس سے موت و حیات کی حقیقت اور موت کے بعد دوبارہ اٹھائے جانے کی کیفیت کی حقیقت معلوم ہوتی ہے اور یہاں اسلوب کلام کہانی کے انداز کے بجائے خطاب کی شکل اختیار کر جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ حضرت موسیٰ کی قوم کے لئے گائے کو ذبح کرنے کے حکم کی حکمت کھول دیتے ہیں۔ واقعہ یہ تھا کہ انہوں نے ایک شخص کو قتل کیا تھا' اور ہر آدمی اپنے آپ کو قتل کے الزام سے بری قرار دے کر دوسرے پر الزام لگاتا تھا اور کوئی گواہ نہ تھا۔ اللہ تعالیٰ کی مشیئت نے چاہا کہ مقتول خود صداقت کو ظاہر کر دے اور اس شہادت حق سے پہلے گائے کا ذبح کیا جانا دراصل ادائیگی شہادت کا ایک ظاہری ذریعہ تھا۔ یوں کہ بقرہ کے گوشت سے اسے مارتے ہی اس نے زندہ ہو جانا تھا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا' انہوں نے اسے ذبح شدہ گائے کے ایک ٹکڑے سے مارا اور وہ زندہ ہو گیا۔ تاکہ وہ خود اپنے قاتل کی نشاندہی کر دے اور ان تمام شکوک و شبہات کو ختم کر دے جو اس کے قتل کے مسئلے میں پھیلے ہوئے تھے اور یوں صداقت محکم ترین دلائل کے ساتھ سامنے آجائے۔ حق حق ہو جائے اور باطل باطل۔ دودھ' دودھ اور پانی' پانی۔

سوال یہ ہے کہ اس ظاہری وسیلہ اور سبب کی کیا ضرورت تھی؟ اللہ تعالیٰ تو اس کے بغیر بھی مردوں کو زندہ کر سکتا ہے' بغیر کسی وسیلے اور ذریعے کے بھی۔ سوال یہ ہے کہ ذبح شدہ گائے اور زندہ کئے جانے والے مقتول کے درمیان تعلق کی نوعیت کیا ہے؟

بنی اسرائیل کی عادت کے مطابق' ان کے ہاں بطور قربانی اور تقرب الی اللہ گائے ذبح ہوا کرتی تھی' رہا یہ منظر کہ ایک بے جان قطعہ لحم ایک بے جان مقتول کے اندر بظاہر زندگی کے آثار پیدا کر دیتا ہے' تو اس کی حقیقت یہ ہے کہ گوشت کا ٹکڑا محض ظاہری سبب ہے جو اللہ تعالیٰ کی قدرت ماہرہ کا اظہار کر رہا ہے' جس کی حقیقت تک پہنچنا انسان کے لئے ممکن ہی نہیں ہے۔ لوگ اس کا اثر اور نتیجہ تو اپنی آنکھوں کے ساتھ دیکھ رہے ہیں' لیکن مردے کو جلانے کا یہ طریق کار ان کی فہم سے باہر ہے۔ كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى "وہ مردوں کو یوں کر زندہ کرتا ہے؟ یوں جیسا کہ تم بچشم سر دیکھ رہے ہو' لیکن اس کے باوجود اس کی حقیقت سے بے خبر ہو۔ نہیں جانتے کہ وہ کیوں کر زندہ ہوا؟ مقصد یہ ہے کہ ایسی ہی بے مشقت اور بڑی سہولت سے اللہ تعالیٰ مردوں کو دوبارہ زندہ کر دے گا۔

موت اور حیات کی نوعیت کے درمیان کس قدر بعد ہے؟ اس فرق سے سر چکرا جاتے ہیں لیکن قدرت الٰہی کے مقابلے میں موت سے حیات اور حیات سے موت ایک معمولی اور آسان عمل ہوتا ہے۔ کیونکر؟ بس یہی وہ بات ہے جو ہر انسان کے حد ادراک سے وراء ہے۔ اسے کوئی نہیں پا سکتا۔ موت و حیات کے بھید کو پانا دراصل اسرار الوہیہ کو پانا ہے اور اس جہان فانی میں اللہ کے اس راز تک رسائی پانا ممکن نہیں ہے۔ اگرچہ ایک انسان اس بھید اور راز پر غور کر کے اس سے نصیحت اور عبرت حاصل کر سکتا ہے۔

وَ يُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ O "اور اللہ تعالیٰ نشانیاں دکھاتا ہے تاکہ تم سمجھو۔"

اب ہم حسن ادا اور سیاق کلام سے اس کی ہم آہنگی پر آتے ہیں۔

یہ ایک مختصر قصہ ہے، جس کا آغاز بھی نہایت مجمل انداز میں ہوتا ہے۔ ابتدا میں ہمیں یہ تک معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ بنی اسرائیل کو گائے ذبح کرنے کا حکم کیوں دیتے ہیں؟ جیسا کہ خود بنی اسرائیل کو بھی یہ معلوم نہ تھا کہ انہیں یہ حکم کیوں دیا جارہا ہے؟ یوں بنی اسرائیل کے جذبہ اطاعت اور جذبہ تسلیم ورضا کو آزمایا جاتا ہے۔

اس کے بعد اصل حصہ شروع ہو جاتا ہے۔ بنی اسرائیل اور حضرت موسیٰ کے مابین گفتگو شروع ہوتی ہے۔ یہ بات بڑھتی جاتی ہے اور دوسری جانب اللہ تعالیٰ بھی اس گفتگو میں برابر شریک ہیں لیکن معلوم نہیں ہو سکتا کہ حضرت موسیٰ اور اللہ تعالیٰ کے درمیان کیا گفتگو ہوئی؟ حالانکہ وہ ہر بار آپ سے پوچھتے تھے کہ وہ اپنے رب سے پوچھ کر بتائیں اور آپ بھی پہلے اپنے رب سے پوچھتے اور پھر جواب انہیں سنادیتے۔ اگرچہ سیاق کلام میں یہ بات نہیں ہے کہ آپ نے اللہ سے کیا پوچھا اور اللہ نے اس کا کیا جواب دیا' یہ سکوت اور یہ خاموشی اللہ تعالیٰ کی بزرگی اور برتری اور علو مرتبت سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے۔ بنی اسرائیل جس طریقہ سے گفتگو کرنے کے عادی تھے اور جس طرح گفتگو بالخصوص اس واقعہ میں وہ کر رہے تھے' ہرگز مناسب نہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ حضرت موسیٰ کے سوال وجواب کا بھی اس میں ذکر کیا جاتا۔

آخر میں اچانک...... جیسا کہ اس وقت بنی اسرائیل کے لئے یہ بات بالکل خلاف توقع تھی۔ بنی اسرائیل کو حکم ہوتا ہے کہ وہ مذبوحہ بقرہ کے مردہ اور بے جان ٹکڑے کو مقتول پر ماریں اور دیکھیں کہ وہ کس طرح زندہ ہو جاتا ہے اور بات کرتا ہے' حالانکہ بقرہ کے گوشت میں نہ زندگی تھی اور نہ زندگی کا کوئی سامان تھا۔

غرض قرآن کریم کے دیگر مختصر اور بہترین قصوں کی طرح اس مختصر قصے میں بھی حکیمانہ موضوع سخن کے عین مطابق' نہایت ہی حکیمانہ طرز ادا اختیار کی گئی ہے۔

قصے کے اس آخری منظر کے اختتام پر اور اس قصے سے پہلے کے عبرت انگیز مظاہر اور سبق آموز واقعات کے نتیجے کے طور پر اس بات کی توقع تھی کہ اب تو بنی اسرائیل کے دل پگھل جائیں گے اور ان کے دلوں میں خوف خدا اور تقویٰ کے جذبات امڈ آئیں گے' لیکن ہمارے تعجب کی انتہا نہیں رہتی جب ہم دیکھتے ہیں کہ کلام کا خاتمہ بالکل خلاف توقع ان الفاظ پر ہوتا ہے۔

ثُمَّ قَسَتْ قُلُوبُكُمْ مِّنْ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً ۚ وَاِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ ۚ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَآءُ ۚ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ۗ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝

"مگر ایسی نشانیاں دیکھنے کے بعد بھی آخر کار تمہارے دل سخت ہو گئے' پتھروں کی طرح سخت' بلکہ سختی میں کچھ ان سے بھی بڑھے ہوئے' کیونکہ پتھروں میں سے تو کوئی ایسا بھی ہوتا ہے جس میں سے چشمے پھوٹ بہتے ہیں' کوئی پھٹتا ہے اور اس میں سے پانی نکل آتا ہے' اور کوئی خدا کے خوف سے لرز کر گر بھی پڑتا ہے۔ اللہ تمہارے کرتوتوں سے بے خبر نہیں ہے۔"

یہاں ان کے دلوں کو پتھروں سے تشبیہ دی جاتی ہے اور جب ان کا مقابلہ پتھروں کے ساتھ کیا جاتا ہے تو وہ ان سے بھی سخت اور خشک تر نکلتے ہیں۔ جیسے پتھروں سے یہاں انہیں تشبیہ دی جارہی ہے۔ وہ بنی اسرائیل کے علم میں ہے۔ اس سے قبل وہ یہ منظر دیکھ چکے

تھے کہ ایک پتھر سے ۱۲ چشمے پھوٹ نکلے تھے..... وہ یہ بھی دیکھ چکے تھے کہ جب تجلیات الٰہی کا ایک پرتو پہاڑ پر پڑا تو وہ ریزہ ریزہ ہو گیا تھا اور حضرت موسیٰ ؑ بھی بیہوش ہو کر گر پڑے تھے۔ لیکن ان کے دل اس قدر سخت ہیں کہ ان کے اندر کسی قسم کی کوئی نرمی یا تروتازگی پیدا نہیں ہوتی۔ ان میں خوف خدا سے دھڑکن نہیں پیدا ہوتی بلکہ وہ نہایت سخت' خشک' بنجر اور کافر دل ہیں۔ اس لئے انہیں ان الفاظ میں تنبیہ کی جاتی ہے۔ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ "اللہ تمہارے کرتوتوں سے بے خبر نہیں ہے۔"

ان الفاظ پر بنی اسرائیل پر تنقید اور ان کی طویل تاریخ..... کفر' تکذیب انبیاء' مکر و فریب' فسق و فجور' حکم عدولی و سرکشی' بے خوفی و سنگدلی اور لجاجت اور چالاکی سے بھرپور تاریخ پر بحث کا پہلا حصہ یہاں ختم ہو جاتا ہے۔

☆ ☆ ☆ ☆

درس ۵ ایک نظر میں

اس سے قبل ہم نے جس ٹکڑے کی تشریح کی ہے' اس میں خاتمۂ کلام بنی اسرائیل کے لئے یاد دہانی اور تذکیر پر ہوا تھا اور یہ بتایا گیا تھا کہ کس طرح اللہ تعالیٰ ان پر انعامات کی بارش کرتا رہا اور اس کے مقابلے میں یہ لوگ کس ثابت قدمی سے بار بار کفران نعمت کرتے رہے۔ وہاں کہیں بسط کے ساتھ اور کہیں اختصار کے ساتھ اللہ کے انعامات اور بنی اسرائیل کی نافرمانیوں کے واقعات اور مشاہدات بیان کئے گئے تھے۔ بیان کا خاتمہ اس فیصلے پر ہوا تھا کہ بنی اسرائیل کے دل قبول ہدایت کے معاملے میں اس قدر سخت' خشک اور بنجر ہو چکے ہیں جیسے مضبوط پتھر ہوتے ہیں بلکہ سنگدلی اور خشکی میں ان کے دل پتھروں سے بھی کہیں زیادہ سخت ہو گئے ہیں۔

اب ان زیر بحث آیات میں روئے سخن اسلامی جماعت کی طرف پھر جاتا ہے اور مسلمانوں کے سامنے ان کی کہانی بیان ہوتی ہے اور انھیں بتایا جاتا ہے کہ بنی اسرائیل کس قدر مکار اور فتنہ پرداز قوم ہے۔ ان کی فطرت اور ان کی طویل تاریخ کی روشنی میں اسلامی جماعت کو ان کی مکاری اور عیاری سے خبردار کیا جاتا ہے۔ تاکہ کہیں ان کی فتنہ پردازی اور غلط پروپیگنڈے اور جھوٹے دعووں سے متاثر ہو کر مسلمان دھوکہ نہ کھاجائیں۔ بنی اسرائیل کی مکاری کا یہ طویل بیان اور پھر بار بار اور مختلف پہلوؤں سے اس کا تکرار' اس بات کو ظاہر کر رہا ہے کہ اس دور میں یہودی امت مسلمہ اور دین اسلام کے خلاف کتنے وسیع پیمانے پر سازشیں کر رہے تھے اور کس طرح وہ ہر وقت اس تحریک کو نقصان پہنچانے کی تاک میں بیٹھے رہتے تھے۔ اس لئے اس قدر تفصیلی گفتگو کی ضرورت پیش آرہی تھی۔

دوران گفتگو' روئے سخن کبھی کبھی بنی اسرائیل کی طرف پھر جاتا ہے تاکہ امت مسلمہ کے سامنے' انہیں یاد دلایا جائے کہ اللہ نے ان سے کیا کیا وعدے لئے تھے اور انہوں نے کس کس طرح ان وعدوں کو توڑا تھا۔ کس طرح وہ گمراہ ہوئے' عہد شکنی کرتے رہے اور پھر انبیاء کرام کی تکذیب کرتے رہے۔ انہوں نے کئی انبیاء کو قتل بھی کیا۔ کیونکہ وہ ان کی خواہشات نفس کے مطابق نہ چل سکتے تھے۔ نیز یہ کہ کس طرح انہوں نے اللہ کی شریعت کی خلاف ورزی کی ناجائز بحث و جدل کرتے رہے اور شریعت کے جو قوانین ان کے پاس تھے ان میں تحریف کرتے رہے۔

مسلمانوں کے ساتھ جو بحث اور مناظرہ اور جو کٹ حجتی وہ کرتے تھے یہاں اس کے کچھ نمونے بھی پیش کئے جاتے ہیں۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت کی جاتی ہے کہ آپ ان کے دعووں کی حقیقت کھول دیں اور ان کے دلائل کی کمزوری واضح کر دیں اور ان کی باطل سازشوں کے مقابلے میں روشن اور واضح سچائی پیش کریں۔

مثلاً ان کا خیال تھا کہ وہ تو صرف گنتی کے چند دن ہی جہنم میں رہیں گے۔ کیونکہ وہ اللہ کے پسندیدہ اور محبوب لوگ ہیں' اللہ کے ہاں ان کا بلند رتبہ ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیتے ہیں کہ ذرا "ان سے پوچھیں کیا تم نے اللہ سے کوئی عہد لے لیا ہے' جس کی خلاف ورزی وہ نہیں کر سکتا؟ یا یہ بات ہے کہ تم اللہ کے ذمے ڈال کر ایسی بات کہہ دیتے ہو' جن کے متعلق تمہیں علم نہیں ہے کہ اس نے اس کا ذمہ لیا ہے۔"

جب انھیں اسلام کی طرف دعوت دی جاتی ہے تو وہ کہتے! "ہم تو صرف اس چیز پر ایمان لائے ہیں جو ہمارے ہاں اتری ہے۔" اور اس دائرے سے باہر جو کچھ آیا ہے اسے ماننے سے وہ انکار کرتے ہیں' حالانکہ وہ حق ہے اور اسی تعلیم کی تصدیق و تائید کر رہا ہے جو ان کے ہاں پہلے سے موجود تھی۔ چنانچہ نبی ﷺ کو یہ ہدایت کی جاتی ہے۔" اچھا ان سے کہو "اگر تم اس تعلیم ہی پر ایمان رکھنے والے ہو جو تمہارے

ہاں آئی تھی' تو اس سے پہلے اللہ کے پیغمبروں کو (جو خود بنی اسرائیل میں پیدا ہوئے) کیوں قتل کرتے رہے۔" تمہارے پاس موسیٰ کیسی کیسی روشن نشانیوں کے ساتھ آیا۔ پھر بھی تم ایسے ظالم رہے کہ اس کے پیٹھ موڑتے ہی بچھڑے کو معبود بنا بیٹھے۔ پھر ذرا اس میثاق کو یاد کرو جو کوہ طور کو تمہارے اوپر اٹھا کر ہم نے تم سے لیا تھا۔ ہم نے تاکید کی تھی کہ جو ہدایات ہم دے رہے ہیں ان کی سختی کے ساتھ پابندی کرو اور کان لگا کر سنو تمہارے اسلاف نے کہا کہ ہم نے سن لیا مگر مانیں گے نہیں اور ان کی باطل پرستی کا یہ حال تھا کہ دلوں میں ان کے بچھڑا ہی بسا ہوا تھا۔ کہو اگر تم مومن ہو' تو یہ عجیب ایمان ہے' جو ایسی بری حرکات کا تمہیں حکم دیتا ہے۔" (البقرہ۔ ۹۳)

ان کا دعویٰ یہ تھا کہ اگلا جہاں تو صرف انہی کے لئے ہے۔ دوسرے لوگوں کو تو وہاں کچھ نہ ملے گا۔ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ تلقین کی کہ آپ ان کو دعوت مباہلہ دیں اور کسی میدان میں دونوں فریق جمع ہو جائیں اور اللہ سے دست بدعا ہوں کہ ان میں سے جو جھوٹا ہے اللہ اسے مار دے۔ "ان سے کہو کہ اگر واقعی اللہ کے نزدیک آخرت کا گھر تمام انسانوں کو چھوڑ کر صرف تمہارے ہی لئے مخصوص ہے' تب تو تمہیں چاہئے کہ موت کی تمنا کرو' اگر تم اپنے اس خیال میں سچے ہو۔" اس کے بعد اللہ تعالیٰ خود ہی بتا دیتے ہیں کہ یہ لوگ "ہرگز موت کی تمنا نہ کریں گے۔" چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ وہ مباہلہ کرنے سے پھر گئے کیونکہ جس چیز کا وہ دعویٰ کر رہے تھے انہیں معلوم تھا کہ وہ اس میں جھوٹے ہیں۔

غرض دوران کلام یہودیوں پر کڑی تنقید کی جاتی ہے۔ ان کی مکاریوں پر سے پردہ اٹھایا جاتا ہے اور مسلمانوں کو ان کے بارے میں محتاط رہنے کی ہدایات دی جاتی ہیں۔ اس اقدام کا مقصد یہ ہے کہ جماعت مسلمہ کی صفوں میں خفیہ سازشوں کے ذریعے' انتشار پیدا کرنے کی جو کوششیں اس وقت یہودی کر رہے تھے' ان کا زور توڑا جائے اور مسلمانوں کو چوکنا کر دیا جائے۔ آج بھی امت مسلمہ کو یہودیوں کی اسی مکاری اور فریب کاری کا سامنا ہے۔ جس کا سامنا کبھی مدینہ طیبہ میں امت مسلمہ کے اسلاف کو تھا لیکن نہایت افسوس کے ساتھ یہ بات کہنی پڑتی ہے کہ امت مسلمہ ان قرآنی آیات سے اس طرح فائدہ نہیں اٹھا رہی' جس طرح اس امت کے اسلاف نے اس ربانی ہدایت سے فائدہ اٹھایا تھا اور جس کے نتیجے میں وہ مدینہ طیبہ میں یہودیوں کی مکاری اور عیاری پر غالب آئے تھے۔ حالانکہ اس وقت دین اسلام نیا تھا اور جماعت مسلمہ ابھی ابھی تشکیل پائی تھی۔ اس وقت سے لے کر آج تک یہ یہودی اس بات کی سخت کوشش کر رہے ہیں کہ امت مسلمہ کو قرآن کریم سے دور ہٹا دیں' مسلمان اپنے دین کو چھوڑ دیں' کیونکہ یہودیوں کو شدید خطرہ ہے کہ کہیں مسلمان ان کے خلاف وہی قرآنی ہتھیار کام میں لانا نہ شروع کر دیں اور ان کی مکاری اور سازشوں سے بچنے کے لئے وہ تدابیر نہ کریں جو ان کے بچاؤ کی حقیقی تدابیر ہیں اور کارگر بھی ہیں۔ کیونکہ یہودی اس بات کو اچھی طرح جانتے ہیں کہ جب تک امت مسلمہ اپنی شوکت اور برتری کے ان حقیقی سرچشموں سے محروم ہے یہودی امن وچین سے رہ سکتے ہیں۔ لہٰذا یہ ایک حقیقت ہے کہ اس امت کو جو شخص بھی قرآن کریم اور دین اسلام سے دور کرتا ہے وہ یہودیوں کا ایجنٹ ہے۔ چاہے وہ یہ کام شعوری طور پر کر رہا ہو یا غیر شعوری طور پر' بالارادہ کر رہا ہو بلا ارادہ۔ کیونکہ جب تک یہ امت ایک حقیقت یعنی حقیقتاً ایمانی' ایمانی نظام زندگی اور ایمانی شریعت اور اسلامی قانون سے دور اور غافل ہے۔ اس وقت تک یہودیت کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ امت مسلمہ کا وجود' اس کی قوت اور اس کی برتری کا حقیقی اور منفرد سرچشمہ صرف ایک ہے یعنی ایمان اور اسلام۔ یہی ایک راہ ہے اور رہنمائی کرنے والے یہی نشانات ہیں جن پر چل کر ایک مسلمان منزل مقصود تک پہنچ سکتا ہے۔

☆ ☆ ☆

درس ۵ تشریح آیات (۷۵ تا ۱۰۳)

أَفَتَطْمَعُونَ أَنْ يُؤْمِنُوا لَكُمْ وَقَدْ كَانَ فَرِيقٌ مِنْهُمْ يَسْمَعُونَ كَلَامَ اللَّهِ ثُمَّ يُحَرِّفُونَهُ مِنْ بَعْدِ مَا عَقَلُوهُ وَهُمْ يَعْلَمُونَ ﴿٧٥﴾ وَإِذَا لَقُوا الَّذِينَ آمَنُوا قَالُوا آمَنَّا وَإِذَا خَلَا بَعْضُهُمْ إِلَىٰ بَعْضٍ قَالُوا أَتُحَدِّثُونَهُمْ بِمَا فَتَحَ اللَّهُ عَلَيْكُمْ لِيُحَاجُّوكُمْ بِهِ عِنْدَ رَبِّكُمْ ۚ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ﴿٧٦﴾ أَوَلَا يَعْلَمُونَ أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّونَ وَمَا يُعْلِنُونَ ﴿٧٧﴾

"اے مسلمانو! اب کیا ان لوگوں سے تم یہ توقع رکھتے ہو کہ یہ تمہاری دعوت پر ایمان لے آئیں گے؟ حالانکہ ان میں سے ایک گروہ کا شیوہ یہ رہا ہے کہ اللہ کا کلام سنا اور خوب سمجھ بوجھ کر دانستہ اس میں تحریف کی۔ محمد رسول اللہ کے ماننے والوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم بھی انہیں مانتے ہیں اور جب آپس میں ایک دوسرے سے تخلیے کی بات چیت ہوتی ہے تو کہتے ہیں کہ کیا بے وقوف ہو گئے ہو؟ ان لوگوں کو وہ باتیں بتاتے ہو جو اللہ نے تم پر کھولی ہیں تاکہ تمہارے رب کے پاس تمہارے مقابلے میں انہیں حجت میں پیش کریں؟ اور کیا یہ جانتے نہیں ہیں کہ جو کچھ وہ چھپاتے ہیں اور جو کچھ ظاہر کرتے ہیں اللہ کو سب باتوں کی خبر ہے۔"

گزشتہ درس کے آخر میں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے قلوب کی حالت کا جو نقشہ کھینچا تھا۔ اس سے ہمیں معلوم ہوا تھا کہ وہ نہایت سنگدل' خشک اور ناقابل تغیر دل و دماغ کے مالک ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں کو ایسے پتھروں سے تشبیہ دی تھی جو نہایت ہی ٹھوس تھے اور جن میں سے پانی کا کوئی قطرہ بر آمد نہ ہوتا تھا۔ اس قدر کھردرے تھے کہ انسان ان پر سہولت سے ہاتھ نہیں پھیر سکتا تھا۔ ان کے اندر کسی چیز کا اگنا یا ان کے اندر زندگی کے آثار پیدا ہونا تو یہ سرے سے ممکن ہی نہ تھا۔

یہ ایک ایسی تصویر ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے اس جامد دماغ' ایسی پست فطرت اور ایسی بے لچک متعصبانہ ذہنیت کی وجہ سے اس قابل ہی نہیں رہے کہ راہ ہدایت پر آ جائیں۔ چنانچہ اس تصویر کشی اور ان کی طرف سے مایوس ہو جانے کے اس اشارے کے بعد کلام کا رخ بعض ان مسلمانوں کی طرف پھر جاتا ہے جو اب بھی یہ خیال کرتے تھے کہ شاید بنی اسرائیل راہ ہدایت پر آ جائیں۔ ایسے لوگ کوشش کرتے تھے کہ بنی اسرائیل کے دلوں میں ایمان انڈیل دیں' کسی طرح انہیں ایمان کی روشنی کی طرف لے آئیں۔ قرآن کریم اس طرز پر سوچنے والے مومنین کو سوالیہ انداز میں مایوس کر دیتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ اس سلسلے میں ان کے دلوں میں امید کی جو آخری کرن ہے اسے بھی دل سے نکال دیں۔

أَفَتَطْمَعُونَ أَنْ يُؤْمِنُوا لَكُمْ وَقَدْ كَانَ فَرِيقٌ مِنْهُمْ يَسْمَعُونَ كَلَامَ اللَّهِ ثُمَّ يُحَرِّفُونَهُ مِنْ بَعْدِ مَا عَقَلُوهُ وَهُمْ يَعْلَمُونَ اے مسلمانو! اب کیا ان لوگوں سے تم یہ توقع رکھتے ہو کہ تمہاری دعوت پر ایمان لے آئیں گے؟ حالانکہ

ان میں سے ایک گروہ کا شیوہ یہ رہا ہے کہ اللہ کا کلام سنا اور پھر خوب سمجھ بوجھ کر دانستہ اس میں تحریف کی۔"

خبردار! ایسے لوگوں کے ایمان لانے کی کوئی امید نہیں ہے۔ ایمان لانے والوں کا مزاج ہی دوسرا ہوتا ہے ان میں کچھ دوسری ہی صلاحیتیں ہوتی ہیں۔ ایمان لانے والی طبیعت نرم' سادہ اور سہل ہوتی ہے۔ اس کے دل و دماغ کے دریچے ہر قسم کی روشنی کے لئے کھلے ہوتے ہیں۔ وہ اللہ تعالیٰ کے ازلی و ابدی سرچشمہ ہدایت سے جڑنے اور سیراب ہونے کے لئے ہر وقت تیار ہوتی ہے۔ اس کے اندر احساس' احتیاط اور خدا خوفی ہوتی ہے اور یہ خدا خوفی اس بات سے روکتی ہے کہ خدا کے کلام کو سن کر' اسے سمجھ کر پھر اس میں تحریف کرے۔ محض ذاتی خواہش کے لئے اور محض تعصب کی خاطر کلام الٰہی میں تحریف کرے کیوں کہ ایمان لانے والی طبیعت' بالکل سیدھی سادی ہوتی ہے اور وہ اس قسم کی کجروی اور بات کو توڑ موڑ کر پیش کرنے سے محترز رہتی ہے۔

پھر یہاں جس طبقے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ (یہود) سب سے زیادہ تعلیم یافتہ طبقہ ہے۔ اور اس سچائی کو سب سے زیادہ جاننے والا ہے جو اللہ تعالیٰ نے ان پر ان کی کتاب میں اتاری۔ جیسے علمائے یہود کا طبقہ' جو ان کے نبی پر اتری ہوئی کتاب تورات کو سنتے تھے' سمجھتے تھے لیکن اس کے باوجود اسے بدل ڈالتے تھے اور اس میں ایسی تاویلات کرتے تھے کہ بات کچھ کی کچھ بن جاتی تھی اور یہ بات وہ اس لئے نہ کرتے تھے کہ انہیں اس کلام کا صحیح محمل معلوم نہ تھا بلکہ وہ یہ حرکت سوچ سمجھ کر بالارادہ کیا کرتے تھے اور یہ جانتے ہوئے کرتے تھے کہ وہ تحریف کر رہے ہیں۔ خواہشات نفس اور مصلحت کے ہاتھ میں ان کے فکر و عمل کی لگام تھی اور ذلیل اغراض کے نغموں کے پیچھے مست ہو کر دوڑ رہے تھے۔ جب وہ حضرت موسیٰ کی کتاب کے ساتھ بدسلوکی کرتے تھے' جس پر ان کا ایمان بھی تھا تو قرآن کریم جو حضرت محمد ﷺ پر نازل ہوا' اس کے ساتھ تو انہیں اس سے بھی بدتر سلوک کرنا ہی تھا کیونکہ وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر سرے سے ایمان ہی نہ لائے تھے۔ لہٰذا اپنی اس خراب ذہنیت اور باطل رویے پر وہ جان بوجھ کر اصرار کرتے تھے۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ ان کی ذہنیت خراب ہے اور یہ کہ وہ سوچ سمجھ کر باطل پر اصرار کر رہے ہیں یا پھر ان کی جانب سے دعوت اسلامی کی یہ مخالفت اور تحریک اسلامی کے خلاف سازشیں اور بہتان تراشیاں کوئی خلاف توقع امر نہیں رہتا۔

وَ اِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚ وَ اِذَا خَلَا بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ قَالُوْٓا اَتُحَدِّثُوْنَهُمْ بِمَا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ لِيُحَآجُّوْكُمْ بِهٖ عِنْدَ رَبِّكُمْ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ

"جب محمد رسول اللہ کے ماننے والوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم بھی انہیں مانتے ہیں اور جب آپس میں تخلیے کی بات چیت ہوتی ہے تو کہتے ہیں۔ بے وقوف ہو! ان لوگوں کو وہ باتیں بتاتے ہو جو اللہ نے تم پر کھولی ہیں تاکہ تمہارے رب کے پاس تمہارے مقابلے میں انہیں حجت میں پیش کریں۔"

کیا تم ان سے یہ توقع رکھتے ہو کہ وہ تمہاری بات مان جائیں گے؟ حالانکہ وہ نہایت غیر ذمہ دار' حق کو چھپانے والے اور کلام اللہ میں تحریف کرنے والے لوگ ہیں۔ ریاء' فریب کاری' منافقت اور چالبازی جیسے مفاسد ان کی جبلت میں داخل ہو گئے ہیں۔ پھر ان میں بعض ایسے بھی تھے کہ جب مسلمانوں سے ملتے تو کہتے ہم بھی ایمان لا چکے ہیں۔ یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ایمان لا چکے ہیں کیونکہ ان کے ہاں تورات میں نبی آخر الزماں کے بارے میں واضح بشارتیں موجود تھیں اور وہ نبی آخر الزماں کی بعثت کا بڑی شدت سے انتظار کر رہے تھے۔ اور اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کیا کرتے تھے کہ وہ نبی آخر الزماں کے ذریعے انہیں کفار پر فتح عطا کرے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ **كَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا** "وہ اس سے قبل کفار پر دعائے فتح مندی مانگا کرتے تھے۔" لیکن جب وہ ایک دوسرے کے

ساتھ تنہائی میں ملتے' تو ایک دوسرے کو اس بات پر سخت تنبیہہ کرتے کہ کیوں وہ مسلمانوں کو وہ باتیں بتا رہے ہیں جو آپ کی رسالت کی صداقت کے بارے میں تورات میں مذکور ہیں' کہتے ہیں۔ بے وقوف ہو گئے ہو! ان لوگوں کو وہ باتیں بتاتے ہو جو اللہ نے تم پر کھولی ہیں تاکہ تمہارے رب کے پاس تمہارے مقابلے میں انہیں حجت میں پیش کریں۔" اس طرح تم پر حجت قائم کر دیں گے۔ یہاں ان کا مخصوص مزاج جو معرفت الٰہی سے بالکل کورا ہے ان پر غالب آجاتا ہے' وہ اللہ تعالیٰ کے علم کی حقیقت اور اس کی صفات کے حقیقی تصور تک سے عاری نظر آتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اگر وہ یہ باتیں مسلمانوں کو نہ بتائیں تو اللہ تعالیٰ ان سے کچھ مواخذہ نہ کرے گا۔ مواخذہ صرف اس صورت میں ہو گا جب یہ باتیں مسلمانوں کو بتادی جائیں۔

اس سے بھی زیادہ ان کی مضحکہ خیز بات یہ ہے کہ وہ ایک دوسرے کو کہتے ہیں۔ "کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے؟" معلوم نہیں وہ کیسی عقل و دانش ہے جس کے کام میں نہ لانے پر وہ ایک دوسرے کی سرزنش کر رہے ہیں۔

چنانچہ قرآن کریم آگے بڑھنے سے پہلے ان کی اس طرز فکر اور طرز عمل پر تعجب کا اظہار کئے بغیر نہیں رہتا۔

أَوَلَا يَعْلَمُونَ أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّونَ وَمَا يُعْلِنُونَ ۝ "اور کیا یہ جانتے نہیں ہیں کہ جو کچھ وہ چھپاتے ہیں اور جو کچھ ظاہر کرتے ہیں۔ اللہ کو سب باتوں کی خبر ہے۔"

اب قرآن کریم ایک دوسرے پہلو سے مسلمانوں کے سامنے بنی اسرائیل کے حالات پیش کرتا ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ ان میں دو قسم کے لوگ پائے جاتے ہیں۔ ایک طبقہ تو ان جاہلوں اور ان پڑھ لوگوں کا ہے جو ان پر نازل ہونے والی کتاب الٰہی کا کوئی علم نہیں رکھتا۔ اس کے دماغ میں صرف اوہام و خرافات اور ظن و تخمین اور خوش آئند آرزوئیں ہی بسی ہوئی ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ وہ اللہ کی پسندیدہ اور برگزیدہ قوم ہیں اور جو برے عمل بھی وہ کریں اللہ تعالیٰ نے ان کے تمام گناہ معاف کر دیئے ہیں' اس لئے یہ اپنے ذہن میں بسہولت نجات پاجانے کی امید لئے بیٹھے ہیں۔

دوسرا فریق وہ ہے جو اس جہالت سے خوب ناجائز فائدہ اٹھا رہا ہے' وہ بے دھڑک اپنی جانب سے آیات و نصوص گھڑتا ہے۔ اپنی مفید مطلب تاویلات کر کے کتاب اللہ کے مفہوم کو کچھ سے کچھ بنا دیتا ہے۔ جس چیز کو چاہتا ہے' چھپالیتا ہے۔ اور جس کو چاہتا ہے لوگوں کے سامنے کھول کر رکھ دیتا ہے۔ خود اپنے ہاتھ سے لکھی ہوئی باتوں کے بارے میں یہ مشہور کرتا ہے کہ وہ اللہ کا کلام ہے اور یہ سب کام وہ دنیا کے ختم ہو جانے والے منافع اور ذاتی مفادات کے لئے کرتا ہے یا اس لئے کرتا ہے کہ اس کی پیشوائی اور برتری برقرار رہے۔

النصف

وَمِنْهُمْ أُمِّيُّونَ لَا يَعْلَمُونَ الْكِتَابَ إِلَّا أَمَانِيَّ وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَظُنُّونَ ۝ فَوَيْلٌ لِّلَّذِينَ يَكْتُبُونَ الْكِتَابَ بِأَيْدِيهِمْ ثُمَّ يَقُولُونَ هَٰذَا مِنْ عِندِ اللَّهِ لِيَشْتَرُوا بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا ۖ فَوَيْلٌ لَّهُم مِّمَّا كَتَبَتْ أَيْدِيهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُم مِّمَّا يَكْسِبُونَ ۝

"ان میں سے ایک دوسرا گروہ امیوں کا ہے' جو کتاب کا تو علم رکھتے نہیں بس اپنی بے بنیاد امیدوں اور آرزوؤں کو لئے بیٹھے ہیں اور محض وہم و گمان پر چلے جا رہے ہیں۔ پس ہلاکت اور تباہی ہے ان لوگوں کے لئے جو اپنے ہاتھوں سے شرع کا نوشتہ لکھتے ہیں۔ پھر لوگوں سے کہتے ہیں کہ یہ اللہ کے پاس سے آیا ہوا ہے تاکہ اس کے معاوضے میں تھوڑا سا فائدہ حاصل کر لیں۔ ان کے ہاتھوں کا یہ لکھا ہوا' ان

کے لئے تباہی کا سامان ہے اور ان کی یہ کمائی بھی ان کے لئے موجب ہلاکت ہے۔

اب ان دونوں گروہوں میں سے ہم کس سے توقع رکھ سکتے ہیں کہ وہ مشرف بایمان ہو گا۔ حق کی آواز پر لبیک کہے گا اور ہدایت پر قائم ہو جائے گا۔ اور اپنے آپ کو ان پر نازل شدہ کتاب کی ان نصوص کی تحریف سے بچالے گا جو ان کی راہ میں رکاوٹ بنی ہوئی تھیں۔ غرض ایسے لوگوں سے کوئی امید نہیں ہے کہ وہ ایمان لے آئیں گے۔ مسلمانوں کی بات مان کر دیں گے۔ ان کی قسمت میں تو تباہی اور بربادی لکھی ہوئی ہے اور یہ تباہی اور بربادی جو ان کی نوشتہ تقدیر ہے اس لئے ان کے لئے مقرر کی ہوئی ہے کہ انہوں نے اپنے ہاتھ سے آیات لکھیں اور پھر انہیں اللہ کی طرف منسوب کر ڈالا۔ یہ تباہی اور بربادی خود ان کے ہاتھوں کی کمائی ہے۔ کیونکہ انہی ہاتھوں سے انہوں نے ان آیات کو تراشا اور اللہ کی طرف منسوب کیا۔

ان کی خواہشات اور باطل آرزوؤں میں سے ایک یہ بھی تھی کہ وہ جس قدر بدکاری اور احکام کی جتنی خلاف ورزی بھی کریں بہرحال وہ نجات پانے والوں میں سے ہوں گے۔ وہ جہنم کی آگ میں چند دن رہیں گے اور اس کے بعد جنت کی طرف جانکلیں گے۔ ظاہر ہے ان کی یہ تمنا اللہ کے نظام عدالت' اس کی سنت دائمہ اور جزا و سزا کے صحیح تصور کے سرا سر خلاف ہے لیکن سوال یہ ہے کہ ان کی اس آرزو کی بنیاد کیا ہے۔ وہ کس وثیقہ کی بنیاد پر اس وقت کا یقین کرتے ہیں۔ گویا اللہ تعالیٰ اور ان کے درمیان کوئی باقاعدہ معاہدہ ہو گیا ہے۔ اور اس کے اندر ان کی تعذیب کی معیاد متعین ہو چکی ہے۔ یہ خیال جاہل لوگوں کی بے بنیاد آرزو اور خوش فہمی کے سوا کچھ نہیں ہے اور دوسری جانب سے یہ تصور ان کے فریب کار علماء کے کذب و افتراء کا پلندہ ہے۔ یہ ایسی آرزوئیں ہیں جن کا سہارا وہ تمام لوگ لیا کرتے ہیں جو صحیح عقیدہ اور نظریۂ حیات کو چھوڑ چکے ہوتے ہیں' اس پر ایک عرصہ گزر چکا ہوتا ہے اور اپنے حقیقی دین کے ساتھ ان کا کوئی تعلق نہیں رہا ہوتا۔ وہ اپنے دین کے صرف نام اور چند ظاہری رسومات کے سوا اور کچھ نہیں جانتے۔ اور دین کی حقیقت اور اس کے اصل موضوع سے بے خبر ہو جاتے ہیں لیکن چونکہ وہ اپنے آپ کو اس دنیا کی طرف منسوب کرتے ہیں' اس لئے سمجھتے ہیں کہ بس یہ زبانی نسبت ہی ان کی نجات کے لئے کافی ہو گی۔

وَقَالُوا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ إِلَّا أَيَّامًا مَّعْدُودَةً ۚ قُلْ أَتَّخَذْتُمْ عِندَ اللَّهِ عَهْدًا فَلَن يُخْلِفَ اللَّهُ عَهْدَهُ ۖ أَمْ تَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ۝

"وہ کہتے ہیں کہ دوزخ کی آگ ہمیں ہرگز چھونے والی نہیں ہے۔ الا یہ کہ چند روز کی سزا مل جائے تو مل جائے۔ ان سے پوچھو کہ کیا تم نے اللہ سے کوئی عہد لے لیا ہے' جس کی خلاف ورزی وہ نہیں کر سکتا۔ یا بات یہ ہے کہ تم اللہ کے ذمے ڈال کر ایسی باتیں کہہ دیتے ہو جن کے متعلق تمہیں علم نہیں ہے کہ اس نے ان کا ذمہ لیا ہے۔"

یہاں اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو ایک ایسی دلیل اور حجت کی تلقین کرتے ہیں جو باطل کا سر کچل دیتی ہیں۔ "کیا تم نے اللہ سے کوئی عہد لے لیا ہے' جس کی خلاف ورزی وہ نہیں کر سکتا؟" اگر کوئی ایسا عہد تم نے لے رکھا ہے تو بتاؤ وہ کہاں ہے؟ "یا بات یہ ہے کہ تم اللہ کے ذمے ڈال کر ایسی باتیں کہہ دیتے ہو جن کے متعلق تمہیں علم نہیں ہوتا۔" یہ سوالیہ انداز بات کو اور مضبوط بنانے کے لئے اختیار کیا گیا ہے۔ کیونکہ یہ ایک حقیقت ہے کہ ان کے پاس اللہ کا کوئی عہد نہیں ہے۔ سوالیہ انداز میں ناپسندیدگی اور زجر و توبیخ کے معانی بھی مضمر ہوتے ہیں۔

یہاں اب اس سلسلے میں 'انہیں ایک فیصلہ کن اور قطعی بات بتاری جاتی ہے کہ ان کے اس دعوے کی حقیقت کیا ہے؟ یہ بات جزاء و سزا کے متعلق اسلام کے عالمگیر تصور ہی سے ماخوذ ہے اور بطور قاعدہ کلیہ بتادیا جاتا ہے کہ جزا عمل کے مطابق ہوگی۔ جیسا کرو گے ویسا بھرو گے۔

بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓــئَتُهٗ فَاُولٰٓـئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۸۱﴾ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓـئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۸۲﴾

۹ ع ۱۱ ۹

"آخر تمہیں دوزخ کی آگ کیوں نہ چھوئے گی۔ جو بھی بدی کمائے گا اور اپنی خطاکاری کے چکر میں پڑا رہے گا وہ دوزخی ہے اور دوزخ ہی میں وہ ہمیشہ رہے گا اور جو لوگ ایمان لائیں گے اور نیک عمل کریں گے وہی جنتی ہیں اور جنت میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔"

یہاں یہ بات دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ اس مخصوص اصول جزاء و سزا اور اس ذہنی مفہوم کو قرآن نے جس معجزانہ اور فنکارانہ انداز میں بیان کیا ہے اور جس طرح اس کی تصویر کھینچ کر رکھ دی ہے' ہم قدرے توقف کرکے اس پر غور کریں اور اللہ کے اس اٹل حکم اور ابدی اصول کے اسباب و اسرار معلوم کرنے کی کوشش کریں۔

"ہاں جو بھی بدی کمائے اور خطاکاری کے چکر میں پڑا رہے گا گویا بدی ایک قسم کی کمائی ہے۔ یہاں معنی مطلوب صرف غلطی کا ارتکاب ہے لیکن' جن الفاظ سے اس کی تعبیر کی گئی ہے وہ معروف نفسیاتی حالت کی عکاسی کرتے ہیں۔ جو لوگ معصیت میں مبتلا ہوتے ہیں' وہ اس کے عادی ہو جاتے ہیں اور اس کے ارتکاب میں انہیں مزا آتا ہے۔ اور وہ اس سے لذت اندوز ہوتے ہیں۔ اور اسے اپنی کمائی سمجھنے لگتے ہیں۔ کیونکہ اگر وہ اسے مکروہ اور ناپسندیدہ سمجھتے تو اس کا ارتکاب نہ کرتے۔ نیز اگر وہ سمجھتے کہ یہ ایک قسم کا خسارہ ہے تو وہ اس جوش و خروش سے اس کا ارتکاب نہ کرتے' نیز وہ اس برائی کو اپنے اوپر اس طرح غالب نہ کرتے کہ ان کی پوری دنیا اس کی لپیٹ میں آ جائے اور وہ پوری طرح اس کے چکر میں پھنس جائیں کیونکہ یہ لوگ اگر اسے ناپسند کرتے اور اس کے اندر جو خسارہ تھا' اسے محسوس کرتے تو اس کے سائے سے بھی دور بھاگتے۔ اگرچہ طبعاً وہ اس کے ارتکاب کی طرف مائل ہوتے۔ نیز وہ اللہ سے معافی مانگتے اور اس گناہ کے دائرہ اثر سے نکل کر کسی اور کے دامن میں پناہ لیتے۔ اس صورت میں یہ برائی انہیں گھیر نہ سکتی اور نہ ہی ان پر چھا سکتی تھی اور ان کے لئے توبہ اور تلافی مافات کے دروازے بند نہ ہو جاتے وَّاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓــئَتُهٗ "اور اس کی خطاکاری نے اسے گھیر لیا۔" یہ ایک ایسی تعبیر ہے جو اس کیفیت اور معنی کو مجسم شکل میں پیش کرتی ہے۔ قرآن کریم کی فنی خوبیوں اور خصوصیات میں سے یہ ایک اہم خصوصیت ہے نیز قرآن کریم کی مخصوص طرز تعبیر کی اہم نشانی ہے۔ اس طرز تعبیر کا انسان کے ذہن پر ایک خاص اثر پڑتا ہے' جو خالص مفہومات و معانی کا نہیں پڑتا۔ وہ معنوی تعبیریں جو متحرک شکل میں نہ ہوں ایسا اثر پیدا نہیں کر سکتیں۔ معصیت پر اصرار کی معنوی کیفیت کی اس سے اور مستحسن تعبیر کیا ممکن ہے کہ معصیت کا مرتکب خود معصیت کے دائرے میں قید ہو' اس کی حدود کے اندر ہی زندگی بسر کر رہا ہو' وہ اس معصیت ہی کا ہو کر رہ گیا ہو' اس کے بغیر اس کے لئے زندگی کا ایک سانس لینا بھی ممکن نہ رہا ہو۔

اور جب ایک انسان کسی معصیت کے چکر میں اس طرح پڑ جاتا ہے وہ ہر طرف سے محصور ہو جاتا ہے اور اس کے لئے توبہ کے تمام

دروازے بند ہو جاتے ہیں تو اس وقت بھی اللہ تعالیٰ کا یہ عادلانہ اور اٹل فیصلہ صادر ہوتا ہے۔ فَاُولٰٓئِکَ اَصۡحٰبُ النَّارِ ۚ هُمۡ فِيۡهَا خٰلِدُوۡنَ ۝ "ایسے لوگ دوزخی ہیں اور وہ ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے۔"

اس فیصلے اور نتیجے کے بعد دوسرا اور مقابل صورت کا حکم بھی یہاں بیان کیا جاتا ہے۔

وَالَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِکَ اَصۡحٰبُ الۡجَـنَّةِ ۚ هُمۡ فِيۡهَا خٰلِدُوۡنَ "اور جو لوگ ایمان لائیں گے اور نیک عمل کریں گے وہی جنتی ہیں اور جنت میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ اور نیک عمل کریں گے۔"

یعنی ایمان کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ وہ دل سے عمل صالح کی شکل میں پھوٹ کر باہر نکل آئے۔ جو لوگ ایمان کے دعویدار ہیں' انہیں چاہئے کہ اس حقیقت پر ذرا غور کرلیں نیز وہ تمام مسلمان جو اپنے آپ کو مسلمان کہلاتے ہیں' اور ہم بھی ان میں شامل ہیں' اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ ہم اس حقیقت کے بارے میں اچھی طرح تسلی کرلیں۔ ایمان کا وجود اس وقت تک متصور نہ ہو گا جب تک کہ اس کے نتیجہ میں عمل صالح پیدا نہ ہو' رہے وہ لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ وہ مسلمان ہیں' پھر وہ زمین میں فساد پھیلاتے ہیں اور نیکی اور بھلائی کا مقابلہ کرتے ہیں۔ زمین پر اسلامی نظام حیات کے قیام اور اسلامی شریعت کے نفاذ کو روکتے ہیں اور اس کا انکار کرتے ہیں۔ اسلامی اخلاق کے خلاف برسرپیکار رہتے ہیں۔ تو ایسے لوگوں کے لئے دولت ایمان کا ایک ذرہ بھی نہیں ہے' ان کے لئے اللہ کے ہاں کوئی اجر نہیں ہے۔ انہیں اللہ کے عذاب سے بچانے والا کوئی نہیں ہے۔ اگرچہ وہ ایسی خوش آئند امیدیں اور آرزوئیں اپنے دلوں کے اندر رکھتے ہیں جیسی یہود رکھتے تھے' اور جن کا اوپر اللہ تعالیٰ نے ذکر فرمایا۔ پس سب کے لئے یہی حکم ہے۔

☆........O........☆

اس کے بعد بنی اسرائیل کے کچھ اور حالات مسلمانوں کے سامنے رکھے جاتے ہیں' مختلف اوقات میں ان کے طرز عمل' معصیت' کجروی' گمراہی اور عہد و پیمان کی خلاف ورزی کے مختلف واقعات بیان کئے جاتے ہیں اور یہودیوں کے یہ سیاہ کارنامے مسلمانوں کے سامنے' ان پر کھولے جاتے ہیں۔

وَاِذۡ اَخَذۡنَا مِيۡثَاقَ بَنِىۡٓ اِسۡرَآءِيۡلَ لَا تَعۡبُدُوۡنَ اِلَّا اللّٰهَ وَبِالۡوَالِدَيۡنِ اِحۡسَانًا وَّذِى الۡقُرۡبٰى وَالۡيَتٰمٰى وَالۡمَسٰكِيۡنِ وَقُوۡلُوۡا لِلنَّاسِ حُسۡنًا وَّاَقِيۡمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّکٰوةَ ؕ ثُمَّ تَوَلَّيۡتُمۡ اِلَّا قَلِيۡلًا مِّنۡكُمۡ وَاَنۡتُمۡ مُّعۡرِضُوۡنَ ۝۸۳ وَاِذۡ اَخَذۡنَا مِيۡثَاقَكُمۡ لَا تَسۡفِكُوۡنَ دِمَآءَكُمۡ وَلَا تُخۡرِجُوۡنَ اَنۡفُسَكُمۡ مِّنۡ دِيَارِكُمۡ ثُمَّ اَقۡرَرۡتُمۡ وَاَنۡتُمۡ تَشۡهَدُوۡنَ ۝۸۴ ثُمَّ اَنۡتُمۡ هٰٓؤُلَآءِ تَقۡتُلُوۡنَ اَنۡفُسَكُمۡ وَتُخۡرِجُوۡنَ فَرِيۡقًا مِّنۡكُمۡ مِّنۡ دِيَارِهِمۡ تَظٰهَرُوۡنَ عَلَيۡهِمۡ بِالۡاِثۡمِ وَالۡعُدۡوَانِ ؕ وَاِنۡ يَّاۡتُوۡكُمۡ اُسٰرٰى تُفٰدُوۡهُمۡ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيۡكُمۡ اِخۡرَاجُهُمۡ ؕ اَفَتُؤۡمِنُوۡنَ بِبَعۡضِ الۡكِتٰبِ وَتَكۡفُرُوۡنَ بِبَعۡضٍ ۚ فَمَا جَزَآءُ

مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ ۭ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۸۵﴾ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ ۡ فَلَا يُخَفَّفُ عَنْھُمُ الْعَذَابُ وَلَا ھُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۸۶﴾

۱۰ ع ۱۰

"یاد کرو اسرائیل کی اولاد سے ہم نے پختہ عہد لیا تھا کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرنا' رشتہ داروں کے ساتھ یتیموں کے ساتھ نیک سلوک کرنا' لوگوں سے بھلی بات کہنا' نماز قائم کرنا اور زکوۃ دینا' مگر تھوڑے آدمیوں کے سوا تم سب اس عہد سے پھر گئے اور اب تک پھرے ہوئے ہو۔ پھر ذرا یاد کرو' ہم نے تم سے مضبوط عہد لیا تھا کہ آپس میں ایک دوسرے کا خون نہ بہانا اور نہ ایک دوسرے کو گھر سے بے گھر کرنا' تم نے اس کا اقرار کیا تھا۔ تم خود اس پر گواہ ہو' مگر آج وہی تم ہو کہ اپنے بھائی بندوں کو قتل کرتے ہو' اپنی برادری کے کچھ لوگوں کو بے خانماں کر دیتے ہو' ظلم و زیادتی کے ساتھ ان کے خلاف جتھابندیاں کرتے ہو' اور جب وہ لڑائی میں پکڑے ہوئے تمہارے پاس آتے ہیں تو ان کی رہائی کے لئے فدیہ کا لین دین کرتے ہو' حالانکہ ان کو ان کے گھروں سے نکالنا ہی تم پر حرام تھا۔ تو کیا تم کتاب کے ایک حصہ پر ایمان لاتے ہو اور دوسرے حصہ کے ساتھ کفر کرتے ہو؟ پھر تم میں سے جو لوگ ایسا کریں ان کی سزا اس کے سوا کیا ہے کہ دنیا کی زندگی میں ذلیل و خوار ہو کر رہیں اور آخرت میں شدید ترین عذاب کی طرف پھیر دیئے جائیں؟ اللہ ان حرکات سے بے خبر نہیں ہے جو تم کر رہے ہو۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے آخرت کو بیچ کر دنیا کی زندگی خرید لی ہے' لہٰذا نہ ان کی سزا میں تخفیف ہوگی اور نہ انہیں کوئی مدد پہنچ سکے گی۔"

گزشتہ سبق میں جہاں بنی اسرائیل کی وعدہ خلافیوں کا ذکر کیا گیا تھا' اس میثاق کی طرف اشارہ بھی کیا گیا تھا۔ یہاں اس معاہدہ کی بعض شقوں کی طرف تفصیلی اشارہ کیا جاتا ہے۔

پہلی آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے ساتھ جس معاہدہ کا ذکر کیا ہے وہ وہی معاہدہ ہے جو ان کے ساتھ کوہ طور کو ان کے سروں پر لٹکانے کے بعد طے پایا تھا۔ اور جس کے بارے میں انہیں تاکید کی گئی تھی کہ وہ اسے مضبوطی سے پکڑیں اور اس کے اندر جو ہدایات انہیں دی گئی ہیں انہیں یاد رکھیں۔ غالباً اس کے اندر دین کے اساسی امور کا بیان تھا اور یہ اساسی امور وہی ہیں جو اب اسلام نے ان کے سامنے پیش کیے ہیں اور جنہیں وہ کوئی عجیب اور نئی چیز سمجھ کر رد کر رہے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ جو عہد کیا تھا' وہ جن امور پر مشتمل تھا' ان میں ایک اہم امر یہ تھا کہ وہ صرف اللہ کی بندگی کریں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں' یعنی وہ مکمل توحید کا عقیدہ اختیار کریں۔ اس عہد میں یہ حکم بھی تھا کہ والدین' رشتہ داروں' یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کریں۔ اس میں یہ بھی تھا کہ وہ لوگوں کو اچھی باتوں کی تلقین کریں اور ظاہر ہے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اچھی باتوں میں سرفہرست ہے۔ نیز اس عہد میں نماز فرض کی گئی تھی اور زکوۃ کی ادائیگی کا حکم دیا گیا تھا۔ غرض یہ سب چیزیں ایسی تھیں جو اسلام کے اندر بھی اساسی امور سمجھے جاتے ہیں اور یہ سب باتیں اسلام میں فرض قرار دی گئی ہیں۔

اس عہد کے مطالعے سے کئی باتیں ثابت ہوتی ہیں۔

ایک یہ کہ اللہ کا دین ہمیشہ ایک ہی رہا ہے جو اسلام ہے اور یہ کہ اسلام اس دین کی آخری کڑی ہے اور اس میں سابقہ شرائط کی تمام اصولی باتوں کو تسلیم کیا گیا ہے۔ دوسری حقیقت یہ عیاں ہوتی ہے کہ یہودیوں کو دین اسلام سے بے حد بغض تھا۔ اسلام انہیں محض انہیں

باتوں کی طرف بلا رہا تھا جس کا انہوں نے اپنے اللہ سے معاہدہ کر رکھا تھا لیکن اس کے باوجود اس کا انکار کر رہے تھے۔

ان کے اس شرمناک طرز عمل کی وجہ سے انداز گفتگو غائبانہ کلام سے تبدیل ہو کر خطاب کی شکل اختیار کر لیتا ہے حالانکہ اس سے قبل بنی اسرائیل کو چھوڑ کر مؤمنین کو خطاب کیا جا رہا تھا اور ان کے سامنے ان کے برے کارنامے بیان کئے جا رہے تھے۔ ان کے یہ سیاہ کارنامے بیان کرتے کرتے اچانک ان سے مخاطب ہونا ان کے لئے سخت شرمندگی کا باعث ہے ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْكُمْ وَاَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ "مگر تھوڑے آدمیوں کے سوا تم سب اس عہد سے پھر گئے ہو اور اب تک پھرے ہوئے ہو۔"

اس سے وہ بعض راز معلوم ہو جاتے ہیں کہ اللہ کی اس عجیب کتاب میں واقعات کو بیان کرتے ہوئے' کلام میں اچانک التفات کیوں ہوتا ہے۔ اور اس میں کیا حکمت پوشیدہ ہوتی ہے؟

اب اس سے آگے بھی کلام رخ بنی اسرائیل کی طرف ہی ہے۔ قرآن کریم ان کو مخاطب کر کے بتاتا ہے کہ ان کے موقف میں کیا کیا تضادات پائے جاتے ہیں۔ اور کہاں کہاں وہ اللہ کے ساتھ کئے ہوئے عہد کی خلاف ورزی کر رہے ہیں۔

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُوْنَ دِمَآءَكُمْ وَلَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ ثُمَّ اَقْرَرْتُمْ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ۝

"پھر یاد کرو! ہم نے تم سے مضبوط عہد لیا تھا کہ آپس میں ایک دوسرے کا خون نہ بہانا اور نہ ایک دوسرے کو گھر سے بے گھر کرنا۔ تم نے اس کا اقرار کیا تھا اور تم اس پر گواہ ہو۔" پھر اس اقرار اور شہادت اور گواہی کے بعد کیا ہوا؟

ثُمَّ اَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَتُخْرِجُوْنَ فَرِيْقًا مِّنْكُمْ مِّنْ دِيَارِهِمْ ۡ تَظٰهَرُوْنَ عَلَيْهِمْ بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ؕ وَاِنْ يَّاْتُوْكُمْ اُسٰرٰى تُفٰدُوْهُمْ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ ؕ اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۚ

"مگر آج وہی تم ہو کہ اپنے بھائی بندوں کو قتل کرتے ہو۔ اپنی برادری کے کچھ لوگوں کو بے خانماں کر دیتے ہو۔ ظلم و زیادتی کرنے کے ساتھ ان کے خلاف جتھا بندیاں کرتے ہو' اور جب وہ لڑائی میں پکڑے ہوئے تمہارے پاس آتے ہیں تو ان کی رہائی کے لئے فدیہ کا لین دین کرتے ہو۔ حالانکہ ان کو ان کے گھروں سے نکالنا ہی سرے سے تم پر حرام تھا تو کیا تم کتاب کے ایک حصے پر ایمان لاتے ہو اور دوسرے حصے کے ساتھ کفر کرتے ہو۔"

یہ واقعہ جو قرآن کریم ان کے خلاف پیش کر رہا ہے' وہی تھا جو غلبہ اسلام سے کچھ زمانہ پہلے اوس و خزرج کی جنگوں میں پیش آچکا تھا۔ اوس و خزرج مشرکین یثرب کے دو قبیلے تھے اور ان کے درمیان ایسی شدید دشمنی تھی جس کی مثال پورے عرب قبائل میں نہ تھی۔ یثرب میں یہودیوں کے بھی تین قبائل تھے جن میں سے بعض ایک قبیلے اور بعض دوسرے قبیلے کے حلیف ہوتے تھے۔ جب ان دو قبائل کے درمیان جنگ ہوتی تو ان کے یہودی حلیف بھی جنگ میں شریک ہوتے۔ اس طرح بعض اوقات ایک یہودی مدمقابل کے حلیف دوسرے یہودی کو قتل کرتا اور اللہ کے ساتھ انہوں نے جو پختہ عہد باندھا تھا یہ اس کے سراسر خلاف تھا۔ جب ایک قبیلے کا حلیف غالب آتا تو خود ہی اسرائیل' بنی اسرائیل کو لوٹتے۔ انہیں گھروں سے نکال لیتے' ان کی عورتوں کو غلام بناتے حالانکہ میثاق کی نص کی رو سے یہ حرکت ان پر حرام تھی۔ لیکن جب جنگ ختم ہو جاتی تو پھر یہ غالب یہودی مقابل کے مغلوب یہودیوں کا فدیہ دیتے۔ انہیں قید اور غلامی سے رہائی

دلاتے۔ جہاں جہاں بھی وہ قید ہوتے خواہ اپنے کیمپ میں ہوتے یا مخالفین کے کیمپ میں ہوتے۔ اور یہ کام وہ تورات کے اس حکم پر عمل کرتے تھے جس میں کہا گیا تھا "تجھے بنی اسرائیل کا جو شخص غلام ملے اسے خرید و اور رہا کرو۔"

یہ تھا ان کی زندگی کا اہم تضاد اور اسے ان کے سامنے رکھ کر قرآن کریم ان سے پوچھتا ہے'

أَفَتُؤْمِنُونَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَتَكْفُرُونَ بِبَعْضٍ "تو کیا تم کتاب کے ایک حصے پر ایمان لاتے ہوئے اور دوسرے حصے کے ساتھ کفر کرتے ہو۔"

اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ یہ عہد کی صریح خلاف ورزی ہے۔ اس لئے انہیں اس بات کی تہدید کی جاتی ہے کہ اس وجہ سے وہ دنیا میں ذلیل و خوار ہوں گے اور آخرت میں اس پر انہیں دردناک عذاب دیا جائے گا۔ نیز انہیں تنبیہ کی جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نہ ان سے غافل ہے اور نہ ہی ایسی صریح غلطیوں کو معاف کرے گا۔

فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ ۗ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ "پھر تم میں سے جو لوگ ایسا کریں' ان کی سزا اس کے سوا اور کیا ہے کہ دنیا کی زندگی میں ذلیل و خوار ہو کر رہیں اور آخرت میں شدید ترین عذاب کی طرف پھیر دیئے جائیں؟ اللہ ان حرکات سے بے خبر نہیں ہے جو تم کر رہے ہو۔"

اس کے بعد مسلمانوں کو خصوصاً اور تمام انسانیت کو عموماً خطاب کیا جاتا ہے۔ اور بتایا جاتا ہے کہ ان یہودیوں کی حقیقت کیا ہے اور ان کے ان اعمال کا انجام کیا ہے؟ جو وہ کر رہے ہیں۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ ۡ فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ "یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے آخرت بیچ کر دنیا خرید لی ہے۔ لہذا نہ ان کی سزا میں کوئی تخفیف ہوگی اور نہ انہیں کوئی مدد پہنچ سکے گی۔"

لہذا ان کا یہ دعویٰ بالکل جھوٹا ہے کہ ہمیں تو صرف چند دن ہی آگ چھوئے گی کیونکہ "ان کے عذاب میں کوئی تخفیف بھی نہیں ہوگی اور نہ انہیں کوئی مدد پہنچ سکے گی۔"

سوال یہ ہے کہ انہوں نے آخرت بیچ کر دنیا کس طرح خرید لی؟ وہ یوں کہ وہ اللہ کا عہد توڑنے پر محض اس لئے آمادہ ہوئے کہ وہ اپنے دنیاوی مفادات کی خاطر مشرکین کے ساتھ کئے ہوئے عہد کو نبھائیں اور یہ عہد ایسا ہے جسے نباہنے میں لازماً انہیں اپنے دین اور اللہ کی کتاب کی خلاف ورزی کرنی پڑ رہی ہے۔

یاد رہے کہ دو دھڑوں میں بٹ کر دو حلیفوں سے معاہدے کر لینا بنی اسرائیل کا پرانا حربہ ہے۔ یہ ہمیشہ بین بین رہتے ہیں اور احتیاطاً باہم متحارب بلاکوں میں سے ہر ایک کے ساتھ ہو جاتے ہیں تاکہ جو بلاک بھی کامیاب ہو' اس کے حاصل ہونے والے مفادات میں ان کا حصہ بہرحال محفوظ ہو' جو گروہ بھی کامیاب ہو اس کی کامیابی یہودیوں کی کامیابی ہو۔ جن لوگوں کو اللہ پر اعتماد نہیں ہوتا اور جو اللہ کی رسی کو مضبوط تھامے ہوئے نہیں ہوتے ان کا طرز عمل ہمیشہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ ایسے لوگ ہمیشہ عیاری اور چالبازی سے کام لیتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ اللہ کے مقابلے میں انہیں انسانوں کی مدد حاصل رہے۔ وہ اللہ کے عہد و پیمان سے زیادہ انسان کے عہد و پیمان کو اہمیت دیتے ہیں۔

لیکن ایمان تو انسان کو ہر اس عہد و میثاق کے اندر شامل ہونے سے روکتا ہے جو احکام شریعت کے خلاف ہو اور جس سے اللہ کے ساتھ کئے ہوئے عہد کی خلاف ورزیاں لازم آتی ہے۔ کسی مصلحت کی خاطر یا بچاؤ کی کوئی تدبیر اختیار کرنے کی خاطر کوئی ایسا عہد نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ بچاؤ اس میں ہے کہ انسان اللہ کے ساتھ کئے ہوئے عہد کی پابندی کرے۔ نیز سب سے بڑی مصلحت یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ

کے احکام بجالائے اور اپنے دین کا اتباع کرے۔

یہ تھا بنی اسرائیل کا طرز عمل' ان کے مصلحین اور انبیاء علیہم السلام کے ساتھ! قرآن کریم ان کے اس طرز عمل کو بالتفصیل بیان کرتا ہے اور مسلمہ واقعات کی روشنی میں اسے ثابت کرتا ہے اور پھر اچانک ان کو آڑے ہاتھوں لیتا ہے اور نبی آخر الزمان اور اس نئی اور آخری رسالت کے بارے میں ان کے مکروہ طرز عمل پر گرفت کرتا ہے۔ قرآن کریم انہیں بتاتا ہے کہ تمہی تو ہو جنہوں نے انبیائے سابقین کے ساتھ یہ سلوک کیا۔ ذرا غور سے پڑھیئے؟

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَقَفَّيْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ ز وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ط اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ ج فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ ز وَفَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ ﴿۸۷﴾

ہم نے موسیٰ کو کتاب دی' اس کے بعد پے در پے رسول بھیجے' آخر کار عیسیٰ علیہ السلام ابن مریم کو روشن نشانیاں دے کر بھیجا اور روح پاک ۳۰ سے اس کی مدد کی۔ پھر یہ تمہارا کیا ڈھنگ ہے کہ جب بھی کوئی رسول تمہاری خواہشات نفس کے خلاف کوئی چیز لے کر تمہارے پاس آیا' تو تم نے اس کے مقابلے میں سرکشی ہی کی' کسی کو جھٹلایا اور کسی کو قتل کر ڈالا۔

وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ط بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَقَلِيْلًا مَّا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۸۸﴾ وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ لا وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ج فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴿۸۹﴾ بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ اَنْ يَّكْفُرُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بَغْيًا اَنْ يُّنَزِّلَ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ فَبَآءُوْ بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ ط وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿۹۰﴾ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا نُؤْمِنُ بِمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَيَكْفُرُوْنَ بِمَا وَرَآءَهٗ ق وَهُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ ط قُلْ فَلِمَ تَقْتُلُوْنَ اَنْۢبِيَآءَ اللّٰهِ مِنْ قَبْلُ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۹۱﴾ وَلَقَدْ جَآءَكُمْ مُّوْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۹۲﴾ وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ط خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاسْمَعُوْا ط قَالُوْا سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا ق وَاُشْرِبُوْا

فِیۡ قُلُوۡبِہِمُ الۡعِجۡلَ بِکُفۡرِہِمۡ ؕ قُلۡ بِئۡسَمَا یَاۡمُرُکُمۡ بِہٖۤ اِیۡمَانُکُمۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ ﴿۹۳﴾

"وہ کہتے ہیں؟ "ہمارے دل محفوظ ہیں" نہیں' اصل بات یہ ہے کہ ان کے کفر کی وجہ سے ان پر اللہ کی پھٹکار پڑی ہے' اسی لئے وہ کم ہی ایمان لاتے ہیں اور اب جو ایک کتاب اللہ کی طرف سے ان کے پاس آئی ہے اس کے ساتھ ان کا برتاؤ کیا ہے؟ باوجود یہ کہ وہ اس کتاب کی تصدیق کرتی ہے۔ جو ان کے پاس پہلے سے موجود تھی' باوجودیکہ اس کی آمد سے پہلے وہ خود کفار کے مقابلے میں فتح و نصرت کی دعائیں مانگا کرتے تھے' مگر جب وہ چیز آگئی' جسے وہ پہچان بھی گئے تو انہوں نے اسے ماننے سے انکار کر دیا۔ خدا کی لعنت ان منکرین پر' کیسا برا ذریعہ ہے' جس سے یہ اپنے نفس کی تسلی حاصل کرتے ہیں کہ جو ہدایت اللہ نے نازل کی ہے' اس کو قبول کرنے سے صرف اس ضد کی بنا پر انکار کر رہے ہیں کہ اللہ نے اپنے فضل (وحی و رسالت) سے اپنے جس بندے کو چاہا' نواز دیا۔ لہٰذا اب یہ غضب بالائے غضب کے مستحق ہو گئے ہیں اور ایسے کافروں کے لئے سخت ذلت آمیز سزا مقرر ہے۔

جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جو کچھ اللہ نے نازل کیا ہے' اس پر ایمان لاؤ' تو وہ کہتے ہیں "ہم تو صرف اس چیز پر ایمان لاتے ہیں جو ہمارے ہاں (یعنی نسل بنی اسرائیل) اتری ہے۔" اس دائرے کے باہر جو کچھ آیا ہے' اسے ماننے سے انکار کرتے ہیں' حالانکہ وہ حق ہے اور اس تعلیم کی تصدیق و تائید کر رہا ہے جو ان کے ہاں پہلے سے موجود تھی۔ اچھا' ان سے کہو؟ اگر تم اس تعلیم ہی پر ایمان رکھنے والے ہو جو تمہارے ہاں آئی تھی' تو اس سے پہلے اللہ کے ان پیغمبروں کو (جو خود بنی اسرائیل میں پیدا ہوئے تھے) کیوں قتل کرتے رہے؟ تمہارے پاس موسیٰ کیسی کیسی روشن نشانیوں کے ساتھ آیا۔ پھر بھی تم ایسے ظالم تھے کہ اس کے پیٹھ موڑتے ہی بچھڑے کو معبود بنا بیٹھے۔ پھر ذرا اس میثاق کو یاد کرو' جو طور کو تمہارے اوپر اٹھا کر ہم نے تم سے لیا تھا۔ ہم نے تاکید کی تھی کہ جو ہدایات ہم دے رہے ہیں ان کی سختی سے پابندی کرو۔ اور کان لگا کر سنو تمہارے اسلاف نے کہا کہ ہم نے سن لیا' مگر مانیں گے نہیں۔ اور ان کی باطل پرستی کا یہ حال تھا کہ دلوں میں ان کے بچھڑا ہی بسا ہوا تھا۔ کہو؟ اگر تم مومن ہو' تو یہ عجب ایمان ہے' جو ایسی بری حرکات کا تمہیں حکم دیتا ہے۔

یہاں آکر قرآن کریم کا انداز بیان عنیف و شدید ہو جاتا ہے اور بعض مقامات پر تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا بجلی گر رہی ہے یا آگ برس رہی ہے۔ قرآن کریم' خود ان کے اقوال اور ان کے تاریخی افعال میں ان کے سامنے رکھ کر' انہیں اس طرح آڑے ہاتھوں لیتا ہے کہ بیچارے بالکل لاجواب ہو جاتے ہیں۔ ان کے پاس کوئی حجت نہیں رہتی۔ نہ ہی وہ کوئی معذرت پیش کر سکتے ہیں۔ درحقیقت تو وہ از روئے استکبار سچائی قبول کرنے سے اعراض کرتے تھے۔ ان کے دلوں میں اسلام کے خلاف بغض بھرا ہوا تھا' وہ مسلمانوں کو حقیر سمجھ کر ان سے دوری اختیار کئے ہوئے تھے' انہیں یہ بات بے حد ناپسند تھی کہ ان کے علاوہ کوئی بھی یہ مقام بلند پائے اور ان کے دلوں کو یہ حسد کھائے جا رہا تھا کہ اللہ کا یہ فضل و کرم مسلمانوں پر کیوں ہو رہا ہے؟ لیکن لوگوں کو دکھانے کی خاطر اسلام نہ قبول کرنے کی مذکورہ بالا وجوہات بیان کرتے تھے۔ جنہیں اللہ تعالیٰ نے سختی سے رد کر دیا کیونکہ اللہ اور رسول کے مقابلے میں ان کے منکرانہ اور متمردانہ موقف کا یہی علاج تھا۔

وَ قَالُوۡا قُلُوۡبُنَا غُلۡفٌ ؕ بَلۡ لَّعَنَہُمُ اللّٰہُ بِکُفۡرِہِمۡ فَقَلِیۡلًا مَّا یُؤۡمِنُوۡنَ ۝ "اور وہ کہتے ہیں کہ "ہمارے دل محفوظ ہیں"۔ اصل بات یہ ہے کہ ان کے کفر کی وجہ سے ان پر اللہ کی پھٹکار پڑی ہے۔ اس لئے وہ کم ہی ایمان لاتے ہیں۔"

وہ کہتے تھے کہ ہمارے دلوں کے اوپر غلاف چڑھے ہوئے ہیں۔ ان تک کوئی جدید دعوت نہیں پہنچ سکتی۔ نہ ہی وہ کسی نئے داعی کی پکار سننے کے لئے تیار ہیں۔ یہ بات وہ اس لئے کہتے تھے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو مایوس کر دیں تاکہ وہ انہیں اس دین جدید کی طرف بلانا ہی چھوڑ دیں' نیز وہ یہ باتیں نبی ﷺ کی دعوت قبول نہ کرنے کے علت کے طور پر بھی کہتے تھے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ ان کی ان باتوں کو رد کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ "بلکہ اصل بات یہ ہے کہ ان کے کفر کی وجہ سے ان پر اللہ کی پھٹکار پڑی ہے۔" یعنی ان کے مسلسل انکار کی وجہ سے اللہ نے انہیں بطور سزا ہدایت سے بہرہ ور ہونے سے محروم کر دیا اور اس روشنی کے درمیان پردے حائل ہو گئے۔ فَقَلِيْلًا مَّا يُؤْمِنُوْنَ "اس لئے وہ کم ہی ایمان لاتے ہیں۔"

یعنی چونکہ اپنے مسلسل کفر اور قدیم گمراہی کی وجہ سے وہ راہ حق سے دور جا پڑے ہیں۔ اور اللہ نے بطور سزا انہیں محروم بھی کر دیا ہے۔ اس لئے وہ کم ہی ایمان لاتے ہیں۔ نیز اس آیت کا مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے۔ "چونکہ وہ کافرانہ روش اختیار کئے ہوئے ہیں' اس لئے وہ کم ہی ایمان لاتے ہیں۔" یعنی یہ ان کی مستقل روش ہے جس پر وہ قائم ہیں۔ دونوں مفہوم سیاق کلام سے مناسبت رکھتے ہیں۔

ان کی جانب سے یہ کافرانہ رویہ اختیار کرنا اس لئے زیادہ قبیح تھا کہ وہ اس نبی کا انکار کر رہے تھے۔ جس کے انتظار میں وہ صدیوں تک بیٹھے ہوئے تھے اور وہ یہ امید لگائے ہوئے تھے کہ اس کے ذریعہ وہ تمام کفار پر غلبہ پائیں گے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ اس آنے والے نبی کے ذریعے وہ فتح اور نصرت حاصل کریں گے۔ اور جب وہ اس کتاب کی تصدیق کرتے ہوئے تشریف لائے' جو ان کے پاس تھی تو انہوں نے کفر کی راہ لی۔

وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ ۙ وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚ فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ "اور اب جو ایک کتاب اللہ کی طرف سے ان کے پاس آئی ہے۔ اس کے ساتھ ان کا کیا برتاؤ ہے؟ باوجودیکہ وہ اس کتاب کی تصدیق کرتی ہے۔ جو ان کے پاس پہلے سے موجود تھی۔ باوجودیکہ اس کی آمد سے پہلے وہ کفار کے مقابلے میں فتح و نصرت کی دعائیں مانگا کرتے تھے۔ مگر جب وہ چیز آگئی' جسے وہ پہچان بھی گئے تو انہوں نے اسے ماننے سے انکار کر دیا۔"

یہ ان کی ایسی قبیح حرکت تھی کہ اس پر وہ بجا طور پر اس سزا کے مستحق تھے کہ انہیں راہ ہدایت سے دور پھینک دیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ ان پر اللہ کی پھٹکار برستی ہے۔ اور انہیں کفر کے عیب سے متصف قرار دیا جاتا ہے فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ "خدا کی لعنت ان منکروں پر۔" اس کے بعد اللہ تعالیٰ یہ بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے جو سودا کیا ہے وہ گھاٹے کا سودا ہے۔ نیز اللہ تعالیٰ ان کے اس مکروہ موقف اور ناپسندیدہ طرز عمل کا اصل اور پوشیدہ سبب بھی ظاہر فرما دیتے ہیں۔

بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ اَنْ يَّكْفُرُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بَغْيًا اَنْ يُّنَزِّلَ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۚ فَبَآءُوْ بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ ۚ وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ "کیا بری ہے وہ قیمت جس سے یہ اپنے نفس فروخت کرتے ہیں کہ جو ہدایت اللہ نے نازل کی ہے' اس کو قبول کرنے سے صرف اس ضد کی بنا پر انکار کر رہے ہیں کہ اللہ نے اپنے فضل (وحی و رسالت) سے اپنے جس بندے کو خود چاہا نواز دیا! لہٰذا اب یہ غضب بالائے غضب کے مستحق ہو گئے ہیں اور ایسے کافروں کے لئے سخت ذلت آمیز سزا مقرر ہے۔"

انہوں نے جان بوجھ کر اپنی جان کے بدلے جو کفر خریدا ہے' وہ ان کے لئے بہت گھاٹے کا سودا ہے۔ گویا انہوں نے اپنی جان کی قیمت کفر کو قرار دیا۔ انسان اپنے آپ کی کم و بیش کوئی نہ کوئی قیمت لگاتا ہے اور اگر وہ اپنی ذات کو کفر کے عوض فروخت کر دے تو یہ اس کے لئے سخت خسارے کا سودا ہو گا۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ انہوں نے ایسا ہی کیا اگرچہ یہ بات یہاں بطور تمثیل اور منظر کشی کے بیان ہوئی ہے۔

دنیا میں انہیں یہ خسارا ہوا کہ وہ اس قابل احترام قافلۂ ایمان کے ممبر نہ بن سکے۔ اور آخرت کا خسارہ یہ ہوا ہے کہ نہایت ذلت آمیز عذاب ان کے لئے چشم براہ ہے۔ کیونکہ ان کا آخری خاتمہ کفر پر ہوا اور اپنی پوری زندگی میں انہوں نے کفر ہی کمایا۔

انہیں اس روش پر جس چیز نے مجبور کیا وہ صرف یہ تھی کہ ان کے دل نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حسد سے بھرے پڑے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ نبی آخر الزمان ان میں سے ہو گا لیکن اللہ تعالیٰ نے بنی اسماعیل میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا انتخاب فرمایا۔ وہ اپنے دلوں میں یہ وسعت پیدا کرتے ہوئے یہ برداشت نہ کر سکے کہ اللہ اپنے فضل و کرم اور وحی و رسالت سے جسے چاہے نواز دے۔ ان کا یہ طرز عمل صریح ظلم اور حد سے تجاوز تھا۔ اور اس ظلم و تعدی کی وجہ سے یہ لوگ غضب بالائے غضب کے مستحق ہو کر لوٹے۔ چنانچہ اس استکبار' حسد اور مذموم تعدی کی سزا کے طور پر ایک ذلت آمیز عذاب ہے جو ان کے لئے چشم براہ ہے۔

یہودیوں کے اندر اس قسم کا جو ایک خاص مزاج پایا جاتا ہے' یہ احسان فراموشی کا مزاج ہے اور جو لوگ یہ مزاج رکھتے ہیں وہ شدید ترین تعصب کے محدود دائرے میں خود غرضانہ زندگی بسر کرنے کے عادی ہوتے ہیں۔ ایسے لوگ ہر وقت یہ محسوس کرتے ہیں کہ ان کے علاوہ دوسرے لوگوں کی خیر و فلاح در حقیقت ان کی محرومی ہے۔ ایسے لوگ انسانیت کے وسیع ترین تصور اخوت کے شعور سے عاری ہوتے ہیں۔ یہودیوں کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہودیوں نے سالہا سال تک ایسی ذہنیت کے ساتھ پوری انسانیت سے علیحدگی کی زندگی بسر کی۔ گویا کہ شجرانسانیت سے انہیں کوئی تعلق نہ تھا۔ بلکہ وہ ہمیشہ پوری انسانیت کے خلاف سازشیں کرتے رہے۔ وہ ہمیشہ اپنے دلوں کے اندر پوری انسانیت کے خلاف بغض اور حسد کی آگ سلگاتے رہے اور یوں یہ بغض و حسد ان کے لئے بلائے جان بنے رہے۔ اس بغض اور کینہ کا مزہ وہ پوری انسانیت کو یوں چکھاتے رہے ہیں کہ انہوں نے ہمیشہ بعض اقوام کو دوسری اقوام کے خلاف بھڑکایا اور انہیں باہم لڑایا تاکہ وہ ان جنگوں کے نتیجہ میں مالی منفعت حاصل کریں' اور اس طرح اپنے دلوں میں بغض و حسد کی سدا سلگنے والی آگ کو بجھاتے رہیں۔ انہوں نے ہمیشہ مختلف اقوام پر ایسی تباہیاں لانے کی سازشیں کیں' جس کے نتیجہ میں بعض اوقات خود یہ لوگ بھی تباہ اور برباد ہوتے رہے۔ شر و فساد کا یہ طویل سلسلہ ہمیشہ اس لئے بپا ہوا کہ یہودیوں کے دل انسانیت کے خلاف حسد اور بغض سے بھرے ہوئے تھے اور یہ لوگ انتہائی خود غرضانہ ذہنیت کے مالک تھے؟

بَغْيًا اَنْ يُّنَزِّلَ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ "صرف اس ضد کی بنا پر کہ اللہ نے اپنے فضل (وحی و رسالت) سے اپنے جس بندے کو خود چاہا نواز دیا۔"

وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا نُؤْمِنُ بِمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَ يَكْفُرُوْنَ بِمَا وَرَآءَهٗ ۚ وَهُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ ۚ "جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جو کچھ اللہ نے نازل کیا ہے' اس پر ایمان لاؤ' تو وہ کہتے ہیں "ہم تو اس چیز پر ایمان لائے ہیں جو ہمارے ہاں (بنی اسرائیل میں) اتری ہے۔"

اس دائرے کے باہر جو کچھ آیا ہے اسے ماننے سے وہ انکار کرتے ہیں حالانکہ وہ حق ہے اور اس تعلیم کی تصدیق و تائید کر رہا ہے جو ان کے ہاں پہلے سے موجود تھی۔ یہ بات وہ اس وقت کہتے تھے' جب انہیں قرآن پر ایمان لانے اور اسلام کو قبول کرنے کی دعوت دی جاتی تھی۔ وہ کہتے تھے' کہ "ہم پر جو کچھ نازل ہوا ہے' ہم اس پر ایمان لا چکے ہیں اور وہ کافی و شافی ہے۔" اس کے سوا وہ تمام ہدایات کا انکار کرتے تھے۔ خواہ وہ عیسیٰ علیہ السلام پر اتری ہوں یا نبی آخر الزمان' حضرت محمد ﷺ پر اتری ہوں۔

قرآن کریم کے نزدیک ان کا یہ طرز عمل اور ان کی جانب سے توریت کے علاوہ تمام دوسری ہدایات کا انکار ایک عجیب حرکت ہے۔ وَهُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ "کیونکہ وہ حق ہے اور اس تعلیم کی تصدیق و تائید کر رہا ہے جو ان کے ہاں پہلے سے موجود ہے۔"

یعنی بنی اسرائیل کو حق سے کیا واسطہ؟ کیا ہوا کہ سچائی ان تعلیمات کی تصدیق کر رہی ہے جو ان کے پاس موجود ہیں کیونکہ اس سے وہ محروم ہو گئے ہیں۔ وہ تو خود اپنے نفس کے پجاری ہیں اپنی قومی عصبیت کے بندے ہیں بلکہ اس سے بھی آگے وہ تو اپنی ہوائے نفس کی پیروی کرتے ہیں۔ کیونکہ اس سے قبل وہ ان ہدایت کو بھی ٹھکرا چکے ہیں جو خود ان کے انبیاء پر اتاری گئی تھیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے نبی حضرت محمد ﷺ کو سکھاتے ہیں کہ ان کی حقیقت کھولنے کے لئے اور ان کے موقف کی کمزوری کی وضاحت کے لئے وہ ان پر اس پہلو سے حملہ آور ہوں قُلْ فَلِمَ تَقْتُلُونَ اَنْبِيَآءَ اللّٰهِ مِنْ قَبْلُ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ "کہہ دیجئے کہ اگر تم اس تعلیم پر ہی ایمان رکھنے والے ہو جو تمہارے ہاں آئی تھی تو اس سے پہلے اللہ کے ان پیغمبروں کو (جو خود بنی اسرائیل میں پیدا ہوئے تھے) کیوں قتل کرتے رہے؟ تمہارا دعویٰ ہے کہ انبیاء بنی اسرائیل تمہارے پاس جو تعلیم و ہدایت لے کر آئے تھے تم ان پر ایمان لائے ہوئے تھے تو اگر تم سچے مومن تھے تو تم نے پھر ان انبیاء عظام کو قتل کیوں کیا؟"

بات یہ نہیں کیونکہ حضرت موسیٰ تمہارے پہلے نبی تھے اور تمہارے عظیم نجات دہندہ تھے۔ وہ تمہارے پاس جو ہدایت لے کر آئے تھے تم نے اس کا بھی انکار کیا تھا وَلَقَدْ جَآءَكُمْ مُّوْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ "تمہارے پاس موسیٰ کیسی کیسی روشن نشانیوں کے ساتھ آئے تھے، پھر بھی تم اتنے ظالم تھے کہ ان کے پیٹھ موڑتے ہی بچھڑے کو معبود بنا بیٹھے"

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات اور روشن نشانیوں کے بعد اور خود آپ کی زندگی میں تم نے جو بچھڑے کو معبود بنایا تھا۔ کیا یہ تمہارے ایمان اور وحی الٰہی کا مقتضاء تھا؟ کیا اس طرز عمل کے ہوتے ہوئے تم یہ دعویٰ کر سکتے ہو کہ تم ان ہدایات اور نشانیوں پر ایمان لا چکے ہو جو حضرت موسیٰ علیہ السلام تمہارے پاس لائے تھے؟

یہی نہیں بلکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایک چٹان اور پہاڑ کے سائے میں تم سے ایک پختہ میثاق لیا تھا کیا تمہیں یاد نہیں کہ تم نے اس قسم کے غیر معمولی میثاق کو بھی توڑ دیا تھا اور تم سرکشی اور معصیت میں مبتلا ہو گئے تھے۔

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاسْمَعُوْا قَالُوْا سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا وَاُشْرِبُوْا فِىْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ بِكُفْرِهِمْ "پھر ذرا اس میثاق کو یاد کرو جو طور کو تمہارے اوپر اٹھا کر ہم نے تم سے لیا تھا۔ ہم نے تاکید کی تھی کہ جو ہدایات ہم دے رہے ہیں، ان کی سختی کے ساتھ پابندی کرو اور کان لگا کر سنو۔ تمہارے اسلاف نے کہا کہ ہم نے سن لیا مگر مانیں گے نہیں۔ اور ان کی باطل پرستی کا یہ حال تھا کہ دلوں میں ان کے بچھڑا ہی بسا ہوا تھا۔"

یہاں آکر خطابی انداز گفتگو، حکایت و بیان میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ کیونکہ پہلے تو بنی اسرائیل کو مخاطب کر کے انہیں یاد دلایا جاتا ہے کہ تم یہ یہ کرتے رہے، اس کے بعد کلام کا رخ مومنین اور عام انسانوں کی طرف پھر جاتا ہے اور انہیں بتایا جاتا ہے کہ دیکھو یہ بنی اسرائیل یہ یہ کام کرتے رہے۔ اور نبی ﷺ کو سمجھا دیا جاتا ہے کہ آپ اچانک انہیں آڑے ہاتھوں لیں۔ اور ان سے پوچھیں کہ ان کا ایمان کس قدر گھٹیا اور مکروہ ایمان ہے جو بقول ان کے انہیں ایسا صریح کافرانہ اور ناپسندیدہ رویہ اختیار کرنے کے لئے مجبور کر رہا ہے۔ قُلْ بِئْسَمَا يَاْمُرُكُمْ بِهٖٓ اِيْمَانُكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ "کہو اگر تم مومن ہو، تو یہ عجیب ایمان ہے جو ایسی بری حرکات کا تمہیں حکم دیتا ہے۔"

قرآن کریم کی یہ دو مصورانہ تعبیریں کس قدر گہری سوچ بچار کی مستحق ہیں۔ یہ کہ "انہوں نے کہا "ہم نے سن لیا مگر مانیں گے نہیں۔" اور یہ کہ؟ "اور ان کی باطل پرستی کا یہ حال تھا کہ دلوں کو بچھڑا پلا دیا گیا تھا۔"

انہوں نے کہا "ہم نے سن لیا۔" اور بعد میں کہا "ہم مانیں گے نہیں۔ لیکن پہلے ہی سے، یہ نہیں کہا؟ "ہم مانیں گے نہیں۔" سوال یہ

ہے کہ یہ دونوں باتیں وہ ایک ہی سانس میں کس طرح کہہ گئے؟ درحقیقت یہ ایک خاموش موقف اور حقیقت واقعہ کی حکایتی تعبیر ہے۔ انہوں نے اپنے منہ سے تو کہا "ہم نے سن لیا۔" لیکن اپنے عمل سے انہوں نے یہ ثابت کر دیا کہ وہ "مانیں گے نہیں۔" کیونکہ عمل ہی دراصل زبانی تکلم کو معنی پہناتا ہے۔ اور عملی اظہار قولی اظہار سے زیادہ قوی ہوتا ہے۔ واقعاتی صورت حال کی اس تعبیر سے دراصل اسلام کے اس ہمہ گیر اصول کا اظہار ہوتا ہے کہ عمل کے بغیر محض باتوں اور زبانی جمع خرچ کی اسلام میں کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اسلام میں اصل اعتبار عمل ہی کا ہے۔ واقعاتی حرکات اور الفاظ کی تعبیروں کے درمیان عمل ہی اصل رابطہ ہے اور فیصلے عمل پر ہی کئے جاتے ہیں۔

دوسری تعبیر کہ "ان کے دلوں کو بچھڑا پلا دیا گیا ہے۔" بڑی ہی سخت اور اپنی نوعیت کی منفرد تعبیر ہے۔ کہا جاتا ہے کہ "وہ پلائے گئے ہیں" یعنی کسی نے انہیں کچھ پلا دیا ہے۔ کیا پلا دیا ہے؟ انہیں بچھڑا پلایا گیا ہے۔ کہاں؟ ان کے دلوں میں کس قدر سخت تعبیر ہے یہ؟ انسانی تخیل یہ کوشش کر رہا ہے کہ دلوں میں ایک بچھڑے کو داخل ہوتے ہوئے دیکھے یا تصور کرے۔ یعنی گویا مجسم بچھڑا دلوں میں داخل ہو رہا ہے اور یہ بچھڑا ان کے دلوں کی دنیا پر چھایا ہوا ہے۔ تعبیر معانی کے لئے ایسی حسی تجویز کی گئی ہے کہ ایک لمحہ کے لئے انسان کے پردہ خیال سے اصل مفہوم و مدعا' یعنی ان کے دلوں میں بچھڑے کی محبت و عبادت' اوجھل ہو جاتا ہے۔ اور انسان یہ سوچتا ہے کہ گویا فی الواقعہ بچھڑا انہیں گھول کر پلا دیا گیا ہے۔

ایسے مقامات پر ادبیاتی نقطہ نظر سے غور و فکر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم کے مصورانہ طرز ادا کی کیا قدر و قیمت ہے؟ نظریاتی اور ذہنی تعبیروں کے مقابلے میں قرآن کریم کی حسی تعبیر کس قدر واضح اور مفصل ہے۔ الفاظ میں اصل صورت واقعہ کا نقشہ کھینچ کر رکھ دیا جاتا ہے۔

قرآن کریم کی حسی طرز تعبیر اور اس کی خصوصیات میں سے یہ ایک اہم تعبیر ہے۔

یہودیوں کا یہ بڑا دعویٰ تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی پسندیدہ مخلوق ہیں۔ وہی راہ ہدایت پر ہیں اور وہی ہیں جنہیں عالم آخرت میں یقیناً فلاح نصیب ہوگی۔ اور آخرت میں ان کے سوا' دوسری اقوام کو کچھ نہ ملے گا۔ یہودیوں کے اس دعوے کا صاف صاف اشارہ اس طرف تھا کہ آخرت میں نبی آخر الزمان حضرت محمد ﷺ کی امت بھی نجات سے محروم ہوگی۔ اس پروپیگنڈے سے یہودیوں کا مقصد یہ تھا کہ عام مسلمانوں کے دلوں میں قرآن کریم کی تعلیمات حضرت محمد ﷺ کے ارشادات اور دین اسلام کے بارے میں بے اعتمادی کی فضا پیدا کر دی جائے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے حضرت نبی ﷺ کو حکم دیا کہ آپ انہیں مباہلے کی دعوت دیں' دونوں فریق کھڑے ہو جائیں اور ان میں سے جو بھی جھوٹا ہے اس کی ہلاکت کے لئے دعا کریں؟

قُلْ اِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ عِنْدَ اللّٰهِ خَالِصَةً مِّنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۹۴﴾

"ان سے کہو اگر واقعی اللہ کے نزدیک آخرت کا گھر تمام انسانوں کو چھوڑ کر صرف تمہارے ہی لئے مخصوص ہے' تب تو تمہیں چاہئے کہ موت کی تمنا کرو' اگر تم اپنے اس خیال میں سچے ہو۔"

اس کے بعد قرآن کریم خود ہی اعلان کر دیتا ہے کہ یہ لوگ ہرگز دعوت مباہلہ قبول نہ کریں گے۔ اور کبھی موت کی طلب نہ کریں گے۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ وہ جھوٹے ہیں اور انہیں یہ ڈر تھا کہ اگر اللہ تعالیٰ فریقین کی دعا قبول کر لیں تو وہ اس کی پکڑ میں آجائیں گے۔ نیز

وہ یہ بھی جانتے تھے کہ انہوں نے اس دنیا میں جو برے کام کیے ہیں ان کے نتیجے میں 'دار آخرت میں خود ان کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ اور اگر انہوں نے مباہلہ کیا تو نتیجہ یہ ہو گا کہ اپنے منہ مانگی موت کے نتیجے میں وہ دنیا سے بھی محروم ہو جائیں گے اور جو برے کام انہوں نے کیے ہیں اس کے نتیجہ میں آخرت میں تو وہ محروم ہیں ہی..... اس لئے قرآن کریم فیصلہ کن انداز میں کہتا ہے کہ ان سے یہ توقع ہرگز نہیں کی جاسکتی کہ وہ اس تحدی کو قبول کریں گے کیونکہ وہ حیات دنیوی کے لئے سب سے زیادہ حریص ہیں اور یہی حال تمام دوسرے مشرکین کا بھی ہے۔ (بلکہ یہ اس معاملے میں ان سے بھی بڑھے ہوئے ہیں) چنانچہ فرماتے ہیں؟

وَلَنْ يَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًاۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ﴿۹۵﴾ وَلَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰى حَيٰوةٍ ۚ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۚ يَوَدُّ اَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَةٍ ۚ وَمَا هُوَ بِمُزَحْزِحِهٖ مِنَ الْعَذَابِ اَنْ يُّعَمَّرَ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ﴿۹۶﴾

ع ۱۰ | ۱۱ | ۱۱

"یقین جانو کہ یہ کبھی اس کی تمنا نہ کریں گے 'اس لئے کہ اپنے ہاتھوں جو کچھ کما کر انہوں نے وہاں بھیجا' اس کا اقتضاء یہی ہے (کہ یہ وہاں جانے کی تمنا نہ کریں) 'اللہ ان کے حال سے خوب واقف ہے۔ تم انہیں سب سے بڑھ کر جینے کا حریص پاؤ گے۔ حتیٰ کہ یہ اس معاملے میں مشرکوں سے بھی بڑھے ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک ایک شخص یہ چاہتا ہے کہ کسی طرح ہزار برس جیئے حالانکہ لمبی عمر بہرحال انہیں عذاب سے تو دور نہیں پھینک سکتی 'جیسے کچھ اعمال یہ کر رہے ہیں اللہ تو انہیں دیکھ ہی رہا ہے۔"

وہ موت کی تمنا اس لئے نہ کریں گے کہ انہوں نے اس دنیا میں جو کمائی کی ہے 'اس پر انہیں عالم آخرت میں کسی اجر کی توقع نہیں ہے۔ اور نہ انہیں اس بات کی امید ہے کہ اس کے ذریعے وہ عذاب الٰہی سے بچ سکیں گے۔ بلکہ یہ عذاب تو وہاں ان کا منتظر ہے۔ اللہ ظالموں کو اچھی طرح جانتا ہے اور ان کی بداعمالیاں بھی اس کی نظر میں ہیں۔

صرف یہی نہیں 'بلکہ یہودیوں کے اندر ایک دوسری خصلت بھی پائی جاتی ہے۔ قرآن کریم اس خصلت کی ایسی تصویر کھینچتا ہے جس سے ان کی ذلت 'حقارت اور رذیل پنا نکھر پڑتا ہے۔ قرآن کریم کہتا ہے وَلَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰى حَيٰوةٍ ۚ "تم انہیں سب سے بڑھ کر جینے کا حریص پاؤ گے۔" کیسا جینا؟ اس سے انہیں کوئی سروکار نہیں ہے۔ زندگی ہو' چاہے جیسی ہو۔ ان کے نزدیک یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ زندگی باعزت بھی ہو۔ بس وہ تو صرف زندگی چاہتے ہیں۔ چاہے وہ ذلت اور حقارت کی زندگی ہو۔ زندگی اور عافیت..... بس یہی یہودیوں کی حقیقت رہی ہے۔ یہی یہودیوں کا ماضی ہے' یہی حال ہے اور یہی مستقبل کا سطح نظر ہے۔ یہودی صرف اسی وقت سر اٹھاتے ہیں جب خطرہ دور ہو جاتا ہے۔ جب تک خطرہ سروں پر قائم ہو وہ سر نہیں اٹھاتے' ان کی گردنیں جھکی رہتی ہیں کیونکہ وہ پرلے درجے کے بزدل ہیں اور انہیں زندہ رہنے سے بے حد محبت ہے..... وہ کیسی زندگی چاہتے ہیں؟

وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۚ يَوَدُّ اَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَةٍ ۚ وَمَا هُوَ بِمُزَحْزِحِهٖ مِنَ الْعَذَابِ اَنْ يُّعَمَّرَ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ "جب حیات کے معاملے میں یہ مشرکوں سے بھی بڑھے ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک ایک شخص یہ چاہتا ہے کہ کسی طرح ہزار برس جیئے۔ حالانکہ لمبی لمبی عمر بہرحال انہیں عذاب سے تو دور نہیں پھینک سکتی۔ جیسے کچھ اعمال یہ کر رہے ہیں اللہ تو انہیں دیکھ رہا ہے۔

ان میں سے ہر صاحب ایک ہزار سال عمر کی تمنا رکھتے ہیں۔ کیوں؟ اس لئے کہ انہیں اللہ تعالیٰ کے سامنے حاضر ہونے کے بارے میں کوئی پختہ یقین نہیں ہے۔ وہ نہیں سمجھتے کہ اس زندگی کے علاوہ بھی کوئی زندگی ہے؟ اور جب کوئی شخص یہ سمجھتا ہے کہ اس کی اس زندگی کے بعد کوئی دوسری زندگی نہیں ہے تو اس پر عرصہ حیات تنگ ہو جاتا ہے۔ اسے اپنی دنیاوی زندگی بہت ہی تنگ نظر آتی ہے۔ کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ اسے صرف انہی معدودے چند گھنٹوں اور سانسوں کی مہلت ملی ہوئی ہے۔

جب اس نقطہ نظر سے غور کیا جائے تو اخروی زندگی پر ایمان' ایک عظیم نعمت ہے جو انسان کو بخشی گئی ہے۔ ایسی نعمت جس کا فیضان' ایمان کے ذریعے' انسان کے دل پر ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ یہ نعمت اس فانی انسان کو اس لئے عطا کرتا ہے کہ اسے اس دنیا میں ایک محدود وقت دیا گیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس کے دل میں آرزوؤں کی ایک دنیا آباد ہوتی ہے' لہٰذا اسے زندگی کی تنگ دامانی کا احساس نہیں رہتا جو لوگ اپنے آپ کو اس نعمت سے محروم کر دیتے ہیں' اور اپنے لئے حیات دوام کا دروازہ بند کر دیتے ہیں۔ ان کے ذہنوں میں "زندگی" کا ایک ناقص اور مسخ شدہ تصور ہوتا ہے۔ غرض یوم آخرت پر ایمان لانا تو اللہ تعالیٰ کے عدل و انصاف اور آخرت میں مکافات عمل پر ایمان لانا ہے' دوسرے یہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ بندۂ مومن کا وجود زندگی کی فیوض سے مالا مال ہے' اور اسے ایک ایسی دائمی زندگی بخشی گئی ہے جو کبھی ختم نہیں ہوتی اور نہ کسی سرحد پر جا کر رک جاتی ہے' بلکہ یہ زندگی تمام سرحدوں سے گزر کر بقائے دوام کے حدود تک جا پہنچتی ہے۔ اور جس کی انتہا کا علم صرف اللہ کی ذات کو ہے۔ یہ زندگی مستقلاً بلندیوں تک اٹھتی چلی جاتی ہے یہاں تک کہ وصال باری کی منزل تک جا پہنچتی ہے۔

اب اللہ تعالیٰ نبی ﷺ کو ایک نئے پہلو کی طرف متوجہ فرماتے ہیں۔ یہودیوں کو کھلا چیلنج دیا جاتا ہے اور اس حقیقت کا اعلان کیا جاتا ہے کہ؟

قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَهُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿٩٧﴾ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَرُسُلِهٖ وَجِبْرِيْلَ وَمِيْكٰلَ فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ ﴿٩٨﴾

"ان سے کہو جو کوئی جبرئیل سے عداوت رکھتا ہو' اسے معلوم ہونا چاہئے کہ جبرئیل نے اللہ ہی کے اذن سے یہ قرآن تمہارے قلب پر نازل کیا' جو پہلے آئی ہوئی کتابوں کی تصدیق و تائید کرتا ہے۔ اور ایمان لانے والوں کے لئے ہدایت اور کامیابی کی بشارت بن کر آیا ہے۔ (اگر جبرئیل سے ان کی عداوت کا سبب یہی ہے تو کہہ دو کہ) جو اللہ اور اس کے فرشتوں اور اس کے رسولوں اور جبرئیل اور میکائیل کے دشمن ہیں' اللہ ان کافروں کا دشمن ہے۔

اس چیلنج کے ذریعے ہمیں یہودیوں کی ایک عجیب و غریب نئی خاصیت معلوم ہو جاتی ہے۔ یہودیوں نے محض اس لئے کہ ایک غیر یہودی پر وحی نازل ہوئی۔ شدید بغض میں مبتلا ہو گئے' بلکہ انہوں نے بغض و حسد کا ریکارڈ قائم کر دیا ہے اور اس سلسلے میں وہ حماقت کی حد تک جا پہنچے ہیں اور ایسی متضاد باتیں کر رہے ہیں جن کی توقع کسی عقلمند انسان سے نہیں کی جا سکتی۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام وحی لے کر حضرت محمد ﷺ پر نازل ہوتے ہیں تو یہ لوگ حسد اور بغض کی وجہ سے جل بھن گئے اور ایک واہیات قصہ گھڑ لیا کہ

جبرئیل ﷺ تو ان کے پرانے دشمن ہیں کیونکہ وہ ہمیشہ اللہ کا عذاب ان پر لاتے رہے ہیں اور ان کے ہاتھوں بنی اسرائیل ہمیشہ تباہ و برباد ہوتے رہے ہیں۔ چونکہ محمد ﷺ کا تعلق حضرت جبرئیل سے ہے' اس لئے وہ اس پر ایمان نہیں لاتے۔ اگر حضرت میکائیل وحی لاتے تو وہ ضرور ایمان لاتے کیونکہ حضرت میکائیل اللہ کے وہ فرشتے ہیں جو بارش' تروتازگی اور انسانوں کے لئے خوشی کے سامان فراہم کرتے ہیں۔ کیا واہیات دلیل ہے یہ؟

ان کی اس احمقانہ بات پر انسان کو بے اختیار ہنسی آتی ہے لیکن جب انسان بغض و حسد کا شکار ہوتا ہے تو اس کی جانب سے اس سے بھی کہیں بڑی حماقتوں کا صدور ہونا کوئی امر بعید نہیں ہوتا۔ کیونکہ جبرئیل کوئی انسان نہ تھے کہ وہ کسی کے ساتھ دشمنی کر سکیں یا وہ کسی کے ساتھ از خود کوئی دوستی گانٹھ سکیں۔ وہ اپنی مرضی سے کوئی کام کرنے کی سرے سے قدرت ہی نہ رکھتے تھے۔ حضرت جبرئیل فرشتہ ہونے کی وجہ سے' اللہ کے احکامات کی سرتابی نہیں کر سکتے تھے وہ وہی کرتے تھے جس کا انہیں حکم دیا جاتا تھا۔

قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيلَ فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ عَلَىٰ قَلْبِكَ بِإِذْنِ اللَّهِ "کہو اگر کسی کو جبرئیل سے عداوت ہے تو اسے معلوم ہونا چاہئے کہ جبرئیل نے اللہ ہی کے اذن سے یہ قرآن تمہارے قلب پر نازل کیا ہے۔"

جبرئیل علیہ السلام نہ ذاتی رجحان رکھتے تھے اور نہ انہوں نے آپ کے دل پر قرآن کریم اپنے ذاتی ارادہ سے نازل کیا تھا۔ وہ تو صرف ارادۂ الٰہی کو نافذ کرنے والے تھے اور آپ کے قلب پر نزول قرآن کا کام وہ اللہ کے احکامات کے تحت کر رہے تھے۔ قرآن کریم کا نزول دل پر ہو رہا تھا۔ دل ہی دراصل محل ادراک ہے اور وہی ہے جو ادراک کے بعد معانی کو سمجھتا ہے اور مدرکات کو محفوظ رکھتا ہے۔ قرآن کریم انسان کی قوت مدرکہ کی تعبیر "قلب" سے کرتا ہے لہٰذا قلب مدرک سے مراد خون اور گوشت کا معروف طبعی لوتھڑا نہیں ہے بلکہ وہ ملکہ ہے جو فہم و ادراک کا کام کرتا ہے۔

جبرئیل نے آپ ﷺ کے قلب پر اس حال میں قرآن اتارا کہ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَهُدًى وَبُشْرَىٰ لِلْمُؤْمِنِينَ "جو پہلے آئی ہوئی کتابوں کی تصدیق و تائید کرتا ہے اور ایمان لانے والوں کے لئے ہدایت و کامیابی کی بشارت بن کر آیا ہے۔"

قرآن کریم اصولی طور پر تمام کتب سابقہ کی تصدیق کرتا ہے کیونکہ تمام سماوی کتب اور تمام الٰہی ادیان کی اساسی تعلیمات ایک ہی تھیں اور وہ صرف مومنین کے لئے ہدایت اور پیغام مسرت ہے کیونکہ اس کی تعلیمات کے لئے صرف ایک مومن دل ہی کے دریچے کھلے ہوتے ہیں۔ **مومن ہی اس کی تعلیمات پر لبیک کہتے ہیں۔ یہ ایک نہایت اہم حقیقت ہے جس کا کھول کر بیان کرنا نہایت ہی ضروری ہے۔** قرآن کریم کی آیات دل مومن کے اندر اس قدر انس پیدا کرتی ہیں۔ اس کے اندر معرفت و ادراک کی ایسی راہیں کھولتی ہیں اور اس کے اندر ایک ایسا شعور اور احساس پیدا کر دیتی ہیں جن سے ہر وہ دل محروم رہتا ہے جس میں ایمان نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ قلب مومن کو قرآن کریم میں ہدایت ملتی ہے اور اس کے لئے اس میں پیغام مسرت ہوتا ہے۔ قرآن کریم نے اس حقیقت کو مختلف مقامات کے اندر بیان کیا ہے۔" **هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ** "متقین کے لئے ہدایت ہے۔" **هُدًى لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ** "وہ اس قوم کے لئے ہدایت ہے جو ایمان لاتی ہے۔" **هُدًى وَرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُوقِنُونَ** "وہ ایسے لوگوں کے لئے ہدایت ہے جو پختہ یقین رکھتے ہیں۔" گویا ایمان تقویٰ اور یقین کے نتیجے کے طور پر ملتی ہے۔ اور بنی اسرائیل اسی لئے اس سے محروم رہے کہ نہ وہ مومن تھے نہ متقی تھے اور نہ ذوق یقین سے آشنا تھے۔

گویا ہدایت ایمان تقویٰ اور یقین کے نتیجے کے طور پر ملتی ہے اور بنی اسرائیل اسی لئے محروم رہے کہ نہ وہ مومن تھے نہ متقی تھے اور نہ ذوق یقین سے آشنا تھے۔

ان کی یہ عادت تھی کہ وہ اللہ کے بھیجے ہوئے رسولوں اور اس کے ادیان و شرائع کے درمیان فرق کرتے تھے۔ اسی طرح وہ اللہ

تعالیٰ کے فرشتوں کے درمیان بھی فرق کرتے تھے جن کے ناموں اور کاموں سے وہ واقف تھے۔ کہتے تھے میکائیل سے تو ان کے تعلقات بہت اچھے ہیں۔ البتہ جبرئیل سے ان کے مراسم اچھے نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اگلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے جبرئیل میکائیل وغیرہ تمام فرشتوں اور رسولوں کو جمع کر لیا۔ مقصد یہ ہے کہ وہ سب ایک ہی ہیں جو شخص ان میں سے ایک سے عداوت رکھتا ہے وہ سب سے عداوت رکھتا ہے۔ بلکہ وہ اللہ تعالیٰ سے عداوت رکھتا ہے۔ لہٰذا اللہ کو بھی ان سے عداوت ہوگی اور وہ کافر ہو جائیں گے۔

مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَ مَلٰٓئِكَتِهٖ وَ رُسُلِهٖ وَ جِبْرِيْلَ وَ مِيْكٰلَ فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ "جو اللہ کے فرشتوں اور اس کے رسولوں اور جبرئیل اور میکائیل کے دشمن ہیں' اللہ ان کافروں کا دشمن ہے۔"

اس کے بعد روئے سخن نبی ﷺ کی طرف پھر جاتا ہے۔ آپ کو تلقین کی جاتی ہے کہ آپ پر جو سچائی اور کھلی نشانیاں نازل ہو رہی ہیں' آپ ان پر جم جائیں۔ سوائے فساق و فجار کے اور کوئی ان کا منکر نہیں ہو سکتا۔ اور بنی اسرائیل کو تنبیہ کی جاتی ہے کہ وہ کبھی اپنے عہد پر قائم نہیں رہتے۔ چاہے وہ عہد انہوں نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ کیا ہو یا انبیائے سابقین کے ساتھ کیا ہو۔ یا وہ عہد انہوں نے نبی آخر الزمان کے ساتھ کیا ہو۔ قرآن کریم ان کی مذمت کرتا ہے کہ انہوں نے ایک ایسی کتاب الٰہی کو پس پشت ڈال دیا ہے جو ان تمام کتابوں کی تصدیق کرتی ہے جو خود ان کے پاس موجود ہیں۔

وَ لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ ۚ وَ مَا يَكْفُرُ بِهَآ اِلَّا الْفٰسِقُوْنَ ﴿۹۹﴾ اَوَ كُلَّمَا عٰهَدُوْا عَهْدًا نَّبَذَهٗ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۰۰﴾ وَ لَمَّا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ نَبَذَ فَرِيْقٌ مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ ۙۗ كِتٰبَ اللّٰهِ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ كَاَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۱﴾

"ہم نے تمہاری طرف ایسی آیات نازل کی ہیں جو صاف صاف حق کا اظہار کرنے والی ہیں۔ اور ان کی پیروی کرنے سے صرف وہی لوگ انکار کرتے ہیں جو فاسق ہیں۔ کیا ہمیشہ ایسا ہی نہیں ہوتا رہا کہ جب انہوں نے کوئی عہد کیا تو ان میں سے ایک نہ ایک گروہ نے اسے ضرور ہی بالائے طاق رکھ دیا؟ بلکہ ان میں سے اکثر ایسے ہی ہیں جو سچے دل سے ایمان نہیں لاتے اور جب ان کے پاس اللہ کی طرف سے کوئی رسول اس کتاب کی تصدیق و تائید کرتا ہوا آیا جو ان کے ہاں پہلے سے موجود تھی تو ان اہل کتاب میں ایک گروہ نے کتاب اللہ کو اس طرح پس پشت ڈالا گویا کہ وہ کچھ جانتے ہی نہیں۔

یہاں اللہ تعالیٰ نے وہ اسباب کھول کر بیان کر دیئے ہیں جن کی بناء پر بنی اسرائیل اللہ تعالیٰ کی ان واضح آیات کا انکار کر رہے تھے جو خود اللہ کی جانب سے نازل ہوئی تھیں۔ یعنی وہ لوگ فسق و فجور میں مبتلا تھے۔ ان کی فطرت بگڑی ہوئی تھی کیونکہ فطرت سلیمہ کے لئے تو اس کے سوا کوئی چارہ کار ہی نہ تھا کہ وہ ان آیات پر ایمان لے آئے اگر دل میں کجی نہ ہو تو یہ آیات از خود اپنے آپ کو منواتی ہیں اور یہودیوں نے کفر کا جو رویہ اختیار کیا ہے تو اس کا سبب یہ نہیں ہے کہ قرآن کریم کی آیات میں دلائل کی کچھ کمی ہے یا وہ تشفی بخش نہیں بلکہ اصل سبب یہ ہے کہ خود ان کی فطرت بگڑ چکی ہے اور وہ فسق و فجور میں مبتلا ہو چکے ہیں۔

اس کے بعد روئے سخن مسلمانوں اور تمام دوسرے انسانوں کی طرف پھر جاتا ہے۔ یہودیوں کی مذمت کی جاتی ہے اور ان کی صفات

رذیلہ میں سے ایک دوسری صفت کو بیان کیا جاتا ہے کہ یہ لوگ آپس میں بھی مختلف خواہشات اپنے اندر رکھتے ہیں۔ اپنے اس مذموم تعصب کے باوجود ان کے درمیان قدر مشترک ہے۔ وہ کسی ایک رائے پر جمتے بھی نہیں نہ ہی وہ اپنے کیے ہوئے معاہدوں کی پابندی کرتے ہیں۔ وہ کسی ایک رسی کو مضبوطی سے نہیں پکڑتے۔ اگرچہ وہ اپنے ذاتی مفاد اور اپنے قومی مفاد کے سلسلے میں پرلے درجے کے خودغرض ہیں اور اس بات کو پسند نہیں کرتے کہ ان کے سوا کسی اور کو بھی اللہ کا فضل و کرم نصیب ہو۔ لیکن اس قومی تعصب کے ہوتے ہوئے بھی وہ باہم متحد نہیں ہیں۔ وہ خود ایک دوسرے کے ساتھ کیے ہوئے معاہدوں کی پابندی بھی نہیں کرتے۔ جب بھی وہ آپس میں کوئی پختہ عہد کرتے ہیں تو ان میں سے کوئی ایک گروہ اٹھ کر اسے توڑ دیتا ہے اور ان کے اس متفقہ فیصلے کی کھلی خلاف ورزی کرتا ہے۔

أَوَ كُلَّمَا عٰهَدُوْا عَهْدًا نَّبَذَهٗ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ ۭ بَلْ اَكْثَرُھُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ "کیا ہمیشہ ایسا ہی نہیں ہوتا رہا کہ جب انہوں نے کوئی عہد کیا تو ان میں سے ایک نہ ایک گروہ نے اسے ضرور ہی بالائے طاق رکھ دیا بلکہ ان میں سے اکثر ایسے ہیں جو سچے دل سے ایمان نہیں لاتے۔"

انہوں نے کوہ طور کے نیچے اللہ کے ساتھ پختہ پیمان باندھا اور بعد میں اس کی خلاف ورزی کی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے قبل آنے والے پیغمبروں کے ساتھ انہوں نے جو عہد کیے ان کی خلاف ورزی کی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ طیبہ تشریف لانے کے بعد یہودیوں کے ساتھ جو معاہدہ کیا اسے بھی انہوں نے پس پشت ڈال دیا حالانکہ اس معاہدے میں ان کے ساتھ شرائط طے کی گئی تھیں اور انہوں نے پہل کر کے حضور ﷺ کے دشمنوں کی معاونت کی۔ نبی ﷺ کے پیش کردہ نظام زندگی پر تنقید شروع کر دی اور مسلمانوں کے اندر انتشار پیدا کرنے کی کوشش کی۔ حالانکہ یہ سب باتیں میثاق مدینہ کے خلاف تھیں۔

یہ تھی بنی اسرائیل کی مذموم عادت جب کہ مسلمانوں کا رویہ اس سے بالکل مختلف تھا۔ نبی ﷺ فرماتے ہیں "مسلمانوں کے خون باہم مساوی ہیں اور وہ سب دوسروں کے مقابلے میں ایک دوسرے کے مددگار ہیں اور ان میں ادنیٰ ترین آدمی بھی سب کی طرف سے امان دے سکتا ہے۔" اور جب وہ کسی کے ساتھ کوئی معاہدہ کریں تو ان میں سے کسی کو یہ اجازت نہ ہوگی کہ وہ اسے توڑے یا اس کی خلاف ورزی کرے۔

حضرت عمر ﷺ کے زمانہ خلافت میں ان کے کمانڈر انچیف حضرت ابو عبیدہ ﷺ نے لکھا کہ عراق کے ایک گاؤں والوں کو ہمارے ایک غلام نے امان دے دی ہے۔ اب ہم ان کے ساتھ کیا معاملہ کریں؟ حضرت عمر ﷺ نے جواب دیا کہ اللہ تعالیٰ نے معاہدے کی پابندی کرنے کو ایک عظیم فریضہ قرار دیا ہے۔ اور جب تک آپ لوگ اپنے عہد کو پورا نہ کریں گے اس وقت تک آپ کو وفادار نہیں کہا جا سکتا۔ چنانچہ انہوں نے عہد پر عمل کرتے ہوئے اس شہر کے باشندوں کو اپنے حال پر چھوڑ دیا۔

یہ ہے صفت ایک شریف، راستباز اور اصول پرست جماعت کی۔ اس سے یہ بات اچھی طرح معلوم ہو جاتی ہے کہ بدکردار یہودیوں کے اخلاق اور راستباز مسلمانوں کے اخلاق کے درمیان کیا فرق ہوتا ہے۔

وَلَمَّا جَاۗءَھُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَھُمْ نَبَذَ فَرِيْقٌ مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ ڎ كِتٰبَ اللّٰهِ وَرَاۗءَ ظُهُوْرِھِمْ كَاَنَّھُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝

"اور جب ان کے پاس اللہ کی طرف سے کوئی اس کتاب کی تصدیق و تائید کرتا ہوا آیا جو ان کے ہاں پہلے سے موجود تھی تو اہل کتاب میں سے ایک گروہ نے اللہ کی کتاب کو اس طرح پس پشت ڈالا گویا کہ وہ کچھ جانتے ہی نہیں۔

یہ وعدہ خلافی کی ایک مثال ہے جس کا ارتکاب ان میں سے ایک فریق نے کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان سے جو عہد لیا تھا اس کی ایک شق

یہ بھی ہے کہ آئندہ جو جو رسول بھیجے جائیں گے تم ان پر ایمان لاؤ گے۔ ان کا احترام کرو گے اور ان کی مدد کرو گے۔ جب اللہ تعالیٰ نے نبی آخر الزمان کے ذریعے ان کے پاس اپنی کتاب (قرآن) کو بھیجا تو ان اہل کتاب میں سے ایک فریق نے اسے پس پشت ڈال دیا۔ اس طرح انہوں نے ایک تو اس کتاب الٰہی کا انکار کیا جو خود ان کے پاس تھی اور جس کے اندر حضور کے بارے میں پیشن گوئیاں موجود تھیں۔ اور انہوں نے ان پیشن گوئیوں کو پس پشت ڈالا اور دوسرے حضور پر جو نئی کتاب اتری اسے بھی پس پشت ڈال دیا۔

اس آیت میں اہل کتاب پر ایک لطیف طنز بھی مقصود ہے یعنی کتاب اللہ کو مشرکین رد کر دیتے تو ان سے یہ امر کوئی مستبعد نہ تھا لیکن ان بدبختوں نے اہل کتاب ہوتے ہوئے بھی اسے رد کر دیا۔ وہ رسالت اور رسولوں سے اچھی طرح واقف تھے۔ ہمیشہ ہدایت کے سرچشموں سے وہ وابستہ رہے۔ ہمیشہ روشنی ان کی نظروں میں رہی لیکن صاحب ہدایت اور صاحب بصیرت ہوتے ہوئے انہوں نے کیا کیا؟ کتاب الٰہی کو پس پشت ڈال دیا یعنی انسوں نے کتاب کا انکار کیا اور اس پر عمل کرنا چھوڑ دیا۔ انہوں نے کتاب اللہ کو اپنی فکر اور اپنی زندگی سے خارج کر دیا۔ یہاں قرآن کریم نے ان کے انکار اور بے عملی کے ذہنی مفہوم کو ایک خالص حسی انداز میں پیش فرمایا ہے۔ ذہنی مفہوم اب ایک معنویت کے دائرے سے نکل کر محسوسات کے دائرے میں آجاتا ہے۔ ان کے اس عمل کو ایک محسوس جسمانی حرکت سے تعبیر کیا گیا اور اس کی ایسی قبیح اور بدشکل تصویر کھینچی جاتی ہے کہ اس سے انکار و جحود ٹپکے پڑتے ہیں۔ اس تصور میں وہ نہایت ہی غلیظ القلب اور احمق نظر آتے ہیں۔ گستاخی اور گندگی اور ذلت کا مجسمہ نظر آتے ہیں۔ اس تصویر کشی سے انسانی تخیل ایک شدید حرکت کو دیکھتا ہے گویا کچھ ہاتھ حرکت میں آتے ہیں اور کتاب الٰہی کو پس پشت پھینک دیتے ہیں۔

ایسی کتاب کی تکذیب کے بعد جو خود اس دین کی تصدیق کر رہی تھی جو ان کے پاس موجود تھی' پھر کیا ہوا؟ غالباً انہوں نے اس ناقابل شکست سچائی کو قبول کر لیا ہو گا یا اس کے برعکس انہوں نے خود اس ہدایت ہی کا دامن تھام لیا ہو گا جس کی تصدیق یہ قرآن کریم بھی کر رہا تھا۔ اور وہ خود بھی اس پر ایمان لائے ہوئے تھے؟

ہرگز نہیں! نہ صرف یہ کہ انہوں نے ان میں سے کوئی ایک معقول روش اختیار نہیں کی بلکہ انہوں نے اللہ کی کتاب کو پس پشت ڈالا اور ایسی ناقابل فہم موہوم اعجوبوں اور دقیانوسی باتوں کے پیچھے پڑ گئے۔ جن کی کوئی حقیقت نہ تھی نہ وہ باتیں کسی یقینی اساس پر مبنی تھیں۔

وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ ۚ وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ ۚ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ ۭ وَمَا يُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰى يَقُوْلَآ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ ۭ فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ ۭ وَمَا هُمْ بِضَاۗرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ وَيَتَعَلَّمُوْنَ مَا يَضُرُّھُمْ وَلَا يَنْفَعُھُمْ ۭ وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ڜ وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَھُمْ ۭ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۲﴾ وَلَوْ اَنَّھُمْ اٰمَنُوْا وَ

اتَّقَوْا لَمَثُوبَةٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ خَيْرٌ ۚ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۞

۱۲ ع ۷ ۱۲

"اور لگے ان چیزوں کی پیروی کرنے جو شیاطین سلیمان کی سلطنت کا نام لے کر پیش کیا کرتے تھے۔ حالانکہ سلیمان نے کبھی کفر نہیں کیا۔ کفر کے مرتکب تو وہ شیاطین تھے جو لوگوں کو جادوگری کی تعلیم دیتے تھے نہ ہی یہ درست ہے کہ جادوگری کی تعلیم بابل کے دو فرشتوں ہاروت و ماروت پر نازل کی گئی تھی وہ (فرشتے تو آزمائش تھے) جب بھی کسی کو اس کی تعلیم دیتے تھے تو پہلے صاف طور پر متنبہ کر دیا کرتے تھے کہ دیکھ ہم محض ایک آزمائش ہیں تو کفر میں مبتلا نہ ہو۔" پھر بھی وہی لوگ ان سے وہ چیز سیکھتے تھے جس سے شوہر اور بیوی میں جدائی ڈال دیں۔ ظاہر تھا کہ اذن الٰہی کے بغیر وہ اس ذریعے سے کسی کو بھی ضرر نہ پہنچا سکتے تھے۔ مگر اس کے باوجود وہ ایسی چیز سیکھتے تھے جو خود ان کے لئے نفع بخش نہیں بلکہ نقصان دہ تھی۔ اور انہیں خوب معلوم تھا کہ جو اس چیز کا خریدار بنا اس کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں۔ کتنی بری متاع تھی جس کے بدلے انہوں نے اپنی جانوں کو بیچ ڈالا۔ کاش انہیں خبر ہوتی۔"

انہوں نے اللہ کی اس کتاب کو تو چھوڑ دیا جو خود اس ہدایت کی تصدیق بھی کر رہی تھی۔ جو ان کے پاس تھی اور ان باتوں کی پیروی شروع کر دی۔ جو شیاطین حضرت سلیمان علیہ السلام کے دور کی طرف منسوب کرتے تھے۔ یہ شیاطین حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرف غلط باتیں منسوب کیا کرتے تھے۔ یعنی یہ کہ وہ ایک عظیم جادوگر تھے اور انہوں نے جن جن چیزوں کو مسخر کر رکھا تھا وہ انہوں نے اس کالے علم کے ذریعے مسخر کر رکھی تھیں۔ قرآن کریم ان کے اس زعم باطل کی تردید کرتے ہوئے یہ کہتا ہے کہ حضرت سلیمان جادوگر نہ تھے۔ وَ مَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ "سلیمان نے کفر نہیں کیا۔" قرآن کریم گویا جادوگری کو کفر سمجھتا ہے۔ اس لئے حضرت سلیمان ﷤ سے اس کی نفی کر کے اور یہ بتا رہا ہے کہ جادوگری کا کام حضرت سلیمان ﷤ نہیں بلکہ شیاطین کیا کرتے تھے۔ وَ لٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ "کفر کے مرتکب تو وہ شیاطین تھے جو لوگوں کو جادوگری کی تعلیم دیتے تھے۔"

اس کے بعد قرآن کریم اس خیال کی تردید کرتا ہے کہ جادوگری کی تعلیم خود اللہ تعالیٰ نے بابل کے دو فرشتوں ہاروت اور ماروت پر نازل کی تھی۔ وَ مَآ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَ مَارُوْتَ "نہ ہی یہ بات درست ہے کہ جادوگری بابل میں ہاروت و ماروت نامی دو فرشتوں پر نازل کی گئی تھی۔"

معلوم ہوتا ہے کہ یہودیوں کے ہاں ان دو فرشتوں کے بارے میں کوئی قصہ خاصا مشہور تھا اور یہودی اور شیطان یہ کہتے تھے کہ دو فرشتے جادو کا علم رکھتے تھے۔ اور یہ علم وہ لوگوں کو بھی سکھاتے پھرتے تھے۔ ان کا یہ خیال بھی تھا کہ جادو کی یہ تعلیم ان پر اللہ تعالیٰ کی جانب سے نازل کی گئی تھی۔ قرآن کریم نے اس افتراء کی بھی تردید کر دی کہ سحر کی تعلیم بابل میں ان دو فرشتوں پر اللہ کی طرف سے نازل ہوئی تھی۔

البتہ یہاں قرآن کریم اس قصہ کی حقیقت کو واضح کر دیتا ہے کہ یہ دو فرشتے اللہ تعالیٰ کے حکیمانہ رازوں میں سے ایک راز تھے اور عوام الناس کے لئے انہیں بطور فتنہ اور آزمائش کے بھیجا گیا تھا۔ اور وہ ہر شخص جو ان کے پاس تعلیم سحر کے حصول کے لئے جاتا تھا وہ اسے کہہ دیتے تھے وَمَا يُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰى يَقُوْلَآ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ "وہ فرشتے جب بھی کسی کو اس کی تعلیم دیتے تھے تو پہلے صاف طور پر متنبہ کر دیا کرتے تھے دیکھ ہم محض ایک آزمائش ہیں تو کفر میں مبتلا نہ ہو۔"

یہاں قرآن کریم دوبارہ سحر کی تعلیم اور جادوگری کو کفر سے تعبیر کرتا ہے اور اس کے کفر ہونے کا اعلان دو فرشتوں ہاروت و ماروت کے ذریعہ کرایا جاتا ہے۔

قرآن کریم کہتا ہے کہ بعض لوگ ایسے تھے جو ان فرشتوں کے واضح تنبیہ کے باوجود اس بات پر مصر تھے کہ وہ ان سے سحر کی تعلیم

حاصل کریں۔ جب انہیں اصرار تھا کہ وہ اس فتنے کا شکار ہوں تو اللہ تعالیٰ نے بھی ان کے لئے یہ دروازہ کھول دیا۔ فَيَتَعَلَّمُونَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُونَ بِهِ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهِ "پھر بھی یہ لوگ ان سے وہ چیز سیکھتے تھے جس سے شوہر اور بیوی میں جدائی ڈال دیں۔

حالانکہ یہی شر تھا' اس سیاہ علم میں جس سے فرشتوں نے انہیں آگاہ کر دیا تھا لیکن قرآن کریم موقع و محل کی مناسبت سے یہاں اسلامی نظریۂ حیات کے ایک بنیادی اصول کی طرف مبذول کر دیتا ہے یہ کہ اس کائنات میں اللہ کی مشیئت اور اذن کے بغیر ایک پتا بھی حرکت نہیں کر سکتا۔ وَمَا هُمْ بِضَارِّينَ بِهِ مِنْ أَحَدٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ "یہ بات ظاہر تھی کہ اذن الٰہی کے بغیر وہ اس کے ذریعے کسی کو بھی ضرر نہ پہنچا سکتے تھے۔

یہ اللہ کی مشیئت اور اس کا اذن ہی ہے جس کی وجہ سے اسباب سے مسببات اور نتائج پیدا ہوتے ہیں۔ اسلامی نظریۂ حیات کا یہ نہایت ہی بنیادی اور اہم اصول اور عقیدہ ہے۔ اور ایک مومن کے دل و دماغ میں اسے اچھی طرح واضح اور جاگزین ہونا چاہئے۔ اس عقیدے کو پیش کرنے کا بہترین مقام بھی ایسا ہی ساحرانہ ماحول ہوتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ آپ اگر اپنا ہاتھ آگ میں ڈالیں گے تو وہ لازماً جل جائے گا' لیکن یہ جلنا اللہ کے حکم اور مشیت کے بغیر ممکن نہیں۔ اللہ ہی نے آگ میں جلانے اور آپ کے ہاتھ میں جلنے کی قابلیت رکھی ہے اور وہ جب چاہئے آگ اور ہاتھ دونوں سے یہ قابلیت سلب کر سکتا ہے۔ جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعہ میں ایسا عملاً ہوا بھی۔ یہی حال اس جادو کا بھی ہے جس کے ذریعے جادوگر میاں بیوی میں تفرقہ ڈالتے ہیں' اگر اللہ کی مشیئت نہ ہو تو وہ کوئی اثر نہیں کر سکتا۔ اگر اس کی حکمت اور مشیئت متقاضی نہ ہو' تو وہ جادو کی اس خاصیت کو کسی وقت بھی معطل کر سکتا ہے۔

یہی حال ہے ان تمام مؤثرات اور اسباب کا جو آج تک ہمارے علم میں آچکے ہیں۔ ان میں سے ہر سبب میں اللہ تعالیٰ نے ایک مخصوص خاصیت ودیعت کی ہے اور یہ خاصیت اللہ تعالیٰ کے اذن اور مشیئت سے کام کر رہی ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ نے ان اسباب کو یہ خصوصیات عطا کی ہیں' بعینہ اسی طرح وہ ان سے ان خاصیات کو سلب بھی کر سکتا ہے۔

اس کے بعد قرآن کریم اس چیز کی حقیقت بھی کھول کر بیان کر دیتا ہے' جس کی تعلیم وہ حاصل کرتے تھے۔ یعنی وہ جادو جس کے ذریعے وہ میاں اور بیوی کے درمیان تفرقہ ڈالتے تھے۔ قرآن حکیم بتاتا ہے کہ یہ کالا علم خود ان کے لئے بھی کوئی مفید چیز نہ تھی۔ وَيَتَعَلَّمُونَ مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ "مگر اس کے باوجود وہ ایسی چیز کو سیکھتے تھے' جو خود ان کے لئے نفع بخش نہیں بلکہ نقصان دہ تھی۔" جس فتنے میں وہ مبتلا ہو رہے تھے اس کا کفر ہونا ہی اس بات کے لئے کافی ثبوت تھا کہ وہ شر ہی شر ہے اور اس میں کوئی منفعت نہیں ہے۔

وَلَقَدْ عَلِمُوا لَمَنِ اشْتَرَاهُ مَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ "اور انہیں خوب معلوم تھا کہ جو اس چیز کا خریدار بنا اس کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں۔" اور جب کسی کو یہ معلوم ہوا کہ جو کچھ وہ کر رہا ہے' اس کے نتیجے میں وہ آخرت کی تمام بھلائیوں سے محروم ہو جائے گا اور پھر بھی وہ اس روش کو اختیار کرتا ہے' تو گویا وہ بالقصد اپنی آخرت کو خراب کر رہا ہے اور اپنے آپ کو آنے والے جہاں کی جملہ بھلائیوں سے محروم کر رہا ہے۔

یہ کیوں؟ تاکہ وہ اس چند روزہ زندگی میں مزے لوٹ لے۔ کیا ہی برا سودا ہے جو یہ لوگ کر رہے ہیں۔ حالانکہ وہ اس کی حقیقت سے اچھی طرح باخبر ہیں۔

وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهِ أَنْفُسَهُمْ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ "کتنی ہی بری متاع تھی جس کے بدلے میں انہوں نے جان کو بیچ

ڈالا! کاش انہیں معلوم ہوتا!"

وَلَوْ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَمَثُوْبَةٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ خَيْرٌ ۚ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ "اگر وہ ایمان اور تقویٰ اختیار کرتے تو اللہ کے ہاں اس کا جو بدلہ ملتا' وہ ان کے لئے زیادہ بہتر تھا' کاش انہیں خبر ہوتی!"

یہ بات تو ان لوگوں پر بھی صادق آتی ہے جو بابل میں ہاروت اور ماروت سے جادو سیکھتے تھے' ان پر بھی صادق آتی ہے جو ان باتوں کی پیروی کرتے تھے جنہیں شیاطین حضرت سلیمان علیہ السلام کی سلطنت کا نام لے کر پیش کرتے تھے اور یہ لوگ یہودی تھے جنہوں نے اللہ کی کتاب کو توپس پشت ڈال دیا اور ان خرافات اور مذموما ت کی پابندی اپنے اوپر لازم کر دی۔

یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس جادو کی حقیقت پر بھی قدرے روشنی ڈال دی جائے جس کے پیچھے یہ یہودی پڑ گئے تھے اور جس کے ذریعے یہ لوگ میاں اور بیوی میں ناچاقی پیدا کرتے تھے اور اس کی وجہ سے انہوں نے کتاب الٰہی تک کو پس پشت ڈال دیا تھا۔

یہ بات ہمارے دور میں بھی بارہا مشاہدے میں آتی رہتی ہے کہ بعض لوگ اپنے اندر ایسے معجزانہ خصائص رکھتے ہیں کہ سائنس آج تک ان کی کوئی علمی توجیہہ نہیں کر سکتی۔ ایسے عجائبات کے لئے لوگوں نے ' مختلف نام تو تجویز کر رکھے ہیں' تاہم ان کی حقیقت کا تعین ابھی تک نہیں کیا جا سکا۔ اور ابھی تک وہ عجوبہ ہی ہیں۔ مثلاً ٹیلی پیتھی یعنی دور سے خیالات کا اخذ کرنا' اس کی حقیقت کیا ہے؟ یہ کیونکر ممکن ہے کہ ایک آدمی ایک ایسے فاصلے سے' جہاں تک نہ اس کی نظر پہنچتی ہے اور نہ آواز' ایک آدمی کو بلاتا ہے اور اس سے خیالات اخذ کرتا ہے اور ان دونوں کے درمیان طویل فاصلے حائل نہیں ہوتے۔

پھر مقناطیسی تنویم کا عمل بھی قابل غور ہے۔ یہ کیونکر ممکن ہو جاتا ہے۔ ایک ارادہ دوسرے پر ناقابل ادراک طریقے سے استیلاء حاصل کر لیتا ہے اور ایک فکر دوسری فکر کے ساتھ کس طرح مطابقت اختیار کر لیتی ہے کہ ایک دوسرے کی طرف خیالات منتقل کرتی چلی جاتی ہے اور دوسری اس سے اخذ کرتی چلی جاتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا متاثر شخص ایک کھلی کتاب پڑھ رہا ہے۔

آج تک سائنس اس سلسلے میں جو کچھ کر سکی ہے وہ صرف یہ ہے کہ اس نے ان حقائق کا اعتراف کر کے ان کے لئے کچھ نام تجویز کر لئے ہیں لیکن سائنس آج تک اس بات کا جواب نہیں دے سکی کہ ان کی حقیقت کیا ہے؟ نیز سائنس کے پاس اس کا جواب نہیں ہے کہ یہ عمل کیسے مکمل ہوتا ہے؟

ان حقائق کے علاوہ بھی بعض ایسی چیزیں ہیں جن کے تسلیم کرنے میں سائنس کو ابھی تامل ہے۔ یا تو اس لئے کہ ابھی تک ان کے بارے میں اس قدر مشاہدات جمع نہیں ہوئے جن کی بنا پر سائنس انہیں تسلیم کر لے اور یا ابھی تک سائنس کو ادراک کے وہ ذرائع حاصل نہیں ہوئے جن کے ذریعے وہ اس میدان میں کوئی تجربہ کر سکے۔ خود سچے خوابوں کا معاملہ بھی بڑا عجیب ہے۔ فرائڈ جو ہر روحانی قوت کا بڑی شدت سے انکار کرتا ہے' وہ بھی ان کا انکار نہیں کر سکا۔ خواب کے ذریعے ہمیں' مستقبل کی تاریکیوں میں ہونے والے واقعات کا اشارہ کیسے مل جاتا ہے؟ اور پھر طویل عرصہ نہیں گزرتا کہ وہ اشارہ واقعات کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ یہی معاملہ انسان کے ان خفیہ احساسات کا ہے' جن کا ابھی تک وہ کوئی نام بھی تجویز نہیں کر سکا۔ بعض اوقات انسان یہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ کچھ ہونے والا ہے؟ یا کوئی آنے والا ہے؟ اور اس کے بعد یہ متوقع امر کسی نہ کسی صورت میں وقوع پذیر ہو جاتا ہے۔

لہٰذا یہ محض ہٹ دھرمی ہے کہ انسان محض بے تکلفی میں ان نامعلوم حقائق کا انکار کر دے' صرف اس لئے کہ سائنس کی رسائی ابھی ایسے وسائل تک نہیں ہو سکی جن کے ذریعے وہ اس میدان میں کوئی تجربہ کر سکے۔

اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ انسان دنیا کے تمام خرافات کو بے چون وچرا مانتا چلا جائے' ہر فسانے پر ایمان لاتا چلا جائے' بلکہ صحیح

اور معتدل روش یہ ہے کہ ایسے نامعلوم حقائق کے بارے میں انسان ایک لچک دار اور معتدل موقف اختیار کرے۔ نہ تو سو فیصدی ان کا انکار کرنا درست ہے اور نہ ہی بے چون و چرا تسلیم کرلینا معقول ہے۔ اس درمیانی روش کا نتیجہ یہ ہوگا کہ انسان کو علم و ادراک کے جو ابتدائی ذرائع اس وقت حاصل ہیں جب ان میں انسان مزید ترقی کرے گا تو اس کے لئے ایسے حقائق کا معلوم کرلینا ممکن ہو جائے گا۔ لہٰذا انسان کو یہ تسلیم کرلینا چاہئے کہ اس کا علم محدود ہے۔ اور بعض حقائق ایسے بھی ہیں جو اس کے حیطۂ ادراک سے باہر ہیں۔ اسے اپنی حدود کو پہچاننا چاہئے اور نامعلوم حقائق کا بھی کچھ لحاظ رکھنا چاہئے۔

جادوگری کی نوعیت بھی کچھ ایسی ہی ہے۔ شیاطین کی جانب سے جو القاء بدکردار لوگوں کو ہوتا ہے' وہ بھی فوق الادراک امور میں سے ہے۔ اس کی متعدد شکلوں میں سے ایک یہ ہے کہ جادوگر انسانوں کے حواس اور خیالات پر اثر انداز ہونے کی قدرت رکھتا ہے۔ کبھی اس کا اثر ٹھوس چیزوں اور اجسام پر بھی ہوتا ہے۔ البتہ قرآن کریم میں فرعون کے جادوگروں کی جس سحرکاری کا ذکر ہے' وہ محض نظربندی اور نظرفریبی ہی تھی' دراصل اس سے کسی چیز کی حقیقت میں کوئی تبدیلی واقع نہ ہوتی تھی۔

يُخَيَّلُ إِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ أَنَّهَا تَسْعَىٰ "ان کی جادوگری کی وجہ سے' اس کو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا وہ چل رہی ہیں۔" ہو سکتا ہے کہ وہ لوگ اپنی جادوگری کے ایسے اثرات استعمال کر کے میاں بیوی اور دوست اور دوست کے تفریق ڈالتے ہوں' کیونکہ جب انسان کسی چیز سے متاثر ہوتا ہے' اس انفعال کی مطابقت میں اس سے بعض حرکات سرزد ہو جاتی ہیں۔ لیکن جیسا کہ کہا گیا وسائل و اسباب اور ان کے نتائج اور مسببات کا سلسلہ اللہ تعالیٰ کے اذن کے سوا کام نہیں کرسکتا۔

قدرتی طور پر یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ دو فرشتے ہاروت و ماروت کون تھے؟ اور تاریخ کے کس دور میں وہ بابل میں گزرے ہیں؟ اس سوال کی تشریح قرآن نے اس لئے ضروری نہیں سمجھی کہ ان فرشتوں کا قصہ یہودیوں کے درمیان عام طور پر معروف تھا۔ اور جب قرآن کریم نے انہیں یہ قصہ سنایا تو انہوں نے اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ کئی ایسے واقعات جو اس وقت قرآن کریم کے مخاطبین کے ہاں مشہور و معروف تھے۔ انہیں قرآن کریم نے اجمال کے ساتھ بیان کیا ہے۔ کیونکہ قرآن کریم کا مقصد صرف اشارے ہی سے پورا ہو جاتا تھا اور قصہ گوئی قرآن کے پیش نظر تھی ہی نہیں۔

فی ظلال القرآن میں' ہم وہ تمام تفصیلات اور رطب و یابس روایات درج کرنا نہیں چاہتے' جو ان فرشتوں کے بارے میں مشہور ہیں۔ کیونکہ تفاسیر میں ان کے بارے میں جو مواد پایا جاتا ہے' یا جو روایات منقول ہیں ان میں کوئی روایت ثقہ نہیں ہے۔

انسانیت اپنی طویل ترین تاریخ میں متعدد آزمائشوں اور ابتلاؤں سے دوچار ہوتی رہی ہے' یہ آزمائشیں اور ابتلائیں' مختلف ادوار میں انسانیت کی ذہنی سطح اور اس وقت کے ماحول کی مناسبت سے مختلف نوعیت اختیار کرتی رہی ہیں۔ اب یہ آزمائش اگر کسی وقت دو فرشتوں کی صورت میں یا دو فرشتہ سیرت انسانوں کی صورت میں آئی ہے تو یہ کوئی تعجب انگیز اور انوکھی بات نہیں ہے۔ کیونکہ انسانیت پر جو آزمائشیں آتی رہی ہیں وہ کئی قسم کی عجیب و غریب اور خارق العادۃ بھی ہوتی رہی ہیں' بالخصوص اس دور میں جبکہ انسانیت فکر و ادراک کی دنیا میں ترقی کی ابتدائی منازل طے کررہی تھی اور وہم و جہالت کی تاریک رات میں سماوی روشنی کے پیچھے پیچھے چل رہی تھی۔

نیز ان آیات میں جو محکم اور واضح ہدایات دی گئی ہیں ہمارے لئے وہی کافی ہیں۔ اور اگر کوئی چیز متشابہ اور ناقابل فہم ہے تو اس کے پیچھے پڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بالخصوص اب جبکہ ہم اس ماحول سے بہت دور جا نکلے ہیں۔ جہاں ایسے واقعات پیش آئے تھے۔ بس ہمارے لئے یہی جان لینا کافی ہے کہ بنی اسرائیل جادوگری اور دوسری موہوم اور لایعنی باتوں کے پیچھے پڑ کر گمراہ ہو گئے تھے۔ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی سچی اور یقینی ہدایات کو پس پشت ڈال دیا تھا' اور یہ کہ عمل سحر ایک کفریہ عمل ہے۔ اور جو لوگ ایسے اعمال کریں گے ان کے لئے

دار آخرت میں کوئی حصہ نہ ہو گا۔اور وہ ان تمام بھلائیوں اور خیرات سے محروم ہو جائیں گے جو ان کے لئے وہاں اللہ تعالیٰ کی جانب سے تیار کی گئی ہیں۔

☆ ☆ ☆ ☆

درس ۶ ایک نظر میں

اس سبق میں یہودی سازشوں اور اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ان کی ریشہ دوانیوں کو مزید کھولا جاتا ہے۔ اسلامی جماعت کو ان کی چالوں اور حیلوں سے خبردار کیا جاتا ہے جو یہودی اسلام کے خلاف استعمال کرتے تھے۔ نیز بتایا جاتا ہے کہ ان کے دلوں میں مسلمانوں کے خلاف کس قدر بغض اور حسد پایا جاتا ہے اور وہ امت مسلمہ کو نقصان پہنچانے اور ان کے خلاف سازشیں تیار کرنے میں کس طرح رات دن مصروف عمل ہیں۔ اس لئے مسلمانوں کو اپنی بول چال اور اپنے طرز عمل میں ان دشمنان اسلام 'کفار اہل کتاب کے ساتھ ہر قسم کا تشبہ کرنے سے روکا جاتا ہے۔ مسلمانوں کو یہودیوں کے اقوال اور افعال اور پالیسیوں کے حقیقی اسباب بتائے جاتے ہیں۔ مسلمانوں کے اتحاد اور یکجہتی کے خلاف وہ جو سازشیں' جو فتنہ انگیزیاں اور جو فریب کاریاں کر رہے تھے' انہیں واضح طور پر بیان کیا جاتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہودیوں نے اسلامی معاشرے کی تشکیل جدید اور نئے حالات اور تقاضوں کے مطابق بعض شرعی احکامات اور تکالیف میں رد و بدل اور نسخ جیسے مسائل کی آڑ لے کر مکروہ پروپیگنڈے کا طوفان برپا کیا تھا۔ انہوں نے جو گہری سازش مرتب کی تھی اس کے ذریعے وہ ان احکامات اور تکالیف کے منبع یعنی ذات باری تعالیٰ اور اس کی جانب سے وحی الٰہی کے نزول کی بابت مسلمانوں کے دلوں میں شکوک و شبہات پیدا کرنا چاہتے تھے۔ وہ مسلمانوں سے کہتے تھے "اگر یہ وحی من جانب اللہ ہوتی تو سابقہ احکامات میں رد و بدل اور انہیں منسوخ کرنے کی ضرورت ہی پیش نہ آتی۔"

یہودی پہلے بھی ایسے پروپیگنڈے کرتے رہتے تھے لیکن جب ہجرت نبوی ﷺ کے ۱۶ مہینے بعد تحویل قبلہ کا حکم نازل ہوا تو ان لوگوں نے اسلام کے خلاف پروپیگنڈے کا ایک عظیم طوفان برپا کر دیا۔ ہجرت کے بعد ایک عرصے تک نبی صلی اللہ علیہ وسلم' یہودیوں کے قبلہ "بیت المقدس" ہی کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے رہے اور اس امر سے یہودی یہ استدلال کرتے تھے کہ بس قبلہ حق اور دین حق تو انہی کا دین اور قبلہ ہیں لہٰذا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دلی خواہش یہ تھی کہ مسلمانوں کا قبلہ بیت المقدس سے تبدیل ہو کر 'بیت الحرام ہو جائے۔ البتہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی اس کا اظہار نہ کیا تھا لیکن اس پورے عرصے میں یہ خواہش بدستور آپ کے دل میں موجود رہی اور اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اس خواہش کے مطابق آپ ﷺ کے پسندیدہ قبلہ ہی کو مسلمانوں کا قبلہ بنا دیا جیسا کہ آئندہ صفحات میں تفصیلات مذکور ہیں۔ بنی اسرائیل چونکہ اس بات کو اچھی طرح محسوس کر رہے تھے کہ تحویل قبلہ کے نتیجہ میں اسلام کے مقابلے میں ان کے دین کی ایک ظاہری برتری بھی ختم ہو جائے گی۔ اور آئندہ وہ اسے اپنے دین کی برتری کے لئے بطور دلیل استعمال نہ کر سکیں گے لہٰذا اس مرحلے پر انہوں نے اسلامی صفوں میں انتشار پھیلانے اور وحی الٰہی کے من جانب اللہ نزول کے بارے میں اہل ایمان کے عقائد کے اندر شکوک و شبہات پیدا کرنے کی خاطر زبردست پروپیگنڈہ شروع کر دیا۔ ان کی یہ سازش اس قدر گہری تھی کہ اس میں انہوں نے مسلمانوں کے بنیادی عقیدے اور قرآن کے من جانب اللہ ہونے پر کلہاڑا چلانے کی کوشش کی تھی۔ وہ مسلمانوں سے جو کچھ کہتے تھے اس کا خلاصہ یہ تھا "اگر بیت المقدس کی طرف چہرے کر کے نماز پڑھنا باطل اور خلاف حق تھا تو ۱۶ ماہ تک تمہاری تمام نمازیں ضائع ہو گئیں۔ اور اگر یہ فعل برحق تھا تو پھر تبدیلی کیوں ہوئی؟ مقصد یہ تھا کہ اب تک انہوں نے جو نمازیں ادا کیں اس کا انہیں کوئی ثواب نہ ملے گا اور یہ کہ حضرت نبی کریم ﷺ کی قیادت کوئی حکیمانہ قیادت نہیں ہے۔ (نعوذ باللہ)

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بعض مسلمانوں پر اس پروپیگنڈے کے برے اثرات بھی پڑنے لگے تھے۔ اس لئے وہ نہایت ... اور بے

چینی سے اس کے متعلق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوالات بھی کرنے لگے تھے۔ کیونکہ یہ واقعہ اس قدر غیر معمولی تھا اور دلوں میں اس قدر خلش پیدا ہوگئی کہ اس کے ہوتے ہوئے اسلامی قیادت پر اطمینان کی فضا قائم نہیں رہ سکتی تھی۔ نہ اسلامی عقائد کے منبع و ماخذ پر مکمل اعتماد رہ سکتا تھا۔ اس لئے مسلمان بھی اسس کی حکمت اور اس کے بارے میں اطمینان بخش دلائل پوچھنے لگے تھے۔ یہ تھی وہ فضا جس میں قرآن کریم کی یہ آیات نازل ہوئیں۔ ان میں بتایا گیا کہ احکامات میں نسخ ایک گہری حکمت پر مبنی ہوتی ہے۔ اس کے ذریعے اللہ تعالیٰ مسلمانوں کے لئے زیادہ بہتر احکامات نازل فرماتے ہیں۔ ایسے احکامات جو نئے حالات میں مسلمانوں کے لئے زیادہ مفید ہیں۔ کیونکہ اللہ ہی جانتا ہے کہ کن حالات میں کیا حکم بہتر ہے۔ ساتھ ہی مسلمانوں کو اس امر سے بھی خبردار کر دیا جاتا ہے کہ یہودیوں کا اصل مقصد اور کوشش صرف یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کو ایمان لانے کے بعد دوبارہ کافر بنا کے چھوڑیں کیونکہ ان کو یہ حسد کھائے جا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے وحی الٰہی جیسا فضل و کرم اور اعزاز عظیم مسلمانوں کو کیوں بخشا ہے؟ کیونکہ اللہ نے اپنی آخری کتاب مسلمانوں پر نازل کر دی ہے اور ان کے مقابلے میں یہ عظیم ذمہ داری کیوں ان کے سپرد کر دی ہے۔ قرآن کریم یہاں اس بات کو کھول کر بیان کرتا ہے کہ یہودیوں کی ان تمام فتنہ سامانیوں کے پیچھے کون سا خفیہ مقصد کام کر رہا ہے۔ اس موقع پر قرآن کریم ان کے اس جھوٹے دعوے کا بھی مضحکہ اڑاتا ہے کہ جنت تو صرف ان کے لئے مخصوص ہے۔ قرآن کریم ان کی آپس کی الزام تراشیوں کو بھی نقل کر دیتا ہے کہ یہودی کہتے ہیں "نصرانیوں کے دین کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔" اور نصرانی کہتے ہیں "یہودیوں کے دین کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔" اور مشرکین آگے بڑھ کر یہ دعویٰ کرتے ہیں "دونوں باطل پر ہیں۔"

قرآن کریم تحویل قبلہ کے معاملے میں ان کی بدنیتی اور خفیہ سازشوں کے راز کو یوں کھولتا ہے کہ بیت اللہ تو روئے زمین پر اللہ کی پہلی عبادت گاہ ہے اور اس کی طرف چہرہ کر کے نماز پڑھنے سے لوگوں کو روک کر یہودی اللہ کی مساجد اور عبادت گاہوں کو خراب کرنے کے لئے ایسے جرم کے مرتکب ہو رہے ہیں جو خود ان کے نزدیک بھی بہت بڑا جرم ہے۔

غرض اس پورے سبق میں یہی مضمون آخر تک بیان کیا گیا ہے اور آخر میں مسلمانوں کے سامنے یہودیوں اور نصرانیوں کے اس مقصد کو واضح طور پر رکھ دیا گیا ہے۔ جو ان تمام کارروائیوں سے ان کے پیش نظر ہوتا ہے۔ یعنی مسلمانوں کو اپنے اس دین حق سے پھیر کر اپنے دین پر لے آنا۔ قرآن کہتا ہے کہ اہل کتاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس وقت تک راضی نہیں ہو سکتے جب تک آپ ؐ ان کی ملت کے پیرو نہ بن جائیں۔ جب تک آپ ان کی یہ آرزو پوری نہ کریں گے' وہ مکر و فریب اور جھوٹے پروپیگنڈے کی اس جنگ کو آخری وقت تک جاری رکھیں گے۔ ان کی تمام فتنہ انگیزیوں' فریب کاریوں اور ان کی جانب سے پیش کئے جانے والے تمام کھوکھلے دلائل کے پس پشت بس یہی ایک مقصد کارفرما ہے۔

☆ ☆ ☆ ☆

درس ۶ تشریح آیات (۱۰۴ تا ۱۲۳)

اس سبق کے شروع میں روئے سخن "ان لوگوں کی طرف ہے جو ایمان لا چکے ہیں۔" مقصد یہ ہے کہ دوسرے لوگوں سے ان مابہ الامتیاز کی صفت ایمان ہے۔ یہی صفت ہے جس کی وجہ سے ایک طرف تو وہ اپنے نبی سے مربوط ہیں اور دوسری طرف اپنے پروردگار سے منسلک ہیں۔ اور یہی صفت ہے کہ جس کے ساتھ اگر انہیں پکارا جائے تو اس کی وجہ سے ان کے دل متوجہ ہو جاتے ہیں۔ اور وہ ہر پکار پر لبیک کہنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔

اس صفت سے انہیں پکار کر اللہ تعالیٰ انہیں ہدایت دیتے ہیں کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مخاطب ہوتے وقت "راعنا" کا لفظ استعمال نہ کریں۔ بلکہ "انظرنا" کا کیونکہ انظرنا (ہماری رعایت کیجئے) کے بھی وہی معنی ہیں۔ صفت ایمان کے ساتھ اپیل کرتے ہوئے قرآن کریم انہیں سمع اور طاعت اختیار کرنے کا حکم دیتا ہے اور کافروں کے برے ٹھکانے اور برے انجام یعنی عذاب الیم سے انہیں ڈراتا ہے۔

☆☆☆☆☆ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَ قُوْلُوا انْظُرْنَا وَ اسْمَعُوْا ۭ وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۰۴﴾

"اے ایمان والو! راعنا نہ کہا کرو، بلکہ انظرنا کہو، اور توجہ سے سنو اور یہ کافر عذاب الیم کے مستحق ہیں۔"

لفظ "راعنا" کے استعمال سے ممانعت کا سبب مفسرین نے یہ بتایا ہے کہ بعض احمق یہودی اس لفظ کو یوں ادا کرتے تھے کہ یہ مصدر "رعایت" کے بجائے مصدر "رعونت" کا مشتق معلوم ہوتا تھا۔ یہ لوگ یوں نبی کریم ﷺ کی توہین کرکے اور آپ ﷺ کی شان میں گستاخی کرکے دل کی بھڑاس نکالنے کی کوشش کرتے تھے۔ ان میں یہ جرأت تو تھی نہیں کہ اعلانیہ کھل کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کچھ کہہ سکیں۔ اس لئے یہودیوں کے بعض کمینے اور ذلیل لوگ یوں لفظی ہیرپھیر سے آپ کے حق میں بدزبانی کرنے کی سعی کرتے تھے۔ اس لئے مؤمنین کو یہ حکم دیا گیا کہ وہ سرے سے وہ الفاظ استعمال نہ کریں، جسے یہودی اس ذلیل مقصد کے لئے استعمال کر رہے تھے تاکہ ان کی کمینگی کا دروازہ ہی بند ہو جائے۔

نبی ﷺ کی شان میں گستاخی کرنے کے لئے یہودیوں کی جانب سے ایسے ذلیلانہ ہتھکنڈوں کا استعمال اس امر کو اچھی طرح ظاہر کر دیتا ہے کہ ان بدبختوں کو نبی کریم ﷺ اور آپ ﷺ کی تحریک سے کس قدر بغض تھا۔ اور کس طرح وہ آپ کے خلاف ہر گھٹیا حربہ استعمال کرنے کے لئے تیار رہتے تھے، اور اس سلسلے میں کسی موقع کو بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے۔ نیز ایسے موقع پر وحی الٰہی کے ذریعے ایسے الفاظ کے استعمال کی ممانعت کر دینے سے یہ بات بھی ظاہر ہو جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر وقت اپنے نبی اور تحریک اسلامی کے نگہبان تھے اور ان کے مکار دشمنوں کی سازشوں اور مکاریوں کا دفعیہ فرما دیتے تھے۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو متنبہ کرتے ہیں کہ ان لوگوں کے دلوں میں مسلمانوں کے خلاف کس قدر بغض اور کینہ بھرا ہوا ہے۔ کیونکہ یہ ہر وقت مسلمانوں کی عداوت اور ایذا رسانی پر کمربستہ ہیں۔ یہ سب کچھ وہ محض اس لئے کر رہے ہیں کہ کیوں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اپنے اس مخصوص فضل و کرم سے نوازا۔ یہ تفصیلات اللہ تعالیٰ نے اس لئے بیان کیں کہ مسلمان اپنے دشمنوں سے محتاط ہو

جائیں اور جس ایمان کی وجہ سے ان کے دشمنوں کے دل جل اٹھے ہیں' اس پر اور جم جائیں۔ اور اللہ تعالیٰ نے ان پر جو خصوصی فضل فرمایا ہے اس کا شکریہ ادا کریں۔ اس کی حفاظت کریں۔

مَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَلَا الْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ خَيْرٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴿۱۰۵﴾

"یہ لوگ جنہوں نے دعوت حق کو قبول کرنے سے انکار کر دیا' خواہ اہل کتاب میں سے ہوں یا مشرک ہوں' ہرگز یہ پسند نہیں کرتے کہ تمہارے رب کی طرف سے تم پر کوئی بھلائی نازل ہو مگر اللہ جس کو چاہتا ہے اپنی رحمت کے لئے چن لیتا ہے۔ اور وہ بڑا فضل فرمانے والا ہے۔"

اللہ تعالیٰ یہاں اہل کتاب اور مشرکین دونوں کو کافروں کے زمرے میں داخل فرماتے ہیں۔ کیونکہ یہ دونوں طبقے نبی آخر الزمان کی رسالت کے منکر تھے' لہٰذا اس پہلو سے وہ دونوں ایک حیثیت رکھتے ہیں اور دونوں کے دل مسلمانوں کے حسد اور بغض سے بھرے ہوتے ہیں' دونوں یہ نہیں چاہتے کہ مسلمانوں کو کوئی بھلائی نصیب ہو۔ وہ مسلمانوں کی جس چیز سے بہت جل بھن گئے ہیں وہ ان کا دین ہے۔ ان کو یہ بات کھلتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں چھوڑ کر اس بھلائی کے لئے مسلمانوں کو کیوں منتخب فرمایا۔ ان پر قرآن کی صورت میں وحی الٰہی کیوں نازل ہوئی' انہیں اس انعام واکرام سے کیوں نوازا گیا۔ اور کائنات کی عظیم ترین امانت یعنی اسلامی نظریۂ حیات کا محافظ مسلمانوں کو کیوں قرار دیا گیا۔

اس سے پہلے بیان ہو چکا ہے کہ یہ لوگ اس بات کے ہرگز روادار نہیں تھے کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے کسی اور بندے کو بھی نوازے۔ اس سلسلے میں ان کی تنگ دلی اس حد کو جا پہنچی ہے کہ نبی ﷺ پر پیغام وحی لے کر آنے کی وجہ سے یہ لوگ حضرت جبریل علیہ السلام کے بھی دشمن ہو گئے۔ حالانکہ وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ "اللہ جس کو چاہتا ہے اپنی رحمت کے لئے چن لیتا ہے۔" نیز صرف اللہ ہی اس بات کو جانتا ہے کہ اس کی اس امانت ورسالت کا بہترین مہبط کہاں ہے؟ اب اگر اللہ تعالیٰ نے یہ پیغام حضرت محمد ﷺ پر اتارا ہے اور مسلمان اس پر ایمان لائے ہیں تو اللہ کے علم میں یہ بات موجود تھی کہ حضور اکرم ﷺ اور مؤمنین اس بار امانت کے اٹھانے کے اہل ہیں وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ O "اور وہ بڑا فضل فرمانے والا ہے۔"

نبوت اور رسالت کی نعمت سے کوئی بڑی نعمت نہیں ہے' اور دولت ایمان سے بڑی دولت کوئی نہیں ہے اور دعوت اسلامی کے اعزاز سے کوئی بڑا اعزاز نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو یہاں یہ احساس دلانا چاہتا ہے اور ان کے اندر یہ شعور اجاگر کرنا چاہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر ایک عظیم احسان اور فضل وکرم کیا ہے۔ اس سے پہلے مسلمانوں کو یہ تصور دلایا گیا تھا کہ مسلمانوں پر اللہ کے ان احسانات کی وجہ سے کفار کے دل کینہ اور حسد سے جل بھن گئے ہیں۔ لہٰذا انہیں ان سے چوکنا رہنا چاہئے۔ اس کا مقصد بھی یہی تھا کہ مسلمان ان سے محتاط رہیں اور یہودی سازشوں کے مقابلے میں ان کا شعور تیز رہے۔ یہودیوں کی اس وسوسہ اندازی اور تشکیک کے مقابلے میں مسلمانوں کے اندر اس قسم کے احساس اور شعور کو بیدار کرنا ضروری تھا کیونکہ یہ لوگ اس وقت بھی اور اس کے بعد آج تک مسلمانوں کے دل ودماغ میں سے اس نظریۂ حیات پر ایمان کو کمزور کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ دولت ایمان ہی تھی جس کی وجہ سے وہ مسلمانوں کے ساتھ حسد کرتے تھے۔ کیونکہ اس کی وجہ سے مسلمان ان سے ممتاز اور برتر ہو گئے تھے۔

جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا۔ یہودیوں کے اس حملے کا آغاز قرآن کریم کی بعض آیات اور احکامات کی تنسیخ سے ہوا تھا۔ بالخصوص جب بیت المقدس سے خانہ کعبہ کی طرف قبلے کی تحویل کا حکم نازل ہوا۔ یہ واقعہ ایسا تھا جس کی وجہ سے یہودی اپنے دعوائے برتری کے اہم ثبوت سے محروم ہو گئے تھے اور انہوں نے یہ مذموم پروپیگنڈا تیز تر کر دیا تھا۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے فرمایا!

مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا ؕ

"ہم اپنی جس آیت کو منسوخ کر دیتے ہیں یا بھلا دیتے ہیں اس کی جگہ اس سے بہتر لاتے ہیں یا کم از کم ویسی ہی۔"

یہ آیات تحویل قبلہ کے موقعہ پر نازل ہوئی ہیں' جیسا کہ ان آیات کے بعد سیاق کلام سے بھی معلوم ہوتا ہے۔ یا اس سے مراد وہ جزوی تبدیلیاں ہوں جو جماعت مسلمہ کی ہدایت کے لئے مختلف حالات میں احکامات قرآنی اور ہدایات الٰہی میں کی جا رہی تھیں یا اس سے مراد قرآن کریم کی وہ مجموعی تبدیلیاں ہوں جو تورات و انجیل کے مقابلے میں قرآن نے کیں حالانکہ مجموعی لحاظ سے قرآن نے ان کتابوں کو کتب برحق کہا تھا۔ ان میں سے کوئی ایک مراد ہو یا تینوں مراد ہوں جنہیں یہودیوں نے اس وقت تحریک اسلامی کے خلاف پروپیگنڈے اور مسلمانوں کے اندر شبہات پھیلانے کی خاطر استعمال کیا تھا اور اسلام کے مرکزی عقاید پر حملے شروع کر دیئے تھے۔ بہرحال مراد جو بھی ہو قرآن کریم اس موقع پر احکامات میں تبدیلی اور نسخ کے بارے میں واضح ہدایات دے دیتا ہے۔ اور یہودیوں کی ان تمام وسوسہ اندازیوں اور نکتہ چینیوں کا خاتمہ کر دیتا ہے جو وہ حسب عادت مختلف طریقوں سے' اسلامی نظریۂ حیات کے خلاف کرتے رہتے تھے۔

قرآن کریم کہتا ہے کہ زمانۂ رسالت کے دوران ہدایات و احکامات میں جزوی تبدیلی خود انسانوں کی بھلائی کے لئے کی جاتی ہے۔ اور ہر تبدیلی بدلے ہوئے حالات میں انسانیت کی بہتری ہی کے لئے کی جاتی ہے کیونکہ اللہ ہی انسانوں کا خالق ہے۔ اسی نے رسول بھیجے ہیں۔ وہی ان احکامات کا نازل کرنے والا ہے اور یہ سب کچھ اس کے مقررہ پروگرام کے مطابق ہوتا ہے۔ چنانچہ جب اللہ تعالیٰ کسی آیت کو منسوخ کر دیتا ہے یا بھلا دیتا ہے۔ آیت سے مراد پڑھی جانے والی آیات قرآن ہو جو احکامات پر مشتمل ہوتی ہے۔ یا اس سے مراد علامت یا طبعی معجزات اور خارق عادات واقعات ہوں جن کا صدور مختلف حالات میں پیغمبروں کے ہاتھوں ہوا کرتا تھا۔ اور بعد میں یہ آیات و معجزات لپیٹ لئے جاتے تھے۔ جو بھی مراد ہو' اللہ تعالیٰ اس کی جگہ اس سے بہتر لے آتا ہے۔ اور وہ ہر چیز کا مالک ہے' وہ کسی چیز کے معاملے میں بے بس نہیں ہے۔ زمین و آسمان کے تمام امور اس کے دست قدرت میں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿١٠٦﴾ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿١٠٧﴾

"کیا تم جانتے نہیں ہو کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ کیا تمہیں خبر نہیں ہے کہ زمین و آسمان کی فرماں روائی اللہ ہی کے لئے ہے اور اس کے سوا کوئی تمہاری خبرگیری کرنے والا اور تمہاری مدد کرنے والا نہیں ہے۔"

جن الفاظ میں مسلمانوں کو مخاطب کیا گیا ہے کہ "تمہاری خبرگیری کرنے والا اور تمہاری مدد کرنے والا کوئی نہیں ہے۔" ان سے یہ احساس ہوتا ہے کہ ان سے بیک وقت تنبیہہ اور تذکیر مطلوب ہے۔ غالباً تنبیہہ کا انداز اس لئے اختیار کیا گیا ہے کہ بعض لوگ یہودیوں کے اس گمراہ کن پروپیگنڈے سے متاثر ہو گئے تھے۔ اور ان کی جانب سے پیدا کردہ شرانگیزی سے مرعوب ہو کر وہ نبی ﷺ سے ایسے

سوالات کرنے لگے تھے' جو مکمل اعتماد اور پختہ یقین سے میل نہ کھاتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف سے ایسے سوالات کو ناپسند کیا اور واضح طور پر انہیں تنبیہہ کی۔

أَمْ تُرِيدُونَ أَنْ تَسْأَلُوا رَسُولَكُمْ كَمَا سُئِلَ مُوسَىٰ مِنْ قَبْلُ ۗ وَمَنْ يَتَبَدَّلِ الْكُفْرَ بِالْإِيمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَاءَ السَّبِيلِ ﴿١٠٨﴾

"پھر کیا تم اپنے رسول سے اس قسم کے سوالات اور مطالبے کرنا چاہتے ہو' جیسے اس سے پہلے موسیٰ سے کیے جا چکے ہیں؟ حالانکہ جس شخص نے ایمان کی روش کو کفر کی روش سے بدل لیا وہ راہ راست سے بھٹک گیا۔"

اللہ مؤمنین کو متنبہ کرتا ہے کہ وہ حضرت موسیٰ کی قوم کی طرح کج بحثی میں نہ پڑیں اور اپنے پیغمبر سے خواہ مخواہ دلائل نہ پوچھیں اور نہ ہی خارق عادت باتوں کا مطالبہ کریں۔ جس طرح بنی اسرائیل نے یہ حرکت اپنے نبی کو تنگ کرنے کے لئے کی تھی۔ ان کی یہ عادت تھی کہ حضرت موسیٰ ﷺ انہیں کوئی حکم دیتے یا ان تک اللہ تعالیٰ کا کوئی پیغام پہنچاتے تو وہ کج بحثیوں میں پڑ جاتے جیسا کہ اس سے قبل اسی سورت میں کئی واقعات گذر چکے ہیں۔

اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو اس روش کے قدرتی انجام سے ڈراتے ہیں۔ کیونکہ اس روش کا قدرتی انجام گمراہی اور ایمان کے بعد کفر کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ اسی انجام تک اس سے پہلے بنی اسرائیل پہنچ چکے ہیں اور اب ان لوگوں کی دلی خواہش یہ ہے کہ مسلمان بھی اسی انجام تک پہنچ جائیں۔

وَدَّ كَثِيرٌ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَوْ يَرُدُّونَكُمْ مِنْ بَعْدِ إِيمَانِكُمْ كُفَّارًا حَسَدًا مِنْ عِنْدِ أَنْفُسِهِمْ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ ۖ

اہل کتاب میں سے اکثر لوگ یہ چاہتے ہیں کہ کسی طرح تمہیں ایمان سے پھیر کر پھر کفر کی طرف پلٹا لے جائیں اگر چہ ان پر حق ظاہر ہو چکا ہے مگر اپنے نفس کے حسد کی بنا پر تمہارے لئے ان کی یہ خواہش ہے۔

حسد' جو ایک نہایت ہی بری خصلت اور ایک اخلاقی بیماری ہے۔ نفس انسانی کے اندر یہ خواہش پیدا کر دیتی ہے کہ تمام دوسرے لوگ ہر قسم کی بھلائی سے محروم ہو جائیں اور راہ ہدایت نہ پائیں۔ اس لئے نہیں کہ ایسے حاسد شرپسند لوگ حقیقت حال سے واقف نہیں ہوتے۔ وہ حقیقت حال سے اچھی طرح واقف ہوتے ہیں مگر محض حسد کی بنا پر یہ خواہش رکھتے ہیں۔

حَسَدًا مِنْ عِنْدِ أَنْفُسِهِمْ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ "اگر چہ ان پر حق ظاہر ہو چکا ہے مگر نفس کے حسد کی بنا پر وہ ایسا کرتے ہیں۔"

یہود کے دلوں میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف حسد کے جو سیاہ اور گھٹیا جذبات موجزن تھے وہ جذبات آج بھی جوں کے توں موجود ہیں۔ اسلام کے خلاف ان کی تمام سازشیں اور تمام تدابیر انہی جذبات پر مبنی تھیں۔ اور آج تک ان کا طرز عمل جوں کا توں ہے۔ اسی حقیقت کو قرآن کریم تفصیل کے ساتھ مسلمانوں کے سامنے کھول کر بیان کر رہا ہے تاکہ وہ معاملے کی حقیقت تک پہنچ جائیں۔ اور یہ

معلوم کر لیں کہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف یہودیوں کی اس مسلسل جدوجہد کے پس منظر میں صرف وہ جذبہ کار فرما ہے کہ وہ مسلمانوں کے عقائد کو متزلزل کر دیں اور انہیں دوبارہ اسی حالت کفر کی طرف لوٹا کر لے جائیں جس میں وہ پہلے مبتلا تھے اور اللہ تعالیٰ نے انہیں اس سے نجات دی اور وہ ایمان لے آئے اور انہیں فضل عظیم اور نعمت جلیلہ سے نوازا گیا۔

جب یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے اور یہودیوں کا مکروہ بغض و حسد عیاں ہو جاتا ہے تو قرآن کریم مسلمانوں کو یہ تلقین کرتا ہے کہ وہ یہودیوں کی پست سطح سے بالا ہو کر سوچیں۔ حسد کا جواب حسد اور شر کا جواب شر سے نہ دیں بلکہ عفو اور درگذر سے کام لیں اور اس وقت کا انتظار کریں جب اللہ تعالیٰ اپنا فیصلہ لے آئے۔

فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِيْرٌ

"اس کے جواب میں تم عفو و درگذر سے کام لو یہاں تک کہ اللہ خود اپنا فیصلہ نافذ کر دے۔ مطمئن رہو کہ اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔"

اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے جس راہ کو پسند فرمایا ہے اس پر گامزن ہو جاؤ۔ اس کی بندگی کرو اور زیادہ سے زیادہ نیکیاں کما کر اس کے ہاں جمع کرتے رہو۔

وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ؕ وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۱۱۰﴾

"نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو۔ تم اپنی عاقبت کے لئے جو بھلائی کما کر آگے بھیجو گے' اللہ کے ہاں اسے موجود پاؤ گے جو کچھ تم کرتے ہو وہ سب اللہ کی نظر میں ہے۔"

غرض اس پورے پیراگراف میں اسلامی جماعت کو یہ سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے اور مسلمانوں کی فکر کو اس پر مرکوز کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ ان کے لئے خطرے کی اصل جگہ کونسی ہے۔ کہاں ان کے خلاف سازشیں تیار ہوتی ہیں۔ یوں اسلامی شعور کو یہودیوں کے برے ارادوں' گھٹیا سازشوں اور مذموم حاسدانہ جذبات کے مقابلے کے لئے تیار کیا جاتا ہے لیکن اس تیاری کے بعد اس اسلامی شعور کو اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ کر دیا جاتا ہے تاکہ مسلمان اس کے احکام کے منتظر ہوں اور اپنی ہر حرکت اور اپنے ہر فعل کو اللہ تعالیٰ کے تصرف میں دے دیں۔ یہاں تک کہ فیصلے کی گھڑی آ جائے۔ اس وقت مسلمانوں کو حکم دیا جاتا ہے کہ وہ عفو و درگذر سے کام لیں اور اپنے دلوں کو بغض و حسد اور کینہ و دشمنی سے پاک رکھیں اور صاحب امر اور صاحب مشیئت کے احکامات اور فیصلے کا انتظار کریں۔

OOOOO

اس کے بعد قرآن کریم ان دعوؤں کا جائزہ لیتا ہے جو یہود و نصاریٰ بالعموم کیا کرتے تھے۔ مثلاً یہ کہ وہ کہتے تھے کہ صرف وہی ہدایت پر ہیں۔ یہ کہ جنت صرف ان کے لئے ہے اور ان کے علاوہ اس میں کوئی بھی داخل نہ ہو گا۔ اور یہ دعویٰ بیک وقت یہودی اور عیسائی کرتے تھے۔ ان میں سے ہر ایک شخص کہتا تھا کہ دوسرے کے پاس سچائی کا ایک ذرہ بھی نہیں۔ ان کے ان دعوؤں کے تذکرے کے ضمن میں قرآن کریم عمل اور مکافات عمل کے بارے میں اپنے حقیقی تصور کی وضاحت بھی کر دیتا ہے۔

وَقَالُوا لَنْ يَدْخُلَ الْجَنَّةَ إِلَّا مَنْ كَانَ هُودًا أَوْ نَصَارَىٰ ۗ تِلْكَ أَمَانِيُّهُمْ ۗ قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴿١١١﴾ بَلَىٰ مَنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلَّهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهُ أَجْرُهُ عِنْدَ رَبِّهِ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿١١٢﴾ وَقَالَتِ الْيَهُودُ لَيْسَتِ النَّصَارَىٰ عَلَىٰ شَيْءٍ وَقَالَتِ النَّصَارَىٰ لَيْسَتِ الْيَهُودُ عَلَىٰ شَيْءٍ وَهُمْ يَتْلُونَ الْكِتَابَ ۗ كَذَٰلِكَ قَالَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ مِثْلَ قَوْلِهِمْ ۚ فَاللَّهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فِيمَا كَانُوا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ ﴿١١٣﴾

"ان کا کہنا ہے کہ کوئی شخص جنت میں نہ جائے گا' جب تک کہ وہ یہودی نہ ہو یا عیسائی نہ ہو۔ یہ ان کی تمنائیں ہیں ان سے کہو اپنی دلیل پیش کرو' اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو۔ در اصل نہ تمہاری کچھ خصوصیت ہے نہ کسی اور کی۔ حق یہ ہے کہ جو بھی اپنی ہستی کو اللہ کی اطاعت میں سونپ دے اور عملاً نیک روش پر چلے اس کے لئے اس کے رب کے پاس اس کا اجر ہے اور ایسے لوگوں کے لئے کسی خوف یا رنج کا کوئی موقع نہیں۔"

یہودی کہتے ہیں کہ عیسائیوں کے پاس کچھ نہیں۔ عیسائی کہتے ہیں یہودیوں کے پاس کچھ نہیں۔ حالانکہ دونوں ہی کتاب پڑھتے ہیں اور اسی قسم کے دعوے ایسے لوگوں کے بھی ہیں جن کے پاس کتاب کا علم نہیں ہے۔ یہ اختلاف جن میں یہ لوگ مبتلا ہیں ان کا فیصلہ قیامت کے روز اللہ کر دے گا۔"

مدینہ طیبہ میں جو لوگ مسلمانوں کے مقابلے میں اترے ہوئے تھے وہ یہودی تھے کیونکہ وہاں نصرانیوں کا کوئی ایسا منظم گروہ موجود نہ تھا جو یہودیوں کی طرح اسلام دشمنی میں مبتلا ہوتا لیکن آیت میں انداز بیان کو عام رکھا گیا ہے۔ یہاں آیات الٰہی دونوں گروہوں کے اقوال کی تردید کرتی ہیں۔ اور ایک دوسرے کے بارے میں یہود و نصاریٰ دونوں کے اقوال نقل کر کے آخرت میں ان دونوں کے بارے میں مشرکین عرب کے خیالات نقل کر دیے جاتے ہیں وَقَالُوا لَنْ يَدْخُلَ الْجَنَّةَ إِلَّا مَنْ كَانَ هُودًا أَوْ نَصَارَىٰ ان کا کہنا ہے کہ کوئی شخص جنت میں نہ جائے گا جب تک کہ وہ یہودی نہ ہو یا عیسائی نہ ہو۔" یہاں ان دونوں فرقوں کے دعووں کو یکجا کر کے بیان کیا گیا ورنہ ان میں سے ہر ایک اپنی جگہ مدعی تھا۔ یہودی کہتے تھے کہ جنت میں صرف وہ شخص داخل ہو گا جو یہودی ہو اور نصرانی کہتے تھے کہ جنت میں صرف وہ شخص داخل ہو گا جو نصرانی ہو۔ ان دونوں کے یہ لمبے چوڑے دعوے محض ادعائی تھے۔ ان کی پشت پر کوئی عقلی یا نقلی دلیل نہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے نبی کو یہ تلقین کرتے ہیں کہ وہ انہیں ان کے ان دعووں کی دلیل پیش کرنے کا چیلنج کریں۔

قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ "ان سے کہو اپنی دلیل پیش کرو اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو۔"

یہاں اللہ تعالیٰ موقع کی مناسبت سے مکافات عمل کے بارے میں اسلامی نظریۂ حیات کا ایک اہم اصول بیان کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں اس معاملے میں کسی امت کسی گروہ یا کسی فرد کی کوئی رو رعایت نہ کی جائے گی۔ اللہ کے ہاں جس چیز کی قدر ہے وہ نیکی اور مکمل بندگی اور

تسلیم و رضا ہے۔ یہاں محض نام اور عنوان کو دیکھ کر فیصلے نہیں ہوتے۔

بَلٰى مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗۤ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ "حق یہ ہے کہ جو بھی اپنی ہستی کو اللہ کی اطاعت میں سونپ دے اور عملاً نیک روش پر چلے' اس کے لئے اس کے رب کے پاس اجر ہے اور ایسے لوگوں کے لئے کسی خوف یا رنج کا کوئی موقع نہیں ہے۔"

اس سے قبل ایک جگہ یہودیوں کے اس دعوے پر کہ "انہیں آگ نہیں چھوئے گی مگر چند دن" کی تردید کرتے ہوئے بھی اللہ تعالیٰ نے اپنے ہاں سزا کا یہ عام اصول بیان کیا تھا۔ "ہاں جو بھی برائی کمائے گا اور اس کی برائیاں اسے گھیر لیں گی وہ لوگ جہنمی ہوں گے اور وہ ہمیشہ جہنم میں رہیں گے۔" یعنی خطیئات کے مرتکب لوگوں کو سزا محض اس لئے ہوگی کہ انہوں نے خطیئات کا ارتکاب کیا۔ اس کے علاوہ کوئی نقطہ نظر یا کوئی پہلو اس کا باعث نہ ہوگا کہ انہیں سزا دی جائے۔ غرض نیکی اور بدی میں اللہ کے ہاں جزو سزا کا یہی ایک اصول ہے بَلٰى مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗۤ جو اپنی ہستی کو اللہ کی اطاعت میں سونپ دے اور عملاً نیک روش پر چلے" یعنی اپنی پوری ذات کو اللہ کے لئے مختص کر دے۔ اپنے پورے شعور کے ساتھ اللہ کی طرف متوجہ ہو جائے اور جس طرح پہلا شخص خالصتاً برائی میں گرفتار ہو گیا تھا۔ یہ ہمہ تن اللہ کے لئے ہو جائے۔ مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ "جو اپنی ذات کو اللہ کی اطاعت میں سونپ دے۔" اس فقرے میں اسلام کی اہم ترین خصوصیت اور واضح علامت کو بیان کیا گیا ہے۔ یعنی ایک انسان پوری طرح اللہ کی طرف منہ کر لے۔ یعنی ہمہ تن متوجہ ہو جائے اور مکمل انقیاد اور اطاعت اختیار کر لے یعنی معنوی طور پر اللہ کے آگے جھک جائے اور عملاً بھی اس کا مطیع فرمان ہو جائے اور چونکہ معنوی تسلیم و رضا کے لئے ظاہری دلیل عملاً اطاعت حکم ہوا کرتی ہے' اس لئے کہا گیا اور عملاً نیک روش اختیار کرے۔ اسلام کی اہم ترین خصوصیات اور نشانیوں میں سے ایک یہ امر ہے کہ انسان کا شعور اور روش اس کا عقیدہ اور عمل' اس کا قلبی ایمان اور عملی روش کے درمیان مکمل یگانگت ہو۔ جب ایک انسان یہ مقام حاصل کر لیتا ہے تو اس وقت نظریۂ حیات نظام حیات بن جاتا ہے۔ اور اس وقت انسان کی شخصیت اپنی سرگرمیوں اور اپنے رجحانات کے اندر متحد ہو جاتی ہے۔ اور انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں کے درمیان ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے۔ اور تب ایک بندہ مومن اس عطاء الٰہی کا مستحق قرار پاتا ہے۔ فَلَهٗۤ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ "ان کے لئے ان کے رب کے پاس اجر ہے اور ایسے لوگوں کے لئے کسی خوف یا رنج کا کوئی موقعہ نہیں۔" ان کا اجر محفوظ ہے اور ان کے رب کے پاس ہے۔ امن و طمانیت کی ایک عظیم دنیا جس میں رنج و الم کا شائبہ تک نہیں' ان کے لئے منتظر ہے۔ فرحت و سرور کا ایک عالم ہے جس میں حزن و ملال کا کوئی لمحہ نہیں۔ ان کے تیار ہے۔ جزا کا یہ اصول عامہ ہے اور تمام لوگ اس میں برابر ہیں۔ اللہ کے ہاں کسی کی رو رعایت یا کسی کی کوئی شان محبوبیت نہیں ہے۔

یہود و نصاریٰ دونوں لمبے چوڑے دعوے کرتے رہتے تھے اور ان میں سے ہر ایک دوسرے کے بارے میں کہتا تھا کہ وہ تو کچھ نہیں۔ نیز مشرکین تو ان سے بھی ایک قدم آگے بڑھے ہوئے تھے اور کہتے تھے کہ ان دونوں گروہوں کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔

وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَيْءٍ ۠ وَّقَالَتِ النَّصٰرٰى لَيْسَتِ الْيَهُوْدُ عَلٰى شَيْءٍ ۙ وَّهُمْ يَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ۭ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ مِثْلَ قَوْلِهِمْ ۚ فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿۱۱۳﴾

"یہودی کہتے ہیں کہ عیسائیوں کے پاس کچھ نہیں' عیسائی کہتے ہیں یہودیوں کے پاس کچھ نہیں۔ حالانکہ دونوں ہی کتاب پڑھتے ہیں

اور اسی قسم کے دعوے ایسے لوگوں کے پاس بھی ہیں جن کے پاس کتاب کا علم نہیں۔ یہ اختلافات جن میں یہ لوگ مبتلا ہیں ان کا فیصلہ اللہ قیامت کے روز کرے گا۔"

جن لوگوں کے پاس کتاب کا علم نہیں یعنی ان پڑھ عرب جن کے پاس کوئی کتاب نہ تھی۔ یہ لوگ بھی جب دیکھتے تھے کہ یہود و نصاریٰ جس تفرق اور اختلاف کا شکار ہیں ایک دوسرے کو جس طرح گالیاں دے رہے ہیں اور جس طرح الزام تراشیاں کر رہے ہیں یا جن خرافات اور بے حقیقت باتوں پر وہ ایمان لائے ہوئے ہیں۔ وہ اہل شرک اور عربوں کے مشرکانہ خیالات' فرشتوں کے اولاد الٰہی ہونے کے تصورات سے کسی طرح بھی اونچے عقائد یا نظریات نہیں۔ اس لئے وہ بھی ان عقائد کو حقیر سمجھتے ہوئے یہود و نصاریٰ کے بارے میں یہ کہتے تھے کہ ان کے ارکان کی بھی کوئی حقیقت نہیں ہے۔

جنت کی ملکیت کے بارے میں یہود و نصاریٰ کے ان دعووں کے بعد قرآن کریم ان لوگوں کی باہم الزام تراشیاں نقل کر کے ان کے فیصلے کو اللہ پر چھوڑ دیتا ہے اور کہتا ہے فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ

"پس اللہ ہی قیامت کے دن ان کے مختلف فیہ مسائل کا فیصلہ کرے گا۔ کیونکہ وہی عادل جج ہے۔ اور آخر کار تمام امور اسی کے سامنے جانے ہیں۔ جو لوگ دعویٰ تو یہ کرتے ہیں کہ وہی جنتی اور اہل ہدایت ہیں لیکن وہ کسی منطق کے قائل نہیں ہوتے' نہ ان کے دعاوی کسی دلیل پر مبنی ہوتے ہیں۔ ایسے لوگوں کا معاملہ اللہ ہی پر چھوڑ دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ایسے لوگوں سے جان چھڑانے کی بس یہی صورت ہے۔

یہودی' مسلمانوں کے دلوں میں پیغمبر ﷺ کے اوامر اور آپ کی تعلیمات کے بارے میں شکوک و شبہات پیدا کرنے کی مساعی کرتے تھے' خصوصاً تحویل قبلہ کے معاملے میں' ان کا پروپگنڈا تو اپنی انتہا کو پہنچ گیا تھا۔ اب روئے سخن ان کی ان مذموم مساعی کی تردید کی طرف پھر جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ان کی یہ جدوجہد در حقیقت مساجد اللہ کی تخریب ہے اور ان کا مقصد مساجد اللہ میں اللہ کے ذکر و فکر سے لوگوں کو منع کرنا ہے۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى فِيْ خَرَابِهَا ؕ اُولٰٓئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ يَّدْخُلُوْهَآ اِلَّا خَآئِفِيْنَ ۬ؕ لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَّلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۱۴﴾ وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۚ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۱۵﴾

"اور اس شخص سے بڑھ کر ظالم کون ہو گا جو اللہ کے معبدوں میں اس کے نام کی یاد سے روکے اور ان کی ویرانی کے درپے ہو؟ ایسے لوگ اس قابل ہیں کہ ان کی عبادت گاہوں میں قدم نہ رکھیں اور اگر وہاں جائیں بھی' تو ڈرتے ہوئے جائیں۔ ان کے لئے تو دنیا میں رسوائی ہے اور آخرت میں عذاب عظیم۔ مشرق اور مغرب سب اللہ کے ہیں جس طرف بھی تم رخ کرو گے اسی طرف اللہ کا رخ ہے۔ اللہ بڑی وسعت والا اور سب کچھ جاننے والا ہے۔"

اقرب الی الذہن یہ ہے کہ ان دو آیات کا تعلق مسئلہ تحویل قبلہ سے ہے۔ کیونکہ اس مرحلے پر یہودی اس کوشش میں لگے ہوئے

تھے کہ مسلمانوں کو نئے قبلہ کی جانب منہ کر کے نماز پڑھنے سے باز رکھیں' حالانکہ کعبہ وہ پہلا عبادت خانہ تھا جو عوام کے لئے بنایا گیا اور وہی اسبق قبلہ تھا۔ اگرچہ اس آیت کے اسباب نزول کے سلسلے میں اس کے علاوہ بھی متعدد روایات ہیں۔

بہرحال آیت کی عمومیت اس بات پر دلالت کر رہی ہے کہ یہ ایک عام حکم ہے اور اس میں ہر کسی کو اس بات سے منع کیا گیا ہے کہ وہ لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی مساجد میں اس کے ذکر و فکر اور عبادت سے روکیں۔ یا ان مساجد کی تخریب کے درپے ہوں۔ یہاں ایسے لوگوں کا حکم اور وہ جزا بھی بتادی جاتی ہے جس کے مستحق وہ تمام لوگ ہیں جو ایسے کام کرتے ہیں۔" اور وہ جزا یہ ہے۔ أُولَٰئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ أَنْ يَدْخُلُوهَا إِلَّا خَائِفِينَ "ایسے لوگ تو اس قابل ہیں کہ ان عبادت گاہوں میں قدم نہ رکھیں اور اگر وہاں جائیں بھی تو ڈرتے ہوئے جائیں۔"

یعنی وہ ہمیشہ دھکیلے جانے' بھگائے جانے اور امن و سکون سے محروم ہونے کے مستحق ہیں الا یہ کہ وہ اس خوف اور بے چینی سے پناہ گاہ کی تلاش میں ڈرتے ڈرتے مسجدوں میں جاگھسیں۔ اور مسجد کے احترام کا دامن تھام لیں۔ (یہی صورت حال فتح مکہ کے موقع پر پیش آئی) جب رسول اللہ ﷺ کے منادی نے پکارا کہ "جو شخص مسجد حرام میں پناہ لے گا اسے پناہ مل جائے گی۔" چنانچہ قریش کے تمام سرکش افراد مسجد میں جاگھسے حالانکہ یہی وہ لوگ تھے جو ایک عرصہ تک رسول اللہ ﷺ اور آپ کے ساتھیوں کو مسجد حرام میں عبادت کرنے سے بھی روک رہے تھے۔) ایسے لوگوں کا انجام بتاتے ہوئے قرآن کریم مزید وضاحت کرتا ہے کہ ایسے لوگ دنیا میں بھی ذلیل ہوں گے اور آخرت میں تو ان کے لئے عذاب عظیم تیار کیا گیا ہے۔ لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَلَهُمْ فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ "ان کے لئے تو دنیا میں رسوائی ہے اور آخرت میں عذاب عظیم ہے۔"

بعض مفسرین نے آیت مَا كَانَ لَهُمْ أَنْ يَدْخُلُوهَا إِلَّا خَائِفِينَ کی تفسیر یہ کی ہے کہ ایسے لوگوں کا فرض یہ ہے کہ وہ آداب مسجد کا لحاظ کرتے ہوئے' مساجد میں ڈرتے ڈرتے اور خضوع اور خشوع کے ساتھ داخل ہوں' کیونکہ اللہ کی مساجد کا احترام اور اللہ ذوالجلال کی ہیبت اور دبدبے کا یہ تقاضا ہے کہ اس کے گھر میں بصد احترام قدم رکھا جائے۔ بہرحال یہ بھی ایک تفسیر ہے اور آیت اس کی بھی متحمل ہے۔

لیکن ان آیات میں سے دوسری یعنی وَلِلَّهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ چونکہ تحویل قبلہ کے موقع پر نازل ہوئی اس لئے ہم نے پہلی آیت ومن اظلم کو بھی تحویل قبلہ پر محمول کیا ہے۔

وَلِلَّهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۚ فَأَيْنَمَا تُوَلُّوا فَثَمَّ وَجْهُ اللَّهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ وَاسِعٌ عَلِيمٌ "مشرق اور مغرب سب اللہ کے ہیں۔ جس طرف بھی تم رخ کرو گے اسی طرح اللہ کا رخ ہے۔ اللہ بڑی وسعت والا اور سب کچھ جاننے والا ہے۔"

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت یہودیوں کے اس پروپیگنڈے کے رد میں نازل ہوئی ہے جو وہ تحویل قبلہ کے خلاف کر رہے تھے کہ اگر قبلہ یہ ہے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ مسلمانوں نے جو نمازیں بیت المقدس کی طرف رخ کر کے ادا کیں وہ سب باطل تھیں۔ سب ضائع گئیں اور اللہ کے ہاں ان کا کوئی حساب نہ ہوگا۔ آیت میں یہودیوں کے اس خیال باطل کی تردید کی جاتی ہے کہ جس طرف بھی رخ کیا جائے وہی قبلہ ہے۔ ایک عبادت گذار جس طرف بھی رخ کرے' اللہ کا رخ اسی طرف ہے۔ رہا یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایک معین سمت کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کا جو حکم دیا ہے وہ محض امتثال امر ہے اور عبادت و اطاعت ہے۔ یہ حکم اس لئے نہیں دیا گیا کہ نعوذ باللہ کہیں اس طرف اللہ کا رخ ہے اور دوسری طرف نہیں ہے۔ رہا اللہ تو وہ اپنے بندوں پر کسی معاملے میں بھی ضیق اور تنگی نہیں کرتا' نہ ان کے ثواب میں کمی کرتا ہے' کیونکہ وہ ان کے دلوں کے بھید جانتا ہے اور ان میلانات اور رجحانات کو بھی جانتا ہے جو ایک خاص

سمت کی طرف رخ کرنے کے لئے لوگوں میں پائے جاتے ہیں۔ اللہ کے ہاں بڑی وسعت ہے۔ وہ نیتوں کا مالک ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۝ "اللہ بڑی وسعت والا اور سب کچھ جاننے والا ہے۔"

اس کے بعد قرآن کریم اس بات کی وضاحت کرتا ہے کہ ان لوگوں کے تصور الٰہ میں ہی فتور آگیا ہے اور یہ لوگ اساس دین یعنی عقیدۂ توحید ہی سے منحرف ہو گئے ہیں۔ جو تمام رسالتوں اور نبوتوں کا بنیادی اور صحیح تصور تھا۔ اور ان کے تصور الٰہ کے ڈانڈے' اللہ کی ذات و صفات کے بارے میں دوسرے جاہل تصورات سے جاملے ہیں۔

چنانچہ قرآن کریم یہاں اس بات کی وضاحت کرتا ہے کہ مشرکین عرب اور مشرکین اہل کتاب کے تصور الٰہ میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے۔ ان دونوں کے دل باہم ملے ہوئے ہیں۔ اور اس موقع پر ان دونوں فرقوں کے سامنے اسلام کے صحیح ایمانی عقیدے کی وضاحت کر دی جاتی ہے۔

وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ۙ سُبْحٰنَهٗ ۭ بَلْ لَّهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ ۝ بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَاِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۝ وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ لَوْلَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ اَوْ تَاْتِيْنَآ اٰيَةٌ ۭ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّثْلَ قَوْلِهِمْ ۭ تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ ۭ قَدْ بَيَّنَّا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ۝

"ان کا قول ہے کہ اللہ نے کسی کو بیٹا بنایا ہے۔ اللہ پاک ہے ان باتوں سے اصل حقیقت یہ ہے کہ زمین و آسمان کی تمام موجودات اس کی ملک ہیں۔ سب کے سب اس کے مطیع فرمان ہیں۔ وہ آسمانوں اور زمین کا موجد ہے اور جس بات کا وہ فیصلہ کرتا ہے' اس کے لئے بس یہ حکم دیتا ہے کہ ہو جا' اور وہ ہو جاتی ہے۔"

نادان کہتے ہیں کہ اللہ خود ہم سے بات کیوں نہیں کرتا یا کوئی نشانی ہمارے پاس کیوں نہیں آتی۔ ایسی ہی باتیں ان سے پہلے لوگ بھی کیا کرتے تھے۔ ان سب کی ذہنیتیں ایک جیسی ہیں۔ یقین لانے والوں کے لئے تو ہم نشانیاں صاف صاف نمایاں کر چکے ہیں۔"

یہ قول کہ "اللہ نے کسی کو بیٹا بنایا ہے۔" یہ صرف عیسائیوں کا ہی عقیدہ نہیں جو وہ حضرت مسیح کے بارے میں رکھتے تھے بلکہ خود یہودی بھی حضرت عزیر کی ابنیت کے قائل تھے۔ اور یہی عقیدہ مشرکین مکہ اللہ کے فرشتوں کے بارے میں رکھتے تھے۔ قرآن کریم نے یہاں ان فرقوں کے عقیدے کی تفصیلات بیان نہیں کیں۔ کیونکہ یہاں اجمالی بحث مطلوب تھی۔ یہاں اجمالاً ان تین فرقوں کی طرف اشارہ مطلوب تھا جو اس وقت جزیرہ عرب میں تحریک اسلامی کا راستہ روکے کھڑے تھے۔ تعجب ہے کہ آج بھی عالم اسلام میں اسلام کی راہ یہی تین فرقے روکے کھڑے ہیں۔ یہودی بین الاقوامی صیہونیت کے روپ میں' عیسائی بین الاقوامی صلیبیت کی شکل میں اور عرب عالمی کیمونزم کی شکل میں۔ یہ آخری یعنی کیمونزم اس وقت کے "عربی شرک" سے زیادہ شدید کفر ہے۔ اس مشترکہ خصوصیت کے بیان سے یہودیوں اور عیسائیوں کا یہ دعویٰ خود بخود رد ہو جاتا ہے کہ صرف وہی اہل ہدایت ہیں کیونکہ ہدایت کے اس اصل عقیدے میں وہ مشرکین کے ہم مشرب ہیں۔

ان کے تصور الٰہ کے دوسرے سقیم و فاسد پہلوؤں کے بیان سے پہلے ہی اللہ تعالیٰ اپنے بارے میں ان کے مذکورہ بالا سقیم تصور سے

اپنی پاکی اور براءت کا اعلان کرتا ہے اور یہ بیان کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کی تمام مخلوقات کے درمیان تعلق کی نوعیت کیا ہے؟

سُبْحٰنَهٗ ؕ بَلْ لَّهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ ۞ بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَاِذَا قَضٰۤى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ

"اللہ پاک ہے ان باتوں سے اصل حقیقت یہ ہے کہ زمین و آسمان کی تمام موجودات اس کی ملک ہیں' سب کے سب ان کے مطیع فرمان ہیں' وہ آسمانوں اور زمین کا موجد ہے' اور جس بات کا وہ فیصلہ کرتا ہے' اس کے لئے بس یہ حکم دیتا ہے کہ "ہوجا" اور وہ "ہو جاتی ہے"

اس آیت میں 'اسلامی نقطۂ نظر سے اللہ سبحانہ' تعالیٰ کا خالص تجریدی تصور بیان کیا گیا ہے۔ یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ اور اس کی مخلوق کے درمیان تعلق کی نوعیت کیا ہے؟ نیز اللہ کی ذات سے اس کائنات کا صدور کیونکر ہوا؟ ان تمام امور کے بارے میں جو تصور پیش کیا گیا ہے وہ ان کے بارے میں تمام دوسرے تصورات کے نسبت اعلیٰ و ارفع ہے۔ یہ کائنات اللہ کی ذات و الاصفات سے کیونکر صادر ہوئی؟ بس اللہ نے ارادہ کیا اور وہ وجود میں آگئی۔ "کُنْ" کہنے کی دیر تھی کہ "فَيَكُوْنُ" (وہ ہو گئی)۔ یعنی کسی ہونے والی چیز کی طرف ارادہ الٰہی کی توجہ ہی امر کے لئے کافی ہے کہ وہ فی الفور وجود میں آجائے۔ اسی صورت اور شکل میں جو اس کے لئے مقرر اور متعین ہے۔ اس عمل میں کسی واسطے اور کسی مادی قوت کی کوئی ضرورت پیش نہیں آتی۔ اب سوال یہ ہے کہ ارادہ الٰہی کسی مخلوق کے ساتھ کیونکر وابستہ ہو جاتا ہے؟ اور اس کے نتیجہ میں مخلوق کس طرح وجود میں آجاتی ہے؟ تو اس کی حقیقت سے ہم واقف نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ یہ ایک ایسا راز ہے جو انسانی ادراک کے لئے سربستہ ہے۔ اس لئے کہ انسان کی ادراکی قوت ابھی تک اس راز کی متحمل نہیں ہے۔ ازروئے خلقت انسان کی ادراکی قوت کو اس راز کے معلوم کرنے کا اس لئے متحمل نہیں بنایا گیا کہ انسان کی تخلیق 'جس مقصد کے لئے ہوئی ہے' اس کی ادائیگی کے سلسلے میں اسے اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ تخلیق انسان کا کیا مقصد ہے؟ زمین میں فریضہ خلافت کی ادائیگی اور زمین کے اندر تعمیر و ترقی۔ اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کے قوانین قدرت کے اتنے ہی راز بتائے ہیں جن کی اسے ضرورت تھی اور جن کے بغیر وہ اپنے فرائض منصبی ادا نہیں کر سکتا تھا۔ اور جن کے ذریعے سے انسان کے لئے خزائن الارض سے انتفاع ممکن ہوا۔ دوسری طرف اسے ایسے رازوں سے بے خبر رکھا گیا جن کا مقصد تخلیق انسانیت یعنی خلافت کبریٰ کے ساتھ کوئی تعلق نہ تھا۔ اس سلسلے میں دوسرے فلسفے اس قدر بھٹکے کہ انہیں کہیں بھی روشنی کی کرن نظر نہ آئی۔ وہ بے سود ان اسرار و رموز کے حل کے پیچھے پڑے رہے۔ انہوں نے ایسے مفروضے قائم کئے جو محض انسانی ادراک کی پیداوار تھے۔ حالانکہ انسانی ادراک اپنی خلقت ہی کے اعتبار سے اس قابل نہیں ہے کہ وہ ان فوق الطبیعاتی مفروضات پر غور کر سکے۔ اللہ تعالیٰ نے انسانی ادراک کو سرے سے وہ ذرائع ہی نہیں دیئے جن کے ذریعے وہ ان بھیدوں تک پہنچ سکے۔ چنانچہ اگر غور کیا جائے تو تمام فلسفیانہ افکار میں سے اعلیٰ ترین افکار بھی ایسے مضحکہ انگیز ہیں کہ انہیں دیکھ کر ایک عام انسان بھی حیران رہ جاتا ہے اور سوچنے لگتا ہے کہ ایک فلسفی اور ذہین شخص ان نتائج تک کیونکر پہنچا۔ یہ سب کچھ اس لئے ہوا کہ ان فلسفیوں کے پیش کرنے والوں نے انسانی ادراک کو اس کی فطری حدود سے آگے بڑھا دیا اور اسے ان فوق الطبیعاتی مسائل میں استعمال کیا جن میں اس کی کوئی مجال نہ تھی۔ اس لئے وہ کسی قابل اطمینان نتیجے تک نہ پہنچ سکے۔ بلکہ ان کے نتائج فکر اس شخص کی نظر میں کوئی وقعت نہیں رکھتے جو اسلامی نظریۂ حیات پر ایمان رکھتا ہو اور اس کے سایۂ عاطفت میں زندگی بسر کر رہا ہو۔ اسلام نے اپنے معتقدین کو بغیر واضح حجت کے ان اندھیروں میں ٹامک ٹوئیاں مارنے سے محفوظ کر دیا ہے۔ اس لئے وہ اس بنیادی طور پر غلط طریق فکر کی راہ سے مابعد الطبیعاتی مسائل کے حل کی ناکام

کوشش ہی نہیں کرتے۔ مابعد کے ادوار میں مسلمانوں میں سے جن متفلسفوں نے 'یونانی فلسفے سے متاثر ہو کر فلسفیانہ مفروضات کے مطابق سوچنا شروع کیا' وہ بے حد الجھن اور غلط مبحث کا شکار ہوئے۔ جیسا کہ ان سے پہلے ان کے اساتذہ یونانی فلسفی شکار ہوئے تھے۔ ان مسلم فلسفیوں نے اسلامی نظامِ فکر میں وہ مسائل داخل کر دیئے جو اس کے مزاج ہی کے خلاف تھے۔ اور انہیں اسلامی نظریۂ حیات کی حقیقت سے دور کا واسطہ بھی نہ تھا۔ غرض جب بھی انسان نے اپنی عقل و فکر کو اپنی حدود سے آگے بڑھایا اور اپنے مزاج اور خلقت کے خلاف استعمال کیا اس کا انجام یہی رہا۔ بَلْ لَّهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ "اصل حقیقت یہ ہے کہ زمین و آسمان کی تمام موجودات اس کی ملک ہیں۔ سب کے سب اس کے مطیع فرمان ہیں۔"

آسمانوں اور زمینوں کے درمیان جو چیزیں ہیں ان میں سے اسے کسی کو بیٹا بنانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ لہٰذا تمام لوگ اس کی مخلوق ہے اور ایک درجے میں ہے' اور ایک ہی حیثیت رکھتی ہے۔

بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ وَ اِذَا قَضٰۤى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ○ "وہ آسمانوں اور زمین کا موجد ہے اور جس بات کا فیصلہ کرتا ہے اس کے لئے بس صرف یہ حکم دیتا ہے کہ ہو جا اور وہ ہو جاتی ہے۔"

اللہ کا یہ ارادہ جس طرح اس ہونے والی مخلوق کے ساتھ متعلق ہو جاتا ہے' اس کی تفصیلی کیفیت انسانی ادراک اور فہم سے بالا ہے۔ کیونکہ یہ انسانی ادراک کے حیطۂ قدرت ہی سے وراء ہے۔ لہٰذا انسانی ادراک کی قوتوں کو ایسی ناقابل تصور کیفیات کے ادراک میں صرف کر دینا ایک عبث کام ہو گا۔ اور بلادلیل و برہان اس وادی پر پیچ میں سرگرداں ہونے کے مترادف ہو گا۔

یہاں آکر اہل کتاب کے قول ابنیت پر تبصرہ ہو جاتا ہے۔ ان کے عقائد باطلہ کی تصحیح کے بعد' اب مشرکین کے ان اقوال کو لیا جاتا ہے جو مقام الوہیت کے خلاف ہیں اور جو اہل کتاب کے عقائد و اقوال سے ملتے جلتے ہیں۔

وَ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ لَوْ لَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ اَوْ تَاْتِيْنَاۤ اٰيَةٌ ؕ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّثْلَ قَوْلِهِمْ ؕ "نادان کہتے ہیں کہ اللہ خود ہم سے بات کیوں نہیں کرتا یا کوئی نشانی ہمارے پاس کیوں نہیں آتی؟ ایسی ہی باتیں ان سے پہلے لوگ بھی کیا کرتے تھے۔"

"جو لوگ نہیں جانتے" ان سے مراد ان پڑھ لوگ ہیں جو کتاب کے علم سے بے بہرہ ہیں اور وہ بالعموم مشرک تھے۔ ان کے پاس کتاب الٰہی کا کوئی علم نہ تھا۔ ان لوگوں نے بارہا نبی ﷺ سے یہ مطالبہ کیا تھا کہ آپ انہیں اللہ تعالیٰ سے ہمکلام کرائیں۔ یا ان کے سامنے کوئی معجزہ پیش کریں۔ یہاں ان لوگوں کے اس نامعقول مطالبے کا تذکرہ اس لئے ہوا تاکہ یہ بتایا جا سکے کہ ان سے پہلے کی اقوام یہود و نصاریٰ نے بھی اپنے انبیاء سے ایسے ہی مطالبے کئے تھے۔ قوم موسیٰ ؑ نے مطالبہ کیا تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کو کھلا دیکھنا چاہتے ہیں۔ نیز انہوں نے مادی خوارق عادات اور معجزات کے مطالبے میں بھی بے حد غلو کیا تھا۔ مقصود یہ ہے کہ یہ مشرکین اور یہودی ایک ہی مزاج اور ایک ہی طرز فکر کے مالک ہیں' اور یہ ایک ہی قسم کی کجروی میں مبتلا ہیں تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ ؕ "ان سب کی ذہنیتیں ایک ہی جیسی ہیں۔" لہٰذا یہودیوں کو مشرکین پر کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے۔ یہ سب طرز فکر' ہٹ دھری اور کجروی میں بالکل ہم مشرب ہیں۔ قَدْ بَيَّنَّا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ "یقین لانے والوں کے لئے تو ہم نشانیاں صاف صاف نمایاں کر چکے ہیں۔"

جس کے دل میں ذوق ایمان ہے' وہ جب آیات الٰہی کا مطالعہ کرتا ہے تو اسے اپنے ایمان کا مصداق ان آیات میں نظر آتا ہے۔ اور ان آیات میں اس کے ضمیر کے اطمینان کا سامان ہوتا ہے۔ غرض یہ آیات اور نشانیاں کسی کے اندر ایمان نہیں پیدا کر سکتیں بلکہ یہ ایمان

ہے جس کی روشنی میں اللہ کی آیات اور نشانیوں کو سمجھا جاسکتا ہے اور اطمینان حاصل کیا جاسکتا ہے۔ اور اس طرح انسان کا دل و دماغ پیہم ہدایت حاصل کرسکتے ہیں۔

ان کے اقوال کے اختتام' ان کے افکار باطلہ کی تردید' اور ان کے گمراہ کن پروپیگنڈے کے پس پردہ کارفرما مقاصد کی پردہ دری کے بعد اب روئے سخن حضرت نبی کریم ﷺ کی طرف پھر جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کے فرائض بیان فرماتے ہیں' آپ کے لئے مقاصد متعین کر دیئے جاتے ہیں اور آپ کو یہ بتایا جاتا ہے کہ یہود و نصاریٰ اور آپ کے درمیان جو معرکہ بپا ہے' اس کی نوعیت کیا ہے؟ آپ اور ان لوگوں کے درمیان کتنا گہرا اختلاف ہے اور یہ کہ اس اختلاف کو ایک بھاری قیمت ادا کرکے ہی دور کیا جاسکتا ہے جبکہ آپ نہ تو وہ قیمت رکھتے ہیں اور نہ اسے ادا کرسکتے ہیں۔ اور اگر (نعوذ باللہ) ان لوگوں سے اتحاد کرنے کے لئے آپ یہ بھاری قیمت ادا کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں تو آپ اپنے آپ کو غضب الٰہی کا مورد ٹھہرائیں گے۔

إِنَّآ أَرْسَلْنَـٰكَ بِٱلْحَقِّ بَشِيرًا وَنَذِيرًا ۖ وَلَا تُسْـَٔلُ عَنْ أَصْحَـٰبِ ٱلْجَحِيمِ ﴿١١٩﴾ وَلَن تَرْضَىٰ عَنكَ ٱلْيَهُودُ وَلَا ٱلنَّصَـٰرَىٰ حَتَّىٰ تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ۗ قُلْ إِنَّ هُدَى ٱللَّهِ هُوَ ٱلْهُدَىٰ ۗ وَلَئِنِ ٱتَّبَعْتَ أَهْوَآءَهُم بَعْدَ ٱلَّذِى جَآءَكَ مِنَ ٱلْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ ٱللَّهِ مِن وَلِىٍّ وَلَا نَصِيرٍ ﴿١٢٠﴾ ٱلَّذِينَ ءَاتَيْنَـٰهُمُ ٱلْكِتَـٰبَ يَتْلُونَهُۥ حَقَّ تِلَاوَتِهِۦٓ أُو۟لَـٰٓئِكَ يُؤْمِنُونَ بِهِۦ ۗ وَمَن يَكْفُرْ بِهِۦ فَأُو۟لَـٰٓئِكَ هُمُ ٱلْخَـٰسِرُونَ ﴿١٢١﴾

۱۴ ۱ ع ۹ ۱۴

"ہم نے تم کو علم حق کے ساتھ خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔ اب جو لوگ جہنم سے رشتہ جوڑ چکے ہیں ان کی طرف سے تم ذمہ دار و جواب دہ نہیں ہو۔ یہودی اور عیسائی تم سے ہرگز راضی نہ ہوں گے جب تک تم ان کے طریقے پر نہ چلنے لگو۔ صاف صاف کہہ دو کہ راستہ بس وہی ہے جو اللہ نے بتایا ہے۔ ورنہ اگر اس علم کے بعد' جو تمہارے پاس آچکا ہے' تم نے ان کی خواہشات کی پیروی کی' تو اللہ کی پکڑ سے بچانے والا کوئی دوست اور مددگار تمہارے لئے نہیں ہے۔ جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے' وہ اسے اسی طرح پڑھتے ہیں جیسا کہ پڑھنے کا حق ہے۔ وہ اس پر سچے دل سے ایمان لاتے ہیں اور جو اس کے ساتھ کفر کا رویہ اختیار کریں وہی اصل میں نقصان اٹھانے والے ہیں۔"

إِنَّآ أَرْسَلْنَـٰكَ بِٱلْحَقِّ "ہم نے تم کو علم حق کے ساتھ بھیجا ہے۔"

ان کلمات میں اس قدر زور ہے کہ وہ گمراہی پھیلانے والوں کے گمراہ کن شبہات کو ختم کر دیتے ہیں۔ سازشیوں کی سازشوں کی جڑ کاٹ دیتے ہیں اور منافقین کی تلبیس اور تلقین کو ختم کر دیتے ہیں' نیز ان کلمات کا صوتی زیر و بم بھی حزم و یقین کا مظہر ہے۔ بَشِيرًا وَّنَذِيرًا "خوشخبری دینے والا اور ڈرنے والا۔" یعنی پیغام حق پہنچانا اور تبلیغ کرنا آپ کا بنیادی فریضہ ہے' آپ اطاعت کرنے والوں کو خوشخبری دیں گے اور نافرمانوں کو ڈرائیں گے۔ اس پر آپ کا فریضہ ادا ہو جائے گا۔ وَلَا تُسْـَٔلُ عَنْ أَصْحَـٰبِ ٱلْجَحِيمِ O "جو لوگ جہنم سے رشتہ جوڑ چکے ہیں ان کی طرف سے تم ذمہ دار اور جواب دہ نہیں ہو۔" یہ لوگ ایسے ہیں جو اپنی معصیت اور اس کے نتائج

نتائج کی وجہ سے جہنم میں داخل ہوں گے۔

اے پیغمبر! یہود و نصاریٰ ہمیشہ آپ کے خلاف بر سرپیکار رہیں گے' آپ کے خلاف سازشیں کرتے رہیں گے۔ کبھی آپ سے مصالحت نہ کریں گے اور نہ ہی کبھی آپ سے راضی ہوں گے۔ الا یہ کہ آپ اپنے مشن کو چھوڑ دیں' حق کو ترک کر دیں' جو یقین آپ کو حاصل ہے' اسے خیرباد کہہ دیں اور یہ لوگ جس کجروی' شرک اور جاہلی تصورات میں مبتلا ہیں اسے اختیار کر لیں۔ جیسا کہ اس سے پہلے قریب ہی بیان ہو چکا ہے۔

وَ لَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَ لَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ "یہودی اور عیسائی تم سے ہرگز راضی نہ ہوں گے۔ جب تک تم ان کے طریقے پر نہ چلنے لگو۔"

یہ ہے وہ اصل سبب ان کے انکار حق کا۔ یہ نہیں کہ شاید ان کے سامنے دلیل و برہان پیش کرنے کے معاملے میں کچھ کمی کی گئی ہے۔ نہ اس بات کی کمی ہے کہ وہ آپ کے راہ حق پر ہونے کے سلسلے میں مطمئن نہیں ہیں یا یہ کہ آپ کے پاس جو ہدایات آ رہی ہیں وہ اللہ کی جانب سے نہیں آ رہی ہیں۔ آپ ان کی طرف جس قدر بھی آگے بڑھیں اور جس قدر بھی آپ ان سے محبت کریں' ان میں سے کوئی چیز بھی آپ سے انہیں راضی نہیں کر سکتی۔ یہ آپ سے صرف اسی صورت میں راضی ہو سکتے ہیں کہ آپ ان کی ملت اور ان کے دین کو اپنا لیں اور جو حق اور صداقت آپ کے پاس ہے اسے چھوڑ دیں۔

یہ نظریۂ حیات ہی ہے جس کے مظاہر' ہر زمان و مکان میں نظر آتے ہیں۔ یہود و نصاریٰ ہر دور اور ہر زمانے میں جو اسلام اور جماعت مسلمہ کے خلاف بر سرپیکار نظر آتے ہیں' وہ دراصل اسلام کے خلاف ایک نظریاتی جنگ لڑ رہے ہیں۔ اور یہ نظریاتی جنگ اسلامی بلاک اور ان دو مغربی بلاکوں کے درمیان جاری ہے۔ اگرچہ یہ مغربی بلاک کبھی کبھار ایک دوسرے کے خلاف بھی بر سرپیکار ہو جاتے ہیں' لیکن یہ تخاصم ایسا ہی ہوتا ہے جیسا کہ ایک ملت کے دو فرقوں کے درمیان ہوتا ہے جبکہ اسلام اور مسلمانوں کے مقابلے میں یہ دونوں فرقے (یہود و نصاریٰ) ہمیشہ متحد رہے ہیں۔

اپنی حقیقت اور اصلیت کے اعتبار سے یہ ایک نظریاتی جنگ ہے' لیکن یہودی اور عیسائی دنیا جو اسلام اور مسلم دشمنی میں غرق ہے' اسے مختلف رنگ دیتی رہتی ہے۔ اور اس کے اوپر مختلف قسم کے جھنڈے لہراتی رہتی ہے۔ اور یہ کام وہ نہایت ہی بدباطنی' مکاری اور فریب دہی کے ساتھ کرتی ہے۔ اس سے قبل مسلمانوں کے خلاف نظریاتی جنگ لڑ کر یہ لوگ مسلمانوں کے اس والہانہ عشق کا تجربہ کر چکے ہیں جو انہیں اپنے دین اور نظریۂ حیات کے ساتھ ہے۔ چنانچہ اسلام کے ان دشمنوں نے بڑی ہوشیاری کے ساتھ پلٹا کھا کر' اپنی جدوجہد کا عنوان اور جھنڈا تبدیل کر دیا۔ اب انہوں نے نظریاتی جنگ کا اعلان کئے بغیر ہی اسلام کے خلاف لڑائی شروع کی ہے۔ کیونکہ نظریاتی جنگ میں وہ مسلمانوں کے جذبات اور جوش و خروش سے خائف تھے۔ نیز اب یہ لوگ وطن' اقتصادیات' سیاسیات اور جنگی مراکز کے حصول اور ایسے ہی دوسرے مقاصد کے عنوان سے آگے بڑھے اور بعض غافل اور فریب خوردہ مسلمانوں کے دل میں یہ بات ڈال دی کہ عقائد اور نظریات کی جنگ اب قصہ پارینہ بن چکی ہے' جس کا کوئی مفہوم نہیں ہے۔

اب دین و عقیدے کی بنا پر علم جہاد بلند کرنا اور معرکہ آرائی کرنا جائز نہیں ہے۔ یہ ہے ان متعصب اور بظاہر شکست خوردہ دشمنان اسلام کی خصوصیت۔ اور یہ روش انہوں نے محض اس لئے اختیار کی ہے کہ وہ مسلمانوں کے نظریاتی جوش اور غیظ و غضب سے محفوظ رہیں جبکہ اپنی نیت اور مقاصد کے اعتبار سے کٹر قسم کے صیہونی' اور بین الاقوامی صلیبی (چاہے وہ عالمی کمیونسٹ ہی کیوں نہ ہوں) دراصل یہ سب لوگ اپنی راہ سے اس سنگ گراں (نظریہ اسلامی) کے ہٹانے میں مصروف ہیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ اس سے پہلے وہ ایک طویل

عرصے تک اس سے ٹکر لیتے رہے مگر اسلام نے ان سب کو شکست دی۔

غرض یہ ایک نظریاتی جنگ ہے' یہ نہ تو کسی قطعہ ارضی کا جھگڑا ہے' نہ مفادات کا تنازعہ ہے اور نہ جنگی اہمیت کے مقامات پر نزاع ہے۔ زر و زمین کے ان بوگس نعروں اور جھنڈوں کو کوئی اہمیت حاصل نہیں ہے' یہ سب تدابیر دشمنان اسلام نے محض اس لئے اختیار کی ہیں تاکہ سادہ لوح مسلمانوں کو اس معرکے کی اصلیت اور اس کے حقیقی اغراض و مقاصد سے بے خبر رکھیں۔ اور ہم ہیں کہ ان کے اس فریب کا شکار ہو گئے ہیں۔ للذا ان دشمنوں کو ملامت کرنے کی ضرورت نہیں ہے' بلکہ ہمیں چاہئے کہ خود اپنے آپ کو ملامت کریں' کیونکہ ہم نے نبی ﷺ کی سنت' اور اللہ تعالیٰ کی ہدایات کو ترک کر دیا ہے جو اس نے نبی کو امت مسلمہ کی راہنمائی کے لئے دی تھیں جبکہ اللہ تعالیٰ سب سے سچا ہے اور ان کا فرمان صاف صاف یہ ہے۔

وَلَنۡ تَرۡضٰى عَنۡكَ الۡيَهُوۡدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمۡ ؕ "اور یہود و نصاریٰ آپ سے اس وقت تک راضی نہ ہوں گے جب تک آپ ان کے طریقے پر نہ چلنے لگیں۔"

وہ مسلمانوں سے صرف یہی ایک قیمت مانگتے ہیں۔ اس کے سوا جو کچھ بھی ہو وہ انہیں قبول نہیں ہے۔ لیکن یہی ہدایت اور اٹل فیصلہ یہی ہے قُلۡ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الۡهُدٰى "کہہ دیجئے کہ ہدایت بس وہی ہے جس کی طرف اللہ نے راہنمائی فرمائی۔"

ہدایت وہی ہے' ہدایت اس میں محصور اور محدود ہے اور اس کے سوا سرے سے کوئی ہدایت ہے ہی نہیں' للذا اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے صراط مستقیم کے علاوہ کسی راہ پر چل کر کامیابی حاصل نہیں کی جا سکتی۔ للذا اسے اختیار کرنا بے حد ضروری ہے۔ اس سے کوئی چھٹکارا نہیں ہے۔ ہم اس کے اندر کوئی ترمیم نہیں کر سکتے اور نہ اس میں سے کسی چھوٹی یا بڑی چیز کے بارے میں کوئی سودا بازی کر سکتے ہیں۔ یہ ہدایت پوری کی پوری قبول کرنی ہو گی جو چاہے قبول کرے' اور جو چاہے انکار کر دے لیکن خبردار کہ ان کے ایمان و ہدایت کی خواہش یا ان کی محبت اور دوستی تمہیں کہیں اس راہ حق سے اور صراط مستقیم سے ہٹا نہ دے۔

وَلَئِنِ اتَّبَعۡتَ اَهۡوَآءَهُمۡ بَعۡدَ الَّذِىۡ جَآءَكَ مِنَ الۡعِلۡمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنۡ وَّلِىٍّ وَّلَا نَصِيۡرٍ "اس علم کے بعد جو تمہارے پاس آچکا ہے تم نے ان کی خواہشات کی پیروی کی تو اللہ کی پکڑ سے بچانے والا کوئی دوست اور مددگار تمہارے لئے نہیں ہے۔" کیسی خوفناک تہدید ہے؟ کیا اٹل فیصلہ ہے اور کتنی سخت وعید ہے؟ اور ہے کس کے حق میں؟ سرتاج انبیاء اور محبوب کبریا حضرت نبی ﷺ کے حق میں!

مقصد یہ کہ اللہ تعالیٰ کی ہدایت جس کے سوا کوئی ہدایت نہیں ہے' اس سے تم صرف اس وجہ سے ہٹ سکتے ہو کہ تم ان لوگوں کی خواہشات کی پیروی شروع کر دو ورنہ اس کے سوا اسے ترک کرنے کی کوئی وجہ' یعنی دلیل و برہان کی کمی یا کمزوری' نہیں ہے۔

اہل کتاب میں سے جو لوگ خواہشات نفسانیہ سے پاک ہو جاتے ہیں' وہ بھی اپنی کتاب کو اس طرح پڑھتے ہیں جس طرح اس کے پڑھنے کا حق ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اس سچائی پر بھی ایمان لاتے ہیں جو آپ کے پاس ہے اور جو لوگ اس سچائی کا انکار کریں گے وہی گھاٹے میں رہیں گے نہ آپ ر خسارے میں ہیں اور نہ مؤمنین۔

اَلَّذِيۡنَ اٰتَيۡنٰهُمُ الۡكِتٰبَ يَتۡلُوۡنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ ؕ اُولٰٓئِكَ يُؤۡمِنُوۡنَ بِهٖ ؕ وَمَنۡ يَّكۡفُرۡ بِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الۡخٰسِرُوۡنَ "جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے وہ اسے اس طرح پڑھتے ہیں جیسا کہ پڑھنے کا حق ہوتا ہے۔ وہ اس پر سچے دل سے ایمان لاتے ہیں اور جو اس کے ساتھ کفر کا رویہ اختیار کریں وہی اصل میں نقصان اٹھانے والے ہیں۔"

کیونکہ وہ ایمان سے محروم ہو گئے ہیں اور ایمان اس پوری کائنات میں اللہ کی جملہ نعمتوں میں سے ایک عظیم نعمت ہے۔ للذا ایمان

کے خسارے سے بڑا خسارہ اور کیا ہو سکتا ہے؟ اس فیصلہ کن اور زوردار تقریر کے بعد روئے سخن بنی اسرائیل کی طرف پھر جاتا ہے۔ گویا اس طویل مقابلے اور مجادلے کے بعد اور اللہ اور اس کے نبیوں کے ساتھ ان کے طرز عمل کی طویل تاریخ کے دہرانے کے بعد انہیں آخری بار متوجہ کیا جاتا ہے۔ انہیں چھوڑ کر حضرت نبی ﷺ اور مومنین کو خطاب کرنے کے بعد اب یہاں دوبارہ انہیں آخری بار دعوت دی جاتی ہے۔ دراں حالیکہ وہ امانت الٰہی یعنی اسلامی نظریۂ حیات کی حفاظت کے شرف سے حد درجہ غافل اور بے پروا ہو چکے ہیں۔ حالانکہ یہ شرف اور ذمہ داری انہیں ازمنہ قدیم سے حاصل چلی آ رہی تھی۔ غرض اس تقریر کے آخری حصے میں بھی لوگوں کو وہی دعوت دی جاتی ہے جو اس کے آغاز میں انہیں دی گئی تھی۔

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّىْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۲۲﴾ وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۱۲۳﴾

"اے بنی اسرائیل یاد کرو میری وہ نعمت جس سے میں نے تمہیں نوازا تھا اور یہ کہ میں نے تمہیں دنیا کی تمام قوموں پر فضیلت دی تھی اور ڈرو اس دن سے جب کوئی کسی کے ذرا کام نہ آئے گا نہ کسی کا فدیہ قبول کیا جائے گا' نہ کوئی سفارش کسی آدمی کو فائدہ دے گی اور نہ مجرموں کو کہیں سے کوئی مدد پہنچ سکے گی۔"

☆☆☆☆☆

درس ۷ ایک نظر میں

اب یہاں سے وہ حالات بیان کئے جارہے ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بھی پہلے کے دور سے متعلق ہیں یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعات۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قصے کو جس طرح بیان کیا جارہا ہے اس سیاق کلام میں اس کی اہمیت بھی واضح ہو جاتی ہے۔ مدینہ طیبہ میں اسلامی جماعت اور یہودیوں کے درمیان جو مختلف النوع اختلافات پائے جاتے تھے' ان پر روشنی ڈالنے کی لئے یہ قصہ بے حد اہم تھا۔

کیونکہ اہل کتاب حضرت اسحاق علیہ السلام کے واسطہ سے اپنی نسبت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف کرتے تھے اور اپنی اس نسبت اور اللہ تعالیٰ کی جانب سے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور آپ کے بعد اولاد ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ ترقی اور برکت کا وعدہ کرنے پر فخر کرتے تھے۔ اس لئے وہ سمجھتے تھے کہ ہدایت اور صحیح دین پر قائم رہنا گویا ان کی اجارہ داری ہے۔ جیسا کہ وہ اپنے آپ کو جنت کا ٹھیکیدار سمجھتے ہیں چاہے ان کا عمل جیسا بھی ہو۔

اہل قریش بھی حضرت اسماعیل علیہ السلام کے واسطے سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد تھے۔ اور اپنی اس نسبت پر فخر کرتے تھے اور انہوں نے بیت اللہ کی نگرانی اور مسجد حرام کی تعمیر کے مناصب حضرت ابراہیم علیہ السلام ہی سے ورثے میں پائے تھے اور پورے عرب پر دینی سیادت اور فضل و شرف کے رتبے بھی انہوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام ہی سے ورثے میں پائے تھے۔

اس سے قبل جنت کے بارے میں یہود و نصاریٰ کے دعاوی پر کلام کرتے ہوئے یہاں تک کہا گیا تھا۔ "وہ کہتے ہیں کہ جنت میں صرف وہی شخص داخل ہو گا' جو یہودی ہو یا عیسائی ہو۔" اور دوسری جگہ ان کا یہ قول نقل کیا گیا تھا کہ مسلمانوں کو یہودی یا عیسائی بنانے کی سعی کرتے ہوئے کہتے ہیں! "تم یہودی بن جاؤ یا عیسائی تاکہ ہدایت پاؤ۔" نیز یہ بھی بتایا گیا کہ ان میں سے بعض لوگ ایسے ہیں جو لوگوں کو اللہ کی مساجد میں ذکر الٰہی سے روکتے ہیں اور مساجد کو خراب کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہاں ہم نے یہ کہا تھا کہ یہ باتیں واقعہ تحویل سے متعلق ہو سکتی ہیں۔ کیونکہ اس موقع پر یہودیوں نے اسلامی جماعت کے خلاف مسموم پروپیگنڈہ شروع کر دیا تھا۔

اب یہاں حضرت ابراہیم حضرت اسحاق و حضرت اسماعیل علیہم السلام اور بیت اللہ' اس کی تعمیر اور اس سے متعلق اسلامی شعائر کی بابت بات کی جارہی ہے کیونکہ یہی مناسب موقع ہے۔ تاکہ انبیاء کرام کے شجرہ نسب اور باہمی تعلق کے بارے میں یہودیوں' عیسائیوں اور مشرکین کے بے بنیاد دعوؤں کے بارے میں صحیح حقائق لوگوں کے ذہن نشین ہو جائیں اور مسلمانوں کو جس قبلے کی طرف مڑنا ہے اس کے مسئلے کا بھی فیصلہ ہو جائے۔ نیز اس موقع پر دین ابراہیم علیہ السلام یعنی خالص توحید کی وضاحت بھی کر دی جاتی ہے۔ اور یہ بتایا جاتا ہے کہ اہل کتاب اور مشرکین نے جو من گھڑت عقائد اور بے راہ روی اختیار کی ہوئی ہے' اس کا اسلام کے عقیدۂ توحید کے ساتھ دور کا واسطہ بھی نہیں ہے۔ اس کے برعکس حضرت ابراہیم علیہ السلام' حضرت اسماعیل علیہ السلام' حضرت اسحٰق علیہ السلام حضرت یعقوب علیہ السلام (اسرائیل جس کی طرف سے یہ لوگ نسبت کرتے ہیں) اور مسلمانوں کے عقائد اور آخری دین میں کوئی فرق نہیں ہے۔ نیز یہ بھی بتایا گیا کہ اللہ کا دین ہمیشہ ایک ہی رہا ہے اور وہی دین تمام انبیاء اور رسل کا مشن رہا ہے اور وہ کسی قوم یا کسی نسل کے ساتھ مخصوص نہیں ہے نہ اس پر کسی کی اجارہ داری ہے۔ یہ تو ایک عقیدہ ہے جو دل مومن کی دولت ہے۔ اندھی عصبیت سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ ایک ایسی میراث ہے جو خون اور نسل کے رشتوں پر تقسیم نہیں ہوتی بلکہ ایمان اور عقائد کے رشتے پر قائم ہوتی ہے۔ لہٰذا جو شخص بھی اس دین کو قبول کرے اور اس

کی نگہبانی کرے ' وہ جس نسل سے متعلق ہے اور جس قوم کا فرد ہو ' وہ اس کا سب سے زیادہ مستحق ہے۔ یعنی اپنے حقیقی بھائیوں اور صلبی اولاد سے بھی زیادہ۔ کیونکہ یہ اللہ کا دین ہے اور اللہ اور اس کے بندوں کے درمیان کوئی نسبی یا کوئی اور رشتے کا تعلق نہیں ہے۔

یہ حقائق جو اسلامی تصور حیات کے اساسی خطوط کا ایک اہم حصہ ہیں۔ قرآن کریم یہاں انہیں بڑے عجیب طرز ادا میں نہایت واضح کر کے بیان کرتا ہے۔ فصیح وبلیغ انداز بیان کے علاوہ سیاق کلام یہاں غایت درجہ مربوط ہے۔ پہلے بیان کیا جاتا ہے کہ کس طرح اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آزمایا اور وہ اس آزمائش میں پورے اترے اور اس کے نتیجے میں انہیں امامت عالم کے لئے چن لیا گیا۔ ابراہیم علیہ السلام نے بیت اللہ کو تعمیر کیا۔ تعمیر بیت اللہ کے موقع پر جو دعا مانگی اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے نبی آخر الزمان حضرت محمد ﷺ کو مبعوث فرمایا اور امت مسلمہ کو برپا کیا گیا۔ اس لئے امت مسلمہ اس ورثے کی جائز وارث بن گئی اور اولاد ابراہیم علیہ السلام سے یہ اعزاز چھین لیا گیا۔ کیونکہ نظریاتی ورثے کے مستحق صرف وہ لوگ ہوتے ہیں جو رسالت پر پختہ ایمان رکھتے ہیں اور اچھی طرح سے اسے روبہ عمل لاتے ہیں اور رسالت کا صحیح تصور قائم رکھتے ہیں۔ یہی ہے علت نظریاتی میراث کی۔

ان تاریخی حقائق کے بیان کے درمیان ' طرز ادا سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام اپنے مفہوم کے اعتبار سے کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا جائے ' سلسلہ رسل کی ابتدا میں بھی پیغام اول تھا ' اور اس سلسلے کو اختتام پر بھی یہی اسلام رسولوں کا مشن تھا۔ یہی حضرت ابراہیم علیہ السلام کا نظریہ تھا ' اور آپ کے بعد حضرت اسماعیل علیہ السلام ' حضرت اسحاق علیہ السلام اور دوسری رسالتوں اور تحریکات حقہ کا عقیدہ تھا۔ ان حضرات نے اس امانت کو حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے سپرد کیا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یہ وراثت آخر کار امت مسلمہ تک آپہنچی۔ اس عقیدے اور اس نظریئے پر جو بھی ثابت قدم ہو گا وہی حضرت ابراہیم علیہ السلام کا روحانی وارث ہو گا۔ اور وہی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ کئے ہوئے وعدوں کا حقدار اور ان کی دی ہوئی بشارتوں کا مصداق ہو گا۔ اور جس شخص نے اسلام سے روگردانی کی اور اپنے نفس کو ملت ابراہیمی سے دور رکھا ' تو گویا وہ اللہ کے عہد کا مستحق نہ رہا اور اس نے اپنے آپ کو اس حق وفا سے محروم کر دیا اور ان بشارتوں کا مصداق نہ رہا۔

یہاں اگر یہود و نصاریٰ کے وہ تمام دعوے اپنی اساس کھو دیتے ہیں کہ وہ چیدہ اور برگزیدہ قوم ہیں۔ محض اس لئے کہ وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پوتے پڑپوتے ہیں ' اور ان کے خلیفہ ہیں۔ اس لئے کہ جب سے انہوں نے عقیدۂ توحید کو خیرباد کہا ' تب سے وہ وراثت ابراہیمی سے محروم ٹھہرے۔

اور اس مقام پر قبیلہ قریش کے یہ دعوے بھی منہدم ہو جاتے ہیں کہ وہ بیت اللہ کی تولیت اور دیکھ بھال اور تعمیر کے حقدار ہیں۔ کیونکہ انہوں نے اس مقام مقدس کے بانی اول کی روحانی میراث سے انحراف اختیار کر لیا۔ اسی طرح یہودیوں کا یہ دعویٰ بھی منہدم ہو جاتا ہے کہ وہ بیت المقدس کے اصحاب قبلہ ہیں اور مسلمانوں کے لئے بھی مناسب یہی ہے کہ وہ بدستور بیت المقدس کو قبلہ بنائے رکھیں۔ اس لئے کہ خانہ کعبہ ان کا بھی قبلہ ہے اور ان کے والد حضرت ابراہیم علیہ السلام کا بھی قبلہ تھا۔

ان تمام امور کو ایک حسین وجمیل پیرائے میں ادا کیا گیا جس کے اندر بے شمار واضح اشارات موجود ہیں اور جس کے اندر ایسے مواقف اور مقامات غور وفکر بھی ہیں جن کے اندر نہایت ہی دقیق مفاہیم پوشیدہ ہیں اور ایسی توضیحات ہیں جو نہایت پر اثر ہیں۔ اب ہم اس فصیح وبلیغ انداز کلام پر ' درج بالا اشارات کی روشنی میں تفصیلی بات کریں گے۔

☆ ☆ ☆

درس ۷ تشریح آیات (۱۲۴ تا ۱۴۱)

وَ اِذِ ابْتَلٰۤى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ؕ قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ؕ قَالَ وَ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ ؕ قَالَ لَا یَنَالُ عَهْدِی الظّٰلِمِیْنَ ﴿۱۲۴﴾

"یاد کرو جب ابراہیم ؑ کو اس کے رب نے چند باتوں میں آزمایا اور وہ ان سب میں پورا اتر گیا تو اس نے کہا "میں تجھے لوگوں کا پیشوا بنانے والا ہوں۔" ابراہیم ؑ نے عرض کیا! "اور کیا میری اولاد سے بھی یہی وعدہ ہے؟ اس نے جواب دیا "میرا وعدہ ظالموں سے متعلق نہیں ہے۔"

خطاب حضور ﷺ سے ہے۔ ذرا روئیداد ابتلائے ابراہیم ؑ یاد کرو۔ آپ کو کچھ احکام دیئے گئے۔ آپ پر کچھ بندشیں عائد کی گئیں اور آپ نے پوری وفا کیشی سے ان اوامر و نواہی پر عمل کیا۔ ایک دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم ؑ کی وفا کیشی کو سراہتے ہوئے فرمایا وَ اِبْرٰهِیْمَ الَّذِیْ وَفّٰۤى "اور ابراہیم ؑ جنہوں نے احکام پورے کئے۔" یہ وہ بلند و بالا مقام ہے جس تک حضرت ابراہیم ؑ پہنچے۔ اس مقام تک جہاں اللہ تعالیٰ خود بندے کی وفاداری اور اطاعت شعاری کی شہادت دیتا ہے جبکہ بحیثیت انسان ایک ضعیف اور پر تقصیر مخلوق ہے اور اس کے لئے وفائے پوری اطاعت ممکن نہیں ہے۔

اور اس مقام تک رسائی حاصل کرنے ہی کی وجہ سے حضرت ابراہیم ؑ اس سعادت اور اس اعتماد کے مستحق ہوئے قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ؕ "میں تمہیں لوگوں کا پیشوا بنانے والا ہوں۔" ایسا پیشوا جو لوگوں کا قبلہ و کعبہ ہو۔ جو انہیں اللہ تک پہنچانے والا ہو' جو بھلائی کے کام میں سب سے پہلے ہو' اور لوگ ان سے پیچھے ہوں اور وہ ان کا محبوب قائد ہو۔

یہاں آکر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ذات سے انسانی فطرت نمودار ہوتی ہے۔ انسان کے اندر یہ فطری داعیہ موجود ہوتا ہے کہ اس کا تسلسل بذریعہ اولاد جاری رہے۔ یہ ایک گہرا فطری اور نفسیاتی شعور ہوتا ہے' جو اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت کی گہرائیوں میں ودیعت کیا ہوا ہے۔ اور اس کی حکمت یہ ہے کہ زندگی کی ترقی جاری رہے اور انسانی زندگی ان خطوط پر آگے بڑھتی رہے جو خالق نے اس کے لئے وضع کئے ہیں۔ اور جن ترقیات کا آغاز اگلوں نے کیا ہوتا ہے' آنے والے اسے مزید آگے بڑھائیں اور تمام نسلوں کے اندر یہ ہم آہنگی قائم رہے۔ یہ شعور جسے بعض لوگ توڑنا چاہتے ہیں اور ختم کرنا چاہتے ہیں' حالانکہ وہ انسان کی عین فطرت کے اندر مرکوز ہے۔ اور اس کی حکمت یہ ہے کہ انسان بعض دوررس مقاصد پورے کر سکے۔ اسی جذبے اور شعور کے تحت اسلام نے قانون میراث کے لئے تفصیلی قواعد وضع کئے ہیں تاکہ اولاد و احفاد کی بھلائی کے لئے انسان اپنی سعی جاری رکھے اور تیز تر کر دے۔ آج اس فطری شعور کو منہدم کرنے کے لئے دنیا میں جو سعی نامشکور ہو رہی ہے در اصل فطرت انسانی کی تباہی کا سامان ہے۔ انسان کی اجتماعی زندگی میں بے شک بعض مفاسد پائے جاتے ہیں لیکن ان مفاسد کو ختم کرنے کے لئے خود فطرت انسانی اور انسان کی شخصیت ہی کو تباہ کر دینا ایک نہایت ہی بھونڈا' کوتاہ اندیشانہ اور غیر فطری طریق علاج ہے اور ان اجتماعی مفاسد کا ہر وہ علاج جو خلاف فطرت طریقے سے کیا گیا ہو کبھی بھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ کبھی بھی مفید نہیں ہو گا اور قطعاً دیرپا نہیں ہو سکتا۔ ایسے علاج موجود ہیں جو ان مفاسد کو تو ختم کر دیں گے لیکن وہ فطرت انسانی سے

بھی متصادم نہ ہوں گے۔ لیکن ایسے طریقے پانے کے لئے ایمان و ہدایت کی ضرورت اور اس بات کی ضرورت ہے کہ معالج کو فطرت انسانی کا مکمل اور گہرا شعور ہو۔ اور اس کی فکر انسان کی طبعی تخلیق سے بھی آگے گہرائیوں تک پہنچی ہوئی ہو اور یہ فکر اور یہ جذبہ اصلاح طبقاتی بغض و عداوت سے پاک ہو' اس لئے کہ ان طبقاتی جذبات کی وجہ سے بجائے اس کے کہ انسان کی کوئی ہمہ گیر اصلاح ہو' انسان ہمہ گیر تباہی سے دوچار ہو جاتا ہے' تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا: قَالَ وَ مِنۡ ذُرِّیَّتِیۡ "اور کہا کیا میری اولاد سے بھی یہی وعدہ ہے؟"

اس سوال کا جواب حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پروردگار کی طرف سے آتا ہے جس نے انہیں آزمایا اور پھر چن لیا تھا۔ یہ جواب اس اہم اصول کی بنیاد رکھ دیتا ہے جس کا تذکرہ ہم کر آئے ہیں۔ یہ کہ امامت و قیادت ان لوگوں کا حق ہے جو اپنے شعور اور طرز عمل اور اپنی صلاحیت اور ایمان سے اپنے آپ کو اس کا مستحق ثابت کر دیں۔ یہ کوئی نسلی اور موروثی منصب نہیں ہے کہ باپ سے بیٹے کی طرف منتقل ہوتا چلا آئے۔ یہاں رشتہ و تعلق' خون' نسل اور قومیت پر مبنی نہیں ہوتا بلکہ یہاں دین و ایمان کے رشتے مدار تعلق ہوتے ہیں اور منصب و قیادت کے معاملے میں خونی' نسلی اور قومی نعرے دعوائے جاہلیت کے زمرے میں آتے ہیں' جو حیات انسانی کے بارے میں صحیح انسانی نقطۂ نظر کے ساتھ صریحاً متصادم ہوتے ہیں۔

قَالَ لَا یَنَالُ عَہۡدِی الظّٰلِمِیۡنَ "کہا میرا وعدہ ظالموں سے متعلق نہیں ہے۔"

ظلم کی بھی کئی قسمیں اور کئی رنگ ہیں۔ نفس انسانی کا شرک کرنا بھی ایک طرح کا ظلم ہے۔ لوگوں کی جانب سے اللہ کی نافرمانی بھی ایک ظلم ہے۔ ظالموں پر یہاں جس امانت کو ممنوع قرار دیا گیا ہے' اس سے عمومی امامت مراد ہے' جو امامت کی تمام اقسام پر مشتمل ہے۔ امامت رسالت' امامت خلافت' امامت صلوٰۃ اور ان کے علاوہ بھی امامت و قیادت کے تمام مناصب شامل ہیں۔ لہٰذا عدل و انصاف' اپنے وسیع معنوں میں' ہر قسم کی امامت کے استحقاق کے لئے پہلی شرط ہے۔ اور کوئی شخص کسی قسم کے ظلم کا ارتکاب بھی کرے' وہ اپنے آپ کو امامت و قیادت کے استحقاق سے محروم کر دیتا ہے' چاہے وہ قیادت جیسی بھی ہو۔

یہ جو کچھ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے کہا گیا اور یہ عہد جس کے الفاظ میں کوئی پیچیدگی نہیں ہے اس بات کا قطعی فیصلہ کر دیتا ہے کہ یہودی ہمیشہ منصب قیادت سے دور اور محروم رہیں گے۔ کیونکہ انہوں نے ظلم کا ارتکاب کیا' فسق و فجور میں مبتلا ہوئے اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی' اور انہوں نے اپنے جد امجد کے عقائد و نظریات کو ترک کر دیا۔

نیز جو کچھ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے کہا اور یہ عہد جس کے الفاظ میں کوئی کجی اور کوئی غموض نہیں ہے' ان لوگوں کو بھی قطعی طور پر منصب امامت سے محروم کر دیتا ہے جو اپنے آپ کو مسلمان کہلاتے ہیں' انہوں نے بھی ظلم کا ارتکاب کیا ہے' فسق و فجور میں مبتلا ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی راہ سے دور بھٹک گئے ہیں۔ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی شریعت کو پس پشت ڈال دیا ہے۔ وہ دعویٰ تو اسلام کا کرتے ہیں حالانکہ انہوں نے اپنی پوری زندگی سے اللہ تعالیٰ کی شریعت اور ان کے نظام حیات کو باہر نکال دیا ہے۔ ان لوگوں کا دعوائے اسلام محض جھوٹا دعویٰ ہے' جو دراصل اللہ کے ساتھ کیے ہوئے عہد کی اساس محکم پر استوار نہیں ہے۔

اسلامی تصور حیات ان تمام رشتوں اور تعلقات کی جڑ کاٹ دیتا ہے جو کسی فکر و نظریا وحدت عمل کی اساس پر قائم نہیں ہوتے۔ وہ صرف ایسے رشتوں اور تعلقات کو تسلیم کرتا ہے جو وحدت نظریہ اور عمل کی اساس پر قائم ہوں۔ اس کے علاوہ جو روابط بھی ہوں اسلام کی نظر میں ان کی کوئی وقعت نہیں ہے بلکہ اسلام ایک ہی امت کی ان دو نسلوں میں بھی تفریق کر دیتا ہے جب کہ ایک نسل اپنے عقیدے اور نظریہ میں دوسری کی مخالف ہو جائے۔ بلکہ اگر عقیدے کا تعلق ٹوٹ جائے تو اسلام باپ بیٹے اور میاں بیوی کے درمیان بھی جدائی کر دیتا ہے۔ غرض حالت شرک کی عرب دنیا اور حالت اسلام کی عرب دنیا میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ان دونوں کے درمیان اسلامی نقطۂ نظر سے

کوئی تعلق نہیں ' کوئی ربط اور کوئی رشتہ نہیں ہے۔ اہل کتاب میں سے جو لوگ ایمان لائے وہ ایک امت ہیں اور جن لوگوں نے حضرت ابراہیم ' حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام کے دین کو ترک کیا اور ایک دوسری امت ہیں۔ ان دونوں کے درمیان بھی کوئی تعلق ' کوئی رابطہ اور کوئی رشتہ نہیں ہے۔ یہاں خاندان کی تشکیل باپ دادا ' پوتوں کے تعلق سے نہیں ہوتی بلکہ یہاں وہ لوگ افراد خاندان ہوتے ہیں جو ایک عقیدے اور نظریئے پر جمع ہو جائیں۔

اسلامی نقطۂ نظر سے کسی امت کی تشکیل بھی نسلی بنیادوں پر نہیں ہوتی بلکہ امت کی تشکیل اہل ایمان سے ہوتی ہے۔ خواہ ان کے رنگ ' ان کی نسل اور ان کے وطن مختلف ہی کیوں نہ ہوں۔ غرض یہ ہے اسلامی تصور حیات جس کے چشمے کتاب الٰہی کے اس ربانی انداز بیان سے پھوٹتے ہیں۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ وَ اِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَ اَمْنًا ؕ وَ اتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى ؕ وَ عَهِدْنَاۤ اِلٰۤى اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَ الْعٰكِفِيْنَ وَ الرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ﴿۱۲۵﴾

"اور یہ کہ ہم نے اس گھر کو لوگوں کے لئے مرکز اور امن کی جگہ قرار دیا تھا اور لوگوں کو حکم دیا تھا کہ ابراہیم ؑ جہاں عبادت کے لئے کھڑا ہوتا ہے اس مقام کو مستقل جائے نماز بنالو اور ابراہیم ؑ اور اسماعیل ؑ کو تاکید کی تھی کہ میرے اس گھر کو طواف اور اعتکاف اور رکوع اور سجدہ کرنے والوں کے لئے پاک رکھو۔" (۲-۱۲۵)

یہی گھر ہے خدا کا کہ آج جس کے مجاور اہل قریش ' اہل ایمان کو خوفزدہ کر رہے ہیں ' انہیں طرح طرح کی اذیت دے رہے ہیں ' انہوں نے محض دین و ایمان کے جرم میں ان پر طرح طرح کے مصائب ڈھائے ' یہاں تک کہ وہ اس گھر کے پڑوس اور اس کی برکات کو چھوڑ کر ہجرت کرنے پر مجبور ہوئے۔ حالانکہ اس گھر کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا فیصلہ یہ تھا کہ یہ مرکز عوام ہو گا اور تمام لوگ ہر طرف سے اس کا رخ کریں گے۔ یہاں کوئی انہیں خوفزدہ کرنے والا نہ ہو گا۔ یہاں انہیں روحانی اور جسمانی امن و طمانیت حاصل ہو گی۔ کیونکہ یہ گھر بذات خود مجسمہ امن منبع طمانیت اور جائے سلامت ہے۔

لوگوں کو حکم دیا گیا تھا کہ وہ حضرت ابراہیم ؑ کے مقام عبادت یعنی خانہ کعبہ کو (مقام ابراہیم ؑ سے میری رائے اور ترجیح کے مطابق پورا خانہ کعبہ مراد ہے) جائے نماز اور مقام عبادت قرار دیں۔ اس لئے یہ بات اب بالکل منطقی ہے کہ یہی گھر اہل اسلام کا بھی قبلہ ہو۔ اور اس پر کسی کا کوئی اعتراض جائز نہیں ہے۔ مسلمانوں کے لئے یہی مناسب قبلہ ہے کیونکہ ایمان اور توحید کی نسبت سے صرف مسلمان ہی حضرت ابراہیم ؑ کی ملت ہیں اور اس کے وارث ہیں۔ اور خانہ کعبہ صرف اللہ کا گھر ہے۔ کسی انسان کا گھر نہیں ہے اور اللہ تعالیٰ جو اس کا مالک ہے ' اس نے اپنے نیک بندوں میں سے دو حضرات حضرت ابراہیم ؑ اور حضرت اسماعیل ؑ کو یہ فریضہ سپرد کیا تھا ' کہ وہ اسے ان لوگوں کے لئے پاک و صاف اور تیار رکھیں جو یہاں رکوع و سجود کی غرض سے آئیں گے اور یا جو لوگ مقام امن کی تلاش میں یہاں پناہ لیں گے ' یا حج و زیارت کی غرض سے یہاں آئیں گے۔ یا وہ لوگ جو یہاں مقیم ہیں اور اس گھر میں اعتکاف کرتے ہیں یا جو باہر سے بغرض عبادت یہاں پہنچتے ہیں ' یہاں تک کہ یہ گھر خود حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کی ملکیت بھی نہ تھا۔ تاکہ موروثی

طور پر یہ حقوق قریش کو حاصل ہو جاتے۔ قریش تو محض اللہ تعالیٰ کے اذن اور حکم سے اس کے مجاور اور خادم مقرر ہوئے تھے کہ وہ اسے یہاں آنے والے اہل ایمان کے لئے تیار رکھیں۔

وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ اجْعَلْ هَٰذَا بَلَدًا آمِنًا وَارْزُقْ أَهْلَهُ مِنَ الثَّمَرَاتِ مَنْ آمَنَ مِنْهُم بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ۖ قَالَ وَمَن كَفَرَ فَأُمَتِّعُهُ قَلِيلًا ثُمَّ أَضْطَرُّهُ إِلَىٰ عَذَابِ النَّارِ ۖ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ ﴿١٢٦﴾

"اور یہ کہ ابراہیم ؑ نے کہا! اے میرے رب' اس شہر کو امن کا شہر بنا اور اس کے باشندوں میں سے جو اللہ اور آخرت کو مانیں' انہیں ہر قسم کے پھلوں کا رزق دے۔" جواب میں اس کے رب نے فرمایا! "اور جو نہ مانے گا دنیا کی چند روزہ زندگی کا سامان تو میں اسے بھی دوں گا مگر آخر کار اسے جہنم کی طرف گھسیٹوں گا اور وہ بد ترین ٹھکانا ہے۔" (۲-۱۲۶)

حضرت ابراہیم ؑ کی یہ دعا ایک بار پھر اس بات کی تائید کرتی ہے کہ اللہ کا یہ گھر بیت الامن ہے۔ اور ایک بار پھر یہاں اس بات کی وضاحت ہوتی ہے کہ اسلام میں وراثت و نیابت کا مدار اخلاقی فضیلت اور نیکی پر ہے۔ اس سے پہلی آیت میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جو ہدایت دی گئی تھی کہ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظَّالِمِينَ "میرا وعدہ ظالموں سے متعلق نہیں ہے۔"

تو اس سے حضرت ابراہیم علیہ السلام خوب سمجھ گئے تھے کہ دریں راہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست اس لئے ابراہیم علیہ السلام نے دعائے رزق میں مَنْ آمَنَ مِنْهُم "جو اللہ اور آخرت کو مانیں" کہہ کر از خود غلط لوگوں کو مستثنیٰ کر دیا تھا۔ اس لئے کہ وہ سنت الٰہی اور منشائے الٰہی کو خوب سمجھ گئے تھے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نہایت ہی حلیم الطبع اور خدا ترس پیغمبر تھے۔ وہ نہایت ہی یکسو اور راہ مستقیم پر گامزن رہنے والے تھے۔ وہ فوراً وہ طرز عمل اختیار کر لیتے تھے جس کا انہیں حکم دیا جاتا تھا۔ اور آپ ء دعا و درخواست میں بھی منشائے الٰہی کو ملحوظ رکھتے تھے۔ تو اس مقام پر اللہ میاں ان کی دعا کا جواب یوں دیتے ہیں کہ جن لوگوں کے بارے میں آپ خاموش ہو گئے تھے۔ یعنی اہل کفر اور اہل جہنم ان کے بارے میں بھی کہہ دیا جاتا ہے وَمَن كَفَرَ فَأُمَتِّعُهُ قَلِيلًا ثُمَّ أَضْطَرُّهُ إِلَىٰ عَذَابِ النَّارِ ۖ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ

"اور جس نے کفر اختیار کیا تو دنیا کی چند روزہ زندگی کا سامان تو میں اسے بھی دوں گا مگر آخر کار اسے عذاب جہنم کی طرف گھسیٹوں گا اور وہ بد ترین ٹھکانا ہے۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ وَإِذْ يَرْفَعُ إِبْرَاهِيمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَإِسْمَاعِيلُ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ۖ إِنَّكَ أَنتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿١٢٧﴾ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِن ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ وَأَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا ۖ إِنَّكَ أَنتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ﴿١٢٨﴾ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا

مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ يُزَكِّيْهِمْ ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۱۲۹﴾

۱۵ ع۸ ۱۵

"اور یاد کرو ابراہیم علیہ السلام اور اسماعیل علیہ السلام جب اس گھر کی دیواریں اٹھا رہے تھے' تو یہ دعا کرتے جاتے تھے!" "اے ہمارے رب! ہم سے یہ خدمت قبول فرمالے تو سب کی سننے اور سب کچھ جاننے والا ہے۔ اے ہمارے رب' ہم دونوں کو اپنا مسلم (مطیع فرمان) بنا' ہماری نسل سے ایک ایسی قوم اٹھا' جو تیری مسلم ہو۔ ہمیں اپنی عبادت کے طریقے بتا' اور ہماری کوتاہیوں سے درگزر فرما' تو بڑا معاف کرنے والا' رحیم فرمانے والا ہے۔ اور اے رب! ان لوگوں میں خود ان کی قوم سے ایک رسول اٹھائیو' جو انہیں تیری آیات سنائے۔" "ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور ان کی زندگیاں سنوارے۔ تو بڑا مقتدر اور حکیم ہے۔"

ذرا انداز کلام ملاحظہ ہو! کلام کا آغاز حکایتی ہے۔ ایک قصے کا آغاز یوں ہوتا ہے۔ وَ اِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَ اِسْمٰعِيْلُ ؕ "اور یاد کرو کہ جب ابراہیم علیہ السلام اور اسماعیل علیہ السلام اس گھر کی بنیادیں اٹھا رہے تھے۔"

اب قاری انتظار میں ہے کہ یہ حکایت آگے بڑھے گی' لیکن اچانک ہمارے تصور کے اسکرین پر ایسا منظر آتا ہے کہ گویا حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل اس پر سامنے آتے ہیں۔ محسوس ہوتا ہے کہ گویا تصور نہیں بلکہ ہم اپنی آنکھوں سے ان حضرات کو دیکھ رہے ہیں۔ وہ ہمارے سامنے حاضر ہیں اور قریب ہے کہ ہم ان حضرات کی یہ رقت آمیز دعا اپنے کانوں سے سن لیں۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۱۲۷﴾ رَبَّنَا وَ اجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَ مِنْ ذُرِّيَّتِنَاۤ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ۪ وَ اَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَ تُبْ عَلَيْنَا ۚ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۲۸﴾

"اے ہمارے رب' ہم سے یہ خدمت قبول فرمالے تو سب کی سننے اور سب کچھ جاننے والا ہے۔ اے رب' ہم دونوں کو اپنا مسلم بنا' ہماری نسل سے ایک ایسی قوم اٹھا' جو تیری مسلم ہو' ہمیں اپنی عبادت کے طریقے بتا اور ہماری کوتاہیوں سے درگزر فرما' تو بڑا درگزر فرمانے والا' رحم فرمانے والا ہے۔

زمزمہ دعا' نغمہ التجا اور طلب مدعا کی یہ عجیب فضا بالکل آنکھوں کے سامنے ہے' گویا یہ سب کچھ اسی وقت ہو رہا ہے۔ ایک زندہ اور متحرک منظر سامنے ہے جس کے کردار مشخص کھڑے ہیں۔ حسین وجمیل تعبیر اور انداز گفتگو قرآن مجید کی خصوصیات میں سے ایک اہم خصوصیت ہے۔ قرآن مجید ازمنہ سابقہ کے کسی بھی منظر کو اس طرح بیان کرتا ہے کہ وہ بالکل اسکرین پر چلتا ہوا نظر آتا ہے۔ زندگی سے بھرپور' متحرک اور شخصی تصویر کشی اور منظر نگاری کی یہ ایسی خصوصیت ہے جو اللہ کی اس دائمی کتاب ہی کو زیب دیتی ہے اور ہے بھی معجزانہ۔

اور اس دعا کے اندر کیا ہے؟ نبوت کی نیازمندانہ ادا' نبوت کا پختہ یقین اور اس کائنات میں نظریہ اور عقیدے کا پیغمبرانہ شعور۔ یہی ادا اور یہی یقین اور یہی شعور اللہ تعالیٰ وارثان انبیاء کو سکھانا چاہتے ہیں۔ قرآن مجید کی یہ کوشش ہے کہ اس القاء کے ذریعہ یہ شعور وارثان انبیاء کے دل ودماغ میں عمیق تر ہو جائے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ O "اے ہمارے رب' ہم سے قبول فرما' بے شک آپ ہی سننے والے ہیں اور جاننے والے ہیں۔" یہ دعائے اجابت ہے۔ اور یہی منتہائے مراد ہے۔ اس لئے کہ یہ عمل خالص اللہ کے لئے ہے۔ خشوع خضوع کے ساتھ۔ اس کے ذریعہ وہ دونوں اللہ کی جانب متوجہ ہوں۔ اور اس سب کارروائی اور عمل کے پیچھے صرف رضائے الٰہی اور مقبولیت دعا

کا جذبہ کارفرما ہے۔ اور امید کی کرن یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر پکارنے والے کی پکار سنتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اس پکار کے پیچھے جو جذبہ کارفرما ہوتا ہے اور پکارنے والے کا جو شعور ہوتا ہے وہ بھی اس کے علم میں ہوتا ہے۔

رَبَّنَا وَ اجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ أُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ وَ اَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَ تُبْ عَلَيْنَا اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ "اے ہمارے رب ہم دونوں کو اپنا مطیع فرمان بنا' ہماری نسل سے ایک ایسی قوم اٹھا جو تیری مطیع ہو۔ ہمیں اپنی عبادت کے طریقے بتا اور ہماری کوتاہیوں سے درگزر فرما' بے شک تو بڑا معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔" (۲-۱۲۸)

یہ اس معاونت کی امید ہے جو یہ دونوں اسلام کی طرف ہدایت پانے کے سلسلے میں اللہ سے رکھتے تھے۔ ان کے دلوں میں یہ پختہ شعور تھا کہ ان کے دل اللہ تعالیٰ کی انگلیوں میں ہیں' یہ کہ ہدایت صرف اس کی ہدایت ہے۔ اس کی معاونت و توفیق کے بغیر کوئی نہیں جو ہدایت پا سکے۔ اس لئے وہ دونوں ہمہ تن اللہ کی طرف متوجہ اور اس کی طرف راغب اور مائل ہیں اور اللہ تو بہترین مددگار ہے۔

امت مسلمہ کا یہ مزاج ہے کہ وہ باہم معاون و مددگار ہوتی ہے۔ اس کے افراد نسلاً بعد نسل نظریاتی طور پر باہم پیوست ہوتے ہیں' اس لئے دعا کی جاتی ہے۔ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ أُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ' اور ہماری نسل سے بھی تیری مسلم امت پیدا ہو۔"

یہ ایک ایسی دعا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دل مومن کی پہلی تمنا کیا ہوتی ہے۔ عقیدہ اور نظریہ ہی ایک مومن کا محبوب' مشغلہ ہوتا ہے۔ وہ اس کی پہلی ترجیح ہوتی ہے۔ حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کے سامنے اس دولت کی اہمیت واضح تھی جو انہیں دی گئی تھی یعنی دولت ایمان اور ثروت عقیدہ۔ یہ اہمیت اور خواہش انہیں مجبور کرتی ہے کہ وہ آنے والی نسلوں کے لئے بھی اس دولت کے بارے میں التجا کریں۔ اس لئے وہ اپنے رب سے دعا کرتے ہیں کہ وہ ان کی اولاد کو بھی اس دولت ثروت سے محروم نہ رکھیں جس کی قدر و قیمت کے برابر کوئی چیز موجود نہیں ہے۔ اس سے قبل انہوں نے دعا کی تھی کہ وہ ان کی اولاد کو وسائل رزق فراوانی سے دیں۔ اس لئے انہوں نے یہ بھی ضروری سمجھا کہ ان کی اولاد دولت ایمان سے بھی محروم نہ ہو۔ انہوں نے یہ دعا بھی کی کہ وہ ان کی اولاد کو تعلیم مناسک بھی دے۔ ان کو طریقۂ عبادت بھی سکھائے' ان کی مغفرت کرنے والا غفور الرحیم ہے۔

اس کے بعد وہ مزید التجا کرتے ہیں کہ ازمنہ بعیدہ میں بھی وہ ان کی ہدایت کے لئے مستقل بندوبست فرمائیں۔

وَ ابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ يُزَكِّيْهِمْ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ "اے اللہ! ان لوگوں میں خود انہی کی قوم سے ایک رسول مبعوث فرما جو تیری آیات کی تلاوت کرے' ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دے اور ان کی زندگیوں کو پاک کر دے۔ بے شک تو غالب و حکیم ہے۔"

حضرت ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام کی اس دعا کی قبولیت کے نتیجے میں اب اس رسول کریم کی بعثت ہوئی ہے اور کئی صدیاں گزرنے کے بعد' اور آپ کی بعثت حضرت ابراہیم علیہ السلام و اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے ہوئی جو اب انہیں آیات سناتے ہیں' انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتے ہیں اور انہیں ہر قسم کی گندگیوں اور آلودگیوں سے پاک کرتے ہیں۔ اللہ کے ہاں مخلصانہ دعا ہمیشہ قبول ہوتی ہے لیکن وہ اپنے اس وقت میں ظاہر ہوتی ہے' جو اللہ تعالیٰ کی حکمت نے اس کے لئے مقرر کر دیا ہوتا ہے۔ عام لوگوں کی عادت یہ ہے کہ وہ جلد بازی کرتے ہیں اور جو لوگ منزل مراد نہیں پاتے وہ مایوس و پریشان ہوتے ہیں۔

سورۂ بقرہ کی اس دعا کے نزول کے وقت مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان ایک ہمہ گیر کشمکش جاری تھی' ان حالات میں اس دعا کے اندر بعض اشارات بھی پنہاں ہیں اور اس کی خاص اہمیت ہے۔ یہ کہ حضرت ابراہیمؑ و اسماعیلؑ جن کو اس گھر کی تعمیر و تطہیر اور عبادت گزاروں' زیارت کنندگان اور وہاں ٹھہرنے والوں کے لئے سہولیات فراہم کرنے کا حکم دیا گیا تھا' وہ دونوں موجودہ مجاوروں یعنی قریش کے

آباؤ اجداد جن کے ہاتھ میں آج خانہ کعبہ کا انتظام ہے۔ اور ان کا واضح فرمان ہے "ہمیں اپنا مطیع فرمان بنا" اور "ہماری اولاد سے بھی ایک امت مسلمہ اٹھا" جس طرح انہوں نے یہ بھی کہا "اے ہمارے رب ان میں خود انسے ایک رسول مبعوث فرما' جو انہیں آیات پڑھ کر سنائے' انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دے اور ان کی زندگیوں کو پاکیزہ بنادے۔" گویا حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کی اپنی اس دعاسے اس بات کا تقرر کرتے ہیں کہ امت مسلمہ حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کی جانشین و خلیفہ ہے۔ اور اس بات کی حق دار ہے کہ اب خانہ کعبہ کا انتظام اس کے ہاتھ میں ہو۔ گویا خانہ کعبہ امت مسلمہ کا مرکز ہے۔ اور مشرکین کے مقابلہ میں یہ امت "اس خانہ خدا کے انتظام و انصرام کی زیادہ حقدار ہے اور یہ کہ یہ یہود و نصاریٰ کے قبیلوں کے مقابلے میں اس بات کا زیادہ مستحق ہے کہ امتِ مسلمہ کا اپنا قبلہ ہو۔

جو لوگ اس بات کا دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ ہدایات پر ہیں اور اپنے دین کا جوڑ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ملاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ ملت ابراہیمی کے وارث و جانشین ہیں اور قریش کے جو لوگ اپنا نسب نامہ حضرت اسماعیل سے ملاتے ہیں انہیں کان کھول کر سن لینا چاہئے کہ حضرت ابراہیم ﷺ نے جب اپنی اولاد کی نسبت سے اس جانشینی اور امامت و سلطنت کا سوال کیا تھا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے جواب یہ تھا۔

لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ "میرا وعدہ ظالموں کی بابت نہیں ہے۔"

اور اس کے بعد جب ابراہیم علیہ السلام نے اہل مکہ کے لئے برکت و فراوانی رزق کی استدعا کی تو آپ نے فرمایا مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ "جو اللہ اور آخرت پر ایمان لے آئے۔"

اور یہ کہ جب یہ حضرات تعمیر کعبہ کے لئے اٹھے تو انہوں نے یہ دعا کی کہ اے رب! ہمیں اپنا مطیع فرمان بنا اور یہ کہ ہماری اولاد میں سے بھی ایک امت مسلمہ اٹھاتے رہیو! اور یہ کہ ہماری اولاد میں سے نبی آخر الزمان کو مبعوث فرمایئے۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کی دعاؤں کو قبول فرمایا اور حضرت محمد بن عبداللہ کو مبعوث فرمایا اور ان کے ذریعہ امت مسلمہ کو از سرنو قائم فرمایا اور اس نظریاتی وراثت کو یوں جاری فرمادیا۔

قصہ ابراہیم ﷺ کے اختتام پر اب روئے سخن ان لوگوں کی طرف مڑ جاتا ہے جو لوگ امت مسلمہ کے حق امامت و برتری کو چیلنج کر رہے تھے' جو رسول خدا ﷺ کی نبوت اور رسالت سے بر سرپیکار تھے اور حضور سے اس موضوع پر بحث و جدال میں مبتلا تھے کہ دین اسلام کی حقیقت کیا ہے اور یہ کہ اصل دین کیا ہے اور ان کے مزعومات کیا ہیں اس لئے قرآن مجید ان لوگوں کے بارے میں یہ تاثر دیتا ہے۔ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆

وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ ؕ وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا ۚ وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۳۰﴾ اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ ۙ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۳۱﴾ وَوَصّٰى بِهَآ اِبْرٰهٖمُ بَنِيْهِ وَيَعْقُوْبُ ؕ يٰبَنِيَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۳۲﴾

"اور کون ہے جو ابراہیم کے طریقے سے نفرت کرے؟ جس نے خود اپنے آپ کو حماقت و جہالت میں مبتلا کر لیا ہو' اس کے سوا کون یہ حرکت کر سکتا ہے؟ ابراہیم تو وہ شخص ہے جس کو ہم نے دنیا میں اپنے کام کے لئے چن لیا تھا اور آخرت میں اس کا شمار صالحین میں ہو گا۔

اس کا حال یہ تھا کہ جب اس کے رب نے اس سے کہا مسلم ہو جا تو اس نے فوراً کہا "میں مالک کائنات کا مسلم ہو گیا" اسی طریقے پر چلنے کی ہدایت اس نے اپنی اولاد کو کی تھی اور اسی کی وصیت یعقوب اپنی اولاد کو کر گیا۔ اس نے کہا تھا "میرے بچو اللہ نے تمہارے لئے یہی دین پسند کیا ہے۔ لہٰذا مرتے دم تک مسلم رہنا۔"

یہ ہے ملت ابراہیم علیہ السلام یعنی خالص اور واضح اسلام اور فرماں برداری۔ اور اس سے کنارہ کش صرف وہی ہو گا جو اپنے اوپر ظلم کرے گا۔ اس سے وہی دور ہو گا جو دراصل احمق ہو گا۔ اور اپنے آپ کو برباد کرنے والا ہو گا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام جسے رب ذوالجلال نے دنیا کی امت کے لئے چنا اور جن کے بارے میں اللہ نے گواہی دی کہ وہ آخرت میں صالحین میں سے ہوں گے۔ انہوں نے اس دین کو پسند کیا ہے۔ جب ان سے ان کے رب نے کہا "مسلم ہو جا" تو انہوں نے بغیر ہچکچاہٹ کے اور بغیر کسی تردد اور انحراف کے فوراً سر تسلیم خم کر دیا اور فوراً کہا قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ "میں رب العلمین کا فرماں بردار ہو گیا ہوں۔"

یہ ہے ملت ابراہیمی، خالص اسلام اور واضح دین۔ ابراہیم علیہ السلام نے اسے صرف اپنی ذات تک محدود نہیں چھوڑا بلکہ اسے اپنی اولاد کے لئے بھی پسند کیا۔

اپنی اولاد کو وصیت کی کہ وہ اسے اپنائے رکھیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی اولاد کو اس کی وصیت کی۔ حضرت یعقوب علیہ السلام نے بھی اپنی اولاد کو اس کی وصیت کی اور یاد رہے کہ حضرت یعقوب ہی وہ اسرائیل ہیں جن کی طرف یہ لوگ اپنے آپ کو منسوب کرتے ہیں۔ لیکن اس کی وصیت کو تسلیم نہیں کرتے۔ اپنے جد امجد کی وصیت کو تسلیم نہیں کرتے۔ حالانکہ حضرت ابراہیم اور حضرت یعقوب علیہما السلام دونوں نے اپنی اولاد کو یہ یاد دہانی کرائی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے اس دین کو پسند کیا ہے یٰبَنِیَّ اِنَّ اللّٰہَ اصْطَفٰی لَکُمُ الدِّیْنَ "میرے بچو! اللہ نے تمہارے لئے یہی دین پسند کیا ہے۔"

یہ اللہ کی پسند ہے لہٰذا اللہ کی پسند کے بعد اب ان کے لئے اس کے سوا کوئی راہ نہیں ہے کہ وہ اسے پسند کریں اور اللہ کے اس فضل و کرم اور خصوصی عنایت کا کم از کم تقاضا یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی اس پسند اور اس عطا پر اس کا بے حد شکر ادا کریں اور ہروقت یہ سعی کرتے رہیں کہ کسی دور اور کسی زمانے میں بھی اللہ تعالیٰ کی یہ سرزمین امت مسلمہ سے خالی نہ ہو اور اس زمین پر خدا پرستی کی یہ تحریک ہروقت جاری و ساری رہے فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ O "تم صرف اس حال میں مرو کہ تم مسلم ہو۔"

اور اب صدیوں بعد خدا تعالیٰ نے تمہیں یہ موقع فراہم کر دیا ہے۔ اب تو وہ رسول بھی آ گیا ہے جو تمہیں اسلام کی طرف دعوت دے رہا ہے اور اس کی بعثت نتیجہ ہے اس دعا کا جو تمہارے جد امجد ابراہیم علیہ السلام نے صدیوں پہلے کی تھی۔

..........O..........

یہ تھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی وصیت جو انہوں نے اپنی اولاد کو کی تھی اور حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنی اولاد کو کی تھی۔ اور یہ وصیت حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنی زندگی کے اختتامی لمحات میں پھر اپنی اولاد کے سامنے بطور تاکید دہرائی تھی۔ اور اس میں ان کی دلچسپی اس قدر سوا تھی کہ زندگی کے آخری لمحات اور سکرات الموت میں بھی وہ اسے نہ بھلا سکے۔ بنی اسرائیل کو چاہئے کہ وہ اس پر خوب غور کریں۔

اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ حَضَرَ يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ ۙ اِذْ قَالَ لِبَنِيْهِ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْۢ بَعْدِيْ ؕ قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَاِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبْرٰهٖمَ وَ

اِسۡمٰعِیۡلَ وَ اِسۡحٰقَ اِلٰـهًا وَّاحِدًا ۚۖ وَّ نَحۡنُ لَهٗ مُسۡلِمُوۡنَ ﴿۱۳۳﴾

"پھر کیا تم اس وقت موجود تھے جب یعقوب اس دنیا سے رخصت ہو رہا تھا اور اس نے مرتے وقت اپنے بیٹوں سے پوچھا بچو میرے بعد تم کس کی بندگی کرو گے؟ ان سب نے جواب دیا! ہم اس ایک خدا کی بندگی کریں گے جسے آپ نے آپ کے بزرگوں ابراہیم علیہ السلام اسماعیل علیہ السلام اور اسحاق علیہ السلام نے خدا مانا ہے اور ہم اس کے مسلم ہیں۔"

سکرات الموت کے وقت حضرت یعقوب علیہ السلام اور آپ کے بیٹوں کا یہ منظر ایک عظیم منظر ہے۔ یہ منظر ایک نہایت ہی نصیحت آموز' سبق آموز اور پرتاثیر منظر ہے۔ ایک شخص موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا ہے اور ان لمحات میں اس کے دل دماغ پر کیا چھایا ہوا ہے؟ وہ کیا دلچسپی ہے جس میں اس کا دل دماغ مشغول ہے حالانکہ وہ زندگی کے آخری لمحات میں ہے۔ اس وقت وہ کس عظیم الشان معاملے پر بات کر کے اس کے بارے میں اطمینان حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ وہ اپنی اولاد کے لئے کیا ترکہ چھوڑ رہے ہیں اور تاکید کرتے ہیں کہ وہ اس ترکہ کی آخر دم تک حفاظت کریں اور وہ آخری ہچکیوں میں اسے اولاد کے حوالے کر رہے ہیں اور اس پر بڑی تفصیل سے بات کرتے ہیں۔ یہ ترکہ نظریۂ حیات اور عقیدے کا ترکہ ہے۔ یہی دولت ہے جسے وہ بیٹوں کے حوالے کرتے ہیں اور یہی وہ اہم مسئلہ ہے جس میں وہ بے حد دلچسپی لے رہے ہیں۔ یہ ہے وہ عظیم الشان معاملہ جو آخری لمحات میں بھی انہیں یاد ہے۔ مَا تَعۡبُدُوۡنَ مِنۡۢ بَعۡدِىۡ "تم میرے بعد کس کی بندگی کرو گے۔"

یہ وہ عظیم معاملہ ہے جس کے لئے میں نے تمہیں بلایا ہے۔ اور اس اہم معاملے میں' میں چاہتا ہوں کہ تم اسے اطمینان حاصل کر لوں۔ یہ میری دولت ہے' میرا ترکہ ہے اور وہ اہم امانت ہے جو میں تمہارے سپرد کر رہا ہوں قَالُوۡا نَعۡبُدُ اِلٰهَكَ وَاِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبۡرٰهٖمَ وَاِسۡمٰعِيۡلَ وَاِسۡحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۖۚ وَّنَحۡنُ لَهٗ مُسۡلِمُوۡنَ ان سب نے کہا! ہم اس ایک خدا کی بندگی کریں گے جسے آپ نے' آپ کے بزرگوں ابراہیم اور اسماعیل اور اسحاق علیھم السلام نے خدا مانا۔ اور ہم اس کے مسلم ہیں۔"

یوں وہ اپنے دین کو پہچان لیتے ہیں۔ اسے یاد کر لیتے ہیں۔ اس ورثے کو وہ قبول کرتے ہیں۔ اور اس کی حفاظت کا مصمم ارادہ کر لیتے ہیں اور یوں وہ اپنے والد محترم کو مطمئن کر دیتے ہیں جو اپنی زندگی کے آخری لمحات میں ہے۔

حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد نے آخر تم تک ہمیشہ اس وصیت کا خیال رکھا اور وہ ہمیشہ اس بات کے معترف رہے کہ وہ مسلم ہیں۔ اس موقع پر قرآن مجید بنی اسرائیل سے یہ سوال کرتا ہے۔ اَمۡ كُنۡتُمۡ شُهَدَآءَ اِذۡ حَضَرَ يَعۡقُوۡبَ "کیا تم موجود تھے جب حضرت یعقوب علیہ السلام کے سامنے موت آگئی۔"

ہاں یہ واقعہ ہوا تھا' قرآن مجید اس کی گواہی دیتا ہے' اس کی تائید کرتا ہے۔ یوں قرآن مجید ان لوگوں کے مکر و فریب کا پردہ چاک کر دیتا ہے اور یہ فیصلہ کر دیتا ہے کہ بنی اسرائیل کا اب اپنے جد امجد اسرائیل کے ساتھ کوئی نظریاتی یا روحانی تعلق نہیں ہے۔

..........O..........

اس بیان کی روشنی میں وہ فرق و امتیاز کھل کر سامنے آجاتا ہے جو دور رفتہ کی امت مسلمہ اور تحریک اسلامی کے مزاحم بنی اسرائیل کے درمیان پایا جاتا ہے۔ اس لئے کہ دور رفتہ کی اس امت مسلمہ اور اب کے اس نام نہاد جانشینوں کے درمیان کوئی تعلق کوئی وراثت اور کوئی روحانی وراثت کا تعلق نہیں ہے۔

☆☆☆☆☆ تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُم مَّا كَسَبْتُمْ ۖ وَلَا تُسْأَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿۱۳۴﴾

"وہ کچھ لوگ تھے جو گزر گئے۔ جو کچھ انہوں نے کمایا' وہ ان کے لئے ہے اور جو کچھ تم کماؤ گے وہ تمہارے لئے ہے۔ تم سے یہ نہ پوچھا جائے گا کہ وہ کیا کرتے تھے۔"

ہر شخص اپنا حساب خود دے گا۔ ہر ایک کا اپنا راستہ ہے' ہر ایک کا ایک عنوان ہے اور ہر کسی کی اپنی خصوصیات ہیں۔ وہ ایک مومن جماعت تھی جس کا بعد میں آنے والے اس کے فاسق جانشینوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ بعد میں آنے والے ناخلف اور نالائقوں کا ان پاک بازوں سے کیا واسطہ؟ وہ اک علیحدہ جماعت تھے اور یہ ایک علیحدہ جماعت ہیں۔ ان کا جھنڈا علیحدہ تھا اور ان کا جھنڈا جدا ہے۔ ان کا تصور حیات ایک ایمانی تصور حیات تھا اور ان نالائقوں کا تصور حیات بالکل جاہل تصور ہے۔ جاہلی تصور حیات میں ایک جماعت اور دوسری جماعت اور ایک دور اور دوسرے دور میں فرق نہیں کیا جاتا کیونکہ اس تصور کے مطابق اگر دو معاشروں کے درمیان اگر خون اور نسب کا اتحاد ہے تو گویا دونوں معاشرے ایک ہیں لیکن ایمانی تصور حیات میں ایک مومن معاشرے اور ایک فاسق معاشرے کے درمیان امتیاز ہوتا۔ ان کے درمیان کوئی ایک رشتہ داری نہیں ہوتی۔ کوئی تعلق نہیں ہوتا اور نہ یہ دونوں معاشرے ایک امت بن سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں یہ دونوں علیحدہ امتیں ہیں۔ اس لئے مومنین کی اقدار حیات کے مطابق بھی یہ دونوں مختلف اور متضاد ہیں۔ اسلامی تصور حیات کے مطابق ایک امت صرف وہ ہوتی' جو صرف ایک نظریۂ حیات اور عقیدہ پر ایمان رکھتی ہو' چاہے جسمانی تعلق کے لحاظ اور رنگ نسل کے اعتبار سے اس کا تعلق مختلف علاقوں سے ہو۔ اسلامی جماعت کا تعلق کسی زمین کسی علاقے یا کسی رنگ و نسل سے نہیں ہوتا' یہ وہ تصورِ حیات ہے جو شرف انسانیت کے زیادہ مناسب ہے۔ جس کی اساس بلند اور عالم بالا کی روحانیت پر ہے اور اس کی بنیاد خاکی اور سفلی تعلقات پر نہیں ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دور کے تاریخی واقعات کے اس تفصیلی بیان کے ضمن میں' مسلمانوں کے بیت الحرام اور کعبہ کی تاریخ کے بیان کے ضمن میں اور اسلامی نظام زندگی کی حقیقت اور موروثی تصورات کی حقیقت کے بیان کے ضمن میں' اب قرآن کریم معاصر اہل کتاب کے بوگس دعووں کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ اور ان کے غلط خیالات' بے بنیاد دلائل اور غیر معقول مباحث کی تردید کرتا ہے' جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے سب تصورات دلائل کے اعتبار سے اور بحث و جدال کے میدان میں پائے چوبین ہیں۔ اور محض ضد' عناد پر مبنی ہیں اور ان کے ان مزعومات کے حق میں ان کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے۔ یوں قرآن مجید یہ ثابت کرتا ہے کہ اسلامی نظریات و عقائد دراصل معقول اور فطری عقائد ہیں۔ اور ان سے انحراف صرف وہ شخص کر سکتا ہے جو صرف ضدی اور معاند ہو۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

وَقَالُوا كُونُوا هُودًا أَوْ نَصَارَىٰ تَهْتَدُوا ۗ قُلْ بَلْ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا ۖ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ﴿۱۳۵﴾ قُولُوا آمَنَّا بِاللَّهِ وَمَا أُنزِلَ إِلَيْنَا وَمَا أُنزِلَ إِلَىٰ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ وَ

الْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِیَ مُوْسٰی وَعِیْسٰی وَمَآ اُوْتِیَ النَّبِیُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۖ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿۱۳۶﴾ فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا هُمْ فِیْ شِقَاقٍ ۚ فَسَیَكْفِیْكَهُمُ اللّٰهُ ۚ وَهُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ﴿۱۳۷﴾ صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً ۫ وَّنَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ ﴿۱۳۸﴾ قُلْ اَتُحَآجُّوْنَنَا فِی اللّٰهِ وَهُوَ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ۚ وَلَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ۚ وَنَحْنُ لَهٗ مُخْلِصُوْنَ ﴿۱۳۹﴾ اَمْ تَقُوْلُوْنَ اِنَّ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحٰقَ وَیَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطَ كَانُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰی ۗ قُلْ ءَاَنْتُمْ اَعْلَمُ اَمِ اللّٰهُ ۗ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهٗ مِنَ اللّٰهِ ۗ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۰﴾ تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ وَلَا تُسْئَلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۱﴾

۱۶ ع۱۲ ۱۶

”یہودی کہتے ہیں! یہودی ہو جاؤ ہدایت پاؤ گے۔ عیسائی کہتے ہیں عیسائی ہو جاؤ تو ہدایت پاؤ گے۔ ان سے کہو 'نہیں بلکہ سب کو چھوڑ کر ابراہیم علیہ السلام کا طریقہ...... اور ابراہیم علیہ السلام مشرکوں میں سے نہ تھا۔ کہو ہم ایمان لائے اللہ پر اور اس ہدایت پر جو ہماری طرف نازل ہوئی ہے اور جو ابراہیم علیہ السلام' اسماعیل علیہ السلام' اسحاق علیہ السلام 'یعقوب علیہ السلام اور اولاد یعقوبؑ کی طرف نازل ہوئی تھی اور جو موسیٰ علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام اور دوسرے تمام پیغمبروں کو ان کے رب کی طرف سے دی گئی۔ ہم ان کے درمیان کوئی تفریق نہیں کرتے اور ہم اللہ کے مسلم ہیں۔ پھر اگر وہ اسی طرح ایمان لائیں جس طرح تم لائے تو ہدایت پر ہیں اور اگر وہ اس سے منہ پھیریں تو کھلی بات ہے کہ وہ ہٹ دھرمی میں پڑ گئے ہیں۔ لہٰذا اطمینان رکھو کہ ان کے مقابلے میں اللہ تمہاری حمایت کے لئے کافی ہے۔ وہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے۔

کہو اللہ کا رنگ اختیار کرو۔ اس کے رنگ سے اچھا اور کوئی رنگ نہ ہو گا؟ اور ہم اس کی بندگی کرنے والے لوگ ہیں۔

اے نبی ان سے کہو! کیا تم اللہ کے بارے میں ہم سے جھگڑتے ہو حالانکہ وہی ہمارا رب بھی ہے اور تمہارا رب بھی۔ ہمارے اعمال ہمارے لئے ہیں' تمہارے اعمال تمہارے لئے ہیں' اور ہم اللہ کے لئے اپنی بندگی کو خالص کر چکے ہیں یا پھر تمہارا کہنا یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام' اسماعیل علیہ السلام' اسحاق علیہ السلام و یعقوب علیہ السلام اور اولاد یعقوبؑ سب یہودی تھے یا نصرانی تھے؟ کہو تم زیادہ جانتے ہو یا اللہ؟ اس شخص سے بڑا ظالم اور کون ہو گا جس کے ذمے اللہ کی طرف سے ایک گواہی ہو اور وہ اسے چھپائے؟ تمہاری حرکات سے اللہ تو غافل نہیں ہے وہ کچھ لوگ تھے جو گزر چکے۔ ان کی کمائی ان کے لئے تھی اور تمہاری تمہارے لئے۔ تم سے ان کے اعمال کے متعلق سوال نہیں ہو گا۔“

یہودیوں کا کہنا یہ تھا کہ تم یہودیت اختیار کر لو تو راہ ہدایت پا لو گے اور عیسائیوں کا کہنا یہ تھا کہ عیسائی بن جاؤ تو ہدایت پا لو گے۔ اللہ تعالیٰ نے یہاں ان دونوں دعووں کو جمع کر کے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا کہ وہ ان الفاظ میں ان کے ان باطل دعووں کی تردید فرما دیں۔ قُلْ بَلْ مِلَّةَ اِبْرٰهٖمَ حَنِیْفًا ۭ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ”کہو بلکہ ملتِ ابراہیم علیہ السلام راہ ہدایت ہے جو مشرکین میں سے

نہ تھے۔"

حضور کو سمجھایا گیا کہ آپ ان سے کہہ دیں' آیئے ہم اور آپ سب اپنے اصل کی طرف واپس لوٹتے ہیں۔ یعنی ملت ابراہیمی کی طرف جو ہمارے بھی باپ ہیں اور آپ کے بھی جد امجد ہیں اور اسلام کا اصل منبع اور سرچشمہ ہیں اور ان کے رب سے ان سے ساتھ جو عہد کیا ہوا تھا اور وہ مشرک نہ تھے' جبکہ آپ لوگ شرک میں مبتلا ہو گئے ہیں۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو اس عظیم دینی وحدت کے اور دینی اتحاد کے اعلان کا حکم دیتے ہیں' جو دین ابو الانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک جاری رہا اور جس کی آخری کڑی اب اسلام ہے۔ اہل کتاب کو دعوت دی جاتی ہے کہ وہ اس متحدہ اور مسلسل دین پر ایمان لائیں قُولُوٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ مَآ اُنۡزِلَ اِلَيۡنَا وَ مَآ اُنۡزِلَ اِلٰٓى اِبۡرٰهٖمَ وَ اِسۡمٰعِيۡلَ وَ اِسۡحٰقَ وَ يَعۡقُوۡبَ وَ الۡاَسۡبَاطِ وَ مَآ اُوۡتِىَ مُوۡسٰى وَ عِيۡسٰى وَ مَآ اُوۡتِىَ النَّبِيُّوۡنَ مِنۡ رَّبِّهِمۡ لَا نُفَرِّقُ بَيۡنَ اَحَدٍ مِّنۡهُمۡ وَ نَحۡنُ لَهٗ مُسۡلِمُوۡنَ "کہو ہم ایمان لائے ہیں اللہ پر اور اس ہدایت پر جو ہماری طرف نازل ہوئی ہے اور جو ابراہیم علیہ السلام' اسماعیل علیہ السلام' اسحاق علیہ السلام' یعقوب علیہ السلام اور اولاد یعقوب کی طرف نازل ہوئی تھی اور جو موسیٰ علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام اور دوسرے تمام پیغمبروں کو ان کے رب کی طرف سے دی گئی تھی۔ ہم ان کے درمیان کوئی تفریق نہیں کرتے اور ہم اللہ کے مسلم ہیں۔"

یہ سب ملتوں کا اتحاد ہے۔ سب رسولوں کے درمیان وحدت ہے اور یہ اسلامی تصور حیات کی اساس ہے۔ اور یہی وہ فکر ہے جو امت مسلمہ کو ایک ایسی ملت بنا دیتی ہے جو اس زمین پر اس نظریہ کی واحد حامل اور وارث ہے جو نظریہ اللہ کے دین پر مبنی ہے۔ اور جس کی جڑ اصل ابراہیمی سے مربوط ہے اور جس کی وجہ سے ...... یہ امت انسانی تاریخ میں ہدایت اور روشنی کی علمبردار ہے۔ اور یہی تصور حیات ہے جو اسلامی نظام زندگی کو ایک حقیقی عالمی نظام بنا دیتا ہے جس میں کوئی تعصب نہیں ہے۔ اور کوئی ظلم و استحصال نہیں ہے اور جس کے نتیجے میں اسلامی معاشرہ ایک کھلا OpenSociety معاشرہ قرار پاتا ہے جس کے دروازے تمام انسانوں کے لئے وا ہیں۔ اور ان افراد معاشرہ کے درمیان باہم مکمل انس و محبت پائی جاتی ہے۔

اس لئے یہاں دوران کلام ایک فیصلہ کن بات بتا دی جاتی ہے اور مسلمانوں کو ہدایت دی جاتی ہے کہ وہ اس بات پر ڈٹ جائیں۔ وہ یہ کہ یہی عقیدہ اور یہی تصور حیات راہ ہدایت ہے۔ جس نے اس تصور حیات اور اس راہ کو اپنا لیا تو گویا اس نے منزل مراد کو پالیا۔ اور جو شخص اس حقیقت سے منہ موڑ لے گا تو وہ کبھی بھی ثابت قدمی سے کسی مقام پر ٹک نہ سکے گا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم تمام ایسے فرقوں سے اختلاف کرتا ہے جو ثابت قدمی سے کسی اصولی موقف پر قائم نہ ہوں۔ قرآن کہتا ہے فَاِنۡ اٰمَنُوۡا بِمِثۡلِ مَآ اٰمَنۡتُمۡ بِهٖ فَقَدِ اهۡتَدَوْا وَ اِنۡ تَوَلَّوۡا فَاِنَّمَا هُمۡ فِىۡ شِقَاقٍ "پھر اگر وہ اسی طرح ایمان لائیں جس طرح تم لائے ہو' تو ہدایت پر ہیں اور اگر اس سے منہ پھیریں تو کھلی بات ہے کہ وہ ہٹ دھرمی میں پڑ گئے ہیں۔

یہ کلمات الٰہی ہیں اور یہ خود اللہ تعالیٰ کی جانب سے شہادت ہے۔ یوں قلب مومن کو ایک گونہ احساس عزت دلایا جاتا ہے کہ وہ جس موقف کو اختیار کئے ہوئے ہیں وہ قابل فخر بات ہے۔ کیونکہ ان کو لوگوں کے لئے ایک معیار اور ایک ماڈل قرار دیا جا رہا ہے۔ اور یہ فیصلہ کیا جاتا ہے کہ ان لوگوں کا ایمان ایسا ہونا چاہئے جس طرح کا ایمان تمہارا ہے ورنہ وہ منکر حق' دشمنان دین اور ہٹ دھرم قرار پائیں گے اور کوئی مومن گمراہوں اور کافروں کا دوست نہیں ہو سکتا۔ نہ اسے ایسے لوگوں کے ساتھ کسی مناقشہ کی ضرورت ہے۔ نہ اسے ان کے خلاف کسی سازش یا چالبازی کی ضرورت ہے نہ ان کے ساتھ جنگ و جدال اور مقابلہ و معارضہ کی ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ اہل اسلام کی جانب سے از خود ان کے مقابلے کے لئے کافی ہے۔ وہ خود ان سے نمٹ لے گا۔ فَسَيَكۡفِيۡكَهُمُ اللّٰهُ ۚ وَ هُوَ السَّمِيۡعُ الۡعَلِيۡمُ "ان کے

مقابلے میں اللہ تمہاری حمایت کے لئے کافی ہے وہ سننے اور جاننے والا ہے۔"

ایک مومن کی ڈیوٹی صرف یہ ہے کہ وہ اپنی راہ پر سیدھا چلتا رہے۔ اور وہ اس حق کو مضبوطی سے تھام لے جو اس نے براہ راست اللہ تعالیٰ سے پایا ہے۔ وہ اس رنگ میں رنگا ہے جو اللہ کے دوستوں کا رنگ ہوتا ہے اور وہ دنیا میں اپنے اس مخصوص رنگ سے پہچانے جاتے ہیں۔ صِبْغَةَ اللّٰهِ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً وَّنَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ "اللہ کا رنگ اختیار کرو' اس کے رنگ سے اچھا کوئی رنگ نہیں ہے اور ہم اسی کی بندگی کرنے والے ہیں۔"

اور اللہ کا یہ رنگ اللہ تعالیٰ کا وہ آخری پیغام ہے جو اس نے عالم بشریت کو دیا ہے۔ تاکہ اس رنگ میں انسانیت کا ایک وسیع تر حصہ رنگ جائے اور انسانیت ایسے وسعت پذیر اصولوں پر مجتمع ہو جائے جن میں نہ کوئی تعصب ہو' نہ کوئی بغض و کینہ ہو' نہ ان میں محدود قومیت ہو اور نہ محدود رنگ ہو۔

یہاں قرآن مجید کے اسلوب ادا کے ایک خاص رنگ کی طرف اشارہ ضروری ہے۔ اور اس طرز ادا میں ایک گہرا مفہوم پوشیدہ ہے۔ آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ اس آیت کا پہلا حصہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ایک بیانیہ ہے صِبْغَةَ اللّٰهِ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً "اللہ کا رنگ اختیار کرو' اس سے زیادہ اچھا کس کا رنگ ہو گا۔"

اور اس آیت کا باقی حصہ بطور کلام مومنین ہے اور سیاق کلام میں دونوں کلاموں کے درمیان کوئی حد فاصل نہیں ہے۔ اگرچہ آیت کے دونوں حصے کلام الٰہی ہیں۔ لیکن ایک میں متکلم اللہ میاں اور دوسرے میں مؤمنین ہیں۔ مؤمنین صادقین کی یہ ایک عظیم عزت افزائی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے تکلم کو اپنے کلام کا جز بنا دیا جو ایک ہی فقرہ ہے۔ اس سے اس حقیقت کا اظہار مطلوب ہے کہ مومنین کا اپنے رب کے ساتھ ایک گہرا رابطہ ہے۔ اس قسم کے بیان کی کئی مثالیں قرآن مجید میں موجود ہیں اور ان کی بہت بڑی اہمیت ہے۔

اب قرآن مجید کی یہ دندان شکن حجت اور دلیل اپنے فیصلہ کن انجام تک یوں پہنچتی ہے۔

قُلْ اَتُحَآجُّوْنَنَا فِی اللّٰهِ وَهُوَ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ۚ وَلَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ۚ وَنَحْنُ لَهٗ مُخْلِصُوْنَ ۝

"اے نبی ان سے کہو! کیا تم اللہ کے بارے میں ہم سے جھگڑتے ہو۔ حالانکہ وہی ہمارا رب بھی ہے اور تمہارا رب بھی۔ ہمارے اعمال ہمارے لئے ہیں اور تمہارے' تمہارے لئے۔ اور ہم اللہ ہی کے لئے اپنی بندگی خالص کر چکے ہیں۔

اللہ کی وحدانیت اور اللہ کی صفت ربوبیت میں کسی کو مجال اختلاف نہیں۔ وہ ہمارا بھی رب اور تمہارا بھی رب ہے۔ ہم اپنے اعمال کا حساب دیں گے اور تم اپنے اعمال کے جوابدہ ہو گے۔ لیکن ہماری حالت یہ ہے کہ ہم صرف اس کے ہو گئے ہیں' اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتے اور اس کے ساتھ کسی اور سے امیدیں وابستہ نہیں کرتے۔ یوں اللہ تعالیٰ اہل اسلام کی زبانی ان کے نظریاتی موقف کی وضاحت فرماتے ہیں اور یہ موقف ایسا ہے کہ جس میں بحث و مباحثہ اور نزاع و اختلاف کی کوئی گنجائش بھی نہیں ہے۔

اب اس ناقابل نزاع موقف سے روئے سخن ایک دوسرے موضوع کی طرف پھر جاتا ہے' جس میں اختلاف موجود تھا' لیکن بتایا جاتا ہے کہ اس میں بھی جو اختلاف کیا گیا وہ بھی غیر ضروری اور غیر معقول اختلاف ہے۔ فرماتے ہیں۔ اَمْ تَقُوْلُوْنَ اِنَّ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحٰقَ وَیَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطَ كَانُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰی "یا پھر تم یہ کہتے ہو کہ ابراہیم' اسماعیل' اسحاق' یعقوب اور اولاد یعقوب سب کے سب یہودی تھے یا نصرانی تھے؟"

یہ لوگ تو حضرت موسیٰ سے بھی پہلے گزرے ہیں اور یہودیت اور نصرانیت کے وجود میں آنے سے بھی بہت پہلے گزرے ہیں۔ اور

ان کے دین کی حقیقت اللہ نے بیان بھی کر دی ہے۔ اور اس کی گواہی دے دی ہے کہ ان کا دین اسلام تھا۔ جس طرح اوپر تفصیل سے بیان ہوا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ قُلْ ءَ اَنْتُمْ اَعْلَمُ اَمِ اللّٰهُ "کہو تم زیادہ جانتے ہو یا اللہ؟"

اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے موقف پر صرف ایک سوال کر دیا ہے۔ اس لئے کہ ان کا موقف بادی النظر میں غلط تھا۔ جواب دینے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ صرف سوالیہ نظروں سے تنبیہ کر دی گئی۔

اس کے بعد بنی اسرائیل اور اہل کتاب سے کہا جاتا ہے کہ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ یہ حضرات یہودیت اور نصرانیت کے وجود میں آنے سے بھی پہلے گزرے ہیں۔ اور تم یہ بھی جانتے ہو کہ وہ اس ابتدائی دین کے حامل تھے جسے حنفیت سے تعبیر کیا جاتا ہے اور یہ کہ تمہاری کتابوں میں 'تمہارے پاس یہ شہادت موجود ہے کہ اللہ تعالیٰ عنقریب نبی آخر الزمان کو الٰہی دین حنیف کے ساتھ بھیجنے والے ہیں۔ جو دین ابراہیم علیہ السلام بھی ہے لیکن تم اس شہادت کو چھپا رہے ہو۔ وَ مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهٗ مِنَ اللّٰهِ "اس شخص سے بڑا ظالم اور کون ہو گا جس کے ذمے اللہ کی طرف سے گواہی ہو اور وہ اسے چھپائے۔"

اور اللہ کو اس بات کی اچھی طرح خبر ہے کہ جس شہادت کو تمہارے پاس بطور امانت ودیعت کیا گیا تھا' اسے تم چھپا رہے ہو۔ اور اس کے برعکس تم اسے چھپانے کے لئے بحث و جدال اور تلبیس بھی کر رہے ہو۔ وَ مَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ "اور اللہ اس بات سے غافل نہیں جو تم کرتے ہو۔"

اب بات اپنی انتہائی بلندی تک جا پہنچی ہے۔ اس مسئلے کا خاطر خواہ فیصلہ کر دیا جاتا ہے اور یہ بتا دیا جاتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام' حضرت اسماعیل علیہ السلام' حضرت اسحاق علیہ السلام اور حضرت یعقوب علیہ السلام اور اولاد یعقوبؑ کے مابین اور ان کے موجود نام نہاد پیرو کاروں کے درمیان مکمل تضاد پایا جاتا ہے۔ وہ کچھ اور تھے اور یہ کچھ اور۔ اس لئے یہاں خاتمہ کلام اسی فقرے پر کیا جاتا ہے جو پہلے گزر چکا ہے تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَ لَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ وَ لَا تُسْئَلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ "یہ کچھ لوگ تھے جو گزر چکے۔ ان کی کمائی ان کے لئے تھی اور تمہاری کمائی تمہارے لئے۔ تم سے ان کے اعمال کے متعلق سوال نہ ہو گا۔"

یہ ہے ایک فیصلہ کن بات اب گویا نزاع ختم کر دیا گیا ہے اور ان لوگوں کے فضول دعوؤں کے متعلق آخری بات کہہ دی گئی۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

☆ ☆

فی ظلال القرآن

پارہ دوم .... ایک نظر میں

(سورۃ البقرہ آیات ۱۴۲ تا ۲۵۲)

پارہ دوم ایک نظر میں

سورۂ بقرہ کے اس حصے میں' یعنی پارۂ دوئم کے شروع ہی سے اس امر پر زور دیا جارہا ہے کہ تحریک اسلامی کو امانت کبریٰ کی ذمہ داریاں اٹھانے کے لئے تیار ہو جانا چاہئے۔ اسلامی نظریۂ حیات کی ذمہ داریاں۔ پھر اس نظریۂ حیات کی اساس پر اس دنیا میں نظام خلافت کے قیام کی ذمہ داریاں۔ اگرچہ جابجا تحریک اسلامی کے مخالفین کے ساتھ بحث و تکرار کے مضامین بھی پائے جاتے ہیں۔ اس وقت مخالفین کے سرخیل بنی اسرائیل' یعنی یہودی تھے۔ اس لئے یہاں ان کی سازشوں' مکاریوں اور اسلامی نظریۂ حیات کے خلاف ان کی نظریاتی جنگ اور تحریکِ اسلامی کے وجود کے خلاف ان کی جدوجہد کا مقابلہ کیا جاتا ہے۔ جگہ جگہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے تحریک اسلامی کو ہدایات دی گئی ہیں اور انہیں دشمنان تحریک اسلامی کی اس چومکھی لڑائی سے خبردار کیا گیا ہے جو انہوں نے تحریک کے خلاف شروع کر رکھی ہے۔ مسلمانوں کو ان کوتاہیوں سے آگاہ کیا گیا ہے' جن میں بنی اسرائیل مبتلا ہو گئے تھے۔

اس پارے اور سورت کے بقیہ حصے کا بنیادی مضمون امت مسلمہ کو ایک مستقل تشخص اور ایک علیحدہ قبلہ عطا کرنا ہے' تاکہ وہ ایک ایسی امت قرار پائے جو منصب خلافت الٰہی کی حامل بن سکے۔ اور اسے ایک الگ ایسا نظام قانون اور الگ ایسی شریعت دی جائے جو پہلے آئے ہوئے قوانین و شرائع کی تصدیق کرتی ہو اور ان کی حامل ہو۔ اور امت ایک جامع نظام اور عمومی منہاج کی حامل ہو۔ سب سے اہم یہ کہ یہ امت انسانی حیات و ممات کے بارے میں ایک خاص نظریہ کی حامل ہو اور وہ اپنے رب کے ساتھ خصوصی اور شعوری رابطہ رکھتی ہو' نیز اس کرۂ ارض پر ایک نظریۂ حیات اور ایک نصب العین کی حامل ہو۔ اسے اس امر کا شعور ہو کہ اسے اس نظریہ حیات کی راہ میں مال و زر' شعور و خیال' طور اطوار اور جان و آبرو کی کیا کیا قربانیاں دینی ہوں گی۔ اسے اپنے آپ کو قرآن و سنت کے مطابق قادر مطلق کے اقتدار اعلیٰ کے ماننے اور اس کی اطاعت کے لئے تیار کرنا ہے۔ غرض تسلیم و رضا اور نہایت فرمانبرداری کے ساتھ اسے یہ سب کچھ کرنا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ابتداء ہی سے تحویل قبلہ کے متعلق بات شروع کی جاتی ہے۔ تحویل قبلہ کے حکم سے معلوم ہوتا ہے کہ اس امت کو امت وسط قرار دیا جارہا ہے۔ یہ لوگوں پر گواہ ہے اور رسول امت پر گواہ ہیں۔ یہ امت پورے کرۂ ارض کی قائد ہے' رہبر و راہنما ہے' لہٰذا اسے نصیحت کی گئی ہے کہ اس منصب کی وجہ سے اسے جو جو مشکلات پیش آئیں ان پر صبر کرے۔ راضی برضا رہنا ہو گا۔ مالی و جانی قربانیاں پیش کرنی ہوں گی اور ہر حال میں اپنے تمام امور اللہ کے سپرد کر دینے ہوں گے۔

ذرا آگے چلیں تو ہمارے سامنے ایمانی تصور حیات کے کچھ اصول رکھے جاتے ہیں۔ بتایا جاتا ہے کہ "نیکی" تقویٰ اور عمل صالح کا دوسرا نام ہے۔ شرق و غرب کی سمتیں اور عبادت کرتے وقت ان کی طرف رخ کرنا بذات خود کوئی ٹھوس نیکی نہیں ہے۔ دراصل یہ یہودیوں کی اس غوغا آرائی کا جواب ہے جو وہ تحویل قبلہ کے وقت بپا کئے ہوئے تھے۔ وہ حقائق کو مسخ کر رہے تھے یا چھپا رہے تھے اور یہ تمام بحث و تکرار ایک نمائش تھی۔ وہ یہ سب کچھ سوچ سمجھ کر کر رہے تھے' چنانچہ ان آیات میں زیادہ تر بحث تحویل قبلہ اور اس سے متعلق دوسرے مباحث پر مشتمل ہے۔

اب سیاق کلام تحریک کی عملی تنظیم کی طرف پھر جاتا ہے اور ساتھ ساتھ بنیادی عبادات سے متعلق بھی کچھ احکام دیئے جاتے ہیں۔ بتایا جاتا ہے کہ اجتماعی نظم اور عبادت ہی دراصل وہ بنیادی اصول ہیں جن پر امت مسلمہ کی اجتماعی زندگی کا قیام ہے۔ معاشرہ کی تنظیم اس لئے

بھی ضروری ہے کہ تحریک اس ذمہ داری کو بحسن و خوبی ادا کر سکے جو اس پر ڈالی گئی ہے۔ چنانچہ اس حصے میں قانون قصاص' قانون وصیت' احکام صیام' مسجد حرام اور اشہر حرام میں قانونی جنگ۔ فریضۂ حج' شراب اور جوئے کے تعزیری قوانین اور عائلی قوانین کا ذکر ہے۔ یہ سب احکام اسلامی نظریۂ حیات اور تعلق باللہ کے اصولوں پر قائم ہیں۔ اس پارے کے آخری حصہ میں جہاد بالنفس اور جہاد بالمال کی مناسبت سے بطور عبرت و مثال موسیٰ علیہ السلام کے بعد بنی اسرائیل کی نشاۃ ثانیہ کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔ جب انہوں نے اپنے وقت کے نبی سے کہا: "ہمارے لئے ایک بادشاہ مقرر کر دو تاکہ ہم اللہ کی راہ میں جنگ کریں۔" (ا)

یہ بھی تحریک اسلامی کے لئے عبرت ہے۔ اس میں اس کے لئے اہم تجربات و ہدایات موجود ہیں کیونکہ تحریک اسلامی ہی ان امم کے نظریات اور تجربات کی اصل وارث ہے۔

پارۂ اول کے عمیق مطالعے سے اس کشمکش کی حقیقت عیاں ہو جاتی ہے جو قرآن مجید نے برپا کی تھی۔ امت مسلمہ کی تعمیر و تشکیل کے سلسلے میں قرآن کا نصب العین واضح ہوتا ہے۔ یہ ایک عظیم کشمکش ہے۔ جو بیرونی سازشوں' نفرتوں' دھوکہ بازیوں' جھوٹے پروپیگنڈوں اور سفید جھوٹ کے پلندوں کے خلاف شروع کی گئی ہے۔ اور نفس انسانی کی اصلاح کے لئے اس کی اندرونی و بشری کمزوریوں' اخلاقی فتنوں اور گمراہیوں کے خلاف برپا ہے۔ یہ دراصل تعمیر و ہدایت اور صحیح تصور حیات قائم کرنے کا معرکہ ہے جس پر ایک ایسی امت کی اساس رکھنی ہے جو خلیفۃ اللہ فی الارض کا منصب سنبھال سکے اور پوری دنیا کو ایک صالح قیادت دے سکے۔

قرآن کا اعجاز تو دیکھئے! تنظیم جماعت کے وہ اصول و مبادی اور ہدایات و اشارات جو اس نے سب سے پہلی اسلامی جماعت کے لئے تجویز کئے وہ آج بھی اور کل بھی ہر اس جماعت کے لئے ضروری ہیں جو اسلامی خطوط پر اٹھنا چاہے۔ اسلام نے اپنے مخالفین کے مقابلے میں جو معرکہ سر کیا آج بھی ہر مخالف اسلام کے خلاف وہی معرکہ بپا ہو سکتا ہے بلکہ قرآن اپنے اولین مخالفین کی جن سازشوں اور مکاریوں اور مخالفانہ تدبیروں سے بر سر پیکار ہوا۔ وہ مخالفین بعینہ آج بھی موجود ہیں اور ان کی مکاریاں' سازشیں اور تدبیریں بھی وہی ہیں چنانچہ امت مسلمہ آج اپنی جدوجہد اور اپنے بچاؤ کے لئے انہی ہدایات کی محتاج ہے جن کے لئے پہلی تحریک اسلامی محتاج تھی۔ اسی طرح آج بھی تحریک اسلامی اپنے صحیح تصور حیات' اس کائنات میں اپنے منصب کے تعین' لوگوں کے ساتھ اپنے تعلقات کے انضباط میں انہی ہدایات اور نصوص قرآنی کی محتاج نظر آتی ہے۔ اس سلسلے میں قرآن واضح سنگہائے میل پیش کرتا ہے جبکہ علم و معرفت اور رشد و ہدایات کے تمام دوسرے مصادر جدید سے جدید سلسلے بھی اس معاملے میں خاموش ہیں۔ قرآن آج بھی اس امت کا اس کی پوری زندگی میں راہ عمل ہے۔ وہ اس امت کا آج بھی اس راہ حقیقت میں رہبر و راہنما ہے۔ وہ آج بھی امت کا مکمل دستور اس کے نظام زندگی کا منبع اس کی اجتماعیت کا مرجع ہے۔ اس کے عالمی معاملات اور اخلاقی ضوابط کا سرچشمہ ہے۔ یہ ہے اس کتاب کا اصل اعجاز!

درس ۸ ایک نظر میں

اس سبق میں موضوع سخن صرف تحویل قبلہ ہے۔ تمام مباحث اس سے متعلق ہوں گے۔ اس پورے سبق میں ان سازشوں کو بے نقاب کیا گیا ہے جو اس موقع پر یہودیوں نے' اسلامی جماعت کی صفوں میں انتشار پھیلانے کے لئے کیں۔ اس واقعے پر یہود نے جو اعتراضات کئے اور ان کے نتیجے میں اہل اسلام کے ذہنوں پر جو اثرات ہوئے' انہیں دور کیا گیا ہے۔

اس واقعہ سے متعلق کوئی قطعی روایت نہیں ہے۔ نہ ہی اس کی تاریخ کے بارے میں قرآن مجید میں کچھ ذکر ہے۔ ان آیات کا تعلق بیت المقدس سے خانہ کعبہ کی طرف قبلے کی تحویل سے ہے۔ یہ واقعہ مدینہ طیبہ میں ہجرت کے سولہ یا سترہ ماہ بعد پیش آیا۔ اس سے متعلق روایات پر مجموعی نظر ڈالنے سے اجمالاً یہ معلوم ہوتا ہے کہ مکہ مکرمہ میں' فرضیت صلوٰۃ کے بعد' مسلمان خانہ کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے تھے۔ اگرچہ یہ بات منصوص نہیں ہے۔ ہجرت مدینہ کے بعد' امر ربی سے مسلمان بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے لگے تھے۔ اگرچہ اس سلسلے میں بھی قرآن مجید کی کوئی آیت نازل نہیں ہوئی تھی صرف رسول خدا کو حکم دیا گیا تھا۔ آخر کار اس معاملے میں قرآن مجید کی یہ آیت نازل ہوئی:

فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ ۗ (البقرۃ۔۱۴۴)

"مسجد حرام کی طرف رخ پھیر دو۔ اب جہاں کہیں تم ہو' اسی کی طرف منہ کر کے نماز پڑھا کرو۔" سابق حکم منسوخ ہو گیا۔ حقیقت واقعہ جو بھی ہو' لیکن مسلمان چونکہ بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے تھے اور بیت المقدس اہل کتاب یعنی یہود و نصاریٰ کا قبلہ تھا' اس لئے یہود مدینہ نے اسے اسلام میں داخل نہ ہونے کا بہانہ بنا لیا تھا۔ وہ کہتے تھے کہ محمد ﷺ اور ان کے ساتھی چونکہ ہمارے قبلے کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے ہیں اس لئے دین دراصل ہمارا ہی دین ہے۔ ہمارا قبلہ ہی حقیقی قبلہ ہے۔ ہم اصل ہیں اور مسلمان تابع' لہٰذا محمد ﷺ اور ان کے ساتھیوں کے لئے مناسب یہ ہے کہ خود وہ دین یہود میں داخل ہو جائیں' نہ یہ کہ وہ ہمیں اپنے دین کی طرف بلائیں۔

علاوہ ازیں' بیت المقدس کو قبلہ بنانا عرب مسلمانوں کو بہت شاق تھا۔ وہ بیت الحرام کے ادب و احترام کے خوگر تھے۔ وہ ہمیشہ سے ان کا کعبہ اور قبلہ تھا۔ اس پر مستزاد یہ کہ یہودیوں نے اس پر فخر کرنا شروع کر دیا تھا کہ مسلمان ان کے قبلے کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے ہیں۔ وہ اسے دین اسلام کے خلاف بطور دلیل بھی استعمال کر رہے تھے۔

اندریں حالات رسول ﷺ' بار بار آسمان کی طرف منہ اٹھاتے اور اپنے رب کی طرف متوجہ ہوتے تھے' لیکن زبان سے کچھ نہ فرماتے تھے۔ اس انتظار میں تھے کہ خداوند تعالیٰ اپنی مرضی سے راہنمائی فرمائیں گے۔

یہ حالات ہیں کہ وحی کا نزول ہوتا ہے۔ حضور ﷺ کی خواہش پوری ہو جاتی ہے:

قَدْ نَرَىٰ تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَاءِ ۖ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضَاهَا ۚ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ (البقرہ۔۱۴۴)

"اے نبی یہ تمہارے منہ کا بار بار آسمان کی طرف اٹھنا ہم دیکھ رہے ہیں۔ لو' ہم اسی قبلے کی طرف تمہیں پھیر دیتے ہیں جسے تم پسند کرتے ہو۔ مسجد حرام کی طرف رخ پھیر دو۔ اب جہاں کہیں تم ہو' اس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھا کرو۔"

روایت میں آتا ہے کہ یہ واقعہ ہجرت کے سولہویں یا سترہویں ماہ میں پیش آیا۔ مسلمانوں نے جب تحویل قبلہ کی خبر سنی تو ان میں سے بعض نماز کی حالت میں تھے' اور نصف نماز پڑھ چکے تھے۔ انہوں نے دوران نماز ہی میں اپنا منہ مسجد حرام کی طرف پھیر لیا اور قبلہ جدید کی طرف رخ پھیر کر نماز مکمل کی۔ قبلہ بدلنا تھا کہ یہودیوں نے پورے مدینہ کو سر پر اٹھالیا' شور مچانا شروع کر دیا۔ قبلے کا بدل دینا' ان پر شاق گزرا۔ اس لئے کہ وہ قبلہ کے سلسلے میں حجت بازی کر کے' مسلمانوں کے دلوں میں' ان کے دین کے بارے میں شکوک و شبہات پیدا کرتے تھے اور تحویل قبلہ سے ان کی یہ حجت بازی ختم ہو رہی تھی لیکن اب یہ انداز دگر ان کی غوغا آرائی شروع ہو گئی۔ انہوں نے بھی اس کا رخ بدل دیا اور وہ اب دوسری طرف مسلمانوں کے دلوں میں شکوک پیدا کرنے لگے۔ مسلمانوں سے کہتے ہیں: "اگر بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنا باطل تھا اور تم ایک عرصہ تک اسی طرف رخ کر کے نمازیں پڑھتے رہے تو تمہاری وہ تمام نمازیں ضائع ہو گئیں اور اگر بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنا ٹھیک تھا تو اب تحویل قبلہ باطل ہے اور تمہاری تمام نمازیں ضائع ہو رہی ہیں۔ احکام میں یہ تغیر اور ان آیات کا یہ نسخ بہرحال اللہ تعالیٰ کی جانب سے کوئی وحی نہیں آتی۔"

یہودیوں کے اس مخالفانہ حملے کے اثرات اسلامی کیمپ میں بھی محسوس کئے گئے۔ اس کا اندازہ قرآن مجید کی ان آیات سے ہوتا ہے جو اس سلسلے میں نازل ہوئیں۔ پارۂ اول میں مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا ....الخ" (جس آیت کو ہم منسوخ کرتے ہیں یا بھلا دیتے ہیں الخ)" پورے دو اسباق وہاں نازل ہوئے اور دوسرے پارے کی آیات زیر بحث بھی اسی سے متعلق ہیں۔ جن میں اس جدل کے بارے میں تاکیدی ہدایات دی گئی ہیں۔ وضاحتیں کی گئی ہیں اور مسلمانوں کو ڈرایا گیا ہے ان مسائل کے بارے میں نصوص کی تشریح کے موقعہ پر عرض کروں گا۔

اس موقع پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تحویل قبلہ اور اس کی حکمت کے متعلق کچھ کہا جائے۔ مسلمانوں کے لئے ایک مخصوص قبلہ کے تعین کی ضرورت کیوں لاحق ہوئی؟ یہ درحقیقت تحریک اسلامی کی تاریخ میں ایک اہم موڑ تھا۔ تحریک کی زندگی میں اس کے عظیم آثار نمودار ہوئے۔

مسلمانوں کا قبلہ پہلے خانہ کعبہ تھا۔ ہجرت کے بعد بعض تربیتی مقاصد کے لئے اسے تبدیل کر دیا گیا اور بیت المقدس کو قبلہ مقرر کر دیا گیا۔ اس جانب اسی سبق کی اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے: "وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِيْ كُنْتَ عَلَيْهَآ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَيْهِ"

ترجمہ: "پہلے جس طرف تم رخ کرتے تھے' اس کو تو ہم نے صرف یہ دیکھنے کے لئے قبلہ مقرر کیا تھا کہ کون رسول ﷺ کی پیروی کرتا ہے اور کون الٹا پھر جاتا ہے۔"

درحقیقت دور جاہلیت ہی سے عرب بیت الحرام کا بہت احترام کرتے تھے۔ اسے وہ اپنے قومی وقار کی علامت تصور کرتے تھے۔ اسلام چونکہ خالص للہیت قائم کرنا چاہتا تھا' مسلمانوں کے دلوں سے خداوند قدوس کے تعلق کے سوا تمام تعلقات کو ختم کر دینا چاہتا تھا اور اسلامی نظریۂ حیات کے سوا' ہر نعرۂ جاہلیت اور ہر جذبہ عصبیت کو مٹا دینا چاہتا تھا اور ایک ایسا خدائی نظام قائم کرنا چاہتا تھا جس کا تعلق صرف اللہ سے براہ راست ہو۔ وہ تمام تاریخی اور قبائلی عصبیتوں اور رنگ و نسل کی تمام آلائشوں سے پاک ہو' اس لئے مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ وہ نماز میں خانہ کعبہ کی طرف منہ کرنا ترک کر دیں۔ اگرچہ یہ حکم ایک عرصہ قلیل کے لئے ہی کیوں نہ ہو۔ حکم ہوتا ہے کہ اب وہ اپنا رخ بیت المقدس کی طرف موڑ دیں۔ تاکہ ان کے دلوں سے جاہلیت کی تمام گندگی بالکل ختم ہو جائے۔ ان کے نفوس جاہلیت کی تمام نجاستوں سے پاک ہو جائیں۔ تاکہ معلوم ہو جائے کہ کون رسول خدا کی غیر مشروط اطاعت کرتا ہے۔ کون ہے جو تسلیم و رضا کا پیکر ہے اور پختہ کردار کے

ساتھ بغیر کسی تحفظ (Reservation) کے تابع فرمان ہے اور کون جاہلیت کے تصورات رنگ و نسل کے قومی خیالات اور تاریخ و وطن کے جاہلی نعروں سے متاثر ہو کر الٹے پاؤں پھر جاتا ہے' نیز معلوم ہو جائے کہ کسی مسلمان کے شعور کے خفیہ ترین گوشوں میں کسی کارکن کے ضمیر کے پوشیدہ ترین تہوں میں براہ راست یا بالواسطہ باطل کی کوئی آمیزش تو نہیں ہے۔

اس حکم کے مطابق جب مسلمانوں نے سر تسلیم خم کر دیا' وہ اس نئے قبلے کی طرف خوشی سے پھر گئے۔ جس کی طرف رسول خدا ﷺ نے انہیں حکم دیا تھا تو یہود نے اس صورت حال سے فائدہ اٹھانا چاہا اور اسے تحریک اسلامی کے خلاف بطور دلیل استعمال کرنا شروع کر دیا تو حکم الٰہی آپہنچا۔ مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ وہ اب اپنا منہ مسجد حرام کی طرف کر کے نماز ادا کریں۔ نہ صرف یہ کہ یہودیوں کی دلیل ختم ہوئی بلکہ اس تبدیلی سے مومنین کے دل ایک دوسری حقیقت سے آشنا ہو گئے۔ حقیقت اسلام ہے' اسلامی تاریخ ہے۔ اس حقیقت سے کہ بیت اللہ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خالص اللہ کی بندگی کے لئے تعمیر کیا تھا تاکہ وہ اس امت کی میراث بنے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعاؤں کے نتیجے میں اٹھنے والی تھی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دعا کی کہ رب العالمین میری نسل سے ایک رسول پیدا کر اور وہ اس دین پر ہو جو ان کا اور ان کے لڑکوں پوتوں کا دین تھا۔ جیسا کہ پہلے پارے میں ذکر ہوا: وَ اِذِ ابْتَلٰۤى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ؕ " (البقرہ۔۱۲۴)

ترجمہ: "یاد کرو جب ابراہیم علیہ السلام کو اس کے رب نے چند باتوں میں آزمایا اور وہ ان سب میں پورا اترا۔"

جہاں موضوع سخن مسجد حرام تھی اس کی بنیاد اور تعمیر سے متعلق اور ان امور کے ساتھ وابستہ دوسرے حالات و معاملات کے متعلق۔ اہل کتاب اور مشرکین کے ساتھ حضرت ابراہیم علیہ السلام' ان کے دین' ان کی اولاد' ان کے قبلہ' ان کے عہد اور ان کی وصیت کے متعلق' لیکن پارہ اول کی مذکورہ آیات دراصل' تحویل قبلہ کے موجودہ احکام کی تمہید تھیں' جن میں ایک تھوڑے ہی وقفے کے بعد ہی قبلہ بیت المقدس سے بیت اللہ کی طرف بدل دیا گیا۔ مسجد حرام کو حضرت ابراہیم و حضرت اسماعیل علیہما السلام نے تعمیر کیا تھا۔ اس کے پاس کھڑے ہو کر دونوں نے طویل دعا کی تھی۔ پھر امت مسلمہ کو دین حنیف پر اٹھایا گیا اور وہی عہد ابراہیمی کی وارث قرار پائی۔ ان حالات میں بیت المقدس سے بیت الحرام کی طرف قبلہ کی تحویل کا حکم حالات کا طبعی اور منطقی نتیجہ تھا۔ تاریخ نے امت مسلمہ کے دل و دماغ میں جو شعوری ربط پیدا کر رکھا تھا اس حکم نے مسلمانوں کے حسی مظاہر کو ان کے تاریخی شعور کے ساتھ ہم آہنگ کر دیا۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بتاکید وصیت کی تھی کہ وہ مسلمان رہیں اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی اولاد کو بتاکید وصیت کی تھی کہ وہ بھی دین اسلام پر قائم رہیں جیسا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام (اسرائیل) نے بھی ایسی ہی وصیت اپنی اولاد کو کی۔ پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام یہ حقیقت بھی جان چکے تھے کہ اللہ کے اس عہد میں ظالم نہیں آتے۔ چونکہ بیت الحرام کی تعمیر کا حکم حضرت ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام کو ملا تھا' لہٰذا یہ انہی کی میراث تھی۔ یہ میراث ان لوگوں ہی کو ملنی تھی جو دین ابراہیم علیہ السلام کی میراث پانے والے تھے۔ اور چونکہ امت مسلمہ ہی نے اس عہد اور اس فضل خداوندی کو وراثت میں پایا' لہٰذا اس کا طبعی نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ اللہ کا گھر بھی ان کو ملے اور وہ اس امت کا قبلہ ہو۔

بے شک ایک مختصر عرصہ کے لئے مسلمانوں نے مسجد اقصیٰ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی' جو یہود و نصاریٰ کا قبلہ تھی جیسا کہ سیاق و سباق سے اشارہ ملتا ہے۔ ایک مخصوص مصلحت کے تحت ایسا ہوا' جس کا ذکر ہم تفصیل سے لے آئے ہیں۔ اب مشیت ایزدی یہ ہے کہ یہ وراثت امت مسلمہ کے سپرد کر دی جائے۔

اہل کتاب نے دین اسلام کا انکار کر کے خود اپنے آپ کو ورثہ ابراہیمی سے محروم کر دیا تھا' لہٰذا ایسے حالات میں تحویل قبلہ کا حکم

عین حکمت پر مبنی اور نہایت ہی برمحل تھا۔ چنانچہ بحکم خدا اب حضرت ابراہیم علیہ السلام کا تعمیر کردہ بیت اللہ قبلہ ہو گیا۔ تاکہ ظاہری اور شعوری طور پر مسلمان پوری پوری وراثت پالیں۔ دینی وراثت قبلہ کی وراثت اور اللہ کے فضل و کرم کی وراثت۔

تحریک اسلامی کے لئے ضروری ہے کہ وہ ممتاز ہو' مخصوص و جدا ہو' تصورات و عقائد میں ممتاز اور قبلہ و عبادات میں ممتاز! قبلہ اور عبادات کا امتیاز بھی اسی طرح ضروری ہے' جس طرح تصورات و نظریات میں امتیاز ضروری ہے۔

تصوراتی اور نظریاتی امتیاز تو بالعموم سمجھ میں آتا ہے' لیکن قبلہ اور ظاہری شعائر دین کی امتیازی حیثیت بعض اوقات سمجھ میں نہیں آتی' للذا مناسب ہے کہ عبادات کی شکل و صورت پر بھی کچھ کہا جائے۔

جو شخص عبادات کی ظاہری شکل و صورت کو ان کے اصل پس منظر میں نہیں دیکھ پاتا یا انسان کی نفسیات و تاثرات سے ہٹ کر عبادات میں صرف ظاہری اشکال کا مطالعہ کرتا ہے' ایسا شخص جب دیکھتا ہے کہ لوگوں کی طرف سے عبادات کی ظاہری اشکال کی سختی سے پابندی کی جاتی ہے تو یہ فعل اسے متقشفانہ شکل پرستی' تنگ نظری اور تاریک خیالی نظر آتا ہے لیکن ایسا خیال درست نہیں۔ وسیع نقطۂ نظر سے دیکھا جائے اور عمیق غور و فکر سے کام لیا جائے تو ہر اعتبار سے ایک مختلف حقیقت سامنے آتی ہے مثلاً:

انسان کی شخصیت کی تشکیل ظاہری جسم اور پوشیدہ روح سے کی گئی ہے۔ اس لئے انسان روحانی شعور اور پوشیدہ جذبات کے اظہار کے لئے ظاہری شکل و صورت اختیار کرتا ہے۔ اندرونی جذبات کی تسکین اس وقت تک نہیں ہوتی جب تک وہ محسوس ظاہری شکل و صورت اختیار نہ کرلیں۔ صرف اسی صورت میں اندرونی جذبات و میلانات کی مکمل تعبیر ممکن ہے' اس طرح ان میلانات کی تعبیر محسوس طور پر بھی مکمل ہو جاتی جس طرح وہ نفس انسان کے اندر یہ جذبات و میلانات مکمل صورت میں موجود ہوتے ہیں اور یوں جذبات تسکین پاتے ہیں اور انسان مطمئن ہو جاتا ہے اور انسانی شخصیت کا ظاہر و باطن ہم آہنگ ہو جاتا ہے۔

یوں نفس انسانی بیک وقت ایک طرف کائنات کے اسرار اور نامعلوم حقائق کی طرف مائل ہوتا ہے اور دوسری طرف وہ ظاہری اشکال کی اطاعت کرتا ہے۔ ان فطری اصولوں کو مد نظر رکھ کر اسلام نے عبادات و شعائر کی ظاہری شکل و صورت متعین کی ہے' للذا محض نیت یا روحانی توجہ اور ارتکاز فکر سے اسلامی عبادات کی ادائیگی ممکن نہیں ہے۔ اسلامی عبادات میں نیت' توجہ اور ارتکاز فکر کے لئے ضروری ہے کہ وہ ایک ظاہری شکل و صورت میں ہو۔ مثلاً نماز میں قیام کرنا' روبقبلہ ہونا' تکبیر ادا کرنا' تسبیحات پڑھنا' جھکنا' سجدہ ریز ہونا وغیرہ۔

حج میں متعین ایام سے احرام باندھنا' متعین لباس پہننا' متعین حرکات' سعی' دعا' تلبیہ' قربانی اور بال ترشوانا۔ اور روزے میں نیت' کھانا پینا چھوڑنا اور تعلقات زن و شوئی چھوڑنا' اسی قبیل سے ہے۔ دیکھئے ہر عبادت میں حرکت اور ہر حرکت میں عبادت ہے۔ یوں انسانی نفسیات کے ظاہر و باطن کو ہم آہنگ کر دیا گیا ہے۔ انسانی قوتوں کے درمیان' حسن و ترتیب قائم ہو گیا اور یوں فطرت کے تقاضوں کے عین مطابق اسلامی نظریۂ حیات کے تمام مقاصد حاصل کر لئے گئے۔

یہ بات اللہ کے علم میں تھی کہ فطری طور پر انسان اپنے اندرونی تصورات و جذبات کے اظہار کے لئے ظاہری شکل و صورت اختیار کرتا ہے۔ اسی طبعی میلان کی وجہ سے کئی اقوام جادۂ مستقیم سے منحرف ہو گئیں۔ بعض لوگوں نے قوت کبریائی کے اظہار کے لئے کچھ ظاہری رموز و اشارات سے کام لیا۔ پتھروں کے مجسمے گھڑ لئے گئے۔ درختوں اور پتھروں کی پوجا کی گئی۔ سورج' چاند اور ستاروں کے آگے جھکے۔ حیوانات اور طیور و حوش کی پرستش کی۔

جب ان لوگوں نے اندرونی جذبات و عقائد کے اظہار کے لئے موزوں طریقہ اظہار اختیار نہ کیا جو مطابق فطرت ہوتا تو ان حالات میں منشائے الٰہی کے مطابق دعوت اسلامی اٹھی اور اس نے عقائد و جذبات کے اظہار کے لئے وہ فطری طریقہ اختیار کیا جو اسلامی عبادات

کی ظاہری شکل کے تعین سے نظر آتا ہے۔ اسلام نے عبادت الٰہی کے لئے ایسے طریقے اختیار کئے اور اس کے لئے ایسی شکلیں وضع کیں، جن میں ذات خداوندی کے لئے جسمانیت کے تصور کا شائبہ تک نہیں ہے۔ اس میں ذات باری کے لئے کوئی طرف، جہت متعین نہیں ہوتی۔ اسلامی طریقہ عبادت کے مطابق، جب کوئی شخص جناب باری کی طرف مکمل طور پر متوجہ ہوتا ہے، تو وہ قبلہ رخ ہوتا ہے لیکن اس کا دل، اس کے حواس اور اس کے اعضاء صرف اللہ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ اگرچہ اس کا ظاہری رخ ایک مکان کی سمت میں ہوتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ پھر کسی ایک جگہ کو کیوں مخصوص کیا گیا؟ اس کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ ایک مسلمان دوسرے لوگوں سے امتیازی شکل اختیار کرلے اور وہ نماز اور دوسری عبادات میں ایک مخصوص قبلہ یا سمت سے متعارف ہو۔ یہ تعین دراصل تفرد و امتیاز کے فکری دواعی کا تقاضا تھا۔ تاریخ شاہد ہے کہ اس تعین اور تخصیص نے مسلمانوں کو انفرادیت بخشی ورنہ اللہ تعالیٰ کو کسی سمت و جہت سے کوئی تعلق نہیں۔

یہی وہ داعیہ تھا، جس کی بنا پر مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ دوسرے مذاہب و اقوام کے مخصوص شعارات اور ان کے مخصوص مظاہر کو نہ اپنائیں۔ ایسے شعار، جو انہوں نے اپنے اندرونی تصورات و عقائد یا خیالات و جذبات کے اظہار کے لئے وضع کئے ہیں۔ مسلمانوں کو یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ اپنے فکر و عمل میں غیر مسلموں کے طور طریقے نہ اپنائیں۔ یہ حکم محض تعصب یا تنگ نظری و تقشف کی بنا پر نہیں دیا گیا بلکہ اسلام کے پیش نظر شکل و صورت سے ورا، ایک عمیق اور حکیمانہ نقطۂ نظر تھا۔ ظاہری شکل و صورت کے پس منظر میں کچھ اسباب اور حکمتیں بھی پوشیدہ تھیں۔ یہ وہی وجوہات تھیں جن کی بنا پر ایک قوم دوسری قوم سے جدا ہو جاتی ہے، ایک فہم دوسری فہم سے مختلف ہو جاتی ہے، ایک نظریہ دوسرے نظریہ سے ممتاز ہو جاتا ہے، ایک ضمیر دوسرے ضمیر سے الگ ہو جاتا ہے۔ ایک شخص کے اخلاق اور دوسرے شخص کے اخلاق میں فرق ہو جاتا ہے اور زندگی کی گزرگاہوں میں دو افراد کی راہیں مختلف سمتوں میں نکل جاتی ہیں۔

حضرت ابو ہریرہ ؓ فرماتے ہیں: حضور ﷺ نے فرمایا! یہودی و عیسائی رنگ نہیں لگاتے تم ان کے خلاف کرو۔" (۱)

ایک بار نبی ﷺ کچھ لوگوں کے پاس تشریف لے گئے وہ تعظیماً اٹھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا! "عجمیوں کی طرح مت اٹھو، ان میں سے بعض لوگ دوسروں کی تعظیم کرتے ہیں۔" (۲)

آپ ﷺ نے ایک موقعہ پر فرمایا! میری شان میں اس قدر مبالغہ نہ کرو، جس طرح عیسائیوں نے ابن مریم کی شان میں مبالغہ کیا۔ میں تو ایک بندہ خدا ہوں۔

غرض حضور ﷺ نے مظاہر اور لباس میں غیر مسلموں کے ساتھ تشبہ سے منع فرمایا۔ حرکات و سکنات اور طور طریقوں میں بھی تشبہ بالکفار سے منع کیا گیا۔ قول و فعل میں تشبہ سے منع کیا گیا۔ کیونکہ اس ظاہری شکل و صورت کے پس منظر میں درحقیقت وہ تصورات ہوتے ہیں جن کی بنیاد پر ایک نظریۂ حیات دوسرے نظریہ سے، ایک نظام زندگی دوسرے نظام سے اور کسی ایک قوم کا شعار دوسری اقوام کے شعار سے مختلف ہو جاتا ہے۔

امت مسلمہ اس لئے برپا ہوئی ہے کہ وہ دنیا میں اسلامی نظام قائم کرے۔ لہٰذا مسلمانوں کو سختی سے منع کیا گیا کہ وہ اللہ اور اسلامی نظام زندگی کے علاوہ کسی اور نظام سے ہدایات حاصل کریں۔ انہیں حکم دیا گیا کہ وہ اس کرۂ ارض پر کسی دوسری قوم کے مقابلے میں ذہنی شکست ہرگز قبول نہ کریں۔ اگر وہ ایسا کریں گے تو پھر یہی شکست انہیں مجبور کرے گی کہ وہ اس قوم اور اس کی تہذیب کی تقلید کریں۔ امت مسلمہ کو تو اس لئے برپا کیا گیا ہے کہ دوسری اقوام اس کی تقلید کریں اور وہ قیادت سنبھالے۔

(۱) امام مسلم۔ بخاری ابو داؤد (۲) ابو داؤد، ابن ماجہ

لہٰذا اسے چاہئے کہ وہ اپنے نظریات اور طور طریقے صرف اسی منبع اور سرچشمہ سے حاصل کرے' جس نے اس امت کو قیادت کا درجہ عطا کیا ہے۔ اللہ کے نزدیک مسلمان ہی اعلیٰ و برتر ہیں۔ وہی امت وسط ہیں۔ وہی خیر امت ہیں' جنہیں لوگوں کی قیادت اور بھلائی کے لئے برپا کیا گیا ہے۔ تو پھر ان کے نظریہ و عمل کا سرچشمہ کیا ہونا چاہئے؟ وہ اپنے طور طریقے اور اپنے لئے نظم و ضبط کے اصول کہاں سے اخذ کریں؟ کیا وہ اللہ کو چھوڑ دیں اور ان ذلیل ترین اقوام کو سرچشمہ رشد و ہدایت تسلیم کر لیں' جن کو قعر مذلت سے اٹھانے کے لئے اللہ نے خود مسلمانوں کو اٹھایا تھا!

اسلام نے پوری انسانیت کو ایک اعلیٰ تصور حیات سے روشناس کرایا' اس نے انسانوں کو ایک اعلیٰ نظام زندگی دیا' لہٰذا وہ تو پوری انسانیت کو دعوت دیتا ہے کہ وہ اس اعلیٰ تصور حیات اور اعلیٰ نظام زندگی کے حلقہ بگوش ہو جائے۔ اگر اسلام دوسرے نظاموں اور نظریات کے مقابلے میں' انسانیت کو اپنے پیش کردہ اعلیٰ نظام زندگی اور ارفع نظریۂ حیات کی اساس پر متحد کرنا چاہتا ہے' تو اس کی یہ خواہش کسی تعصب کی بنا پر نہیں ہے۔ بلکہ اسلام تو اللہ کی توحید کا داعی ہے۔ وہ ایک اعلیٰ نظریہ حیات پر اتحاد قائم کرتا ہے۔ وہ ایک اعلیٰ نظام پر پوری انسانیت کو متحد کرنا چاہتا ہے۔ لہٰذا وہ کسی ایسے اتحاد میں شریک نہیں ہوتا جس میں اسلام کے الہامی نظام حیات کو ترک کیا گیا ہو۔ وہ کسی ایسے اتحاد میں شریک نہیں ہوتا جس کی بنیاد جاہلیت پر رکھی گئی ہو اور یقیناً یہ کوئی تعصب نہیں ہے۔ کیا یہ تعصب ہے؟ اگر ہے تو پھر یہ نیکی' سچائی اور اصلاح حالات کے لئے کی گئی کوشش کا تعصب ہے اور ایسے تعصب پر میں قربان جاؤں!

تحریک اسلامی کو چاہئے کہ وہ اس حقیقت کو اچھی طرح ذہن نشین کر لے کہ کیوں وہ ایک مخصوص قبلہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتی ہے؟ قبلہ محض ایک مکان ہی نہیں جس کی طرف نماز کے وقت مسلمان رخ کرتے ہیں۔ مکان اور سمت تو محض ایک اشارہ ہے۔ دراصل یہ امتیاز و خصوصیت کا اشارہ ہے اور یہ نظریہ کا امتیاز ہے' تشخص کا امتیاز ہے' نصب العین کا امتیاز ہے' ترجیحات کا امتیاز ہے اور امت کے عناصر ترکیبی کا امتیاز ہے۔

اس وقت دنیا جاہلی تصورات سے اٹی پڑی ہے اور مسلمان اس دنیا کے بیچ میں کھڑے ہیں۔ جاہلیت پر مبنی بے شمار نصب العین ہیں جنہیں لوگوں نے اپنایا ہوا ہے۔ بے شمار جاہلی ترجیحات ہیں جو انسانوں کے دل و دماغ پر سوار ہیں۔ جاہلیت کے بے شمار جھنڈے ہیں جو مختلف لوگوں نے اٹھا رکھے ہیں لہٰذا آج کی ضرورت یہ ہے کہ امت مسلمہ اپنا ایک علیحدہ تشخص قائم کرے جو آج کے مروجہ تشخصات کے ساتھ گڈمڈ نہ ہو وہ اپنی زندگی اور اپنے وجود کے لئے ایک جدا نظریہ اور ایک ممتاز فلسفہ متعین کرے۔ جو جاہلی تصورات اور جاہلی فلسفوں سے مختلف ہو۔ وہ اپنے لئے ایک ایسا نصب العین وضع کرے اور اپنے لئے ایسی ترجیحات متعین کرے جو خاص اس کی شخصیت اور اس کے نظریۂ حیات سے ہم آہنگ ہوں۔ وہ ایک ایسا ممتاز جھنڈا بلند کرے جو صرف للہیت پر مبنی ہو' اس کا طرۂ امتیاز یہ ہونا چاہئے کہ وہ امت وسط ہے' وہ امت وسط جسے اللہ نے انسانوں کی بہتری کے لئے برپا کیا ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ وہ ان تک وہ نظریاتی میراث منتقل کر رہی ہے جس کی وہ امین ہے۔

یہ عقیدہ ایک مکمل نظام زندگی ہے۔ یہ امت اس عقیدے کی وارث اور امین ہے۔ وہ زمین پر خلافت الہیہ کی منصب دار ہے اور یہی اس کا طرۂ امتیاز ہے۔ یہ امت لوگوں پر گواہ ہوگی اور اس کے فرائض میں یہ داخل ہے کہ کل عالم بشریت کی قیادت کرے۔ کدھر! اللہ کی طرف اور اسلامی نظام کے قیام کی طرف۔ غرض اسلامی نظام زندگی کا قیام ہی اس کی امتیازی خصوصیت ہے۔ اسی سے اس کی شخصیت قائم ہوتی ہے۔ اس کے وجود کے عناصر ترکیبی' اس کی شخصیت کا امتیاز' اس کے مقاصد' اس کی ترجیحات' اس کا علم اور اس کا شعار غرض یہ سب کچھ اس کے نظریات کا مرہون منت ہے۔ یہ نظریہ ہی ہے جو اسے قیادت کا مقام عطا کرتا ہے۔ یہ نظریہ ہی ہے جس کی

خاطر اس کی تخلیق ہوئی۔ اس نظریہ کے سوا وہ جو لباس پہنے' جو تحریک بھی شروع کردے' جو علم بھی بلند کرے' وہ امتیاز حاصل نہ کر سکے گی' وہ جاہلی تحریکات کے سیلاب میں بہہ جائے گی اور اس کے خدوخال ہمیشہ مبہم رہیں گے۔ تحریک اسلامی کے فلسفہ و حکمت پر روشنی ڈالنے کے بعد اب ہم تشریح آیات کی طرف آتے ہیں۔

☆ ☆ ☆ ☆

درس نمبر۸ تشریح آیات (۱۴۲ تا ۱۵۲)

سَيَقُولُ السُّفَهَاءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلَّاهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِي كَانُوا عَلَيْهَا ۚ قُلْ لِلَّهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۚ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ﴿١٤٢﴾ وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا ۗ وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنْتَ عَلَيْهَا إِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَتَّبِعُ الرَّسُولَ مِمَّنْ يَنْقَلِبُ عَلَىٰ عَقِبَيْهِ ۚ وَإِنْ كَانَتْ لَكَبِيرَةً إِلَّا عَلَى الَّذِينَ هَدَى اللَّهُ ۗ وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُضِيعَ إِيمَانَكُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوفٌ رَحِيمٌ ﴿١٤٣﴾

ترجمہ: نادان لوگ ضرور کہیں گے! انہیں کیا ہوا کہ پہلے یہ جس قبلے کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے تھے' اس سے یکایک پھر گئے؟ اے نبی! ان سے کہو کہ "مشرق اور مغرب سب اللہ کے ہیں۔ اللہ جسے چاہتا ہے سیدھی راہ دکھا دیتا ہے" اور اس طرح تو ہم نے تم مسلمانوں کو ایک "امت وسط" بنایا ہے تاکہ تم دنیا کے لوگوں پر گواہ ہو اور رسول تم پر گواہ ہو۔

پہلے جس طرف تم رخ کرتے تھے' اس کو تو ہم نے صرف یہ دیکھنے کے لئے قبلہ مقرر کیا تھا کہ کون رسول کی پیروی کرتا ہے اور کون الٹا پھر جاتا ہے۔ یہ معاملہ تو بڑا سخت' مگر ان لوگوں کے لئے کچھ بھی سخت ثابت نہیں ہوا جو اللہ کی ہدایت سے فیض یاب تھے' اللہ تمہارے اس ایمان کو ہرگز ضائع نہ کرے گا یقین جانو کہ وہ لوگوں کے حق میں نہایت شفیق رحیم ہے۔"

قرآن کریم کے سیاق و سباق اور مدینہ طیبہ میں رونما ہونے والے واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ سفہاء سے مراد یہاں یہودی ہیں۔ یہی لوگ تھے جنہوں نے تحویل قبلہ کے موقع پر غوغا آرائی کی تھی۔ وہی تھے جنہوں نے یہ سوال اٹھایا تھا: " مَا وَلَّاهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِي كَانُوا عَلَيْهَا " ("کیا وجہ تھی کہ وہ پہلے جس قبلہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے تھے اس سے وہ یکایک پھر گئے") اور جس قبلہ کی طرف وہ نماز پڑھتے تھے وہ بیت المقدس تھا۔

حضرت براء ابن عازب ﷺ سے روایت ہے' فرماتے ہیں! حضور ﷺ جب مدینہ طیبہ تشریف لائے تو وہ انصار میں سے اپنے ننھیال کے ہاں اترے اور آپ ﷺ یہاں سولہ یا سترہ ماہ تک' مسجد اقصیٰ کی طرف منہ کر کے نماز ادا کرتے رہے۔ لیکن دل ہی دل میں آپ ﷺ کو یہ بات اچھی لگتی کہ کاش قبلہ بیت اللہ کی طرف پھر جائے۔ ایک دن نماز عصر کا وقت تھا کہ وحی الٰہی سے قبلہ تبدیل ہو گیا اور آپ نے نماز عصر بیت اللہ کی طرف منہ کر کے پڑھی۔ لوگوں نے بھی آپ کے ساتھ قبلہ تبدیل کیا۔ پھر ایک صاحب نماز پڑھ کر نکلے تو دیکھا کہ لوگ ایک دوسری مسجد میں نماز پڑھ رہے ہیں اور رکوع کی حالت میں ہیں۔ اس شخص نے کہا! "میں گواہی دیتا ہوں کہ میں نے حضور ﷺ کے پیچھے ابھی ابھی نماز پڑھی ہے اور ہم نے بیت اللہ کی طرف منہ کیا۔" چنانچہ وہ لوگ اسی طرح حالت رکوع میں کعبہ کی طرف پھر گئے۔

یہودی اس پر بہت خوش تھے کہ حضور ﷺ ان کے قبلہ بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے ہیں، لیکن جب قبلہ بدل گیا تو انہوں نے بہت ہی برا محسوس کیا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِى السَّمَآءِ (اے نبی ﷺ یہ تمہارے منہ کا بار بار آسمان کی طرف اٹھنا ہم دیکھتے ہیں۔")

اس پر احمقوں یعنی یہودیوں نے کہا! مَا وَلّٰىهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِىْ كَانُوْا عَلَيْهَا ("انہیں کیا ہو گیا ہے کہ وہ جس قبلے کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے تھے اس سے یکایک پھر گئے۔")(۱)

آنے والی آیات کے دیکھنے سے معلوم ہو گا کہ جس قدر قرآن مجید نے ان لوگوں کے سوالات و اعتراضات کے تفصیلی جوابات دیئے اس لئے کہ ان کے پروپیگنڈے کے اثرات بھی مسلمانوں کے دل و دماغ کو متاثر کر رہے تھے۔ اس بات کا اندازہ قرآن کے طرز تعبیر سے بخوبی ہو جاتا ہے۔

سَيَقُوْلُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰىهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِىْ كَانُوْا عَلَيْهَا ("نادان لوگ ضرور کہیں گے! انہیں کیا ہوا کہ پہلے یہ جس قبلے کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے تھے اس سے یکایک پھر گئے۔"

یہ آیات در حقیقت آنے والی آیات تحویل قبلہ کے لئے تمہید کا کام دے رہی ہیں۔ بات سوال و جواب کی صورت میں کی جا رہی ہے۔ اللہ کو علم تھا کہ ناراض لوگ ایسے سوالات اٹھائیں گے، لہٰذا بطور پیش بندی از خود جواب دے دیا گیا۔ اصل واقعہ یہ تھا کہ تحویل قبلہ کا حکم آپ کا تھا، جس طرح حدیث میں ذکر ہوا، مخالفین نے بھی سوالات کی بوچھاڑ شروع کر دی تھی، لیکن اللہ تعالیٰ نے مستقبل کا انداز بیان اختیار کر کے اس طرف اشارہ کر دیا کہ وہ جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ ان کے پروگرام کے مطابق ہے۔ ان کا یہ منصوبہ کوئی پوشیدہ منصوبہ نہ تھا، لہٰذا اس کا جواب بھی پہلے سے تیار تھا۔ تردیدی مقاصد کے لئے یہ انداز بیان بے حد پر تاثیر ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ لوگ ایسا کہیں گے! حالانکہ وہ کہہ چکے ہوتے ہیں۔

قرآن پہلے سے مخالفین کے سوالات کے جوابات نبی ﷺ کو بتا دیتا ہے، تاکہ جب بھی وہ سوال اٹھائیں مسلمان جواب دے دیں، چنانچہ اس سلسلے میں تحریک اسلامی کو پہلے سے ایک صحیح نقطہ نظر دے دیا جاتا ہے۔ قُلْ لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَ الْمَغْرِبُ يَهْدِىْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ "کہو! مشرق اور مغرب سب اللہ کے ہیں۔ اللہ جسے چاہتا ہے سیدھی راہ دکھا دیتا ہے۔")

شرق و غرب سب اللہ کے ہیں، جدھر دیکھتا ہوں ادھر تو ہی تو ہے۔ ذاتی طور پر کسی سمت یا کسی جگہ کو کوئی فضیلت حاصل نہیں ہوئی ہے۔ ہاں اللہ کسی سمت و مکان کے بارے میں کوئی حکم دیتا ہے یا کسی جگہ کو وہ خود اختیار کرتا ہے تو یوں اس بات سے فضیلت حاصل ہو جاتی ہے۔ یہ تو اللہ ہے کہ جسے چاہے سیدھی راہ پر لگا دے۔ اگر وہ اپنے بندوں کے لئے کوئی سمت اختیار کرے، ان کے لئے کسی مکان کو قبلہ قرار دے دے، تو پھر وہ جگہ ممتاز و محترم ہو جاتی ہے۔ اس لئے کہ اللہ کا حکم وابستہ ہو گیا، لہٰذا صراط مستقیم اس سمت سے گزرتا ہے، باقی سب سمتیں ٹیڑھی ہو جاتی ہیں۔

اس ایک فقرے ہی میں مکان و جہت کے بارے میں اسلامی نقطۂ نظر پیش کر دیا جاتا ہے۔ اس سرچشمے کی نشاندہی ہو جاتی ہے جو انسان کے لئے مصدر ہدایت ہے۔ یوں ایک صحیح نقطۂ نظر سامنے آ جاتا ہے۔ کیا؟ یہ کہ ہر حال میں، زندگی کے ہر موڑ پر، ذات باری تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو جانا۔

---

(۱) روایت امام مالک، مسلم، بخاری اور ترمذی

اب روئے سخن امت مسلمہ کی طرف ہو جاتا ہے۔ اسے بتایا جاتا ہے کہ اس کائنات میں وہ کس عظیم مرتبے کی حامل ہے اور اس کرہ ارض پر اسے کیا فرائض سرانجام دینے ہیں؟ عالم انسانیت میں اسے کیا فضیلت و برتری حاصل ہے؟ لوگوں کی زندگی میں اسے کیا رول ادا کرنا ہے۔ اس مقام اور مرتبے کا تقاضا ہے کہ اس کا ایک خاص قبلہ ہو۔ وہ ایک مخصوص تشخص کی مالک ہو۔ چھوڑیئے اور باتیں! اس رب عظیم کی سنئے جس نے اس امت کو اس عظیم مشن کے لئے منتخب کیا:

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَ يَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ؕ

("اس طرح تو ہم نے تمہیں ایک امت وسط" بنایا ہے تاکہ تم دنیا کے لوگوں پر گواہ ہو اور رسول تم پر گواہ ہو۔")

یہ امت وسط ہے۔ لوگوں پر گواہ ہے۔ اس کا فرض ہے کہ لوگوں کے درمیان عدل و انصاف قائم کرے۔ ان کے لئے معیار حق و اقدار حیات کا تعین کرے۔ ان کو ایسی رائے دے جو رائے عامہ بن جائے۔ اور لوگ اس پر اعتماد کریں۔ وہ تمام دنیا کے لوگوں کی اقدار' ان کے نظریات' ان کے رسم و رواج اور ان کے قومی شعاروں کا بغور جائزہ لے اور اپنا فیصلہ سنا دے! یہ حق ہے اور یہ باطل!" وہ کوئی ایسی امت نہیں ہے کہ دوسری اقوام سے نظریات' اقدار اور معیار حسن و قبح حاصل کرے۔ وہ لوگوں پر گواہ ہے اور ایک منصف اور جج کے منصب پر فائز ہے۔ جس طرح وہ لوگوں پر گواہ ہے۔ خود رسول ﷺ اس پر گواہ ہیں۔ حضور ﷺ اس امت کے لئے اقدار حیات اور معیار حق تجویز کریں گے۔ اس کے اعمال اور رسم و رواج کے بارے میں فیصلہ دیں گے۔ اس کے افعال و اقوال کے بارے میں آخری فیصلہ حضور ﷺ دیں گے۔ اس سے اس امت کی حقیقت اور اس کے فرائض معلوم ہو جاتے ہیں۔ اسے چاہئے کہ اپنی حقیقت سے اچھی طرح روشناس ہو جائے۔ اپنی اہمیت اور قدر و قیمت جانے اور اس دنیا میں اپنے منصب و کردار کو ٹھیک طرح متعین کرے اور اسے ادا کرنے کے لئے اپنے آپ کو پوری طرح تیار بھی کرے' یعنی وہ لوگوں کے لئے معیار حق ہو اور حضور ﷺ اس کے لئے معیار حق ہوں۔

یہ امت' امت وسط ہے۔ وسط کے ہر مفہوم کے اعتبار سے وہ وسط ہے۔ وسط کا مفہوم اگر احسن و افضل ہو' تو پھر بھی یہ وسط ہے۔ وسط کا مفہوم اگر میانہ روی اور اعتدال لیا جائے تو بھی یہ وسط ہے۔ وسط سے مراد اگر مادی اور حسی وسط مراد ہو تو بھی یہ امت' امت وسط ہے۔

"امت وسط" عقائد و نظریات میں وسط' میانہ رو' نہ روحانی تجرد میں ڈوبی ہوئی اور نہ مادہ پرستی میں گرفتار' بلکہ اصول فطرت کو اپنائے ہوئے ہے۔ مثلاً انسانی جسم کیا ہے؟ ایک مادہ ہے اور روح کو جسم مادی میں پیوست کیا گیا ہے یا مادی جسم کو روح کے ساتھ ایک کر دیا گیا ہے۔ یہ امت ان مختلف عناصر کے مرکب اس انسان کو' بلکہ اس کے عناصر ترکیبی میں سے ہر عنصر کو اس کا پورا پورا حق دیتی ہے۔ وہ روحانی زندگی کی ترقی اور کمال کے لئے بھی کام کرتی ہے اور انسان کی مادی ضروریات پوری کر کے اس کی اس مادی زندگی کی بقا کا کام بھی کرتی ہے۔ یہ امت انسان کی آزادی فکر' اس کی آزادی اظہار خیال اور اس کی ذاتی ذوق و شوق کی تسکین کے لئے بلا افراط و تفریط' میانہ روی اور ہم آہنگی اور اعتدال کے ساتھ' ایک وسیع دائرہ مقرر کرتی ہے اور انسان کو اس دائرے میں پوری پوری آزادی دیتی ہے۔

یہ امت وسط ہے' فکر و شعور کے میدان میں بھی' یہ موجودہ ذخیرۂ علم پر قانع اور منجمد ہو کر نہیں بیٹھ جاتی اور نہ علم و معرفت اور تجربہ و تحقیق کے دروازے بند کر دیتی ہے' لیکن وہ ہر سوچے سمجھے بغیر ہر نعرہ باز کے پیچھے بھی نہیں لگ جاتی۔ بندر کی طرح ہر کسی کی نقل بھی نہیں کرتی۔ وہ اپنے نظریات' اصول اور نظام فکر و عمل کی محافظ بن جاتی ہے اور انہیں مضبوطی سے تھامے ہوئے ہوتی ہے' لیکن پوری انسانیت کے افکار و تجربات پر بھی کڑی نظر رکھے ہوئے ہوتی ہے۔۔ اور اس کی مستقل پالیسی یہ ہے! "سچائی مومن کا سامان گم گشتہ ہے۔ جہاں

اسے مل گیا وہ اسے اٹھالے گا۔" لیکن ثابت قدمی مستقل مزاجی اور یقین کے ساتھ۔

وہ نظم وضبط میں بھی امت وسط ہے۔ وہ کارگاہ حیات میں انسان کو' اس قدر آزاد بھی نہیں چھوڑتی کہ اس پر ضمیر وشعور کے سوا کوئی خارجی چیک نہ ہو۔ اس طرح وہ اسے پوری طرح خشک قانونی جکڑ بندی اور جبری اصلاح کے طریقوں کے رحم وکرم پر بھی نہیں چھوڑ دیتی بلکہ وہ ایک طرف رشد واصلاح کے ذریعہ ضمیر وشعور کو اجاگر کرتی ہے اور معاشرے میں نیکی کا شعور پیدا کرتی ہے۔ لیکن دوسری طرف سے قانونی نظام اور تعزیری تادیب کے ذرائع بھی استعمال میں لاتی ہے اور معاشرے کو منظم کرتی ہے۔ بلکہ وہ رشد وہدایت اور قانون وتعزیر کے درمیان ایک حسین امتزاج کی قائل ہے۔ نہ وہ انسان کو صرف قانون کی جبریت کے حوالہ کرتی ہے اور نہ اس قدر آزاد چھوڑتی ہے۔

یہ امت' امت وسط ہے۔ روابط وتعلقات میں بھی امت وسط ہے۔ وہ فرد کے ذاتی وجود کو بھی ایک حقیقت تصور کرتی ہے۔ اس لئے اسے بالکل یہ نظرانداز نہیں کرتی کہ فرد کی شخصیت کو جماعت یاریاست کی شخصیت میں بالکل گم کر دیا جائے۔ نہ ہی اس کو اس قدر آزاد چھوڑتی ہے کہ وہ یکلخت خود سر ہو جائے اور اس کے سامنے اپنی ذات کے سوا کچھ نہ رہے۔ وہ فرد کے ان ذاتی رجحانات اور ان ذاتی قوتوں کو آزاد چھوڑ دیتی ہے جن کے نتیجے میں معاشرے میں حرکت اور فعالیت پیدا ہو اور وہ ترقی کرے۔ وہ ایسے رجحانات اور ایسی خصوصیات کو آزادی دیتی ہے' جن سے فرد کی ذات اور اس کی شخصیت کی تشکیل ہوتی ہو۔

اس کے بعد وہ سوچ سمجھ کر ایسی پابندیاں عائد کرتی ہے جو غلو اور افراط وتفریط کو منضبط کر دیں۔ عام طور پر وہ ایسی سرگرمیوں کی حوصلہ افزائی کرتی ہے جن سے جذبہ خدمت خلق پیدا ہو' لیکن اس کے بعد ایسی قانونی تدابیر بھی اختیار کرتی ہے جن کے ذریعہ فرد جماعت کا خادم ہو اور ریاست اور جماعت فرد کی کفیل ہوں اور امت وسط یہ کام بڑی ہم آہنگی سے انتہائی مناسب طریقے سے سرانجام دیتی ہے۔

جغرافیہ کے لحاظ سے بھی یہ امت وسط ہے۔ وہ زمین کے درمیان میں رہتی ہے۔ کرۂ ارض کے آباد علاقے کے مرکز میں' روئے زمین پر جہاں یہ امت آباد ہے وہ شمال وجنوب اور شرق وغرب کے عین وسط میں واقعہ ہے۔ انسان پر وہ گواہ اور پوری انسانیت اس پر گواہ۔ اس کے پاس جو کچھ ہے وہ اس کو تمام باشندگان زمین کو عطا کرتی ہے اور اس امت کے واسطہ ہی سے قدرت کے مادی خزانے اور روحانی خزانے پوری انسانی آبادی تک پہنچتے ہیں۔ اور وہ اس اہم مقام عالی پر حاکم ومختار ہے۔ اور تمام دنیا کی مادی اور روحانی حرکات اس کے زیر اثر نظر آتی ہیں۔

مکان کے بعد زمانی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو بھی یہ امت' امت وسط ہے۔ انسان کا عہد طفولیت آتے آتے اس امت پر ختم ہو جاتا ہے۔ اس امت سے' عقل ودانش کا دور بلوغ شروع ہوتا ہے۔ انسان کے عہد طفولیت سے' اس کے ساتھ اوہام وخرافات کی آلودگی چلی آرہی تھی۔ یہ امت وسط' انسانی تاریخی ادوار کے وسط میں کھڑی اسے جھاڑ رہی ہے۔ اور اس دور بلوغ میں بھی اسے فتنہ خود سری اور عقلی بے راہ روی سے بچارہی ہے۔ اس نے پیغمبروں کے دور کی خدائی ہدایات وتعلیمات اور عقل وحکمت کے دور جدید کے علمی انکشافات کے درمیان ایک حسین ہم آہنگی پیدا کر دی ہے اور وہ عین وسط میں راہ مستقیم پر پوری انسانیت کو لے کر چلتی نظر آتی ہے اور ہر وقت نقطہ اعتدال پر رہتی ہے۔

یہ تھا وہ مقام جو کبھی اللہ میاں نے اس امت کو بخشا تھا۔ کیا وہ اسے آج دوبارہ نہیں حاصل کر سکتی؟ یقیناً وہ اسے دوبارہ حاصل کر سکتی ہے۔ اس کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ لیکن بات یہ ہے کہ اس امت نے اس نظام زندگی کو ترک کر دیا ہے' جسے اللہ نے اس کے لئے پسند کیا تھا۔ اس کے بجائے اس نے دوسرے نظام ہائے زندگی کو اپنالیا ہے' جنہیں اللہ نے اس کے لئے پسند نہیں کیا۔ اس امت نے کچھ دوسرے رنگ ڈھنگ اختیار کر لئے ہیں۔ جن میں سے ایک بھی صبغۃ اللہ نہیں ہے۔ حالانکہ اللہ کی مرضی یہ تھی کہ یہ امت خالص اللہ

کے رنگ میں رنگی ہوئی ہو۔

یہ ہے امت اور یہ ہے اس کا مشن اور یہ ہے اس کا رول۔ وہ اس لائق ہے کہ یہ ذمہ داریاں اٹھائے اور اس راہ میں قربانی دے۔ مقام قیادت کے لئے جو کچھ ذمہ داریاں ہوتی ہیں۔ کچھ فرائض ہوتے ہیں۔ مقام قیادت کے حصول سے پہلے آزمائشیں ضروری ہوتی ہیں تاکہ معلوم ہو کہ امت' اللہ کے معاملے میں کس قدر مخلص و یکسو ہے۔ اور وہ کس حد تک ایک صالح قیادت کی ذمہ داریاں اٹھانے کے لئے تیار ہے۔

تحویل قبلہ کا حکم صادر ہو گیا اور اس موقع پر اس بات کی وضاحت بھی ہو گئی کہ مسلمانوں کو کیوں حکم دیا گیا تھا کہ وہ مسجد اقصیٰ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھیں وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنْتَ عَلَيْهَا إِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَتَّبِعُ الرَّسُولَ مِمَّنْ يَنْقَلِبُ عَلَىٰ عَقِبَيْهِ "پہلے جس قبلے کی طرف تم رخ کرتے تھے اس کو تو ہم نے صرف یہ دیکھنے کے لئے قبلہ مقرر کیا ہے کہ کون رسول کی پیروی کرتا ہے اور کون الٹا پھر جاتا ہے۔"

اس آیت سے وہ منصوبہ اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے جو اس نوخیز جماعت کی دینی تربیت کے لئے اللہ تعالیٰ نے وضع کیا تھا' اللہ تعالیٰ کی مشیت یہ تھی کہ جماعتِ اسلامی نظریہ کی وارث و امین ہو گی اور خلافت فی الارض کا منصب حاصل کرے گی۔ اللہ تعالیٰ کی مرضی یہ تھی کہ امت خالصتاً اس نظریۂ حیات کے لئے کام کرے اور وہ اپنے دل و دماغ کو تمام جاہلی تصورات کے اثر سے پاک کر دے۔ وہ تمام قدیم عادات اور قومی خصوصیات ترک کر دے۔ جاہلیت کی ہر سلگتی ہوئی چنگاری کو بجھادے۔ جاہلیت کے تمام لباس اتار پھینکے۔ جاہلیت کا ہر شعار ترک کر دے۔ اس کے شعور میں صرف اسلامی سند ہو' خالص اسلامی شعار' ہر آمیزش سے پاک شعار۔ اس کے رشد و ہدایت کا سرچشمہ ایک اور صرف ایک ہو' کوئی دوسرا سرچشمہ اس میں شریک نہ ہو۔

بیت اللہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنے کے معاملہ میں نظریاتی رجحان کے علاوہ کچھ اور رجحانات بھی تھے۔ قریش مکہ کے مورث اعلیٰ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا خالص اسلامی نظریہ ان کے ہاں خالص نہ رہا تھا۔ اس میں مختلف اقسام کی شرک داخل ہو چکی تھی اور قومی عصبیت بھی ان کے دین کا حصہ بن چکی تھی۔ اس وقت بیت اللہ صرف عربوں کا ایک مقدس مقام تصور ہوتا تھا اور اللہ کی رضا اس میں تھی کہ وہ عربوں کے بجائے اللہ تعالیٰ کا مقدس مقام ہو۔ اور اللہ کی نسبت کے سوا اس کی طرف کوئی اور نسبت نہ ہو۔ اور یہ مقام صرف ربانی شعار ہو' کوئی اور نسبت اس سے منسلک نہ ہو۔

چونکہ کعبہ شریف کے ساتھ عربوں کے تاریخی جذبات بھی وابستہ تھے۔ اور قومی میلانات بھی وابستہ تھے' اس لئے اللہ تعالیٰ نے ایک مختصر عرصے کے لئے یہ حکم دیا کہ مسلمانوں کا قبلہ' کعبہ شریف کے بجائے مسجد اقصیٰ ہو گا' تاکہ عربوں کے دلوں سے خانہ کعبہ کے سلسلے میں تاریخی اور قومی میلانات کی جڑ کٹ جائے' پھر یہ بھی معلوم ہو جائے کہ مسلمانوں میں سے کون ہے جو رسول خدا ﷺ کی اطاعت کرتا ہے اور کون ہے جو نہیں کرتا۔ وہ لوگ جو رسول ﷺ کی اطاعت محض اس لئے کرتے ہیں کہ وہ رسول خدا ہیں' ان لوگوں سے جدا ہو جائیں جو اس لئے آپ کے مطیع فرمان ہیں کہ آپ عرب ہیں اور خانہ کعبہ کو قبلہ و کعبہ سمجھتے ہیں' اور اس وجہ سے کہ ان کے قومی شعور اور ان کے قدیم مقامات مقدسہ کے احترام کے جذبات کو اسلام میں بھی اہمیت دی جاتی اور یہ کہ ان کے تاریخی میلانات کا سامان تسکین اسلام میں بھی ہے اور ضرور اسی وجہ سے وہ مسلمان ہیں۔

یہ ایک نہایت ہی لطیف اور دقیق نکتہ ہے۔ اسلام کا نظریۂ حیات وحدہ لاشریک ہے اور جب وہ کسی دل میں جاگزیں ہو جائے تو پھر اس دل میں وہ کسی اور شریک کو برداشت نہیں کرتا۔ وہ اپنے شعار اور اپنی خصوصیات کے سوا تمام دوسرے شعارات و خصوصیات کو ختم کر دیتا ہے۔ اسلامی نظریہ حیات تمام جاہلی تصورات اور جاہلی طور طریقوں کی جڑ کاٹ دیتا ہے۔ بڑے ہوں یا چھوٹے۔ یہ آیت اس طرف اشارہ

کرتی ہے وَ مَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِيْ كُنْتَ عَلَيْهَآ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَيْهِ "پہلے جس قبلہ کی طرف تم رخ کرتے تھے' اس کو تو ہم نے صرف یہ دیکھنے کے لئے قبلہ مقرر کیا تھا کہ کون رسول کی پیروی کرتا ہے اور کون الٹا پھر جاتا ہے۔"

اللہ تعالیٰ تو مستقبل میں ہونے والے واقعات سے قبل از وقوع ہی باخبر ہیں' لیکن ارادہ الٰہی یہ ہوتا ہے کہ ہونے والا واقعہ لوگوں پر ظاہر ہو جائے اور اس کے بعد محاسبہ کیا جائے اور سزا دی جائے۔ وہ اپنے رحم و کرم کی وجہ سے محض اپنے علم مستقبل کی بنا پر سزا نہیں دیتا۔ صرف ان امور پر سزا دیتا ہے جو واقع ہو جائیں اور مجرم سے ان کا صدور ہو جائے۔

یہ بات اللہ کے علم میں تھی تمام تاریخی اور قومی شعوری رجحانات کو یکلخت ترک کر دینا' ایسی خصوصیات اور شعارات کو جو دل و جان سے لگی ہوئی ہوں اور جو دل و دماغ میں رچی بسی ہوں' یکلخت ترک کر دینا ایک نہایت ہی مشکل کام ہے' نہایت ہی شاق ہوتا ہے ان کا اکھاڑ پھینکنا۔ یہ کام صرف اس وقت ہو سکتا ہے کہ جب ایمان دل و دماغ پر پوری طرح چھا جائے اور پھر اس دل کو خدائی امداد حاصل ہو اور ذات باری کا قرب حاصل ہو۔ ذات باری اسے اپنے ساتھ ملا لے اور اس کی راہنمائی کرے۔ وَ اِنْ كَانَتْ لَكَبِيْرَةً اِلَّا عَلَى الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ "یہ معاملہ تھا بڑا سخت مگر ان لوگوں کے لئے کچھ بھی سخت ثابت نہ ہوا' جو اللہ کی ہدایت سے فیض یاب تھے۔"

چونکہ وہ ہدایت الٰہی سے فیض یاب ہے' اس لئے ان کے لئے' اپنے دل و دماغ سے جاہلی تصورات کو نکال دینا کوئی مشکل کام نہ تھا۔ اور انہوں نے ہدایت پاتے ہی جاہلیت کے تمام نشانات کو پرے پھینک دیا۔ یہ امت اللہ کی امت بن گئی۔ سمع و طاعت اس کا شعار ہو گیا اور حالت یہ ہو گئی کہ اللہ تعالیٰ جس طرف چاہیں اسے ادھر موڑ دیں۔ رسول اللہ ﷺ جدھر چاہیں انہیں لے جائیں۔

اب مسلمانوں کو ان کے ایمان اور ان کی نماز کے بارے میں اطمینان دلایا ہے کہ وہ راہ ہدایت پر گامزن ہیں۔ اس لئے ان کی نمازیں ضائع نہیں ہو سکتیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر کبھی ظلم نہیں کرتا۔ وہ اس کی جو عبادت بھی گزارتے ہیں' اسے ضائع نہیں کرتا' وہ ان پر ایسا بوجھ بھی نہیں ڈالتا جو ان کی طاقت سے زیادہ ہو۔ اگرچہ یہ طاقت ایمان کی وجہ سے قوی تر ہو جاتی ہے بلکہ دوچند ہو جاتی ہے:

وَ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ (۱۴۳) "اللہ تمہارے ایمان کو ہرگز ضائع نہ کرے گا یقین جانو کہ وہ تم لوگوں کے حق میں نہایت شفیق و رحیم ہے۔"

وہ انسان کی طاقت اور قوت برداشت سے اچھی طرح باخبر ہے۔ لہٰذا وہ کوئی ایسا حکم صادر نہیں کرتا' جو ان کے دائرہ طاقت سے باہر ہو۔ وہ تو انسان کی راہنمائی کرتا ہے۔ اور اگر ان کی نیت ٹھیک ہو' عزم پختہ ہو تو وہ ہر امتحان میں خود ان کی امداد کرتا ہے تاکہ وہ کامیابی کے ساتھ اس آزمائش سے نکل آئیں۔ اگر امتحان و آزمائش اس کی حکمت کا مظہر ہیں' تو آزمائش میں پورا اترنا اس کا فضل و کرم ہے:

اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ "یقین جانو کہ وہ تم لوگوں کے حق میں شفیق و رحیم ہے۔")

یوں اللہ تعالیٰ مسلمانوں کے دلوں میں طمانیت قلب کا جام انڈیل دیتا ہے۔ ان کی بے اطمینانی دور ہو جاتی ہے۔ اور ان کے دلوں میں رضائے الٰہی کا پختہ شعور اور یقین پیدا ہو جاتا ہے۔

اب اعلان ہوتا ہے کہ قبلہ کے معاملہ میں رسول خدا ﷺ کی خواہش پوری کر دی گئی۔ تحویل قبلہ کا اعلان ہو جاتا ہے' لیکن ساتھ ساتھ مسلمانوں کو یہودیوں کی فتنہ انگیزی سے بھی باخبر کر دیا جاتا ہے۔ ان عوامل اور محرکات سے بھی پردہ اٹھایا جاتا ہے جو اس فتنہ انگیزی اور مسلسل سازشوں کے پس منظر میں کام کرتے ہیں۔ یہ سب کچھ اس انداز میں کہ تحریک اسلامی کو اس عظیم جدوجہد کا صحیح علم ہو جائے' جو خداوند کی طرف سے اس کی تنظیم و تربیت کے لئے کی جارہی ہے جو مخالفین کی فتنہ انگیزیوں اور غوغا آرائیوں سے بچانے کے لئے' اس کی خاطر کی جارہی ہے۔ قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِى السَّمَآءِ ۚ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً

تَرْضٰىهَا ۪ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا
وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ؕ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ؕ
وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۴﴾ وَلَئِنْ اَتَيْتَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ
بِكُلِّ اٰيَةٍ مَّا تَبِعُوْا قِبْلَتَكَ ۚ وَمَا اَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ ۚ وَمَا بَعْضُهُمْ بِتَابِعٍ
قِبْلَةَ بَعْضٍ ؕ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ
اِنَّكَ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۴۵﴾ اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ
اَبْنَآءَهُمْ ؕ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۴۶﴾ اَلْحَقُّ مِنْ
رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ﴿۱۴۷﴾ وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيْهَا فَاسْتَبِقُوا
الْخَيْرٰتِ ؕ اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يَاْتِ بِكُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ
شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۴۸﴾ وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ
وَاِنَّهٗ لَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۹﴾ وَمِنْ حَيْثُ
خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا
وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ۙ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ ۗ اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا
مِنْهُمْ ۗ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِيْ ۗ وَلِاُتِمَّ نِعْمَتِيْ عَلَيْكُمْ وَلَعَلَّكُمْ
تَهْتَدُوْنَ ﴿۱۵۰﴾

۱۷
ع۲
۱

یہ تمہارے منہ کا بار بار آسمان کی طرف اٹھنا ہم دیکھ رہے ہیں۔ لو ہم اس قبلے کی طرف تمہیں پھیرے دیتے ہیں جسے تم پسند کرتے ہو' مسجد حرام کی طرف رخ پھیر دو۔ اب جہاں کہیں تم ہو اس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھا کرو۔

یہ لوگ جنہیں کتاب دی گئی ہے' خوب جانتے ہیں کہ تحویل قبلہ کا یہ حکم ان کے رب ہی کی طرف سے ہے اور برحق ہے' مگر اس کے باوجود جو کچھ یہ کر رہے ہیں' اللہ تعالیٰ اس سے غافل نہیں ہے۔ تم ان اہل کتاب کے پاس خواہ کوئی نشانی لے آؤ' ممکن نہیں کہ یہ تمہارے قبلے کی پیروی کرنے لگیں اور نہ تمہارے لئے یہ ممکن ہے کہ ان کے قبلے کی پیروی کرو' اور ان میں سے کوئی گروہ بھی دوسرے کے

قبلے کی پیروی کے لئے تیار نہیں ہے اور اگر تم نے اس علم کے بعد' جو تمہارے پاس آچکا ہے' ان کی خواہشات کی پیروی کی تو یقیناً تمہارا شمار ظالموں میں ہو گا' جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے' وہ اس مقام کو (جسے قبلہ بنایا گیا ہے) ایسا پہچانتے ہیں' جیسا کہ اپنی اولاد کو پہچانتے ہیں۔ مگر ان میں سے ایک گروہ جانتے بوجھتے حق کو چھپا رہا ہے۔ یہ قطعی ایک امر حق ہے تمہارے رب کی طرف سے' لہٰذا اس کے متعلق تم ہرگز کسی شک میں نہ پڑو۔

ہر کے لئے ایک رخ ہے' جس کی طرف وہ مڑتا ہے۔ پس تم بھلائیوں کی طرف سبقت کرو' جہاں بھی تم ہو گے' اللہ تمہیں پالے گا۔ اس کی قدرت سے کوئی چیز باہر نہیں۔ تمہارا گزر جس مقام سے بھی ہو' وہیں سے اپنا رخ (نماز کے وقت) مسجد حرام کی طرف پھیر دو' کیونکہ یہ تمہارے رب کا بالکل برحق فیصلہ ہے۔ اور اللہ تم لوگوں کے اعمال سے بے خبر نہیں ہے۔ اور جہاں سے بھی تمہارا گزر ہو' اپنا رخ مسجد حرام کی طرف پھیرا کرو' اور جہاں بھی تم ہو' اس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھو تاکہ لوگوں کو تمہارے خلاف کوئی حجت نہ رہے۔ ہاں جو ظالم ہیں ان کی زبان کسی حال میں بند نہ ہو گی تو ان سے تم نہ ڈرو بلکہ مجھ سے ڈرو۔ اور اس لئے کہ میں تم پر اپنی نعمت پوری کروں گا اور اس توقع پر کہ میرے حکم کی پیروی سے تم فلاح کا راستہ پاؤ گے۔")

ان آیات کے شروع میں نبی ﷺ کی حالت کی تصویر کشی ان الفاظ میں کی گئی تھی! قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ ("اے رسول! یہ تمہارے منہ کا بار بار آسمان کی طرف اٹھنا ہم دیکھ رہے ہیں۔")

اس سے اس شدید خواہش کا اظہار ہوتا ہے جو آپ ﷺ تحویل قبلہ کے سلسلے میں رکھتے تھے۔ یہودیوں کی کٹ حجتیوں اور دلیل بازیوں سے مجبور ہو کر آپ ﷺ یہ چاہنے لگے تھے کہ مسلمانوں کا موجودہ قبلہ بدل جائے۔ چونکہ مسلمان یہودیوں کے قبلے کی طرف رخ کر کے نماز ادا کرتے تھے اور یہودیوں نے اس غلط پروپیگنڈے' غوغا آرائی اور مسلمانوں کو گمراہ کرنے کا ذریعہ بنانے کی کوشش کی تھی' اس لئے حضور ﷺ اپنی دلی خواہش کے تحت' بار بار منہ آسمان کی طرف اٹھاتے' ادب و احترام کو ملحوظ رکھتے ہوئے کسی بات کا اظہار نہ کرتے' اس خوف سے کہ جناب باری میں وہ کوئی تجویز پیش کرنے کی جرات کیسے کریں؟ یا از خود کوئی بات اللہ کے سامنے لائیں۔ مبادا کہ اللہ کو پسند نہ ہو لیکن اللہ نے اس کی خواہش پوری کر دی۔ اور جن الفاظ میں یہ خواہش پوری کی گئی ہے' ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ کو اپنے حبیب کی رضا منظور تھی۔

فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰىهَا ("لو ہم اسی قبلہ کی طرف تمہیں پھیرے دیتے ہیں' جسے تم پسند کرتے ہو۔")

اب اس قبلہ کا تعین ہو جاتا ہے جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ جانتے تھے کہ آپ کی مرضی بھی اسی میں ہے: فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ("مسجد حرام کی طرف رخ پھیر دو۔")

اب یہ تمہارا قبلہ ہے تمہاری امت کا قبلہ ہے۔ جو لوگ تمہارے ساتھ موجود ہیں ان کا اور جو آنے والے ہیں ان کا تاقیامت' قبلہ ہے۔ اس وقت تک جب کرۂ ارض پر اور اس میں بسنے والے آخر کار اللہ کے سامنے پیش ہوں گے:

وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ("اب جہاں کہیں تم ہو' اس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھا کرو۔")

ہر سمت سے' کرۂ ارض کے تمام اطراف و جوانب سے' اب یہ ایک ہی قبلہ ہے اور امت کا ہر فرد اسی طرف رخ کرے گا جہاں کہیں بھی وہ رہتا ہو' چاہے وطن کوئی بھی ہو' محل وقوع دور دراز ہی کیوں نہ ہو۔ چاہے ان افراد کے رنگ جدا ہوں' زبانیں مختلف ہوں اور قومیتیں الگ ہوں لیکن قبلہ ایک ہو گا۔ اور امت مسلمہ چاہے شرق میں ہو یا غرب میں' اس سمت میں قبلہ رخ ہو گی۔ یوں اس امت میں احساس پیدا ہوتا ہے کہ وہ ایک جسم ہے' ایک جان ہے' ایک ہی نصب العین اس کے سامنے ہے' ایک ہی نظام زندگی کے قیام کے لئے سرگرم عمل ہے۔ وہ نظام جو اسے ایک ہی تصور' ایک ہی رسول ؐ اور ایک ہی قبلہ عطا کرتا ہے۔

ہے۔ وہ نظام جو اسے ایک ہی تصور' ایک ہی رسول اور ایک ہی قبلہ عطا کرتا ہے۔

یوں اللہ نے اس امت کو جوڑ دیا۔ ایک خدا' ایک رسول' ایک دین اور ایک قبلہ۔ قومیت و اوطان اور السنہ و الوان کے اختلاف کے باوجود ایک امت رنگ و نسل اور لسان و وطن کے تمام اصولوں کو نظرانداز کر دیا گیا اور وحدت امت کی اساس اسلامی نظریۂ حیات اور وحدت قبلہ پر رکھی گئی۔ حقیقت یہ ہے کہ یہی اتحاد بنی آدم کے شایان شان ہے کیونکہ انسان عقیدے اور نظریہ پر متحد ہوتا ہے۔ ایک طرز عبادت اور قبلہ عبادت پر متحد ہوتا ہے جبکہ حیوانات کا اجتماع چارے' چراگاہ اور غار اور باڑے کی بنیاد پر ہوتا ہے۔

اب موضوع ہے "اہل کتاب اور قبلہ جدیدہ وَإِنَّ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ لَيَعْلَمُونَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِن رَّبِّهِمْ ("یہ لوگ جنہیں کتاب دی گئی تھی' خوب جانتے ہیں کہ تحویل قبلہ کا' یہ حکم ان کے رب ہی کی طرف سے ہے اور برحق ہے۔")

یہ بات ٹھیک ٹھیک ان کے علم میں ہے کہ خانہ خدا یعنی مسجد حرام کی بنیادیں اٹھانے والے حضرت ابراہیم ؑ تھے۔ اس امت کے جد امجد جو اس مشن کے وارث بنے بلکہ تمام مسلمانوں کے جد امجد' انہیں اس امر کا بھی ٹھیک ٹھیک طرح علم ہے کہ قبلہ جدید کا حکم بھی اللہ ہی کی جانب سے آیا اور اس میں کوئی شک نہیں ہے لیکن اپنی موروثی عادت کے مطابق وہ اپنے اس علم و یقین کے عین مخالف رویہ اختیار کریں گے۔ محض مسلمانوں کی دشمنی اور عناد کی بنا پر' لیکن اللہ ہی ان کا محافظ ہے۔ وہی ہے نگہبان جو ان کی ہر سازش کو برباد کرے گا وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُونَ ۱۴۴ ("مگر اس کے باوجود جو کچھ یہ کر رہے ہیں' اللہ اس سے غافل نہیں ہے۔")

وہ کسی بھی دلیل سے مطمئن نہیں ہو سکتے۔ ان کے ہاں فہم دلیل کی کوئی کمی نہیں ہے۔ اگر وہاں کسی چیز کی کمی ہے تو وہ اخلاص ہے۔ وہ ہوائے نفس کے بندے ہیں اور باوجود علم کے ان میں حق و صداقت کے تسلیم کرنے کی استعداد نہیں ہے: وَلَئِنْ أَتَيْتَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ بِكُلِّ آيَةٍ مَّا تَبِعُوا قِبْلَتَكَ "تم ان اہل کتاب کے سامنے چاہے کوئی دلیل پیش کرو' ممکن نہیں کہ یہ تمہارے قبلے کی پیروی کرنے لگیں۔")

ان کی نکیل ہوائے نفس کے ہاتھ میں ہے۔ دنیاوی مصالح انہیں ہانکے لے جا رہے ہیں اور ذاتی اغراض ان کے لئے حدی خواں ہیں۔ مخلصین میں سے بے شمار لوگ اب بھی ایسے ہیں جو سمجھتے ہیں کہ یہود و نصاریٰ اسلام کو اس لئے قبول نہیں کرتے کہ انہیں اسلام کا صحیح علم نہیں ہے۔ یا ان کے سامنے اطمینان بخش طریقے سے' اسلام پیش ہی نہیں کیا گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ محض ایک وہم ہے وہ تو اسلام قبول ہی اس لئے نہیں کرتے کہ انہیں اس کا صحیح صحیح علم ہے! وہ جانتے ہیں کہ اسلام ان کے مفادات کے سرا سر خلاف ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ اس میں ان کے لئے قیادت و سیادت کا کوئی مقام نہیں ہے۔ یہی سبب ہے کہ وہ اسلام کے خلاف مسلسل بلاانقطاع سازشیں کرتے چلے جاتے ہیں' مختلف طریقوں سے' مختلف وسائل کے ذریعہ' براہ راست بھی اور بالواسطہ بھی وہ اسلام کے خلاف برسرپیکار ہیں۔ روبرو بھی اور پس پردہ بھی۔ وہ اسلام کے خلاف خود بھی لڑتے ہیں اور دوسروں کو بھی اس کے خلاف لڑنے پر آمادہ اور برانگیختہ کرتے ہیں۔ غرض ہر شکل میں وہ یہ کام کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ سے جو کہا ہے وہ ہر وقت اس کا مصداق ہیں وَلَئِنْ أَتَيْتَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ بِكُلِّ آيَةٍ مَّا تَبِعُوا قِبْلَتَكَ ("تم اہل کتاب کے سامنے چاہے کوئی دلیل پیش کرو' ممکن نہیں کہ وہ تمہارے قبلے کی پیروی کرنے لگیں۔")

اہل کتاب کا تو حال یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کے قبلہ اور اسلامی نظام زندگی سے مسلسل اعراض کرتے چلے آتے ہیں۔ جس کے اشارات اس قبلے میں واضح طور پر نظر آتے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ان کے اس موقف کے مقابلے میں نبی ﷺ اور حلقہ بگوشان اسلام کا موقف کیا ہے؟ وَمَا أَنتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ "اور نہ تمہارے لئے یہ ممکن ہے کہ ان کے قبلے کی پیروی کرو" قدرتی طور پر یہ

درست موقف ہے۔)

یعنی آپ ﷺ کی شان کے خلاف ہے کہ آپ ﷺ کسی صورت میں بھی ان کے قبلے کی پیروی کریں' یہاں قرآن نے یہ انداز بیان اختیار کیا "اور آپ بھی ان کے قبلے کی پیروی کرنے والے نہیں ہیں" یعنی جملہ اسمیہ منفوہ اور یہ نہیں کہا کہ "آپ ان کے قبلے کی پیروی نہیں کرتے" کیونکہ پہلے فقرے کے ذریعے حضور ﷺ کی مستقل شان اور اس معاملے میں اپنے موقف سے ڈٹا رہنے کا اظہار اچھی طرح ہوتا ہے اور آپ ﷺ کے بعد امت مسلمہ کو بھی واضح اشارہ مل جاتا ہے کہ وہ بھی اپنے رسول کے اختیار کردہ قبلے کو ہرگز ترک نہ کرے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ فیصلہ اپنے رسول کی خواہش اور دلجوئی کی خاطر تمہارے لئے پسند کیا ہے۔ وہ اس ربانی جھنڈے کے سوا کوئی اور علم بلند نہ کرے' وہ اسلامی نظام حیات کے علاوہ کسی دوسرے نظام کی پیروی نہ کرے' جس کی طرف تحویل قبلہ میں اشارات موجود ہیں۔ جب تک وہ امت' امت مسلمہ ہے اسے یہی طرز عمل اختیار کرنا چاہئے۔ اگر وہ ایسا نہ کرے تو پھر اس کا اسلام سے کوئی واسطہ اور تعلق نہ رہے گا۔ اس کا اسلام محض دعوائے اسلام رہ جائے گا۔

تحویل قبلہ کی مناسبت سے بتایا جاتا ہے کہ خود اہل کتاب کے مابین بھی قبلے کے معاملے میں شدید اختلاف رائے پہلے سے موجود ہے۔ وہ بھی باہم متفق نہیں ہیں کیونکہ ان کی خواہشات نفس بھی مختلف ہیں وَ مَا بَعْضُهُمْ بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ ("اور ان میں سے کوئی گروہ بھی دوسرے گروہ کے قبلے کی پیروی کے لئے تیار نہیں۔")

یہود و نصاریٰ کے درمیان عداوت ہے' مختلف یہودی فرقے بھی ایک دوسرے کے مخالف ہیں۔ پھر مختلف نصرانی فرقے بھی باہم برسرپیکار ہیں۔

جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اہل کتاب کی یہ عداوت ہے اور آپ پر اللہ کی طرف سے سچائی نازل بھی ہو گئی ہے تو پھر آپ کے لئے یہ کیونکر درست ہو سکتا ہے کہ آپ ان کی خواہشات نفس کی پیروی کریں جبکہ آپ کے پاس اللہ کی جانب سے علم آچکا ہے:

وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ مِّنْ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ اِنَّكَ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ("اور اگر تم نے اس علم کے بعد' جو تمہارے پاس آچکا ہے' ان کی خواہشات کی پیروی کی تو یقیناً تمہارا شمار ظالموں میں ہو گا۔")

اس سے پہلے انداز کلام نہایت نرم اور مشفقانہ تھا' لیکن یہاں آکر نبی ﷺ کے ساتھ خطاب خداوندی یکایک کچھ سخت ہو جاتا ہے۔ انداز کلام میں قطعی سنجیدگی پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ کیوں؟ اس لئے کہ اب بات عمل و استقامت کی ہے۔ معاملہ ہدایات پر عمل کرنے کا ہے۔ چنانچہ دو ٹوک الفاظ میں متنبہ کیا جاتا ہے۔ اِنَّكَ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ("تو یقیناً تمہارا شمار ظالموں میں ہو گا")

راہ واضح ہے۔ صراط مستقیم سامنے ہے۔ علم وہ ہے جو اللہ کی جانب سے ہو۔ اس کے سوا دوسرے ذرائع سے صرف ہوائے نفس ہی حاصل ہوتی ہے۔ مسلمان کا فرض ہے کہ وہ علم یقین حاصل کرے۔ بدلنے والے اور خواہش نفسانیہ پر مبنی مشکوک ذرائع علم کے مقابلے میں علم حقیقی کو ترک نہ کرے۔ اس میں شک نہیں ہے کہ جو علم وحی پر مبنی نہ ہو وہ ہوائے نفس کے سوا کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔

یہاں اس بات کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ یہودیوں کے منظم پروپیگنڈہ اور گمراہ کن وسوسہ اندازیوں کے نتیجے میں' مدینہ طیبہ کے اندر بعض مسلمانوں کی ذہنی کیفیت ایسی ہو گئی تھی کہ ان کے لئے اس قسم کی قطعی تعبیر کی ضرورت تھی۔ ان کو ڈرانا مناسب تھا۔ زجر و توبیخ کا انداز مناسب تھا۔

مسلمانوں سے اس مختصر خطاب کے بعد اب روئے سخن پھر اصل موضوع پر لوٹ آتا ہے۔ بات وہی ہے کہ اہل کتاب اس بات کو یقینی طور پر جانتے ہیں کہ حق وہی ہے جس کا اظہار قرآن شریف کرتا ہے اور جس کا حکم حضور ﷺ دیتے ہیں لیکن وہ اپنے اس یقینی علم کے

باد جود' اس حق کو چھپاتے ہیں-کیوں؟ اس لئے کہ وہ خدا پرست نہیں بلکہ نفس پرست ہیں!

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ؕ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ("جن کو' ہم نے کتاب دی ہے-وہ اس مقام کو (جسے قبلہ بنایا گیا) ایسا ہی پہچانتے ہیں جیسا کہ وہ اپنی اولاد کو پہچانتے ہیں مگر ان میں سے ایک گروہ جانتے بوجھتے حق کو چھپا رہا ہے")

اپنے بچوں کو پہچاننا علم و معرفت کی اعلیٰ ترین مثل ہے-عربی زبان میں یہ مثال ایک ایسے مقام اور ایسے واقعہ کے لئے استعمال ہوتی ہے جو یقینی ہو اور اس کے علم و معرفت میں کوئی شک و شبہ نہ ہو-اہل کتاب کی حالت یہ ہے کہ ان کو سچائی کا یقینی علم ہو چکا ہے-تحویل قبلہ کا حکم بھی اسی عالمگیر سچائی کا ایک حصہ ہے اور پھر بھی وہ اس سچائی کو چھپاتے ہیں جو یقینی علم کے طور پر انہیں حاصل ہے-تو پھر مؤمنین کے لئے درست راہ عمل یہ ہے کہ وہ یہودیوں کے کذب و افتراء سے ہرگز متاثر نہ ہوں-ان کو یہ بات ہرگز زیب نہیں دیتی کہ وہ ان یہودیوں سے کوئی چیز اخذ کریں جنہیں حقیقت کا علم ہے اور پھر بھی وہ اسے چھپاتے ہیں-وہ خود اپنے دین کے اس حصے کا بھی انکار کر دیتے ہیں جسے مسلمانوں کے رسول امین وحی کی صورت میں پیش کریں-محض تعصب کی وجہ سے-

اہل کتاب کے سلسلے میں بیان کے بعد اب روئے سخن نبی ﷺ کی ذات کی طرف ہو جاتا ہے اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ (۱۴۷) ("یہ ایک قطعی امر حق ہے' جو تمہارے رب کی طرف سے ہے' للہذا اس کے متعلق تم ہرگز کسی شک میں نہ پڑو-")

کیا رسول خدا ﷺ نے بھی کبھی شک کیا؟ نہیں ہرگز نہیں-ایک دوسری آیت میں جب کہا گیا: فَاِنْ كُنْتَ فِىْ شَكٍّ مِّمَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ فَسْـَٔلِ الَّذِيْنَ يَقْرَءُوْنَ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكَ ("جو کلام ہم نے تمہاری طرف نازل کیا ہے' اگر تمہیں اس کے بارے میں کوئی شک ہے تو ان لوگوں سے پوچھ لو جو تم سے پہلے کتاب پڑھتے چلے آ رہے ہیں-")

اس پر آپ ﷺ نے فرمایا! "نہ مجھے شک ہے اور نہ ہی میں ان سے پوچھتا ہوں-"

تو پھر رسول خدا ﷺ کو ذاتی طور پر کیوں مخاطب کیا گیا؟ مسلمانوں کو متوجہ کرنا تھا- چاہے وہ مسلمان جو آپ ﷺ کے ساتھ موجود تھے اور یہودیوں کے خرافات سے متاثر ہو رہے تھے یا وہ لوگ ہوں جو بعد میں آنے والے تھے اور دینی معاملات میں یہودیوں کے اباطیل واکاذیب سے متاثر ہو سکتے تھے-

میں کہوں گا کہ آج مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ ذرا اس تنبیہ پر کان دھریں- آج ہم ایسی نادانی میں مبتلا ہیں جس کی کوئی مثال ہی نہیں ہے-ہم اپنے دینی معاملات میں بھی یہود و نصاریٰ اور اشتراکی ملحدین سے یہ ہدایت طلب کرتے ہیں اور فتویٰ لیتے ہیں-ہم ان لوگوں سے خود اپنی تاریخ پڑھتے ہیں-ہم ان پر اعتماد کرتے ہیں کہ وہ ہمارے ورثہ کے بارے میں کوئی بات کریں-وہ ہمارے قرآن اور ہمارے رسول ﷺ کی سنت اور آپ کی سیرت کے بارے میں جو شکوک و شبہات پیدا کرتے ہیں یہ ان پر اطمینان سے کان دھرتے ہیں-ہم ان کے پاس اپنے طلبہ بھیجتے ہیں تاکہ وہ ان سے اسلامی تعلیمات حاصل کریں اور ان کی یونیورسٹیوں سے فارغ التحصیل ہو کر آئیں اور جب ہمارے پاس لوٹیں تو ان کی عقل ان کا ضمیر فاسد ہو چکا ہو اور وہ فاضل کہلائیں-

یاد رکھیے! یہ قرآن ہی ہمارے لئے کتاب شریعت ہے-وہ پوری امت مسلمہ کی کتاب ہے-یہ امت کی وہ دائمی کتاب ہے جس میں اسے راہ عمل بتایا گیا ہے اور راہ بد سے ڈرایا گیا ہے-اس کے بالمقابل اہل کتاب بہرحال اہل کتاب ہیں-کفار' کفار ہیں-ان کا دین ان کا دین ہے' اور ہمارا دین ہمارا دین!

اب بات کا رخ اصل موضوع کی طرف پھر جاتا ہے-مسلمانوں کو حکم دیا جاتا ہے کہ وہ اہل کتاب کی باتوں پر کان ہی نہ دھریں-ان کی

ہدایات و راہنمائی قبول ہی نہ کریں اور مستقل مزاجی کے ساتھ اپنے طریق زندگی اور اپنے نقطۂ نظر کی طرف بڑھتے چلے جائیں۔ ہر گروہ کا اپنا رخ رفتار ہوتا ہے۔ مسلمانوں کا رخ نیکی اور خیر کی طرف ہے۔ انہیں چاہئے کہ کسی چیز کی طرف بھی نظریں نہ اٹھائیں اور بڑھتے چلے جائیں۔ آخر کار انہیں خداوند قیامت کے سامنے حاضر ہونا ہے جو اس پر اچھی طرح قدرت رکھتا ہے کہ انہیں جمع کرے۔ وہ قادر ہے کہ وہاں سب کو جزا و سزا دے: وَ لِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ؕ اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يَاْتِ بِكُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ

("ہر ایک کے لئے ایک رخ ہے' جس کی طرف وہ مڑتا ہے۔ بس تم بھلائیوں کی طرف سبقت کرو۔ جہاں بھی تم ہو گے' اللہ تمہیں پا لے گا۔ اس کی قدرت سے کوئی چیز باہر نہیں۔")

اہل کتاب جو فتنے پھیلاتے تھے اور جو سازشیں کرتے تھے اور اللہ کے کلام کی جو تاویلات و تحریفات کرتے تھے یہاں مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ اہل کتاب کی ان کارستانیوں میں بالکل دلچسپی نہ لیں۔ وہ راہ عمل پر گامزن ہوں اور نیکی کے کام میں ایک دوسرے سے آگے بڑھیں۔ ساتھ ساتھ یہ یاد دہانی بھی کرائی جاتی ہے کہ آخر کار انہیں اللہ تعالیٰ کے سامنے آنا ہے۔ وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ اس کے لئے کوئی کام مشکل نہیں ہے۔ نہ ہی کوئی چیز اس کی نظروں سے اوجھل ہو سکتی ہے۔ یہ ہے وہ سچائی جس کے مقابلے میں تمام اقوال احوال باطل ہیں' جن کی کچھ حقیقت ہی نہیں ہوتی۔

پھر تحویل قبلہ کی بات دہرائی جاتی ہے' تاکیداً حکم دیا جاتا ہے کہ جدید قبلہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھا کرو' جسے اللہ تعالیٰ نے منتخب کیا ہے' اس موقع پر کچھ نئی تفریعات مرتب ہوئی ہیں اور کچھ نئے نتائج نکالے جاتے ہیں۔ وَ مِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَ اِنَّهٗ لَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ ؕ وَ مَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ)

("تمہارا گزر جس مقام سے بھی ہو' وہیں سے اپنا رخ (نماز کے وقت) مسجد حرام کی طرف پھیر دو' کیونکہ یہ تمہارے رب کا بالکل برحق فیصلہ ہے اور اللہ تم لوگوں کے اعمال سے بے خبر نہیں ہے۔")

اس تاکیدی حکم میں اب یہودیوں کا ذکر نہیں ہے اور نہ ہی قبلے کے سلسلے میں ان کے موقف کا ذکر ہے۔ کہا گیا ہے کہ نبی ﷺ جہاں بھی ہوں اور ان کا گزر جس مقام سے بھی ہو' وہ نماز کے وقت رخ بیت اللہ کی طرف پھیر دیں۔ کیونکہ یہ ان کے رب کا برحق فیصلہ ہے۔ اشارۃً یہ بھی کہہ دیا گیا کہ کہیں تمہیں اس سچائی سے روگردانی نہ کر دو۔ قرآن مجید کے الفاظ: "اور اللہ تم لوگوں کے اعمال سے بے خبر نہیں ہے" سے واضح طور پر اس طرف اشارہ ہوتا ہے۔ ان الفاظ سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ واقعی بعض مسلمانوں کے دلوں میں خلجان تھا اور ایسی صورت حال موجود تھی کہ اللہ تعالیٰ کو بار بار تاکید کرنی پڑی اور شدید وعید بھی فرمائی۔

تیسری مرتبہ پھر بالکل ایک جدید غرض کی خاطر' قبلہ کے معاملے میں تاکید کی جاتی ہے۔ مسلمان یہودیوں کے قبلے کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے تھے اور یہودی اور دوسرے لوگ اس پر استدلال کرتے تھے کہ ان کا دین مسلمانوں کے دین سے زیادہ افضل ہے۔ کیونکہ ان کا قبلہ اصل ہے' لہٰذا یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ان کا نظام زندگی بھی اصل ہے۔ اس لئے تحویل قبلہ کے حکم کی تاکید مزید کر کے اس استدلال کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا گیا۔ (دوسری طرف مشرکین عرب بیت الحرام کو ایک مقدس مقام سمجھتے تھے اور اس کا بے حد احترام کرتے تھے۔ وہ بھی بیت المقدس کے قبلہ ہونے پر یوں اعتراض کرتے تھے کہ مسلمان تو یہودیوں کے تابع ہیں۔ انہوں نے اپنے مقدس مقام کو چھوڑ دیا ہے اور بنی اسرائیل کے قبلہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے ہیں۔

وَ مِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَ حَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ۙ

لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ ۙ إِلَّا الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْهُمْ ۚ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِي وَلِأُتِمَّ نِعْمَتِي عَلَيْكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ) ("اور جہاں سے بھی تمہارا گزر ہو' اپنا رخ مسجد حرام ہی کی طرف پھیرا کرو اور جہاں بھی تم ہو' اسی کی طرف منہ کر کے نماز پڑھو تاکہ لوگوں کو تمہارے خلاف کوئی حجت نہ ملے۔ ہاں جو ظالم ہیں ان کی زبان کسی حال میں بھی بند نہ ہوگی۔ تو ان سے تم نہ ڈرو' بلکہ مجھ سے ڈرو' اور اس لئے کہ میں تم پر اپنی نعمت پوری کر دوں۔ اس توقع پر کہ تم یہ ہدایت و فلاح کا راستہ پالو۔")

رسول خدا ﷺ کو حکم دیا گیا ہے کہ تمہارا گزر جہاں سے بھی ہو' مسجد حرام کی طرف رخ کر کے نماز پڑھیں۔ اور مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ جہاں بھی وہ ہوں اپنا منہ بیت اللہ کی طرف پھیر کر نماز پڑھا کریں۔

ارشاد ہوا! لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ ("تاکہ لوگوں کو تمہارے خلاف حجت نہ ملے۔") ظالم اپنی بات کرتے ہی رہیں گے۔ وہ کسی حجت اور کسی دلیل کے آگے نہیں جھکتے۔ ہدایت ہوتی ہے کہ ایسے لوگوں کو نظرانداز کر دیا جائے۔ یہ لوگ کٹ حجتی کرتے ہیں اور عناد میں مبتلا ہیں۔ ایسے لوگوں کو کسی طرح بھی مطمئن نہیں کیا جاسکتا۔ وہ اپنی حجت بازی جاری رکھیں گے۔ مسلمانوں کو چاہئے کہ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِي ("ان سے نہ ڈرو اور مجھ سے ڈرو")

ان کو تم پر کوئی اختیار حاصل نہیں ہے۔ تمہاری زمام کار ان کے ہاتھ میں نہیں ہے۔ یہ بات تمہارے شایان شان نہیں ہے کہ تم ان سے ڈر کر ان احکام کو ترک کرو' جو میری جانب سے تم پر نازل ہوئے۔ ڈر اور خشیت کا لائق تو میں ہوں۔ اس لئے کہ تمہاری دنیا و آخرت کے تمام امور میرے ہاتھ میں ہیں۔

ظالموں کو نظرانداز کیا جاتا ہے۔ مسلمانوں کو اللہ کی پکڑ سے ڈرایا جاتا ہے اور مسلمانوں کو اللہ کے انعام و اکرام یاد دلائے جاتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اگر تم نے اپنا رویہ درست رکھا اور احکام خداوندی کی اطاعت کی تو نتیجہ یہ ہوگا کہ مزید انعامات کی بارش ہوگی: وَلِأُتِمَّ نِعْمَتِي عَلَيْكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ اس لئے کہ میں تم پر اپنی نعمت پوری کر دوں اس توقع پر کہ تم راہ ہدایت پالو۔")

غرض یہ ایک یاد دہانی ہے جس میں ایک خاص اشارہ ہے' ایک بڑھتی ہوئی حوصلہ افزائی ہے' اور بار بار اللہ کے فضل و کرم کی طرف اشارہ ہے۔

وہ کیا انعام ہے؟ وہ تو ان کے ہاتھوں میں ہے' خود ان کے دل و دماغ گواہ ہیں کہ وہ کیا ہے؟ ان کی پوری زندگی میں موجود ہے۔ وہ اپنے موقف اور اپنے معاشرہ میں اسے پاتے ہیں۔ اس کائنات میں انہوں نے جو مقام اپنے لئے متعین کیا ہے اس میں بھی وہ اس نعمت کو پاتے ہیں۔

وہ جاہلیت کی جہالتوں اور تاریکیوں میں زندگی بسر کر چکے تھے۔ وہ اپنی آنکھوں سے جاہلیت کی تاریکیوں کو دیکھ چکے تھے۔ اس کے بعد انہوں نے خود نور ایمان کو اختیار کیا۔ پاکیزگی اور طہارت کو اختیار کیا اور علم و معرفت کو اختیار کیا۔ اس لئے وہ اپنے دل و دماغ میں اس نعمت کا اثر ہروقت تروتازہ' گہرا اور واضح پاتے ہیں۔

وہ کوتاہ اندیشانہ قبائلی زندگی بسر کر چکے تھے۔ گھٹیا مقاصد کے لئے سالہاسال کشت و خون کرتے رہے تھے۔ پھر وہ اپنی خوشی سے ایک نظریہ حیات کے جھنڈے تلے جمع ہو گئے' ایک قوت اور شوکت بن گئے۔ ان کے مقاصد بلند ہو گئے اور ترجیحات وسیع ہو گئیں۔ ان کا نقطہ نظر خاندانوں اور قبائل کے محدود دائرے سے بلند ہو کر تمام بشریت کی بنیادوں پر استوار ہو گیا۔ اور اس نے وسعت اختیار کر لی۔ اس لئے وہ اپنے اندر اور اپنے ماحول میں انعامات الہیہ کا وسیع شعور رکھتے ہیں۔

اسلام سے پہلے وہ کس مقام پر کھڑے تھے؟ گرا پڑا غلیظ معاشرہ' افکار پریشاں اور زندگی کی اقدار مضطرب' یعنی جاہلی معاشرہ کے مقابلے میں۔

انہوں نے خوب سمجھ کر سوچ کر اسلام کا پاک اور بلند معاشرہ اپنایا' جس کے نظریات اور عقائد شیشے کی طرح صاف تھے' جس کی اقدار متوازن تھیں۔ اس لئے اسلام ان کے لئے ایک نعمت غیر مترقبہ تھا۔ وہ اپنے شعور میں' اپنی پوری زندگی میں اور اقوام کی برادری میں' اپنے مقام کو دیکھ کر محسوس کرتے تھے کہ سراپا اسلام کے انعامات و برکات میں ڈوبے ہوئے ہیں۔

اس لئے اللہ کا فرمان وَلِأُتِمَّ نِعْمَتِي عَلَيْكُمْ "اس لئے کہ میں تم پر اپنی نعمت پوری کر دوں" تو اللہ کی طرف سے' اس فقرے میں دراصل ایک خفیہ اشارہ ہے' ایک قسم کی حوصلہ افزائی تھی اور ہے' ان انعامات و اکرامات کی طرف جس کا احساس خود مسلمانوں کو تھا۔

یہاں تحویل قبلہ کے حکم میں تکرار سے کام لیا گیا ہے۔ لیکن اس تکرار میں ہر مرتبہ ایک نیا مفہوم دیا گیا ہے۔ پہلی مرتبہ کہا گیا کہ حضور ﷺ چونکہ تحویل قبلہ کی خواہش رکھتے تھے۔ اس خواہش کا انداز بیان باادب خموشی تھا۔ آپ بار بار آسمان کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھتے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے تحویل قبلہ منظور فرمالیا۔ دوسری مرتبہ کہا گیا کہ اگرچہ حضور ﷺ کی طلب اور خواہش بھی تھی' لیکن حکم اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے اور عین حق ہے۔ تیسری مرتبہ جو حکم دیا گیا اس میں مسلمانوں کو بتایا گیا کہ تحویل قبلہ کی حکمت کیا ہے؟ یہ کہ دشمنان اسلام اس سے اپنے دین کی برتری کے لئے استدلال کرتے تھے اور اس لئے حکم تحویل صادر ہوا۔ اس لئے مقصد یہ تھا کہ جو لوگ حق کا ساتھ نہیں دیتے' براہین و دلائل کو تسلیم نہیں کرتے' وہ اس بات کے مستحق ہیں کہ ان کی کوئی عزت نہ ہو اور وہ ہر معاملے میں ہلکے ہوں۔

ان وجوہ کے ساتھ' اس وقت مدینہ طیبہ میں اس نوخیز اسلامی تحریک کی صفوں میں' ایسے حالات پائے جاتے تھے' جو اس تکرار و تاکید اور استدلال و بیان کے متقاضی تھے۔ بعض مسلمانوں کے دلوں پر مخالفین کے گمراہ کن پروپیگنڈے اور باطل استدلالات کا اثر پایا جاتا تھا' جس کا اندازہ اس امر سے ہو رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس سلسلے میں بار بار تاکید کے ساتھ مسلمانوں کو خطاب فرماتے ہیں اور اس اثر کے ازالے کے لئے' قرآن مجید نے یہ زوردار انداز بیان اختیار کیا ہے اور تحویل قبلہ کی ان وقتی ہدایات کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے قرآن مجید کا جزء بنا دیا گیا۔ تاکہ اس قسم کے حالات میں' مسلمان ایسا ہی طرز عمل اختیار کریں' کیونکہ وہ ایک ایسے معرکہ میں کود پڑے ہیں جو تاقیامت جاری رہے گا' کبھی ٹھنڈا نہ ہو گا' کبھی نرم نہ ہو گا' یعنی معرکہ انقلاب اسلامی۔

اس مناسبت سے قرآن مجید مسلمانوں کو پھر یاد دلاتا ہے کہ اللہ نے تمہیں اپنی نعمت سے نوازا ہے۔ اس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعوت قبول کرتے ہوئے تمہاری طرف اپنے نبی کو بھیجا' وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام جو قبلہ مسلمین بیت الحرام کے معمار اول تھے۔ یوں قرآن مجید مسلمانوں کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا روحانی وارث قرار دیتا ہے۔ اور مسلمانوں کا براہ راست تعلق حضرت ابراہیم علیہ السلام سے قائم کر دیا جاتا ہے۔

كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ﴿١٥١﴾ فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوْا لِيْ وَلَا تَكْفُرُوْنِ ﴿١٥٢﴾

۱۸ ع۵ ۲

"جس طرح' میں نے تمہارے درمیان خود تم میں سے ایک رسول بھیجا' جو تمہیں میری آیات سناتا ہے' تمہاری زندگی کو سنوارتا ہے'

تمہیں کتاب اور سنت کی تعلیم دیتا ہے اور تمہیں وہ باتیں سکھاتا ہے جو تم نہ جانتے تھے' للذا تم مجھے یاد رکھو' میں تمہیں یاد رکھوں گا اور میرا شکر ادا کرو' کفران نعمت نہ کرو۔"

اس آیت کے مضمون پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس میں انہی باتوں کو دہرایا گیا ہے' جن کی دعوت اس صورت میں حضرت ابراہیم ﷺ نے دی تھی۔ اس وقت حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل ﷺ خانہ کعبہ کی دیواریں اٹھا رہے تھے۔ جناب خلیل اللہ نے دعا فرمائی تھی کہ: "اے اللہ' میری اولاد میں سے جو اس گھر کے جوار میں رہتی ہے' ایک نبی مبعوث فرما۔ جو ان کو تیری آیات پڑھ کر سنائے۔ انہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور انہیں پاک کر دے۔" یوں مسلمانوں کو یاد دہانی کرائی گئی ہے کہ ان میں رسول اللہ ﷺ کا مبعوث کیا جانا' اور خود ان کا بطور مسلمان پایا جانا' یہ دراصل ان کے ابا جان حضرت ابراہیم ﷺ کی دعا کی براہ راست قبولیت ہے۔ اس میں یہ اشارہ بھی مضمر ہے کہ ان کی تحریک کوئی نئی تحریک نہیں ہے۔ ایک قدیم تحریک ہے۔ ان کا قبلہ کوئی نیا قبلہ نہیں ہے' بلکہ ان کے ابا ابراہیم ﷺ کا قبلہ ہے۔ اور ان پر اسلام نے جو جود و کرم کیا ہے وہ وہی جود و کرم ہے جس کا وعدہ اللہ تعالیٰ نے اپنے دوست سے کیا تھا۔

اس نے تمہیں تمہارا پرانا قبلہ دے دیا' تمہیں ایک مستقل شخصیت عطا کر دی۔ یہ تو اس کے انعامات کا ایک نمونہ ہے جو وہ تم پر مسلسل کرتا چلا آ رہا ہے۔ اور سب سے پہلی نعمت یہ ہے کہ اس نے تم میں اپنا رسول ﷺ تم ہی میں سے مبعوث فرمایا: كَمَآ أَرْسَلْنَا فِيكُمْ رَسُولًا مِّنكُمْ "جس طرح میں نے تمہارے درمیان خود تم میں سے ایک رسول بھیجا۔"

اس نے تمہارے، اندر رسالت قائم کر دی۔ کیا یہ تمہارے لئے کوئی کم عزت افزائی ہے؟ یہودی ایک عرصہ سے آخری رسول کا انتظار کر رہے تھے اور ان کا خیال تھا کہ وہ انہی میں سے ہو گا اور اس کی قیادت میں وہ قریش پر فتح پائیں گے' لیکن اللہ تعالیٰ نے وہ خاتم الرسل تم میں سے چن لیا يَتْلُوا عَلَيْكُمْ آيَاتِنَا "تمہیں میری آیات سناتا ہے۔"

وہ جو کچھ پڑھ کر تمہیں سناتا ہے وہ حق ہے۔ اس فقرے میں ایک شاہانہ حوصلہ افزائی ہے۔ اللہ کا کلام' رسول خدا ﷺ پر نازل ہو رہا ہے' لیکن خطاب اپنے بندوں سے ہو رہا ہے۔ اس انداز کلام پر غور کیا جائے تو یہ ایک عظیم عزت افزائی معلوم ہوتی ہے۔ دل مارے خوشی کے جھوم جاتا ہے۔ کیا شان ہے ان لوگوں کی! وہ کون ہیں اور کیا ہیں؟ خداوند قدوس ان سے خطاب کر رہا ہے۔ خود اپنے الفاظ میں ان سے بات ہو رہی ہے۔ کیا عظیم قدر دانی ہے یہ؟ اگر اللہ تعالیٰ ان پر اپنا فضل و کرم نہ کرتا تو وہ یہ شان کہاں سے حاصل کرتے۔ یہ محض خدا کی جانب سے باران رحمت کا نتیجہ ہے۔ ابتدائے آفرینش میں اللہ تعالیٰ نے انسان کا ڈھانچہ تیار کیا اور اس میں روح پھونکی۔ اس کی نسل چلائی تاکہ ان میں سے ایسے لوگ پیدا ہوں جو اللہ تعالیٰ کے انعامات کے مستحق ہوں۔ وہ ایسے ہوں' جو ان انعامات کو خوش آمدید کہیں۔

وَيُزَكِّيكُمْ "اور وہ تمہیں پاک کر دے۔" اگر اللہ نہ ہوتا تو مشرکین اہل عرب اور مسلمانوں میں سے کوئی بھی پاک نہ ہوتا۔ نہ پاک ہوتا اور نہ ہی مرتبہ بلند پاتا۔ اللہ نے ان میں سے رسول بھیجا تاکہ وہ انہیں پاک کر دے۔ ان کے دل کو شرک کی آلائش اور جاہلیت کی آلودگی سے پاک کر دے۔ ان کی روح کو ایسے تمام تصورات سے پاک کر دے جن کے بوجھ تلے انسانی روح صدیوں سے دفن ہو کر رہ گئی تھی۔

وہ انہیں شہوانی قوت کی آلودگیوں سے بھی پاک کرتا ہے' للذا ان کی روح جنسی بے راہ روی کے گڑھے میں نہیں گرتی۔ وہ لوگ جنہیں اسلام پاک نہیں کرتا' چاہے زمانہ قدیم کے باشندے ہوں یا زمانہ جدید کے' وہ گویا گندے پانی کے چشمے سے جنسی پیاس بجھاتے ہیں' جس سے طبیعت نفرت کرتی ہے اور جس سے انسان کی انسانیت ختم ہو جاتی ہے۔ اور ایک حیوان جو صرف حیوانی فطرت کا پابند ہوتا ہے' اس انسان سے ارفع و برتر ہو جاتا ہے۔ وہ لوگ جو ایمان سے محروم ہیں ان سے یہ حیوان بدرجہا پاک ہوتا ہے۔ اسی طرح اللہ ان کے

معاشرے کو لوٹ کھسوٹ اور سود و ساہو کاری سے بھی پاک کرتا ہے۔ یہ سب چیزیں بھی ایک قسم کی گندگی ہیں۔ یہ انسانی شعور اور انسانی روح کو گندہ کر دیتی ہیں۔ اور اجتماعی زندگی ان سے آلودہ ہو جاتی ہے۔ وہ ان کی زندگی کو ظلم و زیادتی سے پاک کرتا ہے اور انہیں نظام عدل و احسان عطا کرتا ہے۔ وہ عدل و انصاف جو اسلامی نظام حیات 'اسلامی نظام حکومت سے پہلے انسانیت نے نہ دیکھا تھا اور نہ سنا تھا۔ غرض انہیں تمام گندگیوں اور آلودگیوں سے پاک و صاف کر دیتا ہے جو ان کے ارد گرد پھیلی ہوئی جاہلیت کے چہرے کا بدنما داغ ہیں اور ہر اس معاشرے میں پائی جاتی ہیں' جسے اسلامی روح نے پاک کیا ہو' جس میں اسلام کا پاک و صاف نظام زندگی رائج نہ ہو۔

وَ يُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ　"تمہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔" اس سے پہلے جو فرمایا گیا کہ وہ رسول ہی آیات پڑھ کر تمہیں سناتا ہے' اس سے بھی مراد یہ ہے کہ رسول تمہیں کتاب پڑھاتا ہے لیکن یہاں تعلیم کتاب کے ساتھ تعلیم حکمت کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ حکمت درحقیقت تعلیم کتاب کا نتیجہ ہوتی ہے۔ حکمت اس مہارت کا نام ہے جس کے ذریعے انسان ہر چیز کو اس کا اصلی اور صحیح مقام دے دے۔ ہر بات اور ہر مسئلے کو ایک صحیح معیار پر پرکھے اور احکام و ہدایات کی صحیح غرض و غایت سمجھ سکے۔ تاریخ شاہد ہے کہ رسول خدا ﷺ نے جن لوگوں کو تربیت دی تھی اور جن کو آیات کتاب اللہ کے ذریعہ پاک فرمایا تھا' وہ حکمت و دانائی میں اس طرح کامل ہو گئے تھے جس طرح ایک پھل درخت کے اوپر پوری طرح پک جاتا ہے۔

وَ يُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ (۱۵۱)　"اور تمہیں وہ باتیں سکھاتا ہے جو تم نہ جانتے تھے۔" اسلامی جماعت کی تاریخ اس پر گواہ ہے کہ یہ ایک عظیم سچائی ہے۔ اسلام نے اس جماعت کو عربی معاشرے سے چنا۔ جس کے پاس چند متفرق معلومات کے سوا کوئی ذخیرہ علم نہ تھا۔ صرف وہ علم جو صحرا میں ایک قبیلے کی زندگی کے لئے ضروری تھا یا صحرا کے درمیان گھرے ہوئے چھوٹے چھوٹے شہروں کی ضرورت کے لئے کافی تھا۔ اسلام نے اس صحرائی جماعت کو ایک ایسی امت بنا دیا جو پوری انسانیت کو حکیمانہ اور عادلانہ قیادت فراہم کرنے لگی۔ ایک مختصر عرصے میں حالت یہ ہو گئی تھی کہ اب یہ امت کڑی نگاہ رکھتی ہے۔ امور عالم سے باخبر ہے اور زیور علم سے آراستہ ہے۔ قرآن اور حکمت قرآن پر مبنی ہدایات رسول ﷺ اس امت کے لئے راہ ہدایت اور سرچشمہ علم بن گئے ہیں۔

مدینہ میں مسجد نبوی" جہاں قرآن کریم اور قرآن پر مبنی ارشادات رسول پڑھے اور پڑھائے جاتے تھے' امت کے لئے ایک عظیم یونیورسٹی بن گئی۔ اس یونیورسٹی سے وہ لوگ فارغ ہو کر نکلے جنہوں نے پوری انسانیت کی حکیمانہ راہنمائی کی ایسی قیادت کی جس کی نظیر پوری انسانی تاریخ میں نہ اس سے پہلے ملتی ہے اور نہ اس کے بعد آج تک ملتی ہے۔

اسلامی نظام حیات' جس نے یہ قیادت فراہم کی اور انسانوں کا یہ معیاری گروہ تیار کیا' آج بھی یہ استعداد رکھتا ہے کہ انسانیت کو ویسی ہی قیادت فراہم کرے' بشرطیکہ یہ امت صحیح طرح اس قرآن کریم پر ایمان لے آئے۔ اسے صحیح طرح اپنے لئے زندگی کا ماخذ قرار دے۔ اور اسے خوش الحانی سے پڑھ کر قوت سامعہ کی تسکین کے لئے استعمال نہ کرے' بلکہ اسے دستور حیات بنالے۔

فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ　"تم مجھے یاد رکھو میں تمہیں یاد رکھوں گا۔" یہ وہ کرم ہے جس کا صدور صرف اللہ تعالیٰ ہی سے ہو سکتا ہے جس کے خزانوں میں کمی نہیں' جس کے خزانوں پر کوئی چوکیدار نہیں اور جس کی داد و دہش کا نہ حساب ہے' نہ محاسب۔ اس کے خزانوں سے بغیر طلب اور بلاسبب داد و دہش ہوتی رہتی ہے' اس لئے نہیں کہ ضرورت مند ہے' بلکہ اس کے وہ معطی ہے' وہ فیاض ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے "جس نے مجھے دل میں یاد کیا میں بھی اسے دل میں یاد کروں گا' جس نے مجھے بھری مجلس میں یاد کیا میں بھی اسے ایسے لوگوں میں یاد کروں گا' جو اس کے لوگوں سے افضل و اخیر ہوں گے۔" (حدیث صحیح)

ایسی ہی ایک دوسری حدیث شریف کا مضمون ہے! "رسول اللہ فرماتے ہیں: "اللہ تعالیٰ نے فرمایا" اے بنی آدم! اگر تو نے مجھے دل

میں یاد کیا میں بھی تجھے دل میں یاد کروں گا اور اگر تو نے مجھے لوگوں میں یاد کیا تو میں بھی تجھے ملائکہ کے درمیان یاد کروں گا۔"

بعض روایات میں آتا ہے "ایسے لوگوں میں جو ان سے بہتر ہوں گے۔ اگر تو ایک بالشت میرے قریب آئے گا میں ایک ہاتھ تیرے قریب آؤں گا۔ اگر تم ایک ہاتھ میرے قریب آؤ گے تو میں دو ہاتھ تیرے قریب آؤں گا۔ اگر تو میری طرف چل کر آئے گا تو میں تیری طرف دوڑ کر آؤں گا۔"

یہ ہے وہ فضل و کرم جس کا بیان الفاظ میں نہیں ہو سکتا۔ اس کا شکر 'سوائے اس کے کہ دل اپنی گہرائیوں کے ساتھ سجدہ ریز ہو جائے' ادا نہیں ہو سکتا۔

اللہ کی یاد کیسے ہو' الفاظ میں؟ الفاظ ضروری نہیں ہیں' یہ تو دل کی توجہ ہے۔ دل کا اللہ کی طرف متوجہ ہونا ہے' چاہے الفاظ ساتھ ہوں یا نہ ہوں۔ یاد تو ایک دلی شعور اور انفعال ہے اور اس شعور و انفعال کے ادنیٰ اثرات یہ ہوں کہ انسان اللہ کی اطاعت پر آمادہ ہو جائے اور اعلیٰ اثرات یہ ہوں کہ انسان کو اللہ کا دیدار نصیب ہو' جو لوگ وصول الی اللہ کی نعمت سے سرفراز ہوتے ہیں اور جو ذوق دیدار چکھ لیتے ہیں ان کے پیش نظر اس کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ صرف دیدار یار۔

وَ اشْكُرُوْا لِيْ وَلَا تَكْفُرُوْنِ "میرا شکر ادا کرو اور کفر نہ کرو۔" شکر کے بھی کئی درجے ہیں۔ پہلا یہ کہ انسان اللہ تعالیٰ کے انعامات کا اقرار کرے۔ اور پھر اس کی نافرمانی سے حیا کرے۔ اور آخری درجہ یہ ہے کہ انسان مجسمہ شکر بن جائے۔ بدن کی ہر حرکت' زبان کا ہر لفظ' دل کی ہر دھڑکن اور دماغ کا ہر تصور نمونہ شکر ہو۔ کفر سے روکا گیا ہے۔ اشارہ اس آخری مقام کی طرف ہے' جس تک آخر کار ایک ناشکر گزار انسان پہنچ جاتا ہے۔ لاتکفرون سے وہ آخری نکتہ بتایا گیا ہے جہاں ناشکری کے خط کی انتہا ہو جاتی ہے۔ العیاذ باللہ۔

تحویل قبلہ کے موقعہ پر اشتباہ اور ہدایات بالکل واضح اور مناسب ہیں۔ ذکر الٰہی وہ نقطہ ہے جہاں اگر مومن کا دل اللہ کی عبادت کے لئے تیار ہوتا ہے۔ پھر وہ خالصتاً اللہ کا ہو جاتا ہے اور اسی نسبت سے منسوب ہوتا ہے' یعنی بندگی کی وجہ سے بندہ ہو جاتا ہے۔

یہودی سازشوں سے خبردار کرنے کے موقعہ پر بھی فکر و شکر کی ہدایت دینا مناسب ہے۔ ہم کہہ آئے ہیں کہ یہودیوں کا آخری مقصد یہ تھا کہ وہ مومنین کو دوبارہ کفر میں داخل کر دیں۔ وہ چاہتے تھے مسلمانوں سے یہ نعمت چھن جائے' جو بطور خاص اللہ نے انہیں دی تھی۔ کیا نعمت؟ نعمت ایمان۔ وہ بلند ترین نعمت جو کسی فرد یا کسی جماعت کو دی جا سکتی ہے۔ خصوصاً عربوں کے لئے تو یہ نعمت عظیم سے بھی عظیم تر تھی۔ اسی سے تو عربوں کا وجود قائم ہوا۔ تاریخ آدمیت میں عربوں نے ایک عظیم رول ادا کیا' ان کا نام اس نظریہ حیات سے منسلک ہو گیا جس کے وہ حامل تھے اور جسے انہوں نے بنی نوع آدم تک پہنچانا تھا۔

اس نعمت کے بغیر عرب کچھ نہ تھے۔ گمنام تھے' اب بھی گمنام ہیں اور اگر وہ نہ ہو۔ آئندہ بھی گمنام ہوں گے اگر اسے نہ اپنائیں گے۔ اسلامی نظریہ حیات کے سوا ان کے پاس تھا ہی کیا؟ جس کے ذریعہ وہ دنیا میں کوئی نام پیدا کرتے' کیا کسی نظریہ حیات کے بغیر کوئی قوم دنیا میں مقام قیادت حاصل کر سکتی ہے؟

مقام قیادت کے لئے ایسی فکر کی ضرورت ہے جو پوری زندگی کی قیادت کرے۔ انسانی حیات کو ترقی کی راہ دکھائے۔ اسلامی نظریہ حیات دراصل زندگی کا پورا نظام ہے۔ وہ صرف ایک نعرہ ہی نہیں ہے جس کے پیچھے مثبت عمل نہ ہو بلکہ ایسا عمل ہے جو اس نظریہ کی تائید کرے۔ اسلام کے کلمہ طیبہ کے ساتھ ساتھ عمل طیب بھی ضروری ہے جو کلمہ کا مصداق ہو۔

امت کے لئے ضروری بلکہ فرض ہے کہ وہ اس حقیقت کو یاد رکھے تاکہ اللہ اسے یاد رکھے۔ اور اللہ نے اسے نسیا منسیا نہ کر دے اور جسے اللہ نے بھلا دیا سمجھو کہ وہ ڈوب گیا۔ زمین پر اس کا ذکر خیر نہ رہے گا۔ آسمانوں پر اس کا کوئی خیر خواہ نہ رہے گا۔ اور جو اللہ کو

یاد کرے گا اللہ اسے یاد کرے گا۔ آسمانوں پر بھی اس کا ذکر ہوگا اور اس طویل وعریض کائنات میں بھی اس کا ذکر خیر گونج اٹھے گا۔

ایک وقت تھا کہ مسلمانوں نے اللہ کو یاد کیا۔ پھر اللہ نے بھی انہیں یاد کیا۔ پھر کیا تھا؟ ان کا نام پوری کائنات میں بلند ہوگیا' دنیا کی قیادت صالح قیادت ان کے سپرد ہوگئی۔ لیکن پھر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ انہوں نے رب ذوالجلال کو بھلادیا۔ تو اس نے بھی ان کو بھلادیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ مہمل بن گئے۔ ضائع ہوگئے۔ وہ اقوام کی برادری میں ایک حقیر تابع کے مقام تک جاگرے۔ علاج اب بھی موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ بلاتا ہے "تم مجھے یاد کرو میں تمہیں یاد کروں گا۔ میرا شکر ادا کرو اور کفر اختیار نہ کرو۔"

☆ ☆ ☆ ☆

درس ۹ ایک نظر میں

تحویل قبلہ کے بعد اور امت مسلمہ کو ایک مستقل اور ممتاز حیثیت دینے اور ایسا تشخص عطا کرنے کے بعد' جو اس امت کے ممتاز نظریہ حیات کے ساتھ مناسب تھا' مسلمانوں کو پہلی ہدایت یہ دی گئی کہ وہ صبر و صلوٰۃ سے مدد لیں کیونکہ انہیں ایک عظیم ذمہ داری سونپی گئی ہے۔ یہ منصب بڑی بڑی قربانیاں چاہتا ہے۔ شہداء کو خون پیش کرنا ہو گا۔ جانی نقصان' مالی نقصان' متاع و ثمرات کا نقصان برداشت کرنا ہو گا۔ وہ بھوک کے دن دیکھیں گے اور خوفناک راتوں سے دوچار ہوں گے۔ اس کے علاوہ انہیں بے شمار قربانیاں دینی ہوں گی۔ ان سب قربانیوں کے لئے انہیں اپنے آپ کو تیار کرنا ہو گا۔

انہیں اپنے نفس سے اور اس پوری دنیا سے اسلامی نظام کے قیام کے لئے جہاد کرنا ہو گا۔ اس عظیم جہاد کی خوفناکیوں کا مقابلہ کرنا ہو گا اور یہ مقابلہ اور تیاری اسی صورت میں ہو سکتی ہے کہ اہل ایمان صبر و صلوٰۃ سے امداد حاصل کریں۔ انہیں اس امت کا دل اللہ سے جوڑنا ہو گا۔ اپنے قلوب کو اللہ کے لئے خالص کرنا ہو گا اور اپنے تمام کاموں میں اللہ اور رسول اللہ کی طرف رجوع کرنا ہو گا۔ یہ سب کچھ کس لئے' کیا کس انعام کے لالچ میں؟ یا اللہ کی رضامندی کے حصول کے لئے؟ اس کی رحمت و ہدایت کی طلبگاری کی خاطر؟ کس قدر عظیم اجر ہے یہ؟ اس کی قدر و قیمت دل مومن ہی سے پوچھئے!

☆ ☆ ☆ ☆

درس نمبر۹ تشریح آیات (۱۵۳ تا ۱۵۸)

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ ٱسْتَعِينُوا۟ بِٱلصَّبْرِ وَٱلصَّلَوٰةِ ۚ إِنَّ ٱللَّهَ مَعَ ٱلصَّٰبِرِينَ ﴿۱۵۳﴾

"اے ایمان لانے والو! صبر اور نماز سے مدد لو۔ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔" قرآن کریم میں صبر کا تذکرہ بتکرار ہوا ہے۔ اس لئے کہ تحریک اسلامی کو سخت ترین مخالفتوں اور دشواریوں کا سامنا کرنا تھا۔ اللہ تعالیٰ کے علم میں تھا کہ اس راہ میں صبر و استقامت کی ضرورت ہے۔ کیونکہ تحریک اسلامی کو مسلسل مشکلات اور لگاتار کشمکشوں کا مقابلہ کرنا ہو گا لہٰذا اس بات کی ضرورت تھی کہ اہل ایمان صبر سے کام لیں اور ان کے نفوس داخلی و خارجی معاملات میں بیدار رہیں۔ اہل ایمان کی قوتیں منظم رہیں اور ان کے اعصاب پختہ رہیں۔ ایسے حالات میں صبر و استقامت کے سوا چارۂ کار ہی کیا ہے؟ اس طرح عبادت میں بھی صبر کی ضرورت 'گناہوں سے بچنے میں بھی صبر کی ضرورت' غرض ان مختلف النوع سازشوں کے خلاف صبر' نصرت خداوندی میں تاخیر پر صبر' طویل تر جدوجہد پر صبر' باطل کی قوت پر صبر' دین کے حامیوں کی قلت پر صبر' بغض و عناد کے بوجھ پر اور غرض پر حق کی تلخی پر صبر۔

جب صبر طویل ہو جاتا ہے اور مشقت بڑھ جاتی ہے تو قوت صبر کمزور پڑ جاتی ہے۔ اور بعض اوقات یوں بھی ہوتا ہے کہ اگر بیرونی امداد میسر نہ ہو تو پیمانہ صبر لبریز ہو جاتا ہے' اس لئے نماز کے ساتھ ساتھ صبر کی تلقین بھی کی جا رہی ہے۔ نماز وہ سرچشمہ ہے جو کبھی خشک نہیں ہوتا۔ یہ وہ زاد راہ ہے جو کبھی ختم نہیں ہوتا۔ یہ منبع تجدید قوت ہے' یہ قوت دل کا سامان ہے۔ اس سے صبر کی بھرپور قوت حاصل ہو جاتی ہے اور صبر کے ساتھ رضامندی و خندہ پیشانی اور یقین محکم پیدا ہوتا ہے۔

انسان فانی ہے' ضعیف ہے اور محدود قوت کا مالک ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ قوت کبریٰ سے لو لگائے۔ جب اس کا مقابلہ شر کی ظاہری اور باطنی قوتوں سے ہو اور معاملہ اس کی محدود قوت برداشت سے بڑھ جائے تو اسے چاہئے کہ وہ اس "عظیم قوت" سے مدد لے۔ اس راہ میں ایسے مقامات آتے ہیں کہ خواہشات نفس کا زور ہو جاتا ہے' طمع و لالچ کی شدید کشش ہوتی ہے۔ اور راہ حق پر استقامت کی جدوجہد بھاری ہو جاتی ہے' فسق و فجور اور ظلم و عدوان کی قوتیں زور پکڑ لیتی ہیں اور مقابلہ دشوار ہو جاتا ہے' راستہ طویل ہو جاتا ہے' مشقت بڑھ جاتی ہے اور زندگی کے شب و روز تاریک نظر آتے ہیں۔

انسان غور کرتا ہے دیکھتا ہے کہ ابھی تک وہ کسی مقام تک نہیں پہنچ سکا' لیکن موت قریب ہے۔ اس نے تو کچھ نہیں پایا اور زندگی کا سورج قریب الی الغروب ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ شر دھنی ہوئی روئی کی طرح پھولا ہوا ہے اور حق سکڑا ہوا ہے۔ منزل دور ہے' افق پر سے آخری شعاع امید غائب بھی ہے اور راستے پر کوئی نشان راہ نہیں۔ ایسے حالات میں صبر صلوٰۃ ہی سرچشمہ قوت ہوتے ہیں۔

ایسے مقامات اور ایسی منازل ہی پر نماز کی قدر و قیمت معلوم ہوتی ہے۔ انسان فانی اور خدائے باقی کے درمیان واحد براہ راست رابطہ نماز سے قائم ہوتا ہے۔ یہ وہ مقام التقا ہے جس پر ایک تنہا قطرہ ابدی سرچشمہ سے آملتا ہے۔ یہ اللہ کے ان خزانوں کی کنجی ہے جو مستغنی کر دیتے ہیں' جھولی بھر دیتے ہیں اور رحمتوں کی بارش کر دیتے ہیں۔ یہ ایک جست ہے اس کے ذریعے انسان اس چھوٹی اور محدود دنیا کی حدود کو پھاند کر عظیم تر کائنات کی حدود میں داخل ہو جاتا ہے۔ وہ سخت گرمی اور تپتی ہوئی دھوپ میں' ٹھنڈی چھاؤں ہے' نسیم سحر اور خوشگوار شبنم ہے۔ وہ تھکے مارے دل کے لئے ایک خوشگوار احساس ہے۔

حدیث میں آتا ہے کہ حضور ﷺ جب پریشان ہوتے' سخت حالات سے دوچار ہوتے تو فرماتے! "بلال! ذرا ہمیں اس کے ذریعہ تسکین دو۔" جب بھی آپ ﷺ پریشانیوں کے ہجوم میں ہوتے' نماز کثرت سے پڑھنا شروع کر دیتے۔

اسلامی نظام دراصل عبادت اور بندگی کا نظام ہے۔ اس کی عبادت بھی حکیمانہ ہے اس کی سب سے بڑی حکمت یہ ہے کہ وہ زاد راہ ہے۔ روحانی امداد کا سرچشمہ ہے۔ اور وہ دل کی صفائی ہے۔ جب بھی انسان مصیبت میں مبتلا ہو' دل تنگ ہو' یہ عبادت کشادگی کا ذریعہ بن جاتی ہے اور انسان آرام' خندہ پیشانی اور خوشگواری سے اس مصیبت کو انگیز کرتا ہے۔

جب اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد ﷺ کو اس عظیم شعار اور بھاری منصب کے لئے منتخب کیا تو آپ کو حکم دیا: يَاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ۝ قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝ نِّصْفَهٗٓ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا ۝ اَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا ۝ اِنَّا سَنُلْقِيْ عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيْلًا

"اے اوڑھ لپیٹ کر سونے والے' رات کو نماز میں کھڑے رہا کرو' مگر کم' آدھی رات' یا اس سے کچھ کم کر لو' یا اس سے کچھ زیادہ بڑھا لو' اور قرآن کو خوب ٹھہر ٹھہر کر پڑھو۔ ہم تم پر ایک بھاری کلام نازل کرنے والے ہیں۔" (مزمل ۱:۵)

یہ رات کا قیام' یہ دن کے رکوع و سجود کیا تھے؟ یہ بھاری کلام' اور اس عظیم ذمہ داری کے لئے تیاری اور تربیت تھی' جس کی راہ مصائب و شدائد سے پر تھی۔ یہ وہ عبادت تھی جس سے سکون کے سوتے پھوٹ پڑے ہیں۔ باہمی ربط مضبوط ہو جاتا ہے' کام آسان ہو جاتا ہے' آنکھیں روشن ہو جاتی ہیں اور قلب مومن پر تسلی و تشفی اور آرام و اطمینان کی بارش شروع ہو جاتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جب مسلمان ان مصائب و شدائد کی دہلیز تک جا پہنچتے ہیں تو اللہ تعالیٰ انہیں صبر و صلوٰۃ کی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ اور اس کا نتیجہ کیا ہو گا فرماتے ہیں اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔"

اللہ ان کے ساتھ ہے' ان کی مدد کرتا ہے' انہیں قوت اور ثابت قدمی عطا کرتا ہے' ان کے ساتھ انس و محبت رکھتا ہے۔ اس کٹھن سفر میں وہ انہیں اکیلے نہیں چھوڑتا۔ وہ انہیں اور ان کی محدود طاقت اور قوت کو چھوڑ کر ایک طرف نہیں ہو جاتا۔ جب بھی زاد راہ ختم ہو اس کی جانب سے رسد آ جاتی ہے۔ جب بھی وہ تھک کر چور چور ہو جائیں وہ انہیں از سرنو قوت عطا کرتا ہے۔ وہ اس آیت کا آغاز "اے ایمان والو" کی پیاری آواز سے کرتا ہے اور اس کا اختتام ان حوصلہ افزا الفاظ پر کرتا ہے۔ "بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔"

صبر و تحمل کے بارے میں بے شمار احادیث وارد ہیں۔ یہاں سیاق قرآنی کی مناسبت سے اور اس ذمہ داری کو سنبھالنے کے لئے امت مسلمہ کو تیار کرنے کی خاطر جس کے لئے اس امت کو برپا کیا گیا ہے ان میں سے چند احادیث کا ذکر مناسب ہے:

"حضرت خباب رضی اللہ عنہ' ابن الارت روایت بیان کرتے ہیں!" ہم نے حضور ﷺ سے شکایت کی۔ آپ ﷺ اس وقت خانہ کعبہ کی دیوار سے ٹیک لگائے ہوئے تھے۔ ہم نے کہا: "حضور ﷺ آپ ہمارے لئے نصرت طلب نہیں فرماتے؟ ہمارے لئے دعا نہیں فرماتے؟ آپ ﷺ نے فرمایا تم میں سے پہلے ایسا ہوتا تھا کہ ایک شخص کو پکڑا جاتا' اس کے لئے زمین میں گڑھا کھودا جاتا اور اسے اس میں رکھ دیا جاتا' پھر آرا لایا جاتا اور اس کے سر پر رکھ کر اسے دو ٹکڑے کر دیا جاتا۔ اور لوہے کی کنگھیوں سے نوچ کر اس کی ہڈیوں سے گوشت الگ کر دیا جاتا لیکن باوجود ان مشکلات کے کوئی طاقت اسے اپنے دین سے نہ روک سکتی۔ اور خدا کی قسم اللہ اس کام کو ضرور پورا کرے گا۔ یہاں تک کہ ایک سوار صنعا سے حضرت موت تک سفر کرے گا' لیکن اسے اللہ کے سوا کسی کا ڈر نہ ہو گا۔ بھیڑیا بھیڑوں کی رکھوالی کرے گا لیکن افسوس کہ تم جلد بازی کرتے ہو۔" (لے حاشیہ اگلے صفحہ پر)

ابن مسعود ﷺ فرماتے ہیں ایک بار حضور ﷺ کسی نبی کی کہانی بیان کرتے تھے گویا کہ میں اب بھی انہیں دیکھ رہا ہوں' اس کی قوم نے انہیں مارا اور لہولہان کر دیا۔ وہ اپنے چہرے سے خون صاف کر رہے تھے اور فرمار ہے تھے! "اللہ میری قوم کو معاف کر دے۔ یہ لوگ جانتے نہیں۔" (۲)

یحییٰ ابن وثاب نے حضور ﷺ کے ایک بوڑھے ساتھی سے روایت کی ہے۔ آپ نے فرمایا وہ مسلمان جو لوگوں میں رہے اور ان کی اذیتوں پر صبر کرے اس مسلمان سے بہتر ہے جو لوگوں سے الگ رہے اور ان کی اذیتوں پر صبر نہ کرے۔ (۳)

اور اب' تحریک اسلامی مدینہ طیبہ میں ہے۔ کرۂ ارض پر' اسلامی نظام کے قیام کے لئے' وہ آگے بڑھ رہی ہے۔ کیوں نہ بڑھے! یہ روز ازل سے اس کا مقسوم و مقدر تھا۔ اس نے حق کا علم اٹھالیا ہے اور اس علم کو لے کر ایک طویل و شوار گزار سفر پر روانہ ہو رہی ہے۔ قرآن مجید روحانی طور پر اسے تیار کر رہا ہے اس عظیم تحریک جہاد کے دوران کھینچاتانی ہوگی' مصائب حائل ہوں گے اور ان مجاہدین کو اپنی جانوں اور مالوں کی قربانی دینی ہوگی' للذا قرآن مجید یہاں انہیں ایک صحیح نقطہ نظر اور ایک درست نقطہ نظریۂ حیات عطا کرتا ہے۔ قرآن تحریک اسلامی کو ایک ایسا معیار' ایسی کسوٹی ایک ایسی میزان عطا کرتا ہے جس پر وہ اس طویل اور کٹھن سفر میں اپنے تمام معاملات اور اپنی تمام اقدار کو پرکھ سکیں۔

وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتٌ ۚ بَلْ أَحْيَاءٌ وَلَٰكِنْ لَا تَشْعُرُونَ ﴿١٥٤﴾

"اور جو اللہ کی راہ میں مارے جائیں' انہیں مردہ نہ کہو' ایسے لوگ تو حقیقت میں زندہ ہیں' مگر تمہیں ان کی زندگی کا شعور نہیں ہوتا"

معرکہ حق و باطل میں کچھ لوگ کام آئیں گے' راہ حق میں جان دیں گے۔ کچھ عزیز و محبوب مارے جائیں گے' کچھ شرفاء اور دین دار بھی شہید ہوں گے' تو جو لوگ اللہ کی راہ میں نکلتے ہیں اور جو لوگ معرکہ خیر و شر میں اپنی جان کا نذرانہ پیش کرتے ہیں' وہ بالعموم پاک نیت اور صاف دل اور صیقل شدہ روح کے مالک ہوتے ہیں۔ ایسے لوگ اگر اللہ کی راہ میں مارے جائیں تو وہ مردہ نہیں ہیں۔ درحقیقت وہ زندہ ہیں۔ یہ جائز نہیں کہ انہیں مردہ کہو' نہ تو اپنے احساس اور شعور میں انہیں مردہ سمجھو اور نہ ہی زبان سے انہیں مردہ پکارو۔ وہ تو زندہ ہیں اور اللہ اس پر گواہ ہے۔ وہ زندہ ہیں یقیناً زندہ!

چشم ظاہر بیں' دیکھتی ہے کہ بظاہر وہ مر چکے ہیں۔ کیا یہ سطحی نظر موت و حیات کی حقیقت کا فیصلہ کر سکتی ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ زندگی عمل' ارتقاء اور تسلسل کا نام ہے۔ موت بے کاری' جمود اور انقطاع سے عبارت ہے۔ جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے جاتے ہیں ان کا عمل جاری رہتا ہے' ان کی شہادت معاشرے پر اثر انداز ہوتی رہتی ہے۔ ان کا خون اس نظریۂ حیات کو پہنچتا ہے اور اس سے نظریۂ حیات نشوونما پاتا ہے۔ دوسرے افراد اس شہادت سے متاثر ہوتے رہتے ہیں اور یہ تاثر لگاتار قائم رہتا ہے۔ شہادت کے بعد بھی شہداء فعال اور موثر ہوتے ہیں۔ ان کا خون پورے معاشرے کی زندگی میں ایک رنگ پیدا کرتا رہتا ہے۔ اور یہ تسلسل تاقیامت رہتا ہے۔ یہ ہے زندگی' بلکہ حیات جاوداں۔ اس اعتبار سے تو لوگوں کی اس دنیا میں بھی وہ زندہ ہیں۔

(۱) بخاری' ابوداؤد' نسائی (۲) بخاری اور مسلم (۳) ترمذی

لیکن وہ اپنے رب کے ہاں بھی زندہ ہیں اور وہاں بھی اس طرح زندہ ہیں جیسے یہاں زندہ ہیں۔ رب کے ہاں ان کی زندگی کی کیا کیفیت ہے؟ اسی طرح ہے جیسے یہاں ہے یا یہ کہ ہمیں اس کی کیفیت کا پورا شعور نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں بَلْ اَحْيَآءٌ وَّ لٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ درحقیقت وہ زندہ ہیں مگر تمہیں ان کی زندگی کا شعور نہیں۔" ہمارے علم کا دائرہ محدود ہے۔ اور یہ ایسی زندگی ہے جسے ہم نہیں سمجھ سکتے۔ لیکن بہرحال وہ ہیں زندہ!

وہ زندہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عام مردوں کی طرح انہیں غسل نہیں دیا جاتا۔ انہیں ان کے انہی کپڑوں میں دفن کیا جاتا ہے جن میں وہ شہادت پاتے ہیں۔ غسل سے غرض و غایت یہ ہوتی ہے کہ مردے کا جسم پاک ہو جائے لیکن شہداء پہلے سے پاک ہوتے ہیں۔ اس لئے کہ ان کے بدن میں روح ہوتی ہے۔ دنیا میں جو کپڑے انہوں نے پہنے ہوئے تھے قبر میں بھی وہی پہنیں گے کیونکہ بہرحال وہ زندہ ہیں۔

وہ زندہ ہیں۔ ان کے خاندان میں اس قتل پر ماتم نہیں ہے۔ ان کے یاروں دوستوں پر یہ جدائی گراں نہیں ہے۔ وہ اس طرح زندہ ہیں کہ اپنے خاندان اور عزیز و اقارب کے امور حیات میں شریک ہیں۔ وہ زندہ ہیں۔ اسی لئے تو پیچھے رہنے والوں پر ان کی جدائی گراں نہیں ہوتی۔ یہ عظیم واقعہ، یہ عظیم قربانی نہ انہیں خائف کرتی ہے، نہ ان کے لئے بوجھ بنتی ہے۔ وہ زندہ ہیں تو پھر؟ وہ اپنے رب کے ہاں باعزت طور پر رہ رہے ہیں۔ ان کو بلند ترین اعزاز دیا جاتا ہے اور ان کی اس قربانی کا پورا پورا بدلہ چکا دیا جاتا ہے، بلکہ فضل عظیم اس پر مزید ہوتا ہے۔

صحیح مسلم میں روایت ہے "شہداء کی روحیں سبز پرندوں کی شکل میں، جنت میں جہاں چاہیں اڑتی پھرتی ہیں، پھر وہ عرش کے نیچے معلق قندیلوں میں آکر بسیرا کرتی ہیں۔" اس کی اطلاع تو رب ذوالجلال کو ہوتی ہی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں "تم کیا چاہتے ہو؟ وہ کہتے ہیں! ہمارے رب ہمیں اور کیا چاہئے۔ آپ نے ہمیں وہ کچھ دیا ہے جو آپ نے اپنی مخلوق میں سے کسی کو نہیں دیا؟ اللہ تعالیٰ پھر وہی سوال فرماتے ہیں۔ جب انہیں علم ہو جاتا ہے کہ جب تک وہ کچھ مانگیں گے نہیں جان نہ چھوٹے گی۔ تب وہ کہتے ہیں! ہم چاہتے ہیں کہ آپ ہمیں دوبارہ دنیا میں لوٹا دیں، ہم آپ کی راہ میں لڑیں، ایک بار پھر مارے جائیں۔ اس لئے کہ شہادت کا اجر تو وہ خود دیکھ ہی رہے ہیں۔ اللہ جل شانہٗ فرماتے ہیں! "میں نے لکھ دیا ہے کہ شہداء پھر دنیا میں نہ لوٹائے جائیں۔"

حضرت انس ؓ فرماتے ہیں "حضور ﷺ نے فرمایا! "کوئی شخص ایسا نہیں جو ایک بار جنت میں داخل ہو جائے اور پھر وہاں سے نکلنے کی تمنا کرے۔ اگرچہ اسے تمام دنیا بخش دی جائے۔ ہاں صرف شہید اس بات کی تمنا کرتا ہے کہ وہ دنیا کو لوٹایا جائے اور ایک مرتبہ پھر اللہ کی راہ میں قتل ہو، کیونکہ اسے نظر آتا ہے کہ شہید کی کیا قدر ہے۔" (مسلم، بخاری)

یہ شہداء کون لوگ ہیں؟ یہ وہ لوگ ہیں، جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں لڑیں۔ صرف اللہ کی راہ میں۔ اس میں کوئی دوسرا نعرہ، کوئی دوسرا مقصد اور کوئی دوسرا نظریہ شریک نہ ہو، صرف اس سچائی کے لئے لڑ رہے ہوں، جسے اللہ نے نازل فرمایا۔ صرف اس نظام زندگی کے لئے جو اس نے وضع فرمایا۔ صرف اس دین کی راہ میں جسے اللہ نے واجب کر دیا ہے۔ صرف اس کی راہ میں۔ کسی اور راہ میں نہیں، کسی اور جھنڈے تلے نہیں، نہ کسی اور شعار اور کسی مقصد کی شراکت میں۔ قرآن و سنت نے اس خلوص نیت پر بہت زور دیا ہے، یہاں تک کہ مجاہد کے نفس میں کوئی شبہ نہ رہے، غیر اللہ کا کوئی شائبہ نہ رہے۔ وہ صرف اللہ ہی کا ہو۔

حضرت ابو موسیٰ سے روایت ہے، فرماتے ہیں! رسول اللہ ﷺ سے، ایسے شخص کے بارے میں پوچھا گیا، جو نمائش شجاعت کے لئے یا اظہار حمیت کے لئے یا ریا کے لئے لڑتا ہے آیا ان میں سے کون فی سبیل اللہ ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا! فی سبیل اللہ صرف وہ ہے جو محض اس لئے لڑے کہ اللہ کا کلمہ بلند ہو۔" (مالک، امام بخاری، امام مسلم)

حضرت ابو ہریرہ ﷺ سے روایت ہے' ایک شخص نے کہا: یا رسول اللہ! ایک شخص جہاد فی سبیل اللہ کا ارادہ کرتا ہے' لیکن اس کے ساتھ اس کی دنیاوی غرض بھی وابستہ ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا! "اس کے لئے کوئی اجر نہیں ہے۔" اس شخص نے تین مرتبہ یہ سوال دہرایا۔ اور ہر مرتبہ حضور ﷺ نے فرمایا! "اس کے لئے کوئی اجر نہیں ہے۔" (ابوداؤد)

حضرت ابو ہریرہ ﷺ سے روایت ہے' فرماتے ہیں حضور ﷺ نے فرمایا! جو شخص اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کے لئے نکلتا ہے اور اس جہاد کے لئے وہ صرف اس لئے نکلتا ہے کہ وہ اللہ پر ایمان لایا ہے' رسولوں کی تصدیق کی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ایسے شخص کو ضمانت دی ہے کہ وہ اسے جنت میں داخل کریں گے یا وہ جس مسکن سے جہاد کے لئے نکلتا ہے اسے وہاں تک واپس کر دے گا اور وہ اپنے ساتھ اجر و ثواب اور مال غنیمت کا ایک حظ وافر لے جائے گا۔ خدا کی قسم جس کے ہاتھ میں محمد کی جان ہے۔ اللہ کی راہ میں اسے جو زخم آئے' قیامت کے دن یہ مجاہد اسی زخمی حالت میں اٹھایا جائے گا۔ زخم کا رنگ خون کے رنگ جیسا ہو گا اور اس کی بو' مشک کی طرح ہو گی۔ اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں محمد کی جان ہے۔ اگر مسلمانوں کے لئے یہ بات مشقت نہ بنتی تو میں کبھی اس دستے سے پیچھے نہ رہتا جو اللہ کی راہ میں لڑائی کی لئے نکلتا ہے۔ لیکن نہ میرے پاس اس قدر گنجائش ہوتی ہے کہ میں تمام لوگوں کے لئے سواری کا بندوبست کروں اور نہ ان میں طاقت ہوتی ہے کہ وہ میرے پیچھے آسکیں۔ اور یہ بات ان کے لئے قابل برداشت نہ ہو کہ میں چلا جاؤں اور وہ پیچھے رہیں۔ اس ذات کی قسم' جس کے ہاتھ میں میری جان ہے۔ میری یہ خواہش ہے کہ میں راہ خدا میں جنگ کروں اور مارا جاؤں۔ پھر جنگ کروں اور مارا جاؤں۔ پھر جنگ کروں اور مارا جاؤں۔ (مالک' بخاری' مسلم)

یہ ہیں شہداء وہ لوگ جو اللہ کی راہ میں جہاد کے لئے نکلتے ہیں۔ لیکن سوائے اس کے کہ وہ اللہ پر ایمان لائے ہوئے ہیں' سوائے اس کے کہ وہ تمام رسولوں کی تصدیق کرتے ہیں اور سوائے' اس کے کہ وہ اس ایمان کے نتیجے میں اللہ کی راہ میں جہاد کرنا چاہتے ہیں' ان کے دل میں کوئی اور داعیہ نہ ہو۔

ایک موقعہ پر حضور ﷺ نے ایک فارسی مجاہد کو اس بات سے روکا کہ وہ جہاد کے موقعہ پر اپنی فارسیت کا ذکر کرے یا اپنی قومیت پر کسی قسم کا فخر کرے۔ حضرت عبدالرحمن ﷺ ابن ابو عقبہ سے روایت ہے' وہ اپنے باپ سے روایت فرماتے ہیں (یہ اہل فارس کے آزاد کردہ غلام تھے) فرماتے ہیں میں جنگ احد میں حضور ﷺ کے ساتھ شریک ہوا۔ میں نے مشرکین کے ایک آدمی پر ضرب لگائی اور کہا: یہ لو' اور میں ایک فارسی الاصل غلام ہوں۔" اس پر حضور ﷺ میری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا! "تم نے یہ کیوں نہ کہا! اور میں انصاری غلام ہوں میں ان کی بہن کا بیٹا ہوں اور ان کا آزاد کردہ غلام ہوں۔" (ابوداؤد)

حضور ﷺ نے اس بات کو پسند نہ فرمایا کہ وہ آپ کی نصرت کی صفت کے علاوہ کسی اور صفت پر فخر کرے' یا وہ اس دین کی حمایت و نصرت کے علاوہ کسی اور جھنڈے یا کسی اور نعرے کے لئے جنگ کرے۔

یہ ہے اسلامی جہاد اور صرف اس جہاد کے نتیجے میں انسان مرتبہ شہادت پر فائز ہوتا ہے۔ اور اسے وہ زندگی نصیب ہوتی ہے جس پر شہداء فائز ہوتے ہیں۔

اب اس سبق میں تحریک اسلامی کو نئے واقعات اور نئی صورت حال کے مقابلے کے لئے تیار کیا جاتا ہے۔ آنے والے واقعات کے سلسلے میں اسے ایک صحیح نقطہ نظر دیا جاتا ہے:

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنفُسِ

وَ الثَّمَرٰتِ ؕ وَ بَشِّرِ الصّٰبِرِیْنَ ﴿۱۵۵﴾ الَّذِیْنَ اِذَاۤ اَصَابَتْهُمْ مُّصِیْبَةٌ ۙ قَالُوْۤا اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّاۤ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ ﴿۱۵۶﴾

اور ہم ضرور تمہیں خوف و خطر' فاقہ کشی' جان و مال کے نقصانات اور آمدنیوں کے گھاٹے میں مبتلا کر کے تمہاری آزمائش کریں گے۔ ان حالات میں جو لوگ صبر کریں اور جب کوئی مصیبت پڑے تو کہیں کہ "ہم اللہ ہی کے ہیں اور اللہ ہی کی طرف ہمیں پلٹ کر جانا ہے۔"

تربیت کے لئے انسان کو مصائب کی بھٹی سے گزارا جاتا ہے۔ خوف و خطر میں مبتلا کر کے' جان و مال کا نقصان دے کر' مصائب اور آمدنیوں کے گھاٹے میں مبتلا کر کے' اللہ طالب صادق کے عزم صمیم کا امتحان کرتے ہیں۔ یہ آزمائشیں اس لئے ضروری ہیں کہ مؤمنین اسلامی نظریۂ حیات کی ذمہ داریاں اچھی طرح پوری کرنے کے قابل ہو سکیں اور اسلامی نظریۂ حیات کی راہ میں' جتنا جتنا مصائب سے دوچار ہوں' اسی قدر یہ نظریۂ حیات انہیں عزیز ہوتا چلا جائے۔

وہ نظریات جن کے لئے ان مجاہدین نے کوئی تکلیف نہ اٹھائی ہو نہ کوئی مصیبت برداشت کی ہو' پائیدار نہیں ہوتے۔ ایسے لوگ مصیبت کے پہلے مرحلے ہی میں انہیں الوداع کہہ دیتے ہیں۔ آزمائشیں دراصل ایک نفسیاتی امتحان ہوتی ہیں' جو ایک کارکن اپنے نظریۂ حیات کے لئے پاس کرتا ہے اور اس کی وجہ سے دوسرے لوگوں سے پہلے یہ نظریہ اس کارکن کے لئے عزیز تر از جان ہو جاتا ہے۔ کارکن نظریہ کی خاطر جب دکھ پائیں گے اور مال خرچ کریں گے تو وہ پھر اس کی قدر کریں گے اور اس کی حفاظت بھی کریں گے۔

دوسرے لوگ بھی اس نظریے کی قدر تب ہی کریں گے جب وہ دیکھیں گے کہ اس نظریے کے ماننے والے ان پر جان دیتے ہیں اور اس کی وجہ سے آنے والی تمام مصیبتوں کو بخوشی برداشت کرتے ہیں۔ اپنے نظریات کے لئے مصیبت اٹھانے والوں کو دیکھ کر عام تماشائی بھی یہ کہیں گے "وہ نظریۂ حیات جس کے لئے یہ لوگ لڑتے ہیں' کوئی بڑی ہی قیمتی چیز ہے' اگر وہ قیمتی نہ ہوتی تو یہ لوگ اس قدر عظیم قربانیاں ہرگز نہ دیتے اور ان عظیم مصائب و شدائد پر صبر نہ کرتے۔

ایسے حالات میں اس نظریۂ حیات کے مخالفین بھی لاجواب ہو جاتے ہیں اور اس کے بارے میں تحقیق شروع کر دیتے' قدر کرنے لگتے ہیں اور خود بخود اس کی طرف کھچے چلے آتے ہیں۔ یہ وہ مقام ہے جس تک پہنچ جانے کے بعد اللہ کی امداد اور نصرت آ پہنچتی ہے اور لوگ فوج در فوج اللہ کے دین میں داخل ہوتے ہیں۔

آزمائش بہت ضروری ہے اس سے نظریاتی لوگوں کی قوت میں اضافہ ہوتا ہے ان کی کمر مضبوط ہوتی ہے۔ مصائب و شدائد سے ان کی خفیہ قوتیں جاگ اٹھتی ہیں۔ ذخیرہ شدہ طاقتوں کے لئے چشمے پھوٹ پڑتے ہیں۔ دل کے دریچے کھل جاتے ہیں اور دل میں ایسے چشمے ابل پڑتے ہیں جن کے بارے میں' ان مصائب و شدائد سے پہلے مومن کو گمان بھی نہیں ہوتا۔

اسلامی اقدار اور اسلامی تصورات اس وقت تک پختہ اور سیدھے نہیں ہو سکتے جب تک انہیں شدائد و مصائب کی بھٹی سے نہ گزارا جائے۔ یہ مصائب کا نتیجہ ہی ہوتا ہے کہ کارکنوں کی آنکھیں روشن ہو جاتی ہیں اور دلوں سے میل دور ہو جاتا ہے۔

سب سے اہم' بلکہ سب سے بنیادی بات یہ ہے کہ مصائب و شدائد کی حالت میں تمام دنیاوی رابطے کٹ جاتے ہیں۔ مختلف الاقسام اوہام اور تمنائیں غائب ہو جاتی ہیں' دل اللہ کے لئے خالی ہو جاتا ہے بلکہ صرف اللہ ہی کا سہارا باقی رہ جاتا ہے۔ یہی وہ مقام ہوتا ہے' جہاں تمام پردے ہٹ جاتے ہیں' بصیرت کے دروازے کھل جاتے ہیں' مطلع دور تک صاف و شفاف ہوتا ہے' اللہ کے سوا کوئی شے نظر نہیں آتی' اللہ

کی قوت کے سوا کوئی قوت نظروں میں نہیں جچتی' اللہ کے سوا کسی کا کوئی اختیار نظر نہیں آتا' اللہ ہی کی پناہ ہوتی ہے۔ اس کے سوا کسی کی پناہ نہیں ہوتی۔ اس مقام پر پہنچ کر انسانی روح اس حقیقت کے ساتھ یکجا ہو جاتی ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں قرآن کریم کی یہ آیت نفس انسانی کا ایک حصہ بن جاتی ہے۔

وَ بَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۵۵﴾ الَّذِيْنَ إِذَآ أَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۙ قَالُوْٓا إِنَّا لِلّٰهِ وَ إِنَّآ إِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ "اور خوش خبری سنائیں ان صبر کرنے والوں کو' جن پر جب کبھی مصیبت آتی ہے تو وہ کہتے ہیں! ہم تو اللہ کے ہیں اور ہمیں اسی کی طرف لوٹنا ہے۔" بے شک ہم اللہ کے لئے ہیں۔ سب کے سب اللہ کے لئے ہیں۔ ہمارے جسم کے اندر جو طاقتیں ہیں' بلکہ ہمارا تمام وجود اور ہماری پوری شخصیت اللہ اور صرف اللہ کے لئے ہے۔ ہم کو اللہ ہی کی طرف لوٹنا ہے۔ تمام باتوں کا مرجع وہی ہے۔ سر تسلیم خم ہے۔ ہر معاملے میں سر تسلیم خم ہے!

گویا ہم صحیح تصور اور صحیح عقیدے کے ساتھ' کائنات کی واحد سچائی اور حقیقت یعنی رب ذوالجلال کے سامنے کھڑے ہیں اور دست بدعا ہیں۔

یہ ہیں وہ صابرین جنہیں جلیل القدر رسول' انعام و اکرام کی خوش خبری دیتا ہے۔ اس مقام و مرتبے کا اعلان خود رب جلیل کرتا ہے۔

أُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَ رَحْمَةٌ ۟ وَ أُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ﴿۱۵۷﴾

ان پر ان کے رب کی طرف سے بڑی عنایات ہوں گی' اس کی رحمت ان پر سایہ کرے گی اور ایسے ہی لوگ راست رو ہیں۔"

اللہ کی طرف سے عنایات ہوں گی۔ یہاں صابرین کے لئے لفظ صلوات استعمال کر کے گویا صابرین کو ان صلوات (عنایات) میں شریک کر دیا گیا جو اللہ اور اس کے فرشتے نبیوں پر بھیجتے رہتے ہیں۔ کیا ہی بلند مقام ہے۔ کیا فیضان رحمت ہے کہ خود اللہ گواہ ہے کہ مصائب میں صبر کرنے والے ہی دراصل صحیح معرفت رکھتے ہیں اور صحیح راہ پر گامزن ہیں۔ غرض ہدایات عظیم اور محیر العقول ہے۔

تحریک اسلامی کی تیاری اور تربیت کے اس سبق کے آخر تک ہم پہنچ گئے۔ ذرا رک کر جائزہ لیجئے! مصائب و شدائد' قتل و شہادت' جان و مال کا نقصان' بھوک و افلاس اور خوف و خطر اور دوسری مشکلات کے لئے یہ عظیم تیاری اور تربیت' پر آشوب اور پر خطر اور عظیم المشقت طویل ترین معرکہ حق و باطل کے لئے یہ عظیم تیاری۔ یہ سب امور گہرے غور و فکر کے مستحق ہیں۔

ذرا دیکھئے! اللہ ان تمام مصائب اور مشکلات کو ترازو کے ایک پلڑے میں رکھتے ہیں' جبکہ دوسری طرف صرف ایک بات ہے کہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عنایات' اس کی جانب سے رحمت کے مستحق ہیں اور یہ اعلان کہ دنیا میں یہی لوگ ہدایت پر ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس موقعہ پر مؤمنین صابرین کے ساتھ کسی ظفرمندی اور کامرانی کا وعدہ نہیں فرماتے' کسی خصوصی امداد کا بھی یہاں کوئی اعلان نہیں کیا جاتا۔ نہ یہاں مال غنیمت کا لالچ دیا جاتا ہے۔ کچھ بھی نہیں! صرف اللہ کی رحمت و عنایات کا وعدہ ہوتا ہے اور یہ شہادت دی جاتی ہے کہ وہ یقیناً سچائی اور حق پر ہیں۔۔۔ اللہ تعالیٰ صابرین کو ایک ایسے کام کے لئے تیار کر رہا تھا جو ان کی ذات و حیات سے زیادہ قیمتی ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ اس جماعت کو ہر اس خواہش و رغبت سے پاک کرنا چاہتا ہے' جس کا تعلق اس دنیا سے ہو۔ یہاں تک کہ ان کو ہدایت کی گئی کہ جس نصب العین کے لئے وہ کام کر رہے ہیں' جس نظریہ حیات کے لئے وہ جدوجہد کر رہے ہیں اور جان تک دینے کو تیار ہیں' اس کے غلبہ کی خواہش تک دلوں سے نکال دیں۔ اور صرف رضائے الٰہی اور اطاعت حکم خداوندی کو اپنا منشور قرار دیں۔ وہ صرف حکم الٰہی کے پابند ہوں۔ وہ آگے بڑھتے چلے جائیں اور ان کے پیش نظر اللہ کی رضامندی' اللہ کی رحمت کے حصول اور اس اطمینان کے سوا کچھ نہ ہو' کہ وہ حق

کے لئے نکلے ہوئے ہیں اور صحیح رستے پر ہیں۔ یہ ہے صحیح نصب العین۔ یہ ہے صحیح غرض و غایت اور یہ اور صرف یہ ہے وہ ثمر شیریں جس کے لئے وہ والہانہ دوڑ رہے ہیں۔ رہی یہ امید یہ کہ اس جدوجہد کے نتیجے میں انہیں فتح و نصرت حاصل ہوگی۔ انہیں کرۂ ارض پر غلبہ و اقتدار نصیب ہوگا تو یہ تصرف و غلبہ یہ اقتدار و اختیار ان کے لئے تو نہیں ہے' یہ تو اس دعوت اسلامی کا غلبہ ہوگا جس کے وہ حامل ہیں۔

رہے اہل ایمان مجاہدین' تو انہیں ایک عظیم اجر دے دیا گیا' اللہ کی عنایات اور اللہ کی رحمت ہوگی اور انہیں یہ سرٹیفکیٹ دے دیا گیا کہ وہی حق پر ہیں۔ اور یہ اجر انہیں کس کے بدلے دیا گیا؟ جان و مال کی قربانی پر اور آمدنیوں پر دیا گیا ہے۔ یہ اللہ کی راہ میں قتل و شہادت پر دیا گیا ہے۔ لیکن پھر بھی اللہ کے فضل و عنایت کا پلڑہ بھاری ہے۔ یہ عنایت تمام عنایات سے بھاری ہے۔ فتح' نصرت اور تمکن فی الارض تمام امور سے یہ عنایت بھاری ہے۔ نیز یہ اس مسرت سے بھی زیادہ خوش آئند ہے جو فتح و نصرت اور اسلامی انقلاب کے بعد حسرت دل پوری ہونے سے حاصل ہوتی ہے۔

یہ ہے وہ نظم تربیت جس سے اللہ تعالیٰ نے اسلامی محاذ کو گزارا۔ بنی نوع انسان میں سے' جو شخص اپنے نفس' اپنی دعوت اور اپنے دین کو پاک و صاف کرنا چاہتا ہے' اسے چاہئے کہ وہ تربیت کے اس انداز کو اپنائے۔

☆ ☆ ☆ ☆

درس ۱۰ ایک نظر میں

اس سبق میں بعض بنیادی اصولوں کی تصحیح مطلوب ہے' جن پر اسلامی تصور حیات کی عمارت قائم ہے۔ اسلام کے ان بنیادی اصولوں کے سلسلے میں مدینہ طیبہ کے یہودی تلبیس کرتے تھے اور حق کو باطل سے ملاتے تھے' جان بوجھ کر حق چھپاتے تھے' مسلمانوں کے دلوں میں اضطراب اور ذہنوں میں پراگندگی پیدا کرتے تھے۔ اس لئے ضروری تھا ان اصولوں کے بارے میں واضح احکام دے دیئے جائیں۔ البتہ انداز بیان عمومی ہے اور یہود اور دوسرے تمام مخالفین کے برخلاف بات اصولی طور پر کی گئی اور مسلمانوں کو ان خطرات سے آگاہ کیا گیا ہے' جو اس راہ میں' بالعموم انہیں درپیش ہو سکتے ہیں۔

صفا اور مروہ کے درمیان طواف کے مسئلے کو بھی لیا گیا ہے۔ دور جاہلیت میں اس سعی کے ساتھ چونکہ بعض غیر اسلامی اور شرکیہ تصورات وابستہ تھے' اس لئے وضاحت کر دی گئی کہ یہ شعائر اللہ میں سے ہیں لہٰذا سعی جائز ہے۔ تحویل قبلہ سے بھی اس کی مناسبت واضح ہے۔ نیز بیت اللہ کے حج اور دوسرے شعائر کو چونکہ اسلامی نظام نے قائم رکھا' اس لئے بھی یہ مناسب تھا کہ ان امور کے سلسلے میں اسلامی نظام اپنی پالیسی واضح کرے۔

یہودی اللہ کی تعلیمات وہدایات کو چھپاتے تھے۔ یہاں ان کی سخت مذمت کی جاتی ہے۔ البتہ یہ کہا جاتا ہے کہ توبہ کا دروازہ کھلا ہے' صد بار اگر توبہ شکستی باز آ' لیکن اگر وہ اپنی روش پر قائم رہتے ہیں اور اصرار کرتے ہیں تو ان پر لعنت کی بارش ہوگی اور دردناک عذاب ان کا منتظر ہے۔ اللہ کی وحدانیت کا بیان اور اس پر تکوینی دلائل ہیں اور بتایا جاتا ہے کہ ان لوگوں کے لئے شدید وعید ہے جو اللہ کے ساتھ شریک ٹھہراتے ہیں۔ اس سلسلے میں ان تابعین اور متبوعین کے تعلق کا ایک منظر بھی پیش کیا گیا ہے جو قیامت میں اس وقت سامنے آئے گا جب یہ لوگ عذاب الٰہی کو دیکھیں گے تو ایک دوسرے سے بریت کا اظہار کریں گے لیکن بے سود۔

جو لوگ محض دنیاوی اغراض و مناصب کے لئے اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ احکام چھپاتے ہیں' انہیں سخت تنبیہ کی گئی ہے۔ ان سے کہا گیا ہے کہ آخرت میں ذلت' حقارت اور اللہ تعالیٰ کا شدید غضب تمہارے لئے تیار ہے۔

آخر میں نیکی اور بدی کا اسلامی معیار بتایا گیا ہے۔ کہا گیا ہے کہ ایمان اور عمل صالح ہی وہ اصول ہیں' جن سے اسلامی تصور حیات درست ہوتا ہے۔ نیکی سے مراد کوئی ظاہری شکل و صورت نہیں ہے نہ ہی صرف شرق و غرب کی طرف چہرہ کر کے نماز پڑھنا اصول تقویٰ میں سے ہے۔ نیکی تو شعور و عمل اور اس شعور و عمل میں اللہ سے پختہ رابطے کا نام ہے۔ یہ بیان دراصل تحویل قبلہ کے مباحث سے ملحق ہے۔

اس تمام بحث کو بغور پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بات اسی ایک مضمون یعنی معرکہ حق و باطل کے اردگرد گھومتی ہے۔ ذہن انسانی میں حق و باطل کی کشمکش ہے۔ اسلامی اقدار کا تعین ہو رہا ہے اور تصور حیات کی وضاحت ہو رہی ہے اور بیرونی سازشوں اور مکر و فریب اور ذہنی پراگندگی پیدا کرنے والے مخالفین کے اعتراضات اور پروپیگنڈے کا جواب دیا گیا ہے۔

☆☆☆☆

درس ۱۰ تشریح آیات (۱۵۹ تا ۱۷۸)

إِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَائِرِ اللَّهِ ۖ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ أَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ أَنْ يَطَّوَّفَ بِهِمَا ۚ وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَإِنَّ اللَّهَ شَاكِرٌ عَلِيمٌ ﴿۱۵۸﴾

"بے شک صفاو مروہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں۔ لہٰذا جو شخص بیت اللہ کا حج یا عمرہ کرے اس کے لئے کوئی گناہ کی بات نہیں کہ وہ ان دونوں پہاڑیوں کے درمیان سعی کرے اور جو شخص برضا و رغبت کوئی بھلائی کا کام کرے گا' اللہ کو اس کا علم ہے اور وہ اس کی قدر کرنے والا ہے۔"

اس آیت کی شان نزول میں متعدد روایات منقول ہیں۔ اسلام نے مہاجرین و انصار کے سابقون الاولون کے دلوں میں جس قسم کا تصور حیات پیدا کیا تھا اس کی نوعیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے سب سے زیادہ موزوں اور اس وقت کی نفسیاتی منطق کے مطابق کتب حدیث کی وہ روایت ہے جس میں کہا گیا ہے: "بعض مسلمان حج و عمرہ کے موقع پر صفاو مروہ کے درمیان سعی کرنے سے کراہت محسوس کرتے تھے۔ کیونکہ جاہلیت کے زمانہ میں ان پہاڑیوں کے درمیان وہ اس لئے سعی کرتے تھے کہ یہ مقامات دو بتوں' اساف و نائلہ کے استھان تھے۔ اس لئے اسلام آنے کے بعد اب مسلمان اس سعی میں کراہت محسوس کرنے لگے تھے اور اسے زمانہ جاہلیت کا ایک فعل تصور کرنے لگے تھے۔"

امام بخاری رحمتہ اللہ علیہ نے محمد ابن یوسف' سفیان' عاصم بن سلیمان کے سلسلے سے روایت نقل کی ہے۔ سلیمان کہتے ہیں: میں نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے صفاو مروہ کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے فرمایا: "ہم سمجھتے تھے کہ یہ دور جاہلیت کی رسومات ہیں۔ جب اسلام کا ظہور ہوا تو ہم نے صفاو مروہ کے درمیان سعی کرنا ترک کر دی۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کی یہ آیت نازل فرمائی "صفاو مروہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں۔

امام شعبی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اساف بت صفا پر تھا' اور نائلہ مروہ پر اور وہ انہیں بوسہ دیا کرتے تھے۔ اس لئے اسلام کے بعد مسلمانوں نے ان کے درمیان سعی کرنے میں کراہت محسوس کی اور اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

روایات میں اس آیت کے نزول کی تاریخ متعین نہیں ہے' البتہ راجح صورت یہ ہے کہ تحویل قبلہ کے سلسلے میں جو آیات نازل ہوئیں یہ ان کے بعد نازل ہوئی ہے۔ اگرچہ اس دور میں مکہ مکرمہ دارالحرب بن گیا تھا' لیکن اس کے باوجود بعض مسلمان انفرادی طور پر حج اور عمرہ کر سکتے تھے۔ ایسے ہی لوگوں نے صفاو مروہ کے درمیان سعی کو جاہلیت کی ایک رسم سمجھا ہو گا۔ ان کے دلوں میں طویل تعلیم و تربیت کے نتیجے میں ایمانی تصور حیات جاگزیں ہو چکا تھا۔ اور اس کی برکت سے وہ جاہلیت کے ہر فعل اور ہر رسم و رواج کو شک اور کراہیت کی کی نظر سے دیکھتے تھے۔ وہ جاہلیت کے ہر کام کے بارے میں اس قدر حساس ہو گئے تھے کہ جاہلیت کے دور میں کئے جانے والے ہر فعل کو کرتے ہوئے ڈرتے تھے' مبادا کہ اسلام نے اسے ترک کرنے کا حکم دیا ہو۔ مسلمانوں نے مختلف مواقع پر اپنے اس احساس کا بھرپور مظاہرہ کیا۔

اسلام کی دعوت نے ان کے دلوں کو خوب جھنجھوڑ دیا تھا اور یہ دعوت ان کے دلوں کی گہرائیوں تک اتر چکی تھی اور اس دعوت نے

ان کے دلوں میں ایک عظیم نفسیاتی اور شعوری انقلاب برپا کر دیا تھا۔ وہ اپنی ہربات کو کراہیت سے دیکھتے تھے بلکہ وہ ماضی کو ترک کر چکے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ دور جاہلیت ان کی زندگی کا ایک باب تھا جسے وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند کر چکے ہیں۔ ان کی ماضی کا اب ان سے کوئی تعلق ہے نہ ان کا ماضی سے کوئی واسطہ ہے۔ ان کے خیال میں ان کا ماضی ایک قسم کی ناپاکی اور گندگی تھا جسے اب چھونا بھی جائز نہ تھا۔

اس برگزیدہ قوم کی زندگی کے آخری دور کو ذرا غور سے پڑھا جائے' تو اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ ان پاک نفوس پر اس اسلامی نظریۂ حیات کا کیا ہی عجیب اثر ہو گیا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کو پکڑ کر جھنجھوڑا اور ان سے ہر قسم کی آلودگی کو جھاڑ دیا۔ اور ان کے وجود کے ذرات کو جدید طرز پر مرتب کر دیا بعینہ اس طرح جس طرح بجلی کا ایک جھٹکا دینے سے کسی مادے کے اجزاء اپنی سابقہ کیمیاوی شکل بدل دیتے ہیں اور ایک بالکل نئی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔

یہ ہے اسلام یعنی جاہلیت سے پوری طرح باہر نکل آنا' اور جاہلیت کے تمام امور کو پوری طرح حرام اور ناپسندیدہ سمجھنا۔ ہر اس ناپسندیدہ حرکت سے باہر آنا جو جاہلیت میں ہوتی تھی۔ ہر اس شعور کو دل و دماغ سے نکال دینا جو جاہلیت کے دور میں ذہنوں پر حاوی ہوتا تھا۔ یہاں تک کہ مومن کا جام صبوحئے تصور حیات اور اس کے تمام لوازمات کے لئے خالی ہو جائے۔

تحریک اسلامی کی تاریخ شاہد ہے کہ جب مسلمانوں کے دل و دماغ میں یہ شعور اچھی طرح رچ بس گیا اور وہ اچھی طرح پختہ کار ہو گئے' تب اسلام نے دور جاہلیت کے شعائر میں سے 'بعض مناسب شعائر کو باقی رکھنے کا اعلان فرمایا۔ اور اس سے پہلے ان شعائر کا رشتہ دور جاہلیت سے کاٹ دیا اور ان کے اسلام کے نظام میں' اس طرح پیوست کر دیا' جس طرح نگینہ انگشتری میں پیوست ہو جاتا ہے۔ اب ان چیدہ شعائر پر ایک مسلمان اس لئے عمل پیرا نہیں ہوتا تھا کہ دور جاہلیت میں وہ ان پر عمل کرتا تھا' بلکہ وہ انہیں اسلام کا ایک شعار جدید تصور کرتا تھا۔ جس کا اصل اسلام میں ہوتا تھا جس کی جڑیں اسلامی نظام زندگی سے آبیاری حاصل کرتی تھیں۔

اسلام کے ٹھوس اور عمیق نظام تربیت کی ایک مثال یہ ہے کہ قرآن مجید خاص اس مسئلے کے بارے میں اس طرح بات شروع کرتا ہے کہ وہ صفا و مروہ اللہ کے شعائر میں سے ہیں إِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَائِرِ اللَّهِ یقیناً صفا و مروہ اللہ کی نشانیوں میں ہیں۔" گویا بتایا جاتا ہے کہ ان کے درمیان جو شخص بھی سعی کرے گا وہ اللہ کے شعائر میں سے ایک فریضہ ادا کرے گا۔ وہ ان کے درمیان جو سعی کرے گا اس سے غرض اطاعت حکم خداوندی ہے۔ اس سعی اور دور جاہلیت کی سعی کے درمیان اب کوئی تعلق باقی نہیں رہا۔ اب اس کا آساف و نائلہ اور جاہلیت کے دوسرے بتوں سے کوئی ربط و عقیدت نہیں ہے' بلکہ تعلق صرف اللہ اور رسول سے ہے۔

لہٰذا اب اس طواف و سعی میں کوئی حرج نہیں ہے۔ کوئی گناہ نہیں ہے' بات وہ پرانی بات نہیں رہی' نقطۂ نظر وہ پرانا نقطہ نظر نہیں رہا ہے فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ أَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ أَنْ يَطَّوَّفَ بِهِمَا لہٰذا جو شخص بیت اللہ کا حج یا عمرہ کرے' اس کے لئے کوئی گناہ کی بات نہیں ہے کہ وہ ان دونوں پہاڑوں کے درمیان سعی کرے۔"

حج میں عرب جن مناسک پر عمل کیا کرتے تھے ان میں سے اکثر کو اسلام نے علی حالہ برقرار رکھا ہے۔ صرف ان چیزوں کو ترک کروایا جن کی نسبت سے بتوں کی طرف تھی یا جو جاہلیت کے اوہام پر مبنی تھیں اور ان کی کوئی حقیقت نہ تھی۔ جن شعائر کو بحال رکھا گیا ان کا ربط بھی اسلام کے جدید تصور حیات نے قائم کر دیا اور یہ کہا کہ یہ وہ شعائر ہیں جن پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے عمل کیا۔ (تفصیلات آئندہ بیان حج میں ملاحظہ ہوں)

حج اور عمرہ کے مناسک ایک ہی ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ عمرہ میں عرفہ پر وقوف فرض نہیں ہے' نیز حج کے لئے جو میقات (وہ مقامات جن سے آگے بغیر نیت نہیں جا سکتا) مقرر ہیں وہ عمرہ کے لئے نہیں ہیں' لیکن حج اور عمرہ دونوں میں سعی بین الصفاء والمروۃ ضروری ہے۔

اور شعائر اللہ میں سے ہے۔

آیت کا اختتام اس فقرے پر ہوتا ہے کہ جو شخص بھی برضا و رغبت مطلقاً نیکی کا کوئی کام بھی کرے گا وہ اللہ تعالیٰ کو پسند ہے:

وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَإِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ عَلِيْمٌ "اور جو شخص بھی برضا و رغبت کوئی بھلائی کا کام کرے گا' اللہ کو اس کا علم ہے اور وہ اس کی قدر کرنے والا ہے۔"

اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ یہ سعی بھی دراصل بھلائی ہے۔ اس اشارے سے دلی کراہیت دور ہو جاتی ہے' دل ان کی ادائیگی پر آمادہ ہو جاتا ہے' اس امر پر مطمئن ہو جاتا ہے کہ اللہ تو اس سعی کا شمار نیکی میں کرے گا۔

پھر اس نیکی پر جزائے خیر بھی دیتا ہے اور وہ نیتوں کا مالک ہے اور قلب کی ہر شعوری حرکت سے باخبر ہے۔

اب ذرا رکیے! اور اس حکیمانہ انداز بیان پر دوبارہ ایک نگاہ ڈالئے۔ فَإِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ "اللہ قدر کرنے والا ہے۔" مقصد یہ ہے کہ اللہ اس بھلائی سے راضی ہوتا ہے۔ اس کا اجر دیتا ہے' ثواب دیتا ہے۔ لفظ "شاکر" سے صرف ایک خاص مفہوم ہی نہیں نکلتا بلکہ وہ ایک خاص سایہ عاطفت کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے۔ یہ لفظ رضائے کامل کا پرتو ہے۔ گویا ذات باری بندے کے نیک اعمال کی قدر کرتی ہے' تو پھر اب بندے کا فرض کیا ہے کہ وہ بارگاہ خداوند میں شکر بجالائے؟ اس کا فرض ہے کہ وہ اللہ کی مہربانی کے جواب میں مزید شکر ادا کرے۔ اس کی بے حد تعریف کرے' قرآن کے طرز تعبیر کا یہ ایک خاص اسلوب ہے' جو انسانی شعور و احساس کو شبنم کے تازہ قطروں کی طرح تازگی' حسن اور ملائمت عطا کرتا ہے۔

صفا و مروہ کے درمیان سعی کی فرضیت کے بعد اب ان لوگوں کی مذمت ہے جو اللہ کی نازل کردہ تعلیمات و ہدایات کو چھپاتے ہیں۔ یہ وہ یہودی ہیں جن کے بارے میں اس سورت میں طویل بحث' اس سے پہلے ہو چکی ہے۔ یہاں دوبارہ اس بحث کے چھیڑنے سے معلوم ہوتا ہے کہ تحویل قبلہ اور فرضیت حج کے سلسلے میں انہوں نے بحث و تکرار شروع کر رکھی تھی۔ ابھی تک وہ ختم نہیں ہوئی۔

إِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ أَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالْهُدٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا بَيَّنّٰهُ لِلنَّاسِ فِي الْكِتٰبِ ۙ أُولٰٓئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ ﴿۱۵۹﴾ إِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا وَأَصْلَحُوْا وَبَيَّنُوْا فَأُولٰٓئِكَ أَتُوْبُ عَلَيْهِمْ ۚ وَأَنَا التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۶۰﴾ إِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَمَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ أُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِيْنَ ﴿۱۶۱﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ﴿۱۶۲﴾

"جو لوگ ہماری نازل کی ہوئی روشن تعلیمات اور ہدایات کو چھپاتے ہیں' درآں حالیکہ ہم انہیں سب انسانوں کی راہنمائی کے لئے اپنی کتاب میں بیان کر چکے ہیں۔ یقین کرو کہ اللہ بھی ان پر لعنت کرتا ہے اور تمام لعنت کرنے والے بھی ان پر لعنت بھیجتے ہیں' البتہ جو اس روش سے باز آجائیں اور اپنے طرز عمل کی اصلاح کریں اور جو کچھ چھپاتے تھے' اسے بیان کرنے لگیں' ان کو میں معاف کردوں گا اور میں بڑا درگزر کرنے والا اور رحم کرنے والا ہوں۔

جن لوگوں نے کفر کا رویہ اختیار کیا اور کفر کی حالت ہی میں جان دے دی ان پر اللہ اور فرشتوں اور تمام انسانوں کی لعنت ہے۔ اس لعنت زدگی کی حالت میں وہ ہمیشہ رہیں گے' نہ ان کی سزا میں تخفیف ہوگی اور نہ انہیں پھر کوئی دوسری مہلت دی جائے گی۔"

اہل کتاب' خود اپنی کتاب کے ذریعے سے یہ جانتے تھے کہ حضور ﷺ کی رسالت برحق ہے۔ اور یہ بھی جانتے تھے کہ آپ ﷺ جن احکامات کی تبلیغ کرتے ہیں وہ برحق ہیں اور من جانب اللہ ہیں۔ اس کے باوجود وہ ان احکامات کو چھپاتے تھے جو اللہ نے ان کے لئے ان کی کتاب میں نازل کئے تھے۔ بس ان لوگوں اور ہر دور میں ان جیسے لوگوں کا کردار یہ رہا ہے کہ یہ اللہ کی نازل کردہ حق اور سچائی کو چھپاتے ہیں' خواہ اس حق پوشی کی کوئی معقول وجہ بھی نہ ہو۔ ایسے لوگ مختلف ادوار میں مختلف مقامات پر پائے جاتے ہیں' جو حق و صداقت کا علم رکھتے ہیں مگر پھر بھی اظہار حق کے وقت خاموش رہتے ہیں۔ انہیں وہ اقوال و آیات یقین کے ساتھ معلوم ہوتی ہیں جن میں اس سچائی کا فیصلہ ہو چکا ہوتا ہے' اللہ کی کتاب میں سے کئی آیات سے وہ ایک طرف ہو جاتے ہیں' ان کا اظہار نہیں کرتے' ان کے بارے میں خاموشی اختیار کر لیتے ہیں' انہیں چھپا کر اس حقیقت سے پہلوتہی کر جاتے ہیں جس کی وہ آیات حامل ہوتی ہیں۔ وہ ان آیات کو لوگوں کے سمع و احساس سے دور رکھتے ہیں' چاہے کسی وجہ سے بھی وہ ایسا کرتے ہیں۔ یہ ایک ایسی صورت حال ہے جس سے ہم زندگی کے مختلف مراحل میں دوچار ہوتے رہتے ہیں اور حقائق دین میں سے مختلف اور بے شمار حقائق میں یہ صورت حال پیش آتی رہتی ہے۔

"یقین کرو کہ اللہ بھی ایسے لوگوں پر لعنت کرتا ہے اور تمام لعنت کرنے والے بھی ان پر لعنت کرتے ہیں۔ أُولَٰئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللَّهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللَّاعِنُونَ (۱۵۹)

گویا وہ لعنت کے مقام پر کھڑے ہوں گے' اور ان پر ہر طرف سے لعنت کی بارش ہو رہی ہوگی اور اللہ کے بعد ہر لعنت کرنے والا ان پر لعنت برسا رہا ہوگا۔

لعنت کا مفہوم ہے قہر و غضب سے دھتکارنا۔ اللہ کی لعنت یہ ہوگی کہ وہ انہیں اپنی رحمت سے نکال دے گا اور پھر ہر طرف سے لعنت کرنے والے ان کا پیچھا کر رہے ہوں گے۔ یوں وہ درگاہ الٰہی سے بھی راندہ ہوں گے اور مسلمانوں کی طرف سے بھی دھتکارے جائیں گے۔

إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا وَأَصْلَحُوا وَبَيَّنُوا فَأُولَٰئِكَ أَتُوبُ عَلَيْهِمْ ۚ وَأَنَا التَّوَّابُ الرَّحِيمُ "البتہ جو اس روش سے باز آجائیں اور اپنے طرز عمل کی اصلاح کر لیں' اور جو کچھ چھپاتے تھے' اسے بیان کرنے لگیں' ان کو میں معاف کروں گا۔ میں بڑا درگزر کرنے والا اور رحم کرنے والا ہوں۔"

اس تنبیہ و تہدید کے باوجود قرآن کریم توبہ کا دروازہ کھلا رہتا ہے۔ اس سے وہ روشنی پاتے ہیں اور رشتۂ امل ٹوٹنے نہیں پاتا۔ اس طرح دل نور کے سرچشمے کی طرف کھنچتے ہیں اور اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں ہوتے۔ اللہ کے عفو و درگزر کی امید باقی رہتی ہے۔ اس لئے جو چاہے' جس وقت بھی چاہے صدق نیت سے' اس دارالامن میں داخل ہو جائے۔

سچی توبہ کی نشانی کیا ہوگی؟ عمل میں تبدیلی اور اصلاح' صاف صاف بات کرنا' حق کا اعتراف کرنا' اور حق کے تقاضے پورے کرنا۔ اور جو لوگ توبہ کر لیں وہ یقیناً اللہ کی رحمت سے بہرہ ور ہوں گے' ان کی توبہ قبول ہوگی۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں وَأَنَا التَّوَّابُ الرَّحِيمُ "اور میں بڑا درگزر کرنے والا اور رحم کرنے والا ہوں۔" یقیناً ایسا ہوگا کیونکہ 'بات کرنے والوں میں اللہ تعالیٰ سب سے صادق القول ہے۔

اور جو لوگ اپنی غلط روش پر مصر ہوتے ہیں اور مہلت اور فرصت کو غنیمت نہیں سمجھتے تو وہ یقیناً اپنے اس انجام کو پہنچیں گے جس کی وعید اللہ نے اس سے قبل ان سے فرمائی ہے۔ اور اب زیادہ تفصیل و تاکید کے ساتھ کہا جاتا ہے إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَمَاتُوا وَهُمْ كُفَّارٌ أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللَّهِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ ﴿١٦١﴾ خَالِدِينَ فِيهَا ۖ لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ

وَ لَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ (۱۶۲)

"اور جن لوگوں نے کفر کا رویہ اختیار کیا اور کفر کی حالت ہی میں جان دی' ان پر اللہ اور فرشتوں اور تمام انسانوں کی لعنت ہے۔ اسی لعنت زدگی کی حالت میں وہ ہمیشہ رہیں گے' نہ ان کی سزا میں تخفیف ہوگی اور نہ انہیں پھر کوئی دوسری مہلت دی جائے گی۔"

کیوں؟ اس لئے کہ انہوں نے اس کھلے دروازے کو' خود اپنے اوپر بند کر دیا' انہوں نے فرصت کو غنیمت نہ جانا اور موقعہ ہاتھ سے چلا گیا اور کتمان حق' اور کفر و ضلالت پر اصرار کیا: اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللّٰهِ وَ الْمَلٰٓئِكَةِ وَ النَّاسِ اَجْمَعِيْنَ "ان پر اللہ' فرشتوں اور تمام انسانوں کی لعنت۔" یہ ہمہ جہت لعنت ہوگی' کسی صورت میں بھی وہ اس سے چھٹکارا نہ پاسکیں گے۔ نہ کسی سینے میں ان کے لئے رحم ہوگا۔

قرآن کریم نے ہمہ جہت لعنت کے سوا ان کے لئے کسی اور عذاب کا تذکرہ نہیں کیا' بلکہ کہا ہے کہ اس عذاب میں کوئی تخفیف نہ ہوگی۔ نہ کوئی تاخیر ہوگی اور انہیں کسی قسم کی کوئی مہلت نہ دی جائے گی یہ ایک ایسا عذاب ہے جس سے تمام دوسرے عذاب کم ہوں گے' دھتکارنے' پرے پھینک دینے اور اظہار لاتعلقی کا عذاب۔ کوئی ان پر رحم کرنے والا نہ ہوگا۔ کوئی آنکھ انہیں قبول نہ کرے گی' کسی زبان پر ان کے لئے سلام تک نہ ہوگا۔ ہر طرف سے لعنت' دھتکار اور قطع تعلق' انسانوں کی طرف سے بھی اور خداوند تعالیٰ کی طرف سے بھی' زمین پر بھی اور آسمانوں پر بھی' ہر جگہ اور ہر طرف سے۔ یہ ہے وہ دردناک اور توہین آمیز عذاب۔

اس کے بعد سیاق کلام توحید کی طرف پھر جاتا ہے' ایمانی تصور حیات کی بنیاد عقیدۂ توحید پر رکھی جاتی ہے۔ کائنات سے ایسے مشاہد پیش کیے جاتے ہیں' جو عقیدہ توحید پر ناقابل تردید دلائل پیش کرتے ہیں جو لوگ اللہ کے سوا دوسروں کو معبود بناتے ہیں۔ ان پر تنقید ہے اور بتایا جاتا ہے کہ قیامت کے دن یہ لوگ کس قدر ذلیل و خوار ہوں گے' جب عذاب الٰہی سامنے ہوگا' تابع متبوع سے' اور متبوع تابع سے تبرّی کر رہا ہوگا' لیکن کوئی معذرت بھی انہیں کچھ فائدہ نہ دے سکے گی۔ ان کی پشیمانی ان کے لئے مفید نہ ہوگی نہ انہیں اس کی وجہ سے نار جہنم سے چھٹکارا حاصل ہوگا۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆

۱۹ ع ۱۱ ۳

وَ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ (۱۶۳) اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اخْتِلَافِ الَّيْلِ وَ النَّهَارِ وَ الْفُلْكِ الَّتِيْ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَ بَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ ۪ وَّ تَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ وَ السَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ (۱۶۴) وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ؕ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ؕ وَ لَوْ يَرَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ ۙ اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ۙ

وَأَنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعَذَابِ ﴿١٦٥﴾ إِذْ تَبَرَّأَ الَّذِينَ اتُّبِعُوا مِنَ الَّذِينَ اتَّبَعُوا وَرَأَوُا الْعَذَابَ وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْأَسْبَابُ ﴿١٦٦﴾ وَقَالَ الَّذِينَ اتَّبَعُوا لَوْ أَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَتَبَرَّأَ مِنْهُمْ كَمَا تَبَرَّءُوا مِنَّا ۗ كَذَٰلِكَ يُرِيهِمُ اللَّهُ أَعْمَالَهُمْ حَسَرَاتٍ عَلَيْهِمْ ۖ وَمَا هُمْ بِخَارِجِينَ مِنَ النَّارِ ﴿١٦٧﴾

۲۰
۴ع
۴

"تمہارا خدا ایک ہی خدا ہے' اس رحمٰن اور رحیم کے سوا کوئی اور خدا نہیں ہے۔" (۲: ۱۶۳-۱۶۷)

(اور اس حقیقت کو پہچاننے کے لئے کوئی نشانی اور علامت درکار ہے تو) جو لوگ عقل سے کام لیتے ہیں ان کے لئے آسمانوں اور زمین کی ساخت میں' رات اور دن کے پیہم ایک دوسرے کے بعد آنے میں' ان کشتیوں میں جو انسان کے نفع کی چیزیں لئے ہوئے دریاؤں اور سمندروں میں چلتی پھرتی ہیں' بارش کے اس پانی میں جسے اللہ اوپر سے برساتا ہے پھر اس کے ذریعے زمین کو زندگی بخشتا ہے اور اپنے اسی انتظام کی بدولت زمین میں ہر قسم کی جان دار مخلوق کو پھیلاتا ہے۔ ہواؤں کی گردش میں اور ان بادلوں میں جو آسمان اور زمین کے درمیان تابع فرمان بنا کر رکھے گئے ہیں بے شمار نشانیاں ہیں مگر (وحدت خداوندی پر دلالت کرنے والے ان کھلے کھلے آثار کے ہوتے ہوئے بھی) کچھ لوگ ایسے ہیں جو اللہ کے سوا دوسروں کو اس کا ہمسر اور مد مقابل بناتے ہیں اور ان کے ایسے گرویدہ ہیں جیسے اللہ کے ساتھ گرویدگی ہونی چاہئے۔ حالانکہ ایمان رکھنے والے لوگ سب سے بڑھ کر اللہ کو محبوب رکھتے ہیں۔ کاش جو کچھ عذاب کو سامنے دیکھ کر انہیں سوجھنے والا ہے وہ آج ہی ان ظالموں کو سوجھ جائے کہ ساری طاقتیں اور سارے اختیارات اللہ ہی کے قبضے میں ہیں اور یہ کہ اللہ سزا دینے میں بہت سخت ہے۔ جب وہ سزا دے گا اس وقت کیفیت یہ ہوگی کہ وہی پیشوا اور راہ نما' جن کی دنیا میں پیروی کی گئی تھی' اپنے اپنے پیروؤں سے بے تعلقی ظاہر کریں گے مگر سزا پا کر رہیں گے۔ اور ان کے سارے اسباب و وسائل کا سلسلہ کٹ جائے گا اور وہ لوگ جو دنیا میں ان کی پیروی کرتے تھے' کہیں گے کہ کاش ہم کو پھر ایک موقع دیا جاتا تو جس طرح آج یہ ہم سے بیزاری ظاہر کر رہے ہیں' ہم ان سے بیزار ہو کر دکھا دیتے۔ یوں اللہ ان لوگوں کے وہ اعمال' جو یہ دنیا میں کر رہے ہیں' ان کے سامنے اس طرح لائے گا کہ یہ حسرتوں اور پشیمانیوں کے ساتھ ہاتھ ملتے رہیں گے' مگر آگ سے نکلنے کی کوئی راہ نہ پائیں گے۔

ایمانی تصور حیات وحدت الوہیت کے اصول پر قائم ہے۔ حضور ﷺ کے وقت اللہ تعالیٰ کے وجود کے بارے میں کوئی تنازعہ نہ تھا۔ البتہ ذات باری' صفات باری اور مخلوق و خالق کے باہمی تعلق کے بارے میں اختلاف رائے ضرور تھا۔ کوئی بھی اللہ کے وجود کے بارے میں اختلاف نہ کرتا تھا۔ ایسا کبھی نہ ہوا کہ انسانی فطرت نے کبھی وجود باری کو بھلا دیا ہو۔ یا انسان کسی خدا کا قائل نہ رہا ہو۔ یہ تو اس دور جدید کی بیماری ہے جب اذہان میں ایسے افکار اگ آئے' جن کا تعلق زندگی کے شجرہ طیبہ سے نہیں ہے' جو فطرت کے عین خلاف ہیں' جن کے نتیجے میں انسان نے سرے سے وجود باری کا بھی انکار کر دیا۔ یقیناً یہ اوپرے افکار ہیں اور موجودات و کائنات میں ان کی کوئی جڑ موجود نہیں ہے۔ ایک وقت ضرور آئے گا جب یہ افکار سرے سے ناپید ہو جائیں گے اور ان کا کوئی نام و نشان بھی نہیں رہے گا۔ کائنات کی تشکیل و تکوین اور اس کی ساخت ان افکار کی متحمل نہیں ہے۔ ایسے لوگوں کو فطرت کائنات مسترد کرتی ہے اور یہ لوگ اس لئے ناقابل برداشت ہیں کہ ان کے افکار کی جڑیں فطرت کائنات میں نہیں ہیں۔

عقیدۂ توحید انسان کے نظریۂ حیات میں ایک ضروری تصحیح ہے' اسلامی نظام حیات کے لئے تو خشت اول ہے۔ اس لئے قرآن حکیم بار بار عقیدۂ توحید کا بیان مختلف پیرایوں میں کرتا ہے۔ یہی وہ بنیاد اور اساس ہے جس پر اسلام کا اخلاقی نظام اور اس کی اجتماعی تنظیم استوار ہوئی۔ یعنی اس کائنات میں وحدت ربوبیت کا تصور وَ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ "تمہارا خدا ایک ہی ہے لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ "اس کے سوا کوئی اور خدا نہیں ہے۔" "رحمان و رحیم ہے۔"

تاکید اور بار بار تاکید' یعنی وحدانیت الٰہ کی اس تاکید کا نتیجہ یہ ہے کہ معبود ایک ہو جاتا ہے جس کی تمام مخلوق بندگی کرتی ہے اور اس کے سامنے سر تسلیم خم کرتی ہے۔ وہ سمت ایک متعین ہو جاتی جس سے پوری مخلوق اپنے اخلاق اور اپنے طرز عمل کے اصول اور طریقے اخذ کرتی ہے اور وہ ماخذ اور منبع بھی متعین ہو جاتا ہے۔ جس سے انسان شریعت و قانون کے اصول اخذ کرتا ہے۔ اور وہ واحد نظام حیات بھی متعین ہو جاتا ہے جو انسان کے تمام اصول حیات میں متصرف ہوتا ہے۔

جیسا کہ سیاق کلام سے معلوم ہوتا ہے۔ یہاں امت مسلمہ کو اس عظیم رول کے لئے تیار کیا جارہا ہے جو اسے کرہ ارض پر ادا کرنا ہے۔ اس مناسبت سے یہاں اس حقیقت کا پھر ذکر کر دیا جاتا ہے جس کا ذکر قرآن مجید میں بار بار کیا جاتا ہے۔ جو قرآن مجید کا وہ سایہ دار درخت ہے جس کی جڑیں دور تک زمین میں گئی ہوئی ہیں اور اس کی شاخیں عقل و شعور کے آسمان پر دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ بلکہ وہ اس پوری کائنات کو اپنے گھیرے میں لئے ہوئے ہیں۔ اس حقیقت کا ذکر یہاں مکرر کر دیا جاتا ہے کہ اسلامی معاشرے کی تمام قانون سازی اور ضابطہ بندی میں اسے پیش نظر رکھا جائے۔ کیا ہے وہ حقیقت؟ وہ ہے توحید الٰہی۔ پھر یہاں اللہ تعالیٰ کی صفات رحمٰن رحیم کا ذکر کیا جاتا ہے۔ تمام تشریعات و ضابطہ بندیوں کا ماخذ اور سرچشمہ اللہ تعالیٰ کی یہ گہری اور عمومی صفت' صفت رحمت ہے۔

اسی طرح پوری کائنات اور اس کی ہر گزر گاہ اللہ کی رحمت اور اس کی وحدانیت پر شاہد عادل ہے۔

اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اخْتِلَافِ الَّيْلِ وَ النَّهَارِ وَ الْفُلْكِ الَّتِيْ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَ بَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ وَّ تَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ وَ السَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۝

"جو لوگ عقل سے کام لیتے ہیں ان کے لئے آسمانوں اور زمین کی ساخت میں' رات اور دن کے پیہم ایک دوسرے کے بعد آنے میں' ان کشتیوں میں جو انسان کے نفع کی چیزیں لئے ہوئے دریاؤں اور سمندروں میں چلتی پھرتی ہیں' بارش کے اس پانی میں جسے اللہ اوپر سے برساتا ہے پھر اس کے ذریعہ زمین کو زندگی بخشتا ہے۔ اور اپنے اسی انتظام کی بدولت زمین ہر قسم کی جاندار مخلوق کو پھیلاتا ہے۔ ہواؤں کی گردش میں اور ان بادلوں میں جو (زمین و آسمان کے درمیان تابع فرمان بنا کر رکھے گئے ہیں' بے شمار نشانیاں ہیں)۔

احساس و شعور کو بیدار کرنے کے لئے یہ بالکل ایک نیا انداز ہے۔ اس کے ذریعے عجائبات دنیا کے نظاروں اور کائنات کے گہرے مطالعہ کے قلب و نظر کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ اس کائنات کے عجائب سے چونکہ ہم مانوس ہو چکے ہیں' رات دن انہیں دیکھتے رہتے ہیں۔ اس لئے ان کی جدت و ندرت' احساس و شعور پر اثر انداز نہیں ہوتی۔ کائنات انسان کے لئے ایک معمولی چیز بن گئی ہے۔ اس لئے انسان سے کہا گیا ہے کہ وہ ایک دفعہ لوٹ کر' کھلی آنکھوں کے ساتھ' تیز احساس کے ساتھ اور زندہ دل کے ساتھ' اس کائنات پر یوں نظر ڈالے جیسے وہ اسے پہلی مرتبہ دیکھ رہا ہو اور پھر وہ بار بار مشاہدہ کرے۔ یوں وہ اس کائنات میں عجیب و غریب مشاہدات کر سکے گا۔ یہاں بے شمار مناظر ایسے ہیں کہ جب ان پر انسان نے پہلی نظر ڈالی تو آنکھیں خیرہ ہو گئیں اور دل متحیر ہو گئے لیکن پھر کیا ہوا؟ قلب و نظر کے لئے وہ

مناظر معمولی بن گئے۔ دنیا کے اس عجیب میلے کو ہر روز دیکھتے رہے۔ ہم اس سے مانوس ہو گئے۔ گردش ایام کوئی اچنبھے کی بات نہ رہی۔ اس کا انوکھاپن یک لخت ختم ہو گیا اور یہ رونگٹے کھڑے کر دینے والے مناظر فطرت تو اب ہمارے لئے جاذب نظر ہی نہ رہے۔

یہ آسمان و زمین' یہ خوفناک فاصلے' یہ دیوہیکل اجرام فلکی' یہ حیران کن آفاق اور پھر یہ معلوم اور نامعلوم بے شمار جہاں اس فضا میں ان جہانوں کی گردش ان کے مواقع و مدارات' یہ سب ایسی چیزیں ہیں جن کے تصور ہی سے سر چکرانے لگتا ہے۔ یہ اسرار کائنات جو پردہ غیب میں نہاں ہیں' جو کائنات کے پردوں سے نفس انسانی کو جھانکتے ہیں۔ آسمان و زمین پر مشتمل یہ عظیم کائنات۔ اور پھر یہ انسان ان ابعاد اور فاصلوں سے بے خبر' ان کے حجم اور عظمت سے بے خبر اور ان کے اسرار و رموز سے عاجز۔ ہاں جب انسانی ادراک ترقی کر جائے گا اور جدید علوم اور انکشافات اس کی مد اور معاون ہو جائیں گے تو اللہ تعالیٰ اسے کچھ رازہائے دروں سے خبردار کرے گا۔۱

شب و روز کا اختلاف' نور ظلمت کا باہمی تعاقب' صبح شام کی گردش یہ طلوع اور وہ غروب' اور نگہ اولیں پر ابتدائے آفرینش سے چٹکیاں لینے لگتا تھا' دل دھڑکتے تھے اور یہ سب مناظر انسان کے لئے عجب العجائب تھے' پھر کیا ہوا؟ انسان بار بار مشاہدہ کرتا رہا اور یہ سب کچھ اس کے لئے ایک معمول بن گیا۔ انوکھاپن نہ رہا۔ کشش ختم ہو گئی۔ اور انسان غافل ہو گیا لیکن قلب مومن ہمیشہ بیدار رہتا ہے۔ اس کے احساس میں یہ بات مشاہدات تازہ بتازہ ہو ہو رہتے ہیں۔ وہ ہمیشہ ان میں اللہ کو دیکھتا ہے' اسے یاد کرتا ہے اور وہ ان مشاہد و عجائب کو ہر بار یوں دیکھتا ہے کہ ایک جہان نو' ایک تخلیق نو ابھی ابھی اسے دکھائی گئی ہو۔

دیکھئے لوگوں کی ضروریات لئے ہوئے بحری جہاز جارہا ہے (اور اس منظر کا بقدر حصہ میں نے خود احساس کیا ہے) کیا ہی منظر ہے۔ ایک عظیم سمندر میں سیاہ نقطہ ہے جس پر ہم سوار ہیں جو ہمیں لے کر رواں دواں ہے' ہر طرف سے متلاطم موجوں کے تھپیڑے ہیں اور تاحد نظر نیلگوں بحر بیکراں کی وسعت ہے۔ یہ کشتی تیر رہی ہے۔ ادھر گرتی' ادھر پڑتی جا رہی ہے۔ اللہ کی قدرت اور اللہ کی نگہبانی کے سوا کوئی اور طاقت نہیں' جس کا یہاں بس چل سکے۔ یہاں اللہ کے بنائے ہوئے قانون کی حکمرانی ہے۔ ایک چھوٹا سا نقطہ ہے' لہروں کے مٹتے ہوئے خطوط پر' خوفناک بحر بیکراں کے سینے پر۔

بس وہ اللہ ہی ہے جس نے آسمان کی بلندیوں سے پانی اتارا۔ باغ و راغ اجڑے ہوئے تھے۔ خزاں کا دور دورہ تھا۔ زمین مرچکی تھی۔ یکایک وہ پھر سرسبز و شاداب ہو جاتی ہے۔ مرنے کے بعد پھر زندہ ہو جاتی ہے۔ نوع بنوع کے جانور اس پر دوڑتے پھرتے ہیں۔ قسم قسم کے پرندے اڑتے اور چہچہاتے ہیں۔ ہوائیں چلتی ہیں جن میں درخت جھومتے ہیں۔ زمین و آسمان کے درمیان بادل جھومتے ہیں مگر ہیں قید میں۔ کیا مناظر ہیں یہ اگر انسان' قرآنی اشارات کی سمت میں ان پر قرآنی زاویہ نگاہ سے غور و فکر کرے تو اللہ کی عظیم قدرت اور پھر اس کی وسیع شان رحیمی کو دیکھ کر' اس کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں۔ یہ زندگی جس کے ادراک سے ہم قاصر ہیں۔ جس کا جوہر لطیف سرحدات ادراک سے ماورائی ہے۔ جو بڑے لطف سے کرہ ارض پر نمودار ہوتی ہے۔ پھر یک لخت کھل کر سامنے آجاتی اور طاقتور بن جاتی۔ گٹھلی سے درخت بن جاتا ہے۔ یہ کہاں سے آگئی؟ اگر تخم اور گٹھلی کے اندر پوشیدہ تھی تو پھر گٹھلی اور تخم کہاں سے آئے؟ اور ان میں یہ زندگی کیسے داخل ہوئی؟ اس کا اصل کیا ہے؟ اس کا پہلا مصدر کیا ہے؟ آپ بھاگ نہیں سکیں گے۔

ٹھہرئیے! فطرت اصرار کرتی ہے کہ آپ اس سوال کا جواب دیں۔ ملحدین نے اس سوال کے جواب سے ہمیشہ راہ فرار اختیار کی ہے۔ بے شک بہت مشکل سوال ہے۔ اس کا جواب صرف یہ ہے کہ ایک قادر مطلق تخلیق کنندہ موجود ہے۔

۱۔ سید قطب شہید کی پیش گوئی کے عین مطابق یہ سلسلہ بڑی تیزی سے جاری ہے۔

وہی ہے جو مردے کو زندگی بخشتا ہے۔ ملحدین مغرب' لوگوں کو یہ تاثر دیتے ہیں کہ وہ مردہ چیز کو زندگی بخشنے کی تحقیقات کر رہے ہیں تاکہ خدا کو ماننے کی ضرورت ہی نہ رہے لیکن سعی پیہم کے بعد اپنے کفرو الحاد کے باوجود آخر کار انہیں اقرار کرنا پڑا کہ ہم اس سلسلے میں ناکام ہیں۔ زندگی کی ایجاد محال ہے۔ آج روس ملحد روس میں' حیاتیات کے ماہرترین کو یہ اعلان کرنا پڑا ہے ہم اس راز کے ادراک سے عاجز ہیں۔ اس سے قبل بھی حیاتیات کے ایک مشہور عالم ڈارون نے اس سوال کا جواب دینے سے گریز کیا تھا۔

اور پھر یہ ہوائیں' کبھی ادھر رواں ہیں' کبھی ادھر چلتی ہیں۔ اپنے کندھوں پر بادل لئے ہوئے۔ بادل زمین و آسمان کے درمیان مقید ہیں۔ کرہ ارض پر اللہ تعالیٰ نے جو جو قوانین مقرر کئے ہیں ان کے عین مطابق ان کی حقیقت کیا ہے؟ اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ صرف یہی کافی نہیں ہے کہ ہواؤں کے چلنے کے اسباب گنوا دیں۔ مادہ پرستوں کے نظریات پڑھ دیں۔ یہ بتا دیں کہ بادل یوں بنتے ہیں اور یوں برستے ہیں۔ راز تو کچھ اور ہے۔ سوال یہ ہے کہ ان اسباب کی حقیقت کیا ہے؟ قدرت' اس کا منبع اس کا موجودہ توازن اور اس کے موجودہ قوانین' جو زندگی کو یہ سہولت فراہم کرتے ہیں۔ زندگی کے اسباب بادل' ہوا' بارش اور شبنم ان سب کا سرحلقہ کیا ہے؟ یہ سہولتیں' جو ہم معلوم کر سکے ہیں ہزاروں ہیں اور اگر ان سب سے صرف ایک ہی نہ ہو تو زندگی یک لخت معدوم ہو جائے یا اس طرح خوشگواری سے نہ چلے۔ جس طرح رواں دواں ہے۔ عناصر فطرت کی یہ پیچیدہ ہم آہنگی بتاتی ہے کہ زندگی کوئی اتفاقی چیز نہیں ہے۔ یقیناً اس کے پس منظر میں ایک ارادہ کارفرما ہے۔ ایک اختیار کارگر ہے۔ یہ ارادہ صرف ایک ہے۔ اس میں دوئی نہیں کیوں؟ اس لئے کہ کوئی اس میں تضاد نہیں اور نہایت ہی مشفقانہ ہے اس لئے کہ اس کی ہر حرکت زندگی کے لئے معاون ہے۔ (بے شمار نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو عقل سے کام لیتے ہیں) انسان کو دنیا کی الفت اور غفلت نے کند کر دیا ہے۔ اگر وہ الفت اور غفلت کے ان پردوں کو دماغ سے اتار پھینکے تو یقیناً ان مشاہدات فطرت کو ایک جدید احساس کے ساتھ دیکھ سکے گا۔ بالغ نظری سے دیکھ سکے گا۔ وہ ایک ایسے دل کے ساتھ غور کر سکے گا' جو نور ایمان سے لبریز ہو۔ اگر وہ اس کرہ ارض پر ایک نووارد کی طرح نگاہ ڈالے جو گویا کسی دوسرے جہان سے اس زمین پر پہلی مرتبہ اترا ہے' تو وہ ہر چمک کی طرف ملتفت ہو جائے۔ اس کے کان ہر آواز کی طرف متوجہ ہوں۔ اس کا احساس ہر حرکت کو نوٹ کرے اور قلب و نظر اور حس و شعور نئی نئی واردات سے دوچار ہوں اور وہ حیرت و استعجاب سے کانپ اٹھے۔

یہ ہیں ایمان کی کارستانیاں اور ایمان کی برکات! وسعت نظر حد احساس و شعور' حسن' ہم آہنگی اور کمال کی قدردانی۔ حقیقت یہ ہے کہ ایمان اس کائنات کا ادراک جدید ہے۔ اور حسن و جمال کا ایک نیا شعور ہے۔ ایمانی دراصل' اللہ تعالیٰ کے قوانین کے رنگین میلے میں چہل پہل کا نام ہے جس میں صبح و شام تماشائے قدرت کا نئے سے نیا نظارہ پیش ہوتا ہے۔ لیکن کارگاہ حیات کی ان نیرنگیوں کے باوجود' یہاں ایسے لوگ بھی ہیں جو عقل کے ادراک سے کورے ہیں۔ ان کی نظر کوتاہ ہے اور وہ قوانین فطرت کی ایسی وحدت کو اور اس کائنات کے چلانے والے اس واحد اور منضبط نظام کو جو عقیدۂ توحید کی طرف صاف صاف اشارہ کرتا ہے نظرانداز کر دیتے ہیں اور ان سب چیزوں پر سے یونہی گزر جاتے ہیں یا ان کے لئے مختلف خدا اور مختلف اسباب تلاش کرتے ہیں۔ وَ مِنَ النَّاسِ مَنۡ یَّتَّخِذُ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ اَنۡدَادًا یُّحِبُّوۡنَہُمۡ کَحُبِّ اللّٰہِ اور کچھ لوگ ایسے ہیں جو اللہ کے سوا دوسروں کو اس کا ہمسر اور مدمقابل بناتے ہیں۔ اور ان کے لئے ایسے گرویدہ ہیں جیسے اللہ کے ساتھ گرویدگی ہونی چاہئے۔"

ہاں بعض لوگ ایسے ہیں جو اللہ کے سوا دوسروں کو اللہ کا شریک بناتے ہیں۔ جن لوگوں سے قرآن مخاطب تھا۔ ان کے معاشرے میں اللہ کے یہ ہمسر درخت' پتھر' ستارے اور ملائکہ و شیاطین تھے۔ جاہلیت کے مختلف ادوار میں کبھی عام چیزیں' کبھی افراد و اشخاص' کبھی اشارات و اعتبارات اللہ کے ہمسر رہے ہیں۔ بعض اوقات یہ ہمسری شرک خفی کی تعریف میں آتی ہے اور کبھی شرک ظاہر و جلی کی صورت

میں۔جب ان اشیاء کاذکر اللہ کے ساتھ ہو اور دل میں ان کے بارے میں وہی عظمت و محبت ہو' جو اللہ تعالیٰ کی ہونی چاہئے تو یہ خفیہ شرک ہو گا اور اگر صورت احوال یہ ہو کہ دل سے اللہ کی محبت بالکل نکل جائے اور اس کی جگہ کسی اور چیز کی محبت اور عظمت جاگزین ہو جائے تو یہ کھلا شرک ہو گا۔

مومنین کی صفت یہ ہے کہ وہ اللہ کی محبت اور اللہ کی عظمت کی طرح کسی دوسری چیز کی عظمت نہیں کرتے اور نہ اس کی عظمت کے قائل ہوتے ہیں۔نہ اپنی جان سے نہ کسی اور کی جان سے نہ کسی شخصیت سے' نہ کسی اشارہ و اعتبار سے' نہ کسی نعرہ و نظریہ سے اور نہ ان جدید اقدار میں سے کسی ایک قدر کے ساتھ' جن کے پیچھے آج کل مخلوق خدا بھاگ رہی ہے۔غرض ان میں سے کسی ایک کے ساتھ بھی وہ ربط و تعلق نہیں رکھتے وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ "حالانکہ ایمان لانے والے لوگ سب سے بڑھ کر اللہ کو محبوب رکھتے ہیں۔" ان کے دلوں میں اللہ کی شدید محبت ہوتی ہے۔صرف اللہ کی محبت بلاقید و بلاقدر۔ان تمام محبتوں پر جو دوسری چیزوں کے لئے ان کے دل میں ہوتی ہیں۔اللہ کی محبت شدید تر ہوتی ہے۔سب پر غالب ہوتی ہے۔

بندہ اور یزداں کے مابین تعلق کی تعبیر محبت سے کی گئی ہے۔یہ بہت ہی اچھی تعبیر ہے۔ایک سچے مومن اور حق تعالیٰ کے در میں محبت ہی کا تعلق ہوتا ہے۔قلبی محبت کا تعلق' روحانی کشش کا رابطہ' قرب و دوستی کا تعلق اور ایک پر خلوص نورانی جذبہ محبت کا تعلق۔یہ افسرو ماتحت کا سرکاری تعلق نہیں ہوتا۔

وَ لَوْ يَرَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ ۙ اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ۙ وَّ اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعَذَابِ ۝ اِذْ تَبَرَّاَ الَّذِيْنَ اتُّبِعُوْا مِنَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا وَ رَاَوُا الْعَذَابَ وَ تَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْاَسْبَابُ ۝ وَ قَالَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا لَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَتَبَرَّاَ مِنْهُمْ كَمَا تَبَرَّءُوْا مِنَّا ؕ كَذٰلِكَ يُرِيْهِمُ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ حَسَرٰتٍ عَلَيْهِمْ ؕ وَ مَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنَ النَّارِ

"کاش' جو کچھ عذاب سامنے دیکھ کر' انہیں سوجھنے والا ہے۔وہ آج ہی ان ظالموں کو سوجھ جائے کہ ساری طاقتیں اور سارے اختیارات اللہ ہی کے قبضے میں ہیں۔اور یہ کہ اللہ سزا دینے میں بھی بہت سخت ہے۔جب وہ سزا دے گا اس وقت کیفیت یہ ہو گی کہ وہی پیشوا اور راہ نما' جن کی دنیا میں پیروی کی گئی تھی' اپنے پیروؤں سے بے تعلقی ظاہر کریں گے' مگر سزا پاکر رہیں گے۔اور ان کے اسباب و وسائل کا سلسلہ کٹ جائے گا اور وہ لوگ جو دنیا میں ان کی پیروی کرتے تھے' کہیں گے کاش ہم کو پھر ایک موقع دیا جاتا تو جس طرح آج یہ ہم سے بیزاری ظاہر کر رہے ہیں' ہم ان سے بیزار ہو کر دکھا دیتے۔یوں اللہ ان لوگوں کے وہ اعمال' جو یہ دنیا میں کر رہے ہیں' ان کے سامنے اس طرح لائے گا کہ یہ حسرتوں اور پشیمانیوں کے ساتھ ہاتھ ملتے رہیں گے مگر آگ سے نکلنے کی کوئی راہ نہ پائیں گے۔"

یہ لوگ ہیں جنھوں نے غیر اللہ کو اللہ کا ہمسر بنایا' انہوں نے سچائی کے ساتھ ظلم کیا۔انہوں نے خود اپنے آپ پر ظلم کیا۔کاش وہ آنکھیں کھول کر دیکھتے' اس منظر کے بارے میں کچھ سوچتے کہ ان کو ایک دن اللہ وحدہ لاشریک کے سامنے کھڑا ہونا ہے۔کاش وہ چشم بصیرت سے اس عذاب کو دیکھ سکتے جو ظالموں کا انتظار کر رہا ہے۔ہاں اگر وہ آنکھیں کھولتے تو یقیناً دیکھ لیتے کہ۔اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا "تمام طاقتیں اور اختیارات کو اللہ ہی کے ہیں۔" لہٰذا وہ اللہ کے ساتھ کسی کو بھی شریک نہ کرے۔نہ کسی کو اس کا ہمسر بنائے اور ان کو معلوم ہو جاتا۔وَّ اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعَذَابِ یہ کہ اللہ بہت ہی سخت سزا دینے والا ہے۔"

کاش وہ اس منظر کو دیکھ سکتے کہ پیشوا اپنے مریدوں سے بے تعلقی ظاہر کر رہے ہیں۔ انہوں نے عذاب خود دیکھ لیا ہے۔ ان کے درمیان تمام تعلقات اور دوستیاں ختم ہو چکی ہیں۔ پیشوا ہے کہ مرید دونوں نفسانفسی کی حالت میں ہیں۔ قیادت اور ریاست ڈھیر ہو گئی جس کی وجہ سے پیروکار ان کے پیچھے بھاگتے تھے۔ قائدین کو خود اپنی پڑی ہے۔ وہ پیروؤں کی عزت پر کیا توجہ کریں' ان کو کس طرح بچائیں۔ اب تو الہ واحد کی حقیقت اور طاقت ظاہر ہو چکی ہے۔ اب تو ان کے سامنے صرف ایک ہی قدرت ہے۔ گمراہ قیادتوں کا جھوٹ' ان کی کمزوری اور اللہ کے سامنے ان کا عجز اور عذاب الٰہی کے سامنے ان کی سرسیمگی اور بے بسی سب پر ظاہر ہو چکی ہے وَقَالَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا لَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَتَبَرَّاَ مِنْهُمْ كَمَا تَبَرَّءُوْا مِنَّا "اور وہ لوگ جو دنیا میں ان کی پیروی کرتے تھے' کہیں گے کاش کہ ہم کو پھر ایک موقعہ دیا جاتا تو جس طرح آج یہ ہم سے بیزاری ظاہر کر رہے ہیں' ہم ان سے بیزار ہو کر دکھا دیتے۔" وہاں یہ فریب خوردہ پیروکار اپنی گمراہ قیادت پر سخت غیظ و غضب کا اظہار کریں گے۔ وہ یہ تمنا کریں گے کہ کاش ایک موقعہ ہمیں اور مل جاتا اور ہم زمین پر دوبارہ لوٹا دیئے جاتے تاکہ اپنی کمزور اور ناکارہ دھوکہ باز قیادت سے لاتعلقی کا اظہار کرتے۔ کیا ہولناک منظر ہے یہ' قائد اور پیروکار ایک دوسرے پر تبرہ بھیج رہے ہیں۔ ایک دوسرے کے دشمن ہو گئے ہیں۔ کل کے دوست آج سخت دشمن ہیں۔ ان کے اس حسرت ناک انجام پر یہ نتیجہ بیان کیا جاتا ہے۔ كَذٰلِكَ يُرِيْهِمُ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ حَسَرٰتٍ عَلَيْهِمْ ۭ وَمَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنَ النَّارِ "یوں اللہ ان لوگوں کے اعمال' جو یہ دنیا میں کر رہے ہیں' ان کے سامنے اس طرح لائے گا کہ یہ حسرتوں اور پشیمانیوں کے ساتھ ہاتھ ملتے رہیں گے۔ مگر آگ سے بچنے کی کوئی راہ نہ پائیں گے۔"

اب بتایا جاتا ہے کہ زندگی کی پاک چیزوں سے فائدہ اٹھاؤ' ناپاک اور خبیث چیزوں سے دور رہو' خبردار! شیطان کی اطاعت نہ کرو' وہ تو ہروقت ناپاک چیزوں کی طرف پکارتا ہے۔ شیطان بعض چیزوں کو خدا کی طرف سے حلال قرار دیتا ہے اور بعض کو حرام قرار دیتا ہے۔ حالانکہ اللہ نے اسے تحلیل و تحریم اور قانون سازی کا یہ اختیار ہرگز نہیں دیا ہے۔ (مسلمانوں کو تنبیہہ کی جاتی ہے کہ وہ اپنے عقائد و نظریات کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور ذریعے سے راہ نمائی حاصل نہ کریں۔ جو لوگ اللہ کو چھوڑ کر' ایسی چیزوں کو پکارتے ہیں جو نہ سنتی ہیں نہ سمجھتی ہیں۔ ان کے اس احمقانہ فعل پر تنبیہہ کی جاتی ہے۔ یوں ان آیات کا فصل سابق کی آیات کے ساتھ معنوی ربط بھی واضح ہو جاتا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِي الْاَرْضِ حَلٰلًا طَيِّبًا ڮ وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ۭ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿١٦٨﴾ اِنَّمَا يَاْمُرُكُمْ بِالسُّوْۗءِ وَالْفَحْشَاۗءِ وَاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَي اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿١٦٩﴾ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَاۗءَنَا ۭ اَوَلَوْ كَانَ اٰبَاۗؤُھُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَـيْــــًٔـا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ ﴿١٧٠﴾

"لوگو! زمین میں جو حلال اور پاک چیزیں ہیں انہیں کھاؤ اور شیطان کے بتائے ہوئے راستوں پر نہ چلو۔ وہ تو تمہارا کھلا دشمن ہے' تمہیں بدی اور فحش کا حکم دیتا ہے اور یہ سکھاتا ہے کہ تم اللہ کے نام پر وہ باتیں کہو جن کے متعلق تمہیں علم نہیں ہے کہ وہ اللہ نے فرمائی ہیں۔"

ان سے جب کہا جاتا کہ اللہ نے جو احکام نازل کئے ہیں ان کی پیروی کرو' تو جواب دیتے ہیں کہ ہم تو اسی طریقے کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے باپ دادا کو پایا ہے۔ اچھا اگر ان کے باپ دادا نے عقل سے کچھ بھی کام نہ لیا ہو اور راہ راست نہ پائی ہو تو کیا پھر بھی یہ انہی کی پیروی کئے چلے جائیں گے؟ یہ لوگ جنہوں نے خدا کے بتائے ہوئے طریقے پر چلنے سے انکار کر دیا ہے۔ ان کی حالت بالکل ایسی ہے جیسے چرواہا جانوروں کو پکارتا ہے اور وہ ہانک پکار کی صدا کے سوا کچھ نہیں سنتے۔ یہ بہرے ہیں' گونگے ہیں' اندھے ہیں' اس لئے کوئی بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی۔"

سابقہ آیات میں اللہ تعالیٰ نے بتایا تھا کہ وہی ایک معبود اور اللہ ہے۔ وہی ایک خالق ہے اور جو لوگ دوسروں کو اللہ کا ہمسر بناتے ہیں۔ ایک شدید عذاب ان کا منتظر ہے۔ اب یہاں بیان کیا جاتا ہے کہ اپنے بندوں کا رازق بھی وہی ہے۔ حلال و حرام کے بارے میں قانون سازی کا اختیار بھی اسی کو ہے اور جیسا کہ ہم نے بیان کیا وحدت الوہیت کا یہ قدرتی ثمرہ ہے۔ جس ذات نے پیدا کیا اور پھر پرورش کی' وہی اس بات کی مستحق ہے کہ حلال و حرام کے معاملے میں قانون سازی کرے اور قانون سازی اور نظریات عقائد سے ہم آہنگ ہو۔ اس فقرے میں اللہ تعالیٰ اعلان فرماتے ہیں کہ زمین میں جو حلال اور پاک چیزیں ہیں انہیں کھاؤ' سوائے ان کے جنہیں حرام قرار دیا گیا ہے۔ حرام و حلال کے تعین میں صرف اللہ تعالیٰ سے راہ نمائی حاصل کرو اور ان معاملات میں سے کسی ایک میں بھی شیطان کی پیروی نہ کرو۔ وہ تو تمہارا دشمن ہے۔ وہ ہرگز تمہیں نیکی کا حکم نہیں دے سکتا۔ وہ تو تمہیں غلط تصورات دیتا ہے۔ غلط افعال کی ترغیب دیتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ انسان خود اپنی مرضی سے بعض چیزوں کو حلال قرار دے اور بعض کو حرام۔ حالانکہ اس پر اللہ کی جانب سے کوئی دلیل و سند نہ ہو اور اس پر مستزاد یہ کہ ایسے انسان کو یہ زعم بھی ہو کہ جو کچھ وہ کر رہا ہے وہ عین شریعت کے مطابق ہے۔ جیسا کہ یہود مدینہ اور مشرکین مکہ اپنے عقائد و نظریات اور افعال' اعمال کے بارے میں کرتے تھے۔

يَأَيُّهَا النَّاسُ كُلُوا مِمَّا فِي الْأَرْضِ حَلٰلًا طَيِّبًا ۖ وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ۚ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ ﴿١٦٨﴾ إِنَّمَا يَأْمُرُكُمْ بِالسُّوٓءِ وَالْفَحْشَآءِ وَأَنْ تَقُولُوا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴿١٦٩﴾

"اے لوگو! زمین میں جو حلال اور پاک چیزیں ہیں انہیں کھاؤ اور شیطان کے بتائے ہوئے راستوں پر نہ چلو۔ وہ تو تمہارا کھلا دشمن ہے' تمہیں بدی اور فحش کا حکم دیتا ہے اور یہ سکھاتا ہے کہ تم اللہ کے نام پر وہ باتیں کہو جن کے متعلق تمہیں علم نہیں ہے کہ وہ اللہ نے فرمائی ہیں۔" (یہ حکم کہ زمین کی تمام چیزیں تمہارے لئے جائز و مباح ہیں۔ الایہ کہ انہیں اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہو' ظاہر کرتا ہے کہ اسلامی نظریۂ حیات ایک سادہ اور وسیع نظریہ ہے۔ وہ اس کائنات کے مزاج اور پھر اس میں بسنے والوں کے مزاج سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان کی تمام چیزوں کو انسان کے لئے پیدا کیا ہے۔ اس کے لئے ان کا استعمال جائز قرار دیا ہے اور یہ کہ کسی چیز کے بارے میں ممانعت کا کوئی حکم آیا ہو' یا یہ کہ کوئی حکم نہ بھی ہو تو بھی یہ عام حکم موجود ہے کہ کسی چیز کا استعمال حد اعتدال سے زیادہ نہ ہو۔ لیکن اصل پالیسی یہ ہے کہ دنیا کی تمام پاک چیزوں سے فائدہ اٹھانا جائز ہے۔ تقاضائے فطرت کے عین مطابق' تنگی' سخت گیری اور ناجائز پابندیوں کے بغیر۔ صرف ایک شرط ضرور ہے وہ یہ کہ لوگوں کے لئے کیا حلال ہے اور کیا حرام ہے؟ اس کا فیصلہ صرف اللہ کے پاس ہو' کیونکہ اللہ ہی نے ان طیبات کو پیدا کیا ہے۔ لہٰذا حلال و حرام کے احکامات وہ اس شیطان سے اخذ نہ کریں جو ان کا بین دشمن ہے۔ وہ

تو انہیں صرف برائی اور فحش کا حکم دیتا ہے۔ اور بغیر کسی ثبوت و تعین کے یہ شیطان اللہ پر افترا باندھتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی طرف کفر کی نسبت کر کے اس کی توہین کرتا ہے۔ وَ اِذَا

قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا "ان سے جب کہا جاتا ہے کہ اللہ نے جو احکام نازل کئے ہیں ان کی پیروی کرو' تو جواب دیتے ہیں کہ ہم تو اسی طریقے کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔"

یہ لوگ کون تھے' مشرکین بھی ہو سکتے ہیں جو بار بار یہ ورد کرتے تھے کہ جب بھی انہیں اسلام کی طرف دعوت دی جاتی اور کہا جاتا کہ وہ اپنی اقدار اور اپنے قانون کا ماخذ اسلام کو تسلیم کر لیں اور جاہلیت کی ان تمام باتوں کو ترک کر دیں جنہیں اسلام نے بحال نہیں رکھا' تو وہ یہی دلیل دیتے۔ یہودی بھی مراد ہو سکتے ہیں' جنہوں نے اپنی روایات کو سختی سے پکڑا ہوا تھا' اور وہ دین اسلام کی کسی بات کو ماننے کے لئے تیار نہ تھے۔ بہرحال مراد مشرکین ہوں یا یہود' اسلام اپنے پیروکاروں کو بڑی شدت سے منع کرتا ہے کہ وہ نظریہ و عمل میں کوئی چیز ان لوگوں سے اخذ کریں۔ مسلمان ان لوگوں کی تقلید کریں اور نہ ہی ان سے کوئی چیز سوچے سمجھے بغیر درآمد کریں۔

اَوَ لَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْئًا وَّ لَا يَهْتَدُوْنَ "اگر ان کے آباؤ اجداد نے کسی چیز کو سمجھا ہو نہ کوئی راہ پائی ہو تو پھر بھی" اگر ان کے آباؤ اجداد کی فہم و فراست یہ ہو تو کیا پھر بھی یہ لوگ ان کے اتباع پر اصرار کریں گے؟ تقلید و جمود کی یہ کیا گھناؤنی مثال ہے۔ اس تقلید و جمود کی وجہ سے ہی قرآن مجید ان کے لئے نفرت آمیز خاکہ تجویز کرتا ہے۔ انہیں ایک ایسے حیوان سے تشبیہ دی جاتی ہے جو کچھ نہیں سمجھتا۔ اگر چرواہا پکارتا ہے تو وہ صرف آواز سنتا ہے۔ کچھ نہیں سمجھتا کہ اس نے کہا کیا۔ بلکہ ان کی حالت اس حیوان سے بھی بدتر ہے۔ حیوان بہرحال دیکھتا ہے' سنتا ہے' آواز نکالتا ہے اور یہ لوگ نپٹ اندھے' گونگے اور بہرے ہیں۔

وَمَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا كَمَثَلِ الَّذِيْ يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ اِلَّا دُعَآءً وَّ نِدَآءً ؕ صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ﴿۱۷۱﴾

"ان کی حالت بالکل ایسی ہے جیسے چرواہا جانوروں کو پکارتا ہے اور وہ ہانک پکار کی صدا کے سوا کچھ نہیں سنتے۔ یہ بہرے ہیں' گونگے ہیں' اندھے ہیں' اس لئے کوئی بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی۔"

گونگے' بہرے اور اندھے ہیں۔ اگرچہ وہ کانوں' آنکھوں اور زبانوں والے ہیں۔ وہ کیوں ایسے نہ ہوں کہ ان چیزوں کے باوجود وہ ان سے فائدہ نہیں اٹھاتے۔ راہ ہدایت نہیں پاتے۔ جو آنکھیں ہوتے نہیں دیکھتا تو اندھا ہے' کان ہوتے نہیں سنتا تو بہرا ہے' زبان ہوتے حق بات نہیں کرتا تو گونگا ہے۔

جو شخص غور و فکر چھوڑ دے۔ علم و معرفت اور رشد و ہدایت کے دروازے اپنے اوپر بند کر دے اور نظریۂ حیات اور راہ عمل کا ماخذ و مصدر اس ذریعے کو قرار دے جو دراصل ماخذ و مصدر نہ ہو اور نہ اس کا مستحق ہو تو ایسے شخص کی اس سے زیادہ گھناؤنی تصویر کھینچنا ممکن نہیں ہے۔

اب یہاں روئے سخن مومنین کی طرف پھر جاتا ہے۔ ان کے لئے کھانے پینے کی پاک چیزوں کو حلال قرار دیا جاتا ہے۔ حکم دیا جاتا ہے کہ وہ اپنے منعم کا شکر ادا کریں۔ غیر پاکیزہ چیزوں میں سے بعض کو بصراحت حرام قرار دیا جاتا ہے۔ یہودی' مسلمانوں کے ساتھ ان طیبات اور محرمات کے معاملے میں خواہ مخواہ الجھتے تھے۔ ان پر تنقید کی جاتی ہے اور بتایا جاتا ہے کہ حلال و حرام کے یہ احکامات اور یہ اصول تو خود ان

کے ہاں بھی بصراحت موجود تھے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَ اشْكُرُوْا لِلّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ﴿۱۷۲﴾ اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَ الدَّمَ وَ لَحْمَ الْخِنْزِيْرِ وَ مَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّ لَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۷۳﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ الْكِتٰبِ وَ يَشْتَرُوْنَ بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۙ اُولٰٓئِكَ مَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ اِلَّا النَّارَ وَ لَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَ لَا يُزَكِّيْهِمْ ۚۖ وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۷۴﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى وَ الْعَذَابَ بِالْمَغْفِرَةِ ۚ فَمَآ اَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ ﴿۱۷۵﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ نَزَّلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ ؕ وَ اِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِي الْكِتٰبِ لَفِيْ شِقَاقٍ بَعِيْدٍ ﴿۱۷۶﴾

۲۱
ع ۹
۵

"اے ایمان لانے والو! اگر تم حقیقت میں اللہ ہی کی بندگی کرنے والے ہو' تو جو پاک چیزیں ہم نے تمہیں بخشی ہیں انہیں بے تکلف کھاؤ اور اللہ کا شکر ادا کرو۔ اللہ کی طرف سے اگر کوئی پابندی تم پر ہے' تو وہ یہ ہے کہ مردار نہ کھاؤ۔ خون سے اور سور کے گوشت سے پرہیز کرو۔ اور کوئی ایسی چیز نہ کھاؤ جس پر اللہ کے سوا کسی اور کا نام لیا گیا ہو۔ ہاں جو شخص مجبوری کی حالت میں ہو اور وہ ان میں سے کوئی چیز کھالے بغیر اس کے کہ وہ قانون شکنی کا ارادہ رکھتا ہو یا ضرورت کی حد سے تجاوز کرے' تو اس پر کچھ گناہ نہیں اللہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔ حق یہ ہے کہ جو لوگ ان احکام کو چھپاتے ہیں جو اللہ نے اپنی کتاب میں نازل کئے ہیں اور تھوڑے سے دنیوی فائدوں پر انہیں بھینٹ چڑھاتے ہیں' وہ دراصل اپنے پیٹ آگ سے بھر رہے ہیں۔ قیامت کے روز اللہ ہرگز ان سے بات نہ کرے گا' نہ انہیں پاکیزہ ٹھہرائے گا اور ان کے لئے دردناک سزا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت کے بدلے ضلالت خریدی اور مغفرت کے بدلے عذاب مول لیا۔ کیسا عجیب ہے ان کا حوصلہ کہ جہنم کا عذاب برداشت کرنے کے لئے تیار ہیں۔

یہ سب کچھ اس وجہ سے ہوا کہ اللہ نے تو ٹھیک حق کے مطابق کتاب نازل کی تھی' مگر جن لوگوں نے کتاب میں اختلافات نکالے وہ اپنے جھگڑوں میں حق سے بہت دور نکل گئے۔"

یہاں مسلمانوں کو "اے ایمان والو" کے الفاظ سے پکارا گیا ہے۔ اس لئے کہ ایمان ہی اہل اسلام کے درمیان مضبوط رابطہ ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ میں ہی ماخذ قانون ہوں اس لئے قانون مجھ سے اخذ کرو۔ مجھ ہی سے حلال و حرام کے احکام اخذ کرو۔ بتایا جاتا ہے کہ میں نے تم پر جو انعامات کئے ہیں انہیں یاد رکھو۔ میں ہی تمہارا رازق ہوں اور میں نے ہی تمہارے لئے کھانے پینے کی پاکیزہ چیزوں کو حلال قرار دیا ہے۔ پاکیزہ چیزوں میں سے کسی ایک کو بھی حرام نہیں قرار دیا گیا۔ جو چیزیں حرام قرار دی گئی ہیں وہ اس لئے حرام نہیں کہ اللہ تم پر تنگی کرنا

چاہتا ہے بلکہ اس لئے کہ اپنی اصلیت کے اعتبار سے وہ پاک اور طیب نہیں ہیں۔ وہی تو ہے جو ابتدائے آفرینش سے تمہیں رزق دے رہا ہے۔ پھر تلقین ہوتی ہے کہ اگر وہ صرف اللہ وحدہ لاشریک کی بندگی چاہتے ہیں تو پھر اس کا شکر ادا کریں۔ شکر بھی عبادت اور بندگی کی ایک قسم ہے۔ اور اللہ شکر ادا کرنے سے بہت راضی ہوتا ہے۔ یہ تمام ہدایات اس آیت میں دے دی گئی' جو چند کلمات پر مشتمل ہے۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَ اشْكُرُوْا لِلّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ایمان لانے والوں اگر تم حقیقت میں اللہ ہی کی بندگی کرنے والے ہو تو جو پاک چیزیں ہم نے تمہیں بخشی ہیں انہیں بے تکلف کھاؤ اور اللہ کا شکر ادا کرو۔"

اس کے بعد مخصوص طور پر بعض ان چیزوں کو جو حرام قرار دی گئی ہیں بیان کر دیا جاتا ہے۔ اور لفظ قصر "انما" استعمال کر کے دائرہ محرمات کو محدود کر دیا اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَ الدَّمَ وَ لَحْمَ الْخِنْزِيْرِ وَ مَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ اللہ کی طرف سے اگر کوئی پابندی تم پر ہے تو وہ یہ ہے کہ تم حرام نہ کھاؤ۔ خون سے اور سور کے گوشت سے پرہیز کرو اور کوئی ایسی چیز نہ کھاؤ جس پر اللہ کے سوا کسی اور کا نام لیا گیا ہو۔"

ہر سلیم الفطرت انسان' ازروئے طبع مردار کو ناپسند کرتا ہے۔ یہی حال خون کا ہے لیکن فطرت کی کراہت کے علاوہ قرآن اور اس سے پہلے تورات کی بیان کردہ حرمت کے طویل عرصہ بعد' طب جدید نے بھی اس سلسلے میں کچھ قیمتی انکشافات کئے ہیں۔ مثلاً یہ کہ خون اور مردار میں کئی قسم کے مضر صحت اجزاء اور جراثیم (Microde) جمع ہو جاتے ہیں۔ لیکن ہمیں کوئی یقینی علم نہیں ہے کہ طب جدید نے وہ تمام مضرات اور نجاستیں معلوم کر لی ہیں اور کوئی اور سبب تحریم اب باقی نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ان اشیاء کی تحریم کے لئے کچھ اور اسباب بھی ہوں جن کا علم تک ہمیں نہ ہو سکا ہو۔ رہا خنزیر تو اس کے متعلق ابھی تک بعض لوگ اچھی رائے رکھتے ہیں۔ لیکن فطرت سلیمہ اس سے بھی شدید متنفر ہے۔ ایک طویل عرصہ سے شرائع سماویہ نے اسے حرام قرار دیا ہوا ہے۔ اب جا کر یہ معلوم ہوا ہے کہ اس کے خون' گوشت اور انتڑیوں میں ایک خطرناک کیڑا موجود ہے۔ یہ کیڑا لمبے دھاگے (Tape Worm) کی شکل میں ہوتا ہے۔ اور اس کے انڈے ملفوف ہوتے ہیں۔ اس کے بارے میں بعض سور خور کہتے ہیں۔ صحت و صفائی کے وسائل بہت ترقی کر چکے ہیں۔ لہٰذا یہ کیڑے اور ان کے انڈے مضر صحت نہیں رہے۔ کیوں کہ زیادہ حرات سے یہ انڈے اور کیڑے یکسر ختم ہو جاتے ہیں۔ اور صحت و صفائی کے جدید وسائل کے تحت یہ سہولتیں ہر جگہ میسر ہیں لیکن یہ لوگ اس بات پر غور نہیں کرتے کہ قرون طویلہ کے بعد ان کے علمی جدوجہد نے صرف ایک مضر صحت کیڑا دریافت کیا۔ اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ خنزیر کے گوشت میں کوئی اور ایسا مضر صحت جز نہیں ہے۔ جس کا انکشاف نہ ہوا ہو۔ شریعت الہیہ' جس نے ہزاروں سال پہلے' انسانی علم و آگہی سے بہت پہلے اس مضر صحت کو ممنوع قرار دیا' کیا اس بات کی مستحق نہیں ہے کہ اس پر کلی اعتماد کیا جائے۔ اس کے فیصلے کو قول فیصل سمجھا جائے اور اس کے حلال کردہ کو حلال اور اس کے حرام کردہ کو حرام قرار دیا جائے۔ اس لئے کہ یہ شریعت حکیم و خبیر خدا کی جانب سے نازل شدہ ہے۔

وہ چیزیں جن پر اللہ کے سوا دوسروں کا نام لیا گیا ہو۔ ان چیزوں کے مالکان نے انہیں غیر اللہ کی طرف موڑ دیا ہو۔ یہ چیزیں بھی حرام ہیں۔ اس لئے نہیں کہ ان چیزوں کی ذات میں حرمت کی کوئی وجہ ہے' محض اس لئے کہ ان چیزوں کا رخ غیر اللہ کی طرف کر دیا گیا ہے۔ مرکز توجہ بدل گیا' ضمیر خالص نہ رہا۔ روح پاک نہ رہی' دل اللہ کے لئے سالم نہ رہا اور عقیدہ و نظریہ پاک نہ رہا۔ یہ ہے وہ روحانی سبب جس کی وجہ سے ان چیزوں کا استعمال حرام قرار دیا گیا اور یہ بھی اسی طرح ناپاک ہوا' جس طرح مادی نجاست ناپاک ہوتی ہے۔ لہٰذا یہ بھی غیر طیب اور وہ بھی غیر طیب۔ چونکہ اسلام اس امر کی تاکید کرتا ہے کہ مسلمان تعظیم و تکریم کے ساتھ صرف بارگاہ الٰہی کی طرف متوجہ

ہوں اور اس میں کسی اور کو شریک نہ کریں' اس لئے ان چیزوں کو بھی اسی طرح نجس قرار دے کر نجس العین اشیاء کے ساتھ رکھا۔ کیونکہ یہ اشیاء نظریاتی طور پر ناپاک ہیں۔ا۔

پاکی قلب و نظر اور جسم و جگر ان تمام حرام کردہ چیزوں کے اسباب میں قدر مشترک ہے۔ چونکہ سابقہ آیات میں عقیدۂ توحید بیان ہوا تھا۔ مطلب یہ تھا کہ تمہارا خالق و رازق ایک ہے۔ یہاں کہا گیا کہ شارع اور مقنن بھی وہی ہے۔ رزق و خلق کا مصدر اور قانون و شریعت کا ماخذ ایک ہے۔ ان آیات میں یہ تصور ایک گہرا ربط پیدا کر دیتا ہے۔

اس حرمت کے باوجود اسلام بعض حالات و ضرورت کا خیال بھی رکھتا ہے۔ ایسے حالات میں محدود طور پر' ضرورت کی کم سے کم حد تک' ان محرمات کو جائز قرار دے دیتا ہے۔ لیکن ہدایت کرتا ہے کہ ضرورت کی حدود سے آگے ہرگز نہ بڑھا جائے۔ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۚ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ "ہاں جو شخص مجبوری کی حالت میں ہو اور وہ ان میں سے کوئی چیز کھا لے بغیر اس کے کہ وہ قانون شکنی کا ارادہ رکھتا ہو۔ یا ضرورت کی حد سے تجاوز کرے' تو اس پر کچھ گناہ نہیں اللہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔" استثناء کا یہ اصول بذاتہ تو عام ہے' لیکن یہاں یہ مذکورہ بالا محرمات پر متفرع ہے۔ لیکن ان محرمات کے علاوہ اس کا اطلاق دوسرے محرمات پر بھی ہو سکتا ہے۔ جہاں ایسی ضرورت ہو' جہاں زندگی خطرے میں ہو اور ان محرمات کے علاوہ کوئی اور چیز سامنے نہ ہو تو وہاں بھی کسی ممنوع چیز کو کم از کم ضرورت پورا کرنے کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ ضرورت کے مقامات کے بارے میں فقہاء کے درمیان فقہی اختلافات پائے جاتے ہیں' مثلاً کیا ضرورت کے مسئلے میں قیاس چلے گا یا محض منصوص ضرورت تک استفادہ محدود ہو گا؟ پھر ضرورت پوری کرنے کی مقدار کیا ہے؟ کم از کم استعمال ہے یا سیر ہو کر کھا لینا ہے؟ میں یہاں ان اختلافات کی تفصیلات میں جانا نہیں چاہتا۔ جو کچھ کہا گیا وہ فی ظلال القرآن کے لئے کافی ہے۔

جن چیزوں کو حرام یا حلال قرار دیا گیا تھا' ان کے بارے میں یہودیوں نے غوغا آرائی شروع کر دی تھی۔ جیسا کہ قرآن مجید نے دوسری جگہ صراحت کی ہے۔ بعض چیزیں ایسی بھی تھیں جو صرف یہودیوں پر حرام کی گئی تھیں۔ وَعَلَى الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِيْ ظُفُرٍ ۚ وَمِنَ الْبَقَرِ وَالْغَنَمِ حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ شُحُوْمَهُمَآ اِلَّا مَا حَمَلَتْ ظُهُوْرُهُمَآ اَوِ الْحَوَايَآ اَوْ مَا اخْتَلَطَ بِعَظْمٍ "اور جن لوگوں نے یہودیت اختیار کی ان پر ہم نے سب ناخن والے جانور حرام کر دیئے تھے' اور گائے اور بکری کی چربی بھی بجز اس کے جو ان کی پیٹھ یا ان کی آنتوں سے لگی ہوئی ہو یا ہڈی سے لگی رہ جائے۔" یہ چیزیں مسلمانوں کے لئے جائز تھیں۔ غالباً اس جواز پر وہ سخت معترض تھے۔ بعض روایات میں یہ بھی آیا ہے کہ ان کو ان چیزوں کی حرمت پر بھی اعتراض تھا جو یہاں حرام کر دی گئی ہیں حالانکہ یہ چیزیں تورات میں خود ان کے لئے بھی حرام بیان ہوئی تھیں۔ مطلب ان کا صرف یہ تھا کہ کسی نہ کسی طرح قرآنی احکامات کو مشکوک کیا جائے اور مسلمانوں کے دلوں میں یہ شبہ ڈال دیا جائے کہ حضور پر وحی من جانب اللہ آتی ہے یا نہیں۔

جو لوگ آسمانی کتابوں میں اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ احکامات کو چھپاتے ہیں ان پر ان آیات میں شدید ترین تنقید کی گئی ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ الْكِتٰبِ وَيَشْتَرُوْنَ بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۙ اُولٰٓئِكَ مَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ اِلَّا النَّارَ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ ۖ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۷۴﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ

ا۔ یاد رہے کہ اسلام معدہ اور جسم کی پاکی کے مقابلہ میں قلب و نظر کی پاکی کو زیادہ ملحوظ رکھتا ہے۔ (مترجم)

اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى وَ الْعَذَابَ بِالْمَغْفِرَةِ ۚ فَمَآ اَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ ۝ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ نَزَّلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ ۗ وَ اِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِي الْكِتٰبِ لَفِيْ شِقَاقٍۢ بَعِيْدٍ

"حق یہ ہے کہ جو لوگ ان احکام کو چھپاتے ہیں جو اللہ نے اپنی کتاب میں نازل کئے ہیں اور تھوڑے دنیوی فائدوں پر انہیں بھینٹ چڑھاتے ہیں' وہ دراصل اپنے پیٹ آگ سے بھر رہے ہیں۔ قیامت کے روز اللہ ہرگز ان سے بات نہ کرے گا' نہ انہیں پاکیزہ ٹھہرائے گا' اور ان کے لئے دردناک سزا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت کے بدلے ضلالت خریدی اور مغفرت کے بدلے عذاب مول لیا' کیسا عجیب ہے ان کا حوصلہ کہ جہنم کا عذاب برداشت کرنے کے لئے تیار ہیں۔ یہ سب کچھ اس وجہ سے ہوا کہ اللہ نے تو ٹھیک ٹھیک حق کے مطابق کتاب نازل کی تھی مگر جن لوگوں نے کتاب میں اختلافات نکالے وہ اپنے جھگڑوں میں حق سے بہت دور نکل گئے۔

کون لوگ تھے وہ جو اللہ کے نازل کردہ احکام کو چھپاتے تھے؟ سب سے پہلے ان سے مراد اہل کتاب ہیں۔ لیکن قرآن مجید کی اس آیت کے مفہوم میں ہر مذہب و ملت کے وہ لوگ شامل ہیں جو سوچنے سمجھنے کے باوجود حق کو چھپاتے ہیں۔ کیوں چند ٹکوں کی خاطر ان مفادات کی خاطر جو وہ کتمان حق کے نتیجے میں حاصل کرتے ہیں یا اس لئے کہ انہوں نے کچھ مفادات پیش نظر رکھے ہوتے ہیں اور اگر وہ حق بیان کریں تو یہ مفادات خطرے میں پڑ سکتے ہیں۔ یا ثمن قلیل سے مراد پوری دنیا ہے۔ کتمان حق سے یہ لوگ ثواب آخرت اور رضائے الٰی سے محروم ہو جاتے ہیں اور یہ ایک عظیم خسارہ ہے۔ اس کے مقابلے میں بے شک پوری دنیا ثمن قلیل ہے۔

کھانے پینے کے حلال و حرام اشیاء کے بیان کے سلسلے میں اعلان ہوتا ہے۔ مَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ اِلَّا النَّارَ وہ دراصل اپنے پیٹ میں آگ بھر رہے ہیں۔" حلال و حرام کے بیان کی مناسبت سے ان کے لئے یہ فقرہ استعمال کیا گیا۔ یعنی حق چھپاکر وہ جو قلیل اجرت لیتے ہیں اور اسے کھاتے ہیں' یہ دراصل ان کے پیٹ میں آگ ہوگی اور ان کا کھانا بھی آگ ہی ہوگی۔

انہوں نے حق کو چھپایا۔ اس کے تحت سزا ملے گی انہیں۔ انہیں قیامت کے دن ذلت اور اہانت کی حالت میں چھوڑ دیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ کی توجہ اور نظر کرم سے وہ محروم رہیں گے اور اس حالت زار' بے قدری اور ذلت کی تعبیر اللہ تعالیٰ ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

وَ لَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَ لَا يُزَكِّيْهِمْ "قیامت کے روز اللہ ہرگز ان سے بات نہ کرے گا اور نہ انہیں پاکیزہ ٹھہرائے گا۔" ان کے ساتھ کوئی بات نہ ہوگی' ان کا کوئی اہتمام نہ ہو گا' انہیں پاک نہ کیا جائے گا اور ان کی مغفرت بھی نہ ہوگی۔ اور انہیں مکمل طور پر نظرانداز کر دیا جائے گا۔ یہ اس لئے کہ اہل ایمان کی نظر میں ان کی سزا خوفناک ہو جائے اور صورت حال عام لوگوں کے حس و شعور کے قریب ہو جائے وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ "اور ان کے لئے دردناک سزا ہے۔" اور ایک دوسری زندہ تعبیر اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى وَ الْعَذَابَ بِالْمَغْفِرَةِ "یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت کے بدلے ضلالت خریدی اور مغفرت کے بدلے عذاب مول لیا۔ گویا یہ ایک خرید و فروخت ہے۔ جس میں یہ لوگ ہدایت سے روگردانی کرتے ہیں اور ضلالت خریدتے ہیں۔ مغفرت سے محروم ہوتے اور عذاب دائمی خریدتے ہیں۔ کس قدر ناسمجھ ہیں یہ لوگ جو اس قدر عظیم خسارے کا سودا کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان لوگوں نے ایک عظیم الشان برائی خرید لی ہے۔ ہدایت ان کے لئے عام تھی مگر انہوں نے اسے ترک کر کے ضلالت کو اختیار کر لیا۔ مغفرت کے مواقع انہیں فراہم تھے۔ مگر انہوں نے انہیں گنوا دیا اور عذاب کو اپنا لیا۔ فَمَآ اَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ "کیا عجیب ہے

ان کا حوصلہ کہ جہنم کا عذاب برداشت کرنے کے لئے تیار ہیں- اس کی طرف آگے بڑھ رہے ہیں- ان کے اس احمقانہ کام پر قدرت خندہ زن ہے-

انہوں نے سخت گھناؤنے جرم کا ارتکاب کیا ہے اور یہ اس کی پوری سزا ہے- اللہ تعالیٰ نے تو کتاب اس لئے بھیجی تھی کہ اسے لوگوں تک پہنچایا جائے' اسے اس زمین پر نافذ کیا جائے- اور وہ ان کا قانون ہو' ان کا نظام زندگی ہو' لیکن ان ظالموں نے اس کو چھپالیا- اسے چھپاکر میدان عمل سے خارج کر دیا- حالانکہ وہ ایک ایسی سچائی تھی جس پر عمل کرنے کی غرض سے بھیجا گیا تھا- ذٰلِكَ بِأَنَّ اللّٰهَ نَزَّلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ "یہ سب کچھ اس وجہ سے ہوا کہ اللہ نے تو ٹھیک ٹھیک حق کے مطابق کتاب نازل کی تھی-" اور جو لوگ اس کتاب پر ایمان لے آئے وہ ہدایت پر آگئے' حق کے ساتھی بن گئے' ان لوگوں کے ٹولے میں آگئے جو حق کے راہ یاب تھے- انہوں نے فطرت کائنات کا ساتھ دیا اور فطرت کے حقیقی اصولوں پر آگئے-

وَ اِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِي الْكِتٰبِ لَفِيْ شِقَاقٍ بَعِيْدٍ "مگر جن لوگوں نے کتاب میں اختلاف نکالے وہ اپنے جھگڑوں میں حق سے بہت دور نکل گئے-" ایسے لوگ حق سے دور جاچکے ہیں-

وہ اصول فطرت سے بھی ٹکراتے ہیں- وہ خود ایک دوسرے سے بلکہ خود اپنے نفس سے بھی ٹکراتے ہیں- وہ اس طرح تھے اور اسی طرح رہیں گے- یہی حال ہو گا ہر اس امت کا جو کتاب اللہ میں جھگڑے ڈالتی ہے- کتاب الٰہی کو پورے طور پر قبول نہیں کرتی- بلکہ اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتی ہے- ہر دور اور ہر زمانے میں' ہر امت اور ہر قوم کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا یہی سلوک ہے- جس دنیا میں ہم رہ رہے ہیں' اس آیت کا مصداق ہمیں اچھی طرح نظر آرہا ہے-

سب سے آخر میں ایک اور صرف ایک آیت میں ایمانی تصور زندگی کے تمام اصول رکھ دیئے جاتے ہیں- ایمانی طرز عمل کا معیار بیان کر دیا جاتا ہے اور بتایا جاتا ہے کہ قرآن کی رو سے نیک لوگوں کی صفات کیا ہیں؟

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَ الْمَغْرِبِ وَ لٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ الْمَلٰٓئِكَةِ وَ الْكِتٰبِ وَ النَّبِيّٖنَ وَ اٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَ الْيَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِيْنَ وَ ابْنَ السَّبِيْلِ وَ السَّآئِلِيْنَ وَ فِي الرِّقَابِ وَ اَقَامَ الصَّلٰوةَ وَ اٰتَى الزَّكٰوةَ وَ الْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا وَ الصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَ الضَّرَّآءِ وَ حِيْنَ الْبَاْسِ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ﴿۱۷۷﴾

"نیکی یہ نہیں ہے کہ تم نے اپنے چہرے مشرق کی طرف کر لئے یا مغرب کی طرف' بلکہ نیکی یہ ہے کہ آدمی اللہ کو اور یوم آخر اور ملائکہ کو اور اللہ کی نازل کی ہوئی کتاب اور اس کے پیغمبروں کو دل سے مانے اور اللہ کی محبت میں اپنا دل پسند مال رشتے داروں اور یتیموں پر' مسکینوں اور مسافروں پر' مدد کے لئے ہاتھ پھیلانے والوں پر اور غلاموں کی رہائی پر خرچ کرے' نماز قائم کرے اور زکوٰۃ دے اور نیک وہ لوگ ہیں کہ جب عہد کریں' تو وفا کریں اور تنگی اور مصیبت کے وقت میں اور حق و باطل کی جنگ میں صبر کریں- یہ ہیں راست باز لوگ

اور یہی متقی ہیں۔" صحیح بات یہ ہے کہ یہ آیت بھی تحویل قبلہ کے احکام اور ان پر یہودیوں کے طویل اعتراضات و جوابات کے ساتھ مربوط ہیں۔ تحویل قبلہ کی حکمت کے بارے میں تو ہم اس سے پہلے بیان کر آئے ہیں۔ یہاں اللہ تعالیٰ عبادات اور شعائر دین کی ظاہری شکل و صورت کے بارے میں یہودیوں کی ظاہر بینی اور تقشف پرستی کو بے نقاب کرتے ہوئے' حسن و قبح کا ایک عظیم معیار اور نیکی اور بدی کی اصلی حقیقت بیان کر رہے ہیں۔ کیونکہ یہودی ان ظاہری امور کے بارے میں بے حد حساس تھے اور جھگڑتے تھے۔

تحویل قبلہ یا تمام عبادات میں غرض و غایت یہ نہیں کہ لوگ مشرق کی طرف رخ کریں یا مغرب کی طرف چہرہ کر کے عبادت سرانجام دیں۔ بیت المقدس کی طرف رخ کریں یا مسجد حرام کی طرف۔ یا یہ کہ عبادات کی موجودہ شکل و صورت ہی عین خیر و بھلائی نہیں ہے۔ بلکہ ان کے لئے بہت ضروری ہے کہ دل کے اندر محسوس کیا جانے والا تصور اور اسلامی نظریۂ حیات کا زندہ شعور ضروری ہے۔ ان ذہنی امور کے ساتھ ساتھ مخصوص طرز عمل اپنانا بھی ضروری ہے۔ ورنہ نیکی و بھلائی کے حصول اور حسن و خیر کو بروئے کار لانے کا اصل مقصد پورا نہ ہو سکے گا۔ نیکی دراصل ایک تصور ہے' ایک شعور ہے' کچھ اعمال ہیں' ایک طرز عمل ہے۔ یہ ایک تصور حیات ہے۔ جو ایک فرد اور ایک جماعت کے ضمیر پر اثر انداز ہو' وہ ایک عمل ہے جو فرد و جماعت کی زندگیوں میں پسندیدہ اثرات پیدا کرے۔ صرف مشرق و مغرب کی طرف سے رخ پھیر دینے سے زندگی میں یہ انقلاب کیونکر آسکتا ہے۔ منہ کوئی ادھر کرے یا ادھر کرے' فرق کیا پڑتا ہے۔ اصل مقصد تو رجوع قلب ہے۔ جو اللہ کے احکام مانتا ہے' منزل پالیتا ہے۔ یہی معاملہ ہے تمام دینی شعائر کی ظاہری شکل و صورت کا' جنہیں یہ ادا کرتے ہیں۔ وَلَٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالْكِتَابِ وَالنَّبِيِّينَ "بلکہ نیکی یہ ہے کہ آدمی اللہ کو اور یوم آخر اور ملائکہ کو اور اللہ کی نازل کی ہوئی کتاب اور اس کے پیغمبروں کو دل سے مانے۔"

یہ ہے بھلائی کا وہ معیار جو تمام بھلائیوں کا مجموعہ ہے۔ اس معیار میں نیکی کی جو اقدار مقرر کی گئی ہیں وہ بہت ہی وزنی ہیں۔ اللہ پر ایمان' یوم آخر پر ایمان' اور ملائکہ و کتب اور انبیاء پر ایمان کی قدر و قیمت اسلامی نقطۂ نظر سے کیا ہے؟

اللہ پر ایمان لانا انسانی زندگی میں ایک نقطۂ انقلاب ہے۔ اس کے ذریعے انسان مختلف قوتوں' مختلف چیزوں اور مختلف پسندیدہ تصورات کی بندگی اور غلامی سے آزاد ہو جاتا ہے۔ اور صرف ایک بندگی اور ایک غلامی قبول کر لیتا ہے۔ یوں انسان تمام دوسرے انسانوں کے ساتھ' ایک ہی صف میں کھڑا ہو کر' ایک ہی معبود کے سامنے جھک کر' اخوت و مساوات کا بلند مقام حاصل کر لیتا ہے۔ ایمان وہ مقام ہے جہاں طوائف الملوکی کی بجائے ایک نظام قائم ہوتا ہے۔ انتشار کی جگہ یکسوئی اور اختلاف کی جگہ اتحاد قائم ہو جاتا ہے نیز گمراہی کے بجائے ایک اونچا نصب العین سامنے آجاتا ہے۔ اگر انسان کے دل میں ایک واحد لاشریک خدا پر ایمان نہ ہو تو' اس دنیا میں اس کا کوئی نصب العین نہیں ہوتا' جس پر دلجمعی کے ساتھ اپنی قوتوں کو مرتکز کر سکے اور جس پر مساوات کے ساتھ وہ مجتمع ہو سکے۔ بعینہ اس طرح جس طرح وجود کائنات ایک نقطہ کے اردگرد مرتکز ہے۔ اس کے اجزا کا باہمی ربط ہے۔ اور ان کے مابین واضح نسبت موجود ہے۔ اور جس کے مختلف اجزاء کے باہمی علائق اور مقاصد بالکل واضح اور معلوم اور مربوط ہیں۔

آخرت پر ایمان کا مقصد یہ ہے کہ انسان جزا و سزا میں اللہ تعالیٰ کی عدالت کو یقین کے ساتھ تسلیم کرے۔ یہ جانے کہ اس کرۂ ارض پر انسان کو یونہی بے مقصد نہیں پیدا کیا گیا۔ وہ غیر ذمہ دار نہیں ہے بلکہ اسے حساب دینا ہو گا اگر کوئی بھلائی کرے تو وہ ختم نہیں ہو سکتی اگرچہ اس کی جزا اس دنیا میں نہ ملے۔ ملائکہ پر ایمان بھی غیب پر ایمان کا ایک حصہ ہے۔ انسانی فہم و ادراک اور ایک حیوان کے فہم و ادراک میں یہی فرق ہے۔ انسانی تصور حیات اور حیوانی تصور حیات میں یہی فرق ہے کہ انسان محسوسات سے آگے کی بھی بعض چیزوں پر ایمان لاتا ہے اور ان کا ادراک کر سکتا ہے۔ جبکہ حیوان کا احساس صرف محسوسات کے دائرے تک محدود ہوتا ہے (!) کتاب اور نبیوں پر

ایمان کا مقصد یہ ہے کہ انسان تمام رسولوں پر ایمان لائے بلاتفریق۔ یعنی انسانیت بھی ایک ہے اور ہمارا اس پر ایمان ہے۔ اس کا خدا بھی ایک ہے۔ اس کے لئے دین اور نظام زندگی بھی ایک ہے۔ اس طرح مومن انبیاء و رسل کے اعلیٰ خیالات کا وارث ہو جاتا ہے۔ لہٰذا کتب و رسل پر ایمان ایک مومن کو بہت ہی قیمتی شعور عطا کرتا ہے۔

مال کے ساتھ انسان کو بڑی محبت ہے لیکن مالی قربانی کرنے کی بھی بڑی اہمیت ہے۔ غریب رشتہ داروں' یتیموں' مسکینوں' مسافروں اور گردن چھڑانے اور غلامی سے نجات دلانے کے لئے مال خرچ کرنا یہ سبھی کام انسان کو بلند مرتبہ بناتے ہیں۔

انفاق فی سبیل اللہ کا اثر یہ ہوتا ہے کہ انسان لالچ' خود غرضی اور بخل کے بندھنوں سے آزاد ہو جاتا ہے۔ مال کی محبت ہاتھوں کو انفاق سے کھینچ لیتی ہے۔ انسان بلند ہمتی' اولوالعزمی' جود و سخا اور داد و دہش کے مقام بلند سے گر جاتا ہے اور روح انسانی میں کشادگی نہیں رہتی۔ اسلامی نظام میں انفاق کا ایک روحانی مقام ہے۔ اس لئے یہاں مسلمانوں کو حکم دیا جاتا ہے کہ مال کی محبت کے باوجود اپنا محبوب ترین اور پسندیدہ ترین مال کو دل و جان کی آمادگی اور کشادگی کے ساتھ خرچ کریں۔ اس کی بڑی روحانی اہمیت ہے اور اس طریقہ سے مومن اپنے آپ کو دولت کی پوجا اور دولت کی غلامی سے چھڑا لے گا۔ دولت کی پوجا سے انسان بالیقین ذلیل ہو جاتا ہے۔ سرفرازی کی بجائے سرنگوں ہوتا ہے اور انفاق سے وہ لالچ اور حرص کی غلامی سے آزاد ہو جائے گا۔ اسلامی نقطۂ نظر سے سرنگوں ہونے کے بجائے وہ گردن فراز ہو جائے گا لیکن اگر وہ انفاق نہ کرے گا تو ذلیل ہو گا۔ اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے کی بہت بڑی قدر و قیمت ہے۔ کیونکہ اسلامی نظام کی غایت یہ ہے کہ وہ انسان کو سب سے پہلے نفسیاتی پریشانیوں' اخلاقی کمزوریوں اور طمع و لالچ سے نجات دلائے۔ یہ کام انسان کے لئے معاشرتی آزادی سے بھی پہلے کیا جاتا ہے۔ شخصی و سیاسی آزادی سے بھی پہلے کیوں؟ اس لئے کہ جو شخص اپنے نفس کا غلام ہو وہ بسہولت طاغوت کی غلامی کے لئے بھی تیار ہوتا ہے۔ لیکن جو شخص خواہشات نفسانیہ کے قید و بند سے آزاد ہو جاتا ہے وہ اپنے معاشرے اور سوسائٹی میں بھی آزاد ہوتا ہے۔ کسی کی غلامی کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ انسانی معاشرے میں انفاق فی سبیل اللہ کی ایک معاشرتی قدر و قیمت بھی ہے۔ اقرباء سے صلہ رحمی کی وجہ سے نفس انسانی میں مروت پیدا ہوتی ہے' خاندان میں شرافت کا چلن فروغ پاتا ہے اور اقرباء کے درمیان تعلقات زیادہ قوی ہو جاتے ہیں۔ اسلامی معاشرے کی اساس خاندان پر ہے اس لئے یہاں انفاق فی سبیل اللہ کے ذریعہ خاندانی نظام کو مضبوط کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ پھر یتیموں کی مالی امداد کا حکم ہے۔ اس کا مقصد اصل معاشرہ میں امیر و غریب' طاقتور اور کمزور کے درمیان نظام کفالت کا قیام ہے۔ یتامیٰ مادری اور پدری شفقت سے محروم ہو جاتے ہیں۔ ان کے لئے ایسا انتظام کیا گیا ہے کہ ان کے احساس محرومیت کی تلافی کی جائے۔ پھر اس تکافل کے نتیجے میں پوری سوسائٹی کو ان خودرو شتر بے مہار اور غیر تربیت یافتہ افراد کی کثرت سے بھی بچایا گیا ہے۔ جو معاشرے کے لئے مسائل پیدا کرتے ہیں۔ اس کے لئے وبال جان بن جاتے ہیں اور فتنہ سامانیوں کا موجب بنتے ہیں۔ ایسے لوگ آگے جاکر معاشرے کی لاپروائی اور بے مروتی کا خوب انتقام لیتے ہیں۔ (۲) مساکین پر انفاق جن کے پاس وسائل زندگی نہیں ہیں۔ پھر بھی وہ خاموش بیٹھے ہیں۔ عزت نفس رکھتے ہیں اور سوال نہیں کرتے۔ یہ انفاق ان کی عزت نفس کے لئے محافظ ہے۔ انہیں تباہی سے بچاتا ہے۔ نظام انفاق سے اسلامی معاشرے میں' ایسے حضرات کے دلوں میں اجتماعی کفالت اور ضمانت کا شعور پیدا ہوتا ہے۔ اسلامی معاشرہ تو ہوتا ہی وہ ہے جس میں کسی فرد کو بے یار و مددگار نہ چھوڑا جائے اور اس کے کسی عضو کو ضائع ہونے نہ دیا جائے۔ ابن سبیل (مسافر) جو اپنے خاندان سے دور ہو' جن کے پاس وسائل موجود نہ ہوں' اچانک مصیبت میں گرفتار ہو جائے۔ خاندان کے افراد اس سے دور ہوں' ایسے حالات میں یہ مسافر بھی مصیبت زدہ ہے۔

(۱) تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو سورۂ بقرہ کی ابتدائی آیات۔ (۲) آج کے مغربی ترقی یافتہ معاشرہ کے لئے ایسے ہی لوگ وبال جان بنے ہوئے ہیں۔ (مترجم)

یہ انفاق اس کے لئے ایک قسم کی ہنگامی امداد ہے۔ اس امداد سے اسے یہ شعور دیا جاتا ہے کہ پوری انسانیت اس کا خاندان ہے۔ ہر ملک اس کا ملک ہے' ہر جگہ اس کا خاندان موجود ہے 'مسلمان اس کے اہل خاندان ہیں۔ ہر جگہ اس کے اپنے مال کے بدلے اس کے لئے مال موجود ہے۔ اس کے لئے صلہ رحمی موجود ہے۔ اور اس کے لئے آرام کا سامان فراہم ہو سکتا ہے۔ سائلین پر انفاق ضروری ہے تاکہ ان کی ضرورت پوری ہو' وہ آئندہ سوال کرنا چھوڑ دیں۔ اسلام بھیک مانگنے کو ناپسند کرتا ہے۔ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ جس کے پاس بقدر کفالت موجود ہو اس کے لئے سوال جائز نہیں ہے۔ جو کام کاج کر سکتا ہے' اس کے لئے بھی سوال جائز نہیں ہے۔ ایسے شخص کے لئے خدا کا حکم یہ ہے کہ وہ مزدوری کرے' بھیک نہ مانگے یا قناعت کرے' دست سوال دراز نہ کرے' بھیک مانگنا تب جائز ہے جب کام نہ ہو' مال نہ ہو' اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہ ہو۔

غلامی سے چھڑانے میں انفاق بھی ایک مد ہے۔ جو بدقسمت اپنی بدعملی کی وجہ سے غلام ہو گیا' اس نے اسلام کے خلاف تلوار اٹھائی۔ جنگ کے نتیجے میں اس کی آزادی ختم ہو گئی۔ اسے عارضی طور پر معاشرے میں مقام شرافت سے محروم کر دیا گیا۔ اس پر انفاق یوں ہو گا کہ اس کو خرید کر آزاد کر دیا جائے یا غلام اپنے آقا سے معاہدۂ آزادی کرے اور اسے رقم معاہدہ ادا کرنے کا پابند ہو۔ اسلام نے غلاموں کے لئے یہ قانون بنایا تھا کہ غلام جس وقت چاہتا مالک کے ساتھ ایک معاہدہ آزادی کرتا ہے اور آزاد ہو جاتا ہے۔ اس معاہدے کے مطابق اسے وہ رقم ادا کرنی ہوتی ہے جو طے پا جائے۔ (ایسے معاہدہ کے بعد غلام) اپنے کام کی اجرت وصول کرنے کا مستحق ہو جاتا ہے جو معاہدے کی رقم میں کٹتی رہتی ہے۔ علاوہ ازیں وہ مستحق زکوٰۃ ہو جاتا۔ اسی طرح انفاق فی سبیل اللہ کی تمام مدات میں سے اس کی امداد کی جاسکتی تھی تاکہ وہ جلد از جلد رقم معاہدہ ادا کر کے آزادی کی نعمت سے سرفراز ہو جائے۔

اقامت صلوٰۃ

نیکی کے اس معیار میں نماز کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ اور اقامت صلوٰۃ صرف مشرق و مغرب کی طرف چہرہ کر کے کھڑے ہو جانے سے اقامت کا مفہوم ادا نہیں ہو جاتا۔ یہ نقطہ وسیع تر مفہوم رکھتا ہے۔ جو یہ ہے کہ انسان کا ظاہر و باطن اور اس کی عقل و روح سب پوری طرح اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو جائیں۔ نماز نہ تو محض جسمانی ورزش کا نام ہے اور نہ ہی صرف صوفیانہ ورد و وظائف کا نام ہے۔ نماز دراصل اسلام کے بنیادی فکر و نظر کی عکاس ہے۔ اسلام اس حقیقت کا اعتراف کرتا ہے کہ انسان اس ایک وجود میں جسم' روح اور عقل تین چیزوں کا اجتماع ہے۔ اسلام اس بات کا بھی قائل نہیں ہے کہ ان تین طاقتوں کی سرگرمیوں اور دائرہ عمل میں باہمی کوئی تضاد پایا جاتا ہے۔ وہ جسم کو فنا کر کے روح کو آزاد کرنا جائز نہیں سمجھتا۔ کیونکہ روحانی آزادی کے لئے جسمانی فنا یا جسم کو مارنا لازمی نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے' اپنی سب سے اہم اور بڑی عبادت یعنی نماز میں ان تینوں طاقتوں کی سرگرمی کو ہم آہنگ کر دیا ہے۔ نماز میں تینوں قوتیں مکمل نظم کے ساتھ اپنے خالق کی طرف متوجہ ہو جاتی ہیں۔ قیام' رکوع اور سجدہ وہ جسمانی حرکات ہیں جو روح کو رجوع الی اللہ کی طرف راغب کرتی ہیں۔ قرآن کی تلاوت' اس میں غور و فکر اور مفہوم کو سمجھنا عقل کا کام ہے اور اس پورے عرصے میں عقل انسانی اس کام میں مصروف ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی عزت توجہ اور مکمل تسلیم و رضا اور عجز و انکسار روح کا کام ہے اور اس طرح یہ تینوں قوتیں ایک ہی وقت میں مصروف کار ہوتی ہیں۔ غرض اس معنی میں اقامت صلوٰۃ پوری اسلامی طرز فکر کی نمائندہ ہے۔ اور وہ چشم بینا کو یہ سبق یاد دلاتی ہے کہ پوری زندگی کے متعلق اسلام کا نقطہ نظر کیا ہے؟ ہر نماز اور ہر نماز کی ہر رکعت میں ہم یہ سبق دہراتے ہیں۔

زکوٰۃ کی ادائیگی

یہ اسلامی نظام میں غرباء و مساکین کے لئے اغنیاء اور اہل ثروت کی دولت پر عائد کردہ' ایک اسلامی ٹیکس ہے۔ یہ ٹیکس اللہ تعالیٰ نے عائد کیا ہے۔ دراصل اللہ تعالیٰ ہی دولت کا حقیقی مالک ہے۔ بندے کو اس کا مجازاً مالک بنایا گیا ہے۔ اور اس لئے اسلامی نقطۂ نظر سے اس پر کچھ شرائط عائد کی گئی ہیں اور ان میں سے اہم اور لازمی شرط ادائیگی زکوٰۃ ہے۔ زکوٰۃ کی ادائیگی کا ذکر عام انفاق فی سبیل اللہ کے عام حکم کے بعد کیا گیا ہے۔ جس کا ذکر اوپر ہو گیا ہے کہ دولت محبت کے باوجود اقرباء وغیرہ پر صرف کی جائے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ زکوٰۃ مذکورہ بالا تمام صرف مال اور انفاق فی سبیل اللہ سے علیحدہ ایک مستقل مد ہے۔ یہ لازمی ٹیکس اور منصوص فرض ہے۔ جب کہ عام انفاق فی سبیل اللہ صرف ترغیب ہے۔ لیکن نیکی کا یہ مجموعی معیار جس کا اس آیت میں ذکر ہوا ہے' اس وقت تک مکمل نہ ہو گا جب تک ان دونوں مدات پر حسب حساب و حسب توفیق عمل نہ کیا جائے۔ یہ دونوں مدیں اسلام کے بنیادی عناصر ترکیبی ہیں۔ قرآن نے زکوٰۃ کو علیحدہ اس لئے بیان کیا ہے کہ یہ ایک لازمی اور فرض مد ہے' جب کہ مذکورہ بالا دولت کا عام خرچ نفلی ہے۔ لیکن ہر انسان کی زندگی میں دونوں کا پایا جانا ضروری ہے۔ ایک پر عمل کرنے سے دوسرا ہرگز ساقط نہیں ہو سکتا۔

وفائے عہد

یہ اسلام کی وہ علامت ہے جس کی حفاظت میں اسلام بے حد کوشش کرتا ہے۔ قرآن کریم میں بار بار اس کا تذکرہ ہوتا ہے۔ اسے ایمان کی نشانی گردانا گیا ہے۔ اسے احسان اور آدمیت کی نشانی قرار دیا گیا ہے اور یوں اس کی بہت زیادہ اہمیت ہے۔ ایک انسان اور انسان کے تعلقات میں ایک فرد اور جماعت کے تعلقات میں' ایک قوم اور دوسری قوم کے تعلقات میں اعتماد اور اطمینان پیدا کرنے کے لئے وفائے عہد نہایت ہی ضروری ہے۔ وفائے عہد کی خشیت اول خود ذات باری تعالیٰ سے اپنے عہد کی وفا ہے۔ اگر ایک مستحق اپنے مالک کا وفادار نہ ہو تو ہمیشہ پریشان اور غیر مطمئن رہے گا اور کوئی عہد پورا نہ کر سکے گا۔ وہ کسی میثاق پر جم نہ سکے گا۔ کسی انسان پر اعتماد نہ کریگا۔

دوستوں اور دشمنوں کے ساتھ' وفائے عہد میں اسلام اس مقام بلند تک پہنچا ہے کہ جس کی مثال پوری انسانی تاریخ میں اور کہیں نہیں ملتی۔ کوئی قوم' کوئی امت بھی اس مقام بلند تک نہیں پہنچ سکی۔ یہ مقام انسانیت کو اسلام کے سایہ اور اسلامی نظریۂ حیات کی روشنی ہی میں معلوم ہوا۔

حق و باطل کی کشمکش میں صبر

صبر وہ وصف ہے جو انسان کو مصائب برداشت کرنے کے قابل بناتا ہے۔ اسلام کا مقصد یہ ہے کہ کوئی مشکل مرحلہ آئے تو انسان بہت ہمت سے اس کا مقابلہ کرے۔ مصیبت کے وقت آہیں بھرنا شروع نہ کر دے۔ سختیوں میں جزع و فزع شروع نہ کر دے۔ صبر اور مصابرت اور تحمل و ثبات اسی کا نام ہے۔ صبر مضبوطی سے حق کو پکڑ لینے کا نام ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مصائب کے بادل چھٹ جاتے ہیں۔ مصیبت دور ہو جاتی ہے اور مشکلات کے بعد آسانیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ یہ اللہ کی مرضی کو قبول کرنا ہے' اس سے پر امید ہونا' اس پر اعتماد کرنا ہے۔ وہ امت جسے پوری انسانیت کی امامت اور نگرانی کا مقام دیا گیا ہو' جسے دنیا میں عدل قائم کرنا ہے اور پوری انسانیت کی اصلاح کا فرض ادا کرنا ہے' اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ دولت صبر سے مالا مال ہو۔ مشکلات درپیش ہوں' اس کی راہ میں بڑی بڑی رکاوٹیں کھڑی ہوں۔ اسے تنگیوں' مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑے۔ باطل کے ساتھ کشمکش برپا ہو اور شدید سے شدید تر حالات پیش آئیں تو

صبر و استقامت ہی اس کا سب سے بڑا ہتھیار ہو۔ مصیبت اور غربت میں صبر' جسمانی ضعف اور بیماری میں صبر افراد کی قلت اور کمزوری پر صبر' محاصرے اور مجاہدے میں صبر' غرض ہر حال میں صبر اور ہر آن میں صبر۔ صرف یہی ایک صورت ہے جس میں یہ امت اپنا عظیم فرض منصبی ادا کر سکتی ہے۔ وہ اپنے منصوبے کو پورا کر سکتی ہے۔ بصورت دیگر اسے کامیابی حاصل نہ ہو گی۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں تنگی و مصیبت اور حق و باطل کی کشمکش میں صبر کرنے والوں کو لفظ الصابرین (حالت نصبی) سے مخاطب کیا ہے۔ جس سے لفظ "خاص کر" کا اظہار ہوتا ہے۔ اس سے پہلے جن صفات کا ذکر ہوا ہے وہ حالت رفعی (مستقل جملوں) میں ہیں لیکن اس صفت کو حالت منصبی (مفعول ہے اور فعل محذوف ہے) میں ذکر کیا ہے۔ مطلب ہے (میں صابرین کو مخصوص طور پر بیان کرتا ہوں' نیکی اور بھلائی کی صفات کے ذکر کے ضمن میں یہ ایک خاص اشارہ ہے اور اس کا اپنا ایک مخصوص وزن اور ایک خاص اہمیت ہے' یعنی اللہ پر ایمان فرشتوں پر ایمان' کتابوں پر ایمان' نبیوں پر ایمان' مال کا خرچ کرنا' نماز قائم کرنا' زکوٰۃ ادا کرنا۔ اور وفائے عہد کی تمام صفات میں سے صفت صبر اور اس کے حاملین الصابرین کو زیادہ اہمیت حاصل ہے' اللہ کے ہاں ان کی سب سے زیادہ قدر ہے۔ صابرین کا مقام سب سے زیادہ بر تر و بلند ہے۔ صابرین کے اس مقام بلند کو دیکھ کر تمام لوگوں کی نگاہیں اس طرف اٹھ جاتی ہیں۔[۱]

ذرا دیکھئے ایک ہی آیت میں نظریہ و عقیدہ کے اصول' جسمانی فرائض اور مالی ذمہ داریوں اور دولت کے واجبات کو بیان کر دیا گیا ہے۔ نظریہ و حقیقت کو ایک کر دیا گیا۔ ایسی اکائی کی صورت میں جس کو ٹکڑے نہ کیا جا سکتا ہو' جس کے اجزاء ایک دوسرے سے کبھی جدا نہ ہو سکیں اور زندگی کے ان مختلف شعبوں کا عنوان صرف ایک ہے (نیکی)۔ بعض احادیث میں نیکی کو عین ایمان کہا گیا ہے۔ غرض یہ آیت اسلامی تصور حیات کا مکمل خلاصہ ہے۔ اسلامی نظام زندگی کے اصول اس میں یکجا ہو گئے ہیں۔ یہ سب ضروری اصول ہیں ایک دوسرے کے متکامل ہیں۔ اور ان کے بغیر اسلامی نظام کا قیام ہرگز نہیں ہو سکتا۔

جن لوگوں کی صفات یہ ہوں' ان کا مقام بھی یہاں آخر میں بطور نتیجہ بیان کر دیا جاتا ہے۔ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ صَدَقُوا ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ (۱۷۷) "یہ ہیں راست باز لوگ اور یہ ہیں متقی۔"

یہی لوگ ہیں جنہوں نے اپنے اسلام میں' اپنے رب کے ساتھ بالکل سچ کہا۔ وہ ایمان و اعتقاد میں بھی سچے ہیں اور اپنے ایمان و اعتقاد کو اپنی زندگی میں عملی شکل دینے میں بھی وہ بالکل سچے ہیں۔ یہی لوگ دراصل متقی ہیں جو اپنے رب کے ساتھ جڑ جاتے ہیں' اس سے ڈرتے ہیں۔ وہ احساس ذمہ داری اور شعور کے ساتھ اپنے فرائض سرانجام دیتے ہیں۔

ان آیات کے درمیان سے ذرا جھانک کر دیکھیں' ہمیں ایک بلند افق نظر آئے گا۔ ایک بلند مقام عزت نظر آئے گا۔ یہ وہ مقام ہے جہاں تک اللہ تعالیٰ' انسانیت کو اپنے تجویز کردہ اعلیٰ ترین نظام حیات کے ذریعے سرفراز کرنا چاہتا ہے۔ اور پھر ہم ذرا لوگوں کی حالت زار پر نظر ڈالیں' تو وہ اس نظام سے دور بھاگتے ہیں۔ اس سے پہلو تہی کرتے ہیں۔ اس کا مقابلہ کرتے ہیں' بلکہ اس کے ساتھ دشمنی کرتے ہیں۔ اور اس کے ماننے والے کے جانی دشمن ہو جاتے ہیں۔ جب ہم یہ سب کچھ دیکھتے ہیں تو ہاتھ ملتے رہ جاتے ہیں اور جس طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا اسی طرح کہنا پڑتا ہے۔ یا حسرۃ علی العباد۔

اور پھر ہم نصب العین کے اس افق بلند پر دوبارہ نظر ڈالتے ہیں۔ یاس و حسرت کی یہ کیفیت فوراً رفو ہو جاتی ہے۔ امید کی کرن نظر آتی ہے۔ اللہ پر پختہ یقین پیدا ہو جاتا ہے۔ اسلامی نظام زندگی کی قوت اور برتری پر غیر متزلزل یقین پیدا ہو جاتا ہے اور جب اپنے مستقبل پر نظر ڈالتے ہیں تو افق پر امید کی کرن موجود پاتے ہیں۔ وہ روشن تر اور واضح تر ہے۔ ضروری ہے کہ اس طویل تھکاوٹ اور مصائب نے ایک بار پھر اسلامی نظام زندگی پر ان کا یقین پختہ کر دیا ہو۔ امید ہے اس اعلیٰ و ارفع نظام کی طرف انسانیت ایک بار پھر بڑھے گی اور یہ مان لے گی کہ اللہ ہی مستعان ہے وہی معین و مددگار ہے۔

---

(۱) اس سلسلے میں دیکھئے آیات یاایھا الذین امنوا استعینوا بالصبر والصلوۃ کی تفسیر ملاحظہ فرمائیں۔

درس ۱۱ ایک نظر میں

اس سبق میں مدینہ طیبہ کے نوزائیدہ اسلامی معاشرہ کے بعض اجتماعی معاملات کی شیرازہ بندی کی گئی ہے۔ ساتھ ساتھ بعض عبادات جیسے فرض عبادات کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ یہاں یہ دونوں چیزیں اس سورت کے ایک ہی ٹکڑے میں باہم ضم کر دی گئی ہیں۔ دونوں قسم کی تعلیمات کے درمیان رابطہ تقویٰ اور خوف خدا کو بنایا گیا ہے' جہاں اجتماعی معاملات کی شیرازہ بندی کے آخر میں بار بار تقویٰ اور خوف خدا کا ذکر ہے وہاں عبادات مفروضہ کے آخر میں بھی تقویٰ' شکر اور خشیت اللہ پر زور دیا گیا ہے' اور پھر اس سبق کو آیات بر کے بعد لایا گیا ہے' جو ایمانی تصورات زندگی' ایمانی طرز عمل اور اسلامی طریق کار پر مشتمل ہے۔ اور جس میں نیکی اور تقویٰ کا اعلیٰ معیار بیان ہوا ہے۔

اس سبق میں' مقتولین کے قصاص کے احکام بیان کئے گئے ہیں اور اس سلسلے میں ضروری قانون سازی کی گئی ہے۔ موت کے وقت وصیت کے احکام' روزے کی فرضیت کے احکام اور دعا' اعتکاف کے احکام بیان ہوئے ہیں اور آخر میں مالی واجبات کی ادائیگی کے احکام بیان کئے گئے ہیں۔

احکام قصاص کے بیان کے بعد خاتمہ کلام تقویٰ پر کہا گیا وَ لَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ "عقل و خرد رکھنے والو! تمہارے لئے قصاص میں زندگی ہے۔" اسی طرح جب وصیت کے احکام بیان ہوئے تو بات پھر تقویٰ ہی پر ختم ہوتی ہے۔ كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ اِنْ تَرَكَ خَيْرَا ۖۚ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَ الْاَقْرَبِيْنَ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ "تم پر فرض کیا گیا ہے کہ جب تم میں کسی کی موت کا وقت آئے اور وہ اپنے پیچھے مال چھوڑ رہا ہو' تو والدین اور رشتہ داروں کے لئے معروف طریقے سے وصیت کرے۔ یہ حق ہے متقی لوگوں پر۔"

اب روزے کی فرضیت کے حکم کا مطالعہ کریں۔ اس کے آخر میں بھی بتایا گیا ہے کہ یہ فرض ہی اس لئے ہوا ہے کہ تم متقی بن جاؤ۔ اے لوگو جو ایمان لائے ہو' تم پر روزے فرض کر دیئے گئے ہیں' جس طرح تم سے پہلے انبیاء کے پیروؤں پر فرض کئے گئے تھے۔ اس سے توقع ہے کہ تم میں تقویٰ کی صفت پیدا ہو جائے۔ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ

احکام روزہ کے آخر میں اعتکاف کے احکام ہیں اور ان کے بعد بھی آخری نتیجہ تقویٰ ہی ہے۔ یہ اللہ کی باندھی ہوئی حدیں ہیں۔ ان کے قریب نہ پھٹکنا۔ اس طرح اللہ اپنے احکام لوگوں کے لئے بصراحت بیان کرتا ہے۔ توقع ہے کہ وہ غلط رویے سے بچیں گے۔

تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ

اس کے علاوہ اس سبق میں اختتام مضمون پر جو تبصرے کئے گئے ہیں ان میں سے کوئی بھی تقویٰ اور دلوں میں اللہ تعالیٰ کا خوف اور جلالت شان کا شعور پیدا کرنے کے مضامین سے خالی نہیں ہے۔ مثلاً ایک جگہ کہا گیا اور جس ہدایت پر اللہ تعالیٰ نے تمہیں سرفراز کیا ہے' اس پر اللہ کی کبریائی کا اظہار و اعتراف کرو اور شکر گزار بنو۔ وَ لِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ وَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ دوسری جگہ ہے فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ وَ لْيُؤْمِنُوْا بِيْ لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ لہٰذا انہیں چاہئے کہ میری دعوت پر لبیک کہیں اور مجھ پر ایمان لائیں شاید کہ وہ راہ راست پالیں۔ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ "بے شک اللہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ "بے شک بخشنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔"

غرض اس پورے متن میں تسلسل کے ساتھ تقویٰ کا ذکر ہے جس سے ایک نظر میں دین کی حقیقت تک رسائی ہو جاتی ہے اور اندازہ ہو جاتا ہے کہ دین ایک ایسی اکائی ہے جس کے اجزا ایک دوسرے سے الگ نہیں ہو سکتے۔ اس کا اجتماعی نظام' اس کے قانونی اصول' اس کی رسوم عبادت' سب کی سب صرف ایک ہی عقیدہ اور ایک ہی نظریہ کے سرچشمے سے پھوٹتے ہیں۔ یہ سب شعبے صرف ایک ہی تصور حیات سے نکلتے ہیں اور یہ تصور حیات نظریۂ اسلام سے ابھرتا ہے۔ یہ سب شعبے ایک ہی رسی میں بندھے ہوئے ہیں اور ان کا آخری نقطہ ارتکاز اللہ ہے۔ سب کی غرض و غایت ایک ہی ہے' یعنی بندگی۔ صرف خدائے واحد کی' جس نے پیدا کیا' جس نے رزق دیا' جس نے انسان کو اس زمین میں اپنا جانشین مقرر کیا۔ مگر یہ جانشین اس شرط کے ساتھ ہے کہ وہ صرف خدائے واحد پر ایمان لائے' وہ صرف خدائے واحد کی بندگی کرے اور وہ اپنا تصور حیات اپنے اجتماعی نظم کو اپنے قوانین کا ماخذ صرف اللہ ہی کو قرار دے' صرف اللہ کو!

غرض یہ پورا سبق اور اس کے مضامین اور پھر مضامین کے آخر میں بیان کردہ تبصروں اور نتائج کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دین کے تمام اجزاء باہمی مربوط ہیں اور ربط کیا ہے؟ تقویٰ' بندگی اور ایمان باللہ!

☆ ☆ ☆ ☆

درس نمبر۱۱ تشریح آیات (۱۷۹ تا ۱۸۸)

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلَى ۖ الْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْأُنْثَىٰ بِالْأُنْثَىٰ ۚ فَمَنْ عُفِيَ لَهُ مِنْ أَخِيهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوفِ وَأَدَاءٌ إِلَيْهِ بِإِحْسَانٍ ۗ ذَٰلِكَ تَخْفِيفٌ مِنْ رَبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ ۗ فَمَنِ اعْتَدَىٰ بَعْدَ ذَٰلِكَ فَلَهُ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿١٧٨﴾ وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيَاةٌ يَا أُولِي الْأَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ﴿١٧٩﴾

"اے ایمان والو! تمہارے لئے قتل کے مقدمات میں قصاص کا حکم لکھ دیا گیا ہے۔ آزاد آدمی نے قتل کیا ہو' تو اس آزاد ہی سے بدلہ لیا جائے' غلام قاتل ہو' تو وہ غلام ہی قتل کیا جائے اور عورت اس جرم کی مرتکب ہو تو اس عورت ہی سے قصاص لیا جائے۔ ہاں کسی قاتل کے ساتھ اس کا بھائی کچھ نرمی کرنے کے لئے تیار ہو' تو معروف طریقے کے مطابق خون بہا کا تصفیہ ہونا چاہئے اور قاتل کو لازم ہے کہ وہ راستی کے ساتھ خون بہا ادا کرے۔ یہ تمہارے رب کی طرف سے تخفیف اور رحمت ہے۔ اس پر بھی جو زیادتی کرے اس کے لئے دردناک سزا ہے۔ عقل رکھنے والو! تمہارے لئے قصاص میں زندگی ہے۔ امید ہے کہ تم اس قانون کی خلاف ورزی سے پرہیز کرو گے۔

یہ پکار صرف اہل ایمان کے لئے ہے۔ صفت ایمان کو خطاب میں کیا گیا' اس صفت کا تقاضا یہ ہے کہ قصاص کے معاملے میں ہدایت صرف اللہ ہی سے حاصل کی جائے' جس پر تم ایمان لائے ہو۔ اللہ پکار کر اطلاع دیتا ہے کہ تم پر مقتولین کے معاملے میں قصاص فرض کر دیا گیا۔ پہلی آیت قانون سازی کے ضمن میں ہے اور دوسرے میں اس قانون کی حکمت بیان کی گئی ہے۔ اہل ایمان کو دعوت دی گئی ہے کہ وہ سمجھنے کی کوشش کریں' اس طرح مسلمانوں کے دلوں میں خدا خوفی کا احساس پیدا کیا گیا ہے۔ غرض قتل اور سزا کے قتل کے معاملے میں اسلام کا نظام قصاص سیفٹی وال (Safty Valve) کی حیثیت رکھتا ہے۔

منقولہ بالا آیت میں جو قانون بیان ہوا ہے وہ یہ ہے کہ قتل کے معاملے میں قصاص یوں ہو گا کہ آزاد آدمی نے قتل کیا ہو تو اس آزاد ہی سے بدلہ لیا جائے' غلام نے قتل کیا ہو تو غلام ہی سے بدلہ لیا جائے گا لیکن اس کے ساتھ ہی ایک ایسی رعایت کا ذکر کر دیا گیا جو انسانی تمدن کی استواری کے لئے ضروری ہے۔ فَمَنْ عُفِيَ لَهُ مِنْ أَخِيهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوفِ وَأَدَاءٌ إِلَيْهِ بِإِحْسَانٍ "ہاں اگر قاتل کے ساتھ اس کا بھائی (مقتول کا وارث) کچھ نرمی کرنے کے لئے تیار ہو' تو معروف طریقے کے مطابق خون بہا کا تصفیہ ہونا چاہئے اور قاتل کو لازم ہے کہ راستی کے ساتھ خون بہا ادا کرے۔"

نرمی اور معافی کی صورت میں یہ ہے کہ مجرم کو قصاص میں قتل کرنے کے عوض مقتول کے ورثا دیت قبول کرنے پر راضی ہو جائیں۔ جب وہ دیت لینے پر راضی ہوں تو انہیں چاہئے کہ وہ باہمی رضامندی اور معروف اصولوں کے مطابق دیت کی رقم طے کر لیں۔ اور قاتل اور اس کے اولیاء کا فرض ہے کہ وہ راستی اور حسن و خوبی کے ساتھ دیت ادا کریں، تاکہ ان کے دلوں کی کدورت دور ہو

جائے' تلخی کم ہو جائے اور مقتول کے خاندان کے جو لوگ زندہ رہ گئے ہیں' ان کے پھر سے برادرانہ تعلقات قائم ہو سکیں۔

اللہ تعالیٰ نے اس اہم ترین معاملے میں دیت کی گنجائش رکھ کر مسلمانوں پر تخفیف اور رحمت کی ہے۔ اس لئے انہیں توجہ دلائی گئی کہ وہ اسے اللہ کا ایک عظیم احسان سمجھیں۔

ذٰلِكَ تَخْفِيفٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ "یہ تمہارے رب کی طرف سے تخفیف اور رحمت ہے۔" یہ گنجائش تورات کے قانون قصاص میں نہ تھی۔ یہ امت مسلمہ کے ساتھ ایک رعایت ہے۔ جو محض اس لئے کی گئی کہ اگر فریقین کے درمیان راضی نامہ ہو جائے' اور دل ایک دوسرے کے لئے صاف ہو جائیں تو اس صورت میں نہ صرف رنجشیں مٹ جائیں بلکہ ایک شخص کی زندگی بھی بچ جائے۔ فَمَنِ اعْتَدَىٰ بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهُ عَذَابٌ أَلِيمٌ اس کے بعد بھی اگر کوئی زیادتی کرے تو اس کے لئے دردناک سزا ہے۔"

آخرت میں جو سزا ہو گی وہ تو ہو گی' اس دنیا میں اس کی سزا یہ ہو گی کہ اگر قتل ثابت ہو جائے تو اس کا قتل لازمی ہو گا۔ اور اس سے دیت قبول نہ کی جائے گی' کیونکہ باہمی رضامندی اور مصالحت کو بے کار بنانا ہے۔ دلوں کی صفائی کے بعد دشمنی پیدا کرنا ہے۔ اسی طرح اگر وارث نے دیت قبول کر لی ہے تو پھر اس کے لئے دوبارہ انتقام لینے کا کوئی جواز نہیں ہے' یہ ناروا زیادتی ہے۔

قصاص اور دیت کے نظام سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کس قدر وسیع نقطۂ نظر کا حامل ہے اور قانون سازی کے وقت نفس انسانی کے محرکات پر اس کی پوری نظر ہے۔

خدائے برتر نے انسان کی فطرت میں جو رجحانات ودیعت کئے ہیں ان کا پورا پورا لحاظ رکھا گیا ہے۔ خون دیکھ کر خون فطرتاً کھول اٹھتا ہے۔ اسلام نے اس کا تقاضا قانون قصاص کے ذریعہ پورا کر دیا۔ صحیح انصاف یہ ہے کہ دلوں کو ٹھنڈا کر دے۔ دلوں کے اندر انتقام کی جو گھٹن پائی جاتی ہے اسے دور کر دے۔ یہاں تک کہ مجرم کے خیالات بھی درست کر دے۔ ان سب تدابیر کے باوجود اسلام اس بات کو پسند کرتا ہے کہ غلطی معاف کر دی جائے۔ اس لئے وہ عفو و درگزر کی راہ ہموار کرتا ہے۔

قانون قصاص کی فرضیت کے بعد عفو و درگزر کی دعوت دینے کا مقصد یہ ہے کہ اگر کوئی اس معافی سے یہ بلند مرتبہ حاصل کرنا چاہے تو یہ اس کے لئے بہتر ہے۔ لیکن یہ عفو و درگزر فرض نہیں ہے۔ یہ اس لئے کہ انسان کے فطری تقاضے دب نہ جائیں۔ اور اس پر اس قدر بوجھ نہ ڈالا جائے کہ وہ اسے سہار نہ سکے۔

بعض روایات میں یہ ذکر ہے کہ یہ آیت منسوخ ہے اور اس کو سورت مائدہ کی اس آیت نے منسوخ کر دیا ہے جو اس کے بعد نازل ہوئی ہے۔ وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيهَا أَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ

علامہ ابن کثیر اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں "ان آیت کی شان نزول کے سلسلے میں ابن ابی حاتم کی روایت بیان کی جاتی ہے۔ ابو زرعہ' یحییٰ بن عبداللہ بن بکیر' عبداللہ بن لہیعہ' عطاء ابن دینار' سعید ابن جبیر کے واسطہ سے نقل کیا ہے۔ اس آیت کے بارے میں يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلَى یعنی اگر قتل عمد ہو' تو اس میں آزاد کو آزاد ہی کے بدلے میں قتل کیا جائے گا۔ اس کی شان نزول یہ ہے کہ اسلام سے کچھ ہی پہلے' دور جاہلیت میں قبائل آپس میں لڑ پڑے۔ بہت لوگ قتل ہوئے بے شمار زخمی ہوئے۔ یہاں تک کہ غلام اور عورتیں بھی ماری گئیں۔ ان لوگوں نے ایک دوسرے سے ابھی کچھ نہ لیا تھا کہ اسلامی نظام آ گیا۔ اور وہ مسلمان ہو گئے۔ ایک قبیلہ دوسرے پر مال اور تعداد میں بے انصافی کرنے لگا۔ انہوں نے قسم اٹھائی کہ وہ اس وقت تک راضی نہ ہوں گے جب تک ہمارے غلام کے بدلے میں ان سے آزاد نہ مارا جائے اور ہماری عورت کے بدلے ان کا مرد نہ مارا جائے۔ اس پر آیت نازل ہوئی "آزاد کے بدلے آزاد' غلام کے بدلے غلام اور عورت کے بدلے عورت۔" لیکن یہ آیت منسوخ ہے اور اسے آیت النفس بالنفس

نے منسوخ کر دیا ہے اس طرح ابو مالک سے روایت ہے کہ اس آیت کو آیت النفس بالنفس نے منسوخ کر دیا ہے۔"

لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس آیت کا مقام و محل اور مائدہ کی آیات النفس بالنفس کا موقع و محل ہی الگ ہے۔ النفس بالنفس کا اطلاق انفرادی قتل پر ہے یعنی کوئی متعین شخص کسی متعین شخص یا اشخاص کو قتل کرے۔ اگر قتل عمد ہو تو مجرم سزایاب ہو گا۔ لیکن زیر بحث آیت کا محل ہی الگ ہے۔ اس میں اجتماعی قتل کی صورت کا حکم بیان کیا ہے۔ جہاں خاندان دوسرے خاندان پر ہاتھ اٹھائے، قبیلہ قبیلے کے خلاف لڑے اور ایک گروہ دوسرے گروہ پر حملہ آور ہو، جیسا کہ مذکورہ بالا قبائل کا معاملہ تھا۔ جس سے آزاد، غلام اور عورتیں ماری گئی تھیں۔ ایسے مواقع پر جب قصاص طے ہو گا تو آزاد کے بدلے آزاد، ایک قبیلے کے غلام کے بدلے دوسرے قبیلے کا غلام اور ایک عورت کے بدلے دوسرے کی عورت قتل ہو گی۔ اگر یہ محل نہ ہو گا تو پھر بتایا جائے کہ جب کسی تنازعے میں دونوں طرف سے بڑے بڑے گروہ باہم بر سر پیکار ہوں تو اس صورت میں قصاص کی صورت کیا ہو گی؟

اگر اس نقطہ نظر کو تسلیم کر لیا جائے تو پھر یہ آیت منسوخ تصور نہ ہو گی اور قصاص کی آیات میں کوئی تعارض نہ ہو گا۔

اب قصاص کے قانون کی گہری حکمت اور اس کے دور رس مقاصد بتا کر بات ختم کی جاتی ہے وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ عقل و خرد رکھنے والو! تمہارے لئے قصاص میں زندگی ہے۔" امید ہے کہ تم اس قانون کی خلاف ورزی سے پرہیز کرو گے۔"

ضرور انتقام ہی لیا جائے بلکہ یہ اس سے کہیں بلند و برتر مقاصد کا حامل ہے۔ یہ زندگی کے لئے، زندگی کے قیام کی راہ میں انسان کا قتل ہے، بلکہ قیام قصاص بذات خود زندگی ہے۔ یہ اس لئے ہے کہ اس فریضہ کی حقیقت کو سمجھا جائے۔ اس کی حکمت میں غور و تدبر کیا جائے۔ دل زندہ ہوں اور ان میں خدا خوفی موجزن ہو۔

ایک مجرم جرم کی ابتدا کرتا ہے اسے سوچنا چاہئے کہ یہ بات معمولی نہیں بلکہ ایسی ہے کہ مجھے تو اس کے بدلے میں اپنی جان کی قیمت دینی پڑے گی۔ یوں نظام قصاص سے دو زندگیاں بچ جاتی ہیں۔

ارتکاب قتل کی صورت میں قاتل کو سزا ہو جاتی ہے۔ وہ قصاص میں مارا جاتا ہے۔ مقتول کے ورثا مطمئن ہو جاتے ہیں ان کے دلوں سے کینہ دور ہو جاتا ہے اور انتقام کے جذبات سرد پڑ جاتے ہیں اور پھر وہ انتقام جو عرب قبائل میں تو کسی حد پر، کسی مقام پر رکتا ہی نہ تھا۔ چالیس چالیس سال تک قتل کے بدلے قتل کا سلسلہ چلتا رہتا تھا۔ مثلاً حرب البسوس میں یہی ہوا۔ عرب کیا آج بھی اس پر گواہ ہیں، جہاں زندگی خاندانی دشمنیوں اور کینوں کے بھینٹ چڑھتی رہتی ہے اور نسلاً بعد نسل یہ معاملہ چلتا ہی رہتا ہے اور یہ سلسلہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتا۔

"قصاص میں زندگی ہے۔" اپنے عمومی مفہوم میں۔ ایک فرد کی زندگی پر حملہ دراصل جنس زندگی پر حملہ ہے۔ پوری زندگی پر حملہ ہے۔ ہر زندہ انسان پر حملہ ہے۔ ہر اس انسان پر حملہ جو مقتول کی طرح زندہ ہے۔ اگر قانون قصاص کی وجہ سے ایک مجرم، صرف ایک زندگی کو ختم کرنے سے رک جائے تو اس نے پوری انسانیت کو بچا لیا۔ یوں اس کا ارتکاب جرم سے رک جانا عین حیات ہے اور یہ عام زندگی، کسی ایک فرد کی زندگی نہیں ہے، کسی خاندان کی نہیں، کسی جماعت کی نہیں بلکہ مطلقاً زندگی ہے۔

اب آخر میں قانون الٰہی کی حکمت میں غور و فکر اور اس فکر کے شعور کو موجزن کیا جاتا ہے اور خدا خوفی کی تلقین کی جاتی ہے۔ (یہی وہ اہم فیکٹر اور موثر ذریعہ ہے جس کی وجہ سے انسانی زندگی قائم رہ سکتی ہے) تَتَّقُوْنَ "امید ہے کہ تم قانون کی خلاف ورزی سے پرہیز کرو گے۔"

یہ ہے وہ اصل بندھن' جو انسان کو ظلم و زیادتی سے باز رکھتا ہے' ابتدا میں قتل ناحق کی زیادتی سے روکتا ہے' اور آخر میں انتقام کی زیادتی سے۔ یہ کیا ہے؟ خدا خوفی' تقویٰ' دل میں خدا خوفی کا شعور اور شدید احساس۔ اللہ کے قہر و غضب سے ڈرنے کا احساس اور اس کی رضاجوئی کی کشش۔

اس پابندی کے بغیر کوئی قانون کامیاب نہیں ہو سکتا۔ کوئی شریعت کامیاب نہیں ہوتی۔ کوئی شخص ارتکاب جرم سے باز نہیں رہتا۔ انسانی طاقت سے اعلیٰ اور برتر طاقت کے تصور کے بغیر اخروی خوف اور طمع کے روحانی احساس کے بغیر کوئی ظاہری شیرازہ بندی اور قانونی انتظام کامیاب نہیں ہو سکتا۔

حضرت محمد ﷺ کے دور اور خلافت اسلامیہ کے زمانہ میں جرائم کا وقوع شاذ و نادر ہی رہا ہے۔ جو جرائم وقوع پذیر ہوئے بھی تو مجرم نے خود اعتراف کیا۔ اس کا راز یہی ہے کہ وہاں تقویٰ کا زور تھا۔ لوگوں کے دل و دماغ میں' ایک زندہ ضمیر کی صورت میں تقویٰ' چوکیدار کی طرح بیٹھا تھا۔ جو ہروقت بیدار رہتا تھا۔ وہ انہیں حدود جرم سے بھی دور رکھتا۔ ساتھ ساتھ انسانی فطرت اور انسانی جذبات و میلانات و انصرام تھا۔ دوسری طرف اسلامی عبادات کے نتیجے میں تقویٰ اور خدا خوفی کا سیل رواں تھا۔ دونوں کے باہم تعاون اور ہم آہنگی کے نتیجے سے ہم آہنگ اور پاک و صاف قانون اور شریعت بھی موجود تھی۔ ایک طرف شریعت و قانون اور ظاہری انتظام میں ایک پاک صالح تصور زندگی' اور نظام زندگی نے جنم لیا' جس میں لوگوں کا طرز عمل پاک طرز فکر صالح تھی۔ کیوں؟ اس لئے کہ اس نظم نے ملک سے پہلے ہر شخص کے دل میں ایک منصف بٹھا دیا تھا اور ایک عدالت قائم کر دی تھی۔ "حالت یہ تھی کہ اگر کسی وقت کسی پر حیوانیت غالب ہی آگئی اور غلطی کا صدور ہو گیا اور یہ شخص قانون کی گرفت سے بچ بھی گیا تو بھی اس کا ایمان اس کے لئے نفس لوامہ بن گیا۔ اس نے اپنے ضمیر میں خلش اور چبھن محسوس کی۔ دل میں ہروقت خوفناک خیالات کا ہجوم برپا ہو گیا۔ اور گناہ کرنے والے کو تب آرام نصیب ہوا کہ جب اس نے قانون کے سامنے رضاکارانہ اعتراف جرم کر لیا اور اپنے آپ کو سخت ترین سزا کے لئے پیش کر دیا اور خوشی اور اطمینان کے ساتھ اس سزا کو برداشت کیا' محض اللہ کے غضب سے بچنے کی خاطر۔ ا۔ یہ ہے تقویٰ' یہ ہے خدا خوفی۔

اب موت کے وقت وصیت کے مسائل کا بیان ہوتا ہے۔ آیات قصاص کی فضا اور ان آیات کی فضا (یعنی موت اور زندگی کا اختتام) کے درمیان مناسبت بالکل ظاہر ہے۔

كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرًا ۖ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ بِالْمَعْرُوفِ ۖ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ ﴿١٨٠﴾ فَمَنْ بَدَّلَهُ بَعْدَ مَا سَمِعَهُ فَإِنَّمَا إِثْمُهُ عَلَى الَّذِينَ يُبَدِّلُونَهُ ۚ إِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿١٨١﴾ فَمَنْ خَافَ مِنْ مُوصٍ جَنَفًا أَوْ إِثْمًا فَأَصْلَحَ بَيْنَهُمْ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿١٨٢﴾

۲۲ ع ۶ ۶

"تم پر فرض کیا گیا ہے کہ جب تم میں سے کسی کی موت کا وقت آئے اور وہ اپنے پیچھے مال چھوڑ رہا ہو' تو والدین اور رشتہ داروں کے لئے معروف طریقے سے وصیت کرے۔ یہ حق ہے متقی لوگوں پر۔ پھر جنہوں نے وصیت سنی اور بعد میں اسے بدل ڈالا' تو اس کا گناہ بدلنے والوں پر ہو گا۔ اللہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے۔ البتہ جس کو یہ اندیشہ ہو کہ وصیت کرنے والے نے نادانستہ یا قصداً حق تلفی کی ہے

اور معاملہ سے تعلق رکھنے والوں کے درمیان وہ اصلاح کرے تو اس پر کچھ گناہ نہیں ہے' اللہ بخشنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔"

وصیت بھی فرائض میں سے ایک فرض ہے۔ والدین اور اقربا کے لئے بشرطیکہ مرنے والا اپنے پیچھے دولت چھوڑ رہا ہو۔ خیر سے مراد دولت ہے۔ کتنی مقدار پر وصیت فرض ہے؟ اس میں اختلاف رائے ہے۔ راجح بات یہ ہے کہ مقدار کا تعین مختلف مواقع کے لئے' عرف کے مطابق' مختلف ہو سکتا ہے۔ بعض فقہاء نے کہا ہے کہ ۶۰ درہم سے کم ترکہ ہو تو سمجھا جائے کہ کوئی ترکہ نہیں ہے۔ بعض لوگوں نے اس حد کو ۸۰ دینار' بعض نے ۴۰۰ دینار اور بعض نے ایک ۱۰۰۰ تک بڑھا دیا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ مختلف ادوار میں' اور مختلف خاندانوں کے لئے ظروف و احوال کے مطابق مقدار میں کمی بیشی ہو سکتی ہے۔

وصیت کی ان آیات کے بعد میراث کی آیات نازل ہوئیں جن میں ورثاء کے لئے حصص متعین ہو گئے۔ اور وراثت کی ہر صورت میں والدین کو حقدار قرار دیا گیا' لہٰذا اب والدین کے لئے وصیت نہ ہو گی کیونکہ وارث بہرحال وصیت سے محروم ہیں۔

حضور نے فرمایا ہے "اللہ تعالیٰ نے ہر حقدار کو اس کا حق عطا کر دیا ہے' لہٰذا اب وارث کے لئے کوئی وصیت موثر نہ ہو گی۔" رہے اقرباء تو ان کے لئے یہ حکم اب بھی اپنے عموم پر باقی ہے۔ لہٰذا اب جو شخص قانون میراث کے مطابق حصہ پالے' وہ وصیت سے فائدہ نہ اٹھا سکے گا اور جو قانون میراث میں حقدار نہیں ہے آیت وصیت اس لئے موجود (Operative) ہے۔

اس آیت کی تفسیر میں' بعض صحابہ اور تابعین میں سے بعض حضرات اس طرف گئے ہیں۔ ہم بھی اسی کو ترجیح دیتے ہیں۔

قانون میراث کی دفعات کی رو سے بعض اوقات بعض قریبی رشتہ دار محروم ہو جاتے ہیں۔ صلہ رحمی کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ ایسے لوگوں کو بھی کچھ نہ کچھ ضرور دیا جائے' ایسے حالات میں وصیت کے ان احکام کی حکمت خود بخود سمجھ میں آ جاتی ہے۔ قانون وصیت در حقیقت قانون وراثت کے دائرے سے باہر خاندان کے باہمی تکافل اور معاشی ذمہ داریوں کا ایک رنگ ہے۔ اس لئے حکم ہوا کہ حق وصیت کا استعمال معروف اصولوں کے مطابق ہونا چاہئے اور اس سلسلے میں خدا خوفی کے اصل الاصول کو پیش نظر ہونا چاہئے۔

بِالْمَعْرُوْفِ ۚ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ "معروف طریقے سے' یہ متقین پر حق ہے۔"

اس حق کے استعمال سے ورثا پر ظلم نہ ہو' نہ غیر وارث محروم رہیں' اعتدال و انصاف کے ساتھ' خدا خوفی کو پیش نظر رکھتے ہوئے' احسان اور نیکی کی خاطر اس حق کو استعمال کرنا چاہئے۔ یہی وجہ ہے کہ حدیث شریف میں اس حق پر پابندی لگائی گئی اور ۱/۳ حصہ حد مقرر کر دی گئی ہے اور افضل یہ ہے کہ اس حق کو ۱/۴ حصہ تک محدود رکھا جائے۔ تاکہ اس غیر وارث کی وجہ سے اصل وارث کو زیادہ نقصان نہ ہو۔ اس معاملے کا فیصلہ' بیک وقت قانون اور تقویٰ دونوں کے ہاتھ میں دے دیا گیا ہے اور یہی روح ہے اس اجتماعی نظام کی جسے قرآن مجید قائم کرنا چاہتا ہے۔

جو شخص بھی وصیت سنے اس کا فرض ہے کہ وہ بے کم و کاست فریقین تک پہنچا دے۔ اگر وہ اس میں تبدیلی کرے گا' تو اسے سخت گناہ ہو گا اور اگر سننے والے اپنی طرف سے تبدیلی کریں گے تو متوفی بری الذمہ ہو گا۔ فَمَنْۢ بَدَّلَهٗ بَعْدَمَا سَمِعَهٗ فَاِنَّمَآ اِثْمُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يُبَدِّلُوْنَهٗ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ "پھر جنہوں نے وصیت سنی اور بعد میں اسے بدل ڈالا' تو اس کا گناہ ان بدلنے والوں پر ہو گا۔ اللہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے۔"

اس شخص نے جو سنا اور جس کا اسے علم ہے اس پر خود اللہ گواہ ہے۔ وصیت کنندہ کے لئے بھی اللہ گواہ ہے۔ لہٰذا میت پر کوئی مواخذہ نہ ہو گا اور چونکہ تبدیل کنندہ کے خلاف بھی اللہ گواہ ہے' لہٰذا اس ناجائز تغیر و تبدل پر اس سے مواخذہ ہو گا۔

ایک حالت ایسی ہے جس میں وصی کو اختیار ہے کہ وہ وصیت کرنے والے کی وصیت میں کچھ رد و بدل کرے' لیکن یہ اس وقت ہو

گا جب اس بات کا علم ہو جائے کہ وصیت کرنے والے نے کسی کی ناحق طرفداری کی ہے یا ناجائز طور پر وارث کی حق تلفی کی ہے۔ اس صورت میں جو شخص وصیت نافذ کرنے کا اختیار رکھتا ہے اس کے لئے جائز ہے کہ وہ اس حد تک اس میں تبدیلی کرے کہ ناجائز حق تلفی نہ رہے نہ ہی کسی کی طرفداری رہے۔ معاملہ عدل و انصاف کے مطابق ہو جائے فَمَنْ خَافَ مِنْ مُّوْصٍ جَنَفًا اَوْ اِثْمًا فَاَصْلَحَ بَيْنَهُمْ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ

"البتہ جس کو اندیشہ ہو کہ وصیت کرنے والے نے نادانستہ یا قصداً حق تلفی کی ہے اور پھر معاملہ سے تعلق رکھنے والوں کے درمیان' وہ اصلاح کرے' اس پر کچھ گناہ نہیں ہے۔ اللہ بخشنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔"

تمام معاملات میں' معاملہ اللہ تعالیٰ کی مغفرت اور اس کی رحمت خصوصی کے سپرد ہے۔ ہر حال میں اللہ کا کرم اور اس کی نگہبانی ہمارے حالات کی شیرازہ بند ہے۔ اور یہی عدل و انصاف کے حصول کی آخری ضمانت ہے۔ قانون قصاص اور قانون وصیت دونوں کو ایک ہی رسی میں باندھ دیا گیا ہے یعنی خدا خوفی بلکہ اسلامی نظام زندگی کے تمام شعبے اور اسلامی معاشرے کا ہر مسئلہ اس میں باندھا ہوا ہوتا ہے۔

یہ امت پوری انسانیت پر گواہ ٹھہرائی گئی ہے۔ وہ انسانیت کی نگران اعلیٰ ہے۔ اور اسے کرۂ ارض پر اسلامی نظام زندگی قائم کرنا ہے اور اس سلسلے میں اس پر جہاد فی سبیل اللہ فرض ہو چکا ہے۔ لہٰذا اب یہ قدرتی امر ہے کہ اس پر روزہ بھی فرض کر دیا جائے۔ روزہ سے ارادہ قوی اور عزم صمیم ہو جاتا ہے۔ اس کے ذریعے انسان اطاعت و انقیاد کے ساتھ اپنے رب سے ملتا ہے۔ اور اس کے ذریعہ سے انسان جسم کی تمام ضروریات پر قابو پانے کی کوشش کرتا ہے۔ ان کے دباؤ اور ان کے بوجھ کو برداشت کرتا ہے۔ محض رضائے الٰہی کے حصول اور اجر اخروی کے طمع میں۔

یہ سب تدابیر اس لئے ہیں کہ تحریک اسلامی کے کارکنوں کی راہ میں جو دشواریاں اور جو مشکلات ہیں' اس راہ میں جو رکاوٹیں ہیں اور جو کانٹے بچھے ہیں' ان کے برداشت کے لئے نفس انسانی تیار ہو جائے۔ یہ راستہ ایسا ہے کہ اس کی دشواریوں کے علاوہ اس کے دونوں طرف مرغوب اور پسندیدہ چیزیں بکھری پڑی ہیں۔ ہزاروں ایسی چیزیں اس راستے میں پڑی ہیں' جو قدم قدم پر اسے فریب دینے کے لئے تیار ہیں۔

اب دور حاضر کے انکشافات سامنے آتے ہیں۔ حکما کہتے ہیں کہ روزہ سے انسان کے جسم پر بھی اچھے اثرات پڑتے ہیں۔ اگرچہ میں اس بات کے حق میں نہیں ہوں کہ روزے یا دوسری اسلامی عبادات کے ایسے دنیاوی فوائد بیان کئے جائیں جو طبعی زندگی سے متعلق ہوں اور حس و نظر تک محدود ہوں۔ اس لئے کہ عبادات کی اصل غرض و غایت یہ ہے کہ انسان کو اس فرض کی ادائیگی کے لئے تیار کیا جائے جو اسے اس کرۂ ارض پر ادا کرنا ہے۔ دوسری طرف اسے اس کامیابی اور اس کمال کے لئے جدوجہد کرنی ہے' جو اسے دار آخرت میں حاصل ہو گا لیکن اس کے باوجود میں اس کے خلاف بھی نہیں ہوں کہ سائنس اور تجربہ سے عبادات کے سلسلے میں جو فوائد ثابت ہوتے ہیں ان کا بالکل انکار کر دیا جائے۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے وجود انسانی کے لئے فرائض و عبادات کے تعین میں جو عمومی تدابیر اختیار کی ہیں۔ ان سے جو حکمت واضح طور پر ملحوظ و مفہوم نظر آتی ہے' اس پر اعتماد ضروری ہے۔ البتہ یہ بات پیش نظر رہے کہ سائنس اور تجربات سے ظاہر ہونے والی ان حکمتوں اور فوائد کو احکام و تکالیف شرعیہ کا اصل سبب اصل علت نہیں قرار دینا چاہئے۔ اس لئے کہ سائنس کا دائرہ بہت ہی محدود ہے۔ اللہ تعالیٰ انسان کی حیوانیت کو توڑ کر جس طرح اس کی تربیت کرنا چاہتا ہے اور اس میں جو حکمتیں ہیں وہاں تک انسانی علم ترقی کر ہی نہیں سکتا۔ یا خود اس پوری کائنات کی بے قابو قوتوں کو اللہ تعالیٰ جس طرح سدھانا چاہتا ہے' سائنس کی وہاں تک رسائی کب ہے۔

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ كُتِبَ عَلَيْكُمُ ٱلصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى ٱلَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ﴿۱۸۳﴾ أَيَّامًا مَّعْدُودَٰتٍ ۚ فَمَن كَانَ مِنكُم مَّرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ ۚ وَعَلَى ٱلَّذِينَ يُطِيقُونَهُۥ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ ۖ فَمَن تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهُۥ ۚ وَأَن تَصُومُوا۟ خَيْرٌ لَّكُمْ ۖ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿۱۸۴﴾ شَهْرُ رَمَضَانَ ٱلَّذِىٓ أُنزِلَ فِيهِ ٱلْقُرْءَانُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنَٰتٍ مِّنَ ٱلْهُدَىٰ وَٱلْفُرْقَانِ ۚ فَمَن شَهِدَ مِنكُمُ ٱلشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ۖ وَمَن كَانَ مَرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ ۗ يُرِيدُ ٱللَّهُ بِكُمُ ٱلْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ ٱلْعُسْرَ وَلِتُكْمِلُوا۟ ٱلْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا۟ ٱللَّهَ عَلَىٰ مَا هَدَىٰكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿۱۸۵﴾

"اے ایمان لانے والو! تم پر روزے فرض کر دیے گئے ہیں جس طرح تم سے پہلے انبیاء کے پیروؤں پر فرض کیے گئے تھے۔ اس سے توقع ہے کہ تم میں تقویٰ کی صفت پیدا ہوگی' چند مقرر دنوں کے روزے ہیں۔ اگر تم میں سے کوئی بیمار ہو' یا سفر پر ہو' تو دوسرے دنوں میں اتنی ہی تعداد پوری کرلے اور جو روزہ رکھنے کی قدرت رکھتے ہیں (پھر نہ رکھیں) تو وہ فدیہ دیں۔ ایک روزے کا فدیہ ایک مسکین کو کھانا کھلانا ہے اور جو اپنی خوشی سے کچھ زیادہ بھلائی کرے' تو یہ اسی کے لئے بہتر ہے۔ لیکن اگر تم سمجھو' تو تمہارے حق میں اچھا یہی ہے کہ روزہ رکھو۔

رمضان وہ مہینہ ہے' جس میں قرآن نازل کیا گیا' جو انسانوں کے لئے سرا سر ہدایت ہے اور ایسی واضح تعلیمات پر مشتمل ہے' جو راہ راست دکھانے والی اور حق و باطل کا فرق کھول کر رکھ دینے والی ہیں۔ لہٰذا اب سے' جو شخص اس مہینے کو پائے' اس کو لازم ہے کہ اس پورے مہینے کے روزے رکھے اور جو کوئی مریض ہو یا سفر پر ہو' تو وہ دوسرے دنوں میں روزوں کی تعداد پوری کرے۔ اللہ تمہارے ساتھ نرمی چاہتا ہے' سختی کرنا نہیں چاہتا۔ اس لئے یہ طریقہ تمہیں بتایا جا رہا ہے تاکہ تم روزوں کی تعداد پوری کرسکو اور جس ہدایت سے اللہ نے تمہیں سرفراز کیا ہے' اس پر اللہ کی کبریائی کا اظہار و اعتراف کرو اور شکر گزار بنو۔"

اللہ تعالیٰ کے علم میں تھا کہ فرائض اور تکلیفات پر عمل کرنے کے لئے انسان کے نفس کو بڑی قوت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں انسان اللہ کی خصوصی امداد کا محتاج ہے۔ اس بات کی ضرورت تھی کہ ان احکامات پر عمل کرنے کے لئے اس میں سپرٹ پیدا کی جائے۔ اس کی روح ان احکامات کی طرف مائل ہو جائے تاکہ وہ مطمئن ہو جائے اور عمل پر راضی ہو جائے۔ حالانکہ ان احکام پر عمل کرنے میں خود اس کا مفاد مضمر ہے۔ چنانچہ اسی خاطر بہت ہی پیاری آواز سے پکارا گیا۔ "اے لوگو! جو ایمان لائے ہو" غور کیجئے' یہ آواز انہیں ان کی آصل حقیقت یاد دلاتی ہے۔ پھر روزہ فرض ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے اور یہ تو پہلی امتوں کے مؤمنین پر بھی فرض ہوتا رہا ہے۔ کوئی نئی بات تو نہیں ہے۔

اس کا مقصد اہل ایمان کے دلوں کو صاف کرنا ہے۔ انہیں خوف خدا کے لئے تیار کرنا ہے اور ان میں اللہ کی مشیئت کا احساس و شعور بیدار کرنا ہے۔ يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ
"اے لوگو! جو ایمان لائے ہو' تم پر روزے فرض کر دیئے گئے ہیں' جس طرح تم سے پہلے انبیاء ﷺ کے پیروؤں پر فرض کئے گئے تھے' اس سے توقع ہے کہ تم میں تقویٰ کی صفت پیدا ہوگی۔"

اس آیت میں روزے کی اصلی غرض و غایت ظاہر کی جاتی ہے' یعنی تقویٰ جب ایک مومن اللہ کے حکم کی اطاعت کرتے ہوئے اور اللہ کی رضا کے حصول کی خاطر روزہ رکھتا ہے تو اس کے دل میں تقویٰ کا شعور اجاگر ہو جاتا ہے۔ یہ تقویٰ ہی ہے جو دلوں کا نگہبان ہے اور جو انسان کو روزے کے احکام کی خلاف ورزی سے بچاتا ہے' اگرچہ وہ ایسی معصیت سے بھی انسان کو بچاتا ہے' جو کسی حد تک محض وسوسہ ہو۔ قرآن کریم کے اول مخاطب صحابہ کرام اس کے معنی سے اچھی طرح واقف تھے۔ وہ جانتے تھے کہ اللہ کے ہاں تقویٰ کس قدر وزنی ہے۔ اس لئے تقویٰ ہی ان کا نصب العین تھا۔ وہ برابر اس کی طرف بڑھتے جاتے تھے اور روزہ ذرائع حصول تقویٰ میں سے چونکہ ایک ذریعہ ہے اس لئے یہ فرض کیا گیا۔ دراصل روزہ وہ راہ ہے جس کی آخری منزل تقویٰ ہے۔ یوں لگتا ہے کہ یہاں قرآن مجید' ایک بلند مقام پر' بالکل سامنے تقویٰ کا ایک روشن نشان رکھ دیتا ہے اور اہل ایمان کی آنکھیں اس نشانہ پر جم جاتی ہیں اور وہ روزہ کے واسطے اور روزے کی امداد سے وہاں تک پہنچنے کے لئے کوشاں نظر آتے ہیں۔ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ "تاکہ تم ڈرو۔"

بات کا ایک دوسرا رخ دیکھئے' کہا جاتا ہے! یہ تو چند دن ہیں پوری عمر کے روزے تو فرض نہیں کئے گئے۔ تمام زمانے کے لئے تو فرض نہیں ہیں۔ ساتھ ساتھ یہ کہ بیمار اس وقت تک مستثنٰی جب تک وہ صحت یاب نہ ہو جائیں۔ مسافروں پر اس وقت تک لازم نہیں جب تک گھر تک لوٹ نہ آئیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بطور سہولت اور تخفیف خاص رعایت دی گئی ہے۔ أَيَّامًا مَّعْدُودَاتٍ ۚ فَمَن كَانَ مِنكُم مَّرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ "چند مقرر دنوں کے روزے ہیں' اگر تم میں سے کوئی بیمار ہو' یا سفر پر ہو تو دوسرے دنوں میں اتنی ہی تعداد پوری کرے۔"

سفر اور مرض کے اعتبار سے آیت کا مفہوم عمومیت کا حامل ہے۔ اسے محدود نہ کیا جائے گا۔ بیماری کی نوعیت کیسی بھی ہو' جس قسم کا سفر بھی درپیش ہو روزہ قضا کرنا جائز ہے' لیکن سفر ختم ہونے کے بعد اور بیماری دور ہونے کے بعد چھوڑے ہوئے روزے رکھنے ضروری ہیں۔ آیت میں بیماری کی شدت اور سفر کی مشکلات کو اس رخصت کا سبب نہیں بنایا گیا۔ صرف "مرض" اور "سفر" کا علی العموم ذکر کیا گیا ہے تاکہ لوگوں کے لئے مشکلات پیدا نہ ہوں اور سہولت رہے۔ اب اس میں کیا حکمت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے صرف مرض اور صرف سفر کا ذکر کیا ہے۔ ساتھ کوئی قید نہیں لگائی؟ یہ صرف اللہ جانتا ہے' ہو سکتا ہے کہ بیماری اور سفر میں کچھ ایسی باتیں اللہ تعالیٰ کے پیش نظر ہوں جنہیں ہم نہیں جانتے۔ ہو سکتا ہے کہ سفر اور بیماری میں کچھ ایسی مشکلات ہوں جن کا احساس ہمیں نہ ہو۔ جب اللہ تعالیٰ نے اس حکم کی اصل علامت کو ظاہر کرنا ضروری نہیں سمجھا تو ہمیں اس بارے میں تاویلات کی کیا ضرورت ہے۔ بہر حال ہمیں ان کی حکمت معلوم ہو یا نہ ہو۔ یہ عقیدہ ضرور رکھتے ہیں کہ ان کے پیچھے کوئی حکمت و مصلحت ضرور ہے۔

کہا جا سکتا ہے کہ رخصت مرض و سفر کی اس تعبیر سے ان لوگوں کی حوصلہ افزائی ہوگی جو ہر وقت دین میں رخصت و سہولت کی تلاش میں رہتے ہیں۔ کیا کسی ادنیٰ سبب یا بلاوجہ ہم فرض عبادات کو ترک کر دیں؟ یہی تو وجہ ہے کہ ہمارے فقہاء نے سختی کر کے اس رخصت سے استفادہ پر قیود و شروط عائد کی ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ استدلال ایک ضعیف استدلال ہے۔ محض اس کی وجہ سے اور صرف اس استدلال کی بنا پر ایک مطلق آیت کو مقید کرنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ لوگوں کو زنجیروں میں باندھ کر ان کو عبادات پر مجبور کرنا اسلام کی مستقل

پالیسی نہیں۔ اسلام تقویٰ کے ذریعہ عبادات میں کشش پیدا کرنا مناسب سمجھتا ہے۔ روزہ تو ہے ہی وہ عبادت جس کا مقصد صرف تقویٰ ہے۔

جس شخص کی حالت یہ ہے کہ وہ رخصتیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر عبادات سے پیچھا چھڑاتا ہے' وہ تو پہلے ہی بھلائی سے محروم ہے۔ وہ اگر روزہ رکھ بھی لے تو وہ مقصد پورا نہ ہو گا جو فرضیت صیام کا اصل مطالبہ ہے۔

پھر سوچنے کی بات یہ ہے کہ یہ دین لوگوں کا ہے یا اللہ تعالیٰ کا؟ دین اللہ کا ہے اور وہ رخصت اور نرمی اور عزیمت و تشدد کے مقامات کو خوب جانتا ہے۔ بعض اوقات رخصت سے ایسے مقاصد کا حصول پیش نظر ہوتا ہے جو رخصت کے بغیر کسی طرح حاصل نہیں ہوتے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کو حکم دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں جو رعاتیں دی ہیں' انہیں چاہئے کہ وہ ان سے استفادہ کریں۔ خصوصاً ایسے دور میں جب مسلمانوں کی اخلاقی اور دینی حالت تباہ و برباد ہو چکی ہو تو ایسے حالات میں احکام میں تشدد' اصلاح احوال کے لئے مفید نہیں ہوتا' ضرورت اس بات کی ہے کہ نرمی اور آسانی سے لوگوں کو اخلاقی تربیت دی جائے' اور ان کے دلوں اور ان کی روح میں خدا خوفی کو نئے سرے سے زندہ کیا جائے۔ اگر یہ بات درست ہے تو پھر میں کہوں گا کہ امت کے عمومی فساد کے وقت احکام میں تشدد کرنا غیر موثر علاج ہے۔ اس سے ذرائع اصلاح بند ہو جاتے ہیں۔ یہ بات سمجھ لینی چاہئے کہ عبادات کے فرائض اور معاملات کے احکام میں بہت بڑا فرق ہے۔ عبادات میں معاملہ صرف بندے اور اس کے رب کا ہوتا ہے۔ اس میں عوام الناس کا براہ راست فائدہ یا نقصان نہیں ہوتا۔ جبکہ معاملات میں شریعت معاملے کے صرف ظاہری پہلو پر نظر رکھتی ہے۔ رہی عبادات تو ان کی ظاہری صورت اس وقت تک مفید نہیں ہوتی جب تک ان کی تہہ میں تقویٰ نہ ہو۔ اگر دل میں تقویٰ ہو تو کوئی شخص ادھر ادھر نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھے گا۔ اور ایک متقی شخص صرف اس رخصت سے فائدہ اٹھائے گا جس پر اس کا دل مطمئن ہو گا کہ رخصت سے فائدہ اٹھانے ہی میں اللہ کی رضا اور اطاعت ہے۔

عبادات کے احکام میں سختی کرنا یا تنگی پیدا کرنے کی سعی کرنا' یعنی اللہ تعالیٰ نے جن احکام کو عام چھوڑا ہے' ان پر قیود کا اضافہ کرنا' بعض اوقات عوام کے لئے سخت مشکلات تو پیدا کر دیتا ہے لیکن اس سختی کے نتیجے میں کج رو افراد کی کجی میں کوئی کمی نہیں ہوتی۔ اس لئے ہر حال میں بہتر رویہ یہ ہے کہ ہم معاملات کو اس طرح لیں جس طرح اس دین میں اللہ تعالیٰ نے طے کر دیئے ہیں۔ رخصتوں اور عزائم میں جو حکمتیں ہیں ان کے متعلق ہم سے اللہ تعالیٰ زیادہ جاننے والا ہے۔ میں سمجھتا ہوں اس نکتے پر جو کچھ کہہ دیا گیا وہ کافی و شافی ہے۔

اب ہم چاہتے ہیں کہ حالات سفر کے بارے میں جو متعدد احادیث مروی ہیں' وہ سب یہاں نقل کر دیں۔ ان میں سے بعض ایسی ہیں جن میں افطار کی طرف میلان پایا جاتا ہے۔ بعض ایسی ہیں جن میں روزہ توڑنے سے منع نہیں کیا گیا۔ ان سب روایات پر غور کرنے سے وہ نقشہ ذہن نشین ہو جاتا ہے' جس پر صحابہ کرام کا تعامل تھا۔ متاخرین فقہاء نے جو سختیاں کی ہیں ان سے پہلے اس معاملے میں سلف صالحین اور صحابہ کرام کی سوچ کیا تھی؟ صحابہ کرام کا تعامل کیا تھا؟ اس کے بارے میں ان احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ سلف صالحین اور صحابہ کرامؓ کا طرز عمل بمقابلہ متاخرین فقہاء اور ان کے فقہی بحوث کے' دین اسلام کی روح اور اس کے مزاج کے زیادہ قریب تھا۔ صحابہ کرامؓ کی زندگیوں اور ان کے طرز عمل کے مطالعہ سے اسلامی نظریۂ حیات اور اس کی خصوصیات کا ایک زندہ ذوق پیدا ہو جاتا ہے۔

حضرت جابر ؓ فرماتے ہیں: رسول خدا ﷺ فتح مکہ کے سال' ماہ رمضان میں' جانب مکہ نکلے۔ آپ ﷺ نے روزہ رکھا۔ جب آپ ﷺ "کراع الغمیم" تک پہنچے تو لوگوں نے بھی روزہ رکھ لیا۔ اس پر آپ ﷺ نے پانی کا ایک پیالہ منگوایا اور اسے اتنا اٹھایا کہ لوگ دیکھ لیں۔ اس کے بعد اسے نوش فرمایا۔ آپ ﷺ سے عرض کیا گیا کہ "بعض لوگ تو روزے سے ہیں۔" آپ ﷺ نے فرمایا! "یہ لوگ نافرمان ہیں' یہ لوگ نافرمان ہیں۔" (مسلم۔ ترمذی)

۲۔ حضرت انس ﷺ سے روایت ہے "ہم نبی ﷺ کے ساتھ سفر میں تھے۔ ہم میں سے بعض روزے سے تھے اور بعض نے افطار کیا تھا۔ سخت گرم دن تھا۔ ہم نے ایک جگہ ڈیرہ ڈالا۔ سب سے زیادہ سایہ اس کا تھا جس کے پاس چادر تھی۔ ہم میں سے بعض ایسے تھے کہ وہ ہاتھ کا سایہ کر کے اپنے آپ کو سورج کی تپش سے بچاتے تھے۔ روزہ دار تو گر پڑے اور جن کا روزہ نہ تھا وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ انہوں نے خیمے لگائے' جانوروں کو پانی پلایا۔ اس پر حضور ﷺ نے فرمایا: آج تو افطار کرنے والوں نے ثواب لوٹ لیا۔" (بخاری۔ مسلم۔ نسائی)

۳۔ حضرت جابر ﷺ سے روایت ہے۔ فرماتے ہیں: حضور ﷺ سفر میں تھے۔ آپ ﷺ نے دیکھا کہ ایک شخص کے پاس لوگ جمع ہیں اور اس پر سایہ کیا گیا ہے۔ آپ ﷺ نے دریافت فرمایا "اسے کیا ہو گیا ہے؟" لوگوں نے بتایا "یہ ایک روزہ دار ہے۔" اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "سفر میں روزہ رکھنا نیکی نہیں ہے۔" (امام مالک' امام بخاری۔ مسلم۔ ابوداؤد۔ نسائی)

۴۔ عمرو بن امیہ ضمری ﷺ سے روایت ہے۔ میں ایک سفر سے رسول خدا ﷺ کے پاس حاضر ہوا۔ حضور ﷺ نے فرمایا: "ابوامیہ کھانے کا انتظار کرو۔" میں نے عرض کیا: حضور میں تو روزے سے ہوں۔" آپ ﷺ نے فرمایا تو پھر سنئے مسافر سے متعلق: "اللہ تعالیٰ نے اس کا روزہ معاف فرمایا ہے اور نصف نماز معاف فرما دی ہے۔" (نسائی)

۵۔ انس بن مالک ﷺ سے روایت ہے' حضور ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے نماز کا ایک حصہ مسافر کے لئے معاف فرما دیا ہے۔ سفر میں اس کے لئے افطار کی رخصت ہے۔ دودھ پلانے والی اور حاملہ کے لئے بھی یہی رخصت ہے' اگر بچے کو نقصان پہنچنے کا خوف ہو۔" (روایت سنن)

۶۔ حضرت عائشہ ﷺ سے روایت ہے فرماتی ہیں: "حمزہ بن عمر اسلمی نے حضور ﷺ سے سفر میں روزے رکھنے کے بارے میں دریافت کیا۔ یہ صاحب بہت روزے رکھتے تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا! "چاہو تو روزہ رکھو چاہو تو افطار کرو۔"

۷۔ حضرت انس ﷺ سے روایت ہے۔ فرماتے ہیں: "ہم حضور ﷺ کے ساتھ تھے ہم میں سے بعض روزے سے تھے اور بعض نے افطار کیا تھا۔ نہ روزہ دار افطار کرنے والے پر نکتہ چینی کرتا اور نہ افطار کرنے والا روزہ رکھنے والے کے طرز عمل کو معیوب سمجھتا۔" (روایت مالک' مسلم' بخاری' ابوداؤد)

۸۔ حضرت ابو الدرداء سے روایت ہے فرماتے ہیں: "ہم حضور ﷺ کے ساتھ ماہ رمضان میں شدید گرمی میں نکلے۔ گرمی کی شدت کا یہ عالم تھا کہ ہم تپش سے بچنے کے لئے سر پر ہاتھ رکھ دیتے۔ ہم سب میں صرف حضور ﷺ اور حضرت ابن رواحہ ﷺ روزے سے تھے۔ (بخاری' مسلم' ابوداؤد)

۹۔ حضرت محمد بن کعب سے روایت ہے فرماتے ہیں: "میں رمضان شریف میں انس ﷺ بن مالک کے پاس آیا۔ آپ سفر پر نکلنے والے تھے۔ سواری تیار تھی۔ آپ نے سفر کا لباس پہن رکھا تھا۔ آپ نے کھانا منگوایا اور کھایا۔ سب نے کہا: کیا یہ سنت ہے؟" آپ نے فرمایا "ہاں!" اس کے بعد سوار ہو گئے۔" (ترمذی)

۱۰۔ عبید ﷺ بن جبیرہ سے روایت ہے فرماتے ہیں: "میں حضور ﷺ کے ایک صحابی ابو بصرہ غفاری ﷺ کے ساتھ کشتی میں تھا' ماہ رمضان میں کشتی کو پانی میں ڈال دیا گیا اور کھانا ان کے قریب لایا گیا۔ انہوں نے فرمایا: "قریب ہو جایئے۔" میں نے عرض کیا: "آپ دیکھ نہیں رہے کہ مکانات ابھی نظر آتے ہیں؟" انہوں نے کہا "کیا تم رسول خدا ﷺ کی سنت سے منہ پھیرتے ہو؟" چنانچہ انہوں نے بھی کھانا کھایا اور میں نے بھی کھایا۔" (ابوداؤد)

۱۱۔ منصور کلبی سے روایت ہے کہ حضرت دحیہ ابن خلیفہ ؓ اپنے نواح دمشق کے ایک گاؤں سے ماہ رمضان میں سفر پر نکلے۔ سفر اس قدر تھا جس طرح فساط گاؤں سے عقبہ گاؤں ہے اور یہ فاصلہ بقدر تین میل ہے۔ آپ نے افطار کیا۔ آپ کے ساتھ بے شمار لوگوں نے افطار کر لیا' لیکن بعض دوسرے لوگوں نے روزہ افطار کرنے میں کراہت محسوس کی۔ جب وہ اپنے گاؤں لوٹے تو فرمایا: "خدا کی قسم میں نے آج وہ بات دیکھی ہے جو کبھی دیکھنے میں نہ آئی تھی۔ لوگوں کے ایک گروہ نے حضور ﷺ اور آپ کے ساتھیوں کی سنت سے منہ پھیر لیا ہے۔ اے اللہ مجھے اپنی طرف اٹھا لے۔" (روایت ابوداؤد)

ان تمام احادیث سے ظاہر ہوتا ہے کہ خوشگوار اور آرام دہ سفر میں بھی رخصت افطار کو قبولیت حاصل ہوئی ہے بلکہ افطار کو ترجیح دی گئی ہے۔ اور رخصت پر عمل کرنے کے لئے سفر کی مشقت یا دشواری کو ضروری شرط نہیں قرار دیا گیا جیسا کہ آخری دو احادیث سے خاص طور پر معلوم ہوتا ہے۔ آٹھویں حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ اور عبداللہ بن رواحہ ؓ کے سوا کسی اور کا روزہ نہ تھا۔ لیکن احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ عبادات میں آپ ﷺ کے لئے بعض خصوصیات ایسی تھیں جو امت کے لئے نہ تھیں۔ مثلاً "لگاتار روزہ" رکھنے سے آپ ﷺ نے منع فرمایا حالانکہ آپ کبھی کبھی "لگاتار" روزہ رکھتے تھے۔ ("لگاتار" کا مطلب یہ ہے کہ ایک دن کا روزہ دوسرے دن سے بلا افطار مل جائے) صحابہ کرام نے اس سلسلے میں آپ ﷺ سے بات کی تو آپ ﷺ نے فرمایا! "میں تمہاری طرح نہیں ہوں۔ مجھے میرا رب ہر وقت کھلاتا پلاتا رہتا ہے۔" (بخاری' مسلم) پھر پہلی حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ خود آپ ﷺ نے افطار فرمایا اور جنہوں نے افطار نہ کیا تھا ان کے بارے میں فرمایا! "یہ لوگ نافرمان ہیں' یہ لوگ نافرمان ہیں۔" پھر یہ حدیث ہے بھی سب احادیث سے متاخر کیونکہ یہ فتح مکہ کے سال کا واقعہ ہے' چنانچہ اس میں جو حکم ہے وہ سب سے آخر میں ہے اور اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ پسندیدہ طرز عمل کیا ہے۔

ان حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے پردۂ احساس پر جو تصویر ابھرتی ہے' اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضور ﷺ کے وقت کچھ مخصوص واقعات تھے' جن میں ایک متعین حکم دینا ضروری تھا۔ حضور ﷺ ملت اسلامیہ کی تربیت فرما رہے تھے۔ آپ کو ایک زندہ اور متحرک صورت حال سے واسطہ تھا۔ محض جامد اور غیر متحرک جتوں ہی سے واسطہ نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ بعض اوقات ایک عام موضوع کے متعلق جو احادیث وارد ہوتی ہیں ان میں احکام وہدایات میں تنوع ہوتا ہے۔ اس لئے کہ احکام موقعہ ومحل کے مطابق دیئے جاتے ہیں۔

تمام حالات و احادیث کو پیش نظر رکھ کر جو تاثر قائم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ سفر میں روزے کے مقابلے میں افطار زیادہ افضل ہے اور اس میں کوئی قید نہیں ہے کہ عملاً مشقت موجود ہے یا نہیں۔

رہی بیماری' تو اس کے بارے میں اقوال فقہاء کے علاوہ مجھے کچھ نہیں ملا۔ بظاہر یہ نظر آتا ہے کہ اس سے مراد ہر وہ حالت ہے جس پر مرض اور بیماری کا اطلاق ہو سکتا ہو۔ اس کی نوعیت' اس کی مقدار اور اس کی شدت وغیرہ کی کوئی قید نہیں ہے۔ صرف ایک شرط ہے اور وہ یہ ہے کہ بیماری اور سفر میں دن کے بدلے قضا کرنی ہوگی اور قضا لوٹانے میں بھی راجح مذہب یہ ہے کہ دنوں کی تعداد پوری کرنی ہے۔ ضروری نہیں ہے کہ روزے مسلسل ہوں۔

ان تفصیلات کا ذکر میں نے اس غرض سے نہیں کیا کہ میں فقہی اختلافات میں کوئی خاص دلچسپی رکھتا ہوں۔ میرا مقصد صرف اس بنیادی اصول کی وضاحت ہے جس کے مطابق اسلامی عبادات کو دیکھنا چاہئے۔

سوال ہے کہ ان کا اصل مقصد کیا ہے؟ کیا یہ کہ انسان کے ذہن میں ایک ایسی شعوری حالت پیدا ہو جائے' جو انسان کے طرز عمل پر اثر انداز ہو۔ یہی وہ حالت ہے جس کا اثر انسان کے طرز عمل پر ہوتا ہے اور اسی سے انسان کی روحانی تربیت ہوتی ہے۔ عبادات میں خشوع کا مطلب ہے دل کا اللہ کی طرف پوری طرح متوجہ اور گداختہ ہو جانا اور پوری زندگی میں حسن سلوک اور بہتر طرز عمل صرف اسی

شعوری حالت کے نتیجے میں پیدا ہو سکتے ہیں۔ یہ تو ہے ایک پہلو اور دوسرا پہلو یہ ہے کہ ہم اس دین کو اسی طرح قبول کریں جس طرح وہ ہے۔ پورے فرائض و تکالیف کے ساتھ۔ اطاعت و خشیت کے ساتھ۔ اس کی عزیمتوں پر عمل کریں اور رخصتوں سے فائدہ اٹھائیں۔ پوری طرح ہم آہنگی سے 'اطمینان قلب کے ساتھ' اس کی حکمتوں پر یقین رکھتے ہوئے اور خدا خوفی کا پورا پورا احساس کرتے ہوئے۔

اس بحث کے بعد اب پھر سیاق کلام کو لیجئے!

وَ عَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ ؕ فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ ؕ وَ اَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ

"اور جو لوگ مشکل سے روزہ رکھ سکتے ہوں تو وہ فدیہ دیں۔ ایک روزے کا فدیہ ایک مسکین کو کھانا کھلانا ہے اور جو اپنی خوشی سے کچھ زیادہ بھلائی کرے تو یہ اسی کے لئے بہتر ہے۔ لیکن اگر تم سمجھو "تو تمہارے لئے بہتر یہی ہے کہ روزہ رکھو۔"

روزہ سنہ ۲ ہجری میں جہاد کی فرضیت سے کچھ پہلے فرض ہوا۔ پہلے پہل روزہ کی تکالیف مسلمانوں کے لئے بہت ہی شاق تھیں۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کے لئے چھوٹ دے دی' جو مشکل سے روزہ رکھ سکتے تھے۔ (یطیقونہ کے معنی ہیں جو مشکل سے روزہ رکھ سکتے ہوں۔ الاطاقہ کے معنی عربی میں مشکل سے اٹھانے کے ہوتے ہیں۔ رخصت یہ دے دی کہ ایسے لوگ افطار کرلیں مگر انہیں ایک روزے کے بدلے ایک مسکین کو کھانا کھلانا ہوگا۔ اس کے بعد انہیں ترغیب دی کہ وہ مساکین کے ساتھ مزید بھلائی کریں مثلاً یہ کہ بغیر فدیہ کی مقرر حد سے زیادہ مساکین کو کھانا کھلائیں۔ مثلاً رمضان شریف کے ایک روزے کے بدلے اگر تین' چار یا اس سے بھی زیادہ افراد کو کھانا دیں۔ فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ "اور جو اپنی خوشی سے کچھ زیادہ بھلائی کرے تو یہ اس کے حق میں اچھا ہے۔" پھر انہیں ترغیب دی گئی کہ سفر و بیماری کے علاوہ اگر وہ روزہ ہی رکھ لیں تو یہ ان کے لئے زیادہ اچھا ہے وَ اَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ "لیکن اگر تم سمجھو تو تمہارے لئے بہتر یہی ہے کہ روزہ رکھو۔" کیونکہ ایسے حالات میں روزہ رکھنا بہت بڑی بھلائی ہے۔ ایسے حالات میں روزہ رکھنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ روزہ دار پختہ ارادے کا مالک ہے۔ اس کے اندر قوت برداشت موجود ہے اور وہ اپنے آرام کو اللہ کی بندگی کے لئے قربان کر سکتا ہے۔ اور یہ تمام وہ امور جو اسلام کے نظام تربیت کے مقاصد اولیہ ہیں۔ نیز اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مریض کے علاوہ دوسرے لوگ اگر جبر و مشقت کے ساتھ روزے رکھیں تو اس میں ان کے لئے جسمانی فائدہ بھی ہے۔

بہر حال یہ آیت ایک تمہید تھی۔ اور جیسا کہ دوسری آیت میں ذکر ہوا ہے' اصل مقصد یہ تھا کہ تندرست اور مقیم پر بتدریج روزے کو علی الاطلاق فرض کر دیا جائے۔ ہاں البتہ یہ حکم ایسے بوڑھے مرد اور بوڑھی عورت کے لئے اب بھی باقی ہے جن کے لئے روزہ رکھنا بہت مشکل ہو اور یہ امید بھی نہ ہو کہ وہ پھر سے تندرست ہو کر روزہ رکھنے کے قابل ہو سکیں گے۔ امام مالک ؒ فرماتے ہیں کہ ان تک یہ روایت پہنچی ہے کہ حضرت انس ؓ بن مالک کافی بوڑھے ہو گئے تھے اور ان میں روزہ رکھنے کی قدرت ہی نہ رہی تھی۔ اس لئے ان کی جانب سے فدیہ دیا جاتا تھا۔ (حضرت ابن عباس ؓ فرماتے ہیں کہ یہ آیت منسوخ نہیں ہے۔ یہ اس بوڑھے مرد اور اس بوڑھی عورت کے لئے ہے جو روزہ رکھنے کی طاقت نہ رکھتے ہوں۔ ان پر فرض ہوگا کہ وہ ایک روزے کے بدلے ایک مسکین کو کھانا کھلائیں۔ ابن ابولیلی ؓ سے روایت ہے۔ کہتے ہیں: میں رمضان شریف میں عطاء کے پاس گیا۔ دیکھتا ہوں کہ کھانا کھا رہے ہیں۔ اس کی وجہ دریافت کی تو انہوں نے فرمایا! ابن عباس فرماتے ہیں کہ (ا) یہ آیت نازل ہوئی۔ سابقہ منسوخ ہو گئی۔ البتہ نہایت بوڑھے شخص کے لئے اب بھی یہ رخصت ہے کہ وہ اگر چاہے تو ایک روزے کے بدلے ایک مسکین کو کھانا کھلا کر افطار کرے غرض اگلی آیت سے ثابت ہوتا ہے

ا۔ شھر رمضان۔

کہ تندرست اور گھر میں مقیم شخص سے یہ رخصت اٹھالی گئی ہے۔ اور آنے والی آیت فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ "تم میں سے جو بھی اس مہینے کو پائے اس کے پورے روزے رکھے۔" نے اس آیت کو اس حد تک منسوخ کر دیا ہے۔

تندرست اور مقیم شخص کو اب دوبارہ ترغیب دی جاتی ہے کہ وہ ضرور روزے رکھے۔ یہ رمضان شریف کے روزے ہیں۔ یہ وہ مہینہ ہے جس میں قرآن عظیم نازل ہوا ہے۔ رمضان میں نزول قرآن کا آغاز ہوا یا یہ کہ اس کا زیادہ تر حصہ رمضان شریف میں نازل ہوا۔ قرآن اس امت کے لئے دائمی کتاب ہے۔ قرآن ہی نے تو اس امت کو گھٹاٹوپ اندھیروں سے نکال کر روشنی بخشی اور اسے اس عظیم الشان عروج تک پہنچایا۔ خوف کے بدلے اسے چین نصیب ہوا۔ اسے اس کرۂ ارض پر تمکنت بخشی۔ اسے ایسے مقومات اور ایسے عناصر دیئے جن کی بنیاد پر وہ ایک امت قرار پائی۔ حالانکہ قرآن سے پہلے وہ کیا تھی؟ کچھ نہ تھی اور اب بھی اس قرآن کے بغیر اس کرۂ ارض پر' اس امت کا مقام ہی کیا رہتا ہے؟ اس کے بغیر تو وہ امت ہی نہیں رہتی۔ نہ زمین پر اس کا کوئی مقام ہو گا نہ آسمان میں اس کا کوئی ذکر ہو گا۔ لہٰذا ان انعامات کا کم از کم شکر یہ ہے کہ مسلمان شہر رمضان میں روزے سے ہوں' جس میں یہ قرآن نازل ہوا۔

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَ بَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَ الْفُرْقَانِ ۚ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ؕ وَ مَنْ كَانَ مَرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ

"رمضان وہ مہینہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا جو انسانوں کے لئے سراسر ہدایت ہے اور ایسی واضح تعلیمات پر مشتمل ہے جو راہ راست دکھانے والی اور حق و باطل کا فرق کھول کر رکھ دینے والی ہیں' لہٰذا تم میں سے جو شخص اس مہینے کو پائے اس کو لازم ہے کہ وہ اس پورے مہینے کے روزے رکھے۔"

یہ آیت روزے کو مطلقاً فرض کر دیتی ہے اور تندرست اور مقیم سے افطار کی رخصت واپس لے لی جاتی ہے۔ اب وہ فدیہ دے کر افطار نہیں کر سکتے ماسوائے بوڑھے مرد اور بوڑھی عورت کے' جس طرح کہ ہم پہلے کہہ آئے ہیں۔ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ "لہٰذا اب سے جو شخص اس مہینے کو پائے' اس کو لازم ہے کہ وہ اس پورے مہینے کے روزے رکھے۔" یعنی جو اس مہینے کو پائے اور مسافر نہ ہو۔ جو شخص ماہ رمضان کا چاند دیکھ لے۔ اگر کسی کو چاند ہونے کا یقین ہو جائے چاہے جس ذریعہ سے بھی' تو اس پر بھی روزہ اس طرح فرض ہے جس طرح چاند دیکھنے والے پر فرض ہے۔

چونکہ یہ آیت بھی عمومیت کی حامل ہے' اس لئے یہاں مریض اور مسافر کے لئے دوبارہ استثنائی دفعہ تجویز کی گئی۔ وَ مَنْ كَانَ مَرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ "اور جو مریض ہو یا سفر پر ہو تو وہ دوسرے دنوں میں روزوں کی تعداد پوری کرے۔"

اب تیسری مرتبہ پھر اس اہم فریضہ کی ادائیگی کی ترغیب دی جاتی ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ روزے کی فرضیت بھی ایک رحمت ہے اور افطار کے لئے رخصت بھی ایک رحمت۔ يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَ لَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ "اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ نرمی کرنا چاہتا ہے' سختی کرنا نہیں چاہتا۔" غرض اسلامی نظریۂ حیات میں تمام عبادات و فرائض کا اصل الاصول یہ ہے کہ معاملات میں نرمی ہو اور ضرورت سے زیادہ سختی نہ ہو۔ یہ عبادات ایسی ہیں کہ جس دل میں ان کا صحیح ذوق پیدا ہو جائے' اسے یہ شعور ملتا ہے کہ وہ پوری زندگی کے معاملات میں نرم رویہ اختیار کرے' سختی نہ کرے۔ ان کے نتیجے میں ایک مسلمان میں سادگی پیدا ہو جاتی ہے اور اس کی زندگی پاک ہو جاتی ہے۔ اس میں کوئی تکلف نہیں ہوتا' اس میں کوئی پیچیدگی نہیں ہوتی۔ یوں نظر آتا ہے کہ ایک مسلمان کی پوری زندگی فرائض و واجبات کی ادائیگی' عملی زندگی کے پورے معاملات' ایک سیل رواں کی طرح جاری و ساری ہیں۔ اس کی زندگی اس طرح غیر محسوس طور پر' اطمینان' یقین اور

تسلیم و رضا کے ساتھ رقی کر رہی ہوتی ہے جس طرح ایک درخت بڑھتا رہتا ہے اور یہ شعور ہر جگہ مومن کے ساتھ ہوتا ہے کہ اللہ کی رحمت اس کے شامل حال ہے اور یہ کہ وہ ترقی کرتا ہے۔ عبادات گزاری میں مومنین پر کوئی بے جاسختی نہیں ہے۔

مریض و مسافر کے لئے یہ رخصت ہے کہ وہ دوسرے دنوں میں روزے رکھے تاکہ جو شخص مجبوراً رخصت پر عمل کر رہا ہے وہ ہمیشہ کے لئے اجر عبادت سے محروم ہی نہ ہو جائے وَ لِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ "تاکہ تم روزوں کی تعداد پوری کر سکو۔"

اس نقطہ نظر سے روزہ ایک عظیم نعمت ہے۔ لہٰذا اس بات کی ضرورت ہے کہ ہم اللہ کی عظمت کا اقرار کریں اور اس کے شکرگزار بنیں: وَ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ وَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ "اور جس ہدایت سے اللہ تعالیٰ نے تمہیں سرفراز کیا ہے' اس پر اللہ کی کبریائی کا اظہار و اعتراف کرو اور شکرگزار بنو۔"

اس فریضہ کے مقاصد میں سے ایک یہ ہے کہ جو لوگ ایمان لائے ہیں ان کے دلوں میں اس ہدایت و راہنمائی کی قدر و قیمت کا صحیح شعور پیدا ہو جائے' جو اللہ تعالیٰ نے انتہائی سہولت اور فراوانی سے انہیں فراہم کر دی ہے اور ان کی حالت یہ ہو جائے کہ دوسرے ایام کے مقابلے میں ماہ صیام میں' ان کے دلوں میں دین کا شعور زیادہ پختہ ہو۔ ان کے دل معصیت اور گناہ کے بارے میں سوچنا ہی چھوڑ دیں۔ ان کے اعضاء معصیت کے ارتکاب کے لئے تیار ہی نہ ہوں۔ وہ اس طرح لگیں کہ اللہ کی ہدایت کو محسوس کر رہے ہیں' بلکہ اسے چھو رہے ہیں۔ ان کے دل اس اطاعت و بندگی کے ساتھ اللہ کی طرف مائل ہوں جیسا کہ رمضان شریف کی بحث کے آغاز میں کہا گیا۔ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ "اس امید پر کہ تم پرہیزگار بن جاؤ۔"

روزہ جو بادی النظر میں جسم و بدن کے لئے شاق و دشوار نظر آتا ہے دراصل اللہ تعالیٰ کا احسان عظیم ہے۔ نیز یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کے تربیتی مقاصد کیا ہیں۔ اور یہ کہ اس تربیت کے ذریعے ایک مومن کو اس عظیم کردار کے لئے تیار کیا جا رہا ہے جس کے لئے اس امت کو برپا کیا گیا ہے تاکہ وہ نہایت ہی خدا خوفی سے' اللہ کی نگرانی اور ایک زندہ ضمیر کے ساتھ اس فرض کو ادا کرے۔

اس سے پہلے کہ روزے کے تفصیلی احکام بیان ہوں' یعنی کس وقت سے کس وقت تک روزہ ہو اور اس میں کیا جائز ہے اور کیا منع ہے' ہم روزے کی برکات کی طرف توجہ دلاتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ روزے کی مشقتوں کے عوض اللہ ہمیں پورا پورا معاوضہ عطا کرتا ہے۔ یہ معاوضہ اور یہ صلہ کیا ہے؟ اللہ کا قرب اور دعاؤں کی قبولیت۔ ذرا قرآن کے الفاظ کو دیکھئے۔

وَ اِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ ؕ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ۙ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ وَ لْيُؤْمِنُوْا بِيْ لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ ﴿۱۸۶﴾

"میرے بندے اگر تم سے میرے متعلق پوچھیں تو انہیں بتا دو کہ میں ان سے قریب ہی ہوں۔ پکارنے والا جب مجھے پکارتا ہے' میں اس کی پکار سنتا اور جواب دیتا ہوں۔ لہٰذا انہیں چاہئے کہ میری دعوت پر لبیک کہیں اور مجھ پر ایمان لائیں شاید کہ وہ راہ راست پالیں۔"

"میں قریب ہوں۔" "پکارنے والا جب بھی مجھے پکارے میں اس کی پکار سنتا ہوں۔" کیا نرمی ہے؟ ذرا نظر کرم ملاحظہ ہو؟ الفاظ و معانی کی صفائی دیکھو! انس و محبت دیکھو! روزے کی تکالیف کیا۔ بلکہ تمام عبادات کی تکالیف مشقتیں اس قرب و محبت کے مقابلے میں کہاں رہتی ہیں؟ اس انس اور محبت کے ٹھنڈے سایے میں احساس مشقت کہاں باقی رہتا ہے؟

اس آیت کے لفظ لفظ پر انس و محبت کی تازہ شبنم ہے۔ "میرے بندے! اگر تم سے میرے متعلق پوچھیں تو انہیں بتا دیجئے کہ میں تو ان سے قریب ہوں پکارنے والا جب مجھے پکارتا ہے تو میں اس کی پکار سنتا ہوں اور جواب دیتا ہوں۔" اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا

دَعَانِ

عجیب آیت ہے یہ! دل مومن کو میٹھی تازگی' خوشگوار محبت' پرسکوں و رضامندی اور یقین محکم سے بھر دیتی ہے۔ مومن تسلیم و رضا کی جنت میں پہنچ جاتا ہے۔ اسے پرشفقت وصال نصیب ہوتا ہے۔ وہ پرامن پناہ گاہ اور پرسکون آرام گاہ میں پہنچ جاتا ہے۔

انس و محبت کی اس فضا میں پرجوش باریابی کے اس ماحول میں اور الہامی قبولیت کے اس پس و پیش میں' اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو ہدایت فرماتے ہیں کہ وہ میری دعوت پر لبیک کہیں اور مجھ پر ایمان لائیں۔ ہو سکتا ہے کہ یہ ایمان اور یہ اطاعت انہیں راہ ہدایت اور راہ مستقیم پر پہنچا دے۔ فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي وَلْيُؤْمِنُوا بِي لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُونَ "لہٰذا انہیں چاہئے کہ میری دعوت پر لبیک کہیں اور مجھ پر ایمان لے لائیں شاید کہ وہ راہ راست پالیں۔"

تسلیم و رضا اور ایمان باللہ کا آخری فائدہ بھی بندوں کا ہے یعنی ہدایت و راہنمائی اور اصلاح حال۔ خود اللہ کو ایمان اور بندگی سے کیا فائدہ ہے۔ وہ تو دونوں جہانوں سے مستغنی ہے۔

غرض ہدایت وہی ہے جو اللہ پر ایمان اور اللہ کی اطاعت پر مبنی ہو۔

صرف اسلامی نظام ہی انسان کو راہ ہدایت دے سکتا ہے اور اسلامی نظام ہی صحیح راہ ہے۔ اس کے علاوہ تمام نظام عین جاہلیت ہیں۔ عین حماقت ہیں۔ کوئی حق پسند ان پر راضی نہیں ہو سکتا۔ نہ ان نظاموں کے ذریعے انسان راہ ہدایت پا سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور فرماں برداری بھی تب ہی ممکن ہے کہ جب لبیک کہنے والا راہ ہدایت پر ہو۔ متلاشیان راہ حق کو چاہئے کہ وہ اللہ تعالیٰ کو پکاریں' لیکن قبولیت دعا میں جلدی نہ کریں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنی حکیمانہ مصلحتوں کے مطابق اور ہر پکار کا جواب اپنے وقت اور مناسب انداز میں دیتے ہیں۔

ابوداؤد' ترمذی' ابن ماجہ نے ابن میمون کی حدیث اپنی سند کے ساتھ حضرت سلمان فارسی ﷺ سے روایت کی۔ وہ کہتے ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ کے سامنے اگر کوئی ہاتھ پھیلائے اور اللہ سے خیر کا طلب گار ہو تو اللہ تعالیٰ ان ہاتھوں کو نامراد لوٹانے سے بہت حیاء کرتے ہیں۔"

ترمذی نے عبداللہ بن عبدالرحمٰن کے ذریعہ سے ابن ثوبان کی حدیث اپنی سند سے اور اسی حدیث کو عبداللہ بن امام احمد نے اپنی سند کے ساتھ حضرت عبادہ ابن الصامت سے روایت کیا ہے۔ دونوں نے کہا کہ حضور ﷺ نے فرمایا: "اس روئے زمین پر جو شخص بھی اللہ کو پکارے اور کوئی خیر طلب کرے' اللہ تعالیٰ یا تو اس کو وہ چیز عطا کر دیتا ہے یا اس مطلوب کے مطابق اس سے کوئی درپیش آنے والی مصیبت دور کر دیتا ہے بشرطیکہ وہ کسی بری چیز یا قطع صلہ رحمی کا طالب نہ ہو۔"

بخاری و مسلم نے روایت کیا ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: تمہاری دعا قبول ہوگی بشرطیکہ تم نے جلد بازی نہ کی۔ مثلاً کوئی کہے: "میں نے تو اللہ کو بہت پکارا مگر میری دعا قبول نہ کی گئی۔"

صحیح مسلم میں ہے حضور ﷺ نے فرمایا: "بندے کی دعا ضرور قبول ہوگی بشرطیکہ وہ گناہ اور قطع صلہ رحمی کا طلب گار نہ ہو اور جلد بازی نہ کرے۔" صحابہ ﷺ نے فرمایا یا رسول اللہ! جلد بازی کیسے ہوتی ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: "یہ کہے کہ میں نے بار بار اللہ کو پکارا' مجھے یقین نہیں ہے کہ میری دعا قبول ہوگی۔ یوں وہ دعا چھوڑ کر خسارے میں پڑ جائے۔"

روزہ دار تو ہوتا ہی مستجاب الدعوات ہے۔ امام ابوداؤد ﷺ اپنی مسند میں' اپنی سند کے ساتھ حضرت عبداللہ بن عمر ﷺ سے روایت کرتے ہیں۔ فرمایا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ کہتے سنا ہے کہ "افطار کے وقت ہر روزہ دار ایک دعا کی قبولیت کا حقدار ہوتا ہے۔"

چنانچہ عبداللہ بن عمر ﷺ جب بھی افطار کرتے تو اہل خانہ ان کو بلاتے اور دعا کرتے۔

ابن ماجہ نے اپنے سنن میں اپنی سند کے ساتھ عبداللہ بن عمر ﷺ سے روایت بیان کی ہے' حضور ﷺ نے فرمایا: ہر روزہ دار کے لئے افطار کے وقت ایک دعا کی قبولیت کا حق ہے۔"

مسند امام احمد' ترمذی' نسائی اور ابن ماجہ نے حضرت ابو ہریرہ ﷺ سے روایت فرمائی ہے۔ فرماتے ہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا: تین افراد ایسے ہیں جن کی دعا مسترد نہیں ہوتی۔ امام عادل' روزہ دار یہاں تک کہ افطار کرے اور مظلوم کی پکار۔ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اسے بادلوں کے اوپر اٹھائے گا اس کے لئے آسمان کے دروازے کھول دیئے جائیں گے اور اللہ تعالیٰ فرمائے گا: "میری عزت کی قسم میں ضرور تمہاری امداد کروں گا اگرچہ قدرے دیر سے۔" یہی وجہ ہے کہ ذکر صیام میں دعا کا ذکر خصوصیت سے کیا گیا۔

اب اہل ایمان کے لئے روزے کے ضروری احکام بیان کر دیئے جاتے ہیں۔ روزہ دار کو اس بات کی اجازت مل جاتی ہے کہ ماہ رمضان میں مغرب سے لے کر طلوع فجر تک اپنی بیویوں کے پاس جا سکتے ہیں۔ اسی طرح اس عرصہ میں کھانا بھی کھا سکتے ہیں۔ روزے کا وقت بھی بتایا جاتا ہے کہ وہ طلوع فجر سے لے کر غروب آفتاب تک ہے۔ اس طرح مدت اعتکاف کے دوران میں بیویوں کے پاس جانے کا حکم بھی دے دیا جاتا ہے۔ أُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ إِلَىٰ نِسَائِكُمْ ۚ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ۗ عَلِمَ اللَّهُ أَنَّكُمْ كُنتُمْ تَخْتَانُونَ أَنفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنكُمْ ۖ فَالْآنَ بَاشِرُوهُنَّ وَابْتَغُوا مَا كَتَبَ اللَّهُ لَكُمْ ۚ وَكُلُوا وَاشْرَبُوا حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ۖ ثُمَّ أَتِمُّوا الصِّيَامَ إِلَى اللَّيْلِ ۚ وَلَا تُبَاشِرُوهُنَّ وَأَنتُمْ عَاكِفُونَ فِي الْمَسَاجِدِ ۗ تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ فَلَا تَقْرَبُوهَا ۗ كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ آيَاتِهِ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ ﴿١٨٧﴾

"وہ تمہارے لئے لباس ہیں اور تم ان کے لئے لباس ہو۔ اللہ کو معلوم ہو گیا کہ تم لوگ چپکے چپکے اپنے آپ سے خیانت کر رہے تھے مگر میں نے تمہارے قصور معاف کر دیئے اور تم سے درگزر فرمایا۔ اب تم راتوں کو کھاؤ پیو یہاں تک کہ تم کو سیاہی شب کی دھاری سے سپیدۂ صبح کی دھاری نمایاں نظر آ جائے۔ تب یہ سب کام چھوڑ کر رات تک اپنا روزہ پورا کرو' اور جب تم مسجدوں میں معتکف ہو' بیویوں سے مباشرت نہ کرو۔ یہ اللہ کی باندھی ہوئی حدیں ہیں' ان کے قریب نہ پھٹکنا۔ اس طرح اللہ اپنے احکام لوگوں کے لئے بصراحت بیان کرتا ہے' توقع ہے کہ وہ غلط رویے سے بچیں گے۔"

ابتداءً حکم یہ تھا کہ اگر روزہ دار افطار کے بعد سو جائے تو اس پر کھانا پینا اور بیویوں کے پاس جانا حرام ہے۔ اگر کسی کی آنکھ لگ جاتی اور پھر وہ اٹھتا تو اگرچہ طلوع فجر سے پہلے اٹھتا۔ اس کے لئے بیوی کے پاس جانا اور کھانا پینا حرام ہوتا۔ بارہا ایسا ہوتا کہ ایک صحابی پر افطار کے وقت نیند کا غلبہ ہو گیا اور آنکھ لگ گئی۔ اب اس کے سوا کوئی اور چارہ نہ تھا کہ وہ مسلسل دوسرے دن تک روزہ رکھے۔ ایک صاحب کے ساتھ ایسا ہی ہوا۔ دوسرے دن اس نے بڑی مشکل سے روزہ پورا کیا۔ بات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچی۔ اس طرح ایسے واقعات

بھی ہوئے کہ افطار کے بعد ایک صاحب سو گئے' بیوی بھی سو گئی۔ جب جاگے تو ہم بستری کی اور حضور تک بات پہنچ گئی۔ ان واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمانوں پر یہ حکم بھاری ہو رہا ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس مشکل حکم کو منسوخ کر دیا اور معاملہ آسان ہو گیا۔ چونکہ روزے کے ان احکام میں مشکلات کا سامنا وہ کر چکے تھے۔ تجربہ ان کے ذہن میں تھا' اس لئے اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کو انہوں نے خوب محسوس کیا۔ آیت نازل ہوئی اور ان کے لئے مغرب اور طلوع فجر کے درمیان کھانا پینا اور بیوی کے پاس جانا جائز قرار دیا گیا۔

أُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ إِلَىٰ نِسَائِكُمْ "تمہارے لئے روزوں کے مہینے میں راتوں کو اپنی بیویوں کے پاس جانا جائز قرار دیا گیا ہے۔" الرفث کا مفہوم مباشرت کا آغاز ہے یا عین مباشرت ہے۔ یہاں دونوں کا جواز مقصود ہے۔ دونوں جائز ہیں لیکن دوران بیان' قرآن مجید پر ایک نظر پھیرتا ہوا خوشگوار تاثر چھوڑے بغیر نہیں رہتا۔ میاں بیوی کے اس تعلق کے اندر ابریشم کی طرح ملائمت' شیشے کی سی صفائی پیدا کی جاتی ہے۔ نیز اس کو حیوانی درشتگی اور حیوانی نقائص سے پاک کر دیا جاتا ہے۔

هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ "وہ تمہارے لئے لباس ہیں اور تم ان کے لئے لباس ہو۔" لباس پردہ پوشی کرتا ہے۔ گرمی سردی سے بچاتا ہے' اسی طرح میاں بیوی کا باہمی تعلق دونوں کا پردہ پوش ہے۔ ان کا محافظ ہے۔ اسلام مخلوق انسانی کو اس کی حقیقت واقعہ کے لحاظ سے دیکھتا ہے۔ اور حقیقت واقعہ کے لحاظ سے اس کے فطری تقاضوں کو بھی پورا کرتا ہے اور اس طرح یہ نظام انسان کا ہاتھ پکڑ کر اسے بلندیوں تک پہنچا دیتا ہے۔ یہ ہے اسلام اور یہ ہے اس کا نظریۂ حیات۔ وہ گوشت و پوست کے فطری تقاضے پورے کرتا ہے اور پورے بھی کرتا ہے خوشگوار اور لطیف فضا میں' پاکیزگی کے لطیف پردوں میں۔

اللہ علیم و خبیر ہے۔ وہ بتا دیتا ہے کہ تمہارے خفیہ جذبات کیا ہیں؟ اور پھر دکھاتا ہے کہ وہ تمہارے فطری دواعی پورے کرنے کے لئے تمہاری حاجات کو پوری کرتا ہے۔

عَلِمَ اللَّهُ أَنَّكُمْ كُنتُمْ تَخْتَانُونَ أَنفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنكُمْ "اللہ کو معلوم ہو گیا کہ تم لوگ چپکے چپکے اپنے آپ سے خیانت کر رہے تھے مگر اس نے تمہارا قصور معاف کر دیا اور تم سے درگزر فرمایا۔" یہ خیانت کیا تھی؟ ان کے دلوں میں دبی ہوئی خواہشات تھیں۔ خفیہ جذبات تھے جو ارتکاب جرم کا تقاضا کر رہے تھے۔ یا مراد یہ ہے کہ تم چوری چھپے اس حکم کو توڑ رہے تھے۔ جیسا کہ بعض روایات میں آتا ہے کہ بعض حضرات سے اس کی خلاف ورزی کا ارتکاب ہوا لیکن دونوں قسم کے حضرات کو اللہ تعالیٰ نے معاف کر دیا۔ چونکہ ان کی کمزوری اور ناتوانی ظاہر ہو گئی تھی' اللہ تعالیٰ جانتے تھے چنانچہ ان کی حاجت روائی کر دی گئی فَالْـَٔـٰنَ بَـٰشِرُوهُنَّ "اب تم اپنی بیویوں کے ساتھ شب باشی کرو۔"

لیکن اس جواز کا رابطہ بھی رضائے باری سے جوڑ دیا گیا۔ حکم دیا گیا کہ اس میں بھی تم اللہ کی طرف متوجہ وَابْتَغُوا مَا كَتَبَ اللَّهُ لَكُمْ "اور جو اللہ نے تمہارے لئے لکھ دیا ہے اسے حاصل کرو۔" یعنی عورتوں سے جو لطف اندوزی اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے جائز کر دی ہے' اس سے فائدہ اٹھاؤ اور اس کے نتیجے میں آنے والی اولاد سے بھی بہرہ مند ہو۔ دونوں چیزیں حکم خداوندی میں شامل ہیں۔ دونوں وہ سامان ہیں جن کا حاصل کرنا اور جن سے لطف اندوز ہونا اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے جائز قرار دے دیا ہے لیکن اس لطف اندوزی کے پس منظر میں ایک گہری حکمت پوشیدہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں یہ ایک بامقصد فریضہ ہے۔ یہ جسمانی طلب اور مجرد حیوانی تلذذ ہی نہیں ہے جس کا تعلق محض جسم سے ہو۔ اس طرح میاں بیوی کے درمیان تعلق ایک بلند مقصد سے مربوط ہو کر فریضۂ فطرت قرار پاتا ہے۔ وہ لطف و لذت کے ایک مختصر لمحے کے بجائے انسانیت کے افق پر ایک پاک مقصد قرار پاتا ہے۔ اسلامی نظام حیات اور اسلام کے طرز زندگی کے اندر اس قسم کے اشارات و ارشادات دیکھ کر معلوم ہو جاتا ہے کہ اسلام انسانی زندگی کے اندر کیا انقلاب لانا چاہتا ہے اور اسے کن

خطوط پر ترقی دیتا ہے یہ تمام کام وہ انسان کے حدود میں' اس کی قوت برداشت کے اندر اور اس کے پیدائشی مزاج کے مطابق سرانجام دیتا ہے۔ یہ ہے تربیت' سربلندی اور ترقی کا اسلامی نظام۔ جس کا سرچشمہ خدا تعالیٰ ہے' جو اسے مخلوق کے حالات سے خوب خبردار ہے۔ جو باریک بین اور لطیف و خبیر ہے۔

ان اوقات میں جس طرح بیوی کے پاس جانے کی اجازت دے دی گئی اسی طرح ان اوقات میں کھانے پینے کی اجازت بھی مل گئی۔ وَ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ نیز راتوں کو کھاؤ یہاں تک کہ تم کو سیاہی شب کی دھاری سے سپیدۂ صبح کی دھاری نمایاں نظر آجائے۔" یعنی اس وقت تک کہ افق پر اور پہاڑوں کی چوٹیوں پر روشنی پھیل جائے۔ اس سے مراد افق پر سفید دھاری کا محض "ظہور" نہیں ہے۔ اس کو فجر کاذب کہتے ہیں۔ روزہ بند کرنے کے سلسلے میں جو روایات وارد ہیں ان کا مطالعہ کرنے کے بعد ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ وقت طلوع الشمس سے تھوڑا پہلے ہے۔ آج کل ہمارے علاقے میں عام طور پر جو اوقات مقرر ہیں ہم انہی کے مطابق روزہ رکھتے ہیں۔ یہ اوقات شرعی وقت سے قدرے پہلے ہی ہیں اور مزید احتیاط کے لئے مقرر کئے گئے ہیں۔

ابن جریر ؒ نے اپنی سند سے' سمرہ ؓ بن جندب سے روایت کی ہے۔ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "تمہیں بلال کی اذان اور یہ سفیدی دھوکہ میں نہ ڈال دے۔ یہاں تک کہ صبح کھل نہ جائے یا فرمایا :طلوع نہ ہو جائے۔"

اس حدیث کو اس نے شعبہ ؒ سواد ؓ بن حنظلہ اور سمرہ ؓ کے واسطوں سے یوں نقل کیا ہے :"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بلال کی اذان اور "مستطیل صبح" کہیں تمہیں سحری کرنے سے روک نہ دے۔

اس سے مراد وہ صبح ہے جو افق میں پھیل جائے (المستطیر) اور طلوع آفتاب سے قدرے پہلے صبح پھیلتی ہے۔ ہوتا یہ تھا کہ حضرت بلال سوئے ہوئے لوگوں کو سحری سے آگاہ کرنے کے لئے بہت سویرے اذان دیتے تھے اور ابن ام مکتوم آخر میں روزہ بند کرنے کے لئے اذان دیتے تھے۔ اس لئے یہ کہا گیا کہ تم اذان بلال سے دھوکہ نہ کھاؤ۔

اس کے بعد مساجد میں اعتکاف کے دوران میں مباشرت کے حکم کا بیان ہوتا ہے۔ اعتکاف کے معنی ہیں' مسجد میں علیحدہ ہو کر اللہ کی طرف متوجہ ہونا اور سوائے حاجات ضروریہ کے مسجد سے نہ نکلنا۔ مثلاً کھانا پینا قضائے حاجت وغیرہ۔ یہ مستحب ہے اور رمضان شریف کے آخری عشرے میں کیا جاتا ہے۔ رمضان شریف کے آخری عشرے میں حضور ﷺ اس پر عمل پیرا ہوتے تھے' اعتکاف کا عرصہ عام معمولات زندگی سے الگ ہو کر صرف اللہ کی طرف متوجہ ہونے کا عرصہ ہوتا ہے۔ اس لئے اس تجرد اور علیحدگی کو مکمل کرنے کے لئے حکم دیا گیا کہ اس عرصے میں بیویوں کے پاس جانے سے بھی اجتناب ہونا چاہئے۔ تاکہ نفس انسانی تمام الائشوں سے علیحدہ ہو جائے اور دل تمام مشغولیات سے پاک ہو جائے۔

وَ لَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَ اَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ فِي الْمَسٰجِدِ "اور جب تم مسجدوں میں معتکف ہو تو بیویوں سے مباشرت نہ کرو۔" چاہے روزے کا وقت ہو یعنی دن یا افطار کا وقت ہو یعنی رات۔

سب سے آخر میں تمام معاملے کو ذات باری کے ساتھ مربوط کر دیا جاتا ہے۔ جیسا کہ ہر انضباطی حکم اور ہر ہدایت کے معاملے میں قرآن مجید کا مستقل انداز بیان ہے۔ یعنی ہر امر میں' ہر نہی میں ہر حرکت میں اور ہر سکون میں۔

تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا "یہ اللہ کی باندھی ہوئی حدیں ہیں' ان کے قریب نہ پھٹکنا۔"

یہاں اس شدت سے روکا گیا ہے کہ قریب ہی مت جاؤ' تاکہ انسان اور ممنوعات کے درمیان امن کا ایک لازمی علاقہ موجود ہو۔ جو

چرندہ چراگاہ کے اردگرد گھومتا ہے آخر کار اس میں داخل ہو جاتا ہے اور ہر وقت انسان بھی اپنے نفس کی نگرانی نہیں کر سکتا۔ اس لئے اس کے لئے مناسب نہیں ہے کہ وہ ایسی ممنوعات کے قریب گھومتا رہے جو مرغوب ہوں اور پھر اس اعتماد پر کہ وہ جب چاہے گا اپنے نفس پر قابو پالے گا۔ کسی شخص کے لئے یہ مناسب نہیں کہ وہ اپنے آپ کو ایسے خطرناک امتحان میں ڈالے' چنانچہ یہ ممانعت ایسے ہی معاملے سے وابستہ ہے جو پرلطف ہے اور مرغوبات میں سے ہے۔ اس لئے حکم دیا گیا ہے کہ قریب ہی مت جاؤ۔ حالانکہ مقصد صرف یہ ہے کہ ان ممنوعات کے اندر مبتلا ہونے سے بچو کہ قریب جانے کی ممانعت نہیں ہے۔ مطلب صرف یہ ہے کہ احتیاط اور خدا خوفی سے کام لینا چاہئے۔ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ اس طرح اللہ اپنے احکام لوگوں کے لئے بصراحت بیان کرتا ہے۔ توقع ہے کہ وہ غلط رویے سے بچیں گے۔" بتایا جاتا ہے کہ نزول قرآن اور تبلیغ آیات کا آخری مقصد خدا خوفی کا حصول ہے۔ یہ وہ قیمتی اور عظیم مقصد ہے جس کی اہمیت اور قدر و قیمت صرف ان لوگوں کے ہاں ہے جو ایمان لانے والے ہیں اور جو ہر دور میں قرآن کے طالب ہیں۔

روزہ کے بیان کی مناسبت سے کھانے کی ایک اور قسم کی بھی ممانعت کی گئی ہے۔ اور وہ ہے لوگوں کا مال ناجائز طور پر کھانا' انہیں مقدمات میں ملوث کرنا' چالاکی سے انہیں پھنسانا اور ان کے خلاف حکام کے سامنے شواہد اور قرائین فراہم کرنا اور چالاکی اور چرب زبانی سے ان کے خلاف ڈگری حاصل کر لینا۔ یہ سخت ممنوع ہے۔ کیونکہ حاکم تو مقدمہ کے ظاہری حالات اور شہادت و دلائل کے مطابق ہی فیصلہ کرے گا۔ اور اگر جھوٹی شہادتیں پیش کر دی جائیں تو یہ فیصلہ خلاف موقعہ ہو گا اس لئے یہ ممانعت اللہ کے مدد کے ذکر کے بعد خدا خوفی اور خدا ترسی کی مسلسل دعوت کے بعد کی گئی ہے تاکہ نہی کا یہ اہم حکم خدا خوفی کے ایسے ماحول میں وارد ہو جو انسان کو ارتکاب ممنوعات سے باز رکھے۔

وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۸﴾

۲۳ ع۶ ۷

"اور تم لوگ نہ تو آپس میں ایک دوسرے کے مال ناروا طریقے سے کھاؤ اور نہ حاکموں کے آگے ان کو اس غرض کے لئے پیش کرو کہ تمہیں دوسروں کے مال کا کوئی حصہ قصداً ظالمانہ طریقہ سے کھانے کا موقع مل جائے۔"

ابن کثیر ﷫ نے اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے: علی ابن ابو طلحہ' حضرت ابن عباس سے روایت کرتے ہیں: "یہ اس شخص کے بارے میں ہے کہ اس پر دوسرے کا قرضہ ہو۔ اور اس کے خلاف کوئی ثبوت نہ ہو۔ وہ انکار کر دے اور مقدمہ حکام کے پاس جائے۔ وہ جانتا ہو کہ اس پر حق موجود ہے اور اسے خوب علم ہو کہ وہ گناہ گار اور حرام خور ہے۔" مجاہد ﷫' سعید ﷫ بن جبیر' عکرمہ ﷫' حسن قتادہ ﷫' سدی ﷫' مقاتل ﷫ بن حیان اور عبدالرحمن ﷫ بن زید بن اسلم سے روایت ہے۔ ان سب نے کہا! "اگر تمہیں معلوم ہو کہ تم ظلم کر رہے ہو تو ہرگز مقدمہ دائر نہ کرو۔" بخاری و مسلم میں حضرت ام سلمہ ﷞ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا! "بہرحال میں ایک انسان ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ تم ایک مقدمہ میرے پاس لاؤ اور تم میں سے ایک شخص دوسرے کی نسبت زیادہ چرب زبان ہو اور میں اس کے حق میں فیصلہ کروں۔ یاد رکھو کہ جس کے حق میں' میں کسی دوسرے کی کسی چیز کا فیصلہ کروں تو وہ اس کے حق میں دوزخ کا ایک ٹکڑا ہو گا۔ اب یہ اس کی مرضی ہے کہ وہ اسے اٹھاتا ہے یا اسے چھوڑ دیتا ہے یوں اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کا

معاملہ خود ان کے سپرد کردیتا ہے جو اپنے دعویٰ کی حقیقت سے باخبر ہوں- جج کے فیصلے سے حرام حلال نہیں ہو جاتا' نہ حلال حرام ہو جاتا ہے- اس کی حیثیت صرف یہ ہوتی ہے کہ بظاہر وہ فیصلہ نافذ ہو جاتا ہے- اور گناہ دھوکہ باز کے ذمہ ہوتا ہے-

حکم قصاص 'حکم وصیت اور احکام صیام کی طرح مقدمہ بازی Letigation اور مالی معاملات میں بھی معاملہ خدا خوفی اور تقویٰ کے سپرد کر دیا جاتا ہے- یہ سب احکام دراصل اسلامی نظام کے جسم اجتماعی کے مختلف اجزاء ہیں اور سب کی روح تقویٰ ہے- یہ تمام اجزاء تقویٰ کی مضبوط رسی میں بندھے ہوئے ہیں- یہی وجہ ہے کہ اسلامی نظام حیات ایک وحدت ہے- یہ جزلاینجزی ہے- ایک ایسی اکائی ہے جس کے اجزاء علیحدہ نہیں ہو سکتے- اگر ہم اس کے بعض اجزاء پر عمل کریں اور بعض کو ترک کر دیں تو یہ بعض کتاب پر عمل ہو گا اور ایک حصے کا انکار ہو گا جو آخر کار کفر پر منتج ہو گا- نعوذ باللہ!

☆ ☆ ☆

درس ۱۲ ایک نظر میں

سابقہ اسباق کی طرح اس سبق میں امت کو بعض مزید فرائض کی تعلیم دی گئی ہے۔ اسلامی نظام زندگی کے بعض قومی اور بعض بین الاقوامی معاملات پر قانون سازی کی گئی ہے۔

اس سبق میں چاند کی بڑھتی گھٹتی صورتوں کا بیان ہے۔ گھروں میں پیچھے کی طرف سے داخل ہونے کا بیان ہے' جاہلیت میں بعض اوقات لوگ اس رسم کی پابندی کرتے تھے۔ احکام قتال' حرام مہینوں میں مسجد حرام کے پاس جنگ اور حج و عمرہ کے اصلاح شدہ احکام ہیں۔ ترتیب و تعدیل کے ساتھ اور مناسب ترامیم کے ساتھ۔ ان تمام معاملات سے وہ اجزاء نکال دیئے گئے ہیں جن کا ربط دور جاہلیت سے تھا۔

سابقہ درس کی طرح اس میں بھی بعض احکام' عقائد و نظریات سے متعلق ہیں اور بعض کا تعلق رسومات و عبادات سے ہے جبکہ بعض احکام کا تعلق جنگ سے ہے۔ ان سب کو ایک ہی لڑی میں پرو دیا گیا ہے۔ یعنی اللہ کا ذکر اور اس کا ڈر یعنی تقویٰ۔

جہاں حکم دیا جاتا ہے کہ تم گھروں میں پیچھے کی طرف سے نہ داخل ہو' سیدھے آؤ۔ اس کے ساتھ ہی نیکی کے مفہوم اور تصور کو درست کر دیا جاتا ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ حرکات و سکنات کی ظاہری اشکال کا نام نیکی نہیں ہے۔ بلکہ بر خدا خوفی کا نام ہے۔ وَ لَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا وَ لٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى وَ اْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا وَ اتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ "یہ کوئی نیکی کا کام نہیں ہے کہ تم اپنے گھروں میں پیچھے سے داخل ہوتے ہو۔ نیکی تو اصل میں یہ ہے کہ آدمی اللہ کی ناراضی سے بچے۔ لہٰذا تم اپنے گھروں میں دروازے میں سے آیا کرو۔ البتہ اللہ سے ڈرتے رہو شاید کہ تمہیں فلاح نصیب ہو جائے۔"

حکم دیا جاتا ہے کہ دوران جنگ ظلم اور زیادتی سے بچو۔ لیکن اس سے بچنے کا محرک بھی خدا سے لگاؤ اور اس کا خوف ہونا چاہئے۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ مسجد حرام کے قریب جنگ کے حکم میں بھی کہا جاتا ہے۔ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ وَ اعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ اللہ سے ڈرتے رہو اور جان رکھو کہ اللہ انہی لوگوں کے ساتھ ہے جو اس کی حدود توڑنے سے پرہیز کرتے ہیں۔"

اب مواقیت حج کا بیان شروع ہوتا ہے۔ اس کے دوران میں شہوانی افعال' بدفعلی اور لڑائی جھگڑے کی ممانعت ہوتی ہے اور نتیجہ وہی تقویٰ ہے۔ وَ تَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى وَ اتَّقُوْنِ يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ سفر حج کے لئے زاد راہ ساتھ لے جاؤ اور سب سے بہتر زاد راہ پرہیز گاری ہے۔ پس اے ہوشمندو! میری نافرمانی سے پرہیز کرو۔"

انفاق فی سبیل اللہ کا حکم دیا جاتا ہے اور اس میں آخری نتیجہ تقویٰ اور احسان ہے۔ وَ اَحْسِنُوْا ۛۚ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ "احسان کا طریقہ اختیار کرو اللہ محسنوں کو پسند کرتا ہے۔" حج کے بعض احکام کے آخر میں بھی دعوت دی گئی ہے کہ خدا خوفی اختیار کرو ورنہ عذاب سے نہ بچ سکو گے وَ اتَّقُوا اللّٰهَ وَ اعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ اللہ کے احکام کی خلاف ورزی سے بچو اور جان لو کہ اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔"

حج کے بعد لوگوں کو ہدایت کی جاتی ہے کہ اللہ کی یاد میں مشغول ہو جاؤ۔ لیکن آخری نصیحت پھر تقویٰ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ وَ اعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ "اللہ کی نافرمانی سے بچو اور خوب جان رکھو کہ ایک روز اس کے حضور میں تمہاری پیشی ہونے والی ہے۔"

صاف نظر آجاتا ہے کہ یہ تمام اور مختلف النوع احکام ایک مضبوط رسی میں نہایت مضبوطی سے باندھے ہوئے ہیں۔ یہ رسی اور یہ رابطہ اس دین کے مجموعی مزاج سے وجود میں آتا ہے۔ اس دین کا مزاج یہ ہے کہ اس میں عبادات شعور سے جدا نہیں ہوتیں اور عبادات سے قوانین عامہ اور دنیاوی قواعد و ضوابط جدا نہیں ہوتے۔ یہ دین اس وقت تک قائم نہیں ہو سکتا جب تک دنیاوی امور اور آخرت کے امور کو ساتھ ساتھ نہ بٹھایا جائے۔ نظریہ حیات اور قلب و نظر کی دنیا کے ساتھ قومی اور بین الاقوامی معاملات کو وابستہ نہ کر دیا جائے اور جب تک اس دین کو انسان کی پوری زندگی میں جاری و ساری اور غالب نہ کر دیا جائے اور حالت یہ نہ ہو جائے کہ پوری زندگی مکمل طور پر تصور وحدت کے مطابق چل رہی ہے' ایک ہی ہم آہنگ نظام اس پر حاوی ہے ایک ہی اور کامل نظام ہے جو اس میں نافذ ہے اور یہ ایسا نظام ہے جو اللہ کی شریعت پر قائم ہے۔ ایک اکائی ہے اور زندگی کے پورے معاملات کو اپنی حدود میں لئے ہوئے ہے۔

سورت کے اس حصے کے آغاز ہی میں ہمارے سامنے ایک منظر آتا ہے۔ اس منظر میں مسلمان زندگی کے مختلف شکلوں کے بارے میں اپنے پیارے نبی کے اسوۂ حسنہ کی طرف نظر کرتے ہیں۔ ایسے حالات کے بارے میں پوچھتے ہیں جو آئے دن زندگی میں انہیں پیش آتے رہتے ہیں۔ وہ یہ جاننے کے لئے بے تاب نظر آتے ہیں کہ وہ ان معاملات میں' اپنے جدید تصور حیات کے مطابق کیا طرز عمل اختیار کریں۔ جو ان کے جدید نظام زندگی کے مطابق ہو۔ وہ سب سے پہلے جس چیز کی طرف توجہ مبذول کرتے ہیں وہ مظاہر فطرت ہیں وہ چاند کے بارے میں غور کرتے ہیں کہ اس کی کیا حقیقت ہے؟ وہ ہلال نظر آتا ہے۔ پھر وہ بتدریج مکمل ہو جاتا ہے اور پھر گھٹنے لگتا ہے۔ پھر ہلال ہو جاتا ہے یہاں تک کہ غائب ہو جاتا ہے اور پھر نئے سرے سے ہلال ہو کر نکلتا ہے۔ پھر وہ یہ سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں کہ کیا خرچ کریں؟ مال کی کون سی قسم خرچ کریں؟ وہ کس قدر خرچ کریں؟ خرچ کس نسبت سے ہو؟

پھر وہ سوچتے ہیں کہ مسجد حرام کے نزدیک جنگ کرنا کیسا ہے؟ پھر حرام مہینوں میں جنگ کرنے کا کیا حکم ہے؟ پھر وہ جوئے اور قماربازی کے بارے میں دریافت کرتے ہیں کہ نئے نظام میں کیا حکم ہے؟ کچھ ہی عرصہ پہلے وہ تو سب شراب خور تھے اور جوئے بازی کے سوا ان کا اور کوئی کام ہی نہ تھا۔

پھر اچانک عورتوں کے ایام کے سلسلے میں پوچھتے ہیں کیا ان ایام میں تعلقات زن و شوئی جائز ہیں؟ پھر وہ اپنی بیویوں کے خصوصی تعلقات کے بارے میں سوال کرتے ہیں اور بعض اوقات تو ایسے سوالات خود بیویوں نے بھی کئے۔ غرض پورے نظام زندگی کے بارے میں نہ صرف ان کی سوچ بدل جاتی ہے بلکہ طرز عمل بھی بدل جاتا ہے۔ وہ طہارت اور پاکیزگی میں معراج کمال پر نظر آتے ہیں۔

یہ سوالات نہایت اہمیت کے حامل ہیں اور ان سے بے شمار حقائق کا اظہار ہوتا ہے مثلاً:

اولاً یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اس وقت اجتماعی زندگی کی جو اشکال تھیں اور ان کے درمیان جو ربط ضبط تھا وہ زندہ' ترقی پذیر اور وسعت پذیر تھا۔ اسلامی معاشرے کی تشکیل جدید ہو رہی تھی' تشخص قائم ہو رہا تھا اور نئی نئی صورتیں پیش کی جا رہی تھیں۔ افراد معاشرہ اپنی اجتماعی زندگی پر پختہ یقین رکھتے تھے۔ وہ اب بکھرے ہوئے افراد اور متفرق قبائل نہ تھے۔ اب وہ ایک امت بن چکے تھے' جس کا الگ وجود تھا۔ اپنا نظام تھا۔ اس کی اپنی وضع قطع تھی اور سب افراد اس نظام کے ساتھ پختہ طور پر وابستہ تھے۔ ہر فرد کیلئے یہ بات اہم تھی کہ وہ زندگی کے پاکیزہ خطوط سے پوری طرح باخبر ہو' باہمی تعلقات و رابطہ کی نوعیت کے بارے میں خبردار ہو۔ یہ نئی صورت حال دراصل نئے نظریۂ حیات' نئے نظام زندگی اور نئی قیادت کے نتیجے میں پیدا ہوئی تھی۔ اور ان کی انسانیت' ان کا شعور اور ان کی فکر غرض پوری سوسائٹی ہمہ جہت ترقی کر رہی تھی۔

اس ہمہ جہت تجسس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی دینی حس کس قدر تیز تھی۔ اسلامی نظریۂ حیات ان کے دلوں میں کس

قدرا تر چکا تھا۔ یہ نظریہ ان کی زندگیوں پر یوں چھا گیا تھا کہ وہ روز مرہ کا کوئی کام بھی اس وقت تک نہ کرتے تھے جب تک اس جدید نظریۂ حیات کی روشنی میں یہ یقین نہ کر لیتے کہ وہ درست ہے۔ اس لئے کہ اب ان کی سابقہ زندگی کی کوئی بات برقرار نہ تھی۔ انہوں نے دور جاہلیت کی تمام رسموں اور عادتوں کا جوا گردن سے اتار پھینکا تھا۔ اب انہیں قدیم رسومات پر کوئی اعتماد نہ تھا اور وہ زندگی کے ہر کام اور ہر موڑ پر ایک جدید تعلیم کے منتظر تھے۔ وہ ہروقت بیدار اور باشعور رہتے تھے اور ان کی یہ شعوری حالت سچائی پر پختہ عقیدے کی وجہ سے تھی۔ ان کے نفوس تمام جاہلی عادات اور طور طریقوں سے پاک ہو گئے تھے۔ وہ جاہلیت کی ہربات کا بڑی احتیاط سے جائزہ لیتے تھے اور اسے ترک کر دیتے تھے۔ جدید نظریۂ حیات سے ہدایات لینے کے لئے وہ ہروقت تیار رہتے تھے۔ وہ اپنی نئی زندگی کو خالصتاً اس نئے نظریہ حیات کے مطابق جلد از جلد استوار کرنے کا عزم کر چکے تھے۔ یہ جدید نظریہ حیات ان کی زندگی کو نئے سانچوں میں ڈھال رہا تھا۔ قدیم عہد کی جن باتوں کو بدرجہ مجبوری باقی رکھا گیا تھا انہیں بھی وہ جدید رنگ اور جدید تربیت کے ساتھ لیتے تھے۔ یہ ضروری نہیں ہوتا کہ ہر آنے والا نظام قدیم نظام کی جزئیات تک کو ترک کر دے۔ اصل بات یہ ہوتی ہے کہ جدید نظام قدیم نظام کی بعض صالح جزئیات کو منتخب کر کے انہیں جدید نظام میں سمو دیتا ہے۔ وہ اس جدید نظام کا جزو ہو جاتی ہیں۔ مثلاً حج کے اکثر مناسک ایسے ہیں جنہیں اسلام نے باقی رکھا ہے۔ اور وہ یوں ہو گئے کہ گویا وہ اسلامی نظام زندگی کے سرچشمے سے پھوٹے ہیں۔

تیسری بات اس دور کی تاریخ سے سمجھ میں آتی ہے وہ یہ کہ اس دور میں مشرکین مکہ اور یہود مدینہ بار بار 'اسلامی اقدار کے سلسلے میں' مسلمانوں کے دلوں میں شبہات پیدا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ اسلام نے جاہلیت کے رسوم عبادت میں جو ترمیمات کی تھیں یا اس دور میں جو واقعات پیش آئے تھے ان کی وجہ سے یہ عناصر کوئی موقعہ ہاتھ سے جانے نہ دیتے تھے اور اسلام کے خلاف ہروقت گمراہ کن پروپیگنڈے میں لگے رہتے تھے۔ مثلاً مشرکین عبداللہ بن جحش کے سریہ کے سلسلے میں سخت اعتراض کرتے تھے۔ انہوں نے حرام مہینوں میں مشرکین پر حملہ کر دیا تھا۔ اور اس کی وجہ سے بے شمار سوالات پیدا ہو گئے تھے جن کا جواب ضروری تھا۔ اندرونی طور پر قرآن کریم جاہلی تصورات' جاہلی رسومات اور جاہلی نظام کا ابطال کر رہا تھا تو ظاہری طور پر اسلام اور مسلمانوں کے ان دشمنوں کے خلاف اس نے اعلان جنگ کر دیا تھا۔ یہ اندرونی اور بیرونی جنگ مسلمانوں کے لئے اب بھی برپا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ انسانی نفس اور انسانی ذہن میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی' اسلام کے وہی دشمن آج بھی تیغ بکف ہیں اور قرآن کریم اس وقت جو جواب دے رہا تھا آج بھی وہی جواب دے رہا ہے اور یہ امت آج بھی' اس وقت تک کامیابی حاصل نہیں کر سکتی جب تک حق و باطل کی اس جنگ میں قرآن عظیم کو اپنا رہنما نہیں بناتی۔ یقیناً قرآن کریم آج بھی وہ کارہائے نمایاں دکھائے گا جو اس نے سینکڑوں سال پہلے دکھائے تھے۔ جب تک مسلمان اس حقیقت کا یقین اور تسلیم نہ کریں گے اور اس پر عمل نہ کریں گے' ان کے لئے کوئی نجات نہیں ہے اور نہ ہی وہ اس دنیا میں کامیابی سے ہمکنار ہو سکتے ہیں۔

اس حقیقت پر غور کرنے کا ادنیٰ نتیجہ یہ ہونا چاہئے کہ انسان اس تصور اور ادراک کے ساتھ' اس کتاب کو قبول کرے۔ وہ اس کی طرف اس طرح متوجہ ہو کہ اس کی تعلیمات متحرک صورت میں نظر آئیں' وہ میدان عمل میں ہو اور ذہن کو ایک جدید تصور حیات دے رہا ہو۔ جاہلیت کے تصورات کا مقابلہ کر رہا ہو' اس امت کو لغزشوں سے بچا رہا ہو اور اس کی مدافعت کر رہا ہو' اس حال میں متوجہ نہ ہو' جس طرح آج ہم اس کی طرف رخ کرتے ہیں۔ میٹھے نغمے کی طرح ایک اچھے کلام کی صورت میں جو ترتیل سے پڑھا جا رہا ہے اور بس.....

حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے تو قرآن مجید کو ذہنی آسودگی حاصل کرنے کے لئے نہیں بلکہ ایک عظیم مقصد کے لئے اتارا تھا۔ اسے اس لئے اتارا تھا کہ وہ اس کرۂ ارض پر ایک پاکیزہ اور مکمل زندگی تخلیق کرے۔ اسے حرکت دے۔ راستے کی مصیبتوں' لغزشوں اور کانٹوں کے درمیان سے انسان کی راہنمائی کر کے اسے پرامن منزل تک پہنچائے۔

درس نمبر ۱۲ تشریح آیات (۱۸۹ تا ۲۰۳)

یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ ؕ قُلْ هِیَ مَوَاقِیْتُ لِلنَّاسِ وَ الْحَجِّ ؕ وَ لَیْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُیُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا وَ لٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى ۚ وَ اْتُوا الْبُیُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا ۪ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۱۸۹﴾

"اے نبی' لوگ تم سے چاند کی گھٹتی بڑھتی صورتوں کے متعلق پوچھتے ہیں' کہو یہ لوگوں کے لئے تاریخوں کی تعین کی اور حج کی علامتیں ہیں۔ نیز ان سے کہو کہ یہ کوئی نیکی کا کام نہیں ہے کہ تم اپنے گھروں میں پیچھے کی طرف داخل ہوتے ہو۔ نیکی تو اصل یہ ہے کہ آدمی اللہ کی ناراضی سے بچے۔ لہٰذا تم اپنے گھروں میں دروازے ہی سے آیا کرو۔ البتہ اللہ سے ڈرتے رہو' شاید کہ تمہیں فلاح نصیب ہو جائے۔

بعض روایات میں آتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے یہ سوال کیا گیا تھا' جیسا کہ پہلے ہم کہہ آئے ہیں' یعنی چاند کا ظہور اس کا گھٹنا بڑھنا کیونکر ہوتا ہے؟ بعض روایات میں آتا ہے کہ سوال اس طرح تھا کہ حضور ﷺ چاند کیوں پیدا کیا گیا ہے؟ سوال کا یہ انداز جواب سے زیادہ مطابقت رکھتا ہے۔ اس لئے حضور ﷺ سے کہا گیا کہ اے نبی تم یہ جواب دے دو : قُلْ هِیَ مَوَاقِیْتُ لِلنَّاسِ وَ الْحَجِّ ؕ "یہ لوگوں کے لئے تاریخوں کے تعین اور حج کی علامتیں ہیں۔" یعنی حج کا احرام باندھنے کا وقت' حج سے باہر آنے کا وقت' روزہ بند کرنے کا وقت' روزہ کھولنے کا وقت۔ نکاح' طلاق اور عدت کا وقت۔ معاملات تجارت اور قرضوں کی ادائیگی کے اوقات وغیرہ۔ تمام دینی امور میں اور تمام دنیاوی امور میں وقت کا حساب ضروری ہے اور اس لئے چاند کا حساب رکھنا تمام امور میں لابدی ٹھہرا۔

چاہے یہ پہلے سوال کا جواب ہو یا دوسرے کا' تعلق اس کا بہرحال مسلمانوں کی عملی زندگی کے ایک حقیقی مسئلے سے ہے۔ محض سائنسی اور علمی مسئلے کا حل یہاں مقصود نہیں ہے۔

قرآن کریم نے بھی انہیں چاند کے وہ فائدے گنوا دیئے جو ان کی عملی زندگی میں رات دن انہیں نظر بھی آتے تھے لیکن قرآن نے انہیں زمین کی گردش یا چاند گردش کے بارے میں کچھ نہیں بتایا' حالانکہ سوال کے مفہوم میں یہ بات بھی شامل تھی کہ اس کی حقیقت کیا ہے؟ سوال یہ تھا : چاند ہلال بن جاتا ہے کیسے؟ پھر اسی طرح قرآن کریم نے انہیں یہ بھی نہیں بتایا کہ نظام شمسی میں چاند کا کام (Function) کیا ہے یا اجرام سماوی کی گردش میں چاند کا مدار کیا ہے؟ یہ بات بھی یقیناً سائل کے سوال میں شامل تھی۔ سوال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو عملی جواب دیا تھا اس کا راز کیا ہے۔ قرآن کریم نے سائنسی معلومات کے بجائے محض عملی فوائد کیوں گنوائے؟

دراصل قرآن کریم کا مقصد نزول یہ تھا کہ انسان کو ایک خاص نظریۂ حیات دے۔ ایک خاص مقام زندگی عطا کرے۔ اس کے نتیجے میں ایک مخصوص معاشرہ وجود میں آئے۔ قرآن کریم کے پیش نظر اس کرۂ ارض پر ایک امت کی تشکیل تھا' جس نے زمین پر پوری انسانیت کی قیادت کا اہم فریضہ ادا کرنا تھا۔ اس کو تاریخ انسانیت کے اندر ایک ایسے معاشرے کی تخلیق کرنی تھی جو تمام گزشتہ انسانی معاشروں میں سب سے زیادہ بلند ہو۔ اس کو انسانی زندگی کا ایک ایسا نمونہ پیش کرنا تھا جس کی مثال پوری انسانی تاریخ میں نہ ہو۔ اس کو

اس طرز زندگی کے بنیادی اصول وضع کرنا تھے اور لوگوں کو ان کی طرف دعوت دینی تھی۔

قرآن کی زبان میں کیا اللہ تعالیٰ اس سوال کا علمی جواب دیتے ہیں۔ ظاہر ہے قرآن ان احکام کا مجموعہ ہے جو انسانی زندگی کو پاکیزہ بنانے اور خدا پرستی تک لے جانے والے ہیں۔ یہ علم فلکیات کی کتاب نہیں ہے۔ اس لئے کوئی علمی جواب تلاش کرنا قرآن کے مزاج اور موضوع سے بے خبری کی دلیل ہو گا۔ یوں بھی یہ علوم ایک نہج پر نہیں۔ نظریات بدلتے رہتے ہیں۔ ان نظریات کو انسانی فہم و ادراک تک لانے کے لئے بے شمار معلومات و نظریات کی ضرورت ہوتی رہی ہے۔ اور اس وقت پوری انسانیت کا جو مبلغ علم تھا اس کے مطابق یہ علمی جواب ایک معمہ ہی نظر آتا۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن نے علمی جواب کو چھوڑ دیا۔ قرآن کریم اپنے مقصد نزول کی تفہیم کو اولیت دیتا ہے اور اس فہم میں علم فلکیات کے انداز میں جواب موزوں ہی نہ ہوتا اور اگر یہ علمی جواب ضروری بھی ہوتا تو بھی قرآن کریم جیسی کتاب اس کے لئے موزوں نہ تھی جس کا موضوع سائنس نہیں ہے کیونکہ قرآن بلند تر مقاصد کے لئے نازل ہوا ہے۔ قرآن مجید کے بعض ناداں دوست اس میں علوم جدیدہ تلاش کرتے ہیں جو قرآن کا موضوع ہی نہیں ہے۔ اس کے مقابلے میں کینہ پرور دشمنوں کا خیال یہ ہے کہ قرآن مجید طبیعی علوم کا مخالف ہے۔ یہ بھی خام خیالی ہے۔ گو قرآن کا موضوع مادی علوم نہیں، لیکن اس کا اعجاز یہ بھی ہے کہ ان علوم کے سرچشمے اس میں تلاش کئے جا سکتے ہیں۔

یہ دونوں طرف کے خیالات اس لئے پیدا ہوئے ہیں کہ ان کے حامل حضرات نے اس کتاب مقدس کے مزاج ہی کو نہیں سمجھا۔ اس کے مقاصد اور اس کے دائرہ کار ہی کو یہ حضرات متعین نہیں کر سکے۔ قرآن کریم کا دائرہ کار بالیقین نفس انسانی اور حیات انسانی کا تزکیہ ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ اس کائنات اور ان موجودات کے سلسلے میں انسان کو ایک ایسا تصور دیا جائے جس کے ذریعے یہ اپنے خالق سے پیوستہ ہو جائیں اور پھر اس تصور کی اساس پر زندگی کا ایک پورا نظام تعمیر کیا جائے جس میں انسان آزادی کے ساتھ اپنی پوری قوتوں کو کام میں لائے۔ ظاہر ہے کہ انسانی قوتوں میں 'ایک قوت'، قوت عقل و ادراک بھی ہے اور یہ قوت صحیح طرح کام تب ہی کر سکتی ہے جب اس کرۂ ارض پر ایک صالح نظام قائم ہو جائے اور قوت عقلی کو آزادانہ طور پر تحقیقات علمیہ کا موقع دیا جائے اور علمی و سائنسی نتائج اخذ کرنے میں آزادانہ طور پر ترقی و کمال کے جس مقام تک پہنچنا چاہئے پہنچ جائے۔ لیکن انسان اپنی اس محدود قوت ادراک کے ذریعے میں جس مقام پر بھی پہنچے وہ آخری مقام نہ ہو گا جیسا کہ تجربات سے ظاہر ہے۔

قرآن کا موضوع "انسان" ہے۔ انسان کا تصور و نظریہ، اس کا فہم اور شعور، اس کا طرز عمل اور کردار، اس کے تعلقات و باہمی روابط۔ رہے طبیعی علوم، انواع و اقسام کی مادی ایجادات، تو وہ قرآن کے موضوع بحث نہیں۔ بلکہ یہ عقل انسانی کے لئے موضوع بحث اور مرکز عمل ہیں۔ یہ عقل انسانی کا کام ہے کہ وہ اس میدان میں نظریات قائم کرے اور نئے نئے انکشافات کرے۔ کیونکہ عقل انسانی کا فہم و ادراک ہی وہ امتیاز ہے جس کی وجہ سے خلیفتہ اللہ فی الارض کا مقام حاصل ہوا ہے۔ اور یہ خصوصیت انسان کو اس کی تخلیق کے وقت سے دی گئی ہے۔ رہا قرآن مجید تو وہ صرف فطرت انسانی کا رہنما و نگہبان ہے۔ وہ صرف یہ دیکھتا ہے کہ انسان کی فطرت میں فساد واقعہ نہ ہو، اس نظم میں خلل نہ پڑے جس کے مطابق زندگی بسر کر کے یہ اپنی فطری طاقتوں کو کام میں لائے گا۔ قرآن کریم انسان کو اس کائنات کے بارے میں ایک جامع علم دیتا ہے۔ یہ بتاتا ہے کہ اس کائنات کا تعلق اس کے خالق کے ساتھ کیا ہے؟ اس کے مختلف اجزاء کا (جن میں سے ایک خود انسان بھی ہے) باہمی تعلق کیا ہے؟ اس کے بعد قرآن نے انسان کو آزاد چھوڑ دیا ہے کہ وہ جزئیات کا ادراک خود کرے اور اپنے منصب خلافت کی کارگزاری میں ان صلاحیتوں سے فائدہ اٹھائے جو اللہ تعالیٰ نے اسے دی ہیں۔ قرآن کریم ان جزئیات کی تفصیل مہیا نہیں

کرنا کہ یہ تو انسان کے فرائض منصبی میں شامل ہے۔ (۱)

مجھے تو قرآن مجید کے ان نام نہاد حامیوں کی سادہ لوحی پر بے اختیار ہنسی آتی ہے' جو قرآن مجید کی طرف ایسی چیزوں کی نسبت کرتے ہیں جو اس کا حصہ نہیں اور نہ وہ اس کے مقاصد میں شامل ہیں۔ یہ لوگ قرآن مجید سے علم طب' علم کیمیا اور علم فلکیات کی جزئیات ثابت کرتے ہیں۔ کیا ان لوگوں کے نزدیک قرآن مجید کی عظمت ثابت کرنے کے لئے یہی بات رہ گئی ہے؟

اپنے موضوع کے اعتبار سے بالیقین قرآن کریم ایک عظیم و کامل کتاب ہے اور ان تمام علوم کے مقابلے میں قرآن کا موضوع ایک عظیم الشان موضوع ہے۔ کیونکہ اس کا موضوع خود انسان ہے۔ ادراک (جس سے یہ علوم عبارت ہیں) کا سرچشمہ انسان کی قوت مدرکہ ہے جو انکشافات کرتی ہے اور دنیا میں انسان ان سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ تحقیقات و تجربات اور ان سے نتائج کا اخذ کرنا عقل کے خواص ہیں اور عقل خود انسان کا ایک جزء ہے۔ اس کے مقابلے میں قرآن مجید کا موضوع خود انسان کی تشکیل و تکوین ہے۔ اس کی شخصیت کی تعمیر' اس کے ضمیر' اس کی عقل اور اس کی فکر کی تعمیر ہے۔ اس کے بعد قرآن مجید ایک صالح انسانی معاشرہ کی تعمیر سے بحث کرتا ہے جس میں انسان ان قوتوں کو کام میں لائے جو اللہ تعالیٰ نے نفس انسان میں ودیعت کی ہیں۔ جب ایک سلیم الطبع انسان صحیح تصور حیات' صحیح فکر' پختہ شعور پالیتا ہے اور ایک ایسا اسلامی معاشری اسے مل جاتا ہے جس میں وہ آزادی سے کام کرتا ہے تو پھر قرآن مجید اسے آزاد چھوڑ دیتا ہے تاکہ سائنس اور دوسرے علوم کے میدان میں وہ تحقیقات اور تجربے کرے۔ قرآن صرف صحیح فکر' صحیح شعور اور صحیح تصور حیات کے معیار مقرر کر دیتا ہے اور بس۔

قرآن کریم بعض اوقات اس کائنات کے وجود کے بارے میں اور اس کے اجرام کے باہمی ربط اور پھر کائنات اور اس کے خالق کے درمیان ربط کے بارے میں صحیح فکر دینے کے لئے کچھ آخری حقائق بیان کرتا ہے۔ یہ وہ حقائق ہوتے ہیں جن پر علم طبیعات جاکر ختم ہو جاتا ہے' لہٰذا ان حقائق کے ساتھ ہمیں عقل انسانی کے ان مفروضات کو نہیں ملانا چاہئے جو انسانی نظریات ہیں اور جنہیں عوام سائنسی حقائق کہتے ہیں۔ اور جن تک انسان ان تجربات کے نتیجے میں پہنچا ہے اور جنہیں وہ قطعی اور آخری حقائق سمجھتا ہے' اس لئے کہ قرآن کریم جن حقائق کا ذکر کرتا ہے وہ قطعی اور انتہائی ہیں۔ لیکن وہ حقائق جن تک انسان بذریعہ عقل و تجربہ پہنچتا ہے۔ وہ آخری اور قطعی ہرگز نہیں ہوتے۔ وہ انسان کے تجربات' میسر آلات کے ذریعہ حاصل ہوتے ہیں اور آلات کی قوت کی بھی ایک حد ہوتی ہے' لہٰذا یہ حقائق فہم انسانی اور اس کو میسر آلات کی قوت کی حد تک ہی ہو سکتے ہیں۔ خود انسانی تحقیقات اور تجربات کے جو مسلم اصول ہیں ان کے مطابق بھی ہم یہ دعویٰ نہیں کر سکتے کہ انسان کے دریافت کردہ حقائق' قرآن کریم کے بیان کردہ حقائق کے مقابلے میں معیار صحت ہو سکتے ہیں' کیونکہ یہ حقائق علم بشری کے حدود تک ہیں۔ (اور قرآنی حقائق علم بشری سے ماورئی ہیں)

یہ تو تھی بات سائنسی تجربات کی۔ رہے وہ نظریات یا مفروضات جنہیں سائنسی اور علمی کہا جاتا ہے۔ مثلاً فلکیات کے بارے میں نظریات' انسان کی تخلیق اور ترقی کے بارے میں نظریات' انسان کی نفسیات اور اس کے طرز عمل کے بارے میں نظریات' انسانی معاشرے اور اس کی

---

(۱) یہاں سید کا اشارہ اس طرف ہے کہ انسان کو فرشتوں پر ترجیح اس لئے دی گئی کہ اللہ تعالیٰ نے فطرت انسانی میں فہم و ادراک کی قوت ودیعت کر دی تھی۔ وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا۔ یعنی آدم سے مراد اگر جنس آدم لیا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ جنس آدم کے اندر یہ قوت ودیعت کر دی گئی تھی اور اسے منصب خلافت کے لئے زمین پر اتار دیا گیا تھا تاکہ یہاں اس فطری قوت کو کام میں لاکر انسان منصب خلافت کے فرائض سرانجام دے۔ اگرچہ ادراک جزئیات کے نتیجے میں وہ ایٹم بناکر ہیروشیما کو تباہ کر دے۔ وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا۔ "کیا آپ زمین میں کسی ایسے کو مقرر کرنیوالے جو اس کے انتظام کو بگاڑ دے اور خونریزیاں کرے گا۔"

ترقی کے بارے میں نظریات' یہ سب نظریات معروضی ہیں اور انسانی قیاس اور گمان پر مبنی ہیں۔ انہیں کسی مفہوم میں بھی سائنسی حقائق نہیں کہا جاسکتا۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ نظریات' اس کائنات کے مظاہر' انسانی زندگی' انسانی نفسیات اور انسانی معاشرے کی تفسیر و تشریح ہیں اور ان کی اصلیت یہ ہے کہ ایک نظریے کی جگہ دوسرا نظریہ لیتا چلا آرہا ہے۔ ان کا اعتبار اس وقت تک قائم رہتا ہے جب تک دوسرا نظریہ اس کی جگہ نہیں لے لیتا۔

یہی وجہ ہے کہ یہ مفروضات اور یہ نظریات ہمیشہ تغیر اور تبدل کے قابل ہوتے ہیں اور ان میں کمی بیشی ہوتی ہی رہتی ہے۔ بعض اوقات تو وہ یکلخت الٹ ہو جاتے ہیں' اس لئے کہ بعض اوقات انسان تجربات اور ملاحظہ کا کوئی جدید اور زیادہ طاقتور آلہ دریافت کر لیتا ہے۔ یا بعض وقات جب انسان ان تمام مشاہدات کو اکٹھا کرتا ہے اور ان پر مجموعی حیثیت سے غور کرتا ہے تو وہ ایک جدید نظریہ اور مفروضہ قائم کر لیتا ہے۔

وہ کوشش اور تفسیر' جو ان عام قرآنی اشارات کو سائنس کے متغیر و متبدل نظریات سے وابستہ کرتی ہے' یا ان سائنسی حقائق سے وابستہ کرتی ہے جو بذات خود آخری اور قطعی نہیں ہیں تو ایسا نتیجہ مرتب نہیں ہوتا جسے قطعی کہا جاسکے۔ یہ کوشش ایک تو خود سائنس کے منہاج بحث و تحقیق کے خلاف ہے۔ دوسرے یہ کہ ایسی کسی کوشش کے فوائد و مقاصد صرف تین ہو سکتے ہیں اور تینوں ایسے ہیں جو قرآن مجید کے شان جلالت اور علو مرتبت کے منافی ہیں۔

۱۔ یہ ایک قسم کی اندرونی اور ذہنی شکست خوردگی ہے جو لوگ اس ذہنی مرعوبیت کا شکار ہوتے ہیں وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ شاید سائنس قرآن مجید پر غالب ہے اور اس سے برتر درجہ رکھتی ہے۔ یہ قرآن مجید کی تفسیر و تشریح میں سائنس کے اکتشافات بیان کرتے ہیں۔ حالانکہ قرآن مجید خود اپنے موضوع پر ایک مکمل کتاب ہے۔ اور اس نے جو حقائق بیان کئے ہیں وہ آخری حقائق ہیں' جبکہ سائنس کا حال یہ ہے کہ وہ اپنے موضوع کے ہر دائرے میں ناقص ہے۔ وہ آج جس حقیقت کو ثابت کر رہی ہے' کل خود اس کی تردید کر دیتی ہے۔ سائنس کی رسائی جہاں تک بھی ہو' وہ آخری اور مطلق نہیں کہلا سکتی۔ سائنس کی ہر دریافت' انسانی قوات' اس کے عقلی ادراکات اور اس کے آلات معاونہ کے حدود و قیود کے ساتھ مقید ہوتی ہے اور یہ سب ادوات و آلات ایسے ہیں جو اپنے مزاج و ساخت کے اعتبار سے کوئی ایک آخری اور مطلق حقیقت کو گرفت میں نہیں لا سکتے۔

۲۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ ایسے حضرات نے سرے سے قرآن مجید کے مزاج اور اس کے مقاصد ہی کو نہیں سمجھا۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن مجید آخری اور مطلق حقائق کا مجموعہ ہے اور وہ انسان کی تعمیر و تربیت بعینہ ایسے انداز میں کرنا چاہتا ہے جو نوامیس فطرت اور اس کائنات کے مزاج کے خلاف نہ ہو اور جہاں تک انسانی مزاج اس کا متحمل ہو۔ یہ اس لئے کہ انسان اور اس کے اردگرد پھیلی ہوئی کائنات کے درمیان کوئی تصادم نہ ہو' بلکہ انسان اس کائنات کے راز معلوم کرے' قوانین فطرت دریافت کرے اور انہیں اپنے منصب خلافت فی الارض کے فرائض سرانجام دینے میں استعمال کرے۔ ان قوانین فطرت کو جو مکمل فکر و نظر تحقیق و تطبیق اور عمل و تجربہ کے نتیجے مین خود اس نے حاصل کئے ہوں۔ یہ نہ ہو کہ اسے کوئی تیار علوم دے دے اور وہ انہیں من وعن تسلیم کر لے۔

۳۔ تیسری قباحت یہ ہے کہ ان حضرات کو بڑے ہی تکلف اور چالاکی کے ساتھ' آیات قرآنی میں مسلسل تاویل کرنی پڑتی ہے۔ اور یہ حضرات ان آیات کو اٹھائے ہوئے' بے آبروئی کے ساتھ ان سائنسی نظریات اور مفروضات کے پیچھے بھاگتے پھرتے ہیں' جنہیں کوئی ثبات و قرار حاصل نہیں ہے۔ ان نظریات کے شب و روز میں تو ہر شب تاریک تر ہوتی جارہی ہے اور ہر دن ایک نیا نظریہ لے

کر آتا ہے جو سابق نظریہ کو باطل کر دیتا ہے۔ کیا ہم بھی سابق تفاسیر کو باطل کرتے چلے جائیں؟

جیسا کہ ہم اوپر کہہ آئے ہیں' یہ انداز فکر' نہ صرف یہ ہے کہ قرآن عظیم کی شان و عظمت و جلالت کے خلاف ہے' بلکہ خود سائنس کے منہاج تحقیق و تجربہ کے بھی خلاف ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ سائنس نے اس کائنات' نسل انسانی اور زندگی کے بارے میں جو حقائق و نظریات پیش کئے ہیں یا مسلسل دریافت ہو رہے ہیں' ہم قرآن مجید کے فہم و ادراک میں ان سے کام نہ لیں اور انہیں بالکل نظرانداز کر دیں۔ ہرگز نہیں۔ ہماری مراد یہ نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں خود فرماتے ہیں:

سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنْفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ "عنقریب ہم ان کو اپنی نشانیاں آفاق میں بھی دکھائیں گے اور ان کے اپنے نفس میں بھی' یہاں تک کہ ان پر یہ بات کھل جائے گی کہ یہ قرآن واقعی برحق ہے۔"

اس آیت کا مقتضایہ ہے کہ ہم نفس انسانی اور آفاق کے متعلق سائنس کی فراہم کردہ تازہ بتازہ معلومات پر مسلسل غور و فکر کرتے رہیں اور اپنی اس محدود قوت مدرکہ اور دائرہ تصور میں' قرآنی مدلولات و مفاہیم کا دائرہ وسیع کرتے چلے جائیں۔

یہ کیسے؟ اور پھر بغیر اس قباحت کے کہ قرآن مجید کے مطلق اور آخری مطالب کو ان سائنسی اکتشافات سے وابستہ بھی نہ کریں جو آخری نہیں ہیں جو مطلق نہیں ہیں' اضافی ہیں۔ یہاں ایک مثال مفید مطلب ہے:

قرآن کریم میں ہے وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهُ تَقْدِيرًا "اس نے ہر چیز کو پیدا کیا' پورے پورے اندازے سے۔"[۱]

جب سائنس نے ترقی کی تو معلوم ہوا کہ اس کرۂ ارض پر بعض نہایت ہی پنہاں سہولتیں ہیں' بعض نہایت ہی دقیق ہم آہنگیاں ہیں۔ یہ کرۂ ارض' اپنی اس مخصوص ہیئت کے ساتھ' سورج سے اس مخصوص فاصلے پر' چاند سے ایک متعین بعد پر' سورج اور چاند کے مقابلے میں ایک حساس حجم لئے ہوئے' اس قدر تیزی سے رواں دواں' اپنے محور کے گرد ایک خاص انداز میں جھکا ہوا' اس موجودہ پانی اور سطح کے ساتھ اور ان کے علاوہ اپنی ہزاروں دوسری خصوصیات کے ساتھ' صرف یہ کرۂ ارض ہی اس قابل ہے کہ یہاں زندگی اور زندگی کے دوسرے ملحقات قائم رہ سکتے ہیں۔ ان حقائق میں سے کوئی بھی عارضی انتظام نہیں ہے۔ نہ ہی یہ کام بغیر کسی منصوبے کے یوں اتفاقاً ہو رہا ہے۔ ان حقائق کا سائنٹیفک مطالعہ قرآن مجید کی اس آیت کے مفہوم میں کس قدر وسعت پیدا کر دیتا ہے: وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهُ تَقْدِيرًا

ذرا سوچئے اکتشافات جدیدہ نے اس آیت کے مفہوم کو کیا وسعت دے دی ہے۔ پوری سائنس آیت کی تفسیر ہو گئی' لہٰذا قدرت کی مزید کاریگری معلوم کیجئے اور یوں آیت کے مفہوم کو وسیع سے وسیع تر کرتے چلے جایئے۔

قرآن کریم میں ہے خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ سُلَالَةٍ مِنْ طِينٍ "اس نے انسان کو مٹی کے ست سے بنایا۔" صدیوں بعد والاس اور ڈارون نظریہ ارتقا پیش کرتے ہیں۔ وہ فرض کرتے ہیں کہ زندگی کا آغاز ایک خلیہ سے ہوا۔ اس خلیہ نے پانی میں نشو و نما پائی۔ وہ خلیہ ارتقا کی منزلیں طے کرتے کرتے موجودہ انسان پر منتج ہوا۔ ضرورت تھی کہ اس نظریئے کو علمی معیار پر پرکھا جاتا' لیکن ہم دوڑے اور قرآن مجید کو اٹھاتے ہوئے' نہایت بے آبروئی کے ساتھ اس نظریہ کو ہاتھوں ہاتھ لیا بلکہ اسے تفسیر قرآن بنا دیا۔

اول تو یہ نظریہ کوئی آخری نظریہ نہیں ہے۔ ابھی ایک صدی بھی نہیں گزری کہ اس میں بے شمار تبدیلیاں رونما ہو گئیں۔ قریب ہے کہ سرے سے پورا نظریہ ہی ختم ہو جائے۔ کیونکہ یہ ناقص معلومات پر مبنی تھا اور اس کی کمزوریاں ظاہر بھی ہو چکی ہیں۔ مثلاً حیوانات

(۱) حم سجدہ ۵۳

کے ہر نوع کے کچھ موروثی خصائص ہوتے ہیں اور ہر نوع کی موروثی اکائیاں ان کا تحفظ کرتی ہیں۔ یہ ایک نوع کو دوسرے نوع کی طرف منتقل ہونے ہی نہیں دیتیں۔ یہ ایک ایسا نقص ہے جس کے ذریعہ سرے سے یہ نظریہ ہی ختم ہو سکتا ہے اور آج نہیں تو کل یہ نظریہ ختم ہو گا۔ جبکہ قرآن کریم آخری حقائق پر مشتمل ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ قرآن مجید کا مفہوم یہی ہو جو نظریۂ ارتقاء نے پیش کیا۔ قرآن نے تو صرف انسان کی اصلی تخلیق کا تذکرہ کیا ہے' انسان کی نشوونما کی تفصیلات کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ اصل تحقیق ایک آخری حقیقت ہے۔ وہ آخری نکتہ جہاں سے وجود انسان کا آغاز ہوا بس یہی آیت کا مفہوم ہے۔ اس کی مزید تفصیلات کیا تھیں ان کا ذکر یہاں نہیں ہے۔

قرآن مجید نے کہا الشَّمْسُ تَجْرِیْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا "اور سورج' وہ اپنے ٹھکانے کی طرف چلا جارہا ہے۔" (۱) اس آیت میں صرف یہ کہا گیا ہے کہ سورج چلتا ہے۔ سائنس کی دریافت یہ ہے کہ سورج اپنے اردگرد کے تاروں کی نسبت سے تو ۱۲ میل کی سیکنڈ کی رفتار سے چلتا ہے۔ لیکن وہ اپنی کہکشاں کو لئے ہوئے' جس کا وہ خود بھی ایک ستارہ ہے' ۱۷۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چلا جارہا ہے' لیکن سائنس کی یہ معلومات بھی قرآن مجید کی اس آیت کا عین مدلول نہیں ہیں۔ کیونکہ سائنس نے ابھی تک جو کچھ دریافت کیا ہے وہ نسبتی ہے۔ آخری علم یا حقیقت نہیں۔ اس میں تبدیلی ہو سکتی ہے۔ رہی آیت تو اس میں اس آخری حقیقت کا اظہار ہوا ہے کہ سورج چلا جارہا ہے۔ بس ہم اس رفتار کو کسی سائنسی رفتار سے وابستہ نہیں کر سکتے جو بذات خود متبدل ہے۔

ایک دوسری جگہ قرآن مجید میں ہے: اَوَلَمْ یَرَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا "کیا وہ لوگ جنہوں نے (نبی کی بات ماننے سے) انکار کر دیا ہے غور نہیں کرتے کہ یہ سب آسمان و زمین باہم ملے ہوئے تھے' پھر ہم نے انہیں جدا کیا۔" سائنس ایک نظریہ پیش کرتی ہے۔ "یہ کہ کرۂ ارض سورج کا ایک حصہ تھا' جو اس سے جدا ہوا" اور ہم بھاگے' سانس پھولا ہوا' زبان نکلی ہوئی۔ ہم نے کوشش کی کہ اس نظریہ کو اٹھالیں اور قرآن مجید کی آیت کو لے جاکر اس سے ملادیا۔ اور کہنے لگی بس یہی تو ہے جس کا قرآن مجید نے ذکر کیا ہے۔

ہرگز نہیں' یہ ہمارا مقصد کبھی نہیں ہونا چاہئے کیونکہ سائنس کا یہ تو کوئی آخری نظریہ نہیں ہے۔ زمین کی طبیعاتی تشکیل کے کئی سائنسی نظریات موجود ہیں۔ کئی ہو سکتے ہیں رہا قرآن مجید تو اس نے فقط یہ کہا ہے اور جو آخری حقیقت ہے کہ زمین آسمان سے جدا ہوئی ہے اور بس۔ وہ کیسے جدا ہوئی؟ آسمانوں کے کس حصے سے جدا ہوئی؟ ان تفصیلات کا ذکر آیت نے نہیں کیا ہے' لہٰذا اس موضوع پر سائنس جو نظریہ پیش کرے' جس مفروضے پر چاہے بحث کرے' ہم یہ نہیں کر سکتے کہ آیت کا مفہوم سائنس کے موجودہ نظریئے کے مطابق ہے اور یہی آخری ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ اس آیت کی مناسبت سے یہاں یہ تفصیل کافی ہے۔ یہاں ہمارا مقصد صرف یہ تھا کہ سائنس کے انکشافات کو آیت کے فہم اور آیات کے مفہوم میں وسعت اور عمق پیدا کرنے کے لئے کس طرح استعمال کیا جاسکتا ہے؟ بغیر اس قباحت کے کہ ہم کسی آیت کو سائنس کے کسی نظریہ کے ساتھ وابستہ کر دیں اور وہ بھی اس طرح کہ دونوں کو ایک سمجھ لیا جائے' دونوں کو ایک دوسرے کا مصداق گردانا جائے۔ ہمارا مقصد صرف یہ تھا کہ ان دونوں صورتوں میں فرق کر لیا جائے۔ اب ہم قرآن کی اصل عبارت کی طرف لوٹتے ہیں:

وَلَیْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُیُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى ۚ وَاْتُوا الْبُیُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا ۪ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ "نیز ان سے کہو! یہ کوئی نیکی کا کام نہیں ہے کہ تم اپنے گھروں میں پیچھے کی طرف سے داخل ہو۔ نیکی تو

(۱) یٰس:۳۸

دراصل یہ ہے کہ آدمی اللہ کی ناراضگی سے بچے۔ للذا تم اپنے گھروں میں دروازے ہی سے آیا کرو۔ البتہ اللہ سے ڈرتے رہو شاید کہ تمہیں فلاح نصیب ہو جائے۔"

آیت کے دونوں حصوں کے درمیان ربط یہ ہے کہ پہلے حصے میں بیان کیا گیا کہ چاند کی بڑھتی گھٹتی شکلیں اوقات مناسک حج کے تعین کی خاطر ہیں اور دوسرے حصے میں دور جاہلیت کی اس رسم کی اصلاح کر دی گئی جو ایام حج ہی سے وابستہ تھی۔ (بخاری و مسلم میں حضرت براء ﷺ بن عازب سے روایت ہے' وہ فرماتے ہیں: انصار کا رواج یہ تھا کہ جب وہ حج کرنے جاتے تو واپسی کے وقت گھروں میں دروازوں کی جانب سے داخل نہ ہوتے۔ ایک بار ان کا ایک آدمی آیا اور وہ سیدھا دروازے کی طرف سے داخل ہو گیا۔ لوگوں نے اسے ملامت کی' اس پر یہ آیت نازل ہوئی' "یہ کوئی نیکی کا کام نہیں ہے کہ تم اپنے گھروں میں پیچھے کی طرف سے داخل ہو' نیکی تو دراصل یہ ہے کہ آدمی' اللہ کی ناراضی سے بچے' للذا تم اپنے گھروں میں دروازے میں سے آیا کرو۔"

ابوداؤد نے' شعبہ ﷺ بن اسحاق اور براء ﷺ بن عازب کی روایت سے نقل کیا ہے کہ "انصار جب کسی بھی سفر سے لوٹتے تو دروازے کی جانب سے داخل نہ ہوتے' اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔"

یہ رسم چاہے ہر سفر کے موقع پر ہو یا صرف حج میں ہو (سیاق سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ حج میں تھی) بہرحال ان کا عقیدہ یہ تھا کہ یہ نیکی کا کوئی کام ہے۔ ایمان کا جزو ہے۔ قرآن کریم نے اس باطل تصور کو ختم کر دیا کیونکہ یہ ایک فضول حرکت تھی۔ اس کی کوئی شرعی حیثیت نہ تھی۔ نہ اس میں کوئی دنیاوی فائدہ تھا۔ قرآن کریم نے نیکی کا صحیح تصور دے دیا کہ نیکی خدا خوفی کا نام ہے۔ ظاہر و باطن میں اللہ کی نگرانی اور اس کے وجود کا پختہ شعور ہی نیکی ہے۔ وہ کسی ایسی ظاہری شکل کا نام نہیں ہے' جس کے پس منظر میں کوئی ایمانی شعور کار فرما نہ ہو' بلکہ محض ایک رسم جاہلیت ہی ہو۔

حکم دیا گیا کہ دور جہالت کی رسم ترک کر کے گھروں میں دروازے سے داخل ہوا کرو اور پھر اشارہ کیا کہ تقویٰ ہی راہ نجات ہے۔

وَأْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ أَبْوَابِهَا ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ "للذا تم اپنے گھروں میں دروازے ہی سے آیا کرو۔ البتہ اللہ سے ڈرتے رہو۔ شاید کہ تمہیں فلاح نصیب ہو جائے۔"

یوں دلوں کو اصلی ایمانی حقیقت سے مربوط کر دیا گیا۔ یعنی تقویٰ کو' دنیا و آخرت کی فلاح و بہبود سے جوڑ دیا گیا۔ اور جاہلیت کی اس رسم کو جڑ سے اکھاڑ دیا گیا جس کے پس منظر میں کوئی ایمانی جذبہ نہ تھا اور مومنین کو متوجہ کر دیا گیا کہ اللہ کی اس نعمت کو سمجھنے کی کوشش کریں جو اللہ نے چاند کی شکل میں' ان کے اوقات اور مناسک حج کے تعین کے لئے فراہم کی گئی ہے۔ یوں اللہ تعالیٰ نے صرف ایک آیت میں ایسے اہم مضامین بیان فرما دیئے۔

اب جنگ کی عمومی بحث شروع ہو جاتی ہے۔ پھر مخصوص طور پر مسجد حرام کے ساتھ' محرم اور ممنوعہ مہینوں میں جنگ کے بارے میں احکام آتے ہیں۔ انفاق فی سبیل اللہ کی دعوت بھی دی جاتی ہے جو جہاد و قتال کے ساتھ گہرا ربط رکھتا ہے۔ فرمایا:

وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا ۚ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ ﴿١٩٠﴾ وَاقْتُلُوهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوهُمْ وَأَخْرِجُوهُمْ مِنْ حَيْثُ أَخْرَجُوكُمْ ۚ وَالْفِتْنَةُ أَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ ۚ وَلَا تُقَاتِلُوهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِ

الْحَرَامِ حَتّٰى يُقٰتِلُوْكُمْ فِيْهِ ۚ فَاِنْ قٰتَلُوْكُمْ فَاقْتُلُوْهُمْ ۗ كَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۹۱﴾ فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۹۲﴾ وَ قٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّ يَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ ۗ فَاِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۹۳﴾ اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَ الْحُرُمٰتُ قِصَاصٌ ۗ فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ ۚ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ وَ اعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۹۴﴾ وَ اَنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ لَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ ۛ وَ اَحْسِنُوْا ۛ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۹۵﴾

"اور تم اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں مگر زیادتی نہ کرو کہ اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ ان سے لڑو جہاں بھی تمہارا ان سے مقابلہ پیش آئے اور انہیں نکالو جہاں سے انہوں نے تم کو نکالا' اس لئے کہ قتل اگرچہ برا ہے مگر فتنہ اس سے بھی زیادہ برا ہے۔ اور مسجد حرام کے قریب جب تک وہ تم سے نہ لڑیں تم بھی نہ لڑو۔ مگر جب وہ وہاں لڑنے سے نہ چوکیں تو تم بھی بے تکلف انہیں مارو کہ ایسے کافروں کو یہی سزا ہے۔ پھر اگر وہ باز آجائیں تو جان لو کہ اللہ معاف کرنے والا رحم فرمانے والا ہے۔

تم ان سے لڑتے رہو' یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین اللہ کے لئے ہو جائے۔ پھر اگر وہ باز آجائیں تو سمجھ لو کہ ظالموں کے سوا اور کسی پر دست درازی جائز نہیں۔

ماہ حرام کا بدلہ ماہ حرام ہی ہے اور تمام حرمتوں کا لحاظ برابری کے ساتھ ہو گا لہٰذا جو تم پر دست درازی کرے' تم بھی اسی طرح اس پر دست درازی کرو البتہ اللہ سے ڈرتے رہو اور یہ جان رکھو کہ اللہ انہی لوگون کے ساتھ ہے جو اس کی حدود توڑنے سے پرہیز کرتے ہیں۔

اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور اپنے ہاتھوں اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔ احسان کا طریقہ اختیار کرو کہ اللہ محسنوں کو پسند کرتا ہے۔"

بعض روایات میں آتا ہے کہ قانون جنگ کے سلسلے میں قرآن کریم کا یہ پہلا حکم ہے۔ اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے ان مومنین کو جن کے ساتھ کفار بر سرپیکار تھے صرف جنگ کی اجازت دی تھی۔ اس لئے کہ وہ مظلوم ہیں۔ مسلمانوں نے محسوس کر لیا تھا کہ یہ اذن فرضیت جہاد کے لئے ایک تمہید ہے اور اللہ تعالیٰ اب اس زمین پر مسلمانون کو تمکنت عطا کرنے والا ہے' چنانچہ سورۂ حج میں فرمایا:

اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ۚ وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُ ۙ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ۗ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا ۗ وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ ۗ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ ۝ اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ۗ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ۔

"اجازت دے دی گئی ان لوگوں کو جن کے خلاف جنگ کی جارہی ہے کیونکہ وہ مظلوم ہیں اور اللہ یقیناً ان کی مدد پر قادر ہے ۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے گھروں سے ناحق نکال دیئے گئے ۔ صرف اس قصور پر کہ وہ کہتے تھے "ہمارا رب اللہ ہے" اگر اللہ لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعہ دفع نہ کرتا رہے تو خانقاہیں اور گرجا اور مندر اور مسجدیں' جن میں اللہ کا کثرت سے نام لیا جاتا ہے' سب مسمار کر ڈالی جائیں ۔ اللہ ضرور ان لوگوں کی مدد کرے گا جو اس کی مدد کریں گے ۔ اللہ بڑا طاقتور اور زبردست ہے ۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہیں اگر ہم زمین میں اقتدار بخشیں تو وہ نماز قائم کریں گے' زکوٰۃ دیں گے' نیکی کا حکم دیں گے اور برائی سے منع کریں گے ۔ اور تمام معاملات کا انجام کار اللہ کے ہاتھ میں ہے ۔" وہ اس اذن کے معنی خود سمجھ گئے کیونکہ ان پر ظلم ہو رہا ہے' لہٰذا وہ ظلم کا بدلہ لے سکتے ہیں ۔ مکہ مکرمہ میں ان کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے اور وہ ظلم کی مدافعت بھی نہ کر سکتے تھے ۔ وہاں انہیں حکم دیا گیا تھا = كُفُّوٓا اَيۡدِيَكُمۡ وَاَقِيۡمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ "ہاتھ روکے رکھو' نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو ۔"

مکہ میں ہاتھ اٹھانے کی ممانعت بھی ایک خاص حکمت پر مبنی تھی ۔ اس حکمت کے بعض پہلو ہم یہاں بیان کرتے ہیں:

۱۔ جنگ اور مدافعت سے روکنے کا پہلا سبب یہ تھا کہ عرب مسلمانوں کے اندر ڈسپلن پیدا کرنے کی ضرورت تھی تاکہ وہ اطاعت امیر کے عادی ہو جائیں' اپنی قیادت کے مطیع فرمان ہوں اور مدافعت اور قتال کے حکم تک انتظار کریں ۔ جاہلیت میں تو وہ سخت جنگجو تھے ۔ پہلی آواز پر ہی آپے سے باہر ہو جاتے تھے اور کسی ناخوشگوار بات کو دیکھ کر ان میں صبر کرنے کا مادہ تو تھا ہی نہیں ۔ انسانی تاریخ میں امت مسلمہ نے جو کردار ادا کرنا تھا اس کا تقاضا یہ تھا کہ اس امت کی ایسی تربیت ہو اور اس کی سیرت کی تعمیر ایسی ہو کہ اس کی یہ تمام نفسیاتی کمزوریاں ضبط و نظم میں ڈھل جائیں' وہ ایک مقتدر و مدبر قیادت کے تابع فرمان بن جائیں ۔ اس حد تک تابع کہ وہ دور جاہلیت کی تمام عصبیتوں اور ناجائز طرفداروں کو چھوڑ دیں' جن کی حمایت میں وہ جنگ و جدل کے لئے کسی پکارنے والے کی پہلی پکار پر اٹھ کھڑے ہو جاتے تھے ۔

یہی تعمیر سیرت تھی جس کی وجہ سے حضرت عمر بن الخطاب ؓ جیسے پرجوش شخص اور حضرت حمزہ بن عبدالمطلب ؓ اور ان جیسے نڈر اشخاص امت مسلمہ کو سخت مصائب و شدائد میں دیکھتے اور اف تک نہ کرتے ۔ اس لئے کہ انہیں حکم دیا تھا کہ وہ حضور ﷺ کی ہدایت کے مطابق اپنے آپ کو پوری طرح کنٹرول میں رکھیں ۔ اپنی ہائی کمان کی پوری اطاعت کریں اور قیادت عالیہ کا حکم تھا = كُفُّوٓا اَيۡدِيَكُمۡ وَاَقِيۡمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ "ہاتھ روکے رکھو' نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو ۔"

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے اندر پائے جانے والی تیزی سے کود پڑنے اور سوچنے سمجھنے' جلد بازی اور تدبر اور حمیت اور اطاعت امر جیسی متضاد صفات کے درمیان توازن قائم ہو گیا اور پھر عرب جیسی بے حد' پرجوش اور جنگجو قوم میں ۔ حقیقت یہ ہے کہ عربوں میں اس قسم کی تربیت کا کامیاب ہونا اور ان کے اندر ڈسپلن کا پیدا ہونا ہی ایک معجزہ معلوم ہوتا ہے ۔

۲۔ دوسرا اہم سبب جس کی وجہ سے مکہ مکرمہ میں مسلمانوں کو قتال سے روکا گیا تھا وہ یہ تھی کہ عرب معاشرہ ایک بہادر اور شریف معاشرہ تھا ۔ لوگ خوددار اور عزت نفس کے مالک تھے ۔ مسلمانوں میں بعض ایسے لوگ بھی تھے جو اینٹ کا جواب پتھر سے دے سکتے تھے لیکن اس کے باوجود جب وہ مظالم پر صبر کرتے' کئی شرفاء کی عزت نفس اور شرافت میں جوش آ جاتا اور ان کے دل اسلام کی طرف مائل ہو جاتے ۔

اس کا اظہار عملاً اس وقت ہوا جب قریش نے بنی ہاشم کے ساتھ بائیکاٹ کا فیصلہ کیا اور وہ شعب ابی طالب میں محصور ہو گئے ۔ قریش کا مطالبہ یہ تھا کہ بنی ہاشم حمایت رسول سے دستبردار ہو جائیں ۔ جب بنی ہاشم پر مصائب ناقابل برداشت ہو گئے تو بعض غیور اور شرفاء کی

بہادری اور غیرت جوش میں آگئی۔ انہوں نے اس دستاویز کو پھاڑ ڈالا' جس کے مطابق انہوں نے بائیکاٹ کا معاہدہ کیا تھا۔ اور محض اس جذبہ شرافت کی وجہ سے یہ محاصرہ ختم ہو گیا۔ جنگ اور مدافعت سے ہاتھ روکنے کی کی پالیسی میں رسول برحق ﷺ نے عربوں کے ان جذبات کو پیش نظر رکھا تھا۔ اگر حضور ﷺ کی سیرت کا مطالعہ بحیثیت قائد تحریک کیا جائے تب ان حکمتوں کا اظہار ہر جگہ ہوتا ہے۔

داعی اسلام ﷺ کا یہ منشاہی نہ تھا کہ اسلام کی وجہ سے گھر گھر میں خونریزی شروع ہو جائے کیونکہ ہر خاندان میں سے کوئی نہ کوئی مسلمان تھا اور مسلمانوں کو ایذا رسانی میں' اور انہیں دین اسلام سے روکنے میں' خود مسلمانوں کے اپنے خاندان پیش پیش تھے۔ وہاں کوئی منظم حکومت نہ تھی جو مسلمانوں پر تشدد کر رہی تھی۔ اگر اس مرحلے میں مسلمانوں کو یہ اجازت دے دی جاتی کہ وہ اپنی مدافعت میں جنگ کریں تو نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ گھر گھر میں فساد رونما ہوتا اور خاندان سے خاندان ٹکراتا اور خانہ جنگی شروع ہو جاتی۔ ایسی صورت رونما ہوتی تو لازمی طور پر یہ تاثر قائم ہو جاتا کہ اسلام نے گھر گھر اور خاندان خاندان میں فتنہ و فساد کے شعلے بڑھکا دیئے ہیں۔

ہجرت کے بعد صورت حال بالکل جدا ہو گئی' اب جماعت اسلامی مدینہ طیبہ میں ایک مستقل اور منظم وحدت تھی اور اس کا مقابلہ مکہ مکرمہ کی ایک منظم برادری سے تھا جس میں افواج کی تنظیم ہو رہی تھی اور وہ فوج تحریک اسلامی کے خلاف حملہ آور ہو رہی تھی۔ یہ صورت حال مکہ مکرمہ کی صورت حال سے بالکل مختلف تھی۔ گویا واضح طور پر اپنی حفاظت کا مسئلہ سامنے تھا اور یہ حفاظت افراد کے بجائے پوری ملت کی تھی۔ یہ ہیں وہ اسباب جو ایک انسان اپنے محدود ذہن کے ساتھ' اس بارے میں سوچ سکتا ہے کہ مکہ مکرمہ میں مسلمانوں کو تشدد و بربریت کا جواب دینے سے کیوں روکا گیا تھا۔

ان اسباب کے علاوہ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ اس وقت مسلمان تعداد کے اعتبار سے بہت ہی کم تھے' پھر وہ مکہ مکرمہ میں محصور تھے' اگر وہ مقاتلہ شروع کر دیتے تو ان کے خلاف فوراً مقاتلہ شروع ہو جاتا اور ان کا مقاتلہ ایسے لوگوں سے ہوتا جو ہر لحاظ سے ان کے مقابلے میں طاقتور اور بارسوخ تھے۔ اللہ تعالیٰ کی مشیئت یہ تھی کہ مسلمانوں کی تعداد میں قدرے اضافہ ہو جائے اور وہ اپنے مستقل دارالحکومت میں علیحدہ ہو کر مجتمع ہو جائیں۔ جب یہ کام ہو گئے تو انہیں جہاد و قتال کی اجازت دے دی گئی۔

بہرحال اس کے بعد' تدریج کے ساتھ' جزیرۃ العرب اور عرب سے باہر کے علاقوں میں' حسب ضرورت مسلمانوں کو جنگ کے احکام دیئے جاتے رہے۔

زیر بحث آیات اس سلسلے کی ابتدائی آیات ہیں اور ان میں قتال کے بعض ایسے احکام دیئے گئے ہیں جو اس وقت کے بنیادی متحارب کیمپوں میں' اسلامی کیمپ اور مشرکین مکہ کے کیمپ کے درمیان محاذ آرائی کے لئے مناسب اور ضروری تھے۔ جبکہ بعض احکام ایسے بھی ہیں جو اصولی حیثیت رکھتے ہیں اور ہر جنگ میں عموماً ایسے حالات پیش آسکتے ہیں۔ ان احکام میں معمولی رد و بدل سورت براۃ کے احکام کے ذریعہ ہوا ہے۔

یہاں' تفسیر آیات قتال سے پہلے' مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جہاد کے موضوع پر ایک مختصر نوٹ دے دیا جائے تاکہ آیات قتال اور دوسری آیات کی تفسیر کے لئے اساس کا کام دے۔

اسلامی نظریۂ حیات' اپنی آخری شکل و صورت میں یعنی دین اسلام کی صورت میں رونما ہوا۔ مقصد یہ تھا کہ اب اسے یہ تمام انسانیت کی زندگی کا اصول بن جائے۔ تمام انسانیت کا نظام زندگی قرار پائے اس نظام اور اس منہاج کو لے کر امت مسلمہ اٹھے اور اللہ تعالیٰ کی جانب سے پوری انسانیت کی قیادت کرے۔ یہ نظام زندگی ایک ایسا نظام ہے کہ یہ اس کائنات کے وسیع تر تصور پر مبنی ہے۔ وجود انسانی کے اصل اور حقیقی مقصد کی اساس پر تعمیر شدہ ہے اور اس کی توضیح و تشریح ایک کتاب میں کر دی گئی ہے جو اللہ تعالیٰ خالق

کائنات کی جانب سے اتاری گئی ہے۔ نیز اس امت نے راہنمائی بھی ایک خالص بھلائی اور خیر محض کی طرف کرنی ہے' جو کسی دوسرے جاہلی نظام میں نہیں ہے اور انسانیت کو ایک ایسے مقام بلند تک پہنچایا جہاں تک وہ اسلامی نظام زندگی کے سوا' کسی اور نظام کے ذریعے نہیں پہنچ سکتی۔ اسے ایسی نعمت سے سرفراز کرنا ہے جس کے مقابلے میں کوئی نعمت نہیں ہے۔ اسلام یقیناً وہ نظام زندگی ہے کہ اگر اس سے انسانیت محروم ہو جائے تو پھر اس کے لئے نجات و فلاح نہیں ہے۔ اگر انسانیت کو اس نیکی سے محروم کر دیا جائے اور اللہ تعالیٰ اسے جس بلندی' جس پاکیزگی اور جس سعادت و کمال تک پہنچانا چاہتا ہے' اسے اس سے روک دیا جائے تو انسانیت کے ساتھ اس سے بڑا ظلم اور اس سے بڑی زیادتی کا تصور بھی ممکن نہیں ہے۔

یوں انسانیت کا یہ حق ہو جاتا ہے کہ اسلام کے اس مکمل نظام زندگی کی دعوت پوری انسانیت تک آزادی کے ساتھ پہنچ سکے۔ اور اس کی راہ میں یعنی دعوت اسلامی کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہ ہو' اور کوئی حکومت بھی کسی صورت میں بھی سد راہ نہ بن سکے۔

ادھر انسانیت پر یہ لازم تھا کہ جب لوگوں تک دعوت اسلامی پہنچے تو وہ اس کے رد و قبول میں بالکل آزاد ہوں۔ دین قبول کرنے کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہ ہو۔ کوئی حکومت سد راہ بنی ہوئی نہ ہو۔ اگر کوئی شخص اسلامی نظام کو قبول کرتا ہے تو حکومت رکاوٹ نہ ڈالے' نیز اسے یہ اختیار نہ ہو کہ دعوت اسلامی کو اپنی منزل تک بڑھنے سے روکے۔ علاوہ ازیں انسانیت کا یہ بھی فرض تھا کہ اسلام قبول کرنے والوں کو اطمینان اور آزادی کی ضمانت دے اور تبلیغ دین کے سلسلے میں تحریک اسلامی کی راہ میں جو مشکلات در پیش آرہی ہیں وہ انہیں دور کر دے۔ اس سلسلے میں کارکنان دعوت اسلامی پر کوئی زیادتی نہ ہونے پائے۔

اگر اللہ تعالیٰ کسی کو ہدایت نصیب فرمائے اور وہ دعوت اسلامی کو قبول کر لیں تو ان کا یہ بنیادی حق ہے کہ ان پر کسی قسم کا ظلم اور زیادتی نہ ہو۔ ان پر تشدد نہ ہو اور ان کے خلاف کوئی اشتعال نہ ہو۔ ان کی راہ میں اس قسم کی رکاوٹیں نہ کھڑی کی جائیں جن کا مقصد لوگوں کو اسلامی نظام سے روکنے کے سوا اور کچھ نہ ہو۔

تحریک اسلامی کے کارکنان کے فرائض میں یہ بات داخل تھی کہ وہ قوت کے ساتھ تشدد اور اشتعال کا مقابلہ کریں تاکہ دنیا میں آزادی رائے جیسے بنیادی حقوق کی ضمانت دی جاسکے اور وہ لوگ امن و امان کے ساتھ زندگی بسر کر سکیں جنہوں نے اس دین کو اپنانا ہے تاکہ زندگی میں اسلامی نظام رائج ہو اور انسانیت اس بھلائی اور نیکی سے محروم نہ ہو۔ ان بنیادی حقوق کے قیام کے نتیجے میں جماعت مسلمہ پر ایک اور ذمہ داری یہ عائد ہو جاتی ہے کہ وہ ہر اس قوت کو پاش پاش کر دے جو دعوت اسلامی اور اس کی تبلیغ کے آڑے آئے۔ یا وہ حق آزادی رائے کو چیلنج کرے یا وہ ایسے لوگوں پر تشدد کرے جنہوں نے دین و نظریہ کے معاملے میں آزادی سے کوئی نظریہ قبول کر لیا ہے۔

امت مسلمہ کا یہ فرض اس وقت تک ہے جب تک اسلامی نظام قبول کرنے والوں کے لئے کوئی تشدد باقی رہتا ہے اور نظام زندگی صرف اللہ ہی کا رائج نہیں ہو جاتا۔ اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ جہاد اس وقت تک جاری رہے گا جب تک لوگوں کو اسلامی نظام زندگی اختیار کرنے پر مجبور نہیں کر دیا جاتا۔ مقصد صرف یہ ہے کہ اس کرۂ ارض پر اسلامی نظام زندگی غالب ہونا چاہئے یوں کہ جو شخص بھی دین اسلام میں داخل ہونا چاہے اس کیلئے کوئی رکاوٹ نہ ہو' دنیا میں کوئی ایسی قوت نہ ہو جو کسی کو دین اسلام قبول کرنے سے روکے' یا اس کی تبلیغ کرنے سے روکے' یا اس دین پر قائم رہنے سے روکے۔ دنیا میں کوئی ایسا نظام نہ ہو جو اللہ کی ہدایت اور اس روشنی کو چھپا رہا ہو اور اس کے تحت رہنے والوں تک یہ ہدایت و روشنی پہنچنے میں رکاوٹ پیدا ہو رہی ہو' یا عوام کو اللہ کی اس راہ سے گمراہ کیا جارہا ہو' چاہے اس رکاوٹ کی نوعیت جو بھی ہو۔

یہ تھے وہ بنیادی مقاصد جن کے لئے اسلام نے جہاد فی سبیل اللہ کو فرض کیا ہے۔ یہ جہاد صرف انہی مقاصد عالیہ کے لئے تھا' ان کے علاوہ اسلام کے پیش نظر اور کچھ نہ تھا۔ نہ کوئی اور مقصد نہ کوئی اور رنگ۔

یہ جہاد اسلامی نظریۂ حیات کے لئے تھا' کافرانہ نظریاتی پھیلاؤ کا محاصرہ توڑنے کے لئے تھا' نظریۂ تشدد کے خلاف تھا' اور زندگی میں اسلامی نظام کے بچاؤ اور اسلامی شریعت کے قیام کے لئے تھا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ کرۂ ارض پر اسلامی جھنڈے بلند کر دیئے جائیں' اس طرح کہ اسلامی نظریۂ حیات کے مخالفین دہشت زدہ ہو جائیں اور ہروہ شخص جو اسلامی نظام زندگی میں دلچسپی رکھتا ہے' وہ اس میں داخل ہو جائے اور اسے دنیا کی کسی قوت کی جانب سے یہ خوف نہ ہو کہ اسے روکا جائے گا۔ اس پر تشدد ہو گا۔

یہ ہے اور صرف یہی ہے وہ جہاد جس کا حکم اسلام نے دیا تھا اور یہ ابھی تک برقرار رہے اور اسلامی نظام اس پر قائم ہے جو لوگ اس میں کام آئیں اسلام کی نظر میں شہید ہوتے ہیں اور جو لوگ جہاد کے مصائب برداشت کرتے ہیں وہ غازی اور اولیاء اللہ کہلاتے ہیں۔

یہ تھی وہ صورت حال جس سے مدینہ طیبہ میں جماعت مسلمہ دوچار تھی اور جس کے بارے میں سورۂ بقرہ کے اس سبق کی یہ آیات نازل ہوئیں' مشرکین قریش نے مسلمانوں کو ان کے گھروں سے ناحق نکال دیا تھا۔ انہیں محض اس لئے تشدد کا نشانہ بنایا جا رہا تھا کہ وہ حلقہ بگوش اسلام ہو چکے ہیں۔ ان کو صرف یہ اعتراض تھا کہ انہوں نے آزادانہ طور پر کیوں ایک نظریۂ حیات قبول کر لیا ہے۔ ان حالات میں خصوصی ہدایت کے ساتھ ساتھ یہ آیات اسلام کے نظریہ کے لئے قاعدہ کلیہ بھی بیان کر دیتی ہیں جو یوں ہے کہ مسلمانو! تم ان لوگوں سے جنگ کرو جنہوں نے تم سے ناحق جنگ کی اور ابھی تک برسرجنگ ہیں اور آئندہ بھی تمہارے لئے یہی ہدایت ہے کہ جو تم سے لڑے اس سے لڑو مگر زیادتی نہ کرو۔ ارشاد ہوا! وَ قَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَكُمْ وَ لَا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ "اور اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں مگر زیادتی نہ کرو کہ اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔"

آیات قتال میں سے یہ پہلی آیت ہے اور پہلی آیت ہی میں قتال کے مقاصد کے بارے میں قطعی فیصلہ کر دیا گیا اور واضح طور پر بتادیا گیا کہ وہ کون سا علم ہے جس کے تحت مسلمانوں کو معرکہ جہاد سر کرنا ہے۔ وَ قَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَكُمْ "اور اللہ کی راہ میں' ان لوگوں سے لڑو' جو تم سے لڑتے ہیں۔"

یہ جہاد' یہ قتال صرف اللہ ہی کے لئے ہے اور انسان نے طویل انسانی تاریخ میں' جن معروف مقاصد کے لئے زبردست جنگیں لڑیں ان میں سے کوئی مقصد بھی اسلامی جہاد کو مطلوب نہیں ہے۔ نہ خاندانی شرف کے لئے' نہ علوفی الارض اور برتری کے لئے' نہ دولت و غنیمت کے لئے' نہ منڈیوں اور خام اشیاء پر قبضے کے لئے' نہ کسی طبقے پر دوسرے کی سیادت کے قیام کے لئے اور نہ کسی نسل پر کسی نسل کی حکومت کے لئے۔ اسلامی جہاد صرف ان مقاصد کے لئے ہے جن کی تحدید اسلام نے کر دی ہے۔ دنیا میں اسلام کا کلمہ بلند کرنے کیلئے' اسلامی نظام زندگی کے نفاذ کیلئے' مسلمانوں کو ظلم و تشدد سے بچانے کیلئے' مسلمانوں کو گمراہی اور ضلالت سے بچانے کے لئے۔ غرض یہ ہیں اسلامی مقاصد' ان کے علاوہ دوسرے مقاصد کے لئے جو جنگیں بھی لڑی جائیں وہ اسلامی جہاد کہلانے کی مستحق نہیں ہیں اور جو شخص بھی ایسی جنگوں میں حصہ لے گا اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ کسی اجر کا مستحق نہیں ہے۔ نہ ہی اللہ کے ہاں اس کا کوئی مقام ہے۔

جنگ کے مقاصد کے تعین کے ساتھ ساتھ' اس کی مقدار اور حد بھی مقرر کر دی گئی:

وَ لَا تَعْتَدُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ "مگر زیادتی نہ کرو' اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔"

زیادتی یوں ہو گی کہ جنگ لڑنے والے سپاہیوں کے علاوہ پرامن شہریوں کو بھی تکلیف دی جائے' جو دعوت اسلامی کے لئے کوئی خطرہ نہیں ہیں' نہ ہی ان سے اسلامی جماعت کو کوئی خطرہ ہے۔ مثلاً عورتیں' بچے' بوڑھے اور جو لوگ خدا کی عبادت کے لئے الگ ہو گئے ہیں خواہ وہ کسی بھی مذہب و ملت سے متعلق ہوں حکم دیا گیا کہ جنگ میں ان حدود و قیود کو پامال نہ کیا جائے' جو اسلام نے جنگ کے لئے مقرر کئے ہیں۔ اسلام نے سب سے پہلے' ان قباحتوں پر پابندی عائد کی جو جاہلیت میں عام طور پر معروف تھیں۔ خواہ یہ جاہلیت قدیم ہو یا جدید۔ یہ

قباحتیں ہیں جن سے اسلامی نظام متصادم ہے۔ جن سے اسلام کی روح ابا کرتی ہے۔

اس سلسلے میں حضور ﷺ کی چند احادیث کا مطالعہ کیجئے۔ آپ ﷺ کے ساتھیوں کی ہدایات پڑھیے' ان سے ان آداب کا مزاج آپ پالیں گے۔ یہ وہ آداب جنگ ہیں' جن سے انسانیت کا تعارف سب سے پہلے اسلام کے نظام جنگ کے مطالعہ کے بعد ہوا :

۱۔ حضرت ابن عمر ﷺ سے روایت ہے۔ فرماتے ہیں: "حضور ﷺ کے مغازی میں سے ایک موقعہ پر ایک عورت پائی گئی جسے قتل کر دیا گیا تھا' اس پر حضور ﷺ نے عورتوں اور بچوں کے قتل سے منع فرمایا۔" (مالک' شیخین' ابوداؤد اور ترمذی)

۲۔ حضرت ابو ہریرہ ﷺ سے روایت ہے۔ فرماتے ہیں رسول خدا ﷺ نے فرمایا! "جب تم جنگ کر رہے ہو' تو اس وقت چہرے پر مارنے سے اجتناب کرو۔" (شیخین)

۳۔ حضرت ابو ہریرہ ﷺ روایت کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں! "ہمیں رسول خدا ﷺ نے جنگ کے لئے بھیجا۔ اس موقع پر فرمایا : "اگر تم فلاں فلاں (قریش کے دو افراد) کو پاؤ تو انہیں آگ میں جلاؤ۔" جب ہم تیار ہو کر نکلنے لگے تو آپ نے فرمایا! "میں نے تمہیں حکم دیا تھا کہ فلاں فلاں کو آگ میں ڈالو! لیکن آگ کے ساتھ اذیت دینا' صرف اللہ تعالیٰ کا حق ہے' لہٰذا حکم یہ ہے کہ اگر تم انہیں پاؤ تو دونوں کو قتل کر دو۔" (بخاری' ابوداؤد اور ترمذی)

۴۔ حضرت ابن مسعود ﷺ سے روایت ہے۔ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا! "جنگ میں سب سے زیادہ عفو و درگزر کرنے والے صرف اہل ایمان ہیں۔" (ابوداؤد)

۵۔ عبد بن یزید انصاری سے روایت ہے۔ فرماتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے مال غنیمت میں چوری اور قتل میں مثلہ کرنے سے منع فرمایا۔

۶۔ حضرت ابویعلی ﷺ سے روایت ہے۔ فرماتے ہیں ہم عبد الرحمٰن بن خالد بن ولید کی قیادت میں شریک جنگ ہوئے۔ دشمن کے چار آدمی لائے گئے۔ حکم دیا گیا کہ انہیں نیزے کے چپٹے حصے کی طرف سے قتل کیا جائے اور انہیں اس طرح قتل کیا گیا۔ اس کی اطلاع حضرت ابو ایوب انصاری ﷺ کو ہوئی تو انہوں نے فرمایا : میں نے حضور ﷺ کو اذیت دے کر قتل کرنے سے منع کرتے ہوئے سنا۔ خدا کی قسم اگر مرغی بھی ہوتی تو بھی میں اسے اذیت دے کر نہ قتل کرتا۔ جب اس کا علم عبد الرحمٰن ﷺ کو ہوا تو انہوں نے چار غلام آزاد کئے۔ (ابوداؤد)

۷۔ حارث نے مسلم ابن حارث ﷺ سے روایت کی ہے۔ فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں ایک سریہ میں بھیجا۔ جب ہم حملہ کی جگہ پہنچے تو میں نے گھوڑی کو ایڑی دی۔ وہ میرے ساتھیوں سے آگے جا نکلی۔ میں نے دیکھا کہ آبادی کے لوگ (خوف کے مارے) چیخ پکار کر رہے ہیں۔ میں نے ان سے کہا جلدی سے کلمہ طیبہ لاالٰہ الا اللہ کا اقرار کر لو اور اپنے آپ کو بچالو' انہوں نے کلمہ پڑھ لیا۔ میرے ساتھیوں نے مجھے سخت ملامت کی اور کہنے لگے" تم نے ہمیں مال غنیمت سے محروم کر دیا۔ ہم رسول خدا ﷺ کے پاس واپس آئے۔ لوگوں نے حضور کو میری حرکت سے آگاہ کیا۔ آپ نے میری تعریف کی۔ اس کے بعد مجھ سے کہا :" اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے ہر آدمی کے بدلے تمہارے لئے یہ یہ اجر لکھ دیا ہے۔ (ابوداؤد)

۸۔ حضرت بریدہ ﷺ سے روایت ہے' فرماتے ہیں رسول خدا ﷺ جب بھی کسی کو مجاہدوں کے دستے کا سردار مقرر کرتے یا کوئی سریہ بھیجتے تو انہیں سب سے پہلے خدا خوفی کی وصیت فرماتے۔ پھر فرماتے کہ اپنے ساتھیوں سے حسن سلوک رکھو اور پھر فرماتے "اللہ کے نام کے ساتھ لڑو' اللہ کی راہ میں' ان لوگوں سے لڑو جنہوں نے کفر اختیار کیا۔ لڑو لیکن غداری نہ کرو۔ مقتول کا مثلہ نہ کرو اور بچے

کو نہ قتل کرو۔" (مسلم' ابوداؤد اور ترمذی)

۹۔ مالک نے حضرت ابوبکر صدیق ؓ سے روایت کی ہے کہ انہوں نے اپنی فوج کو وصیت کرتے ہوئے منجملہ اور باتوں کے یہ فرمایا "تمہیں ایسے لوگ بھی ملیں گے جنہوں نے بزعم خود اپنے آپ کو اللہ کا کر دیا ہے۔ انہیں ان کی حالت عزلت ہی میں چھوڑ دو۔ عورت کو قتل نہ کرنا۔ بچے اور بہت زیادہ بوڑھے کو بھی قتل نہ کرنا۔"

یہ ہے وہ جنگ جو اسلام فرض کرتا ہے اور یہ ہیں اسلام کے آداب جنگ۔ وہ مقاصد جن کے لئے اسلام معرکہ جنگ برپا کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔ اور ان سب کا منبع قرآن مجید کا یہ حکم ہے "اور اللہ کے راستے میں ان لوگوں سے لڑو' جو تمہارے ساتھ لڑیں اور زیادتی نہ کرو۔ بے شک اللہ تعالیٰ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔"

قرن اول کے مسلمان اس حقیقت کو اچھی طرح جانتے تھے کہ وہ محض اپنی تعداد کے بل بوتے پر فتح حاصل نہیں کر سکتے۔ ان کی تعداد تو بہت قلیل ہے۔ وہ اپنی تعداد اور سازوسامان کی بدولت فتح مند نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ ان کا سازوسامان دشمن کے مقابلے میں بہت ہی قلیل ہے۔ وہ جانتے تھے کہ فتح صرف ایمان' بندگی اور اللہ کی نصرت کے نتیجے میں حاصل ہو سکتی ہے۔ اگر انہوں نے اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کی ہدایات کو ترک کیا تو وہ فتح و نصرت سے محروم ہو جائیں گے جو ان کا اصل سہارا ہے۔ اس لئے وہ اپنی جنگوں میں ان آداب جنگ کو سختی سے ملحوظ رکھتے تھے۔ یہاں تک کہ یہ آداب انہوں نے اپنے ان ازلی دشمنوں کے ساتھ بھی ملحوظ رکھے جنہوں نے انہیں سخت سے سخت اذیتیں دی تھیں۔ اور ان کے شہداء کی لاشوں کا مثلہ کیا تھا۔ ایک موقعہ پر حضور ﷺ کا غضب جوش میں تھا' آپ نے بعض لوگوں کے جلا دینے کے احکامات صادر فرمادیئے' لیکن تھوڑی ہی دیر بعد میں ہی آپ نے اپنے احکامات واپس لے لئے اور جلانے سے منع فرمایا۔ اس لئے کہ آگ کے ساتھ سزا صرف خاصۂ خدا ہے۔

مسلمانوں کو صرف ان لوگوں کے ساتھ جنگ کی تاکید کی جاتی ہے' جنہوں نے ان کے ساتھ جنگ کی۔ محض دینی نظریات کی وجہ سے ان پر تشدد کیا۔ انہیں ان کے گھروں سے نکالا۔ حکم دیا گیا ہے کہ ایسے لوگوں کے ساتھ جنگ جاری رکھو یہاں تک کہ وہ جس حال میں بھی ہوں' مارے جائیں' جہاں بھی ہوں مارے جائیں۔ ماسوائے مسجد حرام کے' ہاں اگر مسجد حرام میں بھی کفار جنگ کا آغاز کر دیں تو پھر مسلمانوں کے لئے بھی جائز ہو گا' سوائے اس کے کہ وہ حلقہ بگوش اسلام ہو جائیں۔ اس صورت میں چاہے انہوں نے مسلمانوں کو قتل کیا ہو' چاہے ان پر ظلم کیا اور تشدد کا ارتکاب کیا ہو' مسلمانوں کو یہ حکم ہے کہ وہ ہاتھ روک لیں: وَاقْتُلُوهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوهُمْ وَأَخْرِجُوهُمْ مِنْ حَيْثُ أَخْرَجُوكُمْ وَالْفِتْنَةُ أَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ وَلَا تُقَاتِلُوهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتَّى يُقَاتِلُوكُمْ فِيهِ فَإِنْ قَاتَلُوكُمْ فَاقْتُلُوهُمْ كَذَلِكَ جَزَاءُ الْكَافِرِينَ ۝ فَإِنِ انْتَهَوْا فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ (۱۹۲) "اور ان سے لڑو جہاں بھی ان سے تمہارا مقابلہ پیش آئے' اور انہیں نکالو جہاں سے انہوں نے تم کو نکالا ہے' اس لئے کہ قتل اگرچہ برا ہے مگر فتنہ اس سے بھی زیادہ برا ہے اور مسجد حرام کے قریب جب تک وہ تم سے نہ لڑیں' تم بھی نہ لڑو۔ مگر جب وہ وہاں لڑنے سے نہ چوکیں' تو تم بھی بے تکلف انہیں مارو کہ ایسے کافروں کی یہی سزا ہے۔ پھر اگر وہ باز آجائیں تو جان لو کہ اللہ معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔"

محض دین' مذہب یا نظریہ کے اختلاف کی وجہ سے تشدد کرنا' دراصل' حیات انسانی کی مقدس ترین قدر (Value) پر دست درازی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے اسے قتل سے بھی زیادہ برا قرار دیا ہے۔ اسے جان لینے اور زندگی ختم کر دینے سے بھی زیادہ گھناؤنا جرم قرار دیا ہے۔ یہ فتنہ جو قتل سے بھی شدید تر ہے کیا ہے؟ محض ہراساں کرنا بھی اس میں آتا ہے۔ عملاً تشدد بھی اس میں شامل ہے۔ ایسے حالات پیدا کر دینا بھی فتنہ ہے' جن میں لوگوں کو گمراہ کیا جاتا ہو' انہیں اللہ کے مقرر کردہ نظام زندگی سے دور کرنا بھی فتنہ ہے۔

مسلمانوں کے لئے کفر کو مرغوب بنانا اور اسلام سے انہیں دور کرنا' ان کے اخلاق کو خراب کرنا یہ سب فتنے کی تعریف میں داخل ہیں- اس فتنے کی واضح ترین مثال اشتراکی نظام ہے- جہاں دینی تعلیم ممنوع اور الحاد کی تعلیم لازمی ہوتی ہے- ایسے قوانین بنائے جاتے ہیں جو زنا' شراب جیسے محرمات کو جائز قرار دیتے ہیں اور نشرو اشاعت کے مختلف ذرائع سے ان چیزوں کو انسانوں کے لئے مرغوب بناتے ہیں- جب کہ اسلامی نظام زندگی کی ہر بات میں کیڑے نکالتے ہیں- اسے مسخ کرتے ہیں اور جو اجتماعی حالات میں یہ نظام پیدا کر دیتا ہے ان کا اتباع وہاں کے عوام الناس کے لئے ایک حتمی فریضہ قرار پاتا ہے-

آزادی رائے کے بارے میں یہ نقطۂ نظر' انسانی زندگی میں آزادی رائے کا یہ مقام بلند اسی نظام کے عین مطابق ہے- وجود کائنات کی جو غرض و غایت اسلام نے پیش کی ہے- یہ نقطۂ نظر اس کے ساتھ بھی ہم آہنگ ہے- اسلام کے مطابق تخلیق کائنات کی غرض و غایت بندگی ہے- بندگی ہر اس اچھے کام کو کہا جاتا ہے جس میں کرنے والے کے پیش نظر خدا کی رضامندی ہو' اور اللہ کی بندگی تب ہی ممکن ہے جب انسان تمام دوسری بندگیوں سے آزاد ہو' یہی وجہ ہے کہ انسان کی بلند ترین قدر (Value) اس کی آزادی ہے- بالخصوص آزادی رائے- اب جو شخص کسی کی آزادی چھین لیتا ہے' محض نظریہ کی وجہ سے تشدد کرتا ہے' براہ راست یا بالواسطہ' وہ اس شخص کے قتل سے بھی اس پر زیادہ ظلم کرتا ہے- یہی وجہ ہے کہ ایسے افراد کے مقابلہ میں مدافعت ہر طرح جائز ہے' اگرچہ اس کے لئے جنگ کرنی پڑے- قرآن کریم نے (قاتلوھم) جنگ کرنے کا حکم نہیں دیا بلکہ (واقتلوھم) انہیں قتل کر دینے کا حکم دیا ہے- وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ اور جہاں بھی ایسے لوگ پائے جائیں انہیں قتل کر دینے کا حکم دیا ہے- جہاں بھی پائے جائیں- جس حال میں بھی وہ ہوں' جس ذریعے سے بھی تم نے ایسے لوگوں کو مار سکو' ہاں اس سلسلے میں تم صرف اسلامی آداب جنگ کا لحاظ رکھنا ہو گا' کسی کو مثلہ نہ کرنا کسی کو آگ میں جلانا-

مسجد حرام دارالامن ہے- اس لئے اس کے قریب نہ لڑو- اس کے بارے میں اللہ نے اپنے دوست ابراہیم کی دعا قبول کی تھی- اسے مرکز عوام قرار دیا گیا تھا- اسے دارالامان گردانا گیا تھا- لہٰذا حکم ہوا مسجد حرام کے قریب کسی کے ساتھ نہ لڑو' الا یہ کہ کفار کا کوئی گروہ یہاں تمہارے ساتھ لڑنے لگے' لیکن جنگ کا آغاز تم نہ کرو- اگر وہ آغاز کر دیں اور مسجد حرام کا پاس نہ رکھیں تو پھر تمہارے ہاتھ بھی بندھے ہوئے نہیں ہیں- یہ لوگ عوام کو ان کے دین کی وجہ سے ستاتے ہیں- مسجد حرام کا احترام نہیں' لہٰذا یہی ان کے لئے مناسب سزا ہے- ارشاد ہوا!

فَإِنِ انْتَهَوْا فَإِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ "پھر اگر وہ باز آجائیں تو جان لو کہ اللہ معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے-" صرف باز آنا ہی کافی نہیں- مسلمانوں پر تشدد سے باز آجائیں- جنگ سے باز آجائیں' کفر سے بھی باز آجائیں تب وہ معافی اور مہربانی کے مستحق ہوں گے- صرف جنگ سے باز آنے کے لئے تو یہ کیا جا سکتا ہے کہ مسلمان حالت امن کا اعلان کر دیں- مگر یہ نہیں ہو سکتا کہ کفار اللہ کی مغفرت اور رحمت کے بھی مستحق ہو جائیں- ہاں یہاں مغفرت اور رحمت کی طرف اشارے سے مراد یہ ہے کہ کفار کو ایمان کی ترغیب دی جائے تاکہ کفر اور تشدد کے چھوڑ دینے کے بعد وہ اللہ کی مغفرت اور اس کی رحمت کے مستحق بھی ہو جائیں-

اسلام کی شان عظمت اور شان کریمی تو دیکھئے- کفار اور ظالموں کو بھی اشارہ دیا جاتا ہے' کہ آؤ مغفرت و رحمت کی بارش ہو رہی ہے- آؤ تمہارے سب سابقہ گناہ معاف' تشدد اور ظلم کا قصاص معاف' دیت معاف' اسلامی صفوں میں مؤمنانہ شان سے داخل ہو جاؤ' تو سب کچھ معاف- تم نے قتل کیا تم نے تشدد کیا' تم نے کیا کچھ نہ کیا' مگر سب معاف اور مغفرت و رحمت کی بارش-

اسلام میں جنگ کی غرض و غایت ہی یہ ہے کہ لوگوں کے تشدد کے ذریعے' دین اسلام سے نہ روکا جائے- قوت کے ذریعے' یا قوت

سے بھی زیادہ موثر ہتھیار یعنی معاشرتی حالات کے ذریعے عوام کو اسلام سے نہ پھیرا جائے۔ ان کے اخلاق کو خراب کرنے والے' انہیں گمراہ کرنے والے اور انہیں فریب دینے والے ذرائع استعمال نہ کئے جائیں۔ نیز یہ کہ اسلامی نظام کو وقعت حاصل ہو' اور اس کا پلڑا بھاری ہو' اس کے دشمن ہیبت زدہ ہوں۔ ان کو یہ جرأت نہ ہو کہ وہ اہل ایمان پر تشدد کریں یا انہیں اذیت دیں۔ نیز عام لوگوں کے لئے اب کوئی خوف محسوس نہ ہو کہ اگر انہوں نے اسلام قبول کیا تو ان پر تشدد ہو گا یا انہیں کوئی اذیت دی جائے گی۔ ایک اسلامی جماعت کا یہ مستقل فریضہ ہے کہ وہ اس وقت تک بر سرپیکار رہے جب تک ظالمانہ اور جابرانہ قوتیں ختم نہیں ہو جاتیں۔ اور جب تک وقار اور غلبہ صرف اسلام کو حاصل نہیں ہو جاتا۔ اور کوئی فتنہ باقی نہ رہے وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّىٰ لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ لِلَّهِ ۖ فَإِنِ انتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ إِلَّا عَلَى الظَّالِمِينَ تم ان سے لڑتے رہو' یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین اللہ کے لئے ہو جائے۔ پھر اگر وہ باز آجائیں' تو پھر سمجھ لو کہ ظالموں کے سوا اور کسی پر دست درازی جائز نہیں ہے۔"

ایک وقت تھا' جب یہ آیت نازل ہوئی تھی تو روئے سخن جزیرۃ العرب میں مشرکین مکہ کی طرف تھا' کیونکہ اس وقت مشرکین مکہ ہی تشدد پر اترے ہوئے تھے۔ جو یہ نہ مانتے تھے کہ نظام زندگی کا سرچشمہ صرف اللہ ہی ہے۔ آیت کا مفہوم عام ہے۔ ہر وقت نافذ ہے اور ہمارے لئے بھی راہ ہدایت ہے' اس لئے کہ جہاد امت مسلمہ کے لئے قیامت تک ایک فریضہ رہے گا' کیونکہ ہر دور میں ایسی قوتیں موجود رہتی ہیں جو لوگوں کو دین سے روکتی ہیں۔ وہ ان کے کانوں تک دعوت اسلامی کی پہنچنے کے تمام ذرائع مسدود کرتی ہیں اور پھر بھی اگر کوئی کسی طرح دعوت اسلامی پر مطمئن ہو جائے تو یہ قوتیں عوام کو روکتی ہیں کہ وہ اسلام قبول کریں اور اسلام پر امن وامان کی حالت میں عمل پیرا ہوں چنانچہ ہر وقت اسلامی جماعت کا یہ مستقل فریضہ ہے کہ وہ ایسی طاقتوں کو پاش پاش کر دے اور لوگوں کو ان کے جبر و تشدد سے آزاد کرائے۔ وہ آزادی سے سنیں چاہے قبول کریں یا نہ کریں۔ تشدد اور فتنے کو قتل سے بھی برا قرار دینے کے بعد' بار بار اس کا تکرار بھی خالی از حکمت نہیں ہے۔ یہ تکرار اس لئے کی جا رہی ہے کہ اس معاملے کو اسلام میں بہت بڑی اہمیت حاصل ہے۔ یہاں اسلام ایک عظیم اصول کی بنیاد رکھ رہا ہے' انسان بدل رہا ہے۔ یہ انسان کے لئے درحقیقت ایک نیا جنم ہے۔ یہ نئی زندگی انسان کو اسلامی نظام سے مل رہی ہے۔ اب انسان کی قدر و قیمت اس کی حیوانیت اور اس کی جسمانی زندگی سے نہیں۔ بلکہ اس کی قدر و قیمت کا تعین اس کے عقیدے اور نظریے سے ہو رہا ہے۔ ایک طرف انسان کی زندگی ہے' دوسری طرف انسان کا نظریہ اور اس کا عقیدہ ہے۔ عقیدے کا پلڑا بھاری قرار دیا جا رہا ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ انسانیت کے دشمن صرف وہ لوگ ہیں جو دوسرے انسانوں پر محض اختلاف عقیدہ' اختلاف نظریہ کی وجہ سے ظلم و تشدد کریں۔ وہ لوگ جو ایک مسلمان پر محض اس لئے ظلم کرتے ہیں کہ وہ مسلمان ہے۔ وہ اسے تشدد کے ذریعہ اسلام سے پھیرنا چاہتے ہیں۔ یہ لوگ انسانیت کو ایک ایسے تصور سے محروم کرتے ہیں جو خیر ہی خیر ہے۔ وہ لوگوں کو اللہ کے عطا کردہ نظام زندگی کی طرف آنے نہیں دیتے۔ اس لئے ان کے ساتھ جنگ کرتے رہنا اسلامی جماعت کا فرض اولین ہے۔ اس کا فرض ہے کہ ایسے لوگ جہاں بھی ملیں انہیں ختم کر دے تاکہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین اللہ کے لئے ہو جائے۔

یہ عظیم اصول' جسے اسلام نے اپنے ابتدائی ایام میں وضع کیا تھا۔ اب بھی اپنی جگہ پر قائم ہے۔ اب بھی اسلامی نظریۂ حیات اور اس کے حاملین پر قسم قسم کے تشدد ہو رہے ہیں۔ حاملین اسلام کو' فرداً فرداً بھی اور بحیثیت جماعت بھی ظلم اور تشدد کا نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ اور جو لوگ بھی ظلم و تشدد کا محض اس لئے شکار بنائے جا رہے ہیں کہ انہوں نے ایک نظریۂ حیات کو اپنا لیا ہے یا انہوں نے ایک پسندیدہ نظام زندگی کو اپنا رکھا ہے' چاہے جس قسم کا تشدد بھی ہو' ان لوگوں کا فرض ہے کہ وہ ایسے ظالموں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں' ان کے ساتھ لڑیں۔ ماریں یا مارے جائیں اور ہر حال میں اس علم کو بلند رکھیں۔ آزادی رائے کے علم کو جسے سب سے پہلے اسلام نے بلند کیا جس کے

ذریعے بالکل ایک نیا اور آزاد انسان وجود میں آیا۔

جب بھی ظالم اپنے ظلم سے باز آجائیں۔ وہ انسان اور اس کے خدا کے درمیان مداخلت چھوڑ دیں تو ان پر کوئی زیادتی یعنی ان کے خلاف کوئی مدافعت نہ ہوگی۔ کیونکہ جہاد ہمیشہ صرف ظلم اور ظالم کے خلاف ہوتا ہے۔ ارشاد ہوا پھر اگر وہ باز آجائیں تو سمجھ لو کہ ظالموں کے سوا کسی اور کے خلاف کوئی مدافعت نہ ہوگی فَإِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ إِلَّا عَلَى الظّٰلِمِينَ ، یہاں ظالموں کے خلاف مدافعت اور ان کے مقابلے کی تعبیر لفظ عدوان سے کی گئی ہے۔ محض لفظی مشکلات کی بناپر ورنہ ظالموں کے خلاف جو کارروائی ہے' وہ عدل ہے۔ انصاف ہے اور مظلوموں کو ظلم سے بچانا ہے' ظلم کو روکنا ہے' کوئی زیادتی نہیں ہے۔

مسجد حرام کے قریب لڑنے کے احکام بیان کرنے کے بعد اب حرام مہینوں میں جنگ کے احکام بیان کئے جاتے ہیں۔ اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَالْحُرُمٰتُ قِصَاصٌ ۚ فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ "ماہ حرام کا بدلہ ماہ حرام ہی ہے۔ اور تمام حرمتوں کا لحاظ برابری کے ساتھ ہو گا' لہذا جو تم پر دست درازی کرے' تم بھی اسی طرح اس پر دست درازی کرو۔ البتہ اللہ سے ڈرتے رہو اور یہ جان رکھو کہ اللہ انہی لوگوں کے ساتھ ہے جو اس کی حدود توڑنے سے پرہیز کرتے ہیں۔"

جو شخص محرم کے مہینے کی حرمت کا کوئی پاس نہیں رکھتا اسے یہ حق نہیں ہے کہ وہ ان پابندیوں سے فائدہ اٹھائے جو ان حرام مہینوں کے اندر عائد ہوتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے تمام معاملات میں صرف ایک مقام مسجد حرام کو دارالامن قرار دیا ہے اور زمانوں میں سے حرام مہینوں کو زمانہ امن قرار دیا ہے۔ اس مکان اور اس زمان میں کسی کا خون نہیں بہایا جاسکتا۔ ہر کسی کی جان و مال محفوظ ہوں گے۔ کسی بھی زندہ چیز کو دکھ نہ دیا جائے گا۔ جو شخص یہ چاہتا ہو کہ وہ خود تو امن کے اس شاداب باغیچے میں عیش کرے اور مسلمانوں کو اس سے محروم کر دے۔ اس کا علاج صرف یہ ہے کہ خود اسے بھی اس سے محروم کر دیا جائے۔ جو دوسروں کی آبروریزی کرتا ہے۔ خود اس کی آبرو محفوظ نہ ہوگی کیونکہ الحرمات قصاص تمام حرمتوں کا لحاظ برابری کا ہو گا لیکن اس کے باوجود مسلمانوں کو تنبیہہ کر دی گئی کہ ظلم کا مقابلہ کرنے اور ظلم کا بدلہ لینے میں' وہ اپنے حدود سے آگے نہ بڑھیں۔ کیونکہ ان مقدس مقامات اور ان مقدس و محرم مہینوں کے اندر محض ضرورت کے تحت تمہیں جنگ کی اجازت دی جارہی ہے۔

فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ "لہذا جو تم پر دست درازی کرے تم بھی اسی طرح اس پر دست درازی کرو" لیکن اس معاملہ میں غلو اور زیادتی سے کام نہ لو۔ اس سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے قدر انتقام مقرر نہیں کی۔ مقدار ان کی خدا خوفی پر چھوڑ دی گئی ہے۔ جب کہ اوپر ہم کہہ آئے ہیں کہ مسلمان اس بات سے خوب واقف تھے کہ ان کی نصرت اور امداد صرف اللہ تعالیٰ کر رہا ہے۔ اس لئے انہیں حکم دیا جاتا ہے کہ وہ اللہ سے ڈریں۔ یہی وہ حد ہے جس پر انہیں رکنا چاہئے۔ حقیقت یہ ہے کہ خدا خوفی ہی امن کی سب سے بڑی ضمانت ہے۔

جہاد میں افراد کی طرح مال کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ جہاد سے پہلے ایک مجاہد کو سامان جنگ کی ضرورت ہوگی' مثلاً سواری' اور دوسرا سامان جنگ۔ حضور ﷺ کے دور میں فوجیوں اور افسروں کے لئے مقررہ تنخواہ نہیں تھی۔ وہ لوگ اسلام کے لئے جس طرح جان قربان کرتے تھے' اس طرح اپنی دولت بھی راہ خدا میں خرچ کرتے تھے۔ اگر اجتماعی نظم' نظریۂ حیات پر استوار کیا جائے تو یہی صورت ہوتی ہے۔ اگر حکومت کی بنیاد نظریہ پر ہو تو پھر اپنے بچاؤ یا اپنے عوام کے بچاؤ کے لئے' یا دشمنوں کے مقابلے میں کسی جنگ کے لئے اسے دولت خرچ کر کے تنخواہ دار ملازمین رکھنے کی ضرورت سرے سے پیش ہی نہیں آتی' فوج خود آگے بڑھتی ہے' لیڈر خود آگے بڑھتے ہیں' جان بھی دیتے

ہیں اور مال بھی۔

ضرورت اس بات پر غور کرنے کی تھی کہ بے شمار غریب مسلمان ایسے تھے' جو جذبہ جہاد سے تو سرشار تھے' وہ اسلامی نظریۂ حیات اور اسلامی نظام زندگی کے لئے لڑ مرنے کے لئے تیار تھے لیکن صورت حال یہ تھی کہ ان کے پاس سامان جنگ تھا اور نہ کوئی زاد راہ تھا۔ میدان جنگ تک جانے کے لئے کوئی سواری نہ تھی' ایسے لوگ حضور کے پاس آتے اور التجائیں کرتے کہ آپ انہیں دور دراز میدان جنگ تک لے جائیں۔ کیونکہ میدان جنگ بعض اوقات اتنا دور ہوتا تھا کہ وہاں تک پیدل جانا ممکن نہ تھا اور جب حضور معذرت کا اظہار فرماتے تو وہ مایوس لوٹتے۔ ان کے بارے میں قرآن مجید میں ہے۔

تَوَلَّوْا وَّاَعْيُنُهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ حَزَنًا اَلَّا يَجِدُوْا مَا يُنْفِقُوْنَ (وہ لوٹے مگر اس حال میں کہ ان کی آنکھیں اشک بار ہوتیں' اس دکھ کی وجہ سے کہ ان کے پاس وہ کچھ نہیں ہے جسے وہ اس موقعہ پر خرچ کریں) قرآن مجید کی بے شمار آیات اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بے شمار احادیث میں انفاق فی سبیل اللہ کی ترغیب دی گئی ہے۔ خصوصاً غازیوں کے سازوسامان کے لئے۔ قرآن مجید میں بے شمار مقامات ایسے ہیں جہاں دعوت جہاد کے ساتھ ساتھ دعوت انفاق بھی دی گئی ہے اور یہاں تو انفاق فی سبیل اللہ سے پہلو تہی کرنے کو ہلاکت اور بربادی سے تعبیر کیا گیا ہے اور حکم دیا گیا ہے کہ اس سے بچو وَ اَنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ لَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ وَ اَحْسِنُوْا اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ اور اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور اپنے ہاتھوں اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔ احسان کا طریقہ اختیار کرو کہ اللہ محسنوں کو پسند کرتا ہے۔"

جو لوگ اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے وہ بخیل ہوتے ہیں اور بخل کی وجہ سے نفس انسانی مردہ ہو جاتا ہے۔ بخیل جس جماعت کا فرد ہے وہ اپنی ضعیفی کی وجہ سے مرگ مفاجات میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ بالخصوص ایسے نظام زندگی میں جو قائم ہی رضاکاری پر ہو' جیسے کہ اسلام کے ابتدائی ایام میں نظر آتا ہے۔

بطور مزید تاکید کہا جاتا ہے کہ انفاق سے بھی آگے بڑھو۔ درجہ احسان تک جا پہنچو وَ اَحْسِنُوْا اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ "احسان کا طریقہ اختیار کرو' بے شک اللہ تعالیٰ محسنوں کو پسند کرتا ہے۔"

اسلام میں جو مراتب ہیں' احسان ان میں بلند ترین مرتبہ ہے۔ احسان کی تعریف خود رسول خدا ﷺ نے فرمائی ہے۔ "تم اللہ کی بندگی اس طرح کرو گویا کہ تم اسے دیکھ رہے ہو اور اگر تم اسے نہیں دیکھ رہے تو وہ تمہیں دیکھ رہا ہے اور جو انسان اس مقام بلند تک جا پہنچے' اس کے لئے تمام دوسری عبادات ادا کرنا آسان ہو جاتا ہے۔ تمام معاصی خود بخود چھوٹ جاتے ہیں اور ایسا شخص چھوٹے بڑے گناہ کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی ذات سے ڈرتا ہے۔ تنہائی میں اور محفل میں ہر جگہ خدا کا خوف اس کے پیش نظر رہتا ہے۔

یہ وہ آخری نتیجہ ہے جس پر آیات جہاد کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور جہاد کے معاملہ میں نفس انسانی کو احسان کے سپرد کر دیا جاتا ہے' جو ایمان کا بلند ترین درجہ ہے۔

اب یہاں سے حج' عمرہ اور ان کے مناسک کا بیان شروع ہوتا ہے۔ سلسلہ کلام میں خود بخود ربط قائم ہو جاتا ہے۔ پہلے بات چاند کے سے چلی تھی جواب دیا گیا تھا کہ وہ لوگوں کیلئے اور حج کے دوران اوقات کے تعین کیلئے ہے۔ پھر حج کے حرام مہینوں میں جنگ کے قریب۔ جنگ کی بات چلی اور اسکے بعد اب حج اور عمرہ کے احکام بیان ہوتے ہیں جو مسجد حرام میں سرانجام پاتے ہیں۔

وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ ؕ فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ وَ
لَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَكُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهٗ ؕ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا
اَوْ بِهٖۤ اَذًى مِّنْ رَّاْسِهٖ فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ ۚ فَاِذَاۤ
اَمِنْتُمْ ٚ فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ فَمَنْ
لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ فِى الْحَجِّ وَسَبْعَةٍ اِذَا رَجَعْتُمْ ؕ تِلْكَ عَشَرَةٌ
كَامِلَةٌ ؕ ذٰلِكَ لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ اَهْلُهٗ حَاضِرِى الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ
وَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۱۹۶﴾ اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ ۚ فَمَنْ فَرَضَ ۲۴ ع ۸
فِيْهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ ۙ وَلَا جِدَالَ فِى الْحَجِّ ؕ وَمَا تَفْعَلُوْا ۸
مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ ؕ وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى ۫ وَاتَّقُوْنِ
يٰۤاُولِى الْاَلْبَابِ ﴿۱۹۷﴾ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ فَاِذَاۤ
اَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفٰتٍ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ ۪ وَاذْكُرُوْهُ كَمَا
هَدٰىكُمْ ۚ وَاِنْ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الضَّآلِّيْنَ ﴿۱۹۸﴾ ثُمَّ اَفِيْضُوْا مِنْ حَيْثُ
اَفَاضَ النَّاسُ وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۹۹﴾ فَاِذَا قَضَيْتُمْ
مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا ؕ فَمِنَ النَّاسِ
مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَاۤ اٰتِنَا فِى الدُّنْيَا وَمَا لَهٗ فِى الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ﴿۲۰۰﴾ وَ
مِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَاۤ اٰتِنَا فِى الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِى الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا
عَذَابَ النَّارِ ﴿۲۰۱﴾ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّمَّا كَسَبُوْا ؕ وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿۲۰۲﴾
وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِىْۤ اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ ؕ فَمَنْ تَعَجَّلَ فِىْ يَوْمَيْنِ فَلَاۤ اِثْمَ
عَلَيْهِ ۚ وَمَنْ تَاَخَّرَ فَلَاۤ اِثْمَ عَلَيْهِ ۙ لِمَنِ اتَّقٰى ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْۤا
اَنَّكُمْ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿۲۰۳﴾

”اللہ کی خوشنودی کے لئے جب حج اور عمرہ کی نیت کرو' تو اسے پورا کرو اور اگر کہیں گھر جاؤ تو جو قربانی میسر آئے' اللہ کی جناب میں
پیش کرو اور اپنے سر نہ مونڈو جب تک کہ قربانی اپنی جگہ نہ پہنچ جائے۔ مگر جو شخص مریض ہو یا جس کے سر میں کوئی تکلیف ہو اور اس بنا

پر اپنا سر منڈوا لے تو اسے چاہئے کہ فدیے کے طور پر روزے رکھے یا صدقہ دے یا قربانی دے' اور اگر قربانی میسر نہ ہو تو تین روزے حج کے زمانے میں اور سات گھر پہنچ کر' اس طرح پورے دس روزے رکھ لے۔ یہ رعایت ان لوگوں کے لئے ہے جن کے گھر مسجد حرام کے قریب نہ ہوں۔ اللہ کے ان احکام کی خلاف ورزی سے بچو اور خوب جان لو کہ اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔"

حج کے مہینے سب کو معلوم ہیں۔ جو شخص ان مقرر مہینوں میں حج کی نیت کرے اسے خبردار رہنا چاہئے کہ حج کے دوران میں اس سے کوئی شہوانی فعل' کوئی بدفعلی' کوئی لڑائی جھگڑے کی بات سرزد نہ ہو اور جو نیک کام تم کرو گے وہ اللہ کے علم میں ہو گا۔ سفرِ حج کے لئے زادِ راہ ساتھ لے جاؤ اور سب سے بہتر زادِ راہ پرہیز گاری ہے۔ پس اے ہوشمندو' میری نافرمانی سے پرہیز کرو اور اگر حج کے ساتھ ساتھ تم اپنے رب کا فضل بھی تلاش کرتے جاؤ تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ پھر جب عرفات سے چلو تو مشعر حرام کے پاس ٹھہر کر اللہ کو یاد کرو۔ اور اس طرح یاد کرو جس کی ہدایت اس نے تمہیں کی ہے' ورنہ اس سے پہلے تو تم بھٹکے ہوئے تھے۔ پھر جہاں سے سب لوگ پلٹتے ہیں' وہیں سے تم بھی پلٹو اور اللہ سے معافی چاہو' یقیناً وہ معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔ پھر جب اپنے رب کے احکام ادا کر چکو تو جس طرح پہلے اپنے آباؤ اجداد کا ذکر کرتے تھے' اس طرح اب اللہ کا ذکر کرو' بلکہ اس سے بھی بڑھ کر (مگر اللہ کو یاد کرنے والے لوگوں میں بھی بہت فرق ہے) ان میں سے کوئی تو ایسا ہے جو کہتا ہے کہ اے ہمارے رب' ہمیں دنیا ہی میں سب کچھ دے دے' ایسے شخص کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے۔ اور کوئی کہتا ہے' اے ہمارے رب' ہمیں دنیا میں بھی بھلائی دے اور آخرت میں بھی بھلائی۔ اور آگ کے عذاب سے ہمیں بچا۔ ایسے لوگ اپنی کمائی کے مطابق (دونوں جگہ) حصہ پائیں گے اور اللہ کو حساب چکاتے کچھ دیر نہیں لگتی۔ یہ گنتی کے چند روز ہیں جو تمہیں اللہ کی یاد میں بسر کرنے چاہئیں۔ پھر جو کوئی جلدی کر کے دو ہی دن میں واپس ہو گیا تو کوئی حرج نہیں اور جو کچھ دیر زیادہ ٹھہر کر پلٹا تو بھی کوئی حرج نہیں۔ بشرطیکہ یہ دن اس نے تقویٰ کے ساتھ بسر کئے ہوں۔ اللہ کی نافرمانی سے بچو اور خوب جان رکھو کہ ایک روز اس کے حضور میں تمہاری پیشی ہونے والی ہے۔

ہمارے پاس آیاتِ حج کی تاریخ نزول کا کوئی صحیح علم نہیں ہے۔ اس سلسلے میں ایک روایت ہے جس میں آیا ہے کہ آیت فَإِنْ أُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ "اور اگر کہیں گھر جاؤ تو جو قربانی میسر ہو" ۶ھ میں صلح حدیبیہ کے موقع پر نازل ہوئی' لہٰذا اسلام میں حج کب فرض ہوا؟ اس کی صحیح تاریخ بھی ہمیں معلوم نہیں' اس میں اختلاف رائے ہے کہ حج فرض کس آیت سے ہوا' اس آیت سے یعنی أَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلَّهِ اللہ کی خوشنودی کے لئے جب حج اور عمرہ کی نیت کرو تو اسے پورا کرو یا وَلِلَّهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا "جن لوگوں کے پاس زادِ راہ کی استطاعت ہو ان پر اللہ تعالیٰ کی جانب سے حج بیت اللہ فرض ہے۔" بہرحال ان دونوں آیات کے نزول کے بارے میں تاریخ کا تعین کرنے والی کوئی روایت منقول نہیں ہے۔

امام ابن قیم جوزی اپنی کتاب زاد المعاد میں لکھتے ہیں کہ حج ۹ھ یا ۱۰ھ میں فرض ہوا ہے۔ انہوں نے یہ سن اس قیاس میں متعین کیا ہے کہ حضور ﷺ نے دس ہجری کو حج فرمایا۔ ظاہر ہے کہ لازماً آپ ﷺ نے یہ فریضہ فرض ہونے کے بعد ادا کیا ہو گا جو ۹ھ یا ۱۰ھ میں ہو سکتا ہے' لیکن صرف یہ بات صحیح دلیل نہیں بن سکتی کیونکہ ہو سکتا ہے کہ حج پہلے سے فرض ہو۔ مگر بعض مجبوریوں اور رکاوٹوں کی وجہ سے حضور ﷺ نے اسے ۱۰ھ تک مؤخر فرما دیا ہو۔ جبکہ ۹ھ میں حضور ﷺ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو امیر حج مقرر فرما کر بھیجا۔ روایات میں یہ بات آ چکی کہ حضور ﷺ جب غزوۂ تبوک سے واپس ہوئے تو آپ نے حج کا ارادہ فرمایا تھا۔ اس کے بعد جب آپ ﷺ نے یہ خیال کیا کہ مشرکین حسبِ عادت حج کے موسم میں مکہ مکرمہ آتے ہیں اور ان میں سے بعض لوگ بالکل ننگے ہو کر طواف کرتے ہیں۔ آپ ﷺ نے ان لوگوں میں خلط ہونے کو پسند نہ فرمایا۔ اس کے بعد سورت برأت نازل ہوئی۔ حضور ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ارسال فرمایا تاکہ وہ سورت برأت

کا ابتدائی حصہ پڑھ کر لوگوں کو سنائیں' جن مشرکین کے ساتھ جو معاہدے تھے انہیں ختم کر دیں اور جب لوگ منیٰ میں قربانی کے وقت جمع ہوں تو اعلان کر دیں یاد رکھو! کوئی کافر جنت میں داخل نہ ہو گا' اس سال کے بعد کوئی مشرک طواف نہ کر سکے گا۔ کوئی ننگا شخص طواف نہ کر سکے گا۔ جن لوگوں نے حضور ﷺ کے ساتھ کوئی معاہدہ کر رکھا ہے' تو وہ اپنی میعاد تک ہی رہے گا۔ یہی وجہ تھی کہ خود حضور ﷺ نے حج نہ فرمایا اور انتظار کیا تاکہ بیت اللہ پاک ہو جائے۔ مشرکین اور برہنہ ہوکر طواف کرنے والوں سے۔

یہاں یہ بات دل کو لگتی ہے کہ اسلام نے فریضہ حج اور مناسک حج اکثر و بیشتر برقرار رکھے تھے۔ اور ان تاریخوں سے بہت پہلے ایسی روایات موجود ہیں کہ ہجرت سے پہلے ہی مکہ مکرمہ میں حج فرض ہو چکا تھا لیکن ان روایات کی سند قوی نہیں ہے۔ سورت حج' جو ارجح قول کے مطابق مکی سورت ہے۔ اس میں حج کے اکثر و بیشتر مناسک کا ذکر ہوا ہے۔ یوں کہ حضرت ابراہیم ؑ نے ان مناسک کا حکم دیا تھا۔ سورت حج کی یہ آیات ملاحظہ فرمائیں:

(یاد کرو وہ وقت جب کہ ہم نے ابراہیم ؑ کے لئے اس (خانہ کعبہ) کی جگہ تجویز کی تھی (اس ہدایت کے ساتھ) کہ میرے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کرو' اور میرے گھر کو طواف کرنے والوں قیام و رکوع و سجود کرنے والوں کے لئے پاک رکھو اور لوگوں کو حج کے لئے اذن عام دے دو کہ تمہارے پاس ہر دور دراز مقام سے پیدل اور اونٹوں پر سوار آئیں تاکہ وہ فائدے دیکھیں' جو یہاں ان کے لئے رکھے گئے ہیں۔ اور چند مقرر دنوں میں ان جانوروں پر اللہ کا نام لیں جو اس نے انہیں بخشے ہیں۔ خود بھی کھائیں اور تنگ دست اور محتاج کو بھی دیں۔ پھر اپنا میل کچیل دور کریں اور اپنی نذریں پوری کریں' اور اس قدیم گھر کا طواف۔ یہ ہے اصل معاملہ (اسے سمجھ لو) اور جو اللہ کے مقرر کردہ شعائر کا احترام کرے تو یہ دلوں کے تقویٰ سے ہے۔ تمہیں ایک وقت مقررہ تک ان (ہدی کے جانوروں) سے فائدہ اٹھانے کا حق ہے' پھر ان کے قربان کرنے کی جگہ اسی قدیم گھر کے پاس ہے۔

اور قربانی کے اونٹوں کو ہم نے تمہارے لئے شعائر اللہ میں شامل کیا ہے۔ تمہارے لئے ان میں بھلائی ہے' پس انہیں کھڑا کر کے ان پر اللہ کا نام لو اور جب (قربانی کے بعد) ان کی پیٹھیں زمین پر ٹک جائیں تو ان میں سے خود بھی کھاؤ اور ان کو بھی کھلاؤ جو قناعت کئے بیٹھے ہیں اور ان کو جو اپنی حاجت پیش کریں ان جانوروں کو ہم نے اس طرح تمہارے لئے مسخر کیا ہے تاکہ تم شکریہ ادا کرو۔ ان کے گوشت اللہ کو پہنچتے ہیں نہ خون' مگر اسے تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے۔ اس نے ان کو تمہارے لئے اس طرح مسخر کیا ہے تاکہ اس کی بخشی ہوئی ہدایت سے تم اس کی تکبیر کرو اور اے نبی بشارت دے نیکو کاروں کو۔"

ان آیات میں اکثر مناسک کا ذکر ہوا ہے یا اشارہ ملتا ہے' مثلاً ھدی' نحر' طواف' احلال' احرام اور تسمیہ' یہی حج کے اساسی شعائر ہیں۔ خطاب' حضرت ابراہیم ؑ کے تاریخی واقعہ کی شکل میں' مسلمانوں سے ہو رہا ہے۔ ان آیات میں واضح طور پر یہ اشارہ پایا جاتا ہے کہ حج کالی ابتدائی دور میں فرض ہو گیا تھا۔ کیونکہ حج حضرت ابراہیم ؑ کا شعار تھا' جن سے مسلمانوں کی نسبت تھی۔ چونکہ مشرکین مکہ خانہ کعبہ کے مجاور تھے' کلید بردار تھے' اور ایک عرصہ تک مسلمانوں اور مشرکین کے درمیان سخت کشمکش برپا تھی' ہو سکتا ہے کہ فریضہ حج کی ادائیگی کو مناسب وقت تک مؤخر کر دیا گیا ہو۔ لیکن یہ تاخیر تو الگ بات ہے۔ تو اس پارے کی ابتدائی آیات میں ہم اس رائے کو ترجیح دے چکے ہیں کہ بعض مسلمان' بہت پہلے سے فریضہ حج کو ادا کرتے تھے۔ یعنی دو ہجری میں تحویل قبلہ کے بعد۔

بہر حال حج کی تاریخ کے سلسلے میں یہی بحث کافی ہے' اب ہم تشریح آیات' شعائر حج کے بیان اور ان ہدایات کی تشریح کریں گے جو ان کے اثناء میں دی گئی ہیں۔

وَأَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلَّهِ فَإِنْ أُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ وَلَا تَحْلِقُوا رُءُوسَكُمْ حَتَّى يَبْلُغَ الْهَدْيُ

مَحِلَّهٗ ؕ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ بِهٖۤ اَذًى مِّنْ رَّاْسِهٖ فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ ۚ فَاِذَاۤ اَمِنْتُمْ ٙ فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ فِى الْحَجِّ وَسَبْعَةٍ اِذَا رَجَعْتُمْ ؕ تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ ؕ ذٰلِكَ لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ اَهْلُهٗ حَاضِرِى الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ

"اللہ کی خوشنودی کے لئے جب حج اور عمرے کی نیت کرو تو اسے پورا کرو' اور اگر کہیں گھر جاؤ تو جو قربانی میسر آئے' اللہ کی جناب میں پیش کرو اور اپنے سر نہ مونڈو جب تک کہ قربانی اپنی جگہ نہ پہنچ جائے۔ مگر جو شخص یا جس کے سر میں کوئی تکلیف ہو اور اس بنا پر اپنا سر منڈوا لے تو اسے چاہئے کہ فدیے کے طور پر روزے رکھے یا صدقہ دے یا قربانی کرے۔ پھر اگر تمہیں امن نصیب ہو جائے (اور تم حج سے پہلے مکہ پہنچ جاؤ) تو جو شخص تم میں سے حج کا زمانہ آنے تک عمرے کا فائدہ اٹھائے' وہ حسب مقدور قربانی دے اور اگر قربانی میسر نہ ہو تو تین روزے حج کے زمانے میں اور سات گھر پہنچ کر' اس طرح پورے دس روزے رکھ لے۔ یہ رعایت ان لوگوں کے لئے ہے جن کے گھر مسجد حرام کے قریب نہ ہوں۔ اللہ کے ان احکام کی خلاف ورزی سے بچو اور خوب جان لو کہ اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔"

ان آیات میں' سب سے پہلے وہ حسن الفاظ اور حسن تعبیر قابل دید ہے جسے اس قانون سازی کے لئے اختیار کیا گیا ہے' فقروں کی تقسیم' بامقصد اور بہترین طرز ادا' ہر فقرے میں الگ بیان اور الفاظ و فقرات مختصر' جن میں کوئی لفظ بھی زیادہ نہیں۔ ہر حکم کے ساتھ شرائط تحدید اور سب احکام کو خوف خدا اور تقویٰ کے ساتھ مربوط کرتے چلے جانا۔

پہلے فقرے میں کہا گیا کہ حج اور عمرے کو شروع کر چکنے کے بعد' مطلقاً تکمیل لازمی ہے۔ جب حاجی حج کا آغاز کر دے' عمرہ کرنے والا عمرے کا آغاز کر دے' نیت باندھ لے خواہ علیحدہ علیحدہ یا دونوں کی ایک ساتھ اور اس کی توجہ کا مرکز خالص اللہ کی رضاجوئی ہو' تو انہیں حکم ہے وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ "اللہ کی خوشنودی کے لئے جب حج اور عمرے کی نیت کرو' تو اسے پورا کرو۔"

بعض مفسرین کا خیال ہے کہ لفظ "پورا کرو" کے ذریعہ ہی سب سے پہلے حج فرض ہوا ہے۔ لیکن بعض نے اس سے یہ سمجھا ہے کہ مراد یہ ہے کہ جب تم شروع کرو تو پھر پورا کرو۔ مکمل کرو۔ یہ مفہوم زیادہ ظاہر ہے۔ اس لئے کہ یہاں یہ مطلب نہیں لیا جا سکتا کہ حج بھی فرض ہو گیا اور عمرہ بھی فرض ہو گیا۔ کیونکہ بعض علماء عمرے کو فرض نہیں سمجھتے' لہٰذا یہاں مقصد یہی ہو گا کہ حج و عمرہ شروع کرنے کے بعد واجب ہو جاتے ہیں۔ اتمام لازمی ہے ابتداً عمرہ واجب نہیں ہوتا لیکن جب اس کی نیت کر کے احرام باندھ لیا جائے تو پھر پورا کرو۔ اب اتمام واجب ہو گا اور عمرہ تمام مناسک میں حج ہی کی طرح ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ عمرے میں' میدان عرفات میں وقوف نہیں ہوتا۔ نیز عمرے کے لئے مقررہ اوقات بھی نہیں۔ پورے سال میں کسی بھی وقت ادا کیا جا سکتا ہے۔ حج کی طرح معلوم مہینوں کے اندر ہی اس کی ادائیگی لازمی نہیں ہے۔

اتمام حج و عمرہ کے اس عام حکم سے حالت احصار کو مستثنیٰ قرار دیا جاتا ہے۔ احصار کسی جانی دشمن کی وجہ سے ہو (اس پر سب مذاہب کا اتفاق ہے) یا بیماری یا بیماری کی طرح کوئی اور رکاوٹ ہو۔ جس کی وجہ سے حج اور عمرے کی تکمیل ممکن ہو' فقہاء کے درمیان اس بارے میں اختلاف ہے کہ بیماری کی وجہ سے احصار جائز ہے یا نہیں۔ راجح بات یہ ہے کہ بیماری کی وجہ سے احصار معتبر ہے۔ فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ "اور اگر کہیں گھر جاؤ' تو جو ھدی بھی میسر ہو' جناب باری میں پیش کرو۔" اس حالت میں حاجی یا عمرے کی نیت کرنے والا وسعت و سہولت کے مطابق جو قربانی کر سکے کرے اور احرام توڑ دے۔ وہیں جہاں حالت احصار پیش آئی۔ اگرچہ وہ مسجد حرام تک نہ پہنچ سکے۔ میقات سے احرام باندھنے کے سوا' مناسک حج ادا نہ کر سکے۔ مناسک عمرہ ادا نہ کر سکے (میقات وہ مقام ہے جہاں

سے حاجی اور عمرہ کرنے والا احرام باندھتا ہے 'پھر اس کے لئے سلے ہوئے کپڑے پہننا حرام ہو جاتا ہے 'بال چھوٹے کرنا' منڈوانا' ناخن چھوٹے کرنا منع ہو جاتا ہے۔نیز اس پر خشکی کا شکار کھیلنا اور اس کا کھانا منع ہو جاتا ہے۔

۶ھ ہجری میں یہی پیش آیا' جب حضور ﷺ اور آپ کے ساتھی حدیبیہ پہنچے تو مشرکین نے آپ کو مسجد حرام آنے سے روک دیا۔ اس پر مذاکرات ہوئے اور معاہدہ صلح حدیبیہ طے ہوا۔اس کے مطابق طے ہوا کہ حضور ﷺ اگلے سال عمرہ ادا کریں۔روایات میں آتا ہے کہ یہ آیت نازل ہوئی اور حضور ﷺ نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ وہ جہاں جہاں تک پہنچے ہیں وہیں رک جائیں' قربانی کریں اور عمرہ کی نیت ختم کر کے احرام سے باہر آجائیں۔ مسلمان تعمیل امر سے ہچکچانے لگے۔ان پر یہ بات گراں گزر رہی تھی کہ وہ کیونکر ہر ہدی کو اس کے مقام نحر سے پہلے ہی قربانی کر دیں' حالانکہ عادۃً وہ منیٰ میں ایسا کرتے ہیں۔ان کی ہچکچاہٹ کو دیکھ کر حضور ﷺ آگے بڑھے اور اپنی قربانی ذبح کر کے احرام سے باہر نکل آئے۔اس پر سب نے تعمیل کی۔

فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ سے مراد وہ ہے جو میسر آجائے۔ہدی جن مویشیوں سے ہوگی وہ یہ ہیں 'اونٹ 'گائے 'بھینس اور بھیڑ بکری۔ صرف اونٹ 'بھینس اور گائے میں سات افراد تک شریک ہو سکتے ہیں جیسا کہ صلح حدیبیہ کے موقع پر سات افراد ایک اونٹنی میں شریک ہوئے تھے۔یہ ہے تیسر۔ہاں بھیڑ بکری صرف ایک آدمی کے لئے ہدی ہوگی۔

حالت احصار' جیسا کہ حدیبیہ میں پیش آیا' یا بیماری کی وجہ سے گھر جانے کے حالات کو اصل حکم سے اس لئے مستثنیٰ کیا گیا کہ مسلمانوں پر تنگی نہ ہو' اس کی حکمت صرف مسلمانوں کے لئے سہولت کی گنجائش رکھنا ہے۔ مناسک حج کی غرض و غایت یہی ہے کہ انسان اللہ کے نزدیک ہو جائے اور اس کے دل میں خدا کا خوف پیدا ہو جائے۔اور اس طرح وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عائد کردہ فرائض سرانجام دینے کے لئے تیار ہو جائے۔جب اس نے نیت کرلی' احرام باندھ لیا اور دشمن اس کی راہ میں حائل ہو گیا یا بیماری اور یا اسی طرح کا کوئی اور عذر لاحق ہو گیا تو حاجی یا عمرہ کی نیت کرنے والا حج یا عمرے کے ثواب سے کیوں محروم ہو۔اس حالت کا حکم ایسا ہی ہو گا جیسے حج مکمل ہو گیا' عمرہ ادا ہو گیا' چنانچہ ایسا شخص وہیں قربانی کر کے احرام سے نکل آئے گا۔یہ سہولت ایسی ہے جو اسلام کی روح' اسلامی عبادات کے مقاصد اور شعائر حج و عمرہ کی اصل غرض و غایت کے عین مطابق ہے۔

پہلے عام حکم کی اس استثناء کے بعد' اب روئے سخن ایک دوسرے حکم' عام حکم' حج کے لئے بھی' عمرے کے لئے بھی اس کی طرف پھرتا ہے۔وَلَا تَحْلِقُوا رُءُوسَكُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهٗ 'اور اپنے سر نہ مونڈو' جب تک کہ قربانی اپنی جگہ نہ پہنچ جائے۔" یہ حکم اس حالت کے لئے ہے کہ جہاں حج و عمرہ مکمل ہو رہے ہوں اور احصار نہ ہو' حج' عمرے یا دونوں کی نیت کی صورت میں آدمی اس وقت تک حالت احرام میں رہتا ہے اور اسے سر مونڈانے کی اجازت نہیں ہوتی جب تک قربانی اپنی جگہ کو پہنچ کر ذبح نہ ہو جائے۔یعنی میدان عرفات میں وقوف کر کے' مزدلفہ آنے کے بعد' بمقام منیٰ' ذوالحجہ کی دسویں تاریخ کو۔اس قربانی کے بعد حاجی احرام سے نکلتا ہے۔اس سے پہلے اس کے لئے سر مونڈنا' بال چھوٹے کرنا یا دوسرے کام جو محرم کے لئے جائز نہیں ان کا ارتکاب کرنا منع ہے۔اب اس عام حکم میں بھی استثنا (Proviso) ہے۔فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ بِهٖٓ اَذًى مِّنْ رَّاْسِهٖ فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ مگر جو شخص مریض ہو یا جس کے سر میں کوئی تکلیف ہو اور اس بنا پر اپنا سر منڈوا لے تو اسے چاہئے کہ فدیے کے طور پر روزے رکھے یا صدقہ دے یا قربانی کرے!

ا۔ تفصیلات کے لئے دیکھئے سورۃ الفتح کی تفسیر ج ۲۶

اگر ایسی بیماری لاحق ہو جائے جس میں سرمنڈوانا ضروری ہو یا سر میں جوئیں وغیرہ پڑ جائیں' بال لمبے ہو جائیں اور دیر تک ان میں کنگھی نہ کی گئی اور جوئیں وغیرہ پڑگئیں تو اس وقت ہدی کے محل تک پہنچنے سے پہلے بھی سرمنڈوانا جائز ہے۔کیونکہ اسلام سہولت کا دین ہے' للذا تکمیل حج سے پہلے بھی سرمنڈوا سکتا ہے۔ البتہ اس صورت میں ایسے شخص کو فدیہ دینا پڑے گا یا تین دن کے روزے یا چھ مساکین کو کھانا یا ایک بکری ذبح کر کے صدقہ کرنا' فدیہ کی یہ تحدید حضور ﷺ کی احادیث میں کی گئی ہے۔ امام بخاری ؒ نے اپنی سند کے ساتھ کعب بن عجرہ سے روایت کی ہے' فرماتے ہیں: مجھے حضور ﷺ کے پاس لے جایا گیا' میری حالت یہ تھی کہ میرے بالوں سے میرے چہرے پر جوئیں گر رہی تھیں۔ آپ نے فرمایا میرا یہ خیال نہ تھا کہ تم اس قدر مصیبت میں پڑ گئے ہو۔ کیا تمہارے پاس بکری ہے؟ میں نے کہا نہیں۔ آپ نے فرمایا: تین روزے رکھو یا چھ مساکین کو کھانا کھلاؤ اور کھانے کی مقدار یہ ہو کہ مساکین کو نصف صاع غلہ ملے' اور اپنے سر کو منڈوا لو۔

اب حج کا ایک دوسرا' عام حکم سنیں فَإِذَآ أَمِنتُمْ فَمَن تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ إِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ "پھر اگر تمہیں امن نصیب ہو جائے تو جو شخص تم سے حج کا زمانہ آنے تک عمرے کا فائدہ اٹھائے۔ وہ حسب مقدور قربانی دے۔" مطلب یہ ہے کہ جب احصار کی صورت درپیش ہو اور تم فریضہ حج ادا کر رہے ہو' پس جو شخص ایام حج آنے سے پہلے عمرہ کرنا چاہتا ہو تو وہ حسب مقدور قربانی دے۔ اس حکم کی تفصیل یہ ہے کہ ایک شخص عمرہ کے لئے نکلے' میقات پر احرام باندھے' عمرہ ادا کر لے' یعنی طواف اور سعی بین صفا مروہ سے فارغ ہو جائے' پھر وہ حج کی نیت کر لے اور ایام حج کا انتظار کرے۔ یہ اس صورت میں ہے کہ ایک شخص یہ عمرہ حج کے مہینوں میں کر رہا ہو' حج کے مہینے شوال' ذوالقعدہ اور ذوالحجہ کے دس دن ہیں' حج سے عمرہ کرنے کی یہ ایک صورت ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ میقات سے حج اور عمرہ دونوں کا احرام باندھے اور عمرہ ادا کرنے کے بعد حج کے ایام کا انتظار کرے۔ یہ تمتع کی دوسری صورت ہے۔ ان دونوں صورتوں میں تمتع کرنے والے پر قربانی واجب ہے۔ یہ قربانی عمرہ کے بعد ہو گی تاکہ وہ احرام سے نکل آئے۔ یہ شخص ادائے عمرہ اور آغاز حج کے درمیانی عرصہ میں حلال رہے گا۔ حسب مقدور قربانی اونٹ' گائے' بھیڑ بکری کی ہو گی۔

اور اگر قربانی میسر نہ ہو تو فَمَن لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلَاثَةِ أَيَّامٍ فِي الْحَجِّ وَسَبْعَةٍ إِذَا رَجَعْتُمْ تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ "اور اگر قربانی میسر نہ ہو تو تین روزے حج کے زمانے میں اور سات گھر پہنچ کر اس طرح پورے دس روزے رکھ لے۔" اس سلسلے میں اولیٰ یہ ہے کہ حج کے تین روزے ذوالحجہ کو عرفات پر وقوف سے پہلے ہی رکھ لے اور باقی سات دن گھر لوٹ کر رکھ لے۔ اس طرح پورے دس روزے رکھ لے' مزید تاکید کے لئے کہا گیا ہے ہدی اور روزے کی حکمت صرف یہ ہے کہ حاجی کا تعلق اللہ کے ساتھ مسلسل قائم رہے' یعنی عمرہ اور حج کے درمیانی عرصے میں جب وہ احرام سے باہر آجائے تو اس کا یہ شعور ختم نہ ہو جائے کہ وہ ایام حج کی فضا میں ہے۔ اسے برائیوں سے خاص طور پر بچنا چاہئے اور یہ کہ اللہ مسلسل نظر رکھے ہوئے ہے۔ یہ شعور اور جذبہ بالعموم ایام حج میں زندہ ہوتا ہے۔

رہے وہ لوگ جو مسجد الحرام کے رہنے والے ہیں تو ان کے لئے ایام حج میں عمرہ جائز نہیں ہے۔ وہ صرف حج کریں گے۔ وہ عمرے اور حج کے درمیان قربانی کر کے احرام سے نہیں نکل سکتے۔ اس لئے ان پر فدیہ' قربانی یا روزہ لازم نہیں ہے۔ ذَٰلِكَ لِمَن لَّمْ يَكُنْ أَهْلُهُ حَاضِرِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ "یہ رعایت ان لوگوں کے لئے ہے' جن کے گھر مسجد حرام کے قریب نہ ہوں۔" جو احکام یہاں تک بیان ہو چکے ہیں ان کے آخر میں اب قرآن مجید ایک زوردار تعقیب اور نتیجہ پیش کرتا ہے اور حجاج کے دلوں کو اللہ تعالیٰ کی جانب موڑنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

وَ اتَّقُوا اللّٰهَ وَ اعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ "اللہ کے ان احکام کی خلاف ورزی سے بچو اور خوب جان لو کہ اللہ خوب سزا دینے والا ہے۔"تقویٰ ہی امتثال امر کی گارنٹی ہے۔ اللہ کا خوف اور اللہ کی سزا کا خوف ہی تعمیل احکام کا ضامن ہے۔ احرام میں تو ایک وقت کے لئے پابندی عائد ہو جاتی ہے۔ قانونی پابندی لیکن اگر احرام کی حالت ختم ہو جائے تو پھر تقویٰ اور خدا خوفی وہ واحد نگرانی ہے جو انسان پر اچھا اثر ڈال سکتی ہے اور ایک مومن کی نگہبان ہو سکتی ہے۔ اب حج کے خصوصی احکام بیان ہوتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ حج کے آداب کیا ہیں؟ اوقات کیا ہیں؟ سابق پیراگرافوں کی طرح اس مقطع کا اختتام بھی اسی تلقین خدا خوفی اور اتقاء پر ہوتا ہے۔ اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ ۚ فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ ۙ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ ۭ وَ مَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ ۭ وَ تَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى ۡ وَ اتَّقُوْنِ يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ "حج کے مہینے سب کو معلوم ہیں۔ جو شخص ان مقرر مہینوں میں حج کی نیت کرے' اسے خبردار رہنا چاہئے کہ حج کے دوران میں اس سے کوئی شہوانی فعل' کوئی بدعملی' کوئی لڑائی جھگڑے کی بات سرزد نہ ہو' اور جو نیک کام تم کرو گے' وہ اللہ کے علم میں ہو گا۔ سفر حج کے لئے زاد راہ ساتھ لے جاؤ اور سب سے بہتر زاد راہ پرہیزگاری ہے۔ پس اے ہوشمندو' میری نافرمانی سے پرہیز کرو۔"

اس آیت کی ظاہری عبارت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حج کے مہینے سب کو معلوم ہیں۔ اوقات معلوم ہیں۔ وہ شوال' ذوالقعدہ اور ذوالحجہ کے ابتدائی دس دن ہیں۔ لہٰذا صرف ان اوقات کے اندر ہی حج کی نیت درست ہو گی۔ اس سے پہلے اگر کوئی نیت کرے تو صحیح نہ ہو گی۔ اگرچہ بعض مذاہب نے سنت رسول ﷺ کی بنیاد پر اسے جائز قرار دیا ہے اور وہ اس آیت کا مفہوم بیان کرتے ہیں کہ حج کے جو معلوم اوقات ہیں وہ مناسک حج کی ادائیگی کے لئے ہیں۔ نیت پہلے بھی درست ہے۔ یہ رائے امام مالک ؒ' امام ابو حنیفہ ؒ' امام احمد بن حنبل ؒ نے اختیار کی ہے۔ ابراہیم نخعی ؒ' ثوری ؒ اور لیث بن سعد بھی اسی طرف گئے ہیں۔ جبکہ امام شافعی ؒ نے پہلی رائے اختیار کی ہے۔ حضرت ابن عباس ؓ' جابر ؓ' عطاء ؒ' طاؤس ؒ' مجاہد ؒ وغیرہ سے بھی یہی مروی ہے۔ چنانچہ یہی رائے زیادہ واضح معلوم ہوتی ہے۔

اب ان معلوم ایام میں اگر کوئی اپنے اوپر حج فرض کر لے یعنی وہ یہ پختہ ارادہ کر لے کہ وہ حج ادا کرے گا اور احرام باندھ لے تو اسے خبردار رہنا چاہئے کہ حج کے دوران میں کوئی رفث کوئی بدفعلی کوئی جھگڑے لڑائی کی بات سرزد نہ ہو۔ رفث سے مراد یہاں جماع اور دواعی جماع کا تذکرہ ہے۔ عورتوں کے سامنے یا عام محفلوں میں جدال سے مراد وہ لڑائی جھگڑا جس سے فریق دوم غصہ ہو جائے اور فسوق سے مراد تمام بدفعلیاں ہیں' چھوٹی ہوں یا بڑی۔ ان افعال کے ذکر سے مراد یہ ہے کہ ان تمام کاموں سے دوران حج میں بچنا چاہئے جو تحرج و احتیاط اور خدا کی جانب تنہائی اور یکسوئی کی فضا کے خلاف ہوں' کیونکہ حج کے دوران میں انسان تمام دنیاوی معاملات ترک کر دیتا ہے' اور اللہ سے لو لگا دیتا ہے اور یہ پورا عرصہ تعلق باللہ کے قیام کی روحانی مشقوں کا عرصہ ہوتا ہے۔ ایام حج وہ پیریڈ ہے جس میں انسان اپنے عادی لباس سے بھی علیحدہ ہو کر اللہ کے گھر میں چلا جاتا ہے۔ لہٰذا یہاں اسے چاہئے کہ اس گھر کے شایان شان احترام اور ادب کو ملحوظ رکھے۔

برے افعال سے روکنے کے بعد اب کہا جاتا ہے کہ تم اچھے کام کثرت سے کرو وَ مَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ "اور جو نیک کام تم کرو گے' وہ اللہ کے علم میں ہو گا۔" کیا مومن کے لئے یہی کافی نہیں ہے کہ اس کا آقا اس کے ہر اچھے کام کو ہر وقت دیکھتا رہتا ہے۔ اللہ دیکھ رہا ہے یہ احساس جگاؤ لو' تمہارا آقا دیکھتا ہے۔ بڑھتے چلے جاؤ' زیادہ سے زیادہ بھلائی جمع کر لو۔ یہ ہوتا ہے مومن کا احساس۔ یقیناً یہ اخروی جزاء سے پہلے ہی ایک عظیم انعام ہے۔

اس کے بعد یہ ترغیب دی جاتی ہے کہ سفر حج کے دوران میں اپنے لئے حسب مقدور زاد راہ کا انتظام کرو۔ ہر قسم کا زاد راہ۔ روح کے لئے بھی اور جسم کے لئے بھی۔ احادیث میں آتا ہے کہ یمنیوں میں سے کچھ لوگ حج کے لئے ایسے حال میں چل پڑے تھے کہ پاس کچھ بھی نہیں۔ وہ کہتے ہم تو اللہ کے گھر کی زیارت کو جائیں اور وہ ہمیں روٹی بھی نہ دے۔ اسلام کا مزاج یہ ہے کہ انسان جو کام بھی کرے وہ مکمل تیاری سے کرے۔ پوری تیاری کے ساتھ دل کو اللہ کی طرف متوجہ کرے اور پھر اعتماد اور بھروسہ مکمل اسی پر ہو۔ ان لوگوں کی یہ بات نہ صرف اسلام کے مزاج کے خلاف تھی بلکہ اس سے اللہ تعالیٰ کے ساتھ بات چیت میں ایک قسم کی بے باکی کا اظہار بھی ہوتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ حج کرنے کو ذات باری پر ایک قسم کا احسان سمجھتے تھے۔ چونکہ وہ اللہ تعالیٰ کا حج کرتے ہیں للٰہذا وہ زاد راہ کا ذمہ دار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زاد راہ کی دونوں اقسام 'جسمانی زاد راہ اور خدا خوفی اور تقویٰ کا زاد راہ کا انتظام کرنے کا حکم دیا۔ اور کہا کہ اللہ کے جناب میں بے باکی اختیار نہ کرو۔ تعبیر ایسی ہے کہ ہروقت' ہر لحہ تقویٰ ہی تمہارا زاد راہ ہو' زاد حیات ہو وَ تَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى وَ اتَّقُوْنِ يٰۤاُولِي الْاَلْبَابِ "سفر حج کے دوران زاد راہ ساتھ لے جاؤ۔ بہترین زاد راہ پرہیزگاری اور خدا خوفی ہے۔"

تقویٰ روح اور قلب کی خوراک ہے۔ اس سے روح کو قوت حاصل ہوتی ہے۔ تقویٰ اور خدا خوفی سے روح طاقتور ہوتی ہے۔ پھر پھڑاتی لہلاتی ہے۔ روح اس سے جلا پاتی ہے اور روشن ہو جاتی ہے۔ تقویٰ ہی مدار نجات ہے۔ وہی لوگ ہو[illegible] جو تقویٰ اور خدا خوفی کی راہ لیں اور ہر کام میں اسے کام میں لاکر خیر و برکت حاصل کریں۔

مزید احکام حج بیان ہوتے ہیں 'کیا تجارت جائز ہے۔ کیا دوران حج میں حاجی مزدوری کر سکتا ہے؟ وقوف کہاں ہو اور کہاں سے واپسی جائز ہے؟ ذکر و استغفار کا کیا طریقہ ہے' یہ مسائل سنئے!

لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاِذَاۤ اَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفٰتٍ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ وَاذْكُرُوْهُ كَمَا هَدٰىكُمْ ۚ وَاِنْ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الضَّآلِّيْنَ ۞ ثُمَّ اَفِيْضُوْا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ النَّاسُ وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ ۗ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ "اگر حج کے ساتھ ساتھ تم اپنے رب کا فضل بھی تلاش کرتے جاؤ' تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ پھر جب عرفات سے چلو' تو مشعر حرام (مزدلفہ) کے پاس ٹھہر کر اللہ کو یاد کرو اور اس طرح یاد کرو جس کی ہدایت اس نے تمہیں کی ہے' ورنہ اس سے پہلے تو تم لوگ بھٹکے ہوئے تھے۔ پھر جہاں سے اور سب لوگ پلٹتے ہیں وہیں سے تم بھی پلٹو' اور اللہ سے معافی چاہو' یقیناً وہ معاف کرنے والا' رحم فرمانے والا ہے۔

امام بخاری ؒ نے اپنی سند کے ساتھ حضرت ابن عباس ؓ سے روایت کی ہے' فرماتے ہیں عکاظ مجنہ اور ذوالمجاز دور جاہلیت کے مشہور تجارتی میلے ہوا کرتے تھے۔ مسلمانوں نے خیال کیا شاید دور اسلام میں ان میلوں میں تجارت کرنا اب جائز نہیں ہے۔ اس پر حکم آیا کہ موسم حج میں "اگر حج کے ساتھ ساتھ تم اپنے رب کا فضل بھی تلاش کرتے جاؤ' تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔"

ابوداؤد نے' اپنی سند کے ساتھ' ایک دوسرے واسطہ سے حضرت ابن عباس ؓ سے یہ روایت نقل کی ہے۔ فرماتے ہیں: مسلمان ایام حج اور اس کے بعد تجارتی موسم میں خرید و فروخت سے پرہیز کرتے تھے۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ یہ تو اللہ کو یاد کرنے کے دن ہیں۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ حکم نازل فرمایا' اگر حج کے ساتھ ساتھ تم اپنے رب کا فضل تلاش کرتے جاؤ تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔

ابوامامہ تیمی کی ایک روایت میں ہے' کہتے ہیں میں نے حضرت ابن عمر سے پوچھا ہم باربرداری کا کام کرتے ہیں۔ کیا ہمارا بھی حج ہوگا؟ انہوں نے فرمایا کیا تم طواف نہیں کرتے' نیکی کے کام نہیں کرتے' جمرے نہیں مارتے' پھر سر نہیں منڈواتے؟ کہتے ہیں ہم نے جواب

دیا ہاں' ابن عمر نے فرمایا ایک صاحب رسول خدا ﷺ کے پاس آئے اس نے آپ ﷺ سے یہی سوال دریافت کیا جو آپ لوگ مجھ سے پوچھ رہے ہیں۔ آپ نے اس وقت تک کوئی جواب نہ دیا جب تک حضرت جبریل یہ آیت لے کر آنہیں پہنچے۔ اگر حج کے ساتھ ساتھ تم اپنے رب کا فضل بھی تلاش کرتے جاؤ' تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔

ابن جریر ﷺ نے ابو صالح' حضرت عمر ﷺ کے آزاد کردہ غلام' سے روایت کی ہے۔ اس نے کہا اس نے سوال کیا امیر المومنین کیا تم حج میں تجارت کیا کرتے تھے؟ انہوں نے فرمایا بھائی ہمارے لوگوں کی معیشت کا تو دار و مدار ہی حج پر تھا۔

تجارت کے بارے میں اوپر کی پہلی دو روایات سے اہل اسلام کی جس احتیاط کا اظہار ہوتا ہے پھر دوسری روایت میں بار برداری اور مزدوری کے بارے میں جس احتیاط اور پرہیز کا ذکر ہے' یہ اسی احتیاط اور پرہیز ہی کا ایک حصہ ہے جو اسلام نے مسلمانوں کے اندر دور جاہلیت کے ہر فعل و ہر رسم کے خلاف پیدا کر دی تھی۔ مسلمانوں کا حال یہ تھا کہ وہ دور جاہلیت کے کسی فعل یا کسی رسم کا ارتکاب اس وقت تک نہ کرتے تھے جب تک اس کے بارے میں اسلام کوئی فیصلہ نہ سنا دیتا۔ اس پارے کی ابتداء میں ہم اس پر بحث کر چکے ہیں' یعنی صفاد مروہ کے درمیان سعی کے بیان کے ضمن میں۔ ایام حج کے دوران میں بیع و شراء بار برداری و مزدوری کی اجازت قرآن نے دے دی مگر اس کی تعبیر یوں ہے کہ یہ اللہ کا فضل ہے۔

لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَبْتَغُوا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ "تم اگر اپنے رب کا فضل تلاش کرو تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔"

حلال کمائی کی تعبیر فضل خداوندی سے کی گئی ہے۔ تاکہ تجارت کرنے والے' مزدوری کرنے والے یا دوسرا کوئی نفع آور کام کرنے والے' یہ سمجھیں کہ وہ محض دولت نہیں کماتے بلکہ یہ اللہ کا فضل بھی ہے۔ یہ کام صرف مادی جسم کا سروساماں ہی نہیں ہے بلکہ اسے تقدس حاصل ہے اور فضل خدا ہے۔ اور اللہ اسے اپنے فضل سے نوازتا ہے۔ اس لئے اس تجارت کی اس نوعیت یعنی فضل خداوندی کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہئے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ فضل خداوندی اسے تب ہی مل سکتا ہے جب وہ لین دین کرے اور ان اسباب کے ذریعے ہی اسے تلاش کرے جو اللہ تعالیٰ نے نظام رزق کے لئے مقرر کئے ہوئے ہیں۔ جب قلب مومن میں یہ احساس جاگزیں ہو جاتا ہے اور پھر وہ طلب رزق میں نکلتا ہے' تو وہ اس سعی میں بھی دراصل حالت عبادت میں ہوتا ہے اور اس لئے یہ سرگرمی حالت حج کے خلاف نہیں ہے۔ کیونکہ حج بھی اللہ کے لئے ہے اور یہ تجارت بھی فضل الٰہی ہے۔ اسلام سب سے پہلے قلب مومن میں ایسے جذبات اور ایسے تصورات بٹھا دیتا ہے اور پھر اسے میدان عمل میں اتار دیتا ہے اور کھلا چھوڑ دیتا ہے کہ وہ جس طرح چاہے کام کرے۔ اس نقطہ نظر سے اس کا ہر فعل' اس کی ہر حرکت اللہ کی عبادت ہوتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ طلب رزق' تجارت کے حکم کو بھی احکام حج کے عین وسط میں بیان کر دیا اور تلاش فضل کے ساتھ ہی شعر حرام کے پاس ذکر اور عرفات سے واپسی کے مسائل بیان ہوئے فَإِذَا أَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفَاتٍ فَاذْكُرُوا اللَّهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ وَاذْكُرُوهُ كَمَا هَدَاكُمْ وَإِنْ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِهِ لَمِنَ الضَّالِّينَ "پھر جب عرفات سے چلو' تو مشعر الحرام کے پاس ٹھہر کر اللہ کو یاد کرو اور اس طرح یاد کرو جس کی ہدایت اس نے تمہیں کی ورنہ اس سے پہلے تو تم لوگ بھٹکے ہوئے تھے۔"

عرفات پر وقوف (کھڑا ہونا) افعال حج کا مرکزی ستون ہے۔ اصحاب سنن نے دیلمی کی روایت نقل کی ہے۔ وہ کہتے ہیں :میں نے رسول خدا ﷺ کو یہ کہتے سنا : حج عرفات ہے (تین مرتبہ فرمایا) اگر کوئی شخص طلوع فجر سے پہلے پہلے عرفات تک جا پہنچے تو گویا اس نے حج پا لیا۔ منیٰ میں قیام کے دن تین ہیں۔ لیکن اگر کوئی دو دن گزار کر چلا آئے تو بھی کوئی حرج نہیں ہے۔ اور کوئی تاخیر کرے تو بھی گناہ گار نہیں ہے۔

عرفات کے میدان میں کھڑے ہونے کا وقت یوم عرفہ کے زوال کے بعد دوپہر سے شروع ہوتا ہے یعنی ۸ ذوالحجہ کے دن ظہر سے۔ اور یہ وقت دوسرے دن یعنی یوم النحر قربانی کے دن کے طلوع فجر تک ہے۔ امام احمد کا قول یہ ہے کہ وقوف عرفہ کا وقت دن کے شروع ہی سے شروع ہو جاتا ہے۔ وہ ایک حدیث سے استدلال کرتے ہیں جو انہوں نے روایت کی ہے۔ دوسرے اصحاب سنن کے علاوہ امام ترمذی نے روایت کر کے اسے صحیح قرار دیا ہے۔ شعبی عروہ بن مضرس ابن حارثہ ابن لام الطائی سے روایت کرتے ہیں۔ میں حضور ﷺ کے پاس مقام مزدلفہ میں آیا جب آپ نماز کے لئے کھڑے ہوئے میں نے کہا حضور ﷺ میں طے پہاڑ سے آیا ہوں۔ میری سواری بھی تھک گئی اور میں بھی چور چور ہو گیا۔ خدا کی قسم میں ہر پہاڑ پر کھڑا ہوا ہوں۔ کیا میرا حج مکمل ہو گیا؟ اس پر حضور ﷺ نے فرمایا جو شخص ہماری اس نماز میں پہنچ جائے اور ہمارے ساتھ یہاں توقف کرے یہاں تک کہ ہم یہاں سے چل پڑیں۔ بشرطیکہ وہ اس سے پہلے دن کے وقت یا رات کے وقت میدان عرفات میں کھڑا ہو چکا ہو۔ تو اس کا حج پورا ہو گیا اور اس کی تکلیف دور ہو گئی۔

درج بالا دو اقوال کے مطابق حضور ﷺ نے عرفات پر وقوف کے وقت کو قدرے بڑھایا یا اسے یوم النحر کی صبح تک بڑھا دیا یعنی ذوالحجہ کی دسویں تک یہ کیوں؟ اس لئے کہ مسلمانوں کا طرز عمل مشرکین کے طرز عمل سے قدرے مختلف ہو جائے۔ ابن مردویہ اور حاکم نے مستدرک میں روایت کی ہے۔ دونوں نے عبدالرحمٰن بن مبارک سے حضرت مسور ابن مخرمہ سے وہ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ نے ہمیں عرفات میں خطبہ دیا۔ حمد و ثنا کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا (امابعد) آج کا دن حج اکبر کا دن ہے۔ مشرکین اور بت پرست غروب شمس سے پہلے ہی چلنا شروع کر دیتے تھے۔ جب سورج ابھی پہاڑیوں کے سروں پر ہوتا اور سورج کے سامنے پہاڑیاں یوں نظر آئیں گویا کہ آدمیوں کے عمامے ہیں اور ہم ان کے طرز عمل کے خلاف دوسرے دن طلوع الشمس سے پہلے پہلے یہاں سے چلیں گے۔

حضور ﷺ کی یہ روایت کہ آپ یوم عرفہ کے دن غروب آفتاب کے بعد عرفات سے روانہ ہوئے۔ صحیح مسلم میں جابر ﷺ بن عبداللہ کی روایت میں ہے۔ آپ یوں عرفات پر کھڑے رہے سورج غروب ہو گیا زردی تھوڑی تھوڑی واضح ہو گئی۔ اور سورج کی ٹکیہ صاف غائب ہو گئی۔ اسامہ آپ کے پیچھے آپ کی سواری پر بیٹھ گئے۔ حضور ﷺ اب آگے بڑے۔ اونٹنی کی لگام خوب کھینچ لی۔ یہاں تک کہ اس کا سر ہودج کے اگلے حصے سے لگنے لگا۔ آپ ﷺ اپنے دائیں ہاتھ سے اشارہ فرماتے رہے: لوگو! آرام سے رک رک کر چلو۔ جب راستے میں پہاڑی آجاتی اور سواری کو اوپر چڑھنا ہوتا تو آپ مہار ڈھیلی چھوڑ دیتے تاکہ وہ سہولت سے چڑھ جائے۔ جب آپ ﷺ مزدلفہ پہنچے تو آپ ﷺ نے مغرب و عشاء کی دونوں نمازیں ایک اذان اور دو اقامتوں کے ساتھ پڑھائیں۔ دونوں نمازوں کے درمیان تسبیح کچھ نہ تھی۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے آرام فرمایا۔ صبح طلوع ہونے کے بعد جب روشنی خوب پھیل گئی تو آپ ﷺ نے صبح کی نماز ایک اذان اور ایک اقامت کے ساتھ پڑھائی۔ آپ ﷺ پھر اونٹنی پر سوار ہو گئے اور مشعر الحرام تک آئے اور رو بقبلہ ہو کر وہاں دعا فرمائی۔ تکبیر و تہلیل فرمائی۔ یہاں آپ ﷺ کھڑے ہی رہے یہاں تک زردی پھیل گئی۔ اور طلوع آفتاب سے پہلے ہی آپ وہاں سے روانہ ہو گئے۔ یہ ہے وہ فریضہ جو ادا کیا اور حضور ﷺ نے جس کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے فَإِذَآ أَفَضۡتُم مِّنۡ عَرَفَٰتٍ فَٱذۡكُرُواْ ٱللَّهَ عِندَ ٱلۡمَشۡعَرِ ٱلۡحَرَامِۖ وَٱذۡكُرُوهُ كَمَا هَدَىٰكُمۡ وَإِن كُنتُم مِّن قَبۡلِهِۦ لَمِنَ ٱلضَّآلِّينَ "پھر جب تم عرفات سے چلو تو مشعر حرام کے پاس ٹھہر کر اللہ کو یاد کرو۔ اور اس طرح یاد کرو جس کی ہدایت اس نے تمہیں کی ہے۔ ورنہ اس سے پہلے تو تم بھٹکے ہوئے تھے۔"

مشعر حرام سے مراد مزدلفہ ہے۔ قرآن مجید کا حکم یہ ہے کہ عرفات سے واپسی پر یہاں آکر اللہ کو یاد کرو یاد دلایا جاتا ہے کہ اس ذکر کی بھی اس نے انہیں ہدایت کی ہے۔ اس کی ہدایات میں سے یہ ہدایت ہے اور یہ ذکر گویا ان کی جانب سے ایک شکریہ ہے جو وہ اللہ تعالیٰ کا ادا کرتے ہیں کیوں کہ یہ وہی ہے جس نے انہیں ہدایت دی ورنہ اس ہدایت سے پہلے تو ان کی حالت یہ تھی وَإِن كُنتُم مِّن قَبۡلِهِۦ

لَمِنَ الضَّآلِّيْنَ ورنہ اس سے پہلے تو تم بھٹکے ہوئے تھے۔"

پہلی جماعت مسلمہ' صحابہ کرام اس حقیقت کو خوب اچھی طرح سمجھتے تھے اور اس کا گہرا احساس اپنے اندر پاتے تھے۔ عرب گمراہی میں ڈوبے ہوئے تھے' انہوں نے اسے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ عقائد خراب' بتوں' جنوں اور ملائکہ کے پجاری' فرشتوں کو اللہ کی اولاد سمجھنے والے' جنوں کو اللہ تعالیٰ کا رشتہ دار سمجھنے والے' غرض یہ اور اس قسم کے بے شمار نظریاتی اور عملی گمراہیوں میں یہ لوگ ڈوبے ہوئے تھے۔ ان غلط تصورات اور باطل عقائد کی اساس پر ان لوگوں نے اپنے لئے ایک نظام عبادت اور نظام زندگی وضع کر لیا تھا۔ بعض جانوروں کی پشت کا گوشت اور یا پورا گوشت بغیر کسی معقول جواز کے انہوں نے حرام قرار دے دیا تھا' جواز یہ پیش کرتے کہ ان جانوروں کا خدا تعالیٰ سے خاص تعلق ہے۔ وہ اپنی اولاد کو اللہ کے لئے نذر کرتے اور جنات کو اس میں شریک کرتے۔ اور اس کے علاوہ بے شمار جاہلی عبادات و رسومات تھے جن کا کوئی جواز نہ تھا' صرف ان بے بنیاد اور غلط عقائد کا نتیجہ تھے۔ نیز ان عقائد کی وجہ سے ان کا اجتماعی نظام فاسد ہو چکا تھا اور وہ بحیثیت قوم اخلاق باختہ تھے۔ ان کے اندر طبقاتی امتیازات گھر کر چکے تھے مثلاً ایک یہ کہ وہ عرفات تک نہ جاتے اور جس کی اصلاح اس آیت سے کی گئی کہ ثُمَّ اَفِيْضُوْا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ النَّاسُ "پھر جہاں سے اور لوگ پلٹتے ہیں وہیں سے تم بھی پلٹو" اور قرآن مجید نے ان تمام فسادات اور رسومات کو ختم کر کے رکھ دیا۔ اس کے علاوہ ان کے درمیان مسلسل خاندانی رقابتیں اور قبائلی جنگیں جاری رہتی تھیں اور وہ اجتماعی طور پر کسی وقت بھی ایک قوم نہ بن سکے تھے' تاکہ اقوام کی برادری میں ان کی کچھ وقعت ہوتی۔ ان کا خاندانی نظام تباہ و برباد ہو چکا تھا اور جنسی تعلقات میں سخت بے راہ روی پائی جاتی تھی اور وہ اس جنسی بے راہ روی پر فخر کرتے تھے۔ ان کے زبردست لوگ ضعفاء کے ساتھ وحشیانہ سلوک کرتے تھے اور اس سلسلے میں جس کی لاٹھی اس کی بھینس کے سوا ان کے معاشرے میں کوئی میزان عدالت نہ تھی۔ غرض اس وقت کے عرب معاشرے کا اگر سرسری جائزہ لیا جائے تو وہ انسان کی فکری اور عملی گمراہی اور فساد کا ایک اعلیٰ نمونہ تھا۔

اور یہ صرف اسلام تھا' جس نے اس معاشرے کو بلند کیا اور اسے فکری اور عملی ضلالت سے نجات دی۔ اور جب وہ قرآن مجید کی یہ آواز سنتے وَاذْكُرُوْهُ كَمَا هَدٰىكُمْ وَاِنْ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الضَّآلِّيْنَ اللہ کو اس طرح یاد کرو جس کی ہدایت اس نے تمہیں کی' ورنہ اس سے پہلے تو تم لوگ بھٹکے ہوئے تھے۔" تو ان کے حافظہ کی سکرین پر ان کے تخیلات کے نگار خانہ میں' ان کے شعور کے نہاں خانہ سے یکلخت وہ تصاویر۔ ان کی زندگی کی بھدی تصاویر' ان کی زندگی کے گرے ہوئے بدنما نقشے سامنے آ جاتے ہوں گے۔ ان کی تاریخ تو ان بدنما مناظر سے بھری پڑی تھی۔ خیال و شعور کی اسکرین پر اپنی یہ تصاویر دیکھ کر جب وہ پھر اپنی موجودہ پاکیزہ زندگی اور اپنے اس بلند مقام پر نگاہ ڈالتے ہوں گے جو اسلام نے انہیں عطا کیا' جہاں تک اسلام نے انہیں بلند کیا۔ تو وہ اس سچائی کی گہرائیوں تک جا پہنچتے ہوں گے۔ وہ بغیر کسی بحث کے یہ سمجھ جاتے ہوں گے کہ ان کی زندگی میں اسلام کا اساسی رول کیا ہے؟

عربوں کے علاوہ بھی ہر قوم' ہر نسل کے مسلمانوں کے سلسلے میں یہ بات اب بھی ایک زندہ حقیقت ہے۔ اسلام کے بغیر ان کی حیثیت [illegible] ہے؟ اس نظریۂ حیات کو اگر نظر انداز کر دیا جائے تو ان کا وزن کیا رہ جاتا ہے؟ جب یہ لوگ اسلام کی روشنی پا لیتے ہیں' اور جب ان کی پوری زندگی میں اسلامی نظام حیات نافذ ہو جاتا ہے اور ایک حقیقت بن جاتا ہے۔ تو وہ گراوٹ سے رفعت' چھٹ پنے کے مقابلے میں عظمت' گمراہی کے بدلے ہدایت اور پریشان خیالی کے مقابلے میں فکر مستقیم پا جاتے ہیں۔ ان کی زندگی میں یہ تبدیلی اس وقت تک رونما نہیں ہوتی جب تک وہ صحیح معنوں میں مسلمان نہیں بن جاتے۔ اور جب تک وہ اپنی پوری زندگی کو اسلامی نظام حیات کے مطابق استوار نہیں کر لیتے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت پوری انسانیت ایک اندھی جاہلیت میں سرگرداں ہے۔ اور اس وقت تک یوں ہی رہے گی

جب تک وہ اسلام کے حظیرہ ہدایت میں داخل نہیں ہو جاتی۔ اس راز کو تو صرف وہی شخص کماحقہ پا سکتا ہے' جس نے جاہلیت میں کچھ دن گزارے ہوں' جس میں آج کل پوری انسانیت مبتلا ہے اور جس نے پوری دنیا کو بدی سے مالا مال کر دیا ہے' جس کا ہر جگہ دور دورہ ہے' پھر ایسا شخص اسلامی تصور حیات کو پالے اور پھر اس کے مطابق زندگی بسر کر کے دیکھ لے اور تجربہ کر کے معلوم کرے کہ اسلامی نظام زندگی کس قدر اعلیٰ و ارفع نظام ہے اور اس کے علاوہ اس کے ماحول میں جو نظام ہیں وہ ناپاکی' غلاظت اور گندگی کے ڈھیر ہی ڈھیر ہیں۔

جب انسان اسلامی تصور حیات اور اسلامی نظام زندگی کی بلند ترین چوٹی پر چڑھ جاتا ہے وہاں سے پوری انسانیت کے تمام تصورات زندگی' تمام مروجہ اجتماعی نظام اور زندگی کے تمام طور طریقوں پر نظر ڈالتا ہے' ان تمام بڑے بڑے فلسفیوں کے تصورات پر' تمام جدید و قدیم مفکرین کے افکار پر' تمام جدید و قدیم نظام ہائے زندگی پر انسان اس بلندی اور اسلامی نظام حیات کی بلند چوٹی سے جب نظر ڈالتا ہے تو وہ حیران رہ جاتا ہے کہ پوری انسانیت کس مصیبت' کس بدبختی میں مبتلا ہے۔ ان فضولیات اور ان بدبختوں نے اسے کس قدر ذلیل و لاغر کر دیا ہے۔ وہ ایسی ژولیدہ فکری اور علمی افراتفری میں مبتلا ہے کہ کوئی عقلمند آدمی اس میں مبتلا نہیں ہو سکتا۔ اور پھر وہ بزعم خود ایک عظیم عقلمند ہے' جسے زندگی کی گاڑی کے چلانے والے کسی خدا کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ یا اگر خدا ہے تو اس بر خود غلط انسان کا دعویٰ یہ ہے کہ اسے خدا کے بھیجے ہوئے نظام زندگی کی بھی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

یہ ہے وہ حقیقت جس کی یاد دہانی اللہ میاں یہاں کرا رہے ہیں اور جس کا احسان مومنین کو یاد دلایا جا رہا ہے کہ اللہ میاں کا یہ عظیم کرم ہے کہ اس نے تمہیں اس نعمت کبریٰ سے سرفراز کیا وَاذْكُرُوهُ كَمَا هَدَاكُمْ وَإِنْ كُنْتُمْ مِنْ قَبْلِهِ لَمِنَ الضَّالِّينَ "اور اسے اس طرح یاد کرو جس کی ہدایت اس نے تمہیں کی ہے۔ اگرچہ اس سے قبل تم گم کردہ راہ تھے۔"

حج مسلمانوں کا ایک عظیم سالانہ اجتماع ہے۔ اس میں وہ باہم ملتے ہیں' اسلام کے آسرے کے سوا کوئی آسرا نہیں ہوتا' اسلامی نشانات کے سوا سب نشانات مٹ جاتے ہیں۔ بدن پر غیر سلے دو کپڑے' باقی ہر چیز سے عاری۔ ضروری ستر کے علاوہ سر پاؤں ننگے' فرد اور فرد کے درمیان کوئی جدائی نہیں' قبیلے اور قبیلے کے درمیان کوئی اختیار نہیں' قوم اور قوم کے درمیان کوئی جدائی نہیں' اسلامی نظریۂ حیات ہی سب کا عقیدہ ہے' اسلامی نسبت میں سب کا نسب ہے۔ اسلامی رنگ ہی سب کا رنگ ہے۔ قریش دور جاہلیت میں اپنے آپ کو "حمس" بہادر و غیور کہتے تھے۔ انہوں نے اپنے لئے ایسے امتیازات اختیار کئے ہوئے تھے جو انہیں تمام عربوں سے الگ کر دیتے تھے' ان امتیازات میں سے ایک یہ تھا کہ وہ عام عربوں کی طرح عرفات پر "وقوف" نہ کیا کرتے تھے۔ نہ وہ قیام (عرفات) سے لوٹتے تھے جہاں سے تمام لوگ واپس ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ احکام حج میں خصوصی طور پر ان کے لئے یہ حکم نازل ہوا' اور امتیاز ختم کر کے انہیں اس مساوات کے دائرے کے اندر لے آیا گیا' جو اسلام پیدا کرنا چاہتا تھا' چنانچہ تمام مصنوعی امتیازات کو ختم کر کے ذی امتیاز قبیلہ قریش کو امت مسلمہ کے اندر ضم کر دیا گیا۔ حکم دیا گیا ثُمَّ أَفِيضُوا مِنْ حَيْثُ أَفَاضَ النَّاسُ وَاسْتَغْفِرُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ "اور پھر جہاں سے سب لوگ پلٹتے ہیں وہیں سے پلٹو' اور اللہ سے معافی چاہو' یقیناً وہ معاف کرنے والا ہے۔"

امام بخاری نے ہشام' اس کے باپ کے واسطہ سے حضرت عائشہ کی یہ حدیث روایت کی ہے۔ فرماتی ہیں: "قریش اور ان کے دین کے پیرو کار نہ صرف وہاں رک جاتے تھے۔ وہ اپنے آپ کو "حمس" کہتے تھے جبکہ تمام عرب اقوام عرفات میں "وقوف" کرتیں۔ جب اسلام ظہور پذیر ہوا تو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو حکم دیا کہ آپ عرفات پر جائیں اور وہاں وقوف فرمائیں اور پھر وہاں سے پلٹیں۔ یہ ہے مراد اس آیت سے حَيْثُ أَفَاضَ النَّاسُ "جہاں سے لوگ پلٹیں۔"

جہاں اور لوگ ٹھہریں وہاں تم بھی ٹھہرو' جہاں سے اور لوگ پلٹیں وہیں سے تم بھی پلٹو' اسلام کی نظر میں انساب اور طبقات کی کوئی

حیثیت نہیں ہے۔ تمام لوگ ایک ہی امت کے فرد ہیں۔ بالکل برابر' یوں جس طرح کنگھی کے دندانے 'کسی کو کسی پر برتری نہیں۔ سوائے تقویٰ اور خدا خوفی کے۔ اسلام نے تو حکم دیا ہے کہ وہ عام طور پر رنگا رنگ لباس پہنتے ہیں اسے اتار پھینکیں۔ اللہ کے گھر میں بھائیوں کی طرح سادہ شکل اور عام حیثیت میں آئیں۔ بھائی بھائی سے برابری کے ساتھ ملے۔ جب رنگا رنگ کپڑے تک اتروا لئے گئے تو قوم و نسب پر فخر کے کیا معنی؟ چھوڑ دو' چھوڑ دو جاہلیت کے تمام تعصبات کو۔ یہ تو ناپاک ہیں۔ اسلامی رنگ میں رنگ جاؤ۔ اللہ سے مغفرت کے طلب گار بنو۔ ایک مدت اس عظیم جاہلیت میں پھنسے رہے۔ اس کوتاہی کی معافی مانگیں۔ ان تمام وسوسوں' ان تمام غلطیوں' ان تمام بدکلامیوں پر معافی مانگیں جو دوران حج میں تمہارے دلوں میں کھٹکے' جن کا تم سے ارتکاب ہو گیا۔ جو غصے میں تمہاری زبان پر آگئیں۔ اگرچہ معمولی ہوں کیونکہ ان سے تمہیں روکا گیا تھا' حکم تھا کسی شہوانی فعل کو سوچو بھی مت۔ کسی بدفعلی کا ارتکاب نہ ہو اور کسی سے غصے کی بات نہ کرو۔

یوں اسلام' دوران حج مسلمانوں کے سلوک اور طرز عمل کو درست کر دیتا ہے۔ ایک امت اور ایک ملت کے تصور پر' جس میں کوئی طبقاتی امتیاز نہ ہو۔ جس میں کسی قوم اور قوم کے درمیان کوئی فرق نہ ہو' جس میں لسانی بنیادوں پر لوگوں کے درمیان امتیازات نہ ہوں۔ جس میں وطن کی بنیاد پر قوم' قوم سے جدا نہ ہو جاتی ہو۔ غرض مسلمانوں کو حکم دیا جاتا ہے کہ ہر چیز سے استغفار پڑھیں جو انہیں اس بلند اور پاکیزہ تصور زندگی سے دور پھینک دیتی ہو۔

فَإِذَا قَضَيْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللَّهَ كَذِكْرِكُمْ آبَاءَكُمْ أَوْ أَشَدَّ ذِكْرًا ۗ فَمِنَ النَّاسِ مَن يَقُولُ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ۝ وَمِنْهُم مَّن يَقُولُ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝ أُولَٰئِكَ لَهُمْ نَصِيبٌ مِّمَّا كَسَبُوا ۚ وَاللَّهُ سَرِيعُ الْحِسَابِ

"پھر جب اپنے حج کے ارکان ادا کر چکو' تو جس طرح پہلے اپنے آباؤ اجداد کا ذکر کرتے تھے' اسی طرح اب اللہ کا ذکر کرو' بلکہ اس سے بھی بڑھ کر۔ (مگر اللہ کے یاد کرنے والے لوگوں میں بھی بہت فرق ہے) ان میں سے کوئی تو ایسا ہے جو کہتا ہے اے ہمارے رب! ہمیں دنیا ہی میں سب کچھ دے دے۔ ایسے شخص کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے۔ اور کوئی کہتا ہے اے ہمارے رب! ہمیں دنیا میں بھی بھلائی دے اور آخرت میں بھی بھلائی۔ اور آگ کے عذاب سے ہمیں بچا' ایسے لوگ اپنی کمائی کے مطابق (دونوں جگہ) حصہ پائیں گے اور اللہ کو حساب چکاتے کچھ دیر نہیں لگتی۔"

جیسا کہ اوپر ذکر ہوا' اختتام حج کے بعد عرب سوق عکاظ' مجنہ اور ذوالمجاز نامی بازاروں کو جاتے۔ یہ بازار صرف خرید و فروخت ہی کے بازار نہ تھے' بلکہ ان میں تقریروں' اشعار اور آباؤ اجداد کی تفاخر کا بھی مقابلہ ہوتا۔ ان بازاروں میں ہر شخص اپنا نسب نامہ بیان کرتا۔ اس وقت عربوں کی حالت یہ تھی کہ ان تفاخر اور کارہائے نمایاں کے بیان و اظہار کے علاوہ عربوں کے پاس کوئی پروگرام ہی نہ تھا۔ ان کے پاس کوئی انسانی مشن نہ تھا' جس کی راہ میں وہ اپنی عظیم قوت گویائی اور بلاغت اور عظیم عملی قوتوں کو کام میں لاتے۔

عربوں کو بلند تر انسانی مشن تو صرف اسلام نے دیا ہے۔ اسلام سے پہلے ان کی حالت یہ تھی کہ نہ زمین پر ان کا کوئی پروگرام ہے اور نہ آسمانوں پر ان کا کوئی ذکر یا مقام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حج سے فارغ ہو کر یہ لوگ ان میلوں اور بازاروں میں اپنے قیمتی اوقات اور اپنی قیمتی طاقتوں کو ان لغو اور بے کار باتوں میں صرف کرتے۔ اپنے حسب و نسب بیان کرتے' اپنے آباؤ اجداد کے کارنامے یاد کرتے۔ اور فخر و مباہات کے ساتھ...... لیکن جب اسلام آیا اور انہیں ایک عظیم نصب العین دیا گیا' انہیں زندگی کا ایک جدید تصور دیا گیا' بلکہ انہیں ایک نیا جنم دیا گیا تو وہ بامقصد اور بامراد قوم بن گئے۔ قرآن کریم انہیں صرف وہ تعلیم دیتا ہے جس میں ان کی بھلائی ہے۔

مناسک حج ادا کر چکنے کے بعد' اب اسلامی تعلیم پر کہئے کہ آباؤ اجداد کے تذکروں کی بجائے اللہ تعالیٰ کو یاد کرو فَإِذَا قَضَيْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ

فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا "پھر جب اپنے حج کے ارکان ادا کر چکو' تو جس طرح پہلے اپنے آباؤ اجداد کا ذکر کرتے تھے' اس طرح اب اللہ کا ذکر کرو' بلکہ اس سے بھی بڑھ کر۔"۔۔۔۔ "جس طرح پہلے اپنے آباؤ اجداد کا ذکر کرتے تھے۔" ان الفاظ سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اللہ کے ذکر کے ساتھ اب بھی آباؤ اجداد کا تذکرہ جائز ہے۔ اس تمثیل میں تنقیدی پہلو ہے اور مقصد یہ ہے کہ اس کام سے بہتر کام میں اپنے اوقات صرف کرو یعنی جس طرح تم پہلے آباؤ اجداد کا تذکرہ کرتے تھے جو ایک فضول حرکت تھی۔ جو کوئی جائز یا مستحسن کام نہیں تھا' اس کو بدل دو۔ اب اللہ کو یاد کرو بلکہ اس سے بھی اللہ کو زیادہ یاد کرو بالخصوص موسم حج میں جبکہ تم نے عام لباس بھی اتار کر ایک خاص لباس پہن لیا ہے۔ اسی طرح آباؤ اجداد پر تکابر و تفاخر کے لباس کو اتار پھینکو۔ صرف اللہ کے ذکر ہی سے انسان کا رتبہ بلند ہوتا ہے۔ آباؤ اجداد کے جائز و ناجائز تفاخر کے ذریعے نہیں۔ اب زندگی کی جدید قدروں کا میزان و معیار تقویٰ ہے۔ خدا کا خوف ہے اور تعلق باللہ ہے۔ اس کا ذکر اور اس کی خشیت ہے۔

اب یہاں انسانوں کو اسلامی میزان اور اسلامی معیار کے مطابق تولا اور پرکھا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو انسانوں کی قدریں بتاتا ہے اور ان کے مطابق مختلف لوگوں کی قیمتیں متعین کر کے دکھلاتا ہے:

فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ۝ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ۝ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّمَّا كَسَبُوْا ۭ وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ۝ "ان میں سے کوئی تو ایسا ہے' جو کہتا ہے اے ہمارے رب! ہمیں دنیا میں سب کچھ دے دے۔ ایسے شخص کے لئے آخرت میں کوئی صلہ نہیں ہے۔ اور کوئی کہتا ہے' اے ہمارے رب! ہمیں دنیا میں بھی بھلائی دے اور آخرت میں بھی بھلائی' اور آگ کے عذاب سے ہمیں بچا' ایسے لوگ اپنی کمائی کے مطابق (دونوں جگہ) حصہ پائیں گے اور اللہ کو حساب چکاتے کچھ دیر نہیں لگتی۔"

لوگوں میں دو نقطہ ہائے نظر ہیں۔ ایک گروہ وہ ہے جس کے پیش نظر صرف دنیا ہے۔ اسے حصول دنیا کا بے حد شوق ہوتا ہے۔ ہر وقت دنیاوی امور ہی میں مصروف رہتا ہے۔ اس نقطہ نظر کے حامل لوگ بھی حج کے موقعہ پر آیا کرتے تھے' ان لوگوں کی دعائیں کچھ اس قسم کی ہوا کرتی تھیں: "اللہ! اس سال کو بارشوں کا سال بنایئے' ترو تازگی کا سال بنایئے' اچھی اولاد کا سال بنایئے وغیرہ۔ یہ لوگ اپنی دعاؤں میں آخرت کا ذکر تک نہ کرتے تھے۔

حضرت ابن عباس ﷺ سے روایت ہے کہ یہ آیت ایسے ہی لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے' لیکن اس آیت کا مفہوم عام ہے اور ہمیشہ کے لئے ہے۔ کیونکہ ہر نسل اور ہر علاقے میں ایسے لوگ پائے جاتے ہیں۔ وہ لوگ جن کے پیش نظر صرف دنیا ہی دنیا ہوتی ہے اور یہ لوگ جب اللہ تعالیٰ سے بھی کچھ مانگیں تو بھی دنیا ہی مانگتے ہیں۔ کیونکہ ان کا شغل ہی دنیا میں ہوتا ہے۔ ان کے دل و دماغ پر دنیا ہی چھائی ہوئی ہوتی ہے۔ اور دنیا اس کی ذات کی گہرائیوں تک اتر چکی ہوتی ہے۔ بعض اوقات اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو ان کا پورا حصہ اس دنیا ہی میں عطا کر دیتا ہے۔ اگر ان کے لئے یہاں کچھ مقرر ہو' ان کے مقدر میں ہو' اور آخرت میں تو ایسے لوگوں کا کچھ حصہ نہیں ہے۔ مطلقاً کچھ نہیں۔

دوسرا گروہ ایسا ہے جس کا نقطہ نظر گروہ سابق سے زیادہ وسیع ہے۔ ان کا نفس بلند اور فطرت عظیم ہے۔ یہ لوگ واصل باللہ ہیں۔ یہ لوگ اگرچہ اچھی دنیا کے طالب بھی ہیں لیکن وہ عالم آخرت میں بھی حصہ چاہتے ہیں۔ اسے بھی صاف بھولے ہوئے نہیں ہیں۔ یہ گروہ کہتا ہے رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ "اے ہمارے رب! ہمیں دنیا میں بھی بھلائی دے اور آخرت میں بھی بھلائی دے اور آگ کے عذاب سے ہمیں بچا۔"

یہ لوگ اللہ تعالیٰ سے دونوں جہانوں کی بھلائی کے طلبگار ہیں۔ یہ بھلائی کا نام نہیں لیتے۔ اس کی تخصیص نہیں کرتے ' یہ اللہ پر چھوڑ دیتے ہیں۔ اللہ ان کے لئے جو بھلائی چاہے اختیار کرے۔ وہ مختار ہے اور یہ لوگ اس کے اختیار پر راضی ہیں۔

اس قسم کے لوگوں کو اللہ ضمانت دیتا ہے کہ ان کا حصہ انہیں ضرور ملے گا۔ اس میں دیر نہ ہوگی کیونکہ اللہ تعالیٰ بڑی جلدی حساب چکاتے ہیں۔

ان قرآنی تعلیمات کی رو سے دیکھا یہ جاتا ہے کہ ایک شخص کا نقطہ نگاہ کیا ہے؟ لہٰذا جو شخص اللہ تعالیٰ کی جانب متوجہ ہو ' اپنے تمام امور اس کے سپرد کر دے ' اللہ کو اپنا اختیار دے دے ' اور پھر اللہ اس کے لئے جو اختیار کرے اس پر راضی ہو ' تو ایسے شخص کو دنیاوی بھلائیاں بھی ملیں گی اور آخرت میں بھی خیر ہی خیر اس کے حصے میں ہوگی اور جس شخص نے اپنے پیش نظر صرف دنیا ہی کو رکھا تو ایسا شخص تو آخرت کو ابھی سے کھو بیٹھا۔ اس لحاظ سے پہلا شخص ہر لحاظ سے ظاہری حساب کے لحاظ سے بھی فائدے میں رہا۔ لیکن اللہ کے ہاں تو وہ بہت ہی فائدے میں ہے۔ اس نقطہ نظر والے شخص نے اپنی دعا میں بھی راہ اعتدال کو اختیار کیا ہے اور یہ اسلام کے پیدا کردہ ایک ایسے تصور حیات پر جما ہوا ہے جو نہایت موزوں اور نہایت خوشگوار ہے۔

اسلام اپنے ماننے والوں سے یہ مطالبہ نہیں کرتا کہ وہ ترک دنیا اختیار کر لیں۔ کیونکہ انہیں خلافت کے لئے پیدا کیا گیا ہے اور منصب خلافت انہوں نے اس کرۂ ارض پر سنبھالنا ہے۔ اسلام کا مطالبہ صرف یہ ہے کہ مسلمان اپنے دنیاوی امور میں بھی اللہ کی طرف متوجہ رہیں۔ وہ اپنے نقطہ نظر کو اس قدر محدود نہ کریں کہ وہ خود دنیا کے محدود دائرے کے اندر محدود ہو کر رہ جائیں۔ اسلام یہ چاہتا ہے کہ انسان کو اس محدود دنیا کی چار دیواری سے آزاد کر دے۔ یوں کہ وہ اس دنیا میں کام بھی کرے ' اس سے کام بھی لے۔ مگر اس کے اندر گھر نہ جائے۔ اس کے پنجے سے آزاد بھی رہے۔ وہ یہاں منصب خلافت کے تمام فرائض سرانجام دے۔ لیکن اس کی نظریں افق اعلیٰ پر ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ تمام اہتمامات ' وہ تمام سرگرمیاں جن کے فوائد اس دنیا تک محدود ہوں ' ان پر اگر ایک انسان ' ایک مومن انسان اسلامی تصور حیات کے مقام بلند سے ایک حقارت آمیز نظر ڈالے تو وہ سب کچھ اسے حقیر ' ذلیل اور بے وقعت نظر آئے گا بشرطیکہ وہ اسلامی تصور حیات کی بلند چوٹی پر پہنچا ہوا ہو۔

مناسک حج اب ختم ہوتے ہیں۔ جملہ مناسک حج ادا کئے جا چکے ' تو اب ذکر الٰہی کی طرف توجہ کرو۔ خدا خوفی کی راہ اختیار کرو۔ اللہ ہی اللہ کیا کرو۔ وَ اذْكُرُوا اللّٰهَ فِیْۤ اَیَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ فَمَنْ تَعَجَّلَ فِیْ یَوْمَیْنِ فَلَاۤ اِثْمَ عَلَیْهِ وَ مَنْ تَاَخَّرَ فَلَاۤ اِثْمَ عَلَیْهِ لِمَنِ اتَّقٰى وَ اتَّقُوا اللّٰهَ وَ اعْلَمُوْۤا اَنَّكُمْ اِلَیْهِ تُحْشَرُوْنَ "یہ گنتی کے چند روز ہیں جو تمہیں اللہ کی یاد میں بسر کرنے چاہئیں۔ پھر جو کوئی جلدی کر کے دو ہی دن میں واپس ہو گیا تو کوئی حرج نہیں ' اور جو کچھ دیر زیادہ ٹھہر کر پلٹا تو بھی کوئی حرج نہیں۔ بشرطیکہ یہ دن اس نے تقویٰ کے ساتھ بسر کئے ہوں۔ اللہ کی نافرمانی سے بچو اور خوب جان رکھو کہ ایک روز اس کے حضور میں تمہاری پیشی ہونے والی ہے۔"

راجح بات یہ ہے کہ ایام ذکر یوم عرفہ ' یوم نحر اور پھر ایام تشریق ہیں۔ ابن عباس ﷺ فرماتے ہیں کہ ایام معدودات سے مراد ایام تشریق ہیں۔ عکرمہ ﷺ کہتے ہیں کہ معدود دنوں میں ذکر سے مراد وہ تکبیریں ہیں جو ایام تشریق میں ہر فرض نماز کے بعد پڑھی جاتی ہیں۔ اللہ اکبر ' اللہ اکبر۔ پہلے ہم عبدالرحمٰن ﷺ بن معمر دیلمی کی حدیث نقل کر آئے ہیں کہ "منیٰ کے دن تین ہیں۔ اب اگر کوئی دو ہی دنوں میں شتاب واپس ہو گیا تو بھی کوئی حرج نہیں ہے اور اگر کوئی تاخیر کر کے پورے وقت کے بعد آئے تو بھی کوئی حرج نہیں۔ غرض عرفہ ' حج اور ایام تشریق سب میں مناسب ہے کہ اللہ کا ذکر زیادہ سے زیادہ ہو ' چاہے ان میں پہلے دو دنوں کو منتخب کیا جائے یا دوسرے دو دنوں کو ' لیکن ہر معاملے میں خدا خوفی اور پرہیز گاری پیش نظر رہے "بشرطیکہ یہ دن تقویٰ کے ساتھ بسر کئے۔" لِمَنِ اتَّقٰى ۔

حج کی گہما گہمی کی مناسبت سے 'اب یہاں یوم حشر کا ذکر کیا گیا جہاں تمام مخلوق حساب و کتاب کے لئے جمع ہو گی۔ وہاں ایک خوفناک منظر ہو گا للہذا اس مقام کی تیاری کر دو اور پرہیزگاری کا راستہ اختیار کرو۔ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ "اللہ کی نافرمانی سے بچو اور خوب جان رکھو کہ ایک روز اس کے حضور میں تمہاری پیشی ہونے والی ہے۔"

ان آیات کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام نے عربوں کے مروجہ حج کو کس طرح ایک اسلامی فریضہ قرار دیا۔ اس کا ربط جاہلیت کے پس منظر سے ٹوٹ گیا۔ اب وہ اسلامی نظام زندگی کا ایک جزو بن گیا۔ اسے بد اخلاقیوں اور گندگیوں سے پاک کر دیا۔ اسلام نے زندگی کے تمام معاملات میں یہی طریقہ اختیار کیا ہے' جس رسم' جس عبادت کو بھی باقی رکھا ہے اسے جاہلیت کے شوائب سے پاک کر کے رکھا ہے۔ اس کی وہ شکل بالکل بدل گئی ہے جو ایام جاہلیت میں ہوا کرتی تھی۔ یوں نظر آتا ہے جیسا کہ جدید لباس میں ایک موزوں ٹکڑا۔ اب حج معروف معنوں میں اہل عرب کا ایک عادی اور رسمی فعل نہ رہا بلکہ اب وہ ایک اسلامی عبادت قرار دے دی گئی ہے کیونکہ اب اسلام ہی معیار ہے۔ اسلام ہی کو یہ حق حاصل ہے کہ اگر وہ چاہے تو کسی مفید رسم کو باقی رکھے۔

☆ ☆ ☆

درس ۱۳ ایک نظر میں

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے مختلف قسم کی ہدایات دیں۔ مختلف موضوعات پر قانون وضع کیے گئے ہیں۔ ان ہدایات اور قوانین کو مجموعی طور پر دیکھا جائے تو ان سے ایک خدائی نظام زندگی وجود میں آتا ہے جو انسان کی پوری زندگی پر حاوی ہے۔ اس راہنمائی اور اس قانون سازی کے درمیان اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایک نظام تربیت بھی عطا کر دیا ہے۔ یہ ایک بہترین نظام اصلاح ہے۔ اس لئے کہ اللہ نفس انسانی کی حقیقت کے بارے میں اس کی ظاہری اور خفیہ رسم و راہوں کے بارے میں سب سے زیادہ علم رکھتا ہے اللہ تعالیٰ نفس انسانی کے ہر پہلو کو لیتا ہے۔ اور مختلف انسانوں کی ایسی تصویر بناتا ہے' جس کے خدوخال بالکل واضح ہوتے ہیں۔ جس میں تمام مطلوبہ خصائص واضح طور پر نظر آتے ہیں۔ جب انسان الفاظ کی اس تصویر کو آئینہ دماغ میں رکھ کر' انسانوں کی بھیڑ میں ان اوصاف کے حاملین کی تلاش میں نکلتا ہے' تو یوں لگتا ہے کہ گویا وہ لوگ گلیوں اور بازاروں میں چلتے پھرتے ہیں۔ زمین پر دوڑتے پھرتے ہیں اور ایک انسان انگلی رکھ کر بتا سکتا ہے کہ یہ ہیں وہ لوگ جن کا تذکرہ قرآن نے کیا ہے۔

اس سبق میں انسانوں کی دو اقسام کے واضح خدوخال بیان کیے گئے ہیں۔ یہ اقسام عام طور پر انسانوں میں پائی جاتی ہیں۔ پہلی قسم نمائشی' شریر اور زبان دراز لوگوں کی ہے۔ ایسا شخص اپنی ذات کو پوری زندگی کا محور بنا لیتا ہے۔ ایسا شخص بظاہر بہت ہی بھلا معلوم ہوتا ہے' لیکن جب اندرون کھلتا ہے تو گندگی ہی گندگی ہوتی ہے۔ اسے جب اصلاح احوال اور خدا خوفی کی طرف دعوت دی جائے تو حق کی طرف نہیں آتا۔ اپنی اصلاح نہیں کرتا' اپنے وقار کا خیال اسے گناہ پر جما دیتا ہے۔ اپنے غرور کی وجہ سے وہ سچائی اور بھلائی سے منہ پھیر لیتا ہے وہ کھیتوں کو غارت کرتا ہے اور نسل انسانی کو تباہ کرتا ہے۔

دوسری قسم ان مومنین صادقین کی ہے جو اپنی پوری ہستی کا سودا رضائے الٰہی کے حصول کے عوض کر لیتے ہیں۔ پوری زندگی بیچ دیتے ہیں۔ اس کا کچھ حصہ بھی رہنے نہیں دیتے۔ اپنی سعی اور عمل' اپنی تمام تگ و دو میں' وہ اپنا کوئی حصہ نہیں رکھتے۔ وہ اپنے آپ کو فنا فی اللہ کر دیتے ہیں اور ہمہ تن اللہ کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔

انسانوں کے یہ دو معیاری نمونے پیش کرنے کے بعد اب مسلمانوں کو دعوت دی جاتی ہے کہ وہ کسی تردد' کسی جھجک' مطالبہ خوارق و معجزات کے بغیر پورے کے پورے دین اسلام میں داخل ہو جائیں۔ بنی اسرائیل کی طرح نہ بنیں' جنہوں نے قدم قدم پر خوارق و معجزات کا مطالبہ کیا' اللہ کی اس نعمت یعنی اسلامی نظام زندگی کی نعمت کو چھوڑ کر کفر کا راستہ اختیار کیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "پوری طرح اسلام میں داخل ہو جاؤ۔" اشارہ اس طرف ہے کہ اسلام ایک مکمل نظام زندگی ہے اور تمہیں اپنی پوری زندگی کو اس نظام میں ڈھالنا ہے۔ اس نظام پر عمل کرنا ہے۔ (تفصیل آگے آ رہی ہے)

ایمان کی نعمت عظمیٰ اور مسلمانوں پر اس کی امن و آشتی کی چھاؤں کے مقابلے میں' کفار کے غلط نقطۂ نظر کی ایک جھلک بھی دکھائی جاتی ہے۔ یہ لوگ اپنے ناقص تصور زندگی کی وجہ سے مسلمانوں کا مذاق اڑاتے ہیں۔ لیکن بتا دیا جاتا ہے کہ اللہ کے نزدیک کس کی کیا قدر (Value) ہے۔ "مگر قیامت کے روز پرہیزگار لوگ ہی ان کے مقابلے میں عالی مقام ہوں گے۔"

اس کے بعد بتایا جاتا ہے کہ لوگوں کے درمیان اختلاف رائے کس طرح پیدا ہو گیا اور یہ کہ اس کا حل صرف یہ ہے کہ وہ معیار حق کی طرف پلٹیں اور اسے اپنا حکم تسلیم کریں۔ بتایا جاتا ہے کہ حق کا یہ معیار اللہ کی کتاب ہے' جو نازل ہی اس لئے کی گئی ہے تاکہ لوگوں کے

درمیان حق کے بارے میں جو اختلاف رائے پیدا ہو گیا ہے' اس میں ان کے درمیان فیصلہ کرے۔

اس مناسبت سے بتادیا جاتا ہے کہ اس معیار حق کتاب اللہ کے حاملین کی راہ میں بے شمار مشکلات ہیں۔ امت مسلمہ کو بتایا جاتا ہے کہ اس کی راہ میں سختیاں ہیں' مصیبتیں ہیں' نہ صرف تمہاری راہ میں بلکہ تاریخ انسانی میں جس جماعت نے بھی اس امانت کا بوجھ اٹھایا' اس کا حال یہی رہا ہے تاکہ وہ اپنے آپ کو اس بار امانت کے اٹھانے کے لئے تیار کر سکے۔ جسے بہرحال اس نے اٹھانا ہے۔ اور تاکہ وہ خوشی خوشی اس بوجھ کو اٹھانے کے لئے تیار ہو' اطمینان کے ساتھ۔ جب بھی فضا میں خطرات کی آلودگی ہو' جب بھی اسے یہ نظر آتا ہو کہ صبح دور ہے' وہ اللہ کی نصرت کے بارے میں پرامید رہے۔

اس سبق میں ہم دیکھتے ہیں کہ اسلامی جماعت کی ٹریننگ اور تربیت کے لئے قانون سازی کے ساتھ ساتھ اسلامی نظم و تربیت بھی سکھایا جارہا ہے۔ اس تربیت کے مختلف پہلو بیان کئے جاتے ہیں جن کا زمزمہ نہایت خوشگوار اور پرتاثیر ہے اور یہ سب کچھ ان ہدایات و وضع قوانین کے اثنا میں ہو رہا ہے جن سے اسلامی نظام بنتا ہے جو انسان کی پوری زندگی پر حاوی ہے۔

☆ ☆ ☆ ☆

درس ۱۳ تشریح آیات (۲۰۴ تا ۲۱۴)

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِي الْحَيٰوةِ

[illegible] يُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰى مَا فِيْ قَلْبِهٖ ۙ وَهُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ ﴿۲۰۴﴾ وَاِذَا تَوَلّٰى

سَعٰى فِي الْاَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيْهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ ؕ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ

الْفَسَادَ ﴿۲۰۵﴾ وَاِذَا قِيْلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ فَحَسْبُهٗ

جَهَنَّمُ ؕ وَلَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴿۲۰۶﴾ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ

مَرْضَاتِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌ بِالْعِبَادِ ﴿۲۰۷﴾

انسانوں میں کوئی تو ایسا ہے جس کی باتیں دنیا کی زندگی میں تمہیں بہت بھلی معلوم ہوتی ہیں اور اپنی نیک نیتی پر وہ بار بار خدا کو گواہ ٹھہراتا ہے۔ مگر حقیقت میں وہ بدترین دشمن حق ہوتا ہے۔ جب اُسے اقتدار حاصل ہو جاتا ہے' تو زمین میں اس کی ساری دوڑ دھوپ اس لئے ہوتی ہے کہ فساد پھیلائے' کھیتوں کو غارت کرے اور نسلوں کو تباہ کرے۔ حالانکہ اللہ (جسے وہ گواہ بنا رہا ہے) فساد کو ہرگز پسند نہیں کرتا اور جب اس سے کہا جاتا ہے کہ اللہ سے ڈرو' تو اپنے وقار کا خیال اسے گناہ پر جما دیتا ہے۔ ایسے شخص کے لئے تو بس جہنم ہی کافی ہے۔ اور وہ بہت برا ٹھکانا ہے۔ دوسری طرف انسانوں ہی میں کوئی ایسا بھی ہے جو رضائے الٰہی کی طلب میں اپنی جان کھپا دیتا ہے اور ایسے بندوں پر اللہ بہت مہربان ہے۔"

نفس انسانی کے یہ عجیب خدوخال' کسی ماہر فن عکاس کی قلم سے ہیں اور یہ اس بات کا بین ثبوت ہیں کہ یہ کلام کسی انسان کا کلام نہیں ہے۔ یہ تصویر کسی انسان کی بنائی ہوئی نہیں ہے۔ اس کلام اور اس نفسیاتی عکاسی کا سرچشمہ انسانی دماغ ہرگز نہیں ہے۔ کیونکہ کوئی انسان اس قدر مختصر الفاظ میں' اتنی مختصر عکاسی کے ساتھ' اس طرح انسانی نفسیات کی گہرائیوں تک نہیں پہنچ سکتا۔ اور نفس انسانی کے ایسے گہرے خدوخال سامنے نہیں لا سکتا۔ جو اس قدر وسیع بھی ہوں اور اس قدر واضح بھی۔

اس کلام کا ہر لفظ تصویر کی ایک لکیر ہے' جو انسان کے کسی خدوخال' کسی خصوصیت کا اظہار کرتی ہے' جلد ہی یہ نقش و نگار چلتے پھرتے زندہ انسانوں کی صورت میں نظر آتے ہیں۔ جس کی تصویر کھینچی گئی ہے۔ وہ ایک الگ شخصیت بن جاتی ہے' جس کی طرف انگلیوں سے اشارہ کیا جا سکتا ہے۔ لاکھوں انسانوں میں سے' اسے الگ کیا جا سکتا ہے۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ ہے وہ شخص جس کی مصوری قرآن نے کی ہے۔ الفاظ میں تصویر کشی بھی ایک قسم کی تخلیق ہے جس طرح زندہ چیزیں دست قدرت سے' رات اور دن پیدا ہوتی رہتی ہیں۔

اب یہ زندہ شخصیت ہے۔ گویا بھی ہے اور چلتی پھرتی ہے۔ اور اس کی ذات نیکی کا خلاصہ اور اخلاص کا پتلا ہے۔ محبت و یکسوئی کا نمونہ اور بلند ہمت ہے' بھلائی و نیکی اور طہارت و پاکیزگی کی ایک تڑپ ہے۔ جو اس کے اندر پائی جاتی ہے۔

اور یہ دوسری شخصیت جس کی باتیں بھلی معلوم ہوتی ہیں جو بہت زبان دراز ہے۔ اس کی آواز کڑاکے دار ہے' بات کرتا ہے تو

بھلائی، نیکی اور اصلاح کی بات کرتا ہے۔ اپنی نیک نیتی پر اللہ کو گواہ ٹھہراتا ہے تاکہ اس کی بات زیادہ موثر اور واضح ہو۔ اور اس کی یکسوئی اور خلوص میں شبہ نہ ہو، اس سے بظاہر نیکی اور خدا خوفی کا اظہار ہو، حالانکہ یہ شخص فی الحقیقت اللہ کا بدترین دشمن ہے۔ اس کا نفس کینے اور جھگڑے سے بھرا پڑا ہے۔ اس میں محبت اور شرافت کا ہلکا سا پرتو بھی نہیں یہ محبت و بھلائی سے یکسر محروم ہے۔ احسان و ایثار اس میں نام کو نہیں۔

اس شخص کا ظاہر اس کے باطن سے الٹ ہے۔ اس کا عیاں اس کے نہاں سے دور ہے۔ وہ جھوٹ کو بڑی چابکدستی سے سچ کا رنگ دے سکتا ہے لیکن جب عمل کا میدان آتا ہے تو وہ یہاں عیاں ہو جاتا ہے۔ حقیقت پردے سے باہر آجاتی ہے اور اس کا شر و فساد، اور اس کا فتنہ و شر کھل کر سامنے آجاتا ہے اس کی دشمنی اور کینہ پروری عیاں ہو جاتے ہیں وَ إِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِي الْاَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيْهَا وَ يُهْلِكَ الْحَرْثَ وَ النَّسْلَ ؕ وَ اللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ "جب اسے اقتدار حاصل ہو جاتا ہے تو زمین میں اس کی ساری دوڑ دھوپ اسی لئے ہوتی ہے کہ فساد پھیلائے، کھیتوں کو غارت کرے، اور نسل انسانی کو تباہ کرے۔ حالانکہ اللہ فساد کو ہرگز پسند نہیں کرتا۔"

جب وہ کسی عملی کام کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو اس کا رجحان شر و فساد، سنگدلی اور ظلم کی جانب ہوتا ہے۔ ہر معاملے میں سخت جھگڑالو۔ وہ کھیتوں کو غارت کرتا ہے، کھیتوں کے پھل، سبزیاں اور روئیدگی و سرسبزی چھین لیتا ہے اور نسل انسانی کو بھی برباد کر دیتا ہے۔

وہ ہر قسم کی بھلائی کا دشمن ہے۔ کھیتوں کو غارت کر دیتا ہے۔ پھل اور سبزیاں اور غلے تباہ ہو جاتے ہیں۔ سرسبزی و شادابی کی جگہ خشکی و ویرانی آبستی ہے۔ اور اس کا غلبہ نسل انسانی کی ہلاکت کا باعث ہوتا ہے۔

زندگی کی ہلاکت سے مراد وہ کینہ و شر اور وہ غدر و فساد ہے، جو اس بداخلاق شخص کے وجود میں پرورش پا رہی تھی لیکن یہ شخص اسے اپنی چرب زبانی اور شیریں کلامی، نیکی کے مظاہرے اور اصلاح و شرافت اور بھلائی و تقویٰ کی نمائش کے ذریعے چھپائے رکھتا ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ فساد کو پسند نہیں کرتا اور ان مفسدین کو بھی پسند نہیں کرتا جو اس کائنات میں فساد پھیلانے کا موجب بنتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ سے اس قسم کے لوگ ہرگز پوشیدہ نہیں رہ سکتے۔ اللہ تعالیٰ کے سامنے یہ ملمع کاری اور یہ پالش کارگر نہیں ہو سکتی، ہاں انسانوں میں کبھی کبھار یہ روغن سازی اور ملمع کاری دھوکہ دے سکتی ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ کو اس قسم کے بداخلاق اور بدفطرت شخص کی ملمع سازی دھوکہ نہیں دے سکتی۔ ہاں عوام الناس جن کے سامنے خفیہ راز نہیں ہوتے اور ظاہرداری انہیں دھوکہ دے سکتی ہے۔ ان کی نظروں میں ضرور اس قسم کے لوگ کسی قدر وقعت رکھتے ہیں۔

سیاق کلام آگے بڑھتا ہے۔ یہی تصور سامنے ہے کچھ رنگ اور بھرے جاتے ہیں۔ کچھ لکیریں مزید کھینچی جاتی ہیں اور کچھ نشانات اور واضح ہو کر سامنے آتے ہیں وَ إِذَا قِيْلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ فَحَسْبُهٗ جَهَنَّمُ ؕ وَ لَبِئْسَ الْمِهَادُ "جب اس سے کہا جاتا ہے کہ اللہ سے ڈر تو اپنے وقار کا خیال اس کو گناہ پر جما دیتا ہے۔ ایسے شخص کے لئے تو بس جہنم ہی کافی ہے اور وہ بہت برا ٹھکانا ہے۔"

جب اسے اقتدار حاصل ہوتا ہے تو وہ زمین میں فساد برپا کرتا ہے، کھیتوں کو غارت کرتا ہے، انسانی نسل کو تباہ کرتا ہے، تباہی و بربادی کا دور دورہ ہوتا ہے۔ ایسے شخص کے سینے میں شر و فساد اور کینہ کا جو لاوا پک رہا تھا وہ پھوٹ کر باہر نکل آتا ہے۔ جب اس قسم کا شخص یہ سب کچھ کرنے لگتا ہے اور اسے نصیحت کی خاطر خدا خوفی کی یاددہانی کے لئے اللہ کے غضب سے بچنے کے لئے اور اس محسن سے حیا کرنے کے لئے صرف یہ کہا جاتا ہے: "اللہ سے ڈرو" (اتق اللہ) تو وہ سخت بگڑتا ہے کہ کیوں اس کے سامنے یہ جرأت کی گئی۔ یہ بات اسے کیوں کہی گئی، یہ تو بری چیز ہے۔ اسے نیکی کی طرف متوجہ کرنے والے ہیں کون؟ اس پر اعتراض کرنے والوں کو یہ جرأت کیسے ہوئی۔ کیا یہ لوگ اسے

ہدایت دے رہے ہیں چنانچہ اسے اپنے وقار کا خیال ' حق پر نہیں ' انصاف پر نہیں ' بھلائی پر نہیں بلکہ گناہ پر جمادیتا ہے۔ وہ جرم کو عزت سمجھنے لگتا ہے۔ خطا کو صواب سمجھتا ہے۔ گناہ کو نیکی تصور کرتا ہے اور حق کے مقابلے میں اکڑتا ہے۔ گردن فرازی کرتا ہے ' اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں بزرگ ڈھٹائی سے اتراتا ہے۔ حالانکہ پہلے خود اس کی حالت یہ تھی کہ یہ اپنی نیک نیتی پر ہروقت اللہ کو گواہ ٹھہراتا اور ہروقت بھلائی ' نیکی ' یکسوئی اور حیا جسّی کا مظاہرہ کرتا۔

یہ ایک آخری (Touch) ہے ' جس سے اس تصویر کے خدوخال پورے ہو جاتے ہیں۔ یہ واضح تر ہو جاتی ہے اور اس کی کئی اقسام بھی سامنے آجاتی ہیں۔ یہ تصویر اب زندہ و متحرک مثالوں کی شکل اختیار کرلیتی ہے۔ کسی تردد کے بغیر آپ یہ کہہ سکتے ہیں : "وہ ہے! وہ ہے! وہ ہے جس کی تصویر قرآن مجید نے الفاظ میں کھینچی ہے۔ غرض ایسے لوگ تمہیں زندہ اشخاص کی صورت میں ہردور میں اور ہرجگہ نظر آئیں گے۔

ان صفات کفر پر جم جانے ' گناہ کو وطیرہ بنالینے ' حق کے ساتھ دشمنی اختیار کرنے ' سنگدلانہ فساد بپا کرنے اور فسق و فجور پھیلانے غرض ان سب صفات کے مقابلے میں اللہ کا صرف ایک ہی تازیانہ آتا ہے۔ تازیانہ عبرت! جو اس قماش کے لوگوں کے لئے موزوں اور ان کے حالات کے مطابق ہے کیا؟ فَحَسْبُهٗ جَهَنَّمُ وَ لَبِئْسَ الْمِهَادُ ایسے لوگوں کے لئے تو جہنم ہی علاج ہے جو بہت ہی برا ٹھکانہ ہے۔"

کافی ہے ان کے لئے بس ' بس یہ کفایت کرتی ہے۔ جہنم جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہوں گے۔ جہنم جس میں ایسے مفسدین کو النا کر کے گرایا جائے گا اور شیطان کا تمام لشکر اس میں النا کر کے گرایا جائے گا۔ جہنم جس کی آگ دل کو جلا ڈالے گی۔ جس کی جلن بجلی کی طرح دل سے چیخیں نکال دے گی۔ جہنم جو ہر چیز کو نیست و نابود کر دے گی ' جلا کر راکھ کر دے گی۔ جہنم جس کے شعلے خوفناک و غضبناک ہوں گے..... یہ جہنم ہی اس کا علاج ہے ' بہت ہی برا ٹھکانا ہے۔

غور کیجئے! اس قدر حقارت آمیز تصویر ہے جہنم کی۔ اس حقیر ٹھکانے کی۔ کس قدر بدحال ہو گا وہ شخص جس کا یہ ٹھکانا ٹھہرے۔ ابھی ابھی دنیا میں یہ شخص اکڑ کر چلتا تھا۔ پھولا ہوا پھرتا تھا اور کبرو غرور کا عالم یہ تھا کہ برائی پر بھی جم جاتا تھا لیکن اب کہاں ہے؟ مقام ذلت میں!

"یہ تو ہے ایک قسم کے لوگوں کی تصویر۔ یہ تصویر کا ایک رخ ہے۔ دوسرا بھی دیکھئے۔ اس دنیا میں کچھ اچھے لوگ بھی تو ہیں۔ ذرا ان نفوس قدسیہ پر بھی نظر ڈالیں۔ ان کے مقابلے میں وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ دوسری طرف انسانوں ہی میں کوئی ایسا بھی ہے جو رضائے الٰہی کی طلب میں اپنی جان کھپا دیتا ہے اور ایسے بندوں پر اللہ بہت مہربان ہے۔"

لفظ یشری کا مفہوم وسیع ہے یعنی فروخت کر دیتا ہے اپنی جان کو ' پوری جان کو ' پوری کی پوری حوالہ کر دیتا ہے۔ اپنے لئے کچھ بھی نہیں چھوڑتا لیکن اس سودے میں قیمت کیا وصول کرتا ہے؟ صرف رضائے الٰہی کی امید۔ اب اس کا نفس اس کا اپنا نہیں رہا ہے۔ نہ نفس کے بعد اس کے لئے کچھ رہ گیا ' بے دھڑک اس نے سب کچھ بیچ ڈالا۔ بے خطر سب کچھ دے دیا اور لیا بھی کچھ نہیں۔ تمام پونجی ' تمام وجود بیچ ڈالا ' اللہ کو دے دیا۔ غیر اللہ کے لئے نفس کا کوئی حصہ بچاکر نہ رکھا گیا۔

ایک تعبیر یہ بھی ہو سکتی ہے : اس نے اپنے نفس کو بیچا نہیں ' بلکہ خریدا ہے۔ اس کا نفس اغراض دنیاوی کا غلام تھا۔ اس نے اسے خرید لیا۔ خرید کر آزاد کر دیا۔ آزاد کر کے اللہ میاں کے سامنے پیش کیا۔ خالص اللہ کا کر دیا۔ اب اس نفس کے ساتھ کسی کا کوئی حق وابستہ نہیں ہے۔ صرف اللہ کا حق ہے۔ مالک کا حق ہے۔ یہ شخص دنیا کی تمام اغراض ' تمام مقاصد کو قربان کر دیتا ہے اور اپنے نفس کو قابض کر کے اللہ کے لئے کر دیتا ہے۔ بعض روایات میں ان آیات کے نزول کا موقعہ بھی بیان کیا گیا ہے۔

ابن کثیر نے لکھا ہے :"ابن عباس ؓ' انس ؓ' سعید بن مسیب ؓ' ابو عثمان نہدی ؓ' عکرمہ ؓ اور ایک پوری جماعت صحابہ و تابعین کا کہنا ہے :کہ یہ آیت صہیب ؓ بن سنان رومی کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ یہ مکہ مکرمہ میں مشرف بہ اسلام ہوئے۔ ہجرت کی تیاری کرنے لگے۔ لوگوں نے کہا کہ تم اپنی دولت کے ساتھ نہیں جاسکتے۔ اگر جانا ہی چاہتے ہو تو دولت یہاں چھوڑ دو اور انہوں نے ان کی شرائط کے مطابق جان چھڑائی۔ تمام دولت ان کے حوالے کر دی۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت ان کے حق میں نازل فرمائی۔ حضرت عمر ؓ اور آپ کے بعض دوسرے رفقاء کی ملاقات ان سے حرہ کے گردونواح میں ہوئی۔ انہوں نے اس سے کہا :"سودا نفع بخش ہے۔" انہوں نے کہا :"اچھا آپ لوگ ہیں! اللہ آپ کی تجارت میں کبھی خسارہ نہ کرے۔ معاملہ کیا ہے؟" انہوں نے انہیں پورا قصہ سنایا اور اطلاع دی کہ تمہارے متعلق اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی ہے۔

روایات میں آتا ہے کہ حضور ﷺ نے ان سے کہا :"صہیب نے اس سودے میں بہت ہی نفع کمایا ہے۔"

ابن مردویہ ؒ نے محمد ابن ابراہیم ؒ' محمد بن عبداللہ ؒ' سلیمان بن داؤد' جعفر ابن سلیمان ضبعی' عوف ؒ' اور ابو عثمان نہدی ؒ کے واسطوں سے حضرت صہیب ؓ سے یہ روایت نقل کی ہے۔ فرماتے ہیں :"جب میں نے مکہ مکرمہ سے حضور ﷺ کی طرف ہجرت کا ارادہ کر لیا تو مجھے اہل قریش نے کہا صہیب! جب تم آئے تھے تو تمہارے پاس ایک کوڑی نہ تھی' اب تم جاتے ہو تو مال کے ساتھ۔ یہ نہ ہو سکے گا۔ میں نے ان سے کہا :اگر میں اپنی دولت تمہارے لئے چھوڑ دوں تو کیا تم مجھے جانے دو گے؟ انہوں نے کہا :"بڑی خوشی سے۔" میں نے اپنی دولت ان کے حوالے کر دی انہوں نے مجھے چھوڑ دیا۔ میں نکل پڑا۔ مدینہ پہنچا۔ اس ماجرا کی اطلاع حضور ﷺ نے پائی تو آپ ﷺ نے فرمایا :"صہیب خوب کمایا صہیب خوب کمایا۔" دو مرتبہ آپ نے فرمایا۔

چاہے آیت اس واقعے میں نازل ہوئی یا اس واقعے پر حضور ﷺ اور صحابہ نے اسے منطبق پایا۔ لیکن اس کا مفہوم ایک حادثہ ایک فرد کے مقابلے میں بہت ہی وسیع ہے۔ یہ تو ایک نفس کی نفسیاتی کیفیت کی ایک تصویر ہے۔ اس میں لوگوں کی ایک قسم کے خدوخال بتائے گئے ہیں۔ اس کی مثالیں جگہ جگہ ملتی ہیں' دیکھی جاسکتی ہیں۔

یہ دو فیچر ہیں' دو تصاویر ہیں' پہلی تصویر ہر شخص پر منطبق ہوتی ہے جس میں دو رنگی ہو' نمائش ہو' چرب زبان ہو' سنگ دل ہو' شریف النفس ہو' سخت جھگڑالو ہو اور اس کی فطرت فاسدہ ہو چکی ہو۔۔۔ دوسری تصویر ہر اس شخص کی ہے جو مومن ہو۔ خالص الایمان ہو' اللہ کے لئے یکسو ہو' اس نے اغراض دنیا کو خیر باد کہہ دیا ہو۔ یہ دونوں انسانوں کے دو معروف نمونے ہیں۔ تخلیق قلم سے ان کی یہ عجیب معجزانہ تصاویر ہیں۔ لوگوں کے سامنے ان دونوں تصاویر کی نمائش ہو رہی ہے۔ لوگ ایک طرف قرآن کے اعجاز بیان پر غور کرتے ہیں اور دوسری طرف اس پر حیران ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کس اعجاز سے انسانوں میں فرق کیا ہے۔ ایک ہی انسان ہے مگر مومن اور وہی انسان ہے مگر منافق۔ ایک ہی شکل مگر ذائقہ جدا...... لوگوں کو بتایا جاتا ہے کہ میٹھی میٹھی باتوں سے دھوکہ نہ کھاؤ' محض چرب زبانی کی وجہ سے کسی کے بارے میں کوئی فیصلہ نہ کر لو' میٹھی میٹھی ذائقہ دار باتوں کے پیچھے حقیقت بھی تلاش کرو۔ نیز الفاظ اور بناوٹی لفاظی' خوش ذائقہ ریاکاری کے پس منظر میں معنی بھی دیکھو اور ساتھ ہی ساتھ بتا دیا کہ ایمانی قدریں کیا ہیں؟

دو تصاویر آئل پینٹنگ (Oil Painting) کی دو چادریں' ایک بدکار منافقت کا نمونہ اور دوسری خالص ایمان کا نمونہ۔ ان کو سامنے رکھ کر' ان کے سائے میں رک کر تحریک اسلامی کو پکارا جاتا ہے۔ اہل ایمان کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ اس نام سے جو ان کا جانا پہچانا ہے :ایمان والو! پورے کے پورے اسلام میں آجاؤ! شیطان کے نقش قدم پر نہ چلو! ہوشیار ہو جاؤ! اس بین خطاب کے بعد بھی کہیں پائے خیال پھسل نہ پڑے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوا ادۡخُلُوۡا فِى السِّلۡمِ كَآفَّةً ۖ وَلَا تَتَّبِعُوۡا خُطُوٰتِ الشَّيۡطٰنِ‌ؕ اِنَّهٗ لَـكُمۡ عَدُوٌّ مُّبِيۡنٌ ﴿۲۰۸﴾ فَاِنۡ زَلَـلۡتُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ مَا جَآءَتۡكُمُ الۡبَيِّنٰتُ فَاعۡلَمُوۡٓا اَنَّ اللّٰهَ عَزِيۡزٌ حَکِيۡمٌ ﴿۲۰۹﴾

"اے ایمان لانے والو! تم پورے کے پورے اسلام میں آجاؤ اور شیطان کی پیروی نہ کرو کہ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔ جو صاف صاف ہدایات تمہارے پاس آچکی ہیں۔ اگر ان کو پالینے کے بعد بھی تم نے لغزش کھائی تو خوب جان رکھو کہ اللہ سب پر غالب اور حکیم و دانا ہے۔"

اہل ایمان کو بلایا جاتا ہے ایمان کے لقب کے ساتھ۔ صفت ایمان کے ساتھ جو انہیں بہت ہی پیاری ہے' جو انہیں امتیاز بخشتی ہے۔ انہیں اوروں سے ممتاز بناتی ہے۔ جو ان کے اور ان کو پکارنے والے' ان کے اپنے رب کے درمیان واحد رابطہ ہے۔ اہل ایمان کو پکار کر دعوت دی جاتی ہے کہ پورے پورے اسلام میں آجاؤ!

اس دعوت کا پہلا اور ابتدائی مفہوم یہ ہے کہ اہل ایمان کلیتاً اللہ کے سامنے سر تسلیم خم کر دیں۔ اور ان کا پورا وجود' اپنے چھوٹے اور بڑے سے بڑے معاملے میں' اللہ کے لئے ہو جائے۔ ان کے تصور اور ان کے شعور' ان کی نیت اور ان کے عمل' ان کی خواہش اور ان کی قناعت کا کوئی حصہ بھی آزاد نہ رہ جائے۔ وہ پورے کے پورے اسلام میں آجائیں۔ پورے کے پورے اللہ کے تابع ہو جائیں۔ اور ہر معاملے میں اللہ کے ہوں اور اللہ کے فیصلے پر راضی ہوں۔ وہ اپنی لگام اس ہاتھ میں' مکمل یقین و اطمینان کے ساتھ تھمادیں جو ان کی قیادت کر رہا ہے۔ اور انہیں پورا پورا یقین ہو کہ ان کا قائد بھلائی' خیر خواہی اور صحیح راہنمائی کے سوا کچھ بھی نہیں چاہتا۔ وہ اطمینان کرلیں کہ جس راہ پر وہ گامزن ہیں' جس منزل کی طرف وہ رواں ہیں وہی حق ہے اور اسی میں دنیا و آخرت کی فلاح ہے۔

اس مرحلے پر' اہل ایمان کو مکمل تسلیم کی دعوت دینے سے اس بات کا اظہار ہوتا ہے کہ ابھی تک مسلمانوں کی صفوں میں ایسے لوگ پائے جاتے تھے جن کے دلوں میں تردد تھا' خلجان تھا جو ابھی تک اس بات پر مطمئن نہ تھے کہ انہوں نے ظاہراً اور باطناً ہر طرح سے پوری پوری اطاعت کرنی ہے۔ اور یہ کوئی اچنبھے کی بات بھی نہیں ہے۔ تحریکات میں ایک طرف' اگر مطمئن' پختہ کار اور مطیع فرمان لوگ ہوتے ہیں' تو ساتھ ساتھ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جن میں کمزوریاں ہوتی ہیں۔ یہ پکار اور یہ دعوت ایسی ہے جو ہروقت اہل ایمان کو دی جاتی رہے گی کہ وہ مخلص ہو جائیں' یکسو ہو جائیں۔ ان کے دل کی دھڑکنیں' ان کے شعور اور میلانات اللہ کے حکم اور اللہ کے ارادے سے ہم آہنگ ہو جائیں' وہ اللہ کے ہو جائیں جو انہیں ان کے نبی اور ان کے اپنے نظام کی طرف لے جاتا ہے' بغیر کسی تردد' بغیر کسی خلجان کے اور پوری یکسوئی کے ساتھ۔

اور ایک مومن جب اس دعوت کو قبول کرتا ہے' شرح صدر کے ساتھ اور پورے طور پر' تو وہ ایک ایسی دنیا میں قدم رکھتا ہے' جو امن کی دنیا ہے' جو سلامتی کی دنیا ہے۔ وہ ایک ایسے جہاں میں داخل ہو جاتا ہے جو اطمینان کا جہاں ہے۔ جو رضا اور سکون کا جہاں ہے' وہ ایک ایسے عالم میں جا پہنچتا ہے جس میں نہ حیرانی ہے نہ پریشانی' جس میں فساد ہے نہ گمراہی جہاں ہر شخص اور ہر ذی روح کے ساتھ بن پڑتی ہے۔ جہاں وجود اور موجودات کے ساتھ ہم آہنگی ہوتی ہے۔ جہاں نفس انسانی کے خفیہ ترین اور پوشیدہ ترین گوشوں میں بھی سکون ہے اور انسان کی ظاہری اور اجتماعی زندگی میں سکون ہے۔ ایسا عالم جس کی زمین پر امن و سکون اور جس کے ایمان پر بھی اطمینان و قرار

اس سلامتی کا قلب مومن پر پہلا اثر یہ ہوتا ہے کہ اسے اپنے خدا اور اپنے رب کے بارے میں ایک صحیح تصور ملتا ہے۔ یہ تصور خالص بھی ہے اور ستھرا بھی۔ یہ کہ وہ واحد معبود ہے صرف اسی کی طرف مومن متوجہ ہوتا ہے اور وہی اس کا قبلہ ہوتا ہے۔ پھر اس پر مومن مستقلاً جم جاتا ہے اس کا دل مطمئن ہو جاتا ہے۔ نہ اب مختلف راستے رہتے ہیں نہ مختلف قبلے رہتے ہیں۔ اب وہ حالت نہیں رہی جیسا کہ جاہلیت کی بت پرستی میں تھی کہ ایک معبود ادھر سے اس کا پیچھا کر رہا ہے تو دوسرا ادھر سے 'بلکہ اب وہ ایک خدا ہے جس کی طرف وہ نہایت ہی اطمینان' نہایت ہی وثوق اور نہایت صحت اور نہایت صفائی کے ساتھ متوجہ ہوتا ہے۔

وہ ایک ایسا الٰہ ہے جو عزیز اور طاقتور ہے' جو غالب اور قادر ہے۔ جب مومن اس کی طرف پھرتا ہے تو وہ سچائی کی ایک زبردست قوت کی طرف پھرتا ہے' جو اس کائنات کی واحد قوت ہے۔ اب یہ اطمینان و استراحت کی زندگی بسر کرے گا اور اسے کسی جھوٹی قوت کا کوئی ڈر نہ ہو گا۔ وہ کسی چیز سے خوف نہیں کھائے گا وہ ایسے معبود کی بندگی کرے گا جو عزیز اور طاقتور ہے۔ جو غالب اور صاحب قدرت ہے۔ اس لئے اب اسے کسی چیز کی محرومی کا کوئی خوف نہ ہو گا۔ نہ وہ ایسی طاقتوں سے خوف کھائے گا نہ ایسی طاقتوں سے توقع کرے گا جن کے پاس نہ دینے کی طاقت ہے اور نہ محروم کرنے کی قوت ہے۔

وہ ایک عادل اور حکیم اللہ ہے۔ اس کی قوت اور اس کی قدرت ہی مظالم کے خلاف ضمانت ہے۔ خواہشات نفسانیہ کے خلاف ضمانت ہے' کھوٹ کے خلاف ضمانت ہے۔ وہ جاہلیت کے بتوں جیسا معبود نہیں ہے۔ جن کے تصور کے ساتھ سفلی جذبات اور شہوات کا تصور لازم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ایک شخص اسلام میں داخل ہوتا ہے تو وہ باطل معبودوں کو چھوڑ کر ایک مضبوط ذات کا سہارا لیتا ہے۔ جہاں سے انصاف ملتا ہے' امن ملتا ہے اور خصوصی رعایت و اکرام حاصل ہوتا ہے۔

وہ ایک ایسا رب ہے جو نہایت مہربان ہے۔ نہایت مشفق ہے' منعم ہے' وہاب ہے۔ گناہ معاف کرنے والا' توبہ قبول کرنے والا ہے۔ وہ مصیبت زدہ کی پکار کو سنتا ہے اور قبول کرتا ہے۔ اس کی مصیبت دور کرتا ہے' لہٰذا ایک مسلمان اس کے سایہ عطوفت میں مانوس و مامون ہوتا ہے۔ سلامتی میں اور بہرہ مندی میں ہوتا ہے۔ اگر ضعیف ہو جائے تو اس پر رحم ہوتا ہے۔ اگر تائب ہو جائے تو معاف کر دیا جاتا ہے۔

اسلام میں آنے کے بعد ایک مومن کو اسلام سب سے پہلے اپنے اس رب کی صفات سے روشناس کراتا ہے۔ مومن ان صفات کا مطالعہ کرتا جاتا ہے۔ اس صفت میں اسے ایسا مفہوم ملتا ہے جس سے اس کا دل مانوس ہوتا جاتا ہے۔ اس کی روح مطمئن ہوتی چلی جاتی ہے اور اسے اپنے اس معبود کی طرف سے حمایت' بچاؤ' مہربانی' رحمت' عزت' شرافت و سکون اور امن کی گارنٹی ملتی ہے۔

سلامتی کے جس نظام میں یہ مومن داخل ہوتا ہے' اس سے اسے بندے اور خدا کے مابین تعلق کے بارے میں صحیح تصور ملتا ہے۔ نیز یہ نظام خدا اور بندے کے تعلق' اس کائنات کے ساتھ انسان کے تعلق کے بارے میں صحیح فکر دیتا ہے۔ مثلاً یہ کہ وہ اللہ ہی ہے جس نے سچائی کے ساتھ اس کائنات کی تخلیق کی۔ اس کائنات میں پھر اس نے ہر چیز کو حکمت کے ساتھ پورا پورا پیدا کیا۔ پھر اس نے اس کائنات میں انسان کو ایک حکمت کے تحت پیدا کیا۔ اس لئے اسے یونہی آزاد نہ چھوڑ دیا جائے گا۔ اللہ نے تمام کائناتی ماحول کو ایسا بنایا ہے کہ یہ سب کا سب اور اس کی ہر چیز انسانوں کے لئے ممد حیات ہے۔ پھر زمین کے اندر جتنی چیزیں ہیں ان پر انسان کا اقتدار قائم کیا۔ (اللہ کے نزدیک بھی انسان بڑی ذی شرف مخلوق ہے۔ اس زمین پر وہ اللہ کا خلیفہ اور نائب ہے۔ اس منصب خلافت کے چلانے میں خود اللہ اس کا مددگار ہے۔ اور پھر اس انسان کے اردگرد پھیلی ہوئی یہ کائنات بھی اس کی ہمدم ہے' اس کے ساتھ مانوس ہے۔ کائنات کی روح انسان کی روح سے ہم آہنگ ہے۔ یہ کائنات بھی اللہ کی تسبیح کرتی ہے اور انسان بھی اس کی تمجید کرتا ہے۔ کائنات کیا ہے بلکہ ارض و سماوات میں

ایک میلہ ہے جو قادر مطلق نے اس انسان کی فرحت، طبع کے لئے قائم کیا ہے اور اسے دعوت دی ہے کہ وہ اس میلے میں شریک ہو۔ اس کے خلا کو بھر دے اور اس کے ساتھ مانوس ہو جائے۔ اسے کہا گیا ہے کہ وہ اس کائنات عظیم کی ہر چیز کے ساتھ محبت کرے' اس کے ہر انداز کے ساتھ پیار کرے' اس کائنات میں تو بے شمار ہمدم ہیں اور وہ بھی خصوصی دعوت پر اس میلے میں وارد ہیں' غرض کائنات کی سب چیزیں بے جان یا زندہ سب کی سب اس جشن نوبہاراں کے ارکان ہیں اور پیار کی مستحق ہیں۔

آشتی کا یہ نظام مسلمان کو ایک نظریۂ حیات عطا کرتا ہے۔ اس نظریہ کے ساتھ وہ اگر ایک حقیر پودے کو دیکھتا ہے' جسے پانی کی ضرورت ہے اور پھر اسے سیراب کر دیتا ہے' اس کی نشوونما میں معاون ہوتا ہے' اس کی راہ میں حائل مشکلات کو دور کرتا ہے' تو اس نظریۂ حیات کے مطابق محض اس فعل پر بھی وہ ماجور ہو گا۔ کیا حسین نظریہ ہے! کیا ہی قیمتی نظریہ ہے! جو ایک ماننے والے کی روح کو امن سے بھر دیتا ہے۔ وہ اس پوری کائنات کا ہمدم بن جاتا ہے اور ہر موجود کو گلے لگاتا ہے۔ وہ اس طرح بن جاتا ہے کہ ایک قمقمے کی طرح اپنی ہر طرف امن و سلامتی اور رفق و محبت کی ضوپاشی کرتا رہتا ہے۔

پھر اس نظام میں عقیدہ آخرت ہے۔ مومن کی روح اور مومن کی دنیا میں یہ عقیدہ بہت اہم رول ادا کرتا ہے۔ اس پر سلامتی کا فیضان ہو جاتا ہے۔ اس کی زندگی سے ہر قسم کی بے چینی' پریشانی' مایوسی اور جھنجلاہٹ دور ہو جاتی ہے۔ کیونکہ حساب و کتاب اس دنیا ہی میں ختم نہیں ہو جاتا' ضروری نہیں ہے کہ پوری پوری چیز اس دنیا میں چکا دی جائے۔ اصل حساب و کتاب تو عادل مطلق کی عدالت میں ہو گا۔ اس لئے وہ اگر کوئی بھلائی کرتا ہے' اللہ کی راہ میں جدوجہد کرتا ہے اور اس دنیا میں کامیاب نہیں ہوتا اور اسے اس کا کوئی صلہ نہیں ملتا تو اسے کوئی ندامت نہیں ہوتی۔ اسے اس پر کوئی پریشانی لاحق نہیں ہوتی کہ اس دنیا میں' دنیا والوں کے معیاروں کے مطابق' اسے کوئی صلہ نہیں ملا' نہیں ملا تو نہ ملے۔ عنقریب اسے اللہ کی میزان کے مطابق مل جائے گا اور پورا پورا۔ جب اس دنیا میں حقوق کی غیر منصفانہ تقسیم ہوتی ہے۔ اس کے منشاء کے خلاف تقسیم ہوتی ہے تو وہ "عدل" کے معاملے میں مایوس نہیں ہوتا' عدالت تو لازماً لگنے والی ہے۔ جس کا افسر رب العباد ہے' جو اپنے عباد پر ظلم و زیادتی کا ارادہ ہی نہیں کرتا چہ جائیکہ ظلم کرے۔

اس دنیا میں ایک مجنونانہ کشمکش برپا ہے۔ اس کشمکش میں بالعموم بلند اقدار پامال ہو رہی ہیں۔ آبروئیں لٹ رہی ہیں۔ بے شرمی اور بے حیائی سے حقوق پامال ہوتے ہیں' لیکن مومن سلامتی و آشتی کے اس نظام حیات میں داخل ہونے والا مومن اس سے دور رہتا ہے۔ یہ عقیدہ آخرت ہی ہے' جو اسے اس گندگی سے دور رکھتا ہے۔ وہ تو آخرت پر نظریں جمائے ہوئے ہے۔ وہاں داد و دہش ہے' وہاں تلافی مافات ہے۔ وہاں عطا و غنا ہے۔ یہ دنیا باہمی مسابقت کا ایک میدان ہے۔ باہمی حسد و منافقت کی ایک جنگاہ ہے۔

زندگی کا یہ تصور قلب مومن پر سکون و سلامتی اور صبر و قناعت کی بارش کر دیتا ہے۔ جب وہ اس دوڑ میں حصہ لینے والوں کی حرکات کو دیکھتا ہے تو یہ اسے بھلی معلوم نہیں ہوتیں۔ انسان میں قدرتاً یہ شعور ہوتا ہے کہ زندگی مختصر ہے۔ فرصت کے لمحات تھوڑے ہیں۔ زندگی کی اس دوڑ میں پھر یہ شعور شدید سے شدید تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ لیکن اسلامی نظریۂ حیات کا عقیدہ آخرت پیاس کی اس شدت کو کم کر دیتا ہے۔

پھر امن و آشتی کے اس نظام میں' انسان کو وجود میں لانے کی غرض و غایت اور اس کا مقصد تخلیق اللہ کی بندگی اور اللہ کی غلامی کو قرار دیا جاتا ہے۔ وہ پیدا ہی اس لئے ہوا ہے کہ اللہ کی غلامی کرے' حقیقت یہ ہے کہ اس طرح' یہ انسان کی ایک بلند اور روشن افق پر ایک بلند ستارہ بن جاتا ہے۔ اس کا ضمیر اور اس کا شعور بلند ہو جاتے ہیں۔ اس کے اعمال اور اس کی سرگرمیاں بلند ہو جاتی ہیں۔ اس کے وسائل اور اس کے ذرائع پاک ہو جاتے ہیں۔ وہ اپنے تمام اعمال اور تمام سرگرمیوں میں اللہ کا غلام بن جاتا ہے۔ اس کا کمانا اور اس کا خرچ کرنا بھی

عبادت بن جاتے ہیں۔ وہ دنیا میں منصب خلافت حاصل کرتا ہے اور یہاں اسلامی نظام زندگی قائم کرتا ہے تو بھی عبادت کرتا ہے۔ بندگی' عبادت اور غلامی کے اس تصور کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک مسلم نہ غدار ہوتا ہے نہ بدکار' وہ نہ فریب کار ہوتا ہے نہ دھوکہ باز' نہ ظالم ہوتا اور نہ جبار' وہ حصول مقصد کے لئے ناپاک ذرائع کام میں نہیں لاتا' نہ وہ خسیسانہ وسائل سے کام لیتا ہے۔ وہ منزل تک پہنچنے کے لئے بے تاب بھی نہیں ہوتا۔ وہ عجلت و جلد بازی نہیں کرتا اور وہ اپنے آپ کو دنیاوی مشکلات میں نہیں پھنساتا۔ وہ خالص نیت کے ساتھ مسلسل عمل کے ساتھ' اپنی طاقت کے حدود میں رہتے ہوئے' اپنے نصب العین کی طرف بڑھتا رہتا ہے۔ ان سب باتوں کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کوئی خوف اور کوئی لالچ اس کے نفس پر اثر انداز نہیں ہوسکتا۔ زندگی کے اس سفر کے مختلف مراحل میں سے کسی مرحلے میں بھی وہ بے چین نہیں ہو جاتا۔ اس لئے کہ ہر قدم پر وہ اللہ کی عبادت میں ہوتا ہے۔ وہ ہر خطرے کو انگیز کرتا ہے۔ اس لئے کہ وہی اس کا مقصد تخلیق ہے۔ غرض وہ ہر سرگرمی اور ہر میدان میں بلندیوں کی طرف بڑھتا چلا جاتا ہے۔ اپنے اللہ رب العالمین اور اپنے خالق کی سمت میں۔

مومن کا یہ شعور کہ وہ اللہ کی تقدیر کا ہمدم ہے۔ شاہراہ تقدیر پر گامزن ہے۔ وہ اللہ کی بندگی میں ہے' وہ ارادۂ الٰہی کا عملی مظہر ہے' اس کی روح پر طمانیت کی بارش کر دیتا ہے۔ اس کا پیمانہ دل سکون و قرار سے لبریز ہو جاتا ہے۔ کسی تحیر کے بغیر' کسی بے چینی کے بغیر' کسی جھنجلاہٹ کے بغیر اور مصائب و مشکلات کو خاطر میں لائے بغیر اپنے نشان منزل کی طرف رواں دواں ہوتا ہے۔ وہ اللہ کی اعانت اور نصرت سے مایوس نہیں ہوتا۔ اسے یہ خوف بھی نہیں رہتا کہ اس کا نصب العین نظروں سے اوجھل ہو جائے گا یا اس کا اجر ضائع ہو گا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے دشمنوں کے ساتھ' اللہ کے دشمنوں کے ساتھ برسر جنگ بھی ہوتا ہے لیکن اس کی روح میں ٹھہراؤ اور سکون ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ نہ جاہ و منصب کے لئے لڑ رہا ہوتا ہے' نہ دولت اور غنیمت کے لئے لڑتا ہے اور نہ اغراض دنیا میں سے کسی غرض کے لئے برسرپیکار ہے۔

قلب مومن یہ شعور لئے ہوئے ہے کہ وہ اس پوری کائنات میں سنت اللہ کا ہمقدم ہے۔ اس کا قانون قانون فطرت ہے۔ اس کا رخ اسی سمت ہے جو فطرت کائنات کی سمت ہے۔ پس اس کے اور اقوائے فطرت کے درمیان کوئی تصادم نہیں' حقائق فطرت کے ساتھ اس کی کوئی لڑائی نہیں۔ اس لئے مومن کی فطری قوتیں اور اس کائنات کی قوتیں ہم آہنگ ہو جاتی ہیں۔ ان کے درمیان ٹکراؤ کے نتیجے میں یہ قوتیں بکھر نہیں جاتیں۔ منتشر نہیں ہو جاتیں بلکہ اس کائنات کی تمام قوتیں ایک مسلمان کی قوتوں کے ساتھ آملتی ہیں۔ یہ قوتیں بھی اسی روشنی کے ساتھ منزل تلاش کرتی ہیں جس کے ساتھ مرد مومن تلاش کرتا ہے۔ غرض کائنات کی تمام قوتیں اللہ کی سمت میں رواں دواں ہیں اور مرد مومن بھی اس طرف رواں دواں ہے۔

اسلام نے' مسلمانوں کے لئے جو فرائض مقرر کئے ہیں وہ فطری ہیں' فطرت کی تصحیح کے لئے ہیں۔ سب کے سب انسانی طاقت کے حدود میں ہیں۔ ان میں انسان کے مزاج اور اس کے عناصر تکوینی کا پورا پورا لحاظ رکھا گیا ہے۔ اسلام انسان کی قوتوں میں سے کسی قوت کو بھی مہمل رہنے نہیں دیتا' ہر قوت کام میں لگی ہوتی ہے' نشوونما اور تعمیر و ترقی میں اپنا پارٹ ادا کر رہی ہوتی ہے۔ وہ انسان کی روحانی اور جسمانی ضروریات میں سے کسی کو نظر انداز نہیں کرتا' بلکہ وہ بڑی آسانی' بڑی نرمی' بڑی فراخ دلی کے ساتھ انسان کے تمام دواعی فطرت کو پورا کرتا ہے۔ اس لئے ان عبادات پر عمل پیرا ہوتے وقت اسے کوئی پریشانی نہیں ہوتی' بے چینی کا مقابلہ نہیں کرنا ہوتا۔ وہ ان عبادات و فرائض پر اپنی طاقت و قدرت کے مطابق عمل پیرا ہوتا ہے۔ اور بڑی طمانیت قلب کے ساتھ' بڑے روحانی سکون کے ساتھ مسلسل اپنی منزل طے کرتا چلا جاتا ہے۔ کدھر؟ اپنے خالق معبود کی طرف۔

اسلام' یعنی ربانی نظام زندگی جس معاشرے کو جنم دیتا ہے' وہ معاشرہ بھی امن و سلامتی کا مینار ہے۔ یہ مینار ایک اونچے مقام سے مسلسل امن و آشتی کی ضو پاشی کر رہا ہے۔ یہ معاشرہ اس نظام کے نتیجے میں پیدا ہوتا ہے۔ جس کی کونپلیں اس قیمتی اور حسین نظریۂ حیات کے

شجر سے پھوٹتی ہیں جو قلب مومن میں جاگزیں ہے 'یہ معاشرہ حفظ نفس' حفظ آبرو اور حفظ مال کی خدائی تحفظات (Guaranties) کے سائے میں نشوونما پاتا ہے۔

ایسا معاشرہ 'جس کے سپوت بھائی بھائی ہوں' ایک دوسرے کے ساتھ پیار کرنے والے ہوں' ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہوں' ایک دوسرے کا سہارا ہوں اور ایک دوسرے کے ساتھ اجتماعی طور پر ضامن (SocialSureties) ہوں اور جس کا ہر جزو دوسرے اجزاء کے ساتھ ہم آہنگ ہو۔ تاریخ میں ایک بار تو اسلام ایسے معاشرے کو عملاً وجود میں لایا۔ بہت اعلیٰ و امثل شکل میں' اپنی ترقی یافتہ صورت میں' اسلامی تاریخ کے بعد کے ادوار میں بھی ایسے معاشرے وجود میں آتے رہے جو اپنے معیار کے اعتبار سے بے شک بعض کم رہے 'بعض اچھے رہے 'لیکن اپنی کمزوریوں کے باوجود وہ ان تمام معاشروں سے اونچے رہے جو کبھی بھی وجود میں آئے' چاہے جاہلیت قدیمہ کے دور میں ہوں' چاہے جاہلیت جدیدہ کے دور میں ہوں بلکہ ان تمام معاشروں سے بھی جو اگرچہ جاہل نہ ہوں' لیکن ان میں جاہلیت کی آمیزش آگئی ہو۔ جو جاہلیت کے ساتھ آلودہ ہو چکے ہیں اور جن کی فکر میں اور جن کے نظم اجتماعی میں صرف دنیاوی تصورات ہی کارفرما ہوں۔

یہ معاشرہ یعنی اسلامی معاشرہ ایسا ہوتا ہے جس کے افراد و اجزاء میں صرف ایک رابطہ ہوتا ہے یعنی نظریۂ حیات کا رابطہ۔ یہ بہت ہی وسیع نظریاتی معاشرہ ہوتا ہے۔ تمام قومیات 'تمام ملکی حدود' تمام زبانیں اور تمام رنگ اس کے مقابلے میں پگھل کر فنا ہو جاتے ہیں۔ غرض تمام غلط افکار قومیت 'لسانیت' وطنیت اور رنگ و نسل کے تمام فکری فتنے جن کا انسان کی انسانیت کے ساتھ کوئی واسطہ نہیں ہوتا وہ سب کے سب پگھل کر اس وسیع الاساس اسلامی معاشرے میں جذب ہو جاتے ہیں۔

ذرا سنئے! اس معاشرے کے بارے میں اللہ کی ہدایات :"بے شک مومنین آپس میں بھائی بھائی ہیں-ا۔ اس معاشرے کی بہترین تصویر حضور ﷺ نے ایک مشہور حدیث میں کھینچی ہے :"باہمی محبت' باہمی رحم' باہمی مہربانی کے لحاظ سے' مومنین کی مثال ایک جسم واحد کی سی ہے۔ جسم میں سے ایک عضو بھی تکلیف میں ہو تو تمام جسم بے آرام ہوتا ہے۔ پورا جسم جاگتا ہے اور پورے جسم میں بخار کی حالت پیدا ہو جاتی ہے-۲۔

ذرا دیکھئے اس معاشرے کے عمومی آداب کیسے حسین ہیں اور جب کوئی احترام کے ساتھ تمہیں سلام کرے تو اس کو اس سے بہتر طریقہ کے ساتھ جواب دو یا کم از کم ۳- اسی طرح "اور لوگوں سے منہ پھیر کر بات نہ کر' نہ زمین میں اکڑ کر چل' اللہ کسی خود پسند اور فخر جتانے والے شخص کو پسند نہیں کرتا ۴۔ بدی کو نیکی سے رفع کر جو بہترین ہو۔ 'تم دیکھو گے کہ تمہارے ساتھ جس کی عداوت پڑی ہوئی تھی' وہ جگری دوست بن گیا۔"۵۔ "اے لوگو! جو ایمان لائے ہو' نہ مرد دوسرے مردوں کا مذاق اڑائیں' ہو سکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں' اور نہ عورتیں دوسری عورتوں کا مذاق اڑائیں' ہو سکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں۔ آپس میں ایک دوسرے پر طعن نہ کرو اور نہ ایک دوسرے کو برے القاب سے یاد کرو۔ ایمان لانے کے بعد فسق میں نام پیدا کرنا بہت بری بات ہے اور جو لوگ اس روش سے باز نہ آئیں وہ ظالم ہیں۶۔ "اور تم میں سے کوئی کسی کی غیبت نہ کرے گا؟ دیکھو تم خود اس سے گھن کھاتے ہو۔ اللہ سے ڈرو' اللہ بڑا توبہ قبول کرنے والا ہے رحیم ہے ۷۔

یہ معاشرہ ایسا ہے جو اپنے کو یہ ضمانتیں (Securities) دیتا ہے :"اے لوگو جو ایمان لائے ہو' اگر کوئی فاسق تمہارے پاس کوئی خبر لے کر آئے' تو تحقیق کر لیا کرو' کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی گروہ کو نادانستہ نقصان پہنچا بیٹھو اور پھر اپنے کئے پر پشیمان ہو۔"

ا۔ سورۃ الحجرات ۱۰۔ ۲۔ روایت امام احمد۔ ۳۔ نساء ۸۶۔ ۴۔ لقمان ۱۸۔ ۵۔ حم سجدہ ۳۴۔ ۶۔ الحجرات ۱۱۔ ۷۔ الحجرات ۱۲

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو' بہت گمان کرنے سے پرہیز کرو کہ بعض گمان گناہ ہوتے ہیں۔ تجسس نہ کرو"۔ "اے لوگو جو ایمان لائے ہو' اپنے گھروں کے سوا دوسرے گھروں میں داخل نہ ہوا کرو جب تک گھر والوں کی رضا نہ لے لو' اور گھر والوں پر سلام نہ بھیج دو۔ ا۔" ہر مسلمان دوسرے مسلمان پر حرام ہے یعنی اس کا خون' اس کی عزت اور اس کا مال۔"

یہ پاک معاشرہ ایسا ہے کہ اس میں فحاشی نہیں پھیل سکتی۔ اس میں بے حیائی کو پسند نہیں کیا جاتا۔ اس میں فتنے کا رواج نہیں۔ اس میں عریانی نہیں پھیلتی۔ آنکھیں پوشیدہ مقامات جسم کی طرف ملتفت ہی نہیں ہوتیں۔ اس میں لوگوں کی عصمتیں آزاد شہوت رانی سے محفوظ ہوتی ہیں۔ اس میں جنسی خواہشات اور خون اور گوشت کا ملاپ اس طرح آزاد نہیں ہوتا جس طرح نظام جاہلیت میں ہوتا ہے' خواہ جاہلیت قدیمہ ہو یا جدیدہ۔ اس سلسلے میں اس اسلامی معاشرہ پر ربانی ہدایات کی حکمرانی ہوتی ہے اور وہ ہروقت اپنے رب کی بات سنتا ہے۔ آپ بھی سنیں :"جو لوگ چاہتے ہیں کہ ایمان لانے والوں کے گروہ میں فحاشی پھیلے وہ دنیا اور آخرت میں دردناک سزا کے مستحق ہیں۔ اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے ۲۔" زانیہ عورت اور زانی مرد' دونوں میں سے ہر ایک کو سو کوڑے مارو۔ اور ان پر ترس کھانے کا جذبہ اللہ کے دین کے معاملے میں تم کو دامن گیر نہ ہو۔ اگر تم اللہ تعالیٰ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہو اور ان کو سزا دیتے وقت اہل ایمان کا ایک گروہ موجود رہے۔" ۳۔

"اور جو لوگ پاکدامن عورتوں پر تہمت لگائیں' پھر چار گواہ لے کر نہ آئیں' ان کو اسی کوڑے مارو اور ان کی شہادت کبھی قبول نہ کرو' اور وہ خود ہی فاسق ہیں۔" ۴۔ "اے نبی مومنین مردوں سے کہو کہ اپنی نظریں بچاکر رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں' یہ ان کے لئے زیادہ پاکیزہ طریقہ ہے' جو کچھ وہ کرتے ہیں اللہ اس سے باخبر رہتا ہے' اور اے نبی مومن عورتوں سے کہہ دو کہ اپنی نظر بچاکر رکھیں' اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں اور اپنا بناؤ سنگھار نہ دکھائیں بجز اس کے کہ جو خود ظاہر ہو جائے اور اپنے سینوں پر اپنی اوڑھنیوں کے آنچل ڈالے رہیں۔ وہ اپنے بناؤ سنگھار نہ ظاہر کریں مگر ان لوگوں کے سامنے شوہر' باپ' شوہروں کے باپ' اپنے بیٹے' شوہروں کے بیٹے' بھائی' بھائیوں کے بیٹے' بہنوں کے بیٹے' اپنے میل جول کی عورتوں' اپنے لونڈی غلام' وہ زیردست مرد جو کسی اور قسم کی غرض نہ رکھتے ہوں اور وہ بچے جو عورتوں کی پوشیدہ باتوں سے ابھی واقف نہ ہوئے ہوں۔ وہ اپنے پاؤں زمین پر مارتی ہوئی نہ چلا کریں کہ اپنی جو زینت انہوں نے چھپا رکھی ہو' اس کا لوگوں کو علم ہو جائے۔ اے مومنو! تم سب مل کر اللہ سے توبہ کرو' توقع ہے کہ فلاح پاؤ گے۔ "۵۔ پھر قرآن مجید خود حضور ﷺ کی عورتوں سے بھی خطاب کرتا ہے جو کرۂ ارض پر پاکیزہ ترین عورتیں تھیں' پاکیزہ ترین گھر' پاکیزہ ترین خاندان میں اور پھر پاکیزہ ترین دور میں۔

"نبی کی بیویو! تم عام عورتوں کی طرح نہیں ہو۔ اگر تم اللہ سے ڈرنے والی ہو تو دبی زبان سے بات نہ کیا کرو کہ دل کی خرابی کا مبتلا کوئی شخص لالچ میں پڑ جائے بلکہ صاف سیدھی بات کرو۔ اپنے گھروں میں ٹک کر رہو اور سابق دور جاہلیت کی سی سج دھج نہ دکھاتی پھرو۔ نماز قائم کرو' زکوٰۃ دو' اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو' اللہ تو یہ چاہتا ہے کہ تم اہل بیت نبی سے گندگی کو دور کرے اور تمہیں پوری طرح پاک کردے۔" ۶۔

ایسے معاشرہ میں بیوی کو خاوند پر اعتماد ہوتا ہے۔ خاوند کو بیوی پر اعتماد ہوتا ہے۔ والدین و سرپرست اپنی حرمتوں اور عصمتوں کے بارے میں مطمئن ہوتے ہیں۔ لوگوں کو اپنے دلوں اور اپنے اعصاب پر اعتماد ہوتا ہے۔ نظروں سے فتنے اوجھل ہوتے ہیں' اس لئے وہ دلوں کو ممنوعات کی طرف کھینچ ہی نہیں سکتیں۔ اس کے مقابلے میں آج کل کے مغربی ممالک کا حال یہ ہے کہ

۱۔ النور ۲۷۔ ۲۔ نور ۱۹۔ ۳۔ نور: ۴۔ النور ۳۱۔ ۵۔ الاحزاب ۳۳۔

دز دیدہ نگاہوں کا تبادلہ ہروقت ہوتا رہتا ہے۔ اس معاشرے کے افراد کو ہروقت خواہشات کو دبانا پڑتا ہے۔ جس کے نتیجے میں وہ کئی قسم کی نفسیاتی بیماریوں کا شکار ہوتے ہیں۔ ان کے اعصاب میں ہروقت تناؤ ہوتا ہے جبکہ اسلام کا پاکیزہ اور عفت مآب معاشرہ ہروقت تھما ہوا ہے۔ اس معاشرے پر ہروقت امن' پاکیزگی اور سلامتی کے کشادہ پردوں کا سایہ ہوتا ہے۔

اور سب سے آخر میں یہ کہ معاشرہ ہر اس شخص کو جو کام کرنے کی قدرت رکھتا ہے' رزق حلال اور روزگار کی ضمانت دیتا ہے۔ یہ معاشرہ ہر معذور شخص کو شریفانہ زندگی اور مناسب ضروریات زندگی کی ضمانت دیتا ہے۔ جو شخص عفت اور پاکدامنی کی زندگی بسر کرنا چاہتا ہے' اس معاشرے میں اس کے لئے جائز نکاح کی سہولتیں ہوتی ہیں۔ اسے صالح رفیقہ حیات ملتی ہے۔ یہ ایسا معاشرہ ہوتا ہے کہ اگر اس کے کسی محلے میں کوئی بھوک سے مرجائے تو وہ تمام محلہ کو اس موت کا قانوناً ذمہ دار ٹھہراتا ہے۔ اور ان پر تعزیری سزا عائد کرتا ہے' بعض فقہاء اور قانون دانوں نے لکھا ہے کہ اہل محلہ کو بطور تاوان اس شخص کی دیت ادا کرنی ہوگی۔

اور پھر ایک نئے پہلو سے دیکھئے' یہ معاشرہ اپنے افراد کو شہری آزادیوں کی ضمانت دیتا ہے۔ اس میں لوگوں کی شرافت' ان کی عزتیں اور ان کے جان و مال ازروئے قانون محفوظ ہوتے ہیں۔ اس بات کی ضمانت خود شارع مطلق رب ذوالجلال دیتا ہے' جو مطاع ہے اور اس معاشرے میں اس کی ہربات قانون ہے۔ لہٰذا اس معاشرے میں محض شک کی بناپر کوئی نہ پکڑا جائے گا۔ کسی کی دیوار پھاند کر کوئی کسی کا حق تنہائی چھین نہ لے گا۔ کوئی شخص کسی کے خلاف تجسس نہ کر سکے گا۔ اس معاشرے میں اگر کسی کا خون بہا تو وہ لغو نہ جائے گا بلکہ قصاص نافذ ہوگا۔ کسی کا مال چوری یا ڈاکے میں نہ جائے گا کیونکہ اس میں حدود نافذ ہیں۔

اور پھر اس معاشرے کا سیاسی نظام شوریٰ (Parliament) تعاون اور آزادی رائے اور ضمانت حق تنقید (نصیح) پر قائم ہوتا ہے۔ اس معاشرے میں انصاف اور قانون کی نظروں میں سب لوگ برابر ہوتے ہیں۔ اس کا ہر فرد یہ شعور رکھتا ہے کہ اس کے بارے میں ہر قانونی فیصلہ اللہ کی جانب سے ہے۔ اللہ کے قانون کا فیصلہ ہے' اس میں نہ حاکم وقت کا دخل ہے' نہ اس کے کسی حاشیہ نشین کا دخل ہے اور نہ ہی اہل کاران سرکار کے رشتہ داروں کا دخل۔

الغرض پورے انسانی معاشروں میں یہ واحد معاشرہ ہے' جس میں انسان' انسان کے تابع نہیں ہے' بلکہ تمام انسان حاکم ہوں یا محکوم ہر صورت میں اللہ اور اس کی شریعت کے تابع ہیں۔ حاکم ہوں کہ محکوم دونوں اللہ کی شریعت کو نافذ کرتے ہیں' چنانچہ سب کے سب برابری اور مساوات کے ساتھ' پورے ایمان' پورے یقین اور پورے وثوق کے ساتھ' اللہ رب العالمین اور احکم الحاکمین کے سامنے قدم بقدم کھڑے ہوتے ہیں۔

یہ سب معانی السلم کے مفہوم میں داخل ہوتے ہیں' جو آیت میں استعمال ہوا ہے اور جس میں مومنین کو پورا پورا داخل ہونے کی دعوت دی گئی ہے تاکہ وہ اپنے نفس کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیں۔ پورے کے پورے سپرد کر دیں۔ اس طرح کہ ان کے لئے ان کے نفس کا کچھ حصہ بھی نہ رہے۔ سب کا سب اللہ کا ہو جائے' اطاعت و انقیاد میں اور تسلیم و رضا میں۔

امن و سلامتی کے اس مفہوم کا صحیح ادراک تب ہی ہو سکتا ہے جب ہم ان معاشروں کا مطالعہ کریں' جو اسلام سے متعارف نہیں ہیں یا اسلام سے متعارف تو ہیں لیکن پھر بھی اس سے بیگانہ ہو گئے ہیں اور دوبارہ نظام جاہلیت کی طرف پلٹ گئے ہیں اور مختلف ادوار میں انہوں نے اپنے لئے مختلف نام اور مختلف عنوان تجویز کئے۔ ان معاشروں کی حالت یہ ہے کہ وہ بے یقینی میں مبتلا ہیں۔ ایمان سے خالی ہیں۔ ان کے افراد نفسیاتی اور اعصابی پریشانیوں اور بے چینیوں کا شکار ہیں۔ یہ معاشرے تہذیبی ترقی کے اعلیٰ معیار تک پہنچے ہوئے ہیں۔ ان میں ساری سہولتیں اپنے انتہا کو پہنچی ہوئی ہیں اور وہ تمام سہولتیں وافر ہیں جنہیں کوئی بھی گم کردہ راہ جاہلی تہذیب ترقی کیلئے ضروری سمجھتی ہو۔

اس مثال کا مطالعہ کیجئے۔ سویڈن دنیا کے تمام ممالک کے مقابلے میں زیادہ ترقی یافتہ ہے جس کے ہر فرد پر قومی دولت سے پانچ سو پونڈ سالانہ خرچ کیا جاتا ہے۔ جہاں ہر آدمی کے لئے علاج و معالجے کی ضمانت حاصل ہے۔ جہاں علاج کیلئے نقد رقم دی جاتی ہے' اور ہسپتالوں میں علاج مفت ہے۔ جہاں ہر مرحلہ تعلیم میں تعلیم بالکل مفت ہے' جہاں ہر طالب علم کو کپڑوں کا الاؤنس دیا جاتا ہے۔ اور لائق طالب علموں کو قرض بھی دیا جاتا ہے' جہاں حکومت تین سو پونڈ شادی الاؤنس دیتی ہے تاکہ گھریلو سامان خرید ا جا سکے۔ غرض ان کے علاوہ متعدد سہولیات اور آسانیاں ہیں جو وہاں عوام کو میسر ہیں لیکن اس مادی ترقی اور تہذیبی سہولتوں کے نتائج کیا ہے؟ جبکہ ان فرزندان تہذیب کے دل ایمان سے خالی ہیں۔

اس قوم کا حال یہ ہے کہ آزادانہ جنسی اختلاط کی وجہ سے جسمانی لحاظ سے پوری قوم مسلسل روبزوال ہے۔ آزادانہ جنسی اختلاط' فتنہ انگیز عریانی اور آزادانہ جنسی بے راہ روی کی وجہ سے ہر چھٹی شادی طلاق پر منتج ہوتی ہے۔ا۔ جدید نسل بری طرح منشیات کی عادی ہو چکی ہے۔ ان منشیات کے استعمال سے یہ لوگ اس روحانی خلا کو بھرتے ہیں اور بے یقینی کے نتیجے میں پیدا ہونے والے عدم اطمینان کا نعم البدل تلاش کرتے ہیں۔ نفسیاتی بیماریاں' اعصابی بیماریاں اور جنسی بیماریاں وبا کی طرح ان کے دماغ' ان کے اعصاب اور ان کی روح پر حملہ آور ہیں اور ہزاروں آدمی ان میں بری طرح مبتلا ہیں۔ اس بے چینی کی انتہا اس وقت ہوتی ہے' جب ایک شخص تنگ آکر خودکشی کا فیصلہ کرتا ہے۔

امریکہ کا حال بھی ایسا ہے بلکہ اس سے بھی بدتر ہے۔ اور روس کے حالات تو اس سے بھی بدتر ہیں۔

یہ تلخی اور بدبختی مقدر ہے ہر اس شخص کے لئے جس کا دل فرحت ایمان سے خالی ہے' بشاشت ایمانی سے خالی۔ ایسا شخص ہرگز امن و سلامتی سے لطف نہیں اٹھا سکتا' جس میں پوری طرح داخل ہونے کی دعوت' مسلمانوں کو دی جا رہی ہے تاکہ وہ اس کے سائے میں امن و آرام اور قرار و سکون سے خوش و خرم رہیں۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَاۗفَّةً ۠ وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ۭ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ "اے ایمان والو! تم پورے کے پورے اسلام میں' امن میں داخل ہو جاؤ اور شیطان کی پیروی نہ کرو' کہ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔"

اس دعوت کے ساتھ ساتھ کہ تم پورے کے پورے' اس امن و سلامتی (اسلام) میں داخل ہو جاؤ' مسلمانوں کو خبردار کیا جا رہا ہے کہ تم ہرگز شیطان کی پیروی نہ کرنا۔ کیونکہ راستے دو ہی ہیں۔ ایک اسلام کا' سلامتی کا راستہ اور دوسرا شیطان کے نقش قدم والا راستہ۔ ایک طرف ہدایت کی راہ ہے' دوسری طرف گمراہی کی راہ ہے۔ ایک طرف اسلام ہے' اور دوسری طرف جاہلیت ہے۔ یا اللہ کا راستہ یا شیطان کا راستہ یا اللہ کی ہدایت ہے اور یا شیطان کی غوایت ہے۔ مسلمان کو چاہئے کہ وہ اپنے موقف کے فیصلہ کن انداز کو اچھی طرح سمجھے' چنانچہ اس سلسلے میں وہ کسی تردد' کسی حیرانی کو قریب نہ آنے دے اور مختلف راستوں کو دیکھ کر ایک منٹ کے لئے بھی متحیر نہ ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ ایک مومن کو یہ آزادی نہیں دی گئی کہ وہ زندگی کے متعدد نظاموں میں سے کسی ایک نظام حیات کو اپنے لئے چن لئے۔ یا ایک دو نظاموں کے اجزا کو ملا کر ایک تیسرا نظام گھڑ لے۔ اس کے لئے صرف دو راستے ہیں' حق ہے یا باطل' ہدایت ہے یا ضلالت' اسلام ہے یا جاہلیت' اللہ کا نظام زندگی ہے یا شیطان کی گمراہی ہے ہے۔ یہاں اس آیت میں ایک تو اللہ مسلمانوں کو یہ دعوت دیتا ہے کہ وہ پورے کے پورے سلامتی کے اس نظام میں آجائیں۔ دوسرے انہیں اس بات سے منع کرتا ہے کہ وہ شیطان کی پیروی کریں۔ یہاں ان

ا۔ یاد رہے کہ ایک فرد بار بار شادی کرتا ہے اس لئے کوئی فرد ایسا نہیں رہتا جس نے کبھی طلاق نہ دی ہو یا طلاق نہ لی ہو۔ الا ماشاء اللہ

کے ضمیر اور شعور کو بیدار کیا جارہا ہے۔ انہیں شیطان کی جدی عداوت یاد دلا کر چوکنا کیا جارہا ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ شیطان کی تمہارے ساتھ جو دشمنی ہے وہ کوئی پوشیدہ اور چھپی ہوئی دشمنی نہیں ہے۔ یہ بالکل بین اور واضح ہے۔ اسے تو صرف وہ شخص بھول سکتا ہے جو غافل ہو۔ اور غفلت اور ایمان ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔

اب بتایا جاتا ہے کہ اگر ان ہدایات اور واضح ہدایات کے بعد بھی تم لغزش کھاتے ہو تو تمہارا انجام اچھا نہ ہو گا۔ فَاِنْ زَلَلْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْكُمُ الْبَيِّنٰتُ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ "جو صاف صاف ہدایات تمہارے پاس آچکی ہیں' اگر ان کے پا لینے کے بعد پھر تم نے لغزش کھائی' تو خوب جان رکھو کہ اللہ سب پر غالب اور حاکم ہے۔"

وہ عزیز ہے اور غالب ہے۔ اشارہ اس طرف ہے کہ وہ قوت' قدرت اور غلبے کا مالک ہے۔ اگر وہ اللہ کی ہدایات کی خلاف ورزی کریں گے تو انہیں اللہ کی قوت قاہرہ کا سامنا کرنا ہو گا۔ اور وہ حکیم ہے' صاحب حکمت ہے۔ اشارہ اس طرف ہے کہ اس نے تمہارے لئے جو نظام زندگی تجویز کیا ہے' وہ بہتر ہے اور جس سے اس نے تمہیں روکا ہے وہ دراصل تمہارے لئے برا ہے اور اگر وہ اللہ کے احکام کی پیروی نہیں کریں گے اور اس کی منع کی ہوئی چیزوں سے نہیں بچیں گے تو انہیں سخت خسارہ ہو گا۔ اس لئے اس **تعقیب** اور خلاصے کے دونوں حصے دراصل سخت تنبیہ ہیں اور ایک ڈراوا ہے۔

اب یہاں سے تنبیہ و تخویف کے لئے ایک جدید اسلوب اختیار کیا جاتا ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ اسلام میں پورے پورے نہ آنے اور شیطان کی پیروی اختیار کرنے پر نتائج کیا ہو سکتے ہیں۔ اب خطاب کا انداز ترک کر کے غائب کے **صیغے** استعمال کئے جاتے ہیں۔

هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِيْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَ الْمَلٰٓئِكَةُ وَ قُضِيَ الْاَمْرُ ؕ وَ اِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴿۲۱۰﴾

۲۵
ع ۱۴
۹

"کیا اب وہ اس کے منتظر ہیں کہ اللہ بادلوں کا چتر لگائے' فرشتوں کے پرے ساتھ لئے' خود سامنے آموجود ہو اور فیصلہ ہی کر ڈالا جائے۔ آخر کار سارے معاملات پیش تو اللہ ہی کے حضور ہونے والے ہیں۔"

ھل' کے لفظ کے ساتھ عربی میں ایسا سوال ہوتا ہے جس میں ناپسندیدگی کا اظہار بھی ہو۔ اس کے جواب میں وہ وجوہات بیان کی گئی ہیں جن کی وجہ سے بعض مخالفین' اسلام کو قبول کرنے میں پس و پیش کر رہے ہیں اور پورے کے پورے اسلام میں داخل نہیں ہوتے۔ وہ کیا وجہ ہے جس کی وجہ سے وہ اسلام کی اس دعوت کو قبول نہیں کرتے؟ وہ کس چیز کا انتظار کر رہے ہیں۔ یہ اسی طرح بغیر کسی وجہ کے انتظار کرتے رہیں گے' اور اللہ تعالیٰ بادلوں کا چتر لگائے آجائے گا۔ فرشتے آجائیں گے؟ بالفاظ دیگر' کیا یہ لوگ اس خوفناک دن کا انتظار کر رہے ہیں جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے کہ اللہ بادلوں کا چتر لگائے ہوئے آئیں گے اور فرشتے صفیں باندھے ہوئے ہوں گے کوئی بات نہ کرے گا۔ مگر وہ شخص جسے بات کی اجازت ہو گی اور وہ بات بھی درست کر رہا ہو گا۔

اچانک...... ہم اس تہدید آمیز سوال کے بارے میں سوچ ہی رہے تھے کہ اچانک کیا دیکھتے ہیں کہ گویا وہ دن پہنچ ہی گیا اور فیصلہ ہو ہی گیا۔ معاملہ ختم ہی ہو گیا۔ لوگوں کے سامنے اچانک وہ منظر آجاتا ہے' جس سے انہیں ڈرایا جارہا تھا۔ جس کی طرف اشارہ ہو رہا تھا۔

قُضِيَ الْأَمْرُ ("اور فیصلہ ہو ہی گیا") وقت کا دفتر لپیٹ کر رکھ دیا گیا۔ فرصت کے اوقات ختم ہو گئے۔ نجات مشکل ہو گئی۔ اب تو گویا لوگ اللہ میاں کے سامنے کھڑے ہیں۔ اس اللہ کے سامنے جس کے آگے سارے معاملات کو پیش ہونا ہے: وَ إِلَى اللَّهِ تُرْجَعُ الْأُمُوْرُ "تمام امور نے اللہ کے حضور پیش ہونا ہے۔"

یہ قرآن مجید کا ایک انوکھا انداز ہے۔ تمام دوسری تقاریر اور تحریروں سے یہ انداز اسے امتیازی حیثیت دیتا ہے۔ وہ طریقہ یہ ہے کہ قرآن مجید' چند لمحوں کے اندر اندر اچانک کسی بھی منظر کو زندہ و متحرک صورت میں پیش کرتا ہے۔ انسان یہ محسوس کرتا ہے کہ گویا وہ اس منظر کے سامنے کھڑا ہے اور وہ دیکھتا ہے' سنتا ہے' اور اپنی آنکھوں سے گویا اس منظر کا معائنہ کر رہا ہے۔

کب تک یہ لوگ پیچھے رہیں گے اور اس سلامتی میں داخل نہ ہوں۔ خوفناک دن ان کے انتظار میں ہے۔ بلکہ وہ اچانک ان پر آنے ہی والا ہے۔ اور سلامتی ان کے قریب ہے۔ دنیا کی سلامتی اور آخرت کی سلامتی' جس دن آسمان پر بادل پھٹے پھٹے ہوں گے اور فرشتے اتر رہے ہوں گے۔ جس دن روح اور ملائکہ صف بستہ کھڑے ہوں گے' کوئی نہ بولے گا سوائے اس کے جسے رحمان اجازت دے اور جو ٹھیک بات کہے' وہ دن جب اللہ فیصلے کرے گا۔ وہ دیکھو گویا اس نے معاملات چکا دیئے اور سب معاملات کو آخر کار اللہ کے حضور پیش ہونا ہی ہے۔ وَ إِلَى اللَّهِ تُرْجَعُ الْأُمُوْرُ

اب انداز کلام میں اچانک ایک اور تبدیلی آتی ہے۔ روئے سخن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جاتا ہے۔ آپ ﷺ سے کہا جاتا ہے کہ ذرا بنی اسرائیل سے تو پوچھئے' بنی اسرائیل ان لوگوں کے سرخیل تھے جو دعوت اسلامی کو قبول کرنے میں متردد تھے اور پس و پیش کرتے تھے۔ اسی صورت میں ان کے بارے میں کہا گیا ہے "اللہ نے بے شمار واضح نشانیاں انہیں دکھائیں لیکن پھر بھی انہوں نے دعوت کو قبول نہ کیا۔ لیکن انہوں نے ایمان کی نعمت اور سلامتی کی نعمت کے مقابلے میں کفر کو اختیار کیا۔ حالانکہ یہ انعامات بذریعہ رسول خود ان کے ہاں بھیجی گئیں تھیں۔

سَلْ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ كَمْ اٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ اٰيَةٍ بَيِّنَةٍ ؕ وَ مَنْ يُّبَدِّلْ نِعْمَةَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۲۱۱﴾

"بنی اسرائیل سے پوچھو کیسی کھلی کھلی نشانیاں ہم نے انہیں دکھائی ہیں (اور پھر یہ بھی انہی سے پوچھ لو کہ) اللہ کی نعمت پانے کے بعد جو قوم اس کو شقاوت سے بدلتی ہے اسے کیسی سخت سزا دیتا ہے۔"

بات پھر بنی اسرائیل کی طرف پلٹتی ہے اور یہ ایک قدرتی امر ہے۔ ڈرایا جاتا ہے کہ بنی اسرائیل جیسا موقف اختیار نہ کرو' اس میں تو ہلاکت ہے۔ جو تردد اور انکار حق کا موقف ہے۔ بغاوت اور سلامتی سے دور بھاگنے کا موقف ہے۔ ہٹ دھرمی اور بار بار طلب معجزات کا موقف اور معجزات دیکھ کر بھی بغض و عناد رکھنے اور انکار کرتے چلے جانے کا موقف۔ یہ ہیں وہ مقامات جہاں یہ قدم ڈگمگا سکتے ہیں' پائے استقامت پھسل سکتا ہے' اس لئے اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو پہلے سے خبردار کر دیتا ہے' تاکہ مسلمان بنی اسرائیل کی طرح تلخ انجام تک نہ پہنچ جائیں۔

سَلْ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ كَمْ اٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ اٰيَةٍ بَيِّنَةٍ بنی اسرائیل سے پوچھو کیسی کھلی کھلی نشانیاں ہم نے انہیں دکھائی ہیں۔"
سوال سے مراد یہ نہیں ہے کہ حضور ﷺ جائیں اور بنی اسرائیل سے سوال کریں اور وہ پھر کوئی جواب دیں۔ یہ تو اسالیب قرآن

میں سے ایک اسلوب ہے' مقصد یہ یاد دلانا ہے کہ بنی اسرائیل کے سامنے بکثرت معجزات پیش کیے گئے۔ بے شمار کھلی نشانیاں ان کے سامنے آتی رہیں۔ بعض نشانیاں تو ان کی ضد اور مطالبے پر دکھائی گئیں اور بعض معجزات اللہ تعالیٰ نے از خود اس وقت کی کسی مصلحت کی خاطر صادر فرمائے' لیکن کثرت معجزات کے باوجود ان کا طرز عمل کیا تھا' تردد اور وعدہ خلافی' ہٹ دھرمی اور پس و پیش کرنا لیکن مسلسل یہ لوگ امن و سلامتی کے اس سایہ سے دور رہے جو صرف حظیرہ ایمان پر سایہ فگن ہے۔ ——— اس پر ایک عام تعقیب آتی ہے وَ مَنۡ یُّبَدِّلۡ نِعۡمَۃَ اللّٰہِ مِنۡۢ بَعۡدِ مَا جَآءَتۡہُ فَاِنَّ اللّٰہَ شَدِیۡدُ الۡعِقَابِ اللہ کی نعمت پا لینے کے بعد جو قوم اسے شقاوت سے بدلتی ہے' اسے اللہ سخت سزا دیتا ہے۔" یہاں جس نصیحت کا ذکر ہو رہا ہے وہ نصیحت اسلام ہے یا اس سے مراد ایمان کی نعمت ہے۔ دونوں تقریباً مترادف ہیں۔ اللہ کی نعمت کو شقاوت سے بدل دینے کی اعلیٰ ترین مثال تاریخ بنی اسرائیل میں ملے گی۔ جب انہوں نے نعمت کو شقاوت سے بدلا تو اطمینان اور سکون و قرار سے محروم ہو گئے۔ انہوں نے تسلیم و رضا سے انکار کر دیا۔ اللہ تعالیٰ کی ہدایات کے سامنے سر تسلیم خم نہ کیا۔ انہوں نے ہمیشہ شک اور تردد کا رویہ اپنایا۔ قدم قدم پر معجزات طلب کرتے رہے۔ ہر مرحلے پر دلائل پوچھتے رہے لیکن نہ معجزات سے انہیں اطمینان ہوا نہ دلائل بینات سے وہ قائل ہوئے۔ نہ انہوں نے اللہ کے نور اور ہدایت سے استفادہ کیا۔ اور "اللہ کے عذاب شدید سے ڈرو" اس کی اعلیٰ ترین مثال بھی تاریخ بنی اسرائیل ہے۔ اور اس کے انجام بد کا انتظار وہ سب لوگ' ہر دور میں اور ہر جگہ کرتے ہیں جو نعمت اسلام کے مقابلے میں شقاوت اور بدبختی کو اختیار کرتے ہیں اور پھر وہ اس پر فخر کرتے ہیں (تاریخ شاہد ہے کہ ایسے لوگ ایسے ہی انجام سے دوچار ہوئے جس طرح بنی اسرائیل)

انسانیت نے جب بھی اس نعمت عظمیٰ کو بیچ کر شقاوت اور بدبختی حاصل کی' سے آخرت سے بھی پہلے اس کی اس دنیاوی زندگی میں سخت سے سخت سزا دی گئی۔ ذرا کرۂ ارض پر پھیلی ہوئی اس بدبخت انسانیت کی حالت زار پر تو نگاہ ڈالئے! کیا وہ ایک شدید عذاب میں مبتلا نہیں ہے؟ دیکھتے نہیں کہ وہ ہر جگہ بدبختی اور تلخی ہی پاتی ہے۔ ہر جگہ حیرت و اضطراب کا شکار ہے۔ انسان' انسان کو کھائے جا رہا ہے بلکہ انسان خود اپنی جان اور اپنے اعصاب کو کھائے جا رہا ہے۔ فرد انسانیت کی تلاش میں دوڑتا ہے۔ اور انسانیت فرد کی متلاشی ہے۔ لیکن دونوں خالی سراب کے پیچھے بھاگ رہے ہیں۔ غرض عالم انسانیت میں اس وقت ایک مہلک خلا ہے۔ اس خلا کو بعض نام نہاد تہذیب مغرب کے فرزند بھرنے کی کوشش کرتے ہیں' مگر کبھی مسکرات کے استعمال سے اور کبھی منشیات کے کثرت استعمال سے۔ بعض اوقات ان لوگوں سے ایسی حرکات ہو جاتی ہیں کہ انسان حیران ہو جاتا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ وہ بھاگ رہے ہیں اور کوئی خوفناک غول ان کے تعاقب میں ہے۔

فرزندان تہذیب مغرب کی صرف شکل و صورت ہی کا مطالعہ کیجئے۔ یہ عجیب عجیب شکلیں بناتے ہیں' اور پھر ان کی نمائش کرتے ہیں۔ کوئی عورت سر جھکائے ہوئے ہے۔ کسی نے سینہ بالکل ننگا کر رکھا ہے' کوئی منی سکرٹ پہنے ہوئے ہے' کسی نے ایسا ٹوپ بنایا ہے جیسے کوئی حیوان سر پر رکھا ہوا ہے۔ بعض نے ایسی ٹائیاں باندھ رکھی ہیں' جن پر ہاتھی کی تصویر ہے' ایسی قمیصیں پہنی ہیں جن پر شیر یا ریچھ کی تصویر ہے۔

دراصل ایک نظر دیکھئے! ان کے مجنونانہ رقص' ہیجان انگیز گانے' متکلفانہ طرز زندگی' تقریبات اور مجالس میں شوخ لباس' انوکھی اور جاذب نظر شکلیں بنا کر لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنا' اور عجیب و غریب طرح اپنے آپ کو ممتاز کر کے جذبات کی تسکین کرنا۔

ایک نظر ان لوگوں کی بدلتی ہوئی خواہشات پر بھی ڈالئے۔ خواہشات بدل جاتی ہیں' خاوند بدل جاتے ہیں' دوست بدل جاتے ہیں' لباس بدل جاتے ہیں' ہر موسم میں' بلکہ ہر صبح و شام میں۔

یہ سب چیزیں ظاہر کرتی ہیں کہ یہ معاشرہ قلق اور بے چینی اور حیرت و اضطراب میں مبتلا ہے۔ جس میں کوئی اطمینان نہیں ہے۔

جس میں کوئی امن نہیں ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان اقوام کی حالت خوفناک حد تک گر گئی ہے۔ چنانچہ لوگ اپنے معاشرے اور اپنی تہذیب سے فرار کی راہ اختیار کئے ہوئے ہیں۔ لیکن افسوس کہ وہ کوئی راہ نہیں پاتے۔ یوں لگتا ہے جیسے فرزندان تہذیب کی روح خالی ہے 'خود اپنے سایے سے بھاگ رہے ہیں 'گویا کہ جنات اور بھوت ان کا پیچھا کر رہے ہیں۔

کیا یہ عذاب الٰہی نہیں ہے۔ یقیناً یہ عذاب ہے اور ہر اس شخص کے لئے ہے جو اسلامی نظام زندگی اختیار نہیں کرتا۔ جو اللہ کی یہ پکار نہیں سنتا يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَافَّةً "اے ایمان لانے والو! امن و سلامتی میں داخل ہو جاؤ پورے کے پورے۔"

غرض اللہ کے انعامات پر پختہ یقین کسی چیز سے بھی نہیں بدلتا۔ الا یہ کہ کسی کو خداوند کریم کا یہ عذاب گھیر لے تو یقیناً پختہ ایمان ختم ہو جاتا ہے۔ العیاذ باللہ۔

اس سے پہلے بیان ہوا کہ جو لوگ دعوت اسلامی قبول کرنے میں پس و پیش کر رہے ہیں اور نعمت کے مقابلے میں شقاوت اور بدبختی لے رہے ہیں' ایک سخت عذاب ان کے انتظار میں ہے۔ اب یہاں بتایا جاتا ہے کہ مسلمانوں کی جنت کیا ہے اور ان کا انجام کیا ہوگا اور کافروں کا حال کیا ہے اور ان کا انجام کیا ہوگا؟ بتایا جاتا ہے کہ اشخاص کی قدر و قیمت معلوم کرنے اور احوال اور اقدار حیات کے ناپ تول کے لئے مسلمانوں کا ترازو کیا ہے؟ اور کافروں کا ترازو کیا ہے؟

زُيِّنَ لِلَّذِينَ كَفَرُوا الْحَيَوٰةُ الدُّنْيَا وَيَسْخَرُونَ مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ اتَّقَوْا فَوْقَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَاللَّهُ يَرْزُقُ مَنْ يَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۲۱۲﴾

"جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی ہے' ان کے لئے دنیا کی زندگی بڑی محبوب و دل پسند بنادی گئی ہے۔ ایسے لوگ ایمان کی راہ اختیار کرنے والوں کا مذاق اڑاتے ہیں مگر قیامت کے روز پرہیز گار لوگ ہی ان کے مقابلے میں عالی مقام ہوں گے۔ رہا دنیا کا رزق تو اللہ کو اختیار ہے' جسے چاہے بے حساب دے دے۔"

کافروں کے لئے اس دنیا کی حقیر عارضی چیزوں اور چھوٹی چھوٹی ضروریات کو ہی اہم اور مزین بنادیا گیا ہے۔ یہ چیزیں انہیں اتنی بھلی لگیں کہ وہ انہی کے ہو کر رہ گئے۔ اور آگے نہ بڑھے۔ ان کی نظریں انہی پر ٹک گئیں اور ان سے آگے حقائق تک نہ پہنچ سکیں۔ ان لوگوں کو ان حقیر چیزوں کے علاوہ' بلند اقدار کا علم ہی نہیں ہے اور جو شخص دنیا میں پھنس جاتا ہے' دنیا کی آخری حد پر جاکے ہی دم لیتا ہے۔ ممکن نہیں کہ اس کی عقل و فکر ان بلند مقاصد تک رسائی حاصل کر سکے جو مرد مومن کی توجہ کا مرکز ہیں اور جن کو مومن کی نگاہ بلند نے بہت دور اور بلند آفاق میں پالیا ہے۔

بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک مومن بنیادی ساز و سامان کو بالکل ہی نظر انداز کر دیتا ہے۔ اس لئے نہیں کہ وہ دوں ہمت ہے' اس لئے نہیں کہ اس میں حصول دنیا کا جوہر نہیں ہے۔ اس لئے بھی نہیں کہ وہ منفی الفکر ہے اور دنیا کی ترقی و کمال میں اسے کوئی دلچسپی نہیں ہے' یہ محض اس لئے ہوتا ہے کہ وہ ایک نہایت ہی بلند مقام سے' اس عارضی دنیا پر نگاہ غلط انداز ڈالتا ہے' باوجود اس کے کہ وہ اس دنیا میں اللہ کا نائب ہے' اس کی دیکھ بھال اس کی ذمہ داری میں ہے۔ وہ اس کی تعمیر و ترقی میں حصہ لیتا ہے' وہ اس کی تہذیب اور پیداواری صلاحیت میں اضافہ کرتا ہے' لیکن وہ اس زندگی کی تمام بوقلمونیوں میں سے اپنے لئے اس اعلیٰ مقصد کو تلاش کر کے چن لیتا ہے جو بہت ہی

اعلیٰ ہے' ارفع ہے' اور قیمتی ہے۔ اس کی نگاہ انتخاب اس پر پڑتی ہے کہ اس دنیا کے لئے ایک نظام زندگی چاہئے۔ انسانیت ٹھیکریاں اور خزف تلاش کرتی پھرتی ہے' اس کی راہنمائی اس کان تک کی جانی چاہئے جہاں موتی ہی موتی ہیں۔ لوگوں کے سروں پہ اور زمین کی چوٹیوں پر اللہ کا علم بلند ہونا چاہئے تاکہ انسانیت اس مقام بلند تک ترقی کر سکے۔ انسانیت اس دنیا کی ذلیل و حقیر چیزوں سے نظریں اٹھا کر آگے بھی دیکھے کہ اس قصر دنیا سے آگے اور جہاں بھی ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ جن لوگوں کے دل میں ایمان کی چنگاری نہیں ہے وہ بڑے مقاصد' اعلیٰ نصب العین اور وسعت فکر و نظر سے محروم ہوتے ہیں اور ایسے لوگ ہی دنیا کے غلام ہوتے ہیں اور بندگان دنیا کہلاتے ہیں۔

یہ کوتاہ ہمت اور زمین کی آلائشوں میں گھرے ہوئے بونے قد کے لوگ' یہ دنیاوی اغراض کے بندے اور مطلب پرست' بڑی حقارت سے ایمان داروں پر نظر ڈالتے ہیں۔ دیکھتے ہیں کہ ان لوگوں نے دنیا کی تمام آلودگیوں تمام کدورتوں اور تمام حقیر ساز و سامان کو ان کفار کے لئے کھلا چھوڑ دیا ہے اور اپنے سینوں میں پاک آرزوہائے عالیہ لئے پھرتے ہیں' ان آرزوؤں کا تعلق ان کی ذات ہی سے نہیں ہوتا بلکہ وہ تمام انسانیت کی آرزوئیں ہوتی ہیں۔ ان تمناؤں کی تعلق ان کا ذات ہی سے نہیں ہوتا' بلکہ یہ ان کے نظریۂ حیات کی تمنائیں ہوتی ہیں۔ اب یہ کفار ذرا اور گہری نظر اور سنجیدگی سے دیکھتے ہیں کہ یہ لوگ ان آرزوؤں کے حصول کے لئے نہ صرف یہ کہ دنیا کو ترک کئے ہوئے ہیں بلکہ وہ اس جدوجہد میں تھک کر چور چور ہو گئے' وہ ان کی خاطر بڑی سے بڑی مشکلات کا مقابلہ کر رہے ہیں اور ان بونے لوگوں نے جن دنیاوی لذائذ کو زندگی کی روح سمجھ رکھا ہے اور جو ان کا بلند ترین مقصد ہے' ان پر ان اولوالعزم لوگوں نے لات مار دی ہے۔ غرض ایسے حالات میں یہ بونے اور دوسرے درجے کے لوگ ان لوگوں کی زندگیوں پر نظر دوڑاتے ہیں جو صحیح معنوں میں مومن ہیں تو یہ لوگ ان کے مقاصد بلند تک نہیں پہنچ سکتے۔ ان کی زندگی کے راز کو نہیں پا سکتے۔ تو پھر کیا ہوتا ہے؟ وہ بے اختیار ان سے مذاق کرتے ہیں' ان کے حال پر انہیں ہنسی آتی ہے' پھر وہ ان کے نظریات کا مذاق اڑاتے ہیں اور انہوں نے جو طرز عمل اختیار کر رکھا ہوتا ہے اس پر منہ چڑاتے ہیں زُيِّنَ لِلَّذِينَ كَفَرُوا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَيَسْخَرُونَ مِنَ الَّذِينَ اٰمَنُوا "جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی ہے ان کے لئے دنیا کی زندگی بڑی محبوب اور دل پسند بنا دی گئی ہے۔ ایسے لوگ ایمان کی راہ اختیار کرنے والوں کا مذاق اڑاتے ہیں۔"

لیکن جس ترازو میں یہ کفار' زندگی کی قدروں کو تولتے ہیں' وہ حقیقی ترازو نہیں ہے۔ سچائی کا ترازو اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے' اور اللہ کے ترازو میں ایمان والوں کا کیا وزن ہے اور کیا قدر و قیمت ہے وَالَّذِينَ اتَّقَوْا فَوْقَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ "مگر قیامت میں پرہیز گار مومن ہی ان کفار کے مقابلے میں عالی مقام ہوں گے۔"

یہ ہے سچائی کا ترازو اور پھر ہے بھی دست قدرت میں۔ اہل ایمان کو چاہئے کہ وہ اپنی قدر و قیمت کا تعین اس ترازو سے کریں۔ وہ منزل کی طرف بڑھتے چلیں اور ان احمقوں کی حماقتوں کی طرف توجہ ہی نہ کریں' مذاق اڑانے والوں کے مذاق کی طرف دھیان ہی نہ دیں' کافروں کی گھٹیا اقدار کو خاطر ہی میں نہ لائیں۔ اس لئے کہ اہل ایمان تو ان کفار کے مقابلے میں' دار آخرت میں بلند مرتبت ہوں گے۔ آخری حساب جب ہو گا تو اہل ایمان کا حساب زیادہ نکلے گا۔ اور اس بات پر اللہ گواہ ہے جو احکم الحاکمین ہے۔

اللہ نے ان کے لئے بھلائی رکھ چھوڑی ہے' وہ رزق سے بھی زیادہ کشادہ ہے یعنی روح کی غذا ہے' وہ یہ دولت انہیں دنیا میں بھی عطا کرے گا اور آخرت میں بھی۔ یا دنیا و آخرت دونوں میں جو وہ مناسب سمجھے کیونکہ وہ مختار ہے' حکیم ہے' وہی سمجھتا ہے کہ ان کے لئے بھلائی کس میں ہے۔ رزق دنیا کی اہمیت ہی کیا ہے وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ "دنیا کا رزق تو اللہ کو اختیار ہے' جسے چاہے بے حساب دے۔"

وہی دانا ہے، جسے چاہتا ہے دیتا ہے، جس پر چاہتا عطیات کی بارش کر دیتا ہے، وہ کبھی کفار کو دنیاوی شان و شوکت دیتا ہے اور یہ اس کی حکمت ہوتی ہے۔ اس میں ان کی کوئی فضیلت نہیں ہوتی۔ وہ اپنے مختار بندوں کو بھی دنیا و آخرت دونوں میں دیتا ہے۔ ہر قسم کی داد و دہش کا سرچشمہ وہی ہے لیکن برگزیدہ لوگوں کے لئے اس کی پسند بہت ہی اعلیٰ اور دیرپا ہوتی ہے۔

انسانی زندگی میں ہر وقت انسانوں کے یہ دونوں نمونے پائے جاتے ہیں۔ بعض ایسے لوگ ہوتے ہیں جو اپنی قدر و قیمت اپنے فکر و عمل کی قدر اللہ رب العزت سے اخذ کرتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ زندگی کی صفات اور زمین کی عارضی چیزوں، اور چھوٹے چھوٹے مقاصد سے بلند ہو جاتے ہیں۔ ان لوگوں کی انسانیت ایک ٹھوس حقیقت ہوتی ہے۔ یہ لوگ زندگی کے حکمران ہو جاتے ہیں، زندگی کے غلام نہیں ہوتے۔ بعینہٖ اسی طرح ایسے لوگوں کے مقابلے میں کچھ دوسرے لوگ ہیں، جن کے لئے دنیا کی زندگی کو محبوب بنا دیا گیا ہے۔ وہ دنیا کے عارضی ساز و سامان کے غلام بنا دیئے گئے ہیں۔ وہ بنیادی اقدار کے غلام ہیں۔ یہ لوگ ضروریات زندگی کے دام میں گرفتار ہیں اور دنیا کے اس گندے دلدل میں ایسے پھنسے ہیں کہ اب اس سے نکل ہی نہیں سکتے۔

لیکن اس افتادہ مخلوق خدا کے پاس چاہے جتنا ساز و سامان ہو، ان پر مرد مومن ایک نہایت ہی بلند مقام سے نظر ڈالتا ہے۔ اگرچہ اپنی جگہ وہ سمجھتے ہیں کہ وہ خوش قسمت ہیں۔ صاحب فضل و کرم ہیں اور ایمان والے محروم ہیں۔ کبھی تو یہ لوگ ایمان والوں کے ساتھ ہمدردی کرتے ہیں اور کبھی ان کا مذاق اڑاتے ہیں۔ حالانکہ خود وہ ہمدردی کے مستحق ہیں، خود وہ قابل رحم و قابل شفقت ہیں۔

زندگی کی اعلیٰ قدروں کے بیان اور اہل ایمان کے بارے میں کافروں کے موقف کی وضاحت اور خود اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کفار کے وزن اور مقام کے تعین کے بعد، اب اگلی آیات میں وہ اصل کہانی بیان کی جاتی ہے کہ لوگوں کے درمیان تصورات و نظریات اور اقدار و مقاصد کے بارے میں اختلاف رائے شروع کیسے ہوا؟ اور پھر وہ اصول بتا دیا جاتا ہے جس پر اختلاف کرنے والے یہ لوگ ایسے اختلافات ختم کر سکتے ہیں اور عدالت کی وہ ترازو بتائی جاتی ہے جو ان اختلافات کے بارے میں، ان لوگوں کے درمیان، آخر کار فیصلہ دے گی۔

كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً ۚ فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَ مُنْذِرِيْنَ ۪ وَ اَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ؕ وَ مَا اخْتَلَفَ فِيْهِ اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ۚ فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ ؕ وَ اللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۲۱۳﴾

"ابتدا میں سب لوگ ایک ہی طریقے پر تھے، (پھر یہ حالت باقی نہ رہی اور اختلافات رونما ہو گئے) تب اللہ نے نبی بھیجے جو راست روی پر بشارت دینے والے اور کج روی کے نتائج سے ڈرانے والے تھے۔ اور ان کے ساتھ کتاب برحق نازل کی تاکہ حق کے بارے میں لوگوں کے درمیان جو اختلافات رونما ہو گئے تھے، ان کا فیصلہ کرے۔ اختلاف ان لوگوں نے کیا جنہیں حق کا علم دیا جا چکا تھا۔ انہوں نے روشن ہدایات پالینے کے بعد، محض اس لئے حق کو چھوڑ کر مختلف طریقے نکالے کہ وہ آپس میں زیادتی کرنا چاہتے تھے۔ پس جو لوگ انبیاء پر ایمان لے آئے، انہیں اللہ نے اپنے اذن سے اس حق کا راستہ دکھایا جس میں لوگوں نے اختلاف کیا تھا۔ اللہ جسے چاہتا ہے راہ راست دکھا دیتا ہے۔"

یہ ہے وہ کہانی۔ پہلے سب لوگ ایک امت ہی کے افراد تھے۔ ایک تصور زندگی اور ایک ہی طرز عمل تھا۔ یہ اشارہ ہے اس چھوٹے انسانی خاندان کی طرف' جو حضرت آدم ﷺ حضرت حوا اور ان کی اولاد پر مشتمل تھا۔ اور ابھی ابن آدم کے درمیان افکار و نظریات کا اختلاف پیدا نہ ہوا تھا۔ یہاں یہ بات ذہن نشین کر لینا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کرۂ ارض پر انسانی زندگی کا آغاز ایک چھوٹے سے خاندان سے محض اس لئے کیا کہ انسانی زندگی میں خاندانی نظام خشت اول کی حیثیت رکھتا ہے۔ ابتدا میں انسانیت پر ایک ایسا دور گزرا ہے' جس میں سب انسان ایک ہی سطح کے تھے' ان کا ایک ہی رخ تھا' ایک ہی نظریہ تھا۔ وہ صرف ایک ہی خاندان کی شکل میں تھے۔ رفتہ رفتہ ان کی تعداد میں اضافہ ہو گیا۔ انسان ترقی کر گئے۔ پھر ادھر ادھر بکھر کر بسنے لگے ان کے بود و باش کے طریقوں میں اختلاف ہو گیا۔ ان کے اندر اللہ تعالیٰ نے جو خوبیاں ودیعت کی تھیں وہ ظاہر ہونے لگیں۔ یہ خوبیاں اللہ نے تخلیق کے وقت ان کے اندر رکھ دی تھیں۔ کسی میں کم تھیں کسی میں زیادہ۔ اس کی حکمت اللہ ہی کے علم میں ہے اور زندگی کی بوقلمونی کے لئے یہ ضروری سمجھا گیا کہ کسی میں کچھ استعداد اور کسی کا کچھ رجحان۔

قدرت کی سکیم کے مطابق لوگوں کے درمیان نقطہ نظر کا اختلاف شروع ہو گیا۔ ان کے رجحانات کی سمتیں مختلف ہو گئیں۔ ان کے زندگی کے نظام مختلف ہو گئے۔ ان کے عقائد میں اختلاف پیدا ہو گیا' لہٰذا انسانیت نے اگلے درجے میں قدم رکھا اور اللہ تعالیٰ نے ان کی راہنمائی کے لئے نبی بھیجے جو بشارت دینے والے اور ڈرانے والے تھے وَأَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ "اور ان کے ساتھ کتاب برحق نازل کی تاکہ حق کے بارے میں لوگوں کے درمیان جو اختلافات رونما ہو گئے' ان کا فیصلہ کرے۔"

یہاں وہ عظیم حقیقت کھل کر سامنے آ جاتی ہے یہ کہ لوگوں کے درمیان اختلاف رائے ایک طبعی امر ہے۔ کیونکہ اختلاف ان کی تخلیق کے اصولوں میں سے ایک اصل ہے۔ اس اختلاف ہی کے نتیجے میں وہ سکیم روبعمل آتی ہے جس کی خاطر اللہ نے انسان کو پیدا کیا ہے۔ یعنی زمین پر نیابت الٰہی اور منصب خلافت کے چلانے میں انسان کو مختلف قسم کے فرائض سرانجام دینے تھے' ان کے لئے مختلف قسم کے لوگ اور گوناگوں قابلیتوں رکھنے والوں کی ضرورت تھی' تاکہ یہ سب افراد مل کر نظام خلافت کو پوری ہم آہنگی کے ساتھ پایہ تکمیل تک پہنچائیں اور اس کرۂ ارض کی تعمیر و ترقی کے لئے اللہ تعالیٰ کی تیار کردہ سکیم کو روبعمل لائیں اور ہر شخص اس میں اس کے لئے طے شدہ رول ادا کرے' لہٰذا ضروری ہے کہ مختلف فرائض کی ادائیگی کے لئے لوگوں کی صلاحیتیں بھی مختلف ہوں اور جس طرح انسان کی ضروریات ہیں اسی طرح انسانوں کی استعداد بھی مختلف ہو: وَلَا يَزَالُونَ مُخْتَلِفِينَ إِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ وَلِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ "اور یہ لوگ یونہی مختلف رہیں گے۔ ماسوائے ان کے جن پر اللہ رحم فرمائے اور اسی اختلاف کے لئے تو اللہ نے انہیں پیدا کیا ہے۔"

قابلیتوں اور فرائض کے اس قدرتی اختلاف کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لوگوں کے درمیان افکار کا اختلاف جنم لیتا ہے' ان کی ترجیحات بدل جاتی ہیں۔ ان کا طریقہ کار اور پھر آخر کار ان کا نظام زندگی بدل جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا منشا یہ ہے کہ یہ فطری اختلافات مطلوب حد تک ہونے ضروری ہیں۔ البتہ ان اختلافات کو ایک وسیع دائرے کے اندر رہنا چاہئے اور یہ اختلافات تعمیری ہونے چاہئیں اور سیدھے ہونے چاہئیں۔ یہ وسیع دائرہ کیا ہے جس کے اندر یہ محدود ہوں؟ وہ ایمانی تصور حیات کا دائرہ ہے اور یہ اس قدر وسیع ہے کہ مختلف استعداد رکھنے والے لوگ' مختلف طاقتوں کے مالک لوگ' اور مختلف قابلیتوں کے لوگ اس کے اندر پوری ہم آہنگی کے ساتھ کام کر سکتے ہیں۔ ایمانی تصور حیات ان اختلافات یعنی فطری اختلافات کو نہ دباتا ہے اور نہ ہی بالکل ان کا قتل عام کرتا ہے بلکہ ان کو ایک تنظیم میں لاتا ہے اور ہم آہنگ کرتا ہے اور ان سب کے رخ کو اصلاح و ترقی کی شاہراہ کی طرف موڑ دیتا ہے۔

اندریں حالات ایک ایسے معیار کا وجود ضروری ہو گیا تاکہ باہم ٹکراؤ کی صورت میں لوگ اس کی طرف رجوع کریں۔ جو ایک حاکم عادل ہو' جس کے سامنے فریقین پیش ہوں اور جس کا قول قول فیصل ہو' جس کے بعد بحث و تکرار ہی نہ رہے' وہ ایسا ہو کہ سب لوگ اس کے ذریعہ ذوق یقین اپنے اندر پیدا کریں فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَ مُنْذِرِيْنَ وَ اَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا "تب اللہ نے نبی بھیجے جو راست روی پر بشارت دینے والے اور کج روی کے نتائج سے ڈرانے والے تھے اور ان کے ساتھ کتاب برحق نازل کی تاکہ حق کے بارے میں لوگوں کے درمیان جو اختلاف رونما ہو گئے تھے' ان کا فیصلہ کرے۔"

ہمیں چاہئے کہ لفظ بالحق پر غور کریں۔ یہ دراصل اس امر پر قول فیصل ہے کہ حق وہی ہے جو کتاب اللہ میں ہے۔ اور اس حق کو اس لئے اتارا گیا ہے کہ وہ لوگوں کے مختلف تصورات' ان کے طریقہ ہائے کار اور ان کی اقدار کے لئے بمنزلہ دیانت دار منصف ہے اور تمام اختلافات میں فیصلے کا آخری مقام ہے۔ اس کے سوا سچائی کہیں نہیں ملے گی' اس کے ساتھ کوئی متوازی منصف نہیں ہے' اس کی بات کے بعد پھر کوئی بات نہیں ہے' یہ حق جو ایک اور لاشریک ہے' اس کے بغیر تمام اختلافات اور نظریات میں اسے حکم بنائے بغیر' اور بغیر کسی مزید مقدمہ بازی اور بغیر کسی اعتراض کے اس کے حکم کو حکم آخر تسلیم کئے بغیر اس زندگی کی گاڑی سیدھی پٹڑی پر روانہ نہیں ہو سکتی۔ ہرگز نہیں ہو سکتی۔ لوگوں کے درمیان موجود شدید اختلافات ختم نہیں ہو سکتے۔ زمین پر امن قائم نہیں ہو سکتا اور کسی صورت میں بھی' ان تدابیر کے بغیر' انسان امن و سلامتی میں داخل نہیں ہو سکتا۔

لوگ اپنے تصورات اور قوانین حیات کہاں سے لیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ قوانین حیات اور نظام حیات کے سرچشمے کے تعین کے لئے ضروری ہے کہ سب سے پہلے کتاب اللہ کی اس حیثیت کو تسلیم کیا جائے کہ تمام اختلافات کا آخری فیصلہ کتاب اللہ ہی سے ہو گا۔ نیز یہ کہ یہ دوئی قبول نہیں کرتا۔ اللہ پاک نے اس کتاب کو نازل فرمایا اور حق کے ساتھ نازل فرمایا۔ وہ منبع ایک ہی ہے۔ اس میں تعدد ممکن نہیں اور یہ وہی منبع ہے جہاں سے کتاب اللہ کا نزول ہوا اور اس لئے ہوا کہ وہ اختلافی امور میں قوت فیصلہ ہو' معیار حق ہو۔

وہ کتاب اپنی ماہیت کے اعتبار سے ایک ہی ہے۔ سب رسول اسی ایک کتاب کو لے کر آتے رہے ہیں' لہٰذا تمام آسمانی کتابیں ایک ہی کتاب ہیں اور تمام ملتیں بھی دراصل ایک ہی ملت ہیں اور ان کتب و رسل کے تصورات حیات بھی دراصل ایک ہی ہیں۔ ایک خدا' ایک معبود' تمام انسانوں کے لئے ایک ہی قانون ساز' البتہ مختلف ادوار اور مختلف ملل و نحل اور مختلف طرز ہائے زندگی اور مختلف قسم کے ادوار کے لئے تفصیلی اور جزوی احکام میں قدرے فرق ہوا۔ اور تمام حذف و اضافہ کے بعد آخری مستقل اور مکمل صورت قرآنی تعلیمات اور ان تعلیمات کے ذریعہ زندگی کو بغیر کسی رکاوٹ کے ترقی کی راہ پر آزادانہ طور پر ڈال دیا گیا تاکہ انسانی زندگی اپنے وسیع دائرے میں' اللہ کی راہنمائی اور ہدایت کی روشنی میں' اللہ کی شریعت اور زندہ نظام زندگی کے مطابق اپنے وسیع حدود میں ترقی کرتی چلی جائے۔

کتاب اللہ کے بارے میں قرآن کریم کا یہ فیصلہ ہی دراصل تمام نظریات اور تمام عقائد کے بارے میں صحیح اسلامی نقطہ نظر ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اصل میں ہر نبی اسی ایک دین کو لے کر آیا جو چند بنیادی عقائد یعنی عقیدۂ توحید وغیرہ پر مشتمل رہا ہے لیکن ہوتا یہ رہا کہ ہر امت نے اپنے رسول کے اٹھ جانے کے بعد رفتہ رفتہ اپنے اصل دین سے انحراف اختیار کر لیا اور غلط روایات اور کہانیوں کا ایک ایسا انبار جمع ہوا کہ اس کے اندر دین کے اصل الاصول دب کر رہ گئے۔ لوگ اصل دین سے دور جا پڑے۔ یوں ضرورت پیش آتی ہے کہ ایک جدید رسالت ایک جدید نبی کے ذریعے بھیجی جائے۔

جدید نبی ضرور آتا رہا لیکن دراصل دین اسلام کی تجدید ہی ہوتی رہی۔ خرافات کا جو انبار دین میں داخل ہو چکا تھا یہ رسول اس کی نفی

کرتا رہا' اور اس دور کے حالات کے مطابق لوگوں کو ایک قانون دیا جاتا رہا۔ ایک نظام معاشرت کی بنیاد رکھتا رہا' تا آنکہ قرآن نازل ہوا اور اب دینی نظریات و عقائد کے بارے میں قرآن کریم ہی لائق اتباع ہے اور حق ہے۔

بعض غیر مسلم علماء جب تاریخ مذاہب و عقائد پر بحث کرتے ہیں تو ان کا منہاج بحث یہ ہوتا ہے کہ وہ ہر نبی کی تعلیمات کو نبی ماقبل سے مختلف ثابت کرتے ہیں' یوں گویا وہ نظریاتی ارتقاء ثابت کرتے ہیں۔ بعض مسلم محققین بھی اس منہج بحث سے متاثر ہوتے جاتے ہیں اور غیر شعوری طور پر وہ بھی ادیان کے اصل نظریات و عقاید میں تغیر و تبدل ڈھونڈتے ہیں۔ یہ انداز بحث مستشرقین اور مذاہب کے بارے میں خود مغرب کے اہل تحقیق اختیار کرتے ہیں۔

ایمان کے اصل تصور میں تسلسل اور ثبات کا یہ نظریہ ہی اس کتاب کا مقصد نزول ہے' جسے سچائی کے ساتھ نازل کیا گیا ہے اور اس لئے نازل کیا گیا کہ وہ لوگوں کے درمیان' ان کے اختلافی مسائل کے بارے میں فیصلہ کرے۔ ہر دور میں' ہر رسول' نبی کے بارے میں اور ابتدائی زمانوں سے لے کر آج تک کے تمام مسائل کے بارے میں کرے۔

اس بات کی ضرورت بھی تھی کہ ایک ایسی ترازو موجود ہو جس کے مطابق سب لوگ اپنے نظریات و عقائد کی قیمت معلوم کریں۔ ایک قول فیصل ہو جس کے بعد بحث ختم ہو جائے' نیز اس بات کی بھی اشد ضرورت تھی کہ اس ترازو اور اس قول فیصل کا سرچشمہ انسانی نہ ہو۔ یہ ترازو اور قول فیصل اس ذات کا ہو جو انسانی خواہشات سے متاثر نہ ہو' وہ انسانی نقائص سے بھی پاک ہو اور اس سرچشمے میں انسان کی طرح جہالت بھی نہ ہو۔ پھر اس قسم کی ترازو قائم کرنے کے لئے لامحدود علم کی ضرورت ہے۔ ہر واقعہ کا علم ضروری ہے' خواہ ہو چکا ہے' ہو رہا ہے یا ہونے والا ہے۔ یہ علم ہو بھی مطلق یعنی وہ علم نہ زمانے کی قید سے مقید ہو کر ایک ہی چیز زمانے کے اعتبار سے جدا ہو جاتی ہے۔ ماضی' حال اور مستقبل قرار پاتی ہے۔ ایک ہی چیز یقینی' ظنی اور مجهول کہلاتی ہے۔ ایک ہی چیز کبھی حاضر ہوتی کبھی غائب ہوتی ہے۔ کبھی قابل مشاہدہ ہوتی اور کبھی چھپی ہوئی۔ پھر مکان کی قید سے ایک ہی چیز قریب ہوتی ہے' پھر وہی بعید ہوتی ہے۔ کبھی دائرہ نظر میں ہوتی کبھی پس پردہ ہوتی ہے' یا کبھی محسوس ہوتی ہے اور کبھی غیر محسوس ہوتی ہے۔ غرض ایسے اللہ و معبود کے علم کی ضرورت ہے جو یہ جانے کہ کیا پیدا کیا اور کس نے پیدا کیا۔ اسے معلوم ہو کہ کیا مفید ہے اور کیا سب کے لئے مفید ہے۔

اس قسم کی میزان قائم کرنے کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ میزان قائم کرنے والا ضروریات سے بے نیاز ہو' نقص سے پاک ہو' فنا سے مبرا ہو' کوئی چیز اس سے بچ نہ سکتی ہو' اور موت اسے لاحق نہ ہوتی ہو' وہ طمع سے پاک ہو' اسے کسی چیز کی رغبت نہ ہو اور نہ کسی کا ڈر ہو۔ وہ اس پوری کائنات پر غالب ہو اور اس کی ہر چیز اور ہر شخص پر حکمرانی ہو' غرض میزان اس اللہ اور معبود کی ہو جو خواہشات سے پاک' ضروریات سے پاک اور اس میں کوئی قصور اور کمی نہ ہو۔

رہی خود انسان کی عقل و دانش' تو اس کے لئے تو یہی کافی ہے کہ وہ بدلتے ہوئے حالات پر نظر رکھے' بدلتے ہوئے ماحول پر اس کی نظر ہو' نئی نئی ضروریات اس کے سامنے ہوں اور پھر وہ ان حالات میں ایک متعین وقت اور ایک مخصوص صورت حال میں' ہم آہنگی پیدا کرے' لیکن اس صورت میں جب انسان کے پاس کوئی معیار حق موجود ہو' جس کے ذریعہ انسان اپنی غلطی اور اپنی راستی کا اندازہ کر سکے۔ اپنی راست روی اور کج روی معلوم کر سکے' بر سر حق اور بر سر باطل ہونے کا اندازہ کر سکے اور یہ سب فیصلے اسی معیار کے مطابق ہی ہوں۔ صرف یہی ایک صورت ہے جس کے مطابق زندگی صحیح ڈگر پر چل سکتی ہے۔ اور لوگ اس بات پر مطمئن ہو سکتے ہیں کہ ان کے امور سیاست و قیادت رب معبود کے ہاتھ میں ہیں۔

یہ کتاب سچائی کے ساتھ اس لئے نہیں اتاری گئی کہ یہ لوگوں کے درمیان سے قدرتی صلاحیتوں کے امتیازات ختم کر دے' متنوع

وسائل حیات کو ختم کر دے ' مختلف طور طریقوں اور مختلف قابلیتوں کا فرق اور امتیاز مٹاڈالے بلکہ اس کتاب کا مقصد ہمیشہ یہ رہا ہے کہ اگر لوگوں کے درمیان کسی معاملے میں اختلاف ہو جائے تو حق کے مطابق فیصلہ کر دے۔

اس حقیقت کو اگر صحیح طرح ذہن نشین کر لیا جائے تو اس کے منطقی نتیجے کے طور پر اسلام کا تاریخی نقطہ نظر اچھی طرح سمجھا جاسکتا ہے۔ وہ یہ کہ اسلام اس کتاب کو' جسے اللہ تعالیٰ نے حق کے ساتھ نازل فرمایا' لوگوں کے اختلافی امور میں ایک لازمی حاکمیت کا درجہ دیتا ہے۔ وہ اس کتاب کو انسانی زندگی کا اصل الاصول قرار دیتا ہے۔

اب قافلہ حیات کو دیکھا جائے گا کہ اگر وہ اس اصل سے متفق ہے' اس کے مطابق جارہا ہے' اس اصول پر قائم ہے' تو وہ راہ حق پر ہے۔ اگر قافلہ حیات اس نظام سے نکل جائے اور کچھ دوسرے اصولوں پر چل پڑے' تو معلوم ہو جائے گا کہ اب یہ قافلہ راہ باطل پر گامزن ہو گیا ہے۔

اگر تاریخ انسان کے کسی دور میں تمام کے تمام انسان اس نظام باطل پر راضی بھی ہو جائیں تب بھی وہ اس باطل کو حق میں نہیں بدل سکتے۔ باطل' باطل ہی رہے گا۔ اس لئے کہ لوگ حق و باطل کھرے اور کھوٹے کو معلوم کرنے کا معیار ہی نہیں ہیں۔ وہ حکم نہیں ہیں۔ لوگ اگر از خود کسی بات کا فیصلہ کر لیں تو وہ حق نہیں بن جائے گی اور نہ یہ کہ اگر پوری انسانی آبادی کوئی فیصلہ کر دے تو وہ دین بن جائے گا۔

اسلام کا نظریہ یہ ہے کہ اگر لوگ کسی بات پر عمل پیرا ہیں۔ اگر لوگ کسی بات کے قائل ہو گئے ہیں' اگر سب لوگ کسی غلط اصول پر اپنی زندگیاں استوار بھی کر لیں تب بھی وہ قول' وہ فعل اور وہ اصول حق میں نہیں بدل جاتا۔ اگر وہ اللہ کی کتاب کے خلاف ہو' لوگوں کا اجتماع اس باطل کو اصول دین میں داخل نہیں کر دیتا' نہ لوگوں کے اس عمل سے وہ اصول دین کی تعبیر و تشریح بن جائے گا۔ ایسی باتوں پر اگر صدیوں عمل ہوتا رہا ہے۔ تب بھی اس کے معنی یہ نہیں کہ اب وہ جائز ہو گئی ہیں۔

یہ ایک حقیقت ہے اور اس کی بہت بڑی اہمیت ہے۔ اصول دین میں لوگوں نے کئی نئی چیزیں داخل کر دی ہیں اور صرف اس صورت میں ہم ان چیزوں کو دین سے علیحدہ کر سکتے ہیں کہ کتاب اللہ کو حکم مانیں۔ خود اسلام کی تاریخ گواہ ہے کہ مختلف مراحل میں لوگوں نے اصول دین سے انحراف کیا ہے اور یہ انحراف رفتہ رفتہ بڑھ رہا ہے۔ لیکن یہ نہیں کہا جاسکتا چونکہ ایک عرصہ سے لوگوں کی زندگی کا اجتماعی نظام اس انحراف پر استوار ہو گیا ہے اس لئے اب یہ انحراف ہی اسلامی نظام کی واقعی اور عملی شکل ہے۔ ہرگز نہیں' ایسا نہیں ہو سکتا۔

اگر تاریخ میں اسلام سے کوئی انحراف ہوا ہے اور تعامل بن گیا ہے تو اسلام اس کا ذمہ دار نہیں ہے۔ یہ انحراف اب بھی ایک غلطی تصور ہو گی۔ اسے حجت نہ سمجھا جائے گا اور نہ وہ کوئی نظیر قرار پائے گا۔ اس لئے جو لوگ نئے سرے سے اسلامی نظام زندگی قائم کرنا چاہتے ہیں ان کو چاہئے کہ وہ ان تمام انحرافات کو اکھاڑ پھینکیں' ان کو کالعدم قرار دیں۔ اور سب لوگ اس کتاب کی طرف لوٹ آئیں جو نازل ہی اس لئے کی گئی ہے کہ حق کے ساتھ لوگوں کے اختلافات کا فیصلہ کرے اور ان کے درمیان حکم ہو۔

جب یہ کتاب آئی تو لوگ ہر طرف سے خواہشات میں گھرے ہوئے تھے۔ لوگوں پر ان کی خواہشات غالب تھیں۔ خوف اور لالچ' مرغوبات اور کجروی لوگوں کو اللہ کی اس کتاب کی حاکمیت سے دور کیے ہوئے تھی۔ لوگوں نے حق کی طرف لوٹنا چھوڑ دیا تھا۔ محض خواہشات نفسانیہ کی بنا پر وَ مَا اخْتَلَفَ فِيهِ إِلَّا الَّذِينَ أُوتُوهُ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْهُمُ الْبَيِّنَٰتُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ اختلاف ان لوگوں نے کیا جنہیں حق کا علم دیا جا چکا تھا' انہوں نے روشن ہدایات پالینے کے بعد محض اس لئے حق کو چھوڑ کر مختلف طریقے نکالے کہ وہ آپس میں زیادتی کرنا چاہتے تھے۔"

بغی سے مراد حسد ہے۔ لالچ میں منافست ہے' حرص میں مقابلہ اور خواہشات نفسانیہ کی حسد ہے۔ غرض یہ حسد اور منافست ہی ہے جس نے لوگوں کو اسلامی تصور حیات اور اسلامی نظام زندگی کے بارے میں اختلافات کو ہوا دینے پر آمادہ کیا۔ لوگ تفرقہ بازی' عناد اور بحث و تکرار میں مبتلا رہے۔

اس اصول کے مطابق مذہبی اختلافات کا تاریخی مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ اگر اصول دین کے بارے میں کبھی دو آدمیوں کے درمیان کوئی اختلاف ہوا ہے تو دو میں سے ایک کے دل میں حسد ضرور تھا' یا دونوں ہی حسد کا شکار تھے لیکن اگر ان فریقین میں ایمانی قوت موجود ہو تو پھر اتحاد و اتفاق کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے فَهَدَى اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا لِمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ مِنَ الْحَقِّ بِإِذْنِهِ "پس جو لوگ انبیاء پر ایمان لے آئے انہیں اللہ نے اپنے اذن سے اس حق کا راستہ دکھا دیا' جس میں ان لوگوں نے اختلاف کیا تھا۔"

اہل ایمان کو اس لئے ہدایت نصیب ہوئی کہ ان کے دل صاف تھے' ان کی روح یکسو تھی' ان کے دلوں میں حق تک پہنچنے کی امنگ تھی۔ اگر حالات ایسے ہوں تو پھر حق تک پہنچنا اور اس پر جم جانا بہت ہی آسان ہو جاتا ہے وَاللَّهُ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ "اللہ جسے چاہتا ہے' راہ راست دکھا دیتا ہے۔"

وہ راہ کون سی ہے' جس کی طرف یہ کتاب راہنمائی کرتی ہے؟ وہ نظام جو حق پر قائم ہوتا ہے اور حق پر چلتا ہے اور حق پر جما رہتا ہے۔ لوگوں کی خواہشات کے مطابق کبھی ادھر کبھی ادھر نہیں بدلتا۔ انسانوں کی مرغوبات اور ان کے رجحانات کے ہاتھ میں ایک کھلونا بن کر نہیں رہ جاتا۔

اللہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے اس راہ مستقیم کے لئے چن لیتا ہے۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ کون لوگ ہیں جن میں قبولیت حق کی استعداد ہے اور پھر اس پر جم سکتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جو سلامتی کی راہ پا لیتے ہیں بلکہ سلامتی کے دائرے میں داخل ہو جاتے ہیں۔ یہی لوگ غالب ہوں گے۔ اگرچہ دنیا پرستوں کی نظروں میں ان کی کچھ قدر و قیمت نہیں ہوتی اور یہ لوگ محروم تصور ہوتے ہیں۔ اگرچہ یہ دنیا پرست ان کا مذاق اڑاتے ہیں' جس طرح کافر مومنین کا مذاق اڑاتے ہیں۔

اب تک جو ہدایات دی گئیں ان کا مقصد یہ تھا' جماعت مسلمہ کے دل میں ایک مکمل واضح اور جامع تصور حیات قائم ہو جائے۔ یہ ہدایات یہاں ختم ہو جاتی ہیں۔ اب جماعت مسلمہ کو توجہ دلائی جاتی ہے کہ وہ ذرا ان اہل ایمان کے حالات کا مطالعہ کرے' جو اپنے مخالف دشمنان اسلام' مشرکین اور اہل کتاب کے ساتھ اختلاف رائے رکھتے تھے' پھر ان نظریاتی اختلافات کی وجہ سے ان پر بے شمار مصیبتیں آئیں۔ ان اختلافات کی بنا پر بڑی بڑی جنگیں لڑی گئیں' لوگوں پر مصائب کے پہاڑ ٹوٹے اور وہ چور چور ہو گئے۔

جماعت مسلمہ کو متوجہ کیا جاتا ہے کہ یہ سنت اللہ ہے جو زمانہ قدیم سے چلی آ رہی ہے۔ یوں اہل ایمان کو عام لوگوں سے علیحدہ کر دیا جاتا ہے اور انہیں جنت میں داخل کرنے کے لئے تیار کیا جاتا ہے۔ تاکہ وہ اس میں داخل ہوں اور اس کے مستحق ہوں۔ سنت اللہ یہ ہے کہ نظریاتی لوگ اپنے نظریات کی مدافعت کریں۔ وہ اپنے عقائد و نظریات کے لئے مشکلات' تکالیف اور دکھ درد برداشت کریں۔ انہیں کبھی فتح نصیب ہو گی کبھی شکست لیکن وہ ہر حال میں اپنے نظریات پر ثابت قدم رہیں گے' کوئی سختی انہیں متزلزل نہ کر سکے گی۔ کوئی قوت انہیں ڈرا نہ سکے گی۔ مشکلات اور آزمائشوں کے پے در پے حملوں میں وہ ہمت نہ ہاریں۔ اگر انہوں نے ایسا کیا تو وہ لوگ اللہ کی نصرت کے مستحق ہو جائیں گے۔ کیونکہ وہ اللہ کے دین کے امین بن گئے ہیں اور جو امانت ان کے سپرد کی گئی ہے اس میں وہ دیانتدار ہیں۔ وہ اس کے بچانے کی قابلیت رکھتے ہیں اور اس لئے وہ جنت کے بھی مستحق ہیں۔

ان کی روحیں خوف سے آزاد ہو گئیں ہیں' وہ ذلت سے آزاد ہو گئے ہیں۔ وہ عیش و آرام کے حریص نہیں رہے۔ بلکہ انہیں اب

خود اپنی زندگی کی بھی کوئی پرواہ نہیں ہے۔ ایسے حالات میں اللہ کے یہ سپاہی آب و گل کی اس دنیا سے بہت ہی دور ہو جاتے ہیں اور جنت اور خدا کے زیادہ قریب ہو جاتے ہیں۔

أَمْ حَسِبْتُمْ أَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَأْتِكُمْ مَثَلُ الَّذِينَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ ۖ مَسَّتْهُمُ الْبَأْسَاءُ وَالضَّرَّاءُ وَزُلْزِلُوا حَتَّىٰ يَقُولَ الرَّسُولُ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ مَتَىٰ نَصْرُ اللَّهِ ۗ أَلَا إِنَّ نَصْرَ اللَّهِ قَرِيبٌ ﴿۲۱۴﴾

"پھر کیا تم لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ یونہی جنت کا داخلہ تمہیں مل جائے گا' حالانکہ ابھی تم پر وہ سب کچھ نہیں گزرا ہے' جو تم سے پہلے ایمان لانے والوں پر گزر چکا ہے۔ ان پر سختیاں گزریں' مصیبتیں آئیں اور مارے گئے حتیٰ کہ وقت کا رسول اور اس کے ساتھی اہل ایمان چیخ اٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی (اس وقت انہیں تسلی دی گئی) ہاں اللہ کی مدد قریب ہے۔"

یہ تھا اللہ تعالیٰ کا خطاب' پہلی اسلامی جماعت سے۔ فرماتے ہیں کہ میری ایک سنت ہے کہ میں اپنے بندوں میں سے جس کے ہاتھ میں اپنا علم پکڑاتا ہوں' جنہیں میں اس دنیا میں اپنا امین بنالیتا ہوں' جن کے ذریعے میں اسلامی نظام قائم کرتا ہوں' اور شریعت نافذ کرتا ہوں انہیں پہلے مصائب کی بھٹی میں ڈال کر ان کی تربیت کرتا ہوں' یہ میری تاریخی سنت ہے۔

ذرا انسانی تاریخ میں اسلامی تحریکات کا مطالعہ تو کرو۔ یہ خطاب صرف مدینہ طیبہ کی پہلی تحریک اسلامی کے لئے مخصوص نہ تھا' بلکہ یہ خطاب ہر اس تحریک کے لئے ہے جسے اللہ تعالیٰ اس کائنات میں یہ عظیم رول ادا کرنے کے لئے منتخب کرلیتا ہے جو اسلامی نظام کے داعی ہوں' ان سے یہ خطاب ہے۔

یہ ایک عظیم' دور رس اور خوفناک تجربہ ہے' رسولوں کا چیخ اٹھنا' رسولوں کے ساتھ مومنین کا پکار اٹھنا' سب کا بیک آواز پکار اٹھنا کہ کب آئے گی اللہ کی مدد؟" اس سوال ہی سے ان مصائب و شدائد کا اندازہ کیا جاسکتا ہے جنہوں نے ان خدا رسیدہ لوگوں کو جھنجوڑ کر رکھ دیا تھا' یقیناً وہ مصائب و شدائد ناقابل برداشت ہوں گے' جنہوں نے ایمان سے بھرے ہوئے ان دلوں کو متاثر کرلیا اور ان کے منہ سے بھی یہ کربناک چیخ نکل ہی گئی: "کب آئے گی اللہ کی مدد؟"

اللہ کی سنت ہے کہ جب ایمان سے بھرے ہوئے یہ دل ان ہلا مارنے والے مصائب کو برداشت کرلیتے ہیں تو پھر اللہ کی بات پوری ہو جاتی ہے اور اس کی مدد آپہنچتی ہے أَلَا إِنَّ نَصْرَ اللَّهِ قَرِيبٌ ہاں اللہ کی مدد قریب ہے۔"

ہاں اللہ کی نصرت محفوظ ہوتی ہے' ان کے لئے جو اس کے مستحق ہوتے ہیں اور اس کے مستحق وہ لوگ ہوتے ہیں جو آخر وقت تک ثابت قدم رہتے ہیں۔ جو تنگی اور مصیبت میں ثابت قدم رہتے ہیں جو لوگ مصائب کے مقابلے میں کھڑے رہتے ہیں۔ شدائد کی آندھیوں کے آگے جھکتے نہیں' جنہیں یہ یقین ہوتا ہے کہ صرف اللہ ہی ہے جو امداد و نصرت دے سکتا ہے (اور جب اس کی مشیئت ہوگی وہ نصرت دے گا) حالت یہ ہو جائے کہ مصائب انتہا کو پہنچ جائیں اور اہل ایمان کا کوئی اور سہارا نہ رہے۔ اللہ کے سوا کسی اور نصرت و امداد کا کوئی ذریعہ نہ رہے۔ صرف اللہ ہی کی نصرت باقی رہ جائے اور اہل ایمان بھی صرف اللہ ہی کی طرف نظریں اٹھائے ہوئے ہیں۔

یہ ہے وہ حالت جس کی بنا پر اب تو مومنین داخلہ جنت کے مستحق ہو جاتے ہیں۔ وہ جنت میں داخل ہوتے ہیں' آزمائش و امتحان کے بعد' صبر و اثبات کے بعد' صرف اللہ کی ہی طرف یکسو ہو جانے کے بعد صرف اللہ کیلئے اپنا شعور خالص کر دینے کے بعد اور اللہ کے سوا ہر چیز

اور ہر سبب کو بھول چکنے کے بعد۔

اسلامی جدوجہد اور اس کے دوران میں مصائب و شدائد پر صبر کے نتیجے میں انسان کو ایک عظیم قوت عطا ہو جاتی ہے۔ انسان کو اپنی ذات پر حاکمیت حاصل ہو جاتی ہے۔ اذیت و مصیبت کی بھٹی میں نفس انسانی کے عناصر صاف و شفاف ہو جاتے ہیں۔ اسلامی نظریۂ حیات میں گہرائی، زندگی اور قوت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ نظریہ زندہ اور تابندہ ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کے اس نظریہ کے اعداء کی آنکھیں بھی چکاچوند ہو جاتی ہیں اور یہ وہ مقام ہوتا ہے جہاں پھر دین کے یہ ازلی دشمن بھی فوج در فوج اللہ کے دین میں داخل ہونے لگتے ہیں۔

ہر مسئلہ حق میں یہی کچھ ہوتا ہے۔ آغاز سفر میں حاملین حق کو مشکلات پیش آتی ہیں، لیکن جب وہ ثابت قدمی دکھائیں تو نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ان کے دشمن اور محارب بھی ان کی طرف جھکتے ہیں اور اس نظریۂ حیات کے شدید ترین دشمن اور اس کے طاقتور مخالف بھی ہتھیار ڈالتے ہیں اور اس دعوت کی نصرت اور امداد کرنے لگتے ہیں لیکن اگر یہ نتیجہ نہ بھی نکلے، تو بھی اس سے زیادہ عظیم نتائج نکلتے ہیں۔

دعوت اسلامی کے حاملین کی روح تمام دنیاوی فتنوں، تمام دنیاوی خرابیوں پر غالب آجاتی ہے۔ یہ روح حرص و لالچ اور عیش و عشرت کی غلامی سے آزاد ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ آخر میں جاکر مرد مومن کو اپنی زندگی کا لالچ بھی نہیں رہتا۔ جب نفس انسانی اس مقام تک پہنچ جائے تو وہ پوری کائنات کو جیت لیتا ہے۔ ان تمام دلوں کو جیت لیتا ہے جو اس مقام تک مشکلات پر غالب ہو کر پہنچتے ہیں۔ یہ وہ نفع ہے جو تمام مصائب تمام تلخیوں پر بھاری ہے۔ جو اہل ایمان اس مقام تک پہنچنے کے لئے مصائب برداشت کرتے ہیں، یہ وہ اہل ایمان جو اللہ کے علم کے امین ہیں۔ جو اللہ کے دین، اس کی شریعت اور اس کی امانت کے اٹھانے والے ہیں۔

یہ آزادی ہی اہل ایمان کو، اس جہاں میں داخلہ جنت کے اہل بناتی ہے۔ یہ ہے اصل راہ۔ یہ وہ راہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے روز اول تحریک اسلامی کو دکھائی۔ ہر دور میں اٹھنے والی ہر اسلامی تحریک کے لئے یہی راہ ہے۔

یہی ہے راہ ایمان و جہاد کی راہ، آزمائش و ابتلا کی راہ، صبر و ثبات کی راہ، صرف اللہ وحدہ لاشریک کی طرف رخ۔ پھر دیکھئے کہ کس طرح مدد آتی ہے، پھر دیکھئے کہ انعامات کی بارش کس طرح ہوتی ہے۔

☆ ☆ ☆ ☆

درس ۱۴ ایک نظر میں

جیسا کہ واضح ہے' سورت کے اس حصے میں احکام کے سوال و جواب کی فضا ہے۔ جیسا کہ ہم آیت یسئلونک عن الاھلۃ کی تفسیر میں بیان کر آئے ہیں کہ یہ ایک ایسا منظر ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ اسلامی نظریۂ حیات کس قدر بیدار تھا' جماعت کے افراد کے دلوں پر کس طرح چھایا ہوا تھا اور یہ کہ مسلمان اپنی روز مرہ کی زندگی کے ہر معاملے میں اپنے نظریے کا حکم معلوم کرنے کے لئے کس قدر بے تاب تھے' تاکہ ان کا طرز عمل ان کے نظریۂ حیات کے مطابق ہو اور یہ ایک صحیح مسلمان کی پختہ علامت ہے کہ وہ اپنی زندگی کے ہر چھوٹے بڑے معاملے میں اسلام کا حکم معلوم کرنے کی کوشش کرے۔ اور وہ اس وقت تک عملی قدم نہ اٹھائے جب تک یہ معلوم نہ کرلے کہ اس بارے میں اسلام کا حکم کیا ہے؟ جس چیز کو اسلام برقرار رکھے وہ اس کا دستور اور قانون بن جائے اور جسے اسلام ترک کر دے وہ اس کے لئے ممنوع اور حرام ہو جائے۔ یہ حساسیت دراصل اس نظریہ حیات پر پختہ ایمان کی علامت ہے۔

یہودیوں' منافقین اور مشرکین نے' اسلام کی بعض اصلاحات کے خلاف جو اعتراضات شروع کر رکھے تھے اور اس سلسلے میں وہ سازش کے طور پر حملے کر رہے تھے' ان سے متاثر ہو کر یا ان کی اصل حقیقت اور حکمت معلوم کرنے کی خاطر بعض مسلمان بھی سوالات اٹھا رہے تھے۔ ان اصلاحات کے خلاف یہودی سخت زہریلا پروپیگنڈا کرتے تھے اور بعض مسلمان اس سے متاثر بھی ہو جاتے۔ ایسے مواقع پر قرآن مجید کا کوئی حصہ نازل ہوتا اور مسئلہ زیر بحث کا فیصلہ کر دیتا۔ مسلمان یقین حاصل کر لیتے' سازشیں ختم ہو جاتیں۔ فتنے اپنی موت آپ مر جاتے اور سازشیوں کی سازش خود ان کے گلے پڑ جاتی۔

ان سوالات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں قرآن مجید جو کبھی فکری جنگ لڑ رہا تھا' کبھی یہ معرکہ خود مسلمانوں کے دل و دماغ میں برپا ہے' کبھی مسلمانوں کی صفوں میں اور کبھی ان دشمنان اسلام کے خلاف ہے جو اسلام سے برسرپیکار تھے اور اسلام کے خلاف سازشوں میں مصروف تھے۔

یہ سبق بھی اس فکری جنگ کا ایک حصہ ہے اور اس میں بعض سوالات کے جوابات دیئے گئے ہیں۔ مثلاً انفاق' اس کی مقدار' اس کے مصرف اور مال کی قسم جس سے انفاق کیا جائے' کے بارے میں سوال' حرام مہینوں میں لڑنے کے بارے میں سوال' شراب اور جوئے کے بارے میں سوال' یتیموں کے بارے میں سوال' ان سب سوالات کے اسباب وہی تھے جن کا ہم اوپر ذکر کر آئے ہیں اور آیات پر بحث کے وقت تفصیلات عرض ہوں گی انشاء اللہ!

☆☆☆☆

درس نمبر۱۴ تشریح آیات (۲۱۵ تا ۲۲۰)

يَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنفِقُونَ ۖ قُلْ مَا أَنفَقْتُم مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينِ وَابْنِ السَّبِيلِ ۗ وَمَا تَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ فَإِنَّ اللَّهَ بِهِ عَلِيمٌ ﴿٢١٥﴾

"لوگ پوچھتے ہیں ہم کیا خرچ کریں؟" جواب دو کہ جو مال بھی تم خرچ کرو اپنے والدین پر' رشتے داروں پر' یتیموں اور مسکینوں پر اور مسافروں پر خرچ کرو اور جو بھلائی بھی تم کرو گے اللہ اس سے باخبر ہو گا۔"

اس سوال سے پہلے انفاق فی سبیل اللہ کے بارے میں متعدد آیات نازل ہو چکی تھیں۔ جن حالات میں تحریک اسلامی کا آغاز ہوا' ایسے حالات میں انفاق فی سبیل اللہ نہایت ضروری ہوتا ہے' تاکہ اسلامی جماعت مصائب و مشکلات اور ان جنگی معرکوں میں دشمنوں کا مقابلہ کر سکے' جو اسے درپیش آنے والے تھے۔ انفاق کی اہمیت ایک دوسری وجہ سے بھی اس دور میں بہت زیادہ ہو گئی تھی' مثلاً یہ کہ تحریک اسلامی میں ساتھیوں کے درمیان اجتماعی تکافل کے قیام کی بھی اشد ضرورت تھی۔ افراد جماعت کے مابین ظاہری امتیازات کو ختم کرنے کی ضرورت تھی' تاکہ ہر فرد یہ سمجھے کہ وہ ایک جسم کا عضو ہے اس سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے اور نہ کوئی چیز ان سے روکی جاتی ہے۔ شعوری طور پر ایک جماعت کے قیام کے لئے اجتماعی تکافل اور انفاق کا نظام قائم کرنا بہت ہی ضروری ہے۔ افراد جماعت کی کارکردگی میں اضافہ کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ان کی ضروریات کا لحاظ رکھا جائے۔

ایسے حالات میں بعض مسلمانوں نے سوال کیا تھا کہ وہ کیا خرچ کریں؟ سوال تو یہ تھا کہ وہ کیا خرچ کریں؟ نوعیت انفاق کیا ہو؟ جواب میں انفاق کی صفت اور انفاق کے مصارف بیان کئے گئے:

قُلْ مَا أَنفَقْتُم مِّنْ خَيْرٍ "جو مال بھی تم خرچ کرو" اس تعبیر میں دو اشارے ہیں۔ ایک یہ کہ جو چیز بھی تم خرچ کرو اسے خیر ہونا چاہئے۔ دینے والے کے لئے بھی خیر ہو' لینے والے کے لئے بھی۔ اس معاشرے کے لئے بھی جس میں یہ لین دین ہو رہا ہے اور اپنی ذات میں بھی وہ خیر ہو۔ اس طرح ہو کہ عمل بھی پاک' تحفہ بھی پاک' چیز بھی پاک۔

دوسرا اشارہ یہ ہے کہ خرچ کرنے والے کو اچھی طرح سوچ کر اپنے مال سے اعلیٰ تر چیز خرچ کرنی چاہئے۔ اس کے پاس جو بہترین چیزیں ہوں انہیں خرچ کرے۔ اس میں دوسروں کو شریک کرے۔ انفاق سے دل پاک ہو جاتا ہے۔ نفس کا تزکیہ ہوتا ہے اور دوسروں کا فائدہ ہوتا ہے۔ ان کی اعانت ہو جاتی ہے۔ پھر تلاش کر کے اپنے مال میں سے بہتر چیز خرچ کرنا ایک ایسا اقدام ہے جس سے دل میں طہارت آ جاتی ہے۔ نفس انسانی پاک و صاف ہو جاتا ہے اور انفاق کو اپنانے کا اعلیٰ مفہوم سامنے آتا ہے۔

لیکن یہ محض اشارہ ہے اور اسے لازم اور فرض قرار نہیں دیا گیا۔ جبکہ دوسری آیت میں اس کی وضاحت کر دی گئی ہے۔ اس سلسلے میں مناسب ہے کہ اوسط درجے کا مال اللہ کی راہ میں دیا جائے۔ نہ بہت قیمتی ہو اور نہ بالکل ردی ہو' البتہ آیت میں یہ اشارہ ہے کہ نفس پر قابو پانے کے لئے بہتر مال خرچ کیا جائے اور اہل ایمان کو اس پر آمادہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہی قرآن کریم کا انداز تربیت ہے یعنی بذریعہ ترغیب اور آمادگی اصلاح کی جاتی ہے۔

انفاق کا طریقہ اور مصرف کیا ہے؟ اس سوال کا جواب یہ ہے فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينِ وَابْنِ السَّبِيلِ "اپنے والدین رشتے داروں پر یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں پر خرچ کرو۔"

انفاق کرنے والے اور ان لوگوں کے درمیان مخصوص روابط ہیں۔ بعض افراد اور انفاق کرنے والے کے درمیان نسبی رشتہ ہے۔ بعض کے درمیان رحم کے رشتے ہیں۔ بعض کے ساتھ محض رحم و شفقت کا رشتہ ہے اور بعض کے ساتھ نظریات کے وسیع حدود میں صرف انسانی ہمدردی کا تعلق ہے۔ اور سب کو ایک ہی آیت میں سمو دیا گیا ہے۔ والدین' اقربین' یتامیٰ' مساکین' مسافر' ان سب کو اسلامی نظریات حیات کے وسیع دائرے میں ضروریات اور بوقت ضرورت معاونت کی گارنٹی حاصل ہے۔

انفاق کے مصارف میں وہی ترتیب ہے جو اس آیت میں بیان کی گئی ہے۔ نیز بعض دوسری آیات میں بھی اس کی وضاحت کی گئی اور بعض احادیث میں اس کی مزید تفصیل اور تشریح کا ذکر ہے۔ صحیح مسلم میں ایک روایت ہے جس میں حضور ﷺ نے ایک شخص سے کہا: "پہلے اپنے نفس سے آغاز کرو اور اس پر صدقہ کرو۔ اس سے بھی زیادہ ہو تو اپنے اہل و عیال پر خرچ کرو' اگر پھر بھی کچھ بچ جائے تو رشتے داروں پر خرچ کرو' اگر ان سے بھی بچ جائے....."

مصارف کی اس ترتیب سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام نے نفس انسانی کی تربیت اور اس کی قیادت اور راہنمائی کے لئے کیا حکیمانہ اور سادہ انداز اختیار کیا ہے۔ اسلام انسان کے ساتھ اس کی حقیقت کے مطابق معاملہ کرتا ہے۔ اس کی فطرت' اس کے میلانات اور اس کے رجحانات کے عین مطابق۔ اسلام انسان کو ساتھ لے کر اس طرح چلتا ہے جس طرح بچہ پیدا ہوتا ہے پھر وہ کھڑا ہوتا ہے اور ایک متعین مقام پر ہوتا ہے۔ اسلام اس کا ہاتھ پکڑ کر قدم بقدم اسے لے کر چلتا ہے۔ آہستہ آہستہ آگے بلندی تک اٹھانے کی کوشش کرتا ہے۔ بڑی آہستگی کے ساتھ دھیمی رفتار سے وہ چڑھتا جاتا ہے' لیکن بڑے آرام کے ساتھ اس کی یہ رفتار اس کی فطرت' اس کے رجحانات اور اس کی استعداد کے تقاضوں کے مطابق ہوتی ہے۔ وہ تدریج کے ساتھ اپنے ساتھ پوری زندگی کو نشوونما اور ترقی دیتا جاتا ہے۔ وہ بلندی کی طرف جا رہا ہوتا ہے۔ لیکن تنگی' اور تھکاوٹ کا اسے احساس تک نہیں ہوتا۔

اسلام کے ترقی کا انداز یہ نہیں ہے کہ کسی کو بیڑیاں اور ہتھکڑیاں پہنا کر اور اسے گھسیٹ کر بلندیوں تک لے جایا جائے۔ نہ ہی اس کی فطری قوتوں اور فطری رجحانات کو دبا دیا جاتا ہے کہ وہ ایک پرندے کی طرح پنجرے میں بند ہو جائے اور پھڑپھڑائے اسے راہ ترقی پر اس طرح نہ لے جایا جائے کہ ترقی نہ رہے بلکہ ظلم بن جائے۔ یا اسے ٹیلوں اور پہاڑیوں سے اڑاتے ہوئے لے جایا جائے۔ بلکہ اسے آہستگی اور نرمی سے اوپر کی طرف لے جایا جائے۔ قدم زمین پر ہوں' آنکھیں آسمان پر ہوں اور دل افق کے ساتھ لٹکا ہوا ہو اور اس کی روح عرش کی بلندیوں میں واصل باللہ ہو۔

یہ بات اللہ کے تو علم میں تھی کہ انسان میں حب ذات کا داعیہ ہے۔ اس لئے اللہ نے حکم دیا کہ پہلے اپنی ذات کے لئے بقدر کفایت سامان مہیا کرو۔ ذات کے بعد پھر دوسرے رشتے داروں پر انفاق کا حکم دیا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کے کھانے پینے کی پاک چیزوں کو جائز قرار دیا۔ اسے ترغیب دی کہ وہ ان پر حلال چیزوں سے لطف اٹھائے' البتہ یہ پابندی لگا دی کہ عیاشی اور غرور سے دور رہے۔

انفاق و صدقہ تو تب شروع ہوتا ہے جب انسان بقدر کفایت خود اپنی ضروریات پوری کر لے۔ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں: "بہترین صدقہ وہ ہے جو ضروریات پورا کر کے دیا جائے اور اوپر کا ہاتھ نچلے ہاتھ سے زیادہ بہتر ہے اور شروع اپنے خاندان سے کرو۔"

حضرت جابر ﷺ سے روایت ہے فرماتے ہیں: "حضور ﷺ کے پاس ایک شخص ایک انڈے کے برابر سونا لے کر حاضر ہوا۔ اس نے عرض کیا حضور ﷺ یہ مجھے کان سے ملا ہے۔ آپ ﷺ اسے لے لیں۔ یہ صدقہ ہے اور اس کے سوا میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔

حضور ﷺ نے اس سے منہ پھیر لیا۔ وہ حضور ﷺ کے داہنے جانب سے لے آیا اور وہی بات دہرائی' تو آپ ﷺ نے پھر منہ پھیر لیا۔ پھر بائیں جانب سے آیا اور وہی بات دہرائی۔ حضور ﷺ نے پھر منہ پھیر لیا۔ پھر وہ پیچھے کی طرف سے آیا اور وہی بات دہرائی۔ اس پر حضور ﷺ نے اس سونے کو لیا اور اسے اس پر دے مارا۔ اگر اسے لگی ہوتی تو یاد رکھتا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "تم میں سے ایک صاحب میرے پاس وہ سب کچھ لے کر آجاتا ہے جو اس کے پاس ہوتا ہے اور کہتا ہے یہ صدقہ ہے' اور پھر بیٹھ جاتا ہے لوگوں سے بھیک مانگنے۔ بہترین صدقہ وہ ہے جو غنا پر کیا جائے۔"

یہ حقیقت اللہ تعالیٰ کے علم میں تھی کہ انسان سب سے پہلے اپنے قریبی افراد خاندان سے محبت کرتا ہے' اپنی اولاد سے اور اپنے والدین سے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے انسان کی ذات کے بعد انفاق کے لئے ان افراد کو مستحق قرار دیا تاکہ وہ اپنی دولت کا کچھ حصہ ان پر خوشی و رضا کے ساتھ خرچ کرے۔ اللہ تعالیٰ نے یہاں انسان کے ان فطری میلانات کا لحاظ رکھا ہے' جو بے ضرر ہیں' بلکہ ان کا لحاظ رکھنے میں بھلائی اور حکمت پوشیدہ ہے۔ اور اس حکمت کے ساتھ ساتھ بعض ایسے افراد کی کفالت بھی ہو جاتی ہے جو صدقہ دینے والے کے قریبی رشتہ دار بھی ہیں اور خود امت مسلمہ کے بھی افراد ہیں۔ اگر ان حضرات کی اعانت ان کے اس قریبی رشتہ دار نے نہ کی تو وہ محتاج ہوں گے۔ ان کے لئے اپنے اس قریب رشتہ دار سے امداد حاصل کرنا زیادہ بہتر ہے' بہ نسبت اس کے کہ وہ کسی دور کے شناسا یا غیر شناسا شخص سے امداد لینے پر مجبور ہو جائیں۔

پھر یہ فائدہ مزید ہے کہ اس کے ذریعہ انسان کی پہلی تربیت گاہ یعنی خاندان کے اندر امن و محبت میں اضافہ ہو گا اور افراد خاندان کے درمیان روابط مضبوط ہوں گے جو ایک عظیم انسانیت کی تعمیر میں خشت اول کی حیثیت رکھتا ہے۔

اپنے قریبی رشتہ داروں کے بعد انسان فطرتاً اپنے جملہ رشتہ داروں کو درجہ بدرجہ اور تعلقات و روابط کے مطابق ترجیح دیتا ہے اور خالق فطرت اس بات سے خوب واقف ہے۔ اور یہ کوئی بری بات بھی نہیں ہے کیونکہ یہ رشتہ دار بھی بہر حال امت کا ایک حصہ ہیں اور اسلامی معاشرے کے اجزاء ہیں۔ چنانچہ ایک دولت مند مسلمان اپنے قریبی رشتے داروں کے دائرہ سے ایک قدم اور باہر نکل آتا ہے۔ اس کی یہ پیش رفت بدستور اس کے فطری رجحانات اور میلانات کی سمت میں ہے اور ان دور کے رشتے داروں کی ضرورت بھی پوری ہو رہی ہے اور دور کے رشتہ داروں کے ساتھ بھی محبت اور رشتے کے تعلقات بھی استوار ہو رہے ہیں۔ یوں اسلامی جماعت کی ابتدائی یونٹ کے باہم تعلقات مربوط ہو جاتے ہیں اور روابط قوی ہو جاتے ہیں۔

اپنی ذات اور قریب و بعید رشتے کے لوگوں پر خرچ کرنے کے بعد بھی اگر کچھ بچ رہتا ہے تو پھر اسلام کا حکم یہ ہے کہ معاشرے کے ان ضعفاء پر خرچ کرو جنہیں دیکھ کر ہی ایک آدمی کی شرافت' جذبہ رحمت اور جذبہ اشتراک میں جوش آجاتا ہے اور ایک شریف انسان ایسے کمزور لوگوں کی امداد کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ ایسے لوگوں میں یتیم سب سے پہلے درجے میں آتے ہیں جو چھوٹے بھی ہوتے ہیں اور کمزور بھی۔ پھر ان مساکین کا درجہ ہے جن کے پاس اخراجات کے لئے کچھ بھی نہیں ہوتا۔ لیکن وہ اپنی شرافت اور اپنی سفید پوشی کی وجہ سے کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلاتے۔ پھر مسافروں کا نمبر آتا ہے جن کے پاس اگر مال و دولت ہوتا ہے لیکن ان سے دور گھر میں اور اس کے حصول میں رکاوٹیں ہوتی ہیں۔

ابتدائی دور میں تحریک اسلامی میں ایسے لوگوں کی کثرت تھی۔ یہ لوگ اپنی دولت مکہ مکرمہ میں چھوڑ کر ہجرت کر آئے تھے' اور اب یہ لوگ اسلامی معاشرے کے افراد تھے۔ اسلام تحریک اسلامی کے خوش حال لوگوں کی راہنمائی کرتا ہے کہ وہ ایسے نادار لوگوں پر خرچ کریں۔ اس سلسلے میں اسلام ان لوگوں کے پاک فطری رجحانات کو ابھارتا ہے اور ان کی تطہیر کرتا ہے اور بڑی نرمی اور تدریج کے ساتھ ان

لوگوں کو نصب العین تک پہنچا دیتا ہے۔ پہلے ان خوشحال لوگوں کے نفوس کا تزکیہ کیا جاتا ہے۔ اور وہ جو کچھ خرچ کرتے ہیں وہ طیب نفس کے ساتھ خرچ کرتے ہیں' خرچ پر راضی ہوتے ہیں۔ بغیر کسی تنگی اور بغیر کسی جبر کے' اپنے اللہ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ معاشرے کے ضعیف اور محتاج لوگوں کو ان کی ضروریات مل جاتی ہیں۔ دوسرے یہ کہ تمام افراد معاشرہ باہم پیوست ہو جاتے ہیں۔ ایک دوسرے کے کفیل اور مددگار بن جاتے ہیں لیکن اس اجتماعی کفالت میں نہ جبر ہے اور نہ کسی کا کوئی نقصان ہے۔ اسلام کی یہ راہنمائی نہایت ہی لطیف' نہایت کی خوشگوار اور نہایت ہی دور رس ہے۔ اس میں بھلائی ہی بھلائی ہے۔ یہ راہنمائی نہ جابرانہ ہے' نہ مصنوعی ہے اور نہ اس میں کسی قسم کا تشدد ہے۔

انفاق فی سبیل اللہ کے اس کفالتی انتظام کا سررشتہ بھی افق اعلیٰ سے ملا دیا جاتا ہے۔ اس لئے انفاق کر کے دل مومن میں تعلق باللہ کا ایک جوش پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کی داد و دہش میں' اس کے قول فعل میں' اس کے ضمیر و نیت میں اور اس کے فہم و شعور میں' غرض اس کی ہر چیز میں تعلق باللہ پیدا ہو جاتا ہے وَمَا تَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ فَإِنَّ اللَّهَ بِهِ عَلِيمٌ "اور جو بھلائی بھی تم کرو گے' اللہ اس سے باخبر ہو گا۔" اللہ تعالیٰ اس انفاق سے بھی باخبر ہے۔ اس کی غایت سے بھی خبردار ہے' اس کے پس منظر میں جو نیت ہے اس کا بھی اسے علم ہے۔ اس لئے یہ انفاق ہرگز ضائع نہیں ہو سکتا۔ وہ اللہ کے کھاتے میں لکھا گیا ہے اور اس کھاتے میں کوئی چیز ضائع نہیں ہوتی۔ وہ لوگوں کے حقوق میں کوئی کمی نہیں کرتا اور نہ ان پر کسی قسم کا ظلم کرتا ہے' لیکن اس پر ریاکاری کا کچھ اثر ہوتا ہے نہ دھوکہ بازی اس کے ہاں چل سکتی ہے۔

یوں قرآن کی یہ راہنمائی دلوں کو لے کر افق اعلیٰ کی بلندیوں تک جا پہنچتی ہے۔ یہ دل صاف و شفاف ہو جاتے ہیں' یکسو ہو جاتے ہیں اور صرف اللہ تعالیٰ کے لئے خالص ہو جاتے ہیں' لیکن بڑی نرمی کے ساتھ' بڑی دھیمی رفتار کے ساتھ' بغیر کسی مصنوعی طریقے کے' بغیر کسی جابرانہ ذریعے کے۔ یہ ہے وہ نظام تربیت جسے اللہ تعالیٰ نے وضع کیا ہے جو علیم بھی ہے اور خبیر بھی ہے۔ اور اس نظام تربیت کے اصولوں کے مطابق اسلامی نظام زندگی تیار ہوتا ہے۔ یہ نظام انسان کی تکمیل اپنے ہاتھ میں لے کر ایک عام انسان کی قیادت سنبھالتا ہے۔ وہ جہاں بھی ہو وہاں سے اس کا ہاتھ پکڑ لیتا ہے اور اسے عروج و کمال کے اس مقام بلند تک لے جاتا ہے جہاں تک یہ انسانیت اسلام سے قبل اپنی پوری تاریخ میں نہیں پہنچ سکی ہوتی۔ ہاں انسانیت نے یہ مقام بلند اگر کبھی حاصل کیا ہے تو وہ صرف اسلامی نظام زندگی کے سایہ میں' اسلام کے صراط مستقیم پر چل کر۔

انفاق فی سبیل اللہ کے بعد' جہاد فی سبیل اللہ کا حکم آتا ہے اور اس میں بھی اسلام نے وہی منہاج تربیت اختیار کیا ہے جو انفاق کے سلسلے میں اختیار کیا گیا ہے۔

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسَىٰ أَن تَكْرَهُوا شَيْئًا وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۖ وَعَسَىٰ أَن تُحِبُّوا شَيْئًا وَهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ۗ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ﴿٢١٦﴾

۲۶
ع ۶
۱۰

"تمہیں جنگ کا حکم دیا گیا ہے اور وہ تمہیں ناگوار ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ایک چیز تمہیں ناگوار ہو اور وہی تمہارے لئے بہتر ہو۔ اور ہو سکتا ہے کہ ایک چیز تمہیں پسند ہو اور وہی تمہارے لئے بری ہو۔ اللہ جانتا ہے' تم نہیں جانتے۔"

قتال فی سبیل اللہ بہت گراں بار فریضہ ہے۔ اس کے باوجود یہ ایسا ہے کہ اس کی ادائیگی واجب ہے۔ اس لئے کہ اس میں ایک

مسلمان کے لئے بھی بہت بڑی خیر ہے' اسلامی جماعت کے لئے بھی خیر کثیر ہے بلکہ اس میں پوری انسانیت کی عظیم بھلائی ہے۔ یہ فریضہ محض سچائی کے لئے ہے' بھلائی کے لئے ہے اور اصلاح احوال کے لئے ہے۔

اسلام چونکہ ایک فطری دین ہے' اس لئے وہ ہر معاملے میں اپنا موقف اور نقطہ نظر بھی عین مطابق فطرت اختیار کرتا ہے۔ اس فریضے کی ادائیگی میں جو مشقتیں اور دشواریاں ہیں اللہ ان کا انکار نہیں کرتا۔ نہ اسے آسان اور ہلکا تصور کیا جاتا ہے۔ نہ اس بات کا انکار کیا جاتا ہے کہ نفس انسانی اسے بتقاضائے فطرت ناپسند کرتا ہے اور اسے بھاری سمجھتا ہے۔ اسلام نہ فطرت کا انکار کرتا ہے۔ نہ کسی معاملے میں نظام فطرت سے متصادم ہوتا ہے۔ نہ انسان پر اس کے ان فطری احساسات کو حرام قرار دیتا ہے' جن کے انکار کا کوئی جواز نہیں ہے۔ جن کو کالعدم نہیں گردانا جاسکتا۔ البتہ اسلام ان فطری احساسات کا علاج ایک دوسرے طریقے سے کرتا ہے۔ اسلام فطرت کی ان تاریکیوں کو ایک جدید قسم کی روشنی سے ختم کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تم پر جو فرض عائد کیا گیا ہے بے شک وہ شاق ہے ناپسندیدہ ہے' لیکن اس کے پس منظر میں ایک عظیم مصلحت ہے جس کی وجہ سے وہ بہت ہی ہلکا ہو جاتا ہے' آسان ہو جاتا ہے۔ اس کی مشقت کم ہو جاتی ہے۔ اور اس کے ذائقے کی کڑواہٹ کم ہو جاتی ہے۔ اس کے ذریعہ ایک پوشیدہ بھلائی وجود میں آتی ہے۔ اس پوشیدہ بھلائی کو انسان کی سطحی نظر اچھی طرح نہیں دیکھ سکتی۔ اس نقطہ نظر کو پالینے کے بعد' انسانی روح پر معرفت کے لئے دروازے کھل جاتے ہیں اور ان کے ذریعہ انسان اس معاملے کی حقیقت تک پہنچ سکتا ہے۔ اب انسان جہاد و قتال کے مسئلے پر ایک نئے زاویہ سے نگاہ ڈالتا ہے۔ اور پھر جب انسان مشکلات سے دوچار ہوتا ہے اور مصائب میں گھرا ہوتا ہے' تو اس کی روح کے اس زاویہ اور معرفت کے اس نئے دروازے سے اس کے قلب و نظر پر ٹھنڈی ٹھنڈی خوشگوار ہوا چلتی ہے اور اسے اطمینان نصیب ہوتا ہے اس لئے کہ عین ممکن ہے شاید ان مشکلات کے بعد آسانیاں ہوں اور کسے خبر ہے کہ شاید پسندیدہ امر کا انجام یہ نہ ہو گا۔ یہ تو وہی ہے جو دور دراز انتہاؤں کا علم رکھنے والا ہے جبکہ تمام لوگ اس علم کے ایک حصہ سے بھی خبردار نہیں ہیں۔

جب نفس انسانی پر یہ خوشگوار باد نسیم چلتی ہے تو اس پر ٹوٹنے والے تمام مصائب اور مشقتیں اور سختیاں آسان ہو جاتی ہیں۔ امید و بقا کے دریچے کھل جاتے ہیں' سخت تپش میں بھی دل ٹھنڈک محسوس کرتا ہے اور یقین و امید کے ساتھ اطاعت اور ادائے فرض کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔

اسلام فطرت کے ساتھ یوں معاملہ کرتا ہے کہ وہ انسان کے فطری رجحانات پر کوئی نکیر نہیں کرتا۔ اور نہ ہی انسان کو کسی مشکل فرض کے سرانجام دینے پر محض آرڈر اور حکم کے ذریعہ مجبور کرتا ہے' بلکہ وہ انسان کی تربیت کرکے اسے اطاعت پر آمادہ کرتا ہے۔ امید کا دائرہ وسیع کر دیتا ہے۔ وہ اسے یہ تعلیم دیتا ہے کہ ادنیٰ چیز کو خرچ کرکے اعلیٰ حاصل کرو' وہ انسان کو ذاتی خواہشات کے مقابلے میں نہیں بلکہ خوشی و رضا سے کھڑا کرتا ہے تاکہ انسان کی فطرت کو اس بات کا احساس ہو کہ اللہ کا رحم و کرم اس کے شامل حال ہے کیونکہ وہ انسانی کمزوریوں سے خوب واقف ہے۔ اور وہ معترف ہے کہ انسان پر جو فریضہ عائد کیا گیا ہے وہ ایک مشکل کام ہے۔ وہ اس کی مجبوریوں سے بھی واقف ہے اور انسان کی قدر بھی کرتا ہے اور بلند ہمتی' التجا اور امید کے ذریعے اسے مسلسل آگے بڑھانے کی ہمت بھی دیتا رہتا ہے۔

یوں اسلام انسانی فطرت کی تربیت کرتا ہے' وہ فرائض پر ملول نہیں ہوتی' صدمات کی ابتلا میں جزع فزع نہیں کرتی اور نہ مصائب شروع ہوتے ہی وہ ہمت ہار بیٹھتی ہے۔ اگر مشکلات کے مقابلے میں کمزوری ظاہر ہو جائے تو شرمندہ ہو کر صاف گر ہی نہیں جاتی بلکہ ثابت قدم رہنے کی سعی کرتی ہے اور سمجھتی ہے کہ اسے عند اللہ معذور سمجھا جائے گا۔ اسے یہ امید ہوتی ہے کہ اللہ اس کی امداد کرے گا اور اپنی طرف سے قوت بخشے گا اور مصائب کا مقابلہ کرنے کا پختہ ارادہ کر لیتی ہے۔ کیونکہ ہو سکتا ہے کہ ان مشکلات کی تہہ میں کچھ خیر پوشیدہ ہو۔

مشکلات کے بعد آسانیاں آجائیں۔ تھکاوٹ اور ضعف کے بعد بہت بڑا آرام نصیب ہو جائے۔ یہ فطرت محبوبات و مرغوبات پر فریفتہ نہیں ہوتی اس لئے کہ عیش و عشرت کا نتیجہ حسرت بھی تو ہو سکتی ہے۔ محبوب کی تہہ سے مکروہ بھی بر آمد ہو سکتا ہے۔ کبھی یہ بھی ہو سکتا ہے کہ روشن تر امیدوں کے پس پردہ ہلاکت اور مصیبت انتظار کر رہی ہو۔

تربیت کا یہ عجیب نظام ہے۔ بہت ہی گہرا اور بہت ہی سادہ۔ یہ نظام نفس انسانی کے سرچشموں' اس کے پوشیدہ گوشوں اور اس کے مختلف گزر گاہوں کا شناسا ہے۔ یہ نظام تربیت سچائی اور صداقت سے کام لیتا ہے۔ اس میں جھوٹے اشارے' جھوٹے تاثرات اور نظر فریب جعل سازی نہیں ہوتی۔ پس یہ حقیقت ہے کہ انسان کا ناقص اور ضعیف ذہن کسی بات کو ناپسند کرے حالانکہ وہ خیر ہی خیر ہو۔ اور یہ بھی حق ہے کہ انسان کسی چیز کو پسند کرے اور اس کا جانثار ہو۔ لیکن اس میں شر ہی شر ہو۔ اور یہ بھی حق ہے کہ اللہ جانتا ہے اور انسان نہیں جانتے۔ لوگوں کو عواقب اور انجام کا کیا علم ہے۔ وہ کیا جانیں کیونکہ پردہ گرا ہوا ہے اور پس پردہ کیا ہے؟ غرض لوگوں کو ان حقائق کا علم نہیں ہو سکتا جو ہماری خواہشات' جہالت اور نفس کے تابع نہیں ہیں۔

قلب انسانی کے اندر یہ ربانی احساس' اس کے دریچے کھول دیتا ہے۔ اس کے سامنے ایک نئی دنیا نمودار ہو جاتی ہے۔ یہ دنیا اس محدود دنیا سے بالکل مختلف ہے جسے ہماری آنکھیں دیکھ رہی ہیں۔ اس کی نظروں کے سامنے کچھ دوسرے عوامل بھی آجاتے ہیں جو اس کائنات کی گہرائیوں میں کام کر رہے ہوتے ہیں' جو معاملات کی کایا پلٹ دیتے ہیں' جو نتائج کی اس ترتیب کو الٹ دیتے ہیں جن کی انسان کو تمنا ہوتی ہے یا وہ ان کی توقع کئے ہوئے ہوتا ہے۔ جب قلب مومن تن بہ تقدیر اس ربانی احساس کے تابع ہو جاتا ہے' تو پھر وہ پر امید ہو کر کام کرتا ہے۔ اسے امید بھی ہوتی ہے اور خدا کا ڈر بھی' لیکن وہ تمام نتائج برضا و رغبت دست قدرت کے سپرد کر دیتا ہے جو حکیم ہے اور علیم ہے۔ جس کا علم سب کو گھیرے ہوئے ہے۔ یہ ہے دراصل سلامتی کے کھلے دروازے کا داخلہ۔ نفس انسانی کو اسلام کا صحیح شعور اس وقت تک نصیب نہیں ہو سکتا' جب تک اس میں یہ یقین پیدا نہ ہو جائے کہ خیر اسی میں ہے جسے اللہ نے خیر بتایا' بھلائی اس میں ہے کہ اپنے رب کی اطاعت و فرمانبرداری اختیار کی جائے۔ اللہ تعالیٰ کو آزمانے اور اللہ سے براہین طلب کرنے میں کوئی بھلائی نہیں ہے۔ پختہ یقین' پرسکوں امید اور سعی پیہم ہی سلامتی کے دروازے ہیں اور اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو انہی دروازوں سے داخل ہونے کی دعوت دیتا ہے اور حکم دیتا کہ نیمے دروں اور نیمے بیروں میں نہیں بلکہ پورے پورے ان دروازوں سے داخل ہو جاؤ۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو بڑے سادہ عجیب لیکن بہت گہرے منہاج کے ساتھ اس سلامتی کی طرف لے جا رہا ہے۔ بڑی نرمی' بڑی آسانی اور دھیمی رفتار سے۔ سلامتی کے اس راستے پر وہ انہیں اس طریقے سے لے جا رہا ہے کہ آخر کار وہ ان پر قیام امن کے لئے قتال بھی فرض کر دیتا ہے۔ سلامتی کیا چیز ہے؟ سلامتی یہ ہے کہ میدان جنگ میں انسان کی روح اور اس کا ضمیر مطمئن اور امن و سلامتی سے رہیں۔

قرآن کریم کی اس آیت میں قتال کی نسبت سے جو اشارہ کیا گیا ہے' وہ قتال تک ہی محدود نہیں ہے۔ قتال تو ان امور کی ایک واضح مثال ہے جسے نفس انسانی فطرتاً پسند نہیں کرتا۔ لیکن اس میں نتائج کے اعتبار سے بھلائی ہوتی ہے۔ یہ نکتہ دراصل مومن کی پوری زندگی میں اس کا فلسفہ حیات ہے۔ اس کے تمام واقعات زندگی پر اس کا پرتو ہوتا ہے۔ انسان تو کسی معاملے میں یہ نہیں جانتا کہ خیر کہاں ہے اور شر کہاں ہے؟ بدر کے دن مسلمان نکلے کہ قریش کے قافلے کو لوٹ لیں اور ان کے مال تجارت پر قبضہ کر لیں۔ اللہ نے ان سے غنیمت کا وعدہ بھی کر رکھا تھا' وہ سمجھتے تھے کہ یہی قافلہ اور اس کا مال تجارت بس انہیں ملنے ہی والا ہے۔ ان کے تصور میں بھی نہ تھا کہ انہیں قریش کی فوج کے ساتھ دوچار ہونا پڑے گا' لیکن اللہ کا کرنا یہ تھا کہ قافلہ بچ نکلا اور ان کا سامنا قریش کی ساز و سامان سے لیس فوج سے ہو گیا اور اس کے نتیجہ میں اہل اسلام کو وہ کامیابی نصیب ہوئی جس کی آواز بازگشت پورے جزیرۃ العرب میں سنی گئی۔ اب دیکھئے کہ مسلمانوں کی کامیابی کے

مقابلے میں قافلہ اور اس کے سامان تجارت کی حیثیت ہی کیا رہ جاتی ہے؟ اب دیکھئے 'مسلمانوں نے اپنے لئے جو پسند کیا اس کی قدر و قیمت کیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے جو اختیار کیا اس کی قدر و قیمت کیا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ اللہ جانتا ہے اور لوگ نہیں جانتے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ساتھی نوجوان اپنا کھانا بھول گیا یعنی مچھلی۔ جب پتھر کے پاس پہنچے تو مچھلی دریا میں چلی گئی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام آگے چلے گئے اور اپنے خادم سے کہا لاؤ ہمارا ناشتہ آج کے سفر میں تو ہم بری طرح تھک گئے ہیں۔ خادم نے کہا آپ نے دیکھا' یہ کیا ہوا؟ جب ہم اس چٹان کے پاس ٹھہرے ہوئے تھے' اس وقت مجھے مچھلی کا خیال نہ رہا اور شیطان نے مجھ کو ایسا غافل کر دیا کہ میں اس کا ذکر آپ سے کرنا بھول گیا۔ مچھلی تو عجیب طریقے سے نکل کر دریا میں چلی گئی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا اسی کی تو ہمیں تلاش تھی' چنانچہ وہ دونوں اپنے نقش قدم پر پھر واپس ہوئے اور وہاں انہوں نے بندوں میں سے ایک بندے کو پایا۔ یہی وہ مقصد تھا جس کے لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سفر اختیار کیا۔ اگر مچھلی کا واقعہ نہ ہوتا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نہ لوٹتے اور وہ پورا مقصد فوت ہو جاتا جس کے لئے انہوں نے یہ تھکا دینے والا سفر اختیار کیا تھا۔

ہر انسان اگر تامل کرے تو وہ بعض مخصوص تجربوں میں اس سچائی کو دریافت کر سکتا ہے کہ وہ اپنی زندگی میں کئی ایسے تجربات سے دوچار ہوا جو اسے ناپسند تھے۔ لیکن ان کے پس پردہ خیر عظیم کار فرما تھی۔ اور کئی پر ذائقہ اور لذیذ چیزیں بھی تھیں۔ لیکن ان کی تہ میں شر عظیم نہاں تھا۔ کئی ایسے مقاصد ہوتے ہیں کہ جن سے انسان محروم ہو جاتا ہے اور اسے اپنی اس محرومی کا بے حد صدمہ بھی ہوتا ہے لیکن ایک عرصہ کے بعد نتائج دیکھ کر انسان کو معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے محروم رکھ کر دراصل بلائے عظیم سے نجات دی تھی۔ کئی مصائب و شدائد ایسے جاں گسل ہوتے ہیں' کہ انسان بڑی ناخوش گواری سے ان کے کڑوے گھونٹ بھرتا ہے اور قریب ہوتا ہے کہ ان مصائب کی سختی کے نتیجے میں اس کی جان ہی نکل جائے' لیکن ایک طویل عرصہ نہیں گزرتا کہ ان سختیوں کے نتائج اتنے اچھے نکلتے ہیں جتنے ایک طویل پر آسائش زندگی کے نتیجے میں اچھے نہ ہو سکتے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان نہیں جانتا' اللہ ہی جانتا ہے۔ اب انسان اگر اللہ کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کرتا' راضی برضا نہیں ہوتا تو وہ کرے گا کیا؟

یہ ہے منہاج تربیت جس کے مطابق اللہ تعالیٰ نفس انسانی کو لیتا ہے کہ وہ ایمان لے آئے' اسلام میں داخل ہو جائے اور آنے والے نتائج اللہ کے سپرد کر دے۔ اس کا کام صرف یہ ہے کہ وہ بقدر استطاعت' ظاہری جدوجہد کے میدان میں اپنی پوری قوت لگا دے۔

تحریک اسلامی کو امن و سلامتی کی طرف لے جایا جا رہا تھا کہ وہ پوری کی پوری سلامتی کے نظام میں داخل ہو جائے۔ اسی سلسلے کی ایک کڑی حرام مہینوں میں قتال کے بارے میں فتویٰ بھی ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ ۭ قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ ۭ وَصَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَكُفْرٌۢ بِهٖ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۤ وَاِخْرَاجُ اَھْلِهٖ مِنْهُ اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَالْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ ۭ وَلَا يَزَالُوْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ حَتّٰى يَرُدُّوْكُمْ عَنْ دِيْنِكُمْ اِنِ اسْتَطَاعُوْا ۭ وَمَنْ يَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَيَمُتْ وَھُوَ كَافِرٌ فَاُولٰۗىِٕكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ

فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ وَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۱۷﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ اُولٰٓئِكَ يَرْجُوْنَ رَحْمَتَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۱۸﴾

”لوگ پوچھتے ہیں کہ ماہ حرام میں لڑنا کیسا ہے؟ کہو ! اس میں لڑنا بہت برا ہے مگر راہ خدا سے لوگوں کو روکنا اور اللہ سے کفر کرنا اور مسجد حرام کا راستہ خدا پرستوں پر بند کرنا اور حرم کے رہنے والوں کو وہاں سے نکالنا اللہ کے نزدیک اس سے بھی زیادہ برا ہے اور فتنہ خونریزی سے شدید تر ہے۔ وہ تو تم سے لڑے ہی جائیں گے حتیٰ کہ اگر ان کا بس چلے تو تمہارے دین سے تم کو پھیر لے جائیں (اور یہ خوب سمجھ لو کہ) تم میں جو کوئی اپنے دین سے پھرے گا اور کفر کی حالت میں جان دے گا' اس کے اعمال دنیا و آخرت میں ضائع ہو جائیں گے۔ ایسے سب لوگ جہنمی ہیں اور ہمیشہ جہنم میں رہیں گے۔ بخلاف اس کے جو لوگ ایمان لائے ہیں اور جنہوں نے خدا کی راہ میں اپنا گھر بار چھوڑا اور جہاد کیا ہے' وہ رحمت الٰہی کے جائز امیدوار ہیں اور اللہ ان کی لغزشوں کو معاف کرنے والا اور اپنی رحمت سے انہیں نوازنے والا ہے۔“

متعدد روایات میں آیا ہے کہ یہ آیات عبد اللہ ابن جحش کے سریہ کے بارے میں نازل ہوئی ہیں۔ حضور ﷺ نے انہیں ایک سیل شدہ خط دیا اور آٹھ افراد ان کے ساتھ روانہ کئے جو سب کے سب مہاجر تھے' انصار کا ان میں کوئی نہ تھا۔ آپ ﷺ نے عبد اللہ کو حکم دیا کہ وہ دو رات دن کے سفر سے پہلے اس خط کو نہ کھولے۔ جب اس نے اپنے مقررہ وقت پر خط پڑھا تو اس کی عبارت یہ تھی جب تم میرے اس خط کو پڑھو تو آگے بڑھو یہاں تک کہ وادی بطن نخلہ میں جا اترو۔ جو مکہ اور طائف کے درمیان ہے۔ یہاں تم قریش کے حالات نگاہ میں رکھو اور ہمیں ان کی اطلاع دیتے رہو۔ لیکن اپنے ساتھیوں میں سے کسی کو بھی اپنے ساتھ لے جانے پر مجبور نہ کرنا۔ یہ واقعی بدر کبریٰ سے پہلے کا ہے۔ عبد اللہ بن جحش نے خط پڑھ کر کہا ”سر آنکھوں پر“۔ اس کے بعد اپنے ساتھیوں سے کہا کہ حضور ﷺ نے تو مجھے حکم دیا ہے کہ میں بطن نخلہ جاؤں' وہاں قریش کو نگاہ میں رکھوں اور ان کے حالات کی اطلاع حضور ﷺ کو دوں۔ حضور ﷺ نے مجھے اس سے منع کیا ہے کہ میں تم میں سے کسی کو اپنے ساتھ جانے پر مجبور کروں۔ تم میں سے جو شخص شہادت کا درجہ حاصل کرنا چاہتا ہے اور اسے اس کا شوق ہے تو وہ چلے اور اگر کوئی اسے ناپسند کرتا ہے تو واپس ہو جائے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے تو میں حضور ﷺ کے حکم کو بجا لاؤں گا۔ چنانچہ وہ آگے چلا اور اس کے تمام ساتھی اس کے ساتھ ہو لیے' کوئی بھی ان میں پیچھے نہ مڑا۔ وہ مجاز کے راستے گئے اور ابھی راستے پر ہی تھے کہ سعد بن ابی وقاص اور عتبہ بن عزوان کا اونٹ گم ہو گیا۔ وہ عبد اللہ بن جحش کے قافلے سے پیچھے رہ گئے تاکہ اونٹ تلاش کر لیں۔ باقی چھ افراد آگے بڑھ گئے۔ جب یہ بطن نخلہ پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ قریش کا ایک قافلہ جا رہا ہے' جس کے اونٹوں پر سامان تجارت لدا ہوا ہے۔ اس قافلے میں عمرو بن الحضرمی اور تین دوسرے افراد تھے۔ عمرو کو قتل کر دیا گیا اور دو گرفتار ہوئے اور ایک بھاگ نکلا۔ انہوں نے پورے قافلے کے سامان کو قبضے میں کر لیا۔ اس دستے کا خیال یہ تھا کہ حملے کا دن جمادی الاخر کا آخری دن ہے۔ حالانکہ دراصل حملے کا دن رجب کا پہلا دن تھا۔ اور حرام مہینوں کا آغاز ہو گیا تھا' جن کا احترام عرب بھی بہت زیادہ کرتے تھے اور اسلام نے بھی ان کے احترام کو برقرار رکھا تھا۔ جب یہ دستہ اس قافلے اور قیدیوں کو لے کر مدینہ پہنچا اور حضور ﷺ کے سامنے غنیمت پیش کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا میں نے تمہیں حرام مہینوں میں لڑنے کا حکم دیا ہی کب تھا؟ قافلہ اور قیدی کھڑے کر دیئے گئے اور آپ ﷺ نے ان کے لینے سے انکار فرمایا۔

جب حضور ﷺ نے یہ فرمایا تو لوگ گھبرا گئے اور انہوں نے یہ یقین کر لیا کہ ان سے ایک عظیم جرم کا ارتکاب ہو گیا ہے' وہ تو مارے گئے۔ مسلمان بھائیوں نے بھی انہیں سخت سست کہا کہ انہوں نے یہ کیا کیا؟ قریش مکہ نے کہا محمد ﷺ اور اس کے ساتھیوں نے حرام مہینوں کی حرمت کو ختم کر دیا ہے' انہوں نے ان میں خون ریزی کی' مال چھین لیا اور لوگوں کو قید کر لیا۔ یہودیوں نے اس واقعے سے حضور ﷺ کیلئے فال بد نکالی۔ انہوں نے کہا: عمرو الحضرمی کو واقد ابن عبداللہ نے قتل کیا: "عمرو" یعنی جنگ کی عمارت بن گئی "حضرمی" یعنی جنگ سرسبز ہو گئی "واقد" جنگ کے شعلے بھڑک اٹھے۔۱۔

غرض اس واقعے کے بعد گمراہ کن پروپیگنڈے کا طوفان برپا ہو گیا اور اسے مختلف مکارانہ طریقوں سے اہل عرب کے درمیان پھیلایا گیا۔ اور اس میں حضور ﷺ اور آپ کے ساتھیوں کو ایک ایسے شخص کی شکل میں پیش کیا گیا جو عربوں کے تمام مقدسات کا انکار کرتا ہے اور جو صدیوں سے قائم روایات کو پامال کر رہا ہے۔ اور جب بھی مصلحت کا تقاضا ہو وہ ہر بندھن کو توڑتا ہے۔ (نعوذ باللہ) اس پروپیگنڈا کے طوفان بدتمیزی کے دوران' اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں' جنہوں نے بات کو کاٹ کر رکھ دیا اور معاملے کا فیصلہ سچائی کے ساتھ کر دیا گیا۔ حضور ﷺ نے مال غنیمت اور قیدیوں کو قبول فرمایا:

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ ۗ قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ "لوگ پوچھتے ہیں ماہ حرام میں لڑنا کیسا ہے؟ کہو اس میں لڑنا بہت برا ہے۔" یہ آیات نازل ہوئیں۔ انہوں نے حرام مہینوں میں لڑائی جھگڑے کو تو برا اور گناہ کبیرہ قرار دیا اور کہا یہ تو ٹھیک ہے' لیکن وَ صَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَكُفْرٌۢ بِهٖ وَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۗ وَ اِخْرَاجُ اَهْلِهٖ مِنْهُ اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَ الْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ مگر راہ خدا سے لوگوں کو روکنا اور اللہ سے کفر کرنا اور مسجد حرام کا راستہ خدا پرستوں پر بند کرنا اور حرم کے رہنے والوں کو وہاں سے نکالنا' اللہ کے نزدیک اس سے بھی زیادہ برا ہے اور فتنہ خونریزی سے شدید تر ہے۔"

یہ جنگ مسلمانوں نے شروع نہ کی تھی' دشمنی کا آغاز انہوں نے کیا تھا۔ یہ تو مشرکین ہی تھے جنہوں نے پہل کی۔ انہی لوگوں نے اللہ کی راہ میں لوگوں کو روکا' انہی لوگوں نے اللہ سے کفر کیا۔ انہی لوگوں نے خدا پرستوں کو مسجد حرام سے روکا۔ انہوں نے لوگوں کو اللہ کی راہ سے روکنے کے لئے ہر کبیرہ گناہ کا ارتکاب کیا۔ انہوں نے خود بھی اللہ کا انکار کیا اور لوگوں کو بھی اللہ کا منکر بنایا۔ انہوں نے مسجد حرام کی حرمت کا بھی انکار کیا اور اس کی حرمت کو توڑا۔ اس میں مسلمانوں کو اذیت دی اور ہجرت سے پہلے پورے تیرہ سال تک' وہ مسلمانوں کو اذیتیں دے دے کر انہیں ان کے دین سے روکتے رہے۔ پھر انہوں نے اس پر بھی اکتفانہ کیا بلکہ انہوں نے مسجد حرام کے باشندوں کو ان کے گھروں سے نکالا حالانکہ وہ قابل احترام اور امن کی جگہ تھی۔ انہوں نے حرم کے تقدس کا کوئی خیال نہ رکھا اور اس کے احترام کے کسی اصول پر عمل نہ کیا۔

اللہ کے نزدیک باشندگان حرم کو ان کے گھروں سے نکالنا حرام مہینوں میں جنگ کرنے سے زیادہ برا ہے۔ اور لوگوں کو محض دین اور نظریہ کی وجہ سے مصائب میں مبتلا کرنا اور انہیں تکالیف پہنچانا قتل سے بھی زیادہ برا ہے۔ چونکہ مشرکین مکہ نے اعلانیہ ان دو کبائر کا ارتکاب کر لیا تھا' لہٰذا ان کا یہ استدلال کہ مسلمانوں نے حرام مہینوں کے احترام کا کوئی خیال نہیں کیا' یا بیت الحرام کی حرمت کا کوئی خیال نہیں کیا' یہ محض پروپیگنڈا ہے اور ساقط الاعتبار ہے۔ چنانچہ ان آیات کے ذریعہ خود مسلمانوں کا موقف واضح ہو کر سامنے آگیا کہ مسلمان تو درحقیقت ان لوگوں کے خلاف برسرپیکار ہیں جو حرم مقدس کا کوئی احترام نہیں کرتے۔ دراصل حرم شریف اور حرام مہینوں کے احترام

۱۔ عمرو کے لفظی مفہوم میں تعمیر شامل ہے۔ حضرمی کے لفظی مفہوم سرسبزی شامل ہے اور واقد کا لفظی معنی "جلانے والا"

کو اپنے لئے ایک پردہ اور پناہ بنالیا ہے جس کی آڑ میں یہ لوگ جب چاہیں قداست اور پاکی کا ڈھنڈورا پیٹیں اور جب چاہیں اس تقدس کو پامال کر دیں۔ مسلمانوں کا فرض یہ تھا کہ یہ لوگ جہاں ملیں انہیں ختم کر دیں کیونکہ یہ لوگ باغی اور شرپسند ہیں' کسی احترام کا کوئی لحاظ نہیں رکھتے' کسی جعلی پردے کے پیچھے من مانی کرنے نہ دیتے۔ کیونکہ ان کے دل میں کوئی حقیقی احترام نہیں ہے۔

حرمتوں کے شعار اور روایات دراصل ایک حیثیت تھی مگر اس سے وہ ناجائز فائدہ اٹھاتے تھے' کفار مکہ ماہ حرام کی بے حرمتی کا جو پروپیگنڈا کر رہے تھے' وہ تو محض ظاہرداری تھی' اس کے پردے میں چھپ کر دراصل وہ ثابت یہ کرنا چاہتے تھے' مسلمان زیادتی کر رہے ہیں اور یہ ان کا موقف درست نہیں ہے۔ حالانکہ ظلم و زیادتی کی ابتدا خود انہوں نے کی۔ یہ وہی تھے جنہوں نے بیت الحرام کی حرمت کا کوئی خیال نہ کیا۔

اسلام زندگی کا ایک حقیقت پسندانہ نظم ہے۔ وہ محض خیالی مثالوں اور نظریاتی شکلوں پر مبنی نہیں ہے وہ انسانی زندگی کا حقیقت پسندانہ مطالعہ کرتا ہے۔ اس کی مشکلات' اس کے میلانات اور اس کے واقعی حالات پر نظر رکھتا ہے۔ اس کی حقیقت پسندانہ راہنمائی کرتا ہے۔ وہ اس زندگی کو زمین پر بطور حقیقت واقعہ چلاتا ہے اور آہستہ آہستہ اسے ترقی کی سمت میں لے جاتا ہے۔ وہ اس کے مسائل کو اس طرح حل کرتا ہے کہ وہ حل ایک عملی حل ہو۔ محض خام خیالی اور فلسفیانہ تخیلات ہی نہ ہوں بلکہ وہ ایسا حل پیش کرتا ہے جو عملی دنیا میں چل بھی سکے۔

اب ذرا قریش کی حالت کو دیکھئے۔ یہ لوگ سخت ظالم اور سرکش تھے' مقامات مقدسہ ان کی نظروں میں کچھ حیثیت ہی نہ رکھتے تھے۔ وہ حرمتوں کے تقدس کے قائل ہی نہ تھے۔ وہ ہر اچھے اخلاق' ہر دینداری اور ہر اچھے نظریہ کو کچل رہے تھے۔ حق کے مقابلے میں اکڑ گئے تھے اور لوگوں کو حق قبول کرنے سے روکتے تھے۔ مومنین کو انہوں نے فتنوں میں مبتلا کر رکھا تھا' اور انہیں سخت اذیتیں پہنچاتے تھے' وہ انہیں مسجد حرام سے نکال رہے تھے حالانکہ عربوں کی روایات کے مطابق مسجد حرام اور بیت الحرام دارالامان تھے اور ان میں انسان کیا' حیوانوں اور کیڑوں مکوڑوں کو بھی امن امان حاصل تھا لیکن ان سب حقائق کے باوجود ان لوگوں نے ان حرمتوں کی آڑ میں پوری دنیا کو سر پر اٹھا رکھا تھا' اور ان حرمتوں کا ڈھنڈورا پیٹ رہے تھے۔ وہ چلاتے تھے' دیکھو' یہ ہے محمد ﷺ اور اس کے ساتھی' انہوں نے حرام ماہ کی حرمت کو پامال کر دیا۔

اب دیکھئے اسلام ان کے مقابلے میں کیا رویہ اختیار کرتا ہے۔ کیا اسلام ان کے مقابلے میں کوئی نظری' مثالی اور خیالی جواب لاتا ہے اور مسئلے کا نظریاتی جائزہ لیتا ہے۔ اگر اسلام اس معاملے میں کوئی خیالی حل پیش کرتا تو یقیناً وہ آئیڈیل ضرور ہوتا لیکن نتیجہ یہ ہوتا کہ مسلمانوں کی حالت یہ ہوتی کہ ان کو غیر مسلح کر دیا جاتا۔ جب کہ ان کا مقابلہ ایک ایسے شریر اور سرکش دشمن سے تھا' جو ہر ہتھیار استعمال کرتا تھا اور کوئی حربہ استعمال کرنے میں دریغ نہ کرتا تھا۔ ہرگز نہیں' اسلام کبھی بھی یہ رویہ اختیار نہیں کرتا کیونکہ اس کا مقابلہ ایک حقیقی صورت حال سے تھا۔ اس نے اس صورت حال کا مقابلہ کرنا تھا۔ اور اسے اپنے راستے سے ہٹانا تھا۔ اسلام شر و فساد کو اپنے راستے سے ہٹانا چاہتا تھا۔ وہ اس زمین کے اختیارات ایک صالح قوت کے ہاتھ میں دینا چاہتا تھا' وہ اختیارات اور قیادت ایک صالح جماعت کے ہاتھ میں دینا چاہتا تھا۔ اس لئے وہ ہرگز یہ نہ کر سکتا تھا کہ یہ حرمتیں مفسدوں اور باغیوں کے لئے قلعہ بن جائیں اور اس کے اندر پناہ لے کر یہ لوگ پاک طینت صالح اور تعمیری کام کرنے والوں پر وار کریں۔ اور جوابی حملے سے بالکل محفوظ بیٹھے ہوں۔

اسلام تو ان لوگوں کے مقابلے میں حرمتوں کا بہت خیال رکھتا ہے جو خود ان کا لحاظ رکھیں اور وہ حرمتوں کے اصول و روایت کا سختی سے پابند ہے۔ لیکن وہ ہرگز کسی کو یہ اجازت نہیں دیتا کہ وہ خود تو ان حرمتوں کا کوئی خیال نہ کرے' ان کو خوب توڑے اور اپنے لئے انہیں

ایک حصار قرار دے اور اس کی اوٹ سے نیک بندوں کو اذیت دے' بھلے لوگوں کو قتل کرے اور ہر برائی کا مزے سے ارتکاب کرے اور ان حرمتوں کی اوٹ میں جوابی حملے سے محفوظ و مامون رہے اور لوگوں کو تلقین کرے کہ ان حرمتوں کا لحاظ رکھو۔

اسلام نے ہر معاملے میں یہی پالیسی اختیار کی ہے' مثلاً اسلام میں غیبت حرام ہے' لیکن فاسق کی غیبت' غیبت ہی نہیں ہے۔ اگر وہ اپنے فسق و فجور میں مشہور ہو تو جو لوگ اس کے فسق و فجور کے نتیجے میں داغہائے سینہ رکھتے ہیں' وہ معاف ہیں۔ اسلام الجہر (بدگوئی) کو حرام قرار دیتا ہے لیکن اس شخص کو مستثنیٰ کیا جاتا ہے جس پر ظلم کیا گیا ہو' اگر کوئی مظلوم ہے تو وہ اس ظلم کے خلاف علی الاعلان بدگوئی کر سکتا ہے کیونکہ یہ اس کا حق ہے۔ اگر ظالم کے خلاف آواز نہ اٹھائی گئی' اس نیت سے کہ وہ غیبت ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم ظالم کو ایک اچھے اصول کی پناہ دیتے ہیں حالانکہ وہ اس بات کا مستحق نہیں ہے کہ وہ اس اصول سے فائدہ اٹھائے۔

لیکن برابر کے اس معاملے میں باوجود اسلام اپنا معیار گرنے نہیں دیتا' وہ اپنی اونچی سطح سے اتر کر ان شریروں اور ظالموں کی سطح تک نہیں اترتا۔ وہ اپنے مخالفین کے مقابلے میں اوچھے ہتھیار استعمال کرتا ہے' نہ غیر اخلاقی وسائل یا قابل نفرت ذرائع۔ وہ مسلمانوں کو صرف یہ حکم دیتا ہے کہ ظالموں کے ہاتھ توڑ دو' ان سے لڑائی کرو' ان کو قتل کر دو۔ اور زندگی کے ماحول کو ان سے پاک کر دو' کھلے طور پر' اور علی الاعلان۔

اصل مسئلہ ہے قیادت کا' جب قیادت پاک لوگوں کے ہاتھ میں آجائے' جو مومن ہوں' سلیم الفطرت ہوں اور جب زمین کو ان لوگوں کی نجاست سے پاک کر دیا جائے جو کسی حرمت کا کوئی لحاظ نہیں رکھتے اور تمام مقدسات کو پامال کرتے ہیں تب جاکر تمام مقدسات کی حرمت بحال ہوگی اور اس طرح بحال ہوگی جس طرح اللہ تعالیٰ چاہتا ہے۔

یہ ہے اسلام۔ صریح' واضح' قوی اور باطل کا سر پھوڑنے والا جس میں کوئی لگی لپٹی نہیں' کوئی ہیر پھیر نہیں۔ نہ وہ کسی دوسری طاقت کو یہ موقعہ دیتا ہے کہ وہ اس کے ساتھ کوئی ہیرا پھیری کرے یا اسے کوئی دھوکہ دے۔ اور یہ ہے قرآن مجید جو مسلمانوں کو ایک مضبوط موقف عطا کرتا ہے۔ اس قدر مضبوط جس پر ان کے قدم ڈگمگانے نہ پائیں۔ وہ راہ خدا میں آگے ہی بڑھتے جائیں اور خدا کی اس زمین کو ہر قسم کے شر و فساد سے پاک کر دیں۔ قرآن مجید ان کے دل و دماغ کو شیشے کی طرح صاف نقطہ نظر عطا کرتا ہے' وہ ان کے دلوں میں کسی قسم کا قلق' کسی قسم کا خلجان نہیں رہنے دیتا' شبہات و وساوس ان کے دلوں سے ختم کر دیئے جاتے ہیں۔ قرآن صاف صاف کہتا ہے دیکھو! وہ شر ہے' فساد ہے' نافرمانی ہے اور باطل ہے' لہٰذا اسے کوئی حرمت اور کوئی تحفظ حاصل نہیں ہے۔ اس باطل کو یہ اجازت نہیں دی جاسکتی کہ وہ ان حرمتوں کو ڈھال بناکر خود ان حرمتوں پر ضربیں لگائے۔ قرآن مجید واضح طور پر یہ ہدایت کرتا ہے کہ اپنی منزل کی طرف بڑھے چلو' یقین کے ساتھ' اطمینان کے ساتھ' اپنے ضمیر کی سلامتی کے ساتھ اور اپنے اللہ کے ساتھ جڑے ہوئے۔

اس حقیقت کے بیان اور اچھی طرح ذہن نشین کرنے اور مسلمانوں کو دلجمعی اور صبر و ثبات دینے کے بعد اب انہیں بتایا جاتا ہے کہ جس شر سے ان کا مقابلہ ہے وہ کوئی سطحی شر نہیں ہے وہ بہت ہی گہری برائی ہے۔ دشمنوں کا منصوبہ بہت ہی گہرا ہے اور وہ اس پر بطور اصول جمے ہوئے ہیں۔

وَلَا يَزَالُوْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ حَتّٰى يَرُدُّوْكُمْ عَنْ دِيْنِكُمْ اِنِ اسْتَطَاعُوْا "اور وہ تم سے لڑے ہی جائیں گے حتیٰ کہ اگر ان کا بس چلے تو تمہارے دین سے تم کو پھیر لے جائیں۔"

یہ ہے صحیح رپورٹ' جو علیم و خبیر کی طرف سے ہے اور جو بتاتی ہے کہ شر اپنے ناپاک موقف پر کس قدر مصر ہے' کفار' مسلمانوں کو اپنے دین سے ہٹانے کے لئے کس قدر زور لگا رہے ہیں اور یہ کہ مسلمانوں کے دشمنوں کا یہ ایک مستقل نصب العین ہے' وہ چاہتے ہیں کہ

انہیں کسی طرح اسلام سے دور کر دیں۔ دشمنان اسلام کا یہ نصب العین ایسا مستقل نصب العین ہے کہ یہ کسی دور میں اور کسی علاقے میں کبھی بھی تبدیل نہیں ہوا۔ زمین پر اسلام کا وجود ہی ان کو ناگوار ہے۔ دین کے دشمن اس سے ہمیشہ خائف رہے ہیں۔ ہر دور میں یہ لوگ اسلامی جماعت اور اسلامی تحریک سے خائف رہتے ہیں۔ نفس اسلام سے انہیں چڑ ہے' انہیں اس سے سخت اذیت ہوتی ہے۔ وہ ہر وقت اس سے خوف کھاتے ہیں۔ اسلامی نظام کی قوت اور اس کی سنجیدگی سے ہر باطل پرست خائف رہتا ہے۔ خدا کا ہر باغی اس سے مرعوب ہوتا ہے۔ ہر مفسد اسلام کو ناپسند کرتا ہے۔ اسلام بذات خود کفر سے ایک جنگ ہے۔ اسلام کی روشن سچائی' اس کا پائیدار نظام زندگی اور اس کا پائیدار طریق کار ہی باطل کے لئے چیلنج ہے۔ ان خوبیوں کی وجہ سے اسلام بذات خود کفر اور فساد کے لئے اعلان جنگ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ باطل پرست' باغی اور مفسد کبھی بھی اسلام کو برداشت نہیں کرتے۔ وہ ہر وقت اس ٹوہ میں لگے رہتے ہیں کہ اہل اسلام کو کسی نہ کسی طرح فتنے میں ڈال دیں۔ انہیں واپس کفر کی طرف لے آئیں۔ چاہے کفر کی کوئی صورت ہی وہ اختیار کریں لیکن اسلام کو چھوڑ دیں۔ جب تک اس کرۂ ارض پر کوئی ایسی جماعت بھی موجود ہے جس کا نصب العین اسلامی نظام زندگی ہے' جو اسلام کی پیرو کار ہو اور اسلام میں زندہ رہنا چاہتی ہو۔ اس وقت تک باطل پرست اپنے باطل پر اور اپنے فساد پر پر امن طور پر گامزن نہیں رہ سکتے۔ اس لئے وہ تحریک اسلامی سے ہر وقت خائف رہتے ہیں۔

اسلام کے یہ دشمن' مسلمانوں کے خلاف کئی قسم کی جنگ لڑتے ہیں اور اس میں قسم قسم کے ہتھیار استعمال کرتے ہیں' لیکن ان کا مقصد ایک ہی رہتا ہے اور ہمیشہ وہی ان کے پیش نظر رہتا ہے یہ کہ اگر ان کا بس چل سکے تو یہ لوگ صادق مسلمانوں کو اپنے دین سے پھیر دیں۔ جب ان کا کوئی ایک ہتھیار ناکارہ ہو جاتا ہے تو یہ فوراً دوسرا ہتھیار استعمال کرتے ہیں۔ جب ان کا ایک ہتھیار کند ہو جاتا ہے تو یہ لوگ دوسرا ہتھیار تیز کر لیتے ہیں' لیکن علیم و خبیر کی یہ سچی رپورٹ اپنی جگہ پر قائم ہے اور مسلمانوں کو ان مخالفین کے ہتھکنڈوں سے خبردار کرتی ہے کہ وہ ہتھیار نہ ڈالیں۔ مسلمانوں کو دعوت دی جاتی کہ وہ ان کفار کی سازشوں کے مقابلے میں ثابت قدم رہیں۔ ان کے ساتھ جنگ پیش آجائے تو اس میں صبر و تحمل سے کام لیں۔ اور اگر ایسا نہ کریں گے تو دنیا و آخرت میں خسارہ اٹھائیں گے۔ وہ ایسے عذاب سے دوچار ہوں گے جو کسی عذر سے معاف نہ ہو گا اور جو کسی جواز سے کم نہ ہو گا:

وَمَنۡ يَّرۡتَدِدۡ مِنۡكُمۡ عَنۡ دِيۡنِهٖ فَيَمُتۡ وَهُوَ كَافِرٌ فَاُولٰٓـئِكَ حَبِطَتۡ اَعۡمَالُهُمۡ فِى الدُّنۡيَا وَالۡاٰخِرَةِ‌ ۚ وَاُولٰٓـئِكَ اَصۡحٰبُ النَّارِ‌ ۚ هُمۡ فِيۡهَا خٰلِدُوۡنَ "تم میں سے جو کوئی اپنے دین سے پھرے گا اور کفر کی حالت میں جان دے گا' اس کے اعمال دنیا اور آخرت دونوں میں ضائع ہو جائیں گے۔ ایسے سب لوگ جہنمی ہیں اور ہمیشہ جہنم ہی میں رہیں گے۔"

حبطت حبوط سے نکلا ہے۔ عرب کہتے ہیں حبطت الناقۃ' یعنی اونٹنی پھول گئی۔ جب وہ کوئی ایسی چیز چر لے جس سے وہ پھول جائے اور آخر کار مر جائے (جس طرح شفتل اور بعض دوسرے چاروں سے جانور پھول جاتے ہیں)۔ قرآن مجید نے اس لفظ کو کفار کے اعمال کے لئے استعمال کیا ہے جس سے حسی اور معنوی مفاہیم کا تطابق بھی معلوم ہوتا ہے۔ جس طرح اونٹنی بظاہر پھول کر بڑی ہو جاتی ہے لیکن اس کا انجام ہلاکت ہوتا ہے۔ اس طرح کفار کے اعمال بہت ہی بڑے اور پھولے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن انجام ان کا کچھ نہیں ہوتا بلکہ تباہ ہو جاتے ہیں۔

یہی حال اس شخص کا ہو گا' جو اسلام کو سمجھنے اور اس کا تجربہ کر لینے کے بعد' اس سے روگردانی کرے گا۔ محض اذیتوں اور مصیبتوں سے گھبرا کر۔ اگرچہ وہ حد سے گزر جائیں تو اس کا انجام یہی ہو گا جس کا اللہ نے ذکر فرمایا: کہ دنیا و آخرت میں اس کے اعمال ضائع ہو جائیں گے اور آخرت میں وہ ہمیشہ جہنم کی آگ میں رہیں گے۔

جو دل ایمان کا ذوق آشنا ہو جائے' صحیح طرح وہ اسلام کو سمجھ لے' اس بات کا امکان ہی نہیں ہے کہ وہ فی الواقع اسلام کو چھوڑ دے اور راہ ارتداد اختیار کرے۔ الا یہ کہ کسی کا دل و دماغ اس قدر فاسد ہو جائے جس کی اصلاح کی کوئی صورت نہ رہے لیکن یہ حکم ان لوگوں کا نہیں ہے جو ناقابل برداشت عذاب سے بچنے کے لئے تقیہ اختیار کرلیں۔ اللہ رحیم و کریم ہے' اس نے مسلمان کو اجازت دی ہے کہ جب مصائب اس کی قوت برداشت سے بڑھ جائیں تو وہ ظاہری رواداری اختیار کرلیں بشرطیکہ ان کا دل اسلام پر ثابت قدم ہو' قلب ایمان پر مطمئن ہو۔ لیکن اللہ نے کسی صورت میں بھی کفر حقیقی اور ارتداد حقیقی اختیار کرنے کی کوئی رخصت نہیں دی۔ یوں کہ وہ کافر ہو کر رہ جائے نعوذ باللہ من ذلک۔

اور اللہ تعالیٰ کی جانب سے یہ تنبیہ اور تحذیر روز قیامت تک اپنی جگہ پر قائم ہے۔ مسلمان کے لئے اس بات کا کوئی عذر نہیں ہے کہ وہ مصائب اور شدائد سے تنگ آکر اپنا دین ایمان چھوڑ دے۔ اور ایمان و اسلام سے منحرف ہو جائے اور اس حق کو ترک کر دے جو اس نے چکھا اور جانا۔ بلکہ ایک مسلمان کا فرض ہے کہ جس قدر ممکن ہو وہ مجاہدہ کرے۔ جبر و ثبات سے کام لے اور سخت جانی سے کام لے۔ یہاں تک کہ اللہ کا حکم آجائے۔ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو جو اس پر ایمان لے آئیں اور پھر اس کی راہ میں مصائب برداشت کریں یونہی نہیں چھوڑ دیتا۔ وہ ان کی ان تکالیف پر انہیں جزائے خیر دیتا ہے اور وہ دو باتوں میں سے ایک ضروری ہوتی ہے یا اس کی نصرت آجاتی ہے اور مومن کامیاب ہو جاتا ہے اور یا اسے شہادت کا مقام بلند حاصل ہو جاتا ہے۔

جن لوگوں کو اللہ کی راہ میں اذیت دی جائے۔ وہ اللہ کی خصوصی رحمت کے امیدوار ہوتے ہیں اور جس مومن کا دل ایمان سے معمور ہو وہ کبھی بھی مایوس نہیں ہوتا۔ إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَاجَرُوا وَجَاهَدُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أُولَٰئِكَ يَرْجُونَ رَحْمَتَ اللَّهِ ۚ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ ‏ جو لوگ ایمان لائے ہیں اور جنہوں نے خدا کی راہ میں اپنا گھر بار چھوڑا اور جہاد کیا' وہ رحمت الٰہی کے جائز امیدوار ہیں اور اللہ ان کی لغزشوں کو معاف کرنے والا اور اپنی رحمت سے انہیں نوازنے والا ہے۔"

جب ایک مومن رحمت خداوندی کا امیدوار ہو تو اللہ اسے کبھی نامراد نہیں لوٹاتے۔ مہاجرین و انصار کے مخلص مومنین نے' اگرچہ وہ قلیل تعداد میں تھے' اللہ تعالیٰ کے اس وعدے کو اپنے کانوں سے سنا تھا' انہوں نے جہاد کیا' مشکلات پر صبر کیا تو اللہ تعالیٰ نے اپنا وعدہ پورا کر دیا۔ بعض کو شہادت نصیب ہوئی اور بعض کو نصرت خداوندی پہنچی۔ دونوں خیر ہیں۔ دونوں اللہ کی رحمت ہیں۔ یہ لوگ اللہ کی مغفرت اور اللہ کی رحمت کے مراتب پر فائز ہو گئے کیونکہ اللہ غفور ہے اور رحیم ہے۔ یہ ہے طریقہ مومن۔

اب سیاق کلام بعض منہیات کی طرف آتا ہے۔ شراب اور جوئے کے احکام بیان ہوتے ہیں۔ یہ دونوں چیزیں ان لذات میں سے ہیں جن میں عرب کانوں تک غرق تھے۔ کیونکہ اس دور میں ان کے سامنے کچھ اونچے مقاصد نہ تھے جن میں وہ اپنے آپ کو مصروف رکھتے اور یوں ان کا قیمتی وقت اور ان کی قیمتی قوتیں کسی تعمیری کام میں صرف ہوتیں۔

يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ ۖ قُلْ فِيهِمَا إِثْمٌ كَبِيرٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَإِثْمُهُمَا أَكْبَرُ مِنْ نَفْعِهِمَا ۗ

پوچھتے ہیں' شراب اور جوئے کا کیا حکم ہے؟ کہو ان دونوں چیزوں میں بڑی خرابی ہے۔ اگرچہ ان میں لوگوں کے لئے کچھ منافع بھی ہیں مگر ان کا گناہ ان کے فائدے سے بہت زیادہ ہے۔

اس وقت شراب اور جوئے کی حرمت کا حکم نازل نہ ہوا تھا' لیکن قرآن مجید میں کوئی ایسی آیت بھی نہیں ہے جس سے ان کی حلت کا ثبوت ملتا ہو' لیکن اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو جس راستے پر لے جانا چاہتا تھا' اس کی مرضی یہ تھی کہ وہ انہیں اس راہ پر قدم بقدم لے جائے اور خود اپنی نگرانی میں اس امت کو اس رول کیلئے تیار کرے جس کیلئے اس نے اسے برپا کیا۔ یہ رول اس قدر عظیم تھا کہ اس کے ساتھ شراب اور جوئے جیسے مخرب اخلاق و مخرب اوقات کام چل ہی نہ سکتے تھے۔ عمر کا ٹکڑے ٹکڑے کر دینا' فہم کا پریشان کر دینا اور جدوجہد کے حصے بخرے کر دینا اس رول اور اس منصب کے مناسب نہیں۔ اس کے حاملین ان نکموں کی طرح نہیں ہو سکتے' جن کا کوئی کام اس کے سوا نہیں ہوتا کہ وہ کام و دہن اور گوشت و پوست کی لذت کے پیچھے دوڑتے پھریں۔ نہ وہ ایسے لوگوں کی طرح ہوتے ہیں جن کا کوئی نظریہ نہ ہو اور ذہن و شعور کا خلا' خوفناک خلا' ان کے تعاقب میں ہو اور وہ اس خلا کو شراب کی مدہوش اور جوئے کی مشغولیت سے بھرنا چاہتے ہیں: نہ وہ ایسے لوگوں کی طرح ہوتے ہیں کہ جو نفسیاتی مریض ہیں اور خود اپنے سایہ سے بھاگ رہے ہیں اور شراب و قمار کی پناہ لینے پر مجبور ہیں۔ حاملین جاہلیت ہمیشہ ان مفاسد میں مبتلا رہے ہیں۔ آج بھی وہ اس میں مبتلا ہیں اور مستقبل میں بھی جاہلیت کا یہی نشان ہو گا۔ البتہ یہ بات ایک حقیقت ہے کہ اسلام اپنے مخصوص نظام تربیت کے مطابق' نفس انسانی کو بڑی سہولت میں لے کر چلتا ہے اور بڑی تدریج اور ترقی کے ساتھ اس کی تربیت کرتا ہے۔

آیت زیر بحث محرمات کے سلسلے کی پہلی کڑی ہے۔ یہ پہلا قدم ہے۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ کوئی چیز یا کوئی فعل بذات خود شر ہی شر ہو' ہو سکتا ہے کہ شر میں خیر کا بھی کوئی پہلو موجود ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ خیر اور بھلائی میں بھی شر کا کوئی پہلو ہو۔ لیکن جائز' حلال و حرام اور امر و نہی کا دارومدار دراصل غالب خیر یا غالب شر کے لحاظ سے ہوتا ہے۔ جوئے اور شراب میں شر کا پہلو چونکہ غالب ہے اس لئے یہ ان چیزوں کی حرمت کے لئے علت بن جائے گا۔ اگرچہ یہاں ان اشیاء کی حرمت کی صراحت نہیں کی گئی۔

یہاں اسلامی نظام تربیت اور قرآنی منہاج تعمیر اور ربانی طرز تعلیم کا ایک انداز کھل کر سامنے آ جاتا ہے۔ یہ نہایت ہی حکیمانہ انداز تربیت ہے۔ اسلام کی اکثر ہدایات و فرائض اور قانون سازی میں تتبع اور استقراء سے معلوم ہو گا کہ یہی منہاج اختیار کیا گیا ہے۔ خمر اور میسر کے بارے میں اس ہدایت کی مناسبت سے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی نظام تربیت کے ایک اصول کی طرف یہاں اشارہ کر دیں:

۱۔ اگر کسی امر و نہی کا تعلق کسی ایسے اصول سے ہو جس کا تعلق اسلام کے نظریات و عقائد سے ہو تو اسلام پہلی فرصت میں اس کا قطعی اور اٹل فیصلہ کر دیتا ہے۔

۲۔ اور اگر امر و نہی کا تعلق کسی ایسے معاملے سے ہو جو بطور عادت معمول بہ ہو یا بطور رسم چلا آتا ہو' تو اسلام اس کے بارے میں اصلاحی قدم اٹھانے سے پہلے انتظار کرتا ہے۔ تدریج' رفق اور سہولت سے اس میں کوئی قدم اٹھاتا ہے اور اقدام سے پہلے ایسے حالات تیار کرتا ہے' جن میں نفاذ قانون اور نفاذ حکم کے لئے راہ اچھی ہموار ہو جاتی ہے۔

مثلاً مسئلہ توحید اور مسئلہ شرک کے بارے میں اسلام نے پہلی فرصت میں فیصلہ کن بات کر دی۔ عقائد شرکیہ پر فیصلہ کن حملہ کیا۔ بغیر کسی تردد کے' بغیر کسی جھجک کے' بغیر کسی رکھ رکھاؤ کے' بغیر کسی سودے بازی کے' بغیر کچھ لو اور کچھ دو پالیسی کے۔ پہلے ہی مرحلے میں ایک ایسا وار کیا کہ شرک کا تانا بانا ادھیڑ کر رکھ دیا۔ کیونکہ یہ مسئلہ اسلامی نظریۂ حیات کا اساسی مسئلہ' اعتقاد کا مسئلہ تھا۔ اس کے بغیر ایمان مکمل ہی نہ ہو سکتا تھا۔ اس کی صفائی کے بغیر اسلام اپنی جگہ پر قائم ہی نہیں رہ سکتا تھا۔

شراب اور جوا ایسے معاملات تھے جن کا تعلق عادت (Custom) سے تھا۔ عادت بد ایک ایسی بیماری ہے جس کا علاج معالجہ ضروری ہے۔ اس لئے اس کے علاج کے لئے قرآن کریم نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ ان چیزوں کے خلاف دینی شعور بیدار کیا گیا' مسلمانوں

کے دماغ میں قانون سازی کرنے کے لئے وہ دلائل بٹھائے گئے جن کی وجہ سے ان چیزوں کو حرام قرار دیا جاسکتا ہے۔ مثلاً یہ کہ جوئے اور شراب میں جو مضرات اور قباحتیں ہیں وہ ان فائدوں سے کہیں زیادہ ہیں جو ان میں ہیں۔ اس منطقی دلیل میں اسی طرف اشارہ تھا کہ ان چیزوں سے پرہیز کرنا زیادہ بہتر و مناسب ہے۔ اس کے بعد دوسرا اقدام سورۃ نساء کے ذریعہ کیا گیا يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ "اے لوگو جو ایمان لائے ہو نشے کی حالت میں نماز کے قریب نہ جاؤ یہاں تک کہ تم جو کہتے ہو اسے سمجھنے لگو پھر نماز پڑھو۔ اب نماز کے پانچ اوقات ہیں اور اکثر اوقات ایک دوسرے کے بہت ہی قریب ہیں۔ ان کے مابین اتنا وقت نہیں ہوتا کہ ایک شخص شراب پیے نشہ میں ہو جائے اور پھر اسے افاقہ ہو جائے۔ یوں عملاً اس کے اوقات میں کمی کر دی گئی۔ یوں نشے کے مخصوص اوقات میں نفس میں جو اشتیاق پیدا ہوتا ہے اسے توڑ دیا گیا۔ یہ بات عام طور پر مشہور ہے کہ نشے کے عادی نشے کے اوقات میں طلب محسوس کرتے ہیں یعنی جن اوقات میں عام طور پر وہ نشہ کرتے ہیں۔ اگر کوشش کر کے کسی طرح وہ وقت گزار دیا جائے تو پھر نشے کی حدت طلب ختم ہو جاتی ہے اور اگر مسلسل اس طرح کیا جائے تو اس پر غلبہ پایا جاسکتا ہے۔ جب یہ دو مرحلے طے ہو گئے تو پھر آخری اور قطعی حکم نازل ہوا اور شراب اور جوئے کو قطعاً حرام قرار دے دیا گیا۔ اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ "اے ایمان لانے والو! یہ شراب اور جوا' یہ آستانے اور پانسے' یہ سب شیطانی گندے کام ہیں۔ ان سے پرہیز کرو۔ امید ہے کہ تمہیں فلاح نصیب ہو گی۔"

اس اصول کی دوسری مثال غلامی ہے۔ غلامی اس وقت کے اجتماعی اور اقتصادی نظام کا ایک لازمی حصہ تھی۔ اس وقت کا یہ ایک مسلم بین الاقوامی قانون (International Law) تھا اور اقوام کا یہ رواج تھا کہ جنگی قیدیوں کو غلام بنالیا جاتا تھا اور ان سے کام لیا جاتا تھا۔ ان بین الاقوامی اجتماعی حالات کی ظاہری شکل و صورت کو تبدیل کرنے سے پہلے اس بات کی ضرورت ہوتی ہے کہ ان اسباب میں تبدیلی کی جائے جن کی وجہ سے یہ حالات رونما ہوئے اور ان بین الاقوامی روابط کو بدلا جائے جن کے نتیجے میں غلامی کے ذرائع وجود میں آتے ہیں۔ بین الاقوامی قانون اور بین الاقوامی رسومات میں بین الاقوامی سمجھوتوں اور معاہدوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ جہاں تک اسلام کا تعلق ہے اس نے قیام غلامی کے سلسلے میں کوئی حکم نہیں دیا۔ نہ قرآن مجید میں کوئی آیت اتری ہے جس میں یہ کہا گیا ہو کہ جنگی قیدیوں کو غلام بنالیا جائے۔

جس وقت اسلامی نظام زندگی کا آغاز ہوا' تو اس وقت غلامی کا ایک عالمی نظام رائج تھا' اور یہ مسئلہ صرف غلامی اور جنگی قیدیوں کا نہ تھا' بلکہ غلامی بین الاقوامی تجارت کا بھی ایک حصہ تھی۔ اور جنگی قیدیوں کو غلام بنانا ایک بین الاقوامی معروف ضابطہ تھا۔ اور اس پر بین الاقوامی اور مقامی جنگوں میں حصہ لینے والے تمام فریق عمل کرتے تھے۔ اس لئے یہ ضروری تھا کہ اسلام اس عالمی اور اجتماعی مسئلے کے مکمل حل کے لئے ٹھوس اقدامات کرتا۔

اسلام نے ابتدائی طور پر جو کچھ کیا وہ یہ تھا کہ اس نے اس جبر' تشدد اور استحصال کو ختم کر دیا جو غلامی کا خاصہ تھا' اس نے کوشش کی کہ غلامی کا یہ نظام ہی ختم ہو جائے۔ غلامی کے ختم کرنے کے لئے اسلام نے کوئی انتہائی قدم نہیں اٹھایا۔ نہ اس نے ایک جھٹکے کے ساتھ اس وقت کے اجتماعی نظام کو درہم برہم کرنے کی کوشش کی' اس طرح کہ جھٹکے کے بعد اس کے نتائج کو کنٹرول نہ کیا جاسکے یا اس تحریک کی قیادت ہی مشکل ہو جائے۔ غرض غلامی کے سرچشمے بند کرنے کے ساتھ ساتھ غلاموں کی زندگی کی سہولیات میں اضافہ کیا۔ ان کو مناسب زندگی گزارنے کی ضمانت دی اور وسیع حدود میں انہیں شریفانہ زندگی بسر کرنے کی اجازت دے دی۔

اسلام نے سب سے پہلے دو ذرائع کے علاوہ غلامی کے تمام سرچشمے بند کر دیئے۔ ایک یہ کہ کوئی شخص جنگی قیدی بن جائے اور اس کے نتیجے میں وہ غلام بن جائے۔ دوسرا یہ کہ اس شخص کا باپ غلام ہو تو اس کا بیٹا بھی غلام ہو گا۔ یہ بھی اس لئے کہ اسلامی نظام کے دشمن معاشروں میں مسلمان اسیروں کو غلام بنالیا جاتا تھا' اور یہ اس وقت کا معروف طریقہ تھا' اور اسلام اس وقت کوئی بین الاقوامی غالب قوت نہ تھا کہ وہ ان دشمن معاشروں کو اس بات پر مجبور کر سکتا کہ وہ نظم غلامی سے دستبردار ہو جائیں' جس پر پوری دنیا کا اجتماعی اور اقتصادی نظام قائم تھا(ا)۔ اگر اسلام یکطرفہ طور پر غلامی کے نظام کو ختم کر دیتا تو نتیجہ یہ ہوتا کہ اسلامی ضابطے کا اجراء صرف ان اسیروں پر ہوتا جو مسلمانوں کے ہاتھ میں تھے' جبکہ خود مسلمانوں کے قیدی اس وقت کے نظام کے مطابق غلام ہی رہ جاتے۔ اس طرح اسلام کے دشمن بڑی جرأت سے اسلام کے خلاف لڑتے' اس خیال سے کہ اگر وہ قید ہوئے تو رہا ہو جائیں گے جبکہ جو مسلمان ان کے ہاتھ آئیں گے وہ غلام بن جائیں گے اور قبل اس کے کہ اسلامی حکومت کا اقتصادی نظام مستحکم ہوتا' غلاموں کی جو نسل اس وقت عملاً موجود تھی' اگر اسے آزاد کر دیا جاتا تو ان غلاموں کا اس وقت کے معاشرے میں آمدن کا کوئی ذریعہ نہ ہوتا' نہ ان کی کفالت کرنے والا کوئی ہوتا اور نہ ہی وہ کسی خاندان کے اجزاء تصور ہوتے' نہ ان کے کسی کے ساتھ رشتے ناطے کے تعلقات ہوتے جو انہیں معاشرتی اور اخلاقی بے راہ روی سے بچاتے۔ اس حالت میں ایک تو ان لوگوں کے معاشی حالات خراب ہوتے جن کی غلامی سے یہ آزاد ہوتے۔ اور دوسرے خود یہ لوگ اسلامی معاشرہ کو ایک گری پڑی نسل کی حیثیت سے' خراب اور گندہ کر دیتے جبکہ خود مسلمان مالکان کے حالات بھی اچھے نہ تھے اور اسلامی معاشرہ بھی بالکل نیا تھا۔ غرض یہ تھی اس وقت کی صورت حال اور اس کے پیش نظر' اس کے مطابق قرآن مجید نے صرف یہ کیا کہ اسلامی قانون میں کوئی ایسی دفعہ نہیں رکھی جس کے مطابق جنگی قیدیوں کو لازماً غلام بنالیا جائے بلکہ قرآن مجید نے صرف یہ حکم دیا **فَإِذَا لَقِيتُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا فَضَرْبَ الرِّقَابِ حَتَّىٰ إِذَا أَثْخَنتُمُوهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ فَإِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَإِمَّا فِدَاءً حَتَّىٰ تَضَعَ الْحَرْبُ أَوْزَارَهَا**

"پس جب ان کافروں سے تمہاری مڈبھیڑ ہو تو پہلا کام گردنیں مارنا ہے۔ یہاں تک کہ جب تم ان کو اچھی طرح کچل دو تو تب قیدیوں کو مضبوط باندھو اس کے بعد (تمہیں اختیار ہے) احسان کرو یا فدیے کا معاملہ کر لو' تا آنکہ لڑائی اپنے ہتھیار ڈال دے۔"

قرآن مجید نے یہ بھی نہیں کہا کہ جنگی قیدیوں کو غلام نہ بنایا جائے' بلکہ اس معاملے کو اسلامی حکومت کی صواب دید پر چھوڑ دیا ہے۔ تاکہ وہ موقعہ و محل کے اعتبار سے جو موقف مناسب ہو وہ اختیار کرے۔ یا فریقین کے قیدیوں کا باہمی تبادلہ ہو جائے اور جن لوگوں کا غلام بنانا ہی مناسب ہو انہیں غلام بنالے۔ اس صورت میں معاملہ وہی ہی ہو گا جو کہ محارب قوت معاملہ کرے گی۔

اسی طرح غلامی کے دوسرے سرچشمے بند ہو جانے سے غلاموں کی تعداد کم ہوتی چلی گئی۔ جبکہ اس وقت مختلف ذریعوں سے لوگوں کو غلام بنالیا جاتا تھا۔ غلاموں کی جو قلیل تعداد رہ گئی تھی اسے بھی اسلامی نظام مختلف تدابیر کے ذریعہ کم سے کم کئے جا رہا تھا۔ مثلاً جب کوئی غلام دائرہ اسلام میں داخل ہو جاتا اور پھر وہ دشمن کے کیمپ کو چھوڑ کر اسلامی کیمپ میں داخل ہو جاتا تو وہ آزاد قرار پاتا۔ پھر اسلام نے ہر غلام کو یہ حق دیا کہ وہ اپنے مالک سے آزادی کا سودا کر سکتا ہے۔ اور اس سودے کا معاوضہ ادا کرنے کے سلسلے میں مالک کے ساتھ اسے تحریری یا زبانی اگریمنٹ کرنے کا پورا پورا اختیار ہے۔ یہ معاہدہ ہونے کے بعد جسے مکاتبت کہتے تھے غلام آزاد ہو جاتا تھا۔ آزادانہ کاروبار کر سکتا تھا۔ چاہے اپنے مالک ہی کی نوکری کر لیتا۔ وہ اپنی کمائی کا خود مالک ہوتا تھا۔ چاہے دوسری کسی جگہ آزادانہ کام کرتا اور مالک کو مقررہ رقم ادا کر دیتا۔

ا۔ قدیم نظام کو جزوی طور پر برقرار رکھنے کے باوجود اسلام نے عملاً غلامی کے رواج کو اس طرح ختم کیا کہ اکثر گناہوں کا کفارہ غلام آزاد کرنا قرار دیا اور مالکوں کو حکم دیا کہ وہ جو خود کھائیں وہی غلاموں کو کھلائیں اور جو خود پہنیں وہی غلاموں کو پہنائیں۔ ۲۔ محمد :۴

مکاتبت کے ساتھ یہ غلام اس معاشرے کا ایک مستقل فرد بن جاتا تھا۔ ایسے افراد کے لئے اسلام کے نظام زکوٰۃ کا ے را حصہ مقرر ہے۔ اس کے علاوہ بھی مسلمانوں کے لئے یہ بات ضروری قرار دی گئی کہ وہ ایسے افراد کو مالی امداد دیں تاکہ وہ اپنی گردن کو غلامی کے جوئے سے آزاد کر سکیں۔ اس کے علاوہ جو اسلامی نظام نے مختلف معاملات میں افراد معاشرہ پر کفارات (Fines) واجب کئے اور کفارے کی شقوں میں سے ایک شق یہ ہوا کرتی ہے کہ کسی غلام کو آزاد کر دیا جائے۔ مثلاً قتل خطاء کی بعض صورتوں میں، قسم کے کفارے میں۔ ظہار کے کفارے میں' ان تدابیر کا نتیجہ یہ نکلا کہ مرور زمانہ کے ساتھ ساتھ غلامی کا وجود ہی ختم ہو گیا۔ اور یہ چیز طبعی موت مرگئی۔ اگر اسے یکلخت ختم کر دیا جاتا تو اس وقت کے معاشرے میں بے حد افراتفری پیدا ہو جاتی' اور اس معاشرے میں فتنہ وفساد برپا ہو جاتا۔

سوال یہ ہے کہ دور نبوی کے بعد اسلامی معاشرے میں غلامی ختم ہونے کے بجائے غلامی میں اضافہ کیوں ہو گیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ بعد کے ادوار میں غلامی میں اضافہ محض اس لئے ہو گیا تھا کہ مسلمانوں نے اسلامی نظام زندگی سے انحراف کر لیا تھا' جوں جوں مسلمان اسلامی نظام سے دور ہوتے گئے' خرابیاں زیادہ ہوتی گئیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ یہ مسلمانوں کا قصور تھا' اسلامی نظام زندگی کا اس میں کوئی قصور نہ تھا۔ دور نبوی کے بعد اگر لوگوں نے اسلامی نظام زندگی سے انحراف کیا(۱)' تھوڑا کیا یا زیادہ کیا اور اسلامی نظام زندگی کے اصولوں کو اچھی طرح نافذ نہ کیا تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اسلامی نظام میں کچھ خرابی ہے۔ اسلامی تاریخ کے سلسلے میں ہمارا جو نقطہ نظر ہے وہ ہم اس سے پہلے بیان کر آئے ہیں۔ اگر اسلامی نظام سے انحراف کے نتیجے میں کچھ ناپسندیدہ حالات' اسلامی تاریخ کے کسی دور میں' کبھی پیدا ہو گئے تھے۔ تو ان حالات کو اسلام کے سر نہیں تھوپا جا سکتا۔ ایسے حالات کو اسلامی تاریخ کی کوئی کڑی نہ گردانا جائے گا۔ اس لئے کہ اسلام میں کوئی تبدیلی نہیں آگئی۔ نہ اس کے اصولوں میں نئے اصولوں کا اضافہ ہو گیا ہے۔ اگر تبدیلی آئی ہے تو لوگوں میں آئی ہے۔ لوگ اسلام سے اس قدر دور ہو گئے کہ ان کا اسلام سے کوئی واسطہ ہی نہ رہا۔ اور ان کی تاریخ اسلامی تاریخ کا حصہ نہ رہی۔

اب اگر کوئی یہ چاہتا ہے کہ نئے سرے سے اسلامی نظام زندگی قائم ہو' تو وہ اسلامی نظام زندگی کا آغاز اسلامی تاریخ کے اس مقام سے ہرگز نہ کرے گا جہاں اسلامی تاریخ ختم ہو جاتی ہے' بلکہ اب اسلامی نظام زندگی کا قیام از سر نو اسلامی اصولوں کی روشنی میں کیا جائے گا۔ خالص اسلامی اصولوں کی روشنی میں!

یہ ایک اہم حقیقت ہے کہ نظریہ اور نقطہ نظر کے اعتبار سے بھی اور اسلامی نظریہ اور اسلامی نظام کے قیام کی تحریک کے نشوونما کے نقطہ نظر سے بھی۔ اس نکتے کی تاکید یہاں دوبارہ اس لئے کی جا رہی ہے کہ اسلام کی تاریخ اور اسلامی نظام زندگی کے درمیان لوگوں کے ذہنوں میں سخت الجھاؤ پیدا ہو گیا ہے' حالانکہ اسلامی نظام اور ہے اور عملی اسلامی تاریخ' یعنی مسلمانوں کی تاریخ چیزے دیگر ہے۔

یہی وجہ ہے کہ لوگ صحیح اسلامی تحریک اور صحیح اسلامی نظام زندگی اور مسلمانوں کی تاریخ کے درمیان فرق نہیں کر پاتے۔ اس دھوکے میں وہ تمام مستشرقین مبتلا ہیں' جنہوں نے اسلامی تاریخ پر قلم اٹھایا ہے۔ بعض لوگ جان بوجھ کر اسلامی تاریخ کو یہ رنگ دیتے ہیں اور بعض لوگ فی الواقعہ غلط فہمی کا شکار ہیں۔

اب اس سے اگلی آیات میں' اسلامی اصول حیات کے بارے میں چند سوالات کا جواب دیا گیا ہے۔ یہ سوالات مختلف لوگوں نے مسائل سمجھنے کے لئے کئے تھے:

۱۔ یہ انحراف واضح ہے' لیکن اس کے باوجود یہ حیرت انگیز واقعہ بھی ہوا کہ اسلامی معاشرے میں غلام سربراہ مملکت بنے۔ اس سلسلے میں غزنی کے سلاطین' مصر کے مملوک اور ہندوستان کا خاندان غلاماں روشن مثالیں ہیں۔ (مترجم)

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۬ قُلِ الْعَفْوَ ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۲۱۹﴾ فِى الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ ؕ

”پوچھتے ہیں: ہم راہ خدا میں کیا خرچ کریں؟ کہو: جو کچھ تمہاری ضرورت سے زیادہ ہو' اس طرح اللہ تمہارے لئے صاف صاف احکام بیان کرتا ہے' شاید کہ تم دنیاو آخرت دونوں کی فکر کرو۔“

اس سے پہلے بھی انہوں نے سوال کیا تھا کہ وہ کیا خرچ کریں؟ اس کے جواب میں خرچ کی نوعیت اور مصرف کی تشریح کر دی گئی۔ یہاں بھی سوال تو وہی ہے' جواب میں خرچ کی مقدار اور اس کا درجہ بتایا گیا ہے۔ عفو کے معنی عربی میں فاضل اور زیادہ کے ہوتے ہیں۔ جو مال ذاتی ضروریات سے زیادہ ہو۔ ضروریات سے مراد ایسی ضروریات ہیں جو عیاشی اور نمائشی نہ ہوں' اسے خرچ کیا جاسکتا ہے اور مصرف کی ترتیب وہی ہے جو اس سے پہلے بیان ہو چکا ہے۔ قریب سے قریب تر کا حق زیادہ ہے اس کے بعد دوسرے لوگ درجہ بدرجہ۔☆
انفاق کا حکم صرف ادائیگی زکوٰۃ ہی سے پورا نہیں ہو جاتا۔ کیونکہ اس آیت کو نہ تو آیت زکوٰۃ نے منسوخ کیا ہے اور نہ ہی مخصوص کیا ہے۔ جیسا کہ میں سمجھا ہوں۔ زکوٰۃ کی ادائیگی سے ایک فرض ادا ہو جاتا ہے لیکن اس کا مقصد یہ نہیں ہے کہ ادا کنندہ بس دوسری معاشرتی ذمہ داریوں سے بری الذمہ ہو گیا بلکہ زکوٰۃ کے بعد بھی انفاق کا حکم علی حالہ باقی رہتا ہے۔ زکوٰۃ تو مسلمانوں کے بیت المال کا حق ہے اور اسے وہ حکومت حاصل کرے گی جو اللہ کی شریعت نافذ کرے۔ اور یہ حکومت بھی اسے اس کے معلوم و معروف مصارف پر خرچ کرے گی۔ لیکن اس کے بعد بھی مسلمانوں پر اللہ تعالیٰ کی جانب سے اور خود مسلمان بھائیوں کی جانب سے عائد شدہ ذمہ داریاں بدستور قائم رہتی ہیں۔ پھر زکوٰۃ تو ایک خاص شرح سے فرض کی گئی ہے۔ اور یہ ممکن نہیں ہے کہ زکوٰۃ کی ادائیگی سے تمام فاضل دولت سرمایہ دار کے ہاتھ سے نکل جائے۔ لیکن آیت زیر بحث تو واضح طور پر بتاتی ہے کہ العفو پورا کا پورا خرچ ہونا چاہئے۔

اس سلسلے میں ایک واضح حدیث بھی موجود ہے۔ حضور ﷺ فرماتے ہیں: اِنَّ فِى الْمَالِ حَقًّا سِوٰى الزَّكٰوةِ ”بے شک دولت میں زکوٰۃ کے سوا بھی حق ہے۔“

ایسا حق' جسے صاحب ثروت اللہ کی رضا کے لئے خود مناسب جگہ خرچ کرتا ہے اور یہ خرچ کی اعلیٰ صورت ہے' کامل صورت۔ اگر وہ خود خرچ نہیں کرتا اور اسلامی نظام کو نافذ کرنے والی حکومت کو اس کی ضرورت ہوتی ہے تو اسے اختیار ہے کہ وہ یہ دولت اس صاحب ثروت سے حاصل کرے اور اسلامی جماعت کے ان افراد پر خرچ کر دے جو امداد کے مستحق ہیں' تاکہ صاحب ثروت نہ اسے عیش و عشرت اور عیاشی کے کاموں میں استعمال کر سکے اور نہ ہی ذخیرہ کر کے معطل کر دے۔ دولت کی گردش روک دے اور اس پر سانپ بن کر بیٹھ جائے۔ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۲۱۹﴾ فِى الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ ”اس طرح اللہ تعالیٰ تمہارے لئے صاف صاف احکام بیان کرتا ہے۔ شاید کہ تم دنیا اور آخرت دونوں کی فکر کرو۔“

اس آیت میں فرمایا گیا ہے' اللہ تعالیٰ اپنے احکام بیان کرتا ہے اور اس لئے بیان کرتا ہے کہ تم لوگ دنیاو آخرت دونوں کے بارے میں غور و فکر سے کام لو۔ اس لئے کہ صرف دنیا کے بارے میں غور و فکر کرنے سے' وجود انسانی کی حقیقت' انسان کی زندگی اور اس کے فرائض اور ان کے درمیان باہمی ربط کی اصل حقیقت کے بارے میں نہ عقل انسانی صحیح تجزیہ کر سکتی ہے۔

(۱) اے الجصاص۔ احکام القرآن۔ روایت فاطمہ بنت قیس

اور نہ ہی انسان کے قلب و نظام زندگی اور اس کی قدروں کی صحیح تصویر بنائی جاسکتی ہے۔ اس لئے کہ دنیا تو زندگی کا ایک حصہ ہے۔ اور بہت ہی ادنیٰ اور مختصر حصہ ہے۔ اگر انسان اپنے نظریات اور اپنے نظام کی اساس اس مختصر اور سطحی نقطہ نظر پر رکھے تو اس کے نتیجے میں کبھی انسان نہ کسی صحیح تصور حیات تک پہنچ سکتا ہے اور نہ زندگی میں کوئی صحیح طرز عمل اختیار کر سکتا ہے۔ پھر انفاق کا ذاتی طور پر دنیا سے بھی تعلق ہے۔ اور آخرت سے بھی تعلق ہے۔ انفاق سے اس کی دولت میں جو کمی آتی ہے اس کے نتیجے میں اسے دل کی صفائی اور قلب و نظر کی پاکیزگی' اس دنیا میں نصیب ہو جاتی ہے۔ پھر انفاق کرنے والا جس معاشرے میں رہتا ہے اس معاشرے کے ساتھ اس کی آشتی ہو جاتی ہے' صلح ہو جاتی ہے اور افراد کے درمیان تعلقات مضبوط ہو جاتے ہیں۔ لیکن ابنائے معاشرہ کا ہر فرد ہو سکتا ہے یہ باتیں نہ سوچ سکے اس لئے' آخرت کا عقیدہ اور شعور اور جزائے اخروی کی امید اور آخرت میں جو درجات ہیں اور جو قدریں ہیں ان کا خیال تو ہر شخص کے ذہن میں وزن رکھتا ہے اور اس سے انفاق کا پلڑا بھاری ہو جاتا ہے۔ اس سے نفس انسانی مطمئن ہو جاتا ہے' اسے سکون و آرام نصیب ہوتا ہے۔ ترازو نفس انسانی کے ہاتھ میں آجاتا ہے جو ہروقت معتدل رہتا ہے اور کسی وقت بھی کھوٹی قدروں اور آنکھوں کو چکاچوند کرنے والے دنیاوی معیارات سے اس کے ترازو کو ہلکا نہیں کر سکتے۔

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْيَتٰمٰى ۭ قُلْ اِصْلَاحٌ لَّھُمْ خَيْرٌ ۭ وَاِنْ تُخَالِطُوْھُمْ فَاِخْوَانُكُمْ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ ۭ وَلَوْ شَاۗءَ اللّٰهُ لَاَعْنَتَكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۲۰﴾

" پوچھتے ہیں یتیموں کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے؟ کہو: جس طرز عمل میں ان کیلئے بھلائی ہو' وہی اختیار کرنا بہتر ہے۔ اگر تم اپنا اور ان کا خرچ اور رہنا سہنا مشترکہ رکھو تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ آخر وہ تمہارے بھائی بند ہی تو ہیں۔ برائی کرنیوالے اور بھلائی کرنیوالے دونوں کا حال اللہ پر روشن ہے۔ اللہ چاہتا تو اس معاملے میں تم پر سختی کرتا۔ مگر وہ صاحب اختیار ہونے کے ساتھ صاحب حکمت بھی ہے۔"

اجتماعی تکافل (Social Security) اسلامی معاشرے کا سنگ اول ہے۔ اسلامی جماعت کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنے نادار اور ضعیف لوگوں کا خیال رکھے' یتیموں کا بالخصوص' جو نابالغ ہیں اور ماں باپ کے سائے سے محروم ہو گئے ہیں۔ چونکہ وہ کمزور ہیں اس لئے وہ اجتماعی امداد اور اجتماعی حمایت کے مستحق ہیں۔ اسلامی معاشرے کا یہ فرض ہے کہ وہ ان کی پرورش کرے اور ان کے اموال اور ان کی جائدادوں کی حفاظت کرے۔ بعض اولیاء (Guardians) ایسے تھے جو یتیموں اور خود اپنے کھانے پینے کا انتظام یکجا کرتے تھے۔ نیز انہوں نے اپنے اور یتیموں کے اموال کو یکجا کر کے تجارت میں لگایا ہوا تھا۔ بعض اوقات اس طرح یتیموں کو نقصان ہوتا تھا۔ اس پر قرآن مجید کی آیات اتریں جن میں مسلمانوں کو یتیموں کا مال کھانے سے سخت ڈرایا گیا۔ اس پر بعض نیک لوگوں نے اس قدر احتیاط شروع کر دی کہ انہوں نے یتیموں کا مال کھانا بھی الگ کر دیا۔ اب صورت حال یہ ہو گئی کہ کسی کے پاس اگر یتیم ہوتا تو وہ یتیم کے مال سے اس کے لئے کھانا تیار کرتا۔ اگر کچھ بچ جاتا تو وہ دھرا رہتا تو وہ دوسرے وقت اسے کھاتا یا ضائع ہو جاتا اور پھینک دیا جاتا۔ یہ اس قدر زیادہ تشدد تھا جسے اسلام کا مزاج گوارا نہ کرتا تھا۔

علاوہ ازیں بعض اوقات اس میں یتیم کو نقصان بھی ہوتا' چنانچہ یہ آیات نازل ہوئیں اور مسلمانوں کو تلقین کر دی گئی کہ وہ اعتدال

اور آسانی کا راستہ اختیار کریں' جس میں اس کی مصلحت ہو۔ درحقیقت ان کے لئے خیر خواہی کا جذبہ اس سے بہتر ہے کہ انہیں الگ تھلگ کر دیا جائے۔ اگر اکٹھا رہنے سہنے اور کھانے پینے کے انتظام میں یتیم کی بھلائی ہے تو ساتھ رکھنا چاہئے۔ کیونکہ یتیم بھی بہرحال اولیاء کے بھائی بند ہی تو ہیں۔ تمام مسلمان ہیں اور بھائی بھائی ہیں۔ سب کے سب ایک عظیم اسلامی خاندان کے افراد ہیں۔ اللہ بھلائی کرنے والے اور برائی کرنے والے دونوں کے حال سے باخبر ہے۔ اللہ کے ہاں ظاہری شکل و صورت پر ہی فیصلے نہ ہوں گے' نیت اور نتائج کو بھی دیکھا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو تکلیف میں ڈالنا پسند نہیں کرتا نہ امر و نہی میں ان پر کوئی تکلیف لانا چاہتا ہے یا ان کو مشقت میں ڈالنا چاہتا ہے۔ اگر اللہ چاہتا تو تکلیف میں ڈال دیتا' لیکن اللہ کا یہ ارادہ نہ تھا' وہ تو عزیز و حکیم ہے۔ وہ جو چاہتا ہے کر گزرتا ہے لیکن وہ حکیم ہے۔ آسان بھلائی اور اصلاح کے سوا وہ اور کچھ نہیں چاہتا۔

یوں تمام معاملات کا ربط خدائے لایزل سے قائم ہو جاتا ہے۔ تمام معاملات کو اس اصلی محور کے ساتھ باندھ دیا جاتا ہے۔ جس کے گرد پورا نظریہ حیات گھومتا ہے۔ جس کے گرد پوری زندگی گھومتی ہے۔ یہ ہوتا ہے حال اس نظام قانون کا جو کسی نظریۂ حیات پر مبنی ہوتا ہے۔ اس قانون کے نفاذ کی ضمانت' انسان کے خارج' انسان کی ذات سے علیحدہ کسی اور ذریعہ سے فراہم نہیں ہوتی۔ بلکہ انسان کے ضمیر کے اندر [illegible] سے اس قانون پر عمل کرنے کا داعیہ پیدا ہوتا ہے اور ہر شخص اس پر از خود عمل کرتا ہے۔

☆ ☆ ☆ ☆

درس ۱۵ ایک نظر میں

یہ سبق گویا عائلی قوانین پر مشتمل ایک ضابطہ ہے۔ اس میں خاندانی نظام کی شیرازہ بندی کی گئی ہے۔ خاندان تحریک اسلامی کی تنظیم کی اساس ہے۔ خشت اول ہے۔ اس اساس کو اسلام نے ہر پہلو سے مضبوط کیا ہے۔ اس پر بے حد توجہ دی گئی ہے۔ اسے بڑی تفصیل سے منظم کیا ہے۔ اسے ہر طرح سے بچاکر رکھا گیا ہے۔ اسے دور جاہلیت کی انارکی سے پاک کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں اتنی کوشش کی گئی ہے کہ قرآن مجید کی مختلف سورتوں میں جگہ جگہ اس سلسلے میں ہدایات دی گئی ہیں اور ان میں وہ تمام بنیادیں فراہم کر دی گئی ہیں جو تحریک اسلامی کی تنظیم کے ابتدائی حلقے کی تنظیم اور تعمیر کے لئے ضروری تھیں۔

اسلام کا اجتماعی نظام ایک قسم کا خاندانی نظام ہے۔ اس کی اساس خاندان پر ہے۔ اس لئے کہ انسان کے لئے اس کے رب کا تجویز کردہ نظام ہے۔ اس میں انسان کی فطرت کی تمام ضروریات' تمام خصوصیات اور تمام بنیادی باتوں کا پورا پورا لحاظ رکھا گیا ہے۔

خاندانی نظام کی جڑیں ابتدائے تخلیق تک جا پہنچی ہیں۔ اس کی کونپلیں شاخ فطرت سے پھوٹتی ہیں۔ انسان بلکہ تمام حیوانات کی تخلیق ہی خاندانی نظام پر ہے۔ قرآن مجید سے صاف ظاہر ہوتا ہے۔ وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ "اور ہر چیز کے ہم نے جوڑے بنائے ہیں' شاید کہ تم اس سے سبق لو۔"

ایک دوسری آیت میں فرماتے ہیں سُبْحَانَ الَّذِي خَلَقَ الْأَزْوَاجَ كُلَّهَا مِمَّا تُنْبِتُ الْأَرْضُ وَمِنْ أَنْفُسِهِمْ وَمِمَّا لَا يَعْلَمُونَ "پاک ہے وہ ذات جس نے تمام جوڑوں کو پیدا کیا' ان تمام چیزوں سے جو زمین اگاتی ہے۔ انسانی نفوس سے اور ان تمام دوسری چیزوں سے جو وہ نہیں جانتے۔"

اب انسان کا مزید نقطہ نظر سے جائزہ لیا جاتا ہے اور اسے وہ پہلا انسان یاد دلایا جاتا ہے جس کے واسطہ سے پہلی انسانوں کی بستی کا آغاز ہوا۔ پہلی انسانی آبادی ایک جوڑا تھا۔ پھر اس کی اولاد پیدا ہوئی' پھر اس سے انسانیت اور انسانی آبادی پھیل گئی۔ يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَنِسَاءً وَاتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي تَسَاءَلُونَ بِهِ وَالْأَرْحَامَ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيبًا "لوگو! اپنے رب سے ڈرو جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا اور اسی جان سے اس کا جوڑا بنایا اور ان دونوں سے بہت مرد و عورت دنیا میں پھیلا دیئے۔ اس خدا سے ڈرو جس کا واسطہ دے کر تم ایک دوسرے سے اپنے حق مانگتے ہو' اور رشتہ و قربت کے تعلقات بگاڑنے سے پرہیز کرو۔ یقین جانو کہ اللہ تم پر نگرانی کر رہا ہے۔"

دوسری جگہ ہے يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَى وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا "لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور پھر تمہاری قومیں اور برادریاں بنا دیں تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔"

پھر بتایا جاتا ہے کہ میاں بیوی کے درمیان ایک فطری جاذبیت ہے۔ اس لئے نہیں کہ مرد و عورت علی الاطلاق اکٹھے ہوں' بلکہ ان کے درمیان انس و محبت کا نتیجہ یہ ہونا چاہئے کہ وہ خاندان کی بنیاد ڈالیں اور گھرانے تعمیر ہوں: وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِنْ أَنْفُسِكُمْ أَزْوَاجًا لِتَسْكُنُوا إِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَوَدَّةً وَرَحْمَةً "اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تمہارے لئے تمہاری جنس سے بیویاں بنائیں تاکہ تم ان کے پاس سکون حاصل کرو اور تمہارے درمیان محبت اور رحمت پیدا کر دی۔" هُنَّ لِبَاسٌ لَكُمْ وَأَنْتُمْ لِبَاسٌ لَهُنَّ "وہ تمہارے لئے لباس ہیں اور تم ان کے لئے لباس ہو۔" نِسَاؤُكُمْ حَرْثٌ لَكُمْ فَأْتُوا

حَرْثُكُمْ أَنّٰى شِئْتُمْ وَ قَدِّمُوا لِأَنْفُسِكُمْ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوا أَنَّكُمْ مُلٰقُوْهُ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِينَ "تمہاری عورتیں تمہاری کھیتیاں ہیں تمہیں اختیار ہے۔ جس طرح چاہو اپنی کھیتی میں جاؤ مگر اپنے مستقبل کی فکر کرو اور اللہ کی ناراضگی سے بچو۔ خوب جان لو کہ تمہیں ایک دن اس سے ملنا ہے۔ **واللّٰہ جعل لکم من بیوتکم سکنا** "حقیقت ہے کہ اللہ نے تمہارے گھروں کو تمہارے لئے جائے سکون بنایا ہے۔"

یہ فطرت ہے کہ جو اپنا کام کرتی ہے اور یہ خاندان ہی ہے جو ابتدائی تخلیق اور پھر انسان کی تعمیر و تربیت میں فطرت عمیق مقاصد کی بجا آوری کے لئے لبیک کہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی نظام زندگی میں خاندانی نظام ایک فطری اور طبعی نظام ہے جس کا سرچشمہ انسان کی تخلیق کے آغاز ہی سے پھوٹا ہے۔ (آدم و حواسے) اگر گہرا مطالعہ کیا جائے تو اس کائنات کی تمام اشیاء کا آغاز تخلیق بھی اسی نظام کے مطابق ہوا ہے۔ اس طرح اسلام نے نظام فطرت کے منہاج کو اپنایا ہے' جس طرح اس کائنات کی دوسری اشیاء کی تخلیق خاندانی نظام کے اسلوب پر ہوتی ہے۔ اسی طرح اسلامی نظام کی اساس بھی خاندان کو قرار دیا گیا کیونکہ انسان بھی بہرحال اس کائنات کا ایک جزء ہے۔

خاندان دراصل ایک قدرتی نرسری ہے۔ جہاں چھوٹے بچوں کی صحیح دیکھ بھال اور تربیت ہو سکتی ہے۔ صرف اس نرسری میں وہ صحیح طرح روحانی' عقلی اور جسمانی نشوونما پا سکتے ہیں۔ خاندان کے سایہ میں بچے میں محبت' شفقت اور اجتماعی ذمہ داری (Reciprocal Responsibility) کا شعور پیدا ہوتا ہے۔ اور اس نرسری میں اس پر جو رنگ چڑھتا ہے' وہ پوری زندگی میں قائم رہتا ہے۔ بچے کو خاندان کی نرسری میں جو سبق ملتا ہے اسی کی روشنی میں وہ زندگی' عملی زندگی کے لئے آنکھیں کھولتا ہے' اسی کی روشنی میں وہ حقائق حیات کی تشریح کرتا ہے اور اسی کی روشنی میں زندگی میں عمل پیرا ہوتا ہے۔

تمام زندہ مخلوقات میں طفل آدم کی طفولیت سب سے طویل ہوتی ہے۔ تمام زندہ چیزوں سے زیادہ۔ وجہ یہ ہے کہ ہر زندہ ذی روح کا عہد طفولیت دراصل باقی زندگی کے لئے تیاری' تربیت اور ٹریننگ کا زمانہ ہوتا ہے۔ اس میں بچے کو اس رول کے لئے تیار کیا جاتا ہے جو اس نے باقی زندگی میں ادا کرنا ہوتا ہے۔ چونکہ دنیا میں انسان نے جو فرائض سرانجام دینے ہیں وہ عظیم فرائض ہیں۔ جو رول زمین پر انسان نے ادا کرنا ہوتا ہے وہ ایک عظیم رول ہے' اس لئے اس کا عہد طفولیت بھی نسبتاً لمبا رکھا گیا ہے تاکہ اسے مستقبل کی ذمہ داریوں کے لئے بطریق احسن تیار کیا جاسکے اور اسے اچھی طرح ٹریننگ دی جاسکے۔ اس لئے دوسرے حیوانات کے مقابلے میں وہ والدین کے ساتھ رہنے کے لئے زیادہ محتاج ہے لہٰذا ایک پرسکون خاندانی ماحول' مستقل خاندانی نرسری انسانی نظام زندگی کی لئے لازمی ہے۔ انسانی فطرت کے زیادہ قریب اور اس کی تشکیل اور نشوونما اور اس زندگی میں اس کے کردار کے لئے موزوں تر ہے۔

دور جدید کے تجربات نے اس بات کو یقین تک پہنچا دیا ہے کہ خاندانی گہوارے کے مقابلے میں لوگوں نے بچوں کی نگہداشت کے جو انتظامات بھی کئے وہ سب کے سب ناقص رہے اور وہ خاندان کے نعم البدل ثابت نہیں ہو سکے' بلکہ ان انتظامات میں سے کوئی انتظام بھی ایسا نہیں ہے جس میں بچے کی نشوونما کے لئے مضر پہلو نہ ہوں یا جس میں اس کی معیاری تربیت ممکن ہو سکے۔ خصوصاً اجتماعی نرسری کا وہ نظام جسے دور جدید کے بعض مصنوعی اور جابرانہ نظام ہائے حیات نے محض اس لئے قائم کیا کہ وہ اللہ کے قائم کردہ مضبوط فطری اور صالح خاندانی نظام کی جگہ لے سکے۔ محض اس لئے کہ یہ لوگ دین کی دشمنی میں مبتلا ہو گئے اور دین پر اندھا دھند حملے کر کے اس کی ہر چیز کے خلاف ہو گئے۔ اس لئے خاندانی نظام کو جبراً ختم کر کے اس کی جگہ بچوں کے لئے نرسریاں قائم کر دیں۔ اگرچہ بعض اوقات ایسی نرسریاں حکومت کے تحت بھی قائم ہوئیں مثلاً دینی حدود و قیود سے آزاد مغربی ممالک نے ماضی قریب میں جو وحشیانہ جنگیں لڑیں' وہ سب کے سامنے ہیں۔ ان جنگوں میں ان وحشیوں نے لڑنے والوں اور پرامن شہریوں میں کوئی تمیز نہ کی' اس کے نتیجے میں لاتعداد لاوارث بچے ماں

باپ کے سایہ کے بغیر رہ گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یورپ کی بعض حکومتیں ان بچوں کے لئے اجتماعی نرسریاں قائم کرنے پر مجبور ہو گئیں۔
(ا) علاوہ ازیں مغرب کے جاہلی تصور حیات کے نتیجہ میں وہاں کے انسان کے لئے مناسب اجتماعی اور اقتصادی نظام کے مقابلے میں بدشکل اقتصادی اور معاشرتی نظام وجود میں آیا اور جس میں نوزائیدہ بچوں کی مائیں اس پر مجبور ہو گئیں کہ وہ اپنے لئے خود کمائیں اور مجبوراً بتقاضائے ضرورت بچوں کی اجتماعی نرسریاں وجود میں آئیں۔ یہ نظام نہ تھا بلکہ ایک لعنت تھی۔ اس نے بچوں کو ماؤں کی مامتا اور خاندان کے زیر سایہ ان کی تربیت سے محروم کر دیا' بیماروں کو نرسری میں پھینک دیا گیا' نرسری کا نظام بچوں کی فطرت اور ان کے نفسیاتی ساخت سے متصادم تھا اس لئے نتیجہ یہ نکلا کہ اس قسم کے بچے ذہنی الجھنوں کا شکار ہو گئے اور انہیں بے شمار نفسیاتی پریشانیاں لاحق ہو گئیں۔

تعجب انگیز بات یہ ہے کہ ہمارے بعض معاصرین ان حقائق کے باوجود اس بات پر زور دیتے ہیں کہ عورت کے لئے ملازمت کا اختیار کرنا ترقی اور آزادی کی علامت ہے۔ اور اس بات کا ثبوت ہے کہ معاشرہ رجعت پسندی سے آزاد ہو گیا ہے۔ آپ نے دیکھا! ان لوگوں کے نزدیک آزادی اور ترقی اس لعنت کا نام ہے جس کی وجہ سے اس دنیا میں انسان کے سب سے قیمتی ذخیرہ یعنی بچوں کی نفسیاتی صحت اور ان کی اخلاقی ترقی تو ختم ہو کر رہ گئی ہے۔ حالانکہ بچے انسانیت کے مستقبل کا سرمایہ ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اس قیمتی سرمایہ کو ضائع کر کے انسان فائدہ کیا حاصل کرتا ہے؟ صرف یہ کہ خاندان کی آمدنی میں ایک حقیر سا اضافہ ہو جاتا ہے بجائے اس کے کہ وہ اپنی اولاد کی کفالت کرے۔ یہ صورت حال اس لئے پیش آئی کہ مغربی جاہلیت اور جدید مشرقی جاہلیت اور اس کے فاسد اجتماعی نظام نے بچوں کے لئے والدہ کی کفالت کی خاطر والدہ کی ملازمت کی حوصلہ شکنی کرنے سے انکار کیا۔ اور صورت یہ ہو گئی کہ اگر کوئی عورت ملازمت نہیں کرتی تو اس کے ساتھ رشتہ کرنے کے لئے بھی کوئی تیار نہ ہوتا۔ حالانکہ ملازمت سے وہ جو کچھ کماتی ہے وہ اس عظیم سرمایہ کی تربیت اور نگہداشت کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں۔ اس لئے کہ بچے انسانیت کا نہایت ہی قیمتی اور نایاب سرمایہ ہیں۔

نرسریوں کے تجربات سے سب سے پہلے جو چیز ثابت ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ پہلے دو سال کے عرصہ میں بچہ فطری اور نفسیاتی طور پر اس بات کا محتاج ہوتا ہے کہ اسے مستقلاً والدین کی گود میں ہونا چاہئے۔ بالخصوص والدہ کے معاملے میں تو اس کی ضرورت یہ ہے کہ والدہ مستقلاً صرف اس کی خدمت گزار ہو اور اس کے ساتھ اس میں کوئی دوسرا بچہ بھی شریک نہ ہو۔ اس کے بعد ایک عرصہ تک پھر اسے یہ ضرورت ہوتی ہے کہ اس کے ماں اور باپ ہوں اور اس کی نسبت ان کی طرف ہو۔ پہلی ضرورت نرسری کے سلسلہ میں ممکن نہیں ہے اور دوسری صورت سوائے اس کے کہ خاندانی نظام موجود ہو ممکن الحصول نہیں ہے۔

جو بچہ ان دو سہولتوں سے محروم رہے وہ توانائی اور نفسیاتی لحاظ سے ناقص رہے گا۔ ایسے بچے لازماً کسی نہ کسی نفسیاتی الجھن کا شکار ہوتے ہیں۔

اگر کسی کو کوئی ایسا حادثہ پیش آ جائے اور وہ ان دونوں سہولتوں میں سے کسی ایک سے محروم ہو جائے تو یہ حادثہ اس بچے کے لئے تباہ کن ہوتا ہے لیکن ہمیں تعجب ہے کہ ہم کدھر جا رہے ہیں؟ ذرا اس غافل اور بے خبر جاہلیت پر غور کریں' جس کی کوشش یہ ہے کہ نرسری کا نظام عام کر دیا جائے اور زیادہ سے زیادہ بچوں کو ایسے تباہ کن حادثوں سے دوچار کیا جائے اور پھر جاہلیت کے بعض وہ تماشائی جو اسلام کی عطا کردہ امن و سلامتی سے محروم ہیں وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ ہلاکت' چھوٹے چھوٹے بچوں کی ہلاکت و تباہی ترقی اور آزادی ہے۔ ثقافت و تہذیب ہے۔ (۲)

ا۔ تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو۔ الانسان بین المادیہ والاسلام فصل جنسیت۔ کتاب شبہات حول الاسلام' محمد قطب فصل المرأۃ
۲۔ تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو۔ الانسان بین المادیہ والاسلام فصل جنسیت۔ کتاب شبہات حول الاسلام' محمد قطب فصل المرأۃ

یہی وہ وجوہات ہیں جن کی وجہ سے اسلامی نظام حیات نے ' اپنے اجتماعی نظام کی بنیاد " خاندان " پر رکھی ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی رضا یہ تھی کہ مسلمان امن و سلامتی کے دائرے میں داخل ہو جائیں۔ اور اسلام کے زیر سایہ سلامتی اور چین کی زندگی بسر کریں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید نے خاندانی نظام کے استحکام پر بہت زیادہ توجہ کی ہے۔ اس لئے کہ اسلام کے اجتماعی نظام میں خاندان بنیادی یونٹ قرار پانے والا تھا۔ چنانچہ قرآن مجید کی مختلف سورتوں میں خاندانی نظام کے استحکام کے لئے 'اس کے مختلف پہلوؤں کو منظم کیا گیا ہے اور اس کے لئے بنیادی مواد فراہم کیا گیا ہے۔ چنانچہ سورۂ بقرہ ان سورتوں میں سے ایک ہے۔

اس سورت میں خاندانی نظام کے سلسلے میں جو آیات نازل ہوئی ہیں ان میں نکاح' معاشرت' ایلا' طلاق' نفقہ' متعہ' رضاعت اور حضانت کے اہم مسائل بیان کئے گئے ہیں 'لیکن یہاں ان احکام کو خاص احکام کی شکل میں بیان نہیں کیا گیا جیسا کہ عام طور پر قانون کی کتابیں پڑھنے والے کتب قانون میں مجرد دفعات اور احکام پاتے ہیں۔ ہرگز نہیں! یہ احکام ایسی فضا میں وارد ہوتے ہیں کہ انسان کا دل و دماغ اسے بحیثیت ایک عظیم اصول کے لیتے ہیں۔ انسانی زندگی کے لئے اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے نظام زندگی کا ایک عظیم اصول اور اس نظریۂ حیات کا عظیم اصول جس سے اسلامی نظام زندگی کی کونپلیں پھوٹتی ہیں۔ اور یہ کہ اس اصول اور اس قانون کا تعلق براہ راست اللہ تبارک و تعالیٰ سے ہے۔ یہ قانون اس کے ارادے 'اس کی حکمت 'اس کی مشیئت سے ملا ہوا ہے۔ اور یہ اصول اس نظام زندگی کا ایک اہم حصہ ہے جو اس نے اپنے بندوں کے لئے پسند کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے ساتھ اللہ کی رضا و غضب 'ثواب و عقاب وابستہ ہوتے ہیں اور ان احکام کا تعلق اسلامی نظریۂ حیات سے ہوتا ہے۔ اگر کوئی ان پر عمل کرے گا تو وہ شخص مسلم کہلائے گا۔ اگر عمل نہ کرے گا تو مسلم نہ کہلائے گا۔

انسان پہلی نظر ہی میں اس معاملے کی نزاکت اور اہمیت کو سمجھ لیتا ہے۔ اسی طرح یہ بات بھی اس کی سمجھ میں آجاتی ہے کہ اس نظام کا ہر جز خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا ہو اہمیت کا حامل ہے۔ خود اللہ تعالیٰ اس نظام کا نگران ہے اور اس طرف اس کی خاص توجہ ہے۔ اور یہ کہ اس نظام کی ہر چھوٹی اور بڑی بات مقصود بالذات ہے اور اللہ کے ہاں ایک عظیم مقصد کے لئے اسے رکھا گیا ہے۔ اور یہ کہ اس انسان کی ذات کی نگرانی خود اللہ تعالیٰ کرتا ہے۔ پھر تحریک کی تعمیر و تربیت کا کام بھی خود ذات باری اپنی نگرانی میں فرماتی ہے اور اس تعمیر اور نشوونما اور ٹریننگ کی غرض صرف یہ ہے کہ تحریک اسلامی کو اس عظیم رول کے لئے تیار کرنا ہے' جو اس نے اس کائنات میں ادا کرنا ہے' پھر انسان یہ محسوس کر لیتا ہے کہ اس نظام زندگی کے کسی حصے پر عمل نہ کرنا' اسے کمزور کرنا' اللہ تعالیٰ کے غضب کو دعوت دینا ہے۔ ایسے افراد شدید غضب کے مستحق ہو جاتے ہیں۔

پھر یہ احکام بڑی تفصیل سے بیان کئے جاتے ہیں' جب تک ایک حکم ختم نہیں ہو جاتا' اس کے مالہ و ماعلیہ بیان نہیں کر دیئے جاتے' اس وقت تک دوسرے حکم کا آغاز نہیں کیا جاتا۔ پھر ہر حکم کے بعد تعقیبات اختتامیہ تبصرے اور نتائج بیان کئے جاتے ہیں۔ بعض اوقات تو یہ تعقیبات اور تنبیہات بیان احکام کے درمیان ہی آجاتی ہیں' جن سے مقصود یہ بتلانا ہوتا ہے کہ یہ معاملہ اہمیت کا حامل ہے۔ بالخصوص وہ تعقیبات' جن کا تعلق ضمیر و احساس اور دل کے تقویٰ سے ہوتا ہے کیونکہ یہ بیدار تقویٰ' احساس اطاعت اور ضمیر کی نگرانی کے بغیر نہیں ہو سکتا کہ ان احکام کے بجالانے میں حیلہ سازی سے کام لیا جائے۔

پہلا حکم یہ ہے کہ مسلمان مشرکہ عورتوں سے نکاح نہ کریں نہ اپنی عورتوں کا نکاح کر کے مشرک کے حوالہ کریں۔ اس کی وجوہات یہ بتائی گئی ہیں۔ **أُولَٰئِكَ يَدْعُونَ إِلَى النَّارِ ۖ وَاللَّهُ يَدْعُو إِلَى الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ بِإِذْنِهِ ۖ وَيُبَيِّنُ آيَاتِهِ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ** " یہ لوگ تمہیں آگ کی طرف بلاتے ہیں اور اللہ اپنے اذن سے تم کو جنت اور مغفرت کی طرف بلاتا ہے اور وہ اپنے احکام

واضح طور پر لوگوں کے سامنے بیان کرتا ہے' توقع ہے کہ وہ سبق لیں گے اور نصیحت قبول کریں گے۔"

دوسرا حکم حیض کے دوران میں عورتوں کے ساتھ مباشرت کرنے کے مسئلے سے متعلق ہے۔ اس پر جو تعلیق و تبصرہ ہے' اس میں اس فعل کو محض قضائے شہوت کے چند منٹ کے جسمانی تلذذ سے بلند کر کے' اعلیٰ مقاصد اور انسانی فریضے کے اعلیٰ مقام تک بلند کیا جاتا ہے۔ بلکہ بتایا گیا ہے کہ یہ انسان کے ذاتی اور نجی فرائض میں سے ایک اہم فریضہ ہے اور اس کا تعلق خالق تعالیٰ کی اس سکیم سے ہے کہ اس کی مخلوق اس کی عبادت اور اس کے ذکر کی وجہ سے پاک و صاف ہو جائے۔

فَإِذَا تَطَهَّرْنَ فَأْتُوهُنَّ مِنْ حَيْثُ أَمَرَكُمُ اللَّهُ ۚ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ التَّوَّابِينَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِينَ نِسَاؤُكُمْ حَرْثٌ لَكُمْ فَأْتُوا حَرْثَكُمْ أَنَّىٰ شِئْتُمْ ۖ وَقَدِّمُوا لِأَنْفُسِكُمْ ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّكُمْ مُلَاقُوهُ ۗ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِينَ "پھر جب وہ پاک ہو جائیں' تو ان کے پاس جاؤ اس طرح جیسا کہ اللہ نے تمہیں حکم دیا ہے' اللہ ان لوگوں کو پسند کرتا ہے' جو بدی سے باز رہیں اور پاکیزگی اختیار کریں۔ تمہاری عورتیں کھیتیاں ہیں۔ تمہیں اختیار ہے' جس طرح چاہو' اپنی کھیتی میں جاؤ مگر اپنے مستقبل کی فکر کرو اور اللہ کی ناراضی سے بچو۔ خوب جان لو کہ تمہیں ایک دن اس سے ملنا ہے۔ اور اے نبی جو تمہاری ہدایات لیں انہیں خوشخبری دے۔"

تیسرے حکم میں قسموں کے بارے میں احکام ہیں۔ بعد میں چونکہ ایلا اور طلاق کے احکام بیان ہوں گے۔ اس لئے یہاں بطور تمہید قسموں کے بارے میں عمومی حکم دے دیا۔ اللہ کے نام کی قسمیں کھانے کا ربط بھی' اللہ پر پختہ یقین اور خدا خوفی سے قائم کر دیا گیا ہے۔ ایک جگہ کہا گیا وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ "اللہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔" اور دوسری جگہ ہے وَاللَّهُ غَفُورٌ حَلِيمٌ "اللہ بہت درگزر کرنے والا بردبار ہے۔"

چوتھا حکم ایلا کا ہے اور اس کے آخر میں یہ تعقیب ہے فَإِنْ فَاءُوا فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ وَإِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَإِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ "اگر انہوں نے رجوع کر لیا تو اللہ معاف کرنے والا اور رحیم ہے۔ اور اگر انہوں نے طلاق ہی کی ٹھان لی ہو تو جانے رہیں کہ اللہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے۔"

پانچواں حکم مطلقہ عورت کی عدت کے بارے میں ہے۔ اور اس حکم کے ساتھ بھی متعدد تعقیبات و تنبیہات پیوستہ ہیں۔

لَا يَحِلُّ لَهُنَّ أَنْ يَكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللَّهُ فِي أَرْحَامِهِنَّ إِنْ كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ "اور ان کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ اللہ نے ان کے رحم میں جو کچھ خلق فرمایا ہو' اسے چھپائیں' انہیں ہرگز ایسا نہ کرنا چاہئے اگر وہ اللہ اور روز آخر پر ایمان رکھتی ہیں۔"

اور چھٹا حکم طلاقوں کی تعداد کے بارے میں ہے اور طلاق کی حالت میں مہر اور نفقہ واپس لینے کے احکام ہیں۔ ان احکام کے بعد بھی یہ تعقیبات وارد ہیں۔

وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ أَنْ تَأْخُذُوا مِمَّا آتَيْتُمُوهُنَّ شَيْئًا إِلَّا أَنْ يَخَافَا أَلَّا يُقِيمَا حُدُودَ اللَّهِ ۖ فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا يُقِيمَا حُدُودَ اللَّهِ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيمَا افْتَدَتْ بِهِ "اور تمہارے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ جو کچھ تم انہیں دے چکے ہو' اس میں سے کچھ واپس لے لو' البتہ یہ صورت مستثنیٰ ہے کہ زوجین کو اللہ کے حدود پر قائم نہ رہ سکنے کا اندیشہ ہو' ایسی صورت میں اگر تمہیں یہ خوف ہو کہ وہ دونوں حدود الٰہی پر قائم نہ رہیں گے تو ان دونوں کے درمیان یہ معاملہ ہو جانے میں مضائقہ نہیں کہ عورت اپنے شوہر کو کچھ معاوضہ دے کر علیحدگی حاصل کرے۔ یہ اللہ کی مقرر کردہ حدود ہیں' ان سے تجاوز نہ کرو اور جو لوگ حدود الٰہی سے تجاوز کریں وہی ظالم ہیں۔"

اور یہ کہ فَاِنۡ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيۡهِمَاۤ اَنۡ يَّتَرَاجَعَاۤ اِنۡ ظَنَّاۤ اَنۡ يُّقِيۡمَا حُدُوۡدَ اللّٰهِ‌ؕ وَتِلۡكَ حُدُوۡدُ اللّٰهِ يُبَيِّنُهَا لِقَوۡمٍ يَّعۡلَمُوۡنَ "اور یہ دوسرا شخص بھی اسے طلاق دے دے تب اگر پہلا شوہر اور یہ عورت دونوں یہ خیال کریں کہ حدود الٰہی پر قائم رہیں گے' تو ان کے لئے ایک دوسرے کی طرف رجوع کر لینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ یہ اللہ کی مقرر کردہ حدیں ہیں' جنہیں وہ ان لوگوں کی ہدایت کے لئے واضح کر رہا ہے' جو (ان حدود کو توڑنے کا انجام) جانتے ہیں۔"

ساتواں حکم یہ ہے کہ اگر تم عورت کو طلاق دو تو یا پھر صحیح طرح اسے الگ کر دو اور یا صحیح طرح اسے اچھے طریقے سے رخصت کر دو اور اس حکم پر اللہ تعالیٰ کا تبصرہ یہ ہے۔ وَاِذَا طَلَّقۡتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغۡنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمۡسِكُوۡهُنَّ بِمَعۡرُوۡفٍ اَوۡ سَرِّحُوۡهُنَّ بِمَعۡرُوۡفٍ‌ وَلَا تُمۡسِكُوۡهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعۡتَدُوۡا‌ ۚ وَمَنۡ يَّفۡعَلۡ ذٰلِكَ فَقَدۡ ظَلَمَ نَفۡسَهٗ‌ ؕ وَلَا تَتَّخِذُوۡٓا اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا‌ وَّاذۡكُرُوۡا نِعۡمَتَ اللّٰهِ عَلَيۡكُمۡ وَمَآ اَنۡزَلَ عَلَيۡكُمۡ مِّنَ الۡكِتٰبِ وَالۡحِكۡمَةِ يَعِظُكُمۡ بِهٖ‌ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعۡلَمُوۡٓا اَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَىۡءٍ عَلِيۡمٌ "یا بھلے طریقے سے انہیں روکو یا بھلے طریقے سے رخصت کرو۔ محض ستانے کی خاطر انہیں نہ روکے رکھنا کہ یہ زیادتی ہوگی اور جو ایسا کرے گا' وہ درحقیقت آپ اپنے ہی اوپر ظلم کرے گا۔ اللہ کی آیات کا کھیل نہ بناؤ۔ بھول نہ جاؤ کہ اللہ نے کس نعمت عظمیٰ سے تمہیں سرفراز کیا ہے۔ وہ تمہیں نصیحت کرتا ہے کہ جو کتاب اور حکم اس نے تم پر نازل کی ہے اس کا احترام ملحوظ رکھو۔ اللہ سے ڈرو اور خوب جان لو کہ اللہ کو ہر بات کی خبر ہے۔"

دوسری ہدایت یہ ہے:

ذٰ لِكَ يُوۡعَظُ بِهٖ مَنۡ كَانَ مِنۡكُمۡ يُؤۡمِنُ بِاللّٰهِ وَالۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ‌ؕ ذٰ لِكُمۡ اَزۡكٰى لَـكُمۡ وَاَطۡهَرُ‌ؕ وَاللّٰهُ يَعۡلَمُ وَاَنۡتُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ یہ تمہیں نصیحت کی جاتی ہے کہ ایسی حرکت نہ کرنا' اگر تم اللہ اور آخر پر ایمان لانے والے ہو' تمہارے لئے شائستہ اور پاکیزہ طریقہ یہی ہے کہ اس سے باز رہو۔ اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔"

آٹھواں حکم رضاعت اور اجرت پر دودھ پلانے اور اس کی اجرت کے متعلق ہے۔ اور مفصل احکام بیان کرنے کے بعد اس پر یہ نصیحت کی جاتی ہے وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعۡلَمُوۡٓا اَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ بَصِيۡرٌ "اللہ سے ڈرو اور جان رکھو کہ جو کچھ تم کرتے ہو' سب اللہ کی نظر میں ہے۔"

نواں حکم اس عورت کی عدت کے بارے میں ہے جس کا خاوند فوت ہو گیا ہو' اس پر یہ تعقیب بارِ پروانہ آزادی فَاِذَا بَلَغۡنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيۡكُمۡ فِيۡمَا فَعَلۡنَ فِىۡۤ اَنۡفُسِهِنَّ بِالۡمَعۡرُوۡفِ‌ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ خَبِيۡرٌ "پھر جب ان کی عدت پوری ہو جائے تو انہیں اختیار ہے کہ اپنی ذات کے معاملے میں معروف طریقے سے' جو چاہیں فیصلہ کریں' تم پر اس کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ اللہ تم سب کے اعمال سے باخبر ہے۔"

دسواں حکم دوران عدت عورت کو اشارۃً نکاح دینے کے بارے میں ہے۔ اس پر اللہ تعالیٰ کی جانب سے یہ تعقیب و تبصرہ آتا ہے۔

عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمۡ سَتَذۡكُرُوۡنَهُنَّ وَلٰـكِنۡ لَّا تُوَاعِدُوۡهُنَّ سِرًّا اِلَّاۤ اَنۡ تَقُوۡلُوۡا قَوۡلًا مَّعۡرُوۡفًا ؕ وَلَا تَعۡزِمُوۡا عُقۡدَةَ النِّكَاحِ حَتّٰى يَبۡلُغَ الۡكِتٰبُ اَجَلَهٗ‌ ؕ وَاعۡلَمُوۡٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعۡلَمُ مَا فِىۡۤ اَنۡفُسِكُمۡ فَاحۡذَرُوۡهُ‌ ۚ وَاعۡلَمُوۡٓا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ حَلِيۡمٌ "اللہ جانتا ہے کہ ان کا خیال تمہارے دل میں تو آئے گا ہی مگر دیکھو' خفیہ عہد و پیمان نہ کرنا' اگر کوئی بات کرنی ہے تو معروف طریقے سے کرو۔ اور عقد نکاح باندھنے کا فیصلہ اس وقت تک نہ کرو جب تک کہ عدت پوری نہ ہو جائے۔ خوب سمجھ لو کہ اللہ تمہارے دلوں کا حال تک جانتا ہے۔ لہٰذا اس سے ڈرو اور یہ بھی جان لو کہ اللہ بردبار ہے۔ (چھوٹی چھوٹی باتوں سے) درگذر فرماتا ہے۔"

گیارہواں حکم اس مطلقہ عورت کے بارے میں ہے' جس کے ساتھ مباشرت نہ ہوئی ہو' ایسی عورت کا مہر مقرر نہ کیا گیا ہو تو حکم یا ادا کر دیا گیا ہو تو حکم۔ اس پر یہ وجدانی تبصرہ دیکھئے۔

وَاَنْ تَعْفُوْٓا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ "اور اگر تم (مرد) نرمی سے کام لو' تو یہ تقویٰ سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔ آپس کے معاملات میں فیاضی کو نہ بھولو۔ تمہارے اعمال کو اللہ دیکھ رہا ہے۔"

بارہواں حکم مطلقہ عورتوں کے بارے میں اور جس کا خاوند فوت ہو چکا ہے۔ اس کے بارے میں ہے کہ ایک سال تک نان و نفقہ دو۔ اس حکم پر آخر میں حکم ہوتا ہے وَلِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ اور مطلقہ عورتوں کا حق ہے کہ انہیں مناسب طور پر کچھ نہ کچھ دے کر رخصت کیا جائے۔ یہ حق ہے متقی لوگوں پر۔"

اب ان سب احکام کے بیان کرنے کے بعد ان سب پر ایک جامع تبصرہ کیا جاتا ہے : كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ "اس طرح اللہ اپنے احکام تمہیں صاف صاف بتاتا ہے۔ امید ہے کہ تم سمجھ بوجھ کر کام کرو گے۔"

یہ سب احکام عبادت ہیں۔ نکاح میں اللہ کی بندگی۔ مباشرت اور اضافہ نسل میں اللہ کی بندگی ہے۔ طلاق اور جدائی بھی اللہ کی غلامی اور بندگی ہے۔ عدت اور دوران عدت طلاق سے رجوع بھی بندگی ہے' نفقہ اور رخصتی کا ساز و سامان بھی اللہ کی بندگی ہے۔ معروف طریقے سے عورت کو روک کر بیوی بنا لینا بھی بندگی ہے۔ ورنہ اچھے طریقہ سے ہمیشہ کے لئے رخصت کر دینا بھی اللہ کی بندگی' فدیہ دینا بھی بندگی ہے۔ عوض دینا بھی بندگی دودھ پلانا بھی بندگی ہے اور دودھ سے چھڑانا بھی اللہ کی بندگی اور اطاعت ہے۔ غرض ہر حرکت اور ہر پیش آمدہ واقعہ میں ایک مسلمان کا طرز عمل اگر خدائی ہدایات کے مطابق ہے تو بندگی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان احکام کے عین وسط میں اچانک نماز کا حکم بھی آ جاتا ہے۔ یعنی خوف میں بھی نماز اور امن میں بھی نماز فرماتے ہیں حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا فَاِذَآ اَمِنْتُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَمَا عَلَّمَكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ "اپنی نمازوں کی نگہداشت رکھو' خصوصاً ایسی نماز کی جو محاسن صلوٰۃ کی جامع ہو۔ (پانچ والی نماز) اللہ کے آگے اس طرح کھڑے ہو' جیسے فرمانبردار غلام کھڑے ہوتے ہیں' بدامنی کی حالت ہو تو خواہ پیدل ہو' خواہ سوار جس طرح ممکن ہو' نماز پڑھو اور جب امن میسر آ جائے تو اللہ کو اس طریقے سے یاد کرو جو اس نے تمہیں سکھایا ہے' جس سے تم پہلے ناواقف تھے۔"

آپ دیکھیں نماز کا یہ حکم عائلی احکام کے درمیان واقعہ ہے۔ ابھی عائلی احکام ختم نہ ہوئے تھے کہ درمیان میں نماز کا ذکر آ گیا۔ تاکہ نماز کی عبادت کا حکم دوسری عبادات زندگی کے درمیان خلط ہو جائے۔ یہ خلط اس لئے ہوا کہ یہ اسلام کے مزاج کے عین مطابق ہے۔ اور اسلامی نظریۂ حیات کی رو سے یہ کلی بندگی اور ہر کام میں عبادت وجود انسان کی اصل غرض و غایت ہے۔ اس پورے سبق کا انداز بیان' اسطرف بہت ہی لطیف انداز میں اشارہ کرتا ہے۔ یہ کہ یہ سب چیزیں عبادت ہیں۔ جس طرح نماز کے معاملے میں احکام الٰہی کی اطاعت عبادت ہے' اسی طرح ان دوسرے عائلی معاملات میں بھی احکام الٰہی کی اطاعت عبادت ہے۔ زندگی ایک اکائی ہے اور عبادات سب کی سب ایک ہی نوعیت کی ہیں۔ تمام احکام اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں اور یہ سب احکام ہی زندگی کا وہ نظام ہیں جو اللہ تعالیٰ نے تجویز کیا ہے[1]۔

(1) قرآن مجید میں اس مقام پر سیاق کلام میں اچانک تبدیلی کی وجہ سے سخت پریشان تھا' بات سمجھ میں نہ آتی تھی۔ میں نے اس حصہ کے طبع اول اور دوم میں یہ کہا تھا "میں سیاق کلام کی اس اچانک تبدیلی کے بارے میں سوچتا رہا لیکن اس سلسلے میں کوئی حکمت میری سمجھ میں نہ آئی۔ اس لئے میں اس سلسلے میں بلند سازی مناسب نہیں سمجھتا اور بعض مفسرین نے اس سلسلے میں جو کچھ کہا ہے اس پر میں مطمئن نہیں ہوں۔ وہ لکھتے ہیں عائلی احکام کے درمیان نماز کا ذکر اس لئے کر دیا گیا کہ نماز کی اہمیت واضح ہو۔ مطلب یہ ہے کہ ہاں نماز کو نہ بھولنا۔ " دیکھئے طبع اول ۸۴' ۸۵۔ میں نے مزید کہا تھا "لیکن میں اس پر مطمئن نہیں ہوں" اور اگر اللہ نے مجھے کوئی چیز سجھائی تو انشاء اللہ آئندہ ایڈیشن میں اس کا اضافہ کر دیا جائے گا۔ اور اللہ تعالیٰ قرآن مجید کے کسی معاملے میں کوئی بات سجھائے تو اس کا شکر ادا کرنا چاہئے۔ اب خدا کے فضل سے بات سمجھ میں آ گئی۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہی وہ راز اور حکمت ہے۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر کہ اس نے یہ بات سجھائی ورنہ اگر وہ مہربانی نہ کرتے تو اس نکتے کا سمجھنا مشکل تھا۔

ان تمام احکام میں، جس طرح خدا کی عبادت اور بندگی کا ماحول، خدا کی اطاعت و عبادت کا رنگ ہے اور اللہ کی غلامی کا پرسکون سایہ ہے، اسی طرح ان میں واقعی زندگی کے ماحول کو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا۔ انسان کی طبعی ساخت اور اس کی فطری خواہشات سے بھی قطع نظر نہیں کی گئی اور اس کرۂ ارض پر انسان کی انسانی ضروریات کو بھی اچھی طرح پورا کیا گیا ہے۔

اسلام جو قانون بناتا ہے وہ انسانوں کے ایک گروہ کے لئے بنا رہا ہے، وہ یہ قانون بہرحال فرشتوں کے لئے نہیں بنا رہا ہے۔ نہ اڑتے ہوئے تخیلات کے عالم میں کسی فرضی مخلوق کے لئے۔ اس لئے عام ہدایات اور قانون سازی یا شرعی احکام کے ذریعے، جب اسلام انہیں اللہ کی بندگی کی فضا تک بلند کرنے کی کوشش کرتا ہے تو یہ حقیقت اچھی طرح اس کے سامنے ہوتی ہے کہ وہ سب کچھ ایک انسان کے لئے کر رہا ہے۔ یہ کہ یہ بندگی ایک بشر نے کرنی ہے اور انسانوں میں انسانی جذبات و میلانات پائے جاتے ہیں۔ ان میں ضعف ہے اور کئی قسم کی کمزوریاں ہیں۔ ان کو ضروریات لاحق ہوتی ہیں اور ماحول سے متاثر ہوتے ہیں، وہ جذبات رکھتے ہیں اور باشعور مخلوق ہیں۔ ایک طرف ان میں روحانی اشراق ہے تو دوسری طرف انسانی کثافتیں بھی ہیں اور اسلامی نظام زندگی ایک ایسا نظام ہے جو ان سب امور کا خیال رکھتا ہے۔ اور ان کے باوجود انسان کو ایک پاک بندگی کی راہ پر لگا دیتا ہے۔ ایک روشن چراغ انہیں دکھاتا ہے۔ ہدایت کا روشن چراغ۔ لیکن بغیر کسی جبر کے، بغیر کسی مصنوعی ذریعہ کے، وہ اپنے تمام نظام زندگی کی بنیاد اس پر قائم کرتا ہے کہ یہ انسان بہرحال انسان ہے!

یہی وجہ ہے کہ اسلام نے ایلا کو جائز قرار دیا۔ یعنی ایک مرد کے لئے جائز ہے کہ وہ ایک مقررہ وقت تک عورت کے ساتھ مباشرت نہ کرنے کی قسم کھالے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ یہ قسم چار ماہ سے زیادہ نہ ہوگی۔ پھر اسلام طلاق کی گنجائش رکھتا ہے۔ اور اس کے لئے باقاعدہ قانون سازی کرتا ہے۔ اس کے احکام اور اس کے نتائج کو بھی منظم طریقے سے قانونی ضابطہ کا پابند کر دیتا ہے۔ ایسے حالات میں ازروئے قانون طلاق کی گنجائش رکھی گئی ہے، جبکہ دوسری طرف خاندانی نظام کی بنیادوں کو پوری طرح مستحکم کرنے کی پالیسی اختیار کی گئی ہے۔ خاندانی تعلقات کو مزید پختہ کرنے کی سعی کی گئی ہے اور افراد خاندان کے باہمی ربط کو محض معاشرتی فائدے سے بلند کر کے اسے اطاعت خداوندی اور عبادت رب کا بلند تصور دے دیا گیا ہے۔ یہ وہ توازن ہے جو اسلامی نظام زندگی کے عملی پہلوؤں کو واقعی بہت ہی بلند اور ایک حقیقی مثالی نظام کر دیتا ہے۔ جو مثالی ہونے کے ساتھ ساتھ انسانی طاقت اور وسعت کے دائرے کے اندر بھی رہتا ہے۔ اور یوں لگتا ہے کہ یہی نظام ہے جو فی الواقعہ ایک عام انسان کے لئے بنایا گیا ہے۔

نظام کیا ہے فطرت کے لئے سہولتیں ہی سہولتیں ہیں۔ مرد اور عورت دونوں کے لئے حکیمانہ سہولیات ہیں۔ اگر ایک تشکیل شدہ خاندان، جس کی بنیاد مرد و عورت کے نکاح سے پڑی تھی کامیاب نہیں ہوتا، اس ابتدائی انسانی خلیہ (Cell) میں امن و سکون قائم نہیں ہو سکتا تو اللہ وہ ذات ہے جو جاننے والا ہے خبردار ہے، وہ لوگوں کے بارے میں وہ کچھ جانتا ہے، جو وہ خود بھی نہیں جانتے۔ اس لئے ذات باری نے یہ نہ چاہا کہ وہ مرد و عورت کے رابطہ نکاح کو ناقابل انفکاک بنا دے اور اس طرح ابتدائی انسانی جوڑے کو انس و محبت کے گہوارے کے بجائے ایک قید خانہ بنا دے۔ میاں بیوی ایک دوسرے کو دیکھنا چاہتے ہوں مگر جدائی محال ہو، ان کے دلوں میں سب شکوک و شبہات سیلابی شکل اختیار کر گئے ہیں لیکن بچنے کی کوئی صورت نہ ہو۔ میاں بیوی کے تعلقات شبہات کے گھٹاٹوپ اندھیرے میں دب کر رہ گئے ہوں لیکن روشنی کی طرف نکل آنے کی کوئی صورت نہ ہو۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے تو میاں بیوی کے جوڑ اور امن چھوٹے خاندان کو اس لئے بنایا تھا کہ وہ دارالسکون ہو، دارالامن ہو۔ اور اگر اس سے یہ مقصد پورا نہ ہو رہا ہو اور اس لئے نہ ہو رہا ہو کہ فریقین کی فطرت اور طبائع میں اختلاف ہو، تو پھر ایسی صورت میں بہتر یہی ہے کہ میاں بیوی کے درمیان جدائی ہو جائے اور اس بیمار خاندان کو ختم کر دیا جائے اور وہ دوبارہ کوشش کریں کہ جڑ سکیں لیکن جدائی کا فیصلہ بھی محض سرسری اختلافات کی بنیاد پر نہیں کیا جاتا بلکہ خاندان کے بچانے کے

لئے تمام وسائل کام میں لائے جاتے ہیں۔ اس لئے کہ اسلامی نظام زندگی میں انسانی اجتماع میں خاندان مقدس ترین اکٹھ ہے۔ لیکن جدائی کی صورت میں بھی ایسے احکام دیئے گئے ہیں کہ نہ خاوند کو نقصان پہنچے نہ بیوی کو۔ نہ بچے کو اور نہ جنین کو۔

یہ ہے وہ ربانی نظام زندگی' جسے اللہ تعالیٰ نے انسان کے لئے تشکیل دیا۔

جب انسان اس نظام کی بنیادوں پر غور کرتا ہے' جسے اللہ تعالیٰ نے انسان کے لئے تجویز کیا ہے اور پھر اس نظام کے نتیجے میں پیدا ہونے والے اس معاشرے' پاک معاشرے پر نگاہ ڈالتا ہے جس میں امن و سلامتی کا دور دورہ ہوتا ہے اور پھر اس کے مقابلے میں اس نظام زندگی کا مطالعہ کرتا ہے' جو اس وقت فعلاً انسانی زندگی میں قائم و رائج تھا۔ تو نظر آتا ہے کہ دونوں کے درمیان زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اور اسلامی معاشرہ ایک مثالی معاشرہ ہے۔ اور اگر اسلامی معاشرے کا مقابلہ مشرق و مغرب میں آج کے جدید جاہلی معاشروں سے کیا جائے تو بھی یہ مثالی معاشرہ ایک اونچے مقام پر نظر آتا ہے' حالانکہ ان جدید جاہلی معاشروں کے حامی اپنے آپ کو بڑا ترقی یافتہ معاشرہ سمجھتے ہیں۔ اس تقابلی مطالعہ کے نتیجے میں اچھی طرح احساس ہو جاتا ہے کہ اسلام نے شرافت' پاکیزگی اور امن و سکون کا اونچا معیار قائم کیا ہے۔ کس طرح اللہ تعالیٰ نے اس اونچے مقام تک انسانوں کو پہنچانے کے لئے قانون بنایا۔ خصوصاً عورت کو تو اس نظام میں خصوصی رعایتیں دی گئی ہیں۔ بہت بڑی حرمت اور شرافت اسے عطا کر دی گئی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جو مستقیم الفطرت عورت بھی ان خصوصی رعایتوں پر غور کرے' جو اللہ نے اسلامی نظام میں عورتوں کو دی ہیں' وہ بے اختیار اللہ تعالیٰ کے ساتھ بے پناہ محبت کرنے لگے گی' بشرطیکہ وہ استقامت فکر سے غور کرے۔ (۱)

اب دیکھئے آیات کی تشریح و تفصیلات

☆ ☆ ☆

(۱) دیکھئے۔ العدالت الاجتماعیہ کی فصل انسانی مساوات ۔۔۔ انسان مادیت اور اسلام۔ فصل صنفی تعلقات ۔۔۔ شبہات حول الاسلام' الفصل "اسلام اور عورت" ۔۔۔ فی ظلال القرآن سورت احزاب' نساء اور طلاق

درس نمبر ۱۵ تشریح آیات (۲۲۱ تا ۲۴۲)

وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ ۭ وَلَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَّلَوْ اَعْجَبَتْكُمْ ۚ وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا ۭ وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ وَّلَوْ اَعْجَبَكُمْ ۭ اُولٰۗىِٕكَ يَدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ ښ وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلَى الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ بِاِذْنِهٖ ۚ وَيُبَيِّنُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ (۲۲۱)

۲۷
ع۵
۱۱

"اور تم مشرک عورتوں سے ہرگز نکاح نہ کرنا جب تک وہ ایمان نہ لے آئیں۔ ایک مومن لونڈی ایک مشرک شریف زادی سے بہتر ہے۔ اگرچہ وہ تمہیں بہت پسند ہو۔ اور اپنی عورتوں کے نکاح مشرک مردوں سے کبھی نہ کرنا جب تک وہ ایمان نہ لے آئیں۔ ایک مومن غلام مشرک شریف سے بہتر ہے' اگرچہ وہ تمہیں بہت پسند ہو۔ یہ لوگ تمہیں آگ کی طرف بلاتے ہیں اور اللہ اپنے اذن سے تم کو جنت اور مغفرت کی طرف بلاتا ہے' اور وہ اپنے احکام واضح طور پر لوگوں کے سامنے بیان کرتا ہے' توقع ہے کہ وہ سبق لیں گے اور نصیحت قبول کریں گے۔"

نکاح یعنی شادی بنی آدم کے دو افراد کے درمیان بہت گہرا' بہت مضبوط اور بہت ہی دائمی رشتہ ہے۔ اس رشتے کے دونوں فریق ایک دوسرے کے وسیع مطالبات پورے کرتے ہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ فریقین کے دل ایک ہوں' وہ ایک ہی لاینحل گرہ میں بندھے ہوئے ہوں' لیکن دونوں کا ملاپ تب ممکن ہے جب اس غرض وغایت میں اتحاد ہو' جس پر معاہدۂ نکاح کا انعقاد ہوا ہے☆۔ اور وہ ذات متحد ہو جس کی طرف یہ دونوں متوجہ ہوں۔ جہاں تک دینی عقائد و نظریات کا تعلق ہے وہ انسان کی زندگی اور ان کی شخصیت پر بہت ہی گہرے اثرات رکھتے ہیں۔ انسان پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ انسانی شعور کو ایک خاص کیفیت عطا کرتے ہیں۔ یہ اس کی تاثر کی حد مقرر کرتے ہیں اور نفس کی خواہشات کو محدود کرتے ہیں اور پوری زندگی میں نفس انسانی کی راہنمائی و اعانت کرتے رہتے ہیں۔ بعض اوقات مذہبی عقیدہ پس پشت چلا جاتا ہے۔ اور اس میں ٹھہراؤ سا پیدا ہو جاتا ہے۔ اس سے اکثر لوگوں کو یہ مغالطہ ہو جاتا ہے کہ شاید دین کا تصور نفس انسانی کے لئے کوئی ضروری تصور نہیں۔ یہ ایک عارضی شعور ہے اور بعض فکری فلسفے اور بعض اجتماعی نظام دینی شعور کی جگہ لے سکتے ہیں اور یوں ہم مذہب اور دین سے چھٹکارا حاصل کر سکتے ہیں۔ لیکن یہ ایک وہم ہے اور نفس انسانی کی حقیقت اور اس کی نفسیات سے بے خبری کی دلیل ہے۔ اور اس کے عناصر ترکیبی کو نہ سمجھنے کی دلیل ہے۔ یا یہ لوگ جان بوجھ کر نفس انسانی اور اس کے منابع اور اس کی عملی صورت حال سے جان بوجھ کر تغافل کرتے ہیں۔

مکہ کے ابتدائی دور میں اگرچہ مسلمانوں اور مشرکین کے درمیان شعور و اعتقاد اور نظریاتی اعتبار سے مکمل جدائی ہو گئی تھی لیکن فریقین کے درمیان معاشرتی اور عائلی روابط کے اعتبار سے کلی طور پر جدائی کرنا ناممکن تھا اور نہ ہی مناسب تھا۔ اس لئے کہ اس وقت کے حالات کے مطابق ضرورت اس بات کی تھی کہ اس قسم کی اصلاحات مناسب وقت کے بعد اچھی طرح حکیمانہ طور پر کی جائیں۔ لیکن اس کے

بعد اللہ تعالیٰ نے تحریک اسلامی کو مدینہ طیبہ میں ایک مستقل مستقر بخشا' اور اعتقادی تشخص کی طرح اس کا اجتماعی تشخص بھی قائم ہو گیا۔ چنانچہ اب موقعہ آ گیا اور اب عائلی زندگی کی تحدید جدید کا کام شروع ہو گیا اور یہ آیات نازل ہوئیں۔ ان کی رو سے مسلمانوں اور مشرکوں کے درمیان نئے نکاح پر پابندی لگا دی گئی۔ رہے وہ نکاح جو پہلے سے قائم تھے تو ان کے بارے میں کوئی حکم نہ تھا۔ یہ سن چھ ہجری تک قائم رہے۔ چھ ہجری کو صلح حدیبیہ کے موقعہ پر آیات نازل ہوئی:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا جَاءَكُمُ الْمُؤْمِنَاتُ مُهَاجِرَاتٍ فَامْتَحِنُوهُنَّ اللَّهُ أَعْلَمُ بِإِيمَانِهِنَّ فَإِنْ عَلِمْتُمُوهُنَّ مُؤْمِنَاتٍ فَلَا تَرْجِعُوهُنَّ إِلَى الْكُفَّارِ لَا هُنَّ حِلٌّ لَهُمْ وَلَا هُمْ يَحِلُّونَ لَهُنَّ..... وَلَا تُمْسِكُوا بِعِصَمِ الْكَوَافِرِ "اے لوگو! جو ایمان لائے ہو' مومن عورتیں ہجرت کر کے تمہارے پاس آئیں تو (تو ان کا مومن ہونے کی) جانچ پڑتال کر لو' اور ان کے ایمان کی حقیقت تو اللہ ہی خوب جانتا ہے' پھر جب تمہیں معلوم ہو جائیں کہ وہ مومن ہیں' تو انہیں کفار کی طرف واپس نہ کرو۔ وہ کفار کے لئے حلال ہیں اور نہ کفار ان کے لئے حلال ہیں۔۔۔ اور تم خود بھی کافر عورتوں کو اپنے نکاح میں نہ روکے رکھو۔

غرض ان آیات کے نزول سے مسلمانوں اور کفار کے درمیان عائلی تعلقات منقطع کر دیئے گئے۔

اب یہ بات حرام ہو گئی کہ کوئی مسلمان مشرک عورت سے نکاح کرے یا کوئی مشرک کسی مسلمان عورت سے نکاح کرے۔ یہ بات حرام کر دی گئی کہ جب دو دل ایک نظریۂ حیات پر اکٹھے نہیں ہو سکتے تو ان کے لئے نکاح میں اکٹھا ہونا بھی ممکن نہیں ہے لہٰذا یہ حرام ہے۔ کیونکہ اسلام رشتہ نکاح کو بہت مضبوط رشتہ قرار دیتا ہے اور وہ ایک مضبوط رشتہ استوار کرنا چاہتا ہے جبکہ نظریۂ حیات کے اتحاد کے بغیر ہر رشتہ کمزور' ڈھیلا کھوٹا اور ناکارہ ہو گا۔ کیونکہ دونوں فریق اللہ کے معاملے میں ملے ہوئے نہیں ہیں۔ اللہ کے نظام زندگی پر وہ متفق نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہی وہ ذات ہے جس نے میاں بیوی کو پیدا کیا اور اسے انسانی شرافت دے کر اس مقام حیوانیت سے بلند کر دیا۔ اس کا منشا یہ ہے کہ یہ تعلق محض حیوانی تعلق نہ ہو' نہ محض شہوت رانی کے لئے ایک طریقہ ہو۔ اسلام اس تعلق کو ایک بلند مقام دیتا ہے بہت بلند اللہ کے پاس۔ زندگی کی پاکیزگی' نشوونما اور ترقی کے بارے میں اس کا جو منصوبہ ہے وہ اسے پاکیزہ تعلقات زن و شوئی کے نتیجے میں پورا کرتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكَاتِ حَتَّى يُؤْمِنَّ "اور مشرک عورتوں سے نکاح اس وقت تک نہ کرنا' جب تک وہ ایمان نہ لے آئیں۔" اگر وہ ایمان لے آئیں تو پھر وہ رکاوٹ دور ہو جاتی ہے۔ اب دونوں دل اللہ کے ہاں مل گئے ہیں۔ اور دو انسانوں کا یہ خاندانی ربط اب پر امن رہ گیا اور اس رکاوٹ سے پاک ہو گیا جو ان کے باہمی تعلق کو خراب کر رہی تھی۔ یہ باہمی تعلق صحیح و سالم رہ گیا اور ان کا اتحاد نظریۂ حیات کے نتیجے میں قوی تر ہو گیا۔ اب یہ نظریۂ حیات کا عقد قرار پایا۔ صرف کاروباری عقد نہ رہا۔ وَلَأَمَةٌ مُؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِنْ مُشْرِكَةٍ وَلَوْ أَعْجَبَتْكُمْ "اور ایک مومن لونڈی' ایک مشرک شریف زادی سے بہتر ہے۔ اگرچہ تمہیں بہت ہی پسند ہو۔" یہ پسندیدگی محض انسانی طبیعت کی بنا پر ہے۔ اس میں انسان کے بلند افکار کا کوئی دخل نہیں ہے۔ اس پسندیدگی کا دائرہ صرف اعضاء اور حواس تک محدود ہوتا ہے۔ حالانکہ دل کا حسن زیادہ گہرا اور زیادہ قیمتی ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ مسلمان عورت غلام ہو' آزاد نہ ہو' تو اسلام کے ساتھ اس کا جو نسب ہے۔ وہ اسے اس مقام شرافت سے زیادہ بلند کر دیتا ہے جو ایک کافرہ کو بطور حسب حاصل ہے۔ یہ نسب اللہ کا نسب ہے اور انسانی انساب میں یہ سب سے اعلیٰ نسب ہے وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِينَ حَتَّى يُؤْمِنُوا وَلَعَبْدٌ مُؤْمِنٌ خَيْرٌ مِنْ مُشْرِكٍ وَلَوْ أَعْجَبَكُمْ "اور اپنی عورتوں کے نکاح مشرک مردوں سے کبھی نہ کرنا' جب تک وہ ایمان نہ لے آئیں۔ ایک مومن غلام مشرک شریف سے بہتر ہے۔" یہی مسئلہ تکرار کے ساتھ دوسری صورت میں بیان کیا گیا ہے۔

محض تاکید اور بیان کی زیادہ گہرائی کے لئے۔ علت دونوں کی ایک ہی ہے اُولٰٓئِكَ يَدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ ۚ وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلَى الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ بِاِذْنِهٖ ۚ وَيُبَيِّنُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ "یہ لوگ تمہیں آگ کی طرف بلاتے ہیں اور اللہ اپنے اذن سے تم کو جنت اور مغفرت کی طرف بلاتا ہے اور وہ اپنے احکام واضح طور پر لوگوں کے سامنے بیان کرتا ہے' توقع ہے کہ وہ سبق لیں گے اور نصیحت قبول کریں گے۔"

راستے دونوں کے بالکل جدا ہیں۔ دونوں کا نظریہ اور دعوت بالکل جدا ہے۔ کس طرح یہ دو متضاد نظریات رکھنے والے اکٹھے رہ سکتے ہیں اور ایسا جوڑ جس پر آئندہ نسلوں کی زندگی کی بنیاد رکھی جا رہی ہے۔

مشرکوں اور مشرکات کا راستہ جہنم پر ختم ہوتا ہے اور وہ خود بلاتے بھی جہنم کی طرف ہیں۔ مومنین اور مومنات کا راستہ اللہ تعالیٰ تک جاتا ہے اور اللہ جنت اور مغفرت کی طرف بلاتا ہے اور اپنے اذن سے بلاتا ہے۔ ذرا سوچو تو سہی ان کی دعوت اللہ کی دعوت سے کس قدر دور ہے۔

کیا مشرکین اور مشرکات آگ کی طرف بلاتے ہیں؟ پھر کون ہے جو اپنی جان کو آگ کے حوالے کرنا چاہتا ہے؟

یہ آخری حقیقت ہے اور بات آکر یہاں ختم ہو جاتی ہے۔ پہلے سے حقیقت کو ظاہر کر دیا جاتا ہے کہ یہ دراصل دعوت الی النار ہے۔ اس لئے اس راستے پر جو بھی جاتا ہے اس کی آخری منزل آگ ہی ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کفار کی اس دعوت سے مومنین کو ڈراتا ہے: وَيُبَيِّنُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ 'اور وہ اپنے احکام واضح طور پر لوگوں کے سامنے بیان کرتا ہے' توقع ہے کہ وہ سبق لیں گے اور نصیحت قبول کریں گے۔"

اگر کوئی شخص اللہ تعالیٰ کی اس واضح نصیحت کو قبول نہیں کرے گا' اسے پلے نہیں باندھے گا تو وہ خود ملامت ہو گا۔

یہاں یہ بات نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو یہ اجازت دی ہے کہ وہ اہل کتاب کی پاکدامن عورتوں کے ساتھ نکاح کر سکتے ہیں' حالانکہ ان کے اور مسلمانوں کے عقیدے کے درمیان بہت بڑا اختلاف ہے۔ لیکن اہل کتاب کی عورتوں کا معاملہ دوسروں سے مختلف ہے۔ مسلمان مرد اور اہل کتاب عورت اصل عقیدہ میں تو بہرحال متحد ہیں۔ دونوں خدا تعالیٰ کو تسلیم کرتے ہیں البتہ تفصیلات شرعیہ میں دونوں کے درمیان اختلاف ہے۔

فقہاء کے درمیان اس کتابیہ عورت کے بارے میں اختلاف نہیں ہے' جو اس کی قائل ہے کہ اللہ تینوں کا ایک ہے۔ اور یہ کہ حضرت مسیح بن مریم الٰہ ہیں یا یہ کہ حضرت عزیر' اللہ کے بیٹے ہیں۔ کیا یہ عورت مشرکہ کی تعریف میں آکر حرام ہو جائے گی؟ یا اسے کتابیہ سمجھا جائے گا اور سورۂ مائدہ کی اس آیت میں شامل ہو گی:

اَلْيَوْمَ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ ... وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ "آج تمہارے لئے ساری پاک چیزیں حلال کر دی گئی ہیں۔ ان قوموں کی محفوظ عورتیں جن کو تم سے پہلے کتاب دی گئی تھی۔"

جمہور علماء کی رائے یہ ہے کہ ایسی عورت اس آیت میں داخل ہے اور اس کے ساتھ نکاح جائز ہے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ ان لوگوں کی رائے درست ہے جو ایسی عورت سے نکاح کو حرام سمجھتے ہیں۔ امام بخاری نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے' فرماتے ہیں حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا "کیا اس سے بھی بڑی مشرک ہو سکتی ہے جو کہے کہ اس کا رب حضرت عیسیٰ ہیں۔

ہاں مسلمان عورت کا نکاح کتابی مرد سے منع ہے۔ کیونکہ یہ صورت اس سے اپنے نتائج کے اعتبار سے مختلف ہے کہ ایک مسلم مرد کتابیہ سے نکاح کرے۔ اسلامی قانون کی رو سے اولاد باپ کے نام سے پکاری جاتی ہے۔ جس طرح بیوی اپنے خاندان کو چھوڑ دیتی ہے اور

شوہر کے خاندان کا ایک حصہ بن جاتی ہے اور خاوند کی زمین پر بستی ہے اور شوہر کے خاندان کا ایک حصہ بن جاتی ہے۔ جبکہ یہ امر واقع ہے کہ اگر ایک مسلم کتابیہ سے شادی کرتا ہے تو وہ مسلمان کی قوم کی طرف چلی آتی ہے۔ اس کی اولاد مسلمان ہوتی ہے۔ اور مسلمان کے نام سے پکاری جاتی ہے۔ چنانچہ اس عورت اور اس کے خاندان پر اسلامی فضا غالب ہوتی ہے۔ لیکن اگر ایک مسلمان عورت کا نکاح اہل کتاب مرد سے ہو جائے تو صورت حال بالکل اس کے برعکس ہو جاتی ہے۔ مسلمان عورت اپنی قوم سے دور رہے گی۔ اپنے فطری ضعف کی وجہ سے اور مخالف دین کے غلبہ کی وجہ سے اس کی اسلامی حیثیت کمزور ہو سکتی ہے اور پھر اس کے بچے بھی اہل کتاب ہی ہوتے۔ اور ان کا دین والدہ کے دین سے علیحدہ ہوتا حالانکہ اسلام کی پالیسی ہمیشہ یہ ہے کہ وہ ہر جگہ غلبہ کی پوزیشن اختیار کرے گا۔

لیکن ان قرآنی احکام کے باوجود بعض عملی اور انتظامی وجوہات کی بنا پر کسی مسلمان کے لئے غیر ملکی عورت سے شادی مکروہ قرار دی جا سکتی ہے۔ حضرت عمر بن خطاب ﷺ نے انہی وجوہات کی بنا پر اسے ناپسند فرمایا۔ ابن کثیر نے ابن جریر کی یہ رائے نقل کی ہے کہ حضرت عمر ﷺ ایسی شادیوں کو اس لئے ناپسند فرماتے تھے کہ اس طرح مسلمان عورتوں کو نظر انداز کیا جا سکتا تھا۔ نیز اس کے علاوہ دوسری وجوہات بھی ہو سکتی تھیں۔

یہ روایت ہے کہ حضرت حذیفہ ﷺ نے ایک یہودی عورت سے شادی کر لی۔ اس پر حضرت عمر ﷺ نے انہیں لکھا: "اسے طلاق دے دو" اس پر حضرت حذیفہ ﷺ نے فرمایا: "کیا تمہارا خیال یہ ہے کہ وہ مجھ پر حرام ہے اس لئے میں اسے گھر سے نکال دوں" حضرت عمر ﷺ نے فرمایا: "نہیں' یہ میرا عقیدہ نہیں ہے کہ وہ حرام ہے۔ لیکن میں اس بات سے خائف ہوں کہ تم اس کے مقابلے میں مومن عورتوں کو حقیر سمجھو گے۔" اور ایک دوسری روایت میں خود حضرت عمر ﷺ سے مروی ہے کہ مسلمانوں کو مسلمان عورت یا عیسائی عورت سے نکاح کرنا چاہئے۔

اور ہم آج تجربہ سے دیکھتے ہیں کہ اس قسم کی بیویاں ایک مسلمان خاندان کے لئے مصیبت ہوتی ہیں۔ بطور حقیقت واقعہ ہم اس کا انکار نہیں کر سکتے کہ یہودی عیسائی اور لادینی عورت اپنی اولاد کو اپنے رنگ میں رنگ دیتی ہے۔ اور ایسی شادیوں کے نتیجے میں ایسی نسل وجود میں آتی ہے جو اسلام سے بہت دور ہوتی ہے اور خصوصاً جاہلیت کے اس جدید معاشرے میں' جس میں ہم رہ رہے ہیں اور جو اپنے آپ کو اسلامی معاشرہ کہلاتا ہے' لیکن اپنی حقیقت کے اعتبار سے اس معاشرہ کے لئے لفظ اسلام کا استعمال بطریقہ مجازی ہو سکتا ہے' جس میں لوگوں کا تعلق اسلام کے ساتھ اس قدر کمزور ہو گیا ہے' جیسے کسی نے کچا دھاگہ پکڑا ہوا ہو اور جب کسی ایسے گھرانے میں ایک غیر مسلم داخل ہوتی ہے تو یہ تعلق بھی ختم ہو جاتا ہے۔

وَيَسْـَٔلُونَكَ عَنِ الْمَحِيضِ ۖ قُلْ هُوَ أَذًى فَاعْتَزِلُوا النِّسَاءَ فِي الْمَحِيضِ ۖ وَلَا تَقْرَبُوهُنَّ حَتَّىٰ يَطْهُرْنَ ۖ فَإِذَا تَطَهَّرْنَ فَأْتُوهُنَّ مِنْ حَيْثُ أَمَرَكُمُ اللَّهُ ۚ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ التَّوَّابِينَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِينَ ﴿٢٢٢﴾ نِسَاؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ فَأْتُوا حَرْثَكُمْ أَنَّىٰ شِئْتُمْ ۖ وَقَدِّمُوا لِأَنفُسِكُمْ ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّكُم مُّلَاقُوهُ ۗ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِينَ ﴿٢٢٣﴾

"پوچھتے ہیں حیض کا کیا حکم ہے؟ کہو وہ ایک گندگی کی حالت ہے' اس میں عورتوں سے الگ رہو اور ان کے قریب نہ جاؤ' جب تک کہ وہ پاک صاف نہ ہو جائیں۔ پھر جب وہ پاک ہو جائیں تو ان کے پاس جاؤ۔ اس طرح جیسا کہ اللہ نے تم کو حکم دیا ہے۔ اللہ ان لوگوں کو پسند کرتا ہے جو بدی سے باز رہیں اور پاکیزگی اختیار کریں۔ تمہاری عورتیں تمہاری کھیتیاں ہیں۔ تمہیں اختیار ہے' جس طرح چاہو' اپنی کھیتی میں جاؤ' مگر اپنے مستقبل کی فکر کرو اور اللہ کی ناراضی سے بچو۔ خوب جان لو کہ تمہیں ایک دن اس سے ملنا ہے۔ اور اے نبی! جو تمہاری ہدایات کو مان لیں انہیں (فلاح و سعادت کی) خوشخبری دے دو۔"

زن و شوہر کے باہمی تعلقات پر یہ ایک دوسری نظر ہے۔ اچٹتی نظر۔ اس طبعی تعلق کو اللہ کی طرف ذرا اور بلند کر دیا جاتا ہے۔ جسم انسانی کے اعضائے رئیسہ کی شدید ترین طبعی اور حیوانی لذتیت یعنی مباشرت کو بھی بلند مقصدیت عطا کر دی جاتی ہے۔ اور اس میں بھی ایک گونہ تقدس کا رنگ آجاتا ہے۔

زن و شوہر کے باہمی تعلق میں مباشرت بھی ایک وسیلہ اور ذریعہ ہے۔ بذات خود مقصد نہیں ہے۔ یہ حیات انسانی کے ایک گہرے راز اور بلند مقصد کا ذریعہ ہے۔ نسل کشی اور زندگی کا تسلسل اور یہ نقطہ نظر آخر کار ہمیں اللہ تک پہنچاتا ہے۔ باوجود اس کے کہ دوران حیض مباشرت سے مرد و زن دونوں کے لئے مضرات یقینی ہیں لیکن اس کے باوجود محض حیوانی لذت تو بہرحال موجود ہوتی ہے' پھر کیوں اس کی ممانعت کی گئی۔ اس لئے کہ اس صورت میں وہ مقصد اعلیٰ پورا نہیں ہو سکتا۔ نیز یہ وجہ بھی ہوتی ہے کہ اس دوران طبع سلیم بھی مباشرت سے ابا کرتی ہے۔ کیونکہ جس طرح خارج سے اسلامی قانون اس عرصہ میں مباشرت سے روکتا ہے' اسی طرح ذات انسانی کے اندر سے فطرت سلیمہ بھی اسے روکتی ہے۔ اس لئے کہ بجائی کے لئے یہ موزوں موسم نہیں ہے۔ اس موسم میں فصل نہیں اگ سکتی۔ نہ اس بجائی سے زندگی کے کھیت میں کسی پودے کا اضافہ ہو سکتا ہے۔ اس کے مقابلے میں پاکی کے دنوں میں مباشرت میں لذت بھی پوری پوری ہوتی ہے اور وہ فطری مقاصد بھی پورے ہوتے ہیں' جن کے لئے یہ نظام وضع کیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایام حیض کے بارے میں سوال کا یہ جواب دیا گیا۔ وَيَسْـَٔلُونَكَ عَنِ الْمَحِيضِ ۖ قُلْ هُوَ أَذًى فَاعْتَزِلُوا النِّسَاءَ فِي الْمَحِيضِ ۖ وَلَا تَقْرَبُوهُنَّ حَتَّىٰ يَطْهُرْنَ "پوچھتے ہیں حیض کا کیا حکم ہے؟ وہ ایک گندگی کی حالت ہے' اس میں عورتوں سے الگ رہو اور ان کے قریب نہ جاؤ' جب تک کہ وہ پاک نہ ہو جائیں۔"

لیکن اس کے بعد بھی تم اس میں بالکل آزاد نہیں ہو کہ اپنی خواہشات کے مطابق جو چاہو کرو۔ ایام حیض کے بعد بھی تم امر و نہی کے پابند ہو۔ گویا مباشرت بھی ایک فریضہ حیات ہے۔ اس میں بھی تم اس کے نازل کردہ حدود و قیود کے پابند ہو۔ فَإِذَا تَطَهَّرْنَ فَأْتُوهُنَّ مِنْ حَيْثُ أَمَرَكُمُ اللَّهُ ۚ "پھر جب وہ پاک ہو جائیں تو ان کے پاس جاؤ' اس طرح جیسا کہ اللہ نے تم کو حکم دیا ہے۔"

یعنی رحم کی جانب سے دوسری جانب سے نہیں کیونکہ مقصد مطلق شہوت رانی ہی نہیں بلکہ مقصد زمین پر سلسلہ حیات کو بھی جاری رکھنا ہے۔ مباشرت کے نتیجے میں اولاد کی دولت حاصل کرنا ہے۔ جس کا آنا اللہ نے مقرر فرما دیا ہے۔ اللہ حلال اور جائز چیز کو مقرر فرماتے ہیں اور اسے فرض قرار دیتے ہیں۔ مسلمان اس حلال کا متلاشی ہوتا ہے' جو اس کے لئے اس کے رب نے لکھ دیا ہے۔ وہ اپنے لئے خود کوئی منصوبہ نہیں بناتا۔ اللہ اپنے بندوں کے لئے جو فرائض مقرر فرماتا ہے' وہ سب اس لئے ہیں کہ اس کے یہ بندے پاک و صاف ہو جائیں۔ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو پسند کرتا ہے جو بدی سے باز رہیں۔ اگر ان سے کوئی غلطی سرزد ہو جائے تو اس کی طرف رجوع کریں۔ اور اس کی مغفرت کے طلبگار ہو کر اس کی جانب سے لوٹ آئیں۔

إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ التَّوَّابِينَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِينَ "اللہ ان لوگوں کو پسند کرتا ہے' جو بدی سے باز رہیں اور پاکیزگی اختیار

کریں۔"

یہ ہے قرآن مجید کے خوشگوار سایوں میں سے ایک ظل' ایک چھاؤں۔ اس میں زن و شو کے باہمی تعلقات کے مختلف رنگوں میں سے ایک رنگ کو تصویر کی شکل دی گئی ہے۔ جو قرآنی تعلیمات کے ساتھ مناسب ہے اور جو قرآنی منصوبہ حیات کے عین مطابق ہے۔ نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ فَأْتُوا حَرْثَكُمْ أَنَّىٰ شِئْتُمْ "تمہاری عورتیں تمہاری کھیتیاں ہیں' جس طرح چاہو اپنی کھیتی میں جاؤ۔"

یہاں اس آیت میں زن و شوئی کے تعلقات کی نوعیت اور اس کے ایک خاص پہلو کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ یعنی اس تعلق کے مقاصد کیا ہیں اور اس کا اصلی رجحان کیا ہونا چاہئے۔ اس کے سب پہلو یہاں نہیں بیان کئے گئے۔ دوسرے مقامات پر ان مقامات کی مناسبت سے کچھ دوسرے پہلو بھی نمایاں کئے گئے ہیں۔ مثلاً ایک جگہ یہ فرمایا گیا ہے هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ : "وہ تمہارا لباس ہیں اور تم ان کا لباس ہو۔" .... دوسری جگہ فرمایا: وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ خَلَقَ لَكُم مِّنْ أَنفُسِكُمْ أَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوا إِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُم مَّوَدَّةً وَرَحْمَةً "اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تمہارے لئے' تمہاری جنس سے بیویاں بنائیں تاکہ تم ان کے پاس سکون حاصل کرو اور تمہارے درمیان محبت و رحمت پیدا کی۔"

غرض ان تعبیرات میں سے ہر تعبیر اس عمیق و عظیم تعلق کے کسی نہ کسی پہلو کو ظاہر کرتی ہے' ہر جگہ جو پہلو مناسب ہو۔ یہاں سیاق کلام ایسا ہے جس کے ساتھ "کھیتی" کی تعبیر زیادہ مناسب تھی۔ کیونکہ یہاں تروتازگی' پیدائش اور نشوونما کی فضا ہے' اس لئے کھیتی کے لفظ سے اس تعلق کی تعبیر کی گئی اور حکم دیا گیا کہ جس طرح چاہو اپنی عورتوں کے پاس جاؤ مگر رحم کی جانب سے جہاں سے پیداواری عمل ہوتا ہے۔ **فاتوا حرثکم انی شئتم** "تم اپنی کھیتی میں آؤ جس طرح چاہو۔"

لیکن ساتھ ساتھ اس ملاپ کا مقصد اصلی بھی نہ بھولو' اسے عبادت اور خدا خوفی سمجھو اور اس لئے اگر تم اس میں بھی خدا کے بیان کردہ حدود و قیود کی پابندی کرو گے تو یہ تمہارے لئے توشہ آخرت ہوگا۔ اور یقین رکھو کہ ایک دن تمہیں اللہ کے سامنے جانا ہے اور وہاں تم اپنے تمام اعمال کا صلہ پاؤ گے۔ وَقَدِّمُوا لِأَنفُسِكُمْ ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّكُم مُّلَاقُوهُ "اگر اپنے مستقبل کے لئے کچھ آگے بھیجو' اللہ کی ناراضی سے بچو' خوب جان لو کہ تمہیں ایک دن اس سے ملنا ہے اور اے نبی' جو تمہاری ہدایات کو مان لیں انہیں خوشخبری دے دو۔"

آیت ختم ہو جاتی ہے اور مسلمانوں کو خوشخبری دے دی جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے بہت بڑی بھلائی تیار کی ہوئی ہے اور اس بھلائی میں وہ بھلائیاں بھی شامل ہیں جو انہوں نے اپنے کھیت میں بوئی ہیں۔ کیونکہ مومن جو کچھ بھی کرتا ہے وہ خیر ہے اور اللہ اس پر اس کا ثواب دیتا ہے۔ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِينَ "مومنین کو خوشخبری دیجئے۔"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام ایک فطری اور سادہ نظام زندگی ہے۔ وہ انسان کو بحیثیت انسان لیتا ہے۔ اس کے رجحانات اور میلانات کو تسلیم کرتا ہے۔ وہ بلندی اور پاکیزگی کے نام پر فطرت کے ساتھ جنگ نہیں کرتا۔ وہ انسانوں کی ان ضروریات کو گندگی قرار نہیں دیتا' جن پر اس کا بس ہی نہ چلے۔ اور بلکہ وہ قرار دیتا ہے کہ زندگی کی ترقی' نشوونما اور تسلسل کے لئے' یہ اس کا فریضہ حیات ہیں اور فطری فریضہ ہیں۔ اسلام کی کوشش تو یہ ہے کہ انسان کی انسانیت برقرار رہے۔ اسے اس کی انسانیت کے دائرے کے اندر ترقی دے۔ اسے اللہ سے جوڑ دے' اس کے جسمانی میلانات بھی پورے کرے' پہلے جسمانی تقاضوں اور انسانی شعور کا امتزاج پیدا کر دے اور پھر اس پر دینی شعور کا رنگ غالب کر دے۔ یوں عارضی جسمانی تقاضے پورے کرتے ہوئے' اس تلذذ کو دائمی انسانی فرائض کے ساتھ مربوط کر دے اور یہ سب کچھ دینی وجدان اور دینی شعور کے ماحول میں ہو۔ غرض ایک ہی لمحہ میں ایک ہی وقت میں' ایک ہی رخ میں یہ دینی شعور اور جسمانی

تلذذ انسان کی اس چھوٹی سی ہستی میں جمع ہو جاتے ہیں۔ وہ زمیں میں اللہ کا خلیفہ ہو۔ اور اس وجہ سے ہو کہ اس کی اس ہستی میں اللہ تعالٰی نے مختلف النوع طاقتیں ودیعت فرمائی ہیں۔ دینی شعور اور جسمانی تقاضے۔ یہ ہے اسلامی نظام زندگی اور یہ ہے انسان کی فطرت۔ چونکہ اللہ خالق فطرت بھی ہے اور اسلامی نظام زندگی بھی اس کی طرف آیا ہے۔ اس لئے اس نظام میں تمام فطری تقاضوں کو پورا کیا گیا ہے۔ اور تمام دوسرے نظامہائے زندگی جو من جانب اللہ نہیں ہیں وہ فطرت سے متصادم ہیں اور بعض میں یہ تصادم کم ہے اور بعض میں بہت ہی زیادہ ہے۔ اس لئے ان کا انجام ہلاکت و بربادی ہے۔ ان نظاموں میں افراد کی بھی کم بختی ہے اور جماعتوں کی بھی ہلاکت ہے۔ اس لئے کہ اللہ جانتا ہے اور انسان نہیں جانتا۔

ایام حیض میں مباشرت کے مسائل کے بیان کے بعد ایلا کا حکم بیان کیا جاتا ہے۔ ایلا کا مفہوم یہ ہے کہ خاوند یہ قسم کھائے کہ وہ بیوی کے ساتھ مباشرت نہیں کرے گا۔ قبل اس کے کہ قسم ایلا کا بیان ہو' نفس قسم کے بارے میں بھی ہدایات دے دی جاتی ہیں۔ گویا قسم تمہید ہے ایلا کے لئے۔

وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً لِّاَيْمَانِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْا وَتَتَّقُوْا وَتُصْلِحُوْا بَيْنَ النَّاسِ ؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۲۴﴾ لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿۲۲۵﴾ لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ ۚ فَاِنْ فَآءُوْ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۲۶﴾ وَاِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَاِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۲۷﴾

"اللہ کے نام کو ایسی قسمیں کھانے کے لئے استعمال نہ کرو' جن سے مقصود نیکی اور تقویٰ اور بندگان خدا کی بھلائی کے کاموں سے باز رہنا ہو۔ اللہ تمہاری ساری باتیں سن رہا ہے اور سب کچھ جانتا ہے جو بے معنی قسمیں تم بلاارادہ کھالیا کرتے ہو' ان پر اللہ گرفت نہیں کرتا' مگر جو قسمیں تم سچے دل سے کھاتے ہو' ان کی باز پرس وہ ضرور کرے گا۔ اللہ بہت درگزر کرنے والا اور بردبار ہے۔

جو لوگ اپنی عورتوں سے تعلق نہ رکھنے کی قسم کھا بیٹھتے ہیں' ان کے لئے چار مہینے کی مہلت ہے۔ اگر انہوں نے رجوع کرلیا' تو اللہ معاف کرنے والا اور رحیم ہے۔ اور اگر انہوں نے طلاق ہی کی ٹھان لی ہو تو مانے رہیں کہ اللہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے۔"

وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً کی تفسیر میں حضرت ابن عباس ؓ سے روایت ہے کہ تم اپنی قسم کو اس لئے استعمال نہ کرو کہ تم بھلائی کے کام نہ کرو گے بلکہ قسم کا کفارہ ادا کرو اور بھلائی کرتے چلے جاؤ۔ یہی تفسیر مسروق' شعبی' ابراہیم نخعی' مجاہد' طاؤس' سعید بن جبیر' عطاء عکرمہ' مکحول' زہری' حسن' قتادہ' مقاتل بن حیان' ربیع بن انس' ضحاک' عطا خراسانی' السدی سے منقول ہے۔ تفصیل دیکھئے ابن کثیر میں۔

اسی کی تائید میں امام مسلم ؒ کی روایت ہے جو کہ ابو ہریرہ ؓ سے منقول ہے۔ حضور ﷺ فرماتے ہیں "جو کوئی ایسی قسم کھا بیٹھے کہ اس کے توڑ میں خیر ہو' اسے چاہئے کہ وہ قسم کا کفارہ ادا کرے۔ اور وہ کام کر ڈالے جس میں بھلائی ہے۔"

اس طرح امام بخاری نے حضرت ابوہریرہ ؓ سے نقل کیا ہے' حضور ﷺ فرماتے ہیں: خدا کی قسم تم سے کوئی شخص اپنے اہل و عیال کے بارے میں قسم کو پورا کرے۔ تو وہ زیادہ گناہگار ہے بہ نسبت اس کے کہ وہ کفارہ دے دے' جو اللہ نے فرض کیا ہے۔

ان احادیث کی روشنی میں مفہوم یہ ہو گا کہ اللہ کے نام کی قسم کھالینا تمہیں نیکی' تقویٰ اور اصلاح بین الناس کے کاموں سے کہیں روک نہ دے۔ اگر تم اس قسم کی کوئی قسم کھا بیٹھے تو اسے توڑ دو' نیکی کے کام جاری رکھو اور حلف توڑنے کا کفارہ ادا کرو۔ کیونکہ نیکی' تقویٰ اور بھلائی کے کاموں پر عمل کرنا اس سے بہتر ہے کہ کوئی اپنی قسم کو پورا کرے۔

حضرت ابوبکر صدیق ؓ کو ایسا ہی واقعہ پیش آیا۔ آپ کے ایک رشتہ دار کا نام مسطح تھا' آپ ان کے ساتھ امداد و تعاون فرمایا کرتے تھے۔ حضرت عائشہ ؓ پر افک کے معاملے میں غیر شعوری طور پر یہ بھی شریک ہو گیا تھا' اور اس پر حضرت ابوبکر صدیق ؓ نے قسم کھائی تھی کہ وہ اس کے ساتھ کوئی امداد نہ کریں گے۔ اس پر سورۃ النور کی یہ آیت نازل ہوئی۔ وَلَا يَأْتَلِ أُولُو الْفَضْلِ مِنكُمْ وَالسَّعَةِ أَن يُؤْتُوا أُولِي الْقُرْبَىٰ وَالْمَسَاكِينَ وَالْمُهَاجِرِينَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلْيَعْفُوا وَلْيَصْفَحُوا أَلَا تُحِبُّونَ أَن يَغْفِرَ اللَّهُ لَكُمْ "تم میں سے جو لوگ صاحب فضل اور صاحب مقدرت ہیں وہ اس بات کی قسم نہ کھا بیٹھیں کہ اپنے رشتہ دار' مسکین اور مہاجر فی سبیل اللہ لوگوں کی مدد نہ کریں گے۔ انہیں معاف کر دینا چاہئے' درگزر کرنا چاہئے۔ کیا تم نہیں چاہتے کہ اللہ تمہیں معاف کرے۔" اس پر حضرت ابوبکر ؓ نے اپنی قسم کو توڑ دیا اور کفارہ ادا کیا۔

اللہ تعالیٰ رؤف و رحیم ہے' اس لئے اس نے کفارہ اس قسم پر عائد کیا ہے جو قصد و ارادہ سے ہو' جس میں قسم کھانے والا قصداً قسم کھالے۔ اور اس کا ارادہ یہ ہو کہ اس نے جس چیز پر قسم کھائی ہے وہ اس کا ارتکاب نہ کرے گا' لیکن عام طور پر لوگ بلا ارادہ اور بلا قصد جو قسمیں کھالیتے ہیں ان پر کفارہ عائد نہیں کیا گیا۔

لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللَّهُ بِاللَّغْوِ فِي أَيْمَانِكُمْ وَلَٰكِن يُؤَاخِذُكُم بِمَا كَسَبَتْ قُلُوبُكُمْ وَاللَّهُ غَفُورٌ حَلِيمٌ "جو بے معنی قسمیں تم بلا ارادہ کھالیا کرتے ہو' ان پر اللہ گرفت نہیں کرتا مگر جو قسمیں تم سچے دل سے کھاتے ہو' ان کی باز پرس وہ ضرور کرے گا۔ اللہ بہت درگزر کرنے والا ہے۔"

ابوداؤد نے اپنی سند سے حضرت عائشہ ؓ سے روایت کی ہے کہ رسول خدا ﷺ نے فرمایا' قسم میں لغو یہ ہے کہ آدمی گھر میں کہے ہرگز نہیں خدا کی قسم' یا کہے ہاں خدا کی قسم۔ ابن جریر نے عروہ کے واسطہ سے اس روایت کو حضرت عائشہ سے موقوف[1] نقل کیا' فرماتی ہیں جن بے معنی قسموں پر اللہ کی گرفت نہیں ہے وہ یہ ہیں' کہ کوئی کہے' ہرگز نہیں خدا کی قسم ہے یا کہے ہاں اللہ کی قسم' حسن بن حسن سے ایک مرسل حدیث میں ہے حضور ﷺ ایک گروہ پر سے گزرے جو تیر اندازی کر رہے تھے۔ حضور ﷺ کے ساتھ ایک صحابی بھی تھے۔ ایک شخص ان میں سے اٹھا اور چلایا خدا کی قسم میرا تیر نشانے پر لگ گیا ہے اور تمہارا نشانہ ٹھیک نہیں لگا' خدا کی قسم' حضور ﷺ کے ساتھ جو صحابی جا رہا تھا اس نے کہا حضور ﷺ' یہ شخص تو اپنی قسم میں حانث ہو گیا۔ اس پر حضور ﷺ نے فرمایا' ہرگز نہیں' تیر اندازی کا مقابلہ کرنے والوں کی قسمیں لغو ہیں' بے معنی ہیں ان میں نہ کفارہ ہے اور نہ ہی کوئی عذاب ہے۔

حضرت ابن عباس ؓ سے روایت ہے آپ فرماتے ہیں' لغو قسم یہ ہے کہ کوئی شخص غصے کی حالت میں قسم کھا بیٹھے۔ نیز ان سے یہ روایت ہے کہ یمین لغو یہ ہے کہ تم اللہ کی حلال کی ہوئی چیزوں کو حرام قرار دو۔ اس میں تم پر کوئی کفارہ نہیں ہے۔

حضرت سعید ابن المسیب سے روایت ہے' فرماتے ہیں کہ دو انصار بھائیوں کے درمیان میراث کا تنازعہ تھا' ایک نے دوسرے

۱۔ موقوف اس روایت کو کہتے ہیں جس میں صحابیؓ سے ایک روایت نقل کرے لیکن حضور ﷺ کی طرف نسبت نہ ہو

سے کہا کہ وہ اسے اس کا حصہ دے دے' اس پر اس نے قسم کھائی کہ اگر تم نے دوبارہ مجھ سے اپنا حصہ طلب کیا تو میرا تمام مال خانہ کعبہ کے لئے وقف ہوا' حضرت عمرؓ نے فرمایا کعبہ غریب نہیں ہے۔ کعبہ کو تیرے مال کی ضرورت نہیں ہے' اپنی قسم کا کفارہ ادا کرو اور اپنے بھائی سے بات کرو۔ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ اللہ کی معصیت میں تم جو قسم کھاؤ وہ کوئی قسم نہیں ہے اور نہ وہ کوئی نذر ہے۔ نہ صلہ رحمی قطع کرنے کی کوئی قسم واجب ہے۔ نہ اس چیز کی قسم جس کے تم مالک ہو۔

ان روایات سے جو چیز معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ قسم میں اگر اس کام کے کرنے اور چھوڑنے کی نیت نہ ہو' جس پر قسم کھائی گئی ہے' تو یہ قسم بے معنی ہے اور اس پر کوئی کفارہ نہیں ہے۔ وہی قسم' قسم کہلائے گی کہ قسم کھانے والا کسی بات کے کرنے یا کسی کام سے رکنے کا پختہ ارادہ کرے جس پر وہ قسم کھا رہا ہے۔ ایسی قسم اگر توڑ دی جائے تو اس پر کفارہ واجب ہو گا۔ اور اگر اس قسم کی قسم کسی اچھے کام سے رکنے کے لئے ہو یا کسی برے کام یا برے فعل کے ارتکاب کے لئے ہو' تو ایسی قسم کا توڑنا لازمی ہے۔ رہا وہ شخص جو کسی ایسے امر پر قسم کھائے جس کے بارے میں اسے یقین ہو کہ وہ جھوٹا ہے' تو بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ اس قسم کا کوئی کفارہ نہیں ہے' نہ کسی کے کفارے سے اس گناہ کی تلافی ممکن ہے۔

امام مالکؒ مؤطا میں فرماتے ہیں' اس سلسلے میں سب سے اچھی جو بات میں نے سنی ہے وہ یہ ہے کہ یمین لغو وہ ہے کہ انسان کسی بات پر قسم کھائے اور اسے یقین ہو کہ وہ سچا ہے' لیکن بعد میں آشکارا ہو جائے کہ حقیقت اس کے خلاف تھی۔ اس میں کوئی کفارہ نہیں ہے۔ اور اگر کوئی قسم کھائے اور جان رہا ہو کہ وہ جھوٹا ہے' گناہ گار ہے' اس طرح کرنے سے وہ کسی کو خوش کر رہا ہو' یا کسی کا حق مارنا چاہتا ہو' یہ عظیم گناہ ہے اور کفارہ سے اس کی تلافی نہیں ہو سکتی۔

جس قسم کے توڑنے میں خیر ہو' بھلائی ہو' اس کے حکم کے آخر میں فرمایا جاتا ہے وَ اللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ "اللہ سننے والا اور علم رکھنے والا ہے۔" اس میں اشارہ اس طرف ہے کہ تم جو کچھ کہتے ہو وہ اسے سنتا ہے لیکن وہ یہ بھی اچھی طرح جانتا ہے کہ خیر کس میں ہے اس لئے وہ یہ حکم دیتا ہے۔

اور لغو و بے معنی قسم اور سچی قسم کے حکم کے آخر میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ وہ "غفور رحیم" معاف کرنے والا اور رحیم ہے کہ وہ بندوں کے ہر فعل پر مواخذہ نہیں کرتا۔ جب ان کے منہ سے غلطی سے جو نکل جائے وہ اس پر مواخذہ نہیں کرتا۔ وہ چھوٹی چھوٹی غلطیوں کو معاف کر دیتا ہے۔ بشرطیکہ بندہ اس کی طرف لوٹ آئے۔ ان دونوں تبصروں اور نتائج سے قسم کے یہ معاملات سب کے سب اللہ سے جڑ جاتے ہیں اور ایک مسلمان کا دل ہر قول میں اور ہر فعل میں اللہ تعالیٰ کی ذات کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔

قسم کے قاعدہ کلیہ کے بیان کے بعد اب مسئلہ ایلا کا بیان شروع ہوتا ہے' جو قسم ہی کی ایک قسم ہے۔ ایک خاوند قسم کھا لے کہ وہ اپنی بیوی کے پاس نہیں جائے گا۔ یا محدود وقت کے لئے یا غیر محدود عرصہ کے لئے تو اس قسم کو شرعی اصطلاح میں ایلا کہا جاتا ہے۔ لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ ۚ فَاِنْ فَآءُوْ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۞ وَ اِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَاِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۞ "جو لوگ اپنی عورتوں سے تعلق نہ رکھنے کی قسم کھا بیٹھتے ہیں ان کے لئے چار مہینے کی مہلت ہے۔ اگر انہوں نے رجوع کر لیا' تو اللہ معاف کرنے والا رحیم ہے۔ اور اگر انہوں نے طلاق ہی کی ٹھان لی ہو' تو جانے رہیں کہ اللہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے۔

میاں بیوی کی زندگی میں ایک طویل رفاقت ہوتی ہے' جس میں مختلف قسم کے حالات پیش آتے رہتے ہیں۔ مختلف نفسیاتی کیفیات زوجین پر اثر انداز ہوتی رہتی ہیں۔ اور ان کے بے شمار اسباب ہوتے ہیں۔ ان حالات میں جب شدت آ جاتی ہے تو زوجین مباشرت تک کے تعلقات قطع کر دیتے ہیں۔ یہ عارضی جدائی اور قطع تعلق بیوی کے لئے سخت دشوار ہوتا ہے' جس کی وجہ سے اس کی ذات پر نفسیاتی اور

اعصابی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ بحیثیت ایک عورت اس کی عزت نفس مجروح ہوتی ہے۔ غرض ہر قسم کے تعلقات زن‌ؤ شوئی ختم ہو کر رہ جاتے ہیں اور حسن معاشرت کے تمام بندھن ٹوٹ کر رہ جاتے ہیں اور اگر یہ کیفیت غیر متعین مدت تک رہے تو پورا خاندان ہی تباہ ہو کر رہ جائے۔

اسلام نے ابتداء ہی سے ایلا کو حرام قرار نہیں دیا۔ اس لئے کہ ہو سکتا ہے کہ بعض حالات میں وہ ترش مزاج بیوی کے لئے ایک مفید علاج ہو' بالخصوص ایسی بیوی کا علاج جسے اپنی نسوانیت پر بہت ناز ہو' جو کبرو غرور میں مبتلا ہو اور اپنے غرور یا ناز و ادا کے ذریعہ مرد کو ذلیل کرنا چاہتی ہو' یا وہ سمجھتی ہو کہ وہ مرد کو جس طرح چاہے زیر کر سکتی ہے۔ نیز بعض اوقات اس عرصہ میں ذہنی کوفت اور تھکاوٹ دور کرنے کا موقعہ مل جاتا ہے۔ جس طرح بعض اوقات آدمی پر غصے کی کیفیت طاری ہوتی ہے اور اس کے بعد دل کا غبار نکل جاتا ہے اور زندگی کی گاڑی نئے سرے سے بڑی قوت اور خوشی سے چل پڑتی ہے۔

لیکن اسلام نے مرد کو بھی اس معاملے میں مکمل آزاد نہیں چھوڑ دیا۔ ہو سکتا ہے کہ بعض اوقات وہ حد سے گزر جائے اور عورت کے ساتھ ظلم و زیادتی شروع کر دے۔ اور اسے ذلیل کر کے رکھ دے۔ اس کی حالت اس طرح ہو جس طرح کوئی چیز فضا میں معلق ہو' نہ وہ بیوی بن کر رہ سکے اور نہ وہ آزاد ہو کہ کسی دوسری جگہ گھر بسا سکے۔

اس لئے 'متعدد صورتوں' مختلف قسم کے حالات اور زندگی کے عملی حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اسلام نے یہ فیصلہ کیا کہ ایلا اور تعلق زن‌ؤ شوئی کے بائیکاٹ کے لئے انتہائی مدت چار ماہ ہے۔ اس سے زیادہ کسی خاوند کو اجازت نہ ہوگی کہ وہ بائیکاٹ کرے۔ چار ماہ کی مدت بھی صانع فطرت نے اس لئے مقرر کی ہے کہ اس میں عورت کی فطری خواہشات اور اس کی قوت برداشت کا بھی خیال رکھا گیا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ اپنے فطری تقاضے پورے کرنے کے لئے اپنے خاوند کی بجائے کسی دوسرے ناجائز ذریعہ کی طرف رجوع کرے۔ روایات میں آتا ہے کہ حضرت عمرؓ ایک رات خفیہ طور پر نکلے۔ لوگوں کے حالات معلوم کرنے کے لئے۔ ان کی ضروریات معلوم کرنے کے لئے۔ ایک گھر سے انہیں آواز آئی ایک عورت یہ شعر گا رہی تھی۔

رات لمبی ہے' اور اس کا ہر پہلو تاریک ہو گیا!
میں جاگ رہی ہوں' کیوں؟
اس لئے کہ میں کس سے پیار کروں؟
خدا کی قسم! خدا کی قسم جو نگہبان ہے' جو دیکھ رہا ہے!
اگر یہ خدا نہ ہوتا تو میری چارپائی کے چاروں کونے جھنکار رہے ہوتے۔

حضرت عمرؓ نے اپنی بیٹی حفصہ سے پوچھا' کہ عورت خاوند کے بغیر کتنا عرصہ رہ سکتی ہے۔ حضرت حفصہؓ نے فرمایا چھ ماہ یا چار ماہ۔ اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ میں اپنے فوجیوں میں سے کسی کو بھی چھ ماہ سے زیادہ باہر نہ رکھوں گا۔ اسی پر آپ نے احکامات جاری کر دیئے کہ فوجیوں کو چھ ماہ سے زیادہ عرصہ کے لئے اپنے گھروں سے دور نہ رکھا جائے۔

بہرحال ان معاملات میں مختلف لوگوں کے مختلف مزاج ہوتے ہیں۔ لیکن چار ماہ کا عرصہ ایک مرد کے لئے کافی ہے کہ وہ اس میں اپنے نفس اور اپنے جذبات کو آزمائے۔ ان چار مہینوں میں یا تو وہ لوٹ آئے اور میاں بیوی کے درمیان از سرنو ایک صحت مند عائلی زندگی کا آغاز ہو جائے اور اپنی بیوی کو گلے لگائے۔ اور اپنے بستر پر لوٹ آئے اور یا یہ کہ چار ماہ کے عرصہ میں بھی وہ اپنے آپ کو اس قابل نہ پائے کہ تعلقات کی پھر سے تجدید ہو اور قطع تعلق مجبوراً جاری ہو' اگر حالات دوسری صورت ہی کے ہوں تو پھر قرآن کا حکم یہ ہے کہ عقدۂ

نکاح کو کھل جانا چاہئے۔ بیوی کو طلاق دے کر اسے آزاد کر دینا چاہئے۔ یا وہ خود طلاق دے دے اور اگر وہ نہ دے تو قاضی اس کی طرف سے طلاق دے دے تاکہ میاں بیوی سے ہر دو اس امر میں آزاد ہو جائیں کہ وہ اپنے لئے کسی دوسرے جوڑے سے نئی اور صحت مند عائلی زندگی کا آغاز کر سکیں۔ بیوی کے لئے بھی یہی شریفانہ اور پاکیزہ راستہ ہے اور مرد کے لئے بھی یہی خوشگوار اور فرحت بخش راستہ ہے۔ اور یہی مناسب ہے۔ یہی وہ راستہ ہے جو سنجیدہ راستہ ہے' جو منصفانہ راستہ ہے۔ یہی وہ راستہ ہے جس پر چل کر زندگی کا سلسلہ جاری رہ سکتا ہے ورنہ کشیدہ تعلقات کی صورت میں زندگی' دونوں فریقوں کی زندگی' منجمد ہو کر رہ جاتی ہے۔ قسم اور ایلا کے مسائل آخر کار طلاق پر منتہی ہوئے۔ اس مناسبت سے یہاں طلاق کے تفصیلی احکام دیئے گئے۔ نیز طلاق کے ساتھ دوسرے متعلقہ مسائل مثلاً عدت' فدیہ' نفقہ' رخصتی کا سامان اور دوسرے نتائج وغیرہ۔ سب سے پہلے عدت اور رجوع کے مسائل۔

وَالْمُطَلَّقٰتُ یَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ ؕ وَلَا یَحِلُّ لَهُنَّ اَنْ یَّكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِیْۤ اَرْحَامِهِنَّ اِنْ كُنَّ یُؤْمِنَّ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِیْ ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْۤا اِصْلَاحًا ؕ وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِیْ عَلَیْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۪ وَلِلرِّجَالِ عَلَیْهِنَّ دَرَجَةٌ ؕ وَاللّٰهُ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ ﴿۲۲۸﴾

۲۸ ع ۷ ۱۲

"جن عورتوں کو طلاق دی گئی ہو' وہ تین مرتبہ ایام ماہواری آنے تک اپنے آپ کو روکے رکھیں' اور ان کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ اللہ نے ان کے رحم میں جو کچھ خلق فرمایا ہو' اسے چھپائیں انہیں ہرگز ایسا نہ کرنا چاہئے۔ اگر وہ اللہ اور روز آخر پر ایمان رکھتی ہیں۔ ان کے شوہر تعلقات درست کر لینے پر آمادہ ہوں' تو وہ اس عدت کے دوران میں انہیں پھر اپنی زوجیت میں واپس لے لینے کے حقدار ہیں۔ عورتوں کے لئے بھی معروف طریقے پر ویسے ہی حقوق ہیں۔ جیسے مردوں کے حقوق ان پر ہیں۔ البتہ مردوں کو ان پر ایک درجہ حاصل ہے۔ اور سب پر اللہ غالب اقتدار رکھنے والا اور حکیم و دانا موجود ہے۔"

اپنے آپ کو روکے رکھیں ذرا اپنے جذبات پر کنٹرول کریں۔ تین مرتبہ ایام ماہواری تک یا تین مرتبہ ایام ماہواری سے پاک ہونے تک' اپنے آپ کو روکے رکھیں۔ میں نے قرآن مجید کی اس تعبیر اور انداز بیان پر بہت غور کیا' لطیف نفسیاتی حالت کی یہ عجیب تصویر کشی ہے۔ مفہوم اور مقصد یہ ہے کہ تین دفعہ ایام ماہواری آنے یا ان سے پاک ہونے تک وہ دوسری شادی کرنے سے باز رہیں۔ لیکن اس عقلی اور قانونی مفہوم کے علاوہ قرآن کریم کا طرز تعبیر کچھ اور بھی بتاتا ہے۔ انداز تعبیر روکے رکھیں' لگام کھینچ لیں' باوجود اچھلنے کودنے کے روکے رکھیں' اس تعبیر سے اس نفسیاتی کیفیت کی طرف اشارہ ہے جو ایسے حالات میں پائی جاتی ہے۔ ایسے حالات میں بالعموم مطلقہ عورت کو اس بات کی شدید خواہش ہوتی ہے کہ وہ جلد از جلد نئی زندگی کا آغاز ایک نئے شوہر کی قیادت میں کر دے۔ یہ کیفیت فطری ہے۔ ایسے حالات میں عورت پر شدید اعصابی دباؤ ہوتا ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ وہ ثابت کر دکھائے کہ سابقہ تجربہ ازدواج میں اس کا کوئی قصور نہیں ہے۔ اس میں کوئی جسمانی نقص نہیں ہے۔ وہ کسی وقت بھی' دوسرے شوہر کے لئے پرکشش بن سکتی ہے اور جدید ازدواجی زندگی کا آغاز کر سکتی ہے جبکہ یہ جذبہ اور یہ احساس مرد میں نہیں ہوتا' اس لئے کہ طلاق کا حق اس کے ہاتھ میں ہے' طلاق کا وار اس نے کیا ہے اور عورت نے اس وار کو برداشت کیا ہے۔ اس لئے عورت سے یہ کہا گیا کہ ذرا نفس کو روکے رکھو' اس کی لگام کو کم از کم تین ماہ تک کھینچے رکھو۔ یوں قرآن

مجید ایک لفظ اور ایک انداز تعبیر سے نفسیاتی کیفیت کی فضا ظاہر کر دیتا ہے۔ اس نفسیاتی کیفیت کو ملحوظ خاطر رکھ کر ہدایات دیتا ہے اور ضابطہ بندی کرتا ہے۔

وہ اس عرصہ کے لئے اپنے نفوس کو روکے رکھیں تاکہ ان کے رحم سابق زوجیت کے آثار سے پاک ہو جائیں اور پھر وہ نئے سرے سے ازدواجی زندگی کا آغاز کر سکیں' اگر چاہیں لَا يَحِلُّ لَهُنَّ أَنْ يَكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللَّهُ فِي أَرْحَامِهِنَّ إِنْ كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ "اور ان کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ اللہ نے ان کے رحم میں جو کچھ خلق فرمایا ہو' اسے چھپائیں۔ انہیں ہرگز ایسا نہ کرنا چاہئے اگر وہ اللہ اور روز آخر پر ایمان رکھتی ہیں۔"

ان کے رحم میں حالت حمل ہے یا حالت حیض ان کے لئے جائز نہیں ہے کہ اسے چھپائیں۔ رحم میں جو کچھ ہے' اسے خدا تعالیٰ کی خالقیت سے وابستہ کر دیا گیا ہے۔ تاکہ ان کے دلوں میں خدا خوفی پیدا ہو۔ انہیں اللہ اور یوم آخرت پر ایمان و یقین کی غیرت دلا کر کہا جاتا ہے کہ اگر تم مومن ہو تو تمہیں ہرگز کسی چیز کو چھپانا نہیں چاہئے۔ یہاں یوم آخرت کا ذکر اس لئے ہوا ہے کہ یوم آخرت یوم الجزاء ہے۔ اس دنیا میں جو چیز احکام خداوندی کے بجالاتے ہوئے فوت ہو جائے' وہ ایک مومن کو وہاں بطور اجر ملتی ہے۔ یہاں چونکہ عورتوں کے لئے حکم ہے کہ باوجود اس کے کہ ان کے جذبات کو ٹھیس لگی ہے وہ اپنے نفوس کو روکے رکھیں۔ اس لئے کہا گیا کہ جزاء آنے والی ہے۔ ہاں اگر وہ پردہ داری کریں گی اور جو کچھ ان کے رحم میں ہے صاف صاف اس کا اظہار نہ کریں گی تو اس پر سزا بھی ہے۔ اس سے تو کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے۔ کیا کوئی چیز اللہ سے چھپائی جا سکتی ہے؟ للذا مت چھپاؤ۔ کسی بات سے اثر لے کر' کسی مطلب کے لئے' کسی خواہش سے مغلوب ہو کر' کہیں خلق خدا کو چھپا نہ لو۔

یہ تو تھا ایک پہلو' دوسرا پہلو یہ ہے کہ قطعی جدائی سے پہلے' ایک وقفہ کی ضرورت ہے۔ معقول وقفہ۔ اس وقفے میں فریقین جدائی کے بعد اپنے جذبات کو اچھی طرح آزما لیں گے۔ ہو سکتا ہے کہ ان کے دل میں محبت کی کوئی چنگاری باقی ہو اور پھر محبت سلگ اٹھے۔ ہو سکتا کہ جذبات محبت میں پھر تلاطم برپا ہو جائے اور وہ ایک دوسرے سے آملیں۔ ہو سکتا ہے کہ ان کی سوچ جذبات' کوتاہی یا کبر و غرور کے نیچے دب گئی ہو اور وقفے میں انہیں سوچ آجائے۔ جب غصہ فرو ہو جائے' جب طیش اتر جائے' جب نفس مطمئن ہو جائے اور وہ اسباب جو موجب فراق بن گئے تھے دب جائیں' کچھ عقل کی باتیں سامنے آجائیں' سوچ کی نئی راہیں کھل جائیں۔ جن اسباب کو عظیم سمجھ کر فراق کا فیصلہ کر لیا گیا تھا وہ اس وقفے میں معمولی نظر آنے لگ جائیں اور فریقین میں از سر نو زندگی کا آغاز کرنے کا داعیہ پیدا ہو جائے۔ یا اس عرصہ میں کسی اور حسن عمل اور حسن تدبیر سے حالات کا رخ بدل جائے۔ اس لئے یہ بات نہایت ضروری تھی کہ ایک طلاق کے بعد متعلقہ تین ایام ماہواری یا ان کے پاک ہونے تک انتظار کرے۔ اسلام میں طلاق مشروع ہے لیکن خدا اور رسول کو سخت ناپسندیدہ بھی ہے۔ یہ کاٹ دینے کا عمل ہے اور اسے صرف اس وقت اختیار کرنا چاہئے' جب علاج کا کوئی طریقہ' جوڑنے کا کوئی حربہ کام نہ آسکے۔ (قرآن مجید میں دوسری جگہ تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے کہ طلاق واقعہ ہونے سے پہلے صلح صفائی کے لئے سخت کوشش ہونی چاہئے۔ نیز یہ بھی ہدایت ہے کہ طلاق ایسی حالت میں دینی چاہئے کہ عورت ایام ماہواری سے پاک ہو چکی ہو' اور ابھی مرد نے اس کے ساتھ مباشرت نہ کی ہو' محض اس لئے کہ طلاق دینے یا طلاق کو آخری شکل دیتے وقت مرد کو سوچ بچار کی کافی مہلت ملے۔ اگر حیض کی حالت ہے تو مرد طلاق دینے کے لئے طہر کا انتظار کرے گا۔

جہاں تک پہلی طلاق کا تعلق ہے' یہ ایک تجربہ ہے۔ اس تجربہ سے میاں بیوی دونوں یہ معلوم کر لیتے ہیں کہ ان کے جذبات اور احساسات کیا رخ اختیار کرتے ہیں۔ اگر دوران عدت انہوں نے محسوس کر لیا کہ وہ ایک دوسرے کی رفاقت میں زندگی کا آغاز نئے سرے

سے کر سکتے ہیں تو راستہ کھلا۔ وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْٓا اِصْلَاحًا "ان کے شوہر تعلقات درست کر لینے پر آمادہ ہوں' تو وہ اس عدت کے دوران میں انہیں پھر اپنی زوجیت میں واپس لینے کے حقدار ہیں۔"

فِيْ ذٰلِكَ یعنی اس میں' اس سے مراد عدت کے دوران میں انتظار اور تربص کے زمانے میں۔ بشرطیکہ تعلقات زوجیت کو نئے سرے سے اختیار کرنے کا ارادہ ہو محض عورت کو اذیت دینا مقصود نہ ہو' محض انتقام لینے کی خاطر اسے ایسی زندگی کی طرف لوٹانا مقصود نہ ہو' جس میں کانٹے ہی کانٹے ہوں۔ یا محض غرور کی خاطر یہ رجوع نہ ہو۔ یا محض اس لئے نہ ہو کہ اگر میں نے رجوع نہ کیا تو اسے کوئی دوسرا خاوند نکاح میں لے لے گا' جو میرے لئے شرم کی بات ہے۔ وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ "عورتوں کے لئے بھی معروف طریقے پر وہی حقوق ہیں جیسے مردوں کے حقوق ان پر ہیں۔" یعنی اس حالت میں مطلقات کیلئے ایسے حقوق ہیں جس طرح ان پر واجبات ہیں وہ مکلف ہیں کے دوران عدت میں اپنے آپ کو روکے ہوں' ان کے رحموں میں اللہ تعالیٰ نے جو کچھ خلق فرمایا ہے اسے چھپائیں نہیں۔ خاوند کا فرض یہ ہے کہ اگر وہ رجوع کرتا ہے تو خالص نیت سے ہو' اس سے عورتوں کو تکلیف دینا مقصود نہ ہو' نہ اذیت دینا ہو' اس پر مزید یہ کہ دوران عدت وہ نان و نفقہ کی بھی حقدار ہوں گی جیسا کہ عنقریب بیان ہو گا۔ اس لئے کہ وہ ازروئے قانون روکی ہوئی ہیں۔ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ "البتہ مردوں کو ان پر ایک درجہ حاصل ہے۔" اس درجہ سے مراد یہ ہے کہ مردوں کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ دوران عدت اگر چاہیں تو مطلقہ عورت کو دوبارہ اپنی زوجیت میں لوٹا سکتے ہیں۔ یہ حق اللہ تعالیٰ نے مرد کو اس لئے دیا ہے کہ طلاق کا حق مرد کا ہے۔ بعض لوگوں نے اس فقرے سے یہ مفہوم لیا ہے کہ عمومی طور پر مردوں کو عورتوں پر برتری حاصل ہے۔ یہ حضرات اس سے مراد یہ نہیں لیتے کہ صرف مرد کو حق مراجعت حاصل ہے چنانچہ وہ حق مراجعت عورت کو بھی دیتے ہیں کہ عورت کو بھی اختیار ہے کہ وہ واپس چلی آئے اور مرد کو اپنی زوجیت میں لے لے' لیکن ان حضرات کا یہ استدلال نہایت ہی سقیم' بے محل اور بے موقعہ ہے۔ یہ حق' حق طلاق کے ساتھ وابستہ ہے اور صرف مرد ہی کو حاصل ہے۔

اب آخری تبصرہ اور نتیجہ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ "اللہ سب پر غالب اقتدار رکھنے والا اور حکیم و دانا ہے۔" یعنی اللہ قوت اور اقتدار اعلیٰ کا مالک ہے۔ لہٰذا وہ ہر قسم کا حکم نافذ کرنے کا مجاز ہے۔ اور پھر یہ کہ وہ حکیم و دانا ہے۔ اس کے احکام بھی حکیمانہ ہیں۔ اس آخری تبصرے کا اثر یہ ہے کہ مختلف وجوہات اور مختلف حالات سے متاثر ہو کر تم اللہ کے احکام سے منحرف نہ ہو جاؤ' انہیں پس پشت نہ ڈال دو۔

اب آنے والا حکم طلاقوں کی تعداد کی تحدید کے بارے میں ہے۔ یہ کہ مطلقہ کو یہ حق ہے کہ وہ پورا مہر حاصل کرے۔ یہ حرام ہے کہ وہ مرد طلاق کے وقت اس سے کچھ واپس لے۔ ہاں ایک صورت ایسی ہے جس میں مرد کو حق ہے کہ وہ اگر چاہے تو واپس لے۔ اگر صورت حال یہ ہو کہ عورت کو مرد سے سخت نفرت ہو' اور وہ اس کے ساتھ حدود الٰہی کی پابندی کرتے ہوئے زندگی گزارنے کے اہل نہ ہو' خطرہ ہو کہ وہ کسی معصیت میں مبتلا ہو جائے یعنی خلع کی وہ حالت جس میں عورت' فدیہ کے بدلے اپنی آزادی خریدنا چاہتی ہو۔ اس صورت میں مرد کو حق ہے کہ وہ کچھ لے لے۔

☆☆☆☆☆ اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌ

(۱) میں بھی اپنی بعض تحریروں میں کسی وقت یہ تاویل اختیار کی تھی' لیکن میرا خیال یہ ہے کہ یہ تاویل سقیم ہے۔

بِاِحْسَانٍ ؕ وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْئًا اِلَّآ اَنْ يَّخَافَآ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ؕ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ۙ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ ؕ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا ۚ وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۲۹﴾

"طلاق دوبار ہے۔ پھر یا تو سیدھی طرح عورت کو روک لیا جائے یا بھلے طریقے سے اس کو رخصت کر دیا جائے اور رخصت کرتے وقت ایسا کرنا تمہارے لئے جائز نہیں ہے کہ جو کچھ تم انہیں دے چکے ہو' اس میں سے کچھ واپس لے لو' البتہ یہ صورت مستثنیٰ ہے کہ زوجین کو اللہ کی حدود پر قائم نہ رہ سکنے کا اندیشہ ہو۔ ایسی صورت میں اگر انہیں یہ خوف ہو کہ وہ دونوں حدود الٰہی پر قائم نہ رہیں گے' تو ان دونوں کے درمیان یہ معاملہ ہو جانے میں مضائقہ نہیں کہ عورت اپنے شوہر کو کچھ معاوضہ دے کر علیحدگی حاصل کرے۔ یہ اللہ کی مقرر کردہ حدود ہیں۔ ان سے تجاوز نہ کرو اور جو لوگ حدود الٰہی سے تجاوز کریں' وہی ظالم ہیں۔"

وہ طلاق جن کے بعد' فریقین ازدواجی زندگی کا آغاز کر سکتے ہیں دو ہیں۔ اگر خاوند ان دو سے بھی آگے بڑھ جائے تو پھر ان کے درمیان ازدواجی تعلقات صرف اس صورت میں قائم ہو سکتے ہیں' جس کی تشریح اگلی آیات میں آرہی ہے۔ یعنی یہ کہ پہلے وہ کسی دوسرے خاوند سے جدا ہو جائے۔ صرف اس صورت میں پہلے خاوند کے لئے' جس نے تین طلاقوں کا حق استعمال کر لیا تھا' یہ جائز ہے کہ اس عورت سے دوبارہ نکاح کرے بشرطیکہ یہ عورت از سرنو اس کے ساتھ نکاح کرنے پر راضی ہو۔

اس پابندی کے عائد ہونے کی وجہ کے بارے میں بعض روایات میں آتا ہے کہ اسلامی دور کے آغاز میں بھی (جاہلیت کی طرح) طلاقوں کی تعداد مقرر نہ تھی۔ اور مرد کو یہ حق بھی حاصل تھا کہ وہ ہر طلاق کے بعد دوران عدت رجوع کر سکے۔ چنانچہ بعض لوگ اسی طرح طلاق دیتے' پھر رجوع کرتے اور یوں ہی سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ اسلامی دور میں انصار میں سے ایک صاحب کی اپنی بیوی کے ساتھ ان بن ہوگئی' اس نے بیوی سے کہا بخدا کی قسم نہ میں تجھے اپنے قریب چھوڑوں گا اور نہ ہی تجھے اپنے سے جدا کروں گا۔ اس نے کہا کیونکر ہو گا؟ اس نے کہا میں تجھے طلاق دوں گا لیکن جب عدت کا وقت قریب آئے گا تو میں رجوع کروں گا۔ وہ پریشان ہوئی اور اس نے رسول اللہ ﷺ سے یہ شکایت کی۔ اس پر اللہ تعالیٰ کی جانب سے یہ وحی آئی اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ طلاقیں دو ہیں۔"

اللہ نے اسلامی نظام کے نزول احکام میں یہ حکیمانہ پالیسی اختیار کی کہ جب بھی کسی حکم کی ضرورت پڑی' حکم نازل کر دیا گیا۔ اور اس طرح بتدریج پورے احکام نازل ہو گئے۔ اور اسلامی نظام زندگی کے اصول مکمل کر لئے گئے۔ اب جو کام رہ گیا تھا وہ جزوی اور نئے حالات پر ان اصولی احکام کی تطبیق کا تھا تاکہ اصول کی روشنی میں جزئیات کے حل معلوم کئے جائیں۔

اس پابندی کے نتیجے میں طلاقوں کی تعداد محدود ہو گئی۔ اب وہ سابقہ صورت حال باقی نہ رہی کہ خاوند مسلسل طلاق دیتا چلا جائے اور اس کو بازیچہ اطفال بنا دے۔ اب طریق کار یہ ہو گیا کہ جب مرد عورت کو ایک مرتبہ طلاق دے دے تو وہ دوران عدت کسی قانونی پیچیدگی کے بغیر اپنی بیوی سے رجوع کر سکتا ہے۔ اور اگر یوں ہی عدت گزر جائے تو عورت جدا ہو جائے گی جسے فقہ میں 'بائنہ' کہتے ہیں۔ اب بھی عدت کا عرصہ گزر جانے کے بعد وہ محض رجوع سے واپس نہیں لے سکتا' بلکہ اسے ایک نئے نکاح کے ذریعہ' اور ایک نیا مہر مقرر کر کے عورت کی رضا سے اسے واپس نکاح میں لانا ہو گا۔ ایک طلاق کے بعد مرد عورت کو دوران عدت میں واپس لے لے' رجوع کر کے یا عدت گزرنے کے بعد وہ نکاح تازہ کر لے اور جدید مہر کے ساتھ عورت کو واپس کر لے دونوں صورتیں جائز ہیں۔

اس کے بعد اگر دوسری مرتبہ یہ خاوند پھر اسے ایک طلاق دے دیتا ہے تو بھی اسے یہی حق حاصل ہو گا۔یعنی دوران عدت میں رجوع اور بعد از عدت نکاح جدید۔ لیکن اگر وہ تیسری مرتبہ طلاق دے دے تو اس صورت میں یہ عورت اس سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جدا ہو جائے گی۔ فقہی اصلاح میں اسے عظیم جدائی (بینونت کبریٰ) کہتے ہیں۔ تیسری مرتبہ طلاق دیتے ہی عورت بائن ہو جائے گی یعنی جدا تصور ہو گی۔ اب یہ مرد دوران عدت رجوع کا حق استعمال نہیں کر سکتا' نہ وہ نکاح جدید کر سکتا ہے۔ الا یہ کہ اس عورت کا نکاح کسی دوسرے مرد سے ہو جائے اور یہ دوسرا خاوند اپنی ازدواجی زندگی کے دوران اسے طلاق دے دے' پھر رجوع نہ کرے یا یہ دوسرا خاوند بھی تین طلاقوں کا حق استعمال کرے اور عورت ہمیشہ کے لئے جدا ہو جائے تو پھر پہلے مرد کے لئے جائز ہے کہ وہ اس عورت کو اپنے نکاح میں لے لے۔ لیکن یہ سب کام اپنی قدرتی رفتار سے ہونا چاہئے۔

پہلی طلاق ایک کسوٹی اور ایک معیار ہے جیسا کہ ہم اوپر کہہ آئے ہیں۔ دوسری طلاق دوبارہ آزمائش اور ایک آخری تجربہ ہے۔ دوسری طلاق کے بعد اگر زندگی کی گاڑی چل پڑے تو فبہا ورنہ تیسری طلاق اس بات کا بین ثبوت فراہم کر دیتی ہے کہ زوجین کے درمیان طبائع اور مزاجوں کا اختلاف بہت ہی بنیادی نوعیت کا ہے اور ناقابل اصلاح ہے۔

بہرحال طلاق بھی ایک آخری علاج ہے۔ کوششوں کے بعد بھی اگر فریقین کے درمیان مصالحت کا کوئی امکان نہ رہے تو پھر یہی بہتر ہے کہ دائمی جدائی ہو جائے۔ اگر دو طلاقیں ہو جائیں تو پھر بیوی کو یا تو معروف طریقے سے رکھنا ہے اور نرمی و محبت کی زندگی کا نئے سرے سے آغاز کرنا ہے اور یا پھر بھلے انداز میں حسن و خوبی کے ساتھ' احسان کے ساتھ' شرافت کے ساتھ اس کو رخصت کر دینا ہے' یعنی تیسری مرتبہ طلاق دے کر' جس کے بعد عورت کو پھر زندگی کی نئی لائن اختیار کرنی ہوتی ہے۔ یہ ہے حقیقت پسندانہ قانون سازی' جو انسان کے حقیقی واقعاتی زندگی کو سامنے رکھ کر کی گئی ہے۔ اور جو عائلی زندگی کے پیچیدہ مسائل کا بہترین اور عملی (Practical) حل پیش کرتی ہے۔ اس قانون سازی میں ایسی شدت بھی نہیں ہے جو مفید نہ ہو' انسان کو ایسے اخلاقی نظام میں ڈھالنے کی کوشش نہیں کرتی جو اسکی جبلت سے متصادم ہو' نہ یہ قانون سازی انسان اور اسکی قوتوں کو مہمل چھوڑنے پر اصرار کرتی ہے' اگر یہ اسے یوں ہی چھوڑ دیتے ہیں کوئی فائدہ نہ ہو۔

ازدواجی زندگی کے دوران مرد نے عورت کو جو مہر دیا ہے' یا اس پر مختلف قسم کے جو اخراجات کئے ہیں' مرد کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ تیسری طلاق کے بعد' وہ اس سے کوئی چیز واپس لے' محض اس کے بدلے میں کہ اب وہ اس عورت کو آزاد کر رہا ہے۔ ہاں صرف ایک صورت ہی ایسی ہے جس میں مرد کوئی چیز واپس لینے کا حقدار بن جاتا ہے۔ وہ یہ کہ عورت کو ذاتی اسباب کی بناپر ذاتی جذبات اور بمقتضائے طبیعت مرد ناپسند ہو اور عورت یہ محسوس کرتی ہو کہ اس نفرت اور کراہت کی وجہ سے وہ اس خاوند کے ساتھ حدود الٰہی کی پابندی کرتے ہوئے زندگی بسر نہیں کر سکتی۔ وہ اس قابل نہیں ہے کہ اس کے ساتھ حسن معاشرت سے پیش آئے۔ اس کے ادب کا خیال رکھے یا اس کی عزت و آبرو بچائے اور عفیفانہ زندگی بسر کر سکے تو ایسے حالات میں عورت کے لئے یہ جائز ہے کہ وہ مرد سے طلاق طلب کرے۔ اس صورت میں یہ عورت چونکہ محض ذاتی وجوہات کی بناپر اس مرد کے جذبات مجروح کرتی ہے اور اس کے خاندان اور گھر کو خراب کر رہی ہے۔ اور اس میں بیچارے مرد کا کوئی ذاتی قصور نہیں ہے۔ اس لئے اس عورت کا فرض ہے کہ وہ مہر واپس کر دے۔ یہ محض اس لئے کہ عورت اللہ کی معصیت سے بچے' اس کی حدود توڑنے کا موقعہ اسے نہ ملے' اور نہ اپنے نفس پر اور نہ دوسروں پر مصیبت لانے کے مواقع پیدا ہوں۔

یہ ہے اسلامی نظام زندگی' جس میں لوگوں کو پیش آنے والے تمام واقعی حالات زندگی کی رعایت کی گئی ہے۔ اس میں ان انسانی

جذبات اور فطری پسند و ناپسند کا بھی خاطر خواہ لحاظ رکھا گیا ہے' جن پر خود انسان کو کوئی کنٹرول نہ ہو' بیوی کو بھی مجبور نہیں کیا گیا کہ وہ اپنی پوری زندگی ایک ایسے شخص کے ساتھ بسر کر دے جسے وہ پسند ہی نہیں کرتی' اس سے طبعاً متنفر ہے' اور ساتھ ہی مرد کے حقوق کو بھی نظر انداز نہیں کرتی۔ جس میں اس کا کوئی قصور نہیں ہے۔ اس طبعی نفرت اور مزاج کی ناہمواری کے پیدا کرنے میں اس کا کوئی قصور نہیں ہے۔

اس آیت کی اہمیت اور اس کے دور رس نتائج تک پہنچنے کے لئے' ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم قارئین کے سامنے وہ واقعی حالات بھی رکھ دیں جن حالات کے پیش نظر اللہ تعالیٰ نے یہ قانون بنایا اور اسے نافذ کیا گیا۔ ان واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کے اس ربانی نظام زندگی میں کس حقیقت پسندی' کس وقت نظر' کس میانہ روی اور عدل و انصاف کے کس اونچے معیار کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔

امام مالک ؒ نے اپنی مشہور کتاب موطا میں روایت کی ہے کہ حبیبہ ؓ بنت سہل انصاری' ثابت ابن قیس ابن شماس کی بیوی تھی۔ حضور ﷺ صبح اندھیرے منہ گھر سے باہر نکلے تو دیکھا کہ صبح کی تاریکی میں حبیبہ ؓ کھڑی ہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا کون ہو سکتی ہیں یہ؟ کہنے لگی میں حبیبہ بنت سہیل ہوں جناب۔ حضور ﷺ نے فرمایا! ایسے وقت میں کیسے؟ کہنے لگی حضور ﷺ میں کسی صورت میں بھی ثابت ابن قیس کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔

اس کے بعد ثابت بن قیس بلائے گئے تو حضور ﷺ نے فرمایا! ثابت' یہ حبیبہ ہے اس نے میرے سامنے تمہارے بارے میں وہ باتیں کی ہیں جو اللہ کو منظور ہوں گی۔

اس پر حبیبہ نے کہا حضور ﷺ "اس نے مجھے جو کچھ دیا ہے وہ میرے پاس محفوظ ہے۔"

اس پر حضور ﷺ نے ثابت ؓ سے کہا اس سے لے لو چنانچہ اس نے وہ سب کچھ لے لیا اور حبیبہ اپنے اہل خاندان کے پاس چلی گئی۔

امام بخاری ؒ نے اپنی سند کے ساتھ حضرت ابن عباس ؓ سے روایت کی ہے کہ ثابت ابن قیس ابن شماس کی بیوی حضور ﷺ کے پاس آئیں' کہنے لگیں حضور ﷺ میں اس پر کسی بے دینی و بداخلاقی کا الزام نہیں لگاتی' لیکن میں نہیں چاہتی کہ ہم مسلمان ہو کر کفر کا ارتکاب کریں۔

حضور ﷺ نے فرمایا! "کیا تم اس باغ کو واپس کر دو گی جو اس نے تمہیں (بطور مہر) دیا ہے؟"

اس نے کہا: "ہاں" حضور ﷺ نے فرمایا: "ثابت! اپنا باغ واپس لے لو اور اسے ایک طلاق دے دو۔"

ایک دوسری روایت میں ذرا زیادہ تفصیل آئی ہے۔ ابن جریر ؒ نے نقل کیا ہے کہ ابو جریر ؓ نے عکرمہ ؓ سے دریافت کیا: کیا خلع کی کوئی شرعی حقیقت ہے؟ عکرمہ ؓ نے جواب دیا حضرت ابن عباس ؓ کہا کرتے تھے اسلام میں پہلا خلعہ عبداللہ ابن ابی کی بہن کا ہوا۔ وہ حضور ﷺ کے پاس آئیں اور کہا: حضور' میرا سر اس چیز کے سر کے ساتھ ہرگز جمع نہیں ہو سکتا۔ میں نے پردے کا ایک کونہ اٹھایا اور اسے چند آدمیوں کے درمیان آتے ہوئے دیکھا۔ وہ سب میں سیاہ رنگ تھا' سب میں کوتاہ قد اور سب میں قبیح صورت تھا۔"

اس پر اس کے خاوند نے کہا: "حضور ﷺ میں نے تو اسے بہترین جائیداد عطا کر دی ہے۔ ایک ہی باغ تھا میرا جو میں نے اسے دے دیا ہے' کیا وہ میرا باغ واپس کر دے گی؟"

حضور ﷺ نے عورت سے دریافت کیا تمہاری رائے کیا ہے؟ اس نے کہا: "ہاں اگر وہ چاہتا ہے تو میں اسے واپس کر دوں گی۔" ابن

عباس ﷺ کہتے ہیں : "اس پر حضور ﷺ نے دونوں کے درمیان تفریق کرا دی۔"

ان تمام روایات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کیا نفسیاتی صورت حالات تھی' جو حضور ﷺ کے سامنے آئی۔ حضور ﷺ نے اس صورت حال کو اس طرح قبول کر لیا کہ یہ کیس ناقابل علاج ہے۔ تشدد اور سختی سے اس کا علاج ممکن نہیں ہے اور نہ اس میں ازدواجی زندگی میں کوئی مفید مثال قائم ہو سکتی ہے۔ کہ عورت کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ایسی تلخ معاشرت پر مجبور کر کے رکھ دیا جائے۔ اس لئے حضور ﷺ نے اس صورت حال کا اصل اسلامی نظام زندگی کے مطابق' اسلامی منہاج کے مطابق' پیش کر دیا جو بے حد عملی ہے۔ واضح ہے' حقیقت پسندانہ ہے اور انسانی فطرت کے عین مطابق ہے۔ حضور ﷺ نے نفس انسانی کے ساتھ ایک ایسے شخص کا معاملہ کیا جو اس حقیقت سے اچھی طرح باخبر ہو' کہ اس نفس کے اندر کیا جذبات کام کر رہے ہیں۔ کیا رجحانات ہیں۔

پھر ایسی تمام صورتوں میں سنجیدہ طرز عمل یا طفلانہ طرز عمل' اور سچائی کی راہ یا فریب کاری کی راہ اختیار کرنے کے لئے واحد نگراں صرف خدا خوفی اور اس کی پکڑ کا ڈر ہی ہو سکتا تھا' اس لئے ان احکام کے خاتمہ پر تنبیہ کر دی گئی کہ یہ ہیں اللہ کی حدود۔ ان سے تجاوز مت کرنا۔

تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا ۚ وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ "یہ اللہ کی مقرر کردہ حدود ہیں' ان سے تجاوز نہ کرو اور جو حدود الٰہی سے تجاوز کریں' وہی ظالم ہیں۔"

یہاں ذرا تھوڑی دیر کے لئے رکیے! یہاں ہمارے سامنے قرآن مجید نے ایک ہی مضمون کو مختلف حالات میں مختلف انداز میں بیان کیا ہے۔ مضمون ایک' حالات مختلف' اس لئے انداز بیان اور۔

اس صورت میں روزے پر بحث کرتے ہوئے آخر میں یہ تنبیہ فرمائی گئی تھی تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا "یہ اللہ کی حدیں ہیں' ان کے قریب نہ بھٹکو اور یہاں یہ کہا گیا ہے۔ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا "یہ اللہ کی مقرر کردہ حدود ہیں ان سے تجاوز نہ کرو۔" سوال یہ ہے کہ انداز بیان میں یہ اختلاف کیوں ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ سابقہ مقام ایسا تھا' جس میں اللہ تعالیٰ نے ایسی چیزوں سے روکا تھا' جو طبعاً سخت پسندیدہ ہیں بلکہ ایک مادہ پرست کے لئے خلاصہ حیات ہیں وہاں فرمایا گیا تھا :

"تمہارے لئے روزوں کے زمانے میں راتوں کو اپنی بیویوں کے پاس جانا حلال کر دیا گیا ہے۔ وہ تمہارے لئے لباس ہیں اور تم ان کے لئے لباس ہو۔ اللہ کو معلوم ہو گیا کہ تم لوگ چپکے چپکے اپنے آپ سے خیانت کر رہے تھے۔ مگر اس نے تمہارا قصور معاف کر دیا اور تم سے درگزر فرمایا۔ اب تم اپنی بیویوں کے ساتھ شب باشی کرو اور جو لطف اللہ نے تمہارے لئے جائز کر دیا ہے اسے حاصل کرو۔ نیز راتوں کو کھاؤ پیو یہاں تک کہ تم کو سیاہی شب کی دھاری سے سپیدہ صبح کی دھاری نمایاں نظر آ جائے۔ تب یہ سب کام چھوڑ کر اپنا روزہ پورا کرو اور جب تم مسجدوں میں معتکف ہو تو بیویوں سے مباشرت نہ کرو۔ یہ اللہ کی باندھی ہوئی حدیں ہیں' ان کے قریب نہ پھٹکنا۔" تلک حدود اللہ فلاتقربوھا

ان آیات میں جن چیزوں کی ممانعت کر دی گئی ہے' وہ سب ایسی ہیں کہ انسان ازروئے طبیعت انہیں بے حد چاہتا ہے۔ اس لئے یہاں حکم دیا گیا کہ ان کے قریب نہ پھٹکنا' قریب ہی نہ ہونا' انسان ضعیف ہے' ہو سکتا ہے کہ ان چیزوں کی جاذبیت کا مقابلہ نہ کر سکے اور ان میں مبتلا ہو جائے' ان کے پھندے میں بس کہیں پھنس ہی نہ جائے۔

اب یہاں سیاق کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسی چیزوں سے منع کیا گیا ہے جو بذات خود ناپسندیدہ ہیں۔ گھریلو اختلافات' جھگڑے

بذات خود ناپسندیدہ ہیں۔ یہاں خطرہ اس بات کا نہیں ہے کہ کوئی لڑائی جھگڑے کا شوق کرے' بلکہ خطرہ اس بات کا ہے کہ بامر مجبوری اگر کوئی مبتلا ہو ہی جائے تو اس میں حدود سے تجاوز نہ کرے۔ معقول حدود میں رہے' حدیں توڑ ہی نہ دے۔ اس لئے یہاں حکم یہ نہیں دیا گیا کہ قریب ہی مت جاؤ بلکہ یہ حکم دیا گیا کہ حدود سے آگے نہ بڑھو۔ انداز بیان میں یہ لطیف فرق اس لئے ہوا ہے کہ موقع و محل میں اختلاف ہے۔ دونوں مواقع و محل کے اس قدر لطیف فرق میں بالکل جدا ہیں۔ یہ قرآن کریم کا اعجاز ہے کہ وہ مواقع و محل کے اس قدر لطف فرق میں بھی انداز بیان مختلف اختیار کرتا ہے۔

احکام طلاق کا سلسلہ جاری ہے۔ چلتے جائیے :

فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ ؕ فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَاۤ اَنْ يَّتَرَاجَعَاۤ اِنْ ظَنَّاۤ اَنْ يُّقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ؕ وَ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ يُبَيِّنُهَا لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿۲۳۰﴾

"پھر اگر (دوبار طلاق دینے کے بعد) تیسری بار طلاق دے دی' تو وہ عورت پھر اس کے لئے حلال نہ ہوگی' الا یہ کہ اس کا نکاح کسی دوسرے شخص سے ہو اور وہ اسے طلاق دے دے۔ تب اگر پہلا شوہر اور عورت دونوں یہ خیال کریں کہ حدود الٰہی قائم رکھیں گے تو ان کے لئے ایک دوسرے کی طرف رجوع کر لینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ یہ اللہ کی مقرر کردہ حدود ہیں' جنہیں وہ ان لوگوں کی ہدایت کے لئے واضح کر رہا ہے۔ جو (اس کی حدوں کو توڑنے کا انجام جانتے ہیں۔)

جیسا کہ اوپر ہم کہہ آئے ہیں' تیسری بار طلاق اس بات کی دلیل ہے کہ میاں بیوی کے یہاں بنیادی اختلاف موجود ہے۔ اس قدر گہرا کہ اصلاح کی کوئی سبیل نہیں ہے۔ تو اس صورت میں مناسب یہی ہے کہ میاں بیوی کو ہمیشہ کے لئے جدا کر دیا جائے اور ہر ایک کو آزاد کر دیا جائے کہ وہ اپنے لئے جدید رفیق حیات تلاش کریں اور از سر نو عائلی زندگی کا آغاز کریں۔ اور اگر خاوند محض ژاوہ گوئی' جلد بازی اور کبرو غرور کی وجہ سے یہ طلاقیں دے رہا ہو تو پھر بھی تیسری طلاق دینے کو نافذ کر دیا گیا ہے۔ اس لئے کہ اس نازک معاملے میں ژاوہ گوئی کے لئے بھی کوئی حد ہونا چاہئے۔ اس لئے کہ طلاق کی گنجائش اس لئے نہیں رکھی گئی کہ اسے مذاق بنا دیا جائے۔ یہ تو اس لئے مقرر ہوئی ہے کہ بعض ناقابل علاج اور ناقابل اصلاح کیسوں میں اسے استعمال کرنا چاہئے۔ اس لئے ایسے جوڑے کو بھی علیحدہ کر دینا چاہئے جس کے دل میں اس مقدس عقد کا کوئی احترام اور اس کا کوئی تقدس نہیں ہے۔ اور خاوند بار بار طلاق کو استعمال کر رہا ہے اور اس معاملے میں کوئی احتیاط نہیں کرتا۔

یہاں یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ ایک غیر ذمہ دار خاوند کی جانب سے لفظ طلاق کہنے کے نتیجے میں ایک بے گناہ عورت کا امن و سکون کیوں تباہ کیا جاتا ہے۔ اس کی زندگی کو کیوں خطرے میں ڈالا جا رہا ہے؟ جواب یہ ہے کہ انسانی معاشرے میں ہم فی الحقیقت ایسے واقعات سے دوچار ہوتے ہیں' جن کا علاج ضروری ہوتا ہے' ایسے قضیے ہوتے ہیں جن کا فیصلہ ضروری ہے' قانون سازی ضروری ہے۔ اگر ہم یہ علاج نہ کریں جو قرآن کریم نے بتایا' اس قانون پر فیصلہ نہ کریں جو اللہ نے دیا ہے تو بتائیے کیا کریں۔ کیا ہم اس عورت کو اس مرد پر ٹھونس دیں لو یہ تمہاری بیوی ہے' تم چاہو نہ چاہو' یہ تمہاری بیوی ہے۔ تم سو بار طلاق دو ہم تمہاری طلاق کو تسلیم نہیں کرتے۔ تمہاری طلاق بے اثر ہے' حالانکہ اس شخص کے دل میں بیوی کا کوئی احترام نہیں ہے۔ اس کے ساتھ ذرہ بھر محبت نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک

عورت کے لئے اس سے بڑی اہانت اور کیا ہو سکتی ہے؟ ازدواجی تعلقات کی اس سے زیادہ اور تذلیل کیا ہو سکتی ہے؟ اسلام میں عورت کا احترام ضروری ہے۔ مرد و زن کے باہمی تعلقات کو اسلام مقدس رشتہ سمجھتا ہے۔ اس رشتے کو محض رشتہ تلذذ ہی نہیں سمجھتا بلکہ اسے فریضہ حیات اور اللہ کی عبادت اور بندگی کا درجہ دیتا ہے۔ وہ خاوند جو طلاق کو ایک مذاق بنا دیتا ہے تو اگر اس نے ایک طلاق دی ہے یا دوسری طلاق دی ہے اور قبل از رجوع عورت بائن ہو گئی ہے' جدا ہو گئی تو اس کی سزا یہ ہی کہ اگر وہ دوبارہ نکاح کرنا چاہتا ہے تو اس عورت کو دوبارہ راضی کرے گا۔ نکاح ہو گا اور اسے مہر ادا کرنا ہو گا۔ اور اگر وہ تیسری بار طلاق دیتا ہے تو پھر اس کی سزا یہ ہے کہ وہ عورت اس پر حرام ہو گئی ہے مکمل حرام اگرچہ اب یہ پشیمان ہو جائے۔ اب اس عورت کی دوسری شادی اور اس میں بھی ناکامی سے قبل یہ اس کے ساتھ نکاح نہیں کر سکتا۔ مزید یہ کہ مہر بھی اسے دینا پڑے گا اور جو کچھ عورت کو دیا ہے اس کی واپسی سے بھی یہ محروم ہو گا۔ ہر حال میں اسے دوران عدت نفقہ بھی ادا کرنا ہو گا۔ اہم بات یہ ہے کہ ہم انسانی نفسیات کا حقیقت پسندانہ جائزہ لیں۔ انسان کی زندگی کے عملی پہلوؤں پر غور کریں۔ ہمیں ایسی تخیلاتی دنیا میں نہیں ٹھہرنا چاہئے چاہے جس کا عملی وجود' اس کرہ ارض پر نہ ہو۔ انسان کی عملی زندگی میں وہ خیالی تصور قابل عمل نہ ہو۔

اب اگر یہ عورت' تیسری طلاق کے بعد' جیسا کہ قدرتی طور پر ہوتا ہے' دوسرے خاوند سے شادی کر لیتی ہے اور یہ دوسرا خاوند بھی اتفاقاً اس عورت کو طلاق دے دیتا ہے' تو پھر یہ بیوی اور اس کا پہلا خاوند اگر چاہیں تو دوبارہ معاہدہ نکاح کر سکتے ہیں' اب ان کے لئے کوئی ممانعت نہیں ہے۔ صرف یہ شرط ہے (قانونی نہیں) اخلاقی اور ایمانی شرط ہے۔

إِنْ ظَنَّآ أَنْ يُقِيمَا حُدُوْدَ اللهِ "اگر ان دونوں کا خیال یہ ہو کہ وہ حدود الٰہی پر قائم رہ سکیں گے۔ اور ویسا معاملہ نہ ہو گا جس طرح پہلے ہوا۔ کیونکہ اسلام میں رشتہ نکاح محض خواہش نفس کی پیروی کا نام نہیں ہے۔ یہ محض داعیہ شہوت کی تشفی کے لئے کوئی معاہدہ نہیں ہے۔ اور اسلامی معاشرہ میں میاں بیوی کو اس طرح آزاد نہیں چھوڑ دیا گیا کہ بس وہ آزاد شہوت رانی کریں' جب چاہیں نکاح کر لیں' جب چاہیں ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں۔ ان کو حدود الٰہی کی پابندی کرنی ہوتی ہے۔ اسلام کا نظام ازدواج تو حیات انسانی کی شیرازہ بندی ہے' زندگی کے لئے ایک فریم ہے۔ اگر زندگی اس فریم سے باہر نکل آئے تو وہ زندگی اللہ کو مطلوب نہیں ہے۔ وہ اللہ کو پسند نہیں ہے۔

وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللهِ يُبَيِّنُهَا لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ "یہ اللہ کی مقرر کردہ حدیں ہیں جنہیں وہ ان لوگوں کی ہدایت کے لئے واضح کر رہا ہے' جو (اس کی حدوں کو توڑنے کا انجام) جانتے ہیں۔"

اپنے بندوں پر اللہ کی یہ ایک عظیم رحمت ہے کہ اس نے اپنی حدیں کھول کھول کر بیان فرما دی ہیں۔ ان میں کوئی شبہ اور کوئی پیچیدگی نہیں چھوڑی گئی۔ ان سب کو واضح کر دیا گیا ہے لیکن ان لوگوں کے لئے جو جانتے ہیں' جو قدر کرتے ہیں جو لوگ ان حدوں کو صحیح طرح جانتے ہیں وہ ان حدود پر جا کر رک جاتے ہیں۔ اگر وہ ان حدود کو پار کر جائیں تو آگے قابل مذمت جاہلی دنیا ہے۔ اور اندھی جاہلیت ہے۔

اب ان مردوں کو ہدایات دی جا رہی ہیں جو طلاق کا حق استعمال کرتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ تم مطلقہ عورتوں کے ساتھ حسن سلوک کرو۔ شریفانہ رویہ اختیار کرو اور طلاق کے متصلا بعد کے تلخ دور میں بھی معروف طریقے کے مطابق حسن سلوک کا رویہ اختیار کرو وَإِذَا

طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ سَرِّحُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ

وَلَا تُمْسِكُوْهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوْا ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ ؕ وَلَا تَتَّخِذُوْٓا اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا ؗ وَّاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمَآ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ وَالْحِكْمَةِ يَعِظُكُمْ بِهٖ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۲۳۱﴾ وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ اِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ ذٰلِكَ يُوْعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ ذٰلِكُمْ اَزْكٰى لَكُمْ وَاَطْهَرُ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۳۲﴾

۲۹ ع ۳ ۱۴

"اور جب تم عورتوں کو طلاق دے دو اور ان کی عدت پوری ہو جانے کو آجائے' تو یا بھلے طریقے سے انہیں روک لو یا بھلے طریقے سے رخصت کر دو۔ محض ستانے کی خاطر انہیں نہ روکے رکھنا کہ یہ زیادتی ہوگی اور جو ایسا کرے گا وہ درحقیقت آپ اپنے اوپر ظلم کرے گا۔ اللہ کی آیات کا کھیل نہ بناؤ۔ بھول نہ جاؤ کہ اللہ نے کس نعمت عظمیٰ سے تمہیں سرفراز کیا ہے۔ وہ تمہیں نصیحت کرتا ہے کہ جو کتاب اور حکمت اس نے تم پر نازل کی ہے' اس کا احترام ملحوظ رکھو' اللہ سے ڈرو' اور خوب جان لو کہ اللہ کو ہربات کی خبر ہے۔

جب تم اپنی عورتوں کو طلاق دے چکو اور وہ اپنی عدت پوری کر لیں تو پھر اس میں مانع نہ ہو' کہ وہ اپنے زیر تجویز شوہروں سے نکاح کر لیں' جبکہ وہ معروف طریقے سے باہم مناکحت پر راضی ہوں۔ تمہیں نصیحت کی جاتی ہے کہ ایسی جرأت ہرگز نہ کرنا' اگر تم اللہ اور روز آخر پر ایمان لانے والے ہو' تمہارے لئے شائستہ اور پاکیزہ طریقہ یہی ہے کہ اس سے باز رہو' اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔"

زندگی کے رشتے کٹ رہے ہوں یا جڑ رہے ہوں' ہر صورت میں اسلام یہ ہدایات دیتا ہے کہ احسان' حسن سلوک اور معروف و مستحسن طرز عمل کو فضا پر غالب رہنا چاہئے۔ اگر رشتے ٹوٹ رہے ہوں تو نیت یہ نہ ہو کہ فریق مخالف کو اذیت دی جائے' اسے بطور پالیسی دکھ پہنچایا جائے۔ جدائی اور طلاق کی فضا میں نفوس اور مزاج ایک دوسرے سے کھچے رہتے ہیں' ایسے حالات میں حسن سلوک کا یہ اعلیٰ و ارفع معیار صرف اس صورت میں قائم کیا جاسکتا ہے کہ اس کی اساس کسی ایسے اصول حیات پر رکھی گئی ہو جو اس دنیاوی زندگی کے حالات سے بلند تر ہو۔ ایسا اصول جو دلوں سے حسد اور بغض اور کینہ نکال دے' زندگی کے آفاق کو وسیع تر کر دے' زندگی کو موجود اور حاضر سے وسیع کر کے غیر موجود اور دوسرے جہاں تک وسیع کر دے۔ یہ اساس صرف اللہ پر ایمان کی اساس ہو سکتی ہے۔ آخرت پر ایمان کی اساس ہو سکتی ہے۔ یہ اساس ہو سکتی کہ انسان انعامات الٰہی پر غور کرے۔ جن میں سے سب سے بڑی نعمت' نعمت ایمان ہے۔ پھر اس نے ہر شخص کو قدر کے مطابق جو فراخی رزق دیا ہے اس پر غور کرے' پھر ہر شخص کو جو صحت اور توانائی دی ہے' اس پر غور کرے تو انسان کے سوچ کی سطح بلند ہو سکتی ہے۔ پھر اللہ کا خوف دل میں موجود ہو' اور یہ امید بھی ہو کہ جو ازدواجی زندگی ناکام ہو گئی ہے جو نقصانات و اخراجات ضائع ہو چکے' ان کے عوض اللہ تعالیٰ نعم البدل عطا کر سکتا ہے۔ غرض یہ ہے وہ اساس جسے یہ دو آیات پیش کر رہی ہیں' جن کا مقصد صرف یہ ہے کہ رشتہ کٹ رہا ہو یا جڑ رہا ہو' ہر صورت میں ایثار' بھلائی اور احسان کا رویہ اختیار کرنا چاہئے۔

زمانہ جاہلیت میں عورت پر جو مظالم ممکن تھے' ہوا کرتے تھے۔ بچپن میں اس پر مظالم ہوتے' اسے زندہ درگور کر دیا جاتا' اگر زندہ

دفن کرنے سے بچ جاتی تو وہ ذلت' مشقت اور سخت اہانت کی زندگی بسر کرتی۔ پھر جب وہ ازدواجی زندگی میں قدم رکھتی تو اسے مرد کے عام سامان اور مال کی طرح ایک مال ہی سمجھا جاتا ہے۔ مال بھی اس درجے کا کہ اس کے مقابلے میں گھوڑے کی قیمت زیادہ ہوتی۔

بہت زیادہ اگر ناچاقی کے نتیجے میں خاوند اسے طلاق دے دیتا تو یہ عضو معطل کی طرح پابند رہتی اور جب تک طلاق دینے والا خاوند رحم کھاکر اسے اجازت نہ دیتا وہ کسی دوسرے خاوند سے نکاح نہ کر سکتی یا اس کے اہل خاندان غیرت میں آکر اسے بند کر دیتے۔ اور اگر طلاق دینے والا شخص پشیمان ہو کر رجوع کرنا چاہتا تو یہ لوگ اسے اس کے پاس واپس جانے سے روکتے۔

عمومی طور پر عورت کو حقارت آمیز نظروں سے دیکھا جاتا۔ معاشرے میں اسے گھٹیا درجے کی مخلوق تصور کیا جاتا۔ غرض عرب معاشرہ میں عورت کی وہی حیثیت تھی جس طرح اس دور کے دوسرے جاہل معاشروں میں عورت کی حیثیت تھی۔

ایسے حالات میں اسلامی نظام زندگی کا نزول ہوتا ہے۔ اب ریگستان عرب کی طوفانی اور گرم ہواؤں کے بجائے' مصیبت زدہ عورت باد نسیم کے خوشگوار جھونکے محسوس کرتی ہے' جس کے کچھ نمونے ان آیات میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ اب عورت کے بارے میں یہ نقطہ نظر دیا جاتا ہے کہ مرد و عورت دونوں ایک ہی نفس سے پیدا کئے گئے ہیں۔ دونوں کا خالق ایک ہے۔ ازدواجی تعلقات کو محض ذریعہ لذت کے بجائے عبادت اور احسان کا درجہ دیا گیا۔ اسے فریضۂ حیات کا درجہ دیا گیا۔ یہ اس وقت اور ایسے حالات میں دیا گیا جبکہ عورتوں کی کسی انجمن نے کوئی مطالبہ نہ کیا تھا' نہ عورت اس وقت ان حقوق کی اہمیت سے واقف تھی۔ نہ اس وقت کے عورت پرست مردوں نے عورت کے حقوق کے لئے کوئی مطالبہ کیا تھا' نہ ایسا کوئی مطالبہ ان کے تصور ہی میں تھا' یہ تو اللہ کی رحمت اور فضل کی ایک عام بارش تھی' جس سے بیک وقت مرد اور عورت دونوں فیض یاب ہوئے اور پوری انسانیت اور انسانی زندگی کو سیراب کیا۔ وَ اِذَا طَلَّقۡتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغۡنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمۡسِكُوۡهُنَّ بِمَعۡرُوۡفٍ اَوۡ سَرِّحُوۡهُنَّ بِمَعۡرُوۡفٍ‌ وَلَا تُمۡسِكُوۡهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعۡتَدُوۡا "اور جب تم عورتوں کو طلاق دے دو اور ان کی عدت پوری ہونے کو آجائے' تو یا بھلے طریقے سے انہیں روک لو' یا بھلے طریقے سے رخصت کر دو۔ محض ستانے کی خاطر انہیں نہ روکے رکھنا کہ یہ زیادتی ہوگی۔"

فَبَلَغۡنَ اَجَلَهُنَّ کا مفہوم یہ ہے کہ وہ میعاد جو گزشتہ آیت میں مقرر کی گئی ہے' وہ پوری ہونے کو آجائے۔ اگر عدت ختم ہونے کو آجائے تو پھر دو طریقے ہیں یا تو معروف طریقے سے' اصلاح احوال کی نیت سے روک لو' یعنی طلاق سے رجوع کر لو۔ امساک معروف کا یہی مفہوم ہے۔ اگر اصلاح نیت سے روکنا مطلوب نہیں ہے تو پھر رجوع نہ کرو اور عدت پوری ہونے دو تاکہ عورت کی طلاق' طلاق بائنہ ہو جائے۔ یہ ہے معنی تسریح باحسان کا۔ یعنی بغیر کسی قسم کی ایذا رسانی کے' بغیر فدیہ طلب کرنے کے اور بغیر کسی قسم کی جاہلانہ پابندی کے کہ وہ فلاں جگہ شادی نہ کرے گی یا فلاں حدود کے اندر شادی نہ کرے گی۔ وَلَا تُمۡسِكُوۡهُنَّ ضِرَارًا "محض ستانے کی خاطر انہیں روکے نہ رکھنا

جیسا کہ اوپر ہم ایک انصاری کی روایت نقل کر آئے ہیں جس نے اپنی بیوی سے کہا تھا کہ نہ تو میں تمہیں زوجیت میں لوں گا اور نہ ہی تمہیں طلاق دوں گا۔ یہ ہے برے طریقے سے روکے رکھنا۔ محض ستانے کے لئے روکے رکھنا۔ اسلام ایسے روکنے کی اجازت نہیں دیتا۔ اس سلسلے میں ان آیات میں بار بار نہی آئی ہے۔ یہ مکرر تاکید اس لئے ہے کہ اس وقت کی عربی سوسائٹی میں یہ ظلم عام تھا۔ بلکہ یہ ظلم ہر اس سوسائٹی میں عام ہو سکتا ہے جسے اسلام نے مہذب نہ بنایا ہو اور جسے ایمان نے اونچا نہ کر دیا ہو۔

یہاں اب قرآن مجید انسان کے فہم و شعور میں جوش پیدا کرتا ہے' انسان کے جذبات شرم و حیا کو بیدار کرتا ہے۔ اور ساتھ ساتھ انہیں اپنے برے انجام سے بھی ڈراتا ہے۔ یہ سب ذرائع محض اس لئے استعمال کئے جا رہے ہیں کہ انسان کی زندگی سے جاہلیت کے آثار کو

ایک ایک کر کے مٹا دیا جائے اور اسے شرافت و عزت کے اس بلند مقام تک پہنچا دیا جائے جہاں تک اسے اسلامی نظام زندگی ہاتھ پکڑ کر لے جانا چاہتا ہے۔

وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ ۚ وَلَا تَتَّخِذُوْٓا اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا ۚ وَّاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمَآ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ وَالْحِكْمَةِ يَعِظُكُمْ بِهٖ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ

"اور جو ایسا کرے گا' وہ در حقیقت آپ اپنے ہی اوپر ظلم کرے گا۔ اللہ کی آیات کا کھیل نہ بناؤ۔ بھول نہ جاؤ کہ اللہ نے کس نعمت عظمٰی سے تمہیں سرفراز کیا ہے۔ اور وہ تمہیں نصیحت کرتا ہے کہ جو کتاب اور حکمت اس نے تم پر نازل کی ہے' اس کا احترام ملحوظ رکھو۔ اللہ سے ڈرو اور خوب جان لو کہ اللہ کو ہربات کی خبر ہے۔"

جو شخص عدت گزرنے والی عورت کو محض ستانے کے لئے یا اسے نقصان پہنچانے کے لئے روکے رکھتا ہے' وہ خود آپ اپنے اوپر ظلم کرتا ہے۔ آخر یہ بیچاری عورت بھی بنت آدم ہے اور اس طرح اس کی بہن ہے۔ اس کی جنس ہے۔ اگر یہ اس پر ظلم کرتا ہے تو گویا خود اپنے نفس پر ظلم کرتا ہے۔ پھر وہ اپنی جان پر بھی ظلم کرتا ہے کہ وہ معصیت کر کے اسے مستوجب سزا ٹھہرا رہا ہے۔ راہ اطاعت سے اسے ہٹا رہا ہے۔ یہ ہے وہ پہلا احساس جو ان آیات میں دلایا جارہا ہے۔

معاشرت اور طلاق کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے جو آیات بیان کی ہیں وہ بین ہیں' ظاہر ہیں' اور بالکل سیدھی ہیں۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ اجتماعی زندگی کی تنظیم صداقت اور سنجیدگی پر ہونا چاہئے۔ کوئی شخص ان آیات کو کھیل نہ بنائے' انہیں عورت کو محض تکلیف دینے اور اسے ایذا پہنچانے کے لئے استعمال نہیں کرنا چاہئے۔ یہ رخصتیں تو اللہ تعالیٰ نے اس لئے دیں کہ معاشرتی زندگی امن و قرار کی جگہ بن جائے۔ اللہ تعالیٰ نے مرد کو رجوع کرنے کا حق اس لئے دیا ہے میاں بیوی کی شکر رنجی ختم ہو جائے اور ان کے درمیان ازدواجی زندگی کا از سرنو آغاز ہو جائے۔ اس لئے نہیں کہ مرد اس حق سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے اس عورت کو ایذا دینے اور اس پر تشدد کرنے کے لئے استعمال کرے۔ اگر کوئی شخص اس حق کو اس مطلب کے لئے استعمال کرے گا تو وہ آیات الٰہی کا کھیل بنا رہا ہے اور ان سے مذاق کر رہا ہے۔ یہ صورت حال ہمارے موجودہ جاہلی معاشرے میں بہت عام ہے۔ لوگ فقہی رخصتوں اور فقہی مسائل کو آڑ بنا کر ان کی بناپر دھوکہ' ایذا رسانی اور شروفساد کا کام کر رہے ہیں۔ نیز مرد کو جو طلاق اور رجعت کا حق دیا گیا ہے' اس سے بھی یہ لوگ بہت ہی غلط فائدہ اٹھاتے ہیں' ہلاکت ہے ان لوگوں کے لئے جو اللہ کی آیات کا کھیل بناتے ہیں اور انہیں اپنی حیلہ سازیوں کے لئے استعمال کرتے ہیں اور اس سارے عمل پر انہیں شرم بھی نہیں آتی۔

اللہ تعالیٰ یہاں انسان کے جذبۂ حیا اور اعتراف نعمت کو بھی بیدار فرماتے ہیں۔ انہیں یاد دلایا جاتا ہے کہ ان پر اللہ نے جو انعام و اکرام کیا ہے ذرا اس پر بھی غور کریں۔ ان پر اس نے اپنی کتاب نازل فرمائی' حکمت و دانائی کے ذخائر سے انہیں نوازا۔ اس وقت کے اہل ایمان کو نعمت الٰہی کا یاد دلانا' دراصل اس عظیم انقلاب کی طرف ان کو متوجہ کرنا تھا' جو ان کی پوری زندگی میں تحریک اسلامی کی وجہ سے رونما ہو گیا تھا۔ ان مسلمانوں کے لئے انعامات الٰہی کا یاد دلایا جانا ایک گہرے مفہوم کا حامل تھا۔ شاید آج کے لوگ اس کا اچھی طرح تصور بھی نہیں کر سکتے۔

اہل ایمان' یہ محسوس کرتے تھے کہ انعامات الٰہی میں سے پہلا انعام ان پر یہ ہے کہ وہ اس کرۂ ارض پر ایک امت کی حیثیت سے موجود ہیں' ذرا غور کریں کہ عرب اور اعراب اسلام کے آنے سے پہلے تھے کیا؟ ان کی کیا حقیقت تھی؟ ان کی کوئی قابل ذکر حیثیت نہ تھی۔

ان کو دنیا نہ جانتی تھی اور نہ ہی دنیا عربوں کو کچھ سمجھتی تھی۔ وہ قبائل کی شکل میں ٹکڑے ٹکڑے تھے۔ نہ ان کا کوئی وزن تھا اور نہ کوئی قیمت تھی۔ ان کے پاس کوئی پیغام نہ تھا کہ وہ یہ پیغام انسانیت کو دیتے اور یوں وہ پہچانے جاتے۔ بلکہ ان کے پاس کوئی ایسی چیز نہ تھی جو وہ خود استعمال کرتے اور دوسری اقوام سے کم از کم بے نیاز تو ہو جاتے۔ غرض وہ تہی دامن تھے' کچھ بھی نہ تھا ان کے پاس۔ نہ کوئی مادی چیز ان کے پاس تھی' نہ کوئی معنوی چیز' نہ مصنوعات اور نہ ہی نظریات۔ وہ فقراء کی طرح غربت کی زندگی بسر کرتے تھے۔ ایک قلیل تعداد ایسی تھی جنہیں خوشحال کہا جاتا تھا' لیکن اس کی خوشحالی بھی ایسی تھی جیسے بدویانہ زندگی میں ہوتی ہے۔ مثلاً کوئی بدوی کسی ایسی جگہ خیمہ زن ہو جہاں زیادہ شکار ملتا ہو' یعنی یہ خوشحالی بھی بہت سادہ' بہت ابتدائی قسم کی تھی' جسے آج کی دنیا میں خوش حال بھی نہیں کہا جاسکتا۔

عقل' روح اور ضمیر کے لحاظ سے وہ بالکل تہی دامن تھے۔ عقاید بالکل مہمل' بے ہودہ اور بہت ہی سادہ قسم کے تھے۔ زندگی کا جو تصور ان کے دماغ میں تھا' وہ بالکل سادہ' ابتدائی اور قبائلی قسم کا تھا۔ ان کی زندگی کا اہم مشغلہ لوٹ مار اور ڈاکے ڈکیتی تک محدود تھا۔ اس سے اگر زیادہ کوئی چیز تھی تو وہ یہ تھی کہ یہ لوگ سخت منتقم المزاج تھے۔ لہو ولعب' شراب و کباب اور جوئے اور قمار کے دلدادہ تھے۔ غرض زندگی کے ہر پہلو میں یہ لوگ بالکل ابتدائی حالت میں تھے۔

یہ تھا قعرِ مذلت جس میں عرب گرے ہوئے تھے اور یہ تھا اسلام جس نے اس سے انہیں نجات دلائی بلکہ انہیں از سرِ نو پیدا کیا۔ نئی زندگی دی۔ انہیں پیدا کیا اور ایک عظیم وجود انہیں عطا کیا۔ ایسا وجود جسے پوری انسانیت نے پہچانا۔ اسلام نے انہیں ایک ایسا پیغام دیا' جو انہوں نے پوری انسانیت کو عطا کیا۔ یوں عرب بھی اس پیغام کی وجہ سے نامور ہو گئے۔

اسلام نے ان کو ایک عظیم نظریۂ حیات دیا' مکمل نظریۂ حیات۔ اس نظریۂ حیات نے اس کائنات کی وہ تشریح' دل لگتی تشریح کی جو اس سے قبل کسی نظریۂ حیات نے نہ کی تھی۔ اس نظریۂ حیات نے انہیں قیادت کا مقام عطا کیا اور انہوں نے انسانی تاریخ میں پوری انسانیت کی قیادت کی۔ بہت اعلیٰ و ارفع قیادت کی۔ برادری اقوام میں ان کی کوئی حیثیت نہ تھی۔ اس نظریۂ حیات اور اس پیغام کی بدولت انہوں نے اقوام عالم کی صف میں ایک مقام عالی اور مرتبہ بلند حاصل کیا بلکہ ان کی شخصیت امور عالم میں ممتاز شخصیت بن گئی۔ پھر اس نظریۂ حیات نے انہیں ایک ایسی عظیم قوت کی شکل میں نمودار کیا کہ پوری دنیا اس قوت سے خائف ہو گئی اور اسے قابل قدر اہمیت دینے لگی۔ حالانکہ اس سے پہلے وہ عربوں کے اردگرد پھیلی ہوئی شہنشاہیتوں کے خدام سمجھے جاتے تھے۔ یا ایسی گری پڑی قوم اور بدوی قبائل سمجھے جاتے تھے' جن کی طرف سرے سے کوئی متوجہ ہی نہ ہوتا۔ اور پھر سب سے ممتاز چیز یہ کہ اس فقر کے مقابلے میں اسلام نے ان لوگوں کو عظیم دولت و ثروت سے نوازا۔ دولت کے دروازے ہر طرف سے کھل گئے اور تمام دنیا کی ثروت ان کے پاس جمع ہو گئی۔ اور سب سے بڑی چیز یہ کہ اسلام نے امن و سلامتی دی۔ نفس کی سلامتی' گھر کا امن اور معاشرے کا سکون دیا جس میں عیش و عشرت سے زندگی بسر کرنے لگے۔ ان کے دل مطمئن ہو گئے' ان کے شعور و ضمیر میں فرحت آگئی اور جو نظام زندگی انہوں نے پایا وہ اس پر جم گئے۔ اور انہیں وہ سربلندی دی' وہ اونچا مقام دیا کہ جہاں سے وہ پوری انسانیت کے گم کردہ راہ گروہوں پر نظر ڈالتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ یہ لوگ جاہلیت کے گھٹا ٹوپ اندھیروں میں راہ حیات گم کئے ہوئے ہیں اور ٹاک ٹوئیاں مار رہے ہیں اور پوری دنیا کی یہی حالت ہے۔ اس مقام بلند پر انہیں احساس ہو جاتا ہے کہ فی الواقعہ وہی اعلون ہیں' وہی سربلند ہیں اور اللہ نے انہیں وہ دولت دی ہے جس سے پوری آباد دنیا محروم ہے۔

ان حالات میں جب قرآن مجید اہل ایمان عربوں کو اپنے انعامات یاد دلاتا ہے تو ان انعامات کی فہرست دینے یا اس دعوت تذکیر پر ان کو زیادہ سوچنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ خود ان کی پوری زندگی ہی انعامات الٰہیہ کی ایک نمونہ تھی۔ وہی لوگ تھے جو جاہلیت کے زمانے میں ایک عرصے تک رہ بس چکے تھے اور وہی تھے جو اب اسلامی نظام حیات کی برکات سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ وہ اپنی آنکھوں سے اس

عظیم انقلاب کا مشاہدہ کر رہے تھے جس کے بارے میں انسان تصور بھی نہ کر سکتا تھا اور جو اسلام اور قرآن کا ایک زندہ معجزہ تھا۔ وہ اللہ کی کتاب اور اس میں بیان کردہ حکیمانہ فلسفہ حیات کی صورت میں اس نعمت عظمیٰ کو یاد کیا' دیکھ ہی رہے تھے وہ اس کا زندہ نمونہ تھے۔ قرآن انہیں خطاب کر کے کہہ رہا تھا وَ مَآ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ جو تم پر نازل کیا گیا' انہیں مخاطب کر کے کہا گیا تم پر' تاکہ وہ اس انعام کی عظمت کا شعور پیدا کر سکیں' اس کی گہرائی تک پہنچ سکیں اور یہ دیکھ سکیں کہ یہ انعام الٰہی ان کے لئے ہے' ان پر حاوی ہے اور ان کے ساتھ چمٹا ہوا ہے۔ اللہ یہ آیات حکمت ان پر نازل کر رہا ہے جو آیات اسلامی نظام زندگی کی تشریح و تکمیل کر رہی ہیں اور مسلمانوں کا عائلی ضابطہ بھی اسی ربانی نظام کا ایک حصہ ہے۔

اب ذرا آخری احساس دیکھئے۔ آخری بار چٹکی بھری جاتی ہے۔ متنبہ کیا جاتا ہے کہ جاگو' سوچو کہ اللہ تو علیم بذات الصدور ہے۔ جانو کہ وہ جاننے والا ہے سنبھل کر رہو۔ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ وَ اعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ اللہ سے ڈرو اور خوب جان لو کہ اللہ کو ہربات کی خبر ہے۔" حیا اور شکر کے بعد اب یہاں خوف اور خبرداری کے جذبات کو بیدار کیا جا رہا ہے۔ یوں نفس انسانی کو ہر طرف سے گھیر کر اسے حسن سلوک' مشفقانہ طرز عمل اور سچائی کا رویہ اختیار کرنے پر مجبور کیا جا رہا ہے۔

پھر مزید یہ کہ اگر ایک بیچاری کو تم نے طلاق دے دی ہے' اپنی رفاقت کے لائق نہیں سمجھا ہے تو اسے پابند نہ بناؤ۔ اگر وہ عدت پوری کر دیتی ہے تو اب اسے ہر طرح سے' ہر طرف سے' آزاد چھوڑ دو۔ اگر وہ اس سابق خاوند کے ساتھ دوبارہ نکاح کرنا چاہتی ہے اور دونوں اس پر راضی ہو گئے ہیں تو تم اسے اپنی عزت کا مسئلہ نہ بناؤ' اور اسے ایسا کرنے دو۔ وَ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ اِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ "اور جب تم اپنی عورتوں کو طلاق دے چکو اور وہ اپنی عدت پوری کر لیں' تو پھر اس میں مانع نہ ہو' کہ وہ اپنے زیر تجویز شوہروں سے نکاح کر لیں' جبکہ وہ معروف طریقے سے باہم مناکحت پر راضی ہوں۔"

ترمذی میں معقل بن یسار سے روایت ہے کہ اس نے اپنی بہن کا نکاح مسلمانوں میں سے کسی سے کرا دیا تھا۔ وہ اس کے پاس کچھ عرصہ رہی پھر اس نے اسے ایک طلاق دے دی لیکن رجوع نہ کیا اور عدت ختم ہو گئی۔ اس کے بعد وہ اسے چاہنے لگا اور عورت اسے چاہنے لگی۔ اب دوسرے پیغام دینے والوں کے ساتھ اس نے بھی دوبارہ اس کا پیغام دیا۔ اس پر معقل نے اسے کہا بارے ذلیل بن ذلیل' میں نے اپنی بہن تجھے دے کر تمہیں اعزاز بخشا۔ تجھے نکاح کر کے دے دی لیکن تو نے اسے ناحق طلاق دے دی۔ خدا کی قسم! اب وہ کبھی تمہارے پاس نہ لوٹے گی۔ اور قیامت تک' معقل کہتا ہے' اللہ کو اس بات کا علم تھا کہ وہ دونوں ایک دوسرے کو چاہتے ہیں اس لئے یہ آیات نازل ہوئیں وَ اِذَا طَلَّقْتُمُ ..... لَا تَعْلَمُوْنَ جب معقل نے سنا کہ یہ آیات نازل ہو گئی ہیں تو اس نے کہا میرا رب سنتا ہے۔ میں مطیع فرمان ہوں۔ اس کے بعد اس نے اس شخص کو بلایا اور کہا میں تمہیں اپنی بہن نکاح کر کے دیتا ہوں اور میں تمہارا احترام کرتا ہوں۔

اللہ نے جان لیا کہ میاں بیوی دونوں صدق دل سے ازدواجی زندگی کا آغاز کرنا چاہتے ہیں۔ اور ایک دوسرے کی طرف مائل ہیں۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے فوراً ہمدردانہ انداز میں ان کی خواہش کو قبول کر لیا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اپنے بندوں پر کس قدر رحمت و شفقت ہے۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ اپنے بندوں کے ساتھ کس قدر نرمی چاہتا ہے۔ جماعت مسلمہ کو کس قدر تربیت دی جا رہی ہے۔ اسلامی نظام زندگی کے زیر سایہ وہ مہذب انسان بن رہے ہیں اور اسلامی نظام کے زیر سایہ ان پر ربانی عنایات کی بارش ہو رہی ہے۔ زندگی کے ہر ہر موڑ پر ان کی بہترین راہنمائی کی جا رہی ہے۔

اس ممانعت اور تنبیہ کے بعد اب مسلمانوں کے ضمیر اور ان کے وجدان کو جگایا جا رہا ہے ذٰلِكَ يُوْعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ ذٰلِكُمْ اَزْكٰى لَكُمْ وَ اَطْهَرُ ؕ وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ وَ اَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ "تمہیں نصیحت کی جاتی ہے کہ ایسی حرکت ہرگز نہ کرنا اگر تم اللہ اور روز آخرت پر ایمان لانے والے ہو' تمہارے لئے شائستہ اور پاکیزہ طریقہ یہی ہے۔ اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔"

اللہ و رسول پر ایمان ہی وہ عامل ہے جس کی وجہ سے یہ نصیحت دلوں کی تہوں تک پہنچ جاتی ہے اور یہ اس وقت ہوتا ہے کہ جب یہ دل اس دنیا سے زیادہ تر وسیع دنیا یعنی دار آخرت سے معلق ہوں۔ جب دلوں کی پسند و ناپسند اللہ کی رضا کے تابع ہو جاتی ہے۔ جب دلوں میں یہ شعور پیدا ہو جاتا ہے کہ اللہ' جو طرز عمل اختیار کرنے کی ہدایت کرتا ہے' وہی اعلیٰ ہوتا ہے' وہی شائستہ ہوتا ہے اور وہی پاکیزہ ہوتا ہے لہٰذا اہل ایمان کا فرض ہے کہ وہ اسے اپنائیں اور پاکیزگی اور شائستگی اختیار کریں' اپنے لئے بھی اور اپنے پورے معاشرے کے لئے بھی۔ آخر میں یہ تاثر دیا جاتا ہے کہ جو ذات تمہارے لئے لائحہ عمل کا انتخاب کرتی ہے' وہ ذات وہ ہے' جو سب کچھ جانتی ہے لہٰذا تمہارا فرض ہے کہ تسلیم و رضا کی حالت میں اس کی ہر بات پر لبیک کہو۔

یوں اللہ تعالیٰ عائلی زندگی کے ان چھوٹے چھوٹے معاملات کو بلند کر کے عبادت کے مقام تک پہنچا دیتے ہیں۔ ان معاملات کا تعلق بھی اللہ کی رسی سے ہو جاتا ہے۔ ان کو زمین کی آلودگیوں سے پاک کر دیا جاتا ہے۔ زندگی کی گندگیوں سے صاف کر دیا جاتا ہے اور یہ معاملات اب محض دنیاوی کھینچا تانی یا محض خاندانی اور معاشرتی کشمکش نہیں رہتے جو بالعموم طلاق کے وقت ایک فضا بن جاتی ہے' بلکہ ان کو پاک کر کے خدائی تعلیمات کے ساتھ وابستہ کر دیا جاتا ہے۔

اگلا حکم طلاق کے بعد' بچے کی پرورش اور دودھ پلانے کے بارے میں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اکثر اوقات محض تکمیل طلاق سے میاں بیوی کے باہمی معاملات ختم نہیں ہو جاتے۔ اکثر اوقات بچے رہ جاتے ہیں جن کی پیدائش میں دونوں نے حصہ لیا ہوتا ہے۔ جو اب بھی دونوں کے لئے باہمی رابطے کا ذریعہ ہوتے ہیں۔ اگر والدین کی باہم نہیں نبھتی تو چھوٹے لوتھوں کا قصور کیا ہے؟ ان کے لئے تو مناسب اور تفصیلی گارنٹی ہونی چاہئے تاکہ وہ عملی زندگی میں قدم رکھنے کے قابل بن سکیں' ایسی گارنٹی جو سب حالات میں ان کے لئے مفید ہو:

وَ الْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ ؕ وَ عَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَ كِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ اِلَّا وُسْعَهَا ۚ لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌۢ بِوَلَدِهَا وَ لَا مَوْلُوْدٌ لَّهٗ بِوَلَدِهٖ ۗ وَ عَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ ۚ فَاِنْ اَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا وَ تَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا ؕ وَ اِنْ اَرَدْتُّمْ اَنْ تَسْتَرْضِعُوْۤا اَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِذَا سَلَّمْتُمْ مَّاۤ اٰتَيْتُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ وَ اعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۲۳۳﴾

"جو باپ چاہتے ہوں کہ ان کی اولاد پوری مدت رضاعت تک دودھ پئے' تو مائیں اپنے بچوں کو کامل دو سال دودھ پلائیں۔ اس

صورت میں بچے کے باپ کو معروف طریقے سے انہیں کھانا کپڑا دینا ہوگا۔ مگر کسی پر اس کی وسعت سے بڑھ کر بار نہ ڈالنا چاہئے۔ نہ تو ماں کو اس وجہ سے تکلیف میں ڈالا جائے کہ بچہ اس کا ہے' نہ ہی باپ کو اس وجہ سے تنگ کیا جائے کہ بچہ اس کا ہے۔ دودھ پلانے والی کا یہ حق جیسا کہ بچے کے باپ پر ہے' ویسا ہی اس کے وارث پر بھی ہے۔ لیکن اگر فریقین باہمی رضامندی اور مشورے سے دودھ چھڑانا چاہیں' تو ایسا کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ اگر تمہارا خیال اپنی اولاد کو کسی غیر عورت سے دودھ پلوانے کا ہو تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں' بشرطیکہ اس کا جو کچھ معاوضہ طے کرو' وہ معروف طریقے پر ادا کرو۔ اللہ سے ڈرو اور جان رکھو کہ جو کچھ تم کرتے ہو' سب اللہ کی نظر میں ہے۔"

مطلقہ والدہ' اپنے بچوں کے بارے میں بالخصوص دودھ پینے والے بچوں کے بارے میں بری الذمہ نہیں ہے۔ اس پر اس سلسلے میں فرائض عائد ہوتے ہیں۔ یہ فرائض اللہ تعالیٰ کی جانب سے عائد ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے عورت کو آزاد نہیں چھوڑ دیا کیونکہ ایسے حالات میں' اگر عورت کو ایسے حالات میں اپنی فطرت کے مطابق آزاد چھوڑ دیا جائے تو وہ کشیدہ تعلقات کی وجہ سے کوئی غلط فیصلہ بھی کر سکتی ہے اور اس کے غلط فیصلے کے نتیجے میں بچہ ضائع ہو سکتا ہے' اسے نقصان پہنچ سکتا ہے' چنانچہ اللہ تعالیٰ یہاں بچوں کے لئے ضابطہ وضع فرماتے ہیں اور والدہ پر فرض کر دیتے ہیں کہ وہ ایسے حالات میں کوئی ایسا رویہ اختیار نہ کرے جس سے بچے کو نقصان پہنچے۔ اللہ کو ہم سے بھی' ہمارے ساتھ زیادہ محبت ہے۔ وہ سب سے زیادہ مہربان ہے بلکہ والدین سے بھی زیادہ رحیم و کریم ہے۔ ماں کا فرض ہے کہ وہ پورے دو سال تک بچے کو دودھ پلائے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ سب سے زیادہ اس بات سے واقف ہیں کہ اصول صحت کے لحاظ سے بچے کے لئے دو سال کے عرصہ تک دودھ پینا ضروری ہے۔ صحت کے اصولوں کے لحاظ سے بھی اور نفسیاتی اصولوں کے اعتبار سے بھی لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ "جو لوگ پوری مدت رضاعت تک دودھ پلانا چاہیں۔" جدید اصول صحت اور جدید اصول نفسیات کی تحقیقات سے ظاہر ہوتا ہے کہ صحت اور نفسیات دونوں اعتبار سے بچے کو اپنی ماں کی گود میں ہونا ضروری ہے۔ تاکہ دونوں لحاظ سے وہ صحیح طرح نشو و نما پا سکے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اس کی نعمت نے اس وقت تک انتظار نہ کیا کہ مسلمان از خود' اصول فطرت کے ان رازوں تک رسائی حاصل کریں اور پھر ان پر عمل پیرا ہوں۔ کیونکہ اللہ میاں صدیوں تک بچوں کی قیمتی نسل کو انسان کی جہالت کے حوالے نہیں فرما سکتے تھے۔ اللہ تو اپنے بندوں پر بے حد مہربان ہے۔ بالخصوص ان چھوٹے اور بے بس بچوں پر تو وہ بہت مہربان ہے۔ کیونکہ وہ اس کے رحم و شفقت کے زیادہ محتاج ہیں۔

لیکن والدہ پر جو فرض عائد کیا گیا ہے' اس کے مقابلے میں اسے حق بھی دیا گیا ہے اور یہ حق والد کے ذمہ ہے یہ کہ وہ والدہ کو معروف طریقے کے مطابق نفقہ اور لباس فراہم کرے۔ اور اس کے ساتھ حسن سلوک کرے' کیونکہ بچوں کے معاملے میں دونوں شریک ہیں۔ اور دودھ پینے والے اس چھوٹے بچے کے مقابلے میں دونوں مسئول ہیں' وہ اسے دودھ پلائے گی اور دیکھ بھال کرے گی اور والد اس کی ماں کو نفقہ اور لباس فراہم کرے گا۔ دونوں اپنے اپنے فرائض ادا کریں گے۔ اپنی اپنی طاقت کی حدود میں۔ لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ اِلَّا وُسْعَهَا "کسی پر اس کی وسعت سے بڑھ کر بار نہ ڈالا جائے۔"

اور یہ بھی مناسب نہیں ہے کہ والدین میں سے کوئی بھی اس بچے کو دوسرے کی اذیت و انتقام کا وسیلہ بنائے لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌ بِوَلَدِهَا وَ لَا مَوْلُوْدٌ لَّهٗ بِوَلَدِهٖ "نہ تو ماں کو اس وجہ سے تکلیف میں ڈالا جائے کہ بچہ اس کا ہے' نہ ہی باپ کو اس وجہ سے تنگ کیا جائے کہ بچہ اس کا ہے۔"

ماں کو بچے سے بے حد محبت ہوتی ہے۔ وہ بچے کے سوا زندہ نہیں رہ سکتی۔ باپ کے لئے یہ مناسب نہیں ہے کہ ماں کی محبت سے ناجائز فائدہ اٹھائے اور اسے ایسی شرائط پر مجبور کر دے جو معروف نہ ہوں۔ نہ ہی ماں کے لئے یہ مناسب ہے کہ وہ والد کی مجبوری اور اس کی محبت سے غلط فائدہ اٹھائے اور اس پر ایسا بوجھ ڈالے جو اس کی قوت برداشت سے زیادہ ہو' یا ضد میں آکر سرے سے انکار کر دے۔

اگر والد فوت ہو جائے تو اس کے ورثاء پر یہی فرائض عائد ہوتے ہیں جو بچے کے والد پر عائد ہوتے ہیں۔ وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذَٰلِكَ "اور وارث پر بھی ایسے ہی حقوق ہیں جس طرح والد پر ہیں۔" وارث کا یہ فرض ہے کہ وہ دودھ پلانے والی کو خرچہ اور کپڑے دے' معروف طریقے کے مطابق اور حسن سلوک کے ساتھ۔ اس لئے کہ معاشرہ کی اجتماعی ذمہ داریاں پوری کی جاسکیں۔ ایک طرف میت کی میراث وارثوں کو ملے تو دوسری طرف میت کے ذمہ جو عائد فرائض ہیں وہ بھی وارثوں پر عائد ہوں۔ اس طرح اگر کبھی ایسا ہو کہ بچے کا والد فوت ہو جائے تو بچہ ضائع نہ ہو۔ یوں اسلامی نظام میں ایسے بچے اور اس کی والدہ دونوں کے حقوق ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو جاتے ہیں۔

ان تمام احتیاطی تدابیر کے بعد اب قرآن مجید حالت رضاعت کی ایک دوسری صورت کی طرف متوجہ ہوتا ہے فَإِنْ أَرَادَا فِصَالًا عَن تَرَاضٍ مِّنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا "اگر فریقین باہمی رضامندی اور مشورے سے دودھ چھڑانا چاہیں' تو ایسا کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔" اگر والد اور والدہ یا وارث اور والدہ باہمی مشورے سے یہ فیصلہ کرلیں کہ دو سال کا عرصہ پورا ہونے سے پہلے ہی بچے کا دودھ چھڑا لیں' اس لئے کہ اسی میں بچے کی مصلحت ہے' مثلاً اصول صحت کے اعتبار سے یا اور کسی وجہ سے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ بشرطیکہ یہ فیصلہ دونوں فریقوں کی رضامندی اور مشورے سے ہو۔ اور اس میں بچے کے لئے کوئی مصلحت ہو' جس کی تربیت ان دونوں کے حوالہ سے ہے' جس کی دیکھ بھال ان دونوں پر من جانب اللہ فرض ہے۔

یہی حکم اس صورت میں ہے کہ والد کی خواہش یہ ہو کہ وہ اجرت پر بچے کو کسی کا دودھ پلائے۔ بشرطیکہ بچے کا مفاد اس میں ہو' بشرطیکہ وہ دودھ پلانے والی کو طے شدہ اجرت ادا کرے۔ اور اس کے ساتھ بھی حسن سلوک اختیار کرے۔ وَإِنْ أَرَدتُّمْ أَن تَسْتَرْضِعُوا أَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِذَا سَلَّمْتُم مَّا آتَيْتُم بِالْمَعْرُوفِ "اگر تمہارا خیال اپنی اولاد کو کسی غیر عورت سے دودھ پلوانے کا ہو' تو اس میں کوئی حرج نہیں' بشرطیکہ اس کا جو کچھ معاوضہ طے کرو' معروف طریقے سے ادا کرو۔" یہ ادائیگی اس بات کی ضمانت ہوگی کہ دودھ پلانے والی بچے کے ساتھ اچھا سلوک رکھے گی۔ اس کی خدمت کرے گی اور اس کی ہر ضرورت کو پوری کرے گی۔ اور آخر کار پھر اس سارے معاملہ کو اللہ کے ساتھ وابستہ کر دیا جاتا ہے۔ تقویٰ کے ساتھ وابستہ کر دیا جاتا ہے۔ اس گہرے اور لطیف شعور سے وابستہ کر دیا جاتا ہے' جو وہ کام کر سکتا ہے جو دوسرے ذرائع سے نہ کیا جاسکتا ہو یا نہ کرایا جاسکتا ہو وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ "اللہ سے ڈرو اور جان رکھو کہ جو کچھ تم کرتے ہو' سب اللہ کی نظر میں ہے۔" یہ ہے وہ آخری ضمانت۔ پختہ گارنٹی اور یہی وہ آخری ضمانت ہے جو قابل اعتماد ہے۔

مطلقات یعنی مطلقہ عورتوں کے بارے میں احکام بیان کرنے اور طلاق کے نتیجے میں پیدا ہونے والے معاملات کے بارے میں قانون سازی کے بعد' اب اس عورت کا حکم بیان ہوتا ہے' جس کا خاوند فوت ہو جائے۔ اس کی عدت کا حکم' عدت کے اختتام کے بعد اسے نکاح ثانی کی پیشکش دینے کے بارے میں اور دوران عدت کنایوں سے خواہش نکاح کرنے کے سلسلے میں احکام:

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆ وَالَّذِينَ يُتَوَفَّوْنَ مِنكُمْ وَيَذَرُونَ أَزْوَاجًا يَتَرَبَّصْنَ بِأَنفُسِهِنَّ أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ وَعَشْرًا ۖ فَإِذَا بَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا فَعَلْنَ فِي أَنفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ ۗ وَاللَّهُ بِمَا

تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿٢٣٤﴾ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا عَرَّضْتُمْ بِهٖ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَآءِ اَوْ اَكْنَنْتُمْ فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ۭ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ سَتَذْكُرُوْنَهُنَّ وَلٰكِنْ لَّا تُوَاعِدُوْھُنَّ سِرًّا اِلَّآ اَنْ تَقُوْلُوْا قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ڛ وَلَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتّٰى يَبْلُغَ الْكِتٰبُ اَجَلَهٗ ۭ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ فَاحْذَرُوْهُ ۚ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿٢٣٥﴾

۳۰
ع ۴
۱۴

"تم میں سے جو لوگ مرجائیں' ان کے پیچھے اگر ان کی بیویاں زندہ ہوں' تو وہ اپنے آپ کو چار مہینے دس دن روکے رکھیں' پھر جب ان کی عدت پوری ہو جائے' تو انہیں اختیار ہے' اپنی ذات کے معاملے میں معروف طریقے سے جو چاہیں کریں۔ تم پر اس کی کوئی ذمہ داری نہیں۔ اللہ تم سب کے اعمال سے باخبر ہے۔ زمانہ عدت میں خواہ تم ان بیوہ عورتوں کے ساتھ منگنی کا ارادہ اشارے کنایے میں ظاہر کر دو' خواہ دل میں چھپائے رکھو' دونوں صورتوں میں کوئی مضائقہ نہیں۔ اللہ جانتا ہے کہ ان کا خیال تو تمہارے دل میں آئے گا ہی۔ مگر دیکھو' خفیہ عہد و پیمان نہ کرنا۔ اگر کوئی بات کرنی ہے تو معروف طریقے سے کرو۔ اور عقد نکاح باندھنے کا فیصلہ اس وقت تک نہ کرو جب تک کہ عدت پوری نہ ہو جائے۔ خوب سمجھ لو کہ اللہ تمہارے دلوں کا حال تک جانتا ہے۔ لہٰذا اس سے ڈرو اور یہ بھی جان لو کہ اللہ بردبار ہے۔ (چھوٹی چھوٹی باتوں) سے درگزر فرماتا ہے۔"

دور جاہلیت میں' جس عورت کا خاوند فوت ہو جاتا' وہ بیچاری سخت مصیبت میں مبتلا ہو جاتی۔ اہل خاندان' مرد کے اہل خاندان اور پورا معاشرہ اس پر ظلم کرتا۔ عربوں میں رواج یہ تھا کہ جب اس کا خاوند فوت ہو جاتا تو وہ ایک خستہ حال مکان میں چلی جاتی' سب سے بے کار کپڑے پہن لیتی۔ وہ ایک سال تک خوشبو نہ لگا سکتی اور نہ ہی اور زیب و زینت کا کوئی کام کر سکتی۔ اس کے بعد یہ زمانہ جاہلیت چند جاہلانہ رسومات کی ادائیگی پر ختم ہوتا' جو سب کی سب سخت توہین آمیز اور گری ہوئی تھیں جیسا کہ جاہلیت کی دوسری رسومات ہوا کرتی تھیں۔ مثلاً وہ اونٹ کی مینگنی لیتی اور اسے پھینکتی۔ کسی سواری مثلاً گدھے پر یا بکری پر سوار ہوتی وغیرہ وغیرہ لیکن جب اسلام آیا تو اس نے اس بیچاری کو ان تمام مصیبتوں سے چھڑایا۔ اس کے کندھوں سے یہ تمام بوجھ اتار دیئے۔ اس کے بعد وہ بیک وقت دو مصیبتوں میں گرفتار نہ ہوتی' یعنی ایک تو خاوند فوت ہو جائے اور دوسرے اہل خاندان اس کے ساتھ برا سلوک کریں۔ اور اس پر شریفانہ زندگی کے تمام دروازے بند کر دیں اور مطمئن ہو کر عائلی زندگی گزارنے کے لئے آزاد نہ ہونے دیں۔ اسلام نے اس کی عدت چار ماہ اور دس دن مقرر کیے بشرطیکہ حاملہ نہ ہو' ورنہ اس کی عدت وضع حمل ہوگی' یہ عدت مطلقہ کی عدت سے قدرے طویل ہے۔ اس میں ایک طرف تو اس کا رحم صاف ہو گا۔ یہ شبہ نہ رہے گا کہ سابق خاوند کے کچھ آثار اس میں ہیں۔ اور چار ماہ دس دن کے انتظار میں یہ فائدہ بھی ہو گا کہ خاوند کے اہل خاندان کے جذبات بھی مجروح نہ ہوں گے' کیونکہ ادھر خاوند فوت ہو' ادھر عورت اگر دوسرے خاوند کی تلاش میں نکل پڑے تو خاوند کے اہل خاندان لازماً اسے محسوس کریں گے۔ اس عدت کے دوران میں اسے اچھے کپڑے زیب تن کرنے کی اجازت ہوگی' البتہ وہ ایسے کپڑے نہ پہنے گی جن کی وجہ سے لوگ اسے نکاح ثانی کا پیغام دیں۔ اور جب عدت ختم ہو جائے تو اب وہ مکمل آزاد ہے' اس پر کسی کا کوئی اختیار نہیں ہے' نہ اس کے اپنے خاندان کی طرف سے اور نہ ہی اس کے خاوند کے خاندان کی طرف سے۔ وہ معروف طریقے سے اپنے لئے جو شریفانہ رویہ اختیار کرنا چاہے' قرآن و سنت کے مطابق وہ آزادانہ طور پر اپنے لئے اختیار کر سکتی ہے۔ مسلمان عورتوں کے

لئے جو زیب و زینت جائز ہے وہ اسے اختیار کر سکتی ہے وہ پیغام نکاح حصول کر سکتی ہے۔ وہ جس سے چاہے نکاح کر سکتی ہے۔ اب اس کی راہ میں کوئی جاہلی رسم رکاوٹ نہیں ہے۔ اور نہ کوئی کھوٹا تکبر و غرور اسے روک سکتا ہے۔ اب اس پر اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی رقیب و نگراں نہیں ہے وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ "تم جو کام کرتے ہو اللہ اس سے خبردار ہے۔"

یہ تو تھی عورت۔ اب اللہ تعالیٰ ان مردوں کو بھی ہدایات دیتے ہیں جو اس عورت سے نکاح چاہتے ہیں' لیکن وہ عدت گزار رہی ہے۔ ان کو ایسی ہدایت دی جاتی ہے کہ جس میں ذاتی آداب' اجتماعی آداب' فریقین کے جذبات و میلانات اور ایسے مرحلے کے مصالح اور تقاضوں سب کو ملحوظ رکھا گیا ہے:

وَ لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا عَرَّضْتُمْ بِهٖ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَآءِ اَوْ اَكْنَنْتُمْ فِيْۤ اَنْفُسِكُمْ "زمانہ عدت میں خواہ تم ان بیوہ عورتوں کے ساتھ منگنی کا ارادہ اشارے کنایے میں ظاہر کر دو' خواہ دل میں چھپائے رکھو' دونوں صورتوں میں کوئی مضائقہ نہیں۔"

دوران عدت عورت کے ساتھ' میت کے خاندان کی کچھ ایسی یادیں وابستہ ہوتی ہیں' جو ابھی تک زندہ ہوتی ہیں۔ پھر ابھی تک اس بات کا امکان بھی ہوتا ہے کہ اس کے رحم میں حمل کے آثار نمایاں ہو جائیں یا حمل واضح ہے اور عدت وضع حمل تک متعلق ہے۔ یہ تمام حالات ایسے ہیں' جن میں کوئی شریف عورت مناسب نہیں سمجھتی کہ بصراحت' جدید ازدواجی زندگی کے سلسلے میں کوئی بات کر سکے' کیونکہ ایسے حالات میں ایسی باتوں کا ہونا مناسب نہیں ہوتا۔ اس طرح عورت کے جذبات مجروح ہوتے ہیں اور ابھی یادیں تازہ تازہ ہوئی ہیں۔

ان آداب کا لحاظ کرتے ہوئے' اشارے' کنایے میں بات کرنے کو جائز قرار دیا گیا ہے' لیکن بصراحت کوئی معاملہ طے کرنے سے منع فرمایا ہے۔ اشارہ ایسا ہو کہ اس سے عورت یہ سمجھ جائے کہ یہ مرد اسے بحیثیت رفیقہ حیات لینے میں دلچسپی رکھتا ہے' لیکن کنایات میں۔ حضرت ابن عباس ﷺ سے روایت ہے کہ انہوں نے اس اشارے کنایے کی یہ مثال بیان کی ہے۔ مجھے ایک رفیقہ حیات کی ضرورت ہے۔ مجھے عورتوں سے دلچسپی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ کوئی صالح رفیقہ حیات مل جائے۔

اسی طرح قرآن کریم نے دلی رغبت اور خواہش کی بھی کوئی ممانعت نہیں کی ہے۔ بشرطیکہ اس کی کوئی صراحت نہ کی گئی ہو اور نہ ہی اشارہ کنایہ سے ظاہر کی گئی ہو۔ اس لئے کہ دلی خواہش پر انسان کوئی ضبط نہیں کر سکتا۔ دل پر کوئی کنٹرول کس طرح کر سکتا ہے:

عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ سَتَذْكُرُوْنَهُنَّ "اللہ جانتا ہے کہ ان کا خیال تو تمہارے دل میں آئے گا ہی۔"

یہ اللہ تعالیٰ نے اس لئے جائز قرار دیا ہے کہ یہ فطری میلان ہے۔ اور بذات خود نکاح جائز ہے۔ اس میں کسی قسم کی ممانعت نہیں ہے۔ یہاں بعض خارجی اسباب کی بنا پر اس بات کی ممانعت کی گئی ہے کہ بصراحت شادی کا پیغام دوران عدت میں نہ دیا جائے۔ کوئی عملی قدم نہ اٹھایا جائے۔ اسلام فطری میلانات کا قلع قمع کرنا نہیں چاہتا۔ بلکہ وہ انہیں تہذیب کے دائرے میں لاتا ہے اور ان کی اصلاح کرتا ہے۔ وہ انسان کے طبعی جذبات کو دباتا نہیں بلکہ ان کی ضابطہ بندی کرتا ہے۔ اس معاملے میں وہ صرف ایسی پابندیاں عائد کرتا ہے جو شعور کی پاکیزگی کے خلاف ہوں اور جو ضمیر کی طہارت کے منافی ہوں: وَ لٰكِنْ لَّا تُوَاعِدُوْهُنَّ سِرًّا "مگر ان کے ساتھ خفیہ عہد و پیمان نہ کرو۔" اس پر کوئی مواخذہ نہ ہو گا کہ تم منگنی کی طرف اشاروں کنایوں میں عورت کی توجہ مبذول کر دو۔ یا تم دل ہی دل میں نکاح کی خواہش رکھو۔ ممنوع یہ ہے کہ تم خفیہ طور پر عدت گزرنے سے پہلے ہی نکاح کا کوئی معاہدہ کر لو۔ یہ فعل آداب نفسیات کے خلاف ہے' سابقہ خاوند کی یادوں کو مجروح کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ازدواجی زندگی کے دو ادوار کے درمیان عرصہ عدت کو حد فاصل رکھا ہے' انہیں ایسا کرنے سے حیا آنا چاہئے اور ایسا کرنے سے انقضائے عدت تک باز رہنا چاہئے اِلَّاۤ اَنْ تَقُوْلُوْا قَوْلًا مَّعْرُوْفًا "اگر کوئی بات کرنی ہے تو معروف طریقے سے کرو۔"

جس میں کوئی ناپسندیدہ بات نہ ہو کوئی فحش بات نہ ہو اور کوئی ایسی بات نہ ہو جس کے ذریعہ اللہ کے وہ حدود ٹوٹتے ہوں جو اس سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے مقرر کئے ہیں وَلَا تَعْزِمُوا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتّٰى يَبْلُغَ الْكِتٰبُ اَجَلَهٗ "اور عقد نکاح باندھنے کا فیصلہ اس وقت تک نہ کرو جب تک کہ عدت پوری نہ ہو جائے۔" یہاں قرآن مجید کے الفاظ قابل غور ہیں۔ یہ نہیں کہا ہے: تم نکاح نہ کرو "یا "عقد نکاح نہ باندھو" بلکہ یہ کہا ہے: "عقد نکاح باندھنے کا فیصلہ نہ کرو۔" مقصد یہ ہے کہ دوران عدت عقد نکاح باندھنے سے سخت گریز کرو۔ یہاں تک کہ اس کا فیصلہ بھی نہ کرو۔" کیونکہ فیصلہ عقد کے نتیجے ہی میں عقد وجود میں آتا ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے۔ قرآن مجید کی اس قسم کی لطیف طرز ادا کی طرف ہم اوپر آیت تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا "یہ اللہ کی حدیں ہیں ان کے قریب ہی نہ جاؤ۔" میں بیان کر آئے ہیں۔ یعنی قرآن مجید محض ایک لفظ کے انتخاب کے ذریعہ ایک ایسے مفہوم کی طرف اشارہ کر دیتا ہے جو نہایت ہی لطیف و دقیق ہوتا ہے وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ فَاحْذَرُوْهُ "خوب سمجھ لو کہ اللہ تمہارے دلوں کا حال تک جانتا ہے۔ لہٰذا اس سے ڈرو۔" یہاں آکر قرآن مجید اپنے منہاج کے عین مطابق قانون سازی اور خدا خوفی کو باہم مربوط کر دیتا ہے بتاتا ہے کہ جو خدا قانون بنا رہا ہے وہ تمہارے دلوں کے بھیدوں سے واقف ہے۔ مرد و زن کے باہمی تعلقات کا گہرے میلانات اور خفیہ جذبات سے گہرا تعلق ہے۔ اس تعلق میں دل کو دل سے ربط ہوتا ہے ایک دوسرے کی محبت دلوں کی تہوں تک پہنچی ہوئی ہوتی ہے۔ اس لئے یہاں انہیں یہ تاثر دیا جا رہا ہے کہ اللہ تو تمہارے ہر راز سے واقف ہے۔ تمہارے دلی بھیدوں کا جاننے والا ہے۔ خبردار رہو! اس سے ڈرو! اور اللہ کے حدود اور اللہ کے قانون کے سلسلے میں تمہاری حیلہ سازی یا بہانہ سازی یا کوئی بات خفیہ اور راز اس کے مقابلے میں نہ رہ سکے گی۔ خبردار!

اب تک انسانی ضمیر کو خوف دلا کر متنبہ کر کے جھنجھوڑ دیا گیا وہ جاگ اٹھا اور اس کے اندر احتیاط اور خدا خوفی پیدا کر دی گئی۔ تو خدائے شفیق و رحیم دیر کئے بغیر خود اسے تسلی بھی دے دیتے ہیں اطمینان قلب کا سامان بھی فراہم کر دیا جاتا ہے۔ یقین دلایا جاتا ہے کہ وہ تو غفور و رحیم ہے۔ وہ نہایت بردبار ہے اور سزا دہی میں جلدی نہیں کرتا۔ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ "اور جان لو کہ اللہ بردبار ہے چھوٹی چھوٹی باتوں سے درگزر فرماتا ہے۔" وہ تو بخشنے والا ہے اور اس دل کی خطا معاف کر دیتا ہے جس میں اللہ کا شعور ہو جو اپنی پوشیدہ اور نہفتہ بھیدوں کے بارے میں محتاط ہو۔ وہ حلیم اور بردبار ہے۔ سزا دہی میں جلدی نہیں کرتا اس انتظار میں کہ بیچارہ بندہ عاجز بندہ شاید باز آجائے اور توبہ تائب ہو جائے۔

سلسلہ عائلی احکام جاری ہے اب اس عورت کے احکام آتے ہیں جس کو رخصتی سے پہلے ہی طلاق دے دی جائے۔ یہ صورت ان سے مختلف ہے جن میں مطلقہ عورتوں کے ساتھ شب باشی ہو چکی ہو جن کا بیان پوری طرح ہو چکا ہے۔ یہ ایسی صورت ہے جو اکثر و بیشتر آتی رہتی ہے اس صورت میں حقوق الزوجین یہ ہیں:

☆☆☆☆☆☆☆☆☆ لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ مَا لَمْ تَمَسُّوْهُنَّ اَوْ تَفْرِضُوْا لَهُنَّ فَرِيْضَةً ۚۖ وَّمَتِّعُوْهُنَّ ۚ عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ ۚ مَتَاعًا ۢ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۲۳۶﴾ وَاِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ

قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ وَ قَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيْضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ اِلَّآ اَنْ يَّعْفُوْنَ اَوْ يَعْفُوَا الَّذِىْ بِيَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ ؕ وَاَنْ تَعْفُوْٓا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ؕ وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۲۳۷﴾

"تم پر کچھ گناہ نہیں' اگر اپنی عورتوں کو طلاق دے دو' قبل اس کے کہ ہاتھ لگانے کی نوبت آئے یا مہر مقرر ہو۔ اس صورت میں انہیں کچھ نہ کچھ دینا ضرور چاہئے۔ خوشحال آدمی اپنی مقدرت کے مطابق اور غریب اپنی مقدرت کے مطابق معروف طریقہ سے دے۔ یہ حق ہے نیک آدمیوں پر۔ اگر تم نے ہاتھ لگانے سے پہلے طلاق دی ہو' لیکن مہر مقرر کیا جاچکا ہو تو اس صورت میں نصف مہر دینا ہو گا۔ یہ اور بات ہے کہ عورت نرمی برتے (اور مہر نہ لے) یا وہ مرد' جس کے اختیار میں عقد نکاح ہے' نرمی سے کام لے (اور پورا مہر دے دے) اور تم (یعنی مرد) نرمی سے کام لو' تو یہ تقویٰ سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔ آپس کے معاملات میں فیاضی کو نہ بھولو۔ تمہارے اعمال کو اللہ دیکھ رہا ہے۔"

اس میں دو حالتیں ہیں۔ پہلی حالت یہ ہے مطلقہ کے ساتھ شب باشی نہ ہوئی ہو اور اس کا مہر بھی مقرر نہ کیا گیا ہو۔ مہر چونکہ ایک لازمی فریضہ ہے اس لئے ایسے حالات میں خاوند پر لازم ہے کہ وہ مطلقہ کو اپنی وسعت کے مطابق کچھ ساز و سامان دے۔ اس سے ایک تو عورت کی دلجوئی ہو گی اور نفسیاتی طور پر دونوں خاندانوں کے درمیان خوشگواری پیدا ہو گی اور دوسرے یہ کہ اسے کچھ نہ کچھ مالی فائدہ ہو گا۔ اس طرح کی جدائی سے عورت اپنے لئے کرب اور درد محسوس کرتی ہے۔ یہ اس کے لئے عمر بھر کا طعنہ اور دشمنی بن جاتی ہے۔ ایسے حالات میں اگر اسے بطور تحفہ کچھ دے دے تو اس سے نفسیاتی طور پر اس عورتکے برے احساسات میں کمی آسکتی ہے اور دونوں خاندانوں کے درمیان کشمکش 'کشیدہ تعلقات کے بادل چھٹ سکتے ہیں اور یہ تحفہ اس قسم کا اظہار محبت ہو سکتا ہے اور ساتھ ہی اعتراف جرم اور معذرت بھی۔ اس سے خود مرد کی جانب سے بھی اس بات کا اظہار ہو گا کہ وہ خود بھی اس طلاق اور جدائی پر متاسف ہے' معذرت خواہ ہے۔ یہ کہ یہ باہمی تعلقات کی یہ ایک ناکام کوشش تھی لیکن یہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس سے باہمی حسن سلوک کا دروازہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند کر دیا جائے۔ اس لئے یہاں وصیت کی گئی کہ اس صورت میں عورت کو کچھ نہ کچھ ضرور دیا جائے معروف طریقے کے مطابق تاکہ فریقین کے درمیان انسانی بنیادوں پر انس و محبت قائم رہ سکے اور ٹوٹے ہوئے تعلقات کی اچھی یادیں باقی رہیں۔ لیکن قرآن مجید ساتھ ساتھ یہ ہدایت بھی کر دیتا ہے کہ خاوند پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہ ڈالا جائے۔ غنی اپنی مقدرت کے مطابق اور نادار آدمی اپنی وسعت کے مطابق دے عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ "خوشحال آدمی اپنی مقدرت کے مطابق اور غریب اپنی مقدرت کے مطابق۔"

اشارہ کیا جاتا ہے کہ یہ تحفہ معروف طریقے کے مطابق اور احسان سے ہو تاکہ خشک دلوں میں تازگی پیدا ہو جائے اور باہمی تعلقات کی فضا پر جو گہرے بادل چھائے ہوئے ہیں وہ چھٹ جائیں۔ مَتَاعًا بِالْمَعْرُوْفِ حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ ○ "یہ تحفہ ہے معروف طریقے کے مطابق اور یہ حق ہے نیک آدمیوں پر۔"

دوسری صورت یہ ہے کہ مباشرت سے پہلے ہی طلاق دے دی جائے' لیکن نکاح کے ساتھ مہر بھی مقرر کر دیا گیا ہو۔ اس صورت میں

مہر کا نصف حصہ واجب ہو گا۔ یہ تو ہے قانون' لیکن قرآن مجید قانون کے بجائے معاملہ مہربانی حسن سلوک اور سہولت پر چھوڑ دیتا ہے۔ عورت اور اگر وہ نابالغ ہے تو اس کے ولی نکاح کے لئے مناسب یہ ہے کہ وہ معاف کرے اور اپنے قانونی حق سے دستبردار ہو جائے۔ ایسے کشیدہ حالات میں جو فریق اپنے حق سے دستبردار ہو جاتا ہے' دراصل بہت ہی شریف النفس' خوش اخلاق' بردبار اور معاف کرنے والا ہوتا ہے۔ وہ کسی ایسے شخص کے مال کو بھی اسی کے پاس رہنے دیتا ہے' جس کے ساتھ اب دوسرے تعلقات باقی نہیں رہے۔ لیکن قرآن مجید آخر تک اس کوشش میں ہے کہ ان کے درمیان سے کدورتیں صاف ہو جائیں۔ ان میں کوئی کدورت نہ رہے اور دل ہلکے ہو جائیں وَاَنْ تَعْفُوْٓا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰىؕ وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَیْنَكُمْؕ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ ۝ "اور اگر تم نرمی سے کام لو تو یہ تقویٰ سے زیادہ مناسب ہے۔ آپس کے معاملات میں فیاضی کو نہ بھولو' تمہارے اعمال کو اللہ دیکھ رہا ہے۔"

سب سے آخر میں تقویٰ کے احساس کو تیز کیا جاتا ہے۔ باہمی حسن سلوک اور احسان کے رویہ کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔ اور کہا جاتا ہے کہ اپنے دلوں میں یہ شعور پیدا کرو کہ اللہ تعالیٰ دیکھنے والا ہے اور نگران ہے تاکہ تمہارے باہمی تعلقات میں حسن سلوک' نرمی اور احسان کی فضا غالب رہے' چاہے تعلقات رشتہ داری کامیاب ہوں یا ناکام ہو چکے ہوں۔ دلوں کو صاف اور خالی رہنا چاہئے اور ہر حال میں تعلق باللہ قائم اور پختہ رہنا چاہئے۔

مندرجہ بالا تمام احکام میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ دلوں کا رابطہ اور تعلق باللہ مضبوط ہو جائے اور یہ سعی کی گئی ہے کہ باہمی معاشرت میں نیکی اور احسان کو عبادت سمجھا جائے' ایسی فضا کے عین بیچ میں نماز کا ذکر کر دیا جاتا ہے جو اسلام کی سب سے بڑی اور اہم عبادت ہے۔ حالانکہ ابھی تک عائلی احکام کا بیان جاری تھا اور وہ ختم نہ ہوئے تھے۔ ابھی ایک حکم یہ باقی تھا کہ جس عورت کا خاوند فوت ہو جائے۔ اس کے حق میں یہ وصیت کی جائے کہ اسے ایک سال تک گھر سے نہ نکالا جائے اور نان و نفقہ دیا جائے۔ دوسرا یہ کہ مطلقہ عورتوں کو بالعموم کچھ نہ کچھ سامان بطور تحفہ دے دیا جائے۔ اس کا مقصد یہ بتانا ہے کہ جس طرح نماز ایک عبادت ہے اس طرح ان احکام پر عمل کرنا عبادت ہے۔ یہ دونوں امور اللہ کی بندگی کے ضمن میں آتے ہیں۔ یہ ایک بہت ہی لطیف اشارہ ہے اور یہ اشارہ انسان کی تخلیق کے بارے میں' اسلامی نقطہ نظر کے عین مطابق ہے۔ اللہ تعالیٰ انسان کے بارے میں فرماتے ہیں وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ "میں نے جن و انس کو صرف اس لئے پیدا کیا ہے کہ وہ میری بندگی کریں۔" (عبادت اور بندگی صرف ان چیزوں میں نہیں ہے جو شعائر عبادات ہیں بلکہ ہر وہ کام عبادت ہے جس میں انسان اللہ کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور اس کا مقصد' اس کام سے صرف یہ ہو کہ اللہ کی اطاعت کی جائے۔

حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰىۗ وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِیْنَ ۝۲۳۸ فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًاۚ فَاِذَآ اَمِنْتُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَمَا عَلَّمَكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ۝۲۳۹

"اپنی نمازوں کی نگہداشت رکھو' خصوصاً اس نماز کی جو درمیان میں ہے۔ اللہ کے آگے اس طرح کھڑے ہو جیسے فرمان بردار غلام کھڑے ہوتے ہیں۔ بدامنی کی حالت ہو' تو خواہ پیدل ہو' خواہ سوار' جس طرح ممکن ہو نماز پڑھو۔ اور جب امن میسر آجائے تو اللہ کو اس

ا۔ روایت امام مسلم

طریقے سے یاد کرو جو اس نے تمہیں سکھادیا ہے۔ جس سے تم پہلے ناواقف تھے۔" یہاں حکم دیا ہے کہ نماز کی حفاظت کرو۔ یعنی اسے اپنے وقت پر' تمام ارکان نماز صحیح طرح ادا کرتے ہوئے تمام شرائط پوری کرتے ہوئے ادا کرو۔ راجح قول یہ ہے کہ صلوٰۃ وسطیٰ سے نماز عصر مراد ہے۔ یوم احزاب کے موقعہ پر حضور ﷺ نے فرمایا: "ہمیں ان لوگوں نے درمیانی نماز سے مشغول کر دیا' نماز عصر سے' اللہ ان کے گھروں اور دلوں کو آگ سے بھردے۔" نماز عصر کا ذکر خصوصیت کے ساتھ اس لئے کیا گیا کہ اکثر اوقات قیلولہ کے بعد نماز آتی ہے اور اس کے قضا ہونے یا موخر ہونے کا خطرہ رہتا ہے۔

راجح قول یہ ہے کہ قنوت کے معنی عاجزی اور خشوع کے ہیں۔ نماز میں اس کی یاد کی طرف یکسو ہو جانے کا مفہوم بھی اس میں داخل ہے۔ ایک وقت تک سخت ضرورت کے وقت مسلمان نماز کے دوران' ایک دوسرے کے ساتھ بات چیت کر لیا کرتے تھے۔ اس آیت کے نزول کے بعد مسلمانوں نے جان لیا کہ اللہ کے ذکر' خشوع اور یکسوئی کے سوا کوئی اور شغل نماز کے دوران جائز نہیں ہے۔

اگر حالت خوف و خطر کی ہو اور ممکن نہ ہو کہ قبلہ رخ ہو کر نماز ادا کی جاسکے تو بھی نماز ادا ہو گی۔ اسے موقوف نہ کیا جائے گا۔ اگر کوئی سواری پر سوار ہے یا کوئی خطرے کی حالت میں مدافعت پر مامور ہے تو اس کے لئے جس طرف ممکن ہو' اس طرف منہ کر کے پڑھ لے۔ اشارے سے پڑھے اور رکوع و سجود کے لئے خفیف اشارہ کرے۔ یہ نماز اس سے مختلف ہے' جسے صلوٰۃ الخوف کہا جاتا ہے۔ اور جس کی تفصیل سورت نساء میں بیان کی گئی ہے۔ وہ نماز ایسی حالت میں ادا ہوتی ہے' جہاں ایسے حالات ہوں کہ مسلمانوں کا صف میں کھڑا ہونا ممکن ہو' یوں امام کھڑا ہو اور ایک صف آکر ایک رکعت پڑھ لے۔ پھر دوسری صف آجائے اور وہ امام کے ساتھ ایک رکعت پڑھ لے۔ اور دوسری صف اس کی حفاظت میں کھڑی رہے۔ یہاں جس نماز کا ذکر کیا گیا ہے' اس سے مراد وہ نماز ہے' جو ایسے حالات میں ادا کی جارہی ہو جہاں جنگ عملاً شروع ہو' تلواریں چل رہی ہوں' فائرنگ ہو رہی ہو اور صف بستہ ہونا ممکن نہ ہو۔

یہ ایک عجیب بات ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک نماز کی اہمیت کتنی زیادہ ہے۔ مسلمانوں کو یہاں اشارتاً بتایا جاتا ہے کہ خوف اور شدائد جنگ کی انتہائی حالت میں بھی نماز پڑھی جانی چاہئے۔ یہی وجہ ہے کہ اس قدر خوف میں' عین جنگ کے وقت تلوار ہاتھ میں ہو بلکہ دشمن کی تلوار سر پر ہے' لیکن نماز ادا ہو رہی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نماز مرد مومن کا اسلحہ ہے' اس کا سامان جنگ ہے۔ وہ مومن کی ایک دفاعی تدبیر ہے۔ ایسے حالات میں مومن نماز میں کھڑا ہو جاتا ہے تو وہ اللہ تک پہنچ جاتا ہے اور یہی وقت ایسا ہوتا ہے جس میں اللہ تک پہنچنے کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔ ایسے ماحول میں' جس میں انسان چاروں طرف سے خطرات میں گرا ہوا ہو' اللہ تعالیٰ سے بہت زیادہ قریب ہو جاتا ہے۔

کیا خوب دین ہے ہمارا۔ یہ عبادت کا نظام ہے۔ مختلف شکلوں اور مختلف عنوانوں سے عبادت' جن میں نماز ایک جلی سرخی ہے۔ اس عبادت کے ذریعہ یہ دین' انسان کو مقام بلند تک پہنچاتا ہے۔ اس عبادت کے ذریعہ اللہ تعالیٰ مومن کو شدائد کے وقت ثابت قدم کر دیتا ہے۔ اس عبادت کے ذریعہ اللہ تعالیٰ' امن و امان کے دور میں ایک مومن کو مہذب بنا دیتا ہے۔ اس عبادت ہی کے ذریعہ ایک مومن پورے کا پورا ایک ایسی دنیا میں داخل ہو جاتا ہے جو امن و سکون کی دنیا ہے۔ جہاں اس پر اطمینان اور سلامتی کی بارش ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس عبادت کی سخت تاکید عین ایسے حالات میں بھی کی جاتی ہے جبکہ تلواریں سروں کو کاٹ رہی ہوں اور گردنوں کو اڑا رہی ہوں۔

اور اگر بالکل امن و امان کی حالت ہو جائے تو پھر نماز وہی ہے' جس کی تعلیم دی ہے اور مزید انہیں ہر وقت اللہ تعالیٰ کو یاد رکھنا چاہئے۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں ان باتوں کی تعلیم دی جن سے وہ واقف نہ تھے: فَإِذَآ أَمِنتُمْ فَاذْكُرُوا اللَّهَ

كَمَا عَلَّمَكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ○ "اور جب امن میسر آجائے تو اللہ کو اس طریقے سے یاد کرو' جو اس نے تمہیں سکھایا ہے۔ جس سے تم پہلے ناواقف تھے۔" لوگ جانتے ہی کیا تھے' اگر اللہ تعالیٰ انہیں نہ سکھاتا' اگر اللہ تعالیٰ زندگی کے ہر موڑ پر لحہ لحہ ان کی راہنمائی نہ فرماتا۔

ازدواجی زندگی کے احکام اور طلاق کے احکام کے دوران' نماز کی یہ سرسری بحث بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ اس سے مقصود مسلمانوں کے دل میں عبادت اور بندگی کا وہ جامع تصور بٹھانا ہے جو اسلامی نظام زندگی کا اصل الاصول ہے یعنی امتثال امر عبادت ہے چنانچہ پھر اصل موضوع یعنی عائلی احکام کو یہاں مکمل کر دیا جاتا ہے:

وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا ۖۚ وَّصِيَّةً لِّاَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ اِخْرَاجٍ ۚ فَاِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْ مَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ مِنْ مَّعْرُوْفٍ ۭ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝ وَلِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ ۭ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ ۝ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝

۳۱ ع ۷ ۱۵

"تم میں سے جو لوگ وفات پائیں اور پیچھے بیویاں چھوڑ رہے ہوں' ان کو چاہئے کہ اپنی بیویوں کے حق میں' یہ وصیت کر جائیں کہ ایک سال تک ان کو نان و نفقہ دیا جائے اور وہ گھر سے نہ نکالی جائیں۔ پھر اگر وہ خود نکل جائیں تو اپنی ذات کے معاملے میں 'معروف طریقے سے وہ جو کچھ بھی کریں اس کی کوئی ذمہ داری تم پر نہیں ہے' اللہ سب پر غالب' اقتدار رکھنے والا اور حکیم و دانا ہے۔ اس طرح جن عورتوں کو طلاق دی گئی ہو' انہیں بھی مناسب طور پر کچھ نہ کچھ دے کر رخصت کیا جائے۔ یہ حق ہے متقی لوگوں پر۔ اس طرح اللہ اپنے احکام تمہیں صاف صاف بتاتا ہے۔ امید ہے کہ تم سمجھ بوجھ کر کام کرو گے۔"

پہلی آیت میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ جس عورت کا خاوند فوت ہو' اپنی وفات سے پہلے وہ اپنی عورت کے بارے میں ضرور یہ وصیت کر جائے کہ اسے گھر سے ایک سال کے عرصہ تک کم از کم نہ نکالا جائے اور ایک سال تک اسے اجازت ہو کہ وہ اس کے مال سے اخراجات کرے۔ گھر سے نہ نکلے اور اگر وہ مناسب سمجھتی ہے کہ اس کے حالات ابھی نکاح ثانی کے لئے مناسب نہیں یا اس کے جذبات ابھی تک مجروح ہیں تو ایک سال تک گھر میں رکی رہے۔ لیکن یہ حق عورت کا ہے اور چار ماہ دس دن کی عدت گزارنے کے بعد بہرحال وہ آزاد ہو جاتی ہے اور اگر وہ گھر سے نکلنا چاہئے تو نکل سکتی ہے کیونکہ عدت تو اس پر فرض ہے اور گھر میں رہنا اس پر فرض نہیں ہے بلکہ یہ اس کا حق ہے جس کا استعمال کرنا اس پر لازمی نہیں ہے۔ بعض مفسرین نے یہ کہا کہ یہ آیت' آیت عدت کے ذریعہ منسوخ ہو گئی ہے۔ لیکن میرا خیال یہ ہے کہ نسخ کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ دونوں آیات کے محل میں اختلاف ہے۔ جیسا کہ ہم کہہ آئے ہیں عدت اس کے ذمہ ایک فریضہ ہے' جو اس نے ادا کرنا ہے اور ایک سال کا عرصہ اس کا حق ہے جس کا استعمال کرنا اس پر لازم نہیں ہے۔

فَاِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْ مَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ مِنْ مَّعْرُوْفٍ "پھر اگر وہ خود نکل جائیں' تو اپنی ذات کے معاملے میں 'معروف طریقے سے' وہ جو کچھ بھی کریں' اس کی کوئی ذمہ داری تم پر نہیں ہے۔" علیکم (تم پر) سے مراد مسلمانوں کا اجتماعی نظام ہے' جو ہر فعل کا ذمہ دار ہے جو اسلامی معاشرہ میں وقوع پذیر ہوتا ہے۔ اسلامی نظام زندگی میں' ہر نظریے کا معاملہ' ہر فرد کا معاملہ' اور

ہر واقعہ کی ذمہ داری معاشرے پر ہے۔ اگر اسلامی معاشرے میں بھلائی ہوتی ہے یا برائی دونوں کا اجر اور باز پرس اسلامی معاشرے سے بھی ہوگی۔ اسلامی جماعت کی حقیقت اور اس کے فرائض کی نوعیت کا اندازہ اس اشارے سے اچھی طرح ہو جاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تحریک اسلامی کا قیام ضروری ہے تاکہ اسلامی نظام زندگی کا قیام عمل میں آسکے۔ قیام کے بعد پھر اس نظام کی حفاظت کی جاسکے اور یہ نگرانی ہوتی رہے کہ اسلامی معاشرے کا کوئی فرد اس نظام کی خلاف ورزی یا اس سے بغاوت کا ارتکاب تو نہیں کر رہا ہے۔ اس لئے کہ افراد جماعت کے ہر چھوٹے بڑے کام کی آخری مسئولیت اسلامی جماعت ہی کے کاندھوں پر ڈالی گئی ہے۔ یہاں لفظ "تم پر" استعمال کر کے اس حقیقت کو اسلامی جماعت کے ذہن نشین کرانے کی کوشش کی گئی کہ یہ حقیقت اسلامی جماعت اور اس کے ہر فرد کے حس و شعور میں اچھی طرح جاگزین ہو جائے اور آخری تبصرہ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ○ "اللہ مقتدر اعلیٰ اور دانا ہے۔" وہ مقتدر اعلیٰ ہے اس لئے اسے حق ہے کہ جو قانون بنائے لیکن جو قانون بنائے گا حکیمانہ ہو گا۔ مقتدر ہے صاحب قوت ہے' نافرمانی پر تمہیں سزا دے سکتا ہے۔

دوسری آیت میں خدا خوفی کی دعوت دیتے ہوئے حکم دیا گیا کہ ہر مطلقہ کو رخصت کرتے وقت کچھ نہ کچھ سامان ضرور دیا جائے:

وَلِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ ○ "جن عورتوں کو طلاق دی گئی ہو' انہیں بھی مناسب طور پر کچھ نہ کچھ دے کر رخصت کیا جائے۔ یہ حق ہے متقی لوگوں پر۔"

بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ چونکہ مطلقات کے بارے میں سابقہ آیات میں تفصیلی احکام آچکے ہیں' اس لئے یہ آیت ان آیات کی وجہ سے منسوخ تصور ہوگی۔ لیکن یہاں اسے منسوخ سمجھنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اس لئے کہ متاع یعنی کچھ نہ کچھ دے دینا نفقات واجبہ سے علیحدہ ایک چیز ہے۔ اس سلسلے میں قرآن مجید نے جو احکامات اب تک دیئے ہیں' ان کی حقیقت پر غور کیا جائے تو ہر مطلقہ عورت کے لئے' تحفہ کے طور پر کچھ نہ کچھ دیئے جانے کی گنجائش رکھنا اسلامی تعلیمات کے عین مطابق ہے۔ چاہے اس کے ساتھ مباشرت ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو۔ اس کا مہر مقرر کیا گیا ہو یا مقرر نہ کیا جاسکا ہو۔ اس لئے کہ طلاق کی وجہ سے فریقین کے تعلقات میں خشکی پیدا ہو جاتی ہے' دلوں میں ایک دوسرے کے خلاف وحشت اور نفرت پیدا ہو جاتی ہے' چنانچہ ایسے موقع پر اس قسم کے حسن سلوک سے تعلقات میں تازگی پیدا ہو سکتی ہے' دلوں کی باہمی وحشت دور ہو سکتی ہے۔ یہ واحد گارنٹی ہے' جس کی سخت تاکید کی گئی ہے۔ اور جس سے جماعت مسلمہ کے تعلقات درست ہو سکتے ہیں۔

اب تیسری آیت اس میں ان تمام عائلی احکام پر تبصرہ ہے جو اس پورے سبق میں بیان کئے گئے ہیں۔ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ○ "اس طرح اللہ اپنے احکام تمہیں صاف صاف بتاتا ہے' امید ہے کہ تم سمجھ بوجھ کر کام کرو گے۔"

اس طرح اس بیان کی طرح جو اس پورے سبق میں بیان احکام کے سلسلے میں تمہاری نظروں سے گزرا' جو محکم' دقیق' الہامی اور اثر انگیز بیان ہے۔ اس طرح' اللہ صاف صاف اپنے احکام بیان کرتا ہے' اس امید پر کہ تم سمجھ بوجھ سے کام لو گے' تمہیں عقل آجائے اور تم ان احکام میں تدبر کرو گے' غور و فکر سے کام لو گے' ان کی تہہ میں جو حکمت کارفرما ہے اسے پانے کی کوشش کرو گے۔ ان میں اللہ کی شان رحمت کی جو جھلک ہے اسے دیکھ سکو گے' ان میں تمہارے لئے جو انعامات پوشیدہ ہیں انہیں جان سکو گے۔ سہولت اور تیسیر کی نعمت' سادگی اور صفائی کی نعمت' پختگی اور قطعیت کی نعمت اور پھر ان کی وجہ سے پوری زندگی پر امن و سلامتی کی موسلادھار بارش کی نعمت۔

اے کاش! لوگ اسلامی نظام کو سمجھتے۔ کاش! وہ اس پر غور کرتے۔ اگر وہ اسے صحیح طرح سمجھتے تو ان لوگوں کا اسلامی نظام سے وہ تعلق نہ ہوتا جو آج ہے' بلکہ وہ اسلامی نظام کے مطیع ہو جاتے' اس کے ہر حکم کے سامنے سر تسلیم خم کر دیتے' ان کے دل قبولیت کے لیے ہر وقت تیار ہوتے' ان کے دل اس کی ہر ہدایت پر راضی ہوتے اور ان کے قلوب اور ان کی روح' امن و سلامتی اور یقین اطمینان سے بھر جاتے۔ کاش! کہ وہ سوچتے کاش کہ وہ سمجھتے۔

درس نمبر۱۶ ایک نظر میں

اس سبق کی اہمیت اور اس میں امم سابقہ کے جو واقعات بیان کئے گئے ہیں ان کی صحیح قدر و قیمت تب ہی ذہن میں بیٹھ سکتی ہے' جب ہم پہلے اس بات کو اچھی طرح سمجھ لیں کہ قرآن امت مسلمہ کی ایک زندہ کتاب ہے' یہ کتاب اس کے لئے ایک راہنمائے ناصح ہے۔ یہ اس کی مرشد ہے۔ یہ اس کا مدرسہ ہے جہاں وہ امن سے زندگی کا سبق حاصل کرتی ہے اور یہ کہ اللہ تعالیٰ نے پہلی اسلامی جماعت کے لئے اس کتاب کو ضابطہ تربیت قرار دیا۔ جس نے اپنے وقت پر اس کتاب کی روشنی میں اسلامی نظام زندگی قائم کر کے دنیا کے سامنے پیش کیا اور یہ کہ پہلی اسلامی جماعت کو اس منصب پر اس وقت فائز کیا گیا' جب اس کتاب کے مطابق اسے اچھی طرح تیار کیا گیا' اور اللہ تعالیٰ نے اس کتاب کے لئے یہ مقام متعین کیا ہے کہ وہ تحریک اسلامی کا ایک زندہ راہنما ہو گی اور یہ کہ حضور ﷺ کی وفات کے بعد اس تحریک کی آنے والی نسلوں کے لئے یہ کتاب زندہ قائد کا کام سرانجام دے گی۔ ان آنے والی نسلوں کی تربیت کرے گی اور انہیں اس قائدانہ رول کے لئے تیار کرے گی' جس کے لئے اس کتاب نے اس تحریک کی ہر نسل کے ساتھ پختہ وعدہ کر رکھا ہے کہ جب بھی تحریک اسلامی اس کتاب کو اپنا ہادی اور راہنما تسلیم کرے گی' جب بھی اس کی ہدایت کو اپنائے گی' جب بھی تحریک اپنا یہ عہد پورا کرے گی کہ وہ مطیع فرمان ہے اور اپنا نظام زندگی اس کتاب سے اخذ کرے گی' اس کتاب کو باعث عزت سمجھے گی' اور تمام نظاموں پر اس کو غالب کرے گی تو تحریک اسلامی دنیا میں اعلیٰ مقام پائے گی۔ سب سے برتر ہو گی اور یہ اللہ کا وعدہ ہے' یہ اس کتاب کا وعدہ ہے۔

یاد رکھو! قرآن مجید محض ایک کتاب تلاوت ہی نہیں ہے یہ تو ایک مکمل دستور حیات ہے۔ یہ تو دستور تربیت ہے۔ یہ تو دستور عمل ہے اور پوری زندگی کے لئے راہ عمل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کتاب میں امم سابقہ کے تجربے اور ان کے واقعات بھی بیان کئے گئے ہیں تاکہ ان سے جماعت مسلمہ عبرت حاصل کرے' اس لئے کہ یہ کتاب نازل ہی اس لئے ہوئی کہ اس سے اس جماعت کی تربیت ہو۔ اس کتاب میں آدم علیہ السلام سے لے کر حضور ﷺ کے دور تک تمام کرۂ ارض پر ان تمام ایمانی دعوتوں کے تجربات بیان کئے گئے ہیں۔ یہ تمام دعوتی تجربات امت مسلمہ کے لئے تاقیامت زاد راہ ہیں۔ نفس انسانی کے تجربات اور حیات انسانی کے مختلف واقعاتی تجربات اس کتاب میں ضبط ہیں تاکہ امت مسلمہ اپنی راہ و رسم سے باخبر ہو جائے' اپنے لئے زاد راہ کا ساز و سامان تیار کرے اور اس راہ میں ان متنوع تجربات کا ذخیرہ اس کے لئے مشعل راہ ہو۔

یہی وہ مقاصد ہیں جن کی خاطر قرآن مجید میں بکثرت قصص بیان ہوئے' یہ قصے مختلف نوعیت رکھتے ہیں اور ہر قصے میں امت کے لئے واضح اشارات پائے جاتے ہیں۔ قرآن مجید نے اور اقوام کی نسبت' بنی اسرائیل کے قصے زیادہ تعداد میں نقل کئے ہیں' جس کی متعدد وجوہات ہیں۔ ان میں سے کچھ وجوہات ہم نے فی ظلال القرآن پارۂ اول کی تفسیر میں 'آغاز ذکر بنی اسرائیل کے موقعہ پر بیان کئے ہیں۔ کچھ وجوہات اس بارے میں مختلف مقامات پر ہم نے بیان کی ہیں۔ بعض وجوہات یہاں کی مناسبت سے پیش خدمت ہیں۔ یہ بات اللہ تعالیٰ کے علم میں تھی کہ امت مسلمہ کی بعض آنے والی نسلیں ان حالات سے گزریں گی' جن سے بنی اسرائیل گزرے۔ مسلمان اپنے دین اور اپنے نظریۂ حیات کے معاملے میں وہی موقف اختیار کریں گے جو بنی اسرائیل نے اختیار کیا۔ اس لئے قرآن مجید نے درحقیقت سرد لبراں' قصص بنی اسرائیل کی صورت میں بیان کیا ہے تاکہ مسلمانوں کی آنے والی نسلیں اس سے نصیحت حاصل کریں اور عبرت پکڑیں۔ گویا اللہ تعالیٰ نے آنے والی نسلوں کے ہاتھ میں ایک صاف آئینہ تھما دیا ہے تاکہ وہ ہر وقت اس میں اپنی شکل دیکھ سکیں' اور زندگی کی گزرگاہوں میں' جو نشیب

وفراز پیش آتے رہتے ہیں' ان کے بارے میں پیشگی ہدایات ان کے پاس ہوں۔

امت مسلمہ کی تمام نسلوں کا یہ فریضہ ہے کہ وہ اس کتاب الٰہی کو خوب سمجھ بوجھ کر پڑھیں۔ وہ اس کی ہدایات پر اس طرح غور کریں کہ گویا یہ ہدایات آج اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہو رہی ہیں' تاکہ آج کے مسائل کو ان کی روشنی میں حل کیا جائے اور انسانیت کے لئے آج کے سفر میں' اس کے مستقبل کی تاریکیاں روشن کرے۔ اس کتاب کو محض کلام جمیل سمجھ کر اور نہایت ہی حسن قرأت سے پڑھ کر ہی نہ بیٹھ جاؤ یا اسے یہ سمجھ کر نہ پڑھو کہ یہ ایک رفتہ وگزشتہ حقیقت کی محض ایک روئیداد ہے۔ اور اس حقیقت کو اس کرۂ ارض پر اب دوبارہ نہیں دہرایا جانا۔

ہم اس قرآن مجید سے اس وقت تک فائدہ نہیں اٹھاسکتے جب تک اس میں ہم روز مرہ کی واقعاتی زندگی کے حقائق کے بارے میں ہدایات کی تلاش نہ کریں۔ آج کے مسائل کا حل اور کل کے مسائل کی منصوبہ بندی' بعینہ اسی طرح جس طرح پہلی جماعت اسلامی اس کتاب کو اس طرح لیتی تھی۔ وہ اپنے تمام موجودہ مسائل کا حل اس کتاب میں تلاش کرتی تھی۔ جب بھی ہم قرآن مجید کو' اس فہم و تدبر کے ساتھ پڑھیں گے' ہمیں جس چیز کی بھی تلاش ہوگی وہ ہمیں اس میں ملے گی۔ بلکہ ہم اس میں ایسی عجیب ہدایات پائیں گے' جن تک کسی ایسے شخص کا ذہن نہیں پہنچ سکتا' جو اس کتاب کو غفلت سے پڑھتا ہے۔ ہمیں اس کا ہر کلمہ' اس کا ہر لفظ' اس کی ہر عبارت اور اس کی ہر ہدایت زندہ جاوید نظر آئے گی۔ چلتی پھرتی نظر آئے گی' زندہ و متحرک نظر آئے گی اور صاف صاف اشارہ کرتی نظر آئے گی یہ وہ ہے تمہاری راہ! وہ ہے نشان راہ! یہ کتاب کہے گی یہ کرو اور اس سے بچو' وہ کہے گی یہ تمہارا دوست ہے اور یہ دشمن ہے۔ وہ کہے گی یہ احتیاط کرو اور یہ تیاری کرو۔ غرض یہ کتاب ہماری زندگی کے ہر حال کے بارے میں ہم سے طویل اور مفصل گفتگو کرے گی اگر ہم اس انداز سے قرآن مجید کا مطالعہ کریں تو یقیناً ہمیں اس میں زندگی بھی ملے گی اور زندگی کا سازوسامان بھی ملے گا۔ اور تب ہم اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کو صحیح طرح سمجھ سکیں گے يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ "اے لوگو! جو ایمان لائے ہو' جب اللہ اور رسول تمہیں اس بات کی طرف بلائیں' جو تمہیں زندہ کرتی ہے' تو اس پر لبیک کہیں۔" قرآن کریم دراصل زندگی کی طرف دعوت ہے۔ دائمی زندگی اور تازہ بتازہ زندگی کی دعوت ہے۔ وہ تمہیں ایسی زندگی کی طرف دعوت نہیں دیتا جو گزر چکی ہے اور جو صفحات تاریخ کا ایک ورق بن چکی ہے۔

اب اس تمہید کی روشنی میں ذرا اس پورے سبق پر ایک نظر دوڑائیں۔ اس سبق میں امم سابقہ کے تجربات میں سے دو تجربے پیش کئے گئے ہیں۔ امت مسلمہ جن عملی تجربات سے گزری' ان دو تجربات کو بھی اس کے ذخیرہ میں شامل کیا جارہا ہے۔ امت کے سامنے یہ تجربات رکھ کر اسے' ان حالات کے لئے تیار کیا جارہا ہے جو اس کی زندگی میں پیش آنے والے ہیں۔ اس لئے کہ وہی ایمانی نظریۂ حیات کی وارث ہے اور امم سابقہ کے تجربات کے اس سرسبز کھیت کی دہقانی اب اس امت کے حصے میں ہے اور اسے میدان میں ایک اہم رول ادا کرنا ہے۔

پہلا تجربہ ایسے لوگوں کا ہے جن کا نام قرآن مجید نے نہیں لیا۔ یہ واقعہ قرآن مجید نے پورے اختصار کے ساتھ بیان کیا گیا ہے' لیکن جس مقصد کے لئے اسے لایا گیا ہے وہ اچھی طرح پورا ہو جاتا ہے۔ یہ ایسے لوگوں کا تجربہ ہے جو خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَهُمْ اُلُوْفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ "موت کے ڈر سے اپنے گھربار چھوڑ کر نکلے تھے اور ہزاروں کی تعداد میں تھے۔" لیکن انہیں اس خروج وفرار اور اس خوف و ہراس نے کوئی فائدہ نہیں پہنچایا اور وہ جس انجام سے ڈر کے مارے بھاگ رہے تھے اور جو اللہ نے ان کے لئے مقدر کر رکھا تھا' اس نے انہیں آلیا۔ ان سے اللہ نے کہا: مُوْتُوْا "مرجاؤ۔ ثُمَّ اَحْيَاهُمْ "پھر اس نے ان کو زندگی بخشی" نہ ان کی جدوجہد

انہیں موت سے بچا سکی اور نہ ہی دوبارہ زندگی حاصل کرنے کے لئے ان کو کچھ جدوجہد کرنی پڑی۔ دونوں حالات میں اللہ کی مشیئت نے فیصلہ کیا۔

اس تجربہ کی روشنی میں اللہ تعالیٰ مسلمانوں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور انہیں قتال فی سبیل اللہ اور انفاق فی سبیل اللہ کی ترغیب دیتے ہیں۔ اس لئے کہ زندگی دینے والا بھی وہ ہے اور مال دینے والا بھی وہ ہے۔ وہ اس بات پر قادر ہے کہ زندگی قبض کرے اور مال واپس لے لے۔

دوسرا تجربہ موسیٰ علیہ السلام کے بعد "تاریخ بنی اسرائیل سے لیا گیا ہے۔ اس دور میں ان کی مملکت تباہ ہو چکی تھی۔ ان کے مقدسات لوٹ لئے گئے تھے۔ وہ دشمنوں کے سامنے ذلیل و خوار ہو گئے تھے۔ انہوں نے اپنے نبی کی تعلیمات اور اپنے رب کی ہدایات کو پس پشت ڈال دیا تھا۔ اور اس وجہ سے وہ ذلت اور خواری میں مبتلا ہو گئے تھے۔ لیکن اس گراوٹ کے بعد وہ پھر اٹھ کھڑے ہوئے۔ انہوں نے اپنے کپڑے جھاڑے اور نئے سرے سے تیار ہوئے اور ان کے دلوں میں نظریۂ حیات پھر سے زندہ ہو گیا اور ان کے دلوں میں اپنے نظریۂ حیات کے لئے پھر سے ولولہ جہاد پیدا ہوا اور اپنے نبی سے کہنے لگے : ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُّقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ "ہمارے لئے ایک بادشاہ مقرر کر دو تاکہ ہم اللہ کی راہ میں جنگ کریں۔"

قرآن مجید جس الہامی انداز میں اس تجربے کو بیان کرتا ہے' اس سے تمام حقائق کھل کر سامنے آجاتے ہیں اور اس میں دور اول کی تحریک اسلامی کے لئے جس طرح واضح اشارات پائے جاتے ہیں' اسی طرح ہر دور کی اسلامی جماعت کے لئے واضح ہدایات موجود ہیں۔

اس قصے سے جو عام عبرت حاصل ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ مومنین کی ایک مٹھی بھر تعداد نے ثابت قدمی کا ثبوت دیا اور اس کے نتیجے میں بنی اسرائیل کو ایک عظیم کامیابی نصیب ہوئی' اگرچہ اس پورے واقعہ میں لشکر اسلام کو بار بار مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اور اس مہم میں کئی نقائص تھے جو سامنے آئے' متعدد کمزوریاں بار بار سامنے آتی رہیں۔ لشکر کشی کے مختلف مراحل میں' فوج در فوج لوگ الگ ہوتے رہے اور نافرمانیاں کرتے رہے' لیکن ان سب کمزوریوں کے باوجود بنی اسرائیل کا یہ اٹھنا' آلودگیاں جھاڑ کر اٹھنا اور نظریۂ حیات کو لے کر اٹھنا' مٹھی بھر ثابت قدم مومنین کی وجہ سے کامیاب رہا۔ اس کامیابی کے نتیجے میں بنی اسرائیل کو نصرت' عزت اور استقرار حاصل ہوا' حالانکہ اس سے پہلے وہ شکست فاش کھا چکے تھے۔ انتہائی ذلت کی زندگی بسر کر رہے تھے' طویل عرصہ تک جلاوطنی کی زندگی بسر کر رہے تھے اور ان پر دوسری اقوام مسلط تھیں۔ اس کامیابی کے نتیجے میں بنی اسرائیل میں حضرت سلیمانؑ اور حضرت داؤدؑ کی حکومت قائم ہوئی' جن کے دور میں بنی اسرائیل کی حکومت اپنے عروج کو پہنچی اور ان حضرات کا دور ان کی تاریخ کا سنہری دور قرار پایا۔ جس کے بارے میں بنی اسرائیل فخریہ انداز میں بات کرتے ہیں اور اس مقام تک بنی اسرائیل اپنی نبوت کبریٰ کے دور میں بھی نہ پہنچے تھے۔ یہ تمام کامیابی نتیجہ ہے اس نظریاتی قیام کا' جبکہ انہوں نے نظریۂ حیات کو جاہلیت کے ڈھیروں کے نیچے سے نکالا اور ایک قلیل جماعت اس نظریہ کو لے کر اس ثابت قدمی سے اٹھی اور جالوت کی عظیم افواج سے ٹکرا گئی اور کامیاب رہی۔

اس تجربے کے دوران بعض جزوی مسائل کے بارے میں بھی ہدایات دی گئی ہیں' جن کی اس دور میں اسلامی جماعت کو بہت ضرورت تھی اور اس کے لئے بہت اہم تھیں۔ مثلاً یہ کہ اجتماعی جوش و خروش بعض اوقات قائد کو دھوکے میں ڈال دیتا ہے۔ اگر وہ محض ظاہر بینی سے کام لے اور حقیقت تک پہنچنے کی کوشش نہ کرے۔ اس لئے قائدین کا یہ فرض ہے کہ وہ کارکنان کو کسی سخت معرکے میں ڈالنے سے پہلے انہیں آزمائے۔ اس واقعہ میں بنی اسرائیل کے اصحاب رائے' نبی وقت کے پاس گئے اور ان سے یہ مطالبہ کیا کہ وہ کوئی بادشاہ مقرر کر دیں' جس کی قیادت میں وہ اپنے دین کے دشمنوں سے لڑیں' اس لئے کہ ان دشمنوں نے ان سے حکومت چھین لی ہے' ان کی

دولت پر قابض ہو گئے ہیں' وہ ان مقدسات سے بھی محروم کر دیئے گئے ہیں جو آل موسیٰ اور ہارون کے عہد سے ان کے پاس محفوظ تھے۔ جب نبی وقت نے ان سے' ان کے اس ارادے کے بارے میں تسلی چاہی اور ان سے کہا: قَالَ هَلْ عَسَيْتُمْ إِنْ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ أَلَّا تُقَاتِلُوا "کہیں ایسا تو نہ ہو گا کہ تم کو لڑائی کا حکم دیا جائے اور پھر تم نہ لڑو۔" انہوں نے نبی کے اس سوال اور طلب یقین دہانی کو اچھا نہ سمجھا۔ یہ بات ان پر ناگوار گزری اور ان کا جوش و خروش انتہا کو پہنچ گیا اور کہنے لگے وَمَا لَنَا أَلَّا نُقَاتِلَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَقَدْ أُخْرِجْنَا مِنْ دِيَارِنَا وَأَبْنَائِنَا "بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہم راہ خدا میں نہ لڑیں' جبکہ ہمیں اپنے گھروں سے نکال دیا گیا ہے۔ اور ہمارے بال بچے ہم سے جدا کر دیئے گئے ہیں؟" لیکن اس جوش و خروش کی آگ جلد ہی بجھ گئی۔ جذبات کا طوفان ختم ہو گا۔ اور اس راہ کے مختلف مراحل میں وہ بیٹھتے گئے۔ جیسا کہ اس واقعہ میں تفصیلات آئی ہیں یا سیاق کلام سے معلوم ہوتا ہے فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ تَوَلَّوْا إِلَّا قَلِيلًا مِنْهُمْ مگر جب ان کو جنگ کا حکم دیا گیا تو ایک قلیل تعداد کے سوا' وہ سب پیٹھ موڑ گئے۔

"بنی اسرائیل کی تو یہ امتیازی خصوصیت ہے کہ وہ وعدہ خلافی کرتے ہیں' اپنے عہد سے پھر جاتے ہیں اور اپنے ساتھی کو آدھی راہ میں چھوڑ دیتے ہیں' لیکن ایسے واقعات انسانی جماعتوں میں بہرحال پائے جاتے ہیں اور خصوصاً ان جماعتوں میں' جو اپنے ایمان و یقین کے اعتبار سے' اور اپنی اعلیٰ تربیت کے اعتبار سے ابھی اعلیٰ معیار تک نہ پہنچی ہوں۔ اس لئے جماعتی زندگی کا یہ منظر بھی' ہر دور کی جماعت مسلمہ کے سامنے پیش کیا جانا ضروری تھا' تاکہ ہر دور کی مسلم جماعت بنی اسرائیل کے اس تجربہ سے فائدہ اٹھائے۔

اس واقعہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کے ظاہری جوش و خروش' جذباتی اور فوری اقدام کی آزمائش صرف ایک مرتبہ ہی نہ ہو بلکہ بار بار کارکنان کو آزمانا چاہئے۔ جب بنی اسرائیل کے اپنے مطالبے پر قتال فرض ہوئی تو ان کی اکثریت نے پیٹھ پھیر لی۔ وہی قلیل تعداد رہی جس نے اپنے نبی کے ساتھ کیے ہوئے عہد کو قائم رکھا۔ اور یہ وہی لوگ تھے جو پہلے تو نبی وقت کے ساتھ طالوت کی سربراہی پر لڑتے رہے کہ وہ بادشاہت کے قابل ہی نہیں ہے۔ لیکن جس وقت اس کی بادشاہی کی علامت ظاہر ہو گئی اور بنی اسرائیل کو اس کی قیادت میں وہ مقدسات واپس مل گئے جو دشمنوں کے قبضے میں چلے گئے تھے اور جنہیں فرشتوں نے اٹھا کر واپس کیا' تب بنی اسرائیل قیادت پر تو راضی ہوئے لیکن ان کی اکثریت پہلے مرحلے ہی میں جہاد سے مکر گئی۔ اور وہ پہلی آزمائش ہی میں' جو ان کے قائد نے قائم کی' ناکام ہو گئے۔

فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوتُ بِالْجُنُودِ قَالَ إِنَّ اللَّهَ مُبْتَلِيكُمْ بِنَهَرٍ فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّي وَمَنْ لَمْ يَطْعَمْهُ فَإِنَّهُ مِنِّي إِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةً بِيَدِهِ فَشَرِبُوا مِنْهُ إِلَّا قَلِيلًا مِنْهُمْ

"پھر جب طالوت لشکر لے کر چلا' تو اس نے کہا:" ایک دریا پر اللہ کی طرف سے تمہاری آزمائش ہونے ولی ہے۔ جو اس کا پانی پیئے گا وہ میرا ساتھی نہیں۔ میرا ساتھی صرف وہ ہے' جو اس سے پیاس نہ بجھائے' ہاں ایک آدھ چلو کوئی پی لے' مگر ایک گروہ قلیل کے سوا سب اس دریا سے سیراب ہوئے۔" لیکن یہ قلیل تعداد بھی آخر تک ثابت قدم نہ رہ سکی۔ یہ قلیل تعداد ایک زندہ خطرہ کے مقابلے میں آئی' جب انہوں نے دشمن کی کثرت اور ان کی قوت کو دیکھا تو حوصلے پست ہو گئے' دل متزلزل ہو گئے فَلَمَّا جَاوَزَهُ هُوَ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ قَالُوا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوتَ وَجُنُودِهِ "پھر جب طالوت اور اس کے ساتھی مسلمان دریا پار کر کے آگے بڑھے تو انہوں نے طالوت سے کہہ دیا کہ آج ہم میں جالوت اور اس کے لشکروں کا مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں ہے۔" اس شرمناک موقف کے مقابلے میں صرف چنے ہوئے اور مٹھی بھر لوگ ڈٹ گئے۔ انہوں نے اللہ تعالیٰ پر اعتماد کیا۔ اور اس پر یقین کیا اور انہوں نے کہا: كَمْ مِنْ فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللَّهِ وَاللَّهُ مَعَ الصَّابِرِينَ بارہا ایسا ہوا ہے کہ ایک قلیل گروہ اللہ کے اذن سے

ایک بڑے گروہ پر غالب آگیا ہے۔ اللہ صبر کرنے والوں کا ساتھی ہے۔" یہ تھا وہ قلیل گروہ جس نے پلڑا بھاری کر دیا۔ اور اللہ کی امداد آگئی اور بنی اسرائیل عزت اور استقرار کے مالک بن گئے۔

اس واقعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک صالح' دانشمند اور مومن قیادت کی شان کیا ہوتی ہے؟ طالوت کی قیادت میں یہ تمام صفات موجود ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ طالوت لوگوں کی نفسیات سے اچھی طرح واقف تھے۔ انہوں نے بنی اسرائیل کا ظاہری جوش و خروش دیکھ کر دھوکہ نہ کھایا۔ پھر انہوں نے صرف ایک ہی تجربہ پر اکتفانہ کیا۔ انہوں نے اپنے فوجیوں کے عزم اور اطاعت امر کا' اصل معرکہ میں داخل ہونے سے پہلے ہی امتحان لیا۔ جو لوگ ان آزمائشوں میں ناپختہ پائے گئے انہیں جدا کر کے پیچھے چھوڑ دیا گیا۔ پھر اہم بات یہ ہے کہ انہوں نے مشکل سے مشکل حالات میں بھی ہمت نہیں ہاری۔ ایک ایک تجربہ کے بعد ان کی فوج گھٹتی ہی رہی لیکن وہ بڑھتے چلے گئے اور ہمت نہ ہاری۔ آخر کار ان کے ساتھ مٹھی بھر لوگ ہی جے رہے لیکن چنے ہوئے لوگ منتخب مجاہد تھے۔ اب وہ خالص قوت ایمان اور اللہ کے بھروسہ کے بل بوتے پر معرکے میں کود پڑے اور اللہ کا وعدہ تو ایمان والوں سے سچا ہوتا ہی ہے۔

اس معرکہ میں جو آخری عبرت ہے وہ یہ ہے کہ جو انسان اللہ سے لو لگالیتا ہے تو اس کی اقدار بدل جاتی ہیں' اس کے تصورات کے پیمانے بدل جاتے ہیں' کیونکہ اس کی نظر صرف اس دنیا کے اس محدود دائرے پر ہی نہیں ہوتی بلکہ وہ اس دنیا سے بہت ہی آگے' ایک وسیع دائرے میں جاکر سوچتا ہے' جو تمام معاملات کا اصل الاصول ہے۔ یہ مٹھی بھر اہل ایمان جو ثابت قدم رہے جو معرکے میں کود پڑے' اور جنہوں نے اللہ کی نصرت حاصل کی' وہ بھی تو اپنی قلت کو دیکھ رہے تھے کہ ان کی تعداد کم ہے۔ اور ان کے دشمن تعداد میں بہت ہی زیادہ ہیں اور جنہیں دیکھ کر ان کے دوسرے بھائی' یہ پکار چکے قَالُوْا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ "ہم میں جالوت اور اس کے لشکروں کے ساتھ لڑنے کی طاقت نہیں۔" لیکن اس مٹھی بھر ایماندار جماعت نے اس صورت حال کے بارے میں وہ فیصلہ نہ کیا۔ اس نے بہت ہی مختلف فیصلہ کیا۔ انہوں نے کہا كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةًۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ "بارہا ایسا ہے کہ ایک قلیل گروہ اللہ کے اذن سے ایک بڑے گروہ پر غالب آگیا ہے۔" اس کے بعد یہ گروہ مٹھی بھر ایمانداروں کا گروہ اللہ کی طرف متوجہ ہوتا ہے: رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ "اے ہمارے رب! ہم پر صبر کا فیضان کر۔ ہمارے قدم جمادے اور کافر گروہ پر ہمیں فتح نصیب کر۔" یہ جماعت محسوس کرتی تھی کہ قوتوں کا ترازو کافروں کے ہاتھ میں نہیں ہے۔ وہ تو صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ اس لئے اس گروہ نے اللہ سے نصرت طلب کی اور اس نے وہ امداد اس ہاتھ سے وصول کرلی جس کا وہ ہاتھ مالک تھا' اور جس کو وہ ہاتھ عطا کر سکتا تھا۔ جب اہل ایمان اللہ تک پہنچ جاتے ہیں تو ان کے پیمانے بدل جاتے ہیں' ان کی اقدار بدل جاتی ہیں اور جب دل میں صحیح ایمان پیدا ہو جاتا ہے۔ اس سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ دل کی دنیا میں اللہ کے ساتھ معاملہ کرنا زیادہ بہتر ہے بجائے اس کے کہ ہم اس ظاہری اور جھوٹی دنیا کے معیاروں کے مطابق کوئی معاملہ کریں۔

ان سطور میں ہم نے ان تمام اشارات کا احاطہ نہیں کر لیا' جو اس قصہ میں پائے جاتے ہیں۔ اس لئے کہ قرآنی اشارات اور حکمتوں کا القاء ہر اس شخص پر اس کے حالات کے مطابق ہوتا ہے اور نیز اس مقدار کے مطابق ہوتا ہے جس قدر اس کو ضرورت ہوتی ہے لیکن اس کے باوجود ہر شخص اپنا حصہ لے لیتا ہے' پھر بھی اشارات اور حکم کا بڑا حصہ محفوظ ہوتا ہے اور مختلف حالات میں اپنی اپنی مقسوم کے مطابق' ان اشارات کا انکشاف ہوتا رہتا ہے۔

غرض اس عمومی تبصرے کے بعد اب مناسب ہے کہ آیات پر تفصیلاً بحث کی جائے۔

☆ ☆ ☆

درس نمبر۱۶ تشریح آیات (۲۴۳ تا ۲۵۲)

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ خَرَجُوا مِن دِيَارِهِمْ وَهُمْ أُلُوفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ فَقَالَ لَهُمُ اللَّهُ مُوتُوا ثُمَّ أَحْيَاهُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ لَذُو فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُونَ ﴿٢٤٣﴾

"تم نے ان لوگوں کے حال پر بھی کچھ غور کیا؟ جو موت کے ڈر سے اپنے گھر بار چھوڑ کر نکلے تھے اور ہزاروں کی تعداد میں تھے؟ اللہ نے ان سے فرمایا: مرجاؤ۔ اور پھر اس نے ان کو دوبارہ زندگی بخشی۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ انسان پر بڑا فضل فرمانے والا ہے مگر اکثر لوگ شکر ادا نہیں کرتے۔"

یہ لوگ کون تھے؟ جو ہزاروں کی تعداد میں تھے اور جو موت کے ڈر کے مارے اپنے گھروں سے نکلے۔ یہ کس سرزمین کے باشندے تھے؟ تاریخ کے کس دور میں نکلے یہ لوگ؟ میں ان کے بارے میں تاویلات و توجیہات کے انبار میں اپنے آپ کو گم کرنا نہیں چاہتا۔ اگر اللہ تعالیٰ کو ان کے بارے میں کچھ بتانا مقصود ہوتا تو وہ ضرور بتا دیتا۔ جیسا کہ قرآن مجید کے بعض دوسرے متعین قسم کے قصص کے سلسلے میں کیا گیا ہے۔ یہاں مطلب صرف عبرت کا حصول اور مسلمانوں کو نصیحت کرنا ہے۔ مقصد یہ نہیں ہے کہ قصہ بذات خود مطلوب ہے تاکہ اس کے اشخاص 'مقام واقعہ اور زمان واقعہ کی تفصیلات دی جائیں۔ یہاں اگر مکان و زمان کا تعین کر بھی لیا جائے تو بھی اس سے معنی و مطلب میں نہ اضافہ ہوتا ہے اور نہ کمی۔ یعنی واقعہ سے عبرت لینا۔

یہاں مقصود صرف یہ ہے کہ موت و حیات کے ظاہری اسباب اور ان اسباب سے بھی آگے اس کی اصل حقیقت کے بارے میں مسلمانوں کے نقطہ نظر کو درست کر دیا جائے۔ اور یہ بتا دیا جائے کہ موت و حیات کا فیصلہ اس دنیا میں نہیں ہوتا۔ یہ فیصلے قادر مطلق اور مدبر الکون کرتا ہے۔ اور یہ کہ اس سلسلے میں اللہ تعالیٰ کی تقدیر اور اس کے نوشتہ پر مکمل اطمینان کر لینا چاہئے۔ اور اس بابمیں انسان کو بغیر کسی خوف و خطر اور بغیر کسی جزع و فزع کے اپنے فرائض سرانجام دینے چاہئیں۔ تقدیریں لکھنے والا موجود ہے اور زندگی اور موت کا آخری فیصلہ صرف اس کے ہاتھ میں ہے۔

یہاں مقصد یہ کہنا ہے کہ موت کے ڈر سے موت ٹل نہیں جاتی اور جزع و فزع کرنے سے 'چیخنے پکارنے سے 'زندگی میں اضافہ نہیں ہو جاتا' نہ ان سے قضائے الٰہی ٹل سکتی ہے۔ نہ اجل ان سے ذرا بھی موخر ہو سکتی ہے۔ اللہ ہی ہے جو زندگی عطا کرتا ہے۔ وہی زندگی کی بخشش کرتا ہے اور وہی ہے جو زندگی واپس لے لیتا ہے۔ دونوں حالات میں اس کا فضل انسان کے شامل حال ہوتا ہے۔ لیتا ہے پھر اس کا فضل ہے اور اگر دیتا ہے پھر فضل ہے۔ زندگی دینے کے پس منظر میں اور زندگی نہ دینے کے پس منظر میں دونوں حالات میں اس کی عظیم حکمت عملی کار فرما ہوتی ہے۔ ان دونوں حالات میں لوگوں کی مصلحت ہے۔ دونوں صورتوں میں لینے میں اور دینے میں اللہ کا فضل ہمارے شامل حال ہوتا ہے: إِنَّ اللَّهَ لَذُو فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُونَ ○ "حقیقت یہ ہے کہ اللہ انسان پر بڑا فضل فرمانے والا ہے مگر اکثر لوگ شکر ادا نہیں کرتے۔"

ان لوگوں کا جمع ہونا' پھر ہزاروں کی تعداد میں جمع ہونا' پھر اپنے گھروں سے نکل پڑنا اور موت کے ڈر سے نکل پڑنا لازماً ایسے حالات میں جزع و فزع' ہائے ہو کا عالم ہو گا۔ ان کا یہ بھاگنا کسی جنگجو دشمن کے ڈر سے ہو یا کسی سخت وبائی بیماری کے پھوٹ پڑنے کی وجہ سے ہو' چاہے وجہ جو بھی ہو' اس سے موت کا کوئی علاج نہیں ہو سکتا فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا اللہ نے فرمایا: مر جاؤ۔"

اللہ تعالیٰ نے کس طرح انہیں کہا؟ وہ کس طرح مر گئے؟ کیا وہ اسی مصیبت کی وجہ سے مر گئے' جس کی وجہ سے نکلے تھے یا وہ کسی دوسرے ایسے سبب کی وجہ سے مر گئے جس کا انہیں وہم و گمان بھی نہ تھا۔ اس کی کوئی تفصیل قرآن مجید نے نہیں دی ہے۔ کیونکہ ان تفصیلات کی اس مقصد کے لئے کوئی ضرورت نہ تھی یعنی عبرت انگیزی۔ بتانا یہ ہے کہ جزع و فزع اور خوف و ہراس کی وجہ سے وہ اس چیز سے بچ نہ سکے جس کی وجہ سے وہ بھاگ رہے تھے۔ وہ موت سے بچ نہ سکے اور اللہ کے فیصلے کو رد کرنے کی کوئی سبیل نہ تھی۔ اگر وہ اللہ کی طرف لوٹ آتے اور صبر و ثبات اور سنجیدہ رویہ اختیار کرتے تو یہ زیادہ بھلا ہوتا۔

ثُمَّ اَحْيَاهُمْ "پھر اس نے ان کو دوبارہ زندگی بخشی۔" کس طرح اس نے ان لوگوں کو زندہ کر دیا؟ کیا انہی لوگوں کی موت کے بعد معجزانہ طور پر زندہ کر دیا گیا۔ یا ان کی نسلوں سے ایسے لوگ پیدا کئے جو طاقتور اور بہادر تھے اور آباؤ اجداد کی طرح آہ و بکا کرنے والے نہ تھے۔ ان باتوں کی تفصیل بھی قرآن مجید نے پیش نہیں فرمائی۔ اس لئے ہمیں بھی کوئی ضرورت نہیں ہے کہ ہم اس کی تشریح میں طرح طرح کی تاویلات شروع کر دیں اور بے سند روایات کے انباروں میں خواہ مخواہ اپنے آپ کو گم کر دیں' جیسا کہ بعض تفاسیر میں ذکر ہوا ہے۔ جو کچھ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے' وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے' بغیر کسی جدوجہد و مشقت کے ان کو دوبارہ زندگی دے دی' حالانکہ انہوں نے موت سے بچنے کے لئے جو آہ و بکا کیا تھا' اس سے ان کی موت رک نہ سکی۔

خلاصہ یہ ہے کہ آہ و بکا اللہ کے فیصلے کو نہیں روک سکتی۔ جزع و فزع سے زندگی محفوظ نہیں ہو جاتی۔ زندگی اللہ کے ہاتھ میں ہے اور یہ ایک شخص کو اس کی اپنی جدوجہد کے بغیر ہی دی جاتی ہے۔ اگر یہ ہے حقیقت تو پھر بزدلو! تمہاری آنکھیں نیند کے لئے ترس جائیں اور تمہیں کبھی چین نہ ملے:

وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۴۴﴾

"اللہ کی راہ میں جنگ کرو اور خوب جان رکھو کہ اللہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔" یہاں اس حادثے کا ایک اور پہلو سامنے آتا ہے' بلکہ اس کی مغز سامنے آ جاتی ہے۔ اور یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ مسلمانوں کی نسلوں میں سے پہلی نسل کے سامنے اس واقعہ کو کس غرض کے لئے بیان کیا گیا تھا۔ یہ کہ کہیں زندگی کی محبت کی وجہ سے کہیں تم گھروں ہی میں نہ بیٹھ جاؤ۔ موت کے ڈر سے کہیں پیچھے نہ ہٹ جاؤ۔ ان وجوہات سے کہیں جہاد فی سبیل اللہ ترک نہ کرو۔ موت و حیات تو اللہ کے ہاتھ میں ہیں اور تم صرف اللہ کی راہ میں لڑو۔ کسی اور مقصد کے لئے نہ لڑو۔ صرف اللہ کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو جاؤ اور اس کے سوا تمام جھنڈوں کو ترک کر دو۔ اس کی راہ میں لڑو اور یاد رکھو وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ "خوب جان رکھو کہ وہ سنتا ہے اور جانتا ہے۔" ——————— وہ بات سنتا ہے اور اس کے پس منظر کو بھی جانتا ہے۔ وہ سنتا ہے' اور دعا قبول کرتا ہے' اور یہ بھی جانتا ہے کہ انسان کی زندگی اور اس کے قلب و نظر کے لئے کیا مفید ہے اور کیا نہیں ہے۔ تمہارا کام صرف یہ ہے کہ تم اللہ کی راہ میں اپنی جدوجہد جاری رکھو۔ تمہارا کوئی عمل بھی ضائع نہ ہو گا۔ اور وہی ہے جو زندگی دیتا ہے اور وہی ہے جو زندگی واپس لیتا ہے۔

جہاد فی سبیل اللہ قربانی اور خرچ کا دوسرا نام ہے۔ قرآن مجید کے اکثر مقامات میں جہاد و قتال کے ساتھ ساتھ مال خرچ کرنے اور انفاق

فی سبیل اللہ کا تذکرہ بھی ہوتا ہے۔ بالخصوص حضور ﷺ کے دور میں تو انفاق فی سبیل اللہ کی اہمیت اور زیادہ اس لئے تھی کہ آپ ﷺ کے دور میں جبکہ جہاد فی سبیل اللہ میں لوگ رضاکارانہ طور پر حصہ لیتے تھے اور مجاہدین اپنا خرچہ خود برداشت کیا کرتے تھے۔ بعض اوقات ایسا ہوتا تھا کہ وہ جذبہ جہاد سے تو سرشار ہوتے تھے لیکن وہ مال سے محروم ہوتے تھے اور ان کے پاس اسلحہ اور سواری نہ ہوتی۔ اس لئے نادار مجاہدین کی سہولیات کے لئے ضروری تھا کہ لوگوں کو بار بار انفاق فی سبیل اللہ کی طرف متوجہ کیا جاتا رہے۔ اس لئے قرآن مجید بہت ہی موثر انداز میں انفاق کی دعوت دیتا ہے:

مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا فَیُضٰعِفَهٗ لَهٗۤ اَضْعَافًا كَثِیْرَةً ؕ وَ اللّٰهُ یَقْبِضُ وَ یَبْصُۜطُ ۪ وَ اِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۲۴۵﴾

"تم میں سے کون ہے، جو اللہ کو قرض حسن دے تاکہ اللہ اسے کئی گنا بڑھا چڑھا کر واپس کر دے۔ گھٹانا بھی اس کے اختیار میں ہے اور بڑھانا بھی، اور اسی کی طرف تمہیں پلٹ کر جانا ہے۔"

جس طرح موت و حیات اللہ کے ہاتھ میں ہے اور اگر اللہ نے زندگی لکھی ہوئی ہے تو موت آ ہی نہیں سکتی، اسی طرح مال انفاق فی سبیل اللہ سے نہیں جاتا۔ وہ تو اللہ میاں کے نام قرض حسن ہوتا ہے۔ اللہ اس کا ضامن ہے اور وہ اس قرض کو بڑھا چڑھا کر کئی گنا دے گا۔ دنیا میں بھی ایسے شخص کا مال بڑھے گا اسے سعادت و برکت نصیب ہوگی اور آخرت میں بھی سکون اور راحت نصیب ہوگی۔ اور آخرت میں تو ایسے شخص کے لئے بے شمار ساز و سامان اور انعام و اکرام ہوگا۔ اسے اللہ کا قرب نصیب ہوگا اور اللہ راضی ہوگا۔

انسان حرص اور بخل کی وجہ سے غنی نہیں ہوتا۔ غنا و فقر تو اللہ کے ہاتھ میں ہیں۔ انفاق اور خرچ سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے:

وَ اللّٰهُ یَقْبِضُ وَ یَبْصُۜطُ "گھٹانا بھی اللہ کے اختیار میں ہے اور بڑھانا بھی۔"

اور آخر کار تم سب نے اللہ تعالیٰ کی طرف پلٹ کر جانا ہے۔ جب تم چار و ناچار اللہ کی طرف روانہ ہو گے اور اس دنیا سے رخصت ہو گے تو اس وقت تمہیں مال و دولت سے کیا فائدہ ہوگا: وَ اِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ "اور اسی کی طرف تمہیں پلٹ کر جانا ہے۔" اگر اسی کی طرف بہرحال جانا ہے تو پھر موت سے ڈرنا کیا؟ جزع و فزع سے کیا حاصل؟ نہ موت کا ڈر اس لئے کہ اللہ کی طرف تو جانا ہے۔ نہ فقر و مسکنت کا ڈر، اس لئے کہ بہرحال اس دنیا کو چھوڑ کر جانا ہی ہے۔ تو پھر مومنین کو چاہئے کہ وہ اللہ کی راہ میں زور و شور کے ساتھ جہاد شروع کریں۔ وہ جان بھی پیش کریں اور مال بھی۔ وہ یقین کر لیں کہ اس دنیا میں ان کے گنے چنے سانس ہیں۔ زندگی محدود ہے۔ ان کا رزق مقرر ہے۔ ان کی بھلائی اسی میں ہے کہ وہ جرأت و بہادری کی زندگی گزاریں۔ شریفانہ اور آزادانہ زندگی بسر کریں۔ آخر کار جانا انہوں نے اللہ تعالیٰ ہی کے سامنے ہے۔

ان آیات کی تشریح، ایمانی ہدایات کی توضیح اور تربیتی ہدایات کے اظہار کے بعد مناسب ہے کہ قرآن مجید کے حسن ادا اور اظہار خیال کی فنی خوبیوں کو بھی کچھ وقت دیں۔ مناسب نہیں کہ یوں ہی گزر جائیں اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِیْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ وَ هُمْ اُلُوْفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ "کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا؟ جو موت کے ڈر سے اپنے گھروں سے نکلے۔" انداز تعبیر ایسا ہے، جیسا کہ یہ لوگ ہزارہا کی تعداد میں صفیں باندھے کھڑے ہیں اور ان کا معائنہ ہو رہا ہے۔ (جس طرح گارڈ آف آنر کا معائنہ ہوتا ہے) قرآن نے صرف دو الفاظ استعمال کر کے ان لوگوں کا پورا نقشہ کھینچ دیا ہے اَلَمْ تَرَ کیا آپ نے نظر نہیں ڈالی۔ ان دو الفاظ کے سوا، کوئی اور انداز

تعبیر وہ نقشہ نہیں کھینچ سکتا تھا جو ان دو الفاظ نے پردۂ تخیل پر منقش کر دیا۔ یوں لگتا ہے کہ گویا یہ لوگ صف بستہ سامنے کھڑے ہیں اور ہم انہیں دیکھ رہے ہیں۔

ان کی حالت یہ ہے کہ ہزاروں کی تعداد میں ہیں۔ گھروں سے نکل پڑے ہیں' ڈرے سہمے' پھٹی پھٹی نظروں سے ادھر ادھر دیکھ رہے ہیں۔ اب قرآن مجید صرف ایک لفظ استعمال کرتا ہے اور یہ تمام لوگ میدان معائنہ کی بجائے اب میدان مقتل میں پہنچ جاتے ہیں۔ گویا گارڈ آف آنر کا معائنہ کرنے والا حاکم مطلق ایک کاشن دیتا ہے مُوْتُوْا: "مرجاؤ" اور سب ڈھیر ہو جاتے ہیں۔ اب منظر یہ ہے کہ گارڈ آف آنر کی صفوں کی بجائے میدان میں لاشے بکھرے پڑے ہیں۔ ان کا یہ ڈر انہیں کام نہیں دیتا۔ ان کا یہ اجتماع عظیم ان کے لئے مفید ثابت نہیں ہوتا۔ تمام تر کوششیں ناکام ہو جاتی ہیں۔ صرف ایک لفظ سنائی دیتا ہے' مُوْتُوْا "مرجاؤ" اور نقشہ بدل جاتا ہے۔ اس لفظ سے احساس دلایا جاتا ہے کہ موت کے سامنے بند نہیں باندھے جا سکتے۔ تمہارا طرز عمل غلط ہے۔ یہ لفظ بتاتا ہے کہ اللہ کے فیصلے کاشن کی طرح نافذ ہوتے ہیں۔ ادھر لفظ نکلتا ہے' ادھر اس پر عمل ہو جاتا ہے۔ جس طرح پریڈ کے میدان میں ہوتا ہے۔

ثُمَّ اَحْيَاهُمْ "پھر ان کو زندہ کر دیا۔" کیونکر؟ اس کی کوئی تفصیل یہاں نہیں۔ اللہ قادر ہے' مالک ہے۔ موت و حیات کی زمام اس کے ہاتھ میں ہے۔ بندوں کے ہر معاملے میں وہ خود متصرف ہے۔ اس کا کوئی ارادہ مسترد نہیں ہو سکتا۔ وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے۔ یہ انداز تعبیر ہی بتا دیتا ہے کہ اللہ کے ہاں موت و حیات کے فیصلے کس طرح ہوتے ہیں اور امر الٰہی کے نفاذ کا منظر کیا ہوتا ہے۔ یوں جیسے پریڈ کا میدان اور کاشن پر کاشن۔

اوپر ہمارے پردۂ تخیل پر موت و حیات کا منظر تھا۔ روح کو مٹھی میں لے لینے' قبض کرنے اور پھر یکلخت اسے آزاد کرنے کے مناظر تھے۔ اس کے متصلاً بعد جب رزق کا معاملہ آتا ہے تو قرآن مجید اس کے لئے قبض اور بسط کے الفاظ استعمال کرتا ہے وَ اللّٰهُ يَقْبِضُ وَ يَبْصُۜطُ "اللہ مٹھی بند کرتا ہے اور کھولتا ہے۔" تنگی رزق و فراخی رزق کی یہ تعبیر اس لئے اختیار کی تاکہ قبض روح اور اعادۂ روح کے سابقہ مضامین سے متناسق الفاظ آجائیں۔ دونوں جگہ الفاظ کا اختصار' معانی کا استحضار قرآن مجید کا ایک عظیم الشان اعجاز ہے۔

ایک طرف عجیب منظر کشی ہے۔ دوسری طرف استعمال الفاظ میں عجیب تناسق اور ہم آہنگی ہے۔ معانی چلتے پھرتے نظر آتے ہیں اور حسن ادا کی تو کوئی انتہا نہیں ہے۔

اب قرآن مجید دوسرا تجربہ امت مسلمہ کے سامنے رکھتا ہے۔ اس کے کردار بنی اسرائیل ہیں۔ واقعہ حضرت موسیٰ کے زمانہ مابعد کا ہے: اَلَمْ تَرَ اِلَى الْمَلَاِ مِنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى ۘ اِذْ قَالُوْا لِنَبِيٍّ لَّهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُّقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ قَالَ هَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ اَلَّا تُقَاتِلُوْا ۭ قَالُوْا وَ مَا لَنَآ اَلَّا نُقَاتِلَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ قَدْ اُخْرِجْنَا مِنْ دِيَارِنَا وَ اَبْنَآىِٕنَا ۭ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ تَوَلَّوْا اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ ۭ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ۝۲۴۶

"پھر تم نے اس معاملے پر غور کیا' جو موسیٰ کے بعد سرداران بنی اسرائیل کو پیش آیا تھا؟ انہوں نے اپنے نبی سے کہا ہمارے لئے

ایک بادشاہ مقرر کر دو تاکہ ہم اللہ کی راہ میں جنگ کریں۔ نبی نے پوچھا! کیا کہیں ایسا تو نہ ہو گا کہ تم کو لڑائی کا حکم دیا جائے اور پھر تم نہ لڑو؟ وہ کہنے لگے بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہم راہ خدا میں نہ لڑیں' جبکہ ہمیں اپنے گھروں سے نکال دیا گیا ہے اور ہمارے بال بچے ہم سے جدا کر دیئے گئے ہیں؟ مگر جب ان کو جنگ کا حکم دیا گیا' تو ایک قلیل تعداد کے سوا وہ سب پیٹھ موڑ گئے' اور اللہ ان میں سے ایک ایک ظالم کو جانتا ہے۔"

کیا تو نے نہیں دیکھا! گویا یہ ابھی ابھی کا واقعہ ہے اور دیکھا ہوا منظر ہے۔ بنی اسرائیل کے سردار جمع ہوئے ہیں۔ ان کے اکابرین اور اہل الرائے کا ایک عظیم اجتماع ہے۔ وہ اپنے نبی وقت کے پاس آتے ہیں۔ سیاق کلام میں نبی کا نام بھی نہیں لیا جاتا' اس لئے کہ مقصد قصہ گوئی نہیں ہے۔ اگر نبی کا نام لیا جائے تو اس سے اس قصے کی مقصدیت میں کوئی اضافہ نہیں ہو جاتا۔ بنی اسرائیل میں نبیوں کی کثرت تھی ان کی طویل تاریخ میں بے شمار نبی مبعوث ہوئے۔ غرض یہ سردار اور یہ امراء جمع ہیں۔ وہ نبی وقت سے مطالبہ کر رہے ہیں کہ وہ ان کے اوپر ایک بادشاہ مقرر فرمادیں' جس کی کمانڈ میں وہ فی سبیل اللہ جہاد کریں۔ اس جنگ کے لئے وہ فی سبیل اللہ کا لفظ استعمال کر رہے ہیں۔ اس لئے کہ وہ جنگ کی نوعیت کا اظہار بھی کرنا چاہتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے دلوں میں ایمان نے کروٹ لی ہے۔ ایمان پیدا ہو کر کھڑا ہو گیا اور اپنے آپ کو جھاڑ کر اقدام کے لئے تیار ہو گیا۔ ان کا یہ شعور زندہ ہو گیا کہ وہ تو ایمان اور نظریۂ حیات کے حاملین ہیں۔ وہ تو حق اور سچائی کے علمبردار ہیں۔ ان کے دشمن ضلالت' کفر اور باطل کے علمبردار ہیں۔ ان کے سامنے اب ایک منزل ہے' جہاد فی سبیل اللہ کی منزل۔

غرض مقصد کی یہ وضاحت' مقصد کا تعین اور مقصد کی قطعیت سے کامرانی اور فتح مندی کی نصف منزل طے ہو جاتی ہے۔ اس لئے مومن کے ذہن میں سب سے پہلے یہ بات واضح ہو کر بیٹھ جانی چاہئے کہ وہ حق پر ہے اور اس کا دشمن باطل پر ہے۔ اس کے شعور میں مقصد متعین ہو۔ خالص اللہ کے لئے ہو۔ اس میں کسی دوسری چیز کی آمیزش نہ ہو اور نہ ہی اس میں کوئی التباس ہو جس کی وجہ سے اسے معلوم نہ ہو کہ وہ کدھر جا رہا ہے؟

نبی نے چاہا کہ وہ نیت کی پختگی اور عزم کی سچائی کے بارے میں تسلی کر لیں۔ معلوم کر لیں کہ آیا وہ اس قدر عظیم ذمہ داری کے اٹھانے کا قابل ہونا بھی رکھتے ہیں یا نہیں۔ وہ اس معاملے میں سنجیدہ ہیں۔ سوچ سمجھ کر مطالبہ کر رہے ہیں: قَالَ هَلْ عَسَيْتُمْ إِن كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ أَلَّا تُقَاتِلُوا "نبی نے پوچھا! کہیں ایسا تو نہ ہو گا کہ تم کو لڑائی کا حکم دیا جائے اور پھر تم نہ لڑو۔" آیا ایسا ممکن ہے کہ تم پر جہاد فرض کر لیا جائے اور تم اس سے پیٹھ پھیر لو؟ اب تو تم آزاد ہو۔ جہاد کرو نہ کرو۔ لیکن اگر اللہ میاں تمہارے اس مطالبے کو مان لیتے ہیں اور تم کو جہاد کا حکم دے دیا جاتا ہے تو پھر یہ تم پر فرض ہو جائے گا۔ پھر تم انکار نہ کر سکو گے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک نبی کو ایسا ہی سوال کرنا چاہئے تاکہ وہ معاملہ کی تاکید و توثیق کرے۔ انبیاء کے کلمات اور ان کی باتیں مذاق نہیں ہوا کرتیں۔ ان کے احکام میں نہ تردد ہوتا ہے اور نہ ہی ذرہ بھر تاخیر ہو سکتی ہے۔

نبی وقت کے اس استفسار پر ان کا جوش و خروش عروج تک پہنچ گیا۔ سرداران نے بتایا کہ جنگ ناگزیر ہو چکی ہے۔ اس کے سوا کوئی چارۂ کار ہی نہیں رہا ہے۔ درستی حالات کا مدار اب صرف جہاد اور جہاد فی سبیل اللہ پر ہے۔ جنگ متعین ہے اور اس میں تردد کی کوئی گنجائش نہیں قَالُوا وَمَا لَنَا أَلَّا نُقَاتِلَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَقَدْ أُخْرِجْنَا مِن دِيَارِنَا وَأَبْنَائِنَا "کہنے لگے بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہم راہ خدا میں نہ لڑیں جبکہ ہمیں اپنے گھروں سے نکالا گیا ہے اور ہمارے بال بچے ہم سے جدا کر دیئے گئے ہیں؟" معلوم ہوتا ہے کہ ان کے دل میں بات واضح ہے۔ انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ جنگ ضروری ہے۔ ان کے دشمن اللہ کے دشمن ہیں۔ اللہ کے دین کے دشمن

ہیں۔ انہیں گھروں سے نکال دیا گیا ہے۔ ان کی عورتوں اور بچوں کو غلام بنالیا گیا ہے۔ اس لئے ان دشمنوں کے ساتھ جنگ کرنا واجب ہے۔ بلکہ ان کے سامنے واحد راستہ ہی یہ ہے کہ وہ ان دشمنان حق کے ساتھ جنگ کریں۔ اس لئے اس سلسلے میں ان سے بار بار پوچھنا اور تکرار کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ یہ تو عزم صمیم ہے اور ہم یہ عزم کئے ہوئے ہیں۔

لیکن یہ وقتی بہادری' اور حالات امن کی یہ جرأت زیادہ دیر تک قائم نہیں رہتی۔ قرآن مجید جلد ہی تصویر کا دوسرا رخ سامنے کر دیتا ہے فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ تَوَلَّوْا إِلَّا قَلِيلًا مِّنْهُمْ "مگر جب ان کو جنگ کا حکم دیا گیا تو ایک قلیل تعداد کے سوا وہ سب پیٹھ موڑ گئے۔"

یہاں آکر بنی اسرائیل کی ایک اہم خصوصیت معلوم ہو جاتی ہے۔ اپنی تاریخ میں وہ سخت وعدہ خلاف رہے ہیں' عہد کر کے فوراً پھر جائیں گے۔ جب حکم دیا جائے تو اطاعت سے پہلوتہی کریں گے۔ فرائض کی ادائیگی میں پیچھے رہتے ہیں۔ حق سے منہ موڑتے ہیں اور باہمی اختلاف ان کا شعار ہوتا ہے۔ لیکن یہ صفات ہر اس جماعت میں پائی جاتی ہیں جن کی ایمانی تربیت مکمل نہ ہوئی ہو۔ جن کو دیر تک گہری اور اعلیٰ معیار کی تربیت سے گزارا گیا ہو۔ یہ ایک ایسی کمزوری ہے' جس پر تحریک کی قیادت کو خبردار رہنا چاہئے اور اس کی فکر کرنی چاہئے۔ مشکلات راہ میں اس کا خیال رکھنا چاہئے۔ یہ نہ ہو کہ مشکلات میں یہ کمزوریاں سامنے آجائیں اور معاملات مشکل ہو جائیں۔ ایسے حالات میں ان تمام انسانی جماعتوں کو پیش آتے رہتے ہیں جن کی صفوں میں ابھی تک کمزور لوگ موجود ہوں اور جن کو پگھلا کر میل کچیل سے صاف نہ کیا گیا ہو۔

اس روگردانی پر اللہ تعالیٰ صرف یہ تبصرہ فرماتے ہیں وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالظَّالِمِينَ "اللہ ان میں سے ایک ایک ظالم کو جانتا ہے۔" یہ بنی اسرائیل کے لئے سخت نکیر ہے۔ ان لوگوں نے پہلے جہاد کا مطالبہ کیا۔ جہاد فرض کیا گیا اور قبل اس کے کہ یہ لوگ میدان جہاد کو جائیں' انہوں نے انکار کر دیا۔ حالانکہ تعداد میں یہ بہت زیادہ ہیں۔ بہت ہی ذلیل ہیں یہ لوگ۔ ذلت کے ساتھ ساتھ ظالم بھی ہیں۔ اپنے نفس کے لئے بھی ظالم' نبی کے لئے بھی ظالم' حق کے لئے بھی ظالم۔ انہوں نے حق کو پہچانا اور پھر اسے اہل باطل کے ہاتھوں ذلیل ہونے دیا۔

جو شخص سچائی کو پہچان لے اور یقین کرے کہ وہ حق پر ہے۔ یہ جان لے کہ اس کا دشمن باطل پر ہے۔ جس طرح بنی اسرائیل کے سرداروں نے جان لیا تھا' اور نبی سے مطالبہ کر دیا تھا کہ وہ ان کے لئے ایک بادشاہ مقرر کر دے تاکہ اس کی سرکردگی میں وہ دشمنوں سے' اللہ کی خاطر جنگ کریں اور پھر یہ شخص پیٹھ پھیر لے اور دشمن کے مقابلے میں علم جہاد نہ بلند کرے اور نہ ہی تکالیف اٹھائے' سب کچھ جانتے ہوئے تو یہ شخص ظالم ہے' اور اسے اس ظلم کی سزا دی جائے گی۔ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالظَّالِمِينَ "اور اللہ ایک ایک ظالم کو جانتا ہے۔"

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ اللَّهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوتَ مَلِكًا ۚ قَالُوا أَنَّىٰ يَكُونُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا وَنَحْنُ أَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ ۚ قَالَ إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَاهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهُ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ ۖ وَاللَّهُ يُؤْتِي مُلْكَهُ مَن يَشَاءُ ۚ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ﴿٢٤٧﴾

"ان کے نبی نے ان سے کہا کہ اللہ نے طالوت کو تمہارے لئے بادشاہ مقرر کیا ہے۔ یہ سن کر وہ بولے: "ہم پر بادشاہ بننے کا وہ کیسے

حقدار ہو گیا؟ اس کے مقابلے میں بادشاہی کے ہم زیادہ مستحق ہیں۔ وہ تو کوئی بڑا مالدار آدمی نہیں ہے۔" نبی نے جواب دیا "اللہ نے تمہارے مقابلے میں اس کو منتخب کیا ہے اور اس کو دماغی اور جسمانی دونوں قسم کی اہلیتیں فراوانی کے ساتھ عطا فرمائی ہیں اور اللہ کو اختیار ہے کہ اپنا ملک جسے چاہے دے' اللہ بڑی وسعت رکھتا ہے اور سب کچھ اس کے علم میں ہے۔"

اس بحث و تکرار اور سوال و جواب سے بنی اسرائیل کی ایک اور خصوصیت کا اظہار ہوتا ہے' جس کا تذکرہ اس سورت میں بارہا ہوا ہے۔ ان کا مطالبہ یہ تھا کہ ان کے لئے ایک بادشاہ مقرر ہو' جس کی قیادت میں رہ کر' وہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں جنگ کریں' لیکن بادشاہ کے تقرر کا اعلان ہوتے ہی انہوں نے سر جھکالئے گردنیں پھیر لیں اور اللہ تعالیٰ کی جانب سے بادشاہ کی تقرری اور نبی کی جانب سے اسکی اطلاع پر اس معاملے میں بحث و تکرار میں مشغول ہو گئے۔ طالوت کی بادشاہت پر ناک بھنویں چڑھانے لگے۔ یہ کیوں؟ اس لئے کہ وہ طالوت کے مقابلے میں اپنے آپ کو موروثی طور پر زیادہ مستحق رکھتے ہیں۔ طالوت ایک تو شاہی خاندان سے نہ تھا' دوسرے یہ کہ وہ کوئی دولت مند آدمی نہ تھا کہ دولت کی بناپر وراثت کے استحقاق کو نظرانداز کر دیا جائے۔ غرض یہ تاریک خیالی اور یہ لجاجت بنی اسرائیل کی مستقل خصوصیت ہے۔

نبی وقت نے بتایا کہ وہ ذاتی خصوصیات کی وجہ سے زیادہ مستحق ہے اور یہ کہ اس کے انتخاب میں یہ حکمت کارفرما ہے: قَالَ إِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهٗ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ وَاللّٰهُ يُؤْتِي مُلْكَهٗ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ "اللہ نے تمہارے مقابلے میں اس کو منتخب کیا ہے اور اس کو دماغی اور جسمانی دونوں قسم کی اہلیتیں فراوانی کے ساتھ عطا فرمائی ہیں اور اللہ کو اختیار ہے کہ اپنا ملک جسے چاہے دے' اللہ بڑی وسعت رکھتا ہے اور سب کچھ اس کے علم میں ہے۔"

وہ ایک ایسا شخص ہے جسے اللہ نے چنا ہے۔ یہ تو اس کی صفت ہے۔ اس کو دماغی اور جسمانی قابلیتیں دی ہیں۔ یہ اس کی دوسری ترجیح ہے اور پھر اللہ جسے چاہے اپنا ملک عطا کر دے۔ وہ اس کا ملک ہے۔ دنیا اس کی ہے۔ وہ متصرف و مختار ہے۔ اپنے بندوں میں سے جس کو چن لے۔ وہ بڑی وسعت والا ہے۔ بڑے علم والا ہے۔ اس کے فضل و کرم پر کوئی خازن مقرر نہیں۔ اس کی داد و دہش کے لئے کوئی حد و قید نہیں ہے۔ وہی جانتا ہے کہ بھلائی کس میں ہے؟ وہی جانتا ہے کہ کس موقع پر کیا فیصلہ بہتر ہے؟

یہ ایسے معاملات ہیں جن کے بارے میں ایک مسلمان کا نقطہ نظر درست ہونا چاہئے۔ اور اس کا ذہن کدورت سے صاف ہونا چاہئے۔ لیکن کیا کیا جائے معاملہ بنی اسرائیل سے آپڑا ہے۔ ان کے نبی اس بات سے خوب واقف ہیں۔ نبی وقت جانتا ہے کہ بنی اسرائیل کا مزاج ان بلند حقائق کا متحمل ہی نہیں ہے۔ حالات ایسے ہیں کہ فہمائش کے لئے وقت نہیں ہے۔ معرکہ حق و باطل سر پر ہے۔ اس لئے مناسب یہی ہے کہ وقت کی کمی کے باعث ان کے سامنے ایک ایسا معجزہ ظاہر کر دیا جائے جس سے ان کے دل نرم ہو جائیں۔ وہ بے حد متاثر ہوں اور انہیں اس قیادت پر اطمینان ہو جائے اور وہ یقین کر لیں:

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ اٰيَةَ مُلْكِهٖٓ أَنْ يَّأْتِيَكُمُ التَّابُوْتُ فِيْهِ سَكِيْنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَبَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ اٰلُ مُوْسٰى وَاٰلُ هٰرُوْنَ تَحْمِلُهُ الْمَلٰۗئِكَةُ ۭ إِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمْ إِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۲۴۸﴾

۳۲
ع ۶
۱۶

"ان کے نبی نے کہا خدا کی طرف سے اس کے بادشاہ مقرر ہونے کی علامت یہ ہے کہ اس کے عہد میں وہ صندوق تمہیں واپس مل جائے گا' جس میں تمہارے رب کی طرف سے تمہارے لئے سکون قلب کا سامان ہے' جس میں آل موسیٰ اور آل ہارون کے چھوڑے ہوئے تبرکات ہیں اور جس کو فرشتے اٹھائے ہوئے ہیں۔ اگر تم مومن ہو' تو یہ تمہارے لئے بہت بڑی نشانی ہے۔"

تیہ کی سرگردانی اور حضرت موسیٰ ؑ کی وفات کے زمانہ مابعد میں یہ اس دور کا واقعہ ہے جبکہ حضرت یوشع نبی تھے۔ اس دور میں بنی اسرائیل کے دشمنوں نے ان پر حملہ کیا۔ ان سے ان کا علاقہ بھی چھین لیا اور وہ تبرکات بھی چھین لئے جو ان کے پاس ایک بکس میں حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کے خاندانوں سے محفوظ چلے آرہے تھے۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ اس بکس میں تورات کا وہ نسخہ بھی محفوظ تھا' جو کوہ طور پر حضرت موسیٰ ؑ کو اللہ کی طرف سے دیا گیا تھا۔ نبی وقت نے اس واقعہ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے علامت قرار دیا کہ یہ معجزہ تمہارے سامنے رونما ہو گا۔ یہ بکس تمہارے پاس لوٹ آئے گا۔ فرشتے اسے اٹھائے ہوئے ہوں گے تاکہ ان کے دلوں پر اطمینان کی بارش ہو جائے۔ نبی وقت نے فرمایا کہ یہ معجزہ اس بات کا شاہد صادق ہو گا کہ اللہ نے تمہارے لئے طالوت کو بادشاہ مقرر فرمایا ہے بشرطیکہ تمہارے دلوں میں ایمان ہو۔

سیاق کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ معجزہ رونما ہوا اور تب جا کر ان لوگوں کو یقین ہوا کہ طالوت اللہ کی جانب سے مقرر ہیں۔

اب طالوت نے ان لوگوں کو منظم کیا' جنہوں نے جہاد میں شریک ہونے سے انکار نہ کیا تھا' اور انہوں نے نبی وقت کے ساتھ جو پختہ عہد کیا تھا' وہ اس پر قائم تھے۔ یہ سب باتیں قرآن مجید نے' اپنے اسلوب قصص کے عین مطابق ترک کر دیں۔ قرآن کا اسلوب یہ ہے کہ وہ کسی قصے کے ایک منظر کے بعد متصلاً دوسرا منظر پیش کر دیتا ہے۔ اور درمیان کی غیر ضروری کڑیاں چھوڑ دیتا ہے۔ (۱) چنانچہ یہاں بھی جو منظر پیش ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ حضرت طالوت لشکر اسلام کو لے کر دشمن کی طرف مارچ کر رہے ہیں:

فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوتُ بِالْجُنُودِ قَالَ إِنَّ اللَّهَ مُبْتَلِيكُمْ بِنَهَرٍ فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّي وَمَنْ لَمْ يَطْعَمْهُ فَإِنَّهُ مِنِّي إِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةً بِيَدِهِ فَشَرِبُوا مِنْهُ إِلَّا قَلِيلًا مِنْهُمْ

"پھر جب طالوت لشکر لے کر چلا' تو اس نے کہا: "ایک دریا پر اللہ کی طرف سے تمہاری آزمائش ہونے والی ہے۔ جو اس کا پانی پئے گا وہ میرا ساتھی نہیں۔ میرا ساتھی صرف وہ ہے کہ جو اس سے پیاس نہ بجھائے ہاں ایک آدھ چلو کوئی بھر لے' تو پی لے مگر ایک گروہ قلیل کے سوا وہ سب اس دریا سے سیراب ہوئے۔"

یہاں پہلے قدم پر ہی معلوم ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت طالوت کا انتخاب کیوں فرمایا تھا۔ وہ ایک سخت معرکہ سر کرنے جا رہے تھے' لیکن ان کے ساتھ جو فوج تھی وہ شکست خوردہ لوگوں پر مشتمل تھی۔ یہ لوگ اپنی طویل تاریخ میں بار بار ہزیمت اٹھا چکے تھے۔ اور بار بار ذلت اٹھانے کے خوگر ہو گئے تھے۔ اور مقابلہ ایک فاتح اور غالب قوم کی فوج کے ساتھ تھا۔ اس لئے اس بات کی ضرورت تھی کہ وہ اس ظاہری شان و شوکت والی فوج کے مقابلے میں ایک ایسی فوج لے کر جائیں جن کے ضمیر قوت' پوشیدہ قوت سے بھرے ہوئے ہوں' یہ پوشیدہ قوت' قوت ارادہ ہی ہو سکتی ہے۔ اتنا پختہ ارادہ کہ وہ ہر خواہش اور ہر رجحان کو ضبط کر سکے۔ وہ محرومیت اور شدائد کے مقابلے

(۱) دیکھئے میری کتاب التصویر الفنی فی القرآن

میں چٹان کی طرح کھڑا ہو سکے۔ جو ضروریات اور لازمی حاجات سے بھی بلند ہو جائے۔ وہ اطاعت حکم کو ترجیح دے اور اس سلسلے میں مشکلات اور تکلیفات کو انگیز کرے۔ آزمائش کے بعد آزمائش سے گزرتا چلا جائے' لہٰذا اس چنے ہوئے' اللہ کے پسند کئے ہوئے کمانڈر کا فرض تھا کہ وہ اپنی فوج کی قوت ارادی کو آزمائے۔ اس کی ثابت قدمی اور صبر کو پرکھے کہ کس حد تک وہ خواہشات نفس اور مرغوبات کے مقابلے میں ٹھہر سکتے ہیں۔ کس قدر وہ ضروریات زندگی سے محرومی اور مشکلات کو برداشت کر سکتے ہیں۔ روایات میں آتا ہے کہ کمانڈر نے یہ حکم فوج کو اس وقت دیا جبکہ وہ سخت پیاسے تھے۔ پیاس سے نڈھال ہو رہے تھے۔ یہ جاننے کے لئے کہ کون ہے جو صبر کرتا ہے اور کون ہے جو پیٹھ پھیر کر واپس ہو جاتا ہے' الٹے پاؤں پھرتا ہے اور کنج عافیت میں بیٹھ جاتا ہے چنانچہ اس مختار کمانڈر کی فراست صحیح ثابت ہوئی۔

فَشَرِبُوْا مِنْهُ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ "ایک گروہ قلیل کے سب اس سے سیراب ہوئے۔" انہوں نے پیا لیکن خوب پیٹ بھر کر حالانکہ ان کو اجازت یہ دی گئی تھی کہ وہ صرف ہاتھ سے ایک آدھ چلو بھر کر پی لیں۔ اس قدر کہ پیاس کی تیزی ختم ہو جائے۔ لیکن یہ معلوم نہ ہو کہ وہ واپس ہونا چاہتے ہیں۔ ان لوگوں کی اکثریت نے گویا ہتھیار ڈال دیئے۔ پیاس کے سامنے' اور پیٹھ پھیر لی دشمن سے' اس لئے یہ جدا ہو گئے۔ یہ اس قابل ہی نہ تھے کہ طالوت اور اس کے ساتھیوں کے ذمہ جو مہم سر کرنی تھی اس میں ان کو شریک کیا جائے۔ بہتری اسی میں تھی۔ دانشمندی یہی تھی کہ وہ اس فوج سے الگ ہو جائیں جس نے فی الواقعہ جنگ لڑنی ہے۔ یہ دراصل کمزوری' شکست اور ناکامی کا بیج تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ فوج کی کامیابی عظیم تعداد کی وجہ سے نہیں ہوا کرتی بلکہ پختہ ارادے اور مضبوط ایمان' مضبوط دل اور مستقل مزاجی سے ہوا کرتی ہے۔

اس تجربہ سے معلوم ہوا کہ صرف چھپی ہوئی نیت ہی کافی نہیں بلکہ عملی تجربہ بھی ضروری ہے۔ میدان جنگ میں قدم رکھنے سے پہلے اس راہ کے نشیب و فراز سے واقفیت ضروری ہے۔ اس تجربہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے لئے جو قائد چنا تھا وہ کس قدر اولوالعزم تھا۔ اس کی ہمت کی بلندی تو دیکھو کہ اکثر لوگوں نے اعلان جہاد کے وقت ہی انکار کر دیا لیکن اس کا ارادہ متزلزل نہ ہوا۔ پھر پہلے تجربہ ہی میں اس کی فوج کی اکثریت ناکام رہی اور انہوں نے پیٹھ پھیر لی۔ لیکن وہ ثابت قدم رہا اور اپنی راہ پر گامزن رہا۔

یہاں پہلے تجربے نے جیش طالوت کو اگرچہ چھان کر رکھ دیا تھا' کمزور لوگ اگرچہ الگ ہو گئے تھے لیکن اب بھی تجربات کا سلسلہ جاری ہے:

فَلَمَّا جَاوَزَهٗ هُوَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ ۙ قَالُوْا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ ؕ

"پھر جب طالوت اور اس کے ساتھی مسلمان دریا پار کر کے آگے بڑھے تو انہوں نے طالوت سے کہہ دیا کہ آج ہم میں جالوت اور اس کے لشکروں کا مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں ہے۔" اب یہاں آکر فی الواقعہ وہ ایک قلیل تعداد میں رہ گئے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ دشمن کے پاس ایک عظیم قوت ہے۔ جالوت جیسا کمانڈر اس کی قیادت کر رہا ہے۔ وہ مومن ہیں انہوں نے اپنے نبی کے ساتھ جو عہد کیا تھا' اس پر وہ اب بھی قائم ہیں۔ لیکن وہ اپنی آنکھوں سے حالات کو دیکھ رہے ہیں' وہ صدق دل سے محسوس کر رہے ہیں کہ وہ اس عظیم قوت کے ساتھ مقابلے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔ اب یہ آخری اور فیصلہ کن تجربہ ہے۔ یہ تجربہ کہ کون دنیا کی ظاہری قوت پر بھروسہ کرتا ہے اور کون ہے جو ظاہری قوت کے مقابلے میں اللہ کی عظیم قوت پر بھروسہ کرتا ہے۔ ایسے معاملات میں صرف وہ لوگ ہی ثابت رہ سکتے ہیں جن کا ایمان مکمل ہو چکا ہو' ان کے دل اللہ تک پہنچ چکے ہوں۔ ان کی قدریں بدل چکی ہوں۔ وہ خیر و شر کا امتیاز اپنے ایمان کی روشنی میں متعین کرتے ہوں' ان ظاہری حالات کی روشنی میں نہیں جن میں عوام الناس گرفتار ہوتے ہیں۔

یہاں آکر اب وہ مٹھی بھر گنے چنے اہل ایمان کھل کر سامنے آجاتے ہیں۔ وہ لوگ جن کی تعداد کا تعین ایمان کی روشنی میں ہوتا ہے۔ جن کا پیمانہ ظاہر بین کے پیمانوں سے مختلف ہوتا ہے:

قَالَ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوا اللّٰهِ ۙ كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةًۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۗ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۲۴۹﴾

"لیکن جو لوگ یہ سمجھتے تھے کہ انہیں اللہ سے ملنا ہے انہوں نے کہا بارہا ایسا ہوا ہے کہ ایک قلیل گروہ اللہ کے اذن سے ایک بڑے گروہ پر غالب آگیا ہے۔" یہ ہے اصول ان لوگوں کا جنہیں یقین ہوتا ہے کہ وہ ایک دن اللہ کے سامنے پیش ہوں گے' کہ بارہا ایسا ہوا ہے کہ کم لوگ کثیر تعداد پر غالب آگئے ہیں۔ اس لئے کہ وہ مصائب و شدائد کے مختلف مراحل سے گزر کر' کٹھن حالات سے دوچار ہو کر' مقام برگزیدگی اور مقام عالی پر فائز ہو چکے ہوتے ہیں اور غالب اس لئے ہوتے ہیں کہ طاقت کا سرچشمہ ان کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ وہ اس عظیم قوت تک رسائی پا چکے ہوتے ہیں' جو تمام قوتوں کا سرچشمہ ہوتی ہے' تمام قوتوں پر غالب ہوتی ہے جس کے احکام نافذ ہوتے ہیں جو اپنی مخلوق کے مقابلے میں جبار ہے' جو دنیا کے جباروں کو پاش پاش کر دیتی ہے' جو ظالموں کو ذلیل کر دیتی ہے اور بڑے بڑے گردن فرازوں پر غلبہ پا لیتی ہے۔

ان کو یہ کامیابی اللہ کے اذن سے ہوتی ہے' خود ان میں کوئی کمال نہیں ہوتا۔ اس کا حقیقی سبب اللہ میاں کی ذات برتر ہوتی ہے۔ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ "اس لئے کہ اللہ صبر کرنے والوں کا ساتھی ہوتا ہے۔ وہ اس لئے کامیاب ہوتے ہیں کہ اذن الٰہی ایسا ہوتا ہے۔ یہ سب باتیں کہہ کر یہ مٹھی بھر لوگ ثابت کر دیتے ہیں کہ یہ ہیں وہ لوگ جو معرکہ حق و باطل کے لئے چن لئے گئے ہیں۔

اب ہم اس کہانی کو لے کر ذرا آگے بڑھتے ہیں۔ کیا دیکھتے ہیں کہ نہایت ہی قلیل افراد پر مشتمل ایک گروہ ہے جسے یہ یقین ہے کہ وہ ایک دن اللہ کے سامنے پیش ہوں گے۔ اسے اس ملاقات کا پورا یقین ہے اور یہی یقین اس کی اس مصابرت کا سرچشمہ ہے۔ یہ گروہ اپنی قوت حکم الٰہی اور اذن اللہ میں تلاش کرتا ہے۔ اسے اللہ پر پورا پورا بھروسہ ہے' اس لئے اسے اپنی کامیابی کا پورا یقین ہے اور یہ گروہ ان لوگوں کے شانہ بشانہ کھڑا ہے جو اللہ کے ہاں صابرین کہلاتے ہیں۔ غرض یہ گروہ جو صابر ہے ثابت قدم ہے اور غیر متزلزل' ضعف و قلت کے باوجود خائف نہیں۔ یہ گروہ اچانک میدان معرکہ میں ایک عظیم قوت کے مقابلے میں کود پڑتا ہے اور فیصلہ کن کردار ادا کرتا ہے۔ یہ تجدید عہد کرتا ہے۔ اس کے دل اللہ تک جا پہنچتے ہیں' صرف اللہ سے نصرت مانگتے ہیں اور اس ہولناک معرکے میں کود پڑتے ہیں۔

وَلَمَّا بَرَزُوْا لِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ قَالُوْا رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۵۰﴾ فَهَزَمُوْهُمْ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۙ وَقَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ وَاٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَآءُ ۗ

"اور جب وہ جالوت اور اس کے لشکر کے مقابلے پر نکلے تو انہوں نے دعا کی "اے ہمارے رب! ہم پر صبر کا فیضان کر' ہمارے قدم جمادے اور اس کافر گروہ پر ہمیں فتح نصیب کر" آخر کار اللہ کے اذن سے انہوں نے کافروں کو مار بھگایا اور داؤد نے جالوت کو قتل کر دیا اور

اللہ نے اسے سلطنت اور حکمت سے نوازا اور جن جن چیزوں کا چاہا علم دیا۔"

یہ ہے صحیح طریقہ "" اے ہمارے رب! ہم پر صبر کا فیضان کر۔" یہ ایسی تعبیر ہے جس سے فیضان صبر کا پورا منظر آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ اللہ کی طرف سے فیضان اس طرح ہوتا ہے جس طرح ایک برتن بھر کر ان پہ انڈیل دیا جائے اور ان کا پیالہ دل اس سے لبریز ہو جائے۔ اس کے نتیجے میں ان پر طمانیت اور سکینت نازل ہو جاتی ہے اور وہ اس ہولناک معرکے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ "ہمارے قدم جمادے۔" اس لئے کہ قدم اس کے دست قدرت میں ہیں۔ وہی ہے جو ان کو اپنی جگہ ثابت کرتا ہے کہ متزلزل نہ ہوں، پسلیں نہیں، جگہ چھوڑ کر ہٹ نہ جائیں۔ "اور اس کافر گروہ پر ہمیں فتح نصیب فرما۔" موقف واضح ہے ایمان کا مقابلہ کفر کے ساتھ ہے حق باطل کے مقابلے میں صف آراء ہے اسی لئے اللہ کو پکارا جاتا ہے کہ اللہ اپنے دوستوں کی مدد فرما، جو تیرے کافر دشمنوں کے مقابلے میں صف آرا ہیں۔ ان لوگوں کے ضمیر میں کوئی شک و شبہ نہیں، کوئی خلجان نہیں، ان کی فکر میں کوئی کھوٹ نہیں اور نصب العین کی صحت اور طریق کار کے تعین میں کوئی شک نہیں۔

نتیجہ وہی ہوا جس کے وہ منتظر تھے، جس کا انہیں پوری طرح یقین تھا فَهَزَمُوهُم بِإِذْنِ اللَّهِ آخر کار انہوں نے کافروں کو مار بھگایا "اللہ کے اذن سے" کا لفظ استعمال کر کے یہ بتایا جاتا ہے کہ فتح و نصرت اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ اور مسلمانوں کو اس معاملے میں اپنا ذہن اچھی طرح صاف کر لینا چاہئے کہ اس کائنات میں جو کچھ ہوتا ہے وہ اللہ کے اذن سے ہوتا ہے، اس قوت کی منشا کے مطابق ہوتا ہے جو اس کائنات کو چلا رہی ہے۔ مومن تو دراصل قدرت کا ایک ہاتھ ہیں۔ ان کے ذریعے اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے، وہ جو چاہتا ہے ان کے ذریعے نافذ کرتا ہے۔ وہ خود مختار نہیں ہیں نہ ان کے ہاتھ میں کوئی قدرت ہے۔ نہ ان کے پاس کوئی طاقت ہے۔ اللہ ان کے ذریعے اپنی مشیئت نافذ کرتا ہے۔ اس لئے وہ جو چاہتا ہے، ان کے ذریعے وہ چیز صادر ہو جاتی ہے۔ یہ ہے وہ حقیقت جو مرد مومن کے دل کو ایمان، اطمینان اور یقین و سکون سے بھر دیتی ہے۔ مومن اللہ کا غلام ہے۔ اللہ نے اسے اہم رول ادا کرنے کے لئے استعمال کیا ہے۔ اور یہ اللہ کا فضل و کرم ہے کہ اس نے اس اہم رول کے لئے مومنین کا انتخاب کیا ہے تاکہ وہ اس قدر اہم رول ادا کرے۔ یعنی وہ اللہ کی تقدیر کو حقیقت بنانے والا ہو۔ اس اہم رول کے لئے اسے چن لینے کے بعد اللہ مزید فضل و کرم کا اظہار یوں کرتا ہے کہ یہ اہم رول ادا کرنے کا اعزاز حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ اللہ اسے اس کا ثواب بھی عطا کرتا ہے۔ اگر اللہ کا یہ کرم نہ ہوتا تو ہرگز ایسا نہ کرتا۔ اور اگر اللہ کی کرم نوازی نہ ہوتی تو اس پر وہ ثواب نہ دیتا۔ پھر مرد مومن کو یہ یقین ہوتا ہے کہ وہ ضرور اپنی منزل مقصود تک پہنچے گا۔ اس کا مقصد پاک ہوتا ہے۔ اس کا طریقہ کار پاکیزہ ہوتا ہے۔ کیونکہ جہاد فی سبیل اللہ سے اس کی کوئی ذاتی غرض وابستہ نہیں ہوتی۔ وہ تو اللہ کی مشیئت کا نافذ کنندہ ہوتا ہے۔ اس کے ارادے کا تابع ہوتا ہے اور اس مقام کا وہ مستحق بھی اس لئے ہوا ہے کہ اس کی نیت صاف ہے۔ وہ اطاعت کا عزم صمیم کئے ہوئے ہے اور پر خلوص طریقے سے اللہ کی طرف متوجہ ہے۔

قرآن مجید حضرت داؤد کا نام لے کر کہتا ہے وَقَتَلَ دَاوُودُ جَالُوتَ اور داؤد نے جالوت کو قتل کر دیا۔" داؤد بنی اسرائیل کا ایک چھوٹا سا لڑکا تھا۔ جبکہ جالوت ایک شہنشاہ اور خوفناک قائد تھا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی مشیئت تھی کہ وہ مسلمانوں کو موقعہ پر ہی یہ سبق دے دے کہ معاملات ہمیشہ اس طرح نہیں چلتے رہتے جس طرح بظاہر نظر آتے ہیں۔ بلکہ معاملات کا فیصلہ حقائق کے مطابق ہوتا ہے۔ اور حقائق کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہوتا ہے۔ واقعات کی تقدیریں اللہ کے ہاتھ میں ہوتی ہیں۔ مومنین کا فرض یہ ہے کہ ان کے ذمے جو ڈیوٹی ہے وہ بس اسے ادا کر دیں۔ اللہ کے ساتھ انہوں نے جو عہد باندھا ہوا ہے اسے پورا کر دیں، اس کے بعد فیصلہ اللہ پر چھوڑ دیں، وہ جو چاہتا ہے وہی ہو گا۔ دیکھئے اللہ نے چاہا کہ اس جبار اور طاقتور بادشاہ کا کام اس چھوٹے سے نوجوان کے ہاتھوں تمام کر دے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا، تاکہ

لوگ دیکھ لیں کہ وہ جبار و قہار لوگ جن سے ضعفاء ڈرتے رہتے ہیں' جب اللہ چاہتا ہے کہ وہ ختم ہو جائیں تو ایسے چھوٹے چھوٹے بچوں کے ہاتھوں اپنے انجام کو پہنچ جاتے ہیں۔ ایک دوسری پوشیدہ حکمت یہ تھی کہ مشیئت الٰہی میں یہ بات طے شدہ تھی کہ طالوت کے بعد داؤد نظام حکومت اپنے ہاتھ میں لیں اور اس کے بعد داؤد کے بیٹے سلیمان تک یہ نظام پہنچے تاکہ سلیمان علیہ السلام اور داؤد علیہ السلام کا دور بنی اسرائیل کا سنہری دور بنے۔ اس لئے کہ بنی اسرائیل محض اسلامی نظریۂ حیات لے کر اٹھے۔ بڑے عرصہ تک وہ گمراہی کی حالت میں پھرتے رہے۔ بار بار نقض عہد اور نافرمانی کرتے رہے' لیکن جب بھی انہوں نے اسلامی نظریہ حیات کے مطابق انقلاب برپا کیا تو بطور جزاء اللہ تعالیٰ نے انہیں بام عروج پر پہنچایا وَ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَ الْحِكْمَةَ وَ عَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَآءُ "اور اللہ نے اسے سلطنت و حکمت سے نوازا اور جن جن چیزوں کا چاہا اس کو علم دیا۔"

حضرت داؤد بیک وقت نبی اور بادشاہ تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو زرہ اور دوسرا سامان جنگ کی تیاری کی مہارت دی تھی' جن کی تفصیلات قرآن مجید نے دوسری جگہ دی ہیں۔ یہاں اس قصے کو لانے سے مقصد چونکہ اور ہے اس لئے یہاں تفصیلات ترک کر دی ہیں۔

جب بات یہاں تک پہنچ گئی اور اعلان ہو گیا کہ فتح نظریۂ حیات اور پختہ عقائد کی ہو گی' مادیت کو شکست ہو گی' کثرت تعداد کو نہیں بلکہ ہمت بلند کو کامرانی ہو گی۔ اس لئے یہاں وہ بلند حکمت عملی بیان کر دی جاتی ہے۔ وہ فلسفہ بتایا جاتا ہے' جو حق و باطل کے اس ٹکراؤ کے پس پشت کارفرما ہے۔ اللہ نے جہاد و قتال اس لئے نہیں فرض کیا کہ مال غنیمت حاصل کیا جائے' لوٹ مار کی جائے' دنیا میں عزت و برتری حاصل کی جائے' بلکہ اسلام کا فلسفہ جنگ یہ ہے کہ یہ جنگ دراصل بھلائی اور شر کا ٹکراؤ ہے۔ یہ اس لئے کہ کرۂ ارض پر حق و صداقت اور خیر کو غلبہ حاصل ہو اور شر مغلوب ہو۔ اس لئے ہے کہ طاقت کو اصلاح فی الارض کے لئے استعمال کیا جائے۔

وَ لَوْ لَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ ۙ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۵۱﴾

"اگر اللہ اس طرح انسانوں کے ایک گروہ کو دوسرے گروہ کے ذریعے ہٹاتا نہ رہتا' تو زمین کا نظام بگڑ جاتا۔ لیکن دنیا کے لوگوں پر اللہ کا بڑا فضل ہے۔" اب اشخاص پس منظر میں چلے جاتے ہیں۔ واقعات اختتام پذیر ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ قرآن مجید کے ایک مختصر فقرے میں' اس کرۂ ارض پر مختلف طاقتوں کے ٹکراؤ' مختلف قوتوں کی باہمی منافست اور زندگی کے میدان میں آگے بڑھنے کی سعی اور جدوجہد کا عظیم فلسفہ بیان کر دیتے ہیں۔ اب اسکرین پر کرۂ ارض کا وسیع و عریض میدان ہے۔ اس میدان میں لوگوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر ہے۔ دھکم پیل شروع ہے' کھینچا تانی شروع ہے' مختلف لوگوں کے سامنے مختلف مقاصد ہیں اور حصول مقاصد کے لئے ہر ایک دوسرے سے آگے بڑھ رہا ہے۔ ہر شخص کی یہ کوشش ہے کہ وہ گیند لے جائے لیکن سب کی ڈوری اللہ جل شانہ کے ہاتھ میں ہے۔ وہ جسے چاہتا ہے آگے بڑھا دیتا ہے' جسے چاہتا ہے ڈوری کھینچ لیتا ہے۔ اس اژدہام میں جو لوگ بھلائی اصلاح اور ترقی کے لئے کوشش کر رہے ہیں آخر کار نتیجہ یہ ہے کہ وہ آگے بڑھ جاتے ہیں اور دست قدرت تمام اہل باطل کی لگام کھینچ لیتا ہے۔

٭ اگر لوگ ایک دوسرے کے خلاف صف آرا نہ ہوتے اور ان کا مزاج' جس پر انہیں پیدا کیا گیا ہے ایک دوسرے سے مختلف نہ ہوتا' ان کے ظاہری رجحانات اور ان کے قریبی مقاصد باہم متعارض نہ ہوتے' تو زندگی باسی ہو کر متعفن ہو جاتی۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے مزاج مختلف بنائے تاکہ وہ اپنی تمام قوتوں کو کام میں لا کر ایک دوسرے کی مزاحمت کریں' ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کریں

اور ایک دوسرے پر غالب آنے کی سعی کریں وہ سستی اور جمود کو ختم کریں' اپنی خفیہ قوتوں کو بیدار کریں' بروقت چوکنے رہیں۔ زمین کے خفیہ ذخائر کی تلاش کریں۔ زمین کی خفیہ قوتوں اور پوشیدہ اسرار کو دریافت کریں اور آخر کار اصلاح' بھلائی اور ترقی کا دور دورہ ہو۔

لیکن یہ سارا کام اللہ میاں کس طرح کرتے ہیں؟ ایک صالح' ہدایات یافتہ اور مخلص جماعت کے قیام سے' جو اس سچائی سے واقف ہو' جسے اللہ نے سچائی قرار دیا ہو' وہ اس طریقہ کار سے بھی واقف ہو' جو طریقہ کار اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمایا ہے۔ اسے یہ یقین ہو کہ وہ اس کرۂ ارض پر سچائی کو غالب کرنے اور باطل کا مقابلہ کرنے کے لئے من جانب اللہ مامور ہے۔ اسے یہ یقین ہو کہ اس کی نجات اسی میں ہے کہ وہ بلند رول ادا کرے۔ وہ صرف اسی صورت میں نجات پاسکتی ہے کہ وہ اس مقصد کے حصول کے لئے مشکلات برداشت کرے۔ اور یہ سب کچھ وہ اللہ کی اطاعت کرتے ہوئے اور حصول رضائے الٰہی کے لئے کرے۔

جب ایسی جماعت قائم ہوتی ہے اور جدوجہد کرتی ہے تو پھر امر دنی نافذ ہوتا ہے' اللہ کی تقدیر ظاہر ہوتی ہے۔ سچائی' بھلائی اور اصلاح کا کلمہ بلند ہو جاتا ہے۔ اس کشمکش' باہمی منافست اور باہمی مدافعت کا حاصل اس قوت کے ہاتھ آتا ہے جو اس کرۂ ارض پر بھلائی اور تعمیر کی علمبردار ہوتی ہے' وہ اس کشمکش کے نتیجے میں آگے بڑھتے ہیں اور ان کو ان درجات کمال کی انتہاؤں کو پہنچادیا جاتا ہے جو ان کے لئے مقرر اور مقدر تھا۔ سب سے آخر میں' اس پورے قصے پر ایک تعقیب ہے:

تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ۭ وَاِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۲۵۲﴾

"یہ اللہ کی آیات ہیں' جو ہم ٹھیک ٹھیک تم کو سنا رہے ہیں اور تم یقیناً ان لوگوں میں سے ہو جو رسول بنا کر بھیجے گئے ہیں۔"

یہ آیات عالی مقام ہیں' دور رس مقاصد کی حامل ہیں' اور اللہ تعالیٰ خود ان کو اپنے نبی کو پڑھ کر سناتے ہیں نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ "ہم خود تم کو سنا رہے ہیں۔" ہم خود سنا رہے ہیں۔ کس قدر عظیم بات ہے۔ انتہائی مہیب حقیقت ہے یہ۔ سوچنے کی بات ہے کہ خود رب ذوالجلال ان آیات کو پڑھ کر سنا رہا ہے اور جو بالحق سچائی کے ساتھ۔ خود ذات باری یہ آیات سنا رہی ہے جسے سنانے کا حق ہے۔ جس کے حکم پر یہ آیات نازل ہو رہی ہیں' جس کے حکم سے یہ انسانوں کا دستور العمل بنی ہیں۔ اللہ کے سوا یہ مقام کسی کو حاصل نہیں ہے۔ اس لئے جو شخص انسانوں کے لئے از خود کوئی نظام تجویز کرتا ہے وہ مفتری ہے۔ وہ حق تعالیٰ پر افتراء باندھتا ہے۔ وہ خود اپنے اوپر ظلم کر رہا ہے اور بندوں پر بھی ظلم کر رہا ہے۔ وہ ایک ایسا دعویٰ کر رہا ہے جس کا وہ مستحق نہیں ہے۔ وہ باطل پرست ہے اور اس بات کا مستحق نہیں کہ اس کی اطاعت کی جائے۔ اطاعت تو امر الٰہی کے لئے مخصوص ہے۔ پھر اس کی اطاعت کی جاتی ہے جو اللہ تعالیٰ سے ہدایت لیتا ہے۔ اس کے سوا کوئی مستحق اطاعت نہیں ہے۔

وَاِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ "تم یقیناً ان لوگوں میں سے ہو' جو رسول بنا کر بھیجے گئے ہیں۔" یہی وجہ ہے کہ باری تعالیٰ خود تم پر آیات کی تلاوت فرماتے ہیں اور پوری انسانی تاریخ کے تمام تجربات سے تمہیں آگاہ کر رہے ہیں۔ قافلہ اہل ایمان کے تمام تجربے' تمام مراحل کے نشیب و فراز تمہیں بتائے جا رہے ہیں اور تمام مرسلین کی میراث تمہارے حوالے کی جا رہی ہے۔

چنانچہ یہاں یہ سبق ختم ہو جاتا ہے' جو تحریکی تجربات کے ذخیرہ سے بھرا پڑا ہے۔ اس سبق پر فی ظلال القرآن کا یہ دوسرا حصہ بھی ختم ہو جاتا ہے۔ جس میں تحریک اسلامی کو مختلف سمتوں میں لے جایا گیا اور مختلف میدانوں میں اسے پھرایا گیا۔ اور اسے اس عظیم رول کے لئے تربیت دی گئی جس کو اس نے اس کرۂ ارض پر ادا کرنا تھا' جسے اللہ تعالیٰ نے اس کا نگران مقرر کیا اور اسے امت وسط قرار دیا تاکہ وہ زمانہ آخر تک لوگوں کے لئے اس ربانی نظام زندگی کی حامل ہو۔

فی ظلال القرآن

پارہ نمبر ۳

سورۃ البقرہ آیات ۲۵۳ تا ۲۸۶

سورہ آل عمران ۱ تا ۹۱

پارہ سوئم ایک نظر میں

(سورۃ البقرہ کا آخری حصہ)

تیسرا پارہ دو اجزاء پر مشتمل ہے۔ پہلا سورۂ بقرہ کے بقیہ پر مشتمل ہے (یاد رہے کہ پہلے دو اجزاء سورۂ بقرہ ہی پر مشتمل رہے ہیں) اور دوسرا سورۂ آل عمران کے ابتدائی حصہ پر مشتمل ہے۔

یہاں ہم صرف بقرہ کے آخری حصہ کے بارے میں اجمالی بحث کریں گے۔ اور آل عمران کے حصہ پر بحث اس وقت کریں گے جب سورۂ آل عمران پر بحث کا آغاز ہوگا۔

سورۂ بقرہ کے اس حصہ میں بھی اسی اساسی موضوع ہی کو لیا گیا ہے جس کے بارے میں ہم حصہ اول کے آغاز میں بتا چکے ہیں۔ اور جس کا مطالعہ ہر اس سورت میں مسلسل کرتے رہے ہیں۔ وہ یہ کہ امت مسلمہ کو اس ہدف کے لئے تیار کرنا جس کی خاطر اسے برپا کیا گیا ہے تاکہ وہ ان مقاصد کو لے کر آگے بڑھے' ایسے حالات میں کہ اس کے سامنے ایمانی تصور حیات ہو اور اسے یہ احساس ہو کہ اس عظیم امت اور تحریک کو انہی مقاصد کے لئے برپا کیا گیا ہے۔ اور اس کے سامنے امم سابقہ کے وہ تمام تجربات بھی کھول کر رکھ دیئے ہیں۔ اسے آگاہ کر دیا گیا ہے کہ اس راہ کے لئے اس نے کن کن وسائل کو کام میں لانا ہے اور یہ کہ اس راہ کی مشکلات کیا ہیں اور یہ کہ تحریک کے دشمن اس کے خلاف کیا کیا سازشیں کر سکتے ہیں۔ کیونکہ وہ اللہ کے دشمن' حق کے دشمن اور ایمان کے دشمن ہیں اور یہ اس لئے کہ یہ امت اس مشکل راہ میں بیدار مغزی کے ساتھ آگے بڑھے اور تمام مراحل طے کرے۔

امت مسلمہ کی تربیت و تیاری' اس کی یہ تمام سروسامانیاں اور اس کی ہمہ گیر ٹریننگ اور اس کا نصب العین اور اس کے اغراض و مقاصد' وہ مضامین ہیں جن کے ذریعہ قرآن کریم' ابتدائی نسل کے بعد' ہر دور میں جماعت مسلمہ کو تروتازہ رکھتا ہے۔ کیونکہ ہر دور میں تحریک اسلامی کی قیادت و راہنمائی کے لئے یہی منہاج متین ہے۔ لہٰذا قرآن مجید ایک زندہ' فعال اور محرک ذریعہ تربیت ہے اور وہ ہر وقت اور ہر زمانہ میں ایک زندہ اور فعال اور مکمل دستور ہے بلکہ قرآن مجید ہر مرحلے' ہر قدم اور ہر دور میں ایک قائد' ایک مرشد اور ایک راہنما ہے۔ لیکن صرف اس شخص کے لئے جو قرآن سے نصیحت' ہدایت اور راہنمائی کا طالب ہے۔

پارۂ دوئم کا خاتمہ اس آیت پر ہوا تھا تِلْكَ آيَاتُ اللَّهِ نَتْلُوهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ۚ وَإِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِينَ ...... "یہ اللہ کی آیات ہیں جو ہم ٹھیک ٹھیک تم کو سنا رہے ہیں اور تم یقیناً مرسلین میں سے ہو۔" اور یہ آیت بنی اسرائیل کے بعض لوگوں کے اس قصے کے بعد "جو موسیٰ کے بعد سرداران بنی اسرائیل کو پیش آیا تھا' جنہوں نے اپنے نبی سے کہا تھا کہ ہمارے لئے ایک بادشاہ مقرر کر دو تاکہ ہم اللہ کی راہ میں جنگ کریں۔" (۲:۲۴۶) اور اس قصے کے آخر میں کہا گیا تھا "اور داؤد نے جالوت کو قتل کر دیا اور اللہ نے اسے سلطنت اور حکمت سے نوازا اور جن جن چیزوں کا چاہا اسے علم دیا۔" (۲:۲۵۱) تو گویا پارۂ دوئم کا خاتمہ حضرت موسیٰ ﷺ کی قوم کی بات پر ہوا۔ جس میں حضرت داؤد کے واقعہ کی تفصیل تھی۔ اس میں حضور اکرم ﷺ کی رسالت کی طرف بھی اشارہ تھا اور یہ بتایا گیا تھا کہ آپ ﷺ کو ان تجربات سے مسلح کیا جا رہا ہے جو تمام مرسلین کو انسانی تاریخ میں پیش آتے رہے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ پارۂ سوئم میں بات یوں شروع کی جاتی ہے کہ وہ اس سے پہلے کے کلام سے مربوط ہے۔ یعنی انبیائے سابقہ کے بارے

میں بات یوں چلتی ہے کہ ان میں سے بعض دوسروں کے مقابلے میں زیادہ برگزیدہ تھے۔ بعض کے درجات دوسروں پر بلند تھے۔ اور یہ کہ ان رسولوں کے پیروکاروں نے ازمنۂ مابعد میں باہم اختلافات پیدا کر لئے۔ حالانکہ انہیں اچھی طرح معلوم تھا کہ حق پر کون ہے۔ اس کے باوجود انہوں نے اختلافات قائم رکھے۔ ان میں سے بعض لوگ ایمان پر قائم رہے اور بعض نے کفر کا راستہ اپنایا۔ ان میں سے بعض نے دوسروں کو قتل کیا۔ کہا جاتا ہے :"یہ رسول .... ہم نے ان کو ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر مرتبے عطا کئے۔ ان میں سے کوئی ایسا تھا جس سے خدا خود ہمکلام ہوا۔ کسی کو اس نے دوسری حیثیتوں سے بلند درجے دیئے اور آخر میں عیسیٰ ابن مریم کو روشن نشانیاں عطا کیں اور روح پاک سے اس کی مدد کی۔ اگر اللہ چاہتا تو ممکن نہ تھا کہ ان رسولوں کے بعد جو لوگ روشن نشانیاں دیکھ چکے تھے وہ آپس میں لڑتے۔ مگر انہوں نے باہم اختلاف کیا' پھر کوئی ایمان لایا اور کسی نے کفر کی راہ اختیار کی۔ ہاں' اللہ چاہتا' تو وہ ہرگز نہ لڑتے' مگر اللہ جو چاہتا ہے' کرتا ہے۔

ربط کلام بالکل واضح ہے کہ پارۂ دوئم کے آخر میں بھی رسولوں کی نسبت بات تھی اور پارہ سوئم کے آغاز میں بھی یہی بات ہے بلکہ اس پوری سورت میں کلام مربوط ہے۔ اس پوری سورت میں' مدینہ میں منظم ہونے والی اسلامی جماعت اور بنی اسرائیل کے درمیان فکری مجادلہ ہے۔ اور قرآن مجید کے پہلے دو پاروں میں عموماً یہی مباحث ہیں۔ اسی نسبت سے یہاں رسولوں اور ان کے بعد ان کی امم کے مابین فرقہ وارانہ اختلافات اور باہم قتل و مقاتلہ کی بات یہاں تفصیل سے چھیڑی گئی ہے۔ یعنی یہ کہ ان امتوں میں سے بعض لوگ تو ایمان پر قائم رہے اور بعض نے کفر کا راستہ اختیار کیا اور پھر ناحق باہم دست و گریباں ہوئے۔ لہٰذا ربط کلام واضح ہے ا۔

یہاں یہ بات اس لئے کی گئی ہے کہ تحریک اسلامی کے سامنے' اس وقت کے متبعین انبیاء' بنی اسرائیل وغیرہ کی مبہم اور واقعی صورت حالات واضح کر دی جائے تاکہ تحریک ان حالات میں اپنے لئے مناسب راہ عمل اختیار کرے۔ امت مسلمہ کو بتایا گیا کہ متبعین انبیاء میں سے بعض لوگ تو راہ ہدایت پر صحیح طرح قائم ہیں اور بعض منحرف ہو گئے ہیں۔ ایسے حالات میں امت مسلمہ کا فرض ہے کہ وہ اپنی ذمہ داریاں پوری کرے۔ کیونکہ اب متبعین انبیاء میں صرف یہی امت ہے جو راہ ہدایت پر ہے۔ اسے چاہئے کہ وہ منحرفین کا مقابلہ کرے۔

رسولوں' ان کے متبعین اور ان کے باہم مجادلہ اور مقاتلہ کے بیان کے بعد تحریک اسلامی کو یہ بتایا جاتا ہے کہ وہ اللہ کی راہ میں اپنا بہترین مال خرچ کرے اور یہ محض توشۂ آخرت کے لئے جہاں "نہ خرید و فروخت ہو گی' نہ دوستی کام آئے گی اور نہ سفارش چلے گی" (۲ : ۲۰۴) اس لئے کہ انفاق فی سبیل ایک ایسا مالی فریضہ ہے جو فریضۂ جہاد فی سبیل اللہ کا ایک لازمہ ہے۔ اور خصوصاً ایسے حالات میں جو تحریک اسلامی کو اس وقت درپیش تھے' جن میں غازیان کرام کو خود ان کے لئے اپنے اموال اور ان لوگوں کے اموال کے ذریعہ جنگ کے لئے تیار کیا جا رہا تھا جو انفاق فی سبیل اللہ کے نتیجے میں فراہم ہوتے تھے۔

اس کے بعد اس فکری اساس کے بعض پہلوؤں پر بحث کی گئی ہے جس پر اسلامی جماعت کا قیام عمل میں لایا گیا ہے۔ یعنی وجود باری اور اس کی وحدانیت یہ کہ اللہ وحدہ ہر چیز کا منتظم ہے اور ہر چیز اس کی وجہ سے قائم ہے۔ وہ اس کائنات کا مالک مطلق ہے۔ وہ اس کائنات کی ہر چیز کا علیم و خبیر ہے۔ اسے اس پوری کائنات پر قدرت حاصل ہے' وہ پوری طرح اس کے قبضہ میں ہے اور اس کی حفاظت میں ہے۔ اور یہ کہ قیامت کے دن اس کے ہاں کوئی سفارش کارگر نہ ہو گی الا یہ کہ وہ اجازت دے' یہ کہ اس جہاں میں انسان کو وہی علم حاصل ہے جو وہ عطا کرتا ہے' تاکہ ایک مسلمان اپنی راہ پر اس طرح گامزن ہو کہ اس کے ذہن میں اس کے نظریات کا ایک واضح تصور ہو

ا۔ مرحوم سید قطب نے اپنی تفسیر قرآن مجید کے پاروں کو پیش نظر رکھ کر لکھی ہے۔ حالانکہ قرآن مجید کی تدوین میں پاروں کا لحاظ نہ تھا۔ پاروں کی تقسیم محض ایک ماہ میں تلاوت کرنے میں سہولت پیدا کرنے کے لئے کی گئی ہے۔ لہٰذا تلک الرسل سے جو کلام شروع ہوتا ہے ظاہر ہے کہ وہ سابقہ آیات سے مربوط ہے۔

جن نظریات پر یہاں وہ نظام زندگی قائم کرنے چلا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں :

"اللہ وہ زندۂ جاوید ہستی ہے جو تمام کائنات کو سنبھالے ہوئے ہے' اس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے۔ وہ نہ سوتا ہے اور نہ اسے اونگھ لگتی ہے۔ زمین و آسمان میں جو کچھ ہے' اسی کا ہے۔ کون ہے جو اس کی جناب میں اس کی اجازت کے بغیر سفارش کر سکے؟ جو کچھ بندوں کے سامنے ہے اسے بھی وہ جانتا ہے اور جو کچھ ان سے اوجھل ہے' اس سے بھی واقف ہے اور اس کی معلومات میں سے کوئی چیز بھی ان کی گرفت ادراک میں نہیں آسکتی۔ الا یہ کہ کسی چیز کا علم وہ خود ہی ان کو دینا چاہے۔ اس کی حکومت آسمانوں اور زمین پر چھائی ہوئی ہے اور ان کی نگہبانی اس کے لئے کوئی تھکا دینے والا کام نہیں ہے۔ بس وہی ایک بزرگ و برتر ذات ہے۔" (۲:۲۰۰)

اس تصور حیات کے مطابق ایک مسلمان آگے بڑھتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے راستے میں قتال شروع کرتا ہے' اس لئے نہیں کہ وہ لوگوں سے اپنے نظریۂ حیات اور اپنے عقائد زور سے منوائے' بلکہ اس لئے کہ ہدایت اور گمراہی کے درمیان تمیز ہو جائے' فتنہ و فساد اور ضلالت و گمراہی کے اصل عوامل و اسباب کا خاتمہ کر دیا جائے اور اس کے بعد لوگوں کو مکمل آزادی ہو گی کہ وہ جو روبہ چاہیں اپنائیں۔

"دین کے معاملے میں کوئی زبردستی نہیں ہے۔ صحیح بات غلط خیالات سے الگ چھانٹ کر رکھ دی گئی ہے۔ اب جو کوئی طاغوت کا انکار کر کے اللہ پر ایمان لے آیا' اس نے ایک ایسا مضبوط سہارا تھام لیا' جو کبھی ٹوٹنے والا نہیں۔ اللہ سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے۔" (۲:۲۵۶)

یوں ایک مسلمان اپنی راہ حیات پر پورے اطمینان کے ساتھ رواں دواں ہے۔ وہ اپنے آپ کو اللہ کی پناہ میں سمجھتا ہے۔ اور اللہ کی نصرت اس کے ساتھ ہوتی ہے۔ اسے یقین ہوتا ہے کہ اللہ کی راہنمائی اور اللہ کی امداد اس کے شامل حال ہے۔

"جو لوگ ایمان لاتے ہیں اللہ ان کا ناصر و مددگار ہے۔ وہ ان کو تاریکیوں سے روشنی کی طرف لاتا ہے۔ اور جن لوگوں نے کفر کی راہ اپنائی ہے ان کے حامی شیطان ہیں جو انہیں روشنی سے تاریکیوں کی طرف لاتے ہیں۔ یہ لوگ آگ میں جانے والے لوگ ہیں جو وہاں ہمیشہ رہیں گے۔" (۲:۲۵۷)

غرض اس پارہ کے آخر میں بھی' یہ پیراگراف مسلسل اسی ہدف کی طرف آگے بڑھتا ہے جس کی طرف اس پارہ کے آغاز میں روئے سخن تھا یعنی تحریک اسلامی کے اغراض و مقاصد کا بیان اور جماعت اسلامی میں ان مقاصد کی آبیاری۔

اس کے بعد اسلامی نقطۂ نظر سے موت و حیات کی حقیقت پر ایک نظر ڈالی جاتی ہے۔ اس سلسلے میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نظریاتی زندگی کے دو تجربات بیان کئے جاتے ہیں اور ایک مشاہدہ ایک دوسرے شخص کا بیان کیا گیا ہے جس کا نام ظاہر نہیں کیا گیا۔ ان تجربات میں موت و حیات کی حقیقت یہ بتائی گئی ہے کہ اس کا تعلق صرف اللہ کے علم و ارادہ کے ساتھ ہے۔ اور یہ کہ انسان کا محدود ادراک موت و حیات کی اصل حقیقت کو اپنے احاطہ میں لانے سے قاصر ہے کیونکہ اصل حقیقت ماوراء الادراک ہے۔ اور اس کی حقیقت صرف اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے۔

یہاں موت اور حیات کی حقیقت کو اس لئے واضح کیا گیا ہے کہ ایک تو حیات انسانی کے بارے میں انسانی تصور اور فکر کی اصلاح ہو دوسرے یہ کہ جہاد و قتال میں جو لوگ شریک ہوتے ہیں ان کے پیش نظر بھی موت و حیات کا صحیح تصور آنا ضروری ہے۔

ان فکری ہدایات کے بعد اسلامی معاشرہ کے اجتماعی معاملات کے سلسلے میں قدرے طویل بات ہوتی ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ سوشل سیکورٹی اسلامی معاشرہ کی اساس ہے' اس معاشرہ میں ربا کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ایک قابل لعنت فعل تصور ہو گا۔ اس کے مقابلے میں اسلامی معاشرہ میں زیادہ دولت بذریعہ صدقات و انفاق فی سبیل اللہ خرچ کرنے کی ترغیب دی جاتی ہے اور اس پر قدرے طویل بحث ہوتی

ہے۔ انفاق فی سبیل اللہ کا بیان بہترین تصویر کشی ' بہترین تاثرات و اشارات اور اعلیٰ فنی خوبیوں پر مشتمل ہے۔ اس فنی اور ادبی پہلو پر ہم انشاء اللہ اس وقت بات کریں گے جب یہ خوبصورت آیات تشریح و تفسیر کے وقت ہمارے سامنے ہوں گی۔ یہاں اس قدر اشارہ مناسب ہے کہ جہاد و قتال اور انفاق فی سبیل اللہ کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ نیز انفاق فی سبیل اللہ اور صدقہ و خیرات اسلام کی اجتماعی زندگی کا ایک اہم پہلو ہے۔ اور معاشی زندگی کے اس پہلو کو اس سورت میں ترغیب اور قانون سازی کے مختلف طریقوں سے منظم کیا گیا ہے۔

احسان و صدقہ کے بالمقابل سود کا خبیث نظام ہے۔ اس خبیث نظام کے خلاف قرآن مجید نے طویل جنگ کی ہے۔ اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ قرآن مجید نے بمباری کر کے اجتماعی زندگی کے معاشی نظام سے اس مذموم ادارے کی بنیادیں بھی منہدم کر دی ہیں۔ قرآن سودی نظام کی جگہ ایک مستحکم اور صحت مند معاشی نظام قائم کرنا چاہتا ہے۔ جس کے ذریعہ معاشرے کا اقتصادی نظام ترقی کر سکے۔

اس کے بعد باہمی لین دین کے بارے میں قانون سازی کی گئی ہے اور ایسا قانون بنایا گیا ہے کہ دنیا کے کسی قانونی نظام میں یہ قانون (معاملات کی تحریری شکل) نہ تھا۔ یہ قانون سازی دو آیات میں کی گئی ہے۔ ایک آیت قرآن کریم کی طویل ترین آیات میں سے ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم قانون سازی میں کیا طریق کار اختیار کرتا ہے۔ اور کس انداز سے کرتا ہے۔ قرآن کا قانون ایک زندہ ' منفرد اور معجزانہ قانون ہوتا ہے اور ہر دور اور ہر زمانے کے لئے موزوں بھی۔

اس سورت کا خاتمہ بھی انہی الفاظ اور مضامین پر کیا جاتا ہے جن سے اس کا آغاز ہوا تھا یعنی اللہ کی ذات ' ملائکہ ' اللہ کی کتابوں اور رسولوں کے بارے میں اسلامی تصور اور نظریہ کہ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِّن رُّسُلِهِ "ہم اللہ کے رسولوں کے درمیان فرق نہیں کرتے۔" یہ وہ اصول ہے جس کا اس سورت میں بار بار اظہار کیا گیا۔ آخر میں مؤمنین کو طریقہ دعا سکھایا جاتا ہے اور بتایا جاتا ہے کہ ایک مومن کا تعلق اپنے رب کے ساتھ کیسا ہوتا ہے ؟ اور اس دعا میں بھی بنی اسرائیل کی تاریخ کی طرف ایک اشارہ ہے یعنی یہ کہ انہوں نے اپنے خدا کے ساتھ اپنا تعلق نہ جوڑا تھا۔ اس دعا پر اس سورت کا خاتمہ ہوتا ہے جو مختلف مضامین پر مشتمل اس طویل سورت کا مناسب خاتمہ ہے۔

"اے ہمارے رب! ہم سے بھول چوک میں قصور ہو جائے ان پر گرفت نہ کر۔ مالک! ہم پر وہ بوجھ نہ ڈال ' جو تو نے ہم سے پہلے لوگوں پر ڈالے تھے۔ پروردگار! جس بوجھ کو اٹھانے کی ہم میں طاقت نہیں ہے ' وہ ہم پر نہ رکھ۔ ہمارے ساتھ نرمی کر ' ہم سے درگزر فرما ' ہم پر رحم کر ' تو ہمارا مولیٰ ہے ' کافروں کے مقابلے میں ہماری مدد کر۔" (۲ : ۲۸۶)

☆ ☆ ☆

درس ۱۷ ایک نظر میں

☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆

اس سبق کے آغاز ہی میں ہمیں رسولوں کے بارے میں قرآن کریم کا مخصوص انداز تعبیر ملتا ہے۔ تِلْكَ الرُّسُلُ ...... "رسولوں کی یہ جماعت" اور هٰٓؤُلَاۗءِ الرُّسُلُ ...... "یہ رسول" کا لفظ اختیار نہیں کیا گیا۔ رسولوں کے لئے آغاز کلام میں یہ خاص طرز تعبیر کیوں اختیار کیا گیا؟ اس میں کچھ واضح اشارات ہیں۔ مناسب ہے کہ تشریح آیات سے پہلے اس انداز کلام پر کچھ بات ہو جائے۔

تِلْكَ الرُّسُلُ .... "یہ گروہ رسل" جو ایک خاص جماعت ہیں۔ اس جماعت کا ایک خاص مزاج ہے اور ایک خاص ماہیت ہے۔ اگرچہ وہ بشر ہیں۔ تو پھر وہ کون ہیں؟ رسالت کی حقیقت کیا ہے؟ رسالت کا مزاج کیا ہے؟ یہ فریضہ کیسے ادا کیا جاتا ہے؟ پھر صرف ان مخصوص افراد ہی کو کیوں درجہ رسالت پر فائز کیا گیا اور کیسے کیا گیا؟ یہ ایسے سوالات ہیں جن پر میں ایک طویل عرصہ سے سوچتا رہا ہوں۔ تسلی بخش جواب کا متلاشی رہا ہوں۔ میرے پردۂ احساس پر کچھ ایسے مفہوم اور معانی ابھرتے ہیں جن کو میں کلمات و عبارات کی صورت میں منتقل نہیں کر سکتا۔ البتہ یہ ضروری ہے کہ میں اپنے اس وجدان و شعور کو اور ان تصورات و مفہومات کو الفاظ و افہام کے قریب تر کر سکوں۔

یہ کائنات جس میں ہم زندہ ہیں اور ہم جس کا ایک اہم حصہ ہیں کچھ اصول و قواعد پر چل رہی ہے۔ اور یہ اصول وہ تکوینی اصول و ضوابط ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کے لئے وضع فرمائے ہیں۔ اور اس کائنات کو حکم دیا ہے کہ یہ ان کے مطابق چلتی رہے اور ان کے مطابق حرکت کرے اور ان اصولوں کی منشا کے مطابق چلے۔ اور اس کائنات میں انسان جونہی علمی میدان میں ایک قدم آگے بڑھتا ہے اور کچھ نئے انکشافات و دریافت کر لیتا ہے یا انسان کو اللہ تعالیٰ کچھ مزید معلومات حاصل کرنے کے مواقع فراہم کر دیتا ہے تو یہ ادراک اور انکشاف اس کی محدود قوت مدرکہ کے حدود کے اندر ہوتا ہے اور اسی قدر ہوتا ہے جس قدر اسے اس دنیا میں زندگی بسر کرنے کے لئے ضروری ہوتا ہے تاکہ وہ یہاں اپنی محدود زندگی میں انسانی خلافت کے فرائض اچھی طرح سرانجام دے سکے۔

اور اس کائنات میں ان طبعی قوانین اور ضوابط کے دریافت کرنے کے لئے انسان اپنی شخصیت کے نقطۂ نظر سے دو چیزوں کو کام میں لاتا ہے۔ ایک مشاہدہ اور دوسرا تجربہ۔ مشاہدہ اور تجربہ اپنے مزاج کے اعتبار سے دونوں جزدی ذرائع علم ہیں۔ وہ اپنے نتائج کے اعتبار سے اٹل اور آخری اور فیصلہ کن نہیں ہوتے۔ البتہ ان دو ذرائع سے اس کائنات میں بعض ایسے کلی قواعد و ضوابط دریافت کر لیے جاتے ہیں جو ایک طویل عرصے تک قوانین کلیہ سمجھے جاتے ہیں لیکن آخر کار یہ دریافت بھی ایک جزوی دریافت بن جاتی ہے۔ جو نہ تو انتہائی ہوتی ہے اور نہ ہی مطلق۔ اس لئے کہ کائنات کے ان قوانین کے درمیان تناسق و تطابق اس کلی ناموس سے منسلک ہے جو ان تمام کلیات کو باہم مربوط کرتا ہے۔ اور یہ ناموس اکبر ہمیشہ سے مخفی رہتا ہے اور یہ اس جزدی مشاہدہ اور تجربہ کے دائرہ سے باہر ہوتا ہے۔ اگرچہ بحث و تحقیق کا ایک طویل دور گزر جائے اس لئے کہ اس سلسلے میں زمانہ کوئی اہم عنصر نہیں ہے۔ اس کائنات میں اس کی اہمیت اور اس کی تشکیل کے لحاظ سے یہ تو انسانی ذات اور طاقت کے میدان کے لئے ایک حد ہے۔ اور اس کی یہ حیثیت بھی ایک جزدی اور نسبتی حیثیت ہے۔ پھر پوری بنی نوع انسان کو جو زمان عطا کیا گیا ہے وہ بھی جزئی اور محدود ہے۔ اس لئے ہمارے ذرائع معرفت اور ان ذرائع کے نتیجے میں حاصل ہونے

والے تمام نتائج جزئی ہی رہتے ہیں اس لئے کہ یہ جزوی اور نسبتی ذرائع کے واسطے سے سامنے آتے ہیں۔

یہاں آکر معلوم ہوتا ہے کہ اس کائنات میں رسالت کی اہمیت کیا ہے۔ رسالت کا ایک خاص مزاج ہوتا ہے اور یہ مزاج خاص اور یہ قوت اسے اللہ تعالیٰ کی جانب سے عطا ہوتی ہے تاکہ وہ اس ناموس اکبر کو اخذ کر سکے اور اس کی گہرائی تک جا سکے۔ جس پر اس کائنات کا وجود قائم ہے۔ ایک رسول کا رابطہ اس ناموس اکبر کے ساتھ کس نوعیت کا ہوتا ہے' ہم آج تک اس کی حقیقت کو نہیں پا سکے۔ ہم صرف اس رابطہ و تعلق کے آثار کو سمجھ سکتے ہیں۔

رسول کی یہ مخصوص طبیعی قوت ہوتی ہے جو اس ناموس اکبر سے وحی حاصل کرتی ہے۔ اور اس میں اس کی صلاحیت ہوتی ہے' اس لئے کہ رسول کا یہ مزاج اس پیغام کے وصول کرنے کے لئے تیار ہوتا ہے۔ اور یہ پیغام وہی پیغام ہوتا ہے جو اس ناموس اکبر سے یہ پوری کائنات بھی وصول کرتی رہتی ہے۔ اس لئے کہ یہ پوری کائنات براہ راست اس ناموس اکبر سے منسلک ہے اور اس کے تصرف اور کنٹرول میں ہے۔ اب رسول یہ اشارہ کس طرح وصول کرتا ہے' وہ کس ذریعہ یا کس سے یہ اشارہ وصول کرتا ہے؟ اس سوال کا جواب ہم صرف اس وقت دے سکتے ہیں جب اللہ تعالیٰ ہمیں بھی وہ استعداد اور وہ طبعی استعداد بخش دے جو وہ اپنے بندوں میں سے ان مختار اور منتخب لوگوں کو بخش دیتا ہے جو رسول کہلاتے ہیں اور وَاللَّهُ أَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهُ............... "اور اللہ خوب جانتا ہے کہ وہ استعداد و رسالت کہاں رکھ دے" یہ ایک عظیم الشان معاملہ ہے اور یہ اس کائنات کا وہ عظیم الشان راز ہے جو انسان کی قوت ادراک سے ماوراء ہے۔

تمام رسول توحید کی حقیقت کو پا گئے تھے اور تمام رسولوں کا نظریہ نظریۂ توحید رہا ہے۔ اس لئے کہ ان رسولوں کے وجود کے اندر ناموس اعظم کے ساتھ رابطے کی استعداد ودیعت کی گئی اس لئے کہ ان تمام انبیاء کا منبع ہدایت ایک ہی تھا۔ اگر یہ منبع اور مصدر ہدایت ایک نہ ہوتا تو ان انبیاء کے نظریات جدا ہوتے اور ان کا طریقۂ واردات متنوع ہو جاتا۔ رسولوں کا یہ ادراک اس دور میں ہوا جب کہ انسانیت اپنے ابتدائی دور میں تھی اور فہم و ادراک اور مشاہدہ و تجربہ کے وہ ذرائع جو آج ہیں انسانیت کو میسر نہ تھے اور نہ ہی اس دور میں وہ کلی قوانین بشریت پر ظاہر ہوئے تھے جو نظریۂ توحید پر دلالت کرتے ہیں۔

آغاز بشریت سے آج تک تمام رسولوں نے صرف اللہ کی بندگی کی طرف دعوت دی ہے۔ یہ تمام انبیاء اس ایک حقیقت کی طرف بلاتے رہے ہیں اور انہوں نے اپنے اس مزاج خاص اور طبیعت خاصہ سے یہی پیغام پایا ہے۔ اس لئے ان کے اس مزاج نبوی پر جب اس ناموس کلی کا القاء ہوا تو اس سے ان کے قلوب پر ایک فطری سوچ ابھری جو اس ناموس کلی سے پوری طرح مربوط تھی۔ پھر اس پیغام کی تبلیغ و اشاعت بھی ان کی اس سوچ اور یقین کا قدرتی نتیجہ تھی۔ ان کا یہ پختہ ایمان تھا کہ یہ حق ہے اور یہ سوچ ان کی طرف اللہ وحدہ کی طرف سے القاء ہوئی ہے اور یہ کہ عالم بالا سے ان کے اس وثیق اور قوی رابطہ اور ان کی مخصوص رسولانہ فطرت کی وجہ سے ان کو پورا یقین تھا کہ وہ ناموس اللہ وحدہ لاشریک ہے اور اس کی ذات میں تعدد ممکن نہیں ہے۔

عقیدۂ توحید رسولوں کی فطرت نبوت کا لازمی شعور ہوتا ہے۔ قرآن کریم نے انبیاء علیہم السلام کے جو قصص نقل کئے ہیں ان میں بعض الفاظ ایسے موجود ہیں جن سے اس فطرت نبویہ کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے۔ بعض اوقات انبیاء کو اس فطرت سے موصوف کیا جاتا ہے۔ مثلاً حضرت نوح علیہ السلام کے قصے میں مذکور ہے

قَالَ يَٰقَوْمِ أَرَءَيْتُمْ إِن كُنتُ عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِّن رَّبِّي وَءَاتَىٰنِي رَحْمَةً مِّنْ عِندِهِۦ فَعُمِّيَتْ عَلَيْكُمْ

أَنُلْزِمُكُمُوهَا وَأَنْتُمْ لَهَا كَارِهُونَ ۝ وَيَا قَوْمِ لَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مَالًا ۖ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَى اللَّهِ ۚ وَمَا أَنَا بِطَارِدِ الَّذِينَ آمَنُوا ۚ إِنَّهُمْ مُلَاقُو رَبِّهِمْ وَلَٰكِنِّي أَرَاكُمْ قَوْمًا تَجْهَلُونَ ۝ وَيَا قَوْمِ مَنْ يَنْصُرُنِي مِنَ اللَّهِ إِنْ طَرَدْتُهُمْ ۚ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ

"اے برادران قوم! ذرا سوچو تو سہی کہ اگر میں اپنے رب کی طرف سے ایک کھلی شہادت پر قائم تھا اور پھر اس نے مجھ کو اپنی خاص رحمت سے بھی نواز دیا، مگر وہ تم کو نظر نہ آئی تو آخر ہمارے پاس کیا ذریعہ ہے کہ تم ماننا نہ چاہو اور ہم زبردستی اس کو تمہارے سر چپک دیں؟ اور اے برادران قوم! میں اس کام پر تم سے کوئی مال نہیں مانگتا، میرا اجر تو اللہ کے ذمہ ہے۔ اور میں ان لوگوں کو دھکے دینے سے بھی رہا جنھوں نے میری بات مانی ہے، وہ آپ ہی اپنے رب کے حضور جانے والے ہیں۔ مگر میں دیکھتا ہوں کہ تم لوگ جہالت برت رہے ہو اور اے قوم! اگر میں ان لوگوں کو دھتکار دوں تو خدا کی پکڑ سے مجھے کون بچانے آئے گا؟ تم لوگوں کی سمجھ میں کیا اتنی بات نہیں آتی؟

(۱۱:۲۸)

اور حضرت صالح علیہ السلام کی زبانی فرمایا گیا

قَالَ يَا قَوْمِ أَرَأَيْتُمْ إِنْ كُنْتُ عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِنْ رَبِّي وَآتَانِي مِنْهُ رَحْمَةً فَمَنْ يَنْصُرُنِي مِنَ اللَّهِ إِنْ عَصَيْتُهُ ۖ فَمَا تَزِيدُونَنِي غَيْرَ تَخْسِيرٍ

"اے برادران قوم! تم نے کچھ اس بات پر غور کیا کہ اگر میں اپنے رب کی طرف سے ایک صاف شہادت رکھتا تھا اور پھر اس نے اپنی رحمت سے بھی مجھے نواز دیا تو اس کے بعد اللہ کی پکڑ سے مجھے کون بچائے گا۔ اگر میں اس کی نافرمانی کروں تم خسارے میں ڈالنے کے سوا میرے کس کام آسکتے ہو۔" اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سیرۃ میں بھی یہی نظر آتا ہے۔

وَحَاجَّهُ قَوْمُهُ ۚ قَالَ أَتُحَاجُّونِّي فِي اللَّهِ وَقَدْ هَدَانِ ۚ وَلَا أَخَافُ مَا تُشْرِكُونَ بِهِ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ رَبِّي شَيْئًا ۗ وَسِعَ رَبِّي كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا ۗ أَفَلَا تَتَذَكَّرُونَ ۝ وَكَيْفَ أَخَافُ مَا أَشْرَكْتُمْ وَلَا تَخَافُونَ أَنَّكُمْ أَشْرَكْتُمْ بِاللَّهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهِ عَلَيْكُمْ سُلْطَانًا ۚ فَأَيُّ الْفَرِيقَيْنِ أَحَقُّ بِالْأَمْنِ ۖ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ

"اور اس کی قوم اس سے جھگڑنے لگی تو اس نے قوم سے کہا "کیا تم لوگ اللہ کے معاملے میں مجھ سے جھگڑتے ہو؟ حالانکہ اس نے مجھے راہ راست دکھا دی ہے۔ اور میں تمہارے ٹھہرائے ہوئے شریکوں سے نہیں ڈرتا۔ ہاں اگر میرا رب کچھ چاہے تو ضرور ہو سکتا ہے۔ میرے رب کا علم ہر چیز پر چھایا ہوا ہے۔ پھر کیا تم ہوش میں نہیں آؤ گے؟ اور آخر میں تمہارے ٹھہرائے ہوئے شریکوں سے میں کیسے ڈروں جب کہ تم اللہ کے ساتھ ان چیزوں کو خدائی میں شریک بناتے ہوئے نہیں ڈرتے۔ جن کے لئے اس نے تم پر کوئی سند نازل نہیں کی ہے۔ ہم دونوں فریقوں میں سے کون زیادہ بے خوفی اور اطمینان کا مستحق ہے۔ بتاؤ اگر تم کچھ علم رکھتے ہو۔

اور حضرت شعیب علیہ السلام کے حصے میں بھی یہی بات بتائی گئی ہے۔

قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَ رَزَقَنِيْ مِنْهُ رِزْقًا حَسَنًا ؕ وَ مَاۤ اُرِيْدُ اَنْ اُخَالِفَكُمْ اِلٰى مَاۤ اَنْهٰىكُمْ عَنْهُ ؕ اِنْ اُرِيْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ ؕ وَ مَا تَوْفِيْقِيْۤ اِلَّا بِاللّٰهِ ؕ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَ اِلَيْهِ اُنِيْبُ

"بھائیو! تم خود ہی سوچو کہ اگر میں اپنے رب کی طرف سے ایک کھلی شہادت پر تھا اور پھر اس نے اپنے ہاں سے مجھ کو اچھا رزق بھی عطا کیا اور میں ہرگز یہ نہیں چاہتا کہ جن باتوں سے میں تم کو روکتا ہوں ان کا خود ارتکاب کروں۔ میں تو اصلاح کرنا چاہتا ہوں' جہاں تک میرا بس چلے اور یہ جو کچھ میں کرنا چاہتا ہوں' اس کا سارا انحصار اللہ کی توفیق پر ہے۔ اس پر میں نے بھروسہ کیا اور ہر معاملہ میں اس کی طرف رجوع کرتا ہوں۔" (۱۱:۸۸)

اور یہ بات حضرت یعقوب علیہ السلام نے ان الفاظ میں کی

قَالَ اِنَّمَاۤ اَشْكُوْا بَثِّيْ وَ حُزْنِيْۤ اِلَى اللّٰهِ وَ اَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ

"اس نے کہا میں اپنی پریشانی اور اپنے غم کی فریاد اللہ کے سوا کسی سے نہیں کرتا۔ اور اللہ سے جیسا میں واقف ہوں تم نہیں ہو۔" (۱۲:۸۶)

یوں اور اسی طرح تمام رسولوں کے اقوال اور ان کے اوصاف میں اس گہری ہم آہنگی اور رابطے کے اثرات پائے جاتے ہیں جو ان کی فطرت کا حصہ ہیں اور ان کے ضمیر کی گہرائیوں میں جاگزیں ہیں۔ اور جن کی وجہ سے ان رسولوں کا کلام متنوع اور مزین ہوتا ہے۔

مرور زمانہ کے ساتھ ساتھ انسان کے علم و معرفت نے کچھ ایسی علامات دریافت کرلی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کائنات میں قانون وحدت موجود ہے۔ انسانوں میں اہل علم اس بات کو پاچکے ہیں کہ اس طویل و عریض کائنات میں وحدت وجود اور وحدت حرکت موجود ہے۔ اور انسان نے اپنے محدود علم کے اندر رہتے ہوئے اس بات کو پالیا ہے کہ اس کائنات کی تعمیر ذرہ سے ہوئی ہے اور یہ کہ ذرہ دراصل قوت (Power) ہے۔ یوں اس ذرے میں مادہ اور قوت دونوں ملے ہوئے ہیں اور علماء طبیعات اس عرصے تک جس نظریہ پر قائم تھے کہ یہ کائنات مادہ اور قوت دو علیحدہ چیزوں سے مرکب ہے وہ اب ختم ہو گیا ہے۔ اب صحیح بات یہ ہے کہ کائنات ذرے سے مرکب ہے اور ذرے کو اگر توڑ دیا جائے تو یہ ایک عظیم قوت ہے۔ اور انسان نے اپنے محدود علم کی حد تک اس بات کو پالیا ہے کہ یہ ذرہ اپنے اندرونی نظام کے مطابق متحرک ہے اور وہ الیکٹرون اور پروٹون نیوٹرون سے مرکب ہے۔ اور الیکٹرون دونوں کے اردگرد ہروقت حرکت کرتے ہیں جو اس ذرے کا قلب ہوتا ہے۔ اور یہ حرکت دائمی ہے اور ہر ذرے میں ہے۔ اور جس طرح فریدالدین العطار نے کہا ہے کہ ہر ذرہ ایک سورج کے مانند ہے جس کے اردگرد ستارے گھومتے ہیں۔ جس طرح ہمارے اس سورج کے اردگرد ستارے گھومتے ہیں اور جو تسلسل کے ساتھ گھوم رہے ہیں۔

اس کائنات کی وحدت اور حرکت کی وحدت اس کائنات کی وہ خصوصیات ہیں جن کو انسان نے پالیا ہے اور یہ دونوں خصوصیات دور سے یہ اشارہ کررہی ہیں کہ اس کائنات کو ایک وسیع تر ضابطۂ وحدت اپنے احاطہ میں لئے ہوئے ہے۔ اس حقیقت تک انسانی علم نے اس حد تک رسائی حاصل کرلی ہے جس حد تک انسان کی قوت مشاہدہ اور قوت تجربہ کے لئے رسائی ممکن تھی لیکن خواص کی قوائے موہوبہ اس

قدر طاقتور ہوتی ہیں کہ وہ ان تمام حقائق کو ایک لمحہ میں پالیتی ہیں' اس لئے کہ ان پر یہ حقائق بلاواسطہ القاء ہوتے ہیں اور ان حقائق کی ادراک کی قوت صرف ان خواص کے پاس ہوتی ہے۔

ان خواص نے علمی تجربات کے ذریعہ ان مشاہدات اور خصوصیات کا ادراک نہیں کیا ہوتا' ان کو ایسی قوت مدرکہ عطا کی گئی ہوتی ہے جو اس حقیقت وحدت کو براہ راست پالیتی ہے۔ یہ خواص اس واحد ناموس کو براہ راست پاتے ہیں اور یہ ان کا داخلی' اپنی ذات کے اندر کا عمل ہوتا ہے۔ وہ اس بات کو پاتے ہیں کہ یہ ایک جیسا القاء لازماً ایک ہی مصدر اور منبع سے صادر شدہ ہے۔ ان خواص کی ذات میں جو مشینی قوت مدرکہ ودیعت کی جاتی ہے وہ نہایت ہی کامل اور نہایت ہی پیچیدہ ہوتی ہے۔ اس لئے کہ وہ آن واحد میں اس حقیقت کو پالیتے ہیں' جس منبع سے ان کو ہدایت ملتی ہے۔ وہ واحد ہے' جس ارادے کے تحت وہ روبعمل ہوتے ہیں۔ وہ اسی منبع سے صادر ہوتا ہے۔ لہذا ان کی یہ مخصوص قوت مدرکہ یا یہ مخصوص آلات مدرکہ بشکل یقین اس حقیقت کو پالیتے ہیں کہ اللہ جل شانہ کی واحد ذات ہی ہے جو اس کائنات میں متصرف حقیقی ہے۔

میں یہ بات اس بنا پر نہیں کر رہا ہوں کہ جدید سائنس کا یہ دعویٰ ہے کہ اس نے وحدت کائنات سے متعلق کوئی ایک یا دو حقائق دریافت کر لئے ہیں۔ اس لئے کہ سائنسی حقائق کبھی ثابت تصور ہوتے اور کبھی ان کی تردید ہو جاتی ہے اور سائنس جن حقائق تک پہنچتی ہے وہ جزوی اور نسبتی حقائق ہوتے ہیں کیونکہ سائنس کے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ کسی مطلق اور اٹل حقیقت تک پہنچ سکے۔ اس لئے کہ سائنسی نظریات بدلتے رہتے ہیں۔ بعض نظریات بعض دوسرے نظریات کی تکذیب کرتے ہیں۔ بعض ایک دوسرے میں تبدیلی کرتے ہیں۔

میں نے وحدت کائنات اور وحدت حرکت کے بارے میں جو بات کی ہے اس لئے نہیں کہ اس کا اور اس ناموس وحدت کے درمیان کوئی مماثلت ہے جو ان خواص رسل پر من جانب اللہ القاء ہوا کرتی ہے۔ میرا منشا یہ ہرگز نہیں ہے۔ میرا مقصد ایک دوسرا امر ہے اور وہ یہ ہے کہ ہدایت اور راہنمائی کا قابل اعتماد مصدر اور منبع صرف انبیاء کے ہاں ہے اور صرف انبیاء ہی اس کائنات کے بارے میں واحد 'مکمل' جامع اور سچائی پر مشتمل تصور دے سکتے ہیں۔

یہ ممکن ہے کہ جدید علمی انکشافات نے اس کائنات کی حقیقت عظمیٰ کے بعض پہلو اور بعض خواص پالئے ہوں اور انہوں نے یہ معلوم کر لیا ہو کہ حقیقت کبریٰ صرف ایک ہی ہے لیکن یہ وہی حقیقت ہے جسے رسولوں نے براہ راست اپنی مخصوص قوت مدرکہ سے پالیا ہوتا ہے اور اس کا احاطہ کر لیا ہوتا ہے اور وہ حقیقت ان رسولوں کی فطری قوت مدرکہ میں براہ راست پوری طرح موجود ہوتی ہے اور یہ کہ رسولوں کا یہ ادراک اپنی جگہ سچائی پر مبنی ہوتا ہے' چاہے جدید سائنس نے اس کی بعض خصوصیات کو صحیح طرح پالیا ہو یا نہ پایا ہو۔ اس لئے کہ سائنسی نظریات قابل بحث اور قابل نظرثانی ہوتے ہیں۔ پہلے تو یہ ثابت نہیں ہوتے۔ ظن وتخمین پر مبنی ہوتے ہیں پھر اگر بظاہر ثابت نظر بھی آئیں تو یہ ثبوت اٹل نہیں ہوتا۔ اس لئے حقیقت رسالت کو ان نظریات پر قیاس نہیں کیا جاسکتا۔ اس لئے کہ مقیاس و معیار ہمیشہ ایسا ہونا چاہئے جو ثابت ہو اور اٹل ہو۔ اس لئے ہم لازماً اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ رسالت ہی وہ معیار و مقیاس ہے جس پر ہم جدید سائنسی نظریات کی جانچ پڑتال کریں گے۔

اس حقیقت سے ایک دوسری حقیقت سامنے آتی ہے جو نہایت ہی اہم ہے۔ وہ یہ کہ یہ مخصوص شخصیات جن کا براہ راست ناموس حقیقت سے رابطہ ہوتا ہے۔ یہی اس بات کی مستحق ہیں کہ انسانیت کے لئے نظریہ وعمل کی مکمل سمت مقرر کریں۔ ایسی سمت جو اس کائنات کی فطرت اور کائنات کے مستحکم ضابطوں اور اس کے اٹل اصولوں سے ہم آہنگ ہو۔ یہ شخصیات براہ راست مہبط وحی ہوتی ہیں اس لئے ان کی ہدایات میں کسی خطا کا کوئی امکان نہیں ہوتا اور نہ اس بات کا امکان ہوتا ہے کہ وہ صحیح راستے سے بھٹک جائیں۔ یہ شخصیات نہ تو جھوٹ

بولتی ہیں اور نہ ہی حق کو چھپاتی ہیں۔ اظہار حقیقت سے ان کی راہ میں زمان و مکان کے عوامل حائل نہیں ہوتے۔ اس لئے کہ یہ شخصیات اس حقیقت کو اللہ کی جانب سے پا رہی ہوتی ہیں اور اللہ کی ذات حقیقت زمان و مکان کے عوامل سے وراء ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کی شان کبریائی نے یہ ارادہ کیا کہ اس کائنات کی تاریخ میں وقفے وقفے سے انبیاء ورسل کو بھیجا جاتا رہے تاکہ انسانیت کا رابطہ حقیقت مطلقہ سے قائم رہے۔ اس لئے کہ انسان اپنے تجربے اور مشاہدے کے بل بوتے پر ہزارہا سال کی جدوجہد کے بعد بھی اس کے ایک حصے تک نہیں پہنچ سکتا۔ اور اپنی پوری زندگی یعنی تاقیامت اس حقیقت کو نہیں پا سکتا۔ اس رابطے کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ یہ اشخاص اس پوری کائنات کے ساتھ ہم آہنگی سے قدم اٹھاتے ہیں۔ ان کی حرکت اس کائنات کی حرکت کی سیدھ میں ہوتی ہے اور ان کی فطرت' فطرت کائنات سے ہم آہنگ ہوتی ہے۔

ایک اور صرف ایک منبع صافی ہے جس سے تمام بشریت ایک سچا' ایک جامع اور کامل تصور حیات اخذ کر سکتی ہے۔ ایسا تصور حیات جس میں اس پوری کائنات کی ماہیت کو سمو دیا گیا ہو۔ اس میں حقیقت انسانی کا صاف تصور بھی موجود ہو۔ اس میں اس پوری کائنات کی تخلیق کی غرض و غایت بھی موجود ہو اور اس کائنات میں وجود انسانی کی تخلیق کے مقاصد بھی موجود ہوں۔ ایسے جامع تصور کے نتیجے ہی میں ایک صحیح اور مضبوط نظام وجود میں آسکتا ہے' جو تخلیق کائنات کے اصل منصوبے کے مطابق ہو' جو نظام اس کائنات کی حرکت اور اس کے رخ کے مطابق ہو اور جس کے قیام کے نتیجے میں پوری انسانیت کو امن و سلامتی نصیب ہو۔ انسان اس کائنات کے ساتھ بھی ہم آہنگ ہو اور انسان اپنی فطرت سے بھی ہم آہنگ ہو۔ اس لئے کہ فطرت انسان بھی فطرت کائنات ہی کا ایک حصہ ہے۔ اور تمام انسان اس دنیا میں اپنی جدوجہد' اپنی سرگرمیوں' اپنی ترقیات اور اپنی تمام حرکات و سکنات میں بھی ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگ ہو اور ان کے درمیان کوئی تلخی نہ ہو۔

اور یہ مصدر وحید اور یہ منبع صافی صرف انبیاء کا سرچشمہ ہے اور اس کے علاوہ جو کچھ بھی ہے وہ باطل اور گمراہی ہے۔ کیونکہ ان تمام دوسرے سرچشموں کا تعلق خالق کائنات سے نہیں ہوتا۔

وحی کے علاوہ علم معرفت کے جو ذرائع بھی انسان کو دیئے گئے ہیں وہ بہت ہی محدود ہیں۔ اور وہ اس لئے دیئے گئے ہیں کہ انسان اس کائنات کے بعض ظاہری قوانین دریافت کرلے اور اس کائنات کی بعض طبیعی قوتوں تک رسائی حاصل کرلے اور اسے یہ محدود علم اس لئے دیا گیا ہے کہ اس کرۂ ارض پر اسے جو محدود خلافت کا منصب سپرد کیا گیا ہے وہ اس کی ذمہ داریاں پوری کر سکے۔ اور یہاں اپنی اس محدود زندگی کو کسی قدر پرسکون بنا سکے۔ بعض اوقات انسان اس محدود دائرے کے اندر اندر کافی آگے بڑھ جاتا ہے' لیکن اپنی اس تمام ترقی کے باوجود انسان اپنے خالق اور قادر مطلق تک اور ماوراء تک رسائی نہیں حاصل کر سکتا' حالانکہ انسان اس بات کا محتاج ہے کہ وہ حقیقت مطلقہ تک پہنچ سکے اور اپنی زندگی کو اس کے رنگ میں رنگ سکے۔ فقط نئے نئے ظروف و احوال کے مطابق نہیں بلکہ اس کائنات کے ثابت شدہ اور اٹل قوانین کے مطابق جن پر اس کائنات کا وجود قائم ہے' بلکہ اس غرض و غایت کے مطابق جس کے لئے اس پوری کائنات کی تخلیق کی گئی ہے اور اس حقیقت کا علم صرف خالق کائنات ہی کے پاس ہے جو زمان و مکان کے محدود دائروں سے باہر ہے۔ اور انسان اس کا ادراک اس لئے نہیں کر سکا کہ اس کی قوتیں محدود ہیں اور وہ زمان و مکان کے محدود دائروں ہی میں کام کر سکتا ہے۔

جو ذات سفر آخرت اور اس کائنات کے انجام کا منصوبہ بناتی ہے وہی اس کے پورے راستے کے نشیب و فراز سے واقف ہوتی ہے۔ انسان جس کا علم محدود ہے اور اس کا دائرہ علم محدود ہے۔ اس کائنات کے اوجھل انجام تک صرف اپنے عقل کے بل بوتے پر نہیں پہنچ سکتا۔ اسے آنے والے پل کی خبر نہیں ہے۔ آنے والے واقعات اور انسان کے درمیان ایک پردہ حائل ہے۔ اسی لئے انسان کے

لئے یہ جائز بھی نہیں ہے اور نہ اس کے لئے یہ ممکن ہے کہ وہ اس پورے سفر آخرت کے لئے کوئی منصوبہ خود تیار کرے۔

انسان یا تو تباہی اور گمراہی کا راستہ اختیار کرے گا اور یا اسے رسولوں کے اس راستے کی طرف لوٹنا ہو گا۔ اسے وہ نظام زندگی اختیار کرنا ہو گا جو رسولوں نے براہ راست خالق کائنات سے پایا۔ یہ ان انبیاء عالی مقام کا نظام ہے جن کو خالق کائنات کے ساتھ براہ راست رابطہ کی سہولت حاصل ہوتی ہے۔

یہ انبیاء ورسل یکے بعد دیگرے گزرتے رہے اور یہ مشعل نور لئے ہوئے اور انسانیت کا ہاتھ پکڑے ہوئے اس کی مسلسل راہنمائی کرتے رہے اور اسے ایک مقام بلند تک پہنچا گئے۔ انسانیت کبھی ایک جگہ سے بھٹک جاتی اور کبھی دوسری جگہ سے گمراہ ہو جاتی۔ کبھی ایک مقام پر منحرف ہو جاتی اور کبھی غفلت کا شکار ہو جاتی اور اللہ میاں اس کی ہدایت کے لئے ایک نیا رسول بھیج دیتے جو اس کائنات کا قائد ہوتا اور اسے پھر سے راہ راست پر لاتا۔

ہربار یہ نیا رسول ایک ہی حقیقت کو پیش کرتا لیکن انسانیت علمی دنیا میں جو نئے تجربات کر چکی ہوتی تھی یہ حقیقت ان تجربات کی مناسبت سے ذرا ترقی یافتہ شکل میں ہوتی۔ جب یہ سلسلہ رسل رسول آخر الزمان کے دور تک پہنچا تو انسانوں کی حالت یہ ہو گئی تھی کہ وہ عقلی لحاظ سے بالغ ہو چکے تھے اور ان کی عقل منور ہو گئی تھی۔ اور اس آخری رسالت نے آخر کار انسانی عقل سے خطاب کیا اور عقل انسانی کو اس حقیقت مطلقہ کے جملہ اصول بتا دیئے تاکہ ان خطوط کے مطابق انسانیت اس راہ حقیقت پر گامزن رہے۔ اور اس آخری رسالت نے حقیقت اعلیٰ کو اس قدر واضح شکل میں بیان کر دیا کہ اب اس کے بعد کسی جدید رسالت کی ضرورت ہی نہ رہی۔ اب امت کے لئے آئندہ زمانوں کے لئے یہ انتظام کر دیا گیا کہ مجددین ان اصولوں کی تعبیر جدید کرتے رہیں گے۔

بہرحال انسانیت کے لئے اب اس کے سوا کوئی اور چارۂ کار نہیں رہا کہ یا تو وہ انبیاء کے وضع کردہ دائرہ فکر وعمل میں داخل ہو جائے جو انسانیت کی سرگرمیوں کے لئے ہمیشہ کھلا اور کشادہ ہے اور جو انسانیت کی ترقی یافتہ سے ترقی یافتہ سرگرمیوں کے لئے کافی ہے اور اس حقیقت کبریٰ تک رسائی حاصل کرلے جس تک انسانیت کسی اور راستے سے نہیں پہنچ سکتی۔ اور یا پھر اس بات کے لئے تیار ہو جائے کہ گمراہی کے گڑھے میں ڈوبی رہے اور بے آب وگیاہ صحرا میں یوں بھٹکتی رہے کہ اسے کوئی نشان راہ نظر نہ آئے۔

☆ ☆ ☆ ☆

درس ۱۷ تشریح آیات

آیت نمبر ۲۵۳ تا ۲۵۷

اس آیت میں رسولوں اور ان کے مشنوں کا خلاصہ بیان کیا گیا ہے۔ نیز اس نے جماعت رسل کو علیحدہ رکھ کر اسے تمام لوگوں سے ایک امتیازی مقام دیا ہے۔ اور یہ حقیقت بھی بیان کر دی ہے کہ خود رسولوں میں سے بھی بعض رسول بعض کے کے مقابلے میں زیادہ فضیلت کے حامل رہے ہیں۔ اور اس میں اس فضیلت و امتیاز کی بعض علامتوں کا بیان بھی ہے۔ اس کے بعد اس میں آنے والی نسلوں کے اختلافات کا تذکرہ ہے' حالانکہ ان کے پاس واضح نشانیاں آگئی تھیں اور یہ بتایا گیا ہے کہ اختلافات کی وجہ سے یہ قومیں باہم جنگ و جدل میں بھی مبتلا رہیں اور بعض نے ایمان کی راہ لی اور بعض نے کفر کا راستہ اختیار کیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے درمیان جدل و جدال اور قتل و قتال کا فتنہ ڈال دیا تاکہ کفر کا مقابلہ ایمان سے کیا جائے اور شر کی مدافعت بذریعہ خیر ہو۔ یہ سب مضامین جن کی طرف اس آیت میں اشارات کئے گئے ہیں یہ اس طویل تاریخ رسالت کے اہم واقعات ہیں۔

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۘ

"یہ رسول (ایسے تھے کہ) ہم نے ان میں سے بعض کو بعض پر زیادہ فضیلت دی۔" یہ فضیلت کبھی اس نسبت سے ہوئی ہے کہ بعض رسولوں کو دوسروں کے مقابلے میں وسیع دائرہ کار دیا گیا۔ جس کے اندر اس رسول نے کام کرنا تھا۔ مثلاً کبھی وہ ایک قبیلے کا رسول ہوتا یا وہ ایک قوم کا رسول ہوتا' یا وہ ایک نسل کا رسول ہوتا یا تمام امتوں اور اپنے وقت کی تمام اقوام کا رسول ہوتا۔ نیز رسولوں کے درمیان فرق مراتب ان خصوصیات کی وجہ سے بھی ہوتا جو کسی رسول یا اس کی قوم کو عطا کی جاتی تھیں۔ نیز اس پیغام' اور اس کی عمومیت اور اس کی ہمہ گیری اور جامعیت کی اساس پر بھی رسولوں کے درمیان فرق مراتب رہا ہے۔

یہاں اس آیت میں بطور مثال دو پیغمبروں کا ذکر کیا ہے۔ یعنی حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام اور ان کے علاوہ دوسرے انبیاء کی طرف اجمالی اشارہ کیا گیا ہے۔

مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ ؕ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ؕ

"ان میں سے کوئی ایسا تھا جس سے خدا تعالیٰ خود ہمکلام ہوا۔ کسی کو اس نے دوسری حیثیتوں سے بلند درجے دیئے اور آخر میں عیسیٰ ابن مریم کو روشن نشانیاں عطا کیں اور روح پاک سے اس کی مدد کی۔"

جب اس بات کا ذکر ہوتا ہے کہ کوئی نبی اللہ سے ہمکلام ہوا تو ذہن حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف خود بخود منتقل ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں ان کا نام نہیں لیا گیا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نام لیا گیا۔ اور قرآن مجید کے اکثر مقامات پر ان کے نام کی نسبت ان کی

والدہ کی طرف کی گئی ہے۔ جس کی حکمت واضح ہے۔ اس لئے کہ نزول قرآن کے زمانے میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں بے شمار رطب و یابس قصے مشہور تھے۔ نعوذ باللہ یہ کہ وہ اللہ کے بیٹے ہیں اور یہ کہ ان کا مزاج لاہوت اور ناسوت کا مرکب تھا یا یہ کہ وہ منفرداً خود ایک الٰہ تھے اور اس کے اندر مادی مزاج اس طرح گھل مل گیا تھا جس طرح قطرہ دریا میں۔ یہ اور ان جیسے فضول تصورات اور نظریات جن پر مجمعوں اور کنیسوں میں جدل و جدال اور بحث و مناظرے کے بازار گرم تھے۔ اور مملکت روما میں اس بات پر اس قدر خونریزی ہوئی تھی کہ خون کی ندیاں بہہ گئیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بشریت کا ذکر بطور تاکید بار بار کرتا ہے۔ اور اکثر مقامات پر اسے ابن مریم کہا گیا ہے۔ روح القدس سے قرآن کی مراد حضرت جبرئیل علیہ السلام ہیں۔ کیونکہ وہ رسولوں تک پیغام پہنچانے کے ذمہ دار تھے۔ اس لئے بینات کے ساتھ ساتھ یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی عظیم تائید تھی۔ یہ حضرت جبرئیل ہی تھے جو رسولوں تک وہ پیغام اور بشارت لے کر آئے تھے کہ انہیں اس عظیم ذمہ داری کے لئے منتخب کیا گیا ہے۔

یہ وہی تھے جو انہیں اس طویل اور پرمحنت راستے میں جہد مسلسل کرنے کی تلقین کرتے تھے۔ وہی تھے جو کہ وہ اس راستے کے ہولناک اور مایوس کن مواقع پر سکینہ لے کر آتے تھے اور الٰہی تائید و نصرت سے رسولوں کو ثابت قدم رہنے کی تلقین کرتے تھے۔ یہ سب وہ تائید یں ہیں جو جبرئیلؑ کے ذریعہ ہوا کرتی تھیں۔ بینات میں سب سے پہلے انجیل آتی ہے جو حضرت عیسیٰ کو دی گئی۔ نیز بینات میں وہ معجزات بھی آتے ہیں جو حضرت عیسیٰؑ کے ہاتھوں ظاہر ہوئے اور جن سے مخالفین بنی اسرائیل کے مقابلے میں آپ کی تائید ہوئی اور جن کی تفصیل قرآن مجید کے دوسرے مقامات پر بیان کی گئی ہے۔

قرآن مجید کی اس آیت میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا نام نہیں لیا گیا۔ اس لئے کہ خطاب خود حضور سے ہو رہا ہے۔ اس آیت سے پہلی آیت میں تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ۭ وَاِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ **تِلْكَ الرُّسُلُ** ..... "یہ اللہ کی آیات ہیں جو ہم ٹھیک ٹھیک تم کو سنا رہے ہیں اور تم یقیناً ان لوگوں میں سے ہو جو رسول بنا کر بھیجے گئے ہیں۔ یہ رسول......" یعنی بات یہ ہو رہی ہے کہ آپ کو دوسرے رسولوں کی بابت بتایا جا رہا ہے اور آپ تو یقیناً رسولوں میں سے ہیں۔

انبیاء و رسل کی سیرتوں اور خصوصیات کے اعتبار سے ہم ان کے جس پہلو پر بھی نظر ڈالتے ہیں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو سرفہرست پاتے ہیں۔ رسالت کی جامعیت اور شمولیت کے اعتبار سے دیکھیں یا اس کے دائرہ کار کی وسعت اور زمانی دوام کے اعتبار سے دیکھیں ہر اعتبار سے حضور سرور انبیاء ﷺ نظر آتے ہیں۔

اسلام نے نظریۂ توحید کو اپنی بہترین شکل میں پیش کیا ہے۔ اور یہ الہامی حقائق میں سے اعلیٰ حقیقت ہے یہ کہ' خالق صرف ایک ہے اور اس جیسا کوئی نہیں (لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ)......... اور یہ کہ وہ اپنی ذات میں بھی ایک ہے اور صرف اس کے ارادۂ کن سے پوری کائنات وجود میں آئی ہے اور وہ قانون قدرت بھی ایک ہے جو اس پوری کائنات میں جاری و ساری ہے۔ اور سادہ سے سادہ مخلوقات سے لے کر انسان ناطق جیسی پیچیدہ سے پیچیدہ مخلوقات بھی اسی ارادۂ کن اور اسی قانون قدرت کا نتیجہ ہے اور آدم علیہ السلام سے دنیا کے آخری انسان تک تمام انسان بھی ایک ہی مخلوق ہیں اور اس ایک انسانیت کے لئے اللہ کی ارسال کردہ تہذیب اور دین بھی ایک ہے۔ جماعت انبیاء بھی ایک ہی جماعت ہے اور وہ تمام امم بھی ایک امت ہیں جنہوں نے ان انبیاء کی دعوت پر لبیک کہا ہے۔ اور وہ تمام بشریت ایک ہے جو اس ایک خالق کی طرف متوجہ ہوتی ہے اور اس توجہ اور یکسوئی کا نام بھی ایک ہے یعنی عبادت....... دنیا اور آخرت بھی ایک ہیں۔ بدیں مضمون کہ دنیا دار العمل ہے اور آخرت دار الجزاء ہے اور وہ شریعت اور قانون بھی ایک ہے جو اللہ نے ان انسانوں کے لئے وضع کیا ہے۔ اس کے سوا اسے کوئی اور شریعت مقبول نہیں ہے اور وہ سرچشمہ اور مصدر اور منبع بھی ایک ہے جس سے اس

انسانیت نے اپنی زندگی کا نظام فکر و عمل اخذ کرنا ہے۔

اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم وہ ذات ہیں جن کو اس قدر روحانی قوت دی گئی تھی کہ ان کی روح وحدانیت کبریٰ اور لامحدود سے رابطہ رکھتی تھی۔ نیز آپ کو اس قدر طاقتور قوت ادراک دی گئی تھی۔ آپ وحدانیت کبریٰ کا تصور کر سکتے تھے۔ اور اسے مثالی شکل دے سکتے تھے اور آپ کی ذات میں ایسی قوت پنہاں تھی کہ آپ نے اپنی ظاہری اور عملی زندگی میں وحدانیت کبریٰ کے اس تصور کو عملاً پیش کیا۔

یہ تھا وہ رسول جو پوری بشریت کی ہدایت کے لئے بھیجا گیا۔ اپنے یوم بعثت سے لے کر اس وقت تک جب تک اس دنیا کی مخلوقات اپنے خالق اللہ کے ہاں حاضر نہیں ہو جاتی۔ آپ کی رسالت ایسی تھی جس نے انسان کے فہم و ادراک پر بغیر کسی پابندی کے اعتماد کیا۔ یہاں تک کہ مادی اور قاہرانہ معجزات کے مقابلے میں بھی اور اس سے مقصود یہ تھا کہ دنیا کے سامنے یہ اعلان کر دیا جائے کہ اب وہ دور آگیا ہے جس مین انسان نے عقلی بلوغ کا مقام پالیا ہے۔

اس کا منطقی نتیجہ یہی ہو سکتا تھا کہ آپ خاتم الرسل ہوں اور آپ کی رسالت خاتم رسالات ہو اور یہی وجہ ہے کہ آپ کے بعد اب سلسلہ وحی منقطع ہو گیا اور آپ کی رسالت کے عہد میں بشریت کے لئے وحدانیت کبریٰ کے خطوط و حدود قائم ہو گئے اور ایک ایسے مکمل نظام زندگی کا اعلان کر دیا گیا جس کے حدود میں تمام آنے والی نسلیں زندگی کی تگ و دو جاری رکھ سکتی ہیں۔ اس نے تفصیلات و تشریحات تو عقل انسان پر چھوڑ دیں اور باقی سب کچھ بتا دیا اور لازم کر دیا گیا کہ یہ تفصیلات و تشریحات بھی اس مکمل نظام الٰہی کی روشنی میں طے کی جائیں۔ کیونکہ ان کے لئے جدید رسالت کی ضرورت نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ خوب جانتا تھا وہی تو تھا جس نے انسان کو پیدا کیا تھا۔ وہ خوب جانتا تھا کہ وہ کون ہیں اور کیا ہیں۔ وہ خوب جانتا تھا کہ وہ کیا تھے اور کیا ہیں؟ وہ خوب جانتا تھا کہ اس رسالت آخرہ نے جو مکمل نظام زندگی تجویز کیا ہے وہ اس انسان کی جدید سے جدید اور ترقی یافتہ سے ترقی یافتہ زندگی کے لئے کافی ہے۔ کون ہے جو یہ زعم لے کر سامنے آسکتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ کے بندوں کی مصلحت کے بارے میں زیادہ جانتا ہے یا کون ہے جو یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ خاتم النبیین کا پیش کردہ نظام زندگی اس قابل نہیں ہے کہ دور جدید میں انسان کی ترقی یافتہ زندگی کے لئے مفید ہو۔ یا کون ہے جو یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ وہ الٰہی نظام زندگی کے مقابلے میں کوئی اچھا نظام زندگی تجویز کر سکتا ہے۔ جو شخص بھی ان میں سے کوئی ایک دعویٰ کر بیٹھے یا یہ یقین کرتا ہو کہ یہ دعوے درست ہیں تو اس شخص نے کفر صریح کا ارتکاب کر لیا ہے۔ اور یہ ایسی حرکت ہے جس کے کفریہ حرکت ہونے میں کوئی شک نہیں ہے۔ اور ایسے شخص نے گویا اپنی ذات اور پوری انسانیت کے لئے ایک عظیم فتنہ اور ایک عظیم شر کا ارادہ کر لیا ہے۔ یہ شخص صریحاً اللہ کا دشمن ہے۔ یہ انسانیت کا کھلا دشمن ہے حالانکہ اسلامی نظام زندگی اس بشریت کے لئے بطور رحمت و برکت نازل کیا گیا تھا کہ وہ قیامت تک انسانی زندگی پر حکم فرما ہو۔

اور اس کے بعد کیا ہوا؟ ان رسولوں کے پرستاروں نے باہم مقاتلہ شروع کر دیا۔ تمام انبیاء علیہم السلام کی دعوت اور پیغام کی ایک نوعیت نے انہیں کوئی فائدہ نہ دیا۔ تمام انبیاء کی جماعت کے اتحاد سے بھی انہیں کوئی فائدہ نہ ہوا۔ یہ حقیقت ان متبعین کو اس بات سے باز نہ رکھ سکی کہ وہ باہم جدال و قتال میں مبتلا ہوں اور یہ اس لئے کہ

وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلَ الَّذِیْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا

جَآءَتۡهُمُ الۡبَيِّنٰتُ وَلٰكِنِ اخۡتَلَفُوۡا فَمِنۡهُمۡ مَّنۡ اٰمَنَ وَمِنۡهُمۡ مَّنۡ كَفَرَ ؕ وَلَوۡ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقۡتَتَلُوۡا ۡ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَفۡعَلُ مَا يُرِيۡدُ

۴۳
۴۵
۱

"اگر اللہ چاہتا تو ممکن نہ تھا کہ ان رسولوں کے بعد' جو لوگ روشن نشانیاں دیکھ چکے تھے' وہ آپس میں لڑتے مگر (اللہ کی مشیئت یہ نہ تھی کہ وہ لوگوں کو جبراً اختلافات سے روکے' اس وجہ سے) انہوں نے باہم اختلاف کیا۔ پھر کوئی ایمان لایا اور کسی نے کفر کی راہ اختیار کی۔ ہاں اللہ چاہتا تو وہ ہرگز نہ لڑتے مگر اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔"

یعنی یہ جدال و قتال اللہ تعالیٰ کی مشیئت کے خلاف نہ تھے۔ اس لئے کہ اللہ کی مشیئت کے خلاف اس کائنات میں کوئی واقعہ نہیں ہو سکتا۔ یہ کارخانۂ قدرت جس طرح چل رہا ہے یہی اللہ کی مشیئت ہوتی ہے۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کی تخلیق اور اس میں ہدایت اور ضلالت دونوں کی استعداد کا ودیعت ہونا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ بات انسان کے اختیار تمیزی پر چھوڑ دی ہے کہ وہ اچھا راستہ اختیار کرتا ہے یا برا۔ اس لئے اس تخلیق اور اس کے اندر ودیعت کی ہوئی استعداد کے نتیجے میں جو امر بھی وقوع پذیر ہوتا ہے وہ دائرہ مشیئت ایزدی میں شامل ہے اور وہ اللہ کی مشیئت کے عین مطابق ہے۔

اسی طرح مخلوقات اور خصوصاً انسان میں قابلیت اور استعداد کا تفاوت بھی سنن الٰہیہ میں سے ایک اہم سنت ہے۔ خالق نے مخلوقات کو متنوع بنایا ہے۔ اگرچہ اصل تخلیق اور نشوونماسب کی ایک جیسی ہے اور یہ اس لئے کہ انسان نے اس کرۂ ارض پر جو فریضۂ منصبی اور بار خلافت اٹھانا تھا وہ مختلف النوع تھا۔ اس لئے ہر کسے را بہر کارے ساختند۔ اللہ تعالیٰ کی مشیئت یہ نہ تھی کہ تمام مخلوقات کو ایک ہی صلاحیت اور ایک ہی معیار پر کاربن کاپی کی طرح بنتا چلا جائے۔ اس لئے کہ اس دنیا میں اس مخلوقات نے مختلف النوع کام سرانجام دینے تھے۔ جہاں حیات انسانی کو ترقی دینا مقصود تھا' اس میں رنگارنگی اور بوقلمونی پیدا کرنا مطلوب تھا۔ اگر اللہ تعالیٰ نے مخلوقات کے لئے متنوع فرائض منصبی پیدا کیے تھے تو لازمی تھا کہ استعداد اور صلاحیتوں میں بھی فرق ہوتا۔ تاکہ یہ اختلاف وسیلۂ کمال بنے۔ ہاں اللہ تعالیٰ نے ہر انسان پر یہ لازم کیا ہے کہ وہ غور و فکر کرے۔ اپنے لئے راہ ہدایت اور حقیقت ایمان تلاش کرے۔ اس لئے کہ اس نے انسان کے اندر یہ استعداد اور صلاحیت ودیعت کی ہے کہ وہ غور و فکر کے ذریعہ براہ راست ہدایت پائے۔ اس کائنات میں ایمان و ہدایت کی راہ پانے کے لئے واضح دلائل بکثرت موجود ہیں اور انسانی تاریخ میں سلسلہ انبیاء و رسل کا تاریخی ریکارڈ اس کے سامنے موجود رہا ہے۔ اور اس ہدایت اور ایمان کے دائرے کے اندر اندر ہر قسم کا صحت مند تنوع اور اختلاف جاری رہے گا۔ اور یوں کبھی نہ ہو گا کہ لوگ کاربن کاپی بن جائیں اور ایک ہی قالب سے نکلی ہوئی مصنوعات کی طرح بنتے رہیں۔

وَلٰكِنِ اخۡتَلَفُوۡا فَمِنۡهُمۡ مَّنۡ اٰمَنَ وَمِنۡهُمۡ مَّنۡ كَفَرَ ...... "مگر انہوں نے باہم اختلاف کیا پھر کوئی ایمان لایا اور کسی نے کفر کی راہ اختیار کی۔"

انسانوں کا اختلاف ایمان و عقیدہ کے اعتبار سے جب اس حد تک پہنچ جائے تو یہ نظریاتی اختلاف کفر و ایمان کا اختلاف بن جاتا ہے۔ پھر تصادم ناگزیر ہو جاتا ہے۔ اور یہ تصادم اس لئے ہوتا ہے کہ دنیا میں قوت کا توازن قائم ہو اور ایک قوت کا دفاع دوسری قوت کے ذریعہ ہو۔ کفر کا دفاع ایمان کے ذریعہ کیا جائے۔ گمراہی کا مقابلہ ہدایت سے کیا جائے۔ شر کا دفاع خیر سے کیا جائے' اس لئے کہ اللہ کی اس سرزمین کو کفر' گمراہی اور شر کے حوالے نہیں کیا جا سکتا۔ اور جب صورت حال یہاں تک پہنچ جائے کہ ایک گروہ اور دوسرے گروہ کے درمیان کفر

وایمان کی خلیج واقع ہو جائے تو اس وقت کوئی گروہ یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ وہ مطیع انبیاء ہے۔ جب مدینہ طیبہ میں یہ آیات نازل ہوئیں تو جماعت مسلمہ ایسی ہی صورت حال سے دوچار تھی۔ مکہ مکرمہ میں مشرکین مکہ اس زعم میں مبتلا تھے کہ صرف وہی ملت ابراہیمی کی نمائندگی کرتے ہیں۔ مدینہ طیبہ میں یہودی یہ دعویٰ کرتے تھے کہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دین کے پیرو ہیں۔ اور عیسائیوں کا دعویٰ یہ تھا کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دین کے پیروکار ہیں۔ حالانکہ ان فرقوں میں سے ہر ایک فرقہ اپنے اصل دین سے بہت دور جا چکا تھا۔ اس نے اپنے نبی کے پیغام کو ترک کر دیا تھا۔ اور وہ اپنے اصل ادیان سے اس قدر دور جا چکے تھے کہ ان پر کافر ہو جانے کا اطلاق درست طور پر ہو سکتا تھا۔

جس دور میں یہ آیات نازل ہوئیں اس دور میں مسلمان مشرکین عرب کے ساتھ برسرپیکار تھے اور حالات یہ رخ اختیار کر رہے تھے کہ قریب ہی اہل کتاب کے اہل کفر کے ساتھ بھی ان کی لڑائی شروع ہونے والی تھی۔ اس لئے ایسے حالات میں عام مسلمانوں کے ذہن کو صاف کر دیا گیا کہ مختلف العقائد لوگوں کے درمیان نظریاتی جنگ اور مسلح جنگ ایسے حالات میں مشیت الٰہی کے عین مطابق ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی اجازت سے یہ جنگ لڑی جا رہی ہے۔

لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلُوْا .... "اگر اللہ کی مشیت ہوتی تو وہ ہرگز نہ لڑتے۔" لیکن اللہ نے چاہا کہ وہ لڑیں اور اس لئے چاہا کہ ایمان کفر کے مقابلے میں صف آرا ہو اور دنیا میں وہ نظریاتی اساس جم جائے اور مستحکم ہو جائے جسے تمام انبیاء لے کر آئے جو ایک بھی ہے اور مسلم سچائی بھی ہے۔ لیکن بعض لوگوں نے اس متحدہ سچائی سے انحراف اختیار کر لیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس حقیقت کو خوب جانتے تھے کہ باطل اور گمراہی کا مزاج یہی ہے کہ وہ کبھی غیر جانبدار ہو کر کھڑی نہیں رہتی۔ وہ اپنے مزاج کے اعتبار سے شوریدہ سر ہے۔ اس لئے وہ لازماً جارحیت کی راہ اختیار کرتی ہے۔ اور اہل ہدایت کو گمراہ کرتی ہے۔ وہ راستی کو کجی میں تبدیل کرتی ہے۔ لہٰذا اہل ایمان اور اہل راستی کا فرض ہے کہ وہ گمراہی اور کجی کے خلاف برسرپیکار رہیں۔

وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ .... "مگر اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔" اللہ کی مشیت بے قید ہے۔ اس کی قدرت کامل اور فعال ہے۔ اس نے فیصلہ کیا کہ انسان اپنی تخلیق کے اعتبار سے مختلف ہوں۔ اس نے یہ فیصلہ فرمایا کہ انہیں اپنی زندگی کی راہیں اختیار کرنے کی آزادی ہو۔ اس نے یہ فیصلہ کیا کہ جو راہ ہدایت اختیار نہ کرے گا وہ گمراہ ہو گا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ شر اپنے مزاج کے اعتبار سے جارح ہوگی اور کجی کو پسند کرے گی۔ اس نے فیصلہ کیا کہ خیر و شر برسرپیکار ہوں۔ اس نے یہ فیصلہ کیا کہ اہل ایمان اس واحد' واضح اور بالکل سیدھی حقیقت کے قیام کے لئے جہاد کریں۔ اس نے یہ قرار دیا کہ انبیاء و رسل کے متبعین کے لئے صرف یہ کافی نہیں ہے کہ وہ اپنے آپ کو انبیاء کی طرف منسوب کر دیں۔ اعتبار اس بات کا ہے کہ ان کا رویہ کیسا ہے اور ان کا عمل کیا ہے؟ اور یہ کہ اہل ایمان کے جہاد کی زد سے وہ محض اس لئے نہ بچ سکیں گے کہ وہ انبیاء کے وارث ہیں حالانکہ انہوں نے انبیاء کے عقیدہ اور ایمان سے انحراف کر لیا ہے۔

یہ حقیقت اور اصول جس کا فیصلہ اللہ تعالیٰ نے مدینہ کی پہلی اسلامی جماعت کے لئے کیا' ایک ایسی حقیقت اور ایک ایسا اصول ہے جو بے قید ہے اور جس کا تعلق کسی خاص زمانے سے نہیں ہے۔ قرآن مجید کا یہ انداز بیان ہے کہ وہ ایک اصولی اور مطلق بات کو بھی ایک مخصوص واقعہ کے ضمن میں بیان کرتا ہے۔ محل خاص ہوتا ہے لیکن حکم عام ہوتا ہے۔

○○○

یہی وجہ ہے کہ اس اصولی بات یعنی اختلاف عقیدہ اور قتال کے بیان کے بعد' اللہ تعالیٰ اہل ایمان کو خطاب کر کے یہ حکم دیتے ہیں

کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں جو وسائل رزق دیئے ہیں اس میں سے اس کی راہ میں خرچ کریں۔ اس لئے کہ انفاق مالی جہاد ہے اور مالی قربانی جہاد کے لئے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہے۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ ۭ وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۵۴﴾

"اے لوگو! جو ایمان لائے ہو' جو کچھ مال و متاع ہم نے تم کو بخشا ہے' اس میں سے خرچ کرو' قبل اس کے کہ وہ دن آئے' جس میں نہ خرید و فروخت ہوگی' نہ دوستی کام آئے گی اور نہ سفارش چلے گی۔ اور ظالم اصل میں وہی ہیں جو کفر کی روش اختیار کرتے ہیں۔"

اہل ایمان کے دلوں سے یہ ایک محبت بھری اپیل ہے۔ یہ اپیل اہل ایمان اور اپیل کنندہ کے درمیان ایک روحانی رابطہ ہے کیونکہ وہ ذات باری پر ایمان لائے ہوئے ہیں۔ "اے ایمان لانے والو!"

اپیل یہ ہے کہ جو تمہیں ہم نے عطا کیا ہے اس کا ایک حصہ ہمیں دے دو۔ آخر ہم ہی دینے والے اور داتا ہیں اور ہم ہی اپنے دیئے سے کچھ مانگ رہے ہیں۔ اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ .... "جو کچھ ہم نے تمہیں دیا ہے' اس میں سے خرچ کرو۔"

دیکھو ایسے مواقع بار بار نہیں آتے۔ اگر تم نے اس سے فائدہ نہ اٹھایا تو پھر یہ مواقع نصیب نہ ہوں گے۔ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ .... "قبل اس کے کہ وہ دن آئے جس میں نہ خرید و فروخت ہوگی' نہ دوستی کام آئے گی اور نہ سفارش چلے گی۔"

یہ آخری موقعہ ہے۔ اگر یہ تم سے چلا گیا تو پھر ہاتھ نہ آئے گا۔ اس موقعہ پر مال نفع بخش کاروبار میں لگ رہا ہے۔ اس کے بعد کوئی دوستی' کوئی سفارش اس نقصان اور خسارے کی تلافی کرنے کے لئے نہیں ہے۔

یہاں اس مقصد کی طرف بھی اشارہ کر دیا جاتا ہے جس کے لئے خالق کائنات خود چندہ کی اپیل کر رہے ہیں یعنی جہاد فی سبیل اللہ کے لئے یہ مطالبہ ہو رہا ہے۔ اور جہاد اس لئے ہے کہ کفر کا دفعیہ کیا جائے۔ دنیا سے ظالمانہ نظام کو ختم کیا جائے جو کفر کی شکل میں قائم ہے۔ وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ .... "ظالم وہی ہیں جو کفر کی روش پر جم جاتے ہیں۔"

انہوں نے سچائی کا انکار کر کے ظلم کا ارتکاب کیا۔ انہوں نے خود اپنے نفوس پر ظلم کیا ہے جنہیں وہ ابدی ہلاکت کے گڑھے میں گرا رہے ہیں۔ وہ عوام الناس پر بھی ظلم کر رہے ہیں۔ یوں کہ وہ انہیں راہ ہدایت پر آنے سے روکتے ہیں اور انہیں گمراہ کرتے ہیں اور انہیں اس بھلائی تک پہنچنے نہیں دیتے جس جیسی اور کوئی بھلائی نہیں ہے۔ یعنی امن و سلامتی کی بھلائی' اطمینان و محبت کی بھلائی اور اصلاح و یقین کی بھلائی۔

جو لوگ اس بات کے دشمن ہیں کہ لوگوں کے دل و دماغ میں ایمان کی حقیقت جاگزیں ہو جائے۔ جو لوگ اس بات کے دشمن ہیں کہ ایمانی نظام زندگی ہماری زندگیوں میں جاری و ساری ہو جائے اور جو لوگ اس بات کی جدوجہد کر رہے ہیں کہ ایمانی شریعت ہمارے اجتماعی نظام میں نافذ نہ ہونے پائے' وہ اس انسانیت کے بدترین دشمن ہیں۔ وہ پرلے درجے کے ظالم ہیں۔ اگر انسانیت نے راہ راست کو پا لیا ہے تو اس کا یہ فرض ہے کہ وہ ایسے لوگوں کا اس وقت تک تعاقب کرے جب تک وہ اس ظلم سے باز نہیں آ جاتے۔ جو وہ مسلسل

انسانیت پر ڈھارہے ہیں۔ انسانیت کا یہ فرض اولیں ہے کہ وہ ایسے لوگوں کے مقابلے کے لئے جان و مال کی یہ قربانی دے۔ اور یہ ہر اس اسلامی جماعت کا بھی فرض ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اس کام کے لئے برپا کیا ہے۔ اور جسے یہ فریضہ سرانجام دینے کی دعوت دی جارہی ہے اور جسے اس کا رب ایسے گہرے الہامی الفاظ میں پکار رہا ہے۔

OOO

رسولوں کے بعد ان کی امتوں کے درمیان نظریاتی اختلافات اور تاریخی جنگ و جدال کے بیان کے بعد اور یہ واضح کرنے کے بعد کہ واضح ایمانی دلائل کے باوجود انہوں نے ناحق کفریہ تصورات اپنا لئے۔ اب یہاں یہ مناسب سمجھا گیا کہ یہاں ایک ایسی جامع آیت اتاری جائے جو ایمانی تصورات کے اصول و قواعد پر مشتمل ہے۔ یہ آیت الکرسی ہے جو نظریۂ توحید کو اپنی پوری گہرائیوں اور واضح نشانات کے ساتھ پیش کرتی ہے۔ یہ ایک عظیم المرتبہ آیت ہے۔ جس میں گہرے معانی پوشیدہ ہیں اور جس کا دائرہ اطلاق بہت ہی وسیع ہے۔ (جس میں وہ کم از کم عقائد بیان کئے گئے ہیں جو کفر و ایمان کے درمیان فاصلہ متعین کرتے ہیں)

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ۚ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّ لَا نَوْمٌ ؕ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ؕ مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ؕ یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ۚ وَلَا یُحِیْطُوْنَ بِشَیْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖۤ اِلَّا بِمَا شَآءَ ۚ وَسِعَ كُرْسِیُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ۚ وَلَا یَـُٔوْدُهٗ حِفْظُهُمَا ۚ وَهُوَ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ ﴿۲۵۵﴾

"اللہ 'وہ زندۂ جاوید ہستی' جو تمام کائنات کو سنبھالے ہوئے ہے' اس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے۔ وہ نہ سوتا ہے اور نہ اسے اونگھ لگتی ہے۔ زمین و آسمان میں جو کچھ ہے' اسی کا ہے۔ کون ہے جو اس کی جناب میں اس کی اجازت کے بغیر سفارش کر سکے؟ جو کچھ بندوں کے سامنے ہے۔ اسے بھی وہ جانتا ہے اور جو کچھ ان سے اوجھل ہے' اس سے بھی وہ واقف ہے اور اس کی معلومات میں سے کوئی چیز ان کی گرفت ادراک میں نہیں آسکتی۔ الا یہ کہ کسی چیز کا علم وہ خود ہی ان کو دینا چاہے اس کی حکومت آسمانوں اور زمین پر چھائی ہوئی ہے اور ان کی نگہبانی اس کے لئے کوئی تھکا دینے والا کام نہیں ہے۔ بس وہی بزرگ و برتر ذات ہے۔"

اس آیت میں جن صفات کو گنوایا گیا ہے ان میں ہر ایک اسلامی تصور کائنات کے اساسی اصولوں میں سے کسی ایک اصول پر مشتمل ہے۔ اگرچہ اسلامی نظریہ حیات اور اسلام کے اساسی عقائد پر مکی دور میں نازل ہونے والی آیات میں تفصیلی بحث کی گئی ہے۔ تاہم اس اہم اور اساسی موضوع پر مدینہ میں نازل ہونے والی آیات میں بھی بعض اوقات بحث کی گئی ہے۔ اس لئے کہ ان عقائد و تصورات پر ہی اسلامی نظام زندگی کی بنیاد رکھی گئی ہے اور جب تک اساس ٹھیک نہ ہو' پوری دیوار درست نہیں ہو سکتی۔ نہ اس نظام کی تشریح ہو سکتی اور نہ یہ نظام نفس انسانی کے مسلمہ حقائق سے ہم آہنگ ہو سکتا ہے۔ نہ اس کی کوئی معقول اور پر از یقین تعبیر کی جا سکتی ہے۔

اس کتاب کے حصہ اول میں "تفسیر سورۃ فاتحہ کے ضمن میں' میں نے اس گمراہی پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔ اور یہ کہا ہے کہ ذات

باری کے بارے میں انسانی ضمیر اور عقیدہ کے تطہیر کی بڑی ضرورت ہے۔ انسانی ضمیر جاہلیت کی تہہ بہ تہہ غلط افکار کے نیچے محض اس لئے دبا ہوا تھا کہ انسان کے ذہن میں تصور الٰہ اپنی صاف و شفاف اور واضح شکل میں نہ تھا۔ یہ عقیدہ خرافات اور دیو مالائی عقائد کے نیچے دبا ہوا تھا۔ یہاں تک کہ بڑے بڑے فلاسفر کے ہاں بھی تصور خدا واضح اور صاف نہ تھا۔ یہاں تک کہ جب اسلامی نظریۂ حیات آیا اور اس نے ذات باری کو اپنے صحیح تصور کے ساتھ پیش کیا اور انسانی ضمیر کو ان ناقابل یقین مروجہ تصورات کے بوجھ کے نیچے سے نکال دیا اور انسان جس اندھیر میں ٹامک ٹوئیاں مار رہا تھا' اس سے اسے نجات ملی۔

غرض اس آیت میں جو صفات بھی بیان کی گئی ہیں وہ اسلامی تصور کائنات کے لئے ایک عمومی اساس ہیں اور اس طرح یہ صفات پھر اسلام کے تفصیلی نظام زندگی کے لئے ماخذ ہیں۔

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ .... "اللہ' جس کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے۔" یہ ایک فیصلہ کن وحدانیت ہے جس میں کسی قسم کے انحراف کی کوئی گنجائش نہیں ہے' اور اس میں وہ شرکیہ شائبے بھی نہیں ہیں جو سابقہ ادیان کے تصور الٰہ پر طاری ہو گئے تھے۔ مثلاً تثلیث کا خود ساختہ عقیدہ جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد اہل کلیسا نے اختیار کیا.... یا وہ عقائد جن کی قدیم مصری اقوام قائل تھیں۔ جو کسی وقت ایک خدا کے قائل تھے لیکن ازمنہ مابعد میں اس ایک خدا کو سورج کی ٹکیا کی شکل میں متمثل کر دیا گیا اور بعدہ' اس بڑے سورج الٰہ کے تحت بہت سے چھوٹے چھوٹے الٰہ گھڑ لئے گئے۔

یہ فیصلہ کن وحدانیت' اسلامی تصورات و عقائد کی اساس ہے۔ جس سے اسلامی نظام زندگی اپنی مفصل صورت میں متشکل ہوتا ہے۔ یہی تصور خدا ہے جس کے نتیجے میں ہم اپنی عبادات اور اپنی اطاعت میں صرف اللہ کی جانب متوجہ ہوتے ہیں اس کے مطابق کوئی انسان اللہ کے سوا کسی کا مطیع فرمان اور کسی کا غلام نہیں ہو سکتا۔ وہ صرف اللہ کی عبادت کر سکتا ہے۔ صرف اللہ کی اطاعت اس پر فرض ہے جس کا اللہ نے اطاعت کرنے کا واضح حکم دیا ہے۔ اسی تصور خدا سے یہ اصول پھوٹتا ہے کہ حاکمیت صرف اللہ کے ساتھ مخصوص ہے۔ اس لئے صرف وہی قانون ساز ہو سکتا ہے اور انسان اپنے قواعد و ضوابط صرف شریعت کی روشنی میں وضع کر سکتا ہے۔ اسی تصور الٰہ سے یہ بات نکلتی ہے کہ انسان اپنے لئے اقدار حیات صرف اللہ سے اخذ کر سکتا ہے۔ زندگی کی کوئی قدر اگر اللہ کے ترازو میں کوئی وزن نہیں رکھتی تو اس کا کوئی وزن نہ ہو گا۔ کوئی قانون' کوئی رواج اور کوئی تنظیم جو اللہ کے نظام کے خلاف ہے بالکل کالعدم ہے۔ غرض عقیدۂ توحید کے نتیجے میں انسانی ضمیر میں ایک شعور پیدا ہوتا ہے اور پھر اس کے نتیجے میں ایک تفصیلی نقشۂ حیات مرتب ہوتا ہے۔

اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ .... "زندۂ جاوید اور سنبھالنے والا" جس حیات کی نسبت یہاں ذات باری کی طرف کی گئی ہے۔ وہ ذاتی صفت ہے۔ وہ ایسی حیات نہیں ہے جو مثلاً ایک مخلوق اپنے خالق سے مستعار لیتی ہے۔ اس معنی میں صرف اللہ ہی زندۂ جاوید ہے۔ وہ ازلی اور ابدی زندہ ہے۔ نہ اس کا کوئی نقطۂ آغاز ہے اور نہ نقطۂ انتہا ہے۔ حیات الٰہیہ زمان و مکان کے اس تصور سے پاک ہے جو مخلوقات کی زندگی کا ایک لازمہ ہے۔ جس کا ایک نقطہ سے آغاز ہوتا ہے اور ایک یونٹ پر وہ جا کر ختم ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں هُوَ الْحَیُّ ...... کہا گیا کہ صرف وہی زندہ ہے۔ اس مفہوم کے ساتھ اور کوئی زندہ نہیں ہے۔ پھر حیات باری ان تصوراتی لوازم سے پاک ہے۔ جن کے ساتھ ایک انسان زندگی کا کوئی تصور کر سکتا ہے۔ اس لئے کہ اللہ جیسا کوئی نہیں ہے لَیْسَ كَمِثْلِهٖ شَیْءٌ .... یہی وجہ ہے کہ عام زندگی کے مفہوم کے ساتھ جو خصائص وابستہ ہیں اللہ تعالیٰ کی زندگی میں ان کا شائبہ تک نہیں ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی حیات ایک مطلق اور بے قید حیات ہے اور ان خصوصیات سے پاک ہے جو انسانی زندگی کا لازمہ ہیں۔ لہٰذا اس سے ان تمام تصوراتی دیو مالائی مفاہیم کی نفی ہو جاتی ہے جو لوگوں نے اللہ کی جانب منسوب کر رکھے ہیں۔

القیوم کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام مخلوقات کا نگہبان ہے اور تمام موجودات اس کی وجہ سے موجود ہیں- اور تمام موجودات اپنے وجود اور قیام کے لئے اس کے محتاج ہیں اور اس کے زیر تدبیر ہیں- یہ بات نہیں ہے کہ اللہ تخلیق کے بعد اپنی مخلوقات کے بارے میں کوئی فکر نہیں کرتا جیسا کہ ارسطو کا قول ہے- ارسطو کا خیال یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ اپنی ذات کے علاوہ کسی کے بارے میں فکر مند نہیں ہو سکتا- وہ سمجھتا ہے کہ قیومیت کے اس تصور میں مکمل پاکی اور عظمت پائی جاتی ہے- حالانکہ اس کے اس تصور کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ جل شانہ کا رابطہ اپنی مخلوق کے ساتھ کٹ جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ مخلوق کو ترک کر دیتے ہیں- اس کے مقابلے میں اللہ کا اسلامی تصور ایک مثبت تصور ہے اس میں سلبیت نہیں ہے- وہ اس اساس پر قائم ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کا نگہبان ہے اور دنیا کی ہر ہستی اپنے وجود میں اللہ کے وجود اور تدبیر کی محتاج ہے- یوں ایک مسلم مومن کا ضمیر و شعور' اس کی پوری زندگی اور اس کا پورا وجود' اس کے اردگرد پھیلی ہوئی کائنات کا وجود اللہ جل شانہ کے وجود کے ساتھ مربوط اور متعلق ہو جاتا ہے- اور وہ اللہ ہی ہے جو اس مومن و مسلم کی زندگی میں متصرف ہے اور پھر وہی ذات اس کے اردگرد پھیلی ہوئی کائنات میں بھی متصرف ہے اور یہ تصرف ذات باری تعالیٰ نہایت ہی حکیمانہ اور مدبرانہ شان سے فرمارہی ہے- اس لئے انسان اپنی پوری زندگی میں ایک مقرر منہاج پر کاربند ہوتا ہے جو منہاج نہایت ہی حکیمانہ اور مدبرانہ ہے- اسی منہاج سے وہ اپنی اقدار حیات اور حسن و قبح کے پیمانے اخذ کرتا ہے- اور اس پوری زندگی میں اور اس پورے عمل میں اللہ تعالیٰ انسان کا نگہبان رہتا ہے-

لَا تَأْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ ؕ ... "وہ نہ سوتا ہے اور نہ اسے اونگھ لگتی ہے-" یہ اس کی نگہبانی کی تائید ہے- یعنی ہر چیز پر وہ نگہبان ہے- اور ہر چیز اس سے قائم ہے- یہ ایک قسم کی تعبیر ہے- اور یہ اللہ تعالیٰ کی صفت نگہبانی کو انسانی ادراک کے قریب تر کر دیتی ہے ورنہ اصل حقیقت تو یہ ہے کہ کوئی چیز بھی اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات جیسی نہیں ہو سکتی- لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ .... یہاں اگرچہ اس بات کی نفی کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ کو نیند آتی ہے یا اونگھ پکڑ سکتی ہے- لیکن حقیقت یہ ہے کہ ذات باری ان سب تصورات سے وراء ہے اور مطلقاً ان تشبیہات سے پاک ہے-

یہ حقیقت کہ اللہ تعالیٰ اس پوری کائنات کا اس کی تمام جزئیات کے ساتھ نگہبان ہے اور ہروقت اور ہر حالت میں قیوم ہے- ایک عظیم حقیقت ہے بشرطیکہ انسان اس کا اچھی طرح تصور کر سکے- خصوصاً جب وہ اپنے محدود تصور میں اس عظیم کائنات کے لاتعداد ذرات' خلیوں' مخلوقات' اشیاء اور ان کی نسبت ہونے والے ان گنت واقعات کو لانے کی سعی کرے اور اپنی وسعت فکر کے مطابق یہ سوچنے کی کوشش کرے کہ کس طرح یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی نگہبانی میں چل رہا ہے- اور اللہ تعالیٰ ان تمام امور کی تدابیر کس طرح اختیار فرماتے ہیں- یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ عقل انسانی کے حقیقی ادراک سے وراء ہے- اور انسان اس کا ایک محدود تصور ہی کر سکتا ہے اور اس محدود تصور سے بھی سر چکرا جاتا ہے- عقل حیران رہ جاتی ہے ہاں دل مطمئن ہو جاتا ہے- ☆

لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ .... "زمین و آسمان میں جو کچھ ہے' اسی کا ہے-" یہ ایک ہمہ گیر ملکیت ہے اور بے قید ملکیت ہے- کسی شرط کے ساتھ مشروط نہیں- کسی حد میں محدود نہیں ہے- نہ اس میں کوئی شریک ہے اور نہ یہ ملکیت کبھی ختم ہوتی ہے- یہ وحدہ' لاشریک الٰہ واحد کے معانی میں سے ایک معنی ہے- وہ واحد اللہ ہے- صرف وہی الحی ہے- صرف وہی نگہبان ہے- صرف وہی مالک ہے- اس سے ان تمام شرکیہ عقائد کی نفی کر دی گئی جو بھی انسانی عقل میں در آسکتے ہیں- اس دنیا میں ملکیت اور حاکمیت کے نظریہ کی بھی وضاحت ہو جاتی- جب اللہ ہی حاکم و مالک ٹھہرا تو پھر اس دنیا میں بھی حق حاکمیت کسی کو حاصل نہ ہو گا- انسان حاکم نہ ہو گا بلکہ وہ اسی وحدہ لاشریک حاکم کا خلیفہ ہو گا- اور وہ نظام خلافت میں ان تمام حدود و قیود کا پابند ہو گا جو حدود و قیود خلیفہ

گیرندہ نے استخلاف کے وقت اپنی شریعت میں خلیفہ پر عائد کی ہیں۔ اس لئے کوئی خلیفہ شریعت کی حدود و قیود سے آزاد نہ ہو سکے گا۔ اور اگر کوئی خلیفہ ان قیود کی پابندی نہ کرے گا جو خلافت کے منصب کی وجہ سے اس پر عائد ہیں تو سرے سے اس کی خلافت ہی کالعدم ہو جائے۔ اور اہل ایمان کا یہ فرض ہو گا کہ وہ اس خلیفہ کے خلاف شریعت اقدامات کو مسترد کر دیں۔ اسلامی شریعت میں یہی اسلامی نظریہ کارفرما ہے۔ نیز اس شریعت پر مبنی جو عملی زندگی تشکیل ہوتی ہے۔ اس کی تہہ میں بھی یہی نظریہ کارفرما ہے۔ جب اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں یہ فرماتے ہیں لَهُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ .... "اسی کے لئے جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے۔" تو اس سے محض عقیدہ اور نظریہ یا محض خیال مراد نہیں ہوتا۔ یہ فقرہ دراصل انسان کی پوری زندگی کے لئے ایک دستوری دفعہ ہوتی ہے۔ نیز دنیاوی زندگی میں باہم جو رابطے قائم ہوتے ہیں' وہ بھی اسی اساس پر ہیں کہ جو کچھ اس دنیا میں ہے وہ اللہ کا ہے۔

جب یہ حقیقت انسانی ضمیر میں جاگزیں ہو جائے۔ جب انسان اپنے مالک حقیقی کا صحیح شعور اپنا لیتا ہے کہ وہ زمین و آسمان کا مالک ہے اور جب انسان اپنے دل و دماغ سے یہ غلط خیال نکال لیتا ہے کہ جسے وہ اپنی ملکیت سمجھتا ہے وہ تو اس کی ملکیت ہی نہیں ہے اور جب وہ شعوری طور پر اپنی جملہ مقبوضات کو مالک حقیقی کی ملکیت سمجھتا ہے اور جب انسان کے ذہن میں صرف یہ احساس پیدا ہو جاتا ہے کہ اس کے ہاتھ میں جو کچھ ہے وہ تو عارضی طور پر مانگا ہوا ہے۔ اور اسے مالک حقیقی کی جانب سے ایک محدود وقت کے لئے دیا ہوا ہے تو ان حقائق کا محض ادراک اور احساس ہی انسان کے دل سے اس کی سرتیزی' لالچ' حرص' بخل اور رات دن جمع کرنے کی فکر کی شدت کو کم کر دیتا ہے۔ اس تصور حیات اور ان احساسات کی وجہ سے انسان کے اندر صبر' تمنا اور قناعت اور راضی برضا ہونے کی صفات پیدا ہو جاتی ہیں۔ وہ فیاض اور سخی ہو جاتا ہے۔ اس کے دل میں سکون اور طمانیت پیدا ہو جاتی ہے۔ چاہے وہ امیر ہو یا غریب اس کی چال ڈھال میں ایک قسم کا سکون و اطمینان اور قرار پیدا ہو جاتا ہے۔ اگر اسے کچھ نہ ملے تو اسے حسرت نہیں ہوتی اور اگر اسے اس کا مطلوب حاصل نہیں ہوتا تو وہ اپنے دل میں جلن یا گھٹن نہیں پاتا۔

مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ... "کون ہے جو اس کے ہاں' اس کی اجازت کے بغیر سفارش کرتا ہے؟" یہ صفات باری میں سے ایک دوسری صفت ہے۔ اس سے مقام الوہیت اور مقام عبدیت کی اچھی طرح وضاحت ہو جاتی ہے۔ بندے سب کے سب اللہ تعالیٰ کے دربار میں مقام عبودیت میں کھڑے ہوتے ہیں۔ وہ اپنے اس مقام سے نہ آگے بڑھ سکتے ہیں اور نہ تجاوز کر سکتے ہیں۔ وہ بندے کے مقام پر خشوع و خضوع کی حالت میں ایستادہ ہوتے ہیں۔ جو نہ رب کی طرف آگے بڑھ سکتا ہے اور نہ ہی اس کے ہاں سفارش کی جرأت کر سکتا ہے۔ الا یہ کہ اسے پیشگی اجازت مل گئی ہو تو وہ اس صورت میں اس اجازت کی حدود میں سفارش کر سکتا ہے۔ ہاں یہ بندے اور غلام خود اپنے درمیان ضرور فرق مراتب رکھتے ہیں اور خود اللہ کے ہاں بھی ان کے درجات و مقامات میں ضرور تفاوت ہے۔ لیکن جناب باری تعالیٰ میں ان کے لئے ایک حد عبدیت ہے جس سے انہیں آگے بڑھنے کی نہ اجازت ہے اور نہ صلاحیت۔

اللہ تعالیٰ کی شان کبریائی' اس کی جلالت شان اور اس کے رعب اور دبدبے کی طرف یہاں ایک اشارہ کیا گیا ہے اور استفہام انکاری کا فقرہ استعمال کر کے اس اشارے کو مزید مؤثر بنا دیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ اور اگر ایسا ہوا تو وہ ناپسندیدہ ہو گا۔ لہٰذا کون ہے جو جناب باری میں ایسی جرات کر سکے؟ ہاں اگر اس کی اجازت ہو تو......

اس حقیقت کی روشنی میں وہ تمام باطل تصورات واضح ہو جاتے ہیں۔ جو انبیاء و رسل کے بعد میں آنے والے لوگوں میں پیدا ہو گئے تھے جن کے حاملین نے حقیقت الوہیہ اور حقیقت عبدیت کے درمیان التباس پیدا کر دیا تھا۔ ان لوگوں نے یہ عقیدہ اختیار کر لیا تھا کہ اللہ کا بیٹا ہے جو اس کے ساتھ بوجہ تعلق ابنیت کسی نہ کسی شکل میں شریک اور خلط ہے۔ پھر انہوں نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایسے لوگوں

کو شریک بنالیا تھا جو اللہ کے ہاں سفارش کرتے ہیں اور وہ لازماً ان کی سفارش کو تسلیم کرتے ہیں یا پھر انہوں نے انسانوں میں سے بعض کو اللہ کا جانشین مقرر کر دیا تھا جو اللہ سے اپنی قرابت کی وجہ سے اختیارات حاصل کر چکے تھے لیکن اس حقیقت کے اظہار کے بعد کہ اللہ کے ہاں کوئی شفیع نہیں ہے۔ یہ تمام تصورات باطل اور ناپسندیدہ ٹھہرتے ہیں۔ اور انسانی ذہن انہیں قبول ہی نہیں کرتا۔ انسانی ضمیر اس کا انکار کرتا ہے اور وہ ایک مومن کے رخ خیال پر آتے ہی نہیں۔

یہ اسلامی تصور حیات کا ایک جلاء ہے کہ اس میں کوئی وہم و تلبیس نہیں ہے۔ اسلامی سوچ میں کوئی لچک نہیں ہے۔ خدائی ' خدائی ہے اور بندگی' بندگی ہے۔ ان دو حقائق میں کوئی ذاتی التقاء ممکن نہیں ہے۔ رب' رب ہے اور بندہ' بندہ ہے۔ ان کے مزاج اور طبیعت میں اشتراک ممکن نہیں اور نہ ہی ان کا آپس میں ملاپ اور ایکا ممکن ہے۔

ہاں بندے کا اپنے رب کے ساتھ ایک تعلق ہوتا ہے۔ رب کی جانب سے بندے پر رحمت کا نزول ہوتا ہے۔ قرب' محبت اور اعانت ہوتی ہے۔ اسلام اس تعلق کو تسلیم کرتا ہے اور تعلق باللہ سے نفس انسانی کو شرابور کر دیتا ہے۔ اس سے دل مومن بھر جاتا ہے اور اس پر فیضان رحمت و محبت ہوتا ہے اور مومن رحمت رب کی خوشگوار چھاؤں میں زندگی بسر کرتا ہے۔ بغیر اس کے ذات الٰہی اور ذات انسانی کے درمیان اختلاط کا کوئی تصور پیش کیا جائے۔ بغیر اس کے کہ ہم حق و باطل کی کوئی آمیزش کریں یا افکار باطلہ کا ڈھیر لگا کر کوئی ایسا فکری انتشار واضطراب پیدا کریں' جس میں صداقت اور سچائی کی کوئی واضح اور صاف وشفاف صورت نظر نہ آئے۔

يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ۖ وَلَا يُحِيطُونَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهِ إِلَّا بِمَا شَاءَ ۚ

.... "جو کچھ بندوں کے سامنے ہے اسے بھی وہ جانتا ہے اور جو کچھ ان سے اوجھل ہے اس سے بھی وہ واقف ہے۔ اور اس کی معلومات میں سے کوئی چیز بھی ان کی گرفت ادراک میں نہیں آسکتی۔ الا یہ کہ کسی چیز کا علم وہ خود انہیں دینا چاہے۔" اس حقیقت کے دو متقابل پہلو ہیں۔ ایک جانب اس سے اس بات کا اظہار ہوتا ہے کہ ایک مسلم کا تصور الٰہ کیا ہے؟ دوسری جانب اس کا اظہار ہوتا ہے کہ اس الٰہ کے سامنے بندۂ مسلم کا مقام کیا ہے؟ اللہ کا مقام یہ ہے کہ وہ ہر ظاہر و باطن' حاضر و غائب کے بارے میں مکمل علم رکھتا ہے۔ وہ علیم و خبیر ہے۔ اس کا علم' کامل' جزئیات پر حاوی اور تمام موجودات پر مشتمل ہے۔ وہ انسان کے موجود حاضر پر بھی حاوی ہے۔ اور ان سے پوشیدہ ماضی اور آنے والے مستقبل پر بھی حاوی ہے۔ وہ ان امور پر بھی حاوی ہے جنہیں انسان جانتا ہے اور ان پر بھی حاوی جن کے بارے میں اسے کوئی علم نہیں ہے۔ غرض ان فقروں میں اللہ تعالیٰ کے علم کی شمولیت اور استقصاء کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ رہے انسان تو وہ صرف اس قدر جانتے ہیں جس قدر انہیں اللہ تعالیٰ جاننے کی اجازت دیتے ہیں۔

حقیقت کا پہلا حصہ یہ ہے کہ اللہ ہر ظاہر و باطن کا عالم ہے۔ یہ حقیقت نفس انسان کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتی ہے انسان اور اس کا ضمیر باری تعالیٰ کے سامنے بالکل ننگا ہو جاتا ہے۔ باری تعالیٰ ظاہر و باطن کا علیم و بصیر ہے۔ جس حقیقت کا انسان کو علم ہے اور وہ اس کا اظہار کر رہا ہے وہ بھی اس کے سامنے ہے اور جس چیز کو وہ نہیں جانتا وہ بھی اس کے سامنے ہے۔ وہ ماضی' حال اور مستقبل مستور کو بھی جانتا ہے۔ جس کے بارے میں نفس انسانی بے علم ہوتا ہے۔ جب انسان کو اس حقیقت کا صحیح شعور ہو جائے تو اس کے جسم پر کپکپی طاری ہو جاتی ہے۔ کیونکہ اسے یقین ہوتا ہے کہ وہ تو باری تعالیٰ کے سامنے بالکل ننگا کھڑا ہے۔ نیز اس تصور سے نفس انسانی میں تسلیم و رضا اور خدا خوفی کے جذبات پیدا ہوتے ہیں اس لئے کہ وہ علیم و بصیر ہے۔

دوسرا پہلو اس حقیقت کا یہ ہے کہ انسان کا علم صرف اس حد تک محیط ہے جس حد تک اللہ تعالیٰ کی مرضی ہو۔ انسانوں کو اس حقیقت پر ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہئے۔ خصوصاً اس دور میں جبکہ انہوں نے اس کائنات کے طبعی اور تخلیقی شعبے میں قدرے معلومات

حاصل کر لی ہیں۔

وَلَا يُحِيطُونَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهِ إِلَّا بِمَا شَاءَ .... "اور وہ اللہ کے علم میں سے کسی چیز کا ادراک نہیں کر سکتے الا یہ کہ خود اللہ چاہے۔" صرف اللہ ہی ہر چیز کا مکمل علم رکھتا ہے جو کامل اور شامل ہے۔ اور اس کا علم بے قید ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی اجازت ہی سے انسانوں پر بعض علوم منکشف ہو جاتے ہیں۔ اور یہ انکشافات اللہ تعالیٰ اس لئے فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس کا وعدہ فرمایا ہوا ہے اور اس کا وعدہ ہمیشہ سچا ہوتا ہے۔ فرماتے ہیں سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ .... "عنقریب ہم ان کو اپنے نشانات دکھائیں گے جو آفاق میں بھی ہیں اور خود ان کے نفسوں میں بھی ہیں' تاکہ ان پر یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ وہ حق ہے۔" لیکن انسان اس بات کو بھول جاتے ہیں اور اللہ میاں ان پر جن علوم و حقائق کا انکشاف کر دیتے ہیں وہ ان کے لئے فتنہ بن جاتے ہیں۔ چاہے اس انکشاف کا تعلق قوانین فطرت کائنات سے ہو یا اس کا تعلق ان پوشیدہ معلومات سے ہو جسے وہ چند لحظوں کے لئے ایک متعین حد کے اندر اندر رہ کر جان لیتے ہیں۔ ان دونوں حقائق اور عطا کردہ معلومات سے انسان فتنے اور گمراہی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اور وہ اس حقیقت کو فراموش کر دیتا ہے کہ ان انکشافات کا اصل داتا تو اللہ ہے۔ اس فتنے اور گمراہی کی وجہ سے وہ نہ اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں اور نہ ذکر الٰہی ان کے دل میں ہوتا ہے بلکہ وہ خود سر ہو جاتے ہیں اور بھول جاتے ہیں بلکہ بعض اوقات کفر تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔"

اللہ تعالیٰ نے جب چاہا کہ انسان کو اس کرۂ ارض پر اپنا خلیفہ بنائے تو اس نے انسان کو اپنی معرفت سے نوازا۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کے ساتھ یہ وعدہ کیا کہ وہ عنقریب تمہیں تمہارے انفس اور تمہارے آفاق میں تمہیں بعض نشانات راہ دکھائے گا۔ اللہ کا وعدہ ہمیشہ سچا ہوتا ہے۔ اور اللہ نے اسے یوں سچا کر دکھایا کہ آئے دن انسان پر نئے نئے رازوں کا انکشاف ہوتا ہے۔ نسلوں کے بعد نسلوں میں ان انکشافات کا گراف مسلسل اوپر چلا جا رہا ہے۔ ان انکشافات میں قدرتی توانائیاں' اور اس کائنات کے طبعی اصول شامل ہیں جو فریضۂ خلافت ارضی ادا کرنے کے لئے انسان کے لئے ضروری ہیں تاکہ وہ ان اصولوں کی دریافت کے نتیجے میں ان درجات بلند تک پہنچ سکے جو اس کے لئے اللہ نے مقدر کر رکھے ہیں۔

اس میدان میں اللہ تعالیٰ نے جس قدر علم مناسب سمجھا' انسان کو عطا کر دیا اور اسے اجازت دے دی کہ وہ اس میں کام کرے اور کچھ گوشے ایسے بھی تھے جن کی بابت اللہ تعالیٰ نے انسان کو علم نہیں دیا۔ اس لئے کہ منصب خلافت فی الارض کے لئے اسے ان گوشوں کی ضرورت نہ تھی۔ مثلاً انسان سے خود زندگی کا راز پوشیدہ رکھا گیا جو ابھی تک پوشیدہ ہے اور مستقبل میں بھی وہ ذہن انسانی کے قابو میں آنے والا معلوم نہیں ہوتا۔ اور ابھی تک پوزیشن یہ ہے کہ اس موضوع پر بحث کرنا اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارنے کے برابر ہے۔ جبکہ کسی بات پر کوئی بین دلیل نہیں ہوتی۔ اسی طرح انسان سے اگلے لمحے میں ہونے والے واقعات محفوظ اور پوشیدہ رکھے گئے۔ کیونکہ وہ واقعات غیب ہیں جن تک رسائی کی کوئی سبیل نہیں ہے۔ اور ان کے آگے اس قدر بھاری دیوار کھڑی کر دی گئی ہے کہ انسان اسے دور نہیں کر سکتا۔ ہاں بعض اوقات اس پردۂ مستور کے پیچھے سے اللہ تعالیٰ اپنے خاص بندوں کو ایک جھلک دکھا دیتا ہے۔ اور پھر پردہ گر جاتا ہے اور خاموشی چھا جاتی ہے۔ اور انسان کی رفتار ایک حد پر رک جاتی ہے اور وہ اس سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔

بہت سے اسرار و رموز انسان سے پوشیدہ رکھے گئے' جن کے علم کی اسے کوئی حقیقی ضرورت نہ تھی۔ جن کے بغیر بھی وہ خلافت فی الارض کے فرائض سرانجام دے سکتا تھا۔ اور اس زمین کی حقیقت کیا ہے؟ یہ تو ایک ذرہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ اس وسیع کائنات کی فضا میں تیر رہا ہے۔

اپنے اس علم کی محدودیت کے باوجود اور اس حقیقت کے باوجود کہ اسے جو کچھ دیا گیا ہے وہ اللہ کی جانب سے ہے اور اس کی اجازت سے ہے۔ انسان فتنے میں پڑ جاتا۔ وہ اس زمین پر اپنے آپ کو الٰہ سمجھنے لگتا ہے۔ وہ کفر کی راہ اختیار کرتے ہوئے اس کائنات کے لئے کوئی اور الٰہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔ حالانکہ آج بیسویں صدی کے سائنس دان بڑی عاجزی سے یہ تسلیم کرنے لگے ہیں کہ ان کا علم محدود ہے۔ وہ تسلیم کرتے ہیں کہ اس کائنات کے وہ گوشے بہت ہی کم ہیں جن کا وہ ادراک کر سکے ہیں۔ ہاں بعض جاہل جو اپنے آپ کو سائنس دان سمجھتے ہیں وہ اس غرے میں مبتلا ہیں کہ وہ بہت کچھ جانتے ہیں۔

وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ۚ وَلَا يَئُوْدُهٗ حِفْظُهُمَا ۚ .... "اس کی حکومت آسمانوں اور زمین پر چھائی ہوئی ہے اور اس کی نگہبانی اس کے لئے تھکا دینے والا کام نہیں ہے۔"

یہ مقام تو ایسا ہے کہ یہاں اللہ کے اقتدار اعلیٰ کا بیان مجرد طور پر کیا جاتا لیکن یہ قرآن کریم کا ایک خاص انداز بیان ہے کہ وہ مجرد حقائق کو بھی محسوسات کی شکل میں پیش کرتا ہے۔ اس محسوس تصویر کشی کے انداز بیان سے ذہن انسانی اصل حقیقت کے قریب آجاتا ہے۔ اور یوں حقیقت انسان کے دل و دماغ مین بیٹھ جاتی ہے۔ کرسی سے مراد بالعموم اقتدار اعلیٰ ہوتا ہے۔ اور جب یہ کہا گیا کہ اس کی کرسی آسمانوں اور زمین سے بھی وسیع تر ہے تو گویا آسمانوں اور زمین پر اسی کا اقتدار اعلیٰ قائم ہے۔ یہ بات تو تصوراتی پہلو سے ہے لیکن ایک محسوس اور ٹھوس انداز تعبیر سے جو تصویر ذہن نشین ہوتی ہے وہ دیرپا اور ٹھوس ہوتی ہے۔ یہی بات وَلَا يَئُوْدُهٗ حِفْظُهُمَا .. میں ہے۔ اس میں بطور کنایہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کا بیان کیا گیا ہے۔ لیکن یہ تعبیر بھی محسوس انداز میں پیش کی گئی ہے یعنی اللہ تعالیٰ کو اس عظیم نگہبانی میں نہ کوئی جدوجہد کرنا پڑتی ہے۔ اور نہ ہی اسے کوئی تھکاوٹ لاحق ہوتی ہے۔ تعبیر کا یہ انداز قرآن کریم اس لئے اختیار کرتا ہے کہ معانی کی ایسی تصویر کشی کی جائے کہ وہ حس میں اتر جائے اور اس طرح ذہن انسانی میں یہ معانی اچھی طرح بیٹھ جائیں اور یوں نظر آئیں جس طرح محسوسات نظر آتے ہیں۔

جو شخص قرآن کے اس انداز بیان کو سمجھ لیتا ہے اسے ان مباحث اور اعتراضات سے کوئی دلچسپی نہیں رہتی جو قرآن کی اس محسوس انداز تعبیر پر یونانی فلسفہ کے نتیجے میں پیدا ہوئیں اور ان پر طویل عرصے تک جدل و جدال ہوتا رہا۔ کیونکہ ان مباحث نے قرآن مجید کے سادہ اور فطری انداز تعبیر کو خواہ مخواہ چیستاں بنانے کی کوشش کی اور اس کے حسن سادہ کو ختم کر دیا [1]

یہاں اس قدر کہنا کافی ہے کہ کرسی اور عرش کے بارے میں مجھے کوئی ایسی صحیح حدیث نہیں ملی ہے جس میں کرسی اور عرش کی تفسیر اور توضیح کی گئی ہو۔ اس لئے میں یہی مناسب سمجھتا ہوں کہ اس سے زیادہ ان کے بارے میں مزید کچھ نہ کہوں۔

وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ .... "اور وہ بزرگ و برتر ہے۔" اس آیت میں جو صفات بیان کی گئی ہیں یہ ان میں سے آخری صفات ہیں۔ جن میں ایک حقیقت کا بیان ہے اور نفس انسانی میں اس حقیقت کا القاء مقصود ہے۔ یعنی صرف وہ ذات ہی بلند ہے اور صرف وہ ذات ہی عظیم ہے۔ مفہوم یہ ہے کہ اس کے علاوہ نہ کوئی عظیم ہے اور نہ کوئی سربلند ہے۔ یہ نہیں کہا گیا کہ "وہ بزرگ و برتر ہے" بلکہ یہ کہا گیا: "وہی علی اور وہی عظیم ہے" پہلی تعبیر میں نص علو و عظمت ثابت ہوتی۔ دوسری تعبیر میں علو اور عظمت کو ذات باری کے ساتھ مخصوص کر دیا گیا۔ اور یہ اشارہ دیا گیا کہ اس معاملے میں اس کے ساتھ کوئی بھی شریک نہیں ہے۔

صرف وہی علی ہے۔ عظمت میں وہ منفرد ہے۔ اور بندوں میں سے جو بھی علو اور عظمت کا ادعاء کرتا ہے اللہ اسے ذلیل اور سرنگوں کرتا ہے۔ اور آخرت میں وہ توہین آمیز سزا کا مستحق ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں

[1] تفصیلات کے لئے دیکھئے میری کتاب التصویر الفنی فی القرآن میں فصل التصویر الفنی اور طریقۃ القرآن

تِلْكَ الدَّارُ الْآخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِينَ لَا يُرِيدُونَ عُلُوًّا فِي الْأَرْضِ وَلَا فَسَادًا

"وہ آخرت کا گھر ہم ان لوگوں کے لئے مخصوص کر دیں گے جو زمین پر اپنی بڑائی نہیں چاہتے اور نہ فساد کرنا چاہتے ہیں۔" (۲۸: ۸۳) اور جب فرعون کو ہلاک کیا گیا تو اس پر یہ تبصرہ کیا گیا **انه كان من العالين** .... "وہ ان لوگوں میں سے تھا جو اپنی بڑائی چاہتے ہیں۔"

انسان بہت بلند ہو سکتا ہے 'وہ عظمت و سربلندی کے اونچے مدارج تک بھی پہنچ سکتا ہے۔ لیکن وہ اللہ تعالیٰ کی بندگی کے حدود و قیود سے باہر نہیں نکل سکتا۔ اور جب قلب مومن میں یہ عقیدہ اچھی طرح بیٹھ جاتا ہے تو وہ اسے مقام عبودیت تک پہنچا دیتا ہے۔ اور وہ سرکشی اور بڑائی سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ اس کی طبیعت میں جھکاؤ پیدا ہو جاتا ہے۔ اور اس کے دل میں اللہ تعالیٰ کا خوف اور اس کی ہیبت بیٹھ جاتی ہے۔ اس کے دل میں اللہ کی عظمت اور جلالت قدر کا شعور پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کا طرز عمل نہایت ہی مؤدبانہ اور پھر وہ اللہ کے بندوں کے مقابلے میں غرور و تکبر کا رویہ بھی اختیار نہیں کرتا۔ غرض یہ شعور ایک طرف سے ایک عقیدہ اور ایک تصور ہے اور دوسری جانب ایک طرز عمل اور ایک سلوک اور رویہ ہے۔

اسلامی تصور حیات کے ان دقیق پہلوؤں کی وضاحت اور تشریح اور اس بیان کے بعد کہ اس کائنات اور مخلوقات کا اپنے خالق کے ساتھ تعلق کیا ہے اور اس وضاحت کے بعد کہ خالق کائنات کے اوصاف کیا ہیں 'اب یہاں یہ موضوع لیا جاتا ہے کہ اس ایمانی تصور حیات کو اپنا نصب العین بنانے کے بعد اب اہل ایمان کا طریق کار کیا ہو گا؟ وہ اس نظریہ کی دعوت کس طرح دیں گے۔ اور وہ اس گم راہ انسانیت کی ہدایت کے لئے کیا طریقہ کار اختیار کریں گے۔

لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ ۖ قَد تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ فَمَن يَكْفُرْ بِالطَّاغُوتِ وَيُؤْمِن بِاللَّهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقَىٰ لَا انفِصَامَ لَهَا ۗ وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿٢٥٦﴾ اللَّهُ وَلِيُّ الَّذِينَ آمَنُوا يُخْرِجُهُم مِّنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ ۖ وَالَّذِينَ كَفَرُوا أَوْلِيَاؤُهُمُ الطَّاغُوتُ يُخْرِجُونَهُم مِّنَ النُّورِ إِلَى الظُّلُمَاتِ ۗ أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿٢٥٧﴾

۳۴
ع ۴
۲

"دین کے معاملے میں کوئی زور زبردستی نہیں ہے۔ صحیح بات غلط خیالات سے الگ چھانٹ کر رکھ دی گئی ہے۔ اب جو کوئی طاغوت کا انکار کر کے اللہ پر ایمان لے آیا 'اس نے ایک ایسا مضبوط سہارا تھام لیا جو کبھی ٹوٹنے والا نہیں اور اللہ سب کچھ سننے والا اور جاننے والا ہے۔ جو لوگ ایمان لاتے ہیں ان کا حامی اور مددگار اللہ ہے۔ اور وہ ان کو تاریکیوں سے روشنی میں نکال لاتا ہے اور جو لوگ کفر کی راہ اختیار کرتے ہیں ان کا حامی و مددگار طاغوت ہے۔ اور وہ انہیں روشنی سے تاریکیوں کی طرف کھینچ لے جاتے ہیں۔ یہ آگ میں جانے والے لوگ ہیں جہاں یہ ہمیشہ رہیں گے۔"

نظریہ ایک ایسی چیز ہے کہ بیان و ادراک کے بعد یہ سمجھنے اور سمجھانے کی چیز ہے۔ جبر و تشدد اور ظلم و عدوان کے نتیجے میں نظریات نہیں پھیلائے جاسکتے اور یہی پالیسی اسلام نے اسلامی نظریۂ حیات کی بابت اختیار کی ہے۔ دین اسلام اپنی پوری قوت اور طاقت کے ساتھ انسانی قوت مدرکہ کو خطاب کرتا ہے۔ وہ غور و فکر کرنے والے دماغوں کو خطاب کرتا ہے۔ اور ایک واضح سوچ دیتا ہے۔ اور وہ اثر پذیر وجدان کو مخاطب کرتا ہے۔ اسلام فطرت سلیمہ کو خطاب کرتا ہے بلکہ پوری انسانی شخصیت پر اثر انداز ہوتا ہے اور وہ انسانی فہم و ادراک کے ہر پہلو کو آزماتا ہے۔ جس میں وہ جبر و تشدد کو کام میں نہیں لاتا۔ یہاں تک کہ وہ نظریۂ حیات دینے میں خوارق عادت ذرائع کا بھی زیادہ استعمال نہیں کرتا۔ اس لئے کہ خوارق عادت واقعات کے نتیجے میں ذہن انسانی اگرچہ یقین کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے لیکن یقین کے باوجود ذہن انسانی اس حقیقت کے فہم و ادراک سے قاصر رہتا ہے۔ بات انسان کی عقل میں نہیں اترتی کیونکہ خارق عادت مناظر کی وجہ سے وہ عقل و ادراک کے دائرہ سے باہر ہوتی ہے۔

اگر دین اسلام' اسلامی نظریۂ حیات کو لوگوں کے دلوں میں اتارنے کے لئے خارق عادت مناظر اور معجزات کا استعمال کرنا مناسب نہیں سمجھتا' اس لئے کہ یہ بھی مخاطب کو ایک طرح مجبور کرنا ہوتا ہے کہ وہ مان لے' تو اسلامی نظریہ کے پھیلانے میں جبر و اکراہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اسلام کی یہ پالیسی نہیں ہے کہ وہ لوگوں کو دباؤ اور تہدید کے ذریعہ دائرہ اسلام میں داخل کرے' اس معاملہ میں اسلام صرف تبلیغ اور تلقین اور افہام و تفہیم سے کام لیتا ہے۔ اور وہ لوگوں کے دل و دماغ کو مطمئن کرتا ہے۔

اسلام سے قبل مسیحیت آخری دین حق تھا۔ اس کے پیرو کاروں نے اس کے پھیلانے کے لئے اسلحہ کا استعمال کیا۔ لوگوں کو زندہ جلایا گیا۔ اور جوں ہی شہنشاہیت روما کے فرمانروا قسطنطین نے عیسائیت کو قبول کیا' حکومت نے جبر و تشدد کے تمام وسائل استعمال کئے اور لوگوں کو مسیحیت قبول کرنے پر مجبور کیا۔ حالانکہ اس سے پہلے یہی حکومت ان مسیحیوں کے خلاف جبر و تشدد کے تمام وسائل بروئے کار لا چکی تھی جنہوں نے برضاء و رغبت عیسائیت کو قبول کیا تھا۔ سلطنت روما کا یہ جبر و تشدد صرف ان لوگوں کے خلاف نہ تھا جو مسیحیت قبول نہ کر رہے تھے بلکہ یہ جبر و تشدد ان صحیح العقیدہ مسیحیوں کے خلاف بھی بڑی بے دردی سے جاری رہا جو حضرت مسیح علیہ السلام کی ذات کے بارے حکومت روما کے غلط عقاید تثلیث قبول کرنے پر آمادہ نہ تھے۔

جب اسلام آیا تو اس کا پہلا اعلان ہی یہ زریں اصول تھا کہ اسلام کے قبول کرنے پر کسی کو مجبور نہ کیا جائے گا۔ گمراہی سے ہدایت بالکل الگ ہوگئی ہے۔ اب یہ لوگوں کا اپنا کام ہے کہ وہ برضا ہدایت قبول کریں۔

اس اصول کو وضع کر کے اللہ تعالیٰ نے انسان کو عزت و کرامت سے نوازا ہے۔ اس کے ارادے' اس کی فکر اور اس کے شعور کا احترام کیا گیا اور نظریاتی ہدایت و گمراہی کے اختیار کرنے میں اسے آزاد چھوڑ دیا ہے۔ اسے کہہ دیا گیا کہ وہ ایک ذمہ دار ذات ہے۔ اس سے اس کے افعال و اعمال کا حساب لیا جائے گا۔ یہ آزادی انسانی آزادیوں میں سے اہم ترین آزادی ہے جو اسلام نے انسان کو عطا کی۔ یہ وہ آزادی ہے جس سے انسان اس بیسویں صدی میں بھی محروم ہے۔ متعصب نظریات اور ظالمانہ نظامہائے زندگی آج بھی انسان کو یہ آزادی نہیں دیتے۔ ذات انسانی جسے اللہ نے مکرم بنایا ہے آج اسے اپنے عقائد کے معاملے میں بھی مجبور و مقہور بنا دیا گیا ہے۔ اسے مجبور کیا جا رہا ہے کہ یا تو وہ ان نظریات کو اپنائے جسے حکومت وقت اپنے تمام وسائل اور میڈیا کے ذریعہ پھیلاتی ہے اور جو ایسے نظریات ہیں جو انکار خدا کے تصورات پر مبنی ہیں اور یا وہ موت کے لئے تیار ہو جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ نظریاتی آزادی وہ پہلا حق ہے جو انسان کو بحیثیت انسان ملنا چاہئے۔ جو شخص یا جو نظام انسان سے نظریاتی آزادی چھین لیتا ہے' وہ در حقیقت انسان سے اس کی انسانیت سلب کر لیتا ہے۔ نظریاتی آزادی کا پھر فطری تقاضا ہے کہ انسان کو اپنے عقیدہ کی تبلیغ

کی بھی اجازت ہو۔ اور ایسا کرنے میں وہ محفوظ و مامون بھی ہو۔ اگر حریت عقیدہ کے ساتھ اظہار رائے کی آزادی نہ ہو تو آزادی رائے بے معنی ہو جاتی ہے اور اس میں کوئی واقعیت نہیں رہتی۔

اسلام زندگی اور موجودات کا ایک بہترین تصور ہے اور وہ بلاشک و شبہ ایک بہترین اور مستحکم نظام زندگی ہے۔ یہ اسلام ہی ہے جو ببانگ دہل پکار رہا ہے کہ اختیار دین میں کوئی جبر و اکراہ نہیں ہے۔ وہ اپنے قبول کرنے والوں کو سب سے پہلے یہ تلقین کرتا ہے کہ وہ لوگوں کو دین اسلام قبول کرنے پر مجبور نہیں کر سکتے۔ جب اسلام جیسا دین فطرت لوگوں کو مسلمان بنانے کے لئے مجبور نہیں کر سکتا تو اس کے دوسرے مروجہ ادیان باطلہ کو یہ اجازت کیسے دی جاسکتی ہے کہ وہ محض حکومت کے بل بوتے پر ان ادیان کے نہ ماننے والوں پر عرصۂ حیات تنگ کر دیں۔

یہاں جبر و اکراہ کی مطلق نفی کی گئی ہے۔ یعنی دین میں سرے سے جبر نہیں ہے۔ یعنی جنس جبر کا وجود دین میں نہیں ہو گا۔ یعنی جبر کا وجود ہی نہ ہو گا۔ وہ وقوع پذیر ہی نہ ہو گا۔ یہاں یہ نہیں کہا گیا کہ تم جبر کا ارتکاب نہ کرو۔ یعنی جبر تو ہو گا مگر تم جبر کا ارتکاب نہ کرو۔ جنس جبر اور وجود جبر کی نفی کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سخت تاکید فرما رہے ہیں کہ اسلام میں جبر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور یہ انداز کلام نہایت ہی مؤثر ہے۔

یہاں سیاق کلام' انسانی ضمیر کو ٹچ کرتا ہے اور اسے جگا دیتا ہے' اسے راہ ہدایت اختیار کرنے کی ترغیب دلاتا ہے۔ اسے راہ راست کی طرف موڑ دیتا ہے اور یہ بیان کر دیا جاتا ہے کہ جس حقیقت ایمانی کا اعلان کیا گیا ہے وہ واضح اور متمیز ہو چکی ہے۔ فرماتے ہیں

قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ .... "راہ ہدایت غلط راہوں سے الگ کر دی گئی ہے۔" ایمان کی راہ' راہ ہدایت ہے۔ انسان کو چاہئے کہ وہ اسے پالے اور اس کی طرف لپکے۔ اور کفر بے راہ روی ہے۔ انسان کو چاہئے کہ اس سے نفرت کرے اور اس سے منسوب ہونے کے مواقع اپنے لئے فراہم نہ کرے۔

عملی صورت حال کچھ ایسی ہے کہ انسان دولت ایمان کی حقیقت کو پانے کی کوشش نہیں کر رہا ہے۔ ایمان انسانیت کو ایک صاف ستھرا تصور حیات دیتا ہے۔ وہ انسانیت کو اطمینان قلب اور سلامتی عطا کرتا ہے۔ وہ انسان کے دل و دماغ میں اعلیٰ قدریں اور پاک ترجیحات پیدا کرتا ہے۔ وہ انسانی معاشرہ کو ایک صحت مند نظام زندگی اور ترقی پذیر پالیسی عطا کرتا ہے۔ جس سے زندگی ترقی یافتہ اور متنوع بن جاتی ہے۔ ان خطوط پر اگر انسان حقیقت ایمانی پر غور کرتا تو پھر کوئی بے وقوف ہی ہوتا جو راہ ایمان کو اختیار نہ کرتا۔ ہدایت چھوڑ کر گمراہی لیتا' سیدھی راہ چھوڑ کر ٹیڑھی راہ اختیار کرتا۔ اطمینان' سلامتی' بلندی اور علوشان کے مقابلے میں بے اطمینانی' پریشانی' گراوٹ اور گمراہی اختیار کرتا۔

اس کے بعد حقیقت ایمانی کی مزید وضاحت اور تشریح کرتے ہوئے کہا جاتا ہے

فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَ يُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى لَا انْفِصَامَ لَهَا

.... "اب جو طاغوت کا انکار کر کے' اللہ پر ایمان لے آیا' اس نے ایک مضبوط سہارا تھام لیا' جو کبھی ٹوٹنے والا نہیں۔"

الطاغوت' طغیان سے ہے۔ مفہوم ہے ہر وہ شخص جو صحیح فکر سے تجاوز کر جائے جو حق سے سرکشی کرے۔ جو ان حدود سے آگے بڑھ جائے جو اللہ نے اپنے بندوں کے لئے قائم کیے ہیں۔ اس کا اللہ کے بارے میں کوئی باضابطہ عقیدہ نہ ہو۔ وہ اللہ کی شریعت کا پابند نہ ہو۔ اسی طرح ہر وہ نظام طاغوتی نظام ہے جو ذات باری سے اخذ نہ کیا گیا ہو۔ اسی طرح ہر وہ عقیدہ' وہ تمام عادات و تقالید جو ذات باری سے مستفاد نہ ہوں' طاغوت ہیں۔ پس راہ راست پر وہی شخص ہے جو طاغوت کی ان تمام شکلوں اور تمام صورتوں کا انکار کر دے اور صرف

اللہ وحدہ پر ایمان لائے اور وہی کامیاب ہے۔ اور اس کی مثال اس طرح ہے جس طرح ایک شخص مشکل حالات میں ایک مضبوط سہارا تھام لے جو گرنے والا نہ ہو۔

یہاں آکر ہم اپنے آپ کو ایک شعوری حقیقت کی محسوس تصویر کے سامنے پاتے ہیں۔ اللہ پر ایمان لانا دراصل ایک ایسے سہارے کا دستیاب ہونا ہے جس کے لئے کبھی کوئی زوال نہیں ہے۔ یہ ایک ناقابل انقطاع ٹھوس سہارا ہے جو شخص بھی اس سہارے کو مضبوطی سے پکڑ لے وہ کبھی بھی گمراہ نہ ہو گا۔ اس سہارے کا براہ راست اس ذات سے تعلق ہے جو کامیابی اور ناکامی کا مالک ہے۔ ایمان دراصل اس حقیقت کبریٰ تک رسائی کا نام ہے جس کی ذات سے اس کائنات کے تمام حقائق قائم ہیں یعنی ذات باری تک رسائی۔ ایمان اس ناموس اکبر تک رسائی کا نام ہے جو ذات باری نے اس کائنات کے لئے وضع کیا ہے۔ اور جس پر یہ کائنات قائم ہے۔ اور جو شخص ایمان کو مضبوط کر لیتا ہے وہ راہ راست پر پڑ کر اپنے رب تک پہنچ جاتا ہے۔ اس کے پاؤں نہیں ڈگمگاتے۔ وہ پیچھے نہیں رہتا اور نہ وہ بھول بھلیوں میں پڑتا ہے۔ نہ بے راہ روی میں پڑتا ہے اور نہ گمراہی کا شکار ہوتا ہے۔

وَ اللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ .... "اور اللہ سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے۔" وہ مختلف بولیوں کی بات سنتا ہے۔ وہ دلوں کے مضمرات کو جانتا ہے۔ اس لئے جو شخص اس ذات پر ایمان لے آئے وہ گھاٹے میں نہ رہے گا۔ اس پر کوئی ظلم نہ ہو گا۔ اور نہ ہی وہ کبھی ناکام ہو گا۔

اب سلسلہ کلام اور آگے بڑھتا ہے۔ ایک متحرک اور محسوس انداز میں منظرکشی کی جاتی ہے۔ ہدایت کا صراط مستقیم اور گمراہی اور ضلالت کے راستے صاف صاف آنکھوں کے سامنے آجاتے ہیں۔ نظر آتا ہے کہ ہدایت کیا ہے اور ضلالت کیسی ہے؟ اسکرین پر نظر آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اہل ایمان کو ہاتھ سے پکڑ کر اندھیروں سے نکالتے ہیں اور روشنی میں لاتے ہیں جبکہ طاغوت جو کفار کے مددگار ہیں اہل کفر کا ہاتھ تھامے ہوئے انہیں نور ایمان سے ظلمات کفر میں لے جاتے ہیں۔

یہ ایک عجیب پر کیف زندہ منظر ہے۔ راہوار خیال کبھی ایک منظر کی طرف سرپٹ دوڑ رہا ہے اور کبھی دوسرے کی طرف۔ ادھر سے واپس ہوتا ہے تو ادھر بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔ یہ انداز گفتگو ایسے جامد اور غیر متحرک انداز کلام کی جگہ اختیار کیا گیا ہے جو راہوار خیال کو مہمیز نہیں دے سکتا۔ نہ اس سے انسانی احساس لطف اندوز ہو سکتا ہے نہ شعور و وجدان میں طلاطم آتا ہے۔ اور جو صرف ذہن انسانی سے بذریعہ الفاظ ہی خطاب کر سکتا ہے۔

اگر ہم کلام الٰہی کی عظمت کا صحیح اندازہ کرنا چاہیں تو اسی مفہوم کو ہم مختلف الفاظ میں محض لفظا اور معانی کا اظہار کر سکتے ہیں مثلاً ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اللہ مسلمانوں کا دوست ہے وہ انہیں راہ ایمان کی طرف لاتا ہے اور وہ لوگ جو کفر اختیار کرتے ہیں' وہ انہیں راہ کفر کی طرف کھینچتے ہیں۔" دیکھئے یہ الفاظ اور انداز کلام ہمارے سامنے مردہ پڑا ہے۔ اس میں وہ گرمی' وہ حرکت اور القاء نہیں ہے جو کلام الٰہی میں ہے۔[ا]

لیکن اس حسی اور القائی تصویرکشی کے ساتھ قرآن کریم کا حسن تعبیر اور حقیقت پسندانہ اظہار مفہوم دیکھئے۔

اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۬ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْلِيٰٓـُٔــهُمُ الطَّاغُوْتُ يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ ۭ .....

ا۔ تفصیل کے لئے دیکھئے میری کتاب التصویر الفنی فی القرآن کی فصل طریقہ قرآن

"جو لوگ ایمان لاتے ہیں ان کا حامی و مدد گار اللہ ہے اور وہ ان کو تاریکیوں سے روشنی میں نکال لاتا ہے اور جو لوگ کفر کی راہ اختیار کرتے ہیں ان کے حامی و مدد گار طاغوت ہیں اور وہ انہیں روشنی سے تاریکیوں کی طرف کھینچ لے جاتے ہیں۔"

حقیقت یہ ہے کہ ایمان نور ہے۔ وہ اپنے مزاج اور اپنی حقیقت کے اعتبار سے ایک منفرد نور ہے۔ اور بے شک کفر اندھیرے ہیں۔ اور یہ اپنے مزاج اور حقیقت کے اعتبار سے متعدد اور متنوع ہیں لیکن ہیں سب کے سب اندھیرے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایمان کی تعبیر نور کے ساتھ اور کفر کی تعبیر ظلمات کے ساتھ ایک بہترین تعبیر ہے۔ یہ نہایت ہی حقیقت پسندانہ انداز تعبیر ہے۔

جب دل مومن میں پہلے پہل ایمان کی چنگاری سلگتی ہے تو اس کے ذریعہ مومن کی پوری شخصیت نور سے بھر جاتی ہے۔ اس کی روح روشن ہوتی ہے اور اسے تشفی ہو جاتی ہے۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک مومن کی روح اپنے ماحول میں روشنی پھیلاتی ہے۔ اس کا ماحول روشن اور واضح ہو جاتا ہے۔ اس نور سے تمام موجودات کی حقیقت سامنے آ جاتی ہے۔ تمام اقدار کی تشریح ہو جاتی ہے۔ تمام تصورات حیات کی اصلیت سامنے آ جاتی ہے۔ مومن کا دل و دماغ ان تمام حقائق کو بغیر کسی ملاوٹ کے واضح طور پر پا لیتا ہے۔ وہ ہر قدر کو اپنی جگہ دیکھتا ہے اور اسے اس کا صحیح مقام دیتا ہے۔

ایمان ایک ایسا نور ہوتا ہے جس کے ذریعہ ایک مومن اس کائنات میں رائج قانون قدرت کو پا لیتا ہے۔ اب یہ مومن اپنے طرز عمل کو اس کائنات میں رائج قانون قدرت کے ساتھ ہم آہنگ کر لیتا ہے۔ جو اس کے اردگرد جاری و ساری ہوتا ہے۔ اور وہ بڑی سنجیدگی کے ساتھ پروقار طریقے سے اپنی راہ پر آگے بڑھتا ہے۔ وہ اپنی راہ کو چونکہ اچھی طرح پا لیتا ہے اس لئے وہ نہ کہیں گمراہ ہوتا ہے اور نہ ہی اپنی راہ میں غیر اہم رکاوٹوں کے ساتھ الجھتا ہے۔

یہ ایک ایسی روشنی ہے جو صرف ایک اور منفرد راستہ دکھاتی ہے۔ کفر کی گمراہیاں تو وہ مختلف قسم کی تاریکیاں ہیں۔ شہوت و خود سری کی تاریکی' فسق و فجور کی تاریکی' کبر و غرور اور سرکشی کی تاریکی' غلامی اور ضعیفی کی تاریکی' ریاکاری اور نفاق کی تاریکی' لالچ اور نفع اندوزی کی تاریکی' شک اور بے چینی کی تاریکی' غرض بے شمار اور لاتعداد ظلمات ہیں جو سب کے سب کفر و گمراہی کی تاریکیاں ہیں اور سب کا مزاج یہ ہے کہ ان میں گھرا ہوا انسان اللہ کی راہ سے بے طرف ہو جاتا ہے۔ وہ غیر اللہ سے ہدایت حاصل کرتا ہے اور غیر اسلامی نظام زندگی کے مطابق زندگی بسر کرتا ہے اور جونہی ایک انسان اللہ کے اس منفرد نور اس واحد حقیقت پسندانہ اور واضح روشنی کو ترک کر دیتا ہے' وہ کفر کے مختلف اندھیروں میں سے کسی اندھیرے میں پھنس جاتا ہے۔ یہ اندھیرے متنوع ہیں اور سب ہی اندھیرے ہیں۔ اور ان اندھیروں کا انجام کیا ہے؟ جو لوگ ان اندھیروں میں زندگی بسر کرتے ہیں أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ....

"یہ لوگ آگ والے ہیں اور یہ ہمیشہ آگ میں رہنے والے ہیں۔" اگر یہ لوگ اسلام کی روشنی میں راہ پانے کی کوشش نہیں کرتے تو وہ اس بات کے مستحق ہیں کہ ہمیشہ آگ میں رہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ سچائی ایک اور منفرد حقیقت ہے۔ سچائیاں دو نہیں ہو سکتیں اور گمراہی کی مختلف انواع و اقسام ہیں اور حق و صداقت کے علاوہ جو کچھ ہے وہ سب گمراہی ہے۔

○○○

اس سے پہلے کہ ہم اس سبق پر بات ختم کر کے آگے بڑھیں' مناسب یہ ہے کہ ہم اس قاعدے یعنی لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ .... کے بارے میں ایک اصولی بات کر دیں۔ اس قاعدہ کلیہ کے ساتھ ساتھ اسلام میں فرضیت جہاد کا بھی حکم دیا گیا ہے

اور ایسے مواقع پر پیش آئے ہیں جن میں اسلام نے جہاد میں حصہ بھی لیا ہے۔ حالانکہ ایک سابقہ آیت میں کہا گیا ہے۔ وَ قٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّ يَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ .... (بقرہ ۱۹۳) "اور ان سے لڑو یہاں تک کہ فتنہ نہ رہے اور نظام زندگی اللہ کا ہو جائے۔"

اسلام کے بعض مفاد پرست دشمنوں نے یہ الزام لگایا ہے کہ لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ .... کے اصولی قاعدہ کے ساتھ ساتھ جہاد کی فرضیت کا حکم دینا ایک متضاد بات ہیں۔ اس سوال کے جواب میں بعض لوگوں نے بظاہر اسلام کی مدافعت کرتے ہوئے اور بباطن اسلام کے ساتھ دشمنی کرتے ہوئے مسلمانوں کے شعور سے جذبۂ جہاد ختم کرنے کی کوشش کی ہے۔ ایسے لوگ فریضہ جہاد کی اہمیت کو کم کرنے کی کوشش کرتے ہیں حالانکہ اسلام کے قیام اور اس کی نشرو اشاعت میں فریضۂ جہاد نے بہت اہم رول ادا کیا ہے۔ ایسے لوگ بڑی مکاری سے 'نہایت ہی نرم انداز سے اور نہایت ہی حکیمانہ انداز سے مسلمانوں کے دل میں یہ بات بٹھانا چاہتے ہیں کہ آج جہاد کی ضرورت باقی نہیں رہی اور نہ آئندہ کبھی فریضہ جہاد کی ضرورت پیش آسکتی ہے۔ بظاہر یہ لوگ یہ بات اسلام کی مدافعت میں کرتے ہیں۔[۱]

یہ دونوں قسم کے لوگ مستشرقین ہیں۔ جو ایک ہی میدان میں کام کرتے ہیں۔ یہ دونوں اسلام کے خلاف بر سرپیکار ہیں۔ یہ اسلامی منہاج میں تحریف کرنا چاہتے ہیں۔ یہ لوگ اس شعور کو ختم کرنا چاہتے ہیں جو نظام جہاد ایک مسلمان کے نفس میں پیدا کر دیتا ہے۔ یہ لوگ اسلام کے شعور جہاد سے خائف ہیں۔ اس لئے کہ میدان جہاد میں وہ کبھی بھی اسلام کا مقابلہ نہیں کر سکے۔ اس لئے اس شعور کو مٹا کر یہ اپنے لئے امن و اطمینان پیدا کرنا چاہتے ہیں اور جب سے انہوں نے دل مسلم سے جذبہ جہاد ختم کیا ہے یا اسے الجھا دیا ہے' انہوں نے امت مسلمہ کے جسم پر مختلف پہلوؤں سے ضرب ہائے کاری لگائی ہیں اور ہر میدان میں اسے شکست دے دی ہے۔ یہ لوگ امت مسلمہ کو یہ سمجھانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ مسلم اقوام اور استعماری قوم کی جنگ فقط معاشی اور تجارتی منڈیوں کی جنگ ہے۔ لہٰذا اس جنگ میں امت مسلمہ کو جذبہ جہاد کو بیچ میں نہیں لانا چاہئے جو فقط نظریاتی جنگ میں کار آمد ہوتا ہے۔ اس لئے اس دور جدید میں جہاد کی بات بلاجواز ہے۔

اسلام نے پہلے پہل جہاد اس وقت شروع کیا جس وقت مسلمانوں پر مظالم توڑے جا رہے تھے تاکہ ان کی جان' مال اور نظریۂ حیات کو محفوظ کیا جا سکے۔ یعنی جہاد برائے قیام امن۔ اس تفسیر کے حصہ دوئم میں اس اصول کی تشریح آیت وَ الْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ ۚ .... (اور فتنہ و فساد و قتل سے زیادہ شدید ہیں) کی تفسیر کے موقعہ پر کر چکے ہیں۔ اس اصول کے مطابق اسلام نے نظریاتی تشدد اور اس کی وجہ سے جسمانی ازیت اور اہل نظریہ پر بوجہ نظریہ ظلم و تشدد کو قتل سے زیادہ شدید قرار دیا۔ اس اصول کے مطابق نظریات کی قدر و قیمت انسانی زندگی سے بھی زیادہ ہے۔ اگر ایک مسلمان کو اس بات کی اجازت ہے کہ وہ اپنے مال اور اپنی جان کی حفاظت میں ہتھیار اٹھا سکتا ہے تو اسے بطریق اولیٰ اس بات کی اجازت ہے کہ وہ اپنے دین' عقیدے اور نظریہ کی حفاظت اور دفاع میں ہتھیار اٹھائے۔ اس وقت مسلمان محض اپنے عقیدے کی وجہ سے ظلم و تشدد کی چکی میں پس رہے تھے۔ ان کے سامنے اس کے سوا اور کوئی چارۂ کار ہی نہ تھا کہ وہ اپنی عزیز ترین دولت یعنی دولت ایمان کی مدافعت میں ہتھیار اٹھائیں۔ ان پر یہ تشدد محض ان کے عقیدے کی وجہ سے ہو رہا تھا اور کرۂ ارض کے مختلف حصوں میں ان پر یہ مظالم ڈھائے جا رہے تھے۔ سرزمین اندلس نے ان وحشیانہ مظالم کو دیکھا ہے۔ وہ اس اجتماعی قتل و غارت کی گواہ جو مسلمانوں پر محض ان کے دین اور عقیدے کی وجہ سے ڈھائے گئے۔ پھر یہ سرزمین ان مظالم کی بھی گواہ ہے جو وہاں عیسائیوں کے کیتھولک فرقے نے دوسرے فرقوں کے خلاف روا رکھے تاکہ انہیں زبردستی کیتھولک بنایا جائے۔ آج اسپین کی حالت یہ

۱۔ دیکھئے آرنلڈ کی کتاب "دعوت اسلامی" ترجمہ ڈاکٹر ابراہیم حسن و برادرزنہ

ہے کہ وہاں سے مسلمانوں اور دوسرے عیسائی فرقوں کا نام و نشان مٹادیا گیا ہے۔ پھر بیت المقدس اور اس کے اردگرد کے اسلامی علاقے صلیبی حملوں سے بھی بخوبی واقف ہیں۔ جن کا ہدف صرف اسلامی نظریۂ حیات اور دین اسلام پر غلبہ پاناتھا۔ ان جنگوں کا دفاع بھی اہل اسلام نے اسلامی نظریۂ حیات کے پلیٹ فارم سے دیا اور وہ اس میں بہت اچھی طرح کامیاب رہے۔ اور اس علاقے کو اندلس کے انجام بد سے بچالیا۔ آج بھی اشتراکی علاقوں‘ بت پرست علاقوں‘ یہودی علاقوں اور مسیحی علاقوں میں مسلمانوں پر مظالم ڈھائے جارہے ہیں اور یہ محض اس لئے کہ وہ مسلمان ہیں۔ لہٰذا اگر مسلمان صحیح معنوں میں مسلمان ہیں تو آج بھی ان پر جہاد اسی طرح فرض ہے جس طرح پہلے فرض تھا تاکہ مسلمانوں کے خلاف ان مظالم کو بند کیا جاسکے۔

اسلام کے نظریۂ جہاد کی پشت پر دوسرا محرک یہ تھا کہ نظریاتی آزادی کے بعد نظریاتی دعوت و تبلیغ کی آزادی کے لئے بھی مواقع پیدا کئے جائیں۔ اس لئے کہ اسلام انسانی زندگی اور اس کائنات کا ایک بہترین حل پیش کرتا ہے۔ وہ اس کرۂ ارض پر انسانی زندگی کی نشوونما کے لئے ایک بہترین نظام تجویز کرتا ہے۔ وہ اس بہترین عقیدے اور مکمل نظام کو پوری انسانیت تک پہنچانا چاہتا ہے۔ تاکہ وہ اسے سنیں اور سمجھیں۔ اور سننے اور سمجھنے کے بعد پھر وہ آزاد ہیں کہ وہ اسے قبول کرلیں یا رد کردیں۔ اس لئے کہ دین و عقیدے کے بارے میں وہ کسی جبر و اکراہ کا قائل نہیں ہے۔ لیکن مکمل نظریاتی آزادی سے پہلے اس امر کی ضرورت ہے کہ تمام انسانوں تک اسلامی پیغام کے پہنچنے کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہ ہو۔ اس لئے کہ اللہ کی جانب سے یہ پیغام تمام انسانوں کے لئے بھیجا گیا ہے۔ لہٰذا وہ تمام رکاوٹیں دور ہونی چاہئیں جو عوام الناس کو اس پیغام کے سننے‘ اسے قبول کرنے اور اگر وہ چاہیں تو قافلہ ہدایت یافتگان میں شامل ہونے کی راہ میں حائل ہیں۔ ان رکاوٹوں میں سب سے بڑی رکاوٹ اس کرۂ ارض پر قائم طاغوتی نظام زندگی ہوتا ہے۔ یہ نظام عوام الناس اور اس پیغام کی راہ میں حائل ہوتا ہے۔ اور جو لوگ کسی طرح اس عقیدے اور پیغام کو سن کر اپنالیتے ہیں۔ یہ طاغوتی نظام ان پر تشدد شروع کردیتا ہے۔ لہٰذا اسلام نے جب بھی جہاد کیا ہے اس نے ایسے باطل اور طاغوتی نظامہائے زندگی کا قلع قمع کرنے کے لئے کیا ہے۔ اور اس نے ایسے نظاموں کی جگہ ایسا عادلانہ نظام زندگی قائم کیا ہے جس میں ہر جگہ دعوت حق اور داعی حق کو پوری پوری آزادی حاصل ہو۔ یہ مقصد اور ہدف آج بھی قائم ہے۔ لہٰذا آج بھی مسلمانوں پر جہاد فرض ہے تاکہ وہ اس پیغام کو عام کرسکیں بشرطیکہ مسلمان‘ مسلمان ہوں۔

ایک دوسرا مقصد جس کے لئے اسلام نے جہاد کو روا رکھا ہے وہ اسلامی نظام زندگی کا قیام اور اس کی حفاظت ہے۔ یہ واحد نظام زندگی ہے جو ایک انسان کو اپنے دوسرے انسان بھائی تک رسائی حاصل کرنے کی آزادی عطا کرتا ہے۔ اور اس میں ہر انسان دوسرے انسان کی نسبت سے بالکل آزاد بھی ہے۔ اس نظام میں بندگی صرف خدائے بلند و برتر کے لئے مخصوص ہے۔ اور یہ نظام اس دنیا سے انسان کی جانب سے دوسرے انسان کے لئے ہر قسم کی غلامی کا قلع قمع کردیتا ہے۔ اس نظام میں کوئی فرد‘ کوئی طبقہ اور کوئی قوم دوسرے انسانوں کے لئے قانون سازی کا کام نہیں کرسکتی۔ اور نہ اس قانون سازی کے ذریعہ انسانوں کو کوئی اپنا غلام اور زیردست بناسکتا ہے۔ اس نظام میں سب انسانوں کا ایک ہی رب ہے۔ وہ تمام انسانوں کے لئے قانون وضع کرتا ہے بالکل مساوات کے ساتھ۔ اور تمام انسان صرف اس رب کی بارگاہ میں خضوع اور خشوع کے ساتھ سجدہ ریز ہوتے ہیں‘ صرف اس رب واحد کی بندگی کرتے ہیں اور صرف اس پر ایمان لاتے ہیں۔ اس نظام میں انسان کی جانب سے کسی دوسرے انسان کی اطاعت صرف ایک ہی صورت میں کی جاتی ہے کہ وہ اللہ کی شریعت کا نافذ کنندہ ہو۔ اور امت کی جانب سے نفاذ شریعت کا کام اس کے سپرد کردیا گیا ہو۔ نفاذ شریعت کا کام بھی کوئی از خود نہیں کرسکتا۔ اس لئے کہ قانون سازی صرف اللہ کا کام ہے۔ انسانی زندگی میں شریعت شان خداوندی کا اظہار ہے۔ اس لئے کوئی انسان اس بات کا مستحق نہیں ہے کہ وہ اپنے لئے شریعت سازی کا کام مخصوص کرسکے حالانکہ وہ صرف ایک بندۂ خدا ہے۔

یہ اسلامی نظام حیات کا اصل الاصول ہے اور اس اصول و دستور کے نتیجے میں ایک ایسا پاک اخلاقی نظام زندگی پرورش پاتا ہے جس میں تمام بنی نوع انسان کو کامل حریت اور آزادی حاصل ہو جاتی ہے۔ ان انسانوں کو بھی جو اسلامی عقیدۂ حیات کو سرے سے قبول ہی نہیں کرتے۔ اس نظام میں ہر شخص کی عزت محفوظ ہوتی ہے' یہاں تک کہ جو لوگ اسلامی نظام زندگی کو قبول ہی نہیں کرتے ہر اس باشندے کے حقوق محفوظ ہوتے ہیں جو کسی اسلامی ملک میں رہائش پذیر ہوتا ہے۔ چاہے اس کا عقیدہ جو بھی ہو۔ اس نظام میں کسی بھی شخص کو اسلامی عقاید اپنانے پر مجبور نہیں کیا جاتا۔ اس میں دین کے بارے میں کسی کو مجبور نہیں کیا جاتا۔ اس میں صرف تبلیغ کی آزادی ہوتی ہے۔

محض اسلام نے جہاد کو اس لئے فرض کیا ہے کہ وہ دنیا میں مذکورہ بالا ارفع اور اکمل نظام زندگی قائم کرے اور اس کی حمایت اور بچاؤ کی تدابیر اختیار کرے۔ یہ اسلام کا حق تھا کہ وہ بذریعہ جہاد باطل اور فاسد نظامہائے زندگی کا قلع قمع کر دے جو اس اصول پر قائم تھے کہ بعض انسان بعض دوسرے انسانوں کے غلام ہیں اور جن میں بعض انسان خدائی کے مقام کے مدعی ہوتے ہیں جو خدائی فرائض سنبھالتے ہیں' حالانکہ یہ ان کا حق نہیں ہوتا۔ اور ظاہر ہے کہ جب اسلام اس نصب العین کو لے کر اٹھتا ہے تو یہ باطل نظامہائے زندگی بھی اس کے مقابلے میں اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور وہ اس کے دشمن ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا اس کے سوا کوئی چارۂ کار ہی نہ تھا کہ اسلام ان طاغوتی نظاموں کا قلع قمع کر کے ان کی جگہ اس کرۂ ارض پر اپنے ارفع اور اکمل نظام کا اعلان کر دے۔ اور پھر اس نظام کے زیر سایہ انہیں اپنے مخصوص عقائد کے اندر آزادی عطا کر دے اور ان پر صرف اسلام کے اجتماعی سول کوڈ' اسلامی اخلاقیات اور مملکت کی اقتصادی پالیسی کی پابندی لازم ہو۔ رہے دینی اور قلبی عقائد و رجحانات تو ان میں وہ مکمل طور پر آزاد ہیں۔ ان کے شخصی قوانین و معاملات میں بھی وہ مکمل طور پر آزاد۔ اپنے عقائد کے مطابق اپنے معاملات طے کریں لیکن اسلامی نظام زندگی ان پر قائم ہو جو ان کی حفاظت کرے۔ ان کی آزادی اس کے سایہ میں محفوظ ہو۔ ان کو مکمل آزادی رائے حاصل ہو۔ ان کی عزت محفوظ ہو اور ان کے مکمل اساسی حقوق انہیں حاصل ہوں لیکن اس نظام کے دائرے کے اندر۔

یہ جہاد اب بھی باقی ہے اور مسلمانوں پر فرض ہے کہ وہ اسلامی نظام زندگی کے قیام کے لئے اس جہاد کو قائم رکھیں۔ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّ يَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ .... "یہاں تک کہ کوئی فتنہ باقی نہ رہے اور جنس دین اللہ کا ہو جائے۔" اور اس دنیا سے انسانوں کی خدائی ختم ہو اور اللہ کے سوا کسی کی بندگی اور غلامی دنیا میں نہ رہے۔[۱]

غرض اسلام نے تلوار اس لئے نہیں اٹھائی کہ وہ لوگوں کو اسلامی اعتقادات اور تصورات اپنانے پر مجبور کر دے۔ نہ دنیا میں اسلام کا پھیلاؤ تلوار کے بل بوتے پر ہوا ہے جیسا کہ اسلام کے بعد اعداء اسلام یہ الزام لگاتے ہیں۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اسلام نے جہاد اس لئے شروع کیا تھا کہ وہ اس کرۂ ارض پر ایک پر امن نظام زندگی قائم کر دے جس کے سائے میں تمام عقائد اور مختلف دینی تصورات رکھنے والے لوگ امن و آشتی کی زندگی بسر کر سکیں۔ ہاں وہ اسلام کے سیاسی دائرہ عمل میں رہتے ہوئے اپنے عقائد محفوظ رکھیں اور آزادی سے رہیں۔ اگرچہ وہ اسلامی عقائد قبول نہ کریں۔

اسلامی نظام کے وجود' اس کے پھیلاؤ اور اہل اسلام کے امن و سکون کے لئے اور ان کو لوگوں کے امن و اطمینان کے لئے جو لوگ اس نظام زندگی میں داخل ہونا چاہتے تھے اسلام کی مسلح قوت کی اشد ضرورت تھی۔ نیز اقامت دین اور حفاظت دین کے لئے بھی مسلح قوت کا وجود ازبس ضروری تھا۔ اسلامی جہاد کا ادارہ کوئی معمولی اہمیت کا حامل نہ تھا۔ نہ وہ ایسا تھا کہ اس کی اس وقت کوئی ضرورت نہ ہو

[۱] مسئلہ جہاد میں زیادہ وضاحت کے لئے ملاحظہ فرمایئے کتاب الجہاد فی الاسلام مصنفہ المسلم العظیم سید ابوالاعلیٰ مودودی ۔ نیز میری کتاب "السلام العالمی فی الاسلام" (سید قطب)

یا آج اس کی ضرورت نہ ہو یا یہ کہ مستقبل میں اس کی ضرورت نہ ہو۔ مسلمانوں کے بدترین دشمن یہ بات ان کے ذہن نشین کرتے ہیں کہ اب جہاد کی ضرورت نہیں ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اسلام کو ایک اجتماعی نظام کی ضرورت ہے۔ اس نظام کو ایک اجتماعی قوت کی ضرورت ہے۔ اور یہ قوت اسلام کے جذبہ جہاد میں مضمر ہے۔ یہ اسلام کا مزاج ہے جس کے بغیر نہ اسلام قائم ہو سکتا ہے اور نہ ہی وہ قائدانہ کردار ادا کر سکتا ہے۔

یہ بات درست ہے کہ لَآ اِكْرَاهَ فِى الدِّيْنِ .... "دین میں جبر نہیں ہے" لیکن اس کے ساتھ ساتھ قرآن مجید یہ حکم بھی دیتا ہے

وَ اَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّ مِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَ عَدُوَّكُمْ وَ اٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ ۚ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ ۚ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ

"اور تم لوگ، جہاں تمہارا بس چلے، زیادہ سے زیادہ طاقت اور تیار بندھے رہنے والے گھوڑے ان کے مقابلے کے لئے مہیا رکھو تاکہ اس کے ذریعے اللہ کے اور اپنے دشمنوں کو اور ان دوسرے اعدا کو خوفزدہ کر دو جنہیں تم نہیں جانتے مگر اللہ جانتا ہے۔" (۸:۶۰)

اسلام کی نظر میں یہ بنیادی نقطہ ہے اور اسی کی روشنی میں مسلمانوں کو اپنے دین کو سمجھنا چاہئے اور اسی نقطۂ نظر سے اہل اسلام کو اپنی تاریخ پڑھنا چاہئے۔ اسلام کے نظریۂ جہاد کے بارے میں مسلمانوں کو ایسا موقف اختیار نہ کرنا چاہئے جس میں وہ ایک ملزم کی طرح کھڑے ہوں اور اپنا دفاع کرنے کی کوشش کر رہے ہوں۔ اس سلسلے میں انہیں ایک پر اعتماد، پر عزم اور خوددار شخص کا موقف اختیار کرنا چاہئے جسے یہ یقین ہو کہ وہ اس دنیا کے تمام تصورات سے بلند تر ہے۔ اسلامی نظام تمام نظاموں کے مقابلے میں بلند تر ہے۔ دین اسلام تمام ادیان سے بالاتر ہے۔ اہل اسلام کو ان لوگوں سے دھوکہ نہ کھانا چاہئے جو بظاہر دین اسلام کا دفاع کر رہے ہوتے نظر آتے ہیں لیکن دراصل وہ ان کے دل و دماغ سے تصور جہاد کھرچ کھرچ کر نکال رہے ہیں تاکہ وہ خود اسلام دشمن اقوام کو محفوظ کر سکیں۔ جہاد دراصل ظالم طاغوت کی برتری کو ریزہ ریزہ کرنے والا عمل ہے۔ اور جہاد میں تمام انسانیت کی بھلائی ہے۔ اور انسانیت کا سب سے بڑا دشمن وہ شخص ہے جو اسے جہاد سے محروم کرتا ہے اور انسانیت اور جہاد کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کرتا ہے۔ لہٰذا یہ شخص انسانیت کا دشمن نمبر ایک قرار پاتا ہے۔ اور انسانیت میں اگر رشد و ہدایت ہو تو اسے چاہئے کہ وہ اپنے اس عظیم دشمن کا پیچھا کرے۔ اور انسانیت میں اس قسم کی رشد و ہدایت پیدا کرنے کے لئے اہل ایمان کا فرض بنتا ہے کہ وہ اس دشمن انسانیت کا پیچھا کریں۔ اس لئے کہ اہل ایمان امت مختار ہیں۔ انہیں دولت ایمان سے برگزیدہ بنایا گیا ہے۔ اس لئے خود ان کے اپنے نفوس کے لئے بھی اور پوری انسانیت کی خاطر بھی یہ ان کا فرض بنتا ہے کہ وہ منکر جہاد کا تعاقب کریں اور یہ ان کا ایک ایسا فریضہ ہے جس کے بارے میں ازروئے شریعت وہ عند اللہ مسئول ہیں۔

☆ ☆ ☆ ☆

درس ۱۸ ایک نظر میں

☆☆☆☆☆☆

یہ تین آیات ہیں اور ان کا موضوع ایک ہے یعنی زندگی اور موت کی حقیقت کیا ہے؟ اور موت کے بعد زندگی کا راز کیا ہے؟ حیات بعد الممات اسلامی نظریات کا ایک اہم پہلو ہے۔ جس پر قرآن مجید میں بحث کی گئی ہے۔ اور اس پارہ کے آغاز ہی سے جابجا اس پر بحث کی گئی ہے۔ نیز ان آیات کا ان صفات الٰہی کے ساتھ بھی براہ راست تعلق ہے جو آیت الکرسی میں بیان کی گئی ہیں۔ اور ان سب آیات سے قرآن کریم کی اس واضح جدوجہد کا اظہار ہوتا ہے' جو قرآن مجید' ایک مسلمان کے شعور و ادراک میں' ایک صحیح اسلامی تصور حیات کے پیدا کرنے کے لئے کر رہا ہے۔ اور انسانی زندگی کے بصیرت افروز جائزے کی خاطر اس بات کی ضرورت ہے کہ ذہن انسانی میں اس کا صاف ستھرا تصور موجود ہو' جو اس کائنات کے حقیقی مشاہدے پر مبنی ہو۔ اور جو مضبوط اور دل نشین اعتقاد پر مبنی ہو۔ اس لئے کہ انسان کے پورے نظام زندگی' انسان کے مکمل طرز عمل اور اس کے تمام اخلاق و آداب کے قواعد و ضوابط کا ایک گہرا تعلق اس کے اعتقادات کے ساتھ ہوتا ہے۔ بلکہ یہ تمام چیزیں انسان کے عقائد و نظریات پر مبنی ہوتی ہیں۔ انسانی نظام زندگی کا تعلق اگر اس کے عقائد و نظریات اور اس کے مکمل تصور کائنات کے ساتھ نہ ہو تو وہ نظام زندگی نہ تو مضبوط و مستحکم ہو سکتا ہے اور نہ ہی اس کا کوئی ایک مستقل معیار ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے تطہیر افکار اور عقائد و تصورات کی توضیح اور پختگی پر بڑا زور دیا ہے اور قرآن کریم کا مکی دور زیادہ تر اسی پر مشتمل ہے۔ اور یہی رنگ مدنی دور کی آیات میں بھی نظر آتا ہے۔ جہاں تفصیلی ہدایات اور قانون سازی بھی ہو رہی ہے۔

ان میں سے پہلی آیات میں حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے دور کے کسی بادشاہ کے درمیان ہونے والی گفتگو کو نقل کیا گیا ہے۔ یہاں بادشاہ کا نام نہیں دیا گیا' اس لئے کہ یہاں اس کے نام کے ذکر سے اصل بات میں کسی چیز کا اضافہ نہیں ہوتا۔ یہاں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور جماعت مسلمہ کے سامنے استعجاب کے ساتھ اس گفتگو کو پیش کیا جاتا ہے کہ اس شخص نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ رب کائنات کے بارے میں یہ مناظرہ کیا اور کس قدر احمقانہ موقف اختیار کیا۔ اس نے اور قرآن کریم نے اپنے خاص بلیغانہ انداز میں اس مباحثے کو یہاں نقل کیا ہے۔

☆☆☆☆

تشریح آیات درس نمبر ۱۸

آیت نمبر ۲۸۵ تا ۲۶۰

☆☆☆☆☆ أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِي حَاجَّ إِبْرَاهِيمَ فِي رَبِّهِ أَنْ آتَاهُ اللَّهُ الْمُلْكَ إِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّيَ الَّذِي يُحْيِي وَيُمِيتُ قَالَ أَنَا أُحْيِي وَأُمِيتُ ۖ قَالَ إِبْرَاهِيمُ فَإِنَّ اللَّهَ يَأْتِي بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَأْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِي كَفَرَ ۗ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ﴿۲۵۸﴾ أَوْ كَالَّذِي مَرَّ عَلَىٰ قَرْيَةٍ وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلَىٰ عُرُوشِهَا قَالَ أَنَّىٰ يُحْيِي هَٰذِهِ اللَّهُ بَعْدَ مَوْتِهَا ۖ فَأَمَاتَهُ اللَّهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهُ ۖ قَالَ كَمْ لَبِثْتَ ۖ قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ۖ قَالَ بَلْ لَبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ فَانْظُرْ إِلَىٰ طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّهْ ۖ وَانْظُرْ إِلَىٰ حِمَارِكَ وَلِنَجْعَلَكَ آيَةً لِلنَّاسِ ۖ وَانْظُرْ إِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنْشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوهَا لَحْمًا ۚ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُ قَالَ أَعْلَمُ أَنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿۲۵۹﴾ وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ أَرِنِي كَيْفَ تُحْيِي الْمَوْتَىٰ ۖ قَالَ أَوَلَمْ تُؤْمِنْ ۖ قَالَ بَلَىٰ وَلَٰكِنْ لِيَطْمَئِنَّ قَلْبِي ۖ قَالَ فَخُذْ أَرْبَعَةً مِنَ الطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ إِلَيْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلَىٰ كُلِّ جَبَلٍ مِنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ يَأْتِينَكَ سَعْيًا ۚ وَاعْلَمْ أَنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿۲۶۰﴾

۳۵
ع۳
۳

”کیا تم نے اس شخص کے حال پر غور نہیں کیا جس نے ابراہیم علیہ السلام سے جھگڑا کیا تھا۔ جھگڑا اس بات پر کہ ابراہیم علیہ السلام کا رب کون ہے اور اس بنا پر کہ اس شخص کو اللہ نے حکومت دے رکھی تھی۔ جب ابراہیم علیہ السلام نے کہا کہ ”میرا رب وہ ہے جس کے

اختیار میں زندگی اور موت ہے۔" تو اس نے جواب دیا :"زندگی اور موت میرے اختیار میں ہے۔" ابراہیم علیہ السلام نے کہا :"اچھا' اللہ سورج کو مشرق سے نکالتا ہے' تو ذرا اسے مغرب سے نکال لا۔" یہ سن کر وہ منکر حق ششدر رہ گیا' مگر اللہ ظالموں کو راہ راست نہیں دکھایا کرتا۔

یا پھر مثال کے طور پر اس شخص کو دیکھو' جس کا گزر ایک ایسی بستی پر ہوا' جو اپنی چھتوں پر اوندھی گری پڑی تھی۔ اس نے کہا:"یہ آبادی جو ہلاک ہو چکی ہے' اسے اللہ کس طرح دوبارہ زندگی بخشے گا؟" اس پر اللہ نے اس کی روح قبض کر لی اور وہ سو برس تک مردہ پڑا رہا۔ پھر اللہ نے اسے دوبارہ زندگی بخشی اور اس سے پوچھا :"بتاؤ' کتنی مدت پڑے رہے ہو؟" اس نے کہا :"ایک دن یا چند گھنٹے رہا ہوں گا" فرمایا :"تم پر سو برس اسی حالت میں گزر چکے ہیں۔ اب ذرا اپنے کھانے اور پانی کو دیکھو کہ اس میں ذرا تغیر نہیں آیا ہے۔ دوسری طرف ذرا اپنے گدھے کو بھی دیکھو (کہ اس کا پنجر تک بوسیدہ ہو رہا ہے) اور یہ ہم نے اس لئے کیا ہے کہ ہم تمہیں لوگوں کے لئے ایک نشانی بنا دینا چاہتے ہیں۔ پھر دیکھو کہ ہڈیوں کے اس پنجر کو ہم کس طرح اٹھا کر گوشت پوست اس پر چڑھاتے ہیں۔" اس طرح جب حقیقت اس کے سامنے بالکل نمایاں ہو گئی' تو اس نے کہا :"میں جانتا ہوں کہ اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔"

اور وہ واقعہ بھی پیش نظر رہے' جب ابراہیم علیہ السلام نے کہا تھا کہ "میرے مالک' مجھے دکھا دے' تو مردوں کو کیسے زندہ کرتا ہے۔" فرمایا :"کیا تو ایمان نہیں رکھتا؟" اس نے عرض کیا" ایمان تو رکھتا ہوں' مگر دل کا اطمینان درکار ہے۔" فرمایا :"اچھا' تو چار پرندے لے اور ان کو اپنے سے مانوس کر لے۔ پھر ان کا ایک ایک ٹکڑا ایک ایک پہاڑ پر رکھ دے۔ پھر ان کو پکار' وہ تیرے پاس دوڑے چلے آئیں گے۔ خوب جان لے کہ اللہ نہایت بااقتدار اور حکیم ہے۔"

یہ شخص جس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ یہ مباحثہ کیا وہ وجود باری کا منکر نہ تھا۔ وہ اگر منکر تھا تو اللہ کی وحدانیت اور ربوبیت کا منکر تھا۔ وہ اللہ تعالیٰ کو اس کائنات کا واحد متصرف اور واحد مدبر ماننے کے لئے تیار نہ تھا۔ اسی طرح جس طرح جاہلیت کے گمراہ لوگوں میں سے بعض ایسے تھے جو وجود باری کے معترف تھے لیکن وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ بعض دوسروں کو شریک ٹھہراتے تھے۔ بعض افعال واقعات کو ان شریکوں کی طرف منسوب کرتے تھے۔ اسی طرح یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی صفت حاکمیت کے بھی منکر تھے۔ اسلامی تصور کائنات کے مطابق جس طرح اس کائنات کے تکوینی امور اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں اسی طرح یہاں قانون سازی اور اجتماعی امور کے فیصلے کا اختیار بھی اللہ کے پاس ہے اور اس میں اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔

یہ منکر حق بادشاہ بہت ہی ہٹ دھرم تھا اور یہ اس سبب کی وجہ سے منکر حق تھا کہ اسے اللہ نے حکومت دے رکھی تھی۔ اَنۡ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الۡمُلۡكَ .... حالانکہ اس سبب کا تقاضا تو یہ تھا کہ وہ اس کی وجہ سے پکا مومن ہوتا اور شکر گزار ہوتا اور اللہ کے احسانات کا معترف ہوتا لیکن اس نے اس اقتدار اور بادشاہت کی وجہ سے کفر و طغیان کا راستہ اختیار کیا۔ اور اللہ کے اس انعام کی ناقدری کی اور اس انعام و اکرام کی اصل حقیقت اور اس کے حقیقی تصور کو نہ پا سکا۔ شکر کی جگہ اس نے کفر کی روش اختیار کی۔ اور جو بات ان کی ہدایت کا سبب ہونا چاہئے تھی' اس کی وجہ سے وہ گمراہ ہو گئے۔ وہ حاکم اس لئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں حاکم بنایا۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں حاکم اس لئے نہیں بنایا کہ وہ عوام کو خود اپنا بندہ بنا لیں۔ اور خود اپنے بنائے ہوئے قوانین کی پیروی کرائیں۔ وہ تو خود اللہ کے بندے ہیں' جس طرح دوسرے لوگ اللہ کے بندے ہیں۔ وہ بھی ان کی طرح اللہ سے شریعت پانے والے ہیں۔ وہ اللہ تعالیٰ سے بغاوت کر کے نہ حاکم رہتے ہیں اور نہ کوئی قانون بنا سکتے ہیں۔ یہ حکام تو خلفاء ہیں اصل حاکم نہیں ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ جب یہ بادشاہ نبی وقت کے ساتھ مباحثہ کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کو ان کا یہ طرز عمل عجیب نظر آتا ہے۔

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِي حَاجَّ إِبْرَاهِيمَ فِي رَبِّهِ أَنْ آتَاهُ اللَّهُ الْمُلْكَ ....
"کیا تم نے اس شخص کے حال پر غور نہیں کیا جس نے ابراہیم سے جھگڑا کیا تھا۔ جھگڑا اس بات پر کہ ابراہیم کا رب کون ہے؟ اس بنا پر کہ اس شخص کو اللہ نے حکومت دے رکھی تھی۔" "کیا تو نے نہیں دیکھا! یہ قابل مذمت رویے اور حقارت آمیز طرز عمل پر استعجاب کا اظہار ہے۔ انکار اور استنکار اپنے لفظی اور معنوی ہم آہنگی کی وجہ سے ایک ساتھ چلتے ہیں۔ اس بادشاہ کی یہ حرکت فی الحقیقت ناپسندیدہ ہے۔ اس لئے کہ انعام واکرام پانے کے سبب اگر کوئی جدل وجدال شروع کردے تو یقیناً قابل مذمت ہے۔ نیز یہ بات بھی قابل مذمت ہے کہ کوئی رب کائنات کی صفات اپنے لئے مخصوص کرے۔ اور کوئی حاکم اپنی خواہشات نفس کے مطابق عوام الناس پر حکمرانی کرے اور تقنین وتشریع کے کام میں اللہ سے ہدایت نہ لے۔

إِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّيَ الَّذِي يُحْيِي وَيُمِيتُ .... "جب ابراہیم نے کہا کہ میرا رب وہ ہے جس کے اختیار میں زندگی اور موت ہے۔" زندگی اور موت ایسے واقعات ہیں جن کا اعادہ ہر لحظہ ہوتا رہتا ہے' یہ حقائق ہر وقت انسانی احساس اور انسانی عقل کے سامنے آتے رہتے ہیں لیکن باوجود اس تکرار اور کثرت وقوع کے زندگی اور موت ایک حیرت انگیز راز ہیں۔ اس سربستہ راز کے حل کے لئے عقل انسانی ایک ایسے سرچشمے کی طرف رجوع کرتی ہے جو بشریت سے وراء ہے۔ اور ایک ایسے مرجع اور مصدر کی طرف رجوع جس کا اس مخلوقات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ لہٰذا اس ناقابل حل پہیلی کے صحیح حل کے لئے ضروری ہے کہ انسان ذات باری کی طرف رجوع کرے جو پیدا کرنے پر بھی قادر ہے اور فنا کرنے پر بھی قادر ہے۔

آج تک ہم موت وحیات کی حقیقت نہیں پا سکے۔ البتہ زندوں میں ہم زندگی کے آثار سمجھ لیتے ہیں اور مردوں سے ہم موت کی خصوصیات جان لیتے ہیں۔ اس لئے ہم مجبور ہیں کہ موت وحیات کی حقیقت اس حقیقی قوت کے حوالے کردیں جو ان تمام قوتوں سے وراء ہے جن کو ہم جانتے ہیں یعنی قوت الٰہیہ۔

یہی وجہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے رب کی ایک ایسی صفت بیان کی جس میں اس کے ساتھ کوئی شریک نہیں ہے۔ نہ کسی کو یہ زعم ہو سکتا ہے کہ وہ اس میں شریک کار ہو سکتا ہے۔ جب ابراہیم علیہ السلام سے اس بادشاہ نے پوچھا کہ تمہارا رب کون ہے جو تمہارے لئے قانون بناتا ہے' جس کے پاس اقتدار اعلیٰ ہے اور جسے قانون سازی کے پورے اختیارات حاصل ہیں؟ تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جواب دیا کہ میرا رب وہ ہے جس کے ہاتھ میں موت وحیات ہے۔ لہٰذا وہی ہے جو حاکم اور قانون ساز ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام موت وحیات کی حقیقت سے خوب واقف تھے۔ اور موت اور زندگی سے ان کی مراد یہ تھی کہ اللہ ان حقائق کا خالق ہے۔ اس لئے کہ وہ رسول تھے اور انہیں وہ لدنی اسرار ورموز عطا کئے گئے تھے جن کے بارے میں ہم نے حصہ اول میں بحث کی ہے۔ اور موت وحیات کی تخلیق ایک ایسا عمل ہے جس میں اللہ کے ساتھ اس کے بندوں میں سے کوئی شریک نہیں ہے لیکن جو بادشاہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ مباحثہ کر رہا تھا وہ یہ سمجھتا تھا کہ وہ اپنی قوم کا حاکم مختار ہے۔ اس کی قوم پر اس کے پورے احکام نافذ ہوتے ہیں۔ وہ سزائے موت بھی دے سکتا ہے اور معاف بھی کر سکتا ہے۔ تو گویا یہ بھی ایک قسم کی ربوبیت ہے۔ اس لئے اس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے کہا: "میں اس قوم کا سردار ہوں۔ ان کے معاملات میرے ہاتھ میں ہیں۔ اس لئے میں ہی ایک قسم کا رب ہوں۔ جس کے سامنے تمہیں بھی جھکنا چاہئے اور مری حاکمیت اور اقتدار اعلیٰ کو تسلیم کرنا چاہئے۔" چنانچہ اس نے کہا

قَالَ أَنَا أُحْيِي وَأُمِيتُ .... "زندگی اور موت میرے اختیار میں ہے۔"

اس موقعہ پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ مناسب نہ سمجھا کہ وہ اس کے ساتھ حقیقت موت وحیات کے موضوع پر تفصیلی بات

چیت شروع کر دیں۔ خصوصاً ایسے شخص کے ساتھ جو حقیقت موت و حیات میں بذات خود اشتباہ میں تھا اور ڈانواں ڈول تھا۔ جو ہمیشہ ایک مشکل مسئلہ رہی ہے۔ یعنی یہ حقیقت کہ اللہ تعالیٰ انسان کو کس طرح زندگی عطا کرتے ہیں اور کس طرح اس پر موت طاری کر دیتے ہیں۔ یہ ایک ایسا راز ہے جس تک پوری انسانیت کی رسائی آج تک نہیں ہو سکی ہے۔ اس لئے اس مقام پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مناسب سمجھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی اس مشکل تکوینی حقیقت سے ذرا ہٹ کر ایک ایسی ظاہری سنت کا سہارا لیں جو ہروقت اس شخص کے مشاہدے میں آتی رہی ہے۔ پہلے تو آپ نے صرف تکوینی سنت الٰہیہ کو پیش کیا کہ اللہ وہ ہے جو زندگی اور موت عطا کرتا ہے۔ اب انہوں نے اپنے مخالف کے لئے ظاہری چیلنج کا راستہ اختیار کیا کہ تم اللہ کی قدرت کے بارے میں جھگڑتے ہو تو اللہ کی سنن میں سے کسی سنت کو تبدیل کر کے دیکھ لو۔ اور یہ چیلنج انہوں نے یہ دکھانے کے لئے دیا کہ رب وہ نہیں ہوتا جو انسانی زندگی کے کسی ایک شعبے میں حاکم ہو یا کسی ایک خطے میں حاکم ہو وہ تو اس پوری کائنات میں متصرف ہوتا ہے اور اس کی اس عمومی ربوبیت کا تقاضا یہی ہے کہ وہ تمام لوگوں کے لئے قانون ساز بھی ہو اس لئے کہ وہ ان کا رب ہے۔

تو حضرت ابراہیم ﷺ نے فرمایا قَالَ اِبْرٰهٖمُ فَاِنَّ اللّٰهَ يَاْتِيْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ .... "ابراہیم نے کہا: "اچھا اللہ سورج کو مشرق سے نکالتا ہے' تو ذرا اسے مغرب سے نکال لا۔" یہ بھی ایک مسلسل وقوع پذیر ہونے والی کائناتی حقیقت ہے۔ ہماری نظر روز یہ نظارہ دیکھتی ہیں اور ہماری قوت مدرکہ روز اسے پاتی ہے اور کبھی بھی اس نظام میں کوئی تعطل یا تاخیر واقعہ نہیں ہوتی۔ یہ کائنات ایک شہادت ہے جو ہماری فطرت کو اپیل کرتی ہے۔ اگرچہ ہم اس کائنات کی طبیعت اور مزاج کو اچھی طرح نہ سمجھ پا رہے ہوں۔ اگرچہ ہم نے فلکیات کے بارے میں مختلف نظریات کا علم حاصل نہ کیا ہو۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے جس قدر انبیاء مبعوث فرمائے ہیں انہوں نے ہمیشہ انسانی فطرت کو مخاطب کیا ہے۔ چاہے فطرت انسانی اپنی علمی اور عقلی ترقی کے تاریخی مراحل میں سے جس مرحلے میں بھی ہو اور فطرت انسانی نے اجتماعی لحاظ سے ترقی کے جو مدارج بھی طے کئے ہوں انبیاء نے فطرت انسانی کا ہاتھ پکڑا ہے۔ اور اسے ترقی کے اگلے مدارج تک پہنچایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس بادشاہ کو جو چیلنج دیا اور جو مطالبہ فطرت پر مبنی تھا وہ لاجواب تھا۔ اور نتیجہ یہ نکلا فَبُهِتَ الَّذِيْ كَفَرَ ۭ .... "تو وہ منکر حق ششدر رہ گیا۔"

یہ چیلنج اس منکر حق کے سامنے کھڑا تھا۔ بات بالکل واضح تھی' کسی غلط فہمی کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ مناسب رویہ تو یہ تھا کہ وہ سیدھی طرح ایمان لے آتا اور سر تسلیم خم کر دیتا لیکن جو شخص کافرانہ رویہ اختیار کر لیتا ہے اور پھر متکبر بھی ہوتا ہے۔ یہ صفات اسے رجوع الی الحق سے روک لیتی ہیں اور وہ حیران رہ جاتا ہے' پریشان ہوتا ہے اور متحیر ہو جاتا ہے۔ اسے نہیں سوجھتا کہ وہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔ لیکن اسے اللہ تعالیٰ راہ حق اس لئے نہیں سجھاتے کہ وہ ہدایت کا متلاشی ہی نہیں ہوتا۔ اسے راہ حق کی طرف آنے کا شوق نہیں ہوتا۔ وہ سیدھی راہ نہیں پکڑتا تاکہ منزل مقصود پائے۔ اس لئے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ .... "مگر اللہ ظالموں کو راہ راست نہیں دکھایا کرتا۔"

اس واقعہ کو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی پہلی جماعت' جماعت مسلمہ کے سامنے 'بعض عناد اور ضلالت اور ہٹ دھرمی کی مثال کے طور پر یہ پیش فرمایا۔ نیز ان لوگوں کے لئے بھی جو دور جدید میں دعوت اسلامی کا کام کرتے ہیں۔ یہ ایک تاریخی تجربہ کے طور پر قرآن مجید میں درج کر دیا گیا کہ اہل دعوت منکرین حق کا مقابلہ کس طرح کریں۔

سیاق کلام ایسے حقائق کو لے کر آگے بڑھتا جو ایمان و یقین کے ساتھ ایک واضح تصور کے عناصر ترکیبی ہیں۔ "میرا رب وہ ہے جس

کے اختیار میں موت و حیات ہے۔" اور "اللہ تو سورج کو مشرق سے نکال کر لاتے ہیں' تم ذرا اسے مغرب سے نکال کر دکھاؤ۔" ایک حقیقت ایسی ہے جو نفوس انسانی میں پائی جاتی ہے۔ دوسری حقیقت ایسی ہے جو آفاق کائنات میں عیاں ہے۔ دونوں عظیم تکوینی حقیقتیں ہیں لیکن اپنی عظمت کے ساتھ ساتھ پیش پا افتادہ ہیں۔ روز کے مشاہدے میں ہیں۔ رات دن فکر و نظر کی آماجگاہ ہیں اور ان حقائق کے پانے کے لئے کسی بڑی علمی استعداد کی ضرورت نہیں ہے۔ اور نہ کسی طویل غور و فکر کی ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر رحیم و کریم ہے۔ وہ اللہ پر ایمان لانے اور اللہ کی جانب ہدایت پانے کے مسئلے پر اس قسم کی علمی اور منطقی بحث نہیں کرتا کہ جو کم علم آدمی کی دسترس سے باہر ہو یا ایسے لوگوں کی استعداد فکری کے دائرے سے باہر ہو جو غور و فکر کے معاملے میں طفل مکتب ہوں۔ یہ ایک زندہ اور اہم معاملہ ہے۔ انسانی فطرت کے لئے وہ لابدی ہے۔ اس کے بغیر انسانی زندگی استوار ہو سکتی ہے نہ انسانی معاشرہ اس کے بغیر منظم ہو سکتا ہے۔ اور اس کے بغیر انسان یہ پہچان حاصل نہیں کر سکتے کہ ان کے اجتماعی نظام اور اعلیٰ اقتدار اور آداب کا ماخذ کیا ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ ایمان کے مسئلہ میں انسان کے ساتھ ایسے حقائق کو پیش نظر رکھ کر بات کرتا ہے' جو سب کے سامنے ہوتے ہیں اور جن کا تعلق فطرت انسانی سے ہوتا ہے۔ اور وہ حقائق ایسے ہوتے ہیں جو ہر فطرت سلیمہ سے اپنے آپ کو خود تسلیم کراتے ہیں۔ ان حقائق اور مشاہدات کے اشارات اس قدر مضبوط ہوتے ہیں کہ ان کی گرفت سے انسان بمشکل نکل سکتا ہے۔ اور ان سے دامن چھڑانے کے لئے اسے انتہائی محنت' مشقت' کبر و غرور اور عناد و مکابرہ کا سہارا لینا پڑتا ہے۔

اعتقادات اور ایمانیات کے علاوہ بھی انسانی زندگی کے وہ معاملات جن پر حیات انسانی مکمل طور پر موقوف ہے' ان میں بھی انسان راہ فطرت اپناتا ہے اور اشارات فطرت کے دائرے میں رہتا ہے۔ مثلاً تلاش معاش' ہوا' پانی' تناسل و تکاثر وغیرہ۔ ان اہم معاملات میں بھی انسان کو اپنے حال پر نہیں چھوڑا گیا۔ یہاں تک کہ اس کی سوچ مکمل اور پختہ ہو گئی۔ اس کا علم ترقی کر گیا اور پختہ ہو گیا۔ اگر اسے یونہی چھوڑ دیا جاتا تو وہ کب کا ہلاک و برباد ہو گیا ہوتا۔ ایمان انسان کے لئے اسی قدر اہم اور ضروری ہے جس قدر اس کی زندگی کے لئے کھانا' پینا اور ہوا ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان موضوعات پر اللہ تعالیٰ فطرت انسانی کے تقاضوں کے مطابق بات کرتا ہے اور ایسے آثار و شواہد پیش کرتا ہے جو انسان کے اردگرد صفحہ کائنات پر پھیلے ہوئے ہیں۔

○○○

راز حیات اور اسرار وجود ہی کے موضوع پر ایک دوسرا قصہ شروع ہو جاتا ہے۔

أَوْ كَالَّذِي مَرَّ عَلَىٰ قَرْيَةٍ وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلَىٰ عُرُوشِهَا قَالَ أَنَّىٰ يُحْيِي هَٰذِهِ اللَّهُ بَعْدَ مَوْتِهَا ۖ فَأَمَاتَهُ اللَّهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهُ ۖ قَالَ كَمْ لَبِثْتَ ۖ قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ۖ قَالَ بَل لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ فَانظُرْ إِلَىٰ طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّهْ ۖ وَانظُرْ إِلَىٰ حِمَارِكَ وَلِنَجْعَلَكَ آيَةً لِّلنَّاسِ ۖ وَانظُرْ إِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوهَا لَحْمًا ۚ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُ قَالَ أَعْلَمُ أَنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ

☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆

یا پھر مثال کے طور پر اس شخص کو دیکھو' جس کا گزر ایک ایسی بستی پر ہوا' جو اپنی چھتوں پر اوندھی گری پڑی تھی۔ اس نے کہا: "یہ آبادی جو ہلاک ہو چکی ہے' اسے اللہ کس طرح دوبارہ زندگی بخشے گا؟" اس پر اللہ نے اس کی روح قبض کرلی اور وہ سو برس تک مردہ پڑا رہا۔ پھر اللہ نے اسے دوبارہ زندگی بخشی اور اس سے پوچھا: "بتاؤ' کتنی مدت پڑے رہے ہو؟" اس نے کہا: "ایک دن یا چند گھنٹے رہا ہوں گا۔" فرمایا: "تم پر سو برس اسی حالت میں گزر چکے ہیں۔ اب ذرا اپنے کھانے اور پانی کو دیکھو کہ اس میں ذرا تغیر نہیں آیا ہے۔ دوسری طرف ذرا اپنے گدھے کو بھی دیکھو (کہ اس کا پنجر تک بوسیدہ ہو رہا ہے) اور یہ ہم نے اس لئے کیا ہے کہ ہم تمہیں لوگوں کے لئے ایک نشانی بنا دینا چاہتے ہیں۔ پھر دیکھو کہ ہڈیوں کے اس پنجر کو ہم کس طرح اٹھا کر گوشت پوست اس پر چڑھاتے ہیں۔" اس طرح جب حقیقت اس کے سامنے بالکل نمایاں ہو گئی' تو اس نے کہا: "میں جانتا ہوں کہ اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔"

یہ شخص کون تھا جس کا گزر ایک بستی پر ہوا۔ وہ کون سی بستی تھی جو اپنی چھتوں پر اوندھی گری ہوئی تھی۔ اس کے بارے میں قرآن کریم خاموش ہے۔ اور اگر اللہ تعالیٰ کی مشیئت ہوتی تو قرآن کریم اس بستی کے بارے میں تفصیلات بتا دیتا۔ اگر ان تفصیلات کے حذف کر دینے سے حکمت قرآنی کے اظہار و بیان میں کچھ فرق پڑتا تو قرآن کریم میں اس کی تفصیلات ضرور بتائی جاتیں۔ یہاں صرف اس بستی کی ایک جھلک دکھائی گئی ہے اور جس طرح فی ظلال القرآن میں ہمارا منہاج ہے ہم بھی بس اس جھلک سے آگے تفصیلات میں جانا مناسب نہیں سمجھتے۔ اس بستی کی جو جھلک یہاں دکھائی گئی ہے وہ نہایت ہی واضح' مؤثر اور پردہ دماغ میں مرتسم اور منقش ہو جاتی ہے۔ موت' پھر بوسیدگی اور ٹوٹ پھوٹ کا ایک واضح نقشہ اپنی پوری صفات کے ساتھ ذہن نشین ہو جاتا ہے۔ وَّهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا......... "جو اپنی چھتوں پر اوندھی گری پڑی ہے۔" یہ بستی گر کر اپنی بنیادوں پر پڑی ہے اور ریزہ ریزہ ہو چکی ہے۔ جو شخص اس پر سے گزرتا ہے اس کے احساسات میں یہ تصور نمودار ہوتا ہے۔ وہ سوچنے لگتا ہے اَنّٰى يُحْيٖ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا ۚ........... "یہ آبادی جو مکمل طور پر تباہ و برباد ہو چکی ہے اسے اللہ کس طرح دوبارہ زندگی بخشے گا۔"

قائل یہ یقین رکھتا ہے کہ اللہ موجود ہے لیکن اس بستی کی موجودہ شکست و ریخت کی صورت حال کو دیکھ کر سوچتا ہے۔ اس کے احساسات میں یہ تصور پیدا ہوتا ہے کہ اس ہمہ گیر تباہی کے بعد اللہ اسے کس طرح دوبارہ زندہ و تابندہ بنا دے گا۔ احساسات کی یہ تعبیر اسی منظر کو دیکھ کر جو احساسات پیدا ہو سکتے ہیں۔ قرآن کریم ان کی نہایت رقت کے ساتھ' پرتاثیر تعبیر کرتا ہے۔ یوں قرآن کریم اپنا پرتو اور اپنی تعبیرات کو مخاطب کے ذہن میں منقش کر دیتا ہے۔ یوں نظر آتا ہے کہ قاری کے سامنے وہ منظر عیاناً" موجود ہے۔ وہ اسے دیکھ رہا ہے اور اس کے دل میں وہی احساسات پیدا ہو رہے ہیں جو کبھی اس شخص کے دل میں پیدا ہوئے تھے۔

اَنّٰى يُحْيٖ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا .... "اسے اللہ کس طرح دوبارہ زندگی بخشے گا۔" اس تباہی میں سے تعمیر کس طرح نمودار ہو گی؟" فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهٗ ۭ........... "تو اللہ تعالیٰ نے اس کی روح قبض کرلی۔ وہ سو برس تک مردہ پڑا رہا۔ پھر اللہ نے اسے دوبارہ زندگی بخشی۔" اللہ تعالیٰ نے اسے زبانی طور پر یہ نہ کہا کہ اسے اس طرح زندہ کیا جائے گا۔ بلکہ اسے واقعات کی دنیا میں بطور تجربہ دکھایا گیا۔ اس لئے کہ تاثر اور شعور بعض اوقات اس قدر گہرے اور مشکل ہوتے ہیں کہ عقلی دلائل سے انہیں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ نہ منطق اور وجدان سے وہ تاثر پیدا کیا جا سکتا ہے۔ بعض اوقات یوں ہوتا ہے کہ عام اور پیش پا افتادہ واقعات سے بھی ایسا تاثر اخذ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ شعور اور تاثر صرف براہ راست ذاتی تجربے ہی سے پیدا کیا جا

سکتا ہے۔ ایسے تجربے کے بعد یہ شعور انسان کے احساسات پر چھا جاتا ہے۔ دل اس پر مطمئن ہو جاتا ہے اور پھر کسی مزید یقین دہانی کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

قَالَ كَمْ لَبِثْتَ ۖ قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ۖ .... "اللہ نے اس سے پوچھا "بتاؤ کتنی مدت پڑے رہے ہو؟ اس نے کہا ایک دن یا چند گھنٹے رہا ہوں۔" اسے کیا پتہ تھا کہ وہ کتنی مدت پڑا رہا ہے۔ زمانے کا احساس اور شعور تب ہوتا ہے جب انسان زندہ ہو اور اس کی سمجھ کام کر رہی ہو۔ یہ حقیقت اپنی جگہ ہے کہ انسانی حس دراصل ادراک حقیقت کے لئے صحیح معیار بھی نہیں ہے۔ اس لئے کہ حس اور ادراک حقیقت میں کبھی دھوکہ دیتی ہے اور کبھی دھوکہ کھا جاتی ہے۔ مثلاً حس نے یہاں ایک طویل زمانے کے ادراک میں دھوکہ کھایا اور اسے ایک دن یا اس سے بھی مختصر زمانہ سمجھا۔ اور کبھی یوں ہوتا ہے کہ انسانی حس ایک مختصر زمانے کو ایک طویل عرصہ تصور کرتی ہے۔

قَالَ بَلْ لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ .... "اللہ نے کہا بلکہ تو نے اس حالت میں سو سال گزارے ہیں۔

"اس تجربے کی نوعیت کا تقاضا یہ تھا' خصوصاً جبکہ یہ ایک حسی تجربہ تھا' کہ وہاں لازماً ایسے آثار ہونے چاہئیں جو یہ بتائیں کہ ایک سو سال کا طویل عرصہ گزر گیا ہے لیکن اس شخص کے کھانے اور پینے کے سامان سے تو ایسے آثار ظاہر نہیں ہو رہے تھے۔ اس لئے کہ اس کے کھانے پینے کے سامان میں کوئی تغیر واقعہ نہیں ہوا تھا۔ نہ وہ خراب اور متعفن ہوئے تھے۔

فَانْظُرْ إِلَىٰ طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّهْ ۖ .... "اور اپنے کھانے اور پانی کو دیکھو کہ اس میں کوئی تغیر واقعہ نہیں ہوا۔" اور ظاہر ہے کہ پھر ایسے آثار صرف اس شخص کی ذات یا اس کے گدھے کے ساتھ متعلق ہو سکتے ہیں۔"

وَانْظُرْ إِلَىٰ حِمَارِكَ وَلِنَجْعَلَكَ آيَةً لِلنَّاسِ ۖ وَانْظُرْ إِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنْشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوهَا لَحْمًا ۚ

"اور اپنے گدھے کو بھی دیکھو اور یہ ہم نے اس لئے کیا ہے کہ ہم تمہیں لوگوں کے لئے ایک نشانی بنا دینا چاہتے ہیں۔ پھر دیکھو کہ ہڈیوں کے اس پنجر کو ہم کس طرح اٹھا کر گوشت پوست اس پر چڑھاتے ہیں۔"

کون سی ہڈیاں؟ کیا مطلب یہ ہے کہ اس شخص کی ہڈیاں؟ اگر یوں ہوتا جس طرح بعض مفسرین کہتے ہیں کہ اس شخص کی ہڈیاں گوشت و پوست سے ننگی ہو گئی تھیں تو جب اس کی نظروں میں بینائی ڈالی گئی اور وہ سمجھنے لگا تو وہ سب سے پہلے خود اپنی حالت کو دیکھتا اور سوچنے لگتا۔ اور اس وقت اس کا جواب یہ نہ ہوتا "لَبِثْتُ يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ" .... "کہ میں ایک دن یا چند گھنٹے رہا ہوں۔"

اس لئے صحیح تفسیر یہ ہے کہ ان ہڈیوں سے مراد صرف گدھے کی ہڈیوں کا پنجر ہے جو گوشت و پوست سے ننگی ہو کر علیحدہ ہو گئی تھیں۔ اور اس کے بعد یہ معجزہ رونما ہوا کہ یہ ہڈیاں آپس میں جڑنے لگیں۔ ان پر گوشت و پوست چڑھنے لگا۔ اور پھر اسی صحیح و سالم گدھے کو دوبارہ حیات بخشی گئی۔ اور یہ شخص جو اس طویل عرصہ میں بذات خود اپنے کھانے اور پینے کے سامان سمیت صحیح سالم اپنی اصلی حالت میں رہا تھا اس کے دیکھتے ہی دیکھتے یہ معجزہ رونما ہوا۔ تاکہ ایک ہی جگہ ان دونوں مادی اشیاء کے انجام کا یہ متضاد فرق' باوجود اس کے کہ فضا اور موسمی موثرات ایک ہی تھے۔ ایک دوسرے معجزے کا اظہار کر دے۔ یہ معجزہ یہ بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اپنی اس مخلوقات پر قدرت کاملہ حاصل ہے۔ اس کی قدرت و اختیار بے قید ہے۔ اس معجزے سے اس بات کا اظہار ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس پوری کائنات کو دوبارہ زندہ کرے گا اور اس کی کیفیت کچھ ایسی ہی ہو گی۔

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ معجزہ کس طرح وقوع پذیر ہوا۔ یہ اسی طرح ہوا جس طرح تمام معجزات وقوع پذیر ہوا کرتے ہیں۔ جس طرح اس کرۂ ارض پر پہلی زندگی کو وجود میں لانے کا معجزہ رونما ہوا۔ جسے ہم اکثر اوقات بھول جاتے ہیں۔ اور ہم نہیں جانتے کہ آغاز حیات کیونکر ہوا؟ زندگی کس طرح آئی؟ یہ آئی اور جس طرح اللہ تعالیٰ نے چاہا اسے لے آیا اور جو ہمارے سامنے موجود ہے۔ ڈارون علمائے حیاتیات میں ایک اونچے درجے کا سائنسدان تھا۔ وہ اپنے نظریہ کو لے کر درجہ بدرجہ نیچے آتا رہا۔ وہ زندگی کی گہرائیوں میں دور تک سرگرداں رہا اور آخر کار وہ اسے یہاں تک پہنچا سکا کہ اس کا آغاز ایک زندہ خلیے سے ہوتا ہے۔ یہاں آکر وہ رک جاتا ہے اور اس کا راستہ آگے سے بند ہے۔ اس زندہ خلیے میں زندگی کہاں سے داخل ہوئی؟ اس راز کو وہ نہیں پا سکتا۔ لیکن اس کے باوجود وہ اس حقیقت کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا جسے انسانی ادراک کو تسلیم کر لینا چاہئے۔ جو حقیقت انسانی کی فطری سوچ اور منطق کو ہر لمحہ مجبور کر رہی ہے کہ اسے تسلیم کیا جائے۔ یہ کہ ایک ایسی ذات کو تسلیم کیا جائے جس نے اس خلیے کو زندگی عطا کی اور ڈارون کسی علمی یا منطقی دلیل کی بنا پر اس حقیقت کے تسلیم کرنے سے انکاری نہیں ہے بلکہ یہ انکار اہلِ کنیسا کے اس رویہ کی وجہ سے ہے جو انہوں نے اہل علم و دانش کے خلاف اپنی پوری تاریخ میں اختیار کیا۔ ڈارون اس تعصب کی وجہ سے کہتا ہے "زندگی کے معاملات کی ایسی تفسیر جس میں ایک خالق کے وجود کو تسلیم کیا جائے' رب ہے جس طرح ایک خالص طبعی میکانزم میں ایک خارق العادت عنصر کو شامل کیا جائے۔" سوال یہ ہے کہ وہ طبعی میکانزم کیا ہے؟ میکانزم کا اس حقیقت سے دور کا واسطہ بھی نہیں ہے جو ہمارے فکر و نظر کے سامنے کھڑی ہے اور ہم سے باصرار مطالبہ کر رہی ہے کہ ہم اس کا راز بتائیں یعنی حیات اولیٰ کا راز۔

ایک مرحلہ ایسا بھی آتا ہے کہ اس فطری اور منطقی استدلال کے سامنے خود ڈارون بھی بے بس ہو جاتا ہے۔ جو استدلال باصرار مطالبہ کرتا ہے کہ خلیہ اولیٰ کے پیچھے خالق کائنات کو تسلیم کیا جائے تو وہ خلیہ اول کو سبب اول کا نتیجہ قرار دیتا ہے۔ اور اگر اس سے کوئی پوچھے کہ یہ سبب اول ہے کیا؟ اس کا اس ماہر حیاتیات کے پاس کوئی جواب نہیں ہے حالانکہ یہ ایک اہم سوال ہے کہ خلیہ اول کے اندر حیات اور زندگی کا موجد کون ہے؟ اس سوال کا جواب دیئے بغیر ہی وہ اس خلیے سے اپنے نظریئے کا آغاز کرتا ہے جبکہ آج اس کا یہ مشہور نظریہ بھی محل نظر بن گیا ہے۔ اس کا نظریہ یہ ہے کہ زندگی اپنی موجودہ شکل میں اس خلیے کی ترقی یافتہ شکل ہے حالانکہ آغاز حیات کا دوسرا طریق کار بھی ہو سکتا ہے اور ہے۔

آغاز حیات کے بارے میں اہم سوال کا جواب ڈارون نہ دے سکا۔ اس نے فرار کی راہ اختیار کی اور اپنا بناوٹی بوگس نظریہ پیش کیا۔[1]

اب ہم دوبارہ اس گاؤں کے معجزے کی طرف لوٹتے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ آخر کیا وجہ ہے کہ ایک ہی حالات و کوائف میں ہیں اور ایک ہی مقام پر یہ معجزہ کیسے ظہور پذیر ہو گیا کہ بعض چیزیں تو متغیر ہو جاتی ہیں اور ختم ہو جاتی ہیں اور بعض دوسری چیزیں اپنی اصل شکل و صورت اور حالت و کیفیت پر قائم رہتی ہیں۔ آغاز حیات بھی ایک معجزہ ہے کہ دوبارہ تخلیق بھی ایک بڑا معجزہ لیکن ان دونوں معجزات سے اس بات کی وضاحت نہیں ہوتی کہ ایک جیسی چیزوں میں سے بعض ختم ہوں اور بعض اپنی اصل حالت پر قائم رہیں۔

اس متضاد صورت حال کی وضاحت دراصل اس حقیقت سے ہوتی ہے کہ مشیئت ایزدی بے قید ہے۔ اللہ کی مشیئت اس ہمہ گیر قانون فطرت سے بھی آزاد ہے جسے ہم لازمی اور اٹل سمجھتے ہیں اور ہمارے ذہنوں میں یہ بات بیٹھی ہوئی ہے نہ اس قانون فطرت کی مخالفت ہو سکتی ہے اور نہ اس سے کوئی جزئیہ مستثنیٰ ہو سکتا ہے۔ ہمارے لئے یہ بات کافی ہے کہ اللہ کی مشیئت کی نسبت سے یہ عقیدہ غلط ہے کہ قانونِ طبیعت میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ اور ہمارے لئے یہ الجھن اس لئے پیدا ہو جاتی ہے کہ ہم اپنے اندازوں یا عقلی

[1] تفصیلات کے لئے دیکھئے کتاب "الانسان بین المادیہ والاسلام" کا باب "فرائد"

فیصلوں کو نام نہاد سائنسی اصولوں کو اللہ تعالیٰ کی ذات پر بھی لازماً منطبق کرتے ہیں اور یہ ہمارے فکر و نظر کی وہ غلطی ہے جو کئی دوسری غلطیوں کو جنم دیتی ہے۔

۱۔ مثلاً ہمیں یہ حق کب پہنچتا ہے کہ ہم قادر مطلق کو اس قانون کا تابع قرار دیں جس کے ہم قائل ہیں' جو ہمارے محدود وسائل کے محدود تجربات سے اخذ کیا گیا ہوتا ہے۔ پھر ہم اپنی محدود قوت مدرکہ کی وجہ سے ان تجربات کی تفسیر کرتے ہیں جس میں غلطی کا امکان ہر وقت موجود ہوتا ہے۔

۲۔ چلو ہم نے قوانین قدرت میں سے کوئی قانون صحیح طور پر سمجھ لیا اور وہ فی الحقیقت ہے بھی قانون قدرت۔ لیکن ہمیں یہ کس نے بتلایا کہ بس یہ قانون انتہائی اٹل قانون ہے' بے قید و شرط ہے۔ اور اس سے زیادہ کلی اور جامع اور کوئی قانون اور ضابطہ نہیں ہے۔

۳۔ چلو مان لیا کہ وہ قانون اٹل ہے' مطلق ہے اور عام حالات میں اس سے تخلف ممکن نہیں ہے لیکن یہ قانون اللہ کا وضع کردہ ہے۔ ذات باری کس طرح اپنے بنائے ہوئے قانون میں مقید ہوگئی۔ ذات باری تو بہرحال مختار کل ہے۔

غرض یہ تجربہ یوں ہی آگے بڑھتا ہے۔ جدید اہل دعوت کے فکری سرمایہ میں ایک صحیح ایمانی تصور حیات کا اضافہ کرتا ہے اور موت و حیات کی حقیقت کے اظہار کے ساتھ ساتھ اس دوسری حقیقت کا اضافہ بھی کرتا ہے جس کی جانب ہم نے ابھی اشارہ کیا۔ یہ حقیقت کہ اللہ کی مشیت بے قید ہے۔ اور قرآن کریم نے اس حقیقت کو بار بار بیان کر کے اہل ایمان کے ضمیر میں اسے پختہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ تاکہ اہل ایمان براہ راست اپنے خدا سے تعلق قائم کریں۔ اس سلسلے میں ظاہری اسباب کو کوئی اہمیت نہ دیں۔ ان تمہیدات کو خاطر میں نہ لائیں جو عام طور پر منظور نظر ہوتی ہیں۔ اللہ جو چاہتا ہے' کر گزرتا ہے۔ اور یہی بات اس شخص نے کی' جس کے سامنے اس تجربے کو دہرایا گیا تھا۔ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُ ۙ قَالَ اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ .... "میں جانتا ہوں کہ اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔"

○○○

اس کے بعد حقیقت موت و حیات کے سلسلے میں ایک تیسرا تجربہ بیان کیا جاتا ہے۔ یہ تجربہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو کرایا گیا۔ جو امت مسلمہ کے نزدیک ترین گزرے ہیں۔

وَ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اَرِنِیْ كَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰى ؕ قَالَ اَوَ لَمْ تُؤْمِنْ ؕ قَالَ بَلٰى وَ لٰكِنْ لِّیَطْمَىٕنَّ قَلْبِیْ ؕ قَالَ فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّیْرِ فَصُرْهُنَّ اِلَیْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰى كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ یَاْتِیْنَكَ سَعْیًا ؕ وَ اعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ

"جب ابراہیم علیہ السلام نے کہا کہ "میرے رب مجھے دکھا دے تو مردوں کو کیسے زندہ کرتا ہے؟" فرمایا: "کیا تو ایمان نہیں رکھتا؟" اس نے عرض کیا "ایمان تو رکھتا ہوں مگر دل کا اطمینان درکار ہے۔ فرمایا اچھا تو چار پرندے لے اور ان کو اپنے سے مانوس کر لے پھر ان کا ایک ایک جز ایک ایک پہاڑ پر رکھ دے۔ پھر ان کو پکار' وہ تیرے پاس دوڑے چلے آئیں گے۔ خوب جان لے کہ اللہ نہایت بااقتدار اور

حکیم ہے۔"

یہ قدرت الٰہیہ کی کاریگریوں تک رسائی کا ایک شوق ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام جو نہایت ہی حلیم الطبع اور مطیع فرمان اولوالعزم نبی تھے ان کی جانب سے یہ شوق اس حقیقت کا اظہار کرتا ہے کہ بعض اوقات اللہ کے برگزیدہ اور اقرب المقربین بندوں کے دل میں بھی یہ امنگ پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی کاریگریوں کے رازہائے پس پردہ تک رسائی حاصل کریں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام جیسے راضی برضا' خشوع و خضوع کرنے والے اور عبادت گزار بندے کی جانب سے اس خواہش کا اظہار دراصل اسی قسم کی امنگ کا نتیجہ ہے۔

اس امنگ کا تعلق ایمان' کمال ایمان یا ایمان کی پختگی اور ثبوت و قرار کے ساتھ نہیں ہے۔ اس امنگ کے ذریعہ حضرت ابراہیم کسی قوی دلیل کا مطالبہ نہ کر رہے تھے یا ایمان کی کمزوری دور کر کے اس میں پختگی حاصل کرنا نہ چاہتے تھے۔ یہ چیزیں تو انہیں پہلے سے حاصل تھیں۔ رازہائے درون پردہ تک رسائی دراصل ایک دوسرا ہی ذوق ہے۔ یہ ایک قسم کا روحانی شوق ہے۔ بندہ مومن رازہائے الٰہیہ کے ساتھ منسلک ہونا چاہتا ہے۔ عملاً ان واقعات کو رونما ہوتے ہوئے دیکھنا چاہتا ہے۔ وجود انسانی میں یہ ذوق و شوق ایک فطری امر ہے۔ اس کا تعلق ایمان بالغیب سے نہیں ہے۔ ایمان بالغیب بکمال درجہ موجود ہوتا ہے۔ پھر بھی یہ جذبہ کمال درجہ موجود ہوتا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ ذات باری سے ہمکلام ہیں۔ رب کریم حضرت ابراہیمؑ سے ہمکلام ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ کو اس ہمکلامی سے زیادہ کس ایمان کی ضرورت تھی' کس دلیل و برہان کی ضرورت تھی؟ وہ جو چیز دیکھنا چاہتے تھے وہ یہ تھی کہ کارخانہ قدرت میں قدرت کو کام کرتے ہوئے دیکھیں تاکہ ان کے اس جذبہ حصول رازہائے دروں کو تسکین حاصل ہو۔ وہ ان رازوں کے ہم نفس ہو جائیں۔ اور ان میں گھل مل جائیں۔ یہ ایک ایسی بات ہے جس کا نفس ایمان سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ کیونکہ نبی کے ایمان کے لئے کوئی اور ایمان نہیں ہو' وہ تو درجہ کمال میں ہوتا ہے۔

جب حضرت ابراہیمؑ کی گفتگو اور ان کا یہ تجربہ مکمل ہوتا ہے تو پھر پتہ چلتا ہے کہ ایمان کے نتیجے میں قلب مومن میں متعدد قسم کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ اور مومن کامل کے دل میں پیدا ہونے والی یہ امنگیں اسے مجبور کرتی ہیں کہ وہ حریم قدرت کے اندر جھانکنے کی کوشش کرے۔

وَ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اَرِنِیْ كَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰىؕ قَالَ اَوَ لَمْ تُؤْمِنْؕ قَالَ بَلٰى وَ لٰكِنْ لِّیَطْمَىٕنَّ قَلْبِیْؕ

"جب ابراہیم نے کہا" مجھے دکھا دے تو مردوں کو کیسے زندہ کرتا ہے؟" فرمایا:" کیا تو ایمان نہیں رکھتا؟" اس نے عرض کیا" ایمان تو رکھتا ہوں مگر دل کا اطمینان درکار ہے۔" حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مطلب یہ تھا کہ قلبی اطمینان تب حاصل ہو تا جب وہ دست قدرت کو کام کرتے دیکھ لیں۔ اور جذبہ افشائے رازہائے درون خانہ کی تسکین تب ہوتی ہے جب انسان ان رازوں کو کھول دیتا ہے اور وہ اس پر عیاں ہو جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کو اچھی طرح علم تھا کہ اس کا بندہ اور دوست پکا مومن ہے لیکن اس کا یہ سوال محض تسکین شوق اور اعلان ذوق کی خاطر ہے۔ سوال و جواب کا یہ سلسلہ اللہ کریم کی جانب سے اپنے اس مطیع فرمان اور حلیم الطبع بندے کے ساتھ ایک قسم کا اظہار لطف و کرم تھا اور ذرہ نوازی تھی۔

غرض اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کے اس شوق تجسس کی تسکین کا سامان فراہم فرمادیا۔ اور اس کو براہ راست ایک ذاتی تجربے سے

دوچار کر دیا۔

قَالَ فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ اِلَيْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰى كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ يَاْتِيْنَكَ سَعْيًا ؕ وَ اعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ

"فرمایا تو چار پرندے لے لے اور ان کو اپنے سے مانوس کر لے۔ پھر ان کا ایک جزء ایک پہاڑ پر رکھ دے۔ پھر ان کو پکار' وہ تیرے پاس دوڑے چلے آئیں گے۔ خوب جان لے کہ اللہ نہایت بااقتدار اور حکیم ہے۔"

اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کو حکم دیا کہ اب چار پرندے لیں۔ ان کو اپنے ساتھ مانوس کر لیں۔ ان کی خصوصیات اور ان کی نشانیاں اچھی طرح جان لیں تاکہ انہیں جاننے میں غلطی واقعہ نہ ہو۔ پھر انہیں ذبح کر کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیں اور ان کے اجزاء کو اردگرد کے پہاڑوں پر بکھیر دیں۔ اور پھر ان کو پکاریں۔ اب ان کے یہ متفرق اعضاء دوبارہ صحیح ہونے لگیں گے۔ ان میں زندگی لوٹ آئے گی اور دوڑ کر وہ تمہاری طرف لوٹ آئیں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

حضرت ابراہیم ﷺ نے راز تخلیق کو عیاں پایا۔ یہ وہ راز ہے جو ہر لحظہ دہرایا جارہا ہے۔ لیکن لوگ اس راز کی تکمیل کے بعد صرف اس کے آثار دیکھ سکتے ہیں۔ یہ راز عطائے حیات کا راز تھا۔ یہ وہ حیات ہے جو اس کائنات کو عطا کی گئی جبکہ پہلے کچھ نہ تھا۔ اور اب وہ ہر زندہ مخلوق کی شکل میں دہرائی جارہی ہے۔

حضرت ابراہیم ﷺ نے اپنی آنکھوں سے اس راز کو دیکھ لیا۔ چند پرندے تھے' جن سے زندگی الگ ہو گئی تھی۔ ان کا قیمہ مختلف مقامات پر بکھیر دیا گیا۔ اب ان کے اجزاء جمع ہو رہے ہیں اور ان میں دوبارہ زندگی ڈالی جارہی ہے۔ اور وہ آکر حضرت ابراہیمؑ تک پہنچ جاتے ہیں۔

یہ کیونکر ہوا؟ یہی تو وہ راز ہے جس کا ادراک اس بشر کے حیطۂ قدرت سے وراء ہے۔ کبھی انسان اس راز کو اسی طرح دیکھتا ہے جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دیکھا۔ وہ اس کی تصدیق اسی طرح کرتا ہے جس طرح حضرت ابراہیمؑ نے اس کی تصدیق فرمائی۔ لیکن وہ اس کی حقیقت کا ادراک نہیں کر سکتا۔ اس کا طریقہ واردات اسے معلوم نہیں ہے۔ یہ امر الٰہی ہے۔ اور لوگوں کی حالت یہ ہے کہ وہ علوم الٰہیہ میں سے ایک محدود مقدار کو جان اور پا سکتے ہیں' وہ بھی جسے وہ چاہے دے دے لیکن راز حیات سے اس نے کسی کو آگاہ نہیں کیا۔ اس لئے کہ وہ انسان کی قدرت اور طاقت کے مقابلے میں بہت ہی بڑا راز ہے۔ اس کو عبث ہمارے حس و ادراک کی نوعیت سے مختلف ہے۔ اور اس کرۂ ارض پر ادائیگی فریضۂ خلافت کے سلسلے میں انہیں اس تکوینی علم کی قدرت بھی نہیں ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی خاص شان ہے اور مخلوقات کا شملہ علم اس کے مقابلے میں بہت ہی کوتاہ ہے اور اگر انسان دروازۂ مستورات میں جھانکنے کی سعی بھی کرے تو اسے پردے ہی پردے نظر آئیں گے اور حجاب در حجاب نظر آئے گا۔ اس کی یہ سعی لاحاصل ہو گی اور عالم الغیب کا دائرہ علوم النبوت تک ہی محدود رہے گا۔

☆ ☆ ☆ ☆

درس نمبر ۱۹ ایک نظر میں

اس پارے کے سابقہ تینوں سبق مجموعی طور پر بعض اساسی ایمانی تصورات کے بارے میں تھے۔ اور ان میں اس تصور حیات کے بارے میں بعض وضاحتیں کی گئی تھیں۔ اور مختلف پہلوؤں سے اس کی جڑیں مضبوط کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ یہ اس طویل سورت کی اس لائن کا ایک مرحلہ تھا، جس پر یہ پوری سورت جارہی ہے یعنی انسانیت کی قیادت کے نصب العین کی راہ میں امت مسلمہ پر جو فرائض عائد ہوتے ہیں ان سے عہدہ برآ ہونے کے لئے امت کو تیار کرنا جیسا کہ اس سے قبل ہم اس بات کی تشریح کر چکے ہیں۔

یہاں سے لے کر تقریباً اس سورت کے اختتام تک اب بیان کا رخ ان اساسی معاشی اصولوں کے بیان کی طرف ہے جن پر امت مسلمہ کے اجتماعی نظام کی نیو اٹھائی جانی مقصود ہے۔ اور جن کے مطابق جماعت مسلمہ کی تنظیم بھی مقصود تھی۔ اور یہ اجتماعی نظام دراصل باہم تعاون اور تکافل پر مبنی ہے اور جس کی تشکیل عشر و زکوٰۃ اور خیرات و صدقات پر مبنی ہے۔ اور یہ معاشی نظام اس سودی نظام سے بالکل مختلف ہے۔ جو اس دور جاہلیت میں رائج تھا۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں صدقہ کی فضیلت اور آداب کا بیان کیا جاتا ہے اور ربا کی مذمت کی جاتی ہے۔ اور اگلے اسباق میں آپ پڑھیں گے کہ قرضہ اور تجارت کے اساسی اصول بیان کئے گئے ہیں اور مجموعی طور پر یہ سب چیزیں اسلام کے اقتصادی نظام کا حصہ ہیں اور اسلام کی اجتماعی زندگی ان پر قائم ہے۔ آگے آنے والے تینوں اسباق باہم مربوط ہیں۔ یہ سب دراصل ایک ہی موضوع (اقتصادیات) کے مختلف پہلو ہیں یعنی اسلام کا اقتصادی نظام۔

اس سبق میں انفاق فی سبیل اللہ اور دولت کے خرچ کرنے پر زور دیا گیا ہے۔ اور اسلام کے ایک اقتصادی پہلو یعنی صدقہ اور اجتماعی کفالتی نظام کے بارے میں زور دیا گیا ہے۔ یہ بتایا گیا ہے کہ انفاق فی سبیل اللہ دراصل جہاد کی ایک قسم ہے اور یہ بات واضح ہے کہ جہاد فی سبیل اللہ امت مسلمہ پر فرض کیا گیا ہے۔ اس لئے کہ اللہ کی جانب سے امت مسلمہ پر یہ ڈیوٹی عائد کی گئی ہے کہ وہ پوری دنیا میں اس دعوت کو پھیلائے۔ پوری دنیا تک اس پیغام کو پہنچائے۔ پوری دنیا میں اہل ایمان کی حمایت کرے اور پوری دنیا سے شر و فساد اور ظلم و زیادتی کو ختم کر دے اور ان تمام قوتوں کو پاش پاش کر دے جو اہل اسلام کے مقابلے میں غالب ہیں اور جو زمین پر فساد پھیلاتی ہیں اور اہل دنیا کو اللہ کی سیدھی راہ اپنانے میں رکاوٹ بن رہی ہیں۔ اور بالفاظ دیگر دنیا کو اس خیر عظیم سے محروم رکھنا چاہتی ہیں۔ جس کا حامل اسلامی نظام حیات ہے۔ دنیا کو اس خیر سے محروم کرنا اس قدر بڑا جرم ہے جس سے بڑا جرم اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ اور انسانی روح اور انسانی جسم اور مال کے خلاف اس سے بڑی دست درازی اور کوئی نہیں ہے۔

اس سورت میں بار بار انفاق فی سبیل اللہ کی دعوت دی گئی ہے لیکن یہاں انفاق فی سبیل اللہ کے اصول و آداب کو ذرا تفصیل سے بیان کیا جاتا ہے۔ یہاں دستور انفاق کی تصویر کشی بڑے ہی پیارے اور مانوس پرتو سے کی جاتی ہے۔ اس کے اجتماعی اصول اور آداب و اثرات اور نفسیاتی مضمرات سے تفصیلاً بحث کی جاتی ہے۔ ایسے آداب جن کی وجہ سے خود انفاق کرنے والے کی نفسیاتی اصلاح ہوتی ہے۔ اور دوسری جانب صدقہ وصول کرنے والے کے لئے وہ مفید بن جاتا ہے۔ اور اس کے نتیجہ میں معاشرتی انقلاب یوں برپا ہوتا ہے کہ یہ معاشرہ اجتماعی طور پر باہم متعاون اور متکافل (Socially Sacurl) معاشرہ بن جاتا ہے۔ اور اس کے افراد میں باہم محبت اور ہمدردی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کی وجہ سے انسانیت ایک بلند مقام تک جا پہنچتی ہے۔ اور جس میں دہندہ اور گیرندہ بالکل ایک ہی سطح کے لوگ بن جاتے ہیں۔

اس حقیقت کے باوجود کہ اس سبق میں جو ہدایات دی گئی ہیں وہ عمومی ہیں اور کسی زمان و مکان کی قید کے ساتھ مقید نہیں ہیں۔ اور ایک دائمی دستور کی حیثیت رکھتی ہیں۔ لیکن یہ بات ہمارے پیش نظر رہنی چاہئے کہ اس وقت جماعت مسلمہ کے اندر ایسے حالات موجود تھے جن کی اصلاح کے لئے یہ ہدایات اتاری گئیں۔ اور یہ بات بھی عین ممکن ہے کہ آنے والے ادوار میں بھی یہ بات ممکن تھی کہ مستقبل کا کوئی اسلامی معاشرہ بھی ایسی ہی ہدایات کا محتاج ہو۔ اس وقت اسلامی معاشرہ میں ایسے اشخاص موجود تھے جن کی نظروں میں مال ہی سب کچھ تھا اور جن کی اصلاح کے لئے ایسی ضربات کی ضرورت تھی اور جن کے لئے اس طرح کی موثر روحانی اثر اندازی کی ضرورت تھی۔ انہیں ضرورت تھی کہ ضرب الامثال کے ذریعہ حقائق کو ان کے مشاہدے میں لایا جائے اور یوں بات ان کی دلی گہرائیوں تک اتر جائے۔

اس وقت کے معاشرے میں اگر ایک طرف ایسے لوگ تھے جو سود خوری کے بغیر کسی کو مال دینا تصور نہ کر سکتے تھے تو دوسری طرف اس معاشرے میں ایسے لوگ بھی تھے جو بادل ناخواستہ خرچ کرنے والے تھے یا محض دکھاوے کے لئے خرچ کرتے تھے۔ بعض ایسے بھی تھے جو خرچ کر کے مسلسل احسان جتلاتے تھے اور یوں دوسروں کے لئے باعث اذیت ہوتے تھے۔ بعض ایسے تھے جو ردی اور بیکار مملوکات اللہ کے نام پر دیتے تھے اور ان کے ساتھ ساتھ بہرحال مخلصانہ طور پر اللہ کی راہ میں بھی انفاق کرنے والے موجود تھے جو اپنے بہترین اموال خرچ کیا کرتے تھے جو اگر موقعہ و محل کا تقاضا خفیہ طور پر خرچ کرنے کا ہو تو خفیہ خرچ کرتے تھے اور اگر موقعہ و محل علی الاعلان خرچ کرنے کا ہو تو اعلانیہ خرچ کرتے تھے۔ یہ خرچ خالص اللہ کے لئے 'بالکل پاک اور ستھرا ہوتا تھا۔

اور مذکورہ بالا دونوں قسم کے افراد جماعت مسلمہ میں اس وقت موجود تھے۔ ہمیں اس حقیقت پر غور کرنا چاہئے اور اگر اسے پالیں تو یہ ہمارے لئے نہایت مفید ہوگی۔

اس حقیقت سے پہلا فائدہ یہ ہوگا کہ ہم اس کتاب کی حقیقت کو صحیح طرح پا سکیں گے۔ اور اس کے مقاصد ہم پر واضح ہوں گے۔ ہمیں یوں نظر آئے گا کہ قرآن کریم ایک زندہ اور متحرک حقیقت ہے۔ ان واقعات کی روشنی میں وہ ہمیں مسلسل سرگرم اور متحرک نظر آتا ہے اور قرآن کریم کی یہ تحریک جماعت مسلمہ کے اندر نظر آتی ہے۔ اس کا مقابلہ واقعی حالات سے ہے۔ وہ بعض واقعات اور حقائق کو برقرار رکھتا ہے اور بعض حالات کو تبدیل کر رہا ہے۔ یوں یہ جماعت قدم بقدم آگے بڑھ رہی ہے۔ اور قرآن ان حالات کا مقابلہ کر رہا ہے۔ وہ مسلسل فعال اور متحرک ہے۔ اس کی حرکت میں تسلسل اور دوام ہے۔ وہ زندگی کے عملی میدان میں برسرپیکار ہے۔ قرآن کریم ہی اس معاشرہ میں واحد ترقی پسند' محرک اور عملی میدان میں آگے بڑھنے والا عنصر ہے۔

آج ہمیں اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ ہم اس نہج پر قرآن کریم کا احساس کریں اور دیکھیں کہ قرآن کریم ایک زندہ حقیقت' متحرک اور آگے بڑھنے کے لئے اقدام کرنے والا ایک فیکٹر ہے۔ اس لئے کہ آج تحریک اسلامی 'اسلامی نظام زندگی' اور اسلامی معاشرہ کے ناپید ہوئے ایک طویل عرصہ گزر چکا ہے۔ قرآن کریم' جس طرح ہم نے اسے محسوس کیا ہے اور سمجھا ہے وہ انسانی تاریخ کے زندہ دھارے سے الگ تھلگ ایک کتاب ہے۔ آج قرآن کریم کو جس طرح ہم نے سمجھا ہے وہ اس نظام زندگی کا کوئی نقشہ پیش نہیں کرتا جو کبھی یہی قرآن عملاً اس کرۂ ارض پر وجود میں لایا تھا اور جو جماعت مسلمہ کی تاریخ میں کبھی زندہ حقیقت تھی۔ اور اب ہمیں یہ سبق یاد نہیں رہا ہے کہ اس وقت کے مسلم مجاہد کے لیے قرآن حکم الیوم (Order of the day) تھا۔ یعنی ان کے لئے قرآن کریم ایسی ہدایات تھا جن پر عمل ضروری تھا۔ ان پر فرض تھا کہ وہ ہر روز کی ہدایات کو عملاً نافذ کر دیں۔ ہمارے فہم و ادراک میں وہ عملی قرآن گویا مرگیا ہے یا وہ سو گیا ہے۔ اور ہم قرآن کریم کو اس طرح سمجھنے اور محسوس کرنے کی کوشش نہیں کرتے جس طرح اسے دور اول کے مسلمانوں نے سمجھا اور محسوس کیا۔

ہمارا طرز عمل یہ بن گیا ہے کہ ہم قرآن کریم کو نہایت ہی خوش الحانی اور گلوکاری کے ساتھ پڑھتے ہیں اور جھومتے ہیں یا ہمارا وجدان اس سے کچھ چالو مجمل اور ناقابل فہم و ناقابل تاویل تاثرات لیتا ہے یا ہم اس کی تلاوت بطور اوراد کرتے ہیں' جس سے مومنین صادقین کے دل میں وجد' خوشی اور قلبی اطمینان کی ایک مبہم اور مجمل سی کیفیت پیدا ہو جاتی۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ تلاوت قرآن میں یہ سب فائدے بھی موجود ہیں لیکن ان تمام فوائد کے ساتھ ساتھ اصل مطلوب یہ ہے کہ قرآن قلب مومن میں فہم و فراست اور عمل و حرکت پیدا کر دے۔ اسے زندہ کر دے۔ اعلیٰ ترین مقصد یہ ہے کہ مسلمان کے دل و دماغ میں ایسی کیفیت پیدا ہو جائے کہ وہ قرآن کریم کی ہدایات کے ساتھ ساتھ ایک زندہ اور عملی زندگی لے کر چلتا رہے' ایسی زندگی جسے قرآن یہاں رائج کرنا چاہتا ہے اور جس کے لئے اس کا نزول ہوا ہے۔ ایسی زندگی جسے مومن اس عرصۂ کارزار میں اور اس میدان کشمکش میں پائے' جس کے لئے ایک مومن اپنے آپ کو ہمیشہ تیار رکھتا ہے۔ کیونکہ امت مسلمہ کی زندگی میں یہ کشمکش ایک لابدی امر ہے۔ مطلوب یہ ہے کہ ایک مسلمان قرآن کریم کی طرف اس نیت سے متوجہ ہو کہ وہ اس سے اپنی زندگی کا لائحہ عمل اخذ کرنا چاہتا ہے۔ بعینہٖ اس طرح جس طرح "مسلم اول" کرتا تھا۔ وہ آج کی زندگی' آج کے واقعات' آج کے مسائل جو اس کے ارد گرد رواں دواں ہیں' ان کے بارے میں قرآنی ہدایات و اشارات کا طلبگار ہو۔ اسے چاہئے کہ وہ امت مسلمہ کی تاریخ کی تشریح بھی قرآنی ہدایات کی روشنی میں کرے۔ قرآنی کلمات و اشارات کو اسلامی تاریخ کی تشریح قرار دے۔ اور یوں محسوس کرے کہ اسلامی تاریخ قرآن کریم سے کوئی علیحدہ تاریخ نہیں ہے۔ اسلامی تاریخ قرآن کی تاریخ ہے۔ اور آج امت مسلمہ جس صورت حالات سے دوچار ہے' وہ بھی قرآنی تاریخ کا ایک حصہ ہے۔ آج کے حالات ان حالات کا منطقی نتیجہ ہیں جو اس امت کے اسلاف کو پیش آئے۔ اس وقت بھی قرآن ان حالات و حوادث میں ایک معین تبدیلی کا خواہاں تھا اور آج بھی یہ قرآن ویسی ہی تبدیلیاں چاہتا ہے۔ اس لئے ایک مومن یہ محسوس کرتا ہے کہ جس طرح یہ قرآن اس امت کے لئے کتاب عمل تھی' آج میرے لئے بھی کتاب عمل ہے۔ آج بھی وہ چاہتا ہے کہ اپنے شب و روز کے معاملات میں' پیش آمدہ حادثات میں قرآن کی طرف رجوع کرے گا۔ وہ اس کے تصورات اور اس کی فکر کا اصول اساسی ہے۔ وہ آج بھی اس کی تگ و دو اور اس کی جہد و عمل کا حقیقی محرک ہے۔ وہ کل بھی اس کے لئے محرک ہے اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس کی زندگی کا محور ہے۔

اس حقیقت کے سمجھ لینے کا دوسرا فائدہ یہ ہو گا کہ اس سے ہمیں انسانی فطرت اور انسانی مزاج کی حقیقت اور ماہیت کا واضح ادراک ہو جاتا ہے۔ دعوت اسلامی اور اس کے عائد کردہ فرائض اور واجبات کو ہمیشہ اس انسانی فطرت سے واسطہ پڑا ہے۔ ان آیات میں پہلی اسلامی جماعت کے حوالے سے' انسانی فطرت کا جو واضح نقشہ کھینچا گیا ہے' اس سے انسانی فطرت اپنی اصل شکل اور ماہیت میں واضح ہوتی ہے۔ اس پہلی جماعت پر قرآن نازل ہو رہا تھا۔ اس جماعت کے نگران و مربی خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ اس جماعت کی صفوں میں بعض کمزور پہلو موجود تھے۔ جن کی اصلاح کی ضرورت تھی' جن کی طرف مستقلاً توجہ دینے کی ضرورت تھی۔ اور جن کی نشاندہی اور جن کی رعایت کی ضرورت تھی۔ یاد رہے کہ صحابہ کرام ﷺ کی اصلاح کرنا اس بات کے منافی نہیں کہ وہ امت کے تمام طبقات سے برگزیدہ تھے۔ اس حقیقت کا ادراک ہمارے لئے بہت ہی مفید ہے۔ یوں ہم ایک انسانی جماعت اور تنظیم کی حقیقت و ماہیت بغیر افراط و تفریط کے سمجھ سکیں گے۔ بغیر اس کے کہ اس پر مصنوعی خول چڑھائے ہوئے ہوں۔ بغیر اس کے کہ اس کے بارے میں کسی قسم کے گمراہ کن تصورات قائم کئے جائیں۔ اس کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ اس کی وجہ سے ہمارے دل و دماغ سے مایوسی کے بادل چھٹ جاتے ہیں۔ کیونکہ جب ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام انسانیت کے لئے جو مقام بلند تجویز کرتا ہے ہم اس سے بہت دور ہیں۔ لہٰذا ہمارے لئے کافی ہے کہ ہم اس راہ پر چلتے رہیں۔ اس مقام بلند تک پہنچنے کی جدوجہد جاری رکھیں۔ اس سے ہمیں ایک فائدہ یہ بھی ہوتا ہے کہ ہم اس حقیقت کو پالیتے ہیں کہ

لوگوں کو مقام بلند اور کمال کے اعلیٰ درجوں تک پہنچانے کے لئے مسلسل دعوت کی ضرورت ہے۔ اس میں کسی وقت بھی کمی ' سستی ' مایوسی اور وقفہ نہیں ہونا چاہئے۔ اگرچہ بعض نفوس میں نقص اور عیب پایا جاتا ہو کیونکہ انسان تو ہوتا ہی ایسا ہے۔ انسان مسلسل دعوت اور اصلاحی جدوجہد کے نتیجے میں اصلاح پذیری کی راہ پر آہستہ آہستہ چلتا ہے۔ اسے قرآن کے مقام بلند تک پہنچانے کے لئے مسلسل دعوت کی ضرورت ہے۔ اسے ہمیشہ بھلائی کی یاد دہانی کی ضرورت ہے۔ ہمیشہ اس بات کی ضرورت ہے کہ اس کے سامنے بھلائی کو اچھی صورت میں اور شر کو قبیح صورت میں مسلسل پیش کیا جاتا رہے۔ اور کردار کی کمزوری ' اور نقائص سے اس کے دل میں مسلسل نفرت بٹھانا چاہئے۔ اور جب بھی وہ بے راہ روی اختیار کرے ' اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے صحیح راہ پر ڈال دیا جانا چاہئے۔ کیونکہ زندگی کا یہ سفر بہت ہی طویل اور کٹھن ہے۔

اس سے ہمیں تیسرا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ ہم اس سادہ حقیقت کو اچھی طرح پا لیتے ہیں جس سے بارہا ہم غافل ہو جاتے ہیں۔ یہ کہ انسان بہرحال انسان ہے۔ دعوت اسلامی بہرحال اسلام کی طرف بلاوا ہے۔ اور یہ معرکہ بہرحال انسانوں کا معرکہ اور انسانی جدوجہد ہے۔ یہ معرکہ سب سے پہلے اپنی ذات کی کمزوریوں ' اپنے ذاتی نقائص اور نفس انسانی میں پوشیدہ جذبات حرص اور بخل کے خلاف ہے۔ اس کے بعد انسان کے اردگرد پھیلی ہوئی زندگی میں باطل ' شر ' ظلم اور گمراہی کے خلاف معرکہ ہے۔ یہ ایک قسم کی دو طرفہ جنگ ہے جو ایک داعی کو کرنی ہے۔ اور اس کرۂ ارض پر جماعت مسلمہ کی لیڈر شپ کو یہ دو طرفہ جنگ لازماً لڑنا پڑے گی۔ جس طرح قرآن کریم کو پہلی مرتبہ یہ جنگ لڑنا پڑی تھی اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو سب سے پہلے یہ جنگ لڑنا پڑی تھی اور اس مسلسل معرکہ کے دوران یہ امر لازمی ہے کہ کچھ غلطیاں بھی ہوں ' لغزشیں بھی ہوں اور اس کٹھن راہ کے مختلف مراحل میں بعض نقائص اور بعض کمزوریوں کا ظہور بھی ہو۔ اور نئے واقعات اور نئے تجربوں کے دوران ان نقائص اور لغزشوں کی اصلاح بھی ہوتی رہے۔ اور اصلاح و ہدایت کے معاملے میں قرآن کریم نے جو طریقۂ کار اختیار کیا ہے ' اس کے مطابق لوگوں کے دل و دماغ کی اصلاح ہوتی رہے۔ یہاں میں پھر یہ بات کہوں گا جو پہلے کہہ چکا ہوں کہ ہم تمام حالات ' اور اپنی زندگی کی تمام تگ و دو میں قرآن مجید کو اپنا مشیر اور ہادی بنا دیں۔ یوں نظر آئے کہ ہمارے خیالات و شعور میں ہماری عملی زندگی میں اور ہمارے تمام معاملات میں قرآن کریم یوں جاری و ساری ہے جس طرح پہلی جماعت مسلمہ کی زندگی میں وہ پوری طرح جاری و ساری تھا۔

☆ ☆ ☆ ☆

درس نمبر ۱۹ تشریح آیات

آیت نمبر ۲۶۱ تا ۲۷۴

اب ہم اس سبق کی قرآنی آیات و نصوص کی تفصیلی تشریح کرتے ہیں۔

مَثَلُ الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِیْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ؕ وَ اللّٰهُ یُضٰعِفُ لِمَنْ یَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ ﴿۲۶۱﴾

”جو لوگ اپنے مال اللہ کی راہ میں صرف کرتے ہیں' ان کے خرچ کی مثال ایسی ہے جیسے ایک دانہ بویا جائے اور اس سے سات بالیں نکلیں اور ہر بال میں سو دانے ہوں۔ اسی طرح اللہ جس کے عمل کو چاہتا ہے' افزونی عطا کرتا ہے۔ وہ فراخ دست بھی ہے اور علیم بھی“

اسلامی نظام زندگی کا آغاز فرائض واجبات سے نہیں ہوتا۔ اسلام اپنے کام کا آغاز' محبت' تالیف قلب اور نیکی کی تحریک سے کرتا ہے۔ وہ انسانی شعور کو جگاتا ہے اور انسانی زندگی میں زندہ جذبات پیدا کرتا ہے۔ وہ انسان کے مطالعہ اور مشاہدہ کے لئے زندگی کی ایک ایسی تصویر پیش کرتا ہے جو پھوٹتی ہے' بڑھتی ہے اور آخر کار ایک مفید پھل دیتی ہے۔ انسان اس سے ثمرہ حاصل کرتا ہے۔ وہ انسان کے سامنے فصل کی مثال پیش کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ اور زمین کا ایک عام عطیہ ہے۔ کھیتی ایک دانہ لیتی ہے لیکن سینکڑوں دانے واپس دیتی ہے۔ تخم اور بیج کی نسبت سے وہ کئی گنا حاصلات دیتی ہے۔ قرآن کریم میں یہ زندہ منظر ان لوگوں کے سامنے رکھتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں اپنی کمائی خرچ کرتے ہیں۔

مَثَلُ الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِیْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ؕ

”جو لوگ اپنے مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں' ان کے خرچ کی مثال ایسی ہے' جیسے ایک دانہ بویا جائے اور اس کی سات بالیں نکلیں اور ہر بال میں سو دانے ہوں۔“

تعبیر کا یہ تصوراتی انداز حساب و کتاب کے عمل پر جا پہنچتا ہے۔ ایک دانہ بڑھ کر سات سو دانے بن جاتا ہے لیکن اس مفہوم کو قرآن مجید جس زندہ و تابندہ انداز میں پیش کرتا ہے وہ نہایت ہی حسین و جمیل ہے۔ اس سے انسانی شعور میں ایک قسم کا جوش و خروش پیدا ہوتا ہے۔ انسانی ضمیر جاگ اٹھتا ہے۔ ایک زندہ اور بڑھنے والی فصل کا منظر سامنے آتا ہے۔ ایک زندہ طبیعت ظاہر ہوتی ہے۔ پیداوار دینے والا ایک ہرا بھرا کھیت نظروں کے سامنے آتا ہے۔ عام نباتات کا ایک عام اور عجیب بیش پا افتادہ تجربہ سامنے آتا ہے۔ ایک نال پر سات بالیں ہیں

اور ہربال میں سو دانے ہیں۔

اس زندہ اور نامی منظر کے سامنے انسانی ضمیر بھی بذل و عطا کی طرف متوجہ ہوتا ہے لیکن دراصل وہ دیتا نہیں کچھ لیتا ہی ہے۔ یوں یہ عطا اور داد و دہش ایک ایسے راستے پر جاتی ہے جس میں وہ کئی گنا نشوونما پاتی ہے۔ یوں انسان کا جذبہ داد و دہش کئی گنا زیادہ ہو جاتا ہے۔ اور وہ فصل کی طرح کئی گنا زیادہ حاصلات لاتا ہے۔ اور اللہ جسے چاہتا ہے' اس سے بھی زیادہ حاصلات دیتا ہے۔ بغیر حساب دیتا ہے اور بے شمار دیتا ہے۔

وہ اپنی مخلوق کے لئے اس کے رزق میں اس قدر فراوانی کرتا ہے جو بے حد و حساب ہوتی ہے۔ اس کی رحمت اس قدر وسیع ہے کہ جس کی انتہاؤں کا پتہ نہیں۔ وَ اللّٰہُ وَاسِعٌ عَلِیۡمٌ .... "وہ فراخ دست بھی ہے اور علیم بھی۔"

وہ اس قدر فراخ دست ہے کہ جس کی عطا میں کوئی تنگی نہیں ہے۔ وہ نہ ختم ہونے والی ہے اور نہ اس کے جوش میں کمی آنے والی ہے۔ وہ علیم ہے۔ وہ نیتوں کا مالک ہے۔ نیت اور نیکی پر بھی اجر دیتا ہے۔ اس پر کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ وہ کون سا انفاق فی سبیل اللہ ہے جو بڑھتا ہے اور نفع بخش ہے اور وہ کون سی جود و کرم ہے' جسے اللہ تعالیٰ دنیا و آخرت میں دوچند کر دیتا ہے؟ جس کے لئے چاہے۔ یہ انفاق وہ ہے جو انسانی جذبات کو بلند کر دے اور انہیں پاک و صاف کر دے۔ وہ انفاق فی سبیل اللہ وہ ہے جو کسی انسان کی شرافت و عزت نفس نہ کچلے۔ وہ انفاق جسے دلی طہارت اور صفائی کے نتیجے میں روبعمل لایا جائے۔ وہ محض جذبہ رضائے الٰہی کے تحت کیا جائے۔ اور اس کے علاوہ کوئی اور مقصد پیش نظر نہ ہو۔

اَلَّذِیۡنَ یُنۡفِقُوۡنَ اَمۡوَالَہُمۡ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ ثُمَّ لَا یُتۡبِعُوۡنَ مَاۤ اَنۡفَقُوۡا مَنًّا وَّ لَاۤ اَذًی ۙ لَّہُمۡ اَجۡرُہُمۡ عِنۡدَ رَبِّہِمۡ ۚ وَ لَا خَوۡفٌ عَلَیۡہِمۡ وَ لَا ہُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ ﴿۲۶۲﴾

"جو لوگ اپنے مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اور خرچ کر کے پھر احسان نہیں جتاتے' نہ دکھ دیتے ہیں' ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے۔ اور ان کے لئے کسی رنج اور خوف کا موقعہ نہیں۔"

احسان جتلانا ایک مکروہ' ناپسندیدہ اور گھٹیا درجے کی حرکت ہے۔ یہ ایک ایسا شعور ہے جو نہایت ہی پست ہے۔ نفس انسانی صرف اس صورت میں احسان جتلاتا ہے جب وہ جھوٹے احساس برتری میں مبتلا ہو اور اسے تعلی کا روگ لگا ہوا ہو۔ یا وہ گیرندہ کو ذلیل کرنا چاہتا ہو' یا وہ دل میں یہ خواہش رکھتا ہو کہ لوگ اس کی طرف متوجہ ہوں اور اس کے اس فعل انفاق کو پسندیدہ نظروں سے دیکھیں۔ اس صورت میں بھی مطمح نظر لوگ ہیں۔ اللہ کی ذات نہیں ہے۔ یہ تمام جذبات ایسے ہیں جو کبھی ایک پاکیزہ دل میں پروان نہیں چڑھ سکتے۔ اور نہ ہی ایسے جذبات ایک سچے مومن کے دل میں پیدا ہوتے ہیں۔ پس احسان جتلانا بیک وقت ایک دہندہ کے لئے اور گیرندہ کے لئے موجب اذیت ہے۔ دہندہ کے لیے اذیت یہ ہے کہ اس کے دل میں کبر و غرور پیدا ہوتا ہے۔ اس کے دل میں یہ خیال اور یہ خواہش پیدا ہوتی ہے کہ ایک بھائی اس کے سامنے ذلیل اور شکستہ حال صورت میں ظاہر ہو۔ اور خود دہندہ کے دل میں نفاق' ریاکاری اور اللہ سے دوری کے جذبات پیدا ہوں اور گیرندہ کے لئے اذیت یوں ہے کہ وہ اپنے آپ کو کمتر اور شکستہ حال تصور کرتا ہے اور پھر اس کے دل میں حقارت اور انتقام کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ انفاق فی سبیل اللہ سے اسلام کی غرض صرف یہ نہیں ہے کہ ایک خلا کو پر کر دیا جائے' کسی کی حاجت پوری ہو اور بھوکا پیٹ بھر جائے۔ صرف یہ غرض ہرگز نہیں ہے۔ اس سے اسلام ایک طرف تو عطا کنندہ کی اخلاقی تطہیر کا بندوبست کرتا

ہے۔ اس کے نفس کو پاک کرتا ہے۔ اس کے اندر انسانی ہمدردی کے جذبات کو ابھارتا ہے۔ اور ایک مسلم بھائی اور بھائی کے درمیان رابطہ پیدا کر کے بحیثیت انسان اور مسلمان صرف رضائے الٰہی کے لئے اسے ایک فقیر کی امداد پر آمادہ کرتا ہے۔ اسلام ایک دہندہ کو یہ یاد دلاتا ہے کہ اس پر اللہ کا فضل ہے اور اس نے اس فضل کے بارے میں اللہ سے ایک عہد بھی کر رکھا ہے اور وہ عہد یہ ہے کہ وہ اس فضل ونعمت سے بغیر اسراف کے بقدر ضرورت کھائے بھی اور اس سے فی سبیل اللہ خرچ بھی کرے۔ یعنی بغیر کسی رکاوٹ اور احسان جتلانے کے۔ دوسری جانب اس سے اللہ تعالیٰ گیرندہ کی دلجوئی اور رضامندی کا سامان بھی کرتے ہیں۔ اور یوں ایک انسان اور ایک انسان اور ایک مومن اور مومن کے درمیان اچھے تعلقات بھی قائم ہو جاتے ہیں۔ اور اسلامی معاشرہ میں یہ خطرہ بھی نہیں رہتا کہ اس کے درمیان تعاون وتکافل نہ ہو۔ یوں ایک اسلامی معاشرہ کی تعمیر میں وحدت' اس کے رجحانات میں یکسوئی' اس کے فرائض وذمہ داریوں میں ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن احسان جتلانے سے یہ تمام فائدے ختم ہو جاتے ہیں اور انفاق فی سبیل اللہ زہر اور آگ بن جاتا ہے۔ اگرچہ انسان کے ہاتھ اور اس کی زبان سے کسی گیرندہ کو کوئی اذیت نہ پہنچی ہو لیکن مجرد احسان جتلانا ہی بڑی اذیت ہے۔ یہ بذات خود مجسم اذیت ہے۔ اس سے انفاق بے اثر ہو جاتا ہے۔ معاشرہ کے اندر تفرقہ پیدا ہوتا ہے اور افراد معاشرہ کے درمیان دشمنیاں اور نفرتیں پیدا ہوتی ہیں۔ جدید علوم نفسیات کے ماہرین اس نتیجے تک پہنچے ہیں کہ احسان جتلانے یا احسان کرنے کے نتیجے میں بالآخر محسن اور وہ شخص جس کے ساتھ احسان کیا گیا' کے درمیان کسی نہ کسی وقت دشمنی ضرور پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ اس سلسلے میں یہ دلیل دیتے ہیں کہ ایک گیرندہ اپنے دل ہی دل میں احساس کمتری' اور معطی کے سامنے اپنے ضعف کے جذبات اپنے دل میں پیدا کر لیتا ہے۔ اور یہ شعور ہر وقت اس کے دل میں چھپتا رہتا ہے۔ اور ایک احسان مند شخص اس شعور پر غلبہ پانے کے لئے ردعمل میں خود احسان کنندہ پر حملہ آور ہو جاتا ہے اور اپنے دل میں اس کی دشمنی کو چھپا لیتا ہے۔ اس لئے کہ احسان کنندہ کی نسبت سے وہ ہمیشہ اپنے آپ کو کمتر سمجھتا ہے اور خود احسان کنندہ بھی یہ شعور اپنے اندر پیدا کر لیتا ہے کہ وہ اس شخص کے مقابلے میں برتر ہے۔ اور یوں یہ شعور یعنی ایک جانب احساس برتری اور دوسری جانب احساس کمتری ایک دوسرے کی دشمنی میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔

بے شک ماہرین نفسیات کا یہ تجربہ بعض اوقات جاہلی اور غیر اسلامی معاشروں کے درمیان بالکل درست نکلتا ہے۔ یہ جاہلی معاشرے ایسے ہوتے ہیں جن میں نہ اسلامی روح ہوتی ہے نہ اس میں اسلامی افکار کی حکمرانی ہوتی ہے۔ لیکن اسلامی نظام زندگی نے اس مسئلے کو بالکل ایک نئے انداز میں حل کیا ہے۔ وہ یوں کہ اسلام تمام لوگوں کے دل ودماغ میں یہ حقیقت بٹھاتا ہے کہ مال ودولت دراصل اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہے جو رزق اور دولت اہل ثروت کے ہاتھوں میں ہے وہ اس کے محافظ وامین ہیں۔ اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کا انکار جاہل سے جاہل شخص بھی نہیں کر سکتا۔ اس لئے کہ دولت وثروت کے قریبی اور دور کے تمام اسباب اللہ کے پیدا کردہ ہیں۔ ان اسباب میں سے کوئی سبب بھی انسان کے دائرہ قدرت میں نہیں ہے۔ یہ سب کچھ اللہ کا دیا ہوا ہے۔ گندم کا ایک دانہ لیجئے۔ اس کی پیدائش میں اس کائنات کی کئی قوتیں شریک ہوئی ہیں۔ سورج سے لے کر زمین تک اور پانی سے لے کر ہوا تک۔ ان میں سے کوئی قوت بھی انسان کے دائرہ قدرت میں نہیں ہے۔ گندم کے ایک دانے پر تمام دوسری اشیاء کو قیاس کیا جا سکتا ہے۔ چاہے وہ کپڑے کا ایک ریشہ ہو یا کوئی اور چیز ہو۔ یوں اس تصور کے ساتھ اگر کوئی صاحب ثروت اگر کوئی چیز خرچ کرتا ہے تو گویا وہ خدا تعالیٰ کی دی ہوئی چیز خرچ کرتا ہے۔ نیز اس تصور کے مطابق اگر کوئی شخص کوئی نیکی کر کے اپنی آخرت کے لئے جمع کرتا ہے تو گویا وہ اللہ تعالیٰ کو قرض دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ اسے اس کا کئی گناہ اجر دے گا۔ البتہ یہ نادار شخص اس مالدار شخص کے اخروی اجر کا ایک سبب بن جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اخذ وعطا کے لئے ایسے آداب مقرر فرمائے ہیں جن کو یہاں ہم بیان کر رہے ہیں۔ یہ آداب انسانی دل ودماغ میں یہ

تصور راسخ کرتے ہیں کہ کوئی دینے والا تعلی نہ کرے اور نہ کوئی لینے والا احساس کمتری کا شکار ہو اور دونوں ان آداب و اصول کا لحاظ رکھیں جو اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کے لئے وضع فرمائے ہیں۔ اور ان عہدوں کی پوری پوری پابندی کریں جو اللہ تعالیٰ نے ان سے لئے ہیں۔ فرماتے ہیں

وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ .... "ان کے لئے کسی خوف کا موقعہ نہ ہو گا۔" یعنی ان کے لئے نہ یہ خطرہ ہے کہ ان کے ساتھ دشمنی ہوگی' نہ یہ خطرہ ہے کہ وہ غریب ہو جائیں گے اور نہ یہ خطرہ ہے کہ ان کا کوئی اجر ضائع ہو گا۔

وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ .... "اور نہ ان کے لئے رنج و ملال کا موقع ہو گا" یعنی دنیا میں بھی ان کے لئے کوئی رنج نہ ہو گا۔ اور نہ آخرت میں انجام بد سے دوچار ہو کر وہ پریشان ہوں گے۔

بذل و انفاق کی مذکورہ بالا حکمت کی تائید مزید کے لئے اور اس بات کی مزید وضاحت کے لئے انفاق فی سبیل اللہ سے اصل غرض و غایت تہذیب نفس اور اصلاح القلوب ہے۔ اور عطا کنندہ اور گیرندہ کے درمیان محض دینی محبت کا قیام ہے' اگلی آیت میں کہا جاتا ہے۔

قَوْلٌ مَّعْرُوفٌ وَّمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَآ اَذًى ۗ وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَلِيْمٌ ﴿٢٦٣﴾

"ایک میٹھا بول اور کسی ناگوار بات پر ذرا سی چشم پوشی اس خیرات سے بہتر ہے' جس کے پیچھے دکھ ہو۔" اور اللہ بے نیاز ہے اور بردباری اس کی صفت ہے۔"

یہاں یہ فیصلہ کر دیا جاتا ہے کہ جس صدقہ کے بعد نادار کو اذیت دی جاتی ہو' ایسے صدقے کی سرے سے ضرورت ہی نہیں ہے۔ اس سے تو ایک میٹھا بول اور ایک نرم بات ہی بہتر ہے۔ ایک اچھی بات سے دلوں کے زخم جڑ جاتے ہیں۔ اس سے خوشی اور رضاجوئی پیدا ہوتی ہے' جس سے زخم بھر آتے ہیں۔ معافی اور چشم پوشی سے دلوں کی میل دور ہو جاتی ہے۔ اور اس کے بدلے بھائی چارہ اور دوستی پیدا ہو جاتی ہے۔ ایسے حالات میں میٹھا بول اور عفو و درگزر دوستی اور اخوت کے راستے میں خشت اول کا کام دیتے ہیں۔ اس سے نفوس میں پاکیزگی اور دو دلوں میں یگانگت پیدا ہوتی ہے۔

یہ بات کہنے کے بعد کہ صدقہ عطا کنندہ کی طرف سے گیرندہ پر کوئی برتری نہیں اس لئے کہ صدقہ کر کے ایک شخص دراصل اللہ تعالیٰ کو قرض دیتا ہے' تو اس کے بعد کہا جاتا ہے وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَلِيْمٌ .... "اور اللہ بے نیاز ہے اور بردباری اس کی صفت ہے۔" وہ عطا کنندہ کی ایسی عطا سے مستغنی ہے جس کے بعد وہ ایک نادار کو اذیت دیتا ہو اور وہ بردبار ہے۔ کیونکہ وہ اپنے بندوں کو سب کچھ دیتا ہے اور پھر بھی وہ اس کا شکر ادا نہیں کرتے۔ لیکن اللہ تعالیٰ انہیں سزا دینے میں عجلت سے کام نہیں لیتے اور نہ ہی شتابی سے انہیں اذیت دیتے ہیں۔ اللہ اپنے بندوں کو سب کچھ دیتا ہے اور سب کچھ دینے سے بھی پہلے انہیں وجود عطا کرتا ہے۔ لہٰذا بندوں کو بھی چاہئے کہ اللہ تعالیٰ سے بردباری سیکھیں۔ وہ اگر اللہ کے دیئے میں سے کچھ کسی کو دے بھی دیں تو فوراً ہی اس احسان مند کے درپے آزار نہ ہو جائیں۔ ایسے حالات میں جبکہ انہیں ان کی کوئی بات پسند نہ ہو یا یہ کہ وہ احسان مند شخص ان کا شکریہ ادا کر رہا ہو۔

قرآن کریم بار بار لوگوں کے سامنے صفات باری کا ذکر کرتا ہے۔ اور مطلوب یہ ہے کہ لوگ حتی الوسع اپنے اندر وہ صفات پیدا کریں۔ اسلامی زندگی کے آداب میں سے یہ ایک اہم طرز عمل ہے کہ ایک مسلم اپنے اندر صفات باری پیدا کرتا رہے اور اس راہ کے

مختلف مراحل مسلسل طے کرتا رہے۔ اور ان صفات میں سے جو حصہ اس کا ہے وہ اسے حاصل کرتا رہے۔ اپنے مزاج اور اپنی طبیعت کی صلاحیتوں کے مطابق۔

جب یہ وجدانی تاثر اپنی انتہاؤں کو چھو لیتا ہے اور جو لوگ اپنے اموال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں' جب ان کے سامنے ترقی پذیر اور مفید زندگی کے طبعی مظاہر پیش کر دیئے جاتے ہیں' اور یہ انفاق ایسا ہوتا ہے کہ اس کے بعد کوئی احسان مندی' احسان جتلا کر اذیت رسانی نہیں ہوتی اور یہ اشارہ دینے کے بعد کہ اللہ تعالیٰ کو ایسے انفاق اور ایسے صدقات اور احسانات کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ جن کے بعد ایذا رسانی ہو اور یہ کہ اللہ تعالیٰ رازق اور داتا ہے۔ وہ اپنا قہر و غضب نازل کرنے میں اور اذیت رسانی میں جلد بازی نہیں کرتا۔ غرض جب یہ وجدانی تاثر اپنی ان انتہاؤں تک جا پہنچتا ہے۔ تو اب روئے سخن ان لوگوں کی طرف پھر جاتا ہے جو اہل ایمان ہیں کہ وہ احسان جتا کر اور احسان کے بعد اذیت دے کر اپنے صدقات اور نیکیوں کو ضائع نہ کریں۔

قرآن یہاں ان کے سامنے ایک عجیب صورت حال کی منظر کشی کرتا ہے۔ یہ دو مناظر ہیں جو بڑے خوبصورت ہیں۔ جو پہلے منظر کے ساتھ ایک جگہ چلتے ہیں۔ پہلا منظر یہ تھا کہ ایک کھیت ہے جو نشوونما پا رہا ہے۔ لیکن ان دو نئے مناظر میں اس انفاق فی سبیل اللہ کا مزاج بتایا جا رہا ہے جو خالص للہ ہو اور اس انفاق کی حقیقت بھی بتائی جاتی ہے جو احسان مندی اور اذیت رسانی کے ساتھ ہو اور یہ مناظر قرآن کریم کے اس اسلوب میں ہیں جو وہ فن کارانہ تصویر کشی کے لئے اختیار کرتا ہے یعنی مفہوم اور معنی کو ایک مشخص شکل میں پیش کیا جاتا ہے اور اس میں کسی عمل کے اثرات متحرک شکل میں ہوتے ہیں اور یہ منظر کشی ایسے حالات میں ہوتی ہے کہ پورا نظارہ ہمارے تخیل کے سامنے ہوتا ہے۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَ الْاَذٰى ۙ كَالَّذِيْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَ لَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَكَهٗ صَلْدًا ؕ لَا يَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَيْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا ؕ وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۶۴﴾ وَ مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَ تَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍۭ بِرَبْوَةٍ اَصَابَهَا وَابِلٌ فَاٰتَتْ اُكُلَهَا ضِعْفَيْنِ ۚ فَاِنْ لَّمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ ؕ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۲۶۵﴾

"اے ایمان لانے والو! اپنے صدقات کو احسان جتا کر اور دکھ دے کر اس شخص کی طرح خاک میں نہ ملا دو' جو اپنا مال محض لوگوں کے دکھانے کو خرچ کرتا ہے اور نہ اللہ پر ایمان رکھتا ہے' نہ آخرت پر۔ اس شخص کے خرچ کی مثال ایسی ہے جیسے ایک چٹان تھی' جس پر مٹی کی تہہ جمی ہوئی تھی۔ اس پر جب زور کا مینہ برسا تو ساری مٹی بہہ گئی اور صاف چٹان کی چٹان رہ گئی۔ ایسے لوگ اپنے نزدیک خیرات کر

کے جو نیکی کماتے ہیں' اس سے کچھ بھی ان کے ہاتھ نہیں آتا' اور کافروں کو سیدھی راہ دکھانا' اللہ کا دستور نہیں ہے۔ بخلاف اس کے جو لوگ اپنے مال محض اللہ کی رضاجوئی کے لئے دل کے پورے ثبات و قرار کے ساتھ خرچ کرتے ہیں۔ ان کے خرچ کی مثال ایسی ہے' جیسے کسی سطح مرتفع پر ایک باغ ہو۔ اگر زور کی بارش ہو جائے تو دگنا پھل لائے' اور اگر زور کی بارش نہ بھی ہو تو ایک ہلکی پھوار ہی اس کے لئے کافی ہو جائے۔ تم جو کچھ کرتے ہو' سب اللہ کی نظر میں ہے۔"

یہ ہے وہ پہلا منظر یہ ایک مکمل اور دو اجزاء سے مرکب منظر ہے' جو اپنی شکل وضع اور اپنے نتائج کے اعتبار سے ایک دوسرے کے متضاد مناظر ہیں۔ ہر منظر کے پھر مختلف اجزاء ہیں جو ایک دوسرے کے ساتھ متناسق ہیں۔ وہ تعبیر اور مشاہدے کے اعتبار سے بھی باہم متوافق اور ہم رنگ ہیں۔ اور معانی اور جذبات کے اعتبار سے بھی جو معانی اور جو جذبات اس منظر کشی سے پیدا کرنے مطلوب تھے۔ جن کا اظہار اس پوری منظر کشی سے مطلوب تھا یا جو شعور ان مناظر کی وجہ سے پیدا کیا جانا مطلوب تھا۔

پہلے منظر میں ہمیں ایک ایسے دل کا سامنا کرنا پڑتا ہے جو پتھر سے بھی سخت ہے۔ كَالَّذِيْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ .... "اس شخص کی طرح جو اپنے مال کو محض لوگوں کے دکھاوے کے لئے خرچ کرتا ہے۔ نہ اللہ پر ایمان رکھتا ہے اور نہ آخرت پر۔" اسے ایمان کی تروتازگی اور مٹھاس کا شعور نہیں ہوتا' لیکن وہ اپنی اس سنگ دلی پر ریاکاری کا پردہ ڈالتا ہے۔ یہ دل جس پر ریاکاری کا پردہ ہوتا ہے' اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک چٹان ہو اور اس پر مٹی کی تہہ جمی ہوئی ہو۔ ایک ایسا پتھر جس پر کوئی تروتازگی نہ ہو' جس میں کوئی نرمی نہ ہو۔ اس پر مٹی کی ایک ہلکی سی تہہ ہو اور جس کی سختی اور درشتی کو اس تہہ نے چھپا رکھا ہو۔ بعینہ اسی طرح جس طرح ایک شخص اپنی ریاکاری کی وجہ سے اپنے اس دل کی کیفیت کو چھپالیتا ہے جو ایمان سے خالی ہو۔

فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَكَهٗ صَلْدًا .... "اس پر جب زور کا مینہ برسا تو ساری مٹی بہہ گئی اور صاف چٹان کی چٹان رہ گئی۔" موسلا دھار بارش نے مٹی کی اس خفیف تہہ کو ختم کر دیا۔ چٹان ظاہر ہو گئی اور وہ کیا تھی؟ ایک سخت اور مضبوط اور کرخت چٹان۔ جس پر کوئی روئیدگی ممکن نہ تھی۔ نہ اس سے کسی قسم کی پیداوار حاصل ہو سکتی تھی۔ یہی مثال اس دل کی ہے جو اپنا مال محض ریاکاری کے طور پر خرچ کرتا ہے۔ جس سے کوئی فائدہ نہ ہوگا نہ دنیا میں اور نہ آخرت میں۔

اس منظر کے بالمقابل ایک دوسرا منظر ہے' جو اس کے بالکل متضاد ہے۔ ایک دل ہے جو ایمان سے بھرا ہوا ہے۔ وہ ایمان کی تروتازگی سے سرشار ہے۔ وہ اپنے مال کو محض رضائے الٰہی کی خاطر خرچ کرتا ہے۔ اسے پورا پورا یقین ہے کہ وہ جو کچھ خرچ کر رہا ہے اس کا وہ اجر ضرور پائے گا۔ اور یہ خرچ وہ محض اپنے ایمان اور نظریہ کے تقاضے کے طور پر کرتا ہے۔ یہ نظریہ اس کے دل کی گہرائیوں میں رچا بسا ہے۔ ایک طرف یہاں ریاکار دل ہے' اس کو ایک ایسے پتھر کے ساتھ مشابہت دی گئی ہے جس پر مٹی کا ایک خفیف سا پردہ ہے۔ اور دوسری جانب ایک ایسا دل ہے جو ایمان سے بھرپور ہے اور اسے ایک سرسبز باغ کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے' جس کی زمین زرخیز ہے اور مٹی گہری ہے جبکہ پتھر پر مٹی کا ایک خفیف سا پردہ تھا۔ باغ ایک اونچے مقام پر ہے اور مذکور چٹان ایک گہرے گڑھے میں ہے۔ تاکہ یہ دونوں مناظر متناسب اور ہم شکل ہو جائیں۔ اب اگر اس باغ پر موسلا دھار بارش برس جاتی ہے تو اس سے اس کی تروتازگی ختم نہیں ہوتی۔ جس طرح چٹان پر سے مٹی کی خفیف تہہ بہہ نکلتی ہے۔ بلکہ یہ بارش اس باغ کو زیادہ سرسبز اور شاداب کر دیتی ہے۔ اسے نئی زندگی عطا کرتی ہے اور اس کی نشوونما ہوتی ہے۔ اَصَابَهَا وَابِلٌ فَاٰتَتْ اُكُلَهَا ضِعْفَيْنِ ....
"اور اس پر زور کی بارش ہو جائے تو دگنا پھل لائے۔"

یہ بارش اس باغ کو زندہ اور سرسبز کر دیتی ہے۔ جس طرح صدقہ ایک مومن کے دل کو پاک و صاف کر دیتا ہے اور اس کی وجہ سے ایک مومن کا تعلق باللہ مضبوط ہو جاتا ہے۔ دل مومن کی طرح ایک مومن کا مال بھی صاف ہو جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس میں برکت ڈالتے ہیں اور اسی طرح انفاق فی سبیل اللہ کے ذریعہ جماعت مسلمہ کی اجتماعی زندگی میں پاکیزگی پیدا ہوتی ہے اور اس سے اجتماعی روابط بڑھتے ہیں۔ اور اگر زور کی بارش نہ بھی ہو تو ایک ہلکی پھوار ہی اس کے لئے کافی ہو جاتی ہے جبکہ مٹی میں پہلے سے نم موجود ہو تو ہلکی بارش بھی کافی ہوتی ہے۔

یہ ہے ایک مکمل نظارہ' جس کے مناظر ایک دوسرے کے بالمقابل صاف نظر آتے ہیں جس کی جزئیات باہم متناسب ہیں اور جسے ایک معجزانہ پیرایہ اظہار میں پیش کیا گیا ہے۔ طرز ادا میں ہم آہنگی پائی جاتی ہے اور اس کے مناظر تمام دلی خلجانات اور تمام غلط تصورات کے علاج کے لئے بالکل واضح ہیں۔ یہ منظر انسانی وجدان اور انسانی شعور کے سامنے ایک صاف تصویر پیش کرتا ہے۔ تمام حالات اور تمام محسوسات کو بڑے امتیاز کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ جو انسان کے قلب پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اور انسان بڑی آسانی سے راہ ہدایت پالیتا ہے۔

اس منظر کا تعلق چونکہ فکر و نظر سے تھا۔ اور اس سے اصل غرض و غایت یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کی جائے اور اس ظاہری دنیا سے آگے اس کے کرشمہ ہائے قدرت کو اپنی آنکھوں سے دیکھا جائے۔ اس لئے اس کے آخر میں یہ نتیجہ نکالا گیا

وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ .... "اور جو کچھ تم کرتے ہو' اللہ کی نظر میں ہے۔"

رہا دوسرا منظر تو احسان جتلانے اور اذیت دینے کی انتہائی تمثیل ہے۔ اس میں باری تعالیٰ بتاتے ہیں کہ اس قسم کے صدقے اور احسان کو اللہ تعالیٰ کس طرح تباہ و برباد کر دیتے ہیں' جبکہ صاحب صدقہ اور صاحب احسان اس وقت اس صدقے اور احسان کے فائدے کا بہت زیادہ محتاج ہوتا ہے۔ وہ ضعیف ہو جاتا ہے۔ جسمانی قوتیں ختم ہوتی ہیں لیکن وہ اس بربادی کا کوئی علاج نہیں کر سکتا۔ یہ انجام بد کی ایک انتہائی قسم کی بری منظر کشی ہے۔ اور نہایت ہی موثر اور سبق آموز۔ اس منظر میں امن اور خوشحالی کے بعد مکمل تباہی اور ویرانی ہے۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ أَيَوَدُّ أَحَدُكُمْ أَنْ تَكُوْنَ لَهٗ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّأَعْنَابٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهٰرُ ۙ لَهٗ فِيْهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ۙ وَأَصَابَهُ الْكِبَرُ وَلَهٗ ذُرِّيَّةٌ ضُعَفَآءُ ۚ فَأَصَابَهَآ إِعْصَارٌ فِيْهِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ ۗ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۲۶۶﴾

۳۶
ع۲
۴

"کیا تم میں سے کوئی یہ پسند کرتا ہے کہ اس کے پاس ایک ہرا بھرا باغ ہو' نہروں سے سیراب' کھجوروں اور انگوروں اور ہر قسم کے پھلوں سے لدا ہوا' اور وہ عین اس وقت ایک تیز بگولے کی زد میں آکر جھلس جائے جبکہ وہ خود بوڑھا ہو اور اس کے کم سن بچے ابھی کسی لائق نہ ہوں؟ اس طرح اللہ اپنی باتیں تمہارے سامنے بیان کرتا ہے' شاید کہ تم غور و فکر کرو۔"

یہاں صدقہ کو اپنی حقیقت اور اپنے آثار کے اعتبار سے ایک محسوس شکل میں پیش کیا گیا ہے۔

جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيلٍ وَّ اَعْنَابٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ لَهٗ فِيْهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ .... "یہ صدقہ گویا ایک باغ ہے جو نہروں سے سیراب ہے۔ کھجوروں اور انگوروں اور ہر قسم کے پھلوں سے لدا ہوا۔" اس کی چھاؤں گھنی ہے' خوشگوار اور تروتازہ ہے۔ اس میں ہر قسم کے پھل کثرت سے ہیں جس طرح یہ باغ مفید ہے اس طرح صدقہ بھی مفید اور فائدہ بخش اور فرحت بخش تھا۔ یہ صدقہ دینے والے کے لئے بھی مفید تھا۔ لینے والے کے لئے بھی مفید تھا اور پورے معاشرے کے لئے بھی مفید تھا۔ جس کے روحانی فائدے بے شمار تھے اور اس میں خیر و برکت تھی جس کے ذریعہ معاشرے کو مفید غذا مل رہی تھی اور جو معاشرے میں اجتماعی نشوونما اور ترقی کا باعث تھا۔

کوئی بدبخت ایسا ہے جو اس قسم کے باغ کا مالک ہو اور جو اس قسم کے اعلیٰ بھائی چارے اور نیکی کا مالک ہو اور پھر وہ ایسے باغ کو احسان جتلانے یا احسان کے بعد اذیت دینے کی آفات و بلیات کے ذریعہ جلا کر خاکستر کر دے' جس طرح ایک آتشی بھگولا کسی سرسبز و شاداب باغ کو جھلسا کر خاکستر کر دیتا ہے۔

اور پھر یہ عمل کیسے حالات میں ہو؟ ایسے حالات میں کہ اس باغ کا مالک صاحب احتیاج ہو۔ جسمانی لحاظ سے ضعیف ہو گیا ہو' عیالدار ہو اور اسے اس باغ کی چھاؤں اور نعمتوں کی اشد ضرورت بھی ہو۔ وَ اَصَابَهُ الْكِبَرُ وَ لَهٗ ذُرِّيَّةٌ ضُعَفَآءُ فَاَصَابَهَآ اِعْصَارٌ فِيْهِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ .... "وہ خود بوڑھا ہو جائے اور اس کے بچے بھی کسی لائق نہ ہوں اور ایسے میں ایک تیز بگولے کی زد میں آ جائے جس میں آگ ہو۔" کون ہے جو ایسی صورت حال کو پسند کرے گا؟ کون ہے جو اگر ایسے انجام کو سمجھ سکتا ہو اور اس سے بچنے کی سعی نہ کرے؟

كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ .... "اس طرح اللہ اپنی باتیں تمہارے سامنے بیان کرتا ہے' شاید کہ تم غور و فکر کرو۔"

یوں یہ زندہ و تابندہ منظر سٹیج ہوتا ہے۔ اس کی ابتدا نہایت خوشی' خوشگواری اور آرام سے ہوتی ہے۔ منظر کا آغاز تروتازگی' فرح و سرور اور حسن و جمال سے ہوتا ہے۔ اس کے بعد تباہی کا منظر آتا ہے اور یہ ایک خوفناک منظر ہوتا ہے۔ ایک بگولا آتا ہے جو اس تروتازگی کو پژمردہ کر دیتا ہے۔ جب یہ سب مناظر اسٹیج پر آتے ہیں تو انسان کو ایک لاشعوری احساس دلاتے ہیں اور یہ شعور اس قدر پر تاثیر ہوتا ہے کہ ایک باشعور آدمی کو ایک صحیح راہ اختیار کرنے میں کوئی تردد نہیں رہتا۔ اس سے پہلے کہ انسان کے ہاتھ سے موقعہ جاتا رہے اور اس سے پہلے کہ گھنی چھاؤں والے باغات اور پھلوں سے لدے ہوئے درخت پژمردہ ہو جائیں اور جھلس جائیں۔ ایک باشعور انسان رد و قبول کا فیصلہ کر ہی لیتا ہے۔

میں یہاں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ یہ حسین و جمیل انداز کلام اور مربوط اور ہم آہنگ مناظر جن سے اس سبق کا ہر انفرادی منظر تشکیل پاتا ہے اور پھر جس خوش اسلوبی سے ہر ایک انفرادی منظر کو پیش کیا جاتا ہے۔ یہ ربط و ہم آہنگی صرف ان انفرادی مناظر تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ یہ ہم آہنگی مجموعی طور پر ان تمام مناظر میں بھی پائی جاتی ہے۔ یہ تمام مناظر بھی باہم مربوط اور متناسب ہیں۔ دیکھئے! ایک زرعی ماحول ہے۔ ایک دانہ ہے جس سے سات بالیں اگتی ہیں۔ ایک چٹان ہے جس پر مٹی کی ایک خفیف تہہ جمی ہوئی ہے۔ اور اس پر اچانک موسلا دھار بارش ہو جاتی ہے۔ پھر ایک اونچی جگہ پر ایک باغ ہے جو ہر قسم کے پھلوں سے لدا ہوا ہے۔ اور دو چند پھل لگا ہوا ہے۔ یہ باغ

کھجوروں اور انگوروں پر مشتمل ہے۔کہیں زوردار بارش ہورہی اور کہیں پھوار ہے۔اور پھر ایک بگولا ہے جو اکثر زرعی کھیتوں میں تباہی مچاتا ہے۔غرض ایک زرعی ماحول کے تمام قدرتی اجزاء یہاں موجود ہیں اور کوئی ایسا جزغائب نہیں ہے جو موثر ہو سکتا ہو۔

قرآن کریم کے بلیغانہ انداز گفتگو کی یہ ایک اہم خصوصیت ہے کہ وہ انسانی ادراک اور اس زمین کے قدرتی ماحول کے درمیان فاصلے کم کردیتا ہے کیونکہ انسان کا وجود اسی کائنات کے عناصر ترکیبی سے مرکب ہے۔انسان اور کائنات میں نباتات کی نشوونما کے درمیان ایک مکمل ہم آہنگی ہے۔جس طرح ایک بگولا اس کائنات کی تروتازگی کو جھلس دیتا ہے' اسی طرح گمراہی انسان کی روحانی دنیا کو نیست و نابود کر دیتی ہے۔یہ ہے قرآن کریم۔ایک خوبصورت انداز گفتگو جو یقیناً علیم و خبیر کی جانب سے ہے۔

○○○

انفاق فی سبیل اللہ کے آداب اور نتائج کے بیان کے بعد اب یہاں سے سیاق کلام' انفاق فی سبیل اللہ کے دستور کو لے کر اب مزید آگے بڑھتا ہے۔انفاق کی حقیقت' انفاق کا طریقہ کار اور لوازمات کو بیان کیا جاتا ہے۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَنْفِقُوا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّا أَخْرَجْنَا لَكُمْ مِنَ الْأَرْضِ ۖ وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيثَ مِنْهُ تُنْفِقُونَ وَلَسْتُمْ بِآخِذِيهِ إِلَّا أَنْ تُغْمِضُوا فِيهِ ۚ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ حَمِيدٌ ﴿٢٦٧﴾

"اے لوگو! جو ایمان لائے ہو' جو مال تم نے کمائے ہیں اور جو ہم نے زمین سے تمہارے لئے نکالا ہے' اس میں سے بہتر حصہ راہ خدا میں خرچ کرو۔ایسا نہ ہو کہ اس کی راہ میں دینے کے لئے بری سے بری چیز چھانٹنے کی کوشش کرنے لگو' حالانکہ وہی چیز اگر کوئی تمہیں دے' تو تم ہرگز اسے لینا گوارا نہ کرو گے۔الا یہ کہ اس کو قبول کرنے میں تم اغماض برت جاؤ۔تمہیں جان لینا چاہئے کہ اللہ بے نیاز ہے اور بہترین صفات سے متصف ہے۔"

اس آیت سے پہلی آیات میں انفاق فی سبیل اللہ کے لئے جو قواعد اور اساسات متعین کئے تھے اور جن پر اس کی عمارت اٹھانے کا حکم دیا تھا' ان کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ کی راہ میں بہترین مال خرچ کیا جائے۔اللہ کی راہ میں ردی اور گھٹیا اشیاء خرچ کرنے کا ارادہ ہی نہ کیا جائے جن میں خود مالک کی کوئی دلچسپی نہیں رہتی۔ایسی اشیاء اگر خود ایسے شخص کو کسی سودے یا بیوپار میں دی جائیں تو وہ ان کے عوض حقیر قیمت دینے کے لئے بمشکل تیار ہو۔اللہ غنی بادشاہ ہے۔اسے ضرورت نہیں ہے کہ ایسی ردی اشیاء قبول کرے۔

اللہ کی یہ پکار تمام مسلمانوں کے لئے ہے۔وہ جب بھی ہوئے ہوں اور جہاں کہیں بھی ہوں اور یہ حکم تمام اموال کے لئے ہے جو ان کے ہاتھ آجائیں۔وہ تمام اموال جو انہوں نے حلال اور پاکیزہ طریقے سے کمائے ہوں یا وہ اموال ہوں جو ان کے لئے زمین سے پیدا کئے گئے ہوں۔زرعی اجناس ہوں یا معدنیات ہوں مثلاً پٹرول وغیرہ۔یہی وجہ ہے کہ آیت میں عمومی الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔یعنی وہ اموال جو حضور ﷺ کے وقت موجود تھے یا وہ جو بعد میں پیدا ہوئے۔اس لئے آیت کے الفاظ عام ہیں۔ان کا اطلاق ان اموال پر بھی ہوتا ہے جو بعد میں پیدا ہوں۔ان تمام پر زکوۃ واجب ہوگی۔ہاں نصاب زکوۃ کا تعین سنت نبوی ﷺ نے کر دیا ہے۔لہٰذا ہر قسم کی پیداوار کو ان

اموال پر قیاس کر لیا جائے۔ جو حضور ﷺ کے وقت موجود تھے۔ ہر نئی پیداوار کو ان اجناس پر قیاس کر لیا جائے گا جو حضور ﷺ کے وقت موجود تھیں' اپنی اپنی نوعیت کے مطابق۔

بعض روایات میں' اس آیت کا شان نزول بھی بیان ہوا ہے۔ میں سمجھتا ہوں یہاں ان کا تذکر غیر موزوں نہ ہو گا۔ کیونکہ ان روایات کے ذریعہ وہ حالات دوبارہ سامنے آجاتے ہیں' جن میں ان آیات کا نزول ہوا۔ ان روایات سے وہ پست معاشرتی صورت حال بھی مستحضر ہو جاتی جس کی اصلاح قرآن کے پیش نظر تھی اور جس کے معیار کی بلندی کے لئے قرآن کریم جدوجہد کر رہا تھا۔

ابن جریر نے حضرت براء ابن عازب ﷺ سے روایت کی ہے' فرماتے ہیں "یہ آیت انصار کے بارے میں نازل ہوئی' جب کھجوریں توڑنے کا وقت قریب آتا تو وہ اپنے باغوں میں سے کھجوروں کے ایسے خوشے توڑ لاتے جن کے رنگ پیلے ہو جاتے تھے' لیکن ابھی پکے نہ ہوتے تھے اور وہ انہیں مسجد نبوی کے دو ستونوں کے درمیان لٹکا دیتے تھے' تو فقراء مہاجرین ان سے کھاتے تھے۔ بعض لوگ ردی قسم کی کھجوریں بھی لاکر ان میں لٹکا دیتے۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ یہ جائز ہے۔ جو لوگ یہ کام کرتے تھے ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيثَ مِنْهُ تُنْفِقُونَ .... "اور خبیث کا ارادہ نہ کرو کہ اس میں سے تم خرچ کرو۔" اس حدیث کو براء سے حاکم نے بھی روایت کیا ہے۔ اور یہ کہا کہ یہ حدیث اگرچہ بخاری اور مسلم کی شرائط صحت کے مطابق ہے۔ لیکن بخاری مسلم نے اسے روایت نہیں کیا ہے۔ ابن ابی حاتم نے اپنی سند کے ساتھ ایک دوسری سند کے ساتھ حضرت براء ﷺ سے روایت کی ہے۔ کہتے ہیں یہ ہمارے متعلق نازل ہوئی ہے۔ ہم کھجوروں کے مالک تھے تو ہر شخص تھوڑی بہت کھجوریں لایا کرتا تھا' بعض لوگ ناپختہ لاتے تھے اور مسجد میں لٹکاتے تھے۔ اہل صفہ کے طعام و قیام کا بندوبست کوئی نہ تھا۔ ان میں سے جو بھی بھوکا ہو جاتا' وہ آتا اور اپنی لاٹھی ان لٹکی ہوئی کھجوروں پر مارتا اور نیم پختہ اور پوری پختہ کھجوروں میں سے جو کچھ گرتا' وہ کھا لیتا۔

لوگوں میں سے بعض ایسے بھی تھے جو مائل بخیر نہ تھے' وہ ناپختہ اور ردی قسم کی کھجوریں لے آتے۔ وہ خصوصاً ایسا خوشہ لاتے جو ٹوٹ چکا ہوتا تھا اور جس کے دانے ناپختہ ہوتے تھے' اسے لٹکا دیتے تو یہ آیت نازل ہوئی وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيثَ مِنْهُ تُنْفِقُونَ وَلَسْتُمْ بِآخِذِيهِ إِلَّا أَنْ تُغْمِضُوا فِيهِ .... "ایسا نہ ہو کہ اس کی راہ میں دینے کے لئے بری سے بری چیز چھانٹنے کی کوشش کرنے لگو' حالانکہ وہی چیز اگر کوئی تمہیں دے تو تم ہرگز اسے لینا گوارا نہ کرو گے۔ الایہ کہ اسے قبول کرنے میں تم اغماض برت جاؤ۔" فرمایا: کہ اگر تم میں سے کسی کو ایسی ہر چیز ہدیہ دے جو وہ خود دے رہا ہے' تو وہ اسے ہرگز نہ لے۔ الایہ کہ اغماض برتے یا حیا چشمی سے کام لے۔ چنانچہ اس کے بعد ہم سے ہر شخص کے پاس جو کچھ ہوتا' اس میں سے اچھی چیز لاتا۔

دونوں روایات قریب المفہوم ہیں۔ دونوں مدینہ طیبہ میں فی الواقع موجود صورت حال کا نقشہ کھینچ رہی ہیں۔ یہ دونوں احادیث تاریخ کے ایک ورق کے بالمقابل ایک دوسرا ورق دکھاتی ہیں' جس کے اوپر انصار مدینہ فیاضانہ داد و دہش کے انمٹ نشان چھوڑتے ہیں۔ نیز یہ احادیث بتاتی ہیں کہ ایک ہی جماعت کے اندر بعض افراد نہایت ہی عجیب اور بلند مقام کے حامل ہوتے ہیں اور بعض دوسرے ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی تربیت اور تہذیب کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس بات کی ضرورت ہوتی ہے کہ انہیں درجہ بلند کے راستے پر ڈالا جائے' جس طرح بعض انصار کے معاملے میں یہ ضرورت پیش آئی' انہیں اللہ کے راستے میں ردی اموال کو خرچ کرنے سے منع کیا جائے۔ ایسے اموال کہ خود اگر انہیں پیش کئے جائیں تو وہ انہیں قبول نہ کریں۔ الایہ کہ رد کرنے میں حیا مانع ہو اور اگر کوئی لین دین ہو تو اس میں وہ اغماض برت جائیں۔ یعنی قیمت میں کمی کرنے کے معاملے میں۔ حالانکہ وہ جس ذات باری کے سامنے ہدیہ پیش کر رہے ہیں وہ باری تعالیٰ ہے۔

یہی وجہ ہے کہ آیت کا خاتمہ اس فقرے پر ہوتا ہے۔ وَ اعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰہَ غَنِیٌّ حَمِیۡدٌ ....
"تمہیں جان لینا چاہئے کہ اللہ بے نیاز ہے اور بہترین اوصاف سے متصف ہے۔" یعنی وہ اس بات سے مطلقاً" بے نیاز ہے کہ اس کی راہ میں کوئی دیتا ہے یا نہیں دیتا۔ اگر کوئی اس کی راہ میں خرچ کرتا ہے تو خود اپنے مفاد کے لئے کرتا ہے۔ تو بس اس کے لئے مناسب یہی ہے کہ وہ بہترین چیز خرچ کرے اور بطیب خاطر کرے نیز وہ حمید ہے۔ وہ پاکیزہ چیزیں قبول کرتا ہے اور ان کی تعریف کرتا ہے۔ ان پر جزا دیتا اور اچھی جزا۔ غرض اس مقام پر یہ ان دونوں صفات کے ذکر سے انسانی دل اس طرح دہل جاتے ہیں' جس طرح ان انصار کے دل دہل گئے تھے جن کے بارے میں یہ آیات نازل ہوئیں۔ "اے لوگو! جو ایمان لائے ہو' جو مال تم نے کمائے ہیں' ان میں سے بہترین حصہ راہ خدا میں خرچ کرو۔" ورنہ اللہ کو اس ردی چیز کی ضرورت نہیں جس کو تم چھانٹ چھانٹ کر بطور صدقہ خرچ کرتے ہو' حالانکہ اللہ وہ ذات ہے جو تمہاری تعریف اس صورت میں کرتا ہے کہ تم اس کی راہ میں پاکیزہ چیز خرچ کرو اور اس رضامندی کی وجہ سے وہ پھر تمہیں اچھی جزا بھی دیتا ہے۔ درآں حالیکہ کہ یہ مال اسی نے تمہیں دیا۔ اصل داتا تو وہی ہے وہ تو بطور اعزاز تمہیں اس فیاضی پر جزا دیتا ہے' اس لئے کہ تم جو کچھ دیتے ہو وہ اسی نے تو تمہیں عطا کیا ہے۔ کس قدر شاندار تفہیم ہے یہ! کیا عجب انداز ترغیب ہے! یہ ایک عجیب اسلوب تربیت ہے جو قرآن کریم نے اختیار کیا ہے۔

حقیقت یہ تھی اور ہے کہ اللہ کی راہ میں انفاق نہ کرنا' یا ردی اور بیکار چیز بارگاہ الٰہی میں پیش کرنا' اپنے اندر بعض برے تصورات لئے ہوتے ہیں۔ ایسے شخص کو دراصل ان اعمال پر اللہ تعالیٰ کے ہاں جو اجر مقرر ہے اس پر پورا یقین نہیں ہوتا یا ایسے شخص کو تنگ دستی کا خوف لاحق ہوتا ہے' جو کبھی بھی ان لوگوں کو لاحق نہیں ہوتا جن کا رابطہ اللہ تعالیٰ سے ہوتا ہے' جن کو اللہ تعالیٰ کی ذات پر پورا بھروسہ ہوتا ہے۔ انہیں اس بات کا یقین ہوتا ہے کہ ہر چیز کا انجام آخر کار اللہ کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ پر پختہ ایمان کے مقابلے میں ان تصورات کی حقیقت کھول کر رکھ دی' یہ بات عیاں کر دی اور اچھی طرح سمجھا دیا کہ نفس انسانی کے اندر یہ تصورات کہاں سے پیدا ہوتے ہیں۔ اور انسانی دلوں میں ان کو بار بار جگانے والی وہ قوت کون سی ہے؟ چنانچہ بتایا جاتا ہے کہ وہ قوت شیطانی قوت ہے۔

☆ ☆ ☆ اَلشَّیۡطٰنُ یَعِدُکُمُ الۡفَقۡرَ وَ یَاۡمُرُکُمۡ بِالۡفَحۡشَآءِ ۚ وَ اللّٰہُ یَعِدُکُمۡ مَّغۡفِرَۃً مِّنۡہُ وَ فَضۡلًا ؕ وَ اللّٰہُ وَاسِعٌ عَلِیۡمٌ ﴿۲۶۸﴾ یُّؤۡتِی الۡحِکۡمَۃَ مَنۡ یَّشَآءُ ۚ وَ مَنۡ یُّؤۡتَ الۡحِکۡمَۃَ فَقَدۡ اُوۡتِیَ خَیۡرًا کَثِیۡرًا ؕ وَ مَا یَذَّکَّرُ اِلَّاۤ اُولُوا الۡاَلۡبَابِ ﴿۲۶۹﴾

"شیطان تمہیں مفلسی سے ڈراتا ہے اور شرمناک طرز عمل اختیار کرنے کی ترغیب دیتا ہے' مگر اللہ تمہیں اپنی بخشش اور فضل کی امید دلاتا ہے۔ اللہ بڑا فراخ دست اور دانا ہے۔ جس کو چاہتا ہے' حکمت عطا کرتا ہے اور جس کو حکمت ملی' اسے حقیقت میں بڑی دولت مل گئی۔ ان باتوں سے صرف وہی لوگ سبق لیتے ہیں جو دانشمند ہیں۔"

شیطان تمہیں فقر اور تنگدستی کا خوف دلاتا ہے۔ اس وجہ سے تمہارے نفوس کے اندر حرص' بخل پیدا کرتا ہے۔ شیطان تمہیں فاشی کا حکم دیتا ہے۔ عربی زبان میں فحاشی ہر اس معصیت کو کہتے ہیں' جس میں انسان حد سے تجاوز کر جائے۔ اگرچہ زیادہ تر اس کا استعمال

ایک خاص معصیت میں ہوتا ہے۔تاہم یہ لفظ عام ہے۔ تنگدستی کا یہ خوف ہی تھا' جس کی وجہ سے ایام جاہلیت میں اقوام عرب اپنی بچیوں کو زندہ درگور کر دیتے تھے جو ایک قسم کی فحاشی تھی۔ اسی طرح زیادہ سے زیادہ دولت سمیٹنے کا جذبہ انہیں سود خوری پر آمادہ کرتا تھا۔ جو ایک قسم کی فحاشی تھا۔ نیز یہ خوف کہ انفاق فی سبیل اللہ سے وہ تنگدست ہو جائیں گے بجائے خود فحاشی ہے۔

ایک طرف شیطان تمہیں تنگدستی سے ڈراتا ہے اور فحشاء پر آمادہ کرتا ہے' جبکہ دوسری جانب اللہ تعالیٰ تمہیں مغفرت کا یقین دلاتا ہے اور وعدہ کرتا ہے کہ انفاق فی سبیل اللہ پر وہ تمہیں اجر عطا کرے گا۔ وَ اللّٰهُ يَعِدُكُمْ مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَ فَضْلًا ۗ .... "لیکن اللہ تمہیں اپنی بخشش اور فضل کی امید دلاتا ہے۔"

یہاں لفظ مغفرت کو پہلے لایا گیا ہے' اس لئے کہ فضل و کرم مغفرت کے بعد ہوتا ہے۔ اور اس فضل و کرم میں اس سرزمین پر وسائل رزق بھی شامل ہیں یعنی بطور جزائے انفاق فی سبیل اللہ اس دنیا میں بھی رزق فراواں عطا ہو گا۔ وَ اللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۶۸﴾ ... "اللہ بڑا فراخ دست اور دانا ہے۔"

وہ اپنی وسعت اور فراخ دستی سے عطا کرتا ہے' وہ تمام دلی خلجانات کو بخوبی جانتا ہے۔ وہ انسانی ضمیر کے تمام میلانات اور رجحانات سے بھی واقف ہے' اس لئے وہ فقط مال ہی عطا نہیں کرتا' فقط مغفرت ہی نہیں کرتا بلکہ وہ حکمت و دانشمندی بھی عطا کرتا ہے۔ اور دانشمندی اور حکمت سے انسان میں توازن اور اعتدال پیدا ہوتا ہے۔ انسان اسباب اور مقاصد کے ادراک سے بہرہ ور ہوتا ہے۔ اور اس کے نتیجے میں انسان ہر چیز کو اس کی ماہیت کے مطابق مقام عطا کرتا ہے۔ اور وہ تمام فیصلے فہم و فراست کے ساتھ سوچ سمجھ کر کرتا ہے۔

يُّؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَ مَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا ۗ
.... "جس کو چاہتا ہے' حکمت عطا کرتا ہے اور جس کو حکمت ملی' اسے حقیقت میں بڑی دولت مل گئی۔"

اسے میانہ روی دی گئی اور اعتدال نصیب ہوا' اس لئے وہ انتہاپسندی اور حد سے تجاوز سے محفوظ ہو گیا۔ اسے تمام چیزوں کے اسباب اور نتائج سمجھائے گئے۔ اس لئے وہ اشیاء کی قدر و قیمت کے تعین میں غلطی نہیں کرتا' اسے روشن بصیرت دی گئی' اس لئے وہ حرکات و سکنات اور اعمال و افعال میں سے صالح اور صائب کا انتخاب کرتا ہے اور یہ ایک ایسی دولت ہے جو مختلف رنگوں میں ظاہر ہوتی ہے۔

وَ مَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ .... "ان باتوں سے صرف وہی لوگ سبق لیتے ہیں جو دانشمند ہیں۔" غرض وہی لوگ سبق لیتے ہیں جو صاحب بصیرت ہیں اور عقلمند ہیں۔ ایسے لوگ سبق کو یاد بھی کرتے ہیں' بھول نہیں جاتے۔ ایک دفعہ اگر متنبہ ہو جائیں تو پھر غفلت نہیں کرتے۔ اگر کسی واقعہ سے عبرت پکڑیں تو پھر گمراہی کے راستے پر نہیں پڑتے۔ یہ سب کام عقل کے فرائض میں شمار ہوتے ہیں۔ عقل کا یہ فرض منصبی ہے کہ وہ راہ ہدایت اور اس کے نشانات کو پالے۔ وہ معقول روش اختیار کرے اور لہو و لعب کی بے مقصد زندگی نہ گزارے۔

یہ حکمت اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جسے پسند کرتا ہے' اسے عطا کر دیتا ہے۔ یہ حکمت و دانائی اللہ کی مشیت پر موقوف ہے۔ اسلامی تصور حیات کا یہ اصل الاصول ہے۔ یہاں ہر چیز کا مرجع اللہ جل شانہ کی بااختیار مشیت ہے۔ ہاں اس کے ساتھ ساتھ قرآن کریم نے ایک دوسرا اصول بھی بیان کیا ہے۔ وہ یہ کہ جو شخص بھی راہ ہدایت کی تلاش کا ارادہ کرے اور اس کے لئے پوری جدوجہد کرے تو اللہ تعالیٰ کبھی بھی اسے راہ ہدایت پانے سے محروم نہیں کرتا بلکہ وہ اس سلسلے میں اس متلاشی کی پوری پوری اعانت کرتا ہے۔

وَ الَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ۭ وَ اِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ ....

"جو لوگ ہماری خاطر مجاہدہ کریں گے انہیں ہم اپنے راستے دکھائیں گے' اور یقیناً اللہ نیکو کاروں ہی کے ساتھ ہے۔" (۲۹:۶۹) اس لئے ہر وہ شخص جو راہ ہدایت اختیار کرنا چاہتا ہے' پوری طرح مطمئن رہے کہ مشیت ایزدی اس کا حصہ ضرور کرے گی اور اسے راہ ہدایت کے ساتھ ساتھ حکمت و دانشمندی بھی عطا ہوگی اور اسے اس کے ساتھ ساتھ خیر کثیر بھی عطا ہوگی۔

ذرا رکئے! اس سے قبل کہ ہم اس آیت پر غور و خوض ختم کریں۔ ایک دوسری اور اہم حقیقت کی طرف اشارہ ضروری ہے۔ ذرا غور کیجئے "شیطان تمہیں مفلسی سے ڈراتا ہے۔ اور شرمناک طرز عمل اختیار کرنے کی ترغیب دیتا ہے مگر اللہ تمہیں اپنی بخشش اور فضل کی امید دلاتا ہے۔ اللہ بڑا فراخ دست اور دانا ہے۔ جس کو چاہتا ہے حکمت عطا کرتا ہے اور جس کو حکمت ملی' اسے حقیقت میں بڑی دولت مل گئی۔"

انسان کے سامنے صرف دو راستے ہیں' کوئی تیسرا راستہ نہیں ہے۔ ایک اللہ کا راستہ ہے اور ایک شیطان کا راستہ ہے۔ وہ یا تو اللہ کے وعدہ کی طرف کان لگائے گا اور یا شیطان کی پکار پر لبیک کہے گا۔ اور یاد رکھو کہ جو شخص اللہ کی راہ پر گامزن نہیں اور اللہ کی پکار نہیں سن رہا ہے' وہ شیطان کی راہ پر گامزن ہے اور اس کے ورغلانے میں آگیا ہے۔ صرف ایک ہی طریق زندگی ہے' یعنی حق کا راستہ۔ وہ منہج' وہ نظام جسے اللہ تعالیٰ نے وضع کیا۔ اس کے علاوہ جو بھی راستہ ہے وہ شیطان کا راستہ ہے اور اس کی انتہا شیطان تک ہے۔ وہ شیطان تک پہنچاتا ہے۔

قرآن کریم اس حقیقت کو بار بار بیان کرتا ہے۔ بار بار اس کی تاکید کرتا ہے۔ اس لئے کہ جو شخص اسلامی طریقۂ حیات کو ترک کرکے شیطانی نظام زندگی اختیار کرنا چاہتا ہے' اس کے لئے کوئی ایسا دعویٰ کرنے کی کوئی گنجائش نہ رہے کہ وہ کسی طرح بھی راہ ہدایت پر ہے۔ اس میں اب نہ کوئی شبہ کی گنجائش ہے اور نہ اس میں کوئی پوشیدگی ہے۔ ایک جانب اللہ ہے اور دوسری طرف شیطان ہے۔ ایک طرف خدائی طریق حیات ہے اور دوسری جانب شیطانی طریقۂ کار ہے۔ ایک طرف اللہ کی راہ ہے دوسری جانب شیطان کی راہ ہے۔ جو چاہے جس راستے کو اختیار کرے۔ لِّيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ وَّيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ ....
"اور جسے ہلاک ہونا ہے وہ دلیل روشن کے ساتھ ہلاک ہو اور جسے زندہ رہنا ہے وہ دلیل روشن کے ساتھ زندہ رہے۔" (۸:۴۲) کوئی بات پوشیدہ نہ ہو۔ کوئی شک و شبہ کی گنجائش نہ ہو۔ یا گمراہی ہے اور یا راہ مستقیم ہے۔ یہ راہ راست ہی حق اور سچائی ہے اور یہی واحد راہ ہے۔ اس راہ کے علاوہ جس قدر راہیں ہیں وہ سب باطل ہیں اور ضلالت کی راہیں ہیں۔

اس اہم نکتے کے بعد ہم اصل بات کی طرف آتے ہیں۔ یعنی صدقہ اور انفاق فی سبیل اللہ۔ جو شخص بھی اللہ کی راہ میں جو کچھ بھی خرچ کرے اللہ کو اس کا پوری طرح علم ہے۔ وہ صدقہ ہو یا نذر ہو۔ وہ خفیہ ہو یا اعلانیہ ہو' وہ اللہ کے علم میں ہوتی ہے اور علم الٰہی کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ وہ اس فعل پر بھی اجر دیتا ہے اور اس فعل کے پس منظر میں جو نیت اور ارادہ پنہاں ہوتا ہے' اس پر بھی اجر ملتا ہے۔

وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ نَّفَقَةٍ اَوْ نَذَرْتُمْ مِّنْ نَّذْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُهٗ ۗ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ﴿۲۷۰﴾ اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِيَ ۚ وَاِنْ تُخْفُوْهَا وَتُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۗ وَيُكَفِّرُ عَنْكُمْ مِّنْ سَيِّاٰتِكُمْ ۗ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۲۷۱﴾

"تم نے جو کچھ بھی خرچ کیا ہو اور جو نذر بھی مانی ہو' اللہ کو اس کا علم ہے' اور ظالموں کا کوئی مددگار نہیں۔ اگر اپنے صدقات اعلانیہ دو تو یہ بھی اچھا ہے' لیکن اگر چھپا کر حاجت مندوں کو دو تو یہ تمہارے حق میں زیادہ بہتر ہے۔ تمہاری بہت سی برائیاں اس طرز عمل سے محو ہو جاتی ہیں۔ اور تم جو کچھ کرتے ہو اللہ کو بہرحال اس کی خبر ہے۔"

انسان اپنی دولت میں سے جو کچھ بھی خرچ کرتا ہے' اس پر صدقہ کا اطلاق ہوتا ہے۔ زکوٰۃ' خیرات و صدقات اور جہاد فی سبیل اللہ کے لئے دیا جانے والا مال سب صدقات کے ضمن میں آتے ہیں۔ نذر بھی انفاق فی سبیل اللہ کی ایک قسم ہے۔ صرف فرق یہ ہوتا ہے کہ انفاق کرنے والا ایک معلوم چیز کو اپنے اوپر لازم کر دیتا ہے۔ اللہ کے سوا کسی کے لئے' کسی کی راہ میں' کسی کی وجہ سے' کسی قسم کی نذر دینا منع ہے۔ اللہ کے سوا' اس کے بندوں میں سے کسی کی نذر ماننا ایک گونہ شرک ہے۔ جس طرح مشرکین اپنے الہوں اور بتوں کے استھانوں پر مختلف جانور ذبح کرتے تھے اور یہ کام جاہلیت کے مختلف ادوار میں ہوتا رہا ہے۔

وَ مَاۤ اَنۡفَقۡتُمۡ مِّنۡ نَّفَقَةٍ اَوۡ نَذَرۡتُمۡ مِّنۡ نَّذۡرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ یَعۡلَمُهٗ .... "تم نے جو کچھ بھی خرچ کیا ہو اور جو نذر بھی مانی ہو' اللہ کو اس کا علم ہے۔" مومن کا یہ عقیدہ کہ ذات باری کو اس کی نیت کا پورا علم ہے' وہ اس کے ضمیر کی پوشیدہ خواہشات سے بھی خبردار ہے اور اس کی تمام خفیہ حرکات بھی اس کی نظر میں ہیں' اس کے شعور میں مختلف قسم کے زندہ احساسات پیدا ہو جاتے ہیں۔ وہ اس بات سے پرہیز کرتا ہے کہ اس کی سوچ اور اس کے عمل میں کسی قسم کی ریاکاری یا دکھاوا پایا جائے۔ وہ بخیلی اور کنجوسی سے نفرت کرنے لگتا ہے۔ اس کے دل میں کمی وسائل اور فقر مسکنت کا خوف پیدا نہیں ہوتا۔ اس کا یہ شعور پختہ ہو جاتا ہے کہ وہ اللہ کے ہاں پوری پوری جزا پالے گا۔ وہ راضی برضا ہو کر اطمینان اور راحت کی زندگی بسر کرنے لگتا ہے۔ وہ اللہ کے دربار میں اس کے انعامات کا شکر ادا کرتے ہوئے حاضر ہوتا ہے۔

لیکن اس کے برعکس جو شخص حق نعمت ادا نہیں کرتا' وہ اللہ اور اپنے بندوں کے حقوق ادا نہیں کرتا۔ وہ اللہ کے دیئے سے خیرات و صدقات نہیں ادا کرتا' تو وہ شخص ظلم کا ارتکاب کرتا ہے۔ وہ اپنے عہد کے ساتھ ظلم کرتا ہے' عوام الناس پر ظلم کرتا ہے' خود اپنے نفس پر ظلم کرتا ہے' وَ مَا لِلظّٰلِمِیۡنَ مِنۡ اَنۡصَارٍ .... "اور ظالموں کا کوئی مددگار نہیں۔"

پس داد و دہش انصاف اور عدل ہے اور عدم انفاق ظلم اور بربریت ہے۔ اور اس باب میں لوگوں کی صرف دو قسمیں ہیں جو اللہ کے عہد پر قائم رہتے ہوئے' اللہ کے دیئے ہوئے انعامات کا شکر ادا کرتے ہوئے' ان میں خرچ کرتا ہے' دوسرا وہ ظالم ہے جو اللہ کے عہد کو توڑتا ہے اور لوگوں کے حقوق ادا نہ کر کے ناشکری کرتا ہے اور ظالم ہے وَ مَا لِلظّٰلِمِیۡنَ مِنۡ اَنۡصَارٍ .... "اور ظالموں کا کوئی مددگار نہیں ہے۔"

صدقہ اگر نفلی ہو تو اس صورت میں اللہ کے ہاں پسندیدہ یہ ہے کہ وہ خفیہ ہو' اور اس لائق ہے کہ اس میں ریاکاری اور دکھلاوے کا شائبہ تک نہ ہو۔ لیکن اگر صدقہ' صدقات واجبہ اور فرائض میں سے ہو' تو اس میں اطاعت اور حکم کی بجا آوری کا پہلو بھی ہوتا ہے۔ اور اس پہلو کا اظہار اور اشاعت زیادہ مطلوب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں

اِنۡ تُبۡدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِیَ ۚ وَ اِنۡ تُخۡفُوۡهَا وَ تُؤۡتُوۡهَا الۡفُقَرَآءَ فَهُوَ خَیۡرٌ لَّكُمۡ .... "اگر اپنے صدقات اعلانیہ دو تو یہ بھی اچھا ہے لیکن اگر چھپا کر حاجت مندوں کو دو تو تمہارے حق میں زیادہ بہتر ہے۔" اس میں ان دونوں حالتوں کا ذکر کر دیا گیا ہے۔ اس لئے ہر صورت کو اس وقت کے موجودہ حالات کی نسبت سے اختیار کیا جاتا ہے اور ہر بات عملاً موجود۔ حالات کے مطابق اچھی یا بری شمار ہوتی ہے۔ بہرحال اہل ایمان انفاق فی سبیل اللہ کے لئے جو صورت بھی اختیار کریں' اس

پر ان کے ساتھ وعدہ کیا جاتا ہے کہ یہ ان گناہوں کا کفارہ ہو گا۔ يُكَفِّرُ عَنْكُمْ مِّنْ سَيِّاٰتِكُمْ .... "تمہاری بہت سی برائیاں محو کر دے گا۔" ایک طرف اہل ایمان کے دل خدا خوفی اور برائی کے مقابلے میں پرجوش اور ہوشمند ہو جاتے ہیں اور دوسری طرف وہ راحت، اطمینان کا صلہ پاتے ہیں۔ اور نیت اور اعمال کے ہر مرحلے اور ہر حال میں وہ تعلق باللہ قائم رکھے ہوئے ہوتے ہیں۔ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ .... "اور تم جو کچھ کرتے ہو اللہ کو بہر حال اس کی خبر ہے۔"

یہاں مناسب ہے کہ انفاق فی سبیل اللہ کی ان طویل ہدایات پر قدرے غور کریں۔ ان ہدایات میں مختلف انداز میں ترغیب و ترہیب سے بھی کام لیا گیا ہے۔ اس غور و فکر سے ہمیں دو باتیں حاصل ہوتی ہیں۔ پہلی یہ کہ اسلامی نظام میں انسان کے مزاج اور اس کی طبیعت کا پورا پورا خیال رکھا گیا ہے۔ انسانی مزاج میں بخل اور کنجوس داخل ہے۔ انسان مال سے بے حد محبت کرتا ہے۔ اور اس بات کی ضرورت ہے کہ بار بار اسے انفاق فی سبیل اللہ پر آمادہ کیا جائے۔ اس کے سرانجام دینے کے لئے اسے بار بار جوش دلاتے رہنا چاہئے تاکہ وہ اس بخل اور لالچ سے ذرا بلند ہو کر سوچے اور بخل و کنجوسی کے بندھنوں سے رہائی پائے۔ اور اس رتبہ بلند پر فائز ہو جو اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے لئے پسند کیا ہے۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ اگرچہ عربی معاشرہ میں جود و کرم ایک عام صفت تھی لیکن وہ لوگ جود و کرم محض اس لئے کرتے تھے کہ انہیں شہرت عام نصیب ہو، ان کی فیاضی کا ڈھنڈورہ پٹ جائے۔ شہروں، اور بازاروں میں ان کا تذکرہ ہو۔ اسلام کے لئے یہ آسان نہ تھا کہ وہ ابتدائے کار ہی میں لوگوں سے یہ مطالبہ کرے کہ وہ ان امور میں سے کسی کا انتظار کئے بغیر ہی اللہ کی راہ میں خرچ کریں۔ اور ان امور میں سے کسی کا کوئی لحاظ نہ رکھیں۔ صرف اللہ کی ذات پیش نظر ہو اور عوام الناس کو خاطر ہی میں نہ لائیں۔ یہ مقام تو ایک طویل تعلیم و تربیت ہی سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ وہ بھی ایک طویل جدوجہد کے بعد۔ یہ تو تب حاصل ہو گا کہ لوگوں کو یہ بلند مقام حاصل کرنے کے لئے مسلسل پکارا جائے اور ان کو تزکیہ اور اخلاص کی تربیت دی جائے۔ چنانچہ تحریک اسلامی نے مسلسل یہ کام جاری رکھا۔

یہی وجہ ہے کہ یہاں اب اہل ایمان سے روئے سخن پھیر کر، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کیا جاتا ہے۔ اور روئے سخن اس لئے پھیر دیا جاتا ہے کہ وہ تمام حقائق یہاں ذہن نشین کر دیئے جائیں جن کا اسلامی تصور حیات کی نشوونما میں بہت زیادہ دخل ہے۔ اور اسلامی نظام زندگی کے حوالے سے، اسلامی طرز عمل اختیار کرنے اور انسانی طرز عمل کو درست کرنے میں وہ بہت زیادہ اثر انداز ہوتے ہیں۔

لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ ؕ وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ ؕ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ﴿۲۷۲﴾

☆ ☆ ☆

"لوگوں کو ہدایت دینے کی ذمہ داری تم پر نہیں ہے۔ ہدایت تو اللہ ہی جسے چاہتا ہے بخشتا ہے۔ اور خیرات میں جو مال تم خرچ کرتے ہو، وہ تمہارے اپنے لئے بھلائی ہے۔ آخر تم اسی لئے خرچ کرتے ہو کہ اللہ کی رضا حاصل ہو۔ تو جو کچھ مال تم خیرات میں خرچ کرو گے، اس کا پورا پورا اجر تمہیں دیا جائے گا اور تمہاری حق تلفی ہرگز نہ ہو گی۔"

ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباس ﷺ کے ذریعہ حضور ﷺ سے یہ روایت کی ہے کہ حضور ﷺ یہ حکم فرماتے تھے کہ صرف اہل

اسلام پر صدقہ کیا جائے۔ یہاں تک کہ یہ آیت نازل ہوئی "لوگوں کو ہدایت دینے کی ذمہ داری تم پر نہیں ہے....." تو آپ نے حکم دیا کہ جس دین کے پیرو کار بھی تم سے سوال کریں انہیں صدقہ دیا کرو۔

دل اللہ کے ہاتھ میں ہوتے ہیں۔ اللہ کی مخلوق میں سے یہ بات کسی کے اختیار میں نہیں ہے کہ وہ کسی کو ہدایت دے یا گمراہ کر دے۔ اگرچہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم خود ہوں۔ ہدایت دینا یا گمراہ کرنا اللہ وحدہ کی ذات کا کام ہے۔ اس لئے کہ وہ دلوں کا خالق ہے۔ دلوں پر صرف اللہ کی حکمرانی ہے۔ صرف اللہ ہی دلوں کو موڑ سکتا ہے۔ وہی ہے جو دلوں کو حکم دے سکتا ہے۔ رسول کا کام صرف یہ ہے کہ وہ پیغام اچھی طرح پہنچا دے۔ رہی ہدایت تو یہ صرف اللہ کا کام ہے۔ وہ جسے چاہے ہدایت نصیب کر دے کیونکہ وہی ہدایت دینے کا مستحق ہے۔ ہدیت دینا صرف اللہ کا استحقاق ہے۔ انسان سے اس استحقاق کو لے لینا محض اس لئے ہے کہ ایک مومن طلب ہدایت کے لئے صرف اللہ کی طرف رجوع کرے اور وہ صرف اللہ ہی سے دلائل ہدایت اخذ کرے۔ اس کا دوسرا فائدہ یہ ہے کہ اس استحقاق کو صرف خاصہ خدا اقرار دینے کے بعد اب ایک داعی کے لئے یہ جواز باقی ہی نہیں رہتا کہ وہ گمراہ لوگوں کے ساتھ نفرت کرے یا ان کی ہٹ دھرمی کی وجہ سے دل تنگی محسوس کرے۔ اس لئے کہ وہ انہیں مسلسل دعوت دیتا رہے گا۔ ان کے ساتھ رحیمانہ برتاؤ کرے گا اور اس بات کا انتظار کرے گا کہ کب اللہ میاں ان کے دلوں کو اجازت دیتا ہے کہ وہ راہ راست پر آ جائیں؟ کب انہیں توفیق بخشتا ہے کہ وہ اس سمت قدم اٹھائیں اور اپنے اللہ کو پہچانیں۔

لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ .... "لوگوں کو ہدایت دینے کی ذمہ داری تم پر نہیں ہے۔ ہدایت تو اللہ ہی ہے جسے چاہتا ہے بخشتا ہے۔" لہٰذا تم انہیں کھلے دل کے ساتھ دعوت دو اور ان کے لئے سینہ کھول دو۔ ان پر اپنی رحمت اور حسن عمل کا فیضان کرو۔ ان کے ساتھ بھلائی کرتے رہو اور ان کے لئے مددگار ثابت ہو جہاں تک بھی وہ تمہاری امداد کے محتاج ہوں۔ انہیں حکم دیتے رہو کہ وہ اللہ کی طرف لوٹ آئیں اور اس امداد کا اجر اللہ کے ہاں محفوظ ہے۔

یہاں آ کر ہم ان بلندیوں تک پہنچ پاتے ہیں جن کے آفاق وسیع اور روشن ہیں۔ اللہ تعالیٰ اہل ایمان کے دل و دماغ کو ان بلندیوں تک پہنچا دیتے ہیں اور ان پر ان کے دلوں کو مستحکم کر دیتے ہیں۔ اسلام نہ صرف یہ کہ مذہبی آزادیوں کا اصول متعین کرتا ہے' نہ صرف یہ کہ وہ دینی امور میں جبر و تشدد کا ہی قلع قمع کرتا ہے بلکہ وہ اس سے بھی آگے بڑھ کر مذہبی رواداری کی ایسی فضا قائم کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہدایات پر مبنی ہے اور وہ یہ اصول طے کرتا ہے کہ بلا امتیاز مذہب و عقیدہ' معاشی تعاون اور معاشی امداد کے دروازے تمام لوگوں پر کھلے ہیں۔ بشرطیکہ وہ امت مسلمہ کے ساتھ حالت جنگ میں نہ ہوں۔ وہ یہ یقین دلاتا ہے کہ ایسے حالات میں غیر مسلموں پر خرچ کرنے والوں کا اجر بھی عند اللہ محفوظ ہے' بشرطیکہ یہ انفاق فی سبیل اللہ محض حصول رضائے الٰہی کے لئے ہو۔ انسانیت کی یہ ایک ایسی سربلندی ہے' جس سے ایک جست میں وہ ایک مقام بلند تک پہنچ جاتی ہے اور یہ مقام بلند اسے صرف اسلام کے طفیل ہی نصیب ہو سکتا ہے اور صرف وہی لوگ اس مقام بلند کی حقیقت پا سکتے ہیں۔ جو صحیح معنوں میں مسلمان ہوں۔

وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ ؕ وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ ؕ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ

"اور خیرات میں جو مال تم خرچ کرتے ہو وہ تمہارے اپنے لئے بھلائی ہے۔ آخر تم اسی لئے تو خرچ کرتے ہو کہ اللہ کی رضا حاصل

ہو۔ تو جو کچھ مال تم خیرات میں خرچ کرو گے' اس کا پورا پورا اجر تمہیں دیا جائے گا۔ اور تمہاری حق تلفی ہرگز نہ ہوگی"

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مومنین کی شان کی جو جھلک دکھائی ہے' وہ ہمارے پیش نظر رہنی چاہئے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اہل ایمان جب خرچ کرتے ہیں تو وہ وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ .... "تم اسی لئے تو خرچ کرتے ہو کہ اللہ کی رضا حاصل ہو۔" ایک مومن کی صفت بس یہی ہے' اس کے سوا کچھ نہیں ہے۔ وہ یہ ہے کہ وہ صرف رضائے الٰہی کے لئے خرچ کرتا ہے۔ وہ خواہشات نفسانیہ یا کسی غرض اور مطلب براری کے لئے نہیں خرچ کرتا۔ وہ یوں انفاق فی سبیل اللہ نہیں کرتا کہ انفاق کرے اور پھر کان لگا کر بیٹھ جائے اور سنے کہ لوگ کیا کہتے ہیں۔ وہ اس لئے خرچ نہیں کرتا کہ وہ اپنے انفاق کے ذریعہ لوگوں کی گردنوں پر سوار ہو جائے۔ ان پر اپنی برتری ثابت کرے اور ان کے مقابلے میں اپنے آپ کو بڑا ثابت کرے۔ وہ اس لئے نہیں خرچ کرتے کہ ان سے صاحبان اقتدار لوگ راضی ہوں یا وہ انہیں اس کا کوئی بدلہ دیں۔ وہ تو صرف حصول رضائے الٰہی کے لئے خرچ کرتے ہیں۔ خالص اللہ کے لئے۔ اس لئے دل مومن اس پر مطمئن ہوتا ہے کہ اللہ میاں اس صدقہ کو ضرور قبول فرمائیں گے۔ نیز اسے پورا پورا اطمینان ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے مال میں برکت دے گا۔ اسے یہ اطمینان بھی ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نہ صرف یہ کہ اسے پورا پورا اجر دے گا بلکہ اس پر مزید انعام بھی ہوگا۔ اسے پورا اطمینان ہوتا ہے کہ اللہ کی مخلوق پر احسان اور انفاق کے نتیجے میں اللہ کی جانب سے وہ احسان اور بھلائی کا مستحق ہے۔ چنانچہ اس داد و دہش کی وجہ سے اس کا تزکیہ نفس ہوتا ہے۔ اس کے اخلاق پاکیزہ ہوتے ہیں۔ اور اس کی شخصیت بلند ہو جاتی ہے۔ جب تک وہ اس جہاں میں زندہ ہوتا ہے رہی جزائے آخرت تو وہ بہرحال اعلیٰ و افضل ہوتی ہے۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ خیرات و صدقات کے مصارف میں سے خصوصاً ایک مصرف کا ذکر فرماتے ہیں۔ مومنین میں سے ایک گروہ کی تصویر پیش کی جاتی ہے جو صاف و شفاف ہے۔ شریفانہ اور باوقار ہے۔ اس تصویر کو دیکھ کر انسانی شعور میں تلاطم برپا ہوتا ہے۔ اس تصویر کو دیکھ کر دل مومن حرکت میں آتا ہے اور نفس انسانی ایسی شخصیات کا ادراک کر لیتا ہے جو کسی جانب سے کسی قسم کی امداد حاصل کرنے کو پسند نہیں کرتیں۔ اس لئے ان کی عزت نفس کو کسی طرح بھی ٹھیس نہ لگے۔ اور وہ طلب حاجت نہیں کرتیں۔ مبادا کہ انہیں حقیر سمجھ لیا جائے۔ اس لئے وہ دست سوال دراز کرنے پر آمادہ نہیں ہو پاتیں۔ اور نہ وہ اس سلسلے میں اظہار مطلب کرتی ہیں۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں :-

☆ ☆ ☆ لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ ۡ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ ۚ تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ ۚ لَا يَسْئَلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا ۭ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ

الربع ۳۷ ع ۷ ۵

"خاص طور پر مدد کے مستحق وہ تنگ دست لوگ ہیں جو اللہ کے کام میں ایسے گھر گئے ہیں کہ اپنی ذاتی کسب معاش کے لئے زمین میں کوئی دوڑ دھوپ نہیں کر سکتے۔ ان کی خودداری دیکھ کر ناواقف آدمی گمان کرتا ہے کہ یہ خوش حال ہیں۔ تم ان کے چہروں سے ان کی اندرونی حالت پہچان سکتے ہو۔ مگر وہ ایسے لوگ نہیں ہیں کہ لوگوں کے پیچھے پڑ کر کچھ مانگیں۔ ان کی اعانت میں جو مال تم خرچ کرو گے وہ اللہ سے پوشیدہ نہ رہے گا۔"

یہ پرتاثیر صفت مہاجرین کی ایک جماعت پر پوری طرح منطبق تھی۔ وہ اپنے پیچھے اپنی دولت اور اپنا خاندان چھوڑ کر آئے ہوئے تھے۔ وہ مدینہ میں قیام پذیر تھے اور انہوں نے اپنے آپ کو جہاد فی سبیل اللہ کے لئے وقف کر لیا تھا۔ یہ لوگ ہروقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے باڈی گارڈ تھے۔ مثلاً اہل صفہ جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اقامت گاہوں کے محافظ بھی تھے۔ کوئی دشمن ان سے آنکھ چرا کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اقامت گاہوں تک نہ پہنچ سکتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ جہاد فی سبیل اللہ کے لئے وقف تھے اور کسب معاش یا تجارتی مقاصد کے لئے ادھر ادھر نہ جاسکتے تھے۔ اس صورت حال کے باوجود وہ لوگوں سے کچھ مانگتے بھی نہ تھے۔ وہ اس قدر خوددارانہ رویہ اختیار کئے ہوئے تھے کہ جو شخص ان کے حالات سے واقف نہ ہوتا وہ سمجھتا کہ یہ تو بہت ہی خوش حال اور فارغ البال لوگ ہیں۔ نہ کسی سے کچھ مانگتے ہیں اور نہ ہی کوئی کاروبار کرتے ہیں۔ صرف اصحاب عقل و دانش ان کی اصل صورت حال و کیفیت کو سمجھ پاتے تھے۔

لیکن اس ابتدائی مصداق کے باوجود' یہ آیت عام ہے۔ اس کا اطلاق ہر دور اور ہر زمانے میں پائے جانے والے لوگوں پر ہوتا ہے جو شرفاء میں سے ہوں جو ایسے حالات میں محبوس ہوں کہ وہ ان میں تلاش معاش نہ کر سکتے ہوں۔ اور ان کی شرافت نفس انہیں اس بات سے روک رہی ہو کہ وہ کسی سے سوال کریں۔ وہ بظاہر ایسا رویہ رکھتے ہوں جس سے ان کی اصل حالت کا اندازہ نہ ہو سکتا ہو اور ان کی اس ظاہری حالت کے پس پردہ جو صورت حال ہو' ناواقف آدمی ان کی اس خودداری کی وجہ سے اس کا صحیح اندازہ نہ کر سکتا ہو' ہاں ایک حساس اور سمجھدار شخص ہی ان کی اصل صورت حال سے واقف ہو سکتا ہو۔ اس لئے کہ کسی بھی شخص کے اندرونی تیز احساسات چہرے پر آہی جاتے ہیں۔ اگرچہ وہ شخص حیاء اور خودداری کی وجہ سے انہیں چھپانے کی بہتیری کوشش کرتا ہو۔

یہ ایک ایسی تصویر ہے جو گہرے اشارات کی مظہر ہے۔ یہ مختصر آیت ان شرفاء کی ایسی تصویر بناتی ہے۔ یہ ایک مکمل تصویر ہے اور خودداری اور حیاچشمی کے رنگوں سے بنی ہوئی ہے۔ اس آیت کا ہر جملہ گویا نقاش کی قلم کی نوک ہے۔ جو ان لوگوں کے خدوخال کو کاغذ پر منقل کرتی چلی جارہی ہے اور اس تصویر سے ان کے تاثرات اور احساسات کا پوری طرح اظہار ہوتا ہے۔ جونہی ایک انسان ان آیات کی تلاوت کرتا ہے' اس کی لوح دماغ پر ان حضرات کی تصاویر منقش ہو جاتی ہیں۔ اس طرح کہ گویا وہ شخصیات نظروں کے سامنے کھڑی ہیں۔ وہ چہرے صاف نظر آرہے ہیں۔ انسانیت کے مختلف نمونوں کی تصویر کشی میں قرآن کریم کا یہی انداز ہے۔ مختلف قسم کے انسان یوں نظر آتے ہیں کہ گویا وہ زندہ اور متحرک شخصیات ہیں۔

ان شرفاء اور فقراء کی حالت یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنی ضروریات اور حاجات کو یوں چھپاتے ہیں جس طرح ایک انسان اپنے ستر کو چھپاتا ہے۔ ایسے لوگوں کو اگر کچھ دیا جائے گا تو وہ صرف تنہائی میں دیا جائے گا تاکہ ان کی خودداری اور عزت نفس کو ٹھیس نہ لگے۔ یہی وجہ ہے کہ آیت کے آخر میں ایک قسم کا اشارہ دیا جاتا ہے کہ ایسے لوگوں کی امداد بھی نہایت ہی خفیہ طریقے سے کی جانی چاہئے۔ چنانچہ انفاق کنندہ کو یقین دہانی کرائی جاتی ہے کہ اللہ خوب جانتا ہے۔ اور اس کی پوری پوری جزا دینے والا ہے۔ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ .... "ایسے لوگوں کی اعانت میں جو مال تم خرچ کرو گے وہ اللہ سے پوشیدہ نہ رہے گا۔" یہ صرف اللہ ہی ہے جو خفیہ بھیدوں کو بھی جانتا ہے اور اس کے ہاں کوئی بھلائی بغیر اجر کے ضائع نہیں ہوتی۔

سب سے آخر میں اس ضابطہ انفاق فی سبیل اللہ کا خاتمہ ایک عام اور ایک کلیہ پر مشتمل آیت پر ہوتا ہے۔ جو ہر قسم کے انفاق اور صدقات کو شامل ہے۔ اور اس کا حکم بھی عام ہے اور ہر اس چیز کو شامل ہے جو اللہ کے لئے دی جائے۔

اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ

عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿٢٧٤﴾

"جو لوگ اپنے مال شب و روز کھلے اور چھپے خرچ کرتے ہیں ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے۔ اور ان کے لئے کسی خوف و رنج کا مقام نہیں۔"

اس خاتمہ کلام پر اس آیت کی عمومیت اور ہم آہنگی بہت ہی خوبصورت نظر آتی ہے۔ آیت کا آغاز اور اختتام ایک موزوں سر کی طرح باہم متوازن اور اصول عام کی صورت میں دوبارہ دہرایا جاتا ہے۔ اور بہت ہی موزونیت کے ساتھ اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ .... "وہ لوگ جو اپنے اموال خرچ کرتے ہیں۔" یعنی ہر قسم کے مال اور دولت جو وہ خرچ کرتے ہیں۔ اس میں کوئی تخصیص نہیں ہے۔ بِالَّيْلِ وَ النَّهَارِ سِرًّا وَّ عَلَانِيَةً .... "شب و روز' چھپے یا کھلے۔" یعنی جن اوقات اور جن حالات میں بھی وہ انفاق فی سبیل اللہ کرتے ہیں فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ .... "تو ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے۔" ان کا ہر قسم کا اجر محفوظ ہے۔ اس میں اضافہ بھی ہو گا' اس سے ان کی عمر میں برکت بھی ہو گی۔ آخرت میں بھی پوری پوری جزا ملے گی۔ اور اللہ کی رضامندی اس پر مستزاد ہو گی۔ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ...... کسی جانب سے بھی انہیں کوئی خوف نہ ہو گا۔ کسی جانب سے کسی کی کا کوئی خدشہ نہ ہو گا۔ نہ دنیا میں ہو گا نہ آخرت میں ہو گا۔ غرض دستور انفاق فی سبیل اللہ کا یہ موزوں اور مناسب اختتامیہ ہے۔ جس میں یہ اشارات پنہاں ہیں کہ انفاق فی سبیل اللہ اپنی عمومی شکل میں ماجور ہے چاہے وہ جس قسم کا ہو جس وقت ہو' جس مقصد کے لئے ہو۔

یہاں یہ بات نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ اسلام اپنے ماننے والوں کی زندگی کی معیشت کا مدار صرف انفاق فی سبیل اللہ پر نہیں رکھتا۔ اسلامی نظام میں معیشت کا دارومدار اس پر تھا کہ ہر اس شخص کے لئے' جو قدرت رکھتا ہو' روزگار کے مواقع فراہم کئے جائیں۔ اس کے علاوہ اسلام نے اپنی معیشت کا دارومدار' اہل اسلام کے درمیان' دولت کی منصفانہ تقسیم پر رکھا ہے اور دولت کی اس تقسیم کا اصول حسن کارکردگی اور استحقاق پر رکھا گیا ہے لیکن بعض اوقات ایسے استثنائی حالات درپیش ہو جاتے ہیں' جن میں معیشت کے عمومی اصول کارآمد نہیں ہوتے اور ان حالات میں درپیش مشکلات ان سے حل نہیں ہوتیں۔ ایسے حالات کو اسلام انفاق فی سبیل اللہ کے ذریعہ حل کرتا ہے۔ یہ انفاق بعض اوقات تو ایک لازمی ٹیکس کی صورت میں ہوتا ہے' جسے وہ اسلامی حکومت نافذ کرتی جو اسلامی شریعت نافذ کرنے والی ہو۔ صرف اسلامی حکومت ہی اس قسم کا لازمی ٹیکس نافذ کر سکتی ہے۔ زکوۃ اور صدقات واجبہ اسلامی حکومت کے محاصل میں سے اہم ہوتے ہیں اور بعض اوقات یہ تقسیم دولت صدقات نفلیہ کی صورت میں ہوتا ہے جس کی مقدار کا تعین نہیں ہوتا اور یہ نفلی صدقات اہل ثروت کی جانب سے مستحقین کے لئے ہوتے ہیں۔ جو انہیں ذاتی طور پر دیئے جاتے ہیں۔ اور اس قسم کا عطیہ دیتے وقت ان آداب اور شرائط کا لحاظ رکھنا ضروری ہوتا ہے جن کا اوپر ذکر ہوا۔ اور ان آداب ہی کی وجہ سے لینے والے خودداری کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ یہی خودداری ہے جس کا اظہار اس آیت میں ہوا ہے۔ اس خودداری کو اسلام نے اسلامی معاشرہ میں اس قدر ترقی دی تھی کہ ایک شخص کے پاس کچھ بھی نہ ہوتا اور وہ معمولی ضروریات زندگی کا بھی محتاج ہوتا' تب بھی وہ دست سوال کسی کے سامنے دراز نہ کرتا۔

بخاری نے عطاء ابن یسار اور عبدالرحمن بن ابی عمرہ سے روایت کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم نے ابو ہریرہ سے سنا۔ فرمایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "مسکین وہ نہیں ہوتا جسے ایک کھجور یا دو کھجوریں لوٹا دیں۔ یا ایک لقمے یا دو لقموں کے لئے وہ بھیک مانگتا پھرے' مسکین وہ ہوتا ہے جو خوددار ہو۔" اگر تم چاہو تو اس آیت کو پڑھو لَا يَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا ....

"وہ لوگوں کے پیچھے پڑکر سوال نہیں کرتے۔"

امام احمد نے ابوبکر' عبدالحمید بن جعفر' اس کے والد کے واسطہ سے قبیلہ مزینہ کے ایک شخص کی روایت نقل کی ہے۔ اس شخص کو اس کی والدہ نے مشورہ دیا کہ دوسرے لوگوں کی طرح تم کیوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جاکر سوال نہیں کرتے؟ اس نے کہا کہ میں چلا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ مانگوں۔ پہنچا تو آپ تقریر فرما رہے تھے "جس نے خودداری کی اللہ تعالیٰ اسے دے دے گا اور جو شخص استغناء کرے گا اللہ تعالیٰ اسے غنی بنا دے گا۔ جو شخص لوگوں سے سوال کرتا ہو حالانکہ اس کے پاس پانچ اوقیہ کے برابر مال موجود ہے تو گویا اس نے اصرار کر کے سوال کیا (الحافا)" میں نے اپنے دل میں کہا "میرے پاس ایک اونٹنی ہے جو یقیناً پانچ اوقیہ سے زیادہ قیمتی ہے۔ اور میرے غلام کے پاس ایک دوسری اونٹنی ہے' وہ بھی یقیناً پانچ اوقیہ سے زیادہ قیمتی ہے۔" اس لئے میں واپس ہو گیا اور درخواست نہ کی۔

حافظ طبرانی نے اپنی سند کے ساتھ' محمد بن سیرین سے روایت کی ہے۔ حارث کو (ایک شخص جو قریشی تھے اور شام میں رہتے تھے) خبر ملی کہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کے مالی حالات ٹھیک نہیں تو اس نے انہیں تین سو دینار بھجوائے۔ ابوذر نے جواب دیا: "کیا عبداللہ کو مجھ سے زیادہ تنگ دست اور کوئی نظر نہیں آیا۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا "جو شخص سوال کرے اور اس کے پاس چالیس درہم ہوں تو اس نے الحاف کیا۔" ابوذر کے خاندان کے پاس چالیس درہم موجود ہیں ایک بکری اور دو نوکر بھی موجود ہیں۔ ابوبکر بن عیاش نے کہا کہ ماھنان سے مراد خادمان ہے۔

غرض اسلام ایک مکمل نظام زندگی ہے۔ اس کے نصوص' اس کی ہدایات اور اس کے قوانین سب کے سب بیک وقت کام کرتے ہیں ان نصوص وہدایات اور قوانین کے دفعات پر علیحدہ علیحدہ غور نہ کیا جائے گا۔ اسلام کے اصول اور ضابطے بیک وقت روبعمل ہوتے ہیں۔ اس لئے ان میں باہم تناسق اور تناسب ہوتا ہے۔ اور اس کے نتیجے میں ایک ایسا معاشرہ وجود میں آیا ہے جس کی نظیر اس کرۂ ارض پر انسانی معاشروں میں نہیں ہوتی۔ وہ اپنی نوعیت کا ایک منفرد معاشرہ ہوتا ہے۔

☆ ☆ ☆

درس ۲۰ ایک نظر میں

گزشتہ سبق میں'اسلامی نظام زندگی میں انفاق فی سبیل اللہ اور صدقہ کا دستور اور طریقہ بیان کیا گیا تھا۔ یہاں انفاق اور صدقے کا عین صفحہ بالمقابل الٹا جاتا ہے۔ یعنی نظام ربا اور اس کے ظالمانہ اور سیاہ کارانہ نتائج صدقہ میں تو داد و دہش' احسان و پاکیزگی ہے اور طہارت و جوانمردی ہے۔ باہم تعاون اور تکافل ہے۔ جبکہ سود خوری میں بخل اور کنجوسی' گندگی اور نجاست' خود غرضی اور ذاتی مفاد ہے۔

صدقہ کا خلاصہ یہ ہے کہ اس میں دنیا میں مال کو ترک کر لیا جاتا ہے۔ اور بظاہر اس کا کوئی عوض یا بدلہ نہیں لیا جاتا' اور ربا کا خلاصہ یہ ہے کہ قرض روپیہ واپس لینے کے ساتھ ساتھ سود خور کچھ زیادہ بھی وصول کرتا ہے۔ یہ زائد دولت مدیون کی محنت یا اس کے گوشت اور خون سے لی جاتی ہے۔ محنت سے اس صورت میں جب مدیون نے مال لیا' اس کے ساتھ محنت کی اور اس کی محنت کے نتیجے میں اسے منافع حاصل ہوا۔ اس صورت میں تو زائد دولت محنت کا حصہ ہو گی لیکن اگر اسے نفع نہ ہوا یا اسے خسارہ ہو گیا تو اس صورت میں اس کے خون پسینہ کا حصہ ہو گی۔ یا مثلاً قرض اس نے ذاتی اخراجات یا اپنے خاندان کے ضروری اخراجات کے لئے لیا ہو اور اسے نفع بخش کاروبار میں لگایا ہی نہ ہو تو اس صورت میں بھی سود کی رقم گویا' اس شخص کی ذات سے وصول ہو گی۔

یہی وجہ ہے کہ اگر صدقہ روشن صفحہ ہے تو ربا اس کے بالمقابل ایک تاریک صفحہ ہے۔ انفاق کرنے والے کا چہرہ اگر روشن ہے تو سود خور کا چہرہ تاریک اور سیاہ ہے۔ اس لئے کہ اس حسین و جمیل اور پاک وصاف اور رحیم و کریم چہرے کے بیان کے متصلاً بعد سود خور کے بدنما چہرے کو بھی پیش کر دیا گیا۔ اس چہرے کو ایسے انداز میں پیش کیا گیا ہے کہ جس سے سودی کاروبار کی تمام اندرونی برائیاں اور قباحتیں اس چہرے سے عیاں ہو گئیں' افراد کا سنگدلانہ طرز عمل' ناداروں کی ہلاکت اور معاشرہ میں اس سودی نظام سے پیدا ہونے والی تمام برائیاں اور فسادات ظاہر ہو گئے۔

اسلام نے دور جاہلیت کی کئی برائیوں کو ختم کیا' لیکن اسلام نے جس قدر مذمت سود خوری کی کی ہے' اس قدر مذمت کسی دوسری برائی کی نہیں کی ہے۔ نیز اسلام نے سود خوری کے خلاف جس طرح لفظی اور معنوی دھمکی دی ہے' اس قدر کسی بھی دوسری برائی کے ارتکاب کرنے والے کو نہیں دی گئی۔ ان آیات میں بھی اور ان کے علاوہ دوسرے مقامات پر بھی۔ اور اللہ کی ذات یقیناً دور رس حکمتوں کا احاطہ کرنے والی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ دور جاہلیت میں جو سودی نظام جاری و ساری تھا اس کے اپنے مفاسد اور قباحتیں تھیں' لیکن آج ہمارے دور سرمایہ داری میں جس طرح اس کے نتائج اور فسادات کھل کر سامنے آ گئے ہیں اور اس کا یہ بدنما چہرہ جس خوش اسلوبی سے بے نقاب ہو کر سامنے آ گیا ہے' دور جاہلیت میں ایسا کبھی نہ تھا۔ اس دور میں یہ مکروہ چہرہ اس طرح بدنما' بد شکل اور پھر تیوری چڑھائے ہوئے نہ تھا جس طرح وہ آج ہے۔ اور ہمارے اس جدید دور میں وہ کھل کر سامنے آ گیا ہے۔

اس وقت کے غالب سودی معیشت پر' اس آیت میں جو خوفناک حملہ شروع کیا گیا ہے' اس کی حقیقی حکمت و افادیت' دور جاہلیت کے مقابلے میں آج اچھی طرح ظاہر ہو رہی ہے جبکہ پوری انسانیت آج اس نظام کی چکی میں پس رہی ہے۔ جو شخص اسلامی نظام زندگی کی اصل حکمت' اس کی حقیقی عظمت اور اس کی جامعیت اور اس کی باریک بینی پر اچھی طرح غور و فکر اور تدبر کرنا چاہتا ہے' وہ ان آیات و نصوص پر غور کر کے وہ کچھ پا سکتا ہے' جو ان لوگوں کے لئے ممکن نہ تھا' جنہوں نے سب سے پہلے ان آیات کا مطالعہ کیا تھا۔ اس لئے کہ آج پوری انسانی معیشت ان نصوص کے ایک ایک حکم کی براہ راست تصدیق کر رہی ہے۔ آج کی پوری انسانیت جو سود کھلاتی ہے اور سود

کھاتی ہے' اس پر مصائب و شدائد کے وہ پہاڑ ٹوٹ چکے ہیں' جنہوں نے اس کی کمر توڑ دی ہے اور اسے پیس کر رکھ دیا ہے۔ اس نظام نے اس کے اخلاق کو بگاڑ دیا ہے۔ اس کی صحت کا معیار گرا دیا ہے' اس کا اقتصادی نظام درہم برہم ہو گیا ہے اور سب سے بڑی خرابی یہ کہ اس کے دین کو تباہ و برباد کر دیا ہے۔ آج دنیا خالق حقیقی کے ساتھ بر سرپیکار ہے۔ جس کی وجہ سے وہ عذاب الٰہی میں مبتلا ہے۔ ایک فرد ہے تو وہ بھی اس عذاب میں گرفتار ہے۔ کوئی قوم ہے یا امت ہے تو وہ بھی اس مصیبت میں گرفتار ہے۔ لیکن نہ تو اس عذاب میں کمی آتی ہے اور نہ ہی کوئی قوم یا امت عبرت پکڑتی ہے۔

گزشتہ سبق میں قرآن نے جو دستور انفاق فی سبیل اللہ وضع فرمایا تھا' تو وہ دراصل اسلام کے اجتماعی اور اقتصادی نظام کا اصل الاصول تھا' مطلوب یہ تھا کہ ایک اسلامی معاشرہ کا اقتصادی نظام باہم بر احسان اور صدقہ و انفاق پر قائم ہو اور اس کے سائے میں لوگ باہم شفیق و ہمدرد بن کر رہیں۔ جبکہ جاہلی نظام' اس کے بالمقابل سود خوری کے ظالمانہ اور گھٹیا درجے کے اخلاقیات پر قائم ہوتا ہے۔ جس میں احسان اور رحم کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔

یہ دونوں نظام دراصل ایک دوسرے کے بالمقابل نظام ہیں۔ ایک اسلامی نظام ہے اور دوسرا سودی نظام ہے۔ اپنے اساسی فکر کے اعتبار سے یہ کبھی ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔ کسی اساس پر یہ متحد نہیں ہو سکتے۔ نہ اپنے اثرات و نتائج کے اعتبار سے وہ ایک جیسے ہو سکتے ہیں۔ ہر ایک اپنے مخصوص تصور حیات' اپنے اہداف و مقاصد کے پیش نظر کام کرتا ہے اور یہ دونوں نظام پوری طرح ایک دوسرے سے متضاد ہیں۔ ان دونوں کے نتائج بھی ایک دوسرے سے بالکل مختلف مرتب ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ چھوٹتے ہی اس نظام پر یہ خوفناک حملہ کیا گیا اور جو لوگ نظام سود خوری کے کل پرزے ہیں انہیں خوفناک نتائج کی دھمکی دی گئی۔

اسلام اپنے اقتصادی نظام' بلکہ اپنے پورے نظام کی بنیاد اس سچائی کے اساسی تصور پر رکھتا ہے جو اس کائنات میں موجود ہے۔ یہ سچائی ذات باری ہے۔ وہ اس کائنات کی خالق ہے۔ وہ اس زمین کی خالق ہے۔ وہ اس انسان کی خالق ہے۔ وہی تو ہے جس نے ہر موجود کو انور وجود سے آراستہ کیا۔ وہی تو ہے جو ہر موجود کا مالک ہے۔ اس لئے کہ وہی ہر موجود کا موجد ہے۔ اس نے اس کائنات میں ہر بنی نوع انسان کو اپنا جانشین بنایا۔ اس کائنات میں اس نے جو قوتیں اور جو ضروریات زندگی ودیعت کئے تھے' اس نے انہیں بنی نوع انسان کے تصرف میں دیا۔ لیکن یہ اختیارات ایک وعدے اور ایک شرط کے ساتھ مشروط تھے۔ یہ عظیم کائنات اس نے اس حضرت انسان کے تصرف میں بے قید و بے شرط نہیں دیدی کہ جو چاہے اس میں کرتا پھرے۔ یہاں زندگی بسر کرنے کے لئے' اس نے انسان کے لئے کچھ حدود و قیود واضح طور پر متعین کر دیئے تھے۔ اس نے اسے خلافت فی الارض اس شرط پر دی کہ وہ الٰہی نظام حیات کے مطابق یہاں اپنی زندگی بسر کرے گا۔ وہ اللہ کی شریعت کا پیروکار ہو گا۔ اس لئے یہاں اس کے وہ تمام فیصلے' اعمال' اخلاق اور عبادات جو اس عہد کے مطابق ہوں گے وہ نافذ العمل اور معتبر ہوں گے۔ اور اس کے جو کام اس عہد کے مخالف اور شریعت سے متضاد ہوں گے وہ باطل' کالعدم اور موقوف ہوں گے۔ اور اگر وہ خلاف شریعت کسی اصول و اخلاق کو زبردستی یہاں نافذ کرتا ہے تو وہ ظلم اور عدوان ہو گا۔ اور انہیں نہ مسلمان تسلیم کریں گے اور نہ ہی اللہ انہیں قبول کرے گا۔ لہٰذا اس کرۂ ارض پر حاکمیت صرف اللہ کے لئے مخصوص ہے۔ جس طرح اس کائنات میں حاکمیت صرف اللہ کی جاری و ساری ہے۔ رہے انسان تو وہ حاکم ہوں یا محکوم' ان کی حاکمیت کا ماخذ اور منبع اسلامی نظام زندگی اور اسلامی شریعت کا نفاذ ہے۔ پوری کی پوری انسانیت بھی اگر فیصلہ کر دے تب بھی اسے یہ فیصلہ کرنے کا اختیار نہیں کہ اب وہ اتباع شریعت سے آزاد ہے۔ اس لئے کہ انسان بحیثیت حاکم و مختار یہاں اللہ کا نائب اور ایجنٹ ہے اور اسے یہ ایجنسی ایک چارٹر کے تحت دی گئی ہے۔ جس کی پابندی اس کے لئے ضروری ہے۔ انسان بذات خود اس دولت کا مالک نہیں ہے جو اس کے تصرف میں ہے۔

اس عہد اور چارٹر کی دفعات میں سے ایک اہم دفعہ یہ ہے کہ اس کرۂ ارض پر وہ تمام لوگ جو اپنے خالق پر ایمان لانے والے ہیں' باہم تعاون اور تکافل سے زندگی بسر کریں۔ وہ ایک دوسرے کے ولی اور دوست ہوں اور اللہ تعالیٰ نے انہیں جو وسائل رزق عطا کئے ہیں ان سے سب کے سب فائدہ اٹھائیں۔ باہمی تعاون و تکافل کی اساس پر۔ اس اساس پر نہیں کہ یہ تمام وسائل مطلقاً مشترک ہیں۔ جس طرح مارکسیت جدیدہ کا تصور ہے۔ یہ تکافل و تعاون محدود انفرادی ملکیت کے اساس پر ہے۔ اس محدود ملکیت کی اساس پر اگر کسی کی محنت پھل لائے اور اس کے پاس وافر دولت جمع ہو جائے تو اس کا فرض ہے کہ وہ اللہ کے دیئے میں سے ان لوگوں پر خرچ کرے جو نادار ہیں اور جن کے وسائل محدود ہیں لیکن اس انفاق کے ساتھ ساتھ تمام افراد معاشرہ پر اپنی طاقت و وسعت کے مطابق کسب و عمل فرض کیا گیا ہے۔ جس قدر وسائل اسے میسر ہیں۔ کسی کے لئے یہ جائز نہیں قرار دیا گیا کہ وہ دوسروں پر بوجھ بنے۔ یا باوجود اس کے کہ وہ کسب و عمل پر قادر ہو اور پھر بھی معاشرے سے اجتماعی کفالت کا طالب ہو۔ جیسا کہ اس سے قبل ہم بیان کر چکے ہیں۔ اسلامی نظام کے اس اجتماعی کفالتی نظام کے لئے ہر شریعت نے زکوٰۃ کو فرض قرار دیا ہے اور صدقہ اور انفاق فی سبیل اللہ کو نفلی مدد قرار دیا ہے' جس کی کوئی انتہا اور کوئی حد نہیں ہے۔

اسلام نے اپنے اقتصادی نظام کے اصول وضع کرتے وقت میانہ روی اور اعتدال کو پیش نظر رکھا ہے۔ اس نظام میں انفاق فی سبیل اللہ میں بھی اسراف اور ظلم اور حد سے تجاوز کو منع کیا گیا ہے۔ نیز جو پاک چیزیں یہاں انسان کے لئے جائز قرار دی گئی ہیں' ان سے انتفاع اور تلذذ میں بھی اسراف سے منع کیا گیا ہے۔ اس لئے انسان کی ضروریات زندگی کی مد میں اخراجات کے دائرے کو محدود کر دیا گیا ہے۔ اور اسے دائرہ اعتدال میں محدود کیا گیا ہے۔ محدود ضروریات کے بعد جو بچ جاتا ہے' اس پر زکوٰۃ اور صدقات نافلہ کا ہروقت تصرف رہتا ہے۔ خصوصاً ایسے حالات میں جبکہ ایک مومن کو یہ حکم بھی دیا جاتا ہے کہ وہ اپنی دولت کو نفع بخش کاروبار میں لگائے اور اس میں اضافہ کرتا رہے۔

کاروباری زندگی میں اہل اسلام پر یہ قید لگائی گئی ہے کہ وہ اپنی کاروباری جدوجہد میں کسی کے لئے اذیت اور مضرت کا باعث نہ بنیں۔ اور ایسا کاروبار نہ کریں جس کے نتیجے میں لوگوں تک ان کی ضروریات کی رسد میں کسی قسم کی رکاوٹ پیدا ہو۔ نہ ایسا کاروبار کریں جس کے نتیجے میں دولت بالا بالا چند ہاتھوں تک محدود ہو جائے اور اس کا دائرہ محدود ہو جائے۔ كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةًۢ بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ ؕ .... "تاکہ وہ تمہارے مالداروں کے درمیان گردش نہ کرتا رہے۔" (۵۹ : ۷)

اسلام نے معاشی جدوجہد میں فکر و عمل کی طہارت و پاکیزگی کو بھی لازم قرار دیا ہے۔ اس نے کاروبار میں وسائل و نتائج کی پاکیزگی پر بہت زور دیا ہے۔ کاروبار کی ترقی اور دولت میں اضافہ کرنے کے بارے میں ایسے ضابطے اور قاعدے وضع کئے ہیں جن کے نتیجے میں انسانی ضمیر اور انسانی اخلاق پر برے اثرات نہیں پڑتے۔ نہ ان سرگرمیوں سے معاشرے کے اجتماعی وجود اور اجتماعی زندگی متاثر ہوتی ہے [۱]

یہ سب اصول اور سرگرمیاں اس سچائی کی اساس پر ہیں جو اس پوری کائنات میں جاری ہے۔ یعنی تصور الٰہ اور پھر اس عہد کے دائرے کے اندر جو انسان اور حقیقت وجود کے درمیان طے پایا جو خلیفہ بننے والے انسان کے تمام تصرفات اور سرگرمیوں پر حاوی ہے' جو اللہ کی مملوکہ سرزمین پر فرائض خلافت سرانجام دے رہا ہے۔

یہ وجوہات ہیں جن کے نتیجے میں سود خوری ایک ایسا عمل قرار پاتی ہے' جو اساسی طور پر پوری طرح ایمانی تصور حیات کے ساتھ متصادم ہے۔ اس لئے کہ سودی نظام بالکل ایک علیحدہ تصور حیات پر مبنی ہے۔ ایک ایسا تصور جس میں عقیدۂ توحید اور وجود باری کے لئے

---

[۱] تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو میری کتاب العدالۃ الاجتماعیۃ فی الاسلام

کوئی گنجائش نہیں ہے۔ وہ ایک بے خدا تصور حیات ہے۔ اس لئے سودی نظام میں اس اصول و اخلاق کی کوئی گنجائش نہیں ہے جس اصول اور اخلاق کی اساس پر اللہ تعالیٰ انسانی زندگی کی تنظیم چاہتے ہیں۔

سودی نظام کا اساسی تصور یہ ہے کہ انسانی زندگی اور ارادۂ الٰہی کے درمیان کوئی رابطہ نہیں ہے۔ انسان ابتداء ہی سے اس کرۂ ارض کا مالک ہے۔ اس پر اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی عہد و پیمان کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ اس لئے وہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے جاری کردہ احکام کا سرے سے پابند ہی نہیں ہے۔

اس تصور حیات کے مطابق انسان ان تمام ذرائع کے استعمال میں آزاد ہے' جن کے ذریعہ وہ دولت جمع کر سکے۔ وہ دولت کے بڑھانے اور ترقی دینے میں بھی کسی اصول کا پابند نہیں ہے۔ اسی طرح وہ دولت کے استعمال میں بھی کسی حد و قید کا پابند نہیں ہے۔ اس سلسلے میں اللہ کے ساتھ کسی عہد و پیمان کا بھی پابند نہیں ہے۔ نہ وہ اس بات کا پابند ہے کہ دوسرے لوگوں کی مصلحتوں کو خاطر میں لائے۔ اس لئے اس پر اس بات کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اگر اس کی ذخیرہ اندوزی اور سرمایہ میں بے پناہ اضافے کے نتیجے میں لاکھوں انسانوں کو تکلیف پہنچے۔ بعض اوقات انسان کے بنائے ہوئے قوانین' ایسے شخص کی آزادی پر بعض جزوی پابندیاں عائد کر کے' دولت کی لامحدود ارتکاز کو روکنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مثلاً سود کی شرح پر پابندی عائد کر دی جاتی ہے۔ بعض اوقات انسان کے بنائے ہوئے قوانین بعض مالی چالبازیوں' ظلم و زیادتی' دھوکہ بازی اور مالی ضرر انسانی پر پابندیاں عائد کر دیتے ہیں۔ لیکن یہ پابندیاں ایک روٹین بن جاتی ہیں اور لوگ اپنی اصلی عادت کی طرف لوٹ آتے ہیں۔ اس لئے وہ وہی کام کرنے لگتے ہیں جن کی خواہش ان کے دلوں میں بھی رچی بسی ہوتی ہے۔ یہ انسانی قوانین معاشرے میں وہ اصول رائج اور راسخ نہیں کر سکتے جو خداوند قدوس کی طرف سے نازل کردہ قوانین انسان کے دل میں پیدا کر دیتے ہیں۔ غرض سودی نظام کی نیو ایک غلط اور فاسد اساس پر اٹھائی جاتی ہے۔ اور وہ یہ کہ اس جہاں میں انسان کا مقصد اعلیٰ صرف یہ ہے کہ وہ مال و دولت جمع کرتا پھرے۔ چاہے اس کے لئے جو بھی مکروہ ذریعہ اسے اختیار کرنا پڑے۔ اور پھر وہ اس دولت سے فائدہ اٹھائے اور اسے جس طرح چاہے خرچ کرے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک مادہ پرست شخص کے دل میں اس قدر لالچ پیدا ہو جاتا کہ وہ کتوں کی طرح دولت پر ٹوٹ پڑتا ہے۔ اور سب کچھ حاصل کرنا چاہتا ہے اور اس سے ہر طرح کے مفادات حاصل کرنا چاہتا ہے۔ یوں وہ تمام اصولوں کو پامال کر کے اور تمام جہاں کے مفادات کو قربان کر کے بھی دولت جمع کرنے میں لگا رہتا ہے۔

نظام ربا کا ایک نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ تمام بشریت کو پیس کر رکھ دیتا ہے۔ اس میں افراد اور معاشرے کی زندگی دوبھر ہو جاتی ہے۔ اس کے نتیجے میں اقوام و ملل تباہ ہو جاتی ہیں۔ اور یہ تباہی صرف ان مٹھی بھر لوگوں کے مفاد کے لئے ہوتی ہے جو اس نظام میں روپیہ فراہم کرتے ہیں۔ جو اقوام اس نظام کی زد میں آجاتی ہیں وہ اخلاقی' نفسیاتی اور اعصابی اعتبار سے بھی گر جاتی ہیں' ان اقوام کا مالی نظام خراب ہو جاتا ہے' اور انسانی اقتصادیات میں مناسب نشوونما نہیں ہوتا۔ اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پوری انسانیت پر حقیقی اور عملی اقتدار چند ایسے لوگوں کے ہاتھ میں چلا جاتا ہے' جو اللہ کی اس پوری مخلوق میں ذلیل ترین لوگ ہوتے ہیں۔ اس کے ساتھ وہ پرلے درجے کے فسادی ہوتے ہیں۔ یہ ایک ایسا طبقہ ہوتا ہے جو انسانیت کیلئے اس کرۂ ارض پر کسی قسم کی دوستی' ہمدردی یا ذمہ داری کا کوئی پاس نہیں رکھتا۔ جیسا کہ ہمارے اس جدید دور میں انسانیت کو ایسے ہی ایک گروہ سے واسطہ پڑا ہوا ہے۔ یہ گروہ جس طرح افراد کو روپیہ فراہم کرتا ہے اسی طرح حکومتوں اور اقوام کو بھی روپیہ فراہم کرتا ہے۔ اپنے وہ ممالک جہاں پر یہ گروہ رہائش پذیر ہوتا ہے' ان کے اندر بھی یہ کاروبار کرتا ہے اور بیرونی دنیا میں بھی یہ کام کرتا ہے۔ اور تمام انسانیت کی محنت کا پھل اسے ملتا رہتا ہے۔ اور لوگوں کی خون پسینے کی کمائی غیر محسوس طور پر ان کی تجوریوں کی طرف لوٹتی رہتی ہے۔ اور یہ فائدہ انہیں محض اپنے اس سودی کاروبار کی وجہ سے ملتا رہتا ہے' جس میں خود ان کی محنت و مشقت کا کوئی

دخل نہیں ہوتا۔

نہ صرف یہ کہ لوگوں کی دولت اس گروہ کے ہاتھ میں ہوتی ہے بلکہ اس گروہ کو اس معاشرہ میں مکمل اثر و رسوخ بھی حاصل ہوتا ہے۔ اس گروہ کے پیش نظر نہ اصول ہوتے ہیں' نہ وہ کسی اخلاقی نظام کا پابند ہوتا ہے' نہ وہ کسی دین و مذہب پر یقین رکھتا ہے بلکہ وہ مذہب و اخلاق اور اصول اور کردار کا مزاح اڑانے میں اپنا پورا اثر و رسوخ استعمال میں لاتے ہیں۔ جو اس سودی معاشرے میں انہیں حاصل ہوتا ہے اور اس خوفناک اثر و رسوخ کے نتیجے میں وہ ایسے حالات پیدا کرتے ہیں اور ایسے ایسے منصوبے روبعمل لاتے ہیں اور ایسی فکری فضا پیدا کرتے ہیں جس کے اندر رہ کر وہ اس سودی نظام کی وجہ سے عوام الناس کا مزید استحصال کرتے ہیں۔ ان حالات میں ان کی خساست اور قابل نفرت لالچ کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں رہتی۔ اور ان کے تمام مقاصد پورے ہوتے ہیں۔ اس سلسلے میں ایسے لوگوں کا بہترین اور آسان طریقہ یہ ہوتا ہے وہ عوام کو جنسیت اور لذتیت کا خوگر بنا کر انسانی اخلاق اور عفت کو ختم کر کے انسان کو شہوات و لذتیت کے گندے نالے میں گرا دیتے ہیں۔ اور وہ اس کے اس قدر عادی ہو جاتے ہیں کہ اپنی آخری کوڑی بھی اس میں صرف کر دیتے ہیں۔ چنانچہ ان کی دولت ان کے اقتصادی جال میں پھنستی چلی جاتی ہے۔ یہ کام یوں سرانجام دیا جاتا ہے کہ یہ سودی کاروبار کرنے والے تمام عالمی اقتصادی نظام کو اپنی محدود مصلحتوں کے موافق چلاتے ہیں۔ چاہے ان کے ان اقدامات کی وجہ سے عالمی اقتصادی نظام بدترین بحرانوں کا شکار ہو جائے۔ جن سے آج کل ماہرین اقتصادیات اچھی طرح واقف ہیں۔ اس نظام کے نتیجے میں عالمی صنعتی پیداوار عوام الناس اور پورے انسانی معاشرے کے مفاد کے مقابلے میں چند سرمایہ داروں کے مفاد میں محبوس ہو جاتی ہے جو سرمایہ فراہم کرتے ہیں اور جن کے ہاتھ میں عالمی سرمایہ کی باگیں آجاتی ہیں اور وہ سب تاریں اپنے مفاد میں ہلاتے ہیں۔

یہ اندوہناک واقعہ ہمارے' اس دور جدید میں یوں پایہ تکمیل کو پہنچا کہ دور جاہلیت میں بھی وہ ایسی خوفناک صورت میں نہ تھا۔ اس لئے کہ قرون اولیٰ کے سود خور' جو ایک فرد کی صورت میں یا ایک ادارے کی صورت میں ہوتے تھے وہ اس قدر موثر نہ تھے' جیسا کہ جدید دور کے بنک اور مالی ادارے کام کرتے ہیں۔ ان جدید مالی اداروں کو پوری دنیا میں بڑی بڑی حکومتوں کے اندر اثر و رسوخ حاصل ہوتا ہے۔ وہاں حکومتوں کی خارجہ پالیسیوں اور تجارتی پالیسیوں پر اثرانداز ہوتے ہیں۔ پھر وہ صحافت اور نشر و اشاعت کے عالمی اداروں پر قابض ہیں۔ اپنے مزاج اور نظریات کے مطابق تصانیف لکھواتے ہیں۔ اساتذہ اور یونیورسٹیوں پر ان کا قبضہ ہوتا ہے۔ اور میڈیا پر مکمل طور پر وہ اثرانداز ہوتے ہیں۔ ان وسائل اور ذرائع سے وہ عامۃ الناس میں ایک ایسی ذہنیت پیدا کرتے ہیں کہ وہ عوام جن کا گوشت و پوست وہ کھا رہے ہوتے ہیں۔ ان کا خون چوس رہے ہوتے ہیں اور اس سودی نظام کی وجہ سے ان کی محنت لوٹ رہے ہوتے ہیں وہ ان کے ذہنوں کو اس طرح مسخر کر دیتے ہیں کہ یہ سودی نظام ان کی نظروں میں ایک معقول نظام اور لازمی نظام بن جاتا ہے جو بالکل معقول نظر آتا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اس سودی نظام کے بغیر دنیا اقتصادی ترقی سے محروم رہے گی۔ اور یہ کہ مغربی دنیا کی اقتصادی ترقی محض اس سودی نظام کی وجہ سے ہوئی ہے اور یہ کہ جو لوگ سودی نظام کے خاتمہ کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں وہ عملی لوگ نہیں' محض خیالی گھوڑے دوڑاتے ہیں۔ اور یہ کہ ان کے خیالات و تصورات کی اساس محض اخلاقی نظریات پر ہے یا محض نظریاتی اصولوں پر ہے۔ جن کا عملی دنیا میں کوئی نمونہ موجود نہیں ہے۔ اور نہ ان کے نفاذ کی کوئی راہ ہے۔ اور اگر ایسا کوئی نظام وضع کرنے کی کوشش کی گئی تو اس کے نتیجے میں پوری دنیا کا اقتصادی نظام تباہ ہو جائے گا۔ پھر یہ سود خور ان لوگوں کو مزاح کا نشانہ بناتے ہیں جو موجودہ سودی اقتصادی نظام پر تنقید کرتے ہیں۔ اور یہ مزاح ان لوگوں کے ذریعہ سے کرایا جاتا ہے' جو خود اس سودی نظام کے ڈسے ہوئے ہیں اور صرف اس نظام کی وجہ سے وہ مفلوک الحال ہیں جس طرح آج کا پورا عالمی اقتصادی نظام اس سودی نظام کی وجہ سے خستہ اور تباہ و برباد ہو گیا ہے اور سود خوروں کی یہ عالمی تنظیمیں اس

اقتصادی نظام کو محض اپنی نہج اور اپنی منشاء کے مطابق چلاتی ہیں اور جب بھی وہ ان کی منشاء کے خلاف جائے' یہ اسے ایسے جھٹکے دیتی ہیں اور ایسے مالی بحران پیدا کرتی ہیں کہ ماہرین اقتصادیات کے دماغ درست ہو جاتے ہیں اور وہ اس پورے عالمی مالی نظام کو از سرنو اس مٹھی بھر سود خوروں کی جماعت کے مفادات کے مطابق استوار کر دیتے ہیں۔

خالص اقتصادی نقطۂ نظر سے بھی' یہ سودی نظام ایک ناقص نظام ہے۔ بعض مغربی ماہرین اقتصادیات پر بھی اس کے مفاسد آشکارا ہو چکے ہیں' حالانکہ یہ لوگ اس سودی نظام میں پروان چڑھے۔ اور خود مغربی علوم و ثقافت اور اخلاق و تصورات میں مغربی مالیاتی اداروں کے پروپیگنڈے کی وجہ سے سود کا تصور رچا بسا تھا۔ وہ ماہرین اقتصادیات جو محض اقتصادی نظام کے نقطہ نظر سے سود کے خلاف ہیں' ان میں سرفہرست جرمنی کے ڈاکٹر شاخت ہیں۔ وہ جرمنی بینک "رائخ" کے سابق ڈائریکٹر تھے۔ ۱۹۵۳ء میں انہوں نے دمشق میں جو تقاریر کیں ان میں یہ ایک اہم نتیجہ حیرت انگیز ہے کہ ایک گہرے اور مسلسل شماریاتی عمل سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ پوری دنیا کی دولت آخر کار چند مٹھی بھر سود خوار مالی اداروں کی طرف لوٹتی نظر آتی ہے۔ اس لئے کہ اس نظام میں روپیہ فراہم کرنے والا فائدہ ہی اٹھاتا چلا جاتا ہے جبکہ قرض لینے والا ہر وقت خسارہ اٹھاتا ہے۔ لہذا آخر کار شماریات کے عمل کا نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ دولت ہمیشہ قرض دینے والے سود خواروں کی طرف لوٹتی رہتی ہے۔ ہمارے دور میں شاخت کا نظریہ پوری طرح ثابت ہو چکا ہے۔ اس لئے کہ اس وقت اس کرۂ ارض کی پوری دولت کا حقیقی مالک چند ہزار افراد اور ادارے ہیں۔ دوسرے وہ افراد جو مالک تصور ہوتے' یا کارخانوں کے مالک جو بینکوں سے قرض لیتے ہیں یا وہ لوگ جو ان کارخانوں میں کام کرتے ہیں' یہ سب لوگ دراصل ان مالی اداروں کے کارکن اور ملازم ہیں اور ان کے مفادات کے لئے کام کرتے ہیں یہ چند ہزار افراد اور ادارے اس پوری دنیا کے کارکنوں کی محنت کے نتائج وصول کرتے ہیں۔

سودی اقتصادی نظام کی یہ صرف ایک کمزوری ہے۔ جو نظام بھی سودی لین دین پر مبنی ہو گا' اس میں رقم فراہم کرنے والے اور صنعت و تجارت کے میدانوں میں کام کرنے والوں کے درمیان ہمیشہ مخالفت اور تضاد کا تعلق ہو گا اور وہ ایک جواری کی طرح ایک دوسرے کے ساتھ معاملہ کرتے ہیں اور مسلسل ایک دوسرے کی مخالفت کرتے ہیں۔ قرض دہندہ ہر وقت زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کے درپے ہوتا ہے۔ اس لئے وہ یہ کوشش کرتا ہے کہ دولت کو سمیٹے رکھے اور تجارت اور صنعت کو اس کی بے حد ضرورت ہو جائے اور یوں ایک تاجر اور صنعت کار اسے زیادہ سے زیادہ نفع دینے پر آمادہ ہو جائے۔ وہ شرح سود مسلسل بڑھاتا رہتا ہے یہاں تک کہ قرض لینے والے تاجر اور صنعت کار یہ محسوس کرتے ہیں کہ اس کام میں انہیں کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اس لئے کہ وہ جو کام کرتے ہیں' اس کے نتائج قرض اور سود میں چلے جاتے ہیں' ان کے لئے کچھ نہیں بچتا۔ ایسے وقت مال کا پھیلاؤ ختم ہو کر سکڑتا ہے۔ کارخانے پیداوار بند کر دیتے ہیں۔ کارکن بے روزگار ہو جاتے ہیں۔ لوگوں کی قوت خرید کم ہو جاتی ہے۔ اور جب اقتصادی بحران اس مقام تک پہنچ جاتا ہے تو سود خور اب محسوس کرتا ہے کہ دولت کی طلب ختم ہو گئی ہے' سرمایہ بیکار پڑا ہے تو وہ مجبوراً پھر سود کی شرح کم کر دیتا ہے بلکہ کم کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ اور صنعت کار اور تاجر پھر اس طرف متوجہ ہوتے ہیں اور پھر زندگی میں خوشحالی عود کر آتی ہے۔ یوں یہ دنیا عالمی اقتصادی بحرانوں کا شکار ہوتی رہتی ہے اور ایک عام آبادی اس چکی میں پستا رہتا ہے اور ایک مویشی کی طرح بے خبر رہتا ہے۔

اس نظام میں ہر صارف بالواسطہ سود خوروں کو ان کے حصے کا ٹیکس ادا کرتا ہے۔ اس لئے کہ تاجر اور صنعت کار سود خوروں کو جو نفع ادا کرتے ہیں وہ انہیں اپنی جیب سے نہیں ادا کرتے۔ وہ یہ نفع ایک صارف سے وصول کرتے ہیں۔ وہ اشیائے صرف کی قیمت بڑھاتے ہیں اور یوں یہ سودی رقم پوری انسانیت پر تقسیم ہوتی ہے اور ان سے وصول ہو کر آخر کار سود خوار کے ہاں جمع ہوتی ہے۔ رہے وہ قرض جو حکومتیں ان مالی اداروں سے لیتی ہیں یعنی اصلاحات اور ترقیاتی منصوبوں کے لئے' تو ان کا بوجھ بھی آخر کار ایک عام آدمی پر پڑتا ہے۔

اس لئے کہ حکومت ان قرضوں کا سود ادا کرنے کے لئے لوگوں پر مزید ٹیکس عائد کرتی ہے۔ اور یوں ایک عام آدمی یہ بوجھ بھی اٹھاتا ہے۔ غرض آخر کار ہر شخص سود خوروں کو شرح سود ادا کرنے میں اپنے حصے کا بوجھ اٹھاتا ہے۔ لیکن اس حد تک بھی یہ معاملہ رکتا نہیں۔ یہ استعماریت صرف سودی لین دین پر آکر نہیں رکتی۔ اس کے بعد اس استحصال کے لئے جنگیں شروع ہوتی ہیں۔

یہاں فی ظلال القرآن میں ہمارے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ سودی نظام کے تمام مفاسد گنوا دیں۔ اس کے لئے ایک مستقل بحث کی ضرورت ہے۔[ا] اس لئے یہاں ہم صرف اس قدر تلخیص پیش کرتے ہیں تاکہ جو لوگ صحیح مسلمان بننا چاہتے ہیں 'انہیں یہ معلوم ہو جائے کہ وہ اساسی حقائق کیا ہیں جن کی وجہ سے اسلام نے اس مکروہ سودی نظام کو حرام قرار دیا ہے :-

۱۔ پہلی بات یہ ہے کہ ہمیں اس کے بارے میں اپنے دل و دماغ کو صاف کر لینا چاہئے۔ وہ یہ کہ اسلام کے ساتھ کسی بھی جگہ سودی نظام جمع نہیں ہو سکتا۔ اس کے علاوہ جو عالم' جو مفتی بھی جو بات کہے گا وہ فریب کاری ہے۔ اور صریح دھوکہ ہے۔ اس لئے کہ اسلامی تصور حیات بنیادی طور پر سودی نظام سے متصادم ہے۔ سودی نظام کے نتائج جو عوام کے فکر و عمل میں پیدا ہوتے ہیں یا اس کے نتیجے میں جو اخلاقیات پیدا ہوتی ہیں وہ اسلام کے خلاف ہیں۔

۲۔ سودی نظام پوری انسانیت کے لئے ایک مصیبت ہے۔ صرف ایمان اخلاق' اور تصور حیات کے میدان ہی میں نہیں بلکہ خالص اقتصادی زندگی کی گہرائیوں میں بھی ایک عذاب ہے۔ یہ نظام انسان کی خوشحالی اور فلاح پر ڈاکہ ڈالتا ہے اور انسانیت کی متوازن نشوونما کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ حالانکہ بظاہر اس نظام پر یہ جعلی لیبل لگایا گیا ہے کہ وہ پوری انسانیت کی اقتصادی ترقی کے لئے وضع کیا گیا ہے۔

۳۔ اسلام میں عملی نظام اور اخلاقی نظام کا باہم چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اسلام میں تصور یہ ہے کہ اپنے تمام معاملات اور تصرفات میں انسان اس عہد کا پابند ہے کہ وہ اس کرۂ ارض پر اللہ کا نائب اور خلیفہ ہے۔ اور اس کے تمام تصرفات شرط خلافت سے مشروط ہیں۔ اور یہ کہ یہاں اس کی پوری زندگی امتحان گاہ میں ہے۔ وہ بطور آزمائش یہاں بھیجا گیا ہے۔ اور اس نے اپنی پوری زندگی کا حساب و کتاب ایک دن دینا ہو گا۔ اسلامی نظام زندگی نہ تو صرف اخلاقی نظام ہے جو صرف چند اخلاقی ہدایات پر مشتمل ہو اور نہ ہی صرف عملی نظام ہے' یہ بیک وقت اخلاقی اور عملی ہدایات پر مشتمل نظام زندگی ہے۔ اگر اس نے اچھی طرح اس نظام کو اپنایا تو اسے اس کی پوری زندگی پر اس طرح اجر ملے گا' کہ گویا اس نے عبادت کی۔ اور اگر اس نے اسے ترک کیا تو بعینہ اسی طرح اسے آخرت میں ان دو پہلوؤں پر سزا دی جائے گی۔ چنانچہ اسلام کا اقتصادی نظام اس کے اخلاقی پہلو کے بغیر مکمل نہیں ہوتا۔ اور اسلام کے اقتصادی اخلاقیات کوئی غیر لازم عمل نہیں ہے بلکہ اسلام کے اقتصادی نظام کا وہ لازمی جزو ہیں۔ ان کے بغیر اسلام کا عملی اقتصادی نظام چل ہی نہیں سکتا۔

۴۔ چوتھی بات یہ ہے کہ سودی کاروبار کے نتیجے میں لازماً انسانی ضمیر مردہ اور خراب ہو جاتا ہے۔ انسان کے اخلاق خراب ہو جاتے ہیں۔ دوسرے بنی نوع انسان کے حق میں ایک سود خوار کا رویہ اور اس کے جذبات اچھے نہیں رہتے۔ انسانی معاشرہ کی زندگی دوبھر ہو جاتی ہے۔ معاشرے کی اجتماعی کفالت کا انتظام خراب ہو جاتا ہے۔ سودی نظام کی وجہ سے عوام کے اندر طمع' لالچ' خود غرضی' دھوکہ بازی اور قمار بازی کے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں۔ دور جدید کے ماہرین اقتصادیات سود خوری کو اس بات کی بڑی وجہ تصور کرتے ہیں کہ جس کی وجہ سے سرمایہ گھٹیا درجے کے غیر پیداواری مصارف کی طرف بہہ نکلتا ہے' تاکہ سرمایہ کاری پر یقینی فائدہ حاصل ہو۔

ا۔ اس سلسلے میں وہ قیمتی مباحث قابل ملاحظہ ہیں جو امام مسلم العظیم سید ابوالاعلیٰ مودودی نے اسلام اور جدید اقتصادی نظریات کے نام سے لکھی ہیں۔ (سید قطب)

اور سود ادا کرنے کے بعد اس سے قرض حاصل کرنے والے کے لئے بھی کچھ بچ جائے۔ یہی جذبہ ہے جس کی وجہ سے گھٹیا درجے کی گندی فلموں، گندی صحافت، رقص گاہوں، عیاشی کے اڈوں، شراب خانوں اور ان تمام مصارف میں سرمایہ لگایا جاتا ہے جو اخلاق کے لئے تباہ کن ہوتے ہیں اور جن کے ذریعہ اخلاقی توڑ پھوڑ کا عمل جاری رہتا ہے اور سودی نظام کے تحت ایسے کاموں میں سرمایہ کاری نہیں کی جاتی جو انسانیت کے لئے مفید ہوں بلکہ مقصد یہ ہوتا ہے کہ ایسے منصوبوں میں سرمایہ لگایا جائے جن سے زیادہ سے زیادہ نفع ملے۔ آج کی عالمی اقتصادیات میں یہ روزانہ کا مشاہدہ ہے۔ اور اس کا پہلا سبب سودی کاروبار کا موجودہ نظام ہے۔

۵۔ پانچواں نکتہ یہ ہے کہ اسلامی نظام زندگی ایک مکمل نظام حیات ہے جو باہم مربوط ہے۔ وہ جب سودی کاروبار کو حرام قرار دیتا ہے تو وہ ایک ایسا نظام تیار کرتا ہے، جس میں اس سودی کاروبار کی طرف سے کوئی احتیاج ہی نہیں رہتی۔ وہ اقتصادی زندگی کی تشکیل و تنظیم یوں کرتا ہے کہ کسی شعبے میں سرے سے اس کی ضرورت ہی نہ رہے۔ اور اس سے انسان کی معاشی ترقی کا کوئی گوشہ بھی متاثر نہیں ہوتا۔ اجتماعی اقتصادی ترقی جاری رہتی ہے۔

۶۔ ششم نکتہ یہ ہے کہ جب اسلامی نظام زندگی کو اپنا نظام نافذ کرنے کا موقعہ ملے گا تو اس کی پالیسی یہ نہ ہوگی کہ وہ اجتماعی ترقی کے اداروں کو سرے سے ختم کردے بلکہ پالیسی یہ ہوگی کہ ان اداروں کو سودی کاروبار سے پاک کر دیا جائے۔ چنانچہ ان اداروں سے سودی نجاست کو ختم کر دیا جائے گا۔ یہ ادارے بعض دوسرے اصولوں پر منظم ہوں گے اور اجتماعی ترقی کے لئے کام کرتے رہیں گے۔ ان اداروں میں بینک، کمپنیاں اور جدید اقتصادی ادارے سب شامل ہیں۔

۷۔ یہ نہایت ہی اہم نکتہ ہے۔ ایک مسلمان کو یہ پختہ یقین کر لینا چاہئے کہ یہ بات بالکل محال ہے کہ اللہ تعالیٰ سودی کاروبار کو حرام کر دیں اور پھر صورت حال یہ ہو کہ انسان کی اجتماعی زندگی غیر سودی کاروبار کے ذریعہ چل ہی نہ سکے۔ اسی طرح یہ بھی محال ہے کہ ایک ناپاک، نجس اور مضر چیز ہو اور انسانی زندگی اس کے بغیر استوار نہ ہو سکتی ہو۔ اس لئے کہ اللہ ہی اس کرۂ ارض پر حیات انسانی کا خالق ہے۔ اسی نے اس کرۂ ارض پر انسان کو اپنا خلیفہ قرار دیا ہے اور خود ذات باری کا حکم ہے کہ اس کرۂ ارض پر حیات انسانی کو ترقی دی جائے اور انسان کو سہولیات فراہم کی جائیں۔ ہر کام اللہ تعالیٰ کے ارادے سے ہی سرانجام پاتا ہے۔ وہی ہے جو انسان کو توفیق دیتا ہے کہ وہ اس جہاں میں بھلائی کرے۔ اسی لئے نظریاتی حوالے سے یہ بات محال ہے کہ کوئی چیز اللہ کے ہاں حرام ہو اور اس کے ساتھ ساتھ وہ زندگی کی ترقی اور نشوونما کے لئے ضروری ہو۔ اس کے سوا زندگی میں ترقی نہ کی جاسکتی ہو۔ یا کوئی بھی گندی اور خبیث چیز ایسی ہو، جس کے سوا زندگی قائم نہ رہ سکتی ہو یا اس کے سوا اس جہاں میں زندگی کو ترقی نہ دی جاسکتی ہو جو شخص یہ سوچ رکھتا ہو یقیناً اس کی یہ سوچ غلط ہے۔ اس کا یہ دعویٰ زہر آلود اور یہ تصور غلط تصور ہے۔ جسے نسلاً بعد نسل پھیلایا گیا ہے۔ یعنی یہ کہ سودی نظام دنیا کی ترقی اور نشوونما کے لئے سنگ میل ہے۔ اور یہ کہ سودی نظام ایک قدرتی نظام ہے۔ اس تصور کو دراصل ایک منظم سازش کے ذریعہ تعلیم و ثقافت کے سرچشموں میں داخل کر دیا گیا ہے اور شرق و غرب میں علوم اور تربیت کے منابع کے اندر اسے داخل کر دیا گیا ہے پھر دور جدید میں 'زندگی کی اساس اس نظام پر استوار کر دی گئی ہے۔ اور یہ کام ان افراد اور ایجنسیوں نے کیا ہے جو اس نظام میں سرمایہ فراہم کرنے والی ہیں۔ مشکل یہ درپیش ہے کہ ہر کسی کو زندگی کا نظام سود کے سوا کسی دوسری اساس پر قائم کرنا مشکل نظر آتا ہے۔ یہ مشکل اس وقت ایک بھیانک شکل اختیار کر لیتی ہے جب ایک انسان دولت ایمان سے محروم ہو۔ پھر ذہنی غلامی اور آزادانہ غور و فکر نہ کرنے کی وجہ سے بھی یہ کام مشکل نظر آتا ہے۔ اس لئے کہ سرمایہ فراہم کرنے والی ایجنسیوں نے یہ وہم انسانی دل و دماغ میں یقین کی صورت میں جانشین کر دیا ہے۔ اس لئے کہ ذرائع علم و معرفت پر ان کا مکمل کنٹرول ہے۔ بین الاقوامی

اداروں اور حکومتوں پر ان ایجنسیوں کو مکمل کنٹرول حاصل ہے۔ عام اور خاص نشرو اشاعت کے اداروں پر ان سود خوروں کا مکمل قبضہ ہے۔

۸۔ آٹھویں بات یہ ہے کہ جو لوگ یہ خیال رکھتے ہیں کہ دور جدید میں سودی نظام کے علاوہ کسی اور نظام پر اقتصادی نظام استوار نہیں ہو سکتا' دراصل ایک بے حقیقت وہم ہے۔ یہ دراصل ایک بہت بڑا جھوٹ ہے اور یہ جھوٹ اس لئے رائج ہے کہ بعض طاقتور بین الاقوامی ادارے اسے محض اپنی مصلحت کے لئے زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ جس وقت بھی بین الاقوامی مالی اداروں کی نیت درست ہوگی۔ جس وقت بھی پوری انسانیت اس نظام کو بدلنے کا عزم کرے گی یا کم از کم امت مسلمہ اس کی تبدیلی کا ارادہ کرلے گی اور یہ ٹھان لے گی کہ اب وہ بین الاقوامی مالی اداروں کے چنگل سے آزاد ہونا چاہتی ہے اور وہ اپنی بھلائی کا انتظام خود کرتی ہے' اپنی خوشحالی اور ترقی کے نظام کی اساس' اخلاق اور پاکیزگی پر استوار کرتی ہے تو اسی وقت دنیا کے سامنے بالکل ایک نیا مالی نظام استوار ہو کر سامنے آجائے گا۔ یہ اسلامی نظام ہوگا اور جسے اللہ تعالیٰ نے تمام انسانیت کے لئے پسند کیا ہوا ہے۔ جس کا نفاذ عملاً ہو چکا ہے۔ اس کے سائے میں زندگی نے بھرپور مظاہرہ کیا ہوا ہے۔ اب بھی یہ نظام قابل نفاذ ہے اور اس کے تحت اقتصادی نظام منظم ہو سکتا ہے' لیکن شرط یہ ہے کہ لوگ سمجھیں اور راہ ہدایت پالیں۔

یہاں ہم وہ تفصیلات نہیں دے سکتے جن سے اس نظام کی مکمل تفصیلات اور جزئیات سے بحث کی جاسکے۔ یہاں ہمارے لئے یہ اجمالی اشارات ہی کافی ہیں[۱]۔ ان سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ سود خوری کی یہ برائی اقتصادی زندگی کی ضروریات میں سے نہیں ہے۔ تاریخ انسانیت میں اس سے پہلے بھی یہ سودی نظام چھا گیا تھا اور اسلام نے انسانیت کو اس کے چنگل سے آزاد کرایا تھا۔ آج بھی انسانیت نے اقتصادی بے راہ روی اختیار کرلی ہے۔ اور اسے اس بے راہ روی سے صرف اسلام کا مستحکم' رحیمانہ اور سلیم الفطرت نظام نجات دلا سکتا ہے۔

اب ذرا تفصیل سے ملاحظہ کیجئے کہ سود کے تلخ اقتصادی نظام پر اسلام کس طرح حملہ آور ہوتا ہے۔ اس نظام نے انسانیت کو ان تلخیوں سے دوچار کر دیا ہے۔ جس سے زیادہ کوئی اور تلخی انسانیت کو کبھی نصیب نہیں ہوئی۔

☆ ☆ ☆

[۱] اس سلسلے میں بعض عملی تجاویز مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے پیش کی ہیں جن کا حوالہ میں اس سے پہلے دے چکا ہوں۔ ان پر غور کیا جاسکتا ہے۔ (سید قطب)

درس نمبر۲۰ تشریح آیات

آیت نمبر ۲۷۵ تا ۲۸۱

اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا يَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِيْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّھُمْ قَالُوْٓا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا ۘ وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا ۭ فَمَنْ جَاۗءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَ ۭ وَاَمْرُهٗٓ اِلَى اللّٰهِ ۭ وَمَنْ عَادَ فَاُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ ھُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۷۵﴾ يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ ۭ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِيْمٍ ﴿۲۷۶﴾

جو لوگ سود کھاتے ہیں ان کا حال اس شخص کا سا ہوتا ہے جسے شیطان نے چھو کر باؤلا کر دیا ہو اور اس حالت میں ان کے مبتلا ہونے کی وجہ یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں: "تجارت بھی تو آخر سود ہی جیسی چیز ہے" حالانکہ اللہ نے تجارت کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام کیا ہے۔ لہٰذا جس شخص کو اس کے رب کی طرف سے یہ نصیحت پہنچے اور آئندہ وہ سود خواری سے باز آجائے تو جو کچھ وہ پہلے کھا چکا' سو کھا چکا اس کا معاملہ اللہ کے حوالے ہے اور جو اس حکم کے بعد پھر اسی حرکت کا اعادہ کرے' وہ جہنمی ہے' جہاں وہ ہمیشہ رہیگا۔ اللہ سود کا مٹھ مار دیتا ہے اور صدقات کو نشو ونما دیتا ہے اور اللہ کسی ناشکرے بد عمل انسان کو پسند نہیں کرتا۔"

یہ ایک خوفناک جملہ ہے اور دہشتناک تصویر کشی ہے۔ لَا يَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِيْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ۭ .... "ان کا حال اس شخص جیسا ہوتا ہے جسے شیطان نے چھو کر باؤلا کر دیا ہو۔"

قرآن کریم نے سود خور کی جو تصویر کھینچی ہے جس طرح سود خوار کو زندہ اور متحرک شکل میں پیش کیا ہے۔ اس جیسی تاثیر اور تنبیہ حسین سے حسین معنوی اور نظری پیرایہ اظہار میں نہیں پیدا کی جاسکتی۔ یہ ایسی تصویر کشی ہے جس کے نتیجے میں سود خوار کی تصویر الگ محسوس اور پیش پا افتادہ پیرائے میں نظر آتی ہے۔ اس تصویر کے ذریعے معروف اور عام طور پر تجربے میں آنیوالے کرداروں کو ظاہر کیا گیا ہے۔ قرآن لوگوں کے اس دیکھے ہوئے کردار کو ان کی نظروں میں تازہ کرتا ہے تاکہ یہ کردار انسانی احساس میں خوف پیدا کرے' سرمایہ کاری کرنے والے سود خوروں کے انسانی جذبات جاگیں اور متحرک ہوں۔ انہیں جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر ان کے مروج اور عادی سودی نظام

اقتصادیات سے انہیں نکالا جائے۔ اور انہیں لالچ اور خود غرضی کی اس فضاء سے نکالا جائے جس میں انہیں بہت سے فائدے نظر آتے ہیں۔ اپنی جگہ یہ انداز تربیت بہت ہی مفید ہوتا ہے جبکہ یہ پیرایہ بیان اپنی جگہ حقیقت پسندانہ اور واقعی بھی ہوتا ہے۔

اکثر تفاسیر میں لَا يَقُومُونَ ...... کا مفہوم یہ بیان ہوا ہے کہ اس سے مراد روز قیامت کا قیام اور حشر ہے لیکن میرا خیال یہ ہے کہ اس کرۂ ارض پر ہماری زندگی میں بھی خوفناک تصویر عملاً موجود ہوتی ہے۔ نیز یہ مفہوم کہ دنیا میں سود خوار کی حالت ایسی ہوتی ہے اگلے فقرے کے ساتھ بھی ہم آہنگ ہوتا ہے کہ جو لوگ سودی نظام کو ترک نہیں کرتے وہ دراصل اللہ تعالیٰ کے ساتھ اعلان جنگ کر رہے ہیں ہم دیکھتے ہیں کہ عالم اقتصادیات میں یہ جنگ مسلسل لڑی جارہی ہے اور گم کردہ راہ انسانیت پر یہ جنگ مسلط ہے اور اس نظام میں ایک سود خور اسی طرح دیوانہ وار تگ و دو میں مصروف ہے جس طرح شیطان کا چھوا ہوا شخص دیوانہ ہوتا ہے۔ اس سے پہلے کہ ہم سود خور کی دیوانگی کو زندگی کے عملی نظام میں تلاش کریں ذرا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ حضور اکرم ﷺ کے دور میں نزول قرآن کے وقت سودی اقتصادی نظام جس نہج پر چل رہا تھا ذرا اس کی تصویر کشی کر دیں۔ نیز یہ کہ اس سودی نظام کے بارے میں اہل جاہلیت کے ماہرین اقتصاد کے تصورات کیا تھے۔

سودی نظام عرب اقتصادیات میں نزول قرآن کے وقت ایک معروف نظام تھا اور اس وقت اچھی طرح مروج تھا۔ جس سودی نظام کو ان آیات میں باطل قرار دیا گیا ہے اس کی بڑی دو صورتیں اس وقت رائج تھیں۔ ایک "ربائے میعاد" اور دوسری "ربائے فاضلہ" ربائے میعاد کے بارے میں حضرت قتادہ فرماتے ہیں "یوں ہوتا کہ ایک شخص کسی پر کچھ فروخت کرتا اور ادائیگی ثمن کے لئے وقت مقرر ہو جاتا۔" جب مقررہ وقت آپہنچتا تو مدیوں کے پاس رقم نہ ہوتی تو قرض خواہ میعاد میں اضافہ کر دیتا لیکن زر ثمن میں بھی اضافہ کر دیتا۔"..... اور حضرت مجاہد فرماتے ہیں "جاہلیت میں ایسی صورت پیش آتی کہ ایک شخص کا دوسرے کے ذمے قرض ہوتا تو قرض دار قرض خواہ کے سامنے یہ تجویز پیش کرتا کہ آپ قرض میں تاخیر کر دیں اور اس کے عوض آپ کیلئے یہ رقم ہوگی چنانچہ قرض خواہ موخر کر دیتا۔" امام ابوبکر الجصاص اس سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں "یہ بات طے شدہ ہے کہ جاہلیت میں مروج ربا کی حقیقت یہ تھی کہ وہ ایک قرض ہوتا تھا اور اس میں ایک مقررہ شرح کے عوض میعاد مقرر ہوتی تھی اور شرح سود کا اضافہ اس میعاد کا معاوضہ ہوتا تھا جو مدیون کو دی جاتی تھی' اللہ تعالیٰ نے اسے حرام قرار دیا۔"

امام رازی اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ "میعادی ربا وہ تھی جو جاہلیت میں معروف اور مروج تھی۔ ان میں سے کوئی اپنا مال دوسرے پر ادھار فروخت کرتا اور ہر مہینہ میں ایک مقرر شرح سے سود وصول کرتا اور اصل زر ثمن اپنی جگہ قائم رہتا جب بھی میعاد پہنچی سرمایہ دار سرمایہ کی واپسی کا مطالبہ کرتا۔ اگر مدیون ادا نہ کر سکتا تو وہ سرمایہ اور میعاد دونوں میں اضافہ کر دیتا۔"

حضرت اسامہ ابن زید ؓ کی حدیث میں یہ بات آئی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: لَا رِبَا إِلَّا فِي النَّسِيئَةِ .... "سود صرف میعاد میں ہوتا ہے" (بخاری، مسلم)

"ربائے فاضلہ" دراصل اجناس کے باہم تبادلہ میں ہوتی یعنی ایک جنس کا تبادلہ اسی جنس سے ہو رہا ہو' مثلاً سونے کا تبادلہ سونے سے روپے کا تبادلہ روپے سے' گندم کا تبادلہ گندم سے' جو کا تبادلہ جو سے ہو رہا ہو تو اس میں اگر کوئی فریق زیادہ لے گا تو وہ سود ہو گا۔ اس قسم کے تبادلہ اجناس کو سود میں اس لئے شامل کیا گیا کہ یہ سودی کاروبار کے ساتھ بالکل ہم جنس اور ہم شکل ہے۔ اس میں بھی وہی جذبات کارفرما ہوتے ہیں جو سودی کاروبار کرنے والے تجار کے دل و دماغ پر چھائے ہوئے ہوتے ہیں۔ جدید سودی نظام اقتصادیات پر بحث کرتے

وقت ہمیں "ربائے فاضلہ" کے متعلق وارد ہونے والی حرمت پر زیادہ غور کرنا ہو گا۔

حضرت ابو سعید خدری ؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "سونا سونے کے عوض، چاندی چاندی کے بدلے، گندم گندم کے بدلے، جو جو کے بدلے، کھجور کھجوروں کے بدلے، نمک نمک کے بدلے برابر برابر ہوں گے اور دستی ہوں گے، جس شخص نے اضافہ کیا یا اضافے کا مطالبہ کیا تو گویا اس نے سود کیا۔ سودی معاملات میں لینے والا اور دینے والا دونوں برابر ہیں" (شیخان)

حضرت ابوسعید خدری ؓ سے ایک دوسری روایت میں مروی ہے فرماتے ہیں: "حضرت بلال حضور ﷺ کے پاس "برنی" کھجور لیکر آئے۔" حضور ﷺ نے فرمایا: بلال! یہ کہاں سے لائے؟ فرمایا ہمارے پاس ردی قسم کی کھجوریں تھیں تو ہم نے انھیں ایک صاع کے بدلے دو صاع کے ساتھ تبادلہ کر دیا۔ تو آپ نے فرمایا "بہت افسوس) یہ تو عین ربا ہے۔ ایسا نہ کیا کرو اگر کبھی تمہیں بدلنے کی ضرورت پڑے تو ردی کھجوروں کو علیحدہ سودے میں فروخت کر دو اور پھر رقم کے عوض اچھی خرید لو۔" (بخاری، مسلم)

ربائے میعادی (ربا النسیہ) بالکل واضح ہے، اسکے بارے میں کسی قسم کی تشریح کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ اس لئے کہ اسی میں سودی معاملہ کے تمام اجزاء بالکل واضح نظر آتے ہیں یعنی یہ کہ اصل زر پر اضافہ وہ میعاد جس کی وجہ سے یہ اضافہ کیا گیا اور یہ کہ اس اضافے کا سودی معاہدہ میں بطور شرط طے پانا یعنی سرمایہ کی وجہ جلب از بوجہ میعاد اور مدت ایک خالص سودی معاملہ ہے۔

رہی دوسری قسم یعنی ربائے فاضلہ تو یہ بات اپنی جگہ ایک حقیقت ہے کہ اس میں ہم جنس تبادلہ میں آنیوالی اشیاء کی نوعیت اور قیمت میں بنیادی طور پر فرق ہوتا ہے جس کی وجہ سے اضافہ کا تقاضا پیدا ہوتا ہے۔ حضرت بلال ؓ کے واقعہ میں یہ بات واضح ہو کر آجاتی ہے کہ انہوں نے دو ردی صاع کھجوریں دیں اور ایک صاع اعلیٰ قسم کی لے لیں لیکن دو قسم کی کھجوریں چونکہ ہم جنس ہیں اور دونوں پر کھجور کا اطلاق ہوتا ہے اسی لئے ان میں اضافہ سودی کاروبار کا شبہ پیدا کرتا ہے کیونکہ کھجور کے بدلے کھجور ہی آتی ہے اور اضافے کو حضور ﷺ نے ربا قرار دیا اور اس سے منع فرمایا اور حکم دیا کہ پہلے ردی اور گھٹیا چیز کو فروخت کر کے نقد وصول کرو اور پھر نقد دے کر اچھی چیز لے لو، چاہے اس میں کمی بیشی ہو تاکہ بظاہر معاملے میں سودی کاروبار کا شبہ نہ رہے۔

اسی طرح ایسے تبادلہ میں یہ شرط بھی لگائی گئی کہ ایک تو مقدار برابر ہو اور دوسری یہ کہ ہم جنس اشیائے مبادلہ کو حالاً اپنے اپنے قبضے میں لیا جائے۔ اس سلسلے میں کوئی میعاد مقرر نہ ہو یعنی اگر زیادت نہ بھی ہو تو بھی قبضہ فوری ضروری ہے۔ اس لئے کہ مدت اور میعاد سودی کاروبار کا اہم جز ہے...... اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضور ﷺ کاروبار میں سودی عنصر کے خلاف کس قدر حساس تھے۔ آپ نے اس معاملے میں بے حد سختی کر کے اس وقت نظام جاہلیت میں رائج وشائع سودی نظام کو ختم کرنے کی کوشش کی۔

ہمارے زمانے میں مغرب کے سرمایہ دارانہ نظاموں کے مقابلے میں شکست خوردہ بعض ماہرین اقتصادیات یہ کوشش کرتے ہیں کہ سودی عمل ونظام کو صرف اس شکل میں محدود کر دیا جائے جسے اسلامی اقتصادیات میں "ربائے میعاد" کہا جاتا ہے۔ یہ لوگ حضرت اسامہ کی حدیث سے استدلال کرتے ہیں یا ان آثار سے استدلال کرتے ہیں جن میں بعض سلف صالحین نے دور جاہلیت میں مروج ربا کی شکلوں کو بیان کیا ہے۔ یہ لوگ اسلامی نقطۂ نظر سے دور جدید کے سودی نظام کو ان تمام جدید شکلوں کو جائز گردانتے ہیں جو حرف بحرف دور جاہلیت میں مروج شکلوں کے ساتھ منطبق نہ ہوں۔

ان لوگوں کی یہ حرکت اور یہ سعی لاحاصل صرف اس بات کا اظہار کر دیتی ہے کہ یہ لوگ روحانی اور ذہنی طور پر مغربی سودی نظام کے مقابلے میں بری طرح شکست کھا چکے ہیں۔ اسلام کوئی ایسا نظام نہیں ہے جس میں معاملات کی صرف ظاہری شکل دیکھ کر فیصلہ کر دیا جاتا ہو۔ یہ نظام ایک حقیقی تصور حیات پر قائم ہے۔ اس نے جب ربا کو حرام قرار دیا تو مقصد یہ نہ تھا کہ ربا کی صرف ایک شکل کو حرام قرار

دیدیا جائے اور دوسری شکلوں کو ترک کردیا جائے۔ اسلام ہر اس تصور حیات کا مقابلہ کرتا ہے جو اس کے اپنے تصور حیات کے خلاف ہو۔ وہ ہر اس ذہنیت سے بر سرپیکار ہوتا ہے جو اس کی ذہنیت کے مطابق نہ ہو۔ اس نے "ربائے فاضلہ" کو محض اس لئے حرام قرار دیا کہ اس میں بظاہر سودی ذہنیت کی ایک مماثلت پائی جاتی تھی اور بالکل ایک معمولی سودی شعور پایا جاتا تھا۔

اس لئے ہمارے نزدیک تمام سودی معاملات حرام ہیں۔ چاہے وہ ان سودی معاملات سے ہم شکل ہوں جو دور جاہلیت میں مروج تھے یا جاہلیت جدیدہ میں نئی شکلوں میں سامنے آئے ہیں۔ بشرطیکہ ان شکلوں میں سودی معاملہ کے اساسی عناصر ترکیبی پائے جاتے ہوں یا ان میں سودی ذہنیت کارفرما ہو اور یہ سودی ذہنیت کیا ہے؟ وہ خود غرضی 'لالچ' انفرادیت اور قماربازی ہے جن میں یہ خبیث شعور اور بری نیت پائی جاتی ہے کہ جس طرح ہو فائدہ حاصل کیا جائے چاہے جس طرح بھی ہو۔

اس لئے دور جدید میں اہل اسلام کا فرض ہے کہ وہ اس حقیقت کو اچھی طرح پالیں اور اس بات کا یقین کرلیں کہ کہیں وہ اپنے معاملات میں سودی کاروبار کرکے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے ساتھ اعلان جنگ تو نہیں کر رہے۔

اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا يَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِيْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ

"جو لوگ سود کھاتے ہیں ان کا حال اس شخص کا سا ہوتا ہے جسے شیطان نے چھوکر باؤلا کردیا ہو۔" اس سے مراد صرف وہ لوگ نہیں ہیں جو سودی منافع کماتے ہیں اگرچہ اس خوفناک دھمکی کا پہلا نشانہ یقیناً وہی ہیں اس آیت کے مفہوم میں وہ معاشرہ بھی شامل ہے جس کا تمام لین دین سودی اصولوں پر ہوتا ہے۔ حضرت جابر بن عبداللہ ؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ "رسول اللہ ﷺ سود کھانے والے سود کھلانے والے 'سودی معاہدے کے دوگواہوں اور سودی دستاویز لکھنے والے سب پر لعنت فرمائی اور فرمایا کہ وہ سب کے سب برابر ہیں۔" (مسلم 'احمد 'ابوداؤد' ترمذی)

یہ تو تھے وہ لوگ جو فرداً سودی معاملے کرتے ہیں۔ رہا وہ معاشرہ جس میں سودی کاروبار ہوتا ہے جس کا اقتصادی نظام اصول ربا پر قائم ہے تو اس معاشرے کے تمام افراد قابل لعنت و ملامت ہیں۔ وہ اللہ اور رسول ﷺ کے ساتھ حالت جنگ میں ہیں اور بے شک وہ اللہ کی رحمت سے محروم ہیں۔

ایسے لوگوں کی حالت یہ ہوئی کہ وہ اس زندگی کے ہر موقف میں یوں نظر آتے ہیں کہ گویا وہ آسیب زدہ ہیں۔ پریشان اور مضطرب نظر آتے ہیں ایک نامعلوم خوف اور خطرہ ہروقت ان کے چہروں سے عیاں ہوتا ہے اور دولت اطمینان سے محروم اور مخبوط الحواس نظر آتے ہیں۔ آج سے چار صد سال قبل جب سودی اصول پر مبنی نظام سرمایہ داری وجود میں آیا۔ اس نظام کی ان مضرتوں میں شک و شبہ کی گنجائش موجود تھی لیکن گزشتہ چار سو سالوں کے تجربے نے اس شک کے لئے اب کوئی گنجائش نہیں چھوڑی۔

آج ہم جس جہاں میں رہ رہے ہیں۔ اس کے اطراف و اکناف میں قلق و اضطراب اور خوف خطرات کا دور دورہ ہے 'لوگوں کے اعصاب شل ہو چکے ہیں اور وہ نفسیاتی بیماریوں کا شکار ہیں۔ ہماری اس ترقی یافتہ دنیا کے عقلاء' مفکرین علماء اور پروفیسر کھلے بندوں اس بات کا اعتراف کرتے ہیں اور جن لوگوں نے مغربی تہذیب اور مغربی معاشروں کا مشاہدہ کیا ہے وہ چشم سران بیماریوں اور اعصاب شکن حالات کا مشاہدہ کرچکے ہیں۔ اس کے باوجود کہ مغربی معاشرہ 'مغربی تہذیب کے زیر سایہ اپنی مادی ترقیات کے حوالے سے آج بھی بام عروج پر ہے۔ ان ممالک میں مجموعی پیداوار کا گراف بہت ہی اونچا ہے۔ ہر طرف خوشحالی اور مادی عروج کے مظاہرے ہیں اور نظروں کو چکاچوند کر رہے ہیں۔ اعصابی اور نفسیاتی بیماریوں کے علاوہ یہ معاشرے ہروقت عالمگیر جنگوں کے خطرات سے دوچار ہیں۔ حکومتوں کے درمیان ایک نہ ختم ہونے والی اعصابی کشمکش جاری ہے اور وہ معاشرے ایک نہ ختم ہونے والی اضطراری کیفیات کا شکار ہیں اس لئے کہ ان

کے سر پر ایک نہ ختم ہونے والی جنگ کے خطرات منڈلا رہے ہیں۔

مصائب سے پر اور ہر بھلائی سے محروم ایک ہمہ گیر شقاوت و بدبختی جو جہان مغرب پر چھائی ہوئی ہے اور مغرب کی خالص مادی تہذیب و تمدن کے پاس اس کا کوئی علاج نہیں ہے۔ مادی خوشحالی اور مادی زندگی کی ہمہ گیر سہولتوں اور مغربی ممالک کی اکثریت جہاں زندگی نہایت ہی آسان ہے اور اشیاء ضرورت کی فراوانی ہے اس میں ان بیماریوں کا کوئی علاج نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ ان تمام سہولیات اور فراوانیوں کی کیا قدر و قیمت رہ جاتی ہے۔ اگر ان کی وجہ سے نفس انسانی کو تسلیم و رضا اور طمانیت اور سکون حاصل نہ ہو؟

دور جدید میں یہ ایک عظیم حقیقت ہے جسے اگر کوئی چاہے تو مشاہدہ کر سکتا ہے۔ بشرطیکہ کہ وہ خود اپنی آنکھوں پر از خود وہ مصنوعی پردے نہیں ڈال دیتا جو اس نے خود اپنے لئے تیار کئے ہیں تاکہ وہ بھیانک منظر نہ دیکھے۔ یہ حقیقت ہے کہ اس کرہ ارض کے وہ تمام ممالک جو مادی لحاظ سے ترقی یافتہ ہیں۔ جہاں زندگی کی تمام سہولیات وافر مقدار میں فراہم کی جا رہی ہیں۔ مثلاً امریکا' سوئٹزرلینڈ' وغیرہ جہاں مادی سہولیات کے دریا بہہ رہے ہیں' وہاں کے لوگوں کو دیکھو تو وہ خوشحال ہونے کی بجائے پریشان حال ہیں۔ وہ گہرے قلق میں مبتلا ہیں۔ یہ اندرونی رنج و الم ان کی نظروں سے آنسوؤں کی طرح ٹپک رہا ہے' حالانکہ بظاہر وہ بڑے دولتمند ہیں۔ وہ رات دن میں پیداوار (Production) کے اضافے میں مصروف ہیں لیکن یہ اندرونی قلق ان کی زندگی کو گھن کی طرح کھائے جا رہا ہے۔ اس قلق کو کبھی تو وہ بداخلاقیوں کا ارتکاب کر کے چھپاتے ہیں کبھی شوروشغب میں اسے بھلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ کبھی وہ عجیب و غریب حرکات کا ارتکاب کر کے اسے بھلانے کی کوشش کرتے ہیں اور اس سے بھی مسئلہ حل نہ ہو تو وہ جنسی آوارگی میں پناہ لیتے ہیں۔ اگر پھر بھی افاقہ نہ ہو تو پھر وہ اس ترقی یافتہ اور آسائشوں سے بھرپور زندگی سے فرار اختیار کرتے ہیں۔ اپنے آپ سے بھاگتے ہیں۔ اس خلاء سے بھاگنا چاہتے ہیں جس میں وہ جی رہے ہوتے ہیں۔ انہیں اس پرکشش اور سہولیات سے بھرپور زندگی میں اس قلق و اضطراب کا کوئی منطقی سبب بھی نظر نہیں آتا چنانچہ وہ یا تو پاگل ہو کر اس سے نجات پاتے ہیں اور پھر بھی نہ ہو تو وہ خودکشی کر کے نجات پاتے ہیں۔ جنسی بے راہ روی تو ایک عام بات ہے۔ غرض قلق و اضطراب کا خلا اور گمشدگی کا یہ بھوت بدستور ان کا پیچھا کرتا رہتا ہے اور کسی وقت بھی ان کو چین لینے نہیں دیتا۔

سوال یہ ہے کہ یہ مغربی مادی معاشرہ اس صورت حال سے کیوں دوچار ہے اس کا بڑا سبب یہ ہے کہ اپنی مادی ترقیات کے باوجود مغرب کی روح اندر سے خالی اور تہی دامن ہے۔ وہ سرگرداں گم کردہ راہ ہے اور یہ روح اطمینان سے محروم' اہل مغرب کو روحانی غذاء اور دوا کی ضرورت ہے اور روحانی علاج بغیر ایمان کے نصیب نہیں ہو سکتا۔ اطمینان صرف ذکر الٰہی سے نصیب ہوتا ہے جس سے روح مغرب محروم ہے۔ دوسری بڑی وجہ یہ ہے کہ اہل مغرب انسانیت کے مقاصد بلند سے تہی دامن ہیں جو صرف ایمان کے نتیجے میں وجود میں آتے ہیں۔ جن کے خدوخال ایمان سے متعین ہوتے ہیں۔ ان کا تعین اس معاہدۂ خلافت کے تصور سے ہوتا ہے جس کے امر سے انسان کو اس کرۂ ارض پر اللہ کا نائب بنایا گیا ہے۔

اس بڑے سبب کے ضمن میں پھر مغرب کا سودی نظام بھی ان مصائب کا ایک اہم سبب ہے۔ سودی نظام ایک ایسی مصیبت ہے جس میں اقتصادیات بظاہر تو ترقی پذیر نظر آتی ہیں لیکن دراصل ان میں کوئی ترقی نہیں ہوتی۔ اس لئے کہ سودی نظام میں ترقی میں اعتدال' توازن اور وسعت نہیں ہوتی۔ اس ترقی کے ثمرات عامۃ الناس تک نہیں پہنچتے۔ بلکہ تمام انسانیت کے مقابلے میں اس کے ثمرات اور اس کی برکات سے صرف سود خور فائدہ اٹھاتے ہیں اور سود خوروں کا بھی ایک قلیل گروہ جو سرمایہ فراہم کرتا ہے اور جو بینکوں اور مالی اداروں کے پس منظر میں ہر وقت روپے کھرے کرتا رہتا ہے۔ جو صنعتی اداروں' تجارتی اداروں کو ہر وقت مجبور کرتا رہتا ہے کہ وہ ان کے پسندیدہ پروگرام کے مطابق چلتے رہیں اور ان کے مفادات کے لئے کام کریں۔ ان سود خوروں کا مقصد یہ نہیں ہوتا کہ وہ لوگوں کو ان کی

بنیادی ضروریات فراہم کریں یا ایسی پیداوار سامنے لائیں جس میں معاشرے کا اجتماعی مفاد ہو یا یہ کہ عملاً منظم طریقے سے عامۃ الناس کیلئے فراہمی رزق کا بندوبست کریں یا وہ عامۃ الناس کا اطمینان قلب اور سوشل سیکورٹی کے کوئی مقاصد سامنے رکھتے ہوں بلکہ ان کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ ایسی پیداوار مارکیٹ میں لائی جائے جس سے انہیں زیادہ سے زیادہ مفاد حاصل ہو۔ اگرچہ اس پیداوار کے نتیجے میں ہزاروں لاکھوں افراد شکست و ریخت کا شکار ہوں اور لاکھوں کی زندگی تباہ ہو جائے یا لاکھوں افراد شک' بے اطمینانی اور خوف و خطرے سے دوچار ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان بالکل برحق ہے کہ اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا يَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِيْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ .... "وہ لوگ جو سود کھاتے ہیں ان کا حال اس شخص کا سا ہوتا ہے جسے شیطان نے چھو کر باؤلا کر دیا ہو۔" رسول اللہ ﷺ کے دور میں سود خوروں نے سود کی حرمت پر سخت اعتراضات کئے تھے۔ ان کا سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ سودی اقتصادیات کو حرام قرار دینے اور تجارتی لین دین کو جائز قرار دینے کی کوئی حقیقی وجہ ان کے فہم میں نہیں آتی۔ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْٓا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا ۘ وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا ۭ .... "اس حالت میں مبتلا ہونے کی وجہ یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں "تجارت بھی تو دراصل سود ہی جیسی چیز ہے۔" حالانکہ اللہ نے تجارت کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام کیا ہے۔"

وہ جس اعتراض اور شبہ پر اعتماد کرتے تھے وہ یہ تھا کہ تجارت بھی ایک نفع بخش عمل ہے اور سود خوری بھی ایک نفع بخش عمل ہے حالانکہ یہ ایک بالکل واہیات قسم کا استدلال تھا۔ اسی لئے کہ تجارتی عمل میں نفع و نقصان دونوں کا احتمال ہوتا ہے۔ پھر اس میں شخصی محنت اور مہارت کا بھی عمل دخل ہوتا ہے تجارت میں قدرتی حالات یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ تاجر کو فائدہ ہو یا نقصان ہو لیکن سودی کاروبار میں ہر حالت اور ہر صورت میں فائدہ اور سود متعین ہوتا ہے۔ یہ تجارت اور ربا میں یہ ایک بنیادی فرق ہے اور یہی وہ بڑی علت ہے جس کی وجہ سے ایک کو حلال اور دوسری کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ ہر وہ کاروبار جس میں ہر صورت اور ہر حال میں فائدہ متعین کر دیا گیا ہو وہ حرام ہے اس لئے کہ وہ ربا ہے۔ اس لئے کہ اس میں فائدہ محفوظ و مضمون ہے اور مقرر ہے۔ اس میں کسی ہیرپھیر کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا ۭ .... "اللہ نے تجارت کو حلال کیا ہے اور ربا کو حرام قرار دیا ہے۔" اس لئے کہ سود کے اساسی عناصر ترکیبی تجارت میں نہیں پائے جاتے۔ نیز تجارت کے جواز کے لیے بہت سے دوسرے اسباب و علل بھی ہیں۔ مثلاً یہ کہ تجارتی سرگرمیاں بنیادی طور پر انسانیت کے لئے مفید ہیں اور سودی لین دین اپنی اصل کے اعتبار سے انسانیت کیلئے تباہ کن ہے۔[۱]

جب اسلام آیا تو اس دور میں سودی اقتصادیات جس حالت میں فی الواقعہ رائج تھیں اس نے ان کی حقیقت پسندانہ اصلاح کی۔ ایسی اصلاح جس کی وجہ سے نہ کوئی اقتصادی بحران پیدا ہوا نہ اجتماعی نظام میں کوئی اکھاڑ پچھاڑ ہوا۔ فَمَنْ جَاۗءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَ ۭ وَاَمْرُهٗٓ اِلَى اللّٰهِ ۭ .... "لہذا جس شخص کو اس کے رب کی طرف سے یہ نصیحت پہنچے اور آئندہ کیلئے وہ سود خوری سے باز آ جائے تو جو کچھ وہ پہلے کھا چکا سو کھا چکا' اس کا معاملہ اللہ کے حوالے ہے۔"

اسلام نے اپنے نظام کا دارومدار وعظ و نصیحت اور اصلاح پر رکھا ہے اور اسی مقصد سے اسلام قانون سازی کرتا ہے۔ جو شخص نصیحت پکڑے۔ اللہ کے حکم کو تسلیم کرتے ہوئے سود خوری سے باز آ جائے تو اسلام وہ دولت اس سے واپس نہیں لیتا جو وہ کھا چکا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے۔ قیامت کے دن اس کا فیصلہ اللہ کے ہاتھ میں ہو گا۔ وہ جو چاہے گا فیصلہ کرے گا۔ اس

۱۔ وہ عمدہ بحث جو ان موضوعات پر مولانا ابوالاعلیٰ مودودی ؒ نے کی ہے اور جس کی ہم اس سے پہلے اشارہ کر چکے ہیں وہ ملاحظہ فرمائیں (سید قطب شہیدؒ)

انداز بیان سے اس بات کا اظہار ہوتا ہے کہ ایام ماضیہ میں جو سود کھایا جا چکا ہے اس کا فیصلہ اللہ کی رضا اور مشیئت پر ہے۔ اس سے ایک مسلمان اور خطاکار مسلمان کے دل میں ہروقت یہ ڈر رہتا ہے کہ اس نے جو کچھ کیا وہ بہرحال غلط تھا۔ وہ سوچے گا کہ جو سرمایۂ گناہ وہ جمع کر چکا ہے بس وہ اس کیلئے کافی ہے اور اگر میں نے آئندہ اس برے عمل سے توبہ و استغفار کے ساتھ اجتناب کیا تو امید کی جا سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ سابقہ گناہوں کو معاف فرما دے گا۔ اس لئے مجھے اس سرمایہ میں مزید اضافہ نہیں کرنا چاہئے۔ یوں قرآن مجید اپنے اس منفرد انداز اصلاح کے ساتھ انسانی قلب و شعور کی تربیت کرتا ہے۔

وَ مَنْ عَادَ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ .... "اور جو اس حکم کے بعد پھر اسی حرکت کا اعادہ کرے وہ جہنمی ہے 'جہاں وہ ہمیشہ رہے گا۔"

یہ تہدید اور تنبیہ کہ جو دوبارہ اس حرکت کا ارتکاب کرے گا وہ عذاب آخرت کا مستحق ہوگا۔ یہ بتاتی ہے کہ قرآن کریم کا انداز تربیت کیا ہے۔ قرآن کریم انسان کے دل میں خوف آخرت پیدا کر کے اس کی اصلاح کرتا ہے۔

بعض ایسے لوگ بھی ہو سکتے ہیں جنہیں شاید یہ طویل ڈھیل غرہ میں مبتلا کر دے۔ شاید وہ وعدۂ آخرت کا علم و یقین نہ رکھتے ہوں اور شاید ان کے حساب و کتاب میں عذاب آخرت کا کوئی مقام نہ ہو' اس لئے قرآن انہیں اس حقیقت سے آگاہ کرتا ہے کہ اس دنیا میں بھی سودی نظام نیست و نابود ہوگا اور آخرت میں بھی وہ کالعدم تصور ہوگا۔ قرآن مجید یہ قرار دیتا ہے کہ یہ نظام صدقات ہی ہے جو اس دنیا میں بھی نشوونما پائے گا اور ایک پاکیزہ نظام ہوگا اور آخرت میں بھی وہ موجب اجر ہوگا۔ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی ان ہدایات کو تسلیم نہیں کرتے وہ گناہ گار ہیں اور کفریہ اعمال کے مرتکب ہیں اور اللہ تعالیٰ کافروں اور گناہ گاروں سے نفرت کرتے ہیں۔

يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَ يُرْبِي الصَّدَقٰتِ ؕ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِيْمٍ

.... "اللہ تعالیٰ سود کا مٹھ مار دیتا ہے اور صدقات کو نشوونما دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ کسی ناشکرے بدعمل انسان کو پسند نہیں کرتا۔"

اللہ تعالیٰ کا وعدہ بھی سچا ہے اور اس کی وعید بھی یقینی ہے۔ ہمارے اس دور میں ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ آج کے دور جدید میں جو معاشرے بھی سودی کاروبار کرتے ہیں ان کے افراد کے دلوں میں سکون اور اطمینان نہیں ہے ان معاشروں سے برکت اٹھ گئی ہے اور خوشحالی اور اطمینان قلب ختم ہے۔

اللہ تعالیٰ ربا کو محو کرنا چاہتا ہے اس لئے وہ ایسے معاشرے پر اپنے فیوض و برکات نازل نہیں فرماتا جس میں ربا کی گندگی پائی جاتی ہو۔ ایسے معاشروں کو وہ قحط اور بدنصیبی سے دوچار کرتا ہے۔ بظاہر تو یوں نظر آتا ہے کہ معاشرے میں ہر سو خوشحالی ہی خوشحالی ہے۔ ہر طرف وافر پیداوار نظر آتی ہے۔ ہر طرف سے وافر مقدار میں آمدن ہو رہی ہے لیکن جس قدر زیادہ آمدن ہو رہی ہے اس قدر برکت نظر نہیں آتی۔ اس طرح کہ انسان اس وافر آمدنی سے پاکیزہ طریقے سے امن و اطمینان کے ساتھ فائدہ اٹھائے۔ اس سے پہلے ہم اس محرومی اور بدنصیبی کی طرف اشارہ کر چکے ہیں جو مغرب کے مالدار اور کثیر آمدنیوں والے ممالک میں لوگوں کے چہروں سے ٹپکی پڑتی ہے اور اس روحانی قلق اور پریشانی کا بیان بھی ہم اس سے قبل کر چکے ہیں۔ جس میں زیادہ دولت مندی کی وجہ سے اضافہ ہی ہو رہا ہے' کوئی کمی نہیں ہوتی۔ ان ممالک کی جانب سے یہ قلق و اضطراب اور یہ محرومی اور بدحالی تمام دنیا میں پھیل رہی ہے۔ اس لئے کہ ان ممالک میں انسانیت ایک دائمی اور مسلسل مہلک جنگ میں مصروف ہے۔ وہاں کے لوگ صبح و شام سرد جنگ میں اپنی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ یہ شب و روز کے بعد ان کے اعصاب پر زندگی کا بوجھ بھاری ہوتا جا رہا ہے۔ چاہے انہیں اس کا شعور ہو یا نہ ہو۔ اس ذہنی اور اعصابی کشمکش کی وجہ سے نہ

ان کے مال میں برکت ہوتی ہے' نہ عمر میں برکت ہوتی ہے' نہ ان کی صحت قابل رشک ہوتی ہے اور نہ ان کے دل مطمئن ہوتے ہیں۔

اس کے برعکس جو معاشرہ اجتماعی تعاون اور باہم کفالت پر استوار ہو' چاہے یہ تعاون بذریعہ صدقات واجب ہو یا صدقات نافلہ ہو اور اس معاشرے میں باہم محبت' باہم احسان' باہم رضامندی کی روح کارفرما ہو اور جس میں ہر فرد کی تگ و دو محض اس لئے ہو کہ وہ اللہ کی رضامندی حاصل کرکے اس کے اجر کا مستحق بنے اور جسے ہروقت اطمینان ہو کہ اللہ اس کا مددگار ہے اور وہ صدقہ اور احسان کا اجر اس سے کئی گنا زیادہ دے گا تو ایسے تمام معاشروں پر اللہ تعالیٰ اپنی برکت نازل کرتا ہے' معاشرہ کے افراد پر بھی برکات نازل ہوتی ہیں اور ایسے معاشرہ کی جماعتوں پر بھی فیوض نازل ہوتے ہیں۔ ان کے مال میں برکت ہوتی ہے' ان کے رزق میں فراوانی ہوتی ہے' ان کی صحت میں برکت ہوتی ہے' ان کی قوت میں برکت ہوتی ہے اور ان کے دل اطمینان سے سرشار ہوتے ہیں اور دل برقرار ہوتے ہیں۔

جن لوگوں کو انسان کی موجودہ صورتحال میں یہ حقائق نظر نہیں آتے' وہ اس قسم کے لوگ ہیں جو ان حقائق کو درحقیقت دیکھنا ہی نہیں چاہتے' اس لئے کہ ان کی نفسانی خواہشات یہ تقاضا کرتی ہیں کہ وہ ان حقائق کو نہ دیکھیں۔ یہ لوگ ایسے ہیں جن کی آنکھوں پر پردے پڑ گئے ہیں اور یہ پردے انہوں نے قصداً ڈالے ہوئے ہیں اور یہ لوگ وہ سود خوار ہیں جن کی ذاتی مصلحت اس میں ہے کہ یہ سودی نظام دائم و قائم رہے' اس لئے یہ لوگ ان حقائق کو نہ دیکھ سکے۔

وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِيْمٍ .... "اور اللہ تعالیٰ کسی ناشکرے' بدعمل انسان کو پسند نہیں کرتا۔" اس تعقیب اور نتیجے سے یہ بات قطعی طور پر معلوم ہوجاتی ہے کہ سودی نظام اقتصادیات کی حرمت کے بعد بھی اگر کچھ لوگ اس کے جاری رکھنے پر اصرار کرتے ہیں تو وہ گناہ گار اور کفار ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان سے محبت نہیں کرتا اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ جو لوگ بھی اللہ تعالیٰ کی حرام کردہ چیزوں کو حلال قرار دیتے ہیں ان پر کفر اور گناہ گاری کی صفت کا اطلاق ہوتا ہے۔ اگرچہ وہ اپنی زبان سے ایک ہزار مرتبہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ .... کہتے رہیں' اس لئے کہ اسلام صرف زبانی کلمات کا نام نہیں ہے وہ تو ایک مکمل نظام حیات اور طریقہ عمل ہے اور اس کے کسی ایک جزو کا انکار اس بات کو مستلزم ہے کہ وہ سب کا انکار کردے۔ ربا اور سود خوری کی حرمت میں تو کوئی شبہ نہیں ہے اور اسے حلال تصور کرنے اور اس کی اساس پر اپنی اقتصادیات کو استوار کرنے پر یقیناً ایک شخص گناہ گار ہوتا ہے اور کفر کا ارتکاب کرتا ہے۔ نعوذ باللہ منہ۔

اس کفریہ اور غیر صالح نظام زندگی کے بالمقابل اور سودی اقتصادیات کے حاملین اور حامیوں کے لئے اس حقارت آمیز ڈراوے کے مقابلے میں' قرآن کریم ایمان اور عمل صالح کے باب کا آغاز کرتا ہے جو اس معاملے میں جماعت مسلمہ کی اہم خصوصیات ہیں؟ اور اس ظالمانہ سودی نظام کے بالمقابل جو صالح اسلامی نظام ہے' اس کا مرکزی نکتہ یہاں بیان کیا جاتا ہے' یعنی نظام ربا کے مقابلے میں نظام زکوٰۃ۔[۱]

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝

☆ ☆ ☆ ☆

۱۔ شرح بعض اشیاء میں ۵ فیصد' ۱۰ فیصد' ۲۰ فیصد تک بڑھ جاتی ہے' یعنی معدنیات اور زراعت میں۔

"جو لوگ ایمان لے آئیں اور نیک عمل کریں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں' ان کا اجر بے شک ان کے رب کے پاس ہے اور ان کے لئے کسی خوف اور رنج کا موقعہ نہیں ہے۔"

نظام ربا کے صفحۂ بالمقابل کا بنیادی عنصر زکوٰۃ ہے اور زکوٰۃ کی ماہیت یہ ہے کہ وہ ایک قسم کا خرچ اور انفاق ہے' جس کا کوئی عوض اس جہاں میں نہیں ہے نہ اس خرچ کے نتیجے میں کچھ واپس ہوتا ہے اور سیاق کلام میں زکوٰۃ کے ذکر سے مقصد یہ ہے کہ یہاں مؤمنین کی اس اہم صفت کو بیان کر دیا جائے نیز اسلامی معاشرہ کی اس اہم صفت کو بیان کر دیا جائے اور یہ بتایا جائے کہ سودی معاشرہ کے مقابلے میں اس ایمانی معاشرہ میں اطمینان قلب' امن و امان' اللہ کی رضامندی اور برکات الٰہی کے کیا کیا نظارے ہیں اور کس قدر پر کیف منظر ہے اس معاشرے کا۔

زکوٰۃ دراصل ایک ایسے معاشرے کا اصل الاصول ہے جو باہم تضامن اور باہم کفالت پر مبنی ہوتا ہے اور اس معاشرے کے کسی بھی شعبے اور کسی بھی پہلو میں سودی اقتصادیات کا نہ وجود ہوتا ہے اور نہ وہ ان اقتصادیات سے کوئی ضمانت طلب کرتا ہے۔

امت اسلامیہ کے احساس اور خود ہمارے احساسات میں زکوٰۃ کی اصل صورت پریشان اور گم ہوگئی ہے۔ امت مسلمہ کی بدبخت نسلوں نے صدیاں گزر گئیں کہ اسلام کے اقتصادی نظام کو عملاً چلتا ہوا نہیں دیکھا ہے۔ اس نے اسلامی نظام زندگی کا عملی مشاہدہ نہیں کیا کہ وہ خالص ایمانی تصور حیات' خالص نظریاتی تربیت اور نظریاتی اخلاق کی اساس پر قائم ہوا ہو اور وہ انسانیت کو اور انسانی نفسیات کو ایک خاص نہج پر ڈھال رہا ہو اور خود یہ نظام اس طرح ہو کہ اس میں اس کے صحیح تصورات زندہ ہوں' پاک اخلاقی نظام رائج ہو اور اونچی اقدار حیات قائم ہوں اور اس میں اسلام کے اقتصادی نظام کا مرکزی نکتہ زکوٰۃ ہو جبکہ اس کے مقابلے میں تمام دوسرے نظام عملاً ربا کی اساس پر قائم ہوں اور پھر امت دیکھے کہ انسانی زندگی نشوونما پارہی ہو اور اقتصادی نظام انفرادی سعی و جدوجہد پر قائم ہو اور اگر باہم تعاون کی کوئی اجتماعی شکل ہو تو وہ ربا سے پاک ہو۔

زکوٰۃ کی اصل شکل و صورت ہمارے دور کی بدبخت اور ہدایت سے محروم نسلوں کے دل و دماغ میں مشتبہ ہوگئی ہے' اس لئے کہ ان نسلوں نے انسانیت کی وہ بلند و برتر خوبصورت تصویر دیکھی ہی نہیں جو نظام زکوٰۃ کے نتیجے میں سامنے آتی ہے۔ موجودہ نسلیں جدید سودی نظام کے اندر پیدا ہوئیں' اور اسی کے سائے میں پروان چڑھیں اور یہ جدید نظام خالص سودی تصور پر قائم ہے۔ ان نسلوں نے صرف بخل اور کنجوسی' حرص و لالچ اور انفرادیت اور خود غرضی ہی دیکھی ہے جو دور جدید میں ہر کسی کے دلوں پر حکمران ہے۔ اس دور میں دولت محتاجوں اور غریبوں تک صرف قابل نفرت سودی نظام ہی کے ذریعے سے پہنچ رہی ہے۔ لوگ بغیر کسی اجتماعی کفالتی نظام کے زندگی بسر کر رہے ہیں۔ صرف اس صورت میں انہیں تحفظ ملتا ہے جب وہ خود سرمایہ رکھتے ہوں یا انہوں نے اپنی دولت کا ایک معتدبہ حصہ خرچ کر کے موجودہ سودی نظام کے تحت اپنے آپ کو انشور کرا لیا ہو۔ آج صنعت اور تجارت کو صرف اس صورت میں سرمایہ دستیاب ہوتا ہے۔ جب وہ اسے سودی نظام کے واسطہ سے لیں' اس لئے جدید نسلوں کے دل و دماغ پر یہ بات چھا گئی ہے کہ ماسوائے سودی نظام اقتصادیات کے اور کوئی اقتصادی نظام سرے سے موجود ہی نہیں ہے اور یہ کہ صرف اسی نظام کے تحت زندگی بسر ہو سکتی ہے۔

جدید دور کے انسانوں کے ذہن سے زکوٰۃ کا حقیقی تصور یوں مٹ گیا ہے کہ وہ اسے صرف ایک انفرادی احسان اور نیکی سمجھنے لگے ہیں اور یہ کہ اس کی اساس پر کوئی اجتماعی نظام استوار نہیں ہو سکتا لیکن یہ لوگ حاصلات زکوٰۃ کے عظیم حجم کا تصور بھی نہیں کر سکتے کہ اڑھائی فیصد زکوٰۃ اصل سرمایہ اور منافع دونوں پر واجب ہے اور وہ لوگ بڑی خوشی سے یہ شرح ادا کرتے ہیں جن کی تربیت اسلام نے کی ہوئی ہوتی ہے اور اپنے مخصوص انداز میں کی ہوئی ہوتی ہے۔ وعظ و ارشاد کے ذریعہ' قانون سازی کے ذریعہ اور ایک ایسے نظام زندگی

کے ذریعے جس کا تصور ان کے دل و دماغ پر چھایا ہوا ہوتا ہے اور اس شرح زکوٰۃ کو ایک اسلامی حکومت بطور ایک لازمی حق کے وصول کرتی ہے' یوں نہیں کہ کوئی بطور خیرات یہ حق ادا کرے اور اس عظیم فنڈ سے ان تمام لوگوں کی کفالت ہوتی ہے' جن کے لیے اپنے ذاتی وسائل ناکافی ہو جائیں اور حالت یہ ہوتی ہے کہ معاشرے کا ہر فرد یہ ضمانت پالیتا ہے کہ اس کی زندگی اور اس کی اولاد کی زندگی محفوظ ہے اور ہر حالت میں محفوظ ہے۔ اس فنڈ میں سے ان لوگوں کے قرضے بھی ادا کیے جاتے ہیں جو قرضوں کے بوجھ تلے دب جائیں چاہے یہ تجارتی قرضے ہوں یا غیر تجارتی ہوں۔

اسلام میں اہمیت اس بات کو حاصل نہیں ہے کہ کسی نظام کی ظاہری شکل و صورت کیسی ہے۔ اہمیت اس بات کو حاصل ہے کہ کسی نظام کی روح کیسی ہے۔ اسلام اپنی تربیت اور ہدایت' اپنے قانونی نظام اور ضابطہ بندی اور اپنے پورے نظام کے ذریعہ جس قسم کی سوسائٹی وجود میں لانا چاہتا ہے۔ وہ سوسائٹی اس کے نظام کی شکل و صورت' اس کے اجزاء اور اداروں اور اسکی حکمت عملی کے ساتھ مکمل طور پر مناسب اور متناسق ہوتی ہے۔ وہ سوسائٹی اس کے قانون نظام کا تکملہ ہوتی ہے۔ اس سوسائٹی کے افراد کے ضمیر کی گہرائیوں سے ایک اجتماعی کفالتی نظام وجود میں آتا ہے۔ اس کے تمام ادارے اور حکمت عملیاں ایک اجتماعی کفالت وجود میں لاتی ہیں۔ اس نظام میں فرد اور ادارہ باہم معاون اور باہم کفیل ہوتے ہیں۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو ان لوگوں کے فہم و ادراک سے بہت بلند ہے جو جدید مادی نظام زندگی میں پروان چڑھے ہیں لیکن یہ ایک ایسی حقیقت ہے جسے ہم مسلمان بخوبی جانتے ہیں۔ اور ہمارا ذوق ایمانی اس کا مٹھاس محسوس کرتا ہے۔ جبکہ جدید دور کے باسی اپنی بدبختی اور بدذوقی کی وجہ سے یہ مٹھاس نہیں محسوس کرتے۔ جدید دور کا انسان اسی محرومی اور بدبختی میں اسلیئے مبتلا ہے کہ اس کی باگ دوڑ اس جدید مادی نظام کے ہاتھ میں ہے۔ خدا کرے یہ اسی طرح محروم ہوں اور ایسی خیر سے دور ہی رہیں جس کی خوشخبری اللہ ان الفاظ میں دیتے ہیں۔ إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ .... "جو لوگ ایمان لے آئیں اور نیک عمل کریں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں' ان کا اجر بے شک ان کے رب کے پاس ہے اور ان کیلئے کسی خوف اور رنج کا موقع نہیں" ایسے لوگ جو ان آسمانی ہدایات سے محروم ہیں۔ وہ قلبی اطمینان اور سکون سے بھی محروم رہیں گے۔ جبکہ اجر و ثواب سے تو وہ محروم ہیں ہی۔ اس لئے کہ وہ اپنی جہالت' اپنی جاہلیت' اپنی ضلالت اور اپنی ہٹ دھرمی کی وجہ سے تو وہ محروم ہیں۔

اللہ تعالیٰ ان لوگوں سے پختہ عہد کرتا ہے کہ جو لوگ اپنی زندگی کو ایمان اور عمل صالح پر استوار کریں گے۔ باہم اقتصادی تعاون کرکے اپنی معیشت کو درست کریں گے۔ ان کا اجر اللہ کے ہاں محفوظ ہے۔ وہ امن میں رہیں گے' وہ کسی خوف و خطر سے دوچار نہ ہوں گے۔ وہ خوش قسمت ہیں۔ محروم نہیں ہیں۔ اس لئے وہ ہر قسم کے اندیشوں سے محفوظ ہوں گے لَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ .... "ان کا اجر بے شک ان کے رب کے پاس ہے' ان کیلئے کسی خوف اور رنج کا موقع نہیں ہے۔"

ایسے حالات میں جبکہ ایک سودی نظام اقتصادیات والی سوسائٹی اللہ کے قہر و غضب کی مستحق قرار پاتی ہے۔ اس کے افراد مخبوط الحواس اور گم کردہ راہ ہوتے ہیں۔ جس کے نتیجے میں وہ روحانی خوف اور رنج و الم کا شکار ہوتے ہیں۔

انسانی تاریخ میں انسانیت نے صحیح اسلامی معاشرہ میں یہ نظام امن و سکون بچشم سر دیکھا ہے۔ اور وہ رنج و الم اور خوف و بے اطمینانی کی عام فضاء وہ جدید سودی معاشرے میں بھی دیکھ رہی ہے۔ اے کاش کہ ہم ہر حساس دل کو پکڑ کر جھنجھوڑ سکتے۔ تو اسے خوب جھنجھوڑتے اور وہ خواب غفلت سے بیدار ہو کر اس حقیقت کو پالیتا۔ اے کاش! کہ اگر ممکن ہوتا تو ہم ہر سوتی آنکھ کو جگاتے۔ اسے کھولتے

اور وہ اس عظیم حقیقت کو پالیتی۔

افسوس کے ہمارے پاس وہ قوت نہیں ہے۔ اگر ہوتی تو ہم ایسا کر گزرتے..... ہم صرف اس حقیقت کی طرف اشارہ ہی کر سکتے ہیں۔ ممکن ہے کہ اللہ اس گم کردہ راہ اور بدنصیب انسانیت کو اس طرف متوجہ کر دیں۔ اور دل تو اللہ تعالیٰ کی دو انگلیوں کے درمیان ہیں وہ جدھر چاہے پھیر دے۔ اور ہدایت تو اللہ تعالیٰ کے ہاتھ ہی میں ہے جسے چاہے عطا کرے۔ ان حالات میں امن و فراوانی' جس کا وعدہ اللہ تعالیٰ ایک اسلامی سوسائٹی کے ساتھ کر رہا ہے۔ جو اپنی زندگی سے ربا کو نکال دیتی ہے۔ یوں وہ گویا کفر اور معصیت کو اپنی زندگی سے نکال پھینکتی ہے۔ اور اپنی زندگی کو ایمان' عمل صالح اور اللہ کی بندگی اور نظام زکوٰۃ پر قائم کرتی ہے۔ غرض ایسے حالات میں امن و فراوانی میں اللہ تعالیٰ اپنی جانب سے ان لوگوں کو پکارتے ہیں۔ جو ایمان لے آئے ہیں اور یہ پکار دراصل آخری وارننگ ہے۔ انہیں حکم دیا جاتا ہے کہ وہ اپنی پوری زندگی کو اس نجس اور مفلس سودی اقتصادی نظام سے پاک کر دیں اور اگر وہ اس کام کیلئے تیار نہیں ہیں تو یہ گویا ان کی جانب سے اللہ اور رسول اللہ ﷺ کے خلاف اعلان جنگ ہے۔ بغیر کسی نرمی کے' بغیر مہلت کے اور بغیر کسی تاخیری حربے کے۔

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ ٱتَّقُوا۟ ٱللَّهَ وَذَرُوا۟ مَا بَقِىَ مِنَ ٱلرِّبَوٰٓا۟ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ﴿٢٧٨﴾ فَإِن لَّمْ تَفْعَلُوا۟ فَأْذَنُوا۟ بِحَرْبٍ مِّنَ ٱللَّهِ وَرَسُولِهِۦ ۖ وَإِن تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوسُ أَمْوَٰلِكُمْ لَا تَظْلِمُونَ وَلَا تُظْلَمُونَ ﴿٢٧٩﴾

☆ ☆ ☆ ☆

"اے لوگو' جو ایمان لائے ہو' خدا سے ڈرو اور جو کچھ تمہارا سود لوگوں پر باقی رہ گیا ہے' اسے چھوڑ دو' اگر واقعی تم ایمان لائے ہوں۔ لیکن اگر تم نے ایسا نہ کیا' تو آگاہ ہو جاؤ کہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے تمہارے خلاف اعلان جنگ ہے۔ اب بھی توبہ کر لو اور سود چھوڑ دو تو اپنا اصل سرمایہ تم لینے کے حقدار ہو نہ تم ظلم کرو' نہ تم پر ظلم کیا جائے۔"

اس آیت میں ان لوگوں کے ایمان کو جو ایمان لا چکے ہیں۔ اس بات سے متعلق کر دیا گیا ہے کہ وہ اس سود کو چھوڑ دیں جو باقی رہ گیا ہے۔ وہ اس وقت تک صحیح مومن نہیں ہو سکتے جب تک وہ خدا سے ڈریں گے نہیں اور باقی ماندہ سودی رقم کو ترک نہ کر دیں گے وہ صحیح مومن نہیں ہیں اگرچہ وہ اپنے ایمان کا اعلان کرتے پھریں۔ اس لئے کہ اللہ کے احکام و فرامین کی اطاعت و انقیاد کے بغیر ایمان کے کیا معنی ہیں۔ آیت انہیں کسی دھوکے میں نہیں رکھتی نہ وہ کسی بھی شخص کو اس شبہے میں چھوڑتی ہے' جو ایمان کے اعلان کے پردے میں چھپ کر اپنی حقیقت پر پردہ ڈالتا ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہوتی ہے کہ نہ تو وہ مطیع فرمان ہوتا ہے اور نہ راضی برضائے شریعت ہوتا ہے۔ وہ اپنی زندگی میں شریعت کو نافذ نہیں کرتا۔ وہ اپنے معاملات میں شریعت کو حکم نہیں بناتا۔ حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ دین اسلام میں اعتقادات اور اعمال میں فرق کرتے ہیں وہ صحیح مومن نہیں ہیں۔ اگرچہ وہ طویل و عریض دعوائے ایمان کریں۔ زبان سے ایمان کا اعلان کریں' یہاں تک کہ وہ دوسری عبادات میں پابند صوم و صلوٰۃ کیوں نہ ہوں۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ ٱتَّقُوا۟ ٱللَّهَ وَذَرُوا۟ مَا بَقِىَ مِنَ ٱلرِّبَوٰٓا۟ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ .... "اے لوگو جو ایمان لائے ہو۔ خدا سے ڈرو اور جو کچھ تمہارا سود لوگوں پر باقی رہ گیا ہے۔ اسے چھوڑ دو' اگر واقعی تم ایمان لائے ہو۔"

اسلام نے ان لوگوں کے حق میں وہ سودی منافع چھوڑ دیا جو وہ کھا چکے تھے۔ یہ فیصلہ نہ کیا کہ کھایا ہوا سود بھی ان سے لوٹایا جائے۔ نہ اسلام نے ان کی تمام یا کچھ حصہ جائیداد کو ضبط کرنے کا حکم دیا۔ اس سبب سے کہ ان کے کاروبار میں سود شامل تھا۔ اس لئے کہ اسلام میں کوئی بات حرام نہیں قرار پاتی' جب تک اسے اللہ تعالیٰ حرام قرار نہ دیں۔ بغیر قانون سازی کے کوئی حکم نہیں دیا جاسکتا۔ اور قانون کا مزاج یہ ہے کہ وہ اپنے آثار اپنے نفاذ کے بعد ظاہر کرتا ہے۔ جو گزر چکا سو گزر چکا۔ گزرے ہوئے معاملات اللہ کے سپرد ہیں۔ ان پر قانونی احکام کا اطلاق نہیں ہوتا۔ اس طرح اسلام نے سوسائٹی کو ایک بڑے دھماکہ خیز اقتصادی اور اجتماعی بحران سے بچالیا۔ اگر اس قانون کو موثر بماضی قرار دیا جاتا تو ایک بہت بڑا بحران پیدا ہو جاتا۔ یہ وہ اصول ہے جسے جدید قانونی نظام نے حال ہی میں اپنایا ہے۔ اس لئے کہ اسلام میں قانون سازی اس لئے کی جاتی ہے کہ اس کی وجہ سے انسان کی واقعی اور عملی زندگی کی اصلاح ہو۔ وہ اسے صحیح راستے پر ڈالے' اسے گندگیوں سے پاک کرے' اسے ناجائز بندھنوں سے آزاد کرے تاکہ وہ ترقی کرے اور اس کا معیار بلند ہو' اس کے ساتھ ساتھ اسلام نے اہل ایمان کے ایمان کو اس بات پر موقوف کر دیا کہ وہ تب ہی مومن ہوں گے جب وہ اس قانون سازی کو قبول کریں۔ وہ نازل ہوتے ہی اور علم میں آتے ہی اسے اپنی زندگی میں نافذ کر دیں۔ اور اس کے ساتھ ساتھ اسلام ان کے دلوں میں خوف خدا اور تقویٰ بھی پیدا کرتا ہے۔ تقویٰ کا شعور ہی وہ گارنٹی ہے جس کے ذریعہ اسلام اپنے قوانین نافذ کراتا ہے۔ یہ وہ گارنٹی ہوتی ہے جو خود اہل ایمان کے نفس کے اندر پیدا ہوتی ہے۔ یہ اندر کا چوکیدار ہوتا ہے اور اسلام میں اس کا درجہ ان گارنٹیوں اور چوکیداروں سے اونچا ہے جو کسی قانون کو روایتی طور پر حاصل ہوتا ہے۔ اس لئے اسلامی قوانین کو نفاذ کیلئے وہ گارنٹی اور نگرانی حاصل ہوتی ہے جو جدید دور کے وضعی قوانین کو حاصل نہیں ہوتی' اس لئے کہ یہ قوانین صرف خارجی دباؤ کی وجہ سے نافذ ہوتے ہیں۔ اور یہ بات پوشیدہ نہیں کہ خارجی نگران کو کس خوبی سے جل دی جاسکتی ہے۔ ایسے حالات میں جب انسان کے ضمیر کے اندر کوئی چوکیدار نہ بیٹھا ہو یعنی خدا خوفی اور رضائے الٰہی کا نگران۔

یہ تو تھی ترغیب اس بات کی کہ ربا کو ترک کرو' لیکن اس کے ساتھ ساتھ دھمکی اور ترہیب بھی آتی ہے۔ اور یہ دھمکی اس قدر شدید ہے کہ اس سے دل دہل جاتے ہیں۔ فَإِن لَّمْ تَفْعَلُوا فَأْذَنُوا بِحَرْبٍ مِّنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ ....
.... "اگر تم نے ایسا نہ کیا تو آگاہ ہو جاؤ کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف سے تمہارے خلاف اعلان جنگ ہے۔"

خدا کی پناہ! اللہ اور اس کے رسول کی جانب سے اعلان جنگ! یہ ایسی جنگ ہے' جو نفس انسان کو درپیش ہے۔ خوفناک جنگ۔ جس کا انجام بالکل سامنے ہے۔ جس میں بشر کو شکست سے دوچار ہونا ہی ہے۔ انسان فانی اور ضعیف ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کی قوت جابرہ کا کیا مقابلہ کرے گا جو آن واحد میں سب کچھ بھسم کر کے رکھ دے گی۔ اور اس کا نام و نشان مٹا دے گی۔

ان آیات کے نزول کے بعد' حضور ﷺ نے حاکم مکہ کو حکم دیا کہ وہ مکہ کے آل مغیرہ کے ساتھ جنگ کریں' اس لئے کہ وہ ان [illegible]ات کے نزول کے بعد بھی سودی کاروبار سے باز نہ آئے تھے۔ فتح مکہ کے دن حضور ﷺ نے اپنے خطبے میں جاہلیت کے دور کے تمام سودی [illegible]سوں کو ختم کر دیا تھا۔ اور آپ نے فرمایا سب سے پہلے میں اپنے چچا عباس ﷺ کے قرضے کو معاف کرتا ہوں۔ اور یہ بوجھ قرضداروں پر [illegible]ام کے آنے کے بعد بھی ایک عرصہ تک رہا۔ لیکن جب اسلامی معاشرہ پختہ ہو گیا۔ اور اس کی بنیادیں مضبوط ہو گئیں اور وقت آگیا کہ [illegible]تے کے اقتصادی نظام کو اصول رباسے ہٹا کر صحیح اسلامی اصولوں سے استوار کیا جائے تو اسلام نے یہ قدم اٹھایا۔ اس موقع پر حضور ﷺ نے فرمایا۔

"جاہلیت کے دور کا تمام سود میرے ان دونوں پاؤں کے نیچے ہے اور سب سے پہلا سودی قرضہ جسے میں

موقوف کرتا ہوں وہ عباس کا سود ہے۔"

اس کے ساتھ ساتھ آپ لوگوں کو یہ تلقین بھی فرماتے کہ دور جاہلیت میں انہوں نے جو سود وصول کیا اسے واپس کر دیں.......
اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی حکومت کا یہ فریضہ ہے کہ وہ ان لوگوں کے ساتھ جنگ کرے جو سودی اقتصادیات کو جاری رکھنے پر مصر ہیں۔ اور جو اللہ کے حکم کی نافرمانی کرتے ہیں۔ اگرچہ ایسے لوگ یہ اعلان کریں کہ وہ مسلمان ہیں۔ حضرت ابوبکر ؓ نے مانعین زکوٰۃ کے خلاف جنگ اسی اصول کے تحت کی تھی حالانکہ وہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ یعنی کلمہ پڑھتے تھے۔ نماز ادا کرتے تھے۔ اس لئے کہ جو شخص شریعت کی اطاعت کا انکار کردے اور اسے اپنی زندگی میں نافذ نہ کرے وہ مسلم نہیں رہتا۔

یہاں یہ بات پیش نظر رہے کہ اللہ اور رسول اللہ کی جانب سے سود خوروں کے خلاف اعلان جنگ توپ و تفنگ کی جنگ سے عام ہے۔ جو ایک امام وقت کسی قوت کے خلاف کرتا ہے۔ یہ اعلان جنگ، جیسا کہ رسول خدا ﷺ نے فرمایا ہر اس معاشرے کے خلاف ہے جو اپنے اقتصادی نظام کی اساس سود پر رکھتا ہو، یہ جنگ ہمہ گیر اور خوفناک جنگ ہے۔ یہ اعصاب کی جنگ ہے۔ یہ دلوں کی جنگ ہے۔ یہ خیر و برکت اور خوشحالی کے خلاف ربا کی جنگ ہے۔ یہ سودی نظام کی جانب سے انسانیت کی سعادت اور خوشحالی اور اطمینان کے خلاف جنگ ہے۔ یہ انسان کی کشاکش اور ایک دوسرے کے تعاقب کی جنگ ہے۔ آخر کار یہ جنگ اقوام اور امم کے درمیان افواج اور اسلحہ کی جنگ ہے۔ یہ ایک ہمہ گیر اور تباہ کن جنگ ہے اس کرۂ ارض پر اس لئے برپا ہوتی ہے کہ یہاں کا نظام اصول ربا پر مبنی ہو جاتا ہے۔ اور جس کی وجہ سے اس زمین سے خیر و برکت ختم ہو کر رہ جاتی اور خوشحالی ناپید ہو جاتی ہے۔ یہ تمام جنگیں اور کشمکش ان سرمایہ داروں کی جانب سے برپا کی جاتی ہیں جو پوری دنیا کے سرمایہ پر قابض ہوتے ہیں۔ اور ان جنگوں کے شعلے بڑھکاتے ہیں۔ کبھی وہ یہ کام براہ راست کرتے ہیں اور کبھی بالواسطہ کرتے ہیں۔ وہ اپنے دام تزویر میں کارخانوں اور کمپنیوں کو پھانس لیتے ہیں۔ اس کے بعد اقوام اور حکومتیں ان کے دام میں شکار ہوتی ہیں۔ اس کے بعد یہ حکومتیں، اپنے شکار پر جھپٹتی ہیں اور یوں ان کے درمیان جنگ شروع ہو جاتی ہے۔ کبھی یہ حکومتیں اپنے مفادات اور سرمائے کو بچانے کیلئے دوڑتی ہیں اور اپنی فوجی قوت میدان میں لاتی ہیں اور یوں جنگ کے شعلے بڑھک اٹھتے ہیں۔ بعض اوقات یوں ہوتا ہے کہ عوام الناس ٹیکس اور حکومتی واجبات ادا کرنے سے قاصر ہو جاتے ہیں۔ عوام میں غربت عام ہو جاتی ہے۔ محنت کار اور جفاکش لوگ تنگ آکر ایسی تحریکات سے وابستہ ہو جاتے ہیں جن کا مشن تخریب کاری اور تباہی پھیلانا ہوتا ہے۔ اور یوں کسی بھی علاقے میں عوامی جنگ شروع ہو جاتی ہے۔ اور اس سودی نظام کے تحت جو کشمکش برپا ہوتی ہے۔ اس کے عام اور بسہولت برآمد ہونے والے نتائج یہ ہوتے ہیں کہ لوگوں کے نفوس خراب ہو جاتے ہیں۔ اخلاقی تباہی پھیل جاتی ہے۔ لوگوں میں عیاشی پیدا ہو جاتی ہے۔ اور انسانیت کا ڈھانچہ ہی تباہ ہو کر رہ جاتا ہے۔ اور انسان کی روحانی دنیا ایسی تباہی کا شکار ہوتی ہے کہ اس جیسی تباہی انسان کے جسم کو کسی ایٹمی جنگ سے بھی نہیں پہنچ سکتی۔

یہ جنگ جس کا اعلان سودی کاروبار کرنے والوں کے خلاف کیا گیا ہے۔ ہر وقت اس کے شعلے بلند ہوتے ہیں۔ آج بھی یہ ہر طرف برپا ہے۔ گم کردہ راہ انسانیت کا رطب و یابس اس کی نظر ہو رہا ہے۔ لیکن یہ انسانیت اس کو سمجھنے سے قاصر ہے۔ انسانیت یہ سمجھ رہی ہے کہ وہ دولت کما رہی ہے۔ وہ ترقی کر رہی ہے۔ وہ بڑی کثرت سے مادی نتائج پیدا کر رہی ہے۔ متنوع مصنوعات تیار ہو رہی ہیں۔ لیکن یہ پیداوار ہی اس کیلئے تباہی ہے۔ یہی پیداوار اگر کسی پاک اور غیر سودی نظام سے ہوتی تو یہ انسانیت کیلئے نیک بختی اور خوشحالی کا سبب ہوتی۔ لیکن یہ پیداوار سود کے ناپاک اور آلودہ نظام کے نتیجے میں سامنے آتی ہے۔ اس لئے یہ انسانیت کیلئے ایک ایسا بوجھ ہے جس کے نتیجے میں انسانیت کا دم گھٹ رہا ہے۔ جبکہ سود خوروں کا عالمی گروہ عیش و آرام سے زندگی بسر کر رہا ہے۔ اور اسے اس پوری انسانیت کی مصیبتوں

اور رنج والم کا کوئی احساس ہی نہیں ہو رہا ہے۔

اسلام نے پہلی اسلامی جماعت کو اس بات کی دعوت دی اور آج پوری انسانیت کو اس بات کی دعوت دے رہا ہے کہ وہ پاک و صاف ذریعہ آمدن اختیار کریں اور وبائی سودی نظام سے تائب ہو کر راہ راست اختیار کریں وَإِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوسُ أَمْوَالِكُمْ لَا تَظْلِمُونَ وَلَا تُظْلَمُونَ .... "اب بھی توبہ کر لو تو اپنا اصل سرمایہ لینے کے تم حقدار ہو۔ نہ تم ظلم کرو نہ تم پر ظلم کیا جائے۔" یہ ایک معصیت سے توبہ ہے' ایام جاہلیت میں رائج خطاکاری سے رجوع ہے۔ اور جاہلیت کا تعلق کسی خاص زمانے سے نہیں ہوتا یا کسی خاص نظام ہی پر جاہلیت کا اطلاق نہیں ہوتا۔ جاہلیت کی حقیقت یہ ہے کہ انسان الٰہی نظام زندگی سے منحرف ہو جائے۔ جب بھی یہ انحراف ہو اور جہاں بھی ہوں' وہ جاہلیت ہو گی۔ ربا ایک ایسی خطاکاری ہے جس کے اثرات انسان کے تصور حیات' انسان کے اخلاق اور انسان کے شعور پر چھا جاتے ہیں۔ پھر اس کے اثرات سوسائٹی پر اور سوسائٹی کے اجتماعی تعلقات پر پڑتے ہیں۔ پوری انسانی زندگی پر اس کے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ اقتصادی نشوونما اور ترقی پر اس کے اثرات مرتب ہوتے ہیں اگرچہ وہ لوگ جو سودی کاروبار کرنے والوں کے جھانسے میں آ چکے ہیں' یہ سمجھتے ہیں کہ سودی نظام اقتصادیات وہ واحد نظام ہے جو نشوونما اور اقتصادی ترقی کا اہل اور سبب ہے۔

صرف اصل زر کی واپسی کا حق دینا ایک ایسا قاعدہ ہے جس کی رو سے نہ قرض دہندہ کو نقصان ہے اور نہ ہی قرض گیرندہ پر ظلم ہے۔ رہی یہ بات کہ دولت میں اضافہ کیسے کیا جائے گا تو اس کے وسائل و ذرائع علیحدہ ہیں۔ جو ربا سے پاک و صاف ہیں۔ اس کا پہلا ذریعہ ایک فرد کی ذاتی جدوجہد ہے۔ دوسرا ذریعہ بطریقہ مضاربت باہم شرکت اموال ہے۔ یعنی ایک شخص سرمایہ فراہم کرے اور دوسرا اس کے ساتھ کاروبار کرے اور دونوں فائدے اور نقصان میں شریک ہوں۔ نیز اقتصادی ترقی ان کمپنیوں کے ذریعہ بھی ممکن ہو گی جو اپنے حصص براہ راست بازار حصص میں فروخت کرتی ہیں۔ (ماسوائے تاسیسی سندات کے جن کے ذریعہ زیادہ نفع سمیٹ لیا جاتا ہے۔) اور حلال اور جائز ذریعہ کاروبار سے منافع حاصل کرتی ہیں۔ پھر ایسی رقومات سے بھی اقتصادی ترقی ممکن ہو گی جو بغیر منافع کے محض امانت کے طور پر بینکوں میں جمع ہوں گی۔ اس طرح کہ ایسی رقومات کو بینک' کمپنیوں' صنعتوں' تجارتی اور کاروباری مدات میں براہ راست استعمال کریں یا بالواسطہ ان میں شرکت کریں اور شرط یہ ہو کہ وہ اپنے لئے متعین منافع طے نہ کریں اور بینک اپنا منافع یا خسارہ ایک مقررہ نظام کے تحت ان لوگوں پر تقسیم کریں جو ان کے پاس امانتیں رکھتے ہیں۔ اور بینک کو یہ اجازت ہو کہ وہ اپنی کاروباری مصروفیات کے عوض ایک مقرر اور معین منافع اپنے لئے رکھ لے۔ غرض ان ذرائع اور وسائل کے علاوہ بھی اقتصادی ترقیات کیلئے مزید اور وسائل اور ذرائع بھی پیدا کئے جا سکتے ہیں۔ جن کی تفصیلات کا یہ موقع نہیں ہے۔ اگر کسی قوم کا ایمان مضبوط ہو تو ایسے بے شمار وسائل پیدا کئے جا سکتے ہیں۔ نیز نیت صاف ہو جائے اور پختہ ارادہ کر لیا جائے کہ ہم نے پاک اور صاف ذرائع سے وسائل رزق و ترقی حاصل کرنے ہیں اور گندہ اور ناپاک ذرائع پر لات مارنی ہے۔[1]

آخر میں قرآن کریم قرضوں کے بارے میں احکام کی ایک خاص شکل کو بیان کرتا ہے کہ اگر مدیون کیلئے قرضے کی ادائیگی ممکن نہ ہو' اس کیلئے مشکلات ہوں تو اس کا حل یہ نہیں ہے کہ اس پر بذریعہ ربا قرضے کا اضافہ کر دیا جائے' بلکہ حل یہ ہے کہ اسے اس وقت تک مہلت دی جائے جب تک اس کے حالات اچھے نہیں ہو جاتے۔ اور جو شخص زیادہ بھلائی سمیٹنا چاہے اس کے لیے بہتر یہ ہے کہ وہ سرے سے قرضہ ہی معاف کر دے۔ اسلام کی نظر میں یہی بلند مرتبہ ہے۔

[1] تفصیلات کیلئے دیکھئے وہ مباحث جو اس موضوع پر مولانا ابو الاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ علیہ نے کئے ہیں اور جن کی طرف اشارہ میں پہلے کر چکا ہوں۔ (سید قطب رحمۃ اللہ علیہ)

وَإِنْ كَانَ ذُو عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ إِلَىٰ مَيْسَرَةٍ ۚ وَأَنْ تَصَدَّقُوا خَيْرٌ لَكُمْ ۖ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿٢٨٠﴾

"تمہارا قرض دار تنگ دست ہو تو ہاتھ کھلنے تک اسے مہلت دو اور جو صدقہ کر دو تو یہ تمہارے لئے زیادہ بہتر ہے اگر تم سمجھو۔"

یہ وہ خوشگوار داو دہش ہے جسے اسلامی نظام زندگی انسانیت کے سامنے پیش کرتا ہے۔ یہ وہ گھنی چھاؤں ہے جس میں 'خود غرضی' 'لالچ' بخل اور مفاد پرستی کی تپش میں تھکی ماندی انسانیت پناہ لیتی ہے اور سکون کا سانس لیتی ہے۔ یہ قرضدار کیلئے بھی رحمت ہے اور قرض خواہ کیلئے بھی رحمت ہے۔ اور اس پورے معاشرہ کیلئے بھی رحمت و شفقت ہے۔ جس میں یہ دونوں رہتے ہیں۔

ہمیں یقین ہے کہ دور حاضر کی مادی جاہلیت کے زیر سایہ پلنے والے جدید مفلوک الحال لوگ ہماری یہ باتیں لایعنی تصور کریں گے اور یہ باتیں انہیں نامعقول نظر آئیں گی۔ ان کے منہ کا بگڑا ہوا ذائقہ 'ان باتوں کے مٹھاس کا احساس ہرگز نہیں کر سکتا۔ خصوصاوہ وحشی سود خوار جو اس کرۂ ارض کے کونے کونے پر پھیلے ہوئے ہیں۔ جو اپنے شکار کی تلاش میں مارے مارے پھرتے ہیں۔ جو ایسے محتاجوں اور مفلوک الحال لوگوں کی تلاش میں رہتے ہیں جن پر مصائب کے پہاڑ ٹوٹ چکے ہیں۔ جو روٹی کپڑے اور علاج معالجے کے ضرور تمند ہیں۔ تاکہ ان کا استحصال کریں۔ بعض اوقات ان کے پاس اس قدر رقم نہیں ہوتی کہ وہ اپنے مردے دفن کر سکیں اور ان لوگوں کو اس کنجوس اور بخیل دنیا میں کوئی نہیں ملتا۔ جو ان کے لئے بے لوث معاون ثابت ہو۔ اس لئے وہ مجبور ہو کر ان وحشی سود خوروں کے جال میں پھنس جاتے ہیں۔ ان کی حالت ایک ایسے شکار جیسی ہوتی ہے جو خود چل کر دام میں اپنے آپ کو پھنساتا ہے۔ ضرور تمندی اور مجبوری انہیں دھکیل کر ان سود خوروں کے پاس لے جاتی ہے۔ بعض اوقات یہ سود خور تو ایسے بیت المالوں کی صورت میں منظم ہوتے ہیں جو سرمایہ فراہم کرتے ہیں اور بعض اوقات بینکوں کی شکل میں کام کرتے ہیں۔ یہ سب کے سب اسلام کی نظر میں برابر ہیں۔ ہاں فرق صرف اس قدر ہے کہ ان مالی کارپوریشنوں اور بینک کے مالک سود خوار بڑے بڑے دفاتر میں بیٹھے ہوتے ہیں۔ ان کے نیچے بڑی بڑی آرام دہ کرسیاں ہوتی ہیں۔ ان کی پشت پر سود کے اقتصادی نظریات کی قوت ہوتی ہے۔ بڑی بڑی علمی کتابیں ان کے اس کاروبار کی تائید میں ہوتی ہیں۔ بڑے بڑے تعلیمی ادارے اور انسٹی ٹیوٹ ان کی حمایت میں لگے ہوتے ہیں۔ عدالتیں اور بڑی بڑی فوجیں اس نظام کی مؤید ہوتی ہیں۔ یہ تمام ادارے جرم سود خوری کے لئے جواز فراہم کرتے ہیں 'ان کے حامی ان کو تحفظ دینے کے لئے ایک وسیع قانونی نظام اور ضابطے کام کر رہے ہوتے ہیں اور مددگار ہوتے ہیں۔ اور جو لوگ انہیں سود ادا نہیں کرتے۔ اس قانونی نظام کے ذریعہ وہ ان کی پکڑ دھکڑ شروع کر دیتے ہیں۔ اور یہ سب دار و گیر انصاف کے نام پر ہوتی ہے۔

ہمیں یہ پورا یقین ہے کہ ہماری یہ باتیں ہرگز ایسے لوگوں کے دلوں میں نہیں اترتیں۔ لیکن ہمیں پورا یقین ہے کہ ہم جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ حق ہے اور ہمیں یہ بھی یقین ہے کہ تمام انسانیت کی فلاح اسی میں ہے کہ وہ ان باتوں پر کان دھرے 'اور ان پر عمل کرے یعنی

وَإِنْ كَانَ ذُو عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ إِلَىٰ مَيْسَرَةٍ ۚ وَأَنْ تَصَدَّقُوا خَيْرٌ لَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ .....

"تمہارا قرضدار اگر تنگ دست ہو تو ہاتھ کھلنے تک اسے مہلت دو 'اور جو صدقہ کرو تو تمہارے لئے یہ بہتر ہے۔ اگر سمجھو۔"

اسلامی نظام زندگی میں ضابطہ یہ ہے کہ تنگ دست کا تعاقب نہ کیا جائے گا۔ نہ تو قرض خواہ یہ کرے گا اور نہ ہی قانون اور عدالتوں

کو یہ اختیار ہو گا کہ وہ تنگ دست مقروض کا تعاقب کریں۔ بلکہ اسے اس وقت تک مہلت دی جائے گی جب تک اس کے حالات اچھے نہیں ہو جاتے۔ پھر اسلامی سوسائٹی مقروض کو اپنے حال پر نہیں چھوڑتی۔ پہلے تو قرض خواہ سے یہ مطالبہ کیا جاتا ہے کہ وہ اسے معاف کر دے۔ اگر وہ ایسا کر سکے۔ وہ خود اس کیلئے بھی بہتر ہے اور مدیوں کیلئے بھی خیر ہے۔ یہ اس سوسائٹی کے لئے ابھی بہتر ہے جو اپنے افراد کیلئے تکافل فراہم کرتی ہے۔ بشرطیکہ داین و مدیون دونوں اس بات کو سمجھیں کہ اللہ تعالیٰ کے علم میں جو کچھ ہے وہ ان کیلئے مفید ہے۔

اگر قرض خواہ کو یہ اجازت دیدی جائے کہ وہ مدیون پر عرصہ حیات تنگ کر دے اور اس کا تعاقب کرے تو اس صورت میں تحریم رباسے جو فوائد مطلوب تھے' وہ سب فوت ہو جائیں گے۔ اس لئے کہ مدیوں تنگ دست ہے اس کے پاس کچھ ہے نہیں۔ دوسری جانب سے قرض خواہ ازروئے قانون اسے تنگ کرنے کا مجاز ہے۔ چنانچہ یہاں شرط و جواب شرط کی شکل میں یہ حکم دیا گیا کہ اگر تنگ دست ہے تو اسے اس وقت تک مہلت دی جائے جب تک اس کے مالی حالات اچھے نہیں ہو جاتے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ تنگدستی کی صورت میں قرض خواہ کو یہ ترغیب بھی دی جاتی ہے کہ اگر وہ ایسی صورت میں کچھ معاف کر دے یا سب کچھ معاف کر دے تو اس کیلئے یہ بہت اچھا ہے۔

مہلت کے علاوہ قرآن کریم نے دوسری جگہ ایسے نادار قرض داروں کیلئے زکوٰۃ فنڈ سے بھی ایک مد فراہم کی ہے' تاکہ وہ اپنا قرضہ ادا کر سکے۔ اور اس کی زندگی کا بوجھ اتر جائے۔ اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلۡفُقَرَآءِ وَ الۡمَسٰکِیۡنِ .... وَ الۡغٰرِمِیۡنَ .... "بے شک صدقات کے حقدار فقراء' مساکین' ..... اور قرضدار ہیں۔"

الغارمین سے مراد وہ قرضدار ہیں جو قرضوں کے بوجھ تلے دب گئے ہوں۔ وہ نہیں جنہوں نے قرضے لیکر عیاشی اور لذت پرستی کی ہو۔ بلکہ انہوں نے جائز مدات میں اخراجات کئے ہوں یا وہ معقول وجوہ کی بناپر قرضدار ہو گئے ہوں۔ اور ان کے حالات خراب ہو گئے ہوں۔

اب آخر میں قرآن کریم' خاتمہ کلام پر' ایک نہایت موثر اور گہرا اشارہ دیتا ہے جس سے ایک مومن پر کپکپی طاری ہو جاتی ہے۔ وہ تمنا کرنے لگتا ہے کہ کاش وہ سب قرضہ ہی معاف کر دے۔ اور قیامت کے دن اللہ کے ہاں فلاح پالے۔

وَ اتَّقُوۡا یَوۡمًا تُرۡجَعُوۡنَ فِیۡہِ اِلَی اللّٰہِ ٭۟ ثُمَّ تُوَفّٰی کُلُّ نَفۡسٍ مَّا کَسَبَتۡ وَ ہُمۡ لَا یُظۡلَمُوۡنَ ﴿۲۸۱﴾

۳۸ ع۸ ۶

"اس دن کی رسوائی اور مصیبت سے بچو' جبکہ تم اللہ کی طرف واپس ہو گے۔ وہاں ہر شخص کو اس کی کمائی ہوئی نیکی یا بدی کا پورا پورا بدلہ مل جائے گا اور کسی پر ظلم ہرگز نہ ہو گا۔" ..... یہ وہ دن ہو گا' جس میں سب اللہ کی طرف لوٹیں گے اور ہر شخص کو اس کی کمائی پوری پوری دی جائے گی۔ وہ دن بڑا مشکل دن ہو گا۔ اس دن کی بابت دل مسلم میں بڑا خوف پایا جاتا ہے۔ مومن کے ضمیر کی گہرائیوں میں شاید قیامت کا نقشہ اور اس کی ہولناکیاں موجود ہوتی ہیں۔ اس لئے کہ باری تعالیٰ کے سامنے کھڑے ہونے کا تصور ہی اس قدر خوفناک ہوتا ہے کہ اس سے انسان کا پورا وجود کانپ اٹھتا ہے۔ یہ خاتمہ کلام ایسا ہے جو مذکورہ معاملات کی فضا کے ساتھ متناسق ہے۔ یہ فضا لینے اور دینے کی فضا ہے۔ کسب اور جزاء کی فضا ہے۔ اس فضا میں انسان کی پوری زندگی کا تصفیہ ہو رہا ہے۔ انسان کی پوری زندگی کے فیصلے کی فضا ہے۔ اس فضا سے دل مومن خائف ہوتا ہے اور اپنے آپ کو اس کی ہولناکیوں سے بچاتا ہے۔

تقویٰ اور خدا خوفی وہ چوکیدار ہے جو انسانی ضمیر کی گہرائیوں میں بیٹھا ہوتا ہے۔ اسلام ہر مومن کے دل کی گہرائیوں میں یہ چوکیدار بیٹھا دیتا ہے۔ تاکہ دل مومن کیلئے فرار کی کوئی راہ ہی نہ رہے۔

یہ ہے اسلامی نظام زندگی جو ایک مضبوط اور قوی نظام ہے۔ یہ ایک سنجیدہ اور زندگی سے بھرپور نظام زندگی ہے اور ایسا نظام ہے جو اس کرۂ ارض پر عملاً چلنے کے قابل ہے۔ انسانیت کیلئے یہ اللہ تعالیٰ کی رحمت و رأفت ہے۔ یہ انسانیت کیلئے ایک اعزاز ہے۔ یہ ایک ایسی بھلائی ہے جس سے انسانیت کو دور رکھا جا رہا ہے۔ اور اللہ کے دشمن اور انسانیت کے دشمن انسانوں کو اس کی طرف آنے سے روکتے ہیں۔

☆......☆......☆......☆......☆

درس ۲۱ ایک نظر میں

درس سابق کا موضوع سودخوری اور صدقہ تھا' اس درس میں اسی موضوع کے تکمیلی احکام بابت قرضہ جات' تجارت وغیرہ کا ذکر ہے۔ درس سابق میں سودی کاروبار کو ممنوع قرار دیا گیا۔ اسی طرح وہاں سودی قرضہ جات اور سودی نظام تجارت اور بیع و شراء کو ممنوع قرار دیا گیا تھا۔ یہاں قرض حسن' جس میں ربا کا کوئی شبہ نہ ہو' جس پر کوئی سودی منافع عائد نہ ہو' کی بات ہو رہی ہے۔ ان تجارتی امور پر بحث ہوتی ہے جو دستی طور پر طے ہوتے ہیں اور جن میں کسی قسم کے سودی نفع کا کوئی شائبہ نہیں ہوتا۔

اس درس پر ایک نظر ڈال کر انسان حیرت زدہ ہو جاتا ہے۔ قرآن کریم قانون سازی کیلئے جو انداز تعبیر اختیار کرتا ہے وہ حیران کن انداز ہے۔ قانون مدعیٰ کو اس باریک بینی کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے کہ اس میں کسی لفظ کو بدل کر دوسرا لفظ اس کی جگہ نہیں رکھا جاسکتا۔ کوئی فقرہ نہ بدلا جاسکتا ہے اور نہ ہی اسے آگے پیچھے کیا جاسکتا ہے۔ اس خالص قانونی انداز تعبیر کے ساتھ ساتھ قرآن کریم کی خوبصورت ادیبانہ طرز ادا اور الفاظ کی خوشگواری اور مٹھاس اور روانی میں بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔ قانونی مدعا دینی وجدان کے رنگ میں بیان ہوتا ہے۔ جو بہت ہی لطیف انداز میں اور نہایت ہی اثر آمیزی کے ساتھ اور بہترین طرز کے ساتھ جبکہ آیت کے ربط میں بھی کوئی خلل نہیں آتا۔ اور مکمل قانونی مدعا بھی بیان ہو جاتا ہے۔ اس میں معاہدہ کرنے والے فریقین کے درمیان جو جو احتمالات ہو سکتے ہیں' جو جو موقف بھی ہو سکتا ہے لکھنے والوں کی ذمہ داری' گواہوں کی ذمہ داری وغیرہ سب امور کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ غلط طور پر اثر انداز ہونے والے تمام عوامل کی نفی کر دی گئی ہے۔ اور ہر ممکن صورت کے لیے احتیاطی تدابیر اختیار کی گئی ہیں۔

بیان مدعا میں ایک قانونی نکتے سے دوسرے نکتے کی طرف منتقل ہونے سے پہلے اسے مکمل طور پر بیان کر دیا جاتا ہے۔ جسے دوبارہ نہیں دہرایا جاتا۔ الا یہ کہ اس کے اور جدید نکتے کے درمیان کوئی خاص تعلق ہو۔ اس صورت میں پہلے بیان کردہ قانونی نکتے کے ساتھ اسے جوڑ دیا جاتا ہے اور اشارہ کر دیا جاتا ہے۔

قرآن کریم جس طرح اپنی قانون سازی کیلئے انتخاب الفاظ و فقرات میں اعجاز رکھتا ہے' اسی طرح وہ انسان کی ہدایت اور راہنمائی کے سلسلے میں نازل ہونیوالی آیات میں بھی صاحب اعجاز ہے۔ بلکہ قانونی عبارات میں اس کا اعجاز عام آیات سے بھی زیادہ واضح اور حیران کن ہے۔ یہاں کوئی بھی قانونی مدعا اور اصول ایسے لطیف اور ٹیکنیکل پیرائے میں بیان کیا جاتا ہے کہ کسی ایک لفظ کو بھی کسی دوسرے لفظ سے بدل کر وہ مدعا حاصل نہیں کیا جاسکتا۔ کسی لفظ کی جگہ کوئی دوسرا لفظ نہیں لے سکتا۔ اگر قرآن مجید معجزہ نہ ہوتا تو خالص قانونی تعبیرات میں' اس طرز ادا کے ساتھ' خالص ادبی اور فنی پیرایہ اظہار میں کلام نہ کیا جاسکتا۔ جس کا کوئی جواب نہیں ہے۔

ان سب خوبیوں کے ساتھ ساتھ یہ حقیقت اپنی جگہ مسلم ہے۔ دیوانی' شہری' اقتصادی اور تجارتی معاملات میں دور جدید سے بھی تقریباً ایک ہزار سال پہلے قرآن کریم نے یہ قانون سازی کی ہے۔ جسے تمام جدید ماہرین قانون تسلیم کرتے ہیں اور فقہاء اور محدثین اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ قرآن کریم اس معاملے میں سرخیل ہے۔

درس ۲۱ تشریح آیات

آیت نمبر ۲۸۲ تا ۲۸۴

يَأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا تَدَايَنتُم بِدَيْنٍ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوهُ ۚ

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو' جب کسی مقررہ مدت کیلئے تم آپس میں قرض کالین دین کرو' تو اسے لکھ لیا کرو۔" یہ ایک عام قانون ہے جسے اس آیت میں طے کیا گیا ہے۔ اس آیت کی رو سے کسی معاہدے کا لکھنا نہایت ہی ضروری ہے۔ اور اگر کسی قرضے کا معاملہ ہو اور اس قرضے کے سلسلے میں کوئی میعاد مقرر ہو تو اس صورت میں اس کا تحریر میں آنا فرض ہے کسی کو یہ اختیار نہیں ہے کہ وہ تحریر میں نہ لائے۔ اور اس کی حکمت بھی اس آیت کے آخر میں بیان کر دی گئی ہے۔

وَلْيَكْتُب بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌ بِالْعَدْلِ ۚ

"فریقین کے درمیان انصاف کے ساتھ ایک شخص دستاویز تحریر کرے۔"...... یہاں اس شخص کو بھی متعین کر دیا گیا جو ان قرضہ جات کے سلسلے میں دستاویز تیار کرے گا۔ مثلاً عرضی نویس' یہ ایک تیسرا شخص ہو گا۔ فریقین میں سے کوئی نہ ہو گا۔ کسی معاملے میں فریقین معاہدہ کے علاوہ تیسرے شخص کو بلانا' محض زیادہ احتیاط کیلئے ہے تاکہ کوئی شک نہ رہے۔ پھر کاتب کو بھی حکم دیا گیا ہے کہ وہ عدل و انصاف کے ساتھ لکھے گا۔ فریقین میں سے کسی کی طرفداری نہ کرے گا۔ عبارت میں کسی قسم کی کم بیشی نہ کرے گا۔

وَلَا يَأْبَ كَاتِبٌ أَن يَكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللَّهُ ۚ فَلْيَكْتُبْ

"جسے اللہ نے لکھنے پڑھنے کی قابلیت بخشی ہو اسے لکھنے سے انکار نہ کرنا چاہئے۔" اس لئے کہ لکھنے کا حکم اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے یعنی کاتب کو بھی اللہ کی جانب سے حکم دیا جا رہا ہے۔ تاکہ وہ پیچھے نہ ہٹے۔ لکھنے سے انکار نہ کرے اور لکھنے کا یہ کام اس کیلئے ایک بوجھ نہ ہو۔ یہ تو اب اللہ تعالیٰ کی جانب سے منصوص فریضہ ہے۔ اور از روئے قانون یہ لکھنے والے کی ڈیوٹی ہے۔ اور اس کا معاوضہ بھی اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے۔ لکھنے کا عمل اس کی جانب سے اللہ تعالیٰ کے ہاں شکر نعمت ہے۔ اللہ ہی ہے جس نے اپنا فضل کر کے اسے لکھنے کا فن سکھایا۔ اس لئے اسے معاہدات کو تحریر میں لانا چاہئے کیونکہ اللہ ہی نے اسے یہ علم دیا ہے۔

یہاں تک شارع نے میعادی قرضے کو تحریر میں لانے کی قانونی دفعہ کو ختم کر دیا۔ یہ بھی متعین کر دیا گیا کہ لکھنے کی ڈیوٹی کون سرانجام دے گا۔ اس پر یہ فریضہ عائد کر دیا گیا کہ وہ لکھے۔ اسی اثناء میں کاتب کو یہ بھی یاد دلایا گیا کہ وہ اس ضمن میں اللہ کی اس نعمت کا شکرانہ ادا کرے۔ اشارہ اس طرف ہے کہ صاحب فن ہونے کی وجہ سے اس کا فرض ہے کہ وہ لکھنے میں عدل و انصاف کے دامن کو تھامے رکھے۔

اس پہلی دفعہ کی تکمیل کے بعد اب دوسری دفعہ کیفیت تحریر کے بارے میں ہے۔

وَلْيُمْلِلِ الَّذِي عَلَيْهِ الْحَقُّ وَلْيَتَّقِ اللَّهَ رَبَّهُ وَلَا يَبْخَسْ مِنْهُ شَيْئًا ۚ فَإِن كَانَ الَّذِي عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيهًا أَوْ ضَعِيفًا أَوْ لَا يَسْتَطِيعُ أَن يُمِلَّ هُوَ فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهُ بِالْعَدْلِ ۚ

"اور املاوہ شخص کرائے جس پر حق آتا ہے اور اسے اللہ' اپنے رب سے ڈرنا چاہئے کہ جو معاملہ طے ہوا ہو اس میں کوئی کمی بیشی نہ کرے۔ لیکن اگر قرض لینے والا خود نادان یا ضعیف ہو' یا املانہ کر سکتا ہو' تو اس کا ولی انصاف کے ساتھ املا کرائے۔"

مدیون' جس پر حق آرہا ہوں' وہ اس بات کا مستحق ہے کہ وہ دستاویز املاء کرائے۔ قرضے کا اعتراف کرے۔ قرضے کی مقدار لکھوائے۔ اس کی شرائط طے کرے اور نوٹ کرائے' اور اس کی میعاد لکھوائے۔ یہ اس لئے کہ مدیوں کے ساتھ تحریر دستاویز میں کوئی یادتی نہ ہو جائے۔ کیونکہ اگر قرض فراہم کرنے والا دستاویز طے کرائے تو وہ شرائط یا قرضے میں اضافہ کر سکتا ہے۔ میعاد میں کمی بیشی کر سکتا ہے۔ یا اپنی مصلحت و مفاد کیلئے کچھ شرائط اس میں لکھ سکتا ہے۔ اس لئے کہ قرض لینے والا کمزور پوزیشن میں ہوتا ہے۔ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی مجبوریوں کی وجہ سے' دائن کی املاء کی اس وقت مخالفت کرنے کی جرأت نہ کر سکے۔ اس لئے کہ وہ سودا ہر صورت میں کرنا چاہتا ہے اور اسے سخت ضرورت ہے۔ اور اس صورت میں دائن املا کر کے اس کے ساتھ زیادتی کرے۔ لیکن خود اگر مدیون دستاویز لکھوا رہا ہو تو وہ اپنی بات لکھوائے گا۔ جو اس نے بطیب نفس قبول کی ہوئی ہے۔ ایسی صورت میں اس کا اقرار زیادہ قوی اور مضبوط ہو گا۔ کیونکہ اس نے خود تحریر کو املا کیا ہوتا ہے۔ لیکن ساتھ ساتھ مدیوں کے ضمیر کو بھی بیدار کیا جاتا ہے کہ وہ خدا خوفی کو پیش نظر رکھے۔ اور اس کے ذمے جو قرض ہے۔ اس میں سے کسی چیز کو بھی کم نہ کرے۔ اور نہ ہی اس دستاویز کی ضروری شرائط میں سے کسی ایک کو ترک کرے۔ اگر مدیون نادان ہو' اپنے معاملات کو اچھی طرح طے نہ کر سکتا ہو۔ یا وہ ضعیف ہو یعنی عمر میں کم ہو یا ضعیف العقل ہو' یا کسی اور عذر کی وجہ سے املانہ کر سکتا ہو یعنی ان پڑھ ہے' جاہل ہے۔ یا اس کی زبان میں کوئی لکنت وغیرہ ہے۔ یا کوئی محسوس یا معقول سبب ہو' تو اس صورت میں اس کا ولی الامر یہ کام کرے اور اس ولی الامر کا بھی یہ فرض ہے کہ وہ بھی فریقین کے ساتھ انصاف اور عدل سے معاملہ کرے۔ یہاں عدل کا ذکر اس لئے کیا گیا کہ بعض اوقات ولی الامر بھی لاپرواہی کر سکتا ہے۔ اس لئے کہ قرضے کا تعلق اس کی ذات سے نہیں ہے تاکہ وہ اس تحریر میں تمام مفادات اور گارنٹیوں کو ضابطہ بند کر دے۔ اور یہ معاہدہ صحیح طور پر طے ہو جائے۔

یہاں آکر تحریر معاہدہ کے سلسلے میں بات ختم ہو جاتی ہے اور تحریر معاہدہ بابت قرضہ جات میعادی کے تمام پہلوؤں پر بحث مکمل ہو جاتی ہے۔ اور اب معاہدے کے دوسرے ضروری جزء پر بات ہوتی ہے۔ یعنی گواہان دستاویزات (Margucl Witnesses)۔ وَ

اسْتَشْهِدُوا شَهِيدَيْنِ مِن رِّجَالِكُمْ ۖ فَإِن لَّمْ يَكُونَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَامْرَأَتَانِ مِمَّن تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَاءِ أَن تَضِلَّ إِحْدَاهُمَا فَتُذَكِّرَ إِحْدَاهُمَا الْأُخْرَىٰ ۚ

"پھر اپنے مردوں میں سے دو آدمیوں کی اس پر گواہی کرا لو اور اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں ہوں تاکہ ایک

بھول جائے تو دوسری اسے یاد دلائے۔ یہ گواہ ایسے لوگوں میں سے ہونے چاہئیں' جن کی گواہی تمہارے درمیان مقبول ہو۔"

ہر معاہدے پر دو گواہوں کی شہادت ضروری ہے۔ اور وہ ایسے لوگ ہونے چاہئیں جن کی گواہی مقبول ہو۔ ترضون کے دو مفہوم ہیں۔ ایک یہ کہ گواہ عادل ہوں اور امت میں ان کی شہادت کو قبولیت حاصل ہو۔ اور دوسرا مفہوم یہ ہے کہ ان کی شہادت پر معاہدے کے ہردو فریق راضی ہو۔ لیکن بعض اوقات ایسے حالات ہوتے ہیں کہ شہادت میسر نہیں ہوتی اس لئے یہاں قانون میں یہ سہولت رکھ دی گئی ہے کہ اگر مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں گواہ بن سکتی ہیں۔ گواہی کا کام مردوں کے سپرد اس لئے کیا گیا ہے کہ ایک صحت مند اسلامی معاشرہ میں عموماً مرد ہی یہ کام کرتے ہیں۔ کیونکہ اسلامی معاشرہ میں بالعموم' عورت کو اپنی ضروریات زندگی کے لئے جدوجہد نہیں کرنی پڑتی۔ وہ بحیثیت ماں اور بحیثیت صنف نازک اپنے فرائض سرانجام دیتی ہے۔ اور اس کا سب سے بڑا فریضہ یہ ہے کہ وہ انسانیت کے سب سے بڑے سرمایہ یعنی بچوں کی پرورش اور تربیت کا کام کرے جو مستقبل کے نمائندے ہوتے ہیں اور ان بچوں کی قدروقیمت ان چند لقموں اور چند ٹکوں سے زیادہ ہوتی ہے۔ جو کوئی عورت اپنے عمل سے کماسکتی ہے۔ جب کہ آج کے بے راہ اور محروم معاشرہ میں عورت کو مجبوراً اپنے ان فرائض کے ساتھ یہ کام بھی کرنا پڑتا ہے' تو ایسے حالات میں اگر دو مرد گواہ نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں گواہ بن جائیں۔ سوال یہ ہے کہ ایک مرد کے مقابلے میں عورتیں دو کیوں رکھی گئی ہیں؟ قرآن کریم نے اس بات کو مجمل نہیں چھوڑا ہے۔ اس لئے کہ قانون سازی کے میدان میں ہر عبارت واضح' متعین اور قانون سازی کے اصل سبب پر مشتمل ہونا چاہئے۔

أَنْ تَضِلَّ إِحْدَاهُمَا فَتُذَكِّرَ إِحْدَاهُمَا الْأُخْرَىٰ .... "کہ اگر ایک بھول جائے تو دوسری اسے یاد دلادے۔"

سوال یہ ہے کہ عورت بھولتی کیوں ہے؟ اس کے کئی اسباب ہوسکتے ہیں کبھی یہ بھی سبب ہوسکتا ہے کہ عورتوں کو عموماً معاہدات کے میدان میں زیادہ تجربہ نہیں ہوتا۔ اس لئے ہوسکتا ہے کہ کسی معاہدے کے حالات اور شرائط پوری طرح اس کے ذہن میں نہ بیٹھے ہوں۔ اور وہ مقدمہ بازی کے وقت ان کے بارے بالکل اچھی طرح شہادت نہ دے سکتی ہو۔ اس لئے سہولت کیلئے دوسری عورت کو ساتھ رکھا گیا تاکہ شہادت کے وقت وہ اسے اصل بات یاد دلا دے۔ اور وہ ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کریں اور موضوع متنازعہ کے اصل حالات کو ذہن میں لاسکیں۔

کبھی اس بھول کا سبب یہ ہوتا ہے کہ عورت بہت زیادہ منفعل مزاج ہوتی ہے۔ عورت کی مامتا اور اس کی جسمانی اور عضویاتی اور طبیعاتی وظائف کا بھی یہ اہم تقاضا ہے کہ عورت منفعل ہو۔ جلد لبیک کہنے والی ہوتا کہ وہ بچے کی نشوونما کے سلسلے میں اپنے طبعی فرائض اچھی طرح سرانجام دے سکے۔ یہ فرائض ایسے ہیں جو کسی بھی عورت کی شخصیت سے جدا نہیں کئے جاسکتے۔ یہ عورت پر اللہ تعالیٰ کا ایک بہت بڑا کرم ہے اور اسی طرح پیدا ہونے والے بچے پر بھی اللہ کی رحمت ہے۔ اس لئے عورت کا یہ مزاج کسی بھی وقت اس کی شخصیت سے جدا نہیں ہوسکتا۔ اسکی اپنی شخصیت ہے اور اپنا مزاج ہے بشرطیکہ عورت صحت مند ہو اور اس کی شخصیت کو بگاڑ نہ دیا گیا ہو۔ جبکہ معاہدات جیسے پیچیدہ معاملات اور ان معاملات میں شہادت دینا ایک ایسا فریضہ ہے جس میں کسی شخص کا اپنے موقف پر جمار ہنے اور کسی بات سے متاثر نہ ہونا ایک ضروری امر ہے اور یہ بھی ضروری ہے کہ گواہ ایک حقیقت سے اچھی طرح واقف ہو اور ثابت قدم ہو۔ ایسے مواقع پر دو عورتوں کا بیک وقت شہادت دینا اس بات کی ضمانت ہے کہ اگر ایک بھول جائے تو دوسری اسے یاد دلائے۔ جبکہ وہ بھول اور فطری انفعال کی وجہ سے غلط ہو رہی ہو۔ اس طرح یاددہانی کے بعد وہ اصلی واقعہ کی طرف لوٹ آئے گی۔

آغاز آیت میں جس طرح لکھنے والوں کو یہ کہا گیا تھا کہ وہ لکھنے سے انکار نہ کریں۔ اب گواہوں سے بھی کہا جاتا ہے کہ جب انہیں شہادت کیلئے بلایا جائے تو وہ شہادت حق دینے سے انکار نہ کریں۔

وَلَا يَأْبَ الشُّهَدَآءُ اِذَا مَا دُعُوْا ؕ

"گواہوں کو جب گواہ بننے کیلئے کہا جائے تو انہیں انکار نہ کرنا چاہئے۔" گویا شہادت دینا ایک فریضہ ہے' محض نفل اور غیر لازم کام نہیں ہے۔ اس لئے کہ احقاق حق اور قیام عدل کا اہم ذریعہ شہادت حق ہے۔ چونکہ یہ فریضہ اللہ تعالیٰ نے عائد کیا ہے اس لئے اسلامی نظام عدل میں گواہ اپنی دلی رضا' شعوری آمادی کے ساتھ شہادت دینے کیلئے آئیں گے اور وہ بغیر کسی نقصان دہی یا ہچکچاہٹ۔ کے شہادت کیلئے آئیں گے۔ اسی طرح وہ فریقین مقدمہ میں سے کسی پر کوئی احسان بھی نہ کر رہے ہوں گے۔ چاہے وہ ایک فریق کی طرف سے بلائے گئے ہوں یا دونوں کی طرف سے بلائے گئے ہوں۔

* یہاں شہادت کی بات ختم ہو جاتی ہے۔ اس لئے شارع اب ایک دوسرے اہم معاملے کے سلسلے میں ہدایات دیتے ہیں۔ یہ ایک عام ہدایت ہے۔ اس میں تحریر کی تاکید کی گئی ہے۔ معاملہ چھوٹا ہو یا بڑا ہو۔ بعض اوقات ایک انسان یہ بات سوچ کر کہ قرضہ تھوڑا ہے یا معاملے کی اہمیت زیادہ نہیں ہے۔ وہ لکھنے میں سستی کرتا ہے۔ یا بعض اوقات بعض دوسرے حالات ایسے ہوتے ہیں کہ انسان لکھنے میں کوتاہی کر لیتا ہے۔ مثلاً شرم و حیاء' سستی اور تن آسانی' لاپرواہی اور عدم مبالات وغیرہ۔ چنانچہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ وجدانی اور عملی وجوہات کی بنا پر لکھنے اور تحریر میں لانے کو ضروری قرار دیتے ہیں۔

وَلَا تَسْـَٔمُوْٓا اَنْ تَكْتُبُوْهُ صَغِيْرًا اَوْ كَبِيْرًا اِلٰٓى اَجَلِهٖ ؕ ذٰلِكُمْ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ وَ اَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ وَاَدْنٰٓى اَلَّا تَرْتَابُوْٓا

"معاملہ خواہ چھوٹا ہو یا بڑا' میعاد کی تعین کے ساتھ اس کی دستاویز لکھوا لینے میں تساہل نہ کرو۔ اللہ کے نزدیک یہ طریقہ تمہارے لئے زیادہ مبنی بر انصاف ہے۔ اس سے شہادت قائم ہونے میں زیادہ سہولت ہوتی ہے اور تمہارے شکوک و شبہات میں مبتلا ہونے کا امکان کم رہ جاتا ہے۔"

"تساہل نہ کرو" جب نفس انسانی یہ محسوس کرتا ہے کہ کسی کام کی مشقت اس کی قدر و قیمت سے زیادہ ہے تو اس وقت نفس انسانی متاثر ہو کر وہ کام کرنے سے کتراتا ہے اور قرآن کریم اس حقیقت سے اچھی طرح باخبر ہے۔ "یہ طریقہ تمہارے لئے زیادہ مبنی بر انصاف ہے۔" اس لئے کہ کسی معاملے میں زبانی شہادت کے مقابلے میں دستاویزی شہادت کی اساس پر زیادہ سہولت کے ساتھ انصاف کیا جاسکتا ہے۔ کیونکہ زبانی شہادت کا دارومدار صرف حافظہ پر ہوتا ہے۔ اسی طرح دو مردوں یا دو عورتوں کی شہادت بمقابلہ ایک مرد یا ایک عورت کے زیادہ قوی ہے۔ اور شکوک و شبہات میں مبتلا ہونے کا امکان کم رہ جاتا ہے۔ اس صورت میں شک کی گنجائش کم سے کم ہو جاتی ہے۔ یعنی معاہدہ کے اندر مشمولہ بیانات میں شک نہ رہے۔ یا تمہارے نفوس کے اندر شک نہ رہے یا دوسرے لوگوں کے اندر شک نہ رہے۔ یہاں شک کو عام رکھا گیا ہے۔ یعنی کسی پہلو میں بھی شک نہ رہے۔

یوں ان اقدامات کی حکمت آشکارہ ہو جاتی ہے۔ اور معاملہ کرنے والے مطمئن ہو جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جو قانون سازی فرمائی ہے وہ نہایت ہی حکیمانہ ہے اور اس کے مقاصد بہت ہی گہرے ہیں اور نہایت ہی عملی ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ معاملات کے اندر صحت' یقین' اطمینان اور اعتبار قائم ہو۔

یہ احکام اس قرض کے بارے میں ہیں' جو میعادی قرض ہو' رہی وہ تجارت جو ہم روزمرہ کے معمولات کے مطابق کرتے ہیں' تو روزمرہ کے معاملات میں یہ حکم نہیں ہے کہ انہیں لازماً ضابطہ تحریر میں لایا جائے۔ اس میں گواہوں کی شہادت ہی کافی ہے۔ اس لئے کہ ہر کام میں معاہدے اور تحریر کے لازم کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تجارتی اور کاروباری سرگرمیوں میں رکاوٹیں پیدا ہوں گی۔ اس لئے کہ روزمرہ کی تجارتی سرگرمیاں بڑی تیزی سے اور مختصر وقت صرف کرکے کی جاتی ہیں۔ اسلام قانون سازی انسانی زندگی کی بہتری کیلئے کرتا ہے۔ وہ انسانی زندگی کے تمام حالات کو پیش نظر رکھ کر قانون بناتا ہے۔ وہ ایک عملی نظام قانون ہے' جس میں کوئی پیچیدگی نہیں ہے۔ نہ اس قانون کی وجہ سے زندگی کی پرسکون رفتار میں کمی آتی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

إِلَّآ أَن تَكُونَ تِجَـٰرَةً حَاضِرَةً تُدِيرُونَهَا بَيْنَكُمْ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَلَّا تَكْتُبُوهَا ۗ وَأَشْهِدُوٓا۟ إِذَا تَبَايَعْتُمْ ۚ

"ہاں جو تجارتی لین دین دست بدست تم لوگ آپس میں کرتے ہو' اس کو نہ لکھا جائے تو کوئی حرج نہیں' مگر تجارتی معاملے طے کرتے وقت گواہ کرلیا کرو۔"

بظاہر اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ عام معاملات تحریر نہ کرنا رخصت ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ کتابت واجب ہے۔ اور لازمی ہے۔ بعض روایات میں یہ بھی ذکر ہے کہ ہر معاملے کی کتابت مستحسن ہے۔ لازمی نہیں ہے۔ لیکن راجح بات یہ ہے کہ کتابت معاملات لازمی ہے۔

یہاں تک تو قانون سازی تھی اس قرضے کی بابت جس کی میعاد متعین ہو' یا وہ تجارت جس کا تعلق روزمرہ لین دین سے ہو' اور دونوں میں کتابت اور شہادت کو ضروری قرار دیا گیا ہو' لازماً یا بطور استحباب یہاں سے آگے اب کاتبوں اور گواہوں کے حقوق کا تعین کیا جاتا ہے۔ نیز ان کے فرائض کا بھی تعین کردیا جاتا ہے۔ ان پر پہلا فریضہ یہ عائد ہوتا ہے کہ وہ لکھنے یا گواہ بننے سے انکار نہ کریں۔ اور یہ کہ اب یہاں حکم دیا جاتا ہے کہ کاتبوں اور گواہوں کو مکمل تحفظ فراہم ہو تاکہ سچائی اور لوگوں کے حقوق میں توازن پیدا ہو اور لوگ بسہولت اپنے سوشل فرائض سرانجام دے سکیں۔ بلاخوف و خطر..... فرماتے ہیں۔

وَلَا يُضَآرَّ كَاتِبٌ وَلَا شَهِيدٌ ۚ وَإِن تَفْعَلُوا۟ فَإِنَّهُۥ فُسُوقٌۢ بِكُمْ ۗ وَٱتَّقُوا۟ ٱللَّهَ ۖ وَيُعَلِّمُكُمُ ٱللَّهُ ۗ وَٱللَّهُ بِكُلِّ شَىْءٍ عَلِيمٌ ﴿٢٨٢﴾

"کاتب اور گواہ کو نہ ستایا جائے۔ ایسا کرو گے تو گناہ کا ارتکاب کرو گے۔ اللہ کے غضب سے بچو۔ وہ تم کو صحیح طریق عمل کی تعلیم دیتا ہے اور اسے ہر چیز کا علم ہے۔"

کسی لکھنے والے یا کسی گواہی دینے والے کو کوئی نقصان نہیں پہنچنا چاہئے۔ محض اس وجہ سے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے' اس پر عائد کردہ فریضہ ادا کررہا ہے۔ اگر تم ایسا کرو گے تو یہ تمہاری جانب سے خدا کے قانون کے خلاف بغاوت ہوگی اور اسلامی طریقۂ حیات کی مخالفت ہوگی۔ لہٰذا اسلامی ریاست کو چاہئے کہ وہ یہ تحفظ لازماً فراہم کرے۔ کیونکہ کاتبین اور شاہد اکثر اوقات مقدمہ کے فریقین میں سے کسی ایک کے غیظ و غضب کا شکار ہوتے رہتے ہیں۔ اس لئے انہیں ایسے تحفظات اور ایسی ضمانتیں حاصل ہونا چاہئیں جن کی وجہ سے وہ

مطمئن ہو کر اپنا فرض ادا کر سکیں۔ بلکہ ان کی حوصلہ افزائی ہو کہ وہ اپنے فرائض اور ذمہ داریوں سے اچھی طرح عہدہ بر آ ہو سکیں اور شرح صدر کے ساتھ اپنے فرائض سرانجام دے سکیں چاہے حالات کیسے ہی ہوں۔

قرآن کریم کی یہ عادت ہے کہ وہ ہر وقت انسان کے ضمیر کو جگاتا رہتا ہے' انسان کے دل میں یہ شعور پیدا کرتا ہے کہ وہ ایک ذمہ دار شخصیت ہے۔ تاکہ اطاعت قانون کا جذبہ خود نفس انسانی کے اندر سے پیدا ہو' اسلام صرف دفعات قانون کے دباؤ پر اکتفاء نہیں کرتا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن اہل ایمان کو خدا خوفی کی طرف دعوت دیتا ہے۔ اور یہ بات تقریباً ہر مضمون کے خاتمہ پر کی جاتی ہے۔ قرآن کریم اہل ایمان کو یاد دلاتا ہے کہ یہ اللہ ہی کی ذات ہے جس نے تم پر اپنا فضل و کرم کیا۔ وہی ہے جو تمہیں تعلیم دیتا ہے۔ اور تمہاری راہ نمائی کرتا ہے۔ خدا خوفی سے ان کے دلوں کے دروازے معرفت اللہیہ کیلئے کھل جاتے ہیں۔ ان کی روح علم حاصل کرنے کیلئے متوجہ ہوتی ہے۔ اور یہ سب کچھ محض اس لئے ہے کہ وہ اللہ کے اس فضل و کرم کا شکرانہ ادا کرتے ہوئے اس کی اطاعت کریں۔ اس سے راضی ہوں' اور اس کی ذات پر مکمل بھروسہ کریں۔

وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ

"اللہ کے غضب سے بچو' وہ تم کو صحیح طریق عمل کی تعلیم دیتا ہے اور اسے ہر چیز کا علم ہے۔"

اس کے بعد شارع قرضے کے احکام کی تکمیلی دفعات بیان کرتا ہے۔ یہ احکام ذرا مؤخر اس لئے بیان کئے گئے ہیں کہ ان کا تعلق عام حالات سے نہیں ہے۔ بلکہ بعض خاص حالات سے ان کا تعلق ہے۔ مثلاً فریقین معاہدہ اگر سفر میں ہوں اور انہیں ایسا شخص نہ مل رہا ہو جو تحریر تیار کرے تو اللہ تعالیٰ نے بغیر تحریر کے زبانی معاہدہ کرنے کی بھی اجازت دے دی بشرطیکہ قبضہ موقعہ پر ہی دے دیا گیا ہو یعنی اس چیز کا قبضہ جو مقروض نے قرض خواہ کو بطور گارنٹی دینا کی ہو۔ فرماتے ہیں۔ وَاِنْ كُنْتُمْ عَلٰى سَفَرٍ وَّلَمْ تَجِدُوْا كَاتِبًا فَرِهٰنٌ مَّقْبُوْضَةٌ ؕ

"اگر تم سفر کی حالت میں ہو' اور دستاویز لکھنے کیلئے کوئی کاتب نہ ملے' تو رہن بالقبض پر معاملہ کرو۔" لیکن اس ظاہری ضمانت کے ساتھ شارع اہل ایمان کے ضمیر کے اندر خدا خوفی کا جذبہ پیدا کر کے انہیں آمادہ کرتا ہے کہ وہ امانت دار بنیں' اپنی ذمہ داریاں پوری کریں' اس لئے کہ ظاہری ضمانت کے مقابلے میں خدا خوفی وہ آخری ضمانت ہے جو کسی معاملے میں کارگر ہو سکتی ہے۔ اور جس کی اساس پر کسی قانون پر صحیح طرح عمل کیا جا سکتا ہے۔ اور جس کی وجہ سے کسی حقدار تک اسکا حق اچھی طرح پہنچ سکتا ہے۔ اور سب کے حقوق محفوظ ہو سکتے ہیں۔

فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا فَلْيُؤَدِّ الَّذِى اؤْتُمِنَ اَمَانَتَهٗ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ ؕ

"اگر تم میں سے کوئی شخص دوسرے پر بھروسہ کر کے اس کے ساتھ کوئی معاملہ کرے' تو جس پر بھروسہ کیا گیا ہو' اسے چاہئے کہ امانت ادا کرے اور اللہ' اپنے رب سے ڈرے۔"

مدیون پر بھروسہ کیا جاتا ہے کہ وہ قرضہ پوری طرح ادا کرے گا اور مقروض پر یہ اعتماد کیا گیا ہے کہ وہ مرہون چیز کو اپنی اصلی حالت میں واپس کرے گا۔ دونوں کو یہ نصیحت کی جاتی ہے کہ وہ خدا خوفی کا رویہ اختیار کر کے اپنے اپنے فرائض سرانجام دیں۔ اس لئے کہ اللہ ہی ہے جو ان دونوں کا رب ہے۔ وہی دونوں کا نگہبان' مربی' سربراہ' حکم اور قاضی ہے۔ یہ تمام تصورات' معاملات اور فرائض و ذمہ داریوں کی ادائیگی کے معاملے میں بڑی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ بعض مفسرین نے یہ کہا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو اس نے

امانتداری کے معاملے میں آیت کتابت کو منسوخ کر دیا ہے۔ لیکن یہ رائے درست نہیں ہے۔ اس لئے کہ صرف حالت سفر میں معاملات کے اندر تحریر نہ کرنے کی رخصت ہے اور یہ امانت داری اور قرض مکفول کا تعلق بھی سفر کی حالت سے ہے اور سفر میں قرض خواہ اور قرض دار دونوں ہی ایک دوسرے پر بھروسہ کر کے معاملہ کرتے ہیں۔ غرض تقویٰ و طہارت پر ابھارتے ہوئے یہاں شہادت کے سلسلے میں بات اختتام تک پہنچتی ہے۔ اور یہاں شہادت سے مراد وہ شہادت نہیں ہے جو بوقت کتابت کسی تحریر پر ڈالی جاتی ہے بلکہ اس سے مراد وہ شہادت ہے جو عدالت میں دی جاتی ہے۔ اس لئے کہ یہ شہادت گواہ کے پاس ایک قسم کی امانت ہوتی ہے۔

وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ ۚ وَمَن يَكْتُمْهَا فَإِنَّهُ آثِمٌ قَلْبُهُ ۗ

"اور شہادت ہرگز نہ چھپاؤ اور جو شہادت چھپاتا ہے اس کا دل گناہ آلودہ ہے۔"

یہاں بات کی نسبت قلب مومن کی طرف کی جاتی ہے۔ اور گناہ کا استناد قلب مؤمن کی طرف کیا جاتا ہے۔ یوں شہادت کا چھپانا دراصل اپنے ضمیر میں گناہ کا چھپانا ہے۔ دونوں باتوں کا تعلق دل و دماغ کی گہرائیوں سے ہے۔ چنانچہ خاتمۂ کلام ایک دھمکی آمیز فقرے سے کیا جاتا ہے۔ جس میں یہ توجہ دلائی جاتی ہے کہ

۳۹
ع۲
۷

وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ عَلِيمٌ ﴿۲۸۳﴾

"اور اللہ تمہارے اعمال سے بے خبر نہیں۔" اور وہ اپنے علم کے مطابق پوشیدہ قلبی اعمال پر بھی جزاء و سزا دے گا۔"

انہی ہدایات کی مزید تاکید اگلی آیت میں بھی جاری ہے۔ مالک ارض و سماوات کے خوف پر دلوں کو ابھارا جاتا ہے۔ جو اس کائنات کی تمام چیزوں کا مالک حقیقی ہے۔ جو تمام دلی بھیدوں کا بھی جاننے والا ہے اور تمام ظاہری باتوں سے بھی خبردار ہے۔ اور وہ تمام اعمال پر سزا اور جزاء بھی دینے والا ہے۔ وہی ہے جو تمام بندوں کے معاملات پر فیصلے کرتا ہے۔ کسی پر اُس کی رحمت نازل ہوتی ہے اور کوئی اس کے عذاب میں گرفتار ہوتا ہے۔ وہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے اور ہر چیز اس کی مشیئت کے تابع ہے۔ اور اللہ کی مشیئت بے قید ہے۔

لِلَّهِ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ ۗ وَإِن تُبْدُوا مَا فِي أَنفُسِكُمْ أَوْ تُخْفُوهُ يُحَاسِبْكُم بِهِ اللَّهُ ۖ فَيَغْفِرُ لِمَن يَشَاءُ وَيُعَذِّبُ مَن يَشَاءُ ۗ وَاللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿۲۸۴﴾

"آسمانوں اور زمینوں میں جو کچھ ہے' سب اللہ کا ہے۔ تم اپنے دل کی باتیں خواہ ظاہر کرو یا چھپاؤ' اللہ بہرحال ان کا حساب تم سے لے گا۔ پھر اسے اختیار ہے' جسے چاہے' معاف کر دے اور جسے چاہے' سزا دے۔ وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔"

قرآن کریم کا یہ انداز ہے کہ وہ خالص قانون سازی کرنیوالی آیات کے خاتمہ کلام پر بھی خالص وجدانی اور اخلاقی راہنمائی کرتا ہے۔ یوں وہ دنیاوی زندگی کے لیے ضابطہ بندی کا تعلق بھی خالق کائنات سے جوڑ دیتا ہے۔ اور یہ رابطہ ایک مستحکم رابطہ ہوتا ہے۔ جس میں ایک طرف تو خدا خوفی کا تصور ہوتا ہے اور دوسری جانب مالک ارض و سما کی مغفرت اور رحمت کی امیدواری ہوتی ہے۔ یہی اخلاقی ضمانت

ہے جو اسلامی نظام قانون کو حاصل ہوتی ہے۔ اور جو اسے دوسرے نظامہائے قانون سے ممتاز اور ممیز کردیتی ہے۔ اور ایک اسلامی معاشرے میں ایک مسلمان کے دل میں اسلامی قانون کا بےحد احترام پایا جاتا ہے۔ یہ اخلاقی گائڈ اور قانون سازی اسلامی معاشرہ میں متوازی طور پر چلتی ہیں۔ اسلام ان دونوں کی اخلاقی تربیت کا بھی انتظام کرتا ہے جس کے لئے وہ قانون سازی کرتا ہے۔ نیز اسلام اس معاشرے کی اخلاقی تربیت بھی کرتا ہے جس کیلئے وہ قانون سازی کرتا ہے۔ اور یہ کام صرف اللہ تعالیٰ کی مکمل اور متوازن حکمت عملی پر مبنی ہوتا ہے۔ کہ ایک طرف افراد و معاشرہ کی اخلاقی تربیت ہو رہی ہوتی ہے' اور دوسری جانب ان کے لئے حکیمانہ قانون سازی ہو رہی ہوتی ہے۔ خدا کا خوف اور قانون کا خوف ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ اور انسان کیلئے قانون وہی ہوتا ہے جو انسان کے خالق نے اس کیلئے تجویز کیا ہوتا ہے۔ اس لئے اس کے مقابلے میں اہل زمین کے قوانین' اہل دنیا کی ضابطہ بندیاں' اہل زمین کے نظام کیسے چل سکتے ہیں۔ انسان کی کوتاہ سوچ' انسان کی محدود عمر' انسان کا محدود علم' انسان کی محدود فکر' اس کا مقابلہ کیسے کر سکتی ہے۔ انسان کی خواہشات آئے دن بدلتی رہتی ہیں۔ کبھی دو انسان کسی بات پر متفق نہیں ہوتے۔ انسان کی کسی رائے کو قرار و ثبات حاصل نہیں ہوتا۔ اس کی معلومات آئے دن بدلتی رہتی ہیں۔ ایسے حالات میں انسانیت کی حالت یہ ہے کہ وہ اپنے خالق سے جدا ہو کر ماری ماری پھر رہی ہے۔ حالانکہ اللہ وہ ذات ہے جس نے انسان کو پیدا کیا۔ وہ جانتا ہے کہ اس نے جس چیز کی تخلیق کی ہے اس کی فطرت کیا ہے۔ اس کی مصلحت کیا ہے' ہر آن اور ہر جگہ اس کے بدلتے ہوئے مصالح اور ضروریات کیا ہیں۔

انسانیت جان لے کہ اس کی یہ عظیم بدبختی ہے کہ وہ اللہ کی شریعت اور اللہ کے منہاج زندگی سے روگردانی اختیار کئے ہوئے ہے۔ یاد رہے کہ الٰہی نظام زندگی سے فرار اور بغاوت کا آغاز مغرب میں اس وقت شروع ہوا' جب لوگوں ظالم اور باغی کلیسا کا جُوا اپنی گردنوں سے اتارنا چاہا۔ مغرب میں لوگوں نے کنیسا کے اس تصور خدا اور تصور الٰہ کے خلاف بغاوت کی تھی۔ جس کی طرف کنیسا لوگوں کو بلاتا تھا۔ اور جس تصور کے مطابق لوگوں کے لئے غور و فکر کرنا اور عقل سے کام لینا حرام تھا۔ اور کلیسا نے مغرب میں عوام پر بھاری ٹیکس عائد کر رکھے تھے۔ اور ان پر ایک ظالمانہ استبدادی نظام مسلط کر رکھا تھا' جس سے عوام کے اندر سخت نفرت پیدا ہوگئی تھی۔ جب لوگوں نے اس جبر و استبداد سے گلو خلاصی چاہی تو انہوں نے سوچا کہ جب تک وہ کنیسا کے خلاف اعلان جنگ نہ کریں گے اور اس جبر و استبداد سے گلو خلاصی حاصل نہیں کر سکتے۔ لیکن اس معاملے میں اہل مغرب حد اعتدال پر قائم نہ رہے' انہوں نے اہل کنیسا سے آزادی حاصل کرنے پر اکتفانہ کیا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ خدا اور خدا کے اقتدار اعلیٰ سے بھی آپنے آپ کو آزاد کر لیا۔ اس طرح انہوں نے کرہ ارض پر سے ہر اس دین کو مٹا دیا جس کی دعوت یہ ہو کہ لوگ اللہ کے نظام زندگی کے مطابق زندگی بسر کریں۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پوری انسانیت پر ایک عظیم تباہی نازل ہوئی اور اس پر مصائب کے پہاڑ ٹوٹے۔[۱]

رہے ہم جو اسلام کے مدعی ہیں' تو ہمارے حالات قابل غور ہیں۔ ہمارا حال یہ ہے کہ ہم نے اسلامی نظام زندگی سے بغاوت حاصل کر لی ہے۔ اللہ کی شریعت اور اسلامی قانون کو ترک کر دیا ہے۔ اور ہمارے یہ حالات اس حقیقت کے باوجود ہیں کہ ہمارے سیدھے سادھے فطری دین نے ہمیں صرف وہی احکام دیئے ہیں جو ہم سے وہ تمام بوجھ اتارتے ہیں جو عیسائیت نے عائد کئے تھے۔ وہ تمام بندھن توڑ دیئے ہیں جن میں ہم ناجائز طور پر جکڑے ہوئے تھے۔ اس دین نے ہمارے ساتھ نہایت ہی مشفقانہ' رحمانہ سلوک کیا اور ہمارے لئے راہنمائی' یسر اور استقامت کا سامان فراہم کیا۔ اور ایک ایسے راستے پر ہمیں گامزن کیا جو ہر طرف سے ترقی و اصلاح کی طرف جاتا ہے۔ اور جس راستے میں کامیابی ہی کامیابی ہے۔

۱۔ اس موضوع پر دیکھئے کتاب الانسان بین المادیہ والاسلام اور کتاب معرکہ التقالید' از جناب محمد قطب ﷾

درس ۲۲ ایک نظر میں

یہ سبق اس عظیم سورت کا اختتامیہ ہے۔ یہ قرآن کریم کی طویل ترین سورت ہے۔ اور اس کی تعبیرات بھی اپنے اندر ایک بڑا حجم رکھتی ہیں۔ اس سورت کے اس حجم اور طوالت کے اندر اسلامی تصور حیات کے ایک بڑے حصے کو سمو دیا گیا ہے۔ اسلامی نظریۂ حیات کے مختلف پہلوؤں پر گفتگو کے ساتھ ساتھ 'اسلامی جماعت کی مختلف صفات' اس کے فرائض' اس کے طریقۂ کار اور اس کرۂ ارض پر مختلف امور کے بارے میں اسکی پالیسیوں کے بارے میں پوری تفصیلات اس سورت میں موجود ہیں۔ اس پوری کائنات میں امت مسلمہ کا کیا کردار ہے؟ اسلامی نظام زندگی کے مخالفین' مقابلین اور دشمنان کے بارے میں اس کا کیا موقف ہے؟ ان دشمنان کا مزاج کیا ہے اور اسلامی نظام کی محاربت میں ان کے وسائل کیا ہیں؟ نیز اسلامی جماعت ان کے مقابلے میں کیا وسائل و ذرائع اختیار کر رہی ہے۔ اور ان کی سازشوں کا مقابلہ کن ذرائع سے کر رہی ہے۔ ان امور کے علاوہ اس سورت میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ مجموعی لحاظ سے خود حضرت انسان کا اس کرۂ ارض پر کیا کردار مقرر کیا گیا ہے؟ انسان کی فطرت کیا ہے؟ اور انسانی تاریخ میں انسان سے کیا کیا کوتاہیاں اور لغزشیں ہوئی ہیں۔ تاریخی قصص پیش کر کے انکی وضاحت کی گئی ہے۔ غرض یہ اور وہ تمام دوسری باتیں جن کی تفصیلات اس طویل سورت میں بیان کی گئیں۔

یہ سبق اس طویل سورت کا اختتامیہ ہے اور صرف دو آیات میں لیکن ان دو آیات میں ان تمام مضامین اور افکار کو سمو دیا گیا ہے۔ جو اس طویل ترین سورت میں زیر بحث آئے۔ یہ آیات فی الواقع سورت کا ایک اچھا اختتامیہ ہیں جو اس پوری سورت کے ساتھ ہم آہنگ' متناسب اور اس سورت کے مقاصد اور اس کے اندر پائی جانے والی واقعاتی فضاء کے ساتھ مناسب ہیں۔

اس سورت کا آغاز ان الفاظ سے ہوا تھا۔ "الف' لام' میم' یہ اللہ کی کتاب ہے۔" اس میں کوئی شک نہیں ہے۔ ہدایت ہے ان پرہیز گاروں کیلئے جو غیب پر ایمان لاتے ہیں' نماز قائم کرتے ہیں' جو رزق ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ جو کتاب تم پر نازل کی گئی ہے اور جو کتابیں تم سے پہلے نازل کی گئی تھیں ان سب پر ایمان لاتے ہیں۔ اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔"

ان الفاظ میں اس حقیقت کی طرف واضح اشارات دیئے گئے ہیں کہ اہل ایمان تمام رسولوں اور تمام کتابوں پر ایمان لاتے ہیں۔ ان کے درمیان کوئی فرق نہیں کرتے۔ اب ذرا اس اختتامیہ کے الفاظ پر غور کریں۔ اور رسول اس ہدایت پر ایمان لایا ہے۔ جو اس کے رب کی طرف سے اس پر نازل ہوئی ہے۔ اور جو لوگ اس رسول کے ماننے والے ہیں۔ انہوں نے بھی اس ہدایت کو دل سے تسلیم کر لیا ہے۔ یہ سب اللہ اس کے فرشتوں اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں کو مانتے ہیں اور ان کا قول یہ ہے کہ "ہم اللہ کے رسولوں کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کرتے۔" غرض یہ ایک ایسا اختتامیہ ہے جس طرح کتاب کے کور کے دو حصے ہوتے ہیں اور وہ ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے ہوتے ہیں۔

اس سورت میں امت مسلمہ کے فرائض کا بڑا حصہ بیان کیا گیا ہے۔ اور زندگی کے مختلف میدانوں میں اسلامی قوانین کی تفصیلات بھی دی گئی ہیں۔ اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ بنی اسرائیل نے جس طرح اپنے فرائض کو نظرانداز کیا اور جس طرح انہوں نے شریعت خداوندی سے روگردانیاں کیں ان کا بھی تفصیلاً ذکر کیا گیا۔ چنانچہ اختتامیہ میں یہ آیات صاف بتا دیتی ہیں کہ اپنی ذمہ داریوں کی ادائیگی اور شریعت کی اطاعت کس طرح ہوتی ہے اور ذمہ داریوں سے پہلوتہی اور شریعت سے نافرمانیاں کیونکر کی جاتی ہیں۔ اور کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ امت مسلمہ پر کوئی مصیبت ڈالنا نہیں چاہتے۔ نہ اس پر کوئی بھاری بوجھ لادنا چاہتے ہیں۔ نہ اللہ تعالیٰ کو امت مسلمہ

سے کوئی خاص دوستی ہے۔ جس طرح یہود و نصاریٰ یہ سمجھتے تھے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے خاص محبوبین میں سے ہیں۔ اور نہ یہ صورت حال ہے کہ اللہ تعالیٰ نے امت مسلمہ کو نظرانداز کر دیا ہے۔ بلکہ صورت احوال یہ ہے کہ "اللہ تعالیٰ کسی متنفس پر اس کی مقدرت سے بڑھ کر ذمہ داری کا بوجھ نہیں ڈالتا۔ ہر شخص نے جو نیکی کمائی ہے' اس کا پھل اسی کیلئے ہے اور جو بدی سمیٹی ہے' اس کا وبال اسی پر ہے۔"

اس سورت میں بنی اسرائیل کے کچھ قصے بھی بیان کئے گئے ہیں۔ وہ حالات بھی بیان کئے گئے ہیں جن میں بڑے مشکل وقت اللہ تعالیٰ نے اس قوم پر اپنا فضل و کرم کیا اور اس انکار اور ناشکری کا تذکرہ بھی ہوا ہے۔ جو ان انعامات کے مقابلے میں انہوں نے کی۔ پھر وہ سزائیں بھی مذکور ہیں۔ جو اللہ تعالیٰ نے بطور کفارہ ناشکری انہیں دیں اور یہ سزائیں سزائے موت تک تھیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں فَتُوبُوٓا اِلٰى بَارِئِكُمْ فَاقْتُلُوٓا اَنْفُسَكُمْ .... "تو اپنے باری تعالیٰ کی طرف رجوع کرو اور اپنے آپ کو قتل کرو۔" ایسے ہی حالات کے بارے میں اسی سورت کے اختتام پر اہل ایمان کو دعا سکھائی جاتی ہے کہ وہ خشوع و خضوع کے ساتھ ایسے حالات سے پناہ مانگیں جو بنی اسرائیل کو پیش آئے۔ فرماتے ہیں۔ "اے ایمان والو' یوں دعا کرو" اے ہمارے رب' ہم سے بھول چوک میں جو قصور ہو جائیں' ان پر گرفت نہ کر' مالک! ہم پر وہ بوجھ نہ ڈال' جو تو نے ہم سے پہلے لوگوں پر ڈالے تھے۔ پروردگار! جس بار کو اٹھانے کی طاقت ہم میں نہیں ہے وہ ہم پر نہ رکھ' ہمارے ساتھ نرمی کر' ہم سے درگزر فرما' ہم پر رحم کر۔"

اس سورت میں اللہ تعالیٰ نے مومنین پر قتال فی سبیل اللہ فرض کیا تھا۔ اور انہیں حکم دیا گیا تھا کہ وہ اللہ کے راستے میں جہاد کریں اور اپنا مال اس کی راہ میں خرچ کریں تاکہ کفار اور کفر دونوں کا دفاع کیا جاسکے۔ چنانچہ سورت کے آخر میں اس دعا میں وہ ان تمام ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کیلئے اللہ کی امداد چاہتے ہیں۔ دشمن کے مقابلے میں اللہ کی نصرت کے طلبگار ہوتے ہیں۔ "تو ہمارا مولیٰ ہے' کافروں کے مقابلے میں ہماری مدد کر۔"

غرض یہ اس پوری سورت کا اختتامیہ ہے۔ اس میں مضامین سورت کا خلاصہ بصورت اشارات دیا گیا ہے۔ جو پوری سورت کے اصل خطوط کے ساتھ متناسب اور متوازی ہے۔ پھر ان دونوں آیات پر مشتمل اس اختتامیہ کا ہر لفظ اپنے اندر وسیع معانی رکھتا ہے۔ ہر لفظ کا اپنا موضوع اور اپنی اہمیت ہے اور اس کے پیچھے جو مباحث گزرے ہیں۔ یہ لفظ ان کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اور یہ مباحث عظیم مباحث ہیں۔ جن کا تعلق اسلامی نظریۂ حیات' نیز دین اسلام میں اسلامی نظریۂ حیات کی اہمیت' اس کی خصوصیات اور اس کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں ہیں۔ ان میں اہل ایمان کا اپنے رب کے ساتھ تعلق کی نوعیت' اللہ کے بارے میں ان کا تصور' وہ فرائض اور ذمہ داریاں جو اللہ تعالیٰ نے ان پر عائد کیں۔ ان کی تفصیلات ہیں۔ وہ التجا کرتے ہیں کہ اللہ انہیں اپنی جوار رحمت میں جگہ دے۔ وہ مشیت ایزدی کے تابع ہوں اور اللہ کی مدد ان کے شامل حال رہے۔ غرض اس اختتامیہ کے ہر لفظ کی اپنی جگہ ایک عظیم اہمیت ہے۔ اور جو شخص قرآن کے سائے میں زندگی بسر کر چکا ہوں اور اسے معلوم ہو کہ قرآن کریم کا انداز تعبیر کیا ہے؟ اور اس کی آیات میں سے ہر آیت کے اسرار و رموز کیا ہیں تو اسے معلوم ہے کہ ان الفاظ میں سے ہر لفظ کی اپنی شان ہے اور ہر لفظ ایک اعجوبہ ہے۔......... مناسب ہے کہ ہم ان آیات پر قدرے تفصیلی بحث کریں۔

☆......☆......☆......☆......☆

درس ۲۲ نمبر تشریح آیات

آیت نمبر ۲۸۵ تا ۲۸۶

☆☆☆☆ اٰمَنَ الرَّسُوۡلُ بِمَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡهِ مِنۡ رَّبِّهٖ وَالۡمُؤۡمِنُوۡنَ ؕ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓـئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ ۚ لَا نُفَرِّقُ بَيۡنَ اَحَدٍ مِّنۡ رُّسُلِهٖ ۚ وَقَالُوۡا سَمِعۡنَا وَاَطَعۡنَا ٭ غُفۡرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيۡكَ الۡمَصِيۡرُ ﴿۲۸۵﴾

"رسول اس ہدایت پر ایمان لایا ہے' جو اس کے رب کی طرف سے اس پر نازل ہوئی ہے۔ اور جو لوگ اس رسول کے ماننے والے ہیں' انہوں نے بھی اس ہدایت کو دل سے تسلیم کیا ہے۔ یہ سب اللہ اور اس کے فرشتوں اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں کو مانتے ہیں اور ان کا قول یہ ہے کہ "ہم اللہ کے رسولوں کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کرتے۔" "ہم نے حکم سنا اور اطاعت قبول کی۔ مالک' ہم تجھ سے خطابخشی کے طالب ہیں اور ہمیں تیری ہی طرف پلٹنا ہے۔"

ان آیات میں اہل ایمان کی بہترین تصویر کشی کی گئی ہے۔ یہ اس برگزیدہ جماعت کی تصویر ہے۔ جس کی زندگی میں حقیقت ایمان عملی شکل میں ظاہر تھی۔ اور قیامت تک آنیوالی تمام جماعتوں کے یہی خدوخال ہوں گے۔ جن کی زندگیوں میں حقیقت ایمان عملی شکل اختیار کرلے۔ اس جماعت مومنہ کو اللہ تعالیٰ یوں اعزاز دیتے ہیں کہ اس کا ذکر حضور ﷺ کے ساتھ صفت ایمان میں یکجا کرتے ہیں۔ یہ ایک عظیم اعزاز و شرف ہے۔ اس لئے کہ اس یکجائی سے جماعت مومنہ حقیقت رسالت تک رسائی حاصل کرلیتی ہے۔ اور جماعت مسلمہ کو یہ شعور بھی حاصل ہو جاتا ہے کہ اس کرۂ ارض پر اس کی حیثیت اور مقام کیا ہے' اسے احساس ہو جاتا ہے۔ وہ کیا مرتبہ بلند ہے۔ جس تک اللہ تعالیٰ نے اسے اٹھایا ہے۔ اس طرح کہ اللہ تعالیٰ صفت ایمان میں اہل ایمان کو حضور اکرم ﷺ کے ساتھ یکجا فرماتے ہیں کہ رسول اور صحابہ کرام سب ایمان لائے ہیں۔ ایک ہی صفت ایک ہی آیت میں اور پھر اللہ کے کلام میں اٰمَنَ الرَّسُوۡلُ بِمَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡهِ مِنۡ رَّبِّهٖ وَالۡمُؤۡمِنُوۡنَ .... "رسول اس ہدایت پر ایمان لائے ہیں۔ جو ان کے رب کی طرف سے ان پر نازل ہوئی ہے۔ اور جو لوگ اس رسول کے ماننے والے ہیں۔ انہوں نے بھی اسی ہدایت کو دل سے تسلیم کیا ہے۔"

رسول خدا پر جو کلام نازل ہوتا ہے' اس پر رسول کا ایمان مہبط وحی ہونے کی وجہ سے براہ راست ہوتا ہے۔ آپ کے قلب صافی پر بلند و برتر وحی نازل ہوتی ہے اور براہ راست حقیقت عظمیٰ کے ساتھ آپ کا بلاواسطہ تعلق قائم ہوتا ہے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ جو شخصیت رسول میں بذات خود' بلاکسب و اکتساب متشکل ہوتی ہے۔ رسول اور ذات باری کے درمیان نہ کوئی واسطہ ہوتا ہے اور نہ ہی رسول کے مقام رسالت کے بارے میں کچھ عزائم ہوتے ہیں۔ اس لئے رسول کا درجہ ایمان کے متعلق تو رسول ہی سوچ سکتا ہے اور اس کا وصف اور بیان بھی وہی شخص کر سکتا ہے جس نے درجہ ایمان کو بعینہ رسول کی طرح پایا ہے۔ تو ذات باری اور کلام باری پر یہ براہ راست

ایمان صرف رسول کا ایمان ہوتا ہے۔ اب اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو رسول خدا ﷺ کے ساتھ صفت ایمان میں شریک کر کے گویا ان کو ایک قسم کا شرف و اعزاز عطاء فرماتے ہیں۔ حالانکہ رسول خدا ﷺ کے ساتھ صفت ایمان کی حقیقت اور آپ کے سوا تمام اہل ایمان کی حقیقت' ماہیت اور کیفیت میں زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ اور اس ایمان کی حقیقت کیا ہے؟ اور اس کے حدود اربعہ کیا ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ وَ قَالُوْا سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَ اِلَيْكَ الْمَصِيْرُ

"یہ سب اللہ' اس کے فرشتوں' اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں کو مانتے ہیں اور ان کا قول یہ ہے کہ ہم اللہ کے رسولوں کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کرتے۔ ہم نے حکم سنا اور اطاعت قبول کی۔ مالک ہم تجھ سے خطا بخشی کے طالب ہیں اور ہمیں تیری ہی طرف پلٹنا ہے۔"

یہ ہے مکمل ایمان جو دین اسلام نے پیش کیا ہے۔ یہ ایمان اس قابل ہے کہ جس پر یہ امت پوری طرح جم جائے جو دین کی وارث ہے۔ جو اس دین کی داعی ہے۔ اور یہ دعوت اس نے قیام تک پوری دنیا کو دینی ہے۔ جس دعوت کی جڑیں تاریخ کی طویل وادیوں میں پھیلی ہوئی ہیں۔ جس کے قافلے مسلسل چل رہے ہیں۔ یہ رسالت کے قافلے ہیں' ایمان کے قافلے ہیں اور انسان کی طویل تاریخ میں یہ قافلے پھیلے ہوئے ہیں۔ یہی ایمان ہے جس نے آغاز انسانیت سے' انسانوں کو دو محاذوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ ایک محاذ اہل ایمان کا ہے۔ اور دوسرا محاذ اہل کفر کا ہے۔ ایک محاذ حزب اللہ کا ہے اور دوسرا حزب الشیطان کا ہے۔ اور پوری انسانی تاریخ گواہ ہے کہ ان کے علاوہ کوئی تیسرا محاذ نہیں ہے۔

كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ .... "سب ایمان لائے ہیں۔" اللہ کی ذات پر ایمان اسلامی تصور حیات کا بنیادی پتھر ہے۔ یہ اس نظام زندگی کی اساس ہے جو زندگی کو استحکام بخشتا ہے۔ یہ اسلامی اخلاقیات کی اساس ہے۔ اور اسی پر اسلام کا اقتصادی نظام استوار ہوا ہے۔ اور یہ ہر اس تحریک کی اساس ہے جو ایک مسلم یہاں یا وہاں برپا کرتا ہے۔

اور ایمان باللہ کا مفہوم کیا ہے؟ یہ کہ صرف اللہ ہی الٰہ ہے۔ وہی رب ہے' وہی بندگی کے لائق ہے۔ وہی ہے جسے انسان کے ضمیر' انسان کے طرز عمل' اور اس کی زندگی کے ہر موڑ پر حکمرانی کا حق حاصل ہے۔ اس لئے اللہ کے ساتھ اس کی خدائی میں کوئی شریک نہیں ہے۔ اس کے ساتھ اس جہاں کی نگہبانی میں کوئی شریک نہیں ہے۔ اس کائنات کی تخلیق میں اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ اس کائنات کو چلانے میں اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ اس کائنات کے چلانے میں اس کے کام میں کوئی دخل اندازی نہیں کر سکتا۔ اس زندگی کے چلانے میں کوئی دخیل نہیں ہے۔ اس کے ساتھ اس مخلوق کی رزاقی میں کوئی شریک نہیں ہے۔ اس مخلوق کی نفع رسانی یا ضرر رسانی میں اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ غرض اس کائنات کا کوئی بڑا معاملہ ہو یا چھوٹا' اس کی مشیئت اور رضا کے سوا پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچ سکتا۔

عبادت اور بندگی کے معاملے میں اس کا کوئی شریک نہیں ہے کہ لوگ اس کی طرف متوجہ ہوں۔ عبادت کے شعائر میں کوئی شریک نہیں' اطاعت و بندگی میں اس کا کوئی شریک نہیں۔ نہ دین میں اس کا کوئی شریک ہے۔ لہٰذا پرستش صرف اسی کی ہوگی۔ اطاعت صرف اسی کی ہوگی یا اس کی ہوگی جو اللہ تعالیٰ کیلئے کام کر رہا ہے اور اس کی شریعت کو نافذ کر رہا ہے اور اپنے اقتدار اور سلطنت کو اللہ سے اخذ کرتا ہے۔ اس لئے کہ مقتدر اعلیٰ تو وہی ذات ہے۔ لہٰذا عوام الناس پر فکری حکومت' یا ان کے طرز عمل پر حکومت وہی شخص کر سکتا ہے۔ جو

دین اسلام سے اپنے لئے اقتدار اعلیٰ حاصل کرتا ہے۔ لہٰذا اخلاقی اصول اور قانون سازی کے اصول و قواعد' ہمارے اجتماعی نظام کے اصول اور ہمارے اقتصادی اصول' سب کے سب صرف ذات باری تعالیٰ کے احکام اور اس کی ذات سے اخذ ہوسکتے ہیں۔ یہی ہے ایمان کا مفہوم اور اس کا خلاصہ 'یہی ایمانی تصور حیات ہے جس کو اپنا کر ایک شخص ماسوا اللہ کے بندھنوں اور غلامیوں سے آزاد ہو سکتا ہے۔ شریعت خداوندی کے علاوہ تمام حدود و قیود سے آزاد ہو جاتا ہے۔ آزاد ہی نہیں بلکہ انسان سلطنت الٰہیہ کے سوا تمام قوتوں پر غالب آجاتا ہے۔

وَمَلٰٓئِكَتِهٖ .... "اور اس کے فرشتوں پر۔" اللہ کے فرشتوں پر ایمان لانا' ایمان بالغیب کا ایک پہلو ہے۔ اسی سورت کے آغاز میں' یعنی حصہ اول میں ہم اس موضوع پر بحث کر آئے ہیں کہ فرشتوں پر ایمان لانے کے اثرات انسانی زندگی پر کیا پڑتے ہیں اور اس کے کیا فوائد ہیں۔ یہ ایمان انسان کو اس نچلی سطح سے بلند کر دیتا ہے جو خود اس کی دنیا تک محدود ہے اور جو خاصہ حیوانات ہے۔ اس ایمان کی بدولت انسانی علم و معرفت کا ماخذ حواس سے وراء ہو جاتا ہے۔ اور ایک انسان ایک حیوان کی سطح سے بلند ہو جاتا ہے۔ اسی طرح وہ اعلان کر دیتا ہے کہ وہ انسان ہے اور اس کے خواص بالکل جدا ہیں ا۔ انسان کا یہ ایک فطرتی تقاضا ہے کہ وہ پردۂ غیب کے اندر مستور نامعلوم حقائق کو معلوم کرنے کا شوق رکھتا ہے۔ یہ حقائق اگرچہ اس کے حواس کے دائرہ سے باہر ہوتے ہیں لیکن انسان بمقتضائے فطرت ان کے وجود کو محسوس کرتا ہے۔ اگر انسان کے اس فطری داعیہ اور تقاضے کو سامنے وہ غیبی حقائق نہ رکھے گئے۔ جو اسے اللہ تعالیٰ نے عطا کئے ہیں تو انسان کا یہ داعیہ افسانوں اور مذہبی دیومالاؤں میں گم ہو کر اپنے اس فطری تقاضے کی تشفی کرتا ہے۔ اس طرح وہ اپنی ایک فطری پیاس کو بجھاتا ہے اور اگر وہ ان توہمات اور طلسمات میں نہ پڑے تو وہ نفسیاتی الجھنوں اور اضطرابات کا شکار ہو جاتا ہے۔ ۲۔

فرشتوں پر ایمان لانا بھی ایک ایسی حقیقت ہے کہ انسان کا فہم و ادراک بذات خود اسے نہیں پاسکتا۔ یعنی صرف ان محسوس اور ، عقلی قوتوں کے بل بوتے پر جو اسے عطا کی گئی ہیں۔ لیکن اپنی فطرت کے اعتبار سے 'انسان کے اندر ان غیبی حقائق تک رسائی کا بے حد شوق پایا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ چونکہ خالق انسان ہے۔ وہ اس کی ساخت اور اسکے رجحانات سے اچھی طرح واقف ہے۔ وہ ان امور سے بھی واقف ہے جو انسان کیلئے مفید ہیں اور جن سے اسکی اصلاح بھی اچھی طرح ہو سکتی ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنی رحمت و شفقت کی وجہ سے بعض غیبی حقائق سے مطلع کیا۔ اور تمثیلات کے ذریعہ 'ان غیبی حقائق کو اس کے فہم و ادراک کے قریب لانے کی کوشش کی۔ کیونکہ بغیر تمثیلات کے انسان کے موجود ذرائع فہم ان کا براہ راست ادراک سے قاصر تھے۔ یوں اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنی ذاتی جدوجہد سے ان حقائق کے معلوم کرنے کی خاطر محنت و مشقت سے بچالیا۔ اس لئے کہ صرف اپنی ذاتی قوتوں کے بل بوتے پر اس کیلئے یہ ممکن ہی نہ تھا۔ اس سلسلے میں وہ الٰہی علم و معرفت کا محتاج تھا۔ اگر اللہ کی جانب سے اسے یہ حقائق بتلائے نہ جاتے تو اس کا دل کبھی مطمئن نہ ہوتا اور اس کی شخصیت سکون و قرار سے محروم ہوتی۔ جو لوگ اپنی فطرت کے ساتھ جنگ کرتے ہیں اور اپنی زندگی کے تصور سے غیبی حقائق کی نفی کرتے ہیں۔ وہ ایسے خرافات اور اوہام کا شکار ہو جاتے ہیں جنہیں دیکھ کر بے اختیار ہنسی آتی ہے۔ یا پھر وہ ذہنی خلجان میں مبتلاء ہو جاتے اور ان کی زندگی پیچیدگیوں اور مضحکہ انگیز خرافات کا شکار ہو جاتی ہے۔

ملائکہ پر ایمان دراصل ان غیبی حقائق پر ایمان ہے' جو عقل و خرد کے اعتبار سے یقینی حقائق ہیں۔ پھر یہ حقائق منجانب اللہ ہیں اور ان پر ایمان کے نتیجے میں اس کائنات کے بارے میں انسانی شعور کو وسعت ملتی ہے۔ مومن کے تصور میں یہ جہاں اسقدر سکڑا ہوا نہیں ہوتا کہ یہ اسی قدر ہے جس قدر اس کے حواس میں آسکتا ہو۔ اس لئے کہ انسانی حواس اس کائنات کے نہایت ہی مختصر حصے پر قابو پا

ا۔ دیکھئے حصہ اول' طبع چہارم ص ۴۰۔ ۲۔ دیکھئے 'اسلامی تربیت کا منہاج' مصنفہ محمد قطب' فصل خطوط متقابلہ فی النفس البشریہ۔

سکتے ہیں۔ فرشتوں پر ایمان لانیوالے انسان میں یہ شعور بھی موجزن ہوتا ہے کہ اس کی رفاقت میں' اس کے ارد گرد پھیلے ہوئے' بے شمار غیر مرئی مومنین ہیں' جو اس کے ساتھ اپنے رب پر ایمان لانے میں شریک ہیں' جو اس کیلئے ہروقت استغفار کرتے رہتے ہیں۔ ہر بھلے کام میں اس کے معاون و مددگار ہیں' اگر اللہ چاہے۔ غرض یہ ایک لطیف' اور تروتازہ ہم نشین کا شعور ہوتا جو ہروقت ایک مومن کو حاصل ہوتا ہے۔ اس طرح وہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے غیبی معرفت حاصل کئے ہوئے ہوتا ہے۔ جو اللہ پر ایمان لانیوالوں اور فرشتوں پر ایمان لانے والوں کو حاصل ہوتی ہے۔

وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ ۚ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ۚ .... "اس کی کتابوں پر' اس کے رسولوں پر.... اور ہم اس کے رسولوں میں سے کسی ایک میں تفریق نہیں کرتے۔" اسلام نے اللہ پر ایمان لانے کا جو تصور دیا ہے۔ اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہے کہ ہم اللہ کی تمام کتابوں اور اس کے تمام رسولوں پر ایمان لے آئیں۔ اور اس سلسلے میں کسی ایک رسول اور دوسرے رسول کے درمیان کوئی امتیاز نہ کریں۔ اس لئے کہ اللہ پر ایمان لانے کا تقاضا یہ ہے کہ انسان ان تمام حقائق پر ایمان لے آئے' جو منجاب اللہ آئے ہیں۔ ان تمام رسولوں کی تصدیق کرے' جو اللہ تعالیٰ کی جانب سے کبھی مبعوث ہوئے۔ اس لئے کہ وہ سرچشمہ ایک ہے۔ جس کی جانب سے یہ سب رسول آئے۔ وہ تمام کتابیں جو نازل ہوئیں وہ ایک ہی ذات کی طرف سے نازل ہوئیں۔ اس لئے' اس تصور ایمان کے نتیجے میں ایک مسلمان کے ذہن میں رسولوں کے مقام و حیثیت میں کوئی فرق و امتیاز ممکن ہی نہیں ہے۔ ہر رسول اللہ جل شانہ کی جانب سے مبعوث ہوا۔ اور وہ ایسی صورت میں مبعوث ہوا' جو ان لوگوں کے حالات کیلئے مناسب تھی جن کی طرف وہ رسول مبعوث ہوا تھا۔ اور یہ سلسلہ یوں ہی چلتا رہا اور آخر کار حضرت محمد خاتم النبیین ﷺ پر ختم ہوا۔ اور حضرت محمد ﷺ کی رسالت ایسی شکل و صورت میں تشکیل پائی کہ وہ تاقیامت تمام انسانیت کیلئے ایک آخری اور مکمل نظام زندگی قرار پائی۔

اس تصور ایمان کے نتیجے میں امت مسلمہ تمام رسولوں کی رسالت کی وارث قرار پائی۔ اب اسلامی نظام زندگی امت مسلمہ کی وراثت ہے اور اس کرۂ ارض پر وہ اس کی محافظ ہے۔ گویا انسانیت کی طویل تاریخ کا نہایت ہی قیمتی اثاثہ اب امت مسلمہ کی تحویل میں دیدیا گیا ہے اور اسے اس پر نگران مقرر کر دیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امت مسلمہ اپنے اندر یہ شعور پاتی ہے کہ اس کرۂ ارض پر اس کے کاندھے پر عظیم ذمہ داری ڈالی گئی ہے۔ اور مومنین اللہ تعالیٰ کے صاحب اختیار علم بردار ہیں۔ وہ صرف اللہ کا علم بلند کریں گے اور اس علم کے بل بوتے پر وہ اس کرۂ ارض پر' جاہلیت کے تمام نشانات اور علامات کا مقابلہ کریں گے۔ اس وقت یہ جاہلیت کبھی وطنی قومیت کا علم بلند کرتی ہے۔ کبھی نسلی قومیت کے روپ میں آگے بڑھتی ہے۔ کبھی یہ طبقاتی رنگ میں آتی ہے اور کبھی یہ صیہونیوں اور صلیبیوں کے جھنڈوں کے سایہ میں استعماری شکل میں آتی ہے۔ کبھی وہ الحاد اور بے دینی کی شکل میں آتی ہے۔ غرض زمان و مکان کے اختلاف سے' اس کے رنگ ڈھنگ بھی مختلف ہیں۔ کبھی وہ کس نام سے آتی ہے اور کبھی کس نشان سے آتی ہے۔ لیکن اس کے علم بردار وہی ہیں یعنی جاہلیت کے پرستار۔

اس کرۂ ارض پر امت مسلمہ جس سرمایہ کی حفاظت پر مامور ہے' وہ اسے قدیم ترین ادوار سے اس کرۂ ارض پر مبعوث ہونے والے تمام رسولوں سے ملا ہے۔ اور یہ سرمایہ پوری انسانیت کا نہایت ہی قیمتی سرمایہ ہے۔ یہ ہدایت اور روشنی کا سرمایہ ہے۔ یہ یقین و اطمینان کا سرمایہ ہے۔ یہ سعادت اور رضائے الٰہی کا سرمایہ ہے۔ یہ علم و معرفت کا سرمایہ ہے۔ یاد رکھو! جو دل اس سرمایہ سے تہی دامن ہوا وہ تاریکیوں اور رنج و الم کا شکار ہو گا۔ وہ اضطراب و خلجان سے دوچار ہو گا اور شکوک و شبہات میں گرفتار ہو گا۔ وہ بدبختی اور پریشانی کے ہاتھوں عاجز آجائے گا۔ اس کی زندگی یوں گزرے گی جس طرح ایک شخص تہ بہ تہ اندھیروں' بے آب و گیاہ ریگستان میں ٹامک ٹوئیاں

مار رہا ہو۔ اسے نظر نہ آرہا ہو کہ وہ کہاں قدم رکھے اور کہاں نہ رکھے۔

ان دلوں کی چیخ و پکار انتہائی کربناک ہے۔ جو اس زاد راہ سے محروم ہو گئے ہیں۔ جن سے یہ قیمتی سرمایہ لٹ گیا ہے۔ جو ایسے غمگسار' رفیق سفر سے محروم ہو چکے ہیں۔ یہ کربناک چیخ و پکار تاریخ کے ہر دور میں سنی گئی۔ا۔ بشرطیکہ دل زندہ ہوں' ان میں احساس ہو۔ وہ اپنے اندر معرفت حقیقت اور حصول یقین کا داعیہ رکھتے ہوں۔ رہے وہ دل جو مرچکے ہیں' جو غبی ہیں' جن کی عقل موٹی ہے' جن کی سوچ کے سوتے خشک ہو چکے ہیں' ہو سکتا ہے ان میں حصول معرفت کی یہ تڑپ نہ ہو' وہ حصول معرفت سے بے نیاز ہوں۔ لیکن اس کرۂ ارض پر ان جیسے لوگوں کی روش بہائم کی روش ہوتی ہے۔ وہ مویشیوں کی طرح کھاتے اور پیتے ہیں۔ ان کا محبوب مشغلہ یہ ہوتا ہے۔ اس کرۂ ارض پر ظلم واستبداد کا ارتکاب کریں' مار اور دھاڑ میں مشغول ہوں اس زمین میں فساد پھیلائیں اور اس سے اس طرح رخصت ہوں کہ ان پر تمام لوگوں کی نفریں ہو اور اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو۔

وہ معاشرے انتہائی' بدبخت معاشرے ہیں جو اس دولت سے محروم رہ گئے۔ اگرچہ وہ مادی سہولیات میں گردن تک ڈوبے ہوئے ہیں۔ یہ معاشرے گرے ہوئے تباہ حال معاشرے ہیں۔ اگرچہ مادی پیداوار کے اعتبار سے ان کا گراف بہت اونچا ہو۔ یہ معاشرے کربناک معاشرے ہیں۔ اگرچہ وہ مکمل شہری آزادیوں سے مستفید ہوں' داخلی طور پر زندگی پر امن ہو اور انہیں کوئی خارجی خطرہ بھی لاحق نہ ہو' ہمارے پاس اس جدید دور میں ایسے معاشروں کی کئی مثالیں موجود ہیں' اس بات کا انکار صرف وہی شخص کر سکتا ہے جو انتہائی درجے کا مکار ہو اور جو اس قدر بے حیا ہو کہ محسوس اور کھلے حقائق کا انکار کر سکتا ہو۔

رہے اہل ایمان تو ان کی صفت یہ ہے کہ وہ اللہ پر یقین رکھتے ہیں۔ اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں پر ایمان لاتے ہیں۔ وہ بارگاہ الٰہی میں تسلیم و رضا اور سمع و طاعت کے ساتھ حاضر ہوتے ہیں۔ انہیں یقین ہوتا ہے کہ وہ آخر کار اللہ کی جانب لوٹنے والے ہیں۔ لہٰذا وہ ہر وقت اپنی تقصیرات پر طلب مغفرت کرتے ہیں وَقَالُوا سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَإِلَيْكَ الْمَصِيرُ .... "ہم نے حکم سنا اور اطاعت کی۔ مالک! ہم تجھ سے خطابخشی کے طالب ہیں اور ہمیں تیری ہی طرف پلٹنا ہے۔"

ان کلمات سے ایمان باللہ' فرشتوں' کتابوں اور رسولوں پر ایمان کے اثرات روشنی کی طرح ظاہر ہوتے ہیں۔ ان کا ظہور سمع و اطاعت کی صورت میں ہوتا ہے۔ اہل ایمان کے پاس اللہ تعالیٰ کی جانب سے جو کچھ پیغام آتا ہے' وہ اسے سنتے ہیں' وہ ہر اس حکم پر عمل پیرا ہوتے ہیں جس کا حکم اللہ تعالیٰ دیتے ہیں۔ یعنی ان کا قائد صرف اللہ ہو جاتا ہے اور وہ اپنے قائد کے ہر اشارے کو روبعمل لاتے ہیں۔ اس لئے کہ اسلام کا کوئی ایسا تصور نہیں ہے جس میں اللہ کے احکام کی اطاعت نہ ہو' جس میں پوری زندگی میں ربانی نظام زندگی کا نفاذ ضروری نہ ہو۔ اگر کسی معاشرے کی حالت یہ ہو جائے کہ اس میں لوگ اپنی زندگیوں کے یہ چھوٹے بڑے معاملے میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی پر اتر آئے ہوں تو ایسے معاشرے کو اہل ایمان کا معاشرہ نہیں کہا جا سکتا۔ یا جہاں اللہ کی شریعت نافذ نہ ہو۔ جس کے اخلاقی تصورات جس کا طرز عمل' جس کے اجتماعی اور اقتصادی اور سیاسی امور سب کے سب غیر اسلامی تصورات سے ماخوذ ہوں تو ایسے معاشرے کو کس طرح ایک اسلامی معاشرہ کہا جا سکتا ہے۔ اس لئے کہ ایمان کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ دل مومن میں قرار پکڑے اور اس کی تصدیق عمل سے ہو۔

اور سمع و طاعت کے ساتھ ساتھ' انسان کو اپنی تقصیرات اور کوتاہیوں کا بھی مکمل شعور ہو' وہ یقین رکھتا ہو کہ وہ اللہ کی نعمتوں کا حق شکر ادا نہیں کر سکتا۔ وہ اپنے فرائض سے کماحقہ عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔ اس لئے وہ اللہ میاں کے ہاں التجا کرتا ہے کہ وہ اس کی کوتاہیوں کا تدارک اپنی رحمت اور مغفرت سے فرمائیں۔ غُفْرَانَكَ رَبَّنَا .... "اے ہمارے رب' ہم تیری مغفرت کے طلبگار ہیں۔"

ا۔ ذرا عمر خیام جیسے فلسفی کی چیخیں سنیں۔

یہ بات قابل لحاظ ہے کہ اپنی تقصیرات پر طلب مغفرت کا مقام و محل سمع و اطاعت اور اللہ کے سامنے مکمل طور پر سر تسلیم خم کرنے کے بعد آتا ہے۔ پہلے بغیر کسی نافرمانی اور بغیر کسی انکار کے مکمل انقیاد ضروری ہے۔ اس کے بعد ہی انسان کے اندر یہ یقین پیدا ہو سکتا ہے کہ اس نے دنیا و آخرت میں اللہ کی طرف لوٹنا ہے۔ اس کے عمل معاملے میں' اور ہر عمل میں اس نے خدا کے سامنے جوابدہی کرنی ہے۔ اور اللہ کا فیصلہ پھر اس معاملے میں اٹل ہو گا۔ اسکے علاوہ کوئی جائے پناہ نہ ہوگی' اس کے مقابلے میں کوئی طاقت بچانے والی نہیں ہے۔ اس کے فیصلے اور حکم سے صرف اس کی مغفرت ہی بچاسکتی ہے۔ صرف اس کی رحمانیت ہی کام آسکتی ہے۔

وَ اِلَیۡکَ الۡمَصِیۡرُ .... "تیری ہی طرف پلٹنا ہے۔" ان الفاظ میں ایمان بالآخرۃ کا بیان ہوا ہے۔ اللہ پر ایمان لانے کے تقاضوں میں سے ایک بین تقاضا ایمان بالآخرت ہے۔ اسلامی تصور حیات کے حوالے سے یہ لازم و ملزوم ہیں۔ اس تصور حیات کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ نے انسان کو پیدا کیا۔ ایک عہد کے تحت اسے اس زمین پر اپنا خلیفہ بنایا۔ یہ عہد اس کے اندر طے شدہ شرائط' اس کرۂ ارض پر' انسان کی پوری زندگی کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہیں۔ اللہ نے یہاں اسے خلیفہ اس غرض و غایت کے لئے بنایا ہے کہ اس دنیا کی زندگی میں وہ اس کا امتحان لے۔ اور آخری امتحان کے بعد وہ آخرت میں اسے جزاء و سزا دے۔ اس لئے اسلامی تصور حیات کی رو سے عقیدۂ آخرت ایمان کے لازمی تقاضوں میں سے ایک اہم تقاضا ہے۔ اس پر ایمان لانا' ایک مومن و مسلم کے تصورات اور اس کے طرز عمل پر گہرے اثرات مرتب کرتا ہے' اسی ایمان کی روشنی میں' اس دنیا میں ایک مومن کی اقدار حیات تشکیل پاتی ہیں۔ اور اس کے حسی نتائج مرتب ہوتے ہیں۔ وہ مطیع فرمان ہو کر چلتا ہے۔ وہ بھلائی کی راہ پر چلتا ہے۔ وہ بھلائی کا متلاشی اور سچائی پر قائم رہتا ہے۔ چاہے اس کا نتیجہ اس جہاں میں اسے بصورت راحت ملے یا بصورت مشقت' اسے اس جہاں میں فائدہ ہو یا نقصان ہو' اسے فتح ہو یا شکست ہو' وہ کچھ پا رہا ہو یا کچھ کھو رہا ہو۔ اسے یہاں زندگی مل رہی ہو یا شہادت نصیب ہو رہی ہو۔ اس لئے کہ اس کی اصل جزاء اسے یوم آخرت میں ملے گی جب وہ اس دنیا کے امتحان میں کامیاب اور سرخرو ہو جائے گا...... اس کا عزم اس قدر صمیم ہوتا ہے کہ اس راہ اطاعت' راہ حق' راہ بر اور راہ صداقت سے' اسے پوری دنیا کی مخالفت' پوری دنیا کی فتنہ انگیزی اور فتنہ و قتل اسے نہیں ہٹاسکتے۔ کیونکہ اس کا معاملہ اللہ کے ساتھ ہوتا ہے۔ وہ عہد الست کو اپنی پوری شرائط کے ساتھ نافذ کر رہا ہوتا ہے۔ اور اپنے اجر کا طلبگار آخرت میں ہوتا ہے۔

یہ ایک عظیم وحدت ہے۔ اسلامی نظریۂ حیات کا یہی مزاج ہے۔ اور اسے اس مختصر سی آیت میں سمو دیا گیا ہے۔ اللہ اور ملائکہ پر ایمان' تمام کتابوں اور تمام رسولوں پر ایمان' بلاتفریق و امتیاز' اور اللہ کی طرف مکمل رجوع و سمع و طاعت کے ساتھ اور یوم آخرت میں جوابدہی پر ایمان اور اس کا ہر وقت احساس۔

یہ ہے اسلام' یہ ایسا عقیدہ جو خاتم العقائد ہے۔ یہ آخری رسالت ہے۔ ایسا عقیدہ جو قافلہ اہل ایمان کو آغاز انسانیت سے انتہائے انسانیت تک ساتھ لیکر چلتا ہے۔ اس کے سفر کی سمت پوری تاریخ انسانیت میں' اللہ کے رسول متعین کرتے ہیں۔ جن کی قیادت میں انسانیت بتدریج ترقی کے درجات طے کرتی ہے۔ یہ عقیدہ اسے اس کائنات کے ناموس اکبر سے بقدر استطاعت انسان' اسے متعارف کراتا ہے۔ یہاں تک کہ آخر میں اسلامی نظام زندگی آتا ہے۔ وہ توحید کامل کا اعلان کرتا ہے اور عقل انسانی کو آزاد چھوڑ دیا جاتا ہے کہ اب وہ معرفت کردگار میں خود آگے بڑھے۔

یہی وہ نظریۂ حیات ہے جو ایک انسان کو انسانیت سے روشناس کراتا ہے۔ وہ اسے جمادات اور حیوانات کے مقام سے بلند کرتا ہے۔ وہ اسے فرشتوں اور شیطانوں سے بھی ایک علیحدہ تشخص دیتا ہے۔ وہ انسان کا بحیثیت انسان اعتراف کرتا ہے۔ وہ اس کی کمزوریوں کو بھی تسلیم کرتا ہے اور اس کے کمالات کا بھی لحاظ رکھتا ہے۔ وہ اسے ایک ایسی مخلوق کی طرح لیتا ہے جس کے جسم میں مختلف قسم کے رجحانات

ہیں۔ وہ ایک عقل فعال کا حامل ہے۔ وہ ایک روح رکھتا ہے جس کے میلانات میں بوقلمونی ہے۔ اسی لئے وہ اس پر صرف ایسے فرائض و واجبات عائد کرتا ہے جن کے لئے یہ جسم اور یہ حضرت انسان اور اس کی شخصیت متحمل ہو سکتی ہو۔ یہ عقیدہ ان فرائض اور انسان کی صلاحیت اور طاقت کے درمیان بہترین توازن قائم رکھتا ہے۔ اس قدر بوجھ ڈالتا ہے کہ انسان مشقت اور تھکاوٹ محسوس نہ کرے۔ یہ عقیدہ انسان کے جسمانی تقاضوں کو بھی پورا کرتا ہے۔ انسان کے عقلی تقاضوں کا بھی خیال رکھتا ہے۔ اور اس کی روحانی دنیا بھی آباد کرتا ہے۔ اور یہ سب کام انتہائی فطری توازن کے ساتھ' اور ان سب امور کے بعد وہ انسان کو یہ آزادی عطا کرتا ہے کہ وہ جو راہ اپنے لئے اختیار کرتا ہے کرے۔

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ؕ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَ عَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ؕ

"اللہ کسی متنفس پر اس کی مقدرت سے زیادہ ذمہ داری کا بوجھ نہیں ڈالتا۔ ہر شخص نے جو نیکی کمائی ہے' اس کا پھل اسی کیلئے ہے اور جو بدی سمیٹی ہے اس کا وبال اسی پر ہے۔"

یوں ایک مسلمان کی سوچ ہی میں یہ بات ہوتی ہے کہ اس کا رب رحیم ہے' وہ بطور خلیفہ اس پر جو فرائض و واجبات عائد کرتا ہے وہ نہایت ہی عادلانہ اور منصفانہ ہیں۔ اس کی جانب سے ڈالی جانے والی آزمائشیں بھی عادلانہ ہیں اور آخر کار قیامت کے دن بھی اس کے ساتھ ٹھیک ٹھیک انصاف ہو گا۔ اور وہ پوری طرح مطمئن ہو گا۔ اس لئے وہ اللہ کی جانب سے عائد کردہ فرائض پر کوئی تنگی اور دشواری محسوس نہیں کرتا۔ وہ انہیں بوجھ نہیں سمجھتا۔ اس لئے کہ اس کا یہ پختہ یقین ہوتا ہے کہ جس خدا نے یہ فرائض عائد کئے ہیں وہ خوب جانتا ہے کہ میرے اندر ان کے سرانجام دینے کی استطاعت فی الواقعہ ہے۔ اگر طاقت نہ ہوتی تو وہ فرض ہی نہ کرتا۔ اس تصور سے ایک طرف تو دل مومن اطمینان اور انس و محبت سے بھر جاتا ہے' دوسری جانب اس کے اندر ان فرائض و واجبات کو سرانجام دینے کیلئے عزم اور ولولہ پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ محسوس کرتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے یہ فرائض اس پر عائد کر دیئے ہیں تو لامحالہ وہ اس کی ڈیوٹی کا حصہ ہیں۔ اور جب بھی وہ ضعف محسوس کرتا ہے' کبھی تھکاوٹ محسوس کرتا ہے' یہ فرائض بھاری ہونے لگتے ہیں تو وہ محسوس کرتا ہے کہ یہ اس کی ذاتی کمزوری ہے۔ بوجھ زیادہ نہیں ہے۔ چنانچہ وہ اپنے عزم کو از سرنو تازہ کرتا ہے۔ اپنی کمزوری کو دور کرتا ہے اور از سرنو فرائض پورے کرنے کا عزم صمیم کر لیتا ہے۔ جب تک کہ وہ ایسا کر سکتا ہے۔ از سرنو عزم کرنے کیلئے مومن کیلئے یہ اشارہ ہے کہ اگر راہ طویل ہو جائے تو از سرنو عزم کرو۔ چنانچہ یہ تصور روح مومن اور اس کی ہمت مردانہ کے لئے مہمیز کا کام کرتا ہے۔ اور اس طرح اس کی ہمت اور اس کے ارادے میں پختگی آجاتی ہے۔ اس لئے کہ وہ سمجھتا ہے کہ جو کچھ بھی ہے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔

اس تصور حیات کا دوسرا اہم حصہ ہے۔ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَ عَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ؕ ....

.... "ہر شخص نے جو نیکی کمائی اس کا پھل اسی کیلئے ہے اور جو برائی سمیٹی اس کا وبال اسی پر ہے۔"

ہر فرد اپنے کئے کا ذمہ دار ہے۔ اس لئے اسے وہی کچھ ملے گا جو اس نے خود کمایا۔ نیز سزا بھی کسی کو صرف اسی جرم کی ملے گی جو وہ خود کرے گا۔ ہر کوئی اپنے کئے کا ذمہ دار خود ہو گا۔ ہر شخص اپنے رب کے سامنے خود اپنا اعمال نامہ لیکر جائے گا۔ اور اس میں وہی کچھ ہو گا جو اس نے کمایا' یا جس کا اس نے ارتکاب کیا۔ کوئی شخص وہاں کوئی حیلہ بہانہ نہ کر سکے گا۔ نہ وہاں کسی کو کسی کی امداد یا سفارش کی امید ہو گی۔ انسان بحیثیت فرد اپنے رب کے سامنے ہو گا۔

جب انفرادی مسئولیت کا یہ تصور کسی مومن کے قلب میں جاگزین ہو جاتا ہے' تو ہر فرد اپنے اللہ کے جو حقوق اس کے ساتھ وابستہ

ہوتے ہیں۔ ان کا ذمہ دار بن جاتا ہے۔ وہ دوسرے انسانوں کی وجہ سے کسی صورت میں بھی ان حقوق اللہ سے دست بردار نہیں ہوتا الا یہ کہ شریعت کے مطابق یہ دست برداری ہو۔ اب ہر انسان مومن کی ذات کے ساتھ جو حقوق اللہ وابستہ ہوتے وہ اس بارے میں ہر دھوکے، ہر حدود شکنی، ہر گمراہی اور ہر فساد کے مقابلے میں سینہ سپر ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہ وہ اپنے نفس اور اس کے ساتھ وابستہ حقوق اللہ کے بارے میں ذاتی طور پر خود جوابدہ ہے۔ اور ہر نفس کے ساتھ اللہ کے جو حقوق وابستہ ہیں وہ صرف وہی ہیں جن کا اللہ نے حکم دیا ہے یا جن سے اس نے منع فرمایا ہے۔ یعنی ہر فرد اپنے طرز عمل اور اپنے شعور میں صرف اللہ وحدہ کی بندگی بجالائے۔ اگر وہ ان حقوق میں کسی انسان کی وجہ سے کمی کرتا ہے۔ مثلاً یوں کہ اسے کوئی گمراہ کردے، اسے دھوکہ دیدے، یا اسے مجبور کرے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ قیامت کے دن یہ انسان اس مومن کی کوئی امداد نہ کر سکیں گے۔ (ہاں اگر یہ نافرمانی وہ بحالت جبر کرتا ہے اور دل اس کا اسلامی فرائض حقوق پر مطمئن ہے، تو پھر یہ معذور تصور ہوگا۔) غرض ایسے اشخاص قیامت کے دن نہ اس مومن کی مدافعت کر سکیں گے نہ سفارش کر سکیں گے، نہ وہ اس پوزیشن میں ہوں گے کہ اس شخص کا بوجھ اتاریں یا خود اٹھائیں۔

مسئولیت کے اس ذاتی تصور کا نتیجہ یہ ہے کہ ہر شخص بڑی جرأت کے ساتھ خود اپنی اور اس کے ساتھ وابستہ حقوق اللہ کی مدافعت کرتا ہے۔ اسی لئے کہ اس کی سزا صرف اسے ہوگی۔ اور وہ خود اپنے کئے کا ذمہ دار ہوگا۔ یاد رہے کہ یہاں انفرادی مسئولیت کے نظریہ سے مراد یہ خطرہ نہیں ہے کہ کوئی شخص معاشرہ کے اندر اپنی اجتماعی ذمہ داریاں پوری کرنے سے پہلوتہی کرے۔ اس لئے کہ اجتماعی ذمہ داریاں بھی شریعت نے ایک فرد پر بحیثیت فرد ڈالی ہیں۔ اگر معاشرہ میں اجتماعی ذمہ داریاں پوری نہ ہوں گی تو بھی فرد ذمہ دار ہوگا۔ کیونکہ یہ بھی اللہ کی جانب سے اس پر انفرادی طور پر ڈالی گئی ہیں۔ مثلاً ہر فرد اللہ تعالیٰ کی جانب سے مامور ہے کہ وہ اپنے مال اور اپنی دولت سے اجتماعی ذمہ داریاں ادا کرے۔ نیز اسے یہ حکم بھی دیا گیا ہے کہ وہ دوسروں کو تواصی بالحق کرے، معاشرہ میں عدل و انصاف قائم کرے، اپنے معاشرے سے باطل کو مٹانے کی کوشش کرے۔ معاشرے میں سچائی اور بھلائی کو مستحکم کرے اور شر اور منکر کو جڑ سے اکھاڑ پھینکے۔ اس کے اعمال نامہ میں اجتماعی معاملات کے حوالے سے بھی اس کی تمام کارکردگیاں اور کوتاہیاں درج ہوں گی۔ اور جزا و سزا کا وہ انفرادی طور پر ذمہ دار یا حقدار ہوگا۔

اہل ایمان نے جب انفرادی ذمہ داری کے اس حکم کو سن لیا اور سمجھ لیا۔ تو اب ان کے دلوں سے یہ دعا نکلی، جو بڑی جامع اور پر از اخلاص ہے۔ اس دعا کو قرآن کریم اپنے خاص انداز تصویر کشی میں بیان کرتا ہے۔ یوں نظر آتا ہے کہ اہل ایمان ہاتھ اٹھائے ہمارے سامنے کھڑے ہیں۔ صفیں باندھی ہوئی ہیں۔ اور خشوع و خضوع کے ساتھ وہ یہ دعا پڑھ رہے ہیں۔ (خصوصاً فرائض و ذمہ داریوں کی حقیقت پاکر)

رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ إِن نَّسِينَآ أَوْ أَخْطَأْنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ إِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهُۥ عَلَى ٱلَّذِينَ مِن قَبْلِنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهِۦ ۖ وَٱعْفُ عَنَّا وَٱغْفِرْ لَنَا وَٱرْحَمْنَآ ۚ أَنتَ مَوْلَىٰنَا فَٱنصُرْنَا عَلَى ٱلْقَوْمِ ٱلْكَٰفِرِينَ ﴿٢٨٦﴾

۴۰ ع ۳۰ ۸

"اے ہمارے رب، ہم سے بھول چوک میں جو قصور ہو جائیں۔ ان پر گرفت نہ کر۔ مالک، ہم پر وہ بوجھ نہ ڈال، جو تونے ہم سے پہلے لوگوں پر ڈالے تھے۔ پروردگار، جس بار کو اٹھانے کی طاقت ہم میں نہیں ہے۔ وہ ہم پر نہ رکھ، ہمارے ساتھ نرمی کر۔ ہم سے درگزر فرما، ہم پر رحم کر، تو ہمارا مولیٰ ہے۔ کافروں کے مقابلے میں ہماری مدد کر۔"

یہ ایسی دعا ہے جو اہل ایمان اور ان کے رب کے ساتھ ان کے تعلق کی خوب تصویر کشی کرتی ہے۔ وہ اپنے عجز اور ناتوانی کا گہرا ادراک رکھتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو اپنے رب کی رحمت اور درگزر کا محتاج پاتے ہیں۔ وہ اس کے درگاہ میں پناہ کے خواستگار ہیں۔ وہ اپنے آپ کو صرف اللہ کے حوالے کرتے ہیں۔ اسی سے تعلق جوڑ رہے ہیں اور ماسوا اللہ سے کٹ رہے ہیں۔ وہ اس کی راہ میں جہاد کیلئے تیار ہیں۔ اور اسی سے نصرت کے طلبگار ہیں۔ اور ان کی یہ دعا ایک انتہائی دلدوز اور ملال انگیز نغمے کی صورت میں ہے۔ جس کے صوتی زیر و بم میں ان کے دل کی دھڑکن اور ان کے روح کی بیقراری صاف سنائی دیتی ہے اور صاف نظر آتی ہے۔

رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا ۚ

"اے ہمارے رب ہم سے بھول چوک میں جو قصور ہو جائیں ان پر گرفت نہ کر۔"

اگر انسان اس قدر کمزور ہو جائے اور اس سے ایسی بھول چوک ہو جائے جس میں اس کا کوئی دخل نہ ہو اور یہ بھول چوک کبھی کبھار ہو ہی جاتی ہے تو ایسی غلطیاں' خطاء اور نسیان کے حکم میں ہوں گی۔ ان پر ایک مؤمن کیلئے صحیح طریقہ کار یہ ہے کہ وہ فوراً اللہ سے معافی مانگے۔ اپنے رب کی طرف متوجہ ہو۔ بھول چوک وہ ہوتی ہے کہ اس میں کوئی شخص غلطی پر مصر نہ ہو۔ یا وہ قصداً حکم عدولی نہ کر رہا ہو۔ یا وہ کبر و غرور کی وجہ سے نافرمانی نہ کر رہا ہو یا بالارادہ ٹیڑھے راستے پر نہ چل رہا ہو۔ ان حالات میں سے کوئی صورت حال بھی وہ نہیں ہے جو ایک مومن اپنے رب کی بارگاہ میں اختیار کرتا ہے۔ نہ ایسے حالات میں وہ اللہ کی جانب سے عفو و درگزر کا مستحق ہوگا۔ ہاں یہ دوسری بات ہے کہ وہ تائب ہو جائے اور ٹھیک طور پر اللہ کی طرف رجوع کرلے۔ غرض مومنین نے بھول چوک کے بارے میں جو درخواست معافی گزاری' اسے اللہ تعالیٰ نے قبول فرمالیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ "میری امت سے خطاء اور نسیان پر کوئی مواخذہ نہ ہوگا جب تک انہوں نے ایسے افعال کو برا سمجھا۔"[۱]

رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا ۚ

"اے ہمارے رب ہم پر وہ بوجھ نہ ڈال جو تو نے ہم سے پہلے لوگوں پر ڈالے تھے۔"

یہ دعا مرد مومن کی زبان پر اس احساس ذمہ داری کی وجہ سے آتی ہے جو امت مسلمہ پر تمام رسولوں کی رسالت کے سلسلے میں ڈالی گئی ہے' یہ امت تمام رسالتوں کے بار امانت کے نیچے آگئی ہے۔ جیسا کہ ان کے رب نے اس قرآن کریم میں اس امت کو جابجا بتلایا کہ اس سے قبل جن امتوں کے پاس رسول بھیجے گئے انہوں نے اپنے رسولوں کے ساتھ کیا کیا سلوک کیے اور ان امتوں کی نافرمانیوں کی وجہ سے ان پر کیا کیا بوجھ ڈالے گئے۔ اور یہ بوجھ ان پر ان کے بعض جرائم کی وجہ سے ڈالے گئے۔ مثلاً بنی اسرائیل کی بعض بداعمالیوں کی وجہ سے ان پر بعض پاکیزہ قسم کی غذائیں حرام کر دی گئیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ "اور جن لوگوں نے یہودیت اختیار کی ان پر ہم نے سب ناخن والے جانور حرام کر دیئے تھے اور گائے اور بکری کی چربی بھی بجز اس کے جو ان کی پیٹھ یا ان کی آنتوں سے لگی ہوئی ہو یا ہڈی سے لگی رہ جائے۔" (۶ : ۱۴۶) یا جس طرح سورۃ البقرہ میں ہے کہ انہوں نے بچھڑے کی عبادت شروع کر دی اور اللہ تعالیٰ نے انہیں حکم دیا کہ ایک دوسرے کو قتل کریں۔ اسی طرح ان کی اس بدعملی کا کفارہ ہو سکے گا۔ ان پر سبت کے دن تجارت اور شکار کو حرام قرار دیا گیا۔ اسی وجہ سے یہاں اہل ایمان کو دعا سکھائی گئی کہ وہ دست بدعا ہوں کہ ان پر اللہ تعالیٰ وہ بوجھ نہ ڈالے جو ان سے پہلے لوگوں پر ڈالے گئے۔ اس لئے کہ

[۱] طبرانی وغیرہ

نبی آخر الزماں کی بعثت کا تو مقصد ہی یہ ہے کہ وہ ان کے ذریعہ اہل ایمان اور پوری انسانیت سے وہ بوجھ اتار دیں جو انسانیت پر ڈالے گئے تھے۔ اور وہ بندھن توڑ دیں جن میں بشریت خواہ مخواہ جکڑی ہوئی تھی اور جس کے نتیجے میں اسلامی نظریۂ حیات سیدھا سادھا نظریہ بن کر آیا' جو آسان بھی ہے اور نرم بھی ہے۔

فطرت انسانی کے عین مطابق شاہراہ فطرت سے ہمقدم اور یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضور سے فرمایا۔ **وَنُيَسِّرُكَ لِلْيُسْرَىٰ** .... "اور ہم تیری راہنمائی سہولت کے ساتھ' سہل فرائض کی طرف کریں گے۔"

وہ عظیم بوجھ کیا ہے جو امم سابقہ کے کاندھوں پر ڈالا گیا تھا اور اس لئے ڈالا گیا تھا کہ انہوں نے خلیفۃ اللہ فی الارض ہونے کے ناطے اپنے عہد کی خلاف ورزی کی تھی اور عہد توڑ دیا تھا اور وہ عظیم بوجھ اب امت مسلمہ کے کاندھوں سے اتار دیا گیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ وہ کیا ہے اور اس کی ماہیت کیا ہے؟ یہ عظیم بوجھ انسان کیلئے انسان کی غلامی کا بوجھ ہے۔ جس میں بندہ بندے کا غلام ہوتا ہے' جس میں انسان کیلئے دوسرا انسان ضابطۂ حیات بناتا ہے۔ اس طرح ایک نسل انسانی دوسرے انسان کی ذات کے تابع ہوتی ہے' یا انسان ایک طبقے کے غلام ہوتے ہیں یا جس میں انسان ایک نسل کے غلام ہوتے ہیں۔ یہ ہے وہ عظیم بوجھ جس سے اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو رہائی دلائی۔ اور ان تمام غلامیوں سے انہیں چھڑا کر صرف اپنی بندگی اور غلامی اور اپنی اطاعت کے اندر داخل کر دیا۔ اس آزادی کے بعد اب اہل ایمان صرف اللہ تعالیٰ سے اپنے لئے ضابطۂ حیات اخذ کرنے لگے۔ یوں انہیں ایک اللہ وحدہ کی غلامی میں داخل کر کے' ان کی روح' انکی عقل اور ان کی پوری زندگی کو دوسرے انسانوں کی غلامی سے نکالا گیا۔

اللہ جل شانہٗ کی بندگی اور غلامی بایں مفہوم کہ انسان اپنی اقدار حیات نیک و بد کا معیار اور اجتماعی زندگی کے قوانین صرف اللہ سے اخذ کرے گا۔ پوری انسانیت کیلئے آزادی کا نقطۂ آغاز ہے۔ یوں ایک انسان دوسرے جبار و قہار انسانوں کی غلامی اور بندگی سے آزاد ہو جاتا ہے۔ اسی طرح وہ مذہبی پروہتوں' کاہنوں اور پیشواؤں کی غلامی سے بھی آزاد ہو جاتا ہے۔ مزید یہ کہ ایک انسان اوہام و خرافات اور رسوم و رواجات کے بندھنوں سے آزاد ہو جاتا ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ ایک انسان ہوائے نفس اور جسمانی شہوات و مرغوبات کے بندھنوں سے بھی چھٹکارا پاتا ہے۔ انسان ہر کھوئی قوت کی غلامی سے آزاد ہو جاتا ہے جو ناحق انسان کے کاندھوں پر سوار ہوتی ہے اور تاریخ شاہد ہے ایسی غلامیوں نے انسانوں کی کمر توڑ کر رکھدی تھی۔ اور جس کی وجہ سے لوگوں کے سر اللہ واحد القہار کے مقابلے میں دوسرے جباروں کے سامنے جھکتے تھے۔

رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهِ ۚ

"پروردگار' جس بوجھ کو ہم اٹھانے کی طاقت نہیں رکھتے وہ ہم سے نہ اٹھوا۔"

اس دعا سے اہل ایمان کے اس شعور کا اظہار ہوتا ہے کہ اب وہ انسان کی غلامی سے آزاد ہو گئے ہیں۔ نیز وہ اب خائف ہیں کہ کہیں وہ اپنی کوتاہیوں کے سبب دوبارہ دور غلامی میں واپس نہ چلے جائیں جو نہایت ہی برا دور تھا۔

"اے ہمارے رب' ہم سے وہ بوجھ نہ اٹھوا جس کے اٹھانے کی طاقت ہم میں نہیں ہے۔" ایک ایسی دعا ہے جس سے مکمل طور پر سر تسلیم خم کر دینے کی حقیقت کا اظہار ہوتا ہے۔ اہل ایمان کے دل سے اب یہ ارادہ اور نیت ہی نکل گئی ہے کہ وہ احکام خداوندی کی خلاف ورزی کریں گے۔ چاہے جو احکام بھی ہوں' وہ صرف یہ درخواست پیش کرتے ہیں کہ وہ ضعیف ہیں۔ یہ توقع رکھتے ہیں۔ اجرائے احکام میں ان کی صفت کو مد نظر رکھا جائے گا۔ پروردگار' ہم پر رحم کر اور تکلیف مالایطاق سے ہمیں بچا تاکہ ان سے تعمیل احکام میں عجز و

قصور کا ارتکاب نہ ہو' ورنہ وہ تو پختہ ارادہ کئے ہیں کہ مکمل تسلیم و انقیاد کا مظاہرہ کریں گے۔ صرف بندہ ناتواں کی امید یہ ہے کہ مالک الملک ان کے ساتھ مہربانی کرے۔ اور جس طرح وہ اپنے بندوں کے ساتھ جود و کرم' نرمی اور محبت کا رویہ رکھنے کے عادی ہے وہی سلوک ہم سے جاری رکھا جائے۔ ہم اپنی تقصیرات کا اعتراف کرتے ہیں اور وہ تقصیریں صرف اسی صورت میں معاف اور بے اثر ہو سکتی ہیں جب اللہ کا فضل شامل حال ہو۔

وَاعْفُ عَنَّا وَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا

"ہمارے ساتھ نرمی کر' ہم سے درگزر فرما' ہم پر رحم فرما۔"

اس لئے کہ اس امتحان میں کامیاب ہونے کی یہ واحد گارنٹی ہے صرف اسی صورت میں اللہ کی رضامندی حاصل ہو سکتی ہے۔ انسان جس قدر محنت سے بھی وفاداری کرے' اس کے کام میں کوئی نہ کوئی کمی رہ جاتی ہے اور اگر اللہ کا فضل شامل حال نہ ہو وہ عفو و درگزر اور رحمت نرمی سے کام لے گا۔ حضرت عائشہ ؓ سے روایت ہے' فرماتی ہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ تم میں سے کوئی شخص بھی صرف اپنے عمل کے بل بوتے پر جنت میں داخل نہ ہو گا۔ صحابہ کرام ؓ نے پوچھا' رسول خدا ؐ اور آپ بھی؟ تو حضور ؐ نے فرمایا۔ "اور میں بھی' الا یہ کہ اللہ نے مجھے اپنی رحمت میں ڈھانپ لیا ہے۔"

ایک صحیح مومن کے احساس میں یہی اصل بات ہے۔ وہ حتی المقدور عمل کرتا ہے لیکن اپنی تقصیرات کا اسے پوری طرح احساس ہوتا ہے۔ اور اس کے بعد اسے پوری امید ہوتی ہے کہ اللہ اس کی تقصیرات سے عفو و درگزر فرمائے گا۔ اور اس کے ساتھ نرمی برتی جائے گی۔

سب سے آخر میں اہل ایمان اللہ کے مضبوط سہارے کو پکڑتے ہیں' وہ جہاد فی سبیل اللہ کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ اس لئے کہ اللہ کا ارادہ ہے کہ حق کا بول بالا ہو' دین اسلام اور اسلامی نظام زندگی اس کرۂ ارض پر غالب ہو' اور صورت حال یہ ہو کہ "کوئی فتنہ نہ رہے اور دین صرف اللہ کا چلے۔" اب اہل ایمان اللہ کا مضبوط سہارا لیتے ہیں۔ وہ اپنے سروں پر اسلام کے جھنڈے بلند کرتے ہیں۔ وہ صرف انہی جھنڈوں سے اپنی پہچان کراتے ہیں۔ جبکہ جاہلیت کی علامات اور جھنڈے بہت ہی مختلف ہیں' اب وہ اللہ تعالیٰ کی نصرت کے طلبگار ہوتے ہیں۔ اس لئے کہ ان کا وہی والی اور وارث ہے۔ وہ اہل کفر کے ساتھ صرف اللہ کیلئے لڑتے ہیں۔ جو دین اسلام سے خارج ہیں۔

أَنتَ مَوْلَانَا فَانصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ ﴿٢٨٦﴾

"تو ہمارا مولیٰ ہے کافروں کے مقابلے میں ہماری مدد کر۔"

یہ ہے اس عظیم سورت کا خاتمہ جس میں اس پوری سورت کے مضامین کا خلاصہ بیان کیا گیا ہے۔ اس خلاصے میں اسلامی تصور حیات کا خلاصہ بیان ہوا ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ ایک سچے مومن کا اپنے رب کے ساتھ ہر حال میں کیا تعلق ہوتا ہے۔

صدق اللہ العظیم ○

☆......☆......☆......☆......☆

فی ظلال القرآن

سورۂ آل عمران

پارہ ------- ۳

آیات:۔ ۱ تا ۹۱

سورۂ آل عمران ' ایک نظر میں

قرآن حکیم ہی دعوت اسلامی کی کتاب ہے' وہی اس کا باعث اور روح رواں ہے۔ دعوت اسلامی کی شخصیت اور اس کا وجود یہی کتاب ہے۔ اور یہی کتاب اس کی پاسبان اور ساربان ہے۔ یہی اس کا بیان اور ترجمان ہے۔ یہی اس کا نظام اور دستور ہے' اس کی دعوت کا مرجع اور ماخذ یہی کتاب' اس کے داعیوں کیلئے یہی گائیڈ ہے۔ اسی سے دعوت اسلامی منہج حرکت و عمل اخذ کرتی ہے اور اسی سے وہ زاد راہ اور نشان منزل پاتی ہے۔

لیکن جب تک ہم اس بات کو اچھی طرح سمجھ نہ لیں گے کہ اس کتاب کا پہلا خطاب ایک زندہ اور متحرک امت سے تھا۔ اس وقت تک ہمارے اور اس کتاب کے درمیان ایک وسیع خلیج حائل رہے گی۔ ہمارے ذہن میں یہ حقیقت اچھی طرح جاگزین ہونی چاہئے کہ قرآن کی مخاطب امت کا ایک حقیقی وجود تھا۔ پھر اس خطاب کی وجہ سے اس امت نے عالم واقعہ میں بعض عملی اقدامات کئے اور ان واقعات اور اقدامات کے ذریعہ اس امت نے اس کرۂ ارض پر اس وقت کی پوری انسانی زندگی کا رخ ہی بدل کر رکھ دیا۔ اس خطاب کی وجہ سے اس وقت پوری انسانیت کی نفسیاتی دنیا میں ایک زبردست معرکہ برپا ہوا۔ اس نظریاتی جنگ کے علاوہ اس کرۂ ارض کے بعض حصوں میں عملاً معرکے بھی ہوئے۔ یہ ایسے معرکے تھے کہ جن کے عمل اور ردعمل کی وجہ سے دنیا متاثر ہوئی۔ اثرات ڈالے اور ایک طوفان برپا ہوا۔

جب تک اس کتاب کے ساتھ ہمارا رویہ یہ ہوگا کہ ہم صرف خوش الحانی کے ساتھ اس کی تلاوت کریں۔ اسے سنیں' اس پر جھومیں اور اسے صرف برائے حصول ثواب اس کے ختم کرائیں۔ لیکن اس کے علاوہ انسان کی عملی اور واقعاتی زندگی کے ساتھ اس کا کوئی عمل دخل نہ ہو' تو حقیقت یہی رہے گی کہ ہمارے اور اس قرآن کے درمیان ایک دبیز پردہ حائل رہے گا۔ اور اس وقت صورت حالات یہی ہے کہ اس مخلوق یعنی حضرت انسان کی عملی زندگی سے اس کتاب کو نکالا گیا ہے۔ بلکہ امت مسلمہ کی عملی زندگی بھی قرآن کے تابع نہیں ہے۔ حالانکہ اس کتاب کا نزول تو ان حالات میں ہوا تھا کہ زندہ انسانوں کو ہدایت دے رہی تھی۔ وہ عملی واقعات کا رخ پھیر رہی تھی۔ وہ زندہ حادثات میں ہدایت تھی' ان واقعات کا ایک مستقل تاریخی وجود تھا اور وہ زندہ تھے۔ اس نے ان انسانوں کی کایا پلٹ دی۔ ان واقعات کا رخ پھیر دیا۔ ان کے نتیجے میں وہ ایک زندہ موجود معاشرہ وجود میں آیا۔ عام انسانی زندگی میں وہ ممتاز خصوصیات کا حامل تھا۔ لیکن امت مسلمہ کے حوالے سے تو اس وقت کی واقعاتی دنیا خصوصی اہمیت رکھتی تھی۔

اس کتاب کا تو اعجاز ہی یہ ہے کہ اس کا نزول' اس کی ہر آیت کا نزول ہی' ایک متعین واقعہ اور ایک متعین صورت حالات میں ہوا' ایک متعین اور زندہ سوسائٹی میں وہ نازل ہوا اور انسانی تاریخ کے ایک متعین پیریڈ میں وہ نازل ہوا۔ اس نے اس سوسائٹی اور امت کو لیکر ایک عظیم معرکہ برپا کیا۔ جس نے پوری انسانیت کے حوالے سے تاریخ کا رخ پھیر کر رکھدیا۔ لیکن اس تاریخی رول کے ساتھ ساتھ اس کا یہ اعجاز اب بھی قائم ہے کہ وہ اب بھی ایک زندہ کتاب ہے۔ اس میں اب بھی یہ صلاحیت ہے۔ جو انسان کی موجودہ زندگی کا سامنا کرلے۔ بلکہ اس پر غور کیا جائے تو وہ یوں نظر آتی ہے کہ گویا اب بھی وہ امت مسلمہ کو اس کی جاری و ساری زندگی میں ہدایات دے رہی ہے۔ اس وقت امت مسلمہ کو اس کے اردگرد پھیلی ہوئی جاہلیت کے ساتھ ساتھ جو معرکہ درپیش ہے۔ اس میں وہ مسلسل اسے ہدایات دے رہی ہے۔ خود امت مسلمہ کی ذہنیت اور اس کے ضمیر کے اندر جو داخلی کشمکش برپا ہے۔ اس میں بھی وہ ہادی و رہبر ہے۔ اور یہ

راہنمائی اس طرح ایک زندہ راہنمائی ہے جس طرح دور اول میں تھی' اسی طرح واقعاتی راہنمائی جس طرح ہوا کرتی تھی۔

ہم کیونکر اس قرآن کی عملیت اور فعالیت کو دریافت کر سکتے ہیں؟ اس کی پوشیدہ زندگی کا راز ہم کس طرح معلوم کر سکتے ہیں تاکہ اسے ہم دور حاضر میں اپنی زندگی کا راہنما بنالیں اور وہ جماعت مسلمہ کا گائیڈ اور راہنما بن جائے۔ اس مقصد کیلئے ہمیں اس جماعت کی زندگی کی تشکیل کا تفصیلی مطالعہ کرنا ہوگا۔ جس کو اس قرآن نے سب سے پہلے خطاب کیا۔ ایسا مطالعہ کہ ہماری نظروں میں گویا اسکرین پر وہ جماعت تشکیل پا رہی ہے' وہ درپیش واقعات و حادثات میں زندہ اور متحرک ہے۔ وہ مدینہ اور پورے جزیرۃ العرب میں واقعات و حوادث کا مقابلہ کر رہی ہے۔ وہ دشمنوں کے ساتھ بھی برت رہی ہے اور دوستوں کے ساتھ بھی رواں دواں ہے۔ وہ اپنی خواہشات نفس کے ساتھ بھی برسرپیکار ہے اور اپنے اردگرد پھیلی ہوئی جاہلی سوسائٹی کے ساتھ بھی برسرجنگ ہے اور اس پورے عرصے میں قرآن مسلسل نازل ہو رہا ہے۔ اور ان سب واقعات کے بالمقابل جن میں وہ اس جماعت کی راہنمائی اس کشمکش کے حوالے سے بھی کر رہا ہے' جو خود اس کے پہلو میں اپنے نفس کے ساتھ جاری ہے اور اس معرکے میں بھی کر رہا ہے جو اس جماعت کو اپنے ظاہری دشمنوں کے ساتھ' مکہ ان کے اردگرد' مدینہ کے ماحول میں اور پورے جزیرۃ العرب میں درپیش ہے۔

ہاں! ہمارے لئے بہت ہی ضروری ہے کہ ہم کچھ عرصہ اس پہلی جماعت اسلامی کے ساتھ زندہ رہیں۔ اپنے ذہن کی اسکرین پر اسے اس کے حقیقی انسانی روپ میں دیکھیں۔ اس کی زندگی کے واقعات کو چلتا پھرتا دیکھیں بحیثیت انسانی اس کی مشکلات پر غور کریں' اور پھر دیکھیں کہ یہ قرآن اس کی راہنمائی کس طرح براہ راست کر رہا ہے۔ اس کی روزمرہ زندگی میں بھی وہ اس کے لئے گائیڈ ہے۔ اس کے اصولی معاملات میں بھی وہ راہنما ہے۔ ہمیں اس اسکرین پر نظر آئے گا کہ قرآن مجید نے اس جماعت کو ہاتھ سے پکڑ کر رکھا ہے۔ قدم قدم پر اس کے ساتھ ہے۔ وہ کبھی گرتی اور پھر اٹھتی ہے۔ کبھی راستہ کھو دیتی ہے تو فوراً پھر جادۂ مستقیم پر آجاتی ہے۔ کبھی کمزور پڑ جاتی ہے تو فوراً کھڑی ہو جاتی ہے۔ مشکلات کے پہاڑ ٹوٹتے ہیں تو صابر و شاکر ہے۔ وہ مشکلات سے پر دشوار گزار گھاٹیوں کو بڑی مشقت سے عبور کرتی چلی جاتی ہے۔ وہ بڑے نظم و ضبط' صبر و مشقت کے ساتھ اور جدوجہد کے ساتھ مشکلات پر قابو پاتی ہے۔ اس اسکرین پر صاف نظر آتا ہے کہ اس جماعت میں تمام انسانی خصوصیات موجود ہیں۔ اس میں انسانی ضعف و درماندگی بھی ہے اور اس میں ہمت و مردانگی بھی ہے۔

اس پہلی جماعت اسلامی کے ساتھ قدرے زندگی بسر کرنے کے بعد ہی ہم یہ شعور پیدا کر سکتے ہیں کہ یہ کتاب تو ہمیں بھی بعینہ اس طرح خطاب کر رہی ہے' جس طرح اس نے پہلی جماعت مسلمہ کو خطاب کیا تھا۔ اور یہ کہ آج کی انسانیت جسے ہم دیکھتے ہیں۔ جسے ہم اچھی طرح جانتے ہیں۔ جسے ہم اس کی پوری خصوصیات کے ساتھ محسوس کر رہے ہیں۔ یہ دعوت قرآن پر لبیک کہنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ یہ بعینہ پہلی جماعت کی طرح قرآنی قیادت اور قرآنی راہنمائی سے مستفید ہو سکتی ہے۔

اس جماعت مسلمہ کی زندگی پڑھ کر محسوس کریں گے کہ یہ قرآن تو آج بھی ایک زندہ کتاب ہے۔ وہ ہمیں اس جماعت کی زندگی میں فعال نظر آئے گی۔ اور آج کے دور میں وہ ہماری زندگی میں فعال ہو سکتی ہے۔ یوں ہم محسوس کریں گے کہ یہ کتاب آج بھی ہمارے شانہ بشانہ کھڑی ہے اور کل بھی ہمارے ساتھ ہوگی اور یہ کہ یہ محض برائے ثواب تلاوت ہی کیلئے نہیں ہے۔ صرف جھومنے کیلئے نہیں ہے۔ اسے ہماری عملی زندگی سے دور نہیں رکھا جا سکتا' نہ یہ ہماری کوئی ایسی تاریخ ہے' جو گزر گئی اور اس کے صفحات الٹ کر رکھ دیئے گئے۔ اب عملی میدان کے ساتھ اس کو کوئی سروکار نہیں۔ اب جدید تاریخ میں اس کا کیا کام۔

قرآن کریم' ایک ایسی حقیقت ہے' ایک ایسا وجود ہے جس طرح یہ کائنات ایک مستقل وجود رکھتی ہے' یہ کائنات اللہ کی وہ کتاب ہے جسے ہم دیکھتے ہیں اور مشاہدہ کرتے ہیں اور قرآن اللہ کی وہ کتاب ہے جسے ہم پڑھتے ہیں اور اس پر تدبیر کرتے ہیں۔ جس طرح کتاب

کائنات وجود باری پر شاہد ہے' اسی طرح قرآن کریم بھی اپنی شان اعجاز کے ساتھ ذات باری پر شہادت ہے۔ اور یہ دونوں وجود یہاں جاری و ساری ہیں۔ یہ کائنات اپنے تمام قوانین قدرت اور نوامیس فطرت کے ساتھ متحرک ہے۔ اس کے خالق نے اس کی ڈیوٹی لگائی ہے وہ اسے پورا کر رہی ہے۔ سورج اپنے مدار میں متحرک ہے اور اپنا فریضہ سرانجام دے رہا ہے۔ چاند' زمین اور تمام دوسرے ستارے اور سیارے اپنا اپنا فرض منصبی ادا کر رہے ہیں۔ زمانے کی دوری اور طوالت کا ان کے فرائض منصبی پر کوئی اثر نہیں ہے۔ نہ زمانے کی جدت نے اس کی کسی حرکت کو جدت دی ہے .... بعینہ اسی طرح قرآن کریم نے بھی ایک دفعہ انسانیت کی راہنمائی میں ایک بہترین کردار ادا کیا۔ وہ آج بھی اسی طرح موجود ہے' جس طرح تھا۔ انسانیت آج بھی اسی طرح ہے جس طرح تھی۔ اور یہ انسان اسی طرح اپنی حقیقت اور فطرت پر قائم رہے گا۔ اور یہ قرآن مجید اسی انسان کو اللہ کی جانب سے پکار ہے۔ جس طرح اس نے پہلے لوگوں کو پکارا' اس پکار میں کوئی تغیر نہیں ہے۔ اس لئے کہ خود ذات انسانی اور فطرت انسانی میں کوئی تغیر نہیں ہوا ہے۔ اگرچہ اس کے ماحول اور اس کے اردگرد پھیلی ہوئی دنیا میں تغیر اور تبدیلی واقعہ ہوگئی ہے۔ اور وہ خود بھی ان جدید حالات اور واقعات سے متاثر ہوا ہے۔ [۱] جبکہ قرآن مجید اسے اس کی اصل فطرت اور اس کی اصل حقیقت کو سامنے رکھ کر خطاب کرتا ہے۔ جس میں آج تک کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ نہ کوئی تغیر ہوا ہے۔ قرآن مجید آج بھی انسان کی زندگی کا رخ پھیر سکتا ہے اور کل بھی پھیر سکتا ہے' اس لئے کہ وہ اس راہنمائی کیلئے ہر وقت تیار ہے۔ اس لئے کہ وہ انسانیت کے لئے خداوند قدوس کا آخری خطاب اور آخری پیغام ہے۔ اس کا مزاج اس طرح فطری ہے جس طرح اس کائنات کا مزاج ایک فطرت پر ہے۔ جس میں کوئی تغیر اور کوئی تبدیلی نہیں ہے۔

ذرا سوچئے یہ بات کس قدر مضحکہ خیز ہوگی کہ کوئی سورج کے بارے میں یہ کہے کہ یہ تو ایک قدیم ستارہ ہے۔ یہ "قدامت پرست" ہے۔ مناسب ہے کہ اسی سورج کی جگہ ایک جدید ترقی پذیر سورج ہو یا یہ کہ یہ انسان تو ایک قدیم مخلوق ہے۔ یہ قدیم اور رجعت پسند ہے۔ مناسب ہے کہ اسی انسان کی جگہ ایک نیا انسان ہو' جو اس نئی دنیا کی تعمیر و ترقی میں کام کرے .... اگر اس قسم کی بات اور اس قسم کے منصوبے مضحکہ خیز ہو سکتے ہیں۔ تو یہی بات قرآن کریم کے بارے میں کہی جاسکتی ہے۔ جو اپنی حیثیت پر اسی طرح قائم ہے۔ اور اس کا مقام یہ ہے کہ وہ انسان کے لئے رب کا آخری پیغام ہے۔

○.......... ○ ....○

مدینہ طیبہ میں اسلامی جماعت کے حالات میں اس سورت میں' ایک زندہ و تابندہ حصہ پیش کیا گیا ہے۔ یعنی ۲ھ میں غزوۂ بدر کے متصلاً' بعد اور ۳ھ میں غزوۂ احد کے بعد تک اس دور میں امت مسلمہ جن حالات سے دوچار ہوئی۔ ان حالات میں قرآن کریم نے کیا کیا ہدایات دیں۔ کیا کیا تصرفات کئے اور جماعتی زندگی کے مختلف پہلوؤں میں جو کام کیا اس کا اس میں ذکر ہے۔

ان کا بیان ایسے شوکت اور قوت سے بھرپور الفاظ میں کیا گیا ہے کہ اسی دور کے پورے حالات جن سے تحریک اسلامی گزر رہی تھی' ان کی ایک مکمل تصویر کھینچ گئی ہے۔ ان حالات میں جو جھڑپیں ہوئیں۔ جیسے حالات میں ہوئیں' ان کا مکمل نقشہ سامنے آتا ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ گویا سورت کا قاری زندہ طور پر ان حالات میں چل پھر رہا ہے' وہ اس تحریک میں ہے جو ان معرکوں میں حصہ لے رہی تھی۔ اور جو ان کا مقابلہ کر رہی تھی۔ انداز بیان ایسا ہے کہ لوگوں کے دلی راز دلی پوشیدہ جذبات' دلی وساوس اور تفکرات اور ایسے حالات میں انسانی جذبات اور میلانات کو بھی زیر بحث لایا گیا ہے۔ اگر انسان تھوڑی دیر کے لئے آنکھیں بند کر لے تو جس طرح میں دیکھ رہا ہوں' اس طرح اسے بھی اپنے پردۂ خیال پر یہ جماعت مسلمہ یوں چلتی پھرتی نظر آئے' جس طرح گویا وہ زندہ نظر آرہی ہو' تمام چہرے اپنے

۱۔ دیکھئے محمد قطب کی کتاب معرکۃ التقالید۔

خدوخال کے ساتھ صاف نظر آئیں' ان کے چہروں پر ان کے قلبی میلانات بھی صاف نظر آئیں۔ اس جماعت کے اردگرد دشمن بھی صاف نظر آئیں۔ جو ان کے خلاف گھات میں بیٹھے ہیں' ان کے خلاف حملے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ اس جماعت کے اندر وہ شبہات اور غلط فہمیاں پیدا کر رہے ہیں' اس کو حقارت اور دشمنی کی نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔ اب اس کے خلاف جمع ہو رہے ہیں اور اب میدان میں آپہنچے' وہ دیکھو یہ دشمن شکست کھا گیا (احد میں) اب وہ چال چلتے ہیں اور وہ آئے گھاٹی کی اوٹ سے' حملہ آور ہوئے' مسلمانوں پر ٹوٹ پڑے........

غرض اس معرکہ کی تمام حرکات و سکنات' اس کے تمام باطنی اثرات اور ظاہری تاثر صاف صاف پردۂ خیال پر نظر آتے ہیں۔

اس منظر میں قرآن کریم کا نزول ہو رہا ہے' تاکہ کفار کے مکر و فریب کا جال پاش پاش کر دے۔ ان کے پھیلائے ہوئے شکوک و شبہات زائل کر دے' مسلمانوں کے دلوں کو جمع اور ان کے قدموں کو پختگی عطا کرے۔ ان کی روح کو پاک اور ان کے افکار کو صاف کر دے۔ حادثات پر تبصرہ کرے اور غلطیوں سے عبرت سکھائے۔ ان کے افکار کی تعمیر کرے اور ان میں سے آمیزش کو پاک کرے' ان کو آگاہ کرے کہ ان کا دشمن غدار اور امور جنگ میں سخت مکار ہے اور تاکہ وہ اس وادی پر خار میں' تحریک اسلامی کو تمام پھندوں اور کیموفلاگ سے بچاتے ہوئی آگے بڑھائے' یوں جس طرح ایک ماہر تجربہ کار جرنیل اور اپنی فوج کی ظاہری اور چھپی ہوئی کمزوریوں سے باخبر جرنیل قیادت کرتا ہے۔

اس تاریخی پس منظر کے باوجود' اس سورت میں قرآن مجید جو ہدایات اور احکامات دیتا ہے' وہ بالکل عام' دائمی اور زمان و مکان کے قیود و حدود سے پاک ہیں۔ نہ ان میں اس دور کا کوئی رنگ نظر آتا ہے اور نہ اس ماحول کی کوئی جھلک نظر آتی ہے' ان ہدایات کا رخ پوری انسانیت اور ہر دور کی جماعت مسلمہ کی طرف ہے۔ آج کی جماعت ہو یا مستقبل کی جماعت ہو' بلکہ ان ہدایات کا مخاطب پوری انسانیت ہے۔ یوں نظر آتا ہے کہ شاید یہ آیات آج نازل ہو رہی ہیں اور آج کی جماعت مسلمہ کو آج کے مسائل میں ہدایات دی جا رہی ہیں۔ اور موجودہ صورت حال پر تبصرہ کر رہی ہیں۔ یہ اس لئے کہ ان آیات میں ایسے امور پر بحث کی گئی اور ایسے واقعات اور ایسے جذبات کا ذکر کیا گیا ہے جن کا تعلق وجدان کے ساتھ ہے' جن کا تعلق انسان کی نفسیات سے ہے' گویا اس وقت ایسے ہی حالات پیش نظر تھے اور اس سورت میں ان کا ذکر ہے...... بلکہ حقیقت یہ ہے کہ صورت حال کچھ ایسی ہی تھی اور اللہ تعالیٰ جو علیم و خبیر ہے' جو نفس انسانی' امور انسانی اور تمام اشیاء کی حقیقت کا علم رکھتا ہے وہ ہمیشہ کے واقعات و حالات کے بارے میں خوب جانتا ہے۔

اس لئے صاف نظر آتا ہے کہ یہ قرآن دعوت اسلامی کا قرآن' چاہے یہ دعوت جس دور میں ہو' اور جس جگہ بھی ہو' قرآن امت مسلمہ کا دستور حیات' وہ جس زمانے میں ہو' جس نسل میں ہو اور جس قبیلے میں بھی' وہ اس کی راہ کا حدی خواں ہے اور دشوار راستوں میں اس کا رہبر ہے۔ ہر دور اور ہر زمان میں' اس لئے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے اسی انسانیت کیلئے آخری راہنمائی اور آخری پیغام ہے۔

○..........○ ....○

یہ سورت اس دور میں نازل ہوئی جس میں مدینہ کے اندر تحریک اسلامی کو کسی قدر قرار و سکون مل گیا تھا' وہ اپنے ایک مستقل وطن میں جم گئی تھی۔ مسلمان مدینہ الرسول میں حکومت قائم کر چکے تھے۔ اور جس طرح ہم نے سورۃ البقرہ کی ابتداء میں تفصیل سے بتایا' مسلمانوں نے مدینہ میں اپنے پروگرام کے مطابق اقدامات شروع کر دیئے تھے۔

اس دور میں بدر کی عظیم جنگ وقوع پذیر ہوگئی تھی۔ جس میں اللہ تعالیٰ نے قریش پر مسلمانوں کو فتح دی تھی۔ جن حالات میں یہ ٹکر ہوئی تھی اور جس ماحول میں مسلمانوں کو یہ غلبہ نصیب ہوا تھا' ان میں یہ عظیم کامیابی ایک معجزے سے کم نہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ خزرج قبیلے کے رئیس وقت عبداللہ بن ابی ابن السلول کے دانت بھی کھٹے ہوگئے۔ اس کا غرور ٹوٹا اور وہ دین اسلام سے جس قدر نفرت کرتا تھا' اس کی

نفرت میں قدرے کمی آئی' حضور ﷺ سے یہ جو بغض رکھتا تھا' اس میں قدرے کمی ہوئی' چنانچہ اس نے اب اپنی ان ظاہری نفرتوں کو دل میں چھپالیا۔ اور ایک منافق کی حیثیت سے اسلام میں داخل ہوگیا۔ وہ کہتا تھا: "یہ ایک ایسی تحریک ہے جو مقبول ہو رہی ہے۔" اور وہ ایک راہ پڑگئی' اب اس تحریک کی راہ کوئی نہیں روک سکتا۔

بدر الکبریٰ کے بعد مدینہ طیبہ میں نفاق کی بنیاد پڑگئی۔ یا منافقت میں بہت زیادہ اضافہ ہوگیا۔ اس لئے کہ بدر سے پہلے بھی بعض ایسے لوگ تھے' جو منافق تھے اور وہ اسلام میں محض اس لئے داخل ہوگئے تھے کہ ان کے اہالی و موالی سب اسلام میں داخل ہوگئے تھے۔ بہرحال اس وقت ایک گروہ ایسا پیدا ہوگیا تھا' جن میں بعض بااثر لوگ بھی شامل تھے۔ جو بظاہر اسلام میں داخل ہونے پر مجبور ہوگیا تھا' یہ ان کی مجبوری تھی کہ وہ مسلمانوں کی صفوں میں شامل ہوجائیں۔ حالانکہ ان کے دل اسلام اور مسلمانوں کے خلاف بغض و عداوت سے بھرے ہوئے تھے' وہ اس انتظار میں بیٹھے تھے کہ مسلمانوں پر کوئی مصیبت نازل ہو۔ وہ ہروقت اس تلاش میں رہتے تھے کہ اہل اسلام کے اندر انہیں کوئی سوراخ ملے' وہ ایسے واقعات کے انتظار میں تھے۔ جن سے اہل اسلام کی قوت منتشر ہو اور ان کی صفوں میں انتشار پیدا ہوتا کہ انہیں اپنے دلی بغض اور حسد کے اظہار کا موقع ملے اور وہ اس نئی تحریک پر فیصلہ کن وار کرسکیں اگر ممکن ہوسکے۔

ان منافقین کو ایک قدرتی عنصر ایسا مل گیا تھا' جو اس کام میں ان کا قدرتی حلیف تھا' یعنی اہل یہود' جن کے دل بھی تحریک اسلامی اور مسلمان کے خلاف جل بھن گئے تھے۔ ان کو ان منافقین سے بھی' حضور اکرم ﷺ کے ساتھ زیادہ نفرت تھی۔ خصوصاً اس وجہ سے کہ عرب کی جاہل اقوام میں ان کی جو قدر و منزلت' اہل کتاب ہونے کے ناطے تھی' اس میں تحریک اسلامی کی وجہ سے کمی آنے کا شدید خطرہ لاحق ہوگیا تھا۔ نیز وہ اوس و خزرج کو باہم لڑا کر مدینہ میں اپنی جو برتری قائم کئے ہوئے تھے' وہ اس سے قبل اسلام نے ختم کردی تھی' جبکہ اوس اور خزرج خدا کے فضل سے بھائی بھائی بن چکے تھے اور اسلام کے سایہ میں وہ ایک ہی صف میں بنیان مرصوص کی شکل میں کھڑے تھے۔

جب بدر میں مسلمانوں کو فتح نصیب ہوئی' یہ یہودی جل بھن گئے' ان کے دلوں کے بغض و عناد میں ابال آگیا۔ اس لئے اس سے جس قدر ممکن تھا' اسلام کے خلاف انہوں نے خفیہ سازشیں' مکاری اور فریب کاری شروع کردی۔ وہ ہروقت اس کوشش میں لگے رہتے تھے کہ مسلمانوں کی صفوں میں انتشار پیدا ہو' مسلمانوں کے اندر حیرانی و پریشانی پیدا ہو' ان کے دلوں میں شکوک و شبہات پیدا ہوں' ان کے عقائد میں شبہات پیدا ہوں اور خود ان کے نفوس میں شک کا بیج بو دیا جائے۔

ان ہی دنوں غزوہ بنی قینقاع واقعہ ہوا' جس میں یہودیوں کی اسلام دشمنی کھل کر سامنے آگئی۔ حالانکہ یہودی قبائل اور حضور اکرم ﷺ کے درمیان پختہ معاہدے ہوچکے تھے۔ مدینہ میں تشریف لاتے ہی حضور ﷺ نے ان کے ساتھ یہ معاہدے کئے تھے۔

ادھر مشرکین مکہ کی حالت یہ تھی کہ وہ بدر الکبریٰ کی کامیابی سے سخت خوفزدہ تھے۔ وہ رات دن حضرت محمد ﷺ کے مدنی محاذ کی کامیابی پر سوچتے رہتے تھے۔ اس کامیابی سے ان کی تجارت' ان کے وقار اور حتیٰ کہ ان کے لیے وجود کے جو خطرات پیدا ہوگئے تھے اس سے وہ بے فکر نہ تھے۔ اس لئے وہ بھی اس خطرے کا مقابلہ کرنے کے لئے تیاریاں کر رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ قبل اس کے کہ یہ خطرہ ناقابل علاج ہوجائے اس کا تدارک ضروری ہے۔

ان حالات میں صورت حال یہ تھی کہ مسلمانوں کے دشمنوں کے جذبات دشمنی جوبن پر تھے۔ ان کی قوت میں بھی جوش و خروش تھا' ان کے جذبات بغض و عناد اپنی شباب میں تھے۔ لیکن مسلمانوں کی تنظیم بہرحال اپنے ابتدائی مراحل میں تھی۔ اس کی تربیت اور ان کا نظم و نسق ابھی تک مکمل نہ تھا۔ ان میں وہ لوگ بھی تھے جو مہاجرین و انصار میں ممتاز اور تجربہ کار لوگ تھے۔ جو اسلام میں بہت ہی آگے تھے۔ لیکن ایسے بھی تھے' جو ان سابقین مہاجرین و انصار کی طرح پختہ کار اور اسلام میں زیادہ پختگی نہ رکھتے تھے۔ نیز اسلامی جماعت ابھی

تک بہت زیادہ تجربات سے دوچار نہیں ہوئی تھی۔ جس سے اس کی ناہمواریاں دور ہو جاتیں۔ ان پر دعوت اسلامی کی حقیقت اچھی طرح ظاہر ہو جاتی۔ زمانے کے نشیب و فراز سے وہ واقف ہوتے اور تحریک اسلامی کی حکمت عملی اور نظام کار سے اچھی طرح واقف ہوتے۔

اس وقت منافقین کو مدینہ میں اہم مقام حاصل تھا۔ ان کا سربراہ عبداللہ بن ابی تھا۔ ان منافقین کے خاندان اور قبائلی رابطے ابھی تک قائم تھے' مسلمانوں پر ابھی تک یہ حقیقت نہ کھلی تھی کہ صرف اسلامی نظریۂ حیات ہی ان کا خاندان ہے۔ یہی ان کا قبیلہ ہے' یہی ان کا مددگار ہے اور اس کے سوا کوئی قوت ان کی قوت نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان منافقین کے نفوذ کی وجہ سے اسلامی صفوں میں جابجا کمزوریاں تھیں' اس لئے کہ منافقین اہل اسلام میں ابھی تک اثر و رسوخ بھی رکھتے تھے اور ان میں اچھی طرح گھل مل گئے تھے۔ (غزوہ احد کے بارے میں آیات کی تشریح کے وقت انشاء اللہ اس نکتے کی وضاحت ہوگی۔)

اسی طرح اہل یہود کا بھی مدینہ کی سوسائٹی میں اہم مقام تھا۔ اہل مدینہ کے ساتھ ان کے صدیوں پرانے تجارتی اور حلیفانہ تعلقات تھے۔ اور ابھی تک ان کی دشمنی بھی کھل کر سامنے نہ آئی تھی۔ اور اہل اسلام کے دلوں کے اندر بھی ابھی تک یہ بات پختہ طور پر نہ بیٹھی تھی کہ ان کے لئے صرف ان کا نظریۂ حیات ہی عہد و میثاق ہے۔ نظریہ ہی ان کا وطن ہے۔ نظریہ ہی ان کے معاملات اور معاہدوں کی اصل اساس ہے۔ اس لئے جب مسئلہ نظریات کا آجائے' تو اس وقت کوئی معاہدہ یا کوئی پختہ رابطہ بھی کام نہیں دیتا۔ ان حالات میں یہودیوں کیلئے یہ اچھا موقع تھا کہ وہ مسلمانوں کے اندر شکوک و شبہات پھیلائیں۔ انہیں بدراہ کریں اور ان کے اندر افواہیں پھیلائیں۔ بعض اہل اسلام ان کی باتوں پر کان بھی دھرتے تھے اور ان سے متاثر ہوتے تھے۔ بعض اہل اسلام ایسے بھی تھے کہ جب حضور اکرم ﷺ ان کی سازشوں کے دفعیہ کیلئے کوئی پیش بندی فرماتے تو ان یہودیوں کی مدافعت کرتے۔ (مثلاً جب بنی قینقاع کے بارے میں عبداللہ بن ابی نے سفارش کی اور اس معاملے میں حضور ﷺ کے بارے میں سختی کی۔)

دوسری جانب مسلمانوں کی حالت یہ تھی کہ انہیں بدر میں فتح ہوئی تھی۔ یہ ایک مکمل فتح تھی اور واضح فتح تھی۔ اس میں اہل اسلام نے بہت کم تیاری کی تھی اور یہ فتح معمولی جدوجہد کے بعد نصیب ہوئی تھی۔ مسلمانوں کی مٹھی بھر تعداد' بغیر ساز و سامان اور بغیر کسی بڑی تیاری کے نکلی۔ اس کا مقابلہ کفار کے ایک عظیم اور ساز و سامان سے لیس لشکر کے ساتھ ہوا۔ اور تھوڑی ہی دیر میں یہ مڈبھیر ہوئی تو اہل کفر مقابلے میں اہل اسلام کے حصہ میں ایک واضح فتح آئی۔

یہ فتح اہل اسلام اور اہل کفر کے درمیان ان کی پہلی مڈبھیڑ میں ہوئی تھی۔ اور یہ درحقیقت اللہ کے معجزات میں سے ایک معجزہ تھی۔ آج ہمیں اس کی حکمت کا ایک پہلو سمجھ میں آتا ہے' وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس نئی اٹھنے والی تحریک کو قدرے ثبات و استحکام بخشنا چاہتے تھے۔ مقصد یہ تھا کہ تحریک دشمن کے ساتھ جنگ کے عملی تجربے سے کامیابی کے ساتھ گزر جائے تاکہ وہ آئندہ اپنے لئے راہ عمل طے کرے اور اعتماد کے ساتھ آگے بڑھے۔

یہ تو تھی حکمت ایزدی لیکن غالباً مسلمانوں نے یہ سمجھا کہ شاید ان کی کامیابی گویا ایک قدرتی امر ہے اور یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ وہ کسی معرکے میں کودیں اور انہیں فتح نہ ہو' وہ جس طرف بڑھیں گے فتح ان کے قدم چومے گی۔ ہرحال اور ہر مرحلے میں کامیابی ان کیلئے مقدر ہے' اس لئے کہ وہ مسلمان ہیں اور اس لئے کہ ان کے دشمن اہل کفر ہیں اور ظاہر ہے کہ اہل کفر اور اہل ایمان کے مقابلے میں فتح اہل ایمان کی ہی ہوگی۔

لیکن فی الحقیقت بات اس قدر سادہ نہ تھی۔ میدان جنگ میں فتح و شکست کا اصول اس قدر سادہ نہ تھا کہ بس صرف اسلام سبب فتح ہے اور محض کفر سبب شکست ہے۔ بلکہ ان اسباب کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ نفس انسانی کو اچھی طرح تربیت دی جائے۔ اپنی

صفوں کو اچھی طرح درست اور مرتب کیا جائے۔ جنگ کے لئے ضروری سازو سامان تیار کیا جائے۔ افواج کے اندر نظم و اطاعت بکمال ہو اور جنگی اصول و قواعد کی پوری طرح پابندی کی جائے۔ انسانی نفسیات کا اچھی طرح خیال رکھا جائے اور میدان جنگ میں حرکات و سکنات کنٹرول میں ہوں۔ غرض یہ سب امور تھے جو اللہ تعالیٰ اہل ایمان کو میدان جنگ میں عملاً سمجھانا چاہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے اہل ایمان کو ہزیمت سے دوچار کیا اور اس کے بعد پھر سورت آل عمران میں اس پر زندہ جاوید تبصرہ فرمایا۔ جس نے اہل ایمان کی زندگیوں پر گہرے اثرات مرتب کئے۔ اس تبصرے میں انہیں شکست کے اسباب بتائے گئے کہ یہ شکست بعض مسلمانوں کی غلطیوں کی وجہ سے ہوئی۔ ان تبصروں کے اندر ان کے اصلاح نفوس کیلئے تعمیری نصیحتیں بھی کی گئیں اور مسلمانوں کے اندر پختگی پیدا کی گئی۔

جب ہم غزوۂ احد کا مطالعہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ 'اس تجربے کیلئے مسلمانوں کو بہت ہی قیمت ادا کرنی پڑی۔ وہ بہت بڑے خوف سے دوچار ہوئے' ایک بڑی تعداد زخمی ہوئی۔ معزز ترین لوگ شہید' ان میں سرفہرست سید الشہداء حضرت حمزہ ؓ تھے۔ اس سے بڑی قیمت وہ تھی جو ان کے لئے ناقابل برداشت تھی' یعنی رسول خدا ﷺ بذات خود زخمی ہوں' ان کے چہرے پر زخم آئیں اور دانت مبارک شہید اور آپ گڑھے میں گر جائیں اور آپ کے رخساروں میں زرہ کے حلقے چبھ جائیں' یہ ایک ایسا صدمہ تھا جو مسلمانوں کیلئے ناقابل برداشت تھا۔ اور وہ اس کو امر عظیم سمجھتے تھے۔

اس سورت میں 'غزوۂ احد کے واقعات اور ان پر تبصرہ کو پیش کرنے سے بھی پہلے' سورت کا ایک بڑا حصہ ان متنوع ہدایات پر مشتمل ہے۔ جس میں اسلامی تصور حیات کے مختلف پہلوؤں کو صاف کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ تاکہ اس میں شرک اور جاہلیت کا کوئی شائبہ نہ رہے۔ ان ہدایات میں عقیدۂ توحید کو صاف ستھرا اور نکھار کر رکھ دیا گیا ہے' اس میں اہل کتاب نے جو شرکیہ عناصر داخل کر دیئے تھے ان پر سخت تردید کی گئی۔ چنانچہ اہل کتاب کے معتقدات پر تفصیلی بحث کی گئی ہے۔ اسی طرح اہل کتاب اسلامی عقائد و نظریات کے سلسلے میں اعتراضات کر کے اہل ایمان کی صفوں میں انتشار پیدا کرنے کی جو سعی کر رہے تھے اس پر بھی بھرپور وار کیا گیا۔

بعض روایات میں یہ بات آئی ہے کہ اس سورت کی آیات ۱تا۸۳ کا نزول اس وقت ہوا جب یمن کے عیسائیوں کا مشہور وفد نجران حضور ﷺ سے ملاقات کے لئے مدینہ آیا۔ یہ وفد ۹ھ میں آیا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ۹ھ میں ان آیات کا نزول بعید از قیاس ہے' ان آیات کے مضمون ان کی فضا سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ یہ آیت ہجرت کے متصلاً بعد کے ادوار میں نازل ہوئیں' جب کہ اسلامی جماعت نوخیز تھی اور اس کی صحیح تشکیل اور اس کے طرز عمل پر یہودی سازشوں کے اثرات بڑھ رہے تھے۔

وفد نجران کے سلسلہ میں وارد ہونے والی روایات درست ہوں یا نہ ہوں لیکن ان آیات کا موضوع بحث یہ بتا رہا ہے کہ ان میں ان شبہات کی تردید کی گئی ہے جو نصاریٰ کی طرف سے وارد کئے جا رہے تھے۔ خصوصاً جن کا تعلق حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے تھا یا جن کا تعلق عقیدۂ توحید کی اس تعبیر سے تھا جسے اسلام نے پیش کیا اور ان آیات میں عیسائیوں کے عقائد کی غلطیہائے مضامین کو درست کیا گیا تھا۔ اور ان کے تمام ان خرافات تلبیسات کو دور کر کے بتایا گیا کہ وہ اس سچائی کی طرف آئیں جو خود انجیل میں بھی موجود ہے اور جس کی طرف قرآن مجید انہیں دعوت دے رہا ہے۔

لیکن اس حصے میں یہودیوں اور اہل ایمان دونوں کیلئے اشارات و تنبیہات موجود ہیں۔ خصوصاً اہل ایمان کو سخت تنبیہ کی گئی ہے کہ وہ یہودیوں اور اہل کتاب کی سازشوں سے چوکنے رہیں۔ اور مدینہ کے ماحول میں جو خطرناک اہل کتاب موجود تھے وہ یہودی ہی تھے۔

غرض یہ حصہ جو اس سورت کا تقریباً نصف حصے پر مشتمل ہے' اس میں اسلامی نظریۂ حیات اور اس وقت جزیرۃ العرب میں موجود

منحرف اور باطل نظریات کے درمیان طویل کشمکش کا ذکر ہے اور یہ بحث صرف نظریاتی بحث ہی نہیں ہے جس کا عملی دنیا سے کوئی تعلق نہ ہو۔ بلکہ وہ مدینہ طیبہ کے اندر اٹھنے والی نوخیز تحریک اسلامی اور اس کے ان تمام دشمنوں کے درمیان برپا ہونے والی جنگ کا یہ نظریاتی پہلو تھا۔ یہ جنگ عملاً برپا تھی پورے جزیرۃ العرب میں پھیلی ہوئی تھی اور اس میں تحریک اسلامی کے دشمن ہروقت چوکنے تھے' وہ تاک میں بیٹھے رہتے تھے۔ تحریک کیلئے ہروقت کنویں کھودتے رہتے تھے۔ اور اس ہمہ گیر جنگ میں وہ تحریک کے خلاف ہر حربہ استعمال کر رہے تھے۔ اس میں ان کا پہلا ہتھیار یہ تھا کہ مسلمانوں کے عقائد کو متزلزل کر دیں۔ اور یہ نظریاتی جنگ بس جنگ تھی جو آج تک امت مسلمہ اور اس کے دشمنوں کے درمیان جاری و ساری ہے۔ یہ دشمن وہی ہیں جو تھے۔ وہی ملحد' وہی منکرین حق' وہی عالمی صیہونی اور وہی عالمی صلیبیت!!!

اس سورت کے مضامین پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے' اس وقت یہ لوگ جو وسائل اور جو دلائل کام میں لا رہے تھے آج بھی وہی دلائل اور یہی ذرائع استعمال کر رہے ہیں۔ اس وقت ان کے جو مقاصد تھے' آج بھی وہی مقاصد ہیں' اور اس وقت بھی قرآن ان کا جواب دے رہا تھا اور آج بھی وہ مدافعت کر رہا ہے۔ آج بھی قرآن ہمارے لئے مرجع ہے اور آئندہ بھی یہی ہوگا۔ جس طرح اس سے قبل تھا اور آج جو مسلمان قرآن مجید کی اس حیثیت سے انکار و اعراض کرتا ہے' اور اس ناصح مشفق سے نصیحت نہیں لیتا' یا اس مشیر ماہر سے مشورہ نہیں لیتا' اس جنگ میں جو آج اہل ایمان اور اعدائے ایمان کے درمیان جاری ہے' تو یقیناً ایسا شخص دشمنان اسلام کا جاسوس اور ایجنٹ ہے' وہ اس اسلحہ کو نظر انداز کر رہا ہے' جو اس معرکہ میں موجب ظفر ہے' وہ اپنے آپ کو دھوکہ دیتا ہے' وہ اس امت کو دھوکہ دیتا ہے' اور وہ جو کچھ بھی کر رہا ہے وہ اسلام کے قدیم دشمنوں کے مفاد کیلئے کر رہا ہے' وہ اسلام کے جدید دشمنوں کا ایجنٹ ہے' یا تو وہ بہت بڑا احمق ہے اگر وہ نادانی سے کر رہا ہے اور یا وہ بہت بڑا خبیث النفس اگر وہ جان بوجھ کر کر رہا ہے۔

○..........○ ....○

سورت کے اس حصے میں جو انتقادیات' جو مناظرہ اور جو تنقید اہل کتاب کے حوالے سے آئی ہے اس سے یہ اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ اس وقت اہل کتاب کا خود اپنی کتاب کے بارے میں کیا موقف تھا' تحریک اسلامی کے بارے میں ان کا کیا موقف تھا اور اسلامی نظریۂ حیات کے بارے میں ان کا موقف کیا تھا۔ اہل کتاب کا نقطہ نظر درج ذیل آیات سے اچھی طرح ظاہر ہوتا ہے۔

☆ "وہی خدا ہے' جس نے یہ کتاب تم پر نازل کی ہے' اس کتاب میں دو طرح کی آیات ہیں: ایک محکمات' جو کتاب کی اصل بنیاد ہیں اور دوسری متشابہات' جن لوگوں کے دلوں میں ٹیڑھ ہے' وہ فتنے کی تلاش میں ہمیشہ متشابہات ہی کے پیچھے پڑے رہتے ہیں اور ان کو معنی پہنانے کی کوشش کیا کرتے ہیں۔" (۳:۷)

☆ "تم نے دیکھا نہیں انہیں کہ جن لوگوں کو کتاب کے علم میں سے کچھ حصہ ملا ہے' ان کا حال کیا ہے؟ انہیں جب کتاب الٰہی کی طرف بلایا جاتا ہے تاکہ وہ ان کے درمیان فیصلہ کرے' تو ان میں سے ایک فریق پہلو تہی کرتا ہے اور اس فیصلے کی طرف آنے سے منہ پھیر جاتا ہے۔" (۳:۲۳)

☆ "اے اہل کتاب' تم ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں ہم سے کیوں جھگڑا کرتے ہو' تورات اور انجیل تو ابراہیم علیہ السلام کے بعد نازل ہوئی ہیں۔" (۳:۶۵)

☆ "ایمان لانے والو! اہل کتاب میں سے ایک گروہ چاہتا ہے کہ کس طرح تمہیں راہ راست سے ہٹا دے۔" (۳:۶۹)

☆ "اے اہل کتاب! کیوں اللہ کی آیات کا انکار کرتے ہو' حالانکہ تم خود ان کا مشاہدہ کر رہے ہو۔" (۳:۷۰)

☆ "اے اہل کتاب! کیوں حق کو باطل کا رنگ چڑھا کر مشتبہ بناتے ہو؟ کیوں جانتے بوجھتے حق کو چھپاتے ہو۔" (۳:۷۱)

☆ "اہل کتاب کا ایک گروہ کہتا ہے کہ اس نبی کے ماننے والوں پر جو کچھ نازل ہوا ہے اس پر صبح ایمان لاؤ اور شام کو انکار کر دو' شاید اس ترکیب سے یہ لوگ اپنے ایمان سے پھر جائیں' نیز یہ لوگ آپس میں کہتے ہیں کہ اپنے مذہب والے کے سوا کسی کی بات نہ مانو۔" (۳:۷۳)

☆ "اہل کتاب میں سے کوئی تو ایسا ہے کہ اگر تم اس کے اعتماد پر مال و دولت کا ایک ڈھیر بھی دیدو تو وہ تمہارا مال تمہیں ادا کر دے گا۔ اور کسی کا حال یہ ہے کہ اگر تم ایک دینار کے معاملہ میں بھی اس پر بھروسہ کرو تو وہ ادا نہ کرے گا۔ الا یہ کہ تم اس کے سر پر سوار ہو جاؤ۔ ان کی اس اخلاقی حالت کا سبب یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں۔ "امیوں (غیر یہودیوں) کے معاملے میں ہم سے کوئی مواخذہ نہیں ہے۔" اور یہ بات وہ محض جھوٹ گھڑ کر اللہ کی طرف منسوب کرتے ہیں حالانکہ انہیں معلوم ہے کہ اللہ نے ایسی کوئی بات نہیں فرمائی۔" (۳:۷۵)

☆ "ان میں سے کچھ لوگ ایسے ہیں' جو کتاب پڑھتے ہوئے اس طرح زبان کا الٹ پھیر کرتے ہیں کہ تم سمجھو جو کچھ وہ پڑھ رہے ہیں وہ کتاب ہی کی عبارت ہے' حالانکہ وہ کتاب کی عبارت نہیں ہوتی' وہ کہتے ہیں کہ جو کچھ ہم پڑھ رہے ہیں' یہ خدا کی طرف سے ہے' حالانکہ وہ خدا کی طرف سے نہیں ہوتا' وہ جان بوجھ کر جھوٹ بات اللہ کی طرف منسوب کر دیتے ہیں۔" (۳:۷۸)

☆ کہو' اہل کتاب یہ تمہاری کیا روش ہے کہ جو اللہ کی بات مانتا ہے اسے بھی تم اللہ کے راستے سے روکتے ہو اور چاہتے ہو کہ وہ ٹیڑھی راہ چلے حالانکہ تم گواہ ہو۔" (۳:۹۹)

☆ "کہو اے اہل کتاب' تم کیوں اللہ کی باتیں ماننے سے انکار کرتے ہو' جو حرکتیں تم کر رہے ہو' اللہ سب کچھ دیکھ رہا ہے۔" (۳:۹۸)

☆ "تم ان سے محبت رکھتے ہو' مگر وہ تم سے محبت نہیں رکھتے' حالانکہ تم تمام کتب آسمانی کو مانتے ہو' جب وہ تم سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہم نے بھی مان لیا ہے' مگر جب جدا ہوتے تو تمہارے خلاف ان کے غیظ و غضب کا یہ حال ہوتا ہے کہ اپنی انگلیاں چبانے لگتے ہیں۔" (۳:۱۱۹)

☆ "تمہارا بھلا ہوتا ہے تو ان کو برا معلوم ہوتا ہے' اور تم پر کوئی مصیبت آتی ہے تو یہ خوش ہوتے ہیں۔" (۳:۱۲۰)

یوں اس پوری سورت میں نظر آتا ہے کہ اسلامی جماعت کے دشمن' اس کے خلاف صرف روایتی ہتھیاروں ہی سے کام نہ لیتے تھے' وہ صرف میدان جنگ میں' تیرو تفنگ ہی سے نہ لڑتے تھے' محض یہ نہ کرتے تھے کہ تمام دشمنوں کو جماعت اسلامی کے خلاف جمع کریں اور ان کے خلاف میدان کارزار گرم کریں۔ جبکہ وہ تحریک اسلامی کے برخلاف نظریاتی جنگ میں رات و دن مصروف تھے۔ وہ تحریک کے خلاف شکوک و شبہات پھیلاتے تھے۔ خفیہ سازشیں کرتے تھے۔ دشمنوں کو بھڑکاتے' اس نظریاتی جنگ میں وہ سب سے پہلے اسلامی عقائد پر تنقید کرتے' اس لئے کہ امت مسلمہ کی تشکیل اور اس کی شخصیت کی اساس ہی عقائد پر تھی۔ اس لئے وہ ہر وقت اس کام میں لگے رہتے تھے کہ ان عقائد و ایمانیات کو کمزور کریں اور جس طرح ہو سکے ان کی بیخ کنی کریں۔ اس لئے کہ انہیں اچھی طرح یقین ہو گیا تھا۔ جس طرح آج امت کے دشمنوں کو یقین ہو گیا ہے کہ اس امت پر صرف اس صورت میں حملہ کیا جا سکتا ہے کہ اس کے عقائد کو کمزور کیا جائے' یہ

صرف اس وقت کمزور ہوگی جب اس کے نظریات کمزور پڑ جائیں' اسے جسمانی شکست تب ہی دی جاسکتی ہے جب اسے روحانی شکست دی جائے۔ جب تک اس امت نے ایمان کی مضبوط رسی کا سہارا لیا ہوا ہے اس وقت تک وہ اس کا کچھ بھی بگاڑ نہیں سکتے۔ جب تک یہ امت اپنے اس مضبوط سہارے کو تھامے ہوئے ہے۔ اپنے نظریات کی راہ پر رواں دواں ہے' جب تک اس نے نظریاتی جھنڈے گاڑھے ہوئے ہیں' جب تک یہ جماعت ایک نظریاتی جماعت ہے' جب تک ان نظریات سے اسکی پہچان ہے اور جب تک اسے اپنے ان نظریات پر فخر ہے اس وقت تک وہ اس کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے۔

یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کا سخت ترین دشمن وہ ہے' جو اسے اس کے نظریات سے بدراہ کر رہا ہو' اور اللہ کے منہاج اور اللہ کے طریقوں سے بدراہ کر رہا ہو' لیکن یہ دشمن اپنی حقیقت کو ظاہر نہیں کرتا اور نہ اس کے دور رس اہداف و مقاصد کا مسلمانوں کو پتہ ہوتا ہے۔

خوب سمجھ لو' کہ امت مسلمہ اور اس کے دشمنوں کے درمیان' ہر بات سے پہلے نظریاتی دشمنی ہے' امت مسلمہ کے دشمن جب بھی چاہتے ہیں کہ وہ ارض اسلام پر قابض ہوں' اہل اسلام کے محاصل ان کے قبضے میں ہوں' ان کے خام مال ان کے تصرف میں ہوں' ان کی اقتصادیات پر ان کا کنٹرول ہو' تو وہ سب سے پہلے اہل اسلام کو نظریاتی شکست دیتے ہیں اس لئے کہ امت مسلمہ کے بالمقابل تمام تاریخی تجربات سے انہوں نے اس بات کو اچھی طرح پالیا ہے کہ وہ اپنے ان مقاصد میں اس وقت تک کامیاب نہیں ہوسکتے جب تک وہ اپنے نظریات پر استحکام کے ساتھ کھڑی ہے' جب تک وہ اسلامی منہاج پر قائم ہے۔ جب تک وہ جانتی ہو کہ اس کے دشمن کیا کیا سازشیں کر رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ امت مسلمہ کے دشمن اور ان کے ایجنٹ اپنی پوری قوت اس بات پر خرچ کرتے ہیں کہ وہ اس امت کو پوری طرح دھوکے میں رکھیں' انہیں اس نظریاتی جنگ کا کہیں علم نہ ہو جائے۔ اور جب وہ اس جنگ کو خفیہ رکھنے میں کامیاب ہوں گے تو پھر ان کیلئے ان تمام مقاصد کا حصول بہت ہی آسان ہو جائے گا۔ جو وہ چاہتے ہیں' پھر وہ آزادانہ استعماری مقاصد پورے کرسکتے ہیں۔ امت کا اچھی طرح استحصال کرسکتے۔ بشرطیکہ وہ اس امت کے دل سے اس کے عقائد و نظریات کی عظمت نکال دیں۔

جب بھی اس مکر و فریب اور نظریاتی جنگ کے وسائل ترقی کرتے ہیں یہ دشمن ان ترقی یافتہ ذرائع کو کام میں لاتے ہیں' اور اسلامی نظریات میں شبہات پیدا کرتے رہتے ہیں' ان کی اہمیت کو کم کرتے رہتے ہیں۔ وہ اس میدان میں جدید سے جدید ہتھیار لیکر آتے ہیں۔ لیکن ان کے مقاصد وہی ہوتے ہیں جو اول روز سے ان کے پیش نظر تھے۔ "اہل کتاب میں سے ایک گروہ چاہتا ہے کہ کسی طرح تمہیں راہ راست سے ہٹادے۔" یہی ان کی مستقل اور خفیہ پالیسی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے سب سے پہلے ان کے نظریاتی ہتھیاروں کو کند کیا۔ اس نے جماعت مسلمہ کو سخت ترین ہدایات دیں کہ وہ اس سچائی پر سختی سے جم جائیں جس پر وہ قائم ہیں۔ اہل کتاب نے اس سلسلے میں جو جو شبہات پھیلائے قرآن کریم نے بڑی سختی اور قوت سے ان کی تردید کی۔ اور اس حقیقت کبریٰ کو نکھار کر رکھ دیا جس کا حامل یہ دین جدید تھا۔ جماعت مسلمہ کو مطمئن کیا' اس کو اس کے اصل مقام سے آگاہ کیا کہ اس کرۂ ارض پر اس کی اہمیت کیا ہے۔ یہاں اس کا مشن کیا ہے؟ اور یہاں ان نظریات کی اہمیت کیا ہے' جن کی وہ حامل ہے۔

چنانچہ اس سورت میں قرآن کریم امت مسلمہ کو ان سازشوں کی سازشیوں کے مقابلے میں اچھی طرح چوکنا کردیا۔ اپنے خفیہ مقاصد کے لئے جو اوچھے ہتھیار استعمال کر رہے تھے' انہیں طشت ازبام کیا' ان کے خطرناک عزائم سے پردہ اٹھایا' جماعت مسلمہ اور اسلام کے خلاف ان کے دل میں جو نفرت و حقارت تھی اس سے انہیں آگاہ کیا اور بتایا کہ یہ سب دشمنیاں اس لئے ہیں اللہ نے ان پر اپنا فضل

عظیم کیا ہے۔

قرآن کریم نے اس نوخیز جماعت کو بتایا کہ اس کائنات میں جو قوتیں کارفرما ہیں ان کی حقیقت کیا ہے۔ یہاں ان کا توازن کیا ہے' چنانچہ بتایا گیا کہ دشمنان اسلام کی کوئی حیثیت نہیں' اللہ کے مقابلے میں وہ پر کاہ کی حیثیت بھی نہیں رکھتے' انہوں نے خود اپنے دین کے مقابلے میں کفر اور بے راہ روی کا رویہ اختیار کیا' اپنی کتابوں کا انکار کیا اور اپنے انبیاء تک کو قتل کیا' یہ تمہارا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے۔ جب تک اللہ کی مدد تمہیں حاصل ہو۔ وہ مالک الملک ہے' عزت و ذلت صرف اس کے ہاتھ میں ہے' وہ اس معاملے میں وحدہ لاشریک ہے' وہ عنقریب ان سازشی کفار پر اپنا عذاب نازل کر دے گا' کیا تم دیکھتے نہیں ہو کر میدان بدر میں اس کا عذاب کفار مکہ پر کیونکہ نازل ہوا۔ اس پر کچھ زیادہ وقت تو نہیں گزرا۔

امت مسلمہ کو اس وقت ان الفاظ میں یہ ہدایات دی گئیں۔

☆ "اللہ' وہ زندہ جاوید ہستی' جو نظام کائنات کو سنبھالے ہوئے ہے' حقیقت میں اس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے۔ اس نے تم پر یہ کتاب نازل کی' جو سچائی لیکر آئی ہے اور ان کتابوں کی تصدیق کر رہی ہے جو پہلے سے آئی ہوئی تھیں۔ اس سے پہلے وہ انسانوں کی ہدایت کیلئے تورات اور انجیل نازل کر چکا ہے۔ اور اس نے وہ کسوٹی اتاری ہے۔ (جو حق و باطل کا فرق کرنیوالی ہے) اب جو لوگ اللہ کے فرامین کو قبول کرنے سے انکار کریں۔ ان کو یقیناً سخت سزا ملے گی۔ اللہ بے پناہ طاقت کا مالک ہے اور برائی کا بدلہ دینے والا ہے۔ زمین و آسمان کی کوئی چیز اللہ سے پوشیدہ نہیں ہے۔"

(۳ : ۱تا۵)

☆ "جن لوگوں نے کفر کا رویہ اختیار کیا ہے' انہیں اللہ کے مقابلے میں نہ ان کا مال کچھ کام دے گا۔ نہ اولاد' وہ دوزخ کا ایندھن بن کر رہیں گے۔ ان کا انجام ویسا ہی ہو گا' جیسا فرعون کے ساتھیوں اور ان سے پہلے کے نافرمانوں کا ہو چکا ہے کہ انہوں نے آیات الٰہی کو جھٹلایا' نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ نے ان کے گناہوں پر انہیں پکڑ لیا' اور حق یہ ہے کہ اللہ بہت ہی سزا دینے والا ہے۔ بس اے محمد' جن لوگوں نے تمہاری دعوت قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے' ان سے کہہ دو کہ قریب ہے وہ وقت' جب تم مغلوب ہو جاؤ گے اور جہنم کی طرف ہانکے جاؤ گے اور جہنم بڑا ہی برا ٹھکانا ہے۔ تمہارے لئے ان دو گروہوں میں ایک نشان عبرت تھا' جو (بدر میں) ایک دوسرے سے نبرد آزما ہوئے' ایک گروہ اللہ کی راہ میں لڑ رہا تھا اور دوسرا گروہ کافر تھا۔ دیکھنے والے بچشم سر دیکھ رہے تھے کہ کافر گروہ مومن گروہ سے دوچند ہے۔ مگر (نتیجے نے ثابت کر دیا۔) اللہ اپنی فتح و نصرت سے جس کو چاہتا ہے مدد دیتا ہے۔ دیدۂ بینا رکھنے والوں کیلئے اس میں بڑا سبق پوشیدہ ہے۔ (۳:۱۳)

☆ "اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے' اس دین سے ہٹ کر جو مختلف طریقے ان لوگوں نے اختیار کئے' جنہیں کتاب دی گئی' ان کے اس طرز عمل کی کوئی وجہ اس کے سوا نہ تھی کہ انہوں نے علم آجانے کے بعد' آپس میں ایک دوسرے پر زیادتی کرنے کیلئے ایسا کیا' اور جو کوئی اللہ کے احکام و ہدایات سے انکار کر دے' اللہ کو اس سے حساب لیتے کچھ دیر نہیں لگتی۔"

☆ "اس فرمان برداری کے سوا جو شخص کوئی اور طریقہ اختیار کرنا چاہے' اس کا وہ طریقہ ہرگز قبول نہ کیا جائے گا اور آخرت میں وہ ناکام و نامراد رہے گا۔"

☆ "کہو' خدایا! ملک کے مالک! تو جسے چاہے حکومت دیدے اور جس سے چاہے چھین لے' جسے چاہے' عزت دے' جسے چاہے ذلیل کر دے' بھلائی تیرے اختیار میں ہے- بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے-"

☆ "مومنین اہل ایمان کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا رفیق اور دوست ہرگز نہ بنائیں- جو ایسا کرے گا اللہ کا اس سے کوئی تعلق نہیں' ہاں یہ معاف ہے کہ تم ان کے ظلم سے بچنے کیلئے بظاہر ایسا طرز عمل اختیار کر جاؤ مگر اللہ تمہیں اپنے آپ سے ڈراتا ہے- اور تمہیں اسی کی طرف پلٹ کر جانا ہے-"

☆ "ابراہیم علیہ السلام سے نسبت رکھنے کا سب سے زیادہ حق اگر کسی کو پہنچتا ہے تو ان لوگوں کو پہنچتا ہے جنہوں نے اس کی پیروی کی اور اب یہ نبی اور اس کے ماننے والے اس نسبت کے زیادہ حقدار ہیں- اور اللہ صرف انہی کا حامی و مددگار ہے جو ایمان رکھتے ہیں-" (۳:۶۸)

☆ "کیا یہ لوگ اللہ کی اطاعت کا طریقہ (دین اللہ) چھوڑ کر کوئی اور طریقہ چاہتے ہیں' حالانکہ آسمان و زمین کی ساری چیزیں چار و ناچار اللہ ہی کے تابع فرمان (مسلم) ہیں اور اسی کی طرف سب کو پلٹنا ہے-" (۳:۸۳)

☆ "اے لوگو! جو ایمان لائے ہو' اگر تم نے ان اہل کتاب میں سے ایک گروہ کی بات مانی تو یہ تمہیں ایمان سے پھر کفر کی طرف پھیر لے جائیں گے- تمہارے لئے اب کفر کی طرف جانے کا اب کیا موقع باقی ہے جبکہ تم کو اللہ کی آیات سنائی جا رہی ہیں اور تمہارے درمیان اس کا رسول موجود ہے' اور جو اللہ کا دامن مضبوطی سے تھامے گا' وہ ضرور راہ راست پالے گا-" (۳:۱۰۱)

☆ "اے ایمان والو' اللہ سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے' تم کو موت نہ آئے مگر اس حال میں کہ تم مسلم ہو' سب ملکر اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑلو اور تفرقہ میں نہ پڑو' اللہ کے اس احسان کو یاد رکھو جو اس نے تم پر کیا ہے- تم ایک دوسرے کے دشمن تھے- اس نے تمہارے دل جوڑ دیئے اور اس کے فضل و کرم سے تم بھائی بھائی بن گئے- تم آگ سے بھرے ہوئے ایک گڑھے کے کنارے کھڑے تھے' اللہ نے تم کو اس سے بچالیا- اس طرح اللہ اپنی نشانیاں تمہارے سامنے روشن کرتا ہے شاید کہ ان علامتوں سے تمہیں اپنی فلاح کا سیدھا راستہ نظر آجائے-" (۳:۱۰۳)

☆ اب دنیا میں وہ بہترین گروہ تم ہو' جسے انسانوں کی ہدایت و اصلاح کیلئے میدان میں لایا گیا ہے' تم نیکی کا حکم دیتے ہو' بدی سے روکتے ہو' اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو' یہ اہل کتاب ایمان لاتے تو انہیں کے حق میں بہتر تھا- اگرچہ ان میں سے کچھ لوگ ایماندار بھی پائے جاتے ہیں- مگر ان کے بیشتر افراد نافرمان ہیں- یہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے- زیادہ سے زیادہ بس کچھ ستا سکتے ہیں- اگر تم سے لڑیں گے تو مقابلے میں پیٹھ دکھائیں گے- پھر ایسے بے بس ہوں گے کہ کہیں سے ان کو مدد نہ ملے گی- یہ جہاں بھی پائے گئے ان پر ذلت کی مار ہی پڑی- کہیں اللہ کے ذمہ یا انسانوں کے ذمہ میں پناہ مل گئی تو یہ اور بات ہے- یہ اللہ کے غضب میں گھر چکے ہیں- ان پر محتاجی و مغلوبی مسلط کر دی گئی ہے- اور یہ سب کچھ صرف اس لئے ہوا ہے کہ یہ اللہ کی آیات سے کفر کرتے رہے اور انہوں نے پیغمبروں کو ناحق قتل کیا- یہ ان کی نافرمانیوں اور زیادتیوں کا انجام ہے-" (۳:۱۱۲)

☆ "اے لوگو جو ایمان لائے ہو' اپنی جماعت کے لوگوں کے علاوہ دوسروں کو اپنا رازدار نہ بناؤ' وہ تمہاری خرابی کے کسی موقع سے فائدہ اٹھانے میں نہیں چوکتے' تمہیں جس چیز سے نقصان پہنچے وہی انہیں عزیز ہے' ان کے دل کا بغض

ان کے منہ سے نکلا پڑتا ہے اور جو کچھ وہ اپنے سینوں میں چھپائے ہوئے ہیں وہ اس سے شدید تر ہے۔ ہم نے تمہیں صاف صاف ہدایات دیدی ہیں۔ اگر تم عقل رکھتے ہو' تم ان سے محبت رکھتے ہو مگر وہ تم سے محبت نہیں رکھتے حالانکہ تم تمام کتب آسانی کو مانتے ہو اور جب تم سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم نے بھی مان لیا ہے' مگر جب جدا ہوتے ہیں تو تمہارے خلاف ان کے غیظ و غضب کا یہ حال ہوتا ہے کہ اپنی انگلیاں چبانے لگتے ہیں۔ ان سے کہہ دو اپنے غصے میں آپ جل مرو' اللہ دلوں کے چھپے ہوئے راز تک جانتا ہے۔...... تمہارا بھلا ہوتا ہے تو ان کو برا معلوم ہوتا ہے اور تم پر کوئی مصیبت آتی ہے تو یہ خوش ہوتے ہیں۔ مگر ان کی کوئی تدبیر تمہارے خلاف کارگر نہیں ہو سکتی۔ بشرطیکہ تم صبر سے کام لو اور اللہ سے ڈر کر کام کرتے رہو' جو کچھ یہ کر رہے ہیں اللہ اس پر حاوی ہے۔" (۳ : ۱۲۰)

اہل کتاب پر اس طویل بمباری (جس کا ہم نے ایک مختصر حصہ یہاں قارئین کیلئے نقل کیا ہے) سے چند امور کھل کر سامنے آجاتے ہیں۔

پہلا یہ کہ مدینہ اور اس کے اردگرد علاقوں میں' اہل کتاب نے اسلامی نظریۂ حیات کے خلاف ایک عظیم نظریاتی جنگ برپا کر رکھی تھی' یہ نہایت ہی گہری مکاری پر مبنی تھی' اور اس میں اہل کتاب اپنے تمام وسائل لیکر میدان میں آگئے تھے۔ اور ان کا مقصد وحید یہ تھا کہ اسلامی نظریۂ حیات کو متزلزل کر دیا جائے اور اس کے نتیجے میں اسلامی صفوف کے اندر تفرقہ پیدا کر دیا جائے۔

دوسرا یہ کہ اس عظیم مہم کے نتیجے میں' بعض اہل اسلام اس نظریاتی جنگ سے متاثر ہو رہے تھے' اسی لئے قرآن کریم نے اس سورت میں اس کا مختلف اسالیب کے ساتھ قلع قمع کیا اور اس کی جڑ کاٹ کر رکھدی۔

تیسری بات یہ کھل کر ظاہر ہوتی ہے اور اسلامی تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ اسلام کے یہی دشمن ہیں جو اس محاذ پر مسلسل کام کرتے رہتے ہیں۔ انہوں نے ہمیشہ دعوت اسلامی کے برخلاف یہی محاذ کھولے رکھا' جب بھی تحریک اسلامی اٹھی' جہاں بھی اٹھی' انہوں نے اس تحریک کے برخلاف نظریاتی جنگ شروع کر دی۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ جو علیم و خبیر تھا' جس نے آفاق کائنات میں یہ عظیم مشعل روشن کر دی تاکہ اسلام کے لئے کام کرنیوالے اس سے دور دور تک روشنی حاصل کریں اور آنے والی نسلیں اپنے اس تاریخی اور روایتی دشمن سے چوکنا رہیں اور یہ بات اچھی طرح جان لیں کہ یہ لوگ ہیں جو اس نظریۂ حیات اور اس امت کے دائمی دشمن!

○.......... ○ .... ○

اس سورت کا دوسرا حصہ غزوہ احد پر تبصرے کیلئے مخصوص ہے' اس حصے میں اسلامی عقیدہ اور اسلامی نظام حیات کے بعض اہم نکات طے کئے گئے ہیں' پھر یہ بتایا گیا ہے کہ ان نکات کی اساس پر کس طرح ایک اسلامی جماعت کی تنظیم و تشکیل ہوگی' ان واقعات' حادثات' میلانات اور احساسات کی تفصیلات دینے کے ساتھ ساتھ' اس حصے' اس دور کی جماعت مسلمہ کی شب و روز کو بھی کھول کر بیان کر دیا گیا ہے۔ اس وقت جماعت کے اندر مختلف درجات و اقسام کے جو لوگ پائے جاتے تھے۔ ان کی بھی مکمل وضاحت کی گئی ہے' جس طرح ہم اپنی ابتدائی تمہید میں کہہ آئے ہیں۔

اس حصے اور اس سے پہلے حصے کے درمیان ربط بالکل ظاہر ہے' پہلے حصے میں اسلامی تصور حیات کی تعمیر اور وضاحت تھی' یعنی معرکۂ کارزار میں جس میں لوہا خوب گرم ہو' اور اس کے ساتھ دونوں حصوں میں یہ بتایا گیا ہے کہ اس کرۂ ارض پر حاملین دعوت اسلامی کے لئے ضروری ہے وہ اپنی جماعت کی صفوں کو درست کریں اور اس سلسلے میں ان پر جو فرائض عائد ہوتے ہیں ان کا حق ادا کریں۔ اس کے ساتھ بتایا گیا کہ یہاں اللہ کی جانب سے فتح و شکست کے اصول کیا ہیں۔ اس موضوع پر قرآن نے اپنے خاص انداز میں ہدایات دی ہیں

اور واقعات بیان کر کے جماعت مسلمہ کی تربیت کی گئی ہے۔

یہاں ہم اس دوسرے حصے پر تفصیلی تبصرہ اس لئے نہیں کر سکتے کہ اس کا بیشتر حصہ چوتھے پارے میں آتا ہے۔ اس لئے تفصیلی بحث تو وہاں ہوگی البتہ یہاں اس قدر کافی..... اس میں اسلامی نظریہ حیات کے استحکام اور اسلامی جماعت کی تربیت و تشکیل کے بارے میں ہدایات دی گئی ہیں۔

غزوۂ احد کی تفصیلات ختم کر کے جب یہ سورت اختتام تک پہنچتی ہے' تو نظر آتا ہے کہ یہاں اساسی موضوعات کو پھر دہرایا جاتا ہے۔ اس کا آغاز ان اشارات سے کیا جاتا ہے جو ایک مومن کے دل و دماغ کیلئے اللہ کی اس کھلی کتاب یعنی کائنات کے اندر پائے جاتے ہیں' جن پر جب ایک مومن غور و فکر کرتا ہے تو وہ غور و فکر اس کی دعا کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ یہ بڑی نرم اور پر کیف دعا ہے۔ یہ مشاہدہ کائنات پر مبنی دعا ہے۔ جس میں ایک مومن کے لئے بڑی بڑی نشانیاں ہیں۔ ذرا ملاحظہ فرمائیں۔

☆ "زمین و آسمان کی پیدائش میں' اور رات اور دن کے باری باری سے آنے میں ان ہوشمند لوگوں کیلئے بہت نشانیاں ہیں جو اٹھتے' بیٹھتے اور لیٹتے' ہر حال میں خدا کو یاد کرتے ہیں اور آسمان و زمین کی ساخت میں غور و فکر کرتے ہیں۔ (وہ بے اختیار بول اٹھتے ہیں۔) "پروردگار! یہ سب کچھ تو نے فضول اور بے مقصد نہیں بنایا' تو پاک ہے اس سے کہ عبث کام کرے۔ پس اے رب' ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچالے' تو نے جسے دوزخ میں ڈالا اسے در حقیقت بری ذلت و رسوائی میں ڈال دیا' اور پھر ظالموں کا کوئی مددگار نہ ہوگا۔ اے مالک ہم نے ایک پکارنے والے کو سنا جو ایمان کی طرف بلاتا تھا اور کہتا تھا کہ اپنے رب کو مانو' ہم نے اس کی دعوت قبول کر لی' پس اے ہمارے آقا' جو قصور ہم سے ہوئے ان سے درگزر فرما' جو برائیاں ہم میں ہیں انہیں دور کر دے اور ہمارا خاتمہ نیک لوگوں کے ساتھ کر' خداوندا' جو وعدے تو نے اپنے رسولوں کے ذریعہ سے کئے ہیں ان کو ہمارے ساتھ پورا کر اور قیامت کے دن ہمیں رسوائی میں نہ ڈال' بے شک تو اپنے وعدے کے خلاف کرنے والا نہیں ہے۔" (۳:۱۹۴)

اس کا جواب اللہ تعالیٰ کی جانب سے آتا ہے' دعا قبول ہوتی ہے اور جو اعمال باعث قبولیت بنتے ہیں وہ ہجرت' جہاد فی سبیل اللہ اور ایذاء فی سبیل اللہ ہیں' فرماتے ہیں :۔

☆ "جواب میں' ان کے رب نے فرمایا' میں تم میں سے کسی کا عمل ضائع کرنے والا نہیں ہوں' خواہ مرد ہو' یا عورت' تم سب ایک دوسرے کے ہم جنس ہو' لہٰذا جن لوگوں نے میری خاطر اپنے وطن چھوڑے اور جو میری راہ میں اپنے گھروں سے نکالے گئے اور ستائے گئے اور میرے لیے لڑے اور مارے گئے ان سب کے قصور میں معاف کروں گا اور انہیں ایسے باغوں میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ یہ ان کی جزا ہے اللہ کے ہاں اور بہترین جزا اللہ کے پاس ہے۔" (۳:۱۹۵)

اس میں غزوۂ احد کے واقعات اور نتائج کی طرف اشارہ ہے..... اس کے بعد اس سورت میں اہل کتاب کا دوبارہ ذکر ہوتا ہے' جن کے بارے میں اس سورت کے پہلے حصے میں طویل بات ہو چکی ہے۔ اہل ایمان کو بتایا جاتا ہے کہ جس سچائی کے وہ حاملین ہیں' تمام اہل کتاب اس کے منکر نہیں ہیں' ان میں سے ایسے لوگ بہر حال ہیں جو ایمان لا چکے ہیں۔ اور سچائی کی شہادت دیتے ہیں۔ "اہل کتاب میں سے کچھ لوگ ایسے ہیں' جو اللہ کو مانتے ہیں' اس کتاب پر ایمان لاتے ہیں جو تمہاری طرف بھیجی گئی ہے اور اس کتاب پر بھی ایمان رکھتے ہیں جو اس سے قبل ان کی طرف بھیجی گئی تھی' اللہ کے آگے جھکے ہوئے ہیں' اور اللہ کی آیات کو تھوڑی سی قیمت پر بیچ نہیں دیتے۔" (۳:۱۹۹)

اور سب سے آخر میں مسلمانوں کو یہ تلقین کی جاتی ہے کہ وہ راہ ایمان میں صبر' پامردی' خدا خوفی کا مظاہرہ کریں اور کمربستہ ہو جائیں۔ "اے لوگو! جو ایمان لائے ہو' صبر سے کام لو' باطل پرستوں کے مقابلہ میں پامردی دکھاؤ' حق کی خدمت کیلئے کمربستہ ہو' اور اللہ سے ڈرتے رہو' امید ہے کہ فلاح پاؤ گے۔" (۳:۲۰۰) یہ ایک ایسا اختتامیہ ہے جو اس سورت کی فضا اور اس میں بیان کردہ مضامین اور واقعات کے ساتھ مناسب ہے۔

☆.........☆.........☆.........☆.........☆

اس سورت کا مجمل تعارف اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتا جب تک ہم ان تین خطوط کا قدرے ذکر نہ کریں جن پر اس سورت کے تمام مضامین چل رہے ہیں' یہ مضامین اس سورت میں منتشر بھی ہیں اور ایک جگہ بھی ہیں' مناسب ہے کہ ان کی وضاحت کر دی جائے۔

پہلی لائن یہ ہے کہ اس پوری سورت میں الدین اور الاسلام کی حقیقت اور ماہیت پر زور دیا گیا ہے۔ چنانچہ بتایا گیا ہے کہ دین سے مراد صرف وہ عقائد نہیں جو اللہ تعالیٰ کے بارے میں رکھے جاتے ہیں' یعنی عقیدۂ توحید' باین مضمون اللہ ایک ہے' وہ وحدہ لاشریک ہے' وہ جس طرح انسانوں کا الٰہ ہے بعینہٖ اسی طرح وہ اس پوری کائنات کا بھی الٰہ ہے۔ جس طرح کائنات اس کی مطیع ہے' انسان بھی مطیع ہیں' وہ اس کائنات کو بھی تھامے ہوئے اور اس انسانیت کو بھی' ہر چیز اس سے قائم ہے۔ وہی ان کا محافظ ہے' اس لئے اللہ کو مجرد عقیدۂ توحید یا مجرد دین بمعنی عقیدہ مقبول نہیں ہے' بلکہ وہ دین اللہ کے نزدیک مقبول ہے جو اسلام ہو۔ اور اس صورت حال میں اسلام کے معنی مکمل اطاعت اور مکمل انقیاد کے ہیں۔ باین صورت کہ انسان اپنی زندگی کے تمام معاملات میں اسی اللہ سے ہدایت لے۔ اپنے تمام فیصلے اس کی کتاب کے مطابق کرے' ان تمام رسولوں کی اطاعت کرے جن پر یہ کتابیں نازل ہوئیں۔ اپنی اصلیت کے اعتبار سے تمام کتابیں ایک ہی کتاب ہیں۔ تمام الٰہی ادیان بھی ایک دین ہیں یعنی اسلام' یعنی انسان کے دل و دماغ میں بھی اسلام اور اس کی عملی زندگی میں بھی اسلام' اور ہر دور میں ہر مومن کا نقطۂ اتحاد یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے رسول کا مطیع فرمان ہوتا ہے' جب اسلام کا مفہوم یہ ہو کہ نظریاتی طور پر ایک الٰہ اور حی و قیوم کا عقیدہ رکھنا اور عملی زندگی میں' پوری عملی زندگی میں اسلامی نظام کی اطاعت کرنا۔

یہ تمام سورت اس لائن پر جاری ہے اور تیس سے زیادہ مقامات پر اس نکتے کی وضاحت کی جاتی ہے کہ دین اسلام عقیدہ و عمل دونوں سے عبارت ہے' آیات کے بعض ٹکڑے یہ ہیں :-

"اللہ وہ ہے جس کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے جو حی و قیوم ہے۔" "وہ گواہی دیتا ہے کہ نہیں ہے کوئی الٰہ مگر وہ' یہی گواہی فرشتوں' اور سب اہل علم نے بھی دی ہے۔ وہ انصاف پر قائم ہے۔ اس زبردست حکیم کے سوا کوئی الٰہ نہیں۔"...."اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے۔"....."تو اگر یہ لوگ تیرے ساتھ جھگڑیں' تو کہہ دیں' میں اور میرے متبعین اللہ کے سامنے سر تسلیم خم کر چکے ہیں' آپ اہل کتاب اور دوسرے امیوں سے یہ کہیں کیا تم اسلام میں داخل ہو گئے؟ اگر وہ اسلام لے آئیں' ہدایت پالیں گے۔"

"تمہیں معلوم ہے ان لوگوں کی حالت جنہیں کتاب کا کچھ حصہ دیا گیا تھا۔ کہ جب انہیں اللہ کی کتاب کی طرف بلایا جاتا ہے تاکہ وہ ان کے درمیان فیصلہ کرے' اس پر ان میں سے ایک فریق پلٹتے ہوئے منہ پھیر لیتا ہے۔"

....."کہو اللہ کی اطاعت کرو' اور رسول کی اطاعت کرو' پس اگر وہ منہ پھیریں تو اللہ بھی کافروں کو محبوب نہیں رکھتا۔"......"

حواریوں نے کہا ہم اللہ کے مددگار ہیں' ہم اللہ پر ایمان لائے' گواہ رہ کہ ہم مسلم ہیں۔ اے ہمارے رب' ہم ایمان لائے اس کتاب پر جو تو نے نازل کی' اور ہم نے رسول کی پیروی کی' پس لکھ دیجئے ہمیں بھی گواہوں میں سے۔"....."کہہ دیجئے' اہل کتاب' آؤ اس کلمے پر متفق ہو جائیں جو ہمارے اور آپ کے درمیان برابر ہے۔ یہ کہ اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں' اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں اور ہم

آپس میں ایک دوسرے کو اللہ کے سوا رب نہ بنائیں' تو اگر وہ اس سے منہ پھیریں تو کہو گواہ رہو کہ ہم تو مسلمان ہیں۔" ......"ابراہیم نہ یہودی تھا' نہ نصرانی تھا' وہ تو سیدھا مسلمان تھا' وہ مشرکین میں سے نہ تھا۔" ......"کیا وہ اللہ کے نظام (دین) کے سوا کوئی اور دین کی تلاش میں ہیں؟ حالانکہ جو آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے' چار و ناچار اس کا مطیع فرمان ہے' سب نے اس کی طرف پلٹنا ہے۔" ......"اگر کوئی اسلام کے سوا کوئی اور نظام (دین) تلاش کرے گا تو اس کی یہ سعی نامقبول ہوگی۔" ...... غرض یہ اور تمام دوسری آیات میں یہ تفصیلا بتایا گیا ہے کہ دین صرف اسلام ہے۔

وہ دوسری لائن جس پر پوری سورت چل رہی ہے وہ جماعت مسلمہ کے شب و روز ہیں۔ اس پوری سورت میں مسلمانوں کی تصویر کھینچی گئی ہے کہ یہ لوگ اللہ کے سامنے سر تسلیم خم کیے ہوئے ہیں۔ ان پر جو حکم بھی نازل ہوتا وہ بڑی رقت اور صفائی سے اس پر عمل کرتے ہیں۔ فوراً قبول کرتے ہیں اور فوراً ہی روبعمل لاتے ہیں۔ اس کی تفصیلات تو ہم تشریح آیات کے وقت بتائیں گے' کچھ جھلکیاں یہاں بھی ملاحظہ ہوں۔

☆ "جو لوگ علم میں پختہ کار ہیں' وہ کہتے ہیں' ہم اس پر ایمان لائے' سب اللہ کی طرف سے ہے' اور حقیقت یہ ہے کہ دانشمند لوگ ہی صحیح طرح نصیحت حاصل کرتے ہیں۔" ......"وہ دعا کرتے ہیں' کہ اے پروردگار' جب تو ہمیں سیدھے راستے پر لگا چکا ہے' تو پھر کہیں ہمارے دلوں کو کجی میں مبتلا نہ کر دیجیو' ہمیں اپنے خزانہ فیض سے رحمت عطا کر کہ تو ہی فیاض حقیقی ہے۔ پروردگار! تو سب لوگوں کو ایک روز جمع کرنیوالا ہے' جس کے آنے میں کوئی شبہ نہیں' تو ہرگز اپنے وعدے سے ٹلنے والا نہیں۔" ......"وہ لوگ جو کہتے ہیں: اے ہمارے رب' ہم ایمان لائے ہیں' ہمارے گناہوں کو بخش دے' اور ہمیں آگ کے عذاب سے بچا' صبر کرنے والے' سچے' یکسو ہونے والے' خرچ کرنیوالے اور راتوں کو استغفار کرنیوالے" ......"حواریوں نے کہا ہم ہیں اللہ کے مددگار' ہم اللہ پر ایمان لائے' گواہ رہو کہ ہم مسلم ہیں.... اے ہمارے رب تو نے جو کتاب نازل کی' ہم اس پر ایمان لائے' ہم نے رسول کی پیروی کی' تو ہمیں لکھ دیجئے گواہوں میں۔" ......"تم خیر امت ہو جسے لوگوں کیلئے نکالا گیا ہے۔ تم امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے ہو' اور اللہ پر ایمان لاتے ہو۔" ......"اہل کتاب میں سے ایک گروہ ایسا ہے' جو راتوں کو کھڑا رہتا ہے وہ اللہ پر ایمان لاتے ہیں اور یوم آخرت پر ایمان لاتے ہیں' بھلائی کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں' نیکیوں میں ایک دوسرے سے آگے بڑھتے ہیں' ایسے ہی لوگ صالح ہوتے ہیں۔"

......"کئی ایسے نبی گزرے ہیں جن کے ساتھ خدا پرستوں نے مل کر قتال کیا اور اللہ کے رستے میں انہیں جو تکلیف پہنچی' اس کی وجہ سے انہوں نے نہ سستی کی اور نہ کمزوری دکھائی۔ نہ سرنگوں ہوئے اور اللہ صبر کرنیوالوں کو پسند کرتا ہے۔ ان کی دعا بس یہ تھی اے ہمارے رب' ہماری غلطیوں اور کوتاہیوں سے درگزر فرما' ہمارے کام میں تیرے حدود سے جو تجاوز ہو گیا ہو اسے معاف کر دے' ہمارے قدم جما دے اور کافروں کے مقابلے میں ہماری مدد کر۔" ......"وہ لوگ جنہوں نے زخم کھانے کے بعد بھی اللہ اور رسول کی پکار پر لبیک کہا' ان میں جو اشخاص نیکو کار ہیں اور پرہیز گار ہیں ان کیلئے بڑا اجر ہے۔ اور جن سے لوگوں نے کہا کہ "کہ تمہارے خلاف بڑی فوجیں جمع ہوئی ہیں ان سے ڈرو۔" تو یہ سن کر ان کا ایمان اور بڑھ گیا اور انہوں نے جواب دیا کہ ہمارے لئے اللہ کافی ہے اور وہی بہتر کارساز ہے۔"
......"وہ لوگ جو اٹھتے بیٹھتے اور لیٹتے ہر حال میں اللہ کو یاد کرتے ہیں' اور آسمان و زمین کی ساخت پر غور و فکر کرتے ہیں' پروردگار' یہ سب کچھ تو نے فضول اور بے مقصد نہیں بنایا' تو پاک ہے اس سے کہ عبث کام کرے' پس اے رب' ہمیں دوزخ کی آگ سے بچا۔" تو نے جسے

آگ میں ڈالا ور حقیقت بڑی ذلت اور رسوائی میں ڈالدیا۔ اور پھر ظالموں کا کوئی مدد گار نہ ہو گا' مالک' ہم نے ایک پکارنے والے کو سنا جو ایمان کی طرف بلاتا تھا اور کہتا تھا کہ اپنے رب کو مانو' ہم نے اس کی دعوت قبول کرلی' پس اے ہمارے آقا' جو قصور ہم سے ہوئے ان سے درگزر فرما' جو برائیاں ہم میں ہیں انہیں دور کردے اور ہمارا خاتمہ نیک لوگوں کے ساتھ کر' خداوند جو وعدے تو نے اپنے رسولوں کے ذریعے سے کیے ہیں ان کو ہمارے ساتھ پورا کر اور قیامت کے دن ہمیں رسوائی میں نہ ڈال' بے شک تو اپنے وعدے کے خلاف کرنیوالا نہیں ہے۔" ..... "اہل کتاب میں سے کچھ لوگ ایسے ہیں جو اللہ کو مانتے ہیں' اس کتاب پر ایمان لاتے ہیں جو تمہاری طرف بھیجی گئی اور اس کتاب پر بھی ایمان رکھتے ہیں جو اس سے پہلے خود ان کی طرف بھیجی گئی۔ اللہ کے آگے جھکتے ہیں اور اللہ کی آیات کو تھوڑی قیمت پر بیچ نہیں دیتے۔" .... یہ اور ایسی ہی دوسری آیات۔

تیسری لائن اس سورت میں یہ دی گئی ہے' کہ اس پوری سورت میں مسلسل اہل ایمان کو یہ تلقین کی گئی ہے کہ وہ غیر اہل ایمان کے ساتھ دوستی نہ رکھیں۔ اور اس کے ساتھ ساتھ اس ممانعت کے ساتھ یہ بھی سمجھایا گیا کہ اہل کفر اس قابل ہی نہیں کہ وہ تمہارے دوست ہوں۔ نیز فیصلہ کن انداز میں یہ سمجھایا گیا ہے' قرآن کے نزدیک اس شخص کا ایمان کوئی ایمان نہیں ہے' جو ایسے کفار کے ساتھ دوستی رکھتا ہے جو اپنے نظام میں کتاب اللہ پر فیصلہ نہیں کرتے' اور اپنی زندگی کو اسلامی نظام کے مطابق نہیں گزارتے' اس سے پہلے بھی ہم اسلام کی اس پالیسی کی طرف اشارہ کر چکے ہیں لیکن اس کی وضاحت کی اشد ضرورت ہے' اور اس سورت میں اس کو جس قدر کھولا گیا ہے' اس کا یہاں ذکر ضروری ہے' کچھ جھلکیاں ملاحظہ ہوں۔

"مومنین' اہل ایمان کو چھوڑ کر کافروں کو دوست نہ بنائیں' اگر کوئی ایسا کرتا ہے تو وہ اللہ کے نزدیک کچھ ملبشی نہیں ہے۔ الا یہ کہ تم اس سے ڈر کی حالت میں ہو' اللہ تمہیں خود اپنے آپ سے خوف دلاتا ہے اور تمہیں اس طرف پلٹ کر جانا ہے' کہہ دو' تمہارے دلوں میں جو کچھ ہے۔ اسے تم چھپاؤ یا ظاہر کرو' اللہ اسے جانتا ہے' بلکہ وہ ان چیزوں کو جانتا ہے جو آسمانوں اور زمین میں ہیں۔ اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔"

......"اہل کتاب کا ایک گروہ دل سے یہ چاہتا ہے کہ وہ تمہیں گمراہ کردے' لیکن وہ خود گمراہ ہو رہے ہیں لیکن سمجھتے نہیں۔" .....
"اے ایمان لانے والو' اگر تم ان لوگوں سے ایک فریق کے پیچھے چلو گے جنہیں کتاب دی گئی ہے' تو وہ تمہیں تمہارے ایمان لانے کے بعد پھیر کر کافر بنادیں' اور اب تم کس طرح کفر کر سکتے ہو حالانکہ تم پر اللہ کی آیات پڑھی جارہی ہیں اور رسول خدا' تم میں بذات خود موجود ہیں اور جس شخص نے اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لیا تو اس نے سیدھا راستہ پالیا' اے لوگو جو ایمان لائے ہو' اللہ سے اس طرح ڈرو جس طرح اس سے ڈرنے کا حق ہے اور تمہیں موت نہ آئے مگر اس حال میں کہ تم مسلمان ہو' اور سب کے سب اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑو اور تفرقہ نہ کرو۔" ..... "وہ تمہیں کوئی ضرر نہیں پہنچا سکتے' الا یہ کہ کچھ اذیت دیدیں۔ اگر وہ تم سے لڑیں' تو شکست کھائیں' پھر ان کو کسی طرف سے مدد نہ ملے گی۔ یہ جہاں بھی ہوں گے ذلت ان پر مسلط ہو گی۔" .... "اے لوگو جو ایمان لائے ہو' اپنی جماعت کے لوگوں کے سوا دوسروں کو اپنا رازدار نہ بناؤ' وہ تمہاری خرابی کے کسی موقع سے فائدہ اٹھانے میں نہیں چوکتے۔ تمہیں جس چیز سے نقصان پہنچے وہی ان کو محبوب ہے' ان کے دل کا بغض ان کے منہ سے نکلا پڑتا ہے۔ اور جو کچھ ان کے سینوں میں چھپا ہوا ہے وہ اس سے شدید تر ہے۔"
"...... "اے لوگو جو ایمان لائے ہو' اگر تم ان لوگوں کے اشارے پر چلو گے جنہوں نے کفر کی راہ اختیار کی ہے تو تم کو الٹا پھیر لے جائیں اور تم نامراد ہو جاؤ گے' حقیقت یہ ہے کہ اللہ تمہارا حامی و مددگار ہے اور وہ بہترین مدد کرنیوالا ہے' عنقریب وہ وقت آنیوالا ہے جب ہم منکرین حق کے دلوں میں رعب بٹھادیں گے۔ اس لیے کہ انہوں نے اللہ کے ساتھ ان کو خدائی میں شریک ٹھہرایا ہے جن کے شریک

ہونے پر اللہ نے کوئی سند نازل نہیں کی۔ ان کا آخری ٹھکانا جہنم ہے۔" ......"اے نبی دنیا کے ملکوں میں خدا کے نافرمان لوگوں کی چلت پھرت تمہیں کسی دھوکے میں نہ ڈال دے۔ یہ محض چند روزہ زندگی کا تھوڑا سا لطف ہے' پھر یہ سب جہنم میں جائیں گے۔ جو بدترین جائے قرار ہے۔" ...... یہ اور بہت سے دوسری آیات اسی لائن پر ہیں۔

یہ تینوں خطوط باہم متوازن اور متوازی اس پوری سورت میں ایک ساتھ چلتے ہیں۔ یہ ملکر اس سورت کے مقاصد کو مکمل کرتے ہیں۔ یہ حقیقت توحید' توحید کے تقاضے' انسانی زندگی میں اس کے اثرات' انسانی شعور اور سوچ پر اس کے اثرات اور اس عقیدے کی روشنی میں اسلامی تصور حیات کی تشکیل اور پھر اس کی روشنی میں دشمنان اسلام کے ساتھ اپنے موقف کے تعین کے سلسلے میں اہم ہدایات دیتے ہیں۔

اس سورت میں جو آیات آئی ہیں ان کے درمیان موقع و محل کے لحاظ سے ایک زندہ اور گہرا ربط ہے۔ یہ سورت ایک عملی نظریاتی اور میدانی جنگ کے موقع پر نازل ہوئی' نظریاتی جنگ اس وقت افکار و اذہان کے میدان میں لڑی جارہی تھی' جبکہ جسمانی جنگ معرکہ کارزار میں لڑی جارہی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس سورت میں ہدایات و راہنمائی کا ایک زندہ ذخیرہ پایا جاتا ہے۔ اس میں ہر جگہ ملے جلے تاثرات اور اشارات پائے جاتے ہیں۔ مناسب ہے کہ اب ہم نصوص و آیات کا تفصیلی جائزہ لیں' اس سیاق و سباق میں ایک زندہ کلام اپنی طرف سے جانب کھینچتا ہے اور بہت ہی خوبصورت ہے۔

☆ ☆ ☆

درس ۲۳ ایک نظر میں

اگر ہم ان روایات کو لے لیں 'جن میں یہ کہا گیا ہے کہ اس سورت کی ابتدائی ۸۰ سے کچھ اوپر آیات اس موقع پر نازل ہوئیں جب وفد نجران حضور کے ساتھ مناظرے کیلئے آیا تھا' یہ وفد عیسائیوں پر مشتمل تھا' اور یہ لوگ حضور ﷺ سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں گفتگو کرنا چاہتے تھے۔ تو پھر اس سبق کی تمام آیات گویا اس موقع پر نازل شدہ تصور ہوں گی' لیکن یہ روایات خود اس حقیقت کو بیان کر دیتی ہیں کہ یہ وفد عام الوفود ۹ھ میں آیا تھا' اس وقت غلبہ اسلام کا شہرہ جزیرۃ العرب اور اس کے اردگرد علاقوں میں پھیل گیا تھا اور جزیرۃ العرب کے مختلف علاقوں سے وفود حضور اکرم ﷺ کے ساتھ ملاقات کیلئے دھڑا دھڑ حاضر ہو رہے تھے' ان وفود میں سے بعض تو معلومات حاصل کرنے آتے تھے اور بعض ایسے تھے جو جدید حالات میں حضور اکرم کے ساتھ معاہدات کی پیشکش بھی کرتے تھے۔

جیسا کہ اس سے پہلے میں کہہ چکا ہوں' کہ ان آیات میں جن موضوعات پر بحث کی گئی ہے اور جس انداز سے بحث کی گئی ہے۔ یہ دونوں اس بات کا اظہار کرتے ہیں کہ یہ آیات ہجرت کے بعد قریبی زمانہ میں نازل ہوئیں۔ اس سورت میں زیادہ تر اہل کتاب کے ساتھ نظریاتی مباحثہ ہے۔ ان کے غلط عقائد کی وجہ سے مسلمانوں کے اندر جو شبہات پیدا ہوتے تھے۔ ان کے جوابات ہیں' یا ان اعتراضات کے جوابات ہیں جو وہ رسول اللہ ﷺ کی رسالت کی صحت کے بارے میں کرتے تھے' یا وہ ہدایات ہیں جو اہل کتاب کے حوالے سے حقیقت توحید اور شرک کے بارے میں نازل ہوئیں' یا وہ خبرداری ہے جو اللہ نے یہاں اہل کتاب کی سازشوں کے مقابلے میں دی اور کہا کہ تم ان کے دھوکے میں نہ آؤ' اپنے موقف پر ثابت قدم رہو' ان موضوعات و مباحث کی وجہ سے میرا میلان اس طرف ہے کہ یہ آیات وفد نجران کے ساتھ مخصوص نہیں ہیں۔ کیونکہ یہ وفد ۹ھ میں آیا تھا' اس لئے کہ ان آیات کے نزول کیلئے ۹ھ سے پہلے بھی مدینہ طیبہ میں ایسے حالات تھے کہ ان کا نزول ان میں ہوا ہو یا یہ پوری سورت ان میں نازل ہو گئی ہو۔ اس لئے ان آیات کی تشریح کے وقت ہم واقعہ وفد نجران ہی کو پیش نظر نہ رکھیں گے بلکہ اس سورت کا خطاب عام اہل کتاب کو سمجھا جائے گا۔ کیونکہ تاریخی شواہد کے مطابق یہ واقعہ بہت متاخر ہے۔[۱]

جیسا کہ ہم نے اوپر تمہید میں کہا' ان آیات میں' اس اصلی کشمکش کا ذکر ہے' جو اس وقت تحریک اسلامی اور اس کے عقائد و نظریات اور اہل کتاب اور مشرکین اور ان کے عقائد و نظریات کے درمیان برپا تھی' یہ جنگ ظہور اسلام کے ساتھ ہی شروع تھی' اس میں کوئی وقفہ نہ تھا' خصوصاً اس وقت اس کشمکش میں بڑی تیزی آگئی تھی جب تحریک اسلامی کا ہیڈ کوارٹر مدینہ منتقل ہوا اور وہاں ایک اسلامی حکومت قائم ہو گئی۔ اس نظریاتی جنگ میں مشرکین اور یہودی شانہ بشانہ لڑ رہے تھے۔ اور ان کی اس مشترکہ مہم کو قرآن کریم تفصیل سے ریکارڈ کرتا ہے۔

یہ بات بعید از امکان نہیں ہے کہ جزیرۃ العرب کے اطراف و اکناف میں جو عیسائی آباد تھے' ان میں مذہبی پیشوا بھی اس

---

[۱] استاذ محمد عزہ دروزہ اپنی کتاب سیرۃ الرسول میں لکھتے ہیں' کہ بعض روایات سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ وفد نجران ہجرت نبوی کے زمانے میں سے پہلی چوتھائی میں آیا تھا۔ معلوم نہیں انہوں نے کن روایات پر یہ موقف اختیار کیا ہے۔ کیونکہ اکثر روایات وفد نجران کی آمد کی تاریخ ۹ھ ہی متعین کرتی ہیں۔ یعنی دوسرے وفود کے ساتھ' ہاں ابن کثیر نے اس احتمال کا ذکر کیا ہے کہ شاید یہ وفد صلح حدیبیہ سے پہلے آیا ہو' لیکن ابن کثیر نے بھی روایات سلف میں سے کسی روایت کا ذکر نہیں کیا ہے۔ بہرحال اگر ان آیات کو وفد نجران سے متعلق کروانا جائے تو پھر یہ وفد پہلے آیا ہو گا' لیکن چونکہ اکثر روایات میں یہی آیا ہے کہ یہ وفد ۹ھ کو آیا تھا' اس لئے میں یہی موقف اختیار کرتا ہوں کہ ان آیات کا وفد نجران کے ساتھ تعلق نہیں ہے۔

نظریاتی جنگ میں کسی نہ کسی صورت میں شریک ہوں' نیز یہ بات بھی بعید از قیاس نہیں ہے کہ قرآن مجید نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں جو صحیح عقائد و نظریات پیش کیے ان کا علم ان عیسائیوں کو ہو گیا ہو' اور وہ اس موضوع پر حضور اکرم ﷺ کے ساتھ بحث و مباحثہ کیلئے آئے ہوں کیونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں عیسائی اپنی اصل راہ سے ہٹ گئے تھے۔ اور اس موضوع پر قرآن کریم تنقید کر چکا تھا' اور عقیدہ توحید کے حوالے سے عیسائیوں پر رد آ گیا تھا۔

اس سبق میں ابتداء ہی اسلام کے عقیدۂ توحید کو اہل شرک کے انحرافات اور شبہات سے پاک وصاف کر کے بیان کیا گیا ہے' اور یہ قرار دیا گیا کہ قرآن کریم حق و باطل کے درمیان فرقان ہے' اور جو شخص بھی آیات الٰہی کا انکار کرے گا وہ کافر تصور ہو گا۔ چاہے وہ اہل کتاب میں سے ہو' ان آیات میں قرآن کے حوالے سے بتایا گیا مسلمانوں اور اہل ایمان کا رویہ ان آیات کے ساتھ کیا ہے' اپنے رب کے ساتھ ان کا کیا رویہ ہونا چاہئے' واضح طور پر بیان کیا جاتا ہے کہ ایمان کی کیا علامات ہوتی ہیں' وہ اس قدر واضح ہوتی ہیں کہ اہل ایمان کی پہچان میں کوئی غلطی نہیں ہوتی۔ اور کفر کی بھی کچھ علامات ہوتی ہیں اور اہل کفر کی پہچان میں بھی غلطی نہیں ہو سکتی۔ فرماتے ہیں :

"اللہ وہ زندۂ جاوید ہستی' جو نظام کائنات کو سنبھالے ہوئے ہے' حقیقت میں اس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے' اس نے تم پر کتاب نازل کی' جو حق لیکر آئی ہے' اور ان کتابوں کی تصدیق کر رہی ہے جو پہلے آئی ہوئی تھیں۔ اس سے پہلے وہ انسانوں کی ہدایت کیلئے تورات و انجیل نازل کر چکا ہے' اور اس نے وہ کسوٹی اتاری ہے۔ اب جو لوگ اللہ کے فرامین قبول کرنے سے انکار کریں۔ ان کو یقیناً سخت سزا ملے گی۔" اللہ بے پناہ طاقت کا مالک ہے اور برائی کا بدلہ دینے والا ہے' زمین و آسمان کی کوئی چیز اللہ سے پوشیدہ نہیں ہے۔ وہی تو ہے جو تمہاری ماؤں کے پیٹ میں' تمہاری صورتیں' جیسی چاہتا ہے بناتا ہے' اس زبردست حکمت والے کے سوا کوئی اور خدا نہیں۔ وہی خدا ہے' جس نے یہ کتاب تم پر نازل کی۔ اس کتاب میں دو طرح کی آیات ہیں۔ ایک محکمات جو کتاب کی اصل بنیادیں ہیں۔ اور دوسری متشابہات' جن لوگوں کے دلوں میں ٹیڑھ ہے وہ فتنے کی تلاش میں ہمیشہ متشابہات ہی کے پیچھے پڑے رہتے ہیں اور ان کو معنی پہنانے کی کوشش کیا کرتے ہیں' حالانکہ ان کا حقیقی مفہوم اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ بخلاف اس کے جو لوگ علم میں پختہ کار ہیں۔ وہ کہتے ہیں۔ "ہمارا ان پر ایمان ہے' یہ سب ہمارے رب کی طرف سے ہیں' اور سچ یہ ہے کہ کسی چیز سے صحیح سبق صرف دانشمند لوگ ہی حاصل کرتے ہیں۔" (۳:۱تا۸)

"اللہ نے خود شہادت دی ہے کہ اس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے' اور فرشتوں اور سب اہل علم نے بھی شہادت دی ہے' وہ انصاف پر قائم ہے' اس زبردست حکیم کے سوا فی الواقع کوئی خدا نہیں' اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے' اس دین سے ہٹ کر جو مختلف طریقے ان لوگوں نے اختیار کئے جنہیں کتاب دی گئی تھی۔ ان کے اس طرز عمل کی کوئی وجہ اس کے سوا نہ تھی کہ انہوں نے علم آجانے کے بعد' آپس میں ایک دوسرے پر زیادتی کرنے کیلئے ایسا کیا' اور جو کوئی اللہ کے احکام و ہدایات کی اطاعت سے انکار کر دے' اللہ کو اس سے حساب لیتے کچھ دیر نہیں لگتی۔

اور اس سبق میں ایک تہدید تو ایسی آئی ہے جس میں روئے سخن یہود کی طرف ہے' مثلاً فرمایا "جو لوگ اللہ کی آیات کا انکار کرتے ہیں' جو نبیوں کو ناحق قتل کرتے ہیں' اور ان لوگوں کو بھی قتل کرتے ہیں جو عدل و انصاف کا حکم دیتے ہیں تو انہیں دردناک عذاب کی خوشخبری سنا دیجئے۔" قتل انبیاء کا ذکر آتے ہی ذہن یہودیوں کی طرف چلا جاتا ہے' اس لئے کہ یہ کارنامہ وہی سرانجام دیتے رہے ہیں۔ ایک دوسری آیت میں آیا ہے۔ "اہل ایمان اہل ایمان کو چھوڑ کر کافروں کو دوست نہ بنائیں۔" اس آیت میں اگرچہ لفظ کافر وارد ہے تاہم اس سے مراد بھی غالباً یہودی ہیں' اگرچہ اس میں مشرکین بھی شامل ہو سکتے ہیں۔ اس لئے کہ اسلامی تحریک کے اس دور تک بعض مسلمان' اپنے

کافر مشرکین اقارب اور یہودیوں میں سے اپنے دوستوں کے ساتھ تعلقات قائم کئے ہوتے تھے۔ اس لئے یہاں انہیں اب ایسے تعلقات جاری رکھنے سے منع کر دیا گیا اور اس قدر سخت الفاظ میں ان تعلقات کے انجام بد سے ڈرایا گیا' چاہے یہ دوست یہودی ہوں یا مشرکین ہوں۔ کیونکہ سب کیلئے الکافرین کا لفظ استعمال ہوا ہے۔

اسی طرح ایک دوسری آیت "ان لوگوں کو کہہ دو جنہوں نے کفر اختیار کیا' تم عنقریب مغلوب ہو گے اور تمہیں جہنم کی طرف لے جایا جائے گا' جو بہت ہی برا ٹھکانا ہے' تمہارے لیے ان دو گروہوں میں سامان عبرت ہے جو ایک دوسرے سے نبرد آزما ہوئے' ایک اللہ کی راہ میں لڑ رہا تھا اور دوسرا کافر تھا' دیکھنے والے دیکھ رہے تھے کہ کافر گروہ مومن گروہ سے دوچند تھا۔" اس آیت میں غزوۂ بدر کے واقعات کی طرف اشارہ ہے' لیکن خطاب یہودیوں سے ہے' اس سلسلے میں حضرت ابن عباس ؓ سے ایک روایت منقول ہے' فرماتے ہیں کہ جب حضور اکرم ﷺ نے بدر کے دن قریش کو شکست دی اور آپ مدینہ طیبہ لوٹے تو یہودیوں کو جمع کیا تو انہیں یہ نصیحت کی کہ اس سے قبل کہ تمہارا وہ حال ہو جائے جو قریش کا ہو' تم مسلمان ہو جاؤ۔ انہوں نے کہا: محمد! بے شک تم نے قریش کے چند آدمیوں کو قتل کر دیا ہے مگر اس سے کہیں غرور میں مبتلا نہ ہو جاؤ کیونکہ وہ ناتجربہ کار تھے اور وہ جنگ کے بارے میں زیادہ نہ جانتے تھے۔ اگر تم نے ہمارے ساتھ جنگ کی تو تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ ہم کچھ لوگ ہیں شائد آپ کو ہم جیسے لوگوں سے کبھی واسطہ نہ پڑے۔ ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت فرمائی کہ "ان لوگوں سے کہہ دو جنہوں نے کفر کا راستہ اختیار کیا' کہ بہت جلدی تم مغلوب ہو جاؤ گے اور پھر جہنم کی طرف تمہیں اٹھایا جائے گا"...... ان الفاظ تک "ایک گروہ اللہ کے راستے میں لڑتا ہے۔" یعنی بدر میں اور "دوسرا کافر ہے۔" (ابوداؤد)

اسی طرح اس سبق کی آیت "اب اگر یہ لوگ تم سے جھگڑا کریں' تو ان سے کہو' میں نے اور میرے پیروؤں نے اللہ کے آگے سر تسلیم خم کر دیا ہے۔" پھر اہل کتاب اور غیر اہل کتاب دونوں سے پوچھو "کیا تم نے بھی اس کی اطاعت اور بندگی قبول کی؟" اگر کی' تو راہ راست پا گئے اور اگر اس سے منہ موڑا تو تم پر صرف پیغام پہنچانا ہے۔ آگے اللہ خود اپنے بندوں کے معاملات دیکھنے والا ہے۔" (۳: ۲۰) میں حضور ﷺ کو خطاب ہے' اور یہ خطاب اگرچہ اہل کتاب کے ساتھ نظریاتی مباحثہ کے اس سبق کے آغاز میں ہے' تاہم یہ عام ہے اور مخالف خواہ اہل کتاب ہوں یا غیر اہل کتاب ہوں' اس آیت کا آخری حصہ "اگر انہوں نے منہ موڑا تو تم پر صرف پیغام پہنچانے کی ذمہ داری ہے۔" سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تک حضور ﷺ پر اہل کتاب کے خلاف جہاد فرض نہ ہوا تھا۔ اور آپ ان سے جزیہ بھی وصول نہ کرتے تھے۔ جس سے ہمارا یہ نظریہ درست معلوم ہوتا ہے کہ اس سبق میں جو زیر بحث آیات ہیں وہ ہجرت کے بعد ابتدائی دور میں نازل ہوئیں۔

غرض ان تمام آیات پر اچھی طرح غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا تعلق کسی ایک واقعہ مثلاً قدوم وفد نجران سے نہیں ہے' ان میں دی گئی ہدایات عام ہیں اور ان کا انطباق تمام مخالفین اسلام پر ہوتا ہے' ہاں جن واقعات کی نسبت سے ان آیات کا نزول ہوا ہے۔ ایسے واقعات میں سے ایک واقعہ وفد نجران کا بھی ہو سکتا ہے' کیونکہ ان ابتدائی دنوں میں ایسے مواقع بار بار وقوع پذیر ہوا کرتے تھے۔ کیونکہ اس دور میں جزیرۃ العرب میں مسلمانوں اور ان کے مخالفین کے درمیان ایک ہمہ گیر نظریاتی جنگ جاری تھی۔ خصوصاً یہود مدینہ کے ساتھ۔

اس پہلے سبق میں اسلامی تصور حیات کے بارے میں نہایت ہی اہم بنیادی تصورات کو پیش کیا گیا ہے۔ اس نظریہ حیات کی نوعیت اور اس کے مزاج کے بارے میں بھی اہم وضاحتیں دی گئی ہیں۔ نیز یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اس نظریہ حیات کے عملی اثرات' انسانی زندگی پر کیا مرتب ہوتے ہیں' وہ آثار جو لازمۂ ایمان ہیں' مثلاً اللہ تعالیٰ کو وحدہٗ لاشریک سمجھنا' اور اس کا لازمی نتیجہ یہ بتایا گیا ہے کہ ایک موحد اللہ کا

مسلم بھی ہو جائے' یہی دین ہے اور اس کے سوا کوئی دین نہیں ہے۔ اور مسلم ہونے کا مفہوم یہ ہے کہ انسان اللہ کے سامنے سر تسلیم خم کر دے اور اس کی اطاعت کرے۔ اس کے اوامر کو مانے' اس کی شریعت کو مانے' اس کے رسول اور رسول کے طریقہ زندگی کا اتباع کرے۔ پس اس نظریۂ حیات کی رو سے اگر کوئی سر تسلیم خم نہیں کرتا' کوئی اطاعت نہیں کرتا' کوئی رسول کا اتباع نہیں کرتا تو وہ مسلم نہیں ہے۔ لہٰذا وہ ایسا دیندار نہیں ہے جس کے دین کو اللہ نے پسند کیا ہو۔ اور اللہ نے تو صرف اسلام کو پسند کیا ہے۔ اور اسلام جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا مکمل طور پر سر تسلیم خم کر دینے' اطاعت کرنے اور اتباع کرنے کا نام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم بڑے تعجب کے ساتھ اہل کتاب پر یہ تبصرہ کرتا ہے کہ جب انہیں اس طرف بلایا جاتا ہے کہ آؤ کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ کریں يَتَوَلّٰى فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ وَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ وہ منہ پھیر کر چلے جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ قرآن کی اصطلاح میں یہ اعراض کفر کے ہم معنی ہے' اور اس اعراض سے ان کے دعوائے ایمان کی قلعی کھل جاتی ہے اور اس سے ایمان کی نفی ہوتی ہے۔ اس حقیقت کی مزید وضاحت اس سورت کے حصہ دوئم میں کی گئی ہے۔.........اس قدر اجمالی تعارف کے بعد اب مناسب ہے کہ اس درس کی آیات کی مفصل تشریح و تفسیر پیش کی جائے۔

○..........○ ....○

درس ۲۳ تشریح آیات

آیات ۱ تا ۳۲

الٓمّٓ ﴿۱﴾

یہ حروف مقطعات ہیں' ان کی کوئی یقینی تشریح تو ممکن نہیں ہے' البتہ ترجیحی بنیاد پر' میں اس کا وہی مفہوم بیان کرتا ہوں' جو میں نے سورۂ بقرہ کے ابتداء میں بیان کیا تھا' یعنی یہ اس چیلنج کی طرف اشارہ ہے کہ یہ کتاب انہی حروف سے بنی ہے' جو مخالفین اسلام کے دسترس میں ہیں' لیکن اس کے باوجود یہ کتاب معجز ہے' اور مخالفین اس جیسی کتاب لانے میں ناکام رہے ہیں۔

ان حروف کی جس تفسیر کو ہم نے ترجیح دی ہے' متعدد سورتوں میں اس چیلنج کی تشریح یا اشارہ خود اس سورت میں بھی پایا جاتا ہے جس کی ابتداء میں یہ حروف وارد ہوئے ہیں۔ مثلاً سورۂ بقرہ میں یہ اشارہ بطور صریح چیلنج موجود ہے

وَ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ ۠ وَ ادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۲۳﴾

"اور اگر تمہیں اس امر میں شک ہے کہ یہ کتاب جو ہم نے اپنے بندے پر اتاری ہے' یہ ہماری ہے یا نہیں تو اس کی مانند ایک ہی سورت بنا لاؤ' اپنے سارے ہم نواؤں کو بلا لو' ایک اللہ کو چھوڑ کر باقی جس جس کی چاہو' مدد لے لو' اگر تم سچے ہو تو یہ کام کر کے دکھاؤ۔"

(۲۳:۲)

زیر بحث سورۂ آل عمران میں' تحدی اور چیلنج کا اشارہ ایک دوسری نوعیت سے لیا گیا ہے' یہ کہ یہ کتاب اس خدا کی جانب سے نازل کی گئی ہے۔ جس کے سوا کوئی دوسرا الٰہ نہیں ہے۔ اور یہ انہی حروف و کلمات سے مولف ہے جن حروف و کلمات میں تمام دوسری کتب سماوی نازل ہوئی تھیں۔ اور جن پر خود اہل کتاب ایمان لا چکے ہیں' جن سے اس سورت کا زیادہ تر خطاب متعلق ہے۔ اس لئے یہ بات کوئی قابل تعجب یا قابل انکار نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ ان ہی حروف سے مولف ایک نئی کتاب اپنے رسول پر نازل کرے۔

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ﴿۲﴾ نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَ اَنْزَلَ التَّوْرٰىةَ وَ الْاِنْجِيْلَ ﴿۳﴾ مِنْ قَبْلُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَ اَنْزَلَ الْفُرْقَانَ ۬ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ

شَدِيْدٌ ۗ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ ذُو انْتِقَامٍ ﴿۴﴾ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَخْفٰى عَلَيْهِ شَيْءٌ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ ﴿۵﴾ هُوَ الَّذِيْ يُصَوِّرُكُمْ فِي الْاَرْحَامِ كَيْفَ يَشَآءُ ۗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۶﴾ هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ ۗ فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَآءَ تَاْوِيْلِهٖ ۚ وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ ۘ وَالرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ يَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ ۙ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا ۚ وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿۷﴾ رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ ﴿۸﴾ رَبَّنَآ اِنَّكَ جَامِعُ النَّاسِ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيْهِ ۗ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ﴿۹﴾

۱ ع۹ ۹

"اللہ وہ زندہ جاوید ہستی' جو نظام کائنات کو سنبھالے ہوئے ہے' حقیقت میں اس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے۔ اس نے تم پر کتاب نازل کی' جو حق لیکر آئی ہے اور ان کتابوں کی تصدیق کر رہی ہے جو پہلے سے آئی ہوئی تھیں' اس سے پہلے وہ انسانوں کی ہدایت کیلئے تورات اور انجیل نازل کر چکا ہے' اور اس نے یہ فرقان اتارا ہے' اب جو لوگ اللہ کے فرامین کو قبول کرنے سے انکار کریں ان کو یقیناً سخت سزا ملے گی' اللہ بے پناہ طاقت کا مالک ہے اور برائی کا بدلہ دینے والا ہے' زمین و آسمان کی کوئی چیز اللہ سے پوشیدہ نہیں' وہی تو ہے جو تمہاری ماؤں کے پیٹ میں تمہاری صورتیں' جیسی چاہتا ہے' بناتا ہے' اس زبردست حکمت والے کے سوا کوئی اور خدا نہیں ہے۔ وہی خدا ہے' جس نے یہ کتاب تم پر نازل کی ہے۔ اس کتاب میں دو طرح کی آیات ہیں! ایک محکمات' جو کتاب کی اصل بنیادیں ہیں اور دوسری متشابہات' جن لوگوں کے دلوں میں ٹیڑھ ہے' وہ فتنے کی تلاش میں ہمیشہ متشابہات کے پیچھے پڑے رہتے ہیں اور ان کو معنی پہنانے کی کوشش کیا کرتے ہیں۔ حالانکہ ان کا حقیقی مفہوم اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ بخلاف اس کے جو لوگ علم میں پختہ کار ہیں' وہ کہتے ہیں کہ ہمارا ان پر ایمان ہے' یہ سب ہمارے رب کی طرف سے ہیں اور سچ یہ ہے کہ کسی چیز سے صحیح سبق صرف دانشمند لوگ ہی حاصل کرتے ہیں۔ وہ اللہ سے دعا کرتے رہتے ہیں کہ پروردگار! جب تو ہمیں سیدھے رستے پر لا چکا ہے تو پھر ہمارے دلوں کو کجی میں مبتلا نہ کر دیجیو' ہمیں اپنے خزانۂ غیب سے رحمت عطا کر کہ تو ہی فیاض حقیقی ہے۔ پروردگار! تو یقیناً سب لوگوں کو ایک روز جمع کرنیوالا ہے' جس کے آنے میں کوئی شبہ نہیں ہے' تو ہرگز اپنے وعدے سے ٹلنے والا نہیں ہے۔"

یوں اس سورت کا آغاز ان منکرین اسلام اہل کتاب پر تنقید سے ہوتا ہے' جو حضورؐ کی رسالت کا انکار کر رہے تھے' حالانکہ وہ اپنے دین کی بنیاد پر اور اہل کتاب ہونے کے ناطے نبوت' رسالت' کتب سماوی اور وحی الٰہی کے تصور سے واقف تھے' اس لئے انکا

فرض تھا کہ سب سے پہلے اسلام لاتے اور حضورؐ کی تصدیق کرتے بشرطیکہ ان کی تصدیق صرف دلیل اور حجت کے اطمینان پر موقوف ہوتی۔

اس فیصلہ کن حملے میں 'ان تمام شبہات کی بیخ کنی کر دی جاتی' جو اہل کتاب کے دلوں میں پائے جاتے تھے 'یا جنہیں وہ جان بوجھ کر مومنین کے دلوں میں ڈالنا چاہتے تھے 'اس لئے ان کا پروپیگنڈا کرتے تھے۔ اس تنقید میں ان راستوں اور ان دروازوں کی نشاندہی کر دی گئی ہے جن کے ذریعہ یہ شبہات داخل ہوتے تھے۔ اس لئے یہاں انسدادی طور پر بتا دیا گیا کہ اللہ کی آیات سے متعلق سچے مومنوں کا موقف کیا ہے اور ان کے بارے میں مخالفین اور منحرفین کی سوچ کیا ہے۔ سورت کے اس آغاز میں سچے اہل ایمان کا تعلق باللہ 'اللہ کے دربار میں ان کی عاجزی اور ان کی التجاؤں کی ایک خوبصورت تصویر کشی کی گئی ہے۔ اور بتایا گیا کہ وہ اللہ کی صفات کے بارے میں یہ تصور رکھتے ہیں۔ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ.................................. ''اللہ وہ زندۂ جاوید ہستی ہے 'جو نظام کائنات کو سنبھالے ہوئے ہے۔''

یہ خالص اور صاف ستھری توحید دراصل ایک مسلمان کے عقیدہ اور تمام غیر مسلموں کے عقائد کے درمیان ایک خط امتیاز کھینچ دیتی 'جن میں ملحدین اور مشرکین بھی شامل ہیں اور منحرفین اہل کتاب بھی شامل ہیں چاہے یہودی ہوں یا انصاریٰ ہوں 'اپنے تصورات اور عقائد کے اختلاف کے مطابق 'غرض توحید ایک مسلم اور تمام غیر مسلموں کے عقائد کے درمیان ایک خط امتیاز ہے 'اس لئے کہ یہاں نظام زندگی کا تعین تصور حیات اور عقائد پر ہوتا ہے۔ یہ عقیدہ ہی ہے جو نظام زندگی کا تعین کرتا ہے۔

اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے 'خدائی میں اس کے ساتھ کوئی شریک نہیں ہے 'وہ زندہ ہے 'اور حیات اس کی ذاتی صفت ہے۔ وہ ہر قید سے آزاد ہے 'زندہ مطلق ہے 'وہ القیوم ہے 'اس کائنات کو اسی نے تھاما ہوا ہے 'زندگی اس کی وجہ سے قائم ہے 'ہر موجود اس کی وجہ سے موجود ہے۔ پھر وہ سب کو قائم رکھے ہوئے ہے۔ اس لئے اس کے بغیر اس کائنات میں نہ کوئی ہستی موجود رہ سکتی ہے اور نہ موجود ہو سکتی ہے۔

یہ ہے خط امتیاز ایک تصور حیات اور عقیدہ میں اور یہی فرق ہے ایک مسلم کے طرز عمل اور نظام زندگی میں بمقابلہ ایک غیر مسلم 'اس سے اللہ تعالیٰ کی ذات کے بارے میں اسلامی تصور توحید اور اسلامی عقائد اور ان کے عقائد باطلہ اور عقائد جاہلیت کے اندھیروں کے درمیان بھی امتیاز ہو جاتا ہے۔ جاہلیت کے تصورات میں مشرکین عرب کے اس وقت کے تصورات بھی شامل ہیں اور یہود و نصاریٰ کے وہ منحرف شدہ تصورات بھی جن کے وہ قائل تھے۔

قرآن کریم نے یہودیوں کے بارے میں 'یہ بات نقل کی ہے کہ وہ حضرت عزیرؑ کو ابن اللہ کا مقام دیتے تھے 'قرآن کریم نے یہودیوں کے جس باطل عقیدے کا ذکر کیا ہے آج یہودی جس کتاب مقدس کے قائل ہیں اس میں موجود ہے 'مثلاً سفر تکوین اصحاح ششم میں ذکر ہے۔

> ''جب روئے زمین پر آدمی بہت بڑھنے لگے اور ان کی بیٹیاں پیدا ہوئیں 'تو خدا کے ''بیٹوں'' نے آدمی کی بیٹیوں کو دیکھا کہ وہ خوب صورت ہیں اور جن کو انہوں نے چنا ان سے بیاہ کر لیا۔ تب خداوند نے کہا کہ میری روح انسان کے ساتھ ہمیشہ مزاحمت نہ کرتی رہے گی کیونکہ وہ بھی تو بشر ہے اس کی عمر ایک سو بیس برس کی ہوگی۔ ان دنوں میں زمین پر جبار تھے اور بعد میں جب خداوند کے بیٹے انسان کی بیٹیوں کے پاس گئے تو ان کے لئے ان سے اولاد ہوئی۔ یہی قدیم زمانے کے سورما ہیں جو بڑے نامور ہوئے۔''

مسیحی تصورات میں جو خرابی پیدا ہوگئی تھی' قرآن کریم نے ان کا یہ قول نقل کیا ہے کہ "اللہ تینوں میں سے ایک ہے" -إِنَّ اللَّهَ ثَالِثُ ثَلَاثَةٍ .... اور ان کا یہ قول إِنَّ اللَّهَ هُوَ الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ .... "کہ اللہ مسیح بن مریم ہیں" اور یہ کہ انہوں نے حضرت مسیح اور ان کی والدہ کو اللہ کے سوا دو الٰہ بنالیا تھا۔ اور انہوں نے اپنے احبار اور رھبان کو بھی اللہ کے علاوہ رب بنالیا تھا' مشہور مصنف آرنلڈ اپنی کتاب تبلیغ اسلام میں لکھتے ہیں :-

"ظہور اسلام سے تقریباً ایک سو سال پہلے قیصر یوستینیان رومی سلطنت میں اتحاد پیدا کرنے میں بظاہر کامیاب رہا تھا' مگر اس کی وفات کے بعد سلطنت کے ٹکڑے ٹکڑے ہوگئے' کیونکہ دار السلطنت اور صوبجات کے درمیان ایک مشترکہ قومیت کا جذبہ بالکل باقی نہیں رہا تھا۔ ہرقل نے کوشش کی تھی کہ شام کے ملک کو مرکزی حکومت کے ساتھ دوبارہ وابستہ کرے اور اسے اس میں کسی قدر کامیابی بھی ہوئی تھی' مگر بدقسمتی سے اس نے مصالحت کیلئے جو طریقے اختیار کئے' ان سے اختلاف رفع ہونے کی بجائے اور شدید ہوگیا' لوگوں کے دلوں میں مذہبی تعصبات نے قومی جذبے کی جگہ لے رکھی تھی لہٰذا قیصر نے کوشش کی کہ دین مسیحی کی تفسیر و تشریح ایسے طریق پر کرے جس سے مخالف فرقوں کے باہمی مناقشات مٹ جائیں اور جو لوگ دین سے منحرف ہو چکے ہیں ان کو آرتھوڈوکس' کلیسا اور مرکزی حکومت کے ساتھ متحد کر دیں۔ خلقیدونہ کے مقام پر مسیحی علماء کی جو مجلس ۴۵۱ء میں بیٹھی تھی اس نے اس عقیدے کا اعلان کیا تھا کہ "حضرت عیسیٰ ؑ کے دو اقنوم تسلیم کرنے چاہئیں' اس طور پر کہ ان میں کوئی اختلاط یا تبدیلی یا تقسیم یا علیحدگی نہیں ہے۔ ان کی فطرتوں کا جو اختلاف ہے جو ان کے اجتماع سے باطل نہیں ہو جاتا بلکہ ہر اقنوم کے خواص برقرار ہیں اور ایک ذات اور ایک وجود میں موجود ہیں۔ مگر اس طرح نہیں ہے کہ یہ خواص دو ہستیوں میں منقسم یا الگ الگ ہوں بلکہ وہی ایک بیٹا ہے' اکلوتا' کلمۃ اللہ مگر مونو فزائٹ (Monophysites) فرقے نے اس عقیدے کو رد کر دیا کیونکہ وہ لوگ اس بات کے قائل تھے کہ مسیح کی ذات میں صرف ایک اقنوم ہے' یہ ذات مرکب ہے جس میں تمام ربانی اور انسانی صفات شامل ہیں۔ مگر وہ وجود جس میں یہ صفات ہیں' اس میں دوئی نہیں ہے بلکہ وہ ایک مرکب وحدت ہے۔" اس فرقے کے لوگ خاص طور پر شام' مصر اور رومی سلطنت کے باہر کے ملکوں میں آباد تھے۔ چنانچہ ان دونوں فرقوں کے درمیان اس مسئلے پر دو صدیوں تک گرما گرم مباحثہ جاری رہا' یہاں تک کہ ہرقل نے آکر فریقین کے درمیان مونو تھیلیٹزم (Monotheletism) کے عقیدے کے ذریعے سے مصالحت پیدا کرنی چاہی۔ اس عقیدے کا مفہوم یہ تھا کہ اقانیم کی دوئی کو تسلیم کرتے ہوئے مسیح کی واقعی زندگی میں ذات کی وحدت کو قائم رکھا جائے' اس لئے کہ ایک واحد ذات میں حرکت و عمل کے دو سلسلے قابل قبول نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ مسیح' جو ابن اللہ ہیں' ایک ہی ذریعے اور وسیلے سے انسانی اور ربانی دونوں قسم کے نتائج پیدا کرتے ہیں' یعنی کلمہ مجسم میں ایک ہی مشیئت کارفرما ہے۔"

"مگر ہرقل کا بھی وہی انجام ہوا جو بہت سے اور صلح کرانے والوں کا ہوا کرتا ہے' کیونکہ نہ صرف مناظرے کی آگ اور بھڑک اٹھی بلکہ لوگوں نے قیصر پر بے دینی کا الزام لگایا اور دونوں فرقوں کو مورد عتاب بننا پڑا۔"

ایک دوسرے مسیحی مسٹر کینن ٹیلر لکھتے ہیں کہ حضرت محمد ﷺ کی بعثت کے وقت مشرقی عیسائیوں کی حالت یہ تھی کہ یہ لوگ درحقیقت مشرکین تھے' وہ شہداء کے ایک طبقے کی پوجا کرتے تھے۔ اسی طرح عیسائی پیروں اور فرشتوں کی عبادت کرتے تھے۔ ان مشرکین کے غلط عقائد کا ذکر قرآن کریم نے یوں کیا کہ وہ جن اور ملائکہ کی بندگی کرتے تھے۔ سورج' چاند اور بتوں کو پوجتے تھے'

اور ان کا کم سے کم جو شرکیہ عقیدہ تھا وہ یہ ہے کہ بقول ان کے وہ ان الٰہوں کی بندگی محض اس لئے کرتے ہیں کہ ان کی بندگی کی وجہ سے انہیں قرب الٰہی حاصل ہوتا ہے۔ مَا نَعْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُقَرِّبُونَا إِلَى اللَّهِ زُلْفَى ....

غلط اعتقادات اور تصورات کے اس جنگل اور ڈھیر میں، جن کی طرف اس سے قبل ہم اشارہ کر چکے ہیں، اسلام آیا اور اس نے اسلامی نظریۂ حیات اور اسلامی عقیدے کا فیصلہ کن، صریح اور واضح و ممتاز تصور دیا۔ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّومُ..... .... "نہیں کوئی الٰہ مگر خدا، وہی زندہ ہے اور وہی ہے جو تھامنے والا ہے۔"..... یہ عقیدہ اور یہ تصور حیات ایسا تھا کہ اس نے فریقین کے راستے جدا کر دیئے۔ دونوں کا طرز عمل اور دونوں کا طریق زندگی جدا کر دیا...... جس شخص کے نظریہ اور شعور میں یہ ہو کہ اللہ ایک واحدہ لاشریک ہے اور اسکے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے۔ وہ زندہ ہے اور اس کے سوا اس مفہوم میں کوئی زندہ نہیں ہے، تمام دوسرے موجودات کا وجود اس کے ساتھ قائم ہے۔ اور وہی ہے جو تمام موجودات اور تمام زندوں کو تھامے ہوئے ہے...... جس شخص کا یہ عقیدہ ہو اور ان صفات کے ساتھ ہو، اس کا نظام زندگی اور طرز حیات یقیناً اس شخص سے مختلف ہونا چاہئے جس کی ذہنی دنیا پر غلط اور وہم پرستانہ تصورات کے وہ بادل چھائے ہوئے ہوں جن کا اوپر ہم نے ذکر کیا۔ اس قسم کے غلط تصورات کے حامل شخص کی زندگی پر وہ اثرات مرتب نہیں ہو سکتے۔ جو اس شخص کی زندگی پر ہو سکتے ہیں ایسے خدا کا قائل ہو جو اس کی زندگی میں فعال اور متصرف ہے اور علی کل شئی قدیر ہے۔

یہ صرف توحید خالص کی برکت ہے جس کے نتیجے میں ایک انسان صرف ایک ہی الٰہ کی بندگی کر سکتا ہے۔ ایسے تصور میں کوئی شخص کسی غیر اللہ سے کوئی امداد طلب نہیں کرتا۔ وہ صرف اللہ سے نصرت کا طلبگار ہوتا ہے۔ نہ وہ غیر اللہ سے نظام حیات اور نظام قانون اخذ کرتا ہے، نہ وہ اخلاق و آداب غیر اللہ سے اخذ کرتا ہے۔ نہ وہ اجتماعی اور اقتصادی نظام کے اغیار سے لیتا ہے۔ غرض ایک موحد اپنی زندگی کے کسی بھی شعبے میں غیر اللہ سے کچھ اخذ نہیں کرتا اور نہ ہی حیات بعد الممات کے تصور میں غیر اللہ کو اہمیت دیتا ہے۔ رہے وہ کھوٹے، ٹیڑے، پیچیدہ، ناپختہ شرکیہ جاہلی عقائد تو ان کے حاملین کا ایک رخ ہوتا ہے نہ ان کو قرار و ثبات حاصل ہوتا ہے، نہ ان میں حدود حلال و حرام ہوتے، نہ ان میں صحیح اور غلط کے اندر کوئی تمیز ہوتی، نہ نظام اور شریعت میں، نہ آداب و اخلاق میں، نہ طرز عمل اور سلوک میں، غرض یہ تمام امور تب طے ہوتے جب کسی شخص کے عقیدے اور نظریئے میں ان کی جہت طے ہوتی ہے، اس کے بعد ایک انسان، اس مصدر، اس جہت کی طرف متوجہ ہو کر اس کی بندگی اور اطاعت کرتا ہے۔

اور جب اسلام نے طے کر دیا کہ اللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّومُ .... تو اس طرح ایک مسلمان اللہ وحدہ کی طرف متوجہ ہو گیا اور اس طرح اس کے اور دوسرے عقائد والوں کے راستے جدا ہو گئے۔

یہی وجہ ہے کہ اس اعتقادی جدائی کی وجہ سے اسلامی نظام زندگی کا مزاج بالکل علیحدہ ہو گیا۔ اسلامی زندگی، اپنے تمام عناصر ترکیبی کے ساتھ پوری کی پوری اسلامی تصور حیات سے تشکیل پاتی ہے۔ اور اسلامی تصور حیات ایک خالص اور مکمل توحید پر مبنی ہے اور یہ عقیدۂ توحید اس وقت انسانی ضمیر میں مستقلاً قرار نہیں پکڑتا جب تک اس کے کچھ عملی آثار زندگی میں مرتب نہ ہوں، مثلاً زندگی کے ہر شعبے میں عقیدۂ توحید کے ساتھ انسانی نظام شریعت بھی اللہ تعالیٰ سے اخذ کرے اور زندگی کی ہر سرگرمی اور تگ و دو میں ذات خداوندی کی طرف متوجہ ہو۔

توحید خالص کے بیان کے بعد، ایسی جامع توحید کہ اللہ کی ذات میں بھی اس کا کوئی شریک نہ اور اس کی صفات میں بھی کوئی شریک نہ ہو، اب اس منبع اور مصدر کا بیان ہوتا ہے جس سے کہ ایک مسلمان اپنا دین اخذ کرتا ہے۔ جہاں سے کتب سماوی اور رسولوں کی تعلیمات

نازل ہوتی ہیں۔یعنی جہاں سے ہر دور اور ہر زمانے میں انسانوں نے اپنے لئے نظام زندگی اخذ کیا ہے۔

نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ

"اس نے تم پر کتاب سچائی کے ساتھ اتاری' جو اس کی تصدیق کرتی ہے' جو اس سے پہلے نازل ہوا اور وہ تورات اور انجیل اس نے اس سے پہلے نازل کیں' لوگوں کی ہدایت کیلئے اور کسوٹی اتاری' بے شک وہ لوگ جنہوں نے اللہ کی آیات کا انکار کیا۔ ان کیلئے شدید عذاب ہے اور اللہ غالب اور بدلہ لینے والا ہے۔"

اس آیت کے پہلے جملے میں اسلامی تصور حیات کے تمام اساسی حقائق ذکر ہوئے ہیں' اہل کتاب وغیرہ میں سے جو لوگ حضرت محمد ﷺ کی رسالت کے منکر تھے۔ان کی تردید کی گئی ہے اور اللہ تعالیٰ کی جانب سے جو کچھ نازل ہوا ہے وہ درست ہے۔

یہ آیت بتاتی ہے کہ ہدایت کا نزول صرف اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہوتا ہے۔ تمام کتب سماوی اس کی جانب سے ہیں' اللہ وہ ہے جس کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے اور وہ حی اور قیوم ہے' وہی ہے جس نے آپ پر یہ قرآن کریم اتارا اور وہی ہے جس نے اس سے پہلے حضرت موسیٰؑ پر تورات اتاری' وہی ہے جس نے حضرت عیسیٰؑ پر انجیل اتاری' اس لئے اللہ کی الوہیت اور اس کی بندگی میں اس کے ساتھ کسی کا اشتراک واختلاط نہ ہو گا۔ وہی ایک الٰہ ہے جو اپنے مختار بندوں پر کتابیں نازل کرتا ہے۔اور وہ بندے اس سے یہ ہدایت اخذ کرتے ہیں۔اور وہ اخذ کرنیوالے بھی اللہ کے بندے ہی ہوتے ہیں اگرچہ وہ انبیاء ہوں۔

یہ آیت بتاتی ہے کہ کتب سماوی میں جو راہ ہدایت ہے وہ ایک ہی دین ہے' اس لئے کہ آپ پر یہ کتاب جو سچائی لیکر آئی ہے' وہ ان تمام صداقتوں کی تصدیق کرتی ہے' جو انبیاء سابقہ پر نازل ہوئیں۔ مثلاً تورات اور انجیل میں' اور ان سب کتابوں اور رسالتوں کا ہدف ایک ہی رہا ہے یعنی لوگوں کو راہ راست پر لانا' پھر یہ کتاب جو آپ پر نازل کی گئی ہے۔اس کی ایک دوسری صفت بھی ہے۔وہ یہ کہ چونکہ کتب سماوی کے اندر ان کے ماننے والوں نے مرور زمانہ کے ساتھ ساتھ بہت تحریفات کی ہیں اس لئے یہ فرقان بھی ہے۔یہ ان کتب سماوی کی اصل ہدایات اور ان منحرفہ ہدایات کے درمیان فرق کرتی ہے اور بتاتی ہے کہ کیا اصل ہے اور کیا انحراف اور تحریف ہے' جیسا کہ اس کا ایک نمونہ ہم نے آرنلڈ کی کتاب دعوت الی الاسلام کے طویل اقتباس میں دیا تھا۔

اس میں ضمناً یہ فیصلہ بھی کر دیا جاتا ہے کہ اہل کتاب کے لئے اس رسالت جدیدہ کے انکار کرنے کیلئے کوئی وجہ ہی نہیں ہے۔اس لئے کہ اس رسالت کی راہ بھی وہی ہے جن پر سابقہ رسالتیں تھیں۔یہ کتاب اسی طرح نازل ہوئی جس طرح اس سے قبل کتابیں نازل ہوئیں۔جس طرح اس سے قبل ایک بشر رسول پر نازل ہوئیں' اسی طرح یہ کتاب بھی ایک بشر ہی پر نازل ہوئی ہے۔اور یہ کتاب ان تمام کتابوں اور رسولوں کی تصدیق کرتی ہے۔جس طرح یہ حق پر مشتمل ہے' اسی طرح وہ کتابیں بھی سچائی پر مشتمل تھیں۔اور اس کتاب کو اسی ذات نے اتارا ہے جس کا حق ہے کہ وہ سچائی اتارے' اس لئے کہ صرف اسی ذات کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ انسانوں کیلئے نظام زندگی تجویز کرے' ان کے فکری تصورات ان کیلئے وضع کرے۔ ان کے لیے شریعت تجویز کرے۔ان کے لئے اخلاق و آداب کا نظام تجویز کرے اور یہ تمام باتیں اس کتاب منزل میں موجود ہوں۔

اس آیت کے دوسرے حصے میں ان لوگوں کیلئے ایک خوفناک تنبیہہ کا ذکر ہے جو بغیر کسی حجت کے اللہ کی آیات کا انکار کرتے ہیں۔بتایا جاتا ہے کہ اللہ عزیز ہے' وہ بے پناہ قوتوں کا مالک ہے اور اس کی پکڑ شدید ہوتی ہے اور کبھی انتقام بھی لیتا ہے جو بہت خوفناک ہوتا ہے۔اور وہ لوگ جو اللہ کی آیات کا انکار کرتے ہیں گویا وہ تمام دینوں کا انکار کرتے ہیں جو اپنی اصل کے اعتبار سے ایک ہے' اہل کتاب نے پہلے اس کتاب کا انکار کیا جو ان پر نازل ہوئی ہے اور جس کی انہوں نے تحریف کی ہے۔وہی اب اس کتاب کا انکار کرتے ہیں۔اس لئے

کہ انہوں نے خود اپنی کتاب کی بھی تحریف کی تھی۔ اس لئے یہ کتاب جدید ان کیلئے فرقان ہے۔ اس لئے یہاں یہ شدید دھمکی انہی کو دی گئی ہے۔ اور انہی سے کہا گیا ہے کہ تم اللہ کے انتقام سے بچو۔

عذاب الہی اور انتقام الہی کی دھمکی کے بعد انہیں یہ بھی کہہ دیا جاتا ہے کہ اللہ کی ذات سے کسی کی کوئی بات پوشیدہ نہیں ہے۔ اس سے نہ کوئی چیز مخفی ہے اور نہ ہی اس سے کوئی چیز بچ سکتی ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَخْفٰى عَلَيْهِ شَيْءٌ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ ۔ .... "اللہ وہ ذات ہے جس پر زمین و آسمان دونوں کے اندر پائے جانے والی کوئی شئی مخفی نہیں ہے۔" یہ کہ اس پر کوئی بات مخفی نہیں ہے اور ہر وہ چیز کو جانتا ہے اس لئے کہ وہی اللہ ہے' وہی ہے جس نے اس کائنات کو تھاما ہوا ہے۔ اس لئے اس کا علم محیط ہے۔ سورت کے آغاز میں اس کی صفت قیومیت کا ذکر موجود ہے۔ نیز یہاں خصوصاً اس لئے بھی صفت احاطہ علم کا ذکر کیا گیا کہ اس آیت میں ایک خوفناک' ڈراوا بھی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ ممکن نہیں کہ اس سے کوئی چیز پوشیدہ رکھی جائے۔ ارض و سماء میں کوئی شئی بھی اس سے پوشیدہ نہیں ہے۔ اس سے کسی نیت و ارادہ کو بھی پوشیدہ نہیں رکھا جاسکتا۔ کوئی تدبیر بھی اس سے پوشیدہ نہیں ہے۔ اس طرح اس کے نظام میں یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ کوئی سزا سے بچ نکلے یا اس کے حیطہ علم سے کچھ باہر رہ جائے۔

اللہ کے اس لطیف اور دقیق علم کے سائے' انسانی شعور کو خود اس کی پیدائش کے سلسلہ میں ایک ٹچ دیا جاتا ہے' انسانی شعور کو یہ چٹکی' خود تخلیق انسان کے بارے میں دی جاتی ہے۔ انسان کی تخلیق جو پردہ غیب میں' رحم مادر کے پس پردہ اندھیروں میں عمل پذیر ہوتی ہے' جس کے بارے میں نہ انسان کا علم رسائی حاصل کر سکا ہے اور نہ ہی اس کا ادراک کرتا ہے۔ اور نہ ہی وہ عمل تخلیق انسان کے دائرہ قدرت میں آسکا ہے۔

هُوَ الَّذِيْ يُصَوِّرُكُمْ فِي الْاَرْحَامِ كَيْفَ يَشَآءُ ۭ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ

.... "اللہ وہ ذات ہے جو رحم مادر میں تمہاری تصویر بناتا ہے' جس طرح چاہتا ہے' اس کے سوا کوئی الہ نہیں ہے اور وہ عزیز و حکیم ہے۔"

وہ رحم مادر میں تمہیں ایک شکل و حرارت دیتا ہے' جس طرح اس کی مشیئت ہوتی ہے پھر وہ تمہیں اس شکل و صورت کے ساتھ متناسب خصوصیات بھی عطا کرتا ہے۔ اللہ کے سوا کوئی الہ نہیں ہے۔ اس لئے اس کے سوا کوئی ذات اس تصویر سازی میں شریک نہیں ہوتی' یہ کام وہ صرف اپنے ارادے اور اپنی مشیئت سے کرتا ہے۔ "جس طرح چاہتا ہے۔" "اس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے۔" "وہ عزیز ہے۔" وہ اس تخلیق اور تصویر سازی پر پوری قدرت رکھتا ہے۔ "وہ حکیم ہے' یہ تمام تخلیقی عمل بڑی گہری' ٹیکنالوجی پر مبنی ہے۔ اس میں نہ کوئی رکاوٹ آتی ہے' اور نہ اس کام میں اس کے ساتھ کوئی شریک ہے۔"

تخلیق انسان کی طرف یہاں اشارہ کرنے کا مقصد یہ ہے کہ خطاب اہل کتاب سے ہے اور اہل کتاب کے اندر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تخلیق کے بارے میں نہایت ہی غلط خیالات اور شکوک و شبہات پائے جاتے تھے۔ اللہ ہی ہے جس نے حضرت عیسیٰ کی تصویر کشی کی' جس طرح اس نے چاہا' یہ عقیدہ باطل ہے کہ حضرت عیسیٰ بذات خود رب ہیں۔ یا خدا ہیں' یا خدا کے بیٹے ہیں یا کوئی لاہوتی ناسوتی اقنوم ہیں۔ اس لئے کہ یہ تصورات ناقابل فہم ناقابل ادراک ہونے کے ساتھ ساتھ' عقیدۂ توحید کی صحیح' قابل فہم اور واضح تصور کے بھی خلاف ہیں۔

اس کے بعد قرآن مجید ان لوگوں کی نشاندہی کرتا ہے جس کے دلوں میں ٹیڑھ ہے۔ اور یہ لوگ وہ ہیں جو قرآن کریم کی قطعی الدلالت آیات کو چھوڑ کر ان آیات کے درپے ہوتے ہیں جن کے مفہوم میں تاویل کا احتمال ہوتا ہے تاکہ وہ ایسی آیات کی غلط تاویل کر کے اسلامی نظریات کے اندر شبہات پیدا کریں۔ یہ نشاندہی اس لئے کی جاتی ہے کہ اہل ایمان اور اہل حقائق کی حقیقی صفات بیان کر دی جائیں۔ یہ بتایا جائے کہ ان کا ایمان کس قدر خالص ہے۔ اور کس طرح اللہ کے قطعی احکام کو بلاچون وچرا عمل میں لاتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔

هُوَ الَّذِيٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ ۭ فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاۗءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَاۗءَ تَاْوِيْلِهٖ ڤ وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ ڤ وَالرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ يَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ ۙ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا ۚ وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَھَّابُ رَبَّنَآ اِنَّكَ جَامِعُ النَّاسِ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيْهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ

وہی ہے جس نے یہ کتاب تم پر نازل کی' اس کتاب میں دو طرح کی آیات ہیں' ایک محکمات جو کتاب کی اصل بنیادیں ہیں اور دوسری متشابہات' جن لوگوں کے دلوں میں ٹیڑھ ہے' وہ فتنے کی تلاش میں ہمیشہ متشابہات کے پیچھے پڑے رہتے ہیں۔ اور ان کو معنی پہنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ حالانکہ ان کا حقیقی مفہوم اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا' بخلاف اس کے کہ جو لوگ علم میں پختہ کار ہیں' وہ کہتے ہیں' ہمارا ان پر ایمان ہے' یہ سب ہمارے رب کی طرف سے ہیں' اور سچ یہ ہے کہ کسی چیز سے صحیح سبق صرف دانشمند لوگ ہی حاصل کرتے ہیں۔ اے ہمارے رب ہدایت دینے کے بعد ہمارے دلوں کو ٹیڑھا نہ کر دے' اور ہمیں اپنی جانب سے رحمت عطا فرما' بے شک تو ہی داتا ہے۔ اے ہمارے رب' تو ایک ناقابل شک دن میں سب لوگوں کو یقیناً جمع کرنیوالا ہے' بے شک تو کبھی اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرتا۔"

ایک روایت میں آتا ہے کہ وفد نجران کے عیسائیوں نے حضور ﷺ سے پوچھا کہ کیا آپ کا یہ عقیدہ ہے کہ آپ حضرت عیسیٰ کو کلمۃ اللہ اور روح اللہ سمجھتے ہیں؟ وہ ان الفاظ سے عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں اپنے عقائد باطلہ ثابت کرنا چاہتے تھے۔ مثلاً یہ کہ وہ بشر نہیں' وہ روح اللہ ہیں اور روح اللہ کی وہ اپنی تعبیرات کرتے تھے۔ لیکن وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں قرآن کریم کی ان آیات کی بات بھی نہ کرتے تھے۔ جو اس موضوع پر محکمات تھیں' جن میں اللہ کی بے قید وحدانیت کا ذکر تھا۔ اور جن میں اس بات کی قطعی تردید کر دی گئی تھی کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی شریک یا اس کا کوئی لڑکا ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان آیات کا نزول فرمایا اور ان کی اس سازش کا انکشاف کیا جس کی وجہ سے وہ ان متشابہ تعبیرات قرآن سے غلط فائدہ اٹھاتے تھے۔ اور قطعی الدلالت آیات سے صرف نظر کرتے تھے۔

لیکن یہ اپنے مفہوم کے اعتبار سے عام ہے' اس میں قرآن مجید کی آیات کے بارے میں مختلف مکتبہائے فکر کے لوگوں کے مختلف مواقف پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ چنانچہ اس بات کی وضاحت کی گئی ہے کہ قرآن مجید ایک کتاب ہدایت ہے۔ اس میں بعض باتیں تو ایسی ہیں جن کا تعلق اصول ایمان اور اسلامی فکر کے بنیادی حقائق سے ہے۔ بعض میں اسلامی نظام حیات کی تفصیلات دی گئی ہیں اور بعض آیات میں ان غیبی امور کا بیان ہے جن کا صحیح تصور ہماری محدود عقل کے دائرہ قدرت سے باہر' جن پر ادراک انسانی اپنے موجود محدود وسائل علم کے ذریعہ قابو نہیں پا سکتا۔ اور ان نصوص میں اکثر وہ باتیں بیان کی گئی ہیں جو انسان کے ادراک سے باہر ہیں۔

قرآن مجید نے پہلے دو امور یعنی عقیدہ اور نظریہ تصورات اور افکار کے بارے میں اور اسلامی نظام حیات اور شریعت کے بارے میں قطعی الدلالت آیات نازل فرمائیں۔ جن کا تصور بھی ممکن ہے اور جن کے مقاصد بھی بالکل واضح ہیں اور یہی دو شعبے ہیں جو قرآن کا اصل موضوع ہیں۔ رہے وہ امور جن کی خبر حضور نے دی یا قرآن نے دی اور ہم نے انہیں سنایا پڑھایا یا وہ غیبی خبریں جو قرآن نے سنائی ہیں جن میں پیدائش مسیح کی خبر بھی ہے تو اس بارے میں ہدایت یہ ہے کہ جس حد تک انہیں سمجھ سکتے ہو تو ضرور راہوار ادراک کو طولانی دو لیکن حد ادراک سے آگے ایمان لاؤ کہ بس یہ خالق حقیقی کی جانب سے ایک حق بات اور ماہیت اور کیفیت کا ادراک فی الحال مشکل ہے' اس لئے کہ اپنی ماہیت کے اعتبار سے وہ انسان کے موجودہ ذرائع سے وراء ہے۔

اب رہے لوگ' تو وہ ان آیات پر غور' خود اپنی شخصیت کے حوالے سے کرتے ہیں' اگر وہ صحیح الفکر ہیں تو ان کی سوچ صحیح ہے۔ اگر ان کی فکر ٹیڑھی ہے تو انکی سوچ بھی ٹیڑھی ہے۔ اور وہ اپنی اس ٹیڑھی فطرت کی وجہ سے گمراہ ہو گئے ہیں تو یہ لوگ قرآن کریم کی صاف ستھری اور واضح آیات سے صرف نظر کرتے ہیں۔ وہ واضح اصولوں کو ترک کر دیتے ہیں۔ وہ نہایت ہی مفصل ہیں اور جن کے اوپر اسلامی نظریہ حیات اور اسلامی نظام زندگی قائم ہے۔ اور یہ لوگ ان متشابہات کے درپے ہوتے ہیں جن کی تصدیق کا دارومدار صرف ایمان پر ہے کہ یہ اللہ کی جانب سے نازل کی گئی ہیں۔

اور یہ کہ ان کے صحیح معنی صرف اللہ جل شانہ کے علم میں ہیں۔ جیسا کہ انسانی ذرائع علم نسبتی ہیں اور ان کی قوت مدرکہ کا میدان کار محدود ہے۔ نیز ان کے صحیح فہم کا مدار اس براہ راست الہام اور شعور پر ہے' جو کتاب اللہ کی صداقت کے بارے میں ایک صحیح الفکر آدمی کو حاصل ہوتا ہے کہ یہ پوری کتاب ایک سچی کتاب ہے۔ اور یہ کہ وہ سچائی کے ساتھ اتاری گئی ہے اور کسی پہلو سے بھی باطل نہ اس پر حملہ آور ہو سکتا ہے۔ اور ٹیڑھے دل و دماغ والے ان متشابہات کے پیچھے اس لئے پڑے رہتے ہیں کہ وہ ان آیات میں ایسے مواقع تلاش کر لیتے ہیں جن کے ذریعے وہ فتنے پیدا کرتے ہیں۔ ایسی تاویلات پیدا کرتے ہیں۔ جن سے اسلامی تصور حیات کے اندر شکوک پیدا کئے جا سکیں۔ اور جب ان کے ذریعے وہ فکری انتشار پیدا کر لیں تو پھر وہ فکری ژولیدگی کو ان آیات میں بھی داخل کر دیں جو بالکل قطعی اور واضح ہیں۔ حالانکہ ان متشابہات کی تاویل صرف اللہ جانتا ہے وَ مَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ ؔ .... "حالانکہ اس کے اصل معنی صرف اللہ جانتا ہے۔"

رہے وہ لوگ جو علم میں پختہ کار ہیں' وہ لوگ جنہوں نے علم کے بل بوتے پر جان لیا ہے کہ انسانی عقل' انسانی فکر اور یہ عقل و فکر اپنی موجودہ قوت اور موجود ذرائع عقل و فکر کی مدد سے وہ ان متشابہات کے مفاہیم نہیں پا سکتے۔ اس لئے وہ پوری شرح صدر اور اطمینان سے کہتے ہیں اٰمَنَّا بِهٖ ۙ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا ۚ .... "ہم ان پر ایمان لائے' سب ہمارے رب کی طرف سے ہیں" ان کا یہ ایمان انہیں اس نتیجے تک پہنچاتا ہے' بڑے وثوق سے کہ یہ آیات اللہ کی جانب سے ہیں' اس لئے یہ حق ہیں اور سچائی پر مبنی ہیں۔ اور جس چیز کا فیصلہ اللہ کر دے وہ بذات خود سچی ہوتی ہے اور انسانی عقل کے نہ یہ بات فرائض میں شامل ہے۔ اور نہ ہی اس کے دائرہ قدرت میں ہے کہ وہ ان آیات کے اسباب و علل کا کھوج لگائے ...... اس کے مفاہیم کی ماہیت معلوم کرے اور ان کے اندر پوشیدہ اسباب و علل کا کھوج لائے وَ الرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ .... کے سامنے جب آیات پیش ہوتی ہیں تو وہ ان کی صداقت کو قبول کر لیتے ہیں۔ وہ اپنی صداقت شعار فطرت اور فہم رسا کی وجہ مطمئن ہو جاتے ہیں۔ ان کی عقل ان میں شک ہی نہیں کرتی۔ اس لئے کہ انہوں نے یہ بات پالی ہوتی ہے کہ علم اور خردمندی یہ ہے کہ جس حقیقت کا ادراک بذریعہ علم و عقل نہ ہو سکے اس میں دلچسپی نہ لی جائے۔ خصوصاً جو امور انسان کے ذرائع علم کے حدود سے باہر ہوں۔

وَالرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ .... کی یہ ایک بہترین تصویر ہے' اس تصویر اور تعریف کا انکار وہی شخص کر سکتا ہے جو سطحی ہو۔ جو اپنے سطحی علم کی وجہ سے اس غرے میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ انہوں نے سب کچھ حاصل کر لیا ہے۔ اور جو چیز ان کے علم میں نہیں ہے گویا اس کا وجود ہی نہیں ہے۔ وہ فرض کر لیتے ہیں کہ وہ سب کچھ پا گئے۔ اس لئے تمام حقائق کی صورت وہی ہے جو ان کے ذہن میں آتی ہو' اس سے وہ اللہ تعالیٰ کے مطلق اور بے قید کلام کا قیاس اپنی عقلیت کے پیمانوں اور فیصلوں کے مطابق کرتے ہیں' حالانکہ یہ پیمانے ان کی محدود عقل نے تراشے ہیں' ہاں ان کے مقابلے میں حقیقت پسند علماء کا شعار انکسار ہوتا ہے اور وہ اس طرف مائل ہوتے ہیں کہ لامحدود حقائق محدود عقل میں نہیں سماتے' اس لئے ہزارہا حقائق عقل بشری کے دائرے سے باہر ہیں۔ چونکہ وہ فطرتاً یقین کرنیوالے ہوتے ہیں' اس لئے ان کی سچی فطرت سچائی تک جلدی پہنچ جاتی ہے اور تصدیق کر لیتی ہے اور مطمئن ہو جاتی ہے۔ وَمَا يَذَّكَّرُ إِلَّآ أُولُوا الْأَلْبَابِ .... "اور سچ یہ ہے کہ کسی چیز سے سبق صرف دانشمند لوگ ہی حاصل کرتے ہیں۔"

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک صاحب دانش اور سچائی کے درمیان کوئی فاصلہ نہیں ہوتا' ان کی فطرت سلیمہ کے اندر یہ قوت ہوتی ہے کہ وہ حق کو پالیں' اس لئے کہ فطرت سلیمہ کا تعلق براہ راست اللہ سے ہوتا ہے۔

جب ایک انسان دانشمندی کے اس مقام بلند تک آپہنچتا ہے تو ان کا اجر اللہ کی طرف سے ہوتا ہے وہ خشوع و خضوع اور گڑگڑا کر دست بدعا ہو جاتے ہیں کہ اللہ۔ انہیں حق پر قائم رکھ کر ہدایت کے بعد گمراہ نہ کر' ان پر اپنی رحمت اور اپنے فضل کی بارش کر دے۔ خوف آخرت ان کے دامن گیر ہو جاتا ہے' جہاں انہیں لازماً جانا ہے' جس سے کوئی مفر نہیں۔

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوبَنَا بَعْدَ إِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِن لَّدُنكَ رَحْمَةً ۚ إِنَّكَ أَنتَ الْوَهَّابُ
رَبَّنَآ إِنَّكَ جَامِعُ النَّاسِ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيعَادَ

"وہ دعا کرتے ہیں کہ پروردگار! جب تو سیدھے راستہ پر لگا چکا ہے' تو پھر کہیں ہمارے دلوں کو کجی میں مبتلا نہ کر دیجئو! ہمیں اپنے خزانۂ فیض سے رحمت عطا کر کہ تو ہی فیاض حقیقی ہے' پروردگار! تو یقیناً سب لوگوں کو ایک روز جمع کرنے والا ہے۔ جس کے آنے میں کوئی شبہ نہیں تو ہرگز اپنے وعدہ سے ٹلنے والا نہیں ہے۔"

جو لوگ علم میں پختہ کار ہیں ان کا اپنے رب کے ساتھ یہ تعلق ہے' اور یہ ایسا تعلق ہے جو ایک صحیح مومن کا ہونا چاہئے' جو اللہ کے کلام اور اللہ کے عہد پر پورا بھروسہ ہونے کے نتیجے میں پیدا ہوتا ہے۔ وہ اللہ کے فضل و رحمت کے صحیح شعور کے نتیجے میں حاصل ہوتا ہے' خصوصاً اس وقت جب ایک مومن اللہ کی قضاء و قدر پر پختہ یقین بھی رکھتا ہو اور خدا کا خوف بھی اس کے دل میں موجزن ہو۔ اور ایک مومن نہ غافل ہوتا ہے' نہ مغرور ہوتا ہے' نہ اپنے روز و شب میں کبھی اپنے فرائض بھولتا ہے۔

قلب مومن کی ضلالت اور گمراہی کے بعد دولت ایمان ملنے کی بڑی قدر دانی ہوتی ہے۔ اور کسی دھندلے تصور کے بعد اپنی آنکھوں سے حقیقت کو دیکھ لینے کی اس کے دل میں بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ اور حیرانی و پریشانی کے بعد راہ راست پانے سے اسے شعور ہوتا ہے۔ خلجان اور بے یقینی کے بعد اطمینان یقین پانے پر وہ بہت ہی خوش ہوتا ہے' وہ دنیا کی تمام غلامیوں سے آزاد ہو کر ایک اللہ کی غلامی میں داخل ہو کر پرمسرت ہوتا ہے۔ وہ لہو و لعب کی زندگی سے نکل کر اقدار عالیہ کے میدان میں داخل ہوا ہوتا ہے۔ جس سے وہ خود شناسی حاصل کئے ہوئے ہوتا ہے اور اسے یہ شعور ہوتا ہے کہ دولت ایمان دیکر اللہ تعالیٰ نے اسے بہت کچھ دیدیا ہے .... اس لئے وہ دوبارہ گمراہی کی راہ سے بہت ہی ڈرتا ہے' چونکہ وہ راہ راست پر آچکا ہوتا ہے اس لئے دوبارہ گمرہی کے نشیب و فراز اور تاریک راہوں میں پھنس

جانے سے بہت خوف کھاتا ہے' وہ یوں ڈرتا ہے جس طرح وہ شخص جو ایک خوش گوار موسم میں گھنی چھاؤں میں بیٹھا ہو تو جھلسا دینے والی گرمی اور بے آب و گیارہ صحرا کے تصور سے بھی ڈر رہا ہو' حقیقت یہ ہے ایمان کی قدر اور ذوق یقین وہی شخص پا سکتا ہے جس نے بدبختی کے کڑے دن اور الحاد و زندقہ کی ذہنی خشکی کے دن دیکھے ہوں۔ ایسا ہی شخص اچھی طرح اندازہ کر سکتا ہے۔ بے دینی گمراہی اور فسق و فجور کی زندگی کے مقابلے میں ایمانی زندگی کے اندر کس قدر مٹھاس ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ایسے مقامات پر ایک مومن ایسے خشوع و خضوع کے ساتھ اپنے رب کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوبَنَا بَعْدَ إِذْ هَدَيْتَنَا .... "اے ہمارے رب! راہ ہدایت دکھانے کے بعد ہمارے دلوں کو ٹیڑھا نہ کر دیجیو۔" یہ پکارتے ہیں کہ انہیں گمراہی کے بعد ایک عظیم رحمت مل گئی ہے۔ کہیں وہ لٹ نہ جائے' یہ ایک ایسا انعام ہے جس سے بڑا کوئی انعام نہیں ہے۔

وَهَبْ لَنَا مِن لَّدُنكَ رَحْمَةً إِنَّكَ أَنتَ الْوَهَّابُ .... "ہمیں اپنے خزانہ غیب سے رحمت عطا کر کہ تو ہی فیاض حقیقی ہے۔" یعنی یہ لوگ اپنے شعور ایمان کے ذریعہ یقین رکھتے ہیں کہ وہ اللہ کے فضل و رحمت کے سوا کچھ نہیں کر سکتے۔ خود ان کے دل بھی ان کے ہاتھ میں نہیں ہیں۔ اس لئے وہ اپنی ہدایت اور نجات اخروی کیلئے بھی اللہ کے سامنے دست بدعا ہوتے ہیں۔

حضرت عائشہ ؓ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ اکثر اوقات یہ دعا فرمایا کرتے تھے۔ "اے دلوں کو پھیرنے والے! میرے دل کو اپنے دین پر جمادے۔" میں نے عرض کیا کہ حضور ؐ آپ یہ دعا' بہت زیادہ کرتے ہیں؟ تو آپ ؐ نے فرمایا: "تمام دل اللہ رحمان کی دو انگلیوں کی گرفت میں ہیں' جب وہ دلوں کو سیدھا کرنا چاہے تو سیدھا کر دیتا ہے۔ اور جب وہ ٹیڑھا کرنا چاہے تو وہ ٹیڑھا کر دیتا ہے۔" اور جب ایک مومن کو صحیح طرح اس بات کا شعور حاصل ہوتا ہے تو وہ نہایت گرم جوشی کے ساتھ آستانہ درگاہ الہٰی کے ساتھ چمٹ جاتا ہے' اور گڑگڑا کر اللہ تعالیٰ کی معاونت اور توفیق کا طلبگار ہو جاتا ہے اور اس کی طرف متوجہ ہو کر اس کی رحمت اور اس کے فضل و کرم کا طلبگار ہوتا ہے تاکہ وہ خزانہ محفوظ رہے' جو اس نے اس مومن کو عطا کیا ہے اور وہ کرم باقی رہے جن سے اسے نوازا گیا ہے۔

اس کے بعد روئے سخن اہل کفر کی طرف مڑ جاتا ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ ان کا انجام کیا ہونے والا ہے۔ ان کے بارے میں وہ سنت الہٰی کیا ہے۔ جس میں کوئی تبدیلی کبھی واقعہ نہیں ہوتی۔ معنی یہ کہ ان کے گناہوں پر ان سے ضرور مواخذہ ہو گا۔ اہل کتاب میں سے جو لوگ' اس دین کا انکار کرتے ہیں اور اس کی راہ روکے کھڑے ہیں انہیں یہ دھمکی دی جاتی ہے کہ وہ باز آجائیں' حضور ؐ کے واسطہ سے انہیں متنبہ کیا جاتا ہے کہ وہ کفار مکہ کے انجام بد سے عبرت حاصل کریں' جو ان کی آنکھوں کے سامنے وقوع پذیر ہوا' جن میں ایک قلت قلیلہ کے مقابلے میں ان کے بھاری لشکر کو شکست ہوئی۔

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَن تُغْنِيَ عَنْهُمْ أَمْوَالُهُمْ وَلَا أَوْلَادُهُم مِّنَ اللَّهِ شَيْئًا ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمْ وَقُودُ النَّارِ ﴿١٠﴾ كَدَأْبِ آلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَالَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ ۚ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا فَأَخَذَهُمُ اللَّهُ بِذُنُوبِهِمْ ۗ وَاللَّهُ شَدِيدُ

الْعِقَابِ ﴿۱۱﴾ قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَتُغْلَبُوْنَ وَ تُحْشَرُوْنَ اِلٰى جَهَنَّمَ ؕ وَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴿۱۲﴾ قَدْ كَانَ لَكُمْ اٰيَةٌ فِیْ فِئَتَيْنِ الْتَقَتَا ؕ فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ اُخْرٰى كَافِرَةٌ يَّرَوْنَهُمْ مِّثْلَيْهِمْ رَاْىَ الْعَيْنِ ؕ وَ اللّٰهُ يُؤَيِّدُ بِنَصْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِی الْاَبْصَارِ ﴿۱۳﴾

"جن لوگوں نے کفر کا رویہ اختیار کیا ہے' انہیں اللہ کے مقابلے میں نہ ان کا مال کچھ کام دے گا' نہ اولاد' وہ دوزخ کا ایندھن بن کر رہیں گے۔ ان کا انجام ویسا ہی ہو گا جیسا فرعون کے ساتھیوں اور ان سے پہلے کے نافرمانوں کا ہو چکا ہے کہ انہوں نے آیات الٰہی کو جھٹلایا' نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ نے ان کے گناہوں پر انہیں پکڑ لیا اور حق یہ ہے کہ اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔ پس اے محمد! جن لوگوں نے تمہاری دعوت قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ ان سے کہہ دو کہ قریب ہے وہ وقت' جب تم مغلوب ہو جاؤ گے اور جہنم برا ہی ٹھکانا ہے۔ تمہارے لئے ان دو گروہوں میں نشان عبرت تھا' جو ایک دوسرے سے نبرد آزما ہوئے۔ ایک گروہ اللہ کی راہ میں لڑ رہا تھا اور دوسرا گروہ کافر تھا۔ دیکھنے والے بچشم سر دیکھ رہے تھے کہ وہ ان سے دو چند ہیں اور اللہ فتح و نصرت سے جس کو چاہتا ہے مدد دیتا ہے۔ دیدۂ بینا رکھنے والوں کیلئے اس میں بڑا سبق پوشیدہ ہے۔"

یہ آیات بنی اسرائیل کو خطاب کرتے ہوئے کہی گئی ہیں۔ ان میں یہ دھمکی دی گئی ہے کہ وہ اہل کفر کے انجام پر غور کر لیں۔ پہلے جو ہو چکا ہے اور آئندہ جو ہونے والا ہے۔ اس میں ایک لطیف اور عمیق اشارہ ہے اس جانب کہ اللہ تعالیٰ نے فرعون کو ہلاک کیا اور بنی اسرائیل کو نجات دی لیکن یہ ہلاکت اس لئے نہ تھی کہ فرعون فرعون تھا بلکہ اس لئے کہ وہ کافر تھا۔ اور نجات بنی اسرائیل بھی اس لئے نہ تھی کہ وہ قوم بنی اسرائیل سے نسبی رشتہ رکھتے تھے۔ بلکہ اس لئے تھی کہ وہ اہل ایمان تھے۔ اس لئے اب اگر وہ کفر اور گمراہی کا رویہ اختیار کریں گے تو وہ نجات کے مستحق نہ ہوں گے۔ اگر وہ گمراہ ہو گئے تو وہ اہل کفر کہلانے سے نہ بچ سکیں گے۔ اسی طرح وہ دنیا و آخرت میں اہل کفر کے انجام بد سے لازماً دوچار ہوں گے جیسا کہ بوجہ کفر آل فرعون کا یہ انجام ہوا۔

اسی طرح انہیں بدر کے میدان میں اہل قریش کے مقتل کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے۔ اس صورت حال سے وہ محض اس لئے دوچار ہوئے کہ وہ کفار تھے۔ اگر وہ بھی کفر پر قائم رہے تو پھر سنت الٰہی یہی ہے کہ وہ لازماً اسی انجام سے دوچار ہوں گے جن سے اہل قریش دوچار ہوئے۔ اس لئے کہ اس انجام کا اصل سبب کفر تھا۔ اللہ کے ہاں کسی کے ساتھ کوئی امتیازی سلوک نہیں ہے' نہ وہاں سفارش چلتی ہے' صرف ایمان صحیح ہی وہاں شفیع ہو سکتا ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ تُغْنِیَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَ لَاۤ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْئًا ؕ وَ اُولٰٓئِكَ هُمْ وَقُوْدُ النَّارِ

"جن لوگوں نے کفر کا رویہ اختیار کیا' انہیں اللہ کے مقابلے میں نہ ان کا مال کچھ کام دے گا اور نہ اولاد' وہ دوزخ کا ایندھن بن

کر رہیں گے۔"

دنیا میں مال اور اولاد بچاؤ کا سہارا ہوتے ہیں لیکن یہ دونوں چیزیں اس دن کام نہ دیں گی جس کے آنے میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے۔ اس لئے کہ اس دن کے آنے کا وعدہ اللہ نے کیا ہے اور اللہ کے وعدے میں کبھی تخلف نہیں ہوتا۔ اللہ کا وعدہ کبھی ٹلتا نہیں اہل کفر وہاں جہنم کا ایندھن ہوں گے۔ یہاں انداز تعبیر ایسا اختیار کیا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان اہل جہنم سے انسانی خصوصیات سلب ہو جائیں گی اور وہ جہنم میں خس و خاشاک کی طرح سوختنی اشیاء ہوں گے۔ اور اس وقت نہ مال اور نہ دولت نہ جاہ اور نہ سلطنت ان کے کچھ کام آئے گی۔

كَدَأْبِ آلِ فِرْعَوْنَ وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۚ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا فَأَخَذَهُمُ اللَّهُ بِذُنُوبِهِمْ ۗ وَاللَّهُ شَدِيدُ الْعِقَابِ

"ان کا انجام ایسا ہی ہو گا جیسا کہ فرعون کے ساتھیوں کا اور اس کے پہلے کے نافرمانوں کا ہو چکا ہے۔ کہ انہوں نے آیات الٰہی کو جھٹلایا تو اللہ نے ان کے گناہوں پر انہیں پکڑ لیا اور حق یہ ہے کہ اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔"

یہ ایک ایسی مثال ہے جو تاریخ میں بار بار دہرائی گئی ہے۔ اور اس کے کئی قصے اللہ تعالیٰ اپنی کتاب میں بڑی تفصیلات کے ساتھ بیان کئے ہیں۔ اللہ کی آیات کے جھٹلانے والوں کے بارے میں اللہ کی سنت ان قصوں میں پائی جاتی ہے۔ جہاں اللہ چاہے اپنی اس سنت کو کام میں لاتا ہے۔ اس لئے اللہ کی آیات کو جھٹلانے والوں کو اس جہاں میں کوئی گارنٹی حاصل نہیں نہ وہ محفوظ ہیں۔ اس لئے اب جو لوگ رسالت محمدیہ کا انکار کر رہے ہیں اور قرآن کریم کی تکذیب کر رہے ہیں جو آپ پر نازل ہوا ہے۔ ان کے لئے اس انجام سے دوچار ہونا یقینی ہے۔ اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی اس لئے یہاں رسول اکرم کو حکم دیا جاتا ہے کہ وہ ان کفار اہل کتاب کو اس انجام بد سے خبردار کریں۔ اگر وہ فرعون اور تاریخ اسلامی کے دوسرے نافرمانوں کے انجام بد کو بھول چکے ہیں تو خدارا اہل مکہ کے اس انجام بد پر غور کریں جس کا مظاہرہ ابھی ان کی آنکھوں کے سامنے ہو چکا ہے۔ یہ سب کچھ تکذیب آیات ہی کا شاخسانہ تو ہے۔

قُلْ لِلَّذِينَ كَفَرُوا سَتُغْلَبُونَ وَتُحْشَرُونَ إِلَىٰ جَهَنَّمَ ۚ وَبِئْسَ الْمِهَادُ قَدْ كَانَ لَكُمْ آيَةٌ فِي فِئَتَيْنِ الْتَقَتَا ۖ فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَأُخْرَىٰ كَافِرَةٌ يَرَوْنَهُمْ مِثْلَيْهِمْ رَأْيَ الْعَيْنِ ۚ وَاللَّهُ يُؤَيِّدُ بِنَصْرِهِ مَنْ يَشَاءُ ۗ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَعِبْرَةً لِأُولِي الْأَبْصَارِ

"جن لوگوں نے تمہاری دعوت قبول کرنے سے انکار کر دیا ان سے کہہ دو کہ قریب ہے وہ وقت جب تم مغلوب ہو جاؤ گے اور جہنم کی طرف ہانکے جاؤ گے تمہارے لئے ان دو گروہوں میں ایک نشان عبرت تھا جو ایک دوسرے سے نبرد آزما ہوئے ایک گروہ اللہ کی راہ میں لڑ رہا تھا اور دوسرا کافر تھا دیکھنے والے بچشم سر دیکھ رہے تھے کہ وہ ان سے دوچند ہے۔"

اس آیت

يَرَوْنَهُمْ مِّثْلَيْهِمْ رَأْيَ الْعَيْنِ .... کے دو مفہوم ہو سکتے ہیں'

یرون کی ضمیر اگر کفار کی طرف ہے اور ھم سے مراد اہل ایمان ہیں تو مفہوم ہو گا کہ اہل کفر کو اپنی ظاہری کثرت کے باوجود نظریوں آرہا تھا کہ اہل اسلام ان سے دوگناہ ہیں۔ اور یوں یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے تائید غیبی تھی کہ کفار کو اہل اسلام زیادہ اور وہ خود تھوڑے نظر آرہے تھے۔ یوں ان کے قدم اکھڑ گئے اور ان کے دل بیٹھ گئے۔

اور اگر اس کے برعکس لیا جائے یعنی یرون سے مراد ہو کہ مسلمان ھم ان کو دیکھ رہے تھے۔ تو مفہوم یہ ہو گا کہ مسلمانوں کو وہ اپنے سے دوگناہ نظر آرہے تھے' وہ تین گناہ تھے۔ اس کے باوجود اہل اسلام ثابت قدم رہے' اور فتح یاب ہوئے۔ اصل بات یہ ہے کہ تائید و نصرت اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ اس لئے دکھانا یہ مطلوب ہے کہ اہل کفر اپنے انجام پر غور کریں۔ اور اہل اسلام دلوں کو مضبوط کر لیں اور یقین کر لیں کہ ان کے اعداء کی تقدیر میں شکست لکھی جا چکی ہے۔ اس لئے وہ ان اعداء سے خوف نہ کھائیں۔ جیسا کہ ہم نے اس سورت پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ کہا تھا کہ اس وقت جو صورت حال تھی' اس میں اہل کتاب کو اس قسم کی تنبیہہ اور تخویف کی ضرورت تھی۔

قرآن کریم مسلسل اپنی عظیم حقیقت پر کاربند ہے اور اس عظیم سچائی میں سے ایک بات یہ ہے کہ اس دنیا میں جو لوگ کفر کرتے ہیں' آیات کو جھٹلاتے ہیں اور اسلامی نظام زندگی سے انحراف کرتے ہیں ان کی شکست کا وعدہ اب بھی اپنی جگہ قائم ہے اور قائم رہے گا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کا' اہل ایمان کے ساتھ یہ وعدہ بھی اپنی جگہ قائم ہے کہ وہ فتح یاب ہوں گے اگرچہ وہ تعداد میں قلیل ہوں' اور نصرت اور فتح صرف تائید ایزدی پر موقوف ہے اور یہ صرف اس کا اختیار ہے' جسے چاہے وہ فتح و نصرت سے نوازے۔ حقیقت اپنی جگہ اب بھی قائم ہے۔ منسوخ نہیں ہوئی۔

اہل ایمان کا یہ فرض ہے کہ وہ اس حقیقت پر اچھی طرح مطمئن ہو جائیں۔ اور اس پر پوری طرح اعتماد کریں۔ اور میدان جہاد میں اپنی تیاری مکمل طور پر کریں جس قدر ممکن ہو' اور اس تیاری کے بعد پھر تائید خداوندی کا انتظار کریں۔ وہ نہ جلدبازی کریں' نہ مایوس ہوں' اگرچہ انہیں طویل انتظار ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔ کیونکہ اللہ حکیم ہے وہ اپنی تدابیر خود اپنے وقت پر کرتا ہے' اور اس حکمت کے مطابق ہی اس کا وعدہ اپنے وقت پر پورا ہوتا ہے۔

إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّأُولِي الْأَبْصَارِ .... "دیدۂ بینا رکھنے والوں کے لئے اس میں بڑا سبق پوشیدہ ہے۔ اس لئے ضروری ہے دیکھنے والی آنکھ ہو' تدبیر کرنے والی بصیرت ہو' تب ہی ایک انسان عبرت حاصل کر سکتا ہے اور تب ہی قلب میں فہم پیدا ہوتا ہے۔ اگر بصیرت نہ ہو تو سامان عبرت شب و روز آنکھوں کے سامنے سے گزرتا ہے مگر آنکھ نہیں دیکھ سکتی۔"

☆......☆......☆......☆......☆

اگلی آیت میں' جماعت مسلم کی تربیت کے سلسلے میں' اسے ان فطری میلانات اور فطری اسباب کے بارے میں آگاہ کیا جاتا ہے' جن کی وجہ سے انسان کی زندگی میں گمراہی اور انحراف کا آغاز ہوتا ہے' اس لئے اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ ان فطری میلانات کو ہر وقت ضبط و کنٹرول میں رکھا جائے۔ اور ہروقت زندگی کے اعلیٰ مقاصد کو پیش نظر رکھا جائے اور اصل مطمح نظر وہ اکرام و انعام ہو جائے جو کسی انسان کو یوم آخرت میں مل سکتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ خواہشات دنیاوی میں گم ہو جانے' مرغوبات نفس کے درپے ہو جانے اور دوسرے فطری میلانات کا بندہ بن جانے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے' کہ انسان کے دل بصیرت اور اس کی عقل سے عبرت آموزی ختم ہو جاتی ہے۔ اور انسان کی حالت یہ ہو جاتی ہے کہ

وہ حسی لذتوں اور دنیاوی مرغوبات کے ہاتھوں مجبور ہو جاتا ہے۔ اعلیٰ اور بلند مقاصد نظروں سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔ انسان کے احساسات مادی ہو جاتے ہیں وہ دنیائے قریب کی ان لذتوں کے دائرے سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔ اور وہ ان اعلیٰ مقاصد کے حصول کی لذت سے محروم ہو جاتا ہے جس کا تعلق انسان کے خلیفۃ اللہ فی الارض ہونے کے منصب سے ہے۔ اور جو اس دنیا کی اس مخلوق کے شایان شان ہیں جسے اللہ تعالیٰ نے اپنا خلیفہ بنایا ہے۔ اس وسیع مملکت دنیا میں۔

یہاں یہ بات نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ یہ فطری میلانات اور دنیاوی مرغوبات چونکہ اللہ کی جانب سے' انسان کے تکوینی فرائض ہیں اور یہ رجحانات و میلانات' اس دنیا میں حیات انسانی کی نشوونما اور ترقی کیلئے اہم کردار ادا کرتے ہیں اور ایک قسم کا فطری فریضہ ہیں' اس لئے اسلام نے ان فطری میلانات کو ختم کرنے یا انکی بیخ کنی کا کوئی اشارہ نہیں دیتا۔ ہاں اسلام یہ حکم دیتا ہے کہ ان میلانات کو ضابطے کا پابند بنایا جائے۔ ان کو منظم کیا جائے' ان کی تیزی کو کم کیا جائے ان کو اس طرح کنٹرول کیا جائے کہ ان پر انسان کو پورا پورا ضبط حاصل ہو' انسان ان کا مالک اور متصرف ہو' اور انسان ان سے آگے مقاصد عالیہ پر بھی نظر جمائے ہوئے ہو اور اپنے آپ کو ان کی غلامی سے بلند سمجھتا ہو۔

اس لئے قرآن کریم کی آنیوالی آیات ان مرغوبات اور ان میلانات کے بارے میں بحث کرتی ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ اس آیت میں ان اخروی لذائذ' مرغوبات جن کا تعلق کام و دہن سے ہے اور ان کا ذکر کرتے ہیں جن کا تعلق عقل و خرد سے ہوتا۔ اور یہ اخروی لذات ان لوگوں کا نصیبہ ہو گا جنہوں نے اس جہاں میں اپنے نفوس کے اوپر کنٹرول کیا۔ اور وہ اس جہاں میں عیش و عشرت اور لذات میں غرق نہ ہوئے اور انہوں نے یہاں اپنے آپ کو مقام انسانیت پر بلند رکھا۔

اس ایک ہی آیت میں قرآن کریم نے دوران کلام' اس دنیا کی تمام اہم مرغوبات کو ایک ساتھ جمع کر دیا۔ مثلاً عورتیں' اولاد' مال و دولت' گھوڑے اور سواری' سرسبز و شاداب اراضی اور اس میں قسم قسم کے مویشی' اس دنیا میں جس قدر مرغوبات ممکن ہیں وہ سب اس آیت میں جمع کر دی گئی ہیں۔ یا تو بذات خود یہ اشیاء مرغوبات میں شامل ہیں' یا وہ انسان کے لئے فراہمی مرغوبات کا ذریعہ ہیں۔ اور اس کے ساتھ ہی دوسری آیت میں ان مرغوبات اور لذائذ کا ذکر ہے' جو اللہ نے اہل ایمان کیلئے' اس جہاں میں تیار کی ہیں۔ ایسے باغات اور لذائذ کا ذکر ہے' جو اللہ نے اہل ایمان کیلئے' اس جہاں میں تیار کی ہیں۔ ایسے باغات جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی' پاکیزہ بیویاں' اور ان سب انعامات سے بڑا انعام یعنی ذات باری کی رضامندی اور خوشنودی۔ اور یہ انعام صرف ان لوگوں کیلئے ہیں جن کی نظریں ان دنیاوی لذائذ سے اونچی ہیں' جن کا تعلق اللہ سے قائم ہے' ذرا ان آیات پر غور فرمائیں۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ؕ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ ﴿۱۴﴾ قُلْ اَؤُنَبِّئُكُمْ بِخَيْرٍ مِّنْ ذٰلِكُمْ ؕ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَاَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَّ رِضْوَانٌ

مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ بَصِیْرٌۢ بِالْعِبَادِۚ﴿۱۵﴾ اَلَّذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَاۤ اِنَّنَاۤ اٰمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَ قِنَا عَذَابَ النَّارِۚ﴿۱۶﴾ اَلصّٰبِرِیْنَ وَ الصّٰدِقِیْنَ وَ الْقٰنِتِیْنَ وَ الْمُنْفِقِیْنَ وَ الْمُسْتَغْفِرِیْنَ بِالْاَسْحَارِ﴿۱۷﴾

"لوگوں کیلئے مرغوبات نفس 'عورتیں' اولاد' سونے چاندی کے ڈھیر' چیدہ گھوڑے' مویشی اور زرعی زمینیں' بڑی خوش آیند بنادی گئی ہیں۔ مگر یہ سب دنیا کی چند روزہ زندگی کے سامان ہیں۔ حقیقت میں جو بہتر ٹھکانا ہے' وہ اللہ کے پاس ہے۔ کہو! میں تمہیں بتاؤں کہ اس سے زیادہ اچھی چیز کیا ہے؟ جو لوگ تقویٰ کی روش اختیار کریں' ان کیلئے ان کے رب کے پاس باغ ہیں۔ جس کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی' وہاں انہیں ہمیشگی کی زندگی حاصل ہوگی' پاکیزہ بیویاں ان کی رفیق ہوں گی اور اللہ کی رضا سے وہ سرفراز ہوں گے' اللہ اپنے بندوں کے رویے پر گہری نظر رکھتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو کہتے ہیں "مالک! ہم ایمان لائے ہماری خطاؤں سے درگزر فرما اور ہمیں آتش دوزخ سے بچا۔" یہ لوگ صبر کرنیوالے ہیں۔ راست باز ہیں۔ فرمانبردار اور فیاض ہیں اور رات کی آخری گھڑیوں میں اللہ سے مغفرت کی دعائیں مانگا کرتے ہیں۔"

زُيِّنَ لِلنَّاسِ .... میں فعل مجہول کا صیغہ استعمال کرکے اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ ان چیزوں کی طرف لوگوں کا میلان بتقاضائے فطرت ہے۔ ان چیزوں کو محبوب بنادیا گیا ہے اور ان کی تزئین کرکے ان کی محبوبیت میں اضافہ کردیا گیا ہے۔ گویا یہ حقیقت واقعہ کے ایک پہلو کی تصدیق ہے۔ اس لئے کہ انسان کی شخصیت میں ان چیزوں کی طرف میلان اور رغبت رکھی گئی ہے۔ یہ اس کے اصل وجود اور اس کی ذات کا حصہ ہے۔ اس بات کی ضرورت نہیں ہے کہ انسان خواہ مخواہ اس حقیقت کا انکار کرے۔ نہ خود انسان اپنی ذات میں ان میلانات اور رجحانات کو قابل اعتراض سمجھے۔ اس کرۂ ارض پر انسانی زندگی کی ترقی اور نشوونما کیلئے ان میلانات کا موجود ہونا ازبس ضروری ہے جیسا کہ اس موضوع پر اس سے پہلے ہم مفصل بحث کر آئے ہیں۔ لیکن یہ بھی حقیقت واقعہ ہے کہ انسان کی فطرت کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے' جو ان میلانات اور فطری رجحانات میں توازن پیدا کرتا ہے اور وہ ایک قسم کا چوکیدار' جو انسان کو ان میلانات میں مستغرق ہونے سے بچاتا ہے۔ اور یہ پہلو انسان کے عالم بالا کے ساتھ روحانی تعلق کو قائم رکھتا ہے۔ چنانچہ اس کی زندگی میں روحانی معنویت اور روحانی ہدایت پائی جاتی ہے۔ اور یہ پہلو انسانی کی روحانی زندگی کا پہلو ہے جو اس کے اندر بلندی کی استعداد پیدا کرتا ہے۔ اس کے اندر ضبط نفس کی قوت پیدا ہوجاتی ہے۔ اور اس کے نتیجے میں انسان ان' دنیاوی مرغوبات کے استعمال میں ایک حد اعتدال پر قائم رہتا ہے۔ ایسی حدود کے اندر جس میں نفس کی تعمیر ہو۔ زندگی کا نشوونما ہو اور اس کے ساتھ ساتھ یہ جدوجہد بھی جاری رہے کہ انسانی زندگی کو حیوانیت کے نچلے مقام سے بلند کرکے عالم بالا کے روحانی افق تک پہنچایا جائے۔ انسان کے دل کا تعلق عالم بالا سے قائم ہو اور اس کا ہدف دار آخرت اور اللہ کی رضامندی ہو۔ نفس انسانی کی یہ دوسری جبلت' اس کی پہلی فطری جبلت کو مہذب بناتی ہے۔ اور اس کو تمام حیوانی آمیزشوں سے پاک کرتی ہے۔ اور اسے ایسے حدود وقیود کے اندر بند کردیتی ہے جس کے نتیجے میں فطری میلانات سرکش نہیں ہوتے اور انسان صرف دنیاوی لذات کا گرویدہ نہیں ہوجاتا۔ اس طرح کہ اس کی انسانی' روحانی قدریں دب جائیں۔ تقویٰ خدا خوفی اور زندگی کی اونچی اقدار کی راہیں بالکل مسدود ہوجائیں۔

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ "لوگوں کیلئے مرغوبات نفس کو مزین بنادیا گیا ہے۔" بس یہ مرغوبات مستحب ہیں اور لذیذ ہیں' یہ مکروہ اور غلیظ نہیں ہیں۔ انداز تعبیر ایسا ہے کہ جس سے ان مرغوبات کی غلاظت اور کراہت کا اظہار نہیں ہوتا۔ آیت صرف ان چیزوں کے مزاج اور ان کی حقیقت سمجھانا چاہتی ہے۔ اور ان کے اثرات کا اظہار مقصود ہے۔ نیز یہاں مطلوب یہ ہے کہ ان اشیاء کی قدر و قیمت اور ان کے مقام کا تعین کر دیا جائے' تاکہ وہ اس مقام سے آگے نہ بڑھ سکیں۔ نہ وہ ان اقدار پر دست درازی کر سکیں جو ان کے مقابلے میں اعلیٰ و ارفع ہیں۔ انسان صرف ان دنیاوی شہوات میں غرق ہو کر نہ رہ جائے بلکہ اس کی نظریں دار آخرت پر مسلسل لگی ہوں' اگرچہ وہ بقدر ضرورت ان لذات سے بھی لطف اندوز ہوتا رہے۔

یہاں آکر معلوم ہو جاتا ہے کہ اسلام فطرت انسانی کو ایک حقیقت واقعہ کے طور پر لیتا ہے اور فطری میلانات کا مناسب لحاظ رکھتا ہے۔ اور وہ ان میلانات کو مہذب اور شائستہ بناتا ہے۔ اور ان کو رفعت دیتا ہے۔ وہ کسی صورت میں بھی ان میلانات کی بیخ کنی نہیں کرتا' جو لوگ آج کل علم النفس کے مضمون میں میلانات کی بیخ کنی کے نقصانات بیان کرتے ہیں یا وہ نفسیاتی الجھنوں پر بحث کرتے ہیں جو جذبات کی بیخ کنی کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہیں۔ وہ اس بات کی تائید کرتے ہیں کہ نفسیاتی الجھن جذبات کی بیخ کنی سے پیدا ہوتی ہے' وہ جذبات کے ضبط اور تہذیب سے پیدا نہیں ہوتی اور بیخ کنی کا مفہوم یہ ہے تقاضائے فطرت کو گندگی سمجھا جائے اور اس کے ارتکاب کو برا سمجھا جائے۔ ایسا کرنے کا انجام یہ ہوتا ہے کہ ایک فرد مختلف سمتوں سے مختلف قسم کے دو میلانات کے دباؤ میں آجاتا ہے۔ ایک طرف اس کے شعور اور ضمیر کا دباؤ ہوتا جس کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ انسان ان فطری خواہشات کے پورا کرنے سے اجتناب کرے۔ اور یہ شعور اور میلان اس کے نظریہ حیات' اس کے مذہب یا اس کے رسم و رواج کے نتیجے میں پیدا ہوتا ہے۔ مثلاً یوں کہ اس کا نظریہ یہ ہو کر فطری میلانات تمام کے تمام گندے ہیں۔ ان کا وجود ہی نہیں ہونا چاہئے' اور در حقیقت وہ شیطانی میلانات ہیں۔ لیکن ہوتا یہ ہے کہ کوئی نظریاتی یا کوئی مذہبی شعور کبھی بھی ان فطری رجحانات کے دبانے میں کامیاب نہیں ہوا۔ اس لئے کہ یہ میلانات فطری ہوتے ہیں اور فطرت کے اندر اس کی گہری جڑیں ہوتی ہیں۔ نیز ان کا تعلق بسا اوقات وظیفہ بقائے انسانیت سے ہوتا ہے۔ ان کے بغیر بقائے انسانیت کا فرض ادا ہی نہیں کیا جا سکتا۔ انسانی فطرت میں' اللہ تعالیٰ نے یہ میلانات یونہی عبث طور پر نہیں ودیعت کئے۔ اس کشمکش کے نتیجے میں نفسیاتی الجھن پیدا ہوتی ہے۔ اگر ہم ان نفسیاتی مباحث کو تسلیم بھی کر لیں تب بھی یہ بات نظر آئے گی کہ اسلام نے بہت پہلے فطرت انسانی کے ان دونوں رجحانات و میلانات کے اندر توازن پیدا کیا ہے۔ اس نے شہوت اور لذت اور اخلاقی بلندی اور پاکیزگی کے درمیان ایک حسین توازن پیدا کر کے دونوں کو اپنے اپنے مقام پر حدود و اعتدال کے اندر کام کرنے کی اجازت دی ہے۔[1]

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَ الْبَنِيْنَ وَ الْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَ الْفِضَّةِ وَ الْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَ الْاَنْعَامِ وَ الْحَرْثِ ؕ

"لوگوں کیلئے مرغوبات نفس' عورتیں' اولاد' سونے اور چاندی کے ڈھیر' چیدہ گھوڑے' مویشی اور زرعی زمینیں بڑی خوشنما بنادی گئی ہیں۔"

عورتیں اور بچے انسانی خواہشات میں سے بہت ہی قوی اور شدید خواہشات ہیں۔ اور ان کے ساتھ ساتھ سونے اور چاندی کے ڈھیروں کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ زیادہ سے زیادہ دولت جمع کرنے کو وَ الْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ .... سے بیان کیا گیا ہے۔ اور اگر

[1] دیکھئے محمد قطب کی کتاب الانسان بین المادیہ والاسلام۔

صرف مال و دولت کی مذمت مطلوب ہوتی تو بِیْنَ الْاَمْوَالِ .... کا لفظ ہوتا ہے مِنَ الذَّهَبِ وَ الْفِضَّةِ .... ہوتا لیکن قناطیر مقنطرۃ یعنی مال و دولت اور سونے چاندی کے ڈھیر کے الفاظ ایک خاص شیڈ دیتے ہیں۔ اور یہ سونے اور چاندی کے زیادہ سے زیادہ ذخار کا مطلب یہ ہے ایک کہ دولت کا جمع کرنا بذات خود ایک مرغوب چیز ہے۔ رہے اس کے فوائد تو وہ سب کو معلوم ہیں یعنی یہ ڈھیر ایک انسان کیلئے ہر قسم کے شہوات کی فراہمی کا سبب بنتے ہیں۔ عورتوں' اولاد اور ڈھیر سے سونے چاندی کے ساتھ ساتھ یہاں وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ .... کا ذکر کیا گیا یعنی چیدہ گھوڑے۔ گھوڑے' جس طرح آج کے اس مادی اور صنعتی دور میں بھی محبوب سواری تصور ہوتے ہیں۔ اس دور میں نہایت ہی محبوب اور مرغوب ہوتے تھے۔ اور یہ اس لئے کہ ان میں حسن و جمال بھی ہوتا ہے۔ وہ پرشوکت اور سریع الحرکت ہوتے ہیں۔ ان میں ذہانت اور اپنے مالک کے ساتھ بے حد محبت بھی ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ جن لوگوں نے عملاً گھوڑ سواری نہیں کی ہوتی انہیں بھی اسے دیکھ کر خوب مزہ آتا ہے۔ جب تک ان میں اس قدر زندگی موجود ہو کہ وہ ایک مضبوط اور جوان گھوڑے کو دیکھ کر خوش ہوتے ہوں۔

اس کے بعد ان مرغوبات کے ساتھ ساتھ دوسرے مویشیوں اور زرعی اراضی کا ذکر کیا' مویشی اور زرعی اراضی کے درمیان چولی دامن کا تعلق ہوتا ہے۔ اس لئے ان کا ایک ساتھ ذکر ہوا۔ ذہن میں بھی وہ ساتھ ہوتے ہیں اور حقیقت واقعہ میں بھی۔ مویشی اور کھیت اور تروتازہ کھیت' جہاں نشوونما کا کام جاری رہتا ہے۔ انسان کے پسندیدہ ترین مرغوبات ہیں۔ اس لئے کہ ان کھیتوں میں سے زندگی پھوٹ کر نکلتی ہے۔ اور یہ ایک عجیب نظارہ ہوتا ہے۔ بہت ہی پسندیدہ اور جب اس منظر کے ساتھ یہ شعور بھی وابستہ ہو جاتے کہ اس کھیت اور اس میں چلتی جوڑی کا میں مالک بھی ہوں تو واقعی یہ ایک فطرتاً پسندیدہ منظر ہوتا ہے۔

یہاں جن مرغوبات کا ذکر کیا گیا ہے۔ وہ مرغوبات نفس کا ایک ادنیٰ نمونہ ہے۔ ان میں سے بعض ایسی مرغوبات ہیں جو اس سوسائٹی میں اعلیٰ ترین مرغوبات تھیں جس سے قرآن کریم اس دور میں خطاب کر رہا تھا اور بعض مرغوبات ایسی ہیں جو ہر زمانے میں نفس انسانی کیلئے مرغوب ہیں۔ اسلام ان مرغوبات کا ذکر کرتا ہے' ہر ایک کی قدر و قیمت متعین کرتا ہے۔ تاکہ یہ مرغوبات اپنی جگہ پر قائم رہیں اور زندگی کی دوسری قدروں پر دست درازی نہ کریں۔

ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا .... "یہ دنیا کی چند روزہ زندگی کے سامان ہیں۔" یہ تمام مرغوبات جو پیش کی گئیں یا ان کے علاوہ جو دوسری فطرتاً پسندیدہ چیزیں ہیں' یہ دنیا کی چند روزہ حیات کیلئے سازو سامان ہیں' جو اعلیٰ و ارفع اور دائمی زندگی کا سامان نہیں ہیں' نہ یہ ان آفاق عالیہ تک انسان کو بلند کرتے ہیں۔ یہ تو قریب ہی زمین کے اوپر زندہ رہنے کے اسباب ہیں۔ لیکن جو شخص اس سے بہتر مرغوبات چاہتا ہے ان سب مرغوبات سے زیادہ قیمتی' زیادہ بلند اور پاکیزہ مقاصد چاہتا ہے اور اس لئے چاہتا ہے کہ وہ ان مرغوبات ارضی اور شہوات نفسی میں مستغرق ہی نہ ہو جائے اور بلندیوں تک اونچا ہونے کی بجائے زمین پر ہی پڑا نہ رہے تو جو شخص فی الواقعہ اس دنیائے ادنیٰ سے کہیں بلند آشیانے کی تلاش میں ہے تو قرآن کریم اس مقام بلند تک بھی اس کی راہنمائی یوں کرتا ہے۔

قُلْ اَؤُنَبِّئُكُمْ بِخَيْرٍ مِّنْ ذٰلِكُمْ ۭ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَّ رِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ

"کہو! میں تمہیں بتاؤں کہ ان سے زیادہ اچھی چیز کیا ہے؟ جو لوگ تقویٰ کی روش اختیار کریں' ان کیلئے ان کے رب کے پاس باغ ہیں' جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ وہاں انہیں ہمیشگی کی زندگی حاصل ہوگی۔ پاکیزہ بیویاں ان کی رفیق ہوں گی اور اللہ کی رضا سے وہ

سرفراز ہوں گے۔ اللہ اپنے بندوں کے رویے پر گہری نظر رکھتا ہے۔"

یہ ہے آخرت کا سازو سامان' جس کا تذکرہ قرآن مجید کرتا ہے اور رسول خدا ﷺ کو حکم دیا جاتا ہے کہ آپ اہل تقویٰ مؤمنین کو اس کے بارے میں خوشخبری دیدیں۔ نعیم اخروی بھی عموماً انسانی خواہش ہی سے تعلق رکھتی ہیں لیکن اس کے اور اس دنیاوی انعام و اکرام کے درمیان ایک بہت ہی بڑا فرق بھی ہے۔ یہ ایک ایسا سازو سامان ہے جس تک صرف ان لوگوں کی رسائی ہوگی' جو اس دنیا میں اہل تقویٰ تھے' جس کے دل خوف خدا سے بھرے تھے۔ ان کے دل یاد الہٰی سے معمور تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ خدا خوفی کا شعور بیک وقت روحانی دنیا اور حسی دنیا کی اصلاح کرتا ہے۔ وہ نفس انسانی کو شہوات میں مستغرق ہونے سے بچاتا ہے۔ اس کی حفاظت کرتا ہے کہ وہ ان مرغوبات میں جانوروں کی طرح گم نہ ہو جائے۔ جن لوگوں کے دلوں میں خوف خدا ہوتا ہے وہ عالم آخرت کے ان حسی مرغوبات کو بھی غلیظ حسی لذتیت کے مقام سے ذرا بلند کر کے دیکھتے ہیں۔ اسے جانوروں کی طرح کی شہوت رانی سے ذرا اونچا مقام دیتے ہیں۔ وہ اس زمین پر رہتے ہوئے اپنے دلوں میں اس مقام رفیع کی تمنا رکھتے ہیں' اس سے قبل کہ وہ اس جہاں فانی سے کوچ کریں اور رخصت ہوں۔

عالم آخرت کے اس پاک وصاف اور کامل و مکمل سازو سامان میں' اس دنیائے دنی کی ترک کردہ شہوات کا بہترین بدلہ ہے۔ بلکہ وہ انعام ان شہوات سے بہت زیادہ ہے۔ اس دنیا میں اگر وہ ان کھیتوں کے مالک تھے' جو سرسبز و شاداب تھے اور اچھی پیداوار دیتے تھے تو آخرت میں انہیں ایسے باغات دیئے جائیں گے جو مکمل ہوں گے' جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی۔ اور اس شعور اور یقین کے ساتھ ہوں گے کہ وہ ان باغوں میں ہمیشہ کیلئے ہوں گے اور وہ باغ بھی دائمی طور پر سرسبز ہوں گے جو موسمی نہ ہوں گے۔ اس دنیا کے موسمی کھیت کی طرح نہ ہوں گے۔ اگر دنیا میں عورتیں اور بچے ہیں تو وہاں بہت ہی پاکیزہ بیویاں ہیں۔ اور ان کی پاکیزگی گویا دنیاوی بیویوں کے مقابلے میں ایک امتیاز ہے اور بہتری ہے۔ رہے چیدہ گھوڑے' مویشی' کھیت اور سونے چاندی کے ڈھیر' تو اس دنیا میں یہ وسائل عیش تھے۔ فراہمی مرغوبات کا سبب تھے۔ قیامت میں ان کی ضرورت ہی نہ ہوگی۔ اس لئے کہ وہاں وسائل رغبت کی فراوانی ہوگی۔ اور وہ اپنی بڑی تعداد میں حاصل ہوں گے' پس وسائل کی کیا ضرورت جب مراد حاصل ہو۔

اور وہاں پر سازو سامان سے بھی ایک عظیم نعمت ہوگی۔ یعنی رب ذوالجلال کی رضامندی۔ یہ رضامندی اس قدر عظیم نعمت ہے جو اس پوری دنیا کی شہوات اور پوری آخرت کی مرغوبات پر بھی بھاری ہے۔ اور پھر ذرا لفظ رضوان پر غور کریں' بذات خود لفظ رضوان کس قدر خوش کن ہے۔ تروتازہ ہے۔ انس و محبت کی خوشبو لئے ہوئے ہے۔

وَ اللّٰهُ بَصِیْرٌۢ بِالْعِبَادِ .... "اور اللہ اپنے بندوں پر گہری نظر رکھتا ہے۔" .... وہ خوب جانتا ہے کو ان کی فطرت کی اصل حقیقت کیا ہے؟ اس میں کیا کیا میلانات ہیں' اس میں کیا کیا متضاد میلانات ہیں' اس فطرت کو کن کن ہدایات کی ضرورت ہے۔ وہ بھی اس کے علم میں ہیں' وہ فطرت انسانی کے امور کے فیصلے کی اچھی بصیرت رکھتا ہے' اس جہاں میں بھی اور آخرت میں بھی' اس لئے کہ وہ صانع فطرت ہے۔

یہاں اب اللہ تعالیٰ' اپنے خاص بندوں کی صفات گنواتے ہیں' یہ کہ اب آپ کے ساتھ ان کا تعلق کیسا ہوتا ہے۔ اور وہ کیا اعمال ہوتے ہیں جن کی بنا پر بندے جنتوں کے ان انعامات کے مستحق ہو جاتے ہیں۔

اَلَّذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اِنَّنَآ اٰمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَ قِنَا عَذَابَ النَّارِ الصّٰبِرِیْنَ وَ الصّٰدِقِیْنَ وَ الْقٰنِتِیْنَ وَ الْمُنْفِقِیْنَ وَ الْمُسْتَغْفِرِیْنَ بِالْاَسْحَارِ

"یہ وہ لوگ ہیں' جو کہتے ہیں کہ مالک! ہم ایمان لائے' ہماری خطاؤں سے درگزر فرما' اور ہمیں آتش دوزخ سے بچا' یہ لوگ صبر کرنیوالے ہیں راستباز ہیں' فرماں بردار اور فیاض ہیں اور رات کی آخری گھڑیوں میں اللہ سے مغفرت کی دعائیں مانگا کرتے ہیں۔" ان کی دعاؤں میں انکے منہ سے جو بات نکلتی ہے وہ ان کے تقویٰ اور خدا خوفی کا نتیجہ ہوتی ہے وہ خدا سے ڈر کر پہلے ایمان کا اعلان کرتے ہیں۔ پھر ایمان کو عند اللہ اپنا شفیع بناتے ہیں اور مغفرت طلب کرتے ہیں او اپنے آپ کو آگ سے بچاتے ہیں۔

ان کی تمام صفات میں سے' انسانی زندگی کی اقدار میں سے ایک اعلیٰ قدر کا ذکر ہے۔ خصوصاً جماعت مسلمہ کیلئے ان اقدار کی بہت اہمیت ہے۔وہ صبر کرنیوالے ہیں' صبر میں انسان ہر رنج والم کو برداشت کرتا ہے۔ اور دعوت اسلامی کی راہ میں جو بھی مشکلات درپیش ہوں ان پر ثابت قدم رہتا ہے۔ دعوت اسلامی کی راہ میں اپنے فرائض سرانجام دیتا ہے۔ وہ اللہ کے سامنے تسلیم و رضا کا پیکر بن جاتا ہے اور حالات اس پر مصائب کے جو پہاڑ بھی توڑیں وہ اللہ کے حکم پر راضی برضا ہوتا ہے۔ وہ سچے ہیں۔ اس لئے کہ سچائی اس کائنات کی بنیاد ہے۔ سچائی کا دامن تھام کر وہ عام لوگوں سے اونچے ہو جاتے ہیں۔ جھوٹ کا خلاصہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کسی فائدے کیلئے یا کسی ضرر سے بچنے کے لئے سچائی چھوڑ دیتا ہے۔

اور فرمان بردار ہیں' یوں حق الوہیت ادا کرتے ہیں اور اپنی جانب سے واجبات بندگی پر کاربند ہوتے ہیں۔ اور صرف اللہ کی بندگی کرتے ہیں جس کے سوا اور کسی کی بندگی ان کے تصور حیات میں نہیں ہے۔

انفاق فی سبیل اللہ کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ انسان دولت کے ہاتھوں ذلیل نہیں ہوتا۔ اور اسے بخل سے نجات ملتی ہے۔ اور انفاق کر کے ایک شخص عملاً انسانی اخوت کو ذاتی خواہش اور لذت پر ترجیح دیدیتا ہے اور وہ ایسے اجتماعی تحفظ کی فضا پیدا کرتا ہے جو سب انسانوں کیلئے خوشگوار ہو۔

اور رات کے آخر پہر اللہ سے اپنے گناہوں کا استغفار تو ایک ایسا مقام ہے' جہاں گھنی اور خوشگوار چھاؤں' جس کی فضا تروتازہ ہے اور لفظ "**اسحار**" تو اس خاص وقت یعنی طلوع فجر سے قدرے پہلے کی ایسی خوشگوار اور پرسکون تصویر کشی کرتا ہے جو اپنی جگہ لاجواب ہے۔ یہ ایک ایسا وقت ہوتا ہے جب کائنات نہایت ہی پرسکون ہوتی' فضا صاف ہوتی ہے' اس وقت نفس انسانی کے روحانی تصورات جاگ اٹھتے ہیں۔ اچھے خیالات کا ذہن و قلب پر القاء ہوتا ہے۔ اس پرکیف فضا میں جب انسان کی جانب سے بارگاہ الٰہی میں استغفار ہو رہا ہو' تو پھر اس کا پرتو بھی نفس انسانی پر نہایت ہی روحانی اثرات ڈالتا ہے۔ اس وقت انسان کی روح اور اس کائنات کی روح رب کائنات اور خالق انسان کے سامنے ہم سبق اور ہم سمت ہو جاتی ہیں۔

ایسے صابروں' ایسے صداقت شعاروں' ایسے ہی اطاعت گزاروں' ایسے ہی دولت نثاروں اور ایسے بخشش کے طلبگاروں کا یہ حق ہوتا ہے کہ اللہ کی رضامندی ان کا استقبال کرے اس لئے کہ وہ اس کے مستحق ہوتے ہیں۔ اس لئے کہ اللہ کی رحمت کی چھاؤں گھنی ہوتی ہے۔ اور اس کا پھل تروتازہ ہوتا ہے۔ اور وہ ہر لذت اور ہر شہوت سے اپنے اندر زیادہ مٹھاس رکھتی ہے۔ اگر ذوق سلیم ہو۔

یوں قرآن کریم' اس زمین کے اوپر سے اسے مخلوق ارضی سمجھتے ہوئے' نفس انسانی کی راہنمائی شروع کرتا ہے۔ آہستہ آہستہ اسے بلند کرتا ہے اور اسے ایک بلند افق پر ملاء اعلیٰ کی روشنیوں تک لے جاتا ہے' اور یہ عمل بڑے آرام سے' بڑی تسلی سے' بڑی نرمی اور شفقت سے وقوع پذیر ہوتا ہے۔ اس روحانی ترقی میں انسان کی فطرت اور اس کے فطری میلانات کو پوری طرح مدنظر رکھا جاتا ہے۔ اس میں اس کی جسمانی کمزوریوں اور ناتوانیوں کا بھی خیال رکھا جاتا ہے۔ اس محبت اور اس کے شوق کو بھی جوش دلایا جاتا ہے۔ اور اس میں کسی فطری جذبے کی بیخ کنی نہیں کی جاتی اور نہ ہی اسے کسی کام پر مجبور کیا جاتا ہے۔ اس مہم کے دوران عام زندگی رواں دواں رہتی ہے۔ اس

میں تعطل پیدا نہیں کیا جاتا۔ یہ ہے فطرت اللہ ' یہ ہے اللہ کا نظام حیات ' اس فطرت کیلئے اور اللہ اپنے بندوں کے حال سے اچھی طرح خبردار ہے۔ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ!

☆......☆......☆......☆......☆

یہاں تک تو اس سورت کا ہدف یہ تھا کہ عقیدۂ توحید کو نکھار کر رکھ دیا جائے۔ یوں کہ خدا ایک ہے۔ وہی اس کائنات کو تھامے ہوئے ہے۔ دنیا میں آنے والے رسول بھی ایک ہیں اور انکی رسالت بھی ایک ہی اکائی ہے۔ اور یہ بتایا گیا تھا کہ آیات الٰہی اور افکار الٰہیہ کے بارے میں اصل اہل ایمان کا رویہ کیا ہوتا ہے اور جن لوگوں کے دلوں میں ٹیڑھ ہوتی ہے وہ ان افکار و آیات کتاب کے ساتھ کیا رویہ اختیار کرتے ہیں۔ انحراف کرنیوالوں کو اپنے انجام بد سے ڈرایا گیا اور اس سلسلے میں ان کی توجہ ماضی اور حال کے منحرفین کے انجام بد کو بطور مثال پیش کیا گیا۔ اس کے بعد یہ بتایا گیا کہ عقیدۂ توحید اور اسلامی نظریۂ حیات ایک فطری نظام ہے اور اس میں فطری میلانات کا بھی خیال رکھا جاتا ہے۔ لیکن متقین کی نظران سے بلند ہوتی ہے اور وہ ہر وقت اپنے رب کے سامنے گڑگڑاتے ہیں۔

لیکن اب یہاں سے لیکر اس سبق کے اختتام تک ایک دوسری حقیقت سے ہمیں روشناس کرایا جاتا ہے۔ اور یہ دوسری حقیقت عقیدۂ توحید اور اسلامی نظریۂ حیات کا ایک لازمی نتیجہ ہے۔ اگر پہلی حقیقت ہے تو دوسری کو بھی موجود ہونا چاہئے۔ وہ یہ کہ حقیقت توحید کا مصداق اور مظہر ہماری زندگیوں میں ہونا چاہئے۔ یہ تمام باتیں اس سبق کے آنے والے حصے میں بیان کی گئی ہیں۔

پہلے حصہ اول کے خلاصے کو پھر ذہین نشین اور مستحضر کیا جاتا ہے تاکہ اس کے نتائج دوسری حقیقت کے ذریعہ مرتب ہوں ' اس حصے کا آغاز اس شہادت سے کیا جاتا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی الہٰ نہیں ہے۔ اس عقیدہ کی شہادت فرشتے بھی دیتے آئے ہیں اور اصحاب العلم بھی اس کی تصدیق کرتے آئے ہیں۔ الٰہ ہونے کے ساتھ ساتھ اللہ قوام بھی ہے یعنی اس کائنات کا نگہبان ' اور اس کی قیومیت کا یہ مفہوم ہے کو وہ اس کائنات اور اس کے اندر انسان دونوں کو عدل کے مطابق چلاتا ہے۔ اور جب یہ بات مسلم ہے کہ اللہ ہی الٰہ اور قیوم ہے تو پھر دوسری بات خود بخود مستلزم ہو جاتی ہے کہ یہ اللہ کی بندگی کا اقرار کریں۔ یہ بندگی صرف اس کی ہو ' اس کا حکم تمام انسانوں کی زندگی میں نازل ہو ' اس کے مطابق فیصلے ہوں ' تمام بندے اللہ کے سامنے سر تسلیم خم کریں۔ اس کے سامنے جھکیں ' اس ہستی کی اطاعت کریں جو قیوم ہے۔ اس کی نازل کردہ کتاب اور اس کے رسول کی سنت پر عمل پیرا ہوں۔

اس دوسری حقیقت کا اظہار یوں کیا گیا　إِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْإِسْلَامُ .... "اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے۔" اس لئے اللہ اسلام کے سوا کوئی دین قبول نہیں فرماتے ' اور اسلام کیا ہے۔ وہ سر تسلیم خم کرنا ' اطاعت کرنا اور ہر معاملے میں اتباع کرنا ہے۔ اس لئے اللہ کے ہاں مقبول دین صرف عقلی تصور نہیں ہے۔ نہ صرف تصدیق بالقلب دین ' دین یہ ہے کہ اس تصور حیات اور اس تصدیق و یقین کے تقاضے بھی پورے کئے جائیں اور تقاضے یہ ہیں کہ لوگ اپنے تمام امور میں شریعت کے مطابق فیصلے کریں۔ اور پھر شریعت جو فیصلہ کرے اسے بطیب خاطر قبول کریں اور اس نظام میں رسول خدا کی اطاعت کریں۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم بڑے تعجب خیز انداز میں اہل کتاب کے بارے میں اس حقیقت کا اظہار کرتا ہے کہ وہ دعویٰ تو یہ کرتے ہیں کہ وہ اللہ کے دین پر ہیں لیکن ان کا رویہ یہ ہے کہ جب انہیں اللہ کی کتاب کی طرف بلایا جاتا ہے کہ آؤ اس کے مطابق فیصلہ کریں تو ان میں سے ایک گروہ روگردانی کرتا ہے جس سے ان کے دعوائے دین کی قلعی کھل جاتی ہے اور وہ باطل ہو جاتا ہے　　اللہ کے نزدیک مقبول دین صرف اسلام ہے ' اور اسلام بغیر سر تسلیم خم کرنے کے نہیں ہے۔ اسلام یہ ہے کہ رسول خدا کی اطاعت ہو اور امور زندگی میں فیصلے کتاب اللہ کے مطابق ہوں۔

یہاں اللہ کتاب سے اعراض اور روگردانی کی علت کا ذکر بھی کر دیا گیا ہے' اور اسکی ایسی حسی اور واقعی تعبیر کی گئی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سرے سے دین پر ایمان ہی نہیں رکھتے۔ اس لئے کہ وہ یوم الحساب کے عدل و انصاف کے تصور پر پوری طرح یقین نہیں رکھتے۔ وہ اس لئے کہ ان کا خیال تھا' کہ انہیں دوزخ کی آگ میں صرف چند دن ہی رہنا ہو گا اس لئے کہ وہ اہل کتاب ہیں اور ان کے دین کے معاملے میں انہیں ان عقیدوں نے فریب میں ڈالدیا تھا جو انہوں نے جھوٹے طور گھڑے ہوئے تھے۔" اور یہ ان کیلئے عجیب دھوکہ تھا' غرض اس وقت وہ نہ اہل کتاب ہیں اور نہ اہل دین ہیں۔ نہ مومن ہیں کیوں؟ اس لئے کہ جب انہیں بلایا جاتا ہے کہ آؤ تمہاری کتاب کے مطابق کسی قضیئے کا فیصلہ کریں تو وہ منہ موڑ کر بھاگتے ہیں۔

غرض قرآن کریم اس قطعیت اور جزم کے ساتھ دین کا مفہوم اور دین کی حقیقت یہاں بیان کرتا ہے۔ اس لئے تمام لوگوں کی جانب سے اب اللہ کے ہاں مقبول دین صرف دین اسلام ہے جو واضح' صاف اور قطعی ہے۔ یعنی دین اسلام اور اسلام کا معنی ہے کتاب اللہ کے مطابق عدالتوں میں فیصلہ کرنا اور اس کے بعد اسے تسلیم کرنا اور اس پر عمل کرنا ہے۔ اگر کوئی ایسا نہیں کرتا تو وہ دین دار نہیں ہے۔ وہ مسلم نہیں ہے۔ گرچہ وہ دعوائے دین کرے اور دعوائے اسلام کرے۔ اللہ تعالیٰ دین کی جو حد بیان فرماتے ہیں' جو تعریف کرتے ہیں' جس کی تائید کرتے ہیں وہ وہی ہے جو اوپر ہم نے بیان کیا اور اللہ دین کی تعریف بیان کرنے میں کسی انسان کی خواہش کے تابع نہیں' وہ جس طرح جانتا ہے۔

نہ صرف یہ بلکہ جو شخص کفار کو دوست بناتا ہے۔ (اور سیاق کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ کفار وہ ہیں جو عدالتوں کے اندر کتاب اللہ کے مطابق فیصلے نہیں کرتے۔) تو اس کا اللہ کے ساتھ کوئی تعلق نہ ہو گا۔" کسی معاملے میں بھی وہ اللہ سے متعلق نہ ہو گا۔ اس کے اور اللہ کے درمیان کوئی رابطہ نہ رہا۔ یعنی صرف اس لئے کہ اس شخص نے کافروں سے دوستی کی' یا کافروں کی نصرت کی یا کافروں سے نصرت طلب کی۔ اور کافر وہ جو اللہ کی کتاب پر اپنی عدالتوں میں فیصلے نہیں کرتے۔ اگرچہ زبانی طور پر وہ دعویٰ کریں کہ وہ دین اللہ پر ہیں۔

کفار کی دوستی سے اس قدر سختی سے منع کیا جاتا ہے کہ اگر تم باز نہ آئے تو اس سے تمہارا دین اپنی اساس سے ختم ہو جائے گا۔ اور قرآن کریم اس تنبیہہ اور ڈراوے کے ساتھ ساتھ انہیں اچھی طرح سمجھاتا بھی ہے۔ مسلمانوں کو یہ بصیرت دی جاتی ہے کہ وہ اللہ ہی اس پوری کائنات میں اصل متصرف فی الامور ہے۔ وہ سردار ہے۔ اور اسی کے تصرف میں تمام امور ہیں۔ وہی مالک الملک ہے۔ وہ جسے چاہتا ہے ملک عطا کرتا ہے جس سے چاہتا ہے ملک لے لیتا ہے۔ جسے چاہتا ہے عزت دیتا ہے جس سے چاہتا ہے عزت واپس لے لیتا ہے۔ اور لوگوں کی زندگی کے امور میں اس کا یہ تصرف بھی اس تکوینی تصرف کا ایک حصہ ہے' جو وہ اس کائنات کو چلانے کیلئے کرتا ہے۔ دیکھئے' وہ رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے۔ وہ مردہ چیزوں سے زندہ چیزوں کو نکالتا ہے اور زندہ چیزوں سے مردہ چیزیں نکالتا ہے۔ اور یہی اس کا قیام بالعدل ہے۔ جس کے ساتھ وہ انسانوں کو بھی تھامے ہوئے ہے۔ اور کائنات کو بھی تھامے ہوئے ہے۔ اس لئے اہل ایمان کو کیا ضرورت ہے کہ وہ اللہ کو چھوڑ کر کفار کے ساتھ دوستیاں قائم کریں۔ چاہے اہل کفار کی قوت بہت زیادہ ہو' ان کا مال بہت زیادہ ہو اور اولاد بہت زیادہ ہو۔

اس تکرار اور موکد ڈراوے اور تنبیہہ سے اس بات کا اظہار ہوتا ہے کہ اس وقت تو خیر جماعت مسلمہ پر اس نکتے کی اچھی طرح وضاحت نہ ہوئی تھی۔ اور اس وقت اہل اسلام میں سے بعض لوگوں نے اپنے سابقہ خاندانی' قومی اور اقتصادی روابط بحال رکھے ہوئے تھے۔ یہ روابط مشرکین مکہ اور یہودیان مدینہ کے ساتھ بیک وقت تھے۔ اس لئے دین اسلام کی یہ تفسیر کی گئی اور انہیں ان اہل کفر کے ساتھ دوستانہ روابط نہ رکھنے کا حکم دیا گیا۔ نیز اس آیت سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے' دنیا میں انسان انسان کی ظاہری قوتوں کی طرف میلان رکھتا ہے' ان

سے متاثر ہوتا ہے' اس لئے انہیں بتایا جاتا ہے کہ اصلی قوت کون ہے' اصلی حقیقت ان لوگوں کی کیا ہے' اور یہ کہ اسلامی نظریہ حیات کیا ہے۔ اور اس کے تقاضے کیا ہیں یعنی عملی زندگی میں۔

اور اس سبق کا خاتمہ اس قطعی فیصلے پر ہوتا ہے کہ اسلام اللہ اور رسول کی اطاعت کا نام ہے اور یہ کہ اللہ کی جانب چلنے کا واحد راستہ یہ ہے کہ رسول خدا کی اطاعت کی جائے۔ صرف یہ کافی نہیں ہے کہ کلمہء شہادت پر دل سے مجرد یقین کر لیا جائے' اور زبان سے اس کا اقرار کر لیا جائے۔ فرماتے ہیں "کہہ دیجئے' اگر تم اللہ کو محبوب رکھتے ہو تو میری اطاعت کرو اللہ تمہیں محبوب رکھے گا۔" ....

"کہہ دو' اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو' اگر وہ اس سے منہ پھیرلیں' تو جان لو کہ اللہ کافروں کے ساتھ محبت نہیں رکھتا۔" .... پس یا تو اتباع ہو گا اور مکمل تابعداری کرو گے تو اللہ بھی اسے پسند کرے گا یا پھر کفر ہو گا جسے اللہ نہایت ہی ناپسند کرتا ہے۔ یہ ہے وہ مقام جس سے ایک مسلمان اور ایک کافر کے راستے جدا ہوتے ہیں۔ اس سبق کے اس دوسرے حصے پر اب تفصیل سے غور ہو گا۔

☆......☆......☆......☆......☆

شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًۢا بِالْقِسْطِ ؕ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۱۸﴾

النصف

"اللہ نے خود اس بات کی شہادت دی ہے کہ اس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے۔ اور فرشتے اور سب اہل علم بھی راستی کے ساتھ اس پر گواہ ہیں کہ اس زبردست حکیم کے سوا فی الواقع کوئی خدا نہیں ہے۔"

یہ وہ پہلی حقیقت ہے' جس پر اسلام کے نظریاتی تصورات قائم ہیں یعنی عقیدۂ توحید' الوہیت میں توحید' قیومیت میں توحید اور یہ کہ اس کائنات کی پوری نگہبانی اصول انصاف وعدل پر منجانب اللہ ہو رہی ہے۔ اس پہلی حقیقت کے ساتھ اس سورت میں کلام کا آغاز ہوا تھا۔ اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ .... "اللہ وہ ذات ہے جس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے اور وہ زندۂ جاوید اور نگہبان ہے۔" اس آغاز سے ایک تو اسلامی عقیدۂ کا اظہار اور توضیح مقصود تھی اور دوسری جانب سے اہل کتاب کے پھیلائے ہوئے شبہات کا رد مطلوب تھا۔ ایک تو خود اہل کتاب کیلئے ان کے موروثی عقیدۂ توحید کی تشریح اور توضیح بھی مقصود تھی' دوسرے یہ کہ ان کے پھیلائے ہوئے شبہات کا جو اثر اہل اسلام پر ہو رہا تھا' اس کی توضیح بھی مقصود تھی' کیونکہ بعض اوقات اہل اسلام بھی ان سے متاثر ہو جاتے تھے۔

اللہ کی شہادت' کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے' یہ ہر اس شخص کیلئے کافی و شافی عقیدہ ہے' جو ایمان لا چکا ہے۔ یہاں سوال یہ ہے کہ اللہ کی گواہی تو ان کیلئے کافی و شافی ہو سکتی ہے۔ جو اللہ پر ایمان رکھتے ہوں' اور جو لوگ ایمان لے آئے ہوں۔ پھر ان کو شہادت کی ضرورت ہی کیا رہتی ہے۔ حقیقت واقعہ یہ ہے کہ اہل کتاب تو اللہ پر ایمان لاتے تھے لیکن وہ اس کے ساتھ ساتھ اللہ کیلئے اولاد بھی ٹھہراتے تھے اور اس کیلئے شریک بھی ٹھہراتے تھے۔ بلکہ مشرکین مکہ بھی خدا پر ایمان لاتے تھے۔ وہ گمراہ اس حوالے سے ہوتے تھے کہ وہ اللہ کے ساتھ کئی شرکاء بناتے تھے' کئی کو اللہ کے مساوی ٹھہراتے تھے۔ اللہ کیلئے بیٹے اور بیٹیوں کے قائل تھے۔ اس لئے جب قرآن کریم نے اس بات کی تصدیق کی کہ خود وہ جس خدا کے قائل ہیں وہ شہادت دے رہا ہے کہ اس کے ساتھ کوئی شریک نہیں ہے۔ للذا یہ شہادت ان کے تطہیر افکار کیلئے ایک موثر شہادت تھی۔

نیز یہ معاملہ جس طرح کہ ہم نے اس حصے سے قبل اپنے تبصرے میں اس کا جائزہ لیا ہے۔ یہ ایک بڑا ہی گہرا اور دقیق معاملہ ہے۔ یہاں اللہ تعالیٰ کی جانب سے نظریۂ توحید پر شہادت اس لئے دی گئی ہے کہ شہادت توحید کے ساتھ اس کے تقاضے بھی وابستہ ہیں اور ان تقاضوں کا ذکر بعد میں آرہا ہے۔ وہ یہ عقیدۂ توحید کے ان حاملین سے بندگی اور اطاعت بھی صرف اس وحدہ لاشریک کی متوقع ہے۔ اور وہ بندگی اور اطاعت بھی صرف اسلام کی شکل میں ہے۔ اور اسلام بھی سر تسلیم خم کردینے اور مکمل انقیاد کے معنی میں مطلوب ہے۔ اسلام سے مراد صرف شعور' تصور اور عقیدہ مراد نہیں ہے۔ بلکہ اس سے مراد عمل' اطاعت اور مکمل انقیاد بھی ہے۔ اور یہ انقیاد بھی اسلامی نظام زندگی کی اس شکل وصورت کے مطابق جو قرآن وسنت سے ماخوذ ہے۔ اس پہلو سے ہم دیکھتے ہیں کہ ہر دور اور ہر زمانے میں لوگوں کی اکثریت یہ دعویٰ کرتی ہے کہ وہ ایمان لاچکے ہیں' لیکن وہ اس اللہ کے ساتھ بے شمار غیروں کو شریک بھی ٹھہراتے ہیں' اس صورت میں جب وہ اپنے فیصلے ایسے قوانین کے مطابق کراتے ہیں جو شریعت پر مبنی نہیں' ہیں اور وہ ایسے لوگوں کی اطاعت کرتے ہیں جو اللہ اور رسول کی اطاعت نہیں کرتے' اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنے اخلاق واقدار' اپنے تصورات وافکار اور اپنے حسن وقبح کے پیمانے غیر اللہ سے لیتے ہیں' تو یہ سب باتیں ان کے اس قول سے متصادم ہوتی ہیں کہ ہم ایمان لاچکے ہیں' نیز ان کا یہ طرز عمل خود اللہ کی شہادت کے بھی منافی ہے کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے۔

اب سوال رہ جاتا ہے' ملائکہ اور علماء کی شہادت کا' تو اس کا مفہوم یہ ہے کہ علماء اور ملائکہ مکمل طور پر اللہ اور کے اوامر ونواہی کی اطاعت کرتے ہیں' وہ صرف اللہ سے ہدایات لیتے ہیں۔ اور اللہ کی جانب سے جو کچھ نازل ہوتا ہے اس کی پیروی کرتے ہیں۔ نہ اس کے بارے میں بحث ومناظرہ کرتے ہیں۔ اور نہ ہی اس میں کسی قسم کا شک کرتے ہیں۔ بشرطیکہ یہ ثابت ہو جائے کہ یہ بات من جانب اللہ ہے۔ اس سورت میں اولو العلم کا حال بیان کرتے ہوئے یہ فرمایا گیا تھا۔ وَالرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ يَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ ۙ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا ۚ .... "اور علم میں جو لوگ پختہ کار ہیں وہ کہتے ہیں ہم ایمان لائے ہیں' سب کچھ ہمارے رب کی طرف سے ہے۔ یہ ہے اہل علم اور فرشتوں کی شہادت یعنی تصدیق' اطاعت اتباع اور انقیاد' اور فرشتوں' اہل علم کی شہادت کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے اور وہ عدل وانصاف کے ساتھ قائم ہے۔ یعنی عدل وانصاف ایک ایسی صفت ہے جو اس کی شان الوہیت کے ساتھ وہ قائم ولازم ہے۔"

شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًۢا بِالْقِسْطِ ؕ

"اللہ خود اس بات کی شہادت دیتا ہے کہ اس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے اور فرشتے اور سب اہل علم بھی شہادت دیتے ہیں کہ اللہ راستی اور انصاف کے ساتھ قائم ہے۔" جس طرح عبارت نص سے معلوم ہوتا ہے قائما بالقسط ایسی حالت ہے جو شان الوہیت کے ساتھ لازم ہے۔ اور یہ اس بات کی وضاحت ہے جو اس سے پہلے سورت میں کہا گیا کہ اللہ قیوم اور نگہبان ہے' مطلب یہ ہوا کہ اس کی نگہبانی عدل پر قائم ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اس جہان کے چلانے کیلئے جو تدابیر اختیار کی ہیں' یا یہاں لوگوں کی زندگی کے قیام ودوام کیلئے جو تدابیر اختیار کی ہیں وہ عدل وانصاف کے اصولوں پر کی ہیں۔ اس لئے لوگوں کی زندگیوں میں عدل تب ہی قائم ہو سکتا ہے جب ان کی زندگیاں کتاب اللہ کی شریعت پر استوار ہوں' جس طرح اس کائنات کو نوامیس فطرت کے عادلانہ اصولوں پر قائم کیا گیا ہے اور وہ استوار ہے۔ صرف اسی صورت میں انسان اور فطرت کائنات ہم آہنگ ہو کر چل سکتے ہیں' شریعت وہ نظام ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں بیان کیا ہے۔ اگر یہ نہ ہو گا تو اس جہان میں عدل وانصاف نہ ہو گا اور یہاں توازن واعتدال قائم نہ ہو سکے گا۔ اس کائنات کی چلن اور انسان کی چلن کے درمیان

تطابق اور ملامت نہ ہوگی۔ نتیجہ ظلم' افتراق اور قوتوں کے ضیاع کی صورت میں بر آمد ہوگا۔

انسانی تاریخ شاہد عادل ہے کہ اس میں انسانیت نے عدل و انصاف کا مزہ صرف انہیں ادوار میں چکھا جن میں صرف کتاب اللہ کی حکمرانی رہی۔ اور ان کی زندگی اسطرح منظم اور استوار ہوئی جس طرح اس زمین کی گردش منظم اور استوار ہے۔ اس قدر جس قدر انسانی فطرت کیلئے ممکن ہو۔ یعنی فطرت انسانی کے رجحانات اطاعت اور رجحانات معصیت کے درمیان توازن ہو۔ اور ان دونوں پلڑوں کے درمیان توازن ہو۔ اور انسان اسلامی نظام زندگی کے قیام اور کتاب اللہ کی حکمرانی کی صورت میں اللہ کی اطاعت کی طرف مائل ہو۔ اگر انسانی زندگی پر کوئی ایسا نظام حکمران ہو۔ جو خود انسان نے بنایا ہو تو اس میں لازماً انسانی جہالت کا دخل ہوگا۔ انسان کے تصور اور ادراک کا قصور اس میں شامل ہوگا۔ اور اس کے نتیجے میں یہ نظام کسی نہ کسی شکل میں ظلم اور تضاد کا شکار ہوگا۔ کبھی ایک فرد پوری سوسائٹی پر ظلم ڈھائے گا اور کبھی ایک سوسائٹی ایک فرد پر ظلم کر رہی ہوگی' یا کبھی ایک طبقہ دوسرے طبقات پر ظلم کر رہا ہوگا یا ایک قوم دوسری اقوام پر ظلم کر رہی ہوگی یا ایک نسل دوسری نسل پر ظلم کر رہی ہوگی۔ رہا اسلامی نظام زندگی تو وہ ان تمام میلانات و رجحانات سے پاک ہوتا ہے۔ اس لئے کہ اللہ سب کا الٰہ ہے۔ اور اس پر اس ارض و سماء میں کوئی راز مخفی بھی نہیں ہے۔

لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ .... "اس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے۔ وہی غالب ہے اور وہی حکیم ہے۔" یہاں اس آیت کے اس ٹکڑے میں دوبارہ وحدت الٰہیت کو دو اہم صفات کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ ایک صفت یہ کہ وہ غالب ہے قوت والا ہے اور دوسری یہ کہ وہ حکیم ہے اور قدرت و حکمت دونوں ایسی صفات ہیں جن کا موجود ہونا اللہ کی شان عدل و نگہبانی کے لئے ضروری ہے۔ اس لئے کہ عدل کا مفہوم یہ ہے کہ حقدار کو حق ملے اور اسے حق دلایا جاسکے۔ اور اللہ کی صفات کا تصور یہ ہے کہ وہ مثبت کارکردگی کا شعور دیتی ہیں۔ اس لئے کہ اسلام کے تصور خدا میں کوئی سلبیت نہیں ہے۔ ایجاب ہی ایجاب ہے' اور یہ تصور خدا تعالیٰ کا سب سے مکمل تصور ہے۔ سب سے سچا تصور ہے' اور یہ تصور خود اللہ تعالیٰ نے اپنے حوالے سے پیش کیا ہے۔ اور اس مثبت اور ایجابی فعالیت کا اثر انسان پر یہ ہوتا ہے کہ انسان کا دل اللہ کے ارادے سے متعلق ہو جاتا ہے۔ اس لئے انسان کا عقیدہ زندہ اور موثر عقیدہ ہوتا ہے' وہ محض خشک تصور ہی نہیں ہوتا بلکہ اس کے اندر فعالیت اور تروتازگی ہوتی ہے۔

☆......☆......☆......☆......☆

اب اس حقیقت پر جسے اس ایک آیت میں دوبارہ دہرایا گیا' اس کا فطری نتیجہ مرتب کیا جاتا ہے وہ یہ کہ خدا ہی ایک ہے تو پھر بندگی اور انقیاد بھی صرف اسی خدا کیلئے ہے۔

اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ ۗ وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًاۢ بَيْنَهُمْ ۗ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿١٩﴾ فَاِنْ حَآجُّوْكَ فَقُلْ اَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلّٰهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ ۗ وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْاُمِّيّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ ۗ فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ ۗ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿٢٠﴾

۲ ع ۱۱ ۱۰

"اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے۔ اس دین سے ہٹ کر جو مختلف طریقے ان لوگوں نے اختیار کئے' جنہیں کتاب دی گئی تھی۔ ان کے اس طرز عمل کی کوئی وجہ اس کے سوا نہ تھی کہ انہوں نے علم آجانے کے بعد آپس میں ایک دوسرے پر زیادتی کرنے کیلئے ایسا کیا اور جو کوئی اللہ کے احکام وہدایات کی اطاعت سے انکار کردے' اللہ کو اس سے حساب لینے میں دیر نہیں لگتی۔ اب اگر یہ لوگ تم سے جھگڑا کریں' تو ان سے کہو۔ "میں نے اور میرے پیروؤں نے تو اللہ کے آگے سر تسلیم خم کر دیا ہے۔" پھر اہل کتاب اور غیر اہل کتاب دونوں سے پوچھو۔ "کیا تم نے بھی اس کی اطاعت اور بندگی قبول کی؟" اگر کی تو راہ راست پا گئے۔ اور اگر اس سے منہ موڑا تو تم پر صرف پیغام پہنچا دینے کی ذمہ داری تھی۔ آگے خود اللہ اپنے بندوں کے معاملات دیکھنے والا ہے۔"

غرض تصور یہ ہے کہ ایک الٰہ ہے۔ اس لئے ایک ہی نظام ہے' پھر اس الٰہ کے سامنے سر تسلیم خم کرنا ہے۔ نہ ان کے تصور میں اس کے سوا کوئی تصور ہو' نہ ان کی زندگی کا کوئی گوشہ اس نظام سے آزاد ہو.......... جب اللہ ایک ہے تو پھر بندگی اور انقیاد بھی اسی کیلئے ہے۔ اور یہی اللہ اس بات کا حقدار بھی ہے کہ لوگ اس کے مطیع فرمان ہوں' ان کے قانونی نظام میں شریعت نافذ ہو اور ان کی اقدار حیات اور حسن وقبح کے پیمانوں میں یہ شریعت معیار ہو۔ اور ان کی پوری عملی زندگی اس شریعت پر قائم ہو۔

اگر ایک اللہ ہے تو پھر تصور حیات بھی ایک ہی ہو گا۔ اور یہ تصور و نظریہ وہی ہو گا جسے اس الٰہ نے اپنے بندوں کیلئے پسند کیا ہے۔ یعنی خالص عقیدۂ توحید چمکتا ہوا اور صاف ستھرا۔

جس طرح ہم مکرر کہہ آئے ہیں کہ عقیدۂ توحید کا پہلا تقاضا یہ ہے۔ إِنَّ الدِّينَ عِندَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ .... اللہ کے نزدیک نظام زندگی صرف اسلام ہے۔ اور اسلام صرف دعویٰ ہی نہیں ہے۔ وہ صرف جھنڈے کا نام بھی نہیں ہے۔ وہ صرف نعرے کا نام بھی نہیں ہے' وہ صرف ایک تصور اور خیال کا نام بھی نہیں ہے جہاں پر دل مطمئن ہو' اور نہ وہ صرف انفرادی عبادات کا نام ہے جنہیں ایک فرد بطور فرد ادا کرتا ہے۔ مثلاً نماز' حج اور روزے' ایسا ہرگز نہیں ہے۔ صرف یہ امور وہ اسلام نہیں ہیں جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں اس کے سوا کوئی دین قبول نہیں کرتا۔ بلکہ اسلام تو مکمل انقیاد کا نام ہے۔ اسلام مکمل عبادت کا نام ہے۔ وہ مکمل اتباع ہے۔ اسلام یہ ہے کہ عدالتوں میں کتاب اللہ کے مطابق فیصلے ہو رہے ہوں' جس کی تفصیلات عنقریب آرہی ہیں۔

اسلام یہ ہے خدا کو وحدہ لا شریک سمجھا جائے۔ یہ عقیدہ پختہ ہو کہ اس کائنات کو وہی تھامنے والا ہے۔ جبکہ اہل کتاب ذات باری اور ذات مسیح میں خلط کرتے تھے۔ بلکہ وہ اللہ کے ارادے اور مسیح کے ارادے میں بھی خلط کرتے تھے۔ اور اس موضوع پر خود ان کے درمیان کئی فرقے تھے اور ہر فرقے کا اپنا عقیدہ تھا۔ اور ان کے یہ اختلافات بعض اوقات اس قدر شدید ہو جاتے تھے کہ وہ قتل و غارت پر منتج ہوتے تھے۔ اس لئے یہاں اللہ تعالیٰ اہل کتاب اور جماعت مسلمہ کو بتاتے ہیں کہ ان اختلافات اور فکری ژولیدگی کا اصل سبب کیا تھا۔

وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ إِلَّا مِن بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ ۗ

"اور اس دین سے ہٹ کر جو مختلف طریقے ان لوگوں نے اختیار کئے جنہیں کتاب دی گئی تھی' ان کے اس طرز عمل کی کوئی وجہ اس کے سوا نہ تھی کہ انہوں نے علم آجانے کے بعد' آپس میں ایک دوسرے پر زیادتی کرنے کیلئے ایسا کیا۔"

یہ اختلافات اس لئے نہ تھے کہ انہیں حقیقت واقعہ کا پتہ نہ تھا' کیونکہ اس کے پاس اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کے بارے میں فیصلہ کن معلومات آگئی تھیں کہ اللہ صرف ایک ہے' انسان کی فطرت یہ ہے کہ وہ صرف بندہ ہے' معبود نہیں ہے۔ یہ جو انہوں نے شدید اختلافات پیدا کئے یہ محض ایک دوسرے پر زیادتی کرنے کی خاطر کئے۔ ایک دوسرے پر ظلم اور دست درازی کیلئے جواز پیدا کیا گیا۔ ان کیلئے اللہ کے نظام عدل و انصاف میں کوئی جواز نہ تھا' اسلامی نظریۂ حیات اور سماوی شریعت یا سماوی کتب میں ایسے اختلافات کیلئے

کوئی جواز نہ تھا۔

اس سے قبل ہم مسیحی مورخ کا حوالہ دے چکے ہیں جس میں ہم نے بتایا کہ عیسائیوں کے ہاں سیاسی تحریکات کس طرح جان بوجھ کر مذہبی اختلافات پیدا کرتی تھیں اور یہودی اور عیسائی افکار کے درمیان اختلافات بھی اسی قبیل کے تھے۔ ہم یہ پڑھ چکے ہیں کہ مصر اور شام کے درمیان یہ مذہبی منافرت کس قدر پھیلی ہوتی تھی۔ شام میں چونکہ رومی سلطنت کی حکمرانی تھی۔ اس لئے مصریوں نے اس سیاسی نفرت کی وجہ سے رومی کیتھولک مکتب کو چھوڑ کر دوسرا مکتب فکر اپنایا۔ یا جس طرح روم کے قیصروں میں سے بعض نے یہ کوشش کی کہ تمام عیسائی مکاتب فکر ایک متوسط مکتبہ فکر پر متفق ہو جائیں 'تاکہ ان کے زیر اقتدار رعایا کے درمیان فکری اتحاد پیدا ہو جائے' ان کا خیال تھا ایسے مذہب سے سب کے مقاصد پورے ہو جائیں گے۔ گویا عقیدہ ایک کھیل تھا اور اسے بڑی آسانی سے سیاسی اور ملکی مقاصد کیلئے بدلا جاسکتا تھا۔ حالانکہ درحقیقت یہ ایک عظیم ظلم تھا۔ اور یہ ظلم اور تعدی وہ ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کیا کرتے تھے۔

یہی وجہ ہے کہ اسی حرکت پر اللہ تعالیٰ کی جانب سے سخت سرزنش ہوتی ہے اور ٹھیک مناسب وقت پر وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ .... "اور جو کوئی اللہ کی ہدایات اور احکام کی اطاعت سے انکار کر دے' اللہ کو اس سے حساب لینے میں کچھ دیر نہیں لگتی۔" یہاں اللہ تعالیٰ نے عقیدۂ توحید میں اختلاف کرنے کو کفر سے تعبیر فرمایا' اور اہل کفر کو تنبیہ کی اور خوف دلایا کہ میں بہت جلد حساب لینے والا ہوں۔ اس لئے کہ اگر زیادہ مہلت دوں تو یہ لوگ اختلافات اور کفر والحاد میں مزید سرگرداں رہیں گے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ اپنے نبی کو حکم دیتے ہیں کہ آپ ان لوگوں سے فیصلہ کن بات کر دیں۔ یعنی اہل کتاب اور غیر اہل کتاب سب سے تاکہ ان کے ساتھ بات چیت فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہو جائے۔ اور اس کے بعد اسے ختم کر دیا جائے' اور آپ اپنے واضح راستے پر اکیلے گامزن ہو جائیں۔

فَاِنْ حَآجُّوْكَ فَقُلْ اَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلّٰهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ ؕ وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْاُمِّيّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ ؕ فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿۲۰﴾

"اگر یہ لوگ تم سے جھگڑا کریں' تو ان سے کہو' "میں نے اور میرے پیروؤں نے تو اللہ کے آگے سر تسلیم خم کر دیا ہے۔" پھر اہل کتاب اور غیر اہل کتاب دونوں سے پوچھو: "کیا تم نے بھی اس کی اطاعت اور بندگی قبول کی؟" اگر کی تو وہ راہ راست پا گئے۔ اور اگر اس سے منہ موڑا تو تم پر صرف پیغام پہنچا دینے کی ذمہ داری تھی ...... آگے اللہ خود اپنے بندوں کے معاملات دیکھنے والا ہے۔"

اب مزید وضاحت کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ بہت کچھ کہہ دیا گیا' اس لئے اب یا تو تم لوگ اللہ وحدہ کی الوہیت کا اعتراف کرو' اس کی نگہبانی کا اعتراف کرو اور نتیجۃً اتباع اور انقیاد کرو ورنہ پھر تمہیں اس کا کوئی حل نہ ملے گا۔ اور یہ مباحثہ یونہی جاری رہے گا۔ اور تم توحید اور اسلام سے محروم رہو گے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ رسول خدا کو صرف ایک لفظ ایسا بتاتے ہیں جو بیک وقت نظریۂ حیات اور نظام زندگی کا مظہر ہے۔ اور وہ یہ کہ اگر پھر بھی یہ لوگ تم سے جھگڑیں تو تم صاف کہہ دو کہ ہم نے اس کے آگے سر تسلیم خم کر دیا ہے۔ اَسْلَمْتُ وَجْهِيَ .... میں اسلام لایا اور میرے متبعین بھی' یہاں اہل ایمان کو متبعین کہہ کر اشارہ اس طرف مطلوب ہے کہ اسلام صرف تصدیق ہی نہیں ہے۔ اس کے بعد اتباع بھی ضروری ہے' اسی طرح یہ تعبیر کہ میرا چہرہ اللہ کے سامنے جھک گیا ہے۔ اس لئے کہ اسلام محض قول و اقرار کا نام بھی نہیں ہے۔ نہ صرف عقیدے اور تصور کا نام ہے۔ اس کے مفہوم میں انقیاد بھی داخل ہے۔

اتباع اور اطاعت بھی داخل ہے۔ چہرے کا مطیع ہونا مقصد ہے مکمل انقیاد و اتباع' اس لئے کہ انسان کے جسم میں چہرے کو اعلیٰ مقام حاصل ہے۔ چہرے مہرے ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کس قدر مطیع 'متبع' فرماں بردار اور بروقت عمل کے لئے چاق و چوبند ہے۔

یہ ہے خود حضرت محمد ﷺ کا اعتقاد اور آپ کا نظام زندگی 'نظام مصطفیٰ' اور مسلمان تو ہیں ہی وہ لوگ جو اس کے تبع اور مقلد ہیں' اس کے اعتقاد میں بھی اور اس کے عمل میں بھی اس لئے اب یہ اہل کتاب اور غیر اہل کتاب سے پوچھا جائے۔ اب سوال کیا جائے جو دونوں کیمپوں کے درمیان واضح حد بندی کر دے۔ دونوں کے درمیان حد فاصل قائم کردے۔ جس میں کوئی اشتباہ نہ رہے اور دونوں کے درمیان کوئی فکری اختلاط و التباس نہ رہے۔

وَ قُلْ لِّلَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَ الْاُمِّیّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ‌ؕ .... "اہل کتاب اور امیوں (غیر اہل کتاب) سے کہو: 'کیا تم نے بھی سر تسلیم خم کر دیا؟'"......... یہاں اہل کتاب اور غیر اہل کتاب کا فرق اب ختم کر دیا جاتا ہے۔ اب دونوں ایک ہی مقام پر کھڑے ہیں۔ اہل کتاب اور مشرکین دونوں کو دعوت اسلام دی جاتی ہے اور یہ دعوت اسلام اسی مفہوم کے ساتھ ہے۔ جس کی تشریح ہم کرتے ہیں۔ انہیں دعوت دی جاتی ہے کہ وہ عقیدۂ توحید قبول کریں اللہ کی ذات میں اور اس کی قیومیت اور نگہبانی میں' اس کے بعد انہیں دعوت دی جاتی ہے کہ وہ اس عقیدے کو اپنانے کے بعد پھر مطیع فرمان ہو جائیں اور اطاعت یہ ہوگی کہ وہ اپنی پوری زندگی میں فیصلے کتاب اللہ کے مطابق کریں' اسلامی نظام زندگی کو اپنائیں فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدِ اهْتَدَوْا‌ۚ .... اگر انہوں نے یہ اطاعت قبول کرلی تو راہ راست پا گئے۔"

معلوم ہوا کہ ہدایت کا ظہور صرف ایک ہی شکل میں ہوتا ہے یعنی اسلام کی صورت میں یعنی اس کی اس ماہیت اور اس طبیعت کے مطابق' اس کے سوا کوئی اور صورت نہیں ہے' کوئی دوسرا تصور نہیں ہے' کوئی دوسرا طریق کار نہیں اور نہ کوئی دوسرا ایسا منہاج ہے جس کے ذریعہ ہدایت اب حاصل کی جاسکتی ہو۔ اس کے سوا جو بھی اور راستے ہیں وہ سب ٹیڑھے ہیں' وہ سب حیرانی و پریشانی کے راستے ہیں۔ وہ سب زیغ و ضلال کے راستے ہیں۔

وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَیْكَ الْبَلٰغُ‌ؕ .... "اگر وہ منہ موڑیں تو تم پر صرف پیغام پہنچانے کی ذمہ داری ہے۔" پیغام پہنچانے کے بعد رسول کی ذمہ داری ختم ہو جاتی ہے۔ آپ کا کام ختم ہو جاتا ہے اور یہ اس وقت کی بات ہے جب آپ کو ان لوگوں کے ساتھ قتال کی اجازت نہ دی گئی تھی جو اسلام قبول نہیں کرتے یہاں تک کہ وہ باز آجائیں' بعد کا حکم یہ تھا کہ وہ یا تو مکمل انقیاد اختیار کرلیں اور اسلامی نظام کے مطیع ہو جائیں یا پھر وہ معاہدہ کریں اور جزیہ ادا کر کے اسلامی نظام کے تابع ہو جائیں پھر وہ آزاد ہیں اس لئے کہ اسلام میں عقائد تبدیل کرنے کا کوئی جبر نہیں ہے۔

وَ اللّٰهُ بَصِیْرٌۢ بِالْعِبَادِ .... "اللہ اپنے بندوں کے معاملات سے اچھی طرح باخبر ہے۔"

وہ اپنے علم اور بصیرت کے مطابق ہی ان کے معاملات کو چلاتا ہے اور ان کے تمام امور اسی کے ہاتھ میں ہیں ہر حال میں' اس لئے وہ اپنے بندوں کو اندھیرے میں نہیں رکھتا۔ اور وہ انہیں صاف صاف بتاتا ہے کہ ان کا انجام کیا ہوگا۔ وہ بتاتا ہے کہ گزشتہ تاریخ انسانیت میں اللہ کے باغیوں اور نافرمانوں کا انجام کیا ہوتا ہے اور اب بھی اس کی سنت وہی ہے۔ فرماتے ہیں۔ :

اِنَّ الَّذِیْنَ یَكْفُرُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ وَ یَقْتُلُوْنَ النَّبِیّٖنَ بِغَیْرِ حَقٍّ‌ۙ وَّ یَقْتُلُوْنَ الَّذِیْنَ یَاْمُرُوْنَ بِالْقِسْطِ مِنَ النَّاسِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ

﴿۲۱﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۡ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴿۲۲﴾

"وہ لوگ جو اللہ کی ہدایات و احکامات ماننے سے انکار کرتے ہیں اور اس کے پیغمبروں کو ناحق قتل کرتے ہیں اور ایسے لوگوں کی جان کے درپے ہو جاتے ہیں' جو خلق خدا سے راستی اور عدل کا حکم دینے کیلئے اٹھیں' ان کو دردناک سزا کی خوشخبری سنادو' یہ وہ لوگ ہیں جن کے اعمال دنیا و آخرت دونوں میں ضائع ہوگئے۔ اور ان کا مددگار کوئی نہیں۔"

یہ ہے ان لوگوں کا حتمی انجام' ان کیلئے دردناک عذاب ہوگا' یہ عذاب دنیا و آخرت دونوں میں ہوگا۔ یہاں بھی وہ اس کی توقع کریں اور آخرت میں تو یقینی ہے ہی........ دنیا اور آخرت میں ان کے اعمال باطل ہوں گے' بے اثر ہوں گے۔ یہ عجیب تصویر کشی ہے' حبوط کا لغوی معنی ہے۔ کسی مویشی' زہریلی گھاس چر کر پھول جانا ہے۔ بظاہر تو اس صورت میں ایک مویشی کا خوب موٹا تازہ ہو جاتا ہے' لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ آخر کار برباد اور ہلاک ہو جاتا ہے' یہاں بظاہر تو ان کے بڑے بڑے کارنامے ہیں لیکن قیامت میں ان کا کوئی فائدہ نہ ہوگا اور نہ ان کا کوئی حامی و مددگار ہوگا۔

قرآن کریم نے آیات الٰہی کا انکار کے ساتھ ساتھ انبیاء ؑ کے قتل کا ذکر بھی کیا۔ جو ناحق قتل کیے گئے' اس لئے کہ قتل انبیاء ؑ کے ساتھ کبھی حق یکجا نہیں ہوسکتا۔ اور ساتھ ہی یہ ذکر کیا کہ وہ لوگ ان افراد کو بھی قتل کرتے تھے جو عدل و انصاف کا حکم دیتے تھے۔ یعنی وہ لوگ انہیں اس لئے قتل کرتے تھے کہ وہ اس نظام الٰہی کے قائل اور داعی تھے جو عادلانہ نظام تھا۔ اور اس کے سوا کسی دوسرے نظام کے ذریعہ عدل کا قیام ممکن ہی نہ تھا۔ ان تمام صفات کے ذکر سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ یہ توبیخ اور تخویف یہود کیلئے تھی۔ کیونکہ یہ ان کی تاریخی صفات ہیں اور ان صفات کے ساتھ وہ مشہور ہیں۔ جہاں بھی ان کا ذکر ہو ذہن ان کی طرف جاتا ہے۔ لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ اس میں نصاریٰ سے خطاب ہو کیونکہ نزول قرآن کے زمانے تک انہوں نے بھی اپنے مذہب کے مخالفین کو ہزاروں کی تعداد میں قتل کیا تھا۔ کیونکہ جو شخص بھی رومی سلطنت کے سرکاری مذہب کے خلاف ہوتا تھا وہ اسے قتل کر دیتے تھے۔ ان میں وہ مسیحی بھی شامل تھے جو توحید کے قائل تھے۔ اور حضرت عیسیٰ ؑ کو بشر سمجھتے تھے۔ اور یہ لوگ ایسے تھے جو نظام حکومت میں عدل و انصاف کی پرچار بھی کرتے تھے۔ یہود و نصاریٰ کے علاوہ یہ حکم ہر زمان و مکان میں تمام ان لوگوں پر صادق آتا ہے جو اس قسم کے متشددانہ حرکات کا ارتکاب کرتے ہیں اور ہر دور میں کبھی بھی ایسے لوگوں کی کمی نہیں رہی ہے۔

یہاں یہ بات سمجھنے کے قابل ہے کہ قرآن کے یہ الفاظ "وہ لوگ جو آیات کا انکار کرتے ہیں۔" سے مراد کیا ہے۔ ان سے مراد صرف یہ نہیں ہے کہ کوئی آیات الٰہی کا انکار کر کے کلمہ کفر ادا کر دے۔ اس لفظ کے مفہوم میں یہ شامل ہے کہ کوئی وحدت اللہ یا عقیدہ توحید کا قائل نہ ہو' پھر وہ صرف اللہ کی بندگی کا قائل نہ ہو۔ اور اس میں یہ بات از خود آجاتی ہے کہ کوئی اس مصدر اور منبع کا قائل نہ ہو جہاں سے انسانی زندگی کیلئے قانون سازی کی جاتی ہے اور حسن و قبح کی اقدار کا تعین کرنا ہے یعنی کتاب اللہ کا' اس لئے جو شخص ان امور میں بھی اللہ کے ساتھ کسی اور کو شریک کرے گا وہ بھی مشرک تصور ہوگا اور الوہیت کا منکر شمار ہوگا۔ اگرچہ وہ فقط زبان سے اسے ایک ہزار بار جھپتا رہے۔ اس مفہوم کا اظہار آنے والی آیات میں ملے گا۔

☆......☆......☆......☆......☆

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ أُوتُوا نَصِيبًا مِّنَ الْكِتَابِ يُدْعَوْنَ إِلَىٰ كِتَابِ اللَّهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ يَتَوَلَّىٰ فَرِيقٌ مِّنْهُمْ وَهُم مُّعْرِضُونَ ﴿٢٣﴾ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوا لَن تَمَسَّنَا النَّارُ إِلَّا أَيَّامًا مَّعْدُودَاتٍ ۖ وَغَرَّهُمْ فِي دِينِهِم مَّا كَانُوا يَفْتَرُونَ ﴿٢٤﴾ فَكَيْفَ إِذَا جَمَعْنَاهُمْ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيهِ وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ﴿٢٥﴾

"تم نے دیکھا نہیں کہ جن لوگوں کو کتاب کے علم میں سے کچھ حصہ ملا ہے۔ ان کا حال کیا ہے؟ انہیں جب کتاب الٰہی کی طرف بلایا جاتا ہے' تاکہ وہ ان کے درمیان فیصلے کرے' تو ان میں سے ایک فریق اس سے پہلوتہی کرتا ہے اور اس فیصلے کی طرف آنے سے منہ پھیرتا ہے۔ ان کا یہ طرز عمل اس وجہ سے ہے کہ وہ کہتے ہیں۔ "کہ آتش دوزخ تو ہمیں مس تک نہ کرے گی اور اگر دوزخ کی سزا ہم کو ملے گی بھی تو بس چند روز" ان کے خود ساختہ عقیدوں نے ان کو اپنے دین کے معاملے میں بڑی غلط فہمیوں میں ڈال رکھا ہے۔ مگر کیا بنے گی ان پر جب ہم انہیں اس روز جمع کریں گے جس کا آنا یقینی ہے؟ اسی روز ہر شخص کو اس کی کمائی کا بدلہ پورا پورا دیدیا جائے گا اور کسی پر ظلم نہ ہو گا۔"

یہ سوال سوالیہ ہے اور اسی سے ان کے اس عجیب اور متضاد موقف کی تشہیر مطلوب ہے۔ یہ موقف ان لوگوں نے اختیار کیا ہے جنہیں کتاب الٰہی کا ایک حصہ بھی خوش قسمتی سے ملا۔ مثلاً یہود کو تورات اور عیسائیوں کو انجیل کی شکل میں' اور یہ کتابیں کتاب اللہ کا حصہ اس اعتبار سے ہیں کہ کتاب اللہ تو وہ تمام ریکارڈ ہے جو اللہ کی طرف سے کسی بھی زمان و مکان میں کسی نبی پر اترا۔ کیونکہ خدا کے ہاں اللہ بھی ایک ہے۔ نگہبانی بھی ایک ہے۔ اور حقیقتاً کتاب بھی ایک ہے۔ یہود و نصاریٰ کو تو اس کا ایک حصہ ملا اور مسلمانوں کو پوری کتاب ملی۔ اس لئے کہ قرآن کریم اصول الدین کا جامع ہے۔ اور سابقہ کتب کی توثیق کرتا ہے۔ یہ سوال ان لوگوں سے کیا گیا جنہیں کتاب کا ایک حصہ دیا گیا۔ تاکہ وہ کتاب ان کے درمیان برپا شدہ اختلافات کا بھی فیصلہ کردے۔ ان کے تمام امور حیات میں وہ فیصلہ کن ہو۔ ان کی معیشت اور معاش میں وہ فیصلہ کن ہو۔ تو وہ اس دعوت کو قبول نہیں کرتے۔ ان کا ایک فریق اس سے پیچھے ہٹ منہ موڑ دیتا ہے۔ اور کتاب الٰہی اور شریعت الٰہیہ کے مطابق فیصلے نہیں کرتا لہٰذا یہ ایک ایسا موقف ہے جو ایمان کے خلاف ہے اور وہ ان کے اس دعوے کے بھی خلاف ہے کہ وہ اہل کتاب ہیں۔

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ أُوتُوا نَصِيبًا مِّنَ الْكِتَابِ يُدْعَوْنَ إِلَىٰ كِتَابِ اللَّهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ يَتَوَلَّىٰ فَرِيقٌ مِّنْهُمْ وَهُم مُّعْرِضُونَ

"تم نے دیکھا نہیں کہ جن لوگوں کو کتاب کے علم میں سے کچھ حصہ ملا ہے۔ ان کا حال کیا ہے؟ انہیں جب کتاب الٰہی کی طرف بلایا جاتا ہے' تاکہ وہ ان کے درمیان فیصلے کرے' تو ان میں سے ایک فریق اس سے پہلوتہی کرتا ہے اور اس فیصلے کی طرف آنے سے

منہ پھیرتا ہے۔"

اسی طرح اللہ تعالیٰ بعض اہل کتاب کے طرز عمل پر تعجب کا اظہار فرماتے ہیں 'سب کے نہیں بعض کے طرز عمل پر کہ انہیں یہ دعوت دی جاتی ہے کہ وہ اپنے نظریاتی امور میں اور اپنے عملی امور میں کتاب الٰہی کی طرف رجوع کریں اور اس کا انکار کردیں۔ وہ یہ انکار مسلمان ہوتے ہوئے کیسے کرسکتے ہیں' مسلمان بھی ہیں اور شریعت کو انہوں نے اپنی زندگی سے بدر کیا ہوا ہے۔ اور یہ یقین پھر بھی کئے جارہے ہیں کہ وہ مسلم ہیں۔ یہ تعجب انگیز سوال اس لئے کیا جارہا ہے تاکہ مسلمان بھی سمجھ لیں کہ حقیقت دین کیا ہے۔ اور حقیقت اسلام کیا ہے۔ اس لئے کہ ایسا نہ ہو کہ وہ بھی اللہ کے ہاں اضحوکہ بن جائیں اور اس کی جانب سے ایسے سوال کا سامنا کرنا پڑے۔ اہل کتاب جو اسلام کے مدعی نہیں ہیں اگر ان کا حال یہ ہوگا اگر وہ کتاب اللہ کے مطابق اپنے فیصلے نہ کرائیں تو پھر اہل اسلام کیلئے لمحہ فکر یہ ہے۔ کہ اگر وہ اپنے فیصلے اللہ کی کتاب اور شریعت کے مطابق نہیں کرتے تو وہ اللہ کی جانب سے کس قدر نکیر' استنکار' تعجب اور قابل نفرت اور مضحکہ خیزی کے مستحق ہوں گے۔ یہ ایک ایسا تعجب ہے جو رفع نہیں ہوسکتا۔ یہ ایک عظیم مصیبت ہے جس کا اندازہ نہیں کیا گیا۔ اور یہ اللہ کا اسقدر عظیم غضب الٰہی کو دعوت دینا ہے جس کے نتیجے میں ایک مسلم غضب الٰہی کا مستحق ہوسکتا ہے اور راندۂ درگاہ بھی ہوسکتا ہے۔ اور اللہ کی رحمت سے محروم بھی ہوسکتا ہے۔ العیاذ باللہ۔

ذٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ إِلَّا أَيَّامًا مَّعْدُودٰتٍ ۖ وَغَرَّهُمْ فِي دِينِهِمْ مَّا كَانُوا يَفْتَرُونَ ﴿٢٤﴾

"ان کا یہ طرز عمل اس وجہ سے ہے کہ وہ کہتے ہیں۔ "کہ آتش دوزخ تو ہمیں مس تک نہ کرے گی اور اگر دوزخ کی سزا ہم کو ملے گی بھی تو بس چند روز" ان کے خود ساختہ عقیدوں نے ان کو اپنے دین کے معاملے میں بڑی غلط فہمیوں میں ڈال رکھا ہے۔"

یہ ہے ان کے اعراض کا اصل سبب' جس کی وجہ سے وہ کتاب اللہ کے مطابق اپنے فیصلے نہیں کراتے۔ اور ان کے موقف میں یہ تناقض ان کے اس دعوے کے باوجود ہے کہ وہ اہل کتاب ہیں' دراصل وہ قیامت کے دن کے حساب و کتاب کے بارے میں سنجیدہ ہی نہیں ہیں۔ یہ عقیدہ کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن پورا پورا انصاف کریں گے۔ اس پر انہیں کوئی بھروسہ نہیں ہے اور یہ بات ان کے اس قول سے اچھی طرح ظاہر ہوتی ہے کہ دوزخ کی آگ انہیں مس تک نہ کرے گی۔ اگر کوئی سزا ہوگی بھی تو وہ چند روزہ ہوگی۔ اگر یہ حقیقت نہیں تو پھر کیوں انہیں آگ نہیں چھوئے گی۔ اور ان کو چند روزہ سزا ہی کیوں ہوگی۔ وہ اصول الدین سے کیوں پھر گئے ہیں۔ وہ کتاب اللہ کے مطابق فیصلے کیوں نہیں کراتے۔ اگر ان کا خدا کے عدل و انصاف پر یقین ہے تو پھر ان کا یہ موقف کیوں ہے؟ یہ ممکن نہیں ہے اگر انہیں یوم الآخرۃ کے حساب کا یقین ہوتا تو وہ ایسا ہرگز نہ کرتے۔ یہ دراصل وہ جھوٹ بولتے ہیں جس پر خود انہیں بھی یقین نہیں اور وہ اپنے ان خود ساختہ عقائد کے جال میں خود پھنس گئے ہیں وَغَرَّهُمْ فِي دِينِهِمْ مَّا كَانُوا يَفْتَرُونَ.........

"ان کے خود ساختہ عقیدوں نے' ان کو ان کے دین کے معاملے میں بڑی غلط فہمیوں میں ڈال دیا ہے۔"

حقیقت یہ ہے کہ اگر کسی دل میں قیام قیامت کا صحیح عقیدہ موجود ہے تو وہ شخص قیامت کے دن کے حساب و کتاب اور اللہ کی جانب سے عدل و انصاف کے بارے میں وہ سوقیانہ تصورات نہیں اپنا سکتا جو یہ لوگ اپنائے ہوئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی معقول شخص کے دل و دماغ میں خوف آخرت' اللہ کے مقابلے میں حیادارانہ موقف ہونے کے بعد یہ بات آہی نہیں سکتی کہ اسے کتاب الٰہی کے مطابق فیصلے کیلئے بلایا جائے اور وہ انکار کردے یا اعراض کردے۔

آج ہمارے دور میں بھی مسلمانوں کی حالت ایسی ہی ہے جیسا کہ اہل کتاب کی تھی۔ آج کے مسلمان بھی بزعم خود مسلمان ہیں۔ اور جب انہیں یہ دعوت دی جاتی ہے کہ آؤ کتاب اللہ کے مطابق اپنے فیصلے کرائیں اور شریعت نافذ کر دیں تو وہ روگردانی کرتے ہوئے اس بات سے انکار کرتے ہیں ان میں بعض کھاتے پیتے لوگ اس قدر بے حیا ہو گئے ہیں۔ زندگی دنیا کا نام ہے اور دنیا کے ساتھ دین کا تعلق کیا ہے۔ ان لوگوں کا خیال یہ ہے کہ لوگوں کی روز مرہ کی عملی 'اقتصادی اور اجتماعی روابط کے اندر دین کو گھسیڑنے کی ضرورت ہی کیا۔ بلکہ اب وہ کہتے ہیں کہ خاندانی زندگی میں بھی دین کی ضرورت نہیں ہے۔ اور ان خیالات کے حامل ہونے کے بعد بھی وہ مسلسل یہ دعویٰ کئے چلے جا رہے ہیں کہ وہ مسلمان ہیں۔ اس کے بعد ان میں سے بعض اس احمقانہ دھوکے میں مبتلا ہیں کہ اللہ انہیں پاک وصاف کرنے کیلئے صرف چند روز تک آگ میں ڈالے گا۔ اس کے بعد وہ جنت کی طرف لے جائے جائیں گے۔ سوال یہ ہے کہ کیا وہ مسلمان نہیں ہے۔ یہ بعینہٖ وہی توقع ہے جو بنی اسرائیل کے اہل کتاب کو لاحق تھی۔ یہ بھی وہی دھوکہ ہے جو اہل کتاب کو تھا اور دین اسلام میں اسکی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ اور یہ اہل اسلام بھی دین سے اسی طرح دور ہو گئے ہیں جس طرح اہل کتاب دور ہو گئے تھے۔ اور یہ لوگ دراصل دین سے اس طرح بسہولت نکل گئے ہیں جس طرح کسی کے ہاتھ سے مچھلی چھوٹ جاتی ہے۔ یہ اس حقیقت سے نکل گئے جسے اللہ نے پسند فرمایا تھا۔ اس لئے کہ اسلام سے مراد انقیاد اور اطاعت ہے۔ اور زندگی کے ہر شعبے میں اللہ سے ہدایت اور تعلیم لینے کا نام اسلام ہے۔

فَكَيْفَ إِذَا جَمَعْنَاهُمْ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيهِ وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ

"مگر کیا بنے گی ان پر جب ہم انہیں اس روز جمع کریں گے جس کا آنا یقینی ہے؟ اس روز ہر شخص کو اس کی کمائی کا بدلہ پورا پورا دیدیا جائے گا اور کسی پر ظلم نہ ہو گا۔" .... کیا حال ہو گا؟ یہ ایک خوفناک دھمکی ہے۔ دل مومن کانپ اٹھتا ہے' وہ سنتے ہی محسوس کرتا ہے کہ وہ دن نہایت ہی خوفناک اور سنجیدہ ہو گا' اللہ کے سامنے پیشی کا دن ہو گا۔ اس دن صحیح عدل ہو گا۔ اس دن کا تصور اور اس کا صحیح شعور ان باطل تصورات اور انکے خود گھڑے ہوئے تصورات سے کوئی میل نہیں کھاتا۔ اس تہدید اور تخویف کے بعد یہ حکم قائم ہے۔ یہ مشرکین کیلئے بھی ہے' ملحدین کیلئے بھی دعوائے اسلام رکھنے والے اہل کتاب کیلئے بھی اور آج کے مسلمانوں کیلئے بھی جو اپنی زندگیوں میں اسلام کو صحیح طرح نافذ نہیں کرتے۔ ان لوگوں کا اس دن کیا حال ہو گا جس کے آنے میں کوئی شک نہیں اور جس میں ہم ان سب کو جمع کریں گے۔ اور جس دن اللہ تعالیٰ کا نظام عدل اپنے طریقوں پر چلے گا۔ اور ہر شخص کو اس کی کمائی کا صلہ مل جائے گا۔ پورا پورا بغیر کسی ظلم اور بغیر کسی لحاظ کے کسی پر کوئی زیادتی نہ ہو گی۔ گو اللہ کے حساب میں کوئی رو رعایت ان سے نہ ہو گی۔ .... آیت میں سوال کر دیا گیا ہے' لیکن اس کا کوئی جواب نہیں دیا گیا' دل کانپ اٹھے' بدن ہل گیا اور جواب از خود آنکھوں کے سامنے تھا۔

☆......☆......☆......☆......☆

اس کے بعد ہر مومن اور خود رسول خدا ﷺ کو ہدایت کی جاتی ہے کہ وہ اللہ کی طرف متوجہ ہوں' اللہ کو اپنی الوہیت میں ایک سمجھتے ہوئے' اسے اس جہاں کا واحد نگہبان سمجھتے ہوئے' خود بشری زندگی میں بھی اور اس کائنات کی تدبیر میں بھی کیونکہ یہ دونوں پہلو اللہ کی خدائی اور اس کی حاکمیت کے مظاہر ہیں اور ان میں اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ نہ اس کا کوئی مثیل اور شبیہ ہے۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆ قُلِ اللَّهُمَّ مَالِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَن تَشَاءُ وَ

تَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ وَ تُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَ تُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ بِيَدِكَ الْخَيْرُ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (۲۶) تُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَ تُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ وَ تُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَ تُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَ تَرْزُقُ مَنْ تَشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ (۲۷)

"کہو خدایا! ملک کے مالک! تو جسے چاہے' حکومت دے اور جس سے چاہے' حکومت چھین لے' جسے چاہے' عزت دے اور جسے چاہے ذلیل کر دے' بھلائی تیرے اختیار میں ہے۔ بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے۔ تو رات کو دن میں پروتا ہوا لے آتا ہے اور دن کو رات میں' جاندار میں سے بے جان کو نکالتا ہے اور بے جان میں سے جاندار کو' اور جسے چاہتا ہے بے شمار رزق دیتا ہے۔"

یہ نہایت ہی دھیمی اور پر مشمشت آواز ہے۔ اس کی لفظی ترکیب کا دعائیہ ہے۔ لیکن اس کی روح میں گہری معنویت اور خشوع و خضوع ہے۔ اس میں اس کھلی کائنات کی کھلی کتاب پر نظر التفات ڈالی گئی ہے۔ بڑی نرمی اور بڑی محبت کے ساتھ انسان کے شعور میں ابال آتا ہے اس کو بتایا گیا ہے کہ وہ ذات باری مدبر کائنات ہے اور ساتھ ہی انسانی امور کا بھی مدبر ہے۔ اس کی ہمہ گیر تدبیر کو یکجا کر کے ایک عظیم حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ وہ عظیم سچائی یہ ہے کہ اس کائنات کا الٰہ اور نگہبان اور اس کے اندر اس انسان کا الٰہ و نگہبان ایک ہی ہیں۔ یہ انسان اس کائنات کا ایک حصہ ہے۔ وہ اس سے علیحدہ کوئی حقیقت نہیں ہے۔ اور دونوں میں اصل متصرف اللہ ہے۔ صرف اللہ کی نظام زندگی جس اس کائنات کی شان ہے۔ انسان کا فریضہ بھی یہی ہے۔ اور جس طرح یہ کائنات اللہ کے دین سے خارج نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح انسان کے لئے بھی دین الٰہی سے خارج ایک قسم کا انحراف ہے' حماقت ہے اور فساد ہے۔ اللہ فرماتے ہیں :۔

قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَ تَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ وَ تُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَ تُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ

"کہو اے ملک کے مالک! تو جسے چاہے حکومت دے اور جس سے چاہے' چھین لے' جس کو چاہے عزت دے اور جس کو چاہے ذلیل کر دے۔"

یہ وہ حقیقت ہے' جو عقیدۂ وحدالوہیت کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہے۔ ایک خدا کا مفہوم یہ ہے کہ وہی ایک مالک ہے۔ وہ مالک الملک ہے۔ اس کے ساتھ اس میں کوئی شریک نہیں ہے۔ اس کے بعد وہ اپنی جانب سے جو کچھ چاہتا ہے اور جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے اور اس کی یہ عطا عاریتاً ہوتی ہے جب چاہتا ہے اور جس سے چاہتا ہے اپنا ملک واپس لے لیتا ہے۔ اس لئے یہاں کوئی کسی چیز کا بھی اصلی مالک نہیں ہے کہ اپنی ذاتی خواہش کے مطابق اس میں تصرف کرے۔ انسانوں کی ملکیت عارضی ہے۔ عطائی ہے۔ اور یہ ان شرائط و قیود کے تحت ہے جن کے تحت عطا کنندہ نے عطا کی ہے۔ اس کی تعلیمات کے تحت حکومت اور ملکیت میں تصرف ہوگا۔ اگر عطا کنندہ کے شرائط کے خلاف تصرف کیا گیا تو وہ باطل ہوگا۔ اس دنیا میں مسلمانوں پر فرض ہے کہ وہ اس قسم کے ہر تصرف کو مسترد کر دیں اور آخرت میں خود اللہ تعالیٰ ایسے شخص سے حساب و کتاب لیں گے۔

نیز یہ اس کے اختیار میں ہے کہ وہ جسے چاہے عزت بخشے اور جسے چاہے ذلیل کر دے۔ اس کے حکم اور ارادہ کی راہ میں کوئی رکاوٹ ڈالنے والا نہیں ہے۔ اس پر کسی کا کوئی جبر نہیں اور اس کے فیصلوں کو کوئی رد کرنے والا بھی نہیں ہے۔ وہ صاحب الامر ہے۔ تمام امور اس کے ہاتھ میں ہیں۔ وہی اللہ ہے اور شرک سے پاک' اور اس کے اس اختصاص اور اس کبریائی میں اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ کی اس نگہبانی میں سب کا بھلا ہے۔ وہ اس کائنات اور انسان کی نگہبانی انتہائی عدل کے اصولوں پر کرتا ہے۔ جسے چاہتا ہے مملکت اور سلطنت دیتا ہے۔ اور جس سے چاہتا ہے لے لیتا ہے۔ اور یہ سب کچھ انصاف اور عدل کے ساتھ۔ جسے چاہتا ہے معزز بنا دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ذلیل کر دیتا ہے اور یہ سب کچھ عدل کے ساتھ۔ وہ ہر حالت میں خیر ہی خیر ہے۔ "اس کے ہاتھ میں بھلائی ہے۔"

"وہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔"

انسانی امور کی یہ نگہبانی اور انسانی معاملات کا بھلائی کے ساتھ یہ انتظام یہ سب کے سب اس کے اس عظیم اور عظیم تر کائنات کی تدبیر کا ایک حصہ ہے۔ اور اس وسیع اور عریض نظام حیات کا ایک پر تو وہ فرماتا ہے۔

تُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَ تُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ وَ تُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَ تُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَ تَرْزُقُ مَنْ تَشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ

"تو رات کو دن میں پروتا ہوا لے آتا ہے اور دن کو رات میں' جاندار میں سے بے جان کو نکالتا ہے اور بے جان میں سے جاندار کو' اور جسے چاہتا ہے بے شمار رزق دیتا ہے۔"

اس عظیم حقیقت کو ایک تصویر کشی کے انداز میں بیان کیا گیا ہے' جس کی ایک جانب قلب و شعور خوشی سے بھر جاتے ہیں اور دوسری جانب حواس اور نظر بھی مزے لیتی ہے۔ ایک غیر محسوس باہم حرکت رات اور دن کی شکل اختیار کرتی ہے۔ رات دن میں بدلتی ہے اور دن رات میں پرو دیا جاتا ہے اور شب و روز سلسلہ تسبیح کے دانے نظر آتے ہیں' مردہ سے زندہ چیز نکل رہی ہے اور زندہ سے مردہ' اور یہ حرکت اور مسلسل حرکت بلاشبہ یہ بتا رہی ہے کہ اس نظام میں خدائے حکیم کا ہاتھ ہے۔ جو شخص غور سے اور کان لگا کر سنے' اسے معلوم ہو گا کہ اس کائنات سے گہری صداقت پر مبنی آواز آ رہی ہے۔

رات کو دن میں داخل کرنے اور دن کو رات میں داخل کرنے کا مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ گرمیوں میں رات کا ایک حصہ دن میں بدل جاتا ہے اور سردیوں میں دن کا حصہ رات بن جاتا ہے اور یہ مفہوم بھی ہو سکتا ہے کہ رات کی تاریکی میں دن کی روشنی نفوذ کرتی ہے اور دن کی روشنی میں رات داخل ہوتی ہے' جو مفہوم بھی مراد ہو' لیکن اس منظر میں حسی طور پر نظر آتا ہے کہ دست قدرت ارض و سما کو حرکت دے رہا ہے اور یہ زمین جو ایک تاریک کرہ ہے وہ سورج کے روشن کرے کے سامنے اپنے محور پر گردان ہے۔ یوں تاریک حصہ روشن حصے سے بدلتا رہتا ہے اور روشن تاریک سے' یوں دھیرے دھیرے رات کی تاریکی دن کی روشنی کی طرف آ رہی ہے۔ اور دن کی روشنی رات میں بدلتی ہے۔ آہستہ آہستہ رات لمبی ہوتی ہے اور دن کو کھاتی جاتی ہے اور اسی طرح غیر محسوس طور پر دن بڑا ہوتا ہے اور رات کو کھاتا جاتا ہے۔ اور یہ ایسی حرکت ہے جس کے بارے میں کوئی انسان یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اس کی تاہیں اس کے ہاتھ میں ہیں۔ اور نہ ہی کوئی عقل مند یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ حرکت اتفاقاً کسی مدبر کی تدبیر کے بغیر ہی شروع ہو گئی۔

اسی طرح زندگی اور موت کا اعجوبہ بھی ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔ زندگی موت کی طرف بڑھتی ہے اور موت سے زندگی نمودار ہوتی ہے۔ اور یہ کام بڑے آرام اور بڑے سکون سے ہوتا ہے۔ ایک زندہ مخلوق پر جو لمحہ بھی گزرتا ہے' اس میں زندگی کے

ساتھ اس پر موت بھی طاری ہوتی رہتی ہے۔ اور اس کی زندگی کو موت کھاتی جاتی ہے۔ اور اس سے پھر حیات نمودار ہوتی ہے۔ ایک زندہ چیز سے خلئے مرتے جاتے ہیں اور ختم ہوتے جاتے ہیں۔ اور ان کی جگہ جدید خلئے پیدا ہوتے ہیں اور کام کرتے ہیں۔ اور جو خلئے مرجاتے ہیں وہ دوسرے دورے میں دوبارہ زندہ ہوتے ہیں۔ اور ان میں سے جو زندہ ہوگئے وہ دوسرے دورے میں پھر مرجاتے ہیں۔ یہ حالت تو ہے ایک زندہ کے جسم کی۔ اب موت کا دائرہ وسیع ہوتا ہے اور یہ تمام زندہ مرجاتا ہے' لیکن اس کے خلئے ذرات کی شکل اختیار کرلیتے ہیں جو دوسری ترکیب میں آتے ہیں اور دوسرے زندہ جسم میں آتے ہیں اور یہ زندگی اس میں داخل ہوتی ہے۔ یوں رات اور دن یہ دورہ یوں ہی چلتا رہتا ہے۔ اور کوئی انسان یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ وہ خود ان زندہ مخلوقات میں سے کوئی مخلوق تیار کرسکتا ہے۔ اور نہ ہی کوئی اس بات پر یقین کرسکتا ہے کہ موت و حیات کا یہ نظام از خود اتفاقاً اور مصادفتہً قائم ہوگیا ہے۔

اس پوری کائنات میں ایک حرکت جاری ہے اور ہر موجود کے جسم کے اندر ایک حرکت جاری ہے۔ یہ ایک عظیم حرکت ہے مگر نہایت ہی خفیہ' نہایت ہی گہری اور نہایت ہی لطیف' قرآن کا یہ مختصر اشارہ اس مسلسل ذات کا انکشاف کرتا ہے انسان کے دل و دماغ کو ایک اشارہ دیا جاتا ہے اور اس حرکت سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ وہ قادر ہے' از سرنو پیدا کرنے والا ہے۔ اور مدبر ہے' کوئی شخص بھی یہ سعی نہیں کرسکتا کہ وہ اپنی کسی بھی تدبیر اور بہبود میں اللہ تعالیٰ سے علیحدہ ہوجائیں جو لطیف اور مدبر ہے۔ اور کس طرح وہ اپنے لئے از خود کوئی نظام تجویز کرسکتے ہیں۔ جو خود انکی اپنی خواہش نفس پر مبنی ہوں' اس لئے کہ وہ اس کائنات کا حصہ ہیں اور اس کائنات کی تنظیم وہ حکیم و خبیر ہی کررہا ہے۔

پھر وہ کس طرح ایک دوسرے کو غلام اور بندے بناسکتے ہیں اور کیا جواز ہے کہ بعض لوگ دوسرے کے لئے رب اور الٰہ بن جائیں۔ حالانکہ سب کا روزی رساں اللہ ہے۔ اور سب لوگ اللہ کے عیال ہیں۔ فرماتے ہیں

وَ تَرْزُقُ مَنْ تَشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ .... "اور تو جسے چاہتا ہے بغیر حساب کے رزق دیتا ہے۔"

یہ ایک آخری ٹچ ہے اور اس سے انسانی دل پر حقیقت کبریٰ منکشف ہوجاتی ہے۔ وہ کون سی حقیقت ہے؟ یہ کہ اللہ ایک ہی ہے یعنی اللہ' وہی ایک اس کائنات کا نگہبان ہے۔ وہی ایک ذات ہے جو فعال ہے۔ وہ ایک ہی ہے جو مدبر ہے' وہی ایک مالک ہے' وہی مدبر ہے۔ وہی داتا ہے' اور دین بھی اسی کا ہے۔ وہی مالک الملک ہے' وہی معز اور مذل ہے۔ وہی زندہ کرنیوالا اور مارنیوالا ہے۔ وہی دینے والا اور لینے والا ہے۔ وہی اس کائنات کا مدبر ہے جو نظام عدل پر تدبیر کرتا ہے وہی ہے جو بھلائی ہی بھلائی ہے۔

☆......☆......☆......☆......☆

اس سے پہلے' اہل کتاب کے موقف پر جو استنکار اور تنبیہہ کی گئی تھی' یہ آخری تبصرہ بھی اس کی تائید مزید ہے۔ پہلے اہل کتاب کے اس رویے کی مذمت کی گئی تھی۔ کہ انہیں جب اس بات کی طرف بلایا جاتا ہے کہ آؤ اپنے فیصلے کتاب اللہ کے مطابق کریں تو وہ اس بات سے بھی اعراض کرتے ہیں۔ حالانکہ انہیں سمجھایا گیا تھا کہ کتاب اللہ اسی نظام زندگی پر مشتمل ہے۔ جو اللہ نے اپنے بندوں کیلئے اتارا اور یہ پوری کائنات بھی منہاج الٰہی کے مطابق رواں اور دواں ہے۔ جس میں خود انسان بھی شامل ہے۔ یہ اس بات کی تمہید تھی جو آگے آرہی ہے کہ مومنین کیلئے یہ بات جائز نہیں ہے کہ وہ اہل ایمان کے مقابلے میں کافروں کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم' اس لئے کہ کافروں کی اس کائنات میں کوئی قوت نہیں ہے۔ نہ ان کا یہاں اختیار چلتا ہے' یہاں تو تمام امور اللہ کے ہاتھ میں ہیں اور اللہ ہی اہل ایمان کا ولی و مددگار ہے۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللّٰهِ فِيْ شَيْءٍ اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً ۭ وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ۭ وَاِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ ﴿۲۸﴾ قُلْ اِنْ تُخْفُوْا مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ اَوْ تُبْدُوْهُ يَعْلَمْهُ اللّٰهُ ۭ وَيَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲۹﴾ يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُّحْضَرًا ۚۖ وَّمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوْۗءٍ ۚ تَوَدُّ لَوْ اَنَّ بَيْنَهَا وَبَيْنَهٗٓ اَمَدًۢا بَعِيْدًا ۭ وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ۭ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿۳۰﴾

ع ۳ ۱۰ ۱۱

"مومنین' اہل ایمان کو چھوڑ کر' کافروں کو اپنا رفیق اور دوست ہرگز نہ بنائیں۔ جو ایسا کرے گا اس کا اللہ سے کوئی تعلق نہ ہوگا۔ ہاں یہ معاف ہے کہ تم ان کے ظلم سے بچنے کیلئے بظاہر ایسا طرز عمل اختیار کر جاؤ مگر اللہ تمہیں اپنے آپ سے ڈراتا ہے اور تمہیں اس کی طرف پلٹ کر جانا ہے۔ اے نبی لوگوں کو خبردار کر دو کہ تمہارے دلوں میں جو کچھ ہے اسے خواہ تم چھپاؤ' یا ظاہر کرو' اللہ بہرحال اسے جانتا ہے۔ زمین و آسمان کی کوئی چیز اس کے علم سے باہر نہیں اور اس کا اقتدار ہر چیز پر حاوی ہے۔ وہ دن آنے والا ہے جب ہر نفس اپنے کیے کا پھل پائے گا۔ خواہ اس نے بھلائی کی ہو یا برائی' اسی روز آدمی یہ تمنا کرے گا کہ کاش ابھی یہ دن اس سے دور ہوتا' اللہ تمہیں اپنے آپ سے ڈراتا ہے اور اپنے بندوں کا نہایت خیر خواہ ہے۔"

سابقہ آیت میں قرآن کریم نے اہل ایمان کے اس شعور کو بیدار کیا تھا کہ تمام امور اللہ کے ہاتھ میں ہیں' ہر قسم کی قوتوں کا مالک وہ ہے۔ تمام تدابیر وہ اختیار کرتا ہے اور رزق صرف اس کے ہاتھ میں' تو اب یہاں سمجھایا جاتا ہے کہ اہل ایمان پھر کس غرض کیلئے کافروں کے ساتھ دوستیاں قائم کرتے ہیں۔ قلب مومن میں یہ دو متضاد امور کس طرح جمع ہو سکتے ہیں۔ ایک طرف خدا پر ایمان اور خدا سے محبت دوسری جانب خدا کے دشمنوں سے محبت جن کا حال یہ ہے کہ جب انہیں خدا کی کتاب کی طرف بلایا جاتا ہے تاکہ اس کے مطابق فیصلے کیے جائیں تو وہ اس سے اعراض کرتے ہیں۔ اس لئے یہاں یہ شدید دھمکی دی گئی کہ اگر مومن ایسے لوگوں سے محبت کرتا ہے جو کتاب اللہ اور شریعت کے مطابق فیصلے نہیں کرتے تو ان کا ایمان خطرے میں ہے۔ کفار کے ساتھ دوستی مختلف شکلوں میں ممکن ہے۔ دل سے محبت کرے' ان کی مدد کرے یا ان سے مدد مانگے یہ سب موالاۃ الکفار ہے۔

لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللّٰهِ فِيْ شَيْءٍ

"مومنین' اہل ایمان کو چھوڑ کر' کافروں کو اپنا رفیق اور دوست ہرگز نہ بنائیں۔ جو ایسا کرے گا اس کا اللہ سے کوئی تعلق نہ ہوگا۔"

بالکل یونہی' وہ اللہ کے نزدیک کچھ نہیں ہے۔ اس کا اللہ کے ساتھ نہ تعلق ہے اور نہ نسبت ہے۔ نہ وہ اللہ کے دین پر ہے اور نہ عقیدے پر' نہ اس کا اللہ سے ربط ہے اور نہ دوستی۔ یہ شخص اللہ سے دور ہے۔ وہ ہر چیز سے غیر متعلق ہو گیا ہے' جس کے ذریعہ کوئی بھی تعلق قائم ہوا کرتا ہے۔ ہاں یہاں بعض غیر معمولی حالات میں استثناء رکھی جاتی ہے۔ بعض ممالک ایسے ہو سکتے ہیں جہاں بامر مجبوری ایسے تعلقات رکھنے پڑتے ہیں۔ لیکن ان حالات اور علاقوں میں بھی صرف زبانی تقیہ جائز ہے۔ یہ جائز نہیں ہے کہ انسان دل سے اہل کفر کے ساتھ محبت کرے یا گہرے تعلقات قائم کرے۔ حضرت ابن عباس ﷺ فرماتے ہیں تقیہ کا تعلق عمل سے نہیں ہوتا' تقیہ صرف زبان سے تعلق رکھتا ہے۔ اس لئے جس تقیہ کی اجازت دی گئی اس میں یہ نہیں ہوتا کہ اہل ایمان اور کفار کے درمیان تعلقات قائم ہوں۔ اور اس سیاق میں کافر کا لفظ اس شخص کیلئے استعمال ہوا ہے جو شخص کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ کرنے سے روگردانی کرتا ہے۔ یعنی پوری زندگی میں' یہاں تو یہ بات ضمناً کہی گئی مگر دوسری جگہ قرآن کریم نے صراحت کے ساتھ ایسے لوگوں کے لئے الکافرون کا لفظ استعمال کیا ہے۔ نیز تقیہ میں یہ بات بھی شامل نہیں ہے کہ ایک مسلمان کسی بھی صورت میں اہل کفر کے ساتھ عملی تعاون کرے۔ اللہ کے ساتھ اس قسم کا کوئی دھوکہ نہیں کیا جاسکتا۔

ولایت اور محبت چونکہ دلوں کا کام ہے۔ انسانی ضمیر اور شعور کے ساتھ اس کا تعلق ہوتا ہے اور جذبہ خدا خوفی اور تقویٰ ان جرم سے باز رکھ سکتا ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو ایک عجیب انداز میں اپنے غضب اور اپنے قہرانہ انتقام سے ڈرایا ہے۔ وَ يُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ؕ "اللہ تمہیں اپنی ذات سے ڈراتا ہے۔" "اور اسی کی طرف تو تمہیں آنا ہے۔ اور یہ تخویف اور ڈراوا مزید آگے بڑھ کر دلوں کو چھوتا ہے' ان کی توجہ اس طرف مبذول کرتا ہے دیکھو تم اللہ کی نظروں میں ہو۔ اللہ سب کچھ جانتا ہے۔

قُلْ اِنْ تُخْفُوْا مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ اَوْ تُبْدُوْهُ يَعْلَمْهُ اللّٰهُ ؕ وَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ

"اے نبی لوگوں کو خبردار کر دو کہ تمہارے دلوں میں جو کچھ ہے اسے خواہ تم چھپاؤ' یا ظاہر کرو' اللہ بہرحال اسے جانتا ہے۔ زمین و آسمان کی کوئی چیز اس کے علم سے باہر نہیں ہے اور اس کا اقتدار اور ہر چیز پر حاوی ہے۔"

تہدید اور ڈراوے کی یہ انتہاء ہے۔ خدا خوفی کو جوش میں لایا جاتا ہے اور بتایا جاتا ہے کہ اللہ کے انتقام سے اپنے آپ کو بچاؤ' اللہ کے پاس علم و قدرت کے دور رس وسائل ہیں۔ اس سے بچ نکلنے کی کوئی جگہ نہیں ہے اور اسکے مقابلے میں کوئی مددگار نہ ہو گا۔

یہ تہدید اور ڈراوا مزید آگے بڑھتا ہے اور دلوں کی گہرائیوں کو چھوتا ہے' اب اس خوفناک دن کو یادوں کے پردے پر لایا جاتا ہے۔ جس میں ہر عمل اور ہر نیت پیش ہوگی اور اس دن ہر شخص کا مکمل سرمایہ اس کے سامنے ہو گا۔

يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُّحْضَرًا ۖۚ وَّ مَا عَمِلَتْ مِنْ سُوْٓءٍ ۚۛ تَوَدُّ لَوْ اَنَّ بَيْنَهَا وَ بَيْنَهٗۤ اَمَدًۢا بَعِيْدًا ؕ

"وہ دن آنے والا ہے جب ہر نفس اپنے کئے کا پھل حاضر پائے گا۔ خواہ اس نے بھلائی کی ہو یا برائی' اس روز آدمی یہ تمنا کرے گا کہ کاش ابھی یہ دن اس سے دور ہوتا۔"

یہ ایک ایسا خطاب ہے' جو قلب انسانی کی گہرائیوں تک اترتا چلا جاتا ہے' انسان کا کل سرمایہ اس کے سامنے رکھ دیا جاتا ہے اور اسے یاد دلایا جاتا ہے کہ ایک دن وہ بذات خود اپنے اس سرمائے کے سامنے کھڑا ہو گا اور وہ پسند کرے گا اس کا یہ سرمایہ اس سے دور ہوتا لیکن

افسوس کی اس کی یہ خواہش ہرگز پوری نہ ہوسکے گی۔یا وہ یہ خواہش کرے گا کہ یہ دن ہی نہ آتا لیکن وہ تو آگیا ہے۔وہ اسے دیکھ رہا ہے۔ وہ پکڑا گیا ہے۔اب کوئی چھٹکارا نہیں ہے۔اب کوئی جائے فرار نہیں ہے!

اور یہ کلام عالی مقام قلب بشری پر مزید حملے جاری رکھتا ہے' اب اللہ تعالیٰ لوگوں کو اپنی ذات ہیبت مآل سے ڈراتا ہے۔

وَ يُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ .... "اور اللہ اب تمہیں اپنی ذات سے ڈراتا ہے۔

"...... لیکن آخر میں اللہ تعالیٰ اس خوفناک ماحول میں بھی بندے اپنی رحمت کی کرن بھی دکھاتا ہے اور یہ اشارہ کرتا ہے کہ ابھی فرصت باقی ہے وقت ختم نہیں ہوگیا۔ واللہ رؤف بالعباد "اور اللہ اپنے بندوں کا نہایت خیرخواہ ہے۔" اور اللہ کی جانب سے قبل از وقت یہ تحذیر اور ڈراوا بھی اس کی مہربانی ہے اور اس بات کا ثبوت ہے کہ اللہ اپنے بندوں کی بھلائی چاہتا ہے۔

اہل ایمان اور کفار کے درمیان دوستی کے تعلق کے خلاف یہ عظیم حملہ' یہ ہمہ جہت حملہ' جس کے اندر مختلف قسم کے مفید اشارے' ہدایات اور نصیحتیں پائی جاتی ہیں۔اس کی ضرورت اس موقع پر کیوں پیش آئی' اس سے اس بات کا اظہار ہوتا ہے کہ اس دور میں اسلامی کیمپ اور اس کے اردگرد پھیلے ہوئے مخالف کیمپ میں' لوگوں کے درمیان رشتہ داری' معاشی اور معاشرتی تعلقات موجود تھے۔ جماعت مسلمہ کے افراد کے تعلقات اپنے رشتہ داروں اور دوستوں سے قائم تھے۔یہ تعلقات مکہ کے لوگوں کے ساتھ بھی تھے۔اور مدینہ کے اردگرد یہودیوں کے ساتھ بھی قائم تھے۔ان تعلقات کی اساس رشتہ داری یا تجارت پر تھی۔ جبکہ اسلام یہ چاہتا تھا کہ اس کے اس جدید معاشرے میں لوگوں کے باہمی تعلقات صرف نظریۂ حیات کی اساس پر ہوں۔اس نظام زندگی کی اساس پر جو اس نظریۂ حیات سے تشکیل پایا ہے۔یہ ایک ایسا معاملہ ہے جس میں اسلام کسی قسم کی کمزوری یا نرمی ہرگز برداشت نہیں کرتا۔

نیز اس سے یہ بات بھی ظاہر ہوتی ہے' انسانی دل و دماغ اور اس کی فکر و نظر ہروقت اس بات کی محتاج ہے وہ ان مشکلات اور رکاوٹوں سے آزادی حاصل کرے اور ان بندھنوں کو توڑ دے جو اسلامی نظام اور اللہ کی راہ کی طرف آنے میں حائل ہوں۔.......

ہاں یہ بات ذہن میں رہے کہ اسلام اپنے دشمنوں کے ساتھ حسن سلوک سے منع نہیں کرتا۔اگرچہ وہ اس کے دین کے دشمن ہوں۔اس لئے کہ حسن سلوک اور حسن معاملہ ایک الگ چیز ہے اور ولاء اور دوستی ایک الگ معاملہ ہے۔دوستی میں باہم محبت ہوتی ہے' ایک دوسرے کی امداد اور نصرت ہوتی ہے۔اور یہ کام وہ دل ہرگز نہیں کرسکتا جو مومن ہے۔ایک مومن صرف مومنین کے ساتھ دوستی کرسکتا ہے جو رابطہ ایمان میں منسلک ہیں۔اور جو اسلامی نظام زندگی میں باہم رفیق ہیں اور جو لوگ شریعت نافذ کرتے اور اس کے سامنے جھکتے ہیں۔

☆......☆......☆......☆......☆

سب سے آخر میں اس سبق کا اختتامیہ ایک فیصلہ کن انداز میں سامنے آتا ہے۔اور وہ اس مسئلے کو فیصلہ کن انداز میں پیش کرتا ہے اور یہ مسئلہ وہی ہے جس کے اردگرد یہ پوری سورت گھوم رہی ہے۔یہ اختتامیہ فیصلہ کن اور مختصر انداز میں حقیقت ایمان اور حقیقت دین کو بیان کردیتا ہے اور ایمان اور کفر کے درمیان ایک حد فاصل قائم کردی جاتی ہے۔یہ حد اس قدر واضح ہے کہ اب کسی کو کوئی غلط فہمی پیدا ہونے کا کوئی امکان نہیں ہے۔

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَ یَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۳۱﴾ قُلْ اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَ الرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ

اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْكٰفِرِیْنَ ﴿۳۲﴾

"اے نبی لوگوں سے کہہ دو کہ اگر تم حقیقت میں اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی اختیار کرو' اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمہاری خطاؤں سے درگزر فرمائے گا۔ وہ بڑا معاف کرنیوالا اور رحیم ہے۔ کہو کہ "اللہ اور رسول کی اطاعت قبول کرلو۔" پھر اگر وہ تمہاری یہ دعوت قبول نہ کریں تو یقیناً یہ ممکن نہیں ہے کہ اللہ ایسے لوگوں سے محبت کرے جو اس کی اور اس کے رسول کی اطاعت کرنے سے انکار کرتے ہوں۔"

اللہ کی محبت صرف زبانی دعویٰ نہیں ہے اور نہ وہ کوئی وجدانی امر ہے۔ اس کے ساتھ رسول خدا ﷺ کا اتباع ضروری ہے۔ آپ کی سیرت اور نقش قدم پر چلنا ضروری ہے۔ اپنی زندگی میں اسلامی نظام رائج کرنا ضروری ہے۔ ایمان صرف چند کلمات ادا کرنے کا نام نہیں ہے۔ نہ یہ شعور اور جذبات سے عبارت ہے۔ نہ وہ صرف چند شعائر کے قیام کا نام ہے۔ بلکہ ایمان اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کا نام ہے۔ اور اس منہاج پر عمل کا نام جس کے حامل رسول خدا ہیں۔

پہلی آیت کی تفسیر میں امام ابن کثیر فرماتے ہیں "یہ آیت ہر اس شخص کے کیس کا فیصلہ کر دیتی ہے جو اللہ کی محبت کا دعویٰ کرتا ہے لیکن اس کا سلوک طریقہ محمدیہ پر نہیں ہے۔ یہ شخص فی الحقیقت جھوٹا ہے۔ یہاں تک کہ وہ شریعت محمدیہ کی اطاعت کرے۔ اور اپنے تمام اقوال اور اعمال میں دین محمدی کی اطاعت کرے۔ جیسا کے حدیث صحیح میں رسول خدا ﷺ سے ثابت ہے۔ "جس شخص نے جو عمل کیا' جو ہمارے کام کے مطابق نہیں ہے' تو وہ مردود ہے۔"

"اور دوسری آیت کی تشریح میں فرماتے ہیں قُلْ اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَ الرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا............
"کہہ دو کہ اللہ اور رسول کی اطاعت کرو بس اگر وہ منہ پھیر دیں۔"......... اس سے اس بات کا اظہار ہوتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے طریقے کی مخالفت کفر ہے۔ اور اللہ تعالیٰ ایسے اوصاف والے شخص سے محبت ہرگز نہیں کرتا۔ اگرچہ ایسا شخص یہ دعویٰ کرے یا یہ یقین کرے کہ وہ محبّ اللہ ہے۔"

امام شمس الدین ابو محمد' ابن قیم الجوزیہ اپنی کتاب زاد المعاد میں فرماتے ہیں۔ "جو شخص کتب سیرت اور ثابت شدہ احادیث پر غور کرے گا اسے معلوم ہو گا بے شمار اہل کتاب اور مشرکین ایسے ہیں جو حضور ﷺ کی صداقت اور حقانیت کی شہادت دیتے ہیں۔ لیکن ان کی یہ شہادت انہیں اسلام میں داخل نہیں کرتی۔ تو معلوم ہوا کہ اسلام اس سے کہیں زیادہ کوئی اور چیز ہے۔ اسلام صرف علم اور معرفت کا نام نہیں ہے۔ اور نہ ہی وہ معرفت اور اقرار سے عبارت ہے۔ بلکہ اسلام عبارت ہے' معرفت' اقرار اور اطاعت تینوں سے۔ یہ انقیاد اور طاعت ظاہری امور میں بھی لازمی ہے اور باطنی امور میں بھی۔"

دین اسلام کی ایک حقیقت اور ماہیت ہے اور جب تک وہ حقیقت اور ماہیت موجود نہ ہوگی دین نہ ہو گا۔ اور وہ حقیقت صرف رسول اللہ ﷺ کا اتباع ہے۔ شریعت کا اتباع ہے۔ کتاب اللہ کے مطابق عدالتی نظام کا قیام ہے۔ اور یہ حقیقت عقیدۂ توحید سے پھوٹ کر نکلتی ہے۔ جس طرح اس عقیدے کی تشریح اسلام نے کی ہے۔ یعنی یہ کہ اللہ اپنی ذات میں واحدٌ لاشریک ہے۔ اس کا حق ہے کہ لوگ پوری طرح اس کے غلام اور بندے ہوں' وہ اللہ کے احکام نافذ کرنے والے ہوں۔ ان میں شریعت الٰہیہ نافذ ہو اور وہ ایسی اقدار قائم کریں جن کے مطابق لوگ اپنے فیصلے کریں اور پھر ان پر راضی ہوں۔ اس عقیدے کی رو سے اللہ واحد نگہبان ہے۔ اس لئے وہی حاکم ہے اور لوگوں کے درمیان تمام اجتماعی تعلقات اس حاکمیت کی اساس پر قائم ہوں' جس طرح اس پوری کائنات کا نظام اس کے قانون قدرت

کے مطابق رواں دواں ہے۔ اور ظاہر ہے کہ انسان بھی اس کائنات کا ایک جزء ہے۔

جیسا کہ ہم نے تفصیل سے مطالعہ کیا اس سورت کا پہلا سبق بالکل وضاحت اور صاف ستھرے طریقے سے اس بات کا فیصلہ کر دیتا ہے کہ اللہ کے نزدیک مقبول نظام زندگی صرف اسلام ہے۔ اس سے فرار اور جان چھڑانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ جو شخص بھی مسلمان بنا چاہتا ہے اسے یہ حقیقت تسلیم کرنا ہوگی۔ اسلام کی یہی صورت ہے' وہ صورت نہیں ہے جو آج کل لوگوں نے اپنے لئے خود گھڑ رکھی ہے۔ وہ محض اوہام ہیں' محض خرافات ہیں۔

O.........O.........O.........O.........O

درس ۲۴ ایک نظر میں

بعض وہ روایات' جن میں حضور اکرم ﷺ اور وفد نجران کے درمیان مناظرے کا بیان آیا ہے۔ یہ کہتی ہیں کہ اس سورت میں جن قصوں کا ذکر ہوا ہے۔ مثلاً حضرت عیسیٰ کی ولادت' ان کی والدہ کی ولادت' حضرت یحییٰ اور دوسرے واقعات' ان شبہات کے رد میں نازل ہوئے۔ جن کو لیکر یہ وفد آیا تھا۔ اور ان لوگوں کے شبہات کی عمارت قرآن کریم کی اس آیت پر کھڑی کی گئی تھی جس میں کہا گیا کہ حضرت عیسیٰ کَلِمَتُہٗ اللّٰہِ .... ہیں جو مریم کی طرف آیا اور وہ "اس کا روح" ہیں نیز سورت مریم میں جن امور کا ذکر نہ ہوا تھا انہوں نے اس کے بارے میں بھی حضور سے جواب طلب کیا تھا۔

یہ بات درست بھی ہو سکتی ہے' لیکن اس سورت میں جس طرح ان قصوں کو لایا گیا ہے وہ بعینہٖ اسی طریقہ پر ہے جس طرح قرآن کریم قصوں کو لاتا ہے۔ یعنی کچھ حقائق پیش نظر ہوتے ہیں۔ اور ان قصوں کے ذریعے قرآن کریم ان حقائق کو ذہن نشین کرتا ہے اور وہ حقائق دراصل پوری سورت کا موضوع سخن ہوتے ہیں' جو اس موضوع کے اردگرد گھومتے ہیں۔ اور قصوں کو اس طرح پیش کیا جاتا ہے کہ خود بخود ان سے وہ حقائق ظاہر ہوتے ہیں اور ذہن نشین ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اور وہ حقائق زندہ حقائق بن جاتے ہیں اور یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ بعض حقائق اور تصورات کے قصوں کے ذریعے بڑی خوبصورتی کے ساتھ ذہن نشین کر دیا جاتا ہے' انسان پر ان کا گہرا اثر ہوتا ہے اور وہ زندہ صورت میں نظر آتے ہیں۔ وہ حقائق انسان کی زندگی میں چلتے پھرتے نظر آتے ہیں جس طرح اسکرین پر کردار ہوتے ہیں۔ محض فلسفیانہ اور تجریدی انداز بیان کے مقابلے میں حکایتی انداز بیان بہت ہی موثر ہوتا ہے۔

اگر غور کریں تو ان قصوں سے بھی وہ حقائق اچھی طرح کھل کر سامنے آتے ہیں جو اس سورت کا موضوع ہیں اور یہ سورت ان حقائق پر مرکوز ہے۔ اور جن خطوط پر اس میں بحث ہو رہی ہے اسی پر یہ قصے چلتے ہیں۔ اس لئے ان قصوں میں' ان کے شان نزول کا کوئی مخصوص واقعہ نظر نہیں آتا۔ بلکہ قصوں سے وہ واقعات لئے گئے ہیں جو اصل واقعات ہیں اور جن سے اسلام کا نظریاتی پہلو اچھی طرح واضح ہوتا ہے۔

اس سورت کا اصل مسئلہ جس طرح کہ ہم اس سے پہلے کہہ آئے ہیں۔ عقیدۂ توحید ہے۔ یہ کہ اللہ اپنی ذات میں ایک ہے اور اس کے سوا کوئی الٰہ موجود نہیں ہے۔ اور یہ کہ وہ واحد نگہبان ہے اور اس جہاں کو وہ چلانے والا ہے۔ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا قصہ اور دوسرے وہ قصص جو اس کی تکمیل میں یہاں لائے گئے ہیں وہ اس عقیدۂ توحید کو اچھی طرح ثابت کرتے ہیں۔ یہ قصص اللہ کیلئے اولاد کے تصور کی نفی کرتے ہیں' اس لئے شرک کے تصور کو رد کرتے ہیں۔ وہ ان تصورات کو بعید از قیاس اور بعید از فہم بتاتے ہیں۔ یہ ثابت کرتے ہیں کہ اس قسم کے شبہات غلط ہیں۔ اور ایسے تصورات کھوٹے تصورات ہیں۔ اس لئے حضرت مریم کی پیدائش کے واقعات کھول کر بیان کئے جاتے ہیں۔ حضرت عیسیٰ کی پیدائش کی تصویر کھینچی جاتی ہے اور متعلقہ واقعات دیئے جاتے ہیں۔ یہ واقعات اس انداز میں لائے جاتے ہیں کہ پڑھنے والے کے ذہن میں اس کی بشریت کے بارے میں کوئی شبہ ہی نہیں رہتا۔ اور پھر یہ بتایا جاتا ہے کہ وہ اسی طرح رسول ہیں جس طرح دوسرے رسول گزرے ہیں۔ ان کا وہی مقام ہے جو ان رسولوں کا تھا۔ ان کی طبعی حقیقت بھی وہی ہے جو ان رسولوں کی تھی' یہ قصص حضرت عیسیٰ کی اور غیر معمولی پیدائش کے خارق العادت واقعہ کی ایسی تعبیر اور ایسی تشریح کرتے ہیں کہ جس سے اس اعجوبے کی دل لگتی تعبیر سامنے آجاتی ہے۔ جس میں کوئی پیچیدگی اور کوئی لاینحل عقدہ نہیں رہتا۔ اور اس تعبیر پر دل و دماغ بالکل مطمئن ہو

جاتے ہیں اور یہ معاملہ ایک عام اور عادی معاملہ بن جاتا ہے اس میں کوئی بات خارق العادت نظر نہیں آتی اور قصے کے آخر میں جو اختتامیہ آتا ہے وہ قابل غور ہے۔

إِنَّ مَثَلَ عِيسَىٰ عِندَ اللَّهِ كَمَثَلِ آدَمَ ۖ خَلَقَهُ مِن تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهُ كُن فَيَكُونُ

"بے شک اللہ کے نزدیک عیسیٰ کی پیدائش آدم کی طرح تھی۔ اس کو اللہ نے مٹی سے بنایا اور پھر اس کو کہا ہو جا تو ہو گیا۔"

یوں دل کو یقین اور سکون نصیب ہو گیا۔ تعجب ہوتا ہے کہ اس قدر سادہ حقیقت کے بارے میں کیونکر شبہات پیدا ہو گئے۔

اس سورت میں جو دوسرا اہم مسئلہ بیان کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے۔ یہ دوسرا مسئلہ بھی پہلے مسئلے یعنی عقیدۂ توحید پر مبنی ہے۔ یعنی دین اسلام ہے اور اسلام کا مفہوم اتباع اور انقیاد ہے۔ یہ بات بھی ان قصص کے اندر بڑی وضاحت سے بیان کی گئی ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل سے کہتے ہیں "میں اپنے سے پہلے نازل ہونیوالی کتاب تورات کی تصدیق کرتا ہوں اور اس لئے کہ میں حلال کروں بعض ان اشیاء کو جو تم پر حرام قرار دی گئی تھیں۔" اس قول سے معلوم ہوتا ہے کہ رسالت کی نوعیت کیا ہوتی ہے۔ رسول دراصل بھیجا ہی اس لئے جاتا ہے کہ وہ لوگوں کیلئے نظام زندگی تجویز کرے۔ ان کیلئے حلال و حرام کا ضابطہ وضع کرے تاکہ اہل ایمان اسے تسلیم کریں اور اطاعت کریں۔ اس کے بعد حواریوں کی زبانی بھی اسی مفہوم کی تائید کی گئی۔ "جب عیسیٰ علیہ السلام نے محسوس کیا کہ یہ لوگ کفر پر کمربستہ ہو گئے ہیں' تو آپ نے کہا: کون ہے میری مدد کرنیوالا اللہ کی راہ میں؟ حواریوں نے کہا: "ہم ہیں اللہ کے مددگار ہم اللہ پر ایمان لائے' آپ گواہ رہیں کہ ہم مسلمان ہیں۔ اے ہمارے رب! ہم ایمان لائے اس پر جو تو نے اتارا ہے اور ہم رسول کے مطیع فرمان ہو گئے ہیں۔ ہمیں بھی آپ گواہوں میں لکھ دیجئے۔""

اس سورت کا ایک اہم موضوع یہ تھا کہ اہل ایمان اور ان کے خدا کے درمیان تعلق کی نوعیت کیا ہوتی ہے۔ ان قصص میں تعلق باللہ پر بھی کافی بات ہوئی ہے۔ ان قصوں میں ان برگزیدہ ہستیوں کے حالات بیان ہوئے ہیں۔ جنہیں اللہ نے چن لیا تھا' اور ان میں سے بعض دوسروں کی اولاد تھے۔ ان قصوں میں بیگم عمران کے قصے میں تعلق باللہ کے موضوع پر روشنی پڑتی ہے۔ وہ اپنی بچی کے بارے میں اپنے رب سے یوں مخاطب ہوتی ہے جیسے اسے دیکھ رہی ہو' اسی طرح حضرت مریم سے حضرت زکریا علیہ السلام کا مکالمہ' حضرت زکریا کا اپنے رب کے جناب میں عاجزانہ دعا اور التجاء' پھر حواریوں کا اپنے نبی کو لبیک کہنا اور پھر اللہ تعالیٰ سے ملتجی ہونا' یوں ان قصوں میں تعلق باللہ کے زندہ مناظر نظر آتے ہیں۔

جب یہ قصص ختم ہوتے ہیں تو ان پر ایک ایسا اختتامیہ آتا ہے جس میں یہ تمام حقائق دہرا دیئے گئے ہیں جن کے لئے یہ قصص لائے گئے تھے۔ اور ان حقائق کو خلاصہ کی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔ اس خلاصے میں عیسیٰ علیہ السلام کی حقیقت بیان ہوتی ہے۔ مخلوق کا مزاج اور تخلیق میں ارادۂ الٰہیہ کے دخل کے بارے میں حقائق بیان ہوئے ہیں۔ یہ بیان خالص وجدانی بیان ہے۔ اہل کتاب کو ان حقائق کے تسلیم کرنے کی دعوت دی گئی ہے اور ان کو پھر دعوت مباہلہ دی گئی۔

اس سبق کے آخر میں پھر ایک جامع اور مانع بیان دیا گیا ہے اور حکم دیا گیا ہے کہ آپ عام اہل کتاب کو اس حقیقت کی طرف دعوت دیں' چاہے وہ مناظرہ کے لئے آئے ہوں یا نہ آئے ہوں۔ جو اس وقت موجود تھے یا جو آج کے بعد کے ادوار میں موجود ہیں۔ قُلْ

يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَىٰ كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللَّهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِّن دُونِ اللَّهِ ۚ فَإِن تَوَلَّوْا فَقُولُوا اشْهَدُوا بِأَنَّا مُسْلِمُونَ

کہو' "اے اہل کتاب! آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے۔ یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں' اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں' اور ہم میں سے کوئی اللہ کے سوا کسی کو اپنا رب نہ بنائے۔" اس دعوت کو قبول کرنے سے اگر وہ منہ موڑیں تو صاف کہہ دو کہ گواہ رہو' ہم تو مسلم ہیں۔" (۳:۶۴)

یہاں یہ مباحثہ ختم ہو جاتا ہے' اور معلوم ہو جاتا ہے کہ اسلام لوگوں سے کیا مطالبات کرتا ہے۔ وہ زندگی کے کیا قواعد وضع کرتا ہے۔ یہاں دین اور اسلام کا مفہوم بتایا جاتا ہے۔ ہر وہ بھدی صورت صاف ہو جاتی ہے اور وہ تحریف شدہ نظام چھٹ کر رہ جاتا ہے۔ جس کے بارے میں اس کے ماننے والوں کا دعویٰ ہوتا ہے کہ وہ اسلام ہے۔ اور وہ دین ہے حالانکہ وہ حقیقت میں ایسا نہیں ہوتا۔ غرض اس سبق کا یہ اصل موضوع تھا اور یہی موضوع اس سورت کا بھی موضوع تھا۔ جسے ان قصص نے بیان کیا ایک دلکش اور دلچسپ کہانی کی شکل میں' جس میں گہرے اشارے موجود تھے۔ قرآن میں قصص کے بیان کی غرض و غایت ہی یہ ہے۔ اس غرض و غایت کے لئے یہ قصے مناسب اسلوب میں آتے ہیں۔ اور مختلف سورتوں میں ان قصص کو اسی خاص اسلوب میں لایا گیا ہے۔

حضرت عیسیٰؑ کا قصہ سورت مریم میں بھی بیان ہوا ہے۔ اور یہاں بھی یہ قصہ بیان ہوا ہے۔ یہاں اور وہاں دونوں جگہ اس پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اس کے بعض حصوں کو مختصر بیان کیا گیا اور بعض تفصیلات دی گئی ہیں۔ مثلاً سورت مریم میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت کے حصے کو تفصیلاً بیان کیا گیا ہے' جبکہ حضرت مریم کی ولادت کا ذکر وہاں نہیں تھا۔ یہاں حواریوں کے ساتھ مفصل کلام' اور ولادت کا حصہ مختصر ہے۔ جبکہ یہاں اختتامیہ بہت ہی طویل ہے۔ اس لئے کہ یہاں جن موضوعات پر مباحثہ تھا وہ موضوعات بہت ہی اہم تھے۔ مثلاً عقیدۂ توحید' دین کا صحیح تصور' وحی الٰہی اور رسالت کا تصور جبکہ یہ مسائل سورت مریم میں زیر بحث نہ تھے۔ ان نکات سے معلوم ہوتا ہے کہ بیان قصص میں قرآن کا اسلوب کیا ہے۔ یہ اسلوب ہمیشہ سورت کے موضوعات کے پیش نظر طے ہوتا ہے۔[1]

☆ ☆ ☆

[1] دیکھئے "التصویر الفنی فی القرآن" فصل القصہ

درس نمبر ۲۴ تشریح آیات

آیات ۳۳ تا ۶۴

اب ہم آیات پر بحث کریں گے۔ اس قصے کا آغاز ان لوگوں فہرست سے ہوتا ہے جو برگزیدہ تھے اور جنہیں اللہ نے بار رسالت کے اٹھانے کیلئے چن لیا تھا۔ ابتدائے آفرینش سے یہ رسالت ایک تھی اور جس دین کو پیش کیا گیا وہ بھی ایک ہی دین تھا۔ ان لوگوں کا انتخاب اس لئے ہوا تاکہ وہ اقوام اور ازمنہ کی طویل ترین انسانی تاریخ میں قافلہ ایمان کے سالار رہوں' اس میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ یہ لوگ ایک ہی سلسلے کے تھے اور جو ایک دوسرے کی نسل سے پیدا ہوئے تھے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ ان لوگوں کا نسب نامہ طبعی طور ملتا ہو اور وہ ایک دوسرے کی نسبی ذریت ہوں۔ (اگرچہ ان سب کا نسب نامہ حضرت نوح ﷺ اور حضرت آدم ﷺ پر جا کر ملتا تھا۔) ان کا حقیقی نسب نامہ تو یہ ہے کہ ان سب کو اللہ تعالیٰ نے منتخب اور مختار بنا لیا تھا' اور ان کا نسب نامہ ایک نظریاتی نسب نامہ تھا جس کے مطابق یہ قافلہ ایمانی چل رہا تھا۔

إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَىٰ آدَمَ وَنُوحًا وَآلَ إِبْرَاهِيمَ وَآلَ عِمْرَانَ عَلَى الْعَالَمِينَ ﴿٣٣﴾ ذُرِّيَّةً بَعْضُهَا مِن بَعْضٍ ۗ وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿٣٤﴾

"اللہ نے آدم اور نوح اور آل ابراہیم اور آل عمران کو تمام دنیا والوں پر ترجیح دے کر (رسالت کیلئے) منتخب کیا تھا۔ یہ ایک سلسلے کے لوگ تھے' جو ایک دوسرے کی نسل سے پیدا ہوئے تھے۔ اللہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے۔"

سیاق کلام میں حضرت آدم اور حضرت نوح کو بطور فرد گنوایا ہے۔ لیکن حضرت ابراہیم اور عمران کے خاندانوں کا ذکر کیا گیا۔ اس میں اشارہ یہ ہے کہ حضرت آدم اپنی ذاتی حیثیت اور حضرت نوح اپنی ذاتی حیثیت میں قابل احترام اور برگزیدہ تھے۔ لیکن حضرت ابراہیم اور حضرت عمران کی اولاد بھی قابل احترام تھی۔ اور یہ احترام اور برگزیدگی اس اصول کے مطابق تھا جس کا ذکر سورۃ بقرہ میں ہوا ہے۔ اور وہ قاعدہ اور اصول یہ ہے کہ برکت اور احترام جو خاندان نبوت میں آتا ہے وہ محض خونی وراثت کی وجہ سے نہیں آتا بلکہ وہ نظریاتی وراثت ہے۔

وَإِذِ ابْتَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ رَبُّهُ بِكَلِمَاتٍ فَأَتَمَّهُنَّ ۖ قَالَ إِنِّي جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ إِمَامًا ۖ قَالَ وَمِن ذُرِّيَّتِي ۖ قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظَّالِمِينَ

"اور یاد کرو جب ابراہیم کو اس کے رب نے چند باتوں میں آزمایا اور وہ ان سب میں پورا اتر گیا تو اس نے کہا میں تجھے سب لوگوں کا پیشوا بنانے والا ہوں۔" ابراہیم نے عرض کیا: "اور کیا میری اولاد سے بھی یہی وعدہ ہے۔" اس نے جواب دیا میرا وعدہ ظالموں سے

متعلق نہیں ہے۔"
بعض روایات میں آتا ہے کہ عمران حضرت ابراہیم ؑ کی اولاد میں سے تھے۔ تو اس صورت میں حضرت ابراہیم کی اولاد میں سے اس خاص برانچ کا ذکر ایک مخصوص مقصد کیلئے کیا گیا ہے یعنی حضرت مریم اور حضرت عیسیٰ ؑ کے قصوں کیلئے بطور تمہید اس کا ذکر ہوا' اور یہ بات بھی قابل غور ہے کہ حضرت ابراہیم کی اولاد میں سے حضرت موسیٰ ؑ' حضرت یعقوب کا ذکر نہیں کیا گیا۔ اس لئے کہ یہ حضرات بنی اسرائیل کے پیشوا تھے' یعنی حضور ﷺ کے وقت اہل یہود تھے اور یہاں آئندہ بحث چونکہ نصاریٰ کے بارے میں ہونے والی تھی اس لئے حضرت موسیٰ اور حضرت یعقوب کے ذکر کی ضرورت نہ تھی۔

O........O........O........O........O

اس تمہیدی اعلان احترام کے بعد اب آل عمران کے بارے میں براہ راست بات شروع ہو جاتی ہے۔

إِذْ قَالَتِ امْرَأَتُ عِمْرٰنَ رَبِّ إِنِّيْ نَذَرْتُ لَكَ مَا فِيْ بَطْنِيْ مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّيْ ۚ إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۳۵﴾ فَلَمَّا وَضَعَتْهَا قَالَتْ رَبِّ إِنِّيْ وَضَعْتُهَآ أُنْثٰى ؕ وَاللّٰهُ أَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ ؕ وَلَيْسَ الذَّكَرُ كَالْأُنْثٰى ۚ وَإِنِّيْ سَمَّيْتُهَا مَرْيَمَ وَإِنِّيْ أُعِيْذُهَا بِكَ وَذُرِّيَّتَهَا مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ﴿۳۶﴾ فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُوْلٍ حَسَنٍ وَّأَنْبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا ۙ وَّكَفَّلَهَا زَكَرِيَّا ۚ كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ ۙ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا ۚ قَالَ يٰمَرْيَمُ أَنّٰى لَكِ هٰذَا ؕ قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ إِنَّ اللّٰهَ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۳۷﴾

"جب عمران کی عورت کہہ رہی تھی کہ میرے پروردگار! میں اس بچے کو جو میرے پیٹ میں ہے تیری نذر کرتی ہوں۔ وہ تیرے ہی کام کیلئے وقف ہو گا۔ میری اس پیش کش کو قبول فرما' تو سننے اور جاننے والا ہے۔ پھر جب وہ بچی اس کے ہاں پیدا ہوئی تو اس نے کہا: "مالک! میرے ہاں تو لڑکی پیدا ہو گئی ہے۔ حالانکہ جو کچھ اس نے جنا تھا' اللہ کو اس کی خبر تھی..... اور لڑکا لڑکی کی طرح نہیں ہوتا۔ خیر' میں نے اس کا نام مریم رکھ دیا ہے۔ اور میں اسے اور اس کی آئندہ نسل کو شیطان مردود کے فتنے سے تیری پناہ میں دیتی ہوں۔" آخر کار اس کے رب نے اس لڑکی کو بخوشی قبول کر لیا' اسے بڑی اچھی لڑکی بنا کر اٹھایا اور زکریا کو اس کا سرپرست بنا دیا .... زکریا جب اس کے پاس محراب میں جاتا تو اس کے پاس کچھ نہ کچھ کھانے پینے کا سامان پاتا۔ پوچھتا مریم! یہ تیرے پاس کہاں سے آیا۔ وہ جواب دیتی اللہ جسے چاہتا ہے بے حساب دیتا ہے۔"

نذر کے اس قصے سے بیگم عمران کا دل کھل کر سامنے آ جاتا ہے۔ یہ مریم کی ماں تھیں۔ ان کا دل ذوق ایمان سے معمور ہے۔ وہ اپنے عزیز ترین اثاثے کو اللہ کیلئے پیش کرتی ہیں۔ یعنی وہ بچہ جو ابھی تک ان کے پیٹ میں ہے۔ وہ اسے خالصتاً اللہ کیلئے پیش کرتی ہیں' اس

پیش کش کے ساتھ کوئی شرط اور قید نہیں ہے۔ اس کے ساتھ کوئی شرکیہ تصور وابستہ نہیں جیسا کہ اکثر نذروں میں ہوتا ہے۔ اس فعل میں اللہ کے سوا کسی کے حق کا تصور نہیں ہے۔ اور لفظ "محرر" سے اس بے قید نذر کی تعبیر نہایت ہی معنی خیز ہے۔ اس لئے کہ صحیح معنوں میں آزاد وہی شخص ہوتا ہے۔ جو اللہ کا ہو جائے۔ وہ ہر طرف سے بھاگ کر جناب باری میں پناہ لے لے۔ وہ ہر شخص' ہر چیز اور ہر قدر کی غلامی سے نجات پاکر نکل آئے اور بندگی صرف اللہ وحدہ کی اختیار کرے۔ صرف اسی صورت میں ایک انسان صحیح معنوں میں تمام غلامیوں سے آزاد ہو جاتا ہے۔ اس صورت کے علاوہ تمام صورتوں میں کسی نہ کسی شکل میں غلامی موجود رہتی ہے اگرچہ بظاہر کسی کو آزادی نظر آئے۔

اس نکتہ کو پالینے کے بعد ہی یہ بات نظر آتی ہے عقیدۂ توحید دراصل مکمل آزادی کا ایک چارٹر ہے۔ وہ شخص کیونکر آزاد تصور ہو سکتا ہے کہ جب وہ کسی معاملے میں' اللہ کے سوا اوروں کا غلام اور تابع ہونے پر مجبور ہو' اپنی ذات و نفسیات کی دنیا میں' یا اپنے روزمرہ کے امور حیات کے معاملے میں یا اپنے طور طریقوں یا اقدار حیات کے معاملے میں یا قوانین اور دستور حیات کے سلسلے میں اس لئے کہ وہ یہ امور ہیں جو اس کی زندگی کو کنٹرول کرتے ہیں۔ اگر ایک انسان کا دل غیر اللہ کی محبت میں گرفتار ہو' یا غیر اللہ کی غلامی کے زیربار ہو یا وہ کسی چیز کی محبت کا شکار ہو تو اسے کن معنوں میں آزاد کہا جاسکتا ہے۔ جبکہ اس کی زندگی میں ایسی اقدار کی قدر ہو اور ایسے قوانین پر عمل ہو رہا ہو جو غیر اللہ سے ماخوذ ہوں۔ دنیا میں انسانوں کو حقیقی آزادی اس وقت نصیب ہوئی جب انہوں نے اسلام کے نظریۂ توحید کو اپنایا۔

زوجہ عمران کی یہ خشوع و خضوع کے عطر سے معطر دعا کہ اے رب میری نذر قبول فرما! وہ نذر جو اس کے دل کا ٹکڑا ہے۔ اس کا جگر گوشہ ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خالص اللہ کی مسلم اور مطیع فرمان ہیں۔ وہ کلیتہ اللہ کی جہت کی طرف رخ کئے ہوئے ہیں۔ بالکل یکسو ہیں۔ ہر قید سے آزاد ہیں اور ان کے دل میں ماسوائے قبولیت نذر اور رضائے الہی کے جذبے کے اور کچھ نہیں ہے۔

رَبِّ اِنِّيْ نَذَرْتُ لَكَ مَا فِيْ بَطْنِيْ مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّيْ ۚ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ

"میرے پروردگار! میں اس بچے کو جو میرے پیٹ میں ہے تیری نذر کرتی ہوں۔ وہ تیرے ہی کام کیلئے وقف ہو گا۔ میری اس پیش کش کو قبول فرما' تو سننے اور جاننے والا ہے۔"

لیکن جب یہ بچہ پیدا ہوا تو لڑکی تھی' لڑکا نہ تھا۔

فَلَمَّا وَضَعَتْهَا قَالَتْ رَبِّ اِنِّيْ وَضَعْتُهَآ اُنْثٰى ۭ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ ۭ وَلَيْسَ الذَّكَرُ كَالْاُنْثٰى ۚ وَاِنِّىْ سَمَّيْتُهَا مَرْيَمَ وَاِنِّىْٓ اُعِيْذُھَابِكَ وَذُرِّيَّتَهَا مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

"پھر جب وہ بچی اس کے ہاں پیدا ہوئی تو اس نے کہا: "مالک! میرے ہاں تو لڑکی پیدا ہو گئی ہے۔ حالانکہ جو کچھ اس نے جنا تھا' اللہ کو اس کی خبر تھی ..... اور لڑکا لڑکی کی طرح نہیں ہوتا۔ خیر' میں نے اس کا نام مریم رکھ دیا ہے۔ اور میں اسے اور اس کی آئندہ نسل کو شیطان مردود کے فتنے سے تیری پناہ میں دیتی ہوں۔"

اس کا خیال یہ تھا کہ میرا بچہ لڑکا ہو گا۔ اور گرجوں میں جن بچوں کی نذر دی جاتی تھی وہ بالعموم لڑکے ہوا کرتے تھے تاکہ وہ ہیکل کی خدمت کریں۔ اور وہ صرف عبادت کیلئے وقف ہو جائیں اور دنیا سے کٹ جائیں۔ لیکن وہ کیا دیکھتی ہے کہ بچہ لڑکی ہے۔ اس لئے وہ گڑگڑا کر اپنے رب کی طرف متوجہ ہوتی ہے اور نہایت ہی معذرت خواہانہ انداز میں کہتی ہے۔

رَبِّ اِنِّیْ وَضَعْتُهَاۤ اُنْثٰىؕ .... "میرے رب، میرے ہاں تو لڑکی پیدا ہو گئی۔"

وَ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْؕ .... "اور جو کچھ اس نے جنا اس کا علم تو اللہ کو بہر حال تھا۔" لیکن وہ یہ الفاظ اس لئے کہتی ہے کہ وہ خود متوجہ الی اللہ ہے اور ہدیہ پیش کرتی ہے۔ گویا وہ ان الفاظ سے اللہ کے ہاں معذرت پیش کر رہی ہے۔ کہ اگر لڑکا ہوتا تو وہ اپنے فرائض اچھی طرح ادا کرتا۔ وَ لَیْسَ الذَّكَرُ كَالْاُنْثٰىۚ .... "اور لڑکا لڑکی کی طرح نہیں ہوتا۔" یعنی جس مقصد کیلئے نذر مانی گئی ہے، اس مقصد کیلئے تو لڑکا ہی موزوں ہوتا ہے۔ وَ اِنِّیْ سَمَّیْتُهَا مَرْیَمَ .... "میں نے اس کا نام مریم رکھ دیا ہے۔"

یہاں جس انداز سے بات ہو رہی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت زوجہ عمران اللہ میاں سے آمنے سامنے بات کر رہی ہیں، گو تخلیہ میں بات ہو رہی ہے، دل کی پوری بات بتائی جا رہی ہے۔ صاف صاف بتائی جا رہی ہے۔ اور اپنا پوار اثاثہ پیش کیا جا رہا ہے۔ براہ راست خدمت اقدس میں، اللہ کے ان برگزیدہ بندوں کے تعلق باللہ کا یہی حال ہوتا ہے۔ محبت، قرب اور براہ راست رابطہ اپنے رب کے ساتھ سادہ الفاظ میں اخلاص کے ساتھ ہمکلامی، جس میں نہ تکلف ہے اور نہ پیچیدگی ہے۔ وہ بات اس طرح کرتے ہیں جس طرح رب ان کے بالکل قریب ہے۔ ان سے محبت کرتا ہے، سنتا ہے اور قبول کرتا ہے۔

وَ اِنِّیْۤ اُعِیْذُهَا بِكَ وَ ذُرِّیَّتَهَا مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ .... "میں اسے اور اس کی آئندہ نسل کو شیطان مردود کے فتنے سے تیری پناہ میں دیتی ہوں۔" یہ وہ آخری بات ہے جو ایک ماں اپنے بچے کی نذر پیش کرنے کے بعد الوداعی طور پر کہتی ہے۔ اور اسے اپنے رب کی حمایت اور اس کے رحم پر چھوڑ دیتی ہے۔ اور اس کے لئے اور اس کی اولاد کے لئے شیطان سے پناہ مانگتی ہے........ اور یہ باتیں خلوص قلب کا مظہر ہیں، وبطیب خاطر یہ نذر دے رہی ہے اور اپنی محبوب اولاد کے لئے وہ جو تحفظ طلب کرتی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ اسے شیطان مردود سے بچائے۔

فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُوْلٍ حَسَنٍ وَّ اَنْۢبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًاۙ .... "آخر کار اللہ نے اس کی لڑکی کو قبول کر لیا اور اسے اچھی لڑکی بنا کر اٹھایا۔" ماں کے دل میں اخلاص اور للہیت کا جو جذبہ موجزن تھا، یہ اس کا صلہ تھا، یہ ایک خالص نذر تھی جو صرف اللہ کیلئے تھی، اور یہ اسے در حقیقت آنیوالے دور میں نفخ روح کیلئے تیار کرنا تھا۔ کلمۃ اللہ کے حمل کیلئے اسے تیار کرنا تھا۔ تاکہ وہ حضرت عیسیٰ کی خارق العادۃ ولادت کیلئے تیار ہو جس کی کوئی مثل اس سے قبل موجود نہ تھی۔

وَّ كَفَّلَهَا زَكَرِیَّاؕ .... "زکریا کو اس کا سرپرست بنا دیا گیا۔" وہ اس کے ولی اور ذمہ دار قرار پائے۔ اس دور میں حضرت زکریا ہیکل کے صدر نشین تھے۔ اور وہ حضرت ہارون کی اولاد سے تھے۔ اور ہیکل سلیمانی کی مجاوری اور انتظام انکی اولاد ہاتھ میں چلا آ رہا تھا۔ یوں حضرت مریم کی نشوونما اور تربیت کا بابرکت سلسلہ شروع ہوا۔ اللہ تعالیٰ اسی نوخیز راہبہ کیلئے اپنے فیض خاص سے رزق کا خصوصی انتظام فرماتے تھے۔

كُلَّمَا دَخَلَ عَلَیْهَا زَكَرِیَّا الْمِحْرَابَ ۙ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا ۚ قَالَ یٰمَرْیَمُ اَنّٰى لَكِ هٰذَا ؕ قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ یَرْزُقُ مَنْ یَّشَآءُ بِغَیْرِ حِسَابٍ

"زکریا جب کبھی اس کے پاس محراب میں جاتا تو اس کے پاس کچھ نہ کچھ کھانے پینے کا سامان پاتا۔ پوچھتا، مریم! یہ تیرے پاس کہاں سے آیا؟ وہ جواب دیتی اللہ کے پاس سے آیا ہے۔ اللہ جسے چاہتا ہے بے حساب دیتا ہے۔"

ہم ان تفصیلات میں جانا نہیں چاہتے کہ یہ رزق کیسا تھا؟ جس طرح کہ مختلف روایات وارد ہیں' یہاں اس قدر کہنا کافی ہے کہ وہ رزق بڑا بابرکت تھا۔ آپ کے ماحول میں برکت تھی اور ہر طرف سے وہ چیزیں مہیا ہو رہی تھیں جن پر رزق کا اطلاق ہوتا ہے۔ اس قدر وافر رزق ہوتا کہ ان کا کفیل بھی حیران رہ جاتا۔ حالانکہ وہ نبی تھا۔ وہ ان فیوض و برکات کو دیکھ کر حیرانی سے پوچھتا کہ یہ کیسے اور کہاں سے؟ لیکن حضرت مریم ایک مومن صادق کی طرح بڑے خشوع و خضوع کے ساتھ جواب دیتیں اور اللہ کے انعامات کا اعتراف کرتیں۔ اللہ کے کرم کا اقرار کر کے معاملہ اس کے حوالے کر دیتیں۔

هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ یَرْزُقُ مَنْ یَّشَآءُ بِغَیْرِ حِسَابٍ ....

"یہ اللہ کے پاس سے آیا ہے۔ اللہ جسے چاہتا ہے بے حساب دیتا ہے۔" یہ وہ کلمات ہیں' جو بتاتے ہیں کہ بندے کا تعلق اپنے رب کے ساتھ کیا ہوتا ہے۔ اور کس طرح بندگان عالی مقام اپنے ان رازوں کو راز ہی رہنے دیتے ہیں جو ان کے اور ان کے رب کے درمیان ہوتے ہیں۔ اور بات میں اس راز کے بارے میں بڑی تواضع اور کسر نفسی سے بات کرتے ہیں۔ اس کبر و غرور میں مبتلا نہیں ہوتے۔ یہاں حضرت مریم کے ہاں فراہمی رزق کے سلسلے میں جو غیر معمولی صورت حال دکھائی گئی اور جس پر حضرت زکریا نبی وقت کو بھی تعجب ہوا۔ وہ آئندہ آنے والے زیادہ عجائبات قدرت کیلئے بطور تمہید ذکر ہوئے۔ جن میں حضرت یحییٰ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت شامل ہے۔

○.........○.........○.........○.........○

اس مقام پر (مریم جیسی اولاد اور اس کے پاس وافر رزق) کو دیکھ کر حضرت زکریا علیہ السلام کے دل میں امید کی کرن پھوٹی' آپ کی اولاد نہ تھی' یہ ایک فطری خواہش تھی' جو ہر انسان کے دل میں دست قدرت نے ودیعت کی ہوئی ہوتی ہے۔ یعنی اولاد صالح کی زبردست خواہش۔ تاکہ انسان کی ذات تسلسل میں رہے۔ اور اس کے بعد اس کا کوئی جانشین ہو' یہ وہ خواہش ہے جو بڑے بڑے عبادت گزاروں اور زاہدوں کے دل میں بھی موجزن رہتی ہے۔ ان لوگوں کے دل میں بھی جنہوں نے اپنے آپ کو عبادت کے لئے وقف کر لیا ہوتا ہے۔ اور جو ہیکل کی خدمت کیلئے وقف ہو چکے ہوتے ہیں۔ یہ وہ فطرت ہے جس پر اللہ نے لوگوں کی تخلیق کی ہے۔ اور یہ اس گہری حکمت کا نتیجہ ہے کہ اس جہاں میں زندگی کا تسلسل جاری ہے اور وہ دن دوگنی رات چوگنی ترقی کر رہی ہے۔ اس مقام پر حضرت زکریا علیہ السلام سامنے آتے ہیں۔ هُنَالِكَ دَعَا زَكَرِیَّا رَبَّهٗ ۚ قَالَ رَبِّ هَبْ لِیْ مِنْ لَّدُنْكَ ذُرِّیَّةً طَیِّبَةً ۚ اِنَّكَ سَمِیْعُ الدُّعَآءِ ﴿۳۸﴾ فَنَادَتْهُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَهُوَ قَآئِمٌ یُّصَلِّیْ فِی الْمِحْرَابِ ۙ اَنَّ اللّٰهَ یُبَشِّرُكَ بِیَحْیٰی مُصَدِّقًۢا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَسَیِّدًا وَّحَصُوْرًا وَّ نَبِیًّا مِّنَ الصّٰلِحِیْنَ ﴿۳۹﴾ قَالَ رَبِّ اَنّٰی یَكُوْنُ لِیْ غُلٰمٌ وَّقَدْ بَلَغَنِیَ الْكِبَرُ وَامْرَاَتِیْ عَاقِرٌ ؕ قَالَ كَذٰلِكَ اللّٰهُ یَفْعَلُ مَا یَشَآءُ ﴿۴۰﴾ قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّیْۤ اٰیَةً ؕ قَالَ اٰیَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَةَ اَیَّامٍ اِلَّا رَمْزًا ؕ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ كَثِیْرًا وَّسَبِّحْ بِالْعَشِیِّ وَالْاِبْكَارِ ﴿۴۱﴾

۴ ع ۱۱ ۱۲

"یہ حال دیکھ کر زکریا نے اپنے رب کو پکارا "پروردگار! اپنی قدرت سے مجھے نیک اولاد عطا کر' تو ہی دعا سننے والا ہے اس پرسوز اور پرکیف دعا کا نتیجہ کیا ہوا؟ یہ فوراً قبول ہوئی اور اب یہ اولاد اور یہ قبولیت زمان و مکان کی قید سے وراء تھی۔ عام معتاد طریقے سے نظام ہٹ گیا۔ اس لئے کہ اصل سبب تو مشیئت الٰہی ہے۔" جواب میں فرشتوں نے آواز دی' جب وہ محراب میں کھڑا نماز پڑھ رہا تھا کہ اللہ تجھے یحییٰ کی خوشخبری دیتا ہے۔ وہ اس کی طرف سے ایک فرمان کی تصدیق کرنے والا بن کر آئے گا۔ اس میں سرداری اور بزرگی کی شان ہوگی۔ کمال درجے کا ضابطہ ہوگا۔ نبوت سے سرفراز ہوگا۔ اور صالحین میں شمار ہوگا۔ زکریا نے کہا۔ "پروردگار! بھلا میرے ہاں لڑکا کہاں سے ہوگا۔ کہا' اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔" عرض کیا' مالک! "پھر کوئی نشان میرے لئے مقرر فرمادے۔" کہا: "نشان یہ ہے کہ تم تین دن تک لوگوں سے اشارہ کے سواء کوئی بات نہ کرو گے۔" (نہ کر سکو گے) اس دوران میں اپنے رب کو بہت یاد کرنا اور صبح و شام اسکی تسبیح کرتے رہنا۔"

یوں ہم اپنے آپ کو ایک غیر معمولی واقعہ کے سامنے پاتے ہیں۔ یہ واقعہ اس بات کا اظہار ہے کہ اللہ کی مشیئت بے قید ہے۔ اور وہ ان سلسلہ اسباب و مسببات کی قید و بند سے آزاد ہے۔ جنہیں آگے پیچھے دیکھنے کا انسان عادی ہے۔ اور جن کے بارے میں انسان یہ سمجھتا ہے کہ اس سلسلے سے تخلف ممکن نہیں ہے اور یہی وجہ ہے کہ جو واقعات و حادثات اس قانون کے حدود و قیود کے اندر نہیں ہوتے یہ انسان ان کے بارے میں شاکی رہتا ہے۔ اور جب وہ اس بات سے عاجز ہوں کہ اس کی تکذیب کر دیں۔ جب ان کیلئے ایسے واقعات کو جھٹلانا ممکن نہ رہے کیونکہ وہ واقعات ہوتے ہیں تو وہ ان واقعات کے اوپر قصے اور کہانیوں کے خول چڑھا دیتے ہیں۔

دیکھئے زکریا شیخ اور معمر آدمی ہیں اور ان کی بیوی معمر ہونے کے ساتھ ساتھ نوجوانی میں بھی بانجھ رہی ہیں۔ اس بوڑھے کے دل میں اولاد کی خواہش جوش میں آتی ہے۔ جو ایک فطری خواہش ہے۔ وہ مریم جیسی ایک نیک اور خوبصورت بچی کو دیکھتے ہیں' جسے وافر مقدار میں رزق دیا گیا ہے۔ وہ اپنے رب کے ساتھ مناجات کرتے ہیں۔ وہ دعا کرتے ہیں کہ انہیں بھی ایسی ہی پاک اولاد عطا ہو۔

هُنَالِكَ دَعَا زَكَرِيَّا رَبَّهُ ۚ قَالَ رَبِّ هَبْ لِي مِن لَّدُنكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً ۖ إِنَّكَ سَمِيعُ الدُّعَاءِ

"یہ حال دیکھ کر زکریا نے اپنے رب کو پکارا "پروردگار! اپنی قدرت سے مجھے نیک اولاد عطا کر' تو ہی دعا سننے والا ہے۔" ....

اس پرسوز اور پرکیف دعا کا نتیجہ کیا ہوا؟ یہ فوراً قبول ہوئی اور اب یہ اولاد اور یہ قبولیت زمان و مکان کی قید سے ماوراء تھی۔ عام معتاد طریقے سے نظام ہٹ گیا۔ اس لئے کہ اصل سبب تو مشیئت الٰہی ہے۔

فَنَادَتْهُ الْمَلَائِكَةُ وَهُوَ قَائِمٌ يُصَلِّي فِي الْمِحْرَابِ أَنَّ اللَّهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحْيَىٰ مُصَدِّقًا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللَّهِ وَسَيِّدًا وَحَصُورًا وَنَبِيًّا مِّنَ الصَّالِحِينَ

"جواب میں فرشتوں نے آواز دی' جب وہ محراب میں کھڑا نماز پڑھ رہا تھا کہ اللہ تجھے یحییٰ کی خوشخبری دیتا ہے۔ وہ اللہ کی طرف سے ایک فرمان کی تصدیق کرنے والا بن کر آئے گا۔ اس میں سرداری اور بزرگی کی شان ہوگی۔ کمال درجے کا ضابطہ ہوگا۔ نبوت سے سرفراز ہوگا۔ اور صالحین میں شمار ہوگا۔"

وہ دعا جو دل سے نکلی اور پاک دل سے نکلی وہ قبول ہوگئی۔ اس لیے کہ اس دعا میں امید صرف اس ذات سے تھی جو دعا سنتا ہے۔ اور جس وقت چاہے اسے قبولیت کا جامہ پہنا سکتا ہے۔ فرشتوں نے زکریا کو ایک لڑکے کی خوشخبری دیدی۔ اس کا نام بھی ولادت سے پہلے

یحییٰ رکھ دیا گیا۔ اور صفت و اخلاق بھی قبل از وقت بتا دیئے گئے۔ وہ اچھا سردار ہو گا۔ وہ اپنی خواہشات نفس کو اچھی طرح قابو میں رکھنے والا ہو گا۔ اور اس نے اپنے رجحانات اور میلانات کی لگام اچھی طرح تھام لی ہوگی۔ وہ مومن و مصدق ہو گا اور اس کے پاس اللہ کا جو فرمان۱ آئے گا اس کی تائید کرنے والا ہو گا۔ نبی صالح ہو گا اور قافلہ صلحاء کا رکن ہو گا۔

بہرحال یہ دعا قبول ہوگئی۔ اور اس کی راہ میں وہ معمولی صورت حال حائل نہ ہو سکی جسے انسان روزمرہ کی زندگی میں دیکھتے ہیں۔ اور اسے ایک اٹل قانون سمجھتے ہیں۔ اور پھر یہ بھی سمجھتے ہیں کہ اللہ کی مشیئت بھی اس قانون کی پابند ہے۔ انسان جن امور کا مشاہدہ کرتا ہے اور پھر یہ فیصلہ کرتا ہے کہ یہ قانون ہے اور اس سے انحراف ممکن نہیں ہے۔ یہ ایک نسبتی امر ہے۔ یہ کوئی آخری مشاہدہ نہیں ہوتا۔ انسان کی عمر محدود ہے۔ اور اس کا علم محدود ہے۔ انسانی عقل طبیعات کے حدود کے اندر محدود ہے۔ وہ اللہ کے انتہائی قانون تک رسائی بھی نہیں پا سکتی۔ نہ وہ حقیقت مطلقہ کا ادراک کر سکتی ہے۔ کیا انسان کیلئے یہ مناسب نہیں ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے دربار میں ذرا انسان بن کر رہے۔ کیا اس کے لئے یہ مناسب نہیں ہے کہ وہ "ہار قدر خود بشناس" کے مطابق اپنی حدود میں رہے اور اس وادی بے کنار میں بغیر کسی راہنمائے باخبر کے داخل ہی نہ ہو۔ اس لئے کہ ممکنات اور مستحیلات کی وادی بے کراں ہے۔ تعجب ہے کہ انسان اللہ کی مشیئت کیلئے وہ دائرہ تجویز کرتا ہے جو خود اس کے تجربے میں ہو اور جو اس کے علم قلیل کا دائرہ ہے۔

دعائے پرسوز کی یہ قبولیت خود حضرت زکریا علیہ السلام کیلئے بھی تعجب خیز تھی' بہرحال حضرت زکریا بھی تو انسان ہی تھے۔ چنانچہ ان کے دل میں بھی یہ شوق پیدا ہوا کہ وہ دیکھیں کہ یہ خارق العادۃ واقعہ کیسے ظہور پذیر ہو گا' حالانکہ انسان کا روزمرہ کا مشاہدہ اس کے خلاف ہے۔

قَالَ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِىْ غُلٰمٌ وَّقَدْ بَلَغَنِىَ الْكِبَرُ وَامْرَاَتِىْ عَاقِرٌ ؕ

"زکریا نے کہا پروردگار' بھلا میرے ہاں لڑکا کہاں سے ہو گا۔ میں تو بہت بوڑھا ہو چکا ہوں اور میری بیوی بانجھ ہے۔" اس کا جواب بڑی سادگی اور بڑی آسانی سے دیدیا جاتا ہے۔ بات اپنی جگہ تک آجاتی ہے۔ اور ایسی حقیقت کو پیش کر دیا جاتا ہے جس کے فہم میں کوئی مشکل نہیں ہے۔ اور جس کے وقوع پذیر ہونے میں کوئی تعجب نہیں ہوتا۔ قَالَ كَذٰلِكَ اللّٰهُ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ ....

"اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔" یہی طریقہ ہے' جو فی الحقیقت روبعمل ہے۔ رات دن دہرایا جاتا ہے۔ اللہ کی مشیئت کا کام کرتی رہتی ہے۔ اللہ کے کام روز و شب یونہی ہوتے ہیں۔ لیکن لوگ ان واقعات پر اچھی طرح غور نہیں کرتے۔ وہ اللہ کی اس کاریگری کا گہرا مشاہدہ اور اس پر غور نہیں کرتے۔ اور حقائق کو ذہن نشین نہیں کرتے۔

یونہی بسہولت' بہ روانی وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ اس میں اس کے لئے کیا مشکل ہے کہ زکریا کو بیٹا دیدے۔ اگرچہ وہ بوڑھا ہو گیا ہو اور اس کی عورت بانجھ ہوگئی ہو۔ بوڑھا ہونا اور بانجھ ہونا تو انسانوں کا مشاہدہ ہے۔ جس پر وہ اپنے لئے قواعد بناتے ہیں۔ اس لئے اپنے لئے ضابطہ بناتے ہیں۔ رہے اللہ تعالیٰ تو وہ انسانی ذہن کے قوانین و قیاسات کے پابند کیسے ہوگئے۔ وہ تو جس طرح چاہے تجربات کو پھیر دے۔ اس کی مشیئت تو ہر قید سے آزاد ہے۔

لیکن حضرت زکریا کا راہوار شوق سرپٹ دوڑ رہا تھا' بہرحال وہ بھی انسان تھے اچانک خوشخبری سن کر پریشان ہو گئے تھے۔ انہوں نے اپنے رب سے مطالبہ کیا کہ وہ ان کیلئے اس اعجوبے کے ظہور کیلئے کوئی علامت مقرر فرما دیں تاکہ وہ مطمئن ہو کر انتظار کریں۔ قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّىْۤ اٰيَةً ؕ .... "میرے رب میرے لئے کوئی نشانی مقرر کر دے۔" .... اب اللہ

۱۔ بعض مفاسیر نے یہ لکھا ہے کہ اس سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں جو کلمۃ اللہ ہیں' آپ ان کی تصدیق کریں گے۔ کوئی ایسی دلیل نہیں ہے کہ اس سے یہی مراد ہو۔

تعالیٰ ان کیلئے حقیقی اطمینان کا انتظام فرماتے ہیں۔ خود انہیں ان کی روز مرہ معمولات کے دائرے سے ذرا باہر لایا جاتا ہے۔ قرار دیا جاتا ہے کہ علامت یہ ہوگی کہ تین دن کیلئے تیری زبان بند ہو جائے گی' وہ لوگوں کی طرف متوجہ ہوں گے' بات نہ کر سکیں گے۔ صرف اپنے رب کی طرف متوجہ ہوں گے' اللہ کا ذکر کریں گے اور اس کی تسبیح و تہلیل کریں گے۔

قَالَ اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ اِلَّا رَمْزًا ؕ وَ اذْكُرْ رَّبَّكَ كَثِيْرًا وَّ سَبِّحْ بِالْعَشِيِّ وَ الْاِبْكَارِ

کہا: "نشانی یہ ہے کہ تم تین دن تک لوگوں سے اشارہ کے سواء کوئی بات نہ کر سکو گے۔ اس دوران میں اپنے رب کو بہت یاد کرنا اور صبح و شام اس کی تسبیح کرتے رہنا۔" ... یہاں قرآن مجید خاموش ہو جاتا ہے لیکن ہم جانتے ہیں کہ یہ واقعہ عملاً ایسا ہوا۔ حضرت زکریا ؑ کی زبان بندی ہوگئی۔ اور وہ تمام روز مرہ کی زندگی سے نکل آئے۔ لوگوں کی روز مرہ زندگی کا قانون بھی معطل ہو گیا۔ دیکھو اس کی یہی زبان تھی جو زور سے چلتی تھی۔ آج بند ہے۔ لوگوں سے بات بند ہے اور اللہ سے مناجات جاری ہے۔ سوال یہ ہے کہ اب وہ کس قانون فطرت پر جا رہے ہیں؟ وہ قانون یہ ہے کہ اللہ مطلق کی مشیئت ہر قید و بند سے آزاد ہے۔ اگر ہم اپنی زندگی میں یہ اصول تسلیم نہ کریں گے تو پھر ان خوارق عادت معاملات کی اور کیا توجیہ کر سکتے ہیں۔ ہم اس بوڑھے اور عمر رسیدہ عورت کے ہاں اولاد کی پیدائش کی اور کیا توجیہ کر سکتے ہیں۔

○.........○.........○.........○.........○

یہ خارق عادت واقعہ یہاں اس لئے بیان کیا گیا کہ آگے حضرت عیسیٰ ؑ کی پیدائش کا اصل خارق عادت واقعہ بیان کیا جائے۔ جس کی وجہ سے بے شمار شبہات اور ناقابل یقین نظریات وجود میں آگئے تھے۔ پیدائش مسیح ؑ دراصل اللہ تعالیٰ کی بے قید مشیئت کے سلسلہ واقعات میں سے ایک واقعہ تھا۔ یہاں سے پیدائش مسیح کا واقعہ شروع کیا جاتا ہے۔ سب سے پہلے حضرت مریم کو اس روح کی قبولیت کیلئے' عبادت اور رجوع الی اللہ کے ذریعہ پاک کیا جاتا ہے۔

وَ اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰكِ وَ طَهَّرَكِ وَ اصْطَفٰكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۲﴾ يٰمَرْيَمُ اقْنُتِيْ لِرَبِّكِ وَ اسْجُدِيْ وَ ارْكَعِيْ مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ﴿۴۳﴾

"اور جب فرشتوں نے کہا اے مریم! اللہ نے تجھے برگزیدہ کیا اور پاکیزگی عطا کی اور تمام دنیا کی عورتوں پر تجھ کو ترجیح دیکر اپنی خدمت کیلئے چن لیا۔ اے مریم! اپنے رب کے تابع فرمان بن کر رہ' اس کے آگے سربسجود ہو اور جو بندے اس کے حضور جھکنے والے ہیں ان کے ساتھ تو بھی جھک جا۔"

یہ برگزیدگی کیا تھی؟ وہ یہ کہ اللہ براہ راست اس کے اندر اپنی ایک روح ڈالنے والے تھے۔ جس طرح اللہ نے حضرت آدم کے جسد خاکی میں سب سے پہلے روح ڈالی دی تھی۔ اور پھر یہ خارق العادۃ واقعہ پوری انسانیت کے سامنے پیش کیا' یا اپنے خاص طریقے کے مطابق' فی الواقع یہ تاریخ انسانیت کی ایک منفرد برگزیدگی ہے۔ اور بلاشبہ ایک عظیم واقعہ ہے۔ .... لیکن آج تک اس عظیم واقعہ

کا انسانیت کو صحیح علم نہ تھا۔ یہاں صفائی کی طرف اشارہ کر کے یہ تاثر دیا گیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کے بارے میں یہودی جو شبہات پھیلاتے تھے اور جو رکیک حملے کرتے تھے' وہ قابل مذمت ہیں۔ وہ حضرت مریم کی پاکیزگی میں شکوک و شبہات پھیلاتے تھے اور ان کی دلیل یہ تھی کہ آج تک تاریخ انسانیت میں ایسی خارق العادۃ پیدائش کا واقعہ نہیں ہوا ہے۔ اس لئے یہ یہودی (اللہ انہیں غارت کرے) کہتے تھے کہ اس واقعہ کے پیچھے کوئی ناپسندیدہ راز ہے۔

یہاں آکر معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کی عظمت کا کیا مقام ہے' اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام کا منبع صافی کس قدر بلند اور قابل اعتماد ہے۔ حضور پر اہل کتاب بشمول نصاریٰ قسم قسم کے الزامات عائد کر رہے تھے۔ آپ کی تکذیب کر رہے تھے۔ آپ کے دشمن تھے اور جدل و جدال پر ہروقت آمادہ رہتے تھے۔ اسلام کی حقانیت کے خلاف شبہات پھیلاتے تھے۔ لیکن دیکھئے وہ اپنے رب کی جانب سے یہ پیغام لاتے ہیں کہ حضرت مریم علیہا السلام کی حقیقت یہ ہے اور یہ کہ وہ تمام دنیا کی عورتوں پر فضیلت رکھتی ہیں۔ یوں اسلام حضرت مریم کے مقام کو بلند آفاق تک اونچا کر دیتا ہے۔ لیکن موقعہ و محل ایسا ہے کہ حضرت مریم کے پیرو کار آپ کے ساتھ بحث و مناظرہ کیلئے آئے ہوئے ہیں۔ اور حضرت مریم علیہا السلام کی تعظیم کو آپ کیلئے جواز بناتے ہیں کہ وہ حضور ﷺ پر ایمان نہ لائیں۔ اور حضرت محمد ﷺ کے دین کی تکذیب کریں۔

کیا سچائی ہے یہ' کس قدر عظیم عظمت ہے یہ اسلام کی' اس سے بڑی اور دلیل کیا ہو سکتی ہے کہ حضور سچے ہیں اور ایک سچے منبع سے فیض یاب ہیں۔ آپ پر وحی لانے والے بھی سچے ہیں۔ وہ سچائی اپنے سچے رب سے لیتے ہیں۔ وہ حضرت مریم اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حق میں بھی جو سچائی پاتے ہیں اس کا اعلان کر دیتے ہیں۔ اگر آپ اللہ کے سچے رسول نہ ہوتے تو وہ ان حالات میں اپنے دشمنوں کے متعلق اس سچائی کا اظہار نہ کرتے۔

يٰمَرْيَمُ اقْنُتِىْ لِرَبِّكِ وَاسْجُدِىْ وَارْكَعِىْ مَعَ الرّٰكِعِيْنَ .... "اے مریم! رب کی تابع فرمان بن کر رہ' اس کے آگے سربسجود ہو' اور جو بندے اس کے سامنے جھکنے والے ہیں' ان کے ساتھ تو بھی جھک۔" .... یعنی خشوع و خضوع اختیار کر' اللہ کی طاعت و عبادت میں مصروف رہ' اور ایسی زندگی بسر کر جو اللہ سے جڑی ہوئی ہو اور یہ سب کچھ عظیم ذمہ داری ادا کرنے کیلئے' جو آنے والی ہے۔

○........○........○........○........○

حضرت مریم کی اس کہانی کے اس مرحلے کے اختتام پر اور آگے اصل کہانی یعنی پیدائش مسیح سے پہلے یہاں قرآن کریم میں بیان قصص کی حکمت بیان کر دی جاتی ہے۔ حضور اکرم ﷺ سے کہا جاتا ہے کہ تم اس وقت موجود نہ تھے۔ لیکن اس وقت کے صحیح صحیح واقعات تمہیں بتائے جا رہے ہیں' جو اس بات کی دلیل ہیں کہ قرآن کریم وحی الٰہی پر مبنی ہے۔

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ ؕ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ اَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ ۪ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يَخْتَصِمُوْنَ ۝

"اے محمد! یہ غیب کی خبریں ہیں جو ہم تم کو وحی کے ذریعہ سے بتا رہے ہیں' ورنہ تم اس وقت وہاں موجود نہ تھے۔ جب ہیکل کے خادم نے یہ فیصلہ کرنے کیلئے کہ مریم کا سرپرست کون ہو اپنے اپنے قلم پھینک رہے تھے اور نہ تم اس وقت حاضر تھے جب ان کے درمیان

جھگڑا برپا تھا۔"

یہ اشارہ اس واقعہ کی طرف ہے جب ہیکل کے خدام کے درمیان یہ تنازع اٹھ کھڑا ہوا تھا کہ ان میں سے کون اس کا سرپرست ہو' جب اس کی ماں اسے لیکر ہیکل میں آئیں۔ وہ اسی وقت چھوٹی بچی تھی۔ ماں اس لئے لائی تھی کہ وہ اپنی نذر پوری کرے اور جو عہد اس نے اپنے رب کے ساتھ کیا ہے۔ اسے پورا کرے۔ اس آیت میں ایسے واقعہ کا ذکر ہے جو عہد قدیم میں مذکور نہیں ہے اور نہ عہد جدید میں مذکور ہے یعنی ان نسخوں میں جو آج کل مروج ہیں' لیکن یہ بات ایسی تھی جو احبار اور رہبان کے درمیان معروف تھی۔ یعنی خدام کا قلمیں پھینکنے کا واقعہ اس دور میں مشہور واقعہ تھا۔ اور یہ اس لئے تھا کہ کون اس کی کفالت کرے۔ قرآن کریم نے اس واقعہ کی تفصیلات نہیں دی ہیں۔ اور شاید اس لئے کہ سامعین قرآن کے نزدیک یہ واقعہ معروف و مشہور ہو گا۔ یا یہ کہ قرآن کریم نے واقعہ بتا دیا اور اس سے زیادہ تفصیلات بتانے کی ضرورت محسوس نہ کی کیونکہ واقعہ ہی یہ اسی قدر ہو گا۔ مثلاً انہوں نے کفالت کیلئے ایسا ہی کوئی طریقہ طے کر لیا ہو گا۔ یعنی قلمیں پھینک کر یہ معلوم کرتے ہوں گے کہ کفالت کس کے حصے میں آئے۔ جیسا کہ آج کل قرعہ اندازی میں ہوتا ہے۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ انہوں نے اپنی قلمیں نہر اردن میں پھینکیں' تو سب قلمیں موجوں کے ساتھ بہہ گئیں مگر زکریا کی قلم اپنی جگہ ٹھہری رہی اور یہ ان کے درمیان علامت تھی کہ کفالت کس کے حصے میں آئے۔

بہرحال یہ سب واقعات پردۂ غیب میں تھے۔ اس وقت نبی ﷺ حاضر نہ تھے۔ نیز حضور ﷺ کے علم تک بھی یہ بات نہ پہنچی تھی۔ ہو سکتا ہے کہ یہ بات اہل ہیکل کے خفیہ رازوں میں سے ہو جسے عوام کیلئے شائع کرنا منع ہو' اور قرآن نے اس کا افشا کر کے' اس وقت کے علمائے اہل کتاب کو بتایا کہ حضرت محمد ﷺ رسول صادق ہیں اور قرآن کریم وحی الٰہی پر مبنی ہے۔ کسی روایت میں یہ نہیں ہے کہ اہل کتاب میں سے کسی نے اس اطلاع کی تردید کی ہو حالانکہ قرآن کریم نے یہ اطلاع ان کو دوران بحث و مناظرہ دی تھی۔ اور یہ اہل کتاب آئے بھی مناظرہ کیلئے تھے۔ اگر ان کے ہاں یہ واقعہ نہ ہوتا تو کہتے کہ ایسا کوئی واقعہ ہی سرے سے نہیں ہوا۔

اب یہاں سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت کا واقعہ شروع ہوتا ہے۔ لوگوں کے معمولات کے مطابق یہ عظیم اعجوبہ ہے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کی معمول کے مطابق مشیت کی جو شان ہوتی ہے وہ اس کے خلاف ہے۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ إِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ إِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ ۖ اسْمُهُ الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ وَجِيْهًا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ﴿۴۵﴾ وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا وَّمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۴۶﴾ قَالَتْ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ وَلَدٌ وَّلَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ ۭ قَالَ كَذٰلِكِ اللّٰهُ يَخْلُقُ مَا يَشَاۗءُ ۭ اِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿۴۷﴾ وَيُعَلِّمُهُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ﴿۴۸﴾ وَرَسُوْلًا

إِلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ أَنِّي قَدْ جِئْتُكُم بِآيَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ ۖ أَنِّي أَخْلُقُ لَكُم مِّنَ الطِّينِ كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ فَأَنفُخُ فِيهِ فَيَكُونُ طَيْرًا بِإِذْنِ اللَّهِ ۖ وَأُبْرِئُ الْأَكْمَهَ وَالْأَبْرَصَ وَأُحْيِي الْمَوْتَىٰ بِإِذْنِ اللَّهِ ۖ وَأُنَبِّئُكُم بِمَا تَأْكُلُونَ وَمَا تَدَّخِرُونَ فِي بُيُوتِكُمْ ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً لَّكُمْ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ﴿٤٩﴾ وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرَاةِ وَلِأُحِلَّ لَكُم بَعْضَ الَّذِي حُرِّمَ عَلَيْكُمْ ۚ وَجِئْتُكُم بِآيَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ ﴿٥٠﴾ إِنَّ اللَّهَ رَبِّي وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوهُ ۗ هَٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيمٌ ﴿٥١﴾

”اور جب فرشتوں نے کہا ”اے مریم! اللہ تجھے ایک فرمان کی خوشخبری دیتا ہے۔ اس کا نام مسیح عیسیٰ ابن مریم ہو گا۔ دنیا و آخرت میں معزز ہو گا‘ اللہ کے مقرب بندوں میں شمار کیا جائے گا۔ لوگوں سے گہوارے میں بھی کلام کرے گا اور بڑی عمر کو پہنچ کر بھی اور وہ ایک مرد صالح ہو گا۔“ یہ سن کر مریم بولی :”پرودگار‘ میرے ہاں بچہ کہاں سے ہو گا مجھے تو کسی شخص نے ہاتھ تک نہیں لگایا۔“ جواب ملا۔ ”ایسا ہی ہو گا‘ اللہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے۔“ (فرشتوں نے پھر اپنے سلسلہ کلام میں کہا) اور اللہ اسے کتاب اور حکمت کی تعلیم دے گا‘ تورات اور انجیل کا علم سکھائے گا۔ اور بنی اسرائیل کی طرف اپنا رسول مقرر کرے گا۔ (اور جب وہ بحیثیت رسول بنی اسرائیل کب طرف آیا تو اس نے کہا) میں تمہارے رب کی طرف سے تمہارے پاس نشانی لیکر آیا ہوں۔ میں تمہارے سامنے مٹی سے پرندے کی صورت کا ایک مجسمہ بناتا ہوں۔ اور اس میں پھونک مارتا ہوں۔ وہ اللہ کے حکم سے پرندہ بن جاتا ہے۔ میں اللہ کے حکم سے مادر زاد اندھے اور کوڑھی کو اچھا کرتا ہوں اور مردے کو زندہ کرتا ہوں۔ میں تمہیں بتاتا ہوں کہ تم کیا کھاتے ہو اور کیا اپنے گھروں میں ذخیرہ کر کے رکھتے ہو۔ اس میں تمہارے لئے کافی نشانی ہے۔ اگر تم ایمان لانیوالے ہو۔ اور میں اس تعلیم و ہدایت کی تصدیق کرنیوالا بن کر آیا ہوں جو تورات میں سے اس وقت میرے زمانہ میں موجود ہے۔ اور اس لیے آیا ہوں کہ تمہارے لئے بعض ان چیزوں کو حلال کر دوں جو تم پر حرام کر دی گئیں ہیں۔ دیکھو‘ میں تمہارے رب کی طرف سے تمہارے پاس نشانی لیکر آیا ہوں۔ لہٰذا اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ اللہ میرا رب بھی ہے اور تمہارے رب بھی‘ لہٰذا تم اس کی بندگی اختیار کرو‘ یہی سیدھا راستہ ہے۔“

حضرت مریم ؑ اپنی پاکیزگی‘ اپنی یکسوئی اور اپنی پیہم عبادت گزاری کی وجہ سے اس بات کی اہل ہوئیں کہ وہ اس کے اس فضل کو قبول کر سکیں اور اس عظیم واقعہ کیلئے تیار ہو سکیں۔ اور دیکھئے اب وہ تیار ہیں اور اب ملائکہ ان کے ساتھ ہمکلام ہو رہے ہیں۔ انہیں اطلاع دی جاتی ہے۔

إِذْ قَالَتِ الْمَلَٰٓئِكَةُ يَٰمَرْيَمُ إِنَّ اللَّهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ اسْمُهُ الْمَسِيحُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ وَجِيهًا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِينَ وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا وَّمِنَ الصَّٰلِحِينَ .

"اور جب فرشتوں نے کہا "اے مریم! اللہ تجھے ایک فرمان کی خوشخبری دیتا ہے۔ اس کا نام مسیح عیسیٰ بن مریم ہو گا۔ دنیا و آخرت میں معزز ہو گا' اللہ کے مقرب بندوں میں شمار کیا جائے گا۔ لوگوں سے گہوارے میں بھی کلام کرے گا اور بڑی عمر کو پہنچ کر بھی اور وہ ایک مرد صالح ہو گا۔"

اس آیت میں بات پوری طرح کھول کر انہیں بشارت دی گئی ہے۔ یہ بشارت اللہ کے کلام (فرمان) سے متعلق ہے جس کا نام مسیح عیسیٰ ابن مریم ہو گا۔ نحو کے اعتبار سے لفظ مسیح کلمہ کا بدل ہے یعنی کلمہ مسیح ابن مریم ہیں۔ اب اس تعبیر کلام کے بعد کوئی بات ہی نہیں رہتی .... یہ اور اس قسم کے دوسرے بے شمار امور' اصل غیبی امور ہیں اور ان کی ماہیت تک رسائی پوری طرح ممکن نہیں ہوتی۔ اور ہو سکتا ہے کہ یہ امور ان متشابہات میں سے ہوں' جن کے بارے میں اس سورت کے آغاز میں کہا گیا :۔

هُوَ الَّذِيٓ أَنزَلَ عَلَيْكَ الْكِتَٰبَ مِنْهُ ءَايَٰتٌ مُّحْكَمَٰتٌ هُنَّ أُمُّ الْكِتَٰبِ وَأُخَرُ مُتَشَٰبِهَٰتٌ فَأَمَّا الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُونَ مَا تَشَٰبَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَآءَ تَأْوِيلِهِ

"وہی خدا ہے جس نے تم پر کتاب نازل کی ہے۔ اس کتاب میں دو طرح کی آیات درج ہیں' ایک محکمات' جو کتاب کی اصل بنیادیں ہیں اور دوسری متشابہات' جن لوگوں کے دلوں میں ٹیڑھ ہے' وہ فتنے کی تلاش میں ہمیشہ متشابہات ہی کے پیچھے پڑے رہتے ہیں۔ اور ان کو معنی پہنانے کی توثیق کرتے ہیں۔" .... لیکن اس معاملے کا سمجھنا بہت ہی آسان ہے اگر ہم اسے خدا ترسی کے ساتھ سمجھنا چاہیں۔ اور اللہ کی کاریگری اور اس کی قدرت کی نشانیاں ہمارے ذہن میں ہوں اور ہمیں یہ معلوم ہو کہ اللہ کی مشیئت اور حدود و قیود سے آزاد ہے جو اس نے اس جہاں رانی کیلئے خود وضع کیے ہیں۔

اللہ نے جب چاہا تو اس نے مٹی سے آدم کو پیدا کیا' اب تخلیق آدم براہ راست مٹی سے ہوئی اور مٹی میں نفخ روح ہوا ہو یا ابتدائی جرثومہ پیدا کیا گیا ہو اور وہ وجود آدم پر منتج ہوا۔ میں یہاں اس بحث میں نہیں پڑتا کہ تخلیق آدم مجسمے سے ہوئی یا جرثومے سے۔ اس لئے کہ ان دونوں صورتوں میں وہ راز راز ہی رہتا ہے۔ جسے ہم راز حیات کہتے ہیں۔ وہ راز جس نے پہلی مخلوق کو حیات عطا کی۔ یا جس طرح آدم کے پہلے مجسمے میں روح ڈالی گئی یا جرثومے میں ڈالی دونوں صورتوں میں یہ ایک عظیم اعجاز اور معجزہ ہے۔ اس لئے کہ جرثومہ زندہ ہو یا پورے انسان کی زندگی میں یکدم روح ڈال دی جائے۔ دونوں صورتیں معجزہ ہیں۔

سوال یہ ہے کہ یہ زندگی کہاں سے آئی؟ کیسے آئی؟ بہرحال ہم یہ بات قطعیت کے ساتھ کہتے ہیں کہ یہ زندگی مٹی اور ان تمام مردہ عناصر سے علیحدہ کوئی چیز ہے۔ یہ ایک زائد چیز ہے۔ یہ عناصر سے علیحدہ ایک حقیقت ہے۔ اس کے کچھ آثار ہیں۔ اس کی کچھ علامات ہیں جو مٹی یا دوسرے عناصر کے اندر موجود نہیں ہیں۔ نہ دوسرے مردہ مادیات میں موجود ہوتی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہ راز یعنی راز حیات کی اصلیت کیا ہے؟ یہ بات کافی نہیں ہے کہ اس حقیقت کا انکار کرنے کیلئے ہم صرف یہ کہہ دیں کہ ہم نہیں جانتے۔ جیسا کہ آج کل مادہ پرست عاجز آکر یہ کہہ جاتے ہیں لیکن ان کی اس بات کو نہ کوئی عقلمند آدمی اہمیت دیتا ہے نہ کوئی عالم اسے تسلیم کرتا ہے۔

اس راز کو ہم اس حقیقت کے باوجود نہیں جانتے کہ ہم نے راز حیات کے پانے کے سلسلے میں آج تک انتہائی کوششیں کیں لیکن وہ راز ہم نہ پاسکے۔ اس لئے کہ ہم نے اس راز کو معروف مادی ذرائع سے پانے کی کوششیں کیں۔ اور وہ اکارت گئیں۔ ہم نے زندگی کو موت کے جنگل سے چھڑانے کی کوشش کی مگر ناکام رہے۔........ ہم نہیں جانتے لیکن اللہ جس نے موت و حیات کی تخلیق کی وہ تو جانتا ہے۔ وہ کہتا ہے "اس نے اپنی روح اس میں پھونک دی" اور اس کا اظہار اس نے لفظ کُنْ فَیَکُوْنُ سے کیا۔ یعنی "ہو جا" بس ہو گیا۔ اب یہ نفخ روح کیا ہے؟ کس طرح حالت موت پر یہ نفخ روح ہوتی ہے اور وہ حالت حیات میں بدل جاتی ہے اور یہ راز لطیف راز فہم سے باہر رہتا ہے۔

اس کی حقیقت کیا ہے؟ اس کی کیفیت کیا ہے؟ یہ وہ ماہیت و کیفیت ہے جس کا ادراک عقل بشری کے دائرہ قدرت سے باہر ہے۔ کیونکہ یہ اس کی شان اور مقام سے باہر ہے۔ اسے یہ قدرت ہی نہیں دی گئی کہ وہ اس کا ادراک کرسکے۔ اس کے کاسہ سر میں یہ سمندروں جیسی حقیقت سما ہی نہیں سکتی؟ اس لئے کہ انسان کا ایک اپنا مقصد تخلیق ہے۔ اس کے یہاں کچھ فرائض ہیں۔ یعنی فریضہ خلافت فی الارض اس کے لئے اسے اس راز سے آگاہی ضروری ہی نہیں ہے۔ وہ یہاں حیات و موت کے کاروبار کیلئے نہیں پیدا کیا گیا تاکہ اسے حیات کی ماہیت بتائی جائے۔ اسے نفخ روح کی کیفیت سے آگاہ کیا جائے اور زندگی کی پہلی سیڑھی پر اس زندگی کا اتصال ذات آدم سے کیسے ہوا؟ جب ان میں زندگی کا ست ڈالا گیا۔

یہاں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ جب انہوں نے حضرت آدم میں اپنی روح پھونکی تو اس کی وجہ سے حضرت آدم کو یہ اعزاز حاصل ہوا یہاں تک کہ ان کو ملائکہ پر بھی فوقیت دی گئی۔ لہٰذا ضروری ہے کہ یہ اعزاز اور یہ حیات جرثومے اور میکربادت کے علاوہ بھی کوئی چیز ہے۔ یہی وہ نفخ روح ہے جس کی وجہ سے ہم یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ اس کرہ ارض پر انسان ایک ایسی جنس ہے۔ اس کی تخلیق خاص طور پر علیحدہ ہوئی ہے۔ اور اس کائنات میں اس کا معتبر اور مکرم مقام ہے۔ جو دوسری زندہ چیزوں کو حاصل نہیں ہے۔

بہر حال یہاں ہمارا موضوع تخلیق انسان نہیں ہے۔ سیاق کلام میں کچھ دیر کیلئے ہم نے اسی نکتے پر اس لئے روشنی ڈالی ہے کہ بعض اوقات ایک قاری کے ذہن میں یہ شبہ پیدا ہوسکتا ہے۔ کہ انسان کی پیدائش اس طریقے پر کیسے ممکن ہے۔ یہاں اہم بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ یہاں راز حیات سے ہمیں آگاہ فرماتے ہیں۔ اگرچہ ہم اس کی ماہیت نہیں پاسکتے۔ اگرچہ ہم مردہ میں نفخ روح کی کیفیت کا ادراک نہیں کرسکتے لیکن راز حیات کو تو سمجھ سکتے ہیں۔........ حضرت آدم علیہ السلام کو براہ راست پیدا کر کے اللہ تعالیٰ نے پھر پیدائش انسانیت کیلئے ایک طبعی راہ متعین کر دی۔ یعنی میاں بیوی کے ملاپ کے نتیجے میں قافلہ انسانیت رواں دواں ہوا۔ یعنی بیوی کے پیدا کردہ انڈے کے ساتھ مرد کے جرثومے کے ملاپ یوں گودیں ہری ہوئیں، نسلیں چلیں جس طرح یہ انڈہ زندہ ہے۔ اس طرح یہ جرثومہ بھی زندہ ہے۔ دونوں متحرک ہیں۔

قافلۂ حیات اس شاہراہ پر چل پڑا اور لوگ اس کے عادی ہوگئے۔ اب ایک مقام ایسا آگیا کہ اللہ تعالیٰ نے یہ پیش پا افتادہ راستے کو بدل دیا۔ مروجہ اصل ایک محدود وقت کیلئے معطل کر دیا گیا۔ ایک فرد کے بارے میں اس قاعدے کو معطل کر دیا اور ایک مثال ایسی پیدا کر دی گئی جو آدم علیہ السلام کی شکل میں ہو۔ اگرچہ بتمامہ اس جیسی نہ ہو۔ یہاں اب صرف عورت سے بچہ پیدا ہوتا ہے۔ وہی روح اس عورت میں پھونک دی جاتی ہے جس کی ابتدائی تخلیق ہوئی۔ اور اس عورت کے رحم میں زندگی کے آثار پیدا ہوگئے۔ یہاں لاہوتی سوالات پیدا ہوئے۔ کیا یہ نفخ کلمہ ہے؟ کیا کلمہ ارادے کے متوجہ ہونے کا نام ہے؟ کیا کلمہ کن ہے؟ جو کبھی حقیقت ہوتا ہے اور کبھی محض توجہ ارادہ سے کنایہ ہوتا ہے۔ کیا کلمہ خود حضرت عیسیٰ ہیں یا کلمہ وہ ہے جس سے وہ وجود میں آئے؟........ یہ تمام مباحث ایسے ہیں جن سے شبہات ہی حاصل ہوسکتے ہیں۔ ان مباحث کے نتیجے میں یقین حاصل نہیں ہوتا۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے ایک زندگی ایسی وجود میں لائی تھی

جس کی کوئی مثال نہ ہو۔ اس نے اپنے بے قید ارادے کے ذریعے اسے وجود بخشا۔ اس زندگی میں اپنی جانب خاص سے ایک روح پیدا کی۔ ہمیں اس روح کے آثار تو نظر آتے ہیں لیکن ہم اس کی ماہیت اور کیفیت کے ادراک سے قاصر ہیں۔ ہم پر فرض ہے کہ ہم اس سے قاصر ہیں۔ اس لئے کہ اس ادراک کی وجہ سے ہماری اس قوت میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا جو ہمیں اس کرۂ ارض پر فریضہ خلافت کی ادائیگی کیلئے ضروری ہے۔

یہ معاملہ' اس صورت میں بہت سہولت کے ساتھ سمجھا جاسکتا ہے اور اس صورت میں اس کے وقوع پذیر ہونے میں کوئی شبہ بھی پیدا نہیں ہوتا......... غرض ملائکہ نے حضرت مریم کو بشارت دی۔ اس بشارت میں اللہ کی جانب سے فرمان آنا تھا' اس فرمان کا نام مسیح عیسی ابن مریم بتایا گیا۔ ان کی نوع' نام و نسب کا ذکر بھی کر دیا گیا۔ نسب نامہ ماں کی طرف راجع ہوا۔ بشارت میں ان کی صفات اور اللہ کے ہاں ان کے لئے رتبہ بلند کا ذکر کیا گیا۔ دنیا و آخرت میں ان کی وجاہت کا ذکر بھی ہوا اور یہ اعلان بھی ہوا کہ وہ اللہ کے مقرب بندوں میں سے ہو گا۔ اور یہ ذکر بھی ہوا کہ پیدا ہوتے ہیں اس سے معجزات کا ظہور شروع ہو گا۔ "گہوارے" ہی میں لوگوں سے باتیں شروع کر دے گا۔ یعنی جوانی میں بھی بات کرے گا۔ اور اس کی صفات میں سے اہم صفت یہ ہوگی کہ وہ قافلہ صالحین میں سے ہو گا۔

مریم کنواری تھیں' اس کی زندگی پاکیزہ تھی' اس کی سوچ بابت ولادت ایسی ہی تھی جس طرح ماحول میں وہ دیکھ رہی تھی' اس نے اس بشارت کو اسی طرح لیا جس طرح ایک جوان لڑکی اسے سمجھ سکتی ہے' وہ فوراً اپنے رب کی طرف متوجہ ہوئیں' استدعا کی کہ یہ معمہ ان کے فہم کیلئے ناقابل حل ہے۔ اس کی عقل حیران ہے۔

قَالَتْ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ وَلَدٌ وَّ لَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ .... "میرے ہاں بچہ کہاں سے ہو گا' مجھے تو کسی شخص نے ہاتھ تک نہیں لگایا۔"......... اس کا انہیں فوراً جواب دیا گیا' اس جواب میں انہیں اس سادہ حقیقت کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے۔ جسے انسان روز مرہ زندگی میں سلسلہ اسباب و مسببات کے ساتھ عادی ہو جانے کی وجہ' بھول چکا ہے۔ اس لئے کہ اس کے ذرائع علم قلیل ہیں۔ اور وہ اپنے محدود دائرہ عادت کے اندر بند رہتا ہے۔

قَالَ كَذٰلِكِ اللّٰهُ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ؕ اِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ .... "وہ جب کسی کام کے کرنے کا فیصلہ کرتا ہے تو بس کہتا ہے کہ ہو جا اور وہ ہو جاتا ہے۔"

جب اللہ تعالیٰ' اس معاملے کو ابتدائی آفرینش کی حقیقت سے وابستہ کرتے ہیں تو تعجب ختم ہو جاتا ہے۔ حیرانی جاتی رہتی ہے۔ دل مطمئن ہو جاتا ہے۔ اور انسان خود اپنے آپ سے تعجب کے ساتھ پوچھنے لگتا ہے کہ تمہیں اس قدر سادہ اور صاف بات پر تعجب کیسے ہو گیا۔ جو نہایت فطری اور قریب الفہم ہے۔

اس طرح قرآن کریم' اسلامی تصور' کو اس قدر سادگی اور فطری انداز میں' ایسے عظیم حقائق تک بھی پھیلا دیتا ہے۔ فطری انداز میں' قریب الفہم انداز میں اور وہ شبہات جنہیں فلسفیانہ جذبات مزید الجھاتے تھے۔ اسلام انہیں صاف کر کے دلوں میں بٹھا دیتا ہے۔ اور وہ عقل کے بھی قریب آجاتے ہیں۔

اس کے بعد اس بشارت کی مزید تفاصیل بتائی جاتی ہیں' جس کی پیدائش کیلئے حضرت مریم کو منتخب کیا گیا اور جو بے مثال طریقے سے روبعمل آرہی ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ اس نئے آنے والے کی سیرت اور کردار کیا ہو گا۔ حضرت عیسیٰ کی آئندہ تاریخ بتائی جاتی ہے۔ اب بشارت اور تاریخ مستقل ساتھ ساتھ جاری ہیں گویا بشارت بھی ہو رہی اور ساتھ ہی تاریخ بھی چلتی پھرتی ہے۔ یہ قرآن کریم کا اپنا اسلوب کلام ہے۔

وَ يُعَلِّمُهُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ التَّوْرٰىةَ وَ الْاِنْجِيْلَ .... "اور اللہ اسے کتاب و حکمت کی تعلیم دے گا اور تورات اور انجیل کا علم سکھائے گا۔ اور بنی اسرائیل کی طرف اپنا رسول مقرر کرے گا۔" کتاب سے کبھی مراد کتابت بھی ہوتی ہے اور کبھی اس سے مراد تورات اور انجیل بھی ہوتی ہے۔ اس صورت میں تورات اور انجیل کا عطف کتاب پر عطف بیان ہو گا۔ حکمت انسان کے ذہن میں ایک ایسے ملکہ کا نام ہے جس کے ذریعہ وہ ہر چیز کو اپنے مقام پر رکھتا ہے۔ جس کے ذریعہ انسان صحیح اور برے کی تمیز کر سکتا ہے۔ اور صحیح کا اتباع کر سکتا ہے۔ اور یہ حکمت اور ملکہ دراصل خیر کثیر ہے۔ تورات بھی حضرت عیسیٰ کی کتاب تھی جس طرح انجیل ان کی کتاب تھی' تورات اس دین کا اساس تھی جو وہ لیکر آتے تھے۔ انجیل دراصل اسی دین کا ایک تکملہ تھا' اس کے ذریعہ تورات کی اصل روح کا احیاء مطلوب تھا' وہ روح جو یہودیوں میں ختم ہو گئی تھی۔ ان کے دل اس روح سے خالی ہو گئے تھے۔ وہ لوگ جو مسیحیت پر بحث کرتے ہیں' ان میں سے اکثر لوگوں کے ذہن میں یہ بات نہیں ہوتی کہ حضرت مسیح کے دین کی اصل اساس تورات ہے۔ اس میں وہ نظام شریعت ہے جس پر معاشرے کا نظام قائم ہے۔ انجیل نے اس میں بہت سی کمی بیشی کی ہے۔ وہی انجیل بذات خود تو وہ صرف احیائے دین کی ایک جدوجہد تھی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مقصد یہ تھا کہ ظاہری نصوص سے پیچھے جاکر انسان کے ضمیر اور اس کی روح کو پاک کیا جائے۔ اور وہ تحریک احیائے روح کیا تھی جس کی وجہ سے اس معاشرے نے آپ کے خلاف سازش کی تھی۔ وہ اور جس کیلئے آپ جدوجہد کرتے رہتے تھے۔ وہ یہ تھی:

وَ رَسُوْلًا اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۙ۬ اَنِّيْ قَدْ جِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۙ اَنِّيْٓ اَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطِّيْنِ كَهَيْـَٔةِ الطَّيْرِ فَاَنْفُخُ فِيْهِ فَيَكُوْنُ طَيْرًۢا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَ اُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَ الْاَبْرَصَ وَ اُحْيِ الْمَوْتٰى بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَ اُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَاْكُلُوْنَ وَ مَا تَدَّخِرُوْنَ ۙ فِيْ بُيُوْتِكُمْ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ

اور جب وہ بحیثیت رسول بنی اسرائیل کے پاس آیا تو اس نے کہا میں تمہارے رب کی طرف سے تمہارے پاس نشانی لیکر آیا ہوں۔ میں تمہارے سامنے مٹی سے پرندے کی صورت کا ایک مجسمہ بناتا ہوں۔ اور اس میں پھونک مارتا ہوں۔ وہ اللہ کے حکم سے پرندہ بن جاتا ہے۔ میں اللہ کے حکم سے مادرزاد اندھے اور کوڑھی کو اچھا کرتا ہوں اور مردے کو زندہ کرتا ہوں۔ میں تمہیں بتاتا ہوں کہ تم کیا کھاتے ہو اور کیا اپنے گھروں میں ذخیرہ کر کے رکھتے ہو۔ اس میں تمہارے لئے کافی نشانی ہے۔ اگر تم ایمان لانیوالے ہو۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ کی رسالت صرف بنی اسرائیل کیلئے تھی۔ اس لئے کہ آپ انبیائے بنی اسرائیل میں سے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ تورات جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی' اور جس میں بنی اسرائیل کی زندگی کی تنظیم کیلئے شریعت موجود تھی۔ اور جس میں باہم معاملات اور اجتماعی تنظیم کے امور طے ہوئے تھے۔ وہی حضرت عیسیٰ علیہ اسلام کی کتاب بھی تھی' ہاں اس پر انجیل کا اضافہ کیا گیا تھا۔ اور مقصد یہ تھا کہ بنی اسرائیل میں روحانی پاکیزگی پیدا کی جائے اور ان کا ضمیر جاگ اٹھے اور قلب روشن ہو۔

اور وہ معجزہ جس کی بابت اللہ نے ان کی والدہ حضرت مریم کو بشارت دی تھی کہ وہ معجزہ ان کے پاس ہو گا۔ اور جس کے ساتھ اس نے بنی اسرائیل سے عملاً مباحثہ کیا وہ یہی معجزہ احیاء تھا۔ یعنی مردہ چیز میں پھونک مار کر روح ڈالدینا' اور کسی چیز کا زندہ ہو جانا' اور مردہ انسانوں کو ازسرنو زندہ کرنا اور مادرزاد اندھوں کو نظر عطا کیا جانا۔ اور کوڑھی کا تندرست ہونا اور غیب کی خبریں دینا مثلاً یہ کہ بنی

اسرائیل نے کیا کھایا ہے اور کیا گھروں میں ذخیرہ کیا ہے۔ جیساکہ یہ اشیاء نظروں سے اوجھل ہوں...... یہاں آیت میں حضرت عیسیٰ ؑ کی زبانی جن معجزات کا اظہار ہوا ہے۔ اور جن کی بشارت حضرت مریم کو دی گئی تھی اور جن کا اظہار پھر بعد میں حضرت عیسیٰ کی زبان سے بھی ہوا۔ یہاں آیت میں بار بار اس بات کی تاکید کی جاتی ہے کہ یہ سب معجزات کا جو اظہار ہوا' اور جو عملاً بنی اسرائیل کے سامنے پیش بھی ہوئے۔ یہ سب معجزات اللہ کی جانب سے تھے اور اللہ کے اذن سے تھے۔ ہر معجزے کے بعد اذن اللہ کی تاکید کی گئی ہے۔ یہ محض اس احتیاط کی خاطر کی کوئی انہیں حضرت عیسیٰ ؑ کا ذاتی کمال نہ سمجھے۔ ان تمام معجزات کا تعلق یا تو زندگی کی تخلیق سے ہے اور یا جس مخلوق سے زندگی نکل جائے۔ اس میں دوبارہ زندگی لوٹانے سے ہے۔ یا انسانی صحت کے ساتھ ان کا تعلق ہے جو کہ خود بقائے حیات کا ایک ذریعہ ہے۔ یا پھر ان معاملات کو دیکھنے سے جو بظاہر نظروں سے اوجھل ہوں۔ ان تمام معجزات کا تعلق اپنی حقیقت کے اعتبار سے حضرت عیسیٰ ؑ کے غیر معمولی تولد کے معجزے سے ہے۔ اللہ نے حضرت عیسیٰ کو اس طریقے سے وجود بخشا جس کی کوئی مثال ماسوائے مثال حضرت آدم کے اور نہ تھی۔ اگر اللہ اپنی مخلوقات میں سے ایک مخلوق کے ہاتھ پر اس قسم کے معجزات کا اظہار فرماسکتے ہیں تو وہ بذات خود اس طریقے پر معجزے کے طور پر خود حضرت عیسیٰ کو کیوں پیدا نہیں کرسکتے۔ اس لئے نہ ان شبہات کا کوئی جواز ہے جو حضرت عیسیٰ کے بارے میں پھیلائے گئے' نہ ان کہانیوں کی ضرورت ہے جو حضرت عیسیٰ ؑ کی ولادت کے بارے میں خود عیسائیوں نے تصنیف کیں۔ اس لئے کہ جب معاملہ اللہ کی مشیئت کا ہو جائے تو پھر کوئی استحالہ نہیں رہتا۔ اور خود انسانی عادت اللہ پر کوئی پابندی عائد نہیں کرسکتی۔

وَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَ لِاُحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ حُرِّمَ عَلَيْكُمْ وَ جِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوْنِ۝ اِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ

"اور میں اس تعلیم و ہدایت کی تصدیق کرنیوالا بن کر آیا ہوں جو تورات میں سے اس وقت میرے زمانہ میں موجود ہے۔ اور اس لیے آیا ہوں کہ تمہارے لئے بعض ان چیزوں کو حلال کر دوں جو تم پر حرام کر دی گئیں ہیں۔ دیکھو' میں تمہارے رب کی طرف سے تمہارے پاس نشانی لیکر آیا ہوں۔ لہٰذا اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ اللہ میرا رب بھی ہے اور تمہارے رب بھی' لہٰذا تم اس کی بندگی اختیار کرو' یہی سیدھا راستہ ہے۔"

حضرت عیسیٰ ؑ کی دعوت کا یہ خاتمہ ہے۔ یعنی یہ تھی وہ دعوت جو آپ نے بنی اسرائیل کو دی۔ اس میں انہی بنیادی نکات کی وضاحت کی گئی ہے جو ہمیشہ اللہ کے دین کے اصل نکات رہے ہیں۔ اور جن کی طرف تمام رسول دعوت دیتے رہے ہیں۔ اور یہ وہ حقائق ہیں جن کی بہت ہی اہمیت ہے۔ خصوصاً جبکہ ان حقائق کو حضرت عیسیٰ ؑ کی زبان سے دہرایا جاتا ہے۔ اس لئے کہ ان کی ولادت ہی وجہ نزاع تھی اور یہ نزاعات اس لئے پیدا ہو گئے تھے کہ لوگوں نے دین اور رسولوں کی حقیقت پر غور نہ کیا۔ یعنی یہ کہ رسول بھی ایک ہیں اور ان کا دین بھی ایک ہے۔ اس لئے حضرت عیسیٰ ؑ فرماتے ہیں۔

وَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَ لِاُحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ حُرِّمَ عَلَيْكُمْ

"اور میں اس تعلیم کی تصدیق کرتا ہوں جو تورات میں سے میرے سامنے موجود ہے۔ اور اس لئے آیا ہوں کہ تم پر بعض ان چیزوں کو حلال کر دوں جو تم پر حرام کر دی گئی تھیں۔"........

یہاں وہ سچا مذہب بیان کیا جاتا ہے جو مسیحیت کا اصل مذہب تھا۔ پس تورات جو حضرت موسیٰ ﷺ پر نازل کی گئی تھی اس میں وہ دین برحق پوری طرح موجود تھا۔ اور اس میں وہ پوری شریعت موجود تھی جو اجتماعی زندگی کو بہترین طور پر منظم کرتی تھی۔ یعنی اس دور کی ضروریات کے مطابق اور اس وقت بنی اسرائیل کے جو حالات تھے۔ ان کی نسبت سے اور اس نقطۂ نظر سے کہ اس وقت وہ انسانوں کے ایک خاص گروہ کیلئے ایک خاص نظام زندگی تھا۔ اور حضرت مسیح اپنی رسالت میں اسی تورات پر اعتماد فرماتے تھے۔ آپ نے تورات کی تصدیق کی۔ ہاں اس میں بعض حرام چیزوں کو حلال کر دیا گیا اور وہ چیزیں ان پر حرام بھی بطور سزا کی گئی تھیں' اس لئے کہ انہوں نے بعض گناہوں اور بعض بداعمالیوں کا ارتکاب کیا تھا۔ اور ان کی تربیت کیلئے اللہ تعالیٰ نے بعض حلال چیزوں کو بھی حرام کر دیا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے بذریعہ عیسیٰ ﷺ ان پر رحم فرمایا اور وہ بعض اشیاء جو حرام کر دی گئی تھیں انہیں دوبارہ حلال کر دیا گیا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر دین کا یہ حقیقی مزاج ہوتا ہے کہ وہ لوگوں کی زندگی کو بذریعہ قانون سازی منظم کرتا ہے۔ دین کا مزاج صرف تہذیب اخلاق نہیں ہوتا۔ نہ دین انسان کے تصورات اور اس کے وجدان و شعور کو درست کرنے پر اکتفاکرتا ہے۔ نہ دین کا صرف یہ کام ہوتا ہے کہ وہ لوگوں کیلئے کچھ عبادات تجویز کر دے اور وہ ان مراسم عبودیت کے عابد بن کر بیٹھ جائیں۔ ایسے جزوی مسائل ہی پر اکتفاء کرنے والا دین' اپنے اصل معنوں میں دین نہیں ہوتا۔ دین تو صرف وہ ہوتا ہے جو پوری زندگی کا نظام ہو' وہ خدا تعالیٰ کا تجویز کردہ ہو۔ اور جو انسانوں کی زندگی کو اللہ کے منہاج کے مطابق استوار کرے۔

اور یہ بات بھی درست ہے کہ ایمانی عقائد' مراسم عبودیت' اخلاقی قدریں اگر دین سے علیحدہ کر دی جائیں تو اس صورت میں دین صرف فقہ بن جاتا ہے۔ اور پھر وہ انسانی زندگی میں صحیح طرح کام نہیں کرتا۔ پھر یہ بات دینی مزاج کے خلاف ہو جاتی ہے۔

یہی وہ حادثہ ہے جو مسیحیت کے ساتھ پیش آیا کہ بعض تاریخی اسباب کی وجہ سے' اور پھر اس وجہ سے بھی کہ وہ ایک محدود وقت کے لئے نازل ہوئی تھی' اور وہ حضرت محمد ﷺ کی آخری نبوت کیلئے بطور تمہید آئی تھی۔ مسیحیت کی روحانی تعلیمات سے نظام شریعت علیحدہ ہو گیا۔ وہ تاریخی اسباب یہ تھے کہ یہودیوں اور مسیح علیہ السلام کے درمیان سخت عداوت پیدا ہو گئی۔ آپ کے بعد آپ کے انصار اور یہودیوں کے درمیان بھی سخت عداوت رہی۔ جس کی وجہ سے تورات جس کے اندر اسلامی نظام زندگی اور شریعت تھی اور انجیل جس کے اندر صرف روحانی قدروں کا احیاء تھا' کے درمیان فاصلے وسیع ہو گئے۔ بہرحال یہ شریعت تورات بھی ایک محدود قوم اور محدود وقت کے لئے تھی اور حضرت عیسیٰ کی اخلاقی تعلیمات بھی۔ تاکہ اللہ کے نظام قدرت میں طے شدہ منصوبے کے مطابق حضرت محمد ﷺ کی آخری اور جامع شریعت نازل ہو اور ہمیشہ کیلئے پوری انسانیت کیلئے شریعت ہو۔

بہرحال صورت حال یہ ہو گئی کہ مسیحیت ایک ایسا تناور درخت بن گئی جس میں نظام شریعت نہ تھا۔ اس لئے وہ ہمیشہ ان اقوام کی اجتماعی زندگی پر کنٹرول کرنے سے عاجز رہی جن اقوام نے بھی اسے قبول کیا۔ اس لئے کہ اجتماعی زندگی کی راہنمائی کیلئے ایک ایسا تصور حیات ضروری ہے جو زندگی کے ہر شعبے کی وضاحت کرتا ہو' وہ یہ بتاتا ہو کہ اس پوری کائنات میں انسان کی قدر و قیمت کیا ہے۔ اس کے اندر ایک مضبوط نظام عبادات ہو' اور وہ ایک اچھا اخلاقی اور روحانی نظام بھی رکھتا ہو' اور اس کے بعد اس کے پاس ایک بہترین اجتماعی قانونی نظام ہو اور یہ اخلاقی اور قانونی نظام اس کے اصل تصور حیات سے ماخوذ ہو۔ اگر دین ان عناصر ترکیبی سے مرکب ہو تب وہ اجتماعی زندگی کو منظم کر سکتا ہے۔ [illegible] انسان کو حکمت دین بھی سمجھ میں آتی ہے اور وہ پھر انسانی نظام کی ضمانت دیتا ہے۔

غرض جب مسیحیت کی اخلاقی تعلیمات شریعت سے جدا ہو گئیں تو پھر مسیحیت اس قابل نہ رہی کہ وہ مکمل نظام حیات بن جائے۔ اس لئے لوگوں کی زندگی میں اخلاقی قدروں اور اجتماعی قدروں کے درمیان مکمل جدائی واقع ہو گئی۔ اور ان کے اخلاق اور ان کے اعمال

کے درمیان اتحاد نہ رہا۔ اس طرح ان کا اجتماعی نظام ایک فطری نظام نہ رہا جو ان کی اخلاقی قدروں سے ہم آہنگ ہو۔ اس لئے عیسائیوں کا اجتماعی نظام ہمیشہ یا تو ہوا میں معلق رہا' روحانی دنیا سے اس کا کوئی تعلق نہ رہا یا اگر وہ چلا بھی تو وہ ایک لنگڑا لولا نظام تھا۔

تاریخ انسانی کے اندر جب انسانیت اس صورت حال سے دوچار ہوئی تو یہ کوئی معمولی واقعہ نہ تھا بلکہ یہ ایک عظیم حادثہ تھا۔ یہ بہت ہی تباہ کن حادثہ تھا۔ یہ ایک ایسا عظیم واقعہ تھا جس کی وجہ سے انسانیت کیلئے بدبختی کے چشمے پھوٹے۔ انسان حیرانی اور پریشانی کا شکار ہوئے۔ ان پر اخلاقی بے راہ روی کا سیلاب آیا۔ اور ایسی ایسی مصیبتیں آئیں جن میں یہ لادین مادی اجتماعی نظام آج تک گرفتار ہے اور آج یورپ اس کی مثال ہے۔ چاہے اب یہ نظام ان ممالک میں ہو' جن کا مسیحیت کے ساتھ ابھی تک تعلق ہو۔ اس لئے کہ مسیحیت میں سرے سے کوئی اجتماعی نظام ہی نہیں ہے۔ یا ان ممالک میں ہو جہاں سے مسیحیت ختم ہو گئی ہے۔ بہرحال دونوں ممالک کے درمیان کوئی زیادہ امتیاز نہیں ہے۔ اس لئے کہ مسیحیت جس طرح اسے حضرت مسیح علیہ السلام نے پیش کیا تھا' اور جس طرح ہر وہ نظام جس پر دین کا اطلاق ہوتا ہے' ایک ایسا نظام تھا جس میں زندگی کیلئے ایک مکمل شریعت اور نظام قانون موجود تھا۔ جو عقیدۂ توحید پر مبنی تھا۔ اور جو ان اخلاقی تصورات پر قائم تھا جو اس عقیدے سے ماخوذ تھے۔ اس لئے موجودہ مسیحیت کو اس لئے مسیحیت نہیں کہا جاسکتا کہ اس میں وہ پورا نظام زندگی موجود نہیں ہے جو حضرت مسیح نے پیش کیا۔ بلکہ مسیحیت سرے سے دین ہی نہ ہوگی۔ غرض ان عناصر ترکیبی کے سوا زندگی کے مسائل کے حل کیلئے کوئی اجتماعی نظام قائم نہیں ہو سکتا جو مکمل بھی ہو' جو نفس انسانی کی پوری ضروریات کیلئے کافی بھی ہو' جو انسان کی عملی زندگی کے مسائل حل کرتا ہو اور جو حیات انسانی کا وثیق رابطہ اپنے رب کے ساتھ قائم کردے۔ اور یہی وہ حقیقت ہے جو حضرت مسیح علیہ السلام کے اس قول کی تفسیروں اور مفہومات میں سے ایک مفہوم ہے' آپ فرماتے ہیں۔ :

وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَلِأُحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِي حُرِّمَ عَلَيْكُمْ

...... "میں تصدیق کرتا ہوں تورات کے اس حصے کی جو میرے سامنے موجود ہے اور تمہارے لئے بعض ان چیزوں کو حلال قرار دیتا ہوں جو تم پر حرام قرار دی گئی ہیں۔"

حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنے اس منصب کے اظہار کا استدلال توحید الہی سے کرتے ہیں جو اسلام میں پہلی عظیم حقیقت ہے' فرماتے ہیں۔ :

وَجِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ۝ اِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ۭ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ

"دیکھو' میں تمہارے رب کی طرف سے تمہارے پاس نشانی لیکر آیا ہوں۔ لہذا اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ اللہ میرا رب بھی ہے اور تمہارے بھی' لہذا تم اس کی بندگی اختیار کرو' یہی سیدھا راستہ ہے۔"

یہاں آپ اس نظریاتی تصور حیات کو پیش فرماتے ہیں' جس پر اللہ کا دین قائم ہوتا ہے۔ فرماتے ہیں کہ میں نے جو معجزات پیش کئے ہیں وہ میں نے اپنی طرف سے نہیں پیش کئے۔ بذات خود تو وہ ایک بشر ہیں وہ ایسے معجزات کیسے صادر کر سکتے ہیں۔ یہ اللہ کے معجزات ہیں اور میری دعوت خدا خوفی اور اطاعت رسول کے اساسی اصولوں پر قائم ہے۔ اس کے بعد وہ فرماتے ہیں کہ اللہ جس طرح میرا رب ہے اسی طرح تمہارا رب ہے۔ اور یہ کہ وہ بذات خود رب نہیں ہیں بلکہ عبد ہیں۔ اس لئے بندگی اور عبادت رب واحد کی کی جائے کیونکہ عبادت اس کے سوا کسی کی نہیں ہو سکتی۔ اس کے بعد ان تمام باتوں کا اظہار یعنی یہ کہ واحد ہے۔ اسی کی بندگی ہوگی' رسول اور اس

کے لائے ہوئے نظام حیات کی اطاعت ہوگی۔ یہ تو ہے صراط مستقیم اور اس کے سوا جو کچھ بھی ہے وہ بے راہی 'گمراہی اور انحراف ہے۔

○........○........○........○........○

ملائکہ کی جانب سے حضرت مریم کو بشارت 'پھر آنے والے نبی کی صفات 'اس کی رسالت' اس کے معجزات اور کلمات کے تذکرے کے بعد اب اس قصے میں اچانک وہ منظر سامنے آتا ہے جب حضرت عیسیٰ محسوس کرتے ہیں کہ بنی اسرائیل کفر اور انکار پر تل گئے ہیں 'اب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جانب سے اللہ کے دین کی نشرو اشاعت اور اس کے قیام کیلئے ایک عام اپیل کی جاتی ہے۔

فَلَمَّآ اَحَسَّ عِيْسٰى مِنْهُمُ الْكُفْرَ قَالَ مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ؕ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ ۚ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ ۚ وَاشْهَدْ بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ﴿۵۲﴾ رَبَّنَآ اٰمَنَّا بِمَآ اَنْزَلْتَ وَاتَّبَعْنَا الرَّسُوْلَ فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۵۳﴾

"جب عیسیٰ ؑ نے محسوس کیا کہ بنی اسرائیل کفرو انکار پر آمادہ ہیں تو اس نے کہا 'کون اللہ کی راہ میں میرا مددگار ہوتا ہے۔ حواریوں نے جواب دیا ہم اللہ کے مددگار ہیں 'ہم اللہ پر ایمان لائے۔ گواہ رہو کہ ہم مسلم ہیں۔ مالک جو فرمان تونے نازل کیا ہے 'ہم نے اسے مان لیا ہے اور رسول کی پیروی قبول کی 'ہمارا نام گواہی دینے والوں میں لکھ دے۔"

یہاں سیاق قصہ میں ایک بہت بڑا خلا ہے۔ یہاں اس بات کا ذکر نہیں کیا گیا کہ حضرت عیسیٰ کی ولادت ہوئی۔ نہ یہ مذکور ہے کہ ان کی ماں ان کے ساتھ قوم کے سامنے آئی اور اس نے گہوارے میں ان سے باتیں کیں 'یہ بات مذکور نہیں ہے کہ جوان ہوکر انہوں نے تبلیغ رسالت شروع کی 'نہ یہ مذکور ہے کہ حضرت عیسیٰ کی والدہ کو جن معجزات کے بارے میں بشارت دی گئی تھی وہ ان کے ہاتھ دکھائے گئے (جب کہ سورت مریم میں مذکور ہے۔) اس قسم کے گیپ قرآنی قصوں میں بار بار آتے ہیں 'اس کی ایک حکمت تو یہ ہے کہ تکرار نہ ہو' دوسری یہ کہ قرآن کریم میں قصص کے صرف وہی حصے دیئے جاتے ہیں جن کا تعلق اس سورت میں موضوع کلام سے ہوتا ہے باقی کڑیاں ترک کردی جاتی ہیں۔

غرض 'معجزات پیش کرنے اور تبلیغ شروع کرنے کے ساتھ ہی حضرت عیسیٰ ؑ نے محسوس کرلیا کہ یہ لوگ مان کر دینے والے نہیں ہیں' حالانکہ ایسے معجزات کا صدور کسی انسان سے ممکن نہ تھا۔ اور جن سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ ان معجزات کے پس منظر میں صرف اللہ کی ذات کام کررہی ہے۔ اللہ کی قوتیں حضرت عیسیٰ کی مؤید ہیں۔ اور پھر ان امور کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی حقیقت تھی کہ حضرت مسیح اس لئے بھی تشریف لائے تھے کہ بنی اسرائیل پر ان کی نادانیوں کی وجہ سے 'جو چیزیں بطور سزا حرام کی گئیں تھیں انہیں حلال کردیں 'تاکہ ان پر تخفیف ہوجائے اور قیود اور بوجھ اتر جائیں۔

تو ایسے موقعہ پر آپ نے فرمایا قَالَ مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ "کون اللہ کی راہ میں میرا مددگار ہے۔" یعنی کون ہے جو دعوت دین 'اور اسلامی نظام کے قیام کے سلسلے میں میری معاونت کرتا ہے۔ کون ہے جو میرے ساتھ اللہ تک پہنچنے کے سلسلے میں مددگار ہوتا ہے تاکہ میں اپنے فرائض اچھی طرح ادا کرسکوں......... یہ تحریک دعوت دین کا طریق کار رہا ہے۔ کہ ہر داعی کیلئے انصار کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو اس کا ساتھ دیتے ہیں۔ جو اس کی دعوت کے علم اٹھاکر چلتے ہیں 'جو اس کی حمایت کرتے ہیں اور اس دعوت کو مسلسل پھیلاتے ہیں اور پھر اس صاحب دعوت کی وفات یا چلے جانے کے بعد اسے لیکر اٹھتے ہیں تو

قَالَ الْحَوَارِيُّونَ نَحْنُ أَنصَارُ اللَّهِ آمَنَّا بِاللَّهِ وَاشْهَدْ بِأَنَّا مُسْلِمُونَ

"حواریوں نے جواب دیا ہم اللہ کے مددگار ہیں' ہم اللہ پر ایمان لائے۔ گواہ رہو کہ ہم مسلم ہیں۔"

حواریوں نے اسلام کا ذکر ان معنوں میں کیا' جن کا تعلق دین کی حقیقت سے ہے۔ اور انہوں نے پھر اپنے اسلام پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو گواہ بنایا اور اللہ کی مدد کیلئے تیار ہوگئے۔ یعنی اللہ کے رسول کی نصرت' دین اسلام کی نصرت اور اسلامی نظام حیات کی نصرت کیلئے وہ تیار ہوئے اور اس کے بعد وہ اپنے رب کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور وہ اس معاملے میں براہ راست اللہ سے بھی اپنا رابطہ قائم کرتے ہیں کہ وہ اس معاملے کیلئے تیار ہوگئے۔ اس لئے آپ بھی اس بات کے گواہ رہیں۔

رَبَّنَا آمَنَّا بِمَا أَنزَلْتَ وَاتَّبَعْنَا الرَّسُولَ فَاكْتُبْنَا مَعَ الشَّاهِدِينَ

"مالک جو فرمان تو نے نازل کیا ہے' ہم نے اسے مان لیا ہے اور رسول کی پیروی قبول کی' ہمارا نام گواہی دینے والوں میں لکھ دے۔"

یہ جو انہوں نے براہ راست اللہ میاں کی طرف توجہ فرمائی' اور اللہ کے ساتھ بھی یہ وعدہ کیا' اس میں ایک اہم نکتہ پوشیدہ ہے۔ مومن کا ابتدائی عہد صرف اللہ کے ساتھ ہوتا ہے۔ جب ایک رسول کسی پیغام کو اہل ایمان تک پہنچا دیتا ہے تو پھر اس کی ڈیوٹی ختم ہو جاتی ہے اور اب مومن کی بیعت اللہ تعالیٰ کے ساتھ قائم ہو جاتی ہے۔ اور جب رسول اس دنیا سے چلا بھی جائے تب بھی یہ فریضہ اور یہ ذمہ داری مومن کے گلے میں پڑی رہتی ہے۔ اور اس بیعت میں' معاہدہ ذمہ داری میں یہ بات ہوتی ہے کہ وہ رسول کی اطاعت کرتے رہیں گے۔ اس لئے ایمان صرف عقیدے کا نام نہیں ہے جو انسان کے ضمیر میں ہوتا ہے بلکہ اتباع کا نام ہے اور رسول کے نظام کی اطاعت بھی ضروری ہے اور یہی وہ مفہوم ہے جس کے اردگرد اس پوری سورت کے مضامین گھوم رہے ہیں۔ اس سورت میں اس مضمون کو مختلف طریقوں سے مکرر طور پر بیان کیا گیا ہے۔

یہاں حواریوں کے کلام میں ایک اہم جملہ ہے فَاكْتُبْنَا مَعَ الشَّاهِدِينَ .... "آپ ہمارے نام گواہی دینے والوں میں لکھ دیں۔" سوال یہ ہے کہ وہ کیا شہادت دیتے ہیں اور کس بات کے وہ گواہ ہیں؟

در حقیقت ایک شخص جو ایمان لا کر مسلم بن جاتا ہے اور اللہ کے دین کے سامنے سر تسلیم خم کرتا ہے تو اس کے بعد اس کا فرض ہے کہ وہ اس دین کے بارے میں شہادت دے۔ وہ گواہی دے کہ اس دین کا یہ حق ہے کہ یہ قائم و دائم رہے۔ وہ ایسی شہادت دے کہ اس دین میں انسانوں کیلئے جو بھلائی ہے وہ اس کی شہادت ہے۔ اور یہ مومن اس وقت تک شہادت نہیں دے سکتا جب تک وہ اپنے نفس اپنے اخلاق اور اپنی پوری زندگی کو اس دین کی جیتی جاگتی تصویر نہ بنالے۔ وہ ایسی تصویر بنائے کہ لوگ اسے دیکھتے ہی ایک مثال سمجھیں اور اس بات کی شہادت دیں کہ واقعی اگر دین کی یہ صورت ہے تو یہ دین اس بات کا مستحق ہے۔ کہ وہ زندہ رہے۔ اور یہ کہ یہ دین اس پوری کائنات میں تمام نظاموں اور طریقوں اور سوسائٹیوں کے مقابلے میں افضل اور بہتر ہے۔

ظاہر ہے کہ کوئی شخص یہ شہادت اس وقت تک نہیں دے سکتا جب تک وہ اس دین کو اپنے لئے ضابطہ حیات نہ بنالے۔ جب تک وہ اسے اجتماعی نظام نہ بنالے۔ اور جب تک وہ اسے اپنے اور اپنی قوم کیلئے نظام قانون نہ بنالے۔ اور جب تک اس کے اردگرد ایسا معاشرہ قائم نہ ہو جائے جو اس نظام حیات کے مطابق اپنی زندگی کے معاملات کو چلاتا ہو۔ جو ایک خدائی نظام اور جو ایک مضبوط نظام ہے۔ نیز یہ شہادت اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک وہ مومن اس نظام حیات کے قائم کرنے کیلئے جہاد نہیں شروع کرتا۔ اور جب تک وہ اس جہاد میں زندگی پر موت کو ترجیح نہیں دیتا یعنی اس معاشرے کے خلاف جس میں انسانی زندگیوں پر اسلامی نظام رائج نہ ہو اور یہ اس بات کی شہادت ہوگی کہ اقامت دین کا فریضہ خود اس کی زندگی سے بھی عزیز تر ہے۔ حالانکہ زندگی تمام زندہ چیزوں کیلئے ایک عزیز متاع ہوتی ہے۔

س لئے شہید کو شہید کہا جاتا ہے۔ اس لئے کہ وہ یہ شہادت دیتا ہے۔

یہاں ان حواریوں نے دعا کی کہ اللہ ہمیں ایسے گواہوں میں لکھ دے' ہم دین کیلئے شہادت دیں گے۔ یعنی وہ دعا کرتے ہیں کہ ہمیں ایسی توفیق دے' کہ ہماری زندگی دین مسیحی کا زندہ نمونہ بن جائیں اور ہمیں توفیق دے کہ ہم ایک ایسے معاشرے کو وجود میں لانے کیلئے جہاد کریں جس میں یہ دین قائم ہو۔ اگر انہوں نے اس کا حق ادا کر دیا تو گویا انہوں نے اس دین کے حق کی شہادت دیدی کہ یہ دین سچا دین ہے۔

میں یہاں یہ بات کہوں گا کہ آج جو شخص بھی اپنے لئے ایمان اور اسلام کا دعویدار سمجھتا ہے وہ ذرا اس دعا پر غور کرے۔ یہ ہے اصلی اسلام' جس طرح حواریوں نے اسے سمجھا۔ جس طرح حقیقی مسلمانوں کے دل میں بھی یہ حقیقت اچھی طرح بیٹھی ہوئی ہے۔ اور جو شخص دین کیلئے یہ شہادت نہ دے گا اور اسے چھپا دے گا تو اس کا دل گنہگار ہے۔ یاد رہے کہ جو شخص اسلام کا دعویٰ کرتا ہے اور اپنی عملی زندگی میں اسلام کے خلاف روش اختیار کرتا ہے' جو شخص اسلام پر یقین رکھتا ہے لیکن اسلامی فرائض علی الاعلان ادا نہیں کرتا' اور اسلامی نظام حیات کو عملاً قائم کرنے کے لئے جدوجہد نہیں کرتا۔ وہ یہ کام یا اپنی پرامن زندگی کیلئے کرتا ہے یا اپنی زندگی کو دین اسلام کی زندگی پر فوقیت دیتا ہے تو اس نے یقیناً شہادت حق دینے میں سخت کوتاہی کی یا اس نے اسلام کے خلاف دوسرے نظاموں کے حق میں شہادت دی۔ یہ ایسی شہادت ہے جو دوسروں کو بھی اسلام کی طرف آنے سے روکتی ہے۔ اس لئے کہ وہ دیکھتے ہیں کہ اہل اسلام اسلام کے حق میں نہیں بلکہ اسلام کے خلاف شہادت دے رہے ہیں۔ اور اس شخص کا انجام عظیم بربادی ہے جو اپنے اس دعوے کی بنا پر کہ وہ مسلم ہے تمام لوگوں کو اسلام سے روکتا ہے۔ حالانکہ وہ دین کا مومن نہیں ہوتا بلکہ وہ دین سے روکنے والا ہوتا ہے۔ا اب بنی اسرائیل کے ساتھ قصہ عیسیٰ علیہ السلام کا آخری حصہ آتا ہے۔

۵ ع ۱۳ ۱۴ النصف

وَ مَكَرُوْا وَ مَكَرَ اللّٰهُ ؕ وَ اللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ۠ ۝ اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسٰۤى اِنِّيْ مُتَوَفِّيْكَ وَ رَافِعُكَ اِلَيَّ وَ مُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ جَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۚ ثُمَّ اِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَاَحْكُمُ بَيْنَكُمْ فِيْمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ۝ فَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَاُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ ۫ وَ مَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ۝ وَ اَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَيُوَفِّيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ ؕ وَ اللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ۝

"پھر بنی اسرائیل مسیح کے خلاف خفیہ تدبیریں کرنے لگے جواب میں اللہ نے بھی اپنی خفیہ تدبیر کی اور ایسی تدبیروں میں اللہ سب سے بڑھ کر ہے۔ (وہ اللہ کی خفیہ تدبیر ہی تھی۔) جب اس نے کہا کہ "اے عیسیٰؑ! اب میں تجھے واپس لے لوں گا اور تجھ کو اپنی طرف اٹھا

ا۔ اس موضوع پر استاد مودودی نے اپنی کتاب شہادت حق میں جو قیمتی بحث کی ہے اسے ضرور ملاحظہ فرمائیں۔ (سید قطب)

لوں گا۔" اور جنہوں نے تیرا انکار کیا ان سے تجھے پاک کر دوں گا۔ اور تیری پیروی کرنے والوں کو قیامت تک ان لوگوں پر بالادست رکھوں گا جنہوں نے تیرا انکار کیا ہے۔ پھر تم سب کو آخر کار میرے پاس آنا ہے۔ اس وقت میں ان باتوں کا فیصلہ کروں گا۔ جن میں تمہارے درمیان اختلاف ہوا ہے۔ جن لوگوں نے کفر و انکار کی روش اختیار کی ہے انہیں دنیا و آخرت دونوں میں سزا دوں گا اور وہ کوئی مددگار نہ پائیں گے' اور جنہوں نے ایمان اور نیک عمل کا رویہ اختیار کیا ہے' انہیں ان کے اجر پورے دیئے جائیں گے اور خوب جان لو کہ ظالموں سے اللہ ہرگز محبت نہیں کرتا۔"

وہ مکاری جو یہودیوں نے اپنے رسول حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ کی وہ عظیم مکاری تھی' اس کا تانابانا بہت طویل و عریض تھا۔ جس طرح اناجیل میں مذکور ہے کہ انہوں نے اس پر الزام لگایا کہ اس نے اپنے منگیتر یوسف نجار کے ساتھ تعلقات قائم کئے تھے۔ حالانکہ وہ پاک دامن تھیں اور ابھی یوسف کے ساتھ ان کی شادی نہ ہوئی تھی۔ انہوں نے حضرت عیسیٰ پر جھوٹ بولنے کا الزام لگایا۔ ملخصاً اور اس کے بعد انہوں نے رومی حکمران بیلاطس کے پاس ان کے خلاف شکایات کیں اور کہا کہ وہ لوگوں کو رومی حکومت کے خلاف بغاوت پر ابھارتا ہے۔ اور یہ کہ وہ گمراہ ہو گیا ہے اور عوام الناس کے عقائد خراب کر رہا ہے۔ چنانچہ بیلاطس نے انہیں گرفتار کر کے حکم دیا کہ وہ خود اسے جو سزا دینا چاہیں دیدیں' اس لئے کہ وہ اگرچہ ایک بت پرست تھا مگر وہ یہ جانتا تھا کہ ایک ایسے شخص کو وہ کس طرح سزا دے جس پر اس کا کوئی شک و شبہ نہیں ہے۔ یہ تھیں ان کی سازشیں بلکہ یہ ان کی سازشوں کا ایک حصہ تھا۔

وَ مَكَرُوْا وَ مَكَرَ اللّٰهُ ؕ وَ اللّٰهُ خَیْرُ الْمٰكِرِیْنَ .... "وہ اس کے خلاف خفیہ تدبیریں کرنے لگے اور اللہ نے ان کے خلاف خفیہ تدبیر کی' اور ایسی تدبیروں میں اللہ سب سے بڑھ کر ہے۔"

اللہ کی تدبیر اور یہودیوں کی تدبیر کے درمیان صرف مشاکلت لفظی ہے ورنہ حقیقت کے اعتبار سے یہودیوں کی تدبیر مکر ہے اور اللہ کا جواب تدبیر ہے اور مکر کا مفہوم بھی تدبیر کرنا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے یہاں لفظ مکر اپنے لئے اس لئے استعمال کیا ہے کہ اس سے اللہ ان کے مکر کی حقارت کا اظہار فرمائیں۔ اس لئے کہ ان کا مقابلہ اللہ سے کیسے ہو سکتا ہے۔ وہ کہاں اور اللہ کہاں ان کا مکر کیا اور اس کے مقابلے میں اللہ کی تدبیر دونوں میں کیا مقابلہ ہے۔ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کرنا یا سولی پر چڑھانا چاہتے تھے۔ لیکن اللہ نے انہیں صحیح سلامت اپنے ہاں بلا لیا' اور انہیں ان کفار اور ان کے گندے ماحول سے پاک کر لیا۔ یعنی دور کر دیا' اور اس کے بعد انہیں یہ عزت دی کہ جو لوگ ان کے ماننے والے ہیں قیامت تک ان لوگوں کے مقابلے میں برتر رہیں گے جو ان کی تعلیمات کے ساتھ کفر کرتے ہیں۔ اور جس طرح اللہ نے چاہا ایسا ہی ہوا۔ اور اللہ نے مکاروں کے مکر کے بخئیے ادھیڑ دیئے۔

اِذْ قَالَ اللّٰهُ یٰعِیْسٰۤى اِنِّیْ مُتَوَفِّیْكَ وَ رَافِعُكَ اِلَیَّ وَ مُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَ جَاعِلُ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْۤا اِلٰى یَوْمِ الْقِیٰمَةِ ۚ

جب اللہ نے کہا کہ "اے عیسیٰ! اب میں تجھے واپس لے لوں گا اور تجھ کو اپنی طرف اٹھالوں گا۔" اور جنہوں نے تیرا انکار کیا ان سے تجھے پاک کر دوں گا۔ اور تیری پیروی کرنے والوں کو قیامت تک ان لوگوں پر بالادست رکھوں گا جنہوں نے تیرا انکار کیا ہے۔

آپ کی وفات کیسے تھی' آپ کا آسمانوں پر اٹھایا جانا کیسے تھا۔ یہ غیبی امور ہیں اور یہ متشابہات میں داخل ہیں۔ جن کی تاویل صرف اللہ جانتا ہے۔ اس لئے اس بارے میں بحث کرنے سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔ نہ عقیدہ میں فائدہ ہے اور نہ شریعت میں فائدہ ہے۔ جو لوگ اس کے پیچھے پڑتے ہیں اور اسے بحث و مجادلہ کا موضوع بناتے ہیں تو وہ آخر کار ایسے حالات تک پہنچتے ہیں جو ظاہری اور سطحی باتیں ہوتی

ہیں۔ مزید التباس اور پیچیدگی میں پھنس جاتے ہیں اور وہ کوئی قطعی حقیقت سامنے نہیں لاسکتے۔ نہ دل کو کوئی تسلی ہوتی ہے۔ اس لئے کہ یہ ایسا امر ہے جس کی تاویل اللہ ہی جانتا ہے......... رہی یہ بات کہ اللہ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پیروکاروں کو قیامت تک ان لوگوں سے برتر کردیا ہے جنہوں نے ان کا انکار کیا ہے۔ تو اس کا مفہوم بہت ہی سہل ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متبعین وہی لوگ ہیں جو اللہ کے صحیح دین کو ماننے والے ہیں اور وہ اسلام ہے۔ اور اسلام وہ دین ہے جس کی حقیقت ہر نبی کے علم میں تھی۔ اور ہر رسول نے اسلام ہی کی تبلیغ کی۔ اور جب بھی کسی نے دین حقہ پر ایمان لایا تو وہ اسلام ہی تھا' اور اللہ کے دین حق یعنی اسلام کو ماننے والے ہی ان لوگوں سے عند اللہ برتر ہیں۔ جنہوں نے ان کا کفر کیا۔ عملی زندگی میں بھی جب وہ لوگ جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائے۔ ان لوگوں کے مقابلے میں آتے ہیں جو ان کا انکار کرتے ہیں تو اپنی ایمانی قوت کی وجہ سے وہ لوگ جو ایمان لائے برتر ثابت ہوتے ہیں۔ اس لئے کہ وہ حضرت عیسیٰ کے متبعین ہیں۔ اللہ کا دین ایک ہے۔ اسی دین کو لیکر حضرت عیسیٰ علیہ السلام آئے تھے۔ جس طرح ان سے پہلے اور ان کے رسول سب کے سب اسی دین کو لیکر آئے اور جو لوگ حضرت محمد ﷺ کا اتباع کرتے ہیں وہ آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت محمد نبی آخر الزمان تک تمام رسولوں پر ایمان لاتے ہیں......... یہی عام مفہوم ہے جو اس سورت کے سیاق و سباق سے منطبق ہے۔ اور یہی مفہوم حقیقت دین اور حقیقت ایمان کے ساتھ مطابق ہے۔ اور اہل ایمان اور اہل کفر کا انجام کار یہی ہے کہ وہ سب اللہ کے سامنے جائیں گے۔

ثُمَّ إِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَأَحْكُمُ بَيْنَكُمْ فِيمَا كُنْتُمْ فِيهِ تَخْتَلِفُونَ ۝ فَأَمَّا الَّذِينَ كَفَرُوا فَأُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيدًا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَمَا لَهُمْ مِنْ نَاصِرِينَ ۝ وَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فَيُوَفِّيهِمْ أُجُورَهُمْ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الظَّالِمِينَ

"پھر تم سب کو آخر کار میرے پاس آنا ہے۔ اس وقت میں ان باتوں کا فیصلہ کروں گا جن میں تمہارے درمیان اختلاف ہوا ہے۔ جن لوگوں نے کفر و انکار کی روش اختیار کی ہے انہیں دنیا و آخرت دونوں میں سزا دوں گا اور وہ کوئی مددگار نہ پائیں گے' اور جنہوں نے ایمان اور نیک عمل کا رویہ اختیار کیا ہے' انہیں ان کے اجر پورے پورے دیئے جائیں گے اور خوب جان لو کہ ظالموں سے اللہ ہرگز محبت نہیں کرتا۔"

اس آیت میں اس بات کا فیصلہ کردیا گیا ہے کہ ہر کسی کو کئے کی جزاء ملے گی اور اس قدر انصاف ہو گا کہ بال برابر بے انصافی بھی نہ ہوگی۔ اس سلسلے میں چاہے لوگوں کی تمنائیں جو بھی ہوں یا انہوں نے جو افتراء باندھی ہو.......... اللہ کی طرف لوٹنا اٹل ہے۔ اس سے کوئی چھٹکارا نہیں ہے۔ اور لوگوں کے درمیان جو اختلافات ہیں ان کے درمیان ایک دن فیصلہ اللہ نے کرنا ہی ہے۔ اس سے بھاگنے کی سبیل نہیں اور دنیا و آخرت میں اہل کفر کیلئے عذاب طے ہوچکا ہے' کوئی نہیں ہے کہ اسے روک سکے۔ اور جن لوگوں نے ایمان قبول کیا اور اس کے بعد نیک کام کئے انہیں پورا پورا اجر ملنا ہے۔ اس میں کوئی کمی بیشی ممکن ہی نہیں اور اللہ کبھی ظلم نہیں کرے گا اور وہ کیسے کرے گا جب وہ خود ظالموں کو پسند نہیں کرتا۔

اور اہل کتاب کا یہ گمان کہ وہ محض چند دن ہی آگ میں داخل ہوں گے اور اپنے اس گمان پر انہوں نے اللہ تعالیٰ کے عدل و انصاف کے بارے میں جو صغریٰ کبریٰ ملایا وہ سب ان کی نفسانی خواہشات ہیں وہ فاسد ہیں' وہ باطل ہیں اور ان کی کوئی اصل و اساس نہیں ہے۔

○........☆........○........☆........○

جب حضرت عیسیٰ ؑ کا یہ قصہ اس مقام تک پہنچ جاتا ہے' جس کے بارے میں اس وقت حضور ﷺ کا ان لوگوں کے ساتھ مناظرہ ہو رہا تھا تو اس کے بعد اس قصے پر ایک اختتامیہ آجاتا ہے اور اس اختتامیہ میں وہ تمام حقائق کھول دیئے جاتے ہیں جو اس قصے کے واقعات سے اخذ ہوتے ہیں۔ اور اب رسول خدا ﷺ کو وہ بات بتادی جاتی ہے جسے اب اہل کتاب کے سامنے اس مباحثے کو ختم کرنے کیلئے پیش کردیں' یہ بات ایک فیصلہ کن بات ہے جس کے ذریعہ یہ تمام مباحثہ اور مذاکرہ ختم ہو جاتا ہے۔ اور اس میں وہ حقیقت بھی آجاتی ہے جسے لیکر آپ آئے ہیں۔ جس کی طرف آپ دعوت دیتے ہیں اور یہ نتیجہ مکمل یقین اور مکمل وضاحت کے ساتھ سامنے آتا ہے۔

ذٰلِكَ نَتْلُوْهُ عَلَيْكَ مِنَ الْاٰيٰتِ وَ الذِّكْرِ الْحَكِيْمِ ﴿۵۸﴾ اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ ؕ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿۵۹﴾ اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْمُمْتَرِيْنَ ﴿۶۰﴾ فَمَنْ حَآجَّكَ فِيْهِ مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَ اَبْنَآءَكُمْ وَ نِسَآءَنَا وَ نِسَآءَكُمْ وَ اَنْفُسَنَا وَ اَنْفُسَكُمْ ۟ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ ﴿۶۱﴾ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْقَصَصُ الْحَقُّ ۚ وَ مَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ ؕ وَ اِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۶۲﴾ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِالْمُفْسِدِيْنَ ﴿۶۳﴾ قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّ لَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ﴿۶۴﴾

۶ ع ۹ ۱۴

"یہ آیات اور حکمت سے لبریز تذکرے ہیں جو ہم تمہیں سنارہے ہیں' اللہ کے نزدیک عیسیٰ کی مثال آدم کی سی ہے کہ اللہ نے اسے مٹی سے پیدا کیا اور حکم دیا کہ ہو جا اور وہ ہو گیا۔ یہ اصل حقیقت ہے جو تمہارے رب کی طرف سے بتائی جارہی ہے۔ اور تم ان لوگوں میں شامل نہ ہو جو اس میں شک کرتے ہیں۔ یہ علم آجانے کے بعد اب جو کوئی آپ سے جھگڑا کرے تو اس سے کہو کہ آؤ ہم اور تم خود بھی آجائیں۔ اور اپنے اپنے بال بچوں کو بھی لے آئیں اور خدا سے دعا کریں کہ جو جھوٹا ہے اس پر خدا کی لعنت۔ یہ بالکل صحیح واقعات ہیں' اور حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے سوا کوئی خداوند نہیں ہے۔ اور وہ اللہ ہی کی ہستی ہے جس کی طاقت سب سے بالا اور جس کی حکمت نظام عالم میں کارفرما ہے۔ پس اگر یہ لوگ منہ موڑیں تو ان کا مفسد ہونا صاف کھل جائے گا اور اللہ مفسدوں کے حال سے واقف ہے۔ کہو اہل کتاب آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے۔ یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں اور ہم میں سے کوئی اللہ کے سوا اپنا رب نہ بنالے۔" اس دعوت کو قبول کرنے سے اگر وہ منہ موڑیں تو صاف کہہ دو کہ گواہ رہو ہم تو مسلم ہیں۔"

اس اختتامیہ میں سب سے پہلے تو یہ کہا گیا ہے کہ حضور ﷺ پر جو وحی نازل ہوئی ہے وہ حق ہے۔

ذٰلِكَ نَتْلُوْهُ عَلَيْكَ مِنَ الْاٰيٰتِ وَ الذِّكْرِ الْحَكِيْمِ .... "یہ آیات اور حکمت سے لبریز تذکرے ہیں جو ہم تمہیں سنا رہے ہیں۔" یہ قصے اور یہ قرآنی ہدایات' سب کی سب اللہ کی وحی پر مبنی ہیں اور خود اللہ انہیں پڑھ کر نبی ﷺ کو سناتے ہیں۔ انداز بیان ایسا ہے جس سے یہ تاثر ملتا ہے کہ حضور اکرم کو اللہ میاں کا قرب اور خوشنودی حاصل ہے۔ جب خود اللہ تعالیٰ نبی ﷺ کو حکمت و دانائی کی آیات پڑھ کر سناتے ہیں۔ اللہ دانا و حکیم ہیں انسانی زندگی اور نفس کے حوالے سے اونچے حقائق اس کے پاس ہیں۔ اور وہ اس نے ایک خاص طریقے اور خاص اسلوب کے ساتھ وہاں ودیعت کیے ہیں۔ وہی بتا سکتا ہے کہ فطرت کے ساتھ ہمکلامی کا طریقہ کیا ہے۔ اور فطرت انسانی تک رسائی کا اسلوب کیا ہے۔ اور یہ حکمت اس انداز میں بتائی جاتی ہے جس کی کوئی سابق نظیر نہیں ہے۔ یعنی اس تمام انسانی حکمت کے ریکارڈ میں جس کا مصدر اور منبع اللہ نہ ہو۔

اس کے بعد یہ اختتامیہ حقیقت مسیح کا فیصلہ کر دیتا ہے' فیصلہ کن انداز میں بتایا جاتا ہے کہ اللہ کا ارادہ ہی ہر چیز کا خالق ہے۔ جس طرح اللہ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو پیدا کیا۔ اللہ کے ہاں تخلیق کا عمل صرف یہ ہے۔

اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ ؕ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ .... "اللہ کے نزدیک عیسیٰ کی مثال آدم کی سی ہے کہ اللہ نے اسے مٹی سے بنایا اور حکم دیا کہ ہو جا اور وہ ہو گیا۔"

حضرت عیسیٰ کی ولادت اس اعتبار سے کہ وہ پیدائش انسانی کے عام ڈگر سے ہٹ کر ہے ضرور تعجب انگیز ہے۔ لیکن جب اسے حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق کے حوالے سے دیکھا جائے' تو اس میں کوئی انوکھی چیز نظر نہیں آتی۔ پیدائش مسیح کے معاملے میں اہل کتاب کے درمیان جو بحث و مناظرہ اور جدل و جدال جاری تھا۔ اور اس سلسلے میں وہ عجیب و غریب قصے کہانیاں گھڑ رہے تھے۔ طلسماتی ماحول پیدا کر رہے وہ ایک عجیب بات ہے۔ محض اس لئے کہ وہ بغیر باپ کے پیدا ہوئے۔ یہی اہل کتاب اپنی کتابوں میں صبح و شام یہ تلاوت کرتے تھے کہ حضرت آدم کو مٹی سے پیدا کیا گیا اور اس ڈھانچے میں پھر اللہ نے روح پھونکی اور اس سے بطور انسان آدم زندہ ہو گیا۔ اور وہ حضرت آدم کے بارے میں اس قسم کے قصے کہانیاں نہ گھڑتے تھے۔ اور نہ ہی بحث و مباحثہ کرتے تھے۔ وہ آدم علیہ السلام کے بارے میں یہ سوچتے تھے کہ ان کی بھی ایک لاہوتی طبیعت ہے۔ اس لئے کہ جس عناصر سے آدم انسان بن کر آئے وہی عناصر ہیں جن سے حضرت عیسیٰؑ بن باپ پیدا ہو کر آئے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ میں اپنی روح پھونکی' اور حضرت عیسیٰؑ میں بھی روح ڈالی۔ اور اس کا طریقۂ کار ایک کلمہ کن سے مکمل ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے کن کہا اور جو اس نے پیدا کرنے کا ارادہ کیا تھا وہ فیکون ہو گیا۔

یہ حقیقت کس قدر سادہ ہے حقیقت آدم بھی یہ ہے اور حقیقت بھی یہی ہے۔ بلکہ تمام مخلوقات کی تخلیق کی بس یہی حقیقت ہے۔ اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ جو ذہن انسانی میں بسہولت اور بوضاحت آ جاتی ہے۔ تعجب تو اس پر ہے کہ ان واقعات کے بارے میں یہ طویل مجادلہ اور مباحثہ کیوں ہوتا رہا۔ حالانکہ یہ واقعہ اللہ کی سنت کبریٰ کے مطابق تھا۔ جو اس پوری کائنات میں جاری و ساری ہے۔ یعنی تخلیق کرنا اور دوبارہ اٹھانا۔

دراصل یہ ہے انداز اس ذکر حکیم کا' یہ ذکر فطرت انسانی کو فطری منطق سے خطاب کرتا ہے۔ جو واقعی عملی' سادہ ہوتی ہے۔ اس حکیمانہ انداز کلام کی وجہ سے دنیا کے پیچیدہ ترین' مشکل ترین فلسفی مسائل بھی اسے سہل نظر آتے ہیں جیسے روزمرہ کے معمولات۔

سیاق کلام جب اس واضح فیصلے تک پہنچ جاتا ہے۔ تو روئے سخن اب حضور اکرم ﷺ کی طرف پھر جاتا ہے۔ اور آپ کو بتایا جاتا ہے کہ آپ اپنے سچے موقف پر قائم رہیں۔ جس کی تلاوت آپ کے سامنے کی جاری ہے اور جسے آپ کے حس اور شعور میں بٹھایا جا رہا ہے جس

طرح اہل ایمان کے حس و شعور میں اسے مضبوط طرح جاگزین کیا جارہا ہے اس لئے کہ اہل ایمان میں سے بعض افراد پر اہل کتاب کے شبہات اثر ڈال رہے تھے اور عجیب انداز میں تلبیس کر کے اہل ایمان کو گمراہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

فرماتے ہیں۔ اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْمُمْتَرِيْنَ .... "تم ان لوگوں میں شامل نہ ہو، جو اس میں شک کرتے ہیں" .... حضور تو نہ شک کرتے تھے اور نہ ہی ان کے دل میں کوئی خلجان تھا۔ ان پر جو کلام نازل ہوتا تھا وہ اسے من جانب اللہ سمجھتے تھے۔ ایک لحظہ کیلئے بھی شک ان کے قریب نہیں آیا۔ یہاں مقصود یہ ہے کہ آپ اس ہدایت پر جم جائیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جماعت مسلمہ کے دشمنوں نے اس دور میں اہل ایمان کے خلاف سخت سازشوں کا جال پھیلا رکھا تھا، اور وہ اس سازش میں امت مسلمہ کے بعد افراد کو پھانس رہے تھے۔ امت مسلمہ کے خلاف یہ سازشیں آج بھی ہو رہی ہیں اور ہر دور میں ہوتی رہی ہیں۔ اور اس بات کی ضرورت ہے کہ امت مسلمہ ان دھوکہ بازوں اور جھوٹوں کے مقابلے میں محتاط رہے۔ اس لئے کہ امت کے اس قسم کے دشمن ہر دور میں نیا جال لیکر آتے ہیں۔

غرض پیدائش مسیح کا مسئلہ حل ہو گیا۔ حقیقت واضح ہو گئی، اب اللہ تعالیٰ رسول کریم ﷺ کو اس طرف متوجہ فرماتے ہیں کہ وہ اب ان لوگوں کے ساتھ یہ مجادلہ اور مناظرہ ختم کر دیں اس لئے کہ مسئلہ واضح ہو گیا، سچائی واضح طور پر سامنے آگئی ہے اور حکم دیا جاتا ہے کہ اب آخری بات یہ ہے کہ ان لوگوں کو مباہلے کی دعوت دی جائے۔

فَمَنْ حَآجَّكَ فِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَ اَبْنَآءَكُمْ وَنِسَآءَنَا وَ نِسَآءَكُمْ وَ اَنْفُسَنَا وَ اَنْفُسَكُمْ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ

"یہ علم آجانے کے بعد اب جو کوئی آپ سے جھگڑا کرے تو اس سے کہو کہ آؤ ہم اور تم خود بھی آجائیں۔ اور اپنے اپنے بال بچوں کو بھی لے آئیں اور خدا سے دعا کریں کہ جو جھوٹا ہے اس پر خدا کی لعنت۔"

اس کے بعد اس موضوع پر رسول خدا کے ساتھ جو لوگ مباحثہ کرتے تھے، حضور نے بھرے مجمعے میں انہیں دعوت مباہلہ دی۔ یعنی سب آجائیں اور اللہ سے دست بدعا ہوں کہ اللہ جھوٹوں پر لعنت نازل کرے۔ اس چیلنج کے انجام سے وہ لوگ ڈر گئے اور انہوں نے مباہلہ کرنے سے انکار کر دیا۔ جس سے یہ بات واضح ہو گئی کہ حضور ﷺ کا موقف سچا ہے۔ لیکن جس طرح بعض روایات میں آتا ہے کہ اسلام اس لئے قبول نہ کیا کہ ان لوگوں کو اپنے معاشرے میں ایک بلند مقام حاصل تھا۔ نیز یہ لوگ ان کے مذہبی پیشواؤں میں سے تھے اور اس دور میں اہل کینہ کو اپنی سوسائٹی میں مکمل اقتدار حاصل تھا اور اس کے ساتھ ان کے بڑے بڑے مفادات وابستہ تھے۔ اس سوسائٹی میں وہ عیش و عشرت کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ یہ بات نہ تھی کہ جو لوگ دین اسلام سے اعراض کر رہے تھے ان کے سامنے کوئی دلیل نہ پیش کی گئی تھی بلکہ ان کے بعض مفادات ایسے تھے جنہیں وہ نہ چھوڑ سکتے تھے، کچھ ایسی نفسیاتی خواہشات میں وہ گھرے ہوئے تھے جن پر وہ یہ نہ کر سکتے تھے۔ حالانکہ سچائی واضح ہو گئی تھی اور اس میں کوئی شک یا شبہ نہ رہا تھا۔

دعوت مباہلہ کے بعد اب اس اختتامیہ میں حقیقت وحی، حکمت قصص فی القرآن، اور حقیقت توحید کا بیان کیا جاتا ہے۔ شاید یہ آیات دعوت مباہلہ سے مجادلین کے انکار کے بعد اتری ہوں۔ اور ان لوگوں کو سخت دھمکی دی جاتی ہے جو خدا کی اس زمین پر محض برائے فی سبیل اللہ فساد یہ مجادلے کرتے ہیں۔

اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْقَصَصُ الْحَقُّ ۚ وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ ۚ وَ اِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ

الْحَكِيمُ ﴿٦٢﴾ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ بِالْمُفْسِدِينَ ﴿٦٣﴾

"یہ بالکل صحیح واقعات ہیں' اور حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے سوا کوئی خداوند نہیں ہے۔ اور وہ اللہ ہی کی ہستی ہے جس کی طاقت سب سے بالا ہے اور جس کی حکمت نظام عالم میں کارفرما ہے۔ پس اگر یہ لوگ منہ موڑیں تو ان کا مفسد ہونا صاف کھل جائے گا اور اللہ مفسدوں کے حال سے واقف ہے۔"

ان آیات میں جن حقائق کا بیان ہوا اس سے قبل ان کا بیان ہو گیا ہے۔ یہاں دعوت مباہلہ اور وفد کی جانب سے اس کے انکار کے بعد بطور تاکید دوبارہ ذکر کیا جاتا ہے۔ اس آیت میں البتہ نئی بات یہ ہے کہ جو لوگ اس سچائی کو قبول نہیں کرتے وہ در حقیقت مفسد ہیں اور خبردار کیا جاتا ہے کہ تم اللہ سے پوشیدہ نہیں ہو' وہ اندازقد سے پہچانتا ہے۔

اور وہ فساد جو منکرین توحید' توحید کا انکار کر کے پھیلاتے تھے وہ اللہ کے نزدیک ایک عظیم فساد تھا۔ اور دنیا میں جس قدر فسادات بھی رونما ہوتے رہتے ہیں وہ سب کے سب عقیدۂ توحید سے انحراف کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں اور عقیدۂ توحید کا اعتراف بھی محض زبانی اعتراف کافی نہیں ہے۔ اس لئے کہ محض زبانی اعتراف کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہوتی۔ نہ ہی ایسا ہی اعتراف جو خالص منفی اعتراف ہو' اس لئے کہ محض قلبی اور زبانی اعتراف کے نتیجے میں وہ آثار ظاہر نہیں ہوتے جو انسانوں کی عملی زندگی میں نمودار ہونے ضروری ہیں۔ دراصل دنیا نے عقیدۂ توحید کے لازمی آثار و نتائج سے انکار کر دیا ہے اور انسانی زندگی کے عقیدۂ توحید کے آثار کو ختم کر دیا ہے۔ عقیدۂ توحید کا پہلا لازمہ تو یہ ہے کہ ہمارا رب بھی ایک ہو' پھر اس رب کی غلامی اور بندگی بھی ایک ہو' اس لئے کہ بندگی صرف اللہ کے لیے مخصوص ہے پھر اسی ایک رب کی اطاعت ہو' پھر تمام ہدایات بھی اسی ایک رب سے اخذ کی جائیں یعنی اس کے سوا عبودیت نہ ہو۔ اللہ کے سوا اطاعت نہ ہو اور اللہ کے سوا کوئی مرجع ہدایات نہ ہو۔ ہدایات چاہے قانون سازی میں ہوں' چاہے اقدار حیات اور فلسفہ حیات میں ہوں' چاہے آداب و اخلاق میں ہوں' غرض ان تمام امور میں جو اس کرۂ ارض پر حیات انسانی سے تعلق رکھتے ہیں صرف اللہ سے ہدایت لی جائیں .... اگر ایسی صورت حال نہیں تو پھر شرک اور کفر کے سوا کوئی بات نہیں ہے۔ چاہے زبان سے جو کچھ کہتے جائیں۔ چاہے قلب و شعور میں مجرد عقائد جو بھی ہوں۔ الا یہ کہ لوگوں کی روز مرہ زندگی میں' تسلیم و رضا' اطاعت و فرمانبرداری' امر و نہی کی قبولیت کی فضا قائم ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ اس پوری کائنات کا نظام اس وقت تک درست طور پر چل ہی نہیں سکتا جب تک یہ تسلیم نہ کر لیا جائے کہ اس کا اللہ ایک ہی ہے۔ جو اس کے تمام معاملات کی تدبیر اور انتظام کرتا ہے۔ وَلَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ إِلَّا اللَّهُ لَفَسَدَتَا .... "اگر زمین و آسمان میں اللہ کے سوائی الٰہ ہوتے تو وہ بگڑ جاتے۔" اور انسان کے حوالے سے اللہ کی خدائی کا ممتاز ترین مظہر یہ ہے کہ تمام بندے اس کی بندگی کریں۔ اور اللہ ان کیلئے نظام حیات تجویز کرے' ان کیلئے حسن و قبح کے پیمانے وضع کرے۔ لہذا جو شخص بھی یہ دعویٰ کرے کہ ان اشیاء میں سے کوئی چیز بھی اس کیلئے ہے' تو وہ گویا اللہ تعالیٰ کے مخصوص ترین حقوق پر دست درازی کرتا ہے اور وہ اس معنی میں آپ کو لوگوں کے لئے الٰہ اور رب قرار دیتا ہے۔

اور اس معنی میں جب اس کرۂ ارض پر بہت سے الٰہ پیدا ہو جاتے ہیں تو پھر اللہ کی یہ زمین فتنہ و فساد سے بھر جاتی ہے۔ اور لوگ پھر لوگوں کی بندگی اور غلامی شروع کر دیتے ہیں۔ اس کے بعد پھر بندوں میں سے بعض بندے یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ انہیں یہ حق حاصل ہے کہ دوسرے لوگ ان کی ذاتی اطاعت کریں۔ اور یہ کہ انہیں بذات خود لوگوں کیلئے قانون بنانے کا حق حاصل ہے۔ اور یہ کہ وہ لوگوں کے بھلے برے کا فیصلہ از خود کر سکتا ہے۔ یہ تمام دعوے دراصل الوہیت کے دعوے ہیں۔ اگر ایسے لوگ فرعون کی طرح زبانی طور پر یہ نہ

کہیں۔ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى .... "میں تمہارا بڑا رب ہوں۔" اس لئے ایسے لوگوں کیلئے ایسے حقوق کا اقرار کرنا شرک اور کفر کا اقرار کرنا ہے۔ اور یہ دنیا میں بد ترین فتنہ اور فساد ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اس تہدید اور توبیخ کے بعد سیاق کلام میں اہل کتاب کو دعوت دی جاتی ہے کہ وہ ایسے نظریے کی طرف اٹھ آئیں جو فریقین کے درمیان یکساں ہے۔ یعنی صرف اللہ کی بندگی' اس کے ساتھ شرک نہ کرنا۔ اور ایک دوسرے کو رب نہ بنانا۔ اگر وہ یہ صورت نہیں اپناتے تو پھر ہماری راہیں ہمیشہ ہمیشہ کیلئے جدا ہوگئیں۔ اس کے بعد نہ ملاپ ہو سکتا ہے اور نہ مکالمہ۔ قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۭ بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ

"کہو اہل کتاب آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے۔ یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں اور ہم میں سے کوئی اللہ کے سوا کسی کو اپنا رب نہ بنائے۔" اس دعوت کو قبول کرنے سے اگر وہ منہ موڑیں تو صاف کہہ دو کہ گواہ رہو ہم تو مسلم ہیں۔"

اس میں شک نہیں ہے کہ یہ ایک منصفانہ دعوت ہے۔ ایسی دعوت ہے جس میں حضور ﷺ ان پر کسی قسم کی کوئی فضیلت و برتری حاصل کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔ اور نہ اہل اسلام اس میں کسی قسم کی برتری چاہتے ہیں۔ ایک یکساں موقف جس کے سامنے سب کے سب برابری کی پوزیشن میں کھڑے ہوں گے۔ کوئی کسی پر برتری نہ چاہے گا۔ کوئی کسی دوسرے کو اپنا غلام نہ بنائے گا۔ یہ ایک ایسی دعوت ہے جس سے صرف بدفطرت اور مفسد ہی انکار کر سکتا ہے۔ جو یہ نہیں چاہتا کہ حق کے سامنے جھک جائے۔

یہ ایک ایسی دعوت ہے کہ وہ صرف اللہ کی بندگی کریں اور اس کے ساتھ کسی کو بھی شریک نہ کریں۔ نہ کسی بشر کو' نہ کسی پتھر کو' اللہ کی طرف ایسی دعوت کہ جس میں کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا غلام نہ ہو۔ نہ نبی کا غلام ہو' نہ رسول کا غلام ہو' بلکہ سب اللہ کے بندے اور غلام ہوں۔ نبی اور رسول تو وہ لوگ ہیں جنہیں اللہ نے تبلیغ دین کیلئے چن لیا ہوتا ہے۔ اس لئے نہیں منتخب کیا ہوتا کہ وہ اللہ کے ساتھ الوہیت یا ربوبیت میں شریک بن جائیں۔

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ .... "اگر وہ منہ موڑیں تو پھر صاف کہہ دو کہ ہم تو مسلم ہیں۔" یعنی اگر وہ اس بات سے انکار کر دیں کہ وہ صرف اللہ وحدہ کی بندگی کریں گے اور اس نے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں گے اور اس بات سے انکار کر دیں کہ بندگی صرف اللہ کیلئے ہے۔ بغیر کسی شرک کے۔ یہ وہ دو ایسے مظاہر ہیں جن سے اللہ کی نسبت سے بندے کے موقف کا اظہار ہوتا ہے۔ تو اگر اس نظریئے سے وہ منہ موڑیں تو تم اس کے مطابق اپنے اسلام کا اعلان کر دو۔

یہاں مسلمانوں اور ان لوگوں کو جو اللہ کے سوا ایک دوسرے کو رب مانتے ہیں' ایک دوسرے کے مقابلے میں پیش کیا گیا ہے' جس سے اس بات کی فیصلہ کن وضاحت ہو جاتی ہے کہ اللہ کے نزدیک "المُسْلِمُوْنَ" کون ہیں' مسلمون وہ ہیں جو صرف اللہ کی بندگی اور اطاعت کریں اور صرف اللہ کی عبادت کریں اور ساتھ ساتھ باہم ایک دوسرے کو بھی اپنا رب نہ بنائیں۔ یہ ہے مسلمانوں کی خصوصیت جو انہیں تمام ملتوں اور تمام مکاتب فکر سے جدا کرتی ہے۔ اور ان کے نظام زندگی کو تمام نظامہائے زندگی سے جدا اور ممتاز کرتی ہے۔ اب اگر ان میں یہ خصوصیت پائی جاتی ہے تو وہ مسلمان ہیں اور اگر ان میں یہ خصوصیت نہیں پائی جاتی تو وہ مسلمان نہیں چاہے جس قدر وہ دعویٰ کریں اپنے مسلمان ہونے کا۔

اسلام کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان بندے کی غلامی سے مطلقاً آزاد ہو جائے اور اسلامی نظام زندگی وہ واحد نظام زندگی ہے جو کسی انسان کو اس ہمہ گیر آزادی کی ضمانت دیتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کرۂ ارض میں جس قدر نظامہائے حیات رائج ہیں ان میں لوگ بعض دوسرے لوگوں کو اپنا رب تسلیم کئے ہوئے ہیں۔ دنیا کی بہترین سے بہترین جمہوریتوں میں اور بدترین سے بدترین آمریتوں میں یہی صورت حال ہے۔ ربوبیت کا پہلا خاصہ ہی یہ ہے کہ لوگ اس رب کی بندگی کریں۔ اور وہ رب لوگوں کیلئے اجتماعی نظم' طرز زندگی' ضابطے' قوانین اور نیک و بد کے پیمانے وضع کرے۔ اور اس وقت دنیا میں جس قدر نظامہائے زندگی رائج ہیں ان میں یہ حق بعض افراد کو حاصل ہوتا ہے۔ بعض صورتوں میں یہ حق لوگوں کے کسی مجموعے کو حاصل ہوتا ہے۔ لوگوں کا یہ گروہ جو دوسروں کے لیے قوانین وضع کرتا' نیک و بد کے پیمانے وضع کرتا ہے اور ان کے لئے فکر اور فلسفہ وضع کرتا ہے یہی وہ گروہ ہے جو اپنے آپ کو اس زمین پر رب بناتا ہے۔ یہی مفہوم ہے اس آیت کا تم میں سے بعض بعض کو رب نہ بناؤ۔ ان لوگوں کے متبعین ان کو ربوبیت اور الوہیت کا مقام عطا کرتے ہیں اور پھر اللہ کے سوا ان کی بندگی کرتے ہیں۔ اگرچہ وہ ان کے سامنے رکوع و سجود نہ کرتے ہوں' اس لئے کہ بندگی ایک عبادت ہے اور یہ صرف اللہ کیلئے مخصوص ہے۔

صرف اسلامی نظام وہ نظام ہے' جس میں انسان کے گلے سے غیر اللہ کی غلامی کا یہ جوا اترتا ہے۔ اور وہ مکمل طور پر آزاد ہو جاتا ہے۔ وہ اس قدر آزاد ہوتا ہے کہ وہ اپنے لئے تصور حیات' اپنے لئے اجتماعی نظم و نسق' اپنے لئے نظام زندگی اور طریقۂ حیات اور اپنے نیک و بد کے پیمانے سب کے سب صرف اللہ سے اخذ کرتا ہے۔ اور اس کی حیثیت بعینہ وہی ہوتی ہے جو اس کرۂ ارض پر کسی بھی دوسرے انسان کی ہوتی ہے۔ پس زید مثلاً دنیا کے تمام انسانوں کے ساتھ من کل الوجوہ مساوی ہو جاتا ہے۔ تمام لوگ ایک سطح پر کھڑے ہوتے ہیں۔ تمام لوگوں کی نظریں ایک ہی مالک کی طرف اٹھی ہوئی ہوتی ہیں۔ اور ان میں کوئی بھی ایک دوسرے کا مالک نہیں ہوتا۔

اسی اور فقط اسی معنی میں اسلام اللہ کا دین ہے۔ اور یہی دین ہے جسے تمام رسل لے کر آئے' اور اللہ تعالیٰ نے رسولوں کو اسی مفہوم میں مبعوث فرمایا تاکہ وہ لوگوں کو انسانوں کی بندگی سے نکال کر اللہ کی بندگی کے اندر داخل کریں۔ اور لوگوں کے ظلم سے انہیں نکال کر اللہ کے انصاف کے اندر داخل کریں۔ پس اگر کوئی اس مفہوم کے مطابق اسلام سے منہ پھیرے' تو وہ اللہ میاں کی شہادت کے مطابق مسلم نہیں رہتا۔ چاہے تاویل کرنے والے جس قدر تاویلیں کریں۔ اور لوگوں کو گمراہ کرنے والے جس قدر گمراہ کریں بات یہی ہے۔

إِنَّ الدِّينَ عِندَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ .... "اللہ کے نزدیک معتبر دین صرف اسلام ہے۔"

○.......☆.......○.......☆.......○

درس ۲۵ ایک نظر میں

سورت کا یہ حصہ بھی انہیں خطوط پر چلتا ہے' جن پر ابتداء یہ سورت چلی آرہی ہے۔ یعنی اہل کتاب اور جماعت مسلمہ کے درمیان برپا معرکہ آرائی' یعنی فریقین کے درمیان نظریاتی جنگ' اور دشمنان دین اور دین اسلام کے خلاف جو حیلہ سازی و مکاری یعنی جو فریب کاری اور دھوکہ بازی' جو کذب و افتراء اور مختلف قسم کی سازشیں اور تدابیر اختیار کرکے حق و باطل میں ہروقت التباس پیدا کرتے تھے۔ شکوک و شبہات پھیلاتے تھے۔ اور جس طرح اس امت کو نقصان پہنچانے کیلئے ہروقت گھات میں بیٹھے رہے تھے اور جس طرح وہ بلاناغہ مسلسل یہ کام کررہے تھے۔ ان کا ازالہ اور جواب' اور اس حصے میں مسلمانوں کو سمجھایا جارہا تھا کہ وہ اس صورت حال کامقابلہ اس طرح کریں کہ جس حق پر قائم ہیں اس پر علی وجہ البصیرت قائم ہوں اور یہ یقین پیدا کریں کہ ان کے دشمن باطل موقف پر کھڑے ہیں۔ نیز اس سورت میں متنبہ کیا گیا تھا کہ دشمن تمہارے بارے میں کیا کیا منصوبے بناتے ہیں۔ آخر میں پھر ان دشمنوں کی تشریح بھی کردی گئی تھی۔ اور بتایا گیا تھا کہ ان کا مزاج' ان کے اخلاق' ان کے اعمال اور ان کی نیتیں کیسی ہیں۔ اور یہ باتیں کھول کر جماعت مسلمہ کے سامنے رکھدی گئیں تاکہ وہ اپنے دشمنوں کو اچھی طرح جان لے۔ اور وہ جس علم و معرفت کا دعویٰ کرتے تھے۔ اس کی قلعی بھی کھول دی گئی تھی۔ اور پھر جن مسلمانوں کو وہ دھوکہ دے رہے' ان کا اعتماد ان پر سے اٹھادیا تھا۔ انہیں ان سے متنفر کیا گیا۔ اور ان کی مکاریوں کو طشت از بام کردیا گیا تھا تاکہ وہ نہ کسی کو دھوکہ دے سکیں اور نہ ملمع کاری کرسکیں۔ یہ تھے مضامین پہلے سبق کے۔

لیکن اس سبق میں بھی اہل کتاب یعنی یہود و نصاریٰ کے ساتھ بحث ہے' لیکن یہاں بتایا گیا ہے کہ خصوصاً حضرت ابراہیم ؑ کے بارے میں ان کا موقف اور نظریہ توبادی النظر میں غلط ہے۔ یہودی سمجھتے تھے کہ وہ یہودی تھے' عیسائی یہ سمجھتے تھے کہ وہ عیسائی تھے۔ حالانکہ حضرت ابراہیم ؑ یہودیت اور نصرانیت دونوں کے وجود میں آنے سے بھی بہت پہلے دنیا میں تشریف لائے تھے۔ وہ تورات و انجیل کے نزول سے بھی پہلے تشریف لائے تھے۔ لہٰذا ان کے بارے میں اس قسم کے دعوے کرنا محض وھم ہے۔ جس پر کوئی دلیل نہیں ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ حضرت ابراہیم ؑ تو دین حنیف پر قائم تھے۔ جو سیدھے راستے کا نام ہے۔ اور ان کے دوست اور پیروکار کہلانے کے مستحق وہی لوگ ہیں جو اس کے طریقے پر ہوں۔ اور اللہ بھی اہل ایمان کا دوست ہوتا ہے۔ لہٰذا ان لوگوں کے بارے میں یہ دعوے کہ وہ ابراہیم ؑ کے پیرو اور دوست ہیں باطل قرار پاتے ہیں۔ پھر بتایا جاتا ہے کہ رسولوں کے بارے میں اسلام کا نظریہ یہ ہے کہ اہل اسلام تمام رسولوں کو برحق تسلیم کرتے ہیں إِنَّ أَوْلَى النَّاسِ بِإِبْرَاهِيمَ لَلَّذِينَ اتَّبَعُوهُ وَهَٰذَا النَّبِيُّ وَالَّذِينَ آمَنُوا ۗ وَاللَّهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِينَ .... "ابراہیم سے نسبت رکھنے کا سب سے زیادہ حق اگر کسی کو پہنچتا ہے تو ان لوگوں کو پہنچتا ہے جنہوں نے اس کی پیروی کی اور اب یہ نبی اور اس کے ماننے والے اس نسبت کے زیادہ حقدار ہیں۔ اور اللہ صرف انہی کا حامی و مددگار ہے جو ایمان رکھتے ہیں۔" (۳:۶۸)

اس کے بعد بتایا جاتا ہے کہ حضرت ابراہیم ؑ کے بارے میں اہل کتاب یہ مجادلہ کیوں کرتے ہیں؟ اس میں پردہ راز کیا ہے؟ بتایا جاتا ہے کہ ان کا مقصد صرف یہ ہے کہ مسلمانوں کو اپنے دین کے معاملے میں گمراہ کردیں' ان کے عقائد میں شبہات پیدا کئے جائیں۔ چنانچہ اس سلسلے میں ان کی گوشمالی کی جاتی ہے۔

يَاَهۡلَ الۡكِتٰبِ لِمَ تَكۡفُرُوۡنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَ اَنۡتُمۡ تَشۡهَدُوۡنَ ۞ يَاَهۡلَ الۡكِتٰبِ لِمَ تَلۡبِسُوۡنَ الۡحَقَّ بِالۡبَاطِلِ وَ تَكۡتُمُوۡنَ الۡحَقَّ وَ اَنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ

"اے اہل کتاب کیوں اللہ کی آیات کا انکار کرتے ہوں حالانکہ تم خود ان کا مشاہدہ کر رہے ہو' اے اہل کتاب! کیوں حق کو باطل کا رنگ چڑھا کر مشتبہ بناتے ہو؟ کیوں جانتے بوجھتے حق کو چھپاتے ہو۔"

اس کے بعد جماعت مسلمہ کو ان سازشوں کی ایک جھلک دکھائی جاتی ہے۔ جو سازشیں وہ اہل ایمان کے عقائد' ان کے اعتماد اور ان کے اطمینان کے خلاف وہ خفیہ طور پر کرتے تھے۔ اور نہایت ہی مکاری سے کام لیتے تھے اور وہ سکیم یہ تھی کہ اہل کتاب میں سے کچھ لوگ صبح کے وقت اسلام کا اعلان کریں گے اور شام کو پھر واپس کفر کی طرف لوٹ جائیں گے۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ اہل اسلام میں سے جو لوگ ثابت قدم نہیں ہیں ان کے دل میں یہ خلجان ڈالدیں کہ اہل کتاب صبح مسلمان ہوئے اور شام کو پھر انہوں نے کفر کیوں اختیار کر لیا' اور ظاہر ہے کہ ہر جماعت کے اندر ایسے لوگ موجود ہوتے ہیں جو ثابت قدم نہیں ہوتے۔ خصوصاً جبکہ ان کے نزدیک اہل کتاب کتب اور ادیان کے بارے میں زیادہ علم رکھتے تھے۔

وَ قَالَتۡ طَّآئِفَةٌ مِّنۡ اَهۡلِ الۡكِتٰبِ اٰمِنُوۡا بِالَّذِيۡۤ اُنۡزِلَ عَلَى الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَجۡهَ النَّهَارِ وَ اكۡفُرُوۡۤا اٰخِرَهٗ لَعَلَّهُمۡ يَرۡجِعُوۡنَ

"اہل کتاب میں سے ایک گروہ کہتا ہے کہ اس نبی کے ماننے والوں پر جو کچھ نازل ہوا اس پر صبح ایمان لاؤ اور شام کو اس سے انکار کر دو' شاید اس ترکیب سے یہ لوگ اپنے ایمان سے پھر جائیں۔" یہ ان کا نہایت ہی مذموم منصوبہ تھا۔

اس کے بعد بتایا جاتا ہے' اہل کتاب کے اجتماعی اخلاق کیا ہیں اور یہ کہ معاہدات کے بارے میں ان کا نقطہ نظر کیا ہے۔ ان میں سے بعض تو ایسے ہیں جن کی امانت و دیانت مسلم ہے۔ لیکن ان میں اکثر ایسے ہیں ان میں امانت دیانت نام کو نہیں ہے۔ اور انہوں نے اپنی اس بددیانتی اور بدعملی سے اپنے مذہبی عقائد میں سے بعض دلائل تلاش کر لئے تھے۔ حالانکہ اہل کتاب کا اصل دین ایک برحق دین ان باتوں کے ساتھ ان کے دین کا کوئی تعلق نہ تھا۔

وَ مِنۡ اَهۡلِ الۡكِتٰبِ مَنۡ اِنۡ تَاۡمَنۡهُ بِقِنۡطَارٍ يُّؤَدِّهٖۤ اِلَيۡكَ ۚ وَ مِنۡهُمۡ مَّنۡ اِنۡ تَاۡمَنۡهُ بِدِيۡنَارٍ لَّا يُؤَدِّهٖۤ اِلَيۡكَ اِلَّا مَا دُمۡتَ عَلَيۡهِ قَآئِمًا ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمۡ قَالُوۡا لَيۡسَ عَلَيۡنَا فِى الۡاُمِّيّٖنَ سَبِيۡلٌ ۚ وَ يَقُوۡلُوۡنَ عَلَى اللّٰهِ الۡكَذِبَ وَ هُمۡ يَعۡلَمُوۡنَ

"اہل کتاب میں سے کوئی تو ایسا ہے' کہ اگر تم اس کے اعتماد پر مال و دولت کا ایک ڈھیر بھی دیدو تو وہ تمہارا مال تمہیں ادا کر دے گا' اور کسی کا حال یہ ہے کہ اگر تم ایک دینار کے معاملے میں اس پر بھروسہ کرو وہ ادا نہ کرے گا۔ الا یہ کہ تم اس کے سر پر سوار ہو جاؤ۔ ان کی اس اخلاقی حالت کا سبب یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ امیوں کے معاملے میں ہم پر کوئی مواخذہ نہیں ہے۔" اور یہ بات وہ محض جھوٹ گھڑ کر اللہ کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ حالانکہ انہیں معلوم ہے کہ اللہ نے ایسی کوئی بات نہیں فرمائی۔

یہاں آکر معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کا اخلاقی نقطۂ نظر کیا ہے۔ یہ کہاں سے اٹھتا ہے اور یہ کہ اس کا تعلق کس طرح خدا خوفی کے ساتھ ہوتا ہے۔

بَلٰى مَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ وَ اتَّقٰى فَاِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَ اَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيْلًا اُولٰٓئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِى الْاٰخِرَةِ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَلَا يَنْظُرُ اِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ ۠ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝

"جو بھی اپنے عہد کو پورا کرے گا اور برائی سے بچ کر رہے گا۔ وہ اللہ کا محبوب بنے گا۔ کیونکہ پرہیزگار لوگ اللہ کو پسند ہیں۔ رہے وہ لوگ جو اپنے عہد اور قسموں کو تھوڑی قیمت دے کر بیچ ڈالتے ہیں تو ان کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے۔ اللہ قیامت کے روز نہ ان سے بات کرے گا اور نہ ان کی طرف دیکھے گا اور نہ انہیں پاک کرے گا۔ بلکہ ان کیلئے تو سخت دردناک سزا ہے۔"

یہ سبق آگے بڑھتا ہے اور اب اس میں اہل کتاب کی ایک کج روی کو منظر پر لایا جاتا ہے۔ اور بتایا جاتا ہے کہ وہ دین کے معاملے میں جھوٹ تک بولنے میں کس قدر بیباک ہیں۔ اور یہ کام وہ دنیاوی مفادات اور نہایت ہی کم قیمت مفادات کیلئے کرتے ہیں۔

وَ اِنَّ مِنْهُمْ لَفَرِيْقًا يَّلْوٗنَ اَلْسِنَتَهُمْ بِالْكِتٰبِ لِتَحْسَبُوْهُ مِنَ الْكِتٰبِ وَمَا هُوَ مِنَ الْكِتٰبِ ۚ وَ يَقُوْلُوْنَ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَمَا هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۚ وَ يَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَ هُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝

"اور ان میں سے کچھ لوگ ایسے ہیں جو کتاب پڑھتے ہوئے اس طرح زبان کا الٹ پھیر کرتے ہیں کہ تم سمجھو کہ 'جو کچھ وہ پڑھ رہے ہیں وہ کتاب ہی کی عبارت ہے۔ حالانکہ وہ کتاب کی عبارت نہیں ہوتی۔ وہ کہتے ہیں کہ جو کچھ ہم کہہ رہے ہیں' یہ خدا کی طرف سے ہے حالانکہ وہ خدا کی طرف سے نہیں ہوتا۔ وہ جان بوجھ کر جھوٹ بات اللہ کی طرف منسوب کرتے ہیں۔"

اور من جملہ اور امور کے 'جو وہ اپنی زبان کی چالاکی سے کتاب میں داخل کرتے تھے' ایک یہ بات تھی کہ حضرت مسیح علیہ السلام الٰہ ہیں اور یہ کہ روح القدس بھی الٰہ ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ یہاں اس بات کی تردید کرتے ہیں کہ حضرت مسیح علیہ السلام نہ کوئی ایسی آیت لیکر آئے ہیں اور نہ ہی انہوں نے ان لوگوں کو ایسے عقائد رکھنے کا کوئی حکم دیا ہے۔

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ۝ وَلَا يَاْمُرَكُمْ اَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓئِكَةَ وَالنَّبِيّٖنَ اَرْبَابًا ؕ اَيَاْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ اِذْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۝

"کسی انسان کا یہ کام نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو کتاب اور حکم اور نبوت عطا فرمائے اور وہ لوگوں سے کہے کہ اللہ کی بجائے تم

میرے بندے بن جاؤ' وہ تو یہی کہے گا کہ سچے ربانی ہو جاؤ۔ جیسا کہ اس کتاب کی تعلیم کا تقاضا ہے جسے تم پڑھتے اور پڑھاتے ہو۔ وہ تم سے ہرگز نہ کہے گا کہ فرشتوں یا پیغمبروں کو اپنا رب بنالو' کیا یہ ممکن ہے کہ ایک نبی تمہیں کفر کا حکم دے جبکہ تم مسلم ہو۔"

اور اس مضمون کی مناسبت یہاں مسلسل دنیا میں بھیجے جانے والے انبیاء کے باہمی تعلق اور تعاون کی سلسلے میں لیے جانے والے اقرار کو بھی بیان کر دیا جاتا ہے کہ ان میں سے ہر سابق نبی یہ میراث آنے والے کے سپرد کرے گا اور اس کی مدد کرے گا۔

وَإِذْ أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ النَّبِيِّينَ لَمَا آتَيْتُكُمْ مِنْ كِتَابٍ وَحِكْمَةٍ ثُمَّ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مُصَدِّقٌ لِمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهِ وَلَتَنْصُرُنَّهُ ۚ قَالَ أَأَقْرَرْتُمْ وَأَخَذْتُمْ عَلَىٰ ذَٰلِكُمْ إِصْرِي ۖ قَالُوا أَقْرَرْنَا ۚ قَالَ فَاشْهَدُوا وَأَنَا مَعَكُمْ مِنَ الشَّاهِدِينَ ﴿٨١﴾

"اور یاد کو' اللہ نے پیغمبروں سے عہد لیا تھا کہ "آج ہم نے تمہیں کتاب اور حکمت و دانش سے نوازا ہے' کل اگر کوئی دوسرا رسول تمہارے پاس اسی تعلیم کی تصدیق کرتا ہوا آئے' جو پہلے سے تمہارے پاس موجود ہے۔ تو تم کو اس پر ایمان لانا ہو گا اور اس کی مدد کرنا ہو گی۔ " یہ ارشاد فرما کر اللہ نے پوچھا کیا تم اس کا اقرار کرتے ہو اور اس پر میری طرف سے عہد کی بھاری ذمہ داری اٹھاتے ہو" انہوں نے کہا ہاں' ہم اقرار کرتے ہیں۔ اللہ نے فرمایا! اچھا تو گواہ رہو اور میں بھی تمہارے ساتھ گواہ ہوں۔"

یہی وجہ ہے کہ اہل کتاب پر یہ بات فرض ہو جاتی ہے کہ وہ نبی آخر الزمان پر ایمان لائیں اور اس کی امداد کریں۔ لیکن ان کا وطیرہ تو یہ ہے کہ وہ اپنے نہ ان وعدوں کی پابندی کرتے ہیں جو انہوں نے اللہ کے ساتھ کیے اور نہ ان معاہدوں کی جو انہوں نے سابقہ رسولوں کے ساتھ کیے۔

ان مقدمات کا فطری نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کے دین یعنی دین اسلام کے سوا کوئی اور دین اپنے لئے تلاش کرتا ہے۔ تو گویا وہ پوری کائنات کے نظام قدرت سے بغاوت کرتا ہے جیسا کہ جس طرح اللہ نے اس کا ارادہ کیا ہے۔

أَفَغَيْرَ دِينِ اللَّهِ يَبْغُونَ وَلَهُ أَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ طَوْعًا وَكَرْهًا وَإِلَيْهِ يُرْجَعُونَ

"کیا یہ لوگ اللہ کے دین کا طریقہ چھوڑ کر کوئی اور طریقہ چاہتے ہیں؟ حالانکہ آسمان و زمین کی ساری چیزیں چارو ناچار اللہ ہی کے تابع ہیں (مسلم ہیں) اور اس کی طرف سب کو پلٹنا ہے۔" پس وہ لوگ جو اسلام سے خارج ہوتے ہیں' ان کا معاملہ اللہ کے اختیار میں ہے۔ اسی طرح وہ لوگ جو اسلامی نظام کی مکمل اطاعت نہیں کرتے' ان کا معاملہ بھی اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس قدر نافرمان ہیں کہ اللہ کے اس تکوینی نظام سے بھی خارج ہیں۔

یہاں رسول خدا ﷺ اور اہل ایمان کو اللہ وحدہ کے دین پر ثابت قدمی کا اعلان کر دیں اور دین ان ہدایات کے اندر ہے جو حضور ﷺ اللہ کی جانب سے لیکر آئے اور آپ سے قبل دوسرے رسول لیکر آئے اور اللہ تعالیٰ کا اعلان ہے کہ وہ انسانوں کی جانب سے صرف اسی دین کو قبول کرے گا۔

وَمَنْ يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِينَ

.... "اور جو شخص بھی اسلام کے سوا کسی اور دین کی پیروی کرے گا تو یہ اس کی جانب سے قبول نہ کی جائے گی اور آخرت میں وہ خسارہ پانے والوں میں سے ہو گا۔"

اب جو لوگ اس دین پر ایمان نہیں لاتے تو ان کیلئے ہدایت پانے کی کوئی امید نہیں ہے اور نہ ان کیلئے اللہ کی پکڑ سے بچنے کی کوئی امید ہے۔ الا یہ کہ وہ توبہ کریں۔ رہے وہ لوگ جو کفر کی حالت میں اس دنیا سے چلے جائیں تو انہیں وہ تمام مال و دولت کچھ فائدہ نہ دے گی جو انہوں نے بھلائی کی راہ میں خرچ کی۔ اور اگر وہ اپنے اس کفر کا کفارہ اس کرۂ ارض کو بھر کر سونا ادا کریں تو بھی یہ فدیہ قبول نہ ہو گا۔

اللہ کی راہ میں خرچ اور قربانی کے اس مقام پر اہل اسلام کو آمادہ کیا جاتا ہے کہ اپنے مال و دولت سے اللہ کی راہ میں وہ چیزیں خرچ کریں جو انہیں پسند ہیں۔

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ

.... "تم نیکی کو نہیں پہنچ سکتے جب تک تم اپنی وہ چیزیں خرچ نہ کرو جنہیں تم عزیز رکھتے ہو۔ اور جو کچھ تم خرچ کرو گے اللہ اس سے بے خبر نہ ہو گا۔"

غرض اس مختصر حصے میں' اس قدر عظیم حقائق اور بے شمار ہدایات جمع کر دی گئی ہیں۔ اور یہ اس عظیم معرکہ میں ایک مختصر جملہ ہے۔ جو اس پوری سورت میں برپا ہے۔ اور اس کے فریق امت مسلمہ اور اس کے دشمنان ہیں۔ اور یہ معرکہ صدیوں سے یونہی برپا ہے۔ آج بھی امت مسلمہ اور دشمنان دین کے درمیان یہی معرکہ جاری ہے۔ اس معرکے کے اہداف اور مقاصد وہی ہیں جو اس وقت تھے۔ اگرچہ آج کل اس معرکہ میں اسباب اور وسائل بالکل مختلف استعمال ہو رہے ہیں' لیکن لائن آج بھی وہی ہے لیکن آج یہ معرکہ طویل خطوط پر ہے۔

○......☆......○......☆......○

درس ۲۵ تشریح آیات

آیات ۶۵ تا ۹۱

يَاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تُحَاجُّوْنَ فِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمَآ اُنْزِلَتِ التَّوْرٰىةُ وَالْاِنْجِيْلُ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِهٖ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۶۵﴾ هٰٓاَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ حَاجَجْتُمْ فِيْمَا لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ فَلِمَ تُحَآجُّوْنَ فِيْمَا لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۶۶﴾ مَا كَانَ اِبْرٰهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا ؕ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۶۷﴾ اِنَّ اَوْلَى النَّاسِ بِاِبْرٰهِيْمَ لَلَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ وَهٰذَا النَّبِيُّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ؕ وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۶۸﴾

”اے اہل کتاب تم ابراہیمؑ کے بارے میں ہم سے کیوں جھگڑتے ہو؟ تورات اور انجیل تو ابراہیمؑ کے بعد نازل ہوئی ہیں' پھر کیا تم اتنی بات بھی نہیں سمجھتے ہو۔ تم لوگ جن چیزوں کا علم رکھتے ہو ان میں تو خوب بحثیں کر چکے' اب ان معاملات میں کیوں بحثیں کرتے ہو جن کا تمہارے پاس کچھ علم بھی نہیں' اللہ جانتا ہے' تم نہیں جانتے' ابراہیمؑ نہ یہودی تھا نہ عیسائی' بلکہ وہ تو ایک مسلم یکسو تھا اور وہ ہرگز مشرکوں میں سے نہ تھا۔ ابراہیمؑ سے نسبت رکھنے کا حق سب سے زیادہ اگر کسی کو پہنچتا ہے تو ان لوگوں کو پہنچتا ہے جنہوں نے اس کی پیروی کی اور اب یہ نبی اور اس کے ماننے والے اس نسبت کے زیادہ حقدار ہیں۔ اللہ صرف انہی کا حامی و مددگار ہے جو ایمان رکھتے ہوں۔“

محمد بن اسحاق' محمد' سعید بن جبیر' یا عکرمہ اور حضرت ابن عباس ﷺ کے واسطہ سے روایت کرتے ہیں۔ انہوں نے فرمایا نجران کے نصاریٰ اور یہودیوں کے احبار رسول اللہ ﷺ کے پاس جمع ہوئے اور فرمایا آپ سے مباحثہ شروع کر دیا' احبار نے کہا ابراہیم یہودی تھا' نصاریٰ نے کہا کہ وہ نصرانی تھا۔ اس پر یہ آیت نال ہوئی يَاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تُحَاجُّوْنَ فِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ .... ”اہل کتاب! تم ابراہیمؑ کے بارے میں کیوں جھگڑتے ہو۔“ .... چاہے ان آیات کا شان نزول یہ ہو یا نہ ہو' بہرحال آیات بظاہر اس بات پر شاہد ہیں کہ وہ اہل کتاب بے بنیاد دعووں کے رد میں نازل ہوئی۔ ان کا یہ تنازعہ حضور اکرم ﷺ کے ساتھ تھا یا حضورؐ کی موجودگی میں وہ آپس میں جھگڑتے تھے اور ان کے جھگڑے کے پس منظر میں یہ نظریہ کارفرما تھا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم سے یہ وعدہ فرمایا تھا کہ ان کی اولاد میں نبوت رہے گی تو اس طرح وہ یہ فضیلت اور ہدایت اپنے نام الاٹ کرانا چاہتے تھے۔ یہ تھا ان کا اصل مقصد' دوسرے یہ کہ وہ اس طرح حضور ﷺ کے اس دعویٰ کی بالواسطہ تکذیب کرنا چاہتے تھے کہ حضور اور آپ کی امت دین حنیف کے پیروکار ہیں اور حنیفیت اولیٰ کے وارث ہیں۔ نیز اس طرح وہ مسلمانوں کے دلوں میں شبہات پیدا کرنا چاہتے تھے۔ یا کم از کم بعض اہل اسلام میں وہ شک ڈالنا چاہتے تھے۔

یہی وجہ ہے کہ اللہ ان کی سخت ترین الفاظ میں تردید فرماتے ہیں اور ان کی اس خوش فہمی کو طشت ازبام کرتے ہیں' جو کسی علمی دلیل پر مبنی نہیں ہے۔ اس لئے کہ ابراہیم ﷺ تورات سے بھی پہلے گزرے ہیں اور انجیل سے بھی پہلے گزرے ہیں۔ پس کس طرح ممکن ہے کہ وہ یہودی ہوں یا نصرانی ہوں' لہٰذا یہ دعویٰ مکمل طور پر خلاف عقل ہے۔ صرف پیغمبروں کی تاریخ پر اچٹتی نظر ڈالنے سے ہی معلوم ہو جاتا ہے کہ ان کا دعویٰ باطل ہے۔

يَٰٓأَهْلَ ٱلْكِتَٰبِ لِمَ تُحَآجُّونَ فِىٓ إِبْرَٰهِيمَ وَمَآ أُنزِلَتِ ٱلتَّوْرَىٰةُ وَٱلْإِنجِيلُ إِلَّا مِنۢ بَعْدِهِۦٓ ۚ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ﴿٦٥﴾

"اہل کتاب تم ابراہیمؑ کے بارے میں ہم سے کیوں جھگڑتے ہو؟ تورات اور انجیل تو ابراہیمؑ کے بعد نازل ہوئی ہیں۔ پھر کیا تم اتنی بات بھی نہیں سمجھتے۔"

اس کے بعد ان پر تنقید جاری رہتی ہے' وہ جو دلائل پیش کرتے تھے ان کا پول کھولا جاتا ہے۔ اور ان کی ہٹ دھری اور ان کے غیر معقول طرز عمل اور بحث و مباحثہ میں ان کے غیر منطقیانہ استدلال کی وضاحت کی جاتی ہے۔

هَٰٓأَنتُمْ هَٰٓؤُلَآءِ حَٰجَجْتُمْ فِيمَا لَكُم بِهِۦ عِلْمٌ فَلِمَ تُحَآجُّونَ فِيمَا لَيْسَ لَكُم بِهِۦ عِلْمٌ ۚ وَٱللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ﴿٦٦﴾

"تم جن چیزوں کا علم رکھتے تھے ان میں تو خوب بحثیں کر چکے۔ اب ان معاملات میں کیوں بحثیں کرنے چلے جن کا تمہارے پاس کچھ بھی علم نہیں' اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے ہو۔"

انہوں نے حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں مباحثہ کیا' پھر انہوں نے بعض فقہی موضوعات پر بھی مجادلہ کیا' اور جب انہیں دعوت دی گئی کہ آؤ کتاب اللہ کے مطابق فیصلے کریں تو انہوں نے روگردانی کی۔ یہ دونوں موضوعات تو ایسے تھے' جن کے بارے میں انہیں کچھ علم تھا۔ رہے وہ معاملات جو تمہارے وجود سے پہلے ہیں' تمہاری کتابوں سے پہلے ہیں۔ تمہارے اس دین سے پہلے ہیں جن پر تمہارا ایمان ہے۔ تو اس بارے میں تمہارے پاس نہ علم ہے اور نہ سند ہے۔ اگرچہ ہماری سند ہو' لہٰذا ان موضوعات پر تمہارا مباحثہ کرنا صرف بحث برائے بحث ہوگا۔ وہ محض تیر تکے چلانا ہوگا۔ کوئی بامقصد کام نہ ہوگا۔ بلکہ محض مطلب براری اور نفس پرستی ہوگی۔ اور جن لوگوں کا حال یہ ہو وہ ہرگز قابل اعتبار نہ ہوں گے بلکہ ایسے لوگوں سے نہ بات کرنا مناسب ہے اور نہ ان کی بات پر کان دھرنا مناسب ہے۔

ان حضرات کی بحث و تکرار کا پول کھولنے کے بعد اور اس بحث کی حیثیت ختم کر دینے کے بعد اور انہیں مکمل طور پر ناقابل اعتبار کر دینے کے بعد' اب اللہ تعالیٰ وہ اصل حقیقت بیان فرماتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے۔ کیونکہ تاریخ انسانی میں بہت زیادہ قدیم واقعات کی اصل حقیقت تو اللہ ہی جانتا ہے۔ نیز حضرت ابراہیم ﷺ پر جو دین نازل فرمایا گیا تھا' اس کی حقیقت کو بھی اللہ ہی جانتا ہے۔ اور اللہ کا فیصلہ بہرحال قاطع ہے۔ اللہ کے فیصلے کے بعد کسی کیلئے کوئی بات کرنے کی کوئی گنجائش بھی نہیں ہے۔ الا یہ کہ کوئی ہر صورت میں' بغیر کسی دلیل و برہان کے' مجادلہ پر اتر آیا ہو ——— مَا

كَانَ إِبْرَٰهِيمُ يَهُودِيًّا وَلَا نَصْرَانِيًّا وَلَٰكِن كَانَ حَنِيفًا مُّسْلِمًا وَمَا كَانَ مِنَ ٱلْمُشْرِكِينَ ﴿٦٧﴾

"ابراہیم علیہ السلام نہ یہودی تھا' نہ عیسائی بلکہ وہ ایک مسلم یکسو تھا اور وہ ہرگز مشرکوں میں سے نہ تھا۔" یوں' اس سے پہلے اشارۃ جو بات کی گئی تھی کہ ابراہیم نہ یہودی تھے اور نہ نصرانی' اس لئے کہ تورات و انجیل بعد میں نازل ہوئیں۔ یہاں اس کی تصریح کر دی گئی ہے کہ وہ یہودی او نصرانی نہیں تھے بلکہ مسلم حنیف تھے۔ اور وہ اسلام کے سوا کسی اور ملت کی طرف مائل نہ تھے۔ اس لئے کہ وہ مسلم تھے۔ اور مسلم بھی ان معنوں میں تھے' جن کی تفصیل ہم نے اس سے پہلے بیان کر دی ہے۔ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ .... "اور وہ مشرکوں میں سے نہ تھے۔" یہ فقرہ سابقہ فقرے کی تاکید مزید ہے کہ وہ مسلم حنیف تھے۔ اور اس لئے کہ مسلم حنیف جو بھی ہو وہ مشرک نہیں ہوتا۔ اب حنیف مسلم کے بعد یہ کہنا کہ وہ مشرک نہ تھے اس میں چند لطیف اشارے مقصود ہیں۔

پہلا اشارہ یہ ہے کہ یہود و نصاریٰ جن کے اندر عقائد کا انحراف اس حد تک پہنچ گیا ہے وہ درحقیقت مشرک ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ابراہیم نہ یہودی ہو سکتا ہے اور نہ نصرانی' بلکہ وہ مسلم حنیف ہی ہے۔

دوسرا اشارہ یہ ہے کہ اسلام ایک علیحدہ حقیقت ہے اور شرک بالکل ایک الگ چیز ہے۔ ان دونوں کا ایک جگہ اکٹھ کبھی نہیں ہو سکتا۔ اسلام مطلق توحید کا نام اور توحید بھی از ہمہ جہت و باہمہ خصوصیات و باہمہ مقتضیات اس لئے اسلام شرک کے کسی رنگ کے ساتھ لگا نہیں کھاتا۔

اس میں تیسرا اشارہ یہ مطلوب ہے کہ مشرکین قریش اپنے آپ کو حنفی اور دین ابراہیمؑ کے پیرو سمجھتے تھے۔ اور وہ خانہ کعبہ کے خادم اور مجاور تھے۔ ان کو بتایا جا رہا ہے کہ وہ تو مسلم حنیف تھے۔ اور تم مشرکین ہو وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ...... "وہ مشرکوں میں سے نہ تھا۔"

جب حضرت ابراہیمؑ مسلم حنیف تھے اور مشرک نہ تھے تو یہود و نصاریٰ یا مشرکین میں سے کوئی بھی یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ وہ ان کے وارث ہیں۔ اور نہ ہی ان میں سے کوئی یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ وہ ابراہیم کے دین کے والی ہیں حالانکہ وہ اس کے دین سے بہت ہی دور جا چکے ہیں۔ عقیدہ اور نظریہ وہ رابطہ ہے جس پر لوگ اسلام میں باہم جمع ہوتے ہیں۔ جبکہ ہم نسب' ہم قوم' ہم جنس اور ہم وطن ہو کر بھی لوگ ایک دوسرے سے دور ہوتے ہیں۔ اگر وہ مسلمان نہ ہوں اور جب اسلامی نظریہ حیات کی اس مضبوط اساس پر اہل ایمان جمع ہوتے ہیں تو پھر ان کی نظر میں انسان وہ ہوتا ہے جو روحانی اعتبار سے انسان ہو۔ یعنی انسان اس وجہ سے ممتاز ہے کہ اس کے جسم میں اللہ نے ایک پاک روح ڈالی ہے۔ چنانچہ اس کا صحیح اکٹھ بھی عقیدے کی اساس پر ہو سکتا ہے جو اس کی روح کی خصوصیات میں سے اہم خصوصیت ہے۔ انسان کا اجتماعی نظام ان اساسوں پر قائم نہیں ہوتا جس پر مویشیوں کا اکٹھ ہوتا ہے۔ مثلاً ایک جگہ چرنے والے مویشی' ایک جنس کے مویشی' ایک چراگاہ والے مویشی ایک ہی باڑے میں اور اہل زندان میں روکے ہوئے مویشی باہم مل کر رہتے ہیں۔ اسلامی نقطہ نظر سے ایک فرد اور دوسرے فرد' ایک گروہ اور دوسرے گروہ' ایک نسل اور دوسری نسل کے درمیان ماسوائے عقیدہ اور نظریہ حیات کے اور کوئی رابطہ نہیں ہوتا۔ اس میں ایک مومن دوسرے مومن سے محبت کرتا ہے' ایک مسلم گروہ کو دوسرے مسلم گروہ سے محبت ہوتی ہے۔ ایک اسلامی جماعت کا دوسرے اسلامی جماعت سے تعلق ہوتا ہے اور مسلم نسلوں کا دوسری مسلم نسلوں سے تعلق ہوتا ہے اور اس کی راہ میں زمان و مکان کی حدود حائل نہیں ہو سکتیں۔ اس تعلق کی راہ میں خون اور نسب کے فاصلے حائل نہیں ہو سکتے۔ قوم اور علاقے کے فاصلے حائل نہیں ہوتے۔ وہ باہم نظریاتی دوست ہوتے ہیں۔ صرف نظریہ کی اساس پر اور ان سب کے اوپر پھر ذات باری سب کی دوست ہوتی ہے۔ اِنَّ اَوْلَى النَّاسِ بِاِبْرٰهِيْمَ لَلَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ وَهٰذَا النَّبِيُّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِيْنَ

ہم سے نسبت رکھنے کا سب سے زیادہ حق اگر کسی کو پہنچتا ہے تو ان لوگوں کو پہنچتا ہے جنہوں نے اس کی پیروی کی اور اب یہ نبی اور اس کے ماننے والے اس نسبت کے زیادہ حقدار ہیں۔ اللہ صرف انہی کا حامی اور مددگار ہے جو ایمان رکھتے ہیں۔" پس وہ لوگ جو حضرت ابراہیم کی زندگی میں ان کے پیرو رہے' اور ان کے نظام اور طریقے پر چلے' اور انہوں نے ان کے احکام کے مطابق فیصلے کیے تو وہی ان کے دوست تھے۔ پھر یہ نبی ان کے دوست ہیں جو اللہ کی شہادت کے مطابق ان کے دین پر ہیں وہ ان کے دوست ہیں' اس کے بعد وہ لوگ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دوست ہیں جو اس نبی پر ایمان لائے۔ اور وہ اپنے نظام زندگی اور طریقہ حیات میں ان کے ہمرنگ ہو گئے۔ **وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِيْنَ** "اللہ صرف ان کا حامی اور مددگار ہے جو ایمان رکھتے ہیں۔" اس لئے کہ یہی لوگ اللہ کی پارٹی ہیں' یہی لوگ اللہ کا جھنڈا اٹھائے ہوئے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جو اللہ سے محبت اور دوستی رکھتے ہیں اور اس کے سوا ان کا کوئی ولی نہیں ہے۔ یہ لوگ ایک ہی خاندان ہیں۔ یہ ایک امت ہیں' چاہے صدیاں گزر جائیں' زمانے گزر جائیں' زمین اور وطن کے فاصلے طویل کیوں نہ ہوں' نسل اور قوم مختلف کیوں نہ ہو' خاندان اور قبائل مختلف کیوں نہ ہوں' یہ ایک ہیں' ایک رہیں گے۔

انسانی اجتماع کی یہ سب سے ترقی یافتہ شکل ہے جو حضرت انسان کے لئے موزوں ترین ہے۔ اور یہی صورت اسے حیوانوں کے ریوڑ سے ممتاز کرتی ہے۔ دوسری جانب مختلف قسم کی سوسائٹیوں میں سے یہ سوسائٹی سب سے عام اور بلاقید ہے۔ اس لئے کہ اس اجتماعی نظام کی اساس جس شرط کے ساتھ مشروط ہے وہ شرط اختیار ہے۔ انسان کے بس میں ہے کہ وہ اس شرط کو پوری کر دے۔ وہ شرط نظریاتی ہے اور ہر شخص کسی بھی نظریئے کو اپنانے میں آزاد اور مختار ہے۔ جب کہ کوئی شخص اپنی نسل کو تبدیل نہیں کر سکتا۔ اگرچہ ہم اجتماعی نظام کی اساس کسی نسل پر رکھ دیں تو کوئی شخص بہرحال اس نسل میں داخل نہیں ہو سکتا۔ اگرچہ اجتماعیت کو قومیت کی اساس پہ استوار کریں تو پھر کوئی شخص اپنی قومیت تبدیل نہیں کر سکتا۔ اگر ہم اجتماعی نظام رنگ پر رکھیں تو کوئی بھی شخص اپنا رنگ نہیں بدل سکتا۔ اسی طرح اگر ہم زبان کی اساس پر اجتماعی نظام استوار کریں تو کوئی شخص اپنی زبان بھی نہیں بدل سکتا۔ اسی طرح اگر نظام طبقات پر مبنی ہو' تو طبقہ بدلنا بھی آسانی سے ممکن نہیں ہوتا۔ بلکہ بعض اوقات طبقات بھی ناقابل تبدیل ہوتے ہیں مثلاً ہندوستان میں اچھوت وغیرہ' یہی وجہ ہے تمام دوسری سوسائٹیوں میں بعض طبقات کی راہ میں پردے حائل ہوتے ہیں اور وہ اس سوسائٹی کا ممبر نہیں بن سکتے۔ صرف نظریاتی اساس پر تشکیل پانے والی سوسائٹی اس عیب سے خالی ہوتی ہے۔ اس لئے کہ نظریاتی سوسائٹی میں کوئی نظریہ اپنانے نہ اپنانے کا معاملہ ایک فرد کے اختیار میں ہوتا ہے۔ بغیر اس کے اس کی اصلیت بدلے' اس کی زبان بدلے' اس کا طبقہ بدلے' یا وہ صف بدلے جس کی اساس' اس کا پردہ اس میں شامل ہو رہا ہے۔ اس کے علاوہ اس نظریاتی سوسائٹی میں انسان کے مقام اور اس کے اکرام میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ اور اس کا نظریہ اجتماع ان عناصر کی اساس پر ہوتا ہے جو انسانی عناصر ہیں۔ ان پر نہیں جو جانوروں کو باہم اکٹھا کرتے ہیں۔ اب انسان کے لئے صرف دو راستے ہیں' ایک یہ کہ وہ اسلام کے نظریہ اجتماع کے مطابق وہ روحانی اور نظریاتی اساسوں پر جمع ہو اور انسانوں کی طرح رہے اور یا پھر حیوانوں کے ایک ریوڑ اور گلے کی طرح ہم جنس' جو اکٹھے ہوں یا ایسے مویشی اکٹھے ہوں جن کی چراگاہ ایک ہے۔ اور ان حدود وقیود کے اندر رہیں جو ان مویشیوں کے لئے بنائے گئے ہیں۔

○ — ○ — ○

اب امت مسلمہ کو بتایا جاتا ہے کہ اس جدل وجدال اور بحث ومباحثے کے پس منظر میں اہل کتاب کا اصل منصوبہ کیا ہے؟ اس لئے اہل کتاب کی مکاریوں' ان کی خفیہ تدبیروں اور دین کے ساتھ اس کھیل کا بھانڈا امت مسلمہ کے سامنے بھرے چوراہے میں پھوڑا جاتا ہے۔ وہ سترپاش پاش کر دیا جاتا ہے جس کے پیچھے چھپ کر یہ لوگ یہ گھناؤنا کھیل کھیلا کرتے تھے اور انہیں جماعت مسلمہ کے سامنے صاف ننگا کر کے شرمندہ کر دیا جاتا ہے۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ وَدَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يُضِلُّوْنَكُمْ ؕ وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّاۤ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۶۹﴾ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ﴿۷۰﴾ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَلْبِسُوْنَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۷۱﴾ وَقَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اٰمِنُوْا بِالَّذِيْۤ اُنْزِلَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَجْهَ النَّهَارِ وَاكْفُرُوْۤا اٰخِرَهٗ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۷۲﴾ وَلَا تُؤْمِنُوْۤا اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِيْنَكُمْ ؕ قُلْ اِنَّ الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ ۙ اَنْ يُّؤْتٰۤى اَحَدٌ مِّثْلَ مَاۤ اُوْتِيْتُمْ اَوْ يُحَآجُّوْكُمْ عِنْدَ رَبِّكُمْ ؕ قُلْ اِنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ ۚ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۷۳﴾ ۙ يَّخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴿۷۴﴾

۷ ع ۸ ۱۵

"اہل کتاب کا ایک گروہ چاہتا ہے کہ کسی طرح تمہیں راہ راست سے ہٹادے' حالانکہ وہ اپنے سوا کسی کو گمراہی میں نہیں ڈال رہے ہیں مگر انہیں اس کا شعور نہیں۔ اے اہل کتاب! کیوں اللہ کی آیات کا انکار کر رہے ہو حالانکہ تم خود ان کا مشاہدہ کر رہے ہو؟ اہل کتاب! کیوں حق کو باطل کا رنگ چڑھا کر مشتبہ بناتے ہو؟ کیوں جانتے بوجھتے حق کو چھپاتے ہو؟ اہل کتاب میں سے ایک گروہ کہتا ہے کہ اس نبی کے ماننے والوں پر جو کچھ نازل ہوا ہے' اس پر صبح ایمان لاؤ اور شام کو اس سے انکار کر دو۔ شاید اس ترکیب سے یہ لوگ اپنے ایمان سے پھر جائیں۔ نیز یہ لوگ آپس میں کہتے ہیں کہ اپنے مذہب والے کے سوا کسی کی بات نہ مانو' اے نبی ان سے کہہ دو کہ "اصل میں ہدایت تو اللہ کی ہدایت ہے اور یہ اسی کی دین ہے کہ کسی کو وہی کچھ دے دیا جائے جو کبھی تم کو دیا گیا تھا۔ یا یہ کہ دوسروں کو تمہارے رب کے حضور پیش کرنے کے لئے تمہارے خلاف قوی حجت مل جائے۔" اے نبی! ان سے کہو کہ "فضل و شرف اللہ کے اختیار میں ہے' جسے چاہئے عطا فرمائے۔ وہ وسیع النظر ہے اور سب کچھ جانتا ہے۔ اپنی رحمت کے لئے جس کو چاہتا ہے مخصوص کر لیتا ہے اور اس کا فضل بہت بڑا ہے۔"

اہل کتاب مسلمانوں کے خلاف جو عداوت دلوں میں چھپائے ہوئے تھے وہ نظریاتی عداوت تھی۔ وہ ہرگز نہیں چاہتے تھے کہ یہ امت کبھی راہ راست پر آئے۔ وہ اس بات کو پسند نہیں کرتے کہ یہ امت پوری قوت پورے یقین اور پورے اعتماد کے ساتھ اپنے نظریات کی طرف لوٹ آئے۔ اس لئے ان کی تمام جدوجہد اس نکتے پر مرکوز ہے کہ وہ اسلامی نظام حیات سے اس امت کو ادھر ادھر کر دیں اور اسے اس صراط مستقیم سے پھیر دیں۔ وَدَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يُضِلُّوْنَكُمْ ؕ .... "اہل کتاب میں سے ایک گروہ یہ چاہتا ہے کہ کسی طرح تمہیں راہ راست سے ہٹادے۔" یہ ان کی نفسانی خواہش ہے۔ ان

کے دلوں کی تہہ میں یہ جذبہ چھپا ہوا ہے۔ ان کی ہر سازش کے پیچھے ان کی یہ خواہش کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ ان کی ہر تدبیر' ہر بحث' ہر مناظرہ اور ہر تلبیس کے پس پشت یہی خواہش کارفرما ہے اور ان لوگوں کی یہ خواہش محض دشمنی' ہوائے نفس اور شرارت پر مبنی ہے۔ اس لئے وہ صریح گمراہی ہے۔ اس لئے کہ سچائی' بھلائی اور ہدایت و خیر خواہی کے جذبات کے نتیجے میں اس قسم کی خواہش کبھی پیدا نہیں ہوتی اور وہ جب بھی اہل اسلام کی گمراہی کے لئے کوئی جدوجہد شروع کرتے ہیں' اسی وقت وہ خود گمراہ ہو جاتے ہیں۔

وَ مَا يُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَ مَا يَشْعُرُوْنَ .... "حالانکہ وہ اپنے سوا کسی کو گمراہی میں نہیں ڈال رہے مگر انہیں اس کا شعور نہیں ہے۔" اور مسلمان جب تک اسلام پر قائم رہیں گے وہ اپنے ان دشمنوں کی تدابیر کا اچھی طرح مقابلہ کر سکیں گے۔ اہل کفران کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے۔ اللہ تعالیٰ ہر وقت ان کو سازشیوں کی سازشوں سے بچانے والا ہے اور جب تک وہ پکے مسلمان ہیں ان کی تدابیر کو اللہ خود ان کے خلاف الٹاتا ہے۔

اس مقام پر اللہ تعالیٰ اہل کتاب کو سختی سے جھنجوڑتا ہے کہ وہ اپنے اس مشکوک اور کمزور موقف پر ذرا نظر ثانی کریں۔

يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَ اَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ۞ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَلْبِسُوْنَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَ تَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ

"اے اہل کتاب! کیوں اللہ کی آیات کا انکار کرتے ہو حالانکہ تم خود ان کا مشاہدہ کر رہے ہو؟ اے اہل کتاب! کیوں حق کو باطل کا رنگ چڑھا کر مشتبہ بناتے ہو؟ کیوں جانتے بوجھتے حق کو چھپاتے ہو۔"

حقیقت یہ ہے کہ اس وقت بھی اور آج بھی اہل کتاب حق اور سچائی کا مشاہدہ کر رہے ہیں اور واضح طور پر سمجھتے ہیں کہ یہ دین' دین حق ہے۔ ان میں سے بعض تو وہ تھے جو اچھی طرح جانتے تھے کہ ان کی کتابوں میں رسول آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی بابت بشارتیں اور اشارے موجود ہیں' ان میں سے پھر بعض ایسے تھے جو ان اشارات کے بارے میں بالصراحت بتلاتے تھے۔ اور کچھ لوگ ایسے تھے کہ وہ ان بشارتوں کی بناء پر شہادت حق بھی دیتے تھے لیکن بعض دوسرے ایسے تھے کہ وہ اگرچہ اپنی کتابوں سے کچھ نہ جانتے تھے لیکن حضور اکرم ﷺ اور آپ کے دین کو دیکھ کر واضح طور یقین کئے ہوئے تھے کہ یہ دین' دین حق ہے لیکن اس کے باوجود یہ لوگ کفر پر کمربستہ تھے۔ اس لئے نہیں کہ دلیل و برہان میں کوئی کمی تھی بلکہ محض خواہشات نفسانیہ' ذاتی مصلحتوں اور لوگوں کو گمراہ کرنے کی خاطر وہ کفر کر رہے تھے۔ قرآن کریم اہل کتاب کہہ کر انہیں کو پکارتا ہے۔ اس لئے کہ ان کی اس صفت اہل کتاب کا یہ لازمی تقاضا ہے کہ وہ اللہ کی اس کتاب جدید کو سینہ سے لگائیں۔

ایک بار پھر اللہ انہیں پکارتے ہیں تاکہ انہیں ان کے اس فعل پر اچھا شرمندہ کریں کہ وہ حق پر باطل کا رنگ چڑھاتے ہیں' حق کو چھپاتے ہیں' حق کو ضائع کرتے ہیں' اور وہ یہ سب کچھ جانتے بوجھتے کرتے ہیں اور یہ ان کا سوچا سمجھا منصوبہ ہے۔ یہ ان کی نہایت ہی مکروہ اور قبیح حرکت ...... اللہ تعالیٰ نے اس وقت کے اہل کتاب پر جو تنقید فرمائی ہے' اس پر وہ اس وقت سے لے کر آج تک قائم ہیں۔ پوری اسلامی تاریخ میں ان کا کردار یہی رہا ہے۔ سب سے پہلے اس کا آغاز یہودیوں نے کیا اور یہودیوں کے بعد یہی منصب صلیبیوں نے سنبھال لیا۔ اور اس پوری تاریخ میں انہوں نے اسلامی علوم میں بعض ایسے افکار شامل کر دیئے ہیں کہ ان کی تنقیح صرف قرآن کریم کے ذریعہ ہی ممکن ہے۔ انہوں نے تمام اسلامی علوم میں حق کے ساتھ باطل ملا دیا ہے۔ ہاں ان کی ان خفیہ سازشوں سے صرف قرآن کریم محفوظ رہا ہے اس لئے کہ اس کی حفاظت کی ذمہ داری خود اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ لی ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی یہ ذمہ داری تھی کہ وہ ابدالآباد تک وہ قرآن

کریم کو محفوظ رکھے گا۔ انہوں نے تاریخ اسلامی میں دسیسہ کاری کی۔ اسلامی تاریخ کے واقعات میں ملاوٹ کی۔ انہوں نے ذخیرہ احادیث کے اندر احادیث گھڑ کر جعلی احادیث ملانے کی کوشش کی۔ اللہ تعالیٰ کا فضل تھا کہ اس نے اس کے مقابلے کیلئے بعض رجال ایسے پیدا کئے جنہوں نے اس میدان میں داد تحقیق دی اور اس ذخیرہ احادیث کو ان کی جعل سازی سے پاک کیا۔ الایہ کہ انسان کی محدود جدوجہد کی وجہ سے کوئی چیز بچ گئی۔ لیکن وہ شاذ اور محدود ہوگئی۔ انہوں نے قرآن کے ذخیرہ تفاسیر میں بھی ملمع کاری کی اور اسے ایک ایسا صحرائے بے آب وگیاہ بنادیا جس میں سے انسان کیلئے نشان راہ پانا مشکل ہوگیا۔ انہوں نے اسلام کے بعض لیڈروں میں اپنے آدمی داخل کئے۔ سینکڑوں لوگ ایسے تھے جو مسلمان بن کر اسلام کے خلاف سازشیں کرتے رہے۔ اور آج دیکھئے کہ مستشرقین اور مستشرقین کے شاگردوں کی شکل میں ایک فوج ہے جو ان ممالک کے اندر نہایت ہی حساس فکری مقامات پر قبضہ کئے ہوئے ہے۔ جن کے باشندے کہتے ہیں کہ ہم مسلمان ہیں۔ اور بیسیوں ایسے لیڈر ہیں جو یہودیوں اور صلیبیوں نے ہمارے لئے لیڈر بنائے ہیں تاکہ وہ اس نام نہاد عالم اسلام میں یہودیوں اور صلیبیوں کے مفادات کا تحفظ کریں۔ اس لئے کہ اسلام کے یہ دشمن اگر کھل کر آئیں تو وہ یہ مفادات حاصل نہیں کر سکتے۔

یہ سازشیں مسلسل روبعمل ہیں۔ اور آج بھی اگر ہم ان سے کوئی جائے پناہ حاصل کر سکتے ہیں تو وہ صرف قرآن کے دامن میں حاصل کر سکتے ہیں' جو محفوظ ترین کتاب ہے۔ اس قرآن کو اگر ہم اس تاریخی کشمکش میں اپنا مشیر بنالیں تو ہمیں محفوظ پناہ مل سکتی ہے۔

قرآن کریم یہاں ان لوگوں کی بعض کوششوں کو بھی ریکارڈ پر لاتا ہے جو انہوں نے جماعت مسلمہ کو اپنے دین سے بدراہ کرنے کی خاطر کی تھیں۔ اور یہ کام وہ حسب عادت نہایت ہی مکارانہ اور ذلیلانہ طریقہ کار کے مطابق کرتے تھے۔ فرماتے ہیں۔

وَ قَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اٰمِنُوْا بِالَّذِیْۤ اُنْزِلَ عَلَى الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَجْهَ النَّهَارِ وَ اكْفُرُوْۤا اٰخِرَهٗ لَعَلَّهُمْ یَرْجِعُوْنَ ۚۖ وَ لَا تُؤْمِنُوْۤا اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِیْنَكُمْ ؕ

"اہل کتاب کا ایک گروہ کہتا ہے کہ اس نبی کے ماننے والوں پر جو کچھ نازل ہوا ہے' اس پر صبح ایمان لاؤ اور شام کو اس سے انکار کردو۔ شاید اس ترکیب سے یہ لوگ اپنے ایمان سے پھر جائیں۔ نیز یہ لوگ آپس میں کہتے ہیں کہ اپنے مذہب والے کے سوا کسی کی بات نہ مانو۔"

کس قدر مکارانہ طریق کار ہے یہ؟ جیسا کہ ہم نے کہا یہ لوگ ایسے اوچھے ہتھیار بھی استعمال کرتے تھے۔ اس لئے کہ اسلام لانا اور پھر اسلام سے پھر جانا' اس لئے ممکن تھا کہ بعض کمزور طبع لوگ' کم فہم لوگ' ایسے لوگ جو زیادہ ثابت قدم نہ تھے۔ اور جنہیں اپنے دین کی حقیقت کا بھی اچھی طرح علم نہ تھا' وہ متاثر ہوسکتے تھے۔ ان کے دل میں خلجان پیدا ہوسکتا تھا۔ خصوصاً عرب جو امی تھے۔ اور ان میں یہ بات عام تھی کہ دین اور کتب سماوی کے بارے میں اہل کتاب ان سے زیادہ معلومات رکھتے ہیں۔ جب انہوں نے دیکھا کہ وہ ایمان لاتے ہیں اور پھر مرتد ہوجاتے ہیں تو ظاہر ہے کہ انہوں نے اس دین میں کوئی خفیہ کمزوری اور نقص پکڑ لیا ہوگا۔ یا یہ کہ خود یہ مرتد ہونے والے شک میں پڑ گئے کہ وہ فیصلہ نہیں کرپاتے کہ وہ کدھر جائیں اور ان کو کسی حال میں ثبات حاصل نہیں ہے۔ اور اہل کتاب کی جانب سے یہ دھوکہ آج تک جاری ہے۔ ہاں اس کی شکل وصورت اور طور طریقے حالات زمانہ کی مطابقت سے بدل گئے ہیں۔

ہاں آج کے دور میں مسلمانوں کے دشمنوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ وہ اب ان پرانی سازشوں پر ملمع کاری کرکے اہل اسلام کو دھوکہ نہیں دے سکتے۔ اس لئے تمام دشمنوں نے اسی پرانے اسلوب پر کچھ جدید طریقے وضع کئے ہیں اور ان کے ذریعے سے مسلمانوں کو گمراہ کرتے ہیں۔ اب ان لوگوں نے عالم اسلام میں اساتذہ' فلاسفہ' محققین اور پی ایچ ڈی کے حاملین کی ایک جرار فوج چھوڑی ہوئی ہے۔ یہ

سب لوگ درپردہ ان دشمنان اسلام کے ایجنٹ ہیں۔ پھر ان دشمنوں نے ہمارے مصنفین 'شعراء' فن کاروں اور صحافیوں کو بھی اپنے جال میں پھنسا رکھا ہے۔ ان لوگوں کے نام مسلمانوں جیسے ہیں۔ اس لئے کہ وہ مسلمانوں کی اولاد ہیں اور بعض تو مسلمانوں کے علماء ہیں۔

ایجنٹ کی اس فوج کا کام صرف یہ ہے کہ یہ مسلمانوں کے دل و دماغ میں شکوک و شبہات پھیلائے۔ اور اس کے لئے مختلف اسلوب اختیار کرے۔ کبھی وہ علم و ادب کے دروازے سے کام کرتے ہیں۔ کبھی وہ صحافی اور فنکار کے روپ میں کام کرتے ہیں۔ یہ لوگ اسلامی اصول حیات کی قدروقیمت کم کرنے' اسلامی نظریۂ حیات کا مزاح اڑانے' اسلامی اصولوں اور نصوص میں ایسی تاویلیں کرنے میں لگے ہوتے ہیں' جن تاویلیوں کے وہ نصوص متحمل ہی نہیں ہوسکتے۔ یہ مسلسل یہ ڈھول پیٹتے ہیں کہ اسلامی نظام حیات رجعت پسندی ہے۔ اور وہ ہروقت اس تبلیغ میں لگے رہتے ہیں کہ اسلامی نظریۂ حیات کو ترک کردیا جائے۔ اور اسے انسان کی عملی زندگی سے خارج کردیا جائے۔ گویا کہ انسانی زندگی کو اس سے خطرہ ہے اور اس کو زندگی سے خطرہ ہے۔ یہ لوگ مسلمانوں کے شعور اور طرز عمل میں ایسے تصورات اور ایسی روایات اور ایسے اصول کو رواج دیتے ہیں جو اسلامی تصورات کے متضاد ہوتے ہیں اور جن سے اسلامی طرز عمل اور اسلامی روایات کی خوب شکست و ریخت ہوتی ہے۔ یہ ایجنٹ ان جدید جاہلی تصورات اور روایات کو مسلمانوں کے نظریات میں جس قدر جاذب بناتے ہیں۔ اسی قدر ایمانی روایات کا حلیہ بگاڑتے ہیں۔ مزید بر آں یہ کہ یہ ایجنٹ جنسیت کو ہرقید و بند سے آزاد کرتے ہیں۔ اور اساسوں کو بنیاد سے اکھاڑتے ہیں۔ جن کے اوپر پاکیزہ اخلاق استوار ہوتے ہیں اور معاشرے کو اس گندگی کے اندر گراتے ہیں جسے وہ جگہ جگہ پھیلاتے پھرتے ہیں اور سب سے بڑی بات یہ کہ یہ ایجنٹ اسلامی تاریخ کا بعینہ اسی طرح حلیہ بگاڑتے ہیں' جس طرح انہوں نے اپنی کتب سماوی کا حلیہ بگاڑا اور اس میں تحریف کی۔

لیکن آپ حیران ہوں گے کہ یہ ایجنٹ ان سب کارناموں کے ساتھ پھر بھی مسلمان ہیں! کیوں مسلمان نہ ہوں' کیا ان کے نام مسلمانوں کی طرح نہیں؟ اور وہ ان ناموں کے ساتھ ساتھ روز دن چڑھے اپنے اسلام کا اظہار و اقرار بھی کرتے ہیں لیکن وہ مذکورہ بالا کارنامے کرکے گویا شام کے وقت وہ اسلام کا انکار کردیتے ہیں۔ اور اس طرح یہ ایجنٹ وہ کردار ادا کرتے ہیں جو پرانے اہل کتاب کرتے تھے۔ فرق صرف یہ ہے کہ دور قدیم اور آج کے ماحول اور طریقہ واردات میں قدرے فرق ہے۔

اہل کتاب آپس میں طے کرتے تھے کہ تم لوگ دن چڑھے اپنے اسلام کا اظہار کرو اور شام تک یہ اعلان کردو کہ ہم نے اسلام کا اعلان کیا تھا لیکن اب ہم نے اسے ترک کردیا ہے۔ تاکہ اس طرح مسلمانوں کے دلوں میں شک پیدا ہوجائے اور وہ بھی اسلام سے لوٹ آئیں۔ لیکن یہ بات راز میں رہے۔ اس کا افشا بھی نہ کرو اور اپنے دین والوں کے علاوہ کسی اور کو اس راز سے خبردار بھی نہ کرو۔

وَلَا تُؤْمِنُوٓا اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِيْنَكُمْ .... "اپنے مذہب والے کے سوا کسی کی بات پر اعتماد نہ کرو۔"

فعل "اسلام" کا صلہ اگر لام متعدی ہو تو اس کا مفہوم اعتبار اور اعتماد کرنا ہوتا ہے۔ یعنی اعتماد صرف اس پر کرو جو تمہارے دین کو ماننے والا ہے۔ مسلمانوں کے مقابلے میں صرف اپنے ہم مذہب لوگوں کے سامنے اپنے بھید کھولو۔ مسلمانوں کو ان باتوں کی خبر نہ ہونے پائے۔

آج صیہونیت اور صلیبیت کے ساتھیوں کا طرز بھی یہی ہے۔ یہ لوگ آپس میں ایک بات باہم مفاہمت کرلیتے ہیں۔ وہ یہ کہ اسلامی نظریۂ حیات کے بسمل کو موقعہ پاتے ہی قتل کردیا جائے۔ اس کیلئے ایسے مواقع شاید پھر میسر نہ ہوں۔ اور ہوسکتا ہے کہ صیہونیوں اور ملیبیوں اور ان کے ایجنٹوں کے درمیان اس وقت جو مکمل مفاہمت پائی جاتی ہے وہ پھر نہ پائی جائے۔ لیکن یہ مفاہمت ایک طرف ایک (کلائنٹ) موکل (Client) کے درمیان ہے اور دوسری جانب اس کے ایجنٹ کے درمیان ہے۔ اس میں یہ موکلین بعض اوقات

اپنے ایجنٹ کو اپنے اصل راز بھی بتا دیتے ہیں۔ جبکہ انہیں یقین ہو کہ وہ ان رازوں کو افشاء نہ کریں گے۔ اس کے بعد وہ اپنے آپ کو دوسرے روپ میں ظاہر کرتے ہیں اور اس رنگ میں نہیں آتے جس میں انہوں نے ان سازشوں کو تیار کیا ہوتا ہے۔ ان ایجنٹوں کیلئے پہلے سے حالات درست کر کے ماحول کو ان کے لئے سازگار بنا دیا جاتا ہے۔ تمام سہولتیں انہیں مہیا کر دی جاتی ہیں۔ اور جو لوگ اس کرۂ ارض پر اس دین کی حقیقت کو سمجھتے ہیں وہ نظروں سے اوجھل ہیں یا معاشروں میں دھتکارے ہوئے ہیں۔ اس لئے وہ کہتے ہیں وَلَا تُؤْمِنُوٓا اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِيْنَكُمْ .... "اور اپنا راز انہی لوگوں کو بتاؤ جو تمہارے دین کے ماننے والے ہیں۔"

یہاں آکر اللہ تعالیٰ اپنے نبی کو اس طرف متوجہ کرتے ہیں کہ آپ اعلان کر دیں کہ ہدایت تو صرف اللہ وحدہ کی ہدایت ہے۔ اور جو شخص اللہ کی ہدایت کو تسلیم نہیں کرتا وہ کبھی بھی ہدایت نہیں پا سکتا۔ کسی صورت میں بھی اور کسی طریقے سے بھی قُلْ اِنَّ الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ "اصل ہدایت تو اللہ کی ہدایت ہے۔"

اور یہ فیصلہ ان کے اس قول کے جواب میں آتا ہے۔ "اہل ایمان پر جو کچھ نازل کیا گیا ہے اس پر صبح ایمان لاؤ' اور شام کے وقت اس کا انکار کر دو' امید ہے کہ اس طرح وہ پلٹ آئیں۔" مسلمانوں کو ان کے اس مذموم منصوبے کے ردعمل آنے کے خلاف متنبہ کیا جاتا ہے۔ اگر ایسا ہوا تو گویا وہ دوبارہ کفر میں داخل ہو جائیں گے۔ اس لئے ہدایت صرف اللہ کی ہدایت ہے۔ اور یہ مکار جو تدابیر اختیار کرتے ہیں وہ خالص کفر ہے۔ اور یہ فیصلہ بیچ میں آتا ہے۔ یعنی بطور جملہ معترضہ' ابھی تک اہل کتاب کی بات ختم نہیں ہوتی۔

اَنْ يُّؤْتٰٓى اَحَدٌ مِّثْلَ مَآ اُوْتِيْتُمْ اَوْ يُحَآجُّوْكُمْ عِنْدَ رَبِّكُمْ ؕ

"اور یہ کہ کوئی دوسرا اس بات کو جان لے جو تمہیں معلوم ہے اور وہ تمہارے رب کے ہاں تمہارے خلاف حجت پیش کریں۔"

یہ فقرہ ان کے اس موقف پر دلیل ہے کہ "اور اپنا راز انہیں لوگوں کو بتاؤ جو تمہارے دین کے ماننے والے ہیں۔ یہ لوگ اس بغض اور حسد میں مبتلا تھے کہ کسی دوسرے شخص کو بھی اسی طرح نبوت اور کتاب سے سرفراز کیا جائے جس طرح تم نبوت اور کتاب سے سرفراز ہوئے تھے' انہیں یہ خوف دامنگیر تھا کہ اہل اسلام کو دین اور اسلام پر اطمینان نصیب نہ ہو جائے۔ اور وہ اس حقیقت پر مطلع نہ ہو جائیں جسے اہل کتاب نے چھپا رکھا ہے۔ حالانکہ وہ اسے جانتے ہیں اور نیز قیامت کے دن مسلمان اللہ کے ہاں اسے اہل کتاب کے پاس بطور حجت پیش نہ کر دیں۔ ان لوگوں کا خیال یہ تھا گویا مسلمانوں کی اس قولی شہادت کے سواء اللہ انہیں سزا نہ دے گا۔ یہ ایک ایسا تصور ہے جو اللہ کی ذات و صفات پر صحیح ایمان کے نتیجے میں انہیں پیدا ہوتا۔ نہ اس قسم کے تصورات ان لوگوں کے ذہنوں میں پیدا ہو سکتے ہیں جن کو اللہ کی ذات اور صفات' نبوت اور رسالت' اور ایمان پر مبنی افکار و فرائض کا صحیح علم حاصل ہو۔"

چنانچہ اللہ تعالیٰ اہل ایمان اور رسول کریم ﷺ کو اس بات کی طرف متوجہ فرماتے ہیں کہ انہیں آگاہ کر دیں کہ یہ تو اللہ کا فضل و کرم ہے اور یہ اس کی مرضی ہے کہ وہ کسی قوم کو کتاب و نبوت سے نواز دے۔

قُلْ اِنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ ۚ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۚ يَّخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ۞

"اے نبی ان سے کہو کہ "فضل و شرف اللہ کے اختیار میں ہے' جسے چاہے عطا فرمائے۔" وہ وسیع النظر ہے اور سب کچھ جانتا ہے' اپنی رحمت کے لئے جس کو چاہتا ہے مخصوص کر لیتا ہے اور اس کا فضل بہت بڑا ہے۔"

اللہ کی مشیئت نے اب فیصلہ کر لیا ہے کہ اب نبوت اور رسالت سے اہل کتاب کے سوا دوسرے لوگوں کو سرفراز کر دے'

خصوصاً جبکہ وہ اللہ کے ساتھ کئے ہوئے مواعید کی مخالفت کرتے چلے جائیں' جو ان کے باپ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جو ذمہ داری ان پر ڈالی تھی اسے بھی توڑتے چلے جائیں' جو امانت اللہ نے ان کے سپرد کی تھی اس میں خیانت کرتے چلے جائیں' وہ اپنی کتاب کے احکام اور اپنے دین کے قوانین کو توڑتے چلے جائیں۔ اور پھر اگر کوئی انہیں دعوت دے کہ آؤ کتاب اللہ کے مطابق فیصلے کریں تو وہ انکار کر دیں' اور ان کے ان سب بڑے کارناموں کی وجہ سے انسانوں کی قیادت اور راہنمائی اسلامی نظام زندگی' اسلامی قانون اور قرآن کریم کی راہنمائی سے آزاد ہو جائے' یہی وہ مقام تھا جس پر اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل اور اہل کتاب سے قیادت واپس لے لی اور اس بار امانت کو امت مسلمہ کے سپرد کر دیا۔ اور یہ اس امت پر اللہ تعالیٰ کا ایک بہت بڑا فضل اور احسان تھا۔ وَ اللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۷۳﴾ .... "اللہ بڑی وسعت والا ہے اور خبردار ہے۔" اور يَّخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ "............... "وہ جسے چاہتا ہے اپنی رحمت کیلئے مخصوص کر لیتا ہے۔" اس کا فضل و کرم بڑا وسیع ہے۔ اور اس کا علم بھی بڑا وسیع ہے' اس لئے وہ اس جگہ کو بھی خوب جانتا ہے۔ جہاں اس کی رحمت نازل ہو۔ وَ اللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ.............. "اس کا فضل بہت بڑا ہے۔" اور کسی قوم کیلئے اس سے بڑا اور کیا فضل ہو سکتا ہے کہ وہ اسے ایک کتاب کی صورت میں ہدایت دے۔ اور کسی کو وہ اس سے بڑی کیا خیر و برکت عطا کرے کہ ان کو رسالت عطا کر دے اور اس سے بڑی رحمت کا اور کیا مظاہرہ ہو سکتا ہے کہ وہ کسی قوم میں رسول بھیج دے۔

جب اہل اسلام نے یہ سنا تو ان کے دل میں اللہ کے فضل و کرم کا احساس پیدا ہوا۔ انہوں نے یہ جان لیا کہ انہیں ایک عظیم ڈیوٹی کیلئے منتخب کیا گیا ہے۔ اور انہیں مخصوص طور پر یہ اعزاز دیا گیا ہے۔ تو انہوں نے اپنے اس اعزاز کو بڑی دلچسپی کے ساتھ قائم رکھا۔ بڑی مضبوطی اور عزم سے اسے تھام لیا۔ بڑی قوت اور ثابت قدمی سے اس کی مدافعت کی۔ وہ حاسدوں اور مکاروں کی سازشوں کے مقابلے میں چوکنے ہو گئے۔ قرآن کریم کا یہی انداز تربیت تھا۔ اس لئے کہ یہ حکیم و دانا کا کلام ہے۔ اور آج بھی امت مسلمہ کیلئے یہی عنصر موجب اصلاح و تربیت ہو سکتا ہے۔ ہر زمانے اور ہر نسل میں۔

○........○........○........○........○

آگے بڑھ کر مزید حالات اہل کتاب کی بابت بیان ہوتے ہیں۔ بتایا جاتا ہے کہ ان کے طرز عمل میں کس قدر تناقص پایا جاتا ہے۔ اور قطعی طور پر بتا دیا جاتا ہے کہ مسلمانوں کا دین یعنی اسلام کن صحیح اور سچے اقدار پر استوار ہوا ہے۔ اس سلسلے میں بتایا جاتا ہے کہ اہل کتاب کے اندر باہمی معاملات میں کس قسم کے لوگ پائے جاتے ہیں۔

وَمِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مَنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِقِنْطَارٍ يُّؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِدِيْنَارٍ لَّا يُؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ اِلَّا مَا دُمْتَ عَلَيْهِ قَآئِمًا ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَيْسَ عَلَيْنَا فِى الْاُمِّيّٖنَ سَبِيْلٌ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۷۵﴾ بَلٰى مَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ وَاتَّقٰى فَاِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۷۶﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَاَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيْلًا

أُولَٰٓئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِى ٱلْءَاخِرَةِ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ ٱللَّهُ وَلَا يَنظُرُ إِلَيْهِمْ يَوْمَ ٱلْقِيَٰمَةِ وَلَا يُزَكِّيهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿٧٧﴾

"اہل کتاب میں سے کوئی تو ایسا ہے کہ اگر تم اس کے اعتماد پر مال و دولت کا ایک ڈھیر بھی دے دو تو وہ تمہارا مال تمہیں ادا کردے گا' اور کسی کا حال یہ ہے کہ اگر تم ایک دینار کے معاملے میں بھی اس پر بھروسہ کرو تو وہ ادا نہ کرے گا الا یہ کہ تم اس کے سرپر سوار ہو جاؤ۔ ان کی اس اخلاقی حالت کا سبب یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں۔ "امیوں کے معاملے میں ہم پر کوئی مواخذہ نہیں ہے۔" اور یہ بات وہ محض جھوٹ گھڑ کر اللہ کی طرف منسوب کرتے ہیں' حالانکہ انہیں معلوم ہے کہ اللہ نے ایسی کوئی بات نہیں فرمائی ہے۔ آخر کیوں ان سے بازپرس نہ ہوگی؟ جو بھی اپنے عہد کو پورا کرے گا اور برائی سے بچ کر رہے گا وہ اللہ کا محبوب بنے گا کیونکہ پرہیز گار لوگ اللہ کو پسند ہیں۔ رہے وہ لوگ جو اللہ کے عہد اور اپنی قسموں کو تھوڑی قیمت پر بیچ ڈالتے ہیں' تو ان کیلئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں' اللہ قیامت کے روز نہ ان سے بات کرے گا۔ نہ ان کی طرف دیکھے گا اور نہ انہیں پاک کرے گا۔ بلکہ ان کیلئے تو سخت دردناک سزا ہے۔"

جو اہل کتاب اس وقت اہل ایمان اور جماعت مسلمہ کے مقابلے میں اترے ہوئے تھے اور بحث و تکرار کر رہے تھے' ان کے بارے میں قرآن کریم کا تبصرہ نہایت ہی منصفانہ سچائی پر مبنی ہے۔ اور ان کے اوصاف بے کم و کاست بیان کئے گئے ہیں۔ اور جو اوصاف بیان کئے گئے ہیں' آج تک اہل کتاب کا یہی حال ہے۔ غرض اہل کتاب اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ جو دشمنی کر رہے تھے مسلمانوں اور اسلام کے خلاف وہ جس قدر گہری اور مذموم سازشیں کر رہے تھے اور جماعت مسلمہ اور دین اسلام کے خلاف وہ جس قدر شدید شر و فساد کیلئے ہر وقت تیار رہتے تھے۔ ان سب حقائق کے باوجود ان میں سے جو لوگ اچھے تھے نہ ان کے فضائل چھپاتا ہے اور نہ ان کے بیان میں کمی کرتا ہے۔ حالانکہ اس وقت وہ اہل اسلام کے ساتھ مقابلہ و مناظرہ کی حالت میں تھے۔ اس لئے قرآن مجید یہ کہتا ہے کہ اہل کتاب میں سے بعض لوگ ایسے ہیں کہ اگر ان کے ہاتھ میں لوگوں کے عظیم حقوق بھی آجائیں تو وہ انہیں تلف نہیں کرتے۔

وَمِنْ أَهْلِ ٱلْكِتَٰبِ مَنْ إِن تَأْمَنْهُ بِقِنطَارٍ يُؤَدِّهِۦٓ إِلَيْكَ .... "اہل کتاب میں سے کوئی تو ایسا ہے کہ اگر تم اس کے اعتماد پر مال و دولت کا ایک ڈھیر بھی دے دو تو وہ تمہارا مال تمہیں ادا کرے گا۔" لیکن ان میں سے ایسے لوگ بھی ہیں جو پرلے درجے کے خائن' لالچی' اور طمع کار ہیں جو کسی کا حق نہیں لوٹاتے۔ اگرچہ وہ بہت ہی حقیر کیوں نہ ہو' ہاں صرف وہ اس صورت میں ادا کریں گے کہ تم ان سے اصرار سے مطالبہ کرو اور ان کے سر پر سوار ہو جاؤ اور یہ حق مارنے کیلئے وہ ایک ایسا فلسفہ بھی گھڑتے ہیں جس میں سوچے سمجھے اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں۔

وَمِنْهُم مَّنْ إِن تَأْمَنْهُ بِدِينَارٍ لَّا يُؤَدِّهِۦٓ إِلَيْكَ إِلَّا مَا دُمْتَ عَلَيْهِ قَآئِمًا ۗ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوا۟ لَيْسَ عَلَيْنَا فِى ٱلْأُمِّيِّـۧنَ سَبِيلٌ وَيَقُولُونَ عَلَى ٱللَّهِ ٱلْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُونَ اور کسی کا حال یہ ہے کہ اگر تم ایک دینار کے معاملے میں بھی اس پر بھروسہ کرو تو وہ ادا نہ کرے گا الا یہ کہ تم اس کے سرپر سوار ہو جاؤ' ان کی اس اخلاقی حالت کا سبب یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں "امیوں (غیر یہودیوں کے معاملے میں) ہم پر کوئی مواخذہ نہیں ہے۔" اور یہ بات وہ محض جھوٹ گھڑ کر اللہ کی طرف منسوب کرتے ہیں حالانکہ انہیں معلوم ہے کہ اللہ نے کوئی ایسی بات نہیں فرمائی۔"

اور یہ بھی یہودیوں کی ایک خاص صفت ہے۔ صرف یہودی یہ بات کہتے تھے۔ ان کے ہاں اخلاق و آداب کے مختلف پیمانے تھے۔ امانت و دیانت تو صرف ایک یہودی اور دوسری یہودی کے درمیان معاملات کیلئے ہے۔ رہے غیر یہودی جنہیں وہ امی کہتے تھے۔ اور ان سے مراد ان کی صرف عربوں ہی سے تھی۔ تو ان کے اموال تلف کرنے اور ناجائز ہڑپ کر جانے میں وہ کوئی حرج محسوس نہ کرتے تھے۔ وہ بڑی بے تکلفی کے ساتھ غیر یہود کے ساتھ دھوکہ 'فریب' طمع کاری' استحصال جیسے جرائم کا ارتکاب کرتے تھے۔ بغیر کسی جھجک کے وہ ان کے خلاف اوچھے ہتھیار استعمال کرتے اور مذموم حرکات کا ارتکاب کرتے۔

تعجب کی بات تو یہ ہے کہ ان کا کہنا یہ تھا کہ ان کا خدا اور ان کا دین انہیں اس بات کا حکم دیتا ہے۔ لیکن دراصل وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ وہ جھوٹ بولتے ہیں۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کسی فحش بات کا حکم نہیں دیتا۔ مثلاً یہ کہ وہ کسی گروہ کو حکم دے کہ وہ دوسرے گروہ کی دولت ناجائز اور ظالمانہ طور پر کھائے۔ اور اس کے ساتھ اپنے کئے ہوئے معاہدوں کی پابندی نہ کرے۔ اور اپنی ذمہ داریاں پوری نہ کرے۔ اور ان کو بغیر کسی کراہیت اور حرج کے نقصان پہنچاتا چلا جائے۔ لیکن وہ یہودی تھے۔ وہ یہودی جنہوں نے انسانوں کے ساتھ عداوت اور دشمنی کو اپنا دین بنا رکھا ہے۔ وَ يَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَ هُمْ يَعْلَمُوْنَ ....

......."وہ اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں' جانتے ہوئے۔"

اس مقام پر قرآن کریم انسانوں کے لئے اپنا واحد اخلاقی اصول طے کر دیتا ہے۔ یہ اس کا واحد اخلاقی معیار ہے۔ اور وہ اپنے اخلاقی نقطہ نظر کو خدا اور خدا خوفی کے ساتھ جوڑ دیتا ہے۔

بَلٰى مَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ وَ اتَّقٰى فَاِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ. اِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَ اَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيْلًا اُولٰٓئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِى الْاٰخِرَةِ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَلَا يَنْظُرُ اِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ

"آخر کیوں ان سے باز پرس نہ ہوگی؟ جو بھی اپنے عہد کو پورا کرے گا اور برائی سے بچ کر رہے گا وہ اللہ کا محبوب بنے گا' کیونکہ پرہیز گار لوگ اللہ کو پسند ہیں۔ رہے وہ لوگ جو اللہ کے عہد اور اپنی قسموں کو تھوڑی قیمت پر بیچ ڈالتے ہیں' تو ان کیلئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں' اللہ قیامت کے روز نہ ان سے بات کرے گا نہ ان کی طرف دیکھے گا اور نہ انہیں پاک کرے گا۔ بلکہ ان کیلئے تو سخت دردناک سزا ہے۔"

غرض یہ ایک اخلاقی اصول ہے' جس نے اس کا لحاظ رکھا' اللہ کے عہد کا پاس کرتے ہوئے خدا خوفی کا شعور رکھتے ہوئے تو اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ محبت رکھے گا' اسے اعزاز اور اکرام نصیب ہوگا۔ اور جس نے اللہ کے ساتھ کئے ہوئے' اس عہد کو دنیا کے ثمن قلیل کی وجہ سے توڑا' چاہے اسے یہ پوری دنیا کیوں نہ مل رہی ہو' تو اس کیلئے آخرت میں کوئی حصہ نہ ہوگا' اس لئے کہ یہ پوری دنیا بھی آخرت کے مقابلے میں متاع قلیل ہے۔ اللہ کے ہاں ایسا شخص ہرگز مقبول نہ ہوگا اور ایسے شخص کیلئے کوئی نرمی نہ ہوگی۔ نہ وہ صاف ہوگا اور نہ پاک' اس کی حالت یہ ہوگی وہ عذاب الیم میں مبتلا ہوگا۔

یہاں اشارتاً" یہ کہا گیا ہے کہ وفائے عہد کا تعلق خدا خوفی کے ساتھ ہے۔ اس لئے وفائے عہد میں کسی حالت میں بھی فرق نہیں آنا چاہئے۔ وہ دوست کے ساتھ ہو یا دشمن کے ساتھ ہو۔ وفائے عہد مصلحتوں پر موقوف نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ وفائے عہد کا معاملہ اللہ کے

ساتھ مربوط ہوتا ہے۔ اس کا ربط اور تعلق اس شخص کے ساتھ نہیں ہوتا جس کے ساتھ عہد کیا گیا ہو۔

یہ ہے اسلام کا اخلاقی نقطہ نظر' ایفائے عہد میں بھی اور عمومی اجتماعی اخلاق میں بھی۔ یہ کہ اجتماعی معاملات میں سب سے پہلا معاملہ اللہ کے ساتھ ہوتا ہے۔ ایک مسلمان سب سے پہلے ذات باری کو پیش نظر رکھتا ہے۔ وہ سب سے پہلے اللہ کے غضب سے ڈرتا ہے۔ اور اس کی رضامندی کا طلبگار ہوتا ہے۔ اسلام میں اخلاقیات کی تہہ میں محرک مصلحت نہیں ہوتی' نہ اس کا سبب اجتماعی عادت ہوتی ہے اور نہ اخلاقیات سوسائٹی کے دباؤ کی وجہ سے رائج ہوتے ہیں' اس لئے کہ سوسائٹی کبھی راہ راست پر ہوتی ہے اور کبھی گمراہ ہوتی ہے۔ اور اس میں گمراہ کن اقدار اور پیمانے رائج ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا اخلاقیات کیلئے ایسے ناقابل تغیر پیمانے وضع ہونا ضروری ہیں جن کے مطابق ایک فرد بھی اپنے اخلاق کو ناپے اور ایک سوسائٹی بھی ان کے معیار کو سمجھے۔ اور ناقابل تغیر ہونے اور مستحکم ہونے کے ساتھ ساتھ ان اخلاقی پیمانوں کا تعلق عالم بالا سے بھی ہو' جہاں سے یہ پیمانے لئے جائیں۔ یہ پیمانے اور ان کا ماخذ انسانی اصطلاحات اور انسانی ضروریات سے بالا ہو' اس لئے کہ انسانی ضروریات اور مصلحتیں روز بدلتی رہتی ہیں۔ لہٰذا یہ ضروری ہے کہ یہ اصول اور پیمانے ذات باری سے اخذ کئے جائیں اور وہ اس طرح کہ سب سے پہلے معلوم کیا جائے کہ اللہ کی رضا کیا ہے۔ اس کی رضامندی پیش نظر ہو' اس کا خوف دل میں ہو' یوں اسلام انسانیت کو ایک ایسا اخلاقی نظام دیتا ہے جس کی جڑیں اس دنیا کے بجائے عالم بالا میں ہوتی ہیں اور وہ اسی روشن مستحکم اور سربلند سرچشمے سے اپنے اخلاقی پیمانے اور اخلاقی اصول اخذ کرتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جو لوگ وعدہ خلافی کرتے ہیں اور امانت میں بددیانتی کرتے ہیں ان کے بارے میں فرماتے ہیں کہ وہ اللہ کے عہد اور اپنی قسموں کو تھوڑی قیمت پر بیچ ڈالتے ہیں۔ لہٰذا عہد و پیمان کا پہلا تعلق اللہ اور بندے کے درمیان ہے اور بعد میں اس کا تعلق ایک انسان اور دوسرے انسان کے ساتھ ہے۔ لہٰذا جہاں تک اللہ کا تعلق ہے ایسے عہد شکن لوگوں کیلئے آخرت میں کوئی حصہ نہ ہو گا۔ ہاں اگر وہ اس عہد شکنی اور قسم توڑنے کے عوض کوئی دنیاوی مفاد حاصل کرنا چاہتے ہیں تو یہ مصالح دنیا آخرت کے مقابلے میں کوئی قیمت نہیں رکھتے۔ اس لئے ان کی اس عہد شکنی کی وجہ سے روز آخرت میں ان کے لئے کوئی جزا نہ ہوگی اس لئے کہ انہوں نے لوگوں کے ساتھ جو عہد کیا تھا وہ اللہ کے ساتھ بھی عہد تھا۔

یہاں اس بات کی وضاحت بھی ہوتی ہے کہ فنی اعتبار سے قرآن کریم کا اسلوب تعبیر نہایت ہی مصورانہ ہے۔ یہاں اس حقیقت کہ اللہ ان پر کوئی توجہ نہ کرے گا اور ان کی کوئی رورعایت نہ ہوگی۔ یوں ادا کیا گیا ہے کہ اللہ نہ ان کے ساتھ بات کرے گا' نہ ان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھے گا اور نہ ہی انہیں پاک کرے گا۔ یہ وہ انداز ہے جو بالعموم نظرانداز کرنے کیلئے عام لوگوں کے درمیان متعارف ہے۔ قرآن کریم نے اس تصویری انداز بیان کو اس لئے اختیار کیا ہے تاکہ قیامت کے دن ان کی رسوائی کی ایک زندہ اور وجدانی تصویر آنکھوں کے سامنے آجائے۔ یہ زندہ اور وجدانی پیرایہ اظہار محض تجریدی انداز بیان سے زیادہ دلنشین ہوتا ہے۔ یہ قرآن کریم کا پیرایہ اظہار' بہت ہی خوبصورت اور حسین و جمیل۔

O........O........O........O........O

ذرا آگے بڑھئے اور دیکھئے اہل کتاب کے کچھ اور نمونے' ایک نمونہ ان گمراہ کنندگان کا ہے جو خود کتاب اللہ کو لوگوں کی گمراہی کیلئے بطور ہتھیار استعمال کرتے ہیں۔ وہ اپنی زبان کو موڑ کر چالاکی سے بات کرتے ہیں اور مراد کچھ سے کچھ بن جاتی ہے۔ وہ آیات کتاب میں ایسی توڑ پھوڑ کرتے ہیں جس سے مراد اور مفہوم ان کی متعینہ خواہشات کے مطابق ہو جاتا ہے اور اس توڑ اور پھوڑ کے بدلے میں ایک حقیر فیس وصول کرتے ہیں۔ اور اس فیس کا تعلق اس دنیا کے حقیر مقاصد کے ساتھ ہوتا ہے اور وہ جو تحریفات اور تاویلات کرتے تھے

منجملہ ان میں سے وہ عقائد تھے' جو انہوں نے حضرت مسیح اور حضرت مریم کے بارے میں گھڑ رکھے تھے۔ اور وہ عقائد اہل کنیسہ اور حکام وقت کے مفید مطلب تھے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆ وَاِنَّ مِنْهُمْ لَفَرِيْقًا يَّلْوٗنَ اَلْسِنَتَهُمْ بِالْكِتٰبِ لِتَحْسَبُوْهُ مِنَ الْكِتٰبِ وَمَا هُوَ مِنَ الْكِتٰبِ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَمَا هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۷۸﴾ مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ﴿۷۹﴾ وَلَا يَاْمُرَكُمْ اَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓئِكَةَ وَالنَّبِيّٖنَ اَرْبَابًا ؕ اَيَاْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ اِذْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۸۰﴾

۸ ع۹ ۱۶

"اور ان میں سے کچھ لوگ ایسے ہیں جو کتاب پڑھتے ہوئے اسی طرح زبان کا الٹ پھیر کرتے ہیں کہ تم سمجھو کہ جو کچھ وہ پڑھ رہے ہیں وہ کتاب ہی کی عبارت ہے۔ حالانکہ وہ کتاب کی عبارت نہیں ہوتی۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ جو کچھ پڑھ رہے ہیں یہ خدا کی طرف سے ہے' حالانکہ وہ خدا کی طرف سے نہیں ہوتا' وہ جان بوجھ کر جھوٹی بات اللہ کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ کسی انسان کا کام یہ نہیں ہے کہ اللہ تو اس کو کتاب اور حکم اور نبوت عطاء فرمائے اور وہ لوگوں سے کہے کہ اللہ کے بجائے تم میرے بندے بن جاؤ' وہ تو یہی کہے گا کہ سچے ربانی بنو' جیسا کہ اس کتاب کی تعلیم کا تقاضا ہے جسے تم پڑھتے اور پڑھاتے ہو۔ وہ تم سے ہرگز یہ نہ کہے گا کہ فرشتوں کو یا پیغمبروں کو اپنا رب بنالو کیا یہ ممکن ہے کہ ایک نبی تمہیں کفر کا حکم دے جبکہ تم مسلم ہو۔"

جب اہل دین اخلاقی فساد میں مبتلا ہو جاتے ہیں تو وہ دینی حقائق میں ملاوٹ کا ذریعہ بنتے ہیں اور یہ کام وہ علمائے دین کے لباس میں کرتے ہیں۔ قرآن کریم یہاں اہل کتاب میں ایک گروہ کے جو حالات بیان کر رہا ہے' ان سے ہم اپنے زمانے میں اچھی طرح واقف ہیں' اہل کتاب نصوص کتاب میں تاویلات کرتے تھے۔ زبان کے ہیر پھیر سے مفہوم تبدیل کرتے تھے۔ اور اس طرح وہ طے شدہ نتائج اخذ کرتے تھے۔ اور ان کا یقین یہ ہوتا تھا کہ کتاب اللہ کا مفہوم یہی ہے۔ اور یہی مفہوم ارادۂ الٰہی کا اظہار ہے۔ حالانکہ جو نتائج وہ اخذ کرتے تھے وہ اصول دین سے متصادم تھے۔ ان کو یہ اعتماد تھا اکثر سامعین ان پڑھ اور بے علم ہیں اور وہ ان کے خود ساختہ نتائج اور آیات کے حقیقی مفہوم کے درمیان کوئی فرق اور امتیاز نہیں کر سکتے۔ حالانکہ ان کے نتائج جعلی اور جھوٹے تھے اور ان نتائج تک وہ آیات کو زبردستی کھینچ کر لاتے تھے۔

اہل کتاب کا یہ نمونہ ہمارے دور میں بعض دینی راہنماؤں میں پوری طرح پایا جاتا ہے' جو بطور ظلم اپنے آپ کو دین کے حوالے سے پیش کرتے ہیں۔ جو دین میں تحریف کرتے ہیں۔ اور جو اپنی تمام خواہشات نفسانیہ میں اسے مزاح بناتے ہیں۔ وہ اپنے کندھوں پر

آیات الہٰی کو اٹھائے ہوئے پھرتے ہیں اور جہاں بھی انہیں کوئی مفاد نظر آئے اسی کی بھینٹ چڑھاتے ہیں' جہاں بھی اس دنیا کے مفادات میں سے کوئی مفاد ملتا ہے۔ ان آیات کے ذریعہ وہ اسے حاصل کرتے ہیں۔ غرض آیات الہٰی کو اٹھائے یہ لوگ اغراض دنیاوی کے پیچھے دوڑتے رہتے ہیں۔ اور پھر ان آیات کی گردن توڑ کر اور انہیں خوب مروڑ کر ان مفادات پر فٹ کرتے ہیں۔ وہ الفاظ کے مفہوم میں ایسی تبدیلی کرتے ہیں کہ وہ ان کے مقاصد اور رجحانات سے موافق ہو جائیں۔ اگرچہ یہ رجحانات دین کے اساسی تصورات اور اصول دین کے ساتھ متصادم ہوں۔ وہ اس میدان میں سہ گانہ جدوجہد کرتے ہیں اور ہر قسم کی بہتان تراشی کا ارتکاب کرتے ہیں اور ہروقت اسی گھات میں بیٹھے رہتے ہیں کہ کسی طرح قرآن مجید کے کسی لفظ کا وہ مفہوم نکال لیں جو ان کی خواہشات نفسانیہ کے مطابق ہو' اور جس سے یہ رائج اور صاید خواہشات ثابت ہو جائیں۔

وَيَقُولُونَ هُوَ مِنْ عِندِ اللَّهِ وَمَا هُوَ مِنْ عِندِ اللَّهِ وَيَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُونَ

”وہ کہتے ہیں کہ جو کچھ ہم پڑھ رہے ہیں یہ خدا کی طرف سے ہے حالانکہ وہ خدا کی طرف سے نہیں ہوتا' وہ جان بوجھ کر جھوٹ بات اللہ کی طرف منسوب کر دیتے ہیں۔“

قرآن کریم نے اہل کتاب کے ایک گروہ کا جو حال بیان کیا ہے' یہ ایک ایسی بیماری ہے جو اہل کتاب کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ اس میں ہر وہ قوم مبتلا ہو جاتی ہے جو دین کا کام ایسے لوگوں کے سپرد کر دیتی ہے جو نام نہاد دیندار ہوتے ہیں اور جن کے نزدیک دین اس قدر ارزاں ہو جاتا ہے کہ اس کی قدر و قیمت ان کی اغراض دنیاوی میں سے ادنیٰ غرض کے برابر بھی نہیں ہوتی۔ اور ان کی ذمہ داری کی حس اس قدر ماند پڑ جاتی ہے کہ ان کا دل اللہ پر جھوٹ باندھنے سے بھی نہیں چوکتا۔ وہ لوگوں اور بندوں کی چاپلوسی کی خاطر آیات الہٰی میں تبدیلی کرتے ہیں۔ اور اپنی غیر صحت مند خواہشات کو پورا کرنے کیلئے وہ اللہ کے دین میں تحریف کا ارتکاب کرتے ہیں۔ گویا اللہ تعالیٰ جماعت مسلمہ کو اس خطرناک مقام سے آگاہ کرتے ہیں جہاں قدم پھسل جاتے ہیں اور جس کی وجہ سے بنی اسرائیل نے اپنے مقام قیادت کو کھو دیا۔

ان آیات کے مجموعی تاثر کے مطابق معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل کا یہ گروہ کتاب اللہ میں سے مجازی تعبیرات پر مشتمل بعض جملے تلاش کر لیتا تھا' اور پھر ان آیات کو توڑ مروڑ کر ان سے ایسے معانی نکال لیتا تھا' جن کی متحمل وہ آیات نہ تھیں۔ یوں وہ اپنی تاویلات کے ذریعہ عجیب معانی نکالتے اور ان پڑھ لوگوں کو یہ تاثر دیتے کہ یہ مفاہم کتاب اللہ کے مدلولات ہیں۔ حالانکہ وہ خود ان کے ایجاد کردہ تھے۔ وہ لوگوں سے کہتے یہ ہے وہ بات جو اللہ نے کہی ہے۔ حالانکہ اللہ نے ایسی کوئی بات نہیں کہی ہوتی۔ ان تاویلات سے ان کا مقصد اور ہدف یہ تھا کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی الوہیت ثابت کر دیں' اس کے ساتھ روح القدس کی الوہیت ثابت کر دیں۔ یعنی تین اقنوم باپ' بیٹا اور روح القدس' تین بھی اور ایک بھی اور وہ ایک اللہ ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ ان کے اس تصور سے پاک ہے۔ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے ایسے کلمات روایت کرتے تھے جو ان کے ان مزعومات کی تائید کرتے تھے۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان کی ان تحریفات اور تاویلات کی تردید کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ اللہ اپنے ایک بندے کو نبوت کیلئے چن لے اور اس کو یہ عظیم منصب عطا کر دے اور وہ بندہ لوگوں کو حکم دے کہ وہ اسے الہ بنالیں۔ فرشتوں کو الہ بنالیں۔ یہ تو ممکن ہی نہیں ہے۔

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ﴿۷۹﴾ وَلَا يَاْمُرَكُمْ اَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓئِكَةَ وَالنَّبِيّٖنَ اَرْبَابًا ؕ اَيَاْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ اِذْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۸۰﴾

"کسی انسان کا یہ کام نہیں ہے کہ اللہ اس کو کتاب اور حکم اور نبوت عطا فرمائے اور وہ لوگوں سے کہے کہ اللہ کے بجائے تم لوگوں کے بندے بن جاؤ۔ وہ تو یہی کہے گا کہ سچے ربانی بنو' جیسا کہ اسی کتاب کی تعلیم کا تقاضا ہے جسے تم پڑھتے ہو اور پڑھاتے ہو۔ وہ تم سے ہرگز یہ نہ کہے گا کہ فرشتوں کو یا پیغمبروں کو اپنا رب بنالو' کیا یہ ممکن ہے کہ ایک نبی تمہیں کفر کا حکم دے جبکہ تم مسلم ہو۔"

حضرت نبی ﷺ یہ یقین دہانی کراتے ہیں کہ وہ عبد ہیں اور اللہ تعالیٰ وحدہ لاشریک رب ہے اور تمام لوگوں کا فرض ہے کہ وہ صرف اس کی عبادت کریں۔ اس لئے اس بات کا امکان ہی نہیں ہے کہ وہ اپنے لئے مقام ربوبیت کو مخصوص کریں۔ کیونکہ مقام الوہیت کا تو پھر تقاضا یہ ہے کہ لوگ عبادت بھی نبی کی کریں۔ اس لئے کوئی نبی لوگوں کو یہ نہیں کہہ سکتا **كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ** .... "تم اللہ کے سوا میرے بندے بن جاؤ۔" نبی کی دعوت تو یہ ہوتی کہ **كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ** .... "تم سب ربانی بن جاؤ۔" اس لئے کہ جس کتاب کا تم نے علم حاصل کیا ہے۔ اس کی تعلیمات یہی ہیں۔ اور جس کی تم تدریس کرتے ہو اس کا تقاضا بھی یہی ہے۔ اس لئے علم کتاب اور تدریس کتاب کا یہ تقاضا ہے کہ صرف اللہ کی بندگی ہو' پس نبی کیسے لوگوں کو یہ حکم دے سکتا ہے کہ وہ نبیوں اور فرشتوں کو اللہ کے علاوہ رب بنالیں۔ اس لئے کہ نبی اسلام لانے کے بعد لوگوں کو کفر کا حکم کیسے دے سکتا ہے۔ حالانکہ اس کا مقام یہ ہے کہ وہ لوگوں کو ہدایت دے۔ یہ نہیں ہے کہ وہ لوگوں کو ہدایت پانے کے بعد گمراہ کردے۔ وہ اسلام کی طرف ان کا قائد ہے' اسلام سے نکالنے کیلئے ان کا قائد نہیں ہے۔

اس فارمولے کے مطابق وہ بات محال ہو جاتی ہے۔ جو لوگ عیسیٰ ﷺ کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ نیز ان کا یہ جھوٹ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ یہ آیات و روایات جو وہ پڑھتے ہیں اللہ اور رسول کی طرف سے ہو سکتے ہیں۔ اس لئے یہ لوگ جو بات کہتے ہیں اس کی حیثیت ہی ختم ہو جاتی ہے۔ اور وہ دعویٰ بے اعتبار ہو جاتا ہے جسے وہ بار بار اسلامی صفوف میں شبہات اور خلجان پیدا کرنے کیلئے دہراتے ہیں۔ اس لئے کہ قرآن کریم نے انہیں اچھی طرح ننگا کر کے رکھدیا ہے۔ اور وہ جماعت مسلمہ کے سامنے کھلے میدان میں ننگے ہو گئے ہیں۔

ان لوگوں کی مثال بھی بعینہ ان اہل کتاب جیسی ہے جو علم دین کے مدعی ہیں جیسا کہ ہم اس سے پہلے بالتفصیل بیان کر آئے ہیں۔ یہ لوگ اس بات کے مستحق ہیں کہ قرآن کریم کی یہ آیات ان کے سامنے پیش کی جائیں۔ کیونکہ یہ لوگ بھی نصوص قرآنی کو توڑ موڑ کر پیش کرتے ہیں اور انہوں نے بھی اللہ کے سوا کئی ارباب قائم کر رکھے ہیں اور وہ ہر وقت اس تاک میں لگے رہتے ہیں کہ آیات کو توڑ موڑ کر ان سے وہ مفاہیم نکالیں' جو خود انہوں نے گھڑ رکھے ہیں۔

وَيَقُوْلُوْنَ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۚ وَمَا هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ

"وہ کہتے ہیں کہ جو کچھ ہم پڑھ رہے ہیں یہ خدا کی طرف سے ہے حالانکہ وہ خدا کی طرف سے نہیں ہوتا' وہ جان بوجھ کر جھوٹ بات اللہ کی طرف منسوب کر دیتے ہیں۔"

○........○........○........○........○

اس کے بعد تمام رسولوں اور رسالتوں کے قافلہ ایمانی کے درمیان' اللہ تعالیٰ کے ساتھ کئے ہوئے عہد کے حوالے سے' ایک مضبوط رابطے کا ذکر کیا جاتا ہے۔ اس معاہدے کے مطابق وہ تمام لوگ اس عہد کو توڑنے والے اور فاسق قرار پاتے ہیں جو نبی آخر الزمان حضرت محمد ﷺ پر ایمان نہیں لاتے۔ یہ لوگ نہ صرف یہ کہ اللہ سے کئے ہوئے عہد سے منحرف ہوتے ہیں' بلکہ وہ اس پوری کائنات کے ناموس اعظم سے بھی خارج ہو جاتے ہیں۔

وَ إِذْ أَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّ حِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَ لَتَنْصُرُنَّهٗ ؕ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَ اَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِيْ ؕ قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا ؕ قَالَ فَاشْهَدُوْا وَ اَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۸۱﴾ فَمَنْ تَوَلّٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۸۲﴾ اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ وَ لَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ طَوْعًا وَّ كَرْهًا وَّ اِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ ﴿۸۳﴾

"یاد کرو جب اللہ نے پیغمبروں سے عہد لیا تھا کہ "آج ہم نے تمہیں کتاب و حکمت و دانش سے نوازا ہے' کل اگر کوئی دوسرا رسول تمہارے پاس' اسی تعلیم کی تصدیق کرتا ہوا آئے جو پہلے سے تمہارے پاس موجود ہے' تو تم کو اس پر ایمان لانا ہوگا اور اس کی مدد کرنی ہوگی۔" یہ ارشاد فرما کر اللہ نے پوچھا "کیا تم اس کا اقرار کرتے ہو' اور اس پر میری طرف سے عہد کی بھاری ذمہ داری اٹھاتے ہو۔" انہوں نے کہا ہاں ہم اقرار کرتے ہیں' اللہ نے فرمایا۔ "اچھا تو گواہ رہو اور میں بھی تمہارے ساتھ گواہ ہوں' اس کے بعد جو اپنے عہد سے پھر جائے وہی فاسق ہے۔"

اللہ تعالیٰ نے ایک نہایت ہی خوفناک اور پختہ معاہدہ لیا' اور اس معاہدے پر وہ خود گواہ بن گیا اور اپنے تمام نبیوں کو اس پر گواہ بنایا۔ یہ معاہدہ تمام رسولوں سے لیا گیا تھا۔ مضمون یہ تھا کہ جس رسول کو بھی کتاب و حکمت دی جائے اس کا یہ فرض ہوگا کہ وہ اس کے بعد میں آنیوالے رسول کی تائید کرے اگر بعد میں آنیوالا رسول خود اس کی تعلیمات کی توثیق و تائید کر رہا ہو۔ تائید کے ساتھ سابقہ رسول کا یہ بھی فرض ہے کہ اس کی نصرت کرے اور اس کی شریعت کی اطاعت کرے۔ یہ معاہدہ اللہ اور ہر رسول کے مابین طے پایا تھا۔

قرآن کریم نے تاریخ انسانی کے طویل ترین دفتر کو لپیٹ کر تمام رسولوں کو ایک جگہ جمع کر دیا۔ وہ ایک ہی منظر میں سب جمع ہیں۔ اللہ جل شانہ ان کو ایک ساتھ خطاب فرما رہے ہیں تو کیا انہوں نے اس معاہدے کا اقرار کر لیا اور اللہ کی بھاری ذمہ داری کو قبول کر لیا۔ اللہ تعالیٰ سوال فرماتے ہیں قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَ اَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِيْ ؕ .... "کیا تم اس

کا اقرار کرتے ہو اور اس پر میری طرف سے عہد کی بھاری ذمہ داری اٹھاتے ہو؟" وہ سب جواب دیتے ہیں۔ قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا .... "ہم اقرار کرتے ہیں۔" .... پس رب ذوالجلال اس معاہدے پر خود بھی گواہ بن جاتے ہیں اور ان کو بھی گواہ بناتے ہیں۔ قَالَ فَاشْهَدُوْا وَ اَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ .... "فرمایا تو گواہ رہو اور میں بھی تمہارے ساتھ گواہ ہوں۔"

یہ ایک عظیم اور دہشت انگیز منظر' جس کی تصویر کشی قرآن کریم کرتا ہے' اسے دیکھ کر دل کانپ اٹھتے ہیں' اس منظر میں تمام انبیاء ورسل جناب باری میں کھڑے نظر آتے ہیں۔ نظر آتا ہے کہ معززین ارض کا یہ قافلہ ایک دوسرے سے جڑا ہوا' ایک دوسرے پر تکیہ لگائے کھڑا ہے اور سب کے سب لوگ عالم بالا کی ربانی ہدایات کے منتظر ہیں۔ یہ سب اسی حقیقت اور سچائی کی نمائندگی کرتے ہیں جو ایک ہے۔ اور جس کے بارے میں اللہ کا حکم یہ ہے کہ پوری انسانیت کی تعمیر اس کی اساس پر کی جائے جس میں کوئی انحراف نہ ہو' کوئی دوئی نہ ہو' کوئی تعارض نہ ہو اور کوئی تصادم نہ ہو' اس سچائی کے نمائندے وہ لوگ ہیں جو لوگوں میں سے برگزیدہ ہیں۔ ان میں سے ہر برگزیدہ اس سچائی کو دوسرے برگزیدہ کی طرف منتقل کرتا چلا آیا ہے۔ اس طرح وہ اپنی ذات کو بھی آنیوالے مختار کی طرف منتقل کرتا چلا جاتا ہے۔ اس لیے کہ نبی کی ذات اس کی اپنی نہیں ہوتی ہے۔ نہ اس مہم میں اس کا کوئی ذاتی مقصد یا خواہش ہوتی ہے' نہ نبی ذاتی اور شخصی عزت و تکریم کے لئے کام کرتا ہے۔ وہ تو بندۂ مختار ہوتا ہے اور ایک ذمہ دار مبلغ ہوتا ہے۔ یہ ذات باری ہی ہے جو مختلف ادوار میں مختلف نسلوں کی طرف دعوت اسلامی کو منتقل کرتا چلا آتا ہے اور مختاران رسل اسے جس طرح چاہتے ہیں چلاتے ہیں۔

دین کے اس تصور اور اللہ کے ساتھ اس سلسلے میں طے ہونے والے اس عہد کے نتیجے میں اللہ کا دین خالص ہو جاتا ہے۔ اس میں کوئی ذاتی عصبیت نہیں داخل ہوتی۔ یعنی رسول کی ذات بھی اس پر اثر انداز نہیں ہوتی۔ رسول کی قوم کا اس دین پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اس کے پیروکاروں اور ان کے خاندانوں کے مخفی اثرات سے بھی یہ دین پاک و صاف ہوتا ہے۔ اسی طرح متبعین کی ذات اور ان کی قوم قبیلے کی شخصیت کا بھی اس پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ دین اسلام ایک ایسا دین ہے جس میں ہر معاملہ اللہ کے اختیار میں ہوتا ہے' دین بھی ایک اور اللہ بھی ایک' اور اسی ایک دین کو لیکر انسانیت کی تاریخ میں قافلہ رسل بھی ایک' جو نہایت ہی معزز اور ممتاز قافلہ ہے۔

اس حقیقت کے سائے میں ہمارے سامنے اب وہ لوگ کھل کر آجاتے ہیں جو اپنے آپ کو اہل کتاب کہتے ہیں۔ یہ لوگ نبی آخر الزماں پر ایمان نہیں لاتے۔ اور پیچھے رہ جاتے ہیں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ وہ اپنے دین کی وجہ سے ایمان نہیں لاتے' حالانکہ خود ان کے دین کا تقاضا یہ ہے کہ وہ نبی آخر الزماں پر ایمان لائیں اور اس کی نصرت اور تائید کیلئے اٹھیں۔ لیکن یہ لوگ محض تعصب کی وجہ سے یہ ایمان نہیں لاتے۔ اس لئے کہ یہ دین ان تک جن رسولوں نے پہنچایا ہے ان سے تو اللہ تعالیٰ نے نہایت ہی پختہ عہد لیا ہے اور انہوں نے اپنے رب کے ساتھ یہ عہد باندھا ہے اور یہ عہد بر سرعام اور اجلاس میں طے پایا ہے کہ وہ نبی آخر الزمان کی نصرت کریں گے۔ اس لئے جو لوگ نبی آخر الزمانؐ پر ایمان نہیں لاتے وہ در حقیقت فاسق اور بدکار ہیں۔ وہ عہد شکن ہیں۔ وہ اس کائنات کے اسی نظام کو توڑنے والے ہیں۔ جو اپنے رب کا فرماں بردار ہے' جو ناموس قدرت کا مطیع فرمان ہے۔ اس لئے کہ یہی ناموس اس پوری کائنات کا مدبر ہے۔ اور یہ پوری کائنات اس کی مشیئت پر چل رہی ہے۔

فَمَنْ تَوَلّٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۸۲﴾ اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ وَ لَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ طَوْعًا وَّ كَرْهًا وَّ اِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ

"اس کے بعد جو شخص اپنے عہد سے پھر جائے وہی فاسق ہے۔ کیا یہ لوگ اللہ کی اطاعت کا طریقہ چھوڑ کر کوئی اور دین چاہتے ہیں؟ حالانکہ زمین و آسمان کی ساری چیزیں چارو ناچار اللہ ہی کی تابع فرمان (مسلم) ہیں اور اسی کی طرف سب کو پلٹنا ہے۔"

حقیقت ہے کہ نبی آخر الزمان کی اطاعت سے صرف فاسق ہی منہ موڑ سکتا ہے اور اللہ کے اس دین سے وہی شخص منہ موڑ سکتا ہو جو شاذ اور مردود ہو' وہ اس کائنات کے پورے طبیعی نظام میں بھی شاذ ہو گا اور مردود ہو گا اور اس پوری تابع فرمان کائنات میں بھی فساد کنندہ' نافرمان اور شر انگیز ہو گا۔

اللہ کا دین ایک ہے' سب رسول ایک دین لیکر آئے' سب نے اس پر پختہ معاہدہ کیا۔ اللہ کا عہد بھی ایک ہے' جس کے فریق تمام رسول ہیں۔ لہذا اس دین پر ایمان لانا' اس رسول پر ایمان لانا اور اتباع کرنا' اس رسول کی نصرت کرنا اور اسلامی نظام قائم کرنا اور تمام دوسرے نظاموں کا مقابلہ کرنا دراصل اس عہد کی وفاداری ہے۔ اس لئے جس شخص نے بھی دین اسلام سے روگردانی کی گویا اس نے اللہ کے تمام ادیان سے منہ موڑا۔ اور اس نے اللہ کے عام عہدوں کو توڑا ...... اس لئے کہ وہ اسلام جس سے اس کرۂ ارض پہ اسلامی نظام زندگی کا قیام مطلوب ہو' اس کا اتباع اور اس کے ساتھ خلوص کا مظاہرہ' دراصل اس پوری کائنات کا اسلام اور ناموس قدرت ہے۔ یہ اسلام اس کائنات کے ہر زندہ چرند و پرند کا اسلام ہے۔

یہ ہے کہ اسلام اور سر تسلیم ختم کرنے کی ایک گہری شکل' ایک ایسی شکل و صورت جو تکوینی ہے جو انسان کے شعور پر اثر انداز ہوتی ہے۔ جس سے انسانی ضمیر میں خدا خوفی پیدا ہوتی ہے۔ ایک عظیم قانون قدرت کی صورت جو قہار و جبار ہے۔ جو تمام کائنات کی مردہ اور زندہ چیزوں کو ایک ہی سنت الٰہیہ اور شریعت الٰہیہ کے تابع فرمان بناتی ہے۔ اور جس کے مطابق دونوں کا مآل اور انجام ایک ہے۔ یہ ہے اسلام وَإِلَيْهِ يُرْجَعُونَ ...... "اور سب نے اسی کی طرف پلٹ کر جانا ہے۔" ...... لہذا یہ سب چیزیں آخر کار لازماً اسی اللہ کی طرف پلٹ کر جائیں گی جو سب کو گھیرے ہوئے ہے' سب کا مدبر ہے اور نہایت ہی جلال و عظمت کا مالک ہے اور اس انجام سے کوئی راہ فرار نہیں ہے۔

اگر انسان اپنی کامیابی اور سعادت چاہتا ہے' اگر وہ راحت اور اطمینان چاہتا ہے' اگر وہ اطمینان قلب اور صلاح حال چاہتا ہے تو اس کے لئے ماسوائے اس کے کوئی اور راہ نہیں ہے کہ اسلامی نظام زندگی کی طرف رجوع کرے۔ اپنی ذات میں بھی' اپنے نظام زندگی میں بھی اور اپنے اجتماعی نظام میں بھی تاکہ اس کی زندگی اس پوری کائنات کے نظام کے ساتھ ہم آہنگ ہو جائے۔ اور اسے فطرت کائنات کے بر خلاف اپنے لئے کوئی علیحدہ نظام زندگی وضع کرنے کی ضرورت پیش نہ آئے۔ اس لئے کہ اس کا یہ خود ساختہ نظام' نظام کائنات کے ساتھ متضاد ہو گا جو اللہ تعالیٰ کا تخلیق کردہ ہے۔ اور یہ انسان طوعاً و کرہاً اس کے مطابق زندگی بسر کرنے کا پابند ہے۔ وہ نظام جو اس کے تصور اور شعور میں ہے' جو اس کی عملی زندگی اور اس کے باہمی تعلقات میں ہے' جو اس کی تمام جدوجہد اور سرگرمیوں میں ہے۔ جب اس کائناتی نظام کے ساتھ ہم آہنگ ہو جائے گا' تو یہ ہم آہنگی اس کے اور اس پوری کائنات کی عظیم قوتوں کے درمیان ایک تعاون پیدا کر دے گی۔ اور ان کے درمیان کوئی تصادم نہ ہو گا۔ اس لئے کہ جب انسان کائناتی قوتوں کے ساتھ تصادم کی راہ لیتا ہے تو وہ پاش پاش ہو جاتا ہے اور ختم ہو جاتا ہے۔ اور اگر اس کا وجود نہیں مٹتا تو وہ کم از کم فریضہ خلافت فی الارض کی ادائیگی کے قابل نہیں رہتا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کیلئے تیار کیا ہے۔ اور اگر وہ قوانین قدرت اور کائناتی اصولوں کے ساتھ ہم آہنگ ہو جاتا' جو خود اسے اور اس کے ارد گرد پھیلی ہوئی پوری کائنات کو کنٹرول کرتے ہیں۔ خواہ زندہ ہوں یا غیر زندہ تو اس صورت میں وہ تمام اسرار کائنات کا راز دان ہو گا' وہ اس کی قوتوں کو مسخر کر دے گا ان سے مفاد حاصل کرے گا اور اسی طرح وہ راحت' آرام اور سکون حاصل کرے گا۔ اور بے چینی' قلق اور خوف سے نجات ملے

گی۔ مثلاً کائنات کا مفاد یوں ہو گا کہ ایک کائناتی قوت کو جلانے اور تخریب کیلئے استعمال کرنے کے بجائے وہ اسے کھانے پکانے گرمی حاصل کرنے کیلئے استعمال کرے گا۔ اور اس سے روشنی حاصل کرے گا۔

انسانی مزاج اپنی اصلیت کے اعتبار سے ان کائناتی قوتوں اور نوامیس کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔ انسان کا وجدان اسی طرح اپنے رب کی اطاعت چاہتا ہے جس طرح اس کائنات کی پوری زندہ اور غیر زندہ اشیاء اس کے سامنے سربسجود ہیں۔ جب ایک انسان قوانین فطرت کے خلاف راہ اختیار کرتا ہے۔ تو وہ صرف نظام فطرت کے خلاف ہی نہیں جاتا بلکہ وہ خود ان نوامیس طبیعت کے بھی خلاف جاتا ہے جو اس کے نفس کے اندر موجود اور جاری و ساری ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہر وقت پریشان' شکستہ' حیران اور بے چین نظر آتا ہے۔ اور اس کی زندگی اسی طرح برباد ہو جاتی ہے جس طرح آج کا ایک گمراہ' بے راہ رو انسان کی زندگی ہوتی ہے۔ اور جسے ہم ہر طرف دیکھ رہے ہیں۔ حالانکہ آج کے انسان نے علمی میدان میں بڑی بڑی فتوحات حاصل کی ہیں اور وہ مادی ترقی کے بام عروج پر ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس وقت انسانیت ایک انتہائی تلخ روحانی خلا میں جتلا ہے۔ اور یہ ایک ایسا خلا ہے جسے فطرت انسان بھول نہیں سکتی۔ یعنی انسانیت ذوق یقین سے محروم ہے۔ اس کی زندگی اسلامی نظام سے محروم ہے' اس لئے کہ یہی نظام زندگی' ان مادی ترقیات اور قوانین فطرت کے درمیان توازن پیدا کر سکتا ہے جس میں انسان کی تگ و دو اور قوانین فطرت کی رفتار ایک سمت میں ہو جاتی ہے۔

انسانیت اس وقت جھلس دینے والی تپتی دھوپ میں سرگرداں ہے اور وہ اسلامی نظام زندگی کی گھنی چھاؤں سے محروم ہے جس میں وہ خوشگوار زندگی بسر کر سکے۔ اور اس شر و فساد سے اسے نجات ملے جس میں وہ محض اس لئے گرفتار ہے کہ وہ اسلام کے شاہراہ مستقیم اور جادۂ مانوس سے ہٹ گئی ہے۔ اس دشوار گزار راستے پر حیرانی و پریشانی' قلق و بے چینی اور اضطراب و گمراہی کے سوا کچھ نہیں ملتا۔ وہ ہر وقت بھوک' افلاس اور روحانی خلا اور محرومیت کے احساس کا شکار ہے۔ اور اسی صورت حال سے اس نے فرار کا یہی ایک راستہ پایا ہے کہ وہ حشیش' چرس اور ہیروئن جیسی منکرات اور تباہ کن ذرائع اختیار کئے ہوئے ہے۔ یہ جنونی سرعت' احمقانہ حرکات' اخلاقی بے راہ روی سے اس خلا کو بھرنا چاہتی ہے۔ لیکن ناکام ہے۔ اور یہ صورت حال باوجود اس بے پناہ مادی ترقی' بے حد و حساب پیداوار اور ساری زندگی کی بے پناہ سہولیات کے باوجود جوں کی توں ہے۔ بلکہ اس قلق اور اس حیرانی اور ان پریشانیوں میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ اور اسی نسبت سے ہو رہا ہے جس نسبت سے مادی ترقی میں اضافہ ہوتا ہے اور دنیاوی سہولیات اور آسائشوں میں اضافہ ہوتا ہے۔

یہ خوفناک اور تلخ خلا' انسانیت کو ایک خوفناک بھوت کی طرف بھگا رہا ہے۔ لیکن بھاگتے بھاگتے وہ جس مقام تک بھی پہنچتی ہے' ہر جگہ یہ بھوت اس کے پیچھے کھڑا نظر آتا ہے' آج جو شخص بھی مغرب کے مالدار اور ترقی یافتہ دور میں جاتا ہے اسکے احساسات میں پہلا تاثر یہ بیٹھتا ہے کہ یہ سب لوگ بھاگ رہے ہیں۔ کوئی بھوت ہے جو انہیں بھگا رہا ہے اور اس سے بھاگ رہے ہیں' بلکہ وہ خود اپنی ذات اور اپنے سائے سے بھاگ رہے ہیں۔ اس شخص پر بہت جلد یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ ان مادی ترقیات نے اور حسی لذتیت نے ان لوگوں کو گندے کیچڑ میں لت پت کر دیا ہے۔ وہ بے شمار نفسیاتی بیماریوں کا شکار ہو گئے ہیں۔ ان کے اعصاب شل ہو گئے۔ وہ بے راہ روی کے ہیجان میں جتلا ہیں اور اپنی اس روحانی کمی کو منکرات' منشیات اور دوسری مہلک اشیاء کے استعمال سے پورا کرتے ہیں۔ اس لئے وہ جنوں کی حد تک جرائم پیشہ ہو گئے ہیں اور ان کی زندگی ہر قسم کے شریفانہ تصور سے خالی ہے۔

ان لوگوں نے اپنی شخصیت ہی کو گم کر دیا ہے' اس لئے کہ انہوں نے اپنے وجود کا اصل مقصد ہی بھلا دیا ہے۔ وہ روحانی سعادت سے محروم ہو گئے ہیں۔ اس لئے کہ انہوں نے اسلامی نظام زندگی کو گم کر دیا ہے۔ جو انسان کی روحانی اور جسمانی زندگی کے درمیان ہم آہنگی پیدا کر کے اسے ان روحانی امراض سے نجات دیتا ہے جس میں وہ جتلا ہیں۔ اور وہ اس خلجان میں جتلا اس لئے ہیں کہ وہ معرفت

خداوندی سے محروم ہیں جس کی طرف انہوں نے لوٹنا ہے۔

O.......O.......O.......O.......O

صرف تاریخی اور جغرافیائی اعتبار سے ہی نہیں، بلکہ حقیقی نفس الامری کے اعتبار سے امت مسلمہ ہی وہ امت ہے جس نے اس عہد کو اچھی طرح اپنالیا ہے' جو اللہ اور اس کے نبیوں کے درمیان طے پایا تھا' صرف اس امت نے اس حقیقت کا ادراک کیا ہے کہ اللہ کا دین ایک ہے اور اس کا نازل کردہ نظام زندگی بھی ایک ہے۔ اور وہ قافلہ انبیائے کرام بھی ایک ہے جنہوں نے تاریخ میں ہمیشہ اسی واحد دین کو پیش کیا۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نبی آخر الزماں کو یہ حکم دیتے ہیں کہ وہ اس حقیقت کبریٰ کا اعلان کرے یعنی یہ کہ یہ امت تمام نبیوں پر ایمان لاتی ہے' وہ تمام رسل کا احترام کرتی ہے۔ وہ دین اسلام کے مزاج سے اچھی طرح واقف ہے۔ وہ دین جس کے سوا کوئی دوسرا دین اللہ کے ہاں قبول نہ ہوگا۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ مَاۤ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَ مَاۤ اُنْزِلَ عَلٰۤى اِبْرٰهِيْمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ وَ الْاَسْبَاطِ وَ مَاۤ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَ عِيْسٰى وَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۪ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۫ وَ نَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿۸۴﴾ وَ مَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ وَ هُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۸۵﴾

"اے نبی کہو کہ "ہم اللہ کو مانتے ہیں' اس تعلیم کو مانتے ہیں جو ہم پر نازل کی گئی' ان تعلیمات کو بھی مانتے ہیں جو ابراہیمؑ' اسماعیلؑ' اسحاقؑ' یعقوبؑ اور اولاد یعقوبؑ پر نازل ہوئی تھیں۔ اور ان ہدایات پر بھی یقین رکھتے ہیں جو موسیٰؑ اور عیسیٰؑ اور دوسرے پیغمبروں کو ان کے رب کی طرف سے دی گئی۔ ہم ان کے درمیان فرق نہیں کرتے اور ہم اللہ کے تابع فرمان ہیں۔" اس اسلام کے سوا جو شخص کوئی اور طریقہ اختیار کرنا چاہے' اس کا وہ طریقہ ہرگز قبول نہ کیا جائے گا اور آخرت میں وہ ناکام و نامراد رہے گا۔"

یہ ہے اسلامی تصور حیات' جو بہت وسیع ہے اور اس میں تمام سابقہ رسالتیں شامل ہیں اور اسلامی نظام کے جھنڈے تلے وہ تمام رسول جمع ہیں جنہوں نے کبھی بھی رسالت خداوندی کا فریضہ سرانجام دیا۔ اسلامی نظام کی اساس عقیدۂ توحید پر ہے اور اس کے تصور کے مطابق تمام انبیاء کا منبع ہدایت ایک ہے یعنی ذات باری اور ذات باری' اور تمام انبیاء پر ایمان لانا ضروری ہے۔

یہاں یہ بات نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ پہلی آیت میں یہ کہا گیا ہے کہ اللہ کی ذات پر ایمان لانے کا حکم ہے۔ پھر اس کتاب پر ایمان لانے کا حکم ہے جو مسلمانوں پر نازل ہوئی اور پھر ان کتابوں پر ایمان لانے کا ذکر ہے جو مسلمانوں سے قبل دوسرے انبیاء پر نازل ہوئیں۔ اور اس کے بعد یہ فقرہ وَ نَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ .... "اور ہم اس کے مسلم ہیں۔" ان الفاظ سے اسلام کا ان الفاظ میں اقرار کرنا اپنے اندر ایک خاص مفہوم رکھتا ہے۔ پہلے یہ کہا گیا کہ اسلام کا مفہوم سر تسلیم خم کرنا ہے' اطاعت کرنا ہے اور خشوع و خضوع ہے۔ حکم کا اتباع ہے اور اسلامی نظام' اسلامی طریقہ کار اور اسلامی ناموس کی اطاعت ہے۔ اور یہ مفہومات پہلی آیت

أَفَغَيْرَ دِينِ اللَّهِ يَبْغُونَ وَلَهُ أَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ طَوْعًا وَكَرْهًا وَإِلَيْهِ يُرْجَعُونَ

"اب کیا یہ لوگ اللہ کی اطاعت کا طریقہ (دین اللہ) چھوڑ کر کوئی اور طریقہ چاہتے ہیں؟ حالانکہ آسمان و زمین کی ساری چیزیں چاروناچار اللہ ہی کے تابع فرمان ہیں۔ (مسلم ہیں) اور اس کی طرف سب کو پلٹنا ہے۔" سے اخذ ہوتے ہیں' اس لئے کہ اس کائنات کی تکوینی اشیاء کے اسلام کا صرف یہی مفہوم ہو سکتا ہے۔ کہ وہ مطیع فرمان ہوتی ہیں' وہ نظام کائناتی کے تابع ہوتی ہیں اور ضابطہ تکوینی کے اندر جکڑی ہوئی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر مناسب موقعہ پر اسلام کے اس خاص مفہوم کو واضح فرماتے ہیں کہ اسلام عملی نظام کا نام ہے تاکہ لوگوں کے دل میں یہ بات نہ بیٹھ جائے کہ اسلام صرف زبانی اقرار یا صرف تصدیق کا نام ہے جو دلوں میں بیٹھ جاتی ہے اور اس کے بعد اس ایمان و تصدیق کے عملی اثرات کا وجود میں آنا ضروری نہیں ہے مثلاً اسلامی نظام زندگی کی اطاعت اور انسانی زندگی میں اس نظام کے قیام کی عملی جدوجہد...... غرض آنے والی عمومی توضیح اور بیان سے پہلے یہ نہایت ہی اہم نکتہ ہے۔ جس پر قدرے غور ضروری ہے اور جس میں بتاکید کہا گیا ہے۔

وَمَنْ يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِينَ

.... "اور جو شخص اسلام کے سوا کوئی اور طریقہ بطور دین اختیار کرے گا' اس کا وہ طریقہ ہرگز قبول نہ کیا جائے گا اور آخرت میں وہ ناکام و نامراد رہے گا۔"

ان آیات کے بعد' جو مسلسل لفظ اسلام کے مفہوم کی توضیح کرتی ہیں' اب اسلام کے مفہوم میں کوئی تاویل نہیں کی جا سکتی۔ اور نہ ان آیات میں تحریف کی جا سکتی ہے نہ توڑ پھوڑ کیا جا سکتا ہے نہ اسلام کا اب کوئی اور مفہوم بیان کیا جا سکتا ہے۔ جس کا علم قرآن کو نہ ہو۔ اسلام بہرحال وہی اسلام ہے جس کی اطاعت۔ یہ پوری کائنات کر رہی ہے اس نظام کی صورت میں جو اس کے لئے اللہ تعالیٰ نے وضع کیا ہے۔

یہ ہرگز نہیں ہو سکتا کہ اسلام صرف شہادتین کے اقرار تک محدود ہو جائے اور شہادتین کے تلفظ و اقرار کے بعد اس پر وہ مفہوم اور وہ حقیقت منتج نہ ہو' جو اسلام کے مفہوم میں داخل ہے۔ یعنی ذات باری وحدہ لاشریک ہے اور ذات باری وحدہ قیوم ہے' نظام کائنات کو تھامے ہوئے ہے۔ ہم نے اس کی بندگی کرنی ہے اور اس سے ہدایت اخذ کرنی ہے۔ اور یہ کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں اور ہم نے ان کی اطاعت کرنا ہے۔ اس نظام کو قبول کرنا ہے جسے وہ لیکر آئے ہیں۔ اس شریعت کو اپنی زندگی میں نافذ کرنا ہے۔ جسے وہ لیکر آئے ہیں اور اپنے تمام فیصلے اس کتاب کے مطابق کرنے ہیں جسے وہ لیکر آئے ہیں۔

اسی طرح اسلام اس حد تک بھی محدود نہیں ہے کہ ایک انسان دل میں تصدیق کر لے کہ اللہ ایک ہے وہ غیب پر بھی ایمان لائے' قیامت کو بھی مانے' اللہ کی کتابوں اور رسول کو بھی برحق تسلیم کرے' بغیر اس کے کہ اس تصدیق کے بعد کوئی عملی مفہوم بھی زندگی میں ظاہر ہو۔ اور وہ حقیقت نفس الامری وجود میں آئے جیسا کہ اوپر ہم نے تفصیل بیان کی۔

پھر اسلام محض عبادات اور شعائر بندگی تک بھی محدود نہ ہو گا' نہ وہ مراقبے اور ذکر و اذکار تک محدود ہو گا' یا محض اخلاقی اور روحانی اصلاح کے کسی نظام تک بھی محدود نہ ہو گا۔ بغیر اس کے یہ تمام امور ایک منظم نظام حیات کی عملی شکل میں ظاہر نہ ہوں' جس

کی اساس خدائی تعلیمات پر ہو' جس میں دل بھی اللہ کی طرف متوجہ ہوں' مراسم عبودیت اور شعائر بھی اللہ کیلئے ہوں' تصور اور ذکر و اذکار بھی اللہ کیلئے ہوں' اس میں خدا خوفی کے ذریعہ اصلاح قلوب ہو اور لوگوں کو رشد و ہدایت دی جاتی ہو' اس لئے کہ جب تک ایک پاک و صاف اور چمکتا دمکتا اجتماعی نظام قائم نہ ہو گا اس وقت تک ان تمام امور کے کوئی اچھے اثرات مرتب نہ ہوں گے۔

○........○........○........○........○

یہ ہے اسلام جیسا کہ اللہ کو مطلوب ہے' اسلام کا مفہوم وہ نہیں جسے لوگوں کی مختلف نسلوں میں سے ایک تہی دامن نسل اپنی خواہشات نفسانیہ کے دباؤ کے تحت چاہتی ہے۔ اور نہ اسلام کا مفہوم وہ ہے' جو اسلام کے دشمن اسے پہنانا چاہتے ہیں۔ جو اسلام کے خلاف مورچہ زن ہیں اور مسلمانوں میں انہوں نے ان تحریفات کیلئے اپنے ایجنٹ چھوڑے ہوئے ہیں جو جگہ جگہ کام کر رہے ہیں۔

بس اب جبکہ لوگوں پر اسلام کا مفہوم واضح ہو گیا' پھر بھی کچھ لوگ ایسے ہیں جو اسلام کو اس مفہوم میں قبول کرنا نہیں چاہتے جس طرح اللہ چاہتے ہیں' محض اس لئے کہ جانتے ہوئے وہ محض اپنی خواہشات نفسانیہ کے تحت ایسا کرتے ہیں تو یقیناً ایسے لوگ آخرت میں سخت گھاٹے میں ہوں گے۔ اللہ نہ انہیں راہ راست پر لائے گا اور نہ ہی انہیں عذاب سے نجات دے گا۔

كَيْفَ يَهْدِي اللّٰهُ قَوْمًا كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ وَشَهِدُوْٓا اَنَّ الرَّسُوْلَ حَقٌّ وَّ جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ اُولٰۗىِٕكَ جَزَاۗؤُھُمْ اَنَّ عَلَيْهِمْ لَعْنَةَ اللّٰهِ وَالْمَلٰۗىِٕكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ۙ۝ خٰلِدِيْنَ فِيْھَا ۚ لَا يُخَفَّفُ عَنْھُمُ الْعَذَابُ وَلَا ھُمْ يُنْظَرُوْنَ ۝

"کیسے ہو سکتا ہے کہ اللہ ان لوگوں کو ہدایت بخشے' جنہوں نے نعمت ایمان پالینے کے بعد پھر کفر اختیار کیا حالانکہ وہ اس بات پر گواہی دے چکے ہیں کہ یہ رسول حق پر ہے اور ان کے پاس روشن نشانیاں آچکی ہیں۔ اللہ ظالموں کو تو ہدایت نہیں دیا کرتا۔ ان کے ظلم کا صحیح بدلہ یہی ہے کہ ان پر اللہ اور فرشتوں اور تمام انسانوں کی پھٹکار ہے' اسی حالت میں وہ ہمیشہ رہیں گے' نہ ان کی سزا میں تخفیف ہو گی اور نہ انہیں مہلت دی جائے گی۔"

یہ خوفناک دھمکی دیکھ کر' ہر وہ دل جس میں ذرہ برابر بھی ایمان ہو وہ کانپ اٹھتا ہے اور جن کے دل میں دنیا و آخرت دونوں کے بارے میں ذمہ داری کا احساس ہو اور یہی مناسب سزا ہے اس شخص کی جسے نجات کا خوبصورت موقعہ ملے اور وہ اس سے فائدہ نہ اٹھائے بلکہ اس سے اعراض برتے۔

لیکن اس کفر و اعراض کے باوجود اسلام توبہ کے دروازے کھلے رکھتا ہے۔ اسلام کسی گمراہ کیلئے واپسی کے دروازے بند نہیں کرتا' لیکن اسے ہدایت کی طرف آنے پر مجبور بھی کرتا کہ وہ دروازہ ہدایت پر خود دستک دے۔ بلکہ اسلام اس کے قریب ہوتا ہے اور اس کے درمیان کوئی پردہ حائل نہیں ہونے دیتا۔ اور یہاں تک کہ وہ اس پر امن محفوظ مقام تک آجائے اور عمل صالح شروع کر دے تاکہ معلوم ہو کہ اس نے توبہ صحیح طرح کر لی ہے۔

إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا مِنْ بَعْدِ ذَٰلِكَ وَأَصْلَحُوا فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿٨٩﴾

"البتہ وہ لوگ بچ جائیں گے جو اسکے بعد توبہ کر کے اپنے طرز عمل کی اصلاح کر لیں گے۔ اللہ بخشنے والا اور رحم فرمانے والا ہے"

رہے وہ لوگ جو توبہ نہیں کرتے اور نہ باز آتے ہیں وہ لوگ جو اپنے کفریہ رویے پر اصرار کرتے ہیں اور کفر میں آگے ہی بڑھتے ہیں اور جو لوگ کفر ہی کی پناہ میں رہتے یہاں تک کی وقت دیا ہوا ختم ہو جائے اور اختیار اور رد و قبول کی میعاد چلی جائے اور وہ وقت آپہنچے جس میں جزا اور سزا کا عمل شروع ہو جائے تو اس قسم کے لوگوں کیلئے نہ رجوع کا کوئی مقام ہے اور نہ توبہ کرنے کا وقت ہے نہ انہیں نجات ملے گی۔ انہیں ان کا کوئی عمل فائدہ نہ دے گا اگرچہ انہوں نے دنیا میں اس قدر سونا خرچ کیا ہو جس سے دنیا بھر جاتی ہو۔ اگرچہ یہ عمل انہوں نے خیر و برکت سمجھ کر کیا ہو' جب تک کہ یہ عمل اللہ کے حوالے سے نہ کیا گیا ہو۔ اس لئے ایسے اعمال اللہ کے ہاں نہ پہنچیں گے اور نہ وہ اعمال اللہ کیلئے ہوں گے۔ وقت ختم ہونے کے بعد اگر وہ پوری دنیا بھر کر کفارہ ادا کریں تب بھی وہ قبول نہ ہو گا۔ وہ عذاب قیامت سے نہ بچ سکیں گے۔ اس لئے کہ میعاد ختم اور دروازے بند ہو چکے ہیں۔

☆ ☆ ☆ ☆ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بَعْدَ إِيمَانِهِمْ ثُمَّ ازْدَادُوا كُفْرًا لَنْ تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الضَّالُّونَ ﴿٩٠﴾ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَمَاتُوا وَهُمْ كُفَّارٌ فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْ أَحَدِهِمْ مِلْءُ الْأَرْضِ ذَهَبًا وَلَوِ افْتَدَىٰ بِهِ ۗ أُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ وَمَا لَهُمْ مِنْ نَاصِرِينَ ﴿٩١﴾

۹ ع ۱۱ ۱۷

"مگر جن لوگوں نے ایمان لانے کے بعد کفر کیا' پھر اپنے کفر میں بڑھتے چلے گئے ان کی توبہ بھی قبول نہ ہوگی' ایسے لوگ تو پکے گمراہ ہیں' یقین رکھو' جن لوگوں نے کفر اختیار کیا اور کفر ہی کی حالت میں جان دیدی ان میں سے کوئی اگر اپنے آپ کو سزا سے بچانے کیلئے روئے زمین بھر کر سونا فدیہ میں دے تو اسے قبول نہ کیا جائے گا۔ ایسے لوگوں کیلئے دردناک سزا تیار ہے۔ اور وہ اپنا کوئی مددگار نہ پائیں گے۔"

یوں سیاق کلام میں اس مسئلے کا فیصلہ کن تصفیہ کر دیا جاتا ہے اور اسے تاکیدی الفاظ میں کر دیا جاتا ہے جس میں کوئی شک اور شبہ نہیں رہنے دیا جاتا۔

اللہ کے اصولوں کے خلاف انفاق' اور اللہ کے راستے میں نہ خرچ کیے جانے والے اموال کے غیر موثر قرار دینے کے بعد اور یہ فیصلہ کرنے کے بعد کہ دارالعمل کے ختم ہونے کے بعد اگر کوئی روئے زمین کو بھر کر بھی انفاق کرے وہ قبول نہ ہو گا' یہاں اللہ تعالیٰ یہ بیان فرما دیتے ہیں کہ وہ کونسا انفاق ہے جو اللہ کو پسند ہے۔

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتَّىٰ تُنْفِقُوا مِمَّا تُحِبُّونَ ۚ وَمَا تُنْفِقُوا مِنْ شَيْءٍ فَإِنَّ اللَّهَ بِهِ عَلِيمٌ

(۹۲)

"تم نیکی کو نہیں پہنچ سکتے جب تک کہ اپنی وہ چیزیں (خدا کی راہ میں) خرچ نہ کرو جنہیں تم عزیز رکھتے ہو۔" اور جو کچھ تم خرچ کرو گے اللہ اس سے بے خبر نہ ہو گا۔

امام احمد نے اپنی سند کے ساتھ ابو اسحاق ابن عبداللہ ابن ابی طلحہ سے روایت کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں انہوں نے انس ابن مالک کو یہ کہتے سنا، انصار مدینہ میں ابو طلحہ بہت ہی مالدار تھے۔ اور ان کو ان کی دولت سے محبوب ترین ایک کنواں تھا جسے "حاء" کہتے تھے۔ یہ مسجد نبوی کے بالمقابل تھا۔ حضور اس کنویں پر جایا کرتے تھے۔ اور اس کا پاک و صاف پانی پیا کرتے تھے۔ حضرت انس ﷺ فرماتے ہیں کہ جب یہ آیت نازل ہوئی لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ .... "تم نیکی کو نہیں پہنچ سکتے جب تک تم ان چیزوں کو خرچ نہ کرو جنہیں تم پسند کرتے ہو۔" تو ابو طلحہ نے کہا یا رسول اللہ! اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تم اس وقت تک نیکی کو نہیں پہنچ سکتے جب تک تم ان چیزوں کو خرچ نہ کرو جنہیں تم پسند کرتے ہو۔" اور میرا محبوب مال تو "حاء" کنواں ہے۔ اور وہ میری طرف سے صدقہ ہے۔ میں اس کا ثواب اور عند اللہ اس کی جزاء چاہتا ہوں۔ اس پر نبی اکرم ﷺ نے فرمایا بواہ واہ! یہ تو بڑا نفع بخش اور قیمتی مال ہے۔ یہ تو نفع بخش مال ہے۔ میں نے سن لیا لیکن میرا مشورہ یہ ہے کہ آپ اسے اقرباء کے درمیان تقسیم کر دیں تو ابو طلحہ نے کہا، حضور تو پس آپ ایسا ہی کر دیں۔ تو حضور نے اسے اس کے اقرباء اور چچازادوں کے درمیان تقسیم کر دیا۔ (روایت مسلم و بخاری)

مسلم بخاری نے ایک روایت نقل کی ہے کہ حضرت عمر نے کہا حضور خیبر میں مجھے جو حصہ ملا ہے' اس سے اچھی جائیداد مجھے کبھی نہیں ملی تو اس کے بارے میں آپ کیا مشورہ دیتے ہیں۔ آپ نے فرمایا، اصل جائیداد اپنے پاس رہنے دو پیداوار سبیل اللہ کر دو۔"

اسی راستے پر صحابہ کرام ﷺ میں سے اکثر ایک دوسرے سے آگے بڑھے' یوں وہ اپنے رب سے بھلائی کی تلاش میں اس آیت پر لبیک کہتے رہے۔ اس دور میں جب اللہ تعالیٰ نے انہیں اسلام کی طرف ہدایت دی۔ اللہ کی آواز پر لبیک کہہ کر انہوں نے مال اور دولت کی غلامی سے اپنے آپ کو رہائی دلائی۔ دلی بخل اور کنجوسی سے نجات پائی اور ذاتی لالچ سے پاک ہوئے۔ اور یوں اس مقام بلند تک جا پہنچے جو نہایت بلند' نہایت ہی روشن' چمکدار تھا' آزاد' ہلکے پھلکے ہر قید و بند سے نکلے ہوئے۔

O.........O.........O.........O.........O

فی ظلال القرآن

پارہ ------ ۴

سورۃ آل عمران بقیہ حصہ: آیات ۹۲ تا ۲۰۰

سورۃ النساء ابتدائی حصہ: آیات ۱ تا ۲۳

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پارہ چہارم ایک نظر میں

یہ پارہ سورۂ آل عمران کے آخری حصہ اور سورۂ نساء کے ابتدائی حصہ پر مشتمل ہے۔ یعنی آیت وَ الْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ .... تک۔ سورۂ آل عمران کا آخری حصہ چار اجزاء پر مشتمل ہے' جو سورت کے موضوع اور مضمون کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں' جن کے بارے میں ہم سورۂ آل عمران پر تبصرہ کرتے وقت بحث کر آئے ہیں۔ یعنی پارۂ سوئم میں۔ یہاں اس بحث کے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔ وہاں وہ تبصرہ دیکھا جاسکتا ہے۔

یہاں مختصراً یہ جان لینا چاہئے کہ سورۂ آل عمران کے ان چار اجزاء میں سے پہلا ان مکالمات پر مشتمل ہے جو مدینہ طیبہ کے ابتدائی دور میں' اہل کتاب اور اہل ایمان کے درمیان ہوئے۔ یہ مکالمات اس تاریخی پس منظر میں ہوئے جس کے بارے میں ہم آغاز سورت میں وقت کا تعین کر چکے ہیں۔ یہ مکالمات رمضان ۲ھ کے بعد اور ماہ شوال ۳ھ کے بعد تک کے دور میں ہوئے۔ اس سے پہلے سورۂ آل عمران' تقریباً سب اس عظیم الشان معرکہ پر تبصرہ ہے۔ ان تبصروں کے ذریعہ اسلامی تصور حیات کی ماہیت' دین کی حقیقت' اسلام کی حقیقت اور اس نظام حیات کی حقیقت بیان کی گئی ہے' جو اسلام نے پیش کیا' اور اسلام سے قبل تمام رسولوں نے اس نظام کو پیش کیا۔ ان تبصروں میں اہل کتاب کی حقیقت اور ان کے موقف کو بھی واضح کیا گیا' جو حضور اکرم ؐ کے ساتھ دینی امور میں مجادلہ کیا کرتے تھے' اور آپ کے صحابہ کرام کے ساتھ بحث و مباحثہ کیا کرتے تھے۔ یہ واضح کیا گیا کہ اہل کتاب دین اسلام سے کس قدر دور جا چکے ہیں' اور یہ کہ مدینہ میں وہ جماعت مسلمہ کے خلاف جو سازشیں کر رہے تھے' اس سورت میں اس کا بھی انکشاف کیا گیا' اور یہ بتایا گیا کہ ان کی ان سازشوں کے پس پردہ کیا کیا خفیہ محرکات کام کر رہے ہیں۔ ان تمام امور پر روشنی ڈال کر اسلامی جماعت کو ان سب معاملات کے بارے میں خبردار کیا جاتا ہے اور بتایا جاتا ہے کہ وہ ایک عظیم خطرے سے دوچار ہے۔ اسے غفلت نہ کرنا چاہئے اور ان امور میں دشمن کی کوئی بات تسلیم نہیں کرنا چاہئے۔

آیات کا دوسرا ٹکڑا جو اس سورت کے ایک بڑے حصے پر مشتمل ہے' وہ ایک دوسرے معرکے پر محیط ہے۔ یہ معرکہ صرف مکر و فریب اور زبانی جدل و مباحثہ پر ہی موقوف نہیں بلکہ یہ معرکۂ تیرو سنان ہے اور ضرب و حرب پر مشتمل ہے۔ یعنی غزوۂ احد' اس کے واقعات' اس میں پیش آنے والے واقعات کے اسباب و نتائج' غزوۂ احد پر یہ تبصرہ اس مخصوص اسلوب میں ہے جو قرآن مجید کا شاہکار اور اس کا اعجاز ہے' یہ آیات اس معرکہ کے اختتام پر نازل ہوئیں' اس لئے ان میں بھی اسلامی تصور حیات کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور اس معرکے کے حوادث کے حوالے سے اسلامی جماعت کی تربیت کا سامان فراہم کیا گیا ہے۔ اسلامی تصور حیات کے نقطۂ نظر سے اس معرکے میں جو غلطیاں ہوئیں یعنی اسلامی صفوں میں جو انتشار پیدا ہوا اور بعض وہ اقدامات جو اضطراب اور پریشانی کا باعث ہوئے۔ ان واقعات کی وجہ سے ان حالات میں قرآن کریم نے جماعت مسلمہ کو ہدایت دی کہ وہ اپنی راہ پر گامزن رہے' اور اس راہ میں جو مشکلات پیش آئیں انہیں انگیز کرے اور وہ مقام اور مرتبہ حاصل کرے جو اس امانت عظمیٰ کے شایان شان ہے' جو اللہ میاں نے امت مسلمہ کے سپرد کی ہے اور اللہ نے اس امت کو یہ نظام دے کر جس اعزاز پر فائز کیا ہے اور جس عظیم فریضہ کے سرانجام دینے کے لئے

منتخب کیا ہے' اس پر وہ اللہ کا شکر بجالائے۔

تیسرے حصے میں روئے سخن پھر اہل کتاب کی طرف پھر جاتا ہے۔ اور اہل کتاب کو متوجہ کیا جاتا ہے کہ وہ ان معاہدات کو ایک ایک کر کے توڑ رہے ہیں' جو حضور ﷺ نے ان کے ساتھ مدینہ طیبہ میں تشریف لاتے ہی طے کئے تھے۔ ان کو تنبیہہ کی جاتی ہے کہ انہوں نے صحیح اسلامی تصور حیات سے انحراف کر لیا ہے اور یہ کہ انہوں نے' اپنی پوری تاریخ میں' مختلف اوقات میں اپنے انبیاء کے مقابلے میں مسلسل جرائم کا ارتکاب کیا ہے۔ اس کے بعد امت مسلمہ کو متنبہ کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے فکر و عمل میں اہل کتاب کی پیروی ہرگز نہ کریں اور راہ حق میں انہیں جو جانی اور مالی نقصانات پیش آرہے ہیں' ان پر صبر کریں اور ثابت قدم رہیں۔ نیز اہل کتاب اور مشرکین مدینہ' مختلف انداز میں انہیں جو ایذائیں دے رہے ہیں اس پر بھی وہ صبر کریں اور ہر حال میں اپنے دشمنوں سے ہرگز متاثر نہ ہوں۔

حصہ چہارم میں بتایا گیا ہے کہ صحیح اہل ایمان کے نزدیک اپنے رب کے ساتھ تعلق کی نوعیت کیا ہوتی ہے' جب وہ اس کائنات میں باری تعالیٰ کی آیات و نشانات پر غور کرتے ہیں تو ان کے دلوں میں ایمان باللہ راسخ ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے رب اور رب کائنات کی طرف بڑے خشوع اور خضوع کے ساتھ متوجہ ہوتے ہیں۔ اور ان کا رب ان کی ایسی دعاؤں کو قبول کرتا ہے اور ان کے گناہوں کو معاف کر کے انہیں اجر عظیم عطا کرتا ہے۔ اس کے مقابلے میں اہل کفر کے حالات یہ ہیں کہ انہیں صرف اس دنیا کا متاع قلیل دیا گیا۔ یعنی اس کرۂ ارض پر اور یہ کہ آخرت میں ان کا ٹھکانا جہنم ہے جو ان کے لئے تیار ہے اور وہ نہایت ہی برا ٹھکانا ہے۔ اس سورت کا خاتمہ اس پکار پر ہوتا ہے' جس میں اللہ میاں اہل ایمان کو صبر کرنے' مشکلات برداشت کرنے' باہم متحد ہو کر دشمن کے مقابلے میں چوکنا ہونے' اور ہروقت خدا کا خوف دل میں رکھنے کی دعوت دیتے ہیں۔ تاکہ وہ اس دنیا اور آخرت میں کامیاب ہوں۔

○___☆___○

یہ چار اسباق جو باہم مربوط ہیں اور ایک ہی سلسلہ کلام میں پارۂ سوئم میں بیان کئے ہوئے مضامین کا تکملہ ہیں اور انہی خطوط پر آگے بڑھ رہے ہیں جن کے بارے میں ہم پارۂ سوئم کے آغاز ہی میں تفصیلاً "بحث کر آئے ہیں اور مزید تفصیلات اس وقت بیان ہوں گی جب ہم ان پر تفصیلاً" بحث کریں گے اور آیات کی تفسیر بیان کریں گے۔

اس پارے کا دوسرا حصہ سورۂ نساء کے ابتدائی حصہ پر مشتمل ہے۔ اس پر بحث سورۂ نساء کے ابتدائیہ میں ہوگی' انشاء اللہ۔ اور اللہ ہی ہے جو توفیق اور ہمت دینے والا ہے۔

☆☆☆☆

سبق ۲۶ ایک نظر میں

اس سبق میں' اہل کتاب کے ساتھ' جدل و مناظرے کا یہ معرکہ اپنی انتہاؤں کو پہنچ جاتا ہے۔ اگرچہ یہ آیات وفد اہل نجران کے مباحثے کے ضمن میں نہیں آتیں جیسا کہ روایات میں بھی ذکر آتا ہے' لیکن اپنے مضمون اور مفہوم کے اعتبار سے یہ ان آیات کے ساتھ ملتی جلتی ہیں اور انہی کا تکملہ ہیں جو وفد نجران کے بارے میں نازل ہوئیں۔ موضوع وہی ہے' اگرچہ روئے سخن خاص یہودیوں کی طرف ہے۔ اور بتایا گیا ہے کہ وہ مدینہ کے اہل ایمان کے خلاف کیا کیا خفیہ سازشیں' کس کس طرح کر رہے ہیں۔ یہ مجادلہ مکمل بائیکاٹ اور مکمل علیحدگی پر منتج ہوتا ہے اور پھر روئے سخن' اس سبق میں تھوڑی دیر ہی میں اہل اسلام کی طرف پھر جاتا ہے اور صرف انہیں مخاطب کیا جاتا ہے۔

بتایا جاتا ہے کہ امت مسلمہ کی حقیقت کیا ہے' اس کا نظام زندگی کیا ہے' اس کے فرائض کیا ہیں' بعینہ اس طرح جس طرح سورۂ بقرہ میں بنی اسرائیل کے ساتھ مکالمہ ختم کرنے کے بعد امت مسلمہ کو مخاطب کیا گیا تھا۔ اس لحاظ سے ان دونوں سورتوں میں مکمل مماثلت پائی جاتی ہے۔

اس سبق کا آغاز اس سے ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل پہ کھانے پینے کی ہر چیز حلال تھی۔ ہاں حضرت یعقوبؑ نے بعض اشیاء سے پرہیز کرتے ہوئے' انہیں اپنے لئے ممنوع قرار دے دیا تھا۔ یہ اس سے بہت پہلے کی بات ہے کہ جب توراۃ نازل ہوئی۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہودیوں کے ہاں محرمات طعام کی جو فہرست مروج تھی' اسلام نے ان اشیاء میں سے بعض کا استعمال چونکہ جائز قرار دے دیا تھا' اس لئے یہودیوں کو اس پر سخت اعتراض تھا۔ حالانکہ یہ اشیاء صرف یہودیوں کے لئے حرام قرار دی گئی تھیں اور یہ بھی اس لئے کہ وہ نافرمانیوں کا ارتکاب کرتے تھے اور ان پر یہ چیزیں حرام کرکے انہیں سزا دی گئی تھی۔

اس کے بعد تحویل قبلہ پر وہ جو اعتراضات کرتے تھے' اس کا بھی جواب دیا گیا ہے۔ اس سے پہلے سورۂ بقرہ میں ایک طویل بحث ہو چکی تھی۔ یہاں بتایا جاتا ہے کہ خانہ کعبہ بیت ابراہیمؑ ہے۔ اور یہ پہلا گھر ہے جو اس کرۂ ارض پر صرف اللہ کی عبادت اور بندگی کے لئے بنایا گیا۔ اس لئے جو لوگ حضرت ابراہیمؑ کے وارث ہونے کے مدعی ہیں' ان کی جانب سے بیت ابراہیمؑ کو قبلہ قرار دینے کی مخالفت ناقابل فہم ہے۔

اس کے بعد اہل کتاب کو متنبہ کیا جاتا ہے کہ وہ آیات الٰہی کا انکار کرتے ہیں' اور لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی راہ اختیار کرنے سے روکتے ہیں۔ وہ صحیح اور صراط مستقیم چھوڑ کر ٹیڑھے راستوں پر بھٹک رہے ہیں۔ اور وہ چاہتے ہیں کہ یہ گمراہی اسلامی نظام زندگی پر بھی چھا جائے' حالانکہ وہ حق کو اچھی طرح پہچان چکے ہیں' اور وہ بے خبر نہیں ہیں۔

ایسے حالات میں قرآن کریم اچانک اہل کتاب کو چھوڑ کر امت مسلمہ کو مخاطب کرتا ہے اور انہیں زوردار الفاظ میں متنبہ کرتا ہے کہ وہ اہل کتاب کی اطاعت نہ کریں کیونکہ ان کی اطاعت عین کفر ہے۔ اور اہل ایمان کو یہ بات زیب نہیں دیتی کہ وہ عین اسی وقت کفر اختیار کریں جب نبی ان کے سامنے اللہ کی کتاب پیش کر رہا ہو' اور رسول خدا ان میں موجود ہوں اور انہیں اس کتاب کی تعلیم بنفس نفیس دے رہے ہوں' وہ ان کا تزکیہ کرتے ہوئے انہیں خدا خوفی کی تعلیم دے رہے ہوں' اور انہیں یہ تلقین کر رہے ہوں کہ وہ اسلام پر اپنی پوری زندگی میں جمے رہیں اور اسی حالت میں اسلام میں اپنے خالق حقیقی سے جا ملیں۔ رسول خدا اور کتاب اللہ انہیں یاد دلا رہی ہے کہ کس

طرح اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں کو جوڑا' یہ اس کی بڑی نعمت تھی کہ اس نے' اسلام کے جھنڈے تلے' ان کی صفوں کو یکجا کیا۔ حالانکہ اس سے قبل ان کی حالت یہ تھی کہ وہ ٹکڑے ٹکڑے تھے' اور باہم بر سرپیکار تھے۔ بلکہ وہ آگ کے گڑھے کے کنارے کھڑے تھے اور اس میں گرنے ہی والے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اس سے بچایا اور یہ نجات انہیں اسلامی نظام زندگی کے سبب ملی۔ پھر یہ کتاب تمہیں حکم دیتی ہے کہ تم ایک ایسی امت کی شکل اختیار کرو جس کا مشن اس دنیا میں نیکی اور بھلائی کی طرف بلانا اور برائی سے منع کرنا ہو' اور اس نصب العین کے محافظ رہیں کہ تم نے اسلامی نظام زندگی کو بروئے کار لانا ہے۔ پھر تمہیں ڈرایا جارہا ہے کہ تم اہل کتاب کی وسوسہ اندازیوں اور دسیسہ کاریوں پر کان ہی نہ دھرو کیونکہ یہ لوگ تمہاری صفوں کے اندر ہیں' وہ تمہارے اندر اختلافات ڈال کر تمہیں بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنا چاہتے ہیں۔ جس طرح وہ خود ان ہی اختلافات کی وجہ سے دنیا اور آخرت میں تباہی سے دوچار ہوئے۔ روایات میں قرآن کریم کے اس انتباہ کا یہ پس منظر بیان کیا گیا ہے کہ اوس اور خزرج کے درمیان یہودیوں نے اختلافات پیدا کر کے ایک عظیم فتنے کے بیج بو دیئے تھے۔

اس کے بعد قرآن کریم امت مسلمہ کو یاد دلاتا ہے کہ اس کرۂ ارض پر اس کا مقام و منصب کیا ہے؟ حضرت انسان کی زندگی کے ڈرامے میں امت مسلمہ نے کیا کردار ادا کرنا ہے۔

كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ ۗ

"تم تو وہ خیر امت ہو جسے تمام لوگوں کی خاطر برپا کیا گیا ہے' تمہارا فرض یہ ہے کہ تم بھلائی کا حکم دو اور برائی سے روکو اور اللہ پر ایمان لاؤ۔" یوں اللہ تعالیٰ تمہاری رہنمائی کرتا ہے کہ تمہارا مشن کیا ہے؟ اور تمہاری سوسائٹی کا رنگ ڈھنگ کیا ہونا چاہئے۔

اس کے بعد مسلمانوں کے دشمن کی ذرا خبر لی جاتی ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ وہ اہل اسلام کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے' نہ ہی وہ مسلمانوں پر غلبہ پا سکتے ہیں' ایسا غلبہ جو مکمل بھی ہو اور دائمی بھی ہو' ہاں وہ یہ کر سکتے ہیں کہ وہ مسلمانوں کی جدوجہد کے دوران انہیں اذیت دے سکتے ہیں' البتہ مسلمان اگر اسلامی نظام زندگی اور اپنے منہاج پر قائم رہے تو اللہ کی نصرت انہیں حاصل رہے گی۔ ان دشمنان خدا پر اللہ تعالیٰ نے ذلت مسلط کر دی ہے۔ وہ ہمیشہ حالت مسکینی میں رہیں گے' اللہ کا غضب ان کو گھیرے رہے گا۔ اور یہ سب کچھ محض اس لئے ہو گا کہ انہوں نے اپنی پوری تاریخ میں ہمیشہ معاصی کا ارتکاب کیا۔ ناحق اپنے نبیوں تک کو قتل کیا۔ اہل کتاب میں سے بہرحال ایسے لوگ بھی ہیں جنہوں نے ہمیشہ حق کا ساتھ دیا۔ ایمان لے آئے اور انہوں نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے سلسلے میں اہل اسلام کا منہاج اپنایا۔ اور نیکی اور بھلائی کے پھیلانے کا مشن ان کا نصب العین بن گیا۔ ایسے لوگ بہرحال صالحین میں سے ہیں۔ ہاں جن لوگوں نے کفر کا راستہ اپنایا' اسلام کے سامنے سر تسلیم خم نہ کیا' تو وہ لوگ اپنے کفر کی وجہ سے ماخوذ ہوں گے' ان کی دولت انہیں کوئی نفع نہ دے گی' ان کی اولاد انہیں کوئی فائدہ نہ دے سکے گی۔ اور انجام کار انہیں ایک عظیم تباہی کا سامنا کرنا پڑے گا۔

اس سبق کا خاتمہ اہل ایمان کو اس بات کا خوف دلانے پر ہوتا ہے کہ وہ ایمانداروں کے مقابلے میں دوسرے لوگوں کے ساتھ کوئی خفیہ دوستی قائم نہ کریں۔ اس لئے کہ یہ دوسرے لوگ اپنے دلوں کے اندر مسلمانوں کے خلاف بغض و عداوت چھپائے ہوئے ہیں۔ ان کی باتوں سے اہل اسلام کے خلاف بغض و عداوت ٹپکی پڑتی ہے۔ اور ان کے دلوں کے اندر اہل اسلام کے خلاف جو لاوا پک رہا ہے وہ نہایت ہی خوفناک ہے۔ انتہائی غصے اور نفرت کی وجہ سے وہ اپنی انگلیاں کاٹتے ہیں اور اہل اسلام پر اگر کوئی آفت و مصیبت آتی ہے تو یہ نہایت ہی خوش ہوتے ہیں اور اگر اہل اسلام کے لئے کوئی کامیابی ظہور پذیر ہوتی ہے تو وہ بہت کبیدہ خاطر ہو جاتے ہیں۔ ان توضیحات

کے آخر میں اللہ تعالیٰ اہل ایمان کے ساتھ یہ وعدہ کرتے ہیں کہ وہ ان کا نگہبان اور محافظ ہے۔ اگر وہ صبر سے کام لیں اور خدا خوفی کا رویہ اختیار کریں تو اللہ ان کے دشمنوں کے تمام ہتھکنڈوں کو ناکام کر دے گا۔ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ.............. "جو کچھ وہ کرتے ہیں اللہ تعالیٰ اس پر حاوی ہے۔"

یہ طویل توضیحات اور متنوع اشارے' اس بات کا اظہار کرتے ہیں کہ اس دور میں جماعت مسلمہ اور اہل ایمان کی صفوں میں اہل کتاب کس طرح گھسے ہوئے تھے اور کیا کیا سازشیں کر رہے تھے۔ اور بے چینیاں پھیلا رہے تھے۔ اور یہ کہ اس سبق نے اس وقت بحرانی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ نیز یہاں اس بات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ اس وقت تحریک اسلامی کو کس قدر مضبوط راہنمائی کی ضرورت تھی' تاکہ وہ اپنے اور جاہلیت کے کارندوں کے درمیان پائے جانے والے تعلقات و روابط کی نوعیت کو اچھی طرح سمجھ لیں اور اسلامی نظریۂ حیات اور جاہلیت کے درمیان ایک قطعی امتیاز پیدا کر دیا جائے۔ اور پہلی تحریک اسلامی کے بعد آئندہ نسلوں کے لئے بھی یہ ہدایت اور توضیح کام آئے۔ اور آنے والی نسلوں کو متنبہ کر دیا جائے کہ ان کے موروثی دشمن کون ہیں؟ یہ ایسے دشمن ہیں کہ وہ نئے نئے روپ اور نئے وسائل لے کر میدان میں آتے ہیں لیکن ہیں وہ ایک ہی۔

✲ ✲ ✲

درس ۲۶ تشریح آیات ۹۲ تا ۱۲۰

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ۬ؕ وَ مَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَیْءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِیْمٌ ﴿۹۲﴾ كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا لِّبَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ اِلَّا مَا حَرَّمَ اِسْرَآءِیْلُ عَلٰى نَفْسِهٖ مِنْ قَبْلِ اَنْ تُنَزَّلَ التَّوْرٰىةُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا بِالتَّوْرٰىةِ فَاتْلُوْهَاۤ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ﴿۹۳﴾ فَمَنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَاُولٰٓىٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۹۴﴾ قُلْ صَدَقَ اللّٰهُ ۫ فَاتَّبِعُوْا مِلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ حَنِیْفًا ؕ وَ مَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ﴿۹۵﴾ اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّ هُدًى لِّلْعٰلَمِیْنَ ﴿۹۶﴾

"تم نیکی کو نہیں پہنچ سکتے جب تک کہ تم وہ چیزیں (خدا کی راہ میں) خرچ نہ کرو جنہیں تم عزیز رکھتے ہو اور جو کچھ تم خرچ کرو گے اللہ اس سے بے خبر نہ ہو گا۔ کھانے کی یہ ساری چیزیں (جو شریعت محمدی میں حلال ہیں) وہ بنی اسرائیل کے لئے بھی حلال تھیں۔ البتہ بعض چیزیں ایسی تھیں جنہیں توراۃ کے نازل کئے جانے سے پہلے اسرائیل نے خود اپنے اوپر حرام کر لیا تھا۔ ان سے کہو' اگر تم سچے ہو تو لاؤ توراۃ اور پیش کرو اس کی کوئی عبارت ...... اس کے بعد بھی جو لوگ اپنی جھوٹی گھڑی ہوئی باتیں اللہ کی طرف منسوب کرتے رہیں وہی درحقیقت ظالم ہیں۔"

یہودیوں کا یہ طریقہ تھا کہ وہ ہر قسم 'شبہ اور ہر دلیل ڈھونڈ ڈھونڈ کر لاتے تھے' اور ہر طرح کا حیلہ اور مکرو فریب کام میں لاتے تھے تاکہ وہ رسالت محمدیہ کی صحت میں کوئی شبہ پیدا کر دیں۔ تحریک اسلامی میں فکری بحران پیدا کر دیں اور لوگوں کے دلوں میں اضطراب پیدا کر دیں۔ چنانچہ یہ لوگ ہر وقت شکوک و شبہات پھیلاتے پھرتے تھے۔ جب قرآن کریم نے یہ دعویٰ کیا کہ وہ توراۃ کی تصدیق کرتا ہے تو انہیں یہ اعتراض کرنے کا موقع ملا کہ اگر قرآن کریم توراۃ کا مصدق ہے تو پھر اس کا جواز کیا ہے کہ وہ بعض ان چیزوں کو حلال قرار دیتا ہے جو بنی اسرائیل کے لئے حرام تھیں۔ روایات میں آتا ہے کہ انہوں نے اس سلسلے میں اونٹوں کا گوشت اور دودھ کی مثال بھی پیش کی۔ کیونکہ یہ چیزیں بنی اسرائیل پر حرام تھیں۔ اگرچہ اونٹ اور اس کے دودھ کے علاوہ بھی بعض ایسی چیزیں تھیں جو بنی اسرائیل کے لئے حرام تھیں مگر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے لئے حلال کر دیا تھا۔

یہاں قرآن کریم ان کی توجہ اس تاریخی حقیقت کی طرف مبذول کراتا ہے جسے وہ جان بوجھ کر نظر انداز کر رہے تھے۔ ان کا مقصد یہ

تھا کہ وہ قرآن کریم کے اس دعویٰ میں تشکیک پیدا کریں کہ وہ توراۃ کا مصدق ہے۔ دلیل یہ دیتے کہ قرآن نے بعض ایسی چیزوں کو حلال قرار دیا ہے جو بنی اسرائیل پر حرام تھیں' حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ کھانے کی وہ ساری چیزیں جو شریعت محمدیہ میں حلال ہیں' وہ بنی اسرائیل کے لئے بھی حلال تھیں' البتہ بعض چیزیں ایسی تھیں جنہیں توراۃ کے نازل کئے جانے سے پہلے اسرائیل نے خود اپنے اوپر حرام کر لیا تھا۔ یہ اسرائیل حضرت یعقوب ہیں۔ روایات میں آتا ہے کہ وہ ایک شدید مرض میں مبتلا ہوئے تھے' اور انہوں نے یہ منت مانی تھی کہ اگر وہ تندرست ہو گئے تو وہ بطور نفل اونٹ کا گوشت کھانا ترک کر دیں گے۔ اونٹ کا دودھ نہ پئیں گے اور یہ دونوں چیزیں انہیں بہت پسند تھیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان کی منت اور نذر کو قبول فرمایا اور بنی اسرائیل میں یہ سنت یعقوبی چل پڑی اور انہوں نے بھی ان چیزوں کو حرام کر لیا جو ان کے باپ نے حرام کی تھیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل پر بعض دوسری چیزیں بطور سزا بھی حرام کر دی تھیں' اس لئے کہ انہوں نے بعض جرائم کا ارتکاب کیا تھا۔ ان محرمات کی طرف سورت انعام کی آیات (۱۴۶) میں اشارہ کیا گیا ہے۔

وَعَلَى الَّذِينَ هَادُوا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِي ظُفُرٍ ۖ وَمِنَ الْبَقَرِ وَالْغَنَمِ حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ شُحُومَهُمَا إِلَّا مَا حَمَلَتْ ظُهُورُهُمَا أَوِ الْحَوَايَا أَوْ مَا اخْتَلَطَ بِعَظْمٍ ۚ ذَٰلِكَ جَزَيْنَاهُم بِبَغْيِهِمْ ۖ وَإِنَّا لَصَادِقُونَ

"اور جن لوگوں نے یہودیت اختیار کی ان پر ہم نے سب ناخن والے جانور حرام کر دیئے تھے' اور گائے اور بکری کی چربی بھی' بجز اس کے جو ان کی پیٹھ یا ان کی آنتوں سے لگی ہوئی ہو یا ہڈی سے لگی رہ جائے۔ یہ ہم نے اس کی سرکشی کی سزا انہیں دی تھی اور یہ جو کچھ ہم کہہ رہے ہیں بالکل سچ کہہ رہے ہیں۔" جبکہ اس تحریم سے قبل یہ چیزیں ان کے لئے حلال تھیں۔

ان کی تردید کر کے اللہ تعالیٰ انہیں اس حقیقت کی طرف متوجہ کرتے ہیں کہ کھانے پینے کی چیزوں میں اصل الاصول یہ ہے کہ وہ جائز ہیں' اور بنی اسرائیل پر بعض چیزیں ان کے مخصوص حالات کے پیش نظر حرام کی گئی ہیں' اس لئے اگر ان میں سے بعض چیزوں کے استعمال کو مسلمانوں کے لئے حلال قرار دے دیا گیا تو یہ کوئی قابل اعتراض بات نہیں ہے' اس لئے کہ اپنی اصلیت کے اعتبار سے وہ حلال تھیں۔ اس لئے اس حلت سے قرآن کریم اور شریعت الہیہ کی صحت میں شک نہیں کیا جا سکتا۔

اس موقعہ پر قرآن کریم انہیں چیلنج دیتا ہے کہ لائیں وہ توراۃ اور اسے پڑھیں اور بچشم خود دیکھ لیں کہ ان چیزوں کی حرمت کے اسباب صرف ان کے ساتھ مخصوص ہیں۔ یہ اسباب عام نوعیت کے نہیں ہیں۔ قُلْ فَأْتُوا بِالتَّوْرَاةِ فَاتْلُوهَا إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ .... "کہہ دو کہ اگر تم سچے ہو تو توراۃ لے آؤ' پڑھ کر بتاؤ۔"

اس کے بعد اللہ تعالیٰ انہیں متنبہ کرتے ہیں کہ ان میں سے جو لوگ اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں وہ ظالم ہیں۔ وہ نہ سچائی کے ساتھ انصاف کرتے ہیں' نہ خود اپنے آپ کے ساتھ انصاف کرتے ہیں اور نہ اس انسانیت کے ساتھ انصاف کرتے ہیں۔ اور ظالموں کی سزا بھی کسی سے چھپی ہوئی نہیں ہے۔ اس لئے یہاں قرآن کریم اس پر اکتفاء کرتا ہے کہ انہیں ظالم کہہ دے کیونکہ ظلم کے ساتھ ہی ان کے ظالم کا انجام متعین ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہ وہ افتراء اللہ تعالیٰ پر باندھ رہے ہیں حالانکہ وہ خود اللہ کے دربار میں حاضر ہونے والے ہیں۔ وہاں وہ کیا جواب دیں گے؟

○.....☆☆☆.....○

اہل کتاب کے اعتراضات میں سے ایک اعتراض تحویل قبلہ پر بھی تھا' یہ اعتراض بھی وہ بار بار دہراتے تھے۔ یہ اعتراض اس لئے

پیدا ہوا تھا کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت فرمائی تو مدینہ طیبہ میں آپ سولہ 'سترہ یا اٹھارہ مہینوں تک نماز بیت المقدس کی طرف منہ کر کے پڑھتے رہے تھے۔ باوجود اس کے کہ اس سے پہلے 'سورۂ بقرہ میں' اس موضوع پر تفصیلی بحث کی گئی تھی' اور بتایا گیا تھا کہ خانہ کعبہ دراصل حقیقی اور اصلی قبلہ تھا' اور بیت المقدس کو عارضی طور پر' بعض مصلحتوں کے تحت' قبلہ قرار دیا گیا تھا' جس کی وضاحت اللہ تعالیٰ نے اپنی جگہ کر دی تھی' لیکن اس اظہار حقیقت کے باوجود یہودی بار بار اسی اعتراض کو دہراتے رہتے تھے۔ یہ کام وہ اس لئے کرتے تھے کہ اہل ایمان کے دلوں میں فکری انتشار اور تشکیک پیدا کی جائے اور ایک واضح حقیقت کے اندر التباس پیدا کیا جائے۔ یہ کام آج ہمارے دور میں بھی' اسلامی نظریۂ حیات کے ہر موضوع کے بارے میں دشمنان دین کی جانب سے بڑے منظم طریقے سے کیا جاتا ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ از سر نو ان کے ان شبہات اور تلبیسات کی تردید فرماتے ہیں۔

قُلْ صَدَقَ اللّٰهُ ۗ فَاتَّبِعُوْا مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ۗ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۹۵﴾ اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِيْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّهُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۹۶﴾ فِيْهِ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبْرٰهِيْمَ ۚ وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا ۗ وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا ۗ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ

"کہو' اللہ نے جو کچھ فرمایا ہے' سچ فرمایا ہے' تم کو یکسو ہو کر ابراہیم کے طریقہ کی پیروی کرنی چاہئے' اور ابراہیم شرک کرنے والوں میں سے نہ تھا۔ بے شک سب سے پہلی عبادت گاہ' جو انسانوں کے لئے تعمیر ہوئی وہ وہی ہے جو مکہ میں واقع ہے۔ اس کو خیر و برکت دی گئی تھی اور تمام جہاں والوں کے لئے مرکز ہدایت بنایا گیا تھا۔ اس میں کھلی نشانیاں ہیں' ابراہیم کا مقام عبادت ہے اور اس کا حال یہ ہے کہ جو اس میں داخل ہوا مامون ہو گیا۔ لوگوں پر اللہ کا یہ حق ہے کہ جو اس گھر تک پہنچنے کی استطاعت رکھتا ہو' وہ اس کا حج کرے' اور جو کوئی اس حکم کی پیروی سے انکار کرے تو اسے معلوم ہو جانا چاہئے کہ اللہ تمام دنیا والوں سے بے نیاز ہے۔"

یہ الفاظ کہ "اللہ نے جو کچھ کہا سچ کہا" اس طرف اشارہ کرتے ہیں کہ اس بارے میں اللہ تعالیٰ نے اس سے پہلے جو وضاحت کر دی ہے وہ درست ہے یعنی یہ کہ خانہ کعبہ کو حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ نے اس لئے تعمیر فرمایا تھا کہ یہ لوگوں کے لئے زیارت گاہ ہو اور جائے امن و سلامتی ہو' اور اہل ایمان کے لئے قبلہ اور جائے عبادت ہو۔ اسی لئے یہاں حکم دیا جاتا ہے کہ تم حضرت ابراہیم کے طریقے کی پیروی کرو اور حضرت ابراہیمؑ کا طریقہ اور نظریۂ حیات ہمہ جہت توحیدی نظریہ تھا' جس میں شرک کا کوئی شائبہ نہ ہو۔ فَاتَّبِعُوْا مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ۗ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ .... "پس ابراہیم کے طریقے کی پیروی کرو اور وہ شرک کرنے والوں میں سے نہ تھا۔" یہودیوں کا زعم یہ تھا کہ وہ حضرت ابراہیمؑ کے وارث ہیں۔ چنانچہ قرآن کریم انہیں بتاتا ہے کہ یہ ہے دین ابراہیمی کی حقیقت۔ اور وہ دین یہ ہے کہ ہر قسم کے شرک سے نفرت کی جائے۔ اور یہاں اس حقیقت کا اظہار دو مرتبہ کیا گیا۔ ایک مرتبہ یہ کہہ کر وہ حنیف تھے۔ اور دوسری مرتبہ یہ کہہ کر کہ وہ مشرکین میں سے نہ تھے۔ اور یہود کا حال یہ ہے کہ وہ مشرک ہیں۔

اس کے بعد یہ فیصلہ کیا جاتا ہے کہ رو بقبلہ ہونا دین کے اصولوں میں سے ہے۔ اس لئے کہ اس کرۂ ارض پر یہ پہلا گھر ہے جو اللہ کی پرستش کے لئے تعمیر کیا گیا ہے۔ اور اسے ابتدائے تعمیر سے صرف اس مقصد کے لئے مخصوص کیا گیا ہے کہ وہ طواف کرنے والوں' عبادت کرنے والوں اور رکوع و سجود کرنے والوں کے لئے مخصوص رہے۔ نیز یہ ایک متبرک مقام ہے' اور وہ اس مفہوم میں جائے

ہدایت ہے کہ یہاں ملت ابراہیمی کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اور اس میں وہ واضح علامات ہیں کہ یہ ابراہیم کی جائے قیام ہے۔ ایک تفسیر یہ بھی ہے کہ اس سے مراد وہ تاریخی پتھر ہے جس پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کھڑے ہو کر خانہ کعبہ کی تعمیر فرماتے تھے۔ یہ خانہ کعبہ کے ساتھ متصل تھا۔ مگر خلیفہ راشد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے قدرے ہٹایا' تاکہ طواف کرنے والوں کی وجہ سے ان لوگوں کو تکلیف نہ ہو جو اس کے پاس نفل ادا کرتے ہیں۔ اس لئے کہ اہل اسلام کو حکم دیا گیا تھا کہ وہ اس کے پاس نماز پڑھیں وَاتَّخِذُوا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهِيْمَ مُصَلًّى .... "اور حضرت ابراہیم کے مقام کو جائے نماز بناؤ۔"

اس گھر کے فضائل میں سے یہاں ایک بات یہ بتائی جاتی ہے کہ اس گھر میں جو شخص داخل ہوا وہ پرامن رہے گا۔ اس لئے یہ گھر ہر اس شخص کے لئے امن کی جگہ ہے جو یہاں داخل ہو جائے۔ اور یہ حیثیت اس کرۂ ارض پر کسی دوسرے مقام کو حاصل نہیں ہے۔ اور اس کی یہ حیثیت اس وقت سے چلی آ رہی ہے جب سے اسے حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل نے تعمیر کیا۔ یہاں تک کہ عربوں کے دور جاہلیت میں بھی اسے یہ حیثیت حاصل رہی جبکہ وہ بالعموم دین ابراہیمی سے منحرف ہو گئے تھے اور وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرح خالص موحد نہ رہے تھے۔ حضرت حسن بصری کے قول کے مطابق اس برے دور میں بھی یہ احترام و مقام اسے حاصل تھا۔ وہ فرماتے ہیں کہ "ایک شخص اگر دوسرے کو قتل کر دیتا تو ایک اونی کپڑا اپنی گردن کے ارد گرد لپیٹ لیتا۔ اس حالت میں اسے اگر مقتول کا وارث بھی ملتا تو وہ اسے خانہ کعبہ میں کچھ نہ کہتا اور اس کے نکلنے کا انتظار کرتا۔" غرض اس بیت اللہ کو اس وقت بھی یہ اعزاز حاصل تھا جب اس کے ارد گرد کے لوگ جاہلیت میں ڈوبے ہوئے تھے۔ اللہ تعالیٰ اہل عرب پر اپنے احسانات جتلاتے ہوئے فرماتے ہیں اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا اٰمِنًا وَّيُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ .... "کیا یہ دیکھتے نہیں ہیں کہ ہم نے ایک پرامن حرم بنا دیا ہے حالانکہ ان کے گردوپیش لوگ اچک لے جاتے ہیں۔" (۲۹:۶۷)

اور یہ بھی خانہ کعبہ کے احترام کی ایک وجہ ہے کہ اس کے حدود کے اندر شکار کرنا حرام ہے اور وہاں پرندوں کو ان کے گھونسلوں سے نکالنا بھی ممنوع ہے۔ نیز وہاں کے درختوں کو کاٹنا بھی ممنوع ہے۔ **صحیحین** نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے (الفاظ مسلم کے ہیں) کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے دن فرمایا "اس شہر کو اللہ نے حرام قرار دیا ہے۔ اس وقت سے جب اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا۔ تو وہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے آئی ہوئی حرمت کی وجہ سے یہ تا روز قیامت حرام ہے۔ اس میں مجھ سے پہلے بھی کسی کے لئے جنگ کرنا جائز قرار نہیں دیا گیا۔ میرے لئے بھی صرف دن کے ایک تھوڑے سے وقت کے لئے جائز کیا گیا۔ لہٰذا وہ اللہ کی جانب سے آئی ہوئی اس حرمت کی وجہ سے تا روز قیامت حرام ہو گا۔ اس کی جھاڑیوں کو نہ کاٹا جائے گا' اس کے شکار کو نہ بھگایا جائے گا' وہاں کسی گم شدہ چیز کو نہ اٹھایا جائے' الا یہ کہ معلوم ہو کہ کس کی ہے' اور اس کی گھاس کو نہ کاٹا جائے گا...."

یہ ہے وہ خانہ خدا جسے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے لئے چنا ہے۔ اور یہ اس کا وہ گھر ہے' جسے اس نے یہ شرافت عطا کی۔ اس کرۂ ارض پر یہ وہ پہلا گھر ہے جو صرف عبادت کے لئے بنایا گیا ہے۔ یہ ان کے باپ حضرت ابراہیم کا گھر ہے اور اس کے اندر ایسی علامات اور شواہد موجود ہیں جو اس بات پر گواہ ہیں کہ اسے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تعمیر فرمایا۔ اسلام بھی ملت ابراہیمی کے ساتھ وابستہ ہے۔ اس لئے حضرت ابراہیم کا تعمیر کردہ بیت اللہ' سب سے زیادہ اس بات کا مستحق ہے کہ مسلمان اس کی طرف متوجہ ہوں' جو زمین میں جائے امن ہے' اس میں لوگوں کے لئے سامان ہدایت ہے اور دین اسلام کا یہ ایک مرکز ہے۔

چنانچہ یہاں یہ طے کر دیا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے لوگوں پر بیت اللہ کا حج کرنا فرض کر دیا ہے بشرطیکہ کسی کی استطاعت ہو اور اگر استطاعت کے باوجود کوئی حج نہ کرے گا تو گویا وہ کفر کا ارتکاب کرے گا۔

فِيْهِ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبْرٰهِيْمَ ۚ۬ وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا ؕ وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا ؕ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۹۷﴾

"لوگوں پر اللہ کا یہ حق ہے کہ جو اس گھر تک پہنچنے کی استطاعت رکھتا ہو وہ اس کا حج کرے' اور جو کوئی اس حکم کی پیروی سے انکار کرے تو اسے معلوم ہونا چاہئے کہ اللہ تمام دنیا والوں سے بے نیاز ہے۔"

یہاں انداز تعبیر قابل توجہ ہے' فرضیت حج نہایت ہی عموم اور شمول پر مشتمل ہے۔ اس کے لئے علی الناس "تمام لوگوں پر" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے' اس میں پہلا اشارہ تو یہ ہے کہ یہ حج ان یہودیوں پر بھی فرض کیا گیا ہے جو اس وقت حضور اکرم ﷺ کے ساتھ مناظرہ اور محاربہ کر رہے ہیں کہ کیوں مسلمانوں نے اس کی طرف منہ کر کے عبادت کرنا شروع کر دیا ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے خود اہل کتاب سے بھی یہی مطالبہ ہے کہ وہ اس گھر کا حج کریں۔ اس کی طرف متوجہ ہوں' کیونکہ یہ ان کے باپ ابراہیم کا تعمیر کردہ ہے اور پھر اس کرۂ ارض پر یہ پہلا گھر ہے خدا کا اور جو صرف اس کی عبادت کے لئے تعمیر کیا گیا ہے۔ اس لئے اعتراض کرنے والے یہودی اپنے فرائض سے انحراف کر رہے ہیں' یہ تقصیر ہیں اور اللہ کی معصیت کر رہے ہیں۔ اور اس عمومیت میں دوسرا اشارہ اس طرف ہے کہ تمام لوگوں سے مطالبہ یہ ہے کہ اس دین کا اقرار کر لیں اور اس دین کے فرائض اور شعائر ادا کریں۔ اور وہ بھی خانہ کعبہ کی طرف متوجہ ہوں اور حج کریں جس طرح اہل ایمان کر رہے ہیں۔ اور اگر یہ سب لوگ ایسا نہ کریں گے تو گویا وہ کفر کا ارتکاب کر رہے ہیں۔ اگرچہ وہ زبانی طور پر یہ دعویٰ کریں کہ وہ اس دین پر ہیں اور اللہ تمام جہان والوں سے بے نیاز ہے' اسے قطعاً اس بات کی ضرورت نہیں ہے کہ سب لوگ ایمان لائیں یا سب لوگ حج کے لئے جائیں۔ حج میں تو ان کے لئے مصلحت ہے' صرف ان کی فلاح ہے۔ انہیں چاہئے کہ وہ ایمان لائیں اور اللہ کی عبادت کریں۔

حج پوری عمر میں ایک بار فرض ہے اور یہ فرض اس وقت عائد ہو جاتا ہے جب انسان کو اس کی استطاعت ہو جائے' جس میں ذاتی صحت' سفر کا امکان اور راستوں کا امن وامان شامل ہیں۔ اس کی فرضیت کے وقت میں اختلاف ہے۔ وہ لوگ جن کا خیال ہے کہ یہ آیات ۹ ہجری میں نازل ہوئیں جسے عام الوفود کہا جاتا ہے' اور اس سلسلے میں بعض روایات بھی وارد ہیں یا ان کی رائے یہ ہے کہ ۹ ہجری میں حج فرض ہوا ہے۔ ان کا استدلال اس سے بھی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ۹ ہجری کے بعد ہی حج فرمایا۔ اس سے قبل جلد دوئم میں تحویل قبلہ سے بحث کرتے ہوئے ہم نے یہ کہا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے حج میں تاخیر اس بات کی دلیل نہیں ہو سکتی کہ حج کی فرضیت ہی بعد میں ہوئی۔ ہو سکتا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض مصروفیات اور مخصوص حالات کی وجہ سے حج کو مؤخر فرمایا ہو۔ مثلاً یہ کہ مشرکین حج کے موقعہ پر ننگے ہو کر حج کرتے تھے' اور یہ حرکت وہ فتح مکہ کے بعد تک کرتے رہے۔ چنانچہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے لوگوں کے ساتھ اختلاط کو ناپسند فرمایا ہو اور جب ۹ ہجری میں سورت براۃ نازل ہوئی اور مشرکین کے لئے طواف کعبہ حرام قرار دے دیا گیا تو اس کے بعد اگلے سال حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود حج ادا فرمایا۔ اس لئے یہ ممکن ہے کہ حج اس سے پہلے فرض ہو چکا ہو۔ اور یہ سورت ہجرت کے ابتدائی زمانہ میں نازل ہوئی ہو مثلاً غزوۂ احد کے قریب۔

بہرحال جس وقت بھی حج فرض ہوا ہو' اس کی فرضیت اسی نص قاطع کے ذریعہ ہوئی ہے۔ یعنی حج ان تمام لوگوں پر فرض ہے جو

راستے کی استطاعت رکھتے ہو۔ حج مسلمانوں کا ایک عام سالانہ اجتماع ہے' وہ اس گھر کے پاس جمع ہوتے ہیں' جہاں سے دعوت اسلامی کا آغاز ہوا' جہاں سے ان کے باپ حضرت ابراہیم کی ملت کا بھی آغاز ہوا' اور جسے حضرت ابراہیم نے خدا کی عبادت کے لئے پہلا گھر قرار دیا۔ اس لئے حج ایک نہایت ہی بامقصد اجتماع ہے' اس کی کچھ خاص یادیں ہیں اور ان تمام یادوں کا محور یہ بات ہے کہ انسان کا اپنے رب کے ساتھ رابطہ خاص پیدا ہو' انسان کی روح اللہ کی پکار پر لبیک کہے' اس لئے کہ اس روح کی وجہ سے انسان' انسان بنا ہے۔ یہ ایک ایسا مقصد ہے جس پر تمام انسانوں کو جمع ہونا چاہئے اور وہ ہر سال اس گھر میں جمع ہوں جہاں سے کبھی خالص "انسانی روحانی اجتماع" کی دعوت کا آغاز ہوا تھا اور یہ دعوت خالص انسانی بنیادوں پر تھی۔

○.....☆☆☆.....○

اس بیان کے بعد اب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تلقین کی جاتی ہے کہ وہ اہل کتاب کو ذرا سختی سے متوجہ کریں اور انہوں نے جانتے بوجھتے جو غلط موقف اختیار کیا ہے وہ ان کے لئے خوفناک ثابت ہو گا۔ وہ لوگوں کو قبول حق سے روکتے ہیں' آیات الٰہی کا انکار کرتے ہیں حالانکہ ان آیات کی صداقت پر وہ خود گواہ ہیں اور انہیں پورا پورا یقین ہے کہ یہ آیات سچائی پر مبنی ہیں۔

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۖ وَاللّٰهُ شَهِيْدٌ عَلٰى مَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۸﴾ قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ تَبْغُوْنَهَا عِوَجًا وَّ اَنْتُمْ شُهَدَآءُ ۭ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۹﴾

"کہو اے اہل کتاب تم کیوں اللہ کی آیات ماننے سے انکار کرتے ہو؟ جو حرکتیں تم کر رہے ہو اللہ سب کچھ دیکھ رہا ہے' کہو اے اہل کتاب یہ تمہاری کیا روش ہے کہ جو اللہ کی بات مانتا ہے اسے بھی تم اللہ کے راستے سے روکتے ہو اور چاہتے ہو کہ وہ ٹیڑھی راہ چلے' حالانکہ تم خود اس پر گواہ ہو' تمہاری حرکتوں سے اللہ غافل نہیں ہے۔"

یہ تہدید اور اس قسم کا ڈراوا اس سورت میں اور ایسی ہی دوسری سورتوں میں بار بار آیا ہے۔ اس کا پہلا اثر یہ مرتب ہوتا ہے کہ اہل کتاب کو اپنے موقف کی اصلیت کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور ان کی اصل حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو بڑا مومن اور بڑا دیندار ظاہر کرتے ہیں' جبکہ فی الحقیقت وہ اہل کفر میں سے ہیں' کیونکہ وہ خدا کی نازل کردہ آیات قرآنی کا انکار کرتے ہیں۔ اس لئے جو شخص اللہ کے کسی بھی جزء کا انکار کرے گا گویا وہ سب کتاب کا انکار کرے گا۔ اس کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ اگر وہ خود ان کے پاس محفوظ کتاب پر ایمان لائے ہوتے تو وہ لازماً ہر آنے والے رسول پر نازل ہونے والی ہدایات پر ایمان لائے ہوتے۔ اس لئے کہ دین کی حقیقت ایک ہے۔ جو شخص بھی اس حقیقت کو پالے وہ ان تمام رسولوں پر ایمان لائے گا جو بعد میں آئیں اور ان سے بیعت لیں۔ یہ ایک ایسی خوفناک حقیقت ہے جس سے چاہئے کہ وہ کانپ اٹھیں اور انہیں ان کی عاقبت کے بارے میں شک لاحق ہو جائے اور وہ اپنے انجام کی فکر کریں۔

اس کا دوسرا اثر یہ ہے کہ جماعت مسلمہ میں سے بعض لوگ جو اہل کتاب سے ان کے اہل کتاب ہونے کی وجہ سے دھوکہ کھاتے تھے' ان کی آنکھیں بھی کھل جاتی ہیں کہ اللہ خود اہل کتاب کی حقیقت ان کے سامنے کھول کر بیان فرماتے ہیں اور ان پر صریحاً" کفر کا فتویٰ دیتے ہیں' اس لئے اس کے بعد کسی کے لئے کسی قسم کے شک کی کوئی گنجائش ہی نہیں رہتی کہ اہل کتاب غلط ہیں اور اہل اسلام سچے ہیں۔

اللہ تعالیٰ ان کو اس قدر شدید الفاظ میں ڈراتے ہیں جن سے دل دہل جاتے ہیں۔ وَاللّٰهُ شَهِيدٌ عَلَىٰ مَا تَعْمَلُونَ............ "اللہ ان تمام حرکتوں پر نظر رکھے ہوئے ہے جو تم کر رہے ہو۔" اور وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ............ "تمہاری حرکتوں سے اللہ غافل نہیں ہے۔" یہ ایک خوفناک تنبیہہ ہے۔ جب ایک انسان اس بات کو محسوس کر لے کہ اس کے اعمال پر اللہ گواہ ہے اور یہ کہ وہ اس کے اعمال سے غافل نہیں ہے اور عمل بھی کیسا؟ خالص کفر' خالص دھوکہ' خالص فساد اور خالص گمراہ کرنا تو اس کے دل میں خوف کا پیدا ہونا قدرتی امر ہے۔

اللہ تعالیٰ اس حقیقت کو ریکارڈ پر لاتے ہیں کہ وہ جس حق کا انکار کرتے ہیں درحقیقت وہ جانتے بوجھتے ایسا کرتے ہیں۔ اور سمجھتے ہوئے لوگوں کو اس حق سے دور روکتے ہیں۔ جبکہ وہ وَّاَنْتُمْ شُهَدَآءُ ط........ "حالانکہ تم اس پر گواہ ہو۔" یعنی انہیں اس بات پر پورا یقین تھا کہ وہ جس حقیقت کو جھٹلا رہے ہیں وہ حق ہے اور وہ جس بات سے عوام الناس کو روکتے ہیں اس میں ان کی بھلائی ہے۔ اور ان کا یہ رویہ انتہائی قابل نفرت ہے۔ اس لئے ایسے کردار والے کسی شخص پر نہ تو کوئی اعتماد کرنا مناسب ہے اور نہ ایسے شخص کا ہمنشیں ہونا مناسب ہے۔ ایسے شخص کا صحیح علاج یہ ہے کہ اس کے ساتھ پوری طرح نفرت کا مظاہرہ کیا جائے اور اس پر بھرپور تنقید کی جائے۔

اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کا تعارف ان الفاظ میں کیا ہے۔ لِمَ تَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ تَبْغُونَهَا عِوَجًا .... "یہ تمہاری کیا روش ہے کہ جو اللہ کی بات مانتا ہے اسے تم اللہ کے راستے سے روکتے ہو اور چاہتے ہو کہ وہ ٹیڑھی راہ چلے۔" یہ ایک بامعنی جائزہ ہے۔ اور اس میں بہت بڑا راز ہے۔ یعنی اللہ کا راستہ تو بالکل سیدھا راستہ ہے اور اس کے علاوہ جو راستے ہیں وہ سب کے سب ٹیڑھے راستے ہیں۔ اور جب لوگوں کو سیدھے راستے سے روکا گیا اور جب ابھی ایمان کو اسلامی نظام حیات سے محروم کیا گیا تو تمام انسانی امور میں استقامت اور سیدھ ختم ہو جائے گی اور حسن و قبح کے پیمانے صحیح و سلامت نہ رہیں گے۔ اور اس زمین کے نظام کا ہر شعبہ ٹیڑھا ہو جائے گا۔ یہ ایک عظیم فساد ہو گا' نظام فطرت میں فساد برپا ہو گا کیونکہ نظام فطرت کی خلاف ورزی ہو گی' انسانی زندگی میں فساد اس لئے ہو گا کہ یہ زندگی ٹیڑھ پر قائم ہو گی' اور یہ عظیم فساد اس لئے رونما ہو گا کہ لوگوں کو اسلامی نظام حیات سے روک دیا گیا ہو گا۔ پھر یہ فساد انسانی تصورات میں بھی برپا ہو گا' انسانی ضمیر میں بھی فساد ہو گا' انسانی اخلاق میں بھی فساد ہو گا' انسانی طرز عمل میں فساد ہو گا' انسانی روابط میں فساد ہو گا' انسانی معاملات میں فساد ہو گا۔ غرض ان تمام روابط میں فساد ہو گا جو ایک انسان اور دوسرے انسان کے درمیان پیدا ہوں گے۔ نیز یہ فساد ان کے اور اس نظام کائنات میں بھی برپا ہو گا جس کائنات میں انسان رہتے ہیں۔

پس لوگ یا تو اسلامی نظام زندگی کے تحت زندگی بسر کریں گے تو اس صورت میں وہ صراط مستقیم اور حالت صالحہ میں ہوں گے اور ان کے لئے بھلائی ہی بھلائی ہو گی یا پھر وہ ٹیڑھے اور منحنی راہوں پر چلیں گے ' تو اس صورت میں وہ ٹیڑھ' فساد اور شر میں مبتلا ہوں گے۔ دنیا میں یہی دو راستے ہیں اور یہی دو حالات ہیں جو بنی نوع انسان کی زندگی پر آ سکتے ہیں۔ ایک حالت یہ ہے کہ وہ اسلامی نظام زندگی کی شاہراہ پر گامزن ہوں تو پھر ان کے لئے خیر اور بہتری ہے اور یا وہ اس شاہراہ سے منحرف ہوں گے تو اس صورت حال میں شر و فساد ہی ان کا مقدر ہو گا۔

○.....☆☆☆.....○

یہاں آکر اہل کتاب کے ساتھ اب مناظرہ ختم ہوتا ہے۔ اب انہیں بھلا دیا جاتا ہے۔ اور اب خطاب جماعت مسلمہ سے ہو رہا ہے۔ اب امت مسلمہ کو ہدایات دی جا رہی ہیں۔ انہیں تنبیہہ کی جاتی ہے اور دشمن کی چالوں سے ڈرایا جاتا ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ جماعت مسلمہ

کے خصائص کیا ہیں' اس کا تصور حیات کیا ہے اور اس کا نظام زندگی کیا ہے' اور وہ کیا ذرائع ہیں جنہیں کام میں لاکر اس نظام زندگی کو بروئے کار لایا جاسکتا ہے؟

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓاْ إِن تُطِيعُواْ فَرِيقًا مِّنَ ٱلَّذِينَ أُوتُواْ ٱلْكِتَٰبَ يَرُدُّوكُم بَعْدَ إِيمَٰنِكُمْ كَٰفِرِينَ ﴿١٠٠﴾ وَكَيْفَ تَكْفُرُونَ وَأَنتُمْ تُتْلَىٰ عَلَيْكُمْ ءَايَٰتُ ٱللَّهِ وَفِيكُمْ رَسُولُهُۥ ۗ وَمَن يَعْتَصِم بِٱللَّهِ فَقَدْ هُدِىَ إِلَىٰ صِرَٰطٍ مُّسْتَقِيمٍ ﴿١٠١﴾

۱۰ ع۱۰ ۱

"اے ایمان لانے والو! اگر تم نے ان اہل کتاب میں سے ایک گروہ کی بات مانی تو یہ تمہیں ایمان سے پھر کفر کی طرف پھیر لے جائیں گے۔ تمہارے کفر کی طرف جانے کا اب کیا موقعہ باقی ہے جبکہ تم کو اللہ کی آیات سنائی جارہی ہیں۔ اور تمہارے درمیان اس کا رسول موجود ہے؟ جو اللہ کا دامن مضبوطی کے ساتھ تھامے گا وہ ضرور راہ راست پالے گا۔"

اس کرۂ ارض پر اس امت کو اس لئے اٹھایا گیا تھا کہ وہ اس زمین پر صرف اسلامی نظام زندگی کے برپا کرنے کے لئے اپنے لئے راہ متعین کرے۔ یہ امت ایک منفرد' ممتاز اور نمایاں امت ہے۔ اس کا وجود اسلامی نظام زندگی سے پھوٹا ہے' تاکہ وہ حیات انسانی کے اندر وہ رول ادا کرے جو اس کے سوا کوئی نہیں ادا کرتا۔ یہ امت اس لئے برپا کی گئی ہے کہ وہ اسلامی نظام زندگی کا اقرار کرے اور اسے عملی طور پر نافذ کرے' اور اس نظام کا نشان منزل نظر آرہا ہو۔ اس میں قرآن و سنت کی نصوص اور احکام عملاً زندگیوں میں چلتے پھرتے نظر آئیں' اسلامی نصوص انسانی شعور' انسانی اخلاق اور انسانی طرز عمل اور انسانی روابط میں عملاً نظر آئیں۔

امت مسلمہ کے برپا کرنے کا مقصد اس وقت تک پورا نہیں ہو سکتا' اس کی راہ اس وقت تک متعین نہیں ہو سکتی اور وہ انسانی زندگی میں یہ چمکدار اور خوبصورت اور ممتاز عملی زندگی اس وقت تک وجود میں نہیں لاسکتی جب تک وہ تمام ہدایات اللہ جل شانہ' سے اخذ نہ کرے اور جب انسانی قیادت اپنے تمام معاملات میں اللہ تعالیٰ کی راہنمائی کے اصول کو تسلیم نہ کرے۔ تمام انسانوں کی راہنمائی کا انکار نہ کردے' تمام انسانی اطاعتوں کو ترک نہ کردے اور تمام انسانوں کی پیروی ترک نہ کردے۔ اسے یا تو یہ تمام امور سرانجام دینے ہوں گے اور یا پھر اسے کفر' گمراہی اور راہ راست سے انحراف قبول کرنا ہو گا۔

یہ وہ اصول ہے جس کی تاکید قرآن مجید بتکرار کرتا ہے' اور مختلف مواقع پر کرتا ہے۔ اور یہی وہ اصول ہے جس پر جماعت مسلمہ کا شعور' اس کی سوچ' اس کے اخلاق پروان چڑھتے ہیں جہاں بھی اسے موقعہ ملے۔ ان مواقع میں سے ایک موقعہ یہ تھا' جس میں اہل کتاب حضور اکرم ﷺ کے ساتھ مباحثہ کر رہے تھے اور تحریک اسلامی کو مدینہ میں اہل کتاب کے مکر و فریب' خفیہ سازشوں اور عداوتوں کا مقابلہ کرنا پڑ رہا تھا۔ ہاں یہ ہدایات بہرحال مدینہ طیبہ کے ان مخصوص حالات کے ساتھ مخصوص نہیں ہیں۔ یہ ہدایات امت مسلمہ کے لئے دائمی ہدایات ہیں۔ ہر زمانے اور ہر دور اور ہر نسل کے لئے یہی ہدایات ہیں۔ اس لئے کہ امت مسلمہ کا یہ اصول حیات ہے اور یہی اس کا مقصد وجود ہے۔

اس امت کو اس لئے برپا کیا گیا ہے کہ وہ پوری انسانیت کی قیادت کرے۔ اب یہ کس منطق کی رو سے جائز ہے کہ وہ جاہلیت کی

پیروی کرے حالانکہ اس کا مقصد وجود ہی یہ ہے کہ وہ جاہلیت کا قلع قمع کرے اور اسے جڑ سے اکھاڑ پھینکے اور انسانوں کا رشتہ اللہ سے جوڑے۔ انسانوں کی قیادت اسلامی نظام زندگی کے مطابق کرے۔ اور جب یہ امت مسلمہ قیادت کے مقام سے گر جائے تو متصور ہو گا کہ امت مسلمہ کا وجود نہیں ہے۔ اور اگر اس کا کوئی وجود ہے بھی تو وہ بے مقصد وجود ہے۔ اسے تو اس لئے برپا کیا گیا تھا کہ وہ ایک صحیح تصور حیات کے مطابق انسانیت کی قیادت کرے۔ اس کا عقیدہ بالکل درست ہو' اس کا شعور استوار ہو' اس کے اخلاق معیاری ہوں' اس کا نظام مستحکم ہو اور اس کی تنظیم مضبوط ہو۔ صرف ایسے حالات ہی میں انسانی عقل نشوونما پا سکتی ہے اور اس کے لئے مزید راہیں میسر ہو سکتی ہیں۔ اور وہ اس پوری کائنات سے اچھی طرح متعارف ہو سکتی ہے۔ وہ اس کائنات کے بھیدوں سے آگاہ ہو سکتی ہے اور وہ اس کائنات کی قوتیں' اس کے ذخیروں اور خزانوں کو مسخر کر سکتی ہے۔ لیکن امت کی قیادت عالیہ جو تسخیر کائنات کا حکم دیتی ہے' وہ ان تمام قوتوں کو انسانیت کی بھلائی کے لئے استعمال میں لانے کا حکم دیتی ہے۔ وہ ان قوتوں کو مسخر کر کے انہیں اس کائنات کی تباہی اور اس کائنات کی بربادی کے لئے کام میں نہیں لاتی۔ اور نہ وہ ان قدرتی قوتوں کو اس سے دریافت کرتی ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ لذت حاصل کرے اور شہوات حیوانیہ میں گم ہو جائے۔ تسخیر کائنات کا مقصد صرف یہ ہے کہ امت اپنے ایمان باللہ کو مضبوط کرے' یہ تسخیر اللہ کی ہدایات کے مطابق ہو' اور اس معاملے میں وہ اللہ کے سوا کسی اور منبع سے ہدایات نہ لے۔

اس سبق میں اللہ تعالیٰ امت مسلمہ کو اس بات سے ڈراتے ہیں کہ وہ غیر اللہ کی اتباع کرے۔ اور یہ بتاتے ہیں کہ وہ کس طرح صحیح حالات پیدا کر سکتی ہے۔ اور کس طرح اپنے آپ کو بچا سکتی ہے۔ چنانچہ پہلا حکم یہ دیا جاتا ہے کہ امت مسلمہ اہل کتاب کی پیروی اور اطاعت نہ کرے' اگر وہ ایسا کرے گی تو اہل کتاب اسے کفر کی طرف لے جائیں گے اور اس کے سوا کوئی دوسری بات نہ ہو گی۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تُطِيْعُوْا فَرِيْقًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ يَرُدُّوْكُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ كٰفِرِيْنَ۝ وَكَيْفَ تَكْفُرُوْنَ وَاَنْتُمْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ اٰيٰتُ اللّٰهِ وَفِيْكُمْ رَسُوْلُهٗ ؕ وَمَنْ يَّعْتَصِمْ بِاللّٰهِ فَقَدْ هُدِيَ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ

"اے ایمان لانے والو! اگر تم نے ان اہل کتاب میں سے ایک گروہ کی بات مانی تو یہ تمہیں ایمان سے پھر کفر کی طرف پھیر لے جائیں گے۔ تمہارے لیے کفر کی طرف جانے کا اب کیا موقعہ باقی ہے جبکہ تم کو اللہ کی آیات سنائی جارہی ہیں۔ اور تمہارے درمیان اس کا رسول موجود ہے؟ جو اللہ کا دامن مضبوطی کے ساتھ تھامے گا وہ ضرور راہ راست پالے گا۔"

اہل کتاب کی اطاعت کرنا' اور ان سے ہدایات اخذ کرنا' ان کے اوضاع و اطوار کا نقل کرنا' اس بات کا ثبوت ہے کہ امت مسلمہ نے داخلی طور پر شکست قبول کر لی ہے اور اس نے اپنے اس مقام قیادت سے دست برداری کر لی ہے۔ نیز اس سے اسلامی نظام زندگی کی یہ صلاحیت بھی مشکوک ہو جاتی کہ وہ ہمارے دور میں زندگی کی راہنمائی' اس کی تنظیم' اس کی ترقی اور نشوونما کی اہلیت رکھتا ہے۔ اور یہ بات دراصل کفر خفی ہے جو نفس انسانی کے اندر سرایت کر جاتا ہے۔ یہ کفر غیر شعوری ہوتا ہے اور انسان اس کا خطرہ بھی محسوس نہیں کرتا ___ یہ تو اسلام کے نقطہ نظر سے بات تھی' رہی یہ بات کہ اہل کتاب کا نقطہ نظر کیا ہے؟ تو وہ دنیا میں سب سے زیادہ جس امر کے حریص ہیں وہ یہ ہے کہ وہ امت مسلمہ کو اپنے عقیدے سے پھیر دیں۔ اس لئے کہ امت مسلمہ کے لئے یہ عقیدہ صخرۂ نجات ہے۔ وہ اس کے لئے ایک دفاعی لائن ہے اور اس کی قوت اور شوکت کا اصل منبع ہے۔ اور اس امت کے دشمنوں کو اس راز کا بخوبی علم ہے۔ اس سے قبل بھی انہیں اس کا علم تھا اور آج بھی انہیں اس کا علم ہے۔ اور وہ اس امت کو اپنے عقائد و نظریات سے دور کرنے کے لئے ہر مکر اور ہر حیلہ

کام میں لاتے ہیں۔ وہ اس کام میں اپنی پوری توانائی اور اپنی پوری قوت صرف کرتے ہیں۔ اور جب وہ اس امت کا مقابلہ علی الاعلان نہیں کر سکتے تو وہ اس کے خلاف خفیہ مکروفریب کام میں لاتے ہیں اور جب یہ لوگ تنہا اس کام کو سرانجام دینے کے اہل نہیں رہتے تو پھر وہ اس کام میں ان منافقین سے امداد لیتے ہیں جو اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں اور اسلام کا اظہار کرتے ہیں لیکن وہ اپنی افواج منظم کر کے اسلامی قلعے کی دیواروں میں اندر سے نقب لگاتے ہیں اور لوگوں کو اسلام سے دور کرتے ہیں۔ اور ان کی نظروں میں ان نظامہائے زندگی کو حسین بناتے ہیں جو اسلامی نظام کے خلاف ہیں۔ ان کے لئے ایسے طریقے ایجاد کرتے ہیں جو اسلام کے خلاف ہیں اور اس امت پر ایسی قیادت مسلط کرتے ہیں جو اسلامی قیادت نہیں ہوتی۔

جب اہل کتاب دیکھتے ہیں کہ اہل اسلام میں سے انہیں ایسے افراد مل رہے ہیں جو ان کے تابع' ان کے پیروکار اور ان کی بات پر اچھی طرح کان دھرنے والے ہیں تو وہ ان لوگوں کی خدمات حاصل کرتے ہیں اور انہیں ان مقاصد کے لئے استعمال کرتے ہیں جن کے حصول کے لئے ان کی نیند حرام ہے تو وہ ان کو مقام قیادت دیں گے اور لوگوں کو ان کے پیچھے لگا دیں گے تاکہ یہ ایجنٹ پوری امت کو کفرو ضلال کے راستے پر ڈال دیں۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ فیصلہ کن اور دوٹوک بات آتی ہے۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ تُطِيعُوا فَرِيقًا مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ يَرُدُّوكُمْ بَعْدَ إِيمَانِكُمْ كَافِرِينَ

"اے ایمان لانے والو! اگر تم نے ان اہل کتاب میں سے ایک گروہ کی بات مانی تو یہ تمہیں ایمان سے پھر کفر کی طرف پھیر لے جائیں گے۔"

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں اہل اسلام اس امر سے زیادہ کسی اور چیز سے نہ گھبراتے تھے کہ وہ اسلام سے پلٹ کر پھر کفر کی طرف چلے جائیں۔ اور جنت کے مستحق ہو کر پھر جہنم کی طرف چلے جائیں۔ اور یہی صفت ہر سچے مومن کی ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس صورت میں یہ ڈراوا ایک ایسا تازیانہ ہے جس سے ضمیر گرم ہو گا۔ اور اس سے ڈرانے والے کی مشفق آواز سننے کے لئے سامع اچھی طرح آمادہ ہو جائے گا۔ اس کے ساتھ ساتھ ڈراوا اور یاد دہانی کے مضامین مسلسل جاری ہیں۔ کیا برا منکر حق ہے وہ شخص جو اہل ایمان کو ایمان لانے کے بعد بدراہ کرتا ہے۔ ایسے حالات میں کہ ان پر آیات الٰہی مسلسل پڑھی جارہی ہیں اور رسول خدا ان میں موجود ہیں اور وہ تمام محرکات موجود ہیں جو ایمان لانے کے باعث ہیں اور دعوت اسلامی مسلسل دی جارہی ہو اور کفر و ایمان کے دوراہے پر نور ایمان چھاہوا ہے۔

وَكَيْفَ تَكْفُرُونَ وَأَنْتُمْ تُتْلَى عَلَيْكُمْ آيَاتُ اللَّهِ وَفِيكُمْ رَسُولُهُ .... "تمہارے لئے کفر کی طرف جانے کا اب کیا موقعہ باقی ہے جب کہ تم کو اللہ کی آیات سنائی جارہی ہیں اور تمہارے درمیان اس کا رسول موجود ہے۔"

ہاں' ایسے حالات میں' ایمان لانے کے بعد کسی مومن کا کافر ہو جانا بے شک ایک عظیم امر ہے' اور جب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا وقت پورا کر لیا اور اپنے رفیق اعلیٰ کے ساتھ جا ملے تو اس صورت میں بھی آیات الٰہی موجود ہیں۔ اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم باقی ہے۔ آج ہم بھی ان آیات کے اسی طرح مخاطب ہیں جس طرح قرون اولیٰ کے لوگ مخاطب تھے۔ اور آج بھی کامیابی کی راہ واضح ہے اور کامیابی کے جھنڈے بلند ہیں۔ وَمَنْ يَعْتَصِمْ بِاللَّهِ فَقَدْ هُدِيَ إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ........

"اور جو اللہ کا دامن مضبوطی سے تھامے گا وہ ضرور راہ راست پالے گا۔"

ہاں' اللہ کا دامن تھام لینے میں ہی نجات ہے۔ اللہ جل شانہ' موجود ہیں۔ وہ زندہ اور قیوم ہیں رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم

صحابہ کرام پر 'اسلامی نظریۂ حیات' اسلامی عقائد اور اسلامی نظام زندگی کے سلسلے میں بہت زیادہ سختی فرماتے تھے۔ جبکہ زندگی کے خالص عملی اور تجربی امور میں آپ انہیں کھلا چھوڑتے تھے' یعنی ان امور میں جن میں حقیقت کا دارومدار تجربے پر موقوف ہوتا ہے مثلاً طریقہ ہائے زراعت' طریقہ ہائے جنگ و قتال اور ایسے ہی دوسرے امور جن کا تعلق خالص علمی اور تجرباتی امور سے ہوتا ہے اور جس میدان میں اسلامی نظریۂ حیات اور اسلامی عقائد کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ یا جن کا تعلق اسلامی نظام زندگی کے ساتھ نہیں ہوتا اور نہ ان کا تعلق انسان کی اجتماعی زندگی کے باہم روابط سے ہوتا ہے۔ اور ان دونوں امور کے درمیان زمین آسمان کا فرق ہے۔ اسلامی نظام زندگی ایک علیحدہ چیز ہے اور خالص علوم' تجرباتی امور اور دوسرے انطباقی معاملات ایک دوسری چیز ہے۔ اسلام کے نزول کا مقصد یہ ہے کہ انسانی زندگی کو اسلامی نظام کے مطابق چلایا جائے۔ یہ اسلام ہی ہے جس نے عقل انسانی کو ایسے کام میں لگایا اگر وہ علم و معرفت کی قوت سے نئی نئی مادی ایجادات سامنے لائے اور یہ کام اسلامی نظام زندگی کے دائرے کے اندر کیا جائے۔

امام احمد بن حنبلؒ ایک حدیث نقل کرتے ہیں۔ بروایت سفیانؒ' جابرؓ' شعبی عبداللہ بن ثابتؓ۔ وہ فرماتے ہیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور فرمایا! یا رسول اللہ' میں نے بنی قریظہ میں سے اپنے ایک یہودی بھائی کو کہا اور اس نے مجھے تورات سے بعض جامع چیزیں لکھ دیں' کیا میں وہ آپ کی خدمت میں پیش نہ کر دوں؟ فرماتے ہیں کہ یہ سنتے ہی رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ متغیر ہو گیا۔ عبداللہ بن ثابتؓ کہتے ہیں میں نے ان سے کہا کہ تم دیکھ نہیں رہے کہ رسول ؐ خدا کے چہرے پر کیا آثار ہیں؟ عمر نے کہا میں اس پر راضی ہوں کہ اللہ میرا رب ہے' اسلام میرا دین ہے اور محمد میرے رسول ہیں۔ کہتے ہیں کہ اس پر رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرے سے آثار غضب غائب ہو گئے اور آپ نے فرمایا "خدا کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے۔ اگر آج تم میں موسیٰ علیہ السلام آ جائے اور تم اس کی طاعت کرو مجھے چھوڑ دو تو تم یقیناً گمراہ ہو جاؤ گے۔ تمام امتوں میں سے تم میرا حصہ ہو اور میں تمام نبیوں میں سے تمہارا حصہ ہوں۔"

حافظ ابو یعلی نے حماد' شعبی کی روایت سے حضرت جابرؓ سے نقل کیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
"اہل کتاب سے کوئی مسئلہ دریافت نہ کرو' اس لئے کہ جب وہ خود گمراہ ہو گئے ہیں تو تمہیں کیسے ہدایت دے سکتے ہیں۔ اگر تم نے ان سے کوئی بات دریافت کی تو پھر یا تو تم کسی غلط بات کی تصدیق کرو گے اور یا پھر کسی صحیح بات کی تکذیب کرو گے۔ اور خدا کی قسم آج اگر تمہارے درمیان موسیٰ علیہ السلام بھی ہوتے تو ان کے لئے میری اتباع کے بغیر اور کوئی چارۂ کار نہ ہوتا اور بعض روایات میں ہے "اگر موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام زندہ ہوتے' تو ان دونوں کے لئے میرے اتباع کے سوا اور کوئی چارۂ کار ہی نہ ہوتا۔"

یہ لوگ ہیں اہل کتاب اور یہ ہیں رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام اس امر کے بارے میں کہ ان تمام امور میں جن کا تعلق عقائد و نظریات سے ہے یا جن کا تعلق نظام زندگی اور اسلامی قانون سے ہے' ان میں اہل کتاب سے مکمل اجتناب کرنا ہے۔ ہاں جن امور کا تعلق محض سائنسی علوم سے ہے تو ان میں اسلام کی روح اور اس کی واضح ہدایات کے مطابق تمام اقوام و ملل سے استفادہ جائز ہے' لیکن ان علوم کو بھی ایمانی نظام زندگی کے ساتھ مربوط کرنا ضروری ہے۔ اس شعور کے ساتھ کہ وہ ذات باری ہی ہے جس نے انسان کو اس فطرت کی تسخیر کی قوت دی ہے۔ اس نے فطرت کا رخ تبدیل کیا اور انسانیت کی بھلائی کے لئے اسے استعمال کیا اور انسانیت کے لئے امن و سکون اور سہولیات کا انتظام کیا۔ لہٰذا وہ اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں کہ اس نے ان کائناتی قوتوں کو مسخر کرنے کی طاعت ہمیں عنایت فرمائی اور شکر کا ایک طریقہ یہ ہے کہ ہر معاملے میں اس کی بندگی کی جائے اور پھر اس علم و معرفت اور تسخیر کائنات کو انسانیت کی بھلائی کے لئے استعمال کیا جائے۔

رہا ایمانی تصور حیات کا موضوع' اس کائنات کی تخلیق کی بابت نظریات' وجود انسانی کے مقاصد انسانی نظام زندگی اور اس کی تنظیمات اور قوانین' انسان کا اخلاقی نظام اور اس کا طرز عمل تو ان تمام موضوعات میں کسی غیر اسلامی منبع فکر سے کوئی بات اخذ کرنے سے حضور نے منع فرمایا' جس کی وجہ سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ مبارک متغیر ہوا تھا۔ حالانکہ وہ معمولی بات تھی' لیکن اللہ تعالیٰ نے امت مسلمہ کو اس سے بڑی سختی سے ڈرایا کہ اگر وہ ایسا کریں گے تو یہ واضح کفر کا ارتکاب ہو گا۔

یہ ہے اللہ کی ہدایت اور یہ ہے اسوۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ رہے ہم لوگ جو دعوائے اسلام کرتے چلے جا رہے ہیں تو ہمارا حال یہ ہے کہ ہم اپنے علم کے اصول یعنی قرآن اور حدیث کی تعلیم بھی مستشرقین سے حاصل کرتے ہیں یا مستشرقین کے شاگردوں سے حاصل کرتے ہیں اور ذرا غور کیجئے کہ ہم اپنے لئے فلسفہ حیات اور وجود انسانی اور حیات انسانی کے آغاز کے نظریات بھی ان لوگوں سے اخذ کرتے ہیں یا پھر یونانی' روسی اور یورپین اور امریکی فلاسفہ سے یہ نظریات اخذ کرتے ہیں اور پھر ذرا ملاحظہ کیجئے کہ ہم اپنا نظام حیات' اپنے ضوابط اور قوانین بھی ان جعلی مصادر سے اخذ کرتے ہیں۔ ہم اپنا طرز عمل' اپنے اخلاق اور اپنے آداب بھی اس گندے تالاب سے اخذ کرتے ہیں جو نہایت ہی گندہ ہے اور جس میں جدید مادی تہذیب وتمدن کی گندگی جمع ہو چکی ہے' جو ہر قسم کے دینی تصورات سے عاری ہے۔ چاہے وہ اسلام کے سوا کوئی اور دین ہی کیوں نہ ہو۔ اس کے باوجود ہم اس زعم میں مبتلا ہیں کہ ہم مسلمان ہیں۔ یہ ایک ایسا زعم ہے جس کا گناہ کفر صریح کے گناہ سے زیادہ ہے۔ اس لئے کہ ایسا زعم باطل رکھ کر گویا ہم یہ اقرار کرتے ہیں کہ آج کے دور میں اسلامی نظام زندگی کامیاب نہیں ہے یا اگر کامیاب ہے تو گویا ہم نے اسلام کی شکل مسخ کر کے موجودہ طرز عمل کو اسلام سمجھ رکھا ہے۔ اور ہم ان امور کی گواہی دے رہے ہیں جبکہ جو لوگ اس زعم میں مبتلا نہیں ہیں وہ دراصل ایسی شہادت نہیں دے رہے۔

حقیقت یہ ہے اور اسے گرہ میں باندھنا چاہئے کہ اسلام ایک ضابطہ حیات ہے۔ وہ چند ممتاز خصوصیات کا حامل نظام ہے۔ اعتقادی تصورات کے اعتبار سے بھی' نظام زندگی اور نظام قانون کے اعتبار سے بھی اور اپنے اخلاقی قواعد و اصول کے اعتبار سے بھی' جس پر ہمارے اجتماعی روابط قائم ہوتے ہیں اور یہ دین انہیں ترک نہیں کرنا چاہئے۔ یہ روابط سیاسی ہوں' اقتصادی ہوں یا اجتماعی ہوں ___ پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ یہ نظام پوری انسانیت کی قیادت کے منصب کا بھی مدعی ہے۔ لہٰذا اس کا ضروری منطقی اور لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اس کرۂ ارض پر ایک ایسی انقلابی جماعت ہو' جو اس نظام کے جھنڈے اٹھائے اور انسانیت کی راہنمائی کرے۔ اور جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا اسلامی نظام کے اس قائدانہ دعویٰ کے مزاج کے ساتھ یہ امر مطابقت نہیں رکھتا کہ مسلمان دوسری ملل سے کوئی استفادہ کریں یا ان سے ہدایات لیں۔

پھر یہ حقیقت بھی ہر وقت نظروں کے سامنے رہے کہ جب یہ دین آیا تھا تو یہ پوری انسانیت کی بھلائی کے لئے آیا تھا۔ اور آج جو لوگ اس نظام کی حکمرانی کی طرف لوگوں کو دعوت دیتے ہیں وہ بھی پوری انسانیت کی بھلائی کے لئے دے رہے ہیں۔ کل بھی جو شخص اس دعوت کا حامل ہو گا وہ بھی اسی مقصد کے لئے ہو گا۔ بلکہ انسانیت جن ظالمانہ نظامہائے زندگی کے نیچے پس رہی ہے' اور جسے ہم چشم سر سے دیکھ رہے ہیں اسے اسلام کے عادلانہ نظام زندگی کی اشد ضرورت ہے۔ اس الٰہی نظام زندگی کے سوا اور کوئی راہ نہیں ہے جس پر انسانیت کو نجات ملے۔ لہٰذا اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ اسلامی نظام زندگی اپنی تمام خصوصیات کو محفوظ اور زندہ رکھے۔ اور پوری انسانیت کے اندر قائدانہ مقام حاصل کرے اور اسے ایک بار پھر اس دنیا میں مصائب اور مشکلات سے نجات دے۔

اس وقت انسانیت نے تسخیر کائنات کے سلسلے میں جو جدوجہد کی ہے اور مختلف میدانوں میں کامیابیاں حاصل کی ہیں۔ اور طب اور صنعت کے میدان میں جو حقائق فراہم کئے ہیں وہ ماضی کے مقابلے میں معجزانہ ہیں اور انسانیت ان میدانوں میں مسلسل پیش قدمی کر رہی

ہے۔ اور نئی نئی فتوحات حاصل کر رہی ہے لیکن ان سب فتوحات کا اس کی زندگی پر کیا اثر ہے؟ اس کی نفسیاتی دنیا کا حال کیا ہے؟ کیا اس میدان میں بھی وہ خوشحال ہے؟ کیا اسے اطمینان قلب حاصل ہے؟ کیا اس کی زندگی پرامن ہے؟ ہرگز نہیں۔ وہ اس وقت ہمہ گیر بدبختی' بے چینی اور خوف کا شکار ہے۔ وہ اعصابی اور نفسیاتی بیماریوں میں مبتلا ہے۔ وہ بے راہ روی اور جرائم کی وسیع دلدل میں پھنسی ہوئی ہے۔ لیکن اس نے انسانیت' حیات انسانی کے مقصد وجود اور انسان کے مقصد تخلیق کے میدان میں کوئی ترقی نہیں کی۔ اس لئے کہ آج جب ہم جدید تہذیب کے فرزند کی ذہنی دنیا کا مطالعہ کرتے ہیں اور معلوم کرتے ہیں کہ اس کے نزدیک تخلیق انسان کا مقصد کیا ہے تو وہ اسلامی تصور حیات کے مقابلے میں اس میدان میں بالکل مفلس اور پسماندہ اور بونا نظر آتا ہے۔ بلکہ اس میدان میں یوں نظر آتا ہے کہ اسے ایک لعنت گھیرے ہوئے ہے' جس میں انسان خود اپنی ذات' اس کائنات میں اپنے مقام کو گراتا چلا جاتا ہے۔ اور اس گراوٹ کے نتیجے میں انسان کی ترجیحات اور اس کی دلچسپیاں بھی گر جاتی ہیں...... یوں انسان اپنی زندگی میں ایک خلاء محسوس کرتا ہے اور یہ خلا اس تھکے ہوئے انسان کے دل کو کھا جاتا ہے۔ حیرانی و پریشانی میں اس کی روح ہلاک ہو رہی ہے۔ یہ محض اس لئے کہ اس کی روح میں تصور الہ نہیں ہے اور تصور الہ سے شدید معاشی حالات نے اسے دور کر دیا ہے۔ اور غلط علمی تصورات نے اسے گمراہ کر دیا ہے۔ یہی علم اگر اسلامی نظام حیات کے رنگ میں ترقی کرتا' تو اس کی ہر کامرانی انسان کو قدر کے قریب تر کر دیتی' لیکن جدید انسانیت کا حال یہ ہے کہ وہ جس قدر علمی میدان میں آگے بڑھتی ہے' وہ اپنی بجھی ہوئی اور شکست خوردہ روح کی وجہ معرفت خدا سے اور دور ہوتی جاتی ہے۔ وہ اس نور سے محروم ہے جس میں اسے اپنا حقیقی مقصد وجود نظر آئے' اور وہ اس مقصد کی طرف اپنی اس علمی قوت کے ساتھ آگے بڑھے' جو اسے خود اللہ نے عطا فرمایا ہے۔ اور جس استعداد کی وجہ سے وہ یہ علمی ترقی کر رہا ہے وہ بھی اسے اللہ کی عطا کردہ ہی تو ہے۔ چنانچہ انسانیت اس نظام حیات کو نہیں پا رہی ہے جو اس کی حرکت اور اس کائنات کی حرکت کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرے' اس کی فطرت اور اس کائنات کی فطرت کے درمیان تطابق پیدا کرے' اس کے قوانین اور قوانین قدرت کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرے' ایسا نظام جو اس کی قوتوں اور صلاحیتوں کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرے' جو اس کی دنیا اور آخرت کے درمیان جوڑ پیدا کرے' جو ایک فرد اور ایک جماعت کے حقوق کے اندر' توازن پیدا کرے' جو اس کے فرائض اور واجبات کے درمیان عدل پیدا کرے اور یہ سب کام نہایت ہی ترتیب کے ساتھ قدرتی طور پر' جامعیت کے ساتھ اور خوشگوار انداز میں سرانجام پائیں۔

ہمارے دور میں بعض لوگ اسلامی نظام زندگی سے محروم ہو کر کام کرتے ہیں اور جو لوگ اس دور میں اسلامی نظام زندگی کی بات کرتے ہیں اور پرامید نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہیں' انہیں یہ لوگ رجعت پسندی کا طعنہ دیتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اسلامی نظام حیات کی بات کرنے والے دراصل تاریخ اسلامی کے گزشتہ ایک مختصر سنہری دور کی محض آرزو اپنے دلوں کے اندر بسائے ہوئے ہیں' لیکن وہ اسلامی نظام کے حوالے سے' اپنی جہالت کی وجہ سے یا اپنی بدنیتی کی وجہ سے انسانیت کو اسلامی نظام زندگی کی قیادت سے محروم کئے ہوئے ہیں جو ان کی راہنمائی بڑی خوبی' امن و سلامتی اور سکون و اطمینان کی طرف کر سکتا ہے۔ جو ان کی راہنمائی دنیاوی ترقی اور خوشحالی کی طرف کر سکتا ہے۔

ہم جو اسلامی نظام زندگی کی طرف دعوت دیتے ہیں اچھی طرح جانتے ہیں کہ ہم کس چیز کی طرف انسانیت کو بلا رہے ہیں۔ ہم اس انسانیت کو اس کی حقیقی تلخیوں میں دیکھ رہے ہیں۔ ہم اس گندے تالاب کا متعفن رائحہ محسوس کر رہے ہیں جس میں انسانیت لت پت ہے لیکن دور بلند افق پر نجات کے جھنڈے لہرا رہے ہیں جو صحراء کی تپش میں جھلسنے والی تھکی ماندی انسانیت کو نجات کی چمک دکھا رہے ہیں اور یہ پاک وصاف اور روشن چوٹی' اس گندے تالاب میں انسانیت کو اپنی طرف بلا رہی ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ اگر انسانیت کے قائدین نے

اس نظام زندگی کو قبول نہ کیا تو انسانیت پوری انسانی تاریخ میں توہین آمیز مصیبت کا شکار ہوگی اور یہ پوری انسانی تاریخ میں بدترین مصیبت ہوگی اور ہر مفہوم کے اعتبار سے بدی ہوگی۔

اس راہ میں پہلا اقدام یہ ہونا چاہئے کہ یہ نظام زندگی ممتاز اور منفرد ہو اور اس کے حاملین' اس کے اردگرد پھیلی جاہلیت سے کوئی راہنمائی حاصل نہ کریں اور یہ نظام مسلسل پاک اور صاف موجود رہے۔ یہاں تک کہ اللہ کے اذن سے دوبارہ پوری انسانیت کی قیادت سنبھالے۔ اللہ بڑا رحیم و کریم ہے اور وہ انسانوں کو ہمیشہ کے لئے انسان کے دشمنوں کے رحم و کرم پر نہ چھوڑے گا' جو جگہ جگہ انسانوں کو جاہلیت کی طرف بلاتے ہیں۔ یہی وہ نکتہ ہے جس کی تلقین اللہ تعالیٰ' پہلی جماعت مسلمہ کو اپنی کتاب میں کر رہے ہیں اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنی تعلیمات میں اس نکتے کی بار بار تلقین فرمائی۔

○.....☆☆☆.....○

اس تنبیہ اور خبرداری کے بعد کہ اہل کتاب سے کوئی ہدایت اخذ نہ کی جائے' ان کی اطاعت اور اتباع نہ کیا جائے' اب جماعت مسلمہ کو یہ تلقین کی جاتی ہے کہ اس کی زندگی اور اس کی زندگی کا نظام حیات دو اساسی قواعد پر مبنی ہے۔ یہ ایسے قواعد ہیں جن کو مدنظر رکھنا اس کے لئے اس بار امانت کی اٹھانے کے لئے ضروری ہے' جس کی ذمہ داری اللہ نے اس کے سپرد کی ہے اور جس کی خاطر اللہ تعالیٰ اس امت کو وجود میں لایا ہے۔ یہ دونوں اساسی قواعد ایک دوسرے کے ساتھ لازم و ملزوم ہیں یعنی اخوت اور ایمان۔ یعنی اللہ پر ایمان لانا' اس سے ڈرنا اور تمام امور حیات میں ہر وقت اور ہر لحظہ اسے یاد رکھنا۔ اور ان تمام لوگوں کے ساتھ اخوت رکھنا جو اس مفہوم میں مومن باللہ ہوں۔ وہ اخوت جس کی وجہ سے جماعت مسلمہ زندہ' قوی اور مستحکم بنیاد بن جاتی ہے اور یوں وہ اس عظیم کردار کے ادا کرنے کے قابل ہو جاتی ہے جو اسے انسانی زندگی اور انسانی تاریخ میں ادا کرنا ہے یعنی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ اور اس دنیا کے نظام حیات کو معروف پر قائم کرنا اور منکر کی آلودگی سے اسے پاک کرنا۔ فرماتے ہیں: ☆☆☆☆☆☆☆

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تُقَاتِهِ وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنْتُمْ مُسْلِمُونَ ﴿١٠٢﴾ وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا ۚ وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنْتُمْ أَعْدَاءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا وَكُنْتُمْ عَلَىٰ شَفَا حُفْرَةٍ مِنَ النَّارِ فَأَنْقَذَكُمْ مِنْهَا ۗ كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمْ آيَاتِهِ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ﴿١٠٣﴾ وَلْتَكُنْ مِنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ۚ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ﴿١٠٤﴾ وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ ۚ وَأُولَٰئِكَ لَهُمْ

عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿١٠٥﴾ يَّوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوهٌ وَّتَسْوَدُّ وُجُوهٌ ۚ فَأَمَّا الَّذِينَ اسْوَدَّتْ وُجُوهُهُمْ ۚ أَكَفَرْتُم بَعْدَ إِيمَانِكُمْ فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنتُمْ تَكْفُرُونَ ﴿١٠٦﴾ وَأَمَّا الَّذِينَ ابْيَضَّتْ وُجُوهُهُمْ فَفِي رَحْمَةِ اللَّهِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿١٠٧﴾

"اے ایمان لانے والو! اللہ سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے۔ تم کو موت نہ آئے مگر اس حال میں کہ تم مسلم ہو۔ سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑ لو اور تفرقہ میں نہ پڑو۔ اللہ کے اس احسان کو یاد رکھو جو اس نے تم پر کیا ہے' تم ایک دوسرے کے دشمن تھے' اس نے تمہارے دل جوڑ دیئے اور اس کے فضل و کرم سے تم بھائی بھائی بن گئے۔ تم آگ سے بھرے ہوئے ایک گڑھے کے کنارے کھڑے تھے' اللہ نے تم کو اس سے بچالیا۔ اس طرح اللہ اپنی نشانیاں تمہارے سامنے روشن کرتا ہے' شاید کہ ان علامتوں سے تمہیں اپنی فلاح کا سیدھا راستہ نظر آجائے۔ تم میں کچھ لوگ تو ایسے ضرور رہنے چاہئیں جو نیکی کی طرف بلائیں' بھلائی کا حکم دیں' اور برائیوں سے روکتے رہیں۔ جو لوگ یہ کام کریں گے وہی فلاح پائیں گے۔ کہیں تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جو فرقوں میں بٹ گئے اور کھلی کھلی واضح ہدایات پانے کے بعد پھر اختلافات میں مبتلا ہوئے۔ جنہوں نے یہ روش اختیار کی وہ اس روز سخت سزا پائیں گے جبکہ کچھ لوگ سرخرو ہوں گے اور کچھ لوگوں کا منہ کالا ہو گا۔ جن کا منہ کالا ہو گا (ان سے کہا جائے گا کہ) نعمت ایمان پانے کے بعد بھی تم نے کافرانہ رویہ اختیار کیا؟ اچھا تو اب اس کفران نعمت کے صلہ میں عذاب کا مزہ چکھو۔ رہے وہ لوگ جن کے چہرے روشن ہوں گے تو ان کو اللہ کے دامن رحمت میں جگہ ملے گی اور ہمیشہ اسی حالت میں رہیں گے۔"

یہ دو مرکزی ستون ہیں جن پر جماعت مسلمہ کا ڈھانچہ قائم ہے۔ اور ان دونوں کے ساتھ وہ اپنا گراں اور عظیم رول ادا کر رہی ہے۔ اگر ان دونوں میں سے ایک پلر (Pillar) بھی گر جائے تو جماعت مسلمہ کا ڈھانچہ گر جائے گا اور اس کے بعد اس جہاں میں اس کا کوئی کردار نہ رہے گا۔

پہلا ستون ایمان اور تقویٰ کا ستون ہے۔ وہ تقویٰ اور خدا خوفی جو اللہ جل شانہ' کے حقوق کی ادائیگی کا موجب بنے۔ دائمی اور بیدار خدا خوفی' جس میں کوئی غفلت نہ ہو' جس میں کوئی وقفہ نہ ہو اور وہ پوری عمر میں تسلسل کے ساتھ قائم رہے۔ یہاں تک کہ انسان پر موت آجائے۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تُقَاتِهِ .... "اے ایمان لانے والو! اللہ سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے۔" اللہ سے ڈرو' جس طرح اس سے ڈرنے کا حق ہے۔ اس خدا خوفی کے لئے کوئی حد مقرر نہیں کی گئی' یہ ڈرنے والے دل کا کام ہے کہ وہ خدا خوفی میں کس مقام تک جا پہنچتا ہے' جس قدر وہ تصور کر سکتا ہے۔ جس قدر اس کی طاقت ہو۔ قلب مومن اس میدان میں جس قدر آگے بڑھے گا' اس کے سامنے نئے نئے آفاق کھلیں گے اور اس کا رہوار شوق اور مہمیز پائے گا۔ اور وہ اپنی خدا خوفی سے جس قدر بھی اللہ کا قرب حاصل کرے گا تو اس کا شوق اس سے بھی اونچے مقام کی طرف متوجہ ہو گا۔ اور جس مقام پر وہ ہو گا اس سے اونچے مقامات کا طالب ہو جائے گا اور آخر کار وہ ایسے مقام تک پہنچ جاتا ہے جس میں اس کا دل مدام بیدار ہو جاتا ہے اور پھر وہ کبھی نہیں سوتا۔

وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنتُم مُّسْلِمُونَ .... "تم کو موت نہ آئے مگر اس حال میں کہ تم مسلم ہو۔"

موت ایک ایسی خفیہ اور غائبانہ گھڑی ہے جس کا علم انسان سے مخفی رکھا گیا ہے۔ پس جو شخص یہ ارادہ کر لے کہ وہ صرف اس حال میں مرنا

چاہتا ہے کہ وہ صحیح مسلم ہو' تو اس کی طرف ایک ہی سبیل ہے کہ وہ فوراً مسلم بن جائے۔ اور ہر لحظہ وہ مسلم رہے۔ تقویٰ اور خدا خوفی کے بعد اسلام کے ذکر سے ایک وسیع حکمت اور مفہوم کی طرف اشارہ مطلوب ہے۔ یعنی مکمل طور پر سر تسلیم خم کرنا۔ مکمل انقیاد صرف اللہ کے سامنے سر تسلیم خم کرنا۔ اس کی اطاعت کرنا' اس کے نظام زندگی کی پیروی کرنا۔ اس کی کتاب کے مطابق فیصلے کرنا۔ اور یہ وہ مفہوم ہے جسے اس سورت میں بار بار دہرایا گیا ہے جیسا کہ ہم نے اوپر کہا ہے۔ یہ تو ہے وہ پہلا ستون جس پر جماعت مسلمہ قائم ہے تاکہ وہ اپنے وجود کو ثابت کرے' اور اس کائنات میں جو اہم رول اسے سپرد کیا گیا ہے اسے ادا کرے۔ اس لئے کہ اس ستون اور اس اساس کے بغیر انسانوں کا ہر اکٹھ ایک جاہلی اکٹھ تصور ہو گا۔ اس صورت میں پھر وہ اکٹھ اسلامی منہاج پر اکٹھ نہ ہو گا' جسے امت مسلمہ کا اجتماع کہا جا سکے۔ پس جاہلیت پر مبنی سوسائٹیاں ہوں گی جن میں ہدایت یافتہ قیادت نہ ہو گی' جو صحیح معنوں میں انسانیت کی راہبر ہو' بلکہ جاہلی قیادتیں اٹھیں گی۔

دوسری اساس جس پر اسلامی سوسائٹی کی عمارت اٹھتی ہے وہ اخوت اسلامی کی اساس ہے۔ صرف اللہ کے نام پر برادری' اسلامی نظام زندگی کی رفاقت' اسلامی نظام زندگی کے قیام کے لئے جدوجہد کرنے کی رفاقت۔

وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا وَّلَا تَفَرَّقُوا ۪ وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنتُمْ أَعْدَآءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُم بِنِعْمَتِهِۦٓ إِخْوَانًا ۚ وَكُنتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَأَنقَذَكُم مِّنْهَا ۗ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهِۦ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ

"سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑ لو' اور تفرقہ میں نہ پڑو' اللہ کے اس احسان کو یاد رکھو جو اس نے تم پر کیا' تم ایک دوسرے کے دشمن تھے' اس نے تمہارے دل جوڑ دیئے اور اس کے فضل و کرم سے تم بھائی بھائی بن گئے۔ تم آگ سے بھرے ہوئے ایک گڑھے کے کنارے کھڑے تھے' اللہ نے تم کو اس سے بچالیا۔ اس طرح اللہ اپنی نشانیاں تمہارے سامنے روشن کرتا ہے شاید کہ ان علامتوں سے تمہیں اپنی فلاح کا سیدھا راستہ نظر آ جائے۔"

یہ اخوت گویا خدا خوفی اور ایمان سے پھوٹتی ہے' یعنی اسلام کی اساس اول سے۔ اور اخوت کی بنیاد اللہ کی رسی ہے۔ یعنی اللہ کے ساتھ کئے ہوئے عہد کی اساس پر' اس کے دین کی اساس پر اور اس کے منہاج کی اساس پر۔ اس اخوت کی اساس جاہلیت کی اکٹھ کی اساس پر نہیں ہے' نہ جاہلیت کے کسی دوسرے مقصد کی اساس پر ہے' نہ کسی اور رسی پر جو اللہ کی رسی کے علاوہ ہو۔ صرف اللہ کی رسی پر وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا وَّلَا تَفَرَّقُوا ۪ .... "سب مل کر صرف اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑ اور تفرقہ میں نہ پڑو۔"

یہ اخوت جس کی اساس اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑنے پر ہے' اللہ تعالیٰ پہلی جماعت اسلامی پر اسے اپنا احسان عظیم بتاتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ یہ وہ نعمت ہے' جس سے اللہ تعالیٰ صرف ان لوگوں کو سرفراز فرماتے ہیں جن سے اللہ کو محبت ہوتی ہے۔ یہاں اللہ تعالیٰ انہیں اپنے اس انعام کو یاد دلاتے ہیں۔ فرماتے ہیں ذرا اس حالت کو ذہن میں لائیں جس پر وہ جاہلیت کے دور میں تھے۔ یعنی وہ "اعداء" تھے۔ ایک ایک کا دشمن تھا۔ دیکھو مدینہ میں اوس اور خزرج کی طرح دشمنی کا نمونہ اور کوئی پیش کر سکتا ہے۔ یہ یثرب کے دو قبیلے تھے' یہ قبیلے یہودیوں کے پڑوس میں رہتے تھے اور یہ یہودی ان کے درمیان عداوت کی آگ سلگائے رکھتے تھے' وہ ہر وقت پھونکیں مارتے تھے' اور اس آگ کو اس قدر تازہ رکھتے کہ وہ ان کے درمیان ہر قسم کے تعلقات کو جلا کر بھسم کر دیتی۔ یہودیوں کے لئے یہ ایک اچھا میدان کار تھا۔ اور وہ اسی میں رات اور دن کام کرتے رہتے تھے۔ اور اسی کے ساتھ زندہ رہتے تھے۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان دو عربی قبیلوں کی تالیف قلب کا

سامان کر دیا اور یہ اسلام تھا' یہ صرف اسلام ہی تھا جس نے ان نفرت کرنے والے قبائل کے دلوں کو جوڑا۔ اور یہ صرف اللہ کی رسی ہی تھی جسے سب نے مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا اور وہ اللہ کے اس احسان کی وجہ سے بھائی بھائی بن گئے تھے۔ یہ صرف اسلامی اخوت ہی ہے جس کی وجہ سے لوگوں میں اتحاد پیدا ہو سکتا ہے اور وہ اس کی وجہ سے اپنی تاریخی دشمنیاں بھول سکتے ہیں' یا اپنے قبائلی انتقام معاف کر سکتے ہیں' یا لوگ اپنے ذاتی مفادات اور فرقہ وارانہ روایات کو ترک کر سکتے ہیں اور پھر تمام لوگ اللہ تعالیٰ بزرگ و برتر کے سامنے ایک ہی صف میں کھڑے ہو جاتے ہیں۔

وَ اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖۤ اِخْوَانًا ۚ

"اور تم ایک دوسرے کے دشمن تھے' اس نے تمہارے دل جوڑ دیئے اور اس کے فضل و کرم سے تم بھائی بھائی بن گئے۔"

پھر اللہ تعالیٰ انہیں اپنا وہ احسان جتلاتے ہیں کہ وہ آگ سے بھرے ہوئے گڑھے کے کنارے پر تھے اور قریب تھا کہ وہ اس میں گر جائیں لیکن اللہ تعالیٰ نے انہیں اس سے بچالیا۔ اور وہ اس سے اس طرح بچے کہ انہوں نے اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑ لیا اور ایمان لے آئے۔ یہ تھی اسلام کی پہلی اساس۔ اور پھر ان کے دلوں میں محبت ڈال دی اور وہ بھائی بھائی بن گئے اور یہ محبت اور رفاقت اسلام کے اجتماعی نظام کی دوسری اساس تھی۔ اس لئے فرمایا وَ كُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا ۭ

"اور تم آگ سے بھرے ہوئے ایک گڑھے کے کنارے تھے' اس نے تم کو اس سے بچالیا۔" ....

آیت میں "تمہارے دل جوڑ دیئے" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ دل کا لفظ اس لئے استعمال ہوا ہے کہ باہم انسانی رابطے اور شعور محبت کا محل دل ہوتا ہے۔ اس لئے فَاَلَّفَ بَيْنَكُمْ .... کی جگہ فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ .... کا لفظ استعمال کیا گیا۔ گویا دلوں کی ایک گٹھڑی میں باہم ملا کر' جوڑ دیا گیا' اور وہ اللہ کے ہاتھ میں ہیں۔ اللہ کے ساتھ کئے ہوئے عہد اور میثاق کی رسی کے ساتھ باندھ دیا گیا۔ اس طرح اس آیت میں مسلمانوں کی اس وقت کی تصویر کو جامۂ الفاظ پہنایا گیا ہے بلکہ ان کی صورت حال ایک زندہ اور متحرک منظر میں نظر آ رہی ہے کہ وہ وَ كُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ .... "اور تم آگ سے بھرے ہوئے گڑھے کے کنارے پر تھے۔" اور صورت حال یوں تھی کہ تم گرنے ہی والے تھے کہ اچانک اللہ کے دست قدرت نے تمہیں بچالیا۔ گویا اللہ کا ہاتھ محسوس اور شاہد ہے۔ اللہ کی رسی محسوس طور پر نظر آتی ہے۔ اور انتہائی خطرے کی صورت حال سے قوم بال بال بچ جاتی ہے۔ یہ ایک زندہ' متحرک نظارہ ہے۔ اس منظر کو دیکھنے والوں کے دل دھڑک رہے ہیں اور خطرہ سامنے موجود ہے۔ صدیوں اور نسلوں کے بعد گویا آنکھیں دیکھ رہی ہیں۔

محمد بن اسحاق نے اپنی سیرت میں اس کا تذکرہ کیا ہے کہ یہ آیت اوس اور خزرج کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ ہوا یوں کہ ایک یہودی ایک ایسی محفل کے پاس سے گزرا جس میں اوس اور خزرج کے لوگ بھائیوں کی طرح بیٹھے ہوئے تھے' اسے یہ بات بہت ہی شاق گزری۔ اس پر اس نے ایک شخص بھیجا اور اسے کہا کہ جنگ بعاث میں ان کے درمیان جو واقعات ہوئے تھے ذرا اس محفل میں ان کا تذکرہ کرے اور یہ شخص اور ان کی محفلوں میں ان واقعات کا تذکرہ اپنے انداز میں کرتا رہا۔ اس طرح لوگ ایک دوسرے کے خلاف گرم ہو گئے۔ ایک دوسرے کو غضبناک نظروں سے دیکھنے لگے۔ ایک دوسرے کے اندر انہوں نے جذبہ انتقام بھڑکایا۔ اپنے اپنے جھنڈے اٹھالئے' اسلحہ طلب ہو گیا اور مقام "حرہ" دوبارہ جنگ کے لئے تقریباً طے ہو گیا۔ اس بات کی اطلاع حضور ﷺ کو ہو گئی۔ حضور ﷺ ان کے پاس آئے' انہیں ٹھنڈا کیا اور فرمایا: "کیا تم دوبارہ جاہلیت کی طرف دعوت دیتے ہو اور میں تمہارے درمیان ہوں۔" اس کے بعد آپ

نے ان پر اس آیت کی تلاوت فرمائی۔ اس پر انہیں سخت ندامت ہوئی۔ فوراً ان کے درمیان صلح ہوگئی۔ انہوں نے باہم معانقہ کیا اور اسلحے پھینک دیئے گئے' اللہ ان سے راضی ہو۔

جب اللہ تعالیٰ نے ان کے سامنے حقیقت واضح فرمائی تو وہ راہ ہدایت پر آگئے۔ اور ان کے بارے میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی بات سچی ہو گئی۔ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ .... "اس طرح اللہ اپنی نشانیاں تم پر روشن کرتا ہے تاکہ ان نشانیوں سے تمہیں تمہاری فلاح کا سیدھا راستہ نظر آئے۔"

مسلمان ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے' اللہ کے نظام پر قائم تھے اور تمام انسانیت کی قیادت کرنے کی راہ پر گامزن تھے اور اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے ہوئے تھے اور یہودی یہ سعی کر رہے تھے کہ اس رسی کو کاٹ دیں۔ یہودیوں کی ان مسلسل سازشوں کا یہ ایک نمونہ ہے' جو وہ مسلسل جماعت مسلمہ کے خلاف کرتے رہتے ہیں۔ اور یہ سازشیں وہ ہمیشہ اس وقت کرنے لگتے ہیں جب بھی مسلمان اللہ کی رسی کو پکڑنے کی کوشش کرتے ہیں اور اسلامی نظام زندگی کو اپنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور ان کی یہ کوششیں کامیاب ہی اس لئے ہوتی ہیں کہ مسلمان اہل کتاب کی پیروی شروع کر دیتے ہیں اور ان کی یہ ریشہ دوانیاں اس قدر گہری چال پر مبنی ہوتی ہیں کہ قریب تھا کہ وہ دور اول کے مسلمانوں کو بھی باہم دست و گریباں کر دیں اور انہیں اسلام سے پھیر کر دوبارہ کفر کے حالات میں داخل کر دیں۔ اور ان کے درمیان رابطہ پیدا کرنے والی اللہ کی مضبوط رسی کو کاٹ دیں' جس کی وجہ سے وہ ایک دوسرے کے بھائی ہو گئے تھے اور متفق اور مجتمع ہو گئے تھے۔ آیت' کا یہ ٹکڑا اس آیت اور اس سے قبل کی آیات کے درمیان ربط کو بھی ظاہر کرتا ہے۔

یہاں یہ بات نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ اس آیت کا شان نزول یہ ہو یا نہ ہو' آیت بہرحال اس واقعہ کے مقابلہ میں ایک عام صورت حال کو بیان کر رہی ہے۔ کیونکہ اس کے سیاق اور سباق یہ بتا رہے ہیں کہ اس وقت یہودیوں کی طرف سے مسلمانوں کو ایک دوسرے کے ساتھ لڑانے اور ان کے اندر تفریق پیدا کرنے میں ایک زبردست تحریک مسلسل چل رہی تھی۔ وہ اپنے تمام وسائل کو کام میں لاکر اسلامی صفوں میں فتنہ انگیزی اور تفرقہ برپا کرنے کی کوشش میں ہروقت لگے رہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم مسلمانوں کو بار بار تنبیہہ کرتا ہے کہ یہودیوں اور اہل کتاب کی سازشوں کے مقابلے میں ہوشیار رہیں' وہ ان کے درمیان شکوک و شبہات اور نفاق کے بیج بو رہے ہیں اور ان کے اندر فکری انتشار کے لئے ہروقت کوشاں ہیں۔ ہردور میں یہودیوں کا مسلمانوں کے حوالے سے یہی طرز عمل ہے۔ آج بھی وہ یہی کچھ کر رہے ہیں اور کل بھی ان کا رویہ یہی ہو گا' ہر اسلامی سوسائٹی میں اور ہر زمانے میں۔

سوال یہ ہے کہ ان یہودی سازشوں کا مقابلہ کرتے ہوئے ان دو اساسوں (Bases) پر استوار ہو کر پھر امت مسلمہ کا منشور اور ہدف کیا ہے؟ اس کا فریضہ 'فریضہ اقامت دین ہے۔ اس کرۂ ارض پر اسلامی نظام زندگی کا قیام ہے۔ حق کو باطل پر غالب کرنا ہے' معروف کو منکر پر غالب کرنا ہے' خیر کو پھیلانا ہے اور شر کو روکنا ہے۔ یہ ہے وہ نصب العین جس کے لئے اللہ تعالیٰ نے خود اپنے ہاتھوں سے' اپنی نظروں کے سامنے' اپنے خاص منہاج کے مطابق اس امت کو برپا کیا ہے۔ اس نصب العین کا تعین ان الفاظ میں کیا جاتا ہے۔

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ

"تم میں کچھ لوگ تو ایسے ضرور رہنے چاہئیں جو نیکی کی طرف بلائیں' بھلائی کا حکم دیں' اور برائیوں سے روکیں اور جو لوگ یہ کام کریں گے وہی فلاح پائیں گے۔"

پس یہ ضروری ہوا کہ ایک ایسی جماعت ہروقت موجود ہو جو بھلائی کی طرف دعوت دے' معروف کا حکم دے اور منکر سے منع

کرے۔ ان کے اندر ایک ایسا اقتدار' ایک ایسی قوت ضرور ہونی چاہئے جو بھلائی کی طرف بلائے اور امربالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ سرانجام دے۔ یہ بات کہ ایک ایسا اقتدار یا ایسا مقتدر اعلیٰ ضروری ہے جو یہ کام کرے' اس پر یہ آیت بصراحت دلالت کرتی ہے۔ یعنی دعوت الی الخیر ہروقت ہو اور یہ بات ہر کوئی کر سکتا ہے' لیکن پہلی ساتھ ساتھ امربالمعروف اور نہی عن المنکر کے الفاظ بھی وارد ہیں۔ اگر دعوت اسلامی بغیر اقتدار اعلیٰ کے ممکن العمل بھی ہے تو امربالمعروف اور نہی عن المنکر بغیر اقتدار اعلیٰ کے حصول کے ممکن نہیں ہے۔

اس مسئلے کے حل کے لئے صحیح اسلامی تصور حیات یہی ہے کہ ایک ایسا اقتدار اعلیٰ ضروری ہے جو امربالمعروف اور نہی عن المنکر کرے۔ یہ اقتدار اعلیٰ دعوت الی الخیر کے نصب العین پر قائم ہو گا۔ اور اس کا مقصد رفعیہ شر ہو گا۔ یہ اقتدار اعلیٰ ایسا ہو گا جو مکمل اتحاد و اتفاق کے نتیجے میں حاصل ہو گا' یہ اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامنے کے نتیجے میں اور اخوت اسلامی کے قیام کے بعد ہو گا۔ یعنی یہ اقتدار اعلیٰ' یا مملکت یا سلطنت ان دو بنیادوں پر قائم ہوگی یعنی اتحاد اور اخوت اور اس کا نصب العین انسانی زندگی میں اسلامی نظام حیات کا قیام ہو گا۔ اور اس اقتدار اعلیٰ کا قیام اس طرح ہو گا کہ اس نظام کی طرف جو خیر ہی خیر ہے' عام لوگوں کو دعوت دی جائے گی۔ لوگوں کو اس سے متعارف کرایا جائے گا کہ اس نظام کی حقیقت کیا ہے۔ انہیں یہ بتایا جائے گا کہ اسلامی نظام اقتدار اعلیٰ کا خواہاں ہے تاکہ وہ معروف کا حکم دے اور منکر سے روکے۔ اور لوگ اس کی اطاعت کریں یا وہ اپنی اطاعت کروائے۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ .... "ہم نے جو رسول بھی بھیجا ہے' وہ صرف اس لئے بھیجا ہے کہ اللہ کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے۔" اس لئے یہ بات ذہن میں رکھنا چاہئے کہ اس کرۂ ارض پر اسلامی نظام زندگی کے معنی یہ نہیں ہیں کہ صرف وعظ و ارشاد اور تبلیغ و بیان جاری ہو۔ یہ تو اسلامی نظام کا ایک حصہ اور جزء ہے۔ اس کا دوسرا اہم جزء یہ ہے کہ ایک ایسا اقتدار اعلیٰ قائم کیا جائے جو امربالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضہ کو ادا کرے۔ اور انسانی زندگی میں معروف کو رائج کرے۔ اور منکر کا قلع قمع کرے۔ اور اس "جماعت ممتازہ" کو بھی بچائے رکھے کہ ہرکس و ناکس اس امت کو اپنی خواہشات' اپنی مرغوبات اور شہوات کے بھینٹ نہ چڑھا سکے۔ اور اسے اپنی ذاتی مصلحتوں کی خاطر استعمال نہ کر سکے۔ اور معاشرہ کے اندر نیکی اور بھلائی پر مبنی اخلاق کو کوئی اپنی خاص رائے اور اپنے مخصوص تصورات کے تحت تباہ نہ کر سکے' اگرچہ وہ سمجھتا ہو کہ وہ جو کچھ کر رہا ہے وہ معروف اور درست ہے۔

یہی وجہ ہے کہ دعوت الی الخیر' امربالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ کوئی آسان اور سہل کام نہیں ہے۔ خصوصاً جب اس کے مزاج پر غور کریں اور دیکھیں کہ وہ لوگوں کی خواہشات اور میلانات کے ساتھ متصادم ہے۔ وہ بعض لوگوں کی ذاتی مصلحتوں اور مفادات کے ساتھ ٹکراتا ہے' بعض لوگوں کے غرور اور کبریائی پر اس کی زد پڑتی ہے' بعض غاصب جابروں اور زبردستی مسلط ہونے والے حکام بھی اس سے متاثر ہوتے ہیں' بعض گرے ہوئے طبقات جن میں ترقی اور بلندی کا داعیہ ہی نہیں ہے' وہ اسے مصیبت سمجھتے ہیں' بعض اس قدر کاہل ہوں کہ اس کی مشقتوں برداشت کرنے کی ہمت ہی نہ رکھتے ہوں' بعض اس قدر غیر سنجیدہ لوگ ہوں کہ وہ زندگی میں کسی سنجیدہ کام کے لئے تیار ہی نہ ہوتے ہوں' بعض ظالم طبقات ہوں جس کے ساتھ عدل لگا نہ کھاتا ہو۔ بعض ایسے گم کردہ راہ اور کجرو ہوں کہ انہیں صراط مستقیم اچھا ہی نہ لگتا ہو' اور ان میں بعض ایسے بھی موجود ہوں جو منکر کو پسند کرتے ہوں اور معروف کے دشمن ہوں.... حالانکہ انسانیت اور امت مسلمہ صرف اس وقت فلاح پا سکتی ہے کہ اس میں خیر غالب ہو' معروف کو معروف سمجھا جاتا ہو' منکر کو منکر سمجھا جاتا ہو' اور ان تمام امور کا منطقی تقاضا یہ ہے کہ ایک ایسا اقتدار اعلیٰ ہو جس میں خیر غالب ہو وہ نہی عن المنکر اور امربالمعروف کا فریضہ ادا کرتا

ہو۔ اور پھر اپنے اوامر اور نواہی کو منوانے کی قوت بھی رکھتا ہو۔

لہٰذا ایک ایسی جماعت کا قیام از حد ضروری ہے جس کی بنیاد ان دو ستونوں پر ہو' اللہ پر ایمان اور اخوت اسلامی تاکہ وہ اپنی قوت ایمانی' قوت خدا خوفی اور باہم الفت اور محبت اور اتفاق و اتحاد کی قوت کے بل بوتے پر وہ فریضہ ادا کر سکے جس کے لئے اسے اٹھایا گیا ہو' اس لئے کہ جماعت مسلمہ کو جو نصب العین دیا گیا ہے اور جو فریضہ اس پر عائد کیا گیا ہے کہ وہ ان دو خصوصیات کے بغیر اس میں عہدہ برآ نہیں ہو سکتی اور نہ کامیاب و کامران ہو سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ .... "یہی لوگ فلاح پائیں گے۔"

غرض اس قسم کی جماعت کا قیام اسلامی نظام زندگی کے قیام کے لئے ایک بنیادی ضرورت ہے۔ یہ اسلامی نظام کی ذاتی ضرورت ہے۔ یہ جماعت وہ ماحول فراہم کرے گی جس کے اندر اسلامی نظام سانس لے گا' زندہ ہو گا اور ایک حقیقت کے روپ میں نمودار ہو گا۔ یہ ماحول بھلائی کا ماحول ہو گا' باہم متعاون و متکافل ماحول ہو گا' اور اس میں دعوت الی الخیر کا چرچا ہو گا۔ اس میں بھلائی' نیکی' سچائی' انصاف معروف ہوں گے۔ شر' رذالت' باطل اور ظلم اس میں منکر تصور ہوں گے۔ اس ماحول میں بھلائی آسان ہوگی اور برائی کا ارتکاب مشکل ہو گا۔ اس میں بھلائی پر عمل پیرا ہونے میں اس قدر مشقت نہ کرنا ہوگی جس قدر برائی پر مشقت ہوگی۔ اس میں حق باطل کے مقابل میں طاقتور ہو گا۔ اس میں ظلم کے مقابلے میں عدل سے زیادہ نفع ہو گا' اس میں بھلائی کرنے والے کو معاونین بسہولت دستیاب ہوں گے۔ اور اس میں برائی کا ارتکاب کرنے والے کو مزاحمت اور مخالفت کا سامنا کرنا ہو گا' یہی وجہ ہے کہ ایسی سوسائٹی کا قیام ضروری ہے' جس میں سچائی اور بھلائی بلاجدوجہد نشوونما پا سکے۔ اس کے لئے اس کا پورا ماحول اور اس کا ہر فرد اس میں معاون ہو گا اور جس میں باطل اور شر کی نشوونما کی راہ میں بے حد مشکلات اور رکاوٹیں ہوں گی' اس لئے کہ پورا ماحول اس کے لئے سازگار نہ ہو گا۔

اسلام کا تصور کائنات' اس کا تصور حیات' اس کا تصور اقتدار' اس کا تصور اعمال' اس کا تصور واقعات' اس کا تصور اشیاء اور افراد تمام دوسرے جاہلی تصورات سے' اپنی اساس اور نوعیت کے اعتبار سے بالکل مختلف ہے۔ اس لئے اسلام کے اس وسیع تصور حیات کے لئے ضروری ہے کہ اس کے لئے ایک ماحول ہو' جس میں یہ تصور حیات پھلے پھولے اور اس میں اس کی اپنی اقدار حیات پروان چڑھیں۔ لہٰذا اسلام کے لئے جاہلی ماحول سے جدا ایک عمدہ ماحول کی ضرورت ہے اور اسے ایک جاہلی معاشرے کے سوا اس کا اپنا معاشرہ درکار ہے۔

یہ ماحول اور یہ معاشرہ اسلامی تصور حیات کے لئے ہو جس میں یہ تصور زندہ رہے اور یہ ماحول بھی اس کے لئے زندہ ہو' اس ماحول میں یہ تصور پھلے پھولے' اور آزادی کے ساتھ وہ اس ماحول میں سانس لے سکے' اس میں ذاتی ترقی کر سکے' اور اس کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہ ہو' نہ داخلی رکاوٹیں جو اس کی راہ میں مشکلات پیدا کریں اور نہ خارجی رکاوٹیں جو مزاحمت کریں۔ اور اگر ایسی رکاوٹیں کسی وقت وجود میں آ جائیں تو دعوت اسلامی ان کا مقابلہ کرے' اس لئے کہ یہ دعوت الی الخیر ہے' دعوت امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے۔ اور جب اس قسم کی کوئی قاہرانہ قوت دعوت اسلامی کی راہ میں رکاوٹیں ڈالے تو اس معاشرے میں اس کی مدافعت کرنے والے موجود ہوں اور یہ لوگ اسلامی نظام کے محافظین ہوں۔

یہ ماحول اسلامی جماعت کی صورت میں فراہم ہوتا ہے اور یہ جماعت دو بنیادوں پر قائم ہوتی ہے۔ ایمان باللہ اور اخوت اسلامی۔ ایمان باللہ اس لئے ضروری ہے تاکہ اس کا تصور کائنات' تصور حیات' اس کی اقدار' تصور اعمال اور تصور اشخاص و اشیاء میں مطابقت ہو۔ یہ تمام تصورات ایک ہی پیمانے کے مطابق ہوں اور ایک ہی منبع سے ماخوذ ہوں' انہی کے مطابق زندگی کے تمام مسائل حل کئے جائیں اور پوری زندگی کے فیصلے اللہ کی طرف سے آئی ہوئی شریعت کے مطابق ہوں۔ اور وہ جماعت محبت کے ساتھ اس قیادت کی پیروی کرے جو

اسلامی نظام حیات کے مطابق قائم ہو۔ وہ اسلامی اخوت پر قائم ہو۔ اس کی تشکیل محبت اور باہم تعاون و تکافل کے اصولوں پر ہو' یہ ایسے اصول ہیں جن کے سایہ میں خود غرضی اور لالچ ختم ہو جاتی ہے اور ایثار اور قربانی کے جذبات دوچند ہو جاتے ہیں' لوگ بڑی سہولت اور آزادی سے اور بڑی گرمجوشی سے ایثار کرتے ہیں اور نہایت ہی اطمینان' خوشی اور اعتماد سے زندگی بسر کرتے ہیں۔

غرض مدینہ طیبہ میں پہلی اسلامی جماعت انہی دو اصولوں پر قائم ہوئی تھی' اس کا ایمان باللہ نہایت ہی پختہ تھا جو معرفت الٰہی پر مبنی تھا۔ معرفت الٰہی کی وجہ سے صفات باری کا پر تو ان کے ضمیروں پر پڑ گیا تھا' خدا خوفی' خدا کی نگرانی کا شعور' مسلسل بیداری' ذات باری کا احساس اس جماعت کے اندر اس حد تک پہنچا ہوا تھا کہ جس کی نظیر تاریخ انسانی میں بڑی نادر ہے۔ اور معرفت کردگار کے ساتھ ساتھ افراد جماعت کے دلوں میں ایک دوسرے کے ساتھ محبت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ وہ باہم فیاض اور ایثار کرنے والے تھے' وہ خوبصورت اور میٹھی محبت کے پیکر تھے۔ معاشی لحاظ سے باہم معاون متکافل اور گہری اور سچی ہمدردی رکھتے تھے۔ اور وہ اس میدان میں اس قدر اونچے مقام تک پہنچے ہوئے تھے کہ اگر انہوں نے یہ معیار عملاً پیش نہ کیا ہوتا تو وہ محض خواب ہی خواب ہوتا۔ غرض مہاجرین اور انصار کے درمیاں برادری اور مواخات کا قصہ تو ایک حقیقت تھا' لیکن وہ اس قدر ممتاز اور بلند معیار کا تھا کہ آج بھی وہ محض افسانہ نظر آتا ہے' حالانکہ وہ حقیقت تھی۔ اور وہ قصہ اس سرزمین پر بطور واقعہ پیش آیا تھا۔ اگرچہ وہ محیرالعقول اور افسانہ نظر آتا تھا۔ غرض اس قسم کے ایمان اور اس قسم کی اخوت اور بھائی چارے پر ہر دور میں اسلامی نظام قائم ہو گا۔

یہی وجہ ہے کہ سیاق کلام میں مکرر' جماعت مسلمہ کو خبردار کیا جاتا ہے کہ وہ تفرقے اور بے جا اختلافات سے باز رہیں۔ ان سے پہلے جن لوگوں کو اس امانت کے اٹھانے کے لئے منتخب کیا گیا تھا' اور جنہوں نے تفرقہ بازی کی تھی اور انجام کار وہ جس طرح تباہ و برباد ہوئے تھے' اور جس طرح اللہ تعالیٰ نے ان سے وہ اعزاز چھین لیا تھا اور جماعت مسلمہ کے سپرد کر دیا تھا' اس لئے کہ وہ باہم جڑے ہوئے تھے۔ نیز ان لوگوں کا جو برا انجام قیامت میں ہونے والا ہے وہ مستزاد ہے' کہ جس دن کچھ چہرے سیاہ ہوں گے اور کچھ سفید ہوں گے اور یہ لوگ سیاہ چہروں والے ہوں گے۔

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ ۚ وَأُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿١٠٥﴾ يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوهٌ وَتَسْوَدُّ وُجُوهٌ ۚ فَأَمَّا الَّذِينَ اسْوَدَّتْ وُجُوهُهُمْ أَكَفَرْتُمْ بَعْدَ إِيمَانِكُمْ فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُونَ ﴿١٠٦﴾ وَأَمَّا الَّذِينَ ابْيَضَّتْ وُجُوهُهُمْ فَفِي رَحْمَةِ اللَّهِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿١٠٧﴾

"کہیں تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جو فرقوں میں بٹ گئے۔ اور کھلی کھلی واضح ہدایات پانے کے بعد پھر اختلاف میں مبتلا ہوئے' جنہوں نے یہ روش اختیار کی وہ اس روز سخت سزا پائیں گے۔ جبکہ کچھ لوگ سرخ رو ہوں گے اور کچھ لوگوں کا منہ کالا ہو گا۔ جن کا منہ کالا ہو گا (ان سے کہا جائے گا) کہ نعمت ایمان پانے کے بعد بھی تم نے کافرانہ رویہ اختیار کیا؟ اچھا تو اب اس کفران نعمت کے صلے میں عذاب کا مزہ چکھو۔ رہے وہ لوگ جن کے چہرے روشن ہوں گے تو ان کو اللہ کے دامن رحمت میں جگہ ملے گی اور ہمیشہ اسی حالت میں رہیں گے۔"

یہاں سیاق کلام میں' قرآن اپنے مناظر میں سے ایک منظر کو پیش کرتا ہے' جو زندگی متحرک مناظر سے بھرپور ہے' ہم ایک ہولناک منظر کے سامنے ہیں' یہ اس قدر خوفناک ہے کہ جس کی نقشہ کشی بذریعہ الفاظ ممکن نہیں ہے۔ نہ اس کے خدوخال الفاظ میں بیان ہو سکتے ہیں۔

ہمارے سامنے دو قسم کے انسان کھڑے ہیں' یہ زندہ انسان ہیں' ان کے چہرے ہیں اور خدو خال ہیں۔ کچھ لوگ ہیں جن کے چہرے نورانی ہیں' خوشی ان سے ٹپک رہی ہے' اور ہشاش بشاش ہیں اور خوشی و مسرت سے چہرے سرخ و سفید ہو گئے ہیں۔ ان کے مقابلے میں بعض دوسرے چہرے ہیں جو رنج و الم کی وجہ سے بجھے بجھے ہیں' ہوائیاں اڑی ہوئی ہیں' تھکان کی وجہ سے سیاہ ہو گئے ہیں' لیکن اس حالت میں بھی وہ معاف نہیں ہیں۔ اپنے حال پر چھوڑ نہیں دیئے گئے' بلکہ انہیں مزید رلایا جاتا ہے اور ملامت کی جاتی ہے۔

"نعمت ایمان پانے کے بعد تم نے کافرانہ رویہ اختیار کیا؟ اچھا تو اب اس کفران نعمت کے صلے میں عذاب کا مزہ چکھو۔"

"رہے وہ لوگ جن کے چہرے روشن ہوں گے تو ان کو اللہ کے دامن رحمت میں جگہ ملے گی اور ہمیشہ اسی حالت میں رہیں گے۔"

یوں جماعت مسلمہ کے ضمیر کی گہرائیوں میں تفرقہ اور اختلاف کے برے نتائج کا ایک خوف بیٹھ جاتا ہے۔ اور وہ جان لیتے ہیں کہ ایمان اور محبت و الفت اللہ کا کس قدر عظیم انعام و اکرام ہے۔ اور اس منظر میں جماعت مسلمہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتی ہے کہ اہل کتاب جنہوں نے تفرقہ کیا وہ کس قدر بھیانک انجام سے دوچار ہوئے' جن کی اطاعت سے جماعت مسلمہ کو ڈرایا جا رہا ہے تاکہ وہ بھی اسی بھیانک انجام سے دوچار ہو کر عذاب الیم میں گرفتار نہ ہو جائے' جس دن بعض چہرے سفید اور ہشاش بشاش ہوں گے اور بعض چہرے سیاہ و کبیدہ خاطر ہوں گے۔

اور اب ان دونوں فریقوں کی تصویر کشی اور انجام بتا دینے کے بعد قرآن کریم اس پوری بحث پر اپنے مخصوص انداز میں اختتامی کلمات کہتا ہے۔ یہ کلمات انہی خطوط پر ہیں جن پر اس سورت کے مضامین جا رہے ہیں۔ یعنی یہ کہ وحی الٰہی سچائی اور دانائی پر مبنی ہے اور یہ کہ قیامت دن جزاء و سزاء ایک سنجیدہ امر ہے' اللہ کے احکام دنیا و آخرت میں عدل و انصاف کے اصولوں پر مبنی ہیں۔ اور یہ کہ جو کچھ زمین میں ہے اور آسمان میں ہے وہ سب صرف اللہ کی ملکیت ہے۔ اور تمام امور کا فیصلہ آخر کار اس کے سامنے ہونے والا ہے۔

تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ؕ وَمَا اللّٰهُ يُرِيْدُ ظُلْمًا لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۰۸﴾ وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴿۱۰۹﴾

۱۱ ع ۸ ۲

"یہ اللہ کے ارشادات ہیں جو ہم تمہیں ٹھیک سنا رہے ہیں کیونکہ اللہ دنیا والوں پر ظلم کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا' زمین و آسمان کی ساری چیزوں کا مالک اللہ ہے اور سارے معاملات اللہ کے حضور پیش ہوتے ہیں۔"

یہ صورتیں' یہ حقائق اور یہ نتائج اللہ کی یہ آیات اور اس کے یہ دلائل و براہین' یہ سب آپ پر سچائی اور صداقت کے ساتھ پڑھی جا رہی ہیں' یہ آیات جو اصول اور جو اقدار طے کر رہی ہیں وہ حق ہیں اور اعمال کے جو نتائج اور جو جزاء و سزا یہ طے کر رہی ہیں وہ بھی حق ہیں اور پیش آنے والے ہیں۔ یہ آیات سچائی کے ساتھ اس ذات کی طرف سے نازل ہو رہی ہیں۔ وہ ذات اس نزول کی سزاوار ہے۔ اور وہی اس بات کی مالک ہے کہ اقدار کا تعین کرے' وہی مستحق ہے کہ نتائج تک پہنچائے اور وہی اس بات کا حق رکھتا ہے کہ اعمال پر جزاء دے۔ اللہ تعالیٰ کبھی اپنے بندوں پر ظلم کا ارادہ نہیں کرتا' اس لئے کہ وہ حاکم عادل وہ امور سماوات اور امور ارض کا مالک ہے اور وہ آسمانوں اور زمینوں کے اندر جو کچھ ہے' اس کا بھی مالک ہے' اور تمام امور کا آخری فیصلہ اسی کے ہاں ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے عمل پر جزاء و سزا کا تعین اس لئے کیا ہے تاکہ سچ کا بول بالا ہو اور نظام عدل جاری ہو اور معاملات اس نہج پر چلیں جو شان جلالت کے لائق ہو اور یہ بات نہیں ہے جیسا کہ اہل کتاب کو زعم ہے کہ انہیں تو صرف معدودے چند دنوں تک آگ کی سزا دی جائے گی پھر وہ نکل آئیں گے۔

○.....☆☆☆.....○

اس کے بعد امت مسلمہ کے اوصاف کا بیان کیا جاتا ہے تاکہ وہ اپنی حیثیت' اپنی قدر و قیمت اور اپنی حقیقت سے شناسا ہو سکے۔ اس کے بعد امت مسلمہ کے سامنے اہل کتاب کا تعارف کرایا جاتا ہے۔ اہل کتاب کے رتبہ کو کم نہیں کیا جاتا' ان کی حقیقت بیان کر کے انہیں یہ امید دلائی جاتی ہے کہ اگر وہ ایمان لے آئیں تو وہ ان کے لئے مفید ہو گا' لہٰذا اہل ایمان کو اطمینان دلایا جاتا ہے کہ ان کے دشمن انہیں کوئی نقصان نہیں دے سکتے' وہ ان کے مکر و فریب اور ان کے قتال کے باوجود مسلمانوں کو کوئی نقصان نہیں دے سکتے' نہ مسلمانوں پر فتح یاب ہو سکتے' اہل کفر آخرت میں دوزخ میں رہیں گے اور اس دنیا میں ایمان و تقویٰ کے بغیر انہوں نے جو کچھ بھی خرچ کیا وہ آخرت میں انہیں کوئی فائدہ نہ دے گا۔

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ؕ وَ لَوْ اٰمَنَ اَهْلُ الْكِتٰبِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ؕ مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ وَ اَكْثَرُهُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۱۱۰﴾ لَنْ يَّضُرُّوْكُمْ اِلَّاۤ اَذًى ؕ وَ اِنْ يُّقَاتِلُوْكُمْ يُوَلُّوْكُمُ الْاَدْبَارَ ۫ ثُمَّ لَا يُنْصَرُوْنَ ﴿۱۱۱﴾ ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ اَيْنَ مَا ثُقِفُوْۤا اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ حَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ وَ بَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَ يَقْتُلُوْنَ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ؕ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّ كَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ﴿۱۱۲﴾ لَيْسُوْا سَوَآءً ؕ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قَآئِمَةٌ يَّتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَآءَ الَّيْلِ وَ هُمْ يَسْجُدُوْنَ ﴿۱۱۳﴾ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ يُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ ؕ وَ اُولٰٓئِكَ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۱۴﴾ وَ مَا يَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلَنْ يُّكْفَرُوْهُ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۱۵﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَ لَاۤ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا ؕ وَ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۱۱۶﴾ مَثَلُ مَا يُنْفِقُوْنَ فِيْ هٰذِهِ

الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَثَلِ رِيْحٍ فِيْهَا صِرٌّ اَصَابَتْ حَرْثَ قَوْمٍ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَاَهْلَكَتْهُ ۭ وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَلٰكِنْ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۱۱۷﴾

"اب دنیا میں وہ بہترین گروہ تم ہو جسے انسانوں کی ہدایت و اصلاح کے لئے میدان میں لایا گیا ہے۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو' بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔ یہ اہل کتاب ایمان لاتے تو انہی کے حق میں بہتر تھا۔ اگرچہ ان میں کچھ لوگ ایماندار بھی پائے جاتے ہیں مگر ان کے بیشتر افراد نافرمان ہیں۔ یہ تمہارا کچھ بگاڑ نہیں سکتے' زیادہ سے زیادہ بس کچھ ستا سکتے ہیں۔ اگر یہ تم سے لڑیں گے تو مقابلہ میں پیٹھ دکھائیں گے' پھر ایسے بے بس ہوں گے کہ کہیں سے ان کو مدد نہ ملے گی۔ یہ جہاں پائے گئے ان پر ذلت کی مار پڑی' کہیں اللہ کے ذمہ یا انسانوں کے ذمہ میں پناہ مل گئی تو اور بات ہے۔ یہ اللہ کے غضب میں گھر چکے ہیں' ان پر محتاجی اور مغلوبی مسلط کر دی گئی ہے' اور یہ سب کچھ صرف اس وجہ سے ہوا ہے کہ یہ اللہ کی آیات سے کفر کرتے رہے اور انہوں نے پیغمبروں کو ناحق قتل کیا۔ یہ ان کی نافرمانیوں اور زیادتیوں کا انجام ہے۔ مگر سارے اہل کتاب یکساں نہیں ہیں۔ ان میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو راہ راست پر قائم ہیں' راتوں کو اللہ کی آیات پڑھتے ہیں اور اس کے آگے سجدہ ریز ہوتے ہیں' اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہیں' نیکی کا حکم دیتے ہیں' برائیوں سے روکتے ہیں اور بھلائی کے کاموں میں سرگرم رہتے ہیں۔ یہ صالح لوگ ہیں اور جو نیکی بھی یہ کریں گے اس کی ناقدری نہ کی جائے گی' اللہ پرہیز گار لوگوں کو خوب جانتا ہے۔ رہے وہ لوگ جنہوں نے کفر کا رویہ اختیار کیا تو اللہ کے مقابلے میں ان کو نہ ان کا مال کچھ کام دے گا نہ اولاد' وہ تو آگ میں جانے والے لوگ ہیں اور آگ ہی میں ہمیشہ رہیں گے۔ جو کچھ وہ اپنی اس دنیا کی زندگی میں خرچ کر رہے ہیں اس کی مثال اس ہوا کی سی ہے جس میں پالا ہو اور وہ ان لوگوں کی کھیتی پر چلے جنہوں نے اپنے اوپر ظلم کیا ہے اور اسے برباد کر کے رکھ دے۔ اللہ نے ان پر ظلم نہیں کیا۔ درحقیقت یہ خود اپنے اوپر ظلم کر رہے ہیں۔"

ان آیات کے ابتدائی حصہ میں' جماعت مسلمہ کے کاندھوں پر ایک بھاری بوجھ ڈالا گیا ہے اور یہ بوجھ اس لئے ڈالا گیا ہے کہ اللہ نے اس جماعت کو مکرم اور معزز بنایا ہے اور اسے ایسا مقام و مرتبہ دیا گیا ہے' جس پر آج تک کوئی دوسری جماعت فائز نہیں ہو سکی۔

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ۭ

"اب دنیا میں وہ بہتر گروہ تم ہو' جسے انسانوں کی ہدایت اور اصلاح کے لئے میدان میں لایا گیا ہے۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو' بدی سے روکتے ہو' اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔"

یہاں اخرجت صیغہ ماضی مجہول لایا گیا ہے۔ اور یہ ایک خاص انداز تعبیر ہے اور قابل توجہ ہے۔ اس سے اللہ جل شانہ کے لطیف دست قدرت کا اظہار ہوتا ہے۔ جو اس امت کو باہر نکال رہا ہے اور غیب کے اندھیروں میں سے' اس جماعت کو دھکیل دھکیل کر منصہ شہود پر لایا جا رہا ہے۔ اور اسے اس پردے کے پیچھے سے ظاہر کیا جا رہا ہے جس کے پیچھے جھانکنا کسی انسان کا کام نہیں ہے اور نہ انسان اس پردۂ غیب کے پیچھے کچھ جانتا ہے۔ اخرجت سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک خفیہ اور نامعلوم قوت انہیں آہستہ اور غیر محسوس طور پر متحرک کر رہی ہے۔ یہ عمل یوں ہوتا ہے کہ اچانک اس کائنات کے اسٹیج پر ایک امت نمودار ہو جاتی ہے۔ اور اس نے اس اسٹیج پر ایک خاص رول

ادا کرنا ہوتا ہے۔ یہ رول نہایت ہی اہم ہے۔ اور اس کائنات میں اس کا ایک خاص مقام متعین ہو جاتا ہے۔

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ .... "اب دنیا میں بہترین گروہ تم ہو جسے انسانوں کی ہدایت اور اصلاح کے لئے نکالا گیا ہے۔" یہ ہے وہ بات جس کا ادراک امت مسلمہ کو اچھی طرح کر لینا چاہئے تاکہ اسے اپنی حقیقی قدر و قیمت کا احساس ہو جائے۔ اسے معلوم ہو جائے کہ اسے تو تمام انسانوں کی اصلاح کے لئے نکالا گیا ہے تاکہ وہ ہراول دستے کا کام دے اور اس کو اس کائنات میں قیادت کا مقام حاصل ہو۔ اس لئے کہ صرف امت ہی نہیں بلکہ وہ ایک بہترین امت ہے۔ اور اللہ کی مرضی یہ ہے کہ اس کرۂ ارض پر خیر کی قیادت ہو' شر کی قیادت نہ ہو' یہی وجہ ہے کہ یہ بات اس کی شان قیادت سے فروتر قرار دی گئی ہے کہ وہ دوسری جاہلی امتوں سے ہدایت لے۔ اس کا فرض تو یہ ہے کہ وہ دوسری جاہلی اقوام کو اپنے خزانہ علم و اخلاق سے عطیات دے۔ اور اس کے ذخائر میں ہمیشہ ایسی اجناس موجود رہنی چاہئیں جنہیں وہ دوسری محروم اقوام و ملل کو عطا کرتی رہے۔ وہ ان اقوام و ملل کو صحیح عقائد و تصورات دے 'صحیح فکر دے 'صحیح نظام حیات دے 'صحیح اخلاق دے 'صحیح علم و معرفت عطا کرے۔ یہ وہ فریضہ ہے جو اس کی اعلیٰ حیثیت کی وجہ سے اس پر عائد ہوتا ہے اور اس پر یہ فریضہ اس کے مقصد وجود کی وجہ سے فرض ہو جاتا ہے۔ یہ بات اس کے فرض منصبی میں داخل ہے کہ وہ ہر میدان میں دوسری امم کے لئے ہراول دستہ رہے۔ وہ ہمیشہ قیادت کے مقام و منصب پر رہے اور ہمیشہ مرکز امم ہو۔ لہٰذا اس کے اس منصب کے کچھ آثار و نتائج ہیں۔ وہ منصب محض دعویٰ سے حاصل نہیں ہوتا' بلکہ اس امت کے سپرد کیا جاتا ہے جو اس کی اہل ہوا کرتی ہے' وہ اپنے تصورات و افکار کی وجہ سے اور اپنے اعلیٰ نظام حیات کی وجہ سے جب اس کے اہل ہوتی ہے' تب ہی یہ اسے دیا جاتا ہے۔ اس لئے اس امت کو علمی میدان میں بھی سب امم سے آگے ہونا چاہئے اور ترقی و تعمیر کے اعتبار سے بھی اسے اقوام و ملل سے آگے ہونا چاہئے' تاکہ وہ مقام خلافت فی الارض پر فائز ہو اور اپنے آپ کو اس کے لئے اہل ثابت کرے۔ یہی وجہ ہے کہ امت مسلمہ جس نظام حیات کی داعی ہوگی وہ نظام اس سے بہت کچھ کمالات کا مطالبہ کرتا ہے' اور اس سے اس کا اولین مطالبہ یہ ہے کہ وہ ہر میدان میں سب سے آگے رہے اگر وہ اس منصب پر بدستور فائز رہنا چاہتی ہو اور اس کے تقاضوں اور اس کے فرائض کو پورا کرتی ہو۔

اس امت کے منصب اور مقام کا پہلا تقاضا یہ ہے کہ وہ اس زندگی کو شر اور فساد سے پاک کر دے اور اس کے پاس اس قدر قوت ہونا چاہئے کہ وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ سرانجام دے سکے۔ اس لئے کہ وہ ایک بہترین امت ہے اور لوگوں کی اصلاح کے لئے نکالا گیا ہے۔ اور وہ خیر امت محض اللہ کی جانب سے کسی مجاملت یا خصوصی تعلق محبوبیت کی وجہ سے نہیں بنی' نہ ہی اسے خیر امت اتفاقاً' بلا مقصد و ارادہ بنا دیا گیا ہے' اس لئے کہ اللہ تعالیٰ حکیم ہے اور اس سے ایسے کام کی توقع نہیں کی جا سکتی' اللہ کے ہاں اعزاز اور شرف ان خام خیالیوں کی بنا پر نہیں ملتا' جن میں اہل کتاب مبتلا ہو گئے تھے اور کہتے تھے نَحْنُ أَبْنَاءُ اللَّهِ وَأَحِبَّاؤُهُ "ہم اللہ کے بیٹے ہیں اور اس کے محبوب ہیں۔" ہرگز نہیں' یہ ایک مثبت عمل تھا' منصوبے کے مطابق انسانیت کو برائی سے بچانا مقصود تھا' اسے معروف پر قائم کرنا مطلوب تھا' اور اس ایمانی تصور حیات کے ساتھ جو دنیا میں معروف و منکر کی حدوں کو واضح کر دے۔

تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ........................

"نیکی کا حکم دیتے ہو اور بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔"

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر دراصل اس بہترین امت کے فرائض ہیں' جن کو لے کر اسے اٹھنا ہے چاہے وہ ان فرائض کی ادائیگی میں تکالیف اٹھانی پڑیں' اس لئے کہ یہ ایک خاردار راستہ ہے۔ اس میں شر کو چیلنج کرنا ہے' لوگوں کو بھلائی کی طرف بلانا ہے اور معاشرے کو شر و فساد کے عوامل و اسباب سے بچانا ہے اور یہ سب کام تھکا دینے والے کام ہیں' لیکن یہ سب کام ایک صالح معاشرے کے

قیام اور بچاؤ کے لئے ضروری ہیں نیز اس کے سوا وہ نقوش جم نہیں سکتے جن کے مطابق اللہ تعالیٰ انسانی زندگی کو استوار کرنا چاہتے ہیں۔"

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ساتھ ساتھ پکا مومن ہونا بھی ضروری ہے' اس لئے کہ اسلامی معاشرے میں حسن و قبح کے پیمانے ایمان ہی کے ترازو کے ساتھ قائم ہوتے ہیں اور معروف اور منکر کی صحیح پہچان ہو سکے۔ اس لئے کہ کسی ایک گروہ کا صالح ہو جانا ہی کافی نہیں ہے' بعض اوقات شر و فساد اس قدر پھیل جاتا ہے کہ معاشرے کی اجتماعی اقدار بدل جاتی ہیں اور ان میں خلل پڑ جاتا ہے۔ اس لئے خیر و شر کے لئے ایک مستحکم تصور کی ضرورت ہوتی ہے۔ جس میں فضائل اعمال اور رذائل صفات کے اندر اچھی طرح جدائی ہو' معروف منکر سے جدا ہو' اور یہ تصور حیات اصلاح کی کسی مخصوص اسکیم سے علیحدہ ایک دائمی اصول و مبادی پر مبنی ہو۔

اور ظاہر ہے کہ یہ مقاصد صرف ایمان کے نتیجے میں ظہور پذیر ہو سکتے ہیں' یعنی اس کائنات کے بارے میں صحیح تصور اور اس کائنات کے خالق کے ساتھ اس کا تعلق کے بارے میں صحیح تصور' انسان اور اس کے مقصد وجود کے بارے میں صحیح تصور اور اس کائنات کے اندر انسان کے مقام اور اس کی حیثیت کے بارے صحیح تصور۔ پھر ان صحیح تصورات کے نتیجے میں صحیح اخلاقی اصول وجود میں آتے ہیں' جو خدا خوفی اور اس کی رحمت و رضا کی امید پر مبنی ہوتے ہیں' اور ان اصولوں کی وجہ سے لوگ ان اخلاقی اصولوں کے قیام پر بخوشی مائل ہوتے ہیں' ان کے دلوں پر اللہ کی حکمرانی ہوتی ہے اور ان کے معاشرے پر اللہ کی شریعت کی حکمرانی ہوتی ہے اور یوں ان اصول و قواعد کی نگہبانی بھی ہوتی رہتی ہے۔

پھر ایمان اس لئے بھی ضروری ہے کہ داعیان خیر' امر کنندہ گان معروف اور مانعان منکر اس راہ پر خار پر' مشقتیں برداشت کرتے ہوئے ثابت قدمی سے' اس قوت ایمانی کے بل بوتے پر گامزن ہو سکیں۔ خصوصاً جبکہ ان کا مقابلہ شر کے طاغوتوں سے ہو اور یہ طاغوت نوجوان بھی ہو اور تنومند بھی ہو' جبکہ وہ خواہشات نفس کے طاغوت کا مقابلہ کر رہے ہوں اور یہ خواہش اپنی شدت میں ہو اور خوب جوان ہو' جبکہ وہ گری ہوئی ارواح کا مقابلہ کر رہے ہوں جن کے عزائم کند ہو چکے ہوں جن کی شمع امید بجھ چکی ہو اور ایسے حالات میں ان کا زاد راہ صرف قوت ایمانی ہو' ان کا سامان جنگ صرف ایمان ہو اور ان کا تکیہ صرف اللہ پر ہو' ان کی حالت یہ ہو کہ ایمان کے زاد راہ کے سوا تمام توشے ختم ہو چکے ہوں اور ایمان کے ساز و سامان کے سوا تمام ساز و سامان ختم ہو چکے ہیں۔ اور اللہ کے سوا تمام سہارے ایک ایک کر کے گر چکے ہوں۔

اس سے پہلے یہ حکم دیا گیا تھا کہ اے امت مسلمہ تم میں سے ایک گروہ ایسا ہونا چاہئے جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضہ کو سرانجام دے۔ وہاں تو امت پر فریضہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر عائد کیا گیا تھا۔ اب یہاں یہ کہا جاتا ہے کہ تم خیر امت ہو' تمہاری صفت و خاصیت یہ ہے کہ تم امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے ہو' اس میں امت کو یہ اشارہ دیا گیا ہے کہ اگر تمہارے اندر یہ صفت نہ پائی گئی' یا کسی وقت نہ پائی جاتی ہو تو گویا تمہارا حقیقی وجود ہی نہ ہو گا۔ اس لئے کہ انسانی معاشرے میں یہ تمہاری پہچان ہے۔ تم اگر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ لے کر اٹھو گے' تو تم موجود تصور ہو گے اور اگر تم یہ فریضہ ترک کر دو گے تو تم معدوم تصور ہو گے' اور گویا صفت ایمان اور اسلام معدوم تصور ہو گی۔

قرآن کریم میں متعدد مقامات پر امت مسلمہ کے اس فریضے کی طرف صراحت اور اشارات کے ساتھ وضاحت کی گئی ہے' جس پر بحث ہم ان مقامات پر کریں گے۔ مگر رسول خدا ﷺ کی سنت میں بھی بار بار اس فریضہ منصبی کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ چیدہ چیدہ احادیث یہاں پیش کر دوں:

حضرت ابو سعید خدری ؓ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا میں نے رسول خدا ﷺ کو یہ کہتے سنا' تم میں سے جو بھی منکر کو دیکھے

تو اسے چاہئے کہ وہ اسے اپنے ہاتھ سے زائل کر دے' اگر ایسا نہ کر سکے تو اپنی زبان کے ساتھ' اور اگر اس کی طاقت بھی نہ ہو تو اپنے دل کے ساتھ۔ اور یہ ضعیف ایمان ہے۔" (امام مسلم)

حضرت ابن مسعود ﷺ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا کہ رسول خدا ﷺ نے فرمایا :"جب بنی اسرائیل گناہوں میں پڑ گئے' تو انہیں ان کے علماء نے روکا' اور وہ نہ رکے' تو ان علماء نے ان سے ہم نشینی کی' ان کے ساتھ کھاتے پیتے' تو اللہ تعالیٰ نے ان میں سے بعض کے دلوں کو دوسروں کے دلوں کے ساتھ مارا' اور حضرت داؤدؑ' حضرت سلیمانؑ' حضرت عیسیٰؑ ابن مریم کی زبان سے ان پر لعنت کی۔" اس کے بعد آپ ﷺ بیٹھ گئے' (اور آپ ﷺ تکیہ لگائے تھے) اور پھر فرمایا :" ہرگز نہیں! اس خدا کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے' یہاں تک کہ تم انہیں واپس حق کی طرف اچھی طرح پلٹا کر نہ لے آؤ۔" لفظ تامروا کے معنی ہیں تعطفوا (موڑو) اور تردوا (یعنی واپس لاؤ) ہے۔ (ابوداؤد و ترمذی)

حضرت حذیفہ ﷺ کہتے ہیں' فرمایا' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے "اس خدا کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے۔ تمہیں معروف کا حکم دینا ہو گا اور تمہیں منکر سے روکنا ہو گا ورنہ قریب ہے کہ اللہ' اپنی جانب سے تم پر کوئی عذاب بھیج دے اور پھر صورت حال یہ ہو جائے کہ تم اسے پکارو گے اور وہ تمہاری پکار کا کوئی جواب تمہیں نہ دے۔" (ترمذی)

اور حضرت عرس بن عمیرہ کندی ﷺ سے روایت ہے فرماتے ہیں رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جب زمین میں کوئی برائی ہو رہی ہو' تو جو شخص اس وقت اسے دیکھ رہا ہو' اور اس پر نکیر کر رہا تو ایسا ہو گا' جس طرح وہ اس سے غائب ہو' اور جو شخص اس سے غائب ہو لیکن اس پر راضی ہو تو وہ ایسا ہو گا جیسا کہ وہ اسے دیکھ رہا ہو۔ (ابوداؤد)

حضرت ابوسعید خدری ﷺ سے روایت ہے' فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا :"یہ بات عظیم جہاد میں ہے کہ کوئی ظالم بادشاہ کے سامنے عادلانہ بات کرے۔" (ابوداؤد' ترمذی)

اور حضرت جابر ﷺ سے روایت ہے' کہتے ہیں' فرمایا' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حمزہ شہداء کے سردار ہیں اور وہ شخص شہداء کا سردار ہے جو ظالم بادشاہ کے سامنے کھڑا ہو گیا اسے امر بالمعروف کیا اور اسے منکر سے روکا ٹوکا' اور اس وجہ سے اس نے اس شخص کو قتل کر دیا۔" (روایت حاکم)

یہ اور اس کے علاوہ دوسری بے شمار احادیث اسلامی سوسائٹی کی اس خصوصیت کو بیان کرتی ہیں اور بتاتی ہیں کہ اسلامی معاشرے میں یہ فریضہ اور اس کی ادائیگی اشد ضروری ہے۔ اس صفت کی وجہ سے معاشرے کی راہنمائی اور تربیت کا انتظام ہوتا رہتا ہے' اور قرآنی ہدایت کا حکم ہونے کے علاوہ یہ ایک ایسا توشہ ہے جس کی افادیت سے اور اس کی قدر و قیمت سے ہم بالکل غافل ہیں۔[۱] اس کے بعد اب ہم پہلی آیت کے حصہ آخر کی طرف آتے ہیں۔

وَلَوْ اٰمَنَ اَهْلُ الْكِتٰبِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ؕ مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ وَاَكْثَرُهُمُ الْفٰسِقُوْنَ............ "یہ اہل کتاب ایمان لاتے تو ان کے حق میں بہتر ہوتا اگرچہ ان میں کچھ لوگ ایماندار بھی پائے جاتے ہیں مگر ان کے بیشتر افراد نافرمان ہیں۔"

ان فقروں میں اہل کتاب کو ترغیب دی گئی ہے کہ وہ ایمان لے آئیں۔ ایمان ان کے لئے بہتر ہو گا وہ اس دنیا میں بھی بہتر ہو گا' اس کی وجہ سے ان کو اس تفرقہ بازی اور ہلاکت سے نجات ملے گی جس میں وہ پڑے ہوئے ہیں' وہ اعتقادی تصورات میں بھی فرقہ واریت میں

۱۔ دیکھئے کتاب " قبسات من الرسول " مصنفہ محمد قطب' فصل " قبل ان تدعوا فلا اجیب"

مبتلا تھے اور ان کی شخصیت مجتمع نہ تھی' اس لئے کہ انکے اعتقادی تصورات کے اندر اس قدر صلاحیت نہ تھی کہ وہ کسی اجتماعی نظام زندگی کی اساس بن سکیں۔ اس وجہ سے کہ ان کے اجتماعی نظام' ان کے اپنے عقائد کے علاوہ دوسرے تصورات پر قائم تھے۔ چنانچہ ان کا اجتماعی نظام ہمیشہ لنگڑا' لولا اور ہوا کے اندر معلق نظام رہا۔ اس کی جڑیں کبھی بھی ان کے معاشرے کے اندر نہ پھیلیں' جس طرح دنیا کے وہ نظام ہوا میں معلق رہتے ہیں جو کسی مکمل اعتقادی اور نظریاتی اساس پر قائم نہیں ہوتے' جن کی تعمیر ایسے نظریۂ حیات پر نہیں ہوتی جو اس کائنات کے معمہ کا مکمل حل پیش کرتا ہو' جو وجود انسانی کے مقاصد نہ متعین کرتا ہو' جو اس کائنات میں انسان کا مقام نہ متعین کرتا ہو' اور ایمان لانا ان کے لئے آخرت میں بھی مفید ہے۔ اس لئے کہ آخرت میں غیر اہل اسلام کا جو برا انجام ہونے والا ہے' اس سے وہ بچ جائیں گے۔

اس آیت میں صاف صاف اعتراف کیا جاتا ہے کہ ان اہل کتاب میں سے بعض لوگ صالح بھی ہیں۔ مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ وَ اَكْثَرُهُمُ الْفٰسِقُوْنَ .... "ان میں سے بعض اگرچہ مومن ہیں مگر اکثر فاسق ہیں۔"

اہل کتاب میں سے بعض لوگ ایمان لائے تھے' اور وہ بہت ہی اچھے مسلمان تھے۔ مثلاً عبداللہ بن سلام' ثعلبہ بن شعبہ اور کعب بن مالک وغیرہ۔ انہی لوگوں کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے۔ اگرچہ اس آیت میں اجمالی اشارہ ہے اور دوسری آیت میں تفصیلی اشارہ ہے۔ لیکن ان کی اکثریت دین اسلام سے منکر رہی۔ اس لئے کہ انہوں نے اللہ کے اس عہد کو توڑا جو اللہ نے نبیوں سے لیا تھا کہ ان میں سے ہر ایک دوسرے نبی پر ایمان لائے گا' جو اس کے بعد مبعوث ہو گا' اور اس کی نصرت کرے گا۔ وہ دین اسلام کے نافرمان اس طرح قرار پائے کہ انہوں نے نبی آخر الزمان کے بھیجنے کے سلسلے میں اللہ کے ارادہ اور حکم کے سامنے سر تسلیم خم نہ کیا' محض اس لئے کہ یہ رسول بنی اسرائیل کے قبیلے سے نہ تھا' اور انہوں نے اس رسول کی اطاعت کرتے ہوئے اللہ کی آخری شریعت کے مطابق اپنی زندگی کے فیصلے کرانے کے اعزاز سے بھی اپنے آپ کو محروم رکھا' حالانکہ اللہ کا ارادہ اور فرمان یہ تھا کہ تمام انسانیت اس شریعت کے مطابق زندگی بسر کرے۔

اہل ایمان میں سے بعض لوگ چونکہ بدستور مدینہ کے اہل یہود کے ساتھ روابط قائم کئے ہوئے تھے اور اس وقت تک مدینہ طیبہ میں یہودی ایک برتر قوت تھے' وہ ایک عسکری قوت ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اقتصادی قوت بھی تھے اور اہل اسلام میں سے بعض لوگ ان کی اس حیثیت کو تسلیم بھی کرتے تھے' اس لئے قرآن کریم نے یہ ضروری سمجھا کہ ان نافرمانوں کو اس حیثیت پر تنقید کر کے مسلمانوں کو ان کی مرعوبیت سے نکالا جائے اور ان کے کفر' نافرمانی اور ان کے جرائم کی وجہ سے ان کی حیثیت میں جو کمی واقعی ہوئی ہے' اس کا اظہار کیا جائے۔ نیز جس طرح وہ فرقوں میں بٹے ہوئے تھے اور جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان پر ذلت اور خواری مسلط کر دی تھی یہاں اسے واضح طور پر ریکارڈ کر دیا گیا۔

لَنْ يَّضُرُّوْكُمْ اِلَّاۤ اَذًى ؕ وَ اِنْ يُّقَاتِلُوْكُمْ يُوَلُّوْكُمُ الْاَدْبَارَ ۫ ثُمَّ لَا يُنْصَرُوْنَ ﴿۱۱۱﴾ ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ اَيْنَ مَا ثُقِفُوْۤا اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ حَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ وَ بَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَ يَقْتُلُوْنَ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ؕ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّ كَانُوْا يَعْتَدُوْنَ

"یہ تمہارا کچھ بگاڑ نہیں سکتے' زیادہ سے زیادہ بس ستا سکتے ہیں' اگر یہ تم سے لڑیں گے تو مقابلہ میں پیٹھ دکھائیں گے' پھر ایسے بے بس

ہوں گے کہ کہیں سے ان کو مدد نہ ملے گی' یہ جہاں پائے گئے ان پر ذلت کی مار پڑی' کہیں اللہ کے ذمہ یا انسانوں کے ذمہ میں پناہ مل گئی تو اور بات ہے۔ یہ اللہ کے غضب میں گھر چکے ہیں اور ان پر محتاجی اور مغلوبی مسلط کر دی گئی ہے۔ اور یہ سب کچھ صرف اس وجہ سے ہوا کہ یہ اللہ کی آیات سے کفر کرتے رہے اور انہوں نے پیغمبروں کو ناحق قتل کیا۔ اور یہ ان کی نافرمانیوں اور زیادتیوں کا انجام ہے۔"

ان آیات میں اللہ مومنین کو فتح و نصرت کی ضمانت دیتے ہیں' اور آخر کار ان کی سلامتی کی بھی صریح ضمانت دیتے ہیں' جب بھی وہ اپنے دشمنوں کے ساتھ میدان جنگ میں آمنا سامنا کریں گے یہ ضمانت ان کے لئے موجود ہو گی بشرطیکہ وہ اپنے دین کی رسی مضبوطی سے پکڑیں اور اپنے رب پر یقین کریں۔

لَنْ يَّضُرُّوْكُمْ اِلَّآ اَذًى ۭ وَاِنْ يُّقَاتِلُوْكُمْ يُوَلُّوْكُمُ الْاَدْبَارَ ۣ ثُمَّ لَا يُنْصَرُوْنَ.........

........."یہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے زیادہ سے زیادہ بس ستا سکتے ہیں' اگر یہ تم سے لڑیں گے تو مقابلہ میں پیٹھ دکھائیں گے' پھر ایسے بے بس ہوں گے کہ کہیں سے ان کو مدد نہ ملے گی۔"

اس لئے وہ دعوت اسلامی کو کوئی حقیقی ضرر نہیں پہنچا سکتے' نہ وہ جماعت مسلمہ کی تشکیل میں کوئی اثر اندازی کر سکتے ہیں اور نہ وہ دعوت اسلامی کو اس کرۂ ارض سے ختم کر سکتے ہیں۔ ہاں جماعت مسلمہ کے ساتھ جب ان کا تصادم ہوتا ہے تو وہ اذیت دے سکتے ہیں' وہ اس قسم کے عارضی دکھ دے سکتے ہیں جو مرور زمانہ کے ساتھ ختم ہو جاتے ہیں۔ لیکن جب وہ مسلمانوں کے ساتھ میدان جنگ میں مقابل ہوں گے تو ان کے لئے شکست لکھی ہوئی ہے اور آخر کار وہ شکست کھائیں گے' ان کی قسمت میں مسلمانوں کے برخلاف کوئی نصرت نہیں ہے۔ نہ ان کو مسلمانوں کے مقابلے میں کوئی مددگار ملے گا اور نہ وہ مسلمانوں کی زد سے بچ سکیں گے۔ اور یہ اس لئے ہے کہ ان پر ذلت کی زد پڑ گئی ہے اور ان کا یہ انجام بد لکھ دیا گیا ہے' اس لئے وہ جس سرزمین میں بھی ہوں گے وہ ذلیل ہو کر رہیں گے' وہ یا تو اللہ کی ذمہ داری میں رہیں گے اور یا مسلمانوں کی ذمہ داری میں رہیں گے۔ جب وہ مسلمانوں کی ذمہ داری میں داخل ہوں گے تو ان کا مال اور ان کی جان محفوظ ہو گی ماسوائے اس کے کہ ان کے خلاف کوئی حق ثابت ہو چکا ہو' یوں انہیں امن اور اطمینان نصیب ہو گا۔ اس وقت سے لے کر آج تک یہودیوں کو صحیح امن مسلمانوں کی ذمہ داری کے اندر نصیب ہوا ہے۔ لیکن یہود اس قدر نمک حرام ہیں کہ وہ اس کرۂ ارض پر مسلمانوں سے زیادہ اور کسی کے ساتھ دشمنی نہیں رکھتے۔ "وہ اللہ کا غضب لے کر لوٹے ہیں۔ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ یعنی گویا وہ دربدر ہوئے' مارے مارے پھرتے رہے اور آخر کار اللہ کے غضب کا سامان سروں پر اٹھائے ہوئے لوٹے۔" ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ .... "ان پر محتاجی مسلط کر دی گئی۔" ان کے ضمیر اور شعور میں محتاجی کا احساس رچ بس گیا ہے۔

ان آیات کے نزول کے بعد یہ تمام واقعات یہودیوں کی تاریخ میں انہیں پیش آئے' اہل کتاب اور مسلمانوں کے درمیان جو معرکے پیش ہوئے ان میں اللہ نے مسلمانوں کو فتح و نصرت سے سرفراز کیا' جب تک مسلمانوں نے اپنے دین اور اپنے نظام حیات اور اپنے نظریۂ حیات کو اپنے سینے سے لگائے رکھا' اور اپنی زندگیوں میں اسلامی نظام حیات قائم رکھا' تو ان کے اعداء کی قسمت میں اللہ تعالیٰ نے ذلت اور خواری کو لکھ دیا۔ الا یہ کہ مسلمانوں کے عہد و ذمہ داری کی وجہ سے انہیں چین نصیب ہوا یا یہ کہ خود مسلمانوں نے اسلامی نظام حیات کو ترک کر دیا اور اپنے دین کو چھوڑ دیا۔

قرآن کریم اس بات کا بھی انکشاف کرتا ہے کہ ان لوگوں کی قسمت میں ذلت اور خواری کیوں لکھ دی گئی؟ اس کا سبب کیا ہے؟ تو سبب دراصل ایک عام سبب ہے' جس کے آثار و نتائج ہر قوم پر منطبق ہو سکتے ہیں۔ چاہے وہ دین کے معاملے میں جس قدر اونچے دعوے کرتی

ہو۔ ان کی ذلت و خواری کا سبب اللہ کی نافرمانی اور ظلم تھا۔

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا یَكْفُرُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ وَ یَقْتُلُوْنَ الْاَنْۢبِیَآءَ بِغَیْرِ حَقٍّ ؕ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّ كَانُوْا یَعْتَدُوْنَ

"اور یہ سب کچھ صرف اس وجہ سے ہوا کہ یہ اللہ کی آیات سے کفر کرتے رہے اور انہوں نے پیغمبروں کو ناحق قتل کیا۔ یہ ان کی نافرمانیوں اور زیادتیوں کا انجام تھا۔"

لہٰذا اللہ کی آیات کا سرے سے انکار کر دینا یا اپنی زندگیوں میں انہیں نافذ نہ کرنا اور ان کے مطابق اپنا نظام عدالت نہ چلانا اور انبیاء کو ناحق قتل کرنا' اور ان لوگوں کو قتل کرنا جو لوگوں میں داعیان عدل ہوں جیسا کہ اس سورت کی دوسری آیت میں وارد ہے۔ یعنی صرف نافرمانی اور ظلم کی وجہ سے وہ اللہ کے اس غضب کے مستحق ہوئے اور شکست' ذلت اور خواری ان کے مقدر میں لکھ دی گئی۔ اور یہی وہ اسباب ہیں جو آج کل اس کرۂ ارض پر مسلمانوں کی بگڑی ہوئی منحرف نسل کے اندر مکمل طور پر پائے جاتے ہیں' وہ نسل جو اپنے اوپر لفظ اسلام کا اطلاق غلط طور پر کر رہی ہے' اور یہی اسباب آج وہ اللہ کے سامنے اپنے کردار کے آئینہ میں پیش کر رہے ہیں' اس لئے اللہ کی جانب سے بھی آج ان کے ساتھ بعینہ وہی سلوک کیا جارہا ہے جو اللہ نے ان ہی اسباب کی وجہ سے یہودیوں کے ساتھ کبھی کیا تھا' یعنی آج شکست' ذلت اور خواری مسلمانوں کا مقدر بن چکی ہے۔ جب آج ان میں سے کوئی پوچھتا ہے کہ ہم اس کرۂ ارض پر غالب کیوں نہیں ہو رہے' حالانکہ ہم مسلمان ہیں؟ تو یہ سوال کرنے سے پہلے اسے معلوم ہونا چاہئے تھا کہ اسلام ہے کیا؟ اور مسلمان ہوتے کون ہیں؟ پھر وہ یہ سوال کرتے۔

بہرحال حضور ؐ کے وقت اہل کتاب میں کچھ اچھے لوگ بھی تھے۔ اگرچہ تھوڑے تھے' یہ ضروری تھا کہ ان کے ساتھ انصاف کیا جاتا۔ اس لئے آیت بالا کے بیان کردہ کلیہ میں استثناء کی گئی۔ بتایا گیا کہ وہ سب ایک جیسے نہیں ہیں' ان میں سے اچھے مومن بھی تو پیدا ہوئے ہیں۔ اور ان کا تعلق باللہ بعینہ ایک اچھے اور صادق مسلمان کی طرح ہے۔ اس لئے وہ اس جزا کے مستحق ہوں گے' جس کے سچے اہل ایمان مستحق ہوئے۔

لَیْسُوْا سَوَآءً ؕ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قَآىِٕمَةٌ یَّتْلُوْنَ اٰیٰتِ اللّٰهِ اٰنَآءَ الَّیْلِ وَ هُمْ یَسْجُدُوْنَ ۝ یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَ یَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ یَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ یُسَارِعُوْنَ فِی الْخَیْرٰتِ ؕ وَ اُولٰٓىِٕكَ مِنَ الصّٰلِحِیْنَ ۝ وَ مَا یَفْعَلُوْا مِنْ خَیْرٍ فَلَنْ یُّكْفَرُوْهُ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِیْمٌۢ بِالْمُتَّقِیْنَ

"مگر سارے اہل کتاب یکساں نہیں' ان میں سے کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو راہ راست پر قائم ہیں' راتوں کو اللہ کی آیات پڑھتے ہیں اور اس کے آگے سجدہ ریز ہوتے ہیں۔ اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہیں' نیکی کا حکم دیتے ہیں اور برائیوں سے روکتے ہیں اور بھلائی کے کاموں میں سرگرم رہتے ہیں۔ یہ صالح لوگ ہیں اور وہ جو نیکی بھی کریں گے اس کی ناقدری نہ کی جائے گی' اللہ پرہیز گار لوگوں کو خوب جانتا ہے۔"

یہ اہل کتاب مومنین کی ایک روشن تصویر ہے۔ ان میں سے بعض لوگوں نے سچائی کے ساتھ ایمان قبول کیا اور یہ ایمان ان کے دلوں میں گہرائی تک اتر گیا۔ پھر یہ ایمان پوری طرح کامل اور شامل تھا۔ یہ لوگ اسلامی صفوں میں شامل ہو گئے اور دین اسلام کے محافظ

بن گئے۔ اللہ پر اور روز قیامت پر ایمان لے آئے۔ انہوں نے ایمان کے تقاضے پورے کئے' اور جس امت کا وہ جزء بن گئے تھے' اس کی اساسی خصوصیات کے مطابق کام شروع کر دیا' یعنی یہ خصوصیت کہ وہ خیر امت ہے۔ وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضے پر کاربند ہو گئے' اس سے پہلے بھی ان کے نفوس خیر طلب تھے' انہوں نے بھلائی کے میدان میں ایک دوسرے سے مسابقت کی۔ ایک دوسرے سے آگے بڑھے۔ اس لئے عالم بالا سے ان کے حق میں یہ عظیم شہادت نازل ہوئی کہ یہ لوگ یقیناً صالحین میں ہیں۔ اور ان کے ساتھ یہ سچا وعدہ کیا جاتا ہے کہ ان کا کوئی حق نہ مارا جائے گا۔ نہ ہی ان کا کوئی حق روکا جائے گا۔ اور یہ بھی کہہ دیا گیا کہ اللہ کو اچھی طرح علم ہے کہ وہ متقین میں سے ہیں۔

یہ ایک تصویر ہے جو یہاں اس لئے دکھائی جارہی ہے کہ جن لوگوں کی یہ خواہش ہو کہ وہ اپنے حق میں یہ شہادت قلمبند کرا لیں وہ اسے اس روشن افق پر دیکھیں اور اپنے اندر یہ اوصاف پیدا کریں۔

یہ تو ایک محاذ ہے' دوسری جانب کافر ہیں' وہ کافر جنہیں ان کی دولت کچھ فائدہ نہیں دے رہی ہے۔ جن کے لئے ان کی اولاد بھی مفید نہیں ہے۔ پھر دنیا میں انہوں نے جو کچھ بھی خرچ کیا وہ ان کے لئے مفید نہیں ہے۔ قیامت کے دن اس انفاق کا انہیں کوئی فائدہ نہ ہو گا' کیوں؟ اس لئے کہ یہ انفاق بھلائی کے اس خط مستقیم کے ساتھ جڑا ہوا نہیں ہے' جو اللہ نے کھینچا ہے۔ یعنی وہ بھلائی جو ایمان اور اسلامی نظریۂ حیات پر مبنی ہو' جس کا تصور واضح ہو' جس کا ہدف مستقل ہو اور جن کی راہ اللہ تک جاری ہو' ورنہ پھر بھلائی کا ایک عارضی جذبہ کبھی کبھار پیدا ہو جائے گا مگر وہ مستقل نہ ہو گا' اور وہ ایک ایسا جھکاؤ ہو گا جس کے رخ کو معمولی آندھی پھیر سکے گی۔ وہ کسی واضح' قابل فہم اور ٹھوس بنیاد پر نہ ہو گا نہ اس کا کسی مکمل اور جامع اور سیدھے نظام حیات سے ربط ہو گا۔

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ أَمْوَالُهُمْ وَلَا أَوْلَادُهُمْ مِنَ اللَّهِ شَيْئًا ۖ وَأُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿١١٦﴾ مَثَلُ مَا يُنْفِقُونَ فِي هَٰذِهِ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا كَمَثَلِ رِيحٍ فِيهَا صِرٌّ أَصَابَتْ حَرْثَ قَوْمٍ ظَلَمُوا أَنْفُسَهُمْ فَأَهْلَكَتْهُ ۚ وَمَا ظَلَمَهُمُ اللَّهُ وَلَٰكِنْ أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ

"رہے وہ لوگ جنہوں نے کفر کا رویہ اختیار کیا تو اللہ کے مقابلے میں نہ ان کا مال کچھ کام دے گا' نہ اولاد وہ تو آگ میں جانے والے لوگ ہیں۔ اور آگ ہی میں ہمیشہ رہیں گے۔ جو کچھ وہ اپنی اس دنیا کی زندگی میں خرچ کر رہے ہیں اس کی مثال اس ہوا کی سی ہے جس میں پالا ہو اور وہ ان لوگوں کی کھیتی پر چلے جنہوں نے اپنے اوپر ظلم کیا ہے اور اسے برباد کر کے رکھ دے۔ اللہ نے ان پر ظلم نہیں کیا' در حقیقت یہ خود اپنے اوپر ظلم کر رہے ہیں۔"

یوں اس حقیقت کو ایک ایسے منظر کی صورت میں پیش کیا جاتا ہے' جس میں حرکت ہی حرکت ہے۔ اور یہ حرکت زندگی سے بھرپور ہے اور یہ قرآن کا حسین و جمیل طرز تعبیر ہے' جس میں ایک نظری حقیقت بھی متحرک نظر آتی ہے۔"

ان کفار کے اموال اور ان کی اولاد اللہ کے مقابلے میں ان کے کچھ کام نہ آئے گی' وہ اپنے جرائم کا جرم ادا نہ کر سکیں گے' اس لئے کہ وہاں نہ زور چلے گا' اور نہ زر۔ یہ لوگ جہنمی ہیں اور وہ دنیا میں جو مال بھی خرچ کرتے ہیں وہ اکارت جائے گا اور بے اثر ہو گا۔ اگرچہ انہوں نے جن کاموں میں مال خرچ کیا وہ اسے کار خیر سمجھتے ہیں۔ اس لئے کہ خیر وہی ہوتی ہے جس کی کونپلیں شاخ ایمان سے پھوٹیں اور جن کا تعلق ایمان سے ہو' لیکن قرآن کریم اس کی تعبیر اس طرح نہیں کرتا جس طرح ہم کرتے ہیں۔ وہ اس حقیقت کو ایک زندہ اور

متحرک منظر کی صورت میں پیش کرتا ہے' جو نبض کی طرح متحرک ہو۔

ہم ایک ایسے مقام پر کھڑے ہیں جس کے سامنے ایک ہرا بھرا کھیت ہے' اس کی فصل کٹائی کے لئے تیار ہے۔ کھیت لہلہا رہا ہے۔ اچانک تیز ہوا چلتی ہے' یہ نہایت سرد برفانی ہوا ہے' شدید سردی کی وجہ سے تیار فصل جل جاتی ہے' یہ دیکھا گیا ہے کہ شدت برودت کی وجہ سے فصل جھلس جاتی ہے۔ الفاظ اسی طرح استعمال ہوئے ہیں کہ گویا اس کھیت پر بڑی تیزی اور قوت کے ساتھ سنگ باری ہوتی ہے اور پورے کے پورے کھیت کو برباد اور خراب کر دیا جاتا ہے۔

چشم زدن میں یہ پورا عمل سرانجام پاتا ہے۔ آناً" فاناً" کھیت ملیا میٹ اور خراب ہو جاتا ہے۔ یہی مثال اس دنیا میں ان لوگوں کے انفاق کی ہے جو کافر ہیں' اگرچہ وہ بظاہر کار خیر اور اچھے مقاصد میں خرچ کرتے ہیں نیز ان لوگوں کے اموال اور اولاد بھی کچھ کام نہ دیں گے۔ قیامت میں سب کے سب بے کار ہوں گے۔ وہ وہاں نہ کوئی حقیقی دولت ہوں گے اور نہ ان پر کوئی جزاء ہو گی اور نہ مفید بن سکیں گے۔

وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَلٰكِنْ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ .... "اللہ نے ان پر ظلم نہیں کیا' وہ خود اپنے اوپر ظلم کر رہے ہیں۔" خود انہوں نے اس نظام زندگی سے روگردانی کی جو تمام انفرادی بھلائیوں اور اچھائیوں کو جمع کرنے والا ہے' ان کو ایک خط مستقیم پر لاتا ہے اور مستحکم کر کے ایک مرکز تک پہنچاتا ہے۔ جس کا ایک مقرر ہدف ہے' ایک قابل فہم داعیہ ہے' اس میں نیکی کا ایک خاص طریق کار ہے' اس میں نیکی کو کسی عارضی جذبے یا کسی پوشیدہ خواہش اور یا کسی بے ربط عمل کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑا جاتا بلکہ اس میں نیکی اور بھلائی ایک مستقل دائمی منہاج کے مطابق سرانجام دی جاتی ہے۔

ان لوگوں نے خود اپنے لئے گمراہی اور نافرمانی کا راستہ اختیار کیا' انہوں نے اللہ کی رسی کی حفاظت سے منہ موڑا' جس کی وجہ سے ان کے تمام اعمال اکارت گئے' یہاں تک کہ جو مال انہوں نے بظاہر کار خیر میں صرف کئے وہ بھی ضائع ہوئے۔ جب ان کا کھیت بھی تباہ ہو گیا' تو پھر ان کا مال ان کے کس کام اور ان کی اولاد ان کے کس کام؟ یہ ظلم انہوں نے خود اپنے آپ پر کیا ہے۔ اس لئے کہ انہوں نے خود نافرمانی اور روگردانی کا راستہ اپنے لئے اختیار کیا۔

غرض یہ فیصلہ کن بات ہے کہ کوئی انفاق فی سبیل اللہ اور کوئی عمل صالح اس وقت تک مفید نہیں ہے جب اس کا رابطہ ایمانی منہاج سے نہ ہو' جب تک وہ ایمانی داعیہ پر مبنی نہ ہو۔ یہ فیصلہ اللہ کا ہے' یہ اللہ کا کہنا ہے لہٰذا اس میں انسان کے لئے کچھ کہنے کا کوئی موقعہ باقی ہی نہیں رہتا۔ اس فیصلے کو وہی لوگ چیلنج کر سکتے ہیں جو اللہ کی آیات کو چیلنج کرتے ہیں' لیکن ان کا یہ چیلنج علم و دانش پر مبنی نہیں ہوتا۔ وہ ہدایت پر مبنی ہوتا ہے' نہ کتاب الٰہی کے روشن دلائل پر۔

○.....☆☆☆.....○

یہ سبق جس کا آغاز اہل کتاب کے طرز عمل میں انحراف اور بگاڑ سے ہوا تھا' جس میں بتایا گیا تھا کہ اہل کتاب کے جدال و مناظرے میں کیا کیا مغالطے ہیں' جس میں تفصیلاً" بتایا گیا کہ یہ اہل کتاب مسلمانوں کے خلاف کیا کیا سازشیں کر رہے ہیں' جس میں جماعت مسلمہ کو بتایا گیا تھا کہ اس کرۂ ارض پر اس کے فرائض اور ذمہ داریاں کیا ہیں' قطع نظر اس سے کہ یہ فاسق' بگڑے ہوئے لوگ جو محاربہ کر رہے ہیں وہ کیا کہتے ہیں۔ اس سبق کے آخر میں جو اس پوری سورت میں ایک طویل سبق ہے' جماعت مسلمہ کو بڑی سختی سے ڈرایا جاتا ہے کہ وہ ہرگز ان لوگوں کے ساتھ خفیہ دوستی نہ رکھے جو اس کے قدرتی دشمن ہیں۔ اس کے لئے یہ مناسب نہیں ہے کہ وہ ان دشمنوں کو اپنا راز دان بنائے یا ان پر بھروسہ کرے' جبکہ وہ ان تمام لوگوں کے بھی پکے دشمن ہیں جو ایمان لائے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی جانب سے آئی ہوئی یہ

تنبیہہ اور تخویف ایک دائمی اصول کی صورت میں ثبت ہوتی ہے اور ہم اس کا مصداق آج بھی اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں ۔ یہ ایک ایسی شکل میں ہے جسے قرآن کریم نے ایک زندۂ جاوید صورت میں قلم بند کیا ہے لیکن قرآن کے حاملین آج اس سے غافل ہیں ۔ چنانچہ ان کی اس غفلت کی وجہ سے ان پر مصائب کے پہاڑ ٹوٹ رہے ہیں اور آئندہ بھی وہ یقیناً شر و فساد سے دوچار ہوں گے اور ان سے توہین آمیز سلوک کیا جائے گا اگر وہ نہ سمجھے ۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ لَا يَاْلُوْنَكُمْ خَبَالًا ؕ وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ ۚ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَآءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ ۖۚ وَمَا تُخْفِيْ صُدُوْرُهُمْ اَكْبَرُ ؕ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۱۸﴾ هٰاَنْتُمْ اُولَآءِ تُحِبُّوْنَهُمْ وَلَا يُحِبُّوْنَكُمْ وَتُؤْمِنُوْنَ بِالْكِتٰبِ كُلِّهٖ ۚ وَاِذَا لَقُوْكُمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۖۚ وَاِذَا خَلَوْا عَضُّوْا عَلَيْكُمُ الْاَنَامِلَ مِنَ الْغَيْظِ ؕ قُلْ مُوْتُوْا بِغَيْظِكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۱۱۹﴾ اِنْ تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ ۫ وَاِنْ تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ يَّفْرَحُوْا بِهَا ؕ وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْـًٔا ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ ﴿۱۲۰﴾

۱۲ ع ۱۱ ۳

"اے ایمان لانے والو! اپنی جماعت کے لوگوں کے سوا دوسروں کو اپنا رازدار نہ بناؤ ۔ وہ تمہاری خرابی کے کسی موقع سے فائدہ اٹھانے میں نہیں چوکتے ۔ تمہیں جس چیز سے نقصان پہنچے وہی ان کو محبوب ہے ۔ ان کے دل کا بغض ان کے منہ سے نکلا پڑتا ہے اور جو کچھ وہ اپنے سینوں میں چھپائے ہوئے ہیں وہ اس سے شدید تر ہے ۔ ہم نے تمہیں صاف صاف ہدایات دے دی ہیں' اگر تم عقل رکھتے ہو (تو ان سے تعلق رکھنے میں احتیاط برتو گے) تم ان سے محبت رکھتے ہو مگر وہ تم سے محبت نہیں رکھتے ۔ حالانکہ تم تمام کتب آسمانی کو مانتے ہو ۔ جب وہ تم سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم نے بھی (تمہارے رسول اور تمہاری کتاب کو) مان لیا ہے' مگر جب جدا ہوتے ہیں تو تمہارے خلاف ان کا غیظ و غضب کا یہ حال ہوتا ہے کہ اپنی انگلیاں چبانے لگتے ہیں ۔ ان سے کہہ دو کہ اپنے غصے میں آپ جل مرو' اللہ دلوں کے چھپے ہوئے راز تک جانتا ہے ۔ تمہارا بھلا ہوتا ہے تو ان کو برا معلوم ہوتا ہے' اور تم پر کوئی مصیبت آتی ہے تو یہ خوش ہوتے ہیں ۔ مگر ان کی کوئی تدبیر تمہارے خلاف کارگر نہیں ہو سکتی بشرطیکہ تم صبر سے کام لو اور اللہ سے ڈر کر کام کرتے رہو ۔ جو کچھ یہ کر رہے ہیں اللہ اس پر حاوی ہے ۔"

یہ ایک مکمل تصویر ہے' جو نفس انسانی کی اندرونی کیفیات کی مظہر ہے ۔ جو انسان کے ظاہری خدوخال کو بھی پیش کرتی ہے اور اس کی

باطنی کیفیات کو بھی اچھی طرح دکھاتی ہے اور انسان کے ظاہری تاثرات کو بھی دکھاتی ہے اور انسان کی آنے اور جانے والی حرکات کا اظہار بھی اس سے ہوتا ہے۔ اس تصویر میں ایک ایسے انسان کا نمونہ پیش کیا جاتا ہے جو آئے دن ہر جگہ اور ہر زمانے میں ہماری نظروں کے سامنے آتا رہتا ہے اور جماعت مسلمہ کے اردگرد پھیلے ہوئے دشمنوں میں کل بھی یہ نمونے نظر آتے تھے اور آج بھی نظر آتے ہیں۔ یہ ایسے نمونے ہیں کہ جب مسلمانوں کو غلبہ نصیب ہو تو وہ ان کے دوست بن جاتے ہیں لیکن ان کے دل کی ہر دھڑکن ان کی تکذیب کرتی ہے اور ان کا ہر عضو ان کو جھٹلاتا ہے لیکن مسلمان ان سے دھوکہ کھاتے ہیں اور وہ ان سے محبت کرتے ہیں اور ان پر اعتماد کرتے ہیں لیکن اس کے مقابلے میں وہ لوگ مسلمانوں کے لئے صرف بے چینی اور ناکامی ہی کو پسند کرتے ہیں اور وہ مسلمانوں کو نافرمان بنانے اور ان کے راستوں میں کانٹے بچھانے میں کوئی فروگذاشت نہیں کرتے۔ وہ ہروقت ان کے خلاف سازشیں کرتے ہیں جب بھی انہیں فرصت ملے چاہے رات کو ملے یا دن کو ملے۔

یہ تصویر جس کے عجیب خدوخال قرآن کریم نے یہاں بتائے ہیں' اور جس کا اطلاق سب سے پہلے ان اہل کتاب پر ہوتا تھا جو مدینہ میں مسلمانوں کے پڑوس میں رہتے تھے۔ یہ ایسی تصویر ہے جو اپنے فیچرز سے اس بات کا اظہار کر رہی ہے کہ یہ لوگ اسلام اور اہل اسلام کے خلاف جو بے پناہ کینہ اپنے دلوں میں رکھتے تھے وہ اسے چھپا رہے تھے۔ یہ رات دن مسلمانوں کے خلاف سازشیں تیار کر رہے تھے' اور مسلمانوں کی نسبت ان کی نیت میں ہروقت کھوٹ پایا جاتا تھا۔ اور ان کے ان پوشیدہ جذبات میں ہروقت ابال آتا رہتا تھا' اس کے برخلاف سادہ دل مسلمانوں کی حالت یہ تھی کہ ابھی تک ان میں سے بعض لوگوں کو ان کے بارے میں غلط فہمی تھی' بعض لوگ ابھی تک ان کے لئے اپنے دل میں محبت رکھتے تھے' اور ابھی تک ان کو یہ اطمینان تھا کہ اگر ہم ان کو کوئی راز بتا دیں تو وہ انہیں بطور امانت محفوظ رکھیں گے۔ اس لئے انہوں نے ان اہل کتاب میں سے بعض لوگوں کو جگری دوست' ساتھی اور رازدان بنا لیا تھا اور وہ جماعت کے اندرونی راز تک انہیں بتانے سے نہ چوکتے تھے' اس لئے اللہ تعالیٰ کی جانب سے انہیں یہ روشنی دی گئی جس میں جماعت مسلمہ نے ان کے اندروں کو دیکھ لیا اور حقیقت سے آگاہ ہو گئے۔ اور اس روشنی کے ساتھ انہیں یہ سخت تنبیہہ کی گئی اور انہیں اپنے ان قدرتی دشمنوں کے خفیہ منصوبوں اور سازشوں سے آگاہ کیا گیا' اور یہ بتایا گیا کہ وہ ایسے دشمن ہیں جو کبھی ان کے لئے مخلص نہیں ہو سکتے' مسلمانوں کی جانب سے محبت اور ہم نشینی ان کے اس دلی بغض کو صاف نہیں کر سکتی' یہ تبصرہ اور یہ تنبیہہ اسلامی تاریخ کے کسی خاص دور کے ساتھ مخصوص نہیں ہے' بلکہ یہ ایک دائمی حقیقت ہے' یہ ایک دائمی صورت حال کا مقابلہ ہے اور اس کا مصداق ہم اپنے موجودہ دور میں ایک کھلے مشاہدے کے بطور پر اپنے سامنے پاتے ہیں۔

آج مسلمان اپنے رب کریم کے اس حکم سے غافل ہیں' اس نے حکم دیا ہے کہ وہ اپنے سوا کسی کے ساتھ دوستی نہ رکھیں خصوصاً ایسے لوگوں کے ساتھ جو ان کے مقابلے میں اپنی اصلیت کے اعتبار سے بھی کم تر ہیں' نظام زندگی کے اعتبار سے بھی کم تر ہیں اور اپنے وسائل کے اعتبار سے بھی کم تر ہیں۔ اس لئے انہیں چاہئے کہ وہ ان پر اعتماد نہ کریں' ان کو رازدان نہ بنائیں اور ان سے کوئی مشورہ نہ لیں۔ لیکن مسلمانوں کی غفلت کی انتہاء ہے کہ وہ اپنے رب حکیم کا یہ مشورہ بھول چکے ہیں اور ایسے لوگوں کو انہوں نے اپنے لئے ہر معاملے میں مشیر اور مرجع بنایا ہوا ہے۔ ہر معاملے میں' ہر موضوع پر اور ہر مسئلے کے بارے میں' ہر سوچ میں' ہر فکر میں' ہر منہاج میں اور ہر طریقہ کار میں انہوں نے ان لوگوں کو اپنا استاد و مرشد بنا رکھا ہے۔

اللہ کی اس سخت تنبیہہ و تخویف سے آج مسلمان غافل ہیں' وہ ان لوگوں سے دوستی کر رہے ہیں جو اللہ اور رسول کے دشمن ہیں' انہوں نے اپنے دل و دماغ کے دریچے ان دشمنوں کے لئے وا کر دیئے ہیں' حالانکہ اللہ تعالیٰ پہلی جماعت مسلمہ سے بھی کہتے ہیں اور آج کی

جماعت مسلمہ کو بھی کہتے ہیں اور ہر دور کی جماعت مسلمہ کو بھی کہتے ہیں اور آگاہ کرتے ہیں۔

وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ ۚ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَآءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ ۚۖ وَمَا تُخْفِيْ صُدُوْرُهُمْ اَكْبَرُ ۭ

وہ تمہیں جس چیز سے نقصان پہنچے وہی ان کو محبوب ہے۔ ان کے دل کا بغض ان کے منہ سے نکلا پڑتا ہے اور جو کچھ وہ اپنے سینوں میں چھپائے ہوئے ہیں وہ اس سے شدید تر ہے۔"

اور اللہ تعالیٰ مزید فرماتے ہیں:

هٰٓاَنْتُمْ اُولَاۗءِ تُحِبُّوْنَھُمْ وَلَا يُحِبُّوْنَكُمْ وَتُؤْمِنُوْنَ بِالْكِتٰبِ كُلِّھٖ ۚ وَاِذَا لَقُوْكُمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚۖ وَاِذَا خَلَوْا عَضُّوْا عَلَيْكُمُ الْاَنَامِلَ مِنَ الْغَيْظِ ۭ

"اور تم ان سے محبت رکھتے ہو؟ مگر وہ تو تم سے محبت نہیں رکھتے' حالانکہ تم تمام کتب سماوی کو مانتے ہو' جب وہ تم سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم نے بھی مان لیا ہے' مگر جب جدا ہوتے ہیں تو تمہارے خلاف ان کے غیظ و غضب کا یہ حال ہوتا ہے کہ اپنی انگلیاں چبانے لگتے ہیں۔"

اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

اِنْ تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْھُمْ ۡ وَاِنْ تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ يَّفْرَحُوْا بِھَا ۭ..............

......................."تمہارا بھلا ہوتا ہے تو ان کو برا معلوم ہوتا ہے اور اگر تم پر کوئی مصیبت آتی ہے تو یہ خوش ہوتے ہیں۔"

بار بار ہم تجربات کے تھپیڑے کھاتے ہیں' مگر ہمیں ہوش نہیں آتی' بار بار ہم پر سازشوں اور تخریب کاریوں کا انکشاف ہوتا ہے' جو مختلف بھیس بدل کر کی جاتی ہیں' مگر ہم عبرت نہیں حاصل کرتے' بار بار ان دشمنوں کی زبان پر ایسی باتیں آجاتی ہیں جن سے ان کے دلی کینہ کا اظہار ہوتا ہے' جسے مسلمانوں کی مسلسل محبت اور دوستی کی مساعی زائل نہ کر سکیں اور جسے مسلمانوں کی دینی رواداری بھی صاف نہ کر سکی' لیکن ہم پھر بھی وہی کچھ کرتے ہیں اور ان کے لئے اپنے دل کھول دیتے ہیں' ان میں سے دوست چن لیتے ہیں اپنی زندگی میں بھی اور اپنے نظام زندگی میں بھی۔ اور ان لوگوں کے ساتھ ہماری رواداری اس حد تک پہنچ جاتی ہے یا ہماری روحانی شکست کا یہ حال ہو جاتا ہے کہ ہم اپنے نظریہ حیات میں بھی ان کے ساتھ مجاملت اور مداہنت کرتے ہیں اور اس رواداری یا روحانی شکست کی وجہ سے ان کے سامنے اپنے نظریۂ حیات کے ذکر سے بھی ڈرتے ہیں' ان کے ساتھ ہم اپنے نظام حیات میں بھی روداری کرتے ہیں اور اسے اسلامی نظریۂ حیات کی اساس پر استوار نہیں کرتے' ان کی خاطر ہم اپنی تاریخ میں بھی تحریف کرتے ہیں' اپنے نشانات راہ ان کی خاطر مٹاتے ہیں تاکہ اس تاریخ کے بیان میں ان معرکوں کا ذکر نہ آجائے جن میں ہمارے اسلاف نے ان کے خلاف کامیابیاں حاصل کیں۔ یہی ذہنی شکست ہے جس کی وجہ سے ہم پر وہ عذاب نازل ہوتا ہے' جو ہر اس قوم پر نازل ہوتا ہے جو اللہ کے امر سے سرتابی کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم ذلیل و خوار ہوتے ہیں' ہم ضعیف و ناتواں ہوتے ہیں اور ہم شرمندہ اور نامراد ہوتے ہیں اور ہمیں وہ نقصان پہنچ جاتا ہے جس پر ہمارے دشمن خوش ہوتے ہیں اور ہم اس ناکامی اور خرابی سے دوچار ہوتے ہیں' جس کی سازش وہ ہماری صفوں کے اندر کرتے ہیں۔

لیکن دیکھو' ہماری یہ کتاب ہمیں وہ طریقہ بتاتی ہے کہ کس طرح ہم ان دشمنوں سے جان بچائیں' جس طرح اس کتاب نے یہ سبق پہلی جماعت اسلامی کو بھی سکھایا تھا' کس طرح ہم ان کی ایذا رسانیوں سے بچیں گے' کس طرح ہم اس کینہ سے محفوظ ہوں گے جو ہمارے خلاف ان کے دلوں میں چھپا ہوا ہے اور کبھی کبھار اس کی چنگاری کے منہ سے نکل جاتی ہے۔

وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْـًٔا اِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ....

.... "مگر ان کی کوئی تدبیر تمہارے خلاف کارگر نہیں ہو سکتی بشرطیکہ تم صبر سے کام لو اور اللہ سے ڈر کر کام کرتے رہو' جو کچھ یہ کر رہے ہیں اللہ اس پر حاوی ہے۔"

تو وہ طریقہ صبر اور عزم کا طریقہ ہے اور ان کے مقابلے میں ڈٹ جانے کا طریقہ ہے۔ (اگرچہ وہ بہت ہی طاقتور ہوں) اور ان کی مکاری اور سازشوں کے مقابلے میں جم جانے کا طریقہ ہے۔ اگر وہ سازشوں اور خفیہ ریشہ دوانیوں کا طریقہ اپنائیں تو ہمارا طریقہ صبر اور اپنے نظریۂ حیات پر پختگی سے جم جانے کا طریقہ ہو گا۔ بہہ جانے' ختم ہو جانے اور دوسروں کے مقابلے میں ذلیل ہونے کا طریقہ نہیں ہو گا۔ نہ یہ کوئی صحیح پالیسی ہے کہ دشمنوں کو خوش کرنے کے لئے یا ان کے متوقع شر و فساد کی وجہ سے ہم اپنے تمام نظریات یا بعض نظریات کو ترک کر دیں۔

دشمنان اسلام کے مقابلے میں دوسرا طریق کار خدا خوفی کا طریق کار ہے۔ صرف ایک خدا سے ڈرنا اور صرف اس کی نگرانی کا احساس رکھنا' تقویٰ اور خدا خوفی ہی وہ ذریعہ ہے جس سے انسانی دل اپنے رب سے مربوط ہو جاتے ہیں' ان کا تعلق صرف ان لوگوں سے ہوتا ہے جو اس اللہ کے نظام میں داخل ہوتے ہیں اور وہ صرف اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ جب ایک دل ذات باری کی معرفت حاصل کر لیتا ہے تو پھر اس کے اندر سے اللہ کے سوا تمام دوسری قوتوں کا خوف دور ہو جاتا ہے اور جس قدر عزم پختہ ہو جاتا ہے اسی قدر اللہ سے یہ رابطہ مضبوط ہوتا جاتا ہے۔ اس لئے وہ کسی کے سامنے نہیں جھکتا۔ اور نہ ان لوگوں کے ساتھ دوستی کرتا ہے جو اللہ اور اس کے رسول کے دشمن ہیں۔ محض اپنی جان بچانے کے لئے یا دنیاوی عزت و ناموس کمانے کے لئے۔

مسلمانوں کے لئے یہی ایک راستہ ہے' صبر و تقویٰ کا راستہ اور اللہ کی رسی کو مضبوطی کے ساتھ تھام لینے کا راستہ اور اسلامی تاریخ مین مسلمانوں نے جب بھی تاریخ اسلام میں صرف ایک اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑا اور اپنی پوری زندگیوں میں اسلامی نظام حیات اختیار کیا' تو انہوں نے عزت اور وقار کا مقام پایا' وہ کامران رہے' اور اللہ نے انہیں دشمنوں کی سازشوں سے بچایا' ان کا کلمہ بلند ہوا' اور اپنی تاریخ میں مسلمانوں نے جب بھی اپنے قدرتی اعداء کی رسی کو تھاما' وہ اعداء جو ان کے نظریۂ حیات کے مقابلے میں خفیہ اور اعلانیہ طور پر باغیانہ جدوجہد میں مصروف ہیں' اور جب بھی مسلمانوں نے ان اعداء کے مشوروں پر کان دھرا اور انہوں نے انہیں خفیہ طور پر یا ظاہری طور پر دوست بنایا اور انہیں اپنا معاون' مشیر اور ماہر فن بنایا تو اللہ تعالیٰ نے ایسے مسلمانوں کی تقدیر میں شکست لکھ دی' ان کے دشمنوں کو ان کی سرزمین میں قوت دی' ایسے مسلمانوں کو ان کے مقابلے میں ذلیل کیا اور وہ نہایت ہی برے انجام تک پہنچتے رہے۔ اسلامی تاریخ اس بات پر شاہد عادل ہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ اصول اٹل اصول ہے۔ یہ اس کی ایسی سنت ہے جس میں کوئی تغیر ممکن نہیں ہے' اور جو شخص اس کرۂ ارض پر اللہ کی اس بار بار دہرائے جانے والی سنت کا مشاہدہ نہیں کرتا تو اس کی آنکھیں صرف ذلت' کمزوری اور توہین اور ناتوانی کے آثار ہی کا مشاہدہ کر سکے گی۔

○.....☆☆☆.....○

اس جملے پر یہ سبق اختتام پذیر ہوتا ہے اور اس سورت کا حصہ اول بھی یہاں اختتام پذیر ہو جاتا ہے۔ اہل کفر کے ساتھ معرکہ یہاں زوروں پر ہے اور اہل اسلام اور اہل کفر کے کیمپ یہاں آکر مکمل طور پر ایک دوسرے سے جدا جدا ہو گئے ہیں۔

اس سبق کو ختم کرنے سے پہلے ایک دوسری حقیقت بھی نوٹ کر لینے کے قابل ہے۔ وہ یہ کہ اسلام اپنے خالص اور کھلے دشمنوں کے ساتھ بھی پوری رواداری برتتا ہے۔ وہ ابھی اسلام کو صرف یہ مشورہ دیتا ہے کہ وہ اہل کفر کے ساتھ خفیہ دوستی نہ رکھیں لیکن وہ اہل

اسلام کو یہ حکم نہیں دیتا کہ وہ کفار کے ساتھ دھوکہ کریں' ان کے ساتھ کینہ رکھیں' یا ان سے نفرت کریں یا ان کے خلاف مکاری اور سازشوں کے اسلوب اختیار کریں۔ اسلام صرف انہیں مشورہ دیتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو بچائیں اور اسلامی اتحاد کا دفاع کریں اور اسلامی تشخص کو قائم رکھنے کی تدبیر کریں یعنی اسلام نے صرف انہیں خطرے سے آگاہ کیا' اپنے دفاع کی طرف انہیں متوجہ کیا اور وہ خطرہ انہیں ہر طرف سے گھیرے ہوئے تھا۔ اور اس میں ان کے تمام دشمن شریک تھے۔

رہے اہل اسلام تو وہ اسلامی رواداری کے مطابق دوسرے لوگوں کے ساتھ معاملہ کرتے ہیں' لوگوں کے ساتھ ان کا رویہ پاکیزگی اور صفائی پر مبنی ہوتا ہے' وہ لوگوں کے ساتھ بھلائی سے اور محبت کرتے ہوئے ملتے ہیں' وہ اپنے آپ کو سازشوں سے بچاتے ہیں مگر خود کسی کے خلاف سازش نہیں کرتے' وہ دوسروں کے کینہ سے اپنے آپ کو بچاتے ہیں لیکن خود ان کے دل میں کسی کے ساتھ کینہ نہیں ہوتا' الا یہ کہ دوسرے ان کے دین اور نظام حیات کے خلاف بغاوت اور دشمنی کر رہے ہیں' وہ ان کے نظریۂ حیات میں فتنہ انگیزی کر رہے ہوں' اور لوگوں کو اللہ کے صراط مستقیم پر آنے کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کرتے ہوں' اگر ایسے حالات ہوں تو پھر مسلمانوں پر فرض ہے کہ وہ ایسے جنگجو دشمنوں کے ساتھ بر سر پیکار ہوں' تاکہ فتنے کو روکا جائے اور ان رکاوٹوں کو دور کیا جائے جو راہ خدا میں کھڑی کر دی گئی ہوں۔ اور اسلامی نظام کے قیام کے لئے سد راہ ہوں' ہاں ایسے لوگوں کے ساتھ جہاد بھی جہاد فی سبیل اللہ ہو گا۔ صرف ذاتی مقاصد یا ذاتی انتقام کے لئے نہ ہو گا' یہ جہاد پوری انسانیت کی بھلائی کے لئے ہو گا' صرف ان لوگوں کی ذات کے خلاف نہ ہو گا' جنہوں نے اسلام کی راہ کو روکا۔ اور یہ اس لئے ہو گا کہ اسلامی نظام زندگی کا پیغام جو خیر ہے لوگوں تک بے روک ٹوک پہنچ سکے۔ اس لئے جہاد و قتال نہ ہو گا کہ مجاہدین دنیا میں تغلب حاصل کریں' انہیں اس کرۂ ارض پر سربلندی نصیب ہو اور وہ لوگوں کا استحصال کریں' بلکہ مقصد صرف یہ ہو گا کہ اسلام کا نظام زندگی قائم کیا جائے جس کے عادلانہ سایہ تلے سب لوگ انصاف کے ساتھ زندگی بسر کر سکیں' یہ جہاد کسی قوم کا علم بلند کرنے کے لئے نہیں ہے اور نہ ہی دنیا میں امپریلزم کے قیام کے لئے شروع کیا جاتا ہے۔

یہ وہ حقیقت ہے جس کی تائید قرآن و سنت کی متعدد نصوص سے ہوتی ہے' پہلی جماعت اسلامی کی تاریخ اس کی ترجمان ہے۔ اور یہ جماعت تو بہرحال اس دنیا میں ان نصوص کے مطابق زندگی گزار رہی تھی۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ اسلامی نظام زندگی' بھلائی ہی بھلائی ہے۔ جو لوگ اسلامی نظام کی راہ روکتے ہیں وہ پوری انسانیت کے دشمن ہیں' اور اسلامی نظام کا یہ فرض ہے کہ وہ ان کا پیچھا کرے اور ایسے لوگوں سے انسانیت کی قیادت چھین لے' اور یہی وہ فریضہ ہے جس کے لئے اسلامی جماعت اور خیر امت کو اٹھایا گیا ہے۔

☆ ☆ ☆

درس ۲۷ ایک نظر میں

اس سے پہلے اس سورت میں ہم مناظرہ اور مباحثہ کے میدان میں تھے' بیانات اور تبصرے ہو رہے تھے' ہدایات اور تنبیہات کا ذکر تھا' لیکن اس دوسرے سبق میں ہم کلام و بیان کے میدان سے نکل کر اب سیف و سنان کے میدان میں جا اترے ہیں۔ سیف و سنان کا یہ معرکہ معرکہء احد کے نام سے مشہور ہے۔

غزوۂ احد صرف میدان جنگ ہی میں نہیں لڑا گیا بلکہ اس معرکے کا میدان بہت ہی وسیع تھا' یہ انسانی ضمیر اور عقائد کے اندر بھی برپا ہوا تھا' میدان جنگ تو اس کے وسیع میدان کارزار کا ایک چھوٹا سا حصہ تھا۔ یہ معرکہ نفس انسانی کی گہرائیوں میں' انسان کے تصورات اور اس کے شعور میں' انسانی خواہشات اور اس کے میلانات میں اور اس کے اقدامات اور اس کی رکاوٹوں میں برپا تھا۔ اس معرکے کے اندر قرآن کریم نے نفس انسانی کی تربیت نہایت ہی لطیف' گہرے' موثر اور جامع طریقہ تربیت کے مطابق کی اور اس پر قرآن نے ان دشمنوں سے زیادہ توجہ دی جو میدان معرکہ میں اسلام کے خلاف برسرپیکار تھے۔

اس معرکہ میں داخل ہوتے ہی مسلمانوں کو فتح نصیب ہوئی لیکن انجام کار یہ فتح شکست میں بدل گئی۔ آغاز فتح مبین سے ہوا اور انجام ہزیمت اور شکست و ریخت سے ہوا' لیکن اس شکست و ریخت کے نتیجے میں مسلمانوں کو علم و معرفت واقفیت اور تجربے کے میدان میں واضح فتح نصیب ہوئی' ان کی آنکھیں کھل گئیں' انہوں نے اپنی آنکھوں سے وہ حقائق دیکھ لئے جنہیں قرآن نے بار بار بیان کیا تھا۔ ان کا شعور ان حقائق کے حوالے سے یقین کی حد تک پختہ ہو گیا' ان کے نفوس پاک ہو گئے' ان کی صفوں میں گندے عناصر چھٹ کر الگ ہو گئے' اور جماعت مسلمہ آگے بڑھنے لگی۔ وہ ان لوگوں کے بوجھ سے آزاد ہو گئی جن کے نظریات صاف ستھرے نہ تھے' جن کی اقدار حیات ناپختہ تھیں' جن کی فکر ڈانواں ڈول تھی۔ یہ مسئلہ یوں حل ہوا کہ اسلامی صفوں سے منافقین کی اکثریت چھٹ کر الگ ہو گئی' نفاق کی علامات واضح ہو کر سامنے آ گئیں اور سچائی کے اوصاف نکھر کر واضح ہو گئے۔ اقوال میں بھی اور افعال میں بھی۔ شعور میں بھی اور طرز عمل میں بھی۔ اس معرکے کے نتیجے میں یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ ایمان کے تقاضے کیا ہیں' دعوت ایمانی کے تقاضے کیا ہیں' اور تحریک ایمانی کو لے کر اٹھنے کے تقاضے کیا ہیں۔ نیز اس تحریک کو لے کر چلنے کے لئے کس قدر علمی استعداد کی ضرورت ہے' کس قدر یکسو ہو کر تیاری کی ضرورت ہے' اور کس قدر مستحکم تنظیم کی ضرورت ہے۔ اور اس تنظیم و انتظامات کے بعد کس قدر سنگین سمع و اطاعت کی ضرورت ہے۔ اور تنظیم اور سمع و اطاعت کے بعد کس قدر توکل علی اللہ کی ضرورت ہے۔ اس راہ کے ہر قدم پر اللہ پر مکمل بھروسے کی ضرورت ہے اور پوری جدوجہد کر کے بھی نتیجہ' نصرت کی شکل میں ہو یا شکست کی صورت میں' اللہ پر چھوڑ دینا ہے۔ زندہ رہ کر غازی ہونا ہے یا مر کر شہید ہونا ہے' کیا کرنا ہے اور کدھر جانا ہے یہ سب امور اللہ کے ہاتھ میں دے دینا ہے۔

ان واقعات کے نتیجے میں جماعت مسلمہ کے لئے جو بیلنس شیٹ بنی اور ان واقعات کے بعد جماعت کو قرآن کریم نے جو ہدایات دیں' اپنی قدر و قیمت کے اعتبار سے وہ اس مال غنیمت کے مقابلے میں بہت زیادہ اہم تھیں جو فتح مبین کی صورت میں مسلمانوں کو حاصل ہوتا' اس صورت میں کہ مسلمان احد کے میدان سے فتح و نصرت لے کر واپس ہوتے۔ اس لئے کہ اس دور میں مسلمانوں کو ان تجربات کی ضرورت ہزار درجے زیادہ تھی بہ نسبت اس کے کہ وہ میدان سے فتح و نصرت اور مال غنیمت لے کر لوٹتے۔ اس طرح جماعت مسلمہ کے بعد آنے والی امت کے لئے تجربات کا جو سرمایہ چھوڑا گیا وہ زیادہ اہم اور زیادہ باقی رہنے والا تھا' بہ نسبت اس فتح اور مال غنیمت کے جو فتح

کی صورت میں مسلمان حاصل کرتے۔ اس شکست کے پس منظر میں عالم بالا کا منصوبہ یہ تھا کہ اس واقعہ کے ذریعہ وہ نقائص ظاہر کر دیئے جائیں جو مسلمانوں کی صفوں میں پائے جاتے تھے' مثلاً ان کی جسمانی کمزوریاں' اخلاقی کمزوریاں اور فکری ژولیدگی۔ اور ظاہر ہے کہ صرف شکست کھانے کی صورت ہی میں یہ کمزوریاں ظاہر ہو سکتی تھیں۔ عالم بالا کا منصوبہ یہ تھا کہ اس وقت' اللہ کی سنت جاریہ کے مطابق' ٹھیک قدرتی طور پر اور سلسلہ اسباب کے اندر' مسلمانوں کو شکست ہو' اور اس وقت مسلمانوں کے لئے یہ شکست زیادہ مفید تھی' تاکہ جماعت مسلمہ ان تجربات سے دوچار ہو اور اسے عبرت حاصل ہو اور اس طرح اس کی عملی تربیت ہو' اس کی سوچ پختہ ہو جائے اور وہ واقعات کو اپنے فطری انداز میں سمجھے' نیز اس کی صفوں میں کھرے اور کھوٹے کا امتیاز ہو جائے۔ اس کی تنظیم اور تربیت میں جو جھول پائی جاتی تھی وہ دور ہو جائے اور پھر آنے والی امت کے لئے تجربات اور واقعات کا ایک عظیم سرمایہ ریکارڈ پر آ جائے' جو اس قدر قیمتی ہو کہ جس کی قیمت نہ چکائی جا سکتی ہو' یعنی اس معرکے میں فتح و نصرت سے بھی اس کی قیمت زیادہ ہو۔

یہ معرکہ میدان کارزار میں ختم ہوا اور اب قرآن کریم کے صفحات میں اسے لیا گیا' جو میدان جنگ سے بڑا میدان ہے' پھر یہ معرکہ نفس انسانی کے میدان میں شروع ہوا اور آخر کار وہ جماعت مسلمہ کی اجتماعی زندگی کے میدان میں شروع ہوا' یوں اللہ تعالیٰ نے اپنے دست قدرت سے اس جماعت کو بنایا' علم و حکمت کی اساس پر اور تجزیہ و بصیرت کی روشنی میں اور پھر جس طرح اللہ تعالیٰ کی مرضی تھی اس کے مطابق یہ جماعت تیار ہوئی۔ اسی میں اس جماعت کی بھلائی تھی کہ اسے ضرر پہنچے' اسے اذیتیں دی جائیں' اسے مبتلائے مصیبت کیا جائے' اور اسے سخت رنج و الم سے دوچار کیا جائے۔

اس معرکہ کے واقعات پر یہاں جو اختتامیہ دیا گیا ہے اور جو تبصرہ کیا گیا ہے اس میں جو چیز قابل التفات اور قابل تعجب ہے وہ یہ ہے کہ اس میں اس معرکہ کے مناظر اور واقعات کے بیان کے ساتھ ساتھ ان واقعات کے بارے میں ہدایات بھی ساتھ ساتھ موقعہ پر دی گئی ہیں اور ان ہدایات کے ساتھ ایسی ہدایات بھی دی گئی ہیں جن سے تزکیہ نفس اور تطہیر قلب و نظر کا بھی سامان کیا گیا ہے۔ مسلمانوں کے افکار کو گرد و غبار سے صاف کیا گیا ہے۔ ان کے افکار و تصورات کو خواہشات نفسانیہ کے قیود سے آزاد کیا گیا ہے' مسلمانوں کے کردار سے طمع و لالچ' بغض و کینہ' حرص اور بخل' پوشیدہ خواہشات اور فسق و فجور کو بڑی حکمت کے ساتھ پاک کیا گیا ہے۔

اور ان تعقیبات اور تبصروں میں خصوصاً معرکہ کارزار کے واقعات کے اندر سودی کاروبار سے بھی بحث کی گئی ہے اور سود خوری سے روکا گیا ہے جو بظاہر بے جوڑ نظر آتی ہے اور اس کے بعد یہ حکم دیا گیا ہے کہ ہر اہم معاملے میں مشورہ ضرور کیا جائے' اور اس پر عمل کیا جائے' اس کے باوجود کہ جنگ احد کے بارے میں جو شوریٰ ہوئی اور فیصلے ہوئے' اس کے نتائج بظاہر اچھے نہ نکلے تھے اور جنگ میں شکست ہو گئی تھی۔ یہ بات بھی قابل تعجب ہے (تفصیلی بحث بعد میں آتی ہے)

پھر اس کے بعد قرآن کریم' اس موقعہ پر انسانی نفسیات پر بھی بحث کرتا ہے' انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو لیتا ہے۔ اس زندگی کے مختلف پہلوؤں اور مختلف حرکات کے مباحث کو ایک دوسرے کے اندر ملا دیا جاتا ہے۔ یہ مختلف النوع مباحث ایک دوسرے کے ساتھ متکامل نظر آتے ہیں اور بعض اوقات یہ عجیب نظر آتے ہیں۔

لیکن جو لوگ اس ربانی طریقہ کار سے واقف ہیں انہیں وسیع اور مختلف النوع مباحث کی ملاوٹ اور ایک دوسرے کے ساتھ گڈمڈ کرنے پر کوئی تعجب نہیں ہوتا' اس لئے کہ تحریک اسلامی جس معرکہ میں کودی ہے' وہ صرف میدان کارزار ہی کا معرکہ نہیں ہے جس میں صرف اسلحہ' گھوڑے اور افراد کار اور سازو سامان درکار ہوتے ہیں یا زیادہ سے زیادہ جنگی تدابیر اور جنگی چالیں کام میں لائی جاتی ہیں۔ بلکہ یہ ایک وسیع اور ہمہ گیر معرکہ ہوتا ہے اور میدانی جنگ اس کا ایک حصہ یا شعبہ ہوتا ہے۔ اصل معرکہ وہ عظیم کشمکش ہے اور تھی جو انسانی ضمیر

کی دنیا میں برپا ہوتی ہے' یہ کشمکش اس وقت جماعت کی اجتماعی تنظیم کے اندر برپا تھی' اس معرکے کا تعلق انسانی ضمیر کی پاکیزگی سے تھا' انسانی ضمیر کو خالص اور خالی کرنا مقصود تھا' اور اسے ان تمام آلودگیوں سے پاک کرنا مطلوب تھا' جن سے اس کی صفائی اور پاکیزگی متاثر ہوتی تھی۔ اور انسانی ضمیر قرب الٰہی سے دور بیٹھ جاتا تھا۔ نیز اس معرکے کا تعلق ان تنظیمی امور سے بھی تھا جن پر جماعت مسلمہ کی زندگی کا دارومدار تھا' اسلامی نظام زندگی کے مطابق' یعنی وہ شورائی نظام جس پر پوری اجتماعی زندگی کی عمارت اٹھائی گئی تھی' یعنی صرف نظام حکومت میں ہی نہیں بلکہ پورے اسلامی نظام حیات میں جو باہم تعاون کے اصول پر قائم ہے اور جس میں سود خوری جیسا ظالمانہ نظام ممنوع ہے اس لئے کہ سود خوری اور باہم تعاون دو متضاد اصول ہیں۔

اسلام' جماعت مسلمہ کی تربیت صرف ایک میدانی جنگ کے بعد کے نقطہ نظر سے نہ کر رہا تھا' بلکہ وہ اس کی تربیت اس عظیم کشمکش کے حوالے سے کر رہا تھا جو وسیع تر میدان میں برپا تھی' انسانی نفس کے میدان میں انسان کی عملی زندگی کے میدان میں اسلام نے رباکی طرف توجہ کی تو اسے حرام قرار دیا' وہ انفاق کی طرف متوجہ ہوا تو خواہ خوشحالی ہو یا بد حالی اس پر لوگوں کو ابھارا۔ اس نے اللہ و رسول ﷺ کی اطاعت کو اللہ کی رحمت کے لئے ضروری قرار دیا۔ اس نے غصہ پینے اور عفو و درگزر کا حکم دیا' اس نے احسان اور استغفار کا حکم دیا۔ گناہ پر اصرار کرنے سے منع کیا اور توبہ کا حکم دیا۔ اور ان سب امور کو اللہ کی رضامندی کے اسباب قرار دیا۔ انہیں بتایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تمہارے لئے رحم دل کر کے بھیجا گیا۔ اس نے حکم دیا کہ مشکل سے مشکل اوقات میں شوریٰ کے اصول کو قائم رکھا جائے' اس نے حکم دیا کہ معاملات میں راستی کو اختیار کیا جائے اور بد دیانتی نہ کی جائے۔ دولت کو خرچ کیا جائے اور بخل و کنجوسی سے اجتناب کیا جائے۔ غرض یہ اور دوسری ہدایات غزوۂ احد پر تبصرے کے دوران فرمائی گئیں۔

اسلام نے ان سب احکام کی طرف توجہ دی اس لئے کہ یہ وہ عناصر ہیں جن کے ذریعے جماعت مسلمہ کو وسیع تر معرکے اور کشمکش کے لئے تیار کیا جا رہا تھا۔ جس میں میدان جنگ میں قتال بھی شامل تھا مگر یہ معرکہ صرف قتال تک محدود نہ تھا بلکہ یہ وسیع تر ذمہ داریوں کا معرکہ تھا تاکہ اس کے نتیجے میں ایک عظیم انقلابی فتح حاصل کی جائے۔ یہ عظیم اور مکمل فتح اپنی لپیٹ میں نفس انسانی' اس کی تمام خواہشات' اس کی ہر قسم کی حرص و لالچ' اس کی تمام کینہ پروری کو لے لے۔ نیز پر امن حالات میں بھی یہ جماعت مسلمہ کے لئے اقدار و اطوار کے میدان میں فتح عظیم پر مشتمل ہو۔

اسلام نے ان تمام امور پر پوری توجہ کر کے یہ فیصلہ کیا کہ پوری انسانیت کی تکوین اور اس کی تشکیل اور اس کی سرگرمیوں کا جائزہ اسلامی نظریۂ حیات کے نقطہ نظر کے مطابق لیا جائے اور پوری انسانیت کو ایک ہی محور کے گرد گھما دیا جائے' وہ محور کیا تھا؟ یہ کہ بندگی صرف اللہ کی ہو گی' پرستش صرف اللہ کی ہو گی' انسان پورے احساس ذمہ داری کے ساتھ خدا کا خوف دل میں رکھتے ہوئے' اپنے رب کی طرف متوجہ ہوں' اور اللہ کا منہاج زندگی اس پوری کائنات پر چھا جائے اور پوری انسانیت اپنے حالات میں سے ہر حال میں اسی منہاج کے مطابق زندگی بسر کرے۔ اور انسانی زندگی کے مختلف حالات اسلامی نظام زندگی کے رابطے میں مربوط ہوں اور انسانی تگ و دو کے تمام نتائج بھی اسلامی منہاج کے نتائج کے مطابق ہوں اور نفس انسانی کی تمام حرکات اور تمام تنظیمات اور انسانی نظم و نسق کی تمام جزئیات ان آخری نتائج کے برآمد کرنے میں ممد اور مؤثر ثابت ہوں۔

اس لئے جنگ احد پر تبصرے کے درمیان کئی دوسرے مباحث پر بھی گفتگو کی گئی جو اس معرکے کے ساتھ بے جوڑ ہرگز نہیں ہیں' اس لئے کہ نفس انسانی جب تک اپنے شعور و ادراک اور اپنی عادات اور اخلاق میں فاتح نہ ہو گا وہ معرکہ قتال میں کبھی فاتح نہیں ہو سکتا۔ اور وہ لوگ جو مقابلے کے دن پیٹھ پھیر گئے تھے ان کی اس لغزش کا سبب یہ تھا کہ ان کی بعض کمزوریوں کی وجہ سے شیطان نے ان کے قدم ڈگمگا

دیئے تھے۔ (۱۵۵) اور جو لوگ نظریاتی جنگوں میں' اپنے انبیاء کی قیادت میں سرخرو ہوئے تھے' وہ اس لئے سرخرو ہوئے تھے کہ وہ ان معرکوں میں کودنے سے پہلے اپنے گناہوں سے توبہ کر چکے تھے اور وہ اللہ تعالیٰ سے کامیابی کی التجا کے ساتھ آگے بڑھے تھے اور اللہ کے مضبوط سہارے پر بھروسہ کرتے ہوئے میدان کارزار میں کودے تھے۔ اس لئے گناہوں سے پاکیزگی' اللہ کے ساتھ جڑنا' اللہ پر بھروسہ رکھنا دراصل وہ سازوسامان ہے جس کے نتیجے میں نصرت اور فتح نصیب ہوا کرتی ہے۔ اس لئے ان عوامل کو میدان جنگ سے دور نہیں کیا جا سکتا' لہٰذا سودی نظام معیشت کو ختم کر کے باہم تعاون (Co-operation) کے نظام کو قائم کرنا بھی گویا فتح مندی کے اسباب میں سے ایک اہم سبب ہے۔ سودی معاشرے کے مقابلے میں باہمی تعاون و تکافل کا معاشرہ فتح مندی سے زیادہ قریب ہے۔ اس طرح غصے کو پی جانا اور غلطیوں کو معاف کر دینا بھی سامان جنگ میں سے اہم ہتھیار ہے' اپنے نفس امارہ کو قابو میں رکھنا بھی ایک قسم کی جنگی تربیت ہے۔ معاشرہ کا معاشی لحاظ سے باہم کفیل ہونا' باہم انس اور محبت رکھنا' ایک دوسرے کی کوتاہیاں معاف کرنا وغیرہ بھی ایک ایسی فعال قوت عامل ہے جو فتح کی ضامن ہے۔

ان عوامل کے ساتھ کچھ مزید حقائق بھی تھے جن پر اس سبق میں شروع سے آخر تک بھروسہ کیا گیا ہے' مثلاً تقدیر الٰہی کی اہمیت اور یہ کہ اللہ نے جن باتوں کا فیصلہ کیا ہوا ہے انہوں نے وقوع پذیر ہونا ہی ہے' اس لئے جو غلطی ہوگئی' اس سلسلے میں اپنے تصور حیات اور اپنے خیالات کو قطعیت کے ساتھ درست کر لیا جائے کہ جو کچھ ہوا وہ سنت الٰہی کے مطابق ہوا' انسانی سرگرمیوں اور اس کی مساعی' انسان کے درست طرز عمل اور اس کی غلطیوں' انسان کی اطاعت امر اور اس کی معصیت' اسلامی منہاج کو مضبوطی سے پکڑ لینا اور اس میں کوتاہی کرنا' ان سب کے نتائج سنت الٰہی کے مطابق مرتب ہوتے ہیں اور سنت الٰہی کے یہ سب مظاہر پردۂ تقدیر کے پیچھے سے ٹھیک ٹھیک نمودار ہوتے ہیں اور یہ سب مشیئت الٰہی کے نمونے ہوتے ہیں اور جو کچھ واقع ہو جائے وہ اللہ کے طے شدہ فیصلے ہوتے ہیں' اس لئے ان پر کوئی تاسف کرنے کی ضرورت نہیں۔

اسی نکتے کو آخر میں' جماعت مسلمہ کو خطاب کرتے ہوئے یوں بیان کیا جاتا ہے کہ اگر تمہیں فتح نصیب ہو تو اتراؤ نہیں' اس میں تمہارا کچھ بھی نہیں ہے' تم تو اللہ کی تدبیر اور اس کی تقدیر کے آلات ہو اور یوں تمہیں جہاد کے میدان میں لاکر اللہ اپنی قدرت کے نمونے دکھا رہا ہے۔ اس لئے اس تمام جدوجہد کا اجر اللہ پر ہی ہے' اس لئے کہ تم اللہ کا کام کر رہے ہو' تمہارے لئے بطور استحقاق اس دنیا میں فتح مندی کے ثمرات میں کوئی ثمرہ لازمی نہیں ہے اور نہ فتح لازم ہے۔ یہ تو اللہ ہے کہ جسے چاہے فتح دے دے اور وہ یہ فتح دنیاوی مقاصد کے لئے بھی عطا نہیں کرتا بلکہ وہ ان مقاصد عالیہ کے لئے عطا کرتا ہے' جو اس کو مطلوب ہیں' اسی طرح شکست بھی جب کسی کے حصے میں آتی ہے تو وہ بھی سنت الٰہیہ کے مطابق واقع ہوتی ہے' اور اس کے حقیقی اسباب خود جماعت مسلمہ کے اندر کمزوریوں اور کمیوں کی صورت میں موجود ہوتے ہیں اور اس شکست میں بھی' اللہ کے علم کے مطابق کوئی حکمت پوشیدہ ہوتی ہے' مثلاً جماعت مسلمہ کا تزکیۂ نفس' اس کی صفوں سے غلط لوگوں کا چھانٹ کر الگ کرنا' حقائق اور تلخ حقائق کا اظہار' اعلیٰ قدروں کا استحکام اور حسن و قبح کے پیمانوں کا قیام اور آئندہ آنے والوں کے لئے عبرت اور نصیحت آموزی کے لئے نمونوں اور مثالوں کا قیام۔

اسلام کی نظر میں عسکری کامیابی' سیاسی کامیابی یا اقتصادی کامیابی کی اس وقت تک کوئی قدروقیمت نہیں ہے' جب تک یہ کامیابی ربانی نظام حیات کی اساس پر نہ ہو' اس کامیابی میں ظاہری فتح و نصرت کے ساتھ ساتھ نفس انسانی پر فتح' خواہشات نفسانیہ پر غلبہ اور شہوات کے مقابلے میں کامیابی حاصل نہ ہو' اور اس سچائی کو غلبہ نصیب نہ ہو جسے اللہ تعالیٰ لوگوں کی زندگیوں میں قائم کرنا چاہتے ہیں' تاکہ ہر فتح اللہ کی فتح ہو اور اسلامی نظام زندگی کے لئے ہو۔ اگر یہ صورت حال نہ ہو تو پھر جو بھی فتح ہوگی وہ جاہلیت کی فتح ہوگی کسی دوسری جاہلیت کے مقابلے

میں ہوگی' ایسی فتح کے نتیجے میں نہ زندگی کو کوئی فائدہ ہو گا نہ انسانیت کا کوئی بھلا ہو گا بھلائی تو یہ ہوگی کہ بھلائی کے جھنڈے محض سچائی کے لئے بلند ہوں اور سچائی اپنی حقیقت کے اعتبار سے ایک ہے' اس میں تعدد ممکن نہیں ہے اور وہ اسلامی اور الٰہی منہاج حیات ہے' جس کے علاوہ کسی اور منہاج کے لئے زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ اور اسلامی نظام حیات کی فتح اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک یہ فتح سب سے پہلے نفس انسانی کے میدان میں واقع نہ ہو' اس کے بعد انسان کی عملی زندگی میں حق کو یہ فتح نصیب نہ ہو۔ جب نفس انسانی اپنی ذات میں اپنی خودی کو گم کر دے' اپنی ذات سے لالچ اور خواہش نفس کو ختم کر دے' اسے گندگیوں اور کینہ پروری سے پاک کر دے' وہ پوری طرح نفسانی بندھن توڑ دے اور اس کی نظریں صرف ذات باری کی طرف اٹھ رہی ہوں اور وہ ان تمام بوجھوں اور بندھنوں سے آزاد ہو جائے جن میں وہ جکڑا ہوا ہے' غرض جب وہ پوری جدوجہد کر کے اور پوری تگ و دو کے بعد اپنی ظاہری مادی قوت' اپنے مادی وسائل' اپنے ظاہری اسباب سے آزاد ہو کر صرف اللہ کی ذات پر بھروسہ کرنے لگے' اور جب وہ اپنی پوری زندگی کے معاملات میں اللہ کے حکم کے مطابق فیصلے کرے اور اللہ کی اس حاکمیت کے قیام کو اپنی تمام جدوجہد اور فتح و نصرت کا مقصد اعلیٰ سمجھے' غرض جب وہ یہ تمام امور اچھی طرح مکمل کر لے تو تب میدان کارزار میں اس کی عسکری کامیابی' کسی ملک میں اس کی سیاسی کامیابی اور اقتصادی کامیابی صحیح فتح تصور ہوگی' اور تب جا کر اس کی فتح اللہ کے نزدیک فتح ہوگی ورنہ دراصل وہ ایک جاہلیت کی دوسری جاہلیت پر فتح تصور ہوگی۔ اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس قسم کی فتح کی نہ کوئی قیمت اور نہ کوئی وزن ہے۔

یہی وجہ ہے کہ معرکہ بدر پر تبصرے کے درمیان درج بالا امور پر بھی بحث کی گئی ہے جو بظاہر بے جوڑ نظر آتی ہے۔ متنوع امور کو اکٹھا کیا گیا ہے اور اس معرکہ پر اختتامیہ اور تبصرہ میں ان تمام امور کو شامل کیا گیا ہے' اور ان امور کو اس وسیع میدان جنگ میں لایا گیا ہے' جس کا ایک حصہ میدان بدر ہے' جس کے بہت سے پہلوؤں میں سے احد ایک پہلو ہے۔

○.....☆☆☆.....○

اس سے پہلے کہ ہم معرکہ احد کے واقعات پر یہ قرآنی تبصرہ پیش کریں' یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ غزوۂ احد کے واقعات کو اس ترتیب کے ساتھ پیش کر دیا جائے جس کے ساتھ وہ کتب سیرۃ میں بیان ہوئے ہیں۔ تاکہ ہم ان مقامات کو اچھی طرح سمجھ سکیں جن پر اللہ کی جانب سے تبصرہ ہوا اور ہم اس بات کا ادراک کر سکیں کہ اللہ تعالیٰ کا طریقہ تربیت کیا ہے' جو اللہ نے قرآن کریم میں ان واقعات پر تبصرہ کرتے ہوئے اختیار کیا ہے؟

حالات یہ تھے کہ مسلمانوں کو بدر میں مکمل فتح نصیب ہوئی تھی۔ اور یہ ایک ایسا واقعہ تھا اور جن ظروف و احوال میں یہ پیش آیا تھا' ان میں یہ ایک بہت بڑا معجزہ نظر آتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اہل اسلام کے ہاتھوں کفر کے علم برداروں اور بڑے بڑے سرداروں کے سر قلم کروائے۔ جو لوگ قتل ہوئے وہ قریش کے سردار تھے۔

اس کے بعد ابوسفیان بن حرب قریش کا سردار مقرر ہوا۔ سردار مقرر ہوتے ہی اس نے مسلمانوں سے بدلہ لینے کے لئے تیاریاں شروع کر دیں' ابوسفیان کا قافلہ بدر میں مسلمانوں کا ٹارگٹ تھا' جس کے پاس قریش کا کافی تجارتی مال تھا۔ اس قافلے میں وہ بچ نکلا تھا' بدر کے بعد مشرکین نے یہ فیصلہ کیا کہ اس قافلے کا تمام تجارتی سامان بطور ابتدائی سرمایہ مسلمانوں کے خلاف جنگ میں استعمال کیا جائے۔

ابوسفیان نے تین ہزار افراد پر مشتمل ایک فوج تیار کی جو قریش' اس کے حلیفوں اور حبشیوں پر مشتمل تھی۔ ماہ شوال ۳ ہجری میں وہ فوج لے کر نکلا۔ یہ لوگ اپنے ساتھ اپنی عورتیں بھی لے کر آئے تاکہ ان کے بچاؤ کے جوش میں وہ بھاگنے کی کوشش نہ کریں۔ اس نے مدینہ کا رخ کیا اور جبل احد کے قریب اس نے ڈیرے ڈالے۔

اس موقع پر رسول خدا ﷺ نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مشورہ کیا۔ سوال یہ تھا کہ آپ باہر جاکر مقابلہ کریں یا مدینہ میں ٹھہر جائیں۔ خود حضور اکرم ﷺ کی رائے یہ تھی کہ مسلمان باہر نہ نکلیں بلکہ مدینہ کے اندر قلعہ بند ہو جائیں۔ مرد تنگ گلیوں اور مقامات جنگ پر لڑیں اور عورتیں مکانوں کی چھتوں سے جنگ میں حصہ لیں۔ حضور اکرم ﷺ کے ساتھ اس رائے میں رئیس المنافقین عبداللہ ابن ابی بھی موافق اور ہم رائے تھا۔ اس پر صحابہ کرام ﷺ کی ایک بڑی تعداد آگے بڑھی اور ان میں اکثریت ان لوگوں کی تھی جو جوان تھے اور جو بدر کی جنگ میں حصہ نہ لے سکے تھے۔ ان لوگوں نے مشورہ دیا کہ ہمیں باہر جاکر میدان جنگ میں لڑنا چاہئے۔ انہوں نے اپنے مشورے پر کافی اصرار بھی کیا۔ یہ بات ظاہر ہو گئی کہ جماعت میں اکثریت کی رائے یہی ہے۔ آپ اٹھے اور آپ اپنے مکان 'حجرۂ عائشہ رضی اللہ عنہا میں داخل ہوئے اور اپنی زرہ پہن کر واپس تشریف لائے۔ اتنی دیر میں ان لوگوں کی رائے بدل چکی تھی۔ انہوں نے سوچا کہ ہم نے رسول خدا ﷺ کو باہر جاکر لڑنے پر خواہ مخواہ مجبور کر دیا۔ اب انہوں نے عرض کی حضور! اگر آپ ﷺ مدینہ کے اندر رہنے کو پسند فرماتے ہیں تو ایسا کر لیں۔ اس پر رسول خدا ﷺ نے فرمایا: "نبی کے لئے یہ مناسب نہیں ہے کیونکہ نبی جب اپنی زرہ پہن لیتا ہے تو وہ اسے اس وقت تک نہیں اتارتا جب تک اس کے اور دشمن کے درمیان اللہ کوئی فیصلہ نہ کر دے۔" یوں حضور نے انہیں پیغمبرانہ سبق دیا اور وہ سبق یہ تھا کہ شوریٰ کا ایک مقررہ وقت ہوتا ہے' اور جب شوریٰ کا وقت ختم ہو جائے اور عزم وارادہ کا وقت آجائے اور طے شدہ فیصلے پر عمل کا وقت آجائے تو اس وقت پھر صرف اللہ پر توکل کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد پھر تردد کا کوئی موقعہ نہیں ہوتا۔ نہ دوبارہ شوریٰ کا انعقاد ہوتا ہے اور نہ آراء کے بارے میں دوبارہ سوچا جاتا ہے۔ شوریٰ کے بعد تو معاملات اپنے انتہا کو پہنچ جاتے ہیں اور اب فیصلہ اللہ کے ہاتھ میں ہوتا ہے جو وہ چاہے ظاہر کر دیتا ہے۔

اور حضور ﷺ نے خواب میں دیکھا تھا کہ آپ کی تلوار ایک جگہ سے ٹوٹ کر کند ہو گئی ہے اور ایک گائے ذبح ہو رہی ہے' اور یہ کہ انہوں نے اپنا ہاتھ ایک مضبوط زرہ میں ڈالا ہے۔ آپ نے اس خواب کی تعبیریوں کی تلوار میں کند پڑنے کے معنی یہ ہیں کہ میرے خاندان میں سے کوئی شخص فوت ہو گا' گائے ذبح ہونے کی تعبیر آپ نے یہ فرمائی کہ آپ کے کچھ رفقاء قتل ہوں گے اور زرہ کا مفہوم آپ نے مدینہ سے لیا۔ اس لئے اس خواب کے بعد آپ معرکۂ احد کا نتیجہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے' لیکن اس کے باوجود آپ نے شوریٰ کے طریقہ کار اور فیصلے پر عمل فرمایا' نیز شوریٰ کے بعد اپنی تگ و دو کے ذریعہ فیصلوں پر عمل کیا۔ یہ اس لئے کہ آپ ایک امت کی تربیت فرما رہے تھے' اور اقوام کی تربیت واقعات و حوادث سے ہوا کرتی ہے۔ اور تجربات کا ایک طویل سلسلہ ہوتا ہے جس کا نچوڑ چند واقعات کی شکل میں نکلتا ہے۔ مزید برآں یہ کہ آپ کے فیصلوں کے ذریعہ تقدیر الٰہی کا اظہار ہوتا تھا' وہ فیصلے جن پر آپ کا شعور پختہ تھا' جن پر آپ کا دل مطمئن تھا۔ اس لئے آپ تقدیر الٰہی کے مطابق کام کر رہے تھے۔ لیکن اس کے باوجود آپ کا دل ان واقعات کو محسوس کر رہا تھا۔

بہرحال حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک ہزار صحابہ کرام کو لے کر نکلے' مدینہ میں جو لوگ رہ گئے تھے' ان کو نماز پڑھانے کے لئے آپ نے ابن ام مکتوم کو مقرر فرمایا۔ جب آپ مدینہ اور احد پہاڑ کے درمیان پہنچے تو رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی اس لشکر کے ایک تہائی حصہ کو لے کر واپس ہو گیا' اس نے یہ کہا کہ وہ میری مخالفت کرتے ہیں اور نوجوانوں کی بات سنتے ہیں۔ حضرت جابر کے والد عبداللہ بن عمرو ابن حرام' نے ان کا پیچھا کیا' انہیں سخت و سست کہا اور باصرار انہیں آمادہ کرنے کی کوشش کی کہ وہ لوٹ آئیں۔ اس نے انہیں پکارا: "آؤ اور اللہ کی راہ میں لڑو' یا کم از کم مدافعت کرو۔" انہوں نے جواب دیا: "اگر ہمیں یقین ہوتا کہ آپ لڑتے ہیں تو ہم واپس نہ ہوتے۔" اس پر حضرت عبداللہ انہیں خوب گالیاں دے کر واپس ہو گئے۔

اس کے بعد انصار میں سے بعض لوگوں نے یہ تجویز پیش کی۔ اس موقعہ پر یہود سے مدد لی جائے جو ہمارے حلیف ہیں۔ لیکن رسول

خدا ﷺ نے اس تجویز کو بھی رد کر دیا۔ اس لئے کہ یہ معرکہ دراصل کفر اور ایمان کا معرکہ تھا' یہودیوں کو اس سے کوئی دلچسپی نہ تھی' اور فتح و نصرت اللہ کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ اور یہ فتح تب آتی ہے جب اللہ پر توکل کیا جائے اور قلوب اللہ کے لئے خالص ہو جائیں۔ آپ نے فرمایا :"کون لوگ ہیں جو ہمارے ساتھ ان لوگوں کے مقابلے کے لئے ریگستان میں اتریں۔" اس پر آپ کے ساتھ انصار میں سے کچھ لوگ نکلے تو آپ وادی کے آخری حصہ میں اترے' آپ نے اپنی پیٹھ احد پہاڑ کی طرف کی اور لوگوں کو حکم دیا کہ وہ اس وقت تک جنگ شروع نہ کریں جب تک آپ حکم نہ دیں۔

جب صبح ہوئی تو آپ ﷺ نے سات سو افراد پر مشتمل فوج کو جنگ کے لئے ترتیب دیا۔ ان میں صرف پچاس گھوڑ سوار تھے' آپ نے پچاس تیراندازوں پر عبداللہ بن جبیر کو کمانڈر مقرر فرمایا اور ان لوگوں کو حکم دیا کہ آپ گھاٹی میں جہاں ان کی ڈیوٹی لگا رہے ہیں وہ وہاں جمے رہیں اور اس پوسٹ کو کسی حال میں خالی نہ چھوڑیں' اگرچہ وہ دیکھیں کہ پرندے لشکر اسلام کا گوشت نوچ رہے ہوں' یہ لوگ فوج کی پشت پر پہاڑ میں تھے۔ آپ نے فرمایا کہ یہ لوگ مشرکین پر تیروں کی بارش کر دیں تاکہ وہ پشت کی طرف مسلمانوں پر حملہ آور نہ ہو جائیں۔

ابن عمیر کو جھنڈا دیا اور آپ ﷺ نے فوج کے ایک طرف پر زبیر ابن العوام کو مقرر فرمایا اور دوسری طرف پر آپ ﷺ نے مصعب ابن عمیر کو مقرر فرمایا۔ احد کے دن نوجوانوں نے اپنے آپ کو جنگ کے لئے پیش کیا۔ آپ نے ان کا معائنہ فرمایا اور جن کو جنگ میں حصہ لینے کے لئے ناقابل پایا انہیں مسترد کر دیا۔ ان میں عبداللہ ابن عمر' اسامہ ابن زید' اسید بن ظہیر' براء ابن عازب' زید ابن ارقم و زید بن ثابت' عرابہ ابن اوس اور عمرا ابن حزام تھے۔ اور جن لوگوں کو جنگ کے قابل قرار دیا گیا وہ سمرہ ابن جندب اور رافع بن خدیج تھے۔ یہ پندرہ سال کے تھے۔

قریش نے تین ہزار فوجیوں کو جنگ کے لئے تیار کیا۔ ان میں سے دو صد گھوڑ سوار تھے' انہوں نے میمنہ پر خالد ابن الولید اور میسرہ پر عکرمہ ابن ابی جہل کو مقرر کیا۔

آج رسول خدا ﷺ نے اپنی تلوار ابو دجانہ سماک ابن خرشہ کو عطا فرمائی اور وہ ایک ایسے بہادر سورما تھے جو جنگ کے وقت نہایت شوکت اور تعلی کا مظاہرہ کیا کرتے تھے۔

مشرکین میں سے پہلے جو شخص نمودار ہوا وہ ابو عامر فاسق تھا۔ یہ ابو عامر راہب کے لقب سے مشہور تھا مگر حضور ﷺ نے اس کا نام ابو عامر فاسق رکھ دیا۔ یہ شخص دور جاہلیت میں قبیلہ اوس کا سردار تھا۔ جب اسلام آیا تو وہ اسلام کے خلاف ہو گیا اور اس نے علی الاعلان رسول خدا ﷺ کے ساتھ عداوت شروع کر دی۔ اس نے مدینہ چھوڑ دیا اور قریش سے جا ملا اور انہیں رسول خدا ﷺ کے خلاف جمع کرتا رہا اور انہیں رسول خدا ﷺ کے خلاف جنگ پر آمادہ کرتا رہا۔ وہ انہیں یقین دلاتا کہ اس کی قوم جب اسے دیکھے گی تو وہ اس کی بات مان کر رسول خدا ﷺ کو چھوڑ دے گی۔ یہ سب سے پہلے مسلمانوں کے سامنے آیا۔ اس نے اپنی قوم کو پکارا' اور اس نے اپنا تعارف کرایا تو انہوں نے جواب دیا :اے فاسق اللہ آپ کو آنکھیں نہ دے۔ اس پر اس نے جواب دیا کہ میرے بعد میری قوم تباہ ہو گئی ہے۔ اس کے بعد اس نے مسلمانوں کے ساتھ شدید جنگ کی۔

اور جب لڑائی شروع ہوئی تو ابو دجانہ نے داد شجاعت دی۔ ان کے ساتھ طلحہ ابن عبیداللہ' حمزہ ابن عبدالمطلب' علی ابن ابی طالب' نضر بن انس اور سعد ابن زبیر نے کارہائے نمایاں سرانجام دیئے۔ دن چڑھتے ہی مسلمانوں نے کفار کو شکست دے دی۔ ان میں سے انہوں نے ستر بہادر اور معتبر افراد کو قتل کر دیا اور باقی دشمنان خدا ہزیمت اٹھا کر بھاگ گئے' وہ کیمپ میں عورتوں کے پاس پہنچ

گئے۔ عورتوں نے اپنے کپڑے سمیٹ لئے اور بھاگنے لگیں۔

تیراندازوں کے دستے نے جب دیکھا کہ کفار کو شکست ہو گئی ہے اور وہ بھاگ کھڑے ہوئے ہیں تو انہوں نے اپنے وہ مقامات خالی کر دیئے جہاں انہیں رسول خدا ﷺ نے مامور فرمایا تھا اور حکم دیا تھا کہ وہ انہیں ہرگز نہ چھوڑیں۔ ان لوگوں نے ایک دوسرے کو پکارا کہ مال غنیمت لٹ رہی ہے یارو! ان کے امیر نے انہیں حضور اکرم ﷺ کا حکم یاد دلایا مگر انہوں نے ایک نہ سنی۔ ان کا خیال یہ تھا کہ مشرکین اب نہیں لوٹیں گے چنانچہ یہ لوگ بھی مال غنیمت پر ٹوٹ پڑے اور گھاٹی کو انہوں نے خالی کر دیا۔

خالد بن ولید کو یہ معلوم ہوا کہ گھاٹی کو تیراندازوں نے خالی کر دیا ہے' اس لئے وہ مشرکین کے گھوڑ سواروں کو لے کر گھاٹی کے راستے حملہ آور ہوئے' انہوں نے دیکھا کہ راستہ خالی ہے' یوں خالد کی جنگی چال کامیاب ہوئی اور وہ مسلمانوں پر پشت کی جانب سے ٹوٹ پڑا اور جس وقت مشرکین اور شکست خوردہ لشکر نے دیکھا کہ خالد مسلمانوں پر چڑھ دھوڑا ہے تو انہوں نے بھی آگے کی طرف سے انہیں گھیرے میں لے لیا۔

اب اس معرکے کی صورت حال مکمل طور پر تبدیل ہو گئی' میدان جنگ مسلمانوں کے خلاف ہو گیا۔ مسلمانوں کی صفوں میں افراتفری مچ گئی۔ لوگوں کے اندر اضطراب پھیل گیا اور وہ سخت خائف ہو گئے۔ اس لئے کہ خالد کا حملہ اس قدر ہولناک اور اس قدر اچانک تھا کہ کسی کو بھی اس کی توقع نہ تھی۔ بہت سے لوگ مارے گئے اور مسلمانوں میں سے جس کی قسمت میں شہادت لکھی ہوئی تھی وہ شہید ہوا۔ اب مشرکین کو رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم تک راہ پانے کا موقعہ مل گیا۔ آپ تنہا رہ گئے تھے' آپ کی حفاظت کے لئے اس قدر تھوڑے افراد رہ گئے تھے کہ انگلیوں پر گنے جا سکتے تھے۔ انہوں نے رسول خدا ﷺ کا دفاع کیا اور شہید ہو گئے۔ حضور اکرم ﷺ کا چہرہ مبارک زخمی ہو گیا' آپ کے نچلے جبڑے اور دانت مبارک زخمی ہوا اور آپ کے سر پر خود ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا' مشرکین نے آپ کو پتھروں سے مارا' یہاں تک کہ آپ ایک پہلو پر گر گئے۔

اس کے بعد آپ ایک گڑھے میں گر گئے جو ابو عامر فاسق نے کھودا تھا اور اوپر سے ڈھانپ دیا تھا کہ مسلمان اس میں گر جائیں اور زرہ کے حلقے آپ کے چہرۂ مبارک میں گھس گئے تھے۔ اس خوفناک صورت حال کے عین درمیان کسی نے چیخ کر یہ آواز دی کہ حضرت محمد ﷺ شہید ہو گئے ہیں۔ چنانچہ اس خوفناک آواز نے ان کی رہی سہی قوت بھی ختم کر دی۔ چنانچہ بچے کھچے مسلمان بھاگ کھڑے ہوئے اور حضور ﷺ کی وفات کی خبر سن کر وہ اس قدر مایوس ہوئے اور اس قدر کبیدہ خاطر ہوئے کہ ان کی قوت نے جواب دے دیا۔ اب انہوں نے جنگ کا خیال ہی دل سے نکال دیا۔

تمام لوگ بھاگ کھڑے ہوئے مگر انس ابن نضر نہیں بھاگے۔ وہ حضرت عمر ابن الخطاب' طلحہ ابن عبداللہ کے پاس پہنچے جو بعض مہاجرین اور انصار کے ساتھ بیٹھے تھے۔ انہوں نے ہاتھ لٹکائے ہوئے تھے' تو انہوں نے کہا: تم لوگ کیوں بیٹھے ہوئے ہو' انہوں نے کہا رسول خدا ﷺ شہید ہو گئے ہیں۔ تو انہوں نے کہا: "تو رسول خدا ﷺ کے بعد تم زندہ رہ کر کیا کرو گے؟" "اٹھو اور جس مقصد کے لئے حضور اکرم ﷺ نے جان دے دی اس کے لئے جان دے دو۔" اس کے بعد انس ابن نضر کفار پر ٹوٹ پڑے' اس وقت انہیں سعد ابن معاذ ملے اور انہوں نے انہیں پکار کر کہا: "سعد میں جنت کی ہوا احد کے اس پار سے محسوس کر رہا ہوں۔" اس کے بعد انہوں نے سخت لڑائی کی یہاں تک کہ شہید ہو گئے۔ ان کے جسم پر ستر سے کچھ اوپر زخم آئے تھے' نہیں کوئی پہچان بھی نہ سکا۔ آخر کار ان کی لاش کو ان کی بہن نے ان کی انگلیوں سے پہچان لیا۔

اب حضور ﷺ مسلمانوں کی طرف متوجہ ہوئے۔ سب سے پہلے انہیں خود کے نیچے حضرت سعید بن مالک نے پہچانا۔ انہوں نے

باواز بلند چیخ لگائی۔ اے گروہ مسلماناں! مبارک مبارک' رسول خدا ﷺ یہ ہیں۔ حضور ﷺ نے ہاتھ سے اشارہ کیا "خاموش رہو" مسلمان آپ کے پاس جمع ہوگئے۔ آپ کے ساتھ گھاٹی پر چڑھ گئے۔ ان میں حضرت ابوبکر' عمر ابن الحارث' ابن صمہ انصاری وغیرہ تھے۔ جب وہ پہاڑ پر کافی اوپر چڑھ گئے تو رسول خدا ﷺ کو ابی ابن خلف ملا۔ وہ اپنے عود نامی گھوڑے پر سوار تھا۔ وہ اس گھوڑے کو مکہ میں چارہ دیتے وقت کہتا: "اس پر میں محمد کو قتل کروں گا۔" جب حضور اکرم ﷺ کو اس بات کی اطلاع ہوئی تو آپ نے فرمایا: "ان شاء اللہ میں اسے قتل کروں گا" جب حضور ﷺ نے اسے پایا تو حارث نے نیزہ لیا اور اس سے اس خدا کے دشمن کے سینے کی بالائی ہڈی (Collar Bon) پر وار کی۔ وہ اس طرح شور کرتے ہوئے بھاگا جس طرح بیل۔ اسے یقین ہو گیا کہ وہ مارا گیا۔ جس طرح رسول خدا نے پیشین گوئی کی تھی۔ واپس ہونے سے پہلے وہ راستے ہی میں مر گیا۔

اس موقعہ پر ابوسفیان پہاڑ کے اوپر آیا اور آواز دی: "کیا تم میں محمد ہیں؟" حضور نے فرمایا اسے جواب نہ دو۔ پھر اس نے کہا: کیا تم میں ابوبکر صدیق ہیں؟ پھر بھی مسلمانوں نے جواب نہ دیا۔ "کیا تم میں عمر ابن الخطاب ہیں؟" پھر بھی اسے کوئی جواب نہ دیا گیا۔ اس نے صرف ان تینوں کے بارے میں پوچھا۔ اس پر اس نے اپنی قوم سے کہا "جہاں تک ان تین افراد کا تعلق ہے ان کا کام تم نے تمام کر دیا ہے۔ اس موقعہ پر حضرت عمر ﷺ ضبط نہ کر سکے اور کہا: "اے اللہ کے دشمن! جن کا ذکر تم نے کیا ہے وہ سب زندہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے ان لوگوں کو باقی رکھا ہے جنہیں تم پسند نہ کرو گے۔ اس کے بعد اس نے کہا کہ بعض لوگوں نے شہداء کی لاشوں کو مثلہ بنایا ہے۔ میں نے تو ان کو اس بات کا حکم نہ دیا تھا مگر ان کی اس حرکت پر میں نے برا بھی نہیں منایا۔ (اس میں اس کا اشارہ اس واقعہ کی طرف تھا جس میں اس کی بیوہ ہندہ نے حضرت حمزہ کی لاش کے ساتھ کیا تھا۔ حبشی نے جب اسے قتل کیا' ہندہ نے ان کا پیٹ پھاڑا' ان کا کلیجہ نکالا' اس نے اسے چبایا اور پھر پھینک دیا۔)

اس کے بعد اس نے نعرہ لگایا اُعْلُ ہُبَلْ ...... (ہبل سربلند ہو) حضور ﷺ نے فرمایا تم اسے جواب نہیں دے رہے' صحابہ نے کہا ہم کیا جواب دیں؟ آپ نے فرمایا تم کہو اَللّٰہُ اَعْلٰی وَاَجَلّ .... (اللہ سربلند ہے اور جلیل القدر ہے) پھر اس نے کہا لَنَا عُزّٰی وَلَا عُزّٰی لَکُمْ .... (ہمارا معبود عزیٰ ہے اور تمہارا کوئی عزیٰ نہیں ہے) اس پر پھر حضور ﷺ نے فرمایا تم لوگ اسے جواب نہیں دے رہے۔ صحابہ کرام نے پوچھا حضور کیا جواب دیں؟ آپ نے فرمایا تم کہو اَللّٰہُ مَوْلٰنَا وَلَا مَوْلٰی لَکُمْ .... (اللہ ہمارا مالک ہے اور تمہارا کوئی مالک نہیں ہے) اس پر ابوسفیان نے کہا: "آج کا دن بدر کے بدلے میں ہے۔" اور جنگ میں اونچ نیچ ہوتی رہتی ہے۔ اس پر حضرت عمر ﷺ نے فرمایا: "بالکل برابری نہیں ہے' ہمارے مقتول جنت میں ہیں اور تمہارے مقتول دوزخ میں ہیں۔"

جب یہ معرکہ ختم ہوا تو مشرکین لوٹے۔ اس پر مسلمانوں کو شک گزرا کہ شاید وہ مدینہ میں جاکر عورتوں کو غلام بنائیں گے اور لوٹ مار کریں گے۔ یہ بات ان پر بہت ہی بھاری گزری۔ اس پر حضور اکرم ﷺ نے فرمایا "علی! تم نکلو' ان کے پیچھے پیچھے جاؤ' دیکھو وہ کیا کرتے ہیں؟ ان کا ارادہ کیا ہے؟ اگر انہوں نے گھوڑوں کو ایک طرف چھوڑا اور سامان اونٹوں پر لادا تو وہ مکہ کی طرف جارہے ہوں گے اور اگر انہوں نے اونٹوں کو چلایا اور گھوڑوں پر سوار ہوئے تو سمجھو کہ وہ مدینہ پر چڑھائی کا ارادہ کر رہے ہیں۔ خدا کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے' اگر انہوں نے مدینہ کا ارادہ کیا تو میں ان کی طرف ضرور چلوں گا اور مدینہ میں ان سے لڑوں گا۔

حضرت علی ﷺ فرماتے ہیں میں نکلا' ان کے پیچھے چلا' دیکھوں کہ وہ کیا کرتے ہیں؟ انہوں نے گھوڑوں کو چھوڑ دیا اور اونٹوں پر سوار ہوگئے۔ جب وہ کچھ راستہ طے کر کے آگے نکلے تو انہوں نے ایک دوسرے کو ملامت کی۔ انہوں نے کہا تم نے کچھ بھی نہ کیا۔ تم نے ان کی

قوت کو تو ختم کر دیا مگر تم نے ان کو چھوڑ دیا۔ اور ان میں سے بعض سردار ایسے رہ گئے جو تمہارے لئے پھر جمع ہوں گے۔ اس لئے یہیں سے لوٹ جاؤ اور ان کو جڑ سے اکھاڑ پھینکو۔ یہ بات حضور اکرم ﷺ تک پہنچی۔ حضور ﷺ نے مدینہ میں اعلان کیا اور حکم دیا کہ نکلیں اور دشمن کو راستے ہی میں جالیں۔ "اب ہمارے ساتھ وہی شخص جا سکتا ہے جو احد میں حاضر ہوا تھا۔" حضور ﷺ سے عبداللہ ابن ابی نے درخواست کی کہ "میں تمہارے ساتھ جاتا ہوں۔" آپ ﷺ نے فرمایا "نہیں۔" مسلمانوں نے اس قدر خوفناک صورت حال میں بھی آپ کی پکار پر لبیک کہا حالانکہ وہ زخموں سے چور چور تھے۔ انہوں نے کہا: "ہم نے سنا اور مانا۔" حضرت جابر ابن عبداللہ نے اجازت چاہی اور کہا حضور میں ہر مقام پر آپ کے ساتھ رہنا چاہتا ہوں مگر احد کے دن میرے والد نے مجھے روک لیا کہ میں اپنی بہنوں کی حفاظت کے لئے رہوں۔ اس پر آپ ﷺ نے اسے اپنے ساتھ چلنے کی خصوصی اجازت دی۔ حضور ﷺ اور مسلمان مدینہ سے نکلے۔ حمراء الاسد تک جا پہنچے۔ یہاں آپ سے معبد ابن ابو معبد خزاعی آکر ملے۔ یہ مسلمان ہو گئے تھے لیکن ابو سفیان کو ان کے اسلام کے بارے میں علم نہ تھا۔ حضور ﷺ نے ان سے کہا کہ وہ ابو سفیان سے ملیں اور انہیں ڈرائیں۔ وہ مقام روحاء میں اسے ملے۔ ابو سفیان کو اس کے مسلمان ہونے کا علم نہ تھا۔ "معبد تمہارے پیچھے کون آرہا ہے؟ اس سے ابو سفیان نے پوچھا۔ اس نے جواب دیا: "محمد اور اس کے ساتھی آرہے ہیں۔ تم سے وہ جلے ہوئے ہیں اور وہ اس قدر جمعیت کے ساتھ آرہے ہیں' جس قدر جمعیت ان کے ساتھ کبھی نہ نکلی تھی۔ محمد کے جو ساتھی اس جنگ میں شریک نہیں ہوئے تھے وہ نادم ہو گئے ہیں۔" اس پر ابو سفیان نے کہا: "تمہاری رائے کیا ہے؟" اس نے کہا کہ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ جب تک تم کوچ کرتے ہو' وہ لشکر اس پہاڑی کے پیچھے سے نمودار نہ ہو جائے۔" اس پر ابو سفیان نے کہا کہ ہم نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اس سے ایک بار پھر پنجہ آزمائی کریں اور ان کو جڑ سے اکھاڑ پھینکیں۔ اس پر معبد نے کہا: "ایسا ہرگز نہ کرو' میں تمہارا ناصح مشفق ہوں۔ اس پر وہ مکہ کی طرف واپس لوٹے۔

راستے میں ابو سفیان کو بعض مشرکین ملے جو مدینہ جارہے تھے۔ ابو سفیان نے کہا کیا تم محمد کو میرا یہ پیغام پہنچا دو گے؟ اگر تم نے ایسا کیا تو میں تمہیں اور تمہارے گھوڑوں کو اپنے ہاں ٹھہراؤں گا جب تم مکہ آؤ۔ تو ان جانے والوں نے کہا ہاں ہم پیغام دیں گے۔ اس پر ابو سفیان نے کہا کہ محمد کو یہ پیغام دے دو کہ ہم نے ایک بار دوبارہ جنگ لڑنے کا فیصلہ کر لیا ہے تاکہ تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکیں۔ حضرت محمد ؐ اور مسلمانوں کو اس کی یہ بات پہنچی تو انہوں نے کہا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ .... (ہمیں اللہ کافی ہے اور وہ بہترین وکیل ہے) اور اس پیغام سے ان پر کوئی اثر نہ ہوا' مسلمان تین دن تک وہاں ٹھہرے اور ابو سفیان کا انتظار کرتے رہے' اس کے بعد انہیں معلوم ہوا کہ مشرکین اپنی راہ پر بہت دور جا چکے ہیں تو مسلمان مدینہ کو لوٹ آئے۔

○.....☆☆☆.....○

میں یہ کہوں گا کہ غزوہ احد کے واقعات کا یہ خلاصہ اس قدر مجمل ہے کہ اس میں اس کے تمام پہلوؤں کو نہیں سمویا جا سکا۔ نہ اس خلاصے میں وہ تمام واقعات دیئے گئے ہیں جو اس غزوہ میں پیش آئے اور جو ہمارے لئے مثالی تھے یا جن سے ہم عبرت حاصل کر سکتے ہیں۔ اس لئے ہم یہاں مناسب سمجھتے ہیں کہ اس غزوہ کے بعض ان انفرادی واقعات کا ذکر یہاں کر دیں جن میں ہمارے لئے کوئی ہدایت ہے تاکہ اس غزوہ کی فضاء کو یہاں دوبارہ زندہ کیا جا سکے۔

عمر بن قمیئہ ان مشرکین میں سے تھا جو احد کی بھگدڑ کے دوران حضور ؐ تک پہنچ گیا۔ جبکہ اس وقت حضور ؐ اکیلے تھے۔ یہ اس وقت ہوا جب تیر اندازوں نے اپنی جگہ خالی کر دی تھی اور کفار نے مسلمانوں کو گھیرے میں لے لیا تھا اور یہ آوازہ پھیل گیا تھا کہ حضرت محمد ؐ مارے گئے ہیں اور اس افواہ کی وجہ مسلمانوں میں انتشار پیدا ہو گیا اور وہ ہمت ہار گئے۔

ایسے شدید حالات میں بڑے بڑے سورماؤں کے اوسان بھی خطا ہو جاتے ہیں لیکن ایسے حالات میں ام عمارہ نسیبہ بنت کعب المازنیہ نے حضور ﷺ کا بھرپور دفاع کیا۔ اس نے زبردست جوہر دکھائے۔ اس نے عمر ابن قمیئہ کو اپنی تلوار سے کئی بار ضربات پہنچانے کی کوشش کی۔ اس نے اوپر تلے دو زرہ پہن رکھی تھیں' اس لئے وہ بچ گیا۔ لیکن وہ ام عمارہ کو ان کے کاندھے پر شدید طور پر زخمی کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ ان حالات میں ابو دجانہ اپنی خالی پیٹھ کے ذریعے حضور ؐ کو بچا رہے تھے۔ تیر آکر ان کی پیٹھ میں لگتے لیکن وہ حضور ؐ کے سامنے کھڑا رہا۔ نہ حرکت کی اور نہ ہی حضور ﷺ پر تیر لگنے دیا۔

حضرت طلحہ ابن عبید اللہ بار بار رسول خدا ﷺ کی جانب لوٹتے تھے اور صرف اکیلے آپ کے سامنے کھڑے ہو جاتے تھے یہاں تک کہ وہ مارے گئے۔ صحیح ابن حبان میں حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ حضرت ابو بکر ؓ نے فرمایا' کہ احد کے دن سب لوگ رسول ؐ خدا کے پاس سے چلے گئے تھے' میں پہلا آدمی تھا کہ جو رسول ؐ خدا کی طرف لوٹا۔ میں نے دیکھا کہ حضور کے سامنے ایک شخص کھڑا ہے اور آپ ؐ کا وفاع کر رہا ہے اور ہر طرف سے آپ کو بچا رہا ہے۔ میں نے کہا ہو نہ ہو طلحہ ہے' اس پر میرے باپ وماں قربان ہوں' خدا کرے تم طلحہ ہو' تم پر میرے ماں باپ قربان ہوں' تھوڑی ہی دیر میں میرے ساتھ ابو عبیدہ ابن الجراح بھی آملے۔ وہ پرندے کی طرح دوڑ رہے تھے۔ جب ہم دونوں ملے تو ہم رسول خدا ﷺ کی طرف دوڑے۔ ہم نے دیکھا طلحہ آپ کے سامنے شہید ہو گئے تھے۔ اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :"دیکھو تمہارا بھائی شہید ہو گیا۔" حضور ؐ کے رخسار مبارک زخمی ہو چکے تھی۔ آپ کو تیر مارا گیا تھا۔ آپ کے زرہ کے حلقے آپ کے چہرۂ مبارک کے اندر گھس گئے تھے۔ میں آپ ﷺ کے پاس گیا تاکہ زرہ کے حلقے آپ کے رخساروں سے نکالوں' اس پر ابو عبیدہ نے کہا میں آپ کو خدا کا واسطہ دیتا ہوں کہ آپ مجھے یہ کام کرنے دیں۔ آپ نے اپنے منہ میں وہ تیر کو منہ کے ساتھ آہستہ آہستہ نکالتا رہا تاکہ حضور ؐ کو تکلیف نہ ہو' اس سے حضرت ابو عبیدہ کا ایک دانت ختم ہو گیا۔ حضرت ابو بکر فرماتے ہیں۔ میں پھر گیا تاکہ دوسرا تیر میں نکالوں۔ اس پر ابو عبیدہ نے کہا خدا کے لئے مجھے نکالنے دیں۔ اس کے بعد اس نے دوسرے تیر کو بھی دانتوں سے پکڑا اور آہستہ آہستہ اسے کھینچا یہاں تک کہ اسے نکال لیا' اس کے ساتھ اس کا دوسرا دانت بھی نکل گیا۔ اس پر حضور ﷺ نے فرمایا اپنے بھائی کو سنبھالو' وہ تو مر گیا۔ اس کے بعد ہم طلحہ کی طرف مڑے' اس کا ہم نے علاج کیا۔ اس پر تقریباً چودہ زخم تھے۔

حضرت علی ؓ پانی لائے اور حضور کے زخموں کو دھویا۔ آپ زخموں پر پانی ڈالتے تھے اور حضرت فاطمہ انہیں دھو رہی تھیں' جب خون نہ رکا تو انہوں نے چٹائی کا ایک حصہ جلایا اور اس کی راکھ زخم پر رکھی اور اس طرح خون رک گیا۔

ابو سعید خدری کے والد مالک نے آپ کے زخم کو چوس کر پاک وصاف کیا۔ اس پر اسے رسول خدا ﷺ نے کہا کہ اب اسے تھوک دیں۔ اس پر اس نے جواب دیا :"خدا کی قسم میں اسے ہرگز نہ تھوکوں گا۔" اس پر حضور ﷺ نے فرمایا :"جو شخص کسی جنتی کو دیکھنا چاہتا ہے تو اسے چاہئے کہ اس شخص کو دیکھ لے۔"

صحیح مسلم میں ہے کہ حضور ﷺ احد کے دن سات انصار اور دو قریشیوں کے ساتھ علیحدہ رہ گئے تھے' جب کفار نے آپ پر سخت دباؤ ڈالا تو آپ نے فرمایا :"کون ہے جو انہیں مجھ سے دور کرے اور اس کے لئے جنت اجر ہے؟" اس پر انصار میں سے ایک شخص آگے بڑھا' تو اس نے کفار سے جنگ کی یہاں تک کہ وہ شہید ہو گیا۔ اس کے بعد انہوں نے پھر حضور پر سختی کی تو حضور نے پھر فرمایا انہیں مجھ سے کون دور کرے گا' اور اس کے لئے جنت ہے۔ ایسا ہی ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ سات افراد شہید ہو گئے۔ اس پر رسول خدا ﷺ نے فرمایا :"ہم نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔" اس کے ان کفار کا ابو طلحہ نے سخت مقابلہ کیا یہاں تک کہ انہیں حضور سے دور کر دیا۔ اور جس طرح ہم نے کہا کہ حضرت ابو دجانہ نے اپنی پشت کے ساتھ حضور پر ڈھال کا کام کیا یہاں تک کہ یہ مصیبت ٹل گئی۔ اور حضور ﷺ

اس وقت اس قدر تھک گئے تھے کہ آپ اور حضور پہاڑ پر چڑھ رہے تھے اور مشرکین ان کا پیچھا کر رہے تھے۔ آپ ایک پتھر کے اوپر چڑھنا چاہتے تھے' لیکن آپ چڑھ نہ سکے۔ طلحہ آپ کے نیچے بیٹھے یہاں تک کہ آپ چڑھ گئے۔ اس وقت نماز کا وقت ہو گیا تھا' حضور نے ان کے ساتھ نماز پڑھی۔"

اس دن کے واقعات میں سے بعض یہ ہیں۔

حنظلہ انصاری' جو "غسیل دادہ فرشتگان" کے نام سے مشہور ہے' نے ابو سفیان کو دبالیا تھا' جب اس نے اسے اچھی طرح قابو کر لیا تو شداد ابن الاسود نے حملہ کر کے حضرت حنظلہ کو قتل کر دیا۔ وہ جنابت کی حالت میں تھے کیونکہ جب انہوں نے جنگ کے لئے نکلنے کی آواز سنی تو اس وقت وہ اپنی بیوی کے ساتھ تھے' وہ فوراً ہی اٹھے اور جہاد کے لئے نکل پڑے۔ رسول خدا ﷺ نے میدان جہاد میں صحابہ سے کہا کہ اسے فرشتے غسل دے رہے ہیں۔ اس کے بعد آپ اٹھے اور فرمایا کہ ان کے اہل و عیال سے پوچھو انہوں نے اس کی بیوی سے دریافت کیا تو اس نے ان کو حقیقت حال سے آگاہ کیا۔

حضرت زید ابن ثابت فرماتے ہیں کہ مجھے احد کے دن رسول خدا ﷺ نے بھیجا کہ میں سعد ابن ربیع کو تلاش کروں' میں مقتولین کے درمیان انہیں تلاش کرتا رہا۔ میں ان کے پاس آیا اور وہ آخری سانس لے رہے تھے اور اس کے جسم پر ستر کے قریب ضربات تھیں۔ نیزوں' تیروں اور تلوار کے زخم' میں نے ان سے کہا کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم آپ کو سلام کہتے ہیں اور آپ کو کہتے ہیں کہ تمہارا حال کیا ہے؟ آپ نے کہا کہ رسول ؐ خدا پر سلام ہو' سلام کے بعد ان سے کہیں کہ میں جنت کی ہوا کو محسوس کر رہا ہوں۔ اور میری قوم انصار سے کہیں "تمہارے لئے اللہ کے ہاں کوئی عذر نہ ہو گا اگر تمہارے ہوتے ہوئے کوئی رسول ؐ خدا تک پہنچ گیا جب تک تم میں کوئی ایک شخص بھی موجود ہو۔

ایک مہاجر' ایک انصاری کے پاس سے گزرا۔ اور وہ خون میں لت پت تھا' اس نے کہا اے فلاں! کیا آپ کو اس بات کا علم ہے کہ محمد ؐ قتل ہو گئے ہیں؟ تو انصاری نے کہا کہ اگر محمد ؐ قتل ہو گئے تو انہوں نے دین پہنچا دیا ہے اب تمہیں چاہئے کہ تم اپنے دین کے لئے لڑو۔

حضرت عبد اللہ بن عمرو ابن حرام کہتے ہیں: "میں نے خواب میں دیکھا یعنی احد سے پہلے" کہ مبشر ابن منذر مجھے کہتا ہے: تم چند دنوں میں ہمارے پاس آنے والے ہو' میں نے پوچھا کہ تم کہاں ہو' تو اس نے کہا کہ میں تو جنت میں ہوں اور جنت میں ہم جہاں چاہیں پھرتے ہیں۔ میں نے اس سے پوچھا کہ کیا بدر کے دن تم قتل نہ ہو گئے تھے۔ اس نے کہا ہاں! تو میں نے یہ خواب رسول ؐ خدا سے بیان کیا تو حضور ؐ نے فرمایا: "ابو جابر یہ تو شہادت ہے۔"

حضرت خیثمہ جن کے بیٹے بدر میں شہید ہو گئے تھے' کہتے ہیں کہ میں بدر میں نہیں جا سکا۔ میں بدر میں جانے کے لئے بہت ہی بے تاب تھا۔ اس پر میں نے اپنے بیٹے کے ساتھ قرعہ اندازی کی تو اس کا قرعہ نکل گیا اور اسے شہادت نصیب ہوئی۔ میں نے کل رات اپنے بیٹے کو بہترین شکل میں دیکھا' وہ جنت کے پھلوں میں سے کھا پی رہا تھا اور نہروں میں سیر کر رہا تھا' اس نے مجھے کہا: آپ بھی آ جائیں اور جنت میں ہمارے ساتھ رہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے جو وعدہ کیا تھا وہ مجھے مل گیا ہے۔" رسول خدا! مجھے یہ شوق دامن گیر ہے کہ میں اس کے ساتھ جنت میں رفیق بن جاؤں۔ اور حال یہ ہے کہ میں بوڑھا ہو گیا ہوں۔ میری ہڈیاں پتلی ہو گئی ہیں' مجھے اپنے رب کے ساتھ ملاقات کا شوق ہے۔ اے اللہ کے رسول! آپ دعا فرمائیں کہ مجھے شہادت نصیب ہو' اور میں جنت میں سعد کا رفیق بن جاؤں۔ اس کے لئے رسول ؐ خدا نے دعاء کی یہی وجہ ہے کہ وہ احد کے دن شہید ہوئے۔

اس دن کے بارے میں عبد اللہ ابن جحش نے فرمایا: "اے اللہ میں تمہیں قسم دے کر یہ سوال کرتا ہوں کہ میں کل دشمن سے ضرور

ملوں اور وہ مجھے قتل کر دیں۔ پھر وہ میرا پیٹ چاک کریں اور وہ میری ناک کاٹ دیں اور میرے کان کاٹ دیں اور اس کے بعد اے اللہ آپ مجھ سے پوچھیں کہ ان لوگوں نے ایسا کیوں کیا تو میں کہوں کہ یہ محض تیری رضا کے لئے۔

عمرو بن الجموح ﷺ بہت بڑے درجے کے لنگڑے تھے۔ ان کے چار جوان بیٹے تھے' جو رسول ؐ خدا کے ساتھ جنگوں میں شریک ہوا کرتے تھے۔ جب بھی آپ جنگ کے لئے نکلتے' جب حضور ﷺ احد کے لئے نکلے تو انہوں نے ارادہ کیا کہ وہ خود حضور ؐ کے ساتھ چلیں' اسے اس کے بیٹوں نے کہا: "اللہ تعالیٰ نے تیرے لئے رخصت دی ہے۔ مناسب ہے کہ آپ بیٹھے رہیں اور ہم جہاد کے لئے کافی ہیں عمرو بن الجموح رسول خدا ﷺ کے پاس آئے تو کہا! اے رسول خدا! یہ میرے بچے مجھے آپ کے ساتھ نکلنے سے روک رہے ہیں' خدا کی قسم میری یہ خواہش ہے کہ میں شہید ہو جاؤں۔ تو میں اپنے اس لنگڑے پن کے ساتھ جنت میں داخل ہو جاؤں۔ اسے رسول ؐ خدا نے کہا: "جہاد تو اللہ تعالیٰ نے تم سے موقوف کر دیا ہے۔" اس کے لڑکوں کو کہا کہ کیا حرج اگر تم اسے چھوڑ دو' ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے شہادت نصیب کرے' تو اس پر وہ حضور ﷺ کے ساتھ نکلا اور احد کے دن قتل ہو کر شہید ہوا۔

اس معرکہ کے دار و گیر میں حذیفہ ابن الیمان نے' اپنے باپ کی طرف دیکھا اور مسلمان اسے قتل کرنا چاہتے تھے' وہ اسے نہ جانتے تھے اور یہ خیال کر رہے تھے کہ شاید وہ مشرکین میں سے ہے۔ حذیفہ نے کہا' اللہ کے بندو' یہ تو میرا باپ ہے' انہوں نے اس کی بات کو نہ سمجھا اور اسے قتل کر دیا۔ اس پر انہوں نے کہا اللہ تمہیں معاف کرے۔ اس پر رسول خدا ﷺ نے ارادہ کیا کہ وہ اس کی دیت ادا کریں' حضرت حذیفہ نے کہا کہ میں نے اس کی دیت مسلمانوں کو معاف کر دی ہے' اس کی وجہ سے حضور اکرم ؐ حذیفہ کی بہت مدد کرتے تھے۔

جبیر ابن مطعم کے غلام حبشی حضرت حمزہ کے قتل کے بارے میں یوں بیان کرتے ہیں۔ حضرت حمزہ کو سید الشہداء کا لقب ملا اور آپ جنگ احد میں شہید ہوئے۔ مجھے جبیر نے یہ پیشکش کی کہ اگر میں حضرت حمزہ کو قتل کر دوں تو میں غلامی سے آزاد ہوں۔ احد کے دن میں لوگوں کے ساتھ نکلا۔ میں ایک حبشی آدمی تھا۔ اور حبشیوں کی طرح نیزہ پھینکا کرتا تھا۔ کم ہی ایسا ہوتا تھا کہ میرا نیزہ خطا جاتا۔ جب لوگوں نے ایک دوسرے کے خلاف معرکہ شروع کیا تو میں نے حضرت حمزہ کو تلاش کرنا شروع کر دیا اور اسے دیکھتا رہا۔ اچانک میری نظر ان پر پڑ گئی۔ وہ سفید اونٹ کی طرح خوش رنگ تھے اور اپنی تلوار سے لوگوں کو اس طرح بھگا رہے تھے کہ کوئی ان کے سامنے ٹھہر نہ سکتا تھا' میں نے اس پر وار کرنے کی تیاری شروع کر دی' اور میں نے ایک درخت کی اوٹ لی یا یہ کہ میں نے ایک پتھر کی اوٹ میں انتظار کیا تاکہ وہ میرے قریب آ جائے۔ مجھ سے پہلے سباع ابن عبد العزیٰ نے اس پر وار کرنا چاہا۔ جب حمزہ نے اسے دیکھا' اس پر ایسا وار کیا کہ گویا اس کا سر اچک کر لے اڑا۔ میں نے اپنے نیزے کو حرکت دی۔ جب نشانہ برابر ہوا تو میں نے ان پر پھینکا۔ یہ نیزہ ان کے پیٹ میں لگا اور دونوں پاؤں کے درمیان سے نکل گیا۔ اس نے میری طرف بڑھنے کا ارادہ کیا مگر نہ بڑھ سکے۔ میں نے اسے یونہی چھوڑ دیا یہاں تک کہ وہ مر گیا۔ اس کے بعد میں اس کے پاس گیا اور اپنا نیزہ لیا اور لشکر گاہ کی طرف چلا گیا۔ اور وہاں بیٹھ گیا۔ اس لئے کہ مجھے اس کے بغیر کوئی طلب نہ تھی۔ میں نے اسے اس لئے قتل کیا کہ میں آزاد ہو جاؤں۔

ہند بنت عتبہ زوجہ ابو سفیان آئی۔ اس نے حمزہ کا پیٹ پھاڑا۔ ان کا کلیجہ نکالا اور اس نے اسے چبایا مگر نگل نہ سکی۔ اس لئے اسے پھینک دیا۔ جنگ کے خاتمہ کے بعد جب رسول خدا ﷺ حضرت حمزہ کی لاش پر کھڑے ہوئے تو آپ بہت ہی متاثر ہوئے اور آپ نے فرمایا: "آپ کے دکھ جیسا دکھ مجھے کبھی نہ ہو گا۔ میں نے آج کے منظر سے زیادہ المناک منظر کبھی نہیں دیکھا۔" اس کے بعد حضور ﷺ نے فرمایا: "کیا اس عورت نے کوئی چیز کھائی تھی؟" لوگوں نے کہا "نہیں۔" آپ ﷺ نے فرمایا: "اللہ کو یہ منظور نہ تھا کہ حمزہ کے جسم کا کوئی حصہ جہنم میں داخل ہو۔

حضور ﷺ نے حکم دیا کہ شہداء احد کو ان کی جائے شہادت ہی میں دفن کر دیا جائے۔ اور انہیں مدینہ کی طرف منتقل نہ کیا جائے۔ بعض صحابہ کرام نے اپنے مقتولوں کو مدینہ میں پہنچا دیا تھا۔ رسول خدا ﷺ کے منادی نے آواز دی کہ حضور ﷺ کا حکم ہے کہ مقتولین کو واپس لایا جائے۔ چنانچہ سب مقتول واپس لائے گئے۔ حضور ﷺ کی نگرانی میں ایک' دو یا تین تین افراد ایک ایک لحد میں دفن کئے گئے۔ تو دفن کرتے وقت آپ فرماتے ان میں سے قرآن کریم کا عالم کون زیادہ تھا' اگر کوئی بتاتا کہ فلاں زیادہ قرآن کا عالم تھا تو اسے آپ لحد میں آگے کر دیتے۔ عبداللہ ابن عمرو ابن حرام اور عمرو بن الجموح ایک ہی قبر میں دفن ہوئے۔ اس لئے کہ ان دونوں کے درمیان گہری دوستی تھی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "دنیا میں یہ دونوں دوست تھے' اس لئے انہیں ایک ہی قبر میں دفن کر دو۔"

○.....☆☆☆.....○

یہ ہیں اس معرکہ کی بعض جھلکیاں جن میں فتح و نصرت اور ہزیمت و شکست ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ فتح و ہزیمت کے درمیان وقت کا ایک مہین پردہ حائل تھا۔ پس صرف حکم رسول کی خلاف ورزی ہونا تھی کہ فتح شکست میں بدل گئی۔ خواہشات نفس کی ایک معمولی جنبش سے نقشہ بدل گیا۔ شہوت کی ایک جھلک نے جنگ کا رخ بدل دیا۔ ان جھلکیوں میں اعلیٰ اقدار اور گھٹیا تصورات کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ ایمان کی تاریخ میں لازوال کارنامے بھی ہیں اور نفاق و شکست کے مناظر بھی ہیں۔

ان جھلکیوں سے یہ معلوم ہو گا کہ اس وقت جماعت مسلمہ میں پوری طرح ہم آہنگی پیدا نہیں ہوئی تھی' جیسا کہ ان واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض مسلمانوں کے تصور اسلام میں بھی کچھ کمزوریاں تھیں اور یہ واقعات جو نمودار ہوئے' یا جن کمزوریوں کا اظہار ہوا' یہ خداوند قدوس کی سنت کے عین مطابق تھا۔ یہ نتائج جن سے اہل اسلام دوچار ہوئے' وہ عظیم قربانیاں جو انہیں دینا پڑیں اور جن میں سرفہرست وہ مصائب تھے جن سے خود رسول خدا ﷺ کو دوچار ہونا پڑا۔ اور یہ بات شک و شبہ سے بالا ہے کہ صحابہ کرام ؓ اس وقت ان واقعات کا گہرا اور عمیق احساس بھی رکھتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ ان پر مصائب کے پہاڑ ٹوٹ گئے ہیں۔ اس معرکہ میں صحابہ کرام ؓ نے بہت بڑی قیمت ادا کی لیکن اس معرکے کے ذریعہ انہیں عظیم سبق ملا۔ اور اعلیٰ تجربات حاصل ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں کو خالص کر دیا' ان کی صفوں میں سے کھوٹے لوگوں کو چھانٹ کر الگ کر دیا۔ اور اس تجربے کے ذریعہ امت مسلمہ کو اس عظیم مقصد کے لئے تیار کیا جو اس کے ذمہ لگایا گیا تھا۔ وہ یہ مقصد تھا کہ اس امت نے انسانیت کی قیادت کرنی ہے اور اس دنیا میں اس نے اسلامی نظریہ حیات کے مطابق ایک مکمل اسلامی نظام زندگی قائم کر کے دنیا کے سامنے اسے بطور مثال پیش کرنا ہے۔ دیکھئے' قرآن کریم نے اس صورت حال کو اپنے مخصوص انداز میں کس خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے۔

قرآن کریم کا انداز یہ نہیں ہے کہ کسی واقعہ کو بطور تاریخ بیان کرے اور لوگوں کے سامنے صرف واقعات پیش کرے۔ قرآن کریم ان واقعات کی پشت پر نفس انسانی کے اندر جو شعور کارفرما تھا' اس سے بحث کرتا ہے' جو باتیں دلوں میں لہریں پیدا کرتی ہیں ان کی جھلکیاں دکھاتا ہے' اور پھر ان واقعات سے وہ امور سامنے لاتا ہے جن میں کوئی سبق ہوتا ہے' جن سے کوئی ہدایت ملتی ہے یا جن سے کسی پوشیدہ گوشے پر روشنی پڑتی ہے۔

قرآن ان واقعات کو تاریخی انداز میں بیان نہیں کرتا۔ اس طرح کہ واقعات میں تسلسل ہو اور مقصد یہ ہو کہ تاریخی واقعات قلمبند کر دیئے جائیں۔ واقعات کے بیان کے مقاصد یہ ہیں کہ ان سے عبرت حاصل کی جائے' مسلمانوں کی تربیت ہو' اور واقعات کے پس پردہ جو اقدار کارفرما ہوں ان کی وضاحت ہو۔ نفس انسانی کی خصوصیات ظاہر کی جائیں دلوں کی دھڑکنیں صفحہ قرطاس پر لائی جائیں اور اس فضا کی جھلکیاں دکھائی جائیں جو اس واقعہ کے اندر اہم تھیں۔ پھر قرآن کریم واقعات کے تکوینی اسباب بھی بتاتا ہے۔ پھر ان حوادث کے نتیجے میں جو

اصول سامنے آتے ہیں اور ہمیشہ کے لئے اصول بن جاتے ہیں ان کا بیان ہوتا ہے۔اس انداز بیان میں ایک واقعہ دراصل ایک محور بن جاتا ہے اور نقطہ ارتکاز بن جاتا ہے۔اس محور کے اردگرد شعور واحساس کا عظیم سرمایہ جمع ہو جاتا ہے۔استدلال کے نکات اور نتائج اکٹھے ہوتے ہیں'سیاق کلام میں بات اس حادثہ سے شروع کی جاتی ہے'پھر اس محور کے اردگرد بات چلتی رہتی ہے'پھر روئے سخن واقعات کی طرف مڑ جاتا ہے'اس کے بعد اچانک انسانی نفس اور ضمیر کی بات چھڑ جاتی ہے۔پھر زندگی کی گہرائیوں سے حقائق سطح پر لائے جاتے ہیں اور بار بار اسی طرز پر واقعات پر بحث ہوتی رہتی ہے اور نتائج اخذ کئے جاتے ہیں اور پھر اس واقعہ اور حادثہ کے واقعات کو ختم کیا جاتا ہے لیکن اس واقعہ کے ذیل میں معانی' دلائل' اقدار اور اصولوں کا ایک ذخیرہ ریکارڈ کر لیا جاتا ہے۔واقعات اور حوادث کا بیان دراصل ان نتائج اور حکمتوں کے بیان کے لئے ہوتا ہے۔واقعات ان حکمتوں کے لئے محور کا کام دیتے ہیں۔اس کے اردگرد تمام نتائج جمع ہو جاتے ہیں۔بعض اوقات ایک واقعہ کا پس منظر بھی بیان کر دیا جاتا ہے۔اور اس واقعہ کے نتیجے میں دلوں کے اندر جو دشمنیاں پیدا ہوتی ہیں ان کا بیان ہوتا ہے'ان دشمنیوں کو صاف کیا جاتا ہے اور واقعات منقح کر کے ہر بات کو اپنی جگہ پر نکادیا جاتا ہے۔واقعات اور ان کے نتائج بالکل فطری نظر آتے ہیں'کسی کو ان پر حیرت نہیں ہوتی اور کسی کو ان پر افسوس نہیں ہوتا۔وہ محسوس نہیں کرتے کہ ان میں کوئی التباس ہے یا ان کا کوئی دخل ہے۔

انسان جب ان واقعات کی طرف نگاہ اٹھاتا ہے اور میدان جنگ کو دیکھتا ہے اور طویل اور متنوع واقعات پر نگاہ ڈالتا ہے'اور اس کے بعد جب ان واقعات پر تبصرے اور نتائج بیان کئے جاتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ تبصرے اور اخذ نتائج کا میدان اصل واقعات سے وسیع تر ہے۔یہ نتائج ایسے ہیں جو ہمیشہ کے لئے باقی رہنے والے ہیں'دلوں میں پیوست ہو جانے والے ہیں'دلوں کی گہرائیوں میں اتر جاتے ہیں'ان سے نفس انسانی کی ضروریات اچھی طرح پوری ہوتی ہیں'نیز یہ نتائج جماعت اسلامی کے لئے فکری غذا فراہم کرتے ہیں'یعنی اسلامی انقلاب کی راہ میں ہر موقف پر اور ہر دور میں اس کے لئے راہنما ہوتے ہیں۔وہ واقعات جو پیش آتے ہیں'زائل ہو جاتے اور گزر جاتے ہیں لیکن ان واقعات پر قرآن کے تبصرے'لازوال ہیں۔انفرادی واقعات سے کلی اصول اخذ کئے جاتے ہیں اور عارضی جھلکیوں سے دائمی اقدار اخذ کی جاتی ہیں اور علم وبصیرت کا ایسا سرمایہ ریکارڈ کر دیا جاتا ہے جو زمان و مکان کی قید سے باہر ہوتا ہے۔

غرض یہ نتائج جو قرآن اخذ کرتا ہے اور ان کو قرآن نصوص میں ریکارڈ کرتا ہے'دراصل اہل ایمان کے لئے لازوال سرمایہ ہوتے ہیں۔اور ہر دور اور ہر جگہ ان سے اہل ایمان کے دل کھلتے ہیں۔ان تجربات اور تبصروں کو اپنی اپنی تشریح کرنے کے بعد انشاء اللہ ہم ایک جگہ بھی جمع کریں گے۔

☆ ☆ ☆ ☆

درس ۲۷ تشریح آیات

آیت نمبر ۱۲۲ تا ۱۷۹

وَ اِذْ غَدَوْتَ مِنْ اَهْلِكَ تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِيْنَ مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ ؕ وَ اللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۲۱﴾ اِذْ هَمَّتْ طَّآئِفَتٰنِ مِنْكُمْ اَنْ تَفْشَلَا ۙ وَ اللّٰهُ وَلِيُّهُمَا ؕ وَ عَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۲۲﴾

"اس وقت کو یاد کرو کہ جب تم صبح سویرے اپنے گھر سے نکلے تھے اور مسلمانوں کو جنگ کے لئے جابجا مامور کر رہے تھے' اور اللہ ساری باتیں سنتا ہے اور باخبر ہے۔ یاد کرو جب تم میں سے دو گروہ بزدلی دکھانے پر آمادہ ہو گئے حالانکہ اللہ ان کی مدد پر موجود تھا' اور مومنوں کو اللہ ہی پر بھروسہ رکھنا چاہئے۔"

اس معرکے کا پہلا منظر سامنے آتا ہے جس میں معرکے کی تیاریاں ہو رہی ہیں' قرآن کریم کے پہلے مخاطب صحابہ کرام تو اس منظر کے کردار تھے' وہ ان کے نفوس کے قریب تھا' سب واقعات انہیں یاد تھے لیکن اس انداز میں بات شروع کرنا اور اس آیت کے ذریعے معرکہ احد کا پہلا منظر آنکھوں کے سامنے لانا' اس واقعہ کو زندگی اور حرکت سے مالامال کر دیتا ہے۔ یہاں اس زیر نظر منظر کے ساتھ ایسے حقائق کا اضافہ کر دیا جاتا ہے' جو اس منظر میں نظر نہیں آتے' مثلاً یہ کہ اس متحرک منظر میں ذات باری بھی ان کے ساتھ موجود تھی' اور وہ اس سلسلے میں جو کچھ کر رہے تھے یا جو کہہ رہے تھے' اللہ تعالیٰ اس سے خبردار تھا اور سن رہا تھا۔ یہ وہ حقیقت ہے جسے اسلامی نظام تربیت ہر وقت پیش نظر رکھتا ہے' اس کی تاکید کرتا ہے' اور اسلامی تصور حیات میں اسے گہرائی تک بٹھاتا ہے۔ اور یہ وہ اساسی اور عظیم حقیقت ہے کہ اس کے اوپر اسلام نے اپنے نظام تربیت کی بنیاد رکھی ہے۔ اور یہ وہ حقیقت ہے کہ اسلامی نظام حیات کسی دل میں اس وقت تک جڑ نہیں پکڑ سکتا اور قائم نہیں ہو سکتا جب تک اس میں یہ حقیقت جاگزیں نہیں ہو جاتی اور اپنی پوری قوت اور اپنی پوری حرکت اور بھرپور زندگی کے ساتھ جاگزیں نہیں ہو جاتی۔

وَ اِذْ غَدَوْتَ مِنْ اَهْلِكَ تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِيْنَ مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ ؕ وَ اللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ

.... "اے پیغمبر جب تم صبح سویرے اپنے گھر سے نکلے تھے اور مسلمانوں کو جنگ کے لئے جابجا مامور کر رہے تھے' اور اللہ ساری باتیں سنتا ہے اور نہایت باخبر ہے۔"

یہ اشارہ ہے اس امر کی طرف کہ حضور ﷺ صبح سویرے بیت عائشہ رضی اللہ عنہا سے نکلے اور آپ ﷺ نے زرہ اور خود پہن رکھا تھا' اور یہ تیاری آپ ﷺ نے جنگ کے بارے میں مشورہ کر لینے کے بعد فرمائی تھی' جس میں یہ طے ہو گیا تھا کہ جنگ مدینہ سے باہر جا کر لڑی جائے گی اور نکلنے کے بعد حضور ﷺ نے مسلمانوں کی جس طرح صف بندی فرمائی' اور تیراندازوں کو حکم دیا کہ وہ پشت کی جانب پہاڑی پر

مورچہ سنبھالیں۔ یہ ایک ایسا منظر تھا' جس سے وہ باخبر تھے' ان کی لوح حافظہ پر وہ ابھی تک منقش تھا' البتہ اس کے ساتھ جس چیز کا اضافہ فرمایا گیا وہ یہ ہے وَ اللّٰهُ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ .... "اللہ ساری باتیں سنتا ہے اور نہایت باخبر ہے۔"

وہ کیا عظیم منظر ہے جس میں اللہ حاضر ہو' اور وہ کیا ہی بلند موقف ہے جس کا مشاہدہ کرنے والوں میں اللہ ہو' اس منظر پر اللہ کا خوف اور رعب چھایا ہوا ہے جو مشورہ بھی ہو رہا ہے وہ خدا کے سامنے ہے' تمام راز اس کے سامنے کھلے ہیں' زبانوں سے جو کچھ نکلتا ہے وہ بھی اس کے علم میں ہے۔ دلوں میں جو کچھ چھپایا ہوا ہے وہ بھی اللہ کے علم میں ہے۔

اس پہلے منظر کی دوسری اہم جھلکی یہ ہے کہ مسلمانوں میں سے دو گروہ ہمت ہار بیٹھتے ہیں' ان پر کمزوری چھا جاتی ہے۔ اور یہ کمزوری اس وقت چھا جاتی ہے جب عبد اللہ ابن ابی رئیس المنافقین اپنے تین سو آدمیوں کے ساتھ دغا کر جاتے ہیں اور یہ تقریباً پورے لشکر کی ایک تہائی تھی' یہ شخص حضور ﷺ سے محض اس لئے ناراض ہو گیا کہ حضور ﷺ نے اس کی رائے کو نہ مانا اور مدینہ کی نوخیز نسل کی بات کو مانا۔ اس نے کہا کہ اگر ہمارے علم میں کوئی جنگ ہوتی تو ہم ضرور تمہارے ساتھ ہو لیتے۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ شخص اسلامی نظریۂ حیات کے قبول کرنے میں مخلص نہ تھا۔ اور اس کے دل میں ابھی تک اس کی شخصیت کا بت بیٹھا ہوا تھا' اس لئے وہ اسلامی نظریۂ حیات کے مقابلے میں اپنی شخصیت کو زیادہ اہمیت دے رہا تھا۔ وہ نظریہ جو اپنے ساتھ کسی دوسری شئی کا وجود گوارا نہیں کرتا۔ وہ اپنے ساتھ کوئی شریک نہیں چھوڑتا۔ اسلامی نظریۂ حیات کا تقاضا تو یہ ہے کہ یا تو اسے پوری طرح اپنایا جائے اور یا پھر اسے پوری طرح چھوڑ دیا جائے۔

اِذْ هَمَّتْ طَّآئِفَتٰنِ مِنْكُمْ اَنْ تَفْشَلَا ۙ وَ اللّٰهُ وَلِیُّهُمَا ؕ وَ عَلَی اللّٰهِ فَلْیَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ

.... "یاد کرو جب تم میں سے دو گروہ بزدلی دکھانے پر آمادہ ہو گئے تھے' حالانکہ اللہ ان کی مدد پر موجود تھا اور مومنوں کو اللہ ہی پر بھروسہ کرنا چاہئے۔"

یہ دو گروہ کون تھے؟ صحیحین میں اس بارے میں سفیان بن عیینہ کی حدیث نقل ہے۔ وہ بنو حارثہ اور بنو سلیم تھے۔ وہ عبد اللہ ابن ابی کی دغابازانہ حرکت سے متاثر ہو گئے تھے' اس لئے کہ اس حرکت نے اسلامی صفوں میں پہلے ہی قدم پر اضطراب پیدا کر دیا تھا' قریب تھا کہ یہ دو گروہ بزدلی دکھاتے اور کمزور ہو کر بیٹھ جاتے لیکن اللہ کی مدد آپہنچی اور اللہ نے ان کے قدم مضبوط کر دیئے۔ جس طرح اس آیت میں صراحت ہے۔ وَ اللّٰهُ وَلِیُّهُمَا .... "اور اللہ ان کا مددگار تھا۔"

حضرت عمر فرماتے ہیں میں نے جابر بن عبد اللہ سے سنا' وہ کہتے تھے یہ آیت ہمارے متعلق نازل ہوئی ہے۔ "یاد کرو جب دو گروہ تم میں سے بزدلی دکھانے پر آمادہ ہو گئے تھے۔" انہوں نے کہا یہ دو گروہ ہم تھے' بنو حارثہ اور بنو سلیم اور میں ایسا نہیں چاہتا (یا مجھے یہ بات اچھی نہیں آتی) کہ آیت نازل نہ ہوتی' اس لئے کہ اس میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں وَ اللّٰهُ وَلِیُّهُمَا .... یعنی اللہ ان کا دوست اور مددگار ہے۔" (بخاری مسلم)

یوں دلوں کی گہرائیوں میں خفیہ اور پوشیدہ بات کو ظاہر کر دیا جاتا ہے اور اس بات کا علم صرف اللہ ہی کو تھا کہ یہ قبائل بزدلی پر آمادہ ہیں۔ اس لئے کہ یہ کمزوری ان کے دل میں ایک لحظہ کے لئے در آئی تھی اور فوراً ہی اللہ نے انہیں گرنے سے بچا لیا۔ ان کے دل سے اس کمزوری کو دور کر دیا' اور اللہ نے اپنی دوستی کی وجہ سے ان کی تائید فرمائی۔ اور وہ پیچھے لوٹنے کے بجائے آگے بڑھے۔ اس معرکہ کے واقعات کو بیان کرنے کے دوران اللہ نے اس کو دہرایا تاکہ اس معرکے کے واقعات اور مناظر کو زندہ و تابندہ صورت میں پیش کیا جائے۔ اور نفوس انسانی کے دلوں میں جو بات کھٹکتی ہے اسے ریکارڈ پر لایا جاتا ہے' اور لوگوں کو یہ شعور دیا جاتا ہے کہ اللہ تمہارے ساتھ ہے۔ تمہارے دلوں کی باتوں سے خبردار ہے' اسی لئے اللہ نے فرمایا وَ اللّٰهُ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ .... "اللہ سننے والا ہے اور خبردار

ہے۔" تاکہ ان کے دلوں میں یہ حقیقت اچھی طرح بیٹھ جائے اور انہیں بتایا جائے کہ نجات کی راہ کیا ہے اور ان کے احساس میں یہ بات بٹھائی جائے کہ اللہ ان کا مددگار ہے' معاون ہے اور ان کا دوست ہے اور کسی بھی کمزوری میں ان کا ہاتھ پکڑنے والا ہے۔ جب وہ گرنے کے قریب ہوں تو وہ ان کا دستگیر ہے۔ یہ اس لئے کہا کہ انہیں معلوم ہو جائے کہ کمزوری اور ضعیفی کے وقت انہوں نے کہاں سے نصرت طلب کرنی ہے اور کہاں انہوں نے پناہ لینا ہے؟ اس لئے انہیں اس طرف متوجہ کیا جاتا ہے۔ جس جہت کے سوا مسلمانوں کے لئے اور کوئی جہت نہیں ہے۔

وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ .... "اور اہل ایمان کو صرف اللہ ہی پر توکل کرنا چاہئے۔"

غرض پہلے ہی منظر کی یہ دونوں جھلکیاں نہایت ہی باموقع دکھائی گئی ہیں اور نہایت ہی موزوں فضا میں' یہ دونوں جھلکیاں اپنی موسیقی کے زیروبم کو یکجا کرتی ہیں اور نہایت ہی مناسب موقعہ پر اپنے رمزیہ شان کے ساتھ نظروں کے سامنے آتی ہیں۔ ایسے ماحول میں کہ لوگوں کے دل لبیک کہنے' اثر لینے اور ان حقائق کو قبول کرنے کے لئے تیار ہیں۔ ان دو تمہیدی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم دلوں کو کس طرح زندہ کرتا ہے' ان کی تربیت کرتا ہے اور انہیں صحیح سمت پر لگاتا ہے اور یہ اثر اندازی ایسے واقعات کے بعد بطور تبصرہ کی جاتی ہے کہ وہ ابھی تازہ ہوتے ہیں۔ اس لئے وہ فرق معلوم ہو جاتا ہے جو روایت قصص اور بیان واقعات میں قرآن کریم اختیار کرتا ہے' اور جو طریق بیان عام انسانی مصادر تاریخ میں اختیار کیا جاتا ہے۔ حالانکہ انسانی مصادر میں واقعات کی بڑی تفصیل ہوتی ہے۔ لیکن تفصیلات کے باوجود وہ واقعات دلوں میں نہیں اترتے۔ نہ ان کا انسانی زندگی سے کوئی تعلق ہوتا ہے' نہ ان سے دلوں کو زندہ کرنا' انہیں گرمی عطا کرنا مقصود ہوتا ہے اور نہ انسانوں کی ہدایت و تربیت مطلوب ہوتی ہے جیسا کہ قرآن مجید اپنے بیان قصص میں ان امور کو پیش نظر رکھتا ہے' اور نہایت ہی مستحکم اسلوب بیان ہیں۔

○ .... ☆☆☆ .... ○

یوں اس معرکے کے بیان کا آغاز ہوتا ہے جس میں مسلمانوں کو فتح نصیب نہ ہوئی اگرچہ وہ فتح و نصرت کے قریب پہنچ گئے تھے۔ اس معرکے کا آغاز اس طرح ہوتا ہے کہ ایک شخص (عبداللہ ابن ابی) اپنے نظریۂ حیات کے مقابلے میں اپنی ذات اور شخصیت کو ترجیح دیتا ہے اور اس کی اتباع میں وہ سب لوگ اس کے پیچھے چلے جاتے ہیں جن کے ذاتی اعتبارات ان کے عقیدے کے مقابلے میں زیادہ اہم تھے۔ پھر آغاز ہی میں دو گروہ بھی حالات سے قدرے متاثر ہو جاتے ہیں حالانکہ یہ صالح تھے اور اس معرکے کا انجام یوں ہوتا ہے کہ کچھ لوگ اپنی فوجی ڈیوٹی چھوڑ کر مال غنیمت کے لالچ میں گرفتار ہو جاتے ہیں اور ان کی وجہ سے ان لوگوں کو بھی ہزیمت اٹھانی پڑتی ہے جنہوں نے اس معرکے میں قربانی کے اعلیٰ نمونے پیش کئے۔ محض اس لئے کہ بعض لوگوں نے نظم کی خلاف ورزی کی یا ان کے نظریۂ حیات میں ابھی تک کچھ کمزوریاں موجود تھیں۔

اس سے پہلے کہ اس معرکے کی تفصیلات بیان کی جائیں اور ان پر تبصرہ کیا جائے' جس میں مسلمانوں کو شکست کھانا پڑی' اس معرکے کا ذکر کیا جاتا ہے' جس میں مسلمانوں کو فتح نصیب ہوئی یعنی غزوۂ بدر تاکہ اس شکست کے ساتھ اس فتح و نصرت کو بھی وہ پیش نظر رکھیں۔ اور دونوں کا موازنہ کر کے فتح و شکست کے اسباب پر غور کریں۔ اور یہ بھی یقین سے جان لیں کہ فتح و نصرت اللہ کے ہاتھ میں ہے اور وہی کچھ پیش آتا ہے جو اللہ کے ہاں مقرر ہوتا ہے۔ اور تقدیر الٰہی جس طرح نصرت میں کارفرما ہوتی ہے' اسی طرح شکست بھی مقدر ہوتی ہے۔ فتح کی تہہ میں بھی حکمت ہوتی ہے اور شکست کے پس پشت بھی اللہ کی حکمت کارفرما ہوتی ہے۔ اور دونوں حالات میں نتیجہ کار اللہ کے ہاتھ میں ہوتا ہے' ہر حال میں وہی ہے جو مسبب الاسباب ہے۔

وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّاَنْتُمْ اَذِلَّةٌ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۱۲۳﴾ اِذْ تَقُوْلُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ اَلَنْ يَّكْفِيَكُمْ اَنْ يُّمِدَّكُمْ رَبُّكُمْ بِثَلٰثَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُنْزَلِيْنَ ﴿۱۲۴﴾ بَلٰٓى ۙ اِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا وَيَاْتُوْكُمْ مِّنْ فَوْرِهِمْ هٰذَا يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُسَوِّمِيْنَ ﴿۱۲۵﴾ وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى لَكُمْ وَلِتَطْمَئِنَّ قُلُوْبُكُمْ بِهٖ ۗ وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ﴿۱۲۶﴾ لِيَقْطَعَ طَرَفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْ يَكْبِتَهُمْ فَيَنْقَلِبُوْا خَآئِبِيْنَ ﴿۱۲۷﴾ لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ اَوْ يُعَذِّبَهُمْ فَاِنَّهُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۱۲۸﴾ وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۗ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ۗ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۲۹﴾

ربع

۱۳ ع ۴

"اس سے پہلے جنگ بدر میں اللہ تمہاری مدد کر چکا تھا حالانکہ اس وقت تم بہت کمزور تھے 'لہٰذا تم کو چاہئے کہ اللہ کی ناشکری سے بچو' امید ہے کہ اب تم شکر گزار بنو گے۔ یاد کرو جب تم مومنین سے کہہ رہے تھے "کیا تمہارے لئے یہ بات کافی نہیں ہے کہ اللہ تین ہزار فرشتے اتار کر تمہاری مدد کرے؟" بے شک اگر تم صبر کرو اور خدا سے ڈرتے ہوئے کام کرو تو جس آن دشمن تمہارے اوپر چڑھ آئیں گے اسی آن تمہارا رب (تین ہزار نہیں) پانچ ہزار صاحب نشان فرشتوں سے تمہاری مدد کرے گا۔ یہ بات اللہ نے تمہیں اس لئے بتادی ہے کہ تم خوش ہو جاؤ اور تمہارے دل مطمئن ہو جائیں۔ فتح و نصرت جو کچھ بھی ہے اللہ کی طرف سے ہے جو بڑی قوت والا اور دانا اور بینا ہے تاکہ کفر کی راہ چلنے والوں کا ایک بازو کاٹ دے' یا ان کو ایسی ذلیل شکست دے کہ وہ نامرادی کے ساتھ پسپا ہو جائیں۔ اے پیغمبر فیصلے کے اختیارات میں تمہارا کوئی حصہ نہیں ہے۔ اللہ کو اختیار ہے' چاہے انہیں معاف کرے' چاہے سزا دے کیونکہ وہ ظالم ہیں۔ زمین و آسمان میں جو کچھ ہے اس کا مالک اللہ ہے جس کو چاہے بخش دے اور جس کو چاہے عذاب دے۔ وہ معاف کرنے والا اور رحیم ہے۔"

بدر میں مسلمانوں کو جو فتح نصیب ہوئی تھی وہ معجزانہ تھی' جیسا کہ ہم اوپر کہہ آئے ہیں۔ یہ فتح مادی اسباب کی نایابی کے باوجود حاصل ہوئی تھی۔ اس وقت مسلمانوں کے پاس معروف مادی اسباب نہ تھے۔ اس جنگ میں ترازو کے دو پلڑے یعنی مومنین اور مشرکین متوازن نہ تھے' نہ ہی ان کی حالت ایسی تھی کہ وہ توازن کے قریب ہوں۔ مشرک ایک ہزار کی تعداد میں تھے' اور وہ جنگ کی خاطر بطور عام لام بندی نکلے تھے' اس لئے کہ ان سے ابوسفیان نے مدد چاہی تھی' اور ان کا ہدف بھی متعین تھا وہ یہ کہ ابوسفیان کے قافلے کو بچایا جائے اور یہ ہزار آدمی ہر قسم کے سازو سامان سے لیس تھے۔ وہ اپنی دولت کے بچاؤ کے لئے نکلے تھے۔ نیز اپنی عزت اور شرف کو بھی انہوں نے بچانا تھا۔ اس کے مقابلے میں مسلمان صرف تین صد تھے اور وہ اس لئے نہ نکلے تھے' سازو سامان سے لیس اس قدر عظیم فوج سے' ان کا مقابلہ

ہو گا۔ وہ ایک ہلکے پھلکے پروگرام کے لئے نکلے تھے' وہ ایک غیر مسلح قافلے پر ہاتھ ڈالنے کے لئے نکلے تھے' اور اس پر ہاتھ ڈالنا چاہتے تھے' قلیل تعداد میں ہونے کے ساتھ ساتھ ان کے پاس سازو سامان بھی نہ تھا' اور ان کے پیچھے مدینہ میں ابھی تک مشرکین بھی موجود تھے اور وہ بھی اپنی جگہ پر قوت تھے۔ اس طرح مدینہ میں منافقین کا بھی ایک بڑا طبقہ موجود تھا اور وہ بھی مدینہ کے معاشرے میں اونچا مقام رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ مدینہ میں یہودی بھی تھے جو ہر وقت اس تاک میں لگے رہتے تھے کہ مدینہ میں مسلمانوں پر وار کریں۔ علاوہ ازیں وہ قلیل تعداد میں مسلمانوں کا ایک گروہ تھے جو جزیرۃ العرب کفرو شرک کی ایک عظیم قوت کے درمیان گھرے ہوئے تھے اور ان سب اسباب کے علاوہ ابھی وہ مظلوم پناہ گزیں تھے' جنہیں مکہ سے نکال دیا گیا تھا' کچھ انصار تھے جنہوں نے ان مہاجرین کو پناہ دی ہوئی تھی' بہرحال اس معاشرے میں ان کی حیثیت ایک نوخیز پودے کی تھی۔

ان سب حالات کا ذکر کر کے اللہ تعالیٰ بتاتے ہیں کہ ایسے حالات میں اس قدر عظیم فتح کا حقیقی سبب صرف اللہ تعالیٰ کی نصرت ہی ہے۔

وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّاَنْتُمْ اَذِلَّةٌ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ۝

.... "اس سے پہلے جنگ بدر میں اللہ تعالیٰ تمہاری مدد کر چکا تھا' حالانکہ اس وقت تم بہت کمزور تھے' لہٰذا تم کو چاہئے کہ اللہ کی ناشکری سے بچو۔ امید ہے کہ اب تم شکر گزار بنو گے۔"

صرف اللہ ہی نے انہیں نصرت بخشی اور انہیں اس وجہ سے نصرت بخشی جس کی حکمت کو ان آیات میں بیان کیا گیا ہے۔ ناصرو مددگار نہ وہ خود تھے نہ کوئی اور تھا' اس لئے اگر انہوں نے کسی سے ڈرنا ہے اور کسی سے خائف ہونا ہے تو چاہئے کہ صرف اللہ سے ڈریں اور اس کا خوف اپنے اندر پیدا کریں۔ اس لئے کہ فتح و شکست اس کے ہاتھ میں ہے۔ وہی اللہ ہے جو اقتدار و قوت کا سرچشمہ ہے۔ خدا خوفی ہی انہیں شکر پر آمادہ کر سکتی ہے۔ ہرحال میں ان پر اللہ کا جو انعام و اکرام ہو رہا ہے' اس پر ان کا فرض ہے کہ وہ اللہ کا پورا پورا شکر ادا کریں' جو ان انعامات و اکرامات کے لائق ہو۔

یہ ایک جھلکی ہے' جس میں انہیں یاد دلایا جاتا ہے کہ بدر میں انہیں کیونکر فتح نصیب ہوئی' اس کے بعد' وہ مناظر پیش کئے جاتے ہیں جو میدان بدر میں وقوع پذیر ہوئے' ان مناظر کو ان کے پردۂ دماغ پر از سرنو اس طرح تازہ کیا جاتا ہے کہ گویا وہ ابھی پیش آئے۔ ذرا دیکھئے۔

اِذْ تَقُوْلُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ اَلَنْ يَّكْفِيَكُمْ اَنْ يُّمِدَّكُمْ رَبُّكُمْ بِثَلٰثَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُنْزَلِيْنَ

.... "یاد کرو جب تم مومنین سے کہہ رہے تھے' کیا تمہارے لئے یہ بات کافی نہیں ہے کہ اللہ تین ہزار فرشتے اتار کر تمہاری مدد کرے؟" بے شک اگر تم صبر کرو' اور خدا سے ڈرتے ہوئے کام کرو' تو جس آن دشمن تمہارے اوپر چڑھ آئیں گے اسی آن تمہارا رب (تین ہزار نہیں) پانچ ہزار صاحب نشان فرشتوں سے تمہاری مدد کرے گا۔"

یہ کلمات بدر کے دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ادا کئے تھے' اور ان مٹھی بھر اہل ایمان سے کہے تھے جو آپ کے ساتھ نکلے تھے' جنہوں نے مشرکین کی فوج کو دیکھ لیا' یہ مٹھی بھر مسلمان صرف قافلے کو پکڑنے کے لئے نکلے تھے' جس کے پاس سامان تجارت تھا' ان کے گمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ وہ ایک ایسی فوج کے ساتھ آمنا سامنا کریں گے جو سازو سامان سے لیس تھی اور اس دن انہیں رسول خدا ﷺ نے ان امور سے مطلع کر دیا تھا' جن امور سے اللہ تعالیٰ نے رسول خدا ﷺ کو آگاہ کر دیا تھا' تاکہ ان کے دل مضبوط ہوں اور وہ ثابت قدم رہیں۔ وہ بہرحال انسان تھے' اور انہیں ایسی امداد کی ضرورت تھی جو ان کے تصورات اور ان کے شعور کے لئے قریب الفہم ہو' اور ایک ایسی صورت میں ہو' جس صورت میں وہ کسی معاونت کے عادی تھے' اور انہیں یہ بھی بتایا گیا کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے یہ خصوصی

امداد دو شرائط کے ساتھ مشروط ہے' ایک یہ کہ تم صبر سے کام لو اور پرہیزگاری کا رویہ اختیار کرو' صبر اس لئے ضروری ہے کہ جب حملہ ہوتا ہے تو اس وقت حملے کے صدمات پر صبر کی ضرورت ہوتی ہے' اور تقویٰ وہ چیز ہے جو انسان کا رابطہ اللہ سے قائم کر دیتی ہے۔ چاہے فتح ہو یا ہزیمت ہو۔

بَلٰۤى ۙ اِنْ تَصْبِرُوْا وَ تَتَّقُوْا وَ يَاْتُوْكُمْ مِّنْ فَوْرِهِمْ هٰذَا يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓىِٕكَةِ مُسَوِّمِيْنَ۝۱۲۵

"بے شک' اگر تم صبر کرو' اور خدا سے ڈرتے ہوئے کام کرو تو جس آن دشمن تمہارے اوپر چڑھ آئیں گے اس آن تمہارا رب (تین ہزار نہیں) پانچ ہزار صاحب نشان فرشتوں سے تمہاری مدد کرے گا۔"

یہاں قرآن کریم انہیں سکھاتا ہے کہ آخر کار تمام امور اللہ تعالیٰ کی طرف پلٹتے ہیں' اور تمام اشیاء اور واقعات میں اصل فیکٹر اللہ کی ذات ہے' فرشتوں کا اتارا جانا تو اہل ایمان کے لئے خوشخبری ہے تاکہ ان کے دل خوش ہوں' ثابت قدم ہوں اور انہیں اطمینان و سکون نصیب ہو۔ رہی نصرت تو وہ براہ راست اللہ کی جانب سے ہے' اس کا تعلق اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اس کے ارادے سے ہے' بغیر کسی واسطہ' بغیر کسی وسیلہ اور بغیر کسی سبب کے۔

وَ مَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى لَكُمْ وَ لِتَطْمَىِٕنَّ قُلُوْبُكُمْ بِهٖ ؕ وَ مَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ

"اور یہ بات اللہ نے تمہیں اس لئے بتادی ہے کہ تم خوش ہو جاؤ' اور تمہارے دل مطمئن ہو جائیں۔ فتح و نصرت جو کچھ بھی ہے وہ اللہ کی طرف سے ہے جو بڑی نصرت والا اور دانا و بینا ہے۔"

قرآن مجید کی یہ کوشش ہے کہ وہ تمام امور کو اللہ کی طرف پلٹاتا ہے تاکہ ایک مسلمان کے تصور میں کوئی ایسی بات نہ آجائے جس سے اس کے عقائد کا یہ اصول خالص نہ رہے کہ تمام امور اللہ کی مشیئت کے تابع ہیں اور اللہ کی مشیئت پر کوئی قید نہیں ہے' اس کا ارادہ ہی کسی کام کو عملی شکل دے دیتا ہے' اور اس کی قدرت براہ راست ہے۔ اور اگر تمام اسباب بھی فراہم ہو جائیں تب بھی اس کی مشیئت کے بغیر کوئی کام عملی شکل اختیار نہیں کر سکتا۔ غرض اللہ کی مشیئت ہی قوت فاعلہ ہے۔ وہ جو چاہے اسے حقیقت بنادے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں وَ مَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ .... "اور فتح و نصرت جو کچھ بھی ہے وہ اللہ کی طرف سے ہے جو بڑی قوت والا اور دانا و بینا ہے۔"

قرآن کریم نے اسلامی تصور حیات میں مشیئت الٰہی کی کارفرمائی پر بہت زور دیا ہے۔ اور اسے ہر شک و شبہ سے پاک کرنے کی کوشش کی ہے اور اس بات کا بار بار ذکر کیا ہے کہ دنیاوی اسباب کسی صورت میں موثر نہیں ہوتے۔ اگر ان کے ساتھ اللہ کی مشیئت شامل حال نہ ہو۔ اس تصور حیات کے مطابق انسان اور خدا کے درمیان ایک لازوال رابطہ ہو جاتا ہے۔ اللہ کی قدرت اور مومن کے دل و دماغ کے درمیان ایک خاص رابطہ ہو جاتا ہے۔ اللہ اور بندے کے درمیان حائل پردے اٹھ جاتے ہیں۔ اللہ اور بندے کے درمیان براہ راست تعلق قائم ہو جاتا ہے اور اس میں کبھی کوئی رکاوٹ قائم نہیں ہوتی۔ جس طرح عالم موجودات میں اور عالم حقائق میں ہوتا ہے۔

قرآن کریم میں اس قسم کی ہدایات بار بار دہرائی جاتی ہیں' مختلف اسالیب میں ان کی تاکید کی جاتی ہے اور مسلمانوں کے دل میں یہ حقیقت اچھی طرح بیٹھ جاتی ہے' وہ اس حقیقت کا ایک عجیب گہرا' روشن اور سنجیدہ شعور رکھتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ اللہ وحدہ ہی اس

کائنات کے تمام امور میں فاعل اور موثر ہے' انہیں یہ احساس بھی ہوتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے مامور ہیں کہ وہ اسباب و وسائل فراہم کریں' جدوجہد کریں اور ہر کام کے سلسلے میں اپنی سی کوشش کریں' لیکن اس حقیقت کا بھی انہیں پختہ شعور ہو کہ ہو گا وہی جو اللہ کی مشیئت چاہے لیکن اس پختہ یقین کے ساتھ ساتھ وہ اطاعت کرتے ہیں اور شعوری توازن کے ساتھ ہروقت متحرک رہتے ہیں۔ اس کے باوجود قرآن کریم نے یہ شعور ایک عرصہ کے بعد مسلمانوں کی فکر میں بٹھایا۔ کچھ واقعات پیش آئے' ان واقعات نے مسلمانوں کی تربیت کی' ان واقعات سے نتائج اخذ کئے گئے اور اس سورت میں اس تربیت کی کئی مثالیں موجود ہیں۔

ان آیات میں بدر کا منظر نظروں کے سامنے ہے۔ اس منظر میں حضور اکرم ﷺ اہل ایمان کے ساتھ وعدہ فرماتے ہیں کہ اللہ کی جانب سے خصوصی امداد نازل ہوگی بشرطیکہ وہ صبر و ثبات سے کام لیں اور معرکے میں انسانوں سے ڈرنے کے بجائے صرف تقویٰ اور خدا خوفی کی راہ اختیار کریں۔ عین اس وقت جب ان کا کفار کے ساتھ آمنا سامنا ہو' اس کے بعد یہاں قرآن کریم نزول ملائکہ کے بھی پس منظر میں جاکر یہ باور کراتا ہے کہ اصل قوت فاعلہ ذات باری ہے۔ تمام امور اس کے ہاتھ میں ہیں اور اس کے ارادے کے تابع ہیں اور صرف اس کے اذن اور اس کے ارادے سے فتح و نصرت نصیب ہوگی۔ وَاللّٰہُ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ .... "اور اللہ ہی بڑی قوت والا دانا اور بینا ہے۔" وہ بڑی قوت والا ہے' صاحب اقتدار ہے اور اس بات پر قادر ہے کہ نصرت اور فتح عطا کرے اور اس کے ساتھ وہ حکیم بھی ہے اور اس کی قدرت دانائی کے مطابق جاری و ساری ہے۔ اور وہ فتح اس لئے عطا کرتا ہے کہ اس میں اس کی حکمت پوشیدہ ہوتی ہے۔

اس کے بعد اس نصرت کی حکمت بھی یہاں بیان کر دی جاتی ہے' کیسی فتح؟ وہ فتح جس کے مقاصد میں سے کوئی مقصد بھی انسان کی ذات سے وابستہ نہیں ہے۔

لِيَقْطَعَ طَرَفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْ يَكْبِتَهُمْ فَيَنْقَلِبُوْا خَآئِبِيْنَ ﴿۱۲۷﴾ لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ اَوْ يُعَذِّبَهُمْ فَاِنَّهُمْ ظٰلِمُوْنَ

"تاکہ کفر کی راہ چلنے والوں کا ایک بازو کاٹ دے' یا ان کو ایسی ذلیل شکست دے کہ وہ نامرادی کے ساتھ پسپا ہو جائیں۔ فیصلہ کے اختیارات میں تمہارا کوئی حصہ نہیں' اللہ کو اختیار ہے چاہے انہیں معاف کر دے' چاہے سزا دے کیونکہ وہ ظالم ہیں۔"

یہ حقیقت ہے کہ فتح اللہ کی جانب سے آتی ہے۔ وہ اللہ کی تقدیر کو ظاہر کرتی ہے۔ کسی رسول اور اس کے ساتھیوں کو فتح کی صورت میں کوئی ذاتی مفاد نہیں ملتا۔ نہ اس میں ان کی کوئی ذاتی غرض ہوتی ہے۔ نیز حصول فتح میں نہ رسول کا دخل ہوتا ہے نہ اس کے ساتھی اس میں دخیل ہوتے ہیں۔ وہ تو تقدیر الٰہی کے ظہور کے لئے ایک مظہر ہوتے ہیں۔ قدرت انہیں جس طرح چاہتی ہے' استعمال کرتی ہے۔ وہ اس فتح و نصرت کا نہ سبب حقیقی ہوتے ہیں نہ اس کے صانع ہوتے ہیں۔ وہ نہ فاتح ہوتے ہیں اور نہ ہی اس فتح کے نتیجے میں مفادات حاصل کرتے ہیں۔ دست قدرت اپنے بعض اشخاص کو حرکت میں لاتا ہے۔ پھر خود ان کی تائید کرتا ہے تاکہ اللہ کے پیش نظر جو حکمتیں ہوں ان کا ظہور ہو اور جو مقاصد ہوں وہ بروئے کار لائے جائیں۔

لِيَقْطَعَ طَرَفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا .... "تاکہ کفر کی راہ چلنے والوں کا ایک بازو کاٹ دے۔" وہ قتل ہوں اور ان کی افرادی قوت کم ہو' ان کی اراضی ان ہاتھوں سے نکلے اور ان کا رقبہ کم ہوتا جائے۔ یا ان کی جابرانہ حکومت کا دائرہ تنگ ہو جائے۔ ان کی دولت میں بوجہ مال غنیمت کمی آجائے اور ہزیمت اور شکست کے نتیجے میں ان کی سرگرمیوں میں کمی آجائے۔

أَوْ يَكْبِتَهُمْ فَيَنقَلِبُوا خَائِبِينَ .... "یا ان کو ایسی ذلیل شکست دے کہ وہ نامرادی کے ساتھ پسپا ہو جائیں۔" یعنی ذلیل ہو کر ہزیمت اٹھائیں اور اپنے مقاصد میں ناکام ہو کر لوٹیں جبکہ وہ دبے ہوئے ہوں۔

أَوْ يَتُوبَ عَلَيْهِمْ .... "یا انہیں معاف کر دے" اس لئے کہ بعض اوقات اہل اسلام کی فتح کے نتیجے میں کفار کو عبرت حاصل ہو جاتی ہے اور وہ سبق حاصل کر لیتے ہیں اور اس فتح کے نتیجے میں وہ اسلام قبول کر لیتے ہیں 'نتیجتاً' اللہ انہیں معاف کر دیتا ہے۔ ان سے صفت کفر چلی جاتی ہے اور وہ راہ ہدایت پا کر اسلام پر جم جاتے ہیں۔

أَوْ يُعَذِّبَهُمْ فَإِنَّهُمْ ظَالِمُونَ .... "چاہے انہیں سزا دے کیونکہ وہ ظالم ہیں۔" عذاب کی ایک شکل تو یہ ہوتی ہے کہ اہل اسلام ان پر غالب آجاتے ہیں' دوسری صورت' قید ہونے کی صورت میں وہ عذاب پاتے ہیں یا ان کا خاتمہ کفر پر ہو جاتا ہے اور انجام کار وہ سزائے جہنم کے مستحق ہو جاتے ہیں۔ یہ سزا ان کو اس لئے دی جاتی ہے کہ وہ کفر کر کے ظلم کا ارتکاب کرتے ہیں' مسلمانوں کو فتنے میں ڈالتے ہیں اور فساد فی الارض کے مرتکب ہوتے ہیں۔ نیز وہ اس اصلاحی نظام حیات کے مقابلے میں اتر کر ظلم کا ارتکاب کرتے ہیں جو اسلامی نظام حیات اور اسلامی شریعت کی صورت میں دنیا میں نافذ ہونے کے لئے آیا ہے۔ غرض وہ سب مظالم اس میں شامل ہیں جو کفر کی وجہ سے وجود میں آتے ہیں اور جن کی وجہ سے اللہ کی راہ کو مسدود کیا جاتا ہے۔

بہرحال یہ سب پروگرام حکمت الہٰی کے تحت ہوتا ہے اور اس میں انسانی ارادے کا کوئی دخل نہیں ہوتا یہاں تک کہ اس آیت کی رو سے خود رسول خدا ﷺ کی ذات کو بھی اس پروگرام میں دخل انداز ہونے سے خارج کیا جاتا ہے۔ اور ان امور میں فیصلے کا اختیار صرف اللہ کی ذات کے ساتھ مخصوص ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہ ایسے فیصلے ذات باری کے شایان شان ہیں۔ ان میں ذات باری منفرد ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔

یوں اہل ایمان کی ذات فتح و کامرانی کے اس منظر سے باہر آجاتی ہے۔ وہ خود فتح و کامرانی کے اسباب کے دائرے سے نکل جاتے ہیں اور اس کے نتائج میں بھی ان کا کوئی دخل نہیں رہتا۔ یوں وہ اس کبر و غرور سے محفوظ رہتے ہیں جو فاتحین کے دلوں میں بالعموم پیدا ہو جاتا ہے' نیز وہ سخت گیری' غرور اور احساس برتری سے بھی مامون ہو جاتے ہیں جن کی وجہ سے اکثر فاتحین پھولے نہیں سماتے اور ان کے روح اور طرز عمل غیر متوازن ہوتے ہیں۔ چنانچہ اہل ایمان محسوس کرتے ہیں کہ فیصلے کے اختیارات ان کے پاس نہیں ہیں۔ اختیارات تو سب کے سب اللہ کے پاس ہیں۔

غرض لوگ مطیع فرمان ہوں یا نافرمان ہوں ان سب کے امور کا مالک اللہ تعالیٰ ہے۔ یہ کہ لوگوں کی قسمت کے فیصلے' خواہ وہ اچھے لوگ ہوں یا برے' اللہ نے اپنے ہاتھ میں رکھے ہیں۔ یہ ہے تحریک اسلامی کی حقیقت اور یہ ہے اس میں لوگوں کا مقام چاہے وہ اچھے ہوں یا برے ہوں۔ اس میدان میں خود حضور اکرم ﷺ اور اہل ایمان کا کام صرف یہ ہے کہ وہ اچھے طریقے سے اپنے فرائض سرانجام دیں۔ اور نتائج اللہ پر چھوڑ دیں۔ وہ اپنے کئے پر صرف اللہ سے اجر کے طلبگار ہوں' وہ انہیں پورا پورا اجر دے گا اور ان کا والی اور مددگار ہو گا۔

یہ آیت کہ "فیصلے کے اختیارات میں تمہارا کوئی دخل نہیں ہے" اس لئے بھی یہاں لائی گئی ہے کہ آنے والی آیات میں بعض لوگوں کی یہ بات نقل ہونے والی ہے۔ هَل لَّنَا مِنَ الْأَمْرِ مِن شَيْءٍ .... "اس کام کو چلانے میں ہمارا بھی کوئی حصہ ہے۔" (۳:۱۵۴) اور یہ کہ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ مَّا قُتِلْنَا هَاهُنَا .... "اگر اختیارات میں ہمارا کوئی حصہ ہوتا تو یہاں ہم نہ مارے جاتے۔" (۳:۱۵۷) اور یہ آیت دراصل ان مزعومات کا پیشگی جواب ہے کہ جی ہاں اختیارات

الہٰہ میں کوئی شریک نہیں ہے' نہ فتح کسی کے اختیار میں ہے نہ شکست۔ تمہارا کام صرف اطاعت امر ہے' ادائے فرض ہے اور مکمل وفاداری ہے۔ یہی امور تم سے مطلوب ہیں۔ ان کے بعد نتائج کیا نکلتے ہیں تو بس یہ اللہ تعالیٰ کا کام ہے۔ ان میں کسی کا دخل نہیں ہے۔ یہاں تک کہ رسول خدا ﷺ کا بھی دخل نہیں ہے۔ یہ ہے وہ اصلی حقیقت جو اسلامی تصور حیات کے پیش نظر ہے اور اسے نفس انسانی کی گہرائیوں میں جاگزیں ہونا چاہئے اور اسے واقعات' حالات اور افراد کار سے بھی برتر اور بلند ہونا چاہئے۔

واقعہ بدر کی یہ یاد دہانی اور اسلامی تصور حیات کے ان اساسی حقائق کا اختتامیہ اس عام حقیقت کے اظہار سے ہوتا ہے کہ آخر کار فتح و ہزیمت دونوں اللہ تعالیٰ کی قدرت اور حکیمانہ پالیسی کے تابع ہوتی ہیں اور یہاں آکر اس بیان کے خاتمہ پر' اس سے بھی زیادہ عمومی حقیقت کو سامنے لایا جاتا ہے کہ اس پوری کائنات میں اللہ کا امر جاری و ساری ہے۔ اس لئے وہ جسے چاہتا ہے بخش دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے عذاب میں مبتلا کر دیتا ہے۔

وَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ ؕ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَ يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ .... "زمین و آسمان میں جو کچھ ہے اس کا مالک اللہ ہے' جس کو چاہئے بخش دے اور جس کو چاہے عذاب دے' وہ معاف کرنے والا اور رحیم ہے۔"

غرض یہ امور اللہ کی مشیئت کے تابع ہیں جو بے قید ہے اور جو اس کی بے قید شہنشاہیت کے ساتھ وابستہ ہے۔ وہ اپنے بندوں کے معاملات میں بے قید متصرف ہے۔ جس طرح کہ وہ آسمانوں اور زمینوں کا مالک لاشریک ہے۔ وہ اپنے بندوں پر نہ ظلم کرتا ہے اور نہ ان میں سے کسی کی جانبداری کرتا ہے نہ مغفرت میں اور نہ سزا دہی میں۔ بندوں کے درمیان وہ فیصلے حکمت اور عدل کے ساتھ کرتا ہے اور حکمت اور عدالت کے ساتھ ساتھ اس کی صفات رحمت اور عفو بھی اپنا کام کرتی ہیں' اس لئے کہ عفو و درگزر ہی اس کے شایان شان ہے۔

وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ .... "وہ معاف کرنے والا اور رحیم ہے۔" بندوں کے لئے اس کے دروازے کھلے ہیں' وہ ہروقت اس کی رحمت اور مغفرت سے فیض یاب ہو سکتے ہیں' ہروقت لوٹ سکتے ہیں' باز آسکتے ہیں' اس لئے کہ تمام معاملات اس کے ہاتھ میں ہیں۔ فرائض جو اس نے عائد کئے ہیں ان کی ادائیگی اور فرائض سے آگے کے معاملات کو ترک کرنا' یہ اس کی حکمت اور مشیئت کی وجہ سے ہے' جس پر کوئی قید و بند نہیں ہے۔ اور اس کی حکمت اور مشیئت اسباب و وسائل کے پیچھے کام کرتی ہے۔

○......☆☆☆......○

اس سے قبل کہ سیاق کلام معرکہ احد کے مرکزی واقعات کے بیان کا آغاز کرے' ان واقعات کے نتائج ریکارڈ کرے' اور واقعات کی تفصیلات کا ذکر کرے۔ یہاں اس عظیم معرکہ کے بارے میں ہدایات دی جارہی ہیں' جس کا ذکر ہم نے اس بحث کے آغاز میں کیا ہے۔ وہ عظیم معرکہ وہ ہے جو انسانی نفسیات کے میدان میں برپا تھا اور ہے اور جو پوری انسانی زندگی کی سطح پر جاری و ساری ہے۔ اس سلسلے میں یہاں سود خوری اور سودی کاروبار کے بارے میں بات کی جاتی ہے۔ یہاں خدا خوفی' خدا کی اطاعت اور اس کے رسول کی فرمانبرداری سے متعلق بات کی جاتی ہے۔ یہ حکم دیا جاتا ہے کہ سہولت اور مشکلات کے ہر دور میں انفاق فی سبیل اللہ پر عمل کیا جائے_ اسلامی نظام معیشت کے کریمانہ نظام معاونت اور اس کے مقابلے میں سود کی ملعون نظام معیشت کا ذکر' غصہ پی جانا' لوگوں سے عفو و درگزر کرنا اور جماعت مسلمہ کے اندر بھلائی کی اشاعت' گناہوں سے معافی کی طلب گاری اور غلطیوں اور کوتاہیوں پر عدم اصرار کے مباحث کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰوٓا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً ۪ وَّ اتَّقُوا

اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۱۳۰﴾ وَ اتَّقُوا النَّارَ الَّتِیْٓ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِیْنَ ﴿۱۳۱﴾ وَ اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَ الرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۱۳۲﴾ وَ سَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ جَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَ الْاَرْضُ ۙ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِیْنَ ﴿۱۳۳﴾ الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ فِی السَّرَّآءِ وَ الضَّرَّآءِ وَ الْكٰظِمِیْنَ الْغَیْظَ وَ الْعَافِیْنَ عَنِ النَّاسِ ؕ وَ اللّٰهُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ ﴿۱۳۴﴾ وَ الَّذِیْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ ۪ وَ مَنْ یَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ ۪۫ وَ لَمْ یُصِرُّوْا عَلٰى مَا فَعَلُوْا وَ هُمْ یَعْلَمُوْنَ ﴿۱۳۵﴾ اُولٰٓىِٕكَ جَزَآؤُهُمْ مَّغْفِرَةٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَ جَنّٰتٌ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا ؕ وَ نِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِیْنَ ﴿۱۳۶﴾

”اے ایمان لانے والو! یہ بڑھتا اور چڑھتا سود کھانا چھوڑ دو اور اللہ سے ڈرو' امید ہے کہ فلاح پاؤ گے۔ اس آگ سے بچو جو کافروں کے لئے مہیا کی گئی ہے اور اللہ اور رسول کا حکم مان لو' توقع ہے کہ تم پر رحم کیا جائے گا۔ دوڑ کر چلو اس راہ پر جو تمہارے رب کی بخشش اور اس جنت کی طرف جاتی ہے جس کی وسعت زمین اور آسمانوں جیسی ہے' اور وہ ان خدا ترس لوگوں کے لئے مہیا کی گئی ہے جو ہر حال میں مال خرچ کرتے ہیں' خواہ بدحال ہوں یا خوش حال' جو غصے کو پی جاتے ہیں اور دوسروں کے قصور معاف کر دیتے ہیں' ایسے نیک لوگ اللہ کو بہت پسند ہیں اور جن کا حال یہ ہے کہ اگر کبھی کوئی فحش کام ان سے سرزد ہو جاتا ہے یا کسی گناہ کا ارتکاب کر کے وہ اپنے اوپر ظلم کر بیٹھتے ہیں تو معاً اللہ انہیں یاد آ جاتا ہے اور اس سے وہ اپنے قصوروں کی معافی چاہتے ہیں' کیونکہ اللہ کے سوا اور کون ہے جو گناہ معاف کر سکتا ہو۔ اور وہ دیدہ و دانستہ اپنے کئے پر اصرار نہیں کرتے۔ ایسے لوگوں کی جزاء ان کے رب کے پاس یہ ہے کہ وہ ان کو معاف کر دے گا اور ایسے باغوں میں انہیں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور وہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ کیا اچھا بدلہ ہے نیک عمل کرنے والوں کے لئے۔“

یہ تمام ہدایات یہاں عین اس وقت دی جا رہی ہیں کہ سیاق کلام میں جنگی معرکہ پر بحث شروع ہونے والی ہے۔ اور ان سے یہاں اسلامی نظریہ حیات کی خصوصیات میں سے ایک اہم خصوصیت کی طرف اشارہ مطلوب ہے۔ اسلامی نظریہ حیات انسانی شخصیت اور اس کی سرگرمیوں کو ایک جامع نقطہ نظر سے دیکھتا ہے۔ اور انسان اور اس کی تگ و دو کو ایک ہی محور کے گرد گھماتا ہے۔ وہ یہ کہ انسان کو اپنی پوری زندگی میں اللہ وحدہٗ لاشریک کی اطاعت اور پرستش کرنی ہے۔ ہر معاملے میں صرف اسی کی طرف متوجہ ہونا ہے۔ اور صرف اسلامی نظام حیات ہی پوری زندگی پر حاوی ہونا ہے اور انسانی شخصیت کے تمام احوال اور تمام حالات پر اسلامی نظام حیات کو غالب کرنا ہے اور انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں میں اسے رائج کرنا ہے۔ اس کے بعد یہ ہدایات انسانی زندگی کی بوقلمونیوں کے درمیان اس ربط کی طرف

اشارہ کرتی ہیں اور سعی انسانی کے آخری نتائج میں اس ربط کے اثرات بھی بیان کئے جاتے ہیں' جیسا کہ اس سے قبل ہم بیان کر آئے ہیں۔

اسلامی نظام زندگی نفس انسانی کے ہر پہلو کو اپنی گرفت میں لیتا ہے' وہ جماعت مسلمہ کی زندگی کو پوری طرح منظم کرتا ہے۔ وہ اس کے درمیان بخرے بخرے کر کے کوئی فیصلہ نہیں کرتا۔ اس لئے وہ میدان کارزار کے لئے سازوسامان بھی تیار کرتا ہے اور افراد کار کے اندر صلاحیت جنگ بھی پیدا کرتا ہے۔ وہ اہل ایمان کے دلوں کو بھی پاک کرتا ہے۔ ان کے ذہنوں کی تطہیر کرتا ہے' انسان کے اندر ایسی اخلاقی قوت پیدا کرتا ہے کہ وہ ہوائے نفس اور جسمانی خواہشات پر قابو پاسکیں۔ جماعت مسلمہ کے اندر محبت' ملنساری پیدا کی جاتی ہے اور یہ تمام اوصاف ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہیں۔ جب ہم ان تمام خصوصیات پر تفصیل کے ساتھ بحث کریں گے اور ان ہدایات میں سے ہر ایک کی تفسیر کریں گے تو معلوم ہو گا کہ تمام اوصاف و ہدایات جماعت مسلمہ کی عملی زندگی کے ساتھ گہرا ربط ہے۔ اور یہ اوصاف میدان جنگ اور میدان حیات دونوں میں وہ جماعت مسلمہ کی تقدیر کے ساتھ مربوط ہیں۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰوٓا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً ۖ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۱۳۰﴾ وَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْٓ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۳۱﴾ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۱۳۲﴾

"اے ایمان لانے والو! یہ بڑھتا اور چڑھتا سود کھانا چھوڑ دو اور اللہ سے ڈرو' امید ہے کہ فلاح پاؤ گے۔ اس آگ سے بچو جو کافروں کے لئے مہیا کی گئی ہے اور اللہ اور رسول کا حکم مان لو' توقع ہے کہ تم پر رحم کیا جائے گا۔"

سود اور سودی نظام معیشت پر بحث فی ظلال القرآن پارہ سوئم میں تفصیل کے ساتھ بیان ہو چکی ہے۔ اس لئے یہاں ہم اس پوری بحث کو دہرانا مناسب نہیں سمجھتے۔ لیکن یہاں اضعاف مضاعفہ کے الفاظ پر غور کرنا مناسب ہو گا۔ اس لئے کہ ہمارے زمانے کے بعض لوگ ان الفاظ کی آڑ لے کر یہ مفہوم بیان کرتے ہیں کہ جو چیز حرام کی گئی ہے وہ اضعاف مضاعفہ ہے۔ رہا وہ سود جو چار فیصد ہو' پانچ فیصد ہو' سات فیصد ہو' نو فیصد ہو تو وہ اضعاف مضاعفہ نہیں ہے' لہٰذا وہ حرام نہیں ہے۔

اس کی تردید میں صرف یہی کہہ دینا کافی ہے کہ اضعاف مضاعفہ کی قید دراصل نزول قرآن کے وقت موجود واقعی صورت حال کا اظہار کرتی ہے' یہ قید اس حکم کو محدود اور مشروط نہیں کرتی۔ سورۂ بقرہ میں جو آیت وارد ہے وہ قطعی ہے۔ اور ربا کی ہر صورت کو حرام قرار دیتی ہے۔ اس لئے اس میں کوئی قید و حد نہیں ہے۔ وہاں یہ الفاظ نہیں **وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوٓا** ....

"سود میں سے جو کچھ باقی ہے اسے چھوڑ دو" چاہے وہ سود جس شرح سے بھی ہو۔"

اس اصولی بحث کے بعد اب ہم بتائیں گے کہ ربا کے ساتھ اس صفت اضعاف مضاعفہ کی قید کیوں عائد کی گئی ہے؟ نہ صرف یہ کہ یہ صفت سودی نظام کی تاریخ کی طرف اشارہ کر رہی جس میں سودی کاروبار دوچند چہارچند شرح سے کیا جاتا تھا۔ بلکہ یہ بتاتی ہے کہ سود کی شرح جو بھی ہو سود کے تباہ کن نظام کے ساتھ یہ صفت اضعاف مضاعفہ ایک لازم صفت ہے۔

سودی نظام کا خلاصہ یہ ہے کہ کسی سوسائٹی میں پوری دولت کی گردش اس نظام کے مطابق شروع ہوتی ہے' اس لئے سودی کاروبار میں سرگرمیاں سود مفرد کی طرح سادہ سرگرمیاں نہیں ہوتیں۔ اس گردش کا ایک پہلو یہ ہے کہ اس نظام میں مال کی منتقلی بار بار ہوتی رہتی' اس لئے وہ سود مرکب میں تبدیل ہو جاتا ہے' اس لئے بار بار سودی چارج کی وجہ سے بالآخر سود کی رقم کئی گنا ہو جاتی ہے۔ اور وہ بلاجدال "اضعافا" مضاعفہ بن جاتی ہے۔ اس لئے اپنے مزاج کے اعتبار سے سودی نظام میں دولت دوگنی چوگنی بنتی جاتی ہے۔ اس لئے اضعاف

مضاعفۃ کا اطلاق اس صورت حال کے اندر منحصر نہ ہوگا جو نزول قرآن کے وقت عرب سوسائٹی میں مروج تھی بلکہ ہر دور میں ہر قسم کے سودی نظام کی یہ خاصیت ہوتی ہے کہ وہ دوگنا چوگنا ہوتا رہتا ہے۔

اور جیسا کہ ہم نے تیسرے پارے میں تفصیلات دی ہیں' اس نظام کی خصوصیت یہ بھی ہوتی ہے کہ یہ لوگوں کی نفسیات اور اخلاق پوری طرح بگاڑ دیتا ہے۔ نیز یہ نظام ملک کی اقتصادی اور سیاسی صورت حال کو بھی پوری طرح خراب کر دیتا ہے۔ اس لئے اس سودی نظام کے اثرات امت کی اجتماعی زندگی پر پڑتے ہیں اور امت کے انجام پر اس کے اثرات ہوتے ہیں۔ جیسا کہ ہم نے تیسرے پارے میں ذکر کیا ہے۔

اسلام جس وقت امت مسلمہ کی تخلیق کر رہا تھا' وہ اس امت کے لئے ایک اخلاقی اور نفسیاتی نظام حیات کی بنیاد بھی رکھ رہا تھا' وہ اس نئی امت کی سیاسی اور اقتصادی زندگی کو بھی صحت مندانہ اصولوں پر استوار کر رہا تھا' اس سلسلے میں اس نئی امت کو جو معرکے در پیش ہوئے اور ان کے جو اثرات مرتب ہوئے وہ تاریخ اسلام کے معروف و مشہور واقعات ہیں' اس لئے جنگی واقعات کے درمیان میں اچانک حرمت ربا کا ذکر بھی قابل فہم ہے اس لئے کہ اسلامی نظام حیات ایک جامع اور حکیمانہ نظام ہے۔ نیز ربا کی ممانعت کے بعد یہ کہنا کہ اللہ سے ڈرو اور یہ امید رکھو کہ تم پر رحم کیا جائے گا اور پھر یہ کہنا کہ اس آگ سے اپنے آپ کو بچاؤ جو کافروں کے لئے تیار کی گئی ہے' یہ دونوں باتیں بھی اس نقطۂ نظر سے قابل فہم ہو جاتی ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ جو شخص اللہ سے ڈرتا ہو اور اس کے دل میں خدا کا خوف ہو وہ ہرگز سود نہیں کھا سکتا' نیز جس شخص کے دل میں عذاب جہنم کا خوف ہو' وہ بھی ہرگز سود خور نہیں ہو سکتا۔ بالفاظ دیگر جو شخص بھی ایمان رکھتا ہو اور اپنے آپ کو کافروں کی لائن سے نکالنا پسند کرتا ہو وہ بھی سود خور نہیں ہو سکتا۔ ایمان صرف خالی خولی باتوں کا نام نہیں ہے بلکہ اس کا تقاضا یہ بھی ہے کہ اسلامی نظام حیات کا اتباع بھی کیا جائے۔ اس لئے کہ اسلامی نظام حیات کا قیام ایمان کا عملی ترجمہ ہے۔ اور واقعی زندگی میں اسلامی نظام حیات کے قیام اور پوری زندگی کو اسلام کے رنگ میں رنگنے کے لئے ایمان کو ہراول دستہ قرار دیا گیا ہے۔

یہ بات محال ہے کہ ایمان اور سودی نظام ایک جگہ جمع ہو جائیں جہاں سودی نظام قائم ہو گا' وہ سوسائٹی پوری کی پوری دین اسلام سے خارج تصور ہوگی اور اس کا انجام اس آگ میں ہو گا جسے فی الحقیقت کافروں کے لئے تیار کیا گیا ہے۔ اس مسئلے میں جو بھی بحث کی جائے گی وہ غیر ضروری بحث ہوگی' اس لئے کہ اس آیت میں پہلے سودی کاروبار کی ممانعت کی گئی ہے۔ اس کے بعد اہل ایمان کو یہ دعوت دی گئی ہے کہ وہ خدا کا خوف کریں اور اس حکم پر عمل کریں اور اس آگ سے بچیں جو کافروں کے لئے تیار کی گئی ہے۔ یہ مضمون اس نہج پر بے مقصد نہیں لایا گیا نہ اتفاقیہ طور پر اس طرح بیان کر دیا گیا ہے۔ یہ سب ہدایات بامقصد ہیں' بطور تاکید لائی گئی ہیں اور مسلمانوں کے ذہن میں اس حقیقت کو اسی مفہوم میں بٹھانا مقصود ہے۔

انہیں یہ امید دلائی گئی ہے کہ اگر وہ سودی کاروبار ترک کر دیں گے تو وہ امید کر سکتے ہیں کہ وہ کامیاب ہوں گے' اس لئے کہ کامیابی صرف خدا کے تقویٰ کے نتیجے میں مل سکتی ہے۔ تقویٰ کا طبعی انجام فلاح ہے۔ اور فلاح اس لئے ہے کہ انسانوں کی زندگی میں اسلامی نظام قائم کیا جائے۔ پارۂ سوئم میں ہم تفصیل سے بیان کر آئے کہ اس منحوس سودی نظام نے انسانی معاشروں کو کس طرح تباہ کیا ہے۔ اور پوری انسانیت کو اس نظام نے کن کن مصائب میں مبتلا کئے رکھا ہے۔ مناسب ہے کہ پارۂ سوئم میں دی گئی مباحث کو ایک بار پھر ذہن نشین کر لیا جائے تاکہ ہمیں معلوم ہو جائے کہ اسلامی نقطہ نظر سے فلاح کا تصور کیا ہے اور یہ کہ کس طرح فلاح اس بات پر موقوف ہے کہ ہم اس خبیث سودی نظام کو جڑ سے اکھاڑ پھینکیں۔

اس کے بعد یہ آخری تاکید آتی ہے وَ اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَ الرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ....
.... "اور اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو تاکہ تم پر رحم کی امید ہو سکے۔" یہ اللہ اور رسول کی اطاعت کا عام حکم ہے' اور اس اطاعت عامہ پر اللہ کے رحم کو موقوف کیا گیا ہے لیکن سودی کاروبار کی ممانعت کے بعد بطور نتیجہ اس رحمت خداوندی کا ذکر خالی از حکمت نہیں ہے۔ اس میں ایک خاص مفہوم اور اشارہ بھی مطلوب ہے۔ وہ یہ ہے کہ کسی ایسے معاشرے میں جس کی اقتصادیات سودی نظام پر استوار ہوں قطعاً" اللہ اور رسول کی اطاعت ممکن نہیں رہتی۔ نیز اس دل میں اطاعت الٰہی اور اطاعت رسول کا جذبہ ہی نہیں رہتا جو سود کھاتا ہو' چاہے وہ کسی بھی شکل اور کسی بھی صورت میں ہو' اس طرح نہی عن الربا کا یہ نتیجہ اور تعقیب بھی ایک طرح کی تاکید مزید ہے کہ اس منحوس نظام کو ختم کر دیا جائے۔

یہاں اطاعت اللہ اور اطاعت رسول اللہ ﷺ کی اس تاکید کا تعلق کاروبار ربا کے علاوہ جنگ احد کے ان واقعات کے ساتھ بھی ہے جن میں حضور ﷺ کے واضح احکام کی خلاف ورزی کی گئی تھی۔ اشارہ یہ مقصود ہے کہ فلاح صرف اس صورت میں نصیب ہو سکتی ہے کہ تم لوگ اللہ اور رسول کی اطاعت کرو' صرف یہی جائے امید ہے اور یہی راہ نجات ہے۔

اس سے قبل سورۂ بقرہ پارہ سوئم میں جہاں ہم نے سودی نظام پر بحث کی تھی ہم نے بتایا تھا کہ ذکر ربا کے ساتھ ساتھ وہ انفاق فی سبیل اللہ اور فضیلت صدقہ کا بیان اس لئے کیا گیا ہے کہ اجتماعی اقتصادی نظام میں یہ دونوں باہم متقابل سمتیں ہیں' جن سے دو علیحدہ علیحدہ نظامہائے اقتصاد کی طرف اشارہ مطلوب ہے۔ ایک سودی اقتصادی نظام ہے اور دوسرا باہم تعاون پر مبنی نظام اقتصاد ہے۔ چنانچہ یہاں بھی جب ربا سے بحث کی گئی تو اس کے ساتھ ہی ہر حال میں انفاق فی سبیل اللہ کی ترغیب بھی دی گئی۔ چنانچہ ربا کی ممانعت' اور اس آگ سے ڈرانے کے بعد جو اہل کفر کے لئے تیار کی گئی ہے اور لوگوں کو خدا خوفی کی دعوت دینے اور انہیں ہر وقت رحمت خداوندی کے امیدوار رہنے کے ساتھ ساتھ انہیں دعوت دی گئی ہے کہ وہ اللہ کی مغفرت کی طرف دوڑ کر چلیں۔ وہ بھاگے بھاگے ان جنتوں میں داخل ہوں جو آسمانوں اور زمینوں کی وسعتوں سے بھی زیادہ وسیع ہیں اور جنہیں اہل تقویٰ کے لئے تیار کیا گیا ہے اور متقین کے اوصاف میں سے پہلی صفت یہ بیان کی گئی ہے الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِي السَّرَّآءِ وَ الضَّرَّآءِ .... "وہ لوگ جو خوشحالی اور بدحالی دونوں حالتوں میں مال خرچ کرتے ہیں۔" اس لئے یہ لوگ ان لوگوں کے فریق مخالف ہیں جو سودی نظام میں سود کھاتے ہیں اور اس کے ذریعہ دو چند چہار چند رقم بٹورتے ہیں۔ اس کے بعد پھر متقین کی اور صفات بیان کی جاتی ہیں۔ پوری آیت یہ ہے :

وَ سَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ جَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَ الْاَرْضُ ۙ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِي السَّرَّآءِ وَ الضَّرَّآءِ وَ الْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَ الْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ؕ وَ اللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۝ وَ الَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ ۪ وَ مَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ ۪۫ وَ لَمْ يُصِرُّوْا عَلٰى مَا فَعَلُوْا وَ هُمْ يَعْلَمُوْنَ

"دوڑ کر چلو اس راہ پر جو تمہارے رب کی بخشش اور اس جنت کی طرف جاتی ہے جس کی وسعت زمین و آسمانوں جیسی ہے' اور وہ ان خدا ترس لوگوں کے لئے مہیا کی گئی ہے جو ہر حال میں اپنے مال خرچ کرتے ہیں خواہ بدحال ہوں یا خوشحال جو غصے کو پی جاتے ہیں اور دوسروں کے قصور معاف کر دیتے ہیں۔ ایسے نیک لوگ اللہ کو بہت پسند ہیں۔ اور جن کا حال یہ ہے کہ اگر کبھی کوئی فحش کام ان سے سرزد

ہو جاتا ہے یا کسی گناہ کا ارتکاب کر کے وہ اپنے اوپر ظلم کر بیٹھتے ہیں تو معاً اللہ انہیں یاد آجاتا ہے اور اس سے وہ اپنے قصوروں کی معافی چاہتے ہیں..... کیونکہ اللہ کے سوا اور کون ہے جو گناہ معاف کر سکتا ہے....... اور وہ دیدہ و دانستہ اپنے کئے پر اصرار نہیں کرتے۔"

اس آیت کا انداز تعبیر ایسا ہے کہ اس میں ان عبارات کو بالکل محسوس طور پر بیان کیا گیا ہے۔ گویا کچھ لوگ ہیں جو کسی انعامی مقابلے میں ایک مقررہ ہدف کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ وَ سَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ .... "دوڑ کر چلو اس راہ پر جو تمہارے رب کی مغفرت کی طرف جاتی ہے" وَ جَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَ الْاَرْضُ .... "دوڑ کر چلو اس جنت کی طرف جس کی وسعت زمین اور آسمانوں جیسی ہے۔" دوڑو! وہ ہے جنت وہاں ہے مغفرت! اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ .... "جو ان لوگوں کے لئے تیار کی گئی ہے جو خدا سے ڈرتے ہیں۔"

اس کے بعد متقین کی صفات بیان کی جاتی ہیں اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِي السَّرَّآءِ وَ الضَّرَّآءِ .... "وہ لوگ جو بدحالی اور خوشحالی دونوں میں خرچ کرتے ہیں۔"

یعنی وہ انفاق پر ہر وقت ثابت قدمی سے عمل پیرا ہیں' وہ اپنی روش پر رواں دواں ہیں' نہ خوشحالی میں آپے سے باہر ہوتے ہیں اور نہ بدحالی میں اپنی نہج سے پیچھے ہٹتے ہیں۔ خوشحالی انہیں مغرور کر کے غافل نہیں بنا دیتی اور بدحالی ان کی گوشمالی کر کے انہیں ان کا نصب العین بھلا نہیں دیتی۔ انہیں اپنی ذمہ داریوں کا شعور ہر وقت دامن گیر رہتا ہے۔ وہ حرص و آز سے آزاد ہو چکے ہوتے ہیں۔ وہ ہر وقت اللہ تعالیٰ کی نگرانی کا شعور رکھتے ہیں اور ان کے دل میں خدا کا خوف ہر وقت زندہ رہتا ہے۔ نفس انسانی جو اپنے مزاج کے اعتبار سے بخیل ہوتا ہے اور جس کے اندر دولت کی طبعی محبت ہوتی ہے' اسے ہر وقت انفاق فی سبیل اللہ پر قائم رکھنے کے لئے ایک قوی ترجذبے کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ جذبہ مال کی محبت سے قوی تر ہونا چاہئے۔ تاکہ وہ حرص و آز کے فطری بندھن توڑ سکے۔ اور یہ جذبہ صرف خوف خدا کا جذبہ ہی ہو سکتا ہے۔ اور یہ کیا ہوتا ہے؟ یہ ایک نہایت ہی لطیف اور گہرا شعور ہوتا جس کے ساتھ روح اونچی پرواز کرتی ہے۔ وہ خالص ہو جاتی ہے اور قید و بند سے آزاد ہو جاتی ہے۔

معرکہ حق و باطل کی اس فضا میں اس صفت کی طرف یہاں اشارہ ایک خاص مناسبت سے کیا گیا ہے۔ اس معرکے پر تبصرے کے دوران بار بار انفاق فی سبیل اللہ کی تاکید کی جاتی ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ ان سرمایہ داروں پر بھی بار بار تنقید کی جاتی ہے جو انفاق فی سبیل اللہ سے کنی کتراتے ہیں۔ اس نکتہ کی تفصیلات نصوص کی تفسیر کے دوران بیان ہوں گی۔ معرکہ حق و باطل کی اس فضا میں انفاق کی ایک خاص اہمیت ہے۔ اور یہاں اس کا بار بار ذکر اس لئے ہوا کہ انفاق فی سبیل اللہ کے سلسلے میں دعوت اسلامی کے بعض کارکنوں کا موقف اس کا متقاضی تھا۔

وَ الْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَ الْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ .... "جو غصے کو پی جاتے ہیں اور دوسروں کے قصور معاف کر دیتے ہیں۔" غرض خدا خوفی اس میدان میں بھی اپنے اثرات دکھاتی ہے۔ بعینہ وہی اسباب اور وہی اثرات جو انفاق کے لئے تھے' غصہ ایک ایسا طبعی انفعال ہے جس کے بعد انسانی خون میں گرمی پیدا ہو جاتی ہے۔ گویا وہ انسان کے عام فطری ردعمل کی ایک قسم ہے بلکہ وہ انسان کی ایک طبعی ضرورت ہے۔ اور اس فطری ردعمل کو انسان صرف اس روحانی قوت کے ذریعہ ہی قابو میں لا سکتا ہے جو نور تقویٰ کے نتیجے میں انسان کو حاصل ہوتی ہے۔ یہ قوت غضبی اس وقت رام ہوتی ہے جب انسان روحانی قوت سے مسلح ہو اور اس کی نظریں ذاتی ضروریات اور ذاتی وفلاح سے بلند ہو کر ایک اعلیٰ انسانی افق پر مرکوز ہوں۔

ہاں غصہ پی جانا تو پہلا مرحلہ ہے اور یہ کافی نہیں ہے۔ بعض اوقات انسان غصہ تو پی جاتا ہے لیکن اس کے بعد اس کے دل میں کینہ

پیدا ہو جاتا ہے اور اس کے دل میں جوش انتقام ولولہ پیدا کرتا ہے۔ ظاہری غصہ ٹھنڈا ہو کر خفیہ حسد جنم لیتا ہے۔ اور گہری دشمنی پیدا ہو جاتی ہے اور اس صورت میں یہ غیظ و غضب جو ظاہری ردعمل ہوتے ہیں' بمقابلہ کینہ اور بغض نسبتاً زیادہ اچھے ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بعد میں فرماتے ہیں کہ غیظ و غضب کے نتیجے میں حسد اور بغض پیدا نہ ہونا چاہئے بلکہ اس کے بعد عفو و درگزر سے کام لینا چاہئے اور غلطیوں کو معاف کر دینا چاہئے۔ غصہ کو اگر دل میں چھپالیا جائے تو اس سے دلوں پر پردے پڑ جاتے ہیں بلکہ دلوں کے اندر کینہ کی آگ سلگنے لگتی ہے۔ انسانی ضمیر دخان آلود ہو جاتا ہے۔ جب انسان دل و جان سے معاف کر دیتا ہے اور درگزر کر دیتا ہے تو یہ پردہ دلوں سے ہٹ جاتا ہے اور انسان کی روح نور کی فضاؤں میں پرواز کرتی ہے۔ دل ٹھنڈک محسوس کرتے ہیں اور انسانی ضمیر کو امن و سکون نصیب ہوتا ہے۔

وَ اللّٰہُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ .... "ایسے نیک لوگ اللہ کو بہت پسند ہیں۔" کیسے نیک لوگ' وہ جو بدحالی اور خوشحالی میں اپنی دولت اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں' وہ نیک ہیں۔ وہ لوگ جو غصہ پی جانے کے بعد لوگوں کو معاف کر دیتے اور درگزر کرتے ہیں وہ نیک لوگ ہیں۔ ایسے لوگوں کو اللہ محبوب رکھتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے لئے لفظ محبت کا استعمال نہایت ہی خوبصورت' دل لگتا اور ضوپاش ہے۔ اور اس شریفانہ اور منور ماحول کے ساتھ خوب ہم آہنگ ہے۔

نیکی اور نیکوکاروں کے ساتھ اس اعلان محبت سے' اہل ایمان کے دلوں میں نیکی کے سرچشمے پھوٹتے ہیں' اور یہ سوتے مومن سے مومن تک منتقل ہوتے چلے جاتے ہیں اور ان دلوں میں نیکی کے لئے جوش و خروش پیدا ہو جاتا ہے۔ غرض یہ صرف پرتاثیر طرز ادا ہی نہیں ہے بلکہ یہ زوردار انداز تعبیر اپنے پیچھے ایک عظیم حقیقت بھی رکھتی ہے۔

وہ جماعت جسے اللہ محبوب رکھتا ہے اور وہ اللہ کو محبوب رکھتی ہے جس کے اندر عفو و درگزر عام ہے۔ جس کے اندر کینہ اور حسد نہیں ہے۔ یہ ایک ایسی جماعت ہے جو ایک دوسرے سے پیوستہ اور وابستہ ہے۔ اس کے افراد بھائی بھائی ہیں۔ یہ قوی اور متین جماعت ہے۔ اس لئے وہ اپنی اندرونی زندگی میں بھی متحد اور یکجا ہے اور میدان کارزار میں بھی بنیان مرصوص ہے۔ اس لئے عفو و درگزر کا یہ مضمون بعنوان کارزار سے بھی ہم آہنگ ہو جاتا ہے۔

اسی مناسبت سے اہل ایمان کی ایک دوسری اہم صفت کو بھی لیا جاتا ہے۔

وَ الَّذِیْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَۃً اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَھُمْ ذَکَرُوا اللّٰہَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِھِمْ ۠ وَ مَنْ یَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰہُ ۠ وَ لَمْ یُصِرُّوْا عَلٰی مَا فَعَلُوْا وَ ھُمْ یَعْلَمُوْنَ

"جن کا حال یہ ہے کہ اگر کوئی فحش کام ان سے سرزد ہو جاتا ہے یا گناہ کا ارتکاب کر کے وہ اپنے اوپر ظلم کر بیٹھتے ہیں تو معاً اللہ انہیں یاد آ جاتا ہے اور اس سے وہ اپنے قصوروں کی معافی چاہتے ہیں ...... کیونکہ اللہ کے سوا اور کون ہے جو گناہ معاف کر سکتا ہو ...... اور وہ دیدہ و دانستہ اپنے کیے پر اصرار نہیں کرتے۔"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی شریعت کس قدر کشادہ دل ہے' اللہ لوگوں کو صرف اس وقت کشادہ دلی اور باہم برداشت کی دعوت دیتا ہے جب وہ خود ان کے ساتھ نہایت ہی فیاضی کا سلوک کرتا ہے اور اس کی انہیں اطلاع بھی دے دیتا ہے' تاکہ وہ اپنے اندر فیاضی کا ذوق پیدا کریں اور نور خدا سے شمع روشن کریں اور اونچے اخلاق سیکھیں۔ متقین اہل ایمان میں سے بلند مرتبت لوگ ہوتے ہیں۔ لیکن یہ دین اسلام کی بے مثال فیاضی ہے کہ یہ دین ان لوگوں کو بھی متقین میں شمار کرتا ہے "جن کا حال یہ ہے کہ اگر ان سے کوئی فحش کام سرزد ہو جاتا ہے یا گناہ کا ارتکاب کر کے وہ اپنے اوپر ظلم کر بیٹھتے ہیں تو معاً اللہ انہیں یاد آ جاتا ہے اور اس سے وہ اپنے قصوروں

کی معافی چاہتے ہیں۔" اور گناہوں میں سے "فحش" کام اسلامی نقطہ نظر سے بد ترین گناہ اور بڑے گناہوں میں سے ہے لیکن یہ اس دین کی کشادہ دلی اور فیاضی ہے کہ وہ فحاشی جیسے گھناؤنے گناہ کے ارتکاب کرنے والے کو بھی راندۂ درگاہ نہیں بناتا۔ اور اس پر رحمت کے دروازے بند نہیں کئے جاتے۔ نہ یہ دین ایسے لوگوں کو دوسرے درجے کے مسلمان قرار دیتا ہے' بلکہ ان کو بھی متقین کے اعلیٰ مرتبے پر فائز کرتا ہے۔ ہاں اس مرتبے پر فائز کرنے کے لئے صرف ایک شرط ان پر عائد کی جاتی ہے اور اس شرط سے بھی اس دین کا مزاج اور اس کا رجحان اچھی طرح معلوم ہوتا ہے۔ وہ شرط یہ ہے کہ ارتکاب معصیت کے بعد معاً" وہ اللہ کو یاد کر لیں اور اپنے گناہوں کی مغفرت مانگ لیں۔ اور یہ کہ وہ اس گناہ پر اصرار نہ کریں حالانکہ وہ جانتے ہوں کہ وہ جو کچھ کر رہے ہیں وہ ایک معصیت ہے۔ اور یہ کہ وہ معصیت میں بے شرمی اور بے باکی کے ساتھ غرق نہ ہو جائیں بالفاظ دیگر وہ اللہ کی بندگی کے دائرے کے اندر رہیں اور آخر کار اس کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہوں۔ یوں وہ اللہ کی پناہ میں رہیں۔ وہ اس کے عفو و درگزر اور فضل و کرم کے دائرے کے اندر ہی رہیں۔

دین اسلام کو معلوم تھا کہ انسان کمزوریوں کا پتلا ہے' بعض اوقات ان بشری کمزوریوں کی وجہ سے اس سے فحاشی کا ارتکاب بھی ہو جاتا ہے۔ بعض اوقات گوشت و پوست کے جسمانی میلانات جوش میں آتے ہیں اور وہ حیوانی تقاضوں کے تحت جسمانی خواہشات اور میلانات کی سطح تک اتر آتا ہے اور اس سے بھی آگے بڑھ کر وہ جسمانی میلانات' خواہشات اور رجحانات کی گرمی اور دباؤ میں اللہ جل شانہ کے احکامات کی خلاف ورزی پر بھی مجبور ہو جاتا ہے۔ دین اسلام انسان کی اس فطری کمزوری کو مد نظر رکھتا ہے' اس لئے اس کے ساتھ سخت رویہ اختیار نہیں کرتا۔ اور جب انسان ان خطاؤں کا ارتکاب کر کے اپنے اوپر ظلم کا ارتکاب کرے تو یہ دین اسے فوراً ہی رحمت خداوندی سے مار نہیں بھگاتا' خصوصاً جبکہ وہ فحاشی کا ارتکاب کرے یا کسی گناہ کبیرہ میں پڑ جائے۔ اس کے دل میں شمع ایمان روشن ہے تو وہ اس کی دستگیری کے لئے کافی ہے۔ اگر اس کے دل میں ایمان کے سوتے خشک نہیں ہوئے اور اس کا رشتہ تعلق باللہ بالکل کٹ نہیں گیا تو اس کے دل میں یہ احساس زندہ رہتا ہے کہ وہ انسان ہے' غلطی کا پتلا ہے اور اس کا رب غفور رحیم ہے۔ اس لئے یہ انسان ضعیف اور خطاکار پر امید رہتا ہے اور بخیر و عافیت رہتا ہے اور اس دنیا میں اس کا سفر بند نہیں ہوتا۔ وہ ایک مضبوط رسی تھامے ہوئے ہوتا ہے اور اس کا سرا اس کے ہاتھ سے چھوٹ نہیں جاتا۔ اس کی انسانی کمزوریاں اسے چاہے جس قدر گرائیں' جب تک شمع ایمان اس کے دل میں روشن ہے' وہ منزل مقصود پا لے گا۔ جب تک وہ اس مضبوط رسی کو تھامے ہوئے ہے وہ راہ راست پر آ ہی جائے گا۔ جب تک وہ خدا کو یاد رکھتا ہے اور اس کے دل میں خوف خدا پایا جاتا ہے' جب تک وہ اپنے گناہوں کی معافی مانگتا ہے اور اللہ کی بندگی کا اقرار کرتا ہے اور اس کی نافرمانی اکڑ کر نہیں کرتا وہ راہ راست پر آسکتا ہے۔

یہ دین اس مخلوق کے لئے توبہ کا دروازہ بند نہیں کرتا اگرچہ یہ ضعیف مخلوق وقتی طور پر گمراہی کے گڑھے میں کیوں نہ گر جائے۔ یہ دین اس خطاؤں کے پتلے انسان کو کسی غیر آباد صحراء میں بے یار و مددگار نہیں چھوڑتا۔ وہ اسے اپنے انجام کے بارے میں مایوس و پریشان بھی نہیں چھوڑتا۔ اسے ہر وقت مغفرت کی امید دلائی جاتی ہے۔ اس کی راہنمائی کی جاتی ہے۔ اس کے کانپتے ہاتھوں کو ہاتھ میں لیا جاتا ہے۔ اس کے ڈگمگاتے قدم مستحکم اور ثابت ہو جاتے ہیں۔ اسے شمع امید عطا کی جاتی جس میں وہ اپنی راہ پا لیتا ہے اور یوں وہ محفوظ اور مامون جائے قرار تک پہنچ جاتا ہے۔ اور پرامن سرحد میں داخل ہو جاتا ہے۔

اس دین کا مطالبہ اس انسان سے صرف ایک ہے۔ وہ یہ کہ اس کے قلب سے ایمان کے سوتے خشک نہ ہو گئے ہوں۔ اس کی روحانی دنیا تاریک نہ ہو گئی ہو اور اس نے اپنے خالق حقیقی کو بھلا نہ دیا ہو۔ وہ اللہ کو یاد کر رہا ہو اور اس کی روح میں وہ راہنما مینار نور موجود ہو اور اس کے دل میں اس کے ضمیر کی آواز حدی خواں ہو اور اس کی زمین دل میں ایمان کا نم باقی ہو تو امید کی جاسکتی ہے کہ اس

کے دل میں شمع ایمان دوبارہ روشن ہو' امید کی جاسکتی ہے کہ وہ دوبارہ امن و سکون کے خطیرہ میں لوٹ آئے اور امید کی جاسکتی ہے کہ اس کے کشت زار دل میں دوبارہ ایمان کی تخم ریزی ہو سکے۔

ایک واضح مثال آپ کو بھی درپیش ہوئی ہوگی۔ تمہارا خطاکار بچہ اگر یہ یقین رکھتا ہو کہ جس غلطی کا ارتکاب اس سے ہو چکا ہے اس پر اب گھر میں ڈنڈے کے سوا اور کچھ نہیں ہے تو وہ پیچھے نہیں دیکھے گا اور بھاگتا ہی رہے گا اور مزید بے راہ روی اختیار کرے گا۔ اور کبھی گھر کو واپس نہ آئے گا۔ لیکن اگر ڈنڈے کے ساتھ ساتھ گھر میں اس کے سر پر پھرنے والا پر شفقت ہاتھ بھی ہو جو معذرت پر اس کی اس کمزوری سے صرف نظر کرتا ہو اور اسے تھپکی دیتا ہو اور جب وہ معافی مانگے تو اس کی معافی قبول ہوتی ہو تو اس صورت میں اس بات کا امکان ہے کہ وہ واپس گھر آجائے۔

اسلام اس ضعیف اور خطاکار انسان کے ساتھ ایسا ہی رویہ اختیار کرتا ہے۔ خالق کو معلوم ہے کہ انسان کی شخصیت میں اگر ایک طرف ضعف اور کمزوری ہے تو دوسری جانب اس میں کچھ صلاحیت بھی ہے۔ ایک جانب اگر اس پر مادیت کا بوجھ لدا ہوا ہے تو دوسری جانب اس کے اندر روحانیت کی سبک رفتاری بھی ہے۔ ایک طرف اس کی ذات میں اگر نفوس حیوانی کے میلانات ہیں تو دوسری جانب اس کے اندر ربانی رجحانات بھی ودیعت کئے گئے ہیں۔ اس لئے جب بھی وہ حیوانی گندگیوں میں مبتلا ہو کر نیچے گرتا ہے تو دست قدرت اس کی دستگیری کرتا ہے اور اسے اوپر کی طرف اٹھاتا ہے اور پھسلنے پر اس کو تھپکی دے کر دوبارہ اسے کھڑا کرتا ہے کہ وہ راہ راست پر رواں ہو' بشرطیکہ اس کے دل میں خدا کی یاد ہو اور وہ اپنے خالق کو بالکل بھول نہ چکا ہو۔ اور وہ جان بوجھ کر غلطی پر اڑ نہ جائے۔ رسول خدا ﷺ فرماتے ہیں کہ "جو شخص استغفار کرے تو یہ سمجھا جائے گا کہ وہ غلطی پر مصر نہیں ہے اگرچہ وہ دن میں ستر مرتبہ ایسا کرے۔"[۱]

ہاں توبہ کا دروازہ کھلا رکھ کر اسلام بہرحال بے راہ روی میں لوگوں کو آزاد نہیں چھوڑتا۔ اور نہ غلط کار اور گمراہیوں کے گڑھے میں گرنے والوں کو قابل تعریف سمجھتا ہے۔ اور نہ اس گندگی کو حسن سے تعبیر کرتا ہے' جس طرح نام نہاد "واقعیت پسندی" کے پیرو کار کرتے ہیں' ہاں اسلام صرف لغزش اور انسان کی فطری کمزوریوں کو تسلیم کرتا ہے تاکہ انسان کے اندر مایوسی پیدا نہ ہو اور شمع امید روشن رہے۔ اس طرح اسلام شرم و حیاء کے انفعالات کی حوصلہ افزائی کرتا ہے اور انسانی کوتاہیوں پر اللہ کی جانب سے مغفرت ہوتی ہے۔ اس لئے کہ اللہ کے سوا اور کون ہے جو مغفرت کر سکے۔ اسلام گناہ کی حوصلہ افزائی نہیں کرتا البتہ اگر کوئی شرمندہ ہوتا ہے تو اس کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ وہ استغفار کے لئے تو آمادہ کرتا ہے لیکن وہ گناہوں کے ارتکاب میں لاپرواہی کی اجازت بھی نہیں دیتا۔ نہ مسلسل خطاکاری کرنے اور اسے شعار بنانے کی اجازت دیتا ہے' اس لئے کہ جو لوگ ارتکاب جرم کو اہمیت ہی نہیں دیتے اور مسلسل گناہ پر گناہ کئے جا رہے ہیں تو وہ حدود سے نکل گئے ہیں۔ ان کے سامنے دیواریں حائل ہو گئی ہیں۔

یوں اسلام' اس انسانیت کو پکارتا ہے کہ وہ بلند افق کو نصب العین بنائے' لیکن اس دعوت و پکار کے ساتھ اس پر رحمت اور شفقت کے لئے بھی ہر وقت تیار رہتا ہے۔ اس لئے کہ اسلام کو یہ اچھی طرح معلوم ہے کہ انسان کی طاقت کی حدود کیا ہیں۔ اس لئے اسلام' انسان کے لئے' امید کا دروازہ ہمیشہ کھلا رکھتا ہے۔ اور انسان کی طاقت جہاں تک ساتھ دیتی ہے وہ اسے آگے بڑھاتا ہے۔[۲]

اس کے بعد ان متقین کے انجام کا یہاں تذکرہ کیا جاتا ہے۔

۱۔ روایت ابوداؤد' ترمذی اور بزاز۔ اس نے اپنی سند میں عثمان ابن واقد کی روایت سے نقل کیا ہے۔ اگرچہ اس کی سند میں ایک نامعلوم صحابی ہیں لیکن ابن کثیر نے اسے صحیح قرار دیا ہے اور کہا ہے "حدیث حسن"

۲۔ تفصیلات کے لئے دیکھئے میری کتاب "اسلام اور عالمی سلامتی" کی فصل "ضمیر کی سلامتی"

أُولَٰئِكَ جَزَآؤُهُم مَّغْفِرَةٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَجَنَّٰتٌ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَٰرُ خَٰلِدِينَ فِيهَا ۚ وَنِعْمَ أَجْرُ الْعَٰمِلِينَ

"ایسے لوگوں کی جزاء ان کے رب کے پاس یہ ہے کہ وہ ان کو معاف کر دے گا اور ایسے باغوں میں انہیں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور وہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ کیسا اچھا بدلہ ہے نیک عمل کرنے والوں کے لئے۔"

ارتکاب معصیت سے استغفار کر کے وہ محض منفی کام نہیں کر رہے' اور نہ وہ خوشحالی اور بدحالی میں انفاق کر کے محض منفی کام کر رہے ہیں یا غصہ پی کر اور لوگوں سے عفو و درگزر کر کے وہ محض منفی کام کر رہے ہیں' بلکہ وہ مثبت کام بھی کرتے ہیں اور نیک عمل کرنے والے ہیں' اس لئے ان کے لئے ان کے رب کی طرف سے مغفرت ہے اور وہ ایسے باغات میں رہیں گے جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہوں گی اور مغفرت کے بعد ان کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے محبت کا اعزاز بھی حاصل ہو گا۔ یہاں ان کے نفس کی گہرائیوں میں بھی عمل ہے اور ظاہری زندگی میں بھی عمل ہے۔ دونوں عمل ہیں' دونوں میں حرکت ہے اور دونوں میں ترقی ہے۔

یہ تمام صفات جن کا یہاں ذکر ہو رہا ہے اور سیاق کلام میں آگے جس معرکہ کارزار کا ذکر ہونے والا ہے' ان دونوں کے درمیان ایک خاص مناسبت ہے۔ جس طرح سودی معیشت یا باہمی تعاون کے اسلامی نظام معیشت کا تعلق میدان جہاد کے معرکے سے تھا اور اسلامی جماعت کے شب و روز اس سے متاثر ہوئے تھے' اسی طرح ان نفسیاتی خصوصیات اور اجتماعی اوصاف کے اثرات بھی جماعت مسلمہ پر پڑتے تھے۔ ہم نے اس موضوع پر بات کا آغاز کرتے وقت اس طرف اشارہ کیا ہے۔ مثلاً کنجوسی پر فتح یاب ہونا' غصے پر قابو پانا' ارتکاب معصیت کے مقابلے میں ضبط کرنا' اللہ کی طرف رجوع کرنا' اس کی جانب سے مغفرت کا طلبگار ہونا اور اس کی رضامندی کو نصب العین بنالینا ایسی فتوحات ہیں جو معرکہ کارزار میں دشمن پر فتح حاصل کرنے کے لئے اشد ضروری ہیں۔ یہ لوگ دشمنان اسلام اس لئے تو تھے کیونکہ وہ بخل کے نمائندے تھے۔ وہ اپنی خواہشات نفس کے پیروکار تھے' وہ خطاکار اور بے حیا تھے اور وہ اسلام کے دشمن اس لئے تھے کہ وہ اپنی ذات' اپنی خواہشات اور اپنے نظام زندگی میں اللہ تعالیٰ کے احکام' اس کی شریعت اور اس کے پسندیدہ نظام زندگی کے تابع نہ تھے۔ یہی تو ان کے ساتھ عداوت کی وجہ تھی اور یہی تو میدان کشمکش تھا۔ اور اسی وجہ سے ان کے خلاف جہاد شروع کیا گیا تھا۔ ان اسباب کے علاوہ مسلمانوں کی معرکہ آرائی اور عمل جہاد کے کوئی اسباب نہ تھے اور نہ اب ہیں۔ ایک مسلم کی عداوت بھی اللہ کے لئے ہے' اس کی معرکہ آرائی بھی فی سبیل اللہ ہے' اس کا جہاد بھی اللہ کے لئے ہے' اس لئے درج بالا تمام ہدایات اور ان کے بعد آنے والے معرکہ کارزار کے بیان کے درمیان مکمل مناسبت ہے۔ نیز ان باتوں کا ان حالات سے بھی تعلق تھا جن میں یہ معرکہ درپیش ہوا۔ مثلاً یہ کہ رسول ؐ اللہ کی حکم عدولی' مال غنیمت جمع کرنے کا لالچ' اور اس کی وجہ سے حضور کی واضح ہدایات کو نظر انداز کرنا۔ عبداللہ ابن ابی اور اس کے ساتھیوں کی جانب سے محض انا کی خاطر لشکر اسلام سے علیحدہ ہو جانا۔ اور جیسا کہ سیاق کلام میں یہ بات واضح ہو گی کہ بعض لوگوں نے بڑی بڑی غلطیوں کا ارتکاب کیا۔ نیز ان لوگوں کے نظریات اور تصورات میں بھی جھول اس لئے تھی کہ وہ ہر امر کو اللہ اور رسول کی طرف نہ لوٹاتے تھے اور بعض لوگ مایوس ہو کر یہ سوالات کرتے تھے کہ آیا ہماری اس تحریک کا کوئی نتیجہ برآمد ہو گا؟ اور بعض لوگوں کے یہ خیالات کہ ہماری کوئی حیثیت ہوتی تو ہم یہاں یوں نہ مارے جاتے وغیرہ۔

قرآن کریم ان تمام حالات سے بحث کرتا ہے۔ ایک ایک کر کے' بعض امور کی وضاحت کی جاتی ہے' بعض امور کے بارے میں وہ آخری فیصلے کر دیتا ہے۔ ان حقائق کے بارے وہ نفس انسانی کو چٹکی بھر کر جگاتا ہے' اس کے اندر جوش پیدا کرتا ہے' درست تعلق کو نہایت

انسانی کے اندر زندہ کر دیتا ہے۔ اور یہ کام قرآن کریم اپنے منفرد طریقہ کار کے مطابق کرتا ہے جس کے نمونے سیاق کلام کے اندر جا بجا ملیں گے۔

○......☆......○

غرض اس مضمون کے تیسرے فقرے میں اب معرکہ کے واقعات کا آغاز ہو جاتا ہے لیکن ان واقعات کے اندر بھی اسلامی تصور حیات کے بنیادی حقائق ذہن نشین کرائے گئے ہیں۔ رہے واقعات معرکہ تو انہیں محض محور اور مدار کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے اور یہ حقائق ان واقعات کے اردگرد گھومتے ہیں۔

اس پیراگراف کے آغاز میں اس طرف اشارہ کیا جاتا ہے کہ اس کائنات میں اللہ تعالیٰ کی ایک سنت جاریہ ہے اور اس سنت کا تعلق ان اقوام سے ہے جو حق کو جھٹلاتی ہیں۔ اس اصول اور سنت کے ذکر کا مقصد یہ بات مسلمانوں کے گوش گزار کرنا ہے کہ اس معرکے میں انہیں جو شکست ہو گئی ہے یہ ایک عارضی بات ہے اور یہ اس کائنات میں اللہ کی مستقل سنت نہیں ہے۔ یہ عارضی شکست بھی ایک خاص حکمت پر مبنی تھی۔ اس کے بعد انہیں تلقین کی جاتی ہے کہ وہ صبر سے کام لیں اور اس سرزمین پر بذریعہ قوت ایمان اپنے آپ کو سربلند رکھیں۔ اگر اس معرکے میں انہیں شکست ہوئی ہے اور انہوں نے زخم کھائے ہیں تو اس سے قبل ایسے معرکے میں اہل شرک نے زخم کھائے تھے اور انہیں شکست ہوئی تھی لیکن اس میں بھی اللہ تعالیٰ کی گہری حکمت کارفرما تھی اور جس کا بیان ان کے سامنے کھل کر آ جائے گا۔ یہ حکمت کہ اہل اسلام کی صفوں میں سے کھوٹے لوگوں کو علیحدہ کر دیا جائے' ان کے دلوں سے کھوٹ نکال دیا جائے' اور شہداء اسلام کی ایک ایسی مثال تیار کی جائے جو اپنے نظریہ حیات کے لئے جان دینے والے ہوں اور مسلمان موت کا مقابلہ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کریں۔ جبکہ اس سے قبل وہ راہ حق میں تمنائے موت اپنے دلوں میں لئے ہوئے تھے تاکہ وہ اپنے وعدوں اور اپنی آرزوؤں کو حقیقت کے ترازو میں تول کر دیکھیں۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ کفر کو صفحہ ہستی سے مٹا دیں اور کافروں کے مقابلے میں ایک منظم اسلامی جماعت کو مضبوط بنیادوں پر استوار کریں۔ چنانچہ ان پورے واقعات کی تہہ میں ایک بلند حکمت پوشیدہ تھی چاہے یہ واقعات فتح ہوں یا حادثات شکست ہوں۔ فرماتے ہیں

قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ فَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِينَ ﴿١٣٧﴾ هَٰذَا بَيَانٌ لِلنَّاسِ وَهُدًى وَمَوْعِظَةٌ لِلْمُتَّقِينَ ﴿١٣٨﴾ وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنْتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ﴿١٣٩﴾ إِنْ يَمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِثْلُهُ ۚ وَتِلْكَ الْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَيَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَاءَ ۗ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الظَّالِمِينَ ﴿١٤٠﴾ وَلِيُمَحِّصَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَيَمْحَقَ الْكَافِرِينَ ﴿١٤١﴾ أَمْ حَسِبْتُمْ أَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللَّهُ الَّذِينَ

جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَ يَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۴۲﴾ وَ لَقَدْ كُنْتُمْ تَمَنَّوْنَ الْمَوْتَ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَلْقَوْهُ ۠ فَقَدْ رَاَيْتُمُوْهُ وَ اَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ﴿۱۴۳﴾

۱۴
ع ۱۴
۵

"تم سے پہلے بہت سے دور گزر چکے ہیں' زمین میں چل پھر کر دیکھ لو کہ ان لوگوں کا کیا انجام ہوا' جنھوں نے (اللہ کے احکام و ہدایات کو) جھٹلایا۔ یہ لوگوں کے لئے ایک صاف اور صریح تنبیہ ہے اور جو اللہ سے ڈرتے ہوں ان کے لئے ہدایت اور نصیحت...... دل شکستہ نہ ہو' غم نہ کرو' تم ہی غالب رہو گے اگر تم مومن ہو۔ اس وقت اگر تمہیں چوٹ لگی ہے تو اس سے پہلے ایسی ہی چوٹ تمہارے مخالف فریق کو بھی لگ چکی ہے۔ یہ تو زمانہ کے نشیب و فراز ہیں جنہیں ہم لوگوں کے درمیان گردش دیتے رہتے ہیں۔ تم پر یہ وقت اس لئے لایا گیا ہے کہ اللہ دیکھنا چاہتا تھا کہ تم میں سچے مومن کون ہیں' ان لوگوں کو چھانٹ لینا چاہتا تھا جو واقعی راستی کا گواہ ہوں...... کیونکہ ظالم لوگ اللہ کو پسند نہیں...... اور وہ اس آزمائش کے ذریعہ مومنوں کو الگ چھانٹ کر کافروں کی سرکوبی کر دینا چاہتا تھا۔ کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ یونہی جنت میں چلے جاؤ گے حالانکہ ابھی اللہ نے یہ تو دیکھا ہی نہیں کہ تم میں کون وہ لوگ ہیں جو اس کی راہ میں جانیں لڑانے والے اور اس کی خاطر صبر کرنے والے ہیں۔ تم موت کی تمنا کر رہے تھے' مگر یہ اس وقت کی بات تھی جب موت سامنے نہ آئی تھی' لو اب وہ تمہارے سامنے آگئی ہے اور تم نے اسے آنکھوں سے دیکھ لیا۔"

اس غزوہ میں مسلمانوں نے سخت چوٹ کھائی تھی۔ وہ ایک بڑی تعداد میں قتل ہوئے تھے اور انہیں ہزیمت اٹھانی پڑی تھی۔ انہیں عظیم روحانی اور جسمانی اذیت سے دوچار ہونا پڑا تھا۔ ان میں سے ستر صحابی قتل ہو گئے تھے' رسول کریم ؐ کے دانت مبارک شہید ہو گئے تھے۔ آپ ؐ کا چہرۂ مبارک زخمی ہوا تھا۔ آپ ؐ کو مشرکین نے گھیرے میں لے کر تنگ کیا اور صحابہ کرام کو گہرے زخم آئے۔ اس شکست کی وجہ سے اہل اسلام سخت جھنجھوڑ دیئے گئے۔ اس لئے کہ یہ ایک ایسا صدمہ تھا جو جنگ بدر کی عجیب فتح کے بعد شاید بالکل ہی غیر متوقع تھا۔ یہاں تک کہ جب اہل اسلام کو یہ حادثہ پیش آیا تو وہ بے ساختہ کہنے لگے' یہ سب کچھ کیسے ہوا' ہم مسلمان ہوتے ہوئے بھی ایسے حالات سے دوچار ہو سکتے ہیں؟

یہاں قرآن کریم اہل ایمان کو اس کرۂ ارض پر سنت الٰہی کی طرف متوجہ کرتا ہے' یہاں انہیں وہ اصول یاد دلایا جاتا ہے جس کے مطابق اس کرۂ ارض پر واقعات کے فیصلے ہوتے ہیں۔ یہ واقعات بالکل انوکھے نہیں ہیں۔ اس لئے کہ اس کائنات میں انسانی زندگی کے لئے جو نوامیس فطرت وضع کئے گئے ہیں' یہاں زندگی ان کے مطابق چل رہی ہے۔ ان سے تخلف بالکل ممکن نہیں ہے اور نہ یہاں واقعات اتفاقیہ بغیر کسی اصول کے وقوع پذیر ہوتے ہیں جبکہ یہ واقعات نوامیس فطرت کے عین مطابق ہوتے ہیں' اگر وہ ان نوامیس فطرت کو پڑھیں' ان کے مغز تک پہنچیں تو انہیں بآسانی وہ حکمت معلوم ہو جائے گی جو ان واقعات کے پشت پر تھی' اور پھر انہیں وہ مقاصد بھی واشگاف طور پر نظر آجائیں جو ان واقعات کی تہہ میں پنہاں تھے۔ انہیں اچھی طرح معلوم ہو جائے کہ وہ نظام کس قدر پختہ ہے جس کے مطابق یہ واقعات واحداث ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ نیز ان کی تہہ میں جو حکمت پوشیدہ تھی اس کے بارے میں بھی انہیں اچھی طرح اطمینان ہو جائے اور وہ اچھی طرح معلوم کر لیں کہ گزشتہ واقعات کی روشنی میں ان کے لئے آئندہ لائن کیا ہے۔ اب اس روشنی کے آجانے کے بعد وہ یہ توقع کریں گے کہ چونکہ وہ مسلمان ہیں اس لئے واقعات ایسے ہونے چاہئیں اور انہیں فتح اور نصرت حاصل ہونی چاہئے۔ بغیر اس کے کہ وہ فتح و نصرت کا سامان مہیا کریں' جن میں سے پہلا سبب اللہ اور رسول اللہ کی اطاعت امر ہے۔

وہ سنت اللہیہ کیا ہے جس کی طرف سیاق کلام انہیں یہاں متوجہ کر رہا ہے؟ وہ ان لوگوں کا انجام ہے جنہوں نے پوری انسانی تاریخ میں حق کو جھٹلایا ہے اور یہ کہ دنیا میں لوگوں کے شب و روز بدلتے رہتے ہیں۔ لوگوں کو آزمائش میں ڈالا جاتا ہے تاکہ ان کی روح خالص ہو جائے۔ ان کی قوت صبر کو آزمایا جاتا ہے اور یہ آزمائش مصائب و شدائد کے پہاڑ توڑ کر کی جاتی ہے۔ اور یہ کہ جو لوگ صبر سے کام لیتے ہیں آخر کار انہیں فتح نصیب ہوتی ہے اور جو لوگ کفر کا رویہ اختیار کرتے ہیں انہیں صفحہ ہستی سے مٹایا جاتا ہے۔

ان آیات میں سنن اللہیہ کے بیان کے درمیان اہل ایمان کو آمادہ کیا جاتا ہے کہ وہ مشکلات کو انگیز کریں' شدید حالات میں ایک دوسرے کے غم خوار ہوں اور انہیں جو چوٹ لگی ہے' اس پر صبر کریں' اس لئے کہ یہ چوٹ صرف انہیں نہیں آئی بلکہ ان دشمنوں نے بھی تو ان کے برابر چوٹ کھائی حالانکہ مومنین ان کے مقابلے میں بلند نظریات کے حاملین ہیں۔ وہ ان کے مقابلے میں راہ ہدایت پر ہیں اور ان کے مقابلے میں ان کا نظام زندگی زیادہ بہتر ہے۔ اور ان مشکلات کے بعد انجام کار فتح و کامرانی بھی اہل ایمان کو نصیب ہونے والی ہے۔

قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ فَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِينَ ﴿١٣٧﴾ هَٰذَا بَيَانٌ لِلنَّاسِ وَهُدًى وَمَوْعِظَةٌ لِلْمُتَّقِينَ

"تم سے پہلے بہت سے دور گزر چکے ہیں' زمین میں چل پھر کر دیکھ لو کہ ان لوگوں کا کیا انجام ہوا جنہوں نے (اللہ کے احکام و ہدایات کو) جھٹلایا۔ یہ لوگوں کے لئے ایک صاف اور صریح تنبیہ ہے اور جو اللہ سے ڈرتے ہوں ان کے لئے ہدایت و نصیحت۔"

قرآن کریم کا انداز یہ ہے کہ وہ انسانیت کے حاضر کو اس کے ماضی سے مربوط کر دیتا ہے اور ماضی کو حاضر کے ساتھ جوڑ دیتا ہے۔ اور ماضی اور حال کو باہم مربوط کر کے انسانیت کے مستقبل کی فکر کرتا ہے۔ عرب معاشرہ جو قرآن کے مخاطبین اول تھے ان کی زندگی کوئی زندگی نہ تھی' ان کے ہاں کوئی علمی ذخیرہ نہ تھا اور اسلام سے پہلے ان کے ہاں سرمایہ تجربات بھی نہ تھا' تاکہ تحریک اسلامی ان کے سامنے خود ان کے ذخیرۂ ثقافت سے کوئی مکمل نمونہ پیش کرتا۔ یہ تو اسلام اور اسلام کی کتاب قرآن تھی جس نے یہ کارنامہ انجام دیا کہ اس نے عربوں کو حیات جدید سے نوازا اور ان کو ایک ایسی امت کی شکل دی جس نے ادوار مابعد میں پوری دنیا کی قیادت کی۔

وہ قبائلی نظام معاشرت جس کے سایہ میں عرب زندگی گزار رہے تھے' یہ اس قابل ہی نہ تھا کہ وہ ان کی فکر کو اس قدر وسعت دے دیتا کہ وہ جزیرۃ العرب کی زندگی کے واقعات کو کوئی منطقی ربط دے دیتے چہ جائیکہ وہ اس کرۂ ارض میں بسنے والی تمام انسانیت اور اس کے حادثات اور واقعات کے درمیان کوئی منطقی ربط تلاش کر سکتے اور پورے کرۂ ارض کے اندر پیش آنے والے عالمی واقعات اور اس کائنات کے اندر جاری نوامیس فطرت اور ان کے مطابق جاری و ساری انسانی زندگی کے اندر ربط کی تلاش کے بارے میں تو وہ سوچ بھی نہ سکتے تھے۔

قرآن کریم اور اسلام کے نتیجے میں عربوں کے اندر جو علمی اور ثقافتی انقلاب رونما ہوا' وہ ایک دور رس انقلاب ہے' یہ کوئی ایسا انقلاب نہ تھا کہ کسی معاشرے کے اندر تدریج کے ساتھ علمی و ثقافتی ترقی کی وجہ سے رونما ہوا اور نہ یہ انقلاب اس وقت کی رائج اور چلتی ہوئی زندگی کے تقاضوں اور صلاحیتوں کی وجہ سے رونما ہوا۔ بلکہ یہ عظیم انقلاب خالص اسلامی نظریۂ حیات کے نتیجے میں رونما ہوا بلکہ یہ عقیدہ ان کے لئے یہ تحفہ لایا اور انہیں اٹھا کر اسلامی نظریۂ حیات کی سطح تک بلند کیا۔ اور یہ سب کام اس نظریۂ حیات نے صرف ربع صدی کے قلیل عرصہ میں سرانجام دیا۔ جبکہ عربوں کے اردگرد بسنے والی ترقی یافتہ اور علمی سرمایہ سے مسلح اقوام افکار عالیہ کے اس مقام تک صدیوں بعد پہنچ پائیں اور کئی نسلیں گزرنے کے بعد ان اقوام نے معلوم کیا کہ اس کائنات کے اندر کچھ قوانین فطرت عمل پیرا ہیں اور یہ

ان اٹل فطری نوامیس کے تحت چل رہی ہے اور جب انہوں نے ان قوانین قدرت اور نوامیس فطرت کو دریافت کر لیا تو وہ اس حقیقت تک پھر بھی نہ پہنچ سکیں کہ ان اٹل قوانین کے اوپر ایک اٹل مشیت الٰہیہ بھی ہے جو ان قوانین فطرت کی قید میں بھی مقید نہیں ہے۔ اور قوانین فطرت کے بعد بھی تمام امور کے اندر اختیار اللہ تعالیٰ کا ہے۔ رہی امت مسلمہ تو اس نے روز اول سے اس کا یقین حاصل کر لیا تھا۔ اس کائنات کے بارے میں اس کا تصور بہت وسیع ہو گیا تھا اور اس کے احساس اور شعور کے اندر ان قوانین فطرت کے ثبات اور اللہ تعالیٰ کی بے قید مشیت کے اندر ایک توازن قائم ہو چکا تھا۔ اس لئے اس کی عملی زندگی تو قوانین فطرت کے اٹل اصولوں پر قائم تھی لیکن اس کے بعد اسے یہ اطمینان بھی حاصل تھا کہ اللہ تعالیٰ کی مشیت بھی بے قید ہے۔ فرماتے ہیں:

قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ .... "تم سے پہلے بہت سے دور گزر چکے ہیں" ان ادوار میں نوامیس فطرت زندگی پر حکمران تھے۔ اور یہ نوامیس فطرت اللہ کی بے قید مشیت نے جاری کئے تھے۔ اگر تمہارے دور سے پہلے کچھ واقعات ان نوامیس فطرت کے مطابق رونما ہوئے تو تمہارے دور میں بھی ایسے ہی واقعات رونما ہوں گے۔ اس لئے امم سابقہ کی تاریخ میں تمہاری جیسی صورت حال سے جو اقوام دوچار تھیں اور ان کے سامنے کچھ حقائق رونما ہوئے تو ایسے ہی نتائج کے لئے تم بھی تیار رہو۔

فَسِيْرُوْا فِي الْأَرْضِ .... "زمین میں چل پھر کر دیکھ لو" اس لئے کہ پورا کرۂ ارض ایک سیارہ ہے۔ اس سیارے میں انسانی زندگی رواں دواں ہے۔ یہ کرۂ ارض اور اس کے اندر انسانی زندگی ایک کھلی کتاب ہے۔ بصارت اور بصیرت دونوں کے لئے اس میں وافر سامان عبرت موجود ہے۔

فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ .... "دیکھ لو کہ ان لوگوں کا کیا انجام ہوا جنہوں نے (اللہ کے احکام و ہدایات کو) جھٹلایا۔" یہ وہ انجام ہے جس کے آثار کرۂ ارض پر ہر جگہ قابل مشاہدہ ہیں۔ نیز ان کی تاریخ میں وہ آثار و شواہد بعد میں آنے والوں نے ریکارڈ کر دیئے ہیں۔ قرآن کریم نے ان سنن و سیر کی ایک بڑی تعداد کو اپنے ہاں نقل کیا ہے۔ قرآن کریم کے متعدد مقامات پر ان کا ذکر ہے اور بعض جگہ واقعات کی جگہ' ان کا زمانہ اور واقعات کے اشخاص اور کرداروں کا تذکرہ بھی تفصیل سے کیا ہے۔ جبکہ بعض جگہ صرف اشارات سے کام لیا گیا ہے اور زمان و مکان کو چھوڑ دیا گیا ہے۔ مجملاً" واقعہ بیان ہوا ہے۔ یہاں بھی ایک اجمالی اشارہ اس انسانی تاریخ کی طرف کیا گیا ہے اور اس سے ایک مجمل اور مجرد نتیجہ نکالا گیا ہے' وہ یہ کہ پیغمبروں کی تکذیب کرنے والوں کا جو انجام کل ہوا تھا وہی انجام آج بھی مکذبین کے لئے طے ہو چکا ہے۔ اور کل بھی ان کا یہی انجام ہو گا۔ یہ اشارہ اس لئے کیا گیا ہے کہ جماعت مسلمہ اپنے انجام کے بارے میں مطمئن اور یکسو ہو جائے اور اس بات سے متنبہ ہو جائے کہ وہ مکذبین کے ساتھ پھسل نہ جائے۔ اس لئے کہ اس وقت ایسے حالات موجود تھے جن میں اس یقین دہانی کی ضرورت تھی نیز ایسے حالات بھی موجود تھے جن میں مسلمانوں کو لغزش کھانے سے ہوشیار کرنے کی ضرورت تھی۔ اور آنے والے سیاق کلام میں ان حالات پر تفصیلاً روشنی ڈالی گئی ہے۔

نوامیس فطرت اور انسانی تاریخ میں سنت الٰہیہ کی طرف اشارے کے بعد لوگوں کو پکارا جاتا ہے کہ وہ انسانی تاریخ کے ان واقعات سے عبرت اور نصیحت حاصل کریں۔ هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَهُدًى وَّمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ .... "یہ لوگوں کے لئے ایک صرف اور صریح تنبیہ ہے۔ جو اللہ سے ڈرتے ہوں ان کے لئے ہدایت و نصیحت۔" یہ تمام انسانوں کے لئے ایک بیان ہے۔ پس یہ انسانیت کے لئے ایک دور رس انقلاب ہے اور لوگ اس انقلاب سے اس وقت تک بہرور نہیں ہو سکتے جب تک یہ بیان نہ کیا جائے۔ لیکن اس بیان سے استفادہ صرف ایک خاص گروہ ہی کر سکے گا۔ صرف یہی لوگ عبرت و نصیحت حاصل کر سکیں گے۔ صرف یہی لوگ بہرور ہوں گے۔ کون المتقون۔

یہ حقیقت ہے کہ کلمہ ہدایت کو شرف قبولیت صرف دل مومن بخشتا ہے۔ اس لئے کہ وہ ہدایت کے لئے ہر وقت کھلا ہوتا ہے اور فصیح و بلیغ نصیحت سے استفادہ متقی دل ہی کر سکتا ہے' جو ہر وقت کلمہ ہدایت سنتے ہی دھڑکنے لگتا ہے اور قبولیت کے لئے آمادہ ہوتا ہے۔ کم ہی ایسا ہوتا ہے کہ صرف حق و باطل کا علم کسی کو فائدہ دے یا ہدایت و ضلالت کا صرف علم مفید ہو۔ سچائی اپنی فطرت کے اعتبار سے اس قدر واضح ہوتی ہے کہ اس کے لئے وہ کسی طویل کلام و بیان کی محتاج ہی نہیں ہوتی۔ دراصل جس چیز کی کمی ہوتی ہے وہ قبول حق کا داعیہ ہوتا ہے اور لوگوں کو حق کے قبول کرنے کا راستہ معلوم نہیں ہوتا۔ سچائی کی رغبت اور اس کے قبول کرنے کے راستے صرف اس صورت میں مل سکتے ہیں جب کوئی دل ایمان و یقین سے بھر جائے اور ایمان اس وقت محفوظ رہتا ہے جب اس کی پشت پر تقویٰ اور خدا خوفی موجود ہو۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم میں بار بار اس قسم کی تاکیدیں کی گئی ہیں کہ اس کتاب میں جو سچائی' جو ہدایت' جو روشنی' جو وعظ اور جو عبرت آموز باتیں بیان کی گئی ہیں وہ مومنین اور متقین ہی کے مفید مطلب ہیں۔ اس لئے کہ ایمان اور تقویٰ ہی دل کے دریچے ہدایت' روشنی اور عبرت و نصیحت کے لئے کھول دیتے ہیں۔ صرف ایمان و تقویٰ کے بل بوتے پر ہی ایک انسان راہ حق کی تکالیف برداشت کر سکتا ہے۔

یہ اصلی بات ہے اور اس مسئلے کی یہی حقیقت ہے۔ صرف علم اور معلومات کے ساتھ مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ کئی ایسے لوگ دیکھے جا سکتے ہیں کہ وہ حق کے علم و معرفت کی ایک بڑی تعداد رکھتے ہوئے بھی باطل کے پرستار ہوتے ہیں اور اس میں گم گشتہ ہوتے ہیں۔ محض اس لئے کہ ان کی نفسانی خواہشات ان پر قابو پائے ہوئے ہوتی ہیں جن کے مقابلے میں علم و معرفت بے بس ہوتی ہے اور یا اس لئے کہ وہ ان مشکلات کو دیکھ کر گھبرا جاتے ہیں جو حاملین حق اور داعیان حق کا ہمیشہ استقبال کرتی ہیں۔

اس کے بعد روئے سخن مسلمانوں کی طرف پھر جاتا ہے۔ ان کی دلجوئی کی جاتی ہے' تسلی دی جاتی ہے اور ثابت قدمی کی تلقین کی جاتی ہے۔ وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ .... "دل شکستہ نہ ہو' غم نہ کرو' تم ہی غالب رہو گے' اگر تم مومن ہو۔"

وَلَا تَهِنُوْا ...... یہ لفظ وھن سے نکلا ہے' جس کے معنی ضعیفی کے ہیں اور غم نہ کرو' یعنی ان مصائب پر جو تمہیں پیش آرہے ہیں یا ان مفادات کے لئے جو تم سے چھوٹ گئے۔ تم غالب اور برتر ہو' اس لئے کہ تمہارا نظریۂ حیات برتر ہے۔ تم صرف اللہ وحدہ کے سامنے سجدہ ریز ہوتے ہو اور وہ لوگ اللہ کی مخلوقات میں سے کسی مخلوق کے سامنے جھکتے ہیں یا کسی چیز کو اللہ کے ساتھ شریک کر کے اس کے سامنے جھکتے ہیں۔ اور تمہارا نظام حیات ان کے نظام حیات کے مقابلے میں افضل و برتر ہے۔ تم اس نظام کے مطابق زندگی بسر کر رہے ہو جسے اللہ نے بنایا ہے۔ اور وہ اس نظام زندگی کے پیروکار ہیں جو انسانوں نے بنایا ہے۔ تمہارا رول ان کے مقابلے میں برتر ہے۔ تم پوری انسانیت کے لئے حاملین وصیت ہو' اس پوری انسانیت کے لئے ہادی اور رہبر ہو جبکہ وہ اللہ کے اس نظام سے دھتکارے ہوئے ہیں' گمراہ ہو چکے ہیں۔ اس کرۂ ارض پر تمہارا مقام بلند مقام ہے۔ تم اس وراثت کے حاملین میں سے ہو جس کا تمہارے ساتھ اللہ نے عہد کر رکھا ہے۔ اور ان لوگوں کی حالت یہ ہے کہ وہ عدم اور فنا کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ اس لئے اگر تم سچے مومن بن جاؤ تو تم ہی اس دنیا میں اعلیٰ اور سربلند رہو گے۔ اور اگر تم سچے مومن ہو تو نہ ڈرو اور نہ غم کرو اور نہ دل شکستہ ہو' اس لئے کہ یہ اللہ کی سنت ہے کہ کبھی تم پر مصیبت آئے گی اور کبھی تم کامران ہو گے اور جہاد' ابتلا اور کھرے کھوٹے کے درمیان تمیز ہو جانے کے بعد تمہاری عاقبت اچھی ہو گی۔

"اس وقت اگر تمہیں چوٹ لگی ہے تو اس سے پہلے ایسی ہی چوٹ تمہارے مخالف فریق کو بھی لگ چکی ہے۔ یہ تو زمانہ کے نشیب و فراز ہیں جنہیں ہم لوگوں کے درمیان گردش دیتے رہتے ہیں۔ تم پر یہ وقت اس لئے لایا گیا ہے کہ اللہ دیکھنا چاہتا تھا کہ تم میں سچے مومن کون ہیں اور ان لوگوں کو چھانٹ لینا چاہتا تھا جو واقعی (راستی کے) گواہ ہیں۔ کیونکہ ظالم لوگ اللہ کو پسند نہیں ہیں۔ اور وہ اس آزمائش کے

ذریعہ سے مومنوں کو الگ چھانٹ کر کافروں کی سرکوبی کر دینا چاہتا تھا۔"

یہاں اس چوٹ کا ذکر کیا گیا جو اہل اسلام کو لگی اور اس کا بھی ذکر کیا جو جھٹلانے والوں کو لگی تھی۔ مکذبین کی چوٹ سے مراد غزوۂ بدر ہے۔ اس لئے کہ اس موقعہ پر مشرکین کو چوٹ لگی تھی اور اہل اسلام صحیح و سالم بچ گئے تھے لیکن جھٹلانے والوں کی چوٹ سے مراد غزوۂ احد بھی ہو سکتا ہے جس میں ابتداء گو مسلمانوں کو فتح ہوئی تھی۔ اہل کفر کو شکست ہوئی تھی اور ان میں سے ستر آدمی قتل ہو گئے تھے۔ اس کے بعد مشرکین بھاگ نکلے اور مسلمان ان کے تعاقب میں نکلے اور انکی کھوپڑیوں پر ضربات لگاتے رہے۔ مشرکین کا علم تک گر گیا اور کوئی ایسا شخص نہ رہا جو آگے بڑھ کر علم اٹھاتا۔ آخر کار ایک عورت نے علم اٹھایا۔ اس پر انہیں جرات ہوئی اور اس کے ارد گرد جمع ہو گئے۔ اس کے بعد مشرکین کی باری آئی جب تیراندازوں نے حضور ﷺ کے احکام کی خلاف ورزی کی۔ آپس میں اختلاف کیا اور اس معرکے کے آخری دور میں مسلمانوں پر وہ مصیبت آئی جس کا یہاں ذکر ہو رہا ہے اور یہ پوری پوری سزا تھی اس بات کی کہ انہوں نے حضور ﷺ کے احکام کی خلاف ورزی کی اور آپس میں اختلاف کیا۔ یوں اللہ تعالیٰ کی وہ سنت ظاہر ہوئی جسے اس نے اس کائنات کے لئے مقدر فرمایا ہے۔ اس لئے کہ تیراندازوں کی جانب سے حضور ﷺ کے احکام کےخلاف ورزی اور مشورہ کے باوجود آپس میں اختلاف اس وجہ سے پیدا ہوئے تھے کہ ان کے دلوں میں مال غنیمت کا لالچ پیدا ہو گیا تھا اور اللہ تعالیٰ نے جہاد و قتال میں مسلمانوں کے لئے نصرت تو بہرحال لکھ دی ہے لیکن ان لوگوں کے لئے جو صرف فی سبیل اللہ جہاد کرتے ہیں۔ اور ان کا مطمع نظر اس دنیائے دنی کی کوئی بے وقعت فائدہ نہیں ہوتا۔ اس واقعہ کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی ایک دوسری سنت کا ظہور بھی ہوا۔ وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ فتح و نصرت کو لوگوں کے درمیاں پھیرتے رہتے ہیں۔ کبھی اہل حق کو فتح ہوتی ہے تو کبھی کبھار اہل باطل کو فتح ہوتی ہے۔ ان کے اعمال اور ان کی نیتوں کے مطابق۔ ان ایام کی وجہ سے اہل ایمان اور اہل نفاق کو چھانٹ کر رکھ دیا جاتا ہے۔ نیز غلطیوں کا ارتکاب ہوتا ہے اور لوگوں کے دلوں سے نظریاتی کھوٹ نکل جاتا ہے۔

إِنْ يَمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهُ ۚ وَتِلْكَ الْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا

"اس وقت اگر تمہیں چوٹ لگی ہے تو اس سے پہلے ایسی ہی چوٹ تمہارے مخالف فریق کو بھی لگ چکی ہے۔ یہ تو زمانہ کے نشیب و فراز ہیں جنہیں لوگوں کے درمیان گردش دیتے رہتے ہیں۔ تم پر یہ وقت اس لئے لایا گیا تھا کہ اللہ دیکھنا چاہتا تھا کہ تم میں سے سچے مومن کون ہیں۔"

کشادگی کے بعد سختی اور سختی کے بعد کشادگی' وہ حالات ہیں جو نفس انسانی کی خفیہ صلاحیتوں کو ابھارتے ہیں' اس سے لوگوں کے مزاج معلوم ہو جاتے ہیں اور یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ کون نظریاتی لحاظ سے پاک ہو چکا ہے اور کس میں نظریاتی میل کچیل موجود ہے۔ کون ہے جو جلد باز ہے اور کون ہے جو ثابت قدم ہے۔ کون ہے جو مایوسی کا شکار ہوتا ہے اور کون ہے جسے اللہ پر مکمل بھروسہ ہے۔ کون ہے جو تن بتقدیر سپرد کرتا ہے اور کون ہے جو راضی برضا ہوتا ہے' یا خود سری اختیار کرتا ہے؟

یہاں آکر اسلامی جماعت کی تطہیر ہو جاتی ہے اور ظاہر ہو جاتا ہے کہ کون مومن ہے اور کون منافق ہے۔ دونوں فریقوں کی حقیقت واضح ہو کر سامنے آتی ہے۔ اور لوگوں کی دلی کیفیات اس دنیا کے لوگوں پر بھی منکشف ہو جاتی ہیں۔ اس طرح اسلامی صفوں سے ہر قسم کی وہ کمزوریاں دور ہو جاتی ہیں جو لوگوں کے درمیان اخلاقی اور نظریاتی ہم آہنگی نہ ہونے کی وجہ سے پیدا ہو جاتی ہیں جبکہ جمعیت میں مختلف الخیال اور مبہم قسم کے لوگ ہوں۔

اللہ تعالیٰ تو مومنین کو بھی جانتے ہیں اور منافقین کو بھی جانتے ہیں۔ اللہ علیم بذات الصدور ہیں۔ لیکن واقعات زندگی' فتح و شکست کے نتیجے میں چھپے لوگ سامنے آجاتے ہیں' چھپے ہوئے اوصاف واقعات زندگی کی صورت میں برملا ہو جاتے ہیں۔ اب ایمان ایک ظاہری عمل کی صورت میں سامنے آجاتا ہے۔ اور نفاق بھی متشکل اور متجسم ہو جاتا ہے۔ اس لئے ان امور پر حساب و کتاب ہو گا اور ان پر انعام و سزا بھی ہو گی۔ اللہ تعالیٰ ان امور پر حساب و کتاب نہیں لیتے جنہیں وہ جانتے ہیں بلکہ جزاو سزا کا دارومدار ان امور پر ہوتا ہے جو عمل میں آجاتے ہیں۔

اور زندگی کے نشیب و فراز اور سختی اور نرمی کا یکے بعد دیگرے آنا ایک ایسی کسوٹی ہے جس کا نتیجہ غلط نہیں ہوتا' یہ ایک ایسا ترازو ہے جس میں کوئی کمی بیشی نہیں رہتی۔ اس میزان میں مشکلات اور امن دونوں برابر ہیں۔ کئی ایسی شخصیات ہوتی ہیں جو مشکلات کا مقابلہ کرتی ہیں' صبر اور مصابرت کرتی ہیں لیکن جب سہولت آتی ہے تو تن آسانی ہو جاتی ہیں لیکن اہل ایمان کی حالت یہ ہوتی ہے کہ وہ مشکلات میں جم جاتے ہیں اور صبر کرتے ہیں لیکن جب عیش و آرام کا وقت آتا ہے تو پھر بھی آپے سے باہر نہیں ہوتے۔ اور دونوں حالتوں میں ان کی توجہ اللہ کی طرف ہوتی ہے۔ ان کا یقین اس بات پر پختہ ہوتا ہے۔ خوشحالی اور بدحالی دونوں میں عمل دخل ذات باری کا ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ جماعت مسلمہ کی تربیت فرما رہے تھے اور یہ تربیت اس دور میں ہو رہی تھی جب جماعت مسلمہ پوری دنیا کی قیادت کا چارج لینے ہی والی تھی تو اللہ تعالیٰ نے بدر کی کامیابی اور خوشحالی کے بعد احد کی ناکامی اور برے حالات سے دوچار کر کے اسے آزمایا اور اس کی تربیت کی۔ حیرت انگیز کامیابی اور فتح و کامرانی کے بعد اسے اچانک غیر متوقع شکست سے دوچار کر دیا۔ اگرچہ یہ دونوں واقعات بے سبب نہ تھے اور دونوں' اس کائنات میں اللہ تعالیٰ کی سنت جاریہ کے عین مطابق تحت الاسباب تھے' جو فتح و ہزیمت کے لئے اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں مقرر فرما رکھے تھے تاکہ اس نئی اٹھنے والی قیادت اور تحریک کو معلوم ہو جائے کہ فتح و ہزیمت کے اسباب کیا ہوتے ہیں؟ تاکہ وہ اللہ اور رسول کی اطاعت میں اور پختہ ہو جائے۔ اللہ پر اس کا توکل اور بھروسہ اور زیادہ ہو جائے۔ وہ ذات باری کے ساتھ مزید جڑ جائے اور اسلامی نظام زندگی کے مزاج اور اس کے فرائض سے حق الیقین کی طرح واقف ہو جائے۔

اب بات ذرا اور آگے بڑھتی ہے۔ امت مسلمہ کو حکمت الہیہ کے کچھ اور پہلو دکھائے جاتے ہیں۔ یہ حکمتیں اس معرکے کے واقعات کے بیان کے دوران اور زندگی کے نشیب و فراز کے آئینہ میں دکھائی جاتی ہیں یعنی مسلمانوں کی صفوں کی تطہیر اور اہل ایمان کو اہل نفاق سے چھانٹ دینے کے بعد بعض دوسری حکمتیں؟ وَيَتَّخِذَ مِنكُمْ شُهَدَآءَ ط "اور تم سے بعض کو شہید کر دے۔"

یہ عجیب طرز ادا ہے جس میں گہرے معانی پوشیدہ ہیں۔ گویا اللہ تعالیٰ خود شہداء کا انتخاب فرماتے ہیں۔ مجاہدین میں سے مقام شہادت کے لئے انتخاب ہوتا ہے اور یہ انتخاب اللہ تعالیٰ خود اپنے لئے کرتے ہیں۔ پس یہ گویا کوئی مصیبت اور خسارہ نہیں ہے کہ کوئی اللہ کے راستے میں شہید ہو جائے بلکہ اسے اللہ تعالیٰ اپنے لئے اختیار کر لیتے ہیں' چھانٹ لیتے ہیں۔ یہ گویا ان کے لئے خاص اعزاز ہوتا ہے۔ ان کو اللہ نے چھانٹ لیا اور ان کو مقام شہادت اور مرتبہ شہادت حق پر فائز کر دیا تاکہ وہ خالصتاً" اللہ کے ہو جائیں اور اس کی مقرب کابینہ میں شامل ہو جائیں۔ وَيَتَّخِذَ مِنْهُمْ .... "اللہ ان سے چن لے۔"

پھر ایک مفہوم کے مطابق یہ لوگ اللہ میاں کے گواہ ہیں اور یہ اپنی جان دے کر اس سچائی پر شہادت دیتے ہیں جسے اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ پر اتارا ہے۔ یہ لوگ گواہی دیتے ہیں کہ یہ پیغام' پیغام حق ہے اور یہ شہادت وہ اس انداز اور اس اسلوب میں دیتے ہیں کہ پھر اس میں کوئی شبہ نہیں رہتا اور جرح کی ضرورت نہیں رہتی۔ اور اس کے بعد بات کا فیصلہ ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہ وہ یہ شہادت اس مسلسل جدوجہد کے ساتھ دیتے ہیں جس کا انجام جان کا نذرانہ پیش کرنے پر ہوتا ہے اس طرح وہ اپنے خون سے اس سچائی کو تسلیم کرتے

ہیں اور دنیا کے سامنے اسے فیصلہ کن شکل میں پیش کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان مختار لوگوں سے یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ یہ شہادت دیں کہ اللہ کی جانب سے جو نظریۂ حیات نازل ہوا ہے وہ حق ہے۔ وہ اس پر ایمان لاچکے ہیں۔ وہ اس کے لئے خالص ہوگئے ہیں۔ وہ ان کو اس قدر عزیز ہوگیا ہے کہ عزیز تر از جان ہے۔ اور یہ کہ لوگوں کی زندگی اس وقت تک درست نہیں ہوسکتی جب تک وہ اس سچائی کے مطابق نہ ہو جائے۔ یہ کہ وہ اس پر پختہ یقین کر چکے ہیں۔ اس لئے وہ اس امر میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے کہ وہ لوگوں کی زندگیوں سے باطل کو ختم کر دیں' نکال دیں اور یہ حق پوری دنیا میں استوار ہو جائے اور لوگوں کے نظام حکومت میں بھی وہ رائج ہو جائے۔ غرض یہ شہداء ان سب امور کے شہداء ہیں اور ان کی شہادت عبارت ہے جہاد اور موت فی سبیل اللہ سے اور یہ ایک ایسی شہادت ہے جس میں کسی قیل و قال کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

اب ذرا دوسرا پہلو دیکھیں' جب کوئی اپنی زبان سے لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی شہادت ادا کرتا ہے' یہ شہادت اس وقت تک شہادت نہیں ہوتی جب تک یہ مقراس شہادت کے مفہوم اور تقاضوں کو پورا نہیں کرتا۔ اور مفہوم یہ ہے کہ وہ اللہ کے سوا کسی کو الٰہ نہ سمجھے' باہمی مفہوم کہ وہ اللہ کے سوا کسی اور کو ماخذ شریعت اور ماخذ قانون نہ بنائے۔ اس لئے کہ الٰہ کی خصوصیات میں سے مخصوص ترین خصوصیت یہ ہے کہ وہ لوگوں کے لئے قانون سازی کرے۔ اور بندوں کے حوالے سے مخصوص ترین بندگی یہ ہے کہ بندہ اپنا نظام حیات اور نظام قانون اللہ تعالیٰ سے اخذ کرے۔ اور جس کی عملی شکل یہ ہے کہ وہ قانون رسول خدا ﷺ سے اخذ کرے جو اللہ کے رسول اور اس کی جانب سے شارع ہیں۔ اور ان دو مصادر کے علاوہ ان کے نزدیک قانون کا کوئی اور مصدر اور ماخذ نہ ہو۔

پھر اس کلمہ شہادت کا تقاضا یہ ہے کہ انسان وہ جدوجہد شروع کردے جس کے نتیجے میں اس کرۂ ارض پر الوہیت اور حاکمیت صرف اللہ کی ہو جائے۔ جس طرح اس کی تبلیغ حضرت محمد ﷺ نے فرمائی۔ اور یہ شریعت اسلامی نظام حیات بن جائے۔ یہ نظام غالب ہو اور اس کی پیروی ہونے لگے اور یہ نظام لوگوں کی پوری زندگی میں متصرف ہو اور اس کے تصرف سے زندگی کا کوئی پہلو مستثنیٰ نہ ہو۔

اس مفہوم کے اعتبار سے' اس نظریۂ حیات نے یہ تقاضا کیا کہ یہ شخص اس کی راہ میں جان دے دے تو شہید نے جان دے دی۔ اس لئے وہ ایک ایسا گواہ بن گیا جس سے اللہ نے یہ مطالبہ کیا کہ وہ یہ شہادت ادا کرے۔ اس لئے کہ اسے اللہ نے گواہی کے مقام پر فائز کیا ہے۔ اس وجہ سے وہ شہید بن گیا ہے۔

یہ ہے اس عجیب انداز کلام کا گہرا فہم یعنی وَ يَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَآءَ............ اور یہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی شہادت کا مفہوم اور مقتضاء ہے۔ اس شہادت کا وہ مفہوم نہیں ہے جس کے مطابق یہ شہادت محض ایک مذاق بن جائے' محض وقت کا ضیاع ہو اور اس سے رخصتیں برآمد ہوتی ہوں۔

وَ اللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ............ "اللہ کو ظالم لوگ پسند نہیں۔" قرآن کریم میں لفظ ظلم سے اکثر اوقات شرک مراد لیا جاتا ہے۔ اس لئے کہ شرک درحقیقت ظلم عظیم ہے۔ اور سب سے زیادہ قبیح حرکت ہے۔ قرآن مجید میں دوسری جگہ آتا ہے۔

اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ............ "بے شک شرک ایک عظیم ظلم ہے۔" صحیحین میں حضرت ابن مسعودؓ سے روایت ہے۔ فرماتے ہیں میں نے سوال کیا رسول ﷺ خدا کون سا گناہ سب سے بڑا ہے؟ آپؐ نے فرمایا یہ کہ تم اللہ کے ساتھ کسی کو شریک بناؤ حالانکہ صرف اللہ ہی نے تمہیں پیدا کیا ہے۔"

اس سے پہلے سیاق کلام میں جھٹلانے والوں کے بارے میں اللہ کی سنت کی طرف اشارہ کیا گیا تھا۔ اور اب یہ فیصلہ سنایا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ظالموں سے محبت نہیں رکھتا۔ اس لئے کہ بالواسطہ اس بات کی تاکید ہے کہ جھٹلانے والے اپنے منطقی انجام کو ضرور پہنچیں گے'

اس لئے کہ اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ محبت نہیں کرتا۔ اس انداز تعبیر کے یہ اثرات بھی سامنے آتے ہیں کہ ایک مومن ظلم اور ظالم سے نفرت کرنے لگتا ہے۔ اور ظلم اور ظالمین کے خلاف یہ فضا پیدا کرنا حدیث جہاد اور حصول شہادت کے لئے آمادہ کرنے کے اس موقعہ کے ساتھ گہرا ربط رکھتی ہے۔ اس لئے کہ مومن اس بات کے خلاف جہاد کرتا ہے جسے اللہ مٹانا چاہتا ہے اور ان لوگوں کے خلاف جہاد کرتا ہے جو اللہ کو سخت ناپسند ہیں۔ اور یہی شہادت گاہ مومن ہے۔ اس جگہ وہ نذرانہ جان پیش کرتا ہے اور ایسے ہی لوگوں سے اللہ شہداء کا انتخاب فرماتے ہیں۔

اس کے بعد اب مضمون اس طرف جاتا ہے کہ ان حادثات فاجعہ کے پس پشت کیا حکمت پوشیدہ ہے؟ بتایا جاتا ہے کہ ان کے ذریعہ امت کی تربیت مقصود تھی' اسے پاک کر کے اس کے اعلیٰ کردار کے لئے تیار کرنا مقصود تھا تاکہ وہ اللہ کی تقدیر اور ہتھیار بن کر کافروں کو نیست و نابود کر دے اور وہ مکذبین کو سزا دینے کے لئے دست قدرت کے لئے پردہ بن جائے۔ وَلِيُمَحِّصَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَيَمْحَقَ الْكَافِرِينَ.................. "اور وہ آزمائش کے ذریعہ سے مومنوں کو الگ چھانٹ کر کافروں کی سرکوبی کر دینا چاہتا تھا۔" تمحیص علیحدہ اور ممتاز کرنے کے بعد کا درجہ ہے۔ اور یہ وہ کارروائی ہے جو انسانی نفس کے اندر پایہ تکمیل کو پہنچتی ہے۔ ضمیر کے اندر اس کی تکمیل ہوتی ہے۔ یہ ایک ایسا تجربہ ہوتا ہے جس سے شخصیت کے خفیہ گوشے کھل کر سامنے آجاتے ہیں۔ ان خفیہ گوشوں پر لائٹ فوکس ہو جاتی ہے تاکہ ان گوشوں سے میل کھوٹ اور ملاوٹ دور ہو جائے۔ وہ واضح اور صاف نظر آجائیں اور یہ شخصیت سچائی پر خوبی کے ساتھ جم جائے۔

بارہا ایسا ہوتا ہے کہ انسان اپنے نفس اور اپنی شخصیت کے بارے میں صحیح جائزہ نہیں لے سکتا۔ وہ اپنی خفیہ کمزوریوں اور اپنے نفس کے نشیب و فراز سے واقف نہیں ہوتا۔ اور یوں اسے نہ اپنی قوت کا صحیح اندازہ ہوتا ہے اور نہ اپنی کمزوریوں کا صحیح پتہ ہوتا ہے۔ اس کی بعض ایسی خفیہ کمزوریاں ہوتی ہیں جن کا اظہار اس وقت ہوتا جب ان کو ابھارا جائے۔

چھانٹی کے اس عمل کا انتظام اللہ جل شانہ نے اپنے ہاتھ میں لیا ہوا تھا۔ اور یہ چھانٹی اس طرح کی جارہی تھی کہ مسلمانوں کو زندگی کے نشیب و فراز سے دوچار کیا جائے' انہیں فتح بھی ہو اور شکست بھی ہو' سختی بھی آئے اور اچھے حالات بھی درپیش ہوں۔ انہیں خوب رگڑا دیا جائے۔ اور اس تلخ رگڑ کے بعد اہل ایمان اپنے بارے میں وہ کچھ جان لیں جو اس سے قبل وہ نہ جانتے تھے۔ حادثات' تجربے اور مختلف عملی مواقف سے دوچار کر کے ان کی یہ چھانٹی ہوئی۔

بعض اوقات انسان اس غرے میں مبتلا ہوتا ہے کہ وہ قوی و شجاع ہے اور حرص و آز کے پنجے سے آزاد ہے اور جب وہ عملی تجربات کی کسوٹی پر چڑھتا ہے اور جب وہ واقعی حالات سے دوچار ہوتا ہے تو اسے پتہ چلتا ہے کہ اس کی شخصیت میں تو ابھی بڑی بڑی کمزوریاں ہیں' جو ابھی تک دور نہیں ہو سکیں۔ اور یہ کہ وہ ابھی تک مشکلات کے اس قدر دباؤ کے برداشت کرنے کی قوت نہیں رکھتا اس لئے یہ بات خود اس کے مفاد میں ہوتی ہے کہ اسے قبل از وقت اپنی کمزوریوں کا علم ہو جائے تاکہ وہ اپنی شخصیت کو از سر نو ڈھالنے کی کوشش کرے۔ اور وہ ان مشکلات کے برداشت کرنے کے لئے اپنے آپ کو تیار کر لے جو اس دعوت کی راہ میں لازماً درپیش آنے والی ہیں۔ اور اس نظریۂ حیات کی وجہ سے وہ لابدی ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی اسکیم یہ تھی کہ وہ اس پہلی جماعت اسلامی کی اچھی طرح تربیت کر دے۔ جسے اس نے پوری انسانیت کی قیادت کے لئے تیار کرنا تھا۔ اس اسکیم کے مطابق اس جماعت نے اس کرۂ ارض پر ایک عظیم کام سرانجام دینا تھا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس جماعت کو اس طرح چھانا اور چھانٹا اور احد میں اسے ایسے حالات سے دوچار کیا جو غیر متوقع تھے تاکہ یہ جماعت اپنی سطح ذرا بلند کرے اور اپنے آپ کو

اس رول کے لئے تیار کرے جو اللہ نے طے کر دیا تھا کہ اس نے ادا کرنا ہے اور وہ یہ تھا وَ يَمْحَقَ الْكٰفِرِيْنَ ....
"اور تاکہ وہ کافروں کی سرکوبی کر دے۔" اور یہ اس لئے کہ حق کے ذریعہ 'باطل کی سرکوبی کرنا سنت اللہیہ میں سے ایک سنت ہے۔ لیکن یہ سرکوبی اس وقت ممکن ہوتی ہے جب حق ظاہر ہو جائے اور سخت تربیت اور چھانٹی کے ذریعہ اس کی کمزوریاں دور کر دی جائیں۔

اب اگلی حکیمانہ بات بصورت استفہام انکاری آتی ہے۔ دعوت اسلامی کے بارے میں مسلمانوں کی سوچ کو درست کیا جاتا ہے اور بتایا جاتا ہے کہ اس سلسلے میں سنت الٰہی کیا ہے؟ بتایا جاتا ہے کہ فتح و شکست 'اعمال اور ان کے نتائج کے بارے میں اللہ کا ایک اٹل قانون ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ جنت کی راہ میں تو کانٹے بھی بچھے ہوئے ہوتے ہیں 'مشکلات بھی ہوتی ہیں' اور اس راہ کی مشکلات کو صبر و ثبات کے ذریعہ حل کیا جاسکتا ہے۔ محض خالی خولی تمناؤں اور نیک خواہشات رکھنے کے ذریعہ یہ گھاٹی عبور نہیں کی جاسکتی۔ تمہیں اس راہ میں مشکلات انگیز کرنی ہوں گی اور اپنی صفوں کو کمزور لوگوں سے صاف کرنا ہو گا۔

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَ لَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَ يَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۴۲﴾ وَ لَقَدْ كُنْتُمْ تَمَنَّوْنَ الْمَوْتَ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَلْقَوْهُ فَقَدْ رَاَيْتُمُوْهُ وَ اَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ

"کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ یونہی جنت میں چلے جاؤ گے حالانکہ ابھی اللہ نے یہ تو دیکھا ہی نہیں کہ تم میں کون وہ لوگ ہیں جو اس کی راہ میں جانیں لڑانے والے اور اس کی خاطر صبر کرنے والے ہیں۔ تم موت کی تمنائیں کر رہے تھے مگر یہ اس وقت کی بات تھی جب موت سامنے نہ آئی تھی 'لو اب وہ تمہارے سامنے آگئی ہے اور تم نے اسے آنکھوں سے دیکھ لیا۔"

صیغہ استفہام انکاری اس مقام پر استعمال ہوتا ہے جہاں مخاطب کو ایک نہایت ہی خطرناک فکری غلطی پر متنبہ کرنا مطلوب ہوتا ہے۔ یہاں فکری غلطی یہ تھی کہ لوگوں نے سمجھا کہ بس زبان سے اس قسم کا اعلان ہی کافی ہے کہ میں مسلمان ہو گیا ہوں اور میں موت کے لئے تیار ہوں 'اسلام کی راہ میں مرمٹنے کے لئے۔ صرف اس اعلان ہی سے گویا انہوں نے دعوت اسلامی کی راہ کی تمام مشکلات برداشت کر لیں اور اب وہ اللہ کی رضامندی اور جنت دونوں کے مستحق ہو گئے ہیں۔

یہاں انہیں سختی کے ساتھ بتایا گیا کہ تمہاری یہ سوچ درست نہیں ہے۔ تمہیں مشکلات کے واقعی تجربے سے گزرنا ہو گا 'عملی امتحان ہو گا' جہاد میں شرکت کرنی ہو گی اور مصائب کو گلے لگانا ہو گا۔ اور اس کے بعد یہ کہ ان مشکلات کی حالت میں جزع و فزع نہیں بلکہ صبر کرنا ہو گا اور ان کو برداشت کرنا ہو گا۔

یہاں اس آیت کے بعض الفاظ چونکا دینے والے ہیں وَ لَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ ....
.... "حالانکہ ابھی یہ تو اللہ نے دیکھا ہی نہیں ہے کہ تم میں سے کون لوگ ہیں جو اس راہ میں جانیں لڑانے والے ہیں۔
وَ يَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ .... "اور کون ہیں جو اس کی خاطر صبر کرنے والے ہیں۔"

اس لئے اس راہ میں صرف جہاد کر لینا ہی کافی نہیں ہے 'بلکہ مشکلات راہ پر صبر کرنا بھی ضروری ہے۔ یہ مشکلات تو مسلسل ہوتی ہیں' مختلف نوعیت کی ہوا کرتی ہیں اور یہ اس وقت ختم نہیں ہو جاتیں جب میدان جنگ میں جہاد ختم ہو جاتا ہے 'بلکہ بارہا ایسا ہوتا ہے کہ میدان جنگ میں مشکلات جہاد بہت ہی کم ہوتی بمقابلہ اس کے جو جہاد کے بعد آتی ہیں اور جن کی خاطر صبر کا تقاضا کیا گیا ہے اور جن میں ایمان کی

آزمائش ہوتی ہے۔ ہماری روز مرہ کی زندگی میں نہ ختم ہونے والی مشکلات ہوتی ہیں' افق ایمان پر مسلسل جمے رہنا' شعور اور عمل دونوں میں ایمان کے تقاضے پورے کرتے رہنا' زندگی کی راہوں میں انسانی کمزوریوں پر بذریعہ صبر قابو پاتے رہنا' روز مرہ زندگی میں ان تمام لوگوں کے ساتھ یومیہ معاملات میں اور اپنے نفس کے ساتھ تمام معاملات میں اسلام پر جمے رہنا اور خصوصاً ان مقامات پر صبر و ثبات کا مظاہرہ کرنا جن میں باطل قوتوں کو بظاہر کامیابی حاصل ہوتی ہے اور وہ یوں نظر آتی ہیں گویا بس فتح اب ان کے لئے مقدر ہے۔ پھر بعض اوقات جدوجہد طویل ہوتی ہے اور راستہ طویل اور کٹھن نظر آتا ہے اور مشکلات سے پر نظر آتا ہے' ایسے حالات میں صبر کرتے رہنا' جہاد اور مشکلات اور جنگاہ میں آرام طلبی کی تمنا' وسوسے اور نفس کی اکتاہٹ کے مقابلے میں صبر و ثبات کا مظاہرہ کرتے چلے جانا' غرض اس راہ میں جو نامعلوم اور پوشیدہ مشکلات ہوتی ہیں' اور ان میں سے میدان جنگ صرف ایک مشکل ہے' ان سب کو انگیز کرنے کا حوصلہ پیدا کرنا وغیرہ یہ سب اس آیت کے تقاضے ہیں اور جنت کی راہ کی مشکلات ہیں۔ غرض ان مقاصد کا حصول صرف الفاظ اور تمناؤں سے نہیں ہوتا۔

وَلَقَدْ كُنْتُمْ تَمَنَّوْنَ الْمَوْتَ مِنْ قَبْلِ أَنْ تَلْقَوْهُ فَقَدْ رَأَيْتُمُوهُ وَأَنْتُمْ... تَنْظُرُونَ..........

"تم موت کی تمنائیں کر رہے تھے' مگر یہ اس وقت کی بات تھی جب موت سامنے نہ آئی تھی' لو اب وہ تمہارے سامنے آگئی اور تم نے اسے آنکھوں سے دیکھ لیا۔"

یہاں قرآن مجید ان کو ایک بار پھر موت کے سامنے لاکر کھڑا کر دیتا ہے' جس کی وہ تمنائیں کیا کرتے تھے۔ اور پھر جس کا معائنہ وہ معرکۂ احد کے میدان میں کر چکے تھے اور اس منظر کے سامنے انہیں اس لئے کھڑا کیا گیا ہے کہ وہ ذرا ان حقائق کے ساتھ جو عملی میدان میں زیر پیش آئے ہیں' ان الفاظ و کلمات کا مقابلہ کریں جو ان کی زبان پر ہوتے ہیں اور ان تمناؤں کا موازنہ کریں جو ان کے دلوں میں ہوتی ہیں تاکہ وہ انہیں سکھائے کہ وہ ہر اس کلمے اور لفظ کا جائزہ لیں جو ان کی زبانوں سے نکلتا ہے اور یہ دیکھیں کہ ان کلمات کے پیچھے مفہومات کا کس قدر سرمایہ موجود ہے اور یہ جائزہ وہ ان حقائق کی روشنی میں لیں جو معرکۂ احد کے اندر پیش آئے۔ اس طرح انہیں معلوم ہو گا کہ ان کلمات کی قدر و قیمت کیا ہے' جو اپنے منہ سے ادا کرتے ہیں اور ان تمناؤں کی حیثیت کیا ہے جو وہ اپنے دلوں میں بسائے ہوئے ہیں اور ان بھاری حقائق کے مقابلے میں ان وعدوں کا کیا مقام ہے جو انہوں نے کئے تھے۔ پھر یہاں انہیں یہ بھی سکھلایا جاتا ہے کہ صرف ہوا میں تحلیل ہونے والے الفاظ یا دل میں ابھرنے والی تمنائیں ہی انہیں جنت میں داخل نہیں کر سکتیں' بلکہ جنت میں وہ تب داخل ہو سکیں گے جب وہ ان کلمات کو حقیقت کا جامہ پہنائیں اور ان تمناؤں کو میدان عمل میں لائیں تاکہ وہ حقیقی جہاد کا روپ دھاریں اور اس راہ کی مشکلات میں وہ صبر کرتے ہوئے نظر آئیں اور اللہ کی راہ میں ان حقائق کو لوگوں کی واقعی اور عملی دنیا میں دیکھ لیں۔

اللہ تعالیٰ کے لئے یہ کام کوئی مشکل نہ تھا کہ وہ مومنین کو مشکلات میں ڈالے بغیر اور تکالیف دیئے بغیر ہی پہلے ہی دن اپنے نبی' اپنے اس پیغام ہدایت اور اپنے اس تجویز کردہ نظام حیات کو کامیابی سے ہمکنار کر دیتا۔ وہ اس بات پر قادر تھا کہ وہ فرشتے اتارتا اور وہ ان کے ساتھ لڑتے یا وہ اکیلے ہی مشرکین کو تباہ کر دیتے' جس طرح ان فرشتوں نے قوم عاد' قوم ثمود اور قوم لوط علیہم السلام کو تباہ کیا تھا۔

لیکن جو اہداف مقرر ہوئے تھے' وہ صرف فتح و نصرت نہ تھے۔ اہداف میں یہ امر بھی تھا کہ جماعت مسلمہ کی تربیت بھی کی جائے' اس لئے کہ اس جماعت نے پوری انسانیت کی قیادت کا فریضہ سرانجام دینا تھا۔ اس وقت انسانیت ضعیف و نحیف تھی' خواہشات نفسانی اور میلانات جسمانی کی غلام تھی' اور وہ عملاً جاہلیت اور فکراً انحراف کا شکار تھی اور اس مقصد کے لئے ایسی قیادت درکار تھی جو ذہین ہو' اور وہ قائدین سے اعلیٰ صلاحیتوں کا تقاضا کرتی ہو' ان تقاضوں میں سب سے پہلا تقاضا یہ ہو کہ وہ حق اور صداقت پر پختگی سے جمنے والے ہوں۔ وہ مشکلات پر صبر کرنے والے ہوں اور انہیں معلوم ہو کہ ان کی صفوں میں کہاں کمزوری ہے اور کہاں قوت ہے۔ اور اسے

یہ بھی معلوم ہو کہ انسانی نفس کہاں ٹھوکر کھاتا ہے' کہاں راہ راست سے انحراف کا خطرہ ہوتا ہے اور یہ کہ پھر ان سب کمزوریوں کا علاج کیا ہے؟ پھر اگر اچھے حالات اور کامرانی ہو تو پھر بھی صبر کرنے والی ہو اور شدید حالات ہوں تو پھر بھی صبر ہو' اور حقیقت یہ ہے کہ کامیابی کے بعد ناکامی دیکھنا اور اس پر صبر کرنا ان حالات میں بہت ہی کڑوی اور ناخوشگوار صورت حال تھی۔

جماعت مسلمہ کو عالمی قیادت کے منصب پر فائز کرنے کے احکام دینے سے قبل' اللہ تعالیٰ نے جماعت مسلمہ کو ایسی سخت تربیت سے گزارا۔ یہ اس لئے کہ وہ اس عظیم اور خوفناک کام کرنے کے لئے تیار ہو جائے' جو اس نے اس کرۂ ارض پر سرانجام دینا تھا۔ اور اللہ تعالیٰ کی مشیئت یہ تھی کہ وہ اس عظیم مشن پر اس انسان کو بھیجے گا جس کے لئے اس نے اسے چھانٹ لیا ہے اور منتخب کر لیا ہے۔

اور مشیئت الٰہیہ' جماعت مسلمہ کی تیاری اور تربیت میں اب مختلف وسائل کو کام میں لاتی ہے۔ مختلف حالات اور واقعات سے اسے گزارا جاتا ہے۔ کبھی تو اس جماعت کو ایک فیصلہ کن فتح عطا کی جاتی ہے' تو پھر یہ خوش ہو جاتی ہے' اپنے اوپر اس کا اعتماد بحال ہو جاتا ہے' اور یہ کام خداوند تعالیٰ کی معاونت خاصہ کے ذریعہ ہوتا ہے۔ اسے فتح و کامرانی کا تجربہ بھی کرایا جاتا ہے۔ تو وہ کامرانی کے اس نشے میں صبر اور سنجیدگی کا مظاہرہ کرتی ہے' وہ اس میں کبر و غرور بدمستی اور علو کے مقابلے میں بھی کامیاب ہوتی ہے۔ تواضع اور اللہ کے شکر کا دامن نہیں چھوڑتی۔ اور بعض اوقات اسے شکست شدت اور درد سے گزارا جاتا ہے' تو وہ اللہ کے جناب میں پناہ لیتی ہے۔ اسے اپنی ذاتی قوت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ اور اسے معلوم ہو جاتا ہے کہ جب وہ اسلامی نظام زندگی سے معمولی انحراف بھی کرے گی تو اس کے لئے اس کے نتائج کس قدر خطرناک ہوں گے۔ یوں وہ شکست کی کڑواہٹ بھی چکھ لے گی اور اس کے ساتھ وہ باطل پر غالب ہو گی اس لئے کہ وہ حق پر ہے۔ اسے اپنی صفوں کے اندر کمزوریاں اور نقائص معلوم ہو جائیں گے کہ کہاں سے خواہشات نفس در آتی ہیں' کہاں جاکر قدم پھسلتے ہیں تاکہ اگلے مرحلے میں وہ ان تمام کمزوریوں کو دور کر سکے۔ اور وہ فتح اور شکست دونوں سے تجربات کا ایک وسیع سرمایہ لے کر آگے بڑھے۔ یہ تھی سنت الٰہیہ' اور اس کے مطابق قضا و قدر کا نظام چل رہا تھا۔ اس میں سرمو انحراف ممکن نہ تھا اور نہ اب ہے۔

یہ معرکۂ احد کے حاصلات تجربہ میں سے ایک قلیل زاد راہ تھا' تجربات کا ایک حصہ تھا جسے جماعت مسلمہ کے لئے' ہر اسلامی انقلابی جماعت مسلمہ کے لئے' ہر دور' ہر زمان اور ہر مکان میں اٹھنے والی جماعت کے لئے یہاں آیات قرآنی میں قلم بند کیا گیا۔

اس کے بعد قرآن کریم اپنی خاص نہج کے مطابق' جماعت اسلامی کی تربیت کے لئے یہاں بعض عظیم اور اہم حقائق کو معرکۂ بدر کے واقعات کے حوالے سے پیش کرتا ہے تاکہ یہ حقائق اس جماعت کی فکر کا حصہ بن جائیں۔ نصوص قرآنیہ ان واقعات کو اپنے مخصوص انداز میں پیش کرتی ہیں۔ ملاحظہ ہو:

☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۭ اَفَا۟ىِٕنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ ۭ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰي عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَـيْـــًٔـا ۭ وَسَيَجْزِي اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ ﴿۱۴۴﴾ وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا ۭ وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْھَا ۚ وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْھَا ۭ وَسَنَجْزِي الشّٰكِرِيْنَ ﴿۱۴۵﴾ وَكَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ ۙ

مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ ۚ فَمَا وَهَنُوْا لِمَآ اَصَابَهُمْ فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ مَا ضَعُفُوْا وَ مَا اسْتَكَانُوْا ۗ وَ اللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۴۶﴾ وَ مَا كَانَ قَوْلَهُمْ اِلَّآ اَنْ قَالُوْا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَ اِسْرَافَنَا فِیْٓ اَمْرِنَا وَ ثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَ انْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۴۷﴾ فَاٰتٰىهُمُ اللّٰهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَ حُسْنَ ثَوَابِ الْاٰخِرَةِ ۗ وَ اللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۴۸﴾

۱۵ ع ۵ ۶

"محمد اس کے سوا کچھ نہیں کہ بس ایک رسول ہیں' ان سے پہلے اور رسول بھی گزر چکے ہیں' پھر کیا اگر وہ مر جائیں یا قتل کر دیئے جائیں تو تم لوگ الٹے پاؤں پھر جاؤ گے؟ یاد رکھو! جو الٹا پھرے گا وہ اللہ کا کچھ نقصان نہ کرے گا' البتہ جو اللہ کے شکر گزار بندے بن کر رہیں گے انہیں وہ اس کی جزا دے گا۔ کوئی ذی روح اللہ کے اذن کے بغیر نہیں مر سکتا۔ موت کا وقت تو لکھا ہوا ہے۔ جو شخص ثواب دنیا کے ارادے سے کام کرے گا اس کو ہم دنیا میں سے دیں گے' اور جو ثواب آخرت کے ارادے سے کام کرے گا وہ آخرت کا ثواب پائے گا اور شکر کرنے والوں کو ہم ان کی جزا ضرور عطا کریں گے۔ اس سے پہلے کتنے ہی نبی ایسے گزرے ہیں جن کے ساتھ مل کر بہت سے خدا پرستوں نے جنگ کی۔ اللہ کی راہ میں جو مصیبتیں ان پر پڑیں ان سے وہ دل شکستہ نہیں ہوئے' انہوں نے کمزوری نہیں دکھائی' وہ باطل کے آگے سرنگوں نہیں ہوئے۔ ایسے ہی صابروں کو اللہ پسند کرتا ہے۔ ان کی دعا بس یہ تھی "اے ہمارے رب! ہماری غلطیوں اور کوتاہیوں سے درگزر فرما' ہمارے کام میں تیرے حدود سے جو تجاوز ہو گیا ہو اسے معاف کر دے' ہمارے قدم جما دے اور کافروں کے مقابلہ میں ہماری مدد کر۔" آخر کار اللہ نے ان کو دنیا کا ثواب بھی دیا اور اس سے بہتر ثواب آخرت بھی عطا کیا۔ اللہ کو ایسے ہی نیک عمل لوگ پسند ہیں۔"

اس ٹکڑے کی پہلی آیت ایک متعین واقعہ کی طرف اشارہ کر رہی ہے اور یہ واقعہ غزوۂ احد میں پیش آیا۔ جب تیر اندازوں نے پہاڑ پر اپنا متعین مقام چھوڑ دیا' اور مشرکین وہاں سے ان پر چڑھ دوڑے' مسلمانوں پر ٹوٹ پڑے' مسلمانوں کو شکست ہوئی اور حضور ؐ کے دانت مبارک شہید ہو گئے اور آپ کے چہرے پر زخم آئے اور چہرۂ مبارک سے خون بہنے لگا' فریقین باہم گتھم گتھا ہو گئے' مسلمان منتشر ہو گئے' کسی کو کسی کا پتہ نہ رہا۔ ان حالات میں کسی پکارنے والے نے یہ آواز دے دی۔ لوگو! محمد ؐ قتل ہو گئے۔ اس چیخ کا مسلمانوں پر بہت ہی برا اثر ہوا۔ ان میں سے بہت سے لوٹ کر مدینہ آ گئے۔ پہاڑ کے اوپر چڑھ گئے' شکست کھا گئے اور مایوس ہو کر میدان جنگ کو چھوڑ گئے۔ حضور ﷺ کے پاس چند افراد رہ گئے اور ان حالات میں آپ ﷺ ان چند افراد کے ساتھ جم گئے۔ اور مسلمانوں کو یہ آواز دینے لگے کہ واپس آؤ' چنانچہ وہ پھر سے مجتمع ہوئے۔ ان کے دل تھم گئے۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے ایک محسوس انداز سے ان پر اونگھ طاری کر کے انہیں طمانیت قلب اور امن و سکون عطا کر دیا جب کہ تفصیلات بعد میں آ رہی ہیں۔

یہ واقعہ جس نے ان لوگوں کو مکمل طور پر مدہوش کر دیا تھا' قرآن کریم اسے نکتہ توجہ بناتا ہے اور اس مناسبت سے وہ یہاں اسلامی تصور حیات کے اہم حقائق سامنے لاتا ہے۔ اس کو موضوع بنا کر یہاں حقیقت موت و حیات کے بارے میں اہم اشارات دیئے جاتے ہیں اور تاریخ ایمانی اور حالات قافلہ ایمانی پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔

وَ مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ اَفَاۡىِٕنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰۤى اَعْقَابِكُمْ ؕ وَ مَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْــًٔا ؕ وَ سَيَجْزِى اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ

"محمد اس کے سوا کچھ نہیں کہ بس ایک رسول ہیں' ان سے پہلے اور رسول بھی گزر چکے ہیں' پھر کیا اگر وہ مرجائیں یا قتل کر دیئے جائیں تو تم لوگ الٹے پاؤں پھر جاؤ گے؟ یاد رکھو' جو الٹا پھرے گا وہ اللہ کا کچھ نقصان نہ کرے گا' البتہ جو اللہ کے شکر گزار بندے بن کر رہیں گے انہیں وہ اس کی جزا دے گا۔"

بے شک محمد صرف رسول ہیں' ان سے پہلے بھی رسول گزرے ہیں' یہ سب رسل فوت ہوئے ہیں اور محمد ﷺ بھی اس طرح فوت ہوں گے جس طرح وہ رسول فوت ہوئے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ جب اس معرکہ میں یہ حقیقت (اگرچہ جھوٹی افواہ کے طور پر) تمہارے سامنے آئی تو کیوں تمہاری نظروں سے اوجھل رہی۔ یہ نہایت ہی حیرت انگیز بات ہے۔

محمد ﷺ اللہ کی طرف سے ایک پیغام لانے والے ہیں۔ وہ اس لئے آئے ہیں کہ اللہ کا پیغام پہنچا دیں۔ اللہ اپنی جگہ زندہ لایموت ہے۔ اس کا پیغام زندۂ جاوید ہے۔ اس لئے یہ کس طرح مناسب ہو گا کہ اگر پیغام لانے والے فوت ہو جائیں یا قتل ہو جائیں تو تم اپنے نظریۂ حیات کو چھوڑ کر الٹے پاؤں پھر جاؤ۔ یہ بھی ایک واضح حقیقت تھی جو اس معرکہ کی افراتفری میں ان کی نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی حالانکہ مناسب نہ تھا کہ یہ اہل ایمان کی نظروں سے اوجھل ہو جائے کیونکہ یہ نہایت ہی سیدھی سادھی بات تھی۔

انسان فانی ہے اور نظریۂ حیات باقی ہے۔ اسلامی نظام زندگی ایک علیحدہ حقیقت ہے' جو ان لوگوں سے بالکل مستقل حقیقت رکھتا ہے جو اس کے حاملین ہیں اور جو اسے لوگوں تک پہنچاتے ہیں' وہ رسول ہوں یا رسولوں کے بعد امت کے داعی اور مبلغین ہوں۔ وہ مسلمان جو رسول خدا ﷺ کے ساتھ محبت رکھتا ہے اور یہ محبت ایسی ہے جس کی پوری تاریخ انسانی میں کوئی نظیر نہیں ملتی' اس کا فرض ہے کہ وہ ذات رسول اور اس نظریہ حیات کے اندر فرق و امتیاز کرے جسے اس ذات نے لوگوں تک پھیلایا۔ اس لئے کہ جو نظریۂ حیات آپ ﷺ نے دیا وہ حَیٌّ لَایَمُوْتُ ...... ہے۔ اس کا تعلق اللہ تعالیٰ سے ہے جو حَیٌّ لَایَمُوْتُ ...... ہے۔ یہ فرق کرنا ان کا فرض اس لئے بنتا ہے کہ وہ محب رسول ہیں۔ یہ لوگ نہیں چاہتے تھے کہ حضور ﷺ کو کانٹا تک بھی چبھے۔ ابودجانہ کو دیکھو کہ وہ اپنی پیٹھ کے ذریعہ رسول خدا ﷺ کے لئے ڈھال بنے ہوئے ہیں۔ ان پر تیروں کی بارش ہو رہی ہے اور وہ ہیں جو جمے ہوئے ہیں اور یہ دیکھو کہ آپ صرف ۹ آدمیوں کے ساتھ رہ گئے اور ان سے ایک کے بعد ایک شہید ہو رہا ہے' سب ختم ہو جاتے ہیں لیکن آپ ﷺ کو گزند پہنچنے نہیں دیتے۔ اور آج ہر جگہ اور ہر زمانے میں آپ کا نام سنتے ہی لوگ بوجہ محبت وجد میں آجاتے ہیں اور ٹوٹ کر آپ سے محبت کرتے ہیں' اپنے پورے وجود کے ساتھ اور اپنے پورے جذبات کے ساتھ۔

اے محبان رسول! داعی سے دعوت کی قدر و قیمت زیادہ ہے۔ وَ مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ...... "محمد اس کے سوا کچھ نہیں کہ بس ایک رسول ہیں۔ ان سے پہلے اور رسول بھی گزر چکے ہیں۔"

وہ سابق رسول بھی اسی دعوت کے حاملین تھے جس کی جڑیں زمانہ قدیم میں دور تک پھیلی ہوئی ہیں' تاریخ کے بڑے بڑے میدانوں میں بارہا یہ دعوت سرسبز ہوتی رہی ہے۔ اس کا آغاز' آغاز انسانیت کے ساتھ ساتھ ہوا ہے۔ اور یہ رسول زندگی کی گزرگاہوں میں اس کے حدی خواں رہے ہیں۔ قائدانہ انداز میں اور امن و سلامتی کے ساتھ۔

اس لئے یہ پیغام اور یہ نظام داعی سے بڑا ہے اور داعی سے زیادہ زندہ رہنے والا ہے۔ داعی تو آتے جاتے رہتے ہیں لیکن یہ پیغام زمانوں اور نسلوں سے جاری و ساری ہے۔ اس کے ماننے والے اس کے منبع اول کے ساتھ مربوط اور جڑے رہتے ہیں۔ وہ منبع اور مصدر جس نے خود ان رسولوں کو بھیجا وہ منبع باقی ہے۔ اس کی طرف مومنین کا رخ ہے۔ وہ نصب العین ہے اور اہل ایمان کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ الٹے پاؤں پھریں اور اللہ کی ہدایت کو چھوڑ کر مرتد ہو جائیں حالانکہ اللہ زندۂ جاوید ہے۔

یہی وجہ ہے کہ یہاں ان کے رویے پر سخت نکیر کی گئی۔ فرماتے ہیں

اَفَاۡئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ ؕ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْـًٔا ؕ وَسَيَجْزِى اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ

"کیا اگر وہ مرجائیں یا قتل کر دیئے جائیں تو تم لوگ الٹے پاؤں پھر جاؤ گے؟ یاد رکھو جو الٹا پھرے گا وہ اللہ کا کچھ نقصان نہ کرے گا، البتہ جو اللہ کے شکر گزار بن کر رہیں گے انہیں وہ اس کی جزا دے گا۔"

تعبیر ایسی ہے کہ اس میں ارتداد کی زندہ تصویر سامنے آجاتی ہے۔ "تم لوگ الٹے پاؤں پھر جاؤ گے۔" **انقلبتم علیٰ اعقابکم** .... اور **ومن ینقلب علیٰ عقبیہ** .... "جو الٹا پھرے۔" "یہ ایک حسی اور دیکھے جانے والی حرکت ہے' ایک زندہ شخص الٹے پاؤں مڑتا ہے۔ یہ انقلاب ارتداد کی ایک مجسم شکل ہے۔ اسلامی نظریۂ حیات چھوڑنا بعینہ اسی طرح ہے جس طرح ایک شخص اچانک واپس الٹے پاؤں مڑ جائے۔ حالانکہ یہاں اس انقلاب سے مراد یہ حسی حرکت نہیں ہے' بلکہ اس سے مراد وہ نفسیاتی حالت ہے جس میں ایک شخص نظریاتی پسپائی اختیار کرتا ہے۔ ایک شخص نے یہ آواز دے دی کہ محمد ﷺ قتل ہو گئے ہیں' یہ سنتے ہی بعض مسلمانوں کے ذہن میں یہ تصور اور یہ سوال آگیا کہ اب مشرکین کے ساتھ جنگ کا فائدہ کیا ہے؟ غرض اس ذہنی حرکت اور اس ذہنی انقلاب کا اظہار حسی حرکت سے کیا گیا۔ یعنی ان کے ذہن اس طرح واپس ہو گئے جس طرح وہ معرکۂ احد میں جسمانی طور پر پسپائی اختیار کر رہے تھے۔ یہ ہے وہ حقیقت جس کی طرف نضر ابن انس ؓ نے اشارہ کیا تھا۔ لوگوں نے ہتھیار چھوڑ دیئے اور ان سے کہا کہ حضور اکرم ؐ تو مارے گئے۔ اس پر انہوں نے ان سے کہا: "پھر محمد ﷺ کے بعد تم زندہ رہ کر کیا کرو گے۔ اٹھو اور اس مقصد کے لئے شہید ہو جاؤ جس کے لئے آپ شہید ہوئے۔"

ومن ینقلب علیٰ عقبیہ فلن یضر اللہ شیئا .... "یاد رکھو جو الٹا پھرے گا وہ اللہ کا کچھ نقصان نہ کرے گا۔" وہ تو خود خسارہ اٹھائے گا۔ وہ خود اپنے آپ کو ایذا دیتا ہے کہ وہ الٹا پھرتا ہے اور اس کے اس انقلاب موقف سے اللہ کو کوئی نقصان نہ ہو گا۔ اللہ تو لوگوں سے بے نیاز ہے۔ وہ ان کے ایمان کا محتاج نہیں ہے۔ یہ تو اس کی مہربانی ہے کہ اس نے لوگوں کے لئے یہ نظام تجویز کیا جس میں خود ان کی سعادت اور ان کا فائدہ ہے۔ اور جو شخص اس نظام سے روگردانی کرے گا وہ خود برے انجام سے اس دنیا میں دوچار ہو گا۔ وہ اپنی ذات میں حیران و پریشان ہو گا اور اپنی سوسائٹی میں بھی۔ اس کے اس فعل کی وجہ سے یہ نظام خراب ہو گا' حیات انسانی خراب ہو گی اور پوری انسانی آبادی خراب ہو گی۔ تمام معاملات بے ترتیب ہو جائیں گے' لوگ خود اپنے ہاتھوں گرفتار مصیبت ہوں گے۔ محض اس لئے کہ انہوں نے اس نظام سے روگردانی کی کہ صرف اس کے اندر پوری انسانی زندگی کا نظام درست طور پر چل سکتا ہے۔ انسان مطمئن ہو سکتا ہے اور صرف اس نظام کے زیر سایہ نفس انسانی اپنی فطرت کے ساتھ ہم آہنگ ہو سکتا ہے۔ اور اس پوری کائنات کے ساتھ چل سکتا ہے جس کے اندر وہ زندہ رہ رہا ہے۔

وَسَيَجْزِي اللَّهُ الشَّاكِرِينَ .... "جو اللہ کے شکر گزار بندے بن کر رہیں گے انہیں وہ اس کی جزا دے گا۔" یہ شکر گزار وہی ہیں جو اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کی قدر و قیمت جانتے جو اس نے انہیں اسلامی نظام زندگی دے کر ان پر کی۔ وہ شکر اس طرح ادا کرتے ہیں کہ وہ اس نظام کی اطاعت کرتے ہیں' وہ اس طرح بھی شکر کرتے ہیں کہ اللہ کی ثناخوانی کریں' اور اس کو قائم کر کے اس دنیا کی سعادت حاصل کریں اور یہی ان کی جزا اس دنیا میں ہے۔ ان کی شکر گزاری کی بہترین جزا اور اس کے بعد آخرت میں ان کو جزا دی جائے گی اور یہ اخروی سعادت ہوگی جو اس دنیاوی سعادت مندی سے بہت بڑی ہوگی اور جو ابدی ہوگی۔

گویا اس واقعہ پر اس تبصرے کے ذریعہ' اللہ تعالیٰ' مسلمانوں کی اس ذاتی دلچسپی کو' جو حضور اکرم ﷺ کی ذات کے ساتھ تھی' ہٹا کر اسے براہ راست ذات باری کے ساتھ جوڑتے ہیں جو اس دعوت کا اصل سرچشمہ ہے۔ اس لئے کہ دعوت اسلامی کا یہ چشمۂ صافی حضور ؐ نے نہیں جاری فرمایا تھا۔ آپ نے تو لوگوں کی راہنمائی اس طرف فرمائی اور لوگوں کو بلایا کہ وہ اس ٹھاٹھیں مارتے ہوئے دریا کے فیض سے فیض یاب ہوں' جس طرح آپ ؐ سے پہلے دوسرے رسول یہی راہنمائی کرتے رہے تھے۔ اور وہ مخلوق کے پیاسے قافلوں کو دعوت دیتے رہے کہ اس چشمہ صافی سے سیراب ہوں اور پیاس بجھائیں۔

گویا اللہ تعالیٰ کا ارادہ یہ تھا کہ وہ لوگوں کا ہاتھ پکڑ کر ان کے ہاتھ میں وہ مضبوط رسی تھمادیں' جسے حضرت محمد ﷺ نے نہیں باندھا' بلکہ آپ تو اس لئے تشریف لائے تھے کہ لوگوں کو اس پختہ رسی میں باندھ دیں۔ ان کو اسی حالت میں چھوڑ دیں اور وہ اس دنیا سے اس حالت میں چلے جائیں کہ لوگ اس رسی کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے ہوں۔

گویا اللہ تعالیٰ یہ چاہتے تھے کہ مسلمانوں کا رابطہ براہ راست اسلام سے ہو جائے اور ان کا عہد براہ راست اللہ کے ساتھ ہو جائے اور اللہ تعالیٰ کے سامنے' اس عہد کے بارے میں ان کی شمولیت بلاواسطہ ہو جائے۔ براہ راست اللہ کے سامنے وہ جوابدہ ہوں تاکہ وہ اپنی ذمہ داریوں کا احساس کر سکیں' ایسی ذمہ داریاں جو رسول اکرم ؐ کے فوت ہونے سے ختم نہیں ہو جاتیں۔ گویا انہوں نے براہ راست اللہ سے بیعت اور براہ راست اللہ کے سامنے وہ اس کے بارے میں جوابدہ ہیں۔

گویا اللہ کی مشیئت یہ تھی کہ امت مسلمہ اس صدمے سے دوچار ہو جائے جس سے ایک دن اس نے دوچار ہونا تھا۔ اللہ تعالیٰ کو معلوم تھا کہ یہ صدمہ جب ہو گا تو ان کے لئے ناقابل برداشت ہو گا۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے اس مقام پر انہیں اس صدمے کی ریہرسل کرا دی۔ وہ انہیں عملاً پہنچا دیا یعنی حضور کی وفات کے بارے میں بھی انہیں یہ صدمہ پہنچا دیا' قبل اس کے کہ یہ صدمہ جب فی الواقعہ ہو تو انہیں بالکل ہی نڈھال نہ کر دے۔

اور جب حضور ؐ کی وفات کے وقت وہ اس صدمے سے دوچار ہوئے تو وہ فی الواقعہ اسے برداشت نہ کر سکے۔ حضرت عمر ؓ جیسے تربیت یافتہ شخصیت اٹھ کھڑی ہوئی' تلوار سونت لی اور پکارا کوئی یہ لفظ منہ تک نہ لائے کہ محمد ؐ فوت ہو گئے ہیں۔

یہ ابوبکر ؓ ہی تھے جو فوراً اٹھے' جو خدا رسیدہ تھے' جن کا تعلق تقدیر الٰہی سے براہ راست مضبوط تھا' انہوں نے اسی آیت کو پڑھا اور ان لوگوں کو یاد دلایا جو نڈھال ہو کر حواس کھو بیٹھے تھے۔ جب انہوں نے اس خدائی پکار کو سنا تو ان کے حواس بحال ہوئے اور وہ ہوش میں آئے۔

اس کے بعد نفس انسانی کے اندر پائے جانے والے فطری خوف کو ایک ٹچ دیتے ہیں یہ ایک نہایت ہی الہامی مس ہے۔ وہ یکدم اس خوف کو دور کر دیتا ہے اور موت و حیات کے بارے میں ایک اٹل حقیقت بیان کر دی جاتی ہے۔ نیز موت کے بعد لوگوں کے ساتھ اللہ کا سلوک اور جزا و سزا کا ذکر کر دیا جاتا ہے۔

وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ أَنْ تَمُوتَ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ كِتَابًا مُؤَجَّلًا ۗ وَمَنْ يُرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهِ مِنْهَا وَمَنْ يُرِدْ ثَوَابَ الْآخِرَةِ نُؤْتِهِ مِنْهَا ۚ وَسَنَجْزِي الشَّاكِرِينَ

"کوئی ذی روح اللہ کے اذن کے بغیر نہیں مر سکتا۔ موت کا وقت تو لکھا ہوا ہے۔ جو شخص ثواب دنیا کے ارادے سے کام کرے گا اس کو ہم دنیا ہی میں سے دے دیں گے اور جو ثواب آخرت کے ارادے سے کام کرے گا وہ آخرت کا ثواب پائے گا اور شکر کرنے والوں کو ہم ان کی جزا ضرور عطا کریں گے۔"

ہر شخص کی موت کے لئے ایک لکھا ہوا وقت مقرر ہے اور کوئی شخص اس لکھے ہوئے وقت تک زندگی گزارنے سے پہلے ہرگز مر نہیں سکتا۔ اس لئے ڈر' خوف' ہراس اور جزع وفزع ایک پل بھر زندگی کی میعاد کو آگے نہیں بڑھا سکتا۔ شجاعت' ثابت قدمی' اقدام اور وفاداری سے عمر کم نہیں ہوتی۔ ناس ہو بزدلی کا! بزدلوں کی آنکھ نیند کو ترسے! جس کے لئے جو دن مقرر ہے' اس میں نہ ایک دن کی کمی ہو سکتی ہے اور نہ اضافہ!

اس حقیقت کے بیان سے نفس انسانی میں تقدیر اور اجل کی حقیقت بیٹھ جاتی ہے۔ اس لئے نفس انسانی اس کے بارے میں سوچنا چھوڑ دیتا ہے۔ اس کی کوئی پرواہ ہی نہیں کرتا۔ اس کی سوچ تمام تر ادائے فرض' وفائے عہد اور ایمانی تقاضوں کے پورا کرنے میں صرف ہوتی ہے۔ اس کی وجہ سے وہ حرص اور کنجوسی کے بندھنوں سے بھی آزاد ہو جاتا ہے اور خوف اور جزع وفزع پر بھی قابو پا لیتا ہے۔ اب وہ راہ حق کی تمام مشکلات کو انگیز کرتے ہوئے اور راہ حق کے فرائض پورے کرتے ہوئے بڑے صبر و سکون کے ساتھ اور توکل علی اللہ کرتے ہوئے آگے بڑھتا ہے۔ کیونکہ اب اس کی اس نئی سوچ کے مطابق' موت کا وقت اللہ کے ہاتھ میں ہے اور لکھا ہوا ہے۔

ذرا ایک قدم اور آگے جائیں۔ اس بات کا فیصلہ ہو گیا کہ عمر لکھی ہوئی ہے اور موت کا وقت متعین اور مقرر ہے تو بتایا جاتا ہے کہ اصل سوچ یہ ہے کہ تم اپنی کمائی کو دیکھو کہ اس وقت' آنے والے وقت' کے لئے تم نے کیا تیاری کی ہے اور کس مزید کمائی کا ارادہ ہے۔ اس نفس سے پوچھا جاتا ہے کہ اے نفس! کیا تم ایمان کے تقاضوں کو پس پشت ڈالنا چاہتے ہو اور کامیابی اور ناکامی کو اسی دنیا کے اندر محدود اور بند کرنا چاہتے ہو اور صرف اس دنیا کے لئے زندہ رہنا چاہتے ہو یا کہ تمہاری نظریں افق اعلیٰ پر بھی ہیں؟ کیا اس محدود دنیا کے مقابلے میں، بہت بڑی دنیا کی فکر بھی تمہیں ہے۔ اس دنیا کی محدود عمر کے غم اور اہتمام کے ساتھ ساتھ کیا آخرت کا ارادہ بھی ہے؟

وَمَنْ يُرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهِ مِنْهَا وَمَنْ يُرِدْ ثَوَابَ الْآخِرَةِ نُؤْتِهِ مِنْهَا

"جو شخص ثواب دنیا کے ارادے سے کام کرے گا اس کو ہم دنیا ہی میں دے دیں گے اور جو شخص ثواب آخرت کے ارادے سے کام کرے گا وہ آخرت کا ثواب پائے گا۔"

اور ان دونوں زندگیوں میں بہت بڑا فرق ہے۔ اور ان دونوں ارادوں میں بہت بڑا امتیاز ہے جبکہ دونوں صورتوں میں موت کا وقت وہی ہے جو مقرر ہے۔ فرق یہ ہے کہ جو شخص صرف اس دنیا کے لئے زندہ ہے اور صرف اس دنیا کا عوضانہ چاہتا ہے اس کی زندگی اور کیڑوں مکوڑوں اور ڈھور ڈنگروں کی زندگیوں میں کیا فرق ہے۔ دونوں کا وقت مقرر ہے۔ اور جس شخص کی نظریں دار آخرت پر لگی ہوئی ہیں' وہ انسانوں جیسی شریفانہ اور کریمانہ زندگی بسر کرتا ہے' اسے اللہ تعالیٰ نے چن لیا ہے۔ وہ اس کرۂ ارض پر اللہ کا خلیفہ ہے اور یہ بھی وقت مقرر پر اس دنیا سے رخصت ہو گا۔ وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ أَنْ تَمُوتَ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ كِتَابًا مُؤَجَّلًا

.... "کوئی ذی روح اللہ کے اذن کے بغیر نہیں مر سکتا۔ موت کا وقت لکھا ہوا ہے۔"

وَ سَنَجْزِی الشّٰكِرِیْنَ "اور شکر کرنے والوں کو ہم ان کی جزا ضرور عطا کریں گے۔" یہ کون ہیں؟ یہ وہ لوگ ہیں جو مقام انسانیت کو پالیتے ہیں اور اللہ نے انسان کو جو شرف عطا کیا ہے اس کی قدر کرتے ہیں۔ اس لئے وہ اپنے آپ کو حیوانی سطح سے ذرا اوپر رکھتے ہیں۔ اور اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں اور اس شکریہ کی صورت یہ ہے کہ وہ ایمان کے تقاضے پورے کرتے ہیں۔

غرض اس انداز میں حیات و ممات کی حقیقت ذہن نشین کرنے اور زندگی کے ان مقاصد اور ترجیحات کے حوالے سے اپنے لئے چن لیتے ہیں' قرآن کریم انسانوں کے سامنے دو راستے رکھتا ہے' ان کو دعوت فکر دی جاتی ہے کہ وہ اپنے لئے کون سا راستہ منتخب کرتے ہیں۔ وہ اپنے لئے محض کیڑے مکوڑوں کی زندگی پسند کرتے ہیں یا انسان مکرم کی زندگی پسند کرتے ہیں۔ یوں نفس انسانی خوف موت اور دنیا کی تکالیف پر جزع و فزع ترک کر کے ایک زیادہ مفید کام کی طرف منتقل ہونا پسند کرتا ہے اور یہ انتخاب وہ اپنے اختیار تمیزی سے کرتا ہے کیونکہ دونوں میں سے ہر راستہ وہ اختیار کر سکتا ہے۔ چاہے تو دنیا کا راستہ اختیار کرے اور چاہے تو آخرت کا راستہ اختیار کرے۔ جو راہ بھی وہ اختیار کرے' اس کا صلہ پائے گا۔

اس کے بعد قرآن کریم بطور مثل زمانہ ماقبل کے اہل ایمان کی مثال بیان کرتا ہے۔ اس لئے کہ انسانیت کی طویل تاریخ میں' زندگی کی گزرگاہوں میں قافلہ ایمان ہمیشہ رواں دواں رہا ہے۔ یہ مثال ان لوگوں کی ہے جو اپنے وعدہ ایمان پر سچے رہے۔ انہوں نے اپنے نبیوں کے ساتھ داد شجاعت دی۔ جب مصیبت میں مبتلا ہوئے تو جزع و فزع نہیں کی۔ اور اس مقام جہاد میں انہوں نے ایمانی آداب کی سخت پاسداری کی۔ وہ موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے رہے۔ اور ان کے منہ سے اف تک نہ سنی گئی بس صرف اللہ سے استغفار کرتے رہے۔ وہ اپنی معمولی غلطیوں کو بھی بڑا قصور تصور کرتے اور اسے "اسراف" سے تعبیر کرتے۔ وہ اپنے رب سے صرف صبر و ثبات کے ذریعہ کفار کے مقابلے میں نصرت طلب کرتے۔ اور ان کا یہی رویہ تھا جس کی وجہ سے وہ ثواب دارین حاصل کر پائے۔ یہ ثواب انہیں اس لئے دیا گیا کہ وہ نہایت ہی عاجزی سے دست بدعا ہوتے اور جہاد کے مواقف پر احسان اور حسن نیت سے قائم رہتے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مسلمانوں کے لئے مثال بن گئے۔

وَ كَاَیِّنْ مِّنْ نَّبِیٍّ قٰتَلَ ۙ مَعَهٗ رِبِّیُّوْنَ كَثِیْرٌ ۚ فَمَا وَهَنُوْا لِمَاۤ اَصَابَهُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَ مَا ضَعُفُوْا وَ مَا اسْتَكَانُوْا ؕ وَ اللّٰهُ یُحِبُّ الصّٰبِرِیْنَ ۝ وَ مَا كَانَ قَوْلَهُمْ اِلَّاۤ اَنْ قَالُوْا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَ اِسْرَافَنَا فِیْۤ اَمْرِنَا وَ ثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَ انْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِیْنَ ۝ فَاٰتٰىهُمُ اللّٰهُ ثَوَابَ الدُّنْیَا وَ حُسْنَ ثَوَابِ الْاٰخِرَةِ ؕ وَ اللّٰهُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ

"اس سے پہلے کتنے ہی نبی ایسے گزر چکے ہیں جن کے ساتھ مل کر بہت سے خدا پرستوں نے جنگ کی۔ اللہ کی راہ میں جو مصیبتیں ان پر پڑیں ان سے وہ دل شکستہ نہیں ہوئے۔ انہوں نے کمزوری نہیں دکھائی' وہ سرنگوں نہیں ہوئے۔ ایسے ہی لوگوں کو اللہ پسند کرتا ہے۔ ان کی دعا بس یہ تھی کہ "اے ہمارے رب! ہماری غلطیوں اور کوتاہیوں سے درگزر فرما' ہمارے کام میں تیرے حدود سے جو تجاوز ہو گیا ہو اسے معاف کر دے' ہمارے قدم جما دے اور کافروں کے مقابلے میں ہماری مدد کر۔" آخر کار اللہ نے انہیں دنیا کا ثواب بھی دیا اور اس سے بہتر آخرت کا ثواب بھی دیا۔ اللہ کو ایسے نیک عمل لوگ پسند ہیں۔"

احد میں مسلمانوں کو ہزیمت کا جو صدمہ ہوا' وہ اس قسم کا پہلا صدمہ تھا۔ اس سے قبل بدر میں اللہ نے انہیں فتح مندی عطا کی تھی' حالانکہ وہ مخالفین سے کئی گنا کم تھے۔ اس فتح کے بعد ان کے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ گویا یہ فتح شاید ان کے حق میں ایک تکوینی سنت الٰہی ہے' لیکن احد کا تجربہ ان کے لئے اچانک تھا۔ وہ غیر متوقع ابتلاء سے دوچار ہو گئے۔

یہی وجہ ہے کہ واقعہ احد پر قرآن کریم نے طویل ترین تبصرہ کیا ہے۔ اس میں کبھی تو اہل ایمان کو تسلی دی گئی ہے اور کبھی ان پر سخت نکیر کی گئی ہے' کبھی ان کی بات کی تائید کی گئی اور کسی جگہ انہیں تمثیلات سے سمجھایا گیا ہے۔ یوں ان کے نفوس کی تربیت کی گئی ہے' ان کے تصور حیات کی تصحیح کی گئی ہے اور انہیں آنے والے معرکوں کے لئے تیار کیا گیا ہے' اس لئے کہ ان کی راہ طویل تھی' اور ان کے سامنے مشکل مراحل تھے' بھاری فرائض ان پر عائد ہوتے تھے اور وہ جس عظیم انقلاب کے نمائندے تھے وہ ایک عظیم الشان امر تھا۔

یہاں ان کے سامنے جو مثال پیش کی گئی ہے وہ ایک عام مثال ہے۔ اس مثال میں کسی ایک نبی کی بات نہیں کی گئی۔ کسی ایک قوم کی بات بھی نہیں کی گئی' بلکہ قافلہ ایمان کی بات کی گئی ہے۔ آداب مؤمنین کی بات کی گئی۔ بتایا گیا ہے کہ ابتلا ایک ایسا مرحلہ ہے جو ہر دعوت اور ہر دین میں پیش آتا رہتا ہے۔ تمام انبیاء کے متبعین تمہارے اسلاف ہیں۔ اس لئے قافلۂ ایمان دراصل ایک ہے اور ایک ہی تسلسل ہے۔ یہ بات ذہن نشین کرائی جاتی ہے کہ نظریۂ حیات ایک ہی ہے اور یہ سب کے سب ایک ہی ایمانی فوج کی رجمنٹ ہیں۔

وَكَأَيِّن مِّن نَّبِيٍّ قَاتَلَ مَعَهُ رِبِّيُّونَ كَثِيرٌ فَمَا وَهَنُوا لِمَا أَصَابَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَمَا ضَعُفُوا وَمَا اسْتَكَانُوا ۗ وَاللَّهُ يُحِبُّ الصَّابِرِينَ ﴿١٤٦﴾

"اس سے پہلے کتنے ہی نبی گزرے ہیں جن کے ساتھ مل کر بہت سے خدا پرستوں نے جنگ کی۔ اللہ کی راہ میں جو مصیبتیں ان پر پڑیں ان سے وہ دل شکستہ نہیں ہوئے' انہوں نے کمزوری نہیں دکھائی اور نہ وہ باطل کے آگے سرنگوں ہوئے۔"

کتنے ہی نبی گزر چکے ہیں جن کے ساتھ اسلامی جماعتیں لڑ چکی ہیں۔ انہوں نے تو کمزوری نہیں دکھائی۔ ان پر جو مشکلات پڑیں' جو مصائب و شدائد پیش آئے' وہ جس درد و الم میں مبتلا ہوئے وہ تم سے کچھ کم نہ تھا لیکن انہوں نے کمزوری نہیں دکھائی۔ انہوں نے اس جدوجہد کا سلسلہ ختم نہیں کر دیا۔ نہ وہ ان مشکلات کے سامنے جھکے اور نہ دشمنوں کے سامنے جھکے۔ مومنین کی شان تو ایسی ہوتی ہے' اس لئے کہ وہ ایمان اور نظریۂ حیات کے لئے جدوجہد کر رہے ہوتے ہیں۔ وَاللَّهُ يُحِبُّ الصَّابِرِينَ .... "ایسے ہی صابروں کو اللہ پسند کرتا ہے۔" جن کے نفوس ضعف نہیں دکھاتے' ان کی قوتیں مضمحل نہیں ہوتیں' ان کے عزائم نرم نہیں پڑتے۔ وہ نہ جھکتے ہیں اور نہ سرنگوں ہوتے ہیں۔ یہ تعبیر کہ اللہ صابرین کو محبوب رکھتے ہیں نہایت ہی موثر تعبیر ہے۔ اس میں خاص اشارہ پایا جاتا ہے۔ یہ محبت اور پیغام محبت تمام دردوں اور تمام دکھوں کے لئے مرہم ہے' اس سے تمام زخم مندمل ہو جاتے ہیں اور تمام تلخیاں اور تمام تھکاوٹیں ختم ہو جاتی ہیں۔

یہاں تک تو ان سابق اہل ایمان کے ظاہری موقف کا ذکر کیا گیا کہ وہ ظاہری مشکلات کے مقابلے میں یہ ثابت قدمی اختیار کرتے ہیں' لیکن آنے والی آیت ان کی داخلی کیفیات اور ان کے ایمان و شعور کی تصویر کشی بھی کرتی ہے۔ دکھایا جاتا ہے کہ وہ جناب باری میں کتنے مودب ہیں۔ وہ اس خوف کا مقابلہ کس طرح کرتے ہیں جو ان کے نفس پر طاری ہوتا ہے اور جو مدہوش کرنے والا ہوتا ہے' نہایت ہی دہشت ناک ہوتا ہے اور جو نفس انسانی کو پوری طرح گرفت میں لے لیتا ہے' کیونکہ یہ خطرہ اٹل ہوتا ہے لیکن ایسا خوف و خطر بھی ان اہل ایمان کی توجہ الی اللہ پر اثرانداز نہیں ہو سکتا' وہ ایسے حالات میں بھی اللہ سے لو لگائے رکھتے ہیں۔ اور ایسے حالات میں بادی النظر میں کسی

انسان کا یہی مطالبہ ہو سکتا ہے کہ اے اللہ ہمیں فتح نصیب کر لیکن وہ صرف عفوو درگزر کا سوال کرتے ہیں' یوں وہ گویا ادائیگی فرض میں اپنی کوتاہیوں اور خطاکاریوں کا اعتراف کرتے ہیں اور کے بعد وہ ثابت قدمی اور دشمنوں پر فتح مندی کی دعا کرتے ہیں۔

وَمَا كَانَ قَوْلَهُمْ إِلَّآ أَن قَالُوا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَإِسْرَافَنَا فِيٓ أَمْرِنَا وَثَبِّتْ أَقْدَامَنَا وَانصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَٰفِرِينَ ﴿۱۴۷﴾

"ان کی دعابس یہ تھی کہ "اے ہمارے رب! ہماری غلطیوں اور کوتاہیوں سے درگزر فرما' ہمارے کام میں تیرے حدود سے جو تجاوز ہو گیا ہے' اسے معاف کر دے' ہمارے قدم جمادے اور کافروں کے مقابلے میں ہماری مدد کر۔"

ان کا سوال کسی دولت و نعمت کے لئے نہ تھا' بلکہ انہوں نے ثواب و جزا کا مطالبہ بھی نہیں کیا نہ انہوں نے ثواب دنیا کا مطالبہ کیا اور نہ ہی ثواب آخرت کا۔ وہ تو جناب باری میں بڑے ادب سے کھڑے تھے۔ وہ ذات باری کی طرف متوجہ تھے' حالانکہ وہ حالت قتال میں تھے' انہوں نے اس حال میں بھی صرف اپنے گناہوں کی مغفرت طلب کی اور صرف ثابت قدمی کی دعا کی۔ کفار کے مقابلے میں کامیابی کی دعا کی۔ یہاں تک کہ وہ یہ نصرت و کامرانی بھی اپنے لئے طلب نہیں کرتے۔ وہ اس میں بھی کفر کی شکست اور کفار کے لئے مناسب سزا کا مطالبہ کرتے ہیں۔ یہ ہے جناب باری تعالیٰ کی درگاہ میں احترام و ادب جس کے وہ لائق ہے اور جو اہل ایمان کا شیوہ ہے۔

یہ مثال کہ اہل ایمان اپنے لئے کچھ نہیں مانگتے۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ نے انہیں سب کچھ دے دیا۔ انہیں وہ کچھ دے دیا جس کی طالب دنیا بھی تمنا کر سکتی ہے۔ نیز انہیں وہ سب کچھ بھی دے دیا جس کی تمنا کوئی طالب آخرت کر سکتا ہے۔ فَـَٔاتَىٰهُمُ اللَّهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَحُسْنَ ثَوَابِ الْاٰخِرَةِ ؕ .... "آخر کار اللہ نے ان کو دنیا کا ثواب بھی دیا اور اس سے بہتر آخرت کا ثواب بھی دیا۔"

اب اللہ تعالیٰ شہادت دیتے ہیں کہ یہ لوگ محسنین میں سے تھے' انہوں نے بارگاہ الٰہی میں بہترین ادب کا مظاہرہ کیا اور انہوں نے بہترین مظاہرہ دوران جہاد کیا' اس لئے اللہ تعالیٰ نے اعلان کر دیا کہ وہ ان سے محبت کرتے ہیں اور یہ وہ نعمت ہے جو ہر قسم کے ثواب سے بھی زیادہ قیمتی ہے۔ وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ .... "اللہ کو ایسے ہی نیک عمل لوگ پسند ہیں۔"

اس انداز میں یہ پیراگراف ختم ہوتا ہے' جس میں اسلامی تصور حیات کے نہایت ہی اساسی حقائق کو پیش کیا گیا' جن کی وجہ سے پہلی اسلامی جماعت کی بہترین تربیت ہوئی اور جو ہر نسل اور ہر دور میں اٹھنے والی تحریک اور ہر دور کی امت کے لئے سرمایہ بصیرت ہے۔

☆......○......☆

اب یہ تبصرہ ایک قدم اور آگے بڑھتا ہے۔ اس معرکہ کے کچھ اور واقعات سامنے رکھے جاتے ہیں تاکہ ان سے بصیرت افروز نتائج اخذ کئے جا سکیں۔ اہل ایمان کی نظریاتی تصحیح ہو' ان کے نفوس کی تربیت ہو' انہیں آگاہ کیا جائے کہ اس راہ میں کہاں کہاں پھسلنے کا خطرہ ہے' انہیں بتایا جائے کہ ان کے اردگرد سازشوں کے جال بچھے ہوئے ہیں' اور دشمن گھات میں بیٹھے ہوئے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ احد میں شکست کی وجہ سے مدینہ کے کفار' منافقین اور یہود کو از سر نو سازشیں کرنے کا موقعہ مل گیا تھا' اس لئے کہ اس وقت تک اہل مدینہ اہل اسلام کے لئے نیک نیت نہ ہوئے تھے۔ اس شہر میں ابھی تک مسلمان اجنبی تھے۔ اس اجنبی تحریک اور اس نئے پودے کے اردگرد جنگ بدر نے رعب اور دبدبے کی ایک باڑ قائم کر دی تھی۔ کیونکہ بدر میں اہل اسلام کو نہایت ہی فیصلہ کن فتح حاصل ہوئی تھی اور جب احد میں شکست ہوئی تو یہ صورت حال بدل گئی۔ اسلام کے ان خفیہ دشمنوں کو موقعہ مل گیا کہ وہ اپنے دلی کینہ اور

بغض وعناد کا اظہار کر سکیں۔ اور معاشرے کے اندر زہر آلود پروپیگنڈا کر سکیں۔ اور جن گھرانوں میں لوگ شہید ہوگئے تھے' یا جن میں لوگ شدید زخمی تھے اور ایک کہرام مچا ہوا تھا ان میں اُن کے اس زہر آلود پروپیگنڈے اور سازشوں کے لئے راہ ہموار ہوگئی تھی چنانچہ ان لوگوں نے اب کھل کر ریشہ دوانیاں شروع کر دی تھیں۔

آنے والے پیراگرافوں میں اس معرکہ کے اہم واقعات کا نقشہ کھینچا گیا ہے اور اس کے بڑے بڑے واقعات قلم بند کئے گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سب سے پہلے مسلمانوں کو متنبہ کرتے ہیں کہ کافروں کی پیروی مت کرو' تمہیں فتح حاصل ہوگی اور کافروں کے دلوں میں تمہارا رعب از سرنو پیدا ہوگا' انہیں بتایا جاتا ہے کہ ابتدائے معرکہ میں تو تمہیں فتح ہوئی اور یہ میرے وعدے کے مطابق تھی جسے تم نے کمزوری دکھا کر ضائع کیا' آپس میں نزاع اور خلاف کیا' رسول خدا کے حکم کی خلاف ورزی کی' اس کے بعد انہیں اس معرکے کے دونوں رخ زندہ اور متحرک صورت میں بتائے جاتے ہیں۔ ہزیمت کے بعد افراتفری' پھر اہل ایمان کے لئے تسلی و اطمینان کا سامان اور اہل نفاق کے دلوں میں حسرت و یاس' جن کے خیالات اللہ کے بارے میں اچھے نہ تھے۔ نیز انہیں یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ اس معرکہ میں واقعات کا رخ شکست کی جانب پھیرنے میں بھی اللہ تعالیٰ کی لطیف حکمت کارفرما تھی' نیز یہ کہ موت کا ایک دن متعین ہے اور اس سلسلے میں اہل کفر اپنے گمراہ کن پروپیگنڈے کے ذریعہ جو گمراہی پھیلا رہے ہیں ان سے بچ کر رہو اور آخر کار تمہیں بہرحال اللہ کے سامنے پیش ہونا ہے وہ اپنی موت مریں یا شہید ہوں جانا تو ادھر ہی ہے۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن تُطِيعُوا الَّذِينَ كَفَرُوا يَرُدُّوكُمْ عَلَىٰ أَعْقَابِكُمْ فَتَنقَلِبُوا خَاسِرِينَ ﴿۱۴۹﴾ بَلِ اللَّهُ مَوْلَاكُمْ ۖ وَهُوَ خَيْرُ النَّاصِرِينَ ﴿۱۵۰﴾ سَنُلْقِي فِي قُلُوبِ الَّذِينَ كَفَرُوا الرُّعْبَ بِمَا أَشْرَكُوا بِاللَّهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهِ سُلْطَانًا ۖ وَمَأْوَاهُمُ النَّارُ ۚ وَبِئْسَ مَثْوَى الظَّالِمِينَ ﴿۱۵۱﴾ وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللَّهُ وَعْدَهُ إِذْ تَحُسُّونَهُم بِإِذْنِهِ ۖ حَتَّىٰ إِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِي الْأَمْرِ وَعَصَيْتُم مِّن بَعْدِ مَا أَرَاكُم مَّا تُحِبُّونَ ۚ مِنكُم مَّن يُرِيدُ الدُّنْيَا وَمِنكُم مَّن يُرِيدُ الْآخِرَةَ ۚ ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ لِيَبْتَلِيَكُمْ ۖ وَلَقَدْ عَفَا عَنكُمْ ۗ وَاللَّهُ ذُو فَضْلٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ ﴿۱۵۲﴾ إِذْ تُصْعِدُونَ وَلَا تَلْوُونَ عَلَىٰ أَحَدٍ وَالرَّسُولُ يَدْعُوكُمْ فِي أُخْرَاكُمْ فَأَثَابَكُمْ غَمًّا بِغَمٍّ لِّكَيْلَا تَحْزَنُوا عَلَىٰ مَا فَاتَكُمْ وَلَا مَا أَصَابَكُمْ ۗ وَاللَّهُ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ ﴿۱۵۳﴾ ثُمَّ أَنزَلَ عَلَيْكُم مِّن بَعْدِ الْغَمِّ

أَمَنَةً نُّعَاسًا يَّغْشٰى طَآئِفَةً مِّنْكُمْ ۙ وَطَآئِفَةٌ قَدْ اَهَمَّتْهُمْ اَنْفُسُهُمْ يَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ ۭ يَقُوْلُوْنَ هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَيْءٍ ۭ قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ ۭ يُخْفُوْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ مَّا لَا يُبْدُوْنَ لَكَ ۭ يَقُوْلُوْنَ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ مَّا قُتِلْنَا هٰهُنَا ۭ قُلْ لَّوْ كُنْتُمْ فِيْ بُيُوْتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِيْنَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ اِلٰى مَضَاجِعِهِمْ ۚ وَلِيَبْتَلِيَ اللّٰهُ مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ وَلِيُمَحِّصَ مَا فِيْ قُلُوْبِكُمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۱۵۴﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَلَّوْا مِنْكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ ۙ اِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطٰنُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوْا ۚ وَلَقَدْ عَفَا اللّٰهُ عَنْهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿۱۵۵﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَقَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ اِذَا ضَرَبُوْا فِي الْاَرْضِ اَوْ كَانُوْا غُزًّى لَّوْ كَانُوْا عِنْدَنَا مَا مَاتُوْا وَمَا قُتِلُوْا ۚ لِيَجْعَلَ اللّٰهُ ذٰلِكَ حَسْرَةً فِيْ قُلُوْبِهِمْ ۭ وَاللّٰهُ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۱۵۶﴾ وَلَئِنْ قُتِلْتُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَوْ مُتُّمْ لَمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَحْمَةٌ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ﴿۱۵۷﴾ وَلَئِنْ مُّتُّمْ اَوْ قُتِلْتُمْ لَاِلَى اللّٰهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿۱۵۸﴾

۱۶ ع ۷ ۷

"اے لوگو! جو ایمان لائے ہو' اگر تم ان لوگوں کے اشاروں پر چلو گے جنہوں نے کفر کی راہ اختیار کی ہے تو وہ تم کو الٹا پھیر لے جائیں گے اور تم نامراد ہو جاؤ گے۔ (ان کی باتیں غلط ہیں) حقیقت یہ ہے کہ اللہ تمہارا حامی و مددگار ہے اور وہ بہترین مدد کرنے والا ہے۔ عنقریب وہ وقت آنے والا ہے جب ہم منکرین حق کے دلوں میں رعب بٹھا دیں گے' اس لئے کہ انہوں نے اللہ کے ساتھ ان کو خدائی میں شریک ٹھہرایا ہے، جن کے شریک ہونے پر اللہ نے کوئی سند نازل نہیں کی۔ ان کا آخری ٹھکانا جہنم ہے اور بہت ہی بری ہے وہ قیام گاہ جو ان ظالموں کو نصیب ہو گی۔

اللہ نے (تائید و نصرت کا) جو وعدہ تم سے کیا تھا' وہ تو اس نے پورا کر دیا۔ ابتدا میں (اس کے حکم سے تم ہی ان کو قتل کر رہے تھے۔ مگر جب تم نے کمزوری دکھائی اور اپنے کام میں باہم اختلاف کیا' اور جونہی کہ وہ چیز اللہ نے تمہیں دکھائی جس کی محبت میں تم گرفتار تھے (یعنی

مال غنیمت) تم اپنے سردار کے حکم کی خلاف ورزی کر بیٹھے.... اس لئے کہ تم میں سے کچھ لوگ دنیا کے طالب تھے اور کچھ آخرت کی خواہش رکھتے تھے۔ تب اللہ نے تمہیں کافروں کے مقابلہ میں پسپا کر دیا تاکہ تمہاری آزمائش کرے۔ اور حق یہ ہے کہ اللہ نے پھر بھی تمہیں معاف ہی کر دیا کیونکہ مومنوں پر اللہ بڑی نظر عنایت رکھتا ہے۔

یاد کرو جب تم بھاگے چلے جارہے تھے' کسی کی طرف پلٹ کر دیکھنے تک کا ہوش تمہیں نہ تھا اور رسول تمہارے پیچھے تم کو پکار رہا تھا۔ اس وقت تمہاری اس روش کا بدلہ اللہ نے تمہیں یہ دیا کہ تم کو رنج پر رنج دیئے تاکہ آئندہ کے لئے تمہیں یہ سبق ملے کہ جو کچھ تمہارے ہاتھ سے جائے یا جو مصیبت تم پر نازل ہو اس پر ملول نہ ہو۔ اللہ تمہارے سب اعمال سے باخبر ہے۔

اس غم کے بعد پھر اللہ نے تم میں سے کچھ لوگوں پر ایسی اطمینان کی سی حالت طاری کر دی کہ وہ اونگھنے لگے۔ مگر ایک دوسرا گروہ' جس کے لئے ساری اہمیت بس اپنی ذات ہی کی تھی' اللہ کے متعلق طرح طرح کے جاہلانہ گمان کرنے لگا جو سراسر خلاف حق تھے۔ یہ لوگ اب کہتے ہیں کہ "اس کام کے چلانے میں ہمارا بھی کوئی حصہ ہے؟" ان سے کہو "(کسی کا کوئی حصہ نہیں) اس کام کے سارے اختیارات اللہ کے ہاتھ میں ہیں۔" دراصل یہ لوگ اپنے دلوں میں جو بات چھپائے ہوئے ہیں' اسے تم پر ظاہر نہیں کرتے۔ ان کا اصل مطلب یہ ہے کہ "اگر (قیادت کے) اختیارات میں ہمارا کچھ حصہ ہوتا تو یہاں ہم نہ مارے جاتے۔" ان سے کہہ دو کہ "اگر تم اپنے گھروں میں بھی ہوتے تو جن لوگوں کی موت لکھی ہوئی تھی وہ خود اپنی قتل گاہوں کی طرف نکل آتے۔" اور یہ معاملہ جو پیش آیا' یہ تو اس لئے تھا کہ جو کچھ تمہارے سینوں میں پوشیدہ ہے اللہ اسے آزمالے اور جو کھوٹ تمہارے دلوں میں ہے اسے چھانٹ دے' اللہ دلوں کا حال خوب جانتا ہے۔

تم میں سے جو لوگ مقابلہ کے دن پیٹھ پھیر گئے تھے ان کی اس لغزش کا سبب یہ تھا کہ ان کی بعض کمزوریوں کی وجہ سے شیطان نے ان کے قدم ڈگمگا دیئے تھے۔ اللہ نے انہیں معاف کر دیا' اللہ بہت درگزر کرنے والا اور بردبار ہے۔

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو' کافروں کی سی باتیں نہ کرو جن کے عزیز و اقارب اگر کبھی سفر پر جاتے ہیں یا جنگ میں شریک ہوتے ہیں (اور وہاں کسی حادثہ سے دوچار ہو جاتے ہیں) تو وہ کہتے ہیں کہ اگر وہ ہمارے پاس ہوتے تو نہ مارے جاتے اور نہ قتل ہوتے۔ اللہ اس قسم کی باتوں کو ان کے دلوں میں حسرت و اندوہ کا سبب بنا دیتا ہے' ورنہ دراصل مارنے اور جلانے والا تو اللہ ہی ہے اور تمہاری تمام حرکات پر وہی نگراں ہے۔ اگر تم اللہ کی راہ میں مارے جاؤ یا مرجاؤ تو اللہ کی جو رحمت اور بخشش تمہارے حصہ میں آئے گی وہ ان ساری چیزوں سے زیادہ بہتر ہے۔ جنہیں یہ لوگ جمع کرتے ہیں اور خواہ تم مرو یا مارے جاؤ بہرحال تم سب کو سمٹ کر جانا اللہ ہی کی طرف ہے۔"

آیات کے اس مجموعے کو اگر گہری نظر سے دیکھا جائے تو یہ اپنے اندر زندگی سے بھرپور مناظر کی ایک بڑی مقدار لئے ہوئے ہے اور ان مناظر کے علاوہ انسانی زندگی اور اسلامی تصور حیات دونوں کے نہایت ہی اساسی حقائق اس میں ثبت کئے گئے ہیں۔ نیز اس میں اس کائنات کے بعض اٹل اصول بھی بیان کئے گئے ہیں۔ جہاں تک اس معرکے کا تعلق ہے' اس کی جھلکیاں زندگی سے بھرپور' بڑی تیزی کے ساتھ اور بڑی گہرائی کے ساتھ پیش کی گئی ہیں' اس معرکے کا کوئی اہم پہلو نہیں چھوڑا گیا اور وہ اس انداز میں قلم بند ہوا ہے کہ اسے پڑھ کر شعور اور جذبات میں ایک طلاطم برپا ہو جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ پوری طرح زندہ' جزئیات پر مشتمل پوری فضائے جنگ اور اس کے حالات و واقعات ان میں ریکارڈ کئے گئے ہیں۔ اس کے اندر انسانی ضمیر میں پیدا ہونے والے خلجان اور شعوری اور لاشعوری حرکات کی طرف بھی اشارے کئے گئے ہیں۔ جن کی وجہ سے سیرت النبی کی مفصل کتابوں میں بیان کردہ تمام واقعات مستحضر ہو جاتے ہیں اور اس تبصرے کے نتیجے میں اسلامی تصور حیات کے اصلی حقائق' زندہ شکل میں' حرکت کرتے ہوئے اور مسلمانوں کے لئے صحیح تصور حیات تعمیر

کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

اس میں شک نہیں ہے کہ اس معرکے کے تمام مشاہدات اور پورے حقائق کو الفاظ و فقرات کی اس مختصر مقدار میں' زندگی سے بھرپور انداز میں' حرکات اور اشارات کے اس مخصوص انداز میں ثبت کر دینا' کسی انسانی تعبیر کے لئے نہ ممکن ہے اور نہ ہی تاریخ آداب انسانی میں اس کی کوئی مثال ہے اور اس کا ادراک وہی شخص کر سکتا ہے جسے اسلوب ادا کے اسرار اور انسان کی قوت ادا کی حدود کا علم ہوتا ہے' خصوصاً وہ لوگ جن کو مشکل تعبیرات سے واسطہ پڑتا ہے اور جو فن تعبیر میں درک رکھتے ہیں۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن تُطِيعُوا الَّذِينَ كَفَرُوا يَرُدُّوكُمْ عَلَىٰ أَعْقَابِكُمْ فَتَنقَلِبُوا خَاسِرِينَ ۞ بَلِ اللَّهُ مَوْلَاكُمْ ۖ وَهُوَ خَيْرُ النَّاصِرِينَ

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو' اگر تم ان لوگوں کے اشاروں پر چلو گے جنہوں نے کفر کی راہ اختیار کی ہے تو وہ تم کو الٹا پھیر لے جائیں گے تو تم نامراد ہو جاؤ گے۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ ہی تمہارا حامی و مددگار ہے اور وہ بہترین مدد کرنے والا ہے۔"

جنگ احد میں مسلمانوں کو جو شکست ہوئی' ایک بڑی تعداد ماری گئی۔ ایک بڑی تعداد زخمی ہوئی۔ اس سے مدینہ کے کفار' منافقین اور یہودیوں کو یہ موقعہ مل گیا کہ وہ از سر نو انہیں اور مسلمانوں کو حضرت محمد ﷺ کا ساتھ دینے کے نتائج سے ڈرائیں۔ انہیں جنگ کی ہولناکیوں سے آگاہ کریں اور خصوصاً مکہ کے مشرکین اور قریش کے حلفاء کے ساتھ مزید معرکہ آرائی کے نتائج سے انہیں خائف کریں۔ ظاہر ہے کہ شکست و ریخت کی یہ فضاء دلوں کو متزلزل کرنے' اسلامی صفوں کو منتشر کرنے اور اسلامی قیادت کے خلاف بداعتمادی پیدا کرنے اور اپنے مقابلے میں زیادہ طاقتور قوتوں کے ساتھ ٹکرانے پر اصرار کرنے کی پالیسی کو جاری رکھنے کے فوائد کو مشکوک بنانے اور اس پالیسی سے نکل آنے کی افادیت ظاہر کرنے' اور کامیاب ہونے والوں کے ساتھ مصالحت کی احادیث ظاہر کرنے اور اس سلسلے میں انفرادی درد و غم کو برانگیختہ کرنے کے لئے بہت زیادہ موزوں تھی۔ یہ لوگ چاہتے تھے کہ اس فضا سے فائدہ اٹھا کر اسے جماعت مسلمہ کی بیخ کنی کے لئے استعمال کیا جائے۔ اس کے بعد اسلامی نظریۂ حیات کی بیخ کنی تک اسے پہنچایا جائے اور اہل اسلام کو اس پر آمادہ کر لیا جائے کہ وہ اپنے سے قوی تر لوگوں کے سامنے جھک جائیں۔

یہی وجہ ہے کہ یہاں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اس امر سے سخت الفاظ میں ڈرا کر منع فرمایا کہ وہ پالیسی کے معاملات میں اہل کفر کی اطاعت نہ کریں۔ اس معاملہ میں اگر وہ ان کی پیروی کریں گے تو اس کا نتیجہ لازماً خسارے کی شکل میں سامنے آئے گا۔ اس میں کوئی نفع اور کوئی فائدہ نہ ہو گا۔ البتہ یہ ہو گا کہ وہ الٹے پاؤں پھر دوبارہ کفر میں داخل ہو جائیں گے۔ مومن کے لئے دو ہی راستے ہیں' یا تو وہ کفر اور اہل کفر کے ساتھ مسلسل برسرجنگ رہے گا' باطل اور اہل باطل کے ساتھ برسرپیکار رہے گا اور پھر یا الٹے پاؤں پھر کر مرتد ہو جائے گا۔ نعوذ باللہ منہا۔ ان دو راستوں کے سوا کوئی تیسرا راستہ نہیں ہے کہ وہ علیحدہ ہو کر غیر جانبدار کھڑا ہو جائے' بین بین رہے اور اپنے موقف پر بھی جما رہے اور اپنے دین کی حفاظت کر رہا ہو۔ ہو سکتا ہے کہ اس کی سوچ میں یہ بات آتی ہو خصوصاً اس معرکے میں شکست کی فضا میں' چوٹ اور زخم کھا کر وہ یہ سوچ رہا ہو کہ مومن کے لئے ممکن ہے کہ وہ غالب قوتوں کے ساتھ اس معرکہ آرائی سے نکل آئے' ان کے ساتھ مصالحت کرے' ان کی پیروی کرے اور اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنے دین کی حفاظت بھی کرتا ہو' اس کا عقیدہ اپنی جگہ درست ہو' اس کا ایمان قائم ہو' اس کا وجود بھی قائم رہے لیکن یہ سوچ ایک خطرناک واہمہ ہے اس لئے کہ حق و باطل کے اس معرکے میں جو آگے نہیں بڑھتا وہ لازماً پیچھے کو پلٹتا ہے۔ اور جو شخص کفر' شر' باطل' گمراہی اور نافرمانی کے خلاف جدوجہد نہیں کرتا وہ لازماً ذلیل و خوار ہو گا' الٹے پاؤں

پھرے گا اور کفر' شر' گمراہی' باطل اور نافرمانی میں داخل ہو جائے گا۔ جسے اس کا ایمان نہ بچا سکے' اس کا نظریۂ حیات نہ بچا سکے' اور اس کے ساتھ ساتھ وہ کفار کی پیروی کر رہا ہو' ان کی بات سن رہا ہو اور ان پر اعتماد کر رہا ہو تو درحقیقت اس شخص نے اپنے ایمان اور نظریۂ حیات کا موقف چھوڑ دیا ہے۔ وہ روحانی طور پر شکست کھا چکا ہے کیونکہ جب ایک نظریاتی شخص اپنے مخالفین کے سامنے جھکتا ہے تو وہ روحانی طور پر ٹوٹ چکا ہوتا ہے۔ اس لئے کہ اب وہ ان کی وسوسہ اندازی سے متاثر ہوتا ہے۔ ان سے ہدایات لیتا ہے۔ یہی تو ہے شکست۔ اب کسی بھی وقت دوبارہ عقیدہ کفر کی طرف پلٹ سکتا ہے۔ اسے اس آخری شکست سے بچانے والا کوئی نہیں ہے۔ اگرچہ ابتدا میں اسے احساس نہیں ہوتا کہ وہ ایک ایسی راہ پر پڑ گیا ہے جس کا انجام حسرتناک ہو گا۔ صحیح مومن تو وہ ہوتا ہے جو اپنے عقیدے اور اپنی قیادت کی وجہ سے اپنے نظریاتی دشمنوں اور اپنی قیادت کے دشمنوں سے بے نیاز ہو جاتا ہے اور جب بھی وہ ان دشمنوں کی طرف کان دھرے گا گویا اس نے الٹے پاؤں سفر کا آغاز کر دیا ہے۔ یہ ایک فطری حقیقت اور ایک عملی حقیقت ہے اور اللہ تعالیٰ اس سے اہل ایمان کو آگاہ فرماتے ہیں' متنبہ کرتے ہیں اور پکارتے ہیں يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓاْ إِن تُطِيعُواْ ٱلَّذِينَ كَفَرُواْ يَرُدُّوكُمْ عَلَىٰٓ أَعْقَٰبِكُمْ فَتَنقَلِبُواْ خَٰسِرِينَ ......

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو' اگر تم ان لوگوں کے اشاروں پر چلو گے جنہوں نے کفر کی راہ اختیار کی ہے تو وہ تم کو الٹا پھیر لے جائیں گے اور تم نامراد ہو جاؤ گے۔"

اس سے بڑا خسارہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ انسان الٹے پاؤں پھرے اور ایمان کے بعد کفر کی راہ از سر نو اختیار کرے۔ اگر ایمان چلا جائے تو پھر کون سا فائدہ اس کی کمی پوری کر سکتا ہے؟

سوال یہ ہے کہ تم کفار کی طرف مائل صرف اس لئے ہو سکتے ہو کہ تم ان سے حمایت کی امید رکھتے ہو گے اور یہ کہ ان کو اس وقت فتح حاصل ہے۔ یہ بہت بڑا وہم ہے جس میں تم مبتلا ہو' اس لئے اس وہم کو رد کرنے کے لئے اچانک روئے سخن اس طرف مڑتا ہے کہ منبع نصرت و حمایت کہاں ہے بَلِ ٱللَّهُ مَوْلَىٰكُمْ ۖ وَهُوَ خَيْرُ ٱلنَّٰصِرِينَ .... "حقیقت یہ ہے کہ تمہارا حامی و مددگار صرف اللہ ہے اور وہ بہترین مدد کرنے والا ہے۔"

مسلمانوں کی ولایت کا مرجع اللہ ہے۔ وہ اسی سے نصرت طلب کر سکتے ہیں اور جس کا مددگار اللہ ہو تو اسے کسی دوسرے مددگار کی ضرورت کیا رہتی ہے؟ جس کا ناصر اللہ ہو اسے بندوں کی جانب سے کسی نصرت کی ضرورت ہی کیا ہے؟

اس کے بعد مومنین کو تسلی دی جاتی ہے اور انہیں یہ خوش خبری دی جاتی ہے کہ جلد ہی وہ کفار کے دلوں میں تحریک اسلامی کا رعب ڈال دیں گے اور یہ اس لئے کہ وہ اللہ کی ذات میں دوسروں کو شریک کرتے اور نظریہ شرک کی پشت پر اس دنیا میں نہ قوت ہے نہ قوت دلیل ہے اور آخرت میں تو ان کے لئے بہت ہی برا ٹھکانا تیار کیا گیا ہے۔

سَنُلْقِى فِى قُلُوبِ ٱلَّذِينَ كَفَرُواْ ٱلرُّعْبَ بِمَآ أَشْرَكُواْ بِٱللَّهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهِۦ سُلْطَٰنًا ۖ وَمَأْوَىٰهُمُ ٱلنَّارُ ۚ وَبِئْسَ مَثْوَى ٱلظَّٰلِمِينَ

"عنقریب وہ وقت آنے والا ہے جب ہم منکرین حق کے دلوں میں رعب بٹھا دیں گے' اس لئے کہ انہوں نے اللہ کے ساتھ ان کو خدائی میں شریک ٹھہرایا ہے جن کے شریک ہونے پر اللہ نے کوئی سند نازل نہیں کی۔ ان کا آخری ٹھکانا جہنم ہے اور بہت ہی بری ہے وہ قیام گاہ جو ان ظالموں کو نصیب ہو گی۔"

یہ وعدہ اللہ جل شانہ کی جانب سے ہے' جو غالب ہے اور قادر مطلق ہے۔ وہ اہل کفر کے دلوں میں رعب بٹھاسکتا ہے۔ وہ اس بات کا ذمہ دار ہے کہ اس معرکے کا انجام کیا ہو گا' وہ ضمانت دیتا ہے کہ اس کے دوست فاتح ہوں گے اور اس کے دشمنوں کو شکست ہو گی۔

اللہ کا یہ وعدہ ہر اس معرکے کے لئے اب بھی قائم ہے جس میں فریقین معرکہ اہل کفر اور اہل ایمان ہوں۔ جب بھی اہل کفر اہل ایمان سے دوچار ہو جاتے ہیں' ان کے دل میں اللہ تعالیٰ اہل ایمان کا رعب بٹھادیتے ہیں۔ لیکن اہم بات اور اہم شرط یہ ہے کہ اہل ایمان کے دل میں ایمان کی حقیقت موجود ہو۔ ان کو اللہ کی نصرت کا حقیقی شعور ہو' انہیں پورا پورا یقین ہو کہ اللہ ان کا مددگار ہے اور ان کے دل میں ذرہ برابر شک اس بارے میں نہ ہو کہ اللہ کا لشکر ہی غالب رہتا ہے اور یہ کہ اللہ اپنے معاملات پر پورا کنٹرول رکھتے ہیں اور یہ کہ اہل کفر اللہ کو شکست نہیں دے سکتے اور نہ وہ اللہ سے آگے بڑھ سکتے ہیں۔ اور ان کا معاملہ اللہ کے اس وعدے کے ساتھ ہو کہ وہ روبعمل ہو کر رہے گا چاہے ظاہری حالات اس کے خلاف نظر آئیں' اس لئے کہ اللہ کا وعدہ بہرحال سچا ہوتا ہے اگرچہ ہماری آنکھیں الٹ دیکھ رہی ہوں۔

اہل کفر رعب میں اس لئے آجاتے ہیں کہ ان کا تکیہ صحیح نہیں ہے۔ ان کا بھروسہ نہ قوت پر ہے اور نہ صاحب قوت پر۔ انہوں نے اللہ کے ساتھ ایسے خداؤں کو شریک کیا ہوا ہے جن کے ہاتھ میں کوئی قوت نہیں ہے کیونکہ اللہ نے ان شریکوں کو کوئی قوت دے کر اپنے ساتھ شریک نہیں کر لیا۔

یہ انداز تعبیر کہ اللہ نے ان پر کوئی "سلطان" نہیں اتاری' اپنے اندر گہرا مفہوم رکھتی ہے۔ قرآن میں اس انداز تعبیر کو بار بار اپنایا گیا ہے۔ کبھی یہ کہا جاتا ہے کہ ان جھوٹے الہوں کے پاس کوئی سلطان نہیں ہے۔ کبھی یہ کہا جاتا ہے کہ غلط عقاید پر کوئی سلطان نہیں ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ کوئی تصور' کوئی عقیدہ' کوئی نظریہ' کوئی شخصیت اور کوئی بھی تنظیم' اس قدر موثر ہوتی ہے جس قدر اس کے اندر پوشیدہ قوت اور غلبے کا داعیہ ہوتا ہے۔ اس اندرونی قوت کی مقدار کے مطابق ہی اس کی جدوجہد قائم اور دائم رہتی ہے۔ اور اس اندرونی قوت کا دارومدار اس کی اس سچائی یا سچائی کی اس مقدار پر ہوتا ہے جو اس کے اندر موجود ہوتی ہے اور یہ کہ اس قوت اور اس قوت کے اندر کی قدر ہم آہنگی ہے جس قوت اور سچائی پر اللہ نے اس پوری کائنات کو قائم کیا ہے۔ نیز یہ دیکھا جاتا ہے کہ اس کائنات کے سنن اور نوامیس کے ساتھ اس کی ہم آہنگی کی قدر ہے۔ کسی شخص یا ادارے کو اللہ اسی قدر قوت اور سلطان دیتا ہے جس قدر وہ ان نوامیس فطرت کے ساتھ ہم آہنگ ہوتا ہے' جو اس کائنات میں موثر ہیں اور کارفرما ہیں۔ اگر یہ ہم آہنگی نہیں ہے تو وہ شخص' نظریہ اور ادارہ' بوگس' کھوٹا' ضعیف اور ختم ہونے والا ہے' چاہے بظاہر وہ بہت ہی قوی نظر آئے' بظاہر وہ جس قدر مزین کیا گیا ہو اور بظاہر وہ پھولا ہوا نظر آتا ہو۔

مشرکین کی حالت یہ ہے کہ وہ اللہ کے ساتھ دوسرے الہوں کو شریک ٹھہراتے ہیں۔ یہ شرک مختلف الاقسام ہوتی ہے۔ اس کا آغاز اس طرح ہوتا ہے کہ لوگ پہلے اللہ کی خصوصیات میں سے کوئی خصوصیت غیر اللہ کو عطا کرتے ہیں' یا اللہ کے مظاہر میں سے کوئی مظہر غیر اللہ کو دیتے ہیں۔ ان خصائص میں سے اہم خاصہ خدا اس کا حق قانون سازی ہے' جو وہ اپنے بندوں کی زندگی کے مختلف حالات کے لئے کرتا ہے اور ان اقدار کے تعین کا حق ہے جن کے مطابق لوگوں کو اپنی زندگی کے معاملات' انفرادی اور اجتماعی کے فیصلے کرنے ہوتے ہیں اور یہ کہ بندوں پر حق حکمرانی صرف اللہ کو ہے اور یہ صرف اس کا حق ہے کہ وہ اپنے قوانین اور اپنے طے کئے ہوئے حسن و قبح کے معیارات اور پیمانوں کی اطاعت کرائے۔ اس کے بعد شرک پھر ان شعائر تعبدیہ کے اندر ہوتا ہے جو اللہ کے لئے مخصوص ہوتے ہیں یعنی عبادات۔

اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ یہ خدا جن کو مشرکین اللہ کے ساتھ شریک کرتے ہیں اس کے ہاں اس سچائی کی کیا مقدار ہوتی جس پر

اللہ نے اس کائنات کو قائم کیا ہے؟ یہ صرف اللہ ہے جس نے اس کائنات کو حق پر قائم کیا ہے اور تمام مخلوق کو پیدا کیا ہے کہ وہ صرف اس کی بندگی کا اقرار کریں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں۔ اور وہ شریعت اور حسن و قبح کے پیمانے صرف اس سے لیں۔ اور صرف اس کی عبادت اس طرح کریں جس طرح اس کی عبادت کرنے کا حق ہے۔ بغیر کسی شرک کے 'بغیر کسی شراکت کے۔ اس لئے جو نظریہ اصول توحید کے خلاف ہو جس پر یہ کائنات اپنی اساس سے قائم ہے وہ کھوٹا' باطل اور حق کے مخالف ہے۔ اور یہی راز ہے کہ اس کے کمزور اور واہیات ہونے کی اور یہی وجہ ہے کہ اس کے اندر نہ قوت ہوتی ہے اور نہ اس کے اندر سلطان ہوتی ہے اور وہ زندگی کے دھارے کو متاثر نہیں کر سکتا۔ بلکہ اس کے اندر سرے سے زندگی کے بنیادی عناصر (Potentials) نہیں ہوتے۔

جب تک مشرکین شرک میں مبتلا ہیں (اور شرک ایک ایسا نظریہ ہے جس پر اللہ تعالیٰ کی جانب سے کوئی سلطان نہیں ہے) یہ شرک وہ چاہے الہوں کی صورت میں کر رہے ہوں یا عقائد و تصورات میں کر رہے ہوں' تو وہ گویا کمزوری' خلا اور وہم پر بھروسہ کر رہے ہوتے ہیں۔ اس لئے وہ ہمیشہ ذلیل و خوار اور ضعیف ناتواں رہیں گے اور وہ ہمیشہ مرعوب رہیں گے 'جب بھی ان کا آمنا سامنا اہل ایمان کے ساتھ ہوا۔ اس لئے کہ اہل ایمان کا بھروسہ ایسی سچائی پہ ہوتا ہے جو پر شوکت اور پر قوت ہوتی ہے۔

اس وعدے کا مصداق ہمیں ہر وقت نظر آ سکتا ہے جب بھی حق و باطل کا آپس میں ٹکراؤ ہو' بارہا ایسا ہوا ہے کہ باطل زاد و عتاد اور کثر سامان جنگ کے ساتھ حق کے مقابلے میں آیا ہے' جبکہ حق غیر مسلح تھا لیکن اس صورت حال کے باوجود باطل خوفزدہ اور مرعوب ہو کر کانپنے لگا ہے۔ وہ ہر حرکت اور ہر نعرۂ تکبیر کے مقابلے میں تھر تھر کانپتا رہا ہے حالانکہ اس کے ساتھ عظیم مسلح لشکر رہے ہیں۔ لیکن جونہی ان عظیم لشکروں پر حق جھپٹا ہے تو باطل دبک گیا ہے' جزع و فزع کرتے ہوئے منتشر ہو گیا ہے۔ اس کی صفوں میں اضطراب پھیل گیا ہے۔ اگرچہ وہ تعداد اور زاد و عتاد میں بہت زیادہ تھا اور حق اس کے مقابلے میں قلت قلیلہ تھا۔ یوں اس فرمان کی سچائی بارہا ثابت ہوئی ہے۔

سَنُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ بِمَآ اَشْرَكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا .... "عنقریب وہ وقت آنے والا ہے جب ہم منکرین حق کے دلوں میں رعب بٹھا دیں گے' اس لئے کہ انہوں نے اللہ کے ساتھ ان کو خدائی میں شریک ٹھہرایا ہے' جن کے شریک ہونے پر اللہ نے کوئی سند نازل نہیں کی۔"

یہ بات تو دنیا سے متعلق تھی۔ آخرت میں کیا ہو گا' تو وہاں ان کا انجام نہایت ہی پریشان کن اور برا ہو گا اور ان ظالموں کے لائق حال ہو گا۔ وَمَاْوٰىهُمُ النَّارُ ۚ وَبِئْسَ مَثْوَى الظّٰلِمِيْنَ .... "ان کا آخری ٹھکانا جہنم ہے اور بہت ہی بری ہے وہ قیام گاہ جو ان ظالموں کے نصیب ہو گی۔"

یہاں اللہ تعالیٰ انہیں اس اصول کا مصداق خود جنگ احد میں بتاتے ہیں۔ اس جنگ کی ابتدائی جھڑپ ہی میں مسلمانوں کو فیصلہ کن فتح ہو گئی تھی۔ مشرکین مارے جا رہے' یہاں تک کہ وہ بھاگ کھڑے ہوئے۔ انہوں نے اپنا مال غنیمت بھی چھوڑ دیا۔ ان کا علم گر گیا اور کوئی اسے اٹھانے والا نہ رہا۔ صرف ایک عورت کو ہمت ہوئی اور اس نے اس علم کو اٹھایا۔ یہ فتح شکست میں صرف اس وقت تبدیل ہوئی جب تیراندازوں کے دلوں میں ضعف پیدا ہو گیا۔ وہ مال غنیمت سمیٹنے کے لئے چڑھ دوڑے۔ آپس میں تنازعہ بھی ہوا اور انہوں نے رسول اللہ کے احکام کی خلاف ورزی کی جو نبی وقت بھی تھے اور ان کے قائد بھی تھے۔ چنانچہ قرآن کریم اس معرکہ کے عروج پر جو واقعات پیش آئے' جو حادثات ہوئے' جن حالات میں ہوئے اور جس طرح ہوتے ہوئے نظر آئے' ان کی توجہ نہایت ہی عجیب اور زندگی اور حرکت سے بھرپور انداز میں' ان واقعات کی طرف مبذول کراتا ہے ذرا غور سے پڑھئے:

وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗٓ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ ۚ حَتّٰٓى اِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِي

الْأَمْرِ وَعَصَيْتُم مِّن بَعْدِ مَا أَرَاكُم مَّا تُحِبُّونَ ۚ مِنكُم مَّن يُرِيدُ الدُّنْيَا وَمِنكُم مَّن يُرِيدُ الْآخِرَةَ ۚ ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ لِيَبْتَلِيَكُمْ ۖ وَلَقَدْ عَفَا عَنكُمْ ۗ وَاللَّهُ ذُو فَضْلٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ ﴿١٥٢﴾ إِذْ تُصْعِدُونَ وَلَا تَلْوُونَ عَلَىٰ أَحَدٍ وَالرَّسُولُ يَدْعُوكُمْ فِي أُخْرَاكُمْ فَأَثَابَكُمْ غَمًّا بِغَمٍّ لِّكَيْلَا تَحْزَنُوا عَلَىٰ مَا فَاتَكُمْ وَلَا مَا أَصَابَكُمْ ۗ وَاللَّهُ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ ﴿١٥٣﴾ ثُمَّ أَنزَلَ عَلَيْكُم مِّن بَعْدِ الْغَمِّ أَمَنَةً نُّعَاسًا يَغْشَىٰ طَائِفَةً مِّنكُمْ ۖ وَطَائِفَةٌ قَدْ أَهَمَّتْهُمْ أَنفُسُهُمْ يَظُنُّونَ بِاللَّهِ غَيْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ ۖ يَقُولُونَ هَل لَّنَا مِنَ الْأَمْرِ مِن شَيْءٍ ۗ قُلْ إِنَّ الْأَمْرَ كُلَّهُ لِلَّهِ ۗ يُخْفُونَ فِي أَنفُسِهِم مَّا لَا يُبْدُونَ لَكَ ۖ يَقُولُونَ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ مَّا قُتِلْنَا هَاهُنَا ۗ قُل لَّوْ كُنتُمْ فِي بُيُوتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِينَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ إِلَىٰ مَضَاجِعِهِمْ ۖ وَلِيَبْتَلِيَ اللَّهُ مَا فِي صُدُورِكُمْ وَلِيُمَحِّصَ مَا فِي قُلُوبِكُمْ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ ﴿١٥٤﴾ إِنَّ الَّذِينَ تَوَلَّوْا مِنكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعَانِ إِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطَانُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوا ۖ وَلَقَدْ عَفَا اللَّهُ عَنْهُمْ ۗ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ حَلِيمٌ

☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆

”اللہ نے (تائید و نصرت کا) جو وعدہ تم سے کیا تھا' وہ تو اس نے پورا کر دیا۔ ابتدا میں (اس کے حکم سے تم ہی ان کو قتل کر رہے تھے۔ مگر جب تم نے کمزوری دکھائی اور اپنے کام میں باہم اختلاف کیا' اور جونہی کہ وہ چیز اللہ نے تمہیں دکھائی جس کی محبت میں تم گرفتار تھے (یعنی مال غنیمت) تم اپنے سردار کے حکم کی خلاف ورزی کر بیٹھے.... اس لئے کہ تم میں سے کچھ لوگ دنیا کے طالب تھے اور کچھ آخرت کی خواہش رکھتے تھے۔ تب اللہ نے تمہیں کافروں کے مقابلہ میں پسپا کر دیا تاکہ تمہاری آزمائش کرے۔ اور حق یہ ہے کہ اللہ نے پھر بھی تمہیں معاف ہی کر دیا کیونکہ مومنوں پر اللہ بڑی نظر عنایت رکھتا ہے۔

یاد کرو جب تم بھاگے چلے جا رہے تھے' کسی کی طرف پلٹ کر دیکھنے تک کا ہوش تمہیں نہ تھا اور رسول تمہارے پیچھے سے تم کو پکار رہا تھا۔ اس وقت تمہاری اس روش کا بدلہ اللہ نے تمہیں یہ دیا کہ تم کو رنج پر رنج دیئے تاکہ آئندہ کے لئے تمہیں یہ سبق ملے کہ جو کچھ تمہارے ہاتھ سے جائے یا جو مصیبت تم پر نازل ہو اس پر ملول نہ ہو۔ اللہ تمہارے سب اعمال سے باخبر ہے۔

اس غم کے بعد پھر اللہ نے تم میں سے کچھ لوگوں پر ایسی اطمینان کی سی حالت طاری کر دی کہ وہ اونگھنے لگے۔ مگر ایک دوسرا گروہ' جس کے لئے ساری اہمیت بس اپنی ذات ہی کی تھی' اللہ کے متعلق طرح طرح کے جاہلانہ گمان کرنے لگا جو سراسر خلاف حق تھے۔ یہ لوگ اب کہتے ہیں کہ ”اس کام کے چلانے میں ہمارا بھی کوئی حصہ ہے؟“ ان سے کہو ”(کسی کا کوئی حصہ نہیں) اس کام کے سارے اختیارات اللہ کے ہاتھ میں ہیں۔“ دراصل یہ لوگ اپنے دلوں میں جو بات چھپائے ہوئے ہیں' اسے تم پر ظاہر نہیں کرتے۔ ان کا اصل

مطلب یہ ہے کہ "اگر (قیادت کے) اختیارات میں ہمارا کچھ حصہ ہوتا تو یہاں ہم نہ مارے جاتے۔" "ان سے کہہ دو کہ "اگر تم اپنے گھروں میں بھی ہوتے تو جن لوگوں کی موت لکھی ہوئی تھی وہ خود اپنی قتل گاہوں کی طرف نکل آتے۔" اور یہ معاملہ پیش آیا یہ تو اس لئے تھا کہ جو کچھ تمہارے سینوں میں پوشیدہ ہے اللہ اسے آزما لے اور جو کھوٹ تمہارے دلوں میں ہے اسے چھانٹ دے' اللہ دلوں کا حال خوب جانتا ہے۔

تم میں سے جو لوگ مقابلہ کے دن پیٹھ پھیر گئے تھے ان کی اس لغزش کا سبب یہ تھا کہ ان کی بعض کمزوریوں کی وجہ سے شیطان نے ان کے قدم ڈگمگا دیئے تھے۔ اللہ نے انہیں معاف کر دیا' اللہ بہت درگزر کرنے والا اور بردبار ہے۔"

یہاں قرآن مجید نے جنگ کی اسٹیج کے تمام مناظر کو پوری طرح' الفاظ کے ذریعہ منقش کر دیا۔ اس میں فتح اور شکست دونوں کے مناظر دکھائے گئے ہیں' الفاظ کی صورت میں ایک ریل چلتی ہوئی نظر آتی ہے' جس میں میدان جنگ کے تمام مناظر یکے بعد دیگرے سامنے آتے چلے جاتے ہیں' بلکہ دلی خیالات' جسموں کے انداز اور ضمیر کی کھٹک تک صاف نظر آتے ہیں۔ عبارات معانی کو اس طرح منتقل کرتی ہیں گویا ریل ہے جو مناظر دکھا رہی ہے۔ ہر حرکت میں جدید تصویر' متحرک اور زندہ نظر آتی ہے خصوصاً وہ منظر جب لوگ پہاڑ پر چڑھتے ہوئے بھاگ رہے ہیں اور رسول ؐ اللہ انہیں پکار رہے ہیں' لیکن وہ ایک نہیں سنتے۔ دہشت زدہ ہیں' پریشان ہیں' جنگ چھوڑ کر پیٹھ موڑ کر بھاگنے کے لئے اوپر ہی کی طرف جا رہے ہیں۔ ان تصاویر کے ساتھ ساتھ دلی وساوس' قلبی کیفیات' تاثرات اور خلجان بھی صاف نظر آتا ہے۔ اتنی بڑی مقدار میں زندہ' متحرک اور چلتی پھرتی تصاویر اور پھر ان کے اندر فیصلے' ہدایات اور بہترین تبصرے اور یہ سب کچھ اس مختصری عبارت میں۔ یہ ہے قرآن کریم کا منفرد اسلوب بیان اور یہ ہے قرآن کریم کی منفرد طرز تربیت۔

وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗٓ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ ۚ ...... "اللہ نے نصرت کا جو وعدہ تم سے کیا تھا' وہ تو اس نے پورا کر دیا۔ ابتدا میں اس کے حکم سے تم انہیں قتل کر رہے تھے۔" یہ معرکہ کی ابتدائی تصویر ہے جب مسلمانوں نے مشرکین کو قتل کرنا شروع کر دیا تھا۔ تَحُسُّوْنَهُمْ سے مراد تَخْمُدُوْنَ حِسَّهُمْ .... (تم اس کے احساس کو بجھا رہے تھے) یا تم ان کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک رہے تھے۔ اس سے پہلے کہ مال غنیمت کا لالچ انہیں بے راہ کر دے۔ اور رسول ؐ خدا نے انہیں کہہ دیا تھا "تمہیں فتح نصیب ہوگی لیکن اس وقت تک جب تک تم نے صبر کیا۔" چنانچہ یہی بات سچی نکلی۔

حَتّٰٓى اِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِي الْاَمْرِ وَعَصَيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَآ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ ۭ مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ۚ

"مگر جب تم نے کمزوری دکھائی اور اپنے کام میں باہم اختلاف کیا اور جونہی وہ چیز تمہیں اللہ نے دکھائی جس کی محبت میں تم گرفتار تھے' تم نے اپنے سردار کے حکم کی خلاف ورزی کی۔ اس لئے کہ تم میں سے بعض لوگ دنیا کے طالب تھے اور کچھ آخرت کی خواہش رکھتے تھے۔"

یہ تیراندازوں کے حالات کا جائزہ ہے۔ ان میں سے بعض لوگ مال غنیمت کے دھوکے میں آگئے۔ ان کے اور ان میں سے ان لوگوں کے درمیان نزاع ہو گیا جو رسول خدا ﷺ کی مکمل اطاعت کرنا چاہتے تھے۔ بات یہاں تک پہنچی کہ انہوں نے معصیت اور نافرمانی کا فیصلہ کیا خصوصاً اس وقت جب انہوں نے اپنی آنکھوں سے فتح مندی کے آثار دیکھ لئے۔ ان میں دو گروہ بن گئے۔ ایک گروہ نے مال غنیمت کا ارادہ کر لیا اور دوسرے نے ثواب آخرت کو ترجیح دی۔ ان کے دلوں کے اندر اختلاف پیدا ہو گیا۔ اور اسلامی صفوں میں وحدت نہ

رہی۔ اور نہ ہی ہدف ایک رہا۔ لالچ نے اخلاص کو مکدر کر دیا حالانکہ نظریاتی جنگوں میں خلوص شرط اول ہوتی ہے۔ اس لئے کہ نظریاتی جنگ دوسری جنگوں سے مختلف ہوتی ہے۔ یہ جنگ ایک طرف میدان جنگ میں لڑی جاتی ہے اور دوسری طرف خود انسانی ضمیر کے اندر بھی لڑی جاتی ہے اور جب تک ضمیر کے میدان میں فتح حاصل نہ ہو' جنگ کے میدان میں فتح ممکن نہیں ہے۔ یہ ایک ایسی جنگ ہوتی ہے جو صرف اللہ کے لئے ہوتی ہے' اس لئے اس میں کامیابی سے ہمکنار وہی لوگ ہوتے ہیں جن کے دل اللہ کے لئے خالص ہو جائیں۔ جب وہ اللہ کا جھنڈا بلند کرتے ہیں تو اللہ انہیں تب ہی نصرت عطا کرتے ہیں جب اللہ ان کو چھانٹ کر خالص کر دیں اور وہ صرف اسی کے جھنڈے کے لئے لڑیں تاکہ اس جھنڈے کے ساتھ دھوکہ' ملمع کاری اور ملاوٹ نہ ہو۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ اہل باطل بعض معرکوں میں کامیاب رہتے ہیں حالانکہ وہ باطل کے جھنڈے اٹھائے ہوتے ہیں۔ اس میں بھی حکمت ہوتی ہے' جس کا علم اللہ ہی کو ہوتا ہے۔ لیکن جو لوگ حق کا علم بلند کرتے ہیں اور پھر حق کے لئے یکسو نہیں ہوتے' مخلص نہیں ہوتے تو ایسے لوگوں کو اللہ کبھی بھی نصرت عطا نہیں کرتے۔ ان کو آزمائش میں ڈالا جاتا ہے' یہاں تک کہ ان کی چھانٹی ہو جاتی ہے اور وہ لوگ بالکل ستھرے ہو جاتے ہیں جو اللہ کے لئے کام کرتے ہیں۔ یہ ہے وہ بات جسے قرآن مجید جماعت مسلمہ پر ان کے موقف کی روشنی میں واضح کرنا چاہتا ہے۔ یہ ہے وہ حقیقت جس کی تلقین پہلی جماعت اسلامی کو اس وقت کی جارہی ہے جب کہ وہ ہزیمت کے تلخ حقائق سے دوچار تھی' اسے دردناک چوٹ لگی ہوئی تھی اور یہ چوٹ اس کے اپنے ڈانواں ڈول موقف کی وجہ سے لگی تھی۔ مِنكُم مَّن يُرِيدُ الدُّنْيَا وَمِنكُم مَّن يُرِيدُ الْآخِرَةَ ......

...... "تم میں سے کچھ لوگ دنیا کے طالب تھے اور کچھ آخرت کی خواہش رکھتے تھے۔"

قرآن کریم یہاں دلوں کے خفیہ گوشوں پر بھی روشنی ڈالتا ہے۔ خود مسلمانوں کو اپنے دلوں میں ان خفیہ گوشوں کا پتہ نہ تھا۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے' فرماتے ہیں "میرا یہ خیال نہ تھا کہ رسول خداؐ کے ساتھیوں میں سے کوئی ایک شخص بھی دنیا چاہتا ہے۔ یہاں تک کہ معرکہ احد کے دن ہمارے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی مِنكُم مَّن يُرِيدُ الدُّنْيَا وَمِنكُم مَّن يُرِيدُ الْآخِرَةَ ...... (ابن کثیر) یوں اللہ تعالیٰ ان کے دلوں کا حال کھول کر ان کے سامنے رکھ دیتے ہیں' ان کے دلوں کی بات ظاہر کر دی جاتی ہے اور انہیں معلوم ہو جاتا ہے کہ شکست کیوں ہوئی تاکہ آئندہ اس سے بچیں۔

اس کے ساتھ ساتھ اللہ اپنی حکمت اور تدبیر کا ایک پہلو بھی ان پر واضح فرماتے ہیں۔ یہ کہ انہیں جو تکالیف اٹھانی پڑیں اور یہ واقعات جو بالکل ظاہری اسباب کی وجہ سے پیش آئے لیکن اللہ کی قدر دیکھئے ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ لِيَبْتَلِيَكُمْ ....

...... "تب اللہ نے تمہیں کافروں کے مقابلے میں پسپا کر دیا تاکہ تمہاری آزمائش کرے۔" حقیقت یہ ہے کہ انسان کے تمام افعال کی پشت پر تقدیر کارفرما ہوتی ہے۔ جب انہوں نے کمزوری دکھائی' آپس میں تنازعہ کیا' حکم عدولی کی' اللہ تعالیٰ نے ان کی قوت کو پھیر دیا' ان کی طاقت ختم ہو گئی' وہ مشرکین کی آمد کو معلوم نہ کر سکے' تیراندازوں کو گھاٹی سے ہٹا دیا۔ میدان میں لڑنے والوں کو بھی پیچھے ہٹا دیا۔ وہ بھاگنے لگے' یہ سب واقعات اس طرح پیش آئے کہ خود ان کے کئے کا نتیجہ تھے۔ لیکن ان ظاہری واقعات کے پیچھے بھی حکمت و تدبیر تھی' وہ یہ کہ اللہ اہل ایمان کو آزمائش میں ڈالنا چاہتے تھے تاکہ سخت ترین حالات' خوف و ہراس' قتل و جراح اور ہزیمت و شکست سے دوچار کر کے انہیں آزمایا جائے۔ اور ان مشکلات کے نتیجے میں ان کے دلوں کے خفیہ گوشے بھی سامنے آجائیں۔ دل صاف ہو جائیں اور صفوں سے کمزور لوگ دور ہو جائیں جیسا کہ آئندہ بیان ہو گا۔

ہوتا تو یہ ہے کہ واقعات بظاہر اپنے ظاہری اسباب کے نتیجے میں سامنے آتے ہیں لیکن ان ظاہر اسباب کے ہوتے ہوئے بھی ان کے پیچھے تدبیر کام کر رہی ہوتی ہے۔ اس لئے ان دونوں کے درمیان کوئی تعارض نہیں ہے۔ ہر واقعہ کے پیچھے سبب ظاہری بھی ہوتا ہے اور اس

سبب ظاہری کے پیچھے اللہ کی حکمت و تدبیر بھی کام کر رہی ہوتی ہے اور یہ تدبیر لطیف و خبیر کی طرف سے ہوتی ہے۔

وَ لَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ .... "اور حق یہ ہے کہ اللہ نے پھر بھی تمہیں معاف ہی کر دیا۔" یعنی اللہ نے تمہاری کمزوری' باہم نزاع اور حکم عدولی کو معاف کر دیا۔ اسی طرح تم جو بھاگ نکلے' الٹے پاؤں پھرے۔ یہ سب کچھ اللہ نے معاف کر دیا۔ اور یہ معافی صرف اس کا فضل و کرم ہے۔ تمہاری بشری کمزوریوں کو اس نے معاف کر دیا' نظرانداز کر دیا کیونکہ تمہاری نیت بری نہ تھی' تم غلطی پر اصرار نہیں کر رہے تھے۔ کیونکہ تمہاری یہ کمزوری اور یہ غلطی دائرہ ایمان کے اندر ہے۔ تم اللہ کے سامنے بھی جھکتے ہو اور اپنی قیادت کے احکام کے سامنے بھی سر تسلیم خم کرتے ہو۔ وَ اللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ .... "کیونکہ مومنین پر اللہ بڑی نظر عنایت رکھتا ہے۔"

اس کا پہلا فضل تو یہ ہے کہ اس نے انہیں معاف کر دیا۔ جب تک وہ اسلامی نظام پر قائم ہیں اس کی بندگی کا اقرار کرتے ہیں۔ وہ اللہ کے خصائص الوہیت و حاکمیت کے مدعی خود نہیں ہوتے۔ وہ اپنے لئے منہاج حیات' نظام قانون' اقدار حیات اور حسن و قبح کے پیمانے خود وضع نہیں کرتے بلکہ صرف اللہ سے لیتے ہیں۔ یہ اصول تسلیم کرتے ہوئے اگر ان سے بتقاضائے بشریت' بوجہ کمزوری' بوجہ عارضی جوش اور عارضی خواہشات کوئی غلطی ہو جائے تو وہ معاف ہو سکتی ہے لیکن غلطیوں پر ابتلا کی سزا ضرور دی جاتی ہے تاکہ وہ کھوٹ دور ہو اور وہ کمزوری دور ہو۔

اس کے بعد اس شکست کے ایک منظر کو یوں پیش کیا جاتا ہے۔ إِذْ تُصْعِدُوْنَ وَ لَا تَلْوٗنَ عَلٰٓى اَحَدٍ وَّ الرَّسُوْلُ يَدْعُوْكُمْ فِيْٓ اُخْرٰىكُمْ .... "یاد کرو جب تم بھاگے چلے جا رہے تھے' کسی کی طرف پلٹ کر دیکھنے کا ہوش تک تمہیں نہ تھا' اور رسول تمہارے پیچھے تمہیں پکار رہا تھا۔" یہ اس لئے یاد دلایا جاتا ہے کہ ان کے پردۂ احساس پر یہ نقش گہرائی کے ساتھ منقش ہو جائے۔ وہ اپنی جگہ شرمندگی' حیاء اور پشیمانی محسوس کریں۔ اس کے اسباب پر غور کریں جو کمزوری' باہم تنازع اور حکم عدولی کی وجہ سے ان سے سرزد ہوئی۔

یہ آیت ان کی جسمانی حرکات اور ان کی نفسیاتی کیفیات کی اس قدر مختصر الفاظ میں نقشہ کشی کرتی ہے جس کی نظیر نہیں ملتی۔ اس تصویر میں صاف نظر آتا ہے کہ وہ پہاڑ پر اوپر کی طرف بھاگتے ہوئے چڑھتے ہیں' مرعوب ہو گئے ہیں' دہشت زدہ ہیں اور سخت اضطراب میں ہیں۔ کوئی کسی کی طرف دیکھتا ہی نہیں۔ کوئی کسی کی پکار کا جواب نہیں دیتا۔ حضور پکار رہے ہیں تاکہ انہیں مطمئن کر دیں کہ آپ زندہ ہیں لیکن وہ نہیں سنتے۔ کیونکہ کسی نے یہ پکار دیا تھا کہ محمد مقتل ہو گئے ہیں اور اس وجہ سے ان کے دل متزلزل ہو گئے تھے۔ ان کے قدم اکھڑ گئے تھے۔ غرض ایک مکمل تصویر کشی ہے لیکن چند الفاظ میں۔

ان کی اس روش کا نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے اللہ سے بھاگ کر اور رسول خدا کو اکیلا چھوڑ کر آپ کو جو دکھ دیا' اس کے بدلے میں اللہ تعالیٰ نے ان کو بھی بہت دکھ دیئے۔ وہ اپنے کئے پر پچھتاتے رہے کہ انہوں نے رسول خدا کو اکیلا چھوڑ دیا۔ آپ کو زخم آئے' لیکن پھر بھی آپ ثابت قدم رہے جبکہ وہ بھاگ گئے تھے' تاکہ تم اس چیز پر حسرت نہ کرو جو چلی گئی ہے اور نہ اس اذیت پر حزن و ملال کا اظہار کرو جو اس وجہ سے تمہیں پہنچی۔ کیونکہ یہ تجربہ جس سے وہ گزرے اور یہ ضربات جو نبی کو لگیں وہ ان کے لئے ناقابل برداشت تھیں۔ ان کو دیکھتے ہوئے وہ خود اپنی تکالیف بھول گئے۔ اور وہ مصائب ان کی نظروں میں کم ہو گئے فَاَثَابَكُمْ غَمًّۢا بِغَمٍّ لِّكَيْلَا تَحْزَنُوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَ لَا مَآ اَصَابَكُمْ .... "اس وقت تمہاری اس روش کا بدلہ اللہ نے تمہیں یہ دیا کہ تم کو رنج پر رنج دیئے تاکہ آئندہ کے لئے تمہیں یہ سبق ملے کہ جو کچھ ہاتھ سے جائے یا جو مصیبت تم پر نازل ہو اس پر

ملول نہ ہو۔"

اور اللہ تو خفیہ باتوں کا بھی علم رکھتا ہے۔ تمہارے اعمال کی حقیقت اسے اچھی طرح معلوم ہے اور تمہاری تمام حرکات کے پیچھے جو داعیہ ہے اس سے بھی وہ باخبر ہے۔ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ .... "اللہ تمہارے سب اعمال سے باخبر ہے۔"

جب اس ہزیمت کا خوف و ہراس فرو ہو گیا' اس کی افراتفری ختم ہو گئی تو اہل ایمان پر ایک عجیب سکون طاری ہو گیا۔ اہل ایمان جو اپنے رب کی طرف دوبارہ پلٹ آئے اور نبی ﷺ کے اردگرد جمع ہوئے تو ان پر ایک عجیب اونگھ طاری کر دی گئی۔ انہیں ایک ناقابل فہم سکون حاصل ہو گیا اور وہ مطمئن ہو گئے۔ اس نئی معجزانہ فضائے امن و سکون کی تعبیر نہایت ہی تعجب انگیز ہے۔ وہ نہایت شفاف' نرم اور خوشگوار فضا ہے اور اس کے زمزمہ اور خوشگوار چھاؤں کی تصویر کشی ان الفاظ میں ہے۔ ثُمَّ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ الْغَمِّ اَمَنَةً نُّعَاسًا يَّغْشٰى طَآئِفَةً مِّنْكُمْ .... "اس غم کے بعد پھر اللہ نے تم پر ایسی اطمینان کی سی حالت طاری کر دی کہ وہ اونگھنے لگے۔" یہ ایک ایسی فضا تھی جس سے رحمت الٰہی کا اظہار ہو رہا تھا اور اللہ کے خاص مومن بندوں پر یہ خاص رحمت نازل ہوا کرتی ہے۔ یہ ایک اونگھ تھی اور خوفزدہ اور پریشان حال مجاہدین پر جب اونگھ آجائے' اگرچہ ایک لحظہ کے لئے کیوں نہ ہو تو وہ ان کے جسم کے اندر ساحرانہ اثر کرتی ہے' اونگھ دور ہوتے ہی وہ تروتازگی محسوس کرتے ہیں' گویا وہ ایک نئی مخلوق ہیں' دلوں پر اطمینان کی حالت طاری ہو جاتی ہے۔ جسم آرام محسوس کرتا ہے۔ اس اونگھ کی کیا حقیقت ہے' اس کی حقیقت اور ماہیت اور کیفیت کا ادراک ہم نہیں کر سکتے۔ میں صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں نے شدید پریشانی کے عالم میں ایسی حالت کو محسوس کیا ہے۔ میں نے واضح طور پر محسوس کیا کہ اس میں اللہ کی رحمت کی شبنم ہے۔ اور اس قدر معجزانہ ہے کہ ہمارے الفاظ اس کے بیان سے قاصر ہیں۔

ترمذی' نسائی' حاکم نے حماد ابن سلمہ کے واسطہ سے ثابت کی روایت حضرت انس رضی اللہ عنہ نے ابو طلحہ سے نقل کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں "میں نے احد کے دن اپنا سر اٹھایا اور دیکھنے لگا' ہر شخص کا سر ہودج پر جھکا ہوا ہے۔ اور ایک دوسری روایت ابو طلحہ سے یہ ہے "ہم احد کے دن میدان جنگ میں تھے' کہ ہم پر ایک خاص اونگھ طاری ہو گئی۔ میری تلوار گرتی اور میں اسے اٹھاتا' گرتی اور میں دوبارہ اٹھاتا۔"

ایک گروہ کا حال تو یہ تھا اور دوسرے گروہ کا حال یہ تھا کہ وہ متزلزل الایمان تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جنہیں صرف اپنی جان کی فکر تھی' اسی کو اہمیت دیتے تھے۔ یہ لوگ ابھی تک جاہلیت کے تصورات سے نکل کر باہر نہیں آئے تھے۔ نہ انہوں نے پوری طرح اپنے آپ کو اس تحریک کے سپرد کر دیا تھا' نہ وہ پوری طرح تن بتقدیر الٰہی ہو گئے تھے۔ وہ اس بات پر مطمئن نہ تھے کہ انہیں جو چوٹ لگی ہے وہ ان میں چھانٹی کے لئے لگی ہے' آزمائش کے لئے یہ سب کچھ ہوا ہے۔ یہ اس لئے نہیں ہوا کہ اللہ نے اپنے دوستوں اور حامیوں کو دشمنوں کے حوالے کر دیا ہے اور نہ کہیں اللہ نے یہ آخری فیصلہ کر دیا ہے کہ کفر' شر اور باطل کو اب آخری غلبہ حاصل ہو گیا ہے۔ اور انہیں اب پورا کنٹرول حاصل ہو گیا ہے۔

وَطَآئِفَةٌ قَدْ اَهَمَّتْهُمْ اَنْفُسُهُمْ يَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ يَقُوْلُوْنَ هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَيْءٍ

"مگر ایک دوسرا گروہ جس کے لئے ساری اہمیت بس اپنے مفاد ہی کی تھی' اللہ کے متعلق طرح طرح کے جاہلانہ گمان کرنے لگا جو سراسر خلاف حق تھے۔ یہ لوگ اب کہتے ہیں کہ "اس کام کے چلانے میں ہمارا بھی کوئی حصہ ہے۔"

اسلامی نظریہ حیات، اپنے ماننے والوں کو یہ تعلیم دیتا ہے کہ ان کی جان میں ان کا کچھ بھی نہیں ہے۔ وہ تو سب کے سب اللہ کے ہیں اور جب وہ جہاد فی سبیل اللہ کے لئے نکلتے ہیں تو وہ اللہ کے لئے نکلتے ہیں، وہ اللہ کے لئے حرکت میں آتے ہیں اور اللہ ہی کے لئے جنگ کرتے ہیں۔ جہاد کے اس عمل میں ان کی ذات کے لئے کچھ بھی نہیں ہوتا۔ اس میں پھر وہ اپنے آپ کو اللہ کی تقدیر کے سپرد کر دیتے ہیں اور اللہ کی تقدیر ان پر جو حالات بھی لاتی ہے وہ اسے قبول کرتے ہیں، مکمل تسلیم و رضا کے ساتھ جو بھی ہو سو ہو۔

رہے وہ لوگ جو اپنی ذات کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں اور ان کی سوچ اور ان کے اندازے ان کی اپنی ذات کے ارد گرد گھومتے ہیں، ان کی سرگرمی اور ان کے تمام اہتمام صرف اپنی ذات کے لئے ہوتے ہیں، یہ وہ لوگ ہوتے ہیں کہ ان کے دل میں ایمان کی حقیقت ابھی تک جاگزیں ہی نہیں ہوتی۔ یہ دوسرا طائفہ جس کا یہاں ذکر ہو رہا ہے وہ ایسے ہی لوگوں پر مشتمل تھا۔ یہاں قرآن کریم نے ان پر تبصرہ کرنا ضروری سمجھا۔ اس گروہ کے نزدیک ساری اہمیت ان کی ذات کے لئے تھی۔ وہ نہایت کرب اور پریشانی میں مبتلا تھے۔ انہیں یہ احساس کھائے جارہا تھا کہ وہ اپنے آپ کو اور اپنی صلاحیتوں کو ایسے کام میں ضائع کر رہے ہیں، جو ان کے ذہن میں واضح نہیں ہے۔ ان کا خیال یہ تھا کہ وہ بغیر ان کی مرضی کے اس معرکے میں شریک ہونے پر مجبور ہو گئے، انہیں اس میں خواہ مخواہ جھونک دیا گیا اس کے باوجود ان کو یہ تلخ چوٹ لگی اور وہ خواہ مخواہ اس قدر بھاری قیمت ادا کر رہے ہیں، قتل ہو رہے ہیں، زخمی ہو گئے ہیں اور پریشان کا تو حال نہ پوچھو۔ یہ لوگ اللہ کی صحیح معرفت سے محروم ہیں۔ وہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں ایسی بدگمانیاں کرتے ہیں جس طرح جاہل لوگ کیا کرتے تھے اور سب سے بڑی بدگمانی یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ انہیں اس معرکہ میں ضائع کر رہا ہے، جس کے انتظام میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہے بس انہیں تو یہاں دھکیل کر لایا گیا ہے تاکہ وہ مریں، زخمی ہوں۔ اللہ تو نہ انہیں بچاتا ہے اور نہ ان کی مدد کرتا ہے۔ اللہ نے انہیں دشمنوں کے لئے لقمہ تر بنا دیا ہے۔ وہ پوچھتے ہیں هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ شَیْءٍ "اس کام میں ہمارا بھی حصہ ہے۔"

ان کے اس اعتراض میں یہ بات بھی شامل تھی کہ اس معرکے کے لئے قیادت نے جو منصوبہ بنایا اس میں ان کی ایک نہ سنی گئی۔ شاید اس گروہ کی رائے یہ تھی کہ مدینہ کے اندر لڑا جائے اور باہر جاکر لڑنے سے پرہیز کیا جائے لیکن اس کے باوجود وہ عبداللہ ابن ابی کے ساتھ لوٹ نہ گئے تھے۔ لیکن ان کے دل اس منصوبے پر مطمئن نہ تھے۔

اس سے قبل کہ اس سیاق کلام میں ان کی ان بدگمانیوں کی بات ختم کی جائے، درمیان میں مختصر سا جواب دے دیا جاتا ہے اور اس میں ان کے اس اعتراض کو رد کر دیا جاتا ہے۔ قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ .... "کہہ دو کہ اس کام کے سارے اختیارات اللہ کے ہاتھ میں ہیں۔" کسی کے لئے کوئی اختیار نہیں ہے، نہ ان کا کوئی اختیار اور نہ کسی اور کا کوئی اختیار ہے۔ اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے خود اپنے نبی کو یہ حکم دے دیا تھا لَیْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَیْءٌ .... "اس کام کا کوئی اختیار تمہارے ہاتھ میں نہیں ہے۔" لہٰذا اس دین کے تمام معاملات، اس کی خاطر جہاد، اس کے نظام کا قیام، لوگوں کے دلوں کے اندر ہدایت داخل کرنا وغیرہ یہ سب کام اللہ کے لئے ہیں۔ ان اختیارات میں کوئی انسان شریک نہیں ہے۔ بشر کا کام تو صرف یہ ہے کہ وہ اپنے فرائض سرانجام دے۔ وہ اپنے وعدہ ایمان کے تقاضے پورے کرے۔ یہ اب صرف اللہ کا کام ہے کہ اس جدوجہد کے نتائج کیا نکلتے ہیں۔ اور وہ کیا نکالتا ہے۔ اس موقعہ پر اللہ تعالیٰ ان کے دل کے اندر ایک چھپی ہوئی کمزوری کو بھی طشت ازبام کر دیتے ہیں یُخْفُوْنَ فِیْٓ اَنْفُسِهِمْ مَّا لَا یُبْدُوْنَ لَكَ .... "یہ لوگ اپنے دلوں میں جو بات چھپائے ہوئے ہیں تم پر ظاہر نہیں کرتے۔" ان کے دل وسوسوں اور متنوع خدشات سے بھرے ہوئے ہیں۔ ان کے دلوں میں کئی اعتراضات ہیں اور کئی امور پر وہ احتجاج کرنا چاہتے ہیں۔ ان کا یہ سوال کہ "کیا ان کے لئے بھی اس معاملے میں کوئی اختیار ہے؟" اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ ان کے شعور

اور لاشعور میں یہ بات تھی کہ انہیں ایک ایسے کام میں ڈال دیا گیا ہے جس میں وہ از خود نہیں آئے۔ یہ کہ قیادت کی غلطیوں کی وجہ سے وہ قربانی کا بکرا بن گئے ہیں۔ اگر وہ خود اس معرکے کا نقشہ تیار کرتے تو اس کا یہ انجام نہ ہوتا يَقُولُونَ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ مَّا قُتِلْنَا هَاهُنَا ...... "ان کی اصل بات یہ ہے کہ اگر قیادت کے اختیارات میں ہمارا کوئی حصہ ہوتا تو یہاں ہم نہ مارے جاتے۔"

یہ ایک وسوسہ ہے' جو اس وقت تک دلوں میں پیدا ہوتا ہے' جب تک وہ نظریہ کے لئے خالص اور یکسو نہیں ہو جاتے۔ جب ایسے لوگوں کو کسی موقعہ پر شکست سے دوچار ہونا پڑتا ہے' جب ان پر مصائب آتے ہیں' جب انہیں ان کے تصور اور توقع سے زیادہ قیمت ادا کرنی پڑتی ہے' جب انہیں ناقابل تصور ناگوار نتائج کا سامنا ہوتا ہے' جب ان کے دل و دماغ میں وہ نظریۂ حیات اچھی طرح جاگزیں نہیں ہو جاتا اور جب وہ لوگ یہ سوچتے ہیں کہ ان پر یہ مصائب محض قیادت کی غلط پالیسیوں کی وجہ سے ٹوٹ پڑے ہیں اور اگر وہ خود منصوبہ بندی کرتے تو بڑی کامیابی ہوتی۔ غرض جب لوگوں کی ذہنی صورت حال یہ ہوتی ہے تو اس گدلے تصور کے ہوتے ہوئے ایسا شخص یہ نہیں سوچ سکتا کہ تمام واقعات کے پیچھے حکمت خداوندی کارفرما ہوتی ہے۔ وہ یہ نہیں سوچ سکتے کہ اللہ کی طرف سے یہ آزمائش ہے۔ ان کے خیال میں ایسی صورت حال میں خسارہ ہی خسارہ ہوتا ہے۔ ہر طرح کا ضیاع اور ضیاع ہے۔

ایسے تصورات اور وسوسے رکھنے والوں کے خیالات کی درستگی کے لئے اللہ تعالیٰ ایک نہایت ہی گہری سچائی انکے سامنے رکھتے ہیں۔ وہ سچائی موت کی سچائی ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ ابتلا کے اندر جو حکمت پوشیدہ ہوتی ہے اس کے بارے میں بھی وضاحت ہوتی ہے۔ فرماتے ہیں:

قُلْ إِنَّ الْأَمْرَ كُلَّهُ لِلَّهِ ۗ يُخْفُونَ فِي أَنفُسِهِم مَّا لَا يُبْدُونَ لَكَ ۖ يَقُولُونَ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ مَّا قُتِلْنَا هَاهُنَا ۗ قُل لَّوْ كُنتُمْ فِي بُيُوتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِينَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ إِلَىٰ مَضَاجِعِهِمْ ۖ وَلِيَبْتَلِيَ اللَّهُ مَا فِي صُدُورِكُمْ وَلِيُمَحِّصَ مَا فِي قُلُوبِكُمْ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ ﴿١٥٤﴾

"ان سے کہہ دو اگر تم اپنے گھروں میں بھی ہوتے تو جن لوگوں کی موت لکھی ہوئی تھی' وہ خود اپنی قتل گاہوں کی طرف نکل آتے۔ اور یہ معاملہ جو پیش آیا' یہ تو اس لئے تھا کہ جو کچھ تمہارے سینوں میں پوشیدہ ہے۔ اللہ اسے آزمالے۔ اور جو کھوٹ تمہارے دلوں میں ہے اسے چھانٹ دے' اللہ دلوں کا حال خوب جانتا ہے۔"

اگر تم گھروں میں بھی ہوتے اور اسلامی قیادت کی پکار پر لبیک کہتے ہوئے' اس معرکے میں نہ کود پڑتے' اور تمام معاملات تم خود اپنی مرضی سے طے کرتے' تو تم میں سے بعض لوگوں کی موت لکھی ہوئی تھی وہ خود اپنے مقتل کی طرف دوڑے آتے۔ اس لئے کہ موت کا ایک وقت مقرر ہے۔ وہ اس سے نہ آگے بڑھ سکتی ہے نہ پیچھے رہ سکتی ہے۔ ہر شخص کی موت کے لئے ایک جگہ بھی مقرر ہے اور ہر شخص لازماً اس جگہ کی طرف کھنچا آئے گا اور وہاں دم توڑے گا۔ جب موت کا وقت قریب ہو گا تو وہ شخص اپنے پاؤں پر چل کر وہاں پہنچے گا۔ دوڑتا ہوا آئے گا۔ کوئی اسے کھینچ کر نہ لائے گا نہ کوئی اسے اس طرف دھکیلنے والا ہو گا۔

یہ کیا ہی عجیب طرز ادا ہے؟ "اپنی جائے آرام کی طرف" گویا اس کا مقتل وہ نرم بستر ہے' جس پر اس نے آرام کرنا ہے۔ اس کے قدم وہاں آرام سے لیے ہو جائیں گے۔ تمام لوگ' اس دنیا میں اپنی قتل گاہوں اور اپنے آخری آرام کی جگہ کی طرف کھینچے چلے آتے ہیں

اور وہ ان مقامات کی طرف بعض اوقات ایسے محرکات کی وجہ سے آتے ہیں جو ان کے لئے ناقابل فہم ہوتے ہیں بلکہ یہ محرکات ان کے لئے ناقابل کنٹرول ہوتے ہیں۔ یہ محرکات صرف اللہ کے کنٹرول میں ہوتے ہیں اور وہی ان کے نتائج کو جانتا ہے۔ اور اس کا خاص تصرف ہوتا ہے' جس طرح چاہتا ہے وہ سرانجام دیتا ہے۔ اس لئے اگر ہم اللہ کے مقرر کردہ جائے قرار پر راضی ہو جائیں تو یہ ہمارے لئے روحانی سکون اور نفسیاتی اطمینان اور ہمارے ضمیر کے مفاد میں ہو گا۔

یہ اللہ کی تقدیر ہے اور اس کے پس پشت جو حکمت کام کر رہی ہے وہ یہ ہے **لِیَبْتَلِیَ مَا فِیْ صُدُوْرِكُمْ وَلِیُمَحِّصَ مَا فِیْ قُلُوْبِكُمْ** .... "اور یہ معاملہ جو پیش آیا' یہ تو اس لئے تھا کہ جو کچھ تمہارے سینوں میں پوشیدہ ہے اللہ اسے آزمالے اور جو کھوٹ تمہارے دلوں میں ہے اسے چھانٹ دے۔"

اس سے بڑی آزمائش اور کوئی نہیں ہے کہ دلوں کی بات کو ظاہر کر دیا جائے' اور جو دلوں کی تہہ میں ہے وہ اوپر آجائے۔ اس سے کھوٹ اور ریاکاری کو علیحدہ کر دیا جائے اور بغیر کسی ملمع کاری اور بغیر کسی کور کے اصل حقیقت سامنے آجائے۔ یہ بہت بڑی آزمائش ہے' ان باتوں کے لئے جو دل کے خزانے میں پوشیدہ رکھی ہوتی ہیں۔ حقیقت سامنے آجاتی ہے۔ یہ ہے تطہیر القلوب اور تصفیہ القلوب' اس طرح کہ ان میں کوئی ملاوٹ اور کوئی کھوٹ نہ رہے۔ اس طرح نظریات صحیح ہو کر صاف صورت میں سامنے آجاتے ہیں اور ان میں کوئی نقص اور کوئی ملاوٹ نہیں رہتی۔

وَاللّٰهُ عَلِیْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ .... "اللہ دلوں کا حال خوب جانتا ہے۔" ذات الصدور سے مراد وہ خفیہ راز ہیں جو دلوں کی تہہ میں ہوتے ہیں اور ہر وقت دل میں ہوتے ہیں جو دل سے جدا نہیں ہوتے اور نہ روشنی میں آتے ہیں۔ اللہ ان بھیدوں کو بھی خوب جانتا ہے۔ ان بھیدوں کو اللہ لوگوں پر اس لئے ظاہر کرتا ہے کہ لوگ خود بھی بعض اوقات ان خفیہ باتوں سے بے خبر ہوتے ہیں یعنی یہ ان کے لاشعور میں ہوتے ہیں' بعض واقعات ایسے ہوتے ہیں جو انہیں سطح پر لے آتے ہیں۔

اللہ کو ان باتوں کا علم ہے جو ذہن کے اندر تھیں۔ انہوں نے شکست کھائی اور جب اس غزوہ میں انہیں دشمن کے ساتھ آمنا سامنا ہوا تو وہ بھاگ کھڑے ہوئے۔ کمزوری دکھائی' پیٹھ دکھائی' کیوں اس لئے کہ انہوں نے اپنے کمانڈر کی نافرمانی کی تھی۔ اس کی وجہ سے ان کے نفوس متزلزل ہو گئے۔ اس راہ سے شیطان ان کے دلوں میں داخل ہو گیا اور انہیں لغزش میں ڈال دیا اور یہ لوگ پھسل پڑے۔ فرماتے ہیں:

اِنَّ الَّذِیْنَ تَوَلَّوْا مِنْكُمْ یَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ ۙ اِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّیْطٰنُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوْا ۚ وَلَقَدْ عَفَا اللّٰهُ عَنْهُمْ ۗ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِیْمٌ

"تم میں سے جو لوگ مقابلہ کے دن پیٹھ پھیر گئے تھے ان کی اس لغزش کا سبب یہ تھا کہ ان کی بعض کمزوریوں کی وجہ سے شیطان نے ان کے قدم ڈگمگا دیئے تھے۔ اللہ نے انہیں معاف کر دیا' اللہ بہت درگزر کرنے والا اور بردبار ہے۔"

اس سے مراد تیرانداز ہو سکتے ہیں جن کے دل میں مال غنیمت کی لالچ نے جوش مارا تھا۔ جس طرح ان کے دل میں یہ بات بھی آگئی تھی کہ شاید رسول خدا ﷺ انہیں ان کا حصہ نہ دیں گے۔ یہ وہ بات تھی جو انہوں نے اپنی کمزوریوں کی وجہ سے کمائی تھی۔ اور اسی وجہ سے شیطان نے انہیں لغزش میں مبتلا کر دیا تھا۔

لیکن اپنے عموم کے اعتبار سے وہ نفس انسانی کی اس حالت کی تصویر ہے جب آپ سے کسی غلطی کا ظہور اور ارتکاب ہوتا ہے۔ اسے اپنے اوپر قابو نہیں رہتا۔ اللہ کے ساتھ اس کا رابطہ کمزور پڑ جاتا ہے۔ اس کی شخصیت کا توازن ختم ہو جاتا ہے' اسے اپنے اوپر کنٹرول نہیں

رہتا۔اور وہ خلجان اور وسوسوں کا شکار ہو جاتا ہے۔یہ سب کچھ اس وجہ سے ہوتا ہے کہ اس کا تعلق اللہ سے ختم ہو جاتا ہے اور اسے اللہ کی رضامندی کا بھروسہ نہیں رہتا۔یہ مقام ہوتا ہے جہاں شیطان حملہ آور ہوتا ہے۔وہ انسان کے نفس کے اندر داخل ہو جاتا ہے۔اب یہ ایسے شخص کی نکیل اپنے ہاتھ میں لے لیتا ہے اور اس سے لغزشوں پر لغزشیں کرواتا ہے اور یہ نفس اللہ کی پرامن اور مضبوط بارگاہ سے دور چلا جاتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جن خدا پرستوں نے نبیوں کے ساتھ مل کر جنگ کی انہوں نے کفار کے مقابلے میں سب سے پہلے جس ہتھیار کی طرف توجہ کی وہ استغفار تھا۔کیونکہ استغفار کے ذریعہ ان کی توجہ اللہ تعالیٰ کی طرف مڑ جاتی تھی۔اللہ کے ساتھ ان کا تعلق اس کی وجہ سے مضبوط ہو جاتا۔ان کے دلوں میں سے تمام خلجان اور غیر یقینی حالت ختم ہو جاتی۔تمام وساوس دور ہو جاتے اور وہ دروازہ بند ہو جاتا جس میں سے شیطان در آتا۔اور یہ دروازہ ہمیشہ تب کھلتا ہے جب اللہ سے رابطہ ٹوٹ جاتا ہے۔انسان اس کی حمایت اور پناہ گاہ سے باہر نکل آتا ہے اور اس سوراخ سے جب شیطان داخل ہوتا ہے تو وہ ان کے پاؤں کو متزلزل کر دیتا ہے۔وہ بار بار ڈگمگانے لگتے ہیں۔یہاں تک کہ وہ انہیں اللہ کی پناہ گاہ سے بہت دور لے جا کر بے آب وگیاہ صحرا میں سرگرداں کر دیتا ہے۔

اللہ بتاتے ہیں کہ میری رحمت ان کے شامل حال ہوگئی۔اس لئے شیطان انہیں مجھ سے کاٹ نہ [illegible] لہٰذا وہ معاف کر دیئے گئے۔

اللہ تعالیٰ ان کے سامنے اپنا ذاتی تعارف بھی کراتے ہیں کہ وہ غفور ہیں' بخشنے والے ہیں اور بردبار ہیں۔غلط کاروں کو راندۂ درگاہ نہیں کرتے اور نہ ہی سزا دہی میں جلدی کرتے ہیں۔جب اللہ نے جان لیا کہ ان کے اندر اللہ کی تلاش کا داعیہ موجود ہے اور وہ اس سے جڑنا چاہتے ہیں اور اس نے جان لیا کہ وہ سرکشی نہیں چاہتے اور نہ ہی وہ جان چھڑانا چاہتے ہیں اور نہ ہی اللہ کی غلامی سے فرار چاہتے ہیں تو وہ پھر اپنی مغفرت سے نوازتا ہے۔

اب اس مضمون کا خاتمہ موت وحیات کی حقیقت کے بیان کے ساتھ کیا جاتا ہے۔اور یہ بتایا جاتا ہے کہ اس بارے میں کفار اور منافقین کے خیالات کس قدر کھوئے ہیں۔اہل ایمان کو پکار کر کہا جاتا ہے کہ وہ اس سلسلے میں اپنا تصور حیات' ان کے تصور حیات سے بالکل جدا کر لیں۔آخر میں مشکلات' تکالیف اور قربانیوں کی ایک مختلف قدر و قیمت بتائی جاتی ہے۔فرماتے ہیں :

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ لَا تَكُونُوا۟ كَٱلَّذِينَ كَفَرُوا۟ وَقَالُوا۟ لِإِخْوَٰنِهِمْ إِذَا ضَرَبُوا۟ فِى ٱلْأَرْضِ أَوْ كَانُوا۟ غُزًّى لَّوْ كَانُوا۟ عِندَنَا مَا مَاتُوا۟ وَمَا قُتِلُوا۟ لِيَجْعَلَ ٱللَّهُ ذَٰلِكَ حَسْرَةً فِى قُلُوبِهِمْ ۗ وَٱللَّهُ يُحْىِۦ وَيُمِيتُ ۗ وَٱللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ﴿١٥٦﴾ وَلَئِن قُتِلْتُمْ فِى سَبِيلِ ٱللَّهِ أَوْ مُتُّمْ لَمَغْفِرَةٌ مِّنَ ٱللَّهِ وَرَحْمَةٌ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُونَ ﴿١٥٧﴾ وَلَئِن مُّتُّمْ أَوْ قُتِلْتُمْ لَإِلَى ٱللَّهِ تُحْشَرُونَ ﴿١٥٨﴾

"اے لوگو! جو ایمان لائے ہو' کافروں کی سی باتیں نہ کرو جن کے عزیز و اقارب اگر کبھی سفر پر جاتے ہیں یا جنگ میں شریک ہوتے ہیں (اور وہاں کسی حادثہ سے دوچار ہو جاتے ہیں) تو وہ کہتے ہیں کہ اگر وہ ہمارے پاس ہوتے تو نہ مارے جاتے اور نہ قتل ہوتے) اللہ اس قسم کی باتوں کو ان کے دلوں کی حسرت و اندوہ کا سبب بنا دیتا ہے' ورنہ دراصل مارنے اور جلانے والا تو اللہ ہی ہے اور تمہاری تمام حرکات پر وہی نگراں ہے۔اگر تم اللہ کی راہ میں مارے جاؤ یا مر جاؤ تو اللہ کی جو رحمت اور بخشش تمہارے حصے میں آئے گی وہ ان ساری چیزوں سے زیادہ بہتر ہے جنہیں یہ لوگ جمع کرتے ہیں اور خواہ تم مرو یا مارے جاؤ بہرحال تم سب کو سمٹ کر جانا اللہ ہی کی طرف ہے۔"

اس معرکے کے حالات کے بیان کے دوران ان آیات کی مناسبت ظاہر ہے۔ یہ منافقین مدینہ کے اقوال تھے۔ یہ لوگ اس معرکہ کے آغاز ہی میں لشکر اسلام سے جدا ہو گئے تھے۔ نیز مدینہ کے مشرکین بھی ایسی ہی باتیں کرتے تھے۔ یہ لوگ ابھی اسلام میں داخل نہ ہوئے تھے لیکن ان لوگوں اور مسلمانوں کے درمیان قرابت کے تعلقات قائم تھے۔ جنگ احد میں جو لوگ مارے گئے ان کے منافق رشتہ داروں اور مشرک رشتہ داروں کے لئے یہ ایک موضوع بن گیا' ان کو اپنے مسلم رشتہ داروں کے دلوں میں حسرت اور مایوسی پیدا کرنے کا موقعہ مل گیا۔ اور اس معرکہ میں ان لوگوں کے چلے جانے اور قتل ہو جانے کو یہ مشرک اور منافق ان کے رشتہ داروں میں از سرنو زخم تازہ کرنے کے لئے بار بار استعمال کرتے تھے۔ اس بات میں شک نہیں ہے کہ اسلامی صفوں پر اس قسم کی باتوں اور پروپیگنڈے سے بہت گہرے اثرات پڑتے تھے اور ان لوگوں نے اس طرح مایوسی اور ہیجان کی فضا پیدا کر دی تھی۔ چنانچہ قرآن کریم کو ان کی غلط باتوں ان کے غلط عقائد اور ان کے غلط تصورات کو درست کرنے کے لئے یہاں ان کی تردید کرنا پڑی۔ اس طرح کہ ان کی وہ باتیں خود ان کے گلے پڑ گئیں۔

ایک بات کافر یہ کرتے تھے کہ اگر ہمارے ساتھ رہتے یا واپس آجاتے تو وہ نہ مرتے۔ ان کی اس بات سے یہ بات اچھی طرح سامنے آجاتی ہے کہ ایک شخص جو کسی نظریے کا علم بردار ہوتا ہے اور وہ شخص جس کا کوئی عقیدہ نہیں ہوتا ان دونوں میں کس قدر فرق ہوتا ہے۔ دونوں کا تصور' ان اصولوں کے بارے میں جن پر زندگی رواں دواں ہے' جس میں مشکلات بھی ہیں اور آسانیاں بھی ہیں' بہت مختلف ہوتا ہے۔ ایک نظریاتی شخص اس کائنات میں اللہ کے تکوینی اصولوں کو اچھی طرح سمجھ سکتا ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کی قضا اور قدر پر مطمئن ہوتا ہے۔ وہ اچھی طرح جانتا اور مانتا ہے کہ اسے وہی کچھ پیش آسکتا ہے جو اللہ نے لکھ دیا ہے۔ اور یہ کہ جس دکھ نے اسے پہنچنا ہے وہ ٹل نہیں سکتا اور جو مصیبت اس پر نہیں آئی ہے وہ آ نہیں سکتی۔ اس لئے وہ مصیبت پر جزع و فزع نہیں کرتا اور نہ ہی مسرت اور خوشی میں آپے سے باہر ہوتا ہے۔ اس کے نفس پر نہ اس کا اثر ہوتا ہے اور نہ اس کا۔ وہ اس بات پر حسرت نہیں کرتا کہ اس نے یہ نہیں کیا اور وہ نہیں کیا تاکہ وہ فلاں مصیبت سے بچ جاتا یا فلاں فلاں مفادات حاصل کر لیتا۔ جبکہ کام ہو چکا ہوتا ہے اور وقت چلا گیا ہوتا ہے۔ اس لئے کہ تقدیر و تدبیر اور تجاویز و آراء کا موقعہ و محل وہ ہوتا ہے جب کوئی واقعہ ابھی تک وقوع پذیر نہیں ہوا ہوتا' کوئی اقدام اور کوئی حرکت ابھی ہونا ہوتی ہے۔ جب تدبیر اور مشورہ کے بعد وہ حرکت میں آجاتا ہے تو اس کے بعد جو نتائج بھی نکلتے ہیں وہ بڑے تسلیم و رضا اور اطمینان کے ساتھ انہیں قبول کرتا ہے۔ ہاں یہ ضروری ہے کہ اس کی یہ حرکت اللہ تعالیٰ کے اوامر اور مناہی کے مطابق ضروری ہے۔ اس کو یقین ہوتا ہے کہ جو کچھ ہوا وہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر اور اس کی تدبیر کے مطابق ہوا ہے۔ عین اس کی حکمت کے مطابق ہوا ہے۔ اور یہ کہ جس طرح ہوا اسی طرح ہونا تھا۔ اگرچہ اس نے اپنی حرکت اور فعل سے اس کے اسباب فراہم کئے۔ یوں نظریہ عمل اور اس کے نتائج تسلیم کرنے کے درمیان ایک توازن ہوتا ہے۔ وہ توکل اور مثبت سوچ کے درمیان بھی توازن پیدا کر دیتا ہے۔ اس کی وجہ سے انسان کا ہر اقدام درست ہوتا ہے اور ضمیر مطمئن ہوتا ہے۔ رہے وہ لوگ جن کا دل و دماغ نظریہ اور اس نظریہ کے تحت مثبت تصور حیات سے خالی ہوتا ہے تو وہ ہمیشہ ہوا میں ہوتا ہے' ہمیشہ قلق و پریشانی میں مبتلا ہوتا ہے۔ اس کی زندگی "اگر مگر" "اے کاش" اور "اے افسوس" جیسے الفاظ میں گزرتی ہے۔

اللہ تعالیٰ' جماعت مسلمہ کی تربیت کرتے ہوئے' واقعات احد کی روشنی میں' جن میں مسلمانوں پر مصائب کے پہاڑ ٹوٹے' انہیں اس امر سے شدید الفاظ میں ڈراتے ہیں کہ ان کا رویہ کہیں ان بے عقیدہ اور بے نظریہ کافروں کی طرح نہ ہو جائے' جو ہر وقت حسرتوں کا شکار ہوتے رہتے ہیں۔ جب بھی ان کا کوئی رشتہ دار' کسی سفر پر برائے تجارت اور کاروبار جاتا ہے اور وہاں بقضائے الٰہی فوت ہو جاتا ہے یا کبھی کسی معرکے میں شریک ہوتا ہے اور قتل ہو جاتا ہے تو وہ یہ کہتے ہیں :

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ قَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ اِذَا ضَرَبُوْا فِي الْاَرْضِ اَوْ كَانُوْا غُزًّى لَّوْ كَانُوْا عِنْدَنَا مَا مَاتُوْا وَ مَا قُتِلُوْا ۚ

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو، کافروں کی سی باتیں نہ کرو، جن کے عزیز و اقارب اگر سفر پر جاتے ہیں یا جنگ میں شریک ہوتے ہیں (اور وہاں کسی حادثہ سے دوچار ہو جاتے ہیں) تو وہ کہتے ہیں کہ اگر وہ ہمارے پاس ہوتے تو نہ مارے جاتے اور نہ قتل ہوتے۔" یہ باتیں وہ اس لئے کرتے ہیں کہ اس کائنات کے بارے میں ان کی سوچ غلط ہے۔ وہ یہ بات نہیں سمجھتے کہ اس کائنات کے واقعات کے پیچھے دست قدرت کام کر رہا ہے۔ وہ صرف اس قدر دیکھ سکتے جس قدر ظاہری اسباب نظر آتے ہیں۔ وہ صرف ان سطحی حالات کو دیکھ سکتے ہیں جن میں کوئی واقعہ رونما ہوا، یہ محض اس لئے کہ ان کا تعلق اللہ کے ساتھ نہیں ہے، اور وہ اس دست قدرت کو نہیں دیکھ سکتے جو اس کائنات میں جاری و ساری ہے۔

لِيَجْعَلَ اللّٰهُ ذٰلِكَ حَسْرَةً فِيْ قُلُوْبِهِمْ ۗ .... "اللہ اس قسم کی باتوں کو ان کے دلوں میں حسرت و اندوہ کا سبب بنا دیتا ہے۔" ان کا احساس یہ ہے کہ جو شخص تجارتی مقاصد کے لئے نکلتا ہے اور کسی حادثے کا شکار ہو جاتا ہے یا کسی معرکے کے لئے نکلتا ہے اور وہاں قتل ہو جاتا ہے، اس کا اصلی سبب گویا اس شخص کا خروج ہے اور یہی غلط احساس ہے۔ جس کی وجہ سے وہ حسرت و اندوہ میں ہروقت ڈوبے رہتے ہیں کہ کیوں نہ انہوں نے انہیں اس سفر، اس معرکے کے لئے نکلنے سے منع کیا؟ اگر انہیں معلوم ہوتا کہ اس کی حقیقی علت اور اصلی سبب تو یہ ہے کہ اس شخص کا وقت آپہنچا تھا، اسے اس کی جائے قتل تک جانا تھا، تقدیر اسے بلا رہی تھی، موت و حیات کے بارے میں سنت اللہیہ نے اپنا کام شروع کر دیا تھا تو وہ اس طرح حسرت و اندوہ میں نہ ڈوبتے۔ وہ اس ابتلا میں صبر و سکون سے رہتے، وہ اس میں راضی برضا اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹتے اور کہتے وَ اللّٰهُ يُحْيٖ وَ يُمِيْتُ ۗ ....

"دراصل مارنے والا اور جلانے والا صرف اللہ ہے۔"

اسی کے ہاتھ میں ہے جسے زندگی دے، اسی کے اختیار میں ہے کہ خود دی ہوئی زندگی کو واپس لے لے۔ یہ سب کچھ اپنے مقررہ وقت پر ہوتا ہے اور ہر کام کے لئے اس نے وقت لکھا ہوا ہے۔ لوگ اپنے گھروں میں رہیں، اپنے اہل و عیال میں رہیں، وہ کاروباری سفر میں ہوں یا نظریاتی جنگ میں ہوں۔ ثواب بھی اسی کے ہاتھ میں ہے۔ معاوضہ بھی اسی کے ہاتھ میں اور وہ یہ سب کام بڑی خبرداری کے ساتھ، پورے علم کے ساتھ اور اچھی طرح دیکھتے ہوئے کرتا ہے۔ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۱۵۶﴾ ....

"اور تمہاری تمام حرکات پر وہ نگراں ہے۔"

اب ایک دوسری حقیقت پر غور ہوتا ہے۔ موت اور قتل سے کیا زندگی ختم ہو جاتی ہے، نہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ کیا زندگی اس انعام سے بہتر ہے جو اللہ دے گا؟ نہیں۔ کچھ اور اقدار حیات بھی تو ہیں۔ کچھ پہلو بھی ہیں جو اللہ کے ترازو میں قابل غور ہیں:

وَ لَئِنْ قُتِلْتُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَوْ مُتُّمْ لَمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَحْمَةٌ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ وَ لَئِنْ مُّتُّمْ اَوْ قُتِلْتُمْ لَاِلَى اللّٰهِ تُحْشَرُوْنَ

"اگر تم اللہ کی راہ میں مارے جاؤ یا مر جاؤ تو اللہ کی رحمت اور بخشش جو تمہارے حصے میں آئے گی وہ ان ساری چیزوں سے زیادہ بہتر ہے جنہیں یہ لوگ جمع کرتے ہیں اور خواہ تم مرو یا مارے جاؤ، بہرحال تم سب کو سمٹ کر جانا اللہ ہی کی طرف ہے۔"

غرض اللہ کی راہ میں موت اور قتل ہونا، ان شرائط و قیود کے ساتھ، زندگی سے بدرجہا بہتر ہے۔ ان تمام دنیوی مفادات اور مال و

منال سے بہتر ہے جسے رات دن لوگ جمع کر رہے ہیں۔ اس عزت و احترام سے بہتر ہے جس کے لئے لوگ کوشاں ہیں۔ یہ موت اس لئے بہتر ہے کہ اس کے نتیجے میں اللہ کی رحمت اور مغفرت نصیب ہوتی ہے۔ اللہ کے میزان حقیقت نما میں یہ بہتر ہے' ان تمام چیزوں سے جو وہ جمع کرتے ہیں۔ یہ مغفرت اور یہ رحمت ہی مطلوب مومن ہوتی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ موت وحیات کے اس مقام میں لوگوں کو شخصی برتری اور انسانی مقاصد اور سربلندیوں کے حوالے نہیں کرتے' بلکہ انہیں' وہ کچھ دکھایا جاتا ہے جو اللہ کے ہاں ہے' ان کے دلوں کو رحمت خداوندی سے جوڑا جاتا ہے۔ اور رحمت خداوندی کو یونہی دنیا کے مال و منال سے زیادہ خیر اور قیمتی قرار دیا جاتا ہے۔ دنیا کے تمام ممکنہ مقاصد سے' اسے برتر اور قیمتی قرار دیا جاتا ہے۔

سب لوگ لوٹ کر اللہ کی طرف جائیں گے' سب لوگ حشر کے دن اٹھا کر اس کے سامنے حاضر کئے جائیں گے۔ چاہے وہ اپنے بستر پر مریں' چاہے وہ اس کرۂ ارض پر کسی تجارتی سفر میں مریں اور چاہے وہ جہاد فی سبیل اللہ کے دوران شہید ہوں۔ جانا انہوں نے بہرحال اللہ کی طرف ہے۔ انجام کار انہوں نے وہاں حاضر ہونا ہے۔ فرق اگر کوئی ہے تو وہ صرف لوگوں کے نقطہ نظر' ان کے مطمح نظر اور طرز عمل میں ہے۔ رہا واقعی عملی انجام تو اس میں کوئی فرق نہیں ہے۔ ایک مقررہ وقت میں' ایک مقررہ مقام پر' تحریر شدہ تقدیر کے مطابق جو اٹل ہے' ہر شخص کی موت واقع ہوگی۔ یوں وہ اللہ کی طرف لوٹ جائے گا' اور پھر ایک مقررہ وقت قیامت میں وہ حشر کے میدان میں اٹھے گا۔ وہاں یا وہ اللہ کی رحمت اور مغفرت پانے والوں میں ہوگا یا وہ غضب الٰہی اور عذاب الٰہی کے چنگل میں جائے گا۔ اس لئے وہ شخص احمق الحمقاء ہے' جو اپنے لئے برا انجام پسند کرتا ہے' جبکہ اسے ہر حال میں مرنا تو ہے ہی۔

یوں دلوں میں حقیقت موت و حیات بیٹھ جاتی ہے۔ اللہ کی تقدیر کا درس دیا جاتا ہے اور یوں قلوب مومنہ تقدیر کے رواں دواں واقعات کو دیکھتے ہوئے مطمئن ہو جاتے ہیں۔ تقدیر کے پردے کے پیچھے جو حکمت کارفرما ہوتی ہے اس پر مطمئن ہو جاتے ہیں۔ ابتلا میں جو ثواب آخرت ہے اسے پسند کرتے ہیں۔ اس پر غزوۂ بدر کے اہم واقعات یہاں ختم ہو جاتے ہیں اور ان کی جو متعلقہ باتیں تھیں ان پر کلام ختم ہو جاتا ہے۔

☆......○......☆

اب سیاق کلام ایک نئے مضمون کو لیتا ہے۔ اس مضمون کا موضوع قائد انقلاب کی شخصیت ہے۔ رسول خدا ﷺ وسلم کی ذاتی صفات کے بارے میں' حقیقت نبوت کے بارے میں اور امت مسلمہ کی زندگی میں ذات نبوی اور حقیقت نبوت کے اہم کردار کے بارے میں بتایا جاتا ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ ذات باری تعالیٰ اس امت کے ساتھ کس قدر رحیم و کریم ہیں۔ اس موضوع کے ساتھ کچھ اور تاریں بھی ملی ہوئی ہیں کہ جماعت مسلمہ کی تنظیم کے سلسلے میں ربانی طریق کار کیا ہے۔ اور یہ کہ اس تنظیم کی اساس کیا ہے۔ یعنی کن نظریات پر اسے قائم کیا گیا ہے اور کن حقائق پر وہ استوار ہے۔ نیز اس تصور حیات کی اہمیت کیا ہے اور تنظیم کے لئے اس ربانی منہاج کی اہمیت کیا ہے اور پھر اس منہاج کا اثر پوری انسانیت پر کیا ہو گا؟

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللَّهِ لِنتَ لَهُمْ ۖ وَلَوْ كُنتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ ۖ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ ۖ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِينَ ﴿١٥٩﴾ إِن يَنصُرْكُمُ اللَّهُ فَلَا غَالِبَ

لَكُمْ ۚ وَإِن يَخْذُلْكُمْ فَمَن ذَا الَّذِي يَنصُرُكُم مِّن بَعْدِهِ ۗ وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ
الْمُؤْمِنُونَ ﴿١٦٠﴾ وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَن يَغُلَّ ۚ وَمَن يَغْلُلْ يَأْتِ بِمَا غَلَّ
يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۚ ثُمَّ تُوَفَّىٰ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ﴿١٦١﴾ أَفَمَنِ
اتَّبَعَ رِضْوَانَ اللَّهِ كَمَن بَاءَ بِسَخَطٍ مِّنَ اللَّهِ وَمَأْوَاهُ جَهَنَّمُ ۚ وَبِئْسَ
الْمَصِيرُ ﴿١٦٢﴾ هُمْ دَرَجَاتٌ عِندَ اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ بَصِيرٌ بِمَا يَعْمَلُونَ ﴿١٦٣﴾ لَقَدْ
مَنَّ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْ أَنفُسِهِمْ
يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِن كَانُوا
مِن قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ﴿١٦٤﴾

النصف

"(اے پیغمبر) یہ اللہ کی بڑی رحمت ہے کہ تم ان لوگوں کے لیے بہت نرم مزاج واقع ہوئے ہو۔ ورنہ اگر کہیں تم تند خو اور سنگ دل ہوتے تو یہ سب تمہارے گردو پیش سے چھٹ جاتے۔ ان کے قصور معاف کر دو' ان کے حق میں دعائے مغفرت کرو' اور دین کے کام میں ان کو بھی شریک مشورہ رکھو' پھر جب تمہارا عزم کسی رائے پر مستحکم ہو جائے تو اللہ پر بھروسہ کرو' اللہ کو وہ لوگ پسند ہیں جو اسی کے بھروسے پر کام کرتے ہیں۔ اللہ تمہاری مدد پر ہو تو کوئی طاقت تم پر غالب آنے والی نہیں' اور وہ تمہیں چھوڑ دے' تو اس کے بعد کون ہے جو تمہاری مدد کر سکتا ہو؟ پس جو سچے مومن ہیں ان کو اللہ ہی پر بھروسہ رکھنا چاہئے۔

کسی نبی کا یہ کام نہیں ہو سکتا کہ وہ خیانت کر جائے.... اور جو کوئی خیانت کرے تو وہ اپنی خیانت سمیت قیامت کے روز حاضر ہو جائے گا' پھر ہر متنفس کو اس کی کمائی کا پورا پورا بدلہ مل جائے گا اور کسی پر کچھ ظلم نہ ہو گا۔ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ جو شخص ہمیشہ اللہ کی رضا پر چلنے والا ہو وہ اس شخص کے سے کام کرے جو اللہ کے غضب میں گھر گیا ہو اور جس کا آخری ٹھکانا جہنم ہو جو بد ترین ٹھکانا ہے؟ اللہ کے نزدیک دونوں قسم کے آدمیوں میں بدرجہا فرق ہے اور اللہ سب کے اعمال پر نظر رکھتا ہے۔ درحقیقت اہل ایمان پر تو اللہ نے یہ بہت بڑا احسان کیا ہے کہ ان کے درمیان خود انہی میں سے ایک ایسا پیغمبر اٹھایا جو اس کی آیات انہیں سناتا ہے' ان کی زندگیوں کو سنوارتا ہے اور ان کو کتاب اور دانائی کی تعلیم دیتا ہے' حالانکہ اس سے پہلے یہی لوگ صریح گمراہیوں میں پڑے ہوئے تھے۔"

اس پیراگراف کا موضوع اور محور حقیقت نبوت اور ذات نبوی ہے۔ اور اس محور کے متعلقہ حقائق کو اس میں لیا گیا ہے۔ اس میں نظر آتا ہے کہ بڑے بڑے اصول چھوٹی چھوٹی عبارتوں میں بیان کیے گئے ہیں۔ اللہ کی رحمت کو مجسم کر کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق اور طرز عمل کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ آپ کی ذات کریمہ نہایت ہی مہربان' نہایت ہی رحم دل' نہایت ہی نرم اور نہایت ہی سہل شکل میں پیش کی گئی ہے۔ نظر آتا ہے کہ لوگ پروانوں کی طرح ان کے اردگرد جمع ہوتے ہیں۔ آپ کے اردگرد ہر وقت ایک بڑی تعداد جمع رہتی ہے۔ پھر اس محفل میں صاف صاف نظر آتا ہے کہ اس جماعت کا قیام جس نظام کے تحت ہے وہ اصول شوریٰ پر قائم ہے۔

حکم دیا جاتا ہے کہ یہ جماعت باہم مشورہ کر کے فیصلے کرے' اگرچہ اس مشورے کے تحت ہونے والے فیصلوں کے نتائج تلخ ہوں۔ پھر شوریٰ کے اصول کے ساتھ ساتھ یہ بھی نظر آتا ہے کہ دانشمندی اور شوریٰ کے ذریعہ فیصلے کئے جائیں اور پھر ان پر عمل کیا جائے۔ اور یہ عمل فیصلہ کن ہو۔ اور شوریٰ اور عزم کے بعد پھر توکل کر کے کام کیا جائے۔ جب منصوبہ تیار ہو جائے' اس پر شوریٰ ہو جائے اور پھر اس پر فیصلہ کن عمل اور اس کا اجراء (Execution) شروع ہو جائے اور اس کے لئے ہر قسم کا انتظام ہو جائے' تو پھر توکل علی اللہ کا مرحلہ آتا ہے اور پھر قدرت الٰہیہ اپنا کام شروع کر دیتی ہے۔ پھر مسلمان اپنا کام اللہ کے سپرد کر دیتے ہیں۔ اس لئے کہ تمام امور میں حقیقی فاعل اور حقیقی متصرف تو صرف اللہ کی ذات ہے۔ حقیقی تصرف اس کے سوا کوئی اور نہیں کر سکتا۔ تمام نتائج اس کے ہاتھ میں ہیں۔ ان امور کے ساتھ ساتھ پھر یہ حکم بھی دیا جاتا ہے کہ مال غنیمت میں خیانت بہت ہی بڑا جرم ہے۔ اس سے طمع اور لالچ کا اظہار ہوتا ہے۔ جماعت کے اندر افراتفری پیدا ہوتی ہے۔ اس پیراگراف میں بتایا جاتا ہے جو شخص اللہ کی رضامندی کے لئے کام کرتا ہے اور جو اللہ کی نافرمانی اور غضب کی راہ پر ہے ان دونوں میں بہت بڑا فرق و امتیاز ہے۔ دونوں کی اقدار اور ترجیحات میں فرق ہوتا ہے۔ دونوں کے پیمانہ نفع و نقصان میں فرق ہوتا ہے۔ آخر میں اہل اسلام اور اہل دنیا کو یہ بتایا جاتا ہے کہ نبی ﷺ کی رسالت تمہارے لئے بڑی نعمت ہے اور تم پر ایک عظیم احسان ہے اور معمولی اموال غنیمت جس کے لئے تم دوڑتے ہو اس قیمتی اثاثے کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہے۔ نیز اس عظیم خزانہ کے حصول کے لئے وہ مصائب کچھ نہیں جو تم پر آئے ہیں۔ یہ عظیم دولت تو عظیم قربانی کا تقاضا کرتی ہے۔

ہدایات و معانی کی یہ فوج ہے جو چند فقروں اور آیات میں دریا کو کوزے میں بند کر کے پیش کر دی گئی ہے۔

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ۖ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ ۚ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ

"اے پیغمبر یہ اللہ کی بڑی رحمت ہے کہ تم ان لوگوں کے لئے بہت نرم مزاج واقعہ ہوئے ہو۔ ورنہ اگر کہیں تم تند خو اور سنگدل ہوتے تو یہ سب تمہارے گردوپیش سے چھٹ جاتے۔ ان کے قصور معاف کر دو' ان کے حق میں دعائے مغفرت کرو۔ اور اہم امور میں ان سے مشورہ کیا کرو۔ پھر جب تمہارا عزم کسی رائے پر مستحکم ہو جائے تو اللہ پر بھروسہ کرو' اللہ کو وہ لوگ پسند ہیں جو اسی کے بھروسے پر کام کرتے ہیں۔"

یہاں روئے سخن رسول خدا کی طرف ہے۔ لیکن یہ بات رسول کی قوم کی کچھ کمزوریوں کو سامنے رکھ کر کی جارہی ہے کہ پہلے وہ مدینہ سے باہر نکلنے میں بڑے پرجوش تھے۔ اس کے بعد ان کی صفوں میں انتشار پیدا ہوگیا۔ پورے لشکر کا ایک تہائی حصہ تو جنگ سے پہلے ہی واپس ہوگیا۔ اس کے بعد تیراندازوں نے حضور کے حکم کی مخالفت کی۔ انہوں نے مال غنیمت کو دیکھ کر کمزوری کا مظاہرہ کیا۔ پھر جب حضور کے قتل کی جھوٹی خبر عام ہوگئی تو یہ لوگ کمزور پڑگئے اور الٹے پاؤں پھر گئے۔ اور ہزیمت قبول کر لی۔ حضور ایک قلیل تعداد کے ساتھ جم گئے' زخم پر زخم آتے رہے اور ساتھی چھوڑ گئے۔ پھر آپ پیچھے سے پکارتے رہے لیکن وہ بھاگے جارہے تھے اور کسی کی طرف ان کی توجہ ہی نہ ہو رہی تھی۔ اس صورت حال میں روئے سخن آپ کی طرف ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو تسلی دیتا ہے اور مسلمانوں کو یہ شعور و احساس دیا جاتا ہے کہ ان پر اللہ تعالیٰ کا کس قدر عظیم انعام ہے۔ حضور ﷺ اور مسلمانوں دونوں کو اس طرف متوجہ کیا جاتا ہے۔ یہ مجسم خلق کریم اللہ کی ایک عظیم نعمت ہے کہ وہ اس محور کے اردگرد جمع ہو رہے ہیں۔ اس طرح حضور کے دل میں پوشیدہ جذبات رحمت کو

جوش میں لایا جاتا ہے اور آپ صبر کر کے ان کی وہ تمام لغزشیں معاف فرماتے ہیں اور دوسری طرف سے ان کو یہ احساس ہو جاتا ہے کہ اس رؤف و رحیم نبی کی صورت میں ان پر کس قدر انعام ہوا ہے۔ اور حضورؐ کو حکم دیا جاتا ہے کہ وہ بھی ان کے لئے عفو و درگزر کا سوال کریں۔ اور یہ کہ حسب سابق ان کے ساتھ مشورہ کرتے رہیں اور یہ نہ ہو کہ احد میں مشورے کے نتیجے میں جو معرکہ ہوا اور اس میں جو نامطلوب نتائج نکلے' اس کی وجہ سے باہم شوریٰ جیسے اہم کام کو بند کر دیں۔

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللَّهِ لِنتَ لَهُمْ ۖ وَلَوْ كُنتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ ۖ .... "اے پیغمبر یہ اللہ کی بڑی رحمت ہے کہ تم ان لوگوں کے لئے بہت نرم مزاج واقعہ ہوئے ہو۔ ورنہ اگر تم تند خو اور سنگدل ہوتے تو یہ سب تمہارے گردوپیش سے چھٹ جاتے۔"

یہ اللہ کی رحمت تھی جو حضور ﷺ کے بھی شامل حال تھی اور آپ کو ان کے لئے رحیم و شفیق اور نرم خو بنادیا اور خود ان کے لئے بھی رحمت تھی کہ آپ نے بوجہ نرمی مزاج ان سے باز پرس نہ کی۔ اگر آپ سنگ دل ہوتے' تنگ مزاج ہوتے تو یہ جمعیت منتشر ہو جاتی' لوگوں کے خیالات آپ کے ساتھ ہم آہنگ نہ ہوتے۔ عوام الناس کو تو ایک پر شفقت بارگاہ درکار ہوتی ہے' جہاں ان کے ساتھ نہایت رعایتی برتاؤ کیا جاتا ہو' جہاں خندہ پیشانی سے ان کا استقبال کیا جاتا ہو' جہاں سے انہیں محبت ملتی ہو' جہاں ان کی غلطیوں' کمزوریوں اور نقائص سے درگزر کیا جاتا ہو۔ جہاں قائد اتنے بڑے دل کا مالک ہو کہ وہ انہیں سب کچھ دے رہا ہو' لیکن ان سے کچھ نہ لے رہا ہو' جہاں قائد اپنے پیرو کاروں کی مشکلات اپنے سر لیتا ہو لیکن ان پر زیادہ بوجھ نہ ڈالتا ہو' اور جہاں پیرو کاروں کو ہمیشہ رعایت' اہمیت' خندہ پیشانی' نرمی اور محبت اور رضامندی ملتی ہو اور حضور اکرم کا دل ایسا ہی دل تھا اور آپ کا برتاؤ لوگوں کے ساتھ بعینہ ایسا تھا۔ کبھی وہ اپنی ذات کے حوالے سے کسی پہ غصہ نہیں ہوئے' کبھی بھی انسانی کمزوری کی وجہ سے آپ نے تنگ دلی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ کبھی آپ نے اس دنیا کے مفادات میں سے کسی مفاد کو' اپنی ذات کے لئے مخصوص نہیں کیا۔ بلکہ آپ کو جو کچھ بھی ملا آپ نے کھلے ہاتھوں سب کچھ ان پر تقسیم کر دیا۔ غرض آپؐ کے صبر' حلم' ہمدردی' محبت اور شرافت نے ہمیشہ انہیں ڈھانپے رکھا۔ اور ان میں سے جس نے بھی حضور ﷺ کے ساتھ یکجا زندگی کے کچھ ایام بسر کئے یا آپ کو محض ایک نظر دیکھ ہی لیا وہ آپؐ کا گرویدہ ہو گیا۔ اس لئے کہ ذات باری نے آپ کو ایک عظیم اور رحیم و کریم شخصیت عطا فرمائی تھی۔ اور یہ سب کچھ آپؐ پر بھی اللہ کی رحمت تھی اور دوسرے پہلو سے آپ کی امت پر بھی کرم تھا۔

اس کرم کو یاد دلا کر اللہ تعالیٰ آپؐ کو وہ اصولی بات بتاتے ہیں جس پر آئندہ جماعت مسلمہ کی تنظیم ہونا مطلوب تھی وہ یہ کہ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ ۖ.................... "اور ان کے ساتھ الامر میں مشورہ کرو۔" یہ ایک قطعی نص ہے اور تاکیدی ہے۔ "ان کے ساتھ الامر میں مشورہ کرو۔" اسلام یہ اصول نظام حکومت میں لازم قرار دیتا ہے۔ اگرچہ اس نظام حکومت میں ہیڈ آف سٹیٹ محمد ﷺ ہوں۔ یہ قطعی نص اس بارے میں شک کی کوئی گنجائش ہی نہیں چھوڑتی کہ اسلامی نظام مملکت میں شوریٰ ایک اساسی اصول (Principle) ہے۔ اس کے سوا اسلام کا نظام مملکت قائم ہی نہیں ہو سکتا۔ رہی یہ کہ شوریٰ کی شکل و صورت کیا ہو' شوریٰ کا مقصد کس طرح حاصل کیا جائے' تو یہ ایسے امور ہیں جن کی صورت اور شکل مختلف ہو سکتی ہے۔ ہر علاقے کے حالات کے مطابق مختلف شکل و صورت میں شوریٰ قائم کی جا سکتی ہے۔ ہر وہ شکل و صورت جس کے ذریعہ شوریٰ کے مقاصد پورے ہو سکیں۔ یہ نہ ہو کہ محض ایک دکھاوا ہو۔ جس صورت اور جس شکل میں صحیح اغراض پورے ہوں وہی اسلامی ہو گی۔

یہ بات نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ جب یہ آیت اتری تھی تو اس سے پہلے مجلس شوریٰ کا انعقاد ہو گیا تھا اور شوریٰ کے اکثریت کے فیصلے کو تسلیم کرتے ہوئے احد کی جنگ لڑی گئی اور جس کے تلخ نتائج برآمد ہوئے۔ اس شوریٰ کے انعقاد کی وجہ سے پہلا نقصان تو یہ ہوا کہ

اسلامی صفوں میں اختلاف پیدا ہو گیا' آراء مختلف ہوئیں۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ مسلمان مدینہ میں پناہ لیتے ہوئے لڑیں۔ جب دشمن حملہ کرے تو تنگ گلیوں کے اندر اسے آلیا جائے لیکن اس کے مقابلے میں ایک پرجوش گروہ کی رائے یہ تھی کہ مدینہ سے باہر نکل کر میدان میں معرکہ آرائی کی جائے۔ ان اختلافی آراء ہی کی وجہ سے لشکر اسلام میں تفرقہ ہو گیا اور عبداللہ ابن ابی بن السلول کو موقع مل گیا کہ وہ ایک تہائی لشکر کو لے کر واپس ہو جائے۔ یہ اس وقت ہوا جب دشمن دروازے پر کھڑا تھا۔ یہ ایک بڑا حادثہ تھا' اور اسلامی صفوں میں بظاہر بڑی دراڑ تھی۔ پھر اس شوریٰ کے نتیجے میں جو فوجی منصوبہ تیار ہوا' وہ عملاً ظاہر ہو گیا کہ وہ کوئی محفوظ جنگی سکیم نہ تھی۔ خود جنگی نقطہ نظر سے۔ اس لئے کہ مدینہ کی دفاعی تاریخ سے یہ منصوبہ مختلف تھا جیسا کہ عبداللہ ابن ابی ابن السلول نے اس مجلس میں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے یہ تاریخی حقیقت بتائی تھی کہ وہ جب بھی مدینہ کے اندر لڑے ہیں کامیاب رہے ہیں اور غزوۂ احزاب میں خود مسلمانوں نے بھی جنگ احد کی اسکیم کی تصحیح کرتے ہوئے مدینہ کے اندر لڑنے کا فیصلہ کیا اور وہ کامیاب بھی رہے۔ انہوں نے خندق کھودی۔ دشمن کے مقابلے میں باہر نہ نکلے۔ اس لئے کہ جنگ احد سے انہوں نے جو تجربہ حاصل کیا تھا اس کا یہی تقاضا تھا۔

خود رسول خدا کو بھی اس بات کا احساس تھا کہ مدینہ سے باہر نکل کر لڑنے کے نتائج خطرناک ہوں گے۔ آپ کے پاس رویائے صادقہ کے ذریعہ بھی کچھ اشارات آچکے تھے۔ آپ کو اچھی طرح معلوم تھا کہ آپ کے خواب بالکل سچے ہوتے ہیں۔ آپ نے اس کی یہ تاویل پہلے سے کر دی تھی کہ آپ کے خاندان میں سے کوئی ایک شہید ہونے والا ہے اور آپ کے ساتھی بھی شہادت پانے والے ہیں۔ نیز آپ کے خوابوں کی تعبیر کرتے ہوئے مدینہ کو محفوظ ڈھال قرار دیا تھا۔ ان حالات میں آپ کو یہ حق حاصل تھا کہ آپ مجلس شوریٰ کے فیصلے کو ویٹو کر دیتے لیکن آپ نے بادل ناخواستہ اس فیصلے کو نافذ (Execute) کیا۔ حالانکہ اس کے پیچھے جو مشکلات جو قربانیاں اور جو نقصانات پوشیدہ تھے' انہیں آپ کی پیغمبرانہ بصیرت دیکھ رہی تھی۔ اس لئے کہ اصول شوریٰ کی بنیاد رکھی جا رہی تھی' جماعت کو تعلیم دی جا رہی تھی' اور یہ امور ان وقتی خساروں سے زیادہ اہم تھے۔

حق تو یہ تھا کہ کم از کم معرکہ احد کے بعد اصول شوریٰ کو ترک کر دیا جاتا۔ کیونکہ اس شوریٰ کی وجہ سے اختلافات ہوئے' اسلامی صفوں میں انتشار پیدا ہوا۔ اور یہ انتشار مشکل حالات میں ہوا۔ اور معرکے کے بعد خوفناک نتائج سامنے آگئے۔ لیکن اسلام نے ایک امت کو برپا کرنا تھا' اس کی تربیت کرنی تھی' اسے پوری انسانیت کی قیادت کے لئے تیار کرنا تھا' اور اللہ تعالیٰ یہ اچھی طرح جانتے تھے کہ کسی قوم کی بہترین تربیت اور اس کو ایک ہدایت یافتہ قیادت بنانے کے لئے صرف اصول شوریٰ پر تیار کیا جا سکتا ہے۔ اور یہ کہ اسے شوریٰ کے نتائج برداشت کرنے کے لئے بھی تیار کرنا تھا۔ اس سے غلطیاں سرزد کرائی تھیں' چاہے وہ جس قدر عظیم ہوں تاکہ آئندہ وہ اپنے تجربات کی روشنی میں آگے بڑھے' چاہے یہ نتائج کتنے ہی تلخ ہوں' وہ اپنی تصحیح کر سکے۔ اور اپنی آراء کے نتائج' اچھے یا برے بھگت سکے۔ اس لئے کہ جب تک اس سے غلطی سرزد نہ ہوگی' وہ درستی کر ہی نہیں سکتی۔ اگر کسی نقصان کے نتیجے میں ایک ایسی امت وجود میں آتی ہے' جو تجربہ کار' فہیم اور نتائج کو برداشت کرنے والی ہو تو ان نقصانات کی کوئی اہمیت نہیں رہتی۔ اور اگر کسی قوم کے نقصانات غلطیوں اور لغزشوں کو محدود کر دیا جائے لیکن اسے تجربات سے بھی محروم کر دیا جائے تو یہ امت اسی طرح ناتجربہ کار رہے گی جس طرح بچہ ناتجربہ کار رہتا ہے۔ وہ ایک ایک قدم پر نگران کے تحت ہوتا ہے۔ اس حالت میں بچے کی طرح اس قوم کو مادی نقصانات سے بچایا جا سکتا ہے لیکن اور مادی مفادات بھی اسے دستیاب نہیں ہو سکتے ہیں' نفسیاتی لحاظ سے اس قوم کو خسارہ ہوتا ہے' اس کے وجود کی تکمیل نہیں ہوتی۔ اس کی تربیت ناقص ہوتی ہے اور عملی زندگی کا اسے کوئی تجربہ نہیں ہوتا۔ اور اس کی مثال اس بچے کی سی ہوتی ہے جسے کوئی چیز ہاتھ میں نہیں دی جاتی۔

اسلام کی پالیسی یہ تھی کہ وہ ایک ایسی قوم تیار کرے جو ایک تجربہ کار قوم ہو۔ اور اس کا منصوبہ یہ تھا کہ اسے بشریت کی ہدایت یافتہ

قیادت کے لئے تیار کیا جائے۔ اس لئے یہ ضروری تھا کہ یہ امت ایک بالغ امت ہو اور اس کی عملی زندگی میں اسے گرنے پڑنے سے بچانے کے لئے کوئی مددگار نہ دیا جائے تاکہ وہ تجربہ کار ہو۔ اور یہ تجربہ اسے رسول اللہ کی زندگی میں حاصل ہو۔ اور آپ کی نگرانی میں ہو۔ اگر ایک بالغ النظر قیادت کی وجہ سے یہ مناسب ہوتا کہ اب شوریٰ کی ضرورت نہیں ہے' اور امت کی تربیت ضروری نہ ہوتی اور خطرناک واقعات میں اس کے ساتھ مشورے اور اس کی آراء پر چلنے کی ضرورت نہ ہوتی مثلاً معرکہ احد جیسے مراحل میں' کیونکہ یہ ایک فیصلہ کن مرحلہ تھا' اس وقت امت مسلمہ ایک نوخیز امت تھی' ہر طرف سے خطرات میں گھری ہوئی تھی' دشمن چار سو گھات میں تھے۔ اس لئے ایسے حالات میں اگر مناسب ہوتا کہ بالغ نظر قیادت سب فیصلے خود کرتی اور اسے حق بھی تھا اور ایسے حالات میں شوریٰ کی ضرورت نہ ہوتی کیونکہ حالات خطرناک تھے' اور پھر اس وقت حضرت محمد بھی موجود تھے اور وحی بھی آرہی تھی تو ایسے حالات میں امت کو حق شوریٰ سے محروم کیا جا سکتا تھا۔ اور خصوصاً ان حالات میں جبکہ احد میں تمام تر واقعات تلخ واقعات شوریٰ ہی کی وجہ سے ظاہر ہوئے' حالانکہ اس وقت یہ امت نہایت ہی خطرناک اور ہنگامی حالات سے گزر رہی تھی لیکن حضور کے وجود مبارک کے باوجود' وحی الہیٰ کے آنے اور آتے رہنے کے باوجود' اور اس قسم کے تلخ نتائج شوریٰ ظہور پذیر ہونے کے باوجود اور خطرناک اور ہنگامی حالات موجود ہونے کے باوجود اللہ تعالیٰ نے حق شوریٰ کو ختم نہ فرمایا۔ چاہے جس قدر نقصان ہو جائے' چاہے اسلامی افواج میں جس قدر اختلاف و افتراق پیدا ہو جائے' چاہے اس کے جس قدر تلخ تجربات ظہور پذیر کیوں نہ ہوں' چاہے مدینہ کے ارد گرد کے حالات اس نوخیز امت کے لئے بہت خطرناک اور ہنگامی کیوں نہ ہوں۔ اس لئے کہ یہ تمام امور ایک بالغ اور تجربہ کار امت کے بروئے کار لانے کے مقصد عظیم کے مقابلے میں ضروری واقعات ہیں۔ مقصد یہ تھا کہ عملاً امت تجربہ کار ہو' اچھی یا غلط رائے کے نتائج ہضم کرنے کے اہل ہو۔ کسی رائے اور عمل کے نتائج کا ادراک کر سکتی ہو۔ یہی وجہ ہے اور یہی وجوہات ہیں کہ ایسے حالات میں یہ آیت نازل ہوئی فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ .... ''ان کے قصور معاف کر دو' ان کے حق میں دعائے مغفرت کرو' ان کو شریک مشورہ رکھو۔''

فیصلہ یہ کیا گیا کہ خطرناک ترین حالات میں بھی اس اصول' اصول مشورہ کا بحال رکھنا ضروری ہے۔ اور احد جیسے حالات میں اور ان کے بعد جیسے حالات میں بھی اس پر عمل ضروری ہو گا۔ اور مقصود یہ تھا کہ آئندہ کے لئے کوئی یہ بہانہ نہ بنائے کہ چونکہ مشورہ کے بعد بعض برے نتائج ظاہر ہو سکتے ہیں اس لئے ہم اس اصول کو ساقط کرتے ہیں۔ مثلاً احد کے حالات اس کی بہترین مثال ہیں۔ کہ دشمن دروازے پر دستک دے رہا تھا لیکن مشورہ بھی جاری تھا۔ اس لئے کہ ایک بالغ النظر امت تب ہی پیدا ہو سکتی ہے جب اصول مشورہ لازمی ہو' اور پوری قوم کی بالغ النظری وہ قیمتی مقصد ہے جس کے لئے چھوٹے بڑے خسارے برداشت کئے جا سکتے ہیں۔

لیکن اسلامی نظام کی سیاسی تصویر اور تشکیل اس وقت تک پوری نہیں ہو سکتی جب تک ہم اس آیت کے اگلے حصے پر غور نہ کریں۔ یہ بات عیاں ہے کہ یہ ضروری نہیں ہے کہ مجلس شوریٰ کے نتیجے میں ہمیشہ قابل ترجیح اور دانشمندانہ فیصلہ ہو جائے۔ آخر کار فیصلہ یہی ہو گا کہ کسی ایک بات پر توکل علی اللہ کر کے عمل شروع کر دیا جائے۔ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ ....

''اور جب کوئی آخری فیصلہ ہو جائے تو اللہ پر بھروسہ کرو' اللہ کو وہ لوگ پسند ہیں جو اس کے بھروسے پر کام کرتے ہیں۔''

شوریٰ کا خلاصہ یہ ہوتا ہے کہ مختلف آراء سامنے آجائیں اور مجلس میں جو آراء پیش ہوں ان سے ایک کو قبول کر لیا جائے۔ جب کوئی فیصلہ ہو جائے تو اس وقت شوریٰ کا کام ختم ہو جاتا ہے اور اب فیصلے کے نفاذ (Execution) کا دور شروع ہو جاتا ہے۔ اور اس تنفیذی مرحلے کے لئے بڑے پختہ عزم اور فیصلہ کن اقدام کی ضروررت ہے۔ اس مرحلے پر پھر اللہ پر بھروسے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور معاملہ اب اللہ کے ہاں چلا جاتا ہے۔ اللہ کی تقدیر کے سپرد ہو جاتا ہے۔ اب یہ اللہ کی مشیئت کا کام ہوتا ہے کہ وہ کیا فیصلہ اور نتائج ظاہر

کرتی ہے۔

جس طرح حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ربانی انداز میں شوریٰ کا سبق پڑھایا۔ امت کو دکھایا کہ اظہار رائے کا انداز کیا ہوتا ہے اور فیصلے کے بعد اس کے نتائج کو کس طرح برداشت کیا جاتا ہے خصوصاً خطرناک حالات میں۔ اسی طرح حضورؐ نے امت کو فیصلے' کسی شورائی فیصلے کی تنفیذ کے سلسلے میں بھی سبق دیا۔ اور توکل علی اللہ کا انداز بھی سکھایا۔ اور اپنے آپ کو تن بہ تقدیر اللہ کے حوالے کرنے کا طریقہ بھی سکھایا۔ حالانکہ واقعات کے رونما ہونے کا آپ کو اچھی طرح اندازہ تھا۔ واقعات کا رخ آپ کے علم میں تھا لیکن آپ نے مدینہ سے باہر نکل کر لڑنے کے فیصلے کی تنفیذ فرما دی۔ آپ گھر میں داخل ہوئے اور زرہ اور خود زیب تن فرمائی۔ اور آپ کو اچھی طرح علم تھا کہ وہ کہاں جا رہے ہیں؟ آپ اور آپ کے صحابہ کو کن مصائب اور مشکلات سے دوچار ہونا ہے۔ یہاں تک کہ جب باہر لڑنے والے پرجوش لوگوں نے دوبارہ مشورہ دیا اور موقعہ فراہم کر دیا کہ فیصلے کو بدل دیا جائے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ مبارک کو پڑھ کر انہوں نے محسوس کر لیا کہ ان کے جوش و خروش نے حضورؐ کو باہر لڑنے پر مجبور کر دیا ہے۔ حالانکہ آپ ایسا نہ چاہتے تھے اور انہوں نے دوبارہ اختیار آپ کو دے دیا کہ آپ مدینہ کے اندر لڑیں یا باہر لڑیں تو آپ نے اس پر دوبارہ غور کرنے کے موقع سے فائدہ نہ اٹھایا۔ یہ کیوں؟ اس لئے کہ آپ انہیں ایک سبق دینا چاہتے تھے۔ آپ شوریٰ (Parliament) کے فیصلوں کی مثال قائم کرنا چاہتے تھے۔ یہ چاہتے تھے کہ جب فیصلہ پختہ اور آخری ہو جائے تو پھر دوبارہ غور کے بجائے اس کا نفاذ چاہئے۔ اللہ پر توکل کرنا چاہئے جو ہو' سو ہو۔ آپ یہ بھی دکھانا چاہتے تھے کہ شوریٰ کا ایک وقت ہوتا ہے۔ فیصلے کے بعد تردد اور ڈانواں ڈول نہیں ہونا چاہئے۔ دوبارہ غور کر کے از سر نو فیصلہ نہیں ہونا چاہئے۔ اس لئے کہ اس طرح کوئی بات آخری نہ رہے گی' فیصلے بار بار بدلیں گے اور دوبارہ غور کی اگر مثال قائم ہو جائے تو یہ سلسلہ ختم ہی نہ ہو گا۔ بس شوریٰ (Parliament) کا فیصلہ ہو اور پھر نفاذ ہو اور توکل علی اللہ ہو اس لئے کہ اسے اللہ پسند کرتا ہے۔

إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِينَ .... "بے شک اللہ تعالیٰ اس پر بھروسہ کرنے والوں کو محبوب رکھتا ہے۔"

اور وہ صفت جسے اللہ پسند کرتے ہیں اور اس صفت سے متصف لوگوں کو محبوب رکھتے ہیں تو اہل ایمان کا فرض ہے کہ وہ صفت ان کے اندر بدرجہ کمال پائی جائے اور وہ اس کے لئے بے حد حریص ہوں بلکہ وہ مومنین کی صفت ممتازہ ہونی چاہئے۔ توکل علی اللہ اور سپردم بتومایہ خویش را' اسلامی تصور حیات اور اسلامی زندگی کا خط توازن ہے۔ اب معاملہ اس کائنات کی عظیم حقیقت کے سپرد ہو جاتا ہے۔ یہ حقیقت کہ آخری فیصلہ اللہ کے ہاں ہو گا' اب وہ ہو گا جو وہ چاہے۔

احد کے عظیم تجربات میں سے یہ ایک عظیم تجربہ اور ایک عظیم سبق تھا۔ یہ سبق امت مسلمہ کے لئے اس کے ہر دور اور ہر زمانے میں ایک قیمتی سرمایہ ہے۔ یہ صرف ایک دور ہی کی بات نہیں ہے بلکہ ہر دور کے لئے ہے۔

حقیقت توکل کو مزید ذہن نشین کرانے کے لئے اور اس کے اصول کو ثابت اور مستحکم کرنے کے لئے اگلی آیت میں ذرا تفصیل سے واضح کر کے اس حقیقت کو ظاہر کیا جاتا ہے کہ حقیقی قوت فاعلہ ذات باری ہے۔ فتح و کامرانی اور شکست اور ذلت اسی کے ہاتھ میں ہے۔ اس لئے اگر نصرت چاہتے ہو تو اسی سے چاہو اور اگر شکست سے بچنا چاہتے ہو تو اسی کے آگے گڑگڑاؤ۔ اسی کی طرف متوجہ ہو جاؤ' اسی پر بھروسہ کرو' لیکن پوری تیاری کے بعد' نتائج سے بے فکر ہو جاؤ اور نتائج و عواقب اللہ پر چھوڑ دو۔

إِن يَنصُرْكُمُ اللَّهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ ۖ وَإِن يَخْذُلْكُمْ فَمَن ذَا الَّذِي يَنصُرُكُم مِّن بَعْدِهِ ۗ وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ

"اللہ تمہاری مدد پر ہو تو کوئی طاقت تم پر غالب آنے والی نہیں' اور وہ تمہیں چھوڑ دے تو اس کے بعد کون ہے جو تمہاری مدد کر سکتا ہو؟ پس جو سچے مومن ہیں ان کو اللہ پر بھروسہ رکھنا چاہئے۔"

اسلامی تصور حیات کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اللہ کی فاعلیت مطلقہ اور اس کی تقدیر کی کارفرمائی اور اس تقدیر کی رونمائی بذریعہ افعال انسانی اور بذریعہ انسانی سرگرمی کے ظاہر ہونے کا قائل ہے۔ وہ کسی ایسے تصور تقدیر الٰہی کا قائل نہیں ہے جو انسانی افعال اور سرگرمیوں کے علاوہ اور جدا ہو۔ اللہ کی سنت یوں چلتی ہے کہ نتائج اسباب پر مرتب ہوتے ہیں لیکن اسباب بذات خود نتائج کی تخلیق نہیں کرتے۔ حقیقی فاعل اور موثر بہرحال اللہ ہے۔ وہ اپنی قدرت اور مشیت کے ذریعہ اسباب پر نتائج مرتب کرتا ہے۔ اس لئے انسان سے یہ مطالبہ کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے فرائض پورے کرے۔ اس طرح نتائج اگرچہ اسباب کے بعد آتے ہیں لیکن وہ تابع تقدیر الٰہی ہوتے ہیں۔ جب اسباب نتائج پیدا کرتے ہیں تو وہ اللہ کے اذن سے ایسا کرتے ہیں۔ اللہ اجازت دیتا ہے۔ تب یوں ہوتا ہے یوں ایک مسلمان کے عمل اور اس کے تصور حیات کے درمیان ایک قسم کا توازن پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ پوری طرح عمل پیرا ہوتا ہے۔ اپنی پوری طاقت صرف کرتا ہے اپنے عمل اور جهد مسلسل کے نتائج اللہ پر چھوڑ دیتا ہے۔ وہ یہ تصور نہیں کرتا کہ اس کی جدوجہد کے نتائج خواہ مخواہ نکلیں گے۔ اس لئے کہ ایک مسلمان اللہ تعالیٰ پر کوئی امر لازم نہیں کر سکتا۔

یہاں آکر فتح و شکست کے معاملہ میں مسلمان نتائج اللہ پر چھوڑ دیتے ہیں اگرچہ فتح و شکست کا ظہور بہرحال کسی معرکے کے بعد ہی ہوتا ہے۔ وہ معرکے میں کود پڑنے کے بعد نتیجہ اللہ کی مشیت اور قدرت پر چھوڑ دیتے ہیں اور ان کا تصور حیات اب معرکے میں کودنے کے بعد یہ ہوتا ہے کہ اگر اللہ انہیں فتح دے گا تو ان پر کوئی دوسری قوم غالب اور فاتح نہیں ہو سکتی۔ اور اگر اللہ کی مشیت یہ ہو کہ مسلمان ذلیل ہوں تو پھر کوئی دوسری قوت ان کی نصرت نہیں کر سکتی۔ اور یہ اس کائنات کی ایک اٹل حقیقت بلکہ حقیقت کبریٰ ہے۔ کوئی قوت اللہ کی قوت کے سوا یہاں نہیں ہے۔ کوئی تقدیر اللہ کی تقدیر کے سوا نہیں ہے۔ کوئی مشیت اللہ کی مشیت کے سوا یہاں کارفرما نہیں ہے۔ تمام چیزیں حکم ذات باری سے وجود میں آتی ہیں' تمام واقعات کے اسباب وہ فراہم کرتا ہے لیکن یاد رکھو کہ یہ حقیقت کبریٰ اس بات سے اہل اسلام کو بری الذمہ نہیں کر دیتی کہ وہ اسلامی نظام زندگی پر عمل پیرا نہ ہوں۔ وہ ہدایات پر عمل کریں' وہ فرائض سرانجام دیں' وہ جدوجہد کریں اور اس کے بعد توکل علی اللہ کریں۔ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ "پس جو سچے مومن ہیں ان کو اللہ ہی پر بھروسہ کرنا چاہئے۔"

اس کی وجہ سے ایک مومن کا تصور اس بات سے پاک ہو جاتا ہے کہ کوئی چیز اللہ کے سوا کسی اور سے بھی طلب ہو سکتی ہے۔ ایک مومن کی سوچ براہ راست اس ذات کے ساتھ پیوست ہو جاتی ہے جو اس کائنات میں حقیقتاً متصرف ہے۔ اس لئے وہ ان تمام کھوٹے خداؤں اور تمام باطل اسباب سے ہاتھ کھینچ لیتا ہے اور ان کی حمایت اور نصرت کی طلب نہیں کرتا۔ اور وہ اچھے نتائج کے لئے صرف اللہ وحدہ پر توکل کرتا ہے۔ اسی سے توقع کرتا ہے کہ وہ معاملات کو اچھے رخ پر ڈالے گا' اور اپنی حکمت سے درست کرے گا۔ اس عقیدے کے بعد پھر تقدیر الٰہی کے نتیجے میں جو کچھ بھی وقوع پذیر ہوتا ہے وہ اسے بڑی فراخدلی سے قبول کرتا ہے۔ فکر و نظر کا یہ' وہ توازن ہے جسے انسانی فکر نے' صرف اسلام کے زیر سایہ پایا۔

اس کے بعد بات نبوت اور خصائص نبوت کی طرف چلی جاتی ہے تاکہ اس موضوع کے بعد امانت و دیانت کے بارے میں کچھ ہدایات دی جائیں' مثلاً یہ کہ مال غنیمت میں کسی قسم کی بددیانتی اور چوری سخت معیوب چیز ہے۔ اور یہ کہ جو شخص بھی اجتماعی امانتوں میں بددیانتی کرے گا وہ اس کا حساب دے گا۔ اور ہر شخص کا حق اسے پورا پورا دیا جائے گا۔

وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَغُلَّ وَمَنْ يَغْلُلْ يَأْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ثُمَّ تُوَفَّى كُلُّ نَفْسٍ مَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ (۱۶۱)

"کسی نبی کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ خیانت کر جائے.... اور جو کوئی خیانت کرے تو وہ اپنی خیانت سمیت قیامت کے روز حاضر ہو جائے گا' پھر ہر متنفس کو اس کی کمائی کا پورا پورا بدلہ مل جائے گا اور کسی پر ظلم نہ ہو گا۔"

احد کی پہاڑی اور گھاٹی سے تیراندازوں نے حکم عدولی کرتے ہوئے اپنی جگہ اس لئے بھی چھوڑ دی تھی کہ انہیں یہ خوف دامن گیر ہو گیا تھا کہ شاید بعد میں رسول خدا انہیں کوئی حصہ نہ دیں۔ اس طرح جنگ بدر کے اموال غنیمت کے بارے میں بعض منافقین نے یہ پروپیگنڈا کیا تھا کہ غنیمت کی کچھ چیزیں غائب ہو گئی ہیں۔ اور اس سلسلے میں انہیں یہ حیا بھی نہ آئی کہ وہ حضور کا نام لینے سے تو احتراز کریں۔

اس لئے اس آیت میں یہ حکم اور قاطع فیصلہ آ گیا کہ حضرت محمد کیا کوئی نبی بھی ہرگز یہ نہیں کر سکتا کہ وہ اموال غنیمت میں سے کوئی چیز ادھر ادھر کر دے۔ یعنی مال غنیمت میں سے کوئی چیز علیحدہ رکھ لیں اور یہ کہ وہ بعض فوجیوں کو زیادہ حصہ دیں یا غرض وہ کسی طرح کی کوئی خیانت کریں۔ وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَغُلَّ .... "نبی کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ مال غنیمت میں کوئی خیانت کرے۔"

یہ اس کی شان کے خلاف ہے۔ وہ اس کے مزاج اور طبیعت نبوت کے خلاف ہے۔ وہ اس کے اخلاق کے خلاف ہے کہ ایسا کرے۔ گویا ذات نبوت سے اس فعل کا وقوع ہی ممکن نہیں ہے۔ یہاں یہ نفی حلت اور حرمت کی نفی نہیں ہے۔ اس لئے کہ نبی کی امانت دار' منصف مزاج اور پاک طبیعت اور مزاج ہی کے یہ بات خلاف ہے کہ اس سے اس قسم کی کوئی بات وقوع پذیر ہو۔ بعض قرأتوں میں لفظ يُغَلَّ ہے۔ یعنی مجہول کا فیصلہ آیا ہے۔ یعنی یہ بات جائز نہیں ہے کہ نبی کے ساتھ خیانت کا برتاؤ کیا جائے۔ اور اس کے متبعین اس سے کوئی چیز چھپائیں۔ اس صورت میں یہاں اس بات کی ممانعت ہو گی کہ حضور ﷺ کے ساتھ اس کے پیروکار خیانت نہ کریں اور یہ قرأت آیت کے آخری حصے کے ساتھ زیادہ ہم آہنگ ہے۔ حسن بصریؒ کی تلاوت ایسی ہی تھی۔

اس کے بعد ان لوگوں کو سخت تنبیہ کی جاتی ہے کہ جس نے خیانت کی مال غنیمت میں یا اور حکومتی اموال میں تو ان کا انجام یہ ہو گا۔

مِنْ بَعْدِهِ وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ .... "اور جو خیانت کرے تو وہ اپنی خیانت سمیت قیامت کے روز حاضر ہو جائے گا' پھر ہر متنفس کو اس کی کمائی کا پورا پورا بدلہ مل جائے گا اور کسی پر ظلم نہ ہو گا۔"

امام احمد نے 'سفیان' زہری' عروہ' ابو احمد ساعدی کی روایت نقل کی ہے۔ کہتے ہیں کہ حضورؐ نے قبیلہ ازد کے ایک شخص ابن لتبیہ نامی کو زکوٰۃ کا تحصیلدار مقرر فرمایا۔ وہ جب واپس آیا تو کہا یہ مال آپ کا ہے اور یہ مجھے ہدیہ دیا گیا ہے۔ اس پر حضور ممبر پر کھڑے ہوئے اور یہ تقریر فرمائی: "ان تحصیلداروں کا کیا حال ہے کہ ہم انہیں کام پر لگاتے ہیں اور واپس آ کر وہ کہتا ہے کہ یہ تو تمہارا ہے اور یہ مجھے ہدیہ دیا گیا ہے۔ کیوں نہ وہ اپنے باپ یا ماں کے گھر بیٹھا اور انتظار کرتا کہ اسے ہدیہ دیا جاتا ہے یا نہیں۔ خدا کی قسم جس کے ہاتھ میں محمد کی جان ہے جو شخص بھی اس مال سے کوئی چیز لے گا قیامت کے دن وہ اس کے کاندھے پر ہو گی۔ اونٹ ہو گا اور وہ آواز دے رہا ہو گا' گائے ہو گی اور وہ آواز دے رہی ہو گی اور بکری ہو گی تو بھی وہ میارہی ہو گی۔ (مسلم بخاری)

اور امام احمد نے اپنی سند کے ذریعہ حضرت ابو ہریرہ سے روایت کی ہے۔ انہوں نے فرمایا رسول خدا ﷺ ایک دن ہم میں کھڑے ہوئے۔ انہوں نے غلول (غنیمت میں سے چوری) کا ذکر کیا۔ اسے عظیم امر قرار دیا اور اسے بہت ہی بڑا گناہ قرار دیا۔ اور فرمایا کہ قیامت

کے دن مجھے کوئی ایسا شخص نہ ملے جو آئے اور اس کے کندھوں پر اونٹ ہو اور وہ کہے اے رسول خدا ﷺ میری مدد کرو اور میں اسے یہ جواب دوں کہ میں تمہارے لئے اللہ کے ہاں کچھ نہیں کر سکتا۔ میں نے تمہیں پوری طرح پیغام پہنچا دیا تھا۔ میں تم میں سے ایسے شخص کو بھی نہ ملوں جس کے کندھوں پر گھوڑا ہو' جو ہنہنا رہا ہو اور وہ شخص مجھے کہے رسول' خدا میری امداد کرو اور میں اسے جواب دوں میں تمہارے لئے اللہ کے ہاں کچھ نہیں کر سکتا۔ میں نے تمہیں پوری طرح تبلیغ کر دی تھی اور میں تم میں سے ایسے شخص کو بھی نہ ملوں جس کے کندھوں پر کوئی بے زبان جانور ہو اور وہ کہے رسول خدا میری امداد کرو اور میں اسے بھی یہ جواب دوں کہ میں اللہ کے ہاں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ میں نے تمہیں پوری طرح تبلیغ کر دی تھی۔ (بخاری مسلم روایت ابوحیان)

امام احمد نے اپنی سند کے ساتھ حضرت عدی ابن عمیرہ الکندی سے روایت کی ہے۔ رسول' خدا نے فرمایا: "اے لوگو! تم میں سے کوئی شخص ہمارے لئے عامل مقرر ہوا اور اس نے اس سے ایک سوئی چرائی یا اس سے زیادہ تو وہ چور ہے اور قیامت کے دن وہ اسے لے کر آئے گا۔" اس پر انصار میں سے کالے رنگ کا ایک شخص اٹھا (مجاہد کہتے ہیں کہ وہ سعد ابن عبادہ تھے گویا میں اسے اب بھی دیکھ رہا ہوں) اور کہا اے رسول' خدا میں اپنے منصب سے مستعفی ہوتا ہوں آپ اپنا کام سنبھالئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کیا ہو گیا ہے؟ تو اس نے حضور ﷺ سے کہا میں نے آپ کو یہ اور یہ کہتے ہوئے سنا ہے اور میں یہ بات اب بھی کہتا ہوں: "جسے ہم نے کسی ڈیوٹی پر لگایا تو اس کو چاہئے کہ وہ کم ہو یا زیادہ لے کر آئے۔ اسے جو کچھ دیا جائے وہ لے لے۔ اور جو نہ دیا جائے' رک جائے۔ (مسلم ابوداؤد)

قرآن کریم کی اس آیت اور ان احادیث نے جماعت مسلمہ کی تربیت میں ایک عظیم کردار ادا کیا۔ یہاں تک کہ اس کے حیرت انگیز نتائج بر آمد ہوئے۔ ایک ایسا گروہ تیار ہوا' جو نہایت ہی امانتدار' دیانتدار اور اموال حکومت کے بارے میں اس قدر محتاط تھا جس کی مثال تاریخ انسانی میں نہیں ملتی۔ اور پوری انسانی تاریخ میں کبھی ایسی جماعت تیار نہیں ہوئی۔ یوں ہوتا کہ ایک عام مسلمان کے ہاتھ میں مال غنیمت میں سے ایک نہایت ہی قیمتی سامان پڑتا اسے کسی نے دیکھا ہی نہ ہوتا اور وہ اسے لا کر امیر کے حوالے کر دیتا۔ اور اس کا نفس اسے' اس کے بارے میں کسی طرح بھی بدراہ نہ کر سکتا۔ محض اس ڈر سے کہ قیامت کے روز اس کا وہ حشر نہ ہو جو قرآن و سنت کی ان نصوص میں مذکور ہے۔ اس ڈر سے کہ قیامت کے دن اس کی ملاقات نبی ﷺ سے ہو اور اس کی یہ حالت ہو جس کا اوپر ذکر ہوا۔ اور یہ کہ وہ قیامت کے دن شرمندہ نہ ہو۔ جس سے اسے نبی ﷺ نے واضح طور پر خبردار کر دیا ہے۔ غرض مسلمانوں کی زندگی یوں تھی کہ فکر آخرت اور خوف آخرت ان کی زندگی کا عملی جزو ہوا کرتے تھے۔ ان کے احساس کا حصہ ہوا کرتے تھے اور ان کے تقویٰ' خدا خوفی اور غایت درجہ احتیاط کا راز یہی تھا۔ آخرت کا تصور ان کی زندگی میں ایک زندہ تصور تھا' خوابیدہ نہ تھا۔ وہ ایک وعدۂ فردا نہ تھا۔ وہ ان کے یقین کا حصہ تھا جس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہ تھی۔ وہ یہ یقین کرتے تھے کہ ہر کسی کو پورا پورا بدلہ دیا جائے گا اور کوئی ظلم نہ ہو گا۔

ابن جریر طبری نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے کہ جب مسلمان مدائن میں اترے تو انہوں نے مال غنیمت جمع کیا۔ ایک شخص آیا اور اس کے پاس کوئی چیز تھی اور اس نے اسے خزانچی کے حوالے کیا۔ اس کے ساتھیوں نے کہا ہم نے اس قدر قیمتی چیز کبھی نہیں دیکھی۔ ہمارے پاس جو بھی سامان جمع ہوا' وہ اس قدر قیمتی نہیں ہے جس قدر یہ چیز قیمتی ہے۔ تو انہوں نے سوال کیا کہ کیا تم نے اس سے کچھ لیا ہے؟ تو اس نے جواب دیا کہ میں نے کچھ نہیں لیا ہے اور خدا کی قسم اگر اللہ نہ ہوتا تو میں یہ تمہیں لا کر نہ دیتا۔ تب مسلمانوں کو معلوم ہوا کہ یہ شخص ایک غیر معمولی شخص ہے۔ خزانچی کے ساتھیوں نے پوچھا تمہارا تعارف کیا ہے؟ تو اس نے کہا میں اپنا تعارف اس لئے نہیں کراتا کہ تم میری تعریف کرتے پھرو گے اور نہ دوسرے لوگوں کو بتاؤں گا تاکہ وہ میرے اس عمل کی تعریفیں کرتے پھریں' میں صرف اللہ کی تعریف کروں گا اور اس کے ثواب کا امیدوار رہوں گا۔ ان لوگوں نے اس کا پیچھا کیا اور جب وہ اپنے ساتھیوں میں پہنچا تو انہوں نے دیانت کہا

کہ وہ ثابت بن عبد قیس ہے۔ا۔

حضرت عمر کے دور میں جب اموال غنیمت لائے گئے' جنگ قادسیہ کے بعد کا واقعہ ہے تو ان میں کسریٰ کا وہ تاج بھی تھا جسے وہ ایوان شاہی میں بیٹھ کر پہنتا تھا۔ یہ بہت ہی قیمتی تھا۔ حضرت عمر نے اسے دیکھا اور کہا کہ قابل قدر ہیں وہ فوجی جنہوں نے اسے خزانہ میں جمع کیا اور کہا "جس قوم نے یہ تاج لاکر اپنے امیر کو دیا ہے حقیقت یہ ہے کہ وہ لوگ حد درجے کے امین ہیں۔"

یہ تھی مسلمانوں کی اسلامی تربیت' یہ اس قدر عجیب و غریب معلوم ہوتی ہے کہ اس کی داستانیں افسانے معلوم ہوتے ہیں۔

اب اموال غنیمت اور اموال غنیمت کے اندر خیانت کی اس بحث کے بعد قرآن کریم اسی مناسبت سے اخلاقی قدروں کا ذکر کرتا ہے۔

"بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ جو شخص ہمیشہ اللہ کی رضا پر چلنے والا ہو' وہ اس شخص کے لئے کیسے کام کرے جو اللہ کے غضب میں گھر گیا ہو اور جس کا آخری ٹھکانا جنہم ہو' جو بد ترین ٹھکانا ہے۔ اللہ کے نزدیک دونوں قسم کے آدمیوں میں بدرجہا فرق ہے اور اللہ سب کے اعمال پر نظر رکھتا ہے۔"

یہ وہ دور رس تبدیلی ہے جس کے سائے میں' تربیت پانے والوں کی نظروں میں اموال غنیمت کی کوئی حیثیت نہیں' اس دنیا کے بارے میں سوچنا ہی حقیر ہو جاتا ہے اور قرآن منہاج تربیت کے خطوط میں سے ایک خط ہے۔ یہ عجیب نقوش ہیں جن پر یہ منہاج انسانی دلوں کی تربیت کرتا ہے۔ ان کی ترجیحات ہی بدل جاتی ہیں' ان کے افق ہی بدل جاتے ہیں۔ اس لئے وہ دوسرے میدانوں کو چھوڑ کر زندگی کے اصل ہدف کی طرف آگے بڑھتے ہیں۔

أَفَمَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَ اللَّهِ كَمَنْ بَاءَ بِسَخَطٍ مِنَ اللَّهِ وَمَأْوَاهُ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ .... "بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ جو شخص ہمیشہ اللہ کی رضا پر چلنے والا ہو' وہ اس شخص کے لئے کیسے کام کرے جو اللہ کے غضب میں گھر گیا ہو اور جس کا آخری ٹھکانہ جنہم ہو' جو بد ترین ٹھکانا ہے۔"

یہ ہیں حقیقی اقدار۔ یہ ہے میدان جس میں امید ہونی چاہئے۔ یہ ہے وہ میدان جس میں کام ہونا چاہئے اور یہ ہے وہ فیلڈ جس میں کمائی یا خسارے کی بات ہونی چاہئے۔ اور کس قدر وسیع خلیج ہے اس شخص کے درمیان جو رضامندی باری تعالیٰ کا طلبگار ہو اور اس میں کامیاب بھی ہو اور اس شخص کے درمیان جو راہ غضب پر ہو اور اس میں گھر بھی چکا ہو اور جنہم کا مستحق ہو گیا ہو جو یقیناً بہت ہی برا ٹھکانا ہے۔

یہ بھی ایک مقام ہے اور وہ بھی ایک مقام ہے اور ان دونوں مقامات کے درمیان ایک وسیع خلیج ہے هُمْ دَرَجَاتٌ عِنْدَ اللَّهِ .... "یہ درجے ہیں اللہ کے نزدیک" ہر شخص اپنے مقام تک استحقاق کی بنا پر پہنچتا ہے۔ اس لئے اس معاملے میں نہ کسی پر کوئی ظلم و زیادتی ہے اور نہ بے جا محبت اور طرفداری ہے۔ وَاللَّهُ بَصِيرٌ بِالْعِبَادِ .... "اور اللہ اپنے بندوں کے اعمال پر نظر رکھتا ہے۔"

اب یہ پیراگراف اپنے اصل موضوع کی طرف آتا ہے یعنی رسول اللہ ﷺ کی شخصیت کی طرف۔ بتایا جاتا ہے کہ آپ کو رسول بنا کر دراصل اللہ تعالیٰ نے مکہ مدینہ اور پوری دنیا کے اہل ایمان پر ایک عظیم احسان کیا ہے۔ اہل ایمان کو چاہئے کہ وہ رسالت کی اس اسکیم پر غور کریں۔

ا۔ طبری ج ۴۔ ص ۱۶

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْ أَنْفُسِهِمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِنْ كَانُوا مِنْ قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ

"درحقیقت اہل ایمان پر تو اللہ نے بہت بڑا احسان کیا ہے کہ ان کے درمیان خود انہی میں سے ایک ایسا پیغمبر اٹھایا جو اس کی آیات انہیں سناتا ہے' ان کی زندگیوں کو سنوارتا ہے اور ان کو کتاب اور دانائی کی تعلیم دیتا ہے' حالانکہ اس سے پہلے یہی لوگ گمراہیوں میں پڑے ہوئے تھے۔"

اس پیراگراف کا اختتام حقیقت نبوت محمدیہ پر کرنا' اور آپ کی ذاتی حیثیت و مقام کو یہاں بیان کرنا اور اسے عظیم احسان جتانا' اور آپ اور آپ کی نبوت کا اس امت کی تعمیر و تشکیل میں اہم کردار جتلانا اور اس امت کی تعلیم و تربیت اور اس کی قائدانہ صلاحیت اور کھلی گمراہی سے نکل کر اس کا علم و حکمت اور تزکیہ اور طہارت کے اعلیٰ مقام تک پہنچ جانے کا تذکرہ ان سب امور کے اندر متنوع اور عمیق قرآنی احساسات ہیں جن پر غور ضروری ہے۔

یہ آیات ابتدا" مال غنیمت پر بطور تبصرہ آئی ہیں کہ مال غنیمت کا لالچ' اس سے کسی چیز کے چوری ہونے' اور اس معمولی کام کے اندر بہت زیادہ مشغول ہونے کی وجہ سے تم نے احد کی جیتی ہوئی جنگ ہاری۔ اور تمہاری فتح شکست میں بدل گئی۔ اور اس کی وجہ سے مسلمان ملت کے ساتھ وہ کچھ ہوا جو تم نے دیکھ لیا۔ اس ریفرنس میں رسالت کے عظیم منصب کے تذکرے اور اس عظیم احسان کے تذکرے سے جو احساس دلانا مقصود ہے وہ بہت ہی گہرا ہے۔ اور اس سے قرآن اپنے مخصوص انداز کے ساتھ امت کی تربیت کرنا چاہتا ہے۔ اس عظیم منصب کے ذکر اور یہ سمجھانے سے کہ یہ کس قدر عظیم احسان ہے تمہارے لئے یہ تاثر اور احساس دینا مطلوب ہے کہ تمام زمین کے اموال غنیمت' تمام کرۂ ارض سے چھینا ہوا مال اور تمام دنیا کے سامان و اسباب' اس کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہیں اور ان کی کوئی اہمیت نہیں ہے اور یہ قابل ذکر ہی نہیں ہیں۔ اس عظیم منصب و نعمت کے ہوتے ہوئے ان حقیر چیزوں کے تذکرے سے بھی ایک مسلمان کو حیا آتی ہے بلکہ اس کے بارے میں سوچنا بھی شرمندگی ہے۔ چہ جائیکہ مسلمانوں میں سے کوئی اس کے اندر دلچسپی لے۔

پھر یہ فکر انگیز اشارہ اس وقت دیا گیا ہے کہ مسلمانوں کو شکست ہو چکی تھی' وہ رنج و الم میں مبتلا تھے اور اس معرکے میں مسلمانوں کی قیمتی جانیں ضائع ہو چکی تھیں۔ ایسے حالات میں نبوت کے عظیم منصب کے عظیم کام کو سامنے لاکر یہ فکر دلانا مقصود ہے کہ اس نبوت کے پیش نظر جو عظیم انقلاب ہے' اس کے مقابلے میں یہ رنج و الم' یہ نقصانات اور یہ قربانیاں کوئی بہت زیادہ قیمتی نہیں ہیں۔ اس نبوت کے ذریعہ تم پر جو احسانات ہوئے ذرا ان پر بھی تو غور کرو۔ یہ وہ عظیم احسان ہے جس کو دنیا کے تمام دوسرے امور پر ترجیح دی جاسکتی ہے۔"

پھر بتایا جاتا ہے کہ اس احسان عظیم کے نتیجے میں' تمہارے اندر جو تبدیلی آئی اس پر بھی ذرا غور کرو۔ تمہارے اندر اللہ کی آیات پڑھی جارہی ہیں' تمہاری زندگیوں کو سنوارا جارہا ہے' تمہیں کتاب سکھائی جارہی ہے اور پھر دانائی اور حکمت اور ٹیکنالوجی سے آگاہ کیا جارہا ہے۔ اگرچہ اس سے قبل تم صریح گمراہیوں میں پڑے ہوئے تھے۔

يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِنْ كَانُوا مِنْ قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ

"اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں ایک حال سے بذریعہ انقلاب دوسری حالت میں منتقل کر دیا گیا تھا' ایک صورت حال

تبدیل ہوگئی تھی اور ایک بالکل نئی صورت حال پیدا ہوگئی تھی۔ ایک دور گزر گیا تھا اور ایک نیا دور آگیا تھا۔ اس لئے امت کو یہ شعور دیا جا رہا ہے کہ یہ ایک عظیم انقلاب ہے جو اس امت کے اندر محض اللہ کی قدرت' مشیئت اور فضل و احسان کے ذریعہ برپا کیا جارہا ہے۔ اور پھر اس امت کے ذریعہ پوری انسانی زندگی کے اندر اور اس عظیم انقلاب کے برپا کرنے کا آغاز بعث رسالت محمدیہ کے ساتھ ہوا ہے جس نے اس امت کو برپا کیا اور تربیت دی۔ اس لئے اس عظیم انقلابی قوت کے لئے یہ مناسب نہیں ہے کہ وہ اموال غنیمت جیسی حقیر چیز کو پیش نظر رکھ کر کوئی فیصلہ کرے۔ یا وہ معمولی قربانیوں اور رنج والم اور شکست و ریخت پر کوئی جزع و فزع کرے۔ اس لئے کہ اس عظیم انقلاب کی راہ میں یہ چیزیں کچھ بھی نہیں ہیں۔

جنگ بدر کے واقعات کے بیان کے دوران رسالت محمدیہ کی اہمیت اور عظمت کے بیان میں یہ چند اشارات تھے جسے ہم اختصار کے ساتھ یہاں بیان کرتے ہیں۔ اس کے بعد مناسب ہے کہ ہم اس آیت قرآنی پر تفصیل سے روشنی ڈالیں جو حکمت و دانائی کے اشارات سے بھری ہوئی ہے۔

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ ....

"درحقیقت اہل ایمان پر تو اللہ تعالیٰ نے بہت بڑا احسان کیا ہے کہ ان کے درمیان خود انہی میں سے ایک پیغمبر اٹھایا۔" ..... یہ اللہ کا عظیم احسان تھا کہ ان میں سے ایک رسول مبعوث فرمایا۔ پھر یہ دوسرا احسان تھا کہ رسول کریم بھی عربی تھے۔ خود ان میں سے تھے' اللہ کی جانب سے کسی قوم میں رسول مبعوث کرنا دراصل اس قوم پر اللہ کا محض فضل و کرم ہوتا ہے۔ یہ خالص احسان اس لئے ہوتا ہے کہ بعثت رسول کے لئے خود اس قوم میں کوئی استحقاق کی بات نہیں ہوتی۔ اگر ان کا کوئی استحقاق ہوتا تو اس کے لئے کوئی قابل ذکر لوگ ہوتے' لوگوں کے اندر کوئی گروہ ایسا نہیں ہے جس پر یہ عنایت ہو رہی ہو۔ یہ تو محض اللہ کا فضل و کرم ہے کہ ان میں رسول آگیا' جو ان پر آیات الٰہی کی تلاوت کرتا ہے' اللہ کے کلمات سناتا ہے' اور اس کرم عظیم کے لئے ان کے ہاں کوئی سبب یا استحقاق نہ تھا' یہ صرف اور صرف احسان الٰہی ہے۔

اور یہ احسان پھر اس پہلو سے اور زیادہ اور گہرا ہو جاتا ہے کہ یہ رسول خود ان میں سے ان کا ہی ایک بھائی ہے۔ "خود ان میں سے ایک رسول" کے الفاظ کے اندر نہایت ہی گہرے اشارے ہیں۔ مومنین اور رسول کے درمیان رابطہ ایک نفس کا ایک نفس کے ساتھ رابطہ ہے۔ یہ رابطہ نہیں ہے کہ ایک فرد ایک قوم کے ساتھ مربوط ہو۔ صرف یہ بات نہ تھی کہ وہ ان میں سے ایک ہے' بلکہ اس سے زیادہ گہرا اور اس سے زیادہ ارفع مفہوم مطلوب ہے۔ ایمان کی وجہ سے وہ بلند ہو کر رسول سے مربوط ہو جاتے ہیں اور صرف ایمان کی وجہ سے وہ شرف و سربلندی کے اس اونچے مقام تک پہنچ جاتے ہیں اور بے شک اہل ایمان پر یہ عظیم احسان ہے۔ اس طرح یہ احسان دوچند ہو جاتا ہے۔ ایک تو یہ کہ رسول بھیجا گیا اور دوسرا یہ کہ یہ رسول تمہارے اندر موجود ہے اور وہ اس رسول کے پاس موجود ہیں اور دونوں کے درمیان یہ محبوب رابطہ قائم ہے۔

اس کے بعد اس احسان عظیم کے عملی آثار ظاہر ہوتے ہیں۔ ان کی شخصیت میں' ان کی زندگی میں اور پھر ان کی تاریخ میں یَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ .... "جو اس کی آیات انہیں سناتا ہے' ان کی زندگیوں کو سنوارتا ہے' اور ان کو کتاب اور دانائی کی تعلیم دیتا ہے۔" اب اس احسان کا ظہور بڑے وسیع اور عملی میدان میں ہوتا ہے۔ ایک یہ کہ ان کی عزت افزائی کی شکل میں یہ احسان عظیم ظاہر ہوتا ہے کہ خود اس نے اپنی جانب سے' اپنے پروگرام کے مطابق رسول بھیجا جو ان سے اللہ کے کلام کے ذریعہ مخاطب ہے اور انہیں اللہ کی آیات سناتا ہے۔ اگر انسان اللہ کے صرف

اسی ایک احسان پر اچھی طرح غور کرے تو وہ اللہ کے خوف سے مدہوش ہو جائے' کانپ اٹھے اور اس کے لئے یہ ممکن بھی نہ رہے کہ وہ اللہ کے سامنے کھڑا ہو سکے اور فوراً سجدۂ شکر بجالائے۔

اگر وہ یہ سوچے کہ اس پر اللہ کرم کر رہا ہے' اس کے ساتھ بات کر رہا ہے' اس کو اپنی ذات و صفات کے بارے میں متعارف کرا رہا ہے تاکہ انسان اس کی الوہیت کی ماہیت اور اس کے خصائص کو جان لے۔ اس کے بعد وہ ذات باری اس سے مخاطب ہو رہا ہے اور مخاطب بھی اس انسان اور اللہ کے اس حقیر بندے سے اور خطاب بھی اس بندے کی زندگی کے بارے میں ہو' اس کے دلی سوالات کے جواب دے رہی ہو' اس کی حرکات و سکنات پر بحث ہو رہی ہو' اور بات اس پروگرام کی ہو رہی ہو جس میں اس حقیر انسان کی زندگی جاوید کا پروگرام مضمر ہے اور اس کی ہدایت کی بات ہو رہی ہو' اور یہ ہدایت بھی اس دستور و منشور کی طرف دی جارہی ہو جس میں اس کے دل کی پاکیزگی ہے اور اس کے احوال کی بہتری ہے۔ اور اس کے بعد پھر اسے خوشخبری بھی دی جارہی ہے کہ اگر وہ اس پروگرام پر چلے گا تو وسیع تر جنت میں جگہ پائے گا' کیا اس سے اور کوئی عظیم احسان ہو سکتا ہے' بلکہ یہ خالص فیضان جود و کرم ہے' اور خالص فضل و عطا ہے۔

اللہ تو غنی بادشاہ ہے' اور انسان کمزور اور محتاج ہے لیکن یہ غنی بادشاہ اس کمزور اور محتاج سے ہمکلام ہے۔ وہ اس پر عنایات کی بارش کر رہا ہے' اسے دعوت دے رہا ہے' یہ غنی بادشاہ بار بار ان فقراء کو پکار رہا ہے اور اپنے جود و کرم کی مسلسل دعوت دے رہا ہے۔ یہ عظیم کرم ہے' عظیم احسان ہے' عظیم فضل اور عطا ہے جو بے لوث ہے اور اس کے بالمقابل اس کا پورا شکر ادا نہیں کیا جاسکتا اور نہ ہی اس کی احسان کی وفاداری ممکن ہے۔

وَيُزَكِّيهِمْ .... "ان کی زندگیاں سنوارتا ہے" پاک کرتا ہے' بلند کرتا ہے' منقح کرتا ہے اور ان کے دلوں' ان کے تصورات' اور ان کے شعور کو پاک کرتا ہے۔ وہ ان کے گھرانوں کو پاک کرتا ہے۔ ان کی عزتوں کو پاک کرتا ہے' اور ان کے باہم روابط کو پاک کرتا ہے۔ ان کی انفرادی زندگی کو پاک کرتا ہے' ان کے معاشرے کو پاک کرتا ہے اور ان کے اداروں کو پاک کرتا ہے۔ ان کو شرک بت پرستی کی گندگیوں سے پاک کرتا ہے۔ ان کو خرافات اور وہم پرستی سے پاک کرتا ہے اور ان کی وجہ سے زندگی کے اندر جو رسم و رواج پاتے ہیں' جو غلط بندگیاں ہوتی ہیں ان سے پاک کرتا ہے۔ اور شرف انسانیت سے فروتر گھٹیا درجے کی جو حرکات ہوتی ہیں ان سے انسان کو پاک کرتا ہے۔ ان کو جاہلیت کی زندگی کی تمام گندگیوں سے پاک کرتا ہے۔ نیز ان چیزوں سے پاک کرتا ہے جن سے انسانی شعور اور قومی شعائر ملوث ہو جاتے ہیں اور جن سے زندگی کے معانی' اقدار اور روایات گندی ہوتی ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ہر جاہلیت اپنے ماحول میں کچھ ناپاکیاں پھیلا دیتی ہے۔ اسی طرح عرب جاہلیت نے بھی بعض گندگیاں پھیلا دی تھیں اور ان سب سے اسلام انہیں پاک کر رہا تھا۔

اور جاہلیت کی گندگیوں میں سے بعض کا تذکرہ حضرت جعفر ابن ابی طالب نے کیا ہے' جب وہ نجاشی کے سامنے اسلام کا تعارف کرا رہے تھے۔ اور یہ تعارف وہ قریش کے نمائندوں کے سامنے کر رہے تھے۔ جو ان مہاجرین کے خلاف مہم پر آئے ہوئے تھے۔ مطالبہ یہ تھا کہ وہ ان مہاجرین کو ان کے حوالے کر دے۔ حضرت جعفرؓ فرماتے ہیں :

"شاہ محترم! ہم جاہلیت میں ڈوبی ہوئی قوم تھے۔ بتوں کی پوجا کرتے تھے' مردار کھاتے تھے۔ فحاشی کی تمام حرکات کرتے تھے۔ صلہ رحمی کے تمام تعلقات کو کاٹتے تھے۔ پردیسی سے برا سلوک کرتے تھے۔ ہم میں سے طاقتور ضعیفوں کو کھائے جارہا تھا۔ ہماری یہی حالت تھی کہ اللہ نے ہم ہی میں سے ہمارے پاس ایک رسول بھیجا۔ ہم اس کے شجرۂ نسب کو خوب جانتے ہیں' اس کی سچائی' اس کی امانت و دیانت سے بھی خوب واقف ہیں اور اس کی عفت مآبی بھی ہمارے سامنے ہے۔ اس نے ہمیں ایک ہی اللہ کی طرف بلایا تاکہ ہم اسے ایک ہی جانیں' صرف

اس کی بندگی کریں۔ اور اس کے علاوہ ہم اور ہمارے آباء و اجداد جن پتھروں اور بتوں کی پوجا کرتے تھے ان کا جوا اپنے گلے سے اتار دیں۔ اس نے ہمیں حکم دیا کہ سچی بات کرو' امانت میں خیانت نہ کرو' صلہ رحمی کرو' پڑوسیوں کے حقوق کا خیال رکھو' حرام امور کا ارتکاب نہ کرو' قتل نہ کرو' فحاشی سے اس نے ہمیں منع کیا' جھوٹی بات سے منع کیا' یتیم کا مال کھانے سے منع کیا' پاکدامن عورتوں پر بہتان لگانے سے منع کیا اور اس نے حکم دیا کہ صرف اللہ کی عبادت کرو' اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو' نماز قائم کرو' زکوۃ ادا کرو اور روزے رکھو۔"

اور ان گندگیوں میں سے ایک گندگی وہ تھی جس کا تذکرہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ نے کیا ہے۔ وہ جاہلیت کے زمانے میں مرد و زن کے تعلق جنسیت کا نقشہ روایت بخاری کے مطابق یوں کھینچتی ہیں: "جاہلیت میں نکاح کی چار اقسام مروج تھیں۔ ایک تو وہ نکاح تھا' جو آج کل ہمارے درمیان مروج ہے کہ ایک شخص دوسرے کی لڑکی کا پیغام دیتا ہے' مہر مقرر ہوتا ہے اور پھر نکاح ہو جاتا ہے۔ دوسرا طریقہ یہ تھا کہ جب کسی شخص کی عورت ایام ماہواری سے پاک ہو جاتی تو وہ کہتا فلاں کے پاس جاؤ اور اس کے ساتھ تعلق زن و شو قائم کرو۔ اور وہ اپنی بیوی کے ساتھ اس وقت تک مباشرت نہ کرتا جب تک اس کا حمل واضح نہ ہو جاتا۔ یعنی جس شخص کے پاس اس نے اسے بھیجا تھا اس کے نطفے سے۔ اور جب حمل واضح ہو جاتا تو پھر خاوند اس کے ساتھ تعلقات جنسیت قائم کر لیتا اگر چاہتا۔ یہ اس لئے کیا جاتا تھا کہ اس شخص سے اچھی نسل پیدا ہو۔ اسے نکاح استبضاع کہا جاتا تھا۔ دوسرا طریقہ یہ تھا کہ دس افراد سے کم لوگ جمع ہوتے اور وہ ایک ہی عورت کے ساتھ تعلقات قائم کر لیتے۔ ہر ایک اس کے پاس جاتا' جب حمل ہو جاتا اور بچہ پیدا ہو جاتا اور کچھ شب و روز گزر جاتے تو وہ ان سب کو بلاتی۔ ہر ایک کو لازماً آنا پڑتا۔ وہ آتے اور اس کے ہاں اجتماع ہوتا۔ وہ کہتی تمہیں تو بات کا پتہ ہی ہے۔ اب بچہ پیدا ہو گیا ہے۔ اے فلاں یہ بچہ تمہارا ہے اور وہ جس کے نام سے چاہتی اس کا نام رکھ دیتی۔ تو یہ اس کا بچہ ہو جاتا۔ اور وہ شخص اس کا انکار نہ کر سکتا۔ چوتھا نکاح یوں ہوتا کہ بہت سے لوگ ایک عورت کے پاس جاتے۔ یہ عورت کسی کو بھی منع نہ کرتی' جو بھی چاہتا اس کے پاس جاتا' یہ فاحشہ عورتیں ہوا کرتی تھیں۔ ان کے گھر کے دروازوں پر ایسے جھنڈے نصب ہوتے جو ان کے لئے علامت ہوتے۔ جو چاہتا ان کے پاس جاتا۔ ان میں سے اگر کوئی حاملہ ہو جاتی اور حمل وضع ہو جاتا تو یہ سب لوگ اس کے ہاں جمع ہوتے۔ قیافہ دانوں کو بلایا جاتا۔ یہ قیافہ دان جس کے بارے میں چاہتے' بچے کو اس کے ساتھ ملا دیتے۔ وہ اسے لیتا' اس کا وہ بیٹا تصور ہوتا اور از روئے قانون وہ اس کا انکار نہ کر سکتا۔"

اب ذرا غور کیجئے کہ اس بہیمانہ گرے ہوئے جنسی ضوابط پر کیا کسی مزید تبصرے کی ضرورت ہے۔ یہ کافی ہے کہ ہم ایک ایسے شخص کے بارے میں سوچیں کہ وہ اپنی بیوی کو کسی شخص کے پاس ایک اچھا بچہ پیدا کرنے کے لئے بھیجتا ہے۔ جس طرح ایک اونٹنی' ا ـ گھوڑی اور ایک مادہ مویشی کو اچھا بچہ لانے کے لئے بھیجا جاتا ہے تاکہ بہترین نسل کشی ہو۔

رہی جسم فروشی کی چوتھی صورت تو وہ جسم فروشی کی ایک ایسی صورت ہے جس میں بچے کو کسی کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔ اس میں وہ عار محسوس نہیں کرتے اور نہ اس سے رکتے ہیں۔

اور تیسری صورت بھی ویسی ہی ہے کہ دس افراد بیک وقت ایک عورت کے ساتھ گویا شادی کرتے ہیں' سب کے سب اس کے پاس جاتے ہیں اور پھر ان میں سے ایک بچے کو لے لیتا ہے۔

یہ کیا گندگی ہے' کیا بے حیائی ہے جس سے عربوں کو اسلام نے پاک کیا اور اگر اسلام نہ آتا تو وہ کانوں تک اس گندگی میں ڈوبے ہوئے تھے۔

جنسی تعلقات میں یہ گندگی عربوں میں محض اس لئے پھیلی ہوئی تھی کہ ان کا نقطہ نظر عورت کے بارے میں نہایت ہی گرا ہوا تھا' ابو الحسن علی ندوی اپنی کتاب میں فرماتے ہیں:

"جاہلیت کے دور میں عورتوں پر بے حد ظلم ہوتا تھا۔ اور ان کے حقوق مارے جاتے تھے۔ اس کی دولت لوٹ لی جاتی تھی۔ اسے میراث سے محروم کر دیا جاتا تھا۔ اور اگر اسے طلاق ہو جاتی یا اس کا خاوند فوت ہو جاتا تو اسے اپنی مرضی سے نکاح کرنے کی اجازت نہ ہوتی تھی۔ اور وہ اسی طرح میراث میں ملا کرتی تھی جس طرح مویشی اور سامان میراث کے طور پر ملا کرتے تھے۔ حضرت ابن عباس سے روایت ہے۔ اگر کسی کا باپ فوت ہو جاتا تو وہ اس کی منکوحہ کا سب سے پہلا مستحق ہو جاتا' وہ اگر چاہتا تو اسے اپنے نکاح میں لے لیتا' چاہتا تو اسے اس وقت تک بند رکھتا جب تک وہ اسے فدیہ نہ دلاتی یا مرنہ جاتی تاکہ یہ اس کی تمام مملوکات پر قابض ہو جاتا۔ عطا ابن رباح کہتے ہیں اہل جاہلیت کا رواج یہ تھا کہ جب کوئی مرد فوت ہو جاتا اور اس کی بیوی رہ جاتی تو اسے روک لیا جاتا یہاں تک کہ کوئی بچہ بالغ ہوتا اور یہ اس کے حوالے کر دی جاتی۔

سدی نے کہا ہے کہ جاہلیت میں جب باپ اور بھائی فوت ہو جاتے یا لڑکا فوت ہوتا اور اس کے پیچھے بیوہ رہ جاتی تو اگر کوئی وارث جلدی سے اس بیوہ پر کپڑا ڈال دیتا تو وہ اس کی ہو جاتی اور وہ اسی سابقہ مہر کے عوض اس کے ساتھ نکاح کر لیتا یا وہ اسے کسی کے نکاح میں دے دیتا لیکن اس کے مہر کا حقدار وہ شخص ہوتا۔ اور اگر بیوی خاوند کے مرتے ہی اپنے میکے بھاگ جاتی تو آزاد تصور ہوتی۔ جاہلیت میں عورت کے ساتھ اس کے حقوق کے بارے میں سخت عدم توازن تھا۔ خاوند اس کے حقوق تلف کر سکتا تھا' جبکہ وہ خاوند کی حق تلفی کرنے پر قادر نہ تھی۔ اس کا مہر اس سے چھین لیا جاتا۔ اور اسے نقصان پہنچانے کے لئے روکے رکھا جاتا۔ خاوند تو اس کے ساتھ برا سلوک کرتا' اس سے اعراض بھی کرتا اور بعض اوقات اسے معلق کر کے چھوڑ دیا جاتا۔ کھانے پینے کی چیزوں سے بعض چیزیں مردوں کے لئے مخصوص تھیں اور عورتوں پر وہ حرام تھیں۔ مرد کے لئے اجازت تھی کہ وہ جس قدر عورتوں سے نکاح کرنا' کر سکتا تھا۔

لڑکیوں کو اس قدر برا سمجھا جاتا کہ انہیں زندہ درگور کر دیا جاتا۔ ہشیم ابن عدی نے الھمدانی کی روایت کے مطابق لکھا ہے کہ تمام قبائل عرب میں زندہ درگور کرنے کا رواج تھا' ہاں ایک شخص اگر اس پر عمل کرتا تو دس نہ کرتے۔ اسلام آیا تو اس وقت عربوں کے اندر زندہ درگور کرنے کے بارے میں مختلف آراء اور طریقے پائے جاتے تھے۔ بعض لوگ بہت غیرتمند ہونے کی وجہ سے لڑکیوں کو زندہ درگور کرتے۔ اور ان کی وجہ سے وہ اپنی شرمندگی چھپاتے۔ بعض لوگ ایسے تھے جو سبز آنکھوں والی لڑکیوں کو دفن کرتے یا سیاہ فام کو زندہ درگور کر دیتے یا برص زدہ کو دفن کر دیتے یا لنگڑی کو دفن کر دیتے۔ اس لئے کہ یہ لوگ ان صفات کو بہت ہی بدشگون سمجھتے تھے اور بعض ایسے بھی تھے جو فقروفاقہ کے خطرات کی وجہ سے اولاد کو قتل کرتے۔

بعض اوقات وہ اپنی لڑکیوں کو بڑی سنگدلی کے ساتھ قتل کرتے یا زندہ درگور کرتے۔ مثلاً کبھی ایسا ہوتا کہ والد موجود نہ ہوتا' سفر میں ہوتا' یا کوئی اور مصروفیات ہوتیں تو لڑکی کو زندہ درگور کرنے کا موقعہ نہ ملتا' وہ بڑی ہو جاتی وہ سمجھتی کہ اسے قتل کیا جاتا ہے۔ بعض لوگوں نے خود اپنی کہانیاں بیان کی ہیں جو خون کے آنسو رلاتی ہیں۔ بعض لوگ لڑکیوں کو پہاڑی چوٹی سے گرا دیتے۔

ان گندگیوں میں سے ایک گندگی' اور سب سے بڑی گندگی' شرک تھی۔ پھر شرک کی بھی گری ہوئی شکل یعنی بت پرستی عربوں میں عام تھی۔ استاد ندوی اس کا خلاصہ یوں بیان کرتے ہیں: "عرب بت پرستی اور بتوں کی پوجا کی بدترین صورتوں میں جتلا تھے۔ ہر قبیلہ بلکہ ہر درے کا ایک بت ہوا کرتا تھا۔ بلکہ ہر خاندان کا ایک بت ہوا کرتا تھا۔ کلبی کہتے ہیں۔ مکہ کے ہر گھرانے کا اپنا بت ہوتا تھا جسے وہ پوجتے تھے۔ جب کوئی سفر پر جاتا تو جانے سے پہلے آخری کام یہ کرتا کہ وہ اس سے تبرک حاصل کرتا۔ اور جب گھر لوٹتا تو سب سے پہلے اس کی پوجا کرتا۔ عرب بتوں کی پوجا کے اندر اس قدر غلو کر گئے تھے۔ بعض نے اپنے بت خانہ بنا رکھے تھے۔ بعض کا اپنا علیحدہ ایک ہی بت ہوتا تھا۔ اگر کوئی بت خانہ نہ بنا سکتا اور اپنا بت بھی نہ بنا سکتا تو وہ خانہ کعبہ کے سامنے ایک پتھر کھڑا کر دیتا یا کسی اور جگہ کھڑا کر دیتا' اس کا طواف کرتا جس

طرح وہ خانہ کعبہ کا طواف کرتا تھا۔ اور ایسے بتوں کو وہ انصاب کہتے تھے۔ خانہ کعبہ کے اندر' حالانکہ کعبہ صرف اللہ کی عبادت کے لئے تعمیر ہوا تھا' اس کے صحن کے اندر تین سو ساٹھ بت رکھے ہوئے تھے۔ بتوں کی پوجا سے آگے بڑھ کر انہوں نے بتدریج پتھروں کی پوجا شروع کر دی تھی۔ امام بخاری نے ابو رجاء عطاردی سے روایت کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم پتھروں کی عبادت کیا کرتے تھے۔ اگر ہمیں کوئی اچھا پتھر ملتا تو پہلے پتھر کو چھوڑ کر دوسرا لے لیتے۔ اگر پتھر نہ ملتا تو ہم مٹی کا ایک ڈھکیلا لے لیتے اس پر بکری کو دوہتے۔ اس کے بعد اس کا طواف کرتے۔ کلبی کہتے ہیں۔ اگر کوئی سفر کرتا اور کسی جگہ اترتا تو چار پتھر لیتا۔ ان میں سے دیکھتا کہ سب سے اچھا کون سا ہے تو اسے اپنا رب بنا لیتا اور بقیہ تین کو چولہے کے تین پتھر بنا لیتا۔ اور جب وہ اپنی منزل چھوڑتا تو اس پتھر کو بھی چھوڑ دیتا۔

عرب بھی دوسری قوموں کی طرح' ملائکہ اور جنوں کی پوجا کرتے۔ اسی طرح وہ ستاروں کی پوجا بھی کرتے۔ چنانچہ وہ فرشتوں کو اللہ میاں کی بیٹیاں قرار دیتے اور انہیں اللہ کے ہاں سفارشی بناتے۔ ان کی عبادت بھی کرتے اور ان کے وسیلہ سے اللہ کے ہاں اپروچ کرتے۔ اسی طرح انہوں نے جنوں کو بھی شریک خدا کیا ہوا تھا۔ ان کی قدرت اور تاثیر کے وہ قائل تھے' بلکہ ان کی عبادت بھی کیا کرتے تھے۔ کلبی کہتا ہے قبیلہ خزاعہ کا بنو ملیح قبیلہ جنوں کی پوجا کرتا تھا۔ صاعد کہتے ہیں کہ حمیر سورج کی پوجا کرتے تھے۔ کنانہ چاند کے پجاری تھے۔ بنی تمیم دبران کے پجاری تھے۔ لخم مشتری کے پجاری تھے۔ بنی طی سہیل کے پجاری تھے' قیس شعریٰ اور بنو اسد عطارد کے پجاری تھے۔"[۱]

بت پرستی کے اس ابتدائی تصور کے ملاحظہ سے بسہولت معلوم ہو جاتا ہے کہ اس بت پرستی کی وجہ سے عربوں کے دل و دماغ اور ان کے تصورات اور ان کی عملی زندگی کے اندر کس قدر وسیع گندگی پھیلی ہوئی تھی۔ اور یہ بھی معلوم ہو جاتا کہ کس قدر عظیم انقلاب تھا جو اسلام نے عرب معاشرے کے اندر برپا کیا۔ ان کی زندگی کو کس قدر پاک کیا گیا' ان کے تصورات کی کس قدر تطہیر کی گئی۔ اور ان کو اخلاقی اور اجتماعی گندگیوں سے کس قدر پاک کیا گیا' حالانکہ یہ تصورات اور یہ انفرادی اور اجتماعی گندگیاں ان کے لئے ایک قسم کے مفاخر تھے اور وہ اپنے اشعار اور اپنے میلوں اور بازاروں میں ان پر لمبی لمبی فخریہ تقریریں کیا کرتے تھے۔ مثلاً شراب نوشی' قمار بازی' قبائل کے اندر چھوٹے چھوٹے انتقام' ان کے نزدیک عظیم فضائل اخلاق تھے۔ اور یہ لوگ ان کے دائرے سے باہر قدم نہ رکھ سکتے تھے۔

رہی جنگ تو وہ ان کے لئے نہایت ہی معمولی بات تھی۔ خونریزی ان کے لئے روز مرہ کا کام تھا۔ ایک معمولی حادثہ بھی خونریزی کا باعث بن جاتا۔ قبیلہ بکر اور تغلب کے درمیان جنگ ہوئی اور چالیس سال تک ہوتی رہی۔ اس جنگ میں عظیم خونریزی ہوئی۔ جنگ یوں شروع ہوئی کہ کلیب رئیس معد نے تیر مارا اور بسوس بنت منقذ کی اونٹنی کے تھنوں میں لگا۔ خون اور دودھ مل گئے۔ جساس ابن مرہ نے کلیب کو قتل کر دیا۔ اس پر بکر اور تغلب قبائل کے درمیان جنگ چھڑ گئی۔ اور جس طرح مہلہل برادر کلیب نے کہا ہے "اس جنگ نے زندگی کو فنا کر دیا۔ ماؤں کو رلا دیا۔ بچوں کو یتیم کر دیا۔ اس قدر آنسو بہے کہ رکنے کا نام نہ لیا اور اس قدر لوگ مارے گئے کہ دفن نہ ہو سکے۔ اور جنگ داحس کا حال بھی ایسا ہی تھا۔ قیس ابن زہیر کے گھوڑے کا نام داحس تھا۔ قیس ابن زہیر اور حذیفہ ابن بدر کے درمیان ہونے والے شرطیہ مقابلے میں داحس آگے تھا۔ ایک شخص جو اسد قبیلے سے تعلق رکھتا تھا اس نے اس کے آگے رکاوٹ ڈالی اور حذیفہ آگے نکل گیا۔ اس نے اس کے چہرے پر طمانچہ مارا اور اس طرح اسے الجھا دیا۔ اور دوسرے گھوڑے آگے نکل گئے۔ اس کے بعد مقاتلہ شروع ہو گیا' پھر بدلے پہ بدلہ لیا جاتا رہا۔ قبیلوں نے اپنے افراد کی نصرت کی۔ اس میں لوگ مارے گئے' قید ہوئے اور ہزاروں افراد کام آئے۔"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عربوں کی زندگی میں عظیم اور بلند مقاصد کی کوئی اہمیت نہ تھی' اگر ان کے ہاں کوئی بلند نصب العین ہوتا تو

---

[۱] دیکھئے ماذا خسر المسلمون۔ ندوی ص ۳۴

وہ ان گھٹیا سرگرمیوں میں مشغول ہونے کا وقت ہی نہ پاتے۔ ان کی زندگی کا کوئی پیغام نہ تھا' انسانوں کی بھلائی کا کوئی منصوبہ ان کے پیش نظر نہ تھا۔ اس دنیا میں ان کے پاس کوئی بلند انسانی پروگرام نہ تھا تاکہ وہ زندگی کی ان بے قیمت اور گھٹیا سرگرمیوں میں مشغول نہ ہوتے۔ نیز ان کے پاس کوئی ایسا نظریہ حیات بھی نہ تھا جو انہیں ان اجتماعی مذموم گندگیوں سے باز رکھتا۔ اگر لوگوں تک الٰہی نظریۂ حیات نہ پہنچا ہو تو پھر ان کی ترجیحات کیا ہوتی ہیں؟ ان کا تصور حیات کیا ہوتا ہے؟ اور ان کے اخلاق کیا ہوتے ہیں؟

جاہلیت بہرحال جاہلیت ہوتی ہے۔ اور ہر جاہلیت کی گندگیاں اور غلط کاریاں الگ ہوتی ہیں۔ ہر زمان و مکان میں ان کے لئے الگ مواقع رہے ہیں۔ جب لوگوں کے دل الٰہی نظریۂ حیات سے خالی ہو جائیں اور ان پر خدائی فکر کی حکمرانی نہ رہے' جب لوگ الٰہی شریعت سے آزاد ہو جائیں تو خدائی نظریۂ حیات پر مبنی ہوتی ہے' تو ان کی زندگی پر جاہلیت کی حکمرانی ہوتی ہے اور وہ جاہلیت کی مختلف صورتوں میں سے کسی ایک صورت میں داخل ہو جاتے ہیں۔ آج ہمارے دور میں جس جاہلیت نے انسانیت کو کانوں تک گندگی میں ڈبو دیا ہے وہ اپنے مزاج کے اعتبار سے زمانہ قدیم کی عرب جاہلیت سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے۔ اور نہ ان جاہلیتوں سے مختلف ہے جو اس وقت اس دنیا کے اطراف و اکناف میں مروج تھیں اور جن سے انسانیت کو اسلام نے نجات دی تھی۔

آج دنیا ایک عظیم گندگی میں زندگی بسر کر رہی ہے اس کی صحافت کو دیکھیں' اس کی فلموں کو دیکھیں' اس کے لباس کی نمائشوں کو دیکھیں' اس کے مقابلہائے حسن کو دیکھیں' اس کی رقص گاہوں کو دیکھیں' اس کے حماموں کو دیکھیں' اس کے نشر و اشاعت کے اداروں کو دیکھیں' پھر ننگے گوشت اور ہیجان انگیز طور طریقوں کو دیکھیں' ادب اور فن میں اس کی بیمار رمزیت کو دیکھیں اور ذرائع اشاعت کے اندر اس کے گھٹیا اشاروں کو دیکھیں تو یقین ہو جاتا ہے کہ وہ گندگی کے دلدل میں گرفتار اور بیمار ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ معیشت پر ظالمانہ سودی نظام کی گرفت ہے۔ افراط زر اور دولت جمع کرنے اور اسے بڑھانے کے لئے غیر اخلاقی ذرائع کا استعمال عام ہے۔ اور قانون کے سایہ اور لباس کے اندر عوام کو لوٹا جا رہا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اخلاقی بے راہ روی اس قدر عام ہو گئی ہے جس کی لپیٹ میں ہر شخص اور ہر خاندان اور ہر نظام آ رہا ہے بلکہ ہر انسانی سوسائٹی پر اس کے اثرات مرتب ہو رہے ہیں۔ ان تمام امور پر غور کرنے سے یہ فیصلہ کرنا بہت ہی سہل ہو جاتا ہے کہ اس جدید جاہلیت کے زیر سایہ انسانیت ہلاکت خیز بیماری کی طرف بڑھ رہی ہے۔

انسان انسانیت کو کھائے جا رہا ہے۔ اس کی آدمیت تحلیل ہو رہی ہے' وہ حیوان کے پیچھے بھاگ رہی ہے۔ سانس پھولا ہوا ہے۔ وہ ایسی چیزوں کی دلدادہ ہو گئی ہے جو حیوانیت کو جگا رہی ہیں۔ اور انسان عالم حیوانات کی طرف اتر رہا ہے لیکن حیوان کو دیکھیں تو وہ اس انسان سے زیادہ پاکیزہ ہے۔ کیونکہ وہ ضابطۂ فطرت کے اندر جکڑا ہوا ہے اور یہ ضابطہ اس قدر مضبوط ہے کہ کبھی بھی ڈھیلا نہیں پڑتا۔ نہ اس قدر گندہ ہوتا ہے جس طرح انسان اس وقت گندہ ہو جاتا جب وہ عقیدے اور نظریہ اور نظریاتی نظام کے بندھنوں سے آزاد ہو جاتا ہے۔ اور پھر سے اس جاہلیت میں داخل ہو جاتا ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے اسے نجات دی ہے۔ اور جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ اس آیت میں اشارہ کرتے ہوئے اسے اپنا خصوصی انعام قرار دیتے ہیں۔

وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ .... "ان کو کتاب اور دانائی کی تعلیم دیتا ہے۔" اس آیت میں جن لوگوں کو خطاب کیا گیا ہے وہ ان پڑھ اور جاہل تھے۔ وہ لکھنا نہ جانتے تھے۔ عقل اور سمجھ بوجھ کے اعتبار سے بھی امی اور جاہل تھے۔ ابواب علم میں سے کسی باب میں بھی' اس وقت کے عالمی معیار علم و ثقافت کے مطابق کچھ درک نہ رکھتے تھے' نہ ان کی زندگی کے کچھ بلند مقاصد تھے' جو زندگی کے مختلف شعبوں میں سے کسی بھی شعبے میں عالمی وقعت رکھتے ہوں' لیکن اچانک اسلامی نظریۂ حیات آتا ہے' وہ دنیا کے استاد بن جاتے ہیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ دنیا کے حکیم بن گئے۔ وہ ایک نظریاتی نظام زندگی کے حامل بن گئے' جس کے اندر

نظام فکر' نظام اجتماع اور زندگی کی تنظیم کا پورا نظام موجود تھا۔ اور جس نے اپنے دور میں پوری انسانیت کو اس وقت کی جاہلیت سے نجات دی۔ اور اب ہمارے دور میں بھی جدید جاہلیت سے اس جدید بشریت کو' ان شاء اللہ وہی نجات دے گی۔ اس لئے کہ ہماری اس جدید جاہلیت میں وہ تمام عناصر موجود ہیں جن سے جاہلیت قدیمہ مرکب تھی۔ اخلاقی اعتبار سے بھی' اجتماعی اعتبار سے بھی' انسانی زندگی کے اہداف کے اعتبار سے بھی اور اعلیٰ مقاصد کے اعتبار سے بھی۔ اس کے باوجود کہ جدید انسانیت نے علم و معرفت کے میدان میں بڑی بڑی پیش قدمیاں کی ہیں اور صنعتی میدان میں اس نے ریکارڈ پیداوار دکھائی ہے۔ اور زندگی کی بہترین سہولیات فراہم کی ہیں لیکن یہ انسانیت بدستور جاہلیت میں ڈوبی ہوئی ہے۔

وَإِنْ كَانُوا مِنْ قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ .... "اگرچہ اس سے پہلے یہی لوگ صریح گمراہیوں میں پڑے ہوئے تھے۔" اعتقادات و تصورات کے اعتبار سے گمراہی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ زندگی کے مفاہیم اور قدروں کے اعتبار سے بھی ڈوبے ہوئے تھے اور مقاصد اور زندگی کی سمت کے اعتبار سے بھی راہ گم کئے ہوئے تھے۔ اپنی عادات و اطوار کے اعتبار سے بھی' اپنے نظم و نسق کے اعتبار سے بھی' اپنے اجتماعی نظام اور اپنے اخلاقی نظام کے اعتبار سے بھی گمراہ تھے۔

وہ عرب جو اس آیت کے مخاطبین اولین تھے' وہ اچھی طرح' بغیر کسی شک و شبہ کے اپنے ماضی اور حال ماضی کے رنگ ڈھنگ سے واقف تھے' یہ ماضی انہیں خوب یاد تھا۔ اور وہ انقلاب جو اسلام کی وجہ سے ان کی زندگیوں میں نمودار ہو گیا تھا وہ ان کی نظروں کے سامنے برپا ہوا تھا' اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ اسلامی نظریۂ حیات کے بغیر ہرگز ان کی زندگی میں اس قدر عظیم انقلاب برپا نہ ہو سکتا تھا' جس کی مثال تاریخ انسانی میں نہیں ملتی۔

وہ یہ جانتے تھے کہ یہ اسلام اور صرف اسلام تھا جس نے انہیں قبائلی طور طریقوں سے نکالا' قبائلی ترجیحات ان کے ذہن سے نکال دیں' قبائلی انتقام کے دلدل سے انہیں نکالا' صرف اس لئے نہیں کہ بس وہ ایک عظیم قوم بن جائیں بلکہ وہ اچانک بغیر کسی ابتدائی تیاریوں کے' بغیر کسی طویل زمانی منصوبے کے اچانک' ایسی قوم کی شکل اختیار کر لیں جو انسانیت کی قیادت کر رہی ہو' وہ انسانیت کے لئے نقشہ حیات تیار کر رہی ہو' اس کے لئے زندگی کا منہاج تیار کر رہی ہو' اس کی اجتماعی نظم بندی کر رہی ہو' ایسی صورت میں کہ اس کی کوئی سابقہ مثال ان کے سامنے نہ ہو اور پوری انسانی تاریخ میں بھی جس کی کوئی مثال نہ ہو۔

وہ علی وجہ البصیرت اس حقیقت کا ادراک رکھتے تھے کہ اسلام اور صرف اسلام نے انہیں قومی تشخص بخشا ہے۔ انہیں ایک سیاسی وجود بخشا ہے اور ایک بین الاقوامی حیثیت دی ہے۔ اور سب سے پہلے اور سب سے اہم یہ کہ انہیں ایک انسانی حیثیت عطا کی ہے' جس نے ان کی انسانیت' ان کی آدمیت اور اکرام انسانیت کو بلند کیا بلکہ ان کے پورے نظام حیات کو شرف انسانیت کی اساس پر منظم کیا۔ اور یہ تکریم ان کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے بطور ہدیہ اور بطور احسان عطا ہوئی۔ اور اس کے بعد انہوں نے اس تکریم انسانیت کی بارش پوری انسانیت پر کر دی۔ انہوں نے پوری انسانیت کو سکھایا کہ انسان کا اکرام کس طرح کیا جاتا ہے؟ کس طرح اسے اللہ کی تکریم کے ساتھ اشرف المخلوقات قرار دیا جاتا ہے۔ اور انسان کو یہ شرف عطا کرنے میں ان کے سامنے نہ جزیرۃ العرب میں کوئی مثال تھی اور نہ ہی دنیا کے کسی دوسرے خطے میں کوئی مثال تھی۔ اس سے پہلے اصول شوریٰ پر ہم جو بحث کر آئے ہیں' وہ اس نظام اور شرافت انسانیت کے پہلوؤں میں سے ایک پہلو تھا' جس کے اندر وہ محسوس کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ ان پر غیر معمولی انعام تھا۔

وہ اس بات کا اچھی طرح ادراک کئے ہوئے تھے کہ یہ اسلام اور صرف اسلام ہے جس نے انہیں ایک پیغام عطا کیا' اور اب وہ اس پیغام کو تمام دنیا کے سامنے پیش کر رہے ہیں' وہ انسانیت کو ایک نظریۂ حیات دے رہے ہیں۔ وہ انسانی زندگی کے لئے انہیں ایک راہ دکھا

رہے ہیں اور ظاہر ہے کہ انسانی برادری کے اس وسیع کھیت میں اگر کوئی قوم زندہ رہ سکتی ہے تو وہ وہی قوم ہوگی جس کے پاس کوئی پیغام ہو' جس کے پاس زندگی گزارنے کا کوئی طریقۂ حیات ہو اور وہ اس کے ذریعہ انسانیت کو آگے بڑھا رہی ہو۔

یہ اسلام تھا' اس کا تصور کائنات تھا' زندگی کے بارے میں اس کی آراء تھیں' معاشرے کے لئے اس کا اجتماعی اور قانونی نظام تھا' حیات انسانی کے لئے اس کی مخصوص تنظیم تھی اور اس کا مثالی مثبت اور واقعیت پسند نظام زندگی تھا جس کے زیر سایہ انسان کو خوشحالی نصیب ہوئی۔ اسلام اپنی ان خصوصیات کے ساتھ ایک شخصی راہداری تھی جس کے ذریعہ وہ آگے بڑھے اور انہیں انسانیت نے پہچانا' ان کا احترام کیا اور انہیں انسانیت کی قیادت سپرد کی۔

آج ہو یا کل ان کے پاس یہی راہداری ہے۔ اس کے سوا اقوام عالم میں ان کی اور کوئی شناخت ہی نہیں ہے۔ ان کے لئے اب صرف یہی راستہ ہے کہ انسانیت انہیں پہچانے اور ان کی عزت کرے یا پھر وہ اس پیغام کو چھوڑ دیں اور دوبارہ مہمل زندگی بسر کریں۔ جس طرح کہ وہ اسلام سے پہلے تھے' کہ کوئی انہیں جانتا ہی نہ تھا اور نہ انہیں کوئی مانتا تھا۔

سوال یہ ہے کہ اگر وہ انسانیت کو اسلامی نظام زندگی کا پیغام نہیں دینا چاہتے تو اور وہ کون سا پیغام ہے جو وہ دنیا کو دینا چاہتے ہیں۔ کیا وہ دنیا کو فنون' آداب اور سائنس میں کچھ دینا چاہتے ہیں؟ ان میدانوں میں تو دنیا ان سے کہیں آگے نکل گئی ہے۔ ان فروعی علوم و ثقافتوں کے میدان کے اندر انسانیت پہلے سے مالا مال ہو گئی ہے۔ نہ اسے کسی مزید چیز کی ضرورت ہے اور نہ اسے انتظار ہے کہ اس میدان میں عرب اسے کچھ دیں گے۔

کیا عرب دنیا کو صنعتی میدان میں کچھ اعجوبہ دینا چاہتے ہیں؟ حالانکہ اقوام عالم کے ہاں صنعت نے اس قدر ترقی کر لی ہے کہ اس کے مقابلے میں بڑے بڑے گردن فراز جھک گئے ہیں' انہوں نے صنعتی مصنوعات کے بازار بھر دیئے ہیں اور ہمارے ہاں جو صنعتی پیداوار ہوتی ہے اسے زیر سایہ (Over Shade) کر دیا ہے۔ عرب کے مقابلے میں بے شمار قومیں آگے ہیں' اس میدان میں۔ اور اس میدان میں ان کے ہاتھ میں زمام قیادت پہلے سے موجود ہے۔

کیا عرب دنیا کو اجتماعی مذہب کا کوئی فلسفہ دینا چاہتے ہیں؟ یا وہ دنیا کو کوئی ایسا اقتصادی اور تنظیمی نظام دینا چاہتے ہیں جو انہوں نے ایجاد کیا ہے۔ جو ان کی اپنی فکری کاوش کا نتیجہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت ہماری دنیا ان دنیاوی فلسفوں' مذاہب اور نظریات سے بھری پڑی ہے اور یہی دنیاوی نظریات ہیں جن کے تحت انسانیت نہایت ہی بدحالی کا وقت گزار رہی ہے۔

سوال یہ ہے کہ عرب اس انسانیت اور اقوام عالم کے سامنے کیا تحفہ پیش کرنا چاہتے ہیں' جس کی وجہ سے برادری اقوام میں ان کا تعارف ہو' انہیں امتیاز حاصل ہو اور اس میدان میں وہ برتر تصور ہوں؟

میں کہتا ہوں کہ ان کے پاس پیغام اسلام کے سوا اور کوئی پیغام نہیں ہے۔ یہی واحد نظام زندگی ہے جس کا پیغام وہ اس دنیا کو دے سکتے ہیں۔ ان کے پاس اللہ کے اس احسان کے سوا کوئی اور چیز نہیں ہے جس کا احسان انہوں نے مسلمانوں پر کیا۔ اور اس کے ساتھ انہیں اعزاز بخشا' اور ایک دن اسی پیغام کے ذریعہ انہوں نے پوری انسانیت کو نجات دی تھی' اور آج انسانیت سب سے زیادہ جس میدان میں مفلس ہے' سب سے زیادہ جس کی طرف محتاج ہے وہ یہی پیغام ہے۔ وہ جہنم کے گڑھے میں گرنے والی ہے۔ وہ حیرت' قلق اور بے اطمینانی کا شکار ہے۔

یہ وہ واحد پیغام تھا جسے انہوں نے کبھی انسانیت کو دیا تھا اور اس کے سامنے پوری انسانیت نے سر جھکا لیا تھا۔ آج یہی پیغام ہے جو عرب انسانیت کو دے سکتے ہیں اور اس میں انسانیت کی نجات مضمر ہے اور اسی میں اس کی کامیابی کا راز ہے۔

ہر قوم کے پاس کوئی نہ کوئی پیغام ہوتا ہے۔ تمام بڑی اقوام میں سے ہر قوم کے پاس کچھ نہ کچھ ہوتا ہے' سب سے بڑی قوم وہ ہوتی ہے جس کا پیغام بڑا ہوتا ہے' بڑی قوم وہ ہوتی ہے جو سب سے بڑا نظام دے۔ اور پھر دنیا میں اس نظام زندگی کے ساتھ منفرد تصور ہوتی ہے اور وہ نظام اس کی شناخت ہوتا ہے۔

عربوں کے پاس یہ پیغام موجود ہے۔ یہ ہے بھی ان کا اصلی پیغام۔ دوسری اقوام تو پیغام اسلام میں ان کی شریک حیات ہیں۔ سوال یہ ہے کہ وہ کون شیطان ہے جو انہیں اس عظیم اور قیمتی سرمائے سے محروم کر رہا ہے۔ کون ہے وہ شیطان اسے پہچانو۔

اللہ کا عظیم اور عظیم احسان تھا' اس امت پر' اس پیغام کی وجہ سے' اس رسول کی وجہ سے اور اس کی رسالت کی وجہ سے۔ اس عظیم احسان سے انہیں صرف شیطان ہی پھیر کر گمراہ کر سکتا ہے حالانکہ ان کو اللہ نے حکم دیا ہے کہ اس شیطان کو دھتکاریں اور اس پر سنگ باری کریں۔

○ .....☆☆☆.....☆

اس کے بعد معرکۂ احد کے واقعات کے بیان میں بات ایک قدم اور آگے بڑھتی ہے۔ اور اس پر مزید تبصرہ ہوتا ہے اور نتائج اخذ کئے جاتے ہیں۔ ان کے تعجب کو پیش کیا جاتا ہے جس کا اظہار وہ ان نتائج کو دیکھ کر کرتے تھے' جو احد میں بر آمد ہوئے۔ وہ ان واقعات کو انہونی تصور کرتے تھے۔ ان کی سوچ یہ تھی کہ وہ مسلمان ہیں پھر بھی انہیں شکست ہوئی۔ اس سے معلوم ہوتا تھا کہ اسلام کے بارے میں ان کا تصور ابھی بہت ہی ابتدائی ہے۔ ابھی وہ تجربات سے گزر کر فکری اعتبار سے پختہ نہ ہوئے تھے۔ وہ عملی تربیت سے ابھی نہ گزرے تھے تاکہ وہ اصل صورت حال کے ساتھ اور حقیقی واقعات کے ساتھ وہ برتاؤ کریں اور اس دنیا کے تکوینی قوانین فطرت کا ادراک کریں جن کے مطابق یہاں ہر شخص نے اپنی عملی زندگی بسر کرنی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اسلام نے انہیں کھلے میدان میں کھڑا کر کے انہیں صاف صاف بتا دیا کہ انہیں جو کچھ درپیش ہوا' وہ خود ان کے اپنے افعال کا لازمی نتیجہ تھا۔ انہوں نے جو تصرفات اور اقدامات کئے ان کے یہی فطری اور سنت الہی کے مطابق نتائج تھے۔ لیکن قرآن کریم انہیں صرف اس نکتے پر ہی نہیں چھوڑ دیتا' اس لئے کہ یہ نکتہ اگرچہ حقیقت ہے لیکن یہ انتہائی حقیقت نہیں ہے بلکہ ان اسباب اور اسباب کے قدرتی نتائج کی پشت پر تقدیر الہی بھی کام کرتی ہے۔ قرآن انہیں اس کی طرف بھی متوجہ کرتا ہے نیز اس سنن اللھیہ" اور قوانین فطریہ کی پشت پر مشیئت اللھیہ" بھی کام کرتی ہے۔ یوں قرآن کریم انہیں ان واقعات کی حکمت بتاتا ہے اور یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ان واقعات کی اس تدبیر کی پشت پر ان کے لئے بھلائی کا ارادہ کیا تھا۔ اس میں ان کے لئے خیر تھی۔ اس دعوت کے لئے بہتری تھی جس کی خاطر وہ جدوجہد کر رہے ہیں۔ مقصود یہ تھا کہ وہ اس تجربے سے انہیں زمانہ مابعد کے لئے تیار کرے۔ ان کے دلوں کو صاف کر دے۔ ان کی صفوں کی تطہیر کر دے۔ ان منافقین کو علیحدہ کر دیا جائے' جو ان واقعات کے نتیجے میں ننگے ہو گئے۔ آخر کار تمام امور بہرحال اللہ کی مشیئت کے مطابق ہی سرانجام پاتے ہیں۔ اس کی تقدیر اور تدبیر کے مطابق ہی ظہور پاتے ہیں۔ یوں اس تبصرے سے ان کا تصور اور ان کا شعور مکمل ہو جاتا ہے۔ اس سلسلے میں قرآن کریم کے نہایت ہی گہرے عمیق اور لطیف بیان واقعات پر ذرا نظر ڈالیں: ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ أَوَلَمَّا أَصَابَتْكُم مُّصِيبَةٌ قَدْ أَصَبْتُم مِّثْلَيْهَا قُلْتُمْ أَنَّىٰ هَٰذَا ۖ قُلْ هُوَ مِنْ عِندِ أَنفُسِكُمْ ۗ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿١٦٥﴾ وَمَا أَصَابَكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعَانِ فَبِإِذْنِ اللَّهِ وَلِيَعْلَمَ

الْمُؤْمِنِينَ ﴿۱۶۶﴾ وَلِيَعْلَمَ الَّذِينَ نَافَقُوا ۚ وَقِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا قَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَوِ ادْفَعُوا ۖ قَالُوا لَوْ نَعْلَمُ قِتَالًا لَّاتَّبَعْنَاكُمْ ۗ هُمْ لِلْكُفْرِ يَوْمَئِذٍ أَقْرَبُ مِنْهُمْ لِلْإِيمَانِ ۚ يَقُولُونَ بِأَفْوَاهِهِم مَّا لَيْسَ فِي قُلُوبِهِمْ ۗ وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا يَكْتُمُونَ ﴿۱۶۷﴾ الَّذِينَ قَالُوا لِإِخْوَانِهِمْ وَقَعَدُوا لَوْ أَطَاعُونَا مَا قُتِلُوا ۗ قُلْ فَادْرَءُوا عَنْ أَنفُسِكُمُ الْمَوْتَ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ﴿۱۶۸﴾

☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆

"اور یہ تمہارا کیا حال ہے کہ جب تم پر مصیبت آپڑی تو تم کہنے لگے یہ کہاں سے آئی؟ حالانکہ (جنگ بدر میں) اس سے دوگنی مصیبت تمہارے ہاتھوں (فریق مخالف پر) پڑ چکی ہے۔ اے نبی ﷺ ان سے کہو' یہ مصیبت تمہاری اپنی لائی ہوئی ہے' اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ جو نقصان لڑائی کے دن تمہیں پہنچا وہ اللہ کے اذن سے تھا اور اس لئے تھا کہ اللہ دیکھ لے تم میں سے مومن کون ہیں اور منافق کون؟ وہ منافق کہ جب ان سے کہا گیا "آؤ اللہ کی راہ میں جنگ کرو یا کم از کم (اپنے شہر کی) مدافعت ہی کرو" تو کہنے لگے "اگر ہمیں علم ہوتا کہ آج جنگ ہو گی تو ہم ضرور تمہارے ساتھ چلتے۔" یہ بات جب وہ کہہ رہے تھے اس وقت وہ ایمان کی بہ نسبت کفر سے زیادہ قریب تھے۔ وہ اپنی زبانوں سے وہ باتیں کہتے ہیں جو ان کے دلوں میں نہیں ہوتیں' اور جو کچھ وہ دلوں میں چھپاتے ہیں اللہ اسے خوب جانتا ہے۔ یہ وہی لوگ ہیں جو خود تو بیٹھے رہے اور ان کے جو بھائی بند لڑنے گئے اور مارے گئے ان کے متعلق انہوں نے کہہ دیا کہ اگر وہ ہماری بات مان لیتے تو نہ مارے جاتے۔ ان سے کہو اگر تم اپنے اس قول میں سچے ہو تو خود تمہاری موت جب آئے' اسے ٹال کر دکھا دینا۔"

اللہ تعالیٰ نے اپنے اوپر یہ لکھ دیا ہے کہ وہ اپنے دوستوں کی مدد کرے گا' جو اس کا جھنڈا اٹھانے والے ہوں اور جو اس پر پختہ ایمان اور عقیدہ رکھنے والے ہوں۔ لیکن اس نے اس وعدے کو ایک شرط سے مشروط کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ اللہ کی نصرت کے مستحق وہ اس وقت ہوں گے جب ان کے دلوں میں حقیقت ایمان اچھی طرح جاگزیں اور مستحکم ہو جائے۔ اور وہ اپنی تنظیم اور طرز عمل میں ایمان کے تقاضے پورے کر رہے ہوں۔ اور ان کی وسعت اور طاقت کے اندر جو کچھ ہو وہ انہوں نے تیار کیا ہو۔ ان کی طاقت میں جس قدر ممکن ہو وہ جدوجہد کر رہے ہوں۔ یہ ہے سنت الٰہیہ اور سنت الٰہیہ کی کسی کے ساتھ خاص دوستی نہیں ہوتی نہ وہ کسی کی رو رعایت کرتی ہے۔ جب اللہ والے ان امور میں سے کسی میں بھی قصور اور کمی رکھتے ہوں تو ان کا فرض ہے کہ وہ اپنی تقصیرات کے نتائج بھی قبول کریں۔ اس لئے کہ صرف مومن ہونے سے ان کے لئے ضابطہ سنن الٰہیہ معطل نہ کر دیا جائے گا۔ نہ ناموس اعلیٰ باطل ہو جائے گا۔ وہ تو مسلم ہی تب ہوں گے جب وہ اپنی زندگی کے اندر سنن الٰہیہ کو جاری و ساری کر دیں۔ اور اپنی فطرت کو ناموس کائنات کے ساتھ ہم آہنگ کر دیں۔

لیکن ان کا نفس مسلمان ہونا بھی بیکار نہیں جاتا۔ نہ وہ بے اثر ہوتا ہے۔ ان کا اللہ کے سامنے سر تسلیم خم کر دینا' اس کے جھنڈے اٹھانا' اس کی اطاعت کا عزم کر لینا اور اس کے نظام حیات کا التزام کرنا وغیرہ ان امور کا اثر یہ ضرور ہو گا کہ اللہ تعالیٰ ان کی ان تقصیرات اور ان غلطیوں میں سے خیر اور برکت کا پہلو نکال دے۔ اگرچہ ان غلطیوں کی وجہ سے وہ چوٹیں کھائیں' قربانیاں دیں اور وقتی طور پر شکست

کھالیں۔ وہ ان غلطیوں سے ان کے تجربے میں اضافہ کرے گا۔ اس طرح ان کا عقیدہ صاف ہو جائے گا۔ ان کے دل صاف ہوں گے۔ ان کی صفوں کی تطہیر ہوگی اور اس طرح آخر کار وہ اس نصرت کے حق دار ہو جائیں گے جس کا وعدہ اللہ نے کیا ہے۔ آخری انجام خیر و برکت پر ہو گا' مسلمان اللہ کی بارگاہ سے' اس کی رحمت و عنایت سے دھتکارے نہیں جاتے بلکہ اللہ تعالیٰ انہیں مزید زاد راہ سے نوازتا ہے۔ اگرچہ اثنائے راہ میں انہیں تکالیف پہنچیں' مشکلات کا سامنا ہو اور رنج و الم سے دوچار ہوں۔

اس وضاحت کے ساتھ اور فیصلہ کن انداز میں اللہ تعالیٰ جماعت مسلمہ سے خطاب فرماتے ہیں۔ ان کے اس سوالیہ انداز اور جو واقعات پیش آئے' ان پر ان کی حیرانی اور پریشانی کا جواب دیا جاتا ہے اور بتایا جاتا ہے کہ ان واقعات کا قریبی سبب کیا تھا؟ نیز یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ اس میں تقدیر الٰہی کے اندر دور رس حکمت کیا پوشیدہ تھی؟ اور منافقین کو بتایا جاتا ہے کہ موت ایک حق راستہ ہے۔ ڈر سے موت ٹلتی نہیں اور نہ ہی جہاد میں شرکت نہ کرنے سے موت موخر ہو جاتی ہے۔

"اور یہ تمہارا کیا حال ہے کہ جب تم پر مصیبت آپڑی تو تم کہنے لگے یہ کہاں سے آئی؟ حالانکہ اس سے دوگنی مصیبت تمہارے ہاتھوں ان پر پڑ چکی ہے۔ اے نبی ان سے کہو' یہ مصیبت تمہاری اپنی لائی ہوئی ہے۔ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔"

جنگ احد میں مسلمانوں پر جو مصائب آئے وہ سب کے سامنے ہیں۔ ستر آدمی شہید ہوئے اور زخمی اور مزید مصائب ان کے علاوہ تھے۔ بہت ہی کڑوا دن تھا یہ ان کے لئے۔ ان پر یہ مصائب نہایت ہی شاق تھے اور ناقابل برداشت تھے۔ ان کا خیال یہ تھا کہ وہ مسلمان ہیں اور اللہ کی راہ میں جہاد کر رہے ہیں اور ان کے مخالفین اللہ کے دشمن ہیں اور مشرک ہیں اور مسلمان جو اس مصیبت میں مبتلا ہوئے' اس سے پہلے وہ ان دشمنان اسلام کو دوگنا نقصان پہنچا چکے تھے۔ یہ اشارہ ہے بدر کی طرف وہاں انہوں نے ان کے ستر آدمیوں کو قتل کیا' جن میں قریش کے معتبر اور معززین شامل تھے۔ اور اسی طرح احد میں بھی معرکہ کی ابتداء میں انہوں نے کفار کو نقصان پہنچایا تھا جبکہ وہ اللہ کے حکم پر درست کھڑے تھے۔ وہ رسول ؐ اللہ کے احکام پر عمل پیرا تھے۔ اس سے قبل کہ وہ مال غنیمت کو دیکھ کر بے راہ ہو جائیں۔ اور اس سے قبل کہ ان کے دلوں میں ایسے خیالات پیدا ہوں جو ایمان کے ساتھ لگا نہیں کھاتے۔

اللہ انہیں یہ سب باتیں یاد دلاتے ہیں اور ان کے اس حیرانی سے بھرے ہوئے سوال کا جواب یوں دیتے ہیں کہ اس کا براہ راست سبب تو خود ان کے اپنے افعال تھے۔ قُلْ هُوَ مِنْ عِنْدِ أَنْفُسِكُمْ .... "اے نبی ان سے کہو یہ مصیبت تمہاری اپنی لائی ہوئی ہے۔"

یہ خود تمہارے نفوس تھے' جن میں خلل آگیا' تم متفرق ہو گئے اور باہم تنازعہ کرنے لگے اور یہ تم ہی تھے جنہوں نے اللہ اور رسول اللہ ﷺ کی شرائط پر عمل نہ کیا۔ یہ تمہارے ہی نفوس تھے جن میں طمع اور لالچ داخل ہو گئی' اور یہ تم ہی تھے جنہوں نے رسول خدا ﷺ کے صریح احکام کی خلاف ورزی کی اور آپ کے جنگی منصوبے کو سبوتاژ کیا۔ پس یہ نتائج جن سے تم دوچار ہوئے اور جنہیں تم انہونی قرار دیتے ہو' اور تم کہتے ہو کہ یہ حالات کیسے پیش آگئے؟ تو جواب یہ ہے کہ یہ تمہاری اپنی وجہ سے ہوا ہے۔ تم پر تو اللہ میاں کی سنت اللہیہ کا انطباق ہوا ہے۔ جب تم نے اپنے آپ کو اس سنت کے سامنے پیش کیا۔ انسان جب اپنے آپ کو سنت اللہیہ کے سامنے پیش کرتا ہے تو وہ سنت اس پر پوری طرح منطبق ہوتی ہے۔ یہ شخص مسلم ہو یا مشرک ہو' اس سلسلے میں کسی کی رو رعایت نہ ہوگی۔ لہٰذا کسی کے اسلام کا کمال یہ ہونا چاہئے کہ وہ اپنے آپ کو اللہ کی سنت کے مطابق ڈھال لے اور وہ یہ کام پہلے ہی کر لے۔

إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ .... "اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔" اور اس کی قدرت کا ہی یہ تقاضا ہے کہ وہ اپنی سنت کو نافذ فرماتا ہے۔ وہ اس کائنات میں اپنے ناموس کی کارفرمائی قائم کراتا ہے۔ اور تمام کام اس کی قدرت اور ارادے کے

مطابق چلتے ہیں۔ اور یہ بھی اس کی قدرت کا تقاضا ہے کہ اس کی سنت معطل نہ ہو' جس پر اس نے اس کائنات اس زندگی اور زندگی کے ان واقعات کو چلایا ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ یہ بات پیش نظر رہے کہ تمام واقعات کی پشت پر اللہ کی تقدیر ہوتی ہے اور اس میں کوئی حکمت پوشیدہ ہوتی' جس کا علم صرف اللہ کو ہوتا ہے۔ ہر معاملہ جو پیش آتا اور ہر حادثہ جو واقعہ ہوتا ہے اس کی پشت پر اللہ کی تقدیر ہوتی ہے۔ ہر حرکت اور ہر سکوں کے پیچھے دست تقدیر ہوتا ہے اور اس کائنات میں جو وقوعہ بھی پیش آتا ہوتا ہے اس کی پشت پر تقدیر ہوتی ہے۔

وَمَآ اَصَابَكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ فَبِاِذْنِ اللّٰهِ .... "جو نقصان لڑائی کے دن جب دو گروہ باہم متقابل ہوئے تمہیں پہنچا وہ اللہ کے اذن سے تھا۔" یہ نقصان محض اتفاق سے یا سوئے اتفاق سے از خود پیش نہیں آیا۔ نہ وہ خواہ مخواہ بطور عبث پیش آیا۔ اس لئے کہ اس کائنات کے اندر ہونے والی ہر حرکت منصوبے اور دست قدرت کے مطابق ہوتی ہے۔ اس کے اسباب بھی پہلے سے طے شدہ ہیں اور نتائج بھی پہلے سے مقرر ہیں اور مجموعی لحاظ سے ان واقعات کے پیچھے حکمت پوشیدہ ہوتی ہے اور مجموعی لحاظ سے یہ واقعات اس پوری کائنات کی اسکیم کے مطابق ہوتے ہیں۔ اور اس کے باوجود وہ اس کائنات کے اندر جاری سنن الٰہیہ کے مطابق اور ان اٹل قوانین کے مطابق ہوتے ہیں جن کا کبھی بھی نہ تخلف ہوتا' نہ ان میں کوئی تعطل ہوتا ہے اور نہ ہی وہ قوانین کسی کے ساتھ رو رعایت کرتے ہیں۔

تقدیر کے مسئلے میں اسلامی تصور حیات اس قدر کامل' شامل اور متوازن ہے' جس کا مقابلہ آغاز انسانیت سے لے کر آج تک کوئی تصور حیات نہیں کر سکتا۔

اسلامی تصور حیات کے مطابق اس کائنات کا ایک اٹل قانون ہے اور بعض ناقابل تعطل سنن الٰہیہ ہیں۔ ان اٹل قوانین فطرت اور ناقابل انحراف سنن الٰہیہ کے پیچھے اللہ کا ارادہ کام کرتا ہے اور اللہ کی آزاد مشیئت ہے' جو کسی قید میں مقید نہیں ہے۔ اور ان سب یعنی سنن الٰہیہ اور مشیئت الٰہیہ کی پشت پر پھر اللہ کی حکمت مدبرہ ہے۔ اور یہ تمام پھر اللہ کی حکمت مدبرہ کے موافق چلتے ہیں۔ ناموس کی حکمرانی ہے اور سنن الٰہیہ ہر چیز میں جاری ہیں۔ انسان بھی ان کا تابع و محکوم ہے۔ انسان ان سنن الٰہیہ کے دائرے میں اپنے فعل ارادی کے ساتھ اپنے دائرہ اختیار کے اندر کام کرتا ہے۔ اور وہ اپنی سوچ اور اپنی تدبیر کے مطابق جو کام کرتا ہے' یہ سنن ان افعال پر بھی منطبق ہوتی ہیں اور اس پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ لیکن یہ سب کچھ اللہ کی تقدیر اور مشیئت کے مطابق ہوتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اس میں اللہ کی کوئی حکمت اور تدبیر بھی کام کرتی ہے۔ اس نظام میں انسان کا ارادہ' اس کی حرکت' اس کی سوچ' اس کی قوت عمل یہ سب کچھ سنن الٰہیہ کا ایک حصہ ہیں۔ وہ ناموس کائنات کا حصہ ہیں۔ ان انسانی افعال کے ساتھ بھی اللہ اپنا کام کرتے ہیں' ان کو بھی وہ موثر بناتے ہیں اور یہ سب کچھ پھر بھی اس کے دائرۂ قدرت کے اندر ہوتا ہے۔ ان میں سے کوئی چیز نوامیس فطرت اور سنن الٰہیہ کے دائرے سے خارج نہیں ہوتی۔ اور نہ انسان کی کوئی حرکت اور سوچ ان سنن کے ساتھ متضاد ہوتی ہے یا ان کے بالمقابل ہوتی ہے۔ بعض لوگوں کی سوچ یہ ہے کہ وہ ترازو کے ایک پلڑے میں اللہ کے ارادے' اللہ کی تقدیر کو رکھتے ہیں اور انسان کے ارادے اور انسان کی سوچ اور فاعلیت کو دوسرے پلڑے میں رکھتے ہیں۔ جو اللہ کے ارادے کے بالمقابل ہو۔ یہ صورت حال بالکل ممکن نہیں ہے۔ اسلامی تصور حیات ایسا نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ انسان اس کا شریک بالمقابل نہیں ہے۔ نہ انسان اللہ کا دشمن ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جب انسان کو اس کا وجود' اس کی فکر' اس کا ارادہ بخشا تھا' اس کی تقدیر' اس کی تدبیر اور زمین کے اندر اس کی فاعلیت اسے عطا کی تھی تو اس نے اس وقت ان انسانی قوتوں اور سنن الٰہیہ کے درمیان کوئی تضاد نہ رکھا تھا اور نہ ان کے درمیان کوئی مقابلہ رکھا تھا۔ نہ یہ چیزیں مشیئت

الٰہیہ کے خلاف تھیں۔ نہ اللہ کے نزدیک یہ سب امور اللہ کی گہری حکمت سے باہر تھے۔ جو اللہ کی تقدیر کی پشت پر کارفرما ہے۔ اللہ کی سنت اور اللہ کی تقدیر کے اندر یہ بات رکھی گئی تھی کہ انسان اپنی تدبیر سے کام لے۔ وہ متحرک ہو اور اس کائنات میں مؤثر ہو۔ وہ سنن الٰہیہ کے بالمقابل کھڑا ہو اور وہ اس پر منطبق ہوں اور اللہ کی سنن کے تحت اس دنیا میں اسے لذت والم' آرام و بے آرامی' سعادت و شقاوت سے دوچار ہونا پڑے اور پھر اس کی ان تمام سرگرمیوں کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر کام کرے جس کے احاطے میں یہ پوری کائنات ہے' نہایت ہی توازن اور تناسق کے ساتھ۔

یہ واقعات جو احد میں وقوع پذیر ہوئے' وہ اسلامی تصور حیات کی مثال تھے' یعنی تقدیر کے حوالے سے جو ہم بات کر آئے ہیں۔ ان واقعات کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو سکھایا کہ فتح و شکست کے بارے میں اس کی سنت کیا ہے۔ انہوں نے اللہ کی سنت اور اس شرط کی خلاف ورزی کی جو اس نے فتح کے لئے رکھی ہوئی تھی تو اس نے انہیں ان آلام اور ان مصائب سے دوچار کیا جو احد میں انہیں پیش آئے۔ لیکن بات یہاں آکر ختم نہیں ہوگئی۔ اس مخالفت اور رنج و الم کے پیچھے یہ تقدیر کام کر رہی تھی کہ ان کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ اسلامی صفوں میں سے منافقین کو چھانٹ کر علیحدہ کر دے۔ اہل ایمان کے دلوں کو صاف کر دے اور ان کے تصورات کے اندر جو ملاوٹ اور میل تھی اسے دور کر دے یا ان کے کردار میں جو ضعف اور کمزوری تھی وہ دور ہو جائے۔

بظاہر وہ رنج و الم سے دوچار ہوئے' لیکن اپنی جگہ اہل ایمان کے حق میں مستقبل کے اعتبار سے یہ خیر تھا۔ اگرچہ یہ رنج و الم بھی سنت الٰہی کے عین مطابق تھا' اللہ کے سنن میں سے ایک سنت یہ بھی ہے کہ جو مسلمان اسلامی نظام حیات کو قبول کر کے اس کے آگے سر تسلیم خم کریں گے اور عموماً اسلامی نظام کی اطاعت کریں گے' اللہ ان کی حمایت و رعایت کرے گا اور ان کی غلطیاں بھی' اپنی انتہا پر جاکر وسیلہ ظفر اور ذریعہ خیر ہوں گی۔ اگرچہ وہ رنج والم سے دوچار ہوں' کیوں؟ اس لئے کہ رنج والم اور مصائب و شدائد کے ذریعہ تربیت ہوتی ہے' اسلامی صفوں سے کھوٹ دور ہوتا ہے اور آئندہ مرحلے کی خوب تیاری ہوتی ہے۔

اس مضبوط اور کھلے موقف پر مسلمانوں کے قدم جم جائیں گے' ان کے دل مطمئن ہوں گے' ان میں کوئی تزلزل نہ ہو گا' کوئی حیرانی نہ ہوگی اور کوئی پریشانی نہ ہوگی۔ اس طرح وہ اللہ کی تقدیر کو انگیز کریں گے' اس کائنات میں سنن الٰہیہ کے مطابق اپنے معاملات سرانجام دیں گے۔ انہیں یقین ہو گا کہ اللہ ان کی ذات اور ان کے ماحول میں فعال لمایرید ہے اور یہ کہ وہ تقدیر الٰہی کے آلات اور ذریعہ کار ہیں۔ اللہ جس طرح چاہے اپنے آلات کار کو استعمال کر سکتا ہے' یہ کہ ان کے درست فیصلے' ان کے صائب فیصلے اور درست فیصلوں کے اثرات اور غلط فیصلوں کے نتائج سب کے سب اللہ کی تقدیر کے پردے سے ظاہر ہوتے ہیں۔ ان میں اس کی کوئی نہ کوئی حکمت ہوتی ہے اور جب تک وہ اس راہ انقلاب پر گامزن رہیں گے' ان کے لئے ہر مرحلہ خیر ہی خیر ہو گا۔

وَمَآ اَصَابَكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ فَبِاِذْنِ اللّٰهِ وَلِيَعْلَمَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ وَلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ نَافَقُوْا ۚ وَقِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا قَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَوِ ادْفَعُوْا ۭ قَالُوْا لَوْ نَعْلَمُ قِتَالًا لَّا اتَّبَعْنٰكُمْ ۭ هُمْ لِلْكُفْرِ يَوْمَىِٕذٍ اَقْرَبُ مِنْهُمْ لِلْاِيْمَانِ ۚ يَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِهِمْ مَّا لَيْسَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ ۭ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يَكْتُمُوْنَ

"جو نقصان تمہیں اس دن پہنچا جس دن دو جماعتوں کے درمیان ٹکر ہوئی' وہ اللہ کے اذن سے تھا۔ اور اس لئے تھا کہ اللہ دیکھ

لے کہ تم میں سے مومن کون ہیں اور منافق کون؟ وہ منافق کہ جب ان سے کہا گیا "آؤ' اللہ کی راہ میں جنگ کرو' یا کم از کم (اپنے شہر) کی مدافعت ہی کرو۔ تو کہنے لگے "اگر ہمیں علم ہوتا کہ آج جنگ ہو گی تو ہم ضرور تمہارے ساتھ چلتے۔" یہ بات جب وہ کہہ رہے تھے' اس وقت وہ ایمان کی بہ نسبت کفر سے زیادہ قریب تھے۔ وہ اپنی زبانوں سے وہ باتیں کہتے ہیں جو ان کے دلوں میں نہیں ہوتیں۔ اور جو کچھ دلوں میں چھپاتے ہیں' اللہ خوب جانتا ہے۔"

اس آیت میں عبداللہ ابن ابی ابن السلول اور اس کے ساتھیوں کے موقف کی طرف اشارہ ہے۔ انہیں جو خطاب دیا گیا ہے وہ الَّذِينَ نَافَقُوا .... (وہ لوگ جنہوں نے نفاق کیا) کا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس موقعہ پر ان کا پردہ فاش کر دیا۔ اور اسلامی صفوں سے انہیں جدا کر دیا۔ اور ان کے اس دن کے موقف پر یہ تبصرہ کیا هُمْ لِلْكُفْرِ يَوْمَئِذٍ أَقْرَبُ مِنْهُمْ لِلْإِيمَانِ .... (اس وقت وہ ایمان کی بہ نسبت کفر سے زیادہ قریب تھے) یہ کہ وہ اپنے اس احتجاج میں سچے نہ تھے کہ آج مسلمانوں اور کافروں کے درمیان جنگ نہیں ہو رہی ہے۔ اس لئے وہ واپس ہو رہے ہیں۔ اس لئے کہ ان کی واپسی کا فی الحقیقت یہ سبب نہ تھا۔ بلکہ وہ "جو کچھ اپنے منہ سے کہہ رہے تھے وہ بات ان کے دل میں نہ تھی۔" ان کے دل میں تو نفاق کی بیماری تھی۔ اور یہ نفاق انہیں نظریہ حیات کے تابع نہ کرتا تھا بلکہ وہ ان کی شخصیات اور ان کی ذاتی حیثیات کو نظریہ حیات سے زیادہ اہمیت دیتا تھا۔ ان لوگوں کے رئیس عبداللہ ابن ابی ابن السلول نے یہ اعتراض بھی کیا تھا کہ رسول خدا نے احد کے دن اس کی رائے کو قبول نہیں کیا۔ اور اس واقعہ سے پہلے کے اسباب یہ تھے کہ جب حضور اکرم ﷺ اپنی رسالت کے پیغام کو لے کر مدینہ طیبہ پہنچے تو اس وقت عبداللہ ابن ابی کی سربراہی میں ایک ریاست کی تشکیل کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ اس کے لئے تاج بن رہا تھا۔ آپ کی آمد کے نتیجے میں ریاست کا مقام حاملین اسلام نے حاصل کر لیا۔ یہ بات ان کے دل میں تیر کی طرح پیوست تھی۔ اور یہی وجہ تھی کہ وہ احد کے دن واپس ہو گئے تھے۔ چونکہ دشمن مدینہ کے دروازے پر تھے' اس لئے یہ لوگ واپس ہو گئے اور مومن صادق کی یہ بات انہوں نے رد کر دی۔ یہ مومن صادق عبداللہ بن عمرو ابن حزام تھے۔ وہ انہیں پکار رہے تھے تَعَالَوْا قَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَوِ ادْفَعُوا .... (آؤ اللہ کی راہ میں جنگ کرو یا دفاع ہی کرو) اس کے جواب میں ان کا احتجاج و استدلال یہ تھا کہ ان کے خیال میں کوئی جنگ نہیں ہے۔ اگر کوئی بات ہوتی تو وہ ضرور جاتے۔ اور ان کے اس موقف کی تردید یوں کی گئی وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا يَكْتُمُونَ .... "اور جو کچھ وہ دلوں میں چھپاتے ہیں اللہ اسے خوب جانتا ہے۔"

یوں وہ اپنے تخلف اور پلٹنے کو حکمت اور مفید قرار دیتے ہیں اور رسول خدا کی اطاعت کو نقصان اور ضرر رساں قرار دیتے ہیں۔ اور اس سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ اسلام کے صاف اور ستھرے تصور حیات کو خراب کرتے ہیں' کیونکہ اسلامی تصور حیات کے مطابق ہر شخص کی موت کا وقت مقرر ہوتا ہے۔ موت و حیات کی حقیقت یہ ہے کہ ان کا تعلق تقدیر الٰہی کے ساتھ ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ یہاں ان کے ان غلط تصورات کی تردید ضروری سمجھتے ہیں۔ فوراً ان کے اس تصور کی واضح تردید کر دی جاتی ہے' جس سے ایک طرف ان کی تیار کی ہوئی سازش کے تار و پود بکھر جاتے ہیں اور دوسری جانب سے اسلامی تصور حیات ہر قسم کے اجمال اور دھندلے پن سے پاک صاف ہو جاتا ہے۔ فرماتے ہیں قُلْ فَادْرَءُوا عَنْ أَنْفُسِكُمُ الْمَوْتَ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ .... "ان سے کہو اگر تم اپنے اس قول میں سچے ہو تو خود تمہاری موت جب آئے تو اسے ٹال کر دکھا دینا۔"

موت تو جس طرح مجاہد کو آتی ہے اسی طرح جو لوگ گھر میں بیٹھے رہتے ہیں' انہیں بھی آتی ہے' بہادر کو بھی آتی ہے اور بزدل کو بھی آتی ہے۔ نہ کوئی محافظ اسے ٹال سکتا ہے اور نہ کوئی احتیاطی تدبیر۔ نہ بزدلی اور جہاد سے غیر حاضری سے وہ ٹل سکتی ہے۔ اور یہ صورت حال

ایسی ہے' جو خود اپنی دلیل آپ ہے اور اس میں کسی شک کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ یہی حقیقی صورت حال ہے جس کو قرآن مجید خود ان کے خلاف پیش کرتا ہے۔ یوں ان کی اس مکروہ سازش کو رد کر دیا جاتا ہے۔ سچائی کو اپنی جگہ رکھ کر مستحکم کر دیا جاتا ہے۔ مسلمانوں کے دل مطمئن اور مضبوط ہو جاتے ہیں۔ انہیں اطمینان' آرام اور ذوق یقین سے سیراب کر دیا جاتا ہے۔

واقعات احد کے بیان کے اس انداز کی طرف ذہن انسانی ملتفت ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اس بیان میں اس واقعہ یعنی عبداللہ بن ابی اور اس کے ساتھیوں کی روگردانی کو بہت ہی موخر کر کے لایا گیا ہے۔ حالانکہ یہ واقعہ اس معرکے کے ابتدائی دور میں ہوا تھا اور معرکے کے آغاز ہی سے وہ واپس ہو گیا تھا۔ اسے اول میں بیان کرنے کے بجائے آخر میں لایا گیا یہ کیوں؟

یہ تاخیر اس لئے کی گئی کہ اس میں بھی قرآن کریم کے انداز تربیت میں سے ایک خاص انداز کا اظہار کیا گیا ہے۔ مقصد یہ تھا کہ اس حادثہ پر تبصرے سے قبل وہ تمام اساسی تصورات بیان کر دیئے جو اسلامی نظام زندگی کے بنیادی قواعد میں شمار ہوتے ہیں اور جب مسلمانوں کے ذہن میں وہ تمام احساسات جاگزیں ہو گئے' اور مسلمانوں کی اقدار کے لئے حقیقی پیمانے وضع ہو گئے تو آخر میں ان لوگوں کی طرف اشارہ کر دیا گیا جنہوں نے نفاق اختیار کیا تھا۔ ان کے کردار اور ان کی سرگرمیوں کو بے نقاب کیا گیا۔ ایسے موقعہ پر ان لوگوں کے خلاف تنقید آئی جب مسلمانوں کے ذہن اس کے لئے تیار تھے اور اس قابل ہو گئے تھے کہ معلوم کر سکیں کہ ان کے افکار و تصورات کے اندر کیا کیا انحراف ہے اور کیا کیا کمزوریاں ہیں؟ اور یہ کہ ان کے پیمانے کس قدر غلط ہیں؟ اور یہ کہ ایک مومن کے دل و دماغ کے اندر افکار اور تصورات اور حسن و قبح کے پیمانے ایسے ہونے چاہئیں اور کسی فرد اور قوم کے اعمال کا جائزہ ان پیمانوں کے مطابق ہونا چاہئے اور اس کے بعد جب مومن پر اعمال اور افراد کو پیش کیا جاتا ہے تو وہ ایک روشن مزاج اور ایمانی احساس اور ایمانی سرمایہ حکمت کی روشنی میں ان پر فوراً حکم لگاتا ہے کہ کیا کمتر ہے اور کیا بہتر ہے۔ کون صالح ہے اور کون برا ہے۔

یہ قرآنی انداز بیان کا ایک خاص رنگ ہے۔ عبداللہ ابن ابی اس وقت تک اپنی قوم کا سرکردہ لیڈر تھا جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا ہے۔ وہ اس لئے سوچ گیا کہ حضور اکرم ﷺ نے اس کی رائے کو قبول نہ کیا تھا۔ اس لئے کہ نبی ﷺ نے اصول مشورہ کو رائج کرنا تھا۔ پھر جو بات طے ہو جائے اسے نافذ کرنا تھا' چاہے وہ غلط ہی کیوں نہ ہو کیونکہ دوسری رائے کے سلسلے میں لوگوں کا رجحان ظاہر ہو گیا تھا۔ اس شخص کی اس روگردانی کی وجہ سے اسلامی صفوں کے اندر بڑی افراتفری پیدا ہو گئی تھی۔ ان کے افکار میں تزلزل پیدا ہو گیا تھا۔ پھر اس کی رائے کی اہمیت اور بھی واضح ہو گئی جب شکست ہوئی اور لوگوں کو مزید حسرت اور افسوس ہونے لگا۔ اور دلوں میں یہ بات آئی کہ اسی کے کہنے پر عمل کر لیا ہوتا۔ اسلامی منہاج کے لئے یہ ضروری تھا کہ اس کی رائے اور اس کے اس فعل کو قدرے نظرانداز کر کے اور غیر اہم کر کے پیش کیا جائے اور اس جنگ کے واقعات کا آغاز اس واقعہ سے نہ کیا جائے۔ حالانکہ یہ حادثہ پہلے در پیش ہوا تھا۔ اس واقعہ کو اس قدر موخر کرنے اور پھر اسے بیان کر کے اس گروہ پر نفاق کا لیبل چسپاں کر دینے اور پھر ان کے لئے غائب اور مجہول صیغے کا استعمال اور اس گروہ کے سرغنے کا ذکر نہ کرنے سے اور انہیں **اَلَّذِيْنَ نَافَقُوْا** .... کہہ کر پکارنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ ان کی اہمیت کو کم کیا جائے اور یہ بات اصولاً ان تمام لوگوں پر چسپاں ہو' جو ایسی حرکات کرتے ہیں اور بات اس طرح اصولی رنگ اختیار کرے جس طرح آغاز کلام میں اسے اصولی رکھا گیا تھا۔

○.....☆☆☆.....○

اہل اسلام کے دلوں کے اندر سکون پیدا کرنے' ان کے دلوں اور ان کے ضمیر کو' ان سنن اللہیہ پر مطمئن کرنے کے بعد جو اس کائنات میں جاری اور ساری ہیں' انہیں یہ بتانے کے بعد کہ تمام کام اللہ کی تقدیر کے مطابق ہوتے ہیں' اور یہ سمجھانے کے بعد کہ اللہ کی

تقدیر کے پیچھے اللہ کی حکمت اور تدبیر کام کر رہی ہوتی ہے۔ اور یہ بات ذہن نشین کرنے کے بعد کہ موت کے لئے وقت مقرر ہے' اس کا وقت پہلے سے طے شدہ ہے اور جنگ میں شریک نہ ہونا اسے موخر نہیں کر سکتا اور جنگ میں شرکت سے موت پہلے نہیں آسکتی اور یہ سمجھانے کے بعد کہ کوئی محافظ موت سے حفاظت نہیں دے سکتا اور کوئی تدبیر موت کو روک نہیں سکتی' غرض ان تمام امور کے بعد اب سیاق کلام میں ایک دوسری حقیقت کو لیا جاتا ہے۔ یہ حقیقت اپنی ذات میں بھی عظیم ہے اور اس کے اثرات بھی نہایت ہی عظیم ہیں۔

یہ حقیقت کیا ہے؟ یہ کہ جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے جاتے ہیں وہ مردہ نہیں ہوتے' وہ تو زندہ ہوتے ہیں۔ وہ اپنے رب کے ہاں مہمانان خصوصی ہوتے ہیں۔ ان کی زندگی' مرنے کے بعد' اسلامی جماعت کی زندگی سے منقطع نہیں ہوتی' وہ بعد کے واقعات سے لاتعلق نہیں ہوتے' وہ ان واقعات سے خود بھی متاثر ہوتے ہیں اور واقعات میں ایک موثر فیکٹر بھی ہوتے ہیں اور زندگی عبارت کس چیز سے ہے؟ تاثیر اور تاثر ہی تو زندگی ہے۔

یہاں معرکۂ احد کے شہداء کی زندگی اور ان واقعات اور حادثات کے درمیان رابطہ قائم کر دیا جاتا ہے جو ان کی شہادت کے بعد پیش آئے۔ اس کے بعد گروہ مومن کی بات "متصلا" بیان کر دی جاتی ہے' جس نے اللہ اور رسول خدا ﷺ کی پکار پر لبیک کہا۔ درآنحالیکہ وہ زخموں سے چور چور تھے۔ وہ نکلے' انہوں نے قریش کا تعاقب کیا' یہ قریش اگرچہ جاچکے تھے لیکن یہ خطرہ موجود تھا کہ وہ دوبارہ مدینہ پر حملہ آور ہو جائیں۔ اس گروہ نے لوگوں کے اس ڈراوے کی کوئی پرواہ نہ کی کہ قریش پھر سے جمع ہو رہے ہیں۔ ذات باری پر توکل کی اور انہوں نے اس کارنامے کی وجہ سے اپنے ایمان کو حقیقت کا روپ دیا۔ ☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتًا ۚ بَلْ أَحْيَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُونَ ﴿١٦٩﴾ فَرِحِينَ بِمَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ وَيَسْتَبْشِرُونَ بِالَّذِينَ لَمْ يَلْحَقُوا بِهِمْ مِنْ خَلْفِهِمْ أَلَّا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿١٧٠﴾ يَسْتَبْشِرُونَ بِنِعْمَةٍ مِنَ اللَّهِ وَفَضْلٍ وَأَنَّ اللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُؤْمِنِينَ ﴿١٧١﴾ الَّذِينَ اسْتَجَابُوا لِلَّهِ وَالرَّسُولِ مِنْ بَعْدِ مَا أَصَابَهُمُ الْقَرْحُ ۚ لِلَّذِينَ أَحْسَنُوا مِنْهُمْ وَاتَّقَوْا أَجْرٌ عَظِيمٌ ﴿١٧٢﴾ الَّذِينَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ إِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ إِيمَانًا وَقَالُوا حَسْبُنَا اللَّهُ وَنِعْمَ الْوَكِيلُ ﴿١٧٣﴾ فَانْقَلَبُوا بِنِعْمَةٍ مِنَ اللَّهِ وَفَضْلٍ لَمْ يَمْسَسْهُمْ سُوءٌ وَاتَّبَعُوا رِضْوَانَ اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ ذُو فَضْلٍ عَظِيمٍ ﴿١٧٤﴾ إِنَّمَا ذَٰلِكُمُ الشَّيْطَانُ يُخَوِّفُ أَوْلِيَاءَهُ فَلَا تَخَافُوهُمْ وَخَافُونِ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ﴿١٧٥﴾

١٧ ع١٦ ٨

"جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل ہوئے ہیں انہیں مردہ نہ سمجھو' وہ تو حقیقت میں زندہ ہیں' اپنے رب کے پاس رزق پا رہے ہیں' جو کچھ اللہ نے اپنے فضل سے انہیں دیا ہے اس پر خوش و خرم ہیں' اور مطمئن ہیں کہ جو اہل ایمان ان کے پیچھے دنیا میں رہ گئے ہیں اور ابھی وہاں نہیں پہنچے ہیں ان کے لئے بھی کسی خوف اور رنج کا موقع نہیں ہے۔ وہ اللہ کے انعام اور اس کے فضل پر شاداں و فرحاں ہیں اور ان کو معلوم ہو چکا ہے کہ اللہ مومنوں کے اجر کو ضائع نہیں کرتا۔ (ایسے مومنوں کے اجر کو) جنہوں نے زخم کھانے کے بعد بھی اللہ اور رسول کی پکار پر لبیک کہا..... ان میں جو اشخاص نیکوکار اور پرہیزگار ہیں ان کے لئے بڑا اجر ہے..... جن سے لوگوں نے کہا کہ "تمہارے خلاف بڑی فوجیں جمع ہوئی ہیں' ان سے ڈرو" تو یہ سن کر ان کا ایمان اور بڑھ گیا اور انہوں نے جواب دیا کہ "ہمارے لئے اللہ کافی ہے اور وہی بہترین کارساز ہے۔" آخر کار وہ اللہ تعالیٰ کی نعمت اور فضل کے ساتھ پلٹ آئے' ان کو کسی قسم کا ضرر بھی نہ پہنچا اور اللہ کی رضا پر چلنے کا شرف بھی انہیں حاصل ہو گیا' اللہ بڑا فضل فرمانے والا ہے۔ اب تمہیں معلوم ہو گیا کہ وہ دراصل شیطان تھا جو اپنے دوستوں سے خواہ مخواہ ڈرا رہا تھا۔ لہٰذا آئندہ تم انسانوں سے نہ ڈرنا' مجھ سے ڈرنا اگر تم حقیقت میں صاحب ایمان ہو۔"

مومنین کے دل و دماغ میں تقدیر اور موت کے مقررہ وقت کے بارے میں صحیح تصورات بٹھانے کے بعد اور منافقین اسلامی صفوں کے اندر جو بے چینی' شکوک اور حسرتیں پیدا کرتے تھے ان کی تردید کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے یہ مناسب سمجھا کہ اہل ایمان کے دلوں کے اندر مزید سکون اور پورا اطمینان پیدا کیا جائے۔ اس لئے کہ منافقین مسلسل یہ پروپیگنڈا کر رہے تھے کہ اگر تم اتنے ہی باتدبیر ہو تو خود اپنی موت کو روک لینا جب وہ آئے۔ لیکن سابقہ آیات میں پیدا کردہ ایمان و ایقان اور اس مسکت جواب کے بعد اللہ نے چاہا کہ ان کے دلوں میں شہداء کے مستقبل کے بارے میں مزید اطمینان پیدا کر دیا جائے۔ وہ شہداء جو اللہ کی راہ میں قتل ہوئے (اور شہداء ہوتے ہی وہ ہیں جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں قتل ہوں) اور ان کے پیش نظر یہی مقاصد ہوں۔ اور ان مقاصد کے ساتھ کوئی اور مقصد شریک نہ ہو۔ تو ایسے شہداء جو فی سبیل اللہ قتل ہوئے وہ فی الحقیقت زندۂ جاوید ہیں۔ ان کو ایسے خصائص حاصل ہیں جو زندہ لوگوں کو حاصل ہوتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ انہیں ان کے رب کے ہاں کھانے دیئے جاتے ہیں اور کھانے کے علاوہ ان پر فضل خداوندی ہے اور اس فضل پر وہ بہت خوش ہیں' اور ان کو پھر اہل ایمان کے معاملات کی رپورٹ دی جاتی ہے جن معاملات کے لئے انہوں نے اپنی جان دی۔ وہ پورے واقعات ان کو سنائے جاتے ہیں۔ ان کے بعد ان کے بھائیوں کے ساتھ جو واقعات پیش آتے ہیں وہ آس کے سامنے پیش ہوتے ہیں۔ اور یہ سب خواص وہ ہیں جو زندہ لوگوں کو حاصل ہوتے ہیں مثلاً سازوسامان' خوشخبری' اہتمام اور تاثر اور تاثیر۔ یہ سب زندہ لوگوں کی صفا ہیں۔ لہٰذا ان کی جدائی وفات حسرت آیات نہیں ہے۔ وہ زندہ ہیں' ان کا رابطہ زندوں کے ساتھ قائم ہے اور اس کے علاوہ مزید فضل یہ کہ وہ فضل الٰہی میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ یہ فضل ان کے رزق اور مرتبے و مقام سے علیحدہ ہے۔ اس لئے لوگ شہداء اور ان کے بعد رہنے والے بھائیوں کے درمیان جو فرق کرتے ہیں وہ درحقیقت کچھ حقیقت نہیں رکھتا۔ اس لئے لوگوں کے ذہنوں میں عالم الحیاۃ اور عالم بعد الممات کے اندر جو فرق ہے وہ شہداء کے حوالے سے کچھ نہیں ہے۔ مومنین کے نقطہ نظر سے کوئی فرق نہیں ہے' اس لئے کہ ان کا معاملہ یہاں بھی خدا سے ہے اور وہاں بھی خدا سے ہے۔

اس حقیقت کو ذہن میں بٹھانے کے بعد اس دنیا کے واقعات پر سوچنے کے انداز بدل جاتے ہیں۔ یہ حقیقت انسان کی سوچ بدل دیتی ہے۔ اس کائنات کے بارے میں ایک مومن کے اندر ایک بالکل نئی سوچ پیدا ہوتی ہے۔ کائنات کی یہ حرکت ایک مومن کے نقطہ نظر سے اپنے اندر تسلسل رکھتی ہے۔ وہ کبھی منقطع نہیں ہوتی۔ یوں ایک انسان جب مرجاتا ہے تو اس کی زندگی کا خاتمہ نہیں ہوتا بلکہ موت کی وجہ سے قبل الممات اور بعد الممات زندگی میں ایک پردہ سا حائل ہو جاتا ہے۔

یہ موت و حیات کے لئے ایک نیا نقطہ نظر ہے۔ اس سے ایک مسلمان کے شعور میں عظیم انقلاب برپا ہو جاتا ہے۔ مسلمان زندگی اور موت دونوں کا استقبال ایک مخصوص نقطۂ نظر کے ساتھ کرتے ہیں۔

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ............ "اور جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل ہوئے ہیں انہیں مردہ نہ سمجھو' وہ تو حقیقت میں زندہ ہیں' اپنے رب کے پاس رزق پا رہے ہیں۔"

یہ آیت اس بارے میں نص قطعی ہے کہ جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے گئے' جنہوں نے زندگی قربان کر دی' اور لوگوں کی نظروں سے غائب ہو گئے انہیں مردہ کہنا یا سمجھنا ممنوع ہے۔ اور یہ آیت اس امر میں بھی قطعی ہے کہ وہ زندہ ہیں۔ اپنے رب کے ہاں رزق پا رہے ہیں۔ اور اس نہی اور اثبات کے بعد' اس آیت میں ان کے خصائص حیات کا ذکر ہوتا ہے اور ان کے رزق دیئے جانے کا ذکر ہے۔

ہم اس جہان فانی میں' شہداء کی زندگی سے صحیح معرفت نہیں پاتے۔ ہاں ان شہداء کی زندگی کے بعض اوصاف بعض احادیث میں ذکر ہوئے ہیں' لیکن اللہ جل شانہ کی طرف سے بذریعہ وحی آئی ہوئی یہ آیت ہمارے لئے اس ضمن میں کافی اور شافی ہے۔ اس لئے کہ اللہ علیم و خبیر ہے اور صرف اللہ ہی اس بات کا ضامن ہے کہ وہ موت و حیات کے بارے میں تصورات کو بدل دے۔ یہ کہ ان کے درمیان کس حد تک دوئی اور جدائی ہے اور کس قدر اتحاد و اتصال ہے۔ اور یہ بات اللہ ہی بتا سکتا ہے کہ معاملات بعینہٖ ایسے نہیں ہیں جس طرح بظاہر ہمیں ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں یا جس طرح ہم ان کا ادراک کر سکتے ہیں۔ اور ہم جب بے قید اور مطلق حقائق کے معانی اپنے اذہان میں مقرر کرتے ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ یہ مفاہیم آخری مفہومات ہیں اور یہ کہ ہم نے حقائق بعد الممات کا کماحقہ ادراک کر لیا ہے۔ لہذا ہمارے لئے یہ بہتر ہے کہ ہم صرف ذات باری تعالیٰ کے بیان کا انتظار کریں کہ اللہ نے کیا کہا ہے' اور اس پر اکتفاء کریں۔

شہداء وہ لوگ ہیں جو بظاہر قتل ہو جاتے ہیں۔ بظاہر ان کی زندگی ان سے جدا ہو جاتی ہے اور وہ بھی زندگی سے جدا ہو جاتے ہیں' جس طرح ہمیں نظر آتا ہے لیکن چونکہ وہ اللہ کی راہ میں قتل ہوتے ہیں' اور تمام دنیاوی اغراض کو ترک کر کے قتل ہوتے ہیں' دنیا کی چھوٹی چھوٹی اغراض کو وہ چھوڑ دیتے ہیں۔ ان کی روحیں اللہ سے مل جاتی ہیں' اس لئے وہ اپنی روحوں کو اللہ کی راہ میں قربان کر دیتے ہیں۔ اور وہ اسی طرح بظاہر قتل ہوتے نظر آتے ہیں۔ اس لئے اللہ تعالیٰ جو مخبر صادق ہے ہمیں اطلاع دیتے ہیں کہ وہ مردہ نہیں اور ہمیں منع کرتے ہیں کہ انہیں زبان سے بھی مردہ نہ کہو۔ اور بتاکید مزید فرماتے ہیں کہ وہ زندہ ہیں۔ انہیں باقاعدہ رزق دیا جاتا ہے اور وہ اللہ کا رزق اس طرح حاصل کرتے ہیں جس طرح زندہ لوگ حاصل کرتے ہیں۔ اور اسی طرح اللہ تعالیٰ ہمیں ان کی بعض دوسری خصوصیات کی بھی اطلاع دیتے ہیں' مثلاً

فَرِحِيْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۙ............ "جو کچھ اللہ نے اپنے فضل سے انہیں دیا ہے اس پر خوش اور خرم ہیں۔" یعنی وہ اللہ کے ہاں سے آیا ہوا رزق بڑی فرحت کے ساتھ حاصل کرتے ہیں۔ اس لئے کہ انہیں اچھی طرح ادراک ہو چکا ہوتا ہے کہ یہ تو اللہ کا فضل خاص ہے۔ یہ فضل خاص ان کے لئے ثبوت ہے اللہ کی رضامندی کا' اس لئے کہ وہ اس کی راہ میں قتل ہوئے۔ پس اس سے زیادہ ان کے لئے اور کیا چیز سامان فرحت ہو سکتی ہے کہ انہیں اللہ کا رزق اس احساس کے ساتھ ملے کہ وہ ان سے راضی بھی ہو چکا ہے۔

اس کے بعد یہ خصوصیت کہ ان کے دل ان لوگوں کے حالات کے اندر مشغول ہیں اور دلچسپی لے رہے ہیں جو اس دنیا میں زندہ رہ رہے ہیں اور وہ ان زندہ رہنے والوں کے انجام کے بارے میں بہت ہی مطمئن ہیں۔ اس لئے کہ انہیں معلوم ہو گیا ہے کہ ان سے بھی

اللہ میاں راضی ہے۔

يَسْتَبْشِرُونَ بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ فَضْلٍ ۙ وَّ اَنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيعُ اَجْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ

"اور مطمئن ہیں کہ جو اہل ایمان ان کے پیچھے دنیا میں رہ گئے ہیں اور ابھی وہاں نہیں پہنچے' ان کے لئے بھی کسی رنج و خوف کا موقعہ نہیں ہے۔ وہ اللہ کے انعام اور اس کے فضل پر شاداں اور فرحاں ہیں اور ان کو معلوم ہو چکا ہے کہ اللہ مومنوں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔"

وہ اپنے ان بھائیوں سے منقطع نہیں ہو گئے' جو ابھی وہاں نہیں پہنچے اور ان سے جدا ہو گئے ہیں۔ وہ زندہ ہیں' ان کے ساتھ ہیں اور دنیا اور آخرت میں پیچھے آنے والوں کو جو کچھ ملنے والا ہے' اس پر وہ بہت ہی خوش ہیں اور وہ اس لئے شاداں و فرحاں ہیں کہ ان آنے والوں کے لئے بھی کسی رنج اور خوف کا موقعہ نہیں ہے۔ وہ اپنے رب کے ہاں جو اعلیٰ درجے کی زندگی گزار رہے ہیں۔ اس سے انہیں معلوم ہو گیا ہے کہ آنے والوں کے بھی مزے ہیں۔ اس لئے کہ ان پر بے بہا فضل و کرم ہو رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا مومنین صادقین کے ساتھ یہی تعلق ہوتا ہے کہ وہ ان کا اجر ضائع نہیں کرتا۔

سوال یہ ہے کہ زندگی کے خصائص میں سے وہ کون سا خاصہ ہے جو ان شہداء فی سبیل اللہ کو حاصل نہیں ہے؟ اور وہ کیا چیز ہے جو آنے والے مومنین سے ان کو ممتاز کرتی ہے اور یہ کہ ان کے اس انتقال کی وجہ سے پھر حسرت' فقدان اور وحشت اور افسوس کا کیا موقعہ ہے؟ یعنی پسماندگان کے لئے افسوس کا کیا موقع ہے کہ وہ افسوس کرتے ہیں۔ یہ تو نہایت خوشی کا موقعہ ہے۔ یہ تو رضامندی اور محبت کا موقعہ ہے کہ ایک شخص ہم سے جدا ہو کر اللہ کے ہاں پہنچ گیا۔ اور اس انتقال کے ساتھ ساتھ ہم سے ملحق بھی ہے۔

اگر موت فی سبیل اللہ ہے' تو وہ موت نہیں ہے اور خود مجاہدین کے اپنے شعور کے مطابق بھی وہ موت نہیں ہے۔ ان لوگوں کے لئے بھی موت نہیں ہے جو پیچھے رہ گئے ہیں بلکہ یہ زندگی کے میدان کی وسعت ہے۔ اس کے شعور کی وسعت ہے' اس کی صورتوں کی وسعت ہے۔ یہ حیات' شہید کی حیات' زندگی کی سرحدوں کے آگے چلی جاتی ہے۔ اسی طرح اس زندگی کے مظاہر بدل جاتے ہیں۔ یہ زندگی دنیا کی تنگ دامانی سے نکل کر ایک وسیع میدان میں داخل ہو جاتی ہے۔ اس کے سامنے وہ پردے اور رکاوٹیں نہیں ہوتیں جو ہمارے ذہن میں ہوتے ہیں۔ گویا زندگی اپنی ایک شکل و صورت سے منتقل ہو کر دوسری شکل و صورت میں داخل ہو جاتی ہے۔ ایک زندگی ختم ہوتی اور دوسری شروع ہوتی ہے۔

اس آیت نے زندگی کو جو نیا مفہوم دیا ہے' یا قرآن کریم کی اس جیسی دوسری آیات شہداء کی زندگی کو جو مفہ م عطا کرتی ہیں' اس کے اثرات یہ ہوئے کہ مجاہدین کرام کے قدم طلب شہادت میں ہر وقت رواں دواں رہے۔ اور ان کی ایک مثال وہ نمونے ہیں جو ہم نے جنگ احد کے بیان کے آغاز میں دیئے ہیں۔

اس حقیقت اور عظیم حقیقت کے بیان کے بعد کہ اہل ایمان کے لئے جو کچھ اللہ کے ہاں تیار کیا ہوا ہے' اس پر شہداء خوشیاں منا رہے ہیں' تو اللہ تعالیٰ یہاں وضاحت فرماتے ہیں کہ وہ اہل ایمان ہیں' کون ہیں اور ان کا ان کے رب کے ساتھ کیا تعلق ہے؟

اَلَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ مِنْۢ بَعْدِ مَآ اَصَابَهُمُ الْقَرْحُ ۛؕ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا مِنْهُمْ وَ اتَّقَوْا اَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۷۲﴾ اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا ۖۗ وَّ قَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَ نِعْمَ الْوَكِيْلُ ﴿۱۷۳﴾ فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ فَضْلٍ لَّمْ يَمْسَسْهُمْ سُوْٓءٌ ۙ وَّ اتَّبَعُوْا رِضْوَانَ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَظِيْمٍ

''وہ لوگ جنہوں نے زخم کھانے کے بعد بھی اللہ اور رسول کی پکار پر لبیک کہا ان میں جو اشخاص نیکو کار ہیں اور پرہیزگار ہیں ان کے لئے بڑا اجر ہے۔ جن سے لوگوں نے کہا کہ ''تمہارے خلاف بڑی فوجیں جمع ہوئی ہیں' ان سے ڈرو' تو یہ سن کر ان کا ایمان اور بڑھ گیا اور انہوں نے جواب دیا کہ ''ہمارے لئے اللہ کافی ہے اور وہی بہترین کارساز ہے۔'' آخر وہ اللہ تعالیٰ کی نعمت اور فضل کے ساتھ پلٹ آئے' ان کو کسی قسم کا ضرر نہ پہنچا اور اللہ کی رضا پر چلنے کا شرف ان کو حاصل ہو گیا۔ اللہ بڑا فضل فرمانے والا ہے۔''

یہ وہ لوگ تھے جنہیں جنگ احد کی دوسری صبح رسول خدا ﷺ نے پکارا نکلو کہ ابھی یہ تلخ معرکہ ختم نہیں ہے اور ان کی حالت یہ تھی کہ ان کے زخموں سے ابھی تک خون جاری تھا۔ اور وہ کل ہی جان لڑا کر موت کے منہ سے نکلے تھے۔ اور ابھی تک انہوں نے کل کے معرکہ کی ہولناکیوں کو بھولا نہ تھا۔ ہزیمت کی تلخی ان کے منہ میں باقی تھی' درد کی شدت میں ابھی تک کمی نہ آئی تھی۔ مزید یہ کہ انہوں نے اعزہ و اقارب کی قیمتی جانوں کا نذرانہ کل ہی تو پیش کیا تھا اور سب سے بڑی بات یہ کہ ان کی اکثریت بری طرح سے زخمی تھی۔

رسول خدا نے انہیں پکارا تھا اور صرف انہیں پکارا تھا اور یہ دعوت اور اس کے نتیجے میں لوگوں کی طرف سے لبیک کہنا' ایک ایسا فعل تھا جس کے اندر گہرے اشارات پائے جاتے ہیں۔ اور یہ بڑے حقائق پر مشتمل ہے۔ اور اس میں گہری حکمت پوشیدہ تھی۔

ممکن ہے رسول خدا یہ چاہتے ہوں کہ اس معرکے میں اہل ایمان کی آخری بات اور ان کا آخری شعور یہ نہ ہو کہ انہیں ہزیمت ہوئی ہے۔ اور وہ شکست کھا چکے ہیں اور اس زخموں کی حالت میں کراہ رہے ہیں۔ اس لئے رسول خدا نے انہیں حکم دیا کہ کپڑے جھاڑیں اور قریش کا تعاقب کریں۔ ان کا پیچھا کریں تاکہ ان کے ذہن میں یہ بیٹھ جائے کہ یہ تو ایک ابتلا تھی' ایک تجربہ تھا اور یہ اس معرکے کا کوئی آخری فیصلہ نہ تھا۔ اور اس کے بعد بھی مسلمانوں کی قوت اپنی جگہ موجود ہے۔ اور یہ کہ دشمن ابھی تک ضعیف ہیں۔ یہ تو ایک بار تھی جس میں اچانک شکست ہو گئی۔ اور ہم اس کا بدلہ لیں گے۔ اگر ہم نے کمزوری اور بے اتفاقی کو دور کر دیا اور اللہ اور رسول کے حکم کو تسلیم کیا۔

یہ بھی ممکن تھا کہ حضور قریش کے ذہنوں سے یہ بات نکالنا چاہتے ہوں کہ وہ فتح کے پھریرے اڑاتے ہوئے مکہ میں داخل ہو رہے ہیں۔ اس لئے آپ نے اس معرکے میں شریک ہونے والوں کی معیت میں ان کا تعاقب کیا۔ اور اس سے قریش کو یہ جتلانا مقصود تھا کہ انہوں نے ابھی تک مسلمانوں کی قوت کو توڑا نہیں ہے۔ اور یہ کہ ابھی تک ان میں تعاقب یا دوسری جنگ کی قوت باقی ہے۔ جس طرح سیرت کی روایات میں آتا ہے اس تعاقب سے یہ دونوں مقاصد پورے ہو گئے۔

شاید حضور اکرم مسلمانوں اور پوری دنیا کو یہ احساس دلانا چاہتے تھے کہ اس دنیا میں ایک نئی حقیقت کا ظہور ہو چکا ہے اور وہ نئی حقیقت جو اپنے ظہور کے بعد اب قائم بھی ہو چکی ہے وہ یہ ہے کہ اس نئی تحریک کا اصل سرمایہ اس کا عقیدہ ہے۔ یہی اس کا نصب العین ہے اور اس کے سوا اس کا کوئی مقصد حیات نہیں ہے اور اس کے سوا اس کو زندگی میں کوئی اور ترجیح نہیں ہے۔ مسلمان اس نظریہ حیات ہی کے لئے زندہ ہیں' اس لئے اس نظریۂ حیات کے بعد ان کے نفوس کی کوئی اور تمنا نہیں ہے۔ اور وہ اس کے لئے اپنا سب کچھ قربان کرنے کے لئے تیار ہیں۔

اس وقت اس کرۂ ارض پر یہ ایک بالکل نئی بات تھی۔ لہٰذا یہ بات ضروری تھی کہ پوری دنیا کو معلوم ہو جائے اور خود مسلمانوں کو بھی اس کا شعور ہو جائے' کہ یہ جدید نظریہ اب قائم ہو چکا ہے اور اب یہ اس کرۂ ارض پر ایک انمٹ حقیقت ہے۔ اور اس حقیقت کا اس سے بڑا اظہار نہ ہو سکتا تھا کہ احد میں اس قدر گہرے زخم کھانے کے بعد فدایان اسلام اپنے رستے زخموں کے ساتھ ایک غالب قوت

کے تعاقب میں نکل کھڑے ہوں۔ ان کی جانب سے یہ اقدام ایک واضح' روشن اور بالکل ایک خوفناک اقدام تھا۔ اس میں توکل علی اللہ کی روشن مثال پائی جاتی تھی۔ اور لوگ ان جانبازوں کو جو ڈرا رہے تھے کہ قریش پھر جمع ہو رہے ہیں' جس طرح ابوسفیان کے نمائندوں نے انہیں یہ بات پہنچائی تھی اور منافقین نے بھی قریش کے اس منصوبے کو خوفناک انداز میں پیش کیا کہ وہ ایسا کرنے والے ہیں۔

اَلَّذِیْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ مِنْۢ بَعْدِ مَاۤ اَصَابَهُمُ الْقَرْحُ ۛؕ لِلَّذِیْنَ اَحْسَنُوْا مِنْهُمْ وَ اتَّقَوْا اَجْرٌ عَظِیْمٌۚ .... "جن سے لوگوں نے کہا کہ تمہارے خلاف بڑی فوجیں جمع ہوئی ہیں ان سے ڈرو' تو یہ سن کر ان کا ایمان اور بڑھ گیا۔ اور انہوں نے جواب دیا' ہمارے لئے اللہ کافی ہے اور وہی بہتر کارساز ہے۔"

اس خوفناک صورت حال میں یہ تعاقب دراصل یہ اعلان تھا کہ اس کرۂ ارض پر اب انقلاب اور یہ عظیم انقلاب اب حقیقت بن چکا ہے۔ غرض یہ تھے وہ بعض پہلو جو حضور ﷺ کے اس حکیمانہ اقدام سے واضح طور پر نظر آتے ہیں۔ سیرت کی بعض روایات سے ان لوگوں کے حالات کا پتہ چلتا ہے جنہوں نے زخموں کے اندر چکنا چور ہونے کے باوجود حضور کی کال پر لبیک کہا۔

○.....☆☆☆.....○

محمد ابن اسحاق نے عبداللہ ابن خارجہ' ابو السائب سے روایت کی ہے کہ حضور ﷺ کے ساتھیوں میں سے ایک صاحب جو بنو عبدالاشہل سے تعلق رکھتے تھے' وہ احد میں شریک تھے۔ اس نے بیان کیا کہ ہم رسول خدا کے ساتھ احد میں شریک ہوئے تھے۔ میں تھا' میرا بھائی تھا' ہم لوٹے اور دونوں زخمی تھے۔ رسول خدا ﷺ کے موذن نے اعلان کیا کہ نکلو' دشمن کا تعاقب کرنا ہے۔ میں نے اپنے بھائی سے کہا یا بھائی نے مجھ سے کہا کہ کیا اب ہم سے رسول خدا ﷺ کی یہ جنگ رہ جائے گی۔ ہمارے پاس کوئی سواری نہیں ہے اور ہم دونوں شدید زخمی بھی ہیں۔ ہم دونوں رسول خدا ﷺ کے ساتھ نکل پڑے۔ میرا زخم بھائی سے ذرا کم تھا۔ جب اس کی طبیعت خراب ہوتی تو میں اسے پیچھے سے تھامتا' یہاں تک کہ ہم مسلمانوں کے ساتھ منزل مقصود تک پہنچ گئے۔

محمد بن اسحاق کہتے ہیں کہ احد کی جنگ بروز ہفتہ ۱۵ شوال کو ہوئی تھی۔ دوسرے دن ۱۶ شوال کو حضور ﷺ کے موذن نے اذان دی۔ اور حکم دیا کہ دشمن کا تعاقب کرنا ہے۔ اور موذن نے یہ اعلان بھی کیا کہ ہمارے ساتھ صرف وہ لوگ جائیں جو کل کے معرکے میں شریک ہوئے تھے۔ آپ کے ساتھی جابر ابن عبداللہ ابن عمرو ابن حرام نے کہا کہ میرے باپ نے مجھے اپنی بہنوں کی نگرانی کے لئے چھوڑ دیا تھا۔ میری سات بہنیں تھیں۔ میرے باپ نے مجھے کہا کہ "برخوردار نہ یہ میرے لئے مناسب ہے اور نہ آپ کے لئے مناسب ہے کہ آپ ان سات عورتوں کو چھوڑ کر جہاد کے لئے نکلیں۔" اور میرے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ میں رسول خدا ﷺ کے ساتھ جہاد کا شرف تمہیں دے دوں۔ اس لئے تم بہنوں کے پاس رہو۔ صرف ان کو حضور ﷺ نے اجازت دے دی اور وہ آپ کے ساتھ نکلے۔

جب اس عظیم حقیقت کا اعلان ہوا' تو اس قسم کے عظیم اور بے مثال واقعات ظہور پذیر ہوئے۔ لوگوں کی ذہنی دنیا میں انقلاب آیا۔ ایسے تربیت یافتہ نفوس قدسیہ تیار ہوئے جو صرف اللہ کو اپنا وکیل و مددگار سمجھتے تھے۔ وہ صرف ذات باری پر راضی تھے' ذات باری ہی کو کافی سمجھتے تھے۔ وہ ذات باری ہی کو یاد کرتے تھے اور جب سخت سے سخت حالات پیش آتے تو ان کا ایمان اور پختہ ہو جاتا اور جب لوگ انہیں مشکلات سے ڈراتے تو ان کا جواب یہ ہوتا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِیْلُ "ہمارے لئے اللہ کافی ہے اور وہی بہترین کارساز ہے۔"

اور پھر انجام کیا ہو گا؟ وہی جو اللہ نے متوکلین کے لئے لکھ دیا ہے جو اللہ کے لئے خالص ہو جاتے ہیں اور جن کے لئے بس اللہ ہی کافی ہوتا ہے۔

فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ فَضْلٍ لَّمْ يَمْسَسْهُمْ سُوْٓءٌ ۙ وَّ اتَّبَعُوْا رِضْوَانَ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَظِيْمٍ

"آخر کار وہ اللہ تعالیٰ کی نعمت اور فضل کے ساتھ پلٹ آئے' ان کو کسی قسم کا ضرر بھی نہ پہنچا اور اللہ کی رضا پر چلنے کا شرف بھی انہیں حاصل ہو گیا' اللہ بڑا فضل فرمانے والا ہے۔"

وہ مشکلات سے بچ کر بغیر کسی تکلیف کے واپس ہو گئے۔ اللہ کی رضامندی کے ساتھ واپس ہوئے اور کامیابی اور خوشی سے واپس ہوئے۔ بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ فَضْلٍ .... "اللہ کی نعمت اور فضل کے ساتھ۔" اللہ تعالیٰ یہاں پھر ان کی توجہ جود اور بخشش کے سبب اول کی طرف مبذول کراتے ہیں' کہ سبب اول اللہ کی نعمت اور اس کا فضل ہوا کرتا ہے۔ اور اس میں یہ اشارہ بھی مقصود ہے کہ صحابہ کرام کا موقف قابل تعریف تھا۔ کیونکہ ان کا موقف یہ تھا کہ وہ صرف اللہ کا فضل اور اس کی نعمت کی تلاش میں تھے۔ تمام نعمتوں کا سرچشمہ یہی ہے کہ اللہ کا فضل ہو جائے اور ان کا موقف بھی ایسا تھا جہاں فضل خداوندی کی بارش تھی۔ وَ اللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَظِيْمٍ .... "اور اللہ فضل عظیم کا مالک ہے۔" اس طرح' اللہ اپنی ابدی کتاب میں یہ ثبت کر دیتے ہیں اور اپنے کلام میں ان کی یہ تصویر کھینچتے ہیں' ان کا یہ موقف پیش فرماتے ہیں اور اللہ کا کلام وہ کلام ہے جس کے ساتھ یہ پوری کائنات ہم آہنگ ہے۔ غرض ان کا موقف نہایت ہی شریفانہ ہے اور ان کی یہ تصویر بھی نہایت ہی خوبصورت ہے۔

جب انسان ان کے اس موقف اور ان کے اس نظارے پر غور کرتا ہے تو اسے احساس ہو جاتا ہے کہ صرف ایک ہی رات میں ان لوگوں کا نقطہ نظر یکسر بدل گیا ہے' وہ پختہ کار ہو گئے' باہم متناسق ہو گئے' وہ جہاں کھڑے تھے وہاں مطمئن ہو کر جم گئے۔ ان کے خیالات سے تمام دھند اور میل دور ہو گئی اور ان کی صورت حال بالکل نئی ہو گئی۔ کل ان کے تصورات میں اور ان کی صفوں کے اندر جو خلجان اور جو تذبذب پایا جاتا تھا' آج اس کا نام و نشان نہیں ہے۔ صرف ایک رات ہی گزری تھی کہ ان کے موقف میں زمین و آسمان کا فرق ہو گیا۔ عظیم فرق اور میلوں کی مسافت ایک لحظہ میں طے ہو گئی۔ اس تلخ تجربے نے ان کے نفوس کے اندر اپنا کام کر دکھایا۔ اس حادثہ نے انہیں خوب جھنجھوڑا جس کی وجہ سے ان کے تصورات سے ہر قسم کے غبار چھٹ گئے' ان کے دل از سر نو جاگ اٹھے' ان کے قدم جم گئے اور ان کے دل از سر نو عزم صمیم سے مالا مال ہو گئے۔ بالکل درست ہے یہ کہنا کہ اس ابتلا میں بھی اللہ کا عظیم فضل پوشیدہ تھا۔

اس پیراگراف کے آخر میں اس وقت کے موجودہ جزع و فزع اور خوف و ہراس کی علت بھی بتا دی گئی۔ بتایا گیا کہ یہ تو شیطان ہے جو اپنے دوستوں کا ڈر اور رعب تمہارے دلوں میں بٹھاتا ہے۔ وہ اپنے دوستوں کو رعب و دبدبہ کے لباس میں پیش کرتا ہے۔ اس لئے اہل ایمان کو شیطان کی اس چال سے خوب خبردار رہنا چاہئے۔ اور اس کے اس مکر کو بے اثر بنانے کی تدابیر اختیار کرنی چاہئیں۔ اس لئے وہ اہل قریش سے نہ ڈریں کیونکہ وہ اس وقت شیطان کے ساتھی ہیں۔ وہ شیطان سے دوستوں سے خائف ہونے کے بجائے اللہ سے ڈریں کیونکہ صرف وہی قوی قادر مطلق اور جبار ہے اور وہی اس بات کا مستحق کہ اس سے خوف کیا جائے۔

"اب تمہیں معلوم ہو گیا کہ وہ دراصل شیطان تھا' جو اپنے دوستوں سے خواہ مخواہ ڈرا رہا تھا للذا آئندہ تم انسانوں سے نہ ڈرنا' مجھ سے ڈرنا اگر تم حقیقت میں ایمان لانے والے ہو۔"

شیطان اپنے دوستوں کو بہت بڑا کر کے اور پھولا کر پیش کرتا ہے۔ وہ انہیں ایسے لباس میں پیش کرتا ہے جس میں وہ قوی اور طاقتور نظر آئیں۔ وہ دلوں میں یہ رعب بٹھاتا ہے کہ شیطان کے ساتھی سب کچھ اپنے حق میں پھیر سکتے ہیں اور ان کے ہاتھ لمبے ہیں۔ وہ نفع بھی دے سکتے ہیں اور ضرر بھی دے سکتے ہیں تاکہ شیطان اس ذریعہ سے اپنی ضروریات اور اغراض پوری کرتا رہے۔ اور ان دوستوں کے ذریعہ دنیا

میں شر اور فساد پھیلائے۔ اور لوگوں کو اپنے دوستوں کے سامنے اس قدر جھکا دے کہ وہ ان کی اطاعت غیر مشروط طور پر کریں۔ کوئی ان کے سامنے کسی بات کا انکار نہ کر سکے۔ کوئی شخص ان پر تنقید نہ کر سکے اور ان کو شر و فساد سے روکنے کی جرأت ہی نہ کر سکے۔

شیطان کی پالیسی یہ ہوتی ہے کہ باطل کو خوب پھلا کر اور موٹا کر کے پیش کرے۔ اس طرح کہ وہ قوی' صاحب قدرت' قہار اور جبار اور سخت گرفت کا مالک نظر آئے۔ اس کی کوئی اپوزیشن نہ ہو۔ اس کا مقابلہ کرنے والا کوئی نہ ہو اور کوئی قوت ایسی نہ ہو جو اس پر غالب آ سکتی ہو۔ شیطان کی مصلحت یہ ہے کہ وہ صورت حال کو اس طرح قائم رکھے۔ خوف اور رعب کے پردے میں اور تخویف اور پکڑ کی فضا میں شیطان کے دوست دنیا میں سب کارروائیاں کرتے ہیں۔ وہ معروف کو منکر بناتے ہیں اور منکر کو معروف بناتے ہیں۔ شر' فساد اور گمراہی پھیلاتے ہیں۔ سچائی' ہدایت اور عدل کی آواز کو دھیما کرتے ہیں' بغیر اس کے کہ کوئی ان کو چیلنج کرے یا ان کے سامنے کھڑا ہو' یا قیادت کے مقام سے انہیں ہٹا سکے۔ غرض وہ جس باطل کی ترویج کرتے ہیں ان پر تنقید کی جرأت ہی اہل حق کو نہ ہو اور جس حق کو وہ مٹانا چاہتے اس کی وضاحت کرنے اور اسے غالب کرنے کی بھی کسی کو جرات نہ ہو سکے۔

شیطان سخت مکار' دغاباز اور غدار ہے۔ وہ اپنے دوستوں کے لباس میں آتا ہے۔ اور جو لوگ شیطانی وساوس کے مقابلے میں احتیاط نہیں کرتے' وہ ان دوستوں سے انہیں خوب ڈراتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ یہاں اسے خوب ننگا کرتے ہیں۔ اور وہ یوں ننگا ہو جاتا ہے کہ اس کے جسم پر اس کے مکر و فریب کا کوئی لباس ہی نہیں رہتا۔ اہل ایمان شیطان کی حقیقت کو اچھی طرح جان لیتے ہیں۔ اس کے وسوسوں اور اس کے مکر و فریب کی حقیقت کو پا لیتے ہیں تاکہ وہ اس سے محتاط ہو جائیں۔ اس کے دوستوں سے نہ ڈریں اور نہ ان سے خائف ہوں۔ جو مومن ذات باری پر مکمل بھروسہ کئے ہوئے ہے۔ اس کے مقابلے میں شیطان بہت ہی کمزور ہوتا ہے اس لئے کہ اس کی قوت کا سرچشمہ اللہ ہوتا ہے۔ وہ واحد قوت جس سے کسی انسان کو ڈرنا چاہئے وہ صرف وہی قوت ہوتی ہے جو نفع اور نقصان پہنچانے پر قادر ہو اور نفع اور نقصان دینے والی قوت صرف اللہ کی قوت ہے۔ اور ایک مومن صرف اللہ سے ڈرنے والا ہوتا ہے۔ اور جب تمام اہل ایمان صرف اللہ سے ڈرنے والے بن جائیں تو وہ سب قوتوں کے مقابلے میں قوی تر ہو جاتے ہیں۔ پھر ان کے مقابلے میں دنیا کی کوئی قوت ٹھہر نہیں سکتی۔ نہ شیطانی قوت اور نہ شیطان کے دوستوں کی قوت فَلَا تَخَافُوهُمْ وَخَافُونِ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ .... "پس تم ان سے نہ ڈرو اور مجھ ہی سے ڈرو' اگر تم مومن ہو۔"

○.....☆☆☆.....○

اب اس سلسلے میں آخری نتیجہ اور آخری نچوڑ پیش کیا جاتا ہے۔ روئے سخن حضور اکرم ﷺ کی طرف کر کے بطور تسلی اور دلجوئی کہا جاتا ہے کہ آپ پریشان نہ ہوں' اور آپ اس بات کا غم نہ کھائیں کہ یہ اہل کفر' کفر و الحاد کی جانب بہت تیزی سے جا رہے ہیں۔ اور وہ اس کفر میں اس قدر تیز ہیں کہ گویا وہ کسی دوڑ کے مقابلے میں ہیں' کہا جاتا ہے کہ ذرا ان کی اس حرکت پر غور کرو کہ اس سے اللہ تعالیٰ کو نقصان کیا ہے؟ یہ تو خود ان کے لئے ایک مصیبت ہوگی۔ اللہ تعالیٰ نے یہ مصیبت ان کی قسمت میں لکھ دی ہے۔ اللہ تعالیٰ کو اچھی طرح علم تھا کہ وہ کیا کریں گے اور کیا کیا کفر کرنے والے ہیں؟ اس لئے اس سے پہلے ہی یہ فیصلہ کر دیا کہ اچھا تم آخرت میں محروم ہو گے۔ اس لئے انہیں اس نے ان کے حال ہی پر چھوڑ دیا اور وہ ہدف کفر ہی کی طرف بڑی مسارعت سے بڑھتے رہے۔ ان کے سامنے راہ ہدایت بھی واضح تھی' لیکن انہوں نے اپنے اختیار' تمیزی کو استعمال کرتے ہوئے کفر کی راہ کو اپنایا۔ اس لئے انہیں ان کے حال ہی پر چھوڑ دیا گیا۔ اور ان کو مزید مہلت دی گئی کہ وہ خوب گناہ سمیٹ لیں زیادہ سے زیادہ۔ یہ مہلت ان کو وقت کے لحاظ سے بھی دی گئی اور خوشحالی کی صورت میں بھی دی گئی۔ لہٰذا یہ مہلت اور یہ خوشحالی ان کے لئے گویا بطور انجام کار ایک وبال اور مصیبت ہے۔ یہ حصہ آیات اس پر ختم ہوتا ہے کہ ان تمام

واقعات کی پشت پر کیا حکمت تھی؟ یہ کہ مومنین کو کیوں ابتلا میں ڈالا گیا' اہل کفر کو کیوں اس قدر مہلت دی جا رہی ہے۔ یہ اس لئے کہ پاک لوگ گندے لوگوں سے الگ چھٹ کر رہ جائیں۔ اور یہ پاکیزگی اور تطہیر کامل آزمائش اور ابتلا ہی کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اس لئے کہ رسول کی بات کو بذریعہ آزمائش ہی معلوم ہو سکتی ہے۔ وہ تو غیب ہے اور غیب کا علم صرف اللہ کو ہوتا ہے۔ لوگوں کو اس کا پتہ نہیں ہوتا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے یہ مناسب سمجھا کہ ایک مناسب طریقہ کار کے مطابق غیب کا اظہار اہل ایمان پر ہو جائے' اہل ایمان کو دلوں کا حال معلوم ہو جائے' پاک لوگ گندے عناصر سے الگ ہو جائیں ہیں اور اللہ پر ایمان لانے والے' قطعی اور یقینی طور پر میدان میں آجائیں۔

وَلَا يَحْزُنْكَ الَّذِينَ يُسَارِعُونَ فِي الْكُفْرِ ۚ إِنَّهُمْ لَنْ يَضُرُّوا اللَّهَ شَيْئًا ۗ يُرِيدُ اللَّهُ أَلَّا يَجْعَلَ لَهُمْ حَظًّا فِي الْآخِرَةِ ۖ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿١٧٦﴾ إِنَّ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الْكُفْرَ بِالْإِيمَانِ لَنْ يَضُرُّوا اللَّهَ شَيْئًا ۖ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿١٧٧﴾ وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا أَنَّمَا نُمْلِي لَهُمْ خَيْرٌ لِأَنْفُسِهِمْ ۚ إِنَّمَا نُمْلِي لَهُمْ لِيَزْدَادُوا إِثْمًا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُهِينٌ ﴿١٧٨﴾ مَا كَانَ اللَّهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِينَ عَلَىٰ مَا أَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتَّىٰ يَمِيزَ الْخَبِيثَ مِنَ الطَّيِّبِ ۗ وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ يَجْتَبِي مِنْ رُسُلِهِ مَنْ يَشَاءُ ۖ فَآمِنُوا بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ ۚ وَإِنْ تُؤْمِنُوا وَتَتَّقُوا فَلَكُمْ أَجْرٌ عَظِيمٌ ﴿١٧٩﴾

(اے پیغمبر) جو لوگ آج کفر کی راہ میں بڑی دوڑ دھوپ کر رہے ہیں ان کی سرگرمیاں تمہیں آزردہ نہ کریں' یہ اللہ کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکیں گے۔ اللہ کا ارادہ یہ ہے کہ ان کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہ رکھے' اور بالآخر ان کو سخت سزا ملنے والی ہے۔ جو لوگ ایمان کو چھوڑ کر کفر کے خریدار بنے ہیں وہ یقیناً اللہ کا کوئی نقصان نہیں کر رہے ہیں' ان کے لئے دردناک عذاب تیار ہے۔ یہ ڈھیل جو ہم انہیں دیئے جاتے ہیں اس کو یہ کافر اپنے حق میں بہتری نہ سمجھیں' ہم تو انہیں اس لئے ڈھیل دے رہے ہیں کہ یہ خوب بار گناہ سمیٹ لیں' پھر ان کے لئے سخت ذلیل کرنے والی سزا ہے۔

اللہ مومنوں کو اس حالت میں ہرگز نہ رہنے دے گا جس میں تم لوگ اس وقت پائے جاتے ہو۔ وہ پاک لوگوں کو ناپاک لوگوں سے الگ کر کے رہے گا۔ مگر اللہ کا یہ طریقہ نہیں ہے کہ تم لوگوں کو غیب پر مطلع کر دے۔ (غیب کی باتیں بتانے کے لئے تو) اللہ اپنے رسولوں میں سے جس کو چاہتا ہے منتخب کر لیتا ہے۔ لہٰذا (امور غیب کے بارے میں) اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان رکھو۔ اگر تم ایمان اور خدا ترسی کی روش پر چلو گے تو تم کو بڑا اجر ملے گا۔"

غزوۂ احد کے واقعات کا یہ بہترین اختتامیہ ہے۔ اس لئے کہ اس غزوہ میں مسلمانوں پر مصائب کے پہاڑ ٹوٹے تھے اور اس جنگ

میں کفار کو فتح اور غلبہ نصیب ہوا تھا۔ حق و باطل کی کشمکش میں ہمیشہ یہ شبہ پیدا ہو جاتا ہے اور اہل حق کے دلوں میں یہ بات ہمیشہ کھٹکتی ہے یا بعض اوقات کامیابی کی خواہش دلوں میں ابھرتی رہتی ہے کہ حق و باطل کی کشمکش میں حق کو کامیاب ہی ہونا چاہئے اور اگر کسی جگہ حق کو شکست ہو جس طرح احد میں اور کفر و باطل کو فتح و ظفر نصیب ہو تو یہ کیوں ہوتی ہے؟

یہ جھوٹا شبہ ہوتا ہے اور ہمیشہ دلوں میں اٹھتا رہتا ہے۔ اور انسان کی خواہش کامیابی اسے مسلسل دبا رہی ہوتی ہے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے اے رب! حق کو شکست اور باطل کو فتح کیوں ہوتی ہے؟ اہل حق مصائب میں مبتلا ہو رہے ہیں اور اہل باطل نجات پا رہے ہیں اور کامیاب ہو رہے ہیں اور اس طرح کیوں نہیں ہوتا کہ جب بھی حق و باطل کی باہم کشمکش ہو تو حق کو فتح نصیب ہو اور وہ غلبہ اور غنیمت لے کر واپس ہو؟ کیا حق اور سچائی اس بات کی مستحق نہیں ہے کہ اسے فتح نصیب ہو اور باطل کے لئے یہ قوت اور یہ رعب کیوں ہے کہ حق کے ساتھ ٹکراؤ میں اسے ایسی کامیابیاں ہوتی ہیں جس سے اہل حق کے دلوں میں فتنے پیدا ہوتے ہیں اور ان کے دل متزلزل ہو جاتے ہیں۔

اور یہ سوالات عملاً اس وقت سامنے آئے جب احد کے دن اہل ایمان نے نہایت ہی تعجب اور سراسیمگی میں یہ سوال کیا کہ **اَنّٰى هٰذَا؟** .... "یہ کیسے ہو گیا"..... لہٰذا اس آخری اختتامیہ میں اس کا آخری جواب دیا جاتا ہے۔ آخری اور فیصلہ کن بات کر دی جاتی ہے اور یوں اللہ تعالیٰ پریشان دلوں کو سکون فراہم فرما دیتے ہیں اور اس پہلو سے جو بڑا وسوسہ بھی دلوں کے اندر راہ پاتا ہے' اسے صاف کر دیا جاتا ہے۔ اللہ کی سنت کا بیان ہوتا ہے۔ اللہ کی سنت کے تحت اس کی تقدیروں کا بیان ہوتا ہے اور پھر ان تمام سنن اور تقدیروں کے پیچھے جو اس کی وسیع تر تدبیر اور حکمت کار فرما ہوتی ہے' وہ بھی بتا دی جاتی ہے اور یہ حکمت کل بھی تھی' آج بھی ہے اور کل بھی ہوگی۔ اور ہر اس جگہ ہوگی جہاں حق و باطل کی کشمکش ہو اور احد جیسے نتائج نکلیں۔

دنیا کے کسی معرکے سے باطل کا فتح مندی کے ساتھ نکل کر چلا جانا اور ایک وقت کے لئے اس کا پھول جانا اور طاقتور نظر آنا اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ بس اللہ تعالیٰ نے اسے کھلی چھٹی دے دی ہے۔ یا یہ کہ وہ اس قدر طاقتور ہو گیا ہے کہ اس پر اب غلبہ نہیں پایا جا سکے گا یا یہ کہ باطل ہمیشہ کے لئے حق کے لئے مضر ہی رہے گا۔ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔

اسی طرح کسی معرکے میں سچائی کا شکست اور مصائب میں مبتلا ہو کر نکلنا یا سچائی کا کسی دور میں ضعف کا شکار ہو جانا' اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ کوئی ناانصافی فرما رہے ہیں یا اللہ نے حق کو بھلا دیا یا اس نے باطل کو آزاد چھوڑ دیا کہ وہ سچائی کو بیخ و بن سے اکھاڑ کر تباہ کر دے۔

یوں ہرگز نہیں ہو سکتا۔ یہ تو اللہ کی گہری حکمت اور تدبیر ہوتی ہے جو ہر جگہ پر اپنا کام کر رہی ہوتی ہے۔ کبھی حکمت کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ باطل کو مہلت دی جائے اور وہ اپنی آخری سرحد تک پہنچ جائیں۔ وہ اپنے تمام برے نتائج ظاہر کریں' وہ لوگوں پر ناقابل برداشت بوجھ ڈال دیں اور آخر کار وہ اس بات کے مستحق ہو جائیں کہ ان پر سخت سے سخت حملہ کیا جائے اور پھر حق کو آزمائش میں اس لئے ڈالا جاتا ہے کہ حق و باطل کے درمیان فرق ہو جائے۔ طیب اور خبیث کے اندر امتیاز ہو جائے' اور ان آزمائشوں میں جو لوگ ثابت قدم رہیں انہیں عظیم اجر ملے اور وہ ممتاز مقام کے مستحق ہو جائیں۔ اپنی حقیقت کے اعتبار سے یہ صورت حال سچائی کے لئے کمائی ہے اور باطل کے لئے خسارہ ہے۔ ادھر یہ کمائی زیادہ سے زیادہ ہو رہی ہو تو ادھر خسارہ زیادہ سے زیادہ ہو رہا ہے۔

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ خَيْرٌ لِّاَنْفُسِهِمْ ۭ اِنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ لِيَزْدَادُوْٓا اِثْمًا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ

"اے پیغمبر جو لوگ کفر کی راہ میں بڑی دوڑ دھوپ کر رہے ہیں ان کی سرگرمیاں تمہیں آزردہ نہ کریں۔ یہ اللہ کا کچھ بھی بگاڑ نہ سکیں گے۔ اللہ کا ارادہ یہ ہے کہ ان کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہ رکھے' اور بالآخر ان کو سخت سزا ملنے والی ہے۔"

یہ نبیؐ کے لئے تسلی ہے' اس کے ذریعہ آپ کے غبار خاطر کو دور کیا جارہا ہے جو آپ کے دل پر ان واقعات کی وجہ سے تھا۔ آپ اس سے بے حد دلگیر تھے کہ جو لوگ کفر میں غلو کر رہے ہیں وہ کفر میں سرپٹ بھاگے جارہے ہیں۔ وہ نہایت سرعت کے ساتھ آگے بڑھ رہے ہیں۔ گویا ان کے لئے کوئی ہدف مقرر ہے اور انہوں نے اسے حاصل کرنا ہے۔

یہ ایسے الفاظ ہیں اور ایسی تعبیر ہے' جن کے ذریعہ ان کی حقیقی نفسیاتی حالت کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ اکثر اوقات نظر آتا ہے کہ بعض لوگ کفر میں سخت متشدد ہوتے ہیں۔ وہ باطل' شر اور اللہ کی نافرمانی کو اپنا نصب العین بنا لیتے ہیں۔ اس طرح کہ گویا انہوں نے اس کے مقابلے میں گول تک پہنچنا ہے۔ اس لئے ایسے لوگ نہایت قوت' نہایت جرأت اور نہایت ہی تیزی سے آگے بڑھتے ہیں' بعض اوقات یوں محسوس ہوتا ہے کہ شاید پیچھے سے انہیں کوئی دھکیل رہا ہے کہ آگے بڑھو یا آگے سے کوئی انہیں پکار رہا ہے کہ جلدی پہنچو یہ ہے تمہارا انعام۔

آپ کا یہ غبار خاطر اور رنج و غم اللہ کی اس مخلوق کے لئے تھا۔ آپ حسرت سے انہیں دیکھتے تھے کہ یہ لوگ آستیں چڑھائے آگ کی طرف تیزی سے گامزن ہیں اور آپ وہ قوت نہیں پا رہے کہ انہیں بزور بازو روک دیں۔ یہ لوگ خدا کی طرف سے بار بار کے ڈراوے کی طرف بھی کان نہیں دھرتے۔ پھر آپ اس سے بھی پریشان ہوتے کہ یہ لوگ جو آستیں چڑھائے جہنم کی طرف سرپٹ دوڑ رہے ہیں' وہ صرف اپنے آپ ہی کو مصیبت میں مبتلا نہیں کر رہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ وہ اہل اسلام کے لئے بھی رنج و الم اور درد دکھ کا باعث بن رہے ہیں۔ یہ لوگ دعوت اسلامی کو بھی دکھ دے رہے ہیں اور جمہور کے اندر اس کے پھیلاؤ کو بھی روک رہے ہیں۔ اس لئے کہ جمہور عرب یہ دیکھ رہے تھے کہ مدینہ اور مکہ کی معرکہ آرائی کا انجام کیا ہوتا ہے تاکہ وہ بھی اس صف میں شامل ہو جائیں جس کا مستقبل روشن ہو۔ جب قریش مسلمان ہو گئے اور انہوں نے سر تسلیم خم کر لیا تو تمام لوگ اللہ کے دین میں فوج در فوج داخل ہو گئے۔ اور اس بات میں شک نہیں کہ اس صورت حال کی وجہ سے رسول خدا ﷺ کے دل پر اثرات تھے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ کی جانب سے رسول خدا ﷺ کو مطمئن کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ آپ کو تسلی دی گئی اور آپ کے غبار خاطر کو دور کیا گیا۔

وَلَا يَحْزُنْكَ الَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ فِي الْكُفْرِ ۚ اِنَّهُمْ لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْـًٔا ۭ

"اے پیغمبر جو لوگ آج کفر کی راہ میں بڑی دوڑ دھوپ کر رہے ہیں ان کی سرگرمیاں تمہیں آزردہ نہ کریں۔ یہ اللہ کا کچھ بگاڑ نہ سکیں گے۔"..... یہ کمزور بندے اس جوگے نہیں ہو سکتے کہ وہ اللہ کو کوئی نقصان پہنچائیں۔ اور یہ بات محتاج بیان ہی نہیں ہے' اللہ تعالیٰ کی مرضی ہے کہ نظریاتی جنگ نظریاتی رہے اور مشرکین کے ساتھ معرکہ اپنی جگہ رہے۔ اور یہ خود اس کی جنگ اور اس کا معرکہ رہے۔ اس لئے رسولؐ خدا کے کندھوں سے اس ذمہ داری کو اٹھا لیا جاتا ہے۔ اسی طرح مسلمانوں کی بھی یہ ذمہ داری نہیں رہتی کہ وہ لوگوں کے نظریات تبدیل کرنے کے پابند ہوں۔ جو لوگ کفر کے اندر تیزی دکھا رہے ہیں وہ درحقیقت اللہ کے ساتھ جنگ لڑ رہے ہیں۔ اور اللہ کے ساتھ اس جنگ میں انہیں ہرگز کامیابی نہیں ہو سکتی' اس لئے کہ وہ اس ذات باری کے مقابلے میں بہت ہی ضعیف ہیں۔ لہٰذا وہ دعوت اسلامی کو مآل کار کوئی ضرر نہیں پہنچا سکتے۔ اور اس سے یہ نتیجہ خود بخود نکل آتا ہے کہ وہ ان حاملین دعوت اسلامی کو بھی نقصان نہیں پہنچا سکتے ہیں جنہیں وہ اس وقت شکست خوردہ سمجھتے ہیں۔ چاہے جس قدر بھی وہ سرعت دکھائیں اور جس قدر بھی وہ اہل دعوت کو اذیتیں دے دیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اللہ نے انہیں یہ کھلی چھٹی کیوں دے رکھی ہے کہ وہ کامیابی کے ساتھ آگے بڑھتے چلے جائیں اور اپنے

غلبہ کی وجہ سے پھولے نہ سمائیں۔ حالانکہ وہ اللہ کے براہ راست دشمن ہیں۔ اس لئے کہ اللہ نے ان کے لئے نہایت ہی برا اور نہایت ہی رسواکن انجام تیار کر رکھا ہے۔ يُرِيدُ اللَّهُ أَلَّا يَجْعَلَ لَهُمْ حَظًّا فِي الْآخِرَةِ .... "اللہ کا ارادہ یہ ہے کہ ان کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہ رکھے۔" اللہ یہ چاہتا ہے کہ وہ اپنا تمام سرمایہ یہاں ہی ختم کر دیں اور اپنے تمام گناہوں کو اٹھائے ہوئے ہوں اور آخرت میں تمام عذاب کے سزاوار ہو جائیں اور یہ کفر کی راہ میں تیزی سے آگے بڑھ کر اپنی آخری منزل تک پہنچ جائیں۔ اس لئے کہ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ .... "ان کے لئے بڑا عظیم عذاب ہے۔"

اور ان لوگوں کے لئے اللہ تعالیٰ نے اس شرمناک انجام کا ارادہ کیوں کر لیا ہے؟ اس لئے کہ انہوں نے خود اپنی مرضی سے ایمان کے بدلے کفر خرید کر اپنے آپ کو اس کا مستحق بنالیا ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الْكُفْرَ بِالْإِيمَانِ لَنْ يَضُرُّوا اللَّهَ شَيْئًا وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ

.... "جو لوگ ایمان چھوڑ کر کفر کے خریدار بنے ہیں وہ یقیناً اللہ کا کوئی نقصان نہیں کر رہے ہیں۔ ان کے لئے دردناک عذاب تیار ہے۔" ایمان تک ان کے ہاتھ پہنچ سکتے تھے۔ ایمان کے دلائل اس پوری کائنات میں بکھرے پڑے ہیں۔ خود انسانی فطرت اور نفس کے اندر دلائل الایمان موجود ہیں۔ خود انسان کے عجیب و غریب جسم کے منصوبے کے اندر' اس میں باہم مکمل ہم آہنگی کے اندر' اس میں ودیعت کردہ فطرت انسانی کے اندر' اور پھر انسانی فطرت اور اس کے اس طبیعی وجود میں پائی جانے والی ہم آہنگی کے اندر' پھر اس میں اس کے خالق اور صانع کے وجود کا فطری شعور ودیعت کئے جانے کے اندر اور پھر اس شعور کی بہترین نفسیاتی اور طبیعی مزاج کے اندر دلائل ہی دلائل ہیں۔ اور ان دلائل کے علاوہ رسولوں کی دعوت بھی تو موجود رہی ہے اور ہے۔ یہ دعوت اپنی اس فطری حالت میں موجود ہے جسے انسانی فطرت قبول کرتی ہے۔ اور اس فطرت اور اس دعوت رسل کے اندر پھر حسین ہم آہنگی پائی جاتی ہے اور یہ دعوت لوگوں کی ضروریات اور ان کی زندگی کے لئے مکمل صلاحیت رکھتی ہے۔

ہاں' ایمان ان کے سامنے مکمل طور پر موجود تھا' ان کی دست رس میں تھا' انہوں نے اور انہوں ہی نے راہ ایمان کو چھوڑ کر کفر کی راہ خرید لی۔ اور یہ کام انہوں نے اچھی طرح جانتے بوجھتے کیا۔ اس لئے وہ اس بات کے مستحق ہو گئے کہ اللہ انہیں اس حال میں چھوڑ دے کہ وہ کفر کی راہ پر سرپٹ دوڑیں تاکہ وہ اپنا پورا سرمایہ حیات اس راہ میں لگا دیں اور ان کے لئے ثواب آخرت میں کوئی حصہ نہ رہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ وہ اس قابل ہی نہیں ہیں کہ وہ اللہ کو کوئی نقصان دے سکیں۔ اس لئے کہ وہ مکمل طور پر گمراہ ہو گئے ہیں اور ان کے پاس سچائی کی معمولی مقدار بھی نہیں رہی ہے۔ اور گمراہی کے حق میں اللہ تعالیٰ نے کوئی دلیل اور کوئی طاقت نازل ہی نہیں کی ہے۔ اس لئے اپنی حقیقت کے اعتبار سے باطل کے پاس کوئی قوت نہیں ہوتی۔ لہٰذا وہ اہل حق اور اہل دعوت اسلامی کو کبھی کوئی مضرت نہیں پہنچا سکتے۔ کیونکہ ان کے پاس اگر کوئی قوت ہے بھی تو وہ بہت ہی کمزور اور نحیف ہے۔ اگرچہ وہ اپنے آپ کو پھولا کر دکھائے' اور وقتی طور پر مسلمانوں کو کسی شکست کی وجہ سے رنج و الم پہنچ جائے۔

وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ .... "ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔" یہ اس قدر المناک ہو گا جس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا اور اس قدر رنج و الم وہ اس دنیا میں اہل اسلام کو نہیں دے سکتے۔

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا أَنَّمَا نُمْلِي لَهُمْ خَيْرٌ لِأَنْفُسِهِمْ ۚ إِنَّمَا نُمْلِي لَهُمْ لِيَزْدَادُوا إِثْمًا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُهِينٌ

"جو ڈھیل ہم انہیں دے رہے ہیں اس کو یہ کافر اپنے حق میں بہتر نہ سمجھیں' ہم تو انہیں اس لئے ڈھیل دے رہے ہیں کہ یہ خوب بار گناہ سمیٹ لیں پھر ان کے لئے سخت ذلیل کرنے والی سزا ہے۔"

یہاں آکر اب بات اس عقدے پر پہنچ جاتی ہے جو بعض دلوں میں خلجان کا باعث بنا ہوا تھا۔ بعض دلوں میں یہ سوال پیدا ہو رہا تھا اور وہ خلجان جسے بعض لوگوں کی روح محسوس کر رہی تھی' وہ دیکھ رہے تھے کہ بعض اللہ کے دشمن اور بعض سچائی کے دشمن مہلت پا رہے ہیں اور وہ عذاب الہی کی گرفت میں نہیں آرہے ہیں۔ بظاہر خوب کھاتے پیتے ہیں' قوت' حکومت اور مال و مرتبے سے بہرہ ور ہیں اور خود بھی فتنے میں مبتلا ہو رہے ہیں۔ اور ان کے ارد گرد پھیلی ہوئی دنیا میں بھی فتنہ سامانیاں کر رہے ہیں اور وہ اہل ایمان جن کے ایمان ضعیف ہیں' وہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں زمانہ جاہلیت کی طرح غیر مناسب تصورات اور خیالات رکھتے ہیں۔ وہ سمجھتے تھے کہ شاید اللہ تعالیٰ باطل' شر' انکار حق' کفر اور طغیان پر خوش ہوتا ہے' نعوذ باللہ۔ اس لئے وہ اسے مہلت دیتا ہے اور ان کے لئے رسی ڈھیلی چھوڑتا ہے۔ وہ یہ بھی گمان کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ معرکہ حق و باطل میں کوئی مداخلت نہیں کرتے' اس لئے وہ باطل کو اس کے لئے آزاد چھوڑتے ہیں کہ وہ حق کا سر پھوڑ دے اور اللہ اس کی نصرت و امداد کے لئے کچھ نہ کریں' یا وہ یہ سمجھتے تھے کہ شاید یہ باطل ہی حق ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اللہ اسے پنپنے' بڑھنے اور غالب ہونے نہ دیتے۔ یا وہ یہ سمجھتے تھے کہ باطل کا حق یہ ہے کہ وہ حق پر غالب آجائے اور جزیرۃ العرب کی پوزیشن یہی رہے۔ اور سچائی کے حق میں غلبہ نہیں ہے ورنہ کیوں اللہ اہل باطل' ظالموں' باغیوں اور مفسدوں کو یوں چھوڑ دے کہ وہ باطل میں سرگرم رہیں' کفر کی طرف شتابی سے بڑھیں' طغیان میں سرگرداں رہیں اور یہ سمجھیں کہ وہ مستحکم ہو گئے ہیں اور اب کوئی قوت ان کے سامنے کھڑی نہیں ہو سکتی۔

یہ سب افکار باطلہ تھے۔ اللہ کے حق میں بری سوچ تھی۔ معاملہ ایسا نہ تھا اس لئے خود اللہ تعالیٰ اہل کفر کو متنبہ کرتے ہیں کہ ایسا ہرگز گمان نہ کرو۔ یہ جو اللہ تعالیٰ کی پکڑ تمہیں گھیرتی نہیں ہے حالانکہ وہ کفر میں تیزی دکھا رہے ہیں' اور یہ کہ انہیں جو اس دنیا میں حظ وافر دیا جا رہا ہے جس سے وہ لطف اندوز ہو رہے ہیں اور گمراہی میں آگے بڑھ رہے ہیں بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ ان کے لئے مزید فتنہ ہے۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کی مضبوط اسکیم ہے اور یہ ان کے لئے ایک سخت آزمائش ہے کہ ان کی رسی ڈھیلی چھوڑی ہوئی ہے۔

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوٓا أَنَّمَا نُمْلِي لَهُمْ خَيْرٌ لِّأَنفُسِهِمْ إِنَّمَا نُمْلِي لَهُمْ لِيَزْدَادُوٓا إِثْمًا

.... "یہ ڈھیل جو ہم انہیں دیئے جاتے ہیں اس کو یہ کافر اپنے حق میں بہتر نہ سمجھیں' ہم تو انہیں اس لئے ڈھیل دے رہے ہیں کہ یہ خوب بار گناہ سمیٹ لیں۔ پھر ان کے لئے سخت ذلیل کرنے والی سزا ہے۔"

اگر وہ اس بات کے مستحق ہوتے کہ اللہ انہیں ان انعامات سے نکالے' انہیں ایسی ابتلا میں ڈالے جو ان کی آنکھیں کھولنے والی ہو تو ضرور اللہ انہیں ایسی ابتلا میں ڈال دیتے' لیکن حقیقت یہ ہے کہ اللہ ان کے لئے کوئی بھلائی نہیں چاہتے۔ اس لئے کہ انہوں نے ایمان کے مقابلے میں کفر خرید لیا ہے۔ پھر وہ کفر کے میدان میں تیزی سے آگے بڑھ رہے ہیں۔ اس میں جدوجہد کر رہے ہیں۔ اس لئے اب وہ اس بات کے مستحق ہی نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں اس غفلت سے اور خواب خرگوش سے جگائے اور ابتلا میں ڈالے۔ یہ انعامات الہی اور سلطنت و قوت کے غرے میں ڈوبے ہوئے ہی بہتر ہیں۔ اس لئے **لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِينٌ** .... "ان کے لئے سخت ذلیل کرنے والا عذاب ہے۔" اہانت آمیز عذاب ہے اور اس کے مقابلے میں اہل ایمان کے لئے بلند مقام' مرتبہ اور انعامات ہوں گے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتلا بھی اللہ کی جانب سے ایک انعام ہوتا ہے اور یہ انعام بھی صرف اسی شخص پر ہوتا ہے جس کے لئے

اللہ نے خیر و فلاح کا ارادہ کیا ہو۔ اگر ابتلا اللہ کے دوستوں پر ہو تو اس میں ان کی کوئی بھلائی پوشیدہ ہوتی ہے۔ اگرچہ اللہ کے ان دوستوں کے تصرفات کی وجہ ابتلا ابتداء آئی ہو اور ان کے اپنے اعمال کے نتیجے میں آئی ہو۔ بہر حال اس میں کوئی خفیہ حکمت کارفرما ہوتی ہے' کوئی نہایت ہی لطیف تدبیر ہوتی ہے اور اپنے دوستوں پر اللہ کا فضل و کرم مقصود ہوتا ہے۔

یوں دل اپنی جگہ ٹھہر جاتے ہیں' نفس انسانی مطمئن ہو جاتا ہے اور اسلام کے واضح اور سیدھے حقائق مسلمانوں کے تصور کا حصہ بن جاتے ہیں۔

اللہ کی حکمت کا یہ تقاضا تھا اور مسلمانوں کے ساتھ اللہ کی یہ ایک بڑی بھلائی تھی کہ اس نے انہیں چھانٹ کر ان منافقین سے علیحدہ کر دیا جو ان کی صفوں میں گھسے ہوئے تھے اور ان کے آنے کے مختلف اسباب تھے۔ وہ اس لئے نہیں آئے تھے کہ انہیں اسلام کے ساتھ کوئی محبت یا دلچسپی تھی بلکہ وہ مختلف حالات کی وجہ سے اسلامی صفوں میں گھس آئے تھے۔ اس لئے اللہ نے مسلمانوں کو احد میں ابتلا میں ڈالا اور یہ ابتلا بھی خود ان کی اپنی سوچ اور ان کے بعض اپنے کاموں کی وجہ سے ان پر آئی' لیکن اس میں حکمت یہ تھی کہ مجاہدین راہ حق کی صفوں میں سے خبیث اور طیب کے درمیان تمیز ہو جائے۔

مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلٰى مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتّٰى يَمِيْزَ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ ؕ وَ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِيْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ۪ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ ۚ وَ اِنْ تُؤْمِنُوْا وَ تَتَّقُوْا فَلَكُمْ اَجْرٌ عَظِيْمٌ

"اللہ مومنوں کو اس حالت میں ہرگز نہ رہنے دے گا جس میں تم لوگ اس وقت پائے جاتے ہو' وہ پاک لوگوں کو ناپاک لوگوں سے الگ کر کے رہے گا۔ مگر اللہ کا یہ طریقہ نہیں ہے کہ تم لوگوں کے غیب پر مطلع کر دے۔ (غیب کی باتیں بتانے کے لئے تو) اللہ اپنے رسولوں میں سے جس کو چاہتا ہے منتخب کر لیتا ہے۔ لہٰذا (امور غیب کے بارے میں) اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان رکھو۔ اگر تم ایمان اور خدا ترسی کی روش پر چلو گے تو تم کو بڑا ہی اجر ملے گا۔"

یہاں یہ آیت قطعی طور پر یہ فیصلہ کر دیتی ہے کہ اللہ کی شان یہ نہیں ہے' اس کی الوہیت کا تقاضا یہ نہیں ہے اور اس کی اس کائنات میں مروجہ سنت یہ نہیں ہے کہ وہ مسلمانوں کی صفوں میں منافقین کو اسی طرح چھپے ہوئے چھوڑ دے۔ حالت یہ ہے کہ منافقین بس دعوائے ایمان کریں' اسلام کا اظہار کریں اور اسلامی صفوں میں چھپے رہیں حالانکہ ان کے دل ایمان کی تروتازگی سے خالی ہوں' اور ان میں اسلام کی روح سرے سے نہ ہو۔ اس امت کو اللہ نے اس لئے برپا کیا ہے کہ وہ اس کائنات میں ایک عظیم کردار ادا کرے۔ ایک عظیم نظام زندگی کا علم لے کر اٹھے' اس زمین پر ایک منفرد صورت حال پیدا کر دے۔ ایک جدید نظام وجود میں آجائے۔ اس مشن اور عظیم نصب العین کا تقاضا یہ تھا کہ وہ پوری یکسوئی' پوری صفائی اور پوری تمیز کے ساتھ اس نصب العین کو پختہ طریقے سے پکڑے اور یہ تقاضا بھی تھا کہ اس کی صفوں کے اندر کوئی خلل اور کوئی کمزوری نہ ہو' اس کی بنیادوں میں کوئی کمزوری نہ ہو اور مختصر الفاظ میں یوں کہ ان مقاصد کا تقاضا تھا کہ یہ امت اس قدر عظیم ہو جس قدر اس کا یہ نصب العین عظیم ہے۔ جس نصب العین اور جس ٹارگٹ تک اسے اس کائنات میں پہنچنا ہے۔ اور آخرت کا بلند مقام و مرتبہ تو بہر حال ان کے لئے اللہ نے تیار کیا ہوا ہے۔

ان سب باتوں کا تقاضا یہ ہے کہ اسلامی صف ہر وقت جاگتی رہے تاکہ اس سے خبیث عناصر نکل جائیں۔ وہ کلر کنوں پر اس قدر دباؤ

رکھے کہ جو اینٹ کچی ہو' وہ پہلے دن ہی بیٹھ جائے۔ اور ان پر ہروقت روشنی پڑتی رہے تاکہ اندرونی کمزوریاں اور ضمیر کے اندر برے خیالات کی تطہیر ہوتی رہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ نے بھی ان کی صفوں کو صاف کرنے کے لئے ان کی امداد فرمائی۔ اللہ تعالیٰ کی شان کے یہ لائق نہ تھا کہ وہ اپنے دوستوں کی صفوں میں ایسے ناپاک لوگوں کو رہنے دے۔

نیز اللہ تعالیٰ کا یہ طریقہ بھی نہیں ہے کہ وہ لوگوں کو غائبانہ باتوں کا براہ راست علم دے دے۔ اس لئے کہ غیب کا علم تو صرف اللہ کے شایان شان ہے۔ انسان اپنی فطرت کے اعتبار سے جس پر انہیں پیدا کیا گیا ہے' اس بات کے اہل نہیں ہیں کہ وہ غیبی اطلاعات کا ادراک کر سکیں۔ انسانی جسم کی مشینری جو ان کے اندر تخلیق ہوئی ہے وہ اس اسکیم کے مطابق تیار ہی نہیں کی گئی کہ وہ غائبانہ امور کا ادراک کر سکے۔ الا یہ کہ کوئی خاص مقدار اللہ کسی کو دے دے۔ اور یہ بھی خصوصی حکمت کے تحت ہوا کرتا ہے۔ یعنی اس قدر جس قدر اس دنیا میں ان کے خلافت فی الارض کے مقاصد کے لئے ضروری ہو۔ اور اس مقصد یعنی انسان کے وظیفہ خلافت فی الارض کے لئے علم غیب کی سرے سے ضرورت ہی نہیں ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ انسان کی اس موجودہ مشینری پر علم غیب کے دروازے کھول دے تو یہ مشینری ختم ہو کر رہ جائے' اس لئے کہ وہ علوم غیب کے اخذ کے لئے سرے سے تیار ہی نہیں ہے۔ صرف اس قدر غیب کا علم اسے درکار ہوتا ہے جس میں اس کی روح کا ملاپ اس کے خالق کے ساتھ ہوتا ہے اور اس کا وجود' وجود کائنات سے مل جاتا ہے۔ علم غیب پر اطلاع پانے کا کم سے کم نقصان تو یہ ہو گا وہ ہاتھ پاؤں ہلانا چھوڑ دے گا' ہروقت ان نتائج کے بارے میں سوچتا رہے گا جو واقع ہونے والے ہیں' اور وہ اس زمین میں کسی قسم کی ترقی کے لئے سوچ بھی نہ سکے گا۔

یہی وجہ ہے کہ یہ بات اللہ کے شایان شان نہ تھی کہ وہ لوگوں کو علم غیب کی اطلاع دے دے اور نہ یہ اس حکمت اور اسکیم کے مطابق تھی جس کے مطابق وہ اس زمین کو چلا رہا ہے۔

سوال یہ ہے کہ پس اللہ خبیث کو طیب سے کیسے جدا کرتا ہے؟ اور اس کی سنت اور اس کی شان اس تطہیر کے عمل میں کس طرح کام کرتی ہے؟ اور کس طرح اسے چھانٹ کر رکھ دیتی ہے؟ وہ کس طرح غبار اور دھند کو دور کرتا ہے؟ کس طرح منافقین کو الگ کر کے اسلامی صفوں کو پاک کرتا ہے تاکہ مسلمان اس کرۂ ارض پر اپنا کردار ادا کر سکیں جس کے لئے مسلمانوں کو بطور امت برپا کیا گیا ہے۔

وَلَٰكِنَّ اللَّهَ يَجْتَبِي مِن رُّسُلِهِ مَن يَشَاءُ ...... "اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں میں سے جس کو چاہتا ہے منتخب کر لیتا ہے۔" اللہ تعالیٰ کھرے کو کھوٹے سے اس طرح جدا کرتا ہے کہ اس نے رسولوں کو بھیجا' کوئی ان پر ایمان لایا اور کسی نے ان سے انکار کیا۔ اور رسالت کے تقاضے پورے کرنے کے لئے سلسلہ جہاد فرض کیا گیا۔ اور جہاد کے اندر لوگوں کو آزمائشوں میں ڈال کر آزمایا گیا' ان تمام اقدامات سے شان الٰہی ظہور میں آتی ہے۔ یوں اللہ کی سنت کام کرتی ہے اور یوں کھرا کھوٹے سے الگ ہو جاتا ہے۔ دلوں کی تطہیر ہو جاتی ہے' نفوس پاک ہو جاتے ہیں اور اللہ کی تقدیر میں جو ہوتا ہے وہ ظاہر ہوتا ہے۔

اس طرح اللہ کی حکمت کے ایک حصے سے پردہ اٹھتا ہے۔ یہ حکمت زندگی میں حقیقت بن کر ظاہر ہوتی ہے۔ اور یہ حکمت ایک مضبوط بنیاد پر' کھلے بندوں' روشن ستارے کی طرح زمین پہ استقرار حاصل کرتی ہے..... اس حقیقت کو سامنے رکھتے ہوئے جو روشن ہوتی ہے' جو واضح ہوتی ہے' جو سادہ اور قابل فہم ہوتی ہے' اب اللہ تعالیٰ اہل ایمان کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ اپنی ذات کے اندر حقیقی ایمان پیدا کریں اور پھر اس حقیقی ایمان کے تقاضے پورے کریں اور انہیں بتایا جاتا ہے کہ آخرت میں ایک فضل عظیم ہے جو ان کا منتظر ہے۔

فَآمِنُوا بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ ۚ وَإِن تُؤْمِنُوا وَتَتَّقُوا فَلَكُمْ أَجْرٌ عَظِيمٌ ....

"اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لاؤ۔ اگر تم ایمان لاؤ اور خدا ترسی کی روش پر چلو تو تم کو بڑا اجر ملے گا"..... واقعات احد کے بیان اور اس کے بعد ان واقعات پر تبصروں اور تنقیدوں کے بیان کے بعد یہ بہترین ہدایت اور مشورہ ہے جو اہل ایمان کو دیا گیا ہے۔

○.....☆☆☆.....○

جنگ احد کے بارے میں قرآن کریم نے جو تبصرہ کیا ہے' اس میں بعض نہایت ہی اہم اور عظیم حقائق کی نشاندہی کی گئی ہے۔ یہ تو ممکن نہیں ہے کہ ان تمام حقائق کو گنوا دیا جائے اور یہاں ان کے بارے میں پوری تفصیلات دی جاسکیں' لیکن مناسب ہے کہ ان حقائق میں سے جو زیادہ عمومی اور شامل اور زیادہ ظاہر ہیں ان کی طرف اشارہ کر دیا جائے تاکہ ان اشارات پر وہ تمام واقعات قیاس کر لئے جائیں جو اس غزوہ میں پیش ہوئے' جیسا کہ قرآن کریم نے انہیں عبرت کے طور پر پیش کیا ہے۔

۱۔ اس معرکے اور اس پر ہونے والے اس طویل تبصرے نے ایک بنیادی حقیقت کو بالکل کھول کر بیان کر دیا ہے کہ یہ دین جو درحقیقت انسانوں کے لئے ایک نظام زندگی ہے' اس کا اصل مزاج کیا ہے اور وہ انسانوں کی زندگیوں کے اندر کس طرح کام کرتا ہے۔ یہ نہایت ہی اساسی اور سادہ اور قابل فہم حقیقت ہے لیکن بسا اوقات اسے بالکل نظرانداز کر دیا جاتا ہے یا ابتداء" ہی اس کا ادراک نہیں کیا جاتا اور اس کے بھول جانے اور اس کے نہ سمجھنے کی وجہ سے اس دین کی فہم میں فاش غلطیاں کی جاتی ہیں۔ نہ صرف یہ کہ اس دین کی حقیقت کے سمجھنے میں بھی غلطی کی جاتی ہے بلکہ اس کی تاریخ کو سمجھنے میں بھی غلطی کی جاتی ہے اور انسانی زندگی میں اس نے جو کردار ادا کیا یا کرتا ہے یا آئندہ کرے گا اس کے سمجھنے میں بھی نہایت ہی فاش غلطی ہوتی ہے۔

ہم میں سے بعض لوگ یہ توقع رکھتے ہیں کہ دین اسلام جو انسانی زندگی کے لئے خدا کا تجویز کردہ نظام ہے' اسے معجزانہ طور پر کام کرنا چاہئے۔ اس میں اس کے انسانی مزاج' اس کی فطری قوت اور کسی وقت میں موجود مادی صورت حال کا کوئی لحاظ نہ رکھا جائے' چاہے انسان وہ ترقی کے کسی درجے میں ہوں' اور جس معاشرے اور ماحول میں بھی ہوں۔

جب یہ لوگ دیکھتے ہیں کہ اسلام اس معجزانہ اور ساحرانہ انداز میں کام نہیں کرتا بلکہ اسلام لوگوں کی بشری طاقت کے مطابق کام کرتا ہے اور یہ انسانی محدود قوت اور انسان کی اصل بنیادی صورت حال باہم گرمل کر کام کرتے ہیں۔ بعض اوقات انسان اور اس وقت کی موجود صورت حالات اسلامی نظام سے واضح طور پر متاثر ہو جاتے ہیں' اور یا یہ دونوں مل کر لوگوں کی جانب سے اسلام کی جانب ردعمل کو متاثر کرتے ہیں۔ بعض اوقات ان دونوں کے اثرات اسلام کے خلاف ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ سے لوگ کیچڑ کی طرح بھاری کر بیٹھ جاتے ہیں۔ ان کی نظروں میں لالچ' لذت اور شہوت اس قدر اہم ہو جاتی ہے کہ وہ اسلام کے پیغام کے قبول کرنے کی راہ میں حائل ہو جاتی ہے اور لوگ اسلامی سمت میں نہیں چلتے۔ جب یہ لوگ ایسی صورت حال دیکھتے ہیں تو وہ مایوسی کا شکار ہو جاتے ہیں اور یہ صورت حال ایسے لوگوں کی توقعات کے خلاف ہوتی ہے۔ اس لئے کہ یہ دین اللہ کی جانب سے ہوتا ہے..... اور بعض اوقات وہ اس بات میں شبہ کرنے لگتے ہیں کہ آیا یہ دین فی الواقعہ لوگوں کے لئے کوئی مکمل نظام حیات ہے بھی اور اس سے بھی آگے بڑھ کر بعض لوگ سرے سے اس دین کی حقانیت میں شک کرنے لگتے ہیں۔

فکروعمل کی ان غلطیوں کی بنیاد صرف ایک غلطی پر ہے۔ وہ یہ کہ ایسے لوگوں نے اس دین کے مزاج ہی کو نہیں سمجھا۔ اس کے طریقہ کار ہی کو نہیں سمجھا' یا وہ اس حقیقت کو سمجھ کر بھول گئے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ دین انسانی زندگی کے لئے ایک منہاج ہے۔ اور اس کا انسانی زندگی کے اندر قیام خالص انسانی جدوجہد پر موقوف کیا گیا ہے۔ اور اس جدوجہد کو انسانی طاقت کے اندر محدود کیا گیا ہے۔ اور اس دین پر عمل پیرا ہونے کا آغاز وہاں سے کیا جاتا ہے

جہاں انسان اپنی مادی زندگی کی ترقی کے مدارج میں سے جس درجے میں موجود ہو' یہ دین انہیں جہاں پاتا ہے وہاں سے لے کر آگے چلتا ہے۔ اور انہیں اپنے آخری انجام تک پہنچاتا ہے۔ اور یہ سب کام انسان کی طاقت اور وسعت کے حدود میں کیا جاتا ہے۔ اور وہاں تک وہ انہیں آگے بڑھاتا ہے جس قدر ان کے اندر طاقت اور وسعت ہو اور جہاں تک وہ پہنچ سکتے ہوں اور پہنچنے کی صلاحیت اپنے اندر رکھتے ہوں۔

اس کام میں اس کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ایک لحظہ بھی اس کام سے غفلت نہیں کرتا۔ کسی منصوبے میں غفلت نہیں کرتا۔ کسی اقدام میں غفلت نہیں کرتا۔ اور فطرت انسانی کے مطابق کام کرتا ہے' انسانی طاقت کے حدود کے اندر رہتے ہوئے کام کرتا ہے۔ انسان مادی اعتبار سے جہاں تک ترقی یافتہ ہو اس کے مطابق کام کرتا ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ وہ اسے اس مقام تک لے جاتا ہے جہاں تک وہ ابھی تک نہیں پہنچ پایا تھا اور تاریخ انسانی میں انسان کے وضع کردہ تمام نظامہائے زندگی کے ادوار میں سے کسی دور میں بھی نہیں پہنچ پایا تھا۔ اسلام نے اپنے یہ کمالات عملاً اس وقت دکھائے ہیں جب کبھی بھی ایک مختصر وقت کے لئے اسے نافذ کیا گیا اور آئندہ بھی وہ ایسا ہی کر کے دکھائے گا بشرطیکہ سچی کوشش اس کے نفاذ کی کی جائے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ غلطی کا آغاز اس دین کے مزاج کو نہ سمجھنے یا سمجھ کر اسے بھلا دینے کی وجہ سے ہوا ہے جس طرح ہم نے کیا۔ اور ہم نے نفاذ دین کے لئے معجزانہ اور ساحرانہ انقلاب کا انتظار شروع کر دیا' جو انسانی صورت حال کے مناسب نہیں ہے' جس سے فطرت انسانی بدل جاتی ہے' اور جس سے اسلام کا مزاج بدل جاتا ہے۔ اور یہ طریقہ کار اس کی فطرت حقیقی سے لگا نہیں کھاتا۔ اس کی استعداد اور اس کے رجحانات کے بھی خلاف ہے اور جو انسان کے مادی حالات کے بھی خلاف ہیں۔

کیا اسلام من جانب اللہ نہیں ہے؟ کیا وہ ایسی قوت قادرہ کی طرف سے ارسال کردہ نہیں ہے جسے کوئی قوت عاجز نہیں کر سکتی؟ تو پھر اسلام کے نفاذ کو کیوں انسانی طاقت کے حدود پر موقوف کر دیا گیا ہے اور کیوں اسے انسانی جدوجہد کا محتاج کیا گیا ہے؟ پھر کیوں ایسا نہیں ہوتا کہ انسان اس کے لئے کام کریں اور وہ ہمیشہ غالب ہی ہوں؟ کیوں اسلامی لوگ ہمیشہ کامیاب نہیں رہتے؟ انسان کی خواہشات نفسانیہ' ان کا مزاج اور اس کی مادی صورت حال کیوں اس پر غالب آجاتی ہیں اور کبھی ایسا کیوں ہوتا ہے کہ اہل حق شکست فاش کھاتے ہیں حالانکہ وہ اہل حق ہوتے ہیں؟

یہ تمام سوالات جیسا کہ ہم نے بیان کیا حقیقی سوالات ہیں اور یہ اس لئے پیدا ہوتے ہیں کہ ہم نے اس دین کے اصل مزاج ہی کو نہیں سمجھا ہے باوجود اس کے کہ اس دین کا مزاج اور اس کا طریق کار نہایت ہی سادہ ہیں یا ہم نے انہیں سمجھتے ہوئے بھلا دیا ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ قادر مطلق ہے اور وہ انسانی فطرت کو بھی تبدیل کر سکتا ہے۔ چاہے وہ فطرت انسانی کو اس دین کے ذریعہ بدلے یا اس کے لئے کوئی اور طریق کار اختیار کرے اور وہ اس بات پر بھی قادر تھا کہ وہ ابتدائے آفرینش سے انسان کو کسی دوسری فطرت پر پیدا کرتا۔ لیکن اس کی مشیئت یہ تھی کہ وہ انسان کو اس کی موجودہ فطرت ہی پر پیدا کرے۔ اور اللہ تعالیٰ نے پسند کیا کہ انسان کو ذی ارادہ بنائے اور اس کے اندر ہدایت و ضلالت قبول کرنے کی صلاحیت ہو۔ اور اس کی مشیئت یہ بھی تھی کہ ہدایت کو' انسان کی جدوجہد اور اس کی جانب سے طلب ہدایت اور اس کی استعداد قبولیت پر موقوف کر دیا جائے۔ پھر اللہ کی مشیئت نے چاہا کہ انسانی فطرت ہمیشہ کام کرتی رہے اور اسے کسی صورت میں بھی مٹایا نہ جاسکے' نہ تبدیل کیا جاسکے اور نہ معطل کیا جاسکے اور اس کی مشیئت یہ بھی تھی کہ اسلامی نظام زندگی کو اس کرۂ ارض پر بذریعہ انسانی جدوجہد قائم کیا جائے اور انسانی طاقت اور وسعت کے حدود کے اندر قائم کیا جائے۔ اور یہ بھی مشیئت الٰہی کا ایک حصہ تھا کہ انسان کو وہی کچھ ملے جس قدر وہ اپنی وسعت کے مطابق جدوجہد کرے۔ اس کی زندگی کے شب

دروز کے مطابق اور جو صورت حال فی الواقعہ موجود ہو اس کے دائرے میں۔

انسانوں میں سے کسی کے لئے یہ حق نہیں ہے کہ وہ پوچھے اللہ نے ایسا کیوں چاہا۔ جب تک انسان بندہ اور خدا اللہ ہے اس لئے کہ انسان کے پاس اس کائنات کے نظام کا کلی علم نہیں ہے اور نہ اس علم تک کبھی انسان کے پہنچنے کا امکان ہے۔ نہ انسان کو یہ علم دستیاب ہو سکتا ہے کہ اس کائنات کے ہر موجود کے حوالے سے نظام کائنات کے تقاضے کیا ہیں اور یہ کہ انسان کی موجودہ فطرت کی منصوبہ بندی اور تشکیل کے پیچھے کیا کیا حکمت کارفرما ہے۔ اس لئے ایسے مقامات پر ایک سچا مسلمان یہ سوال کر ہی نہیں سکتا کہ کیوں؟ میں سمجھتا ہوں کہ ایک سنجیدہ ملحد بھی یہ سوال نہیں کر سکتا کہ کیوں؟ مومن تو اس لئے نہیں کر سکتا کہ اسے بارگاہ الٰہ میں بڑا باادب ہونا چاہئے اس لئے کہ اس کا دل ذات باری کی حقیقت اور اس کی صفات سے واقف ہوتا ہے اور اسے یہ بھی علم ہوتا ہے کہ انسانی ادراک کا یہ میدان عمل ہی نہیں ہے۔ اور کافر اس لئے یہ سوال نہیں کرتا کہ وہ سرے سے خدا کو تسلیم ہی نہیں کرتا۔ اگر سے ذات باری کی معرفت ہوتی تو وہ اس کی ذات و صفات کا اعتراف کرتا۔ الوہیت کے تقاضوں کو جانتا۔

ہاں بعض ایسے لوگ جو سنجیدہ نہیں ہوتے اور اخلاقی لحاظ سے گرے ہوئے ہوتے ہیں وہ ایسے سوالات کرتے ہیں۔ وہ نہ سنجیدہ اور سچے مسلم ہوتے اور نہ ہی سنجیدہ اور سچے کافر ہوتے ہیں۔ اس لئے اس سوال میں زیادہ دلچسپی لینا ضروری نہیں ہے اور نہ ہی اسے سنجیدگی کے ساتھ لینا چاہئے۔

کبھی یوں ہوتا ہے کہ ایک جاہل شخص ذات باری کے متعلق سوال کرتا ہے۔ اس لئے ایسے جاہل کے سوال کا جواب براہ راست نہ دینا چاہئے۔ اسے صرف اللہ کی الوہیت کی حقیقت بتادینا چاہئے' تو اگر وہ اسے پالے تو مومن ہے اور اگر نہ پاسکے تو کافر ہے۔ بس ایسے جاہل کے ساتھ بات یہاں ختم ہو جاتی ہے۔ ورنہ یہ شخص بحث برائے بحث کر رہا ہو گا۔

اصل بات یہ ہے کہ اللہ کی مخلوقات میں سے کسی کو یہ سوال اٹھانے کا حق ہی نہیں ہے کہ اللہ نے حضرت انسان کو اس کی اس موجودہ فطرت کے مطابق کیوں پیدا کیا؟ کیوں اس کی یہ فطرت ہروقت کام کرتی رہتی ہے' اسے مٹایا نہیں جاسکتا۔ اس میں تبدیلی نہیں لائی جاسکتی۔ اسے معطل نہیں کیا جاسکتا اور پھر کیوں اللہ نے اسلامی نظام زندگی کے قیام کو انسانی جدوجہد پر موقوف کیا اور انسانی طاقت کے اندر جدوجہد کو ضروری قرار دیا۔

ہر انسان کا یہ فرض ہے کہ وہ اس حقیقت کا ادراک کرے۔ وہ دیکھے کہ انسانی فطرت انسانی ماحول کے اندر کس طرح کام کرتی ہے۔ پھر وہ انسانی تاریخ کا مطالعہ اس فطری انداز میں کرے۔ اس طرح ایک تو وہ تاریخی واقعات کے حقیقی اسباب کو سمجھے گا اور دوسرے یہ کہ اسے یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ تاریخ کا رخ کس طرح موڑا جاسکتا ہے۔

یہ نظام زندگی جسے ہم اسلام کہتے ہیں' جس طرح اسے حضرت محمد ﷺ نے پیش فرمایا' اس زمین پر' ان لوگوں کی دنیا میں' صرف اس بنا پر جاری و ساری اور قائم نہیں ہو سکتا کہ بس وہ اللہ کی طرف سے نازل شدہ ہے۔ اور یہ صرف مجرد "تبلیغ" اور "بیان" سے بھی نافذ نہیں ہو سکتا۔ اور یہ اس طرح بھی نافذ نہیں ہو سکتا کہ اسے اللہ تعالیٰ ناموس فطرت اور قوانین قدرت کی طرح نافذ کر دے' جو اس نے آسمانوں کی گردش' ستاروں کی رفتار اور طبیعی اسباب پر طبیعی نتائج مرتب کئے جانے والے کے سلسلے میں جاری کئے ہوئے ہیں۔ بلکہ اس کے لئے یہ منہاج رکھا گیا ہے کہ اسے ایک انسانی جماعت لے کر اٹھے' جو سب سے پہلے اس پر اچھی طرح ایمان رکھتی ہو' پھر خود اس پر پوری طرح عمل پیرا ہو اور اپنی طاقت کے مطابق اسے زندگی کا وظیفہ اور نصب العین قرار دے۔ پھر دوسروں کے دلوں میں اس ایمان کی منتقلی اور ان کی زندگیوں میں اس نظام کے قیام کے لئے یہ جماعت جدوجہد کرتی ہو' اور اس قدر جدوجہد کرے' کہ اس سلسلے میں وہ اپنی پوری

طاقت لگادے۔ وہ انسانی کمزوریوں کے خلاف جہاد کرے وہ انسانی خواہشات کے خلاف جہاد کرے اور وہ اپنے نفس کی جہالت اور دوسرے نفوس کی جہالت کے خلاف جہاد کرے۔ وہ ان لوگوں کے ساتھ جہاد کرے جو انسانی کمزوریوں' خواہشات نفسانیہ اور جہالت کی وجہ سے اس نظام زندگی کی راہ روکے کھڑے ہیں اور اس نظام زندگی کو اس حد تک قائم کروے جس حد تک انسانی مزاج اور طاقت اسے برداشت کر سکتے ہیں اور وہ انسانوں کو اس مقام سے پکڑے جس مقام پر وہ درجہ ترقی کے حوالے سے عملاً موجود ہوں۔ وہ ان انسانوں کے حقیقی حالات زندگی کو نظرانداز نہ کرے۔ نیز وہ لوگوں کے حقیقی حالات کے تقاضوں کو بھی نظرانداز نہ کرے اور ان حالات اور تقاضوں کے مطابق اس نظام کو چلائے۔ لوگوں کی یہ جماعت پہلے خود اپنے نفس پر فتح حاصل کرے' اور پھر کبھی وہ اپنے ماحول کے لوگوں پر فتح حاصل کرے اور کبھی یوں ہو کہ وہ اپنے نفس اور اپنے ماحول کے لوگوں سے شکست کھاجائے۔ یہ بات اس کی جدوجہد کے عین مطابق ہو۔ ان عملی طریقہ ہائے کار کے عین مطابق ہو' جو اس جماعت نے اختیار کئے یا جس قدر اسے اختیار کرنے کی توفیق ہوئی۔ پھر اس جماعت کے لئے ہرچیز سے پہلے' ہرجدوجہد سے پہلے اور ہروسیلہ واسلوب سے پہلے ایک دوسرا بنیادی عنصر بھی ضروری ہے' وہ یہ کہ یہ جماعت اس نصب العین کے ساتھ کس قدر مخلص ہے اور وہ کس قدر اپنی ذات کے اندر اسے نافذ کررہی ہے۔ اور یہ کہ اس نظام کے نازل کرنے والے خدا کے ساتھ اس کا تعلق کس قدر ہے؟ اسے اس پر کس قدر اعتماد ہے اور اسے اس پر کس قدر توکل اور بھروسہ ہے؟

یہ ہے اس دین کی اصل حقیقت اور یہ ہے اس کا طریق نفاذ اور یہ ہے اس کی تحریک کا منصوبہ۔ اور یہی وہ بات ہے جسے اللہ تعالیٰ جماعت مسلمہ کو اچھی طرح سمجھانا چاہتے ہیں۔ واقعہ جنگ احد کے تمام واقعات کے بیان' ان واقعات پر آنے والے تبصروں کا پورا ماحصل یہی ہے۔

اب یہ کہ احد کے موقعہ پر اسلامی جماعت نے جب مکمل اسلام کو' جس میں اس وقت حضور کے احکام شامل تھے' اپنے نفسوں میں عملی شکل پیش کرنے میں قدرے قصور کیا' اور بعض مواقف پر اس نے بعض عملی اقدامات کرنے میں کوتاہی کی' اور جب اس نے اس مذکورہ بالاعظیم اساسی حقیقت کو سمجھنے میں کوتاہی کی اور اس نے یہ خیال کیا کہ ہم تو بہرحال کامیاب ہوں گے' اس لئے کہ یہ دین اور یہ نظام خدا کی طرف سے ہے اور اس بناپر اس نے اپنے تصرفات اور تدابیر کو نظرانداز کردیا تو اللہ تعالیٰ نے اس کو ہزیمت سے دوچار کردیا تاکہ وہ ذرا تلخ تجربات کا مزہ بھی چکھ لے۔ چنانچہ اس تجربے کے بعد قرآن مجید نے ان کی اس غلط فہمی کو اپنے تبصرے کے ذریعہ دور کرنے کی کوشش کی۔

أَوَلَمَّا أَصَابَتْكُم مُّصِيبَةٌ قَدْ أَصَبْتُم مِّثْلَيْهَا قُلْتُمْ أَنَّىٰ هَٰذَا ۖ قُلْ هُوَ مِنْ عِندِ أَنفُسِكُمْ ۗ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ

"اور جب تم پر وہ مصیبت آئی جس کے دوگنا تمہارے ہاتھوں سے ان پر آئی تھی تو تم نے کہا یہ کیسے؟ اے پیغمبر کہہ دو کہ یہ خود تمہارے اپنے نفوس کی وجہ سے ہے۔ بے شک اللہ ہرچیز پر قادر ہے۔"

جیسا کہ اس سے قبل سیاق کلام میں ہم کہہ آئے ہیں' اللہ اہل ایمان کو اس مقام پر چھوڑ نہیں دیتے بلکہ انہیں اللہ کی تقدیر کے ساتھ پیوستہ فرماتے ہیں جو ان اسباب اور نتائج کے پس پشت کام کررہے ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ انہیں بتاتے ہیں کہ اس ابتلا کی پشت پر اللہ کا ارادہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ان کے لئے بھلائی چاہتے ہیں' رہی ابتلا تو یہ تو ان پر ان کے اپنے تصرفات اور اسباب ظاہری کی وجہ سے آتی ہے۔

یہ فیصلہ کہ اسلامی نظام زندگی کا قیام' انسانی جدوجہد پر چھوڑ دیا گیا ہے اور اس پر ان انسانی اقدامات کا اثر ہوتا ہے جو وہ اس کے حوالے سے کرتے ہیں۔ اس میں انسان کے لئے بہت بڑی بھلائی ہے۔ اس لئے کہ اسلامی نظام انسانی زندگی میں فساد کے بجائے اصلاح چاہتا ہے۔ اسے معطل کرنا نہیں چاہتا۔ وہ انسانی فطرت کی اصلاح اس طرح چاہتا ہے کہ وہ اسے بیدار کرتا ہے اور اسے اعتدال پر لاتا ہے۔ یہ اس لئے کہ کسی دل میں ایمان اس وقت تک مکمل اور پورا نہیں ہو سکتا جب تک یہ شخص اسلام کے حوالے سے لوگوں کا مقابلہ نہیں کرتا۔ یہ جہاد وہ سب سے پہلے تبلیغ اور بیان کے ذریعہ کرے گا۔ اس کے بعد وہ مجاہدہ ہاتھ سے کرے گا جبکہ مخالف اسلام قوت زبردستی راہ ہدایت کو مسدود کر رہی ہے۔ اس سلسلے میں اس مومن پر ابتلا کا دور بھی آسکتا ہے جس میں اسے صبر سے کام لینا ہو گا' تکلیف برداشت کرنی ہوں گی' ہزیمت اٹھانی ہوگی اور اس پر صبر کرنا ہو گا۔ اگر فتح نصیب ہو تو سنجیدہ رہنا ہو گا۔ اس لئے کہ فتح کے وقت صبر اور سنجیدگی بہ نسبت شکست کے زیادہ مشکل ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ دل صاف ہو جائے' صفوف کے اندر سے کچا عنصر چھٹ جائے' جماعت اپنی صحیح راہ پر گامزن ہو جائے اور وہ اپنی راہ پر سیدھی اوپر کی طرف چڑھتی جائے اور اس تمام سرگرمی میں وہ متوکل علی اللہ ہو۔

اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ جب تک قلب مسلم ایمان کے معاملے میں لوگوں کے مقابلے میں مجاہدہ اور جہاد نہیں کرے گا ان کے دلوں میں حقیقت ایمان کا بیٹھنا نہایت ہی مشکل ہے۔ اس لئے کہ لوگوں کے ساتھ مقابلہ اور مجاہدہ سے قبل اس نے اپنے نفس کے ساتھ مجاہدہ کر لیا ہو گا۔ اور اس جہاد کے بعد اس کے سامنے ایمان کے وہ آفاق کھلیں گے جو اس کے سامنے کبھی نہیں کھل سکتے جب تک وہ بیٹھا ہوا ہو' پرامن زندگی گزارنے کا عادی ہو اور ہر کسی کے ساتھ مسالمت کر رہا ہو اور ہر حال میں نباہ رہا ہو۔ جب وہ جہاد شروع کرے گا تو اسے لوگوں کے اندر حقائق نظر آئیں گے' زندگی کے اندر کچھ حقائق اس پر روشن ہوں گے جو ہرگز اس پر روشن نہیں ہو سکتے تھے جب تک وہ مجاہدہ فی سبیل اللہ نہیں شروع کرتا۔ اس جہاد فی سبیل اللہ ہی کے نتیجے میں اس کا نفس' اس کا شعور' اس کے تصورات' اس کی عادات' اس کا مزاج' اس کے تاثرات اور اس کی قوت قبولیت حق اس مقام تک پہنچ جائیں گے جہاں تک اس کے بغیر وہ ہرگز نہ پہنچ سکتا تھا۔ غرض جہاد کا یہ شاق اور تلخ تجربہ انسان کو کندن بنا دیتا ہے

اسی طرح کسی جماعت مسلمہ کے اندر بھی ایمان کی حقیقت اس وقت تک مکمل اور مضبوط نہیں ہو سکتی جب تک وہ تجربہ' امتحان اور ابتلا میں نہ پڑے۔ اور جب تک اس کا ہر فرد اپنی قوت کی حقیقت سے واقف نہ ہو۔ جب تک اس کے ہر فرد کو اپنے نصب العین کا پتہ نہ ہو۔ اسی طرح اس جماعت کو بھی اپنی تمام اینٹوں کا پتہ نہ ہو جن سے وہ بنی ہے۔ یوں کہ ہر اینٹ کس قدر بوجھ سہار سکتی ہے اور یہ کہ مشکل اور ٹکر کے وقت وہ اینٹیں ایک دوسرے کے ساتھ کس قدر پیوست ہیں۔

یہ تھی وہ حکمت جس کو اللہ تعالیٰ جماعت مسلمہ کو سمجھانا چاہتے تھے' اور یہ حکمت اس کو تربیت کے اس کورس میں اسے سمجھائی گئی جو میدان احد میں اسے دیا گیا۔ اور اس کے بعد پھر واقعات احد پر اس سورت میں جو تبصرہ کیا گیا' اس میں بھی اسی حکمت کو اسے سمجھایا گیا۔ جبکہ ظاہری اسباب شکست کے بیان کے بعد اللہ نے فرمایا :"جو نقصان لڑائی کے دن تمہیں پہنچا وہ اللہ کے اذن سے تھا' اور اس لئے تھا کہ اللہ دیکھ لے کہ تم میں سے مومن کون ہیں اور منافق کون ہیں۔" اور دوسری جگہ فرمایا "اللہ مومنوں کو اس حالت میں ہرگز نہ رہنے دے گا جس میں تم لوگ اس وقت پائے جاتے ہو۔ وہ پاک لوگوں کو ناپاک لوگوں سے الگ کر کے رہے گا" اور اس کے بعد اللہ تعالیٰ انہیں اللہ کی حکمت اور تقدیر کی طرف حوالے کرتا ہے' یعنی ان اسباب کی پشت پر جو تقدیر اور حکمت تھی۔ چنانچہ انہیں ایمان کی اس عظیم حقیقت اور سچائی کی طرف موڑتا ہے جو اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتی جب تک وہ نفس انسانی کے اندر اچھی طرح بیٹھ نہیں جاتی۔ فرماتے :"اس وقت اگر تمہیں چوٹ لگی ہے تو اس سے پہلے ایسی ہی چوٹ تمہارے مخالف فریق کو بھی لگ چکی ہے۔ یہ تو زمانہ کے نشیب و فراز ہیں جنہیں ہم

لوگوں کے درمیان گردش دیتے رہتے ہیں۔ تم پر یہ وقت اس لئے لایا گیا کہ اللہ دیکھنا چاہتا تھا کہ تم میں سچے مومن کون ہیں اور ان لوگوں کو چھانٹ لینا چاہتا تھا جو واقعی راستی کے گواہ ہیں کیونکہ اللہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا۔ اور وہ آزمائش کے ذریعہ مومنوں کو الگ چھانٹ کر کافروں کی سرکوبی کرنا چاہتا تھا۔"

تو گویا یہ اب اللہ کی تقدیر ہے' اس کی تدبیر ہے اور اس کی حکمت ہے' جو ان اسباب کی پس پشت پر کام کر رہی ہے' ان واقعات کے پیچھے کام کر رہی ہے۔ اور ان تمام اشخاص اور ان کی تمام حرکات کے پیچھے حقیقی موثر ہے۔ اور یہی اسلام کا کامل اور شامل اور جامع تصور ہے۔ اور یہ تصور ان واقعات کے نتیجے میں انسانی ذہن میں بیٹھ جاتا ہے۔ اور پھر ان واقعات پر جو تبصرہ کیا گیا ہے' اس میں بھی اس کی طرف واضح اشارات موجود ہیں۔

۲۔ اس معرکے کے واقعات اور ان پر تبصروں کے ذریعہ ایک دوسری حقیقت واضح ہو کر سامنے آ جاتی ہے۔ یعنی نفس انسانی' فطرت انسانی' انسانی جدوجہد کے مزاج' اور ان تمام امور کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان میں فریضہ اقامت دین کے حصول کے امکانات..... حقیقت یہ ہے کہ نفس انسانی کامل نہیں ہے اور یہ اپنی حقیقت واقعیہ کے اعتبار سے کامل نہیں ہے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ ارتقاء اور ترقی کے اہل بھی ہے اور وہ اس میدان میں ترقی و کمال کی انتہاؤں کو چھو سکتا ہے' جو انتہاء اور حد اس کے لئے مقرر کر دی گئی ہے۔

دیکھئے ہم انسانی جماعتوں میں سے ایک جماعت کا مطالعہ کرتے ہیں' اور یہ جماعت اپنی حقیقی صورت میں ہمارے سامنے موجود ہے۔ یہ جماعت گروہ صحابہ کی صورت میں ہے' جس کے بارے میں قرآن کریم کہتا ہے **كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ**........ .... (تم سب سے بہترین امت ہو' جسے لوگوں کے لئے نکالا گیا ہے) اور یہ خیر امت حضور اکرم ؐ کے صحابہ تھے۔ یہ تمام انسانیت کی روح اور زمین کا نمک تھے۔ لیکن اس جماعت صحابہ کا جو مطالعہ اس سورت میں پیش کیا گیا ہے "تم میں سے جو لوگ مقابلے کے دن پیٹھ پھیر گئے ان کی اس لغزش کا سبب یہ ہے کہ ان کی بعض کمزوریوں کی وجہ سے شیطان نے انکے قدم ڈگمگا دیئے تھے۔ اللہ نے انہیں معاف کر دیا۔" اور بعض دوسرے صحابہ کے بارے میں ہے "مگر جب تم نے کمزوری دکھائی اور کام میں باہم اختلاف کیا' اور جونہی کہ وہ چیز تمہیں دکھائی دی' جس کی محبت میں تم گرفتار تھے تو تم اپنے سردار کے حکم کی خلاف ورزی کر بیٹھے۔ اس لئے کہ تم میں سے کچھ لوگ دنیا کے طالب تھے اور کچھ آخرت کی خواہش رکھتے تھے۔" **وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ**........ "اور دراصل تمہاری اس لغزش کو اللہ نے معاف کر دیا۔"..... انہی کے بارے میں قرآن کہتا ہے "جب تم میں دو گروہوں نے یہ ارادہ کر لیا تھا کہ وہ کمزوری دکھائیں اور اللہ تو ان کا مددگار تھا' اللہ ہی پر اہل ایمان کو توکل کرنا چاہئے۔" انہی حضرات میں سے بعض لوگ شکست کھاتے ہیں اور وہ کھل کر سامنے آجاتے ہیں اور ان کی ہزیمت کے بارے میں خود اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں :

"یاد کرو جب تم بھاگے چلے جا رہے تھے' کسی کی طرف پلٹ کر دیکھنے تک کا ہوش تمہیں نہ تھا۔ اور رسول تمہارے پیچھے تم کو پکار رہا تھا۔ اس وقت تمہاری اس روش کا بدلہ اللہ نے تمہیں یہ دیا کہ تم کو رنج پر رنج دیئے تاکہ آئندہ کے لئے تمہیں یہ سبق ملے کہ جو کچھ تمہارے ہاتھ سے جائے یا جو مصیبت تم پر نازل ہو اس پر ملول نہ ہو۔"

جنگ بدر کے شرکاء سب کے سب مومن اور مسلم تھے۔ لیکن یہ اسلام کا ابتدائی دور تھا۔ اس وقت جماعت کی تربیت اور تشکیل ہو رہی تھی۔ لیکن وہ اسلامی نظریۂ حیات اپنانے میں سنجیدہ اور سچے تھے۔ انہوں نے اپنا تمام معاملہ اللہ کے سپرد کر دیا تھا۔ اللہ کی راہنمائی پر راضی ہو گئے تھے۔ انہوں نے اس کے نظام زندگی کے آگے سر تسلیم خم کر لیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ نے انہیں اپنے جوار رحمت سے

دھتکار نہ دیا۔ بلکہ ان پر رحم فرمایا اور انہیں معاف کر دیا۔ اور حضور ﷺ کو بھی حکم دیا کہ وہ انہیں معاف کر دیں۔ اور ان کے لئے مغفرت طلب کریں۔ اور اللہ نے حضور ﷺ کو یہ حکم بھی دیا کہ آپ ﷺ ان سے مشورہ بھی لازماً کریں۔ باوجود اس کے کہ ان سے غلطیاں ہوئیں' باوجود اس کے کہ مشورے کے نتیجے میں' احد میں نقصان ہوا۔ اللہ نے انہیں اپنے معاملات اور تصرفات کے نتائج کا مزہ چکھنے دیا۔ اور انہیں ایسے سخت اور تلخ ابتلا میں ڈالا۔ لیکن ان غلطیوں کے باوجود انہیں اسلامی صفوں سے باہر نکال کر نہیں پھینک دیا۔ اور یہ حکم صادر نہیں کیا: "جاؤ تم اس کام کے لئے فٹ نہیں ہو' کیونکہ تجربے نے ثابت کر دیا ہے کہ تم سے کمزوریاں سرزد ہوئیں اور تم نے غلطیاں کیں۔" بلکہ اسلام نے ان کی غلطیوں اور کمزوریوں کو قبول کر لیا۔ اس ابتلا میں ڈال کر ان کی تربیت کی۔ اس کے بعد ان کی غلطیوں پر تبصرہ کر کے مزید تربیت کی۔ اور اس کے بعد نصیحت کر کے اور ہدایات دے کر مزید تربیت کی۔ اور یہ نصیحت اور یہ وعظ بھی نہایت ہی مشفقانہ انداز میں اور عفو و درگزر کے ساتھ کیا۔ جس طرح ایک بزرگ اپنے بچوں کی تربیت کرتا ہے۔ وہ آگ سے جلائے جاتے ہیں تاکہ انہیں معلوم ہو کہ آگ جلاتی ہے اور تاکہ وہ ہوشیار ہو جائیں۔ اللہ نے ان کے ضعف کو ان پر آشکارا کیا اور ان کے دلوں کی خفیہ سوچوں سے بھی انہیں آگاہ کر دیا۔ اس لئے نہیں کہ انہیں شرمندہ کیا جائے' یا ذلیل کیا جائے' یا حقیر سمجھا جائے یا یہ کہ انہیں مجبور کیا جائے اور ان پر وہ بوجھ ڈالا جائے جس کے وہ متحمل نہیں ہو سکتے' بلکہ اس لئے کہ ان کے ہاتھ پکڑے جائیں' انہیں ہدایت دی جائے۔ ان کے اندر خود اعتمادی پیدا کی جائے اور وہ اپنے آپ کو حقیر نہ سمجھیں اور کبھی بھی مایوس نہ ہوں جب تک وہ اللہ کی مضبوط رسی کو تھامے ہوئے ہے۔

اس تربیت کے بعد وہ اپنے اصل مقام پر آگئے۔ اپنی آخری منزل پر پہنچ گئے اور ان کے اندر وہ رنگ پیدا ہو گیا جو احد کے معرکہ کے آغاز میں تھا۔ آج ہزیمت اور چوٹ لگنے پر ایک ہی رات گزری ہے۔ وہ رسول خدا ﷺ کے ساتھ تعاقب کے لئے نکل رہے ہیں۔ آج نہ ان کے دل میں ڈر تھا نہ تردد تھا۔ آج وہ ڈرانے والوں کی باتوں کو خاطر ہی میں نہ لا رہے تھے' جو انہیں ان الفاظ میں ڈرا رہے تھے :

اَلَّذِیْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِیْمَانًا ۖ وَّقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِیْلُ

"جن سے لوگوں نے کہا کہ تمہارے خلاف بڑی فوجیں جمع ہوئی ہیں' ان سے ڈرو۔ تو یہ سن کر ان کا ایمان اور بڑھ گیا اور انہوں نے جواب دیا کہ ہمارے لئے اللہ کافی ہے اور وہی بہترین کارساز ہے۔"

اور اس کے بعد جب افراد جماعت بڑے اور بالغ ہوتے گئے تو ان کا معاملہ بھی بدلتا گیا اور ان کا محاسبہ اس طرح کیا جانے لگا جس طرح بڑے اور بالغ افراد کا کیا جاتا ہے۔ لیکن ابتداء میں ان کی تربیت اسی طرح تھی جس طرح بچوں کی تربیت کی جاتی ہے۔ جو شخص غزوہ تبوک کے حالات پڑھے گا (سورت برأت میں) چند افراد اس غزوہ سے پیچھے رہ گئے تھے۔ رسول خدا ﷺ نے ان کا سخت محاسبہ کیا۔ یہ بہت ہی سخت محاسبہ تھا۔ اس سے احد اور تبوک کی پالیسی کے درمیان واضح فرق نظر آئے گا اس لئے کہ اب جماعت تربیتی لحاظ سے بہت ہی آگے جا چکی تھی۔ لیکن یہی لوگ جب احد میں تھے' تو ان سے نرمی کی گئی۔ اس لئے کہ اب تبوک کے معاملے میں وہ تربیت کے آخری مرحلے میں تھے۔ لیکن اس کے باوجود وہ تھے تو انسان۔ پھر بھی ان میں انسانی کمزوری تھی' غلطی ہو گئی' لیکن ان کے اندر غلطی کا اعتراف اور توبہ کا داعیہ موجود تھا' آخر کار معافی ہوئی۔

غرض اسلامی نظام زندگی کے اندر انسان کی بشریت کو ہمیشہ پیش نظر رکھا گیا ہے۔ اسے تبدیل نہیں کیا جاتا' اسے معطل نہیں کیا جاتا' اس پر اس قدر بوجھ نہیں ڈالا جاتا کہ اس کی طاقت سے باہر ہو۔ اگرچہ اسلامی نظام زندگی اسے اس دنیا میں اس مقام بلند تک پہنچاتا ہے جو اس کے لئے مقدر ہو۔

اسلام کا یہ طرز عمل اس نقطہ نظر سے بہت ہی اہم ہے کہ وہ انسان کو ہمیشہ امید کی کرن سے نوازتا ہے تاکہ وہ سعی برائے کمال جاری رکھے اور آگے بڑھے۔ لیکن اسلامی نظام زندگی کے سایے میں' یہ جماعت جس مقام بلند تک پہنچی وہ اس گرے ہوئے مقام سے اپنے سفر کا آغاز کر کے پہنچی جس میں وہ اس وقت پڑی تھی' جب اسلام آیا۔ راستے میں اس سے لغزشیں ہوتی رہیں' اس لئے کہ راستہ دشوار گزار تھا' اور وہ جماعت بہرحال ایک انسانی جماعت تھی اور ایک نہایت ہی پسماندہ سوسائٹی سے اٹھی تھی جو جاہلیت میں ڈوبی ہوئی تھی۔ ہر لحاظ سے پسماندہ تھی جب کہ ہم نے اس کے نمونے تشریح آیات کے وقت پیش کئے۔ اسلام کی اس پالیسی کا اثر یہ ہوتا ہے کہ وہ انسانیت کو اس مقام بلند تک پہنچنے کی امید سے مالامال کر دیتا ہے۔ اگرچہ کسی معاشرے کے موجودہ حالات بد سے بدتر ہوں۔ پھر اس پسماندہ سوسائٹی سے امت کو اٹھا کر اسلام اس قدر ترقی دیتا ہے کہ اس کی مثال آج تک پوری انسانی تاریخ میں نہیں ملتی۔ ابھی تک اس مثال کو دہرایا نہیں جاسکا حالانکہ یہ کوئی معجزانہ انقلاب نہ تھا' جو اب ناقابل اعادہ ہے بلکہ یہ ایک ایسا انقلاب تھا جو اسلامی نظام زندگی کے تحت رونما ہوا' جو انسانی جدوجہد کے نتیجے میں رونما ہوا۔ انسانی طاقت کے حدود کے اندر رونما ہوا۔ آج بھی یہ انقلاب اسی انسانی طاقت کے بل بوتے پر برپا کیا جاسکتا ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ انقلاب ممکن ہے۔

غرض اسلامی نظام زندگی پر سوسائٹی کو وہاں سے لیتا ہے جہاں وہ موجود ہوتی ہے اور جہاں تک وہ مادی ترقی کر چکی ہوتی ہے۔ اس کے بعد وہ اسے مزید ترقی دیتا ہے جب کہ اس نے عربوں کی جاہلیت زدہ اور پسماندہ سوسائٹی کے ساتھ کیا جو نہایت ہی ابتدائی مدارج پہ تھی۔ نہایت گری ہوئی اور اس سوسائٹی کو اسلام نے نہایت ہی ایک مختصر عرصے میں' جو ربع صدی سے بھی کم تھا' اوج کمال تک پہنچایا۔

لیکن اس کے لئے واحد شرط ضروری ہے۔ وہ یہ کہ کوئی انسانی سوسائٹی اپنی نکیل اس نظام کے ہاتھ میں دے دے۔ اس پر ایمان لائے' اس کے آگے سر تسلیم خم کر دے۔ وہ اسے اصول حیات بنا دے' وہ اسے اپنی تحریک کا شعار بنا دے' اور اس طویل اور دشوار گزار سفر میں اس کے ساتھ ہم قدم ہو جائے۔

۳۔ ایک تیسری حقیقت جسے اس معرکے نے چھانٹ کر رکھ دیا اور اس پر تبصرہ بھی کیا' یہ تھی کہ اسلامی نظام زندگی کے اندر فرد مسلم اور جماعت مسلمہ کے درمیان ایک نہایت ہی پختہ رابطہ ہوتا ہے۔ ایک مسلم فرد کا رابطہ اس معرکے سے بھی ہوتا ہے جس میں جماعت مسلمہ کود جاتی ہے خواہ یہ معرکہ جس میدان میں بھی ہو۔ یہ رابطہ عقائد و تصورات کے میدان میں بھی ہوتا ہے۔ اخلاق اور طرز عمل میں بھی ہوتا ہے اور سیاسی تنظیم اور اقتصادی معاملات کے اندر بھی ہوتا ہے۔ غرض تمام اجتماعی معاملات کے اندر ہوتا ہے۔ جب فتح ہو تو بھی ہوتا ہے اور شکست ہو تو بھی ہوتا ہے۔ کیونکہ اسلامی جماعت کی فتح و شکست کے یہ بنیادی عناصر ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ اسلامی نظام زندگی نفس انسانی اور حیات بشری کے وسیع اور عریض میدان میں کام کرتا ہے۔ یہ اس قدر وسیع میدان ہے کہ جس کی مختلف سمتیں ایک دوسرے سے ملی ہوئی ہیں۔ جس کے نقطے ایک دوسرے میں داخل ہیں اور جس کے خطوط اور جس کی تاریں ایک دوسرے کے ساتھ مربوط اور مخلوط ہیں۔ ایک دوسرے کے لئے تکمیل کنندہ ہیں اور ایک دوسرے کے ساتھ شامل اور وابستہ ہیں۔ اور اگر ان خطوط اور نقاط کے اندر سمتوں اور تاروں کے درمیان خلل ہو جائے تو کوئی نقشہ یا کوئی منصوبہ درست طور پر کام نہیں کر سکتا۔

اسلام چونکہ مکمل نظام حیات ہے اس لئے یہ اس کی ایک امتیازی خصوصیت ہے۔ یہ اس پوری زندگی کو ایک اکائی کی حیثیت سے لیتا ہے۔ وہ اس زندگی کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے یا اس کے اجزاء کر کے نہیں لیتا۔ وہ نفس انسانی اور حیات انسانی کو ہر طرف سے لیتا ہے اور اس زندگی کے مختلف تار و پود کو جو ایک دوسرے کے ساتھ پوری طرح مربوط ہوتے ہیں' اپنے ہاتھ میں لے لیتا ہے۔ اور ان تمام ڈوریوں کو

متناسق اور متوازن طور پر بہاتا ہے۔ وہ نفس انسانی کو اجتماعی زندگی سے نہیں کاٹتا اور نہ ہی زندگی کے ٹکڑے اور حصے بخرے کرتا ہے۔

اسلام کی اس جامعیت کی مثال اور اس کے باہم متداخل رابطوں کی مثال اس وقت سامنے آتی ہے جب قرآن مجید معرکہ بدر میں ان کی غلطیوں پر تبصرہ کرتا ہے۔ اور یہ بتاتا ہے کہ فتح و شکست میں اس کے کیا اثرات مرتب ہوئے۔ قرآن کریم کا فیصلہ یہ ہے کہ ہزیمت اس شیطانی عمل کی وجہ سے ہوئی جس میں شیطان نے بعض لوگوں کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھایا: "تم میں سے وہ لوگ جو جنگ کے دن پیٹھ پھیر گئے' انہیں ان کی بعض غلطیوں کی وجہ سے شیطان نے لغزش میں مبتلا کر دیا۔" .... جبکہ وہ لوگ جو انبیاء کے ساتھ مل کر لڑے' ان کے ساتھ وفاداری کی' وہ ایک ایسا ماڈل اور نمونہ ہیں جن کی پیروی کی توقع مسلمانوں سے کی جاتی ہے کہ انہوں نے اپنے معرکے کا آغاز اپنی کوتاہیوں کی طلب مغفرت سے کیا۔ "اس سے پہلے کتنے ہی نبی ایسے گزر چکے ہیں جن کے ساتھ مل کر بہت سے خدا پرستوں نے جنگ کی۔ اللہ کی راہ میں جو مصیبتیں ان پر پڑیں ان سے وہ دل شکستہ نہیں ہوئے' انہوں نے کمزوری نہیں دکھائی۔ وہ سرنگوں نہیں ہوئے۔ ایسے ہی صابروں کو اللہ پسند کرتا ہے۔ ان کی دعا بس یہ تھی کہ اے ہمارے رب ہماری غلطیوں اور کوتاہیوں سے درگزر فرما' ہمارے کام میں تیرے حدود سے جو کچھ تجاوز ہو گیا ہو' اسے معاف کر دے' ہمارے قدم جما دے اور کافروں کے مقابلے میں ہماری مدد کر۔ آخر کار اللہ نے ان کو دنیا کا ثواب بھی دیا اور اس سے بہتر ثواب آخرت بھی عطا کیا۔ اللہ کو ایسے ہی نیک عمل لوگ پسند ہیں۔" .... جب اللہ تعالیٰ جماعت مسلمہ کو ہدایات دیتے ہیں تو وہ انہیں میدان معرکہ میں پہلے کمزوری اور پریشانی سے منع فرماتے ہیں۔ اور اس کے بعد اللہ تعالیٰ انہیں ہدایات دیتے ہیں۔ وہ ذاتی پاکیزگی اختیار کریں اور استغفار کرتے رہیں: "دوڑ کر چلو اس راہ پر جو تمہارے رب کی بخشش اور اس جنت کی طرف جاتی ہے جس کی وسعت زمین اور آسمانوں جیسی ہے۔ اور وہ ان خدا ترس لوگوں کے لئے مہیا کی گئی ہے جو ہر حال میں اپنے مال خرچ کرتے ہیں خواہ بدحال ہوں یا خوش حال ہو' جو غصے کو پی جاتے ہیں اور دوسروں کے قصور معاف کر دیتے ہیں۔ ایسے نیک لوگ اللہ کو پسند ہیں اور جن کا حال یہ ہے کہ کبھی کوئی فحش کام ان سے سرزد ہو جاتا ہے یا کسی گناہ کا ارتکاب کر کے وہ اپنے اوپر ظلم کر بیٹھتے ہیں تو معاً اللہ انہیں یاد آ جاتا ہے اور اس سے وہ اپنے قصوروں کی معافی چاہتے ہیں۔ کیونکہ اللہ کے سوا اور کون ہے جو گناہ معاف کر سکتا ہے اور وہ کبھی دانستہ اپنے کیے پر اصرار نہیں کرتے۔"

اس سے قبل قرآن نے اہل کتاب کی ذلت اور ان کی ٹوٹ پھوٹ کی علت یہ بیان کی کہ انہوں نے معصیت کا ارتکاب کیا اور حد سے تجاوز کیا۔ یہ جہاں بھی پائے گئے ان پر ذلت کی مار پڑی' کہیں اللہ کے ذمہ یا انسانوں کے ذمہ میں پناہ مل گئی تو یہ اور بات ہے۔ یہ اللہ کے غضب میں گھر چکے ہیں۔ ان پر محتاجی اور مغلوبی مسلط کر دی گئی ہے۔ اور یہ سب کچھ صرف اس وجہ سے ہوا ہے کہ یہ اللہ کی آیات سے کفر کرتے رہے اور انہوں نے پیغمبروں کو ناحق قتل کیا اور یہ ان کی نافرمانیوں اور زیادتیوں کا انجام ہے۔"

اس معرکہ کے واقعات کے درمیان غلطی اور غلطی سے رجوع اور توبہ کی بات بھی ہوتی ہے۔ اور تقویٰ اور خدا خوفی کی تلقین بھی بار بار کی جاتی ہے بلکہ تقویٰ اور خدا خوفی کی تلقین اس صورت میں بہت زیادہ ہے۔ اور توبہ اور خدا خوفی کے مضامین کا اس سورت کے مختلف النوع مضامین سے گہرا تعلق ہے۔ نیز یہ دعوت بھی یہاں دی جاتی ہے کہ سودی کاروبار کو ترک کرو' اللہ اور رسول کی اطاعت کرو' لوگوں کی غلطیوں کو معاف کرو' غصے پر قابو پاؤ اور ہر کسی کے ساتھ احسان کرو۔ یہ سب امور تقویٰ' تزکیہ نفس اور اجتماعی معاملات میں صفائی کے موضوعات سے تعلق رکھتے ہیں۔ غرض یہ پوری سورت باہم مربوط ہے اور ایک نہایت ہی اہم مقصد کی طرف بڑھتی نظر آتی ہے۔

۴۔ چوتھی حقیقت اسلامی تربیت کے منہاج سے متعلق ہے۔ پہلے یہاں واقعات بیان کیے جاتے ہیں' پھر ان واقعات کے نتیجے میں ذہن انسانی میں جو تاثرات' جو سوچ' جو شعور اور جو خواہشات پیدا ہوتی ہیں' پھر قرآن ان سے بحث کرتا ہے' اور اس کے بعد ان سب پر

قرآن مجید تبصرہ کرتا ہے۔ جس طرح غزوۂ احد کے واقعات اور تاثرات کے بعد قرآن نے ان پر تبصرہ کیا ہے۔ اس تبصرے میں قرآن کریم نفس انسانی کے ہر اس پہلو کو لیتا ہے جو ان واقعات سے متاثر ہوا تاکہ اس میں اگر کوئی غلطی ہو تو اس کی تصحیح کر دے اور نفس کے اندر اصل حقائق کا ذخیرہ جمع کر دے جو اسلام جماعت مسلمہ کے نفوس کے اندر پختہ طور پر بٹھانا چاہتا ہے۔ اس سلسلے میں قرآن کریم کسی پہلو کو بھی نظر انداز نہیں کرتا کسی سوچ و خیال کو بھی نہیں چھوڑتا کسی تصور کو نہیں چھوڑتا کسی رجحان اور میلان کو نہیں چھوڑتا لوگوں کو اس کی طرف متوجہ کرتا ہے اور ان پر روشنی ڈالتا ہے۔ انسانی نفس کے پوشیدہ ترین گوشوں کو سامنے لاکر ان میں پائے جانے والے خفیہ میلانات کو سامنے لایا جاتا ہے۔ یوں نظر آتا ہے کہ انسان کا دل و دماغ بالکل عیاں اور ننگا ہو کر سامنے کھڑا ہے۔ اس طرح انسان کے اندرون کا تزکیہ ہوتا ہے۔ اسے پاک کیا جاتا ہے' اس کی تطہیر ہوتی ہے اور نہایت ہی روشنی میں' انسانی شعور اور تصور کی تصحیح کی جاتی ہے اور ان اصولوں کو برقرار رکھا جاتا ہے جن پر وہ اسلام کے متعین تصور حیات کو استوار کرنا چاہتا ہے اور جس پر قرآن کریم اسلامی زندگی کا ڈھانچہ استوار کرنا چاہتا ہے۔ یہ وہ امور ہیں جن کے ذریعہ قرآن جماعت مسلمہ کی تربیت کرتا ہے۔ وہ کسی بھی واقعہ کو ذریعہ تربیت بناتا ہے اور یہ ہدایت دیتا ہے کہ یہ تربیت وسیع بنیادوں پر ہو اور عملی ہو۔

غزوۂ احد پر کئے جانے والے اس تبصرے پر جب ہم نگاہ ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس میں بڑی جامعیت' بڑی دقت نظر اور گہرائی پائی جاتی ہے۔ دقت نظر کے ساتھ ہر موقف' ہر حرکت اور ہر خلجان کو لیا گیا ہے۔ بڑی گہرائیوں کے اندر جاکر نفس انسانی اور اس کے شعور کے اندر خفیہ اور دفن احساسات کو لیا گیا ہے اور جامع اس قدر کہ نفس انسانی' اس کے تمام پہلوؤں اور تمام واقعات کو لیا گیا ہے۔ پھر ان واقعات کے اسباب کا گہرا تجزیہ کیا گیا ہے اور اس کے عمومی اسباب سامنے لائے گئے ہیں اور یہ بتایا گیا ہے کہ کن عوامل اور کن اسباب نے کیا نتائج پیدا کئے ہیں اور پھر بیان واقعات کے اندر زندگی سے بھرپور' ہدایات و اشارات سے مالامال اور موثر تصویر کشی کا انداز اختیار کیا گیا ہے۔ یوں نظر آتا ہے کہ گویا تصویر کشی کے اندر اور واقعات کے انداز تعبیر میں شعور اور سوچوں کا طلاطم برپا ہے اور موج پر موج اٹھ رہی ہے اور شعور کی یہ موجیں نہایت ہی گہری نہایت ہی خوفناک اور ساحل پر چڑھ دوڑنے والی ہیں۔ یہ بیان محض توصیفی تبصرہ نہیں ہے بلکہ یہ زندہ تبصرہ ہے' جو مناظر کو آنکھوں کے سامنے منقش کر دیتا ہے۔ یہ مناظر متحرک ہیں' ان کے اندر زندگی حرکت کرتی ہوئی نظر آتی ہے' نہایت ہی چمکدار اور نہایت ہی معانی آفریں۔

۵۔ پانچویں حقیقت یہ ہے کہ اسلامی نظام زندگی ایک حقیقت پسند اور واقعیت پسند عملی نظام ہے۔ وہ اپنے آثار عالم واقعات میں پیدا کرتا ہے اور اس کے لئے وہ مسلسل عملی جدوجہد کی راہ اختیار کرتا ہے۔ وہ صرف نظریات اور محض عمل سے عاری اور مجرد اصولوں میں دلچسپی نہیں لیتا۔ وہ ہر مرحلے پر اپنی ہدایات کا عملی انطباق اور اطلاق چاہتا ہے۔ اس کی واضح ترین مثال غزوۂ احد کے واقعات میں اصول شوریٰ کا عملی انطباق اور مظاہرہ ہے۔

حضور ؐ کے لئے یہ ممکن تھا کہ آپ ؐ امت کو شوریٰ کے نتیجے میں سامنے آنے والے تلخ تجربے سے بچاکر لے جاتے جبکہ تحریک اسلامی نوخیز تھی' ہر طرف سے دشمنوں کے گھیرے میں تھی' اور دشمن نے مدینہ کی فصیل کے نیچے ڈیرے ڈالے ہوئے تھے۔ میں کہتا ہوں کہ حضور ؐ کے لئے یہ ممکن تھا کہ وہ اس تلخ تجربے سے اس نوخیز تحریک کو بچاکر لے جاتے' جس سے وہ اس واقعہ کے اندر دوچار ہوئی۔ اگر آپ اپنی رائے میں یہ عمل فرماتے اور بطور استدلال اپنے سچے خوابوں کو پیش فرماتے' ان خوابوں کے اندر یہ اشارہ دیا گیا تھا کہ مدینہ ایک مضبوط ڈھال ہے' اور آپ سرے سے مشورہ ہی نہ کرتے' یا اس مشورے کو قبول نہ کرتے جو پارلیمنٹ نے کثرت رائے سے پاس کر دیا تھا اور بڑے پرجوش طریقے سے یا جب آپ ؐ وردی میں نکلے تو بھی یہ پیش کش ہو گئی تھی کہ آپ اپنی رائے پر ہی عمل کریں جبکہ شوریٰ کے

پر جوش لوگ اپنی رائے واپس لے رہے تھے جنہیں احساس ہو گیا تھا کہ انہوں نے حضور کو باہر نکلنے پر مجبور کر دیا۔ لیکن 'باوجود اس کے کہ آپ کو نتائج کا اچھی طرح اندازہ تھا' آپ نے شوریٰ کے فیصلے کو نافذ کیا۔ جن امور تک وہ پہنچ گئی تھی ان پر عمل کیا گیا۔ اس لئے کہ حضور یہ سمجھانا چاہتے تھے کہ جماعت کی اکثریت کا احترام اور پابندی کرو۔ یہ نتائج اچھے نہ ہوں۔ نیز آپ یہ بھی سمجھانا چاہتے تھے کہ اگر اجتماعی رائے اور عمل کے نتیجے میں کچھ تلخ نتائج بھی سامنے آجائیں انہیں برداشت کرو۔ اس لئے کہ آپ یہ اچھی طرح جانتے تھے کہ نقصانات اور خسارے کے مقابلے میں اصول شوریٰ کی اہمیت زیادہ ہے۔ اور یہ کہ جماعت کو شوریٰ کے اس عملی تجرباتی مرحلے سے محروم نہیں رکھنا چاہئے۔ اس لئے کہ اس طرح وہ علم و معرفت اور تربیت و تجربے کے اہم موقعہ سے محروم ہو جائے گی۔

اس کے بعد 'اس معرکے میں تلخ نتائج دیکھنے کے بعد' اس اصول کے جاری رکھے جانے کے احکامات از سرنو آتے ہیں۔ اس لئے کہ اس طرح یہ اصول نہایت ہی موثر انداز میں پاس کیا جاتا ہے اور اسے بحال رکھا جاتا ہے اور اس طرح اسلامی نظام زندگی کے ایک اہم اصول کو استقرار نصیب ہوتا ہے۔

اسلام کا یہ انداز تربیت نہیں ہے کہ کسی اصول کے نفاذ کو اس وقت تک موقوف رکھے جب تک قوم اس کے لئے تیار نہیں ہوتی۔ اس لئے کہ اسلام جانتا ہے کہ وہ اس کے لئے ہرگز تیار نہ ہو سکے گی جب تک اسے عملاً نافذ نہ کر دیا جائے اور یہ کہ امت کو ان زریں اصولوں سے محروم رکھنا ان نتائج کے مقابلے میں بہت ہی برا اور نقصان دہ ہے جو اصول شوریٰ کے نفاذ کے ابتدائی ایام میں نکل سکتے ہیں یا ایسے نتائج کا محض اندیشہ ہے۔ غلطیاں جس قدر عظیم ہوں' وہ اس بات کا جواز نہیں ہیں کہ کسی اصول کو نافذ نہ کیا جائے بلکہ کسی اچھے اصول کو ایک مختصر عرصے کے لئے بھی موقوف رکھنا بہتر نہیں ہے۔ کیونکہ اس عمل سے اس اصول کے ذاتی نشوونما کو موقوف کر دیا جاتا ہے۔ پھر اس کے نفاذ سے جو عملی تجربہ شروع ہو جاتا ہے وہ موقوف ہو جاتا ہے اس طرح پوری امت کی ترقی رک جاتی ہے۔

جب یہ شوریٰ ہوئی' اس کے بعد معرکہ ہوا' اس کے برے نتائج سامنے آئے تو اس پر اللہ تعالیٰ کا یہ حکم آیا فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ .... "انہیں معاف کر دیں' ان کے لئے مغفرت طلب کریں اور الامر میں ان سے مشورہ کریں۔"

غرض نظری اصولوں کے نفاذ کا طریق حضور کی سنت اور احد کے اقدامات سے اخذ کیا جا سکتا ہے کہ آپ نے ایک رائے پاس ہو جانے کے بعد دوبارہ اس مسئلے کو شوریٰ کے سامنے پیش نہ کیا۔ اور اسے دوبارہ نظرثانی کے لئے پیش کرنے کو کمزوری' تردد اور غیر فیصلہ کن صورت تصور کیا گیا۔ یہ محض اس لئے کہ لوگ یہ نہ سمجھیں کہ شوریٰ کا اصول لازمی نہیں ہے اور اس معاملے میں ہمیشہ کے لئے اختلاف رائے ہو جاتا اور عملی اقدامات کے لئے مشکوک صورت حال پیدا ہو جاتی۔ چنانچہ آپ نے فرمایا کہ "کسی نبی کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ خدائی فیصلہ آجانے سے پہلے اپنی وردی اتار دے۔" اور ان تمام واقعات اور احد کے عملی تجربات کے بعد دوبارہ یہ حکم آتا ہے کہ جب عزم صمیم ہو جائے تو پھر توکل کر کے اسے نافذ کرو فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ............................ "غرض اسلام میں اگر کوئی ہدایت ہے تو پھر نفاذ ہے' کوئی تعطل نہیں ہے۔"

۶۔ رسول خدا کے ساتھیوں پر مشتمل جماعت صحابہ اور اس دنیا کے مکرم ترین فدایان رسول پر قرآن مجید نے احد کے واقعات کے بعد جو تبصرہ کیا ہے' اس تبصرے سے ہمیں ایک ایسا سبق ملتا ہے جو آج ہمارے لئے بہت ہی اہم ہے۔ ان لوگوں کے لئے جو آج ہماری دنیا میں از سرنو اسلامی زندگی کا احیاء چاہتے ہیں۔

وہ یہ ہے کہ اللہ کا نظام اپنی جگہ موجود ہے۔ اس کی اقدار اور حسن و قبح کے پیمانے موجود ہیں۔ رہے لوگ تو وہ کبھی اس نظام کے

قریب ہوں گے اور کبھی اس سے دور ہوں گے۔ اس نظام کے اصول اور طرز عمل اختیار کرنے میں وہ کبھی غلطی کریں گے اور کبھی درست موقف اختیار کریں گے۔ لیکن ان کا موقف اور ان کے کسی عمل کا اسلامی نظام ذمہ دار نہیں ہو گا۔ نہ لوگوں کے عمل یا بے عملی سے اسلام کے پیمانے بدل جائیں گے۔ اس لئے کہ ہمارے دور میں لوگ اسلام کو لوگوں کے پیمانے سے ناپتے ہیں۔ اب اگر کوئی غلط کام کرتا ہے تو اس غلط کام کا وہ خود ذمہ دار ہے۔ اگر وہ منحرف ہوتے ہیں تو مسلمانوں کو کہا جائے گا کہ وہ منحرف ہو گئے۔ اسلام کسی کے انحراف اور غلطی سے چشم پوشی نہیں کرتا' اگرچہ وہ نہایت ہی محترم اور قابل قدر ہوں۔ اسلام اپنے اصولوں کے اندر ایسا انحراف نہیں کرتا کہ وہ ان محترم لوگوں کے عمل کے مطابق ہو جائے۔

ہم اس سے یہ سبق لیتے ہیں کہ کچھ شخصیات کو پاک اور بری الذمہ کرنے کے لئے ہمارے لئے یہ مناسب نہ ہو گا کہ ہم اسلامی نظام زندگی میں تبدیلی کر دیں۔ اس امت کی بھلائی اسی میں ہے کہ اسلامی نظام زندگی کے اصول و مبادی قطعی ہوں' صحیح و سالم ہوں' روشن اور واضح ہوں۔ جو لوگ ان سے انحراف کرتے ہیں انہیں منحرف کہا جائے۔ وہ لوگ جو بلند مرتبہ و مقام بھی رکھتے ہوں۔ ان کے انحراف اور بدعملی کے لئے کوئی وجہ جواز تلاش نہ کی جائے' خصوصاً اس طرح کہ اسلامی منہاج کے اندر تحریف کر دی جائے۔ اور اس کی اقدار اور پیمانوں کو بدل دیا جائے۔ اور حالت یہ ہو جائے کہ "خود بدلتے نہیں قرآن کو بدل دیتے ہیں۔" ہمارے لئے یہ زیادہ خطرناک ہے کہ ہم بعض محترم شخصیات کو بچانے کے لئے اسلام کے اندر تحریف کریں۔ اس لئے کہ اسلامی نظام زندگی شخصیات کے مقابلے میں بہت ہی اہم اور ارفع ہے۔ اسلامی تاریخ اس سے عبارت نہیں ہے کہ تاریخ کے اندر مسلمانوں نے جو کہا یا جو طرز عمل اختیار کیا وہ اسلامی تاریخ ہے۔ بلکہ صرف وہی افعال و اقدامات اسلامی تاریخ ہوں گے جو پورے طرح اسلام کے مطابق ہوں اور اسلام کے ثابت شدہ اصولوں کے خطوط پر ہوں۔ ورنہ تمام غیر اسلامی افعال کا اسلام سے کوئی تعلق نہ ہو گا۔ انہیں اسلام کے سر نہ تھوپا جائے گا اور نہ انہیں تاریخ اسلام کہا جائے گا۔ یہ افعال صرف لوگوں کے افعال تصور ہوں گے جنہوں نے ان کا ارتکاب کیا اور ان افعال کے مرتکب اشخاص کو ہی ان کا فاعل تصور کیا جائے گا۔ انہیں غلطی' انحراف اور اسلام سے خروج تصور کیا جائے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ تاریخ اسلام اور تاریخ مسلمانان ایک چیز نہیں ہے۔ اگرچہ لوگ اپنا نام اسلامی رکھیں اور زبان سے اقرار اسلام کریں۔ اسلامی تاریخ' اسلام کے عملی نفاذ کی تاریخ ہے۔ لوگوں کے تصورات میں اسلام کا نفاذ' لوگوں کے طرز عمل میں اسلام کا نفاذ' لوگوں کے طریقہ حیات میں اسلام کا نفاذ' ان کے معاشرے میں اسلام کا نفاذ' اس لئے کہ اسلام ایک قائم محور ہے۔ اس محور کے ارد گرد' زندگی کی عملی چکی کو گھومنا چاہئے' ایک دائرے کے اندر رہ کر جب لوگ اس محور کے دائرے سے باہر نکل جائیں بلکہ وہ سرے سے اس محور ہی کو ترک کر دیں تو ان کا تعلق ہی اسلام کے ساتھ کیا رہ جاتا ہے۔ اور کیوں ہم ان کے اعمال اور ان کے عملی اقدامات کو اسلام کے سر تھوپے جائیں یا اسلام کی تشریح مسلمانوں کے انحرافات کی روشنی میں کیوں کی جائے؟ بلکہ میں پوچھتا ہوں کہ ایسے لوگوں کو مسلمان کیوں کہا جاتا ہے جبکہ نہ صرف یہ کہ وہ اسلام کے محور کے ارد گرد نہیں گھومتے بلکہ اسلام کے دائرے سے بھی خارج ہو چکے ہیں۔ انہوں نے اپنی زندگیوں میں اسلام کے نفاذ سے انکار کر دیا ہے۔ وہ مسلمان تو اس لئے کہلاتے تھے کہ وہ اسلام پر عمل کرتے تھے۔ اپنی زندگی میں اسلام کو نافذ کرتے تھے۔ اس لئے مسلمان نہ تھے کہ ان کے نام اسلامی تھے۔ اس لئے مسلمان نہ تھے کہ وہ زبان سے اقرار مسلمانی کرتے تھے۔

یہ تھا وہ سبق جو اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ مسلمانوں کو دیا جائے' اور امت مسلمہ کو دیا جائے' اسی لئے اللہ تعالیٰ نے پہلی جماعت مسلمہ کی غلطیوں کی نشاندہی کی۔ ان کے نقائص اور ان کی کمزوریوں کو قلمبند کیا گیا اور اس کے بعد اللہ نے اعلان کر دیا کہ اللہ نے انہیں معاف کر دیا ہے۔ ان سے کوئی مواخذہ نہ ہو گا۔ ان کا احترام بحال کر دیا گیا ہے۔ اگرچہ دنیا میں اپنے کمزور موقف کی وجہ سے انہیں تلخ نتائج بھگتنے پڑے۔

درس ۲۸ ایک نظر میں

یہاں تک معرکۂ احد کا بیان ختم ہو جاتا ہے لیکن جماعت مسلمہ اور اس کے ارد گرد نواح مدینہ میں پھیلے ہوئے دشمنان اسلام کے ساتھ معرکہ آرائی ابھی ختم نہ ہوئی تھی۔ خصوصاً یہودیوں نے مباحثے اور مجادلے شروع کر رکھے تھے' تشکیک اور بے چینی پیدا کرنا' سازشیں اور کینہ پروری اور گھات میں بیٹھ کر وار کرنے کے مواقع تلاش کرنا۔ اس معرکے کے ارد گرد یہ اس سورت کے اکثر مباحث پھیلے ہوئے ہیں اور گھومتے ہیں۔

حضور اکرمؐ نے قبیلہ بنی قینقاع کو مدینہ کے قرب و جوار سے جلاوطن کر دیا تھا کیونکہ غزوۂ بدر کے بعد وہ سخت بوکھلا گئے تھے اور انہوں نے سازشیں شروع کر دی تھیں۔ انہوں نے مسلمانوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ شروع کر دی تھی اور جو عہد و پیمان ان کے ساتھ ہوئے تھے ان کو وہ کھلے بندوں توڑتے تھے۔ یہ عہد ان کے ساتھ حضور کے مدینہ طیبہ میں ہجرت کرنے کے متصلاً بعد ہوئے تھے۔ اور اس وقت ہوئے تھے کہ اوس و خزرج کی اکثریت کے اسلام میں داخل ہونے کی وجہ سے مدینہ میں اسلامی ریاست قائم ہو گئی تھی۔ لیکن مدینہ کے ارد گرد بنی النضیر' بنو قریظہ ابھی موجود تھے۔ اس کے علاوہ خیبر کے یہودی اور ان کے علاوہ جزیرۃ العرب کے دوسرے یہودی بھی موجود تھے۔ یہ سب لوگ باہم مراسلت کرتے تھے' فوجیں جمع کر رہے تھے۔ مدینہ کے منافقین کے ساتھ رابطے قائم کر رہے تھے اور مدینہ اور مدینہ کے ارد گرد کے کفار کے ساتھ اور مکہ کے مشرکین کے ساتھ ان کے روابط قائم تھے۔ اور مسلمانوں کے خلاف انہوں نے نہ ختم ہونے والی سازشوں کا سلسلہ شروع کر رکھا تھا۔

سورۂ آل عمران کے آغاز ہی میں یہودیوں کو تنبیہ کر دی گئی تھی کہ مسلمانوں کے ہاتھوں تمہارا حشر بھی وہی ہو گا جو مشرکین کا ہوا۔

قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَتُغْلَبُوْنَ وَ تُحْشَرُوْنَ اِلٰى جَهَنَّمَ ؕ وَبِئْسَ الْمِهَادُ ۝ قَدْ كَانَ لَكُمْ اٰيَةٌ فِيْ فِئَتَيْنِ الْتَقَتَا ؕ فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاُخْرٰى كَافِرَةٌ يَّرَوْنَهُمْ مِّثْلَيْهِمْ رَاْيَ الْعَيْنِ ؕ وَاللّٰهُ يُؤَيِّدُ بِنَصْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِي الْاَبْصَارِ ۝

"تمہارے لئے ان دو گروہوں میں نشان عبرت تھا جو (بدر میں) ایک دوسرے سے نبرد آزما ہوئے۔ ایک گروہ اللہ کی راہ میں لڑ رہا تھا اور دوسرا گروہ کافر تھا۔ دیکھنے والے بچشم سر دیکھ رہے تھے کہ کافر گروہ مومن گروہ سے دوچند ہے۔ (مگر نتیجے نے ثابت کر دیا کہ) اللہ اپنی فتح و نصرت سے جس کو چاہتا ہے مدد دیتا ہے۔ دیدۂ بینا رکھنے والوں کے لئے اس میں بڑا سبق پوشیدہ ہے۔"

جب رسول خدا نے ان کو اللہ کی جانب سے آیا ہوا یہ ڈراوا پہنچایا' جو اس لئے نازل ہوا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی نظر میں تھیں وہ تمام سرگرمیاں جو وہ ان دنوں دکھا رہے تھے اور جس غصے کا اظہار ان کی جانب سے ہو رہا ہے اور بدر کے بعد تو وہ مسلسل سازشوں میں لگے ہوئے تھے تو انہوں نے اس ڈراوے کو بہت ہی برے اور حقارت آمیز طریقے سے رد کر دیا۔ انہوں نے کہا: "محمد! اپنے آپ کو غرور میں نہ ڈالو' تم نے بے شک قریش کے بعض لوگوں کو قتل کر دیا۔ یہ لوگ ناتجربہ کار تھے۔ انہیں کیا پتہ تھا کہ جنگ کس طرح لڑی جاتی ہے۔ خدا کی قسم! اگر تم نے کبھی ہم سے جنگ لڑی تو تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ ہم کچھ لوگ ہیں۔ یقیناً تم ہم جیسے لوگ نہ پاؤ گے۔" اس جواب کے بعد

وہ سازشوں میں شریک ہوگئے۔ اس سورت میں ان کی سازشوں کے کچھ رنگ نقل کئے گئے ہیں۔ یہاں تک کہ انہوں نے حضور اکرم ﷺ سے جو عہد و پیمان کیا تھا' اسے انہوں نے توڑ دیا۔ حضور ﷺ نے ان کا محاصرہ کر لیا۔ چنانچہ وہ حضور ﷺ کے فیصلے پر ہتھیار ڈالنے کے لئے آمادہ ہوگئے۔ حضورؐ نے انہیں مدینہ سے جلاوطن کر کے "اذرعات" بھیج دیا۔ یہودیوں کے مدینہ میں صرف دو گروہ رہ گئے بنو قریظہ اور بنو النضیر جو عہد کی پابندی بظاہر کر رہے تھے لیکن خفیہ طور پر یہ بھی سازشوں' مکاریوں' دھوکہ بازی' فتنہ بازی اور افواہیں پھیلانے میں مصروف تھے۔ غرض یہ لوگ وہ تمام کام کرنے لگے جو یہود اپنی پوری تاریخ میں بڑی مہارت سے کرتے آئے ہیں۔ اور کتاب اللہ میں اسے بالکل تفصیلات کے ساتھ ریکارڈ کیا گیا ہے اور پوری کرۂ ارض کی آبادی کو ان سے خبردار کیا گیا ہے کہ اس زمین پر یہ ایک ملعون قوم ہے۔

اس سبق میں بنی اسرائیل کے بعض اقوال و افعال کو لیا گیا ہے۔ نظر آتا ہے کہ وہ بارگاہ رب العزت میں بھی بے ادبی کرنے پر اتر آئے تھے۔ مسلمانوں کے ساتھ برا رویہ تو ان کے لئے کوئی بات ہی نہ تھی۔ یہ لوگ میثاق مدینہ کے مطابق اپنی مالی ذمہ داریاں ادا کرنے سے پہلوتہی کرتے تھے جو معاہدہ انہوں نے خود نبیؐ کے ساتھ کیا تھا' وہ کہتے تھے اِنَّ اللّٰہَ فَقِیۡرٌ وَّ نَحۡنُ اَغۡنِیَآءُ .... "اللہ فقیر ہے اور ہم غنی ہیں۔"

اس سبق میں یہودیوں کے وہ واہی دلائل بھی ملیں گے جو وہ دعوت اسلامی کے خلاف پیش کیا کرتے تھے' جب بھی یہ دعوت انہیں دی جاتی۔ یہ دلائل سب کے سب جھوٹے ہوتے اور تاریخی اعتبار سے بھی ان کی کوئی اصل نہ ہوتی۔ مثلاً یہ کہ وہ اللہ کے ساتھ کئے ہوئے عہد کی بھی خلاف ورزی کر رہے تھے۔ وہ عہد یہ تھا وہ اللہ کے احکام اور سچائی کو بیان کریں گے اور کبھی نہیں چھپائیں گے۔ انہوں نے اس عہد کو توڑ دیا تھا' پس پشت ڈال دیا تھا اور اس کے بدلے انہوں نے مالی فوائد حاصل کئے۔ اپنے پیغمبروں کو ناحق قتل کیا' حالانکہ یہ پیغمبران کے پاس خارق عادت معجزات حسب المطلب ظاہر کر چکے تھے۔ نیز وہ پیغمبر واضح دلائل کے ساتھ آئے تھے مگر ان یہودیوں نے ان کو مسترد کر دیا۔

یہودیوں ان شرمناک اقوال و افعال کے ذکر کی وجہ سے' انبیاء کے ساتھ ان کے برتاؤ اور بارگاہ باری تعالیٰ میں ان کی گستاخیوں کے اظہار و بیان کی وجہ سے' مدینہ کے اردگرد بسنے والے یہودی اس نوخیز جماعت مسلمہ کے دشمن ہوگئے تھے۔ نیز اس سبق میں یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ یہودیوں اور مشرکین کی سازشوں اور ایذا رسانیوں سے مسلمانوں کو کس قدر تکلیف ہو رہی ہے۔ ان امور کا ذکر جماعت مسلمہ کی تربیت کے لئے یہاں نہایت ہی ضروری تھا۔ تاکہ وہ اپنے ماحول سے علی وجہ البصیرت خبردار ہوں کہ ان کے اردگرد جو لوگ رہ رہے ہیں وہ کون ہیں۔ تاکہ اہل ایمان کو اس سرزمین کے حالات اچھی طرح معلوم ہو جائیں جس میں وہ کام کر رہے ہیں۔ نیز یہ کہ ان کی راہ میں کیا کیا مشکلات ہیں' کہاں کہاں ان کے لئے دام زیر زمین بچھے ہیں۔ اور اس راہ میں ان کے لئے کیا کیا مصائب تیار ہیں۔ مدینہ طیبہ میں یہودی مسلمانوں کے خلاف جو سازشیں کر رہے تھے' وہ ان عداوتوں سے کم خطرناک تھیں جو مکہ کے مشرکین مسلمانوں کے ساتھ روا رکھتے تھے۔ غالباً مسلمانوں کے خلاف پوری تاریخ اسلام میں جو سازشیں ہوتی ہیں وہ یہودی کرتے رہے ہیں۔ ہمیشہ یہ لوگ مسلمانوں کے لئے خطرناک رہے ہیں۔

اس اثر آفریں سبق میں پے در پے اس سلسلے میں ہدایات دی گئی ہیں۔ مسلمانوں کو بتایا جاتا ہے کہ کون سی اقدار ہیں جو دائمی ہیں اور کون سی اقدار زائل ہونے والی ہیں۔ اس لئے کہ اس دنیا میں زندگی کی ایک محدود وقت کے لئے ہے۔ ہر نفس ایک دن موت سے دوچار ہونے والا ہے۔ اصل جزاء تو آخرت میں ملے گی۔ اصل کمائی اور خسارے کا پتہ تو وہاں لگے گا۔ وہاں جو شخص آگ سے بچا لیا گیا اور

جنت میں داخل ہو گیا تو گویا وہ کامیاب رہا۔ اور دنیا تو ایسے سازو سامان سے اٹی پڑی ہے جو ہر وقت دھوکے میں ڈال سکتا ہے۔ اور یہ ہمارے اموال' ہماری جانیں ہمارے پاس اللہ کی امانت ہیں۔ اہل کتاب اور مشرکین کی جانب سے اذیت تمہیں پہنچتی رہے گی۔ صرف صبر' خدا خوفی اور اسلام پر پختگی سے عمل ہی تمہیں آگ سے بچاسکتا ہے اور یوں ان سازشوں سے بھی بچاسکتا ہے۔

مدینہ کی پہلی جماعت کو جو ہدایات دی گئی ہیں' وہ آج بھی ہمارے لئے تازہ ہدایات ہیں۔ کل بھی ہمارے لئے یہی ہدایات ہیں۔ جو لوگ اسلام کو از سرنو قائم کرنا چاہتے ہیں اور جو لوگ اسلامی زندگی کا قیام چاہتے ہیں وہ اپنی آنکھوں سے دیکھیں گے کہ ان کے دشمنوں کا وہی مزاج ہے جو مدینہ کے دشمنوں کا تھا۔ یہ دشمن وہی مشرکین اور اہل کتاب کے ملحدین ہیں۔ آج یہودی عالمی صیہونیت کی شکل میں آئے ہیں۔ عیسائی عالمی صلیب کی شکل میں ہیں۔ اور عالمی کیمونزم کی شکل میں ہیں۔ آج بھی تحریک اسلامی کو بتایا جاتا ہے کہ اس کی راہ میں جو مشکلات ہیں' جو دام رکھے ہوئے ہیں' ان کے لئے وہی قربانیاں ہیں' وہی اذیتیں اور وہی ابتلاء ہیں۔ لیکن تم اپنی نظریں آخرت پر رکھو۔ مالی اور جانی نقصانات آج بھی برداشت کرنے پڑیں گے۔ لیکن تمہیں پہلی جماعت اسلامی کی طرح آج بھی وہی سبق یاد کرنا ہو گا۔ "آخر کار ہر شخص کو مرنا ہے۔ اور تم سب اپنے اپنے پورے اجر قیامت کے روز پانے والے ہو' کامیاب دراصل وہ ہے جو وہاں آتش دوزخ سے بچ جائے اور جنت میں داخل کر دیا جائے۔ رہی یہ دنیا' تو یہ محض ایک ظاہر فریب دینے والی چیز ہے..... مسلمانو! تمہیں مال اور جان دونوں آزمائشیں پیش آکر رہیں گی' اور تم ابھی کتاب اور مشرکین سے بہت سی تکلیف دہ باتیں سنو گے۔ اگر ان سب حالات میں صبر اور خدا ترسی کی روش پر قائم ہوئے تو یہ بڑے حوصلے کا کام ہے۔"

غرض قرآن وہی قرآن ہے جو تھا' اس کی حیثیت وہی ہے کہ یہ اس امت کے لئے دائمی ہدایات پر مشتمل کتاب ہے۔ یہ اس امت کا حدی خواں اور رہبر و رہنما ہے۔ یہ اس کے لئے قابل اعتماد قائد ہے..... لیکن اس کے دشمن بھی وہی دشمن ہیں' جو تھے اور انقلاب کی راہ بھی وہی ہے جو تھی۔

☆ ☆ ☆ ☆

درس تشریح آیات

آیت نمبر ۱۸۰ تا ۱۸۹

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ يَبْخَلُونَ بِمَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِن فَضْلِهِ هُوَ خَيْرًا لَّهُم ۖ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ ۖ سَيُطَوَّقُونَ مَا بَخِلُوا بِهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۗ وَلِلَّهِ مِيرَاثُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۗ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ ﴿١٨٠﴾ لَّقَدْ سَمِعَ اللَّهُ قَوْلَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ فَقِيرٌ وَنَحْنُ أَغْنِيَاءُ ۘ سَنَكْتُبُ مَا قَالُوا وَقَتْلَهُمُ الْأَنبِيَاءَ بِغَيْرِ حَقٍّ وَنَقُولُ ذُوقُوا عَذَابَ الْحَرِيقِ ﴿١٨١﴾ ذَٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ أَيْدِيكُمْ وَأَنَّ اللَّهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيدِ ﴿١٨٢﴾ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ عَهِدَ إِلَيْنَا أَلَّا نُؤْمِنَ لِرَسُولٍ حَتَّىٰ يَأْتِيَنَا بِقُرْبَانٍ تَأْكُلُهُ النَّارُ ۗ قُلْ قَدْ جَاءَكُمْ رُسُلٌ مِّن قَبْلِي بِالْبَيِّنَاتِ وَبِالَّذِي قُلْتُمْ فَلِمَ قَتَلْتُمُوهُمْ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ﴿١٨٣﴾ فَإِن كَذَّبُوكَ فَقَدْ كُذِّبَ رُسُلٌ مِّن قَبْلِكَ جَاءُوا بِالْبَيِّنَاتِ وَالزُّبُرِ وَالْكِتَابِ الْمُنِيرِ ﴿١٨٤﴾

۱۸
ع۹
۹

”جن لوگوں کو اللہ نے اپنے فضل سے نوازا ہے اور پھر وہ بخل سے کام لیتے ہیں وہ اس خیال میں نہ رہیں کہ یہ بخیلی ان کے لئے اچھی ہے۔ نہیں ' یہ ان کے حق میں نہایت بری ہے۔ جو کچھ وہ اپنی کنجوسی سے جمع کر رہے ہیں وہی قیامت کے روز ان کے گلے کا طوق بن جائے گا۔ زمین اور آسمانوں کی میراث اللہ ہی کے لئے ہے اور تم جو کچھ کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے۔

اللہ نے ان لوگوں کا قول سنا جو کہتے ہیں کہ اللہ فقیر ہے اور ہم غنی ہیں۔ ان کی یہ باتیں بھی ہم لکھ لیں گے اور اس سے پہلے جو وہ پیغمبروں کو ناحق قتل کرتے رہے ہیں وہ بھی ان کے نامہ اعمال میں ثبت ہے۔ (جب فیصلہ کا وقت آئے گا اس وقت) ہم ان سے کہیں گے کہ لو' اب عذاب جہنم کا مزا چکھو' یہ تمہارے اپنے ہاتھوں کی کمائی ہے' اللہ اپنے بندوں کے لئے ظالم نہیں ہے۔

جو لوگ کہتے ہیں "اللہ نے ہم کو ہدایت کر دی ہے کہ ہم کسی کو رسول تسلیم نہ کریں جب تک وہ ہمارے سامنے ایسی قربانی نہ کرے جسے (غیب سے آکر) آگ کھالے۔" ان سے کہو "تمہارے پاس مجھ سے پہلے بہت سے رسول آچکے ہیں جو بہت سی روشن نشانیاں لائے تھے اور وہ نشانی بھی لائے تھے جس کا تم ذکر کرتے ہو' پھر اگر (ایمان لانے کے لئے یہ شرط پیش کرنے میں) تم سچے ہو تو ان رسولوں کو تم نے کیوں قتل کیا؟" اب اے نبی ﷺ 'اگر یہ لوگ تمہیں جھٹلاتے ہیں تو بہت سے رسول تم سے پہلے جھٹلائے جاچکے ہیں جو کھلی کھلی نشانیاں اور صحیفے اور روشنی بخشنے والی کتابیں لائے تھے۔"

اس مجموعہ آیات میں سے پہلی آیت کے بارے میں کوئی ایسی روایت نہیں ہے کہ اس میں بخیلوں سے مراد کون لوگ ہیں اور یہ کہ بخل کے فعل مذموم سے کن لوگوں کو ڈرایا گیا ہے؟ اور یہ کہ قیامت میں ان کا انجام یہ ہو گا لیکن جس مقام پر یہ آیت ہے' معلوم ہوتا ہے کہ اس کا تعلق بعد میں آنے والی آیات سے ہے جو یہودیوں کے بارے میں وارد ہیں' اس لئے کہ یہ یہودی ہی تھے جنہوں نے یہ کہا تھا کہ اللہ فقیر ہے اور ہم غنی ہیں۔ اور یہ وہی لوگ تھے جنہوں نے کہا تھا کہ اللہ نے ہم سے یہ وعدہ کیا ہے کہ ہم اس وقت تک کسی رسول کو نہ مانیں جب تک وہ کوئی ایسی قربانی نہ لے آئیں جسے آگ جلادے۔"

اصل بات یہ ہے کہ یہ آیت یہودیوں کے بارے میں ہے جنہیں اس وقت یہ دعوت دی جارہی تھی کہ وہ میثاق مدینہ کے مطابق جن مالی ذمہ داریوں کے پابند ہیں' انہیں وہ ادا کریں۔ اور یہ دعوت بھی انہیں دی گئی تھی کہ وہ نبی آخر الزمان کی دعوت کو قبول کرلیں اور اللہ کی راہ میں انفاق کریں۔

چنانچہ یہ تہدید آمیز ڈراوا نازل ہوا' اور اس کے بعد یہودیوں کی ان کٹ حجتی دلائل کو رد کیا گیا جو وہ رسول خدا ﷺ پر ایمان نہ لانے کے لئے پیش کرتے تھے۔ ان دلائل میں نہایت ہی گستاخانہ طرز خطاب اختیار کرتے تھے اور یہ بے ادبی دراصل وہ اپنے رب کی کرتے تھے۔ یہودیوں کو تہدید آمیز تنبیہہ کے بعد حضور اکرم ﷺ کو تسلی دی جاتی ہے' کہ ٹھیک ہے کہ یہ یہود آپ کی تکذیب کر رہے ہیں لیکن آپ سے قبل جو رسول گزرے ہیں ان کے ساتھ بہ نسبت آپ کے سخت رویہ ان کی اقوام نے اختیار کیا تھا۔ ان رسولوں میں سے انبیاء بنی اسرائیل بھی تھے جو ان کے پاس باقاعدہ دلائل لے کر آئے تھے' انہوں نے حسب طلب معجزات بھی پیش کئے جیسا کہ تاریخ بنی اسرائیل میں مشہور ہے۔

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ يَبْخَلُونَ بِمَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ هُوَ خَيْرًا لَّهُمْ ۭ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ ۭ سَيُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ

"جن لوگوں کو اللہ نے اپنے فضل سے نوازا ہے اور پھر وہ بخل سے کام لیتے ہیں وہ اس خیال میں نہ رہیں کہ یہ بخیلی ان کے لئے اچھی ہے۔ نہیں' یہ ان کے حق میں نہایت بری ہے جو کچھ وہ اپنی کنجوسی سے جمع کر رہے ہیں' وہی قیامت کے روز ان کے گلے کا طوق بن جائے گا۔ زمین اور آسمانوں کی میراث اللہ ہی کے لئے ہے۔ اور تم جو کچھ کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے۔"

اس آیت کا مفہوم عام ہے۔ اس سے یہودی بھی مراد ہو سکتے ہیں جو میثاق مدینہ کے تحت عائد ہونے والی مالی ذمہ داریوں میں بخل سے کام لیتے تھے اور دوسرے لوگ بھی اس کے مدلول میں شامل ہیں جو اپنے دیئے سے خرچ نہیں کرتے اور بخل سے کام لیتے ہیں۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ بخل ان کے لئے خیر ہے کہ ان کے مال اس سے محفوظ ہوتے ہیں اور انفاق کی وجہ سے یہ اموال جاتے ہیں۔

یہ آیت انہیں اس قسم کے جھوٹے حسب و کتاب سے منع کرتی ہے' فیصلہ کیا جاتا ہے کہ وہ جو کچھ جمع کرتے ہیں قیامت کے دن ان کے گلے کا طوق ہو گا اور یہ طوق آگ سے بنے گا۔ یہ ایک نہایت خوفناک تہدید ہے۔ انداز تعبیر اس طرح ہے کہ اس بخل کو زیادہ بدشکل کر کے پیش کرتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ان لوگوں کو اللہ نے اپنے فضل سے نوازا ہے اور وہ پھر بھی بخل کرتے ہیں۔ وہ اپنے ذاتی مال میں بخل نہیں کر رہے بلکہ اللہ کے دیئے میں بخل کرتے ہیں۔ وہ جب اس دنیا میں آئے تھے تو ان کے ہاتھ میں کچھ بھی نہیں تھا۔ نہ ان کے ہم قبیلہ لوگوں کے پاس کچھ تھا۔ تو اللہ نے ان پر اپنا فضل کیا اور ان کو سب کچھ دے دیا۔ جب اللہ تعالیٰ نے ان سے یہ مطالبہ کیا کہ وہ خود اس کے دیئے سے اسے کچھ دیں تو انہوں نے اللہ کے فضل و کرم کو یاد نہ کیا اور تھوڑا واپس دینے میں بھی بخیلی کی۔ وہ یہ گمان کرنے لگے کہ یہ ذخیرہ اندوزی ان کے لئے مفید ہو گی حالانکہ یہ ان کے لئے سخت مضر ہے بلکہ شرمناک قسم کی مضرت ہے۔ اس لئے کہ وہ بہرحال اس جہاں سے جانے والے ہیں۔ اس مال اور دولت کو چھوڑنے والے ہیں۔ بعد کے لوگوں کے لئے ہے اور آخر کار اللہ ہی وارث ہو گا۔ اس لئے کہ "اللہ ہی کے لئے میراث ہے آسمانوں اور زمین کی۔" تو پھر یہ سونا اور جمع شدہ دولت تو نہایت ہی تھوڑے عرصے کے لئے رہتی ہے۔ اس کے بعد سب کی سب اللہ کی طرف لوٹتی ہے۔ اور ان کے کھاتے میں تو وہی کچھ ہے جو انہوں نے اللہ کی راہ میں خرچ کیا۔ اللہ کی رضا کے لئے خرچ کیا۔ اس کا اجر ان کو پورا پورا ملے گا اور صرف اس صورت میں وہ آگ کے طوق سے بچ سکتے جب وہ اپنی زائد دولت اللہ کی راہ میں خرچ کر دیں۔

اس کے بعد یہودیوں پر سخت تنقید کی جاتی ہے۔ جن کے ہاتھوں میں دولت تھی۔ یہ دولت انہیں اللہ نے دی تھی۔ اور یہ سمجھنے لگے اپنے آپ کو غنی اور اللہ سے مستغنی کہ انہیں اللہ کی جانب سے کسی اجر اور صلے کی حاجت نہیں ہے۔ اور نہ انہیں دوچند سہ چند ثواب کی ضرورت ہے جو اللہ ان لوگوں کو دیتا ہے جو اس کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اور جسے اللہ اپنا فضل کہتا ہے اور ان لوگوں کی جانب سے قرضہ سے تعبیر کرتا ہے۔ لیکن ان لوگوں نے ایک ذلیل شخص کی حیثیت سے یہ جواب دیا کہ اللہ کو کیا ضرورت ہے کہ وہ ہم سے ہمارا مال قرض مانگتے ہیں اور پھر ہمیں دوگنا کر دیتے ہیں' حالانکہ خود اللہ تعالیٰ ربا سے منع کرتے ہیں اور اضعاف مضاعفہ کو حرام قرار دیتے ہیں۔ ان کی یہ بات الفاظ کا کھیل ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نہایت ہی رذیل اور بے ادب اور گستاخ لوگ ہیں۔

لَقَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ وَّ نَحْنُ اَغْنِيَآءُ ۘ سَنَكْتُبُ مَا قَالُوْا وَ قَتْلَهُمُ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۙ وَّ نَقُوْلُ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ

"اللہ نے ان لوگوں کا قول سنا جو کہتے ہیں کہ اللہ فقیر ہے اور ہم غنی ہیں۔ ان کی یہ باتیں بھی ہم لکھ لیں گے اور اس سے پہلے جو وہ پیغمبروں کو ناحق قتل کرتے رہے ہیں وہ بھی ان کے نامہ اعمال میں ثبت ہے۔ (جب فیصلہ کا وقت آئے گا اس وقت) ہم ان سے کہیں گے کہ لو' اب عذاب جہنم کا مزا چکھو' یہ تمہارے اپنے ہاتھوں کی کمائی ہے' اللہ اپنے بندوں کے لئے ظالم نہیں ہے۔"

اللہ کی ذات کے بارے میں بدترین خیالات یہودیوں کی تحریف شدہ کتابوں کے اندر بھی درج ہیں۔ لیکن قرآن نے ان کا جو قول نقل کیا ہے یہ ان کا ذات باری کے متعلق نہایت گھٹیا تصور ہے۔ اور انتہائی بے ادبی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کو اس قدر تہدید آمیز تنبیہہ کی گئی سَنَكْتُبُ مَا قَالُوْا .... "وہ جو کچھ کہتے ہیں ہم اسے لکھ لیں گے۔" تاکہ ان کا محاسبہ کیا جا سکے۔ ان کی یہ بات یونہی ہوا میں تحلیل نہ ہو جائے گی اور نہ ہی اسے مہمل اور لغو بات سمجھ کر چھوڑ دیا جائے گا۔ ان کی اس گستاخی کے بیان کے ساتھ ساتھ ان

کے سابق کرتوتوں کا ایک حصہ بھی یہاں ذکر کر دیا جاتا ہے۔ یہ وہ گناہ ہیں جو ان کے ہم قوم ماضی میں کرتے رہے ہیں۔ یہ سابقہ گناہ ان کے کھاتے میں اس لئے ڈالے جاتے ہیں کہ ان کی فطرت بدستور وہی ہے۔ وہ اسی طرح نافرمان اور خطاکار تھے۔

وَ قَتْلَهُمُ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ .... "وہ پیغمبروں کو ناحق قتل کرتے رہے ہیں۔"..... بنی اسرائیل کی تاریخ نے قتل انبیاء کے اس مکروہ کام کے واقعات کو محفوظ رکھا ہے اور ان کا آخری کارنامہ وہ تھا جس میں انہوں نے حضرت مسیح علیہ السلام کو قتل کرنے کی سازش کی۔ وہ تو اب بھی بہرحال یہ سمجھتے ہیں کہ انہوں نے حضرت مسیح علیہ السلام کو پھانسی دلوا دی تھی اور اس عظیم جرم پر وہ فخر کرتے ہیں۔

وَّ نَقُوْلُ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ .... "ہم ان سے کہیں گے کہ چکھو آگ میں جلنے کا عذاب۔" لفظ حریق یعنی جلنا اس لئے استعمال ہوا ہے کہ اس عذاب کی خوفناکی نظروں میں آجائے۔ اور یہ بات ذہن میں آجائے کہ یہ عذاب پاتے وقت آگ کے شعلے بھڑک اٹھے ہوں گے، اور وہ اپنا کام ہولناک انداز میں کر رہے ہوں گے۔ آگ میں خوفناک جوش ہو گا۔ یہ اس لئے کہ ان کا یہ فعل بھی اسی قدر مکروہ ہے۔ انبیاء کو قتل کر دینا اور بغیر کسی جواز کے قتل کر دینا اور پھر وہ جو بات کر رہے ہیں وہ بھی بہت ہی گھٹیا ہے کہ اللہ فقیر ہے اور وہ غنی ہیں۔

ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْكُمْ .... "یہ تمہارے ہاتھوں کی کمائی ہے۔" پوری جزاء جس میں نہ ظلم ہے اور نہ ہی کوئی سنگدلی ہے۔

وَ اَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ................ "اللہ اپنے بندوں کے لئے ظالم نہیں ہے۔" یہاں بندوں کے لئے عبید کا لفظ استعمال کرنے سے انسان کی اصل حیثیت بتادی گئی کہ وہ خدا کے مقابلے میں غلاموں کا غلام ہے۔ اور پھر بھی اگر وہ اللہ کی بارگاہ میں اس قدر بے ادبی کرتا ہے اور بندہ اور غلام ہو کر وہ کہتا ہے کہ اللہ فقیر ہے اور ہم غنی ہیں تو یہ کس قدر گستاخی ہے اور پھر اس کے ساتھ ساتھ انبیاء کے قتل جیسا شنیع کام۔

یہ لوگ جو کہتے ہیں کہ اللہ فقیر ہے اور ہم غنی ہیں پھر یہی قاتلون انبیاء بھی ہیں۔ ان کا مزید کارنامہ دیکھو کہ یہ کہتے ہیں کہ ہم محمدؐ پر اس لئے ایمان نہیں رکھتے کہ ہمیں خود اللہ نے یہ کہا ہے کہ وہ اس وقت تک کسی نبی پر ایمان نہ لائیں جب تک وہ ایسی قربانی نہ کرے جسے عالم غیب سے آگ آکر، معجزانہ طور اسے کھانہ لے۔ جس طرح انبیاء بنی اسرائیل میں سے بعض کے ہاتھوں اس قسم کے معجزے کا اظہار ہوا تھا۔ اور جب تک محمدؐ کوئی اس قسم کا معجزہ نہ دکھائیں گے وہ چونکہ اللہ کے ساتھ عہد کر چکے ہیں اس لئے وہ ایمان نہیں لاسکتے۔

یہاں قرآن کریم ان کی اس بات کا تاریخی حوالوں سے جواب دیتا ہے کہ انہوں نے جن انبیاء کو قتل کیا تھا، انہوں نے تو ایسے معجزات دکھادیئے تھے، جو خود انہوں نے طلب کئے تھے۔

اَلَّذِيْنَ قَالُوْۤا اِنَّ اللّٰهَ عَهِدَ اِلَيْنَاۤ اَلَّا نُؤْمِنَ لِرَسُوْلٍ حَتّٰى يَاْتِيَنَا بِقُرْبَانٍ تَاْكُلُهُ النَّارُ ؕ قُلْ قَدْ جَآءَكُمْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِيْ بِالْبَيِّنٰتِ وَ بِالَّذِيْ قُلْتُمْ فَلِمَ قَتَلْتُمُوْهُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ

"جو لوگ کہتے ہیں "اللہ نے ہم کو ہدایت کر دی ہے کہ ہم کسی کو رسول تسلیم نہ کریں جب تک وہ ہمارے سامنے ایسی قربانی نہ کرے جسے (غیب سے آکر) آگ کھالے۔" ان سے کہو "تمہارے پاس مجھ سے پہلے بہت سے رسول آچکے ہیں جو بہت سی روشن نشانیاں لائے تھے

اور وہ نشانی بھی لائے تھے جس کا تم ذکر کرتے ہو' پھر اگر (ایمان لانے کے لئے یہ شرط پیش کرنے میں) تم سچے ہو تو ان رسولوں کو تم نے کیوں قتل کیا؟" یہ نہایت ہی قوی الزامی جواب تھا۔ جس سے ظاہر ہو گیا کہ وہ جھوٹ بولتے ہیں اور بات توڑ موڑ کر بیان کرتے ہیں اور کفر پر اصرار کرتے ہیں۔ اور مزید یہ کہ سخت تکبر کا رویہ اختیار کئے ہوئے ہیں اور اللہ پر افتراء باندھتے ہیں۔

یہاں آکر اب بات کا رخ رسول 'خدا کی طرف مڑ جاتا ہے' آپ کو تسلی دی جاتی ہے اور آپ کی دلجوئی کی جاتی ہے اور آپ کے لئے ان مخالفین کے رویے کو قابل برداشت بنایا جا رہا ہے کہ یہ لوگ ایسا ہی سلوک اپنی تاریخ میں بے شمار رسولوں کے ساتھ کرتے آئے ہیں۔

فَإِنْ كَذَّبُوكَ فَقَدْ كُذِّبَ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ جَآءُوْ بِالْبَيِّنٰتِ وَ الزُّبُرِ وَ الْكِتٰبِ الْمُنِيْرِ........ "یہ لوگ اگر تمہیں جھٹلاتے ہیں تو بہت سے رسول تم سے پہلے جھٹلائے جا چکے ہیں جو کھلی کھلی نشانیاں اور صحیفے اور روشنی بخشنے والی کتابیں لائے تھے۔"

گویا نبی ﷺ پہلے رسول نہیں جن کو اہل کتاب یہودیوں نے جھٹلایا ہو' بنی اسرائیل اپنی پوری تاریخ میں ہمیشہ رسولوں کی تکذیب کرتے آئے ہیں۔ حالانکہ وہ رسول ان کے پاس صحیح دلائل لے کر آئے تھے۔ انہوں نے معجزات پیش کئے تھے۔ انہوں نے ایسے صحائف پیش کئے جن میں الٰہی ہدایات موجود تھیں۔ یعنی زبر..... اور انہوں نے کتاب منیر بھی پیش کی تھی مثلاً تورات اور انجیل۔ غرض یہ رسولوں اور ان کی رسالتوں کا طریقہ کار رہا ہے۔ اور اس راہ میں مشقت اور مصائب ہیں اور یہ واحد طریق کار ہے۔

○.....☆☆☆.....○

اس کے بعد اب بات کا رخ جماعت مسلمہ کی طرف پلٹ رہا ہے۔ اسے بتایا جا رہا ہے کہ جن اقدار حیات کے بارے میں اسے بتایا جا رہا ہے ان کو وہ مضبوطی سے پکڑیں۔ اور ان اقدار کی خاطر قربانیاں دیں۔ پھر بتایا جاتا ہے کہ اس راہ میں کیا کیا مشکلات ہیں' کیا کیا کانٹے ہیں اور کیا کیا متاعب ہیں اور ان مشکلات پر صبر' تقویٰ' برداشت اور عزم صمیم کے ذریعہ قابو پایا جا سکتا ہے۔

كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ۗ وَ اِنَّمَا تُوَفَّوْنَ اُجُوْرَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۗ فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَ اُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ ۗ وَ مَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ﴿۱۸۵﴾ لَتُبْلَوُنَّ فِيْٓ اَمْوَالِكُمْ وَ اَنْفُسِكُمْ ۫ وَ لَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَ مِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا اَذًى كَثِيْرًا ۗ وَ اِنْ تَصْبِرُوْا وَ تَتَّقُوْا فَاِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ﴿۱۸۶﴾

"آخر کار ہر شخص نفس کو مرنا ہے۔ اور تم سب اپنے اپنے پورے اجر قیامت کے روز پانے والے ہو' کامیاب دراصل وہ ہے جو وہاں آتش دوزخ سے بچ جائے اور جنت میں داخل کر دیا جائے۔ رہی یہ دنیا' تو یہ محض ایک ظاہر فریب چیز ہے۔ مسلمانو' تمہیں مال اور جان دونوں کی آزمائشیں پیش آکر رہیں گی' اور تم اہل کتاب اور مشرکین سے بہت سی تکلیف دہ باتیں سنو گے۔ اگر ان سب حالات میں تم صبر اور خدا ترسی کی روش پر قائم رہو' تو یہ بڑے حوصلے کا کام ہے۔"

اس حقیقت کا نفس انسانی کے اندر پوری طرح بیٹھ جانا ضروری ہے کہ اس دنیا کی زندگی بہرحال محدود' وقتی اور ایک متعین تاریخ تک ہے۔ اور اس کا خاتمہ لازمی ہے' یہاں اچھے لوگ بھی مرتے ہیں اور برے بھی رحلت کرتے ہیں۔ یہاں جہاد میں حصہ لینے والے بھی مرتے ہیں اور جو لوگ گھر میں بیٹھے رہتے ہیں وہ بھی مرتے ہیں۔ جو لوگ اپنے نظریات کی وجہ سے سربلند ہوتے ہیں وہ بھی مرتے ہیں جو کبھی ذلت برداشت نہیں کرتے اور وہ بزدل بھی مرتے ہیں جو ہر قیمت پر زندہ رہنا چاہتے ہیں۔ وہ لوگ بھی رحلت کرتے ہیں جن کے عزائم بلند ہوتے ہیں اور جن کے مقاصد پاکیزہ ہوتے ہیں اور وہ مفاد پرست بھی مرتے ہیں جن کے پیش نظر دنیا کی حقیر چیزیں ہوتی ہیں۔

سب مرتے ہیں۔ كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ .... "ہر نفس نے موت کا مزہ چکھنا ہے۔" یہ جام ہر کسی نے منہ سے لگانا ہے۔ ایک دن اسے اس زندگی کو خیر آباد کہنا ہے۔ اس سلسلے میں کسی ایک شخص اور ایک شخص کے درمیان کوئی امتیاز نہیں ہے۔ جام اجل باری باری ہر ایک کے سامنے آتا ہے اور ہر شخص اس کے ساتھ منہ لگاتا ہے۔ فرق اگر ہے تو ایک دوسرے زاویے سے ہے۔ فرق صرف اقدار میں ہے اور فرق انجام میں ہے۔

وَاِنَّمَا تُوَفَّوْنَ اُجُوْرَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَاُدْخِلَ الْجَنَّةَ ... فَقَدْ فَازَ .... "اور تم سب اپنے اپنے پورے اجر قیامت کے روز پانے والے ہو۔ کامیاب دراصل وہ ہے جو وہاں آتش دوزخ سے بچ جائے اور جنت میں داخل کر دیا جائے۔"

یہ ہے ایک موت اور موت کے درمیان فرق۔ یہ انجام ہے جس کے ذریعے فلاں اور فلاں کے درمیان فرق ہو جاتا ہے۔ یہ ہے وہ قیمت جو باقی رہتی ہے اور جس کے لئے سعی اور جدوجہد ضروری ہے۔ اور وہ برا انجام جس سے بچنے کے لئے رات اور دن فکر کرنا چاہئے۔

فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَاُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ .... "جو آتش دوزخ سے بچ جائے اور جنت میں داخل کر دیا جائے تو وہ کامیاب ہے۔" زحزح کا لفظ اپنے زمزمہ ہی سے اپنے مفہوم کو ظاہر کر دیتا ہے۔ وہ ایک صورت حال کا نقشہ نظروں کے سامنے لاتا ہے۔ اس کا ایک خاص پرتو ہے۔ گویا آگ کے اندر کشش ہے' جو بھی اس کے قریب پہنچے وہ اس میں داخل ہو جاتا ہے۔ اس کے دائرے میں آجاتا ہے۔ اس لئے اس کو اس بات کی ضرورت ہوتی ہے کہ کوئی اسے اس جاذبیت سے آہستہ آہستہ چھڑائے تاکہ وہ اس کشش کے دائرے سے باہر آجائے۔ اس لئے جس کے لئے یہ ممکن ہوا کہ اسے اُس دائرے سے کھینچ کر دور کر دیا گیا اور اس آگ کے دائرہ جاذبیت سے ہٹا دیا گیا اور وہ جنت میں داخل ہو گیا تو گویا وہ کامیاب ہو گیا۔

یہ ایک واضح تصویر کشی ہے' ایک زندہ منظر ہے۔ اس میں حرکت ہے اور کھینچا تانی ہے۔ اور حقیقت کے اعتبار سے بھی صورت حال یہی ہوتی ہے۔ آگ میں جاذبیت ہوتی ہے؟ کیا گناہ میں جاذبیت اور لذت نہیں ہوتی؟ کیا نفس انسانی کسی ایسے راہنما کا محتاج نہیں ہے جو اسے آہستہ آہستہ آگ کے دائرہ جاذبیت سے دور کر دے۔ ہاں ضرور ہے اور یہ اسے آگ سے بچاتا ہے۔ کیا انسان مسلسل کوششوں کے باوجود' ہمیشہ عمل میں قصوروار نہیں رہتا۔ الا یہ کہ اس پر خدا کا فضل و کرم ہو۔ ہاں یہ فضل باری تعالیٰ ہی ہے جو اسے آگ سے دور کر دیتا ہے۔ فضل خداوندی اسے آہستہ آہستہ آگ کے دائرے سے کھینچ لیتا ہے۔

وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ .... "اس دنیا کا متاع تو ایک ظاہر فریب چیز ہے۔" دنیا کا سامان تو بہرحال سامان ہی ہے۔ لیکن یہ حقیقی سامان نہیں ہے۔ یہ حالت بیداری اور ہوشیاری کا سامان نہیں ہے۔ یہ دھوکے میں ڈالنے والا سامان ہے۔ انسان اس کے فریب میں آکر متاع سمجھتا ہے۔ یہ ایسا سامان ہے جو فریب اور دھوکہ پیدا کرتا ہے۔ رہا

وہ سامان جو سچائی پر مبنی ہے اور حقیقی سامان ہے' اور جس کے لئے حقیقتاً جدوجہد کرنا چاہئے' وہ آخرت کی کامیابی کا سامان ہے اور آخرت کی کامیابی یہ ہے کہ انسان دوزخ سے ہٹا دیا جائے۔

جب یہ حقیقت نفس انسانی کے اندر جگہ پکڑ لیتی ہے اور جب نفس انسانی اپنے حساب و کتاب سے زندہ رہنے کی تڑپ نکال دیتا ہے' کیونکہ ہر نفس نے بہرحال ایک دن مرنا ہے اور اسی طرح جب اس نے اپنی فہرست ترجیحات سے دنیا کے نظر فریب سامان کو بھی نکال دیا تو اس وقت پھر اللہ اہل ایمان سے بات کرتے ہیں کہ ان کے لئے مال اور جانی آزمائشیں آنے والی ہیں۔ اور اسی وقت پھر وہ ان قربانیوں کے لئے تیار ہوتے ہیں۔

لَتُبْلَوُنَّ فِيٓ اَمْوَالِكُمْ وَ اَنْفُسِكُمْ ۖ وَ لَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَ مِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا اَذًى كَثِيْرًا ۭ وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَ تَتَّقُوْا فَاِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ

"مسلمانو' تمہیں مال اور جان دونوں کی آزمائشیں پیش آکر رہیں گی' اور تم اہل کتاب اور مشرکین سے بہت سی تکلیف دہ باتیں سنو گے۔ اگر ان سب حالات میں تم صبر اور خدا ترسی کی روش پر قائم رہو تو یہ بڑے حوصلے کا کام ہے۔"

عقائد اور نظریات اور دعوت اور تحریک کی سنت یہ ہے کہ ان میں ابتلا' جان کی ابتلا' مال کی ابتلا ضروری ہوتی ہے اور نفس انسانی کو اس میں ثابت قدمی' صبر اور عزم سے مقابلہ کرنا ہوتا ہے۔ اس لئے کہ یہ جنت کی راہ ہے اور جنت تو تب ملتی ہے جب ناپسندیدہ کاموں سے اجتناب کیا جائے اور جنت ان کے اندر گھیری ہوئی ہے اور دوزخ شہوات نفس کے درمیان ہے۔

یہی ایک صورت ہے جس میں کسی دعوت کو لے کر اٹھنے والی جماعت کو برپا کیا جاسکتا ہے۔ اسی صورت میں دعوتی فرائض ادا کئے جا سکتے ہیں۔ یہی طریقہ ہے' ایسی جماعت کی تربیت کا۔ اور صرف اسی طریقے سے اس کی خفیہ قوتوں' بھلائی کی قوتوں' صبر و ثبات کی قوتوں کو جگایا جاسکتا ہے۔ یہ طریقہ کہ فرائض کو عملاً ادا کیا جائے اور لوگوں کی حقیقی حیثیت کو جانا جائے اور زندگی کی اصلیت بھی ذہن میں ہو کہ اس کی کیا حقیقت ہے؟ یہی ایک طریقہ ہے کہ دعوت کے اردگرد مضبوط لوگ جمع ہو جاتے ہیں۔ ایسے ہی لوگ کسی دعوت کو لے کر چلتے ہیں اور اسی کی راہ میں آنے والی مشکلات پر صبر کرتے ہیں اور ایسے ہی لوگوں پر اعتماد کیا جاسکتا ہے۔

کسی بھی دعوت کی قدر ایسے ہی لوگوں کے پاس ہوتی ہے اور وہ اسے اہم سمجھتے ہیں اور اس دعوت کی راہ میں وہ جس قدر مشکلات برداشت کریں گے' اس قدر وہ انہیں عزیز ہوگی۔ اس لئے وہ اس کو کبھی بھی نظر انداز نہ کریں گے' خواہ جیسے حالات بھی ہوں۔

آزمائش کو ہر دعوت کی سنت اس لئے قرار دیا گیا ہے کہ اس سے داعی اور دعوت دونوں مضبوط ہو جاتے ہیں۔ مقابلہ ہی انسان کے اندر سے اس کی خفیہ قوتوں کو جگاتا ہے۔ ان کو نشوونما دیتا ہے' ان کو مجتمع کرتا ہے اور پھر ان کو ایک راہ پر لگاتا ہے۔ کسی بھی جدید دعوت کو چاہئے کہ وہ ان خفیہ قوتوں سے کام لے' انہیں جگائے تاکہ اس کی جڑیں مضبوط ہوں اور وہ معاشرے کے اندر گہری جڑیں رکھتی ہو۔ پھر نظریاتی اعتبار سے اسے چاہئے کہ وہ تروتازہ' اور انسانی فطرت کے اندر رچی بسی ہو۔

حاملین دعوت کو اپنے نفوس کی حقیقت اچھی طرح معلوم ہو' اور وہ جہاد فی سبیل اللہ اور اس زندگی کو ساتھ ساتھ لے کر چلتے ہوں۔ انہیں معلوم ہو کہ نفس انسانی کی حقیقت کیا ہے اور اس کے اندر کیا کیا خفیہ قوتیں ہیں۔ انہیں معلوم ہو کہ ایک جماعت اور ایک معاشرے کی تشکیل کس طرح ہوتی ہے۔ انہیں معلوم ہو کہ ان کی دعوت کے اصول اور ان کی نفسانی خواہشات کے درمیان کہاں کہاں اور

کس کس طرح جنگ ہوگی اور پھر تمام لوگوں کے ساتھ اس دعوت کی جنگ کس طرح ہوگی۔ پھر انہیں معلوم ہو کہ شیطان کن کن دروازوں سے نفس انسانی کے اندر داخل ہو جاتا ہے' راستے میں کہاں کہاں پھسلن ہے اور کہاں کہاں گمراہی کی دلدل ہے۔

اس جہد مسلسل کا ایک فائدہ یہ بھی ہوتا ہے کہ اس پر اس کے مخالفین بھی غور کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ وہ سوچتے ہیں کہ جو اس قدر قربانیاں دیتے ہیں لازماً اس میں کوئی خیر ہوگی کوئی راز تو اس میں ہو گا۔ یہ لوگ اس راہ میں اس قدر مشکلات برداشت کرتے ہیں اور وہ پرعزم طور پر اپنے موقف پر جمے ہوئے ہیں۔ ایک مقام ایسا ضرور آتا ہے کہ مخالفین کے دل پگھل جاتے ہیں' وہ ٹوٹ جاتے ہیں اور آخر کار فوج در فوج تحریک میں داخل ہوتے ہیں۔

غرض دعوت کی یہ سنت ہے۔ اس دعوت کی راہ جو پر مشقت حالات پیش آتے ہیں' ایسے حالات آتے ہیں جن حالات کے اندر تلخ کھینچا تانی قائم رہتی ہے اور اس راہ میں دشمنوں کے حملوں کا مقابلہ ہوتا ہے اور اس راہ میں ہر وقت مشکلات برداشت کر کے اللہ کی رحمت کی امید قائم رکھنا ہوتی ہے اور یہ سب کام صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں جو نہایت ٹھوس لوگ ہوں اور جو نہایت ہی اولوالعزم ہوں۔

وَإِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا فَإِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْأُمُوْرِ .... "اگر تم صبر کرو اور تقویٰ اختیار کرو تو یہ ان لوگوں کے کاموں میں سے ہو گا جو اولوالعزم ہیں۔"

مدینہ کی اسلامی جماعت اس بات کی توقع کرتی تھی کہ اس راہ میں اسے بے پناہ مشکلات پیش آنے والی ہیں۔ وہ اذیت' مصیبت اور مشکلات کی توقع کر رہی تھی۔ چاہے یہ مشکلات جانی ہوں یا مالی۔ یہ ان اہل کتاب کی طرف سے ہوں جو مدینہ کے ارد گرد بستے تھے یا ان دشمن مشرکین کی طرف سے ہوں جو مکہ میں تھے۔ لیکن یہ مشکلات ضرور ان کی راہ میں آئیں گی۔ وہ کبھی بھی شکست تسلیم نہ کریں گی اور کبھی بھی واپس ہو کر شکست تسلیم نہ کریں گی۔ اس جماعت کو یہ بھی یقین تھا کہ اس نے ایک دن ضرور مرنا ہے۔ اور یہ کہ اصل اجر تو وہ ہو گا جو آخرت میں ملے گا اور یہ کہ کامیاب وہی ہو گا جو آگ سے ہٹایا گیا اور جنت میں داخل کر دیا گیا اور یہ کہ دنیا کی زندگی تو متاع غرور ہے۔ مدینہ کی یہ جماعت اس قدر مضبوط بنیادوں پر کھلی زمین پر کھڑی تھی اور وہ اسی شاہراہ پر گامزن تھی جو یقیناً منزل مقصود کو جاتی تھی۔ اور یہ پختہ اور مضبوط زمین اب بھی حاملین دعوت اسلامی کے لئے موجود ہے۔ اور یہ کھلی اور سیدھی شاہراہ ہر انسان کے سامنے ہے۔ اس دعوت کے وہی پرانے دشمن آج بھی اس کے دشمن ہیں۔ صدیوں وقت گزرنے کے باوجود یہ دشمن نہیں بدلے۔ وہ آج تک اس کے خلاف سازشوں میں مصروف ہیں' حالانکہ صدیاں بیت گئیں اور قرآن وہی قرآن ہے اور وہی اس کا پیغام ہے جو تھا۔

ہاں' یہ درست ہے کہ فتنہ و ابتلا کے اسٹائل ہر دور میں بدل جاتے اور اس تحریک کے خلاف پروپیگنڈے کے نئے نئے وسائل سامنے آجاتے ہیں۔ اس کو ایذا دینے کے طریقے بھی نئے آتے رہتے ہیں۔ اس کی شہرت کو خراب کیا جاتا ہے' اس کے تصورات کے بنیادی عناصر کو خراب کیا جاتا ہے۔ ان کی اہمیت کو ختم کیا جاتا ہے اور دعوت کے مقاصد کے بارے میں غلط تاثرات دیئے جاتے ہیں' لیکن اس سلسلے میں واحد اصول یہ ہے :

لَتُبْلَوُنَّ فِيْٓ اَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ۣ وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا اَذًى كَثِيْرًا ۭ

"اے مسلمانو' تمہیں مال اور جان دونوں کی آزمائشیں پیش آکر رہیں گی اور تم اہل کتاب اور مشرکین سے بہت سی تکلیف دہ باتیں سنو گے۔"

اس سورت میں اہل کتاب کی سازشوں کے ایک بڑے حصے کو بے نقاب کیا گیا ہے۔ یہ ان کے پروپیگنڈے اور شکوک و شبہات پھیلانے کے نمونوں سے بھری پڑی ہے۔ کبھی یہ شکوک و شبہات اصل دعوت اور اس کے اصول کے اندر پیش کیے جاتے ہیں۔ کبھی اس دعوت کے حاملین اور کارکنوں کے خلاف شبہات پھیلائے جاتے ہیں۔ اور اس کام کا اسٹائل اور شکل و صورت ہر دور میں بدل جاتی ہے۔ اور جدید وسائل' نشرو اشاعت کے بعد اس کے رنگ ڈھنگ بہت ہی بدل گئے ہیں۔ اور یہ تمام کام اسلام کے نظریاتی کام کے خلاف مسلسل ہو رہا ہے۔ نیز اس کا اول ٹارگٹ اسلامی جماعت اور اس کی قیادت ہوتی ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے مذکور بالا آیت میں جو فریم ورک دیا ہے یہ کام آج بھی بہرحال اسی کے اندر ہو رہا اور جس مزاج کا اللہ تعالیٰ نے بنایا ہے اس مزاج سے ہو رہا ہے۔ اور دشمنوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے جو نشاندہی کی ہے اس کے رنگ ڈھنگ آج بھی وہی ہیں۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے جو ہدایت دی ہے وہ ہر دور میں جماعت اسلامی اور تحریک اسلامی کے لئے ایک سرمایہ ہے' جب بھی وہ اس دعوت کو لے کر اٹھے اور جب بھی وہ اس زمین کے کسی حصے میں اسلامی نظام کے قیام کا نصب العین لے کر اٹھے۔ جب بھی یہ کام شروع ہو گا تو اس کے خلاف فتنہ اور سازشوں کے وسائل حرکت میں آنا شروع ہوں گے' جدید سے جدید پروپیگنڈے کے وسائل کے دروازے کھل جائیں گے۔ اس کے مقاصد کو غلط رنگ میں توڑ موڑ کر پیش کیا جائے گا۔ اور اس کی صفوں کو منتشر کرنے کی سعی کی جائے گی اور قرآن کی جانب سے تحریک اسلامی کی ہدایت اور اس کی آنکھیں کھولنے کے لئے یہ آیت سامنے آجائے گی۔ وہ اس تحریک کے مزاج سے داعیوں کو خبردار کرے گی' اس کا طریق کار سمجھائے گی۔ اور اس کے مخالفین کا مزاج بھی تحریک کے سامنے رکھ دے گی جو راستے میں تحریک کی راہ پکڑے ہوئے ہیں اور یہ آیت تحریک اسلامی کے دل کو اطمینان سے بھر دے گی۔ اور اس راہ میں اسے جو مشکلات پیش آئیں انہیں انگیز کرے گی اور جب یہ بھیڑیئے ہر طرف سے اس کا گوشت نوچیں گے اور جب اس کے چاروں طرف نشرو اشاعت کے وسائل بھونکنے لگیں گے اور جب اس پر ہر طرف سے ابتلا آئے گی اور اسے فتنہ سامانیوں کا سامنا ہو گا تو یہ تحریک مطمئن ہو کر اپنی راہ پر گامزن رہے گی اور اسے یہ تمام نشانات راہ صاف صاف نظر آئیں گے۔

یہی وجہ ہے کہ اسے ابتلا' اذیت' فتنے اور باطل پروپیگنڈے سے پہلے ہی خبردار کر دیا گیا۔ بتا دیا گیا کہ وہ اس دعوت کی وجہ سے بہت کچھ سنے گی اور یہ اس لئے بتا دیا گیا کہ اس تحریک کو اس بات پر پہلے سے پختہ یقین ہے کہ صبر اور تقویٰ ہی زاد راہ ہیں۔ اور ان کے ذریعے تمام سازشیں' تمام پروپیگنڈے ختم ہو جاتے ہیں' ان کے ہوتے ہوئے اذیت و ابتلا کی اہمیت اور شدت ہی ختم ہو جاتی ہے اور تحریک اپنے ٹارگٹ کی طرف جاتی ہے' رواں دواں ہوتی ہے' نہایت ہی پرامید ہو کر' نہایت عزم کے ساتھ اور صبر و تقویٰ کے زاد راہ کے ساتھ۔

○.....☆☆☆.....○

اس کے بعد روئے سخن اہل کتاب پر تنقید کی جانب ہو جاتا ہے۔ ان کے غلط موقف کی قلعی کھول دی جاتی ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ جب ان کو کتاب دی گئی تھی تو ان سے تو عہد یہ لیا گیا تھا کہ تم یہ یہ کرو گے۔ مگر انہوں نے اسے پس پشت ڈال دیا اور جس بات کو ان کے پاس بطور امانت رکھا گیا تھا' اس میں انہوں نے خیانت کی۔ ان سے پوچھا جاتا ہے :

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَتُبَيِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ وَلَا تَكْتُمُوْنَهٗ ۚ فَنَبَذُوْهُ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ وَاشْتَرَوْا بِهٖ ثَمَنًا

قَلِيْلًا ۖ فَبِئْسَ مَا يَشْتَرُوْنَ ﴿۱۸۷﴾

"اہل کتاب کو وہ عہد بھی یاد دلاؤ جو اللہ نے ان سے لیا تھا کہ تمہیں کتاب کی تعلیمات کو لوگوں میں پھیلانا ہو گا۔ مگر انہوں نے کتاب کو پس پشت ڈال دیا۔ اور تھوڑی قیمت پر اسے بیچ ڈالا۔ کتنا برا کاروبار ہے جو یہ کر رہے ہیں۔"

اس سورت میں اہل کتاب کے بہت سے اقوال و افعال کو لیا گیا ہے خصوصاً یہودیوں کے۔ ان میں سے ممتاز ترین کردار ان کا یہ بیان ہوا ہے کہ ان لوگوں کی یہ عادت رہی ہے کہ یہ حق کو چھپاتے ہیں حالانکہ ان کو اچھی طرح یہ پتہ ہوتا ہے کہ یہ حق ہے۔ پھر یہ اس حق کو باطل کے ساتھ ملاتے ہیں اور اس طرح اپنے پروپیگنڈے کے لئے راہ ہموار کرتے ہیں۔ اس طرح وہ دین کے مفہوم میں شکوک و شبہات پھیلاتے ہیں۔ وہ اسلام کی صحت پر اعتراضات کرتے ہیں۔ وہ اس بات کا بھی انکار کرتے کہ اسلام اور ادیان سابقہ کے اندر بنیادیں مشترک ہیں۔ اسلام ادیان سابقہ کی تصدیق کرتا ہے اور وہ دین اسلام کی تصدیق کرتے ہیں۔ ان کے پاس تورات موجود تھی جس میں حضرت محمد ﷺ کی سچائی ثبت تھی اور وہ جانتے تھے۔ اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ قرآن مجید بھی اسی منبع سے آیا ہے جس سے تورات اتری ہے۔

اب وہ جو یہ موقف اختیار کر رہے ہیں وہ ان کے لئے نہایت ہی نامناسب ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں حکم دیا ہے کہ وہ کتاب کی تبلیغ کریں گے اور اس میں جو کچھ ہے اسے چھپائیں گے نہیں وہ اسے بیان کریں گے اور تمام لوگوں کے سامنے بیان کریں گے۔ نہ چھپائیں گے اور نہ خفیہ رکھیں گے۔ لیکن انہوں نے اللہ کے اس عہد صریح کو پس پشت ڈال دیا۔ اس آیت کا انداز تعبیر نہایت ہی موثر ہے۔ اس کے اندر دینی فعل کے علاوہ ظاہری حرکت بھی ہے یعنی کسی چیز کو پس پشت پھینک دینا۔ فَنَبَذُوْهُ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ .... (انہوں نے اسے پس پشت ڈال دیا) اور یہ حیاسوز کام انہوں نے کیا' کیوں؟ وَاشْتَرَوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۖ .... (انہوں نے تھوڑی سی قیمت پر اسے بیچ ڈالا)

یہ کام انہوں نے اس دنیا کے مفادات کے لئے کیا۔ یہ یہودیوں کے مذہبی راہنماؤں کے ذاتی مفادات اور ان کی قومیت کے بچاؤ کے لئے انہوں نے یہ کام کیا۔ اور یہ سب کچھ ثمن قلیل ہی ہیں۔ اگرچہ وہ تمام عرصے کے لئے تمام دنیا پر قابض ہو جائیں۔ یہ بھی اللہ کے عہد کے مقابلے میں ثمن قلیل ہو گا۔ اور اگر اللہ کے ہاں ان کے لئے جو اجر تھا وہ اسے نظروں میں رکھتے تو یہ انہیں واقعی ثمن قلیل نظر آتا۔ فَبِئْسَ مَا يَشْتَرُوْنَ .... (کتنا برا کاروبار ہے جو یہ کر رہے ہیں)۔

○.....☆☆☆.....○

بخاری شریف میں حضرت ابن عباس سے روایت ہے۔ فرماتے ہیں کہ حضور ؐ نے یہودیوں سے کوئی بات پوچھی۔ انہوں نے اسے چھپادیا اور انہوں نے غلط جواب دیا۔ وہ چلے گئے۔ وہ یہ تاثر دیتے ہوئے گئے کہ انہوں نے حضور ؐ کو وہ بات بتادی جو انہوں نے پوچھی تھی اور اس پر وہ اپنی جگہ خوش تھے کہ ان کو حضور کے ہاں تعریف کا مستحق قرار دیا گیا لیکن خوش اس لئے بھی تھے کہ انہوں نے اصل بات چھپا دی تھی۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی :

لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَفْرَحُوْنَ بِمَآ اَتَوْا وَّيُحِبُّوْنَ اَنْ يُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ بِمَفَازَةٍ مِّنَ الْعَذَابِ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۸۸﴾

"تم ان لوگوں کو عذاب سے محفوظ نہ سمجھو جو اپنے کرتوتوں پر خوش ہیں اور چاہتے ہیں کہ ایسے کاموں کی تعریف انہیں حاصل ہو جو فی الواقعہ انہوں نے نہیں کئے۔ حقیقت میں ان کے لئے دردناک سزا تیار ہے۔"

ایک دوسری روایت میں امام بخاری نے ابوسعید الخدری سے نقل کیا ہے کہ منافقین میں سے بعض لوگ ایسے تھے کہ جب رسول ؐ خدا جہاد کے لئے نکلتے تو وہ ہمیشہ پیچھے رہ جاتے اور وہ یوں پیچھے رہ جانے کی وجہ سے بہت ہی خوش ہوتے کیونکہ یہ رسول اللہ کی مرضی کے خلاف ہوتا۔ جب رسول ؐ خدا واپس آتے تو یہ لوگ عذرات پیش کرتے اور قسمیں اٹھاتے۔ اور وہ اس بات کو پسند کرتے کہ انہوں نے جو کام نہیں کئے اس پر ان کی تعریف کی جائے۔ اس پر یہ آیت نازل لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَفْرَحُوْنَ بِمَآ اَتَوْا وَّ يُحِبُّوْنَ اَنْ يُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا

اصل حقیقت یہ ہے کہ کوئی آیت کس واقعہ کے بارے میں نازل ہوئی؟ یہ کوئی قطعی بات نہیں ہے۔ ایسی روایات بعض اوقات ایسی صورت حال کو بیان کرتی ہیں جن میں کسی آیت سے کوئی دلیل حضور ؐ نے پیش کی ہوتی ہے۔ راوی کو یہ غلط فہمی ہوتی ہے کہ شاید یہ آیت ابھی نازل ہوئی ہے یا اگر کسی واقعہ پر کوئی آیت منطبق ہوتی ہے تو راوی کہتا ہے کہ یہ اس آیت کا مصداق ہے۔ اور یہ آیت اس بارے میں نازل ہوئی ہے۔ اس لئے ان دو روایتوں کے بارے میں بھی قطعی بات نہیں کی جاسکتی۔

رہی پہلی روایت تو اس میں سیاق کلام کے ساتھ ہم آہنگی ہے اس لئے کہ بات اہل کتاب کی ہو رہی ہے۔ اہل کتاب کے اس دعویٰ کا ذکر ہے کہ ان کو جو کتاب دی گئی ہے اور اس میں جو ان کے پاس امانت ہے وہ اسے چھپائیں گے نہیں۔ لوگوں کے سامنے بیان کریں گے۔ وہ اسے چھپا رہے ہیں اور جھوٹ اور فریب کاری کے طور پر کچھ اور بتاتے ہیں اور پھر یہ توقع بھی کرتے ہیں کہ ان کے اس جھوٹ اور افتراء پر ان کی تعریف ہو گی۔

اگر دوسری روایت درست ہے تو پھر بھی سیاق کلام میں منافقین کی بات موجود ہے اور یہ آیت بھی انہیں آیات کے ساتھ ملحق ہے۔ غرض یہ ان لوگوں کے نمونے ہیں جو رسول ؐ اللہ کے عہد میں پائے جاتے تھے۔ ایسے لوگ آج بھی ہر تحریک میں پائے جاتے ہیں۔ یہ ایسے لوگ ہوتے ہیں جو اپنے نظریات کے تقاضے اور ان کے فرائض پورے نہیں کر سکتے اور نہ ہی نتائج برداشت کر سکتے ہیں اور نہ ہی نظریہ کی ذمہ داریاں پوری کرتے ہے۔ جدوجہد سے پیچھے بیٹھے رہتے ہیں۔ اگر جدوجہد کرنے والے ناکام ہو جائیں اور انہیں ہزیمت ہو تو یہ لوگ سر اٹھاتے ہیں اور ناک میں شکن ڈال کر اور ناک کھینچ کر بات کرتے ہیں اور یہ تاثر دیتے ہیں کہ وہ بہت ہی عقلمند ہیں اور موقع شناس ہیں اور خوددار ہیں۔ اور اگر مجاہدین کو فتح ہو جائے اور انہیں مفادات ملیں تو ہمارے ایسے ساتھی آگے بڑھتے ہیں اور یہ ظاہر کرتے ہیں کہ وہ ان کے اس منصوبے کے مؤید تھے اور یہ کہ اس فتح میں ہمارا بھی ہاتھ ہے۔ اور یہ لوگ اس بات کو پسند کرتے ہیں کہ ان کی مدح سرائی ان کاموں پر بھی ہو جو انہوں نے نہیں کئے۔

انسانیت میں سے یہ ان لوگوں کا نمونہ ہے جو ڈرپوک ہوتے ہیں اور بلند بانگ دعویٰ کرتے ہیں۔ قرآن کریم ان لوگوں کی پینٹنگ چند لکیروں کے اندر کر دیتا ہے اور ان کے خدوخال بہت ہی واضح طور پر نظر آنے لگتے ہیں۔ پھر الفاظ کا جامہ پہنا کر قرآن کریم ان خدوخال کو دائمی ریکارڈ کے طور پر محفوظ کر لیتا ہے تاکہ اس آئینے میں آنے والے اپنا چہرہ دیکھیں۔ یہ ہے اسلوب قرآن کریم کا۔

اس قسم کے لوگوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ رسول ؐ اللہ کو بتاکید بتاتے ہیں کہ ان کے لئے نجات اخروی کی کوئی صورت نہیں ہے۔

فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ بِمَفَازَةٍ مِّنَ الْعَذَابِ ۚ

(تم ان لوگوں کو عذاب سے محفوظ نہ سمجھو) وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ............ (بے شک ان کے لئے دردناک عذاب ہے) اور عذاب الیم کی یہ وعید اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ جو مالک السموت والارض ہے۔ وہ ہر چیز کی قدرت رکھنے والا ہے۔ تو پھر بچنے کی صورت ہی کیا رہتی ہے۔ اور نجات کب مل سکتی ہے؟ وَلِلَّهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝۱۸۹....

(اور زمین و آسمانوں کا مالک اللہ ہے اور اس کی قدرت سب پر حاوی ہے)

۱۹
ع ۹
۱۰

☆ ☆ ☆

درس نمبر ۲۹ ایک نظر میں

یہ سورت جس قدر سبقوں اور دروس پر مشتمل تھی یہ ان میں سے آخری درس ہے۔ اس سورت میں اسلامی تصور حیات کے اساسی عناصر میں اہم عناصر کی ایک بڑی تعداد کا ذکر ہوا ہے۔ اور ان عناصر کو ہر قسم کے اجمال' اشتباہ اور اہل کتاب کے ساتھ مجادلوں اور مباحثوں کے بعد التباسات اور شبہات سے پاک کرکے ان اساسی عناصر کو موکد طور پر بیان کیا گیا ہے۔ پھر منافقین کے ساتھ مباحثوں اور مشرکین کے ساتھ مباحثے کرکے ان اساسی عناصر کو منقطع کیا گیا ہے۔ اس پوری سورت میں اسلامی نظام زندگی کی نوعیت اور جان و مال کے حوالے سے اس کے تقاضوں کا بیان ہوا ہے۔ جماعت مسلمہ کو تعلیم دی گئی ہے کہ وہ ان فرائض کو کس طرح ادا کرے گی۔ اور مشکل حالات کے ابتلا میں اس کا رویہ کیا ہوگا اور خوشحالی کے حالات میں وہ ابتلا سے کس طرح عہدہ برآ ہوگی اور وہ اسلامی نظریۂ حیات اور اس کے عظیم فرائض اور ڈیوٹیوں کو کس طرح سرانجام دے گی' جو نفس کے حوالے سے بھی ہیں اور مال کے حوالے سے بھی ہیں۔ یہی وہ مضامین تھے جو اس پوری سورت کا محور تھے اور جنہیں ہم نے پارہ سوئم اور چہارم کی تفسیر فی ظلال القرآن میں بیان کیا۔

اب یہ آخری درس ایک طرح کی آخری ضرب یا آخری ضربات ہیں۔ یہ آخری ضربات اس سورت میں موضوع کے ساتھ نہایت ہی متناسب ہیں۔ اور یہ آخری ضرب بھی اپنے موضوع کے اعتبار سے اور طرز ادا کے اعتبار سے سابقہ ضربات سے بالکل ہم آہنگ ہے۔

اس کے اندر ایک نہایت ہی گہری حقیقت کا بیان ہوا ہے۔ یہ کہ یہ کائنات ایک کھلی کتاب ہے۔ اس کے اندر ایمان و یقین کے بے شمار دلائل اور علامات موجود ہیں۔ اس کائنات سے اس ذات کا اچھی طرح اندازہ ہو جاتا ہے جو اسے بڑی حکمت کے ساتھ چلارہی ہے۔ اس سے اظہار ہوتا ہے کہ اس دنیا کی زندگی سے وراء ایک اخروی زندگی ہے۔ اس زندگی کا حساب و کتاب اور مکافات عمل وہاں ہوگا۔ ان دلائل کو کون پڑھ سکتا ہے' ان آیات و اشارات کو کون پاسکتا ہے' اس حکمت کا ادراک کون کر سکتا ہے؟ اور اس کائنات کی آواز کون سن سکتا ہے؟ یہ صرف وہ لوگ کر سکتے ہیں جو اولوالالباب ہیں' جو اصحاب دانش و بینش ہیں۔ وہ لوگ جو اس کتاب مفتوح پر سے یونہی نہیں گزر جاتے اور وہ ان ظاہر و باہر آیات اور نشانیوں سے آنکھیں بند نہیں کر لیتے۔

یہ حقیقت اس کائنات کے حوالے سے اسلامی تصور حیات کے اساسی عناصر میں سے ایک عنصر ہے۔ اور اس کے اور انسانی فطرت کے درمیان ایک عمیق ربط ہے۔ اور فطرت انسانی اور فطرت کائنات کے درمیان گہری داخلی مفاہمت اور ہم آہنگی ہے۔ یہ کائنات ایک جہت سے اپنے خالق کے وجود پر دلالت کرتی ہے۔ اور دوسری جہت سے اس سے وہ ناموس اکبر معلوم ہوتا ہے۔ جو مقصدیت' گہری حکمت اور قصد و ارادے آپ کے حوالے سے اس کائنات کے اندر کارفرما ہے۔ اور اس کا روح رواں ہے۔ اور اس ناموس اکبر کا فہم و ادراک اس نقطہ نظر سے بہت ہی اہم ہے کہ اس کائنات' اس کے خالق اللہ العالمین کے بارے میں انسان کیا موقف اختیار کرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ کائنات اس موجودہ دنیا کے بارے میں اسلامی افکار کا اہم خزانہ اور منبع ہے۔

اس کے بعد اس درس میں' صاحبان عقل و دانش اور عالمان علم کائنات کی اس پر خشوع دعا کی قبولیت کا ذکر ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو کائنات کی اس کتاب مفتوح کا مطالعہ کرتے رہتے ہیں اور یہ کائنات جن دلائل کو پیش کرتی ہے یہ ان پر غور کرتے ہیں۔ اور یہ کائنات جو مقاصد بتاتی ہے۔ یہ اس پر بھی تامل کرتے ہیں۔ اور دعا کی قبولیت کے ساتھ ساتھ ہدایات کیا دی جاتی ہیں؟ یہ کہ عمل پیہم' جہاد مسلسل'

صبر و محبت اور ایمان کے تقاضوں کی بجاآوری ہی دراصل وہ تحفے ہیں جو ان لوگوں کو ملتے ہیں۔ جو اس کائنات کی کتاب مفتوح کو خدا ترسی کے ساتھ بڑھتے ہیں۔ اور پھر آخر میں اہل کفر کی پوزیشن کو حقیر بنایا گیا ہے۔ اگرچہ ان کے پاس اس دنیا کا سازوسامان زیادہ ہے۔ یہ کچھ بھی نہیں ہے' اصل دولت تو وہ ہے جو آخرت میں ملے گی۔ مومنین کو اس کی بات کرنا چاہئے۔

اس سورت میں اہل کتاب اور مسلمانوں کے خلاف ان کے موقف کے بارے میں تفصیلی بات کی گئی تھی۔ اس آخری سبق میں اہل کتاب میں سے بعض اچھے لوگوں کا ذکر بھی کر دیا گیا۔ اور آخرت میں ان کی جزا اور صفت خشوع کا ذکر خصوصی طور پر کیا گیا۔ اس نسبت سے کہ اہل ایمان میں سے ان لوگوں کا ذکر کیا گیا تھا جو اس کائنات کی کتاب مفتوح کا مطالعہ کرتے تھے اور ان کے اندر بھی صفت خشوع اور انابت سے دعا کی تھی۔ اور انہوں نے اس امر کو نہایت ہی شرمناک سمجھا کہ اللہ کی آیات کو معمولی دام کے عوض فروخت کیا جائے۔ جیسا کہ بعض اہل کتاب یہ کام کرتے تھے اور جن کا ذکر اس سورت میں ہو چکا ہے۔ اس کے بعد پوری سورت کا خاتمہ آتا ہے اور اس میں اس پوری سورت کی ہدایت کا خلاصہ دیا گیا ہے۔ اور جماعت مسلمہ کو یہ کہا گیا ہے کہ یہ ہے ان کی زندگی کا خلاصہ ہے۔ یہ ان کے فرائض اور پروگرام کا خلاصہ ہے۔ اور اسی میں ان کی فلاح مضمر ہے۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اصْبِرُوا وَصَابِرُوا وَرَابِطُوا وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴿٢٠٠﴾

"اے ایمان والو! صبر سے کام لو' باطل پرستوں کے مقابلے میں پامردی دکھاؤ' حق کی خدمت کیلئے کمربستہ رہو اور اللہ سے ڈرتے رہو' امید ہے کہ فلاح پاؤ گے۔"

○.....☆☆☆.....○

درس نمبر ۲۹ تشریح آیات

آیت نمبر ۱۹۰ تا ۲۰۰

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ ﴿۱۹۰﴾ الَّذِينَ يَذْكُرُونَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُونَ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿۱۹۱﴾ رَبَّنَآ إِنَّكَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ أَخْزَيْتَهُ ۖ وَمَا لِلظّٰلِمِينَ مِنْ أَنْصَارٍ ﴿۱۹۲﴾ رَبَّنَآ إِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُّنَادِي لِلْإِيمَانِ أَنْ اٰمِنُوا بِرَبِّكُمْ فَاٰمَنَّا ۚ رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَكَفِّرْ عَنَّا سَيِّاٰتِنَا وَتَوَفَّنَا مَعَ الْأَبْرَارِ ﴿۱۹۳﴾ رَبَّنَا وَاٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰى رُسُلِكَ وَلَا تُخْزِنَا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۗ إِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيعَادَ ﴿۱۹۴﴾

"زمین و آسمانوں کی پیدائش میں اور رات اور دن کے باری باری سے آنے میں ان ہوشمند لوگوں کیلئے بہت نشانیاں ہیں جو اٹھتے' بیٹھتے اور لیٹتے' ہرحال میں خدا کو یاد کرتے ہیں اور زمین و آسمان کی ساخت میں غور وفکر کرتے ہیں۔ (وہ بے اختیار بول اٹھتے ہیں۔) پرودگار! یہ سب کچھ تو نے فضول اور بے مقصد نہیں بنایا ہے۔ تو پاک ہے اس سے کہ عبث کام کرے۔ پس اے رب' ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچالے تو نے جسے دوزخ میں ڈالا اسے درحقیقت بڑی ذلت و رسوائی میں ڈال دیا' اور پھر ایسے ظالموں کا کوئی مددگار نہ ہوگا۔ مالک! ہم نے ایک پکارنے والے کو سنا جو ایمان کی طرف بلاتا تھا اور کہتا تھا کہ اپنے رب کو مانو' ہم نے اس کی دعوت قبول کرلی۔ پس اے ہمارے آقا! جو قصور ہم سے ہوئے ہیں ان سے درگزر فرما' جو برائیاں ہم میں ہیں انہیں دور کردے اور ہمارا خاتمہ نیک لوگوں کے ساتھ کر۔ خداوندا' جو وعدے تو نے اپنے رسولوں کے ذریعہ سے کیے ہیں ان کو ہمارے ساتھ پورا کر اور قیامت کے دن ہمیں رسوائی میں نہ ڈال' بے شک تو اپنے وعدے کے خلاف کرنے والا نہیں ہے۔"

زمین و آسمان کی تخلیق میں' اور رات اور دن کی گردش میں وہ کیا آیات اور نشانیاں ہیں' اور جب یہ اولوالالباب آسمان اور زمین میں تفکر کرتے ہیں تو وہ کیا نشانیاں ہیں؟ جب وہ رات اور ان کی گردش میں غور کرتے ہیں تو انہیں کیا نظر آتا ہے؟ جبکہ پھر وہ اللہ کو یاد کرنے لگتے ہیں کھڑے ہوکر بھی' بیٹھ کر بھی اور کروٹ لیتے ہوئے بھی۔ اور پھر سوال یہ ہے کہ ان کے نتیجہ فکر کا تعلق اللہ کے ذکر کے ساتھ کیسے مربوط ہو جاتا ہے کہ وہ فوراً کھڑے' بیٹھے اور کروٹ لیتے اللہ کو یاد کرتے ہیں۔ اور پھر وہ اس ذکر کو اس پر خشوع و خضوع اور پر سوز دعا پر کیسے ختم کرتے ہیں؟ وہ کہتے ہیں۔ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ...... ...... (پروردگار! یہ سب کچھ تو نے فضول اور بے مقصد نہیں بنایا تو پاک ہے اس سے کہ عبث کام کرے پس اے رب ہمیں دوزخ کی آگ سے بچالے۔)

قرآن کریم یہاں ان لوگوں کی ایک زندہ اور متحرک تصویر کشی کرتا ہے جو اس کائنات کے اندر صحت مند غور کرتے ہیں اور ان کو اس کائنات کے موثرات کا ادراک ہوتا ہے۔ اور وہ پھر ان مدرکات اور موثرات کی طرف متوجہ ہوتے ہیں' اور ان کی آنکھوں کے سامنے رات دن اس پوری کائنات میں جو کچھ ہوتا ہے وہ اس کی طرف لبیک کہتے ہیں۔

قرآن کریم انسانی فکر و نظر کو بار بار دعوت نظارہ دیتا ہے اور بڑی تاکید سے حکم دیتا ہے کہ وہ اس کھلی کتاب کا مطالعہ کریں۔ جس کے صفحات رات اور دن خود الٹتے پلٹتے رہتے ہیں۔ ہر صفحے پر صانع قدرت کے نشانات میں سے ایک نشان نظر آتا ہے۔ اور وہ فطرت سلیمہ کے اندر ایک ایسی سچائی کے پہچاننے کا بے حد جوش پیدا کر دیتا ہے' جو سچائی اس کتاب کے صفحات کے اندر جمی ہوئی ہے۔ اس کائنات کی اساس میں وہ سچائی موجود ہے۔ اس کائنات کے خالق کے مطالبات کے تسلیم کرنے کی طرف یہ سچائی مائل کرتی ہے۔ اور جس خالق نے اس کائنات میں یہ ناموس ودیعت کیا ہے۔ اس کی طرف رجوع کی دعوت دی جاتی ہے۔ دل میں خالق کی محبت بھی پیدا ہوتی ہے' اس کے ساتھ ساتھ اس کا خوف اور خشیت بھی پیدا ہوتی ہے۔...... پھر یہ اولوالالباب کون لوگ ہیں؟ یہ وہ لوگ ہیں جو صحیح الفکر ہیں۔ جو آنکھیں کھول کر کتاب کائنات کی آیات کا مطالعہ کرتے ہیں۔ وہ آنکھوں پر پردے نہیں ڈالتے۔ وہ اپنے غور و فکر اور تدبر کے دریچے بند نہیں کرتے۔ اور اس طرح وہ اپنے دل کے حوالے سے' اپنے قیام میں' اپنے قعود میں اور کروٹ لیتے ہوئے اللہ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ یوں ان کی آنکھیں کھل جاتی ہیں اور ان کے ذرائع ادراک کھل جاتے ہیں اور وہ اس ناموس اکبر اور حقیقت کائنات کا ادراک کر لیتے ہیں جو اللہ نے اس کائنات میں ودیعت کی ہے۔ وہ اس کائنات کے مقصد وجود کو پا لیتے ہیں۔ اس ایجاد کرنے کے اصل اسباب ان کے علم میں آجاتے ہیں اور وہ کائنات کے فطرت کے اجزائے ترکیبی اور نظام قیام سے بھی واقف ہوتے ہیں۔ یہ تمام راز وہ اس الہام کے ذریعہ پاتے ہیں جو فطرت کے ان نوامیس اور انسانی دل کے درمیان رابطے کے ذریعے ہوتا ہے۔

زمین و آسمان کا مشہد' رات اور دن کی تبدیلی کا منظر اور سیاروں کی گردش کے مناظر ایسے مناظر ہیں کہ اگر ہم اپنی آنکھیں کھول کر دیکھیں' ہمارے دل کام کر رہے ہوں اور ہمارا ادراک اچھی طرح کام کرتا ہو اور ان کو ہم اس نظر سے دیکھیں جس طرح ایک انسان کسی مشہد اور منظر کو پہلی مرتبہ دیکھتا ہے اور اگر ہم اپنے احساس سے ان مناظر کے عادی ہونے کے تصور کو دور کر دیں' اور اس تکرار کے اثرات سے اپنی حس کو پاک کر دیں تو ہمارے احساس کیلئے یہ قابل ارتعاش ہوں' ہمارے شعور کے اندر زلزلہ آجائے اور ہمیں اچھی طرح احساس ہو جائے کہ اس نظام کے اندر جس قدر دقت نظر سے ہم آہنگی پیدا کی گئی ہے وہ کسی حکیمانہ ہاتھ کے بغیر ممکن ہی نہیں ہے۔ اس نظام کے پیچھے ایک مدبر عقل کام کر رہی ہے۔ اس نظام کے پیچھے ایک ناموس کام کر رہا ہے۔ جس کی خلاف ورزی ممکن نہیں ہے۔ اور یہ سب کچھ ایک دھوکہ اور فریب نہیں ہو سکتا۔ نہ یہ کوئی بخت و اتفاق ہو سکتا ہے اور نہ یہ نظام محض فریب نظر ہو سکتا ہے۔

اور یہ بات بھی ہمارے شعور کے لئے کوئی کم زلزلہ خیز نہیں ہے کہ یہ زمین سورج کے اردگرد اور اپنے محور پر گردش کر رہی ہے۔ اور اس سے رات اور دن کے دو مناظر پیدا ہو رہے ہیں۔ یہ کہ ان اجرام فلکی کے اندر کشش کام آ رہی ہے۔ اور اس نے ہر ایک جرم کو اپنی جگہ ٹھہرایا ہوا ہے۔ یا کوئی اور نظام ہے۔ یہ تو ہمارے مقرر کردہ اصول موضوعہ میں کبھی درست ہوں گے کبھی غلط ہوں گے۔ جو صورت بھی ہو لیکن ہر صورت میں کائنات کا یہ عجوبہ' عجوبہ ہی رہتا ہے۔ اور نظر آتا ہے کہ ایک عظیم نظام ہے جس نے ان دیو ہیکل سیاروں اور اجرام کو تھام رکھا ہے۔ نہایت وقت سے' نہ ٹوٹتے ہیں نہ باہم متصادم ہوتے ہیں' بنی نوع انسان میں سے ماہرین فلکیات چاہے اس کا جو نام بھی رکھیں' بہرحال یہ نظام قدرت کا نشان ہے' یہ سچائی کی برہان ہے' اور یہ سچائی گردش ایام اور دوران فلک سے عیاں ہے۔

قرآن کریم نے یہاں جو منظر کشی کی ہے' اس میں آسمانوں اور اجرام فلکی کی گردش اور رات اور دن کی پیہم تبدیلی کے مناظر اولوالالباب اور صاحبان عقل و دانش کے شعور اور فکر پر جو اثرات چھوڑتے ہیں' ان اثرات کے ایک ایک جزء کو بڑی دقت کے ساتھ قلم بند کر دیا ہے۔ یہ ایک قسم کی اثر انگیز تصویر ہے۔ اسے دیکھ کر دل اس کائنات کے ساتھ باہم معاملہ کرتے وقت بہت ہی صحیح نظام اور طریقہ کار اختیار کرتا ہے۔ یہ مناظر اپنی زبان میں بات کرتے ہیں اور یہ دل کائنات کی فطرت کے ساتھ ہم آہنگی اختیار کرتے ہیں' اس کی حقیقت کے ساتھ یکجا ہو جاتے ہیں۔ اور کائنات کے اشارات اور اثرات کو قبول کرتے ہیں۔ اس طرح کائنات کی یہ کتاب ایک مومن اور واصل باللہ انسان کیلئے کتاب علم و معرفت بن جاتی ہے۔ جسے اللہ نے تصنیف کیا ہے۔

اس مطالعہ کائنات کا انسانی شعور پر پہلا اثر یہ ہوتا ہے کہ وہ اللہ کی یاد اور اس کی عبادت کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ جو لوگ مطالعہ کرتے ہیں وہ کھڑے ہو کر' بیٹھے ہوئے اور کروٹ بدلتے ہوئے ہی اللہ کو یاد کرتے ہیں۔ جبکہ وہ زمین اور آسمانوں کی تخلیق پر غور کرتے ہیں اور جبکہ وہ رات اور دن کے اختلاف کا مطالعہ بھی کر رہے ہوتے ہیں۔ یہ غور و فکر پھر عبادت بن جاتے ہیں۔ اور یوں یہ مشاہدات مشاہدات ذکر الٰہی بن جاتے ہیں۔ اس طرح' اس تصور انسان اور تصور کائنات کے مطابق دو حقائق ثابت ہو جاتے ہیں۔

پہلی حقیقت یہ ہے کہ اللہ کی تخلیق میں تدبر اور مشاہدہ کرنا اور اللہ کی اس کھلی کتاب کا مطالعہ کرنا اور اللہ کے تخلیقی ہاتھ کا مطالعہ کرنا بھی حرکت کائنات کا مطالعہ اور اس کائنات کے صفحات کو 'الٹنا پلٹنا' درحقیقت اصلی اور بنیادی عبادت ہے۔ اور یہ ایک ذکر الٰہی ہے جو نہایت ہی حقیقی ذکر الٰہی ہے۔ اگر کائناتی علوم' جن میں اس کائنات کی تنظیم اور تشکیل سے بحث ہوتی ہے۔ اور اس کائنات کے اندر جاری و ساری نوامیس و سنن کا مطالعہ اور ان قوتوں اور ذخائر کا مطالعہ جو اس کائنات کے اندر جمع شدہ ہیں اور اس کائنات کے اسرار و رموز کے علوم کو اگر اس کائنات کے خالق کے ذکر اور اس کی یاد کے ساتھ یکجا کر دیا جائے اور اس مطالعے سے اللہ کی جلالت قدر کا شعور پیدا کیا جائے اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کا احساس اجاگر کیا جائے تو یہ تمام عمل اس کائنات کے خالق کی عبادت بن جاتا ہے۔ اور نماز کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اور ان علوم کے ذریعہ زندگی درست ہو کر راہ مستقیم پر استوار ہو سکتی ہے۔ پوری انسانی آبادی اللہ کی طرف متوجہ ہو سکتی ہے۔ لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ ہمارے مادی اور کافرانہ رجحان نے اس کائنات اور خالق کائنات کے درمیان تصوراتی بعد پیدا کر دیا ہے۔ انہوں نے تکوینی قوانین اور ازلی ابدی حقیقت کے درمیان تضاد پیدا کر دیا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ علم جو انسان کیلئے اللہ تعالیٰ کا خوبصورت ترین تحفہ تھا وہ خود انسان کیلئے ایک ایسی لعنت بن گیا ہے۔ جو انسان کا پیچھا کر رہا ہے۔ اور انسان کی زندگی کو جہنم میں تبدیل کر رہا ہے۔ اس کی زندگی قلق' روحانی خلا' اور عدم اطمینان کی صورت میں اس طرح بسر ہو رہی جس طرح انسان کا ایک قہار و جبار بھوت پیچھا کر رہا ہے۔

اور دوسری حقیقت یہ ہے کہ اس کائنات میں جو آیات الٰہی ہیں' وہ اپنی الہامی صورت میں اسی شخص پر ظاہر ہوتی ہیں جس کا دل

ذکر الٰہی اور عبادت الٰہیہ میں مشغول ہو۔ اور جو لوگ اللہ کو یاد کرتے ہیں کھڑے ہو کر 'بیٹھ کر اور کروٹ لیتے ہوئے' در حقیقت وہی لوگ ہیں جو زمین و آسمان کی تخلیق پر غور کرتے ہیں اور رات اور دن کے پیہم آنے پر غور و فکر کرتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جن پر عظیم حقائق کھلتے ہیں۔ جو آسمانوں اور زمینوں کی تخلیق کے اندر اور اختلاف لیل و نہار کے نظام میں لپٹے ہوئے ہیں۔ ان رازوں کے رازدان ہونے والے ہی پھر اسلامی نظام زندگی تک پہنچتے ہیں جو نجات اخروی' فلاح دنیوی اور خیر و صلاح کا ضامن ہے۔ رہے وہ لوگ جو صرف ظاہری دنیا کی زندگی ہی پر بس کرتے ہیں اور وہ اس کائنات کی بعض تکوینی چیزوں کو دریافت کر لیتے ہیں اور ان لوگوں کا کوئی ربط اسلامی نظام حیات سے نہیں ہوتا تو یہ لوگ تو پوری زندگی کی بربادی کی فکر کرتے ہیں۔ وہ اپنی زندگی کو شکست و ریخت سے دوچار کرتے ہیں اور ان تکوینی اسرار و رموز کو بربادی کیلئے استعمال میں لاتے ہیں۔ اس طرح وہ اپنی زندگی کو ایک ایک ناقابل برداشت جہنم بنا رہے ہیں' وہ زندگی کے ایسے قلق سے دوچار کرتے ہیں جس میں سانس گھٹتی ہے۔ اور آخرت میں وہ اللہ کے غضب اور اس کے عذاب کی طرف لوٹیں گے۔

غرض یہ دونوں حقائق ایک دوسرے کے ساتھ لازم و ملزوم ہیں' ان دونوں کو اس سورت نے موضوع بحث بنایا' جو اصحاب دانش کیلئے ان کے مطالعہ کائنات کے وقت اور تعلق باللہ کے قیام کی خاطر یہاں بیان کئے گئے ہیں۔ اور یہ ذکر و فکر کا وہ وقت ہوتا ہے' جس میں دلی صفائی حاصل ہوتی ہے' روح شفاف ہو جاتی ہے اور ادراک کے دروازے کھلتے ہیں' ہدایت اخذ کرنے کی استعداد بڑھ جاتی ہے' اور اس میں انسان قبولیت' تاثر اور اخذ کیلئے تیار ہوتا ہے۔

مطالعہ کائنات کا یہ وقت عبادت الٰہی کا وقت ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے یہ اللہ کی جانب سے استقبال اور بندے کی جانب سے اتصال کا وقت ہوتا ہے۔ اس لئے اس وقت ادراک کائنات اور آیات کونیہ کی استعداد بھی زیادہ ہوتی ہے۔ اس وقت اس کائنات میں محض غور و فکر ہی اور اس کے نظام گردش لیل و نہار اور نظام ارض و سما ہی انسان کے ذہن میں القاء کرتا ہے کہ اس کائنات کے اندر ایک عظیم حقیقت پوشیدہ ہے اور یہ کہ یہ کائنات عبث نہیں ہے۔ نہ یہ محض فریب نظر ہے' یہی وقت اللہ کے ساتھ وصال کا وقت ہوتا ہے۔ اور براہ راست معرفت الٰہی کا

رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلاً سُبْحٰنَكَ .... "پروردگار! یہ سب کچھ تو نے فضول اور بے مقصد نہیں بنایا' تو پاک ہے اس سے کہ عبث کام کرے۔" تو نے اس کائنات کو فضول پیدا نہیں کیا۔ بلکہ اس کو اس لئے پیدا کیا گیا ہے کہ وہ حق ہو' سچائی اس کے قیام کا سامان ہو' سچائی اس کا قانون ہو' سچائی اس میں اصل ہو۔

سچ یہ ہے کہ اس کائنات کی ایک حقیقت ہے وہ "عدم" نہیں ہے جس طرح بعض فلسفے یہ کہتے ہیں کہ یہ عدم محض ہے۔ یہ حقیقت ہونے کے بعد ایک ناموس کے مطابق چلتی ہے لہٰذا یہ انارکی کے مطابق نہیں چل رہی ہے۔ وہ ایک مقصد کی طرف بڑھ رہی ہے اس لئے وہ بخت و اتفاق کے مطابق نہیں چلتی۔ غرض وہ اپنے وجود' اپنی حرکت اور اپنے مقاصد کے حوالے سے ایک عظیم سچائی کے کنٹرول میں چلتی ہے۔ اور اس کے ساتھ کوئی باطل ملاوٹ نہیں کر سکتا۔

یہ پہلا ٹچ ہے' جو اصحاب علم و دانش کے دلوں کو اس وقت دیا جاتا ہے جب وہ نظام تخلیق ارض و سما اور نظام گردش لیل و نہار پر غور کرتے ہیں اور اس ٹچ سے انہیں عبادت الٰہی' ذکر الٰہی اور اتصال ذات کا احساس دلایا جاتا ہے۔ اس ٹچ سے ان کے پردۂ احساس پر حقیقی سچائی کا ایک نقش پڑ جاتا ہے جو اس کائنات کی نقشہ سازی میں کارفرما ہے۔ جب یہ اصحاب دانش اس سچائی تک پہنچ جاتے ہیں تو معاً وہ اللہ کی تسبیح اور تنزیہ کرنے لگتے ہیں اور ان کی اس تاویل کا نتیجہ یہ ہوتا ہے رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلاً .... "اے ہمارے رب' تو نے اس کائنات کو عبث نہیں پیدا کیا۔"

اس کے بعد یہ نفسیاتی سوچ زرا اور آگے بڑھتی ہے۔ کچھ مزید تکوینی احساسات اور الہامات سامنے آتے ہیں فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ رَبَّنَآ اِنَّكَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ اَخْزَيْتَهٗ ۭ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ .... "ہمیں دوزخ کی آگ سے بچالے' تو نے جسے دوزخ میں ڈالا اسے درحقیقت بڑی ذلت اور رسوائی میں ڈالدیا۔ اور پھر ایسے ظالموں کا کوئی مددگار نہ ہوگا۔" .... سوال یہ ہے زمین و آسمان کے اندر جو سچائی ہے اور اختلاف گردش لیل و نہار کے اندر جو سچائی ہے' اس کے ادراک اور اس دعائیہ ارتعاش شعور کے درمیان کیا منطقی ربط ہے' کہ صاحب ادراک نہایت ہی خدا ترسی' نہایت ہی عاجزی اور نہایت ہی یکسوئی سے دعا کرنے لگتا ہے؟

جب اصحاب دانش اس سچائی کا ادراک کر لیتے ہیں' جو اس کائنات کی تہہ میں کام کرتی ہے تو ان کے نزدیک اس ادراک کا مفہوم یہ ہوتا کہ اس کائنات کے اندر ایک تقدیر ہے' ایک تدبیر ہے' اس کے اندر ایک حکمت کام کر رہی ہے اور اس کا ایک مقصد تخلیق ہے۔ یہ کہ لوگوں کی زندگی کے پس پشت' ان ستاروں میں ایک سچائی اور عدل کام کر رہا ہے۔ اس لئے لوگ یہاں جو کچھ اعمال و افعال کرتے ہیں' ان کا کسی دن حساب و کتاب ضروری ہے۔ مکافات عمل ہونا چاہئے' اور مکافات عمل کی بنیاد پر عدالت اور انصاف کیلئے لازماً ایک دوسرا جہاں ہونا چاہئے۔ جس میں سچائی' عدل اور جزاو سزا متحقق ہو۔

غرض اصحاب دانش کی دعا کے اندر جو حقائق سامنے آئے وہ فطرت کی بدیہی منطق ہے۔ جس کی کڑیاں اس طرح سرعت کے ساتھ ایک دوسرے سے ملتی چلی جاتی ہیں۔ اور ان کا شعور ایک ہی جمپ میں آگ اور جہنم کا شعور حاصل کر لیتا ہے۔ اور معاً دست بدعا ہوتے ہیں کہ اللہ! ہمیں اس سے بچا' یہ وہ پہلی بات ہوتی ہے جو ان کے دل میں آتی ہے۔ اور یہ آمد اس ادراک کا منطقی نتیجہ ہے جو اس کائنات کے اندر پنہاں سچائی کے حوالے سے وہ کر لیتے ہیں۔ کیفیت کے اعتبار سے یہ دعا نہایت ہی طویل' خشوع و خضوع سے پر' نہایت ہی مضطرب دل کے ساتھ نہایت ہی کانپتے ہوئے جسم کے ساتھ اور پوری یکسوئی کے ساتھ' دل مومن سے اٹھتی ہے اور الفاظ کے اعتبار سے وہ ایک میٹھا نغمہ ہے۔ جس کی ضربات ہم آہنگ اور نغموں کی پرسوز حرارت اپنے اندر لئے ہوئے ہے۔ خوبصورت الفاظ میں ہے۔

زرا آپ ان صاحبان عقل و دانش کی ذہنی دنیا کا پہلا زلزلہ دیکھیں۔ وہ اس میں اپنے رب کی طرف ہمہ تن متوجہ ہو جاتے ہیں تاکہ وہ انہیں آگ کے عذاب سے بچائیں زرا غور فرمائیں رَبَّنَآ اِنَّكَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ اَخْزَيْتَهٗ ۭ .... "تو نے جسے دوزخ میں ڈالا اسے درحقیقت بڑی ذلت اور رسوائی میں ڈالدیا۔ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ .... "پھر ایسے ظالموں کا کوئی مددگار نہ ہوگا۔"

اس دعا سے اظہار ہوتا ہے کہ ان کا خوف آگ کے عذاب سے تھا' اور اس سے بھی زیادہ ان کا خوف اس رسوائی سے تھا جو اہل دوزخ کو ہوا کرتی ہے۔ ان کی ذہنی دنیا میں یہ ارتعاش اس شرمندگی اور رسوائی کی وجہ سے آیا جو اہل دوزخ کی ہوگی۔ اس لئے یہ خوف انہیں محض اس سبب سے دامن گیر ہوا کہ انہیں اللہ سے حیالاحق ہوگئی۔ اس طرح وہ آگ سے داغے جانے کے مقابلے میں اللہ سے حیاء کرنے میں زیادہ حساس ہیں۔ اور یہ خوف اور کپکپی ان کے اس شعور کو بھی ظاہر کرتی ہے کہ اللہ کے مقابلے میں کوئی کسی کی مدد نہیں کر سکتا' اس لئے کسی ظالم کا کوئی ناصر اور مددگار نہ ہوگا۔

اب یہ پر خشوع دعا زرا اور آگے بڑھتی ہے :

رَبَّنَآ اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُّنَادِيْ لِلْاِيْمَانِ اَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّكُمْ فَاٰمَنَّا ڰ رَبَّنَا فَاغْفِرْ

لَنَا ذُنُوْبَنَا وَ كَفِّرْ عَنَّا سَيِّاٰتِنَا وَ تَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ ﴿۱۹۳﴾

"مالک! ہم نے ایک پکارنے والے کو سنا' جو ایمان کی طرف بلاتا تھا اور کہتا تھا کہ اپنے رب کو مانو' ہم نے اس کی دعوت قبول کر لی' پس اے ہمارے آقا جو قصور ہم سے ہوئے ہیں ان سے درگزر فرما' جو برائیاں ہم میں ہیں انہیں دور کر دے اور ہمارا خاتمہ نیک لوگوں کے ساتھ کر۔"

اہل دانش کھلے دل لئے ہوئے ہیں' ان پر جو القاء ہوتا ہے وہ لبیک کہتے ہیں۔ ان کا احساس مزید تیز ہو جاتا ہے' اب ان کی نظریں اپنی تقصیروں' کوتاہیوں' گناہوں اور نافرمانیوں پر لگ جاتی ہیں۔ وہ فوراً اپنے رب سے اپنے گناہوں کی مغفرت کے طلبگار ہوتے ہیں' وہ اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کیلئے تیار ہو جاتے اور اس خواہش کا اظہار کرتے ہیں کہ ان کی موت نیک لوگوں کے زمرے میں ہو۔

اس فقرے میں اس دعا کا جو پرتو ہے وہ اس پوری سورت کے مضامین کے شیڈ کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔ تمام سورت کے مضامین تطہیر اخلاق' اللہ اور رسول ﷺ کی معصیت اور نافرمانی سے استغفار کا رنگ لئے ہوئے ہیں۔ اس پوری سورت میں شہوات نفسانیہ اور ذنوب و خطیئات کے خلاف ایک بھرپور جنگ کا سماں ہے۔ اور یہ وہ جنگ ہے کہ ہر میدانی معرکہ میں کسی بھی فتح مندی کا دارومدار اس جنگ میں کامرانی اور فتح مندی پر ہے۔ جب تک اس اخلاقی تطہیر کی جنگ میں فتح نصیب نہ ہو۔ اسوقت تک اللہ کے دشمنوں اور ایمان کے دشمنوں کے خلاف کوئی میدانی جنگ نہیں جیتی جاسکتی۔ اور اس پوری سورت میں یہی مضامین دیئے گئے ہیں جو باہم وابستہ' ہم آہنگ' متکامل' ہمسایہ اور ایک جیسے اثرات کے حامل ہیں۔

اس دعا کا خاتمہ توجہ الی اللہ اور فضل خداوندی کی امیدواری سے ہوتا ہے۔ اس بات پر اعتماد اور یقین کا اظہار کیا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ہر وعدے کی وفا ہوتی ہے رَبَّنَا وَ اٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰى رُسُلِكَ وَ لَا تُخْزِنَا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيْعَادَ "خداوندا! جو وعدے تو نے اپنے رسولوں کے ذریعے سے کئے ہیں ان کو ہمارے ساتھ پورا کر اور قیامت کے دن ہمیں رسوائی میں نہ ڈال' بے شک تو اپنے وعدے کے خلاف کرنے والا ہے۔"

یہاں اب دعائیہ انداز میں یہ مطالبہ کیا جارہا ہے کہ رسولوں نے آپ کے جو وعدے ہم تک پہنچائے ہیں' اور ہمیں تو یقین ہے کہ آپ کے ہاں وعدہ خلافی نہیں ہوتی' وہ وعدے پورے کر دے۔ یہ لوگ امید کرتے ہیں کہ قیامت کے دن وہ شرمندہ نہ ہوں گے۔ یہ ان کے افکار کی دنیا میں پہلے جھٹکے کے نتیجے میں ان کے دین کی حالت ہے کہ وہ امید سے دامن بھرے ہوئے ہیں کہ وہ رسوا نہ ہوں گے۔ اور اسے وہ دعا کی ابتدا میں بھی لاتے ہیں اور آخرت میں بھی لاتے ہیں۔ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اصحاب دانش کس قدر حساس ہو گئے ہیں۔ ان کے دل کس قدر نرم ہو گئے ہیں۔ وہ کس قدر صاف ہو گئے ہیں۔ خدا کا ڈر اور معصیت کے شرم سے ان کے دل بھرے ہیں۔

اپنے مجموعی مضمون کے اعتبار سے' یہ دعا' ان اہل دانش کی جانب سے مطالعہ فطرت کے نتیجے میں مکمل قبولیت مکمل آمادگی کا اظہار ہے جو ان کے دل پر نظام کائنات کے مطالعہ سے القاء ہوئی۔

مناسب ہے کہ ہم اس دعا پر ایک بار پھر غور کریں' اس کی فنی خوبصورتی اور اس کی مناسب طرز ادا پر نگاہ ڈالنا بھی ضروری ہے۔

قرآن کریم کی ہر سورت میں' اس کی آیات کیلئے ایک متعین قافیہ اپنایا گیا ہے۔ اور قرآن مجید کے اندر قافیہ اور فواصل کا وہ طریقہ نہیں اپنایا گیا جو اشعار میں ہوتا ہے۔ کہ حرف سے حرف ملے۔ لیکن ان کا نغمہ اور زیر و بم باہم متشابہ ہوتے ہیں۔ مثلاً الفاظ بصیر' حکیم' مبین اور مریب ایک جیسے صوتی اثرات رکھتے ہیں۔ یا مثلاً الباب' ابصار' النار اور قرار جیسے الفاظ کے صوتی اثرات یکساں ہیں یا مثلاً خفیا'

شقیا' شرقیا اور شہیا جیسے الفاظ اگرچہ شعری قافیہ نہیں لیکن ان کا صوتی ایقاع ایک جیسا ہے۔ ان میں سے پہلا قافیہ اکثر پرزور تقریر جیسے مواقع پر ہوتا ہے۔ جہاں انداز بیانیہ ہوتا ہے........ دوسرا قسم کا قافیہ دعاؤں کے مواقع پر ہوتا ہے اور تیسری قسم کو حکایات اور بیان واقعات کے لئے لایا جاتا ہے۔

سورہ آل عمران میں پہلی قسم کا قافیہ ہے' صرف دو جگہ اس سے انحراف ہوا ہے۔ ابتداء میں جہاں دعا تھی' اور پھر ان آخری آیات میں جہاں پھر دعا ہے۔

یہ انداز بالکل ایک نیا اور انوکھا انداز ہے جو قرآن نے مخصوص تعبیرات کیلئے اختیار کیا ہے۔ دعا کیلئے جو انداز اختیار کیا گیا وہ دعا کو نرم آواز اور پرسوز لہجہ دیتا ہے۔ الفاظ کے اندر مٹھاس پایا جاتا ہے۔ جو عاجزی کے ساتھ عرض مدعا کیلئے نہایت ہی موزوں ہے۔

ایک دوسری فنی خصوصیت بھی ان آیات میں پائی جاتی ہے۔ کائنات میں سے تخلیق ارض و سما کا منظر اور گردش لیل و نہار کے جو مناظر انسان کے غور و فکر کیلئے پیش کئے گئے تھے' ان کے ساتھ مناسب یہ تھا کہ دعا ایسی ہو جس میں خشوع و خضوع خوش آوازی کے ساتھ ہو۔ اس کے نغمات طویل ہوں' اس کے آواز کے زیر و بم نہایت ہی گہرے ہوں۔ اس طرح اس منظر کے الہامات' اثرات طویل ہوں اور اعصاب سماعت اور خیال پر اس کے گہرے اثرات ہوں اور پھر یہ تاثر وجدان پر منتقل ہو جائے۔ کیونکہ ان کلمات کے صوتی حرکات کے اندر بھی نہایت خشوع' خوش گواری' توجہ اور خدا ترسی ہے۔ اس منظر کی جس طرح عبارت طویل ہے اس طرح نغمات بھی طویل ہیں۔ جن سے قرآن کریم کی تعبیرات کی اصل غرض و غایت پوری ہوتی ہے اور اس کے ساتھ قرآن کریم کی اصل نئی خوبیاں بھی سامنے آتی ہیں۔

جس طرح یہ دعا طویل ہے۔ اسی طرح جواب دعا بھی طویل ہے :

فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ أَنِّي لَا أُضِيعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ أَوْ أُنْثَىٰ ۖ بَعْضُكُمْ مِّنْ بَعْضٍ ۖ فَالَّذِينَ هَاجَرُوا وَأُخْرِجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ وَأُوذُوا فِي سَبِيلِي وَقَاتَلُوا وَقُتِلُوا لَأُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّئَاتِهِمْ وَلَأُدْخِلَنَّهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ عِنْدَهُ حُسْنُ الثَّوَابِ ﴿١٩٥﴾ لَا يَغُرَّنَّكَ تَقَلُّبُ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي الْبِلَادِ ﴿١٩٦﴾ مَتَاعٌ قَلِيلٌ ثُمَّ مَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ ۚ وَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴿١٩٧﴾ لَٰكِنِ الَّذِينَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ لَهُمْ جَنَّاتٌ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا نُزُلًا مِّنْ عِنْدِ اللَّهِ ۗ وَمَا عِنْدَ اللَّهِ خَيْرٌ لِّلْأَبْرَارِ ﴿١٩٨﴾

جواب میں ان کے رب نے فرمایا "میں تم میں سے کسی کا عمل ضائع کرنیوالا نہیں ہوں۔ خواہ مرد ہو یا عورت' تم سب ایک دوسرے

کے ہم جنس ہو۔ لہٰذا جن لوگوں نے میری خاطر اپنے وطن چھوڑے اور جو میری راہ میں اپنے گھروں سے نکالے گئے اور ستائے گئے اور میرے لئے لڑے اور مارے گئے ان کے سب قصور معاف کردوں گا اور انہیں ایسے باغوں میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ یہ ان کی جزا ہے اللہ کے ہاں اور بہترین جزا اللہ ہی کے پاس ہے۔"

اے نبی ؐ! دنیا کے ملکوں میں خدا کے نافرمان لوگوں کی چلت پھرت تمہیں کسی دھوکے میں نہ ڈالے۔ یہ محض چند روزہ زندگی کا تھوڑا سا لطف ہے' پھر یہ سب جہنم میں جائیں گے جو بدترین جائے قرار ہے۔ برعکس اس کے جو لوگ اپنے رب سے ڈرتے ہوئے زندگی بسر کرتے ہیں ان کیلئے ایسے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔ ان باغوں میں وہ ہمیشہ رہیں گے' اللہ کی طرف سے یہ سامان ضیافت ہے ان کیلئے اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے نیک لوگوں کیلئے وہی سب سے بہتر ہے۔

یہ ایک مفصل جواب دعا ہے۔ طرز ادا بھی طویل ہے۔ اور یہ قرآن کریم کے طرز ادا کے عین مطابق ہے۔ تقاضائے حال اور فریقین کے موقف کے عین مطابق نفسیاتی اور شعوری دونوں زاویوں سے۔

اب ہم اللہ کی جانب سے آنیوالے جواب دعا اور قبولیت دعا کے مضامین کی طرف آتے ہیں۔ یہ جواب اسلامی نظام زندگی کے کن امور کو ظاہر کرتا ہے اور یہ کہ اس نظام کا مزاج کیا ہے' اس کے اجزائے ترکیبی کیا ہیں اور یہ نظام انسان کی تربیت کیلئے کیا منہاج اختیار کرتا اور اس کی خصوصیات کیا ہیں؟

یہ اصحاب دانش جنہوں نے تخلیق ارض و سما میں غور کیا' جنہوں نے گردش لیل و نہار میں تدبر کیا اور جنہوں نے اس کائنات کی کتاب مفتوح سے دلائل و آیات اخذ کئے اور ان کی فطرت نے ان دلائل و آیات حق کو قبول کیا اور اس کے بعد وہ اپنے رب کی طرف متوجہ ہوئے۔ انہوں نے خشوع و خضوع سے بھرپور' سوز و ساز میں ڈوبی ہوئی طویل دعا کی۔ اور اس کے بعد ان کے رب رحیم و کریم کی طرف سے فوراً جواب دعا آیا کیونکہ ان کی دعا نہایت ہی پرخلوص تھی وہ محبت سے بھری تھی...... اب دیکھئے جواب دعا کیا ہے؟

یہ جواب دعا قبولیت دعا پر مشتمل ہے' اور اس میں اسلامی منہاج حیات کے اصل عناصر ترکیبی کی طرف ہدایت کی گئی ہے۔ اور اس کے فرائض بتائے گئے ہیں فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ أَنِّي لَا أُضِيعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنكُم مِّن ذَكَرٍ أَوْ أُنثَىٰ ۖ بَعْضُكُم مِّن بَعْضٍ ۖ .... جواب میں ان کے رب نے فرمایا۔

"میں تم میں سے کسی کا عمل ضائع کرنیوالا نہیں ہوں' خواہ مرد ہو یا عورت' تم سب ایک دوسرے کے ہم جنس ہو۔"

تم لوگوں کی جانب سے صرف تدبر اور تفکر ہی کافی نہیں ہے۔ خشوع و خضوع اور پرسوز دعا ہی کافی نہیں ہے۔ صرف اللہ کی طرف متوجہ ہو کر گناہوں سے معافی مانگنا ہی کافی نہیں ہے اور صرف نجات اخروی کی طلب ہی کافی نہیں ہے۔ بلکہ عمل ضروری ہے۔ مثبت عمل کی ضرورت ہے۔ اور یہ مثبت عمل نتیجہ ہے۔ اس غور و فکر اور توجہ الی اللہ کا' اس آمادگی اور اس احساس جس کا اظہار اس پرسوز دعا میں ہو گا۔ اس کا تقاضا ہے کہ انسان مثبت عمل پر آمادہ ہو' وہ عمل جسے اسلام اسی طرح عبادت تصور کرتا ہے جس طرح اسلام تفکر اور تدبر کو عبادت سمجھتا ہے۔ جس طرح اسلام ذکر و فکر' خوف و استغفار اور پرامید توجہ الی اللہ کو عبادت سمجھتا ہے۔ وہ عمل جسے اسلام تمام عبادات کا ثمرہ قرار دیتا ہے۔ اور یہ ثمرہ سب کی جانب سے قبول ہو گا۔ مرد یہ عمل کریں یا عورتیں یہ عمل کریں۔ اس عمل کے معاملے میں جنس و صنف کی کوئی شرط نہیں ہے۔ اس لئے کہ مرد اور عورت انسانیت میں بالکل مساوی ہیں۔ وہ ایک دوسرے کے اجزاء اور آباؤ اجداد ہیں اور قیامت کے ترازو میں برابر ہیں۔

اس کے بعد ان اعمال کی تفصیل دی جاتی ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ اسلام کے نظریۂ حیات میں جان و مال کے ساتھ تعلق رکھنے والی

کیا ڈیوٹیاں ہیں۔ نیز ان اعمال کے ذکر سے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ اس نظام زندگی کا مزاج کیا ہے؟ اور وہ کیا گراؤنڈ ہے جس کے اوپر یہ نظام تعمیر ہوتا ہے۔ اور اس کے طریق کار کا مزاج کیا ہے اور اس میں کیا کیا رکاوٹیں اور کیا کیا کانٹے ہیں۔ اور یہ کہ ان مشکلات پر قابو پانے کی اشد ضرورت ہے۔ ان کانٹوں کو ایک ایک کر کے چننے کی ضرورت ہے اور اس زمین میں پاک درخت کے لگانے کیلئے کس کس تیاری کی ضرورت ہے۔ پھر اسے اس زمین پر تمکنت دینے کیلئے کن کن اقدامات کی ضرورت ہے۔ چاہے جس قدر قربانیاں دینی پڑیں۔ چاہے جس قدر مشکلات کو انگیز کرنا پڑے۔

فَالَّذِينَ هَاجَرُوا وَأُخْرِجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ وَأُوذُوا فِي سَبِيلِي وَقَاتَلُوا وَقُتِلُوا لَأُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّئَاتِهِمْ وَلَأُدْخِلَنَّهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ ثَوَابًا مِنْ عِنْدِ اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ عِنْدَهُ حُسْنُ الثَّوَابِ ﴿١٩٥﴾

"لہٰذا جن لوگوں نے میری خاطر اپنے وطن چھوڑے' اور میری راہ میں اپنے گھروں سے نکالے گئے اور ستائے گئے' اور میرے لئے لڑے اور مارے گئے ان کے سب قصور معاف کر دوں گا اور انہیں باغوں میں داخل کر دوں گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ یہ ان کی جزا ہے اللہ کے ہاں اور بہترین جزا اللہ کے پاس ہے۔"

اس قرآن نے سب سے پہلے جن لوگوں کو خطاب کیا اور دعوت فکر دی' ان کے یہی خدوخال تھے۔ یہی لوگ تھے جنہوں نے مکہ سے ہجرت کی' یہی لوگ تھے جن کو محض اپنے نظریۂ حیات کی وجہ سے اپنے گھروں سے نکالا گیا۔ اس کے سوا ان کا اور کوئی قصور نہ تھا۔ یہی لوگ تھے جنہوں نے اس نظریہ کی خاطر قتال کیا اور مارے گئے۔ لیکن یہ خدوخال ان تمام لوگوں کے ہونے چاہئیں جو دعوت اسلامی کو لیکر اٹھتے ہیں۔ جب بھی کوئی اٹھے اور جہاں بھی کوئی اٹھے۔ یہی خدوخال ہوں گے ان لوگوں کے جو جاہلیت کے اندر پل رہے ہوں' جو جاہلیت بھی ہو وہ..... جو دشمن کی سرزمین پر پل رہے ہوں جو دشمن بھی ہو وہ اور جو سرزمین بھی ہو وہ...... جو دشمن اقوام کے اندر ہوں۔ جو قوم بھی ہو وہ اور ان لوگوں کا پیمانہ صبر لبریز ہو جائے۔ دشمنوں کی نیش زنی اور ان کی لالچ اور ان کی خواہشات نفسانیہ ان کے آڑے آرہی ہوں۔ اور جب وہ قلیل تعداد میں ہوں تو انہیں اذیت کا نشانہ بنایا جا رہا ہو اور یہ حالات نہایت ہی ابتدائی دور میں تھے جبکہ وہ مستضعفین تھے۔ اس کے بعد اس پاک پودے نے ذرا قوت پکڑی اور ہر جگہ پر یوں یہ قوت پکڑتا ہے اور باوجود ان اذیتوں کے پکڑتا ہے۔ باوجود ہجرت اور جلاوطنی کے پکڑتا ہے۔ اس کے بعد یہ قوت اپنے پاؤں پر کھڑی ہو جاتی ہے۔ اس کے اندر مقابلے کی قوت پیدا ہو جاتی ہے اور پھر وہ اپنا دفاع کر سکتی ہے۔ اس مرحلے پر پھر قتال و مقاتلہ شروع ہو جاتا ہے۔ یہ دشوار' تلخ اور مشکل جدوجہد ہی دراصل گناہوں کا کفارہ بنتی ہے اور یہ جزاء اور ثواب دنیا و آخرت کا سبب بھی بنتی ہے۔

یہ ہے طریق کار' یہ ربانی منہاج کار ہے۔ جس منہاج زندگی کیلئے اللہ نے یہ طریق کار وضع کیا ہے کہ اسے انسانوں کی زندگی میں عملاً نافذ کرنے کیلئے انسانی جدوجہد کے ذرائع کو استعمال کیا جائے گا۔ اسی طریق کار کے مطابق اور اسی مقدار جہاد کے مطابق جو مومنین اور مجاہدین فی سبیل اللہ' اللہ کی راہ میں خالص اس کی رضاجوئی کیلئے کرتے ہیں۔

یہ ہے مزاج اس نظام حیات کا' یہ ہیں اس کے عناصر ترکیبی اور یہ ہیں اس کے فرائض' یہ ہے اس منہاج کا طریق تربیت' یہ ہے اس کا طریقہ ہدایت و ارشاد کہ وہ اس کائنات میں غور و فکر کے وجدانی مرحلے سے گزر کر انسان کو مثبت عمل کی طرف منتقل کرتا ہے۔ اور یہ عمل اس نظریاتی تاثرات کے مطابق ہوتا ہے اور اسی طرح یہ نظام زندگی قائم ہوتا ہے۔

اس کے بعد یہ جواب دعا میں ارض کفار کے اندر ساز و سامان کے بھرے ہوئے بازاروں کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے جو اسلامی نظام

زندگی کے دشمن اور نافرمان ہیں۔ متوجہ کیا جاتا ہے کہ ایک مسلمان اس سازوسامان کو وہی وزن دیتا ہے جو فی الحقیقت اس کا اس دنیا کیلئے ہے۔ اور اسے اپنے لئے فتنہ نہیں بناتا ہے۔ اور نہ اسے اہل ایمان کیلئے فتنہ بننے کا موقعہ دیتا ہے۔ کیونکہ 'اس لئے کہ اہل ایمان بہت بڑی قربانیاں دے رہے ہیں۔ انہیں ہدایت دی جارہی ہے۔ انہیں اپنے گھروں سے نکالا جارہا ہے اور انہیں قتل کیا جارہا ہے اس لئے دنیا کا سازو سامان ان کے لئے فتنہ نہ ہو جائے۔

لَا يَغُرَّنَّكَ تَقَلُّبُ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي الْبِلَادِ ۝ مَتَاعٌ قَلِيلٌ ثُمَّ مَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ ۚ وَبِئْسَ الْمِهَادُ ۝ لَٰكِنِ الَّذِينَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ لَهُمْ جَنَّاتٌ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا نُزُلًا مِنْ عِنْدِ اللَّهِ ۗ وَمَا عِنْدَ اللَّهِ خَيْرٌ لِلْأَبْرَارِ ۝

"اے نبی! دنیا کے ملکوں میں خدا کے نافرمانوں کی چلت پھرت تمہیں کسی دھوکے میں نہ ڈالے' یہ صرف چند روزہ زندگی کا تھوڑا سا لطف ہے' پھر یہ سب جہنم میں جائیں گے جو بدترین جائے قرار ہے۔ برعکس اس کے جو لوگ اپنے رب سے ڈرتے ہوئے زندگی بسر کرتے ہیں ان کیلئے ایسے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں' ان باغوں میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ کے پاس سے یہ سامان ضیافت ہے ان کیلئے' اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے نیک لوگوں کیلئے وہی سب سے بہتر ہے۔"

لوگوں کا ممالک میں چلنا پھرنا' سیاحتیں کرنا یہ اس بات کی علامت ہے کہ وہ دولتمند ہیں اور ان کے پاس کچھ ہے۔ نیز یہ ان کے مرتبے اور سیاسی قوت کی بھی علامت ہے۔ یہ ایسے مظاہر ہیں جو اہل ایمان کو کھٹک سکتے ہیں۔ وہ دل میں کسک محسوس کرسکتے ہیں۔ عام لوگ ایسا احساس بہرحال رکھتے ہیں جیسا کہ وہ مشکل معاشی حالات اور محرومیت کا شکار ہوں۔ انہیں اذیت دی جارہی ہو اور وہ جہد مسلسل کر رہے ہوں انہیں جلاوطن کیا گیا ہو اور وہ بہتری کیلئے جہاد کر رہے ہوں۔ ان پر ہر قسم کی تکالیف اور خوفناک حالات آرہے ہوں اور دشمنان اسلام اور باطل پرست نازونعم میں پل رہے ہوں۔ یہ صورت حال ایک تو غفلت کا شکار جمہور عوام کو قلبی اذیت میں مبتلا کرتی ہے کہ جب وہ دیکھتے ہیں کہ سچائی اور اہل حق مشکلات میں ہیں اور باطل اور اہل باطل کامیاب ہیں بلکہ عیش میں ہیں۔ اور خود ان گمراہوں اور اہل باطل کے دلوں میں بھی یہ صورت حال غرور اور خود اعتمادی پیدا کرتی ہے اور وہ مزید گمراہ ہوتے ہیں۔ اور شروفساد میں اور سرکشی اور گمراہی میں مزید آگے بڑھتے ہیں۔ اس لئے یہاں یہ آیت آئی کہ "اے نبی! دنیا کے ملکوں میں خدا کے نافرمان لوگوں کی چلت پھرت تمہیں دھوکے میں نہ ڈالے۔ یہ چند روزہ زندگی کا تھوڑا سا لطف ہے' اور پھر یہ جہنم میں جائیں گے جو بدترین جائے قرار ہے۔" .... متاع قلیل ہے۔ ختم ہونے والا اور جانے والا ہے۔ اور دائمی ٹھکانا ان کا جہنم ہے۔ جو بہت بری جگہ ہے۔ اور اس تھوڑے سے جانیوالے اور ختم ہونیوالے متاع قلیل کے مقابلے میں کیا ہے؟ باغات ہیں' ان میں دائمی زندگی ہے اور اللہ کی طرف سے عزت افزائی ہے۔ "ایسے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔" ...... "ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔" ...... "یہ سامان ضیافت ہے ان کیلئے۔" .... "جو اللہ کے ہاں مزید ہے وہ نیکوکاروں کیلئے بہت بہتر ہے۔"

اس میں شک نہیں کہ اگر اس حصے کو ترازو کے ایک پلڑے میں رکھیں اور اس دوسرے حصے کو دوسرے میں تو جو کچھ اللہ کے ہاں ہے وہ نیک لوگوں کیلئے بہت ہی بہتر ہے۔ اور یہ شک بھی کسی دل میں نہ ہو گا کہ جو لوگ اپنی زندگی میں تقویٰ کی راہ اختیار کرتے ہیں ان کا پلڑا ان لوگوں سے بھاری ہو گا جنہوں نے کفر کا رویہ اختیار کیا۔ اور اسی طرح کوئی ذی عقل انسان اس معاملے میں تردد نہ کرے گا کہ

اسے وہی حصہ اختیار کرنا چاہئے جو دانشور اپنے لئے اختیار کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ یہاں تعلیم و تربیت کے میدان میں اور اسلامی تصور حیات کی اساسی قدروں کے قیام میں مسلمانوں کے ساتھ کوئی وعدہ نہیں فرماتے کہ وہ ان کی نصرت فرمائیں گے۔ یہ وعدہ بھی نہیں فرماتے کہ تمہارے دشمنوں کو میں مقہور اور مغلوب کرکے تمہیں دوں گا اور یہ وعدہ بھی نہیں فرماتے کہ تمہیں زمین کے اندر تمکن اور استقرار نصیب کیا جائے گا اور نہ وہ اس دنیا کی زندگی کی چیزوں میں سے کسی دوسری چیز کا وعدہ فرماتے ہیں۔ جیسا کہ بعض دوسرے مقامات پر اللہ نے وعدہ فرمایا ہے یا وہ جو اللہ تعالیٰ اپنے اوپر یہ فرض کرتا ہے کہ وہ اپنے دوستوں کی مدد کرے گا بمقابلہ دشمنان اسلام۔

یہاں اللہ تعالیٰ صرف ایک چیز کا وعدہ فرماتے ہیں' وہ جو اللہ کے ہاں ہے۔ دعوت اسلامی میں اصل اجر یہی ہے۔ اور یہی ہے اس دعوت کا نقطۂ امتیاز۔ ہر ہدف اور ہر مقصد سے بے نیازی' ہر مطمع نظر سے استغنا۔ یہاں تک کہ وہ اس خواہش سے بھی بے نیاز ہو جائے کہ اس کا نظریۂ حیات غالب ہو۔ اللہ کا حکم بلند ہو اور اللہ کے دشمن مقہور اور مغلوب ہوں۔ غرض اللہ کی مرضی یہ ہے کہ اہل ایمان اس غرض سے بھی بے نیاز ہو جائیں اور اپنے امور اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیں۔ اور ان کے دل اس سے بھی پاک ہو جائیں کہ یہ مقاصد ان کیلئے پسندیدہ ہوں' اگرچہ یہ صرف ان کی ہی خواہش نہیں ہوتی۔

یہ عقیدہ کہ جان دینی ہے' وفاداری کرنا ہے اور ادائیگی فرض بجالانا ہے اور بس بغیر کسی دنیاوی غرض اور لالچ کے۔ بغیر اس طلب کے کہ دنیا میں نصرت' غلبہ تمکن فی الارض اور سربلندی حاصل ہو۔ اور ہر چیز کا انتظار دار آخرت میں ہو۔

اور اس کے بعد نصرت بھی آتی ہے۔ تمکن فی الارض بھی نصیب ہوتا ہے اور دنیا میں اسلام کو سربلندی بھی نصیب ہوتی ہے۔ لیکن یہ تمام امور بیعت میں داخل نہیں ہیں۔ یہ امور سودے میں شامل نہیں۔ اس سودے میں مومنین نے قیمت کا کوئی حصہ اس دنیا میں وصول نہیں کرنا ہے۔ یہاں تو صرف ادائیگی فرض' وفائے عہد اور جان دینا ہے اور مشکلات کو برداشت کرنا ہے۔

مکہ مکرمہ میں دعوت اور دعوت کیلئے بیعت اسی اصول پر جاری تھی۔ یہی سودا وہاں ہو رہا تھا۔ لیکن وہاں اللہ نے مسلمانوں کو نصرت' غلبہ اور سربلندی نصیب نہ کی تھی۔ وہاں اللہ تعالیٰ نے انہیں زمین کے اندر اقتدار کی چابیاں سپرد نہ کی تھیں۔ نہ انسانیت کی قیادت کا منصب ان کے حوالے کر دیا تھا۔ ہاں جب وہ اس معیار کے مطابق مخلص ہو گئے اور اس معیار کے مطابق وفائے عہد کرنے لگے تو انہیں سب کچھ ملا۔

محمد ابن کعب قرظی فرماتے ہیں عبداللہ ابن رواحہ ؓ نے رسول خدا ؐ سے عقبہ کی رات کے موقعہ پر (اوس اور خزرج نمائندوں کے اسی رات بیعت کی اور فیصلہ ہوا کہ آپ ؐ مدینہ کو ہجرت فرمائیں گے۔) عرض کیا :حضور ؐ آپ اپنے رب کیلئے اور اپنے لئے جو شرائط چاہیں عائد کر دیں۔ آپ ؐ نے فرمایا میں رب کیلئے تو یہ شرط لگاتا ہوں کہ تم اس کی بندگی کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو گے۔ اور اپنے لئے میں یہ شرط لگاتا ہوں کہ تم لوگ میری حفاظت اسی طرح کرو گے جس طرح تم اپنی جان و مال کی حفاظت کرتے ہو۔" اس پر انہوں نے کہا تو پھر ہمیں کیا ملے گا؟ تو آپ ؐ نے جواب دیا صرف "الجنہ"۔ اس پر انہوں نے 'سب نے کہا اس سودے میں ہم بہت ہی نفع میں رہے۔ نہ ہم خود اس سودے کو واپس کرتے ہیں اور نہ فریق دوئم سے اس کی منسوخی کا مطالبہ کرتے ہیں۔"

یہ تھی بات الجنہ' فقط جنت اس میں ان سے یہ وعدہ نہ تھا کہ انہیں نصرت عزت' اتحاد' قوت' تمکن فی الارض' قیادت' مال اور دولت یا کوئی اور چیز ملے گی۔ اگرچہ یہ تمام چیزیں انہیں دی گئیں۔ لیکن یہ چیزیں سودے سے خارج تھیں....... اس کے باوجود ان کا خیال یہ تھا کہ وہ اس سودے میں کامیاب رہے۔ اور یہ کہ نہ اقالہ کرتے ہیں اور نہ دوسرے فریق سے اس خواہش کا اظہار کرتے ہیں۔

انہوں نے واضح سودا کیا۔ دو بیعت کرنیوالوں کے درمیان یہ سودا ہوا۔ معاملہ ختم ہوا۔ معاہدہ ہوگیا اور اس کے بعد اس میں کوئی سودا بازی نہیں ہوئی۔

یوں اللہ تعالیٰ نے اس جماعت کی تربیت کی جس کے بارے میں اللہ کا فیصلہ یہ تھا کہ اس کرۂ ارض پر اقتدار کی چابیاں اس کے سپرد ہونی ہیں۔ زمام اقتدار اس کے ہاتھ میں ہوگی اور اسے یہ قیادت اس وقت سپرد ہوئی جب وہ ہر قسم کے لالچ سے پاک ہوگئے' ہر قسم کی خواہشات کو انہوں نے لات ماردی' ہر قسم کی خواہشات نفس پر انہوں نے ضبط کیا۔ یہاں تک کہ انہوں نے اسلامی انقلاب کے حوالے سے بھی اپنی فطری خواہشات کو ترک کردیا۔ اسلامی نظام کے قیام کی خواہش کو بھی انہوں نے دبادیا۔ اور انہوں نے اس نظریۂ حیات کی کامیابی کیلئے بھی سوچنا بند کردیا۔ جس کے لئے وہ جانیں دے رہے تھے۔ اس لئے کہ اس عظیم قیادت کی ذمہ داریاں اٹھانے کا اہل کوئی ایسا شخص یا جماعت نہیں ہوسکتی جس کے نفس کے اندر کوئی خواہش ہو یا اس کے نفس کے اندر کوئی نفسانیت ہو اور وہ پورا پورا اسلام میں داخل نہ ہوگیا ہو۔

○.....☆☆☆.....○

سورت کے مضامین ختم ہونے سے قبل روئے سخن پھر اہل کتاب کی طرف مڑ جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ اہل کتاب میں سے بعض لوگ ایسے ہیں جو مومنین کی طرح صحیح العقیدہ ہیں۔ اور یہ لوگ قافلہ ایمان میں شامل ہوگئے ہیں۔ وہ اسی کے ساتھ جارہے ہیں۔ اس لئے ان کی جزا بھی وہی ہوگی جو اہل ایمان کی ہوگی۔

وَإِنَّ مِنْ أَهْلِ الْكِتٰبِ لَمَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَمَآ أُنْزِلَ إِلَيْكُمْ وَمَآ أُنْزِلَ إِلَيْهِمْ خٰشِعِيْنَ لِلّٰهِ ۙ لَا يَشْتَرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا ؕ أُولٰٓئِكَ لَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ؕ إِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿۱۹۹﴾

"اہل کتاب میں بھی کچھ لوگ ایسے ہیں جو اللہ کو مانتے ہیں' اس کتاب پر ایمان لاتے ہیں جو تمہاری طرف بھیجی گئی ہے اور اس کتاب پر بھی ایمان رکھتے ہیں جو اس سے پہلے خود ان کی طرف بھیجی گئی تھی' اللہ کے آگے جھکے ہوئے ہیں' اور اللہ کی آیات کو تھوڑی سی قیمت پر بیچ نہیں دیتے۔ ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے اور اللہ حساب چکانے میں دیر نہیں لگاتا۔"

یہ اہل کتاب کے ساتھ اختتامی خطاب ہے۔ اس سے قبل اہل کتاب کے فرقوں اور ان کے مختلف مواقف کے بارے میں اس سورت کے ایک بڑے حصے میں بات ہوئی تھی۔ یہاں بتایا جاتا ہے کہ ایمان کے اعلیٰ نمونوں کی اس نمائش گاہ اور دعا اور قبولیت دعا کے اس منظر میں اہل کتاب میں سے بعض لوگ ایسے بھی ہیں جن کے نمونے اس نمائش میں رکھنے کے قابل ہیں۔ اس لئے کہ اہل کتاب میں سے بعض لوگ صحیح راستے پر گامزن ہوگئے ہیں۔ وہ صحیح انجام تک آپہنچے ہیں۔ وہ تمام کتاب پر ایمان لے آئے ہیں۔ (موجودہ اور سابق) وہ اللہ اور اس کے درمیان بلحاظ اطاعت فرق بھی نہیں کرتے۔ وہ اللہ کے رسولوں میں سے بھی کسی میں فرق نہیں کرتے۔ وہ اس کتاب پر بھی ایمان لائے جو ان کی طرف نازل ہوئی اور اس کتاب پر بھی ایمان لائے ہیں جو مسلمانوں پر نازل ہوئی ہے۔ اور یہی اسلامی نظریۂ حیات کی خصوصیت ہے کہ وہ قافلہ ایمانی کی طرف قرب و محبت کی نظروں کے ساتھ دیکھتا ہے۔ اس کا نقطۂ نظریہ ہے کہ وہ نظریہ کی ایک ہی لائن ہے جو ذات باری کے ساتھ موصول ہے۔ وہ اسلامی نظریہ حیات کو ایک وحدت سمجھتا ہے۔ اسے کلی نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے۔ یہاں اہل کتاب

مومنین کی خصوصیات میں سے جس اہم خصوصیت کو ظاہر کیا جاتا ہے وہ ان کی صفت خشوع و خضوع ہے اور ان کی یہ صفت کہ وہ اللہ کی آیات کے بدلے اس دنیا کے ثمن قلیل کو قبول نہیں کرتے۔ یہ صفات اس لئے ذکر کی گئیں کہ انہیں دوسرے اہل کتاب کی صفوں سے چھانٹ کر الگ کر دیا جائے جن میں یہ دونوں کمزوریاں موجود تھیں۔ یعنی متکبر بھی تھے اور بے حیا بھی تھے۔ آیات کو چھپاتے بھی تھے اور ان میں تحریف بھی کرتے تھے۔ اور یہ کام وہ نہایت ہی گھٹیا مقاصد کیلئے کرتے تھے۔ اور ان کے ساتھ وہی وعدہ اجر کیا جاتا ہے جو اہل ایمان کے ساتھ ہے اور یہ اجر دستی طور پر ادا ہو گا کوئی ٹال مٹول نہ ہو گی۔ إِنَّ اللَّهَ سَرِيعُ الْحِسَابِ .... (اللہ تعالیٰ حساب چکانے میں دیر نہیں لگاتا۔)

○.....☆☆☆.....○

اب آخری ضرب ہے۔ اللہ کی جانب سے ان لوگوں کو پکار دی جاتی ہے جو ایمان لائے ہیں۔ اس میں اس راہ کی مشکلات کا مختصر ترین نچوڑ اور خلاصہ یہاں پیش کیا جاتا ہے اور راستے کی ذمہ داریوں اور شرائط کا ذکر کیا جاتا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اصْبِرُوا وَصَابِرُوا وَرَابِطُوا وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴿۲۰۰﴾

۲۰
ع ۱۱
۱۱

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو' صبر سے کام لو' باطل پرستوں کے مقابلہ میں پامردی دکھاؤ' حق کی خدمت کیلئے کمربستہ رہو اور اللہ سے ڈرتے رہو' امید ہے کہ فلاح پاؤ گے۔"

عالم بالا سے یہ پکار' اہل ایمان کیلئے ہے۔ اور اس صفتی نام سے یہ پکار ہے جس صفت نے انہیں ذات باری سے مربوط کیا ہے۔ وہ ذات جو ان مومنین پر یہ ذمہ داریاں ڈال رہی ہے۔ جو انہیں اس پکار کے اہل بناتی اور جو انہیں ذمہ داریاں اٹھانے کی تربیت دیتی ہے۔ اور انہیں اس زمین پر بھی اس طرح مکرم بناتی ہے جس طرح انہیں آسمان پر مکرم بنایا گیا ہے۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا .... (اے لوگو جو ایمان لائے ہو۔)

اور پکار کس لئے ہے۔ صبر سے کام لو' جرات دکھاؤ' ہروقت دشمن کے مقابلے کیلئے تیار رہو' اور ہروقت خوف خدا کو پیش نظر رکھو۔...... اس پوری سورت میں صبر اور تقویٰ کی بار بار تلقین کی گئی ہے۔ ان کا تذکرہ الگ الگ بھی ہوا ہے اور یکجا بھی ہوا ہے۔ نیز اس پوری سورت میں یہ دعوت دی گئی ہے کہ راہ حق میں مشکلات برداشت کرو' مجاہدہ کرو' سازشوں کا مقابلہ کرو اور جو لوگ شکست کی طرف بلاتے ہیں اور ہمت شکنی کی باتیں کرتے ہیں ان کی طرف توجہ نہ کرو اور یہاں اس سورت کے آخر میں اس مضمون کو دہرا کر صبر اور مصابرت کی دعوت دی جاتی ہے۔ اللہ کی راہ میں ہروقت تیار رہنے اور خدا خوفی کو اختیار کرنے کی تلقین یہاں بہترین خاتمہ ہے۔

صبر اس راہ کا بہترین سامان ہے' راہ دعوت اسلامی کا' اس لئے کہ یہ طویل اور پرمشقت راستہ ہے۔ یہ مشکلات سے پر اور کانٹوں سے اٹا پڑا ہے۔ جگہ جگہ ابتلا و آزمائش ہے۔ ہروقت چوٹ لگنے اور جان کی قربانی کے مواقع ہیں۔ اور ہر موقع ایسا ہے جس میں صبر کی ضرورت ہوتی ہے۔ انسانی خواہشات پر صبر' نفس کے مرغوبات پر صبر' ہر قسم کی لالچوں اور آرزوؤں پر صبر' اپنے ضعف اور نقص پر صبر' نفس کی جلدبازی اور افسردگی پر صبر' لوگوں کی خواہشات پر صبر' لوگوں کے ضعف اور کمزوری پر صبر' لوگوں کے جہل اور بری سوچ پر صبر' ان کے مزاج کے انحراف پر صبر' ان کی نخوت اور غرور پر صبر' ان کی چالبازیوں اور جلدبازیوں پر صبر' باطل کے غرور پر صبر' کفر کی گندگی پر

صبر‘ شر کے پھیلنے پھولنے پر صبر‘ شہوت کے غلبے پر صبر‘ غرور اور کبر کی آگ پر صبر‘ مددگاروں کی قلت پر صبر‘ اعانت کندگان کی قلت پر صبر‘ راستے کی طوالت پر صبر‘ کرب اور بے چینی کے اوقات میں شیطانی وسوسوں پر صبر‘ اور جہاد کی تلخی پر صبر اور ان تمام نفسیاتی تاثرات اور متنوع انفعالات پر صبر...... مثلاً رنج و الم‘ غیظ و غضب‘ دل تنگی اور گھٹن‘ بعض اوقات بھلائی پر بے اعتمادی اور انسانی فطرت کی اصلاح کی ناامیدی وغیرہ...... بعض اوقات رنج و ملال اور تھکاوٹ پیدا ہو جاتی ہے اور انسان پر مایوسی کا غبار چھا جاتا ہے۔ ایسے حالات میں صبر ہی کام دیتا ہے۔ پھر جب غلبہ نصیب ہوتا ہے تو انسان کو انتقام پر قدرت حاصل ہو جاتی ہے۔ اور اس وقت پھر صبر کی ضرورت پیش آتی ہے۔ پھر بعض اوقات مادی سہولیات ملتی ہیں تو ان پر تواضع اور سنجیدگی کرنا ہوتی ہے۔ بغیر تکبر اور بغیر میلان انتقام اور بغیر اس کے کہ قصاص میں حد سے گزر جائیں...... پھر خوشحالی اور بدحالی دونوں میں اللہ سے لو لگائے رکھنا‘ اس کے فیصلوں کے سامنے سر تسلیم خم کرنا‘ اور نہایت ہی اطمینان‘ نہایت ہی اعتماد اور منکسر المزاجی کے ساتھ اپنے تمام امور اس کے حوالے کر دینا۔

ان سب امور میں صبر کرنا اور ان جیسے دوسرے امور میں صبر کرنا‘ ایسے امور ہیں جو مسالک راہ حق کو‘ اس کے اس طویل سفر میں پیش آتے رہتے ہیں۔ ایسی مشکلات اور ایسے حالات پیش آتے رہتے ہیں۔ جن کو الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ ان مشکلات کا اظہار الفاظ میں ممکن نہیں۔ ان مشقتوں کا مفہوم کلمات کے جامہ میں نہیں سماتا۔ اس مفہوم کا ادراک وہی شخص کر سکتا ہے جس پر وہ معانی گزرے ہوں اور جس نے اس راہ کی مشقتوں کو انگیز کیا ہو۔ اس نے ان تاثرات کو چکھا ہو اور وہ ان تلخ تجربوں سے خود گزرا ہو۔

وہ لوگ جو ایمان لائے تھے‘ انہوں نے ان مذکورہ بالا مشکلات کے اکثر پہلوؤں کی تلخی کو خود چکھ لیا تھا۔ اس لئے انہوں نے اس پکار کو اچھی طرح سمجھ لیا۔ وہ صبر کے مفہوم کو اچھی طرح سمجھتے تھے جس کے بارے میں انہیں تلقین کی جا رہی ہے کہ وہ اسی پر گامزن ہوں۔

اب صبر کے بعد مصابرہ کیا ہے؟ یہ صبر کا باب مفاعلہ ہے۔ یعنی صبر میں باہم مقابلہ کرو۔ ان تمام امور میں جن کا اوپر ذکر ہوا۔ اسلام کے دشمنوں کے ساتھ مصابرت جو اہل ایمان کے صبر کو اپنی تلواروں سے کاٹنا چاہتے ہیں۔ یعنی مذکورہ بالا جذبات کے ساتھ مصابرت یا دشمنوں کے ساتھ مصابرت‘ پس جہاد کے اس طویل سفر میں ان کا صبر ختم نہ ہونے پائے۔ بلکہ انہیں آخر دم تک اپنے اعداء سے زیادہ صبر کا مظاہرہ کرنا چاہئے۔ ان دشمنوں سے انہیں زیادہ صبر والا ہونا چاہئے جو دلوں کے اندر چھپے ہوئے ہیں۔ اسی طرح شرپسند دشمنوں کے مقابلے میں بھی۔ گویا اہل ایمان اور ان کے دشمنوں کے درمیان مصابرت کا مقابلہ ہے کہ اس میدان میں کون آگے نکلتا ہے۔ حکم دیا جاتا ہے کہ صبر کا مقابلہ صبر سے کرو‘ مدافعت کا مقابلہ مدافعت سے کرو‘ جدوجہد کا مقابلہ جدوجہد سے کرو‘ اصرار کا مقابلہ اصرار سے کرو‘ اور آخری مقابلہ یہ ہو گا کہ اہل ایمان اس مقابلے میں سب سے آگے ہوں۔ اگر باطل اپنے نظریئے پر اصرار کرتا ہے صبر کرتا ہے‘ اور اپنی راہ پر گامزن ہے تو حق اس بات کا زیادہ مستحق ہے کہ زیادہ مصر ہو‘ زیادہ صبرناک ہو اور اپنی راہ میں زیادہ جدوجہد کرنے والا ہو۔

اور رابطہ کیا ہے۔ جہاد کے مقامات پر مورچے لگانا۔ مورچہ زن ہونا۔ دشمنوں کے حملوں کے خطرناک مقامات پر چوکیاں قائم کرنا‘ اور اسلامی جماعت ہر وقت دشمن پر نظر رکھتی تھی۔ کبھی وہ سوتی نہ تھی‘ اس لئے کہ اس کے ساتھ اس کے دشمنوں نے کبھی مصالحت نہیں کی تھی۔ جب سے اس نے دعوت اسلامی کا بوجھ اٹھانے کا اعلان کیا۔ اور لوگوں پر اس دعوت کو پیش کیا‘ تو وہ میدان جنگ اور حالت جنگ میں رہی ہے۔ کسی جگہ بھی اور کسی دور میں بھی وہ رابطہ جہاد سے مستغنی نہیں رہی ہے‘ اور آخر الزمان اور قیامت تک یہ پوزیشن ایسی رہے گی۔

دعوت اسلامی لوگوں کے سامنے ایک حقیقت پسندانہ نظام زندگی پیش کرتی ہے۔ ایسا نظام جو ان کے ضمیر کے اندر بھی قائم ہوتا ہے‘ جو ان کے مال پر بھی حکمران ہوتا ہے‘ جو ان کی زندگی کے تمام امور پر حکمران ہوتا ہے‘ جو ان کی معیشت پر بھی حکمران ہوتا ہے اور جو ایک

منصفانہ اور سیدھا نظام ہوتا ہے۔ لیکن دنیا کا قانون ہے کہ شر ایسے منصفانہ 'عادلانہ اور خیر پر مشتمل سیدھے نظام کو ٹھنڈے پیٹوں برداشت نہیں کرتا۔ کوئی باطل خیر'عدل اور استواری کو محبوب نہیں رکھتا' اور کوئی ظلم عدل' مساوات اور شرافت کو برداشت نہیں کرتا۔ اس لئے دعوت اسلامی کی مخالفت میں اصحاب شر' اصحاب باطل اور ظالم کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اسلام کے خلاف تمام گندے اور مفاد پرست اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ تاکہ وہ لوگوں کو اپنے مفادات کیلئے استعمال کرتے رہیں۔ ظالم اور متکبر بھی اسلام کے خلاف اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ اس لئے کہ وہ ظلم اور استکبار سے دست بردار ہونے کیلئے تیار نہیں ہوتے۔ اور اس کے مقابلے میں تمام بداخلاق اور بے راہ روی اختیار کرنے والے لوگ اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ اس لئے کہ وہ اپنی اخلاقی بے راہ روی اور شہوت رانی کو ترک نہیں کرسکتے۔ اس لئے ان سب کے ساتھ جہاد مسلسل ضروری ہے۔ اور ان کے مقابلے میں صبر اور مصابرت فرض عین ہے۔ اس لئے مسلسل چوکیداری اور اسلامی کوسٹ گارڈز کی ضرورت ہے تاکہ یہ نہ ہو کہ امت مسلمہ کے خلاف کوئی قوت اچانک حملہ آور ہو جائے' جبکہ ایسی قوتیں ہر سرزمین اور ہر نسل میں اس کے خلاف تاک لگائے ہوتی ہیں۔

یہ ہے اس دعوت کا مزاج' یہ ہے اس کا طریق کار اس کی پالیسی یہ نہیں ہوتی کہ وہ حد سے تجاوز کرے لیکن اس کی یہ پالیسی ضرور ہوتی ہے کہ وہ اس کرۂ ارض پر ایک مستحکم نظام زندگی اور ایک صحت مند منہاج قائم کرے۔ لیکن دعوت اسلامی کے مقابلے میں ہمیشہ کوئی نہ کوئی ایسی قوت اٹھ کھڑی ہوتی ہے جو اس منہاج اور اس نظام کو ناپسند کرتی ہے۔ اور پھر یہ قوت اس کی راہ میں اپنی پوری قوت لاکر کھڑی ہو جاتی ہے اور ہر قسم کی مکاری کرتی پھرتی ہے۔ وہ دعوت اسلامی کی ہر برائی پر خوش ہوتی ہے' جو ہاتھ' دل اور زبان سے دعوت اسلامی کے خلاف مسلسل جدوجہد کراتی ہے۔ اس لئے تحریک اسلامی کا بھی فرض ہے کہ وہ اس معرکے میں اپنے پورے فرائض اور واجبات کے ساتھ کود ے۔ اور اس کا فرض ہے کہ وہ ہر وقت بیدار رہے اور کسی وقت بھی غافل نہ ہو۔

لیکن ان تمام کاموں میں خدا ترسی کا ہتھیار اس نے لازماً اپنی کمر کے ساتھ باندھا ہوا ہو۔ کیونکہ تقویٰ ایک بیدار چوکیدار ہے جو دل کے دروازے پر بیٹھا ہوتا ہے۔ وہ اسے غافل ہونے نہیں دیتا۔ وہ اسے ضعیف ہونے نہیں دیتا۔ اور وہ اسے حدود سے گزرنے بھی نہیں دیتا۔ اور وہ اسے راہ راست سے بھٹکنے بھی نہیں دیتا۔

اور تقویٰ کے اس بیدار چوکیدار کی ضرورت کا احساس صرف اس شخص ہی کو ہو سکتا ہے جس نے اس راستے کی مشقتوں کو دیکھا ہوتا ہے۔ جس نے متضاد میلانات اور بکثرت اور پے درپے تاثرات کے دباؤ کا مقابلہ کیا ہو۔ مختلف حالات اور مختلف لحظات میں۔

اس سورت میں تار رباب پر یہ آخری ضرب تھی۔ جس میں اس قسم کے بے شمار مضراب استعمال کئے گئے۔ اور یہ ضربات سب کی سب ان تاروں پر لگائی گئیں ہیں جن کا تعلق دعوت اسلامی کی راہ میں عائد ہونیوالے فرائض اور واجبات سے تھا۔ اور یہی وجہ ہے کہ آخر میں یہ فیصلہ دیا جاتا ہے کہ اگر تم ہمہ گیر فلاح چاہتے ہو اور مکمل انقلاب چاہتے ہو تو ان فرائض کا بطریق احسن پورا کرنا ضروری ہے۔

لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ .... (امید ہے کہ تم فلاح پاؤ گے۔)

○.....☆☆☆.....○

فی ظلال القرآن

پارہ ——— ۴

سورۃ النساء ابتدائی حصہ

۱ تا ۲۳

سورہ نساء ایک نظر میں

یہ سورت مدنی ہے اور یہ سورۂ بقرہ کے بعد طویل ترین سورت ہے' نزولی ترتیب کے اعتبار سے یہ سورۂ ممتحنہ کے بعد نازل ہوئی ہے۔ روایات میں آتا ہے کہ اس کا کچھ حصہ غزوۂ فتح مکہ' سنہ ۸ھ کے وقت نازل ہوا اور کچھ حصہ اس سے قبل صلح حدیبیہ کے وقت ۶ھ میں نازل ہوا۔ لیکن سورتوں کی ترتیب نزولی' جس طرح ہم نے سورۂ بقرہ کے آغاز میں بیان کیا' کوئی یقینی اور قطعی امر نہیں ہے۔ اس لئے کہ کوئی سورت بھی' لازمی نہیں ہے کہ ایک ہی جگہ ایک ہی وقت میں نازل ہوئی ہو بلکہ متعدد سورتوں کی آیات بیک وقت نازل ہوتی رہتی تھیں۔ اور حضور اکرم حکم فرماتے تھے کہ اس آیت کو فلاں سورت کی فلاں جگہ میں رکھدو' چنانچہ ہر سورت کی تشکیل و تکمیل ایک عرصہ تک ہوتی رہی تھی۔ کبھی تو یہ عرصہ مختصر ہوتا تھا اور کبھی سالوں تک طویل ہوتا تھا' سورۂ بقرہ میں ایسی آیات بھی ہیں جو مدینہ کے ابتدائی عہد میں نازل ہوئیں۔ لیکن ایسی آیات بھی ہیں جو سلسلہ نزول قرآن کی آخری آیات ہیں۔

اس سورت میں بھی یہی حال رہا ہے۔ اس کا بعض حصہ ۶ھ کے بعد نازل ہوا' اور بعض حصہ ۸ھ کے بعد نازل ہوا۔ لیکن اس کا بڑا حصہ بہرحال ہجرت کے متصلا" بعد نازل ہوا۔ مجموعی طور پر یہ بات نظر آتی ہے کہ یہ سورت غزوۂ احد ۳ھ کے بعد ۸ھ کے بعد تک نازل ہوتی رہی ہے۔ اور اس کے بعد سورۂ ممتحنہ کا ابتدائی حصہ نازل ہوا۔

مثال کے طور پر اس سورت کی آیات (۴:۱۵) جو زانی عورتوں کے عبوری احکام پر مشتمل ہے یعنی

وَالّٰتِیْ یَاْتِیْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَآىٕكُمْ فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَیْهِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ ۚ فَاِنْ شَهِدُوْا فَاَمْسِكُوْهُنَّ فِی الْبُیُوْتِ حَتّٰى یَتَوَفّٰهُنَّ الْمَوْتُ اَوْ یَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِیْلًا ﴿۱۵﴾

"تمہاری عورتوں میں سے جو بدکاری کی مرتکب ہوں ان پر اپنے میں سے چار آدمیوں کی گواہی لو' اور اگر چار آدمی گواہی دیدیں تو ان کو گھروں میں بند رکھو یہاں تک کہ انہیں موت آجائے یا اللہ ان کیلئے کوئی راستہ نکال دے۔"

یہ بات قطعی طور پر ثابت ہے کہ یہ آیت سورہ نور کی اس آیت سے پہلے نازل ہوئی تھی جس میں زنا کی حد کی تفصیلات دی گئی ہیں۔ سورۂ نور کی آیت یہ ہے۔

اَلزَّانِیَةُ وَالزَّانِیْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ ۪ وَّلَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِیْ دِیْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ ۚ وَلْیَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَآىٕفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِیْنَ

"زانیہ عورت اور زانی مرد' دونوں میں سے ہر ایک کو سو کوڑے مارو' اور ان پر ترس کھانے کا جذبہ اللہ کے دین کے معاملے میں تم کو دامن گیر نہ ہو اگر تم اللہ تعالیٰ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہو۔ اور ان کو سزا دیتے وقت اہل ایمان کا ایک گروہ موجود رہے۔"

یہ آیت ۵ھ میں واقعۂ افک کے موقعہ پر نازل ہوئی۔ جس وقت یہ آیت نازل ہوئی تو حضورؐ نے فرمایا: "یہ لو مجھ سے' یہ لو مجھ سے' اللہ تعالیٰ نے ان عورتوں کیلئے کوئی راستہ نکال ہی دیا۔" (روایت امام احمد' امام مسلم' ابن ماجہ) اور وہ راستہ آیت نور کا حکم تھا۔

اس سورت میں اس قسم کے بہت سے نمونے اور مثالیں پائی جاتی ہیں' جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سورت انداز اً کب نازل ہوئی۔ جس طرح ہم سورۂ بقرہ کے آغاز میں اس اسلوب کا تفصیلاً ذکر کر آئے ہیں۔

○.....☆☆☆.....○

اس سورت میں اس جدوجہد کی تفصیلات دی گئی ہیں' جو اسلام نے جماعت مسلمہ کی تشکیل اور تربیت کے میدان میں کی' اور جس کے نتیجے میں ایک اسلامی معاشرہ پروان چڑھا' اس کے بعد اس معاشرے کے تحفظ اور اس جماعت کے بچاؤ کیلئے جو سعی کی گئی۔ اس کی پوری تفصیلات اس سورت میں موجود ہیں۔ اسلامی معاشرہ جس کی کونپلیں اس سورت کی آیات کے اندر سے پھوٹ کر نکلتی ہیں اور جس کا آغاز ربانی منہاج سے کیا گیا تھا' اس معاشرے کے ارتقا میں قرآن نے جس طرح کام کیا۔ اس کے واضح نمونے اس سورت میں ملتے ہیں۔ اس معاشرے اور اس کے اندر قرآن کریم کے اس کام کو دیکھ کر ایک واضح تصویر نظروں کے سامنے آجاتی ہے جس میں قرآن کریم اس زندہ اور متحرک انسان کے ساتھ ایک خاص منہاج پر معاملہ کرتا ہے۔ نیز اس سورت میں یہ بھی نظر آتا ہے کہ حضرت انسان کا مزاج اس ربانی نظام حیات کے ساتھ کیا رویہ اختیار کرتا ہے۔ قرآن کریم انسان کا ہاتھ پکڑ کر قدم قدم پر اس کی راہنمائی کرتا ہے اور اسے تدریج کے ساتھ اس کی موجودہ گری ہوئی حالت سے نکال کر اسے مقام بلند تک اٹھاتا چلا جاتا ہے۔ قدم بقدم اور مرحلہ بمرحلہ' انسان خواہشات نفس' مرغوبات جسمانی' زندگی کے خوف و خطر میں گھرا ہے۔ بلندیوں تک پہنچ پانے کی اس راہ میں قدم قدم پر مشکلات کے کانٹے بچھے ہوئے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ اس راستے پر جگہ جگہ انسان کا دشمن گھات میں بیٹھا ہے' لیکن قرآن اس کی راہنمائی کر رہا ہے۔

جس طرح اس سے قبل سورۂ بقرہ اور سورۂ آل عمران میں ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ مدینہ طیبہ میں جماعت مسلمہ جن خطرات سے دوچار تھی' ان خطرات کا مقابلہ قرآن مجید نے کس حکمت کے ساتھ کیا۔ جہاں تحریک اسلامی کی نشوونما کیلئے ربانی منہاج کا بیان ہوا۔ اس تصور حیات کا بیان ہوا جس کی اساس پر یہ تحریک اٹھائی گئی اور وہ اقدار اور پیمانے طے کئے گئے جو اس تصور حیات کے نتیجے میں پیدا ہوئے۔ جہاں بتایا گیا تھا کہ اس تصور حیات کے حاملین پر کیا کیا فرائض عائد ہوتے ہیں۔ اس نظام اور منہاج کے دشمنوں کا مزاج کیا ہوتا ہے۔ اور اس منہاج کی حامل جماعت کو اس کرۂ ارض پر کیسے کیسے لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ جہاں جماعت مسلمہ کو اس کے دشمنوں کے وسائل اور ان کی سازشوں سے متنبہ کیا گیا تھا' یہاں یہ بھی بتایا گیا تھا کہ اسلامی نظریۂ حیات کے مقابلے میں خود ان کے عقائد و نظریات کس قدر بودے ہیں اور کس قدر گمراہ کن ہیں۔ اور تحریک اسلامی کی دشمنی میں وہ کس قدر اوچھے ہتھیار استعمال کر رہے ہیں۔ اور کس قدر ذلیلانہ حرکات پر اتر آئے ہیں۔ بعینہٖ اسی طرح اس سورت میں بھی قرآن کریم ان تمام موضوعات پر بات کرتا ہے اور ان حالات کے بارے میں تازہ ترین حقائق پیش کرتا ہے۔

ہاں یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ قرآن مجید کی تمام سورتوں کی اپنی جگہ مخصوص شخصیت اور اپنا علیحدہ موضوع ہوتا ہے' اس کی اپنی خصوصیات ہوتی ہیں' ایک محور ہوتا ہے جس کے اردگرد اس کے مباحث گھومتے ہیں' سورت کی اس شخصیت کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ پوری سورت کے موضوعات باہم مربوط ہوں اور ایک خاص طریقے سے اس کے محور کے گرد گھوم رہے ہوں' یوں اس سورت کے خدوخال سامنے آجاتے ہیں اور اس کی شخصیت یوں ظاہر ہو جاتی ہے جس طرح ایک زندہ شخص کے مخصوص خدوخال اور چہرہ بشرہ ہوتا ہے۔ لیکن اپنے ان مخصوص خدوخال کے ساتھ ساتھ یہ پوری سورت بھی قرآن کریم کی دوسری سورتوں کے ساتھ ہم آہنگ ہوتی ہے اور ان میں سے

ایک نظر آتی ہے۔

چنانچہ جب اس سورت پر ایک نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک زندہ مخلوق ہے' اس کی ایک خاص غرض و غایت ہے' وہ اس ہدف کے حصول کیلئے کوشاں ہے' اور اس نصب العین کے حصول کیلئے یہ زندہ سورت مختلف وسائل کام میں لاتی ہے۔ زندہ فقرے' خوبصورت الفاظ اور متوازن آیات کو کام میں لایا جاتا ہے۔ اور یہ سورت اپنے ہدف کی طرف بڑھتی نظر آتی ہے۔ اور یوں ہم اس کے اس ہدف کا شعور و ادراک پالیتے ہیں۔ جس طرح پورے قرآن مجید کے نصب العین کا شعور ہم پالیتے ہیں۔ یوں نظر آتا ہے کہ ہم ایک زندہ شخصیت کے ساتھ ہمکلام اور ہمقدم ہیں۔ جس کے واضح خدوخال ہیں' جس کی ممتاز خصوصیات ہیں' جس کے متعین اہداف ہیں جس کی سمت متعین ہے۔ جو زندہ ہے' متحرک ہے' اور جو حس اور شعور کی مالک ہے۔

غرض یہ سورت انتہائی جدوجہد کے ساتھ جاہلی معاشرے کے بقیہ آثار اور خدوخال کو ایک ایک کر کے مٹا رہی ہے۔ پہلی جماعت مسلمہ کا انتخاب اسی جاہلی معاشرہ سے کیا گیا تھا' اور اس جماعت نے اس وقت کے موجود جاہلی معاشرہ کے رسوم و رواجات کو ترک کر دیا تھا' یہ سورت اس جاہلیت کے آثار کو محو کر رہی ہے۔ اور یہ اسلامی معاشرہ کے خدوخال کو نمایاں کر رہی ہے۔ اور اس کی مخصوص شخصیت کو نمایاں کر رہی ہے۔ یہ لوگوں کو مسلسل اسلامی معاشرے کے وجود اور اس کے مخصوص تشخص کے دفاع کیلئے آمادہ کر رہی ہے اور یہ بتاتی ہے کہ وہ عناصر کیا ہیں جو اس اسلامی معاشرہ کے دشمن ہیں اور ہروقت اس پر حملہ آور ہونے کیلئے گھات میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ مثلاً مشرکین مکہ اہل قریش' اہل کتاب خصوصاً یہودی اہل کتاب' ضعیف الاعتقاد' کمزور کردار کے مالک منافقین' پھر یہ سورت صاف بتاتی ہے کہ یہ دشمن اسلامی معاشرہ کے خلاف کیا کیا وسائل کام میں لاتے ہیں کیا کیا حیلے اور سازشیں کرتے ہیں۔ پھر یہ بتاتی ہے کہ ان دشمنوں کا طریق کار اور ان کا لائحہ عمل کس قدر مفسدانہ ہے۔ اس غرض کیلئے یہ سورت قانون سازی کر کے اسلامی معاشرے کیلئے حدود و قیود بھی وضع کرتی ہے۔ اور اسے مضبوطی سے نافذ بھی کیا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ سورت جاہلیت کے خدوخال کی وضاحت بھی کرتی ہے۔ وہ خدوخال جو جدید معاشرے کی راہ میں حائل ہیں اور اس سے متضاد ہیں جو جدید معاشرے میں رائج شدہ اقدار اور اہم باتوں کے ساتھ لگا نہیں کھاتے۔ اس کشمکش میں صاف نظر آتا ہے کہ جاہلی معاشرے کی یہ خصوصیات اسلامی معاشرے کی خصوصیات کے ساتھ برسرپیکار ہیں اور جاہلیت اس نئے رنگ کے مٹانے کے درپے ہے۔ جو ایک نئی روشنی اور خوبصورت رنگ ہے۔ غرض اس سورت میں اسلامی نظام حیات جاہلیت کے ساتھ لڑتا ہوا نظر آتا ہے۔ اور یہ معرکہ اس قدر وسیع ہے جو قرآن مجید کے تمام دوسرے معرکوں سے زیادہ وسیع عمیق اور شدید ہے۔ اور یہ بیک وقت ان دشمنوں کے خلاف ہے جو اسلام کے مخالف مورچے میں بیٹھے ہوئے ہیں اور ان دشمنوں کے بھی خلاف ہے جو اندر بیٹھ کر اسلام کے خلاف سازشیں کرتے ہیں۔

جب ہم ان گراوٹوں اور کمزوریوں کو دقتِ نظر سے دیکھتے ہیں' جو اس جدید اسلامی معاشرے میں اس جاہلی معاشرے سے وراثت میں منتقل ہوگئی تھیں۔ اس لئے کہ یہ اسلامی معاشرہ اس جاہلی معاشرے ہی سے نکل کر سامنے آیا تھا۔ اور یہ کہ یہ سورت ان کمزوریوں کے بعض شعبوں کا مداوا کر رہی تھی۔ جس طرح بعض دوسری سورتیں بعض دوسرے پہلوؤں سے ان کمزوریوں کا مداوا کر رہی تھیں' تو ہم یہ دیکھ کر حیران رہ جاتے ہیں کہ جاہلیت کی یہ گراوٹیں اور یہ خرابیاں کس قدر گہری ہیں۔ اور اس وقت تک اسلامی معاشرے میں چھائی ہوئی تھیں جس وقت ہماری ترجیح کے مطابق یہ سورت نازل ہو رہی تھی' اور فی الواقعہ یہ بات عجیب ہے کہ جاہلیت کی یہ کمزوریاں اس قدر سخت جان تھیں اسلامی اقتدار اعلیٰ کے ہوتے ہوئے بھی' ابھی تک وہ اس جدید معاشرے میں موجود تھیں۔ اور اس دقت نظر کے بعد ہمیں ایک دوسری حقیقت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ اسلام کے اس منفرد منہاج اصلاح نے اس عرب جاہلی معاشرے کو کس قدر عمیق پستیوں

سے نکالا اور کس قدر اونچے اور ارفع مقام تہذیب و تمدن تک پہنچادیا۔ اس معاشرے کو قعر مذلت سے نکال کر بام عروج تک پہنچادیا۔ اس قدر مقام بلند تک کہ اس تک تاریخ انسانیت میں' نہ رہے اور نہ بعد میں انسانیت کو پہنچنا نصیب ہوا۔ یہ کام صرف اسلامی نظام زندگی میں ہوسکا اور یہ صرف اسلامی نظام زندگی کی مخصوص صلاحیت ہے کہ وہ انسانیت کو اس قعر مذلت سے اٹھا کر بڑی تدریج کے ساتھ' انتہائی رحمدلی اور نرمی کے ساتھ بام عروج تک پہنچائے۔ بڑی مستقل مزاجی اور ثابت قدمی کے ساتھ' نہایت ہی موزوں اور مربوط خطوط پر۔

جو شخص تاریخ انسانی کے اس منفرد منظر کو وقت نظر سے دیکھے۔ اس کی نظر میں اللہ تعالیٰ کی حکیمانہ پالیسی کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس عظیم کام کیلئے جزیرۃ العرب کی ان پڑھ امت کو منتخب کیا۔ اس لئے کہ وہ جاہلیت کی بدترین شکل میں زندگی بسر کر رہے تھے۔ ان کے اندر جاہلیت اپنے تمام عناصر ترکیبی کے ساتھ موجود تھی۔ ان کے خیالات و تصورات' ان کا فہم و ادراک' ان کی اخلاقیات اور اجتماعی نظام' ان کا اقتصادی نظام اور سیاسی شکل سب کے سب مکمل طور پر جاہلی تھے۔ اور ان لوگوں کا انتخاب اس لئے کیا گیا تاکہ یہ معلوم ہوسکے کہ اس قسم کے بدترین لوگوں پر اسلامی نظام کا اثر کیا ہوتا ہے۔ اور معلوم ہوسکے کہ یہ معجزہ کس طرح حیران کن حالات میں نمودار ہوتا ہے۔ جس کی مثال دنیا کے کسی دوسرے نظام کے اندر موجود نہیں ہے۔ جو آغاز انسانیت سے آج تک لکھی جارہی ہے۔ اور غالب آئے ہیں۔ یہ اس لئے تاکہ عربی جاہلی معاشرہ میں اسلامی انقلاب کے خطوط اچھی طرح کھینچے جاسکیں' اور اس انقلاب احوال کے تمام مراحل بھی اچھی طرح نقش پذیر ہو جائیں۔ جب یہ معاشرہ انتہائی پستیوں میں پڑا تھا اور اس کے بعد جب یہ معاشرہ بام عروج تک جا پہنچا۔ نیز وہ تمام تجربات ریکارڈ پر آجائیں جو اس انقلاب کے دوران وقوع پذیر ہوئے۔ وہ تمام علامات واضح ہو جائیں جن کی وجہ سے یہ تبدیلی ہوئی۔ تاکہ قیامت تک انسانیت کو یہ بات معلوم ہو جائے کہ اس کرۂ ارض پر ترقی اور برتری حاصل کرنے کا نسخہ کیمیا کیا ہے۔ اور عروج حاصل کرنے کیلئے اسے کیا موقف اختیار کرنا چاہئے۔ چاہے وہ ترقی و تنزل کے جس حال اور جس درجے میں بھی ہو۔ اس طرح پس ماندہ جس طرح عرب تھے یا ان سے قدرے اچھی ہو۔

اسلامی نظام زندگی اپنے عناصر ترکیبی اور اپنے اصول کے مطابق ایک مستقل نظام ہے۔ وہ انسان کی اصلاح چاہتا ہے۔ اور انسانی وجود ایک مستقل وجود ہے۔ انسانی فطرت اور اس کی شخصیت طبیعی اعتبار سے بدلی نہیں جاسکتی۔ ہم انسان کی زندگی کے حالات' اس کے طور طریقے اس کے مزاج اور اس کی طبیعت تبدیل نہیں کر سکتے۔ نہ اس کی فطری عادات کو اس کی فطرت سے جدا کیا جاسکتا ہے۔ نہ اس کی فطرت کو یکسر بدلا جاسکتا ہے۔ انسانی زندگی کے طور طریقے اور اس کے رسوم و رواجات وہ سطحی حالات ہو ... ہیں جو اس کی فطرت کے ساتھ تعلق نہیں رکھتے۔ مثلاً سمندر کی موجیں اور لہریں سمندر کی آبی حقیقت میں تغیر نہیں لاسکتیں۔ بلکہ یہ موجیں سمندر کے اندرونی بہاؤ اور حرکات کو بھی متاثر نہیں کر سکتیں جس کا تعلق سمندر کے مستقل نظام سے ہوتا ہے۔

چنانچہ قرآن کریم کے دائمی نصوص' انسان کی اس فطرت کی جانب متوجہ ہوتے ہیں جو ایک مستقل فطرت ہے۔ اس لئے کہ یہ قرآنی نصوص اسی ذات کی جانب سے نازل شدہ ہیں' جس ذات کی جانب سے ذات انسانی کی تخلیق ہوئی ہے۔ انسان کے تغیر پذیر حالات کے مطابق ان نصوص کا انسان سے ایک نیا مطالبہ ہوتا ہے' جس طرح جدید اور متغیر ظروف و احوال میں انسان کی ضروریات اور مطالبات بدلتے رہتے ہیں' لیکن آیات کے اساسی اصول اپنی جگہ قائم رہتے ہیں جس طرح انسانی فطرت اپنی جگہ قائم رہتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کی شخصیت میں ایک لچک ودیعت فرمائی ہے۔ اس میں کمال ہے کہ وہ حالات زمانہ کے مطابق اپنے آپ کو ڈھالتا رہتا ہے۔ اس لئے کہ زمانے کے حالات میں ٹھہراؤ نہیں ہے' یہ حالات ہر وقت متغیر ہوتے رہتے ہیں' اگر انسان میں یہ لچک نہ ہوتی تو اس کیلئے متغیر حالات میں زندگی بسر کرنا مشکل ہو جاتا۔ بعینہ اسی طرح اسلامی نظام حیات میں بھی ایسی ہی لچک رکھی گئی ہے۔ اس لئے کہ اسلامی

نظام زندگی کی تشکیل اسی انسان کیلئے ہوئی ہے' اور انسان کا خالق اور اسلامی نظام کا شارع ایک ہی ذات ہے' اس نے جس طرح کی شخصیت انسان کو عطا فرمائی اسی طرح کے خصائص اسلامی نظام زندگی میں بھی رکھے ہیں۔ تاکہ حضرت انسان اس نظام پر ہر دور اور ہر قسم کے حالات میں عمل کر سکے۔

یہی وجہ ہے کہ یہ قرآنی نصوص اور یہ قرآنی نظام حیات کچھ افراد کو چن لیتا ہے' کچھ مجموعہ افراد کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔ چاہے لوگ تنزل اور ترقی کے جس درجے میں بھی ہوں' وہ بہت پسماندہ ہوں یا ترقی کے بام عروج پر ہوں' اور قرآن کریم ان افراد اور ان جماعتوں کو ان کے موجودہ حالات ترقی سے مزید ترقی یافتہ بناتا ہے۔ اسلام کسی فرد یا کسی جماعت یا کسی سوسائٹی کو پیچھے کی طرف نہیں موڑتا' وہ انہیں پستیوں کی طرف نہیں گراتا' بلکہ انہیں بلند سے بلند تر کرتا ہے' نہ اسلام کسی سوسائٹی پر عرصہ حیات تنگ کرتا ہے' اور نہ اسلام اس قدر کمزور ہے کہ اس میں پسماندہ سے پسماندہ سوسائٹی کو سربلند کرنے کی صلاحیت نہ ہو۔

جاہلیت قدیم کے دور میں عرب سوسائٹی ایک انتہائی پسماندہ سوسائٹی تھی' اور جاہلیت جدید میں یورپ و امریکہ کی صنعتی سوسائٹی ترقی یافتہ اور مہذب ترین سوسائٹی ہے' یہ دونوں سوسائٹیوں کیلئے قرآنی آیات کے اندر ہدایت اور روشنی موجود ہے۔ اور دونوں قرآنی ہدایات کو اپنا کر مزید ترقی کر سکتی ہیں۔ اور بلند سے بلند ہو سکتی ہیں' اور اسلام نے اپنی پوری تاریخ میں بار بار اسی حقیقت کو تجربہ کر کے بتایا ہے۔

جاہلیت یا دور جاہلیت تاریخ کے کسی ایسے دور کا نام نہیں ہے جو بس گزر گیا ہو' بلکہ ہر وہ نظام حیات دور جاہلیت ہے' جس میں ایک انسان انسان کی غلامی کر رہا ہو' اور یہ خصوصیت' اس وقت ہمارے اس ترقی یافتہ دور میں بھی تمام رائج الوقت نظامہائے حیات کے اندر پوری طرح پائی جاتی ہے۔

وہ تمام نظامہائے حیات جنہیں آج انسانیت نے اپنا رکھا ہے' ان میں ایک انسان بعینہٖ اپنی طرح کے ایک دوسرے انسان سے افکار و تصورات' اصول و قواعد' معیار اور پیمانے' رسوم و رواجات اور قوانین و ضوابط اخذ کرتا ہے' یہی تو عین جاہلیت ہے' جس میں ایک انسان دوسرے انسان کی اطاعت اور بندگی کرتا ہے' لوگ ایک دوسرے کی بندگی اور غلامی کرتے ہیں حالانکہ اللہ کے سوا کسی اور کی بندگی جائز نہیں ہے۔

اسلام وہ واحد نظام حیات ہے کہ جس میں انسان دوسرے انسان کا بندہ اور غلام نہیں ہوتا' اس لئے کہ اسلام میں تمام لوگ اپنے افکار و تصورات' حسن و قبح کے تمام پیمانے' ترجیحات حیات اور اقدار حیات' قوانین و ضوابط اور تمام رسم و رواج اللہ جل شانہ کی ہدایات سے اخذ کرتے ہیں' اگر وہ جھکتے ہیں تو صرف اللہ کے سامنے جھکتے ہیں۔ اگر وہ کسی قانون اور ضابطے کی پابندی کرتے ہیں تو گویا وہ اللہ تعالیٰ کی بندگی کرتے ہیں۔ اگر وہ کسی حکومت کے مطیع فرمان ہوتے ہیں تو وہ گویا اللہ کے مطیع فرمان ہوتے ہیں' اسی نقطہ نظر سے گویا انسان انسان کی بندگی اور غلامی سے پوری طرح آزاد ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہ اسلامی نظام میں سب کے سب' بندہ و خواجہ' اللہ کے بندے ہوتے ہیں اور اس کی بندگی میں اللہ کے ساتھ کوئی شریک نہیں ہوتا۔

یہی ہے وہ فرق و امتیاز جو اسلام اور دنیا کی تمام جاہلیتوں کے اندر پایا جاتا ہے چاہے وہ جدید جاہلیت ہو یا قدیم جاہلیت ہو' اور اس سورت میں اس نقطہ نظر سے اسلام اور جاہلیت کے اندر پوری طرح لکیر کھینچ کر رکھ دی گئی ہے۔ یہ لکیر اس قدر واضح ہے کہ اس کے بعد کوئی اجمال اور کوئی التباس نہیں رہتا۔ نہ کوئی شک کا موقعہ رہتا ہے۔

○.....☆☆☆.....○

یہ حقیقت کہ ہر امر اور نہی جو قرآن میں وارد ہے' وہ جاہلی معاشرہ کے حالات میں سے کسی حالت کے بارے میں وارد ہے۔ اس نے

یا تو کسی مروج حالت کو بدل کر ایک نئی صورت حال قائم کی ہے یا کسی غیر موجود صورت حالات میں ایک نئی صورت پیدا کی ہے۔ لیکن ایسے تمام حالات اور اوامر ونواہی کے بارے میں اسلامی قانون نے یہ اصول وضع کیا ہے کہ نصوص کا مفہوم صرف نص عام یا خاص الفاظ کو دیکھ کر متعین ہو گا' اس میں اسباب نزول نصوص کا کوئی اعتبار نہ ہو گا۔ اس لئے کہ نصوص قرآن ہر دور اور ہر زمانے کے حالات میں ہمارے لئے ہدایت ہیں۔ جیسا کہ اوپر ہم نے اس کی تفصیلات دے دی ہیں۔ یہی بات دراصل کمال اعجاز ہے۔ اس لئے کہ یہ آیات جن مخصوص حالات میں نازل ہوئی تھیں وہ ان کا تعلق پوری انسانیت کے ساتھ ابدالاباد تک ہے۔ دنیا کے مختلف حالات میں سے ہر حال میں یہ آیات حجت اور راہنما ہیں' اس لئے اسلام میں جس طرح اس وقت یہ قوت اور صلاحیت تھی کہ اس نے پسماندہ ترین عرب سوسائٹی کو ترقی کی راہ پر ڈالا' اسی طرح اس میں یہ صلاحیت بھی موجود ہے کہ وہ ہر اس سوسائٹی کی راہنمائی کرے اور اسے مزید ترقی کی راہ پر گامزن کرے' جو ترقی پذیر ہو یا نہایت ہی ترقی یافتہ ہو۔

جب ہم قرآن مجید کا مطالعہ کرتے ہیں' تو اس کے دوران ایک تو ہمیں یہ حقیقت معلوم ہو جاتی ہے کہ جس جاہلی سوسائٹی کو اسلام نے بدلا اس کے خدوخال کیا تھے۔ دوسرے یہ کہ آج کی ترقی یافتہ جاہلی سوسائٹی میں اسلام کیا کیا تغیرات لانا چاہتا ہے۔ اور کن کن اچھے امور کو اسلام بحال رکھنا چاہتا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ اس سورت کے مطالعہ کے بعد' اس جاہلی سوسائٹی کے کیا خدوخال سامنے آتے ہیں' جس میں سے اللہ تعالیٰ نے اپنے ربانی منہاج کے مطابق امت مسلمہ کو چنا تھا؟ اور وہ کیا نقشہ ہے جس کے مطابق دور جدید میں اسلام از سر نو ایک نیا اسلامی معاشرہ قائم کرنا چاہتا ہے۔

اس سورت کے آئینہ میں ہمیں ایک ایسا معاشرہ نظر آتا ہے' جس میں یتیموں کے حقوق مارے جاتے ہیں' اور خصوصاً یتیم لڑکیوں کے حقوق مارے جاتے ہیں' والدین کی وفات کے بعد یہ لڑکیاں' ان کے اولیاء اور دوسرے ذمہ دار رشتہ داروں کی نگرانی میں ہیں۔ اپنی کھوٹی اشیاء دے کر یتیموں کی قیمتی جائیداد حاصل کر لی جاتی ہے۔ ان کی دولت کو اسراف سے اڑایا جاتا ہے۔ ہر وقت اسے للچائی نظروں سے دیکھا جاتا ہے' اور یہ کام اس لئے کیا جاتا ہے کہ اگر یتیم بڑے ہو گئے تو وہ خود مختار ہو جائیں گے اور یہ دولت ان کے قبضے میں چلی جائے گی' پھر وہ یتیم بچیاں جو دولتمند تھیں' انہیں روکے رکھا جاتا تھا تاکہ ان کے ولی یا رشتہ دار خود انہیں اپنی زوجیت میں لے لیں۔ انہیں ان کی ذات سے کوئی دلچسپی نہیں ہے بلکہ صرف دولت ہتھیانا مقصود ہے' بعض اوقات یہ اولیاء انہیں اپنے بچوں کی زوجیت میں دے دیتے ہیں۔

ہمیں ایک معاشرہ نظر آتا ہے جس میں چھوٹوں' ناتوانوں اور عورتوں پر مظالم ڈھائے جاتے ہیں۔ ان لوگوں کو میراث میں سے ان کا مروجہ حصہ بھی نہ دیا جاتا۔ میراث کا ایک بڑا حصہ بااثر مرد حاصل کر لیتے تھے' جو اسلحہ اٹھا سکتے تھے' اور بچا کھچا ان مظلوموں کے حصے میں آجاتا' ان بچوں اور عورتوں کو پھر اس حقیر حصے کی وجہ سے بند رکھا جاتا تھا' اور ان عورتوں کا نکاح محض ان کی اس حقیر دولت کی وجہ سے اپنے چھوٹے بچوں سے کر دیا جاتا یا ان نوجوان عورتوں کو نہایت ہی بوڑھے مردوں کے حوالے کر دیا جاتا۔ محض اسی لئے کہ ان کی دولت دور نہ چلی جائے اور غیر لوگ اس پر قبضہ نہ کر لیں۔

ان نصوص میں ہم ایک ایسا معاشرہ دیکھتے ہیں جس میں عورت کو ذلیل و خوار کر کے رکھا ہوا ہے' یہ معاشرہ عورت کے ساتھ بڑی سختی سے پیش آتا ہے۔ اسے ہر دور میں حق وراثت سے محروم کر دیا گیا ہے۔ اور اگر اسے کچھ حقیر سا حصہ دیا بھی جاتا ہے کہ اس وجہ سے وہ بیچاری قید ہو جاتی ہے اور خود یہ عورت اپنے اس حقیر مال کے ساتھ کسی مرد کی وراثت میں چلی جاتی ہے گویا وہ بھی مال ہے' اگر اس کا خاوند فوت ہو جائے تو اس کا ولی اس کی جگہ لے لیتا ہے' وہ فوراً اس پر کپڑا ڈال دیتا ہے' اور یہ کپڑا ڈالتے ہی یہ معاشرہ اس عورت کو میت کیلئے

محبوس سمجھتا ہے' اب اس ولی کی مرضی ہے کہ وہ خود اس عورت کے ساتھ نکاح کر لے اور اس نکاح پر کوئی مہر بھی واجب نہ ہو گا اور اگر چاہے تو کسی دوسرے شخص کو نکاح میں دے دے اور مہر خود لے لے۔ اور اگر مرد عورت کو طلاق دینا چاہے تو وہ اسے طلاق دیتا ہے' پھر رجوع کرتا ہے پھر طلاق دیتا ہے' اور یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہتا ہے جب تک یہ عورت معاوضہ دیکر اپنے آپ کو چھڑا نہیں لیتی۔

ہم ایک معاشرہ پاتے ہیں جس میں خاندانی روابط کے اندر ایک عظیم اضطراب پایا جاتا ہے۔ محض اس لئے کہ اس معاشرہ میں عورت ذات کو ایک ذلت آمیز حیثیت دی گئی ہے۔ اس معاشرہ میں ولایت اور متبنیٰ بنانے کے اصول بھی رائج ہیں' یہ اصول نسب اور حقیقی رشتہ داری کے اصول و قواعد کے ساتھ متصادم ہیں' اور ایک خاندان کے اندر جب بذریعہ ولاء یا بذریعہ متبنیٰ ایک اجنبی شخص داخل ہوتا ہے تو اس خاندان میں جنسی بے راہ روی پیدا ہو جاتی ہے اور ناجائز جنسی تعلقات پیدا ہو جاتے ہیں۔

پھر یہ ایک ایسا معاشرہ ہے جس میں سودی نظام کے ذریعہ لوگوں کی دولت ناجائز طریقوں سے عام طور پر کھائی جاتی ہے۔ اس میں حقوق غصب ہوتے ہیں' اس میں امانت میں خیانت کی جاتی ہے۔ اس میں لوگوں کی دولت اور ان کی جان محفوظ نہیں ہے اور اس پر ڈاکے ڈالے جاتے ہیں۔ اس میں عدل و انصاف کا نام و نشان نظر نہیں آتا' اگر کسی کو انصاف ملتا ہے تو وہ زور آور کو ملتا ہے۔ اسی معاشرے میں دولت کار خیر میں نہیں بلکہ دکھاوے کیلئے خرچ کی جاتی ہے' تاکہ خرچ کرنیوالے کا سر فخر سے بلند ہو' لیکن ضعفاء اور محتاج بھوکوں مرتے ہیں' جو کچھ خرچ ہوتا ہے وہ بھی مالداروں اور دولتمندوں پر خرچ کیا جاتا ہے۔

غرض جاہلیت عربیہ کے یہ بعض خدوخال تھے' اور انہی خصوصیات پر یہ سورت بحث کرتی ہے' ہاں اس کے علاوہ دوسری سورتوں میں اس جاہلیت کے دوسرے پہلوؤں سے بھی بحث کی گئی ہے' نیز عربی دنیا کے اردگرد دوسری اقوام کے اندر جو جاہلی عادات و تقالید پائی جاتی تھیں وہ اس کے علاوہ ہیں۔[1]

ہاں! یہ بات بھی قابل ملاحظہ ہے کہ یہ جاہلی معاشرہ فضائل اخلاق سے بالکل تہی دامن بھی نہ تھا' اس میں کچھ خوبیاں بھی تھیں اور اپنی ان خوبیوں ہی کی وجہ سے وہ اس دنیا کو وہ عظیم پیغام دے سکا جو اس نے دیا۔ لیکن اس کے ان فضائل اخلاق کو بھی اسلام نے مزید منقح کر دیا۔ ان فضائل اخلاق کو تعمیری خطوط پر ڈالا گیا' اگر اسلام کا پیغام نہ ملتا تو یہ فضائل بھی مٹی میں مل جاتے۔ اور ان پر جاہلیت کی تہیں جم جاتیں۔ یہ متفرق اور بکھرے ہوئے ہوتے اور ان کا کوئی تعمیری رخ نہ ہوتا' اور اگر اسلامی نظام حیات کا پیغام نہ ہوتا تو امت عربیہ دنیا کو وہ پیغام نہ دے سکتی جو اس نے دیا' اس لئے کہ اسلامی نظام حیات ہی نے امت عربیہ سے جاہلیت کے خدوخال مٹائے' جس نے اس قوم کے اصل فیچرز خراب کر رکھے تھے' اور ان کی جگہ اسلامی نظام زندگی کا خوبصورت چہرہ بشرہ' ان کے جسم پر نمودار ہوا' جو روشن تھا' جو فضائل اخلاق کا حامل تھا' جس نے امت عربیہ کی ضائع ہونیوالی متفرق صلاحیتوں کو یکجا کیا۔ ورنہ عرب قوم بھی اس دنیا پر بسنے والی دوسری اقوام کی طرح ایک قوم ہوتی' جو اس وقت عرب قوم کے قرب و جوار میں آباد تھیں اور یہ تمام اقوام آج صفحہ ہستی سے اس طرح مٹ چکی ہیں کہ ان کا کوئی نام و نشان نہیں ہے۔ حالانکہ عرب قوم ان سے بہتر نہ تھی۔ اس لئے کہ یہ اقوام اس پیغام سے محروم رہیں جو امت عربیہ کی قسمت میں آیا۔

غرض اسی جاہلی معاشرہ سے' جس کے خدوخال اوپر بیان ہوئے' اسلام نے ان افراد کو چنا جن کی قسمت میں یہ بھلائی لکھی ہوئی تھی' جو انسانیت کی قیادت کیلئے چنے گئے تھے۔ ان افراد سے ایک انقلابی جماعت اسلامی تشکیل پائی' اس جماعت نے ایک جدید معاشرے کو جنم دیا' اور یہ معاشرہ عروج اور ترقی کی انتہاؤں تک جا پہنچا' جہاں تک کبھی کوئی قوم نہ پہنچ پائی تھی۔ جو آج اس دور جدید میں بھی امید کی کرن ہے۔

---

[1] تفصیلات کیلئے دیکھئے اسی پارہ کی آیت لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ .... کی تفسیر دیکھئے صفحہ نمبر

اور اگر یہ معاشرہ آج بھی عزم کرلے تو وہ انسانیت کی قسمت بدل سکتا ہے۔

نیز اس سورت میں بعض نئے خدوخال بھی ملیں گے' جو اسلامی نظام زندگی نے از سرنو جاری کئے اور جنہیں اس معاشرے کے خصائص میں داخل کر دیا گیا اور مستحکم کر دیا گیا' اور یہ نئی اخلاقیات اس وقت رائج کی گئیں جب اسلامی معاشرے کو جاہلی اخلاق رزیلہ سے پاک کر دیا گیا اور اس کے بعد اس نئے معاشرے میں کچھ نئے قوانین اور ضوابط بھی نافذ کئے گئے تاکہ وہ اس نئے معاشرے کے نقوش کو مستحکم کر دیں اور اس پر حملہ کرنے والے عناصر کے مقابلے میں اس کا دفاع کر سکیں۔

اس سورت کے آغاز میں اللہ تعالیٰ کی شان ربوبیت' اس کی وحدانیت کا اظہار کیا جاتا ہے اور یہ بتایا جاتا ہے کہ پوری انسانیت کو اسی رب وحدہ لاشریک نے ایک ہی اصل سے پیدا کیا ہے۔ انسان کی تخلیق کے بعد یہاں اسکے نظام کی اساس خدائی نظام پر رکھی گئی ہے۔ انسانوں کو ایک دوسرے کے ساتھ بوجہ صلہ رحمی جوڑا گیا ہے۔ ان حقائق کے اظہار کے ساتھ انسانوں کو تاکید کی جاتی ہے کہ وہ رشتہ داریوں کے تعلقات کا احترام کریں اور انہیں مضبوط بنائیں۔ اور انسان کے اجتماعی نظام اور انسانی معاشرے کی نیو اس خاندانی حکمت عملی کے نظام پر رکھیں۔ یوں ایک خاندان کے ناداروں کا انتظام اور کفالت خود اس خاندان کے اندر کر دی گئی۔ ایک خاندان اور اس خاندان کے ہر فتنے' ہر ظلم اور ہر قسم کی فحاشی کے مقابلے میں بچاؤ' اس نہج پر ایک مسلم خاندان کی تنظیم' ایک مسلم معاشرے کی تنظیم اور پھر اس کے بعد ایک انسانی معاشرے کی تنظیم' اس نظریۂ حیات پر کہ سب کا مالک اور خالق اور رب ایک ہی ذات ہے اور ہم سب اس کے بندے ہیں۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَنِسَاءً ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي تَسَاءَلُونَ بِهِ وَالْأَرْحَامَ ۚ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيبًا

"لوگو! اپنے رب سے ڈرو جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا اور اسی جان سے اس کا جوڑا بنایا اور ان دونوں سے بہت مرد و عورت دنیا میں پھیلا دیئے۔ اسی خدا سے ڈرو جس کا واسطہ دے کر تم ایک دوسرے سے اپنے حق مانگتے ہو۔ اور رشتہ و قرابت کے تعلقات کو بگاڑنے سے پرہیز کرو۔ یقین جانو کہ اللہ تم پر نگرانی کر رہا ہے۔"

یہ عظیم حکیمانہ آیت جس سے اس سورت کو شروع کیا گیا ہے' اسلامی تصور حیات کے ایک اہم اصول کو اپنے اندر لئے ہوئے ہے۔ اس اصول پر اسلام کا اجتماعی نظام قائم ہوتا ہے۔ مزید تفصیلات انشاء اللہ تفسیر کے وقت بیان ہوں گی۔

اس سورت میں اجتماعی کفالتی نظام (Social Security) کی تشکیل کیلئے کچھ عملی قانون سازی بھی کی گئی ہے۔ تاکہ اس خاندانی حکمت عملی کی اساس پر جماعت مسلمہ اس سے استفادہ کرے۔

یتیموں کے تحفظ کیلئے اس میں زوردار ہدایات دی گئی ہیں۔ اور سخت تنبیہہ بھی کی گئی ہے۔ اور مخصوص قانون سازی کی گئی ہے۔

وَآتُوا الْيَتَامَىٰ أَمْوَالَهُمْ ۖ وَلَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِيثَ بِالطَّيِّبِ ۖ وَلَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَهُمْ إِلَىٰ أَمْوَالِكُمْ ۚ إِنَّهُ كَانَ حُوبًا كَبِيرًا

"یتیموں کے مال ان کو واپس دو' اچھے مال کو برے مال سے نہ بدل لو' ان کے مال اپنے مال کے ساتھ ملا کر نہ کھاؤ' یہ بہت بڑا گناہ ہے۔"

وَ ابْتَلُوا الْيَتٰمٰى حَتّٰۤى اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ ۚ فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْۤا اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ ۚ وَ لَا تَاْكُلُوْهَاۤ اِسْرَافًا وَّ بِدَارًا اَنْ يَّكْبَرُوْا ؕ وَ مَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ ۚ وَ مَنْ كَانَ فَقِيْرًا فَلْيَاْكُلْ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ فَاِذَا دَفَعْتُمْ اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ فَاَشْهِدُوْا عَلَيْهِمْ ؕ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيْبًا

"اور یتیموں کی آزمائش کرتے رہو' یہاں تک کہ وہ نکاح کے قابل عمر تک پہنچ جائیں' پھر اگر تم ان کے اندر اہلیت پاؤ تو ان کے مال ان کے حوالے کر دو۔ ایسا کبھی نہ کرنا کہ حد انصاف سے تجاوز کر کے اس خوف سے انکے مال جلدی جلدی کھاؤ کہ وہ بڑے ہو کر اپنے حق کا مطالبہ کریں گے۔ یتیم کا جو سرپرست مالدار ہو وہ پرہیزگاری سے کام لے اور جو غریب ہو وہ معروف طریقہ سے کھائے۔ پھر جب ان کے مال ان کے حوالے کرنے لگو تو لوگوں کو اس پر گواہ بنالو۔ اور حساب لینے کے لئے اللہ کافی ہے۔"

وَ لْيَخْشَ الَّذِيْنَ لَوْ تَرَكُوْا مِنْ خَلْفِهِمْ ذُرِّيَّةً ضِعٰفًا خَافُوْا عَلَيْهِمْ ۪ فَلْيَتَّقُوا اللّٰهَ وَ لْيَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا ؕ وَ سَيَصْلَوْنَ سَعِيْرًا

"لوگوں کو اس بات کا خیال کر کے ڈرنا چاہئے کہ اگر وہ خود اپنے پیچھے بے بس اولاد چھوڑتے تو مرتے وقت انہیں اپنے بچوں کے حق میں کیسے کچھ اندیشے لاحق ہوتے۔ پس چاہئے کہ وہ خدا کا خوف کریں۔ اور راستی کی بات کریں۔ جو لوگ ظلم کے ساتھ یتیموں کا مال کھاتے ہیں در حقیقت وہ اپنے پیٹ آگ سے بھرتے ہیں۔ اور وہ ضرور جہنم کی بڑھکتی ہوئی آگ میں جھونکے جائیں گے۔"

عورتوں کے تحفظ اور خصوصا یتیم بچیوں اور ضعیف عورتوں کے تحفظ اور انکے حقوق میراث اور ان کی معاشی جدوجہد کے نتائج کے تحفظ اور ان کے حق خود اختیاری کے تحفظ اور ان کو جاہلیت کے مظالم سے بچانے کی خاطر اور جاہلیت کے توہین آمیز اور سخت گیر رسم و رواج سے نکالنے کی خاطر' اس سورت میں خصوصی ہدایات دی گئی ہیں۔ اور مختلف النوع قانون سازی کی گئی ہے۔ اور اس میں بڑی وسعت ہے۔

وَ اِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِي الْيَتٰمٰى فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ ۚ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ؕ ذٰلِكَ اَدْنٰۤى اَلَّا تَعُوْلُوْا ۝ وَ اٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً ؕ فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَيْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوْهُ هَنِيْٓـًٔا مَّرِيْٓـًٔا

"اگر تم یتیموں کے ساتھ بے انصافی کرنے سے ڈرتے ہو تو جو عورتیں تم کو پسند آئیں ان میں سے دو دو' تین تین' چار چار سے نکاح کر لو۔ لیکن اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ انکے ساتھ عدل نہ کر سکو گے تو پھر ایک ہی بیوی کرو یا ان عورتوں کو زوجیت میں لاؤ جو تمہارے قبضہ میں آئی ہیں' بے انصافی سے بچنے کیلئے یہ زیادہ قرین صواب ہے۔ اور عورتوں کے مہر خوشدلی کے ساتھ ادا کرو' البتہ اگر وہ خود اپنی خوشی سے مہر کا کوئی حصہ تمہیں معاف کر دیں تو اسے تم مزے سے کھا سکتے ہو۔"

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ أَوْ كَثُرَ نَصِيبًا مَّفْرُوضًا

"مردوں کیلئے اس مال میں حصہ ہے' جو ماں باپ اور رشتہ داروں نے چھوڑا ہو' اور عورتوں کیلئے بھی اس مال میں حصہ ہے' جو ماں باپ اور رشتہ داروں نے چھوڑا ہو' خواہ تھوڑا ہو یا بہت اور یہ حصہ مقرر ہے۔"

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا يَحِلُّ لَكُمْ أَن تَرِثُوا النِّسَاءَ كَرْهًا وَلَا تَعْضُلُوهُنَّ لِتَذْهَبُوا بِبَعْضِ مَا آتَيْتُمُوهُنَّ إِلَّا أَن يَأْتِينَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ فَإِن كَرِهْتُمُوهُنَّ فَعَسَىٰ أَن تَكْرَهُوا شَيْئًا وَيَجْعَلَ اللَّهُ فِيهِ خَيْرًا كَثِيرًا ﴿١٩﴾ وَإِنْ أَرَدتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ وَآتَيْتُمْ إِحْدَاهُنَّ قِنطَارًا فَلَا تَأْخُذُوا مِنْهُ شَيْئًا أَتَأْخُذُونَهُ بُهْتَانًا وَإِثْمًا مُّبِينًا ﴿٢٠﴾ وَكَيْفَ تَأْخُذُونَهُ وَقَدْ أَفْضَىٰ بَعْضُكُمْ إِلَىٰ بَعْضٍ وَأَخَذْنَ مِنكُم مِّيثَاقًا غَلِيظًا

"اے لوگوں جو ایمان لائے ہو' تمہارے لئے یہ حلال نہیں ہے کہ زبردستی عورتوں کے وارث بن بیٹھو' اور نہ یہ حلال ہے کہ انہیں تنگ کر کے اس مہر کا کچھ حصہ اڑا لینے کی کوشش کرو' جو تم انہیں دے چکے ہو۔ ہاں اگر وہ کسی صریح بد چلنی کی مرتکب ہوں۔ ان کے ساتھ بھلے طریقے سے زندگی بسر کرو۔ اگر وہ تمہیں ناپسند ہوں تو ہو سکتا ہے کہ ایک چیز تمہیں پسند نہ ہو' مگر اللہ نے اس میں بہت کچھ بھلائی رکھ دی ہو۔ اور اگر تم ایک بیوی کی جگہ دوسری بیوی لے آنے کا ارادہ ہی کر لو تو خواہ تم نے اسے ڈھیر سا مال ہی کیوں نہ دیا ہو' اس میں سے کچھ واپس نہ لینا' کیا تم اسے بہتان لگا کر اور صریح ظلم کر کے واپس لو گے؟ اور آخر تم اسے کس طرح واپس لے لو گے جب کہ تم ایک دوسرے سے لطف اندوز ہو چکے ہو اور وہ تم سے پختہ عہد لے چکی ہیں۔"

وَيَسْتَفْتُونَكَ فِي النِّسَاءِ قُلِ اللَّهُ يُفْتِيكُمْ فِيهِنَّ وَمَا يُتْلَىٰ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتَابِ فِي يَتَامَى النِّسَاءِ اللَّاتِي لَا تُؤْتُونَهُنَّ مَا كُتِبَ لَهُنَّ وَتَرْغَبُونَ أَن تَنكِحُوهُنَّ وَالْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الْوِلْدَانِ وَأَن تَقُومُوا لِلْيَتَامَىٰ بِالْقِسْطِ وَمَا تَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ فَإِنَّ اللَّهَ كَانَ بِهِ عَلِيمًا

"لوگ تم سے عورتوں کے بارے میں فتویٰ پوچھتے ہیں' کہو! اللہ تمہیں اس معاملے میں فتویٰ دیتا ہے اور ساتھ ہی وہ احکام بھی یاد دلاتا ہے جو پہلے تم کو اس کتاب میں سنائے جا رہے ہیں۔ یعنی وہ احکام جو یتیم لڑکیوں کے متعلق ہیں' جن کے حق تم ادا نہیں کرتے۔ اور جن کے نکاح کرنے سے تم باز رہتے ہو اور وہ احکام جو ان بچوں کے متعلق ہیں جو بیچارے کوئی زور نہیں رکھتے۔ اللہ تمہیں ہدایت کرتا ہے کہ یتیموں کے ساتھ انصاف پر قائم رہو' اور جو بھلائی تم کرو گے وہ اللہ کے علم سے چھپی نہ رہ جائے گی۔"

اس سورت میں' خاندان کی تنظیم کے سلسلے میں اور اسے دوامی فطرت کی محکم اساس پر منظم کرنے کی خاطر اور میاں بیوی کے

درمیان بعض اوقات عارضی طور پر شکر رنجی پیدا ہونے کی وجہ سے جو مشکل حالات پیدا ہو جاتے ہیں ان میں خاندان کے تحفظ اور بچاؤ کی خاطر تنظیمی ہدایات دی گئی ہیں' ان ہدایات کے علاوہ جو یتیم عورتوں اور مطلقہ عورتوں کے سلسلے میں دی گئی ہیں' جن پر اس سے پہلے بحث ہو چکی ہے۔

وَلَا تَنْكِحُوْا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَّمَقْتًا وَسَآءَ سَبِيْلًا ﴿۲۲﴾ حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ اُمَّهٰتُكُمْ وَبَنٰتُكُمْ وَاَخَوٰتُكُمْ وَعَمّٰتُكُمْ وَخٰلٰتُكُمْ وَبَنٰتُ الْاَخِ وَبَنٰتُ الْاُخْتِ وَاُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِيْٓ اَرْضَعْنَكُمْ وَاَخَوٰتُكُمْ مِّنَ الرَّضَاعَةِ وَاُمَّهٰتُ نِسَآئِكُمْ وَرَبَآئِبُكُمُ الّٰتِيْ فِيْ حُجُوْرِكُمْ مِّنْ نِّسَآئِكُمُ الّٰتِيْ دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَاِنْ لَّمْ تَكُوْنُوْا دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ وَحَلَآئِلُ اَبْنَآئِكُمُ الَّذِيْنَ مِنْ اَصْلَابِكُمْ وَاَنْ تَجْمَعُوْا بَيْنَ الْاُخْتَيْنِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۲۳﴾

"اور جن عورتوں سے تمہارے باپ نکاح کر چکے ہوں ان سے ہرگز نکاح نہ کرو' مگر جو پہلے ہو چکا سو چکا' در حقیقت یہ ایک بے حیائی کا فعل ہے۔ ناپسندیدہ ہے اور برا چلن ہے.......... تم پر حرام کر دی گئیں ہیں تمہاری مائیں' بیٹیاں' بہنیں' پھوپھیاں' خالائیں' بھتیجیاں' بھانجیاں اور تمہاری وہ مائیں جنہوں نے تم کو دودھ پلایا ہو' اور تمہاری دودھ شریک بہنیں اور تمہاری بیویوں کی مائیں' اور تمہاری بیویوں کی لڑکیاں جنہوں نے تمہاری گود میں پرورش پائی ہو.......... ان بیویوں کی لڑکیاں جن سے تمہارا تعلق زن و شو ہو چکا ہو ورنہ اگر تعلق زن و شو نہ ہوا تو تم پر کوئی مواخذہ نہیں ہے۔ اور تمہارے ان بیٹوں کی بیویاں جو تمہارے صلب سے ہوں اور یہ بھی تم پر حرام کیا گیا ہے کہ ایک نکاح میں دو بہنوں کو جمع کرو' مگر جو پہلے ہو گیا سو ہو گیا۔ اللہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔ اور وہ عورتیں بھی تم پر حرام ہیں جو کسی دوسرے کے نکاح میں ہوں۔ البتہ ایسی عورتیں اس سے مستثنیٰ ہیں جو جنگ میں تمہارے ہاتھ آئیں۔ یہ اللہ کا قانون ہے جس کی پابندی تم پر لازم کر دی گئی ہے.......... ان کے سوا جتنی عورتیں ہیں انہیں اپنے اموال کے ذریعہ سے حاصل کرنا تمہارے لئے حلال کر دیا گیا ہے' بشرطیکہ حصار نکاح میں ان کو محفوظ کرو' نہ یہ کہ آزاد شہوت رانی کرنے لگو' پھر جو ازدواجی زندگی کا لطف تم ان سے اٹھاؤ اس کے بدلے ان کے مہر بطور فرض کے ادا کرو' البتہ مہر کی قرارداد ہو جانے کے بعد آپس کی رضامندی سے تمہارے درمیان اگر کوئی سمجھوتہ ہو جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں' اللہ علیم و دانا ہے۔"

وَاِنِ امْرَاَةٌ خَافَتْ مِنْۢ بَعْلِهَا نُشُوْزًا اَوْ اِعْرَاضًا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يُّصْلِحَا بَيْنَهُمَا صُلْحًا وَالصُّلْحُ خَيْرٌ وَاُحْضِرَتِ الْاَنْفُسُ الشُّحَّ وَاِنْ تُحْسِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ﴿۱۲۸﴾ وَلَنْ تَسْتَطِيْعُوْٓا اَنْ تَعْدِلُوْا بَيْنَ النِّسَآءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ فَلَا تَمِيْلُوْا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوْهَا كَالْمُعَلَّقَةِ وَاِنْ تُصْلِحُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا

رَّحِيمًا ﴿١٢٩﴾ وَإِن يَتَفَرَّقَا يُغْنِ اللَّهُ كُلًّا مِّن سَعَتِهِ ۚ وَكَانَ اللَّهُ وَاسِعًا حَكِيمًا

"جب کسی عورت کو اپنے شوہر سے بدسلوکی یا بے رخی کا خطرہ ہو تو کوئی مضائقہ نہیں اگر میاں بیوی آپس میں صلح کرلیں، صلح بہرحال بہتر ہے، نفس تنگ دلی کی طرف جلدی مائل ہو جاتے ہیں۔ لیکن اگر تم لوگ احسان سے پیش آؤ اور خدا ترسی سے کام لو تو یقین رکھو کہ اللہ تمہارے اس طرز عمل سے بے خبر نہ ہوگا۔ بیویوں کے درمیان پورا پورا عدل کرنا تمہارے بس میں نہیں ہے۔ تم چاہو بھی تو اس پر قادر نہیں ہوسکتے۔ لہٰذا ایک بیوی کی طرف اس طرح نہ جھک جاؤ کہ دوسری کو ادھر لٹکتا چھوڑ دو۔ اگر تم اپنا طرز عمل درست رکھو اور اللہ سے ڈرتے رہو تو اللہ چشم پوشی کرنیوالا اور رحم فرمانے والا ہے۔ اور اگر زوجین ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں تو اللہ اپنی وسیع قدرت سے ہر ایک کو دوسرے کی محتاجی سے بے نیاز کر دے گا۔ اللہ کا دامن بہت کشادہ ہے اور وہ دانا اور بینا ہے۔"

ایک خاندان کے افراد کے درمیان باہم تعلقات کی تنظیم اور ان کے درمیان معاشی تکافل (Social Security) پیدا کرنے کیلئے۔ نیز مالکوں اور غلاموں کے درمیان معاشی تعلقات کی ضابطہ بندی کیلئے بھی اس سورت میں قانون سازی کی گئی ہے۔ اس لئے کہ غلاموں اور مالکوں کے درمیان نسب کی نسبت قانون سازی اور تبنی کی منسوخی کے قوانین کے نزول سے قبل باقاعدہ معاہدے ہوا کرتے تھے۔ یہ قانون سازی نہایت ہی جامع اصولوں پر مبنی ہے۔ یہ اصول اجتماعی زندگی کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں۔ یہ قطعی قوانین معاشرے کے اندر دوررس تبدیلیاں لاتے ہیں۔

يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ ۖ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثَيَيْنِ ۚ فَإِن كُنَّ نِسَاءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ ۖ وَإِن كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ ۚ وَلِأَبَوَيْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ إِن كَانَ لَهُ وَلَدٌ ۚ فَإِن لَّمْ يَكُن لَّهُ وَلَدٌ وَوَرِثَهُ أَبَوَاهُ فَلِأُمِّهِ الثُّلُثُ ۚ فَإِن كَانَ لَهُ إِخْوَةٌ فَلِأُمِّهِ السُّدُسُ ۚ مِن بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُوصِي بِهَا أَوْ دَيْنٍ ۗ آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ لَا تَدْرُونَ أَيُّهُمْ أَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا ۚ فَرِيضَةً مِّنَ اللَّهِ ۗ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلِيمًا حَكِيمًا ﴿١١﴾ وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ أَزْوَاجُكُمْ إِن لَّمْ يَكُن لَّهُنَّ وَلَدٌ ۚ فَإِن كَانَ لَهُنَّ وَلَدٌ فَلَكُمُ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْنَ ۚ مِن بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُوصِينَ بِهَا أَوْ دَيْنٍ ۚ وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ إِن لَّمْ يَكُن لَّكُمْ وَلَدٌ ۚ فَإِن كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكْتُم ۚ مِّن بَعْدِ وَصِيَّةٍ تُوصُونَ بِهَا أَوْ دَيْنٍ ۗ وَإِن كَانَ رَجُلٌ يُورَثُ كَلَالَةً أَوِ امْرَأَةٌ وَلَهُ أَخٌ أَوْ أُخْتٌ فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ ۚ فَإِن كَانُوا أَكْثَرَ مِن ذَٰلِكَ فَهُمْ شُرَكَاءُ فِي الثُّلُثِ ۚ مِن بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُوصَىٰ بِهَا أَوْ دَيْنٍ غَيْرَ مُضَارٍّ ۚ وَصِيَّةً مِّنَ اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَلِيمٌ ﴿١٢﴾

"تمہاری اولاد کے بارے میں اللہ تمہیں ہدایت کرتا ہے کہ مرد کا حصہ دو عورتوں کے برابر ہے۔ اگر دو سے زیادہ لڑکیاں ہوں تو انہیں ترکے کا دو تہائی حصہ دیا جائے 'اور اگر ایک ہی لڑکی ہو تو آدھا ترکہ اس کا ہے 'اور اگر میت صاحب اولاد ہو تو اس کے والدین میں سے ہر ایک کو ترکے کا چھٹا حصہ ملنا چاہئے۔ اور اگر وہ صاحب اولاد نہ ہو اور والدین ہی اس کے وارث ہوں تو ماں کو تیسرا حصہ دیا جائے ۔"

اور اگر میت کے بھائی بہن بھی ہوں تو ماں چھٹے حصے کی حقدار ہوگی۔ یہ سب حصے اس وقت نکالے جائیں گے جبکہ وصیت جو میت نے کی ہو پوری کردی جائے اور قرض جو اس پر ہو ادا کردیا جائے۔

تم نہیں جانتے کہ تمہارے ماں باپ اور تمہاری اولاد میں سے کون بلحاظ نفع تم سے قریب تر ہے۔ یہ حصے اللہ نے مقرر کر دیئے ہیں اور اللہ یقیناً سب حقیقتوں سے واقف ہے 'ساری مصلحتوں کو جاننے والا ہے۔

اور تمہاری بیویوں نے جو کچھ چھوڑا ہو اس کا آدھا حصہ تمہیں ملے گا اگر وہ بے اولاد ہوں 'ورنہ اولاد ہونے کی صورت میں ترکہ کا ایک چوتھائی حصہ تمہارا ہے جبکہ وصیت جو انہوں نے کی ہو پوری کردی جائے اور قرض جو انہوں نے چھوڑا ہو ادا کردیا جائے۔ اور وہ تمہارے ترکہ میں سے چوتھائی کی حقدار ہوں گی۔ اگر تم بے اولاد ہو 'ورنہ صاحب اولاد ہونے کی صورت میں ان کا حصہ آٹھواں ہوگا۔ بعد اس کے کہ جو وصیت تم نے کی ہو وہ پوری کردی جائے اور جو قرض تم نے چھوڑا ہو وہ ادا کردیا جائے۔

اور اگر وہ مرد یا عورت بے اولاد ہو اور اس کے ماں باپ بھی زندہ نہ ہوں مگر اس کا ایک بھائی یا بہن موجود ہو تو بھائی بہن ہر ایک کو چھٹا حصہ ملے گا۔ اور اگر بھائی بہن ایک سے زیادہ ہوں تو کل ترکہ کے ایک تہائی میں وہ سب شریک ہوں گے۔

"جبکہ وصیت جو کی گئی ہو پوری کردی جائے اور قرض جو میت نے چھوڑا ہو ادا کردیا جائے 'بشرطیکہ وہ ضرر رساں نہ ہو۔ یہ حکم ہے اللہ کی طرف سے اور اللہ دانا اور بینا اور نرم خو ہے۔" (آیت ۱۱'۱۲)

يَسْتَفْتُوْنَكَ ؕ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِي الْكَلٰلَةِ ؕ اِنِ امْرُؤٌا هَلَكَ لَيْسَ لَهٗ وَلَدٌ وَّ لَهٗۤ اُخْتٌ فَلَهَا نِصْفُ مَا تَرَكَ ۚ وَ هُوَ يَرِثُهَاۤ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهَا وَلَدٌ ؕ فَاِنْ كَانَتَا اثْنَتَيْنِ فَلَهُمَا الثُّلُثٰنِ مِمَّا تَرَكَ ؕ وَ اِنْ كَانُوْۤا اِخْوَةً رِّجَالًا وَّ نِسَآءً فَلِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ ؕ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اَنْ تَضِلُّوْا ؕ وَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ۠

"لوگ تم سے کلالہ کے معاملے میں فتویٰ پوچھتے ہیں 'کہو اللہ تمہیں فتویٰ دیتا ہے 'اگر کوئی شخص بے اولاد مرجائے اور اس کی ایک بہن ہو تو وہ اس کے ترکہ میں سے نصف پائے گی اور اگر بہن بے اولاد مرجائے تو بھائی اس کا وارث ہوگا۔ اگر میت کی وارث دو بہنیں ہوں تو وہ ترکے میں سے دو تہائی کی حقدار ہوں گی اور اگر کئی بھائی اور بہنیں ہوں تو عورتوں کا اکہرا اور مردوں کا دوہرا حصہ ہوگا۔ اللہ تمہارے لئے احکام کی توضیح کرتا ہے تاکہ تم بھٹکتے نہ پھرو اور اللہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔" (آیت ۱۷۶)

وَ لِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِيَ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَ الْاَقْرَبُوْنَ ؕ وَ الَّذِيْنَ عَقَدَتْ اَيْمَانُكُمْ فَاٰتُوْهُمْ

نَصِيْبَهُمْ ۚ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدًا

"اور تم نے ہر اس ترکے کے حقدار مقرر کر دیئے ہیں جو والدین اور رشتہ دار چھوڑیں۔ اب رہے وہ لوگ جن سے تمہارے عہدو پیمان ہوں تو ان کا حصہ انہیں دو یقیناً اللہ ہر چیز کا نگران ہے۔"

اس سورت میں اسلامی معاشرے کو فحاشی سے بچانے کی تدابیر بھی کی گئی ہیں نیز اس میں ایسے اسباب فراہم کرنے کا بھی حکم دیا گیا ہے کہ لوگ شادیاں کر سکیں اور یوں وہ فحاشی سے بچ سکیں مثلاً درج ذیل تدابیر قابل لحاظ ہیں:

وَالّٰتِيْ يَاْتِيْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَآئِكُمْ فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَيْهِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ ۚ فَاِنْ شَهِدُوْا فَاَمْسِكُوْهُنَّ فِي الْبُيُوْتِ حَتّٰى يَتَوَفّٰهُنَّ الْمَوْتُ اَوْ يَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِيْلًا وَالَّذٰنِ يَاْتِيٰنِهَا مِنْكُمْ فَاٰذُوْهُمَا ۚ فَاِنْ تَابَا وَاَصْلَحَا فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمَا اِنَّ اللّٰهَ كَانَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا

"تمہاری عورتوں میں سے جو بدکاری کی مرتکب ہوں ان پر اپنے میں سے چار آدمیوں کی گواہی لو' اور اگر چار آدمی گواہی دے دیں تو ان کو گھروں میں بند رکھو یہاں تک کہ انہیں موت آجائے یا ان کے لئے اللہ کوئی راستہ نکال دے۔ اور تم میں سے جو اس فعل کا ارتکاب کریں ان دونوں کو تکلیف دو' پھر اگر وہ توبہ کریں اور اپنی اصلاح کر لیں تو انہیں چھوڑ دو کہ اللہ بہت توبہ قبول کرنیوالا اور رحم کرنیوالا ہے۔"

وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا اَنْ يَّنْكِحَ الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ فَمِنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ فَتَيٰتِكُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ۭ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِكُمْ ۭ بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۚ فَانْكِحُوْهُنَّ بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ وَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ مُحْصَنٰتٍ غَيْرَ مُسٰفِحٰتٍ وَّلَا مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ ۚ فَاِذَآ اُحْصِنَّ فَاِنْ اَتَيْنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنٰتِ مِنَ الْعَذَابِ ۭ ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ الْعَنَتَ مِنْكُمْ ۭ وَاَنْ تَصْبِرُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۵﴾ يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُبَيِّنَ لَكُمْ وَيَهْدِيَكُمْ سُنَنَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَيَتُوْبَ عَلَيْكُمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ

"اور جو شخص تم میں سے اتنی مقدرت نہ رکھتا ہو کہ خاندانی مسلمان عورتوں سے نکاح کر سکے۔ اسے چاہئے کہ تمہاری ان لونڈیوں میں سے کسی کے ساتھ نکاح کرے جو تمہارے قبضہ میں ہوں اور مومنہ ہوں' اللہ تمہارے ایمان کا حال خوب جانتا ہے۔ تم سب ایک ہی گروہ کے لوگ ہو' لہٰذا ان کے سرپرستوں کی اجازت سے ان کے ساتھ نکاح کر لو اور معروف طریقہ سے ان کے مہر ادا کر دو' تاکہ وہ حصار نکاح میں محفوظ ہو کر رہیں' نہ آزاد شہوت رانی کرتی پھریں اور نہ چوری چھپے آشنائیاں کریں پھر جب وہ حصار نکاح میں محفوظ ہو جائیں اور اس کے بعد کسی بد چلنی کی مرتکب ہوں تو ان پر اس سزا کی نسبت آدھی سزا ہے جو آزاد عورتوں کیلئے مقرر ہے۔ یہ سہولت تم میں سے ان لوگوں کیلئے پیدا کی گئی ہے جن کو شادی نہ کرنے سے بند تقویٰ کے ٹوٹ جانے کا اندیشہ ہو۔ لیکن اگر تم صبر کرو تو یہ تمہارے لئے بہتر ہے۔

اور اللہ بخشنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔"

اللہ چاہتا ہے کہ تم پر ان طریقوں کو واضح کرے اور انہی طریقوں پر تمہیں چلائے جن کی پیروی تم سے پہلے گزرے ہوئے صلحا کرتے تھے۔ وہ اپنی رحمت کے ساتھ تمہارے طرف متوجہ ہونے کا ارادہ رکھتا ہے اور وہ علیم بھی ہے اور دانا بھی۔"

یہاں پورے اسلامی معاشرے کی شیرازہ بندی کے لئے بھی ہدایات دی گئی ہیں تاکہ وہ باہم' ہم آہنگی' باہم دلسوزی اور اجتماعی تکافل (Social Security) امانت داری' عدل وانصاف' محبت و خوش اخلاقی' احسان اور ایثار کی اساس پر پروان چڑھے۔ اور اس سلسلے میں مذکورہ بالا خصوصی ہدایات کے سوا درج ذیل ہدایات دی گئی ہیں اور قانون سازی بھی کی گئی ہے۔ یہاں ہم بطور مثال چند چیزوں کا ذکر کرتے ہیں' پوری تفصیلات یہاں نہیں دی جاسکیں۔ مفصل بحث اپنی جگہ ہوگی۔

وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَاءَ أَمْوَالَكُمُ الَّتِي جَعَلَ اللَّهُ لَكُمْ قِيَامًا وَارْزُقُوهُمْ فِيهَا وَاكْسُوهُمْ وَقُولُوا لَهُمْ قَوْلًا مَعْرُوفًا (۴:۵)

"اور اپنے وہ مال جنہیں اللہ نے تمہارے لئے قیام زندگی کا ذریعہ بنایا ہے۔ نادان لوگوں کے حوالے نہ کرو' البتہ انہیں کھانے اور پہننے کیلئے دو انہیں نیک ہدایت کرو۔"

وَإِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ أُولُو الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينُ فَارْزُقُوهُمْ مِنْهُ وَقُولُوا لَهُمْ قَوْلًا مَعْرُوفًا (۴:۸)

اور جب تقسیم کے موقعہ پر کنبہ کے لوگ اور یتیم اور مسکین آئیں تو اس مال میں سے ان کو بھی کچھ دو اور ان کے ساتھ بھلے مانسوں کی سی بات کرو۔"

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ إِلَّا أَنْ تَكُونَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِنْكُمْ ۚ وَلَا تَقْتُلُوا أَنْفُسَكُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيمًا ۝ وَمَنْ يَفْعَلْ ذَٰلِكَ عُدْوَانًا وَظُلْمًا فَسَوْفَ نُصْلِيهِ نَارًا ۚ وَكَانَ ذَٰلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرًا

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو' آپس میں ایک دوسرے کے مال باطل طریقوں سے نہ کھاؤ' لین دین ہونا چاہئے آپس کی رضامندی سے' اور اپنے آپ کو قتل نہ کرو۔ یقین مانو کہ اللہ تمہارے اوپر مہربان ہے۔ جو شخص ظلم و زیادتی کے ساتھ ایسا کرے گا اس کہ ہم ضرور آگ میں جھونکیں گے اور یہ اللہ کیلئے کوئی مشکل کام نہیں ہے۔"

وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللَّهُ بِهِ بَعْضَكُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ ۚ لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِمَّا اكْتَسَبُوا ۖ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِمَّا اكْتَسَبْنَ ۚ وَاسْأَلُوا اللَّهَ مِنْ فَضْلِهِ ۗ إِنَّ اللَّهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمًا

"اور جو کچھ اللہ نے تم میں سے کسی کو دوسرں کے مقابلے میں زیادہ دیا ہے اس کی تمنا نہ کرو۔ جو کچھ مردوں نے کمایا ہے اس کے

مطابق ان کا حصہ ہے اور جو کچھ عورتوں نے کمایا ہے اس کے مطابق ان کا حصہ ہے۔ ہاں اللہ سے اس کے فضل کی دعا مانگتے رہو' یقیناً اللہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔"

وَ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَ لَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَیْــٴًـا وَّ بِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا وَّ بِذِی الْقُرْبٰى وَ الْیَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِیْنِ وَ الْجَارِ ذِی الْقُرْبٰى وَ الْجَارِ الْجُنُبِ وَ الصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ وَ ابْنِ السَّبِیْلِ ۙ وَ مَا مَلَكَتْ اَیْمَانُكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرَاۙ الَّذِیْنَ یَبْخَلُوْنَ وَ یَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ وَ یَكْتُمُوْنَ مَاۤ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ وَ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِیْنَ عَذَابًا مُّهِیْنًا وَ الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ رِئَآءَ النَّاسِ وَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ لَا بِالْیَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ وَ مَنْ یَّكُنِ الشَّیْطٰنُ لَهٗ قَرِیْنًا فَسَآءَ قَرِیْنًا

"اور اللہ کی بندگی کرو' اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ' ماں باپ کے ساتھ نیک برتاؤ کرو' قرابت داروں' یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آؤ' اور پڑوسی رشتہ دار سے' اجنبی ہمسایہ سے' پہلو کے ساتھی اور مسافر سے۔ اور ان لونڈیوں' غلاموں سے جو تمہارے قبضہ میں ہوں' احسان کا معاملہ رکھو' یقین جانو اللہ کسی ایسے شخص کو پسند نہیں کرتا جو اپنے پندار میں مغرور ہو' اور اپنی بڑائی پر فخر کرے۔ اور ایسے لوگ بھی پسند نہیں جو کنجوسی کرتے ہیں۔ اور دوسروں کو بھی کنجوسی کی ہدایت کرتے ہیں اور جو اللہ نے اپنے فضل سے انہیں دیا ہے اسے چھپاتے ہیں۔ ایسے کافر نعمت لوگوں کیلئے ہم نے رسوا کن عذاب مہیا کر رکھا ہے۔ اور وہ لوگ بھی اللہ کو ناپسند ہیں جو اپنے مال کو محض دکھانے کیلئے خرچ کرتے ہیں اور در حقیقت نہ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں نہ روز آخر پر۔ سچ یہ ہے کہ شیطان جس کا رفیق ہو اسے بہت ہی بری رفاقت میسر آئی۔"

اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰۤى اَهْلِهَا ۙ وَ اِذَا حَكَمْتُمْ بَیْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ نِعِمَّا یَعِظُكُمْ بِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ سَمِیْعًۢا بَصِیْرًا

"مسلمانو! اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں اہل امانت کے سپرد کرو' اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ کرو اللہ تم کو نہایت عمدہ نصیحت کرتا اور یقیناً اللہ سب کچھ سنتا اور دیکھتا ہے۔"

مَنْ یَّشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً یَّكُنْ لَّهٗ نَصِیْبٌ مِّنْهَا ۚ وَ مَنْ یَّشْفَعْ شَفَاعَةً سَیِّئَةً یَّكُنْ لَّهٗ كِفْلٌ مِّنْهَا ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ مُّقِیْتًا وَ اِذَا حُیِّیْتُمْ بِتَحِیَّةٍ فَحَیُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَاۤ اَوْ رُدُّوْهَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ حَسِیْبًا

"جو بھلائی کی سفارش کرے گا وہ اس میں سے حصہ پائے گا اور جو برائی کی سفارش کرے گا وہ اس میں سے حصہ پائے گا اور اللہ ہر

چیز پر نظر رکھنے والا ہے۔ اور جب کوئی احترام کے ساتھ تمہیں سلام کرے تو اس کو اس سے بہتر طریقہ کے ساتھ جواب دو یا کم از کم اسی طرح' اللہ ہر چیز کا حساب لینے والا ہے۔"

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ أَنْ يَقْتُلَ مُؤْمِنًا إِلَّا خَطَأً ۚ وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَأً فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُؤْمِنَةٍ وَدِيَةٌ مُسَلَّمَةٌ إِلَىٰ أَهْلِهِ إِلَّا أَنْ يَصَّدَّقُوا ۚ فَإِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَكُمْ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُؤْمِنَةٍ ۖ وَإِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِيثَاقٌ فَدِيَةٌ مُسَلَّمَةٌ إِلَىٰ أَهْلِهِ وَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُؤْمِنَةٍ ۖ فَمَنْ لَمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ تَوْبَةً مِنَ اللَّهِ ۗ وَكَانَ اللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمًا

"کسی مومن کا یہ کام نہیں ہے کہ دوسرے مومن کو قتل کرے' الایہ کہ اس سے چوک ہو جائے اور جو شخص کسی مومن کو غلطی سے قتل کر دے تو اس کا کفارہ یہ ہے کہ ایک مومن کو غلامی سے آزاد کرے اور مقتول کے وارثوں کو خون بہا دے' الایہ کہ وہ خون بہا معاف کر دیں۔ لیکن اگر وہ مسلمان مقتول کسی ایسی قوم سے تھا جس سے تمہاری دشمنی ہو تو اس کا کفارہ ایک مومن غلام آزاد کرنا ہے اور اگر وہ کسی ایسی غیر مسلم قوم کا فرد تھا جس سے تمہارا معاہدہ ہو تو اس کے وارثوں کو خون بہا دیا جائے اور ایک مومن غلام کو آزاد کرنا ہو گا۔ پھر جو غلام نہ پائے وہ پے در پے دو مہینے کے روزے رکھے۔ یہ اس گناہ پر اللہ سے توبہ کرنے کا طریقہ ہے اور اللہ علیم و دانا ہے۔ رہا وہ شخص جو کسی مومن کو جان بوجھ کر قتل کرے تو اس کی جزا جہنم ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا۔ اس پر اللہ کا غضب اور اس کی لعنت ہے اور اللہ نے اس کے لئے سخت عذاب مہیا کر رکھا ہے"۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ لِلَّهِ وَلَوْ عَلَىٰ أَنْفُسِكُمْ أَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ ۚ إِنْ يَكُنْ غَنِيًّا أَوْ فَقِيرًا فَاللَّهُ أَوْلَىٰ بِهِمَا ۖ فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوَىٰ أَنْ تَعْدِلُوا ۚ وَإِنْ تَلْوُوا أَوْ تُعْرِضُوا فَإِنَّ اللَّهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو' انصاف کے علمبردار اور خدا واسطے کے گواہ بنو اگرچہ تمہارے انصاف اور تمہاری گواہی کی زد خود تمہاری اپنی ذات پر یا تمہارے والدین اور رشتہ داروں پر ہی کیوں نہ پڑتی ہو۔ فریق معاملہ خواہ مالدار ہو یا غریب' اللہ تم سے زیادہ ان کا خیر خواہ ہے۔ لہٰذا اپنی خواہش نفس کی پیروی میں' عدل سے باز نہ رہو۔ اور اگر تم نے لگی لپٹی بات کہی یا سچائی سے پہلو بچایا تو جان رکھو کہ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ کو اس کی خبر ہے۔"

لَا يُحِبُّ اللَّهُ الْجَهْرَ بِالسُّوءِ مِنَ الْقَوْلِ إِلَّا مَنْ ظُلِمَ ۚ وَكَانَ اللَّهُ سَمِيعًا عَلِيمًا () إِنْ تُبْدُوا خَيْرًا أَوْ تُخْفُوهُ أَوْ تَعْفُوا عَنْ سُوءٍ فَإِنَّ اللَّهَ كَانَ عَفُوًّا قَدِيرًا (۴: ۱۴۸-۱۴۹)

"اللہ اس کو پسند نہیں کرتا کہ آدمی بدگوئی پر زبان کھولے' الایہ کہ کسی پر ظلم کیا گیا ہو' اور اللہ سب کچھ سننے والا اور جاننے والا ہے۔ لیکن اگر تم ظاہر و باطن میں بھلائی ہی کئے جاؤ یا کم از کم برائی سے درگزر کرو' تو اللہ کی صفت بھی یہی ہے کہ وہ بڑا معاف کرنے والا ہے حالانکہ سزا دینے پر وہ پوری قدرت رکھتا ہے۔"

○.....☆☆☆.....○

اسلامی معاشرے کو باہم تعاون اور سوشل سیکورٹی' باہم محبت اور ہمدردی باہم اصلاح اور نصیحت باہم امانت و دیانت باہم معاملات کی طہارت اور احسان کے اصولوں پر استوار کرنے کے عظیم مقصد کے ساتھ قرآن کریم کے پیش نظر یہ ہدف بھی تھا کہ اس معاشرے سے قدیم جاہلیت کے آثار باقیہ کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا جائے اور ان کی جگہ اسلامی معاشرے کے روشن خدوخال اجاگر کئے جائیں۔ لیکن ایک دوسرا اہم مقصد جو اگرچہ درج بالا مقاصد کی اساس نہ بنتا ہو لیکن وہ مقصد بھی اسلامی معاشرے کی تشکیل میں ان سے پہلے مقاصد سے کوئی کم اہم نہیں ہے۔ اور وہ مقصد یہ ہے کہ اس سورت میں "دین" کا مفہوم اور اس کی تعریف' ایمان کا مفہوم اور اس کی تعریف' اسلام کی شرائط اور اس کی تعریفات کو وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ ان کی روشنی میں اسلامی معاشرے کے مختلف اداروں اور قوانین کا ایک فرد اور معاشرے کی زندگی کے ساتھ تعلق و ربط کی تشریح و توضیح کی گئی ہے۔ یہ تشریح و توضیح اور ایمان اور دین کی یہ تعریف نہایت ہی مضبوط تعریف ہے۔

دین وہ نظام حیات ہے جو اللہ تعالیٰ نے انسان کی پوری زندگی کیلئے وضع فرمایا ہے۔ یہ وہ نظام ہے جس پر زندگی کی تگ و دو رواں دواں ہے۔ اور یہ خاصہ صرف اللہ کا ہے کہ وہ بلاشرکت غیرے یہ نظام وضع کرے۔ اور دین کا مفہوم اور خلاصہ یہ ہے کہ وہ صرف اللہ تعالیٰ وحدہ کی قیادت ربانی کے اتباع اور اطاعت عامہ کا نام ہے۔ اور یہ کہ صرف یہی قیادت اس کی مستحق ہے۔ دین کے معاملے میں صرف اللہ کی ذات ہی سے ہدایت لی جاسکتی ہے۔ اور صرف اسی کے سامنے سر تسلیم خم کیا جاسکتا ہے۔ پس اسلامی معاشرہ وہ ہو گا جس کی اپنی مخصوص قیادت ہو' جس طرح اس کا اپنا مخصوص نظریۂ حیات ہے۔ اور جس طرح اس کا اپنا مخصوص تصور زندگی ہے۔ یہ ربانی قیادت رسول اللہ کی ذات کی صورت میں نمودار ہوئی' اس ذات پر رب تعالیٰ کی طرف سے جو ہدایت نازل ہوئی وہ آج تک آپ کے بعد صحیح طرح باقی ہے۔ شریعت نبوی اور نظام مصطفیؐ کی صورت میں ہے۔ اسلامی معاشرے کی یہی صفت اطاعت رسول ہی اسے اسلامی معاشرہ بناتی ہے اور اس صفت سے اسلامی معاشرہ وجود میں آتا ہے۔ اس صفت اطاعت کے بغیر کسی صورت میں بھی کوئی معاشرہ مسلم معاشرہ نہیں ہو سکتا۔ اور اسلامی قیادت کی اطاعت اور اتباع یوں متحقق ہو گا کہ تمام فیصلے اللہ اور رسول اللہ کے احکام کے مطابق کئے جائیں اور تمام امور میں فیصلہ اللہ تعالیٰ سے لیا جائے اور ایک مسلمان اللہ اور رسول کے فیصلے پر راضی برضا ہو اور تسلیم و رضا کے ساتھ اس کے آگے جھکے۔

اس سورت کی آیات اس حقیقت کے بیان میں اور اس اصول کی وضاحت میں اس قدر واضح اور اس قدر کثرت سے ہیں اور اس قدر جزم سے اس کا بیان کرتی ہیں کہ اس میں کسی مناقشے اور مجادلے کی کوئی گنجائش ہی نہیں رہتی۔ نہ ان آیات کے مفہوم کے بیان میں کوئی حیلہ اور تاویل کر سکتا ہے۔ نہ کوئی ان میں التباس اور تحریف کر سکتا ہے۔ اس لئے کہ یہ قرآنی آیات غایت درجے واضح' قطعی اور فیصلہ کن ہیں اور وہ کسی مجادلے کی متحمل نہیں ہیں۔

اس عظیم اصول کو متعدد اور واضح آیات میں بیان کیا گیا ہے۔ جس کی تفصیلی تشریح اپنی جگہ ہوگی جہاں ہم ان کی تفسیر بیان کریں گے۔ یہاں ہم بطور نمونہ چند ایک کو اجمالاً نقل کرتے ہیں۔ مثلاً اجمالاً اس اصول کو اس سورت کی آیت افتتاحیہ میں بیان کیا گیا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ

"اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا" نیز اس مضمون کی آیات سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے مثلاً اُعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا .... "اللہ کی بندگی کرو اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کرو۔" (آیت ۲۷)

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ....

"اللہ تعالیٰ اس فعل کی مغفرت نہیں فرماتے کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک کیا جائے اور اس کے سوا جسے چاہیں معاف کرتے ہیں۔" (آیت ۴۸)

اور درج ذیل آیات سے یہ نظریہ تخصیص کے ساتھ بطور قطعیت ثابت ہوتا ہے۔ مثلاً

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ذَلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيلًا ﴿٥٩﴾ أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ يَزْعُمُونَ أَنَّهُمْ آمَنُوا بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيدُونَ أَنْ يَتَحَاكَمُوا إِلَى الطَّاغُوتِ وَقَدْ أُمِرُوا أَنْ يَكْفُرُوا بِهِ وَيُرِيدُ الشَّيْطَانُ أَنْ يُضِلَّهُمْ ضَلَالًا بَعِيدًا ﴿٦٠﴾ وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا إِلَى مَا أَنْزَلَ اللَّهُ وَإِلَى الرَّسُولِ رَأَيْتَ الْمُنَافِقِينَ يَصُدُّونَ عَنْكَ صُدُودًا ﴿٦١﴾

"اے لوگو! جو ایمان لائے ہو' اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور ان لوگوں کی جو تم میں سے صاحب امر ہوں' پھر اگر تمہارے درمیان کسی معاملہ میں نزاع ہو جائے تو اسے اللہ اور رسول کی طرف پھیر دو' اگر تم واقعی اللہ اور روز آخر پر ایمان رکھتے ہو۔ یہی ایک صحیح طریق کار ہے اور انجام کے اعتبار سے بھی بہتر ہے۔ اے نبی تم نے دیکھا نہیں ان لوگوں کو جو دعویٰ تو کرتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ہیں اس کتاب پر جو تمہاری طرف نازل کی گئی ہے اور ان کتابوں پر جو تم سے پہلے نازل کی گئی تھیں۔ مگر چاہتے یہ ہیں کہ اپنے معاملات کا فیصلہ کرانے کیلئے طاغوت کی طرف رجوع کریں' حالانکہ انہیں طاغوت سے کفر کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ شیطان انہیں بھٹکا کر راہ راست سے بہت دور لے جانا چاہتا ہے۔ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ اس چیز کی طرف جو اللہ نے نازل کی ہے اور آؤ رسول کی طرف تو ان منافقوں کو تم دیکھتے ہو کہ یہ تمہاری طرف آنے سے کتراتے ہیں۔"

وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَسُولٍ إِلَّا لِيُطَاعَ بِإِذْنِ اللَّهِ

"ہم نے جو رسول بھی بھیجا ہے اسی لئے بھیجا کہ اذن خداوندی کی بنا پر اس کی اطاعت کی جائے۔"

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا

"اے محمد! تمہارے رب کی قسم یہ کبھی مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ اپنے باہمی اختلافات میں یہ تم کو فیصلہ کرنیوالا نہ مان لیں' پھر جو کچھ تم فیصلہ کرو اس پر اپنے دلوں میں بھی کوئی تنگی محسوس نہ کریں' بلکہ سربسر تسلیم کر لیں۔"

مَنْ يُطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ وَمَنْ تَوَلَّى فَمَا أَرْسَلْنَاكَ عَلَيْهِمْ حَفِيظًا

"جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے دراصل خدا کی اطاعت کی اور جو منہ موڑ گیا' تو بہرحال ہم نے تمہیں ان لوگوں پر پاسبان بنا کر تو نہیں بھیجا ہے۔"

وَمَنْ يُشَاقِقِ الرَّسُولَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدَى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيلِ الْمُؤْمِنِينَ

نُوَلِّهِ مَا تَوَلّٰى وَ نُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ؕ وَ سَآءَتْ مَصِيْرًا

"مگر جو شخص رسول کی مخالفت پر کمربستہ ہو اور اہل ایمان کی روش کے سوا کوئی اور روش چلے' درآنحالیکہ اس پر راہ راست واضح ہو چکی ہو تو اس کو ہم اس طرف چلائیں گے جدھر خود وہ پھر گیا اور اسے جہنم میں جھونکیں گے جو بدترین جائے قرار ہے۔"

یوں ان آیات میں دین و ایمان کی تعریف و تحدید کر دی جاتی ہے۔ اور اسلام کی شرائط وضع کر دی جاتی ہیں۔ اور ایک اسلامی معاشرے کے خدوخال وضع کر دیئے جاتے ہیں۔ اور اسلامی نظام زندگی کا منہاج بتادیا جاتا ہے۔ جن سے نظر آتا ہے کہ اسلام صرف افکار و تصورات سے عبارت نہیں ہے۔ نہ اسلام چند کلمات کی ادائیگی اور چند شعار اپنا لینے کا نام ہے۔ نہ وہ صرف کوئی نظام عبادت اور رسومات پرستش کا نام ہے۔ بلکہ ان امور کے ساتھ ساتھ بلکہ ان سب سے پہلے ایک نظام حیات ہے۔ جو حکمران ہے' وہ ایک منہاج ہے جو فیصلہ کن ہے۔ وہ ایک قیادت ہے جس کی اطاعت کی جارہی ہے اور وہ ایک طرز عمل ہے جو ایک متعین نظام پر مبنی ہے۔ ایک متعین منہاج ہے اور ایک متعین قیادت ہے۔ اور اس کے سوا ایمان کا وجود متصور نہیں ہے۔ اس کے سوا اسلام کالعدم تصور ہو گا اور نہ ان امور کے سوا کوئی ایسا معاشرہ ممکن ہے جو اپنے آپ کو صحیح اسلامی معاشرہ کہہ سکے۔

○.....☆☆☆.....○

اس اصل الاصول کے تسلیم کر لینے کے بعد' اسی صورت میں متعدد توجیہات اور ہدایات دی گئی ہیں۔ اور یہ سب ہدایات اس اصول کا لازمی نتیجہ ہیں۔

۱: یہ کہ تمام اجتماعی اداروں کی حیثیت' ایک اسلامی معاشرے میں' ویسی ہی ہونی چاہئے جس طرح مراسم عبودیت کی حیثیت ہوتی ہے۔ اس عظیم اصول کی نسبت سے ہونی چاہئے جو دین کی مذکورہ بالا تعبیر پر مبنی ہے۔ ایمان کی اس تشریح پر مبنی ہو جس کی نشاندہی کی گئی۔ اور اسلام کی ان شرائط پر مبنی ہو جو ذکر ہوئیں۔ بعینہ اسی طرح جس طرح ہم نے اوپر مثالوں میں بیان کیا۔ اس لئے کہ اسلام میں یہ ادارے مجرد ادارے ہی نہیں نہ اسلام میں قوانین کی وہی حیثیت ہے جو عام قوانین کی ہوتی ہے۔ بلکہ یہ ادارے اور یہ قوانین مقتضائے ایمان ہوتے ہیں۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کی الوہیت کا اعتراف ہوتے ہیں۔ حکومتی اداروں کے قیام کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ الوہیت (بمعنی حاکمیت) میں اللہ کی ذات کو منفرد تصور کیا جائے اور اس سلسلے میں ہدایت اس قیادت سے لینا ضروری ہے جسے اللہ جل شانہ متعین فرمائیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی تصور حیات میں تمام اجتماعی اداروں اور تمام قوانین کا رخ اس سمت کی طرف ہوتا ہے جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا۔ اور یہ ان منصوص دلائل کی بنا پر ہوتا ہے جن سے یہ حقیقت ثابت ہوتی ہے۔

اس سورت کی آیت اختتامیہ وحدت انسانیت پر نص ہے۔ یہ آیت مسلمانوں کو یہ تصور دیتی ہے کہ وہ انسانی واسطوں کا خیال رکھیں اور یہ آیت ان تمام اجتماعی اداروں اور قوانین کیلئے اصل الاصول ہے جو بعد میں اس سورت میں بیان کئے گئے ہیں۔ اس سورت کے آغاز ہی میں لوگوں کو اس خدا کے خوف کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے۔ جس نے تمام لوگوں کو ایک نفس سے پیدا کیا يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ .... "لوگو اپنے رب سے ڈرو جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا۔" اور اس افتتاحی آیت کے آخر میں لوگوں کو یہ دعوت دی گئی ہے کہ وہ اللہ سے ڈریں اس لئے کہ وہ ہر وقت ان کی نگرانی کر رہا ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا .... (اللہ تمہارا نگران ہے) اس کے بعد وہ آیات جن میں حکم دیا گیا ہے کہ یتیموں کے اموال کی حفاظت کی جائے اور ان کے اموال میں جو طریقہ تصرف وضع کیا گیا ہے' ان کے آخر

۲:۔ اس عظیم اصول کے اقرار کا دوسرا اہم نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ تمام اہل ایمان اپنی قیادت اور اپنی جماعت کے پوری طرح وفادار ہوں۔ اس لئے وہ کسی ایسی قوت کے دوست نہ بنیں گے جو ان کی طرح مومن نہیں ہے اور نہ ہی وہ اس نظام حیات کی مطیع ہے جس کے وہ مطیع ہیں اور نہ وہ ان کے اجتماعی نظام کو تسلیم کرتے ہیں۔ اور نہ ہی وہ اسے ماخذ ہدایت تصور کرتے ہیں۔ چاہے اس "قوت" کے ساتھ ان کی نسبت جو بھی ہو۔ اس قوت کے ساتھ ان کی رشتہ داری ہو' اس قوت کے ساتھ ان کو قومی اشتراک حاصل ہو۔ اس قوت کے وہ ہم وطن ہوں' یا اس قوت کے ساتھ ان کے مفادات وابستہ ہوں۔ اگر وہ ایسا نہ کریں گے تو گویا وہ شرک و نفاق کے مرتکب ہوں گے۔ اور ہر صورت میں اسلامی صف سے خارج ہوں گے۔

وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا (۱۱۵) اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا بَعِيْدًا (۱۱۶)

"مگر جو شخص رسول کی مخالفت پر کمربستہ ہو اور اہل ایمان کی روش کے سوا کسی اور روش پر چلے درآنحالیکہ اس پر راہ راست واضح ہو چکی ہو' تو اس کو ہم اس طرف چلائیں گے جدھر وہ خود پھر گیا اور اسے جہنم میں جھونکیں گے جو بدترین جائے قرار ہے۔ اللہ کے ہاں بس شرک کی بخشش نہیں ہے۔ اس کے سوا اور سب کچھ معاف ہو سکتا ہے جسے وہ معاف کرنا چاہے' جس نے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا وہ تو گمراہی میں بہت دور نکل گیا۔"

بَشِّرِ الْمُنٰفِقِيْنَ بِاَنَّ لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۝ الَّذِيْنَ يَتَّخِذُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ اَيَبْتَغُوْنَ عِنْدَهُمُ الْعِزَّةَ فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا

اور جو منافق اہل ایمان کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا رفیق بناتے ہیں انہیں یہ مژدہ سنا دو کہ ان کیلئے دردناک سزا تیار ہے۔ کہ یہ لوگ عزت کی طلب میں ان کے پاس جاتے ہیں حالانکہ عزت تو ساری کی ساری اللہ کیلئے ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ عَلَيْكُمْ سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِى الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ نَصِيْرًا ۝ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا وَاَصْلَحُوْا وَاعْتَصَمُوْا بِاللّٰهِ وَاَخْلَصُوْا دِيْنَهُمْ لِلّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ وَسَوْفَ يُؤْتِ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا

"اے لوگو! جو ایمان لائے ہو' مومنوں کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا رفیق نہ بناؤ' کیا تم چاہتے ہو کہ اللہ کو اپنے خلاف صریح حجت دے

میں بھی یہ تلقین کی گئی ہے کہ تم نے اللہ کے سامنے پیش ہو کر حساب دینا ہے اور اللہ حساب لے سکتا ہے وَ كَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيْبًا ...

اس کے بعد اس سورت میں تقسیم میراث کے احکام آتے ہیں۔ افراد و خاندان کے حصص کا تعین لفظ وصیت سے شروع کیا جاتا ہے۔ يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْٓ اَوْلَادِكُمْ .... "اللہ تمہیں تمہاری اولاد کے بارے میں وصیت کرتا ہے۔" اور کہا جاتا ہے کہ قانون میراث فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ .... (اللہ کی جانب سے عائد کردہ فرض ہے۔) اور آخر میں خاتمہ کلام یوں ہوتا ہے۔

تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ۭ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيْهَا ۠ وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ

"یہ اللہ کی مقرر کی ہوئی حدیں ہیں۔ جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے گا اسے اللہ ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور ان باغوں میں وہ ہمیشہ رہے گا۔ اور یہی بڑی کامیابی ہے۔ اور جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا اور اس کی مقرر کی ہوئی حدوں سے تجاوز کرے گا اسے آگ میں ڈالا جائے گا جس میں وہ ہمیشہ رہے گا۔ اور اس کیلئے رسوا کن سزا ہے۔"

اسی طرح ایک خاندان کی شیرازہ بندی مہر اور طلاق وغیرہ کی ضابطہ بندی کے آخر میں بھی ایسی ہی تعقیبات آتی ہیں مثلاً

وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَاۗءِ اِلَّا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ .... كِتٰبَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ ....

.... (اور وہ عورتیں بھی تم پر حرام ہیں جو کسی دوسرے کے نکاح میں ہوں...... یہ اللہ کا قانون ہے جس کی پابندی تم پر لازم کر دی گئی ہے۔)

يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُبَيِّنَ لَكُمْ وَيَهْدِيَكُمْ سُنَنَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَيَتُوْبَ عَلَيْكُمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ (۲۶)

"اللہ چاہتا ہے کہ تم پر ان طریقوں کو واضح کرے اور انہی طریقوں پر تمہیں چلائے جن کی پیروی تم سے پہلے گزرے ہوئے صلحا کرتے تھے۔ وہ اپنی رحمت کے ساتھ تمہاری طرف متوجہ ہونے کا ارادہ رکھتا ہے وہ علیم بھی ہے اور دانا بھی ہے۔"

......فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيًّا كَبِيْرًا (۳۴)

"......پھر اگر وہ تمہاری مطیع ہو جائیں تو خواہ مخواہ ان پر دست درازی کیلئے بہانے تلاش نہ کرو، یقین رکھو کہ اوپر اللہ موجود ہے جو بڑا اور بالاتر ہے۔"

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـــًٔا...... (۳۶)

"تم سب اللہ کی بندگی کرو، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ۔"...... اور اس آیت کے بعد والدین کے ساتھ احسان کی تاکید کی گئی ہے۔ قرابت داروں، یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا گیا ہے۔........... غرض اسلامی معاشرے میں ہر قسم کی تنظیم و تربیت اور ہر قسم کی قانون سازی اور ضابطہ بندی کو ذات باری کے ساتھ وابستہ کیا گیا ہے۔ اور تمام امور میں حق اطاعت اور بندگی اسی ذات کے حوالے کی گئی ہے۔ جو اس ضمن میں وحدہ لاشریک ہے۔

دو؟ یقین جانو کہ منافق جہنم کے سب سے نچلے طبقے میں جائیں گے اور تم کسی کو ان کا مدد گار نہ پاؤ گے۔ البتہ جو ان میں سے تائب ہو جائیں اور اپنے طرز عمل کی اصلاح کرلیں اور اللہ کا دامن تھام لیں اور اپنے دین کو اللہ کیلئے خالص کر دیں۔ ایسے لوگ مومنوں کے ساتھ ہیں اور اللہ مومنوں کو ضرور اجر عظیم عطا فرمائے گا۔"

۳:۔ اس کا تیسرا نتیجہ یہ ہے کہ مسلمانوں پر دارالحرب سے ہجرت فرض ہو جاتی ہے۔ (اور دارالحرب ہر وہ مملکت ہے جس میں اسلامی شریعت نافذ نہ ہو اور اس میں ایسے لوگ بر سر اقتدار نہ ہوں جو صحیح طرح مسلمان ہوں۔) تاکہ وہ ایک اسلامی جماعت میں مل جائیں جبکہ وہ جماعت موجود ہو اور کسی خطے میں بر سر اقتدار ہو تاکہ وہ ایک اسلامی قیادت کی ماتحتی میں آجائیں اور انہیں کافرانہ جھنڈے کے تحت زندگی بسر نہ کرنا پڑے۔ اور کافرانہ قیادت اور جھنڈا ہر وہ قیادت ہے جو اسلام کے سوا ہے۔ اگر دارالکفر سے مسلمان ہجرت نہ کریں گے تو پھر وہ منافق تصور ہوں گے یا کافر تصور ہوں گے۔ اور دونوں صورتوں میں وہ اسلامی صفوف سے خارج ہوں گے۔

فَمَا لَكُمْ فِي الْمُنٰفِقِيْنَ فِئَتَيْنِ وَ اللّٰهُ اَرْكَسَهُمْ بِمَا كَسَبُوْا ؕ اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَهْدُوْا مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ ؕ وَ مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا ۝۸۸ وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوْا فَتَكُوْنُوْنَ سَوَآءً فَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ اَوْلِيَآءَ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَخُذُوْهُمْ وَ اقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ ۪ وَ لَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ وَلِيًّا وَّ لَا نَصِيْرًا

"پھر تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ منافقین کے بارے میں تمہارے درمیان دو رائیں پائی جاتی ہیں' حالانکہ جو برائیاں انہوں نے کمائی ہیں' ان کی بدولت اللہ انہیں الٹا پھیر چکا ہے۔ کیا تم چاہتے ہو کہ جسے اللہ نے ہدایت نہیں بخشی اسے تم ہدایت بخش دو؟ حالانکہ جس کو اللہ نے راستہ سے ہٹا دیا اس کیلئے تم کوئی راستہ نہیں پاسکتے۔ وہ تو یہ چاہتے ہیں کہ جس طرح وہ خود کافر ہیں اسی طرح تم بھی کافر ہو جاؤ تاکہ تم اور وہ سب یکساں ہو جائیں۔ لہٰذا ان میں سے کسی کو اپنا دوست نہ بناؤ۔ جب تک کہ وہ اللہ کی راہ میں ہجرت کرکے نہ آجائیں اور اگر وہ ہجرت سے باز رہیں تو جہاں پاؤ انہیں پکڑو اور قتل کرو۔ اور ان میں سے کسی کو اپنا دوست اور مددگار نہ بناؤ۔"

اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَالُوْا فِيْمَ كُنْتُمْ ؕ قَالُوْا كُنَّا مُسْتَضْعَفِيْنَ فِي الْاَرْضِ ؕ قَالُوْٓا اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا ؕ فَاُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ وَ سَآءَتْ مَصِيْرًا ۝۹۷ اِلَّا الْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَ النِّسَآءِ وَ الْوِلْدَانِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ حِيْلَةً وَّ لَا يَهْتَدُوْنَ سَبِيْلًا ۝۹۸ فَاُولٰٓئِكَ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّعْفُوَ عَنْهُمْ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَفُوًّا غَفُوْرًا ۝۹۹ وَ مَنْ يُّهَاجِرْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يَجِدْ فِي الْاَرْضِ مُرٰغَمًا كَثِيْرًا وَّ سَعَةً ؕ وَ مَنْ يَّخْرُجْ مِنْۢ بَيْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا

"جو لوگ اپنے نفس پر ظلم کر رہے تھے' ان کی روحیں فرشتوں نے قبض کیں تو ان سے پوچھا کہ یہ تم کس حال میں مبتلا تھے۔ انہوں نے جواب دیا کہ ہم زمین میں کمزور و مجبور تھے۔ فرشتوں نے کہا' کہ خدا کی زمین وسیع نہ تھی کہ تم اس میں ہجرت کرتے؟ یہ وہ لوگ ہیں جن کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بڑا ہی برا ٹھکانا ہے۔ ہاں جو مرد' عورتیں اور بچے واقعی بے بس ہیں اور نکلنے کا کوئی راستہ اور ذریعہ نہیں پاتے' بعید نہیں کہ اللہ انہیں معاف کر دے۔ اللہ بڑا معاف کرنیوالا اور درگزر فرمانے والا ہے۔ اور جو کوئی اللہ کی راہ میں ہجرت کرے گا وہ زمین میں پناہ لینے کیلئے بہت جگہ اور بسر اوقات کیلئے بڑی گنجائش پائے گا اور جو اپنے گھروں سے اللہ اور رسول کی طرف ہجرت کیلئے نکلے۔ پھر راستہ میں اسے موت آجائے' اس کا اجر اللہ کے ذمے واجب ہو گیا۔ اللہ بخشش فرمانے والا اور رحیم ہے۔"

۴:۔ اس سے یہ نتیجہ بھی نکلتا ہے کہ مسلمانوں پر ان قوتوں کے خلاف جہاد کرنا فرض ہو جاتا ہے۔ جن کے ہاں ان کے مسلمان بھائی بند ہیں اور وہ دار الحرب اور کفر کے جھنڈے سے اپنے آپ کو نکالنے کی استطاعت نہیں رکھتے۔ یوں وہ دار السلام میں آکر جماعت مسلمہ کے ساتھ پیوست نہیں ہو سکتے۔ تاکہ وہ اپنے دین کے زاویے سے فتنے میں مبتلا نہ ہوں اور وہ اسلام کے سوا ہو دوسرے جھنڈے کی چھاؤں سے باہر نکل آئیں۔ اور اسلامی نظام کے سوا کسی دوسرے نظام کے تحت زندگی بسر کریں۔ اور اس کے مقابلے میں وہ اسلام کے بلند و برتر نظام کے تحت بہترین زندگی سے لطف اندوز ہو سکیں۔ وہ ایک اسلامی معاشرے کے اندر رہ کر پاکیزہ زندگی بسر کر رہے ہوں۔ یہ ہر مسلمان کا ایک اساسی حق ہے۔ اور جو مسلمان اس سے محروم رہتا ہے وہ گویا اس کرۂ ارض پر اللہ تعالیٰ کی عظیم ترین نعمت سے محروم ہو گیا ہے۔ وہ بہترین زندگی گزارنے کے مواقع سے محروم کر دیا گیا ہے۔ فرماتے ہیں:

وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا أَخْرِجْنَا مِنْ هَٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ أَهْلُهَا وَاجْعَلْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ وَلِيًّا وَاجْعَلْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ نَصِيرًا

"آخر کیا وجہ ہے کہ تم اللہ کی راہ میں ان بے بس مردوں' عورتوں اور بچوں کی خاطر نہ لڑو جو کمزور پا کر دبا لئے گئے ہیں اور فریاد کر رہے ہیں کہ خدایا ہم کو ایسی بستی سے نکال جس کے باشندے ظالم ہیں' اور اپنی طرف سے ہمارا کوئی حامی و مددگار پیدا کر دے۔"

○.....☆☆☆.....○

اس کے بعد یہ سورت بے راہروی کرنے والوں' سست روی اختیار کرنیوالوں اور جہاد کو چھوڑ کر گھر بیٹھنے والوں پر حملہ آور ہوتی ہے اور ان کے رویئے پر سخت تنقید کر کے انہیں آمادہ کرتی ہے کہ وہ جان و مال کے ساتھ جہاد کیلئے اٹھیں۔ اس سورت کے ایک بڑے حصے تک یہ تنقیدات پھیلی ہوئی ہیں۔ اس سے سورت کے مضامین بڑی دھیمی رفتار سے چل رہے تھے لیکن یہاں آکر سورت کی نبض اچانک تیز ہو جاتی ہے۔ اس کا انداز بیان سخت ہو جاتا ہے اور وہ بڑی گرمی سے داعیان حق کی حمایت کرتی ہے اور اہل باطل پر تنقید کرتی ہے۔

ہم یہاں سورت کے اس طویل حصے کو اس کی مصحفی ترتیب کے ساتھ نقل نہیں کر سکتے اگرچہ اس کی مصحفی ترتیب بھی اپنے اندر مخصوص حکمت رکھتی ہے۔ البتہ اس حصے کے جستہ جستہ قطعات یہاں نقل کرنا کافی ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا خُذُوْا حِذْرَكُمْ فَانْفِرُوْا ثُبَاتٍ اَوِ انْفِرُوْا جَمِيْعًا۝ وَ اِنَّ مِنْكُمْ لَمَنْ لَّيُبَطِّئَنَّ ۚ فَاِنْ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالَ قَدْ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيَّ اِذْ لَمْ اَكُنْ مَّعَهُمْ شَهِيْدًا۝ وَ لَئِنْ اَصَابَكُمْ فَضْلٌ مِّنَ اللّٰهِ لَيَقُوْلَنَّ كَاَنْ لَّمْ تَكُنْ بَيْنَكُمْ وَ بَيْنَهٗ مَوَدَّةٌ يّٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ مَعَهُمْ فَاَفُوْزَ فَوْزًا عَظِيْمًا۝ فَلْيُقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يَشْرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ ؕ وَ مَنْ يُّقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيُقْتَلْ اَوْ يَغْلِبْ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا۝ وَ مَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ الْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَ النِّسَآءِ وَ الْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَاۤ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا ۚ وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۙۚ وَّ اجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا۝ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ الطَّاغُوْتِ فَقَاتِلُوْۤا اَوْلِيَآءَ الشَّيْطٰنِ ۚ اِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيْفًا

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو' مقابلے کیلئے ہر وقت تیار رہو' پھر جیسا موقعہ ہو الگ الگ دستوں کی شکل میں نکلو یا اکٹھے ہو کر۔ ہاں' تم میں کوئی آدمی ایسا بھی ہے جو لڑائی سے جی چراتا ہے' اگر تم پر کوئی مصیبت آئے تو کہتا ہے اللہ نے مجھ پر بڑا فضل کیا کہ میں ان لوگوں کے ساتھ نہ گیا' اور اگر اللہ کی طرف سے تم پر فضل ہو تو کہتا ہے......... اور اس طرح کہتا ہے کہ گویا تمہارے اور اس کے درمیان محبت کا کوئی تعلق تھا ہی نہیں .... کہ کاش میں بھی ان کے ساتھ ہوتا' تو بڑا کام بن جاتا۔ اللہ کی راہ میں لڑنا چاہئے ان لوگوں کو جو آخرت کے بدلے دنیا کی زندگی کو فروخت کر دیں' پھر جو اللہ کی راہ میں لڑے گا اور مارا جائے گا یا غالب رہے گا اسے ضرور ہم اجر عظیم عطا کریں گے۔ آخر کیا وجہ ہے کہ تم اللہ کی رہ میں ان بے بس مردوں' عورتوں اور بچوں کی خاطر نہ لڑو جو کمزور پاکر دبا لئے گئے ہیں اور فریاد کر رہے ہیں کہ خدایا ہم کو اس بستی سے نکال جس کے باشندے ظالم ہیں اور اپنی طرف سے ہمارا کوئی حامی و مددگار پیدا کر دے۔ جن لوگوں نے ایمان کا راستہ اختیار کیا ہے' وہ اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں اور جنہوں نے کفر کا راستہ اختیار کیا ہے۔ وہ طاغوت کی راہ میں لڑتے ہیں۔ پس شیطان کے ساتھیوں سے لڑو اور یقین جانو کہ شیطان کی چالیں حقیقت میں نہایت کمزور ہیں۔"

فَقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ لَا تُكَلَّفُ اِلَّا نَفْسَكَ وَ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّكُفَّ بَاْسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ وَ اللّٰهُ اَشَدُّ بَاْسًا وَّ اَشَدُّ تَنْكِيْلًا۝

"پس اے نبی تم اللہ کی راہ میں لڑو' تم اپنی ذات کے سوا کسی اور کے لئے ذمہ دار نہیں ہو' اور اہل ایمان کو لڑنے کیلئے اکساؤ' بعید نہیں کہ اللہ کافروں کا زور توڑ دے۔ اللہ کا زور سب سے زیادہ زبردست اور اس کی سزا سب سے زیادہ سخت ہے۔"

لَا يَسْتَوِي الْقٰعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ غَيْرُ اُولِي الضَّرَرِ وَ الْمُجٰهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ

اللّٰهِ بِاَمۡوَالِهِمۡ وَاَنۡفُسِهِمۡ ؕ فَضَّلَ اللّٰهُ الۡمُجٰهِدِيۡنَ بِاَمۡوَالِهِمۡ وَاَنۡفُسِهِمۡ عَلَى الۡقٰعِدِيۡنَ دَرَجَةً ؕ وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الۡحُسۡنٰى ؕ وَفَضَّلَ اللّٰهُ الۡمُجٰهِدِيۡنَ عَلَى الۡقٰعِدِيۡنَ اَجۡرًا عَظِيۡمًا ﴿۹۵﴾ دَرَجٰتٍ مِّنۡهُ وَمَغۡفِرَةً وَّرَحۡمَةً ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوۡرًا رَّحِيۡمًا ﴿۹۶﴾

”مسلمانوں میں سے وہ جو معذوری کے بغیر گھر بیٹھے رہتے ہیں' اور وہ جو اللہ کی راہ میں جان و مال سے جہاد کرتے ہیں' دونوں کی حیثیت یکساں نہیں ہے۔ اللہ نے بیٹھنے والوں کی نسبت جان و مال سے جہاد کرنے والوں کا درجہ بڑا رکھا ہے۔ اگرچہ ہر ایک کیلئے اللہ نے بھلائی کا وعدہ فرمایا ہے۔ مگر اس کے یہاں مجاہدوں کی خدمات کا معاوضہ بیٹھنے والوں سے بہت زیادہ ہے۔ اللہ کیلئے لڑنے والوں کے اللہ کے ہاں بڑے درجے ہیں اور مغفرت اور رحمت ہے۔ اور اللہ بڑا معاف کرنیوالا اور رحم فرمانے والا ہے۔“

وَلَا تَهِنُوۡا فِى ابۡتِغَآءِ الۡقَوۡمِ ؕ اِنۡ تَكُوۡنُوۡا تَاۡلَمُوۡنَ فَاِنَّهُمۡ يَاۡلَمُوۡنَ كَمَا تَاۡلَمُوۡنَ ۚ وَتَرۡجُوۡنَ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا يَرۡجُوۡنَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيۡمًا حَكِيۡمًا

”اس گروہ کے تعاقب میں کمزوری نہ دکھاؤ' اگر تم تکلیف اٹھارہے ہو تو تمہاری طرح وہ بھی تکلیف اٹھارہے ہیں۔ اور تم اللہ سے اس چیز کے امیدوار ہو جس کے وہ امیدوار نہیں ہیں اور اللہ سب کچھ جانتا ہے اور حکیم و دانا ہے۔“

جہاد فی سبیل اللہ پر آمادہ کرنے کی اس مہم کے درمیان بعض بین الاقوامی معاملات کے سلسلے میں قواعد بھی وضع کئے جاتے ہیں۔ یہ بین الاقوامی ضوابط دارالاسلام اور دوسرے ان تمام کیمپوں کے درمیان تعلقات پر نافذ ہوتے ہیں جو اس وقت قائم ہو چکے تھے۔ چاہے وہ تعلقات دوستی کے تھے یا مخالفت کے تھے۔

بتایا جاتا ہے کہ منافقین کے بارے میں مسلمانوں کے درمیان دو آراء پائی جاتی ہیں۔ لیکن بطور نتیجہ کلام بتایا جاتا ہے کہ وہ منافق جو مدینہ کے اسلامی مرکز میں اپنے مفادات کیلئے داخل ہو جاتے ہیں۔ مثلاً تجارت' نفع اندوزی اور اپنے رشتہ داروں کے ساتھ ملاقات کیلئے اور یہ لوگ اسلام کا اظہار کرتے ہیں لیکن جب یہ لوگ مدینہ سے واپس جاتے ہیں تو یہ لوگ پھر کفر کے کیمپ کے دوست بن جاتے ہیں۔ ان کے بارے میں حکم یہ ہے۔

فَلَا تَتَّخِذُوۡا مِنۡهُمۡ اَوۡلِيَآءَ حَتّٰى يُهَاجِرُوۡا فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ ؕ فَاِنۡ تَوَلَّوۡا فَخُذُوۡهُمۡ وَاقۡتُلُوۡهُمۡ حَيۡثُ وَجَدۡتُّمُوۡهُمۡ ۖ وَلَا تَتَّخِذُوۡا مِنۡهُمۡ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيۡرًا ﴿۸۹﴾ اِلَّا الَّذِيۡنَ يَصِلُوۡنَ اِلٰى قَوۡمٍ بَيۡنَكُمۡ وَبَيۡنَهُمۡ مِّيۡثَاقٌ اَوۡ جَآءُوۡكُمۡ حَصِرَتۡ صُدُوۡرُهُمۡ اَنۡ يُّقَاتِلُوۡكُمۡ اَوۡ يُقَاتِلُوۡا قَوۡمَهُمۡ ؕ وَلَوۡ شَآءَ اللّٰهُ لَسَلَّطَهُمۡ عَلَيۡكُمۡ فَلَقٰتَلُوۡكُمۡ ۚ فَاِنِ اعۡتَزَلُوۡكُمۡ فَلَمۡ يُقَاتِلُوۡكُمۡ وَاَلۡقَوۡا اِلَيۡكُمُ السَّلَمَ ۙ فَمَا جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمۡ عَلَيۡهِمۡ سَبِيۡلًا سَتَجِدُوۡنَ اٰخَرِيۡنَ يُرِيۡدُوۡنَ اَنۡ يَّاۡمَنُوۡكُمۡ وَيَاۡمَنُوۡا قَوۡمَهُمۡ ؕ كُلَّمَا رُدُّوۡۤا اِلَى الۡفِتۡنَةِ اُرۡكِسُوۡا فِيۡهَا ۚ فَاِنۡ لَّمۡ يَعۡتَزِلُوۡكُمۡ وَيُلۡقُوۡۤا اِلَيۡكُمُ السَّلَمَ وَيَكُفُّوۡۤا اَيۡدِيَهُمۡ فَخُذُوۡهُمۡ وَاقۡتُلُوۡهُمۡ حَيۡثُ

ثَقِفْتُمُوْهُمْ ۚ وَ اُولٰٓىِٕكُمْ جَعَلْنَا لَكُمْ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ﴿۹۱﴾

"لہٰذا ان میں سے کسی کو اپنا دوست نہ بناؤ جب کہ وہ اللہ کی راہ میں ہجرت کر کے نہ آئیں۔ اور اگر وہ ہجرت سے باز رہیں تو جہاں پاؤ انہیں پکڑو اور قتل کرو اور ان میں سے کسی کو اپنا دوست اور مددگار نہ بناؤ۔ البتہ وہ منافق اس حکم سے مستثنیٰ ہیں جو کسی ایسی قوم سے جاملیں جن کے ساتھ تمہارا معاہدہ ہے۔ اسی طرح وہ منافق بھی مستثنیٰ ہیں جو تمہارے پاس آتے ہیں اور لڑائی سے دل برداشتہ ہیں۔ نہ تم سے لڑنا چاہتے ہیں نہ اپنی قوم سے۔ اللہ چاہتا تو ان کو تم پر مسلط کر دیتا اور وہ بھی تم سے لڑتے۔ لہٰذا اگر وہ تم سے کنارہ کش ہو جائیں اور لڑنے سے باز رہیں اور تمہاری طرف صلح اور آشتی کا ہاتھ بڑھائیں تو اللہ نے تمہارے لئے ان پر دست درازی کی کوئی سبیل نہیں رکھی۔ ایک اس قسم کے منافق تمہیں ایسے ملیں گے جو چاہتے ہیں کہ تم سے بھی امن میں رہیں اور اپنی قوم سے بھی۔ مگر جب کبھی فتنہ کا موقع پائیں گے اس میں کود پڑیں گے۔ ایسے لوگ اگر تمہارے مقابلہ سے باز نہ رہیں اور صلح و سلامتی تمہارے آگے پیش نہ کریں اور اپنے ہاتھ نہ روکیں تو جہاں وہ ملیں انہیں پکڑو اور مارو۔ ان پر ہاتھ اٹھانے کیلئے ہم نے تمہیں کھلی حجت دیدی ہے۔"

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا ضَرَبْتُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَتَبَيَّنُوْا وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ اَلْقٰٓى اِلَيْكُمُ السَّلٰمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا ۚ تَبْتَغُوْنَ عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۡ فَعِنْدَ اللّٰهِ مَغَانِمُ كَثِيْرَةٌ ۭ كَذٰلِكَ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلُ فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ فَتَبَيَّنُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ﴿۹۴﴾

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو! جب تم اللہ کی راہ میں جہاد کیلئے نکلو تو دوست دشمن میں تمیز کرو اور جو تمہاری طرف سلام سے تقدیم کرے اسے فوراً نہ کہہ دو کہ تو مومن نہیں ہے۔ اگر تم دنیوی فائدہ چاہتے ہو تو اللہ کے پاس تمہارے لئے بہت اموال غنیمت ہیں۔ آخر اسی حالت میں تم خود بھی تو اس سے پہلے مبتلا رہ چکے ہو، پھر اللہ نے تم پر احسان کیا، لہٰذا تحقیق سے کام لو، جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے۔"

اسی طرح جہاد کی گفتگو کے دوران صلوٰۃ الخوف کے بعض احکام بھی بیان کر دیئے جاتے ہیں۔ اور حالت امن کے احکام بھی بیان ہوتے ہیں۔ اور ان احکام کے دوران بھی اہل اسلام کو متنبہ کر دیا جاتا ہے کہ تمہارے دشمن ہر وقت تمہارے خلاف گھات میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ فرماتے ہیں:

وَاِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْاَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوةِ ڰ اِنْ خِفْتُمْ اَنْ يَّفْتِنَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ اِنَّ الْكٰفِرِيْنَ كَانُوْا لَكُمْ عَدُوًّا مُّبِيْنًا ﴿۱۰۱﴾ وَاِذَا كُنْتَ فِيْهِمْ فَاَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ فَلْتَقُمْ طَاۗىِٕفَةٌ مِّنْهُمْ مَّعَكَ وَلْيَاْخُذُوْٓا اَسْلِحَتَهُمْ ۣ فَاِذَا سَجَدُوْا

فَلْيَكُونُوا مِن وَرَآئِكُمْ وَلْتَأْتِ طَآئِفَةٌ أُخْرَىٰ لَمْ يُصَلُّوا فَلْيُصَلُّوا مَعَكَ وَلْيَأْخُذُوا حِذْرَهُمْ وَأَسْلِحَتَهُمْ ۗ وَدَّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْ تَغْفُلُونَ عَنْ أَسْلِحَتِكُمْ وَأَمْتِعَتِكُمْ فَيَمِيلُونَ عَلَيْكُم مَّيْلَةً وَاحِدَةً ۚ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِن كَانَ بِكُمْ أَذًى مِّن مَّطَرٍ أَوْ كُنتُم مَّرْضَىٰ أَن تَضَعُوا أَسْلِحَتَكُمْ ۖ وَخُذُوا حِذْرَكُمْ ۗ إِنَّ اللَّهَ أَعَدَّ لِلْكَافِرِينَ عَذَابًا مُّهِينًا ﴿۱۰۲﴾ فَإِذَا قَضَيْتُمُ الصَّلَاةَ فَاذْكُرُوا اللَّهَ قِيَامًا وَقُعُودًا وَعَلَىٰ جُنُوبِكُمْ ۚ فَإِذَا اطْمَأْنَنتُمْ فَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ ۚ إِنَّ الصَّلَاةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ كِتَابًا مَّوْقُوتًا ﴿۱۰۳﴾

"اور جب تم لوگ سفر کیلئے نکلو تو کوئی مضائقہ نہیں اگر نماز میں اختصار کر دو' جبکہ تمہیں اندیشہ ہو کہ کافر تمہیں ستائیں گے۔ کیونکہ وہ کھلم کھلا تمہاری دشمنی پر تلے ہوئے ہیں۔ اور اے نبی! جب تم مسلمانوں کے درمیان ہو اور حالت جنگ میں انہیں نماز پڑھانے کھڑے ہو تو چاہئے کہ ان میں سے ایک گروہ تمہارے ساتھ کھڑا ہو اور اسلحہ لئے رہے' پھر جب وہ سجدہ کر لے تو پیچھے چلا جائے اور دوسرا گروہ جس نے ابھی نماز نہیں پڑھی ہے۔ آ کر تمہارے ساتھ پڑھے اور وہ بھی چوکنا رہے اور اپنے اسلحہ لئے رہے۔ کیونکہ کفار اس تاک میں ہیں کہ تم اپنے ہتھیاروں اور اپنے سامان کی طرف سے غافل ہو تو وہ تم پر یکبارگی ٹوٹ پڑیں۔ البتہ اگر تم بارش کی وجہ سے تکلیف محسوس کرو یا بیمار ہو' تو اسلحہ رکھ دینے میں مضائقہ نہیں' مگر پھر بھی چوکنے رہو' یقین رکھو کہ اللہ نے کافروں کیلئے رسوا کن عذاب مہیا کر رکھا ہے۔ پھر جب نماز سے فارغ ہو جاؤ تو کھڑے اور بیٹھے اور لیٹے ہر حال میں اللہ کو یاد کرتے رہو' اور جب اطمینان نصیب ہو جائے تو پوری نماز پڑھو' نماز درحقیقت ایسا فرض ہے جو پابندی وقت کے ساتھ اہل ایمان پر لازم کیا گیا ہے۔"

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی نظام زندگی میں نماز کی اہمیت کیا ہے۔ میدان جنگ کے خوف و ہراس کی انتہائی حالت میں بھی اسے موخر نہیں کیا جاتا۔ اور اس کی تفصیلی کیفیات دی جاتی ہیں۔ اور اس اہمیت کے ساتھ ساتھ یہ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ اسلامی نظام زندگی ایک ہمہ گیر نظام ہے۔ اور وہ انسانی زندگی کے تمام حالات میں اس کی راہنمائی کرتا ہے۔ اور یہ نظام ایک مسلمان فرد اور مسلمان سوسائٹی دونوں کو اپنی نظر میں رکھتا ہے۔ اور راہنمائی کرتا ہے۔

یہاں جہاد و قتال کے بارے میں ہدایات دینے کے موقعہ پر منافقین پر سخت تنقید کی جاتی ہے اور بتایا جاتا ہے کہ یہ منافقین یہودیوں سے ساتھ دوستی کے تعلقات قائم کر کے اسلام کے خلاف سازشیں کر رہے ہیں۔ اور یہ لوگ اسلامی تحریک اور اسلامی قیادت کے خلاف گہری سازشیں تیار کر رہے ہیں۔ یہ لوگ تحریک اسلامی کی صفوں میں اور اسلامی نظم و نسق اور اسلامی اقدار کے خلاف منظم کھیل کھیل رہے ہیں۔ اس سے پہلے جہاد کے بارے میں ہم نے جو آیات نقل کی ہیں۔ ان میں جستہ جستہ منافقین کا ذکر بھی ہوا ہے۔ لیکن مناسب یہ ہے کہ یہاں ہم ایک مزید اقتباس دیدیں جو ان منافقین کی بہت ہی اچھی تصویر کشی کرتا ہے۔ اس میں ان کی مکمل خصوصیات دی گئی ہیں۔ نیز اس سے ان کا اصل مزاج عیاں ہوتا ہے اور اسلام کے مقابلے میں وہ جو مسائل میدان میں لاتے ہیں ان کی نقاب کشائی بھی ہوتی ہے۔

وَيَقُولُونَ طَاعَةٌ فَإِذَا بَرَزُوا مِنْ عِندِكَ بَيَّتَ طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ غَيْرَ الَّذِي تَقُولُ ۖ وَاللَّهُ

يَكْتُبُ مَا يُبَيِّتُوْنَ ۚ فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَ تَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۭ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ﴿۸۱﴾ اَفَلَا
يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ۭ وَ لَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا ﴿۸۲﴾
وَ اِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ ۭ وَ لَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَ
اِلٰٓى اُولِى الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ ۭ وَ لَوْ لَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ
وَ رَحْمَتُهٗ لَاتَّبَعْتُمُ الشَّيْطٰنَ اِلَّا قَلِيْلًا

”وہ منہ سے کہتے ہیں کہ ہم مطیع فرمان ہیں ' مگر جب تمہارے پاس سے نکلتے ہیں تو ان میں سے ایک گروہ راتوں کو جمع ہو کر تمہاری باتوں کے خلاف مشورہ کرتا ہے ۔ اللہ ان کی یہ ساری سرگوشیاں لکھ رہا ہے ۔ تم ان کی پروا نہ کرو ' اور اللہ پر بھروسہ رکھو ' وہی بھروسہ کیلئے کافی ہے ۔ کیا یہ لوگ قرآنی آیات پر غور نہیں کرتے ؟ اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اس میں بہت کچھ اختلاف بیانی پائی جاتی ...... یہ لوگ جہاں کوئی اطمینان بخش یا خوفناک خبر سن پاتے ہیں اسے لیکر پھیلا دیتے ہیں ' حالانکہ اگر یہ اسے رسول اور اپنی جماعت کے ذمے دار اصحاب تک پہنچائیں تو وہ ایسے لوگوں کے علم میں آجائے جو ان کے درمیان اس بات کی صلاحیت رکھتے ہیں کہ اس سے صحیح نتیجہ اخذ کر سکیں ۔ تم لوگوں پر اللہ کی مہربانی اور رحمت نہ ہوتی تو معدودے چند کے سوا تم سب شیطان کے پیچھے لگ گئے ہوتے ۔“

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا ثُمَّ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا لَّمْ يَكُنِ
اللّٰهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَ لَا لِيَهْدِيَهُمْ سَبِيْلًا ﴿۱۳۷﴾ بَشِّرِ الْمُنٰفِقِيْنَ بِاَنَّ لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمَا ۨ﴿۱۳۸﴾ الَّذِيْنَ
يَتَّخِذُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۭ اَيَبْتَغُوْنَ عِنْدَهُمُ الْعِزَّةَ فَاِنَّ الْعِزَّةَ
لِلّٰهِ جَمِيْعًا ﴿۱۳۹﴾ وَ قَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ اَنْ اِذَا سَمِعْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ يُكْفَرُ بِهَا وَ
يُسْتَهْزَاُ بِهَا فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖٓ ۡ اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ ۭ
اِنَّ اللّٰهَ جَامِعُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَ الْكٰفِرِيْنَ فِيْ جَهَنَّمَ جَمِيْعَا ۨ﴿۱۴۰﴾ الَّذِيْنَ يَتَرَبَّصُوْنَ بِكُمْ فَاِنْ
كَانَ لَكُمْ فَتْحٌ مِّنَ اللّٰهِ قَالُوْٓا اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ ښ وَ اِنْ كَانَ لِلْكٰفِرِيْنَ نَصِيْبٌ ۙ قَالُوْٓا
اَلَمْ نَسْتَحْوِذْ عَلَيْكُمْ وَ نَمْنَعْكُمْ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۭ فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ
وَ لَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا ﴿۱۴۱﴾ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ يُخٰدِعُوْنَ
اللّٰهَ وَ هُوَ خَادِعُهُمْ ۚ وَ اِذَا قَامُوْٓا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى ۙ يُرَآءُوْنَ النَّاسَ وَ
لَا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۱۴۲﴾ مُّذَبْذَبِيْنَ بَيْنَ ذٰلِكَ ۤ لَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ وَ لَآ اِلٰى
هٰٓؤُلَآءِ ۭ وَ مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا ﴿۱۴۳﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا

الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ؕ اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ عَلَيْكُمْ سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ﴿۱۴۴﴾ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ نَصِيْرًا ﴿۱۴۵﴾

”رہے وہ لوگ جو ایمان لائے' پھر کفر کیا' پھر ایمان لائے' پھر کفر کیا' پھر اپنے کفر میں بڑھتے چلے گئے۔ تو اللہ ہرگز ان کو معاف نہ کرے گا۔ اور نہ کبھی ان کو راہ راست دکھائے گا۔ اور جو منافق اہل ایمان کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا رفیق بناتے ہیں انہیں یہ مژدہ سنادو کہ ان کے لئے دردناک سزا تیار ہے۔ کیا یہ لوگ عزت کی طلب میں ان کے پاس جاتے ہیں؟ حالانکہ عزت تو ساری کی ساری اللہ کیلئے ہے۔ اللہ اس کتاب میں تم کو پہلے ہی حکم دے چکا ہے کہ جہاں تم سنو کہ اللہ کی آیات کے خلاف کفر بکا جارہا ہے اور ان کا مذاق اڑایا جارہا ہے وہاں نہ بیٹھو جب تک کہ لوگ کسی دوسری بات میں نہ لگ جائیں۔ اب اگر تم ایسا کرتے ہو تو تم بھی انہی کی طرح ہو۔ یقین جانوں کہ اللہ منافقوں اور کافروں کو جہنم میں ایک ہی جگہ جمع کرنیوالا ہے۔ یہ منافق تمہارے معاملہ میں انتظار کر رہے ہیں کہ اگر اللہ کی طرف سے فتح تمہاری ہوئی تو آکر کہیں گے کیا ہم تمہارے ساتھ نہ تھے؟ اگر کافروں کا پلہ بھاری رہا تو ان سے کہیں گے کہ کیا ہم تمہارے خلاف لڑنے پر قادر نہ تھے۔ اور پھر بھی ہم نے تم کو مسلمانوں سے بچایا؟ پس اللہ ہی تمہارے اور ان کے معاملہ میں فیصلہ قیامت کے روز کرے گا اور اللہ نے کافروں کیلئے مسلمانوں پر غالب آنے کی ہرگز کوئی سبیل نہیں رکھی ہے............ یہ منافق اللہ کے ساتھ دھوکہ بازی کر رہے ہیں حالانکہ درحقیقت اللہ ہی نے انہیں دھوکہ میں ڈال رکھا ہے۔ جب یہ نماز کیلئے اٹھتے ہیں تو کسمساتے ہوئے محض لوگوں کو دکھانے کی خاطر اٹھتے ہیں اور خدا کو کم ہی یاد کرتے ہیں۔ کفر و ایمان کے درمیان ڈانواں ڈول ہیں۔ نہ پورے اس طرف نہ پورے اس طرف۔ جسے اللہ نے بھٹکا دیا ہو اس کیلئے تم کوئی راستہ نہیں پاسکتے............ اے لوگوں جو ایمان لائے ہو' مومنو کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا رفیق نہ بناؤ' کیا تم چاہتے ہو کہ اللہ کو اپنے خلاف صریح حجت دیدو؟ یقین جانوں کہ منافق جہنم کے سب سے نچلے طبقے میں جائیں گے اور تم کسی کو ان کا مددگار نہ پاؤ گے۔“

○.....☆☆☆.....○

اس سورت کے مباحث جہاد اور دوسرے عام مباحث میں سے' اس بات کا اظہار ہوتا ہے کہ تحریک اسلامی کے خلاف' اسلامی نظریہ حیات کے خلاف اور اسلامی لیڈر شپ کے خلاف' اہل کتاب اور خصوصاً یہودیوں اور ان کے حلیفوں یعنی مشرکین مکہ اور مدینہ کے منافقین کی جانب سے ایک عظیم اعصابی جنگ برپا کر رکھی گئی تھی۔ یہ وہی جنگ تھی جس کا ذکر ہم اس سے قبل سورۃ البقرہ اور سورۃ آل عمران میں تفصیلاً کر آئے ہیں۔ اور یہاں بھی قرآن کریم خالص ربانی انداز میں اس کا ذکر کر رہا ہے۔ جماعت مسلمہ جس راہ پر جارہی تھی وہ کانٹوں سے پر تھی۔ اس کی راہ میں مکاری کے جال بچھے ہوئے تھے۔ ہر جگہ سازشیں تیار تھیں۔ ایسے حالات میں قرآن کریم اس کی دست گیری کرتا ہے' اس کی راہنمائی کرتا ہے۔ اسے فطرت سے آگاہ کرتا ہے۔ وہ اسے ان کے اعداء کے مزاج سے آگاہ کرتا ہے۔ وہ اسے بتاتا ہے کہ جس جنگ میں یہ جماعت کود گئی ہے اس کی نوعیت کیا ہے۔ سرزمین عرب کے حالات کیا ہیں؟ اور کن حالات اور کن پہلوؤں پر اسے غور و فکر کی ضرورت ہے؟

قرآن کریم کے دلائل اعجاز میں سے یہ بھی ایک دلیل ہے کہ یہ آیات جو ایک مخصوص جنگ کے بارے میں نازل ہوئی تھیں' وہ اس قدر اصولی موقف پر مشتمل ہیں کہ آج اس کرہ ارض پر جہاں بھی تحریک اسلامی برپا ہے' اس کے اعداء کا اس کے ساتھ وہی رویہ ہے جو

آج سے صدیوں پہلے تحریک اسلامی کے ساتھ اس کے روایتی دشمنوں کی جانب سے روا رکھا گیا تھا۔ وہی دشمن آج بھی ہر تحریک اسلامی کے دشمن ہیں' اس وقت وہ جو حملے کرتے تھے۔ آج بھی ان کے وہی حملے ہیں۔ اگرچہ آج کے دور میں آلات و وسائل تبدیل ہو گئے ہیں۔ اس وقت بھی وہ اسلامی نظریۂ حیات میں تزلزل پیدا کرتے تھے۔ آج بھی ان کا یہی کام ہے۔ اس وقت بھی وہ مسلمانوں کی صفوں میں انتشار پیدا کرتے تھے۔ آج بھی ان کی یہی سازش ہے۔ جس طرح اس وقت وہ اسلامی قیادت کے خلاف شکوک پیدا کرتے تھے۔ آج بھی وہ یہی کر رہے ہیں۔ یہی اہداف ہیں جن کے لئے آج بھی ان کی توپیں گولے برسا رہی ہیں۔ اور ان دشمنوں کا مقصد وحید یہ ہے کہ تحریک اسلامی کے حساس مقامات پر یہ لوگ اپنے آدمی بٹھا دیں' عالم اسلام میں تمام تصرفات ان کی مرضی سے ہوں' عالم اسلام کی سرزمین اس کی قوتوں اور اسکی صلاحیتوں کو وہ اپنے مفادات کیلئے استعمال کریں جس طرح مدینہ کے یہودی اسلام سے قبل مدینہ کے اوس اور خزرج کے قبائل کو استعمال کرتے تھے۔ جبکہ انہیں اسلامی قیادت میسر نہ تھی۔ اور اسلامی نظام زندگی سے محروم تھے۔ اور ابھی اللہ تعالیٰ نے انہیں اسلامی نظام حیات کے ذریعہ معزز نہ بنایا تھا۔

یہ سورت بھی سورۂ آل عمران اور سورۂ بقرہ کی طرح' یہودیوں کی جانب سے' جماعت مسلمہ کے خلاف مسلسل سازشوں کے بے نقاب کرنے کے مضامین سے بھری پڑی ہے۔ ان سازشوں میں مدینہ کے اردگرد پھیلے ہوئے مشرکین اور منافقین بھی ان کے ساتھ ان کارناموں میں شریک ہیں۔ نصوص کی تشریح کے وقت اپنی جگہ پر ہم ان مضامین کی تشریحات دیں گے یہاں مناسب ہے ان کی سازشوں کی اس طویل مہم سے چند اقتباسات دیدیں۔

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ أُوتُوا نَصِيبًا مِّنَ الْكِتَابِ يَشْتَرُونَ الضَّلَالَةَ وَيُرِيدُونَ أَن تَضِلُّوا السَّبِيلَ ﴿٤٤﴾ وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِأَعْدَائِكُمْ ۚ وَكَفَىٰ بِاللَّهِ وَلِيًّا وَكَفَىٰ بِاللَّهِ نَصِيرًا ﴿٤٥﴾ مِّنَ الَّذِينَ هَادُوا يُحَرِّفُونَ الْكَلِمَ عَن مَّوَاضِعِهِ وَيَقُولُونَ سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا وَاسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ وَرَاعِنَا لَيًّا بِأَلْسِنَتِهِمْ وَطَعْنًا فِي الدِّينِ ۚ وَلَوْ أَنَّهُمْ قَالُوا سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا وَاسْمَعْ وَانظُرْنَا لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَأَقْوَمَ وَلَٰكِن لَّعَنَهُمُ اللَّهُ بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُونَ إِلَّا قَلِيلًا ﴿٤٦﴾ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ آمِنُوا بِمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُم مِّن قَبْلِ أَن نَّطْمِسَ وُجُوهًا فَنَرُدَّهَا عَلَىٰ أَدْبَارِهَا أَوْ نَلْعَنَهُمْ كَمَا لَعَنَّا أَصْحَابَ السَّبْتِ ۚ وَكَانَ أَمْرُ اللَّهِ مَفْعُولًا ﴿٤٧﴾ إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَن يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَٰلِكَ لِمَن يَشَاءُ ۚ وَمَن يُشْرِكْ بِاللَّهِ فَقَدِ افْتَرَىٰ إِثْمًا عَظِيمًا ﴿٤٨﴾ أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ يُزَكُّونَ أَنفُسَهُم ۚ بَلِ اللَّهُ يُزَكِّي مَن يَشَاءُ وَلَا يُظْلَمُونَ فَتِيلًا ﴿٤٩﴾ انظُرْ كَيْفَ يَفْتَرُونَ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ ۖ وَكَفَىٰ بِهِ إِثْمًا مُّبِينًا ﴿٥٠﴾ أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ أُوتُوا نَصِيبًا مِّنَ الْكِتَابِ يُؤْمِنُونَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوتِ وَيَقُولُونَ لِلَّذِينَ كَفَرُوا هَٰؤُلَاءِ أَهْدَىٰ مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا سَبِيلًا ﴿٥١﴾ أُولَٰئِكَ

الَّذِیْنَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ ؕ وَ مَنْ یَّلْعَنِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ نَصِیْرًا ؕ اَمْ لَهُمْ نَصِیْبٌ مِّنَ الْمُلْكِ فَاِذًا لَّا یُؤْتُوْنَ النَّاسَ نَقِیْرًا ۙ اَمْ یَحْسُدُوْنَ النَّاسَ عَلٰی مَاۤ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ فَقَدْ اٰتَیْنَاۤ اٰلَ اِبْرٰهِیْمَ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ اٰتَیْنٰهُمْ مُّلْكًا عَظِیْمًا ۙ فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ بِهٖ وَ مِنْهُمْ مَّنْ صَدَّ عَنْهُ ؕ وَ كَفٰی بِجَهَنَّمَ سَعِیْرًا

”تم نے ان لوگوں کو بھی دیکھا جنہیں کتاب کے علم کا کچھ حصہ دیا گیا ہے؟ وہ خود ضلالت کے خریدار بنے ہوئے ہیں اور چاہتے ہیں کہ تم بھی راہ گم کر دو' اللہ تمہارے دشمنوں کو خوب جانتا ہے اور تمہاری حمایت اور مدد گاری کیلئے اللہ ہی کافی ہے۔ جو لوگ یہودی بن گئے ہیں۔ ان میں سے کچھ لوگ ہیں جو الفاظ کو ان کے محل سے پھیر دیتے ہیں اور دین حق کے خلاف نیش زنی کرنے کیلئے اپنی زبانوں کو توڑ موڑ کر کہتے ہیں **سَمِعْنَا وَ عَصَیْنَا** اور **اسْمَعْ غَیْرَ مُسْمَعٍ** اور **رَاعِنَا** حالانکہ اگر وہ کہتے سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا اور اسْمَعْ اور اُنْظُرْنَا تو یہ انہیں کیلئے بہتر تھا اور زیادہ راست بازی کا طریقہ تھا۔ مگر ان پر تو ان کی باطل پرستی کی بدولت اللہ کی پھٹکار پڑی ہوئی ہے۔ اس لئے وہ کم ہی ایمان لاتے ہیں۔ اے وہ لوگو جنہیں کتاب دی گئی تھی! مان لو اس کتاب کو جو ہم نے اب نازل کی ہے اور جو اس کتاب کی تائید و تصدیق کرتی ہے جو تمہارے پاس پہلے سے موجود تھی۔ اس پر ایمان لے آؤ قبل اس کے کہ ہم چہرے بگاڑ کر پیچھے پھیر دیں یا ان کو اس طرح لعنت زدہ کر دیں جس طرح سبت والوں کے ساتھ ہم نے کیا تھا' اور یاد رکھو کہ اللہ کا حکم نافذ ہو کر رہتا ہے۔ اللہ بس شرک ہی کو معاف نہیں کرتا ہے' اس کے سوا دوسرے جس قدر گناہ ہیں وہ جس کیلئے چاہتا ہے معاف کر دیتا ہے۔ اللہ کے ساتھ جس نے کسی اور کو شریک ٹھہرایا اس نے بہت ہی بڑا جھوٹ تصنیف کیا اور بڑے گناہ کی بات کی ...... تم نے ان لوگوں کو بھی دیکھا جو بہت اپنی پاکیزگی کا دم بھرتے ہیں؟ حالانکہ پاکیزگی تو اللہ ہی جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے۔" (اور انہیں جو پاکیزگی نہیں ملتی تو در حقیقت ان پر ذرہ برابر بھی ظلم نہیں کیا جاتا۔ دیکھو تو سہی' یہ اللہ پر جھوٹے افترا گھڑنے سے نہیں چوکتے اور ان کے صریح گناہ گار ہونے کیلئے یہی ایک گناہ کافی ہے۔...... کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنہیں کتاب کے علم میں سے کچھ حصہ دیا گیا ہے۔ اور ان کا حال یہ ہے کہ جبت اور طاغوت کو مانتے ہیں اور کافروں کے متعلق کہتے ہیں کہ ایمان لانے والوں سے تو یہی زیادہ صحیح راستے پر ہیں۔ ایسے ہی لوگ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کی ہے اور جس پر اللہ لعنت کر دے پھر تم اس کا کوئی مدد گار نہیں پاؤ گے۔ کیا حکومت میں ان کا کوئی حصہ ہے؟ اگر ایسا ہوتا تو یہ دوسروں کو ایک پھوٹی کوڑی تک نہ دیتے۔ پھر کیا یہ دوسروں سے اس لئے حسد کرتے ہیں کہ اللہ نے انہیں اپنے فضل سے نواز دیا؟ اگر یہ بات ہے تو انہیں معلوم ہو کہ ہم نے تو ابراہیم کی اولاد کو کتاب و حکمت عطا کی اور ملک عظیم بخش دیا۔ مگر ان میں سے کوئی اس پر ایمان لایا اور کوئی اس سے منہ موڑ گیا اور منہ موڑنے والوں کیلئے تو بس جہنم کی بھڑکتی ہوئی آگ ہی کافی ہے۔" اِنَّ الَّذِیْنَ یَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ وَ یُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّفَرِّقُوْا بَیْنَ اللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ وَ یَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّ نَكْفُرُ بِبَعْضٍ ۙ وَّ یُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّتَّخِذُوْا بَیْنَ ذٰلِكَ سَبِیْلًا ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ حَقًّا ۚ وَ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِیْنَ عَذَابًا مُّهِیْنًا

”جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں سے کفر کرتے ہیں' اور چاہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان فرق کر دیں' اور کہتے ہیں کہ ہم کسی کو مانیں گے اور کسی کو نہ مانیں گے اور کفر و ایمان کے بیچ میں ایک راہ نکالنے کا ارادہ رکھتے ہیں' وہ سب پکے کافر ہیں اور ایسے کافروں کیلئے ہم نے وہ سزا مہیا کر رکھی ہے جو انہیں ذلیل و خوار کر دینے والی ہوگی۔“

يَسْـَٔلُكَ أَهْلُ الْكِتٰبِ أَنْ تُنَزِّلَ عَلَيْهِمْ كِتٰبًا مِّنَ السَّمَآءِ فَقَدْ سَأَلُوا مُوسٰٓى أَكْبَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَقَالُوٓا أَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً فَأَخَذَتْهُمُ الصّٰعِقَةُ بِظُلْمِهِمْ ثُمَّ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ فَعَفَوْنَا عَنْ ذٰلِكَ ۚ وَاٰتَيْنَا مُوسٰى سُلْطٰنًا مُّبِينًا ﴿۱۵۳﴾ وَرَفَعْنَا فَوْقَهُمُ الطُّورَ بِمِيثَاقِهِمْ وَقُلْنَا لَهُمُ ادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّقُلْنَا لَهُمْ لَا تَعْدُوا فِي السَّبْتِ وَأَخَذْنَا مِنْهُمْ مِّيثَاقًا غَلِيظًا ﴿۱۵۴﴾ فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيثَاقَهُمْ وَكُفْرِهِمْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَقَتْلِهِمُ الْأَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ وَّقَوْلِهِمْ قُلُوبُنَا غُلْفٌ ۚ بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُونَ إِلَّا قَلِيلًا ﴿۱۵۵﴾ وَّبِكُفْرِهِمْ وَقَوْلِهِمْ عَلٰى مَرْيَمَ بُهْتٰنًا عَظِيمًا ﴿۱۵۶﴾ وَّقَوْلِهِمْ إِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيحَ عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُولَ اللّٰهِ ۚ وَمَا قَتَلُوهُ وَمَا صَلَبُوهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ ۚ وَإِنَّ الَّذِينَ اخْتَلَفُوا فِيهِ لَفِي شَكٍّ مِّنْهُ ۚ مَا لَهُمْ بِهِ مِنْ عِلْمٍ إِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ ۚ وَمَا قَتَلُوهُ يَقِينًا ﴿۱۵۷﴾ بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ إِلَيْهِ ۚ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيزًا حَكِيمًا ﴿۱۵۸﴾ وَإِنْ مِّنْ أَهْلِ الْكِتٰبِ إِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهِ قَبْلَ مَوْتِهِ ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكُونُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا ﴿۱۵۹﴾ فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِينَ هَادُوا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبٰتٍ أُحِلَّتْ لَهُمْ وَبِصَدِّهِمْ عَنْ سَبِيلِ اللّٰهِ كَثِيرًا ﴿۱۶۰﴾ وَّأَخْذِهِمُ الرِّبٰوا وَقَدْ نُهُوا عَنْهُ وَأَكْلِهِمْ أَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبٰطِلِ ۚ وَأَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِينَ مِنْهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا ﴿۱۶۱﴾

”یہ اہل کتاب اگر آج تم سے مطالبہ کر رہے ہیں کہ تم آسمان سے کوئی تحریر ان پر نازل کراؤ تو اس سے بڑھ چڑھ کر مجرمانہ مطالبے یہ پہلے موسیٰ سے کر چکے ہیں ...... اس سے تو انہوں نے کہا تھا کہ ہمیں خدا کو اعلانیہ دکھاؤ اور اس سرکشی کی وجہ سے یکایک ان پر بجلی ٹوٹ پڑی تھی۔ پھر انہوں نے بچھڑے کو اپنا معبود بنالیا تھا' حالانکہ یہ کھلی کھلی نشانیاں دیکھ چکے تھے۔ اس پر بھی ہم نے ان سے درگزر کیا۔ ہم نے موسیٰ کو صریح فرمان عطا کیا اور ان لوگوں پر طور کو اٹھا کر ان سے عہد لیا۔ ہم نے ان کو حکم دیا کہ دروازہ میں سجدہ ریز ہوتے ہوئے داخل ہو' ہم نے ان سے کہا کہ سبت کا قانون نہ توڑو اور اس پر ان سے پختہ عہد لیا۔ آخر کار ان کی عہد شکنی کی وجہ سے' اور اس وجہ سے کہ انہوں نے اللہ کی آیات کو جھٹلایا' اور متعدد پیغمبروں کو ناحق قتل کیا۔ اور یہاں تک کہا کہ ہمارے دل غلافوں میں محفوظ ہیں ...... حالانکہ

ان کی باطل پرستی کے سبب سے اللہ نے ان کے دلوں پر ٹھپہ لگا دیا ہے اور اسی وجہ سے یہ بہت کم ایمان لاتے ہیں۔............ غرض ان یہودی بن جانے والوں کے اسی ظالمانہ رویہ کی بنا پر' اور اس بنا پر کہ یہ کثرت سے اللہ کے راستے سے روکتے ہیں' اور سود لیتے ہیں جس سے انہیں منع کیا گیا تھا' اور ان لوگوں کے مال ناجائز طریقے سے کھاتے ہیں' ہم نے بہت سی وہ پاک چیزیں ان پر حرام کر دیں جو پہلے ان کیلئے حلال تھیں۔ اور جو لوگ ان میں سے کافر ہیں ان کیلئے ہم نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔"

ان اقتباسات سے بنی اسرائیل کے اعمال بد کا ایک حصہ سامنے آجاتا ہے' جن کے بارے میں یہاں قرآن کریم نے اس تنقیدی سلسلے کا آغاز فرمایا ہے۔ اور یہاں ان پر ان کی تکذیب اور ان کا احمقانہ رویہ کی وضاحت کی جارہی ہے۔ اس تنقیدی حملے میں قرآن نے یہودیوں کی بابت خصوصاً یہ فرمایا ہے کہ یہ مسلمانوں کے گہرے دشمن ہیں اور ان کیلئے کفر کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ ان باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے یہ تمام افعال اور کارناموں کا ہدف اس وقت جماعت مسلمہ تھی' اس لئے اس بات کی ضرورت تھی کہ مسلمانوں کے سامنے ان کی حقیقت کو منکشف کیا جائے' ان پر تنقید کی جائے اور یہ بتایا جائے کہ یہ لوگ صریحاً جھوٹے ہیں۔ اور ان کی ان باتوں اور کرتوتوں کی تہ میں نہایت ہی خفیہ عزائم ہیں اور یہ لوگ یہ کام محض گھٹیا درجے کے مفادات کے حصول کیلئے کر رہے ہیں۔ اور یہ کہ یہ لوگ بدترین گروہ ہیں۔ اور انہوں نے اپنی طویل ترین تاریخ میں کبھی بھی ہدایت کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کیا۔ یہ گروہ کبھی بھی راہ ہدایت پر سیدھا نہیں چلا' بلکہ انہوں نے ہدایت قبول کرنے کی بجائے خود انبیاء کو قتل کیا ہے۔ اور اب یہ ان کا دلی بغض و عداوت ہے جو انہیں ان سازشوں پر آمادہ کر رہی ہے۔ اس لئے کہ نبی' اور اہل اسلام کا تعلق ان کی قوم سے نہیں ہے۔ اور یہ کہ اہل اسلام عرب ہدایت پر متحد و متفق ہو گئے ہیں۔ اور ان لوگوں کی یہ سازشیں اس وقت سے جاری ہے جب اسلام مدینہ طیبہ میں داخل ہوا تھا۔ اور آج بھی زوروں پر ہے۔ اور آئندہ بھی ہر اسلامی معاشرہ ان کی ان سازشوں اور بغض و عداوت کا شکار رہے گا۔ ہر اسلامی تحریک کے ساتھ ان کا یہی رویہ رہے گا۔ اور ہر دور اور ہر موڑ پر انہوں نے احیائے اسلام کی تحریکات کے ساتھ یہی سلوک کیا۔

یہودیوں کا سب سے پہلا حملہ خود رسول' خدا کی رسالت میں تشکیک پیدا کرنا ہوا کرتا تھا۔ اس لئے کہ جب یہ لوگ حضور ﷺ کی رسالت میں شک پیدا کر لیں تو پھر ان کیلئے یہ بات بہت ہی آسان ہو جاتی ہے کہ اہل اسلام حضور ﷺ کی قیادت سے دور ہو جائیں' اور اپنا فطری نظریۂ حیات چھوڑ دیں۔ یہی وہ مقصد ہے جو یہودیوں کو ہر دور میں اسلام کی مخالفت پر ابھارتا رہا ہے اور جس کیلئے وہ بڑی بڑی مشقتیں برداشت کرتے رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ یہودی سب سے پہلے اسلامی نظریۂ حیات پر حملہ آور ہوتے ہیں۔ اور اہل اسلام کو اسلامی نظریہ سے برگشتہ کر کے از سرنو انہیں خواہشات نفسانیہ اور جاہلیت کی پیروی پر آمادہ کرنا چاہتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ اس سورت میں حضور' کی نفس رسالت کو بھی موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ اور یہ فرمایا گیا ہے کہ آپ کی رسالت کوئی انوکھا واقعہ نہیں ہے۔ دنیا میں پہلے بھی بہت سے نبی اور رسول بھیجے گئے ہیں۔ خود بنی اسرائیل میں ہزاروں نبی مبعوث ہوئے۔ آپ کی نبوت بھی سلسلہ رسالت کی ایک اہم کڑی ہے۔ اور نفس رسالت کا وجود اس لئے ضروری ہے کہ قیامت میں سزا دینے سے پہلے اتمام حجت ضروری ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی جانب سے حضرت محمد' پر اسی طرح وحی آئی جس طرح آپ سے قبل "رسل" پر آتی رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اسی طرح نبوت اور سلطنت عطا کی جس طرح آپ سے پہلے انبیائے بنی اسرائیل کو عطا کی گئی تھی۔ اس لئے یہ واقعہ نہ انوکھا ہے اور نہ باعث تعجب اور انکار ہے۔ اور ایک نبی چونکہ قائد ہوتا ہے اور لوگوں پر اسکی حکمرانی قائم ہوتی ہے' اس لئے حضور' کی رسالت اور حکومت کا قائم ہونا کوئی انوکھی بات نہیں ہے۔ اس لئے کہ یہ تمام امور راہ و رسم رسالت کے اہم اجزاء ہیں۔ اس معاملے میں بنی اسرائیل کی تمام حجت بازیاں جھوٹی ہیں اور ان کے تمام شبہات بے اصل ہیں۔ نیز بنی اسرائیل اپنے بڑے نبی حضرت موسیٰ اور آپ کے

بعد آنیوالے تمام رسولوں کے ساتھ یہی سلوک کرتے رہے ہیں۔ خصوصاً حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ تو انہوں نے بہت ہی برا سلوک کیا۔ اس لئے اہل اسلام میں سے کوئی شخص بھی ان کی ان باتوں پر کوئی توجہ نہ دے اور نہ ہی ان کو کوئی اہمیت دے۔

اس سورت میں اس حقیقت کے اظہار کے لئے پے در پے آیات نازل ہوئی ہیں۔ یہاں مناسب ہے کہ بعض آیات پیش کر دی جائیں۔ تشریح و توضیح اپنی جگہ کریں گے۔

إِنَّآ أَوْحَيْنَآ إِلَيْكَ كَمَآ أَوْحَيْنَآ إِلَىٰ نُوحٍ وَّالنَّبِيِّـۧنَ مِنۢ بَعْدِهِۦ ۚ وَأَوْحَيْنَآ إِلَىٰٓ إِبْرَٰهِيمَ وَإِسْمَٰعِيلَ وَإِسْحَٰقَ وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطِ وَعِيسَىٰ وَأَيُّوبَ وَيُونُسَ وَهَٰرُونَ وَسُلَيْمَٰنَ ۚ وَءَاتَيْنَا دَاوُۥدَ زَبُورًا ﴿۱۶۳﴾ وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنَٰهُمْ عَلَيْكَ مِن قَبْلُ وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ ۚ وَكَلَّمَ ٱللَّهُ مُوسَىٰ تَكْلِيمًا ﴿۱۶۴﴾ رُّسُلًا مُّبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى ٱللَّهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ ٱلرُّسُلِ ۚ وَكَانَ ٱللَّهُ عَزِيزًا حَكِيمًا ﴿۱۶۵﴾ لَّٰكِنِ ٱللَّهُ يَشْهَدُ بِمَآ أَنزَلَ إِلَيْكَ ۖ أَنزَلَهُۥ بِعِلْمِهِۦ ۖ وَٱلْمَلَٰٓئِكَةُ يَشْهَدُونَ ۚ وَكَفَىٰ بِٱللَّهِ شَهِيدًا

"اے محمد! ہم نے تمہاری طرف اسی طرح وحی بھیجی ہے جس طرح نوح اور اس کے بعد کے پیغمبروں کی طرف بھیجی تھی۔ ہم نے ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب، اور اولاد یعقوب، عیسیٰ، ایوب، یونس، ہارون اور سلیمان کی طرف وحی بھیجی۔ ہم نے داؤد کو زبور دی۔ ہم نے ان رسولوں پر بھی وحی نازل کی جن کا ذکر ہم اس سے پہلے تم سے کر چکے ہیں اور ان رسولوں پر بھی جن کا ذکر تم سے نہیں کیا۔ ہم نے موسیٰ سے اس طرح گفتگو کی جس طرح گفتگو کی جاتی ہے۔ یہ سارے رسول خوشخبری دینے والے اور ڈرانے والے بنا کر بھیجے گئے تھے تاکہ ان کو مبعوث کر دینے کے بعد لوگوں کے پاس اللہ کے مقابلے میں کوئی حجت نہ رہے۔ اور اللہ بہرحال غالب رہنے والا اور حکیم و دانا ہے۔ مگر اللہ گواہی دیتا ہے کہ جو کچھ اس نے تم پر نازل کیا ہے۔ اپنے علم سے نازل کیا ہے۔ اور اس پر ملائکہ بھی گواہ ہیں۔ اگرچہ اللہ کا گواہ ہونا بالکل کفایت کرتا ہے۔"

يَسْـَٔلُكَ أَهْلُ ٱلْكِتَٰبِ أَن تُنَزِّلَ عَلَيْهِمْ كِتَٰبًا مِّنَ ٱلسَّمَآءِ ۚ فَقَدْ سَأَلُوا۟ مُوسَىٰٓ أَكْبَرَ مِن ذَٰلِكَ فَقَالُوٓا۟ أَرِنَا ٱللَّهَ جَهْرَةً فَأَخَذَتْهُمُ ٱلصَّٰعِقَةُ بِظُلْمِهِمْ ۚ ثُمَّ ٱتَّخَذُوا۟ ٱلْعِجْلَ مِنۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ ٱلْبَيِّنَٰتُ فَعَفَوْنَا عَن ذَٰلِكَ ۚ وَءَاتَيْنَا مُوسَىٰ سُلْطَٰنًا مُّبِينًا ﴿۱۵۳﴾ وَرَفَعْنَا فَوْقَهُمُ ٱلطُّورَ بِمِيثَٰقِهِمْ وَقُلْنَا لَهُمُ ٱدْخُلُوا۟ ٱلْبَابَ سُجَّدًا وَقُلْنَا لَهُمْ لَا تَعْدُوا۟ فِى ٱلسَّبْتِ وَأَخَذْنَا مِنْهُم مِّيثَٰقًا غَلِيظًا ﴿۱۵۴﴾ فَبِمَا نَقْضِهِم مِّيثَٰقَهُمْ وَكُفْرِهِم بِـَٔايَٰتِ ٱللَّهِ وَقَتْلِهِمُ ٱلْأَنۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ وَقَوْلِهِمْ قُلُوبُنَا

غُلْفٌ ۭ بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝ وَّ بِكُفْرِهِمْ وَ قَوْلِهِمْ عَلٰي مَرْيَمَ بُهْتَانًا عَظِيْمًا ۝ وَّ قَوْلِهِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ۚ وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ ۭ

اے نبی ؐ یہ اہل کتاب اگر آج تم سے مطالبہ کر رہے ہیں کہ تم آسمان سے کوئی تحریر ان پر نازل کراؤ تو اس سے بڑھ چڑھ کر مجرمانہ مطالبے یہ پہلے موسیٰ ؑ سے کر چکے ہیں۔ اس سے تو انہوں نے کہا تھا کہ ہمیں خدا کو علانیہ دکھا دو اور اسی سرکشی کی وجہ سے یکایک ان پر بجلی ٹوٹ پڑی تھی۔ پھر انہوں نے بچھڑے کو اپنا معبود بنالیا' حالانکہ یہ کھلی کھلی نشانیاں دیکھ چکے تھے۔ اس پر بھی ہم نے ان سے درگزر کیا۔ ہم نے موسیٰ کو صریح فرمان عطا کیا اور ان لوگوں پر طور کو اٹھا کر ان سے (اس فرمان کی اطاعت کا) عہد لیا۔ ہم نے ان کو حکم دیا کہ دروازہ میں سجدہ ریز ہوتے ہوئے داخل ہو۔ ہم نے ان سے کہا کہ سبت کا قانون نہ توڑو اور اس پر ان سے پختہ عہد لیا۔ آخر کار ان کی عہد شکنی کی وجہ سے' اور اس وجہ سے کہ انہوں نے اللہ کی آیات کو جھٹلایا' اور متعدد پیغمبروں کو ناحق قتل کیا' اور یہاں تک کہا کہ ہمارے دل غلافوں میں محفوظ ہیں۔۔۔ حالانکہ درحقیقت ان کی باطل پرستی کے سبب سے اللہ نے ان کے دلوں پر ٹھپہ لگا دیا ہے اور اسی وجہ سے یہ بہت کم ایمان لاتے ہیں۔ پھر اپنے کفر میں یہ اتنے بڑھے کہ مریم پر سخت بہتان لگایا' اور خود کہا کہ ہم نے مسیح عیسیٰ ابن مریم' رسول اللہ کو قتل کر دیا ہے۔۔۔ حالانکہ فی الواقع انہوں نے نہ اس کو قتل کیا' نہ صلیب پر چڑھایا بلکہ معاملہ ان کے لیے مشتبہ کر دیا گیا"۔

اَمْ يَحْسُدُوْنَ النَّاسَ عَلٰي مَآ اٰتٰىھُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ فَقَدْ اٰتَيْنَآ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاٰتَيْنٰھُمْ مُّلْكًا عَظِيْمًا ۝ فَمِنْھُمْ مَّنْ اٰمَنَ بِهٖ وَمِنْھُمْ مَّنْ صَدَّ عَنْهُ ۭ

(۴: ۵۴تا۵۵ ابتدائی حصہ)

"پھر کیا دوسروں سے اس لئے حسد کرتے ہیں کہ اللہ نے انہیں اپنے فضل سے نواز دیا ہے۔ اگر یہ بات ہے تو انہیں معلوم ہو کہ ہم نے تو ابراہیم کی اولاد کو کتاب و حکمت عطا کی اور ملک عظیم بخش دیا۔ مگر ان میں سے کوئی اس پر ایمان لایا اور کوئی اس سے منہ موڑ گیا۔"

○.....☆☆☆.....○

اس سورت میں اسلامی معاشرہ کو جاہلیت کی گندگیوں سے پاک و صاف کرنے کا عمل بھی مسلسل جاری رہا ہے۔ اس میں دین کا مفہوم بڑی وضاحت سے بیان کیا گیا ہے۔ ایمان کی تعریف بیان کی گئی ہے۔ اسلام کی شرائط کا ذکر ہوا ہے۔ اور ان مفہومات پر مرتب ہونے والے نتائج کا بھی تفصیلاً ذکر ہوا ہے۔ اور ان مفاہیم کے نتیجے میں جو تقاضے ابھر کر سامنے آتے ہیں ان کے بارے میں ہدایات دی گئی ہیں۔ جیسا کہ اوپر ہم عموماً بیان کر آئے ہیں۔ اس کے بعد اس سورت میں یہودیوں کے شبہات کو دور کرنے کی مسلسل کوشش کی گئی ہے۔ اور ان کی سازشوں سے بھی اہل ایمان کو خبردار کیا گیا ہے۔ خصوصاً وہ شبہات جو وہ رسول خدا ﷺ کی رسالت کی سچائی کے بارے میں پھیلاتے تھے۔ اس کے علاوہ اس میں اسلامی تصور حیات کے بعض اساسی باتوں کی وضاحت بھی کی گئی ہے۔ اور اس میں جو غلط فہمیاں پیدا کی گئیں تھیں ان کو زائل کیا گیا ہے۔ نیز اس کے مقابلے میں وہ غلو اور انتہاپسندی بھی دکھائی گئی ہے جو اہل کتاب کے بعض عقائد و تصورات میں پائی جاتی تھی۔ مثلاً یہودی حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی پاک دامن والدہ کے بارے میں جو ناگفتنی باتیں کرتے تھے' ان کے جوابات بھی دیئے گئے ہیں اور توحید الٰہی اور توحید عبودیت' تقدیر الٰہی' لوگوں کی تخلیق کی نسبت تقدیر الٰہی لوگوں کی وفات کے بارے میں فیصلہ الٰہی اور یہ کہ کسی حد تک اللہ تعالیٰ لوگوں کی تقصیرات کو معاف کریں گے اور کس حد سے آگے جرم ناقابل معافی ہوگا' یہ کہ توبہ کی حقیقت کیا ہے اور اس کی حدود کیا ہیں۔ اسلام میں جزاء و سزا کے بارے میں نظام عدل کیا ہے۔ غرض یہ اور اس قسم کی دوسری اصولی باتیں اس سورت میں بیان کی گئی ہیں۔ بعض نصوص کو یہاں ہم بطور مثال پیش کرتے ہیں۔

إِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللَّهِ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ السُّوءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوبُونَ مِن قَرِيبٍ فَأُولَٰئِكَ يَتُوبُ اللَّهُ عَلَيْهِمْ ۗ وَكَانَ اللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمًا ﴿١٧﴾ وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ السَّيِّئَاتِ حَتَّىٰ إِذَا حَضَرَ أَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ إِنِّي تُبْتُ الْآنَ وَلَا الَّذِينَ يَمُوتُونَ وَهُمْ كُفَّارٌ ۚ أُولَٰئِكَ أَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا ﴿١٨﴾

"ہاں جان لو کہ اللہ پر توبہ کی قبولیت کا حق انہی لوگوں کیلئے ہے جو نادانی کی وجہ سے کوئی برا فعل کر گزرتے ہیں اور اس کے بعد جلد ہی توبہ کر لیتے ہیں۔ ایسے لوگوں پر اللہ اپنی نظر عنایت سے پھر متوجہ ہو جاتا ہے اور اللہ ساری باتوں کی خبر رکھنے والا اور حکیم و دانا ہے۔ مگر توبہ ان لوگوں کیلئے نہیں ہے جو برے کام کئے چلے جاتے ہیں' یہاں تک کہ ان میں سے جب کسی کی موت کا وقت آجاتا ہے تو وہ اس وقت کہتا ہے کہ اب میں نے توبہ کی' اور اسی طرح توبہ ان لوگوں کیلئے بھی نہیں ہے جو مرتے دم تک کافر رہیں۔ ایسے لوگوں کیلئے تو ہم نے دردناک سزا تیار کر رکھی ہے۔"

يُرِيدُ اللَّهُ لِيُبَيِّنَ لَكُمْ وَيَهْدِيَكُمْ سُنَنَ الَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ وَيَتُوبَ عَلَيْكُمْ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ﴿٢٦﴾ وَاللَّهُ يُرِيدُ أَن يَتُوبَ عَلَيْكُمْ وَيُرِيدُ الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الشَّهَوَاتِ أَن تَمِيلُوا مَيْلًا عَظِيمًا ﴿٢٧﴾ يُرِيدُ اللَّهُ أَن يُخَفِّفَ عَنكُمْ ۚ وَخُلِقَ الْإِنسَانُ ضَعِيفًا ﴿٢٨﴾

"اللہ چاہتا ہے کہ تم پر ان طریقوں کو واضح کرے اور انہی طریقوں پر تمہیں چلائے جس کی پیروی تم سے پہلے گزرے ہوئے صلحا کرتے تھے۔ اور وہ اپنی رحمت کے ساتھ تمہاری طرف متوجہ ہونے کا ارادہ رکھتا ہے۔ اور وہ علیم بھی ہے اور دانا بھی۔ ہاں اللہ تم پر رحمت کے ساتھ توجہ کرنا چاہتا ہے مگر جو لوگ خود اپنی خواہشات نفس کی پیروی کر رہے ہیں وہ چاہتے ہیں کہ تم راہ راست سے ہٹ کر دور نکل جاؤ۔ اللہ تم پر سے پابندیوں کو ہلکا کرنا چاہتا ہے کیونکہ انسان کمزور پیدا کیا گیا ہے۔"

إِن تَجْتَنِبُوا كَبَائِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ وَنُدْخِلْكُم مُّدْخَلًا كَرِيمًا ﴿٣١﴾ (۴:۳۱)

"اگر تم ان بڑے بڑے گناہوں سے پرہیز کرتے رہو جن سے تمہیں منع کیا جا رہا ہے تو تمہاری چھوٹی موٹی برائیوں کو ہم تمہارے حساب سے ساقط کر دیں گے اور تم کو عزت کی جگہ داخل کریں گے۔"

إِنَّ اللَّهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ ۖ وَإِن تَكُ حَسَنَةً يُضَاعِفْهَا وَيُؤْتِ مِن لَّدُنْهُ أَجْرًا عَظِيمًا ﴿٤٠﴾

"اللہ کسی پر ذرہ برابر ظلم نہیں کرتا' اگر کوئی ایک نیکی کرے تو اللہ اسے دوچند کرتا ہے اور پھر اپنی طرف سے بڑا اجر عطا فرماتا ہے۔"

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ قِيْلَ لَهُمْ كُفُّوْۤا اَيْدِيَكُمْ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ۚ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَخْشَوْنَ النَّاسَ كَخَشْيَةِ اللّٰهِ اَوْ اَشَدَّ خَشْيَةً ۚ وَقَالُوْا رَبَّنَا لِمَ كَتَبْتَ عَلَيْنَا الْقِتَالَ ۚ لَوْلَاۤ اَخَّرْتَنَاۤ اِلٰۤى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ؕ قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ ۚ وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقٰى وَلَا تُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا ﴿۷۷﴾ اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ وَلَوْ كُنْتُمْ فِىْ بُرُوْجٍ مُّشَيَّدَةٍ ۗ وَاِنْ تُصِبْهُمْ حَسَنَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۚ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِكَ ؕ قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ فَمَالِ هٰۤؤُلَاۤءِ الْقَوْمِ لَا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ حَدِيْثًا ﴿۷۸﴾ مَاۤ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ۫ وَمَاۤ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ ؕ وَاَرْسَلْنٰكَ لِلنَّاسِ رَسُوْلًا ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ﴿۷۹﴾

”تم نے ان لوگوں کو بھی دیکھا جن سے کہا گیا تھا کہ اپنے ہاتھ روکے رکھو اور نماز قائم کرو اور زکوۃ دو؟ اب جو انہیں لڑائی کا حکم دیا گیا تو ان میں سے ایک فریق کا حال یہ ہے کہ لوگوں سے اب ڈر رہے ہیں جیسا کہ خدا سے ڈرنا چاہئے یا کچھ اس سے بڑھ کر ' کہتے ہیں خدایا ہم پر لڑائی کا حکم کیوں لکھ دیا؟ کیوں نہ ہمیں کچھ اور مہلت دی؟ ان سے کہو ' کہ دنیا کا سرمایہ زندگی تھوڑا ہے اور آخرت ایک خدا ترس انسان کیلئے زیادہ بہتر ہے۔ اور تم پر ظلم ایک شمہ برابر بھی نہ کیا جائے گا۔ رہی موت تو جہاں بھی تم ہو وہ بہرحال آکر رہے گی خواہ تم کیسی ہی مضبوط عمارتوں میں ہو۔ اگر انہیں کوئی فائدہ پہنچتا ہے تو کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے اور اگر کوئی نقصان پہنچتا ہے تو کہتے ہیں کہ یہ تمہاری بدولت ہے۔ کہو سب کچھ اللہ ہی کی طرف سے ہے۔ آخر ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ کوئی بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی۔ اے انسان! تجھے جو بھلائی بھی حاصل ہوتی ہے اللہ کی عنایت سے ہوتی ہے اور جو مصیبت تجھ پر آتی ہے وہ تیرے اپنے کسب عمل کی بدولت ہے۔ اگرچہ اللہ کا گواہ ہونا بالکل کفایت کرتا ہے۔“

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ؕ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًاۢ بَعِيْدًا ﴿۱۱۶﴾

”اللہ کے ہاں بس شرک کی بخشش نہیں ہے ' اس کے سوا سب کچھ معاف ہو سکتا ہے جسے وہ معاف کرنا چاہے۔ جس نے اللہ کے ساتھ شرک کیا وہ گمراہی میں بہت دور نکل گیا۔“

لَيْسَ بِاَمَانِيِّكُمْ وَلَاۤ اَمَانِىِّ اَهْلِ الْكِتٰبِ ؕ مَنْ يَّعْمَلْ سُوْۤءًا يُّجْزَ بِهٖ ۙ وَلَا يَجِدْ لَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ﴿۱۲۳﴾ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰۤئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ نَقِيْرًا

”انجام کار نہ تمہاری آرزوؤں پر موقوف ہے نہ اہل کتاب کی آرزوؤں پر۔ جو بھی برائی کریگا اس کا پھل پائے گا اور اللہ کے مقابلہ میں اپنے لئے کوئی حامی و مددگار نہ پاسکے گا۔ اور جو نیک عمل کرے گا خواہ مرد ہو یا عورت، بشرطیکہ ہو وہ مومن، تو ایسے ہی لوگ جنت میں داخل ہوں گے اور ان کی ذرہ برابر حق تلفی نہ ہونے پائے گی۔“

مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَ اٰمَنْتُمْ وَ كَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِيْمًا

”آخر اللہ کو کیا پڑی ہے کہ تمہیں خواہ مخواہ سزا دے اگر تم شکرگزار بندے بنے رہو اور ایمان کی روش پر چلو، اللہ بڑا قدردان ہے اور سب کے حال سے واقف ہے۔“

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ وَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّفَرِّقُوْا بَيْنَ اللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ وَ يَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّ نَكْفُرُ بِبَعْضٍ ۙ وَّ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَّخِذُوْا بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ حَقًّا ۚ وَ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ وَ لَمْ يُفَرِّقُوْا بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ اُولٰٓئِكَ سَوْفَ يُؤْتِيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا

”جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں سے کفر کرتے ہیں، اور چاہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان تفریق کریں، اور کہتے ہیں کہ ہم کسی کو مانیں گے اور کسی کو نہ مانیں گے اور کفر و ایمان کے بیچ میں ایک راہ نکالنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ وہ پکے کافر ہیں اور ایسے کافروں کیلئے ہم نے وہ سزا مہیا کر رکھی ہے جو انہیں ذلیل و خوار کر دینے والی ہوگی........ بخلاف اس کے جو لوگ اللہ اور اس کے تمام رسولوں کو مانیں اور ان کے درمیان تفریق نہ کریں، ان کو ہم ضرور اجر عطا کریں گے اور اللہ بڑا درگزر فرمانے والا ہے۔“

يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ وَ لَا تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ ؕ اِنَّمَا الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَ كَلِمَتُهٗ ۚ اَلْقٰىهَاۤ اِلٰى مَرْيَمَ وَ رُوْحٌ مِّنْهُ ۫ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ ۚ وَ لَا تَقُوْلُوْا ثَلٰثَةٌ ؕ اِنْتَهُوْا خَيْرًا لَّكُمْ ؕ اِنَّمَا اللّٰهُ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ؕ سُبْحٰنَهٗۤ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ وَلَدٌ ۘ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا لَنْ يَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ اَنْ يَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ وَ لَا الْمَلٰٓئِكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ ؕ وَ مَنْ يَّسْتَنْكِفْ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَ يَسْتَكْبِرْ فَسَيَحْشُرُهُمْ اِلَيْهِ جَمِيْعًا فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَيُوَفِّيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ وَ يَزِيْدُهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ۚ وَ اَمَّا الَّذِيْنَ اسْتَنْكَفُوْا وَ اسْتَكْبَرُوْا

فَيُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا ۙ وَلَا يَجِدُونَ لَهُمْ مِّن دُونِ اللَّهِ وَلِيًّا وَلَا نَصِيرًا ﴿١٧٣﴾

"اے اہل کتاب! اپنے دین میں غلو نہ کرو اور اللہ کی طرف حق کے سوا کوئی بات منسوب نہ کرو۔ مسیح عیسیٰ ابن مریمؑ اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ اللہ کا ایک رسول تھا' اور ایک فرمان تھا جو اللہ نے مریم کی طرف بھیجا اور ایک روح تھی اللہ کی طرف سے۔ پس تم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور نہ کہو کہ "تین ہیں" باز آجاؤ' یہ تمہارے لئے بہتر ہے۔ اللہ تو بس ایک ہی خدا ہے۔ وہ بالاتر ہے اس سے کہ کوئی اس کا بیٹا ہو۔ زمین و آسمان کی ساری چیزیں اس کی ملک ہیں اور ان کی کفالت و خبرگیری کیلئے بس وہی کافی ہے......... مسیح نے کبھی اس بات کو عار نہیں سمجھا کہ وہ اللہ کا بندہ ہو' اور نہ مقرب ترین فرشتے اس کو اپنے لئے عار سمجھتے ہیں۔ اگر کوئی اللہ کی بندگی کو اپنے لئے عار سمجھتا ہے اور تکبر کرتا ہے تو ایک وقت آئے گا جب اللہ سب کو گھیر کر اپنے سامنے حاضر کرے گا۔ اس وقت وہ لوگ جنہوں نے ایمان لاکر نیک طرز عمل اختیار کیا ہے اپنے اجر پورے پورے پائیں گے اور اللہ اپنے فضل سے ان کو مزید اجر عطا فرمائے گا اور جن لوگوں نے بندگی کو عار سمجھا اور تکبر کیا ہے ان کو اللہ دردناک سزا دے گا اور اللہ کے سوا جن جن کی سرپرستی اور مددگار پر وہ بھروسہ رکھتے ہیں ان میں سے کسی کو بھی وہ وہاں نہ پائیں گے۔"

○.....☆☆☆.....○

اس کے بعد ان اساسی اخلاقی اصولوں کا نمبر آتا ہے' جن پر ایک اسلامی معاشرہ قائم ہوتا ہے۔ اس سورت میں ان اصولوں کی ایک بڑی تعداد پر بحث کی گئی ہے۔ اس کی طرف ہم پہلے بھی اشارہ کر آئے ہیں کہ اسلامی تصور حیات میں اخلاقی اصولوں کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ نیز اسلامی معاشرے کی تعمیر میں بھی اخلاقی اصولوں کو مرکزی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ اسلامی معاشرے میں زندگی کا ہر پہلو اور زندگی کی ہر جدوجہد اخلاقی ضوابط میں سے کسی ضابطے میں بندھی ہوئی ہوتی ہے۔ ہم یہاں ایک مجمل اور طائرانہ نظر اس سورت پر اس پہلو سے بھی ڈالتے ہیں' کہ وہ کیا اخلاقی اصول ہیں جن سے اس صورت میں بحث کی گئی ہے۔ جبکہ تفصیلات پہلے دیدی گئی ہیں۔

یہ کہ اسلامی معاشرہ ایک ایسا معاشرہ ہے کہ جو صرف ایک اللہ وحدہ لاشریک کی عبودیت کے تصور پر قائم ہوتا ہے۔ اس لئے اپنی نوعیت کے اعتبار سے وہ ایک ایسا معاشرہ بن جاتا ہے جس میں انسان کیلئے کسی دوسرے انسان کی بندگی اور غلامی کا کوئی تصور نہیں ہوتا' چاہے یہ انسانی غلامی جس شکل و صورت میں بھی ہو' اور یہ انسانی غلامی اسلامی نظام زندگی کے ماسوا دنیا کے تمام نظاموں میں کسی نہ کسی شکل و صورت میں پائی جاتی ہے۔ اس لئے کہ صرف اسلامی نظام ہی وہ نظام ہے جس میں بندگی صرف اللہ وحدہ کیلئے خالص کردی گئی ہے۔ اس نظام میں اللہ کی اس غلامی کے خواص میں سے کوئی خاصیت بھی اللہ کے سوا کسی اور بندے کو عطا نہیں کی جاتی۔ اور نہ لوگ اللہ کے سوا کسی اور کی ان معنوں میں اطاعت اور غلامی کرتے ہیں۔ اسلامی نظام کی یہی آزادی ہے جس سے تمام فضائل اخلاق کے سوتے پھوٹتے ہیں اور جس سے ایک اخلاقی نظام وجود میں آتا ہے جس کا مرجع صرف رضائے الٰہی کا جذبہ ہوتا ہے اور جس کا آخری ہدف اللہ کے اخلاق میں اپنے آپ کو رنگنا ہے۔ اس لئے اسلامی اخلاقی نظام نفاق' ریاکاری غیر اللہ کی خوشنودی جیسے برے خصائل سے پاک و صاف ہوتا ہے۔ یہ ہے اسلامی نظام اخلاق کا اصل الاصول اور اجتماعی خصائل کا مدار المہام۔

اس بڑے اصول کے ساتھ ساتھ اسلامی نظام میں بعض انفرادی عناصر پر بھی اس سورت میں بحث کی گئی ہے۔ اسلامی معاشرے میں امانت و دیانت کو بڑی اہمیت دی گئی ہے۔ نیز اس معاشرے کی ایک اہم خصوصیت اس کی عدالت ہے۔ اس میں لوگوں کا مال ناجائز طریقے سے نہیں کھایا جاتا۔ اس میں ایک دوسرے کے خلاف نجویٰ اور خفیہ سازشوں کی اجازت نہیں دی جاتی۔ اس سلسلے میں صرف معروف اور

متد اول انداز اختیار کیا جاتا ہے۔ اس نظام میں کسی کی بدگوئی جائز نہیں ہوتی۔ الایہ کہ کسی کی حق تلفی کی گئی۔ اس معاشرے میں اچھے کاموں کی سفارش کی جاتی ہے۔ اچھی طرح سلام و کلام کیا جاتا ہے۔ جہاں فحاشی کی حوصلہ شکنی کی جاتی ہے۔ مرد اور عورت کے درمیان دوستیاں اور حرام کاری سخت طور پر ممنوع ہوتی ہیں۔ تکبر، ریاکاری، بخل، حسد اور دھوکہ بازی کو ممنوع قرار دیا جاتا ہے اور اس معاشرے کا اجتماعی معاشی نظام باہم تعاون، سوشل سیکورٹی، ہمدردی، ایثار، جوانمردی اور مشکل حالات میں باہم دستگیری پر مبنی ہوتا ہے اور اس اجتماعی معاشرے میں صرف اس قیادت کو تسلیم کیا جاتا ہے جس کی اطاعت کا حق ہو۔

اس سے قبل ہم اکثر ایسی آیات کو نقل کر آئے جن میں اس اصول پر زور دیا گیا ہے۔ اور دوران تفسیر سیاق کلام میں ان پر دوبارہ تفصیلی بحث بھی ہوگی۔ یہاں مناسب ہے کہ ہم تاریخ اسلام کے ایک عدیم المثال واقعہ کی طرف اشارہ کر دیں جس کی تلاش پوری انسانیت کو ہے لیکن یہ اونچا معیار اسے کہیں بھی نہیں ملتا۔ اور نہ آج تک انسانیت اس مقام بلند تک پہنچ سکی ہے۔ نہ آئندہ اسلامی نظام زندگی کے سوا کسی دوسرے نظام کے زیر سایہ انسانیت اس اونچے مقام تک پہنچ سکتی ہے۔

یہ اس وقت کی بات ہے جب یہودی سوسائٹی اس امت اسلامیہ اور نبی کریم ؐ کے خلاف رات دن سازشوں میں لگی ہوئی تھی۔ یہودی اسلامی اتحاد اور اسلامی قیادت کے خلاف قدم قدم پر سازشوں کا جال بچھا رہے تھے۔ اور قرآن کریم اپنی ذاتی نگرانی میں اس امت کی تربیت کر رہا تھا۔ اور یہ امت قرآنی تصور حیات اور قرآنی اخلاق کے ساتھ رات دن ترقی کر رہی تھی۔ اس کا نظام زندگی اور اس کے اجزاء تیار ہو رہے تھے۔ اس وقت اسلامی نظام ایک یہودی شخص کے ساتھ جو سلوک کرتا ہے وہ ہمارا موضوع ہے۔

قرآن کریم نے امت مسلمہ کو حکم دے رکھا تھا کہ وہ ہر معاملے میں امانت و دیانت کے ساتھ کام کرے۔ لوگوں کے درمیان عدل کے ساتھ فیصلے کرے۔ تمام لوگوں کے درمیان عدل چاہے وہ جس قوم اور جس مذہب سے تعلق رکھتے ہوں، چاہے وہ جس قبیلے اور جس وطن سے تعلق رکھتے ہوں۔ اللہ کا حکم یہ تھا :

إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَىٰ أَهْلِهَا وَإِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ أَنْ تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ ۚ إِنَّ اللَّهَ نِعِمَّا يَعِظُكُمْ بِهِ ۗ إِنَّ اللَّهَ كَانَ سَمِيعًا بَصِيرًا

"مسلمانو! اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانت اہل امانت کے سپرد کرو، اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ کرو، اللہ تم کو نہایت عمدہ نصیحت کرتا ہے یقیناً اللہ سب کچھ سنتا اور دیکھتا ہے۔"

اور دوسری جگہ اللہ فرماتے ہیں

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ لِلَّهِ وَلَوْ عَلَىٰ أَنْفُسِكُمْ أَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ ۚ إِنْ يَكُنْ غَنِيًّا أَوْ فَقِيرًا فَاللَّهُ أَوْلَىٰ بِهِمَا ۖ فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوَىٰ أَنْ تَعْدِلُوا ۚ وَإِنْ تَلْوُوا أَوْ تُعْرِضُوا فَإِنَّ اللَّهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو، انصاف کے علمبردار اور خدا واسطے کے گواہ بنو اگرچہ تمہارے انصاف اور تمہاری گواہی کی زد خود

تمہاری اپنی ذات پر یا تمہارے والدین اور رشتہ داروں پر ہی کیوں نہ پڑتی ہو۔ فریق معاملہ خواہ مالدار ہو یا غریب' اللہ تم سے زیادہ ان کا خیر خواہ ہے۔ لہٰذا اپنی خواہش نفس کی پیروی میں عدل سے باز نہ رہو۔ اور اگر تم نے لگی لپٹی بات کہی یا سچائی سے پہلو بچایا تو جان رکھو کہ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ کو اس کی خبر ہے۔"

اس کے بعد قرآن کریم کی چند آیات ایک یہودی فرد کے انفرادی معاملے میں انصاف کے طور پر اترتی ہیں' جس کے خلاف ایک ناجائز الزام میں تحقیقات ہو رہی تھی۔ یہ الزامات بعض انصار اہل اسلام نے عائد کئے تھے۔ جو نئے نئے اسلام میں داخل ہوئے تھے اور جن کے دلوں میں ابھی تک اعلیٰ اسلامی اصول و مبادی اچھی طرح راسخ نہ ہوئے تھے۔ اور نہ ہی ابھی تک ان کے دلوں سے جاہلیت کی میل دور ہوئی تھی۔ چنانچہ ان لوگوں نے' خونی رشتہ داری اور قوم پرستی کے نتیجے میں ایک بے گناہ پر الزام عائد کر دیا اور اصل مجرم کو بری کروا دیا۔ انہوں نے بڑی کثرت سے اس یہودی شخص کے خلاف الزام عائد کیا اور اس کے خلاف گواہی تک دیدی۔ یہ مقدمہ زرہ کی چوری کا مشہور مقدمہ تھا جو خود حضور ﷺ کے سامنے پیش ہوا تھا' اور قریب تھا کہ ان شہادتوں کی بنا پر آپ اس یہودی کو سزائے حد سرقہ سنا دیتے اور اصل مجرم کو بری کر دیتے۔

چنانچہ اس واقعہ کے بارے میں آیات کی ایک بڑی تعداد نازل ہوئی۔ ان آیات میں حضرت نبی ؐ کو شدید تنبیہہ بھی کی گئی۔ نیز اس گروہ انصار کو بھی سخت ملامت کی گئی جنہوں نے حضور ؐ کو مشکل حالات میں پناہ دی تھی اور آپ ؐ کی امداد کی تھی۔ یہ سب کچھ اس لئے کیا گیا کہ ایک یہودی کے ساتھ انصاف کیا جائے' حالانکہ وہ شخص اس گروہ کا فرد تھا جو ہر وقت حضور ؐ کو ایذا دیتا تھا' آپ ؐ کی دعوت کی مخالفت کرتا تھا' اور آپ ؐ اور مسلمانوں کے خلاف ہر وقت گہری اور گھناؤنی سازشوں میں مصروف رہتا تھا۔ نیز ان آیات میں ان لوگوں کو بھی سخت ترین دھمکی دی گئی ہے جو برے افعال کا ارتکاب کرتے ہیں۔ اور پھر اس کا الزام ایک بے گناہ شخص پر دھرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان آیات میں عدل و انصاف کے معیار کو اس قدر بلند اور اونچا بنا دیا گیا جو اس دور میں تعجب خیز نظر آتا ہے۔ اور نیز ان آیات میں ایک روشن اشارہ اس جانب پایا جاتا ہے کہ عدل و انصاف کو اسلام کس مقام بلند تک پہنچانا چاہتا ہے۔

إِنَّآ أَنزَلْنَآ إِلَيْكَ ٱلْكِتَٰبَ بِٱلْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ ٱلنَّاسِ بِمَآ أَرَىٰكَ ٱللَّهُ ۚ وَلَا تَكُن لِّلْخَآئِنِينَ خَصِيمًا ﴿١٠٥﴾ وَٱسْتَغْفِرِ ٱللَّهَ ۖ إِنَّ ٱللَّهَ كَانَ غَفُورًا رَّحِيمًا ﴿١٠٦﴾ وَلَا تُجَٰدِلْ عَنِ ٱلَّذِينَ يَخْتَانُونَ أَنفُسَهُمْ ۚ إِنَّ ٱللَّهَ لَا يُحِبُّ مَن كَانَ خَوَّانًا أَثِيمًا ﴿١٠٧﴾ يَسْتَخْفُونَ مِنَ ٱلنَّاسِ وَلَا يَسْتَخْفُونَ مِنَ ٱللَّهِ وَهُوَ مَعَهُمْ إِذْ يُبَيِّتُونَ مَا لَا يَرْضَىٰ مِنَ ٱلْقَوْلِ ۚ وَكَانَ ٱللَّهُ بِمَا يَعْمَلُونَ مُحِيطًا ﴿١٠٨﴾ هَٰٓأَنتُمْ هَٰٓؤُلَآءِ جَٰدَلْتُمْ عَنْهُمْ فِى ٱلْحَيَوٰةِ ٱلدُّنْيَا فَمَن يُجَٰدِلُ ٱللَّهَ عَنْهُمْ يَوْمَ ٱلْقِيَٰمَةِ أَم مَّن يَكُونُ عَلَيْهِمْ وَكِيلًا ﴿١٠٩﴾ وَمَن يَعْمَلْ سُوٓءًا أَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهُۥ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ ٱللَّهَ يَجِدِ ٱللَّهَ غَفُورًا رَّحِيمًا ﴿١١٠﴾ وَمَن يَكْسِبْ إِثْمًا فَإِنَّمَا يَكْسِبُهُۥ عَلَىٰ نَفْسِهِۦ ۚ وَكَانَ ٱللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمًا ﴿١١١﴾ وَمَن يَكْسِبْ خَطِيٓـَٔةً أَوْ إِثْمًا ثُمَّ يَرْمِ بِهِۦ بَرِيٓـًٔا فَقَدِ ٱحْتَمَلَ بُهْتَٰنًا وَإِثْمًا مُّبِينًا ﴿١١٢﴾ وَلَوْلَا فَضْلُ ٱللَّهِ عَلَيْكَ وَ

رَحْمَتُهُ لَهَمَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ اَنْ يُّضِلُّوْكَ ؕ وَ مَا يُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَ مَا يَضُرُّوْنَكَ مِنْ شَيْءٍ ؕ وَ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ عَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ ؕ وَ كَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا ۝ لَا خَيْرَ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنْ نَّجْوٰىهُمْ اِلَّا مَنْ اَمَرَ بِصَدَقَةٍ اَوْ مَعْرُوْفٍ اَوْ اِصْلَاحٍۭ بَيْنَ النَّاسِ ؕ وَ مَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ۝ وَ مَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَ يَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَ نُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ؕ وَ سَآءَتْ مَصِيْرًا ۝ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَ يَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا

"اے نبی! ہم نے یہ کتاب حق کے ساتھ تمہاری طرف نازل کی ہے تاکہ جو راہ راست اللہ نے تمہیں دکھائی ہے اس کے مطابق لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو' تم بد دیانت لوگوں کی طرف سے جھگڑنے والے نہ بنو' اور اللہ سے درگزر کی درخواست کرو' وہ بڑا درگزر فرمانے والا اور رحیم ہے۔ جو لوگ اپنے نفس سے خیانت کرتے ہیں تم ان کی حمایت نہ کرو' اللہ کو ایسا شخص پسند نہیں ہے جو خیانت کار اور معصیت پیشہ ہو۔ یہ لوگ انسانوں سے اپنی حرکات چھپا سکتے ہیں۔ مگر خدا سے نہیں چھپا سکتے۔ وہ تو اس وقت بھی ان کے ساتھ ہوتا ہے جب یہ راتوں کو چھپ کر اس کی مرضی کے خلاف مشورے کرتے ہیں۔ ان کے سارے اعمال پر اللہ محیط ہے۔ ہاں! تم لوگوں نے ان مجرموں کی طرف سے دنیا کی زندگی میں تو جھگڑا کر لیا' مگر قیامت کے روز ان کی طرف سے کون جھگڑا کرے گا؟ آخر وہاں کون ان کا وکیل ہوگا؟ اگر کوئی برا فعل کر گزرے یا اپنے نفس پر ظلم کر جائے اور اس کے بعد اللہ سے درگزر کی درخواست کرے تو اللہ کو درگزر کرنے والا اور رحیم پائے گا۔ مگر جو برائی کما لے تو یہ اس کی یہ کمائی اسی کیلئے وبال ہوگی' اللہ کو سب باتوں کی خبر ہے اور وہ حکیم و دانا ہے۔ پھر جس نے کوئی خطا یا گناہ کر کے اس کا الزام کسی بے گناہ پر تھوپ دیا اس نے تو بڑے بہتان اور صریح گناہ کا بار سمیٹ لیا۔ اے نبی! اگر اللہ کا فضل تم پر نہ ہوتا اور اس کی رحمت تمہارے شامل حال نہ ہوتی تو ان میں سے ایک گروہ نے تو تمہیں غلط فہمی میں مبتلا کرنے کا فیصلہ کر ہی لیا تھا' حالانکہ درحقیقت وہ خود اپنے سوا کسی کو غلط فہمی میں مبتلا نہیں کر رہے تھے' اور تمہارا کوئی نقصان نہ کر سکتے تھے۔ اللہ نے تم پر کتاب نازل کی ہے اور تم کو وہ کچھ بتایا جو تمہیں معلوم نہ تھا' اور اس کا فضل تم پر بہت ہے۔"

لوگوں کی خفیہ سرگوشیوں میں اکثر و بیشتر کوئی بھلائی نہیں ہوتی' ہاں اگر کوئی پوشیدہ طور پر صدقہ و خیرات کی تلقین کرے یا کسی نیک کام کیلئے یا لوگوں کے معاملات میں اصلاح کرنے کیلئے کسی سے کچھ کہے تو البتہ یہ بھلی بات ہے۔ اور جو کوئی اللہ کی رضاجوئی کیلئے ایسا کرے گا اسے ہم بڑا اجر عطا کریں گے۔ مگر جو شخص رسول کی مخالفت پر کمربستہ ہو اور اہل ایمان کی روش کے سوا کسی اور روش پر چلے' درآنحالیکہ اس پر راہ راست واضح ہو چکی ہو' تو اس کو ہم اسی طرف چلائیں گے جدھر وہ خود پھر گیا۔ اور اسے جہنم میں جھونکیں گے جو بدترین جائے قرار ہے۔

اللہ کے ہاں بس شرک ہی کی بخشش نہیں ہے' اس کے سوا اور سب کچھ معاف ہو سکتا ہے جسے وہ معاف کرنا چاہے۔ جس نے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا۔ تو گمراہی میں بہت دور نکل گیا۔

ذرا اب بتایئے؟ اس نظام کے بارے میں انسان کیا کہہ سکتا ہے؟ صرف یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ ایک بے مثال نظام حیات ہے۔ اسی نظام میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ انسان کی کسی سوسائٹی کو پسماندگی اور جہالت کی ان گہرائیوں سے اس قدر اونچے مقام و معیار تک پہنچا دے۔ اور یوں ایک نہایت ہی مختصر مدت میں اسے گراوٹوں سے نکال کر اس قدر مقام بلند تک پہنچا دے۔

○.....☆☆☆.....○

یہاں ہم اس سورت کے موضوع اور اس کے خطوط پر بحث کے سلسلے میں اسی قدر تعارف اور مقدمہ پر اکتفا کرتے ہیں۔ یہاں ہم نے اس کے موضوعات و مباحث اور اس کی توجیہات و ہدایات کی طرف صرف اشارہ ہی کیا ہے۔ انشاء اللہ تشریح آیات کے وقت ہم کچھ تفصیلات دے سکیں گے۔

○.....☆☆☆.....○

درس ۳۰ ایک نظر میں

سورت کا یہ پہلا پیراگراف 'اپنی افتتاحی آیت کے ساتھ 'لوگوں کو صرف رب واحد اور خالق واحد کی طرف رجوع کرنے کی دعوت سے شروع ہوتا ہے۔ اس میں بتایا جاتا ہے کہ تمام لوگوں کو ایک ہی ماں باپ سے پیدا کیا گیا ہے۔ وہ ایک ہی خاندان سے بکھرے ہیں 'انسانی نفس ہی دراصل اصل انسانیت ہے۔ اور انسانی خاندان ہی دراصل انسانی معاشرے کی اکائی ہے۔ اس لئے نفس انسانی کے اندر خدا خوفی کے جذبات کو جوش میں لایا جاتا ہے اور خاندانی نظام کو جذبہ صلہ رحمی سے مستحکم کیا جاتا ہے 'تاکہ اس مستحکم اساس پر ایک خاندان کے اندر باہم تکافل (Social Security) اور باہم محبت کے فرائض پروان چڑھیں۔ اس کے بعد پوری انسانیت کے اندر باہم محبت اور باہم پشتیبانی کے اصول رائج کیے جاسکیں۔ غرض اس سورت کے اندر کی جانے والی تمام قانون سازی اور انسانیت کی تمام شیرازہ بندی اسی اصول پر کی گئی ہے۔

آیات کا یہ حصہ 'درج بالا اصول و قوانین کے ساتھ ساتھ کسی معاشرے یا کسی خاندان کے اندر پائے جانے والے یتیموں کے بارے میں معاشرتی اور اجتماعی ذمہ داریوں کے حوالے سے بھی ہدایات دیتا ہے۔ یتیموں کے بارے میں ہدایات دی گئی ہیں کہ ان کی نگرانی کس طرح کی جائے۔ ان کے مال کی نگہداشت کس طرح ہو 'نیز افراد خاندان کے درمیان میراث کی تقسیم کے اصول بھی وضع کئے گئے ہیں۔ جن میں مختلف اطراف کے رشتہ داروں کے حصص کا تعین بھی کیا گیا ہے۔ مختلف حالات میں حصص کا فرق بھی بتایا گیا ہے۔ اور یہ سب کچھ اس ہمہ گیر انسانی اصول کی روشنی میں کیا گیا ہے جس کا ذکر آیت افتتاحیہ میں بیان ہوا ہے۔ یہ ہمہ گیر انسانی اصول بعض آیات کی ابتداء میں 'بعض کے درمیان میں اور بعض آیات کے خاتمہ پر اس سبق میں بار بار دہرایا گیا ہے۔ اور اس حقیقت کی توثیق کی گئی ہے کہ ان تمام ہدایات 'تعلیمات اور قانون سازی کے اصولوں کی تہہ میں یہی عظیم اور تابندہ اصول پوشیدہ ہے۔ یعنی یہ کہ اللہ ہی ہمارا رب اور ہر قسم کی ہدایت اور قانون سازی اس کا خصوصی حق ربوبیت ہے۔ اسلامی نظام میں ہر قسم کی قانون سازی اللہ جل شانہ کی اس شان ربوبیت کا اظہار ہے۔

☆ ☆ ☆

درس ۳۰ تشریح آیات

آیت نمبر ۱ تا ۱۴
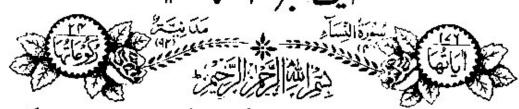
يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا ۝۱

"لوگو! اپنے رب سے ڈرو جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا اور اسی جان سے اس کا جوڑا بنایا اور ان دونوں سے بہت مرد و عورت دنیا میں پھیلا دیئے۔ اس خدا سے ڈرو جس کا واسطہ دے کر تم ایک دوسرے کو اپنا حق مانگتے ہو' اور رشتہ و قرابت کے تعلقات بگاڑنے سے پرہیز کرو۔ یقین جانو کہ اللہ تم پر نگرانی کر رہا ہے۔"

یہ خطاب تمام انسانیت سے ہے۔ بحیثیت انسان ان سے خطاب ہے تاکہ وہ سب کے سب رب واحد کی طرف لوٹ آئیں۔ وہی تو ہے جس نے ان کی تخلیق کی ہے اور پھر اس نے ان سب انسانوں کو ایک ہی جان سے پیدا کیا ہے۔ پھر اس جان سے اس کیلئے جوڑا تخلیق کیا اور پھر ان دونوں سے سلسلہ نسب چلا کر بہت سے مرد اور عورتوں کو پوری دنیا میں پھیلا دیا۔

بظاہر تو یہ باتیں بہت سادہ اور ابتدائی معلوم ہوتی ہیں لیکن در حقیقت یہ عظیم حقائق ہیں۔ یہ بہت ہی بھاری باتیں ہیں اور انسانی زندگی پر ان کے گہرے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ اگر یہ "لوگ" ان باتوں پر کان دھریں' اور انہیں سمجھنے کی کوشش کریں تو ان باتوں سے اس کرہ ارض پر حیات انسانی کے اندر عظیم تغیر واقع ہو جائے اور لوگ جاہلیت یا مختلف جاہلیتوں سے نکل کر ایمانی زندگی' ہدایت یافتہ زندگی اور انسانیت کے لائق مہذب زندگی کی جانب بسہولت منتقل ہو جائیں' یہ مہذب زندگی نفس انسانی کے حسب حال ہوگی اور اس کے خالق اور رب کی مرضی کے مطابق بھی ہوگی۔

اس آیت میں جو ابتدائی حقائق بیان ہوئے ہیں' وہ قلب و نظر کیلئے درج ذیل وسیع میدان فراہم کرتے ہیں:

ا۔ اس میں پوری انسانیت کو یہ بتایا ہے کہ اس کی اصل کیا ہے؟ اور اسے یہ مشورہ دیا گیا ہے کہ وہ اپنے اس خالق کی طرف رجوع کرے جس نے اسے پیدا کر کے اس زمین پر بسایا ہے۔ یہ آیات بتاتی ہے کہ "انسانیت" نے چونکہ اپنی اس اصلیت کو فراموش کر دیا ہے۔ اس لئے وہ سب کچھ بھول گئی ہے اور اس کا کوئی کام درست نہیں رہا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ لوگ اس کرہ ارض پر تشریف لائے' جبکہ پہلے وہ اس پر نہ تھے۔ سوال یہ ہے کہ اس جہاں میں انہیں کون لایا ہے؟ یہاں وارد ہونے میں ان کے اپنے ارادے کا دخل نہیں ہے۔ اس لئے کہ یہاں آنے سے قبل وہ معدوم تھے اور کسی معدوم کیلئے

ارادے کا تصور ممکن نہیں ہے۔ اس لئے کہ معدوم تو اس جہاں میں آنے اور نہ آنے کا کوئی فیصلہ کر ہی نہیں سکتا۔ اس لئے لازماً انسان کے علاوہ کسی اور ذات نے انسانوں کو یہاں لا کر بسایا۔ یہ ارادہ ذات انسان سے علیحدہ ارادہ تھا۔ ایک بالا ارادہ تھا جس نے تخلیق انسانیت کا فیصلہ کیا۔ اور یہ "خالق ارادہ" انسانی ارادہ نہ تھا۔ اس بالائی ارادہ نے انسانیت کیلئے یہاں جینے اور زندگی بسر کرنے کے خطوط وضع کئے۔ اسی دوسرے ارادے نے انسان کو وجود بخشا' انسان کو انسانی خواص عطا کئے۔ انسان کو اس کے خواص اور صلاحیتیں دیں۔ انسان کو وہ قوانین عطا کیے کہ وہ انہیں کام میں لا کر اس کائنات کے ساتھ ہم آہنگی اختیار کرے۔ اس لئے کہ وہ اس کائنات میں نو وارد تھا اور وہ جہاں سے آیا' اس کے بارے میں بھی انسان کو کچھ علم نہ تھا۔ نہ انسان کے اندر ان کے علاوہ صلاحیتیں تھیں جو اس ارادہ بالا نے انسان کو عطا کیں۔

یہ ہے وہ حقیقت کہ اگر موجودہ انسان اسے ذہن نشین کرلے تو وہ پہلے دن سے راہ راست پالے۔ جبکہ یہ حقیقت ہے بھی بالکل واضح' لیکن افسوس یہ ہے کہ انسان اس بدیہی حقیقت کبریٰ سے مکمل طور پر غافل ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ برتر اور عظیم ارادۂ الٰہیہ جو انسان کو یہاں لایا' یہاں اس نے انسان کو زندگی گزارنے کے خطوط دیئے اور اس کائنات میں زندگی بسر کرنے کی قدرت اور صلاحیت اسے عطا کی۔ یہی عظیم ارادہ انسان کی پوری کائنات کا مالک ہے۔ یہی ہے جو انسانی امور میں ہر قسم کا تصرف کر رہا ہے۔ اور یہی وہ ارادہ ہے جو انسانیت کیلئے ہر قسم کی تدبیر یہاں کرتا ہے۔ اس لئے یہی ارادہ الٰہیہ اس بات کا مستحق ہے کہ وہ انسان کیلئے نظام زندگی کے خطوط متعین کرے۔ انسان کیلئے ضابطے اور قوانین وضع کرے۔ اس کیلئے اقدار حیات اور حسن و قبح کے اصول وضع کرے۔ یہی ارادہ ہے جس کی طرف انسان کو رجوع کرنا چاہئے۔ یہی وہ ارادہ ہے کہ جس کے حسن و قبح کے پیمانوں اور جس کے قوانین کی طرف رجوع کرنا فرض ہے۔ اس وقت جبکہ اس امر کے بارے میں ان کے درمیان اختلاف واقع ہو جائے۔ اس لئے کہ وہ ارادۂ رب العالمین ہے جو وحدہ لاشریک ہے۔

۲:۔ یہ حقائق جو اس آیت میں بیان ہوئے ہیں' اس بات کا مظہر ہیں کہ یہ بشریت ایک ہی ارادے کے نتیجے میں عالم وجود میں آئی ہے۔ تمام انسان ایک ہی رحم مادر سے پیدا ہوئے ہیں۔ ان کے درمیان ایک ہی رشتہ ہے۔ وہ ایک ہی جڑ سے پھیلے ہوئے ہیں اور یہ کہ ان کا نسب نامہ بھی ایک ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَنِسَاءً

"اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا ہے اور اسی جان سے اس کا جوڑا بنایا اور ان دونوں سے بہت مرد و عورت دنیا میں پھیلا دیئے۔"

اگر لوگ اس ایک حقیقت کو ہی اچھی طرح ذہن نشین کرلیں تو بیشتر فرقہ بندیاں جو ان کے افکار پر چھائی ہوئی ہیں ختم ہو کر رہ جائیں' جو ان بعد کے ادوار میں انسانوں کی عملی زندگی میں پیدا ہو گئی ہیں' جنہوں نے ایک ہی جان سے پیدا ہونے والے عوام الناس کے اندر فرقے فرقے پیدا کر دیئے ہیں۔ اور ایک ہی ماں سے پیدا ہونے والوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھ دیا ہے۔ جبکہ انسانوں کے اوپر یہ حالات بعد میں طاری ہوئے اور مناسب نہ تھا کہ یہ حالات انسانوں کے درمیان رحم و محبت کے حقیقی جذبات کو ختم کر دیں۔ حالانکہ اس رحم و محبت کا پاس ضروری تھا۔ ایک جان کی اولاد ہونے کے ناطے باہم انسانی محبت ضروری تھی اور اس کے ساتھ ساتھ اپنے رب اور خالق کے ساتھ رابطہ اور اس کے حقوق کا لحاظ اور اس کا ڈر اور تقویٰ دل میں رکھنا ضروری تھا۔

اگر صرف اسی حقیقت کو مستحکم کر دیا جائے تو تمام فرقہ وارانہ کشیدگیاں ختم ہو جائیں۔ اس وقت پوری انسانیت فرقہ وارانہ کشیدگی کی تباہ کاریوں کا مزہ اچھی طرح چکھ چکی ہے۔ اس کرۂ ارض پر فرقہ وارانہ کشیدگیاں قائم ہیں اور رنگ و نسل کی اساس پر تزمیتیں قائم ہیں اور لوگوں نے اپنا انسانی شجرۂ نسب پوری طرح بھلا دیا ہے۔ اور پھر اپنے رب کے ساتھ تعلق ربوبیت کو بھی پس پشت ڈال دیا ہے۔

اگر اس حقیقت کو انسان قبول کر لیں اور اچھی طرح اپنے نظریات میں مستحکم کر دیں تو ہندوستان میں جو طبقاتی غلامی کا نظام رائج ہے وہ اس دنیا سے فی الفور مٹ جائے۔ اسی طرح مشرق کے سوشلسٹ ممالک کے اندر طبقاتی جنگوں میں' جو خون پانی کی طرح بہہ رہا ہے وہ ختم ہو جائے اور قومیت کا وہ فتنہ بھی ختم ہو جائے جو جاہلیت جدیدہ کے فکری تصورات اور فلسفوں کا قاعدۂ اساسی ہے۔ اور یہ دنیا سے طبقاتی کشمکش کے خاتمے کا نقطۂ آغاز بن جائے جس میں ہمیشہ کوشش یہ ہوتی ہے کہ کسی ایک طبقے کو دوسرے طبقات پر قیادت و سیادت کا مقام حاصل ہو جائے۔ اور جس میں اس حقیقت کو فراموش کر دیا جاتا ہے کہ انسان تو سب کے سب دراصل ایک ہی جان سے پیدا ہوئے ہیں اور ان کا پیدا کرنیوالا رب ذوالجلال بھی ایک ہی ہے۔

۳:۔ تیسری حقیقت جس کی طرف یہاں اشارہ کیا گیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ انسانیت نفس واحد سے تخلیق ہوئی ہے۔ اور اس نفس سے پھر اس کیلئے جوڑا پیدا کیا گیا' اگر انسانیت اس پر غور کرے اور اس کی حقیقت کو پالے تو وہ ہمت کر کے ان غلطیوں اور اذیت ناک تصورات کی تلافی کر لے گی' جن میں وہ صنف نازک کے بارے میں مختلف اوقات میں مبتلا رہی ہے۔ انسانیت نے عورت کے ساتھ عجیب و غریب تصورات وابستہ کیے۔ اسے گندگی اور گناہ کا منبع سمجھا گیا۔ اسے ہر مصیبت اور ہر شر کا سبب گردانا گیا۔ حالانکہ وہ اپنی فطرت اور اپنے مزاج کے اعتبار سے نفس اول یعنی آدم کا جزء تھی۔ اور اسے اللہ تعالیٰ نے پیدا ہی اس لئے کیا تھا کہ وہ اس کی ہمنشین وہمدم ہو اور اس کے ذریعہ سے انسان کی نسل کشی کی جائے۔ اسی لئے مرد و عورت کی فطرت میں فرق نہیں ہے بلکہ ان کی استعداد اور ان کے صنفی فرائض میں فرق ہے۔

اس معاملہ میں' انسانیت ایک عرصہ تک بادیہ پیمائی کرتی رہی اور گمراہ ہوتی رہی۔ اس نے عورت کو تمام انسانی حقوق سے محروم رکھا اور اس کی خاصیت انسانی سے بھی انکار کیا۔ ایک عرصہ تک بیچاری پر مظالم ہوتے رہے۔ اور یہ محض ان غلط خیالات و تصورات کی وجہ سے جن کی کوئی حقیقت نہ تھی لیکن جب ان غلط خیالات کی تصحیح کی گئی تو ترازو کے دوسرے پلڑے کو بہت ہی بھاری کر دیا گیا۔ عورت کو شتر بے مہار بنا دیا گیا۔ وہ اپنی اس حیثیت کو بھول گئی کہ بے شک وہ انسان ہے لیکن اسے دوسرے انسانوں کیلئے پیدا کیا گیا ہے۔ وہ ایک جان ہے لیکن اسے دوسری جان کیلئے پیدا کیا گیا ہے۔ وہ انسانیت کا ایک حصہ ہے لیکن وہ دوسرے حصے کیلئے تکمیلی ہے۔ مرد اور عورت دونوں علیحدہ مکمل شخصیات نہیں ہیں بلکہ وہ جوڑا ہیں اور ایک دوسرے کیلئے تکمیلی حیثیت کے حامل ہیں۔

اس عظیم اور طویل گمراہی کے بعد اسلامی نظام زندگی نے انسانیت کو واپس لاکر اصل شاہراہ پر ڈالا اور اسے صحیح تصورات دیئے۔

۴:۔ اس آیت میں اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ پایا جاتا ہے کہ زندگی کا ابتدائی سیل (Cell) خاندان ہے۔ دنیا میں منشائے الٰہی یہ ہے کہ یہ انسانی پودا ایک خاندان میں پھلے پھولے' اس لئے ابتداء ایک جان پیدا کی گئی اس کے بعد اس جان ہی سے اس کیلئے جوڑا پیدا کیا گیا۔ اس طرح یہ ابتدائی خاندان دو افراد پر مشتمل تھا۔ اور اس کے بعد "ان دو سے بہت سے مرد اور عورتیں پیدا کی گئیں۔" اگر اللہ کی مرضی ہوتی تو وہ پہلے سے بہت سے مرد اور بہت سی عورتیں پیدا فرما دیتا اور اس کے بعد انہیں بہت سے جوڑوں کی شکل دیدی جاتی۔ اور ابتداء ہی میں بہت سے خاندان وجود میں آجاتے۔ اور ابتداء ہی سے ان کے درمیان رحم مادر کا رشتہ نہ ہوتا اور ان کے درمیان صرف یہ رابطہ ہوتا کہ انہیں ایک ہی صانع کی مخلوق کی پہلی کھیپ ہونے کا مشترکہ

تعلق حاصل ہے اور بس۔ اور صرف یہی ان کے درمیان پہلا تعلق اور ربط ہوتا' لیکن اللہ تعالیٰ علیم و خبیر تھا' اس کے پیش نظر ایک حکمت تھی' اللہ تعالیٰ انسانوں کے درمیان پختہ رابطے قائم کرنا چاہتے تھے۔ پہلا رابطہ یہ تھا کہ ان کا رب ایک ہی تھا۔ اور یہی تمام انسانی رابطوں کا سرچشمہ تھا اور ہے۔ اس کے بعد باہم صلہ رحمی کا رشتہ آتا ہے' جس کی وجہ سے ایک خاندان وجود میں آتا ہے۔ جو ایک مرد اور ایک عورت سے شروع ہوتا ہے۔ یہ دونوں ایک ہی نفس سے پیدا ہوئے' ان کی طبیعت بھی ایک ہے۔ فطرت بھی ایک ہے' ابتدائی خاندان بھی ایک۔ جس سے پھر بہت سے مرد اور عورت پھیلے۔ ان تمام افراد کے درمیان پہلا رابطہ وحدانیت ربوبیت' اس کے بعد ان کے درمیان وحدت خاندان کا رابطہ ہے۔ اور خاندان وہ ابتدائی سیل ہے' جس کے اوپر انسانی معاشرے کی بنیاد رکھی جاتی ہے۔ لیکن عقیدہ اور نظریہ اس خاندانی رابطے سے بھی پہلے نمبر پر آتا ہے۔

یہی حکمت ہے کہ اسلامی نظام زندگی میں خاندانی نظام کو بڑی اہمیت دی جاتی ہے۔ اور خاندان کی شیرازہ بندی اور پختگی کیلئے تمام تدابیر اختیار کی جاتی ہیں۔ اس کی اساس کو مستحکم کیا جاتا ہے اور اسے ان تمام عوامل اور موثرات سے بچایا جاتا ہے' جو کسی بھی طرح اس کی کمزوری کا باعث ہوں۔ خاندانی نظام کی تباہی میں سب سے پہلا موثر عامل یہ ہوتا ہے کہ انسان فطری روش کے خلاف طریق کار اختیار کرے۔ اور مرد کی صلاحیتوں اور عورت کی صلاحیتوں کا اچھی طرح ادراک نہ کرے نیز مرد اور عورت دونوں کی صلاحیتوں کے اندر توازن پیدا نہ کیا جائے اور ان قوتوں کو مرد اور عورت پر مشتمل ایک خاندان کی تشکیل اور تعمیر میں استعمال نہ کیا جائے۔

اس سورت میں اور اس کے علاوہ دوسری سورتوں میں بھی' اسلامی نظام میں خاندان کی تشکیل اور تقویت کے سلسلے میں بے شمار تدابیر اختیار کی گئی ہیں۔ لیکن خاندانی نظام کو اچھی طرح مضبوط بنیادوں پر اس وقت تک استوار نہ کیا جاسکتا تھا' جب تک عورت ذات کے ساتھ دور جاہلیت کا ظالمانہ سلوک روا رکھا جاتا۔ چاہے یہ جاہلیت قدیمہ ہو یا جدیدہ ہو' اور جب تک عورت کے بارے میں ان توہین آمیز افکار و خیالات کا قلع قمع نہ کر دیا جاتا جو دور جاہلیت میں اس سے وابستہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے سب سے پہلے عورت پر ہونے والے مظالم کو ختم کیا اور اس کے بعد قرآن نے اسے انسانی معاشرہ میں ایک معزز مقام دیکر اس کے بارے میں فرسودہ تصورات کو دفع کیا۔ا۔

۵:۔ سب سے آخر میں یہ بات قابل لحاظ ہے کہ ایک ہی جان اور ایک ہی خاندان میں پیدا کرنے کے بعد تمام افراد بنی نوع انسانی کے اندر اشکال اور صلاحیتوں کا یہ عظیم فرق' جس میں کوئی دو فرد' تاریخ انسانی کے پورے عرصے میں' کبھی بھی باہم کلی طور پر مماثل نہیں ہوئے' جبکہ گزشتہ تاریخی ادوار میں آنے اور جانے والے افراد کی تعداد کا بھی علم نہیں ہے' یہ شکلوں کا اختلاف' خدوخال کا تباین' طبیعت اور مزاج کا اختلاف شعور اور اخلاق کا اختلاف استعداد اور صلاحیتوں کا اختلاف' رجحانات اور دلچسپیوں کا اختلاف غرض یہ ہمہ گیر اور ہمہ پہلو اختلاف اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ بے مثال خالق اور موجد ہے۔ وہ حکیم و علیم ہے اور اس کے اس پیدا کردہ انسانی باغ میں رنگا رنگ پھولوں میں قلب و نظر کا غیر مختتم سامان ہے۔ ہر بچہ جو پیدا ہوتا ہے وہ ایک نئی شخصیت لئے ہوئے ہے۔ اور اپنی مثال آپ ہے' اور یہ کام صرف قادر مطلق ہی کا ہے' اور یہ کاریگری ذات باری تعالیٰ کے سوا کسی اور کے حیطۂ قدرت میں نہیں ہے۔ وہ ذات ہے جس کا ارادہ بے قید ہے۔ اور وہ جو چاہتا ہے ہوتا ہے۔ وہ کن فیکون ہے اور عظیم ہے اور لاتعداد انسانی شخصیت کے اندر یہ کلی امتیاز و تباین صرف وہی قائم کر سکتا ہے۔ جبکہ تمام انسان صرف ایک ہی باپ آدم سے پھیلے ہیں۔

اس نہج پر انسانی شخصیات و افراد پر غور و فکر اس بات کیلئے ضامن ہے کہ تقویٰ اور ایمان کے اساسی توشہ پر قلب مومن کو انس و

ا۔ دیکھئے میری کتاب "اسلام اور عالم امن" کا باب "گھر کی سلامتی"۔

محبت کا مزید سامان عطا کرے۔ یہ غور و فکر نفع کے اوپر مزید نفع ہے اور خیالات کی بلندی پر مزید سربلندی ہے۔

خیالات و افکار کے اس جم غفیر کے بعد اس آیت افتتاح کے خاتمے پر لوگوں کو خدا خوفی کی دعوت دی جاتی ہے۔ اس خدا کی خشیت کی طرف لوگوں کو بلایا جاتا ہے جس کے نام پر وہ ایک دوسرے سے سوال کرتے ہیں۔ اور اس کے نام کا واسطہ دیتے ہیں' نیز لوگوں کو اس طرف متوجہ کیا جاتا ہے کہ وہ باہم تعلقات میں صلہ رحمی کا خیال رکھیں' اس لئے کہ تم سب لوگوں کی اصل تو بہرحال ایک ہی ہے۔

"اس خدا سے ڈرو جس کا واسطہ دے کر تم ایک دوسرے سے اپنا حق مانگتے ہو۔"

اس خدا سے ڈرو' جس کے نام پر تم ایک دوسرے کے ساتھ معاہدے کرتے ہو' ایک دوسرے کے ساتھ عقد کرتے ہو اور تم میں سے بعض لوگ بعض دوسروں سے اپنے حقوق اور وفاداری کا مطالبہ اس کے نام کے ساتھ کرتے ہیں' تم اس کے نام کے ساتھ قسمیں کھاتے ہو' غرض آپس کے روابط' تعلقات' رشتہ داریوں اور باہمی معاملات میں خدا خوفی کا طرز عمل اختیار کرو۔

قرآن کریم میں تقویٰ اور خدا خوفی کا مفہوم واضح ہے' اس لئے کہ قرآن کریم میں بار بار اس کا ذکر ہوا ہے' رہی یہ بات کہ رشتہ و قرابت کے تعلقات سے ڈرو' یہ ایک عجیب قسم کا انداز کلام ہے جس کا شعوری سایہ نفس پر سایہ فگن ہوتا ہے۔ اور اس شعوری پر تو کا نفس انسانی خود بخود مفہوم نکال لیتا ہے۔ یعنی رشتہ قرابت سے ڈرو' ان تعلقات کے بارے میں اپنے احساس کو تیز کرو' ان کے حقوق کا احساس کرو' ان حقوق کی پامالی اور ان میں ظلم سے بچو' ان کو چھونے اور خراش لگانے سے بچو' رشتہ میں اذیت نہ دو' رشتہ داروں کے جذبات مجروح نہ کرو اور ان کے حقوق تلف نہ کرو' غرض رشتہ کے معاملے میں احساس کو تیز رکھو' احترام کرو اور رشتہ کو محبت دو اور محبت کے سایہ میں رہو۔

انتقام اللہ کی نگرانی میں ہوتا ہے۔

"یقین جانو کہ اللہ تم پر نگرانی کر رہا ہے۔"

اور اس کی نگرانی کس قدر ہولناک ہوتی ہے' جب ذات باری خود نگران ہو! وہ رب ہے' خالق ہے اور اپنی تمام مخلوق کی بابت اچھی طرح باخبر ہے' وہ ایسا علیم و خبیر ہے جس پر کوئی بات مخفی نہیں رہتی۔ نہ ظاہری افعال اس سے پوشیدہ ہیں اور نہ خفیہ افکار اس سے پوشیدہ ہیں۔

○.....☆☆☆.....○

اس پر شوکت اور موثر افتتاحی اور اس کے اندر بیان ہونے والے سادہ فطری حقائق اور پوری انسانیت کیلئے عظیم اساسی اصول کے بیان کے بعد' ایسی بنیادی باتوں کا تذکرہ شروع کیا جاتا ہے جن پر کسی معاشرے کا اجتماعی نظام اور اجتماعی زندگی استوار ہوتی ہے۔ مثلاً خاندان اور جماعت کا باہم معاشی تعاون و تکافل' معاشرہ میں ضعیفوں کے حقوق کا تحفظ' معاشرہ میں عورت کے حقوق کا تحفظ اور اس کیلئے مقام شرافت کا تعین' معاشرہ کی عمومی دولت کا تحفظ' میراث اور ترکہ کی ایسی تقسیم جو عدل و انصاف کی کفیل ہو اور جس میں تمام افراد معاشرے کی بھلائی ہو۔

سب سے پہلے ان لوگوں کو حکم دیا جاتا ہے جو یتیموں کے اموال کے نگران مقرر ہوئے ہیں کہ جب وہ یتیم سن رشد کو پہنچ جائیں تو ان کی پوری دولت انہیں لوٹا دی جائے' اور یہ کہ یہ اولیاء ان یتیم لڑکیوں کے ساتھ محض اس لئے نکاح نہ کریں کہ ان کی دولت ان کے قبضے میں آجائے۔ ہاں یتیموں میں سے ایسے لوگ جن کے بارے میں یہ خوف ہو کہ اگر ان کی دولت ان کے حوالے کر دی گئی تو وہ اسے تلف کر دیں گے تو اس بات کی اجازت ہے کہ ان کی دولت انہیں نہ دی جائے' اس لئے کہ ہر شخص کی دولت دراصل معاشرے کی اجتماعی

دولت ہوتی ہے۔ اس میں معاشرے کی اجتماعی مصلحت ہوتی ہے۔ اس لئے یہ مال ایسے شخص کے حوالے نہیں کیا جاسکتا جو اسے برباد کر دے۔ اگرچہ وہ مالک ہو' اور یہ کہ عورتوں کے ساتھ حسن معاشرت عدل و انصاف کے اصولوں کے مطابق کی جائے۔

وَاٰتُوا الْيَتٰمٰٓى اَمْوَالَهُمْ وَلَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِيْثَ بِالطَّيِّبِ ۪ وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَهُمْ اِلٰٓى اَمْوَالِكُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ حُوْبًا كَبِيْرًا ﴿۲﴾

"یتیموں کے مال ان کو واپس دو' اچھے مال کو برے مال سے نہ بدل لو' اور ان کے مال اپنے مال کے ساتھ نہ ملا کر کھاؤ' یہ بہت بڑا گناہ ہے۔"

اور اگر تم یتیموں کے ساتھ بے انصافی کرنے سے ڈرتے ہو تو جو عورتیں تم کو پسند آئیں ان میں سے دو دو' تین تین' چار چار سے نکاح کر لو لیکن اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ ان کے ساتھ عدل نہ کر سکو گے تو پھر ایک ہی بیوی کرو یا ان عورتوں کو زوجیت میں لاؤ جو تمہارے قبضہ میں آئی ہیں۔ بے انصافی سے بچنے کیلئے یہ زیادہ قرین ثواب ہے۔

اور عورتوں کے مہر خوشدلی کے ساتھ ادا کرو' البتہ اگر وہ خود اپنی خوشی سے مہر کا کوئی حصہ تمہیں معاف کر دیں تو اسے تم مزے سے کھا سکتے ہو۔

اور اپنے وہ مال جنہیں اللہ نے تمہارے لئے قیام زندگی کا ذریعہ بنایا ہے' نادان لوگوں کے حوالے نہ کرو' البتہ انہیں کھانے اور پہننے کیلئے دو اور انہیں نیک ہدایات کرو۔

اور یتیموں کی آزمائش کرتے رہو' یہاں تک کہ وہ نکاح کے قابل عمر کو پہنچ جائیں پھر اگر تم ان کے اندر اہلیت پاؤ تو ان کے مال ان کے حوالے کر دو' ایسا کبھی نہ کرنا کہ حد انصاف سے تجاوز کر کے اس خوف سے ان کے مال ہی جلدی جلدی کھا جاؤ کہ وہ بڑے ہو کر اپنے حق کا مطالبہ کریں گے۔ یتیم کا جو سرپرست مالدار ہو وہ پرہیز گاری سے کام لے اور جو غریب ہو وہ معروف طریقہ سے کھائے۔ پھر جب ان کے مال ان کے حوالے کرنے لگو تو لوگوں کو اس پر گواہ بناؤ' اور حساب لینے کے لئے اللہ کافی ہے۔"

جیسا کہ ہم نے اوپر ذکر کیا درج بالا موکد ہدایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ عربوں کے جاہلی معاشرے میں عورتوں اور بچوں اور ضعفاء کو بری طرح پامال کیا جاتا تھا۔ مدینہ طیبہ کے اسلامی معاشرے میں دور جاہلیت کے یہ آثار ابھی تک باقی تھے' اس لئے کہ مدینہ کا اسلامی معاشرہ اصلا عرب کے جاہلی معاشرے سے کٹ کر وجود میں آیا تھا۔ اور قرآن مجید اس کی تہذیب و تربیت کر رہا تھا' اور اسلامی جماعت کو نئی اقدار اور نئے تصورات سے مزین کیا جارہا تھا' مسلمانوں کو نیا شعور دیا جارہا تھا' ان کے اندر نئے خدوخال پیدا کئے جارہے تھے اور جدید رسم و رواج پیدا کئے جارہے تھے۔

وَاٰتُوا الْيَتٰمٰٓى اَمْوَالَهُمْ وَلَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِيْثَ بِالطَّيِّبِ ۪ وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَهُمْ اِلٰٓى اَمْوَالِكُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ حُوْبًا كَبِيْرًا

"یتیموں کے مال ان کو واپس دو' اچھے مال کو برے مال سے نہ بدل لو' اور ان کے مال اپنے مال کے ساتھ نہ ملا کر کھاؤ' یہ بہت بڑا گناہ ہے۔"

یتیموں کو وہ مال دیدو جو تمہارے تصرف میں ہیں' اور یہ نہ کرو کہ یتیموں کو مال دیتے وقت ردی اموال ان کو دیدو اور قیمتی اپنے پاس رکھ لو۔ مثلاً یہ کہ ان کی اچھی اراضی خود لے لو اور اپنی کم درجے کی اراضی انہیں دیدو' اسی طرح اچھے مویشی خود لے لو اور انہیں بے کار مویشی دیدو' یا تقسیم کرکے وہ انہیں گھٹیا حصہ دیدو' یا نقد مال میں انہیں کھوٹے سکے دیدو کیونکہ نقد میں قیمتی اور کھوٹے دونوں سکے ہوتے ہیں۔ نیز ان کی دولت کو اپنی دولت کے اندر ملا کر بھی نہ کھاؤ۔ سب کا سب یا اس کا کوئی حصہ۔ اللہ کے نزدیک یہ گناہ کبیرہ ہے۔ اللہ تمہیں اس گناہ کبیرہ سے متنبہ کرتا ہے۔

یہ سب واقعات اس وقت سوسائٹی میں بالعموم ہوا کرتے تھے جب اسلام آیا اور لوگوں کو ان ہدایات سے خطاب کیا گیا۔ اس خطاب ہی سے اس بات کا اظہار ہوتا ہے کہ مخاطبین کے اندر ایسے لوگ موجود تھے' جن سے اس قسم کی غلطیاں سرزد ہوا کرتی تھیں۔ اور یہ امور جاہلیت کے آثار باقیہ میں سے تھے۔ ہر جاہلی نظام میں ایسے ہی امور بالعموم پائے جاتے ہیں۔ آج ہم گاؤں اور شہروں میں جاہلیت جدیدہ کے نظاموں میں روز ان امور کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ آج بھی مختلف طریقوں سے یتیموں کے مال کھائے جاتے ہیں' اور اس کیلئے مختلف حیلے اور بہانے تراشے جاتے ہیں۔ آج کل مفصل قانونی تدابیر اور افسران حکومت کی جانب سے یتیموں کے اموال کی کڑی نگرانی کے باوجود اولیاء زیر کفالت لوگوں کے مال و جائیداد میں خرد برد کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس معاملے میں جو مشکلات ہیں' انہیں قانون سازی اور حکومتی نگرانی کے ذریعہ سے حل نہیں کیا جاسکتا' اس مسئلہ میں یہ چیزیں کبھی بھی کامیاب نہیں ہو سکتیں اس لیے اس کا کوئی حل ہے تو وہ صرف تقویٰ اور خدا خوفی میں ہے۔ یہ تقویٰ ہی ہے جو دل اور ضمیر کے اندر ایک چوکیدار بٹھا دیتا ہے۔ اور اس کے بعد کبھی قانون سازی اور عمال حکومت کی نگرانی مؤثر ہو سکتی ہے۔ یہ تقویٰ ہی تھا' جس کی وجہ سے اس آیت کے نزول کے بعد حیران کن واقعات وجود میں آئے۔ یتیموں کے اولیاء نے اس قدر احتیاط شروع کردی کہ یتیموں کے اموال کو اپنے مالوں سے علیحدہ کردیا گیا' ان کا کھانا پینا جدا کردیا گیا' تاکہ صحابہ کرام اس گناہ کبیرہ میں مبتلا ہونے سے پوری طرح بچ نکلیں۔ جس کی بابت اللہ تعالیٰ نے ڈراتے ہوئے فرمایا۔ "یہ بہت بڑا گناہ ہے۔"

اس کرۂ ارض پر صرف قانون سازی اور اجتماعی تنظیم کے ذریعہ کوئی اصلاحی اسکیم کامیاب نہیں ہوسکتی۔ قانون سازی اور تنظیم سے پہلے دلوں کے اندر خدا خوفی اور تقویٰ کا چوکیدار بٹھانا ضروری ہے۔ جس کا دل پر قبضہ ہو اور ضمیر خود نظم قائم کرنے اور قانون پر عمل کرنے پر آمادہ ہو' اور یہ تقویٰ اس وقت تک کسی نظم اور قانون کے بارے میں پرجوش نہیں ہو سکتا۔ جب تک یہ قانون ایسے منبع سے صادر نہ ہو جو تمام انسانی خفیہ رازوں سے واقف نہ ہو' وہ منبع ضمیر پر بھی حکمران نہ ہو' صرف ایسے حالات ہی میں ایک فرد کے دل کے اندر شدید احساس پیدا ہوتا ہے کہ وہ قانون کا احترام کرے۔ وہ اللہ جل شانہ سے خیانت نہ کرے وہ اس کے حکم اور اس کے ارادے کے ساتھ تصادم کا رویہ اختیار نہ کرے۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ اس فرد کی نیت اور اس کے اعمال دونوں سے اچھی طرح باخبر ہوتا ہے۔ اس احساس کے دباؤ میں ارتکاب گناہ کے معاملے میں اس کے قدم متزلزل ہو جاتے ہیں۔ وہ ڈر کی وجہ سے کانپنے لگتا ہے۔ اور اس کے جذبہ خدا خوفی میں جوش آجاتا ہے۔

اللہ اپنے بندوں کو خوف جانتا ہے اور ان کی فطرت سے اچھی طرح واقف ہے۔ وہ خود انسان کے نفس اور اس کے اعصاب کا خالق ہے۔ اور اسی نے ان کی تخلیق کی مناسبت سے ان کے لئے اپنے قانون کو قانون قرار دیا ہے۔ اپنی شریعت قرار دیا ہے۔ اس کیلئے اپنے نظام زندگی کو نظام قرار دیا ہے۔ اور اس کے نفاذ کیلئے خود اپنا منہاج اور طریق کار دیا ہے۔ تاکہ لوگوں کے دلوں میں ان چیزوں کا وزن ہو۔ اور وہ اس قانون اور منہاج کی خلاف ورزی کی جرات نہ کریں۔ اور اللہ سے ڈریں۔ اللہ تعالیٰ کو اچھی طرح علم تھا کہ دنیا میں کوئی بھی قانونی

نظام اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتا جب تک اس کی نسبت ذات باری کی طرف نہ ہو' اس لئے کہ لوگوں کے دلوں میں ذات باری کا خوف اور اس کی رحمت کی امید ہوتی ہے۔ نیز انہیں پورا یقین ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ دل کی خفیہ باتوں سے واقف ہیں اور وہ دلی بھیدوں کے جاننے والے ہیں۔ نیز انسان کا بنایا ہوا قانون اس وقت تک چلتا ہے اور اس پر عمل ہوتا ہے' جب تک پکڑ دھکڑ کا خوف قائم رہتا ہے۔ اور سخت ترین ظاہری نگرانی اپنا کام کر رہی ہوتی ہے۔ جس کا دخل اور اثر لوگوں کے دلوں پر نہیں ہوتا لیکن جونہی یہ ظاہری نگرانی کمزور ہوتی ہے' لوگ اس قانون کی خلاف ورزی شروع کر دیتے ہیں یا جب بھی انہیں حیلے اور بہانے کا موقعہ ملتا ہے' باوجود اس کے کہ انہیں پتہ ہو سکتا ہے کہ اگر وہ پکڑے گئے اور ان کی سخت سرزنش ہوگی اور جانی اور مالی نقصان ہو گا۔

وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْیَتٰمٰی فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰی وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ ۚ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَكَتْ اَیْمَانُكُمْ ؕ ذٰلِكَ اَدْنٰۤی اَلَّا تَعُوْلُوْا ؕ

"اگر تم یتیموں کے ساتھ بے انصافی کرنے سے ڈرتے ہو تو جو عورتیں تم کو پسند آئیں' دو دو' تین تین' چار چار سے نکاح کر لو' لیکن اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ ان کے ساتھ عدل نہ کر سکو گے تو پھر ایک ہی بیوی کر و یا ان عورتوں کو زوجیت میں لاؤ جو تمہارے قبضہ میں آئی ہیں' بے انصافی سے بچنے کیلئے یہ زیادہ قرین صواب ہے۔"

حضرت عروہ بن زبیرؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے حضرت عائشہؓ سے دریافت فرمایا کہ آیت "اگر تم یتیموں کے ساتھ بے انصافی کرنے سے ڈرتے ہو۔" کا مفہوم کیا ہے؟ تو انہوں نے فرمایا بھانجے! یہ یتیم بچی وہ تھی جو اپنے ولی کی تحویل میں ہوتی تھی۔ یہ ولی کے ساتھ مال میں شریک ہوتی تھی' اسے اس کے مال اور اس کی خوبصورتی میں دلچسپی ہوتی تھی' اس طرح اس کا ولی یہ چاہتا تھا کہ اس کے ساتھ نکاح کر لے بغیر اس کے کہ اسے مہر ادا کرے' اور اسے وہ حقوق دے جو اسے دوسرے دلچسپی رکھنے والے دینے کیلئے تیار ہوتے تھے۔ چنانچہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ان اولیاء کو یہ حکم دیا کہ ان کے زیر کفالت یتیموں سے صرف اس صورت ہی میں نکاح کر سکتے ہیں جب ان کے ساتھ عدل کر سکیں۔ ان کو ان کے معیار کے مطابق مہر ادا کر سکیں۔ اگر وہ نہیں کر سکتے تو وہ دوسری عورتوں سے نکاح کر لیں۔" عروہ فرماتے ہیں' حضرت عائشہؓ نے فرمایا "اس آیت کے نزول کے بعد لوگوں نے حضورؐ سے فتویٰ دریافت کیا تو اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔":

"لوگ عورتوں کے بارے میں تم سے فتویٰ پوچھتے ہیں' کہو اللہ تمہیں ان کے معاملے میں فتویٰ دیتا ہے' اور ساتھ ہی وہ احکام بھی یاد دلاتا ہے جو پہلے سے تم کو اس کتاب میں سنائے جا رہے ہیں۔ یعنی وہ احکام جو ان یتیم لڑکیوں کے متعلق ہیں' جن کے حق تم ادا نہیں کرتے اور جن کے نکاح کرنے سے تم باز رہتے ہو۔" (۴: ۱۲۷) حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے یہ جو کہا ہے۔ "اور جن کے نکاح کرنے سے تم باز رہتے ہو۔" یہ اس صورت میں ہوتا ہے کہ اس کے پاس نہ پیسے ہوں اور نہ خوبصورتی ہو' اس لئے انہیں صاحب مال و جمال ہستیوں سے بھی نکاح کرنے سے منع کر دیا گیا' الا یہ کہ اس کے ساتھ عدل و انصاف کیا جائے۔ اس لئے کہ مال و جمال نہ ہونے کی صورت میں تو وہ ایسی یتیموں سے نکاح نہ کرتے تھے۔" (بخاری)

حضرت عائشہؓ کی مذکورہ بالا حدیث سے ایام جاہلیت کی مروجہ رسومات میں سے بعض رسموں کی یہاں تصویر کشی کی گئی ہے۔ اور یہ

رسوم جاہلیت کے زمانہ سے اسلامی معاشرے میں بھی ابھی تک موجود تھیں۔ اس لئے قرآن کریم کی یہ آیات نازل ہوئیں اور ان کی ممانعت کرکے ان کی جڑ کاٹ دی گئی۔ غرض یہ رفیع الشان ہدایات دیکر معاملے کو پھر انسان کے ضمیر اور اس کے دلی تقویٰ کے حوالے کر دیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا .... (اگر تم یتیم عورتوں کے ساتھ بے انصافی سے ڈرتے ہو۔)

اس معاملے کا تعلق محض انسان کے قلب و ضمیر کے ساتھ ہے اور اس کے شعور خدا خوفی سے ہے۔ اگر ولی کو یہ خطرہ ہو کہ وہ عدل نہ کر سکے گا تو اسے چاہئے کہ وہ اس قسم کے نکاح سے اجتناب کرے۔ لیکن آیت کی عبارت عام ہے 'حکم اور ہدایت یہی ہے کہ عدل کے ہر مقام پر عدل کا برتاؤ کیا جائے۔ چاہے اس کا تعلق مہر کے معاملے سے ہو یا اس کے علاوہ زندگی کے دوسرے نشیب و فراز سے ہو' مثلاً یہ کہ وہ صرف مال کیلئے یہ نکاح کر رہا ہو اور عورت کی ذات سے اسے دلچسپی نہ ہو' یا اسے اس کے ساتھ حسن معاشرے کے سلسلے میں کوئی رغبت نہ ہو' یا یہ کہ مرد اور عورت کی عمر میں بہت زیادہ فرق ہو اور نباہ ممکن نہ ہو' اور نہ نکاح کے معاملے میں مرد سنجیدہ ہو اور بعض اوقات صورت حال یہ ہوتی ہے کہ لڑکی شرم و حیاء کی وجہ سے کچھ کہہ نہیں سکتی یا اسے یہ خطرہ ہوتا ہے کہ اگر اس کا نکاح باہر ہوا تو اس کا مال جاتا رہے گا وغیرہ وغیرہ' جن حالات میں عدل ممکن نہیں ہوتا' قرآن کریم کا یہ طریق کار یہ ہے وہ ضمیر کے اندر چوکیدار بٹھاتا ہے۔ اور تقویٰ کی نگرانی قائم کرتا ہے۔ اس کی پہلی آیت کا خاتمہ ان الفاظ پر ہوا تھا اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا۝............ (اللہ تم پر نگرانی کر رہا ہے۔)

اگر اولیاء ان یتیم عورتوں کے ساتھ انصاف کرنے کی قدرت اپنے اندر نہیں پاتے' تو ان کے علاوہ دوسری عورتیں بہت ہیں' اس لئے بدگمانی اور شبہات سے اپنے آپ کو بچانے کیلئے' موزوں یہی ہے کہ وہ دوسری عورتوں سے نکاح کرلیں۔

وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِي الْيَتٰمٰى فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ۚ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۭ ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَلَّا تَعُوْلُوْا۝

"اگر تم یتیموں کے ساتھ بے انصافی کرنے سے ڈرتے ہو تو جو عورتیں تم کو پسند آئیں' ان سے دو دو' تین تین' چار چار سے نکاح کرلو' لیکن اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ ان کے ساتھ عدل نہ کر سکو گے تو پھر ایک ہی بیوی کرو یا ان عورتوں کو زوجیت میں لاؤ جو تمہارے قبضہ میں آئی ہیں' بے انصافی سے بچنے کیلئے یہ زیادہ قرین صواب ہے۔"

تعدد ازواج کی یہ رخصت مشروط ہے۔ یہ کہ اگر تمہیں بے انصافی کا خوف ہو تو نہ کرو صرف ایک کرو' یا اپنی مملوکہ عورتوں میں سے کسی کے ساتھ نکاح کرلو۔

مناسب یہ ہے کہ ان تحفظات کے ساتھ تعدد ازواج کی رخصت کی حکمت اور مصلحت پر یہاں کچھ کہہ دیا جائے۔ خصوصاً ہمارے اس دور میں' جس میں لوگ اپنے آپ کو اپنے رب کے مقابلے میں زیادہ عالم سمجھتے ہیں' وہ رب جس نے انہیں پیدا کیا ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ وہ انسانی زندگی' انسانی فطرت اور انسانی مصلحتوں کی بابت خالق تعالیٰ کے مقابلے میں زیادہ بصیرت کے مالک ہیں۔ اور وہ ان معاملات میں محض اپنی ذاتی آراء اور خواہشات نفسانیہ کے تحت کلام کرتے ہیں اور جہالت اور تاریکی میں ٹامک ٹوئیاں مارتے رہتے ہیں۔ گویا آج کے جدید حالات اور ضروریات کو خود انہوں نے پیدا کیا ہے۔ وہ انہیں اچھی طرح سمجھتے ہیں اور ان حالات کا مقابلہ خود ہی کر سکتے ہیں اور گویا یہ حالات اللہ میاں کے پیش نظر نہ تھے۔ نہ اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں اس وقت کوئی فیصلہ کیا ہے جس وقت وہ انسانوں کیلئے قانون سازی

کر رہا تھا۔

اس معاملے میں ایسے حضرات کا دعویٰ اور ان کے فیصلے جہالت اور کور چشمی پر مبنی ہیں' جبکہ ایک پہلو سے یہ ان کی جانب سے نہایت ہی کبر و غرور اور بارگاہ الٰہی میں کھلی گستاخی ہے۔ اور اپنے معنوی اعتبار سے یہ گمراہی اور بے راہ روی ہے اور ایک قسم کا کفر ہے۔ لیکن اس کے باوجود لوگ ایسی باتیں کئے چلے جاتے ہیں اور کوئی نہیں ہے جو ان جاہلوں 'کورچشموں' متکبرین' بے راہ رو کفار کو چیلنج کرے۔ حالانکہ وہ اللہ اور اس کی شریعت کے مقابلے میں ایسی جسارت کر رہے ہیں جو ناقابل برداشت ہے۔ وہ اللہ اور اس کی جلالت شان پر ہاتھ ڈال رہے ہیں۔ اور اللہ کی ذات اور اس کے تجویز کردہ نظام حیات کے خلاف یہ قبیح حرکت کر رہے ہیں۔ اور بڑے امن و سکون اور کامیابی اور عافیت کے ساتھ کام کر رہے ہیں اور ان لوگوں کو ان حلقوں سے برملا امداد مل رہی ہے جن کی دلچسپی ہے کہ مسلمانوں اور ان کے دین کے خلاف یہ کام ہوتا رہے۔

یہ مسئلہ یعنی مسئلہ تعدد ازواج جسے اسلام نے ان تحفظات اور شرائط کے ساتھ جائز رکھا ہے' مناسب ہے کہ اسے بڑی سادگی' وضاحت اور فیصلہ کن انداز میں لیا جائے۔ اور ان حالات اور واقعات کو پیش نظر رکھا جائے جو کسی معاشرے میں عملاً موجود ہوتے ہیں اور اس وقت بھی موجود تھے۔

امام بخاری ؒ نے اپنی مسند کے ساتھ یہ روایت کی ہے کہ غیلان ابن سلمہ ثقفی اسلام لائے۔ اس وقت اس کی دس بیویاں تھیں۔ اسے حضور ؐ نے حکم دیا :"ان میں سے چار کو چن لیں۔"

امام ابوداؤد نے روایت فرمائی ہے کہ عمیر اسدی نے فرمایا' جس وقت میں نے اسلام قبول کیا' میری آٹھ بیویاں تھیں۔ میں نے اس کا تذکرہ رسول ؐ خدا سے کیا تو آپ ؐ نے فرمایا :"ان میں سے چار کو چن لو۔"

امام شافعی ؒ نے اپنی مسند میں فرمایا مجھے ایک شخص نے یہ اطلاع دی جس نے یہ بات ابوالزیاد سے سنی تھی' انہیں عبدالمجید نے بتایا تھا' انہیں سہیل ابن عبدالرحمٰن نے بتایا' انہوں نے عوف ابن الحارث سے نقل کیا' انہیں نوفل ابن معاویہ دیلمی سے انہوں نے کہا۔ :"جس وقت میں اسلام لایا میرے ہاں پانچ بیویاں تھیں۔ مجھے رسول ؐ اللہ نے حکم دیا :"ان میں سے چار چن لو' جو بھی تمہیں پسند ہوں اور جس ایک کو چاہو علیحدہ کر دو۔"

جس وقت اسلام آیا' اس وقت لوگوں کے ہاں دس یا دس سے بھی زیادہ بیویاں ہوا کرتی تھیں۔ اور بیویوں کی تعداد پر کوئی قید و بند نہ تھا۔ ان حالات میں اسلام نے تعداد پر یہ پابندی عائد کر دی اور حکم دیا کہ کوئی مسلمان اس حد سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔ یعنی وہ صرف چار کی حد تک جا سکتا ہے۔ اس کے ساتھ اسلام نے مزید ایک اور پابندی عائد کر دی۔ وہ یہ کہ اگر تعداد زیادہ ہو تو ان کے درمیان مکمل عدل اور انصاف کا قائم کرنا بھی فرض ہے۔ اگر کوئی سمجھتا ہے کہ وہ انصاف نہ کر سکے گا تو اس پر لازم ہے کہ وہ ایک ہی بیوی پر اکتفا کرے۔ یا ان عورتوں پر اکتفا کرے جو کسی کی مملوکہ ہیں۔

اس پس منظر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسلام نے تعدد ازواج کی اجازت بالکل نہیں دی۔ اسلام نے زیادہ بیویوں کی تعداد کی تحدید کر دی۔ اسلام نے اس معاملے کو مرد کی خواہش نفس ہی پر نہیں چھوڑ دیا بلکہ اسے عدل و انصاف کی شرط کے ساتھ مشروط کر دیا۔ اگر عدل نہ ہو گا تو تعدد ازواج کی اجازت نہ ہو گی۔

اب سوال یہ ہے کہ اسلام نے تعدد ازواج کی رخصت اور اجازت ہی کیوں دی؟ اسلامی نظام زندگی انسانوں کیلئے وضع کیا گیا ہے۔ وہ ایک مثبت اور عملی نظام ہے۔ وہ انسان کی فطرت اور اس کے وجود کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔ وہ انسان کے حالات اور انسان کی ضروریات

کے مطابق وضع کیا گیا ہے۔ وہ مختلف حالات، مختلف علاقوں اور مختلف زمانوں میں انسان کے تغیر پذیر شب و روز کو سامنے رکھ کر وضع کیا گیا ہے۔ وہ فی الواقعہ ایک مثبت اور حقیقت پسندانہ نظام ہے۔ وہ انسان کو یوں لیتا ہے جس طرح کسی دور میں انسان فی الواقعہ ہوتا ہے۔ انسان جہاں کھڑا ہوتا ہے یہ نظام اسی مقام سے اس کے سفر کا آغاز کرتا ہے۔ اور اسے وہاں سے لیکر ترقیوں کے اعلیٰ مدارج تک بلند کرتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اسے بام عروج تک پہنچا دیتا ہے۔ وہ انسان کی فطرت حقیقی کا نہ انکار کرتا ہے نہ اسے کراہیت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ وہ انسان کے حقیقی واقعات سے نہ صرف نظر کرتا ہے اور نہ ان سے لاپرواہی برتتا ہے۔ وہ اس کی رفتار اصلاح و ترقی میں نہ تو تشدد کرتا ہے اور نہ بے اعتدالی کرتا ہے۔

اسلامی نظام زندگی خالی خولی ڈھینگ نہیں ہے، نہ وہ سوقیانہ گپ شپ ہے، نہ وہ خالی اور غیر واقعی مثالی تصور ہے۔ اور نہ ہی وہ محض تصورات اور امیدوں پر مبنی ہے۔ جن کا فطرت انسانی کے ساتھ تصادم ہو، جن کا انسان کے واقعات اور حالات کے ساتھ کوئی جوڑ نہ ہو اور جو اس طرح ہو جس طرح بخارات ہوا میں تحلیل ہو جاتے ہیں........ بلکہ وہ ایک ایسا نظام ہے جو انسان کی تخلیق کو مد نظر رکھتا ہے۔ وہ انسانی معاشرہ میں پاکیزگی کا داعی ہے، اس لئے وہ انسانی معاشرہ میں صرف مادیت کو رواج نہیں دیتا۔ ایسی مادیت جو انسان کے چہرے بشرے کو خراب کر دے۔ جو انسانی معاشرے کو آلودہ کر دے اور یہ سب کچھ ان نام نہاد ضرورت کے پھندوں کی صورت میں جو حقائق سے متصادم بلکہ اسلام یہ ہدایت کرتا ہے کہ ایسی صورت حال پیدا کی جائے جس میں تخلیق انسانیت محفوظ ہو، جس میں معاشرہ پاکیزہ ہو، اور یہ سب کچھ بسہولت اور نہایت ہی قلیل جدوجہد سے حاصل کیا جائے اور اس کے لئے فرد اور معاشرے کو کم سے کم جدوجہد کرنا پڑے۔

اسلامی نظام زندگی کے ان اساسی تصورات کو جب ہم پیش نظر رکھیں اور پھر مسئلہ تعدد ازدواج پر غور کریں تو جو نتائج ہمارے سامنے آتے ہیں وہ یہ ہیں :

۱:۔ سب سے پہلے یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ اکثر معاشروں میں ایسے حالات پائے جاتے ہیں جن میں شادی کے قابل عورتوں کی تعداد اور شادی کے قابل مردوں کے مقابلے میں زیادہ ہوتی ہے۔ یہ واقعات گزشتہ تاریخی معاشروں میں بھی رہے ہیں اور دور حاضر کے معاشروں میں بھی پائے جاتے ہیں۔ نیز عورتوں کی زیادتی کی نسبت ۱:۴ سے کبھی بھی زیادہ نہیں رہی ہے۔ یہ کمی بیشی ہمیشہ ایک اور چار کے درمیان ہی رہی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ ہم ایسی صورت حال کا کیا حل کریں گے۔ کیونکہ ایسے حالات بار بار پیش آتے ہی رہتے ہیں۔ اگرچہ ان میں مرد اور عورت کے درمیان نسبت میں کمی بیشی ہوتی رہتی ہے۔ یہ ایسی صورت حال کا علاج ممکن ہے؟

کیا محض شانے ہلانے سے اس صورت حال کا علاج ممکن ہے؟ کیا یہ ممکن ہے کہ ہم ایسی صورت حال سے لاتعلق ہو جائیں اور اسے یونہی چھوڑ دیں؟ اور جس طرح ممکن ہو حالات اپنا رخ خود متعین کریں اور جو صورت حال پیدا ہو اسے قبول کرتے چلے جائیں۔

محض شانے ہلانے سے مسائل حل نہیں ہوا کرتے اور کسی معقول انسان کیلئے یہ حل قابل قبول ہے کہ حالات جو بھی رخ اختیار کریں اسے قبول کر لیا جائے۔ کسی غیرت دار انسان اور کسی سنجیدہ شخص کے نزدیک یہ موقف قابل قبول نہ ہو گا جو نسل انسانی کو محترم سمجھتا ہو۔

اس لئے اس بات کی ضرورت ہے کہ کوئی نظم اور ضابطہ موجود ہو اور اس مسئلے کے حل کیلئے کوئی عملی قدم اٹھایا جائے۔ غور و خوض کرنے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اس مسئلے کے صرف تین حل ممکن ہیں :۔

۱:۔ یہ کہ ہر شخص جو شادی کے قابل ہے وہ شادی کی ایک قابل عورت کے ساتھ شادی کرے۔ اور اس کے علاوہ ایک یا دو دو عورتیں رہتی ہیں ان کو بغیر خاوند کے یونہی چھوڑ دیا جائے اور انہیں ان کی پوری زندگی میں خاوند نہ ملے۔

۲:۔ یہ کہ ہر وہ شخص جو شادی کے قابل ہے ایک شادی کی قابل عورت کے ساتھ قانونی نکاح کرے اور اس کے ساتھ وہ جائز تعلقات قائم کرے لیکن دوسری عورتوں کے ساتھ وہ دوستی اور حرام اور ناجائز تعلقات قائم کرے یعنی ان عورتوں کے ساتھ جن کے خاوند نہیں ہیں۔ اس طرح ان کے تعلقات ناجائز تعلقات ہوں اور وہ تاریکی میں زندگی بسر کریں۔

۳:۔تیسری صورت یہ ہے کہ شادی کے قابل لوگ ایک سے زیادہ شادی کے قابل عورتوں کے ساتھ شادی کریں۔ اور اسی طرح ایک مرد ایک سے زیادہ عورتوں کے ساتھ جائز تعلقات قائم کرے اور اس کی بیوی ہو اور کھلے طور پر وہ روشنی اور دائرہ قانون کے اندر اس کے ساتھ زندگی بسر کرے اور چوری اور حرام کاری کا ارتکاب نہ ہو۔

ذرا غور فرمایئے' پہلی صورت خلاف فطرت ہے۔ اور ایک عورت کیلئے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ پوری زندگی تنہائی میں بسر کرے۔ اور کسی مرد کے ساتھ تعلق قائم نہ کرے۔ اس حقیقت کو ان لوگوں کے دعاوی سے رد نہیں کیا جاسکتا ہے جو منہ پھٹ ہیں جو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ عورت محنت اور مزدوری کر کے مردوں سے مستغنی ہو سکتی ہے۔ اس لئے کہ ایسے سطحی' غیر سنجیدہ اور جاہل گپیں ہانکنے والوں کے فہم و ادراک سے یہ مسئلہ بہت ہی اونچا ہے۔ اس لئے کہ یہ لوگ فطرت انسانی سے بے خبر ہیں۔ عورت کی ہزار محنت اور اس کی ہزار ملازمتیں بھی اسے اپنی فطری احتیاج اور اپنے فطری تقاضے سے مستغنی نہیں کر سکتیں۔ چاہے یہ تقاضے اس کے جسمانی تقاضے ہوں یا اس کی عقل اور روح کے تقاضے ہوں۔ وہ یہ کہ عورت امن وسکون کے ساتھ اپنے خاندان کے اندر رہے اور مرد کسب معاش کیلئے جدوجہد کرے۔ اسی طرح مرد بھی اپنی معاشی جدوجہد اور معاشی سرگرمیوں کے بعد اس بات کی ضرورت محسوس کرتا ہے کہ وہ ایک خاندان کی طرف لوٹے۔ اس معاملے میں مرد اور عورت دونوں برابر ہیں۔ اس لئے کہ وہ ایک ہی جان سے پیدا ہوئے ہیں اور ان کی ایک ہی فطرت ہے۔

دوسری صورت اسلام کے پاکیزہ رجحانات کے بالکل متضاد ہے۔ اور اسلام کے پاکیزہ معاشرتی نظام سے بھی لگا نہیں کھاتا۔ نیز یہ صورت حال عورت کی اسلامی شرافت کے بھی خلاف ہے۔ جو لوگ معاشرہ میں عریانی اور فحاشی کے پھیلاؤ کے خلاف نہیں ہیں' یہ وہی لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں اپنے آپ کو زیادہ عالم سمجھتے ہیں اور یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی شریعت پر دست درازی کرتے ہیں اور اس فعل کا ارتکاب یہ لوگ محض اس لئے کرتے ہیں کہ اس فعل قبیح سے ان کا ہاتھ روکنے والا کوئی نہیں ہے۔ بلکہ اس قسم کے لوگ شریعت اسلامیہ کے دشمنوں کی جانب سے ہر قسم کی حوصلہ افزائی پاتے ہیں۔

اب رہ گئی صرف تیسری صورت حال اور اسلام نے اسے اختیار کیا ہے۔ اسلام نے صرف تعدد ازواج کی اجازت دی ہے اور اس پر کئی حدود وقیود عائد کی ہیں اور یہ اجازت اسلام نے اس حقیقی صورت حال کے حل کرنے کیلئے دی ہے جس میں محض شانے ہلانے سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا اور نہ ایسے حقیقی حالات اور مشکلات کا حل محض متفلسفانہ ادعاء سے ممکن ہوتا ہے اور اس تیسری صورت کو اسلام نے اس لئے اختیار کیا ہے کہ یہی اس واقعی صورت حال کا مثبت حل ہے۔ اور ایک مثبت طرز عمل ہے۔ یعنی یہ کہ انسان کے ساتھ ایسا معاملہ کیا جائے۔ جس طرح انسان ہے۔ اپنی موجودہ فطرت اور اپنے موجودہ حالات کے ساتھ۔ نیز پاکیزہ اخلاق اور ایک صاف اور ستھرے معاشرے کے مقاصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے۔ نیز انسان کو بدکاری اور گندگی کے دلدل سے نکالنے کیلئے اسلام نے جو منہاج تجویز کیا ہے اس کے عین مطابق یعنی نہایت ہی نرمی اور محبت کے ساتھ انسان کا ہاتھ پکڑ کر اسے بام عروج تک پہنچانے کا طریقہ کار۔

یہ تو تھا ایک پہلو' اس کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ انسانی معاشروں میں چاہے وہ قدیم ہوں یا جدید' آج کے ہوں یا کل کے' ان میں ایک دوسری حقیقت نظر آتی ہے۔ نہ اس سے انکار کیا جاسکتا ہے۔ اور نہ ہی اسے نظر انداز کیا جاسکتا ہے۔ وہ یہ کہ مرد میں بچے پیدا کرنے کی قدرت اور صلاحیت ستر سال یا اس کے بھی آگے کی عمر تک طویل ہوتی ہے۔ جبکہ عورت میں یہ صلاحیت ۵۰ سال کے لگ بھگ ختم ہو جاتی

ہے۔ اس طرح بیس سال ایسے آجاتے ہیں جن میں مرد تو بچے پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے لیکن اس کے مقابلے میں عورت بچے پیدا کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ اور یہ حقیقت بھی بالکل واضح ہے کہ مرد اور عورت کو الگ پیدا کر کے ان کے درمیان ملاپ کی زندگی اور نسل انسانی کو جاری رکھنے کا ذریعہ بنایا گیا ہے۔ اس کرۂ ارض کی آبادی کا انتظام انسان کی آبادی میں کثرت اور پھیلاؤ کے ذریعہ کیا گیا ہے۔ اس لئے یہ امر خلاف فطرت انسانی ہو گا کہ ہم کوئی ایسی رسم ڈالیں جس سے ایک مرد بیس سال تک اپنے فطری وظائف پورے کرنے کا اہل ہی نہ رہے۔ جبکہ اسلام نے جو قانون بنایا ہے وہ ہر دور کے حالات میں ہر قسم کے معاشروں کیلئے موزوں ہے اور فطری تقاضوں کے ساتھ بھی ہم آہنگ ہے۔ جبکہ یہ قانون بھی محض اجازت کی شکل میں ہے۔ یہ بات لازم نہیں کی گئی کہ ہر شخص لازماً چار شادیاں کرے۔ بلکہ ایک عام اباحت دی گئی ہے اور لوگوں کیلئے ایک قسم کی وسعت پیدا کی گئی ہے کہ اگر ان کو ضرورت پڑے تو وہ حالت ضرورت میں اس سے فائدہ اٹھائیں۔ یہ وہ ہم آہنگی ہے جو خدائی قانون اور انسانی فطرت کے اندر ہمیشہ پائی جاتی ہے۔ جبکہ اس تناسق اور ہم آہنگی کا خیال انسان کے بنائے ہوئے قوانین میں بالعموم نہیں رکھا جاتا۔ اس لئے کہ انسان کا معاملہ ہمیشہ محدود ہوتا ہے اور وہ دور رس انفرادی حالات اور جزئیات کا مطالعہ کرنے سے اکثر قاصر رہتا ہے۔ اس سے کئی گوشے پوشیدہ رہ جاتے ہیں اور زندگی کے کئی حالات و احتمالات اس کے دائرے سے باہر رہ جاتے ہیں۔

اس مذکورہ بالا حقیقت کے حوالے سے بعض اوقات یوں ہوتا ہے کہ مرد زیادہ بچے پیدا کرنے کا خواہش مند ہوتا ہے جبکہ عورت کو مزید بچے پیدا کرنے میں کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ یہ عدم دلچسپی بعض اوقات کبر سنی کی وجہ سے ہوتی ہے اور بعض اوقات بیماری کی وجہ سے ہوتی ہے۔ اور ان حالات میں فریقین کی دلی خواہش بھی ہوتی ہے کہ وہ رشتہ زوجیت میں بندھے رہیں اور ایک دوسرے سے علیحدگی اختیار نہ کریں۔ اب ایسے حالات میں ہم کیا حل پیش کریں گے۔

کیا محض شانے اچکانے سے یہ مسائل حل ہو جائیں گے؟ یا اس طرح مسئلہ حل ہو گا کہ زوجین میں سے کوئی فریق اپنے سر کو دیوار سے پھوڑ دے یا ان وسائل اور حقیقی سوالات کا جواب ہم محض گپ شپ میں ٹال دیں اور ظریفانہ بذلہ سنجیاں کرتے ہوئے آگے بڑھ جائیں۔

حقیقت یہ ہے کہ بذلہ سنجیوں اور محض شانے اچکانے سے کبھی حقیقی مسائل حل نہیں ہوا کرتے۔ زندگی اور اس کے فطری حقائق سنجیدہ امور ہیں۔ زندگی کی مشکلات حقیقی ہوتی ہیں اور ان کا حل بھی حقیقت پسندی سے ممکن ہے۔

اس سوال کا حل بھی صرف تین طریقوں سے ممکن ہے۔

۱:۔ یہ کہ ہم مرد پر یہ پابندی عائد کر دیں کہ وہ پچاس سال کے بعد اپنے فطری وظائف کی ادائیگی بند کر دے اور ہم اسے کہہ دیں کہ اے مرد، اب یہ بات تمہارے ساتھ نہیں جچتی۔ نیز آپ کے نکاح میں جو عورت موجود ہے اس کی کرامت و شرافت اور عزت و احترام اور حقوق کے یہ بات منافی ہے۔

۲:۔ دوسری صورت یہ ہے کہ ہم ایسے شخص کو آزاد چھوڑ دیں اور وہ جس عورت سے چاہے دوستیاں گانٹھتا پھرے۔

۳:۔ تیسری صورت یہ ہے کہ ہم اسے اجازت دیدیں کہ وہ ایک سے زیادہ بیویاں رکھ سکے۔ اپنے حالات اور اپنی ضروریات کے مطابق، اور یوں ہم پہلی بیوی کو طلاق دلوانے سے بھی بچ جائیں۔

جہاں تک پہلی صورت کا تعلق ہے وہ انسانی فطرت کے خلاف ہے۔ یہ تجرد انسانی نفس برداشت ہی نہیں کر سکتا۔ انسانی اعصاب اور انسانی نفس اس پابندی کو برداشت نہیں کر سکتا۔ اور اگر ہم بذریعہ قانون اور قوت یہ پابندی عائد کر دیں کہ اس صورت میں تو معاشرے کیلئے

عائلی زندگی عذاب جہنم بن جائے گی اور ہر شخص عائلی زندگی کو ان مشکلات و مصائب کی وجہ سے پسند نہیں کرے گا اور اس کے خوفناک نتائج نکلیں گے۔ اور یہ سب امور وہ ہیں جنہیں اسلام کسی معاشرے کیلئے پسند نہیں کرتا' اس لئے کہ اسلام کی پالیسی تو یہ ہے کہ وہ ایک گھر کو پر سکون بنادے اور مرد کیلئے اس کی بیوی کو محبوبہ اور لباس بنادے۔

دوسری صورت اسلام کے اخلاقی رجحانات کے خلاف ہے۔ اور انسانی زندگی کی ترقی جس نہج پر اسلام چاہتا ہے وہ اس کے بھی خلاف ہے۔ نیز انسانی معاشرے کی تطہیر اور پاکیزگی کیلئے اسلام نے جو منہاج اپنایا ہے' یہ اس کے بھی خلاف ہے۔ اس لئے کہ اسلام انسانی معاشرے کو اس لائق بناتا ہے جو ایک حیوانی مقام سے اس کو انسان کے اشرف مقام تک بلند کر دے۔

اب صرف تیسری صورت رہ جاتی ہے' جو انسان کی واقعی فطری ضروریات کو بھی پورا کرتی ہے۔ وہ اسلام کے اخلاقی نقطۂ نظر سے بھی ہم آہنگ ہے۔ یہ صورت پہلی بیوی کے حقوق زوجیت کو بھی مدنظر رکھتی ہے' اور اس صورت میں بھی یہ ممکن ہے کہ زوجین اپنی خواہش کے مطابق اپنی ازدواجی زندگی جاری رکھ سکیں۔ اور ان کی ایک دوسرے کے ساتھ جو یادیں وابستہ ہیں وہ بھی اپنی جگہ قائم رہیں۔ اور انسان کیلئے یہ ممکن اور آسان ہو جائے کہ وہ نرمی' سہولت اور حقیقت پسندی کے ساتھ اپنی زندگی کو ترقی کی جانب گامزن رکھے۔

اور یہی صورت حال اس وقت درپیش آجاتی ہے جب کسی کی بیوی بانجھ ہوتی ہے۔ اور مرد کی یہ فطری خواہش ہوتی ہے کہ اس کی اولاد ہو' ایسے حالات میں بھی صرف دو صورتیں ہوتی ہیں کوئی تیسری صورت نہیں ہوتی۔

۱:۔ یہ کہ اسے خاوند طلاق دیدے اور دوسری بیوی لاکر اس کے ذریعہ وہ حصول اولاد کی فطری خواہش کو پورا کرے۔

۲:۔ یہ کہ وہ دوسری بیوی بھی کرے لیکن پہلی کو بھی اپنی زوجیت میں رکھے اور اس کے حقوق ادا کرے۔

ہمارے دور میں بعض مرد اور عورتیں اپنے آپ کو دانشور ظاہر کرکے ایسے بکواس کرتے ہیں کہ تعدد ازواج کے مقابلے میں پہلی صورت بہتر ہے لیکن کم از کم ۹۹٪ عورتیں ایسی ہوں گی جو طلاق کے مقابلے میں' ایسے حالات میں تعدد ازواج کو ترجیح دیتی ہیں۔ اور اگر ان کو کوئی یہ مشورہ دے کہ وہ طلاق لے لیں تو وہ اس کے منہ پر تھوکیں گی اور ان مشیران کرام پر لعنت بھیجیں گی جو ان کو یہ مشورہ دیتے ہیں کہ بستے گھر خراب ہوں اور اس خرابی کے عوض انہیں کچھ بھی ہاتھ نہ آئے۔ اس لئے کہ اگر کسی عورت کا بانجھ پن ظاہر ہو چکا ہو اور وہ طلاق لے لے تو کون ہے جو اسے نکاح میں لینے کیلئے تیار ہو گا؟ اس کے مقابلے میں اکثر یوں ہوتا ہے کہ ایک بانجھ عورت پر جب خاوند دوسری شادی کرتا ہے تو دوسری عورت کے جو بچے پیدا ہوتے ہیں ان کے ساتھ سابق بیوی کو بہت ہی انس و محبت ہوتی ہے۔ اس لئے کہ کسی گھر میں بچے تو پھول کی طرح ہوتے ہیں اور جب اس قدر انتظار کے بعد وہ کسی گھر میں آتے ہیں تو اس سے احساس محرومی ختم ہو جاتا ہے اور گھر میں چہل پہل پیدا ہو جاتی ہے۔

غرض ہم جہاں بھی جائیں اور انسانی زندگی کا حقیقت پسندانہ عملی مطالعہ کریں' تو یہ حالات تعدد زوجات کے خلاف کسی بکواس کی تائید نہیں کرتے' نہ ان نام نہاد دانشوروں کی آراء کی کہیں سے تائید حاصل ہوتی ہے۔ زندگی کے واقعات و حقائق ان دانشوروں کی سطحی گپ شپ اور بے راہ روی اور آزادی فکر و عمل کی تائید نہیں کرتے اس لئے کہ یہ موضوع نہایت ہی سنجیدہ ہوتا ہے اور اس میں گپ کے بجائے قطعی اور فیصلہ کن موقف کی ضرورت ہوتی ہے......... غرض زندگی کے حقائق پر گہرے غور و فکر کے نتیجے ہی میں باری تعالیٰ کی وہ گہری حکمت واضح ہوتی ہے جس کی وجہ سے اس نے تعدد زوجات کو قرآن کے عائد کردہ حدود و شرائط کے ساتھ جائز قرار دیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً

.... "تو جو عورتیں تم کو پسند آئیں ان میں سے دو دو' تین تین' چار چار سے نکاح کر لو' لیکن اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ ان کے ساتھ عدل نہ کر سکو گے تو پھر ایک ہی بیوی کرو۔"

تعدد زوجات کی یہ رخصت اور اجازت زندگی کے عملی حقائق اور تقاضائے فطرت کے پیش نظر دی گئی ہے۔ اس کے ذریعہ شریعت نے انسانی معاشرے کو' بتقاضائے فطرت اور زندگی کے حقائق کے دباؤ میں' بے راہ روی اور نفسیاتی کشمکش میں مبتلاء ہونے سے بچالیا ہے۔ اور اس اجازت کو جس شرط سے مشروط کیا گیا ہے' اس کے ذریعہ عائلی زندگی کو انارکی' افراتفری سے بچایا گیا ہے۔ نیز بیوی کو بھی خانگی ظلم و ستم سے بچایا گیا ہے۔ نیز اس کی وجہ سے عورت کی عزت کو بھی محفوظ کر دیا گیا ہے۔ اور غیر ضروری طور پر توہین آمیز سلوک سے محفوظ کر دیا گیا ہے۔ اور احتیاط کامل کے ساتھ عورت کو ایسے مواقع سے بچالیا گیا کہ جن میں اس کے ساتھ توہین آمیز سلوک کیا جائے۔ اور ضروری حالات اور زندگی کے تلخ حقائق کے پیش نظر تعدد زوجات کی اجازت کے ساتھ ساتھ عورت کیلئے مکمل عدل و انصاف کی ضمانت دی گئی ہے۔

جو شخص اسلام کی روح اور اس کی پالیسی کا ادراک رکھتا ہو' وہ ہرگز یہ نہیں کہہ سکتا کہ تعدد ازواج اسلام میں بذاتہ مطلوب ہے اور بغیر فطری اور اجتماعی معاشرتی ضروریات کے جائز ہے۔ اور اس کیلئے محض حیوانی لذتیت اور ایک بیوی کو چھوڑ کر دوسری اختیار کر لینا ہی وجہ جواز ہے۔ جس طرح ایک شخص ایک دوست کو چھوڑ کر دوسرے دوست کو اختیار کر لیتا ہے۔ بلکہ اسے ایک حقیقی صورت میں جائز کیا گیا ہے۔ بعض معاشرتی مشکلات پر قابو پانے کیلئے اسے جائز کیا گیا ہے۔ اور ایسی مشکلات ہر معاشرے میں زندگی کا لازمہ ہوتی ہیں۔

اب اگر انسانی تاریخ کے کسی دور میں بعض لوگوں نے اس اسلامی اجازت اور رخصت سے غلط فائدہ اٹھایا اور انہوں نے اس اجازت سے فائدہ اٹھا کر عائلی زندگی کو حیوانی لذتیت کیلئے ایک اسٹیج بنادیا اور انہوں نے بیویوں کو اس طرح بدلنا شروع کر دیا جس طرح دوستوں میں تبدیلی آجاتی ہے' تو اس صورت حال کا اسلام ذمہ دار نہیں ہے۔ اور نہ اس قسم کے عیاش لوگ اسلام کے نمائندے ہو سکتے ہیں۔ اس قسم کے لوگ پستی کے ایسے گہرے گڑھے میں محض اس لئے گر گئے ہیں کہ وہ اسلام سے دور ہو گئے تھے۔ اور اسلام کی پاک و صاف اور شریفانہ روح کا وہ ادراک نہ کر سکے۔ پھر ایسے لوگ ایسے معاشروں میں رہ رہے تھے' جن پر اسلام کی حکمرانی نہ تھی۔ ان میں اسلام کا نظام قانون' اسلامی شریعت نافذ نہ تھی' ان معاشروں پر اسلامی قوانین غالب نہ تھے۔ تاکہ وہ اسلامی پالیسی اور اسلامی شریعت کے مطیع فرمان ہوتے' لوگ اسلام کی تعلیمات اور اسلام کی شریعت پر عمل پیرا ہوتے اور اسلام آداب اور اسلامی روایات کا لحاظ رکھتے۔

اسلام کی عائلی زندگی میں گزشتہ اسلامی تاریخ کے دوران جو نقائص پیدا ہوئے ان کے ذمہ دار وہ معاشرے ہیں جو اسلام کے دشمن تھے' جنہوں نے اپنے آپ کو اسلامی شریعت اور اسلامی قانون سے آزاد کر لیا تھا' یہی معاشرے ان "محلات" اور ان "حریموں" کے ذمہ دار تھے جو انتہائی گھٹیا انداز میں وجود میں آئے۔ اور یہی معاشرے اس امر کے ذمہ دار تھے جنہوں نے عائلی زندگی کو حیوانی لذت کوشی کا اسٹیج ڈرامابنایا۔ اس لئے جو لوگ عائلی زندگی سے ان عیوب کو دور کرنا چاہتے ہیں اور اسے صحت مند اصولوں پر استوار کرنا چاہتے ہیں' انہیں چاہئے کہ وہ لوگوں کو اسلامی نظام حیات اور اسلامی شریعت کی حکمرانی کی طرف لوٹائیں۔ انہیں چاہئے کہ وہ معاشرے کو پاکیزگی' طہارت' استقامت اور اعتدال کی اساس پر از سرنو استوار کرنے کی جدوجہد کریں .... جو بھی مصلح ہے اور اصلاح چاہتا ہے۔ اسے چاہئے کہ بس لوگوں کو اسلامی نظام حیات کی طرف لوٹائے۔ اگر کوئی صرف اس ایک عائلی پہلو میں اصلاح چاہتا ہے تو یہ ممکن نہیں ہے۔ پورے نظام حیات کے اندر انقلاب ضروری ہے۔ اس لئے کہ اسلام ایک مکمل نظام حیات ہے اور وہ صرف اس صورت میں ہی قائم ہو سکتا ہے کہ اسے پورے طور پر اور ہر پہلو سے قائم کیا جائے۔

یہاں جس عدل کا ذکر کیا ہے اور جو مطلوب ہے' وہ ہمہ گیر عدل ہے۔ معاملات میں عدل' خرچ میں عدل' حسن معاشرت میں بیویوں

کے درمیان عدل' ہم بستری میں سب کے ساتھ عدل' رہی یہ بات کی دلی احساسات میں عدل اور نفس انسانی میں پائے جانے والے گہرے میلان کے اندر عدل تو اسلام اس کا مطالبہ کسی انسان سے نہیں کرتا۔ اس لئے کہ گہرے نفسیاتی میلانات ورجحانات انسان کے دائرہ ضبط و ارادہ سے خارج ہوتے ہیں۔ اس عدل سے مراد وہ عدل ہے جس کی تشریح اللہ تعالیٰ نے اس سورت میں دوسری جگہ خود کر دی ہے۔ "اور تم ہرگز تمام عورتوں کے درمیان مکمل عدل نہیں کر سکتے ہو' اگرچہ تم بہت چاہو' اس لئے پوری طرح ایک ہی طرف مائل نہ ہو جاؤ جس کا نتیجہ یہ ہو کہ دوسری عورت معلق ہو کر رہ جائے۔" بعض تجدد پسندوں نے اس آیت سے یہ معانی نکالے ہیں کہ چونکہ مکمل عدل ممکن نہیں ہے' اس لئے تعدد ازواج نتیجتاً" حرام ہو گیا۔ حالانکہ مفہوم یہ نہیں ہے۔ اسلامی شریعت ایک نہایت ہی سنجیدہ قانون ہے' اس میں اس قسم کا مزاح نہیں کیا جاتا کہ وہ ایک آیت میں ایک بات کو جائز قرار دیدے اور ساتھ ہی دوسری آیت میں بالواسطہ اس اجازت کو واپس لے لے۔ مثلاً دائیں ہاتھ سے کوئی کسی کو کچھ دے اور بائیں ہاتھ سے چھین لے۔ اس لئے پہلی آیت میں جس عدل کا ذکر ہے اور ہدایت دی گئی ہے کہ اگر تم ایسا عدل نہیں کر سکتے تو صرف ایک ہی بیوی پر اکتفاء کرو' اس سے مراد معاملات زندگی' نفقات ازواج' معاشرتی سلوک' اور مباشرت میں عدل ہے۔ نیز ان چیزوں کے علاوہ زندگی کے تمام مظاہر میں عدل و مساوات ہے۔ اسی طرح کے بظاہر کسی ایک بیوی کی حیثیت دوسری سے کم نہ نظر آئے۔ کسی ایک کو دوسری بیویوں پر ترجیح نہ دی جائے جس طرح حضور اکرم ؐ کی سیرت طیبہ سے معلوم ہوتا ہے کہ باوجود اس کے کہ آپ ؐ افضل البشر تھے۔ اور آپ کے تمام ساتھیوں اور پڑوسیوں کو یہ معلوم تھا کہ آپ کو حضرت عائشہ ؓ کے ساتھ زیادہ محبت تھی' اور آپ کے قلبی جذبات میں عائشہ کی جگہ زیادہ تھی۔ اور اس مقام میں اس کے ساتھ آپ ؐ کی دوسری ازواج مطہرات میں سے کوئی شریک نہ تھا۔ اس لئے کہ کسی شخص کو اپنے دل پر کوئی کنٹرول نہیں ہوتا۔ دل تو اللہ میاں کی دو انگلیوں کی گرفت میں ہوتے ہیں اور یہ اللہ میاں کی مرضی ہوتی ہے کہ قلوب کو جس طرح پھیر دے۔ حضور اکرم ؐ اپنے دین سے بھی اچھی طرح باخبر تھے۔ اور اپنے دلی جذبات سے بھی وہ اچھی طرح واقف تھے۔ آپ فرمایا کرتے تھے۔ "اللہ! یہ تو وہ تقسیم ہے جو میرے کنٹرول میں ہے' اور میں نے کر دی ہے۔ بس آپ مجھے اس معاملے میں ملامت نہ کیجیو جس پر مجھے کنٹرول نہیں ہے' جو تیرے ہاتھ میں ہے۔"[1]

اس موضوع پر بات ختم کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ ہم دوبارہ اس نکتے کی وضاحت کر دیں۔ اس دنیا میں اسلامی نظام حیات نے تعدد زوجات کے اصول کو رائج (Introduce) نہیں کیا۔ بلکہ موجودہ نظام لاتعداد تعدد زوجات میں چار کی حد تک تحریر کر دی۔ نیز اسلام نے یہ حکم نہیں دیا کہ تم خواہ مخواہ ایک سے زیادہ بیویاں رکھو بلکہ اسلام نے اس کی اجازت دی اور اس اجازت کو شرط و قیود میں مقید کیا۔ اور اجازت بھی اس لئے دی کہ انسانی زندگی کے حقیقی مسائل اور مشکلات کا حل نکالا جائے۔ اور بعض حالات میں انسانی فطرت کے تقاضوں کی ضرورت کو پورا کیا جائے۔ یہ فطری تقاضے اور حقیقی ضروریات زندگی' جن کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے' وہ ہیں جن میں سے کچھ کا معمولی ادراک ابھی تک نہیں ہوا ہے' لیکن ان میں سے بعض حالات اور ضروریات ایسی بھی ہو سکتی ہیں' جن تک ابھی تک ہمارے محدود فہم و ادراک نے رسائی حاصل نہیں کی۔ یا بعض ایسے حالات زندگی بھی ہوں گے جن کا وقوع مستقبل میں ہو گا۔ جن میں یہ رخصت کام آئے گی۔ جس طرح اسلامی نظام زندگی کی ہدایات اور اسلامی شریعت کی حکمتوں کا ظہور آئے دن ہوتا رہتا ہے۔ کیونکہ یہ ربانی نظام زندگی ہے اور انسان کا فہم و ادراک اپنی گزشتہ تاریخ میں اس کی تمام حکمتوں اور مصلحتوں کے احاطے سے قاصر رہا ہے۔ اس لئے کہ ہر اسلامی قانون سازی میں مصلحت اور حکمت پوشیدہ ہوتی ہے۔ چاہے انسانی فہم اس کا ادراک کر سکے یہ نہ کر سکے۔ یا اس کا ادراک انسانی تاریخ میں فہم انسانی کو پہلے حاصل ہو یا کچھ عرصہ بعد میں حاصل ہو' اس لئے کہ یہ فہم نہایت ہی محدود ہے۔

[1] ابوداؤد' ترمذی اور نسائی

اب ہم اس انتظام پر بحث کرتے ہیں جو مکمل عدل و انصاف نہ کرسکنے کی ضرورت میں اسلام نے کیا ہے۔ فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تَعْدِلُوا فَوَاحِدَةً أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ .... "لیکن اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ ان کے ساتھ عدل نہ کرسکو گے تو پھر ایک ہی بیوی کرو یا ان عورتوں کو زوجیت میں لاؤ جو تمہارے قبضہ میں آئی ہیں۔"

یعنی اگر عدل قائم نہ رکھ سکنے کا اندیشہ ہو تو پھر یہ صورت متعین ہو جاتی ہے کہ ایک ہی بیوی پر اکتفاء کرو۔ اس صورت میں ایک سے زیادہ کی اجازت ختم ہو جاتی ہے یا ان عورتوں کو جو تمہارے قبضے میں ہیں۔" بطور لونڈی استعمال کرو یا زوجیت میں لو' اس لئے کہ آیت کے الفاظ نے کسی صورت کی تحدید نہیں کی ہے۔

فی ظلال القرآن کے پارہ دوئم کی تفسیر میں ہم نے غلامی کے مسئلے پر ایک مختصر بحث کی تھی۔ یہاں مناسب ہے کہ غلام عورتوں کے ساتھ مباشرت کرنے کے مسئلے پر قدرے بحث ہو جائے۔

مملوکہ عورتوں کے ساتھ نکاح کرنے سے ان کا اعتماد' ان کی شرافت اور انسانی عزت نفس بحال ہو جاتی ہے۔ اس نکاح کی وجہ سے انہیں آزادی حاصل ہو جاتی ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی اس عورت کی اولاد بھی آزاد ہو جاتی ہے۔ اگر نکاح کے وقت اسے خاوند آزادی نہ بھی دے تو بھی بچہ پیدا ہونے کے بعد وہ ام ولد کہلاتی ہے۔ اس کا مالک اسے اب فروخت نہیں کرسکتا۔ مالک کی وفات کے بعد وہ آزاد ہو جاتی ہے۔ اس سے قبل اس کی اولاد پیدا ہوتے ہی آزاد ہوتی ہے۔

اور اگر کوئی مالک نکاح کے بغیر ہی اپنی مملوکہ کے ساتھ مباشرت کرے تو بھی جب وہ بچہ دیدے "ام ولد" بن جاتی ہے۔ اب اس کی فروخت ممنوع ہو جاتی ہے۔ اور مالک کی وفات کے بعد وہ آزاد ہو جاتی ہے۔ نیز اگر مالک اپنی لونڈی کے بچے کے نسب کا اعتراف کرلے تو وہ بھی آزاد تصور ہوتا ہے۔ اور یہ اعتراف بالعموم لوگ کرتے ہیں۔

لہٰذا غلام عورتوں کی آزادی کیلئے اسلام نے جو مختلف تدابیر (Devices) وضع کی ہیں' ان میں سے اپنی لونڈی کے ساتھ نکاح اور ہم بستری بھی ان کی آزادی کا ایک طریقہ ہے۔ البتہ بعض اوقات بغیر نکاح کے مملوکہ کے ساتھ ہم بستری کا فعل دل کو کھٹکتا ہے۔ لیکن ہمیں یہ حقیقت پیش نظر رکھنا چاہئے کہ غلامی کا مسئلہ ایک اجتماعی ضرورت تھی اور اب بھی ہے۔ جیسا کہ ہم نے اس سے قبل بیان کیا کہ اسلامی حکومت کا ایک سربراہ' جو شریعت کا نافذ کرنے والا ہو وہ اگر اعلان جنگ کردیتا ہے تو اس صورت میں قید میں آنیوالی عورتوں کا غلام ہونا جس طرح ایک اجتماعی اور بین الاقوامی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح ان عورتوں کے ساتھ ہم بستری کرنا بھی ایک اجتماعی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لئے کہ اسلامی کیمپ سے آزاد عورتیں جو دشمن کی غلامی میں جاتی تھیں ان کا انجام ان عورتوں سے برا ہوتا تھا جو کفار کے کیمپ سے گرفتار ہو کر اسلامی کیمپ میں آتی تھیں۔

پھر یہ بات بھی ہمارے پیش نظر رہنی چاہئے کہ ان گرفتار ہونیوالی عورتوں کے بھی تو کچھ فطری مطالبات اور خواہشات ہوا کرتی ہیں۔ اور ان خواہشات اور میلانات کا مدنظر رکھنا بھی ضروری ہے۔ اور اسلام جیسا واقعیت پسند نظام زندگی ان حقیقی فطری جذبات کو ہرگز نظرانداز نہیں کرسکتا۔ اس لئے کہ یہ نظام ہی بذات خود فطری اصولوں پر استوار ہے۔ اب عورت' اسیر عورت کے ان فطری خواہشات کو پورے کرنے کے طریقے یا تو یہ ہوسکتے ہیں کہ ان کو مالک یا غیر مالک کے نکاح میں دیدیا جائے یا مالک کو اگر ضرورت ہو تو وہ مملوکہ کے ساتھ ہم بستری کرے۔ جب تک غلامی کا نظام قائم ہو یا ان کو آزادانہ اجازت دیدی جائے کہ وہ جہاں چاہیں جنسی خواہش پوری کریں۔ اس آخری صورت میں پورے اسلامی معاشرے میں جنسی انارکی اور جنسی بے راہ روی کے پھیلنے اور عام ہونے کا خطرہ لازماً موجود ہوگا اور اس صورت میں جنسی تعلقات پر کوئی ضابطہ نافذ نہیں ہوسکے گا۔ اس لئے کہ اس طرح انہیں جسم فروشی اور جنسی دوستی کی مکمل آزادی ہوگی۔

اور یہ صورت حال دور جاہلیت میں 'اسلام سے قبل عملاً موجود تھی۔

قرن اول کے بعد اسلامی تاریخ کے بعض ادوار میں لونڈیوں کی جو کثرت رہی۔ لونڈی کی یہ فوج خریداری' بردہ فروشی اور اغوا کے ذریعہ پیدا کی گئی۔ انہیں بڑے بڑے محلات میں جمع کیا گیا۔ اور انہیں حیوانی جنسی تلذذ کا ذریعہ بنایا گیا۔ اور ان لونڈیوں کے غولوں میں رنگین راتیں بسر ہوتی رہیں' رقص و سرود اور ناؤ و نوش کے بازار گرم رہے اور اسلامی تاریخ میں بعض لوگوں نے اس کی حقیقت پسندانہ تصویر کشی کی اور بعض نے اس میدان میں مبالغہ آرائی سے کام لیا تو یہ سب کچھ اسلام نہ تھا' نہ یہ اسلام کا کوئی کارنامہ تھا' نہ اسلام نے کسی کو ایسی کوئی ہدایات دی تھی۔ اور نہ یہ بات درست ہوگی کہ اس قسم کے واقعات کو اسلام کے کھاتے میں ڈالا جائے۔ اور نہ اس بات کی اجازت دی جاسکتی ہے کہ ان واقعات کو اسلام کی حقیقی تاریخ کا حصہ قرار دیا جائے۔

اسلامی تاریخ کا حصہ وہ واقعات ہوں گے جو اسلامی نظریۂ حیات اسلامی تصور زندگی' اور اسلامی اقدار اور پیمانوں کے مطابق روبعمل لائے جائیں۔ رہے وہ واقعات جو ان معاشروں میں روبعمل لائے گئے جو اپنی نسبت اسلام کی طرف کرتے رہے ہیں اور جو اسلامی اصول و مبادی کے مطابق نہیں تھے' تو یہ بات بالکل قرین انصاف نہ ہوگی کہ ان واقعات کو اسلام کے کھاتے میں ڈالا جائے۔ اس لئے کہ یہ واقعات تو در پیش اس لئے ہوئے کہ لوگوں نے اسلامی نظام زندگی سے انحراف کیا۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام 'مسلمانوں کی زندگی سے باہر اپنا ایک ڈھانچہ رکھتا ہے۔ اور ہر دور میں اسلام کا اپنا ڈھانچہ رہا ہے۔ اس لئے کہ مسلمانوں نے اسلامی نقشہ یا ڈھانچہ تیار نہیں کیا بلکہ یہ اسلامی نظام زندگی کا نقشہ ہے جس نے دنیا میں مسلمان تیار کئے ہیں اور مسلمانوں کی ایک سوسائٹی وجود میں آئی ہے۔ اسلام اصل ہے اور مسلمان اس کیلئے فرع کا درجہ رکھتے ہیں۔ اسلام کے پیدا کرنے سے مسلمان پیدا ہوئے ہیں۔ اس لئے اسلام وہ نہیں ہے جسے لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ اسلام ہے۔ نہ اسلام وہ افعال و اعمال ہیں جن کا ارتکاب اہل اسلام کرتے ہیں۔ بلکہ لوگوں کے وہی افعال و اطوار اسلام ہوں گے جو اسلامی اصول حیات اور اسلام تصور حیات کے مطابق ہوں گے۔ اور اصل ڈھانچہ اصولی اسلام ہے۔ جس کے مطابق ہم لوگوں کی عملی زندگی کو پرکھیں گے کہ وہ کس قدر اسلام کے مطابق ہے اور کس قدر اسلام کے خلاف ہے۔

لیکن دنیا میں چلنے والے دو نظامہائے زندگی جو انسانوں کے اپنے نظریات کی اساس پر بنائے جاتے ہیں یا ان کی اساس خود انسان کے بنائے ہوئے مذاہب پر ہوتی ہے' ان کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ اس لئے کہ جب یہ لوگ اسلام کو چھوڑ کر از سرنو جاہلیت میں داخل ہو جاتے ہیں تو یہ لوگ گویا اللہ کا انکار کر دیتے ہیں اگرچہ ان کا دعویٰ یہ ہو کہ وہ اللہ کے ماننے والے ہیں۔ اس لئے کہ اللہ پر ایمان لانے کا پہلا مظاہرہ یہ ہوتا ہے کہ ایک مومن اپنا اجتماعی نظام اسلامی منہاج سے اخذ کرے اور اسے اسلامی شریعت پر استوار کرے۔ اس عظیم اصولی قاعدے کے بغیر ایمان کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ یہ اس لئے کہ اس صورت میں لوگوں کے نزدیک تغیر پذیر مفاہیم اور بدلتے ہوئے اوضاع و اطوار کی تشکیل ہی ان مذاہب اور نظریات کا تعین کرتی ہے جس پر ان لوگوں کا ایمان ہوتا ہے۔ اور جسے وہ لوگ عملاً اپنی زندگیوں میں نافذ کرتے ہیں۔

رہی صورت حال اسلامی نظام حیات کی تو اسلامی نظام کو لوگوں نے خود اپنے لئے وضع نہیں کیا ہے۔ اس کی تشکیل اور تشریح رب الناس نے ان کیلئے کی ہے جو ان کا خالق بھی ہے' مالک بھی ہے اور رازق بھی ہے۔ تو اس نظام میں لوگ یا تو اس کی اطاعت کریں گے اور اپنے اوضاع و اطوار کو اس کے مطابق استوار کریں گے تو ان لوگوں کے شب و روز اسلامی تاریخ کے شب و روز ہوں گے۔ یا صورت حال یہ ہوگی کہ وہ اس سے انحراف کریں گے یا کلیتاً اسے ترک کریں گے تو اس صورت میں ان کے شب و روز اسلامی تاریخ کا حصہ

تصور نہ ہوں گے ۔ اسے اسلامی تاریخ سے انحراف تصور کیا جائے گا۔

اسلامی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہوئے اسی نقطہ نظر کا لحاظ رکھنا اشد ضروری ہے ۔ اسی نقطۂ نظر سے اسلام کے تاریخی تصور کو سمجھا جاسکتا ہے ۔ اسلام کا تاریخی تصور تمام دوسرے تاریخی تصورات سے مختلف ہے ۔ اس لئے کہ دوسری سوسائٹیوں کے نظریات میں ان سوسائٹیوں کی عملی صورت حال کو بھی پیش نظر رکھا جاتا ہے ۔ اور اسے کسی نظریہ اور مذہب کی عملی تعبیر تصور کیا جاتا ہے ۔ اس عملی مظہر کے مطابق پھر اس مذہب یا نظریہ کے اندر نرمی اور تبدیلی پر بحث کی جاتی ہے ۔ یعنی نظریہ پر بحث اس سوسائٹی کو پیش نظر رکھ کر کی جاتی ہے ۔ جو سوسائٹی اس نظریہ ایمان رکھنے کا دعویٰ کرتی ہے ۔ اور اس سوسائٹی کے اندر اس نظریہ کی بابت جو فکری تغیرات ہوتے ہیں اس پر بحث کی جاتی ہے ۔ اس کے بعد یہ لوگ اس منہاج بحث کو اسلامی نظام کے مطالعہ پر بھی منطبق کرتے ہیں حالانکہ اسلام کی اپنی منفرد نوعیت کی وجہ سے یہ منہاج بحث اس پر چسپاں نہیں ہوتا ۔ اس لئے اس منہاج پر اسلام کا مطالعہ کرنیوالے اسلام کے حقیقی مفہوم کے تعین میں خطرناک غلطیاں کرتے ہیں ۔

آخر میں اس آیت میں ان تمام انتظامات کی حکمت عملی کی وضاحت کر دی جاتی ہے کہ یہ تمام انتظامات اس لئے کئے جا رہے ہیں کہ تم ظلم و زیادتی کے ارتکاب سے بچ سکو ذٰلِکَ اَدۡنٰۤی اَلَّا تَعُوۡلُوۡا........................ "بے انصافی سے بچنے کیلئے یہ زیادہ قرین صواب ہے ۔" یعنی یہ کہ اگر تم انصاف نہیں کر سکتے تو ان یتیم بچیوں کو اپنے نکاح میں لینے سے باز رہو اور دوسری عورتوں سے نکاح کر لو ۔ دو دو' تین تین اور چار چار ۔ اور اگر عدل ممکن نہ ہو تو فقط ایک پر اکتفا کرو ۔ یا اپنی مملوکہ عورتوں پر اکتفاء کرو ۔ یہی صورت اس کے قریب ہے کہ تم بے انصافی سے بچو' اور ظلم نہ کر سکو ۔

اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر معاملے میں عدل و انصاف کی تلاش اسلامی نظام زندگی کا نصب العین ہے اور اسلام کی جزئیات میں سے ہر جزء میں عدل مطلوب ہے ۔ اور ایک خاندان جس کے اندر اس کے تمام افراد رہائش پذیر ہوتے ہیں' اس کے اندر عدل و انصاف کا قیام دوسرے مقامات کے مقابلے میں زیادہ ضروری ہے ۔ اس لئے کہ کسی سوسائٹی کی تعمیر اور کسی اجتماعی نظام کی تشکیل میں خاندان حیثیت اول کی حیثیت رکھتا ہے ۔ خاندان اجتماعی زندگی کا نقطۂ آغاز ہے ۔ قوموں کی تربیت خاندان کے قالب میں ہوتی ہے ۔ یہاں انسانوں کی شخصیات کی تشکیل ہوتی ہے اور اسی میں رنگ بھرا جاتا ہے ۔ اگر خاندانی نظام کی بنیاد عدل و انصاف اور اخوت و محبت پر نہ ہو تو پھر پورے معاشرے میں عدل و انصاف قائم نہ ہو سکے گا ۔[1]

○.....☆☆☆.....○

اسی مناسبت سے یہاں عورتوں کے بعض دوسرے حقوق بیان کر دیئے جاتے ہیں ۔ اس لئے کہ اس سورت کے آغاز میں ان کا ذکر خصوصیت سے ہوا تھا' اس سورت کا نام بھی نساء رکھا گیا تھا ۔ اس لئے یتیم عورتوں کی بابت بات ختم کرنے سے پہلے بعض حقوق کا بیان مناسب تھا ۔

وَ اٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحۡلَةً ؕ فَاِنۡ طِبۡنَ لَكُمۡ عَنۡ شَىۡءٍ مِّنۡهُ نَفۡسًا فَكُلُوۡهُ هَنِيۡٓـئًا مَّرِیۡٓـئًا ۝۴

۱ ۔ دیکھئے میری کتاب "السلام العالمی والاسلام" کی فصل "سلام البیت"۔

"اور عورتوں کے مہر خوشدلی کے ساتھ (فرض جانتے ہوئے) ادا کرو' البتہ اگر وہ خود اپنی خوشی سے مہر کا کوئی حصہ تمہیں معاف کر دیں تو اسے تم مزے سے کھا سکتے ہو۔"

یہ آیت عورت کے لئے ایک واضح حق (Right) کی بنیاد رکھتی ہے جو اس کا ذاتی حق ہے۔ یعنی اس کا مہر' اس میں اس بات کی طرف اشارہ ملتا ہے کہ دور جاہلیت میں عورت کے اس حق کو مختلف حیلوں بہانوں سے مارا جاتا تھا۔ ایک صورت یہ تھی کہ عورت کا ولی اس مہر کو لے لیتا اور پھر اسے وہ خود استعمال کرتا۔ اسی طرح جس طرح ایک شخص کوئی چیز فروخت کر کے زر ثمن وصول کرتا ہے۔ ایک صورت اس حق کو مارنے کی نکاح شغار کی صورت میں تھی۔ کہ ایک ولی الامر اپنی زیر تولیت لڑکی دوسرے شخص کو نکاح کر کے دیتا ہے۔ اور اس کے مقابلے میں دوسرا ولی الامر اپنی تولیت میں پائی جانے والی کسی لڑکی کا نکاح پہلے ولی کا کسی رشتہ دار سے کر دیتا۔ یعنی لڑکی کے مقابلے میں لڑکی آجاتی۔ یہ سودا دو اولیاء کے درمیان ہوتا اور اس سے ان دو لڑکیوں کو کچھ نہ ملتا۔ جس طرح دو مویشیوں کو آپس میں تبادلہ کر دیا جاتا ہے۔ اسلام نے نکاح شغار کو بالکل منع کر دیا۔ اور یہ حکم دیا کہ نکاح صرف اسی صورت میں ہو کہ دونوں فریق براہ راست اس پر رضامند ہوں اور اپنے اختیار سے معاملہ کریں۔ اور یہ کہ مہر صرف عورت کا حق ہے۔ وہ خود اسے وصول کرے گی۔ اس کے ولی کو وصول کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ اسلام نے مہر کے تعین کو لازمی قرار دیا ہے تاکہ عورت اسے اپنے قبضہ میں لے سکے۔ کیونکہ یہ اس کیلئے ایک فریضہ ہے۔ یہ ایک لازمی اور واجبی حق ہے جو کسی طرح بھی منسوخ یا معطل نہیں ہو سکتا۔ یہ لازمی کیا گیا کہ مرد اس حق کو خوشدلی کے ساتھ ادا کرے۔ اور اسے اس طرح دلی آمادگی سے ادا کرے۔ جس طرح شخص ہبہ صرف اپنی دلی رضامندی سے دیتا ہے یعنی ہے تو فرض لیکن اسے اس طرح طیب نفس اور خوشی سے ادا کیا جائے کہ گویا فرض نہیں ہے یہ ہبہ ہے۔ ہاں ادائیگی کے بعد اگر عورت اپنی مکمل رضامندی اور خوشدلی کے ساتھ یہ پوار مہر یا اس کا کوئی حصہ اپنے شوہر کو لوٹا دیتی ہے تو وہ اس معاملے میں پوری طرح آزاد ہے۔ وہ بھی جو واپس کرے وہ بھی مکمل آزادی اور طیب خاطر کے ساتھ ہو' کوئی جبر نہ ہو۔ اس صورت میں مرد کیلئے بھی اس مہر کا کھانا حلال ہے۔ بلکہ وہ اسے مزے سے کھا سکتا ہے۔ بغیر کسی قلبی خلجان کے۔ غرض زوجین کے درمیان تعلقات مکمل رضامندی کے ساتھ ہونے چاہئیں۔ فریقین مکمل طور پر مختار خود ہوں' وہ ایک دوسرے کے ساتھ جو معاملہ کریں دلی خوشی اور آزادی کے ساتھ کریں۔ اور محبت تو چیز ہی ایسی ہے جس میں کسی جہت سے بھی کدورت نہیں ہونی چاہئے۔

اس طرح اسلامی نظام حیات نے آثار جاہلیت میں سے ایک اور اثر کو ختم کر دیا۔ جو عورت کے مہر کے بارے میں عرب معاشرہ میں مروج تھا۔ اور عورت کیلئے اس کی ذات اور اس کے مہر و مال کے بارے میں مکمل حقوق (Rights) بحال کر دیئے گئے۔ اس طرح اس کی عزت و قار کو بحال کیا گیا۔ لیکن ان قانونی حقوق کی بحالی کے ساتھ ساتھ زن و شو کے باہمی تعلقات کو خشک قانونی پیمانوں کے حوالے بھی نہیں کر دیا گیا۔ اور اس سلسلے میں رضامندی' محبت اور باہم فیاضی کے راستے بھی کھلے رکھے گئے ہیں۔ اس لئے کہ میاں بیوی نے مشترکہ طور پر زندگی گزارنی ہے۔ اور اس بات کی ضرورت ہے کہ ان تعلقات کو خشک قانونی فضا سے نکال کر باہم محبت اور برو احسان کی شبنم سے تروتازہ رکھا جائے۔

○.....☆☆☆.....○

جب یہ موضوع یہاں ختم ہوتا ہے تو بات سے بات نکلتی چلی جاتی ہے۔ چونکہ اس بات کی ضرورت محسوس کی گئی تھی کہ یتیم عورتوں کے ساتھ عام عورتوں کی بات بھی ہو جائے۔ اب یہاں یتیموں کے مالی حقوق کا ذکر بھی مناسب تھا۔ مفصلاً حکم دیا جاتا ہے کہ ان کی دولت ان کو لوٹا کر دی جائے۔ جبکہ اس سے پہلے آیت نمبر ۲ میں مجملاً کہا گیا تھا کہ ان کی دولت انہیں دی جائے۔

دولت چاہے یہ یتیموں کی ہو یا بالغ مرد عورتوں کی ہو' یہ ان لوگوں کی انفرادی ملکیت ہونے سے بھی پہلے یہ پوری سوسائٹی کی دولت ہوتی ہے۔ اور کسی سوسائٹی کو جو دولت دی گئی ہوتی ہے' اس دولت پر اس پوری سوسائٹی کا قیام ہوتا ہے۔ اور اس دولت سے' جو اس سوسائٹی میں گردش کرتی ہے' پوری سوسائٹی استفادہ کرتی ہے۔ اور یہ استفادہ اس کے حسن انتظام سے ہوتا ہے۔ گویا تمام دولت کا ابتدائی مالک عام معاشرہ ہوتا ہے اور یتیم اور دوسرے وارث اس کے مالک محض اس لئے بنائے جاتے ہیں کہ وہ اس دولت کو مزید ترقی دیں۔ اور یہ ترقی اجتماعی نظام کی اجازت سے ہو' وہ خود بھی اس سے استفادہ کریں اور سوسائٹی بھی اس سے مستفید ہو۔ یہ ان پرائیویٹ ہاتھوں میں اس وقت تک رہے گی جب تک وہ اسے بڑھانے اور اس میں اضافہ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ اور اسی دولت میں تصرف کرنے اور اس کا انتظام کرنے میں وہ صحیح طرز عمل اختیار کئے ہوئے ہوں۔ اس اجتماعی دائرے کے اندر انفرادی حقوق ملکیت قائم رہیں گے۔ا۔ رہے وہ نادان یتیم جو مالدار ہیں لیکن اپنے مالی انتظامات سے قاصر ہیں اور اسے ترقی نہیں دے سکتے تو ان کے کنٹرول میں ان کی دولت نہ دی جائے گی۔ ان کو ان کے اموال میں تصرف اور اپنے ہاتھ میں لینے اور اپنی نگرانی میں چلانے کے حق سے محروم کر دیا جائے گا۔ اگرچہ ان کی انفرادی ملکیت کا حق ان اموال پر باقی رہتا ہے۔ یہ دولت ان سے چھین لینے کی اجازت نہیں ہے۔ صرف اسی دولت کو سوسائٹی کے ان افراد کی تحویل میں دیدیا جائے گا جو ان میں اچھا تصرف کر سکتے ہوں۔ ہاں اس سلسلے میں ان لوگوں کو ترجیح دی جائے گی جو یتیم کے ساتھ قرابت اور رشتہ داری رکھتے ہوں۔ تاکہ خاندانی کفالت کا انتظام بھی ساتھ ساتھ چلتا رہے۔ اس لئے کہ خاندان کے کفالتی نظام ہی کے ذریعہ سوسائٹی کے بڑے خاندان کا کفالتی نظام قائم ہوتا ہے۔ ہاں نادان لوگوں کیلئے ان کے اخراجات اور اچھی طرح گزر بسر کا انتظام ہو گا۔

وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِىْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيٰمًا وَّارْزُقُوْهُمْ فِيْهَا وَاكْسُوْهُمْ وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ﴿۵﴾

"اور اپنے وہ مال جنہیں اللہ نے تمہارے لئے قیام زندگی کا ذریعہ بنایا ہے' نادان لوگوں کے حوالے نہ کرو' البتہ انہیں کھانے اور پہننے کیلئے دو اور انہیں نیک ہدایت کرو۔"

نادانی اور دانائی کا پتہ بلوغ کے بعد چل جاتا ہے۔ بالعموم نادان اور دانا کے درمیان تمیز ہو ہی جاتی ہے۔ اس لئے اس بات کی ضرورت نہیں ہوتی کہ قانون کے اندر اس کیلئے کوئی فارمولا وضع کر دیا جائے۔ ہر خاندان اس بات کی تمیز اچھی طرح کر لیتا ہے کہ اس کے اندر نادان کون ہے اور دانا کون ہے۔ اسے اچھی طرح تجربہ ہوتا ہے کہ یہ راشد ہے اور یہ سفیہ ہے۔ نیز سوسائٹی سے بھی کسی شخص کے معاملات اور تصرفات پوشیدہ نہیں ہوتے۔ لہذا جانچ پڑتال اس بات کی ہو گی کہ یتیم بالغ ہو گیا ہے یا نہیں۔ یہاں آیت میں اس بلوغ کی تعبیر لفظ نکاح سے کی گئی ہے۔ کیونکہ آثار بلوغ میں سے نکاح ایک اہم اثر ہوتا ہے۔

وَابْتَلُوا الْيَتٰمٰى حَتّٰٓى اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ ۚ فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْٓا اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ ۚ وَلَا تَاْكُلُوْهَآ اِسْرَافًا وَّبِدَارًا اَنْ يَّكْبَرُوْا ۭ وَمَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ ۚ وَمَنْ

ا۔ تفصیلات کیلئے دیکھئے میری کتاب العدالۃ الاجتماعیہ کی فصل "مالی پالیسی"

كَانَ فَقِيرًا فَلْيَأْكُلْ بِالْمَعْرُوفِ ۚ فَإِذَا دَفَعْتُمْ إِلَيْهِمْ أَمْوَالَهُمْ فَأَشْهِدُوا عَلَيْهِمْ ۚ وَكَفَىٰ بِاللَّهِ حَسِيبًا ﴿٦﴾

"اور یتیموں کی آزمائش کرتے رہو یہاں تک کہ وہ نکاح کے قابل عمر کو پہنچ جائیں۔ پھر اگر تم ان کے اندر اہلیت پاؤ تو ان کے مال ان کے حوالے کر دو۔ ایسا کبھی نہ کرنا کہ حد انصاف سے تجاوز کر کے اسی خوف سے ان کے مال جلدی جلدی کھا جاؤ کہ وہ بڑے ہو کر اپنے حق کا مطالبہ کریں گے۔ یتیم کا جو سرپرست مالدار ہو وہ پرہیزگاری سے کام لے اور جو غریب ہو وہ معروف طریقہ سے کھائے۔ پھر جب ان کے مال ان کے حوالے کرنے لگو تو لوگوں کو اس پر گواہ بنالو' اور حساب لینے کیلئے اللہ کافی ہے۔"

اس آیت پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے یتیموں کو ان کی دولت حوالے کرنے کے سلسلے میں شریعت نے کس قدر سخت کارروائی کی ہے۔ جب وہ بالغ ہو جائیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ شریعت بلوغ اور سیانے ہونے کے بعد جلد از جلد ان کی دولت ان کے حوالے کرنے کیلئے کارروائی کرنے پر زور دیتی ہے۔ یعنی جونہی وہ بالغ ہوں' ان کی دولت ان کے حوالے کی جائے۔ اور یہ دولت پوری کی پوری صحیح سالم ان کے حوالے کی جائے۔ اور جب تک ولی کی حفاظت میں ہو اس کی حفاظت ایمانداری کے ساتھ کی جائے..... اور اسے بے دردی کے ساتھ خرچ نہ کیا جائے۔ اس ڈر سے کہ یتیم بالغ ہونیوالے ہیں اور یہ دولت انہیں لوٹانی ہوگی۔ نیز شریعت کی پالیسی یہ ہے کہ اگر محافظ مالدار ہو تو وہ اس نگرانی اور حفاظت کا کوئی معاوضہ نہ لے اور اگر وہ نادار ہو تو اسے چاہئے کہ معروف طریقے کے مطابق کم سے کم ضرورت کی حد تک کھائے۔ اور شریعت یہ بھی لازمی قرار دیتی ہے کہ جب کسی یتیم کو اس کا مال حوالے کیا جارہا ہو تو اس پر شہادت ضرور قائم کی جائے۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اللہ کی شہادت تو ہر وقوعہ پر قائم ہے اور اللہ کے سامنے جو حساب ہو گا وہ آخری حساب ہو گا

وَكَفَىٰ بِاللَّهِ حَسِيبًا ﴿٦﴾ .... "اور حساب لینے کیلئے اللہ کافی ہے۔"

یہ تمام تشدید و تاکید اور تمام تفصیلات و تشریحات اور یہ تمام تنبیہات و تذکیرات اس حقیقت کی مظہر ہیں کہ جس معاشرے میں اسلامی نظام نافذ ہوا۔ اس میں ہر طرف یتیموں کی حق تلفی ہو رہی تھی۔ یتیموں کے علاوہ دوسرے کمزوروں کے مال بھی کھائے جاتے تھے۔ اس لئے کہ اس رسم و رواج کو ختم کرنے کیلئے اس قدر تاکید و تشدید کی ضرورت پیش آئی۔ اور جزوی تفصیلات کو قرآن کریم کے اندر قلم بند کرنے کی ضرورت لاحق ہوئی۔ تاکہ آئندہ لوگ قانونی حیلوں اور بہانوں سے کام لیکر قانون شکنی نہ کر سکیں۔ اور قانون سے بچنے کی کوئی راہ کھلی نہ رہے۔

اس طرح اسلامی نظام حیات مسلمانوں کی فکری اور عملی دنیا سے جاہلیت کے ایک ایک نشان مٹاتا رہا اور اس کی جگہ اسلامی جھنڈے گاڑتا رہا۔ جاہلیت کے آثار مٹائے جاتے رہے اور معاشرے کے چہرے کو ان بدنما داغوں سے صاف کیا جاتا رہا۔ اور ان کی جگہ اسلام کے خوبصورت خدوخال ظاہر ہوتے رہے۔ اور یوں ایک جدید معاشرہ ڈھلتا رہا۔ جدید معاشرے کی رسوم اور روایات قائم ہوتی چلی گئیں۔ اس کے اصول و ضوابط اور قوانین و احکام نازل ہوتے رہے۔ اور یہ سب کچھ خدا خوفی کی فضا میں اور اللہ تعالیٰ کی نگرانی میں ہوتا رہا۔ اور اسلامی قانون اور اسلامی احکام کے نفاذ کی آخری گارنٹی ذات باری کے خوف اور رضامندی کو قرار دیا جاتا رہا...... حقیقت یہ ہے کہ خدا خوفی' خدا کی رضامندی اور اللہ کی نگرانی کے تصور کے سوا' اس دنیا میں کسی بھی قانونی نظام کی استواری اور چلت کی کوئی گارنٹی نہیں ہے۔ اصل مدار اس پر ہے کہ وَكَفَىٰ بِاللَّهِ حَسِيبًا .... "اور حساب لینے کیلئے اللہ کافی ہے۔"

○.....☆☆☆.....○

جاہلیت کی رسم یہ تھی کہ وہ لڑکیوں اور بچوں کو وراثت نہ دیتے تھے۔ عام رواج یہی تھا۔ البتہ بعض جگہوں پر اس کے خلاف بھی تھا مگر شاذ۔ اس کی وجہ ان کے نزدیک یہ تھی کہ یہ لوگ گھوڑے پر سوار نہیں ہوتے تھے۔ دشمن کے مقابلے میں شریک نہ ہوتے تھے۔ گویا اصل مدار جنگ پر تھا۔ اسلامی نظام قانون نے میراث کو قرابت کے اصول پر استوار کیا۔ جو تقسیم میراث کا حقیقی سبب تھا۔ ہاں جس طرح قرابت کے مختلف درجے ہوتے ہیں۔ اسی طرح اقرباء کے حصص اور فرائض میں بھی فرق ہے۔ جیسا کہ بعد میں تفصیلات آرہی ہیں۔ نظام میراث کو اسلام نے نظام قرابت پر اس لئے استوار کیا کہ اسلام اجتماعی تکافل کے نظام کی اکائی ایک خاندان کو قرار دیتا ہے۔ وہ سب سے پہلے ایک خاندان کے افراد کے درمیان باہم کفالت کا نظام قائم کرتا ہے۔ اور یہ خاندانی نظام بھی اجتماعی کفالتی نظام کے فریم ورک کے اندر ہوتا ہے۔ نیز اس اصول کے تحت کہ حقوق ذمہ داریوں کی نسبت سے متعین ہوتے ہیں تو اس طرح قریبی رشتہ داروں پر خاندان کے کسی غریب فرد کی بابت اس کی قرابت کے اعتبار سے ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ مثلاً قتل میں دیت کی ادائیگی بھی قرابت اور رشتہ داری کے اصول پر ہوتی ہے۔ نیز زخموں کی مرہم پٹی کی ادائیگی بھی قرابت کے اصول پر ہوا کرتی ہے۔ اس لئے پھر انصاف کا تقاضا ہے کہ اگر کوئی رشتہ دار فوت ہو جائے اور اس کا ترکہ رہ جائے تو اسے اصول قرابت پر تقسیم کیا جائے۔ کیونکہ اسلامی نظام زندگی ایک مکمل اور باہم متناسق نظام ہے۔ اور اس کی یہ ہمہ گیری اور ہم آہنگی اس وقت اچھی طرح ظاہر ہوتی ہے جب اس کے اندر حقوق و فرائض متعین ہوتے ہیں۔

غرض میراث کی تقسیم میں شریعت نے عموماً ان قریبی ذمہ داریوں کو ملحوظ رکھا ہے۔ بعض لوگ اس قانون کے اصول تقسیم پر نکتہ چینیاں کرتے ہیں' یہ حرکت وہ اس لئے کرتے ہیں کہ درحقیقت ذات باری کی شان میں گستاخی کیلئے تیار ہیں۔ حالانکہ خود ان کا حال یہ ہے کہ وہ خود ذات انسانی سے بھی اچھی طرح واقف نہیں ہیں۔ اور نہ وہ انسانی زندگی کے مختلف احوال کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اسلام کے نظام میراث کی اساس جن اصولوں پر رکھی گئی ہے اگر یہ لوگ ان کا اچھی طرح ادراک کرلیں تو یہ ہرگز یہ جسارت نہ کریں۔

اسلامی نظام میراث کا اصل الاصول سوشل سیکورٹی ہے۔ اس کفالتی نظام کو شریعت نے ان اصولوں پر استوار کیا ہے۔ جو نہایت ہی مستحکم ہیں اور ان اصولوں کو وضع کرتے وقت اسلام نے نفس انسانی کے فطری رجحانات کو بھی مدنظر رکھا ہے۔ اور یہ وہ رجحانات ہیں جن کا خالق اللہ ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے فطرت انسانی کے اندر ان رجحانات کو عبث طور پر پیدا نہیں کیا ہے۔ یہ فطری میلانات انسانی زندگی کے ارتقاء و بقا میں اہم رول ادا کرتے ہیں۔

ایک خاندان کے اندر قریبی یا دور کے رشتوں کے جو رابطے ہوتے ہیں' وہ چونکہ فطری روابط ہوتے ہیں اور نہایت ہی حقیقی روابط ہوتے ہیں اور وہ ایسے رابطے ہوتے ہیں' جن کی تخلیق کسی ایک نسل یا سوسائٹی نے نہیں کی ہے۔ اور نہ ہی ان رابطوں کی تخلیق میں پوری انسانی نسلوں کے اتفاق کا کوئی دخل ہے۔ اس لئے ان رابطوں کی حقیقت پسندی' ان کی گہرائی انسانی زندگی کے بجائے' اس کی ترقی اور اس کی سربلندی میں ان رابطوں کی اہمیت کا کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ اور اگر کوئی ان حقیقی رابطوں کی اہمیت کا انکار کرتا ہے تو ان کلیہ انکار نظرانداز کرنے کا مستحق ہے۔ اس لئے اسلام نے اپنے کفالتی نظام کی اکائی ایک خاندان کے کفالتی نظام کو قرار دیا ہے۔ اور اس کفالتی یونٹ کو پھر اپنے اجتماعی اور ملکی کفالتی نظام کا سنگ میل قرار دیا ہے۔ اسلام نے نظام میراث کو اس خاندانی کفالتی نظام کا ایک مظہر اور علامت قرار دیا ہے۔ جبکہ اقتصادی اور اجتماعی نظام معیشت و سیاست میں اس کے اور مفید اثرات بھی اپنی جگہ مسلم ہیں۔

اگر کسی شخص کے تکافل میں یہ پہلا قدم کامیاب نہیں ہوتا اور خاندان کسی شخص کی کفالت میں ناکام ہو جاتا ہے تو پھر مقامی مسلم سوسائٹی سامنے آتی ہے اور وہ اس شخص کی کفالت کرتی ہے۔ اور اگر محلہ اور مقامی سوسائٹی بھی ناکام رہیں تو اس کے بعد اسلامی حکومت ان

تمام لوگوں کی کفالت کی ذمہ دار ہے جو خود اپنا انتظام نہیں کر سکتے۔ اس انتظام کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ تمام نادار لوگوں کا انتظام کرنا صرف حکومت کے نظم و نسق کے کاندھوں پر یکدم نہیں پڑتا۔ یہ انتظام اس لئے کیا گیا ہے کہ ایک خاندان اور ایک محدود سوسائٹی کے اندر باہم تکافل کے انتظام کے نتیجے میں افراد معاشرہ کے دلوں میں باہم دگر محبت' لطف و کرم اور رحم اور ہمدردی کے جذبات پیدا ہوتے ہیں اور ان جذبات کی وجہ سے لوگوں کے درمیان باہم تعاون اور ہمدردی کے فطری فضائل اخلاق پروان چڑھتے ہیں اور یہ بالکل حقیقی ہوتے ہیں۔ ان میں کوئی بناوٹ نہیں ہوتی۔ اس خاندانی کفالت کے علاوہ بھی رشتہ داروں کی امداد اور ہمدردی کے جذبات رکھنا ایک ایسا انسانی فعل ہے جسے ایک بدفطرت اور گھٹیا درجے کا خبیث شخص ہی نظر انداز کر سکتا ہے۔ ایک خاندان کے اندر کفالت کرنا تو ایک ایسا فعل ہے جس کے انسانی فطرت اور مزاج پر بہت ہی مفید اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ جو عین فطرت کے مطابق ہوتے ہیں۔ ایک شخص کا یہ شعور کہ اس کی شخصی جدوجہد اس کے تمام رشتہ داروں کیلئے مفید عمل ہے۔ خصوصاً اس کی اپنی اولاد کیلئے' تو اس شعور کی وجہ سے اس کی قوت عمل دوچند ہو جاتی ہے۔ اسی طرح ایک شخصی جدوجہد بالواسطہ پورے معاشرے کیلئے مفید ثابت ہوتی ہے۔ اس لئے کہ اسلامی نظام حیات میں فرد اور جماعت کے درمیان فاصلے نہیں رکھے جاتے۔ ا۔ اس لئے کہ فرد کی تمام ملکیت بھی دراصل پورے معاشرے کی ملکیت ہوتی ہے۔ اگر معاشرے کو اس کی ضرورت پڑے۔

اس آخری اصول کی روشنی میں اسلامی نظام وراثت پر کئے جانے والے وہ تمام اعتراضات زائل ہو جاتے ہیں' جن میں یہ کہا گیا ہے کہ یہ نظام ان لوگوں کو بھی وراثت منتقل کر دیتا ہے جنہوں نے اس کیلئے کوئی جدوجہد نہیں کی ہوتی۔ اس لئے کہ یہ وارث درحقیقت مورث منہ کا تسلسل ہوتا ہے اور اگر یہی مورث منہ محتاج ہوتا اور یہ وارث مالدار ہوتا تو اپنے اسلامی اور معاشرتی فرائض کے تحت وہ اس کی کفالت کرتا۔ اور ان امور کے بعد یہ قاعدہ اپنی جگہ مسلم ہے کہ یہ دولت جس کے پاس بھی ہو اور جس طرح بھی تقسیم ہو یہ پورے معاشرے کی اجتماعی دولت ہے اور اسے اجتماعی ضروریات کیلئے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ ۲۔

ان امور کے علاوہ وارث اور مورث کے درمیان جو رابطہ ہوتا ہے خصوصاً مورث اور اس کی اولاد کے درمیان وہ صرف مالی رابطہ نہیں ہوتا۔ اگر ہم وارث اور مورث کے درمیان مالی مفادات کو از روئے قانون کاٹ بھی دیں تو بھی ان کے درمیان جو خونی رشتے موجود ہیں اور جو دوسرے رشتے موجود ہیں وہ کاٹے سے نہیں کٹتے۔

آباؤ اجداد اور دوسرے رشتہ دار اپنے بچوں' پوتوں اور رشتہ داروں کو صرف مالی وراثت ہی منتقل نہیں کرتے' بلکہ وہ اپنی اچھی صلاحیتیں اچھی عادات' بری عادات اور کمزوریاں بھی منتقل کرتے ہیں۔ اس طرح وہ اپنے بچوں اور پوتوں کی طرف بعض موروثی بیماریاں بھی منتقل کرتے ہیں اور اگر وہ صحت مند ہیں تو اپنی صحت مندی بھی وراثت میں دیتے ہیں۔ اسی طرح ایک شخص کے حسن اخلاق و بداخلاقی اس کی اچھائیاں اور برائیاں اور ذکاوت اور غبی ہونا بھی وراثتاً" منتقل ہوتا ہے۔ اور یہ تمام صفات وارثوں کی طرف منتقل ہو کر ہمیشہ کیلئے ان کی زندگی پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ اور ان کے نتائج ان وارثوں کو بھگتنے پڑتے ہیں۔ اس لئے انصاف کا تقاضا یہی ہے کہ مورث کا مال اگر کوئی ہے تو وہ بھی وارثوں کی طرف منتقل ہو۔ اس لئے کہ اگر ہم کسی شخص کا مال اس کے وارثوں کو نہیں دیتے تو ہمارا فرض ہے کہ ہم وارثوں کو موروثی بیماریوں' اخلاقی کمزوریوں' بدعملی اور ذہنی اور جسمانی کمزوریوں سے بھی نجات دلائیں اور یہ اس وقت بھی ممکن نہیں جب ہم اپنے پورے وسائل اس کام میں لگا دیں۔

تفصیلات کیلئے دیکھئے فصل "فرد اور معاشرہ" کتاب الانسان بین المادیۃ والاسلام۔ مصنفہ محمد قطب اور مصنف کی کتاب العدالۃ الاجتماعیہ فی الاسلام' فصل اجتماعی تکافل اور مالی پالیسی اور میری کتاب "دراسات اسلامیہ۔" ۲۔ ایضاً ۳۔ ایضاً۔

انسانی زندگی کے ان فطری اور واقعاتی حقائق کی وجہ سے اور ان تمام دوسری حکمتوں کی وجہ سے جو شریعت الٰہیہ میں پوشیدہ ہوتی ہیں' اللہ تعالیٰ نے میراث کی تقسیم کا یہ موجودہ نظام وضع فرمایا ہے۔ ۳۔ فرماتے ہیں۔

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ أَوْ كَثُرَ ۚ نَصِيبًا مَّفْرُوضًا ﴿٧﴾

"مردوں کیلئے اس مال میں حصہ ہے جو ماں باپ اور رشتہ داروں نے چھوڑا ہو' اور عورتوں کیلئے بھی اس مال میں حصہ ہے جو ماں باپ اور رشتہ داروں نے چھوڑا ہو' خواہ تھوڑا ہو یا بہت' اور یہ حصہ (اللہ کی طرف سے) مقرر ہے۔"

یہ وہ عام اصول ہے جس کی رو سے اسلام نے آج سے پورے چودہ سو سال قبل عورتوں کو وہ حقوق دیئے جو اس وقت مردوں کو حاصل تھے۔ یہ فیصلہ اصولی فیصلہ تھا۔ جس طرح یتیموں کے حقوق کا تحفظ کیا گیا تھا' جبکہ اس وقت کے معاشرے میں عموماً چھوٹوں اور یتیموں کے حقوق مارے جاتے تھے۔ اور یہ حقوق اس لئے مارے جاتے تھے کہ ایام جاہلیت میں انسانوں کی قدر و قیمت کا تعین انسانی لحاظ سے نہیں بلکہ اس کا تعین اس لحاظ سے کیا جاتا تھا کہ پیداواری عمل میں وہ کس قدر کام آتے ہیں اور پھر جنگ میں وہ کس قدر وہ کام آتے ہیں۔ ان حالات میں اسلام نے ایک ربانی نظام پیش کیا' جس نے سب سے پہلے انسان کو بحیثیت انسان دیکھا۔ اس لئے کہ انسان کو انسانی حیثیت اس سے کسی حال میں بھی علیحدہ نہیں کی جا سکتی۔ انسانی حیثیت بنیادی حیثیت ہوتی ہے اور ایک خاندان کے اندر یا ایک سوسائٹی کے اندر تمام دوسری حیثیات کا لحاظ اس کے بعد آتا ہے۔

○.....☆☆☆.....○

جیسا کہ بعد میں تفصیلات ناظرین کے سامنے آ رہی ہیں' اسلام کے قانون میراث میں بعض رشتہ داروں کی موجودگی سے بعض دوسرے وارث محروم ہو جاتے ہیں۔ وہ رشتہ دار تو ہوتے ہیں لیکن ان کو وراثت میں سے کچھ بھی نہیں ملتا۔ اس لئے کہ ان کے مقابلے میں زیادہ قریبی رشتہ دار ان سے پہلے ہی حق لے لیتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو محجوب کہتے ہیں۔ اس لئے یہاں تقسیم میراث کے وقت ایسے لوگوں کیلئے غیر متعین حق رکھا جاتا ہے۔ جب وہ تقسیم میراث کے وقت موجود بھی ہوں اور مستحق بھی ہوں۔ یہ حق ایسے لوگوں کی دلجوئی کیلئے رکھا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ دیکھیں گے کہ مال تقسیم ہو رہا ہے اور وہ محروم ہیں۔ اس لئے ان کی دلجوئی مطلوب ہے۔ نیز اس سے خاندانی رشتے دار اور رابطے بھی مضبوط ہوں گے اور دلی محبت میں اضافہ ہوگا۔ اسی طرح دوسرے یتیموں' مسکینوں کے بارے میں بھی یہاں مشورہ دیا جاتا ہے کہ تقسیم کنندگان انہیں بھی کچھ ضرور دیں۔

وَإِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ أُولُوا الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينُ فَارْزُقُوهُم مِّنْهُ وَقُولُوا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوفًا ﴿٨﴾

"اور جب تقسیم کے موقع پر کنبہ کے لوگ جمع ہوں اور یتیم اور مسکین آئیں تو اس مال میں سے ان کو بھی کچھ دو اور ان کے ساتھ بھلے مانسوں کی سی بات کرو۔"

اس آیت کے بارے میں علماء سے بہت سے اقوال نقل ہوئے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ آیت منسوخ ہے۔ اور اسے آیت میراث نے منسوخ کر دیا ہے۔ جس میں تمام لوگوں کے حصص مقرر ہو چکے ہیں۔ بعض نے اسے غیر منسوخ اور قائم کہا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ اس کا مفہوم اور مدلول پر عمل کرنا فرض اور واجب ہے۔ بعض نے یہ کہا ہے کہ اس پر عمل کرنا مستحب ہے۔ یہ وارثوں کی مرضی ہے کہ وہ اس پر عمل کریں یا نہ کریں۔ میرے خیال میں اس کے منسوخ ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ بلکہ یہ آیات محکمات میں سے ہیں اور اس پر عمل کرنا واجب ہے۔ اس لئے کہ ایک تو بظاہر یہ مطلق ہے۔ دوسرے یہ کہ اسلامی نظام حیات میں عام کفالت اور بر و احسان کو بہت ہی پسند کیا جاتا ہے۔ بہرحال یہ ایک مستقل مد ہے اور ان حصص کے علاوہ ہے جو آنے والی آیات کے اندر متعین کر دیئے ہیں۔

○.....☆☆☆.....○

اس سے پہلے کہ وارثان کے حصص کا بیان شروع ہو' ایک بار پھر تاکید کی جاتی ہے کہ یتیموں کا مال کھانا بہت ہی خطرناک جرم ہے' یہ دوبارہ تاکید اس لئے کی جاتی ہے کہ اہل ایمان کے دلوں کو ایک دو شدید چٹکیاں بھریں۔ پہلی چٹکی سے ان کے دل کے اندر پوشیدہ پدری شفقت کو جگانا مطلوب ہے۔ بچوں کے ساتھ ہر باپ کو فطری محبت ہوتی ہے۔ خصوصاً جبکہ وہ بہت ہی ضعیف اور ناتوانی کی حالت میں ہوں اور یہ کہ خدا خوفی کا جذبہ ہی بہترین محاسب اور نگران ہوتا ہے اور دوسری چٹکی سے ان کے دلوں میں جذبات خوف اور انجام بد کے ڈر کو جگایا جاتا ہے۔ جہنم کی آگ کا خوف اور یہ یہاں ایک محسوس' مشاہد اور خوفناک انداز میں پیش کیا جاتا ہے۔

وَلْيَخْشَ الَّذِينَ لَوْ تَرَكُوا مِنْ خَلْفِهِمْ ذُرِّيَّةً ضِعَافًا خَافُوا عَلَيْهِمْ فَلْيَتَّقُوا اللَّهَ وَلْيَقُولُوا قَوْلًا سَدِيدًا ﴿٩﴾ إِنَّ الَّذِينَ يَأْكُلُونَ أَمْوَالَ الْيَتَامَىٰ ظُلْمًا إِنَّمَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ نَارًا ۖ وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيرًا ﴿١٠﴾

۱ ع ۱۰ ۱۲

"لوگوں کو اس بات کا خیال کرنے سے ڈرنا چاہئے کہ اگر وہ خود اپنے پیچھے بے بس اولاد چھوڑتے تو مرتے وقت انہیں اپنے بچوں کے حق میں کیسے کچھ اندیشے لاحق ہوتے...... پس چاہئے کہ وہ خدا کا خوف کریں اور راستی کی بات کریں۔ جو لوگ ظلم کے ساتھ یتیموں کا مال کھاتے ہیں در حقیقت وہ اپنے پیٹ آگ سے بھرتے ہیں اور وہ ضرور جہنم کی بھڑکتی ہوئی آگ میں جھونکے جائیں گے۔"

یہ پہلی چٹکی دل کے پردے کو ذبح کرتی ہے۔ ایک حساس محبت سے بھر آنیوالے باپ کے دل کو اپنے چھوٹے اور کمزور بچوں کی نسبت سے یہ تصور دیا جاتا ہے کہ ذرا سوچیں تو سہی' تمہارے چھوٹے بچے ہوں' ناتواں ہوں اور ان پر کوئی ترس کھانے والا نہ ہو اور نہ کوئی ان کا محافظ و نگران ہو۔ جو ان کے سر پر رحم کا ہاتھ پھیرے۔ یہی حالت ان یتیموں کی ہے' جن کی تقدیر تمہارے سپرد ہے۔ ان کے باپوں کا سایہ ان کے سروں سے اٹھ چکا ہے۔ انہیں کیا معلوم ہے کہ کل تم نہ رہو تو خود تمہارے بچے دوسرے زندہ اولیاء کی تولیت میں ہوں جس طرح یہ موجود بچے تمہاری ولایت میں ہیں۔ اس ذبح کے بعد انہیں نصیحت کی جاتی ہے کہ اس تصور کے ساتھ ساتھ ان بچوں کے بارے میں خدا کا خوف ہر وقت دل میں ان کو اور اس کا بدلہ یہ ہوگا کہ کل تمہارے بچوں کا انتظام بھی اللہ ایسے ہی خدا ترس اولیاء کے ذریعے کرانے کا انتظام کرے گا۔ جو خدا خوفی' احتیاط اور محبت سے یہ ڈیوٹی سرانجام دیں گے۔ پھر یہ نصیحت بھی کی جاتی ہے کہ وہ ان یتیموں کے بارے میں سیدھی سیدھی بات کریں۔ یعنی اس تربیت اور نگرانی اور ان کے متاع و اموال کی دیکھ بھال کے دوران۔

اور یہ دوسرا ڈچ کیا ہے؟ نہایت ہی خوفناک' کچھ لوگ ہیں جو دھکتے انگاروں کو اس طرح کھائے جا رہے ہیں جس طرح لقمہ رزق' کیا خوفناک تصویر ہے یہ' آخر کار جہنم میں اور پیٹ میں بھی جہنم' یہ دولت جسے وہ کھا رہے ہیں۔ یتیموں کا مال' گویا وہ آگ کے دھکتے انگارے کھا رہے ہیں۔ مآل کار وہ جہنم رسید ہوں گے۔ وہ ان کے ان معدوں اور ان کی کھال کو بھسم کر کے رکھ دے گی۔ ظاہر میں بھی آگ اور باطن میں آگ۔ مجسمہ آگ جسے پیٹ اور کھال دونوں محسوس کرتے ہیں۔ اس تصویر کو آنکھیں دیکھ رہی ہیں اور اس میں پیٹ اور جسم اور کھال سب جل رہے ہیں۔

قرآن کریم کے اس موثر انداز تعبیر نے صحابہ کرام اور مسلمانوں کے دل و دماغ پر خوب اثر کیا۔ ان نصوص کے موثر اشارات نے اہل ایمان کے دل و دماغ سے جاہلیت کی میل کچیل دھو کر رکھ دی۔ ان کے دلوں کو اس قدر جھنجوڑا کہ جاہلیت کے ہر قسم کے گرد و غبار کو جھاڑ کر رکھ دیا۔ اور اس جگہ ان مومن دلوں کے اندر خدا ترسی' خدا خوفی اور احتیاط و احتساب کے جذبات پیدا کر دیئے اور ان کی حالت یہ ہو گئی کہ انہوں نے یتیموں کے مال کو اچھوت تصور کیا۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ اس مال کے اندر آگ ہے اور یہ تصور ان کے دلوں میں ان آیات پر تاثیرات نے پیدا کر دیا تھا۔ انکی حالت یہ ہو گئی کہ وہ اموال یتامیٰ کو چھونا تک گوارا نہ کرتے تھے۔ اور ان اموال سے اس طرح دور بھاگتے تھے جیسے لومڑی ڈر کے مارے بھاگتی ہے۔

عطاء ابن سائب کے واسطہ سے سعید ابن جبیر نے حضرت ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے۔ فرماتے ہیں جب یہ آیت نازل ہوئی اِنَّ الَّذِيْنَ يَأْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا .... تو جن لوگوں کے پاس یتیم تھے' انہوں نے ان کا کھانا پکانا جدا کر دیا۔ ان کا کھانا پینا علیحدہ کر دیا گیا۔ بعض اوقات ان کے کھانے پینے سے کچھ چیز بچ جاتی تھی تو وہ ان کیلئے چھوڑ دی جاتی تھی کہ یا تو وہ دوسرے وقت کھائیں یا وہ چیز خراب ہو جاتی۔ یہ معاملہ ان کیلئے تکلیف کا باعث بن گیا۔ اس بات کی شکایت حضورؐ کے سامنے ہوئی تو اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

وَ يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْيَتٰمٰى ؕ قُلْ اِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَيْرٌ ؕ وَ اِنْ تُخَالِطُوْهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ ؕ وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَعْنَتَكُمْ ؕ

"پوچھتے ہیں یتیموں کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے؟ کہو جس طرز عمل میں ان کیلئے بھلائی ہو' وہی اختیار کرنا بہتر ہے۔ اگر تم اپنا اور ان کا خرچ اور رہنا سہنا مشترک رکھو' تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ آخر وہ تمہارے بھائی بند ہی تو ہیں۔ برائی کرنے والے اور بھلائی کرنے والے دونوں کا حال اللہ پر روشن ہے۔ اللہ چاہتا تو اس معاملے میں تم پر سختی کرتا۔" .... اس کے بعد صحابہ نے یتیموں کا کھانا اپنے کھانے کے ساتھ شامل کیا اور ان کا پینا اپنے پینے کے ساتھ۔

یوں قرآنی انداز تربیت نے ان لوگوں کے ایمان و ضمیر کو بلند کر دیا اور وہ انسانیت کے افق کا روشن ستارہ بن گئے۔ اور ان کے دل و دماغ کو جاہلیت کی تمام آلودگیوں سے پاک و صاف کر دیا اور یہ پاکی اور تطہیر اس معاشرے میں تعجب انگیز تھی۔

○.....☆☆☆.....○

اب بات نظام وراثت تک آ پہنچی ہے۔ آغاز کلام اس طرح ہوتا ہے کہ اللہ تمہیں تمہاری اولاد کے بارے میں وصیت کرتا ہے۔ اس وصیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ بہت ہی رحیم' بہت ہی بھلائی کرنیوالے اور بہت ہی عادل ہیں۔ اور وہ والدین سے بھی زیادہ رحیم و شفیق ہیں۔ اور ان انداز خطاب میں یہ اشارہ بھی کیا جاتا ہے کہ اس پورے نظام کا مرجع و مآل آخر کار اللہ میاں کی ذات مبارک ہے۔ اور

اللہ کی ذات ہی ہے جو ایک والد اور اس کی اولاد کے درمیان بھی فیصلہ کرنیوالی ہے۔ وہ رشتہ داروں کے درمیان بھی حقوق طے کرنیوالی ہے۔ اور لوگوں کا کام صرف یہ ہے کہ وہ اللہ سے سیکھیں اور اخذ کریں اور اس کے احکام و وصیت کو نافذ کریں۔ یہی معنی دین کے ہیں۔ جیسا کہ ہم نے آغاز سورت پر کلام کے وقت یہ نکتہ بیان کیا تھا کہ اس سورت کے موضوعات میں سے ایک اہم موضوع اور محور دین کے مفہوم کی وضاحت ہے۔ چنانچہ نظام میراث پر کلام کا آغاز یوں ہوتا ہے يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ ۖ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثَيَيْنِ ۚ .... "تمہاری اولاد کے بارے میں تمہیں اللہ ہدایت کرتا ہے کہ مرد کا حصہ دو عورتوں کے برابر ہوگا۔" اور اس فقرے کے بعد پھر تمام وارثوں کے حصص کا بیان ہوتا ہے۔ اور یہ تقسیم اور تقرری اس عمومی اصول کے تحت ہے کہ یہ اللہ کی جانب سے ہدایت اور وصیت ہے۔ اس کی تفصیلات دو طویل آیات میں دی گئی ہیں۔ پہلی آیت میں اصول اور فروع کے درمیان تقسیم میراث ہے۔ یعنی آبا اور اولاد کے درمیان' اور دوسری آیت میں ازدواجی رشتہ اور کلالہ کے حصص میراث کا بیان ہے۔ اور پھر بعض تتمہ احکام اس سورت کے آخر میں کلالہ کے بارے میں آتے ہیں۔ (تفصیلات آرہی ہیں۔)

يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ ۖ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثَيَيْنِ ۚ فَإِن كُنَّ نِسَاءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ ۖ وَإِن كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ ۚ وَلِأَبَوَيْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ إِن كَانَ لَهُ وَلَدٌ ۚ فَإِن لَّمْ يَكُن لَّهُ وَلَدٌ وَوَرِثَهُ أَبَوَاهُ فَلِأُمِّهِ الثُّلُثُ ۚ فَإِن كَانَ لَهُ إِخْوَةٌ فَلِأُمِّهِ السُّدُسُ ۚ مِن بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُوصِي بِهَا أَوْ دَيْنٍ ۗ آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ لَا تَدْرُونَ أَيُّهُمْ أَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا ۚ فَرِيضَةً مِّنَ اللَّهِ ۗ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلِيمًا حَكِيمًا ﴿١١﴾ وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ أَزْوَاجُكُمْ إِن لَّمْ يَكُن لَّهُنَّ وَلَدٌ ۚ فَإِن كَانَ لَهُنَّ وَلَدٌ فَلَكُمُ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْنَ ۚ مِن بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُوصِينَ بِهَا أَوْ دَيْنٍ ۚ وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ إِن لَّمْ يَكُن لَّكُمْ وَلَدٌ ۚ فَإِن كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكْتُم ۚ مِّن بَعْدِ وَصِيَّةٍ تُوصُونَ بِهَا أَوْ دَيْنٍ ۗ وَإِن كَانَ رَجُلٌ يُورَثُ كَلَالَةً أَوِ امْرَأَةٌ وَلَهُ أَخٌ أَوْ أُخْتٌ فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ ۚ فَإِن كَانُوا أَكْثَرَ مِن

ذٰلِكَ فَهُمْ شُرَكَآءُ فِي الثُّلُثِ مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصٰى بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ۙ غَيْرَ مُضَآرٍّ ۚ وَصِيَّةً مِّنَ اللّٰهِ ۗ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَلِيْمٌ ﴿۱۲﴾

"تمہاری اولاد کے بارے میں اللہ تمہیں ہدایت............. اور اللہ دانا و بینا اور نرم خو ہے۔"

یہ دو آیات اور اس سورت کی تیسری آیت میں **علم میراث** کے اصولی قواعد کو منضبط کیا گیا ہے۔ اس سورت کی تیسری آیت یہ ہے۔

يَسْتَفْتُوْنَكَ ۭ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِي الْكَلٰلَةِ ۭ اِنِ امْرُؤٌا هَلَكَ لَيْسَ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَهٗٓ اُخْتٌ فَلَهَا نِصْفُ مَا تَرَكَ ۚ وَهُوَ يَرِثُهَآ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهَا وَلَدٌ ۭ فَاِنْ كَانَتَا اثْنَتَيْنِ فَلَهُمَا الثُّلُثٰنِ مِمَّا تَرَكَ ۭ وَاِنْ كَانُوْٓا اِخْوَةً رِّجَالًا وَّنِسَاۗءً فَلِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ ۭ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اَنْ تَضِلُّوْا ۭ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۱۷۶﴾

"لوگ تم سے کلالہ کے معاملہ میں فتویٰ پوچھتے ہیں کہو کہ اللہ تمہیں فتویٰ دیتا ہے۔ اگر کوئی شخص بے اولاد مر جائے اور اس کی بہن ہو تو وہ اس کے ترکہ میں سے نصف پائے گی اور اگر بہن بے اولاد مرے تو بھائی اس کا وارث ہو گا۔ اگر میت کی وارث دو بہنیں ہیں تو وہ ترکہ میں سے دو تہائی کی حقدار ہوں گی۔ اور اگر کئی بھائی بہنیں ہوں تو عورتوں کا اکہرا اور مردوں کا دوہرا حصہ ہو گا۔ اللہ تمہارے لئے احکام کی توضیح کرتا ہے تاکہ تم بھٹکتے نہ پھرو اور اللہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔"

ان تین آیات میں علم میراث کے اصولوں کو منضبط کر دیا گیا ہے۔ ان اصولوں کے مزید فروعی مسائل کی وضاحت سنت رسول میں اور اقوال صحابہ میں کی گئی ہے۔ اور اس کے بعد ان اصول و فروع سے فقہائے کرام نے اجتہاد کر کے تفصیلی مسائل بیان کئے ہیں۔ ان فروعی مسائل کی تفصیلات کے ذکر کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔ تفصیلات کا مطالعہ کتب فقہ میں کیا جاسکتا ہے۔ یہاں فی ظلال القرآن میں ہم فقط ان آیات کی تشریح کریں گے۔ نیز ان آیات کے آخر میں جو **تعقیبات** ہیں اور ان میں اسلامی نظام زندگی کے جو اصولی **نظریات** بیان ہوئے ہیں ہم ان کی تشریح کریں گے۔

يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْٓ اَوْلَادِكُمْ ۤ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ .... "تمہاری اولاد کے بارے میں اللہ تمہیں وصیت کرتا ہے کہ مرد کا حصہ دو عورتوں کے برابر ہے۔"........ اس افتتاحی آیت سے معلوم ہوتا ہے' جیسا کہ اس سے پہلے ہم کہہ آئے ہیں' کہ علم میراث کا یہ اصل الاصول ہے۔ اور یہ کہ اس علم کا منبع کیا ہے۔ اور یہ کہ یہ علم کس مصدر سے نکلا ہے۔ اور اس میں یہ اشارہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کے ساتھ والدین سے بھی زیادہ رحیم اور شفیق ہے۔ اور اس نے ان کیلئے جو حصص تجویز کئے ہیں تو یہی ان کے مفاد میں ہیں۔ اور اس قسم کی تقسیم خود والدین بھی نہیں کر سکتے۔ یہ دونوں مفہوم ایک دوسرے کے ساتھ مرابط ہیں اور ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں۔

اللہ ہی ہے جو وصیت کرتا ہے۔ وہی حصص مقرر کرتا ہے۔ اور وہی لوگوں کے درمیان میراث تقسیم بھی کرتا ہے۔ بعینہ اسی طرح

وہ ہر معاملے میں وصیت بھی کرتا ہے۔ اور فرائض و واجبات بھی مقرر کرتا ہے اور اسی طرح وہ اس کائنات کے اندر مخلوقات کی روزی بھی تقسیم کرتا ہے۔ اور یہ تمام ضابطے اور شرائع و قوانین بھی اسی کی جانب سے آتے ہیں۔ یہ اللہ ہی ہے جس سے لوگ ان کے تمام حالات زندگی میں ضابطے اخذ کرتے ہیں۔ اور ان میں سے ایک حال لوگوں کے درمیان ترکے کی تقسیم بھی ہے۔ خود ان کی اولاد کے درمیان' اور یہی دین اسلام ہے۔ اور اگر لوگ اپنی زندگی کے تمام حالات میں اللہ تعالیٰ کی وصیت اور ضابطوں کو قبول نہیں کرتے تو یہ دین نہ ہوگا۔ اور یہ حالت اسلامی حالت نہ ہوگی کہ وہ اپنے امور حیات میں' چاہے وہ بڑے امور ہوں یا چھوٹے امور ہوں' کسی دوسرے ماخذ سے ضابطے اخذ کریں۔ یہ صورت حال یا شرک ہوگی یا کفر صریح ہوگی۔ اور یہ پھر وہی جاہلیت ہوگی جس کی جڑیں عوام الناس کی زندگیوں سے اکھاڑنے کیلئے اس دنیا میں اسلام آیا تھا۔

یہاں اللہ جس چیز کی وصیت فرمارہے ہیں' جسے فرض فرمارہے ہیں اور حکم دے رہے ہیں کہ لوگوں کی زندگیوں میں اس کے مطابق عمل چلے' وہ تمام احکام لوگوں کیلئے نہایت نفع بخش اور مفید ہیں۔ خصوصاً وہ چیزیں جو ان کی مخصوص شخصی امور کے ساتھ تعلق رکھتی ہیں مثلاً ان کی دولت کی تقسیم ترکے کی تقسیم اور اس میں ان کی اولاد کے حصص وغیرہ اور یہ تقسیم ان تقسیمات سے زیادہ مفید ہے جو وہ آپس میں خود کر رہے ہیں۔ اور جن چیزوں کو وہ اپنی اولاد کیلئے پسند کرتے ہیں۔ اس لئے کہ لوگوں کو یہ اختیار نہیں ہے کہ وہ یہ کہیں کہ ہم اپنے لئے خود جو چاہیں اختیار کریں گے اور یہ کہ ہم خوب جانتے ہیں کہ ہمارے لئے کیا مفید ہے اور کیا غیر مفید ہے۔ اس لئے کہ یہ بات علاوہ اس کے کہ فی نفسہ باطل ہے' یہ بے جا جسارت ہے، خود سری ہے اور اللہ جل شانہ کے مقابلے میں زیادہ علم کا دعویٰ ہے۔ اور یہ ایک ایسا "ادعاء" ہے جو نہایت بے باک اور جاہل شخص ہی کر سکتا ہے۔

عوفی نے حضرت ابن عباس سے آیت يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثَيَيْنِ .... کے بارے میں ان کا یہ قول نقل کیا ہے کہ جب احکام میراث نازل ہوئے اور ان میں اللہ تعالیٰ نے جو حصص مقرر کئے وہ کر دیئے۔ بیٹے کا حصہ' بیٹی کا حصہ اور والدین کا حصہ تو لوگوں نے اسے بہت ہی برا مانا۔ یا بعض لوگوں نے اسے ناپسند کیا۔ ان کا اعتراض یہ تھا کہ عورت کو چہارم اور ہشتم دیا جاتا ہے اور بیٹی کو نصف دیا جاتا ہے۔ اور چھوٹے بچے کا حصہ بھی مقرر ہو گیا حالانکہ ان لوگوں میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہے جو لڑائی کے وقت کام آتا ہو اور کوئی بھی نہیں ہے جو لڑائی کے بعد مال غنیمت ہتھیا سکتا ہو۔ ان احکام کے بارے میں بالکل خاموش ہو جاؤ' شاید رسول اللہ ﷺ ان احکام کو بھول جائیں یا ہم ان کے بارے میں آپ سے سفارش کریں اور آپ ان میں تبدیلی کر دیں۔ چنانچہ انہوں نے کہا اے رسول خدا! آپ ایک لڑکی کو باپ کے ترکے میں سے نصف دیتے ہیں' حالانکہ وہ گھوڑے پر سوار نہیں ہوتی اور نہ وہ جنگ میں حصہ لیتی ہے۔ پھر ایک نابالغ بچے کو میراث دی جارہی ہے اور وہ ہمارے لئے کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ اور جاہلیت میں تو وہ اس طرح کرتے تھے کہ وہ میراث صرف ان لوگوں کو دیتے تھے جو جنگ میں حصہ لیتا تھا۔ اور وہ تقسیم میں سب سے بڑے کو اس کے بعد جس کا نمبر ہو اس کو دیتے تھے۔ (روایت ابن ابی حاتم و ابن جریر)

غرض عربی جاہلیت کی منطق یہ تھی' اس لئے قانون میراث کے احکامات ان میں سے بعض لوگوں کو کھٹکتے تھے۔ یہ لوگ اللہ کے فرائض اور اس کی عادلانہ تقسیم کے مقابلے میں آگئے حالانکہ یہ تقسیم نہایت حکیمانہ تھی۔ اور آج کی جاہلیت جدیدہ کی بھی یہی منطق ہے جو بعض لوگوں کے دل میں خلجان پیدا کرتی ہے۔ اس لئے یہ منطق بھی اللہ کے فرائض اور تقسیم کے مقابلے میں سامنے آتی ہے۔ اگرچہ جاہلیت جدیدہ بعض پہلوؤں سے جاہلیت عربیہ سے مختلف نوعیت رکھتی ہے۔ آج کی جاہلیت کی منطق یہ ہے کہ ہم ترکہ ان لوگوں کو تقسیم کر کے کیوں دیں جنہوں نے اس ترکے کی کمائی میں کوئی محنت و مشقت نہیں کی۔ اور نہ اس میں کوئی تکلیف برداشت کی۔ اور یہ ذہنیت بھی

ایسی ہے' جس نے حکمت الٰہیہ کو نہیں پایا۔ نیز یہ منطق بھی دراصل سخت گستاخی اپنے اندر لئے ہوئے ہے اور گستاخی اور جسارت میں جاہلیت قدیمہ اور جدیدہ دونوں برابر ہیں۔

لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ .... "مرد کا حصہ دو عورتوں کے برابر ہو گا۔" یعنی اگر مرد کی وارث صرف اس کی اولاد ہو بیٹے اور بیٹیاں تو سب ترکہ انہیں ملے گا اور مرد کا حصہ عورتوں کے حصے میں دوگنا ہو گا۔ یعنی لڑکی کا ایک حصہ اور لڑکے کے دو حصے۔

یہاں یہ بات پیش نظر رہے کہ ان دونوں کے حصوں میں یہ فرق و امتیاز اس لئے نہیں کیا گیا کہ کسی صنف کو دوسرے پر فضیلت ہے۔ بلکہ حصص کا یہ فرق اس لئے روا رکھا گیا ہے کہ اسلامی نظام نے عائلی زندگی میں مرد اور عورت پر جو ڈیوٹیاں رکھی ہیں یہ فرق حصص ان کے مطابق نہایت ہی متوازن اور عادلانہ ہے۔

عائلی زندگی سے آگے اسلامی معاشرے کے اجتماعی امور میں بھی عورت کے مقابلے میں مرد پر زیادہ فرائض عائد کئے گئے ہیں۔ ایک مرد عورت کے ساتھ نکاح کرتا ہے اور وہ اس کا نفقہ بھی دیتا ہے۔ اس کی اولاد کا نفقہ بھی دیتا ہے۔ اور یہ ذمہ داریاں اس وقت بھی اس کے ساتھ لگی ہوئی ہوتی ہیں۔ جب یہ مرد اس عورت کو طلاق بھی دے دیتا ہے۔ رہی عورت تو وہ یا تو خود اپنی ضروریات کی ذمہ دار ہوتی اور یا یہ صورت ہوتی ہے کہ شادی سے پہلے بھی اور شادی کے بعد بھی اس کے نفقے کا ذمہ دار مرد ہی ہوتا ہے۔ اور وہ خاوند اور اپنی اولاد کے نفقات کی کسی صورت میں بھی ذمہ دار نہیں ہوتی۔ اب صورت یہ ہے کہ مرد عورت کے مقابلے میں خاندان کی ضروریات کے دو حصے کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ اسی طرح اجتماعی معاملات میں بھی مرد کی ذمہ داریاں عورت کے مقابلے میں دوگنا ہیں۔ اس لئے اللہ کے مقرر کردہ یہ حصص ایک طرف عادلانہ بھی ہیں اور دوسری جانب بمصداق حصہ بقدر جثہ یہ تقسیم منصفانہ بن جاتی ہے۔ اور اس تقسیم پر ہر اعتراض یا تو جہالت پر مبنی ہے اور یا یہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں بے جا جسارت اور گستاخی کی وجہ سے وارد کیا گیا ہے۔ نیز اس سے مقصد یہ ہے کہ اسلام کے اجتماعی اور خاندانی نظام کی بنیادوں کو اکھیڑ دیا جائے اور پر سکون زندگی کے اندر افراتفری پیدا کر دی جائے۔

تقسیم کا آغاز یوں ہوتا ہے کہ باپ دادا کی میراث اولاد پر کس طرح تقسیم ہوگی فرماتے ہیں فَإِنْ كُنَّ نِسَاءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ ۖ وَإِنْ كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ ۚ .... "اگر میت کی وارث دو سے زیادہ لڑکیاں ہوں تو انہیں ترکے کا دو تہائی دیا جائے اور اگر ایک ہی لڑکی وارث ہو تو آدھا ترکہ اس کا ہے۔" یعنی اگر صرف دو یا دو سے زیادہ لڑکیاں ہوں اور لڑکے نہ ہوں تو انہیں دو تہائی دیا جائے گا۔ اور اگر صرف ایک لڑکی ہو اور لڑکا نہ ہو تو پھر نصف اس کا ہو گا۔ بقایا عصبات کو ملے گا۔ قریب ترین عصبہ کو۔ عصبات یہ لوگ ہیں۔ باپ' دادا' بھائی حقیقی' باپ شریک بھائی' چچا اور پھر باپ دادا کی اولاد' اس آیت کی عبارت یہ ہے کہ "اگر وارث دو سے زیادہ لڑکیاں ہوں تو ان کے دو تہائی ہے۔" سوال یہ ہے کہ اگر دو ہوں تو ان کیلئے حکم کیا ہے۔ ان کا حصہ بھی دو تہائی ہے' جو حدیث سے ثابت ہے۔ نیز وہ ان دو بہنوں کے حصے پر قیاس کرکے بھی ثابت ہوتا جس کا ذکر اس سورت کی آخری آیت میں مسئلہ کلالہ میں ذکر ہوا۔

ابوداؤد' ترمذی اور ابن ماجہ نے عبداللہ ابن محمد ابن عقیل کی روایت حضرت جابر سے نقل کی ہے۔ کہتے ہیں حضورؐ کے پاس سعد ابن ربیع کی بیوی آئی اور عرض کیا حضورؐ یہ سعد ابن ربیع کی دو لڑکیاں ہیں۔ وہ آپ کے ساتھ احد میں شہید ہو گئے ہیں۔ ان کے چچا نے سب مال لے لیا ہے۔ اگر ان کے پاس مال نہ ہو گا تو ان کے ساتھ شادی کون کرے گا؟ آپ نے فرمایا "اللہ اس کے بارے میں ضرور کوئی فیصلہ کرے گا۔" اس موقعہ پر آیت میراث نازل ہوئی۔ حضورؐ نے ان کے چچا کو بلا بھیجا اور حکم دیا سعد کی دو بیٹیوں کو دو تہائی دیدو اور

بیوی کو آٹھواں دیدو اور باقی تمہارا ہے۔ یہ خود حضورؐ کی تقسیم ہے۔ آپؐ نے دو لڑکیوں کو دو تہائی دیا۔ اس لئے اگر دو یا دو سے زیادہ لڑکیاں ہوں تو ان کو دو ثلث ملیں گے۔

رہا سورت کی آخری آیت پر قیاس تو اس میں بہنوں کے بارے میں ہے۔ فَإِنْ كَانَتَا اثْنَتَيْنِ فَلَهُمَا الثُّلُثَانِ مِمَّا تَرَكَ .... "اور اگر وہ بہنیں دو ہیں تو انہیں ترکے میں سے دو تہائی ملے گا۔" لہٰذا کسی باپ کی اگر دو لڑکیاں ہوں تو انہیں بطریق اولی دو تہائی ملے گا۔ دو بہنوں پر قیاس کرتے ہوئے۔ اس لئے کہ اگر ایک لڑکی ہے تو بھی نصف حصہ ہے۔ اور اگر ایک بہن (کلالہ میں) تو بھی نصف حصہ ہے۔ اور دو لڑکیوں کا حصہ بھی وہی ہو گا جو دو بہنوں کا ہو گا۔

اولاد کے حصہ کے بیان کے بعد اب والدین کے حصص کا ذکر شروع ہوتا ہے۔ بشرطیکہ وہ موجود ہوں۔ یہ حصص اولاد میت کی موجودگی اور عدم موجودگی کی صورت میں مختلف ہیں۔

"اگر میت صاحب اولاد ہو تو اس کے والدین میں سے ہر ایک کو ترکے کا چھٹا حصہ ملنا چاہئے اور اگر وہ صاحب اولاد نہ ہو اور والدین ہی اس کے وارث ہوں تو ماں کا تیسرا حصہ دیا جائے گا۔"

میراث میں والدین کے حالات متعدد ہوتے ہیں .... پہلا حال یہ ہوتا ہے، کہ والدین بھی ہوں اور میت کی اولاد بھی ہو۔ اس صورت میں دونوں کو چھٹا چھٹا حصہ ملے گا۔ بقیہ میت کے لڑکے یا لڑکے لڑکیوں میں حسب حصص تقسیم ہو گا۔ مرد کا حصہ عورت کے مقابلے میں دوگنا ہو گا۔ اب اگر میت کی اولاد میں صرف ایک لڑکی ہو تو اسے بقیہ کا نصف ملے گا اور والدین میں سے ہر ایک کو چھٹا ملے گا۔ اب بقیہ (۱/۶) والد کو بطور عصبہ مل جائے گا۔ اس صورت میں اولاد بطور ذوالفروض بھی حصہ پائے گا اور بطور عصبہ بھی حصہ پائے گا۔ ہاں اگر میت کی دو یا دو سے زیادہ لڑکیاں ہوں تو وہ تو انہیں دو ثلث اور والدین میں سے ہر ایک کو چھٹا حصہ ملے گا۔

دوسری صورت یہ ہے کہ میت کی اولاد' بھائی بہن اور خاوند بیوی نہ ہوں' اس صورت میں والدہ بطور ذوالفروض ثلث کی حقدار ہو گی اور باقی سب والد کو بطور عصبہ ملے گا۔ اس صورت میں والد کا حصہ والدہ سے دوگنا ہو جائے گا۔ اب اگر والدین کے علاوہ خاوند بھی ہو یا بیوی بھی ہو' تو خاوند کا نصف ہو گا' اور اگر بیوی ہو تو اس کا چہارم ہو گا اور والدہ کا ثلث ہو گا۔ (یا تو تمام ترکہ کا ثلث ہو گا یا بقیہ ترکہ یعنی خاوند یا بیوی کا حصہ نکال کر بقیہ کا ثلث ہو گا' جیسا کہ فقہا کے دو اقوال ہیں۔) اور ماں کے بعد جو بچے گا وہ والد کا ہو گا بطور عصبہ بشرطیکہ کہ والد کا حصہ والدہ سے کم نہ ہو گا۔

اور تیسری صورت یہ ہے کہ ماں باپ اور میت کے بھائی بہنوں کے ساتھ پائے جائیں۔ یہ بھائی ماں اور باپ دونوں میں شریک ہوں یا باپ میں شریک یا صرف ماں میں شریک ہوں۔ اس صورت میں باپ کی موجودگی میں ان بھائیوں کو کچھ نہ ملے گا اور یہ محروم ہوں گے۔ اس لئے کہ لڑکے کے بعد میت کیلئے والد قریب تر عصبہ ہیں اور قریب کی موجودگی میں دور کو نہیں ملتا۔ لیکن محروم ہونے کے باوجود یہ بھائی میت کی ماں پر اثرانداز ہوں گے اور اس کا حصہ ثلث سے چھٹے تک گھٹ جائے گا۔ اس صورت میں والدہ کو چھٹا حصہ ملے گا۔ اور بقیہ سب کچھ والد کو ملے گا' بشرطیکہ کہ میت کا خاوند یا بیوی نہ ہوں۔ ہاں اگر بھائی فقط ایک ہو تو والدہ کا حصہ ثلث ہی رہے گا' جس طرح اس صورت میں تھا جس میں میت کی اولاد اور بھائی نہ ہوں۔

لیکن والدین کے یہ حصص قرضے کی ادائیگی اور وصیت پورا کرنے کے بعد ہوں گے۔ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُوصِي بِهَا أَوْ دَيْنٍ .... "یہ سب حصے اس وقت نکالے جائیں گے جبکہ وصیت جو میت نے کی ہو پوری کر دی جائے اور جو قرض اس پر ہو ادا کر دیا جائے۔" علامہ ابن کثیر نے لکھا ہے۔ "علمائے جدید و قدیم نے اس بات پر اجماع کر لیا ہے کہ قرضہ وصیت پر مقدم

ہے۔" اور وصیت پر قرضے کو مقدم کرنے کی حکمت بہرحال واضح ہے۔ اس لئے کہ قرضے میں ایک تیسرے شخص کے حقوق کا سوال ہوتا ہے' اس لئے کہ میت کے مال میں سے اس کی ادائیگی لازمی ہے' کیونکہ خود اس نے قرضہ لیا ہوتا ہے۔ بشرطیکہ میت کا مال موجود ہو' یہ اس لئے کہ شریعت نے میت کو قرضے کی ذمہ داریوں سے بری الذمہ کرنے کی بہت تاکید کی ہے تاکہ معاشرے کی اجتماعی زندگی میں باہم اعتماد بحال رہے اور سوسائٹی کے اندر باہم اعتماد کی فضا باقی رہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک شخص کی وفات کے بعد بھی شریعت اس کے ذمہ واجب الادا قرضوں کو موقوف نہیں کر دیتی۔

حضرت ابو قتادہ ؓ سے روایت ہے' وہ فرماتے ہیں : ایک شخص نے کہا : "حضور بتایئے اگر میں مارا گیا تو میرے سب گناہ معاف ہوں گے" تو حضور ؐ نے فرمایا : "ہاں' اگر آپ قتل ہو جائیں' جبکہ آپ مشکلات پر صبر کر رہے ہوں۔ آپ کی نیت ٹھیک ہو اور آپ آگے بڑھ رہے ہوں' بھاگ نہ رہے ہوں۔" .... اسکے بعد اس شخص نے دوبارہ پوچھا "آپ ؐ نے کیا فرمایا تو حضور ؐ نے دوبارہ اسی بات کو دہرایا اور مزید یہ فرمایا "ہاں' ماسوائے قرضے کے' جبرائیل نے مجھے اس کی اطلاع دی ہے۔" (روایت مسلم' مالک' ترمذی اور نسائی)

ابو قتادہ ؓ سے روایت ہے۔ حضور کے پاس ایک شخص کو لایا گیا' آپ ؐ نے فرمایا "اس کا جنازہ تم لوگ پڑھو' اس پر تو قرضہ واجب ہے۔" میں نے اس پر کہا "حضور ؐ یہ قرضہ مجھ پر ہوا۔" تو حضور نے فرمایا۔ پورا کرو گے۔" میں نے عرض کیا۔ "میں پورا کروں گا۔"

اور وصیت کا پورا کرنا اس لئے ضروری ہوتا ہے کہ میت کا ارادہ اس کے ساتھ متعلق ہو گیا ہے۔ وصیت کی گنجائش شریعت نے اس لئے رکھی ہے کہ بعض حالات میں بعض رشتہ دار محروم ہو جاتے ہیں۔ اور یہ محرومی بعض دوسرے رشتہ داروں کی موجودگی کی وجہ سے ہوتی ہے۔ بعض اوقات یہ محروم لوگ معذور اور مستحق ہوتے ہیں یا ان کو کچھ نہ کچھ دینے میں پورے خاندان کی مصلحت ہوتی ہے اور بعض اوقات اس کی وجہ سے حسد' کینہ اور خاندان کے اندر نزاع پیدا ہونے سے رک جاتے ہیں۔ البتہ یہ اصول مسلم ہے کہ کسی وارث کے حق میں وصیت معتبر نہیں ہے۔ اور وصیت محدود بھی ترکہ کی ایک تہائی تک ہے۔ ان دو باتوں کی وجہ سے میت بھی کسی وارث کو محروم نہیں کر سکتا۔

آبَآؤُكُمْ وَ اَبْنَآؤُكُمْ لَا تَدْرُوْنَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا ۚ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا

"تم نہیں جانتے کہ تمہارے ماں باپ اور تمہاری اولاد میں سے کون بلحاظ نفع تم سے قریب ہے۔ یہ حصے اللہ نے مقرر کر دیئے ہیں' اور اللہ یقیناً سب حقیقتوں سے واقف اور ساری مصلحتوں کا جاننے والا ہے۔"

اس آیت کے آخر میں مختلف القاصد ٹچ دیئے گئے ہیں .... پہلا ٹچ اس مقصد کیلئے ہے جسے محسوس کرکے قرآن کریم کی جانب سے 'حصص کے اس الاٹمنٹ سے خوش ہو جائیں اور اسے بطیب خاطر قبول کرلیں' ہو سکتا ہے کہ بعض لوگ محبت کے جذبے سے مغلوب ہو کر باپ کے مقابلے میں اولاد کو ترجیح دیں۔ کیونکہ بچوں کی طرف ہر انسان کا فطری رجحان زیادہ ہوتا ہے۔ اور بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کا اپنے والدین کی نسبت اخلاقی اور آداب کا شعور زیادہ پختہ ہوتا اور وہ اولاد کے مقابلے میں والدین کو زیادہ ترجیح دیتے ہیں۔ بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جو والدین کے پاس ادب اور بچوں کی طرف فطری میلان کے درمیان فیصلہ نہیں کر پاتے .... کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک خاندان رسم و رواج کی ذہنیت کی وجہ سے ایک متعین لائن اختیار کر لیتا ہے' جس طرح نزول قرآن کے وقت مروج قانون میراث میں صرف خاندانی ذہنیت اس وقت کے رسم و رواج کے تحت کام کر رہی تھی۔ اس سے پہلے ہم عربوں کے بعض رواجوں کا

تذکرہ کر چکے ہیں۔ ان حالات میں اللہ تعالیٰ نے مناسب سمجھا کہ اہل ایمان کے دلوں کو تسلیم و رضا اور امن و سکون سے بھر دیں تاکہ وہ اللہ تعالیٰ کے ان احکامات کو خوشی خوشی قبول کرتے چلے جائیں۔ اللہ انہیں یہ شعور دیتے ہیں کہ ہر چیز کا مکمل علم اللہ کی ذات ہی کے پاس ہے۔ اور یہ کہ انہیں اس بات کا پورا علم نہیں ہے کہ اقرباء میں سے کون ان کیلئے زیادہ مفید ہے اور کون کم' نہ انہیں اس بات کا علم ہے کہ کونسی تقسیم زیادہ مفید ہے۔ اٰبَآؤُكُمْ وَ اَبْنَآؤُكُمْ لَا تَدْرُوْنَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا ....

"تم نہیں جانتے کہ تمہارے ماں باپ اور تمہاری اولاد میں سے کون بلحاظ نفع تم سے قریب تر ہے۔"

دوسرا ٹچ جو اس مضمون کو دیا گیا وہ یہ ہے کہ اصل مسئلہ یہ نہیں ہے کہ کون تمہارے لئے مفید ہے اور کون مفید تر ہے۔ اصل مسئلہ دین' نظام قانون اور شریعت کا ہے۔ اور یہ جو حصص مقرر ہو رہے ہیں یہ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ .... "یہ حصص تو اللہ نے مقرر کر دیئے ہیں۔" اللہ وہ ذات ہے جس نے ماں باپ کو بھی پیدا کیا اور اولاد کو بھی پیدا کیا۔ وہی ہے جو مال و دولت دینے والا ہے۔ وہ فرائض و حصص عائد کرنیوالا ہے اور وہی تقسیم کنندہ ہے۔ اور وہی ہے جسے قانون بنانے کا حق ہے۔ انسان کو تو یہ اختیار ہی نہیں ہے کہ وہ اپنے لئے کوئی قانون بنائیں۔ نہ وہ اس میں آزاد ہیں کہ وہ اپنی خواہشات کے مطابق نظام حکومت تجویز کریں' اس لئے کہ وہ نہیں جانتے کہ کس میں ان کی مصلحت ہے۔ یہ تو صرف وہی ہے اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا .... جو سب حقیقتوں سے واقف ہے۔

یہ تیسری ٹچ ہے جو اس تبصرے کے اندر دی گئی ہے۔ کہ باوجود اس امر کے یہ قانون ایک خدائی فیصلہ ہے اور ہر حال میں بھی ان کیلئے واجب الاطاعت ہے' لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ گہری حکمت اور وسیع تر مصلحت پر بھی مبنی ہے۔ اور اللہ نے یہ حکم اپنے وسیع علم کی بناء پر دیا ہے۔ جبکہ اس کے مقابلے میں انسان کا علم محدود ہے۔ اس میں اس کی گہری حکمت کار فرما ہے جبکہ انسان محض خواہش نفس کے پیرو ہوا کرتے ہیں۔

اس قانون سازی کے اندر بار بار تبصرہ ہوتا ہے کہ معاملے کو اپنی اصل مدار کی طرف لوٹانا چاہئے۔ اور اس کی اصل مدار نظریاتی ہے۔ اور یہ نظریاتی اساس دین کے اس مفہوم پر مبنی ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ اپنے تمام فیصلے اللہ سے کرائے جائیں اور اس کی حکمت پر راضی ہو کر فرائض اسی سے اخذ کئے جائیں۔ "یہ حصے اللہ نے مقرر کر دیئے ہیں اور اللہ یقیناً سب حقیقتوں سے واقف ہے۔ اور سب مصلحتوں کا جاننے والا ہے۔"

اس کے بعد باقی حصص یوں متعین ہوتے ہیں۔

وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ اَزْوَاجُكُمْ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهُنَّ وَلَدٌ ۚ فَاِنْ كَانَ لَهُنَّ وَلَدٌ فَلَكُمُ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْنَ مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْنَ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ۭ وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّكُمْ وَلَدٌ ۚ فَاِنْ كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ تُوْصُوْنَ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ۭ

"اور تمہاری بیویوں نے جو کچھ چھوڑا ہو اس کا آدھا حصہ تمہیں ملے گا اگر وہ بے اولاد ہوں' ورنہ اولاد ہونے کی صورت میں

ترکہ کا ایک چوتھائی حصہ تمہارا ہے جبکہ وصیت جو انہوں نے کی پوری کر دی جائے۔ اور قرض جو انہوں نے چھوڑا ہو ادا کر دیا جائے۔ اور وہ تمہارے ترکہ میں سے چوتھائی کی حقدار ہوں گی اگر تم بے اولاد ہو' ورنہ صاحب اولاد ہونے کی صورت میں ان کا حصہ آٹھواں ہو گا' بعد اس کے کہ جو وصیت تم نے کی ہو وہ پوری کر دی جائے اور جو قرض تم نے چھوڑا ہو وہ ادا کر دیا جائے۔"

اگر خاوند بلا اولاد مر جائے تو بیوی کا حصہ چوتھائی ہے' اگر اولاد ہو' لڑکے یا لڑکیاں ایک یا متعدد' اس عورت سے ہو یا کسی اور عورت سے' یا حقیقی بیٹے کے لڑکے ہوں تو ان صورتوں میں بیوی کا حصہ چوتھائی سے آٹھواں ہو جائے گا۔ قرض کی ادائیگی اور وصیت بہرحال پہلے ہو گی۔

نیز دو بیویاں' تین بیویاں اور چار بیویاں ایک ہی بیوی شمار ہوں گی۔ وہ سب کی سب چہارم یا ہشتم میں شریک ہوں گی............ اور اب حکم میراث کے سلسلے میں آخری حکم ہے جو مسئلہ کلالہ کے نام سے مشہور ہے۔

وَإِنْ كَانَ رَجُلٌ يُورَثُ كَلَالَةً أَوِ امْرَأَةٌ وَلَهُ أَخٌ أَوْ أُخْتٌ فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ ۚ فَإِن كَانُوا أَكْثَرَ مِن ذَٰلِكَ فَهُمْ شُرَكَاءُ فِي الثُّلُثِ ۚ مِن بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُوصَىٰ بِهَا أَوْ دَيْنٍ غَيْرَ مُضَارٍّ ۚ

"اور اگر وہ مرد یا عورت جس کی میراث تقسیم ہو رہی ہے بے کلالہ ہو (بے اولاد بھی ہو' اور اس کے ماں باپ بھی زندہ نہ ہوں) مگر اس کا ایک بھائی یا ایک بہن موجود ہو تو بھائی اور بہن ہر ایک کو چھٹا حصہ ملے گا اور بھائی بہن ایک سے زیادہ ہو تو کل ترکہ کے ایک تہائی میں وہ سب شریک ہوں گے۔ جبکہ وصیت جو کی گئی ہو پوری کر دی جائے اور قرض جو میت نے چھوڑا ہو ادا کر دیا جائے' بشرطیکہ وہ ضرر رساں نہ ہو۔"

کلالہ کا مفہوم یہ ہے کہ ایک شخص اپنے جوانب سے میراث کا حقدار ہو' حقداری کا سبب اصول میں سے ہونا یا فروع میں سے ہونا نہ ہو' یعنی تعلق ضعیف ہو' اس قدر قوی نہ ہو جس طرح اصول و فروع کا تعلق قوی ہوتا ہے۔ کسی نے حضرت ابوبکر صدیق ؓ سے کلالہ کے بارے میں سوال کیا تھا تو انہوں نے فرمایا :"میں اس سلسلے میں بات اپنی رائے کے مطابق کروں گا' اگر یہ رائے درست ہو تو اللہ کی جانب سے ہوئی اور اگر غلط ہو تو شیطان کا القاء ہو گا۔ اور اللہ اور رسول اللہ اس کے ذمہ دار نہ ہوں گے۔ کلالہ وہ ہے جس کی نہ اولاد ہو اور نہ والدین ہوں۔" جو حضرت ابوبکر ؓ کے بعد حضرت عمر ؓ خلیفہ ہوئے تو انہوں نے فرمایا کہ مجھے شرم آتی ہے کہ میں حضرت ابوبکر ؓ کی رائے کی مخالفت کروں۔" (اس روایت کو ابن جریر نے شعبی سے نقل کیا ہے۔)

علامہ ابن کثیر فرماتے ہیں "حضرت علی ؓ' ابن مسعود ؓ' ابن عباس ؓ' زید ابن ثابت ؓ سے منقول ہے۔ شعبی' نخعی' حسن ؒ' قتادہ ؒ' جابر ؒ' ابن زید اور حکم کی رائے بھی یہی ہے۔ اہل مدینہ' اہل کوفہ' اہل بصرہ کی بھی یہی رائے ہے۔ فقہائے سبعہ کی رائے بھی یہی ہے۔ ائمہ اربعہ کی رائے بھی یہی ہے۔ اور متقدمین و متاخرین سب کا اس پر اتفاق ہے بلکہ بہت سے لوگوں سے منقول ہے کہ اس پر اجماع منعقد ہو گیا ہے۔"

وَإِنْ كَانَ رَجُلٌ يُورَثُ كَلَالَةً أَوِ امْرَأَةٌ وَلَهُ أَخٌ أَوْ أُخْتٌ فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ فَإِن كَانُوا أَكْثَرَ مِن ذَٰلِكَ فَهُمْ شُرَكَاءُ فِي الثُّلُثِ

"اور اگر مرد یا عورت جس کی میراث تقسیم طلب ہے کلالہ ہو (بے اولاد بھی ہو' اور اس کے ماں باپ بھی زندہ نہ ہوں) مگر اس کا

ایک بھائی یا ایک بہن موجود ہو تو بھائی اور بہن ہر ایک کو چھٹا حصہ ملے گا اور بھائی بہن ایک سے زیادہ ہو تو کل ترکہ کے ایک تہائی میں وہ سب شریک ہوں گے۔"

یہاں "اس کا ایک بھائی اور ایک بہن" سے مراد وہ بھائی اور بہن ہیں جو میت کے ساتھ صرف ماں کی جانب سے رشتہ رکھتے ہوں یعنی اخیافی بہن بھائی۔ اگر حقیقی بہن بھائی ہوں یا یہ بہن بھائی صرف والد کی جانب سے ہوں تو ان کی وراثت اس سورت کی آخری آیت کے مطابق ہوگی اور اس میں بھائیوں کا حصہ بہن کے مقابلے میں دوگنا ہوگا اور اس آیت کی طرح نہ ہوگا کہ ہر ایک کو چھٹا حصہ ملے گا چاہے مرد ہو یا عورت۔ تو یہ حکم گویا اخیافی بہن بھائیوں کیلئے ہوگا۔ اس لئے کہ اخیافی بہن بھائی صرف بحیثیت ذوالفروض (Sharer's) یعنی ہر ایک کیلئے چھٹا حصہ میراث پاتے ہیں' بطور عصبہ ان کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ ذوالعصبات وہ ہوتے ہیں جو تمام ترکہ یا وہ جو ذوالفروض (Sharer's) سے بچ جائے کو بطور (Rosidue) پاتے ہیں۔

وَاِنْ كَانُوْٓا اَكْثَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَهُمْ شُرَكَاۗءُ فِي الثُّلُثِ ....

"اور بھائی بہن ایک سے زیادہ ہوں تو کل ترکہ میں سے ایک تہائی میں شریک ہوں گے۔" چاہے ان کی تعداد کتنی ہی زیادہ ہو۔ اور معمول بہ قول یہی ہے کہ وہ بحیثیت شریک مساوی مساوی حصہ پائیں گے۔ اگرچہ فقہاء میں سے بعض کا یہ قول بھی ہے کہ اس صورت میں وہ مساوی طور پر تقسیم نہ کریں گے بلکہ وہ عام اصول "ایک مرد دو عورتوں کے برابر حصہ پائے گا" کے مطابق تقسیم کریں گے۔ لیکن پہلا معمول بہ قول ہی زیادہ درست معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے کہ ایک بہن اور بھائی کی صورت میں اس آیت نے جو چھٹا حصہ ہر ایک کیلئے مقرر کیا ہے دوسرا قول اس کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔

اخیافی بھائی' جو میت کے ساتھ صرف ماں کے رشتے میں شریک ہوں' دوسرے ورثاء کے مقابلے میں کچھ امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔

۱:۔ پہلی خصوصیت یہ ہے کہ میراث میں ان کے مرد اور عورتوں کا حصہ برابر ہوتا ہے۔

۲:۔ ان کو صرف اس صورت میں میراث ملتی ہے جب میت کلالہ ہو' اس لئے اگر میت کا والد' دادا' لڑکا اور پوتا موجود ہو تو انہیں میراث میں سے کچھ بھی نہیں ملتا۔

۳:۔ یہ کہ ان کے حقوق ثلث سے زیادہ نہیں ہوتے اگرچہ ان کی تعداد بہت بڑھ جائے۔

مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصٰى بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ۙ غَيْرَ مُضَاۗرٍّ .... "جبکہ وصیت جو کی گئی ہو پوری کر دی جائے اور قرض جو میت نے چھوڑا ہو ادا کر دیا جائے' بشرطیکہ وہ ضرر رساں نہ ہو۔" اس آیت کے ذریعہ متنبہ کیا گیا ہے کہ وصیت اس لئے نہ کی جائے کہ ورثاء کو نقصان پہنچ جائے۔ بلکہ انصاف اور مصلحت کے مطابق وصیت ہونا چاہئے۔ اور وصیت سے بھی پہلے قرض ادا ہو اور تقسیم وراثت سے پہلے بہر حال دونوں طے ہوں' یعنی وصیت اور قرضہ۔

اب دوسری آیت کے آخر میں بھی وہی اختتامیہ آتا ہے' جو پہلی آیت کے آخر میں آیا تھا۔ **وَصِيَّةً مِّنَ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَلِيْمٌ** .... "یہ حکم ہے اللہ کی طرف سے اور اللہ دانا و بینا اور نرم خو ہے۔" اختتامیہ کا یہ مضمون مکرر اس لئے لایا گیا ہے کہ نظام میراث کے بارے میں تاکید مزید مطلوب ہے۔ اور احکام میراث کیلئے لفظ وصیت استعمال کیا گیا ہے۔ اور یہ وصیت اللہ کی جانب سے ہے اور اس کا حساب و کتاب بھی اسی کے سامنے ہوگا۔ نہ یہ وصیت کسی خواہش نفس کے مطابق ہے اور نہ ہی کسی کی خواہشات نفسانیہ کی پیروی میں ہے۔ یہ حقیقی علم و آگاہی پر مبنی ہے۔ اس لئے اس قانون میراث کی اطاعت فرض ہے۔ کیونکہ اس کا ماخذ وہ ذات ہے جسے حق ہے کہ وہ انسانوں کیلئے قانون سازی اور ضابطہ بندی کرے۔ اور اس نظام اور ضابطے کو انسانوں کی جانب سے قبول کرنا

بھی لازمی ہے کیونکہ یہ علیم اور حلیم کی جانب سے ہے۔ حکیمانہ ہے اور مشفقانہ ہے۔

اسلامی نظریہ حیات کا اصول اساسی یہ ہے کہ اس میں تمام قوانین کا ماخذ ذات باری ہے۔ اس لئے اس پوری قانون سازی کے عمل کے دوران میں اس حقیقت کی بار بار تاکید کی جا رہی ہے۔ اگر اس اصولی قاعدے کو تسلیم نہ کیا گیا تو یہ کفر' نافرمانی اور دین سے خروج کے مترادف ہو گا......... آنے والی دونوں آیات اس بارے میں فیصلہ کر دیتی ہیں۔ اور یہ دونوں آیات اس سورت میں دیئے جانے والے پورے نظام میراث کے بارے میں زوردار اختتامیہ ہیں۔ ان میں بتایا جاتا ہے کہ نظام میراث در حقیقت حدود اللہ، کے زمرے میں آتا ہے۔

تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ؕ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۱۳﴾ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيْهَا ۪ وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿۱۴﴾

۲ ع ۴ ۱۳

"یہ اللہ کی مقرر کی ہوئی حدیں ہیں۔ جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے گا اسے اللہ ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور ان باغوں میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ اور یہی بڑی کامیابی ہے۔ اور جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا اور اس کی مقرر کی ہوئی حدوں سے تجاوز کر جائے گا اسے اللہ آگ میں ڈالے گا جس میں وہ ہمیشہ رہے گا اور اس کیلئے رسوا کن سزا ہے۔"

یہ نظام میراث اور یہ قانونی شریعت جو تقسیم میراث کیلئے وضع کی گئی ہے اور جسے اللہ نے اپنے علم و حکمت کے مطابق وضع فرمایا ہے۔ اور اس کا مقصد یہ ہے کہ ایک خاندان کے اندر خاندانی نظام کو منظم کیا جائے اور معاشرے کے اجتماعی اور اقتصادی تعلقات مستحکم ہو جائیں۔ "یہ اللہ کی مقرر کردہ حدیں ہیں۔" اور یہ حدیں اس لئے قائم کی گئی ہیں کہ وہ ان عائلی و اقتصادی تعلقات میں سنگ میل ہوں اور ترکہ کی تقسیم میں فیصلہ کن ہوں۔

جو لوگ اس معاملے میں اللہ کی اطاعت کریں گے' وہ ہمیشہ جنت میں رہیں گے اور یہ ان کی عظیم کامیابی ہے۔ اور جو لوگ ان حدوں کو توڑیں گے اور اس معاملے میں اللہ اور رسول اللہ کی نافرمانی کریں گے جہنم میں داخل ہوں گے' اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ اور یہ ان کیلئے دردناک اور توہین آمیز عذاب ہو گا۔

یہ کیوں ہو گا؟ اس معاملے میں اللہ کی اطاعت یا اللہ کی معصیت کے نتیجے میں اس قدر عظیم نتائج کیوں مرتب ہوں گے' حالانکہ قانون میراث نظام شریعت کا بہرحال ایک چھوٹا سا حصہ ہی تو ہے۔ صرف ایک حصہ اور ایک حصے میں اس قدر شدید سزا؟

بظاہر یہ خوفناک سزا اس جرم سے بہت زیادہ نظر آتی ہے۔ لیکن یہ اس شخص کو زیادہ نظر آتی ہے جو اس بات کی حقیقت اور گہرائی تک نہیں پہنچ سکا ہے۔

اس حقیقت کے اظہار کیلئے اس سورت کی بہت سی آیات مسلسل گویا ہیں اور ان کی تشریح و تفسیر آگے آ رہی اور اس امر کی جانب ہم

نے اس سورت کا تعارف پیش کرتے ہوئے اشارہ کیا تھا۔ یہ وہ آیات ہیں جن میں لفظ دین کا مفہوم سمجھایا گیا۔ ایمان کی شرائط بیان ہوئی ہیں اور جن میں اسلام کی تعریف کی گئی ہے۔ لیکن اس کے باوجود مناسب ہے کہ ہم اس امر کے بارے میں مختصراً یہاں بھی ایک نوٹ دیدیں۔ جس قدر ان دو آیات کی تشریح و تفہیم کیلئے ضروری ہے' جو آیات میراث کا اختتامیہ اور تبصرہ ہیں۔

اس دین' دین اسلام بلکہ ان تمام ادیان جو اس پوری تاریخ انسانیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں کے ذریعہ بھیجے ہیں' یعنی تمام سماوی ادیان الٰہیہ کا بنیادی سوال یہی رہا ہے کہ اس کرۂ ارض پر حاکمیت کا حق کس کو حاصل ہے؟ ان لوگوں کا رب کون ہے؟ ان دو سوالوں کا جواب ان آیات میں دیا گیا ہے اور اس دین کے تمام معاملات ان جوابات کی روشنی میں طے ہوتے ہیں اور لوگوں کے تمام امور انہیں جوابات کی روشنی میں طے ہوتے ہیں۔

اب اس سوال کا کیا جواب ہے۔ اس کرۂ ارض پر حاکمیت اور ربوبیت کا حق کس کو حاصل ہے؟ صرف اللہ وحدہ کو' اس حق میں اس کے ساتھ' اس کی مخلوق میں سے کوئی بھی شریک نہیں ہے۔ یہی عین ایمان ہے۔ یہی عین اسلام ہے۔ اور یہی دین اسلام ہے۔ اور اگر حاکمیت اور ربوبیت کا یہ حق کسی مخلوق کو دیا جائے اور انہیں اللہ کے ساتھ شریک کیا جائے یا اللہ کے سوا مستقلاً میں یہ حق دیا تو یہ صریح شرک اور واضح کفر ہے۔

حاکمیت اور ربوبیت یا تو صرف اللہ وحدہ لاشریک کی ہوگی' تو اس صورت میں لوگ صرف اللہ وحدہ کے دین میں داخل ہوں گے اور صرف اللہ وحدہ کی اطاعت میں داخل ہوں گے اور اس کی عملی صورت یہی ہوگی کہ لوگ اسلامی نظام زندگی پر عمل پیرا ہوں۔ کیونکہ اس صورت میں یہ حق صرف اللہ ہی کو حاصل ہوگا کہ وہ لوگوں کیلئے نظام زندگی تجویز کریں اور یہ صرف اللہ وحدہ ہی ہوگا جو لوگوں کیلئے طور طریقے اور قوانین' اور ضابطے وضع کریں۔ پھر یہ صرف اللہ ہی ہوگا جو لوگوں کیلئے حسن و قبح کے معیار متعین کرے گا اور ان کی زندگی کے تفصیلی طور طریقے اور تنظیم کرے گا۔ اور اللہ کے سوا کوئی فرد ہو یا کوئی سوسائٹی ہو ان کیلئے ایسے کچھ حقوق بھی نہ ہوں گے اور ان کیلئے صرف یہی چارۂ کار ہوگا کہ وہ شریعت الٰہیہ کی اطاعت کریں کیونکہ یہ اطاعت اللہ کی الوہیت حاکمیت اور ربوبیت کا منطقی تقاضا ہے اور اس تقاضے کا واحد مظہر اور خاص رنگ نظام شریعت ہے۔

اور اگر یہ صورت حال نہیں ہے تو پھر دوسری صورت یہی ہے کہ حاکمیت اور ربوبیت کا حق اللہ کی مخلوق میں سے کسی کو حاصل ہوگا۔ یہ حق اللہ کے ساتھ شریک ہو کر ہوگا یا ان لوگوں کو مستقلاً حاصل ہوگا۔ اس صورت میں جو لوگ یہ حق قبول کریں گے وہ ان غیر اللہ کے دین میں داخل تصور ہوں گے' یوں وہ غیر اللہ کی بندگی کریں گے۔ پھر یہ انسان کی جانب سے غیر اللہ کی اطاعت ہوگی اور اس کی عملی شکل یوں ہوگی کہ یہ لوگ غیر اللہ کے تجویز کردہ منہاج حیات' ان کے ضابطوں' ان کے قوانین اور ان کے حسن و قبح کے معیاروں کے پیرو کار ہوں گے اور یہ سب چیزیں بعض انسانوں نے وضع کی ہوں گی۔ اس قانون سازی اور ضابطہ بندی میں وہ اللہ کی حاکمیت اور اس کی کتاب کا کوئی حوالہ نہ دے رہے ہوں گے' بلکہ یہ تمام چیزیں بعض دوسرے حوالوں سے تشکیل پائیں گی۔ بعض دوسرے مصادر ان کے لئے مصادر قوت ہوں گے۔ اس لئے یہ صورت حال دین سے خالی ہوگی' ایمان مفقود ہوگا اور اسلام نہ ہوگا جبکہ یہ صورت حال شرک' کفر' فسوق اور معصیت کی صورت حال ہوگی۔

یہ ہے اس معاملے کی اصل حقیقت' لہٰذا اس میں اگر کوئی صرف اللہ کی حدود میں سے ایک حد کو توڑتا ہے یا پوری شریعت کی نفی کرتا ہے' اصل حقیقت کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس لئے کہ ایک حد بھی دین ہے۔ اور پوری شریعت بھی دین ہے' لہٰذا اس میں اصل نارگٹ یہ اصول ہوگا کہ لوگ حاکمیت اور ربوبیت میں اللہ تعالیٰ کو وحدہ لاشریک قرار دے رہے ہیں یا وہ اس میں کسی کو شریک کر رہے

ہیں یا ذات باری کو الگ چھوڑ کر بعض دوسرے لوگوں کی حاکمیت اور ربوبیت قبول کر رہے ہیں۔ رہی یہ بات کہ لوگ زبانی طور پر کیا دعویٰ کر رہے ہیں کہ وہ دین اسلام میں داخل ہیں اور مسلمان ہیں تو اگر یہ بات ان کے عمل میں نہیں تو اسلام نہ ہو گا۔

یہ ہے وہ عظیم حقیقت جس کی طرف آیات میراث کے اس اختتامیہ میں اشارہ کیا گیا ہے۔ اس میں بتایا جاتا ہے کہ نظام میراث میں ورثاء کے حصص کی تقرری کا تعلق براہ راست اللہ کی اور رسول اللہ کی اطاعت سے ہے۔ یا اس معاملے میں اللہ اور رسول کی نافرمانی ہوگی۔ یا اس کا نتیجہ ایسے باغات ہوں گے جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی اور یا اس کا انجام ایک توہین آمیز عذاب کی شکل میں ہو گا جو جہنم کی آگ میں رانمادیا جائے گا۔

اور یہ وہ عظیم حقیقت ہے جس کا اظہار اس صورت میں متعدد آیات کے اندر مکرر سہ کرر کیا گیا ہے اور اسے اس قدر واضح اور فیصلہ کن انداز میں بیان کیا گیا ہے کہ اس میں کسی تاویل اور کسی نفاق کیلئے کوئی گنجائش نہیں چھوڑی گئی۔

وہ لوگ جو ابھی تک اپنا تعارف اسلام کے حوالے سے کراتے ہیں۔ میں ان کو یہ دعوت دوں گا کہ وہ اس بارے میں اپنا ذہن صاف کرلیں اور دیکھ لیں کہ وہ اسلامی نظام حیات اور دین اسلام سے کس قدر دور ہو چکے ہیں۔

○.....☆☆☆.....○

اس بحث کے بعد 'اب اس بات کی ضرورت ہے کہ اسلام کے نظام میراث کے بارے میں چند کلمات عرض کروں' اس سے پہلے آیت لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوا وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ .... "مردوں کیلئے وہی کچھ ہے جو انہوں نے کمایا اور عورتوں کیلئے بھی وہی کچھ ہے جو انہوں نے کمایا۔" کے ضمن میں ہم نے یہ عمومی اصول بیان کیا تھا۔ اسی طرح لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثَيَيْنِ .... یہ کہ مرد کا حصہ دو عورتوں کے حصے کے برابر ہو گا۔ " کے ضمن میں بھی ہم نے بحث کی تھی۔

اسلام کا نظام وراثت ایک نہایت ہی عادلانہ اور فطرت انسانی کے ساتھ نہایت ہی ہم آہنگ نظام ہے۔ نیز خاندانی زندگی کے عملی حال احوال کے ساتھ نہایت ہی موزوں ہے۔ اور اس بات کی اچھی طرح وضاحت اس وقت ہوتی ہے جب ہم اس نظام کا تقابلی مطالعہ ان تمام نظاموں سے کرتے ہیں' جو انسانی تاریخ میں کبھی رائج رہے ہیں یا اب ہیں' جاہلیت قدیمہ میں یا جاہلیت جدیدہ میں۔ دنیا کے کسی خطے میں اور کسی بھی قوم و ملت میں۔ اس نظام میں خاندان کی اجتماعی کفالت کے تمام مقاصد کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ ہر شخص کا حصہ اور خاندان کے اندر اس کی ذمہ داریوں کو پیش نظر رکھ کر متعین کیا گیا ہے۔ مثلاً والدہ اور والد جو ذوی الفروض میں سے ہیں۔ ان کے بعد اس نظام میں عصبات کو اہمیت دی گئی ہے۔ اس لئے کہ والدین کے نہ ہونے کی صورت میں' کسی یتیم کی کفالت عصبات ہی کے ذمہ ہوتی ہے۔ یہ عصبات ہی ہیں جو دیت اور دوسرے اجتماعی تاوان ادا کرتے وقت حصہ داریاں اپنے سر لیتے ہیں۔ اس لئے اسلامی نظام میراث غایت درجہ مناسب اور موزوں ہے۔

اس نظام کی اساس اس اصول پر ہے کہ یہ خاندانی نظام ایک ہی نفس بشر سے وجود میں آیا ہے۔ اس لئے نہ اس میں بچے محروم ہوں گے اور نہ عورتیں محروم ہوں گی۔ محض اس لئے کہ وہ عورتیں ہیں یا نابالغ ہیں۔ چنانچہ اگر یہ نظام عملی ذمہ داریوں میں فرق مراتب کرتا ہے تو نفس انسانیت کی اساس پر کوئی فرق بھی نہیں کرتا۔ اس لئے اس میں حقوق دیتے وقت اصناف مرد اور عورت کے درمیان کوئی فرق نہیں کیا جاتا۔ فرق اگر ہے تو اجتماعی ذمہ داریوں کو پیش نظر رکھ کر کیا گیا ہے۔ جو ذمہ داریاں اجتماعی خاندانی کفالت کے حوالے سے عائد ہوتی ہیں۔
اس نظام کے اندر عام زندہ چیزوں کی فطرت اور خصوصاً انسانی فطرت کو پوری طرح مد نظر رکھا گیا ہے۔ چنانچہ ہر حصص اور حقوق

الاٹ کرتے وقت اولاد میت کو سب سے مقدم رکھا گیا ہے۔ یعنی والدین اور دوسرے رشتہ داروں کے مقابلے میں اس فطری میلان کے علاوہ آنیوالی نوخیز نسل اس لئے بھی زیادہ مستحق ہے کہ اس کرۂ ارض پر وہی زندگی کے تسلسل کا ذریعہ ہے۔ وہی ہے جس کی وجہ سے بنی نوع انسان اس کرۂ ارض پر موجود رہ سکتا ہے۔ لہٰذا اس نوخیز نسل کا لحاظ ضروری ہے۔ لیکن اس نوخیز نسل کی رعایت کے ساتھ ساتھ آباء کو بھی محروم نہیں رکھا گیا۔ اور نہ ہی دوسرے رشتہ داروں کو محروم رکھا گیا ہے۔ ہر ایک کو حصہ دیا گیا ہے۔ فطرت کے منطقی تقاضوں کے عین مطابق۔

یہ ایک ایسا نظام ہے جو ہر زندہ چیز اور ہر انسان کے اس فطری تقاضے کے عین مطابق ہے جس کے تحت وہ اپنی نسل کے ساتھ گہرا ربط رکھنا چاہتا ہے۔ اور یہ کہ اس اولاد کے ذریعہ گویا اس کے وجود کو تسلسل مل رہا ہے۔ اس لئے اس نظام میراث کی وجہ سے ایک انسان مطمئن رہتا ہے کہ وہ جو اپنی سعی اور جدوجہد کو بحث کی شکل میں ذخیرہ کرتا رہتا ہے اور یہ اس کی فطری خواہش ہوتی ہے کہ اس کے عمل کا ثمرہ اس کی اولاد کو ملے۔ اور یہ کہ اس کی آئندہ نسل اس سے محروم نہ رہے۔ اور یہ یقین کہ اس کی جدوجہد کا ثمرہ اس کی اولاد کو ملے گا' اس کی جدوجہد کیلئے مہمیز کا کام دے گا۔ وہ اپنی جہد و سعی میں مزید اضافہ کر دے گا اور یہ بات پوری سوسائٹی کیلئے بھی معاشی لحاظ سے مفید ہوگی۔ اور اس جہد مسلسل کی وجہ سے معاشرے کے اجتماعی نظام تکافل میں بھی کوئی فرق نہ آئے گا بلکہ اس نظام میں اسے پورا پورا ملحوظ رکھا گیا ہے۔

اور آخری بات یہ ہے کہ اسلام کا نظام میراث کسی شخص کی جمع کردہ دولت کو اس وقت پاش پاش کر دیتا ہے جب وہ انتہاؤں کو چھو لیتی ہے۔ اور اسے از سرنو تقسیم کر دیتا ہے۔ اس لئے یہ نظام دولت کو کسی ایک جگہ جمع ہونے نہیں دیتا۔ اور نہ ہی چند ہاتھوں میں منجمد کر کے چھوڑتا ہے۔ مثلاً اس نظام کے حوالے سے جس میں پوری وراثت بڑے لڑکے کو مل جاتی ہے۔ یا اسے چند محدود رشتہ داروں کے دائرے کے اندر محدود کر دیا جاتا ہے۔ اس پہلو سے یہ نظام ایک ایسا ذریعہ ہے جو سوسائٹی میں اقتصادی عمل کی کارکردگی کی از سرنو تجدید کرتا ہے اور اسے اعتدال پہ رکھتا ہے۔ اور اس میں کسی انتظامیہ اور کسی اجتماعی نظام کا بھی کوئی ظاہری دخل نہیں ہوتا' جسے کوئی فرد خوشی سے قبول نہیں کرتا۔ اس لئے کہ انسان کی فطرت میں لالچ اور دولت کی محبت ودیعت کر دی گئی ہے۔ رہی اسلامی نظام میراث کی یہ مسلسل بت شکنی اور بار بار تقسیم جدید تو یہ اپنی جگہ جاری و ساری بھی رہتی ہے اور نفس انسانی بھی اسے خوشی خوشی قبول کرتا ہے۔ کیونکہ یہ نظام انسان کی فطرت اور اس کی فطری حب مال اور حرص و لالچ کے عین مطابق ہے۔ اور یہی ہے اصل فرق و امتیاز اس ربانی نظام زندگی اور دوسرے ان نظاموں کے درمیان جو انسان کیلئے انسان نے تجویز کئے ہیں۔ [1]

☆ ☆ ☆

[1] تفصیلات کیلئے دیکھئے میری کتاب "العدالۃ الاجتماعیہ فی الاسلام" کی فصل "اسلام کی سیاسی پالیسی"

درس ۳۱ ایک نظر میں

اس سورت کے پہلے سبق میں' اسلامی معاشرے کے اندر اجتماعی زندگی کی تنظیم پر توجہ دی گئی اور اسے جاہلیت کی تمام آلائشوں سے پاک و صاف کر دیا گیا۔ اس میں معاشرے کے بے سہارا لوگوں' یتیموں کے حقوق اور ان کی جائیداد کی حفاظت کی ضمانت دی گئی اور یہ حفاظت اور تحفظ ان کو ایک خاندان کے فطری فریم ورک کے اندر فراہم کیا گیا' اجتماعی نگرانی کے اندر۔ اس کے بعد ایک خاندان کے اندر نظام میراث کے اصول بیان کئے گئے اور پھر ان تمام حقوق اور تحفظات کو اس نظریۂ حیات کے ساتھ مربوط کر دیا گیا کہ اللہ ہی تمام لوگوں کا حاکم اور رب ہے۔ اور یہ وہی ذات ہے جس نے اپنے حکم و ارادہ سے' ایک ہی جان سے اس مخلوق کو پیدا کیا ہے اور یہ کہ اللہ نے بشریت کے اجتماعی نظام کو ایک خاندان کی اکائی سے شروع کیا ہے۔ اور پھر اس خاندان کے اندر اجتماعی کفالتی ذمہ داریاں عائد کی گئی ہیں۔ اور زندگی کے تمام حالات کی اس ضابطہ بندی کو اللہ کے علم اور حکمت اور اس کے تجویز کردہ حدود و قیود کے ساتھ مربوط کیا گیا اور یہ فیصلہ کر دیا گیا کہ اگر وہ اللہ کی اطاعت کریں گے تو انعام جنت کے مستحق ہوں گے اور اگر معصیت کا ارتکاب کریں گے تو سزائے جہنم کے سزاوار ہوں گے۔

اب اس دوسرے سبق میں اسلامی معاشرے کی اجتماعی زندگی کی تنظیم ایک دوسرے زاویہ سے کی گئی ہے اور ایک دوسرے پہلو سے اسے جاہلیت کی آلودگیوں سے پاک و صاف کیا گیا ہے یعنی اسے جاہلیت کی بے راہ روی اور فحاشی سے پاک کیا گیا ہے۔ ایسے لوگوں کے لئے یہ تجویز کیا گیا ہے کہ ان کو سوسائٹی سے علیحدہ کر دیا جائے۔ اور ان کی نقل و حرکت پر پابندی عائد کی جائے۔ الا یہ کہ وہ اپنے رویہ سے باز آ جائیں اور سچے دل سے توبہ کر لیں۔ اور پاکیزہ زندگی بسر کرنے پر آمادہ ہوں اور اسلامی معاشرے میں پاکیزہ اخلاق و کردار کے ساتھ از سرنو آنے کے لئے تیار ہوں۔ پھر اس دوسرے حصے میں عورت کو ان مظالم سے نجات دی گئی ہے جن کی چکی میں وہ ایام جاہلیت میں پس رہی تھی۔ اسے زندہ درگور کر دیا جاتا تھا اور اس کے ساتھ توہین آمیز سلوک کیا جاتا تھا اور قسم قسم کے مظالم اس پر ڈھائے جاتے تھے تاکہ اسلامی معاشرہ صحت مند اور مضبوط بنیادوں پر استوار ہو سکے' جس کی عام فضا پاک و صاف ہو اور جس کی عمارت نہایت ہی پختہ اساس پر ہو۔ اور ایک خاندان اس کی پہلی اینٹ ہو۔ اور اس حصے کے آخر میں خاندان کے ایک خاص پہلو یعنی دائرۂ محرمات کی ضابطہ بندی کی گئی ہے۔ اس کے لئے شرعی قانون سازی کی گئی ہے۔ اور اس کا اسلوب یہ اختیار کیا گیا ہے کہ محرمات کا ذکر کر دیا گیا ہے اور ان کے علاوہ تمام بنات آدم کو انسان کے لئے جائز قرار دے دیا گیا ہے۔ ان موضوعات پر یہ سبق بھی ختم ہو جاتا ہے اور قرآن کریم کا یہ پارہ بھی اپنی انتہا کو پہنچتا ہے۔

☆ ☆ ☆

سبق ۱۳ تشریح آیات

آیت نمبر ۱۵ تا ۲۳

وَالّٰتِیْ یَاْتِیْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَآئِكُمْ فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَیْهِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ ۚ فَاِنْ شَهِدُوْا فَاَمْسِكُوْهُنَّ فِی الْبُیُوْتِ حَتّٰی یَتَوَفّٰهُنَّ الْمَوْتُ اَوْ یَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِیْلًا ﴿۱۵﴾ وَالَّذٰنِ یَاْتِیٰنِهَا مِنْكُمْ فَاٰذُوْهُمَا ۚ فَاِنْ تَابَا وَاَصْلَحَا فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ تَوَّابًا رَّحِیْمًا ﴿۱۶﴾

"تمہاری عورتوں میں سے جو بدکاری کی مرتکب ہوں ان پر اپنے میں سے چار آدمیوں کی گواہی لو' اور اگر چار آدمی گواہی دے دیں تو ان کو گھروں میں بند رکھو یہاں تک کہ انہیں موت آ جائے یا اللہ ان کے لئے کوئی راہ نکال دے۔ اور تم میں سے جو اس فعل کا ارتکاب کریں ان دونوں کو تکلیف دو' پھر اگر وہ توبہ کریں اور اپنی اصلاح کر لیں تو انہیں چھوڑ دو کہ اللہ بہت توبہ کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔"

فحاشی کو روکنے کی خاطر اور اس کی پاکیزگی اور تنظیم کی خاطر بھی اسلام نے اپنا مخصوص انداز اختیار کیا۔ سب سے پہلے اس نے فاحشہ عورتوں کو نظر بند کرنے اور انہیں معاشرہ سے دور رکھنے کے اقدامات کئے بشرطیکہ ان پر یہ جرم ثابت ہو جائے۔ اس کے بعد اس نے غیر فطری فعل کا ارتکاب کرنے والے مردوں یعنی لوطیوں کے بارے میں حکم دیا کہ انہیں ایذا و سزا دی جائے لیکن اس کی کوئی مقدار مقرر نہیں کی۔ اور اس کے بعد ان لوگوں کے لئے ایک ہی سزا فرمائی یعنی سزائے حد کی سزا جس کا ذکر سورۂ نور میں ہوا۔ یعنی سو کوڑے سزا اور اس کے علاوہ وہ سزائے رجم مقرر کی جس کا ذکر احادیث میں آتا ہے۔ ان سب اقدامات کا مقصد وحید صرف یہ تھا کہ معاشرے کو بدکاری سے پاک کیا جائے اور معاشرے کی پاکی' شرافت اور عفت مآبی کی حفاظت کی جائے۔

لیکن سزا دہی کے تمام حالات میں' شریعت نے ملزموں کے لئے تحفظ کا پورا پورا انتظام کیا ہے۔ ایسا انتظام کہ جس کے ہوتے ہوئے کسی غلطی' کسی ظلم اور محض ظن و گمان کی اساس پر سزا دہی ممکن ہی نہیں رہتی۔ خصوصاً ان خطرناک جرائم میں جن کے اثرات لوگوں کی رواں دواں زندگی پر پڑے ہیں۔

وَالّٰتِیْ یَاْتِیْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَآئِكُمْ فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَیْهِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ ۚ فَاِنْ شَهِدُوْا فَاَمْسِكُوْهُنَّ فِی الْبُیُوْتِ حَتّٰی یَتَوَفّٰهُنَّ الْمَوْتُ اَوْ یَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِیْلًا ﴿۱۵﴾

"تمہاری عورتوں میں سے جو بدکاری کی مرتکب ہوں ان پر اپنے میں سے چار آدمیوں کی گواہی لو' اور اگر چار آدمی گواہی دے دیں تو ان کو گھروں میں بند رکھو یہاں تک کہ انہیں موت آجائے یا اللہ ان کے لئے کوئی راستہ نکال دے ۔"

آیت میں نہایت ہی محتاط انداز میں قانون سازی کی گئی ہے ۔ جن عورتوں پر یہ جرم عائد کیا گیا ہے' کی تحدید کر دی گئی ہے ۔ **مِنۡ نِّسَآئِكُمۡ** ...... یعنی مسلم عورتیں ۔ اسی طرح ان کے خلاف جو شہادت قائم ہوگی اس کی بھی تحدید کر دی گئی ہے ۔ **مِّنۡكُمۡ** یعنی گواہ بھی مسلمان ہوں ۔

چنانچہ جن ملزموں کو سزا دی جائے گی وہ صرف وہ ہوں گے جن کا جرم ثابت ہو جائے اور جن لوگوں کو بطور گواہ پیش کیا جائے گا' ان کا مسلمان ہونا ضروری ہے ۔ اگر مسلمان عورتوں میں سے کوئی فحاشی کا ارتکاب کرے تو ان کے خلاف غیر مسلمانوں کی شہادت قبول نہیں ہے بلکہ ضروری ہے کہ گواہ مسلمان ہونے کے ساتھ ساتھ تعداد میں بھی چار ہوں ۔ یعنی مسلم معاشرے سے ہوں' اس معاشرے میں بس رہے ہوں' وہ شریعت اسلامی کے تابع ہوں ۔ وہ اسلامی قیادت کے مطیع ہوں ۔ ان کے دلوں میں اسلامی شریعت کا احساس ہو ۔ اور وہ اس معاشرے کے حقوق و ذمہ داریوں سے بھی آگاہ ہوں ۔ اس لئے اس معاملے میں غیر مسلمانوں کی شہادت قبول نہیں ہے ۔ ہو سکتا ہے کہ ایک غیر مسلم ایک مسلمان عورت کو محض مقدمہ میں پھنسانے کے لئے شہادت دے دے ۔ نیز ایک غیر مسلم کی امانت' دیانت' خدا خوفی اور مصلحت وغیرہ پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا ۔ اس لئے کہ ایک غیر مسلم کو اسلامی معاشرے کی پاکیزگی سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی ۔ نہ اسے یہ دلچسپی ہوتی ہے کہ اسلامی معاشرے میں نظام عدالت کامیاب ہو ۔ شہادت کے سلسلے میں یہ حدود و قیود بہرحال اس وقت بھی باقی رہیں جب سزا میں تبدیلی ہوگئی یعنی بعد میں جب سزا کوڑوں اور رجم میں بدل گئی ۔

فَإِنۡ شَهِدُوا فَأَمۡسِكُوهُنَّ فِي الۡبُيُوتِ "اور اگر چار آدمی گواہی دے دیں تو ان کو گھروں میں بند رکھو" .... وہ معاشرہ میں اختلاط نہ رکھیں' اسے مزید گندہ نہ کریں' اس میں نکاح نہ کریں اور نہ کوئی اور سرگرمی دکھائیں ۔ **حَتّٰى يَتَوَفّٰهُنَّ الۡمَوۡتُ** "یہاں تک کہ انہیں موت آجائے ۔" وہ اسی طرح قید میں مرجائیں ۔ گھروں میں بند ہوں ۔ **أَوۡ يَجۡعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِيلًا** "یا اللہ ان کے لئے کوئی راستہ نکال دے ۔" ... یعنی ان کی حالت میں تبدیلی کر دے یا سزا میں تبدیلی کر دے ۔ یا ان کے معاملات میں کوئی اور تبدیلی لے آئے ۔ ان الفاظ سے اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ یہ حکم انتہائی اور آخری نہ تھا ۔ یہ خاص متعین وقت کے لئے تھا اور بعض خاص حالات کے لئے تھا اور اس وقت ایسے مجرموں کے لئے آخری حکم آنے کی توقعات تھیں ۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا ۔ یہ حکم سورۂ نور میں سو کوڑوں کی شکل میں بدل گیا اور احادیث رسول کے ذریعہ رجم میں بدل گیا لیکن شہادت اور ثبوت جرم کے سلسلے میں ملزموں کو جو ضمانتیں دی گئی تھیں وہ بدستور قائم ہیں ۔

امام احمد ؒ نے محمد ابن جعفرؒ' سعیدؒ' قتادہؒ' حسن' اور حطان بن عبداللہ الرقاشی کے واسطوں سے حضرت عبادہ ابن الصامتؓ کی یہ روایت نقل کی ہے ۔ وہ فرماتے ہیں :"حضور اکرم ؐ پر جب وحی نازل ہوتی تھی تو اس کا آپ پر اثر ہوتا تھا' آپ پریشان ہو جاتے تھے' آپ کے چہرے کا رنگ متغیر ہو جاتا تھا ۔ ایک دن آپ ؐ پر وحی آرہی تھی تو جب حالت نزول وحی دور ہوئی تو آپ ؐ نے فرمایا :"لو مجھ سے' اللہ تعالیٰ نے ان عورتوں کے لئے راستہ نکال دیا ۔ شادی شدہ' شادی شدہ کے ساتھ اور کنوارا کنواری کے ساتھ' شادی شدہ کو سو کوڑے اور پھر پتھروں کے ساتھ رجم اور غیر شادی شدہ سو کوڑے اور ایک سال کی جلاوطنی ۔"" اس روایت کو امام مسلم نے قتادہ' حسن' حطان اور عبادہ ابن الصامتؓ کے واسطہ سے نبی ؐ سے روایت کی ہے ۔ الفاظ یہ ہیں :"لو مجھ سے' لو مجھ سے' اللہ تعالیٰ نے راستہ بنا دیا ۔ غیر شادی شدہ' غیر

شادی شدہ کے ساتھ سو کوڑے اور ایک سال کی جلاوطنی اور شادی شدہ' شادی شدہ کے ساتھ سو کوڑے اور پتھروں کے ساتھ رجم۔" ماعز اور غامدیہ کے عملی واقعات' جیسا کہ صحیح مسلم میں واقعات نقل ہوئے ہیں کہ حضور ؐ نے انہیں رجم کی سزا دی لیکن کوڑے نہیں مارے۔ اسی طرح یہودی اور یہودیہ کے واقعات آپ نے ان کو رجم کرنے کا فیصلہ فرمایا اور انہیں کوڑے نہیں مارے۔ ان عملی واقعات سے معلوم ہوتا ہے' آخری فیصلہ یہی تھا۔

وَالَّذٰنِ يَأْتِيٰنِهَا مِنْكُمْ فَاٰذُوْهُمَا ۚ فَاِنْ تَابَا وَاَصْلَحَا فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمَا ۗ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا ﴿۱۶﴾ ....

"اور تم میں سے جو اس فعل کا ارتکاب کریں' ان دونوں کو تکلیف دو' پھر اگر وہ توبہ کریں اور اپنی اصلاح کر لیں تو انہیں چھوڑ دو کہ اللہ بہت توبہ قبول کرنے والا' رحم فرمانے والا ہے۔"

صحیح قول یہ ہے کہ اس آیت سے مراد وہ دو مرد ہیں جو بد فعلی کا ارتکاب کریں۔ یعنی عمل قوم لوط۔ یہ قول مجاہد کا ہے۔ حضرت ابن عباس' سعید ابن جبیر وغیرہ نے کہا ہے کہ اذیت یوں دی جائے گی کہ انہیں گالی گلوچ اور برا بھلا کہا جائے گا اور جوتے وغیرہ مارے جائیں گے۔

فَاِنْ تَابَا وَاَصْلَحَا فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمَا .... "پھر اگر وہ توبہ کریں اور اپنی اصلاح کریں تو انہیں چھوڑ دو۔" جس طرح بعد میں آئے گا۔ توبہ و اصلاح سے مراد ان کی زندگی میں مکمل تبدیلی ہے۔ ان کے نقطہ نظر اور طرز عمل کی سمت کی مکمل تبدیلی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس مکمل اور ہمہ جہت اصلاح کے بعد ان کی سزا موقوف ہو جاتی ہے اور سوسائٹی بھی ایسے منحرف اور بے راہ رو افراد کی سزا کو جاری رکھنے پر اصرار نہیں کرتی۔ یہاں ان کو چھوڑ دینے سے مراد یہی ہے' کہ ان کی سزا کو موقوف کر دیا جائے۔

اور اس فقرے میں ایک لطیف اشارہ پایا جاتا ہے اِنَّ اللّٰهَ كَانَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا .... "اللہ توبہ قبول کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔" وہی ہے جس نے یہ سزا تجویز کی اور وہی ہے جو اصلاح احوال کے بعد اس سزا کو جاری رکھنا مناسب نہیں سمجھتا۔ اس معاملے میں لوگوں کو نہ اختیار ہے کہ وہ سزا تجویز کریں اس معاملے میں قانون بنائیں اور نہ انہیں یہ اختیار ہے کہ اسے موقوف کریں۔ ان کا کام صرف یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی ہدایات اور قانون کے نفاذ کی کوشش کریں۔ وہ توبہ قبول کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔ اور وہ اصلاح پذیری کرنے والوں پر رحم بھی کرتا ہے۔

اور اس میں دوسرا اشارہ اس طرف ہے کہ لوگوں کو بھی چاہئے کہ وہ تخلق باخلاق اللہ اختیار کریں۔ اپنے اندر ربانی اوصاف و اخلاق پیدا کریں۔ اللہ توبہ قبول کرنے والا ہے اور رحم فرمانے والا ہے تو ان کا فرض بھی یہ ہے کہ وہ باہم تعلقات میں معذرت کرنے والے کو معاف کر دیں۔ چشم پوشی سے کام لیں کہ وہ گناہ تھا جو ہو چکا اور گزر گیا۔ اور اس کے بعد توبہ ہو گئی اور اصلاح ہو گئی۔ البتہ اس سے مراد یہ نہیں ہے کہ مجرموں کے ساتھ نرمی کی جائے' فحاشی پھیلانے والوں کے ساتھ نرمی کا سلوک کیا جائے۔ ان معاملات میں نرمی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ نرمی اور مہربانی صرف ان لوگوں کے ساتھ ہو گی جنہوں نے توبہ کر لی' اصلاح پذیر ہو گئے' ایسے لوگوں کے بارے میں حکم یہ ہے کہ انہیں معاشرے میں قبول کیا جائے' ان کو ان کے سابقہ گناہ یاد نہ دلائے جائیں' انہیں طعنہ نہ دیا جائے کیونکہ انہوں نے توبہ کر لی ہے اور اصلاح کر لی ہے۔ ان کے اصلاح احوال کے اس عمل میں ان کے ساتھ تعاون ہونا چاہئے اور ان کی حوصلہ افزائی ہونی چاہئے۔ ان کے جرائم کو بھول جانا چاہئے تاکہ سابقہ یادوں سے ان کو اذیت نہ ہو' اور معاشرے میں آتے ہوئے انہیں کوئی تکلیف نہ ہو۔

کیونکہ اگر معاشرہ ایسے لوگوں کے ماضی کو بھول نہ جائے تو ہو سکتا ہے کہ وہ اس جرم میں 'اصلاح کی راہ کو چھوڑ کر دوبارہ نہ مبتلا ہو جائیں۔ اور اس پر اصرار نہ کرنے لگ جائیں اور دنیا و آخرت کے خسارے میں نہ پڑ جائیں اور معاشرہ میں فساد پھیلا کر اسے مزید گندہ نہ کریں اور معاشرہ کے لئے مزید مصیبت کا باعث نہ بنیں۔

یہ سزا بھی زمانہ مابعد میں تبدیل ہو گئی تھی۔ حضرت ابن عباس سے مرفوع حدیث اصحاب سنن نے نقل کی ہے۔ رسول خدا ﷺ نے فرمایا: "تم جسے لوطیوں کا فعل کرتے ہوئے پاؤ تو فاعل اور مفعول دونوں کو قتل کر دو۔"

ان احکام سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی معاشرہ اپنی اخلاقی پاکیزگی کی خاطر کس قدر جدوجہد کرتا ہے' خصوصاً فحاشی سے۔ چنانچہ پہلے اسلامی معاشرہ نے اخلاقی تطہیر کی طرف بہت ہی آغاز میں توجہ شروع کر دی تھی۔ اخلاقی تطہیر کے لئے اسلام نے مدینہ میں اسلامی حکومت کے قیام کا انتظار نہیں کیا' کہ حکومت قائم ہو جائے اور پھر یہ حکومت شرعی قوانین کے نفاذ کا کام شروع کر دے۔ نفاذ قانون سے پہلے سورت اسراء میں جو مکی سورت ہے زنا سے ممانعت کر دی گئی تھی۔ وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ؕ وَسَآءَ سَبِيْلًا ﴿۳۲﴾ .... "اور زنا کے قریب ہی نہ پھٹکو' یہ بے حیائی ہے اور برا راستہ ہے۔" اور سورۃ المؤمنون میں

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلٰوتِهِمْ خٰشِعُوْنَ .... وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ

"کامیاب ہو گئے وہ مومنین جو اپنی نماز میں خشوع کرتے ہیں..... وہ جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں' مگر بیویوں اور ان عورتوں کے ساتھ جو ان کے قبضے میں آگئی ہیں۔ کیونکہ ان کے معاملے میں وہ قابل ملامت نہیں ہیں۔" اور مزید سورت المعارج میں دوبارہ اس کا ذکر ہوا۔

یہ بات کسی سے پوشیدہ نہیں ہے کہ مکہ میں نہ اسلامی حکومت تھی اور نہ اسلامی انتظامیہ تھی۔ اس لئے مکہ میں اسلام نے ان جرائم کی ممانعت کے باوجود ان کے لئے کوئی سزا تجویز نہیں کی۔ ہاں جب مدینہ میں اسلامی حکومت قائم ہو گئی اور اسلامی انتظامیہ قائم ہو گئی تو اس وقت جرائم کی بیخ کنی کے لئے پھر صرف وعظ و تبلیغ اور امر و نہی پر اکتفاء نہیں کیا گیا۔ اس لئے کہ اسلام ایک حقیقت پسندانہ دین ہے۔ اسے معلوم تھا کہ صرف ہدایات' تبلیغ اور امر و نہی ہی معاشرے کو گندگی سے بچانے کے لئے کافی نہیں ہیں۔ اور اسے یہ بھی معلوم تھا کہ دین مملکت اور حکومت کے بغیر قائم ہی نہیں ہو سکتا۔ اور یہ کہ دین ایک مکمل منہاج اور پورا نظام زندگی ہے' جس پر لوگوں کی پوری عملی زندگی قائم ہوتی ہے۔ دین صرف نظریاتی شعور کا نام نہیں ہے جو صرف دین دنیا تک محدود ہوتے ہیں' جس کی پشت پر حکومت نہ ہو' جس کا کوئی قانونی نظام نہ ہو' جس کا ایک متعین منہاج نہ ہو اور جس کا معلوم و معروف دستور نہ ہو۔

اسلامی نظریۂ حیات مکہ مکرمہ کے اندر جونہی بعض برگزیدہ لوگوں کے ذہن میں بیٹھ گیا' اس نظریۂ حیات نے ان دلوں کے اندر جاہلیت اور جاہلی تصورات کو چیلنج کیا۔ اس نظریہ نے ان کی فکری تطہیر شروع کر دی۔ اور جب اسلام مدینہ میں ایک مملکت بن گیا جس کے اندر نظام شریعت نافذ ہو گیا اور اسلامی منہاج زندگی ایک متعین شکل و صورت میں سامنے آگیا' تب اسلامی حکومت نے معاشرے سے فحاشی کو مٹانا شروع کیا۔ اور اس کے لئے سزا کا نظام نافذ کیا گیا۔ لیکن وعظ و ارشاد کا نظام بھی اپنی جگہ کام کرتا رہا۔ اس لئے کہ اسلام فقط نظریہ ہی نہیں ہے جو صرف دل کی دنیا میں کام کرتا ہو' بلکہ وہ ایک نظام مملکت بھی ہے جسے لوگوں کی عملی زندگی میں نافذ کرنا ضروری ہے۔ لہٰذا نظریہ اور عمل اسلام کے دو پاؤں ہیں' وہ کبھی بھی ایک پاؤں پر کھڑا نہیں ہو سکتا۔

یہ شکل ہر اس دین کی رہی ہے جو اس کرۂ ارض پر کبھی بھی اللہ کی جانب سے نازل کیا گیا ہے۔ بعض لوگوں کے ذہن میں یہ غلط خیال بیٹھا ہوا ہے کہ بعض دین ایسے بھی رہے ہیں جن کی کوئی شریعت نہ تھی؟ ہرگز نہیں ہو سکتا کہ دین ہو' اس کی شریعت نہ ہو' اس کی حکومت نہ ہو' اس لئے کہ دین زندگی کا ایک مکمل نظام ہوتا ہے اور یہ ایک عملی نظام ہوتا ہے۔ اس میں لوگ صرف اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرتے ہیں' صرف اسی کی ذات سے تمام ہدایات اخذ کرتے ہیں۔ اسی سے تصور حیات لیتے ہیں' اسی سے اخلاقی قدریں لیتے ہیں اور اسی سے قانون اور عملی ہدایات لیتے ہیں اور اسی سے قانون اخذ کر کے اسے حکومت کی قوت سے نافذ کرتے ہیں۔ جو لوگ اس نظام اور قانون کی خلاف ورزی کرتے ہیں' انہیں سزا دی جاتی ہے اور اس طرح معاشرے کو جاہلیت کی گندگی سے پاک کیا جاتا ہے۔ تاکہ دین صرف اللہ کے لئے خالص ہو جائے اور تمام اور پورا دین اللہ کا رائج ہو جائے اور اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی الٰہ نہ ہو۔ کسی شکل میں بھی۔ یعنی ایسا الٰہ جو لوگوں کا قانون ساز ہو' ان کے لئے حسن و قبح کے پیمانے وضع کرتا ہو اور ان کی زندگی کی تنظیم کرتا ہو اور پھر یہ کہ انسانوں کے لئے قانون سازی کا مقام رکھتا ہو۔ کیونکہ الٰہ ہوتا ہی وہ ہے جو یہ سب کام کرتا ہو۔ انسانوں میں سے جو شخص بھی درج بالا حیثیات میں سے کوئی حیثیت اپنے لئے مخصوص کرتا ہو' سمجھ لو کہ اس نے گویا الوہیت کا دعویٰ کر لیا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ جو نظام زندگی اللہ کی جانب سے ہو' وہ کسی بھی صورت میں ایسے شخص کو ایسے دعویٰ کی اجازت نہیں دے سکتا کہ وہ ایسا دعویٰ کرے اور اس پر عمل پیرا بھی ہو۔

لہٰذا منطقی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے جو بھی دین آئے گا وہ ایک خالص نظریۂ حیات اور بعض وجدانی تصورات اپنے ساتھ لے کر آئے گا' اس کے ساتھ ایک عملی شریعت ہوگی اور اس کے بعد وہ ایک نظام حکومت حاصل کرے گا اور اس میں شریعت کا نفاذ ہو گا۔

یہی صورت حال تھی' جو مدینہ طیبہ میں اسلام نے پیدا کی۔ اس نے ایک مملکت کی بنیاد رکھی' اس کے لئے قانون سازی کی گئی اور جرائم پر سزا دی گئی۔ جس طرح اس سورت میں ان قوانین و احکام کی تفصیلات ایک ایک کر کے ہم دیکھ رہے ہیں۔ ان احکام میں وقتاً فوقتاً تبدیلی بھی ہوتی رہی اور یہ احکام و قوانین آخری شکل اختیار کرتے رہے۔ جس طرح اللہ نے چاہا' ہوتا رہا۔

اور اس بات میں کوئی انوکھا پن نہیں ہے کہ اسلامی ریاست معاشرہ سے فحاشی کو مٹانے کے لئے اس قدر سخت قوانین وضع کر رہی ہے اور اس کی بیخ کنی کر رہی ہے۔ قانون سازی' اس کے نفاذ' سزا دہی اور تربیت اور تادیب کے ذریعہ اسلامی معاشرے کو پاک کیا جا رہا ہے۔ اس لئے کہ ہر دور میں جاہلیت کی پہلی علامت یہ ہوتی ہے کہ اس میں جنسی انارکی کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے' جیسا کہ ہمارے دور کی جاہلیت جدیدہ میں ہم ہر طرف دیکھ رہے ہیں۔ انسان کو جنسی لحاظ سے حیوان بنا دیا گیا ہے۔ جنسی تعلق کے لئے کوئی ضابطہ اخلاق نہیں رہا ہے' کوئی قانون نہیں رہا ہے اور اس جنسی انارکی اور آزادانہ جنسی اختلاط کو شخصی آزادی تصور کیا جاتا ہے اور جو شخص اس کی مخالفت کرتا ہے اسے رجعت پسند کہا جاتا ہے۔

جاہلیت کے پرستار اپنی تمام آزادیوں کو نظر انداز کر سکتے ہیں لیکن وہ اس حیوانی آزادی سے دستبردار ہونے کے لئے کسی صورت میں بھی تیار نہیں ہوتے۔ وہ تمام دوسری آزادیاں تو چھوڑ سکتے ہیں لیکن جو شخص ان کی حیوانی جنسی آزادی کی ضابطہ بندی کرتا ہے اور اسے پاک کرتا ہے وہ اس کے مقابلے میں اکھڑ ہوتے ہیں۔

جاہلی معاشرے کی ایک اہم پالیسی یہ بھی ہوتی ہے کہ اس کے تمام شعبے اخلاقی ضابطوں کی توڑ پھوڑ میں باہم معاون ہوتے ہیں۔ یہ تمام تنظیمیں نفس انسانی کے اندر پائے جانے والے تمام فطری ضابطوں کو برباد کرنے میں لگے ہوئے ہوتے ہیں' یہ لوگ لوگوں کی نظروں میں اس حیوانی جنسی بے راہ روی کو مزین بناتے ہیں اور اسے بڑے ہی خوبصورت اور پاکیزہ عنوانات کے ساتھ پیش کرتے ہیں اور مختلف طریقوں

سے جنسی تعلقات کے اندر ہیجان پیدا کرتے ہیں اور اسے مجبور کرتے ہیں کہ یہ تعلق کسی ضابطے کا پابند نہ رہے۔ یہ جاہلی نظام ایک نوجوان پر سے خاندان کی طرف سے کنٹرول ختم کرتا ہے' بلکہ خود خاندانی نظام کو ختم کرتا ہے' اور صحت مند جنسی شعور کو ذلیل ننگی جنسی بے راہ روی میں تبدیل کرتا ہے۔ وہ اسے قابل تعریف قرار دیتا ہے' بلکہ اس کی خاطر وہ عریانی کو رواج دیتا ہے اور یہ عریانی بیک وقت جسمانی' جذباتی اور انداز تعبیر یعنی ادب میں بھی رواج پاتی ہے۔ جسم ننگا' جذبات ننگے اور ادب ننگا ہو جاتا ہے۔

جب اسلام آیا تو اس وقت معاشرہ میں اس گری ہوئی جاہلیت کے تمام خدوخال موجود تھے اور اسلام کے اہداف میں سے ایک ہدف یہ تھا کہ انسانی تصورات اور انسانی سوسائٹیوں کو ان گندگیوں سے پاک کر دے اور یہ خدوخال ہر جاہلی نظام میں موجود ہوتے ہیں۔ جن لوگوں نے عرب جاہلیت کے سرخیل امرءالقیس کے اشعار پڑھے ہیں تو بعینہ ویسے ہی نمونے یونانی جاہلیت میں موجود ہیں۔ ویسے ہی نمونے رومی جاہلیت میں بھی پائے جاتے ہیں اور یہی رخ ہے آج کے تمام جاہلی آداب کا جس میں آج کے عربوں کا جاہلی ادب بھی شامل ہے۔ اسی طرح کسی ایک جاہلی معاشرے کے رسم و رواج کا اگر مطالعہ کیا جائے تو اس میں عورت کا بازاری پن' عشاق چاک گریبانی' مرد و زن کا بے قید اختلاط پایا جائے گا اور یہی وہ صفات ہیں جو ہر قدیم و جدید جاہلیتوں کے اندر پائی جاتی ہیں۔ اور یہی ان سب کے درمیان قدر مشترک ہے۔ اور یہ اوصاف ایک ہی فکر کی پیداوار ہوتے ہیں اور باہم بالکل مماثل ہوتے ہیں۔

تاریخ گواہ ہے کہ یہی جنسی بے راہ روی ہے' جس کی وجہ سے ہمیشہ تہذیبوں کے اندر توڑ پھوڑ کا عمل پیدا ہوا' جس سے اقوام زوال کے گڑھے میں گریں' یہی صورت حال یونانی تہذیب کو پیش ہوئی۔ اس کے بعد رومیوں کے ساتھ یہی حادثہ ہوا' قدیم فارسی تہذیب کو بھی انہی اسباب نے تباہ کیا اور آج بھی مغربی تہذیب کے یورپی اور امریکی معاشرے اس جنسی بے راہ روی کے ہاتھوں توڑ پھوڑ کا شکار ہو رہے ہیں۔ ان معاشروں کا تہذیبی زوال شروع ہو چکا ہے' حالانکہ ان کی صنعتی اور تمدنی ترقی اپنے عروج پر ہے۔ اہل غرب کے دانشمند اور دانشور اس تہذیبی زوال کے آغاز سے سخت پریشان ہیں لیکن جس طرح کہ ان کے اقوال اور تجربوں سے معلوم ہوتا ہے وہ اس زوال پذیری کے عمل کے سامنے کسی قسم کا بند باندھنے سے عاجز ہیں۔[۱]

اس امر کے باوجود کہ وہ اپنے انجام کو اچھی طرح جان رہے ہوتے ہیں' جاہلیت کے علمبردار ہر دور میں اور ہر جگہ میں اس زوال کی طرف دھکیلے چلے جاتے ہیں۔ وہ بعض اوقات تمام انسانی آزادیوں سے دستبردار ہو جاتے ہیں' یا اس کے لئے تیار ہو جاتے ہیں لیکن ان کی اس حیوانی آزادی کے سامنے اگر کوئی معمولی سی رکاوٹ آتی ہے تو وہ اس کے لئے ہرگز تیار نہیں ہوتے۔ وہ مکمل غلامی کے لئے تو تیار ہو جاتے ہیں لیکن اس حیوانی جنسی آزادی کو ترک کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔

کیا یہ آزادی ہے۔ کیا یہ کوئی حقوق ہیں' میں سمجھتا ہوں کہ یہ تو انسانی مرتبے سے' حیوانی زندگی کی طرف لوٹنا ہے۔ اور حیوانی تقاضوں کی بد ترین غلامی ہے۔ بلکہ یہ لوگ حیوانوں سے بھی زیادہ گر گئے ہیں۔ حیوانوں کی حالت تو یہ ہے کہ ان کی جنسی خواہش ایک فطری قید کے اندر مقید ہے۔ حیوانوں کے لئے اللہ نے ایک موسم مقرر کر دیا ہے جس کے اندر نر مادہ دونوں کے اندر جنسی ملاپ کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ اور یہ جنسی ملاپ بھی محض تلذذ کے لئے نہیں ہوتا بلکہ فطرت کے مقاصد یعنی نسل کشی کے لئے ہوتا ہے۔ حیوان مادہ نر کو صرف متعین وقت میں قبول کرتی ہے۔ اور نر بھی اسی وقت آمادہ ہوتا ہے جب مادہ تیار ہو۔ رہا انسان تو اللہ تعالیٰ نے اس کی جنسی خواہش کو اس کی عقل کے کنٹرول میں دے دیا ہے اور اس کی عقل کو اس کے نظریہ کے تابع قرار دیا ہے جب بھی عقل انسانی اس کے نظریۂ حیات کے کنٹرول سے باہر نکلتی ہے۔ انسانی عقل فطری خواہش اور دباؤ کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ وہ جسمانی تقاضوں کے سامنے کمزور پڑ جاتی ہے۔ اور ایسے حالات

---

[۱] دیکھئے مولانا سید مودودی ؒ امیر جماعت اسلامی پاکستان کی کتاب "الحجاب"

میں خواہشات نفسانیہ کا ضبط مشکل پڑ جاتا ہے اور معاشرے کو اس گندگی سے پاک کرنا محال ہو جاتا ہے۔ یہ کام صرف نظریۂ حیات ہی کر سکتا ہے جو راہوار نفس کی زمام کو مضبوطی سے پکڑ لیتا ہے۔ اس کے بعد اس نظریۂ حیات کے بل بوتے پر ایک سیاسی قوت کا وجود ضروری ہوتا ہے جو اس عقیدے اور نظریۂ حیات پر مبنی ہو' اور اس قوت کے ہاتھ میں پھر حکومت کا آنا بھی ضروری ہوتا ہے تاکہ یہ حکومت بذریعہ تربیت' راہنمائی اور سزا دہی منحرفین کی راہ روکے اور انسان کو برے راستوں سے موڑ کر' حیوانی مقام سے بلند کر دے اور وہ انسانیت کو اشرف المخلوقات کے مقام بلند تک پہنچا دے۔

جب بھی انسان جاہلیت کے دور میں داخل ہوتا ہے' اس کا کوئی نظریۂ حیات نہیں ہوتا۔ اس کے پاس جو اجتماعی حکومت بھی ہوتی ہے اس کا بھی کوئی نظریہ نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ ایک عرصہ سے مغربی جاہلیت کے دانشور چیخ رہے ہیں اور کوئی نہیں ہے جو ان کی طرف متوجہ ہو۔ اس لئے کہ انسان محض ہوائی باتوں کی طرف کبھی متوجہ نہیں ہوتا۔ جب تک ان باتوں کی پشت پر قوت نافذہ نہ ہو' اسی طرح مغرب میں اہل کنیسا اور مذہبی لوگ مسلسل چیخ رہے ہیں لیکن کوئی نہیں جو ان کی بات سنے۔ اس لئے کہ لوگ محض نظریات کی طرف متوجہ نہیں ہوتے۔ الا یہ کہ ان نظریات کی پشت پر حکومت ہو اور وہ ان کی حامی ہو۔ وہ ان نظریات کی راہنمائی پر عمل پیرا ہو' قوانین و ضوابط کو نافذ کرے۔ یہی وجہ ہے کہ انسانیت جہنم کے گڑھے کی طرف رواں دواں ہے' وہ اس فطری ضابطے سے بھی آزاد ہے جو حیوان کے لئے قدرت نے خود مقرر کر دیا ہے۔ وہ نظریہ' ایمان اور شریعت کے بندھنوں سے بھی آزاد ہے' جو اللہ نے انسان کے لئے نازل کی ہے۔

اس مغربی تہذیب کی بربادی اور تباہی اٹل ہے۔ ان سابقہ تاریخی تجربات کی روشنی میں جو تمام جاہلی تہذیبوں کی تاریخ میں پیش آئے' چاہے بظاہر وہ پختہ اور مستحکم نظر آئے' چاہے بظاہر وہ وسیع الاساس نظر آئے۔ اس لئے کہ انسان تہذیب سے بڑی اور اہم مخلوق ہے۔ جب انسان تباہ ہو جائے تو انسانی تہذیب کو محض صنعت اور کثرت پیداوار کے بل بوتے پر نہیں بچایا جا سکتا۔

یہ ہے اصل حقیقت اور جس وقت ہم اس کی گہرائیوں تک پہنچ گئے' ہمیں معلوم ہو جائے گا کہ اسلام کس قدر عظیم نظام زندگی ہے۔ اور کیوں اس نے جنسی بے راہ روی کے لئے اس قدر سخت ترین سزائیں تجویز کی ہیں؟ محض اس لئے کہ "انسان" کو ہلاکت سے بچایا جائے۔ انسانی زندگی کو اصل انسانی بنیادوں پر استوار کیا جائے اور اس سے ہمیں اس حقیقت کا بھی ادراک ہو جائے گا کہ جو ادارے اور حکومتیں ان انسانی اساسوں کا قلع قمع کر رہی ہیں' وہ انسانیت کے خلاف کس قدر عظیم جرم کا ارتکاب کر رہے ہیں۔ وہ محض فحاشی پھیلا کر' حیوانی شہوت رانی کے جذبات کو جگا کر اور عریانی کے ذریعہ جنسی بے راہ روی کو منظم کر کے' اس جرم کا ارتکاب کرتے ہیں۔ اس کا نام کبھی وہ فن اور فنکاری رکھتے ہیں۔ کبھی وہ اسے آزادی کا نام دیتے ہیں۔ اور کبھی وہ اسے ترقی پسندی کہتے ہیں۔ لیکن ہمارا فرض یہ ہے کہ ہم انسانیت کی تباہی کی ہر شکل و صورت اور ہر عنوان کے سامنے کھڑے ہو جائیں۔ نصیحت و تبلیغ اور جزا و سزا دونوں کے ذریعہ اس کو روکیں۔ یہ وہ کام ہے جسے اس دنیا میں صرف اسلام سرانجام دے رہا ہے اور یہ کام وہ اسلام کے مکمل نظام زندگی کے نفاذ کے ذریعہ کرتا ہے۔ جو نہایت ہی قوی الاساس ہے۔[1]

○.....☆☆☆.....○

ہاں جنسی بے راہ روی کے خلاف ان قانونی تدابیر کے باوجود اسلام خطاکاروں کے لئے واپسی کا دروازہ بند نہیں کرتا۔ اگر وہ توبہ کریں' پاکی کی راہ اپنائیں' اور واپس ہونا چاہیں تو توبہ کے دروازے کھلے ہیں بلکہ اسلام ان کی واپسی کے لئے کھلی راہ فراہم کرتا ہے۔ وہ ان کی

---

[1] دیکھئے میری کتاب (الاسلام والسلام العالمی) کی فصل گھر کی سلامتی

واپسی کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ جب بھی وہ توبہ کریں اللہ تعالیٰ ان کی توبہ قبول کرتا ہے' اور اللہ تعالیٰ اپنے اوپر مجرموں کے لئے یہ حق لازم کرتا ہے کہ وہ ضرور توبہ قبول کرے گا۔ صدبار اگر توبہ شکستی باز آ۔ یہ اللہ کا اس قدر عظیم کرم ہے جو انتہا کو پہنچا ہوا ہے اور اب اس میں مزید کوئی اضافہ ممکن ہی نہیں ہے۔

إِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللَّهِ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ السُّوءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوبُونَ مِن قَرِيبٍ فَأُولَٰئِكَ يَتُوبُ اللَّهُ عَلَيْهِمْ ۗ وَكَانَ اللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمًا ﴿١٧﴾ وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ السَّيِّئَاتِ حَتَّىٰ إِذَا حَضَرَ أَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ إِنِّي تُبْتُ الْآنَ وَلَا الَّذِينَ يَمُوتُونَ وَهُمْ كُفَّارٌ ۚ أُولَٰئِكَ أَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا ﴿١٨﴾

"ہاں یہ جان لو کہ اللہ پر توبہ کی قبولیت کا حق انہی لوگوں کے لئے ہے جو نادانی کی وجہ سے برا فعل کر گزرتے ہیں اور اس کے بعد جلدی ہی توبہ کر لیتے ہیں۔ ایسے لوگوں پر اللہ اپنی نظر عنایت سے پھر متوجہ ہوتا ہے۔ اور اللہ ساری باتوں کی خبر رکھنے والا اور حکیم و دانا ہے۔ مگر توبہ ان لوگوں کے لئے نہیں ہے جو برے کام کئے چلے جاتے ہیں یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کی موت کا وقت قریب آ جاتا ہے اس وقت وہ کہتا ہے کہ میں نے توبہ کی۔ اور اسی طرح توبہ ان کے لئے بھی نہیں ہے جو مرتے دم تک کافر رہیں۔ ایسے لوگوں کے لئے تو ہم نے دردناک سزا تیار کر رکھی ہے۔"

اسی بارے میں ہم فی ظلال القرآن میں سورۂ آل عمران کی تشریح کرتے ہوئے توبہ پر بات کر آئے ہیں۔ وہاں آیت وَالَّذِينَ إِذَا فَعَلُوا فَاحِشَةً أَوْ ظَلَمُوا أَنفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللَّهَ فَاسْتَغْفَرُوا لِذُنُوبِهِمْ .... "وہ لوگ جو کوئی فحش فعل کر لیتے ہیں یا اپنے نفسوں کے اوپر ظلم کر گزرتے ہیں' اللہ کو یاد کرتے ہیں اور فوراً اپنے گناہوں کی معافی مانگتے ہیں) وہ پوری بحث اس آیت کی تفسیر میں بھی نقل کی جا سکتی ہے۔ لیکن یہاں توبہ کے لئے جو انداز کلام اختیار کیا گیا ہے' اس سے پیش نظر کوئی اور مقصد ہے۔ یہاں زیادہ زور اس پر ہے کہ توبہ کی حقیقت کیا ہے؟

وہ توبہ جسے اللہ قبول کرتا ہے اور جس کی قبولیت اللہ تعالیٰ نے اپنے اوپر لازم کر دی ہے (از راہ کرم) وہ توبہ وہ ہے جو نفس کی گہرائیوں سے اٹھے' جس سے معلوم ہو کہ اس نفس انسانی نے ایک نیا جنم لیا ہے' ندامت نے اسے گہرائیوں تک جھنجوڑ کر رکھ دیا ہے اور اسے اس قدر ہلایا ہے کہ وہ اپنی سمت بدل گیا ہے' وہ اللہ کی طرف مڑ گیا ہے' توبہ اس معنی میں پوری عمر کے لئے رجوع ہے' ایک نئی امید کی کرن ہے۔ اس میں پاکیزگی اختیار کرنے کا عزم جدید ہوتا ہے۔ اور ایک حقیقی نیت پائی جاتی ہے کہ توبہ کرنے والا جدید راہوں پر صدق دل سے چلے گا۔

إِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللَّهِ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ السُّوءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوبُونَ مِن قَرِيبٍ فَأُولَٰئِكَ يَتُوبُ اللَّهُ عَلَيْهِمْ ۗ وَكَانَ اللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمًا ﴿١٧﴾

"ہاں یہ جان لو کہ اللہ پر توبہ کی قبولیت کا حق انہی لوگوں کے لئے ہے جو نادانی کی وجہ سے کوئی برا فعل کر گزرتے ہیں اور اس کے بعد جلدی توبہ کر لیتے ہیں۔ ایسے لوگوں پر اللہ اپنی نظر عنایت سے پھر متوجہ ہو جاتا ہے اور اللہ ساری باتوں کی خبر رکھنے والا اور حکیم و دانا ہے۔"

وہ لوگ نادانی کی وجہ سے کوئی برا فعل کرتے ہیں' گناہ کا ارتکاب کرتے ہیں۔ اس بات پر تقریباً اجماع نظر آتا ہے کہ جہالت سے مراد یہاں نظریاتی گمراہی ہے' چاہے طویل ہو یا قصیر عرصے کے لئے ہو۔ بشرطیکہ مرتکب گناہ اس پر اصرار نہ کر رہا ہو اور یہ کہ حالت نزع نہ شروع ہو گئی ہو اور وہ لوگ جو جلدی توبہ کر لیتے ہیں وہ کون ہیں؟ یہ وہ لوگ ہیں جو موت نظریا سکرات الموت کے آغاز سے پہلے لوٹ آئیں۔ ابھی انہیں موت کی دہلیز نظر نہ آئی ہو۔ تو یہ توبہ' توبہ ندامت تصور ہو گی۔ گناہ سے نکل آنا' عمل صالح کا عزم کر لینا اور گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کا عزم کر لینا ہی حقیقی توبہ ہے اور اس سے نفس انسانی گویا ایک نیا جنم لیتا ہے۔ اور ضمیر از سر نو جاگ اٹھتا ہے **فَأُولَٰئِكَ يَتُوبُ اللَّهُ عَلَيْهِمْ** .... "ایسے لوگوں پر اللہ اپنی نظر عنایت سے پھر متوجہ ہوتا ہے۔" اور اللہ ساری باتوں کا خبر رکھنے والا اور حکیم و دانا ہے۔ **وَكَانَ اللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمًا** .... وہ تمام اقدامات علم و حکمت کی بنیاد پر کرتا ہے اور اپنے ضعیف بندوں کو لوٹ آنے کا موقعہ فراہم کرتا ہے کہ وہ از سر نو پاک صفوں میں آ کر کھڑے ہو جائیں اور وہ اس طرح نہیں کرتا کہ گناہ گاروں کو دھتکار دے حالانکہ وہ حقیقتاً باز آنے کی نیت رکھتے ہوں۔ وہ اس کے در رحمت اور بارگاہ امن میں واپس آنا چاہتے ہیں۔

اللہ رحیم و کریم ہیں' وہ اپنے ضعیف بندوں کو دھتکارتے نہیں۔ اور نہ ہی ان کا پیچھا کرتے ہیں۔ اگر وہ باز آنا چاہیں۔ وہ تو بے نیاز ہے۔ اگر وہ باز آتے ہیں تو اسے کیا فائدہ ہے' یہ تو خود ان کا فائدہ ہے۔ خود ان کی زندگی' اس سے سلجھتی ہے' وہ معاشرہ اصلاح پذیر ہوتا ہے' جس میں خود وہ رہتے ہیں۔ یہی تو سبب ہے کہ وہ ان کو ان کی واپسی' توبہ اور پاکیزہ رویہ اختیار کرنے کے لئے وسیع مواقع فراہم کرتا ہے۔

وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ السَّيِّئَاتِ حَتَّىٰ إِذَا حَضَرَ أَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ إِنِّي تُبْتُ الْآنَ .... "مگر توبہ ان لوگوں کے لئے نہیں ہے جو برے کام کئے چلے جاتے ہیں یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کی موت کا وقت آ جاتا ہے اس وقت وہ کہتا ہے کہ اب میں نے توبہ کی۔" اس لئے کہ یہ توبہ گویا اب مضطر کی توبہ ہے جو گمراہی میں ڈوب گیا ہے۔ اور خطاکاری میں وہ گھرا ہوا ہے۔ یہ اس شخص کی توبہ ہے جس کے لئے اب ارتکاب گناہ کا کوئی موقعہ ہی نہیں رہا ہے۔ نہ اب وہ کسی غلط کاری میں پڑ سکتا ہے۔ اور اس حالت میں اللہ تعالیٰ کو یہ توبہ قبول نہیں ہے۔ اس لئے کہ اس سے قلبی اصلاح اور زندگی کی عملی اصلاح کا اظہار نہیں ہوتا۔ اس سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اس شخص کے دل میں کوئی تبدیلی آ گئی ہے یا اس کے نقطۂ نظر اور سمت میں کوئی بہتر تبدیلی ہو گئی ہے۔

توبہ اس لئے قبول کی جاتی ہے کہ یہ ایک دروازہ ہے جو ان لوگوں کے لئے کھلا رکھا گیا ہے' جو اخلاقی گراوٹ کا شکار ہو چکے ہوتے ہیں تاکہ وہ واپس آ کر اسلام کے حظیرہ امن و سکون میں داخل ہو جائیں' وہ واپس آ جائیں' گمراہیوں کی تاریکی' دبیز تاریکی سے واپس آ جائیں۔ انسانیت انہیں شیطان کے جھنڈوں کے زیر سایہ کام کرنے والے گروہ سے نکال کر واپس لے آئے اور وہ صالح زندگی کا آغاز کریں۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس واپسی کے بعد انہیں موقعہ ملتا ہے یا نہیں۔ کم از کم یہ موقعہ تو ہو کہ وہ یہ اعلان کر سکیں کہ ہدایت نے گمراہی پر فتح پا لی ہے۔ اگرچہ اس اعلان کے بعد انہیں مزید فرصت نہ ملے اور ان کی زندگی کا اختتام ہو جائے۔ اس لئے کہ موت کا علم کسی کو بھی نہیں

ہے۔ کہ وہ کب پہنچ آئے۔

وَلَا الَّذِيْنَ يَمُوْتُوْنَ وَ هُمْ كُفَّارٌ .... "اور اسی طرح توبہ ان لوگوں کے لئے بھی نہیں ہے جو مرتے دم تک کافر ہیں۔" کیونکہ ان لوگوں نے اس تعلق ہی کو ختم کر دیا جو ان کے اور توبہ کے درمیان تھا۔ انہوں نے اس مہلت کو ضائع کر دیا جو انہیں توبہ اور حصول مغفرت کے لئے دی گئی تھی۔

اُولٰٓئِكَ اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا .... "ایسے لوگوں کے لئے تو ہم نے دردناک سزا تیار کر رکھی ہے۔" یہ تیار ہے پوری طرح مہیا کر دی گئی ہے' حاضر ہے' موجود ہے' ان کے انتظار میں ہے۔ تیاری کی ضرورت نہ ہوگی۔

غرض یہ درست ہے کہ اسلامی نظام نے فحاشی کے لئے سخت ترین سزا تجویز کی ہے لیکن اس نے توبہ کا دروازہ بھی پوری طرح کھلا چھوڑا ہوا ہے۔ چنانچہ اس طرح سزا کی سختی کے اندر ایک طرح کا توازن پیدا ہو جاتا ہے اور انسانی زندگی میں اس کی وجہ سے ایسے نتائج اور آثار پیدا ہوئے ہیں جو اس کرۂ ارض پر کسی بھی قدیم و جدید نظام کی وجہ سے نہیں پیدا ہوئے۔

○.....☆☆☆.....○

اس سبق کا دوسرا موضوع عورت ہے' عورت کی ذات۔ عربی جاہلیت میں بھی' تمام دوسری ان جاہلیتوں کی طرح جو عرب کے ارد گرد پھیلی ہوئی تھیں' عورت کے ساتھ بہت ہی برا سلوک کیا جاتا تھا۔ اسے بنیادی انسانی حقوق حاصل نہ تھے۔ مرد کے مقابلے میں اس کی حیثیت بہت ہی نیچے تھی۔ وہ ایک انسان کے بجائے ایک سامان سمجھی جاتی تھی۔ اور اس کی یہ حیثیت اس وقت تھی جب مرد اس سے سکون بھی حاصل کرتا' اس سے حیوانی لذت بھی حاصل کرتا' اسے نفس کے لئے فتنہ بھی قرار دیتا اور اسے نیکی اور بھلائی کے اوصاف کے لئے شیطانی فتنہ قرار دیا جاتا۔ بس شہوت رانی اور ننگی غزلوں کا وہ موضوع ہوتی.... ایسے حالات میں جب اسلامی نظام زندگی آیا تو اس نے عورت سے ان تمام مظالم کو رفع کر دیا۔ اور اسے خاندان کے اندر ایک حقیقی مقام اور حیثیت دی گئی اور انسانی سوسائٹی میں اسے اپنے اصلی منصب پر فائز کیا گیا۔ وہ حیثیت جو اس منصب اور مقام کے عین مطابق تھی جس کا ذکر اس سورت کے آغاز میں کیا گیا تھا "جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا اور اسی جان سے اس کا جوڑا بنایا اور ان دونوں سے بہت مرد اور عورت دنیا میں پھیلائے۔" .... اس کے بعد عائلی زندگی کے اندر انسانی جذبات اور انسانی شعور کا درجہ بلند کیا گیا اور ایک دوسرے کے ساتھ محبت اور احترام اور رحم و ہمدردی اور حسن سلوک کا حکم دیا گیا تاکہ دونوں کے یہ تعلقات محض حیوانی درجے سے بلند ہو کر انسانی مقام تک آ جائیں اور اس قدر پختہ ہوں کہ ایک ہی وار میں ٹوٹ پھوٹ نہ جائیں۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرْهًا ؕ وَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ لِتَذْهَبُوْا بِبَعْضِ مَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ ۚ وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔـا وَّيَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا ﴿۱۹﴾ وَاِنْ اَرَدْتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ ۙ وَّاٰتَيْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَيْـًٔـا ؕ اَتَاْخُذُوْنَهٗ بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا ﴿۲۰﴾ وَكَيْفَ تَاْخُذُوْنَهٗ وَقَدْ

أَفْضٰى بَعْضُكُمْ إِلٰى بَعْضٍ وَّ أَخَذْنَ مِنْكُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ﴿٢١﴾ وَلَا تَنْكِحُوْا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ إِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ ۭ إِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَّ مَقْتًا ۭ وَ سَآءَ سَبِيْلًا ﴿٢٢﴾

۳ ع ۸ ۱۴

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو تمہارے لئے یہ حلال نہیں ہے کہ زبردستی عورتوں کے وارث بن بیٹھو۔ اور نہ یہ حلال ہے کہ انہیں تنگ کر کے اس مہر کا کچھ حصہ اڑا لینے کی کوشش کرو جو تم انہیں دے چکے ہو۔ ہاں اگر وہ کسی صریح بد چلنی کی مرتکب ہوں (تو ضرور تنگ کرنے کا حق ہے)۔ ان کے ساتھ بھلے طریقے سے زندگی بسر کرو۔ اگر وہ تمہیں ناپسند ہوں تو ہو سکتا ہے کہ ایک چیز تمہیں پسند نہ ہو مگر اللہ نے اسی میں بہت کچھ بھلائی رکھ دی ہو۔ اور اگر تم ایک بیوی کی جگہ دوسری بیوی لے آنے کا ارادہ ہی کر لو تو خواہ تم نے اسے ڈھیر سا مال ہی کیوں نہ دیا ہو' اس میں سے کچھ واپس نہ لینا۔ کیا تم اسے بہتان لگا کر اور صریح ظلم کر کے واپس لو گے؟ اور آخر تم اسے کس طرح واپس لے لو گے جبکہ تم ایک دوسرے سے لطف اندوز ہو چکے ہو اور وہ تم سے پختہ عہد لے چکی ہیں۔ اور جن عورتوں سے تمہارے باپ نکاح کر چکے ہیں ان سے ہرگز نکاح نہ کرو' مگر جو پہلے ہو چکا سو ہو چکا۔ درحقیقت یہ ایک بے حیائی کا فعل ہے' ناپسندیدہ ہے اور برا چلن ہے۔"

اس سے پہلے کہ اسلام عربوں کو قعر مذلت سے نکال کر عزت و شرافت کی بلند سطح تک پہنچاتا' عربوں کی حالت یہ تھی کہ جب کوئی فوت ہو جاتا تو اس کے ورثاء اس کی بیوی کے بھی حقدار بن جاتے اور وہ بھی انہیں اسی طرح میراث میں ملتی جس طرح دوسرے مویشی اسے بطور ترکہ ملتے تھے۔ اب اگر وارث چاہتا تو عورت کے ساتھ بھی نکاح کر لیتا۔ اور اگر چاہتا تو اسے کسی دوسرے شخص کے نکاح میں دے کر اس کا مہر حاصل کر لیتا۔ جس طرح مویشی فروخت ہوتے تھے گویا یہ عورت بھی فروخت ہو جاتی۔ اور اگر یہ وارث چاہتے تو اسے گھر میں عضو معطل کی طرح رکھ چھوڑتے۔ نکاح بھی نہ کرتے' یونہی رہتی۔ یہاں تک کہ وہ اپنے نفس کا معاوضہ دے کر جان چھڑاتی۔

بعض جگہ یہ رواج تھا کہ جب خاوند فوت ہوتا تو اس کا ولی دوڑ کر آتا اور اس عورت پر کپڑا ڈال دیتا۔ اس طرح وہ اسے گویا تمام لوگوں سے روک لیتا اور اس طرح سے اس پر قابض ہو جاتا جس طرح کوئی مال غنیمت پر قابض ہو جاتا ہے۔ اگر وہ خوبصورت ہوتی تو نکاح میں لے لیتا اور اگر بد صورت ہوتی تو قید رہتی اور موت کے بعد یہ شخص اس کا وارث قرار پاتا یا وہ مال دے کر اپنی گردن آزاد کر لیتی۔ لیکن اگر خاوند فوت ہونے کے بعد وہ فوراً اپنے والدین کے گھر چلی جاتی اور وارث اس پر کپڑا نہ ڈال سکتا تو وہ بچ جاتی اور وہ آزاد بھی جاتی۔

بعض جگہ یہ رواج تھا کہ ایک شخص بیوی کو طلاق دے دیتا اور یہ شرط عائد کر دیتا کہ وہ صرف اس جگہ نکاح کرے گی جس کی اجازت وہ دے گا۔ یوں وہ اس کو مال دے کر اپنے آپ کو آزاد کراتی۔ مہر لوٹاتی اور دوسرے ہدایا واپس کر دیتی۔

اگر کسی کی تحویل میں یتیم لڑکی ہوتی تو وہ اسے بند رکھتا تاکہ اس کا نابالغ بچہ بالغ ہو جائے اور وہ اس کے ساتھ نکاح کرے۔ اس طرح بعض اوقات بیوہ کو بھی ایک چھوٹے بچے کے لئے بند رکھا جاتا۔

یہ اور اس قسم کے اور رواج تھے' جو مقام شرافت اور عزت کے بالکل خلاف تھے۔ وہ شرافت اور عزت جو انسان کو اسلام دیتا ہے۔ حالانکہ عورت مرد کی شقیقہ ہے۔ ایک ہی نفس سے دونوں کو پیدا کیا گیا ہے۔ اور اس طرز عمل سے جس طرح عورت مقام عزت و

شرافت سے گری ہوئی تھی' اسی طرح مرد کے لئے بھی یہ صورت حال باعث شرم تھی۔ یوں نظر آتا تھا کہ مرد اور عورت کا تعلق کوئی تجارتی تعلق ہے یا محض حیوانی تعلق ہے۔

غرض مرد و زن کے تعلق کو اسلام نے ذلت کے اس گہرے گڑھے سے بلند کر کے انسانیت کے باعزت مقام تک پہنچایا۔ اسے ایسا مقام دیا جو انسانی شرافت کے لائق تھا۔ اس لئے کہ اسلام کے تصور انسانیت کے مطابق انسان عالمین کے اندر ذی شرف مخلوق ہے۔ لہٰذا یہ اسلام ہی تھا' جس نے اسے یہ مقام عالی دیا' اس قدر مقام عالی جو انسان کو صرف اسلام کے مصدر اور ماخذ سے ملا۔[ا]

اسلام نے عورت کو بطور سامان وراثت دوسرے سامان کے ساتھ حاصل کرنے کے فعل کو حرام قرار دیا۔ اسی طرح اسے قید کر کے عضو معطل بنانے کی بھی ممانعت کر دی۔ الا یہ کہ اس سے فاشی کا جرم سرزد ہو جائے۔ اور یہ بھی اس وقت تھا جب حد زنا کا حکم نازل نہ ہوا تھا۔ اور اسلام نے ان حالات میں عورت کو یہ حق دیا کہ وہ جس کے ساتھ چاہے نکاح کرے۔ چاہے یہ ابتدائی شادی ہو یا دوسری شادی ہو' کنواری ہو یا بیوہ ہو' مطلقہ ہو یا اس کا خاوند فوت ہو گیا ہو۔ اور اس کے ساتھ معروف طریقے کے مطابق زندگی گزارنا مرد پر لازم کر دیا گیا۔ اگرچہ اس عورت کو مرد پسند نہ کرتا ہو۔ ہاں یہ اور بات ہے کہ اس عورت کے ساتھ اس کی معاشرت ممکن ہی نہ رہے۔ اس لئے کہ ہو سکتا ہے کہ وہ عورت کو پسند نہ کرتا ہو لیکن اس میں اس کے لئے خیر پوشیدہ ہو۔ اس لئے اسے مناسب نہیں ہے کہ طبیعت کے اندر نفرت آتے ہی وہ اسے طلاق دے دے۔ اگر وہ بیوی کو رکھے تو آنے والے دور میں اسے اس سے فائدے بھی مل سکتے ہیں۔ اس لئے اسے چاہئے کہ امید کا دیا جلائے رکھے۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا يَحِلُّ لَكُمْ أَنْ تَرِثُوا النِّسَاءَ كَرْهًا ۖ وَلَا تَعْضُلُوهُنَّ لِتَذْهَبُوا بِبَعْضِ مَا آتَيْتُمُوهُنَّ إِلَّا أَنْ يَأْتِينَ بِفَاحِشَةٍ مُبَيِّنَةٍ ۚ وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ ۚ فَإِنْ كَرِهْتُمُوهُنَّ فَعَسَىٰ أَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَيَجْعَلَ اللَّهُ فِيهِ خَيْرًا كَثِيرًا ﴿١٩﴾

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو' تمہارے لئے یہ حلال نہیں ہے کہ زبردستی عورتوں کے وارث بن بیٹھو اور نہ یہ حلال ہے کہ انہیں تنگ کر کے اس مہر کا کچھ حصہ اڑا لینے کی کوشش کرو جو تم انہیں دے چکے ہو' ہاں اگر وہ صریح بدچلنی کی مرتکب ہوں' ان کے ساتھ بھلے طریقے سے زندگی بسر کرو' اگر وہ تمہیں ناپسند ہوں تو ہو سکتا ہے کہ ایک چیز تمہیں پسند نہ ہو مگر اللہ نے اس میں بہت کچھ بھلائی رکھ دی ہو۔"

اس آیت کی یہ آخری فنشنگ ہے۔ اس میں نفس انسانی اللہ کی ذات سے وابستہ اور مربوط کر دیا جاتا ہے۔ اگر میاں بیوی کے تعلقات کے درمیاں غصے اور غضب اور ہیجان کی حالت پیدا ہو جائے تو اسے ٹھنڈا کیا جاتا ہے۔ اگر بیوی ناپسند ہو تو اس ناپسندیدگی کی حدت کو قدرے نرم کر دیا جاتا ہے تاکہ انسانی نفس میں سکون پیدا ہو' اور یہ نہ ہو کہ تعلق زوجیت خشک پتے کی طرح ہوا کے معمولی جھونکے سے ادھر ادھر ہو جائے۔ کیونکہ تعلق زوجیت کو تعلق باللہ کی رسی سے مضبوطی سے باندھ دیا جاتا ہے۔ اس تعلق کو مومن اور اس کے رب کے پاکیزہ اور مضبوط تعلق سے جوڑ دیا جاتا ہے۔

اسلامی تصور حیات کے مطابق' ایک گھر انا بحیثیت ابتدائی اکائی انسان کے لئے امن و سکون اور محبت و رافت کی جگہ ہونا چاہئے۔

ا۔ "اسلام کا تصور خدا' تصور کائنات' تصور زندگی اور تصور انسان" یہ کتاب عنقریب شائع ہونے والی ہے۔

اس لئے وہ زوجین کے تعلقات کو بھی انس و محبت اور ہمدردی و ایثار کی اساس پر قائم کرنا چاہتا ہے۔ اور یہ تب ہی ہو سکتا ہے کہ میاں بیوی کے درمیاں تعلق مطلق رضامندی اور آزادی کی بنیاد پر قائم ہو تاکہ خاندان کے اندر محبت الفت اور ہمدردی کے جذبات ہر وقت موجود ہوں۔ اگر کبھی کدورت پیدا ہو جائے تو اسلام کی نصیحت یہ ہے کہ برداشت کرو۔ "اگر تم بیویوں کو ناپسند بھی کرتے ہو تب بھی اس بات کا امکان ہے کہ تم کسی چیز کو پسند کرو اور اللہ تمہیں اس میں بھلائی دے دے۔" یہ تلقین اس لئے کی جاتی ہے کہ جذبات کے پہلے جھونکے ہی میں رشتہ زوجیت ختم ہو کر نہ رہ جائے۔ پہلے ہی جھٹکے میں ہی نکاح نہ ٹوٹ جائے اور یہ قیمتی انسانی ادارہ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر نہ رہ جائے اور انسان کے بدلتے ہوئے جذبات اور اڑتے ہوئے میلانات کا شکار نہ ہو جائے۔

حضرت عمر ﷺ نے ایک شخص کو کیا خوب نصیحت فرمائی جو اپنی بیوی کو طلاق دینا چاہتا تھا اور طلاق کی وجہ صرف یہ تھی کہ اسے اس کے ساتھ محبت نہ تھی۔ "تم برباد ہو جاؤ کیا گھرانہ قائم ہونے کے لئے محبت کے سوا کوئی اور اساس نہیں ہوتی؟ پرورش اور ذمہ داریوں کا کیا ہو گا؟"

آج کل کے نام نہاد دانشور محبت کے نام سے جو بکواس کرتے ہیں' اس سے ان کی مراد بدلتے ہوئے ہیجانی اور وقتی جذبات ہوتے ہیں اور ان وقتی امور کی وجہ سے وہ اس بات کی اجازت دیتے ہیں کہ اس کی وجہ سے زوجین کے درمیان جدائی کر کے' اس اہم ادارے کو تباہ کر دیں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ اگر بیوی خاوند سے محبت نہیں کرتی تو اس کے ساتھ اس کی خیانت ہے۔ اور اگر مرد عورت کے ساتھ محبت نہیں کرتا تو یہ بھی اس کی جانب سے ایک قسم کی خیانت ہے۔

جو لوگ یہ باتیں کرتے ہیں وہ کم ظرف لوگ ہیں۔ ان کے دل و دماغ میں بدلتی ہوئی جسمانی خواہشات سے بلند کوئی ارفع اور اعلیٰ تصور سماتا ہی نہیں۔ وہ صرف حیوانی خواہشات ہی کے بارے میں سوچ سکتے ہیں۔ ان کے ذہن میں یہ بات نہیں سماتی کہ انسانی زندگی میں مروت' شرافت' حسن سلوک اور برداشت جیسے اوصاف بھی ہو سکتے ہیں' جو ان اوصاف اور میلانات اور گھٹیا سوچ سی بہت بلند ہیں جن کے یہ منہ پھٹ لوگ غلام ہیں۔ اور ان کی یہ سوچ اس لئے محدود ہے کہ اس کے اندر اللہ جل شانہ کی کوئی جگہ نہیں ہے اس لئے ان کے شعور میں یہ تصور نہیں ہے جو اللہ تعالیٰ کی جانب سے مومنین کو دیا جا رہا ہے۔

فَإِنْ كَرِهْتُمُوهُنَّ فَعَسَىٰ أَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَيَجْعَلَ اللَّهُ فِيهِ خَيْرًا كَثِيرًا ....

"اگر وہ تمہیں ناپسند ہوں تو ہو سکتا ہے کہ ایک چیز تمہیں پسند نہ ہو مگر اللہ نے اس میں بہت کچھ بھلائی رکھ دی ہو۔"

حقیقت یہ ہے کہ صرف ایمان ہی سے انسان کی حیثیت بلند ہوتی ہے' انسان کی ترجیحات بلند ہوتی ہیں اور انسانی زندگی کے مقاصد بلند ہو جاتے ہیں۔ انسانی زندگی کا معیار محض حیوانی فطری میلانات سے ذرا اوپر اٹھتا ہے۔ انسان محض سود اگر نہیں رہتا۔ نہ وہ خالی اور بے معنی ڈھانچہ ہوتا ہے۔

اگر صبر' برداشت' حسن سلوک اور اصلاح کی سب امیدیں خاک میں مل جائیں اور زندگی کا خوش اسلوبی سے بسر ہونا ممکن نہ رہے اور جدائی ہر حال میں ضروری ہو جائے اور مرد مجبور ہو جائے کہ بیوی کا بدلنا ضروری ہے' تو ایسے حالات میں عورت نے جو مہر لیا ہے اور جو مال اسے ملا ہے وہ اس کا ہو گا اور یہ جائز نہ ہو گا کہ کوئی چیز اس سے واپس لی جائے۔ اگرچہ وہ مال بڑی مقدار میں ہو' قیمتی ہو' یہ مال اس سے واپس لینا صریح گناہ ہے اور ایک قابل نفرت فعل ہے۔

وَإِنْ أَرَدْتُمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَكَانَ زَوْجٍ وَآتَيْتُمْ إِحْدَاهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَأْخُذُوا مِنْهُ شَيْئًا ۚ أَتَأْخُذُونَهُ بُهْتَانًا وَإِثْمًا مُبِينًا ﴿٢٠﴾

"اور اگر تم ایک بیوی کی جگہ دوسری بیوی لے آنے کا ارادہ ہی کرو تو خواہ تم نے اسے ڈھیر سا مال ہی کیوں نہ دیا ہو' اس میں سے کچھ واپس نہ لینا۔ کیا تم اسے بہتان لگا کر اور صریح ظلم کر کے واپس لو گے۔"

یہاں بھی ایک گہرا انسانی اور وجدانی ٹچ دیا جاتا ہے۔ عائلی زندگی کی ایک جھلک دکھائی جاتی ہے۔ عجیب انداز تعبیر اور اشارات سے بھرپور رموز ہیں۔

وَكَيْفَ تَأْخُذُونَهُ وَقَدْ أَفْضَىٰ بَعْضُكُمْ إِلَىٰ بَعْضٍ وَأَخَذْنَ مِنكُم مِّيثَاقًا غَلِيظًا ﴿٢١﴾

"اور آخر تم کس طرح لے لو گے جبکہ تم ایک دوسرے سے لطف اندوز ہو چکے ہو اور وہ تم سے پختہ عہد لے چکی ہیں۔"

یہاں افضی فعل کے مفعول کو متعین نہیں کیا گیا۔ لفظ کو عام چھوڑ دیا گیا' اس سے اس کے ہر قسم کے مدلول کا اظہار ہو سکتا ہے۔ تمام مفاہیم پر اس کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ تمام اشارات ذہن میں گردش کرتے ہیں' جسمانی لطف اندوزی بھی' جذبات و میلانات بھی' احساسات اور تصورات بھی' راز و نیاز بھی اور وہ تمام دلچسپیاں بھی جو میاں بیوی کے درمیان ہو سکتی ہیں۔ انسانی زندگی کے شب و روز کی ہر شکل و صورت اس لفظ افضی کے مفہوم میں آتی ہے۔ غرض وہ تمام باتیں پردۂ خیال پر آجاتی ہیں جن کا تعلق میاں بیوی کے اس اہم ادارے کی گزشتہ زمان و مکان کے ساتھ وابستہ رہی ہیں۔ دل کی ہر دھڑکن افضاء ہے' ہر مشتاقانہ نظر افضاء ہے' جسم کا ہر لمس افضاء ہے' غم اور امید میں شرکت افضاء ہے۔ حال و مستقبل کی ہر مشترکہ سوچ افضاء ہے۔ ہر پچھلی سوچ افضاء ہے اور سب سے اعلیٰ یہ کہ دونوں کی مشترا ولاد بھی افضاء ہے۔

تصورات و احساسات کا یہ ڈھیر ہے' جذبات و میلانات کی یادوں کی اس تازگی کو صرف چند الفاظ میں اسکرین پر لایا گیا۔ وَقَدْ أَفْضَىٰ بَعْضُكُمْ إِلَىٰ بَعْضٍ .... "اور تم ایک دوسرے سے لطف اندوز ہو چکے ہو۔" ان یادوں کے ہوتے ہوئے اب مرد کے لئے بعض حقیر چیزوں کا مطالبہ کرنا' نہایت ہی حقیر نظر آتا ہے اور اب شرم کے مارے وہ اس مفاداتی مطالبے سے باز آجاتا ہے۔ اس لئے کہ وہ ماضی قریب کی عملی زندگی کے خوشگوار تصورات کو اسکرین پر دیکھ رہا ہوتا ہے۔ اب اسے وقت فراق میں یہ یادیں اذیت دیتی ہیں اور وہ یہ احساس کرتا ہے کہ یہ تمام واقعات بادل نخواستہ ہیں۔

ان یادوں کے ساتھ ساتھ ایک دوسری بات' ایک دوسرا فیکٹر بھی یاد دلایا جاتا ہے۔ گویا اسکرین پر ایک دوسری جھلک آتی ہے۔ ایک دوسرا رنگ نمودار ہوتا ہے۔ وَأَخَذْنَ مِنكُم مِّيثَاقًا غَلِيظًا .... "اور وہ تم سے پختہ عہد لے چکی ہیں۔" میثاق نکاح اللہ کے نام سے اور خطبے کے ساتھ' نبی کی سنت کے مطابق۔ یہ عہد نکاح ایک عظیم عہد جسے نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ ایک مومن کے نزدیک وہ بہت بڑی بات ہے۔ یہ نکاح اہل ایمان کے مابین ہے اور اہل ایمان اسے ایک عظیم عقد بلکہ میثاق سمجھتے ہیں۔ اس کا احترام ان پر لازم ہے۔

آخر میں ایک فعل شنیع کے بارے میں قطعی حرمت آتی ہے۔ یہ فعل جاہلیت میں مروج تھا۔ بیٹے باپ کی منکوحہ سے نکاح کر لیا کرتے تھے۔ اور بعض اوقات اس حق نکاح کی وجہ سے عورتیں معطل ہو کر رہ جاتی تھیں کہ بچہ بڑا ہو اور اپنے والد کی بیوی سے نکاح کرے۔ اور اگر بڑا ہوتا تو وہ منکوحہ والد کو مال میراث تصور کرتا۔ اسلام نے اس فعل کو سخت ترین الفاظ میں حرام قرار دیا۔

وَلَا تَنكِحُوا مَا نَكَحَ آبَاؤُكُم مِّنَ النِّسَاءِ إِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ ۚ إِنَّهُ كَانَ فَاحِشَةً وَمَقْتًا

وَ سَآءَ سَبِيۡلًا ﴿۲۲﴾

"اور جن عورتوں سے تمہارے باپ نکاح کر چکے ہیں ان سے ہرگز نکاح نہ کرو' مگر پہلے جو ہو چکا سو ہو چکا۔ درحقیقت یہ ایک بے حیائی کا فعل ہے' ناپسندیدہ ہے' اور برا چلن ہے۔"

اس تحریم کی حکمت کے حوالے سے دو تین باتیں ذہن میں آتی ہیں' اگرچہ انسان کے لئے یہ تو ناممکن ہی نہیں ہے کہ وہ شرعی احکام کی تمام حکمتوں اور رازوں کا احاطہ کر سکے۔ ہمارے لئے تو بس یہی کافی ہے کہ اللہ نے یہ قانون بنایا ہے جو ہمارے لئے بنا دیا ہے۔ اور ہمیں یقین ہے کہ اس میں ضرور کوئی حکمت اور مصلحت ہوگی.... بہرحال جو تین چیزیں سمجھ میں آتی ہیں وہ یہ ہیں کہ سوتیلی ماں بھی ماں ہوتی ہے' یہ کہ باپ کی جگہ بیٹے کا آنا سوئے ادب ہے۔ کیونکہ اس شکل میں وہ باپ کا مساوی اور شریک ہو جاتا ہے۔ فطرۃ ایک انسان اپنی بیوی کے پہلے خاوند کو ناپسند کرتا ہے۔ یوں وہ اپنے باپ کو بھی ناپسند کرنے لگے گا۔ تیسری بات یہ ہے کہ منکوحہ اب کے ساتھ والد کے ترکہ کے تصورات کی وابستگی ہو سکتی ہے' جبکہ جاہلیت میں ایسے رواجات بھی تھے۔ اور یہ ایک ایسا کریہہ تصور ہے جو بیک وقت مرد اور عورت دونوں کے لئے مکروہ ہے۔ کیونکہ دونوں ایک ہی نفس سے پیدا کئے گئے ہیں اور ایک کی توہین دوسرے کی توہین ہے۔

یہ ہیں وہ ظاہری وجوہات جن کی بناپر اللہ تعالیٰ نے اس فعل کو مکروہ' ناپسندیدہ اور شنیع اور بدچلنی قرار دیا ہے جبکہ ان کے علاوہ بھی بہت سے اسباب اور حکمتیں ہو سکتی ہیں۔ ہاں اور جاہلیت میں جو نکاح ہوئے وہ معاف ہیں اور ان کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے۔

○.....☆☆☆.....○

اس سبق کے تیسرے پیرے میں عورتوں میں سے محرمات کی فہرست دی گئی ہے۔ یہ بھی خاندانی نظام کی تشکیل اور تنظیم کے اقدامات میں سے ایک اہم اقدام ہے۔ خاندان کے بعد اسلامی معاشرے کی ضابطہ بندی ہے۔

حُرِّمَتۡ عَلَيۡكُمۡ اُمَّهٰتُكُمۡ وَبَنٰتُكُمۡ وَاَخَوٰتُكُمۡ وَعَمّٰتُكُمۡ وَخٰلٰتُكُمۡ وَبَنٰتُ الۡاَخِ وَبَنٰتُ الۡاُخۡتِ وَاُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِىۡۤ اَرۡضَعۡنَكُمۡ وَاَخَوٰتُكُمۡ مِّنَ الرَّضَاعَةِ وَاُمَّهٰتُ نِسَآٮِٕكُمۡ وَرَبَآٮِٕبُكُمُ الّٰتِىۡ فِىۡ حُجُوۡرِكُمۡ مِّنۡ نِّسَآٮِٕكُمُ الّٰتِىۡ دَخَلۡتُمۡ بِهِنَّ فَاِنۡ لَّمۡ تَكُوۡنُوۡا دَخَلۡتُمۡ بِهِنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيۡكُمۡ وَحَلَاۤٮِٕلُ اَبۡنَآٮِٕكُمُ الَّذِيۡنَ مِنۡ اَصۡلَابِكُمۡ ۙ وَاَنۡ تَجۡمَعُوۡا بَيۡنَ الۡاُخۡتَيۡنِ اِلَّا مَا قَدۡ سَلَفَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوۡرًا رَّحِيۡمًا ۙ﴿۲۳﴾

وَّالۡمُحۡصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا مَلَـكَتۡ اَيۡمَانُكُمۡ

"تم پر حرام کی گئی ہیں تمہاری مائیں' بیٹیاں' بہنیں' پھوپھیاں' خالائیں' بھتیجیاں اور تمہاری وہ مائیں جنہوں نے تم کو دودھ پلایا ہو'

اور تمہاری دودھ شریک بہنیں اور تمہاری بیویوں کی لڑکیاں جنھوں نے تمہاری گودوں میں پرورش پائی ہے.... ان بیویوں کی لڑکیاں جن سے تمہارا تعلق زن و شو ہو چکا ہے ورنہ اگر تعلق زن و شو نہ ہوا تو تم پر کوئی مواخذہ نہیں اور تمہارے ان بیٹوں کی بیویاں جو تمہارے صلب سے ہوں اور یہ بھی تم پر حرام کیا گیا ہے کہ ایک نکاح میں دو بہنوں کو جمع کرو مگر جو پہلے ہو چکا سو ہو چکا۔ اللہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔ اور وہ عورتیں بھی تم پر حرام ہیں جو کسی دوسرے کے نکاح میں ہوں۔ البتہ ایسی عورتیں اس سے مستثنیٰ ہیں جو جنگ میں تمہارے ہاتھ آجائیں۔ ان کے سوا جتنی عورتیں ہیں وہ تمہارے لئے حلال ہیں۔"

محرمات، یعنی وہ عورتیں جن سے نکاح حرام ہے وہ تمام اقوام و امم میں معروف ہیں۔ چاہے پسماندہ اقوام ہوں یا ترقی یافتہ اقوام ہوں۔ تحریم کے اسباب اور تحریم کے درجات مختلف اقوام کے ہاں مختلف رہے ہیں۔ قدیم پسماندہ اقوام کے اندر یہ دائرہ بہت ہی وسیع رہا ہے جبکہ ترقی یافتہ ممالک کے اندر یہ سکڑتا رہا ہے۔

اسلام میں آیت زیر بحث اور اس سے پہلی آیت میں ان محرمات کی تحدید کی گئی ہے۔ بعض محرمات ابدی ہیں۔ اور بعض وقتی ہیں۔ بعض بہ سبب نسب ہیں، بعض بوجہ رضاعت ہیں اور بعض بوجہ مصاہرت ہیں۔

ان محرمات اور اسباب کے علاوہ اسلام نے تمام دوسری پابندیوں کو ختم کر دیا، جو دوسرے معاشروں کے اندر مروج تھیں، مثلاً وہ پابندیاں جو نسلی وجوہات کی بنا پر رائج تھیں۔ قومی حد بندیوں کی وجہ سے رائج تھیں یا رنگ کی وجہ سے رائج تھیں یا وہ پابندیاں جو طبقاتی درجات کی وجہ سے رائج تھیں حالانکہ ان میں زوجین ایک نسل، ایک وطن اور ایک علاقے کے باشندے ہوا کرتے تھے۔[۱]

قرابت داری کی وجہ سے اسلام میں چار قسم کی عورتیں حرام ہیں۔

۱۔ کسی شخص کے اصول جس قدر اوپر چلتے جائیں، مثلاً ماں دادیاں، نانی اور یہ سب "امہات" کے لفظ میں شامل ہیں۔
حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ أُمَّهَاتُكُمْ .... "تم پر تمہاری مائیں حرام ہیں۔"

۲۔ دوسری قسم کسی شخص کے فروع ہیں جس قدر نیچے چلے جائیں۔ مثلاً بیٹیوں اور بیٹیوں کی اولاد سے نکاح حرام ہے اور یہ وَبَنَاتُكُمْ میں داخل ہیں۔

۳ ماں اور باپ کے فروع، جس قدر نیچے چلتے جائیں۔ بہن، بھانجی، بھتیجی اور ان کی اولاد یہ أَخَوَاتُكُمْ بَنَاتُ الْأَخِ .... اور بَنَاتُ الْأُخْتِ.............. میں داخل ہیں۔

۴۔ نانا دادا کی براہ راست اولاد، لہٰذا پھوپھیاں اور خالائیں حرام ہوں گی۔ ماں باپ کی پھوپھیاں اور خالائیں بھی حرام ہوں گی اور نانا دادا کی پھوپھیاں اور خالائیں بھی حرام ہوں گی وغیرہ۔ یہ سب عَمَّاتُكُمْ وَخَالَاتُكُمْ .... میں داخل ہیں۔ لیکن اجداد کی وہ اولاد جو براہ راست نہ ہو درمیان واسطہ آجائے تو وہ جائز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ چچازاد بہن، خالہ زاد، پھوپی زاد کے ساتھ نکاح جائز ہے اور ان کی اولاد کے ساتھ بھی۔

مصاہرت کی بنا پر پانچ قسم کی عورتیں حرام ہیں۔

۱۔ بیوی کے اصول، جہاں تک اوپر کی طرف چلتے جائیں۔ چنانچہ بیوی کی ماں، بیوی کی دادی، بیوی کی نانی، جہاں تک اوپر چلے جائیں حرام ہیں۔ اور یہ حرمت نکاح کرتے ہی قائم ہو جاتی ہے۔ چاہے دخول ہوا ہو یا نہیں۔ اور یہ وَأُمَّهَاتُ نِسَائِكُمْ میں داخل ہیں۔

---

[۱] تفصیلات کے لئے دیکھئے ڈاکٹر عبدالواحد وافی کی کتاب "خاندان اور معاشرہ" ص ۲۶ تا ۵۶

۲- بیوی کی فروعات جس قدر بھی نیچے چلتے جائیں۔ مثلاً بیوی کی لڑکی حرام ہے' اس کی اولاد حرام ہے' مرد ہو یا عورت۔ لیکن یہ حرمت اس وقت قائم ہوتی ہے جب بیوی کے ساتھ مباشرت ہو گئی ہو۔ قرآن میں ہے

وَ رَبَآئِبُكُمُ الّٰتِیْ فِیْ حُجُوْرِكُمْ مِّنْ نِّسَآئِكُمُ الّٰتِیْ دَخَلْتُمْ بِهِنَّ٘ فَاِنْ لَّمْ تَكُوْنُوْا دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْكُمْ

"اور تمہاری بیویوں کی لڑکیاں جنھوں نے تمہاری گود میں پرورش پائی جن سے تمہارا تعلق زن و شو ہو چکا ہو ورنہ اگر تعلق زن و شو نہ ہوا ہو تو تم پر کوئی مواخذہ نہیں۔"

۳- باپ دادا اور نانا کی بیویاں' جس قدر اوپر چلے جائیں۔ چنانچہ باپ کی بیوی' دادا اور نانا کی بیوی سے نکاح حرام ہے۔ وَلَا تَنْكِحُوْا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ .... "اور جن عورتوں سے تمہارے باپ نکاح کر چکے ہیں ان سے نکاح نہ کرو۔ مگر جو پہلے ہو چکا' سو ہو چکا۔" یعنی جاہلیت میں جو ہو چکا سو ہو چکا' اس لئے کہ جاہلیت میں یہ جائز تھا۔

۴- بیٹوں کی بیویاں اور پوتوں کی بیویاں جس قدر نیچے کو چلتے جائیں۔ اس لئے ایک شخص کے لئے اپنے صلبی بیٹے کی بیوی سے نکاح حرام ہے۔ اسی طرح صلبی پوتے کی بیوی کے ساتھ نکاح حرام ہے۔ اسی طرح لڑکی کے لڑکے کی بیوی کے ساتھ نکاح بھی حرام ہو گا۔ جس قدر نیچے چلتے جائیں۔ وَحَلَآئِلُ اَبْنَآئِكُمُ الَّذِیْنَ مِنْ اَصْلَابِكُمْ .... "اور تمہارے ان بیٹوں کی بیویاں جو تمہارے صلب سے ہوں۔" اصلابکم کی شرط اس لئے عائد کی گئی ہے کہ جاہلیت میں منہ بولے بیٹے کی بیوی بھی حرام سمجھی جاتی تھی' اس لئے اس کو صلبی بیٹے پوتے کے ساتھ مخصوص کر دیا گیا۔ اور حکم دیا گیا کہ منہ بولے بیٹوں کو ان کے والدین کی طرف نسبت دو۔ (سورۂ احزاب)

۵- بیوی کی بہن بھی حرام ہے لیکن یہ تحریم وقتی ہے۔ اگر بیوی زندہ ہو اور اس کے نکاح میں ہو۔ حرام یہ ہے کہ بیک وقت دو بہنوں کو نکاح میں رکھا جائے۔ وَاَنْ تَجْمَعُوْا بَیْنَ الْاُخْتَیْنِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ .... "اور یہ بھی تم پر حرام کیا گیا ہے کہ ایک نکاح میں دو بہنوں کو جمع کرو مگر جو پہلے ہو گیا سو ہو گیا۔" اس پر مواخذہ نہ ہو گا' اس لئے کہ نظام جاہلیت کے اندر وہ جائز تھا۔

اسی طرح رضاعت کے ذریعہ بھی وہ تمام عورتیں حرام ہو جاتی ہیں جو نسب اور مصاہرت کی وجہ سے حرام ہو جاتی ہیں اور یہ فہرست تو محرمات پر مشتمل ہے۔

۱- دودھ پلانے والی ماں اور اس کی ماں دادی نانی جس قدر بھی اوپر چلتے جائیں۔ وَاُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِیْ اَرْضَعْنَكُمْ .... "اور تمہاری وہ مائیں جنھوں نے تمہیں دودھ پلایا ہو۔"

۲- رضاعی بیٹی اور اس کی بیٹیاں جس قدر بھی نیچے چلتے جائیں۔ رضاعی بیٹی وہ ہوتی ہے' جسے کسی کی بیوی نے دودھ پلایا ہو اور وہ بیوی اس کے نکاح میں ہو۔

۳- رضاعی بہن اور اس کی بیٹیاں جس قدر نیچے بھی ہوں۔ وَاَخَوٰتُكُمْ مِّنَ الرَّضَاعَةِ .... "اور تمہاری دودھ شریک بہنیں۔"

۴- رضاعی چچی اور رضاعی خالہ۔ رضاعی خالہ دودھ پلانے والی کی بہن ہوتی ہے اور رضاعی چچی دودھ پلانے والی کے خاوند کی بہن

ہوتی ہے۔

۵۔ بیوی کی رضاعی ماں۔ یہ وہ عورت ہے جس نے بیوی کو بچپن میں دودھ پلایا۔ اس طرح اس ماں کے اصول یعنی دادی نانی جس قدر بھی اوپر کو جائیں اور یہ تحریم محض نکاح سے قائم ہو جاتی ہے' جس طرح نسب میں ہوتی ہے۔

۶۔ بیوی کی رضاعی بیٹی' یعنی وہ لڑکی جس کو بیوی نے اس شخص کے ساتھ نکاح کرنے سے پہلے دودھ پلایا ہو۔ اسی طرح اس کی تمام پوتیاں' جس قدر بھی نیچے چلیں۔ البتہ یہ تحریم تب جاری ہوگی جب بیوی کے ساتھ مجامعت ہو گئی ہو۔

۷۔ یعنی رضاعی باپ اور دادا کی بیوی حرام ہے۔ رضاعی باپ وہ ہے جس کی بیوی نے دودھ پلایا ہو' اس لئے صرف وہ عورت ہی حرام نہ ہوگی جس نے دودھ پلایا' وہ رضاعی ماں ہو گئی بلکہ اس کے رضاعی باپ کی منکوحہ یعنی رضاعی ماں کی سوکن بھی حرام ہوگی۔

۸۔ رضاعی بیٹے کی بیوی' جس قدر نیچے چلے جائیں۔

۹۔ اسی طرح بیوی اور بیوی کی رضاعی بہن بھی حرام ہوگی' بیوی کی رضاعی چچی اور خالہ بھی حرام ہوگی یا ہر وہ عورت جو اس کے لئے رضاعت کی وجہ سے حرام ہوئیں۔

ان محرمات میں سے قسم اول اور قسم ثالث کے بارے میں تو صراحت اس آیت میں آگئی ہے۔ باقی فہرست حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث کی روشنی میں مرتب کی گئی ہے جس میں ہے۔ "رضاعت وہی محرمات ہیں جو نسب کی وجہ سے حرام ہیں۔"

يَحْرُمُ مِنَ الرَّضَاعَةِ مَا يَحْرُمُ مِنَ النَّسَبِ .... (مسلم بخاری)

○.....☆☆☆.....○

یہ تو ہیں وہ حرام عورتیں جو شریعت نے حرام کی ہیں۔ آیت میں اس حرمت کے لئے کوئی علت اور حکمت نہیں دی گئی۔ نہ عام اور نہ کوئی خاص حکمت و علت جن لوگوں نے مختلف وجوہات و اسباب کا ذکر کیا ہے وہ ان کی جانب سے اجتہاد اور غور و فکر پر مبنی رائے ہے۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان تمام محرمات کے لئے ایک ہی علت اور سبب ہو' اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بعض محرمات کے لئے انکے مخصوص اسباب ہوں' اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کئی اقسام کا باہم مشترکہ سبب بھی ہو۔ مثلاً قریبی رشتہ داروں کے اندر شادیوں کی وجہ سے بعض اوقات بچے کمزور ہوتے ہیں اور مرور زمانہ کے ساتھ ایک ضعیف نسل وجود میں آتی ہے یعنی موروثی کمزوریاں نسلاً بعد نسل جمع ہوتی رہتی ہیں۔ اس کے مقابلے میں اگر دور دور اقوام اور نسلوں میں شادیاں کی جائیں تو اس کے نتیجے میں ایک صحت مند نسل وجود میں آتی ہے اور دونوں کی صلاحیتیں ایک جگہ جمع ہو جاتی ہیں۔

یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ بعض محرمات کے ساتھ نہایت ہی محبت' رواداری' احترام اور وقار کے تعلقات مطلوب ہوتے ہیں۔ اس لئے ان روابط کو میاں بیوی کے نازک تعلق سے دور رکھنا ضروری تھا تاکہ طلاق اور جدائی کی صورت میں تلخی پیدا نہ ہو' اور وہ جذبات مجروح نہ ہوں جنہیں شریعت دائما" رکھنا چاہتی ہے۔ مثلاً مائیں' بیٹیاں' بہنیں' خالائیں' پھوپھیاں' بھانجیاں' بھتیجیاں اور ان کے بالمقابل وہی رشتے رضاعت کی وجہ سے۔ یہ سب اسی زمرے میں آتی ہیں۔

یہ بھی کہا جا سکتا ہے بعض محرمات مثلاً بیوی کی بیٹی' بہنوں کا اجتماع' باپ کی منکوحہ' ان میں اگرچہ رشتے داری کے جذبات اور تعلقات میں کشیدگی کا احتمال نہیں ہے لیکن تعلقات کشیدہ ہو سکتے ہیں۔ مثلاً ماں کو یہ خدشہ ہو گا کہ اس کی بیٹی بھی سوکن بن سکتی ہے۔ بہن اور اس کی بیٹی ایک جگہ اگر سوکن بن جائیں۔ اسی طرح باپ کے اندر یہ شعور جاگ سکتا ہے کہ اس کے بعد اس کا بیٹا اس کا شریک ہو سکتا ہے۔ یہی

ا ب یہ تمام تفصیلات ڈاکٹر عبدالواحد وافی کی کتاب "خاندان اور معاشرہ" سے لی گئی ہیں۔

بات بہو کے بارے میں ہو سکتی ہے۔

یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ قریبی رشتہ داروں کے باہم خاندانی تعلقات تو پہلے سے موجود ہوتے ہیں۔ شریعت کا مقصد یہ ہے کہ دور دراز خاندانوں میں رشتے ناطے ہوں اور یوں خاندانی تعلقات کا دائرہ مزید وسیع ہو جائے اور رشتہ داروں کے اندر صرف اس حد پر جا کر اجازت دی گئی ہے جہاں خاندانی رشتہ کمزور ہو جاتا ہے۔ (Remote)

غرض جو علت بھی ہو، بہر حال ہم یہ بات تسلیم کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جو بھی قانون بنایا ہے، وہ ہرگز خالی از حکمت نہ ہو گا۔ اس میں انسانوں کی مصلحت اور بھلائی ہو گی۔ رہی ہماری دانست کی بات تو کبھی ہمیں اس کا علم ہو گا اور کبھی نہ ہو گا۔ ہماری دانش و علم کا اثر اللہ کی شریعت پر نہیں پڑتا۔ نہ شریعت کے نفاذ اور اس کی اطاعت پر کوئی فرق پڑتا ہے۔ ہمیں تسلیم و رضا کے ساتھ شریعت کی اطاعت کرنا ہے۔ اس لئے کہ ایمان صرف دل ہی میں نہیں ہوتا۔ اس کا تقاضا یہ بھی ہے کہ اللہ کی شریعت کی حکمرانی قائم کی جائے اور ہم مکمل طور پر سر تسلیم خم کر دیں اور ہمارے دلوں میں شریعت کے احکام کے بارے میں کوئی خلجان نہ ہو۔

○.....☆☆☆.....○

اب آخری بات اور آیات کی تشریح باقی رہ گئی، وہ یہ ہے کہ یہ محرمات دو کو چھوڑ کر سب کی سب جاہلیت کے رواج میں بھی محرمات تھیں۔ جاہلیت میں ایک منکوحہ اب کے ساتھ نکاح کر لیا جاتا تھا، دوسرے یہ کہ دو بہنوں کو بیک وقت نکاح میں رکھنا جائز سمجھا جاتا تھا۔ اگرچہ جاہلی معاشرہ بھی انہیں مکروہ سمجھتا تھا۔ لیکن اسلام نے انہیں اس لئے نہیں حرام قرار دیا کہ دور جاہلیت میں ایسا ہوا کرتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس حرمت کو اپنے حق حاکمیت کے حوالے سے پیش فرمایا حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ "تم پر میری جانب سے حرام کی گئی ہیں۔"

یہ معاملہ محض الفاظ کا نہیں ہے، نہ صرف شکل و صورت کا ہے بلکہ یہ پورے دین کا معاملہ ہے۔ اس کے عقدہ کو حل کر لینے سے پوری دین کی حقیقت سمجھ میں آجاتی ہے۔ اور وہ اصول ہمارے ہاتھ آجاتا ہے جس پر یہ دین قائم ہے۔ یعنی حاکمیت صرف اللہ وحدہ کا خاصہ ہے۔

اس دین کا فیصلہ یہ ہے کہ حرام و حلال کی حدود کے تعین کا اختیار صرف اللہ کو ہے۔ اس لئے کہ حاکمیت الٰہیہ کی یہ ایک نہایت ہی بنیادی خصوصیت ہے۔ اس لئے حلال و حرام کے تعین کے لئے ضروری ہے کہ اس پر اللہ کی جانب سے کوئی سلطان و ثبوت ہو۔ یہ وہی ذات ہے جو لوگوں کے لئے بعض چیزوں کو حرام کر دیتی ہے۔ اور بعض کو حلال کر دیتی ہے اور اس ذات کے سوا کسی اور کو یہ اختیار اس نے نہیں دیا ہے۔ نہ یہ حق کوئی اپنے لئے مخصوص کر سکتا ہے۔ اس لئے کہ اگر حاکمیت کے اس حق کا کوئی اپنے لئے مدعی ہو گا تو وہ گویا الوہیت کا دعوٰی کرے گا۔

یہی وجہ ہے کہ ہر جاہلی نظام اپنے لئے حلال و حرام خود مقرر کرتا ہے۔ اور اسلامی نظریۂ حیات کے مطابق اس کے مقرر کردہ یہ حلال و حرام ابتداء ہی سے باطل (Void) اور کالعدم ہیں۔ اس لئے جب اسلام آتا ہے تو وہ جاہلیت کے تمام ضابطوں کو کالعدم کر دیتا ہے، جس میں حلال بھی شامل ہیں اور حرام بھی۔ اور ان میں سے کسی چیز کو قائم نہیں رکھتا۔ اس لئے کہ یہ حلال و حرام اگر درست بھی ہوں، لیکن ان لوگوں نے مقرر کئے تھے جنہیں اس کا اختیار (Jurisdiction) نہ تھا۔ ان میں سے کوئی بھی نہ الٰہ ہے۔ اس منسوخی کے بعد اسلام از خود حلال و حرام کا تعین کرتا ہے۔ اگر جاہلیت میں کوئی چیز حلال قرار دی گئی تھی تو اس کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ وہی حلال ہے جسے اسلام حلال کر دے اور وہی حرام ہے جسے اسلام حرام کر دے۔ از جانب اللہ۔

اسلام کا یہ نظریہ حلال و حرام اس کائنات کی تمام اشیاء اور ان انسان کے تمام افعال و سرگرمیوں پر حاوی ہے۔ اس کے دائرہ سے

کوئی چیز باہر نہیں ہے۔ اس لئے کہ اللہ کے سوا کسی اور کو حلال و حرام کے تعین کا اختیار ہی نہیں ہے۔ نکاح و طلاق میں' کھانے و پینے میں' لباس و صورت میں' عمل و حرکت میں' تعلقات و معاملات میں' رسم و رواج میں اور قانون و ضوابط میں' غرض تمام معاملات میں مصدر قانون ذات باری ہے۔

اللہ کے علاوہ جس مصدر اور جس ادارے سے بھی حلال و حرام کا تعین ہو گا وہ اپنی اصلیت کے اعتبار سے باطل (Void) ہے۔ نہ اس کا اجراء ہو سکتا ہے' نہ اس کی تصحیح (Validation) ہو سکتی ہے۔ کیا اسلامی شریعت نے جاہلیت کے بعض احکام کو جاری رکھا ہے؟ نہیں یہ سوچ درست نہیں ہے۔ شریعت نے ہر چیز اپنی طرف سے از سر نو جاری کی ہے۔ اور اس کا اجراء اللہ کی طرف سے ہوا ہے۔ یہ سوچ درست نہیں ہے کہ بعض احکام جاہلیت کا تسلسل ہیں بلکہ اس نے از سر نو اپنے احکام جاری کئے' تمام رسوم و رواج جاری کئے' اور اللہ تعالیٰ کے اختیار حاکمیت کے تحت جاری کئے۔

قرآن کریم نے اس نظریہ کی بار بار تاکید کی ہے اور اس معاملے میں وہ اہل جاہلیت کے ساتھ بار بار بحث کرتا ہے۔ وہ بار بار چیلنج کرتا ہے کہ تمہیں کیا اختیار ہے کہ تم حلال و حرام کرتے پھرتے ہو۔ کون ہے حرام کرنے والا؟ قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ .... "پوچھو' کون ہے جس نے اللہ کے سلان زینت کو حرام کیا ہے جو اس نے اپنے بندوں کے لئے پیدا کیا ہے اور پاکیزہ خوراک کو۔" قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ "کہہ دو' آؤ میں پڑھ کر سناؤں جو تمہارے رب نے تم پر حرام کیا ہے۔"

قُلْ لَّآ اَجِدُ فِيْ مَآ اُوْحِيَ اِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلٰي طَاعِمٍ يَّطْعَمُهٗٓ اِلَّآ اَنْ يَّكُوْنَ مَيْتَةً اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا اَوْ لَحْمَ خِنْزِيْرٍ

"کہہ دو' جو کچھ میری طرف وحی کیا گیا ہے میں تو اس میں کوئی چیز نہیں پاتا' جو کسی کھانے والے پر حرام کی گئی ہو' جو اس چیز کو کھاتا ہے' سوائے اس کے کہ وہ چیز بہاہوا خون ہو یا خنزیر کا گوشت ہو۔"

اس بحث و تکرار کے ذریعہ قرآن کریم اہل جاہلیت کو اس اصول کی طرف لوٹا رہا تھا کہ حلال و حرام کے حدود کے تعین کا اختیار صرف اللہ تعالیٰ کو ہے۔ اور کسی انسان کو یہ اختیارات حاصل نہیں ہیں۔ نہ کسی فرد کو' نہ کسی طبقے کو' نہ کسی قوم کو اور نہ تمام دنیا کی آبادی کو۔ یہ اختیار صرف اللہ تعالیٰ کے اختیار حاکمیت کے تحت ہی ا' 'حال ہو سکتا' اس کی شریعت کے مطابق استعمال ہو سکتا ہے۔ شریعت تو نام ہی اجازت و ممانعت کا ہے۔ یہی تو دین اسلام ہے' اس لئے جو حرام و حلال مقرر کرتا ہے گویا وہ دین کا مالک ہے۔ اگر یہ حلال و حرام کرنے والا اللہ ہے تو پھر لوگ جو اس کو مانتے ہیں' ہم کہیں گے کہ وہ اللہ کے دین پر ہیں' تو پھر وہ دین اسلام میں داخل ہوں گے۔ اگر حلال و حرام کی حدیں کسی معاشرے میں کوئی اور مقرر کر رہا ہے تو ہم کہیں گے یہ لوگ اس شخص کے دین پر ہیں۔ تو وہ پھر اس کے دین میں داخل ہوں گے۔ دین اسلام میں داخل نہ ہوں گے۔

یہ مسئلہ اپنے اس فریم ورک میں اللہ کی حاکمیت اور الوہیت کا مسئلہ ہے۔ یہ دین اور اس کے مفہوم کا مسئلہ ہے۔ یہ ایمان اور حدود ایمان کا مسئلہ ہے۔ میں پورے عالم اسلام میں مسلمانوں کو دعوت دیتا ہوں کہ وہ اس نقطۂ نظر سے اپنی پوزیشن متعین کریں کہ وہ کہاں کھڑے ہیں۔ ان کا دین سے تعلق کیا ہے؟ ان کا اسلام سے کیا تعلق رہا ہے؟ کیا اس کے باوجود وہ یہ دعویٰ کرتے ہی چلے جائیں گے کہ وہ مسلمان ہیں.....؟